

جمہوریت ہندوستان کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف
کے جملہ خطبات، خطوطات اور تقریریں جو جملہ تصانیف
سے منتخب سنگمروں، انہماقی تیسری نکات

ابوالکلام

تقریریں و خطبات
شیخ الاسلام مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف

نظر ثانی

پروفیسر مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف

طابعہ

دارالافتاء اسلامیہ

محکم المکتبہ دارالمنزل حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
کے جملہ خطبات ملفوظات اور تقریریاں جملہ تصانیف سے منتخب سینکڑوں
الہامی تفسیری نکات

اشرف التفسیر (جلد ۱)

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

سورۃ الفاتحہ - تا - آل عمران

تقدیم و کاوش

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

نقد و ثانی

علم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

صوفی محمد اقبال قریشی صاحب
ابو حذیفہ محمد اسحاق ملتانی

ادارۃ تالیفات اشرفیہ

ہوٹل نورہ ٹسٹان ہیکٹ ٹسٹان فون: 540513-519240
Email: Taleefat@mul.wol.net.pk

نام کتاب..... اشرف التفاسیر (جلد-۱)
تاریخ اشاعت..... صفر القمطر ۱۴۳۵ھ
ناشر..... اِذَا رَهْ تَالِيغَاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
طباعت..... سلامت اقبال پریس ملتان

طے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کونڈ
کتب خانہ شہیدہ راج بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
دارالاشاعت اردو بازار کراچی
بک لینڈ اردو بازار لاہور
ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121 HALLWELL ROAD
BOLTON BLJ3NE (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران غلطی کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نگی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

اشرف التفاسیر

کا جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

الحمد للہ ”اشرف التفاسیر“ بہت مقبول ہوئی، اہل علم نے خاص طور پر اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جزا ہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ نے حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات میں سے مزید بہت سارے تفسیری نکات جمع کر کے ہمیں ارسال فرمائے ہیں جو اس ایڈیشن میں شامل کتاب کر دیئے گئے۔

اس مبارک اضافہ کے علاوہ خود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا عربی رسالہ ”سبق الغایات فی نسق الآیات“ بھی سورتوں کی ترتیب کے مطابق آخر میں لگایا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ اضافہ جات تمام علم دوست حضرات کے لئے مزید علمی و عملی برکتوں کا باعث ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

اجمالي فهرست

جلد - ١

٤٨	سورة الفاتحة
٥٠	سورة البقرة
٢٤٤	سورة آل عمران

جلد - ٢

٥	سورة النساء
٨٠	سورة المائدة
١١٣	سورة الانعام
١٥١	سورة الاعراف
١٩٤	سورة الانفال
٢٠٤	سورة التوبة
٢٧٤	سورة يونس
٢٥٦	سورة هود
٣١٨	سورة يوسف
٣٣٧	سورة الرعد

جلد - ٣

٣٤١	سورة ابراهيم
٣٥٦	سورة الحجر
٣٧٢	سورة النحل
٣٩٨	سورة بني اسرائيل

٥	سورة الكهف
٢٠	سورة مريم
٤٢	سورة طه
٥٦	سورة الانبياء
٦٦	سورة الحج
٨٧	سورة المؤمنون
٩٢	سورة النور
١٣١	سورة الفرقان
١٤٣	سورة الشعراء
١٤٨	سورة النمل
١٥٠	سورة القصص

٨٦	سورة الذاريات	١٧٢	سورة العنكبوت
٩٠	سورة الطور	١٩٦	سورة الروم
٩٤	سورة النجم	١٠٤	سورة لقمان
١٠٤	سورة القمر	٢١٧	سورة الاحزاب
١١١	سورة الرحمن	٢٥٥	سورة سبا
١٢٢	سورة الواقعة	٢٦١	سورة فاطر
١٢٥	سورة الحديد	٢٧٦	سورة يس
١٢٧	سورة المجادلة	٢٧٩	سورة الصافات
١٥٢	سورة الصحر	٢٨٤	سورة ص
١٥٧	سورة الممتحنة	٢٩٢	سورة الزمر
١٦٢	سورة الصف	٣٢٢	سورة المؤمن
١٦٧	سورة الجمعة	٣٢٨	سورة هم السجدة
١٧٦	سورة المنافقون	٣٤٥	سورة التورى
١٩٢	سورة التفاين	جلد - ٢	
٢٠٨	سورة الطلاق	٢٤	سورة الزخرف
٢١٤	سورة التمريم	٢٨	سورة الدخان
٢٢٢	سورة الملك	٣١	سورة الجاثية
٢٣٤	سورة الماقه	٤٢	سورة الاحقاف
٢٣٧	سورة نوع	٤٦	سورة محمد
٢٤٠	سورة المزمل	٥١	سورة الفتح
٢٥٢	سورة القيامة	٥٥	سورة المجرات
٢٦٠	سورة المرسلات	٦٢	سورة ق

۲۱۲	سورة الضحیٰ	۲۶۲	سورة عبس
۲۲۲	سورة الانشراح	۲۶۷	سورة التکویر
۲۲۵	سورة العلوق	۲۶۸	سورة الانفطار
۲۲۸	سورة القدر	۲۷۳	سورة المطففين
۲۳۰	سورة البینة	۲۷۵	سورة البروج
۲۳۵	سورة الزلزال	۲۷۷	سورة الاعلیٰ
۲۳۹	سورة العصر	۲۹۰	سورة الفاتیه
۲۵۱	سورة الکافرون	۲۹۲	سورة الفجر
۲۵۲	سورة النصر	۲۹۷	سورة البلد
۲۵۸	سورة الفلق	۳۰۱	سورة الشمس
۲۶۵	سورة الناس	۳۱۰	سورة اللیل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انعاماتِ الہیہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

تصوف و طریقت جو کہ دین اسلام کا ایک اہم جزو ہے اس کے مطالعہ سے ایک عام قاری اہل اللہ کی صحبت کی اہمیت و افادیت کو نظر انداز کر سکتا ہے لیکن وہ خوش نصیب جن کو یہ دولت حاصل ہوئی ہے وہی اسکی حقیقت و افادیت ضرورت و اہمیت کو سمجھتے ہیں۔

احقر کی زندگی میں تقریباً ۷۰ء کا سال ایک خوشگوار انقلاب کا سال تھا جس نے احقر کو دینی و دنیاوی نعمتوں سے مالا مال کر دیا جس دن کہ مجھے سیدی و مرشدی و مربی عارف باللہ حضرت الحاج مولانا محمد شریف صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ ارشد حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ) کا دامن نصیب ہوا جن کی صحبت اور پر خلوص دعاؤں نے وہ ثمرات عطا کئے کہ جن پر جس قدر بھی شکر خداوندی ادا کیا جائے کم ہے اللہ پاک اس کی صحیح قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ ”طریق القلندر“ کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جس کو حضرت کافی سنبھال کر رکھا کرتے تھے۔ ایک دن احقر نے اس وعظ کی نایابی اور حضرت کی اس سے خصوصی عقیدت کی بنا پر عرض کیا کہ حضرت کیوں نہ اس وعظ کو چھپوایا جائے؟ جس پر حضرت نے کافی مسرت کے ساتھ دعاؤں سے نوازا اور یوں احقر نے اپنی زندگی میں اس وعظ کی طباعت سے حکیم الامت کی کتب کی طباعت و اشاعت کی ابتداء کی اور اس وعظ کی طباعت کے موقع پر میرے محسن جناب حاجی انوار الہی صاحب نے خصوصی معاونت فرمائی جن کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ پاک ان کی بال بال مغفرت فرمائیں۔ آمین

مذکورہ وعظ کی طباعت پر حضرت مرشدی حاجی صاحب نے خصوصی شفقت و مہربانی کا معاملہ فرمایا بلکہ ایک دفعہ میری درخواست پر کہ حضرت اگر ادارہ کی مطبوعات پر اظہار مسرت کے طور پر کچھ تحریر فرمادیں تو کتب کے شروع میں اس تحریر کو

لکھ دیا جائے تو حوصلہ افزائی و برکت کا باعث ہوگی جس پر حضرت نے درج ذیل کلمات تحریر فرمادیے۔

”مجھے دلی خوشی ہے کہ عزیز القدر حافظ محمد اسحاق صاحب مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تالیفات شائع کرنے کے حریص ہیں انہیں حضرت سے صرف محبت ہی نہیں محبت کا نشہ ہے حضرت کے مسلک و مذاق کی تبلیغ کے بہت خواہشمند ہیں اور زر کثیر خرچ کر کے حضرت کی کتب جو نایاب ہیں چھپواتے رہتے ہیں“

مرشدی حضرت حاجی صاحب کی وفات کے بعد احقر نے اپنا اصلاحی تعلق عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبداللہ عارفی صاحب سے قائم کیا۔ رفتہ رفتہ حضرت عارفی صاحب کی بے پناہ شفقت و محبت حاصل ہو گئی۔

ایک دفعہ حاضری پر کسی صاحب نے حضرت عارفی سے کلید مثنوی شرح مثنوی رومی کے بارہ میں پوچھا کہ حضرت کلید مثنوی کے بارہ میں سنتے ہیں کیا حضرت کے پاس مکمل کلید مثنوی موجود ہے جو اب میں حضرت عارفی رحمہ اللہ نے حسرت بھرے لہجے میں فرمایا ”میری دلی خواہش تھی کہ میں اسے مکمل حاصل کروں لیکن بہت کوشش کی تو صرف دو تین جلدیں ہی حاصل کر سکا ہوں۔ بس حضرت کی حسرت بھری تمنا سن کر دل میں اس کو مکمل حاصل کر کے طبع کرانے کا داعیہ پیدا ہوا اور ہندو پاک سے تلاش کے بعد الحمد للہ اس وقت مکمل 24 حصے بارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اللھم لک الحمد و لک الشکر۔

اب اس وقت عارف ربانی مرشدی حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب مہاجر مدنی دامت برکاتہم کی خصوصی شفقتوں اور دعاؤں سے اس وقت ”اشرف التفاسیر“ چار جلدوں میں تکمیل کے مراحل میں ہے۔

اشرف التفاسیر کیا ہے؟ یہ حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے جملہ خطبات و تالیفات سے ان قرآنی آیات کی عجیب و غریب الہامی تفسیر و تشریح کا مجموعہ ہے جن کو حضرت تھانوی کے سلسلہ کے اکابرین دیکھ کر حسرت بھری تمنا رکھتے تھے کہ یہ کسی طرح جمع ہو کر کتابی شکل میں آجائے۔ خصوصاً حضرت ڈاکٹر عبداللہ عارف صاحب مؤرخ اسلام سید سلیمان ندوی صاحب حضرت علامہ محمد یوسف بنوری اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ جیسے ارباب علم حضرات اسکی تالیف و ترتیب کے خواہش مند رہے۔ انہی اکابر کی دعاؤں اور توجہات سے یہ مبارک مجموعہ ”اشرف التفاسیر“ کے نام سے منظر عام پر آ رہا ہے اگرچہ بندہ اس کا بالکل اہل نہیں تھا اور نہ ہے۔

اپنے اکابر کی دعاؤں اور توفیق خدا سے ان نکات کو جمع کرنے کا یہ کام شروع کیا تھا۔ جیسے بن پایا جمع کرتا رہا پھر اس کا تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم سے کیا تو انہوں نے شفقت کی انتہا فرمادی کہ کثیر تعداد میں خطبات جن پر حضرت مطالعہ کے دوران تفسیری نکات پر نشان لگا چکے تھے ان تمام جلدوں کو ارسال فرما کر بندہ کی حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ اس سے اس کام کو چار چاند لگ گئے اور ایک جامع مقدمہ بھی اس پر تحریر فرمادیا جس کو شروع کتاب میں لگا دیا گیا ہے۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے بھی اس کام کو شروع کر رکھا ہے۔ انہوں نے بھی ازراہ شفقت ارسال کرنے کو فرمایا۔ بندہ نے ان سے درخواست کی کہ ہم اپنا مسودہ آپ کی خدمت میں بھیج دیتے ہیں آپ سب نکات کو ترتیب دے دیں۔ انہوں نے کرم بالا کرم فرماتے ہوئے اس درخواست کو قبول فرمایا اور کافی محنت و

کاوش سے ان نکات کو مرتب فرمادیا اور بیان القرآن سے منتخب آیات کا ترجمہ بھی لکھا۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔ اس کے بعد بھی مسودہ تشریح تکمیل تھا جس کی وجہ سے نظر ثانی کیلئے علماء کی ضرورت شدت سے تھی تاکہ ہر لحاظ سے یہ مسودہ مستند ہو جائے اس لئے درج ذیل علماء کی خدمات حاصل کی گئی۔

اولاً یادگار سلف حضرت مولانا مفتی عبدالقار صاحب مدظلہم (شیخ الحدیث دارالعلوم کبیر والا) نے بھی نظر فرمائی اور اپنی نگرانی میں اپنے شاگرد رشید مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب (استاد حدیث جامعہ محمدیہ عربیہ نواب شاہ) سے بقیہ پر نظر ثانی کروائی۔ اس کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب صادق آباد اور مولانا محمد ازہر صاحب مدیر ماہنامہ الخیر نے بھی تصحیح و ترتیب میں کافی معاونت فرمائی۔

فجزاہم اللہ احسن الجزاء

بہر حال یہ سب کچھ اپنے بزرگان کی دعاؤں کا ثمرہ ہے ورنہ ہماری حالت تو بزبان حال یہ ہے

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہو گا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ ہوا ہوا تیرے کرم سے جو کچھ ہو گا تیرے ہی کرم سے ہو گا

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا آیات کے ربط کے بارہ میں خصوصی شغف تھا اور اللہ پاک نے آپ کو اس میں کافی مہارت سے نوازا تھا۔ جس کی بنا پر حضرت نے ایک مستقل رسالہ ”سبق الغایات فی نسق الایات“ تحریر فرمایا تھا جس کی افادیت و ضرورت کے پیش نظر اہل علم حضرت کیلئے ہر سورۃ کے آخر میں رسالہ کا متعلقہ مضمون لگا دیا گیا ہے

جہاں ہمیں دوسرے حضرت کی دعائیں حاصل ہوئیں وہاں جناب نواب عشرت علی خان قیصر صاحب (مستر شد خاص حضرت تھانویؒ) کی بھی خصوصی دعائیں اور توجہات شامل حال رہیں اور کچھ عرصہ قبل ایک خط میں یوں تحریر فرمایا کہ ”حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کی تالیفات کی اشاعت و طباعت سے حضرت مجدد صاحبؒ کی روح مسرور ہے اور

آپ پر برزخی توجہ ہے۔ اللہم لک الحمد والشکر

اللہ تعالیٰ ہماری اس سعی نا تمام کو شرف قبولیت نصیب فرمائیں اور اپنے اکابرین کے مسلک و مذاق پر قائم رکھیں اور انہی کی سرپرستی میں اپنے دین کی خدمت لیتے رہیں۔ آمین

والسلام

احقر محمد اسحاق بن عبدالقیوم عفی عنہما

(ربیع الثانی) ۱۴۲۰ھ

مقدمہ

از شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمین. والصلوة والسلام علی رسولہ الکریم و علی آلہ واصحابہ اجمعین، اما بعد قرآن کریم کے بارے میں بجا طور پر یہ کہا گیا ہے کہ "لأن نقضی عجائبه یعنی اس کے الفاظ و اسالیب میں نہاں اسرار و حکم کے اتھاہ خزانے کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ یہ کلام الہی کا اعجاز ہے کہ جب ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی اسے سادگی سے پڑھتا ہے تو اس کا وہ سادہ مفہوم سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ جو اسے عمومی ہدایت دینے کے لئے کافی ہو۔ لیکن جب کوئی عالم اسی کلام سے احکام اور حکمتوں کا استنباط کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہی کلام بڑے دقیق و عمیق نکات کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور ان نکات کی گہرائی اور وسعت ہر شخص کے علم و بصیرت کی نسبت سے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے جابجا اس کلام میں تدبیر کا حکم دیا ہے جس کے نتیجے میں بسا اوقات ایک عالم پر وہ نکات واضح ہوتے ہیں جن کی طرف سے پہلے کسی نے توجہ نہیں کی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے اس آخری دور میں مآخذ دین کی تشریح و تبلیغ کی غیر معمولی توفیق عطا فرمائی تھی یوں تو دین کے تمام ہی علوم میں حضرت کو کامل دستگاہ حاصل تھی لیکن وہ خود فرماتے تھے کہ انہیں تفسیر اور تصوف سے خاص مناسبت ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تدبیر قرآن کا خصوصی ذوق عطا فرمایا تھا، ان کی تفسیر "بیان القرآن" اہل علم کیلئے ایک گرانقدر سرمایہ ہے اور اس کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب مشکل مواقع پر انسان پچھلی تفاسیر کو کنگھالنے کے بعد اس کی طرف رجوع کرے۔

لیکن حضرت کے تدبیر قرآن کا شاہکار درحقیقت وہ تفسیری نکات ہیں جو آپ نے اپنے مواعظ و ملفوظات میں کسی اور سلسلہ کلام کے ضمن میں بیان فرمائے۔ ہوتا یہ ہے کہ کسی وعظ یا کسی مجلس میں کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن کریم کی کوئی آیت آپ کے قلب پر وارد ہوتی ہے اور آپ اس کی تفسیر کرتے ہوئے اس سے عجیب و غریب مسائل مستنبط فرماتے ہیں۔ قرآن کریم کے نظم و اسلوب کی بے مثال توجیہات بیان فرماتے ہیں فوائد و قیود کی دلنشین تشریح فرماتے ہیں۔ مختلف آیات قرآنی کے درمیان الفاظ و تعبیر کا جو فرق ہے اس کی حکمتیں ظاہر فرماتے ہیں اور بیشتر مواقع پر انسان ان تفسیری نکات کو پڑھ کر بیساختہ پھڑک اٹھتا ہے اور واقعہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نکات منجانب اللہ حضرت کے قلب پر وارد فرمائے گئے ہیں۔ مواعظ و ملفوظات میں بکھرے ہوئے ان تفسیری نکات کی یہ اہمیت و ندرت ہر اس باذوق شخص نے محسوس

(یہاں یہ واضح رہے کہ نئے نئے نکات کی دریافت و عطا و تذکرہ معارف و حقائق اسرار تکوین اور تشریح کی حکمتوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اس میدان میں نئے آنے والے ایسے حقائق دریافت آسکتے ہیں جن کی طرف حقد من کی نظر نہیں گئی اور اسی کو حضرت علیؑ نے "اوفہم یؤتاه الرجل" سے تعبیر فرمایا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عقائد اور احکام کے تعین میں بھی ایک شخص پوری امت کے اجماع کے برخلاف قرآن کریم کی کوئی ایسی نئی تفسیر کر سکتا ہے جو مسلمہ عقائد و احکام کے منافی ہو۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن جن عقائد و احکام کی تبلیغ کیلئے آیا تھا وہ اب تک مبہم اور ناقابل فہم ہے اور اس کے دین کا ناقابل اعتبار ہونا لازم آتا ہے۔ والمعاذ اللہ)

کی ہے جس نے اہتمام سے ان مواعظ و ملفوظات کا مطالعہ کیا ہو۔

عرصہ دراز سے احقر کی خواہش تھی کہ مواعظ و ملفوظات میں منتشران تفسیری نکات کو یکجا مرتب کر کے سورتوں کی ترتیب سے ان کا مجموعہ شائع کیا جائے لیکن مواعظ و ملفوظات کے سمندر سے (جو تقریباً ۳۵۰۳۵ ضخیم جلدوں پر محیط ہے) ان جواہر کی تلاش و انتخاب اور ان کی ترتیب و تدوین بڑا محنت طلب کام تھا جس کے لئے مدت درکار تھی۔ اپنی شدید مصروفیات کی وجہ سے احقر کو براہ راست یہ کام شروع کرنے کی تو ہمت نہ ہوئی لیکن احقر نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ احقر روزانہ حضرت کے مواعظ میں سے جس تھوڑے سے حصے کا معمولاً روزانہ مطالعہ کیا کرتا تھا اس میں ایسے تفسیری نکات پر نشان لگالیتا تھا۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح آہستہ آہستہ تمام مواعظ میں سے ایسے مقامات منتخب ہو جائیں گے۔ پھر انہیں نقل کرا کر سورتوں کی ترتیب پر مرتب کر لیا جائے گا اور پھر یہ مجموعہ شائع کیا جاسکتا ہے۔ احقر کے ذہن میں یہ تجویز بھی تھی کہ بعد میں اس مجموعہ کا عربی میں بھی ترجمہ کیا جائے۔

اس طرح بڑی ست رفتار ہی سے سہی، لیکن بفضلہ تعالیٰ احقر کے پاس حضرت کے تقریباً ایک سو تیس مواعظ (تیرہ جلدوں) میں منتخب تفسیری نکات پر نشانات لگ گئے اور اپنے بعض رفقاء کی مدد سے احقر نے انہیں نقل کرانا بھی شروع کر دیا۔ اسی دوران برادر مکرم جناب مولانا محمد اسحاق صاحب مدظلہم ناظم ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان نے احقر کو بتایا کہ انہوں نے بھی اسی قسم کا کام شروع کیا ہوا ہے۔ احقر کو اس بات سے خوشی ہوئی اور احقر نے اپنا کیا ہوا کام ان کے حوالے کر دیا۔ اس طرح الحمد للہ تقریباً ساڑھے تین سو مواعظ سے ان تفسیری نکات کا انتخاب تیار ہو گیا۔ مولانا موصوف نے بڑی عرق ریزی سے ان تمام نکات کو قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب پر مرتب فرمایا۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ احقر کا کام صرف مواعظ کی حد تک محدود تھا۔ مولانا نے ملفوظات سے بھی ان نکات کا انتخاب کیا ہے احقر نے ان کے کئے ہوئے کام کا نمونہ دیکھا ہے اگرچہ پورا کام نہیں دیکھ سکا لیکن انہوں نے اپنا کام بعض دوسرے علماء کو بھی دکھالیا ہے اس لئے امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ مناسب ہوگا۔ اب حضرت حکیم الامت کے تفسیری جواہر کا یہ عظیم مجموعہ آپ کے سامنے آ رہا ہے۔ یہ نہ جانے کتنے علماء اور کتنے بزرگوں کی خواہش کی تکمیل اور کتنے اہل ذوق کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا صوفی محمد اقبال قریشی صاحب اور محمد اسحاق صاحب کو دنیا و آخرت میں بہترین جزاء عطا فرمائیں کہ وہ اس عظیم کام کو منظر عام تک لانے کا ذریعہ بنے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ حضرت حکیم الامت کے مواعظ و ملفوظات میں تفسیری نکات کے ساتھ احادیث کی تشریح کے سلسلے میں بھی بڑے قیمتی نکات ملتے ہیں۔ احقر نے اپنے کام کے دوران ایسے نکات پر بھی نشان لگائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ ان تفسیری نکات کے بعد ان حدیثی نکات پر مشتمل بھی ایک مجموعہ مرتب اور شائع فرمائیں۔ آمین

ان گزارشات کے ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس مجموعے کو مبارک و مسعود فرمائیں۔ اسے امت کے لئے نافع فرمائیں اور یہ ان تمام حضرات کے لئے ذخیرہ آخرت ثابت ہو جنہوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا۔ و ما توفیقی الا باللہ۔

محمد تقی عثمانی عفی عنہ

طیارہ پی آئی اے براہ کراچی از ملتان

۱۸ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کلمات تشکر

از شیخ الحدیث حضرت مفتی عبدالقادر صاحب دامت برکاتہم العالیہ
الحمد لله حمدا یوافی نعمه و یکافی مزیدہ و صلی اللہ علی
سیدنا محمد و علی الہ و اصحابہ اجمعین . اما بعد

حق تعالیٰ نے جب سے انسانوں کو وجود بخشا اس وقت سے ان کی ہدایت کا سامان بھی بھیجا یعنی انبیاء علیہم السلام کو
مبعوث فرمایا۔ یکے بعد دیگرے نبی اور رسل آتے رہے جب ایک نبی کی امت میں دینی قوت مضحکہ ہو جاتی تو دوسرا نبی
بھیج دیا جاتا جو ان میں علم و عمل کی روح پھونک دیتا۔ یہ سلسلہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا اور جناب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے سلسلہ نبوت ختم ہو گیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے علماء، ربانین سے اللہ تعالیٰ نے
وہ کام لیا جو پہلے انبیاء علیہم السلام سے لیا جاتا تھا اس امت کے علماء اگرچہ شان و مرتبہ میں انبیاء سابقین کے برابر نہیں مگر
نور ہدایت کے پھیلانے میں انبیاء بنی اسرائیل کے مثل ضرور ہیں۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا علماء امتی کا انبیاء
بنی اسرائیل یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے۔

بحمد اللہ یہ سلسلہ ہدایت امت کے ابتدائی دور سے شروع ہوا اور ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ہزاروں بلکہ
لاکھوں علماء آئے اور علوم کے دریا بہائے بعد میں آنے والے علماء سے بھی اللہ تعالیٰ نے دین کی حیرت انگیز خدمتیں لیں
اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عالی شان صادق آ گیا جس میں آپ نے فرمایا انما مثل امتی مثل
الغیث لا یدری اخرہ خیر ام اولہ یعنی میری امت کی مثال بارش جیسی ہے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اول بہتر ہے یا آخر
اور علماء نے صحیح فرمایا۔ کم ترک الاول للآخر۔ پہلے لوگ پچھلوں کے لئے بہت سی چیزیں چھوڑ گئے بعد میں آنے
والے حضرت میں حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ذات ستودہ صفات بھی ہے حق تعالیٰ
نے علم تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، تجوید و قراءات، اصلاح معاشرت، غرضیکہ دین کی جمیع ابواب میں آپ کو خدمت کا موقع عطا
فرمایا اور ہر باب میں حضرت کی گراں قدر تصنیفات میں جن سے امت کے افراد خصوصاً علماء و تعلیم یافتہ حضرات نفع اٹھا
رہے ہیں آپ کی باقیات صالحات میں سے آپ کے کثیر تعداد مواعظ بھی ہیں جو آپ نے اپنے مستقر پر رہتے ہوئے اور
کبھی دور دراز کا سفر کر کے عوام و خاص کے مجمع میں بیان فرمائے ان مواعظ میں اللہ تعالیٰ نے بڑی تاثیر رکھی تھی۔

سے بتقاضا از دل خیز و بردل ریزد

آپ کے مواعظ دلوں کو گرمادیتے تھے۔ بے شمار لوگ متاثر ہوتے اور ان کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا تھا۔ مجلس وعظ کیا ہوتی ایک شیخ کامل کی اصلاحی مجلس ہوتی تھی۔ جس میں سامعین کے قلوب میں نسبت مع اللہ کا لقاء کیا جاتا اور سامعین وعظ سننے کے بعد یہاں پر عمل کرنے کے ذوق و شوق میں سرشار ہوتے، کتنے گناہ گار اور غفلت شعار لوگوں کو توبہ کی توفیق مل جاتی بجز اللہ سینکڑوں کی۔ دیر حضرت کے مواعظ آپ کی زندگی میں اور آپ کے بعد شائع ہوئے ہیں جن سے عوام و خواص نفع اٹھا ہے۔ حقیقہ یہ ہے کہ اگر یہ مواعظ عربی زبان میں ہوتے تو غزالی و رازی رحمہم اللہ کے علوم سے کم نہ ہوتے حضرت کی تصنیفات اور مواعظ کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے بے حد مفید ہے بعض اکابر کا تجربہ ہے کہ حضرت کے مواعظ کے مطالعہ انگریزی خاں اور دیگر جدت پسند لوگوں کے اشکلات کے جوابات خوب ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ایسا شخص کبھی ان لوگوں سے نہیں بتا اور نہ مات کھاتا ہے۔ حضرت قاری محمد طیب نے اپنی ایک کتاب میں اکابر دیوبند کا تعارف پیش کیا ہے اور ہر ایک کی سنیف اور کلام پر تبصرہ کیا ہے کسی کے بارہ میں فرمایا کہ ان کا کلام متکلمانہ ہے کسی کے بارہ میں فرمایا کہ ان کا کلام فقیہانہ ہے اور کسی کا محدثانہ اور کسی کا عارفانہ لیکن حضرت تھانوی کے متعلق فرمایا کہ ان کا کلام محدثانہ فقیہانہ متکلمانہ عارفانہ ہے سب صفات جمع کر دیں حضرت کے مواعظ کو جہاں سے پڑھنا شروع کر دیا جائے اس سے دین کی رہنمائی حاصل ہوتا شروع ہو جاتی ہے ایک بات یہ بھی ہے کہ حضرت کے اہل حق ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت کا دینی فیض وفات کے بعد بھی روز افزوں ہے۔

حضرت کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء اور ان کے خلفاء اصلاح امت کے کام میں لگے ہوئے ہیں اسی طرح حضرت کے شاگردوں کے شاگرد اور ان کے شاگرد علمی و تحقیقی ضیاء پاشیوں میں مشغول ہیں اور حضرت کی تصنیفات اور مواعظ مستقل مدقہ جاریہ ہیں اور عجیب اور حیران کن بات یہ ہے کہ حضرت کی تصنیفات و مواعظ کے بحر بے کراں کے ذریعہ سے نئی نئی تصنیفات وجود میں آ رہی ہیں جن سے حضرت کا فیض عام سے عام ہو رہا ہے۔ بعض اہل علم نے حضرت کی تصنیفات اور مواعظ کو کھنگال کر ایک موضوع سے متعلق حضرت کی تحقیقات کو یکجا جمع کر دیا ہے جس سے گویا نئی تصانیف وجود میں آ گئی ہیں بندہ نے ایک ضخیم کتاب جو دو جلدوں پر مشتمل ہے دیکھی ہے جس کا نام تحفۃ العلماء ہے اس میں حضرت کی تصانیف سے وہ مضامین جمع کئے گئے ہیں جن کا تعلق علماء سے ہے اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے حضرت مفتی محمد زید مدظلہ کو جنہوں نے محنت کر کے اتنا بڑا ذخیرہ حضرت کی تصنیفات سے اخذ کر کے امت کو پیش کر دیا ہے اس طرح انہوں نے کئی موضوعات پر حضرت کی تصنیفات سے مواد جمع کر کے اس کو مستقل نام کے ساتھ شائع کیا ہے جو امت کے لئے بہت مفید چیز ہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

اہل باطل اور اہل بدعت کی زندگی میں ان کا خوب غلغلہ رہتا ہے لیکن ان کے مرنے کے بعد عموماً سارا شور اور جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور اہل حق علماء کے مرنے کے بعد بھی ان کا فیض جاری و ساری رہتا ہے۔

حضرت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کا عجیب ملکہ عطا فرمایا تھا خود بطور تحدیث بالنعمت کے فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے

شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی سے تفسیر اور تصوف کے بارہ میں دعا کرائی تھی کہ مجھے ان میں مہارت نصیب ہو چنانچہ حضرت کی دعا و برکت سے ان دونوں میں بجز اللہ مجھ کو مہارت نصیب ہوئی چنانچہ حضرت کی تفسیر بیان القرآن باوجود مختصر ہونے کے حضرت کے علوم کا شاہکار ہے اس طرح مجالس و عظ میں آپ نے موقع کے مناسب آیات کی جو تفسیر فرمائی وہ بھی حضرت کی مہارت کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ آیات قرآن کے بارے میں نئے علوم، نکات، رموز، حقائق و لطائف القاء ہوتے تھے۔

جن کو آپ مجلس و عظ اور مجلس ملفوظات میں لطف لے لے کر بیان فرماتے رہتے تھے ان میں بہت سے رموز و نکات ایسے ہیں جو عموماً تفسیر کی کتابوں میں نہیں ملتے بلکہ یہ خدا داد قرآن فہمی کا نتیجہ ہیں گویا حضرت والا اس شعر کا صحیح مصداق تھے

بنی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

یہ نکات و رموز حضرت کے مواعظ و ملفوظات کے سمندر میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے ان کو یکجا جمع کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ ہمارے محترم دوست حافظ محمد اسحاق صاحب کو جنہوں نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا خود بھی محنت کر کے تفسیری نکات کا ایک ذخیرہ جمع کیا اور دوسرے اہل علم حضرات اس سلسلہ میں جو کام کر چکے تھے انہوں نے وسعت ظرف اور اخلاص کا ثبوت دیتے ہوئے کیا کرایا حافظ صاحب موصوف کے سپرد کیا۔ حافظ صاحب موصوف کے لئے اب راہ آسان ہو گئی طبع کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظ صاحب موصوف کو شیخ کامل حضرت حاجی محمد شریف صاحب کے فیض صحبت سے حکیم الامت کی کتب چھاپنے کا ایسا جذبہ پیدا ہوا ہے جو ان کو ہر وقت بے تاب کئے رہتا ہے ماشاء اللہ حضرت حکیم الامت کی سینکڑوں کتابیں اور مواعظ طبع کرائے ہیں اور تا حال اس میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ موصوف کو اپنی شان کے مطابق بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائیں اور ان کی کوششوں کو بار آور فرمائیں۔ ماشاء اللہ "اشرف التفاسیر" تیار ہو کر منظر عام پر آ رہی ہے اہل علم اور باذوق حضرات ان شاء اللہ اس کی قدر کریں گے اس سے نفع اٹھائیں گے اور اپنے ذوق علمی کی تسکین کا سامان پائیں گے۔

ان تفسیری نکات کی لذت کا حال ان سے پوچھیے جو قبل ازیں اس لذت سے آشنا ہو چکے ہیں معنوی لذت حس لذت سے کم نہیں ہوا کرتی عربی کا مشہور مقولہ ہے تدا دل الافکار خیر من افتضاض الابدکار۔

اشرف التفاسیر کو اس نظر سے نہ دیکھا جائے کہ یہ کتاب باقاعدہ کوئی تفسیر کی کتاب ہے کہ جس میں ہر آیت کا ترجمہ اور تفسیر لکھی گئی ہو بلکہ اس میں صرف وہ آیات لی گئی ہیں کہ جن کے متعلق حضرت نے مواعظ میں کچھ بیان فرمایا باقی آیات زیر بحث نہیں لائی گئیں اور جن آیات سے تعرض کیا گیا ہے بعض مواقع میں ان کی بھی کھل تشریح و تفسیر نہیں کی گئی بلکہ صرف اسی قدر اکتفاء کیا گیا جس قدر حضرت کے مواعظ و ملفوظات میں مواد موجود ہے بندہ نے اشرف التفاسیر پر نظر ثانی کی ہے۔ مضامین تو حضرت کے ہیں جن کے بارہ میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں البتہ بعض جگہ کہیں کہیں تکرار آ گیا ہے پھر اسی آیت شریفہ کے بارے میں دوسرے و عظ سے مضمون نقل کیا گیا دونوں مضمون ملتے جلتے ہیں اس لئے ممکن ہے کہ سطحی نظر

سے اس کو تکرار محض سمجھ لیا جائے حقیقت میں ایک مضمون میں دوسرے سے کچھ اضافہ ہوتا ہے یا ان کا فرق ہوتا ہے بالفرض اگر تکرار بھی مان لیا جائے تو قدر مکرر سمجھ کر پورا مضمون پڑھ لینا چاہیے۔

اسی طرح اصل مضمون جو مقصود ہوتا ہے اس کا ربط دوسرے مضمون سے ہوتا ہے۔ دونوں مضمونوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا اس لئے مقصود سے قبل یا بعد دوسرے مضامین بھی آگئے ہیں جن کا بظاہر آیت سے کوئی ربط نہیں نظر آتا مگر مجبوراً ان مضامین کو شامل کرنا پڑا وہ مضامین بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتے پس یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ غیر متعلقہ مضامین کیسے آگئے بہر حال اگر کوئی فرو گذاشت نظر سے گزرے تو وہ مرتبہ کاتب یا صحیح کی طرف سے ہوگی حضرت اس سے بری ہیں۔

پس اس تفسیر کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ جو تفسیر اور سبب نزول استنباط مسائل اور رموز و نکات حضرت نے بیان فرمائے ہیں وہ کس قدر واقعہ دقیق اور دلچسپ ہیں ان کو بغور پڑھنے سے ان شاء اللہ قرآن دانی میں مدد ملے گی اور قرآن پاک کے مضامین کے مناسبت پیدا ہوگی اس کے بعد اصل کام آگے ہے یعنی ان پر عمل کرنا اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا اور یہی مقصود اعظم ہے کیونکہ اسی سے آخرت کی دائمی کامیابیاں نصیب ہوں گی اسی کو فرماتے ہیں

جان جملہ علم ہا ایں است و ایں کہ بدانی من کے ام یوم دین

حق تعالیٰ اس محنت و کاوش کو قبول فرمائیں اور حضرت حکیم الامت اور مؤلفین اور حافظ موصوف کے لئے صدقہ جاریہ بنائیں اور ان حضرات کو اور ہم سب کو اپنی رضا نصیب فرمائیں..... آمین برحمتک یا ارحم الراحمین

عبد القادر عقی عنہ

ربیع الاول ۱۴۲۰ھ

مدرس دارالعلوم کبیر والا ضلع خانپور

تعارف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم. و علی الہ و اصحابہ و اولیاءہ
اجمعین و بارک وسلم تسلیما کثیراً کثیراً.

امابعد الحمد اللہ اس ناکارہ نے ۱۹۶۵ء میں معارف باللہ استاذ العلماء سیدی و مرشدی حضرت مولانا خیر محمد صاحب
جالندھری قدس سرہ سے بیعت ہو کر مواظب اشرفیہ کا مطالعہ شروع کیا تو اس میں معارف ہائے قرآنی کا دریا موجزن دیکھا
اور الحمد اللہ ان تفسیری نکات کو جمع کرنا شروع کیا اور اس کا معتد بہ حصہ ماہنامہ ”صدائے اسلام“ پشاور میں بالاقساط
شائع ہوا۔ مفتی اعظم پاکستان حضرت اقدس سیدی و مرشدی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے بھی اس پر مسرت کا
اظہار فرمایا اور اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی ہدایت فرمائی اور اپنے ادارہ کی طرف سے اسے شائع کرنے کا عزم صمیم کر رکھا
تھا۔ برادر مکرمی جناب حافظ محمد اسحاق صاحب ملتانی کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اصرار فرمایا کہ مناسب ہے کہ یہ تفسیری
نکات یکجا شائع ہوں تاکہ قارئین زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں چنانچہ انہوں نے ازراہ ذرہ نوازی اپنا مسودہ بھی ناکارہ
کے حوالے کر دیا اور

- ۱- احقر نے قرآنی سورتوں کے مطابق آیت نمبر بھی درج کر کے نہیں یکجا کیا۔
- ۲- شروع میں آیت بحوالہ قرآنی سورت درج کر کے بیان القرآن سے اس کا اردو ترجمہ نقل کیا۔
- ۲- بعدہ تفسیری نکات کے مطابق ذیلی عنوانات قائم کئے اس طرح ملفوظات کی صورت کی بجائے یہ نکات تفسیری شکل
میں سامنے آ گئے۔

۳- دونوں مسودات کو یکجا کرنے کے بعض مواقع پر تفسیری نکات کا تکرار ہو گیا جناب حافظ صاحب نے نظر ثانی میں اس
تکرار کو حذف فرمادیا۔

اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں سب کی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرما کر زادا آخرت اور وسیلہ نجات بنا دیں آمین کیونکہ
عند اللہ مقبولیت ہی اصل سرمایہ ہے۔

یاں تو اپنا بھی اک نالہ ہے گر پہنچے وہاں
گر چہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

محتاج دعا بندہ محمد اقبال قریشی غفرلہ

امام و خطیب جامع مسجد تھانہ والی ہارون آباد ۲۵ ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ

حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی خدمات قرآنی کا اجمالی تعارف

از مؤرخ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمہ اللہ

اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے یعنی قرآن پاک، مولانا نے اسکی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی وہ بجائے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانہ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے وہاں خیر امت اولین مفسر قرآن حضرت ابن عباسؓ کو آئینہ حضرت ﷺ نے اللہم علمہ الكتاب کی دعادی تھی اور بشارت سنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس روایا کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ روایا اس کی طرف اشارہ تھا۔

قرآن پاک کی خدمت کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی بلکہ لفظ و معنی دونوں حیثیتوں سے وہ حافظ تھے اور بڑے جید حافظ و قاری تھے اور فنون و تجوید و قراءت کے بڑے ماہر، اخیر زمانہ میں پانی پت کو قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی کی برکت سے قراءت سے ایک خاص مناسبت حاصل ہو گئی تھی۔ مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے تو لوگوں نے ان کو بالقصد کسی جہری نماز کا امام بنا دیا، مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر ایسی قراءت فرمائی کہ قاریوں نے تعریف کی کہ صحت مخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر مؤثر قراءت نہیں سنی۔ ایک اور مقام پر جہاں اہل نظر موجود تھے صبح کی نماز پڑھائی تو ایک صاحب نے کہا کہ موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قراءت میں بھیرویں کی کیفیت تھی جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے۔

مولانا کی قراءت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی لیکن لہجہ میں قاریوں کی بناٹ نہ تھی اور نہ تحسین آواز کے لئے بے تکلف اتار چڑھاؤ ہوتا تھا بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسب موقع کھلتی بڑھتی رہتی تھی اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی کہ ”ہرچہ ازل خیز و بردل ریزد“

تجوید قراءت و متعلقات قرآن

علوم القرآن میں سے یہ پہلا فن ہے، مولانا نے اس پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱۔ جمال القرآن:۔ یہ فن تجوید کا رسالہ ہے جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل ہیں، مخارج اور صفات حروف اظہار و اخفاء ابدال و ادغام و تخم و ترفیق و وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں۔

- ۲- تجوید القرآن:- اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کے لئے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں۔
- ۳- رفع الخلاف فی حکم الاوقاف:- اوقاف قرآنی کے بارے میں قاریوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت بیان کی گئی ہے۔
- ۴- وجوہ الثانی:- اس میں قرآن شریف کی مشہور قراءتوں کے اختلاف کو قرآن پاک کی سورتوں کی ترکیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے اور آخر میں تجوید و قراءت کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں۔
- ۵- تھیض الطبع فی اجراء السبع:- قراءت سبع اور اس فن کے روائے کی تفصیل درج کی گئی ہے۔
- ۶- زیادات علی کتب الروایات:- اس میں قراءت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں یہ ”وجوہ الثانی“ کے آخر میں بطور ضمیمہ ہے۔
- ۷- ذنابات لمافی الروایات:- یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے۔
- ۸- یادگار حق القرآن:- اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے۔ یہ ”تجوید القرآن“ کا اختصار و ضمیمہ ہے۔
- ۹- مشابہات القرآن لتراتج رمضان:- قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح میں قرآن سنانے میں بعض مشہور مقامات پر جو مشابہات لگتے ہیں ان سے بچنے کے لئے ان میں چند قواعد کلیہ یعنی کچھ آیات کے ضبط فرمائے گئے۔
- ۱۰- آداب القرآن:- قرآن پاک کی تلاوت کے آداب اور تلاوت کرنے والوں کی کوتاہیوں کی اصلاح کے لئے ہدایات و تنبیہات ہیں۔

۲- ترجمہ و تفسیر قرآن

- ۱- ترجمہ:- قرآن پاک کا سلیس و با محاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے جس سے حقیر کی نظر میں بڑے بڑے تراجم خالی ہیں۔ قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے اس لئے عام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں یعنی ترجمہ صحیح اور زبان صحیح ہے اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانہ میں کم نہیں یا تراجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں انکا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان تراجموں کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی نہ ہونے پائے۔ اسی لئے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے۔
- ۲- تفسیر بیان القرآن:- یہ بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر ہے جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا (اب تین جلدوں میں شائع ہوتی ہے) اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیات ہیں۔

سلیس و بامحاورہ حتی الوسع تحت اللفظ۔ ترجمہ نیچے ”ف“ کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر، تفسیری روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے، فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے، شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں، تمام کتب تفاسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہل علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات و حقائق و معارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر ”روح المعانی“ پر اعتبار فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقتاً مفید ہے کہ تیرہویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ اس لئے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں۔

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیر صرف عوام اردو خوانوں کے لئے علماء لکھتے ہیں یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا نور شاہ صاحب نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے، خود میرا (یعنی علامہ سید سلیمان ندوی) کا خیال یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں سے راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے۔ ساتھ ہی ربط آیات و سورہ کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں اس لئے وجوہ ربط میں قیاس اور ذوق سے چارہ نہیں اس لئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق و وجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہوتو تنگی نہ کی جائے۔

۳۔ چونکہ مسلمانوں پر شفقت اور انکی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی اس لئے وہ ہمیشہ ان کو گمراہیوں سے بچانے میں بجان و دل ساعی رہتے تھے۔ اردو میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے جو ترجمے شائع ہوئے تھے وہ بالکل کافی تھے مگر نئے زمانہ میں پہلے سرسید نے بضمین تفسیر اور پھر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے اپنے ترجمے شائع کئے تو انہوں نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کریں اور لین توجہ زبان کی طرف رکھیں اور اقوال سلف کی پروا نہ کریں اس طرز عمل نے علماء کو مضطرب کر دیا اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مولانا نے اپنا ترجمہ اسی ضرورت سے مجبور ہو کر کیا، مگر اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا اور اس کے اغلاط پر نشان دے کر ایک رسالہ اس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا جس کا نام ”اصلاح ترجمہ دہلویہ“ ہے۔

۴۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کی عام اشاعت نے دہلی کے ایک بلند باغ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا اور انہوں نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمے پر اعتراضات شروع کئے اور پھر اپنا ترجمہ چھپوایا جس کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ لکھنؤ کے ایک عالم کا کیا ہوا ہے لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے، کیونکہ مرزا صاحب خود عربی سے نابلد تھے بہر حال مولانا نے اس ترجمے کی اغلاط کی اصلاح پر بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام ”اصلاح ترجمہ حیرت“ ہے۔

۵- بعض معاصر علماء نے اردو میں قرآن شریف پر حواشی لکھے ہیں جن میں ربط آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے اور آیات کو بہ تاویل و اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے اور اس تاویل و اعتبار میں کہیں کہیں اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے مولانا نے ان تاویلات بعیدہ پر تنبیہات لکھیں جن کا نام ”التقصیر فی التفسیر“ ہے۔

۶- لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدوں میں ”تفصیل البیان فی مقاصد القرآن“ کے نام سے جمع کیا ہے اس کے مولف کی درخواست پر اس میں جو شرعی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے ”الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان“ کے نام سے ظاہر فرمائے۔

۷- مولانا کے خاندان کی بعض لڑکیوں نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا اور اکثر آیات کی تفسیر و تقریر کو ضبط تحریر میں کر لیا تھا وہ ایک مجموعہ ہو گیا اور اس کا نام ”تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الایات“ رکھا مگر چھپا نہیں۔

۸- ”رفع البناء فی نفع السماء“ الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء کی تفسیر جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کیا فائدے ہیں یہ درحقیقت ایک سوال کے جواب میں ہے۔

۹- ”احسن الاثاث فی نظر الثانی فی تفسیر المقامات الثالث“ سورہ بقرہ کی تین آیاتوں پر نظر ثانی فرمائی ہے۔

۱۰- ”اعمال قرآنی“ قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے تجربہ میں آئے ان کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۱- ”خواص فرقانی“ اس کا موضوع بھی وہی ہے اس کا ایک اور حصہ ہے جس کا نام ”آثار قبائی“ ہے ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز غیر شرعی تعویذ گنڈوں اور عملیات سفلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف ملتفت کرنا ہے اور اس قسم کے بعض خواص احادیث میں بھی مروی ہیں۔

۳- علوم القرآن

علوم القرآن کے مختلف مباحث و مسائل تو مولانا کی ساری تصانیف و مواعظ ملفوظات اور رسائل میں ملتے ہیں۔ اگر ان کو کوئی یکجا کر دے تو خاصی ضخیم کتاب ہو جائے مگر ان پر مستقل طور پر بھی بعض کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں سے اول ”سبق انعايات“ ہے۔

۱- ”سبق الغایات فی نسق الایات“ یہ قرآن پاک کی آیات و سورہ کے ربط و نظم پر عربی میں پندرہ صفحات کی کتاب ہے جس کو ۱۳۱۶ھ میں ڈھائی مہینوں میں تصنیف فرمایا اس میں مولانا نے سورہ فاتحہ سے سورۃ الناس تک تمام سورتوں اور ان کی آیات کے ربط پر کلام فرمایا ہے اور اس کا بڑا حصہ امام رازی کی ”تفسیر کبیر“ اور مفتی ابوالسعود بغدادی المتوفی ۱۹۵۱ھ کی ”ارشاد العقل السلیم الی ضرایب القرآن الکریم“ سے ماخوذ و مستنبط ہے ان دو کے علاوہ مولانا نے خود اپنے اضافوں کو ”قال المسکین“ کہہ کر بیان فرمایا ہے۔ یہ حصہ بھی اچھا خاصا ہے اور اخیر کی صورتوں میں زیادہ تر اضافات ہی ہیں جن میں مولف نے ان سورتوں کے موضوع اور عمود کی تعیین فرمائی ہے چونکہ یہ امور زیادہ تر ذوقی ہیں

اس لئے ان ذوقیات کی نسبت ہمیشہ رائیں مختلف ہو سکتی ہیں تاہم ان سے مولانا کے ذوق قرآنی کا اندازہ بہت کچھ ہو سکتا ہے تفسیر ”البيان“ میں بھی ربط و نظم پر گفتگو التزام کے ساتھ کی گئی ہے۔

ذوق ربط آیات

مولانا کے ذوق ربط آیات و سورہ کا حال چونکہ عام طور سے لوگوں کو معلوم نہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مواعظ میں دو قول نقل کر دیئے جائیں جن سے ان کا ذوق اور ان کے بعض اصول ربط واضح ہو جائیں سمیل النجیح ص ۹ میں فرماتے ہیں۔

جواب اس شبہ کا کہ ”مفسرین کے بیان کردہ روابط مختراع ہیں کیونکہ خدائے تعالیٰ نے ان ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں“ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مختراع نہیں ہیں اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ترتیب تلاوت صحف اور ہے۔ یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہو گئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہو گئی و علیٰ ہذا تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہیں۔ اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عزاسمہ نے بدل دی۔ یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی تو جبرئیل علیہ السلام بحکم خداوندی حضور ﷺ سے یہ کہتے کہ اس آیت کو مثلاً سورہ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جاوے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورہ کے ساتھ علیٰ ہذا تو صحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہو تو ترتیب آیات ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا“ (سمیل النجیح)

پھر اسی کتاب کے ص ۶ میں ارشاد ہے کہ ایک شفیق باپ چاہتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کرے کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے بیٹے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس طریقہ کو وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جائے اور ان سب رعایتوں کا منشاء وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جاسکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت بے ربط اور بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پہلی بات کو پورا

کرے۔ یہی راز ہے اس کا کہ خدائے تعالیٰ کا کلام ظاہر میں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے اس ظاہری بے ربطی کا خشاء شفیقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آئے بلکہ وہ ایک نئے مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تشبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفیقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تشبیہ فرمادیتے ہیں اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے سورہ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام جتلا دیئے جائیں گے پھر فرماتے ہیں بل الانسان علی نفسه بصيرة ولو ألقى معاذیرہ (یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ اس دن انسان اپنے نفس کے احوال و اعمال سے خوب واقف ہوگا کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ (بمقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا اس لئے یہ جتلا نا محض قطع جواب اور تمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے اس کے بعد فرماتے ہیں لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه و قرانه فاذا قرانه فاتبع قرانه ثم ان علینا بیانہ

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جمادینا اور زبان سے پڑھو ادینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتہ کی قراءت کا اتباع کیجئے پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون کلابل تحبون العاجلة و تذرون الاخرة کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں وجوه يومئذ ناضرة الی ربها ناظرة بعض کے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے النخ تو لا تحرك به لسانك سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے ”کلامے کہ محتاج یعنی باشد لا یعنی است“

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور ﷺ کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا۔ باپ نے فرط شفیقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تشبیہ کر دی اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور ﷺ اس خیال

سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرمادیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقضاء یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو بھی یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔

۲- ”اشرف البیان لمافی علوم الحدیث والقرآن“: مولانا کے چند مواعظ سے ان کے ایک معتقد و خادم نے ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے جن میں آیات قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات و تحقیقات ہیں افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو کئی حصے اس کے مرتب ہو سکتے تھے۔

۳- ”دلائل القرآن علی مسائل النعمان“: مولانا کو حضرت امام اعظمؒ کی فقہ سے جو شدید شغف تھا وہ ظاہر ہے۔ اس کا مدت سے خیال تھا کہ ”احکام القرآن“ ابو بکر صاں رازی اور ”تفسیرات احمدیہ“ ملا جیون کی طرح خاص اپنی تحقیقات اور ذوق قرآنی سے ان آیات اور ان کے متعلق مباحث و دلائل کو یکجا کر دیں جن سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط و اخراج ہو لیکن یہ کام انجام نہ پاسکا۔ آخر میں یہ خدمت اپنے مسترشد خاص مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو تالیف فرمائیں چنانچہ مفتی صاحب اس کام میں مصروف ہو گئے۔ ابھی حال میں جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے تو خانقاہ امدادیہ میں جا کر خاص اس کام کی تکمیل میں لگ گئے مولانا روزانہ کی مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکات ان کو یاد آتے جاتے بیان فرماتے اور جناب مفتی صاحب اس کو اپنے مقام پر آ کر قلمبند فرما لیتے یہ تصنیف اس طور سے جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا اور کام ناتمام رہ گیا۔

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی روایت میں نے سنی ہے جن کو خود بھی ماشاء اللہ قرآن پاک کے فہم کا ذوق ہے وہ نقل کرتے تھے کہ مجلس میں مولانا ان آیات پر جب گفتگو فرماتے تھے اور فقہیانہ وقت نظر سے کسی حنفی مسئلہ کی صحت پر استدلال کرتے تھے تو اچنبھا ہوتا تھا کہ یہ مسئلہ اس میں موجود تھا لیکن اب تک اس پر اس حیثیت سے نظر نہیں پڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ بادل چھٹ گیا اور آفتاب نکل آیا۔ اس کے ساتھ وہ مفتی صاحب موصوف کے حافظہ کی تعریف کرتے تھے کہ مولانا سے سن کر اپنے مستقر پر پہنچ کر اس کو بعینہ اسی طرح قلمبند کرتے تھے جس طرح مولانا نے تقریر فرمائی تھی۔

۴- ”تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبارات“: تفسیر بیضاوی میں حروف مقطعات کا جو مجمل و مغفل بیان ہے اس رسالہ میں بزبان عربی اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے جس سے حروف مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے۔

۵- ۶ مولانا کے دور سالی علم القرآن سے متعلق اور ان دونوں کا تعلق سلوک سے ہے ایک کا نام ”مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور دوسرا کا نام تائید الحقہ بالایات الحقہ“ ہے ان دونوں رسالوں کا موضوع قرآن پاک کی ان آیتوں کی تفسیر ہے جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس دوسرے رسالہ کی بنا ایک سابق مولف کی تالیف ہے جس کا قلمی رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۲۲ھ میں بہاولپور میں ملا تھا اس پر مزید اضافہ کر کے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے۔ (ماخوذ از حکیم الامت کے آثار علمیہ معارف اعظم گڑھ صفر ۱۳۶۳ھ)

حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے کمال بیان رابط آیات قرآن کی چند مثالیں

از فقیہ عصر حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی مدظلہ العالی (ساہیوال ضلع سرگودھا)

رابط کی ایک مثال

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ ————— وَالَّذِينَ لِيْلَهُ رِبِّ الْعَالَمِينَ (پ ۷) کا ربط اوپر کی آیت

فَلَن أَرِيْبِكُمْ لَمَنَ اتَّخَذَ عَذَابَ اللَّهِ ————— وَتَتَسَوْنَ مَا تَشْرِكُونَ پ ۷ سے بیان القرآن میں اس طرح تحریر فرمایا گیا ہے۔ اوپر مشرکین پر وقوع عذاب فرض کر کے اس بنا پر ان کے دعویٰ شرک کو باطل کیا گیا تھا۔ آگے اس فرض کا غیر مستبعد ہونا ثابت کرنے کے لئے بعض امم سابقہ کا معذب و ہلاک ہونا بیان فرماتے ہیں تاکہ مخاطبین کو اس فرض کے غلط کہنے کی گنجائش نہ ہو اور اس ہلاکت کا ذکر بھی ایک خاص طور سے فرمایا ہے جس سے کفار موجودین کے منشاء انکار کا جواب بھی ساتھ ساتھ ہو جاوے کیونکہ بڑا منشاء انکار کا یہ ہوتا ہے کہ بعض مصائب آ کر ٹل جاتے ہیں تو نادان کو دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ سزائے اعمال نہ تھی ورنہ ٹلتی نہیں اس لئے سنا دیا کہ ان ہالکین کی دار و گیر کی ترتیب بھی یہی ہوتی تھی کہ اول نزول بلیات ہوا کہ تضرع کریں پھر استدرجا نزول نعم فرمایا گیا جب خوب کفر بڑھ گیا پھر ہلاک کر دیئے گئے تو تم بعض بلیات کے ٹلنے سے دھوکہ مت کھانا (بیان القرآن جلد ۳ ص ۹۳)

بعض اور مثالیں

فَلَن لَّسْتُ عَلَيْنِكُمْ بِوَكِيلٍ کا ترجمہ ”کہہ دو کہ میں تمہارے اوپر نگہبان یا داروغہ نہیں ہوں“ کر دینے سے جیسا کہ اکثر نے کیا نہ مطلب کھلتا ہے نہ ربط معلوم ہوتا ہے بخلاف اس کے کہ حضرت علیہ الرحمۃ نے یہ فرمایا کہ ”آپ کہہ دیجئے کہ میں تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں“ اور تفسیری ترجمہ میں یوں فرمایا کہ ”کہہ دیجئے کہ میں تم پر عذاب واقع کرنے کے لئے تعینات نہیں کیا گیا ہوں کہ مجھ کو مفصل اطلاع ہو یا میرے اختیار میں ہو البتہ ہر چیز کے وقوع کا وقت اللہ کے علم میں ہے اور جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ عذاب آیا“

اسی طرح آگے وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِن حِسَابِهِمْ مِّن شَيْءٍ پ ۷ کا ترجمہ بالعموم یہ کر دیا جاتا ہے کہ جو لوگ پرہیزگاری کرتے ہیں ان پر ان کا کچھ حساب نہیں حضرت تھانوی نے ترجمہ فرمایا کہ ”جو لوگ احتیاط رکھتے ہیں ان پر ان کی باز پرس کا کوئی اثر نہ ہوگا“ اور تفسیری ترجمہ میں یوں فرمایا کہ ”جو لوگ منہیات شرعیہ سے جن میں بلا ضرورت ایسی مجالس

(خائنصین فسی آیات اللہ) میں جانا بھی ہے احتیاط رکھتے ہیں ان پر ان (طائغین اور مکذبین) کی باز پرس (اور گناہ طعن) کا کوئی اثر نہ پہنچے گا (یعنی ضرورت) وہاں جانے والے گنہگار نہ ہوں گے (بیان القرآن)

وَأَنْذِرْهُمُ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْ يُخْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِنْ دُونِهِ وَايَةٌ وَلَا شَفِيعَةٌ عَلَيْهِمْ يُكْفَرُونَ (پ ۷) اس آیت کا ترجمہ مع تفسیر اس طرح کیا گیا ہے اور ایسے لوگوں کو (کفر و معصیت پر عذاب الہی سے خاص طور پر ڈرائیے جو اعتقاداً یا امتحاناً) اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ (قیامت میں) اپنے رب کے پاس (قبروں) سے زندہ کرنے کے بعد ایسی حالت سے جمع کئے جائیں گے کہ جتنے غیر اللہ (کفار کے زعم میں مددگار اور مستقل شفیع سمجھے جاتے) ہیں (اس وقت) نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی مستقل شفیع ہوگا (اور ایسے لوگوں کو) اس امید پر (ڈرائیے) کہ وہ (عذاب سے) ڈر جائیں (اور کفر و معصیت سے باز آ جائیں کیونکہ نہ ڈرنا کسی ولی و شفیع کے بھروسے سے ہوتا ہے اور وہ معدوم ہے) (بیان القرآن)

ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر پڑھنے والا شخص یہ محسوس کرے گا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کتاب پڑھ رہا ہے جس کا ہر جملہ دوسرے جملہ سے ملا ہوا ہے اور جزا ہوا ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ الْآيَةَ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوگا کہ قرآن شریف کی اس آیت اور پہلی آیت میں ربط نہیں ہے کیونکہ اوپر کی آیت میں احکام روزے کے بیان ہیں اور یہاں ہے کہ حرام مال سے بچو اس میں جوڑ کیا ہے؟ لیکن اگر غور کیجئے تو آپس میں بڑا جوڑا ہے روزہ میں فرماتے ہیں وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ مَا أَنتُمُ الْبَاطِلُ الْآيَةَ یعنی جب تک صبح صادق نہ ہو اس وقت تک کھاؤ پیا اور جب صبح صادق نکل آوے تو اس وقت کھانا پینا چھوڑ دو پھر سورج غروب ہو جائے اس وقت روزے کو ختم کر دو سوروزہ تو موقت ہے کہ اس میں جو چیزیں چھڑوائی گئی ہیں وہ ایک خاص وقت تک چھڑائی گئی ہیں کھانے پینے کی چیزیں خاص وقت تک حرام کر دی گئیں مگر حرام سے بچنے کا روزہ کبھی ختم نہیں ہوتا گویا ایک روزہ کے ساتھ دوسرے روزہ کا ذکر فرمایا خیال تو فرمائیے کتنا لطیف ربط ہے (احکام الجاہ)

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (پ ۵) یعنی حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصود کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلاف مشاہدہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں بعض دفعہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور اچھا جواب کہ غلبہ فی الحجت مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی غلبہ نہ ہوگا مشاہدہ اور مشاہدے کے موافق ہے حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گویا جواب فی نفسہ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سیاق میں نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے یہ فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور یہ جملہ اس فیصلہ کے متعلق ہے۔ پوری آیت یوں ہے فَأَلَّفَهُمُ بَيْنَكُمْ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (پ ۵) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلے کریں گے۔ قیامت کے دن اور حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے دیکھئے سیاق میں نظر کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدنیا کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے (التزام)

ربط کی ایک عجیب مثال

سورہ قیامت میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقع

ڈھونڈے گا اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں **يُنَبِّئُ الْإِنْسَانَ يَوْمَ يُدْرَىٰ مَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ**
وَلَوْ أَلْفَىٰ مَعَاذِيرَهُ ترجمہ: اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا ہوا جتلا دیا جائے گا (اور انسان کا اپنے اعمال سے
آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہیں ہوگا بلکہ انسان خود اپنی حالت پر بوجہ انکشاف ضروری کے خود مطلع ہوگا گویا
بمقتضائے طبیعت اس وقت بھی اپنے حیلے حوالے پیش لاوے۔

یہاں تک تو قیامت کے بارے میں مضمون تھا آگے ارشاد فرماتے ہیں **لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ سَلَطَنًا لَّيْسَ لَكَ لِيَتَّعِلَّ بِهِ ۚ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ**
وَقُرْآنَهُ ۚ وَإِذَا قُرْآنَهُ فَاتَّبِعْهُ قُرْآنَهُ ۚ تَتْلُوهُنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتٍ ۚ ترجمہ: یعنی حضور کو ارشاد ہے کہ قرآن نازل ہوتے وقت اس کو یاد کرنے
کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ قرآن کو آپ کے دل میں جمادینا اور زبان سے پڑھوادینا ہمارے ذمہ ہے تو جب ہم قرآن
نازل کریں تو اس وقت فرشتے کی قراءت کا اتباع کیجئے پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کی زبان سے اس کو بیان کرادیں گے۔
اس کے بعد قیامت ہی کا ذکر ہے **يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ أَلِيًّا رُبَّهَا نَاضِرَةٌ**۔ ترجمہ: بہت سے چہرے تو اس روز
بارونق ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

تو اوپر بھی قیامت کا ذکر اور بعد کو بھی اس کا ذکر اور درمیان میں یہ مضمون کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے
لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے لوگ اس مقام کے ربط میں تھک گئے اور بہت سی توجیہات کی گئیں مگر سب میں تکلف ہے
لیکن جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور کے ساتھ ہے اس کو صاف نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان
میں کیا موقع اور ربط ہے چنانچہ بیان القرآن میں اس کا جو ربط تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے **يُنَبِّئُ الْإِنْسَانَ يَوْمَ يُدْرَىٰ مَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۚ**
بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ سے دو مضمون مستفاد ہوئے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے عالم اور محیط ہیں دوسرا یہ
کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب حکمت متقسی ہوتی ہے تو علوم غائبہ کثیرہ کو ذہن مخلوق میں حاضر کر دیتا ہے گو ان علوم
غائبہ کا حاضر ہو جانا خلاف عادت طبعی ہو جیسا کہ قیامت میں اس کا وقوع ہوگا۔

اب آگے اس کا ربط ملاحظہ ہو

جب یہ بات ہے تو آپ وحی کے نزول کے وقت جیسا کہ اب تک آپ کی عادت ہے اس قدر مشقت کہ سنتے بھی ہیں
پڑھتے بھی ہیں دھیان بھی رکھتے ہیں محض اس احتمال سے کیوں برداشت کرتے ہیں کہ شاید کچھ مضمون میرے ذہن سے نکل
جائے کیونکہ جب ہم نے آپ کو نبی بنایا ہے اور آپ سے تبلیغ کا کام لینا ہے تو یہاں مقتضائے حکمت یہی ہوگا کہ وہ مضامین آپ
کے ذہن میں رکھے جائیں اور ہمارا مخصی ہونا تو ظاہر ہی ہے اس لئے آپ یہ مشقت برداشت نہ کیا کیجئے (بیان القرآن)
یہ چند مثالیں تو آیات کے درمیان ربط کی پیش کی گئی ہیں اب ذیل میں ایک ایسی مثال پیش کی جاتی ہے جس میں
ایک ہی آیت کے اجزاء میں بڑا ہی عجیب اور نفس ربط بیان فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ **وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَاكُ عَلَيْهِمْ غَالِغَالٍ ۚ** (پ ۱۴) ترجمہ اور گر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان
کے ظلم کے سبب دارو گیر فرماتے تو سطح زمین پر کوئی حرکت کرنے والا نہ چھوڑتے۔

بظاہر اس کلام میں ربط معلوم نہیں ہوتا کہ مواخذہ تو صرف لوگوں سے کیا جاتا اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیا جاتا حضرت تھانوی نے بیان القرآن میں اس آیت کی تقریر اس طرح فرمائی ہے۔

تقریر بلازمت شرط و جزا میں احقر کے نزدیک یہ ہے کہ ظالم تو اپنے ظلم کی وجہ سے ہلاک ہوتے اور غیر ظالم اس لئے کہ حکمت خداوندی باعتبار اکثر اوقات کے اس عالم مجموعے کے آباد کرنے کو متقصدی ہے ورنہ نیکیوں کی آبادی زمین پر بغیر ظالموں کے مثل آبادی ملائکہ کے آسمان پر ہوتی پھر آبادی زمین کو جدا کیوں جاتا اور اس مضمون کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے لولم یلدنوا الذهب اللہ بکم الخ یعنی لولم یکن فیکم مذنبون اس لئے نیک بھی نہ رہتے اور چونکہ حیوانات انسان ہی کے منافع کے لئے مخلوق ہوتے ہیں یہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتے۔ هذا من المواهب ولله الحمد اور اکثر اوقات کی قید اس لئے لگائی کہ بعض اوقات دنیا میں صرف غیر ظالم ہی رہیں گے جیسے زمانہ عیسیٰ علیہ السلام میں (بیان القرآن)

اس کی تفصیل حضرت کے ایک وعظ میں نظر سے گزری وہ بھی افادہ عام کے لئے پیش ہے حضرت فرماتے ہیں بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے مقدم (لَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ) اور تالی (ماترك على ظهرها من دابة) میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ظاہر تو یہ ہے کہ یوں فرماتے کہ اگر آدمیوں سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے نہ کہ مواخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیتے بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے بات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور نرے کیا کرتے کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا شرف بیان کیا جا رہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے۔ (المصلوۃ ۰)

ربط کی ایک اور انوکھی مثال اور منصب نبوت کا احترام

سورہ ص کے دوسرے رکوع میں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس ان کے عبادت خانے میں دیوار پھاند کر اہل مقدمہ کے آنے کا ذکر کیا گیا ہے اور قصے کے اخیر میں فرمایا گیا ہے وَظَنَّ دَاوُدَ اَنَّهُ لَقِيَ رَبَّهُ فَاَسْتَغْفِرُ رَبَّهُ۔ فتنبہ کی تفسیر میں قول مشہور کسی عورت سے نکاح کرنے کے واقعہ کو محققین نے باطل قرار دیا ہے اور بعض نے داؤد علیہ السلام کا لَقِيَ ظَلَمَكَ بلا تحقیق کہہ دینا اس کی تفسیر میں کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ان کی گستاخیوں پر غصہ آ گیا تھا اس سے استغفار کیا مگر غصہ آنا ثابت نہیں کر سکے۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کے صبر و تحمل کا امتحان مقصود تھا کہ آیا زور سلطنت میں متواتر گستاخیوں پر دارو گیر کرتے ہیں یا غلبہ نور نبوت سے عفو فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس میں صابر ثابت ہوئے لیکن انبیاء کی جلالت شان عدل کے جس درجہ عالیہ اور ذرہ قصویٰ کو متقصدی ہے اس سے بظاہر ایک گونہ بعید اتنا خفیف سایہ امر پیش آ گیا کہ بعد قیام برہان شرعی کہ وہ بینہ ہو یا اقرار بجائے اس کے صرف ظالم سے خطاب فرماتے کہ تو نے ظلم کیا اس مظلوم سے خطاب فرمایا کہ تجھ پر ظلم کیا جس سے ایک طرح کی طرفداری متوہم ہوتی ہے اور گو مظلوم ہونے کی حیثیت سے یہ طرفداری بھی عبادت ہے خصوصاً مقدمہ ختم ہو چکنے کے بعد لیکن فریق مقدمہ ہونے کی حیثیت سے اور عدم تبدل مجلس تخاصم اور مجلس واحد کے جامع

المسفرقات ہونے کی حیثیت سے اس تو ہم طرفداری کا بھی نہ ہونا عدل و اکمل تھا سو داؤد علیہ السلام غایت تقویٰ سے اتنی بات کو بھی نخل کمال صبر و منافی ثبات فی الامتحان سمجھے اور انہوں نے اس سے بھی اپنے رب کے سامنے توبہ کی۔ الخ

حضرت فرماتے ہیں کہ سندہ نے جو تفسیر کی ہے اس کا معنی خود منصوص قرآنی ہے اور اِضْبِرْ عَلٰی مَا يَقُولُونَ کے ساتھ اس قصے کا یاد دلانا قرینہ ہے کہ اس میں بھی صبر علی الاقوال تھا گو دونوں جگہ اقوال میں کفر اور سواد اب کا اختلاف ہے البتہ یہ امر مظنون ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اس کو مبنی سمجھا ہو سو چونکہ اور تفسیر کا مبنی بھی قرآن میں نہیں اس لئے یہ تفسیر لوروں سے اقرب ہے (بیان القرآن)

مطلب یہ کہ اس کے معنی کا قرآن میں منصوص ہونا تو متیقن ہے مگر یہ امر محض مظنون ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اس کو مبنی سمجھا اور وہ مبنی یہ قول ہے لَقَدْ ظَلَمَكَ (حاشیہ بیان القرآن)

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان دراصل اس بات میں تھا کہ انہوں نے ایک دن عبادت کے لئے اس طرح خاص کر لیا تھا کہ اس دن وہ مخلوق سے بے تعلق ہو جاتے تھے ایک دن کو عبادت الہی کے لئے اس طرح خاص کر لینا کہ ان کا تعلق مخلوق خدا سے منقطع ہو جائے منصب نبوت اور منصب خلافت کے منافی تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر اور خلیفہ اللہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں تھا چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی اس روش کو ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح آزمائش میں مبتلا کیا (قصص القرآن)

اور بعض اکابر نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی آزمائش ان کی عاجزی اور بندگی میں تھی کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی عبادت کے پروگرام کا بارگاہ حق میں اظہار کیا اور اس اظہار میں عجب و بڑائی کا شائبہ تھا اس پر گرفت کی گئی اور دو آدمی خلاف معمول اندر آگئے اور حضرت داؤد علیہ السلام متنبہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ کی توفیق کے بغیر آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں تو جیہیں بھی اگر چہ درست ہو سکتی ہیں مگر قرآن کریم کے کسی لفظ میں ان کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا اور اوپر کی آیات سے ان کا کوئی ربط ظاہر نہیں ہوتا اس کے برخلاف حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اختیار کردہ توجیہ کا ذکر خود لفظ قرآنی لَقَدْ ظَلَمَكَ میں بھی موجود ہے اور اس کا ربط اوپر کی آیت اِضْبِرْ عَلٰی مَا يَقُولُونَ سے بھی قائم ہو جاتا ہے اس لئے اس توجیہ کا سب تو جیہات سے لطیف و اولیٰ ہونا بعد امعان نظر کے ثابت ہوتا ہے۔ فليله در حکیم الامت التھانوی ما ابھی دررہ و امعن نظره والله اعلم۔

منصب نبوت کے احترام اور عظمت پیغمبرانہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت نے آیات کا باہمی ربط اور حضرت داؤد علیہ السلام کی انابت و استغفار کرنے کے ساتھ غیر مستند روایات اور غلط توجیہات کی تردید بھی فرمادی۔ تفسیر بیان القرآن میں حضرت تھانوی نے اسرائیلی روایات سے حتی الامکان احتراز کیا ہے اور قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن کی آیات اور مستند روایات سے ہی فرمائی ہے خاص طور پر منصب نبوت کے احترام اور انبیاء علیہم السلام کے واقعات کی وضاحت میں اسرائیلی خرافات سے پرہیز کرنے میں یہ تفسیر خصوصی امتیاز رکھتی ہے بیان القرآن میں انبیاء علیہم السلام کے تمام واقعات کی تفسیر میں ایسے کسی واقعہ کو نقل نہیں فرمایا اور نہ کسی ایسی روایت کو تفسیر کی بنیاد بنایا جس سے اسلام کے مسلمہ عقائد پر زد پڑتی ہو یا حضرات انبیاء

علیہم السلام کا احترام و مقام مجروح ہوتا ہو ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

قرآن مجید میں اس واقعہ کے بعد دو واقعے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بیان فرمائے گئے ہیں ارشاد باری ہے
 وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿۲۰﴾ إِذْ عَرَضَ عَلَيْهِ بِالْعَشيِّ الضَّمِيضَةِ الْجِبَالَ فَقَالَ إِنِّي أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّي
 حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۲۱﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَالْقَيْنَانَ عَلَى كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ ﴿۲۳﴾
 قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۲۴﴾

اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا بہت اچھے بندے تھے کہ بہت رجوع کرنے والے تھے جبکہ شام کے وقت ان کے روبرو اصیل عمدہ گھوڑے پیش کئے گئے تو کہنے لگے میں اس مال کی محبت میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا۔ یہاں تک کہ آفتاب پردہ مغرب میں چھپ گیا ان گھوڑوں کو ذرا میرے سامنے لاؤ سوانہوں نے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور ہم نے سلیمان کو ایک اور امتحان میں ڈالا اور ہم نے ان کے تحت پر ایک دھڑلا ڈالا پھر انہوں نے رجوع کیا کیا اے میرے رب میرا تصور معاف کر اور مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے سوا کسی کو میرا نمہ ہو آپ بڑے دینے والے ہیں۔ (پ ۲۳ سورہ ص)

بیان القرآن میں ان دونوں واقعات کی ایسی تفسیر بیان کی گئی ہے جس میں ایسی غیر مستند اسرائیلی روایات و خرافات سے مکمل طور پر پرہیز کیا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کی شان عالی اور منصب نبوت کے قطعی طور پر لائق نہیں ہیں۔ حضرت تھانوی نے اپنی تفسیر کی بنیاد روایات صحیحہ پر رکھی۔ پہلے واقعہ کے متعلق حضرت تھانوی فرماتے ہیں۔

(وہ قصہ ان کو یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ شام کے وقت اس کے روبرو اصیل اور عمدہ گھوڑے (جو بغرض جہاد وغیرہ رکھے تھے) پیش کئے گئے (اور ان کے ملاحظہ کرنے میں اس قدر دیر ہو گئی کہ دن چھپ گیا اور کچھ معمول از قسم نماز فوت ہو گئی۔ کذا فی الدر المنثور عن علی اور بوجہ ہیبت اور جلالت کے کسی خادم کی جرأت نہ ہوئی کہ مطلع و متنبہ کرے۔ کذا فی الدر عن ابن عباس پھر جب خود متنبہ ہوا) تو کہنے لگے کہ افسوس میں اس مال کی محبت میں لگ کر اپنے رب کی یاد سے (یعنی نماز سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ آفتاب پورا (مغرب میں چھپ گیا) پھر چشم و خدم کو حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو ذرا پھر تو میرے سامنے لاؤ (چنانچہ لائے گئے) سوانہوں نے ان گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار سے) ہاتھ صاف کرنا شروع کیا (کذا فی الدر مرفوعاً بسند حسن یعنی ان کو ذبح کر ڈالا اس کو اصطلاح تصوف میں غیرت کہتے ہیں کہ جو چیز سب غفلت عن اللہ ہو جاوے اس کو اپنے پاس نہ رہنے دیں۔ پھر فائدہ میں اس کی وضاحت اس طرح فرمادی کہ: یہ نماز جو رہ گئی تھی اگر نفل تھی تو کوئی اشکال نہیں مگر انبیاء کی شان اعظم ہوتی ہے اس لئے انہوں نے اس کا بھی تدارک کیا اور اگر فرض تھی تو نسیان میں گناہ نہیں ہوتا اور یہ قطع کرنا سوق و اعناق کا اطلاق مال نہ تھا بلکہ بطور قربانی کے تھا اور قطع سوق کو شاید خروج دم اور زہوق روح میں آسانی ہونے کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ کذا فی الروح مگر ہماری شریعت میں قطع سوق مشروع نہیں للنبی عن النخع کذا فی تخریج الزیلعی عن الطبرانی و هذا مثله۔

اس وضاحت سے بڑی خوبی کے ساتھ تمام اشکالات کا حل اور ذہنوں میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب ہو گیا

کہ نسیان فرض میں گناہ نہیں اگر فرض کر لیا جائے کہ وہ فرض نماز تھی اور قطع سوق و اعناق بظاہر اطلاق مال معلوم ہوتا ہے وہ بطور قربانی کے تھا جو کہ مالی اور جانی عبادت ہے اور اب ہماری شریعت میں قطع سوق شروع نہیں ہے۔

اس تفسیر سے حضرت تھانوی کی فقہی بصیرت اور جامعیت اور ہر پہلو پر عمیق نظر کا ہونا ثابت ہو رہا ہے اور احترام نبوت کا لحاظ بھی بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

دوسرے قصہ کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ (حدیث شنیخین میں ہے کہ ایک پار سلیمان علیہ السلام اپنے امراء لشکر کی کسی کو تباہی جہاد پر خفا ہوئے اور فرمانے لگے کہ میں آج کی رات اپنی ستر بیبیوں سے ہمستر ہوں گا اور ان سے سو مجاہد پیدا ہوں گے فرشتہ نے قلب میں القاء کیا کہ ان شاء اللہ کہہ لیجئے آپ کو کچھ خیال نہ رہا چنانچہ صرف ایک عورت حاملہ ہوئی اور اس سے بھی ایک ناقص الخلق پچہ پیدا ہوا (جس کے ایک طرف کا دھڑ نہ تھا) اور (اسی کی نسبت کہا گیا ہے کہ) ہم نے ان کے تحت پر ایک (ادھورا) لاڈلا (یعنی قابلہ نے آپ کے سامنے تخت پر لا رکھا کہ یہ پیدا ہوا کذا فی الروح) پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا (اور ترک ان شاء اللہ سے توبہ کی اور توبہ کرنا ایسے امر سے چونکہ دلیل ہے کمال ثبات فی الدین کی اس کو امتحان میں پورا اترنا کہیں گے ان توجیہات کی تائید کی مستند احادیث سے ہو رہی ہے اور منصب نبوت کا ان میں پورا پورا احترام ملحوظ ہے اور بعض بے سرو پا اسرائیلی قصے جو بعض کتب تفسیر میں نقل ہو گئے ہیں اور ان میں عظمت پیغمبرانہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ایسے قصوں سے اپنی اس تفسیر کو مکمل طور پر محفوظ رکھا۔

رابط کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی محققانہ تحقیق

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے رابط کے سلسلہ میں عربی رسالہ بھی لکھا اور اپنی تفسیر بیان القرآن میں بھی آیات اور سورتوں کے درمیان ارتباط کا لحاظ رکھا اور واقع میں بھی ترتیب نزول آیات اور ترتیب تلاوت کہ مختلف ہونے سے رابط کی ضرورت ثابت ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ باہم آیات میں کوئی مناسبت اور تعلق ضرور ہے لیکن اگر آیات میں ربط نہ بھی ہو تب بھی قرآن کریم پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرز تصنیف نہیں اختیار کیا گیا بلکہ نصیحت مع لحاظ شفقت اختیار کیا گیا ہے اور اس میں ضرورت مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاذ ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے۔ استاذ تو ضابطہ پری کر دیتا ہے مگر باپ ضابطہ پری نہیں کر سکتا نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان سے نصیحت کروں جو اس کے دل میں گھر کر لے۔ اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کرتے وقت کبھی بے ربط و بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے وقت نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اسی درمیان اس نے دیکھا بیٹے نے ایک بڑا سالقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے اس کے بعد پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے شفقت کا

مقتضای یہی ہے کہ بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے دوسری بات کو بیچ میں کہہ کر پہلے بات کو پورا کرے یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے اس ظاہری بے ربطی کا منشاء شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے (وعظ سبیل النجاح ص ۳۳۵ وغیرہ)

اس نصیحت و شفقت کے پیش نظر اللہ تبارک و تعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جس میں ساری سورت کا مضمون اجمال کے ساتھ مذکور ہوتا ہے اور تھوڑے سے مختصر لفظوں میں بڑا مضمون ادا کر دیا جاتا ہے جس کو بلاغت میں ایجاز کہتے ہیں اس طرح تمام احکام پر عمل کرنے میں سہولت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں مختلف ابواب کے احکام بیان فرما کر کلام کو ختم نہیں کیا بلکہ اخیر کی آیت میں بطور میزان اکل کے ایک بات ایسی بتا دی جو سب کو جامع ہے اس طرح یہ آیت اخیرہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ** لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ تمام سورت کے احکام کو اجمالاً جامع ہے جس میں بالا جمال جملہ احکام مذکور داخل ہیں اور دیکھنے میں دو تین باتیں ہیں جن پر عمل بہت آسان ہے۔

سورتوں کے درمیان ربط

آیتوں کے درمیان ربط کے علاوہ سورتوں کے درمیان ربط کا بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اکثر اہتمام فرمایا ہے مثلاً سورہ فاتحہ سے سورہ بقرہ کا ربط اس طرح بیان فرمایا گیا ہے۔

سورہ فاتحہ سے اس سورت کا یہ ربط ہے کہ اس میں راہ ہدایت کی درخواست کی گئی تھی اور اس میں اس درخواست کی منظوری ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اس پر چلو (بیان القرآن)

اور سورہ بقرہ کے ختم پر سورہ آل عمران سے ربط اس طرح ذکر کیا ہے فرماتے ہیں میرے نزدیک یہ تمام سورت جملہ **فَانظُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ** سے مرتبط ہے کیونکہ اس سورت کے زیادہ اجزاء میں کفار کیساتھ مجاہدہ باللسان وبالبنان مذکور ہے جیسا تتبع سے معلوم ہوتا ہے (بیان القرآن جلد ۱) اگر آیتوں اور سورتوں کے روابط کو تفسیر بیان القرآن سے علیحدہ جمع کر کے شائع کر دیا جائے تو طلباء علوم دینیہ کے لئے نہایت درجہ مفید ہو سکتا ہے پھر کسی اور جگہ سے ربط کے تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ سکتی۔

حضرت حکیم الامت کی بعض خاص تفسیری تحقیقات

اردو عربی محاورے کا فرق

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بعض الفاظ لغت عربی میں کسی معنی خاص میں صریح نہیں ہیں مگر اردو محاورہ میں وہ اس معنی میں صریح ہو گئے ہیں اب ان الفاظ کو قرآن میں دیکھ کر بعض جاہلوں کو قرآن پر اشکال ہوتا ہے کہ اس میں تو غیر

مہذب الفاظ ہیں مثلاً ذکر عربی میں (ز) کو کہتے ہیں جوائشی (مادہ) کا مقابل ہے و ذکر و انشی عربی میں زو مادہ کو کہتے ہیں اور کبھی کنایہ عضو مخصوص کو بھی کہتے ہیں یہ تو عربی کا استعمال ہے مگر اردو میں ذکر کا استعمال عضو ہی کے لئے ہونے لگا۔ اب اگر کوئی قرآن میں لِلَّذِکْرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِیٰنِ دیکھ کر اعتراض کرنے لگے کہ اس میں غیر مہذب الفاظ ہیں یہ اس کی حماقت ہوگی کیونکہ جو لفظ تمہارے محاورے میں غیر مہذب ہے وہ عربی میں اس معنی کے لئے موضوع ہی نہیں۔

اسی طرح قرآن کریم میں وَالْحَیْضِیْنَ فُرُوجَهُمْ اور أَحْصَنْتَ فَرْجَهَا بعض جہلا اس کو غیر مہذب سمجھتے ہیں یہ بھی حماقت ہے کیونکہ عربی میں لفظ فرج شرمگاہ عورت کے لئے موضوع نہیں بلکہ اس کے اصل معنی شکاف کے ہیں کنایہ کبھی شرمگاہ کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے۔ چنانچہ احصنت فرجھا کا ترجمہ ہے کہ مریم علیہا السلام اپنے گریبان کو دست اندازی غیر سے بچانے والی تھیں۔ ارکا مرداف یہ ہے کہ پاکدامن تھیں کتنا نفیس عنوان ہے جس میں بتلائے کون سا لفظ غیر مہذب ہے اور فَتَفَحَّنَا فِیْہِ مِنْ زُجْنَا کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے گریبان میں دم کر دیا جس سے وہ حاملہ ہو گئیں بتلائے اس میں کیا اشکال ہے (المورد الفرجی)

چنانچہ بیان القرآن میں اس لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا گیا ہے جنہوں نے اپنے ناموس کو (حرام اور حلال دونوں سے) محفوظ رکھا (بیان القرآن)

مگر محض ترجمہ سے یہ باتیں تھوڑا ہی معلوم ہو سکتی ہیں ترجمہ دیکھنے والے ایک لفظ کا ترجمہ اپنے محاورہ کے موافق کر کے قرآن کریم پر اشکال کرنے لگتے ہیں۔ قرآن کریم عربی کلام ہے اور اس کی بلاغت و فصاحت اور اس کے معانی و مطالب کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو عربیت کا پورا ماہر ہو اور عربی زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ قرآن کریم کو اسی زبان میں سمجھتا ہو جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہو۔ (المورد الفرجی)

اردو زبان کی تنگ دامانی

اردو میں جب عربی زبان کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو چونکہ اردو عربی زبانیں مختلف ہیں دونوں کے محاورات الگ ہیں اس لئے اگر کسی کا عربی میں علم کافی نہیں ہے اس کے ترجمے میں بعض دفعہ ایہام رہ جائے گا جس سے شبہات پیدا ہوں گے اور بعض جگہ ترجمہ غلط ہو جائے گا۔

مثلاً سورہ الضحیٰ میں ضالاً کا ترجمہ بعض نے گمراہ کر دیا۔ جو باوجودنی نفسہ صحیح ہونے کے ایک عارض کے سبب غلط ہو گیا وہ عارض یہ ہے کہ ضال لفظ عربی ہے اس کا عربی میں مختلف استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس میں بھی جس کو موضوع دلیل نہ ہوا ہو اور اس میں بھی جو بعد و ضوع دلیل کے مخالفت کرے گمراہ ہمارے محاورہ میں صرف اس کو کہتے ہیں جو موضوع دلیل کے بعد حق کا اتباع نہ کرے اور لغت عربیہ کے اعتبار سے لفظ ضال دو معنی کو جیسا کہ مذکور ہوا عام ہے ایک معنی ضال کے وہ ہیں جو ہمارے محاورے میں گمراہ کے آتے ہیں اور دوسرے معنی بے خبر کے ہیں اور بے خبر اس کو کہتے ہیں جس پر دلائل ظاہر ہی نہیں ہوئے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور حق کے بعد اس کا اتباع نہ کرنا محال ہے لہذا اس جگہ گمراہ

ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ بے خبری سے ترجمہ کرنا مناسب ہے۔

اور گو بے علمی بھی بے خبری کا مرادف ہے مگر اس سے بھی ترجمہ مناسب نہیں کیونکہ ہمارے محاورہ میں بے علم جاہل کو کہتے ہیں جو علوم صحیحہ سے بالکل عاری ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے گو علوم نبوت سے بے خبر ہوں مگر علوم عقلیہ میں کامل تھے۔ پس بے علمی سے بھی ترجمہ مناسب نہیں بلکہ بے خبری ہی سے ترجمہ کرنا مناسب ہے اور کسی بات سے بے خبری کچھ عیب نہیں کیونکہ ذاتی اور علم محیط سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہر شخص علم میں تعلیم الہی کا محتاج ہے بالخصوص علوم سمعیہ نقلیہ میں جن کے ادراک کے لئے عقل محض نا کافی ہے اور ہر شخص کو جو علم حاصل ہوتا ہے معلوم کرنے سے پہلے وہ غیر معلوم ہی ہوتا ہے پس علم بعد عدم علم کوئی عیب نہیں۔ مناسب ترجمہ ضالا کا اس جگہ ناواقف ہے اس لفظ کا یہ صحیح ترجمہ موجود تھا مگر مترجمین کی نظر اس پر نہیں پہنچی اور وہ ضالا کا ترجمہ گمراہ کر گئے حاصل یہ کہ الفاظ عربیہ کا ترجمہ ہر جگہ کافی نہیں ہوتا اور مقصود کے سمجھنے میں غلطی واقع ہو جاتی ہے اس لئے ترجمہ کے لئے خود غربی کا بھی پوری طرح جاننا اور اس زمانے کے محاورات سے بھی جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے پورا واقف ہونا ضروری ہے (زکوٰۃ النفس)

آج کل اردو میں محاورہ بدل گیا گمراہ کا استعمال ہی معنی میں ہوتا ہے دوسرے موقع میں ناواقف اور بے خبر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح لَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ ترجمہ دیکھنے والوں کو خیال ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو ایسے سخت لفظ سے خطاب فرمایا گیا یہ شبہ اصل میں خلط محاورہ سے ہوا ہے ہمارے محاورہ میں جاہل بہت سخت لفظ ہے اور اس کا اگر ترجمہ کیا جائے تو آسان لفظ ہو جاتا ہے جاہل کا ترجمہ نادان ہے یہ کتنا پیارا لفظ ہے اس سے تو ہین لازم نہیں آتی بلکہ شفقت کے موقع پر یہی بولا کرتے ہیں ظاہر میں تو جاہل کا لفظ کتنا سخت ہے مگر ترجمہ کے بعد اس کی حقیقت بالکل آسان ہے یہ اشکالات خلط محاورہ سے ہوتے ہیں (آداب التبلیغ)

محاورہ کے درپے ہونا

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم کے ترجمے میں یہ ضروری ہے کہ قرآن کا مدلول باقی رہے۔ آج کل کے ترجموں میں ان کو با محاورہ کرنے کے درپے ہو کر اس کا بالکل خیال نہیں کیا جاتا حالانکہ قرآن مجید کے ترجمہ میں محاورہ کی اتباع کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی مدلول کے باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔

زمانہ حال کے بعض ترجمہ کرنے والوں نے محاورات کے اتباع کی پابندی میں اصل مدلول قرآن کا لحاظ نہیں رکھا اور بعض ایسے محاورات استعمال کئے جو فصاحت کے مقام سے گرے ہوئے ہیں حالانکہ ترجمہ قرآن کریم میں زبان فصیح ہونی چاہیے اور محاورہ بھی شاہانہ انداز کا استعمال کرنا چاہیے جس سے کلام کی عظمت و ہیبت قلوب میں باقی رہے اور عامیانہ بازاری محاوروں سے کلام کی وقعت متاثر ہو سکتی ہے مگر عامیانہ طبائع ایسے ہی محاورات پر فریفتہ اور لٹو ہیں۔

مثلاً ایک ایسے ہی مترجم صاحب نے جن کی محاورات دانی پر لوگ فریفتہ ہیں بعمہون کا ترجمہ ٹامک ٹوئیاں مارنا لکھا ہے اور ذہبنا نستبق میں استباق کا ترجمہ کبڈی کھیلنا کیا ہے۔ یہ ترجمہ لغت کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے لغت

میں استباق کے معنی آپس میں اس طرح دوڑنے کے ہیں کہ جس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنا مقصود ہو اور عقلاً بھی ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ کبڈی کھیلنے میں اتنی دور نہیں جایا کرتے جس سے محافظ بچے کی نسبت بھیڑیے کے کھا جانے کا احتمال ہو اگر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام اس پر ضرور جرح فرماتے۔ اسی طرح وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ کی تفسیر میں اس مفسر نے لکھ دیا کہ جو شخص روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے یہ تفسیر اس آیت کی بالکل غلط ہے (وعظ الصوم) حالانکہ روزہ کے بدلے میں فدیہ کا یہ حکم شروع اسلام میں مشروع تھا پھر من شہد منکم الشهر فلیصمه سے منسوخ ہو گیا البتہ جو شخص بہت بوڑھا ہو یا ایسا بیمار ہو کہ اب صحت کی توقع نہیں ایسے لوگوں کے لئے یہ حکم اب بھی باقی ہے مگر روزہ کی طاقت رکھنے والوں کے لئے یہ حکم منسوخ ہے جیسا کہ بیان القرآن مع حاشیہ میں مذکور ہے۔

قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے عربی لغت اور صرف نحو کے علاوہ دوسرے قواعد (عقلیہ) منطقیہ جاننے کی ضرورت بھی ہے کیونکہ آج کل عقول سلیمہ بہت کم ہیں اگر عقل سلیم ہو تو نتیجہ نکالنے کا سلیقہ اور اس کی غلطیاں خود معلوم ہو جاتی ہیں مگر جب عقل سلیم نہ ہو تو قواعد منطقیہ کی ضرورت ہے اس سے صحت استدلال اور نتیجہ کا صحیح و غلط ہونا معلوم ہو جاتا ہے بدوں اس کے قرآن میں بعض جگہ غلطی ہو جانے کا اندیشہ ہے مثال کے طور پر ارشاد باری تعالیٰ ہے وَكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ وَظَنُّوا كُنُوزَهُ يَوْمَ الْحِسَابِ لَاسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ۔ یہاں اشکال ہوتا ہے کہ ان دونوں مقدموں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَآسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ۔ اور اس کا بطلان ظاہر ہے اس اشکال کا حل علم معقول جاننے والا جلد دے سکتا ہے کہ یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کیونکہ صحت نتیجہ تکرار حد اوسط پر موقوف ہے اور یہاں حد اوسط مکرر نہیں کیوں مطلب یہ ہے۔

وَكَوَعَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَآسْمَعَهُمْ سَمِعَ قَبُولَ لَوْ أَسْمَعَهُمْ سَمِعَ قَبُولَ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ اور اس پر کوئی اشکال نہیں اس لئے بقدر ضرورت علم معقول کی بھی ضرورت ہے (المورد الفرخی) بیان القرآن کے عربی حاشیہ میں حضرت نے اس اشکال اور جواب کی تقریر ان لفظوں میں کی ہے۔

اندفع بهذا ما يومهم من الشرطيتين من الاستلزام علم الله منهم خير التوليه بناء على ان لازم الازم لازم وجه الاندفاع ظاهر فان الاسماع الازم غير اللسماع الازم و قدر ايت التصريح بهذا المعنى فى الدر المنثور عن ابن زيد نصر هكذا ولو اسمعهم بعد ان يعلم ان لاخير فيهم مانفعهم بعد ان علم بانهم لا ينتفعون به۔

اسی طرح آیت انما يخشى الله من عباده العلماء میں علماء کو یہ شبہ ہوا کہ ہم عالم ہیں تو ہم میں خشیت بھی ہے اور جب خشیت بھی ہے تو اس فضیلت میں داخل ہوئے حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ محض علم سے خشیت ہونا ضرور نہیں اس کے لئے تدبیر مستقل کی حاجت ہے اور عوام کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم سے خشیت ہوتی ہے حالانکہ ہم نے تو بہت سے عالم دیکھے ہیں کہ ان کو خوف خدا کچھ بھی نہیں۔ عوام کے اعتراض کا اکثریوں جواب دیا جاتا ہے کہ جس عالم کو خوف خداوندی نہ ہو اس کا علم معتد بہ نہیں ہے پس جہاں علم معتد بہ ہوگا وہاں خشیت ضروری ہے حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب فی نفسہ تو صحیح ہے مگر اس مقام پر نہیں چلتا۔ (حضرت کی تقریر سمجھنے کے لئے علوم الہی اور اصطلاحات منطقیہ کی ضرورت ہوگی۔) چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس پر مفہوم آیت کا یہ ہوگا کہ خشیت علم پر ضرور مرتب ہوگی اور علم سے مراد علم مع الخشیت ہوگا۔ پس خشیت مرتب ہوگی خشیت پر پس تقدم الشی علی نفسہ لازم آئے گا اور یہ دور صریح ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ خوف کا پیدا کرنا ضروری ہے اور اس کا موقوف علیہ ہے علم اس کو حاصل کرو لیکن علم حصول خشیت کی علت تامہ نہیں ہے بلکہ اس علت کا ایک جزو ہے دوسرا جزو تقویٰ ہے۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک تو علم دین کی کیونکہ یہ نہ ہو تو خشیت ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اذا فات الشرط فات المشروط اور دوسری چیز خلوت ہے۔

(فضائل العلم والخشیت)

اب ظاہر ہے کہ ان دونوں آیتوں کا مطلب اور مقصد بغیر قواعد منطقیہ ک کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟

دوسری مثال

قرآن کریم کی آیت **وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ** اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔ کے بارہ میں حضرت تھانویؒ سے ایک عالم نے سوال کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ زمین کے مالک کفار ہو گئے؟ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ مولانا آپ تو عالم ہیں مگر ذرا یہ تو دیکھئے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے یا مطلقہ چونکہ وہ عالم تھے اتنی ہی بات سے سمجھ گئے (حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہوں گے بلکہ اس میں اطلاق کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے اور اطلاق کے صدق کے لئے ایک بار وقوع کافی ہے چنانچہ صحابہؓ کے زمانے میں اس کا وقوع ہو چکا۔ یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ آیت میں ان الارض سے مراد یہی دنیا کی زمین ہے ورنہ ظاہراً آیت کے سیاق و سباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارض جنت ہے اور جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہوں گے اس پر کچھ بھی اشکال نہیں۔

بیان القرآن میں حضرت نے اس زمین سے جنت کی زمین ہی مراد لی ہے فرماتے ہیں کہ اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے اور اسی صفحہ کے حاشیہ عربیہ میں فرماتے ہیں کہ جنت کے لفظ سے اشارہ اس طرف ہے کہ الارض محمول ہے ارض جنت پر جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد **وَأَوْزَنَّا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ** میں الارض سے مراد جنت کی زمین ہے۔

تیسری مثال

اور مسئلہ روایت باری تعالیٰ کی دقت تحقیقی

ایک صاحب نے سوال کیا فلما تجلسی ربہ الی۔ خر موسیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ خرور بعد تجلی کے ہوا پس

رویت ثابت ہوگئی پھر لن ترانی کے کیا معنی؟ جواب یہ دیا کہ تقدم زمانی نہیں تقدم ذاتی ہے پس تجلی اور خور میں کوئی زمانہ نہیں ہوا جس میں رویت ہو (ملفوظ ۹۳ از مقالات حکمت)

ایک اور سوال وجواب جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی رویت کی توضیح کیلئے مفید معلوم ہوتا ہے سوال کیا گیا کہ وادی ایمن میں موسیٰ علیہ السلام کو جو نور نظر آیا وہ اگر نور مخلوق نہ تھا تو رویت میسر ہوگئی پھر رب ارنسی انظر الیک کی درخواست کی کیا وجہ؟ اور اگر نور مخلوق تھا تو موسیٰ علیہ السلام میں اور ہم میں کہ دوسرے انوار مخلوقہ کو مثل نور شمس و قمر دیکھتے ہیں کیا فرق ہوا؟ جواب دیا۔ کہ وہ نور غیر مخلوق نہ تھا مگر چونکہ مخلوق بالواسطہ تھا اس لئے اس کو نسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس و تعلق تھا کہ اس تلبس زائد سے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا یعنی ایک معنی کو نور حق کہنا بھی صحیح ہے جیسے کلام لفظی کہ ماترید یہ کے نزدیک مخلوق ہے مگر اس خاص تلبس کی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہنا صحیح ہے۔ بخلاف کلام زید و عمرو کہ اس کو کلام اللہ کہنا جائز نہیں پس سب اشکالات رفع ہو گئے۔ (ملفوظ)

واقعی وادی ایمن میں نور حق نظر آنے کے بعد رویت کی وجہ اور دونوں رویتوں میں اور پھر اس رویت نور وادی ایمن اور دوسرے انوار میں فرق کو بڑی عجیب مثال کلام لفظی سے واضح فرما کر ہر طرح کے اشکالات کو رفع کر دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ علم کلام سے پوری مناسبت اور اس میں مہارت تامہ کے بغیر ایسے دقیق علوم کا سمجھنا سمجھانا ممکن نہیں۔ اسی طرح کی دقیق تحقیق مسئلہ رویت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بیان القرآن میں کی گئی ہے جو قابل ملاحظہ ہے جس سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وقت نظر اور علوم عقلیہ منطقیہ میں بھی کامل مہارت کا اندازہ ہو سکتا ہے فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے کلام فرمایا مگر یہ کہ اس کی حقیقت کیا تھی اللہ ہی کو معلوم ہے جن احتمالات عقلیہ کی شریعت نفی نہ کرے ان سب کے قائل ہونے کی گنجائش ہے لیکن بلا دلیل عدم تعین اسلم ہے تفصیل اس کی کتب کلامیہ میں ہے البتہ قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام کو نسبت اس کلام کے جو عطاءئے نبوت کے وقت ہوا تھا کچھ زیادہ اختصاص تکلم سے ہے چنانچہ یہاں مطلق کلمہ ربہ ہے۔ وہاں نُؤدِی مِنْ شَاطِئِ الْوَادِی الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبْرَکَةِ تَوَمِّنَ الشَّجَرَةَ اَیَا ہے اور غالباً زیادہ اختصاص کے سبب یہ کلام مورث اشتیاق رویت ہوا وہ نہیں ہوا۔ واللہ اعلم

اس تقریر سے دونوں کلاموں میں فرق واضح ہو کر سوال رویت کی وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ زیادت اختصاص تکلم ہے اور آگے فرماتے ہیں۔

پہاڑ پر تجلی ہونے کے معنی واللہ اعلم یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا نور خاص بارادہ خداوندی خلأئق سے محبوب ہونے کے جو وسائل ہیں وہ حجب اور موانع ہیں تعین ان کی اللہ کو معلوم پس غالباً ان حجب میں بعض حجب مرتفع کر دیئے ہوں اور چونکہ وہ حجب مرتفع قلیل تھے اس لئے ترمذی کی حدیث مرفوع میں تمثیلاً اس کی حالت کو انملہ خنصر سے تشبیہ دی ہے ورنہ صفات الہیہ تجزی و مقدار سے منزہ ہیں اور چونکہ افعال حق تعالیٰ کے اختیاری ہیں اس لئے ممکن کہ وہ حجب کے اعتبار سے مرفوع ہوئے ہوں اور موسیٰ علیہ السلام اور دیگر خلق کے اعتبار سے مرتفع نہ ہوئے ہوں یہ معنی ہو جاویں گے لعل جبل

کے صفات حق اور افعال حق کے درمیان فرق واضح فرما کر صفات الہیہ میں تجزی کے تحت اشکال کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت ہی مختصر اور جامع لفظوں میں حل فرما دیا ہے کہ عقل حیران ہے۔ اب تجلی جہل کے معنی بھی واضح ہو گئے ہیں اور صفات الہیہ کی تجزی کا اشکال بھی رفع ہو گیا آگے فرماتے ہیں۔

اور چونکہ ارتقاع حجب کا خاصہ احراق ہے جیسا کہ حدیث میں ہے لا حرقہ سبحات النور ما انتھی الیہ بصرہ۔ اس لئے پہاڑ کی یہ حالت ہو اور یہ ضروری نہیں کہ سارے پہاڑ کی یہ حالت ہو جائے گی کیونکہ تجلی فرمانا یا اختیار خود کسی خاص قطعہ پر ممکن ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی بے ہوشی ان پر تجلی فرمانے سے نہ تھی چونکہ ظاہر الجہل کے خلاف ہے بلکہ پہاڑ کی یہ حالت دیکھ کر نیز جہل تجلی کیساتھ ایک گونا تعلق و تلبس ہونے سے یہ بے ہوشی ہوئی۔

سبحان اللہ کیا عجیب علمی تحقیق ہے ورنہ تو بظاہر نظر اس تجلی کا حضرت موسیٰ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ بصیرت نے اس کو جہل کی قید سے خارج سمجھا اور یہ اشکال بھی اس سے مرتفع ہو گیا کہ جس طرح جہل پر تجلی ہوئی ایسے ہی ایک گونا حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تجلی کے مورد ہوئے اور کسی نہ کسی درجے میں گواہی سے ادنیٰ درجہ کیوں نہ ہو رویت ہو گئی اور یہ سن سنانی کے خلاف ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ کی اس تقریر بلیغ سے سمجھ میں آ گیا کہ تجلی صرف پہاڑ پر تھی اور یہ تجلی فرمانا چونکہ فعل حق تھا اور افعال حق اختیاری ہیں اسی لئے پہاڑ کے علاوہ دوسری کسی مخلوق سے یہ جبابات مرتفع نہیں کئے گئے۔

آگے استقرار جہل کی تقریر رویت کے وقوع اور عدم استقرار کی تقریر پر رویت کے عدم وقوع میں باہم علاقہ کی تحقیق فرماتے ہیں۔ ”ظاہراً فإن استقر مکانہ فسوف تریئنی سے استقرار کی تقریر پر رویت کا وقوع اور عدم استقرار کی تقریر پر رویت کا عدم وقوع مفہوم ہوتا ہے اس میں قابل تحقیق یہ امر ہے کہ ان میں باہم علاقہ کیا ہے سو عدم استقرار اور عدم وقوع رویت میں تو علاقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاسہ بصریہ موسویہ ترکیب عنصر میں جہل سے اضعف والطف ہے جب اقویٰ و اشد متحمل نہ ہو تو اضعف کیسے متحمل ہوگا اور اس تقریر پر گواہی استقرار مستلزم تحمل بصر موسوی عقلانہ ہوگا لیکن اس کو وعدے پر محمول کرنے سے اشکال رفع ہو جائے گا یعنی باوجود دونوں کی عدم تساوی ہم تیرما وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ متحمل ہو گیا تو تمہارے حاسہ بصریہ کو بھی متحمل کر دیا جائے گا۔“

واقعہ یہ اشکال بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے کہ استقرار جہل سے رویت کا تحمل کیسے لازم ہوگا اور ان دونوں میں عقلہ کیا ملازمہ ہے کہ استقرار جہل سے رویت کا تحمل بھی ثابت ہو سکے جب یہ ملازمہ ثابت نہ ہوگا تو اشکال رویت پر رہے گا لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے استقرار جہل اور رویت موسوی میں بنا بر وعدہ عطائے تحمل کے مساوات اور ملازمہ ثابت کر کے اس اشکال کی اساس کو ہی منہدم کر دیا۔

نیز فرماتے ہیں ”وقوع تجلی سے وقوع رویت کا شبہ نہ کیا جاوے کیونکہ دونوں مترادف یا متلازم نہیں بلکہ تجلی کا معنی کسی شے کا ظہور ہے گو دوسرے کو اس کا ادراک نہ ہو پس تجلی کا انفکاک رویت سے ممکن ہے جیسے آفتاب کو تجلی و طالع کہہ سکتے ہیں لیکن خفاش کو رائی اور مد رک کہنا لازم نہیں آتا چونکہ ممکن ہے کہ مبادی تجلی کے سبب چشم خفاش معطل ہو جاتی ہو تجلی کے قبل بہ قبلیت زمانیہ یا تجلی کے ساتھ بمعیت زمانیہ و قبلیت ذاتیہ“ (بیان القرآن) وقوع تجلی سے وقوع رویت کے شبہ کو کس طرح

واضح مثال کے ساتھ دور فرمایا گیا ہے کہ باید و شاید واقعی سخت سے سخت تر شبہ کا حل کر کے پھر اس کو ذہن نشین کر دینا حضرت نبی کی خصوصیات میں سے ہے۔

اس بحث کے متعلق آیت لَا تُذْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُذْرِكُ الْأَبْصَارَ (پ ۸) کے تحت حضرت فرماتے ہیں ”حاصل مقام کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی مبصر و مرئی خواہ کیسا ہی اکبر اعظم ہو ایسا نہیں کہ اس کا احاطہ کسی رائی کی بھر سے خواہ وہ کیسا ہی اصغر و احقر ہو محال ہو چنانچہ اس کا امکان باقتضائے عقل ظاہر ہے بخلاف حق تعالیٰ کے باوجود کہ دنیا میں عقلاً مبصر ہونانی حد ذاتہ ممکن ہے جیسا کہ رب ادنیٰ کی درخواست سے ظاہر ہے گو شرعاً ممتنع ہے جیس کہ لن نوانی سے یقینی ہے نیز احادیث میں علی الاطلاق اس کی تصریح ہے اور آخرت میں مبصر ہونا واقع ہے لیکن احاطہ ہر حالت میں محال ہے اور یہ امر خواص باری تعالیٰ سے ہے پس یہ شبہ دفع ہو گیا کہ بعض اجسام عظیمہ پر بھی یہ امر صادق آتا ہے کہ لَا تُذْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وجہ دفع ظاہر ہے کہ وہاں ادراک بمعنی الاحاطہ محال تو نہیں پس نفی ادراک مذکور فی الایات مرتبہ استحالہ میں خواص واجب سے ہوا اور احاطہ عقلیہ کا محال ہونا مستقلاً بھی کتب کلامیہ میں مذکور ہے اور لَا تُذْرِكُهُ الْأَبْصَارُ بھی بالاولیٰ اس پر دال ہے۔ اس کی تقریر اثباتی ترجمہ میں کر دی گئی اور يُذْرِكُ الْأَبْصَارَ میں تخصیص البصار کی باقتضائے خصوصیت مقام ہے کہ مقام بیان البصار کا ہے خصوصیت حکم کی مقصود نہیں کیونکہ عموم دوسرے دلائل سے ثابت ہے اور اس کا مضمون خواص واجب سے اس طور پر ہے کہ ممکنات میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ دوسری چیز کا اس کو محیط ہونا محال ہو اور اس کا احاطہ اس دوسری چیز کو واجب ہو پس لَا تُذْرِكُهُ الْأَبْصَارُ میں نفی مرتبہ استحالہ میں معتبر ہوگی اور يُذْرِكُ الْأَبْصَارَ میں اثبات مرتبہ وجوب میں معتبر ہوگا۔ اب دونوں حکموں کا خواص باری میں سے ہونا ظاہر و متیقن ہو گیا۔“ (بیان القرآن)

اس آیت مبارکہ کی تفہیم میں مسائل کلامیہ اور قواعد میزانیہ کے علم کی سخت ضرورت ہے ورنہ اس کی صحیح تفسیر و تفہیم ممکن نہیں لَا تُذْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے ظاہر سے یہ عقلی شبہ ہوتا ہے کہ بعض اجسام عظیمہ کا بھی ادراک البصار سے نہیں ہوتا تو پھر اس میں باری تعالیٰ کی کیا خصوصیت ہوئی؟ مگر حضرت کی تقریر بالا سے یہ شبہ دور ہو کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خصوصیت واضح ہو گئی کہ ایک تو کسی ممکن چیز کا منافی ہونا اور اس کے وقوع کی نفی کرنا ہے اور ایک اس کا محال ہونا ہے اس آیت میں البصار سے احاطہ کے وقوع کی صرف نفی مقصود نہیں بلکہ ادراک کا محال ہونا ثابت کرنا مقصود ہے اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اس کا ادراک البصار سے محال ہے بعض اجسام عظیمہ کا احاطہ اور ادراک البصار سے اگرچہ منافی اور غیر واقع ہو مگر غیر ممکن اور محال نہیں ہے حاصل یہ کہ ادراک کی نفی مرتبہ استحالہ میں معتبر ہے جیسا کہ هُوَ يُذْرِكُ الْأَبْصَارَ میں اثبات ادراک مرتبہ وجوب میں معتبر ہے مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے خواص میں سے ہے کہ البصار سے اس کا ادراک محال ہے اور البصار کا ادراک باری تعالیٰ کے لئے مرتبہ وجوب میں ثابت ہے اور هُوَ يُذْرِكُ الْأَبْصَارَ میں جو بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ البصار کے علاوہ اور سب چیزوں کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے پھر صرف البصار کے ادراک و احاطے کا اس جگہ خصوصیت سے کیوں ذکر فرمایا گیا تو اس تخصیص ذکر کی وجہ مقام کی خصوصیت ہے کہ مقام بیان البصار کا ہے خصوصیت حکم کی مقصود نہیں

کیونکہ عموم اور اللہ تعالیٰ کا ہر چیز کو محیط ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہے مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر ابصار سے احاطہ کی نفی کا ذکر تھا تو باری تعالیٰ کے لئے اسی کے احاطہ اور ادراک کا اثبات فرما دیا گیا۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کا ترجمہ اس کو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی فرمایا گیا ہے اس کے بارے میں حضرت ارشاد فرماتے ہیں اور ”ادراک کا جو ترجمہ کیا گیا ہے اس سے معتزلہ کا استدلال دربار انکار رویت الہیہ کے اہل جنت کے واسطے ساقط ہو گیا اور ادراک کے یہ معنی ابن عباس سے منقول ہیں۔ چنانچہ درمنثور میں ہے۔

اخرج ابن جریور عن ابن عباس لا تدركه الابصار ولا يحيط بصر احد بالله تعالى آه اور روح میں ہے و اليه ذهب الكثير من ائمة اللغة و غيرهم پس مطلق رویت ثابت اور احاطہ منافی اور حدیثوں میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سوال کے جواب میں ہل رایت ربک دو جواب آئے ہیں ایک نورانی ارادہ دوسرا رایت نوراً پہلے جواب میں احاطہ مراد ہے دوسرے میں مطلق رویت“ (بیان القرآن)

رویت اور عدم رویت کی حدیثوں میں تطبیق کی یہ کیسی عجیب و غریب صورت تجویز فرمائی گئی ہے جس میں نقل اور عقل ہر ہر پہلو کی رعایت کے ساتھ مذہب اہلسنت والجماعت کی موافقت بھی حاصل ہے۔ آگے ایک اور شبہ کا جواب ارقام فرماتے ہیں جو بظاہر اس تقریر پر ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ کی رویت دنیا میں شرعاً ممنوع ہے فرماتے ہیں ”جاننا چاہیے کہ لیلۃ المعراج میں آپ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جیسا کہ جلالین سے بتخريج مستدرک حاکم بروایت حضرت ابن عباس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے۔ رایت ربی عزوجل الحدیث وہ اس حکم امتناعی شرعی فی الدنیا سے مخصوص ہے اور شیخ اکبر رحمۃ اللہ سموت و ما فوقها کو دنیا سے خارج فرماتے ہیں اور آخرت میں داخل کرتے ہیں اس بنا پر کہ آخرت کا ایک زمانہ ہے جو قیامت میں آوے گا اور ایک مکان ہے جو اوپر مذکور ہو پس یہ رویت آخرت میں ہوئی تھی فلا حاجة الى القول بالتحصيص“ (بیان القرآن)

شروع میں گزر چکا ہے کہ تفسیر قرآن کے لئے بہت سے علوم کی ضرورت ہے جیسا کہ تفصیل مذکور سے ناظرین پر واضح ہو چکا بغیر علوم عربیہ اور قواعد ضروریہ کے قرآن کریم کی آیات کا صحیح مفہوم و مطلب نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ تعارض اور اشکالات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور انسان شبہات میں گھر جاتا ہے اس کی ایک مثال اور پیش ہے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے قد الفلح من زكها (جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا) فرمایا ہے جس سے تزکیہ کا مدار فلاح اور مامور بہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے فلا تنزكوا انفسكم (تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو) اس کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ لا تنزكوا انفسكم کا صیغہ ہے مشتق تزکیہ سے تو اب اس کو اشکال واقع ہوگا کہ ایک جگہ تو تزکیہ کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نفی ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگر اس آیت میں لا تنزكوا انفسكم کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہو جائے گا۔ قرآن کریم میں اکثر شبہات ماسبق اور مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں اگر شبہ وارد ہونے کے وقت آیت کے ماسبق اور مابعد میں غور کر لیا جائے گا تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہو جایا کرے تو اس جگہ شبہ کا جواب موجود ہے۔ چنانچہ لا تنزكوا انفسكم پر جو قد الفلح من زكها سے تعارض کا شبہ ہوا

تھا اس کا جواب اسی جملے کے ساتھ ساتھ دوسرے جملے میں مذکور ہے یعنی ہوا علم بمن اتقی کیونکہ اس میں نہیں مذکور کی علت کا ذکر ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے اس میں حق تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں ایک اپنا زیادہ علیم ہونا دوسرے من اتقی کے ساتھ اپنے علم کا متعلق ہونا اور نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تقویٰ باطنی عمل ہے۔ نیز تقویٰ کے معنی لغتہ ڈرنے اور پرہیز کرنے کے ہیں یعنی معاصی سے بچنا اور ڈرنا تو ظاہر ہے کہ باطن کے متعلق ہے اور معاصی سے ڈرنا خود اصلاح باطنی ہے لہذا تقویٰ اور تزکی دونوں مرادف ہوئے آیت کا حاصل یہ ہوا ہوا علم بمن تزکیٰ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب یہ سمجھو کہ اس میں تزکیٰ کو عبد کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے اس کا داخل اختیار ہونا مفہوم ہوتا ہے تو وہ مقدور ہوا پھر یہ کہ علم فرمایا ہے اقدر نہیں فرمایا اس سے بھی اشارتہ معلوم ہوا کہ بندہ کی قدرت کی نفی نہیں ہے پس اس سے بھی تقویٰ اور تزکیٰ کا مقدمہ ہونا مفہوم ہوا اور نہ علم نہ فرماتے بلکہ اقدر علی جعلکم متقین یا اس کے مناسب اور کچھ فرماتے جب تقویٰ اور تزکیٰ ایک ٹھہرے اور مقدمہ عبد ٹھہرے اب غور کرنا چاہیے کہ ہوا علم بمن اتقی "لاتزکو انفسکم کی علت بن سکتی ہے یا نہیں اگر لاتزکو کے معنی یہ لئے جائیں کہ نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی نفس کو ذائل سے پاک کرنے کی کوشش نہ کرو تو ہوا علم بمن اتقی اس کی علت نہیں ہو سکتی کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو ذائل سے پاک نہ کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکیہ اور تقویٰ کیا ہے اور یہ ایک بے جوڑی بات ہے یہ تو ایسا ہوا جیسے یوں کہا جائے کہ نماز نہ پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کس نے نماز پڑھی ہے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا بندے کے کسی فعل کو جاننا اس کے ترک کی علت نہیں ہو سکتی ورنہ پھر سب افعال کو ترک کر دینا چاہئے کیونکہ حق تعالیٰ بندہ کے سب افعال کو جانتا ہے بلکہ اس کے مناسب یہ علت ہو سکتی تھی کہ ہوا اقدر علی جعلکم متقین یعنی یوں فرماتا کہ تم نفس کو ذائل سے پاک نہ کرو کیونکہ تم کو متقی بنانے پر حق تعالیٰ زیادہ قادر ہیں تم پورے قادر نہیں پھر کیوں کوشش کرتے ہو۔ جب یوں نہیں فرمایا بلکہ علم بمن اتقی فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں تزکیہ کے وہ معنی نہیں بلکہ کچھ اور معنی ہیں جس کے ترک کی علت ہوا علم بمن اتقی بن سکے سو وہ معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو یعنی پاکی کا دعویٰ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کون متقی ہیں اور کون پاک ہوا ہے یہ بات تم کو معلوم نہیں اس لئے دعویٰ بلا تحقیق مت کرو اب کلام میں پورا جوڑ ہے اور علت معلول میں کامل ارتباط ہے (وعلقہ ذکوۃ النفس) لاتزکو انفسکم پر جو قد افلح من زکھا سے تعارض کا شبہ ہو رہا تھا تقریر مذکور سے وہ رفع ہو گیا اور آیت کے اگلے حصے ہوا علم بمن اتقی میں غور کرنے کے بعد یہ شبہ جاتا رہا حسب تقریر سابق علت و معلول میں ارتباط اور کلام میں اتصال سے یہ ثابت ہو گیا کہ تزکیہ کے دو معنی ہیں پاک کرنا اور پاک کہنا ایک آیت میں ایک معنی مراد ہیں اور دوسری میں دوسرے معنی اگر دونوں میں ایک ہی معنی مراد لئے جائیں تو تعارض پیدا ہوتا ہے اب تزکیہ کے دو معنی ہونے کی علت اور اس کی حقیقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زبان فیض ترجمان سے سنئے فرماتے ہیں

"اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تزکیہ باب تفعیل کے مصدر ہے اور تفعیل کی خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح اس کی ایک

خاصیت تعدیہ ہے اسی طرح ایک خاصیت نسبت بھی ہے۔ پس قد افلح من زکھا میں تزکیہ کا استعمال خاصیت تعدیہ کے ساتھ ہوا اس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے نفس کو زائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا اس میں نفس کو زائل سے پاک کرنے کا امر ہے اور لانتز کو انفسکم میں تزکیہ کا استعمال خاصیت نسبت کے ساتھ ہوا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو۔ اس میں نفس کو پاک کہنے کی ممانعت ہے اب ان دونوں میں کچھ بھی تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کا ایک جگہ امر ہے دوسری جگہ اس کی ممانعت نہیں بلکہ ایک نئی چیز کی ممانعت ہے حکم تو نفس کے پاک کرنے کا ہے اور ممانعت پاک کہنے سے ہے (زکوٰۃ النفس)

مگر اس حقیقت کو وہی سمجھے گا جو عربیت اور ابواب کی خاصیات سے واقف ہوگا اس لئے فہم قرآن کے لئے لغت اور صرف و نحو وغیرہ جاننے کی ضرورت ہے ایسے علوم کے حاصل کئے بغیر قرآن کا صحیح ترجمہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ جو شخص خاصیت ابواب کو نہ جانتا ہو گا وہ دونوں آیتوں میں ایک ہی معنی سمجھے گا اور شبہات میں پڑے گا اور جو شخص جانتا ہو گا وہ سمجھے گا کہ باب تفعلیل کی خاصیت جس طرح تعدیہ ہے اس کی ایک خاصیت نسبت بھی ہے اور پاک نہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تزکیہ کی طرف منسوب نہ کرو یعنی یہ دعویٰ نہ کرو کہ ہم پاک ہو گئے یعنی گفتن کے دو معنی ہیں ایک تو مطلق کہنا کہ بقصد قبول حق کے دوسرا کمال کا دعویٰ کرنا پس لانتز کو ا میں تزکیہ بمعنی پاک گفتن سے مراد دعویٰ پاکی کر دن ہے (زکوٰۃ النفس)

علم باری کی وسعت

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ کی تفسیر میں حضرت رحمۃ

اللہ علیہ ارقام فرماتے ہیں۔

یہ گردن کی رگیں ورید اور شریان دونوں کو محتمل ہیں مگر شریان مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ان میں روح غالب اور خون مغلوب رہتا ہے اور ورید میں بالعکس یہاں جس کو روح میں زیادہ خل ہو اس کا مراد لینا مناسب ہے اور سورہ حاقہ میں وتین بمعنی رگ دل سے تعبیر کرنا اس کا مونسید ہے کیونکہ جو رگیں قلب سے ثابت ہیں شرا ئین ہیں اور گو قرآن میں لفظ ورید ہے مگر معنی لغوی اس کے عام ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ ہم باعتبار علم کے اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ علم حصولی میں انسان کو اپنی بہت سی حالتوں کا علم نہیں ہوتا اور جن کا علم ہوتا ہے بعض اوقات ان کا نسیان یا ان سے ذہول ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ میں یہ احتمالات گنجائش ہی نہیں رکھتے اور علم حضوری میں گو حضور معلوم کا لازم ہے مگر بوجہ حادث ہونے کے خود وہ وجود معلوم سے متاخر ہے اور حق تعالیٰ کا علم جو اس سے متعلق ہے جو اس کے وجود سے متقدم ہے اور ظاہر ہے کہ جو علم ہر حالت میں ہو اس کا تعلق بہ نسبت اس کے کہ ایک حالت میں ہو زیادہ ہوگا غرض علم باری کا جمیع احوال انسانیہ کے ساتھ متعلق ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ (بیان القرآن)

اور سورہ ق میں جان کو رگ گردن سے تعبیر فرمایا اور یہاں رگ دل سے جس سے ظاہر مراد شرا ئین ہیں جن کا نسبت قلب ہے بات یہ ہے کہ اسی رگ قلب کی شاخیں گردن تک بھی پہنچی ہیں پس دونوں تعبیروں کا حاصل ایک ہی ہے اور اگر

وہ مراد ہوں جن کا نسبت کبد ہے اور وہ دل میں ہو کر بدن میں پھیل گئی ہیں اور اسی لئے اس کو رگ دل کہہ دیا ہو تو اس کی شاخ بھی گردن میں گئی ہے (بیان القرآن)

لفوی تحقیق کے ساتھ دونوں آیتوں میں مطابقت کیسے اچھے اور عمدہ طریقے سے فرمادی گئی ہے علم لغت میں مناسبت اور مہارت کے بغیر ایسی عجیب تحقیق اور حسین تطبیق کا سمجھنا اور لکھنا ممکن ہے۔

قرب حق کی تحقیق

اسی آیت کے سلسلے میں مزید تشریح سنئے حضرت فرماتے ہیں حق تعالیٰ کو بندہ سے جتنی محبت ہے اتنی بندہ کو حق تعالیٰ سے نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور ظاہر ہے کہ جیسی معرفت بندہ کی خدا کو ہے بندہ کو خدا کی نہیں اور یہ معنی ہے آیت **وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ** کے کہ علماء و معرفتہ بندہ سے ہم قریب ہیں۔ **وَنَعْلَمُ مَا تُوسُّوسُ بِهِ نَفْسُهُ** اسی وجہ سے **وَنَحْنُ أَقْرَبُ** فرمایا ہے کہ ہم قریب ہیں۔ **انتم اقرب الینا** نہیں فرمایا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو۔ سوا اگر اس سے قرب حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا چونکہ یہ قرب نسبت متکررہ سے ہے اگر ایک طرف سے قرب ہو گا تو دوسری سے بھی ضرور ہو گا ہاں قرب علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو گا تو دوسری طرف سے بھی ہو تو قرب علمی خدا کی طرف سے تو ہے اس لئے کہ ان کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں چونکہ بندہ ہے غافل پس بندہ تو خدا سے دور ہو اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب (المصلوہ ص ۴۰)

چونکہ قرب حق کا یہ مسئلہ نہایت دقیق اور عمیق تھا اور اس کی کنہ اور حقیقت و کیفیت تک رسائی ناممکن تھی اس لئے قرب علمی مراد لے کر تفسیر کی جاتی ہے اور اسی سے یہ اشکال بھی حل ہو جاتا ہے کہ قرب تو نسبت متکررہ سے ہے جس میں دونوں طرف سے قرب کا تحقق ہونا چاہیے یہاں ایسا نہیں اس کا حل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر مذکور سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ قرب علمی میں یہ بات ضروری نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف سے قرب علمی ہو اور دوسری طرف سے نہ ہو یہ تقریر تو عام فہم اور علمی اصطلاحی تھی جو علماء کرام میں مشہور اور متعارف ہے آگے ایک نہایت عجیب و غریب تحقیق اور بڑی ہی لطیف تقریر سنئے ارشاد ہوتا ہے۔

اب رہا یہ سوال (**أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ**) رگ گردن سے زیادہ قریب کیسے؟ اس کا حقیقی جواب یہ ہے اس مسئلہ کو کوئی حل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بعض نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ یہاں قرب علمی مراد ہے مگر من حبل الوريد کا لفظ بتلا رہا ہے کہ یہاں قرب علمی سے زیادہ کوئی دوسرا قرب بتلانا مقصود ہے کیونکہ حبل الوريد ذی علم نہیں ہے کہ اس سے اقرب ہونا اقربیت فی العلم پر دال ہو کیونکہ یہاں قرب ذات پر دلالت مفہوم ہوتی ہے مگر اس کیفیت کو ہم بیان نہیں کر سکتے چونکہ حق تعالیٰ کیفیت سے منزہ ہیں ان کا قرب بھی کیفیت سے منزہ ہے مگر تقریب فہم کے لئے اتنا بتلائے دیتا ہوں کہ ہم کو جو اپنی ذات سے قرب ہے یہ قرب وجود کی فرع ہے اگر وجود نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہم کو اپنی ذات سے قرب ہوتا اور ظاہر ہے کہ وجود میں حق تعالیٰ واسطہ ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اور اس تعلق کے درمیان میں واسطہ ہیں جو ہم کو اپنی جان کے ساتھ ہے تو ہم کو اول حق تعالیٰ سے تعلق ہے پھر اپنی جان کے ساتھ تعلق ہے اس تقریر کے استحضار سے قرب حق کا

مشاہدہ گو بہت کچھ ہو جائے گا مگر کیفیت اب بھی واضح نہ ہوگی۔ البتہ عقلاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ہماری جان سے بھی زیادہ قرب و تعلق ہے اور یہی مقصود ہے (وعظ عصم ص ۲۰)

اس تقریر پر انیق کی خصوصیت اور اس کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ قرب سے علمی قرب کے علاوہ غیر معلوم الکفیت قرب مراد ہے صفات الہیہ کے کلامی مسائل میں دسترس اور ان میں عبور و مہارت حاصل کئے بغیر اس تقریر کی تہہ تک نہیں پہنچا جا سکتا اور اس کی وقت و غموض تک رسائی نہیں حاصل ہو سکتی۔

رحمة للعالمین کا مطلب

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ اور ہم نے (ایسے مضامین نافعہ دے کر) آپ کو اور کسی ذات کے واسطے (رسول بنا کر) نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں (یعنی مکلفین) پر (اپنی) مہربانی کرنے کے لئے (وہ مہربانی یہی ہے کہ لوگ رسول سے ان مضامین کو قبول کریں اور ہدایت کے ثمرات حاصل کریں اور جو قبول نہ کرے یہ اس کا قصور ہے اس مضمون کی صحت میں کوئی خلل نہیں پڑتا) (بیان القرآن)

اس پر ایک طالب علمانہ اشکال عام طور پر ہوتا ہے اس کی تقریر اور رفع اشکال ذیل میں پڑھے اگرچہ اس تفسیر پر جو اوپر کی گئی ہے کوئی اشکال متوجہ نہیں ہوتا یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ جب رحمة للعالمین ہیں تو ابو جہل پر بھی کچھ رحمت ہونا چاہیے کیونکہ عالمین میں وہ بھی داخل ہے یہ تو ہوا اشکال اب اس کا جواب سنئے حضرت رحمة اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں رحمت سے مراد رحمت تبلیغ و ارسال ہے نجات و آخرت کے اعتبار سے رحمت مراد نہیں دلیل یہ ہے کہ اِلَّا رَحْمَةً اس جگہ ارسال کی غایت ہے یہ اس کا قرینہ ہے کہ یہاں رحمت سے وہی مراد ہے جو ارسال پر مرتب ہوتی ہے نیز اس سے پہلے ارشاد ہے اِنَّ فِيْ هٰذَا الْبَلٰغِ الْقَوْمِ عٰلَمِيْنَ یہ بھی اس کا قرینہ ہے کہ یہاں تبلیغ کی برکات کا ذکر ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ہم نے جو آپ کو نبی بنا کر بھیجا ہے اس سے اہل عالم پر مہربانی کرنا منظور ہے کہ آپ کے ذریعے سے لوگوں کی طرف وحی پہنچائیں اور ظاہر ہے کہ یہ رحمت تمام عالم کو ہے کوئی فرد بشر اس سے محروم نہیں رہا چاہے کوئی ہدایت قبول کرے نہ کرے۔ (المورد والقرنئی)

حضرت رحمة اللہ علیہ نے بیان القرآن میں تفسیر ہی ایسے طریقے سے کر دی ہے جس پر کوئی اشکال وارد ہی نہیں ہوتا جس کے جواب کی ضرورت ہو اور عام طور پر جو اشکال الفاظ کے اطلاق کی وجہ سے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے اس کا حل حضرت رحمة اللہ علیہ کی اس واضح تقریر و بیان سے ہو جاتا ہے

ملحقات الترجمة عربی میں حضرت رحمة اللہ علیہ نے اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا حاصل مطلب اس طرح ہے کہ ترجمے میں (اور کسی بات کے واسطے) بڑھا کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ رحمت علت اور مفعول لہ ہے اور تمام علتوں میں سے ایک علت رحمت مستثنیٰ ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کے رسول بنا کر بھیجنے کے سوائے رحمت کے اور کوئی وجہ نہیں اور مہربانی سے پہلے (اپنی) کا لفظ بڑھا کر اشارہ اس طرح ہے کہ رحمت مصدر کا فاعل اللہ ہے (بیان القرآن)

ظاہر ہے اس تقریر کو علم نحو میں مناسبت کے بغیر اچھی طرح ذہن نشین نہیں کیا جاسکتا یہ مسئلہ علم نحو کا ہے کہ مفعول لہ کا فاعل وہی ہوتا ہے جو اس کے فعل عامل کا فاعل ہوتا ہے اور وما ارسلناک میں ارسال فعل عامل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہیں اس لئے مفعول لہ کا فاعل بھی اللہ ہے اس نحوی قاعدہ کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مفعول لہ کے ترجمے سے پہلے اپنی کالفظ بڑھا کر ظاہر کر دیا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر میں علم معانی کی رعایت

آیت ذیل کی تفسیر میں علم بیان و معانی اور قواعد عربیت کی رعایت جس عجیب انداز سے کی گئی ہے وہ اہل علم کی توجہ کی طالب ہے فرماتے ہیں وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ اَنْ يَعْبُدُوهَا وَاَنْ يَكُوْلُوا اِلَى اللّٰهِ لَهْمُ الْبَشَرِی جو لوگ شیطان سے بچتے ہیں یعنی اس کی عبادت سے بچتے ہیں اس ترجمے ہی سے معلوم ہو گیا کہ ان یعبدوها الطاغوت سے بدل ہے اور طاغوت سے مراد شیطان ہے جو ہر شیطان کو شامل ہے۔ وَاَنْ يَكُوْلُوا اِلَى اللّٰهِ یہ تقابلی بدیع ہے یعنی وہ لوگ شیطان کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور اسی کو مقصود و معبود سمجھتے ہیں اس کے بعد مبتداء کی خبر ہے۔ لَهْمُ الْبَشَرِی کی جن کی یہ شان ہے بشارت سنانے کے مستحق ہیں جیسا کہ مفہوم ہے لام کا اس کے بعد ہے فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ کہ اچھا پھر ان کو بشارت سنا ہی دیجئے۔ سبحان اللہ قرآن بھی کس قدر بلیغ ہے کہ اول تو اس کا مستحق بشارت ہونا بیان فرمایا پھر بشارت فرمانے کا حکم دیا کہ ان کو بشارت سنا ہی دیجئے اس طرز تشویق کا جس درجے مخاطب پر اثر ہوتا ہے اہل ذوق پر مخفی نہیں۔

اب یہ سمجھئے کہ یہاں عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے کہ وہ شیطان سے بچتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں کیونکہ عربیت کا قاعدہ ہے اذا عیدت المعرفة كانت الثانية عين الاولى کہ جب معرفہ کو دوبارہ معرفہ ہی بنا کر اعادہ کیا جائے تو ثانی سے مراد وہی ہوگا جو اولی سے مراد ہے مگر اعادہ معرفہ کی بھی ظاہر صورت یہ تھی کہ یہاں ضمیر لائی جاتی اسم اشارہ یعنی فبشر ہم یا فبشر هؤلاء فرمایا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ضمیر کو چھوڑ کر وضع الظاہر موضع المضمّر اختیار کیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس عنوان سے تحصیل کمالات کا طریقہ بتلایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ تحصیل کمالات میں ترتیب ہے حاصل اس ترتیب کا یہ ہے کہ تم کو اول استماع القول لازم ہے جس کا حاصل طلب علم ہے اس کے بعد اس کا اتباع لازم ہے اس کا حاصل عمل ہے خلاصہ یہ ہوا کہ تحصیل کمال کا طریقہ علم و عمل ہے (وعظ الاستماع والاتباع)

اس آیت مبارکہ کی کیا ہی عجیب و غریب اور مربوط و مرتبط تفسیر فرمائی گئی ہے جس سے پوری آیت کا مفہوم بڑا ہی وجد آفرین ہو جاتا ہے اور علم معانی و بیان اور دوسرے قواعد عربیت کی ضرورت کس درجہ واضح ہو جاتی ہے وہ اہل علم کے غور کرنے کی چیز ہے اب رہا یہ کہ القول سے مراد آیت مبارکہ میں کونسا قول ہے اور اس کی کیا دلیل ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

اب سمجھئے کہ یہاں يستمعون القول قول سے مراد کلام اللہ ہے دو وجہ سے ایک یہ کہ اس میں لام عہد کا ہے اور یہاں معبود کلام اللہ ہی ہے دوسرے قاعدہ عربیت کا ہے المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل کہ مطلق سے مراد فرد

کامل ہوتا ہے پس یہاں بھی مطلق قول سے مراد قول کامل ہونا چاہیے اور قول کامل قرآن ہی ہے۔ یہ عقلی دلیل تھی القول سے قرآن کی مراد ہونے کی اور اس آیت کے چند آیات بعد ہی نقلی دلیل بھی مذکور ہے کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ تبارک و تعالیٰ نزل احسن الحدیث کتباً متشابہاً مثلاً فی اس میں قرآن کو احسن الحدیث کہا گیا ہے اور یہاں احسنہ فرمایا جس کا مرجع قول ہے تو حاصل احسن القول ہو اور احسن الحدیث و احسن القول کے ایک ہی معنی ہیں اور اس سے یعنی قرآن کو احسن الحدیث کہنے سے یہ معلوم ہو گیا کہ فیکتبون احسنہ میں احسن کی اضافت تغایر کے لئے نہیں بلکہ بیانیہ ہے یہاں تک یہ بات ثابت ہو گئی کہ طریقہ تحصیل کمال کا یہ ہے کہ اول علم قرآن حاصل کیا جائے پھر اس پر عمل کیا جائے اور علم قرآن کو استماع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے شبہ نہ کیا جائے کہ صرف الفاظ کا سننا مراد ہے معنی کا جاننا مطلوب نہیں کیونکہ آگے فیکتبون احسنہ بھی ہے اور اتباع الفاظ مجرورہ کا نہیں ہو سکتا بلکہ اتباع بعد علم معانی کے احکام کا ہو گا اس قرینہ سے معلوم ہوا کہ مراد تو علم معانی ہیں مگر اس کو استماع سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ معانی کا سمجھنا اس پر موقوف ہے کہ اول الفاظ کو غور سے سنا جائے جو شخص تحصیل علم کے وقت معلم کی تقریر کو توجہ سے نہیں سنتا وہ مراد بھی نہیں سمجھ سکتا (الاستماع)

مسائل سائنس

مسائل سائنس کے بارہ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق درج ذیل کی جاتی ہے جس سے معلوم ہو گا کہ یہ مسائل قرآن کریم کے موضوع لہ نہیں ہیں اس لئے ان مسائل پر تفسیر قرآن کی بنیاد رکھنا درست نہیں۔ ویسے بھی یہ مسائل یقینی نہیں ہیں۔ محض ظن و تخمین کے درجہ کی چیزیں ہیں جو آئے دن تجربات کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہیں اس وجہ سے بھی قرآن کریم کی تفسیر مسائل سائنس پر مبنی نہیں کرنی چاہیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں

آج کل لوگوں نے قرآن کے مابین لہ کو بالکل نہیں سمجھا قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن کا موضوع نہیں ہے پھر جب کوئی فلسفہ کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے تو اس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھونس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے قرآن نے تیرہ سو برس پہلے ہی اس کی خبر دی ہے اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے۔ قرآن کریم ایک قانون کی کتاب ہے سائنس وغیرہ کا ذکر اگر اس میں آئے گا تو مقصود کے تابع ہو کر آئے گا۔ چنانچہ سائنس کے متعلق جو گفتگو ہو گی محض اس قدر کہ یہ سب مصنوعات ہیں اور ہر مصنوع کے لئے ایک صانع کی ضرورت ہے لہذا ان کے لئے بھی کسی صانع کی ضرورت ہے مگر اس استدلال کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس چیز کی حقیقت بھی دریافت ہو جائے بلکہ مجہلاً ان کا علم ہونا کافی ہے۔

قرآن کریم نے توحید کا دعویٰ کیا اس کی دلیل میں إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْآيَاتِ فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں بھی توحید کے دلائل ہیں تو اس کائنات میں چند حیثیتیں ہیں اول ان کا دلیل توحید ہونا دوسرے ان کے پیدا ہونے کے طریق اور تیسرے ان کے تغیرات کے ڈھنگ قرآن کریم کو صرف پہلی حیثیت سے ان سے تعلق ہے اس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارش کیونکر ہوتی ہے اور اس قسم کے حالات تو

قرآن سے ان کا تلاش کرنا غلطی ہے (ضرورت العلم)

کائنات سے وجود صانع پر بیان القرآن میں اس طرح عقلی استدلال فرمایا گیا ہے۔

اس استدلال عقلی کا مختصر طریقہ یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں بعض تو بدہمت بہ سبب مشاہدہ وجود بعد العدم یا تغیر و تبدل احوال کے اور بعض بدلیل ترکیب من الاجزا یا افتقار بعض الی البعض کے اور ممکن بوجہ تساوی الوجود والعدم ہونے کے محتاج ہوتا ہے کسی مرئح کا وہ مرئح اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا تو قطع تسلسل محال کے لئے انتہا واجب ہے کسی واجب الوجود کی طرف یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی۔

تقریر تو حید صانع

آگے رہا اس کا واحد ہونا سوا اس کی تقریر یہ ہے اگر نعوذ باللہ متعدد مثلاً دو فرض کئے جاویں تو ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر ہونا ضروری ہے شق اول محال ہے کیونکہ بجز منافی ہے وجوب وجود کے اور شق ثانی پر اگر ان میں سے ایک نے کسی امر کا مثلاً ایجاد یا ارادہ کیا تو دوسرا اس کے خلاف ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کر سکتا تو اس کا بجز لازم آوے گا جو منافی وجوب وجود کے ہے اور اگر ارادہ کر سکتا ہے تو اس پر ترتیب مراد کا ضروری ہے یا نہیں اگر ضروری نہیں تو مختلف مراد کا ارادہ قادر مطلق سے لازم آوے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آوے گا کیونکہ ایک واجب کے ارادے پر ایک مراد مرتب ہو اور دوسرے واجب کے ارادے پر دوسرا اس مراد اول کی ضد مرتب ہو تو اجتماع ضدین لازم آیا اور وہ محال اور مستلزم محال کو محال ہے تو تعدد واجب کا محال ہے پس وحدت واجب ہے اور یہی مطلوب تھا خوب سمجھ لو۔ (بیان القرآن)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر دلائل تو حید میں سائنس کے مسائل مذکور ہوتے تو تو حید کو سمجھنا ان کے علم پر موقوف ہوتا اور مسائل سائنس خود نظری ہیں تو تو حید بدوں ان کے سمجھے ہوئے ثابت نہ ہوتی اور مخاطب ان دلائل کے عرب کے بادیہ نشین تک ہیں تو وہ تو حید کو کیسے جانتے یہ نقصان ہوتا سائنس کے مسائل کو قرآن میں داخل کرنے کا کہ اصل مقصود ختم ہو جاتا۔

ایک مثال

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ سموات اور ارض (مذکور) ہیں لیکن سموات بصیغہ جمع اور ارض بصیغہ واحد لایا گیا تاکہ مقدمات میں شغب نہ ہونے لگے پھر مستقل دلیل سے بتلایا کہ زمین بھی سات ہیں چنانچہ بعض کو اس پر بھی اعتراض ہے کہ ہم تو سب جگہ پھرے ہم کو کوئی دوسری زمین نہیں ملی اور ارض کا ترجمہ حدیث تعدد ارض میں اقلیم کا کیا ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب قرآن شریف میں بعد سبع سموات کے من الارض مثلہن فرمایا ہے تو اقلیم ترجمہ کرنے کی گنجائش کہاں ہے اور حدیث میں صاف آ گیا ہے کہ آسمان سات ہیں اور ہر دو آسمانوں کے

درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے۔ پانچ سو برس سے مراد کثرت ہے اس کے بعد زمین کے متعلق بھی فرمایا اب اقلیم کی تاویل کیسے چل سکتی ہے۔

باوجود کہ یہ ثابت تھی مگر پھر بھی قرآن نے ارضیں نہیں فرمایا بلکہ ارض بصیغہ واحد ارشاد فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ مقصود صرف یہ ہے کہ ان مصنوعات سے توحید پر استدلال کیا جائے اور استدلال مقدمات مسلمہ سے ہوا کرتا ہے تو اگر ارضیں فرماتے تو اصل مقصود تو ثابت نہ ہو سکتا اور مسئلہ گفتگو کے قابل ہو جاتا اور اب یہ ہوا کہ جو واقف ہیں وہ لفظ ارض ہی سے جو کہ اسم جنس ہے قلیل کثیر سب کو شامل سمجھ لیتے ہیں اور جو لوگ واقف نہیں وہ بھی بوجہ ایک ارض کے محسوس ہونے کے نفس استدلال کو بخوبی سمجھ گئے تو معلوم ہوا کہ قرآن میں کسی ایسے مسئلے سے کام نہیں لیا گیا جس سے سامع کو الجھن ہو اگر سائنس کے مسئلے اس میں ہوتے تو سامعین ان کی تحقیق میں پڑ جاتے اور ہر شخص کو اس کے آلات و ذرائع کی تحصیل ممکن نہ تھی تو ہر شخص ایک الجھن میں پڑ جاتا نیز ان میں اختلاف اس قدر ہے کہ آج تک بھی کوئی بات محقق نہیں ہوئی۔

خاتمہ

دل چاہا کہ اس ”مقالہ اشرف“ کو حضرت حکیم الامت کی بیان کردہ اس لطیف مناسبت اور عجیب و غریب ارتباط کے بیان پر ختم کیا جائے جس کو حضرت نے قرآن مجید کے آغاز سورہ فاتحہ اور انجام سورہ الناس کے مضامین میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت حکیم الامت تفسیر بیان القرآن کے خاتمہ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

اور ایک عجیب لطیفہ اس سورت میں جس سے قرآن کا حسن آغاز و انجام بھی ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ اس کے اور فاتحہ کے مضامین میں غایت درجے کا تقارب کہ حکم اتحاد میں ہے محقق ہے چنانچہ رَبِّ النَّاسِ کے مناسب رَبِّ الْعَالَمِينَ اور مَلِكِ النَّاسِ کے مناسب يَوْمَ الدِّينِ اور اِلٰہِ النَّاسِ کے مناسب اِنَّا لَنَعْبُدُ اور استعاذہ کے مناسب اِنَّا لَنَسْتَعِينُ امر الوَسْوَسِ اِنَّ النَّاسَ لَخَنَاسِ الخ کے مناسب اِهْدِنَا الخ ہے۔ (بیان القرآن)

اللهم اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم و اعدنا من شر الوسواس الخناس الذي يوسوس في صدور الناس من الجنة والناس و صلى الله تعالى على خير خلقه محمد و على اله و اصحابه اجمعين الى يوم الدين سبحان ربك رب العزة عما يصفون و سلام على المرسلين و الحمد لله رب العالمين.

سید عبدالشکور ترمذی عنہ

مدرسہ عربیہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا

26 رجب المرجب 1404ھ

29 اپریل 1984ء

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ يَوْمَ الدِّينِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ

وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مہربانی ہیں ہر ہر عالم کے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں جو مالک ہیں روز جزا کے ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کرتے ہیں بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کرتے ہیں۔

استعانت کا مفہوم

سوال کیا گیا کہ اِيَّاكَ نَسْتَعِينُ سے حصر استعانت معلوم ہوا ہے حالانکہ کام کاج میں لوگوں سے استعانت کی جاتی ہے ارشاد فرمایا مراد یہ ہے کہ بالاستقلال کسی کو معین سمجھ کر سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگنا چاہئے۔ باقی جو چیزیں لوگوں کے اختیار میں ہیں ان میں ان سے مدد لینا جائز ہے کیونکہ وہاں ان کا غیر مستقل ہونا ظاہر ہے سب جانتے ہیں کہ ابھی خدا معذور یا بے کار کر دے تو وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اسی طرح صوفیہ فیوض باطنی میں مشائخ احیاء و اموات سے مستفیض ہوتے ہیں اور یہ کشف اور تجربہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ نفع ہوتا ہے اس لئے اس نفع کا ظنا اعتقاد رکھنا جائز ہے لیکن اس میں مستقل سمجھ کر استعانت کرنا جیسا کہ عوام کا اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ مستقل حاجت روا سمجھتے ہیں بالکل ناجائز ہے۔ (اشرف القالات)

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِنَّا لَنَشَاءُ هِ

فرمایا یہ ان شاء ہے خبر نہیں واعظ اس میں غلطی کیا کرتے ہیں (خیر الافادات ص ۷۹)
عَبْرَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ خداستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوئے۔

ضَالِّينَ کا مفہوم

عرض کیا گیا کہ عَبْرَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ سے مراد مغضوب فی الدنیا ہے مغضوب فی الاخرہ فرمایا کہ دونوں ہو سکتے ہیں کیونکہ مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ یہود پر اطلاق فرمایا گیا ہے جن پر دنیا میں بھی غضب کیا گیا مثل مسخ وغیرہ عرض کیا گیا کہ پھر ضَالِّينَ میں قرینہ مقابلہ غضب فی الاخرہ کی نفی ہوتی ہے فرمایا کہ جی نہیں کلام مجید میں صفت غالبہ کے اعتبار سے عنوانات اختیار کئے گئے ہیں۔ مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ یہود کے لئے فرمایا گیا ان میں صفت مغضوبیت غالب تھی کیونکہ باوجود علم کے محض شرارت و عناد کی رو سے مخالفت کرتے تھے۔ ایسے لوگ زیادہ مورد غضب ہوتے ہیں اور ضَالِّينَ سے مراد نصاریٰ ہیں ان میں صفت ضلال غالب تھی کیونکہ عیش پرستی کی وجہ سے دین سے غافل اور بے پرواہ تھے لہذا ضَالِّينَ میں ان کی صفت ضلال کا اظہار فرمایا گیا ہے گو مغضوب فی الاخرہ وہ بھی ہونگے دوبارہ استفسار پر فرمایا کہ قرینہ ضَالِّينَ سے تو مغضوب علیہم میں غضب فی الدنیا مراد معلوم ہوتا ہے کیونکہ ضَالِّينَ کا ضلال بالمعنی الہد کر دینا میں واقع ہوتا تھا۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الَّذِي هَدَىٰ لِلْمُتَّقِينَ ۗ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا

رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۗ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۗ

ترجمہ: یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو، وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں

تفسیری نکات

قرآن میں شک نہ ہوئے کا مفہوم

حالانکہ اسی سورت کے تیسرے رکوع میں ہے **وَلَا تَكُن مِّنَ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَعًا** (اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے اپنے بندے پر نازل فرمائی) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو قرآن میں شک بھی تھا مگر قرآن باوجود اس کے لاریب فیہ بے دھڑک کہہ رہا ہے کیونکہ ان لوگوں کے شک کی مثال ایسی ہے جیسے براقان والا کہتا ہے یہ کپڑا زرد ہے اور تندرست آدمی اس کے جواب میں کہتا ہے کہ اس میں زردی نہیں تو وہ صحیح کہتا ہے کیونکہ وہ زردی تو اس کی آنکھوں میں ہے (السییر للتعیر ص ۱۳)

حروف مقطعات

چنانچہ اس فائدہ کی نسبت ارشاد ہے کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ الف لام

میم کو ایک حرف نہیں کہتا بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے میم ایک حرف ہے سو صرف الم کہنے سے تیس نیکیاں ملتی ہیں اور بقول بعض کے نوے نیکیاں ملتی ہیں۔ اس طرح کہ الم میں جو الف ہے اس کو تعبیر کرنے میں جو تین حرف ہوتے ہیں (ا۔ل۔ف) ہر ایک کے عوض میں دس نیکیاں ملتی ہیں۔ دس الف پر اور دس لام پر اور دس فاء پر سب تیس ہوئیں اس طرح لام کی تعبیر میں تین حرف (ل۔ا۔م) ہوئے جس کی تیس نیکیاں ہوئیں اسی طرح سے میم کی تعبیر میں تین حرف (یعنی م۔ی۔م) پر تیس نیکیاں ملیں سب کا مجموعہ نعرے ہو گیا۔

قرآن پاک میں کوئی بات موجب خلجان نہیں

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ تَرجمہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں اس جملہ میں قرآن کی مدح ہے کہ یہ کتاب کامل ہے اس میں کوئی بات موجب خلجان نہیں رہا یہ شبہ کہ کفار تو اس میں بہت شبہات نکالتے ہیں اس کا جواب ایک تو مشہور ہے کہ قرآن میں کوئی بات فی نفسہ موجب خلجان نہیں ہے اور شبہ نکالنے والوں کو جو شبہات پیش آتے ہیں ان کا منشا قرآن کے مضامین نہیں بلکہ ان کا قصور فہم ہے اور اگر کسی اندھے کو دن میں طلوع آفتاب میں شک ہو تو اس کے شک سے طلوع آفتاب مشکوک نہیں ہو جاتا اور دوسرے جواب میں هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ میں اشارہ ہے۔ حاصل اس جواب کا یہ ہے کہ اگر کسی کو قرآن میں کوئی شک و شبہ پیش آتا ہے تو وہ شبہ اسی وقت تک ہے جب تک قرآن کی تعلیم پر عمل نہ کیا جائے اور اگر قرآن کی تعلیم پر پوری طرح عمل کیا جائے تو سب شبہات خود بخود زائل ہو جاتے ہیں کیونکہ قرآن متقین کے لئے ہدایت ہے پس اہل شبہات کو چاہیے کہ وہ تعلیم قرآن پر عمل کرنا شروع کریں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب عمل کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت میں قرآن سر تا پا ہدایت ہی ہدایت ہے اس میں کوئی امر موجب خلجان نہیں۔

درجات ہدایت

اب سمجھئے کہ ان آیات میں زیادت فی الہدی کی مطلوبیت کا ذکر ہے حق تعالیٰ قرآن کی صفت میں فرماتے ہیں هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ اس پر اشکال مشہور ہے کہ متقین تو خود ہی ہدایت یافتہ ہیں ان کے لئے ہدایت ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے دو جواب ہیں ایک تو یہ کہ متقین میں تاویل کرو کہ اس سے مراد متقی بالفعل نہیں بلکہ صائرین الی التقویٰ مراد ہیں جن کو باعتبار مایوں کے متقی کہہ دیا گیا مگر حقیقت ممکن ہوتے ہوئے مجاز لینا خلاف اصل ہے اس لئے راجح توجیہ یہ ہے کہ لفظ متقین اپنے معنی پر ہے اور ہدی میں درجات نکالے جائیں کہ ہدایت کے لئے مدارج مختلف ہیں جن میں سے بعض مدارج کا حصول ان لوگوں کو بھی نہیں ہے جو بالفعل متقی ہیں۔ قرآن ان مدارج کی طرف متقیوں کو پہنچاتا ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہدایت کے مدارج بہت ہیں۔

رہا یہ کہ زیادت فی الہدی مطلوب ہے۔ اس کی دلیل سورہ فاتحہ کی آیت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ہے جس میں طلب ہدایت کا امر ہے۔ سورہ بقرہ کو سورہ فاتحہ سے ربط بھی ہے کہ اس میں دعائے ہدایت بھی ہے اس میں اجابت دعا ہے

کہ لو یہ کتاب ہدایت ہے اس پر چلو اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ پر بھی یہی اشکال عود کرتا ہے کہ وہ لوگ تو پہلے ہی سے ہدایت یافتہ ہیں جن کو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے اس کا بھی یہی جواب ہے کہ مراد زیادت فی الہدی کی طلب ہے اب هٰذِي الْمُسْتَقِيمَ پر کوئی اشکال نہ رہا کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اور کتابیں تو ان پڑھوں کو پڑھائی جاتی ہیں اور یہ کتاب پڑھے ہوؤں کو پڑھانے والی ہے۔ یہ ہدایت یافتوں کے لئے ہدایت ہے اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ہدایت اور علم متقارب ہیں اور یہاں سے زیادت فی الہدی کا مطلوب ہونا ثابت ہے تو زیادت فی العلم کا مطلوب ہونا بھی ثابت ہو گیا۔

قرآن غیر متقیوں کے لئے بھی ہے

هٰذِي الْمُسْتَقِيمَ (البقرہ آیت ۴) راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو هٰذِي الْمُسْتَقِيمَ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض متقیوں کے لئے ہے اور غیر متقی کے لئے نہیں اس آیت سے اکثر لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے نیز دوسری آیات میں بھی غلط سمجھ لیتے ہیں اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قرآن کو فلسفی نظر سے دیکھا جاتا ہے چنانچہ ایک سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے اس کے متعلق دریافت کیا میں نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہیں یہ محاورہ ہے مطلب یہ ہے کہ اب جو لوگ متقی نظر آتے ہیں یہ اسی کی بدولت متقی بنے ہیں اس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ اب بالکل صاف ہو گیا۔ تو اس میں کوئی توجیہ یا تاویل نہیں ہے۔ صرف بات یہ ہے کہ لوگ محاورات سے قطع نظر کر کے فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی واسطے ضروری ہے کہ قرآن کو تمام علوم فلسفہ سے پہلے کسی محقق عالم سے پڑھ لیں۔ باقی نرے ترجمے کا خود مطالعہ کرنے سے قرآن حل نہیں ہوتا۔

کورس تقوی

ایک مقام پر حافظ محمد احمد صاحب مرحوم (مہتمم دارالعلوم دیوبند) سے نیچری سوال کر رہے تھے کہ هٰذِي الْمُسْتَقِيمَ کا کیا مطلب ہے حافظ صاحب مرحوم جواب دیتے تھے انکی سیری نہ ہوتی تھی آخر میں کہا اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم کہا کرتے ہو یہ کورس بی اے کا ہے یعنی اس کے پڑھنے سے بی اے ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ کورس تقویٰ کا ہے یعنی اس کی ہدایت اختیار کرنے سے متقی بن جاتا ہے۔

متقین کا معنی

فرمایا کہ ایک بار مولانا صاحب سے کسی نے سوال کیا کہ قرآن کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے هٰذِي الْمُسْتَقِيمَ سو متقین تو پہلے ہی سے ہدایت پر ہیں تو یہ تحصیل حاصل ہوا۔ اس کے جواب مختلف حضرات نے مختلف دیئے ہیں چنانچہ ایک جواب صاحب جلالین نے دیا ہے کہ مراد متقین سے صائون الی التقوی ہیں مگر مولانا محمد قاسم نے ایک دوسرا جواب دیا کہ یہاں تقوی سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی ہیں یعنی خوف اور کھٹک تو آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے قلب میں کھٹک ہے اور فکر ہے اور قصد ہے اپنی اصلاح کا ان کو قرآن ہدایت کرتا ہے باقی جو شخص اپنی اصلاح کا قصد ہی نہ کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے قرآن کا اس میں کیا نقص ہے تو مولانا محمد قاسم صاحب کا جب یہ جواب میں نے سنا تو فوراً اس جواب کی

ایک تائید قرآن سے میری سمجھ میں آئی۔ وہ یہ کہ سورہ والیل میں ارشاد ہے فَأَتَا مَنْ أَعْطَى وَالتَّقَى وَصَدَّقَى بِالْحُسْنَى اس کے بعد ارشاد ہے وَأَتَا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَعْتَبَى ۖ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى یہاں صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اعطاء کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں اس کے مقابل میں لفظ بخل کا استعمال کیا گیا ہے اور اعطاء اور بخل میں تقابل ظاہر ہے اس طرح پہلی آیت میں کذب ہے تو دوسری میں صدق اور صدق اور کذب میں بھی تقابل موجود ہے۔ پس اس طرح پہلی آیت میں استعطف ہے تو دوسری میں اس میں مقابل کوئی مفہوم ہونا چاہیے اور وہ اتقی ہے پس اس تقابل کی وجہ سے یہاں تقوی کے وہ معنی مراد ہونگے جو استغنا کے مقابل ہوں۔ پس استغنا کے معنی ہیں بے فکری کے تو یہاں تقوی کے وہ معنی ہوں گے فکر اور کھٹک ورنہ فصاحت کے خلاف ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ متقین کے وہ معنی جو مولانا محمد قاسم صاحب نے بیان فرمائے وہ قرآن سے ثابت ہیں اب میں ان لوگوں سے جو محض ترجمہ کے مطالعہ سے قرآن کو حل کرنا چاہتے ہیں دریافت کرتا ہوں کہ کیا وہ اس اشکال کا جواب محض ترجمہ سے حل کر سکتے تھے (الافاضات الیومیۃ ج ۱)

آیت کی تفسیر پر شبہ اور اس کا جواب

چند نو تعلیم یافتہ حضرات نے سوال کیا کہ حضرت آیت هٰذِي الْمَتَّقِينَ کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ قرآن ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے حالانکہ متقی لوگ تو خود ہی ہدایت پر ہیں ان کو تو ضرورت نہیں غیر متقی جن کو ضرورت ہے ان کے لئے یہ ہدایت نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں اس سے یہ مفہوم سمجھ میں آ جائے گا کہ کسی جگہ چند انگریزی کی کتابیں رکھی ہوں جو بی اے کورس میں داخل ہیں ان کو یہ کہنا کہ یہ بی اے کورس ہے صحیح ہے یا نہیں سب نے کہا کہ بالکل صحیح ہے حضرت نے فرمایا کہ جو شخص بی اے کر چکا ہے اس کو تو اس کورس کی ضرورت نہیں اور جس نے نہیں کیا وہ بی اے نہیں جو جواب آپ یہاں دیتے ہیں وہ ہی ہدی للمتقین کا جواب ہے سب کے سب مطمئن ہو کر خاموش ہو گئے۔ مطلب واضح ہو گیا کہ یہ کتاب متقی بنانے والی ہے (مجالس حکیم الامت)

درجات تقوی میں ترقی

یہاں ایک سوال ہے وہ یہ ہے کہ اس تقریر کی بنا پر ہدی للمتقین سے معلوم ہوتا ہے کہ تقوی سبب ہے ہدی مفسر بزیادت فی العلم کا اور آیت والذین اهتموا من ہدی واتهم تقوہم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدی سبب ہے ہدی کے درجہ علیا اور تقوی کا جو کہ موہبت ہے تو حاصل مجموعہ نصین کا یہ ہوا کہ بندہ اول نفس تقوی جب بکسب اختیار کرتا ہے اس پر ہدی مرتب ہوتا ہے پھر اس ہدی پر ثابت رہنے سے خود اس میں بھی ترقی ہوتی ہے اور تقوی کا درجہ علیا موہبت بھی اس سے عطا ہوتا ہے اور قرینہ اس ارادہ موہبت کا لفظ اتاہم ہے اور قرینہ اس کے علیا ہونے پر اضافت ہے تقوی کے ضمیر مہتدین کی طرف جو اس کے کمال پر دل ہے جیسے وسعی لها سعیها ای السعی المناسب لها۔ اسی طرح یہاں مراد

ہے ای التقوی المناسب لشانہم و ہم کاملون و التقوی المناسب للکاملین هو الکامل منه۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ پر اشکال کا جواب

(ملفوظ) کسی سلسلہ کلام میں یہ فرمایا کہ ہدی للمتقین پر ایک اشکال کیا جاتا ہے کہ جو متقی ہوگا اس کے لئے ہدایت کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سے متقی ہے۔ اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں لیکن میرے نزدیک یہاں تقویٰ کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی دل میں کھٹک پیدا ہونا اور یہ امر محقق ہے کہ اول دل میں کھٹک ہی پیدا ہوتی ہے پھر ہدایت ہوتی ہے اور میری سمجھ میں قرآن سے اتقاء بمعنی کھٹک کی ایک تائید آئی ہے۔ سورہ واللیل میں فاما من اعطی و اتقی و صدق بالحسنیٰ فسینسرہ للیسری و اما من بخل و استغنیٰ و کذب بالحسنیٰ فسینسرہ للعیسیٰ۔ یہاں سب متعاطفات میں تقابل ہوگا اور استغنیٰ کے معنی ہیں بیفکری تو اتقی کے معنی ہوں گے فکر اور یہی حاصل ہے کھٹک اور خوف کا جو لغوی معنی ہیں تقویٰ کے اور وہ ہمیشہ مقدم ہوتا ہے ہدایت پر پس کوئی اشکالی نہیں رہا۔

۲۶ رمضان المبارک ۱۶۳۰ھ مجلس شام

(ملفوظ) فرمایا ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب سے کسی نے سوال کیا کہ قرآن کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ سو متقین تو پہلے ہی سے ہدایت پر ہیں تو یہ تحصیل حاصل ہو اس کے جواب مختلف حضرات نے مختلف دیئے ہیں چنانچہ ایک جواب صاحب جلالین نے دیا ہے کہ مراد متقین سے صائرین الی التقویٰ ہیں مگر مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک دوسرا جواب دیا کہ یہاں تقویٰ سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنی ہیں یعنی خوف اور کھٹک تو آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے قلب میں کھٹک ہے اور فکر ہے اور قصد ہے اپنی اصلاح کا ان کو قرآن ہدایت کرتا ہے باقی جو شخص اپنی اصلاح کا قصد ہی نہ کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے قرآن کا اس میں کیا نقص ہے تو مولانا محمد قاسم صاحب کا جب یہ جواب میں نے سنا تو فوراً اس جواب کی ایک تائید قرآن سے میری سمجھ میں آئی۔ وہ یہ کہ سورہ واللیل میں ارشاد ہے فاما من اعطی و اتقی و صدق بالحسنیٰ اسکے بعد ارشاد ہے و اما من بخل و استغنیٰ و کذب بالحسنیٰ۔ یہاں صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا چنانچہ پہلی آیت میں اعطاء کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں اس کے مقابل میں لفظ بخل کا استعمال کیا گیا ہے اور اعطاء اور بخل میں تقابل ظاہر ہے۔ اس طرح پہلی آیت میں کذب ہے تو دوسری میں صدق اور صدق اور کذب میں بھی تقابل موجود ہے۔ بس اس طرح پہلی آیت میں استغنیٰ ہے تو دوسری میں اس کے مقابل کوئی مفہوم ہونا چاہیے اور وارڈ اتقی ہے پس اس تقابل کی وجہ سے یہاں تقویٰ کے وہ معنی مراد ہونگے جو استغناء کے مقابل ہوں۔ پس استغناء کے معنی ہیں بے فکری کے تو یہاں تقویٰ کے وہ معنی ہوں گے فکر اور کھٹک ورنہ فصاحت کے خلاف ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ متقین کے وہ معنی جو مولانا محمد قاسم صاحب نے بیان فرمائے وہ قرآن سے ثابت ہیں اب میں ان لوگوں سے جو محض ترجمہ کے مطالعہ سے قرآن کو حل کرنا چاہتے ہیں دریافت کرتا ہوں کہ کیا وہ اس اشکال کا جواب محض ترجمہ سے حل کر سکتے تھے۔

رذق باطن کے انفاق پر آیت قرآنی سے استدلال

فرمایا کہ صوفیہ نے **وَمَا كُنْزُهُمْ يَبْفِقُونَ** میں فیض باطنی پہنچانا بھی مراد لیا ہے سوا کہ یہ محض بطور علم اعتبار کے ہوتا ہے تو کچھ شبہ کی گنجائش نہ تھی لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ اگر اس کو تفسیر مان لیا جائے تو اچھا ہے کیونکہ کسی لغت یا قواعد تفسیر یہ کے خلاف نہیں ہے اور اس خیال کی تائید اس سے ہو گئی تھی کہ اہل ظاہر نے بھی اس قول کو لیا ہے چنانچہ بیضاوی نے کہا ہے **ومن انوار المعرفة بفيضون** اگر یہ بات قواعد سے صحیح نہ ہوتی تو اہل ظاہر اس کو نہ لیتے لیکن مزید تائید کے لئے جی یہ بھی چاہتا تھا کہ اگر کسی جگہ قرآن شریف میں رزق کا استعمال اس معنی میں یعنی رزق حسی کی طرح رزق معنوی میں بھی ثابت ہو جائے تو خوب ہو چنانچہ بحمد اللہ ایک مقام کئی روز ہوئے نظر میں آیا بہت خوشی ہوئی لیکن بھول گیا جس کا اس خوشی سے بھی زیادہ رنج ہوا اور جی چاہتا تھا کہ یاد آ جائے تو کہیں لکھا دوں مگر الحمد للہ آج یاد آ گیا وہ یہ ہے کہ سورہ واقعہ میں ہے **وَنَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ اَنْكُمْ تَكْذِبُونَ**.

اس میں تکذیب کو جو کہ ایک امر معنوی ہے رزق فرمایا یعنی تم اپنا حصہ تکذیب کو کرتے ہو اس میں انکم تکذیبون مفعول ثانی ہے اور ان باالفتح معنی میں مصدر کے کر دیتا ہے تو انکم تکذیبون کے معنی ہوئے تکذیبکم ای تجعلون رزقکم تکذیبکم پس تکذیب کو جو کہ رزق متعارف نہیں فرمایا اور ایک عالی درویش جو صاحب مجاہدہ و صاحب کشف بھی تھے اور سانس کے ساتھ ستارے نظر آنے کے مدعی بھی تھے انہوں نے اس کی عجیب تفسیر کی یعنی **وَنَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ اَنْكُمْ تَكْذِبُونَ** کے یہ معنی کئے کہ تم مواقع النجوم کو اپنا رزق بھی بناتے ہو اور پھر اس کی تکذیب بھی کرتے ہو اور بمواقع النجوم کا ترجمہ یہ کیا کہ نجوم جو سانس کے ساتھ جوف میں داخل ہوتے ہیں ان کی قسم کھاتا ہوں ایسے ہی جاہل صوفیوں نے ابوالدرداء کی جو حدیث نسائی میں ہے **لا ابالی اشرب الخمر اور اعبد هذه السارية** (یعنی میں پرواہ نہیں کرتا کہ ستون کی عبادت کو لوں یا شراب پی لوں اور مراد اس سے تغلیظ ہے شرب خمر کی کہ عبادت ساریہ کی برابر ہے) اس کے یہ معنی گھڑے ہیں کہ تصوف میں ایک مقام ایسا ہے کہ وہاں پہنچ کر شراب اور بت پرستی یعنی حرام چیزیں سب جائز ہو جاتی ہیں اور آدی مرفوع القلم ہو جاتا ہے اللہ بچائے اس جہالت سے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۱ ص ۲۱۵-۲۱۶)

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۲۱۶﴾

ترجمہ: بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر۔ جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب

تفسیری نکات

صراط مستقیم ہونے کا نفع

یہاں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی جزاء میں دو باتیں بیان فرمائی ہیں جن میں ایک جزا دنیوی یعنی واقع فی الدنیا ہے

عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ (اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں) دوسری جزا اخروی یعنی واقع فی الآخرة ہے۔ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

(اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مسلمانوں کے لئے جس اصلی جزاء کا وعدہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستے پر چل رہا ہے۔ پس ہدایت پر ہونا یہی بڑی رحمت اور راحت کی چیز ہے۔

ہدایت کا دنیوی نعمت ہونا

أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّكَ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۸﴾ (البقرہ آیت ۸) کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔

اعمال صالح کے ثمرات

یعنی اعمال صالحہ کا ایک ثمرہ اخروی فلاح تو ہے ہی دوسرا عاجلہ ہدایت بھی ہے یہاں ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ ہدایت کا ثمرہ ہونا کیسا ثمرہ تو وہ جس میں حظ ہو اور ہدایت تو خود عملی حالت ہے اس میں کیا حظ ہوتا مگر ایک حکایت سے آپ کو اس کا ثمرہ ہونا معلوم ہو جائے گا اور وہ خود مجھے پیش آیا میں ایک دفعہ سہارنپور سے کانپور جا رہا تھا تو سہارنپور سے لکھنؤ جانے والی ریل میں سوار ہوا اسی گاڑی میں میرا ایک دوست اور ہم وطن مگر جٹلمیں بھی پہلے سے سوار تھا میں یہ سمجھا تھا کہ شاید یہ لکھنؤ جا رہے ہوں گے کیونکہ ایک زمانہ میں ان کے تعلقات لکھنؤ میں بہت رہ چکے تھے سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بیک بنی دوگوش تھے نہ ساتھ میں کابل نہ رضائی کیونکہ آج کل جٹلمیوں کے سفر کا اصول یہی ہے کہ سفر میں اسباب ساتھ نہیں لیتے جب ریل چھوٹ گئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے کہنے لگے میں میرٹھ جا رہا ہوں میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جا رہے ہوں لیکن میں افسوس کرتا ہوں یہ گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے میں نے انہی کے محاورہ میں گفتگو کی اب تو وہ بڑے چونکے کہنے لگے کیا یہ گاڑی لکھنؤ جا رہی ہے؟ میں نے کہا ہاں پھر تو ان کی یہ حالت تھی کہ بار بار لا حول پڑھتے ہیں اور ادھر ادھر دیکھتے جاتے ہیں میں نے کہا ہاں میاں اب تو رڑکی سے اس طرح یہ گاڑی ٹھہرتی نہیں پریشان ہونے سے کیا حاصل اطمینان سے بیٹھو اور باتیں کرو تو وہ جھلا کر کہتے ہیں کہ تم کو باتوں کی سوچھی ہے اور مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔ اس وقت میں نے اپنی اور ان کی حالت میں غور کیا کہ حالانکہ میں ابھی تک منزل پر نہیں پہنچا اور یہ ابھی اپنے مقصود سے بہت دور نہیں آئے بلکہ لوٹی گاڑی میں یہ اپنی منزل مقصود پر مجھ سے پہلے پہنچ جائیں گے مگر پھر بھی میں مطمئن ہوں اور یہ غیر مطمئن تو آخر میرے اطمینان اور ان کی بے اطمینانی کا سبب کیا ہے یہی معلوم ہوا کہ میرے اطمینان کا سبب یہ تھا کہ میں راہ پر تھا اور ان کی بے اطمینانی کا سبب یہ تھا کہ وہ راہ سے ہٹے ہوئے تھے۔ اس وقت ریل جس قدر مسافت طے کرتی تھی میری مسرت و راحت بڑھتی تھی اور ان کو ہر قدم خار تھا تو اس واقعہ سے آیت کی تفسیر واضح ہوئی کہ أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّكَ (یہ لوگ ہیں ہدایت پر اپنے رب کی جانب سے) یہی ایک بڑا ثمرہ ہے اور ہدایت پر ہونا بڑی نعمت اور بڑی دولت ہے۔ یہ ثمرہ دنیا میں ہر مسلمان کو حاصل ہے کافر کو یہ بات نصیب نہیں۔

مزید برآں یہ بات سونے پر سہاگہ ہے کہ اعمال صالحہ باقیات صالحات بھی ہیں کہ آخرت میں ان کا اجر ہمیشہ کے

لئے باقی رہنے والا ہے مگر اس بقاء میں بھی تفصیل ہے کہ بعض اعمال تو مطلقاً باقیات ہیں اور بعض کو اچھی (زیادہ باقی رہنے والا) کہنا چاہیے جیسے مدرسہ اور خانقاہ کہ یہ صدقات جاریہ ہیں یعنی بعض اعمال اس طرح ہیں کہ زندگی کے بعد ان کا ثواب نہیں بڑھتا بس جتنا ثواب زندگی میں کما چلے ہوتا ہی باقی رہے گا۔ اس میں ترقی نہ ہوگی اور صدقات جاریہ کا ثواب مرنے کے بعد بھی برابر بڑھتا رہتا ہے۔ تم قبر میں پڑے سو رہے ہو گے اور اس وقت بھی فرشتے نامہ اعمال میں ثواب لکھتے ہوں گے تو مدرسہ اور خانقاہ کی بنا ایسے ہی اعمال ہیں جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے (مظاہر الامال)

راہ پر آگاہ کرنا بڑی چیز ہے

أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۵۷﴾ ہدی کو فلاح سے بھی پہلے فرمایا۔ اصل چیز تو راہ ہی ہے جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں دنیا میں مسلمان کے لئے جس اصلی جزاء کا وعدہ ہے وہ یہی ہے کہ وہ ہدایت پر ہے اور سیدھے راستے پر چل رہا ہے اور جو اس راہ پر چلنا شروع کر دیتا ہے اس کے لئے مفلحون فرمایا گیا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایسے بزرگوں کی جوتیوں میں پہنچا دیا کہ انہوں نے سیدھے راستے پر ڈال دیا خلاصہ یہ ہے کہ بڑی چیز راہ پر آگاہ کر دینا اور پتہ و نشان بتلا دینا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر اور شبہ کا ازالہ

آیت أُولَئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۵۷﴾ اس میں دو چیزیں ہیں ایک ہدایت دوسرے فلاح کو بطور جزاء کے ذکر فرمایا ہے کیونکہ ان سے پہلے ایمان بالغیب اور ایمان بالرسول کے اوصاف مذکور ہیں۔ اس ایمان کی جزاء کے طور پر اس میں ہدایت و فلاح کو بیان فرمایا گیا ہے ان میں فلاح کا جزائے عمل ہونا تو سمجھ میں آتا ہے کہ فلاح کے معنی کامیابی اور مراد پوری ہونے کے ہیں لیکن ہدایت تو راستہ دکھانے کو کہا جاتا ہے کسی چیز کا راستہ دیکھ لینا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ وہ جزائے عمل میں ہو سکتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: بھگ جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لادیں گے۔

تفسیری نکات

حضور علیہ السلام کو تبلیغ میں بہر صورت ثواب ہے

یہ فرمایا کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۸﴾ یہ نہیں فرمایا کہ سواء علیک کیونکہ آپ کے لئے انذار و عدم انذار مساوی نہیں بلکہ انذار ثواب مرتب ہوا جو کہ عدم انذار کی صورت میں نہ ہوتا اور یہیں سے اہل علم کے نزدیک اس اعتراض کا بھی جواب ہو جاوے گا کہ جب آپ کا انذار و عدم انذار مساوی تھا تو ایک عبث فعل آپ کے کیوں سپرد ہوا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ عبث تو اس وقت کہا جاسکتا تھا کہ جب آپ کے حق میں بھی برابر ہوتا اور جب آپ کے

حق میں برابر نہ تھا۔ لہذا ثواب علی الانذار و انتقائه علی عدمہ (بسیب ثواب مرتب ہونے کے ڈرانے پر اور نہ مرتب ہونا نہ ڈرانے پر تو یہ فعل عبث نہ رہا۔ (فوائد الصحیہ)

غرض اس میں تو شبہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو تبلیغ و انذار پر ثواب تو ملتا ہے لیکن گفتگو یہ ہے کہ یہ ثواب آپ کی نظر میں بھی انذار سے مقصود تھا یا نہیں تو حضور ﷺ کی شفقت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو محض ثواب مقصود نہ تھا کیونکہ اگر آپ کو محض ثواب مقصود ہوتا تو اس قدر دل سوزی کی کیا وجہ تھی ثواب تو صرف تبلیغ پر بھی مرتب ہو جاتا تھا جس کے باب میں قرآن مجید میں ارشاد ہے

لعلک باخع نفسک ان لا یكونوا مؤمنین (شاید آپ اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں اس وجہ سے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں) اور مَا آتَتْ عَلَيْكَ مِنْ شَيْءٍ يَأْتِيكَ (آپ ان پر وکیل نہیں ہیں) اور لَا تَسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ (دوزخ والوں کی نسبت آپ سے سوال نہ ہوگا) ان سب آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بے حد غم تھا ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس کو صاف لفظوں میں ارشاد فرمایا (فوائد)

قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا

ترجمہ: تو ہر بار یہی کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے بیشتر اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا۔

تفسیری نکات

ثمرات جنت دنیا کے مشابہ ہونگے

چنانچہ هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ میں مفسرین نے چند اقوال نقل کئے ہیں ایک یہ کہ نعمائے جنت صورتہ نعمائے دنیا کے مشابہ ہونگے ان کو دیکھ کر جنتی کہیں گے کہ یہ تو وہی چیزیں ہیں جو ہم نے اس سے پہلے دنیا میں کھائی تھیں اور بعض نے کہا ہے کہ ثمرات جنت باہم مشابہ ہوں گے اس لئے ایک بار کسی چیز کو کھا کر پھر دوبارہ جب کوئی چیز سامنے آئے گی تو صورتہ پہلے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے کہیں گے کہ یہ تو ابھی کھائی تھی اور بعض نے کہا ہے کہ وہ نعمتیں اعمال کی صورت ہوں گے جن کو دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے کہ یہ تو وہی نماز ہے جس کو ہم کو دنیا میں توفیق ہوئی تھی اور وہ مناسب ایسی ہوگی جس کو صاحب عمل فوراً سمجھ جائے گا اور گو اس تفسیر کو علماء ظاہر نے زیادہ قبول نہیں کیا مگر اس کی تغلیظ بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ احادیث سے اس کا پتہ چلتا ہے ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے إِنَّ الْجَنَّةَ قَيْعَانٌ وَغَرَاسِيهَا شُبْحَانُ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ کہ جنت چنیل میدان ہے اور اس کے درخت تسبیح و تحمید وغیرہ ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنت کے درخت ان کلمات کی صورت ہیں اسی طرح بعض نصوص قرآنیہ میں ہے ذوقوا ما كنتم تعملون کہ چکھو ان چیزوں کو جو تم کرتے تھے۔ اگر اس میں تاویل نہ کی جائے تو ظاہر نص ان لوگوں کی تائید کرتا ہے جو جزاء کی صورت اعمال کہتے ہیں باقی یہ مقدمات اقناعیہ ہیں میں ان کی بنا پر دعویٰ نہیں کرتا اور نہ آیات کی تفسیر کرتا ہوں بلکہ ایک لطیف استشہاد علم اعتبار کے طور پر کرنا چاہتا ہوں۔

قَالُوا اجْعَلْ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ

ترجمہ: فرشتے کہنے لگے کہ کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد اس میں اور خون ریزیاں کریں

تفسیری نکات فساد سے مراد تحلیل ہے

ایک مولوی صاحب کے کسی سوال کے جواب میں فرمایا کہ اگر بالفرض آدم علیہ السلام سے بھی لغزش نہ ہوتی تب بھی چونکہ مادہ تو ایسی لغزش کا ان میں تھا ہی جس سے بلزوم عادی ان کی اولاد میں سے جنت میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ کرتا اور اس کو نکالا جاتا اس وقت وہ کسی کا بیٹا ہوتا کسی کا پوتا کسی کا بھتیجا کسی کا بھانجا کسی کا بھائی تو روزانہ جنت میں کھرام مچا رہتا اس وجہ سے باپ ہی آگئے ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت جنت میں رنج کیسے ہوتا فرمایا کیوں شبہ کیا ہے آخر آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جنت سے نکلو اس وقت آدم علیہ السلام کو رنج ہوا ہو گا یا نہیں وہ رنج طبعی سہی عقلی نہ سہی اس وقت وہ دنیا میں تھے یا جنت میں عرض کیا کہ جنت میں فرمایا بس ثابت ہو گیا کہ جنت میں بھی رنج ہو سکتا ہے اور یہ تو پیشتر ہی حق تعالیٰ نے فرشتوں سے ظاہر فرمادیا تھا کہ **إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً** اس سے بھی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ارض میں خلیفہ ہونگے جنت سے نکل جانا آدم علیہ السلام کا اسی وقت فرشتوں کو معلوم ہو چکا تھا اسی سلسلہ میں فرمایا **اجْعَلْ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا** کی تفسیر جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی عجیب و غریب ہے بہت سی تفسیریں دیکھیں مگر وہاں تک کسی مصنف کی رسائی نہیں ہوئی وہ یہ کہ یہ امر فطری ہے کہ اپنی بنی ہوئی چیز کے بگڑنے سے رنج ہوتا ہے اور خلافت کے لئے تصرف لازم ہوگا اور تصرف کا حاصل یہی تحلیل و ترکیب سے ہے اور تحلیل بھی توڑ پھوڑ ہے بس فساد سے یہی تحلیل مراد ہے فساد بمعنی معصیت مراد ہونا ضروری ہی نہیں اسی طرح سفک دماء سے سفک محرم مراد ہونا ضروری نہیں چونکہ فرشتوں کا کام تھا پرورش کرنا شجر کو مویشی وغیرہ کو اور یہ آدی کسی درخت کو کانٹے گا کسی کی کڑیاں بنائے گا کسی میں تختے جانوروں میں کسی پر سواری کرے گا کسی سے کھیتی کا کام لے گا کسی کو ذبح کرے گا فرشتوں کو یہ گراں ہوا اب یہ شبہ بھی نہ رہا کہ فرشتوں نے بنی آدم کی طرف معصیت کو کیسے منسوب کر دیا عجیب تحقیق ہے۔

فساد کے لغوی معنی

اس آیت سے بظاہر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو فساد اور خونریزی اس میں بیان کی گئی ہے یہ خود آدم علیہ السلام میں بھی ہے حالانکہ وہ نبی معصوم ہیں اس کا جواب دوسرے حضرات نے تو یہ دیا ہے کہ اس سے خود آدم علیہ السلام کی ذات مراد نہیں بلکہ بنی آدم مراد ہیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے جواب یہ دیا ہے کہ یہاں فساد اور خونریزی کے شرعی معنی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں کیونکہ انسان ان جانوروں کو ذبح کر کے کھائے گا شکار کرے گا تو لغوی معنی کے اعتبار سے فساد کی ایک صورت ہے۔

تخلیق آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا حاکمانہ اور حکیمانہ جواب

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفۃ الارض بنانے کے لئے پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں نے عرض کیا تھا کہ یَسْفِكُ الدَّمَاءُ تَوْحِقَ تَعَالَى نے فرشتوں کو دو جواب دیئے ایک تو حاکمانہ جواب دیا کہ اِنِّیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ مَالًا تَعْلَمُوْنَ (میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے) میرے معاملات کی تمہیں کیا خبر۔

۔ رموز مملکت خویش خسرواں داند

میں اپنے معاملات کا تم سے زیادہ علم رکھتا ہوں دوسرا جواب حکیمانہ دیا کہ عَلَّمَ اَسْمَاءَ الْاَشْیَاءِ كُلَّهَا (اور علم دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کا) کہ تم اوصاف اور اسماء اور خواص اشیاء کے جن سے ان کو کام پڑنے والا تھا تعلیم فرمادیئے تاکہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوتے۔ آدم علیہ السلام کو بنانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں انہوں نے کہا اَنْجَعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدَّمَاءُ وَتَحْنُ نُسُجًا یَّمْدُوكَ وَنُقَدَّاسُ اَلْکَ یعنی آپ زمین میں ایسے لوگوں کو پیدا کریں گے جو فساد اور سفک دماء کریں گے اور ہم آپ کی تسبیح اور تقدیس کے لئے ہر دم تیار ہیں۔ اس آیت کی تفسیر عام مفسرین نے تو معصیت سے کی ہے یعنی مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ انسان زمین میں فساد کریں گے خون بہاویں گے مگر مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایک عجیب تفسیر کی ہے فرمایا کہ فساد فی الارض معصیت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہاں فساد کے معنی بگاڑنے کے ہیں یعنی انسان پیدا ہوگا تحلیل و ترکیب کے لئے انسان کا کام جوڑنا اور توڑنا ہے یعنی جوڑی ہوئی چیزوں کو توڑنا اور علیحدہ چیزوں کو جوڑنا۔ بس ترکیب تحلیل کام ہے۔ انسان ایجاد و اعدام تو کرتا نہیں یعنی اعطائے وجود یا سلب وجود نہیں کر سکتا۔ بس اس کا کام اتنا ہی ہے کہ کسی کو جوڑ دیا کسی کو توڑ دیا مثلاً یہ پنکھا ہے اس میں آپ نے کیا کھجور کی تو شبلی کاٹ کر لائے اس کو پیڑ سے توڑا اور پھر سب پتوں کو جوڑ لیا پنکھا ہو گیا۔ تو اس میں آپ نے صرف تحلیل و ترکیب ہی کی اور کوئی کمال آپ کا نہیں ہے اور فساد کے معنی ہیں بگاڑنا۔ جب کسی کو توڑو گے تو ضرور بگڑیگا اور یہ سب چیزیں فرشتوں کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہیں اور اپنی بنائی ہوئی چیز سے محبت ضرور ہوتی ہے اس لئے طبعی طور پر ان کو قلب ہوا اور رحم آیا کہ یہ انسان ہماری بنائی ہوئی چیزوں کو توڑے پھوڑے گا کیونکہ یہ سب چیزیں شجر حمر حیوانات جمادات نباتات جن وغیرہ سب انسان سے پہلے ہو چکے تھے۔ اور ان سب کے پیدا ہونے میں فرشتوں سے کام لیا گیا ہے پھر انسان ان سب سے بعد میں ان میں تصرف کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ بعد میں پیدا ہونا دلیل ہے اس کی شرافت کی دیکھئے جب آپ کا کوئی معزز مہمان آتا ہے اس کی خاطر مدارات کی جتنی اشیاء ہوتی ہیں سب پہلے سے موجود کر لیتے ہیں پھر اس کو بلا تے ہیں چنانچہ اس کے آنے سے پہلے مکان کو جھاڑو دلواتے ہیں عمدہ فرش بچھاتے ہیں میز کرسی تیار رکھتے ہیں۔ قالین، لائین، دیوار گیری سب لگائے رکھتے ہیں۔ جب وہ آتا ہے تھوڑی دیر باہر بٹھلا کر اندر لے آتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ جب مہمان آجائے اسی وقت جھاڑو دلواتے ہوں تاکہ وہ گرد اس کے اوپر پڑے اور نہ اس وقت فرش بچھاتے ہیں تو انسان کا سب سے پیچھے آنا ہی دلیل ہے اس کے معزز ہونے اور شریف ہونے کی غرض

سب چیزیں پہلے موجود تھیں اور انسان بعد میں آیا اور فرشتے جانتے تھے کہ انسان ان سب کو توڑے پھوڑے گا اور یہ ان کی بنائی ہوئی چیزیں تھیں ان کو قلق ہوا عرض کیا آپ ایسے شخص کو پیدا کرتے ہیں جو توڑ پھوڑ کرے گا۔ اب فساد کی تفسیر معصیت سے کرنے کی ضرورت نہ رہی واقعی عجب تفسیر ہے۔ (اجزالمیام حصہ اول)

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ

هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۶۱﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ

أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ

قَالَ الْمَآءُ أَقْلُ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ الْغَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ

وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۶۳﴾

ترجمہ: اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام (کو پیدا کر کے) سب چیزوں کے اسماء کا پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی ان کے آثار و خواص) اگر تم سچے ہو (فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہم کو علم ہے ہی نہیں بے شک آپ بڑے علم والے حکمت والے ہیں) کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جاتا اسی قدر ہم کو علم عطا کیا) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ آدَم علیہ السلام ان کو چیزوں کے اسماء بتلاؤ جب بتلا دیئے آدَم علیہ السلام نے ان کو چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں اور زمینوں کی اور جانتا ہوں جس بات کو تم ظاہر کر دیتے ہو اور جس بات کو دل میں چھپاتے ہو۔

تفسیری نکات

تعلیم اسماء کی استعداد

اور دوسرا امر یہ فرمایا کہ استعداد کا مسئلہ بڑا اہم ہے قصہ آدَم علیہ السلام اور ان کی تعلیم اسماء میں اور فرشتوں کے عجز عن الجواب کی بناء بھی استعداد ہے ان علوم اسماء کے اخذ کرنے کی استعداد آدَم علیہ السلام میں تھی ملائکہ میں نہ تھی اس لئے آدَم علیہ السلام کو جو علم عطاء ہوا وہ فرشتوں کو عطاء نہیں ہوا پس اس سے یہ اشکال رفع ہو گیا کہ آدَم علیہ السلام کو جن علوم خاصہ کی تعلیم دی گئی اگر ملائکہ کو دی جاتی وہ بھی ان علوم سے متصف ہو جاتے پھر آدَم علیہ السلام کا کمال کیا ہوا وجہ دفع تقریر بالا سے ظاہر ہے کہ آدَم علیہ السلام کو کوئی خفیہ تعلیم نہیں دی گئی مگر ملائکہ میں ان علوم کی استعداد نہ تھی اس لئے ان کو تلقی نہیں کر سکے باقی یہ سوال کہ ان کے عجز عن الجواب کے بعد پھر قال يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ کے کیا معنی اس وقت وہ علم ان کو کیسے حاصل ہو گیا اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تعلیم محض الفاظی اطلاع تھی معنوی نہ تھی معنوی اطلاع صرف آدَم علیہ السلام کو عطا فرمائی گئی

تھی مگر آدم علیہ السلام کے اخبار سے ملائکہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کو جو حقیقت معلوم ہے ہم کو معلوم نہیں اگر کوئی کہے کہ وہ استعداد فرشتوں کو کیوں نہ دے دی گئی جو اب یہ ہے کہ وہ استعداد خواص آدم سے تھی اگر ملائکہ کو عطاء ہوتی تو فرشتہ فرشتہ نہ رہتا اسی کے متعلق ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ انباء جو ابناہمہ یا انبیاہمہ کا مادہ ہے مطلق اخبار کو کہتے ہیں اور تعلیم علم ادرہ کا مادہ ہے حقیقت کا منکشف کر دینا ہے پس انباء سے تعلیم لازم نہیں آتی غرض استعداد خاص عطاء ہونا یہ بھی محض وموہبت ہے کسی عمل کا ثمرہ نہیں چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے کوئی عمل سابق نہیں ہوا تھا۔

خاصیت اور استعداد

پھر فرشتوں پر پیش کیا اور پھر فرشتوں نے فرمایا اَنْبِيَاؤُنِي بِاَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ اگر تم سچے ہو ان کے نام بتلاؤ اور اسماء کی تخصیص محض ذکر ہے۔ مقصود اوصاف و خواص بتلایا ہے۔ پھر فرشتوں نے حق تعالیٰ سے اپنے عجز کا اقرار کیا اور کہا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا الْاِيَةَ (آپ تو پاک ہیں ہم کو علم نہیں مگر وہی جو آپ نے ہم کو سکھلایا ہے) پھر حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے نام بتلاؤ قَالَ يَا دَمْرُؤَيْنُ هَؤُلَاءِ بِاَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ (حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم! تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے نام) پس آدم علیہ السلام نے سب بتلادیا۔ فَلَمَّا ابْتَاَهُمُ جَبَّ اَدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَمَّ نَمًّا بَدِيًّا تَوَلَّى قَوْلَهُ لَمَنْ يَسْمَعُ اَلَمْ يَأْتِكُمْ اَنْ اُنزِلَ عَلَيْكُمْ الْكِتَابُ مِنْ سَمَوٰتِنَا وَمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ (حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم! تم بتلاؤ ان کو ان چیزوں کے نام) پس آدم علیہ السلام نے سب بتلادیا۔ فَلَمَّا ابْتَاَهُمُ جَبَّ اَدَمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَمَّ نَمًّا بَدِيًّا تَوَلَّى قَوْلَهُ لَمَنْ يَسْمَعُ اَلَمْ يَأْتِكُمْ اَنْ اُنزِلَ عَلَيْكُمْ الْكِتَابُ مِنْ سَمَوٰتِنَا وَمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ

جواب اشکال

اب اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے تھے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو امتحان میں اس طرح شریک کریں کہ ایک کو تو پندرہویں مقالہ کی شکل اول خلوت میں سکھلا دیں اور دوسرے سے اسی شکل میں بغیر سکھلائے ہوئے امتحان لیں۔

اس شبہ کا جواب سننے کے قابل ہے یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلائے تھے اور جب ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے سامنے ہی بتلادیا ہو اور یہی احتمال خدا تعالیٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہو سکتی بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہوگی کہ پندرہویں مقالہ کی شکل اول دونوں طلباء کے سامنے بیان کی گئی اور امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت بتلا سکا اور دوسرا نہیں بتلا سکا۔ اعتراض جو وارد ہوتا ہے اول صورت میں ہوتا ہے اور اس پر منع کافی ہے اور وہ احتمال بالفرض راجح نہ سہی مگر احتمال تو ہے کہ فہرست سب کے سامنے پیش ہوئی اور پھر جب آدم علیہ السلام نے تو بتلادیا اور فرشتے نہ بتلا سکے کیوں کہ علم کے واسطے استعداد کی ضرورت ہے اول علوم کی استعداد بشری میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت کہ جبرائیل علیہ السلام نہیں سمجھ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی بوجہ عدم استعداد اس کی حقیقت نہ بتلا سکے تو حق تعالیٰ نے اس امتحان سے یہ بتلادیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور وہی شرط تھی خلافت کی۔

اب ایک شبہ اور رہا کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھ سکے ہوں گے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہوگئی مگر یہ محض لغو اعتراض ہے کیونکہ بتلانے کے لئے مخاطب کا سمجھ لینا لازم نہیں اور اس لئے انباء فرمایا علم نہیں فرمایا۔ تعلیم کے معنی ہیں سمجھا دینے کے اور انباء کے معنی ہیں اخبار کے یعنی تقریر کر دی گو مخاطب نہ سمجھا ہو۔ بہر حال استعداد کی ہر علم کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔

اس تقریر پر بھی اعتراض پڑتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ خاصیت ہی بدل دیتے اور وہ استعداد ملائکہ میں پیدا کر دیتے تو وہ بھی سمجھ لیتے۔ جواب یہ ہے کہ خاصہ اس کو کہتے ہیں کہ اس ذات کے علاوہ کسی اور ذات میں نہ پایا جائے ورنہ خاصہ نہ رہے گا تو استعداد جو خاصہ بشر ہے ملائکہ میں کیسے پائی جاسکتی ہے اور اگر کہو کہ اول ہی فرشتوں کو بشر کر کے خلیفہ کر دیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے اس میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کو بشر کیوں نہیں کیا اس کی نسبت صرف یہی کہا جائے گا

حدیث مطرب و می گووراز دہر کمتر جو کہ کس نکشو دود نکشاید لکمت این معمارا
مطرب و می کی بات کر زمانے کے راز تلاش نہ کر کہ کسی نے حکمت سے اس معمر کو نہیں کھولا۔

فہم کی ایک مثال

(ملفوظ ۲۳۳) ایک مولوی صاحب نے سوال کیا کہ حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا ہے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ کیا آپ ایسے لوگوں کو زمین میں پیدا کریں گے جو فساد کریں گے اس میں اور خونریزیاں کریں گے اور ہم برابر آپ کو تسبیح اور تقدیس کرتے رہتے ہیں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (یعنی میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے) تو یہ مجمل جواب دیا اس کے بعد آدم علیہ السلام کو اسماء بتلا دیئے اور ملائکہ سے فرمایا۔

أَنْتُمْ بِنَاءُ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

فرشتوں نے عرض کیا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ

حق تعالیٰ نے فرمایا يَا دَمْرُ الْكُفْرِ هُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ الْخِ يہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیا جاتا تو ان کو بھی یہ علم حاصل ہو جاتا تو اس میں آدم علیہ السلام کی کیا فضیلت ثابت ہوئی جواب میں فرمایا کہ یہ کہیں ثابت نہیں کہ فرشتوں سے انفاء کیا گیا مگر فرشتوں میں خاص ان علوم کی استعداد نہ تھی اس لئے باوجود اعلانیہ تعلیم کے بھی ان علوم کو نہیں سمجھ سکتے تھے جیسے استاد اقلیدس کے کسی دعوے کی تقریر دو طالب علموں کے سامنے کرے مگر جس کو مناسبت ہے وہ تو سمجھے گا دوسرا نہیں سمجھے گا اگر کہا جائے۔

فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی علم اسماء کی استعداد تھی اس کا جواب یہ ہے کہ انباء محض اخبار روایت کو کہتے ہیں جس کا درجہ تعلیم سے کم ہے پس اس سے علم حقائق اسماء کا حاصل ہو جانا لازم نہیں آتا حاصل یہ کہ علم اسماء کی استعداد بشر کے ساتھ خاص تھی فرشتوں کے اندر وہ استعداد ہی نہ تھی اب رہا یہ سوال کہ فرشتوں میں وہ استعداد رکھ

دیتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بشر میں رکھنا اور فرشتوں میں نہ رکھنا یہ حکمت ہے جس پر کوئی اعتراض ہی نہیں کر سکتا خلاصہ یہ ہے کہ فرشتہ جیسا فرشتہ ہے ویسا ہی رہے اور آدمی جیسا آدمی ہے ویسا ہی رہے اس وقت یہ تفاوت ہوگا جس کا فضا اختلاف استعداد ہے جس کو مختلف عمل میں مختلف پیدا کرنا محض حکمت ہے ایک بد عقیدہ صوفی نے اس سوال کے جواب میں یہ غضب کیا ہے اور اس کو لکھ بھی دیا ہے اور وہ رسالہ چھپ بھی گیا یہاں مدرسہ میں ہے یہ لکھا ہے کہ وہ استعداد غیر مخلوق اور قدیم اور متضادات ممکن کا ہے اس واسطے یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا اللہ تعالیٰ ایک میں استعداد رکھی اور ایک میں نہیں رکھی اس شخص نے اپنے زعم میں خدا تعالیٰ کو اعتراض سے بچایا ہے مگر بیچارہ خود ہی نہیں سمجھا اب ایک سوال اور رہا وہ یہ کہ جب فرشتے آدم علیہ السلام کے اخبار سے بھی نہیں سمجھے تو فرشتوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو یہ علم حاصل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تقریر کی قوت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کہہ رہا ہے گو اس تقریر کو کوئی نہ سمجھے یہ ایسا ہے کہ جیسے اقلیدس کا ماہر کی شکل بیان کرے تو اس کو سمجھے گا تو وہی جو پہلے سے مبادی سے باخبر ہے اور جو مبادی ہی سے بے خبر ہے وہ سمجھے گا تو نہیں مگر اتنا سمجھ لے گا کہ یہ سمجھ کر کہہ رہا ہے آگے اس میں قصور سمجھنے والے کا ہے کہ نہیں سمجھا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ابْتَدَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ

مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ: اور جس وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے سوسب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔

تفسیری نکات

شیطان کے مردود ہونے کا سبب

اس پر شبہ کیا کہ شیطان کے مردود ہونے کی وجہ کیا ہے اس کو تو سجدہ کا حکم ہوا ہی نہیں بلکہ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف ملائکہ کو ہوا تھا۔ نہ معلوم ان صاحبوں کو شیطان کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے جواب اشکال کا یہ ہے کہ عدم ذکر عدم کو مستلزم نہیں اور یہاں اس کے ذکر کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ آگے إِلَّا إِبْلِيسَ میں اس کا ذکر آ رہا ہے یہ اس کا قرینہ ہے کہ وہ بھی مخاطب تھا۔ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کا ذکر آگے موجود ہو تو کلام سابق میں اکتفاء باللاحق اس کا ذکر نہیں کیا کرتے جیسا کہ عرض امانت میں انسان کا ذکر اس لئے نہیں ہوا کہ آئندہ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ میں اس کا ذکر موجود ہے یہ جواب اس اشکال کا بہت سہل ہے اس میں استثناء متصل و منفصل کی بحث کی ضرورت نہ رہے گی۔ بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ابلیس کا ذکر کلام سابق میں ایجازاً محذوف ہے اور تقدیر کلام اس طرح تھی وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ وَالْإِبْلِيسَ اسْجُدُوا

ابلیس کا سجدہ نہ کرنا آدم کے کمال کی دلیل

فرمایا۔ ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملائکہ کا سجدہ کرنا جیسا ان کے یعنی آدم علیہ السلام کے کمال کی دلیل ہے ویسا ہی ابلیس کا سجدہ نہ کرنا بھی ان کے کمال کی دلیل ہے کیونکہ اگر ابلیس بھی سجدہ کرتا تو اہل کمال کو یہ شبہ ہوتا کہ شیطان کو آدم علیہ السلام سے کچھ مناسبت ضرور ہے جس کی وجہ سے اس کو ان کی طرف میلان ہو اور ان کو سجدہ کیا اب سجدہ نہ کرنے کی صورت میں یہ تحقیق ہو گیا کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور ابلیس کے درمیان کوئی مناسبت نہیں کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس (الکلام الحسن حصہ اول ۷۹)

وَلَا تَقْرَبْ هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۷۰﴾

ترجمہ: اور نزدیک نہ جائو اس درخت کے ورنہ تم بھی ان ہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔

تفسیری نکات

لا تقربا فرمانے میں حکمت

حق تعالیٰ نے زنا کی حرمت اس لفظ سے بیان فرمائی ہے کہ لا تقربوا الزنا حالانکہ یہ لفظ بھی کافی تھا لامتنوا یعنی زنا نہ کرو مگر بطور تاکید اور پیش بندی کے یہ لفظ اختیار کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ اور آدم علیہ السلام کو اکل من الشجرہ سے منع فرمانے کے لئے بھی لا تقربا ہذہ الشجرۃ اختیار کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قریب بھی مت جاؤ ایک حدیث تو اس بارہ میں صریح موجود ہے من یرتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ یعنی ارشاد فرماتے ہیں حضور ﷺ جو کوئی سرکاری چراگاہ کے آس پاس بکریاں چرائے گا تو ممکن ہے کہ کوئی بکری چراگاہ میں بھی گھس جائے یہ نکلڑا ہے ایک حدیث کا وہ یہ ہے کہ الحلال بین والحرام بین و بینہما مشتبہات فمن اتقى الشبہات فقد استبرأ لدينہ و من یرعی حول الحمی یوشک ان یقع فیہ۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حلال بین ہے اور حرام بین ہے اور دونوں کے درمیان میں مشتبہات ہیں یعنی وہ اعمال ہیں جن کا حلال و حرام ہونا پوری طرح واضح نہیں ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ جو شبہات سے بھی بچا رہے اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا اور جو کوئی سرکاری چراگاہ کے قریب اپنے مویشی کو لے جائے گا (یعنی شبہات کا ارتکاب کرے گا جو حرام کی سرحد سے ٹلی ہوئی ہے) تو عجب نہیں کہ مویشی چراگاہ میں بھی گھس جائیں اور وہ سرکاری مجرم ہو جائے۔

لا تقربا ہذہ الشجرۃ یعنی اس درخت کے قریب مت جاؤ۔ حالانکہ منہی عنہ اکل شجرہ سے لیکن منع کیا گیا اس کے پاس جانے سے اس لئے کہ حق تعالیٰ نہایت رحیم و کریم ہیں انہوں نے دیکھا کہ جب پاس جاویں گے تو پھر رکنادشوار ہے اس لئے پاس جانے سے ہی روک دیا جیسے بچے کو شفیق باپ کہتا ہے کہ دیکھو بیٹا چولہے کے پاس نہ جانا حالانکہ جانتا ہے کہ

چولہے کے پاس جانا کچھ مضرب نہیں لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی جانتا ہے کہ پاس جا کر بچنا مشکل ہے اس لئے روکتا ہے۔

وَأٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كٰفِرِيْنَ بِهَا

ترجمہ: اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ صحیح بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی توریت کے کتاب الہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے) اور مت ہو پہلے کافر اس کے ساتھ۔

تفسیری نکات

اہل کتاب سے خطاب

ارشاد وَأٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كٰفِرِيْنَ بِهَا یہ خطاب اہل کتاب ہی کو ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اے اہل کتاب ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے اتاری ہے کہ وہ تمہاری کتابوں کی بھی تصدیق کرنے والی ہے اور اس کے ساتھ اول کافر نہ بنو یعنی اگر تم اس کا انکار کرو گے تو کافر ہو گے اور سب سے اول درجہ کے کافر ہو گے کیونکہ تم اہل علم ہو اور پہلے بھی تم کو کتاب مل چکی ہے برخلاف مشرکین کے کہ وہ اہل علم نہیں اور کسی کتاب کو نہیں مانتے ان سے اس کتاب کا انکار بھی اتنا بعید نہیں جتنا تم سے ہے اس آیت میں مَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ سے سوائے قرآن کے اور کچھ مراد نہیں ہو سکتی لہذا ثابت ہوا کہ قرآن پر ایمان لانا بھی شرط ایمان ہے بلا اس کے آدمی مومن نہیں ہو سکتا کافر ہی رہے گا اور کافر کی نجات نہیں اور ظاہر ہے کہ تمام قرآن حضور کی رسالت سے بھر پڑا ہے قرآن پر جو کوئی ایمان لائے وہ حضور کی رسالت کا ضرور قائل ہوگا اس سے ثابت ہوا کہ بلا حضور کی رسالت پر ایمان لائے بھی نجات نہیں ہو سکتی۔

وَاقِيْبُوا الصَّلٰوةَ وَاْتُوا الزَّكٰوةَ وَاذْكُرُوْا مَعَ الزَّاكِيْنَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور زکوٰۃ دو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ

تفسیری نکات

جب مال اور حب جاہ کا علاج

وَاقِيْبُوا الصَّلٰوةَ میں حب جاہ کا معالجہ ہے وَأٰتُوا الزَّكٰوةَ میں حب مال کا علاج ہے۔

ازالہ کبر کی تدبیر

وَازْكُرُوْا مَعَ الزَّاكِيْنَ ﴿۱۶﴾ جو تمہارے ہے واقیمو الصلوٰۃ کا یہ کبر کے زائل ہونے کی تدبیر ہے۔ (العجدیب حصہ اول ۱۷)

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: یا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے

تفسیری نکات

امر بالمعروف اور نسیان النفس

مگر یہ دھوکہ ہے اور سبب اس دھوکہ کا یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ اگر خدا نخواستہ عمل نہ کرو تو دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرو حالانکہ یہ مقدمہ بالکل غلط ہے کیونکہ امر بالمعروف و طاعت ہے اور اس طاعت کی شرائط میں یہ شرط کہیں نہیں کہ اگر خود بھی عمل کرے تو طاقت ہوگی ورنہ نہیں ہاں اپنا عمل نہ کرنا ایک مستقل گناہ ہے جو کہ قابل ترک ہے لیکن امر بالمعروف کے ساتھ اس کو شرطیت وغیرہ کا کچھ تعلق نہیں اور یہ کسی حدیث سے یا کسی مجتہد کے قول سے ثابت نہیں کہ اگر گناہ سے نہ بچے تو دوسری طاعت بھی طاعت نہ ہوگی اور اگر اس کو مانا جائے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الشَّرَّاتِ کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے بارے میں ہے جو کہ نیکی بھی کرتا ہے لیکن گناہ میں بھی مبتلا ہے تو اگر گناہ کرنا دوسری طاعت کے طاعت نہ ہونے کا موجب ہو تو اس کے کفارہ سینات کی کوئی صورت ہی نہ رہے گی اور مضمون آیت کے بالکل خلاف لازم آتا ہے البتہ اگر کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جو کہ مفوت طاعت ہے تو بیشک پھر طاعت طاعت نہ رہے گی اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں طاعت اپنی حالت پر رہے گی اگرچہ معصیت کرنے سے گناہ بھی ہوگا ہاں اتنا اثر ضرور ہوگا کہ گناہ کی وجہ سے طاعت کی برکت کم ہو جائے گی مگر طاعت منعدم نہ ہو جائے گی اور دلیل اس کی یہ آیت ہے إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الشَّرَّاتِ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ جب اس کی بناء الگ ہوئی تو یہ سمجھنا کہ اگر وعظ کہوں گا تو گنہگار ہوں گا غلطی پر مبنی ہے پس امر بالمعروف طاعت ہوا اور اس کا طاعت ہونا گناہ نہ کرنے پر موقوف نہ ہوا بلکہ آیت میں ملامت اس پر ہے کہ تم خود کیوں عمل نہیں کرتے اور وعظ کے چھوڑ دینے سے تو دوسرا جرم قائم ہو گیا یعنی نہ خود عمل کریں اور نہ باوجود معلوم ہونے کے دوسروں کو بتلائیں دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الشَّرَّاتِ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جب ایک شخص امر بالمعروف کرتا ہے جو کہ طاعت ہے اور طاعت مزیل ہوتی ہے معصیت کی تو اس کا اقتضایہ ہو سکتا تھا کہ یہ کفارہ ہو جاتا نسیان نفس بمعنی ترک عمل کا مگر اس طاعت کے ہوتے ہوئے بھی اس کا یہ نسیان اس امر بالمعروف سے ہوا تو جہاں امر بالمعروف بھی نہ ہو نسیان بد عملی ہی ہو جس میں عیب جوئی بھی داخل ہے تو کیونکر موجب ملامت نہ ہوگی ضرور ہوگی۔ خلاصہ یہ ہوگا کہ اے شخص جو کہ اپنی حالت کو بھول رہا ہے جبکہ تیری حالت ایک معصیت اور ایک طاعت کے مجموعہ پر بھی محل ملازمت ہے تو جب طاعت ایک بھی نہ ہو بلکہ

دونوں امر معصیت ہوں تو کیونکر موجب ملامت نہ ہوگی اور دو معصیتیں اس طرح ہوں کہ بد عملی تو اپنی حالت پر رہی جس کو تَنْسُونَ أَنْفُسَكُمْ فرمایا ہے اور امر بالمعروف کے بجائے دوسرے کی عیب جوئی ہوگئی تو اس حالت میں تو بدرجہ اتم ملامت ہونی چاہیے پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں جس میں ملامت کی بناء بد عملی و عیب جوئی ہے علماء کو ہی خطاب نہیں بلکہ جہلاء کو بھی ہے کیونکہ اس کا ارتکاب وہ بھی کرتے ہیں بلکہ جہلاء کو زیادہ سخت خطاب ہے اور علماء کو ہلکا کیونکہ ان کے پاس ایک ہونے کی تو ہے امر بالمعروف اور جہلاء کے پاس تو ایک بھی نہیں اب اس کو غور کیجئے اور جہل پر اپنے فخر کو دیکھئے کہ اس کی بدولت تعزیرات الہیہ کی ایک دفعہ اور بڑھ گئی اور مقصود اس سب سے یہ ہے کہ ہماری جو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ ہم دوسروں کی عیب جوئی کیا کرتے ہیں اس کو چھوڑ دینا چاہیے اور اپنی فکر میں لگنا چاہیے۔

اپنی برائیوں پر نظر رکھنے کی ضرورت

أَفَلَا تَعْقِلُونَ یعنی کیا تم سمجھتے نہیں ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ جس طرح نقلی ہے عقلی بھی ہے یعنی عقل بھی اس کے فتح کا فتویٰ دیتی ہے بہر حال اس آیت سے بدالالت مطابقی اس پر وعید ہوئی کہ اوروں کو سمجھاؤ اور خود عمل نہ کرو اور بدالالت التزامی و بدالالت النص یہ ثابت ہوا کہ اوروں کی برائی کے درپے ہونا اور اپنی برائیوں کو فراموش کرنا برا ہے ضرورت اس کی ہے کہ ہر وقت اپنے گناہوں اور عیوب پر نظر ہو اور اسکے معالجے کی فکر کی جائے اور جس میں اپنی فکر کافی نہ ہو اس میں دوسرے ماہر سے رجوع کرو شرم و حجاب کی وجہ سے اپنے امراض کو معالج سے چھپایا نہ جائے کیونکہ اظہار مرض کے بغیر علاج ممکن نہیں۔

اپنی صلاح ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت

أَتَاْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسُونَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ (وہ اس سے یہی سمجھے کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے) کیونکہ ہمزہ تامرون پر انکار کے لئے داخل ہوا ہے تو امر بالبر منکر ہوا یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو مگر یہ محض غلط ہے بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے۔

آیت اتمرون الناس کا مطلب

نیز قبل روانگی ریل ایک شخص نے سوال کیا کہ آیت اتمرون الناس بالبر و تنسون انفسکم کا مطلب کیا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جسکے اپنے اعمال درست نہ ہوں اسکو دوسروں کو بھی نصیحت نہ کرنی چاہیے۔ فرمایا یہ نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ امر بالبر کو ناسی نفس نہ ہونا چاہیے ورنہ امر بالبر ضروری چیز ہے اور کچھ نہ کچھ نفع اس سے ضرور ہوتا ہے سامع کو تو ہوتا ہی ہے امر کو بھی ہوتا ہے میرا تجربہ ہے کہ جس بات کی میں اپنے آپ میں کسر پاتا ہوں اس کا وعظ کہہ دیتا ہوں بس اسی دن سے وہ کام شروع ہو جاتا ہے کیونکہ شرم آتی ہے کہ میں لوگوں کو اس کی تعلیم کر چکا ہوں اور میں اس میں سے خالی ہوں۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُم إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

ترجمہ: (اور اگر تم کو مال و جاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہو) تو مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں اور خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

تفسیری نکات

نماز کی گرانی کا علاج

اب ایک اشکال رہ گیا کہ نماز و صبر خود بھی تو مشکل ہے پس ایسی چیز سے مدد لینے کی تعلیم دی جو خود بھی آسانی سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اعمال جن میں مدد لی جاتی ہے بہت سے ہیں اور یہ صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ سوہمت اور محنت سے دو باتوں کا حاصل کرنا کچھ دشوار نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی بھی تدبیر بتلائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے **وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ** (ہاں بے شک نماز بہت گراں ہے مگر خاشعین پر) اس کے جز و اول پر تعارض کا شبہ نہ ہو کہ ابھی تو نماز کو آسان کہہ رہے تھے ابھی اس کو بھاری مان لیا۔

بات یہ ہے کہ نماز فی نفسہ آسان ہے اور عارض مزاحمت نفس سے گراں ہو جاتی ہے دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں بطور ارخاعتنان کے اس کو گراں مان لیا گیا ہے تاکہ مخاطب کو ابتداء ہی سے وحشت نہ ہو بلکہ مصلح کو اپنی موافقت کرنا ہوادیکھ کر اس کی بات کو سن لے۔

کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ مصلح اگر مریض کی بات کو مان کر اصلاح کرے تو مریض کا دل بڑھتا ہے۔ مثلاً طبیب نے موگ کی کھجڑی بتلائی مریض نے کہا کہ وہ بدمزہ ہوتی ہے اب ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کی بات کو رد کیا جائے۔ اس سے تو بحث کی صورت پیدا ہو جائے گی اور مریض ہرگز اس کی بات نہ مانے گا بلکہ اپنی بات پر اڑ جائے گا ایک صورت یہ ہے کہ طبیب یوں کہے کہ ہاں واقعی بدمزہ ہے مگر اس لئے تجویز کی جاتی ہے کہ مریض زیادہ نہ کھا جائے۔ فرماتے ہیں واقعی نماز بہت گراں ہے سبحان اللہ کیسا شفقت کا عنوان اختیار فرمایا کہ گرانی کو تسلیم کر لیا آگے فرماتے ہیں خاشعین پر کچھ گراں نہیں پس تم خشوع حاصل کر لو تم پر نماز گراں نہ رہے گی۔

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُم إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ ترجمہ: جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ رب کی ملاقات کرنے والے ہیں

اور اسی طرح لوٹنے والے ہیں۔

لقائے رب کا استحضار مشکل نہیں

کہ تم لقاء رب ورجوع الی اللہ کا استحضار کرو اور یہ کچھ مشکل نہیں کیونکہ خیالات کا بالکل روکنا تو مشکل ہے مگر ایک خیال کا استحضار تو مشکل نہیں اگر وہ دل سے ہٹ جائے تو پھر لے آؤ اس طریقہ سے خشوع قلب جلد حاصل ہو جائے گا۔

خشوع کی حقیقت

مگر لوگ اس میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ عدم حضور و سواوس کو خشوع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خشوع کی حقیقت عدم احضار و سواوس ہے قصداً خیال نہ لایا جائے اور جو بلا قصد آوے وہ مضرب نہیں نہ خشوع کے منافی ہے بلکہ اس کو دفع بھی نہ کرو اس کی طرف التفات ہی نہ کرو۔

صوفیا نے لکھا ہے کہ و سواوس کی مثال ہوا کی طرح ہے کہ جو شخص برتن میں سے تنہا ہوا نکالنا چاہے وہ عاجز ہو جائے گا کیونکہ خلا محال ہے ہاں برتن میں پانی بھر دو۔ جب بھر جائے تو پھر ہوا کا نام بھی نہ رہے گا۔ پس تم اپنے قلب میں لقاء رب ورجوع الی اللہ کا خیال اچھی طرح بھرو پھر و سواوس کا نام بھی نہ رہے گا۔ **وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّهَا الْكَبِيرَةُ إِلَّا عَلَى الْغَاشِيِينَ ۝ الَّذِينَ يُظَنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ رَاجِعُونَ ۝** یعنی مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں وہ خشوع کرنے والے وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بے شک اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں۔

اکثر مفسرین نے صبر سے مراد صوم لیا ہے اور اس کو آیت میں مشکل نہیں فرمایا بلکہ صرف نماز کے ساتھ اس حکم کو مخصوص کیا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں روزہ رکھنے میں بڑی مستعدی کرتی ہیں اور نماز پڑھنا ان پر قیامت ہوتا ہے اس لئے کہ افعال و جود میں مشقت زیادہ ہے اور نہ کھانے میں عورتوں کا کچھ کمال بھی نہیں اس لئے اول تو مزاج بارو جس میں تحلیل رطوبات کم ہوتی ہیں دوسرے کھانا پکانے سے طبعیت سیر ہو جاتی ہے اور مردوں میں یہ امور محقق نہیں ہیں۔

خشوع کی ضرورت

نماز کو جو آیت میں دشوار کہا گیا ہے اس سے خاشعین کو مستثنیٰ بھی فرمایا ہے کہ وہ خاشعین پر مشکل نہیں اس لئے خشوع کی بھی ضرورت ہے تاکہ اس سے نماز آسان ہو اس واسطے خشوع پیدا کرنے کی ترکیب بھی الذین یظنون الخ میں ارشاد فرمائی یعنی وہ یوں خیال کرتے ہیں کہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں بخدا یہ خشوع پیدا کرنے کے لئے عجیب علاج ہے آدمی ہر عبادت میں یہی خیال کر لے کہ یہ میرا خدا سے ملنے کا آخری وقت ہے تو بڑا خشوع ہی ہوگا اسی لئے رسول ﷺ کا ارشاد ہے صل صلوٰۃ مودع مودع یعنی رخصت کئے گئے شخص جیسی نماز پڑھو۔

قرآن شریف اور محاورات عرب میں ظن کے وسیع معنی

فرمایا کتب درسیہ کے بعد قرآن شریف کی تفسیر کو پڑھنے سے لغات اور اصطلاحات میں غلط ہو جاتا ہے اور اس سے بہت سی غلطیاں ہو جاتی ہیں مثلاً لفظ ظن کو قرآن شریف میں ملا کر حسن کے ظن کی اصطلاح میں سمجھ گئے پھر اس سے احکام میں خبط ہونے لگا حالانکہ قرآن شریف میں اور اسی طرح محاورات عرب میں ظن یقین سے لے کر خیالات باطلہ تک بولا جاتا ہے مثلاً **إِنَّمَا الْكِبِيرَةُ إِلَّا عَلَى الْغَشِيحِينَ** **الَّذِينَ يُظُنُّونَ** میں ظن بمعنی یقین ہے اور ان نظن الا ظنا میں ظن بمعنی خیالات باطلہ مستعمل ہے اور باقی مراتب کی مثالیں تم خود سمجھ لو گویا علم کے جمیع مراتب پر ظن کا اطلاق آتا ہے جیسا قرینہ ہو۔ اب یہ اشکال نہ رہا کہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئا سے بعض مسائل کی تخصیص کی جائے کیونکہ فروغ فقیہ میں تو ظن بمعنی جانب راجح معتبر بلکہ آیت میں ظن سے مراد خیال بلا دلیل ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس قسم کا ظن اثبات حق کے لئے کافی نہیں باقی جو ظن مستدالی الدلیل ہو وہ مثبت حکم ظنی ہو سکتا ہے۔

نماز روزہ سے زیادہ مشکل ہے

ارشاد ربانی ہے **وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّوْمِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّمَا الْكِبِيرَةُ إِلَّا عَلَى الْغَشِيحِينَ** (یعنی مدد لو صبر اور نماز سے اور بے شک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں۔) (البقرہ آیت ۲۵) حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے نماز میں تو تخفیف کی درخواست کی لیکن روزہ کا عدد تم سے تین نہیں کرایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ روزہ نماز سے آسان ہے (عصم المصنف ۲۹) اگر نماز روزہ کے برابر ہوتی تو ثانی یا آجاتی (عصم المصنف ۱۲) چنانچہ اب بھی لوگ روزہ کا اہتمام زیادہ کرتے ہیں بلکہ اپنے نابالغ بچوں تک کو رکھواتے ہیں لیکن سارا ماہ اہتمام سے تراویح باجماعت نہیں پڑھتے اور دشوار سمجھتے ہیں۔ بعض تو مطلقاً تراویح نہیں پڑھتے۔

نماز میں پابندی زیادہ ہے چنانچہ بولنے کی بھی پابندی ہے لیکن روزہ میں کوئی ایسی پابندی نہیں چنانچہ اگر کوئی دن بھر سوتا ہے تب بھی اس کا روزہ صحیح ہو جائے گا (عصم المصنف) نماز میں کوئی فعل مفسد صلوٰۃ نسیان سے صادر ہو جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے اور روزہ میں کوئی فعل نسیان ہو جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ نماز کی ہیئت مذکر ہے اس لئے نسیان عذر نہیں اور روزہ کی ہیئت مذکر نہیں اس لئے نسیان عذر ہے اور ظاہر ہے کہ نماز کا مذکر ہونا اس کے وجودی ہونے اور صوم کا مذکر نہ ہونا اس کے عدمی ہونے کی دلیل ہے اور وجودیت کا شاق ہونا اور عدمی کا سہل ہونا لوازم طبعیہ سے ہے (عصم المصنف عن عم الانوف)

حق تعالیٰ شانہ نے بھی مذکورہ آیت میں نماز کو **وَأِنَّمَا الْكِبِيرَةُ** فرما کر بندوں کے جذبات کی رعایت فرمادی لیکن **إِلَّا عَلَى الْغَشِيحِينَ** **الَّذِينَ يُظُنُّونَ** **أَنَّهُمْ تَلَقَّوْا رِجْمًا وَأَنَّهُمْ مَالِيَةٌ رِجْعُونَ** فرما کر گرانی کی تسہیل کا طریقہ بھی بتلادیا کہ

خشوع حاصل ہونے کے بعد نماز گراں نہ رہے گی اور خشوع دیدار الہی کا استحضار اور موت کا دھیان رکھنے سے حاصل ہوگا۔

نماز کی گرائی دور کرنے کا طریقہ

بہر حال اس میں شک نہیں کہ نماز کے اندر جو پابندی ہے وہ نفس کو بہت گراں ہے اور قرآن میں اس کی گرائی کو تسلیم کیا گیا ہے **وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ** بے شک نماز بہت گراں ہے مگر اب حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ آگے اس گرائی کے زائل کرنے کی بھی تدبیر بتلاتے ہیں **إِلَّا عَلَى الْغَشِيحِينَ** یعنی مگر خشوع کرنے والوں پر نماز گراں نہیں ظاہر میں مقصود استثنا ہے مگر درحقیقت اس میں بتلانا مقصود ہے کہ نماز کی گرائی کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خشوع حاصل کرو۔ خشوع کے معنی عربی میں سکون ہیں اور سکون حرکت کا ضد ہے اور قاعدہ ہے کہ علاج بالضد ہوتا ہے پس حاصل علاج کا یہ ہوا کہ نماز گراں اس لئے تھی کہ قلب متحرک رہنا چاہتا ہے تم اس کو سکون کا عادی کرو تو یہ گرائی باقی نہ رہے گی۔ اس جگہ میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آیت کی اس عنوان سے تقریر کرنا ہمارے ذمہ ضروری نہیں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ خشوع سے گرائی نہیں رہتی مگر ایسی تقریر کر دینا محض سامعین کی خاطر ہے مگر شاید کوئی اس علاج پر یہ شبہ کرے کہ یہ تدبیر تو صحیح مگر یہ تو ایسی تدبیر ہوئی جیسے کسی نے کہا تھا کہ ایک منٹ میں سات دفعہ سورہ بقرہ پڑھ لو تو سلطنت ہفت اقلیم مل جائے گی۔ یا جیسے گاندھی نے کہا تھا کہ سب ہندوستانی اتفاق کر کے گورنمنٹ سے ترک موالات کر دیں تو سورج مل جائے گا یہ تو مسلم مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں اتفاق ہو بھی سکتا ہے ہرگز نہیں یہاں کی آب و ہوا میں خاصیت یہ ہے کہ یہاں اتفاق ہو نہیں سکتا اور ہو بھی جائے تو رہ نہیں سکتا تو یہ علاج بھی ایسا ہی ہوا کہ قلب کو سکون کا عادی کر لو نماز گراں نہ رہے گی یہ تو مسلم مگر سکون کیونکر حاصل ہو۔

خشوع قلب حاصل کرنے کا طریقہ

تو صاحبو! اللہ تعالیٰ نے ایسی تدبیر نہیں بتلائی جو حاصل نہ ہو سکے چنانچہ آگے خشوع حاصل کرنے کا بھی طریقہ بتلاتے ہیں **الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبَّهُمْ** کہ خشوع قلب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لقاء رب کا مراقبہ کرو کیونکہ لقاء رب کا مراقبہ قاطع جملہ افکار ہے جس دل میں یہ مراقبہ ہو گا وہاں اور کوئی فکر جم نہیں سکتا پس سکون قلب اور خشوع حاصل ہو جائے گا اسی کو دوسری آیت میں فرماتے ہیں **أَلَا يَهْدِي اللَّهُ تَطْمِينُ الْقُلُوبِ** کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے خشوع اور اطمینان اور سکون سب متحد ہیں اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اطمینان ایمان کے علاوہ کوئی اور شے ہے کیونکہ اطمینان خشوع کا مرادف ہے اور بغیر خشوع کے ایمان حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہت لوگ ایماندار ہیں جن کو خشوع حاصل نہیں تو ایمان بھی بدوں اطمینان متحقق ہو سکتا ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا

هُزُؤًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۷۳﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ

لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا يَكْرُهُ عَوَانٌ بَيْنَ

ذَلِكَ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿۷۴﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْهَا قَالَ

إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءٌ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿۷۵﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ

لَمُهْتَدُونَ ﴿۷۶﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي

الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْإِن جِئْتَ بِالْحَقِّ فَرَجَعْنَا وَمَا

كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿۷۷﴾ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَرَأْتُمُوهَا فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجُ مَا

كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۷۸﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَى

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۷۹﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ

كَالْحِجَارَةِ أَوَّسَدُ قَسْوَةً وَإِنْ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنْ

مِنْهَا لَمَا يَشْقُقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ

اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۸۰﴾

ترجمہ: اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ بیل ذبح کر دو وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخر بناتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ معاذ اللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں آپ نے فرمایا کہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہونہ بالکل بوڑھا ہونہ بہت بچہ ہو پٹھا ہو دونوں عمروں کے درمیان سواب کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے کہنے لگے درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے یہ بیان کر دیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ آپ

نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو وہ ناظمین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں سے اس کے اوصاف کیا کیا ہوں کیونکہ ہم کو اس بیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ٹھیک سمجھ جاویں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق باری تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ بل چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاتی ہے اور نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جاوے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی اور پھر اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم ہوتے نہ تھے کہ جب تم لوگوں نے ایک آدمی کا خون کر دیا پھر ایک دوسرے پر اس کو ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھو دو اس طرح حق تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دیں گے اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس موقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو ایسے واقعات کے بعد پھر بھی تمہارے دل سخت ہی رہے تو ان کی مثال پتھر کی سی ہے یا سختی میں اس سے زیادہ اور بعض پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں اور ان ہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے اور ان ہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے اوپر سے نیچے کلڑھک آتے ہیں اور حق تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہیں)

تفسیری نکات

قصبہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص تھا اس کے داروں نے طمع مال میں اس کو قتل کر دیا تھا کہ جلدی سے اس کے مال پر قبضہ ہو جائے قتل کر کے پھر خود ہی خون کے مدعی ہو گئے۔ جب قاتل خود مدعی ہو تو قاتل کا پتہ کون دے اس لئے سب کی رائے ہوئی کہ اس قصہ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے جایا جائے وہ وحی وغیرہ سے قاتل کا پتہ بتلا دیں گے چنانچہ سب لوگ آپ کے پاس آئے آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا تو وہاں سے ایک جانور ذبح کرنے کا حکم ہوا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبُحُوا بَقَرَةً (جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک بیل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) بقرہ سے خاص گائے مراد نہیں اور نہ اس میں تاء تانیث کے لئے ہے بلکہ تاء وحدت کے لئے ہے اور بقرہ گائے بیل دونوں کو عام ہے اور بظاہر اس جگہ بیل ہی مراد ہے کیونکہ آگے اس کی صفت میں یہ بات مذکور ہے لَأَذْكُلُنَّ لَكُمْ قَبَدًا طَيِّبًا وَلَا تَسْتَعْتِبُوا السُّرُتَ ۗ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ کہ وہ کام کاج میں پامال نہ ہو زمین کو جوتا اور کھیتی کو پانی نہ دیتا ہو اور یہ شان بیل کی ہوتی ہے گائے سے مل نہیں چلاتے نہ اس سے کھیتی کو پانی دیتے ہیں ہاں اس زمانہ میں اگر گائے سے بھی یہ کام لیا جاتا ہو تو خیر ممکن ہے اس وقت گائیں مضبوط ہوتی ہوں جو بیل کا کام دیتی ہوں جیسے بعض لوگ عورتوں سے چور مروایا کرتے ہیں بعض عورتیں اللہ کی بندیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ مردوں کی طرح چور کو مار لیتی ہیں اور جس طرح بعض عورتیں بہادر ہوتی ہیں ایسے ہی بعض مرد عورت ہوتے ہیں۔

جب بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے آ کر قصہ عرض کیا انہوں نے جناب باری سے دعاء کی وہاں سے حکم ہوا

کہ ایک بقرہ ذبح کرو اور یہ نہیں بتلایا کہ بقرہ ذبح کرنے سے کیا ہوگا قاتل کا پتہ اس سے کیونکر معلوم ہوگا کیونکہ آقا کو کچھ ضرورت نہیں ہے پوری بات بیان کرنے کی اور اپنے احکام کی علت و حکمت اور غایت بتلانے کی مگر غلام کا ادب یہ ہے کہ چون و چرا نہ کرے جو حکم ہو فوراً بجالائے اور جتنی بات کہی جائے اس کی جلدی تعمیل کر دے چاہے اس کا فائدہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر بنی اسرائیل نے ایسا نہ کیا وہ چوں و چرا میں پڑ گئے حکم کے سنتے ہی نبی پر اعتراض کر دیا۔ قَالُوا اَنْتَ تَخَذُ نَاهُزُوا کیا آپ ہم سے مسخرہ کرتے ہیں۔

حکیم کے احکام حکمت سے خالی نہیں

فشاء بنی اسرائیل کی اس غلطی کا یہ ہوا کہ وہ تو قاتل کو دریافت کرنے آئے تھے اور یہاں حکم ہو ذبح بقرہ کا تو وہ سوچنے لگے کہ سوال جواب میں جوڑ کیا ہوا ہمیں قاتل کا پتہ پوچھنا تھا اس کا جواب یہ تھا کہ نام بتلا دیتے فلاں ہے یا فلاں یہ بے جوڑ حکم کیسا کہ بقرہ ذبح کرو۔

درس عبرت

بنی اسرائیل کو سمجھنا چاہیے تھا کہ حق تعالیٰ حکیم ہے ان کے احکام میں کچھ حکمت ہوگی ہم نہ سمجھیں تو کیا ہے مگر انہوں نے اپنی عقل سے چون و چرا کو دخل دیا یہ خلاف ادب ہے خوب سمجھ لو اول تو انہوں نے ذبح بقرہ کے حکم کو معاذ اللہ اس پر محمول کیا کہ موسیٰ علیہ السلام ہم سے دلی لگی کرتے ہیں یہ نبی کا ادب تھا بھلا نبی ان سے مسخرین کیوں کرنے لگے تھے اور اگر مزاح کرتے بھی تو اس کے لئے وقت موقع ہوتا ہے یہ کیا موقع تھا مزاح کا کہ لوگ تو ایک مقدمہ فیصلہ کرانے آئیں اور نبی ان سے دل لگی کریں پھر دل لگی بھی اس عنوان سے اِنَّ اللّٰهَ يَامُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوا بَقْرَةً (اللہ تعالیٰ تم کو ایک بتل ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں) خدا تعالیٰ کی طرف ایک حکم کو منسوب کر کے اگر یہ بھی دل لگی ہو سکتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ معاذ اللہ موسیٰ علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کی طرف یہ حکم غلط منسوب کر دیا استغفر اللہ بھلا اس عنوان سے کچھ بھی مزاح کا احتمال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں مگر بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو بے دھڑک کہہ دیا اَنْتَ تَخَذُ نَاهُزُوا (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) موسیٰ علیہ السلام نے لرز کر ڈر کر فرمایا اَنْعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْيٰهٰوِلِيْنَ (نعوذ باللہ جو میں جہالت والوں کا سا کام کروں) بتلا دیا کہ احکام الہی بیان کرتے ہوئے دل لگی کرنا جہالت ہے اور نبی جہالت سے معصوم ہے پھر تمہارا اپنے پیغمبر کو ایسی بات کہنا گنوار پن کی دلیل ہے اب ان کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ حکم خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے چاہئے تھا کہ اب دیر نہ کرتے فوراً تعمیل کر دیتے مگر چونکہ ان کو یہ خلجان ہو رہا تھا کہ ذبح بقرہ کو قاتل کو پتہ سے کیا جوڑ ہے اس لئے مختلف حالات میں پڑ کر متردد ہو گئے اور سوچنے لگے کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہوگا جس کو اس کام میں دخل ہوگا اس لئے سوال کیا قَالُوا اذْعُنَا رَبُّكَ يٰبَيْنٰنَا مَا هٰی کہنے لگے اے موسیٰ علیہ السلام اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ صاف صاف ہم کو بتلا دیں وہ بقرہ کیا چیز ہے معنی کیسی ہے۔

قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت پر سمجھنے کی ضرورت

ماہی سے اصطلاح معقول پر سوال مراد نہیں جو سوال حقیقت کے لئے موضوع ہے کیونکہ حقیقت تو ان کو معلوم ہو چکی تھی کہ بقرہ ہے بلکہ ماہی سے سوال صفات مراد ہے ای ما صفاتها (اس کی صفات کیا ہیں) اور محاورات میں ماہی سے سوال صفات بھی ہوتا ہے یہاں محاورات ہی کے موافق استعمال ہے لوگ غضب کرتے ہیں قرآن مجید کو اصطلاحات فنون حاصل کرنے کے بعد پڑھتے ہیں پھر ان اصطلاحات کو قرآن مجید میں جاری کرتے ہیں جس سے اشکال پڑتا ہے اور خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں۔ بھلا قرآن کریم کو اصطلاحات فنون کا اتباع کس دلیل سے لازم ہے قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت اور محاورات پر سمجھنا چاہیے اصطلاحات علوم پر منطبق نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ سب اصطلاحات نزول قرآن کے بعد مدون ہوئی ہیں باقی اس کا انکار نہیں کیا جاتا کہ ماہی محاورات میں بھی کبھی سوال حقیقت کے لئے آتا ہے مگر اس میں ہی منحصر نہیں۔

سوال کیفیات و صفات کے لئے بھی بہت مستعمل ہے اور ممکن ہے کہ اس کو سوال عن الماہیۃ پر محمول کر کے کہا جاوے کہ ان لوگوں نے صفات کا سوال ماہی سے اس لئے کیا ہو کہ اس عجیب بقرہ کے صفات کا مجہول ہونا گویا ان کے ذہن میں خود ذات کا مجہول ہونا تھا وہ یہ سمجھے کہ جس بقرہ کے ذبح کا ہم کو حکم ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے گائے بیلوں کے ساتھ صرف نام میں شرکت رکھتا ہے اور خواص و کیفیات میں شاید ان سب سے ممتاز ہوگا۔

وہاں سے جواب ملا قَالَ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بَكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ فَاَفْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ (آپ نے یہ فرمایا کہ وہ فرماتے ہیں وہ ایسا بیل ہونہ بالکل بوزھا بچہ ہو پٹھا ہود و عمروں کے درمیان سواب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے)

بے ادبی کی سزا

اب ادھر سے بھی تشدد شروع ہوا کیونکہ غلام کا آقا کے حکم میں چون و چرا اور توقف کرنا خلاف ادب ہے جس کی سزا ان کو دی گئی کہ اچھا جب تم ہمارے حکم کو بے جوڑ سمجھتے ہو (کہ اس کو ہمارے سوال سے کچھ ربط نہیں) اور اس لئے بقرہ کے بارہ میں متعجب و متردد ہو کہ شاید کوئی خاص بقرہ ہوگا تو ہم بھی ایسی قیود کا اضافہ کرتے ہیں جن سے تم کو حقیقت نظر آ جائے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہم کسی نوکر سے کہیں کہ بازار سے پانی پینے کا کٹورا خرید لاؤ اس کو چاہیے کہ اس بات کے سنتے ہی حکم کی تعمیل کرے مگر نہیں اب وہ پوچھتا ہے حضور کتنا بڑا لاؤں یہ سوال محض لغو ہے کیونکہ پانی پینے کا کٹورا سب جانتے ہیں کتنا بڑا ہوا کرتا ہے مگر اس کی اس کاوش پر کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا ہو جس میں پورا آدھ سیر پانی آتا ہونہ اس سے زیادہ ہونہ کم اگر کچھ بھی کم و بیش ہوا تو واپس کر دیں گے لیجئے اب اس کے لئے دن بھر کا دھندا ہو گیا پھر نکریں مارتا ہو سارے بازار میں اگر وہ سنتے ہی حکم کی تعمیل کر دیتا تو یہ مصیبت نہ اٹھانی پڑتی اسی طرح بنی اسرائیل نے چون و چرا کر کے خود اپنے سر مصیبت دھری ورنہ کوئی سی گائے بیل بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا چنانچہ حدیث شریف میں ہے لَوِذَّبَحُوا اِیْ بِقَرَةِ اجْزَا اَتِهِمْ وَلٰكِنْ شَدَّدَ وَاللّٰهُ عَلَیْهِمْ (اگر وہ کوئی سا بیل بھی ذبح کر ڈالتے تو ان کو کافی ہوتا لیکن انہوں نے اپنے اوپر

سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی ڈال دی اب ان کے سوال پر یہ قید بڑھائی گئی کہ وہ بقرہ نہ تو عمر رسیدہ ہونہ بچہ ہو بلکہ درمیانی عمر کا ہو یہ قید بھی کچھ زیادہ سخت نہ تھی کیونکہ اس شان کے تیل گائے بھی بہت دستیاب ہو سکتے ہیں اور خیر خواہی اور شفقت کے طور پر یہ بھی کہہ دیا گیا **فَاعْمَلُوا مِمَّا تُوْمَرُونَ** کہ جو کچھ تم کو حکم دیا گیا ہے اس کو کر ڈالو۔ اس میں زیادہ کاوش نہ کرو مگر وہ کب ماننے والے تھے ان کو اس صفت سے اور تردد پیدا ہو گیا کہ یہ تو کوئی خاص صفت نہ ہوئی ایسی گائے تیل تو بہت موجود ہیں اس لئے دوبارہ پھر سوال کیا **قَالُوا اذْعُرْنَا رَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا لَوْ نُهِيَٰ** یعنی ہم کو یہ بھی بتلا دیا جائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے وہاں سے رنگ بھی متعین کر دیا گیا۔ **قَالَ اِنَّهُ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعَةٌ لَوْنُهَا تَسْوُ النَّظِيرِيْنَ** کہ وہ بقرہ زرد رنگ کا ہو جس کی زردی خوب گہری ہو جو اپنے رنگ سے دیکھنے والوں کو خوش کر دے ان کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی کیونکہ اس رنگ کی بھی بہت سی گائے تیل تھیں اور وہ لوگ تعین جزئی کے طالب تھے کہ بس ایسا یہ نشان بتلا دیا جائے جس میں غیر کا احتمال ہی نہ رہے (مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ وہ گائے یا تیل جو فلاں جنگل میں فلاں کھیت میں ایسے ایسے درخت کے پاس چر رہا ہے یا وہ تیل جو فلاں شخص کے پاس وغیرہ اور حق تعالیٰ کی طرف سے جتنی صفات بتلائی گئیں وہ سب صفات کلیہ تھیں اور قاعدہ ہے کہ صفات کلیہ چاہے کتنی ہی ہوں ان سے تعین نہیں ہوتی احتمال شرکت باقی رہتا ہے جیسے ایک وہمی کا قصہ ہے کہ وہ نماز میں جب کسی امام کی اقتدا کرتا تو پہلے یہ کہتا کہ اقتدا کرتا ہوں میں اس امام کی جو میرے آگے ہے اس سے بھی تسلی نہ ہوتی تو پھر کہتا کہ جس کا لباس ایسا ہے جس کا یہ نام ہے پھر وہم ہوتا کہ شاید میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہو اور اس کا یہ نام ہو تو پھر اس کی کمر میں انگلی چھو کر کہتا پیچھے اس امام کے تو یہ شخص اس حقیقت کو سمجھا کہ صفات کلیہ سے تعین نہیں ہوتی تعین اشارہ جزئیہ سے ہوتی ہے وہ بھی اس طرح کہ اس پر ہاتھ رکھ دیا جائے۔

اسی طرح بنی اسرائیل کو بھی ان صفات سے تسلی نہ ہوئی تو سہ بارہ پھر سوال کیا **قَالُوا اذْعُرْنَا رَبِّكَ يُبَيِّنُ لَنَا مَا هِيَ** اِنَّ الْبَقْرَةَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ (کہنے لگے ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کر دیجئے کہ ہم سے بیان کر دیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں ہم کو اس تیل میں اشتباہ ہے اور ہم ان شاء اللہ ضرور ٹھیک سمجھ جائیں گے) یعنی ایک مرتبہ اور بتلا دیا جائے کہ وہ بقرہ کیسی ہے ان صفات سے تو تعین نہیں ہوتی بلکہ اس شان کی بہت افراد ہیں جن کو ہم کو تشابہ التباس ہو رہا ہے ہم متردد ہیں کہ کون سا بقرہ ذبح کریں ایک دفعہ اور وضاحت کر دی جائے ان شاء اللہ ہم راہ پا جائیں گے یعنی سمجھ جائیں گے اس مرتبہ یہ خیر ہوئی کہ ان کے منہ سے ان شاء اللہ نکل گیا۔

ان شاء اللہ کی برکت

حدیث میں آتا ہے **ولو لم يستنوا لما بين لهم اخر الابد** (او کما قال) یعنی بنی اسرائیل اگر استننا نہ کرتے (یعنی ان شاء اللہ نہ کہتے) تو قیامت تک ان کو پتہ نہ دیا جاتا مگر ان شاء اللہ کی برکت سے یہ سلسلہ سوالات و جوابات کا جلدی ہی ختم ہو گیا چنانچہ ارشاد ہوا۔ **قَالَ اِنَّهُ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقْرَةٌ لَّا ذُلُوْلٌ تُشِيرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْعَرِيْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيْءَ فِيْهَا** **قَالُوا لَنْ نَّجِدَنَّ بِالْحَقِّ قَدْ بَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ** (موسیٰ) علیہ السلام نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ

وہ مل چلا ہوا ہو جس سے زمین جوتی جاتی ہے اور نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جائے سالم ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو کہنے لگے اب آپ نے پوری بات فرمائی اور اس کو ذبح کیا اور کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے کہ وہ ایسا بقرہ ہے جو کام کاج میں استعمال نہیں کیا گیا نہ زمین کو جوتا ہے نہ کھیت کو پانی دیتا ہے اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بقرہ سے نیل مراد ہے تندرست بدن کا ہے جس پر کوئی داغ دھبہ ذرا نہیں مطلب یہ کہ جو جانور کھیتی وغیرہ کے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کے بدن پر جو ارمکھنے کا نشان یا مار پیٹ کا نشان ہو جاتا ہے وہ ایسا نہ ہو اب سمجھنے لگے بس اب لائے تم ٹھیک بات یہاں اشکال ہوتا ہے کہ اخیر میں بھی تو کچھ زیادہ تعین نہیں ہوئی کیونکہ اس میں بھی تو صفات کلیہ ہی ہیں جزئیات نہیں اور تعین جزئیات سے ہوتی ہے نہ کلیات سے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر میں استثناء کی برکت سے ان کے لئے بیان ہو گیا تھا (جس سے مقبدر یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت ہو گئی تھی)

حالانکہ بظاہر اب بھی پہلے سے کچھ زیادہ وضاحت نہیں ہوئی جو صفات اخیر میں مذکور ہوئی ہیں اس شان کے نیل بھی بہت ہوتے ہیں تو بات یہ ہے کہ گو تعین جزئی اب بھی نہیں ہوئی مگر ان کی تسلی اس طرح ہو گئی کہ ان کے ذہن سے ان شاء اللہ کی برکت سے وہ مقدمات واہیہ نکل گئے اور وہ سمجھ گئے کہ تعین درست ہو گئی غرضیکہ اس کے بعد جانور کی تلاش ہوئی اور اس قدر گراں قیمت میں ان صفات کا جانور ملا کہ بقرہ کی کھال میں سونا بھر کر دینا پڑا مگر اس گرانی سے بنی اسرائیل گھبرائے نہیں خرید کر ذبح ہی کر دیا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَذَبْحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ کہ انہوں نے اس کو ذبح کر ہی دیا اور وہ کرنے والے تھے نہیں۔ یہاں سے ان شاء اللہ کی برکت معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض افعال کی تاثیر ایسی ہوتی ہے جو ظاہر ہو کر رہتی ہے گو کل زیادہ قابل نہ ہو (یعنی فاعل ان افعال کا چاہے کیسا ہی ہو پورا قابل یا کم قابل مگر فعل کا اثر ضرور ظاہر ہو کر رہتا ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ بعض افعال مؤثر بالخاصہ ہوتے ہیں جیسے بعض ادویہ مؤثر بالخاصہ ہوتی ہیں کہ خصوصیت مزاج ان کے اثر کو نہیں روک سکتی۔ تو جب بنی اسرائیل کے ان شاء اللہ کا یہ اثر ہوا کہ ان کی فہم اس کی برکت سے درست ہو گئی حالانکہ وہ کچھ زیادہ مؤدب بھی نہ تھے ان کا ادب تو اسی سے ظاہر ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ خطاب کیا اِنۡ خَلۡفٰنَا هٰذَا (کیا آپ ہم سے مسخرہ پن کرتے ہیں) پھر حکم الہی میں چون و چرا کی اور سب سے بڑی ”ادب“ کی بات تو وہ تھی جو انہوں نے اخیر میں کہی یعنی اَلَّذِيۡ جَعَلْتَنِيۡ بِالسَّحۡرِۡۃِ کہ اب لائے ٹھیک بات گویا اس سے پہلے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک نہ تھا اور یہ جملہ اس وقت کہا جب ان شاء اللہ کی برکت سے راہ پر آ گئے تھے فہم درست ہو گئی تھی تو جن کا سمجھ آ جانے کے بعد یہ ادب ہے ان کا مؤدب ہونا ظاہر ہے مگر پھر بھی ان شاء اللہ نے اپنا اثر کیا گو قائل زیادہ قابل نہ تھے بلکہ ناقابل تھے۔

تشبیہ نفس

نفس کو بقرہ کے ساتھ تشبیہ دنیا بہت ہی مناسب ہے اس کے بعد ارشاد ہے قَالَ اِنَّهَا يَقُولُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَاْرِضٌ وَلَا يَكْفُرُ عَوَانٌ بَيْنَ (یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بقرہ جس کے ذبح کا حکم ہوا ہے نہ تو بالکل بوڑھا ہونہ بہت بچہ ہو) بلکہ) پٹھا ہو دونوں عمروں کے اوسط میں لغت میں فارض کے معنی منقطع العمر ہیں یعنی جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ

قطع کر لیا ہو فرض کے معنی قطع ہیں تو فرض کے معنی بہت بوڑھے کے ہوئے اور بکر کہتے ہیں اس نر یا مادہ کو جو دوسرے سے جفت نہ ہو اور جانور عادیہ جوانی سے پہلے ہی بکر رہتا ہے جو ان ہونے کے بعد بکر نہیں رہتا پس بکر کے معنی یہاں بچہ کے ہیں جو ابھی تک جوان نہ ہوا ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ بقرہ نہ بچہ ہو نہ بوڑھا ہو بلکہ ان دونوں عمروں کے درمیان ہو جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ جوان ہو کیونکہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان جوانی ہی کا درجہ ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ علم اعتبار کے طور پر بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی جاتی ہے تو اس صفت کو بھی نفس پر جاری کرنا چاہیے جس سے اشارہ یہ ثابت ہوا کہ جوانی میں مجاہدہ نفس کی زیادہ فضیلت ہے کیونکہ اس وقت غلبہ قوت نفس کے سبب مجاہدہ شاق ہوتا ہے والا جبر بحسب المشقة (یعنی ثواب اعمال کا مشقت کے موافق ہے) جس عمل میں زیادہ مشقت ہو وہ اس سے افضل ہے جس میں مشقت کم ہو نیز قوت بدن کے سبب عمل بھی زیادہ ہے اور ظاہر ہے کہ کثرت عمل موجب ہوگا کثرت ثواب کا اور اس سے لازم یہ آتا ہے کہ بچپن اور بڑھاپے میں مجاہدہ کرنا جوانی کے مجاہدہ کی برابر نہ ہو مگر یہاں ایک سوال و جواب ضروری ہے وہ یہ کہ جوانی کے مجاہدہ میں دو درجے ہیں ایک یہ کہ جوانی میں مجاہدہ کرتے ہوئے کام زیادہ کیا یا مقاومت نفس میں مشقت زیادہ برداشت کرنا پڑی اور اتنا کام اور اتنی مشقت بچپن اور بڑھاپے میں نہ کرنا پڑی اس صورت میں تو جوانی کے مجاہدہ کا بچپن کے اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس وقت عمل اکثر و اشد ہوا تو قرب و اجر بھی زیادہ ہوگا اور ایک درجہ یہ ہے کہ جوانی میں بحالت مجاہدہ عمل زیادہ نہیں کیا نہ مشقت زیادہ ہوئی بلکہ اتفاق سے کسی محل میں عمل و مشقت اتنی ہی کرنا پڑی جتنی بچپن یا بڑھاپے کے مجاہدہ میں ہوتی تو کیا اس صورت میں بھی جوانی کا مجاہدہ بچپن اور بڑھاپے کے مجاہدہ سے افضل ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں جوانی اور بڑھاپے کا مجاہدہ برابر ہو کیونکہ مجاہدہ شباب کی فضیلت بوجہ شدت و کثرت عمل کے تھی اور وہ اس صورت میں مفقود ہے۔

بقرہ کی ایک صفت یہ مذکور ہے قَالَ اِنَّهَا يَقُولُ اِنَّهَا بَقْرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ۔ یعنی ارشاد ہے کہ وہ بقرہ زرد رنگ کی ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو۔ اس صفت کو بھی نفس سے مناسبت ہے کیونکہ صوفیہ کو لطیفہ نفس کا رنگ بھی زرد ہی مکشوف ہوا ہے اور اس کو لطیفہ میں نے اصطلاح کے اعتبار سے کہہ دیا اور وہ اصطلاح بھی تغلیب پر مبنی ہے ورنہ وہ تو کثیفہ ہے البتہ مجاہدہ سے مطمئن ہونے کے بعد ایک معنی کر لطیفہ ہی بن جاتا ہے ایک صفت بقرہ کی یہ ہے لَّا ذُلُّ لَهَا وَّلَا تَحِيُّرٌ اَلْاَرْضِ وَلَا تَسْقَى الْحَرَّةَ مُسْكِمَةً لَّاسِنَّةٍ فِيهَا كَدُّ بَقْرَةٍ كَامِ كَاجٍ مِّنْ مَّسْتَعْمَلٍ نَّهْ هُوَ زَمِيْنٌ كُوْجُوْتًا هُوَ نَهْ كَهِيْتٌ كُوْپَانِي دِيْتًا هُوَ اس مِيْن دَاغِ وَهَبْ نَهْ هُوَ اس مِيْن اِسَارَهْ هِيْ نَفْسِ كِيْ فِرَاغِ كِيْ طَرَفِ يَعْنِيْ مَجَاهِدَهْ سِيْ پَهْلِيْ نَفْسِ كُوْ تَمَامِ اِفْكَارِ وَتَعْلُقَاتِ سِيْ فَاغِ كَرِ كِيْ سُوْ هُوَ كَرِ مَجَاهِدَهْ كَرْنَا چَاهِيْ كِيْ اَسِيْ حَالَتِ مِيْنِ مَجَاهِدَهْ كَا اِثْرُ پُوْرَا ظَاہِرْ هُوْتَا هِيْ كِچھ دِنُوں كِيْ لِنِيْ سَارِيْ كَارِ وَبَارِ كِسِيْ كِيْ سِرْدِ كَرِ كِيْ عَزَلَتِ گَزِيْ هُوَ كَرِ مَجَاهِدَهْ كَرِ وَپُھَرِ دِيْ كِھُوْ كِيْ كَتْنِيْ جَلْدِيْ اِثْرْ هُوْتَا هِيْ كُوْ مَجَاهِدَهْ بِحَالَتِ شُغْلِ بِيْ اِپْنَا اِثْرِ دِكْھَا تَا هِيْ مَگَرِ تَجْرِبَهْ هِيْ كِيْ حَالَتِ فِرَاغِ مِيْنِ جِيْسَا اِثْرِ كَامِلْ هُوْتَا هِيْ وَبِيْسَا بِحَالَتِ شُغْلِ نَهِيْ هُوْتَا يَهِيْ وَجِهْ هِيْ كِيْ پَهْلِيْ زَمَانَهْ مِيْنِ نَسْبِيْتِيْنِ قُوِيْ هُوْتِيْ تَهِيْنِ اُوْرِ حَالَاتِ بِيْ عَالِيْ طَارِيْ هُوْتِيْ تَهِيْ كِيْونكِيْ پَهْلِيْ زَمَانَهْ مِيْنِ طَالِبِيْنِ فِرَاغِ كِيْ سَاتْھِ مَشْغُوْلِ مَجَاهِدَهْ

ہوتے تھے اور مُسَلَّمَةٌ لَا شَيْئَةَ فِيهَا صحیح و سالم ہو اس میں داغ و دھبہ نہ ہو میں اس طرف اشارہ ہے کہ نفس مجاہدہ سے پہلے تمام معاصی سے پاک صاف ہو جائے یعنی معاصی سابقہ سے توبہ صادق کر کے مجاہدہ کرے اگر کسی بندہ کے حقوق ذمہ ہوں ان کو ادا کر دے یا معاف کر لے اور خدا کا حق جیسے نماز روزہ قضا ہو گیا ہو تو اس سے توبہ کر کے ان کی قضا شروع کر دے اس طرح توبہ کرنے سے نفس گناہوں سے بالکل پاک ہو جائے گا کیونکہ التائب من الذنب کمن لا ذنب له (پس وہ اسی کا مصداق ہوگا مُسَلَّمَةٌ لَا شَيْئَةَ فِيهَا)

احکام خداوندی میں جحیتیں نکالنا بڑا جرم ہے

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخَبِّرٌ بِمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ اور جب تم نے ایک جان کا خون کر دیا پھر اس کو ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور حق تعالیٰ کو اس بات کا ظاہر کرنا تھا جسے تم چھپا رہے تھے یہ اس قصہ کی ابتداء ہے جس کو ترتیب میں مؤخر کیا گیا ہے۔ مفسرین نے اس تقدیم و تاخیر میں بہت سے نکات لکھے ہیں ان سب میں سہل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس مقام پر دور سے بنی اسرائیل کی بے عنوانیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے اور یہاں بھی اس کا بتلانا مقصود ہے اور اس قصہ میں بنی اسرائیل سے دو بے عنوانیاں ہوئی تھیں ایک قتل کر کے اخفا و اردات کرنا دوسرے احکام خداوندی میں خواہ مخواہ کی جحیتیں نکالنا۔ پہلی بے عنوانی ابتداء قصہ میں ہوئی اور دوسری اس کے بعد اگر قصہ کو ترتیب وار بیان کیا جاتا تو ناظرین پہلے جزو کو مقصود سمجھتے اور دوسرے جزو کو تمہیم قصہ پر محمول کرتے اور ترتیب بدلنے سے صاف معلوم ہو گیا کہ دونوں ہی جزو مقصود ہیں اور ہر جزو سے ایک مستقل بے عنوانی پر تشبیہ کرنا منظور ہے (دوسرے احکام خداوندی میں جحیتیں نکالنا اخفاء و اردات سے بھی بڑھ کر جرم ہے اس لئے اس کو پہلے بیان کیا گیا کہ ناظرین کو تشبیہ ہو جائے تاکہ خدا کے نزدیک قتل وغیرہ کی نسبت احکام میں جحیتیں نکالنا زیادہ شدید ہے جس کو عام لوگ معمولی بات سمجھتے ہیں۔

اقتتال امر پر رحمت خداوندی

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَلِكَ يُخَيِّبُ اللَّهُ الْمُؤْتِقِينَ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (پس ہم نے حکم دیا کہ اس کو اس کے کوئی سے ٹکڑے سے چھو دو اس طرح حق تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)

پھر ہم نے کہا کہ اس مقتول پر بیل کے کسی عضو کو لگاؤ اس سے وہ زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلائے گا اس وقت گر کی بات بتلا دی کہ بیل کے ذبح کرنے کا حکم اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کے کسی عضو کے مس کرنے سے مقتول زندہ ہو جائے گا پہلے یہ بات نہیں بتلائی کیونکہ بنی اسرائیل کی اطاعت کا امتحان مقصود تھا جس میں وہ ناکام ثابت ہوئے مگر جب جحیتیں نکالنے کے بعد انہوں نے بقرہ کو ذبح کر دیا اس وقت اقتتال امر پر یہ رحمت فرمائی کہ اس حکم کی حکمت بتلائی گئی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس نے زندہ ہو کر قاتل کا نام بتلا دیا اور پھر مر گیا یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ مقتول کے قول پر فیصلہ کیونکر

ہوا کیونکہ مقتول بھی فی الجملہ مدعی ہوتا ہے اور مدعی کا قول محتاج بینہ یا اقرار مدعی علیہ کا ہے خود حجت نہیں۔
جواب یہ ہے کہ یہاں مقتول کا قول فی نفسہ حجت نہ تھا بلکہ حجت وحی تھی جس سے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ مقتول زندہ ہو کر جو کچھ کہے گا وہ صحیح ہوگا۔

علم اعتبار کی حقیقت

یہ تو قصہ تھا اب میں اس کو منطبق کرنا چاہتا ہوں مقصود پر یعنی مضمون مجاہدہ پر قربانی سے تو مناسبت اس قصہ کے جزو اول ہی کو تھی اس کا بیان تو بوجہ مناسبت زمانہ کے ضروری تھا ہی مگر چونکہ مجھے مجاہدہ سے بھی اس مضمون کی مناسبت بیان کرنا ہے اس لئے میں نے جزو اخیر کو بھی تلاوت کیا مجاہدہ کے مقصود سے اس کو مناسبت ہے اب یہ سمجھو کہ اس وقت میں جو کچھ بیان کروں گا وہ علم اعتبار ہوگا جو کہ تفسیر آیات نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس کو تفسیر سمجھا ہے وہی صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں مگر صوفیہ کی مراد علم اعتبار سے یہ نہیں ہے کہ نصوص کو ظاہر سے محرف کریں بلکہ ظاہر کو ظاہر پر رکھ کر پھر بطور قیاس کے امثال قرآنی کو وہ اپنے مقصود پر جاری کرتے ہیں اور یہ بھی ایک قسم کا قیاس ہے جس کی نصوص سے اجازت ہے جیسے فقہی قیاس کی اجازت ہے چنانچہ حق تعالیٰ سورہ حشر میں قصہ بنی نضیر کے بیان کے بعد فرماتے ہیں فاعتبروا یا اولی الابصار (اے بصیرت والو عبرت حاصل کرو اس واقعہ سے) تو اب اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کا مطلب کیا ہے یہی تو مطلب ہے کہ تم اپنے حال کو ان کے حال پر موازنہ کر کے دیکھو اگر تمہارے اندر ان جیسے اعمال و خصائل ہوں گے تو سمجھ لو کہ یہی معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا اسی طرح عاد و ثمود وغیرہ کے قصے بیان فرما کر ارشاد فرمایا لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (البتہ ان قصوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے) اب بتلایا جائے کہ ان کے قصے میں عبرت کیا ہے یہی تو ہے کہ ان کے اعمال میں غور کر کے اپنے کو ان سے بچائے یہی صوفیہ نے کیا ہے قصص قرآنیہ کو وہ اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں ان قصوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے (بلکہ ہر چیز کی نظیر اپنے اندر قائم کر کے مشابہ کے احکام کو مشابہہ پر جاری کرتے ہیں ۱۲)

مثلاً قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ جا بجا مذکور ہوا ہے اس کی تفسیر صوفیہ کے نزدیک بھی وہی ہے جو کتب تفاسیر میں مذکور ہے موسیٰ علیہ السلام سے وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ فرعون سے مراد خاص وہی شخص ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ تھا لیکن صوفیہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ تفسیر آیات کے بعد اس قصہ کو اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی ایک چیز موسیٰ علیہ السلام کے مشابہہ ہے یعنی روح یا عقل اور ایک چیز فرعون کے مشابہہ ہے یعنی نفس اور جس طرح فرعون کا غلبہ موسیٰ علیہ السلام پر باعث فساد تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا غالب ہونا موجب صلاح ہے اس کے بعد وہ تمام قصے کو روح و نفس کے معاملات پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں اب وہ کہتے ہیں کہ اِذْهَبْ إِلَى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ (فرعون کی طرف جاؤ اس نے سرکشی کی ہے) کے معنی علم اعتبار کے طور پر یہ ہیں اِذْهَبْ اِيهَا الرُّوحُ اِلَى النَّفْسِ اِنَّهُ طَغَىٰ (اے روح نفس کی طرف جا اس نے سرکشی کی ہے) تو بتلایئے اس میں شرعاً کیا خرابی ہے اس کی حقیقت قیاس فقہی کے قریب ہے۔

قیاس اور تشبیہ

اتفاق ہے کہ قیاس کا نتیجہ بواسطہ قیاس مدلول نص ہے اور اعتبار کا نتیجہ مدلول نص نہیں بلکہ مدلول نص کے مشابہ ہے اور اسی فرق کا یہ اثر ہے کہ حکم قیاسی میں تو اگر مستقل نص نہ ہو تب بھی مقیاس علیہ سے مقیاس میں حکم کو متعدی کر سکتے ہیں اور حکم اعتباری میں اگر مستقل نص نہ ہو تو مشابہ بہ سے مشابہ میں حکم کو متعدی نہیں کر سکتے جیسے حدیث شریف میں ہے لا تدخل المملکة بیتا فیہ کلب (اس گھر میں فرشتہ نہیں آتا جس میں کتا ہو) اور اس سے بطور اعتبار یہ کہا گیا ہے کہ لا تدخل الانوار الالہیة قلبا فیہ صفات سبعة (نہیں ہوتے داخل انوار الہی اس دل میں جس میں بہانگی صفات ہوں) تو اگر یہ حکم کسی مستقل دلیل سے ثابت نہ ہو تو محض اس نص سے حکم کا تعدیہ نہیں کر سکتے اس لئے بجائے قیاس کے اگر اس کا نام تشبیہ رکھا جاوے تو مناسب ہے تاکہ خلط نہ ہو۔

علم اعتبار کا سلف سے ثبوت

شاید تم یہ کہو کہ دلائل سے تو علم اعتبار کا صحیح ہونا اور خلاف شرع نہ ہونا معلوم ہو گیا لیکن یہ بتلاؤ کہ اس کا ثبوت کہیں سلف سے بھی اس قسم کی نظائر منقول ہیں چنانچہ رزین نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے جس کو تیسیر الاصول میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک آیت میں اسی طرح کا مطلب بیان فرمایا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلَمْ یَاۤیْنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اَنْ تَخْشَۡ قُلُوۡبُہُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مِنَ الْحَقِّ وَاَلَا یَکُوۡنُوۡا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیۡہِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوۡبُہُمْ وَکَثِیۡرٌ مِّنْہُمْ فِیۡسُقُوۡنَ (کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر ایک زمانہ گزر گیا پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی ان میں کے کافر ہیں)

اس میں تو خشوع کا امر ہے اور قساوت قلب سے بچنے کی تاکید ہے اس کے بعد فرماتے ہیں اِغْلُوۡا اَنْۢ اَللّٰہُ یُنۡزِلُ الْاَرْضَۢ بَعۡدَ مَوۡتِہَا قَدۡ بَیۡنَاۤ اَیۡتِ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوۡنَ (جان لو کہ حق تعالیٰ زمین کو بعد اس کے مردہ ہونے کے زندہ کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو)

قال ابن عباس لین القلوب بعد قسوتها فیجعلها مخبئة منیئة یحیی القلوب المیتة بالعلم والحكمة والا فقد علم احياء الارض بالمطر مشاهدة و مقصودة ان هذا امثل ضربه الله لعباده و یرید ان قلوبکم کالارض فلا تبینسوا من قساوتها فانها یحیی بالاعمال کالارض تحیی بالغیث

(حضرت ابن عباس نے فرمایا نرم کر دیا دلوں کو بعد ان کی قساوت کے پس ان کو مطیع و فرمانبردار بنا دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو علم و حکمت کے ساتھ زندہ کرتے ہیں ورنہ جان لیا تھا زمین کے زندہ ہونے کو بارش سے مشاہدہ سے اور یہ مثال ہے کہ بیان کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اور مراد یہ ہے کہ ان کے دل مثل زمین کے ہیں پس ان کی قساوت سے نا امید مت ہو زندہ کر دیں گے ان کو اعمال سے مثل زمین کے کہ اس کو بارش سے زندہ کرتے ہیں)

یعنی مقصود عبد اللہ بن عباس کا یہ ہے کہ اَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا السَّخ (جان لو کہ حق تعالیٰ زمین کو بعد مردہ ہونے کے زندہ کر دیتے ہیں) اس میں حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے ایک مثال بیان فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ اس طرح زمین خشک ہو جانے کے بعد بارش سے زندہ ہو جاتی ہے اسی طرح قلوب بھی قساوت کے بعد اعمال صالحہ سے زندہ ہو جاتے ہیں پس اگر کسی کے قلب میں معاصی گزشتہ سے قساوت پیدا ہو گئی ہو تو وہ اصلاح سے مایوس نہ ہو کیونکہ زمین کی نظیر تمہارے لئے ہم نے بیان کر دی ہے اس پر اپنے قلوب کو بھی قیاس کر لو۔

تو اب دیکھ لو کہ حضرت عباس نے اس آیت میں ارض سے قلب مراد لیا اور موت سے قساوت یہی علم اعتبار ہے ورنہ لغت ارض کے معنی قلب اور موت کے معنی قساوت کے کہیں نہیں ہیں مگر انہوں نے آیت کو تشبیہ پر محمول کر کے یہ معنی بیان فرمائے ہیں اسی طرح صوفیہ بطور تشبیہ کے کہہ دیتے ہیں کہ موسیٰ سے مراد روح اور فرعون سے مراد نفس ہے و علیٰ هذا جب علم اعتبار کی نظیر سلف سے بھی منقول ہے اور قواعد شرع کے بھی وہ خلاف نہیں تو اب کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر وہ علم اعتبار کے طور پر اس قصہ کو مضمون مجاہدہ پر منطبق کر کے بیان کریں۔ الغرض اس جگہ یہ ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل کو ذبح بقرہ کا امر ہوا تھا۔

نفس کشی کا امر

اور اہل لطائف علم اعتبار کے طور پر یہ کہتے ہیں کہ گویا نفس کشی کا امر ہوا تھا گویا بقرہ سے نفس کو تشبیہ دی گئی ہے اور یہ تشبیہ بہت مناسب ہے کیونکہ گائے نیل بھی بہت حریص ہوتے ہیں کھانے پینے کے اور نفس بھی بہت حریص ہوتا ہے اس لئے نفس کو بقرہ کہنا تو مناسب ہے لیکن آج کل نفس کو کتا کہا جاتا ہے چنانچہ شعراء کے کلام میں سگ نفس بکثرت مستعمل ہے مگر یہ واہیات ہے اسی طرح بعض لوگ نفس کو کافر کہتے ہیں یہ اس سے بھی واہیات ہے ہمارا نفس تو الحمد للہ نہ کتا ہے نہ کافر ہے ہاں بقرہ تو ہوگا۔ نہ معلوم لوگ نفس کو کیا سمجھتے ہیں لغت میں تو نفس حقیقت شے کو کہتے ہیں پس نفس زید حقیقت زید ہوئی تو حقیقت میں نفس ہمارا ہی نام ہے ہم سے الگ کوئی چیز تھوڑا ہی ہے تو اپنے کو کتا یا کافر کہنا کیا زبا ہے اور اگر نفس کوئی مستقل چیز بھی ہو تب بھی اول تو وہ ہمیشہ شریر نہیں ہوتا کہ اس کو کتے سے تشبیہ دی جاوے۔

نفس کے تین اقسام

بلکہ کبھی مطمئن ہوتا ہے کبھی لوامہ بھی ہوتا ہے کبھی امارہ ہوتا ہے چنانچہ نصوص میں یہ تینوں صفات مذکور ہیں ایک جگہ ارشاد ہے۔ وَمَا أَرْبَىٰ نَفْسٌ إِلَّا نَفْسٌ لَّا مَعَارَةَ بِالْأَنْفُسِ (اور میں اپنے نفس کو بری نہیں بتلاتا نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے) دوسری جگہ ارشاد ہے لَّا أُقِيمُ بِمَوْرِ الْقِيَمَةِ وَلَا أُقِيمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَامَةِ (میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے)

اور تیسری جگہ ارشاد ہے

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

(اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش ہو اور وہ تجھ سے خوش ہو) پھر اگر شریر بھی ہو تب بھی مسلمان تو ہے تو مسلمان کو کافر کہنا یا کتے سے تشبیہ دینا کیا مناسب ہے ہاں بقرہ کے ساتھ تشبیہ دینے کا مضائقہ نہیں غرض جس طرح بقرہ کے ذبح کا امر ہوا تھا اسی طرح نفس کو بھی مجاہدہ سے ذبح کرنا چاہیے۔ بدون مجاہدہ کے کامیابی نہیں ہوتی بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے بس ویسے ہی کامیاب ہو جائیں۔

وَمِنْهُمْ أَهْتِيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِي وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُونَ ﴿۸۴﴾

ترجمہ: اور ان میں بہت سے ناخواندہ ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے لیکن دل خوش باتیں اور خیالات پکالتے ہیں۔

تفسیری نکات

خودرانی کی مذمت

ایک خط میں کسی نے یہ لکھا تھا کہ کلام کا بلا معنی پڑھنا حاصل ہے بر بناء آیت وَمِنْهُمْ أَهْتِيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ الخ فرمایا کہ افسوس لوگوں کو کیا ہو گیا کہ خودرانی اس درجہ ہو گئی ہے کہ کلام مجید ہی کو اڑانا چاہتے ہیں ایسے لوگوں کو جواب لکھنے سے کچھ نفع نہیں لیکن اس لئے لکھ دیتا ہوں کہ شاید اوروں کو ان کی تقریر سے شبہ پڑ جائے چنانچہ جواب لکھ دیا گیا کہ اس میں ان یہود کی تصحیح ہے جو نہ علم کو فروری سمجھتے تھے نہ عمل کو پس اس کی مذمت ہے نہ کہ ترجمہ نہ جاننے کی۔ (ملفوظات حکیم الامت)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا

بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۵﴾

ترجمہ: آپ (ان سے) یہ کہیے کہ جو شخص جبریل سے عداوت رکھے سو انہوں نے یہ قرآن آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپن سے قبل وای (ساوی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو۔

تفسیری نکات

قلب معانی کا ادراک کرتا ہے

چنانچہ ارشاد ہے قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيْلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللّٰهِ یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن حضور کے قلب پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ قلب معانی کا ادراک کرتا ہے اور الفاظ کا ادراک سمع کو ہوتا ہے پس اس سے لازم آتا ہے کہ منزل من اللہ صرف معانی ہوں الفاظ منزل من اللہ نہ ہوں اس کا ایک

جواب تو یہ ہے کہ اس سے بہت سے بہت معانی کا منزل ہونا معلوم ہوا الفاظ کا منزل نہ ہونا کیسے معلوم ہوا کیونکہ عدم ذکر دلیل ذکر عدم نہیں ہے ان کا منزل ہونا دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔ انا انزلناہ قرانا عربیا اور عربی ہونا صفت الفاظ ہی کی ہے مگر اس جواب سے عوام کو شفا نہیں ہوتی دوسرا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب نے دیا ہے اور یہ جواب ان کے سوا کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا وہ فرماتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ زبان داں کو اپنی مادری زبان میں گفتگو سنتے ہوئے اول التفات معانی کی طرف ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف بعد میں التفات ہوتا ہے اور غیر مادری زبان میں اول التفات الفاظ کی طرف ہوتا ہے ثانیاً معانی کی طرف جیسا کہ آپ لوگ اس وقت میرا بیان سن رہے ہیں چونکہ میں آپ کی مادری زبان میں بول رہا ہوں اس لئے معانی کی طرف آپ کو اول التفات ہوتا ہے اور الفاظ کی طرف اگر ہوتا ہے تو ثانیاً پس قرآن مجید چونکہ آپ کی زبان میں ہے اس لئے وحی کے اسماع کے وقت اول التفات آپ کو معانی کی طرف ہوتا پھر الفاظ کی طرف اس لحاظ سے قرآن کو منزل علی القلب کہہ دیا گیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ الفاظ منزل نہیں۔

نَزْلُهُ عَلَى قَلْبِكَ كِي عَجِيبٌ وَغَرِيبٌ تَفْسِيرٌ

اور نَزْلُهُ عَلَى قَلْبِكَ کے متعلق ایک بات طلبہ کے کام کی یاد آگئی گو مقام سے اجنبی ہے مگر اسطر ادا اسی آیت کے ذکر کی مناسبت سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض اہل باطل کے نزدیک یہ الفاظ قرآنیہ منزل من اللہ نہیں ہیں اور ان کو نزلہ علی قلبک سے دھوکہ ہوا کہ اس میں محل نزول قرآن قلب کو فرمایا ہے اور قلب معانی کا مورد ہوتا ہے اور الفاظ کا مورد سمع ہوتا ہے نہ کہ قلب سو واقع میں یہی غلط ہے کیونکہ الفاظ دل میں بھی ہوتے ہیں چنانچہ ہر حافظ قرآن سوچ لے کہ الحمد للہ وغیرہ کے الفاظ دل میں ہیں یا نہیں۔ یقیناً ہیں اسی کو ایک شاعر کہتا ہے

ان الکلام لفی الفواد وانما جعل اللسان علی الفواد دلیلا

تحقیق کلام منہ میں ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زبان کو دل پر نشان بنایا ہے

البتہ اس پر یہ سوال ضرور ہوگا کہ گو قلب پر بھی الفاظ کا ورود ہوتا ہے مگر بواسطہ سمع کے ہوتا ہے تو یہاں سمع کا ذکر چھوڑ کر قلب کی قید کی کیا ضرورت تھی اس کا جواب ایک محقق نے خوب دیا ہے کہ مادری زبان اور غیر مادری زبان میں فرق ہوتا ہے غیر مادری زبان میں تو اول التفات الفاظ پر ہوتا ہے پھر معانی پر اور مادری زبان میں بالعکس ہے التفات اول معانی پر ہوتا ہے پھر الفاظ کی خصوصیات پر گو خارج میں دونوں مقارن ہیں مگر التفات میں تقدم و تاخر ضرور ہے پس نزلہ علی قلبک میں اس امر کو بتلایا گیا ہے چونکہ قرآن آپ کی مادری زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کا نزول اول آپ کے قلب پر ہوتا ہے یعنی الفاظ پر التفات ہونے سے پہلے قلب کو معانی کا ادراک ہو جاتا ہے واقعی یہ بات بہت عجیب ہے۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمَلَائِكَةِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ

ترجمہ: اور اس (سحر) کا بھی گوکہ ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا شہر بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا۔

تفسیری نکات

قصہ ہارون و ماروت

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمَلَائِكَةِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ انہی میں سے ہاروت و ماروت زہرہ کا قصہ بھی ہے جس کو آج کل بھی بہت لوگ صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ بعض مفسرین نے یہ غضب کیا ہے کہ اس قصہ کو تفسیروں میں ٹھونس دیا ہے مگر محدثین نقاد نے اس کو موضوع کہا ہے وہ قصہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں نبی آدم کے اندر معاصی کی کثرت ہوئی تو فرشتوں نے طعن کیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو خلیفۃ اللہ بنائے گئے ہیں کہ گناہ کرا کے خدا تعالیٰ کو ناراض کرتے ہیں اور ہم خدا کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے ہم تو ہمیشہ اس کی اطاعت ہی کرتے ہیں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان میں جو شہوت کا مادہ رکھا گیا ہے اگر وہ تمہارے اندر پیدا کر دیا جائے تو تم بھی گناہ کرنے لگو گے۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم ہرگز گناہ نہ کریں گے بلکہ اس وقت بھی ہم اطاعت ہی کریں گے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرو جو سب سے زیادہ عبادت گزار ہوں چنانچہ ہاروت و ماروت کو منتخب کیا گیا۔ خدا تعالیٰ نے ان دونوں میں شہوت کا مادہ رکھ دیا اور زمین پر ان کو اتارا اور حکم دیا کہ انسان کے مقدمات کا فیصلہ کیا کرو اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا نہ شراب پینا اور نہ زنا کرنا نہ کسی آدمی کو ناحق قتل کرنا چنانچہ وہ دن بھر مقدمات کا فیصلہ کرتے اور شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلے جاتے۔

اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا ایک دن ان کے پاس ایک عورت کا مقدمہ آیا جو کہ نہایت ہی حسین و جمیل تھی یہ دونوں ان پر فریفتہ ہو گئے اور اس کے موافق فیصلہ کر دیا پھر اس سے اپنی خواہش ظاہر کی اس نے کہا ایک شرط سے میں راضی ہو سکتی ہوں یا تم شراب پیو یا میرے شوہر کو قتل کرو یا بت کو سجدہ بھی کرو جو تمہارے سامنے ہے یا مجھ کو وہ اسم اعظم بتلا دو جس سے تم آسمان پر جاتے ہو۔ اول تو انہوں نے انکار کیا مگر پھر نہ رہا گیا تو انہوں نے شراب پینے کو منظور کیا اور یہ سمجھا کہ یہ سب سے سہل گناہ ہے اس سے توبہ کر لیں گے۔

چنانچہ شراب پی کر اس سے زنا کیا اور اسی مدہوشی کی حالت میں شوہر کو بھی قتل کر دیا اور بت کو سجدہ کیا اور بے خبری کی حالت میں اس عورت کو اسم اعظم بھی بتلا دیا وہ عورت تو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی۔ خدا تعالیٰ نے اسے ستارہ کی صورت میں مسخ کر دیا۔ چنانچہ زہرہ ستارہ وہی ہے۔

یہ دونوں فرشتے جب مستی سے ہوش میں آئے تو بڑے پریشان ہوئے شام کو آسمان پر جانے لگے تو ان کو روک دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ یا تو دنیا کا عذاب اختیار کرو یا آخرت کا۔ انہوں نے دنیا کو عذاب سمجھ کر اختیار کر لیا۔ چنانچہ وہ

دونوں بائبل کے کنویں میں اوندھے منہ لٹکے ہوئے ہیں جہاں ان کو عذاب ہو رہا ہے اور یہ دونوں فرشتے سحر بھی تعلیم کرتے ہیں جس کی تعلیم کا ان کو حکم ہوا تھا۔ یہ سحر انہیں سے منقول چلا آتا ہے۔

اس قصہ کو سن کر وہ شخص جس کو حدیث سے ذرا بھی مس ہے فوراً موضوع کہے گا اس کا طرز بتلا رہا ہے کہ یہ رسول ﷺ کی حدیث نہیں ہو سکتی یقیناً اسرائیلیات میں سے ہے دوسرے شرعی حیثیت سے اس میں بہت سے اشکالات ہیں۔ ایک اشکال تو یہی ہے کہ فرشتے خدا تعالیٰ کے سامنے اس طرح گفتگو نہیں کر سکتے کہ حق تعالیٰ تو یہ فرمائیں کہ اگر تم میں شہوت پیدا کر دی جائے تو تم بھی انسانوں کی طرح گناہ کرنے لگو گے اور وہ خدا تعالیٰ کی بات کو رد کر دیں گے کہ نہیں ہم اس حال میں بھی گناہ نہیں کر سکتے فرشتے ہرگز خدا کی بات کو رد نہیں کر سکتے۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ جس زنا کی وجہ سے یہ فرشتے معذب ہوئے وہ عورت کیوں نہ معذب ہوئی وہ اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر کیوں کر چلی گئی اور ایسی مقرب کیوں کر ہو گئی۔

اور بہت سے اشکالات ہیں جن کے بیان کی اس وقت گنجائش نہیں مگر بعض مفسرین نے تفاسیر میں اس واقعہ کو لکھ دیا ہے اس لئے بہت لوگ اسے صحیح سمجھتے ہیں اسی لئے ہر کتاب دیکھنے کے قابل نہیں ہوتی کسی عالم کو تجویز کرو۔ اس کو کتاب دکھلاؤ کہ جب وہ کہہ دے کہ یہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد مطالعہ کرنا چاہیے اس سے میرا یہ مطلب نہیں جن کتابوں میں یہ قصہ مذکور ہے وہ معتبر کتابیں نہیں ہیں مگر یہ ضرور ہے کہ ہر معتبر کتاب کا ہر جزو معتبر نہیں ہوتا یہ ممکن ہے کہ ایک کتاب معتبر ہو لیکن اس میں کوئی بات غیر معتبر بھی ہو۔ ایک دو مضمون کے غیر معتبر ہونے سے ساری کتاب کو غیر معتبر نہیں کہہ سکتے لیکن اس کا امتیاز عالم محقق ہی کر سکتا ہے کہ اس کتاب میں کون سی بات غیر معتبر ہے۔ غرض یہ قصہ محض غیر معتبر ہے۔

حقیقت قصہ ہاروت و ماروت

صرف ہاروت و ماروت کے قصہ کی مختصر حقیقت یہ ہے کہ ایک زمانہ میں دنیا میں بالخصوص بائبل میں جادو کا بہت چرچا ہو گیا تھا حتیٰ کہ اس کے عجیب آثار دیکھ کر جبلاء کو انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں اور سحر میں اشتباہ ہونے لگا کیونکہ سحر سے بھی بعض باتیں خرق عادت کے طور پر ظاہر ہو سکتی ہیں حالانکہ سحر اور معجزہ میں کھلا فرق ہے۔

ایک فرق تو یہی ہے کہ سحر میں اسباب طبعیہ کو خفیہ دخل ہوتا ہے اور زیادہ تر اس کا مدار نخیل پر ہوتا ہے بخلاف معجزہ کہ اس میں اسباب طبعیہ کو ذرا بھی دخل نہیں ہوتا محض حق تعالیٰ کے حکم کے بدوں اسباب کے خلاف عادت امور ظاہر ہو جاتے ہیں۔ دوسرے صاحب معجزہ کے اخلاق و عادات و اطوار و اعمال میں اور ساحر کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

نبی کی صحبت سے خدا تعالیٰ کی محبت و معرفت اور آخرت کی رغبت دنیا سے نفرت پیدا ہوتی ہے ان کے پاس بیٹھنے سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے اور ساحر کی صحبت میں اس کے خلاف اثر ہوتا ہے لیکن اس فرق کو وہی دریافت کر سکتا ہے جس کی طبیعت سلیم ہو عقل صحیح ہو عوام اس فرق کو نہیں سمجھ سکتے ان کے لئے تو نبوت کی دلیل معجزہ ہوتا ہے اور ظاہر میں معجزہ اور سحر دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس اشتباہ کو دور کرنے کے لئے بائبل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت نام کے نازل کئے تاکہ وہ لوگوں کو سحر کی حقیقت پر مطلع کر دیں کہ اس میں فلاں فلاں اسباب کو دخل ہے اس لئے یہ منجاب اللہ ساحر

کی مقبولیت کی دلیل نہیں ان اسباب کے ذریعہ سے ہر شخص وہ کام کر سکتا ہے جو ساحر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ سحر تو حرام و کفر ہے۔ اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل کئے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سحر پر عمل کرنا حرام اور کفر ہے باقی اس کا جاننا اور بضرورت شرعی سیکھنا جب کہ اس پر عمل مطلق نہ ہو حرام نہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے سور اور کتے کا گوشت کھانا حرام ہے لیکن اس کے گوشت کی خاصیت معلوم کر لینا اس کو بیان کر دینا یہ حرام نہیں کیونکہ خاصیت جاننے اور بتلانے کو گوشت کھانا نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح شراب پینا حرام ہے لیکن اگر طبی کتاب میں شراب کی خاصیتیں لکھی ہوئی ہوں تو ان کو پڑھنا اور پڑھانا حرام نہیں کیونکہ اس کو شراب پینا نہیں کہہ سکتے۔ اس طرح کلمات کفریہ کا عمد ازبان سے نکالنا کفر ہے لیکن اگر کوئی شخص کلمات کفریہ سے بچنے کے لئے ان کو جاننا چاہے کہ کن کلمات سے ایمان جاتا رہتا ہے تاکہ میں ان سے بچتا رہوں یہ کفر نہیں بلکہ جائز ہے۔

چنانچہ فقہانے کتابوں میں کلمات کفر کے لئے مستقل باب منعقد کیا ہے جس میں ایسی باتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ ان کے جاننے اور پڑھنے کو کوئی حرام نہیں کہتا کیونکہ نقل کفر کفر نہیں اسی طرح فلسفہ کے مسائل بہت سے کفر میں داخل ہیں لیکن لوگوں کو اس کی حقیقت پر مطلع کرنے کے لئے فلسفہ کے مسائل بہت سے کفر میں داخل ہیں لیکن لوگوں کو اس کی حقیقت پر مطلع کرنے کے لئے فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے اور ساتھ میں اس کا رد بھی کر دیا جاتا ہے۔

جس سے مقصود صرف یہی ہے فلسفہ کی حقیقت اور اس کا بطلان معلوم کر لینے کے بعد کوئی شخص ان کے دلائل سے متاثر نہ ہو اور ضرورت کے وقت ان کے دلائل کا جواب دے سکے پس یہ اشتباہ جاتا رہا کہ تعلیم سحر کا اہتمام کیوں کیا گیا۔ رہا یہ اشکال کہ پھر اس کی تعلیم کے لئے فرشتے کیوں نازل ہوئے انبیاء علیہم السلام سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہدایت محضہ کے لئے مبعوث ہوتے ہیں اور تعلیم سحر میں یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کو سیکھنے کے بعد اسی میں مشغول و مبتلا ہو جائے تو اس طرح انبیاء علیہم السلام ضلالت و گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو ان کی شان ہدایت محضہ کے منافی ہے اس لئے حق تعالیٰ نے ان کو ضلالت کے سبب بعید بنانا بھی گوارا نہیں کیا۔ بخلاف فرشتوں کے کہ ان سے تشریح اور تکوین دونوں قسم کے کام لئے جاتے ہیں اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش کرتے ہیں اس طرح کفار کی بھی کرتے ہیں۔

وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۗ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي

الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۷۰﴾

ترجمہ: اور ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) ان کو ضرر رساں ہیں اور ان کو نافع نہیں ہیں اور ضرور یہ یہودی بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو اختیار کرے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بیشک بری چیز ہے سحر و کفر جس میں یہ جان دے رہے ہیں کاش ان کو اتنی عقل ہوتی۔

تفسیری نکات

علوم نافعہ

اس آیت میں ایک نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو معلوم ہے کہ جو شخص علم مضر کو اختیار کرے۔ آخرت میں اس کے لئے (اس علم کی وجہ سے) کچھ حصہ نہیں آگے فرماتے ہیں۔ لو کانوا يعلمون۔ کاش وہ جاننے والے ہوتے اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ جانتے تھے تو پھر اس کا کیا مطلب کہ کاش وہ جانتے ہوتے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ حق تکالی نے اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ جس علم پر عمل نہ ہو وہ بمنزلہ جہل کے ہے اس لئے یہودیوں کا وہ جاننا تو نہ جاننے کے برابر ہو گیا۔ اب آئندہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ کاش اب بھی جان لیں یعنی اپنے علم پر عمل کرنے لگیں۔

اور یہاں سے میں ایک اور غلطی پر آپ کے متنبہ کرتا ہوں وہ یہ کہ اس آیت سے یہ معلوم ہو گیا کہ علوم نافعہ وہ ہیں جو آخرت میں کام آئیں مطلق علوم مراد نہیں اب آج کل بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ علم کی فضیلت میں آیات و احادیث لکھتے ہیں اور اس پر زور دیتے ہیں کہ شریعت میں علم حاصل کرنے کی بہت تاکید ہے اور اس کے بعد ان تمام فضائل کو انگریزی تعلیم پر چسپاں کرتے ہیں اس تمام تمہید کے بعد وہ انگریزی پڑھنے کی ضرورت ثابت کرتے اور اس کی ترغیب دیتے ہیں جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گویا انگریزی پڑھنے سے یہ تمام فضائل حاصل ہو جائیں گے۔

ويعلمون ما يضرهم ولا ينفعهم

یہ مسئلہ مستحب ہوتا ہے۔

مضر و نافع علوم

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب بعض علوم مضر ہیں تو کوئی نافع بھی ضرور ہے تو اس سے دو حکم معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ علم مضر سے بچنا چاہیے دوسرے یہ کہ علوم نافعہ کو سیکھنا چاہیے رہا یہ کہ مضر کون ہے اور نافع کون ہے اس کی تعیین خود اسی آیت میں موجود ہے۔

ولقد علموا المن اشتراہ مالہ فی الاخرة من خلاق

اس سے معلوم ہوا کہ علم مضر وہ ہے جو آخرت میں کام نہ آوے تو اس کے مقابلہ میں نافع وہ ہوا جو آخرت میں کام آوے اور ان دونوں کے مجموعہ سے دو غلطیاں معلوم ہوتیں۔ ایک علماء کی ایک عوام کی۔ علماء کی غلطی تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض ساری عمر علوم غیر نافع ہی میں صرف کر دیتے ہیں یعنی صرف معقول ہی پڑھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ معقول آخرت میں کام آنے والی نہیں البتہ اگر علم دین کے ساتھ معقول کو اس غرض سے پڑھا جاوے کہ اس سے فہم و استدلال میں سہولت ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کا وہی حکم ہے جو نحو صرف بلاغت وغیرہ کا حکم ہے کہ یہ سب علوم الہیہ ہیں۔ اگر ان سے علم دین میں مدد لی جائے تو مبعث ان سے بھی ثواب مل جاتا ہے لیکن ساری عمر علوم الہیہ ہی میں گنونا یہ سراسر حماقت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ساری عمر ہتھیار کی درستی اور صفائی میں گزار دے اور ان سے کام ایک دن بھی نہ لے تو ہر شخص اس کو بیوقوف بتلائے گا۔

اور بعضے صرف معقول تو نہیں پڑھتے مگر علوم دینیہ اس کی تقدیم کرتے ہیں یہ بھی غلطی ہے۔ اس میں ایک ضرر تو یہ ہے کہ اگر اس حالت میں موت آگئی تو معقولیوں ہی میں اس کا حشر ہوگا۔ دوسرا ضرر یہ ہے کہ اس شخص کی عقل پر معقول راجح جاتی ہے۔ پھر یہ حدیث و قرآن کو معقول ہی کے طرز پر سمجھنا چاہتا ہے اور ہر جگہ اس کو چلاتا ہے اس لئے حدیث و قرآن کا اثر اسکی طبیعت پر نہیں جمتا۔

گنگوہ میں حضرت مولانا قدس سرہ کے پاس ایک معقولی طالب علم حدیث پڑھنے آئے۔ ایک دن سبق میں یہ حدیث آئی لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَلَاةَ بَغِيرِ طَهْوَرٍ وَلَا صَدَقَةَ مِنْ غُلُولٍ یعنی نماز بدوں طہارت (اور وضو) کے قبول نہیں ہوتی الخ۔ مولانا نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے بغیر نماز فاسد ہے معقولی صاحب نے اعتراض کیا کہ اس سے تو قبول نہ ہونا معلوم ہوتا ہے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بغیر وضو کے نماز صحیح نہیں ہوتی ممکن ہے کہ صحت تو بدوں وضو کے بھی ہو جاتی ہو لیکن قبول بدوں وضو کے نہ ہو اس پر سب کو انہی آگئی سو معقول پہلے پڑھنے کا یہ ضرر ہوتا ہے کہ حدیث کا ذوق اس شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ (الصمیرۃ للتعلیم بالحق موعظہ عمل و عمل)

فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: معاف کرو اور درگزر کرو جب تک حق تعالیٰ (اس معاملہ کے متعلق) اپنا حکم (قانون جدید) بھیجیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیری نکات

تہذیب نفس ابتداء میں کامل نہیں ہوتی

فرمایا کہ امام غزالی نے کہیں لکھا ہے کہ مبتدی سلوک کو وعظ وغیرہ نہ کہنا چاہیے کیونکہ تہذیب نفس ابتداء میں کامل نہیں ہوتی احتمال نفس کے خراب ہو جانے کا ہوتا ہے جب شہرت و عجب وغیرہ سے اس رائے کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ﴿۱۶﴾ کیونکہ یہ آیت ممانعت قتال بالکفار مکہ میں نازل ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک مخالفین تازہ اسلام لائے تھے۔ تہذیب نفس کامل طور پر نہیں ہوئی تھی احتمال تھا کہ شاید قتال میں نفس کا شائبہ ہو جائے اور یہ وجہ نہ تھی کہ اس وقت تک صحابہ کا عدد کم تھا کیونکہ مسلمانوں کو قلت عدد سے کبھی رکاوٹ نہیں ہوئی آخر ساٹھ آدمی ساٹھ ہزار سے لڑے اور مظفر و منصور ہوئے اور جب مدینے میں آئے تو چونکہ اکثر تہذیب نفس کی کامل ہو چکی وراقل تابع ہوتے ہیں اکثر کے اس لئے اجازت قتال دے دی گئی اور یہ آیت نازل ہوئی۔ اِذِذَا لَدَيْنَا يَنْتَقِلُونَ بِالَّذِينَ ظَلَمُوا

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: وہاں جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ ایسے لوگ مغموم ہونے والے ہیں۔

تفسیری نکات

ہماری فلاح کا مدار

یہ ایک آیت ہے کہ جس کے اول میں رد ہے بعض مدعیین کے ایک غلط دعوے کا اور بعد میں دلیل رد کے مقام پر ایک قاعدہ کلیہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ نے ایک نہایت ضروری مضمون ذکر فرمایا ہے جو جامع ہے تمام مشرب و مسلک حق کا عرصہ سے ہم لوگوں کی تمام حالتیں تباہ و برباد ہو رہی ہیں جس کے اسباب مختلف عنوانوں سے بیان کئے جاتے ہیں مگر حقیقت میں اس تباہی و بربادی کا اصلی سبب اس قاعدہ کلیہ کا چھوڑ دینا ہے اس آیت میں اسی کا ذکر ہے ہر چند کہ رد اور قاعدہ کلیہ دونوں میں یہاں زیادہ محط فائدہ رد ہے مگر وہ قاعدہ کلیہ جو کہ رد کے لئے بھی کافی ہے اور نیز ہماری حالتوں کی اصلاح بھی اس سے وابستہ ہے چونکہ وہ متضمن (ضمن میں لینے والا) فائدہ کو ہے اس لئے اس وقت بیان میں وہ ہی زیادہ مقصود ہے اور وہ قاعدہ کلیہ کہ جس پر مدار ہے ہماری فلاح کا اور جس سے غافل رہنے کی وجہ سے ہماری خرابی اور تباہی بڑھتی جاتی ہے اور نہایت ضروری ہے وہ تعبیر میں تو بہت چھوٹی سی بات ہے مگر حقیقت میں بڑی بات ہے اور اس امر ضروری کا نام جس کا تکفل (ذمہ داری) اس قاعدہ نے کیا ہے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنا ہے اب ان لفظوں کی حقیقت پر جب تک زیادہ غور نہ کیا جاوے یہ سمجھ میں نہ آوے گا کہ ہم نے اس قاعدہ کو چھوڑ رکھا ہے اس واسطے کہ ہر شخص یہی جانتا ہے کہ ہمارا خدا سے تعلق ہے یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمارا خدا سے تعلق ہے مگر یہ امور غور طلب ہے کہ آیا آپ کو خدا سے تعلق ہے یا خدا کو آپ سے تعلق ہے پس یہ ہے سمجھ لینے کی بات سوا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خدا کو ہم سے تعلق ہے اور ہمیں خدا سے تعلق نہیں ہے اور اس نے باوجود یہ کہ اس کے ذمہ واجب نہیں لازم نہیں مگر اتنے حقوق ادا کئے ہیں کہ ہم ان کا شمار و اندازہ بھی نہیں کر سکتے یہ محض تعلق اور رحمت ہے ورنہ ہمارا کیا حق اور کیا لزوم اہل سنت نے اس مسئلہ کی حقیقت کو خوب سمجھ لیا ہے کہ ہمارا کوئی حق خدا پر واجب نہیں جو کچھ وہ عطا فرمائے محض رحمت اور خالص عنایت ہے۔

بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۱۲﴾ (البقرہ ۱۱۲)

غلط دعویٰ پر رد

اور اگر فکر ہے تو سنو حق تعالیٰ اسی کا طریق بتلاتے ہیں بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ

عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۹۲﴾ اہلی میں رد ہے اہل باطل کے ایک غلط دعویٰ کا کہ جس کے متعلق رد سے پہلے ارشاد ہے تِلْكَ آيَاتُنَا لَكُمْ یہ ان کی آرزوئیں ہیں دعویٰ یہ تھا کہ ہم ہی جنت میں جاویں گے پہلے اس کو اس طرح رد فرمایا تِلْكَ آيَاتُنَا لَكُمْ یہ ان کی آرزوئیں کہ بجز ان کے اور لوگ جنت میں نہیں جاویں گے آگے ارشاد ہوا بلی یعنی کیوں نہیں جاویں گے پھر اس کی دلیل قاعدہ کلیہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ الْخَيْرِ جو شخص سپرد کردے اپنی وجہ یعنی ذات کو خداوند تعالیٰ کے لئے اس حال میں وہ محسن ہو ان کا اجر اللہ کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہو گا نہ وہ غمگین ہوں گے یہ ترجمہ ہوا۔

یہاں پر حق تعالیٰ نے اس عمل منجی کو اسلام سے تعبیر فرمایا اس کی تفصیل سمجھنے کے بعد معلوم ہو گا کہ وہ کیا چیز ہے سو ہمارے روشن خیال حضرات کے نزدیک اس کی حقیقت ایسی چیز ہے کہ نہ اس میں کچھ مامورات ہیں نہ منہیات ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کو کسی منہی عنہ سے منع کر دو تو کہتے ہیں کیا اس سے ایمان جاتا رہا مولویوں نے خواہ مخواہ تنگی کر دی ہے جی اسلام بہت وسیع چیز ہے وہاں ایسے ایسے افعال کا کیا اثر بس لا الہ الا اللہ کے قائل ہو گئے اور اسلام کامل ہو گیا نہ کسی فعل سے اس میں نقصان آتا ہے نہ کسی عقیدہ سے اس میں خلل آتا ہے اس کے لئے ایک حدیث یاد کر رکھی ہے۔ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَقَدْ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا یقیناً وہ جنت میں داخل ہو گا) سبحان اللہ اچھا ست نکالا کہ لا الہ الا اللہ کہہ لیا بس کافی ہے اب اور اعمال کی کیا ضرورت ہے شک حدیث صحیح ہے مگر جو مطلب آپ سمجھے وہ اس کا مطلب ہی نہیں اس کا مطلب ایک دیہاتی مثال میں سمجھئے ایک شخص ایک عورت سے نکاح کر لے قاضی پوچھے تم نے قبول کی وہ کہے قبول کی لیجئے نکاح ہو گیا یہ میاں یوں سمجھے کہ عورت ہاتھ آئی خوب چہین کریں گے یہ خبر نہ تھی کہ تھوڑے دنوں میں لدنا پڑے گا جس کی حقیقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی کے پوچھنے پر خوب بیان فرمائی۔ سرور شہر ایک مہینہ کی خوشی پھر پوچھا تم ماذا یعنی پھر کیا ہوا فرمایا لزوم مہر یعنی مہر لازم آ جاتا ہے پوچھا تم ماذا پھر کیا فرمایا غموم دھر یعنی تمام زمانہ کے رنج و غم پھر پوچھا ماذا (پھر کیا) فرمایا کسور ظہر یعنی کمر ٹوٹ جاتی ہے غرض میاں ایک ماہ نوشہ ہے خوب عزت رہی دعوتیں ہوا کیں اس کے بعد ماں باپ نے الگ کر دیا اب گھر کرنے بیٹھے اب وہ غموم دھر میں مبتلا ہوئے الگ ہوتے وقت ماں باپ نے ایک ماہ کا غلہ وغیرہ دے دیا تھا مہینہ بھر تک وہ کھاتے رہے جب ختم ہو گیا اب بیوی نے کہا شروع کیا کہ غلہ لاؤ گھی لاؤ کپڑا لاؤ وغیرہ وغیرہ یہ لاؤ وہ لاؤ تو آپ کہتے ہیں بی بی تو پاگل ہو گئی ہے کیسی لکڑی کیسا کپڑا کیسا گھی میں نے ان چیزوں کی کہاں ذمہ داری کی ہے اس نے کہا آخر تم نے ایجاب قاضی پر کہا تھا کہ میں نے قبول کی وہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے یہ تو نہ کہا تھا کہ میں نے غلہ وغیرہ بھی قبول کیا میں نے تو فقط تجھے قبول کیا تھا نہ میں نے آٹا قبول کیا نہ لکڑی قبول کی غرض جھگڑا اس قدر بڑھا کہ محلے کے عقلاء فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہو گئے ان میں آپ بھی ہوں اب آپ بتائیے کہ کیا فیصلہ کیا جائے کہ روٹی کپڑا سب اس سے دلائیں گے اور کہیں گے کہ ارے احمق بیوی کا قبول کرنا اس کی تمام ضروریات کا قبول کر لینا ہے اس کے لئے کسی مستقل معاہدہ کی ضرورت نہیں۔

بس لا الہ لا اللہ کے بھی یہی معنی ہیں اب ذرا سنجھل کر کہے گا بس اسی مختصر کلمہ نے تو باتوں کو لے لیا لہذا جب وضع خلاف شرع ہوگئی تو ایک جزو لا الہ الا اللہ کا چھوٹا تو مولوی اہل مغلہ کے مثل ہیں اور یہ اسی نادان کے مثل ہے جو کہتا ہے کہ میں نے لا الہ الا اللہ کہا تھا یہ کہاں کا جھگڑا نکالا کہ وضع خلاف شرع نہ رکھو دازھی مت منڈاؤ یا مت کٹاؤ موٹھیں مت بڑھاؤ نماز پڑھو روزہ رکھو۔ حاصل یہ کہ سپرد کردینے کے بعد پھر رائے نہیں دی جایا کرتی جس طرح مقدمہ وکیل کے سپرد کردینے کے بعد کوئی رائے نہیں دیتا اسی کو فرماتے ہیں اسلم و جہہ (جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا) باقی ذات کو وجہ سے کیوں تعبیر کیا۔

سو وجہ کہتے ہیں منہ کو عموماً مفسرین نے تو لکھا ہے کہ یہاں تسمية الكل باسم الجزء ہے یعنی جز بول کر کل مراد لیا ہے اور وجہ تخصیص یہ کہ وجہ تمام اعضاء میں اشرف تھا جب اشرف کو سپرد کر دیا تو کل کو سپرد کر دیا اگر ایک اس سے زیادہ بات لطیف ہے وہ یہ کہ پہچان چہرہ سے ہوتی ہے تو گویا شخص میں زیادہ دخل چہرہ کو ہے پس وجہ سے تعبیر کرنا ذوات مشخصہ کو نہایت بر محل ہے یہ تو پرانے طالب علموں کے کام کی بات تھی۔

ایک بات تو تعلیم یافتہ لوگوں کے کام کی بھی سمجھ میں آئی کہ آج کل جو رائے دی جاتی ہے اس کی قوت دماغ کے اندر ہے اور وجہ کو دماغ سے خاص تلبس ہے گویا دونوں متلازم ہیں پس وجہ کو سپرد کرنا گویا دماغ کو سپرد کرنا ہے اور دماغ کے سپرد کرنے کے بعد جب دماغ ہی آپ کا نہ رہا تو رائے اور خیال آپ کا کہاں سے آیا تو یہ تعبیر مشیر ہے خود رائی کے قطع کردینے کی طرف۔ اگر کوئی کہے کہ کیا دماغ سے کام نہ لیں اسلام کے احکام تو سب دماغ ہی کے متعلق ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر مقدمہ کسی بیرسٹر کے سپرد کر دو تو اگر وہ گواہوں کی شناخت کے واسطے کہے تو کیا اس کو یہ جواب دو گے کہ ہم نے تو آپ کے سپرد کر دیا جس چیز کو سپرد کر دیا ہے اس میں اپنی رائے کا دخل مت دو باقی جتنے میں وہ خود دخل دینے کو کہے اس میں دخل دو پس اسی طرح یہاں بھی دماغ سے اتنا کام لو جتنا حکم ہے۔

اور یہ تو جیہیں تو جب ہیں کہ وجہ کو ظاہری وجہ پر رکھا جائے اور اگر وجہ کہ وجہ باطن پر محمول کیا جائے تو یہاں پر 'وجہ' کے معنی قلب کے ہوں گے جیسے اِنِّیْ وَجْہٌ وَّسَجِیٌّ لِذٰلِیْکَ فَطَرَّ (میں اپنے قلب کو اسی ذات کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا) میں کہا گیا ہے کہ یہاں وجہ سے مراد چہرہ نہیں ہے کیونکہ اس کو خدا کی طرف کرنے کے کیا معنی بلکہ یہاں مراد قلب ہے کہ میں نے پھیر دیا رخ قلب اپنا خدا کی طرف جس نے مجھے پیدا کیا تو یہ اَسَلَّمْ وَوَجْہٌ کَا بَطْنِیْ اور باطن تھا خلاصہ مجموعہ تو جیہیں کا یہ ہوا کہ اپنی ہر چیز کو خدا کے سپرد کر دیا۔ اب سمجھئے کہ کبھی سپرد کرنا غرض کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی خوف سے اور کبھی محبت سے محققین کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی نے غرض کی وجہ سے سپرد کیا کہ کام خوب نکلیں گے تو یہ شرک خفی ہے کہ کام بنانے کے لئے اطاعت کرتا ہے خدا کے لئے نہیں کرتا پس یہ تسلیم اس لئے کرو کہ اس کا حق ہے اس لئے وہو محسن بھی فرمایا کہ سپرد کرنے میں اخلاص ہو اپنی کوئی غرض وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ

اسلام جب ہی مقبول ہے کہ اس میں ریا نہ ہو کیونکہ یہ خلاف اخلاص ہے اس تفسیر کے بعد معلوم ہو گیا ہوگا کہ اسلام مطلوب کی یہی حقیقت ہے کہ خالصتاً اللہ کے ہو جاؤ۔

بلاغت قرآن مجید

اس کے بعد اب وعدہ ہے کہ **فَلَمَّا أَجْرُهَا عِنْدَ رَبِّهَا** اس کے لئے اس کا اجر ہے اس کے پروردگار کے نزدیک **فَلَمَّا أَجْرُهَا** پر کفایت نہیں بلکہ **عِنْدَ رَبِّهَا** بھی بڑھایا اس میں بڑا راز ہے ایک تو کسی مزدور سے کہتے کہ کام کرو ہم تمہیں کھانا کھلائیں گے اور ایک یہ کہ اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلائیں گے اور وہ مزدور عاشق بھی ہو تو کس قدر شوق سے کام کرے گا اور کھانے سے کس قدر مسرور ہوگا **عِنْدَ رَبِّهَا** اس لئے بڑھایا ہے۔

ہر کجا یوسف رنے باشد چوماہ جنت ست آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں فوق گردوں است نے قعر زمیں
(جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو جس جگہ محبوب ہو خوش و خرم بیٹھ وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند تر ہے نہ پست زمین)

سبحان اللہ کیا قرآن کی بلاغت ہے بس یہ شعر صادق آتا ہے

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بوار باب معنی را

(اس کی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے) یعنی دو مذاق کے لوگ ہیں ایک تو روٹ کھانے والے جیسے ہم ہیں ان کو **فَلَمَّا أَجْرُهَا** سے خوش کر دیا کہ گھبراؤ نہیں روٹیاں مل جائیں گی ایک وہ ہیں جو دیدار کے مشتاق ہیں ان کے واسطے **عِنْدَ رَبِّهَا** فرمایا کہ دعوت ہوگی اور ہمارے پاس ہوگی اور یہ سب انعام ہوا انعام کا کمال یہ ہے کہ منفعت عطا ہو اور مضرت سے بچایا جاوے منفعت کا مذکور تو ہو چکا آگے مضرت سے بچانے کا وعدہ ہے کہ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ** ان پر کوئی خوف نہیں کوئی قید نہیں لگائی کہ کہاں خوف نہیں گو بعض جگہ سے آخرت کی قید معلوم ہوتی ہے کہ آخرت میں کوئی خوف نہیں لیکن یہاں کا اطلاق اگر بحالہ رکھا جاوے تو دنیا و آخرت دونوں کو عام رہے گا رہا یہ کہ دوسری آیات میں **يَخَافُونَ** سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خوف ہے سو محققین نے جواب دیا ہے کہ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ** فرمایا **لَا خَوْفٌ** بہم **يَا لَيْسَ** ان پر خوف کی چیز واقع نہ ہوگی گو خود وہ خوف کیا کریں اس کے بعد ارشاد ہے **وَأَلَمْ يَخْزِنُونَ** اور نہ وہ **عَمَلِكُمْ** ہوں گے خوف آئندہ کا اندیشہ ہے اور حزن واقعہ ماضیہ کے متعلق ہوتا ہے تو حاصل یہ ہوا کہ نہ تو مستقبل میں کسی مضرت کا احتمال ہے نہ کسی ماضی کی فوت سے ان پر حزن ہے کہ ہائے یہ نہ ہوا ہائے وہ نہ ہوا دنیا میں نہ آخرت میں خلاصہ یہ کہ ہر قسم کی مضرتوں سے محفوظ ہوں گے یہ اسلام پر انعام ہوا۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي

خَرَابِهَا أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُ لَّهُمْ فِي الدُّنْيَا

خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ: اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں ان کا ذکر اور عبادت کئے جانے سے روکے اور ان کے ویران اور معطل ہونے میں کوشش کرے ان لوگوں کو کبھی بے ہیبت ہو کر ان میں قدم نہ رکھنا چاہیے تھا بلکہ جب جاتے ہیبت اور ادب سے جاتے ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی نصیب ہوگی اور آخرت میں سزائے عظیم ہوگی۔

تفسیری نکات

ویرانی مساجد کا مفہوم

شان نزول میں گواختلاف ہو مگر قدر مشترک اتنا ضرور شامل ہے قتل مساجد کے بارے میں مسلم اور غیر مسلم کو جیسا آگے آتا ہے اور جملہ اُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا الْخ (ان لوگوں کو بے ہیبت ہو کر ان میں قدم نہ رکھنا چاہیے تھا) گویا بطور دلیل کے ہے ماقبل کے لئے گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ ان کو چاہیے تھا کہ خود بھی جب مساجد میں داخل ہوتے خاشع و خاضع ہو کر داخل ہوتے دوسرے آنے والوں کو جوذا کرین تخلصین ہیں ان کو بھی روکتے ہیں کیونکہ یہ بے خوف ہونے کی اور بھی زیادہ علامت ہے اس لئے ایسا شخص بہت زیادہ ظالم ہوگا یہاں پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ آیت تو کفار کے حق میں ہے اس کا مخاطب مسلمانوں کو کیوں بنایا جاتا ہے تو اس کا جواب بطور اصولیین کے یہ ہو سکتا ہے کہ العبرہ لعموم اللفظ الا لخصوص المورد (اعتبار لفظ کا ہے نہ کہ مورد کا) اور اس کی نظیر شرعی لعان و حد زنا ہے اور تمثیل جیسے اگر کوئی محسن اپنے کسی نوکر کو کسی بات پر سزا دے اور کہے کہ جو ایسی حرکت کرے گا اس کو ایسی سزا ہوگی تو اس کے کہنے کا سبب اس وقت یہ خاص نوکر ہے مگر چونکہ الفاظ عام اس لئے دوسرے نوکر بھی اپنے لئے اس کو عبرت سمجھتے ہیں اور وہ کام نہیں کرتے میرے نزدیک یہ قاعدہ اصولیہ کہ العبرہ لعموم اللفظ الخ (اعتبار عموم لفظ کا ہے عموم کے ساتھ مقید ہے جہاں تک مراد متکلم کی ہو اس کے آگے تجاوز کر کے ہر عموم کو شامل نہیں ہو سکتا اس کی نظیر حدیث لیس من البر الصیام فی السفر (سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے) کو باوجود (لفظ کے عموم کے چونکہ مطبق کو عام ہونا مراد متکلم کی نہیں ہے ہر مسافر کو شامل نہیں بلکہ صرف اسی کو جس کو خوف ہلاک وازدیا مرض ہو دوسری نظیر یہ کہ اگر آج کل کوئی شخص کسی عالم سے رہن کا مسئلہ پوچھے تو وہ عالم بوجہ اطلاع عرف متعارف کے حکم منع ہی کا دے گا کیونکہ عرف رہن مع الانتفاع ہے اس لئے مراد یہی رہن خاص ہوگا گو فتوے کا لفظ ہوگا کہ رہن جائز نہیں۔

پس محض کسی لفظ کا عام ہونا دلیل ہر عموم کی نہیں ہے تا وقتیکہ قرآن مستقلہ سے اس عموم کا مراد ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ حاصل یہ آیت میں لفظاً تعمیم نہیں مسلم و غیر مسلم کو بلکہ آیت تو کفار ہی کے حق میں ہے جو منع خاص یہاں مراد ہے ایسا منع مخصوص ہے کفار سے مگر مسلمان کو یہ اس طرح سے شامل ہے وہ یہ کہ منع کے بعد سَعَىٰ فِي خُرَابِهِمْ (ان کی ویرانی میں کوشش ہے فرمانا بطور تعلیل کے ہے اور خراب مقابل عمارت کا ہے اور عمارت مسجد کی صلوة سے ہے بس خراب یعنی ویرانی ایسے امر سے ہوگی جو منافی ہو ذکر و صلوة کے پس اگر مسلم سے مسجد میں کوئی فعل خلاف ذکر و صلوة ہو تو وہ بھی اس ملامت میں شریک ہوگا بوجہ اشتراک علت کے رہا یہ قیاس کہ ظنی ہوتا ہے تو ذم یعنی نہیں جواب اس کا یہ ہے کہ قیاس ظنی جب ہوتا ہے کہ اس کی علت بھی ظنی ہو اور اگر منصوص علیہ قطعاً ہو جیسا کہ یہاں ہے تو قیاس بھی قطعاً ہوگا رہا یہ کہ مسلمان اگر ایسا فعل بھی کرے تو قصد خرابی مسجد کا تو نہ ہوگا جو متبادر ہے سعی سے پھر اس کو کیسے شامل ہوا جواب یہ ہے کہ اگر سعی خاص ہوتی تو مباشر کے ساتھ تو اس شبہ کی گنجائش تھی غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سعی عام ہے مباشر اور سبب کو دلیل اس کی یہ ہے کہ جب رسول ﷺ نے مدینہ میں خواب دیکھا انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہے عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ تشریف لائے اور صحابہ سے آپ نے یہ خواب بیان کیا گو اس میں یہ نہ تھا اس سال ہوگا مگر شدت اشتیاق میں صحابہ نے سفر کی رائے دی اور آپ نے خوش خلقی سے قبول فرمایا تو کفار قریش نے آپ کو دخول مکہ سے روک دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس روکنے کو مسجد کی ویرانی کا سبب قرار دے کر ان کو سَعَىٰ فِي خُرَابِهِمْ اور ان کی ویرانی میں سعی کریں کا مصداق بنایا حالانکہ کفار مکہ نہ صرف مسجد حرم بلکہ تمام حد حرم کی غایت تعظیم کرتے تھے اور عمارت بھی مگر بایں معنی وَسَعَىٰ فِي خُرَابِهِمْ اور ان کی ویرانی میں کوشش کریں کا مصداق بنایا گیا صرف اس لئے کہ انہوں نے رسول ﷺ و صحابہ کو کہہ ڈالا کہ مخلصین تھے روکا اس سے اب بدالۃ النص یہ بات ثابت ہوگی کہ کوئی ایسا کام کرنا مسجد میں جس میں ذکر اللہ سے اس کا تعطل ہوگو علی سبب التمسبب ہی سہی منع مساجد اللہ وسعی فی خرابہا مساجدوں سے روکنا اور ان کی ویرانی میں کوشش کرنا کا مصداق بنا ہے ورنہ کفار نے کوئی قفل نہیں ڈالا تھا اور نہ مسجد کی بے تعظیسی کی تھی اور نہ عمارت میں کوئی رابی کی تھی ظاہر ہے کہ مسجد میں بلا ضرورت دنیا کی باتیں کرنا دنیا کے کام کرنا نہ ذکر ہے نہ ذکر کے متعلق ہے اس لئے بلاشبہ معصیت اور ظلم ہے پھر ان یذکر کی تقریب فضیلت ذکر کے متعلق متعدد واقعات بیان کئے گئے اس میں یہ بھی بیان تھا کہ آدمی ذکر تلاوة پر عوض دنیوی لیتے ہیں حالانکہ اللہ کا نام ایسا گراں مایہ ہے کہ دونوں عالم بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتے اور یہ شعر پڑھا۔

حکمت خود ہر دو عالم گفتمہ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تو نے اپنی قیمت دونوں جہاں بتلائی ہے نرخ بڑھاؤ ابھی ارزانی ہے)

تقریب ختم کلام مجید حفاظ کا بعض مال رمضان میں یا رسوم وغیرہ میں اور قبور پر قرآن پڑھنے کا ممنوع ہونا بیان ہوا اور اہل اللہ دنیا کو تو اللہ کے نام اور رضا سے بڑا کیا سمجھتے آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دولت تو نعمائے جنت سے بھی افضل ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَکْبَرُ (رضا الہی بہت بڑی چیز ہے) نص صریح ہے اور دین فردوسی کے شبہ سے بچنے کے لئے بعض

بزرگ بازار میں نہیں جاتے کہ شاید ان کو دیندار سمجھ کر ان کے دین کی وجہ سے کوئی دوکاندار داموں میں رعایت کرے تو وہ اس قسم کا عوض ہو جائے گا دین کا پس نہ جانا بازار میں دو وجہ سے ہوتا ہے ایک تو اس وجہ سے کہ وہ تو حرام ہے دوسرا اس وجہ سے کہ لوگوں پر ہماری وجاہت سے رعب پڑے گا اور وہ دب کر ارزاں دیں گے جس سے ان کو نقصان ہوگا یہ مستحب بھی ہے اور ضروری ہے اس میں شبہ دین فروشی سے بچنے کے علاوہ رفع التاڈی عن الخلق (مخلوق سے اذیت کو ہٹانا)

حاصل یہ ہے کہ مشرکین میں لیاقت مسجد کے آباد کرنے کی نہیں کیونکہ جس چیز سے مسجد کی آبادی ہے جس کا ذکر آیت آئندہ میں ہے وہ ان میں نہیں ہے یعنی وہ تعمیر ذکر اللہ ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے۔ **إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنِ آمَنَ الْخ** (اللہ تعالیٰ کی مساجد کو وہی بناتا ہے جو اللہ پر ایمان لائے الخ) اس آیت میں مقصود اصلی اقام الصلوٰۃ ہے جس کے لئے مسجد موضوع ہے اور امن بطور شرط کے لایا گیا اور اتسی الزکوٰۃ اقام کی تتمیم ہے یعنی اقامت بمعنی ادائے حقوق صلوٰۃ موقوف ہے خلوص اور محبت پر اور اس کی ایک علامت انفاق اموال ہے حاصل یہ کہ نرا ذکر زبان سے جیسا کہ نماز میں ہوتا ہے دلیل خلوص قلب کی نہیں مال بھی دینا چاہیے اور زکوٰۃ وہی دے گا جس کے قلب میں خلوص ہوگا کیونکہ حاکم تو مطالبہ کرنے والا ہی نہیں اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ زمانہ خلفائے راشدین میں تحصیل زکوٰۃ کے لئے عامل مقرر تھے وہ جبراً لیتے ہوں گے پھر اس میں خلوص کہاں رہا جواب یہ ہے کہ عامل صرف مواشی کی زکوٰۃ لیتے تھے اور اموال باطنہ زر و سیم مالکوں کے اختیار میں تھے مواشی کے لئے بھی عامل تحصیل کی وجہ سے نہ تھا بلکہ محض بہ نظر سہولت مصارف تاکہ اصحاب اموال میں دقت نہ ہو اور مال پورے طور پر مستحقین کو مل جائے اور اموال تجارت میں بھی عاشر کی طرف سے کچھ زبردستی نہ تھی بلکہ پوچھا جاتا تھا حولان حول سال گزرا یا نہیں اگر کسی نے کہا نہیں گزرا تو چھوڑ دیا اور اگر اس نے کہا کہ ہم نے زکوٰۃ خود دے دی ہے تب بھی چھوڑ دیا دوسری دلیل اس دعوے کی مسجد کا موضوع لہ ذکر ہے یہ آیت **فِي بُيُوتٍ أُذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَهُ** (ایسے گھروں میں جا کر عبادت کرتے ہیں جس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا ادب کیا جائے) اس میں رفعت معنویہ مراد ہے تیسری دلیل حدیث انما بنیت المساجد للذکر اللہ (مساجد اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے بنائی گئی ہیں پس جو کام ذکر کے متعلق نہ ہو وہ مسجد کی دیرانی ہے) منع ہے جیسا بعض کاتب اجرت مسجد میں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں یا درزی کپڑے سینے بیٹھ جاتے ہیں بلکہ فقہانے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص اجرت پر علم دین پڑھاتا ہو اس کو بھی مسجد میں بیٹھ کر پڑھانا منع ہے۔ علیٰ هذا القیاس مسجد میں قرآن خواں لڑکوں کا پڑھانا جن سے کسی قسم کی اجرت لی جاتی ہے ممنوع ہے البتہ درس دینیات بلا اجرت خود ذکر ہے اس کا کچھ مضائقہ نہیں ایسا ہی محکف جو ذکر اللہ کی غرض سے مسجد میں آ بیٹھا ہے اس کو بیع و شرا کا معاملہ بلا حضور بیع بضرورت جائز ہے تاکہ ذکر اللہ سے حرمان نہ رہے ورنہ مشتغلین بالتجارت کا اعتکاف معتبر نہ ہوتا اور یہ شرط عدم حضور بیع کی اس وقت ہے جب وہ متاع مسجد کی جگہ کو گھیرے ورنہ اگر کوئی مختصری چیز ہو تو احضار سلعہ بھی جائز ہے اور بجز محکف کے دوسرے کو خرید و فروخت کا معاملہ خواہ کیسا ہی چھوٹا ہو مثلاً ریز گاری وغیرہ کالین دین مسجد میں منع ہے اسی طرح کسی ایسی چیز کا اعلان سے پوچھنا جو مسجد سے کہیں باہر کھوئی گئی ہو منع ہے البتہ اگر مسجد کے

اندر چیز کم ہوگئی تو اس کا پوچھ لینا مضائقہ نہیں اسی طرح اپنی تجارت کے اشتہار مسجد میں تقسیم کرنا ممنوع ہے چوتھی دلیل دعویٰ مذکور کی یہ کہ حدیث میں قرب قیامت کی علامات میں وارد ہے مساجد ہم عامرہ وہی خراب (مساجد ان کی آباد ہوگئی مگر خلوص سے کم ہوں گی) عمارت اور خرابی کا جمع ہونا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظاہری عمارت میں تو بڑی زیب و زینت اور مجمع کی کثرت ہوگی مگر معنوی آبادی یعنی جو خلوص ہے کم ہوگا۔ اس سے بھی وہی بات ثابت ہوئی پانچویں دلیل لوگوں نے رسول ﷺ سے دریافت کیا کہ شر البقاع (بری جگہیں) کیا چیز ہے اور خیر البقاع (اچھی جگہیں) کون سی جگہ ہے فرمایا مجھے معلوم نہیں جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا اور یہ کہا کہ دربار خداوندی سے دریافت کر کے جواب دوں گا چنانچہ پوچھنے گئے اس وقت بہ برکت اس مسئلہ کے پوچھنے کے حضور اقدس ﷺ کے لئے ان کو اس قدر قرب ہوا کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو بھی اتنا قرب نہیں ہوا یعنی ستر ہزار حجاب درمیان میں رہ گئے غرض دربار خداوندی سے جواب ارشاد ہوا کہ شر البقاع بازار ہے اور خیر البقاع مسجد سو غور کرنا چاہیے کہ دونوں میں ماہہ الامتیاز کیا ہے بجز ذکر اللہ و ذکر الدنیا کے پس معلوم ہوا کہ مسجد کا موضوع یہی ذکر اللہ ہے پس اس میں ذکر الدنیا کرنا اس کو شر البقاع بنانا ہے جو اس کی ویرانی ہے۔

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُولُوْا فَوَجْهُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب سمتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی کیونکہ تم لوگ جس طرف منہ کرو ادھر (ہی) اللہ تعالیٰ کا رخ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ (تمام جہات کو) محیط ہیں کامل العلم ہیں۔

تفسیری نکات

بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے میں حکمت

فرمایا کہ کعبے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا جو حکم ہے اس میں یہی مصلحت ہے کہ تفریق کلمہ نہ ہو اور شریعت کے تمام کام انتظام سے انجام پائیں ورنہ اگر آیت **فَأَيْنَمَا تُولُوْا فَوَجْهُ اللَّهِ** سے ہر شخص جس طرف چاہے نماز پڑھ لیا کرے تو اس مطلق العنانی سے جماعت کا کام انجام کو نہیں پہنچ سکتا۔

علم کلام کی ضرورت

فثم وجه الله - يداه مبسوطتان - على العرش استوى - والسموات مطويات بيمينه (یعنی کسی جگہ کہا گیا ہے کہ جب ہر تم منہ کرو خدا کا رخ ادھر ہی ہے کہیں فرمایا کہ خدا کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں کہیں فرمایا ہے کہ خدا عرش پر مستوی ہے کہیں فرمایا کہ آسمان خدا کے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔

تو اس پر بعض جاہلوں کو یہ شبہ ہوگا کہ خدا کے بھی ہماری طرح منہ اور ہاتھ اور پیر ہیں مگر علم کلام کے دلائل سے معلوم ہو گا خدا تعالیٰ جو ارح اور مکان و زبان سے پاک ہے اس کے لئے ان چیزوں کا ثابت ہونا حقیقتہً ممکن نہیں ہاں مجازاً کوئی دوسرے معنی مراد لئے جاویں تو ممکن ہے چنانچہ علماء نے ان آیات کے معانی خدا کی شان کے لائق بیان بھی کئے ہیں اور سلف کا طرز اس بارہ میں سکوت ہے تو علم کلام سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے لئے کس صفت کا ثابت ہونا ضروری ہے اور کن کن باتوں سے اس کا پاک ہونا ضروری ہے۔

الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقًّا تِلَاوَتِهِ أَوْلِيكَ يَوْمُنَا بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ

بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿۹۹﴾

ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت کرتے رہے جس طرح کہ تلاوت کا حق ہے ایسے لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو شخص نہ مانے گا خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے۔

تفسیری نکات

تلاوت کرنے والوں کی مدح

اس کی دو تفسیریں ہیں مگر دونوں میں یہ قدر مشترک ہے کہ تلاوت کرنے والوں کی مدح ہے اس آیت میں ہر چند کتاب سے مراد توریت ہے مگر ظاہر ہے کہ توریت کی تلاوت قابل مدح ہونے کا سبب توریت کا کتاب اللہ ہونا ہے اور چونکہ قرآن افضل کتب ہے تو اس کی تلاوت زیادہ قابل مدح ہوگی اور اسی آیت سے اس کی فضیلت بطریق اولی ثابت ہو گئی اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ تلاوت کتاب اللہ کی حقیقت اللہ میاں سے باتیں کرنا ہے اب آیت میں فرماتے ہیں کہ تم ہم سے باتیں تو کرو گے مگر قاعدے اور ادب کے ساتھ کرنا **يَتْلُونَهُ حَقًّا تِلَاوَتِهِ** ترکیباً تو اخبار ہے مگر مقصد انشاء ہے یعنی تلاوت کرنے والوں کو چاہیے کہ حقوق ادا کریں۔

حقوق تلاوت

جب تلاوت کی حقیقت معلوم ہو گئی تو اب سمجھ لیجئے کہ حقوق دو طرح کے ہوتے ہیں باطنی اور ظاہری قربان جائیے تعلیم شریعت کے کہ اعمال میں صرف بناوٹ نہیں بلکہ ظاہری حقوق بھی بتائے اور باطنی کو ظاہری سے زیادہ ضروری رکھا ماں باپ کے حق ظاہری کو فرمایا **وَ الْخَفِيضُ لَهُمَا جَنَاحُ الذَّلٰلٰتِ** کہ ان کے سامنے پستی اختیار کرو وضع قطع میں تکلم میں نشست و برخاست میں غرض ہر چیز میں ان سے تدلل برتو کسی بات پر ترفع مت کرو یہ حق ظاہری ہے اور حق باطنی کو سبحان اللہ کیسے ذرا سے لفظ سے فرمادیا یعنی **مِنَ الرَّحْمٰتِ** یعنی ان کے سامنے نری ظاہری پستی پر اکتفانہ کرو اس کا اعتبار نہیں بلکہ اس ظاہری

پستی کا منشاء رحمت ہو رحمت رقت قلب کو کہتے ہیں یعنی ان کی عزت دل سے کرو جیسا کہ ظاہر ان کے سامنے پست کیا ہے باطن کو بھی پست کرو۔ دل کے اندر تواضع بھی ہو خضوع بھی ہو قرآن میں کوئی ضروری بات چھوئی نہیں جاتی یہی خوبی ہے کلام اللہ کی کسی حاکم یا کسی فلسفی کی تعلیم میں یہ بات نہیں پائی جاتی اور اس پر بھی اکتفاء نہیں کیا آگے فرماتے ہیں وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا اور کہو اے پروردگار ان دونوں (یعنی والدین کو نواز جس طرح کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی اوپر تو ان حقوق کا حکم تھا جن کی ادا کا علم ان کو اور لوگوں کو وقت ادا ہو جائے گا اور اس میں فرما دیا تھا کہ صرف ظاہری بناوٹ نہ ہو ان کو بھی دل سے ادا کرو یہاں حکم ہے کہ ان کے ان حقوق کو بھی ادا کرو جن کی اطلاع نہ ہو قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا یعنی ان کے لئے دعا بھی کرو یہ بھی ایک حق باطنی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حق تین ہیں ظاہری اور باطنی اور باطن اور تینوں قسم کے ادا کا حکم ہے اسی طرح حق تلاوت بھی مختلف ہوتے ہیں میں اس کی ایک مثال دیئے دیتا ہوں جس سے اچھی طرح توضیح ہو جائے گی۔ فرض کیجئے بادشاہ کسی کے ہاتھ میں شاہی قانون دے کر کہے کہ اس کو پڑھو تو اس کی حالت پڑھتے وقت کیا ہوگی کہ ہر لفظ کو صاف صاف پڑھے گا کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا پڑھنا بادشاہ کو ناپسند ہو اور اس کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھتا جائے گا ایک تو اس خیال سے عبارت کا لہجہ بلا معنی سمجھے ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ایک اس خیال سے کہ شاید کہیں بادشاہ پوچھ بیٹھے کہ کیا مطلب سمجھا تو خفت نہ ہو اور ایک حالت پڑھنے والے کی یہ ہوگی کہ دل میں اس قانون کے احکام کی تعمیل کا بھی عزم ہوگا اور یہ کسی قرینہ سے ظاہر نہ ہونے دے گا کہ میں اس کی پابندی میں کچھ کوتاہی کرتا ہوں بلکہ حال سے قال سے یہی ثابت کرے گا کہ میں سب سے زیادہ تعمیل کرنے والا ہوں بس اس مثال کو ذہن میں حاضر رکھئے اور سمجھئے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں بھی اسی طرح کے تین مرتبے ہیں۔ ایک مرتبہ الفاظ ظاہری کا ہے یعنی ہر حرف کو علیحدہ علیحدہ صاف صاف اور مخرج سے ادا کرنا ہے اور ایک مرتبہ معنی کا یعنی مدلول الفاظ کو سمجھ لینا یہ نہیں کہ خیال کہیں پہلے صرف طوطے کی طرح لفظ ادا کر دیئے۔ یہ مرتبہ حق باطنی کا ہے اور ایک مرتبہ اس سے بھی باطن ہے وہ اس کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ جب یہ تینوں باتیں جمع ہوں گی تب کہا جائے گا کہ حق تلاوت کا ادا کیا۔ غرض کل تین حق ہوئے ایک حق ظاہری یعنی تلاوت۔ دوسرا حق باطنی یعنی معنی سمجھ لینا۔ تیسرا عمل کرنا یہ بمقابلہ دوسرے کے بھی باطن ہے تو اس کو باطن کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ معاملہ فیما بینہ و بین اللہ ہے ان تینوں میں وجود اسب سے مقدم حق ظاہری ہے اور موکد ہے وہ تیسرا درجہ یعنی عمل ان دونوں میں حقیقت اور صورت کا فرق ہے اصل چیز حقیقت ہی ہوتی ہے لیکن وجود اس کا لباس صورت میں ہوتا ہے بس حقیقت بلا صورت کے باطل ہے اور صورت بلا حقیقت کے باطل دیکھئے اللہ میاں نے آگے فرمایا اُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ جو لوگ تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں وہی ایمان رکھتے ہیں پس عمل موقوف علیہ ہے کمال ایمان کا اور کمال ایمان کی تحصیل واجب ہے پس ضرور عمل بھی واجب ہوگا کمال ایمان کا وجوب اس آیت میں صاف مصرح ہے۔ غرض حق تلاوت کا تیسرا درجہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے۔ ہاں وجوب فی الفور نہیں مگر بجائے مسلمان ہوتے ہی یہ فرض نہیں ہو جاتا کہ جملہ فروع ایمان پر بھی عبور ہو جائے اور نہ یہ فرض ہو جاتا ہے کہ قرآن شریف کے تینوں حق فوراً ہی ادا کرے بلکہ مہلت دی گئی ہے کہ

اس میں سیکھ لینا چاہیے البتہ یہ جائز نہیں کہ بالکل بیٹھ رہے اور کمال کی طرف توجہ نہ کرے غرض حق ظاہری تو یہ ہے کہ ترتیل کے ساتھ پڑھا جائے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ترتیل کی یہ تفسیر منقول ہے تجويد الحروف و معرفة الوقوف ترتیل اس کو کہتے ہیں (حقوق القرآن)

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمْتِعْهُ قَلِيلًا ثُمَّ اضْطَرْهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَيَسُّ الْمَبِصِطِ ۝

ترجمہ: حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اور اس شخص کو جو کافر رہے سوائے شخص کو تھوڑے روز تو خوب آرام برتاؤں گا پھر اس کو کشاں کشاں عذاب دوزخ میں پہنچاؤں گا وہ پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے۔

تفسیری نکات

اسلام مسلمان کو انہماک فی الدنیا سے مانع ہوتا ہے

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ نے قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمْتِعْهُ (فرمایا اور کوئی کافر کرے سوائے شخص کو خوب آرام برتاؤں گا) کی تفسیر میں ایک لطیف بات فرمائی ہے اس آیت میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ فَأُمْتِعْهُ (اس کو خوب آرام برتاؤں گا) کو ما قبل سے اعراباً کیا تعلق ہے بعض نے کہا کہ فَأُمْتِعْهُ (سواں کو بھی خوب آرام برتاؤں گا) کلام مستأنف ہے اور من کفر (جو کافر کرے) فعل مقدر کا مفعول ہے تقدیریوں ہے و ارزق من کفر کہ میں کافروں کو بھی رزق دوں گا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں مومنین کی تخصیص کی تھی۔ وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (اور اس کے بنے والوں کو پھلوں سے بھی عنایت کیجئے جو کہ ان میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں) حق تعالیٰ نے وَمَنْ كَفَرَ (جو کافر کرے) بڑھا دیا کہ دعا رزق کو مومنین کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں کفار بھی شریک ہوں گے اور ابراہیم علیہ السلام نے یہ تخصیص ادا کی تھی کیونکہ اس سے پہلی دعاء میں انہوں نے تعیم فرمائی تھی قَالَ وَمَنْ ذَرَبْتَنِي (کہا اور میری ذریت سے) جس کو حق تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ خاص کر دیا تھا تو اب انہوں نے دوسری دعا کو خود ہی مومنین کے ساتھ خاص کر دیا حق تعالیٰ نے بتلا دیا کہ اس کو خاص کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ رزق تو میں سب کو دوں گا اس کے بعد فَأُمْتِعْهُ (سواں کو بھی خوب آرام برتاؤں گا) سے کافر کو رزق دینے کی تفصیل ہے کہ اس کو صرف دنیا میں رزق دیا جائے گا آخرت کے رزق سے وہ محروم ہے اور بعض نے کہا کہ فَأُمْتِعْهُ (سواں کو بھی خوب آرام برتاؤں گا) خبر ہے من کفر کی اب اس پر سوال ہوتا ہے کہ خبر پر فاء اس وقت داخل ہوتی ہے جبکہ مبتدا میں معنی شرطیت کے ہوں اور مبتدا سبب ہو خبر کے لئے تو لازم آئے گا کہ کفر کو تمتع میں داخل ہو جمہور نے تو اس لازم کا التزام نہیں کیا اور یوں کہا کہ محط فائدہ ثُمَّ اضْطَرْهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ (پھر اس کو کشاں کشاں دوزخ میں پہنچاؤں گا) ہے اور

فَأَمِيتُهُ قَلِيلًا (سو اس کو بھی تھوڑے روز خوب آرام برتاؤں گا) اس کی تمہید ہے جس پر فاء اس لئے داخل ہوگی کہ مبتدا کو فَاَمِيتُهُ کے معطوف میں دخل ہے گو معطوف علیہ میں دخل نہ ہو مگر مقصود و معطوف ہے معطوف علیہ محض اس کی تمہید ہے لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اس تکلف کی ضرورت نہیں بلکہ مَنْ كَفَرَ كُفْرًا كُفْرًا (سو اس کو بھی ضرور آرام برتاؤں گا) کے ساتھ ہی شرطیت کا علاقہ ہے اور کفر کو تمتع دنیا میں دخل ہے متاع دنیا کامل طور پر کافر ہی کو دی جاتی ہے کیونکہ وہ آخرت کا قائل نہیں اس لئے ہم تن دنیا میں منہمک ہوتا ہے اور ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے کہ دنیا میں ترقی کیونکر ہو اور مال کس طرح جمع کیا جائے تو دنیا کی تمتع اس کے لئے ہوتی ہے بخلاف مسلمان کے کہ اس کو اسلام انہماک فی الدنیا سے مانع ہوتا ہے اس لئے اس کو تمتع دنیا کافر سے کم ہوتی ہے۔

تشریح دعائے ابراہیمی

چنانچہ قرآن شریف میں ہے قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأَمِيتُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ يَٰ اِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ کے قصہ میں ہے اس سے اوپر یہ ارشاد ہے وَإِذْ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّتْهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ كَرِيمًا کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو چند احکام میں آزمایا اور جب اس میں پورے اتر گئے تو خطاب فرمایا کہ میں تم لوگوں کا امام اور مقتداء بناؤں گا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي اِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ نے کہا کہ اور میری اولاد میں سے بھی بعض کو امام اور پیشوا بنائیے۔ قَالَ لَا يَنْتَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ارشاد ہوا کہ امامت ظالم کافر کو نہیں مل سکتی یعنی ذریت میں سے۔ پھر مناسبت مقام سے درمیان میں خانہ کعبہ کا ذکر فرمایا وَلَذَجَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا کہ ہم نے خانہ کعبہ کو مقام امن اور لوگوں کا مرجع فی العبادات بنا دیا۔ وَأَتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى اَلَا يَٰ اِبْرَاهِيمَ اس کے آگے ہے وَلَذَقْنَا رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا کہ یا اللہ اس مقام کو امن والا شہر کر دے وَأَرْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ اور اس کے رہنے والوں کو پھل بھی دے۔ مَنْ أَمِنَ مِنْهُمْ يَأْتِيهِمُ الْيَوْمَ الْأَخِيرُ۔ جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان لا دے آپ نے ثمرات دنیوی کو دینی امامت پر قیاس کیا وہاں حکم ہوا تھا لَا يَنْتَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ کہ کافر ظالم کو امامت اور نبوت نہیں مل سکتی۔ آپ نے اس پر قیاس کیا کہ شاید نعمت دنیوی بھی کافر کو نہ ملے اس لئے دعا میں مَنْ أَمِنَ مِنْهُمْ يَأْتِيهِمُ الْيَوْمَ الْأَخِيرُ کی قید لگا دی تاکہ بے ادبی کا احتمال نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا وَمَنْ كَفَرَ فَأَمِيتُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ وَيَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ عام مفسرین نے تو اس کی اور تفسیر کی ہے مگر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے تفسیر مظہری میں ایک عجیب تفسیر کی ہے۔ عام مفسرین نے تو یہ تفسیر کی ہے کہ یہ معمول ہے ارزق مقدر کا یعنی و ارزق من کفر کہ میں کافر کو بھی رزق دوں گا۔ آگے اس کی تفصیل ہے فَأَمِيتُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ اس تفسیر کے موافق گویا من کفر پر جملہ ختم ہو گیا۔ فَأَمِيتُهُ قَلِيلًا الخ الگ جملہ ہے اور قاضی ثناء اللہ صاحب نے کہا ہے کہ من مبتداء ہے اور فامتعه خبر ہے یا یوں کہو وہ من شرطیہ ہے اور امتعه اس

کی جزاء ہے۔ خواہ من کو مبتداناویا شرطیہ اور امتنعہ کو خبر بناویا جزا دونوں جائز ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ جملہ مستقلہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اس کو دنیا سے تمتع کروں گا اور قلیلا قید واقعی ہے۔ کما قال تعالیٰ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ۔ اب اس پر ایک سوال ہوتا ہے کہ اس تقریر کا تو حاصل یہ ہوا کہ جو کفر کرے گا اسی کو متاع حاصل ہوگی تو کیا کفر سبب تمتع کا ہے؟ قاضی صاحب نے اس کا جواب دیا کہ دنیا کو مومن سے کم مناسبت ہے اور کافر سے زیادہ مناسبت ہے۔ یہ ایسی بات ہے جیسے ارشاد ہے الْخَيْثُ لِلْخَيْثِيْنَ وَالْخَيْثُ لِلْخَيْثِيْنَ کہ خبیث کو خبیث ہی ملا کرتا ہے۔ دنیا خبیث ہے اور کفار بھی خبیث ہے لہذا ان میں باہم تناسب ہے اور دنیا خبیث ہے لہذا ان میں باہم تناسب نہیں ہے۔ میں نے اسی تفسیر پر دعویٰ کیا تھا کہ کفار کا دنیا سے تناسب نقل سے ثابت ہے۔ اس لئے تدابیر باطلہ کفار کے لئے مفید ہے۔ بخلاف اہل اسلام کے ان کے لئے تو دعویٰ تدابیر نافع ہوں گی جو اسلام کے مناسب ہیں وہ تدابیر کیا ہیں وہ وہ ہیں جو اللہ میاں نے بیان فرمائی ہیں جن کو میں نے اب بیان کیا ہے کہ اپنی اصلاح کرو اخلاق کو درست کرو عقائد و اعمال کو سنوارو۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے کو تمہارے بہکانے کی طمع نہ ہوگی دست درازی کی ہمت نہ ہوگی۔ یہ تو اپنا ذاتی فائدہ ہے اپنے نفس کی حفاظت ہے آگے دوسرا درجہ اشاعت اسلام کا ہے اس سے بھی اس میں کامیابی ہوگی۔ کیونکہ اس کا حسن ایسا ہے کہ دوسروں کے دل میں کھینچتا ہے۔ اگر تمہارے اندر اسلام کے پورے اوصاف پائے جائیں گے۔ اس کے انوار و برکات تم میں جمع ہو جائیں تو دوسری قومیں خود ہی اس کے اندر آ جائیں گی۔ زیادہ بولنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار اور اس جماعت کے اندر ہی میں ایک ایسے پیغمبر مقرر کر دیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو آسمانی کتاب کی اور خوش فہمی کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کر دیں بلاشبہ آپ ہی غالب القدرت کامل الانتظام ہیں۔

تفسیری نکات

ابراہیم علیہم السلام نے جہاں اپنی اولاد کے لئے نفع دنیاوی کی دعا کی کہ **وَازْرُقْ أَهْلَكَ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ أَمِنَ مِنْهُمْ** **بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ**۔ وہاں اس دینی نفع کی بھی دعا کی کہ **رَبَّنَا وَابْعَثْ**

دعائے ابراہیمی کی تشریح

فرماتے ہیں کہ اے اللہ! ہماری اولاد میں ایک رسول بھیجئے جن کی یہ صفت ہو کہ ان لوگوں کو آپ کے احکام سنائیں اور

یہ شان ہو کہ ان کو کتاب اور حکمت تعلیم کریں اور ان کا تزکیہ کریں رذائل سے بے شک آپ قادر ہیں اور حکیم ہیں کہ موافق حکمت کے کرتے ہیں اور ایسا کرنا مصلحت ہے تو آپ اس کو ضرور قبول فرمائیں گے اس آیت کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ رسول کی تین صفتیں اس آیت میں بیان کی گئی ہیں اور ان رسول سے مراد ہمارے حضور انور ﷺ ہیں۔ اس لئے کہ داعی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل ہیں لہذا ضرور ہے کہ یہ رسول ان دونوں حضرات کی اولاد میں ہونا چاہیے اور ہر چند کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں حضور ﷺ کے علاوہ بھی متعدد انبیاء ہوئے مگر وہ بسلسلہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ہوئے ہیں۔ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے سلسلے میں صرف ہمارے حضور ﷺ ہی ہیں لہذا آپ ہی مراد ہوئے۔

دعا کے درمیان میں بعثت رسول کی دعا کرنا ایک بڑی رحمت کاملہ کا مانگنا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یوں کہتے ان کو پاک کیجئے اور ان کو کتاب دیجئے اور ان کو قبول کیجئے لیکن تعلیم بواسطہ وحی اس تعلیم سے افضل ہے جو کہ بلا واسطہ وحی کے بذریعہ الہام کے ہو۔

دین کے ضروری شعبے

اس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اے سننے والو سمجھ جاؤ کہ ضروری چیزیں یہ ہیں جن کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا اور سمجھ کر ہم سے دعا کی۔

اب سمجھنا چاہیے کہ وہ ضروری چیزیں کیا ہیں۔ سو وہ مفصلاً تو تین چیزیں ہیں۔ بتلو اور یعلم اور یز کسی۔ اور مجملاً ایک چیز ہے جس کو دین کہتے ہیں کیونکہ یہ سب دین ہی کے شعبے ہیں اس لئے کہ دین مرکب ہے دو چیزوں سے ایک علم اور دوسرا عمل جیسے فن طب کہ اس میں اول علم کی ضرورت ہوتی ہے پھر عمل کی۔ قرآن مطلب روحانی ہے اس میں صرف دو چیزیں ہیں ایک علم اور دوسرا عمل یز کسی میں عمل کی طرف اشارہ ہے اور یعلم میں علم کی طرف۔ حاصل یہ ہوا کہ اے سننے والے! اہتمام کے قابل دو چیزیں ہیں علم اور عمل۔ انہی کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ (ضرورت الاسلام والدین)

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ بَيْتِ اللَّهِ إِبْرَاهِيمَ الْأَمِنِ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي
الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۰۵﴾ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّكَ أَسْلِمُ قَالَ
أَسَلَّمْتُ لِربِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰۶﴾

ترجمہ: اور ملت ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے اجتناب ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو تو انہوں نے عرض کیا میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی۔

تفسیری نکات

اسلام کی حقیقت

اس میں حق جل و علا شانہ نے اسلام کی حقیقت بتائی ہے کہ اسلام کیا چیز ہے تو فرماتے ہیں وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ بَيْتِ اللَّهِ إِبْرَاهِيمَ الْأَمِنِ سَفِهَ نَفْسَهُ فرماتے ہیں کون شخص ایسا ہے جو اعراض کرے ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ سے ابراہیم علیہ السلام کا طریق تو ایک ایسی ملت تھا اور ایک ایسا مشرب تھا کہ کون سا مقبول بندہ ہے جو اس سے روگردانی کرے اور اعراض کرے اباہ کرے استغنا کرے اور اس کو ترک کرے یا اس سے ہٹ جاوے سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی بے قدری کی سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی۔ سوا اس کے کوئی ایسا نہ کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو نفس کی قدر جانے گا وہ اس کو نفع پہنچایگا اور ضرر سے بچائے گا کیونکہ نفس کی یہ قدر ہے کہ وہ اس کو نفع پہنچانا اور اس کو مضرت سے بچانا۔ تو جو اپنے نفس کی قدر جانے لگا وہ ملت ابراہیمی کو ضرور اختیار کرے گا اور کیوں اختیار کرے گا جب وہ چیز ہی اس درجہ کی ہے کیونکہ اس کی ہی برکت سے ابراہیم علیہ السلام اس درجہ کو پہنچے جس کو فرماتے ہیں وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ یعنی ہم نے انہیں مقبول بنایا تھا دنیا میں۔ اور حرف تاکید کے ساتھ فرماتے وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ اور آخرت کے اندر بھی وہ صالحین میں سے ہیں یعنی اس ملت کی برکت سے وہ دنیا میں بھی مقبول تھے اور آخرت میں بھی مقبول ہیں۔ تو ملت ابراہیم ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت ابراہیم علیہ السلام ایسے مرتبہ کو پہنچے۔ تو ظاہر ہے کہ وہ کتنی بڑی چیز ہوگی۔ پھر بھلا ایسی چیز سے کون اعراض کرے گا سوا جاہل کے اور سوا اس کے جس نے اپنے نفس کی قدر نہ جانی آگے اس ملت کی تعین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے ارشاد ہے إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّكَ أَسْلِمُ یعنی جب ان کے رب نے کہا کہ اسلام اختیار کرو۔ اگر کوئی کہے کہ حضرت ابراہیم علیہم السلام پہلے سے ہی اسلام لائے ہوئے تھے تو پھر اس کے کیا معنی تو یہ سمجھو کہ یہ کہنا ایسا ہے جیسے میاں جی نے سبق پڑھا دیا لڑکے نے اسے یاد کر کے سنا بھی دیا۔ اب دوسرے دن میاں جی نے جب کہا کہ آؤ سبق پڑھو تو وہ کہے کہ آج کل تک

سبق پڑھ چکا ہوں اور یاد کر کے سنا بھی چکا ہوں۔ یہ اسی پڑھانا کیسا تو وہ میاں جی کہتا ہے کہ ارے بھائی کل جو تم نے پڑھا ہے تو کیا ساری کتاب ختم کر لی ہے۔ کیا اب کچھ پڑھنے کو باقی نہیں رہا۔ کیا ایک ہی سبق میں علم کی پوری تکمیل کر چکے۔ ارے ابھی اور بھی تو بہت کچھ پڑھنا پڑھانا ہے تو جس طرح میاں جی کہتا ہے کہ اور پڑھو اسی طرح یہ ارشاد ہے کہ اسلام مگر اتنا فرق ہے کہ وہاں لڑکے نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کل تو پڑھ چکا تھا اور یہاں کوئی نبی ایسا نہیں جو اسلام کے جواب میں یہ کہے کہ اسلام لا چکا بلکہ جواب میں وہ کہیں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا یعنی یہ کہا **اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ** کہ میں نے اسلام اختیار کیا یہ ترجمہ کا حاصل ہو اس میں تعین ہو گئی اس ملت کی کہ وہ کیا ہے یعنی اسلام غرض ان دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ اس میں اسلام ہی کی فضیلت وارد ہوئی ہے اور معلوم ہوا کہ یہی وہ ملت ابراہیمی ہے جس کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اب اس کے ساتھ اگر سیاق و سباق کو بھی ملا لیجئے تو اسلام کی فضیلت اور عظمت اور زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ یعنی اس کے قبل حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو حضرت اسمعیل علیہ السلام کے ساتھ جمع ہو کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی اس کا واقعہ مذکور ہے اور اس دوران میں جو دعائیں دونوں نے مل کر مانگی تھیں وہ نقل کی گئی ہیں چنانچہ ارشاد ہے **وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ** (اور جبکہ اٹھارہ تھے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دیواریں خانہ کعبہ کی اور اسمعیل (علیہ السلام) بھی کہ اے ہمارے پروردگار یہ خدمت ہم سے قبول فرمائیے بلاشبہ آپ خوب سننے والے جاننے والے ہیں) پھر ان کی دوسری دعا نقل فرمائی ہے **رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةٌ مُّسْلِمَةٌ لَكَ** تو یہاں اپنے واسطے بھی دعا مانگی ہے کہ اے اللہ ہم کو سچا مسلمان بنا دے۔ دیکھئے کتنی بڑی چیز ہے اسلام کہ انبیاء علیہم السلام بھی باوجود اتنے بڑے درجہ پر ہونے کے یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں کامل اسلام عطا فرما۔ پھر کتنی بڑی سخاوت اور خیر خواہی ہے کہ اپنے ساتھ ہم نالائقوں کو بھی یاد فرمایا **وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا** اور اے اللہ میری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان جماعت بناؤ خواہ وہ اولاد جسمانی ہو یا روحانی اس کے واسطے کہ ایک جگہ حق سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد **وَلَوْلَا إِيمَانُ بآئِنَا لَبِئْسَمَا لَلْعَالَمِينَ** اس کے مخاطب ہیں امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساری امت کے جسمانی باپ نہیں ہو سکتے۔ تو لامحالہ یہاں روحانی باپ ہونا مراد ہے اور کہا جائے کہ خاص عرب مخاطب ہیں جن کے آپ جسمانی باپ بھی ہیں تو اس آیت میں سباق و سیاق اس کا مساعد نہیں چنانچہ اوپر **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** میں عام اہل ایمان کو خطاب یہ ہے کہ خاص عرب کو پھر آگے **سَمِعْنَاكَ يَا مُسْلِمِينَ** اور **سَمِعْنَاكَ يَا مُسْلِمِينَ** واقع ہے جو کہ صفت مشترکہ ہے تمام امت کی تو معلوم ہوا ابیکم عام ہے جسمانی باپ ہونے کو بھی اور روحانی باپ ہونے کو بھی۔ غرض وہ یعنی اہل عرب جسمانی اولاد ہیں اور غیر اہل عرب روحانی اولاد ہیں ان سب کو بھی اپنے ساتھ دعا میں یاد فرمایا البتہ اس اولاد میں سے اس کو مستثنیٰ کر دیا جو اسلام کے ساتھ موصوف نہ ہوں چنانچہ یوں نہیں فرمایا **ذُرِّيَّتِنَا** بلکہ **مَنْ بَرَّهَادِيَا** کیونکہ اس سے قبل جو **إِنِّي جَاعِلُكَ لِلْعَالَمِينَ** (میں تم کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا) کی بشارت سن کر دعا کی تھی۔ **وَمَنْ** ذریتسی اور اس کے جواب میں ارشاد ہوا تھا **لَا يَنْتَظِرُ الْعَالَمِينَ** اس سے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ کچھ ایسے بھی ہوں

گے جو طریق حق پر نہ ہوں گے اس لئے اس دعا کو ان کو مستثنیٰ کر دیا اس دعا میں ایک بات یہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ آپ نے لقب اس امت کا مسلمہ رکھا جس کا ذکر ایک تفسیر کی بنا پر دوسری آیت بھی ہے **هُوَ سَمُّكُمْ الْمُسْلِمِينَ** کیونکہ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف ضمیر راجع ہو۔ بہر حال ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے بھی اسلام کو ثابت کیا اور امت محمدیہ **سَلَّمَ** کے لئے بھی اسلام کی درخواست کی اس سے اسلام کا جو کچھ شرف ثابت ہے ظاہر ہے۔ یہ تو سابق میں نظر تھی آگے سیاق یعنی مابعد میں دیکھے تو ایک صفحہ کے اندر ہی اندر جا بجا اسلام کا ذکر فرمایا ہے سب سابق و سیاق میں جو میں نے غور کیا تو سات جگہ اسلام کا ذکر ہے ایک **وَأَجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ** میں دوسرا **أُمَّةٌ مُسْلِمَةٌ لَكَ** میں تیسرے **قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمُ** میں چوتھے **أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ** میں پانچویں **فَلَا تَتَّبِعُوا إِلَّا مَا أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** میں چھٹے **وَنَحْنُ لَكُمْ مُسْلِمُونَ** میں ساتویں **لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَكُمْ مُسْلِمُونَ** میں اور محاورات عرب میں سات کا عدد یہ کثرت کا مرتب ہے اور جب اور مبالغہ مقصود ہوتا ہے تو ستر کا عدد استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ سات اور ستر کا استعمال کثرت کے لئے احادیث کثیرہ میں موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا کیا درجہ ہے کہ ایک ہی مقام پر بار بار اس کا کئی طرح ذکر کیا جاتا ہے نیز اس امام کی آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب اسلام ہی رہا ہے تو اسلام اتنی قدر کی چیز ہے۔ یہ تو اسلام کی اہمیت و عظمت کا ذکر ہوا اب اسلام کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے۔

اسلام اصل میں ایک لغت عربی ہے پھر اور قرآن حدیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصوص میں جو اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے تو اس کے ساتھ لغوی معنوی پر ایک قید لگائی گئی ہے اس لحاظ سے دو قسم کا اسلام ہوا ایک تو اسلام لغوی اور ایک اسلام شرعی۔ اسلام لغوی کے معنی ہیں سپردن سوئپ دینا۔ اس کو تعبیر کر دیتے ہیں گردن نہادن بہ طاعت سے۔ غرض جو تسلیم کے معنی ہیں وہی اسلام کے معنی ہیں۔ مادہ دونوں کا سین لام میم ہے اور ان حروف میں تسلیم کے معنی مودع ہیں چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ** یعنی جس نے سپرد کر دیا اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے لئے۔ غرض اسلام کے معنی ہیں سپرد کر دینا۔ شریعت نے اس میں ایک اور قید بڑھائی یعنی ایک قید تو اسلم کے معمول میں بڑھائی اور ایک قید اس کے متعلق میں۔ لغوی اسلام میں کوئی قید نہیں۔ اس کے معنی ہیں مطلق سپرد کرنا۔ جس کو چاہے سپرد کرنا اور جس کے چاہے سپرد کرنا۔ اب اسلام شرعی کی قیدیں سنئے ایک قید تو یہ ہے کہ اسلم کا معمول کون ہے خود اپنی ذات اور اس کا متعلق کون ہے اللہ۔ اصل کیا ہوا اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا۔ یہ ہے حقیقت اسلامی شرعی کی۔ (ملت ابراہیم علیہ السلام)

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّيْتُمْ هَذَا وَمَا كُنْتُمْ بِهِ قَدِيرِينَ

ترجمہ: اب تو بے وقوف لوگ کہیں کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس (بات) نے بدل دیا۔

تفسیری نکات مسلمانوں کو تلقین

یہ آیت تحویل قبلہ کے متعلق ہے کیونکہ قبلہ کے احکام اول اول بدلتے رہتے تھے۔ پہلے مسلمانوں کا قبلہ بھی بیت المقدس تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو عارضی قبلہ بنایا تھا اور آئندہ اس کو منسوخ کرنا تھا اور اس پر کفار کی طرف سے اعتراض واقع ہونے والا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا اہتمام فرمایا کہ آئندہ واقع ہونے والے اعتراضات سے مسلمانوں کو زیادہ رنج نہ پہنچے۔ تو پہلے ہی سے اطلاع فرمادیا کہ بے وقوف اور نادان لوگ تمہارے اوپر اس طرح اعتراض کریں گے تم ان سے دلگیر نہ ہونا۔ (الجبر بالصر)

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا

ترجمہ: اور ہم نے تم کو ایسی جماعت بنا دیا جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے

تفسیری نکات

غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں: ۱- حکمت ۲- عفت ۳- شجاعت

اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے اور قرآن میں جو فرمایا ہے وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا اس سے بھی عدل مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے (ایک ایسی شریعت دے کر جو سراپا عدل ہے) ائمہ وسط یعنی امت عادلہ بنایا۔ ایک مقدمہ اور لیجے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وسط حقیقی ایک وسط عرفی۔ وسط حقیقی وہ خط ہے جو بالکل بیچوں بیچ ہو۔ وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا اور ایک وسط عرفی ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ وہ تو منقسم ہے اس کے اندر بھی ایک جزو دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے پھر وہ وسط حقیقی کہاں سے ہوا۔ حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بائیں کچھ نہ نکل سکے۔ سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔ پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو بلکہ عین وسط ہو۔ یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے اور یہی کمال ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے۔ چنانچہ جن اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم

ہوگا۔ اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔

پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلواریں سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی۔ کیونکہ بال بھی غیر منقسم ہے اور وسط حقیقی بھی غیر منقسم ہے۔ پس قیامت میں یہی روح شریعت یعنی وسط حقیقی جو ہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جائے گا۔ پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی و سہولت کے ساتھ چلا ہوگا وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا کیونکہ وہ یہی شریعت تو ہوگی جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلایا کم چلا ہے وہ بل صراط پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ

يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ

ترجمہ: اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں یعنی بیت المقدس وہ تو محض اس مصلحت کے لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتا ہے اور کون پیچھے ہٹتا ہے۔

تفسیری نکات

ایک آیت کی عجیب تفسیر

فرمایا ایک بہت بڑے معقولی فاضل نے آیت لنعلم میں دفع اشکال حدوث کے لئے غضب کیا ہے کہ علم سے مراد علم تفصیلی لیا ہے وہ حادث ہے البتہ علم اجمالی کا ترتب حادث پر صحیح نہیں کیونکہ وہ صفت قدیمہ ہے اور یہ توجیہ بالکل غلط ہے کیونکہ علم تفصیلی تو اصطلاح میں خود معلومات کا نام ہے اس لئے نہ اس سے اشتقاق صحیح ہے اور نہ ہی اس کی اسناد الی الواجب صحیح اور آیت میں اشتقاق بھی ہے اور اسناد بھی۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پٹی نے اس کی تفسیر پارہ سبقتوں میں نہایت عمدہ کی ہے اور کہا ہے کہ علم حق جو اشیاء کے متعلق ہے وہ واقع کے مطابق ہے پس ماضی کے ساتھ صفت مضیٰ اور حل استقبال کے ساتھ حال و استقبال کی صفت کے ساتھ متعلق ہے پس جو چیز مستقبل تھی اس کے ساتھ علم یوں متعلق تھا کہ یہ چیز مستقبل میں واقع ہوگی۔ اب اس علم ثابت فی الآیہ کی یوں تعبیر ہوگی کہ جس چیز کو اس طرح جانتے تھے کہ مستقبل میں ہوگی۔ اب اس طرح جان لیں کہ ماضی میں ہو چکی اور دونوں انکشافوں میں مطلق تفاوت نہیں پس یہ تغیر اضافہ میں ہوا جو صفت معلوم کی ہے علم میں نہیں جو صفت عالم کی ہے۔ (الکلام الحسن حصہ اول)

تفسیر کے اشکال کامل

فرمایا ایک بہت بڑے معقولی فاضل نے آیت لنعلم میں دفع اشکال حدوث کے لئے یہ غضب کیا ہے کہ علم سے مراد علم تفصیلی لیا ہے اور وہ حادث ہے البتہ علم اجمالی کا ترتب حادث پر صحیح نہیں کیونکہ وہ صفت قدیمہ ہے اور یہ توجیہ بالکل غلط ہے

کیونکہ علم تفصیلی تو اصطلاح میں خود معلومات کا نام ہے اس لئے نہ اس سے اشتقاق صحیح ہے اور نہ ہی اس کی اسناد الی الوجوب صحیح اور آیت میں اشتقاق بھی ہے اور اسناد بھی۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پٹی نے اس کی تفسیر پارہ سیمقول میں نہایت عمدہ کی ہے اور کہا ہے کہ علم حق جو اشیاء کے متعلق ہے وہ واقع کے مطابق ہے پس ماضی کے صفات صفت مضی کے ساتھ متعلق ہے اور حال اور استقبال کے ساتھ حال و استقبال کی صفت کے ساتھ متعلق ہے۔ پس جو چیز مستقبل تھی اس کے ساتھ علم یوں متعلق تھا کہ یہ چیز مستقبل میں واقع ہوگی۔ اب اس علم ثابت فی لآ یہ کی یوں تعبیر ہوگی کہ جس چیز کو اس طرح جانتے تھے کہ مستقبل میں ہوگی۔ اب اس طرح جان لیں کہ ماضی میں ہو چکی اور دونوں انکشافوں میں مطلق تفاوت نہیں پس یہ تغیر اضافہ میں ہوا جو صفت معلوم کی ہے علم میں نہیں جو صفت عالم کی ہے۔ (الکلام الحسن ج ۱۰ ص ۷۰)

تفسیر عجیب لنعلم

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ

ترجمہ: اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس کے لئے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے کہ کون تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹا جاتا ہے۔

ایک تقریر اس کی یہ ہو سکتی ہے جو مظہری میں ہے کہ شیخ ابو منصور کہتے ہیں کہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم پہلے اس طرح جانتے تھے کہ وہ موجود کی جاوے گی۔ اس کو ہم موجود فی الحال جان لیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں جن چیزوں کو وہ موجود کرنا چاہتا ہے اس طرح تو علم ہے کہ اس کو فلاں وقت میں موجود کروں گا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو ازل میں ان چیزوں کا اس طرح علم تھا کہ وہ فی الحال موجود ہے کیونکہ جب وہ واقع میں موجود نہیں تو حکیم خلاف واقع موجود فی الحال کیسے جان سکتا ہے اور یہ تغیر معلوم میں ہوا ہے علم میں نہیں ہوا۔ (ماخوذ البدائع)

تفسیر آیت

فرمایا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ الْآيَةَ فِي لَعْنَةِ الْكُفْرَانِ الَّتِي لَكُمْ فِيهَا وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ کہ اس حدیث میں حدوث علم لازم آتا ہے اس لئے کہ جعل قبلہ حادث ہے اور علم جو اس پر مرتب ہو ظاہر ہے کہ وہ بھی حادث ہی ہوگا۔ بعض معقولین نے اس اعتراض کا ایک جواب دیا جو بالکل غلط ہے وہ یہ کہ مراد علم تفصیلی ہے وہ حادث ہے اور صفات میں سے نہیں اور یہ غلط اس واسطے ہے کہ یہ ایک اصطلاحی لفظ بمعنی معلومات ہے نہ کہ لغوی بمعنی مصدر جس سے اشتقاق ہوتا ہے پس لنعلم میں بمعنی علم تفصیلی لینے سے ایک تو اشتقاق لنعلم درست نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر بتکلف اشتقاق کا دعویٰ کیا جاوے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے تبدیل قبلہ اس لئے کیا تا کہ ہم ممکنات کے عین ہو جاویں کیونکہ تفصیلی معلومات ممکنہ کا عین ہوتا ہے اور بہترین جواب اس اعتراض کا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پٹی نے دیا ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہوتا ہے اور یہ مقدمہ ظاہر ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ واقعات تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ماضی، مستقبل اور حال۔ پس اللہ تعالیٰ

جملہ واقعات کو مع ان کے زمانہ کے جانتے ہیں۔ یعنی حق تعالیٰ جملہ اشیاء کو کشف تام سے جانتے ہیں مع ان کے قیود واقعہ کے مثلاً جو چیزیں ماضی میں واقع ہیں ان کو اسی طرح جانتے ہیں کہ قدوقع اور جو مستقبل میں ہیں ان کو اسی طرح جانتے ہیں کہ سبقت اور جب وہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کو قدوقع کی قید سے جانتے ہیں اور یہ تغیر معلوم میں ہے عالم میں نہیں۔ پس تحویل قبلہ کے وقوع سے پہلے تو اس طرح جانتے تھے کہ فلاں فلاں اشخاص اسلام پر رہیں گے اور فلاں فلاں مرتد ہو جاویں گے جب تحویل قبلہ ہوگئی تو بصورت ماضی جان لیا باقی انکشاف دونوں حالتوں میں تام اور کامل ہے اور یہی مراد معلوم ہوتی ہے مفسرین کے اس قول کی لعلم علم ظہور۔

وَلِكُلِّ وَّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ

ترجمہ: اور ہر شخص (ذی مذہب) کے واسطے ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ عبادت میں منہ کرنا رہا ہے۔

تفسیری نکات

ترقی کو شرعاً واجب فرمانا

فرمایا۔ لکھو میں ایک ترقی یافتہ مجمع کی درخواست پر میرا وعظ ہوا۔ میں نے آیہ **وَلِكُلِّ وَّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّئُهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ** کا بیان کیا اور استباق کی حقیقت ترقی بتلا کر میں نے کہا صاحبو! تم تو ترقی کو عقلاً واجب کہتے ہو اور ہم شرعاً واجب کہتے ہیں تو ہم ترقی کے زیادہ حامی ہوئے۔ کیونکہ ہم جب اس کو شرعاً واجب کہتے ہیں تو اس کے ترک پر گناہ کے بھی قائل ہوں گے۔ غرض تم اور ہم اس پر تو متفق ہوئے کہ ترقی مطلوب ہے اور اس پر بھی تم کو اتفاق کرنا پڑے گا کہ ہر ترقی مطلوب نہیں کیونکہ اگر بدن پر مثلاً ورم ہو جائے تو وہ بظاہر ترقی جسمانی ہے مگر تم بھی اس کا علاج کراتے پھر دو گے۔ اسی طرح اگر سمن مفرط ہو جاوے تو اس کا بھی علاج کرانا ضروری سمجھو گے۔ پس اس سے صاف ظاہر ہوا کہ ترقی وہ مقصود ہے جو نافع ہو اور جو ضرار یعنی نقصان دہ ہو وہ مطلوب نہیں پس اتنے حصہ میں تو ہمارا تمہارا اتفاق ہے اختلاف اگر ہے تو صرف اس امر میں ہے کہ کونسی ترقی نافع ہے کونسی مضر سو تم صرف دنیاوی ترقی کو نافع سمجھتے ہو اگر چہ آخرت میں مضر ہو اور ہم دینی ترقی کی مطلقاً نافع سمجھتے ہیں اور دنیاوی ترقی کو قید عدم ضرر کے ساتھ ورنہ ترقی فی الودم والسمن کی طرح مضر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن عزیز میں اسی نافع ترقی کا حکم **فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ** میں فرمایا ہے کیونکہ خیر نافع کو کہتے ہیں باقی مولویوں پر جو شبہ کیا جاتا ہے کہ مولوی تو جائز دنیاوی ترقی کا بھی وعظ نہیں کرتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیاوی ترقی کا وعظ جب کہتے ہیں جبکہ تم لوگ اس کو نہ جانتے ہو تو وعظ سے اس کی ضرورت کو بتلایا جاتا۔ تم تو خود اس قدر زیادہ اس میں مشغول ہو کر حدود سے بھی نکل گئے ہو۔ پھر ہمارے وعظ کی آپ کو اس ترقی کے متعلق کیا ضرورت رہ گئی بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تم جو حدود سے نکل گئے ہو اس سے تم کو روکا جائے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس مسئلہ کو نہایت تصریح کے ساتھ صاف کر دیا ہے

یعنی اول قارون کی دنیوی زندگی کا ذکر فرمایا ہے۔ فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ پھر دنیوی ترقی کے مقصود سمجھنے والوں کا قول نقل فرمایا ہے قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا لَيْسَتْ لَنَا مَبْذُلٌ مَّا آتَى قَارُونَ إِنَّهُ لَذُو حَقٍّ عَظِيمٍ۔ اس کے بعد مولویوں کا جواب ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيُنذِر بَكُورًا إِنَّ اللَّهَ خَيْرٌ لِّمَن أَمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلْقِيهَا إِلَّا الضَّالُّونَ یہ تو دنیا داروں اور دینداروں کے اختلاف کی حکایت تھی آگے اللہ تعالیٰ ان میں فیصلہ فرماتے ہیں اور فیصلہ بھی عملی فیصلہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں فَخَسَفْنَا بِهِ وَبَدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُا مِنْ فِئَةٍ تَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنتَصِرِينَ۔ جب اللہ تعالیٰ کا یہ عملی فیصلہ دیکھا تو دنیوی ترقی کے طالبوں کی رائے بدل گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيَكَانَ اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَوْلَا أَن مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيَكَانَ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ اور میں قسم کہتا ہوں کہ تم بھی عملی فیصلہ کے وقت اقرار کرو گے کہ مولوی ٹھیک کہتے تھے مگر یہ فیصلہ کب ہو گا جب موت آدے گی اس وقت اپنی غلطی کا اقرار کرو گے کہ ہائے علماء حق پر تھے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكَرَكُمُ وَأَشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ

ترجمہ: پس (ان نعمتوں پر) مجھ کو یاد کرو میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکرگزاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو۔

تفسیری نکات ذکر اللہ کا ثمرہ

فرمایا کہ انسان کے جملہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں بعض وہ ہیں جس کا کچھ دنیا میں بھی مشاہدہ ہوتا ہے جیسے تصنیف کتب وغیرہ۔ بعض وہ ہیں جن کا ثمرہ دنیا میں کچھ مشاہدہ نہیں ہوتا جیسے ذکر اللہ و نماز وغیرہ پہلی قسم کے اعمال نفس پر بہت آسان ہو جاتے ہیں لیکن دوسری قسم کے عمل بے حد کٹھن ہیں اور ان کے کرنے میں نفس پر سخت بار ہوتا ہے اس کے آسان کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ خاص ثمرات پر نظر ہی نہ کرے بلکہ اس نیت سے ذکر کرے کہ وعدہ خداوندی ہے فاذکرونی اذکرکم جب اس کو یاد کرے تو وہ ہم کو ضرور یاد کرے گا اور اس کا یاد کرنا مطلوب ہے پھر جب مطلوب حاصل ہے تو اس سے لذت وغیرہ اگر نہ بھی حاصل ہوئی تو کیا مسائقہ ہے اور یہی علاج ہے قبض کا جب ایسی حالت پیش آئے سمجھے کہ ہم کو نہ قبض مطلوب ہے نہ بسط اور نہ یہ ثمرہ ذکر ہے بلکہ جو حالت ہو ہم اس میں راضی ہیں اور وہی خدا کا فضل ہے اس لئے کہ

دل کہ اوبستہ غم و خندیدن ست تو بگو کے لائق آں دیدن ست

ذکر اللہ کا مقصود

فرمایا حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ذکر سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ فاذکرونی اذکرکم

اور کسی چیز کا طالب نہ ہونا چاہیے۔ نہ حالات کا نہ واردات کا کہ یہ مقصود نہیں ہے صرف رضائے حق مقصود ہے۔ پھر جس کے لئے جو مناسب ہوتا ہے عطا فرماتے ہیں۔ کسی کو ذوق شوق میسر ہوا۔ کسی کو قبض ہر شخص کو انعام مناسب ملتا ہے مثلاً دنیا میں کسی کو کپڑا انعام میں ملا کسی کو روپیہ کسی کو غلہ علیٰ ہذا القیاس۔ پس فاذا ذکرونی اذکرکم پر نظر رہنا چاہیے۔

اللہ کے ذکر سے قرب خداوندی نصیب ہوتا ہے

ایک ذکر نے عرض کیا کہ میں ذکر کرتا ہوں مگر کوئی اثر اس کا محسوس نہیں ہوتا کوئی نور یا خواب تک بھی نظر نہیں آتا۔ فرمایا ذکر اس واسطے بتایا ہی نہیں گیا کہ کچھ نظر آوے ذکر سے غرض قرب ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ذکر سے قرب ہوتا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ جو کوئی میرا ذکر کرتا ہے میں اسکو اس سے بہتر مجمع میں ذکر کرتا ہوں خود قرآن شریف میں ہے فاذا کرونی اذکرکم پھر یہ کیا تھوڑا اثر ہے کہ آپ کا ذکر وہاں ہو۔

ہینیم بس کہ وانما ہریم کہ من نیز از خریداران اویم
ہینیم بس اگر کاسہ قماش کہ من نیز از خریداران اش باشم
لوگوں کو یہ خط ہے کہ ذکر کا کچھ نظر آنا قرار دیا ہے۔ ذکر کا محسوس اثر بڑا یہ ہے کہ اس پر دوام ہو۔ حضرت حاجی صاحب سے کسی نے یہی شکایت کی تھی تو فرمایا کہ تمہارا کام یہی ہے کہ

یابم اور ایانیا بم جستوائے می کنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم
اور حضرت کے پاس ایک شخص آیا کہ میں نے طائف میں چلے کھینچا سوالا کہ مرتبہ روزانہ اسم ذات کا ورد کیا مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا اس سے مجھے خیال ہے کہ آپ مجھ سے ناخوش ہیں فرمایا میں ناخوش ہوتا تو ممکن بھی تھا کہ تم یہ چلے پورا کر لیتے۔ ثابت ہوا کہ بعض وقت کسی کی امداد ہمارے ساتھ ہوتی ہے اور ہم کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا تو جو شخص ذکر پر مداومت کرتا ہے اسکے ساتھ امداد حق ہے گو کوئی محسوس علامت اسکی نہیں ہے اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ نظر آنا کیا چیز ہے۔ ان کیفیات کو لوگ مقصود سمجھ لیتے ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ یہ کیفیات اکثر محمود ہوتی ہیں مگر مقصود نہیں۔

فوائد و نتائج

محمود اور مقصود میں فرق یہ ہے کہ مقصود غرض کو کہتے ہیں اور اس کے حصول و عدم حصول پر فعل کا دار و مدار ہوتا ہے اور محمود وہ امر حسن ہے کہ اسکے حصول و عدم پر دار و مدار نہ ہو جیسے دوا کا بیٹھا ہونا کہ محمود ہے مقصود نہیں مقصود شفا ہے اگر حصول مقصود کے ساتھ دوا بیٹھی بھی ہو تو خوبی دو بالا ہے اور اگر صرف مقصود یعنی شفا حاصل ہو تو کڑوی دوا بھی پینا چاہیے اور جب مقصود حاصل نہ ہو تو چاہیے کسی بیٹھی اور خوشگوار دوا ہے اس کا اختیار کرنا غلطی ہے یہی حکم واردات و کیفیات کا ہے کہ جب کسی عمل میں وہ شرائط موجود ہوں جن کی تعلیم شریعت نے تصریح آدی ہے یا وہ شرائط جن کی شیخ نے تعلیم فرمائی ہے تو انکی پروا نہ کرنا چاہیے۔ اگر عمدہ حالات محسوس ہوں ورنہ کچھ ملال نہ کرے اور اگر وہ شرائط موجود نہیں ہیں تو خواہ اسکے زعم میں معراج ہی کیوں نہ

ہونے لگے مگر اس کو جولا ہے والی معراج سمجھے۔ الحانک اذا صلے یومین انتظر المعراج وہ ضرور سلسلہ شیطانی ہے۔ یہ وہ خوفناک چیز ہے کہ ہزار ہا مخلوق خدا کی بدولت ایمان تک کھو بیٹھے ہیں۔ جوگی دہریے قادیانی سب اسی خبط میں گمراہ ہیں اور حقیقت صرف یہ ہے وقبضنا لهم قرناء فزینوا لهم ما بین ایدیہم وما خلفہم وکذالک جعلنا لکل نبی عدو اشیاطین الانس والجن یوحی بعضهم الی بعض زخرف القول غروراه وکذالک زینا لکل امۃ عملہم۔ الفمن زین له سوء عملہ فراہ حسناء۔ کشف وکرامت اور اچھے خوابوں کے متعلق رسالہ ہذا میں بہت جگہ تحقیق موجود ہے ملاحظہ فرمادیں خصوصاً حکمت ششم اور حکمت سی وکیم اور حکمت بست و ہفتم میں۔ (جمال الحکمت ص ۵۱-۵۲)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

ترجمہ: اے مومنو! صبر اور نماز کے ساتھ مدد چاہو بلاشبہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیری نکات

حصول صبر کی سہل تدبیر

استعینوا خود بتلا رہا ہے کہ اس میں کسی کام کو آسان کرنے کی تعلیم ہے تب ہی تو استعانت کی حاجت ہوئی اور سہولت کی توجیہ یہ ہے کہ نماز سے خدا تعالیٰ کی عظمت بڑھ جائے گی اور اپنی عظمت یعنی حب جاہ نکل جائے گی آگے نماز میں خود ایک دشواری تھی اس لئے صبر کی تعلیم دی اس کا دخل نماز کی سہولت میں اس طرح ہے کہ نماز نفل ہے۔

وَلَنْبَلُوْكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَالصَّابِرِينَ ۗ الَّذِينَ إِذَا أصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۗ

ترجمہ: اور البتہ ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے یعنی تم کو دشمنوں کی طرف سے اندیشہ اور خوف بھی پہنچے گا۔ اور جوع سے یعنی کسی وقت تم پر فاقہ بھی آئے گا اور اموال و نفوس اور ثمرات کے نقصان سے (یعنی کسی وقت تمہارا مال بھی ضائع ہوگا جانیں بھی ضائع ہوں گی اور ثمرات بھی ضائع ہوں گے) اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے جن کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہم نے اس کی طرف لوٹنا ہے۔

تفسیری نکات

ثمرات کی ایک تفسیر

ثمرات کی ایک تفسیر تو پیداوار ہے مطلب یہ ہے کہ کسی وقت تمہاری کھیتوں اور باغات کی پیداوار پر آفت آئے گی اور گواہوں میں یہ بھی آگئے تھے مگر چونکہ زمینداروں کے نزدیک یہ اعزاز اموال (مالوں میں سے عزیز تر) ہیں اور مدینہ والے اکثر زمیندار تھے اس لئے ثمرات کو مستقلاً بیان فرمادیا اور ایک تفسیر ثمرات کی اولاد ہے کیونکہ وہ ماں باپ کے جگر کے ٹکڑے ہیں اسی لئے اولاد کو ثمرات الفواد (دلوں کا پھل) کہا جاتا ہے اور گو وہ نفوس میں داخل ہو سکتے ہیں مگر یہاں بھی تخصیص کی وہی وجہ ہوگی جو ثمرات بمعنی پیداوار کو اموال کے بعد ذکر کرنے کی وجہ تھی یعنی چونکہ اولاد اعزاز النفوس (جانوں میں زیادہ عزیز) ہیں اور ان کے مرنے کا غم زیادہ ہوتا ہے اس لئے ان کو جدا بیان کر دیا کہ کسی وقت تمہاری اولاد بھی ہلاک ہوگی۔ اس میں ایک تو یہ بتلا دیا کہ تم پر یہ واقعات وارد ہوں گے۔

حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے امتحان

دوسرے یہ بھی بتلا دیا کہ ان واقعات سے ہم تمہارا امتحان لیں گے یہی ایک لفظ ایسا ہے کہ اگر اور کچھ بھی نہ ہوتا تو اسی سے مصیبت ہلکی ہو گئی ہوتی کیونکہ امتحان کا لفظ سنتے ہی مخاطب کو فکر ہو جاتی ہے کہ مجھے اس امتحان میں پاس ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ میں فیل ہو جاؤں اور قاعدہ ہے کہ انسان امتحان کے وقت اپنے حواس و عقل کو مجتمع رکھنے کی کوشش کرتا ہے پس یہ سن کر یہ واقعات بطور امتحان کے آئیں گے ہر شخص اس کی کوشش کرے گا کہ ان مواقع میں اپنے عقل و حواس کو مجتمع رکھے از خود رفتہ نہ ہو جائے کیونکہ امتحان کے وقت بدحواس ہو جانے سے آدمی فیل ہو جاتا ہے اور مصیبت کے وقت عقل و حواس قائم رکھنا بھی اس کے اثر کو بہت کم کر دیتا ہے۔ پس لنبلونکم (ہم ضرور تمہاری آزمائش کریں گے) میں اس پر تشبیہ کر دی ہے کہ مصائب کے وقت بدحواس نہ ہونا چاہیے بلکہ ان کو امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرنا چاہیے پھر اس میں صیغہ جمع متکلم اختیار فرمایا جس سے عظمت ابتلا پر دلالت ہے کیونکہ معلوم ہو گیا کہ یہ امتحان حق تعالیٰ خود لیں گے اور جیسا امتحان عظیم الشان ہوتا ہے ویسا ہی امتحان بھی عادتاً مہتمم بالشان ہوتا ہے گو واقع میں حق تعالیٰ کی طرف سے امتحان عظیم نہ ہو آسان اور سہل ہی ہو مگر مخاطب کو بتلا دیا کہ وہ ابتلا عظیم کے لئے تیار رہے اور اس میں بھی حق تعالیٰ کی باری رحمت ہے کہ پہلے سے ہم کو مطلع فرمادیا کہ تم کو ایسے ایسے واقعات پیش آئیں گے اس صورت میں تکلیف کی کلفت تو ہوگی مگر دفعۃً جو ایذا پہنچنے کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ نہ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو پہلے سے کہہ دیا جائے کہ تمہارا اپریشن کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس کو اپریشن کی تکلیف تو ہوگی مگر دفعۃً کلفت پہنچنے کا صدمہ نہ ہوگا۔

حضرات کاملین کے عشق و محبت کا امتحان

پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ناگوار واقعات میں حق تعالیٰ کی رحمت میں اعتقاد نہ ہو یہاں شاید یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ غافلین کو ناگوار واقعات پیش آنے کی تو یہ حکمت ہے مگر کاملین کو ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں وہ تو بد شوق نہیں ہیں جس سے ان کو تنبیہ کی ضرورت ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ اہل اللہ کاملین کو بھی ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اس شبہ کا جواب اسی آیت میں لفظ لنبلونکم سے نکلتا ہے کیونکہ اس میں اولاً حضرات صحابہ کو خطاب ہے جو سب کے سب کاملین ہیں اور ان سے فرمایا گیا ہے کہ تم کو ان واقعات سے آزمائیں گے معلوم ہوا کہ کاملین پر ایسے واقعات بطور تنبیہ اور تادیب کے نہیں آتے بلکہ طور امتحان کے پیش آتے ہیں حق تعالیٰ ناگوار واقعات سے ان کی محبت و عشق کا امتحان فرماتے ہیں اور حق تعالیٰ کو خود امتحان کی کوئی ضرورت نہیں ان کو ہر شخص کی حالت خوب معلوم ہے بلکہ اس امتحان سے دوسروں کو دکھلانا منظور ہے مثلاً ملائکہ وغیرہ کو کہ دیکھو ہمارے بندے مصائب میں بھی کیونکہ ہم کو چاہتے ہیں کاملین کو بھی مصائب میں کلفت ہوتی ہے۔ نیز لفظ لنبلونکم (ہم تم کو ضرور آزمائیں گے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کاملین کو مصائب سے کلفت بھی ہوتی ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ اس آیت کے مخاطب حضرات صحابہ ہیں جو سب کے سب کامل ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا ان پر یہ واقعات بطور امتحان کے آتے ہیں اور بغیر احساس کلفت کے امتحان نہیں ہو سکتا رنج طبعی کو کم کرنے کی کوشش کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بلکہ حق تعالیٰ نے تورن رنج طبعی کے کم کرنے کے بھی سامان کئے ہیں چنانچہ وہ باتیں تعلیم فرمائی ہیں جن کے استحضار سے رنج طبعی بھی کم ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (یعنی حضور ﷺ کو خطاب ہے کہ ان صابریں کو بشارت دے دیجئے جو مصیبت پہنچنے کے وقت یہ کہتے ہیں إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) اس جملہ میں ایسا مضمون سکھلایا گیا ہے جو رنج و غم کی بنیادیں اکھاڑنے والا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ کسی واقعہ سے صدمہ جب ہوا کرتا ہے جب وہ خلاف مرضی واقع ہوا ہو اور کوئی واقعہ خلاف مرضی جب ہوتا ہے کہ ہم پہلے سے اپنے ذہن میں اس کے متعلق کوئی شق تجویز کر لیں کہ یوں ہونا چاہیے جب اس کے خلاف دوسری شق ظاہر ہوتی ہے تو وہ ناگوار اور خلاف مرضی ہوتی ہے چنانچہ کسی عزیز کی موت پر ہم کو صدمہ اسی لئے ہوتا ہے کہ ہم نے یہ تجویز کر رکھا تھا کہ یہ ہم سے بھی کبھی جدا نہ ہوا ہمیشہ پاس ہی رہے حق تعالیٰ نے انا اللہ میں تجویز کا استیصال کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تم کو یہ مضمون پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہم خدا کی ملک ہیں خدا تعالیٰ ہمارے مالک ہیں اور ہم ان کے مملوک ہیں اور مملوک کی ہر چیز مالک کی ہوا کرتی ہے تو ہماری چیز ہی خدا ہی کی ملک ہے اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلیہ یہ ملا لو کہ تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے غلام کو کسی تجویز کا حق نہیں۔ جب تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے تو ہمارا کسی عزیز کی مفارقت پر اس لئے غم کرنا کہ ہم نے اس کے متعلق یہ تجویز کر رکھا تھا کہ ہمیشہ ہمارے پاس رہے بڑی غلطی ہے آپ تجویز کرنے والے ہوتے کون ہیں۔ اس کی تو ایسی مثال ہوئی کہ گھر کی مالک نے الماری میں برتنوں کو ایک خاص ترکیب سے رکھ دیا ہو۔ جو ماما کی ترکیب کو دیکھ کر نالہ و شیون کرنے لگے کہ ہائے میری تجویز

کے خلاف کیوں ہوا۔ تو بتلائیے آپ اس کو احمق کہیں گے یا نہیں یقیناً ہر شخص اس کو پاگل کہے گا آخر کیوں۔ اسی وجہ سے کہ تجویز کا حق مالک کو ہے ماما کو کسی تجویز کا حق نہیں پھر حیرت ہے کہ آپ کی ادنیٰ سی ملک تو ایسی ہو کہ اس کے سامنے دوسروں کا حق باطل ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی حقیقی ملک کے سامنے آپ کی تجویز باطل نہ ہو۔ یقیناً اگر خدا تعالیٰ کو مالک حقیقی سمجھا جاتا ہے تو آپ کو اور کسی کو تجویز کا حق نہ ہونا چاہیے پس سمجھ لیجئے کہ حق تعالیٰ نے عالم کے دو درجے بنائے ہیں۔ آسمان اور زمین جیسے الماری کے دو درجے اوپر نیچے ہوتے ہیں جس میں انہوں نے بعض ارواح کو اوپر کے درجہ میں رکھا ہے۔ یعنی آسمان میں اور بعض کو نیچے کے درجہ میں رکھا ہے یعنی زمین میں پھر وہ کبھی اس ترتیب کو بدل کر اوپر کی روحوں کو نیچے بھیج دیتے ہیں اور نیچے کی روحوں کو اوپر رکھ دیتے ہیں اور وہ مالک ہیں ان کو ہر طرح تصرف کا اختیار ہے۔ اس میں ہم غلاموں کا اس لئے نالہ و شیون کرنا کہ ہائے ہماری تجویز کے خلاف کیوں کیا گیا حماقت ہے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کا مفہوم

غرض قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ (ہم اللہ ہی کی مملوک ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں) میں دو جملے ہیں پہلے جملے میں حق تعالیٰ کی مالکیت کو ظاہر کر کے بندوں کی تجویز کا استیصال کیا گیا ہے پھر جب ہم پہلے سے کسی چیز کے متعلق کوئی تجویز ہی نہ کریں گے تو کوئی واقعہ ہمارے خلاف مرضی نہ ہوگا کیونکہ خلاف مرضی ہونے کا معنی تجویز ہی تھی جب وہ نہ رہی تو اب جو کچھ بھی ہوگا خلاف مرضی نہ ہوگا دوسرے جملے میں عموماً ملنے پر تنبیہ کی گئی ہے اس کے استحضار سے رہا سہا غم اور بھی ہلکا ہو جائے گا۔

رنج طبعی کم کرنے کی تدبیر

البتہ مفارقت کا طبعی غم اس کے بعد رہ سکتا ہے سو طبعی غم پر مواخذہ نہیں اور نہ وہ دفعۃً زائل ہو سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے اس کو کم کرنے کا بھی سامان کیا چنانچہ **إِنَّا لِلّٰهِ رَاجِعُونَ ۝** (اور ہم اللہ کے پاس جانے والے ہیں) میں اس کا بھی سامان موجود ہے۔ وہ یہ کہ ہم کو جو موت عزیز سے مفارقت کا صدمہ ہوتا ہے تو غور کر لیا جائے کہ یہ صدمہ نفس مفارقت پر نہیں بلکہ اعتقاد مفارقت دائمہ اس کا سبب ہے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب یہ ہمیشہ کے واسطے ہم سے جدا ہو گیا اگر یہ خیال ذہن میں نہ جے تو نفس مفارقت سے زیادہ صدمہ نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں بھی بعض دفعہ اس سے مفارقت ہوتی تھی چنانچہ کبھی ہم کو سفر پیش آتا تھا کبھی عزیز کو سفر پیش آتا تھا جس میں مہینہ دو مہینہ اور بعض دفعہ سالہا سال کی مفارقت ہوتی تھی مگر یہ اس لئے گوارا تھا کہ پھر ملاقات کی امید رہتی ہے تو **إِنَّا لِلّٰهِ رَاجِعُونَ ۝** میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تم اس مفارقت کو دائمی مفارقت نہ سمجھو کیونکہ تم بھی ایک دن وہیں جانے والے ہو جہاں یہ عزیز گیا ہے اور وہاں اس سے ملاقات ہو جائے گی پس یہ مفارقت ویسی ہی چند روزہ مفارقت ہے جیسی دنیا میں کبھی سفر وغیرہ سے پیش آیا کرتی تھی ایک دن یہ مفارقت ختم ہو کر مبدل بہ وصال ہو جائے گی اور قاعدہ ہے کہ جس فراق کے بعد وصال کی امید ہو وہ زیادہ گراں نہیں ہوتا اس کی ایسی مثال

ہے جیسے نظام حیدرآباد ایک شخص کو اپنے یہاں کسی اعلیٰ ملازمت پر بلا لیں اور اس کے بھائی کو مفارقت کا صدمہ ہو نظام اس کے صدمہ کی خبر سن کر لکھ دیں کہ گھبراؤ نہیں ہم تم کو بھی بلا لیں گے تو غور کر لیجئے کہ نظام کے اس خط سے غمگین بھائی کا صدمہ فوراً اٹل ہو جائے گا یا نہیں۔ یقیناً پہلا سا غم تو ہرگز نہ رہے گا۔ البتہ اب اس فکر میں پڑ جائے گا کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں اور جب تک مفارقت رہے گی اس وقت تک گن گن کر دن گزارے گا اور امید واصل میں فراق کے دن خوشی سے گزار دے گا پس ہم کو بھی کسی عزیز کی وفات پر یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ مفارقت چند روزہ ہے ایک دن خدا تعالیٰ ہم کو بھی بلا لیں گے جیسا اسے بلایا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کل الیناراجعون (ہر شخص ہمارے پاس آنے والا ہے) پھر حیرت ہے کہ نظام حیدرآباد کے تو اس کہنے سے کہ ہم تم کو بھی بلا لیں گے مفارقت کا غم جاتا رہے اور خدا تعالیٰ کے فرمانے سے ہلکا بھی نہ ہو غرض اس نصوص سے معلوم ہوا کہ صاحب شریعت کا مقصود یہ ہے کہ صدمہ کے وقت ہمارے زخم پر مرہم لگا دیں چنانچہ حزن عقلی کے استیصال کا اور حزن طبعی کی تخفیف کا ہر طرح کھل سامان کر دیا ہے۔

بے صبری امتحان میں ناکامی کی دلیل ہے

پھر چونکہ **لَتَنْبَلُوکُمْ** (ہم تمہارا ضرور امتحان لیں گے) سے معلوم ہو گیا کہ مصائب کا آنا بغرض امتحان ہے اور قاعدہ ہے کہ امتحان میں دو درجے ہوتے ہیں ایک فیل ہونے کا ایک پاس ہونے کا تو آگے اس امتحان میں پاس ہونے کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ **(وَابَشِّرِ الصَّابِرِينَ)** آپ صابریں کو بشارت دے دیجئے۔ اس جملہ سے معلوم ہو گیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے صابریں ہیں اور پاس ہونے کا طریقہ صبر ہے کیونکہ بشارت انہی لوگوں کو دی جایا کرتی ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے **وَلَتَنْبَلُوکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ الْمَوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالْأَمْوَالِ** اس میں حق تعالیٰ نے مواقع صبر کو بیان فرمایا کہ ہم تم کو ان واقعات سے آزمائیں گے تم ان میں صبر کرنا آگے صابریں کو بشارت دی گئی ہے۔ عام مفسرین نے تو خوف و جوع و نقص اموال وغیرہ کی تفسیر واقعات تکوینیہ سے کی ہے کہ خوف سے دشمن کا خطرہ مراد ہے اور جوع سے قحط اور نقص اموال و انفس و ثمرات سے آفات و مصائب خسران و ہلاک و قتل و موت و مرض مراد ہیں مگر امام شافعی نے بعض کی تفسیر احکام تشریحیہ سے کی ہے کہ خوف سے مراد خوف حق اور جوع سے مراد صوم ہے اور نقص اموال سے مراد ذکوۃ و صدقات اور نقص انفس سے مراد امراض اور نقص ثمرات سے مراد موت اولاد ہے اور ان احکام تشریحیہ کی تفسیل کرنے والا صابر ہے پس صائم بھی صابر ہوا اور ایک آیت میں خود لفظ صبر کی تفسیر بعض مفسرین نے صوم کے ساتھ کی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں **وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ** مفسرین نے کہا ہے کہ ای بالصوم والصلوة اس لئے یہاں بھی صابروں کی تفسیر صائمون سے ہو سکتی ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ یہاں بغیر حساب سے فرمایا ہے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اجر بغیر حساب بجز صوم کے کسی طاعت کا نہیں مگر یہ اس پر موقوف ہے کہ بغیر حساب کی تفسیر بغیر حد لی جائے جیسا کہ ظاہر و متبادر یہی ہے مگر آیت اس مضمون میں مصرح نہیں ہے اس میں دونوں احتمال برابر درجہ کے ہیں یہ احتمال بھی کہ بغیر حساب سے بغیر حد مراد ہے اور یہ احتمال بھی بغیر حساب سے مطلق

کثرت مراد ہوا اس صورت میں اجر کا غیر متناہی ہونا ثابت نہ ہوگا۔ نیز آیت میں جیسے یہ احتمال ہے کہ صابر سے صائم مراد ہو یہ بھی احتمال ہے کہ مطلق صبر مراد ہو۔

حقیقت بلاءِ نعمت

مگر یہ احکام اپنی خاصیت سے ایسے ہیں اور ان کی جامعیت اور برکت ہے کہ ان سے منافع دنیوی بھی بلا قصد نصیب ہو جاتے ہیں مگر مختلف طور پر حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات حسا اور ظاہر اتو بلا ہوتی ہے مگر معنی و باطناً نعمت ہوتی ہے یہ نکتہ حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد سے معلوم ہوا۔ ایک بار فرمایا کبھی نعمت بصورت بلا ہوتی ہے چنانچہ خضر علیہ السلام کا کشتی کا توڑنا ظاہر میں بلا تھی مگر حقیقت میں نعمت تھی ”نعمت کا بصورت بلا ہونا قرآن میں بھی آیا ہے۔ وَكُنْتُمْ لَكُمُ الْبَقَرَةِ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّرَّاتِ ظَاهِرٌ مِّنْ يَّهِيَ بِلَائِمٍ هِيَ مَكْرٌ اصْلَاحِ اخْلَاقِ كَے اعتبار سے یہ نعمتیں ہیں کہ اس سے تربیت باطنی ہوتی ہے۔

صیغہ جمع موجب تسلی

صیغہ جمع اناللہ (ہم اللہ ہی کے ہیں) بھی ایک گونہ تسلی بخش ہے کیونکہ اس میں دلالت ہے کہ میں تمہا مصیبت میں نہیں اور لوگ بھی میرے ساتھ شریک ہیں جیسے علماء نے آیت كَتَبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كَتَبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (یعنی تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں) میں یہی نکتہ اشتراک کا بیان فرمایا ہے اسی کے قریب نکتہ ہے اِنَّكَ تَعْبُدُ (تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں) جمع لانے میں اس لئے ایہام تعظیم عابد کی پروا نہیں کی گئی مگر اللہ بچا دے جہل سے ایک جاہل اِنَّكَ تَعْبُدُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کی جگہ ایسا کہ عابد (میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں) پڑھتا تھا اور کہتا تھا کہ نعبد میں اپنی تعظیم ہے اسے عابد کہتا چاہیے شاید یہ جاہل یہاں بھی انی اللہ (میں اللہ ہی کا ہوں) پڑھنے کی رائے دے مگر اس جاہل نے یہ نہ سوچا کہ اگر اس میں کوئی نکتہ بھی نہ ہوتا تب بھی سب سے بڑی عبدیت تو امتثال امر ہے جب اللہ تعالیٰ خود فرمائیں کہ تم اپنے کو صیغہ جمع سے تعبیر کرو تو ہم کو ایسی لفظی تواضع کی کیا ضرورت ہے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دریں خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(یعنی جب بادشاہ حقیقی مجھ سے طمع کرنے کی خواہش کرتے تو اس کے بعد قناعت کو ترک کر دوں گا)

مگر امتثال امر میں بھی بعض کو غلو ہو جاتا ہے چنانچہ اہل ظاہر نے اس غلو سے ضروری اجتہاد کو بھی ترک کر دیا۔ یہ بھی نہ چاہیے افراط تفریط تو ہر چیز میں مذموم ہے ضرورت ہر امر میں اعتدال کی ہے۔ غرض ایسا کہ نعبد (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کو کسی تسبیح احکام نے ایسا کہ عابد (میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں) نہیں پڑھا اسی طرح انا للہ کو انی للہ نہیں پڑھا باقی آجکل کے مدعیان ذوق جو حقیقت میں بد ذوق ہیں اگر نعبد کو عابد، انا للہ (ہم اللہ ہی کے ہیں) کو انی

لله (میں اللہ کا ہی ہوں) کہنے لگیں تو اس کا کچھ علاج نہیں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ ان اللہ میں صیغہ جمع بھی موجب تسلی ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبتلائے مصائب میں تنہا نہیں ہوں بلکہ اور بھی بہت ہیں اور قاعدہ ہے مرگ انبوہ جتنے وارد چنانچہ بہت آدمی جیل میں جا رہے ہوں تو وہ بھی گھر سا معلوم ہونے لگتا ہے بلکہ پچھلے دنوں تو بعض لوگ تمنا کیا کرتے تھے کہ حکومت ان کو جیل میں بھیجے کیونکہ اس جیل کے بعد قوم میں عزت ہوتی تھی تو وہ جیل جیل ہی معلوم نہ ہوتا تھا پہلے تو کوئی معمولی آدمی جیل میں جاتا تھا اب بڑے بڑے آدمی جیل جانے لگے تو جیل خانہ مصیبت نہ رہا۔ اور دیکھئے روزہ رکھنا بہت دشوار ہے مگر رمضان میں آسان ہے کیونکہ سب کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی مصیبت زدہ اس تسلی کے نسبت شبہ کرے اور یہ کہے کہ گو مبتلائے مصیبت دوسرے بھی ہیں دوسرے کے اوپر سب سے زیادہ مصیبت ہے مگر یہ تو تفتیش کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے سوچا کرو تو یقیناً بعضے تم سے بھی زیادہ مصیبت میں گرفتار ملیں گے۔ اب یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ **قَالُوا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** (کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف لوٹنے والے ہیں) کی تعلیم سے مقصود تو اہل مصائب کی تسلی اور ازالہ حزن و غم ہے۔

مصیبت کا ایک ادب

مصیبت کا ایک ادب یہ ہے کہ زبان سے **تَوَاتَّ لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** کی کثرت کرے اور دل سے ان باتوں کو سوچے اور ان کے ذریعہ سے اپنے نفس کو تسلی دے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہمارے حال پر کس قدر رحمت و شفقت ہے کہ ان کو ہمارا زیادہ غم گوارا نہیں گویا فرماتے ہیں کہ گو ہم نے کسی کی وجہ سے تم کو رنج دیا ہے مگر تمہارا زیادہ رنجیدہ ہونا پریشان ہونا ہم کو گوارا نہیں اس لئے مصیبت کے موقع پر تم اس اس طرح اپنے آپ کو تسلی دیا کرو اور چنانچہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندہ کے غم کے ناگوار ہونے کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے **مَا تَرَدَدَتْ فِي شَيْءٍ تَرَدَدِي فِي قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِ ارِيْدَ لِقَائِهِ وَهُوَ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَ لَنْ يَلْقَانِي حَتَّى يَمُوتَ** او **كَمَا قَالَ** یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی کام میں ایسا تردد نہیں ہوتا جیسا اپنے بندے کی جان قبض کرنے میں تردد ہوتا ہے (میں اس سے ملاقات کا ارادہ کرتا ہوں اور وہ موت کو مکروہ سمجھتا ہے اور جب تک نہ مرے گا مجھ سے ہرگز ملاقات نہیں کر سکتا) اس کی تفسیر ہم نہیں کر سکتے بلکہ اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کرتے ہیں مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے ساتھ کس قدر تعلق ہے کہ موت سے جو اس کو تکلیف ہوتی ہے وہ بھی ان کو گوارا نہیں حالانکہ موت ضروری اور لا بدی ہے۔

اور جس طرح مصیبت زدہ کو خود تسلی کا مضمون سکھایا گیا ہے اسی طرح دوسروں کو بھی حکم ہے مصیبت زدہ کو تسلی دیں چنانچہ تسلی دینے کی فضیلت حدیث میں بہت آئی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شفقت و رحمت کی دلیل ہے کہ خود بھی اپنے بندے کو تسلی دیتے ہیں اور کوئی دوسرا تسلی دے تو اس کو ثواب عطا فرماتے ہیں حدیث میں ہے **مَنْ عَزَىٰ نَفْسِي كَسِي بَرْدًا فِي الْجَنَّةِ** او **كَمَا قَالَ** جو ایسی عورت کو تسلی دے جس کا بچہ مر گیا ہو اس کو جنت میں بڑھیا چادر یا لباس پہنایا جائے گا اور **مَنْ عَزَىٰ مَصَابَا فُلَهْ مِثْلَ اجْرِهِ** او **كَمَا قَالَ** جس نے کسی مصیبت زدہ کی تسلی کی اس کو مصیبت زدہ کے برابر

ثواب ملے گا یہ تو قول کلی کے طور پر بیان تھا مقصود آیت کا اب اس کی دو چار تفریحات بیان کرتا ہوں۔

ایک یہ کہ اس آیت میں تسلی کا جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس کی حقیقت مراقبہ ہے اس مضمون کو زیادہ سوچنا اور ذہن میں حاضر رکھنا چاہیے۔ خصوصاً جس وقت رنج و غم کا غلبہ ہو اور اگر کسی وقت مراقبہ دشوار ہو تو زبان ہی سے **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ** کی کثرت رکھے۔ کہ حق تعالیٰ سے ہماری کوئی قرابت نہیں اور اسی سلسلہ میں قرابت کے موہم الفاظ کے استعمال کو خلاف ادب بتلایا تھا مگر باوجود قرابت نہ ہونے کے پھر بھی ان کی شفقت و رحمت ہمارے ساتھ بے انتہا ہے۔ چنانچہ کیا یہ عین شفقت و رحمت نہیں ہے کہ جو مشقت ہم اپنے اختیار سے برداشت کریں اس پر بھی اجر اور جو بلا اختیار وارد ہو جائے اس پر بھی اجر اور جو باوجود قرابت نہ ہونے کے حق تعالیٰ سے ہمارا ایسا تعلق ہے جس کے مقابلہ میں نہ قرابت کوئی چیز ہے نہ ابوة و بنوة اور بعض صوفیہ تو اس تعلق کی تفسیر میں بہت آگے پہنچ گئے ہیں کس کا تحمل عقول عامہ کو نہیں ہو سکتا مگر اتنی بات تو سب سمجھ سکتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ رحمت بلا علت ہے اس سے بڑھ کر کیا تعلق ہوگا اور اس شدت تعلق کا مقتضا بھی یہی ہے کہ وہ ہم پر خاص توجہ فرمائیں تو پھر ہر حال میں اجر دینا کیا عجیب ہے سو یہ شدت تعلق اس کا یہ مقتضا مسلم مگر اس کے ساتھ استغناء حق پر بھی تو نظر کی جائے جو اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے تو اس پر نظر کرنے سے پھر عقل کا فتویٰ یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کوئی نفع نہ پہنچائیں کیونکہ جب ان کا کوئی کام ہمارے اوپر اٹکا ہوا نہیں اور وہ تمام عالم سے مستغنی ہیں تو وہ ہم پر کوئی انعام کیوں کریں؟ کیونکہ سلاطین جو کسی پر انعام کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو بھی رعیت کی احتیاج ہے وزراء و افسران فوج کو خوش رکھنے کی ان کو ضرورت ہے تاکہ رعیت باغی نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کو کسی کے خوش رکھنے کی ضرورت نہیں وہ جس پر رحمت فرماتے ہیں بلا سبب اور بلا علت فرماتے ہیں۔

لطف بشارت

الغرض حق تعالیٰ کی عنایت ہے کہ مشاق اختیار یہ وغیر اختیار یہ دونوں پر ثواب کی بشارت ہے اور بشارت بھی بلا واسطہ نہیں بلکہ رسول ﷺ کے واسطہ سے بشارت دلوائی ہے بظاہر بشارت بلا واسطہ کو ترجیح معلوم ہوتی ہے چنانچہ بعض مقامات پر اسی وجہ سے بلا واسطہ بھی وارد ہے مگر عام قاعدہ یہ ہے کہ سلطان عظیم الشان کی بشارت بلا واسطہ سے ہیبت میں اضافہ ہو کہ حواس گم ہو جاتے ہیں اور بشارت کا لطف حاصل نہیں اس لئے حضور ﷺ کے واسطہ سے بشارت دلوائی ہے کہ آپ ہم جنس بھی ہیں ہم نوع بھی ہیں بلکہ مثل عین کے ہیں چنانچہ اسی لئے قرآن میں حضور ﷺ کے لئے کسی جگہ تو منہم فرمایا کسی جگہ مثلکم اور کسی جگہ من النفسکم اور ظاہر ہے کہ نفسی شیء و عین شیء کے ایک ہی معنی ہیں اور اس معنی کا مصداق آپ میں یہ کہ آپ مسلمانوں کو جان سے زیادہ محبوب ہیں **الَّذِي أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ نَفْسِهِمْ** آپ ﷺ مسلمانوں کو ان کی جان سے زیادہ محبوب ہیں۔ اور محبت و محبوب کو ایک گونہ اتحاد ہوتا ہے یہی مراد ہے صوفیہ کی عین سے لوگوں نے اس سے عین باصلاح سمجھ لیا اور اعتراض کرنے لگے ورنہ اس میں اعتراض کی بات کیا ہے محاورات میں دوسرے کو کہہ دیا کرتے ہیں کہ تم غیر تھوڑا ہی ہو اور جب غیر نہ ہو تو عین ہوگا بس جو عین کے یہاں ہیں وہی صوفیہ کے کلام

میں ہیں مگر نا اہلوں کے سامنے ایسے الفاظ جو ان کی عقول سے بالا ہوں کلموا الناس علی قدر عقولہم (لوگوں سے ان کے عقولوں کے اندازہ پر گفتگو کرو) غرض اللہ تعالیٰ نے اس بشارت میں بھی ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے چونکہ بشارت بلا واسطہ ہے بوجہ غایت عظمت حق تعالیٰ کے ہیئت ہوتی اور بشارت کا پورا لطف نہ آتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے بواسطہ بشارت دلوائی بات میں واسطہ بھی حضور ﷺ کا ہے جو مسلمانوں کو اپنی جان سے زیادہ محبوب ہیں پھر آپ کو بھی یہ نہیں فرمایا کہ اخبار یا نبی یعنی خبر دیجئے بلکہ بشر فرمایا اور بشارت وہ خبر ہے جس سے سننے والے کا چہرہ کھل جائے چہرہ پر اسی کے آثار نمایاں ہو جائیں پس اگر کوئی بشارت بھی نہ ہوتی تو بشر کا لفظ ہی ہمارے خوش ہونے کو کافی تھا مگر اس پر بس نہیں ہے بلکہ آگے بھی دلجوئی کے بہت سے سامان جمع فرمائے گئے ایک یہ کہ ان کو صابون خطاب دیا اور اس معزز جماعت میں شامل کیا جس میں انبیاء علیہم السلام سب سے پیش پیش ہیں یہ صبر تو پہلا درجہ کا ہے۔ صبر کے بعد یہ ہے الذین أصابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ الخ (وہ لوگ جبکہ ان کو تکلیف پیش آتی ہے) جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ صابر ایسے ہیں کہ صبر کے بعد اپنے دل کو تھام لیتے ہیں۔ بس یہ دوسرا درجہ تسلی کا ہے اور تسلی بھی کس طرح دیتے ہیں اس کا طریقہ خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ ۖ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ جب مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس میں لفظ اذا کا اختیار فرمانا منجانب اللہ ایک مستقل تسلی ہے کیونکہ لغت عرب میں اذا یقین کے موقع پر بولا جاتا ہے شرط کا وقوع متقین ہو تو آمیں بتلا دیا گیا کہ اے مخاطب و دنیا میں تو مصیبت کا پیش آنا یقینی ہے اس کے لئے پہلے ہی سے تیار رہو اور یہ بھی رحمت ہے کہ پہلے سے انسان کو خبردار کر دیا جائے کہ تجھے ایسا واقعہ پیش آنے والا ہے علماء نے سَيَقُولُ الشُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَهُمْ عَن قِبَلِهِمُ الْبَقِيَّةُ كَانُوا عَلَيْهَا (یعنی اب تو بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے ان کو ان کے قبلہ سے جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس نے بدل دیا میں یہی نکتہ بیان فرمایا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں دنیا میں مصیبت ضرور آئے گی کیونکہ انسان دنیا میں مشقت ہی کے واسطے پیدا ہوا ہے یہاں چین کہاں؟

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۗ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۗ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ ترجمہ: آپ ایسے صابریں کو بشارت سنا دیجئے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے اور ہم سب اللہ ہی کے پاس جانے والے ہیں ان لوگوں پر خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں جن کو رسائی ہوگی۔

مصائب غیر اختیار یہ پر ثواب کی بشارت

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں مصائب اور بلیات کا تذکرہ ہے یعنی مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ہم تم کو مختلف مصائب و بلیات سے آزمائیں گے یعنی تمہارا امتحان لیں گے۔ یہ عنوان اس لئے اختیار فرمایا تا کہ بندوں کو مصائب و بلیات سے توحش نہ ہو بلکہ وہ اس کے لئے پہلے سے آمادہ رہیں اور ظاہر ہے کہ انسان جس چیز کے لئے پہلے سے آمادہ رہتا ہے وہ زیادہ پریشانی کا سبب نہیں بنتی۔ پھر اس کو امتحان و آزمائش قرار دینے سے ہر شخص کو اس بات کی فکر ہو

گی کہ اس امتحان میں کامیابی حاصل ہونا کامی کا سامنا نہ ہو اور کامیابی کا طریقہ آگے صبر بتلایا ہے تو پہلے ہی سے صبر کی تیاری کرے گا اور تکمیل کی کوشش کرے گا تو یقیناً وقت پر مصیبت کا اثر بہت ہی معمولی رہ جائے گا۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جن مصائب و بلیات کا اس مقام پر ذکر ہے ان کی تفسیر مختلف ہے بعض تفاسیر پر ان سے تکوینی مصائب ہیں یعنی مصائب غیر اختیار یہ چنانچہ خوف سے ناگہانی خوف مراد لیا ہے جیسے ڈاکو چور درندہ وغیرہ کا خوف اور جوع سے فاقہ جس کا سبب عسرت و افلاس اور نقص اموال سے ناگہانی نقصان مال جیسے تجارت میں نقصان ہو گیا یا مال چوری ہو گیا اور نقصان نفس سے عزیزوں کی موت جو کسی مرض یا وبا کی وجہ سے ہو جائے اور نقصان ثمرات سے باغات کا نقصان جیسے بجلی یا پالے یا آندھی سے پھل گر جائیں یا خراب ہو جائیں وغیرہ اور بعض تفاسیر پر ان کا محل تکالیف تشریحیہ ہیں یعنی وہ امور اختیار یہ جن کا شریعت نے انسان کو مکلف کیا ہے چنانچہ امام شافعی سے جوع کی تفسیر روزہ سے اور نقصان ثمرات کی تفسیر زکوٰۃ سے اور خوف اور نقصان نفس کی تفسیر جہاد سے منقول ہے اور چونکہ کسی نے کسی تفسیر کو غلط نہیں کہا اس لئے یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں مصائب تکوینیہ بھی تشریحیہ بھی اور جو ثواب مصیبت پر صبر کرنے کا اس جگہ مذکور ہے وہ دونوں پر متفرع و مرتب ہوگا اور چونکہ امت نے دونوں تفسیروں کو قبول کر لیا ہے اس لئے تلقی امت بالقبول (امت کی قبولیت) کے بعد کسی کو اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال (یعنی جب احتمال نکل آئے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے) کہنے کا موقع نہیں رہا۔ یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ شاید کوئی ذہین طالب اشکال کرے کہ جب آیت کی تفسیر میں اختلاف ہو تو اس سے کچھ بھی ثابت نہ ہو۔ جواب یہ ہے کہ اذا جاء الاحتمال (جب احتمال نکل آئے) اس مقام کے لئے ہے جہاں دونوں شقوں کا حکم جمع نہ ہو سکے اور جہاں دونوں شقیں حکم میں جمع ہو سکیں اور امت نے دونوں کو قبول بھی کر لیا ہو وہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پس سبحان اللہ حق تعالیٰ کو کس قدر رحمت ہے کہ امور اختیار یہ پر تو اجر ملتا ہی ہے غیر اختیار یہ پر بھی اجر عطا فرماتے ہیں۔ جو مشقت انسان اپنے اختیار سے اٹھائے اس پر تو استحقاق اجر ہو سکتا ہے مگر جو مصیبت بلا اختیار و ارادہ کے وارد ہو اس پر اجر دینا رحمت ہی رحمت ہے اور اگر زیادہ غور کیا جائے تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ طاعات اختیار یہ پر اجر ملنا بھی رحمت ہے کیونکہ طاعات تو غذا روحانی ہیں جن سے ہم کو ہی نفع ہوتا اور ہمارے باطن کو غذا ملتی ہے تو ان طاعات کے بعد اجر عطا فرمانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کو دعوت کھلا کر دانت گھسائی کے دور پے بھی دیئے جائیں۔ اسی طرح مجاہدات غیر اختیار یہ کی ایسی مثال ہے جیسے مسل دیا جاتا ہے اب اگر کوئی طبیب مسہل دے کر مریض کو دور پے بھی دے تو یہ عنایت ہے یا نہیں؟ پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ہماری کوئی قرابت اور رشتہ داری تو ہے نہیں اور جن لوگوں نے قرابت جتلائی تھی ان کو بہت سختی کے ساتھ زجر کیا گیا ہے اور ایسا سخت خطاب کیا گیا کہ وہ دم بخود ہی رہ گئے **وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ** (یعنی یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں آپ یہ پوچھئے کہ اچھا تو پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض عذاب کیوں دیں گے بلکہ تم بھی منجملہ اور مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو) یہ تو ان کے متعلق ارشاد ہے جنہوں نے اپنے کو حق تعالیٰ کا قرابت دار بتلایا تھا

اور جنہوں نے دوسرے مقبولین کو اللہ کا قرابت دار ٹھہرایا تھا ان پر تو بہت مقامات میں انکار و وعید مذکور ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ بَلْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کُلِّیۡنَ لَہٗ قَانُوۡنٌ ۝۱۰۰ بِدِیۡنِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاِذَا قَضٰی اٰمۡرًا فَاِنۡمَآ یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فِیۡکُوۡنُ ۝۱۰۱ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے سبحان اللہ بلکہ خاص اللہ تعالیٰ کی مملوک ہیں جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور سب ان کے خادم بھی ہیں۔ حق تعالیٰ موجد بھی ہیں آسمانوں اور زمین کے اور جب کسی کام کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس اس کی نسبت فرمادیتے ہیں کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے (اسی طرح جا بجا مختلف طریقوں سے ابہیت کا ابطال فرمایا ہے اور گویہ دلائل ابہیت حقیقیہ کی نفی کرتے ہیں اور یہود و نصاریٰ ابہیت حقیقیہ کے قائل نہ تھے صرف ابہیت مجازیہ کے قائل تھے مگر حق تعالیٰ نے ابہیت حقیقیہ کے ابطال سے اس بات پر ہم کو متنبہ فرمایا ہے جس بات سے اللہ تعالیٰ منزہ ہیں اور اس کا ثبوت حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے محال اور خلاف شان ہے اس کے ایہام سے بھی بچنا واجب و لازم ہے کیونکہ موہم الفاظ کا استعمال کرنا خلاف ادب ہے۔

جو امتحان میں پاس ہوں اور اس سے بطریق مفہوم یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بے صبری فیل ہونے کا سبب ہے پھر اس جگہ بشر بشارت کا اجمال ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد ہو رہا ہے کہ بس آپ تو صابریں کو بشارت دے دیجئے تفصیل نہیں کہ کس چیز کی بشارت دے دیجئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ملے گا کیونکہ بشارت کہتے ہیں خوش خبری کو۔ اب اگر اس کی تفصیل کر دی جائے تو جن چیزوں کو بیان کیا جائے گا ان ہی میں بشارت کا حصر ہو جائے گا اور جب اجمالاً کہہ دیا گیا کہ صابریں کو خوشی ہونے کی خبر دے دیجئے تو اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں بلکہ عموم ہے جس سے تمام خوش ہونے کی باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا کہ جس چیز سے بھی وہ خوش ہوں گے وہی ملے گا اور یہ کام حق تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کی خواہش کو پورا کر دیں۔

غرض بشر کا عموم قدرت کے عموم پر دلالت کرتا ہے پھر اس میں بجائے نبشر (ہم بشارت دیتے ہیں) صیغہ متکلم کے بشر صیغہ امر اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ بشارت بواسطہ زیادہ موثر ہوتی ہے جب اس کی یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ ہم سے خود تکلم فرماتے ہیں تو غلبہ جلال و ہیبت ایسا ہوتا کہ اس غلبہ کے سامنے لذت بشارت حاصل نہ ہوتی اور جنت میں ہمارے قوی بڑھ جائیں گے وہاں ہم کو اس ہیبت و جلال کا تحمل ہو جائے گا تو تکلم بلا واسطہ مفید ہوگا۔ باقی دنیا میں تکلم بلا حجاب کا ہم کو تو کیا تحمل ہوتا حضرت کلیم اللہ علیہ السلام کو بھی تحمل نہ ہوا ان سے بھی حجاب کے ساتھ کلام ہوا ہے۔

صابرین کو بشارت

حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان غم سے پریشان نہ ہوں چنانچہ اسی لئے جتنی اطلاع فرمادی کہ ہم تم کو طرح طرح کی تکالیف سے آزمائیں گے تاکہ دفعۃً کلفت آنے سے پریشانی نہ ہو۔ پہلے سے اس کے لئے آمادہ رہیں پھر چونکہ بسنلو نکم سے معلوم ہو گیا ہے کہ مصائب کا آنا بغرض امتحان ہے اور قاعدہ ہے کہ امتحان میں دو درجے ہوتے ہیں ایک فیل ہونے کا ایک پاس ہونے کا تو آگے اس امتحان میں پاس ہونے کا طریقہ بتلاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ وِبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ اُوْر

صبر کرنے والوں کو خوش خبری دو۔

اس جملہ سے معلوم ہو گیا کہ اس امتحان میں پاس ہونے والے صابریں ہیں اور پاس ہونے کا طریقہ صبر ہے کیونکہ بشارت انہی لوگوں کو دی جاتا کرتی ہے جو امتحان میں پاس ہوں اور اس سے بطریق مفہوم یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بے صبری نفل ہونے کا سبب ہے۔

پھر اس جگہ بشر میں بشارت کا اجمال ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضور کو ارشاد ہو رہا ہے کہ بس آپ ﷺ تو صابریں کو بشارت دے دیجئے تفصیل نہیں کی کس چیز کی بشارت دے دیجئے اس میں اشارہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں گے وہی ملے گا کیونکہ بشارت کہتے ہیں خوشخبری کو۔ اب اگر اس کی تفصیل کر دی جائے تو جن چیزوں کو بیان کیا جائے گا انہی میں بشارت کا حصر ہو جائے گا اور جب اجمالاً کہہ دیا گیا کہ صابریں کو خوش ہونے کی خبر دے دیجئے تو اس میں کسی چیز کی تخصیص نہیں بلکہ عموم ہے جس سے تمام خوش ہونے کی باتوں کی طرف اشارہ ہو گیا کہ جس چیز سے بھی وہ خوش ہوں گے وہی ملے گی اور یہ کام اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کی خواہش پوری کر دیں۔

صابریں کو دنیوی جزا

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ** یعنی صابریں پر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص رحمتیں بھی ہیں اور عام رحمتیں بھی۔ اس میں صابریں کے لئے دوسری بشارت ہے جو بلا واسطہ سنائی گئی ہیں۔ بشر الصابریں میں بشارت بواسطہ تھی یہ بلا واسطہ ہے اور یہی ہے اس قاعدہ پر کہ تائیس تا کید سے اولیٰ ہے۔ بعض علماء نے اس کو بشر الصابریں ہی کا بیان سمجھا ہے۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ مستقل کلام ہے ماقبل کا بیان نہیں کیونکہ دونوں مستقل آیتیں ہیں۔ پس ظاہر یہی ہے کہ دونوں کا مفہوم بھی مستقل ہو بیان کہنے میں یہ آیت مضمون سابق کی تاکید ہوگی اور مستقل ماننے میں تائیس ہے اس لئے یہی اولیٰ ہے۔ پس میرے ذوق میں بشر الصابریں میں بواسطہ بشارت ہے اور اس جملہ میں بلا واسطہ بشارت ہے۔

تیسری بشارت

بہر حال اس میں بتلا دیا گیا ہے کہ صابریں پر خاص و عام دونوں طرح کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ خاص رحمت تو آخرت میں ہوگی اور رحمت عامہ کا ظہور دنیا میں ہوتا ہے صابریں کو صبر و استقلال کا ثمرہ دنیا میں بھی حق تعالیٰ کھلی آنکھوں دکھلا دیتے ہیں بشرطیکہ صبر کی حقیقت صحیح طور پر موجود ہو اس کے بعد ایک تیسری بشارت تو ایسی بیان فرمائی ہے کہ وہ جزا تو ہر صابر مومن کو ضرور ہی حاصل ہے۔ یعنی **وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ**۔ کہ یہی لوگ راہ صواب پر چلنے والے ہیں۔ صاحبو جو شخص ناگوار واقعات میں شریعت پر کامل طور پر جمار ہتا ہے گویا ہر میں اس کو کیسی ہی کلفت ہو مگر دل میں اس کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ خدا کے فضل سے میں حق پر ہوں۔ (فضائل صبر و شکر)

ایک آیت کی تفسیر سے شبہ کا ازالہ

ارشاد فرمایا کہ قرآن کریم میں لم تقولون مالا تفعلون۔ یعنی کیوں کہتے ہو وہ جو خود نہیں کرتے۔ اس کے ظاہر سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ جو شخص خود کوئی نیک عمل نہیں کر رہا اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسروں کو اس نیکی کی طرف دعوت دے حالانکہ تبصریحات یہ غلط ہے۔ اس غلط فہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اس کو دعوت پر محمول کر لیا حالانکہ یہ آیت دعوت کے متعلق نہیں بلکہ دعویٰ کے متعلق ہے اور مراد یہ ہے کہ جو وصف تم میں موجود نہیں اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام تم نے کیا نہیں یا جو وصف تم میں موجود نہیں اس کا دعویٰ نہ کرو۔

اہل اللہ کی شان

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ نہیں فرمایا اذایقین کے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور ان احتمال کے موقعہ پر پس إِذَا أَصَابَتْهُمُ میں بتلایا گیا کہ مصیبت تو آدے ہی گی۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نو زجام دہر مئی کل من علیھا فان

اور اس علم کے بعد مصیبت سے وہ غم نمی ہوتا جو دفعہ آنے سے ہوتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ بڑے عاقل ہیں جو موت کو ہر دم یاد کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان پر موت دفعہ نہ آئے گی اس لئے ان کو موت سے وحشت ہی نہ ہو گی دنیا دار اپنے کو عاقل سمجھتے ہیں یہ غلط ہے وہ بہت سے بہت آکل ہیں عاقل نہیں ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے دل میں حساب و کتاب و معاش کا لگاتے رہتے ہیں اور بڑے بڑے منصوبے قائم کرتے ہیں اور وہ حساب و کتاب پورا ہوتا نہیں کیونکہ

ما کسل ما یتعنی المرء یدر کہ تجرب الارباح بما لا تشہی السفن

انسان کی ہر آرزو پوری نہیں ہوا کرتی بلکہ ہوائیں کبھی کبھی کے خلاف بھی چلتی ہیں

تو جب خلاف امید واقعات ان کو پیش آتے ہیں اس وقت سخت پریشانی کا سامنا ہوتا ہے اور اہل اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت یہ سمجھتے ہیں شاید ہمیں نفس نفس واپس بود (الجبر بالصر)

الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ ترجمہ: وہ لوگ ایسے ہیں جبکہ ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔

تقلیل غم اور تسہیل حزن کا طریقہ

عارفین نے اس مضمون پر غور کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ اس میں حق تعالیٰ نے تقلیل غم و تسہیل حزن کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کو یہ مطلوب نہیں کہ غم بڑھایا جائے بلکہ اس کا کم کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ اول تو انسا لله (ہم اللہ ہی کے ہیں) کی تعلیم ہے کہ یوں سمجھو کہ تم خدا کے ہو اور تمہاری ہر چیز خدا کی ہے پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہاری ذات میں یا متعلقین و متعلقات میں کچھ تصرف کریں تو تم کو ناگواری کا کیا حق ہے اور جن عارفین نے وحدۃ الوجود کو ظاہر کیا ہے جن میں اول شیخ

ابن عربی ہیں وہ تو یوں کہتے ہیں کہ ہمارا وجود ہی کوئی چیز نہیں یہاں تک کہ ہم کسی شے کے مستحق ہوں عارفین کی تو اسی سے تسلی ہو گئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں بلکہ اصل مالک اور اصل موجود حق تعالیٰ ہیں دنیا و آخرت دونوں انہیں کے ہیں ان کو اختیار ہے کہ جب چاہیں کسی کو دنیا میں رکھیں اور جب چاہیں آخرت کی طرف بلا لیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے پاس ایک الماری ہو جس کے اندر متعدد تختے لگے ہوئے ہوں اور اس نے ایک خاص ترتیب سے برتنوں کو ان میں لگا رکھا ہو اب کسی وقت وہ اس ترتیب کو بدل دے اور نیچے کے برتن اوپر اور اوپر کے نیچے رکھ دے تو کسی کو اعتراض یا ناگواری کا کیا حق ہے؟ اسی طرح حق تعالیٰ کے یہاں عالم کے دو تختے ہیں ایک دنیا ایک آخرت اگر وہ کسی وقت ان کی موجودات کی ترتیب کو پلٹ دیں کہ اوپر کی ارواح کو نیچے بھیج دیں اور نیچے کی ارواح کو اوپر بلا لیں تو کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے؟ وہ الماری کے بھی اور اس کے برتنوں کے بھی مالک ہیں تم کھڑ بڑ کرنے والے کون ہو؟ عارفین کو تو اس سے پوری تسلی ہو گئی مگر اہل ظاہر کو صرف عقلی تسلی ہوئی اور طبعی غم مفارقت کا باقی رہا تو اس کی تفتیل و تسہیل کے لئے آگے تعلیم فرماتے ہیں کہ تم یوں سمجھو **إِنَّا إِلَهُو زُجُجُونَ** (ہم اس کی طرف پھر لوٹ کر جانے والے ہیں) کہ ایک دن ہم بھی وہیں جانے والے ہیں جہاں ہمارا عزیز گیا ہے اس تصور سے مفارقت کا غم بھی ہلکا ہو جائے گا اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدرآباد نے ایک بھائی کو دکن بلا کر وزیر کر دیا دوسرا بھائی مفارقت کے غم میں رونے لگا نظام نے اس کو لکھ بھیجا کہ ارے تو کیوں روتا ہے تجھے بھی عنقریب یہیں بلا لیا جائے گا اس مضمون سے دوسرے بھائی کی یقیناً تسلی ہو جائے گی تو یہاں **إِنَّا إِلَهُو زُجُجُونَ** کا مطلب یہی ہے کہ تم مفارقت کا غم نہ کرو بہت جلدی تم بھی وہیں جاؤ گے جہاں تمہارا عزیز گیا ہے۔ عارفین کو یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہتا ہے اس لئے ان کو مفارقت حبیب کا زیادہ غم نہیں ہوتا۔

مصیبت کا آنا یقینی ہے

یہیں سے نکتہ معلوم ہوتا ہے اس کا کہ اللہ تعالیٰ نے **الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَأَنَّا إِلَهُو زُجُجُونَ** فرمایا ان اصابتهم نہیں فرمایا کیونکہ اذا یقین کے موقع پر استعمال ہوتا ہے اور ان احتمال کے موقع پر پس اذا اصابتهم میں بتلا دیا گیا کہ مصیبت تو آوے ہی گی۔

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید ز جام دہرے کل من علیھا فان

جو بھی پیدا ہو ضروری طور پر اسے فنا کی شراب زمانے کے پیالے سے پینی ہوگی

علم کے بعد مصیبت سے وہ غم نہیں ہوتا جو دفعۃً آنے سے ہوتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ بڑے عاقل ہیں جو موت کو ہر دم یاد کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان پر موت دفعۃً نہ آئے گی اس لئے ان کو موت سے وحشت بھی نہ ہوگی۔ (الجبر بالبصر)

تمام غموم اور احزان کا علاج

إِنَّا إِلَهُو زُجُجُونَ تمام غموم و احزان کا علاج ہے اگر اس کو شرائط سے استعمال کیا جائے۔ اب اس کے

شرائط سنئے۔ مگر تمام شرائط کو تو کون ادا کرے گا اور میں ہی کیا ادا کروں گا مگر سب سے ادنیٰ شرط تو یہ ہے کہ اس کو تفکر و فہم معنی سے ادا کیا جائے۔ محض طوطے کی طرح بے سمجھے بوجھے نہ کیا جائے۔ اب سنئے اس کے معنی کیا ہیں۔ اس میں پہلا جملہ تو یہ ہے اناللہ۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ بے شک ہم سب خدا ہی کی ملک ہیں۔ وہ ہمارے اور تمام چیزوں کے مالک ہیں۔ ہم کسی چیز کے مالک نہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان کے بھی مالک نہیں۔ یہ جان بھی خدا ہی کی ملک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی جان میں بھی ہم کو ہر طرح کا تصرف جائز نہیں خودکشی حرام ہے۔ مضر چیزیں کھانا جائز نہیں ہے۔ اپنے کو ذلیل کرنا رسوا کرنا ممنوع ہے۔ آخر کیوں۔ اس لئے کہ تم اپنی جان کے مالک نہیں ہو۔ بلکہ وہ خدا تعالیٰ کی امانت ہے بدوں اس کے اذن کے تم کوئی تصرف اس میں نہیں کر سکتے اگر کرو گے مواخذہ ہوگا جب تم اپنی جان کے مالک نہیں۔ تو مال و اولاد و اعزہ و اقرباء کے تو کیونکر مالک ہو سکتے ہو۔ مال جائیداد گھریا جو کچھ ہے برائے نام تمہاری ملک ہے اور یہ برائے نام ملک بھی اس لئے مقرر کی گئی ہے تاکہ نظام عالم میں اختلال نہ ہو۔ ورنہ کسی کے پاس کوئی چیز بھی نہ رہا کرتی۔ اگر شریعت بندوں کو مالک نہ کہتی تو خدا کی چیز سمجھ کر ہر شخص اس کو چھیننا چاہتا۔ اس لئے برائے نام تم کو مالک بنا دیا گیا ہے مگر حقیقت میں ہر چیز اس کی ملک ہے۔

درحقیقت مالک ہر شے خداست ایں امانت چند روزہ نزد ماست

ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملاؤ کہ مالک کو اپنی مملو کات میں ہر طرح کا اختیار ہوتا ہے وہ جیسا چاہے تصرف کرے۔ دوسرے کو کچھ اختیار نہیں ہوتا۔ اس مضمون کے استحضار کے بعد کسی مصیبت اور کلفت سے بھی پریشانی نہیں ہو سکتی کیونکہ سارے غم کی جڑ یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو مالک سمجھتے ہیں۔ یہ مال ہمارا ہے جائیداد ہماری ہے۔ بیوی بھی ہماری ہے اولاد بھی ہماری ہے۔ پھر اس میں طرح طرح کی تجویزیں کرتے ہیں کہ یہ مال بڑھنا چاہیے۔ ہمارے ہی پاس رہنا چاہیے۔ ضائع نہ ہونا چاہیے۔ باغ میں ہمیشہ پھل آنے چاہئیں۔ اولاد کے متعلق تجویزیں کرتے ہیں کہ یہ پھلیں پھولیں۔ بڑے ہوں۔ کمائیں کھائیں۔ ہماری خدمت کریں۔ اسی طرح تمام چیزوں کے متعلق ہم ایسی ایک تجویز ذہن میں قائم کر لیتے ہیں کہ یوں ہونا چاہیے۔ اس کے خلاف نہ ہونا چاہیے۔ پھر جب اس کے خلاف ہوتا ہے تو رنج غم ہوتا ہے کہ ہائے میں نے تو یہ امید کر رکھی تھی مجھے تو یہ توقع تھی۔ یہ کیا ہو گیا پس اناللہ میں ان تمام تجاویز کی جڑ کٹ گئی کہ تم کو کسی چیز کے متعلق کوئی تجویز قائم کرنے کا حق نہیں کیونکہ تم اور یہ سب چیزیں خدا کی ملک ہو۔ تجویز کا حق مالک کو ہوتا ہے۔ غلام کو کیا حق ہے کہ وہ مالک کی چیزوں میں تجویزیں لگاتا پھرے۔ (ابواء الیتامی)

جذبات طبعہ کی رعایت

مرنے سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں اس سے زیادہ کوئی امر پریشان کن نہ تھا پھر اس کے بارے میں کیسی عمدہ تعلیم فرمائی ہے کہ قرآن شریف میں ہے إِذَا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ کہ ان پر مصیبت آتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اس کے اندر ہم کو تسلی کا طریقہ بتلایا ہے کہ مصیبت کے وقت قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ کہنے سے تسلی ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے تو مصیبت میں تو اس

کو پڑھا تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا تو جواب یہ ہے کہ وظیفہ کی طرح پڑھنے کو کس نے کہا تھا بلکہ ساتھ اس کی حقیقت پر بھی تو غور کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ مصیبت آنے پر دو باتوں کا لحاظ رہے۔

ایک تو یہ کہ ہم خدا کی ملک ہیں۔ ہم اپنے نہیں۔ جب خدا کے ہیں تو ان کے اختیار ہے کہ جیسے چاہیں ہم میں تصرف کریں۔ یہاں رکھیں یا اٹھالیں۔ اس میں تو عقل کی تسلی ہوگئی۔ دوسری یہ ہے کہ جہاں ہمارے عزیز چلے گئے ہم بھی وہیں چلے جائیں گے۔ اس میں طبع کی رعایت ہے۔ ایک عقل ہے اور ایک طبیعت عقل ان اللہ سے راضی ہوگئی تھی کیونکہ عقل تسلیم کرتی ہے کہ ہم اللہ کے ہیں تو پھر ہم کو ان کے کسی تصرف پر رنج کا کیا حق۔ ان کو اختیار ہے جیسا چاہیں کریں مگر طبع ابھی راضی نہ ہوئی تھی کہ باپ مر گیا اس کے مرنے کا کیسے رنج نہ ہو۔ تعلق ہی ایسا ہے کہ خواہ مخواہ رنج ہوتا ہے۔ اس کو ہم کیا کریں۔ اس لئے دوسرا جملہ طبع کے سنبھالنے کو بتلایا کہ جس عشرت کدہ میں وہ گئے ہیں ہم بھی وہیں چلے جائیں گے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ جلدی ہی ملاقات ہو جائے گی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو حیدرآباد کی وزارت کا عہدہ مل گیا اور وہ وہاں چلا گیا۔ اس کے بیٹے کو اس کے چلے جانے سے سخت صدمہ ہوا اور اس سے کہا گیا کہ تم کیوں گھبراتے ہو وہ تو بڑے عیش میں ہے وزارت کے عہدہ پر ہے اور تم بھی عنقریب وہیں بلا لئے جاو گے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا صدمہ اس کو سن کر باقی رہے گا۔ یہ دوسرا جملہ (وَإِنَّا لِلَّهِ رَاجِعُونَ ۝) طبع کی تسلی کے لئے بڑھایا ہے۔

دوسرے عارفین نے اَلَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ کے مضمون پر غور کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ اس میں حق تعالیٰ نے تقلیل غم و تسہیل حزن کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کو یہ مطلوب نہیں کہ غم کو بڑھایا جائے بلکہ اس کا کم کرنا مطلوب ہے۔ چنانچہ اول تو ان اللہ کی تعلیم ہے کہ یوں سمجھو کہ تم خدا کے ہو اور تمہاری ہر چیز خدا کی ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ تمہاری ذات میں یا متعلقین و متعلقات میں کچھ تصرف کریں تو تم کو ناگواری کا کیا حق ہے اور جن عارفین نے وحدۃ الوجود کو ظاہر کیا ہے جن میں اول شیخ ابن عربی ہیں وہ تو یوں کہتے ہیں کہ ہمارا وجود ہی کوئی چیز نہیں یہاں تک کہ ہم کسی شے کے مستحق ہوں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے پاس ایک الماری ہو جس کے اندر متعدد تختے لگے ہوں اور اس نے ایک خاص ترتیب سے برتنوں کو ان میں لگا رکھا ہو اب اگر کسی وقت وہ اس ترتیب کو بدل دے اور نیچے کے برتن اوپر اور اوپر کے نیچے رکھ دے تو کسی کو اعتراض یا ناگواری کا کیا حق ہے؟

اسی طرح حق تعالیٰ کے یہاں عالم کے دو تختے ہیں۔ ایک دنیا اور ایک آخرت اگر وہ کسی وقت ان کی موجودات کی ترتیب کو پلٹ دیں کہ اوپر کی ارواح کو نیچے بھیج دیں اور نیچے کی ارواح کو اوپر بلا لیں تو کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے وہ الماری کے بھی اور اس کے برتنوں کے بھی مالک ہیں۔ تم گڑبڑ کرنے والے کون ہو؟

عارفین کو تو اس سے پوری تسلی ہوگئی مگر اہل ظاہر کو صرف عقلی تسلی ہوئی اور طبعی غم مفارقت کا باقی رہا تو اس کی تقلیل

تسہیل کے لئے آگے تعلیم فرماتے ہیں کہ تم یوں سمجھو انسا الیہ راجعون کہ ایک دن ہم بھی وہیں جانے والے ہیں جہاں ہمارا عزیز گیا ہے اس تصور سے مفارقت کا غم بھی ہلکا ہو جائے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نظام حیدرآباد نے ایک بھائی کو دکن بلا کر وزیر کر دیا۔ دوسرا بھائی مفارقت کے غم میں رونے لگا۔ نظام نے اسکو لکھ بھیجا کہ ارے تو کیوں روتا ہے۔ تجھے بھی عنقریب یہیں بلا لیا جائے گا۔ اس مضمون سے دوسرے بھائی کی یقیناً تسلی ہو جائے گی تو یہاں انسا الیہ راجعون کا مطلب یہی ہے کہ تم مفارقت کا غم نہ کرو۔ بہت جلدی تم بھی وہیں جاؤ گے جہاں تمہارا عزیز گیا ہے۔ عارفین کو یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہتا ہے اس لئے ان کو مفارقت حبیب کا زیادہ غم نہیں ہوتا۔

ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک بڑھا روتا ہوا آیا کہ حضرت میری بیوی مر رہی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ دیکھو کیسی عجیب بات ہے ایک قیدی قید سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا رو رہا ہے کہ ہائے یہ قید سے کیوں نکل رہا ہے۔ پھر فرمایا تم بھی ایک دن اسی طرح قید سے چھوٹ جاؤ گے۔ میں نے دل میں کہا کہ اور بیوی کو چھڑانے آؤ تم بھی منگوائے گئے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ

ترجمہ: اور جو مومن ہیں ان کو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ قوی محبت ہے۔

تفسیری نکات

ایمان کے لئے شدت محبت الہی لازم ہے

حاصل جملہ آیت کا یہ ہوا کہ مسلمان خدا تعالیٰ کی محبت میں بہت مضبوط ہوتے ہیں ترجمہ سن کر معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس مقام پر ایک جملہ خبریہ ارشاد ہوا لیکن بقاعدہ مذکورہ یہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس خبر سے ایک نتیجہ مقصود ہے اور وہی اس خبر کا ثمرہ ہے لیکن بصورت خبر اس لئے بیان فرمایا کہ یہ حکم بہت ہی مہتمم بالشان ہو جائے جیسا کہ علم بلاغت میں ثابت ہو چکا ہے کہ اس تعبیر میں یہ نکتہ ہوتا ہے کہ مخبر صادق کے کلام میں خبر تو ضروری الوقوع ہے ہی پس انشاء کو اس کی صورت میں لانا تحریض ہے سامع کو کہ اس کو ضرور واقع کرے تاکہ صورت عدم وقوع کی نہ ہو اور وہ نتیجہ اور ثمرہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ کی محبت میں نہایت مضبوط ہونا چاہیے اور خدا تعالیٰ کے برابر کسی کی محبت اس کے دل میں نہ ہونی چاہیے۔ اب دیکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ جو شان مومن کی خدا تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ ہم میں پائی جاتی ہے یا نہیں یعنی ہم خدا تعالیٰ کی محبت میں پورے طور سے مضبوط ہیں یا نہیں اگر پورے طور سے مضبوط ہیں تو ہم وَالَّذِينَ آمَنُوا کے پورے مصداق ہیں ورنہ جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجے کا ایمان بھی ہوگا یعنی یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ کسی مسلمان کو خدا تعالیٰ سے بالکل ہی محبت نہیں تھوڑی بہت تو سب کو ہی ہے کیونکہ یہ اس آیت کی رو سے ایمان کے لئے لازم ہے اور انتفاء لازم مستلزم ہوتا ہے انتفاء

مذہب کو پس اگر محبت کی بالکل نفی کی جائے تو اس کے ساتھ ہی ایمان کی بھی نفی کر دینی پڑے گی حالانکہ ایمان بجز اللہ ہم سب میں پایا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ محبت سب میں ہے بلکہ محبت کے ساتھ اس کی شدت بھی ہر مومن میں پائی جاتی ہے اسی آیت کی رو سے لیکن خود شدت کے بھی مراتب مختلف ہیں کہ کسی میں بہت شدت ہے اور کسی میں اس سے کم اور اسی مناسبت سے ایمان کے مراتب بھی مختلف ہوں گے باقی ضعف محبت کسی مسلمان میں پایا ہی نہیں جاتا اور نہ پایا جاسکتا ہے کیونکہ شدت محبت کی نفی سے بھی ایمان کی نفی ہو جائے گی تو اس اعتبار سے مراتب کا اختلاف شدت بلکہ اشدیت ہی میں رہا یعنی کسی کو اشد محبت ہے اور کسی کو اشد سے بھی اشد۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اشدیت محبت ہر مسلمان کے لئے لازم ہے اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو اشدیت محبت کس درجے کی ہے اور اسمیں کلام ہی نہیں کہ آپ کو اشدیت محبت حاصل ہے اور یہ بالکل نئی بات ہے ورنہ سب واعظین یہی کہتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں تو گویا میں نے آپ کو یہ نئی بشارت دی ہے یعنی اگر کوئی شخص فاسق فاجر گنہگار شرابی بھی ہے تو اس میں بھی اشدیت محبت کی ہے لیکن باوجود اس اشتراک کے پھر بھی مراتب اس کے مختلف ہیں کیونکہ ہر اشدیت برابر نہیں ہوتی اور اشتراک اشدیت اگر چہ اس وقت محسوس نہیں ہوتا لیکن امتحان کے موقع پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے مثلاً اگر کسی مسلمان کے سامنے کوئی شخص خدا تعالیٰ کی شان میں یا اس کے رسول ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو اگر چہ وہ مسلمان نہایت کم درجہ کا ضعیف الایمان ہو لیکن اس گستاخی کو سن کر اس قدر بے چین ہو جاتا ہے کہ ماں کی گالی سننے سے بھی اس قدر بے چین نہیں ہوتا اور اس درجہ کی بے چینی بدوں اشدیت محبت کے نہیں ہو سکتی پس معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ سے اشد محبت ہے اگر ضعیف محبت ہوتی تو اس قدر بے چین نہ ہوتا۔ گونہ بے چینی کسی نہ کسی مرتبے میں اس وقت بھی ہوتی ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ شدت محبت لازم ایمان اور اس کے مراتب مختلف اور جس مرتبے کی شدت اسی مرتبہ کا ایمان ہوگا اور یہی بات خدا تعالیٰ کو اس آیت میں بتلانا ہے اور مقصود اس بتلانے سے یاد دلانا ہے کہ تم شدت محبت اختیار کرو جس کی علامت اطاعت کاملہ ہے اور اس کی تائید کے لئے کچھ وقت ذکر اللہ کے لئے مقرر کرنا اور طاعت کے لئے علم دین سے واقفیت حاصل کرنا تاکہ طاعت میں سہولت ہو اور اس سے محبت بڑھے۔

محبت کا طبعی اثر

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ یعنی جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو سب سے زیادہ اللہ کی محبت ہے اس لئے محبت ہونے سے انکار بھی نہیں کر سکتے جب تمہاری محبت اور عشق نص سے ثابت ہو گیا تو عشق تو ایسی چیز ہے کہ سوائے محبوب کے کسی کو نہیں چھوڑتا پھر موانع پر نظر کیسی خوب فرمایا۔

عشق آج شعلہ است کو چوں بر فروخت	ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تج لادر قتل غیر حق براندہ	درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت	مرحبا اے عشق شرکت سوز تفت

محبت خداوندی کا رنگ سب پر غالب آنا چاہیے

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ اس سے پہلے کفار کے بارہ میں فرمایا ہے يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ کہ وہ اپنے اصنام سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے خدا تعالیٰ سے یہاں شبہ ہوگا کہ کفار کو خدا تعالیٰ سے محبت کہاں تھی جو اس کے برابر بتوں سے محبت کرتے تو خوب سمجھ لو کہ کاف مماثلت میں نص نہیں بلکہ مشابہت کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ بتوں کے ساتھ ان کی محبت مشابہ اس محبت کے ہے جو خدا سے محبت رکھنے والوں کو خدا سے ہوا کرتی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ کہ مسلمانوں کو خدا سے زیادہ محبت ہے اس میں مشابہت مذکورہ پر بھی نکیر ہے یعنی کسی مخلوق کی محبت خدا تعالیٰ کی محبت کے مشابہ بھی نہ ہونا چاہیے برابر ہونا تو درکنار محبت خدا کا رنگ ایسا غالب ہونا چاہیے کہ سارے عالم پر ظاہر ہو جائے کہ ان کو سوائے حق تعالیٰ کے کسی کی محبت نہیں ہے۔

حق سبحانہ تعالیٰ سے منشاء محبت

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ یعنی جو لوگ مومن ہیں وہ اللہ کی محبت میں سخت ہیں اگر کوئی کہے کہ کفار کو تو نہیں ہے ورنہ وہ کفر نہ کرتے اگر غور کیا جائے تو ان کو بھی ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمِئِذٍ لَمَّحْجُوبُونَ۔ (یعنی بے شک اس دن (قیامت کے دن) وہ کفار اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے۔ اس آیت کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی محبت ہے ورنہ وعید ان کو کیوں سنائی جاتی یہ تو دلیل ہے۔ محبت کی اور واقعات میں اگر غور کیا جائے تو بہت واضح ہے کہ ہر شخص کو اپنے خالق سے تعلق جی ہے دیکھو جس وقت آدمی سب کاموں سے فارغ ہوتا ہے اس کو ایک توجہ اپنے مولیٰ کی طرف ہوتی ہے اور اگر یہ سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھئے کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی شے سے یا آدمی سے محبت ہے کسی کو عورت سے کسی کو اولاد سے کسی کو باغ سے کسی کو جانوروں سے اور یہ ظاہر ہے کہ منشاء محبت کا یہ اشیاء من حیث ہی نہیں بلکہ محبوب ان کا کوئی وصف ہوتا ہے مثلاً کسی کو حسن محبوب ہے۔ کسی کو علم کی وجہ سے محبت ہے کسی کو محسن ہونے کی وجہ سے محبت ہے۔ اس کے بعد سمجھئے کہ تمام کمالات حق تعالیٰ کے لئے بالذات ثابت ہیں اور مخلوق کے لئے بالعرض جو کمال جس کے اندر ہے حق تعالیٰ کی ذات پاک اس کے لئے واسطہ فی الاثبات ہے جیسے کسی نے کہا

چاہ باشد آں نگار کہ بندد این نگار ہا

(وہ محبوب کس قدر حسین ہوگا جس نے ایسی اعلیٰ درجہ کی حسین صورتیں بنائی ہیں)

اور بعض کے کلام سے واسطہ فی العروض بھی معلوم ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ پس بہ چشم عاشقاں خود را تماشا کردہ

(اپنے حسن کو محبوبان دنیا کے ذریعے آشکارا کر کے تو نے عاشقوں کی آنکھ سے خود ہی اس کا نظارہ کیا ہے یعنی حقیقتاً

حسن اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے محبوبان دنیا مظہر ہیں)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ

إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۳۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو جو (شرع کی رو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ اور حق تعالیٰ کی شکرگزاری کرو اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو۔

تفسیری نکات

وَاشْكُرُوا سے مراد

مقصود تو اشکر واللہ تھا اور شکر سے مراد عبادت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ اس کی عبادت کی جائے مگر اس حکم سے پہلے فرماتے کُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ یعنی اے مسلمانو ہم نے تم کو جو کچھ پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں ان کو کھاؤ پیا اس کے بعد فرماتے ہیں وَاشْكُرُوا لِلَّهِ یعنی ان نعمتوں کو کھاپی کر خدا کا شکر بھی ادا کرو۔ دیکھئے بلا تشبیہ ایسی ہی صورت ہے جیسے باپ کو یہ منظور ہو کہ بیٹے کا سبق سنے تو وہ اس کو بلا کر کہتا ہے کہ آؤ بیٹا یہ لڈو مٹھائی کھا لو ہم تمہارے واسطے لائے ہیں پھر مٹھائی دے کر کہتا ہے کہ اچھا بیٹا سبق تو سنا دو ہم تمہیں پھر بھی مٹھائی دیں گے وہی صورت یہاں ہے کہ پہلے تو پاکیزہ نعمتوں کے کھانے کا حکم فرمایا پھر عبادت کا حکم فرمایا اور عبادت کے بعد پھر مٹھائی دینے کا وعدہ ہے وہ کیا ہے جنت۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۳۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو جو پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے کھاؤ اور حق تعالیٰ کی شکرگزاری کرو اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو۔

چاہے مزا آئے یا نہ آئے دل لگے یا نہ لگے اس میں آجکل بہت کوتاہی ہو رہی ہے لوگ اعمال کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ لذت کو مطلوب سمجھتے ہیں اس لئے اعمال کی ضرورت کا بتلانا ضرور ہے سو اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۳۳﴾۔ اس میں طیبات کی بھی دو تفسیریں اور شکر کی بھی طیبات کی ایک تفسیر تو حلال ہے مطلب یہ ہے حلال کھاؤ حرام نہ کھاؤ اس صورت میں امر و جوہ کے لئے ہوگا یعنی اگر کھاؤ تو اس میں حلال کی رعایت واجب ہے اور اگر کی قید میں نے اس لئے بڑھائی کہ کھانا فی نفسہ واجب نہیں لہذا واجب ہے البتہ اس میں حلال کی رعایت کرنائی نفسہ واجب ہے اور ایک تفسیر جس کی طرف اکثر مفسرین گئے ہیں یہ ہے کُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ کہ طیبات سے مراد لذیذ اور پاکیزہ چیزیں ہیں یعنی حلال اشیاء میں سے لذیذ عمدہ عمدہ چیزیں کھاؤ اور یہی تفسیر راجح ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے اس سے پہلے فرمایا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِن مَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ (اے لوگوں جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور پاک چیزوں کو کھاؤ اور

شیطان کے قدم بقدم نہ چلو) اس میں اول تو حلالا کے ساتھ طیب لایا گیا ہے جس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ طیب حلت کے علاوہ کوئی صفت مراد ہے کیونکہ تائیس تا کید سے اولی ہے دوسرے اس آیت میں کفار عرب کے طریقہ پر انکار کیا گیا ہے اب دیکھنا چاہئے کہ وہ طریقہ کیا تھا آیت سے ظاہر ہے کہ کفار عرب کا وہ طریقہ حرام کو حلال کرنے کا نہ تھا بلکہ حلال کو حرام کرنے کا تھا۔ حق تعالیٰ اس سے منع فرماتے ہیں کہ حلال کو حرام نہ کرو بلکہ حلال کو حلال سمجھو اس میں ترغیب دینے کے طیب کی تفسیر مستلذ ہی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے کہ شیطان تمہارا راہ مارتا ہے کہ تم کو لذیذ چیزوں سے محروم کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کا اتباع نہ کرو تمہارا دشمن ہے اور ان لذیذ پاکیزہ اشیاء کو کھاؤ پو اس میں خدا تعالیٰ کی کس قدر رحمت نیکتی ہے کہ تحریم حلال سے ناخوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میرے بندے لذیذ چیزیں کھالیں کوئی لذیذ چیز نہ کھاوے تو کسی کا کیا حرج ہے مگر وہ نہیں چاہتے کہ بندے ان لذیذ نعمتوں سے محروم رہیں بخدا مجھ کو تو ہر آیت میں رحمت نظر آتی ہے چنانچہ سورہ رحمن میں حق تعالیٰ نے نعمتوں کے ذکر کے بعد تو **فَإِنِّي الْآءِ رَبِّكُمْ أَفَكَذَّبْتُمْ** فرمایا ہے دوزخ اور ذکر عذاب کے بعد بھی **فَإِنِّي الْآءِ رَبِّكُمْ أَفَكَذَّبْتُمْ** فرمایا ہے بعض لوگوں کو ذکر عذاب کے بعد اس کا موقع سمجھ میں نہیں آتا مگر حقیقت میں یہ وہاں بھی موقع پر ہے اور ذکر عذاب میں بھی ایک رحمت ہے وہ یہ کہ ہم کو ایک مضر چیز کی اطلاع دے دی تاکہ اس سے بچنے کی کوشش کریں اگر طیب کسی شے کے متعلق یہ کہہ دے کہ دیکھو اسے نہ کھانا یہ زہر ہے تو اس کو شفقت کہیں گے یا نہیں اسی طرح یہاں بھی سمجھو مجھے تو آیات قہر میں بھی رحمت نظر آتی ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ آیت مداینہ سے زیادہ کوئی بھی آیت رحمت کی نہیں کیونکہ اس میں حق تعالیٰ نے حفاظت مال کے طریقے بتلائے ہیں کہ جب کسی کو قرض دیا کرو تو لکھ لیا کرو اور اس پر دو آدمیوں کو گواہ کر لیا کرو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے پیسہ کا نقصان بھی گوارا نہیں تو جان کا نقصان تو کب گوارا ہوگا پھر وہ جنت سے محروم کر کے دوزخ میں ہم کو کب ڈالنا چاہیں گے جب تک کہ تم خود ہی اس میں نہ گھسو۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔ **مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ** سبحان اللہ کیا شفقت ہے یوں نہیں فرمایا **لَا يَعَذِّبُكُمُ اللَّهُ** بلکہ فرماتے ہیں **مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ** کہ خدا تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا لیں گے اگر تم ایمان لے آؤ اور عمل کرو۔ اسی شفقت کا ظہور اس آیت میں ہے کہ حق تعالیٰ ہم کو ترغیب دیتے ہیں لذیذ اور مرغوب غذاؤں کی کہ لذیذ چیزیں کھاؤ عمدہ عمدہ کھانے کھا لو پھر کچھ عمل کر لو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کا تم سے محض حاکمانہ ہی تعلق نہیں ہے بلکہ ماں باپ جیسا تعلق ہے حاکمانہ تعلق تو ایسا ہوتا ہے جیسا کلکٹر تم سے کہہ دیتا ہے کہ سالانہ مال گزاری ادا کرو جب تم مال گزاری ادا کرتے ہو تو اسکے صلہ میں تمہاری کوئی دعوت ضیافت نہیں ہوتی اور ماں باپ کا تعلق ایسا ہوتا ہے کہ باپ بیٹے کو پڑھانا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ روپیہ لے لو اور سبق پڑھ لو یا مٹھائی کھا لو اور سبق سناؤ اور ایسے ہی برتاؤ حق تعالیٰ کا تمہارے ساتھ ہے۔

وما اهل به لغير الله (اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو)

اولیاء اللہ کے نام پر نذر نیاز کا حکم اور اس کی علمی تحقیق

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت جو لوگ اولیاء اللہ کے نام پر کسی جانور کو ذبح کرتے ہیں یا ان کے مزار پر

نذر و نیاز کی مٹھائی وغیرہ چڑھاتے ہیں اس میں دو قسم کے عقائد کے لوگ ہیں ایک تو یہ کہ ان کو حاجت روا سمجھ کر ایسے کرتے ہیں اس کے تو شرک ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ایک صورت یہ ہے کہ ذبح تو کرتے ہیں اللہ ہی کے نام پر مگر اولیاء کو ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور انکو مقبول سمجھ کر ان سے دعاء کے طالب ہوتے ہیں اس میں کیا حکم ہے فرمایا کہ اس کی حرمت کی کوئی دلیل نہیں مگر عوام کا کچھ اعتبار نہیں اس لئے اس میں بھی احتیاط ضروری ہے سو یہ ایک واقعہ میں اختلاف ہے حکم میں اختلاف نہیں وہ کہتے ہیں کہ سب عوام کی نیت شرک نہیں ہوتی اور ہم کہتے ہیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کی نیت شرک کی ہوتی ہے تو یہ ایک واقعہ میں اختلاف ہوا حکم میں اختلاف نہیں باقی غالب واقعہ یہی ہے کہ نیت عوام کی یہ ہی ہوتی ہے کہ وہ راضی ہو کر خوش ہو کر ہماری حاجت کو پورا کر دیں گے بس یہی شرک ہے اور بعض اہل کی تفسیر ذبح سے کر کے اس مذبح بہ نیت تقرب الی غیر اللہ علی اسم اللہ کو حلال کہتے ہیں سو یہ ان کی غلطی ہے اور اگر ان کی تفسیر کو مان لیا جاوے اور ما اهل لغیر اللہ (اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو) میں داخل نہ مانا جاوے تب بھی وہ ذبح علی النصب (اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے) میں داخل ہونا تو قطعی ہے اس لئے کہ وہ عام ہے ہر منوی لغیر اللہ جس میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کے تقرب کی نیت کی گئی ہو) کو گو مذبح با اسم اللہ (اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو) ہی ہو اس لئے سب ایک ہی حکم میں داخل ہیں البتہ قرآن سے یہ عموم حیوانات کو شامل ہوگا۔ غیر حیوان کو جیسے شیرینی وغیرہ کو شامل نہ ہوگا یعنی لفظاً اس کو عام نہ ہوگا اشتراک علت سے حکم عام ہو اور لفظ ما اهل ظاہر اس کو بھی عام ہے مگر عموم وہی معتبر ہے جو مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو حدیث شلیس من البر الصیام فی السفر (سفر میں روزہ رکھنا ضروری نہیں) اس کی دلیل ہے چنانچہ جمہور فقہاء کا مذہب ہے کہ سفر میں روزہ افطار کرنا واجب نہیں کیونکہ قرآن سے مراد متکلم کی حدیث میں وہی صوم ہے جو سبب درود یعنی مشقت شدید تک مفہمی ہو بہر حال اس عموم لفظی میں ایک حد ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ قرآن میں کلام ہو مراد آباد کے ایک وعظ میں نے یہ مسئلہ عموم کے محدود ہونے کا بیان کیا تھا جس میں مولانا انور شاہ صاحب بھی شریک تھے انہوں نے بہت پسند کیا۔

ف- احقر اشرف علی کہتا ہے کہ ضابطہ ملفوظات اس مضمون کو کافی طور پر ضبط نہیں کر سکتے اس لئے میں خلاصہ لکھے دیتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ ما اهل به لغیر اللہ کو بعض نے خاص کیا ہے اس جانور کے ساتھ جس کو غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جاوے اور جو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جاوے گو اصل نیت تقرب الی غیر اللہ کی ہو اس کو حلال کہا ہے اور منشا اس کا یہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس میں عند الذبح (ذبح کے وقت) کی قید لگادی ہے مگر یہ قول محض غلط ہے دوسری آیت ما ذبح علی النصب میں ما عام ہے اور وہاں کوئی قید نہیں اور مذبح با اسم اللہ کو بھی شامل ہے سو اس کی حرمت کی علت بجز نیت تقرب کے کیا ہیں پس اسی طرح ما اهل به لغیر اللہ بھی عام ہوگا اور دونوں کے مفہوم میں اتنا فرق ہوگا کہ ما اهل به لغیر اللہ میں غیر اللہ کے لئے نامزد ہونا قرینہ ہوگا قصد تقرب بغیر اللہ کا اگرچہ انصاب بتول پر ذبح نہ کیا جاوے اور ما ذبح علی النصب میں ذبح علی الانصاب اس مقصد کا قرینہ ہوگا اگرچہ غیر اللہ کے نامزد نہ کیا گیا ہو پس دونوں میں عموم و خصوص من وجہ ہوگا اور یہی تغایر مبنی ہوگا ایک کے دوسرے پر معطوف ہونے کا سورہ مائدہ میں پس علت حرمت کی قصد مذکور ہوگا یہ تو قرآن مجید سے استدلال ہے ما اهل به لغیر اللہ میں عند الذبح کی قید نہ ہونے کی اور فقہاء نے مذبح با اسم اللہ (جو امیر کے آنے

کے وقت اس کے تقرب کے لئے ذبح کیا ہو) کی حرمت میں اس کی تصریح کی ہے وان ذبح علی اسم اللہ تعالیٰ (اگر چہ اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو) اور یہ علت بیان کی ہے لانه ما اهل به لغیر اللہ بس معلوم ہوا کہ عند الذبح کی قید التفاتی جزاً علی العادة ہے یا اس قید سے یہ مقصود ہے کہ ذبح کے وقت تک وہ نیت تقرب کی رہی ہو یعنی اگر ذبح کے قبل تو بہ کر لی تو پھر حرمت نہ رہے گی اور تفسیر احمدی میں جو بقر من ذرۃ اولیاء (اولیاء اللہ کو ثواب پہنچانے کے لئے جو جانور ذبح کیا جاوے) کو حلال کہا ہے وہ اس تحقیق کے خلاف نہیں ہے کیونکہ منیہ میں یہ تاول کی ہے کہ ذبح اللہ ہے اور نذر سے مقصود ان کو ایصال ثواب ہے تو یہ اختلاف واقعہ کی تحقیق میں ہوا کہ ان کے نزدیک عوام کی نیت تقرب کی نہیں نہ کہ معنوی للتقرب (جس میں تقرب کی نیت کی گئی ہو) کی حرمت میں اس تاول سے خود ظاہر ہے کہ معنوی للتقرب کو وہ بھی حرام سمجھتے ہیں اور بعض نے ما اهل به کو ایسا عام کہا ہے کہ حیوان وغیر حیوان دونوں کو شامل ہے یعنی طعام و شیرینی بھی اکمیں داخل ہے مگر تامل و قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مقصود بیان کرنا احکام حیوان کا ہے رہا ما کے عام ہونے سے استدلال سو محقق یہ ہے کہ اس عموم میں ایک قید بھی ہے وہ یہ کہ مراد متکلم سے مجاوز نہ ہو اور یہاں مجاوز ہو جاوے گا مگر اس سے حلت لازم نہیں آتی بلکہ اشتراک علت سے حکم بھی مشترک ہوگا حیوان میں نص قطعی سے اور غیر حیوان میں قیاس ظنی سے واللہ اعلم۔ (الافاضاف الیومیہ ج ۳ ص ۹)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا

أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا

يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷۱﴾

ترجمہ: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب کا انخفاء کرتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں متاعِ قلیل وصول کرتے ہیں ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے شکم میں آگ بھر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نہ تو قیامت میں کلام کریں گے اور نہ ان کی صفائی کریں گے اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔

تفسیری نکات

منشادین فروشی کتمان حق

اس میں اہل کتاب کی دین فروشی اور کتمان حق کا ذکر ہے اور اس پر سخت عذاب کی دھمکی ہے اس کے بعد یہ آیت ہے اُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلٰةَ بِالْهُدٰی السخ ہے اس میں ان اعمال سابقہ کا منشا بتلایا گیا ہے کہ اہل کتاب جو دین فروشی اور کتمان حق پر دلیر ہیں اس کا منشا دو باتیں ہیں ایک یہ کہ ان لوگوں نے (دنیا میں) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی

دوسرے یہ کہ انہوں نے (آخرت کی چیزوں میں سے) اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کیا اس کے بعد ان دونوں پر سخت وعید ارشاد فرماتے ہیں **فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ** (دوزخ کے لئے کس قدر باہمت ہیں) یہ ایسا ہے جیسا ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ شاباش ہے اس کی ہمت کو آگ میں کودنے کے لئے کیسا باہمت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو دوزخ میں جانے کے لئے کیسے باہمت ہیں۔

اسباب مغفرت کو اختیار کرنے کی ضرورت

خلاصہ یہ کہ آیت ترک ہدایت اور اختیار ضلالت پر اور ترک اسباب مغفرت و اختیار اسباب عذاب پر وعید ہے اور میں نے اسباب کا لفظ ترجمہ میں اس لئے بڑھا دیا کہ عذاب کو بالواسطہ کوئی اختیار نہیں کر سکتا جس سے بھی پوچھا جائے ہر شخص عذاب سے نفرت و کراہت اور خوف ہی ظاہر کرے گا اور کوئی نہ کہے گا کہ مجھے عذاب لینا منظور ہے مگر حق تعالیٰ نے اسباب کے لفظ کو اس لئے حذف کر دیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اسباب کو اختیار کرنا عذاب کو اختیار کرنا ہے دیکھئے جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ بغاوت و قتل کی سزا پھانسی ہے وہ اگر قتل و بغاوت پر اقدام کرے تو عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ کجخت پھانسی پر نکلنا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ پھانسی پر لٹکانا ہرگز نہیں چاہتا مگر اس کے اسباب کو جان بوجھ کر اختیار کرنا عقلاء کے نزدیک پھانسی ہی کو اختیار کرنا ہے ایسے ہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب ان لوگوں نے اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کر لیا تو یوں کہنا چاہیے کہ گویا مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو اختیار کیا ہے یہ تو وجہ ہوئی جانب عذاب میں اسباب کو مقدر کرنے کی یہی وجہ ہے کیونکہ خود عذاب کو بلا واسطہ کوئی اختیار نہیں کر سکتا اور جانب مغفرت میں لفظ اسباب کے مقدر کرے کی بھی یہی وجہ ہے کہ مغفرت ہر شخص کو مطلوب ہے اسکو بھی بلا واسطہ کوئی ترک نہیں کرتا جس سے بھی پوچھو گے وہ طالب مغفرت ہی ہوگا پس ترک مغفرت کے بھی یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب کو ترک کر دیا اور ایک علت مشترکہ مقدر کرنے کی یہ بھی ہے کہ ترک و اختیار کا تعلق ان اشیاء سے ہوا کرتا ہے جو بندہ کی قدرت میں داخل ہوں اور عذاب و مغفرت انسان کی قدرت سے خارج ہیں اس لئے بلا واسطہ ہمارے ترک و اختیار کا تعلق ان کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ البتہ دونوں کے اسباب ہمارے قدرت کے تحت میں ہیں۔ ان کے ساتھ ہمارا ترک و اختیار متعلق ہو سکتا ہے اور اسباب کے واسطہ سے عذاب و مغفرت کے ساتھ بھی ان کا تعلق ہوتا ہے۔

تو یہ ترجمہ تھا آیت کا جس سے معلوم ہو گیا کہ ترک ہدایت و اختیار ضلالت اور ترک اسباب مغفرت و اختیار اسباب عذاب بڑا سنگین جرم ہے جس کے مرتکب کی بابت حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جہنم میں جانے پر بڑے ہی دلیر ہیں۔ اور اس جرأت کو تعجب کے صیغہ سے بیان فرماتے ہیں کہ شاباش ہے ان کی ہمت کو یہ جہنم میں جانے کے لئے کیسے دلیر اور بے باک ہیں اور غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہی افعال مشا ہیں تمام جرائم کا جن میں سے دینی فروشی اور کتمان حق کا ذکر خصوصیت سے اوپر آ بھی چکا ہے کہ ان کا منشاء یہی ترک ہدایت و اختیار ضلالت وغیرہ ہوا ہے اور اس سے بطور مفہوم کے بھی معلوم ہوا کہ جس طرح ترک ہدایت و ترک مغفرت صدور معاصی و دخول جہنم کا سبب ہے اسی طرح

اختیار ہدایت و طلب مغفرت صدور طاعات و دخول جنت کا سبب ہے۔

اس کے مقابلہ میں یہاں **وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ** ہے تو اس ایک حدیث کی بنا پر **وَاشْكُرُوا لِلَّهِ** کی تفسیر **وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ** سے ہوئی ہے کیونکہ شکر کا طریقہ شرعاً عمل ہی ہے جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہے **لِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا** اے آل داؤد عمل کرو شکر پہلے طور پر یہاں شکر مفعول بہ نہیں بلکہ مفعول ہے جس کے بڑھانے میں اس پر تشبیہ ہے کہ تم سے عمل کو بے وجہ نہیں کہا جاتا بلکہ تم پر عقلاً شکر لازم ہے اور وہ زبان ہی سے فقط نہیں ہوتا بلکہ حقیقت شکر کی یہ ہے کہ کچھ کر کے دکھاؤ زبانی شکر یہ کافی نہیں بلکہ عملی شکر یہ بجالاتا۔ اہل بلاغت نے بھی اس راز کو سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ حمد تو زبان کے ساتھ خاص ہے اور شکر زبان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ قلب اور لسان اور جوارح سب سے ادا ہوتا ہے اور گوزبانی شکر یہ میں شکر کی تصریح ہوتی ہے اور عملی شکر میں اس کی تصریح نہیں ہوتی مگر درجہ عملی شکر کا بڑھا ہوا ہے دیکھو اگر تم اپنے دو غلاموں کو انعام دو جن میں سے ایک غلام نے تو محض زبان سے شکر یہ ادا کر دیا اور ایک غلام روپیہ اور خلعت ہاتھ میں لے کر آپ کے پیروں میں گر پڑا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر زبان سے کچھ نہیں کہا تو بتلاؤ کس کا شکر بڑھا ہوا ہے یقیناً جو پیروں میں گر پڑا اس کا شکر بڑھا ہوا ہے معلوم ہوا کہ شکر عمل سے بھی ہوتا ہے اور اس میں قدرے نعمت زیادہ ظاہر ہوتی ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ تفسیر زبان روشن ترست لیک عشق بے زبان روشن گرست

اور اگر زبان سے بھی شکر یہ ہو اور پھر پیروں میں گر پڑے تو یہ تو نور علی نور ہے (عمل الشکر)

یہاں طیبات کے ساتھ ہار زقنا کم بڑھایا گیا تا کہ لذت مطعومات میں منہمک ہو کر عطاء حق سے غافل نہ ہو جائیں پس ساتھ ساتھ تشبیہ کر دی کہ یہ ہماری دی ہوئی نعمتیں ہیں یاد رکھنا چونکہ انبیاء میں یہ احتمال نہ تھا اس لئے وہاں **كُلُوا مِنْ حَيْثُ بَدَأْتُمْ** مطلق فرمایا اور نیز وہاں **وَاعْمَلُوا الصَّالِحَاتِ** میں صراحتاً عمل کا مطالبہ فرمایا کیونکہ عمل ان پر گراں نہیں اور غیر انبیاء پر چونکہ گرانی کا احتمال ہے اس سے **وَاعْمَلُوا** کے مضمون کو **وَاشْكُرُوا لِلَّهِ** کے عنوان سے بیان فرمایا کیونکہ شکر نعمت انسان میں فطرت تقاضا ہے اس کی طلب گراں نہیں ہوتی اس طرح یہ آیت ترغیب و ترہیب دونوں کو جامع ہو گئی۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ

عَلَى النَّارِ

ترجمہ: یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی اور مغفرت کو چھوڑ کر عذاب سو دوزخ کے لئے کیسے باہمت ہیں۔

تفسیری نکات

گناہوں کا سبب جہالت اور عذاب سے بے خوفی ہے

پس حاصل یہ ہوا جہل اور عذاب سے بے خوفی گناہوں کا سبب ہے اور علم و رغبت مغفرت طاعات کا سبب ہے آیت کا حاصل مدلول یہ ہوا کہ تحصیل علم کی بھی سخت ضرورت ہے اور عمل کی بھی۔ اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔ یہ سخت وعید ہے جس میں حق تعالیٰ صیغہ تعجب سے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو ہدایت اور مغفرت کو اور بعنوان دیگر علم و عمل کو چھوڑ کر ضلالت و معصیت میں مبتلا ہیں جہنم میں جانے کے لئے کیسے دلیر اور بے باک ہیں۔ لفظ اصبر کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وعید صبر و ثبات علی المعصیت پر ہے یعنی گناہوں پر اصرار کرنا اور ان پر جمار ہنا سب پر وعید ہے ورنہ ایک بار گناہ کر کے پھر نادام ہو کر اس پر ثبات نہ کرنا اس وعید کا محل نہیں بلکہ توبہ کر لینے سے آئندہ و ماضی دونوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کے کلام میں کیسی بلاغت اور کتنی رعایت ہے کہ لفظ لفظ سے علم عظیم پیدا ہوتا ہے۔ (الہدی والمغفرہ)

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ

مَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّنَّ

ترجمہ: کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو یا مغرب کو (لیکن اصلی کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور (سب) کتب (ساویہ) پر اور پیغمبروں پر۔

تفسیری نکات

نیکی محض استقبال قبلہ نہیں

ایک شخص ایک تصوف کی کتاب لائے اس میں ایسی باتیں تھیں روزہ رکھنا بکل ہے آخر میں تھا دل کو قابو میں لانا مردوں کا کام ہے۔ فرمایا کتاب اچھی ہے لیکن عوام کے لئے مضر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ روزہ نہیں رکھنا چاہیے بلکہ

مطلب یہ ہے کہ اگر دل قابو میں نہ لایا جائے تو بے اس کے روزہ بخل کے مثل ہے اور کمال جب ہی ہوگا جب دل بھی قابو میں ہو اس کی نظیر قرآن میں ہے لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مقصود نہیں کہ استقبال قبلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ مقصد یہ ہے کہ بغیر ایمان کے جو کہ اصل بر ہے استقبال محض معتبر نہیں۔ وَالضَّالِّينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ ترجمہ: اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قال میں۔ یہ لوگ ہیں جو سچے کمال کے ساتھ موصوف ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں۔ وَالضَّالِّينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قال میں۔

کمال اسلام کی شرائط

آیت وَالضَّالِّينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ کی تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ اوپر سے اس آیت میں کمال اسلام کے شرائط کا بیان چلا آتا ہے۔ پھر اوپر سے آیت کو پڑھا اور فرمایا کہ عقائد بھی اس میں ہیں اور اعمال بھی ہر قسم کے ہیں۔ پھر آداب معاشرت بھی ہیں۔ پھر اخلاق یعنی اعمال باطنیہ صبر وغیرہ بھی ہیں اور مجاہدہ کی حقیقت بھی کہ مخالفت نفس ہے اور نفس کو فطرتاً آزادی پسندیدہ ہے اور جس قدر اعمال شرعیہ ہیں ان میں تقلید ہے اور تقلید نفس کی خواہش کے خلاف ہے۔ پھر فرمایا کہ مصیبت میں دو اثر ہیں ”قربت“ اور ”بعد عن اللہ“ اگر صبر کرے تو قربت اگر شکایت کرے تو بعد عن اللہ۔ (الکلام الحسن)

صبر کی تین حالتیں

حق تعالیٰ نے مختصر لفظوں میں تینوں حالتوں کے متعلق دستور العمل بیان فرما دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے ان تینوں حالتوں کے فہرست میں کچھ تطویل ہے لیکن دستور العمل صرف ایک حکمت میں ہے وہ کیا ہے وَالصَّابِرِينَ یعنی ان تینوں میں تعلیم صبر کی فرمائی ہے صبر کی حقیقت تو میں بعد میں بیان کروں گا اور باساء ضراء . باس . ان تینوں لفظوں کی تفسیر میں کلام کرتا ہوں۔ باس کی تفسیر میں کچھ اختلاف نہیں باقی۔ باساء اور ضراء کے مدلول میں اختلاف ہے کہ ان دونوں سے کیا مراد ہے جو میرے نزدیک راجح ہے وہ بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ باساء کے معنی شدت کے ہیں اب رہی یہ بات کہ کون سی شدت مراد ہے فقر و فاقہ کی یا مرض کی۔ ضراء کی تفسیر اگر مرض سے کی جاوے جیسا کہ مشہور ہے تو باساء۔ سے مراد فقر و فاقہ ہوگا لیکن یہ تفسیر میرے نزدیک مرجوح ہے میں کہتا ہوں کہ ضراء کے معنی تو فقر و فاقہ کے ہیں اور باساء کا مدلول مرض ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عباد متقین کی فضیلت میں دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ (یعنی وہ لوگ خرچ کرتے ہیں خوشی اور ناخوشی میں)

مفہوم آیت

اب اس مقام پر دیکھنا چاہیے کہ خوشی اور ناخوشی سے کیا مراد ہے اور وہ کون سی ناخوشی ہے جو خرچ کرنے کی ہمت کو گھٹاتا

دیتی ہے۔ سو ظاہر ہے کہ وہ ناداری اور فقر و فاقہ ہی ہے نہ کہ مرض اس لئے کہ مرض کی حالت میں خرچ کرنے کی ہمت نہیں کھتی بلکہ خرچ کرنا بہت آسان ہے دو وجہ سے اول تو اس وجہ سے کہ آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ خرچ کروں گا تو بیماری سے چھوٹ جاؤں گا دوسرے یہ کہ بیماری کی حالت مایوسی کی ہوتی ہے مال سے تعلق کم ہو جاتا ہے اس لئے آدمی سمجھتا ہے جو خرچ کروں گا وہ میرا ہے اور جو رہ جائے گا وہ پرایا ہے پس مسراء و ضراء سے مراد تنگدستی اور بیماری کی خوشی و ناخوشی مراد نہیں ہے بلکہ مسراء سے مراد فراخی اور ضراء سے مراد تنگ دستی و فقر و فاقہ ہے اس لئے کہ تنگ دستی کی حالت میں خرچ کرنا بڑی ہمت کی بات ہے پس جب کہ ضراء سے مراد فقر و فاقہ ہو تو باسراء سے مراد اس کا معائر ہونا چاہیے وہ کیا ہے مرض پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ صبر کرنے والے ہیں مرض اور فقر و فاقہ میں اور قتال کے وقت بھی جہاں پیش آ جاوے حاصل اور لخص کیا ہوا کہ ناگواری کی حالتوں میں صبر کرنے والے ہیں۔ یہ تو مجملاً دستور العمل ہو گیا۔

صبر کی تعریف

اب اس کے بعد دیکھنا چاہیے کہ صبر کس کو کہتے ہیں شکوہ شکایت کا مذموم ہونا تو لفظ صبر ہی سے معلوم ہو گیا ہو گا اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں رہا بعض اور امور میں اشتباہ باقی ہے اس وقت اس کا زائل کرنا ضروری ہے۔

سوا یک شبہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں نے باسراء کا مدلول مرض لیا ہے تو مرض میں صبر کرنے کے معنی شاید کوئی یہ سمجھے کہ دوا دارو بھی نہ کرے اس کا کرنا بھی صبر کے خلاف ہے تو یاد رکھو کہ تدوی صبر کے خلاف نہیں شریعت نے اس کا مکلف نہیں کیا دوانہ

کرو تدبیر نہ کرو یہ شبہ صبر کی حقیقت نہ جاننے سے ہوا ہے صبر کے معنی استقلال کے ہیں تو دوا دوانہ کرنا یا تدبیر کرنا بے استقلال کا فرد نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے خود تدبیر اور دوا فرمائی ہے چنانچہ پچھنے لگوائے ہیں زخم پر مہندی رکھی ہے۔ بارش کی دعا

فرمائی ہے اور زیادتی بارش میں کی بارش کی دعا فرمائی ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور ﷺ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک اعرابی کھڑا ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! وهلکت الاموال فادع الله لنا آپ نے دعا فرمائی اللهم اسقنا

چنانچہ بادل آئے اور برسنا شروع ہو گئے اور ایک ہفتہ تک برستے رہے دوسرے ہفتے میں وہی اعرابی یا کوئی اور کھڑا ہوا کہ یا رسول اللہ ﷺ گھر گر گئے اور کام بند ہو گئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ بارش روک دیں حضور ﷺ نے دعا فرمائی اللهم

حوالینا ولا علينا اللهم على الاكام والوديه و على ال الظراب و على الجبال اور کما قال۔ چنانچہ اسی وقت بادل پھٹ گیا اور چاروں طرف بادل تھے اور بیچ میں صاف تھا پس دعا بھی ایک تدبیر ہے اور احسن تدبیر ہے لوگ اس تدبیر کو نہیں سمجھتے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ (یعنی یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں)

مقبول کون؟

صدق صرف قول کے ساتھ خاص نہیں بلکہ صدق اصل میں قلب کی صفت ہے جس کا اثر قول و فعل و حال سب میں ظاہر ہوتا ہے اور تقویٰ بھی گو صفت قلب کی ہے چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا الا ان التقویٰ ههنا و اشار الی صدره

یعنی آگاہ رہو کہ تقویٰ یہاں ہے اور اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا لیکن اس کا زیادہ ظہور افعال جوارح سے ہوتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ مقبول وہ ہے جس کا ظاہر بھی اچھا ہو باطن بھی اچھا بعنوان دیگر یوں سمجھئے کہ ظاہر و باطن دونوں کو جمع کر لو۔

وَ اِتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ اُولٰٓئِكَ هُم مَّا رَمَىٰ هُوَ اس کے بعد اقام الصلوٰۃ و اتی الزکوٰۃ یعنی انفاق کا ایک مرتبہ تو یہ فرمایا کہ مال دیا کرو قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو۔ پھر دوسرا عمل یہ فرمایا کہ زکوٰۃ دیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال دینے سے اور مراد ہے اور زکوٰۃ دینے سے اور اس کو سمجھ کر حضور ﷺ نے فرمایا ان فی المال لحقاسوی الزکوٰۃ۔ اس لئے ہمیں یہ حقوق سمجھ کر فرائض کے علاوہ اور بھی کچھ کرنا چاہیے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلٰى الَّذِيْنَ مِنْ

قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا (اس توقع پر کہ تم متقی بن جاؤ)

تفسیری نکات

روزہ ایک عظیم نعمت خداوندی

اس تشبیہ میں اس کی رعایت ہے کہ سہل ہو جائے کیونکہ ایک تو مسابقت میں رغبت ہوتی ہے اور ایک مرتبہ جوش ہوتا ہے کہ ہم بھی کریں گے دوسرے یہ کہ ہماری شان کتنم خیر امة (تم بہتر امت ہو) ہے تو غیرت بھی ہوتی ہے کہ ہم باوجود افضل ہونے کے حق تعالیٰ کا وہ کام نہ کریں۔ جو ہم سے مفضل کر گئے تو گویا پہلی قوم میں ایک ایسی چیز لے گئیں جو تمہیں اب تک نہیں دی گئی۔ انہیں ہم نے ایک بائیسکل دی تھی جس سے وہ بہت جلد اپنا راستہ قطع کر سکتے تھے۔ تمہیں بھی دے دی تاکہ تم ان سے پیچھے نہ رہ جاؤ۔ اسی لئے فرمایا کتب علیکم (تم پر فرض کیا گیا) یہ خدا کی بڑی رحمت ہے کہ فرض کر دیا جس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے کو زبردستی سہل پلائے واقعی بڑی رحمت ہے کہ فرض کر دیا کیونکہ جانتے تھے کہ بغیر اس کے نہیں کریں گے۔ ہمارے والد صاحب نے بچپن میں مجھے سہل پلانا چاہا میں نے انکار کیا مجھ سے کہا کہ پی لوتو ایک روپیہ دیں گے میں جانتا تھا کہ اب اگر انکار کروں گا تو دھمکی دے کر پلائیں گے پھر روپیہ بھی جائے گا اور پینا پڑے گا اس لئے پی لیا۔ حق تعالیٰ نے بھی ہماری ہی ضرورت اور ہماری ہی مصلحت کے لئے مسلسل تجویز فرمایا اور اس کے پی لینے پر انعام کا وعدہ فرمایا اور نہ پینے پر دھمکی بھی دی۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے اس عنایت و شفقت کا۔ واللہ وجد کے قابل ہے۔ لوگ ستار کی تن تن اور سارنگی کی روں روں پر کودتے ناچتے ہیں۔ افسوس انہیں حس نہیں۔ وجد کی چیزیں یہ علوم ہیں۔

ادراک اوامر

شاید کوئی یہ شبہ کر لے کہ قرآن مجید نازل ہوئے سینکڑوں برس ہو گئے جو کچھ حکم ہونا تھا ایک بار ہو چکا روز روز صوموا (تم روزہ رکھو) کہا جاتا ہے فقہا حقیقت میں بڑے عارف تھے وہ اس کی حقیقت کو خوب سمجھے وہ کہتے ہیں کہ قوم کا سبب وجوب شہود شہر (مہینہ کا حاضر ہونا) ہے لہذا جب شہود شہر ہوگا تو تقدیراً امر ہوگا کہ صوموا (تم روزہ رکھو) جس طرح جب ظہر کا وقت ہوگا تو تقدیراً ہمیں امر ہوگا صلوا (تم نماز پڑھو) کیونکہ وقت ظہر وجوب ہے ہاں حج کا سبب بیت اللہ ہے اور وہ چونکہ مکرر نہیں اس لئے حج بھی مکرر نہیں اور یہاں چونکہ یہ اسباب مکرر ہوتے رہتے ہیں اس لئے ان کے مسببات بھی مکرر ہوں گے مگر تمہیں ادراک نہیں ہوتا۔ عارفوں جیسے کان پیدا کرو تو تمہیں بھی ہر ظہر کے وقت صلوا (نماز پڑھو) اور رمضان کے ہر دن میں صوموا سنائی دینے لگے۔ اسی کو عارف رومی فرماتے ہیں۔

پنبہ اندر گوش حس دوں کلید تا خطاب ارجعی را بشنوید
ترجمہ: ان ظاہری کانوں میں جو ادنیٰ درجہ کے حواس سے ہیں روئی رکھ کر گوش باطن کو درست کرو جب اس قابل ہو گئے کہ ارجعی کا خطاب سنو اور عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

است از ازل ہچناں شان بگوش بفریاد قالو بلی در خروش
ترجمہ: الست بر بکم کی ندا ان عاشقان صادق کے کانوں میں ہنوز ویسی ہی ہے قالو بلی کی فریاد سے شور کر رہے ہیں کہ جو الست بر بکم (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) ازل میں کہا گیا تھا وہ منقطع نہیں ہوا اسی طرح صلوا و صوموا (نماز پڑھو اور روزہ رکھو) منقطع نہیں ہوا آج بھی موجود ہے اور برابر ہے گا۔ اہل ادراک ہی اس کو ادراک کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

محکمہ نفع و ضرر

الغرض حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ کس قدر شفقت ہے کہ پرہیز کرایا مگر تھوڑی دیر کہ اَسْتَعُوْا الصِّيَاةَ اِلَى الْاَيْلِ (تم رات کو روزہ کو پورا کیا کرو) اس سہولت پر طبیعت اس لئے قادر نہیں کہ وہ مظہر نفع و ضرر ہے اور حق تعالیٰ محدث ہے نفع و ضرر کا کہ جب تک چاہا ایک شے کو نافع رکھا اور جب چاہا اسے ضار بنا دیا حق تعالیٰ کو کس قدر تمہاری رعایت منظور ہے کہ ایک محکمہ نفع و ضرر کا قائم کیا کہ ایک ہی شے رات بھر نافع رہتی ہے اور صبح کو ضار ہو جاتی ہے دن بھر مضر رہتی ہے رات سے پھر مفید ہو جاتی ہے۔ ایک یہ رحمت دوسری یہ شفقت کہ جب مضر ہوا تو اس سے بچنا فرض کر دیا اور یہی نکتہ ہے کتب علیکم میں آگے فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ روزہ تم پر فرض کیوں ہوا اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ۔

مقصود روزہ

اس ترجمہ سے یہ اشکال رفع ہو گیا ہوگا کہ لعل تردد وترجی کے لئے ہے جب باری تعالیٰ کو تمام اشیاء کا علم ہے تو تردد کا کلمہ کیوں استعمال کیا۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ فرض ہوا ہے تمہاری اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ گے یعنی روزہ رکھ کر یہ امید رکھو

کہ متقی ہو جاؤ گے یہاں بھی امید و بیم میں رکھا کہ تمہیں روزہ رکھ کر متقی بن جانے کی امید رکھنا چاہیے۔ یقین نہ رکھنا چاہیے۔ یہ بھی خدا کا لطف ہے کیونکہ اگر یہ فرمادیتے کہ تم متقی ہونے کا یقین رکھو تو روزہ رکھنے کے بعد تو متقی ہونے کا ناز ہی ہو جاتا جو بالکل خدا سے بعید کر دیتا کیونکہ ناز و نیاز جمع نہیں ہوتے جیسے صحابہ کے بارے میں ارشاد ہے۔ وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے ان سے مغفرت اور ثواب عظیم کا) یہاں بھی منہم فرمایا اگر منہم نہ فرماتے تو اس لفظ سے جو نیاز اب پیدا ہوتا ہے وہ پیدا نہ ہوتا۔ ایک ذرا سا لفظ بڑھایا اور سارے جہان کو ہلا دیا تو منہم اس واسطے بڑھایا کہ صحابہ کو یہ کیفیت بھی میسر ہو کیونکہ ناز والوں کو قرب نہیں ہوتا قرب نیاز والوں کو ہوتا ہے اسی واسطے تمام انبیاء اہل نیاز ہوئے اور یہی نکتہ ہے منہم کے بڑھانے کا کہ نیاز کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں اور ناز کو پسند نہیں کرتے۔

احکام اسرار

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ اس کا مفعول مخدوف ہے یا تو النار اس کا مفعول ہو گا یا المعاصی مگر دونوں کا حاصل ایک ہے کیونکہ نار سے بچنے کے لئے اولاً معاصی سے بچنا ضروری ہے اسی طرح معاصی سے بچ کر نار سے بچ سکتے ہیں لیکن یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل ہوا۔ اطباء جانتے ہیں کہ اشیاء کی تاثیر دو طرح پر ہوتی ہے کوئی شے مؤثر بالکیف ہوتی ہے اور کوئی شے مؤثر بالخاصیت بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ تمام اشیاء مؤثر بالخاصیت ہی ہیں کیونکہ اگر مؤثر بالکیف ہوتیں۔ تو ایک ہی درجہ کی تمام اشیاء ایک ہی اثر کرتیں یعنی جو اشیاء پہلے درجہ میں گرم ہیں ان سب کا ایک ہی کا اثر ہونا چاہیے تھا اور جو دوسرے درجہ میں سرد ہیں ان سب کا بھی ایک اثر ہونا چاہیے اور جو اشیاء تیسرے درجہ میں خشک ہیں ان کا ایک اثر ہونا ہے اور جو چوتھے درجہ میں تر ہیں ان کا ایک اثر ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ایک ہی درجہ کی اشیاء اثر میں مختلف ہو جاتی ہیں تو معلوم ہوا کہ ان کی تاثیر بالخاصیت ہے اور یہ کوئی طب کے خلاف نہیں بلکہ یہ مسئلہ تو فلسفہ کا ہے اس میں کوئی امر خلاف لازم نہیں آتا سو ہم سے یہ سوال کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل۔ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم یہ کہیں کہ روزہ مؤثر بالکیفیت ہے اور اگر ہم مؤثر بالخاصیت کہیں تو یہ سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح جس قدر عبادات کے آثار بیان کئے گئے ہیں سب ان عبادات کے آثار بالخاصہ ہیں۔ لوگ رمضان سے پہلے کیسے ہی فسق و فجور میں مبتلا ہوں مگر رمضان میں ضرور کمی کر دیتے ہیں۔ نماز بھی پڑھ لیتے ہیں تلاوت بھی کرنے لگتے ہیں تو جتنی دیر ان عبادات میں لگے رہتے ہیں معاصی سے بچے رہتے ہیں۔ ایک جواب تو اس سوال کا یہ ہوا کہ معاصی سے بچنے میں روزہ کو کیا دخل؟ دوسرا جواب جس کی ایک تو مشہور تقریر ہے اور ایک حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے میرے قلب پر وارد کی ہے۔ مشہور تقریر تو یہ ہے جسے امام غزالی وغیرہ سب نے لکھا ہے کہ روزہ سے قوت بھیمہ گھٹ جاتی ہے کیونکہ لذات و شہوات کو چھوڑنا پڑتا ہے اور یہی چیزیں گناہ کا باعث تھیں۔ میرے قلب پر جو تقریر وارد ہوتی ہے وہ بالکل بے غبار ہے اور اس پر ایک غبار ہے وہ یہ ہے کہ شہوات اور لذات میں کیا کمی ہوئی ہم پوچھتے ہیں کہ رات کو پیٹ بھر کھانا بیوی سے مشغول ہونا جائز ہے یا ناجائز۔ اگر جائز ہے تو قوت بھیمہ کچھ بھی

نہیں گھٹی کیونکہ رات کو بہت سے لوگ اس قدر کھاتے ہیں کہ ایک دن کیا ڈیڑھ دن کی فرصت ہو جائے۔ اس تقریر پر تو روزہ کا نفع جب ہوتا کہ دن کی طرح رات کو بھی منہ بند ہوتا اور اگر ناجائز کھوتو نص کے خلاف لازم آتا ہے۔

سوال اس پر یہ غبار ہے جس کے لئے بڑے بڑے لوگوں کو ایک نئی اور بے دلیل بات کا قائل ہونا پڑا اور وہ یہ کہ رات کو بھی کم کھاوے کیونکہ اگر کمی نہ کی تو غایت صوم حاصل نہ ہوگی۔ بظاہر یہ توجیہ رنگین اور اقرب ہے مگر حقیقت میں البعد ہے کیونکہ سوال یہ ہے کہ کہیں روزہ میں تقلیل طعام کی ترغیب دی گئی ہے یا نہیں اگر دی گئی ہے تو کہاں ہے ہم نے تو باوجود یہ کہ بہت تلاش کیا کہیں نہ پایا بلکہ پایا تو اس کے خلاف **كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَبَيِّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ الْخِ** (کھاؤ پو بھی اس وقت تک کہ تم کو سفید خط یعنی نور صبح (صادق) سے متمیز ہو جاوے) اور جن احادیث میں تقلیل طعام کی فضیلت آئی ہے وہ عام ہے اور روزہ کے ساتھ اس کی تخصیص نہیں ہو سکتی۔ سوال تو یہ ہے کہ روزہ کے اندر تقلیل طعام کی خصوصیت کے ساتھ کیا دلیل ہے لامحالہ کہنا پڑے گا کہ نص میں ترغیب نہیں دی گئی۔

یہ البتہ صواب معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ مشاہدہ بھی ہے کہ باوجود شب کو توسع ہونے کے آخر رمضان میں کس قدر ضعف ہو جاتا ہے اور اسی پر عاجز عن النکاح (نکاح سے عاجز) کے لئے صوم کا معالجہ تجویز فرمایا گیا ہے پھر اس پر اس کا قائل ہونا پڑے گا کہ رمضان میں رات کو کم کھاوے ورنہ غایت حاصل نہ ہوگی بلکہ اس کا قائل ہونا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

دوسری تقریر حق تعالیٰ نے انہیں حضرات کی برکت سے میرے قلب پر وارد کی ہے اس میں ایک دوسرا معنی بھی ہے کہ صوم کو گناہوں سے بچنے میں دخل اور طرح سے بھی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح شرک و کفر سے بچانے کے لئے جا بجا عذاب کا ذکر ہے مگر اس شرک و کفر سے بچنے میں وقوع عذاب کو دخل نہیں۔ تصور عذاب کو دخل ہے کہ یہ سوچنا کہ عذاب ایسا ہوگا سبب بن جاتا ہے ترک کفر و شرک کا اسی طرح تصور حقیقت صوم کو بھی معاصی سے بچنے میں دخل ہے مشہور تقریر کا حاصل تو یہ تھا کہ صوم ایسی ہیئت ہے کہ اس کا وقوع معاصی سے روکتا ہے اور اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ صوم ایک ایسی شے ہے کہ جس کی ہیئت کا تصور معاصی سے روکتا ہے کسی کو عقل سلیم ہو تو روزہ کی حقیقت میں غور کرے کہ کیا ہے۔ روزہ کی حقیقت ہے نہ کھانا نہ پینا بیوی سے مشغول نہ ہونا اس سے یہ سمجھے گا کہ یہ چیزیں حلال تھیں۔ جب یہ حرام کر دی گئیں تو جو چیزیں پہلے سے حرام ہیں ان کا کیا درجہ ہوگا۔ پھر یہ خیال کرے گا کہ غیرت کی بات ہے کہ جو چیزیں حلال تھیں انہیں چھوڑ دیں اور حرام میں مبتلا ہوں۔ (روح الصیام) **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** (شاید تم متقی ہو جاؤ)

شہانہ محاورہ

یہ بھی شہانہ محاورہ ہے بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ وہ انہی لفظوں کے ساتھ وعدہ لیا کرتے ہیں کہ امیدوار باشید (امیدوار ہو) اور یہ لفظ ان کے کلام میں دوسروں کی قسموں سے زیادہ مؤکد ہے پس ایک بات آخرت کی یہ قابل رغبت ہے کہ اس کی طلب بے کار نہیں جاتی بلکہ ثمرہ ضرور مرتب ہوتا ہے بخلاف دنیا کے کہ وہاں اس کا وعدہ نہیں پھر یہ کہ طالب آخرت کو طلب سے زیادہ ملتا ہے چنانچہ ایک عمل کا دس گنا ثواب تو ہر شخص کے لئے مقرر ہے۔ **مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتَارِهَا** (جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس حصے ملیں گے) اور بعضوں کو سات سو گنا بھی ملے گا جیسا کہ اس آیت میں ہے **كُلُّ حَبْتَةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَةً سِنَانٍ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ قِيَاةٌ حَبْتَةٍ** (جیسے ایک دانہ کی حالت جس سے سات بالیں جمیں

ہر بالی کے اندر سودا نہ ہوں) پھر اس پر بس نہیں بلکہ دوسری جگہ ارشاد ہے **فِيضِعْفَهُ لَئِنْ أَضْعَافًا كَثِيرَةً** (اس کو اس کی افزونی عطا کریں گے کثرت سے افزونی عطا کرنا) اب تو کچھ حد ہی نہ رہی کیونکہ دوسری آیت کا نزول اس وقت ہوا ہے جب پہلی آیت کے نزول پر حضور اقدس ﷺ نے دعا مانگی تھی۔ اللہم زدنی (کذا اذکر فی التفسیر المظہری من عدة كتب الحديث) (اے اللہ مجھے زیادہ عنایت کیجئے اس کو تفسیر مظہری میں حدیث کی متعدد کتابوں سے ذکر کیا ہے) تو یقیناً اس میں پہلی آیت سے زیادہ ہی تضاعف ہے اور مفسرین نے اس کے ہر ضعف کو سات سو کہا ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کثرت کثیرہ میں تو شبہ ہی نہیں وہ تو مخصوص ہے اور حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ کے راستے میں ایک چھوڑا کوئی دے تو حق تعالیٰ اس کو یہاں تک بڑھاتے ہیں کہ احد پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے اس سے تو اور بھی حد بڑھ گئی کیونکہ چھوڑا کے برابر احد پہاڑ کے اجزا کرنے بیٹھو تو اجزا کرنے ہی میں سو دو سو برس لگ جائیں گے گویا اتنا بے حساب ملے گا کہ بعض جاہل لوگ تو اتنی جزا کو سن کر ہی گھبرا گئے چنانچہ ایک جاہل آریہ نے لکھا ہے کہ جزا کا جو قاعدہ مسلمانوں میں ہے وہ ٹھیک نہیں کیونکہ ہمارے اعمال تو محدود ہیں ان پر جزائے غیر محدود کا مرتب ہونا ایسا ہے جیسا کہ پاؤ بھر غذا والے کو پچاس من کھلا دیا جائے تو وہ مر جائے گا پس محدود کو جزائے غیر محدود کی طاقت کہاں۔ اس جہالت کی بات کا جواب ظاہر ہے کہ پاؤ بھر کی غذا والا پچاس من کھلانے سے اس وقت مرے گا جب اسکو ایک وقت میں ایک دم سے کھلا دیا جائے اور اگر جزائے غیر محدود کے ساتھ عمر بھی غیر محدود ہو اور عمر غیر محدود میں غذا کھلائی جائے تو بتلائیے اس میں کیا اشکال ہے اس جاہل نے جزا کو تو غیر محدود رکھا اور عمر کو محدود لے لیا اور خواہ مخواہ اعتراض کر دیا یہ نہ دیکھا کہ مسلمان عمر دار الجزاء کو بھی غیر محدود کہتے ہیں۔

تقویٰ دواماً مطلوب ہے

اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ کے عامل میں گفتگو ہوئی ہے کہ کیا ہے مفسرین نے ایک صومو مقدر نکال کر اس کا معمول بنایا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ تقون کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تقویٰ تو دواماً مطلوب ہے وایاماً کا عامل کیسے ہو سکتا ہے لیکن اس تقریر سے ان کا تقون سے معمول ہونا سمجھ میں آ گیا ہوگا مطلب یہ ہوگا کہ چند روز متقی بن جاؤ یہ تم کو دائمی متقی بنا دے گا۔ باقی بات کہ یہ تفسیر کسی نے کی نہیں سو یہ کوئی بات نہیں۔ قواعد شرعیہ و عربیہ کی موافقت کے بعد نقل خاص کی ضرورت نہیں۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ترجمہ: پھر جو کوئی تم سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو

دوسرے ایام کا شمار رکھنا ہے

یعنی مسافر اور مریض کے لئے ارشاد ہے کہ روزہ افطار کر لینا جائز ہے **وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِدْيَةَ طَعَامٍ مِّنْ سَائِبِ** یہ شیخ فانی کا حکم ہے یعنی اس کے لئے روزہ کا فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا دو وقت کا شکم سیر کر کے اور اگر کوئی زیادہ دے دے اپنی خوشی سے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ گو بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان تصوموا خیر لکم و علی الذین یطیقونہ سے متعلق ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں۔ ظاہر اتو تینوں ہی کے متعلق ہے یعنی مسافر مریض اور شیخ فانی ان تینوں کے لئے روزہ رکھ لینا بہتر ہے مگر دوسرے دلائل کی وجہ سے اس حکم میں قید یہ ہے کہ ٹھل ہو۔ یعنی اگر ٹھل ہو تو روزہ رکھ لینا اچھا ہے تو ان تصوموا خیر لکم سے مسافر کے لئے بھی روزہ رکھنا افضل ہو اور اگر قرآن کو اس بارہ میں نص نہ کہا جائے کیونکہ بعض کے نزدیک اس کا تعلق شیخ فانی کے ساتھ محتمل ہے اور اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال مگر حدیثیں تو صریح ہیں۔ چنانچہ

صحابہؓ نے حضور ﷺ کے ہمراہ سفر میں روزہ رکھا اور حضور ﷺ نے انکار نہیں فرمایا اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جیسا جائز ہے ویسا ہی افضل بھی ہے بہر حال سفر میں روزہ رکھنا ہی افضل ہوا (شرائط الطاعت)

اس زمانے میں ایک قرآن شریف کا ترجمہ طبع ہوا ہے اس میں:

وعلى الذين يطيونه فدية. جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے نہ ہوں ان کے ذمہ فدیہ ہے۔

کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دے دے اس سے لوگوں کی جرات بڑھ گئی اور بجائے روزہ

کے فدیہ کو کافی سمجھ لیا۔

یاد رکھو کہ یہ تفسیر اس آیات کی بانگ غلط ہے اور وجہ یہ ہے کہ یہ ترجمہ کرنے والا ہی علوم سے بالکل جاہل ہے اس

لئے کہ مولوی تو مولا والا ہے اور نفس علم کی دج سے اگر کوئی مولوی ہو جائے تو شیطان بڑا علم ہے بلکہ معلم المملکت و فرشتوں

کا استاد مشہور ہے۔ خدا جانے یہ کہاں کی روایت ہے کسی بزرگ کے کلام میں ہو تو اس کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ علوم میں

فرشتوں سے زیادہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ فرشتوں کو میاں جی کی طرح پڑھایا کرتے تھے اور شیطان کا علم میں زیادہ ہونا اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولویوں کو بہکاتا ہے مولوی کو وہی شخص بہکا سکتا ہے جو اس سے زیادہ علم رکھتا ہو دیکھئے اگر وکلاء کو

کوئی دھوکا دے تو وہ وکالت ذاتی میں اس سے زیادہ ہوگا۔ جب مولویوں کو بھی دھوکا دیتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مولویوں سے

زیادہ علم رکھتا ہے مگر صابو! علم تو اور ہی شے ہے علم وہ ہے جس کی نسبت فرماتے ہیں

علم چه بود آنکہ بنمیدت زنگ گمراهی زول بزود ایدت

توندانی جز بجز لا بجز خود ندانی تو کہ حوری یا نبوز

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ

الهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ

مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ

بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور واضح

الدلائل ہے مجملہ ان کتب کے جو کہ ہدایت ہیں اور فیصلہ کرنے والی ہیں سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس

میں روزہ رکھنا چاہیے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا

منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ شمار کی تکمیل کر لیا کرو اور تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان

کیا کرو۔ اس پر کہ تم کو طریقہ بتلادیا اور تاکہ تم لوگ شکر ادا کیا کرو۔

تفسیری نکات

احکام عشرہ اخیرہ رمضان

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس آیت میں خدا تعالیٰ نے رمضان کی ایک فضیلت کا بیان فرمایا ہے اس آیت سے بظاہر عشرہ اخیرہ کے مضمون کو کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن غور کیا جائے تو عشرہ اخیرہ سے اس آیت کا تعلق معلوم ہو جاوے گا خدا تعالیٰ نے اس آیت میں رمضان کی جو فضیلت بیان کی ہے اسی فضیلت میں غور کرنے سے معلوم ہو جاوے گا کہ وہ فضیلت عشرہ اخیرہ کے لئے بدرجہ اولیٰ قائم ثابت ہے فرماتے ہیں کہ ماہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں ہم نے قرآن نازل کیا ایسا اور ایسا ہے سو اس آیت سے اس قدر معلوم ہوا کہ قرآن کا نزول ماہ رمضان میں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ رمضان میں دن کے زمانہ کا نام ہے اور اس آیت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس طویل زمانہ کے کس جزو میں نزول ہوا ہے لیکن اگر ہم اس کے ساتھ دوسری آیت کو بھی ملا لیں تو دونوں کے مجموعہ سے تعین وقت بھی ہم کو معلوم ہو جاوے گی سو دوسری آیت فرماتے ہیں **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ** پس ان دونوں آیتوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن مجید کا نزول ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔ رہا یہ شبہ کہ ممکن ہے کہ شب قدر رمضان میں نہ ہو تو اس صورت میں دوسری آیت کا ضم مفید نہ ہوگا سو اس کا جواب یہ کہ اول تو شب قدر کا رمضان میں ہونا حدیث میں موجود ہے اس سے قطع نظر اگر ہم ذرا فہم سے کام لیں ان دونوں آیتوں سے ہی معلوم ہو جاوے گا کہ شب قدر رمضان ہی میں ہے اس لئے کلام مجید کا نزول دو طرح ہوا ہے ایک نزول تدریجی جو کہ ۲۳ برس میں حسب ضرورت نازل ہوتا رہا اور جس کا ثبوت علاوہ کتب سیر کے خود کلام مجید سے ہوتا ہے۔ **لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْكَ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا** کہ یہ آیت مشرکین و نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد ﷺ نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب دفعہ پوری کی پوری آسمان سے کیوں نہیں دی گئی جس طرح موسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام کو دی گئی تھی خدا تعالیٰ کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں **كَذَلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ** جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج نازل کر کے اس لئے نازل کیا اس تدریج کے ذریعے سے آپ کے دل کو مثبت اور اس کو محفوظ کرنے اور سمجھ لینا آسان ہو جائے واقعی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر مثبت فواد اور ضبط و فہم بتدریج نازل کرنے میں ہو سکتا ہے نزول ذہنی میں نہیں ہو سکتا (احکام العشر الاخیرہ)

قرآن شریف لوگوں کے لئے بہت بڑی ہدایت ہے

اس آیت میں (ہدی للناس) میں توین تعظیم کی ہے یعنی بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور دلائل واضح ہیں یہ عطف تفسیری ہے من الہدیٰ من من تبعیہ اور الف لام جنس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن بڑی ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور دلائل واضح ہیں ان شرائع سماویہ میں سے جن کی شان ہدایت ہے یعنی شرائع سماویہ تو متعدد ہیں ان سے ایک قرآن بھی ہے اب من کا تبعیہ ہونا واضح ہو گیا اور یہ تخصیص بعد تعمیم ہے یوں تو تمام کتب سماویہ اور تمام شرائع کی شان ہدایت ہے مگر اس تخصیص سے قرآن کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے اور فرقان بوازم ہدیٰ سے ہے کیونکہ وضوح حقیقت کے بعد امتیاز بین الحق والباطل لازم ہے یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ موقع تو ہے رمضان کی فضیلت بیان کرنے کا چنانچہ اوپر سے صوم ہی کا ذکر چلا آ رہا ہے

اور بیان کی گئی قرآن کی فضیلت اس کی کیا وجہ ہے جواب یہ ہے کہ فضیلت بیان کرنے کی دو صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک تو یہ کہ خود اس چیز کی فضیلت بیان کریں اور ایک یہ فضیلت تو بیان کریں دوسرے شے کی اور اس کی فضیلت اس سے لازم آ جاوے اور یہ احسن طریق ہے کیونکہ اس میں دعوے کے ساتھ دلیل بھی ہے اسی کو کہتے ہیں۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگران

مثلاً ہم کو حضرت حاجی صاحب کی فضیلت بیان کرنا ہو تو اس کا ایک طریق تو یہ ہے کہ خود ان کی فضیلت بیان کریں اور دوسرا طریق یہ ہے کہ یوں کہیں کہ حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا گنگوہی جیسے شخص ہیں اور یہ احسن طریقہ ہے پس اسی طریق رمضان کی فضیلت اس طرح لازم آگئی کہ ماہ رمضان وہ ہے جس میں ایسا ایسا کلام نازل ہوا ہے جس ماہ کو اتنی بڑی چیز سے ملا بست ہوگی تو وہ ماہ کتنی فضیلت رکھتا ہوگا ظاہر ہے کہ بڑی فضیلت والا ماہ ہوگا۔

اہتمام تلاوة

اب ماہ رمضان میں نزول قرآن سے برکت ہونے کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ برکت اس کو قرآن کے نازل ہونے سے حاصل ہوئی ایک یہ کہ برکت اس ماہ میں پہلے سے تھی اور قرآن کے نازل ہونے سے یہ ماہ نور علی نور ہو گیا ہو۔ اسی کے مناسب نعت کا یہ شعر ہے

نبی خود نور اور قرآن ملا نور نہ ہو پھر ملے کیوں نور علی نور

اسی طرح عیاں ہوگا کہ رمضان خود نور پھر قرآن دوسرا نور ملکر نور علی نور یُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِيُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِيُتُكِّرُوا وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَيْتُمْ لَكُمُ تَشْكُرُونَ (البقرہ آیت)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظر ہے اور تمہارے ساتھ (احکام و قوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں اور تاکہ تم لوگ ایام ادا یا قضا کی تکمیل شمار کرو اور تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بزرگی (شنا) بیان کیا کرو اس پر کہ (تم کو ایک ایسا طریقہ بتلا دیا جس سے تم برکات اور ثمرات صیام سے محروم نہ ہو گے) اور تاکہ تم شکر کرو۔

مجاہدہ میں آسانیاں اور سہولتیں

بعض مجاہد ایسے ہیں کہ گوشت، گھی، میوہ جات نہیں کھاتے اور جب یہ نعمتیں ان کو میسر نہ ہوں گی تو شکر بھی حق تعالیٰ کا ان پر نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کا جواب اور مجاہدات ارشاد شدہ کی شان اس آیت میں بیان فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے یُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت کا ارادہ فرماتے ہیں اور تم پر سختی کا ارادہ نہیں کرتے۔ یہ ابطال اس کوتاہی کا کہ ان کے مجاہدات میں دشواری ہی دشواری ہے۔ یہاں تو یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ جن مجاہدات کی تعلیم کی گئی ہے وہ سب نہایت لطیف اور ہماری طبیعت اور مذاق کے موافق اور نفع میں سب مجاہدوں سے بڑھ کر ہیں آگے ارشاد ہے وَلِيُكْمِلُوا الْعِدَّةَ اور تاکہ تم شمار کو پورا کر لو یہ اس کوتاہی کا ابطال ہے کہ ان کے مجاہدہ کا کہیں خاتمہ ہی نہیں اور نہ اس میں اکمال ہے۔ یہاں اختتام بھی ہے اور اکمال بھی۔ ایک کوتاہی یہ تھی کہ مجاہدہ کر کے ناز ہوتا تھا اور یہ اس طریق میں سخت مضر ہے اس کو دفع فرماتے ہیں وَلِيُتُكِّرُوا وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَيْتُمْ لَكُمُ تَشْكُرُونَ یعنی تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ یعنی اور تاکہ تم شکر کرو۔ یہ اس کوتاہی کی تکمیل ہے کہ ان کے مجاہدہ کے اختیار کرنے

میں نعم اور لذات سے محرومی تھی تو نعمتوں کا شکر بھی ادا نہ ہوتا تھا اللہ تعالیٰ نے ایسی آسانی فرمائی کہ خوب سب کچھ کھاؤ پیو اور شکرو۔ بعض مفسرین نے لَيْشْكُرُوا لِلَّهِ عَلَىٰ مَا هَدَانَا لَهُ سے تکبیرات عیدین مراد لی ہیں یعنی روزوں کے شمار کو پورا کرنے کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر عید کی نماز میں کہو۔ میں نے اس کو اختیار نہیں کیا اس لئے کہ میرا ذوق اس سے آبی ہے اس لئے میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو اختیار نہیں کیا لیکن اس سے بھی میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے یہ تو اجمالاً اس آیت کا حاصل ہے اب میں تفصیلاً اس کی شرح کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اللہ تمہاری آسانی چاہتے ہیں منجملہ آسانیوں کے ایک آسانی تو یہ ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرمادیا اور خود عین مجاہدہ کے وقت بہت آسانیاں ہیں چنانچہ اعتکاف میں یہ سہولت فرمائی کہ مسجد میں اس کو مشروع فرمایا تا کہ خلوت در انجمن کا مضمون ہو جائے۔ اعتکاف سے آدمی اس کا خوگر ہو جاتا ہے سب سے الگ ایک گوشہ میں بیٹھے ہیں اور سب کے ساتھ شریک بھی ہیں۔

از بروں شو آشنادہ از روں بیگارش ایں چنین زیباروش کم می بود اندر جہاں

عجب کی مذمت

آگے ارشاد ہے وَلَيْشْكُرُوا لِلَّهِ عَلَىٰ مَا هَدَانَا لَهُ یہ ابطال ہے اس کمی کا جو اہل مجاہدہ کو بعض اوقات مجاہدہ سے پیش آ جاتی ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شدت مجاہدہ سے بعض اہل مجاہدہ کو عجب پیدا ہو جاتا ہے اور مجاہدہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں یہ بڑی شے ہے اور یہ بہت بڑا مرض ہے اپنے کو یہ شخص مستحق ثمرات سمجھتا ہے اور جب وہ ثمرات نہیں حاصل ہوتے تو دل میں حق تعالیٰ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور جانتا ہے کہ جو کچھ میرے ذمہ ہے وہ میں ادا کرتا ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے وہ (نعوذ باللہ) ادا نہیں فرماتے حالانکہ کام مقصود ہے ثمرات مقصود نہیں ہیں۔ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہمارے حضرت ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے

یا بم اور ایانیا بم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نہ آید آرزوئے میکنم

(میں اسے پاؤں یا نہ پاؤں مگر اس کی جستجو کرتا رہتا ہوں مقصود حاصل ہو یا نہ ہو آرزو کرتا رہتا ہوں)

مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک ذاکر تھے ہمیشہ رات کو اٹھ کر نماز پڑھتے ذکر کرتے ایک مدت گزر گئی ایک شیطان نے بہکایا جی میں آیا کہ اتنے دن ہو گئے اللہ کا نام لیتے ہوئے نہ ادھر سے سلام ہے نہ پیام ہے۔ یہ محنت ہماری اکارت ہی گئی یہ سوچ کر سو رہا خواب میں حکم ہوا۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ویں نیاز و سوز و دردت لبیک ماست

(اس نے کہا کہ اے اللہ ہماری لبیک تیرے لئے ہے اور یہ عاجزی اور سوز و درد ہمارے تیرے لئے ہیں)

کہ جب حق تعالیٰ کی بڑائی پیش نظر ہوگی تو اپنے اعمال اور خود اپنی ذات لاشئ نظر آوے گی اور بجائے عجب کے شکر کرے گا۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ اور جیسے دل سے بڑائی کی تعلیم ہے اسی طرح زبان سے بھی سکھلائی گئی ہے کہ عید کے راستہ میں اللہ اکبر اللہ اکبر زبان سے کہتے جائیں اور نیز پانچوں وقت کی نماز میں بھی اسی واسطے حکم فرمایا اللہ اکبر زبان سے کہیں اور اسی کی نظر ہے نماز کی نیت کہ اصل نیت تو دل سے ہے لیکن زبان سے کہنا بھی فقہاء نے مشروع فرمایا ہے۔ الحاصل یہ بڑی رحمت ہے کہ مجاہدہ کو ختم فرمادیا۔ اور جو لبی حکم فرمایا کہ عید کے دن ضرور کھاؤ پیو۔ دیکھئے اس میں ہماری مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے جیسے جمعہ کے بارہ میں ارشاد فرمایا وَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ

فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ یعنی جب نماز ادا کر لی جاوے تو زمین میں متفرق ہو جاؤ ہم لوگ خود ایسے تھے کہ نماز کے بعد خود ہی بھاگتے لیکن حکم بھی فرما دیا۔ اس میں بھی مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے اور یہی وجہ تشبیہ ہے گو یہ حکم وجوبی نہیں اور نیز ایسے دلدادہ بھی تھے جو مسجد ہی میں رہ جاتے ہیں بقول امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

خسرو غریب ست اس گدا افتاد در کوائے شما باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بگری

(خسرو غریب ایسا فقیر ہے جو تیری گلی میں پڑا ہوا ہے پس اب تجھ کو چاہیے کہ خدا کے واسطے غریبوں کی طرف نظر کرے) ان کے لئے بھی انتشار فی الارض کو مصلحت سمجھا اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک کام سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور نیز طبائع اکثر ضعیف ہیں جب زیادہ پابندی ہوتی ہے اور اس سے حرج معاش ہوتا ہے اور حاجت ستاتی ہے تو ساری محبت رکھی رہ جاتی ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ یعنی زمین میں متفرق ہو جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق طلب کرو علاوہ اس کے اس میں ایک تمدنی و سیاسی مصلحت بھی ہے جس کو میں نے ایک مرتبہ کراچی میں وعظ کے اندر بیان کیا تھا اس طرح سے کہ تمدن کے مسائل جیسے قرآن مجید سے ثابت ہوتے ہیں ایسے دوسری جگہ سے نہیں ہوتے چنانچہ اس آیت سے بھی ایک مسئلہ مستنبط ہوا کہ بلا ضرورت اجتماع نہ ہونا چاہیے اگر بضرورت ہو تو رفع ضرورت کے بعد فوراً منتشر ہو جانا چاہیے۔ یہی وہ مضمون ہے جو تمام اہل سیاست پائے ہوئے ہیں کہ ناجائز مجمع کو منتشر کر دیا جائے قرآن مجید میں اس مجمع کے ناجائز بننے سے پہلے یہ محض اس احتمال پر کہ اب ان کو کوئی کام تو رہا نہیں یہ ناجائز مجمع نہ بن جاوے سب کو منتشر کر دیا گیا۔ اس وعظ میں ایک بڑا عالی مرتبہ انگریز بھی تھا اس نے بعد وعظ کے مسرت ظاہر کی۔ الحاصل مجاہدہ کو ختم کر کے کھانے پینے اور عید گاہ میں جانے اور خوشی منانے کی اجازت دی اور اس میں بھی یہ نہیں کہ کوئی لہو و لعب ہو بلکہ اس دن میں ایک خاص عبادت مقرر فرمائی اور اس کا طرز علیحدہ رکھا کہ شہر سے باہر صحرا میں جائیں اور اچھے اچھے کپڑے پہنیں اور وہاں نماز پڑھیں اور اس نماز کا طریقہ بھی جدا گانہ رکھا اور نمازوں سے اس میں چھ مرتبہ اللہ اکبر اللہ اکبر زیادہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جوش مسرت میں موحداور خدا پرست کی زبان سے اللہ اکبر ہی نکلا کرتا ہے غرض ہماری فرحت بھی ایسی ہے کہ اس میں بھی عبادت ہے اور مشقت میں بھی راحت ہے بخلاف اور قوموں کے کہ ان کے یہاں خوشی کے دن لہو و لعب اور بعض قوموں میں فسق و فجور تک ہے اور اس دن میں ایک طریق ادائے شکر اور اظہار خوشی کے کا یہ مقرر فرمایا کہ اغنیاء پر صدقہ فطر مقرر فرمایا اس لئے کہ حق تعالیٰ نے جو نعمت ہم پر فائز فرمائی کہ روزے ہم سے ادا ہو گئے اس کا شکر یہ ہے کہ اپنے بھوکے ہونے کو یاد کر کے اپنے بھوکے مسلمان بھائی کی امداد کریں اور کم از کم دو وقت کی کفایت کے لئے اس کو کھانا دیدیں اور نیز اس میں اپنی خوشی کی تکمیل بھی ہے اس لئے کہ مجمع میں اگر ایک شخص بھی کبیدہ ہوتا ہے تو اس کا اثر سب پر ہوتا ہے تو اغنیاء پر صدقہ فطر مقرر فرمادیا تاکہ سب مسلمان بھائی آج سیر اور خوش نظر آویں اور خوشی کی تکمیل ہو جائے ورنہ اپنے بھائی کو افسردہ دیکھ کر دل پھٹ جاتا ہے غرض اس میں ادائے شکر بھی اور فرحت کی تکمیل بھی اور اس کے ساتھ معنی صدقہ کی بھی اس لئے کہ غیر صالحین اور صبیان کی طرف سے

بھی ادا کیا جاتا ہے۔ بہر حال رمضان کا تمام مہینہ تو مجاہدہ کا وقت ہے اور عید اس کا اختتام ہے اور اس اختتام یعنی عید اور مقصود یعنی مجاہدہ رمضان میں چند امور مشترک ہیں وہ یہ ہیں کہ رمضان المبارک میں بعض عبادتیں فرض ہیں بعض نفل ہیں مثلاً روزہ رکھنا فرض ہے اور تراویح و اعتکاف مسنون ہیں عید کے دن میں بھی بعض عبادتیں واجب ہیں بعض مستحب ہیں۔ عید کی نماز واجب ہے صدقہ فطر واجب ہے اور غسل کرنا، عطر لگانا اور اچھے کپڑے پہننا مستحب ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ اس جملہ میں ایک عجیب بات غور کرنے کی ہے وہ یہ کہ اس میں واؤ عطف کا ہے اور لام غایت کا ہے واؤ عطف معطوف علیہ کو چاہتا ہے اور لام غایت عامل کو چاہتا ہے پس یہاں دو تقدیریں ہیں ایک لِكْمِلُوا الْعِدَّةَ کا عامل دوسرا اس عامل کا معطوف علیہ پس عامل یہ ہے یسر بکم جو یرید اللہ بکم الیسر سے مفہوم ہوتا ہے اور معطوف علیہ یہ ہے کہ شرع لکم الاحکام المذكورة جو اوپر کی آیتوں سے مفہوم ہے مشہور توجیہ یہی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے روزہ کو مشروع کیا اور اس کے احکام میں سہولت کی رعایت کی تاکہ تم ایک مہینہ کی شمار پوری کر لو کیونکہ اس شمار کے پورا کرنے میں تمہارے واسطے منافع ہیں اس سے یہ لازم آیا کہ اکمال عدت مقصود ہے کیونکہ اس پر لام غایت داخل ہوا ہے اور ہر کام میں غایت زیادہ ^{مط} نظر ہوتی ہے کیونکہ وہ مقصود ہے مگر اس تقدیر مشہور میں صرف اکمال عدت کی مقصودیت ثابت ہوئی۔ یسر کی مقصودیت ثابت نہ ہوئی حالانکہ ظاہر اثبات یسر زیادہ مہتمم بالشان معلوم ہوتا ہے اس لئے دوسری توجیہ یہ ہے کہ یرید اللہ بکم الیسر کو قوت میں اسی جملہ کے کیا جاوے کہ یرید بکم الیسر اور اس کا عامل شرع بکم الاحکام کو کہا جاوے پس کلام کا حاصل یہ ہوگا کہ شرع اللہ لکم ما ذکر لیرید بکم الیسر ولیرفع عنکم العسرو لتکملوا العدة کہ اللہ نے روزہ کے احکام مذکورہ کو اس لئے مشروع کیا کہ وہ تم کو آسانی دینا اور تنگی رفع کرنا چاہتے ہیں اور اس لئے مشروع کیا تاکہ تم شعار کو پورا کر لو۔ اس صورت میں دو مقصود ہوئے ایک یسر کہ اول مذکور ہونے کے سبب اصلی مقصود اور دوسرا اکمال عدت کہ تاخر فی الذکر دوسرے درجہ میں مقصود ہوا کیونکہ عادت یہی ہے کہ اگر کوئی عارض نہ ہو تو اہم کو ذکر میں مقدم رکھتے ہیں پس آسانی اسی توجیہ پر غایت درجہ کی آیت کی مدلول ہوگی کیونکہ مدخول لام ہونے کے سبب وہ خود بھی مقصود ہوگی اگرچہ ثواب و قرب و رضا مقصود ہے مگر آسانی بھی فی نفسہ مقصود ہوگی اس تقدیر پر صرف عامل مقدر ہوگا باقی معطوف علیہ ظاہر ہوگا اس لئے یہی اولیٰ ہے اور ہر حال میں یسر ثابت ہے اب اس ثبات یسر پر جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان کو بیان کرتا ہوں اول یہ کہ بے روزوں کو شرم کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تو صاف وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزوں میں تم کو آسانی دینا چاہتے ہیں تنگی کو رفع کرنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ روزہ میں دشواری ظاہر کر کے نا حقیقت شناس مخالفین کو فرمان خداوندی پر ظاہراً اعتراض کا موقع دیتے ہیں ارے ظالمو تم نے روزہ رکھ کر تو دیکھا ہوتا اس کے بعد ہی اس کو دشوار کہا ہوتا سب سے اول تو روزہ میں روحانی یسر آپ کو عطا ہوتا ہے اس سے دلچسپی ہو جاتی پھر جسمانی یسر بھی حاصل ہوتا غرض اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں کہ ہم روزہ کو آسان کر دیں گے اور مراد کا ارادہ آہہ سے تخلف ہو نہیں سکتا تو یہ مراد یقیناً متحقق ہوگی چنانچہ مشاہد ہے کانپور میں ایک شخص نے چالیس سال

تک روزہ نہیں رکھا تھا میں نے ان سے کہا کہ یہ تو بہت آسان چیز ہے تم رکھ کر تو دیکھو پھر چاہے رکھنے کے بعد درمیان میں دشواری معلوم ہوگی توڑ دینا۔ انہوں نے رکھا اور روزہ پورا ہو گیا تو بعد میں اقرار کیا کہ واقعی بہت آسان چیز ہے پھر رکھنے لگے یہ روزہ کی خاصیت ہے کہ اس میں ترک طعام و شرب آسان ہو جاتا ہے اگر کوئی بدوں نیت صوم کے دن بھر بھوکا پیاسا رہنا چاہے تو بہت دشوار ہے مگر نیت کے بعد آسان ہو جاتا ہے ان دونوں صورتوں میں وجہ فرق صرف یہی ہے کہ پہلی صورت میں صوم نہیں اور دوسری صورت میں صوم ہے۔

روزہ کو مشروع فرمانے کے مصالح

حاصل آیت کا یہ ہوا شرع اللہ لکم الصوم للیسروا اکمال العدة ولتکبروا اللہ علی ماہد کم جس میں متعدد غایات ہیں اور ایک غایت پر دوسری غایت مرتب چلی آتی ہے۔ اس میں خدا تعالیٰ کی ایک نعمت تو یہ ہے کہ روزہ کو مشروع کیا ورنہ ہم کیسے رکھتے دوسرے یہ کہ اس کو آسان کر دیا تیسرے یہ کہ احکام میں ایسی رعایت فرمائی جس سے شمار کا پورا کرنا آسان ہو گیا اس کے بعد خدا تعالیٰ کی عظمت دل میں آتی ہے تو اس پر خدا کی تکبیر کہو گے یہ چوتھی نعمت ہے اب اس کا دشوار ہونا ایسا ہے جیسا ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میاں لا الہ الا اللہ سے زیادہ کیا چیز آسان ہوگی مگر کفار کے لئے یہ سب سے زیادہ دشوار ہے تو اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں کو آسان ہے وہ خدا تعالیٰ کا فضل ہی ہے ورنہ ہم لوگ اپنی قوت سے کوئی کام نہیں کر سکتے جب تک اللہ تعالیٰ اس کو آسان نہ کر دیں۔ عوارف میں ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں ان کی زبان سے کوئی کلمہ ناگوار خلاف شرع نکل گیا تھا اس کے بعد وہ ولی ہوئے صاحب معرفت شیخ ہوئے مگر اس کلمہ کو کہنا یاد بھی نہ رہا اس سے خاص توبہ نہیں کی ایک دن لا الہ الا اللہ کہنے کا ارادہ کیا تو زبان سے کلمہ نہ نکلا اور سب باتیں کر سکتے تھے مگر لا الہ الا اللہ نہ کہہ سکتے تھے یہ حالت دیکھ کر لرز گئے جناب باری میں دعا کی یہ میرے کس گناہ کی سزا ہے مجھے بتلایا جائے الہام ہوا کہ فلاں زمانہ میں تم نے فلاں کلمہ کہا تھا اور اب تک اس سے استغفار نہیں کیا اس لئے آج اتنے برس کے بعد ہم نے اس کی سزا دی یہ فوراً سجدہ میں گر پڑے اور توبہ کی تو فوراً زبان کھل گئی۔ اسی واقعہ سے سمجھنا چاہیے کہ کبھی طاعت کی دشواری کا سبب دوسرے معاصی بھی ہو جاتے ہیں اس کا علاج توبہ و استغفار ہے کبھی دشوار کا سبب وحشت بھی ہوتی ہے کہ ذکر اللہ سے وحشت ہو وحشت کی وجہ سے اللہ نہ کہہ سکے آپ بہت لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ بہت وقت بیکار ضائع کرتے ہیں مگر ذکر اللہ کے لئے ان کی زبان نہیں اٹھتی اس کا سبب بھی وہی معصیت ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے دل کو ذکر اللہ سے وحشت ہے اسی کو ایک شاعر کہتا ہے

احب مناجاة الحبيب باوجه ولكن لسان المذنبین کلیل

اسی واسطے بے ضرورت گناہوں کو یاد کرنا اپنے ہاتھوں وحشت کا سامان کرنا ہے اسی کے متعلق شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ گناہ معاف ہو جانے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ گناہ دل سے مٹ جائے اور جب تک وہ مٹے گا نہیں قلب پر وحشت سوار رہے گی جو اس گناہ کی سزا ہے اسکی شرح میں مشائخ طریق کا ارشاد ہے کہ گناہ کے بعد جی بھر کے توبہ کر کے پھر

اس کو جان جان کر یاد نہ کرے اس سے بندہ اور خدا کے درمیان ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے جو محبت اور ترقی سے مانع ہے پس خوب سمجھ لو یہ تیسیر بھی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کو ہمارے لئے آسان کر دیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں **يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ** میں ہم کو اس نعمت پر متنبہ فرمایا ہے کہ یہ احکام اس واسطے مشروع کئے گئے ہیں کہ ان کو تمہارے واسطے آسان کر دیں اور گنتی پورا کرنے کی توفیق دیں پس تم اس کو دشوار نہ سمجھو اور نہ اس کی فکر کرو کہ تیس دن کیوں کر پورے ہوں گے اس کے بعد ارشاد ہے **وَلْيُكْفِّرُوا وَلْيُتَّقُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَيْتُمُ** یعنی اور تاکہ ان نعمتوں پر تم خدا کی بڑائی ظاہر کرو یہاں اللہ تعالیٰ نے ہداکم فرمایا ہے مشروع لکم نہیں فرمایا کیونکہ ہداکم سب نعمتوں کو شامل ہے تشریحی نعمتوں کو بھی اور تکوینی نعمتوں کو بھی اور یہاں دونوں قسم کی نعمتیں مذکور ہوتی ہیں کیونکہ تیسیر و اکمال عدة تکوینی نعمتیں ہیں تو ان سب نعمتوں پر جس کا میزان الكل ہداکم ہے خدا کی تکبیر کو پھر یہاں **لِتُحْمَدُوا** اللہ نہیں بلکہ **لِتُكْبَرُوا** اللہ فرمایا کیونکہ اس سے حادثہ کی وقت معلوم ہوتی ہے اور حادثہ عظیمہ پر ہمارے اندر تکبیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ حمد کا اور قرآن شریف میں ہماری محاورات و جذبات کی بہت رعایت کی گئی ہے۔

ہمارے جذبات کی رعایت

غرض اس مقام پر **لِتُكْفِّرُوا وَاللَّهُ** ہمارے جذبات کی رعایت سے فرمایا گیا ہے کہ یہ نعمتیں بڑی ہیں اور بڑی نعمت کو دیکھ کر ہم کو اللہ اکبر کا تقاضا ہوتا ہے نہ الحمد للہ کا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ کی ایسی رعایت فرمائی کہ تکبیر کو ہماری رائے پر نہیں چھوڑا بلکہ خود شروع کر کے دکھلا دیا چنانچہ عید کے روز تکبیر کہنا ضروری کر دیا نماز عید کی ہر رکعت میں تین تکبیریں زیادہ کہی جاتی ہیں یہ تو واجب ہیں راستہ میں بھی عید گاہ کو جاتے ہوئے تکبیر کہنا سنت ہے بعض آئمہ کے نزدیک جہرا اور ہمارے امام صاحب کے نزدیک سرا اور عجب نہیں کہ صلوٰۃ عید میں تین تکبیریں اس لئے ہوں کہ ایک بمقابلہ یسر کے ہے دوسری بمقابلہ رفع عسر کے تیسری بمقابلہ اکمال عدة کے اس کے بعد ارشاد ہے **وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ** اور یہ نعمتیں اس لئے تم کو عطا کیں تاکہ تم ان پر شکر کرو اور یہ عجیب نعمت کا بیان ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ یسر و عدم عسر و اکمال عدة و تکبیر ان سب پر شکر کرو اور شکر دوسری عبادت کے اعتبار سے تو ان عبادات کے متعلق ہے مگر فی نفسہ یہ خود بھی مستقل عبادت ہے اس لئے یہ خود بھی مطلوب اور مقصود ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی ایک غایت ہے جس کے لئے یسر و اکمال عدة وغیرہ ہم کو عطا کیا گیا۔

رابط آیات

پھر چونکہ منعم کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے نعمتوں کا استحضار ہو کر منعم کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور محبت کے بعد محبوب سے قرب کا تقاضا ہوتا ہے تو اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے قرب کو بیان فرماتے ہیں **وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ** اس تقریر سے تمام آیات و اجزاء آیات کا ربط بخوبی ظاہر ہو گیا اور جس طرح ان آیات کی تفسیر آج ذہن میں آئی ہے اس سے پہلے کبھی نہیں آئی آیت (وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي) کا ربط پہلی آیت سے مشہور یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو صوم اور تکبیر و شکر

وغیرہ کا امر کیا ہے تو ممکن ہے کسی کو یہ شبہ پیدا ہو کہ نہ معلوم خدا تعالیٰ کو ہمارے ان افعال کی خبر بھی ہوتی ہے یا نہیں خصوصاً شکر قلب کی کیونکہ افعال قلبیہ مستور ہوتے ہیں جن کی اطلاع دنیا میں تو کسی کو نہیں ہوتی اور چونکہ طبیعت انسانیہ قیاس الغائب علی الشاہد کی عادی ہے اس لئے بعض لوگوں نے سوال بھی کیا افریب ربنا فتاجیہ ام بعید فتادیہ کیا ہمارا پروردگار ہم سے قریب ہے کہ ہم اس سے خفیہ طور پر مناجات کر لیا کریں یا بعید ہے کہ پکارا کریں اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی یہ ربط بھی عمدہ ہے مگر ربط اول احسن ہے اور ربط مشہور پر اس آیت کا پہلی آیت سے متصل آنا امام ابوحنیفہؒ کے اس قول کی تائید کرتا ہے کہ تکبیر عید الفطر راستہ میں سراہونی چاہیے جہر کی ضرورت نہیں رہی تکبیر صلوٰۃ تو وہ چونکہ قراءت کے متصل ہے اور قراءت جہری ہے اس لئے اتصال جہری کی وجہ سے اس میں بھی جہر ہو گیا دوسرے اس میں جہر کی یہ بھی وجہ ہے کہ مقتدیوں کو اعلام کی ضرورت ہے کہ اس وقت تکبیر کہہ رہا ہے تو وہ بھی اس کی اقتدا کریں اور تکبیر طریق میں ہر شخص مستقل ہے وہاں اعلام کی ضرورت نہیں اور تکبیر تشریق کا جہر خلاف قیاس نص سے ثابت ہے۔ لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم الحج العج واثج و فی تکبیر التشریق تشبیہ تلبیۃ الحاج فافہم اور اذا سالک عبادی عن فانی قریب کی بلاغت عجیب قابل دید ہے کہ فقل انی قریب یا فانی قریب ہیں فرمایا بلکہ بلا واسطہ فانی قریب فرمایا ہے یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے سوال کرے کہ فلاں شخص کہاں ہے اور وہ بول پڑے کہ میں تو موجود ہوں اور یہ جب یہ ہوگا جبکہ عجیب کو مسائل کے ساتھ خاص تعلق ہو اور اگر خاص تعلق نہ ہو تو وہ قریب ہوتے ہوئے بھی خود نہ بولے گا بلکہ جن سے سوال کیا گیا ہے ان سے کہے گا کہ اس سے کہہ دو وہ یہاں موجود ہے اور تعلق کی صورت میں ایسا نہ کرے گا خود بول پڑے گا کہ میں تو موجود ہوں اسی طرح یہاں حق تعالیٰ نے خود بلا واسطہ جواب دیا کہ میں تو قریب ہوں حضور ﷺ سے نہیں فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ میں قریب ہوں اس میں جس خاص تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور وہ تعلق ایسی نعمت ہے کہ اس پر ہزار جانیں قربان کر دی جائیں تو تھوڑا ہے پھر اس جواب کا حضور کی زبان سے ادا ہونا بتلاتا ہے کہ رسول ﷺ کا بولنا خدا ہی کا بولنا ہے۔

گرچہ قرآن از لب پیغمبر است ہر کہ گوید حق تکلف او کا فر است

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

حضور ﷺ میں ایک شان تو مبلغ ہونے کی ہے اور دوسری شان لسان حق ہونے کی ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے لئے بمنزلہ لسان یعنی ترجمان کے ہیں اس عنوان سے گھبرائیں نہیں کیونکہ جب شجرہ طور لسان حق ہو گیا اور اس سے ندا آئی اِنِّیْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِیْ تو حضور ﷺ کا لسان حق ہونا تعجب خیز کیوں ہے پھر حدیث میں اہل قرب کے لئے آیا ہے کنت بصرہ الذی ببصرہ وسمعة الذی بسمع بہ ورجلہ الذی یمشی بہا اور ظاہر ہے کہ حضور ﷺ سے زیادہ مقرب کون ہوگا تو آپ کی یہ شان سب سے زیادہ ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے خلاصہ ان اجزاء مرتبہ کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو دیکھ کر خود بخود آپ کے دل پر شکر کا تقاضا ہوگا کہ آپ کی ہی مصلحت و نفع کے لئے صوم کو مشروع فرمایا پھر اس میں تشریعا و تکوینا سیر و عدم عمر کی رعایت فرمائی تاکہ روزہ کی تکمیل ہو جائے اور تکمیل کے بعد اس نعمت پر تکبیر کہو اور شکر کرو پھر شکر سے محبت پیدا ہوگی اور محبت سے قرب حق کا تقاضا ہوگا تو اس آیت میں تسلی فرمادی کہ میں تم سے قریب ہوں

مجھے تمہارے سب اعمال و اقوال کی خبر ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَاكَ مِنْ هَدَعَاكَ كَرِهَ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ
کی دعا کو قبول کر لیتا ہوں یہاں دعا سے مراد عبادت ہے وہ دعائے ظاہری مراد نہیں جیسا آیت اُدْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ
میں بقرینہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ هِيَ مَرَادِ عِبَادَتٍ هِيَ اَوْ عِبَادَتٍ كُوْدَعَا سَعِ تَجْبِيْر كَرِهَ مِيْل تَكْتِه يِه هِي كِه تَمَلَا
دیا گیا کہ تمہاری عبادت کی حقیقت محض دعا و التجا ہے جیسے کوئی شخص ڈوبتا ہو تو وہ دوسروں کو پکارتا ہے پس آپ کی عبادت کا صرف
یہ درجہ ہے اس کے بعد جو کچھ ہے حق تعالیٰ کی عطا و فضل ہے اگر ہم اپنی عبادت پر ناز کرنے لگیں تو اس کی ایسی مثال ہوگی ڈوبنے
والے کی پکار سن کر کسی نے اس کو بچا لیا ہو اور وہ ڈوبنے والا اس کے بعد فخر کرنے لگے کہ میں شاور ہوں ارے تجھے خبر بھی ہے کہ
دوسرے نے تجھ کو بچا لیا اور نہ محض پکارنے سے تو کہاں بچ سکتا تھا اور حقیقت میں ہمارا تو پکارتا بھی ان ہی کی عطا ہے اگر وہ طلب
دل میں پیدا نہ کریں تو ہم سے پکارتا بھی نہ ہو سکتا مولانا فرماتے ہیں

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

اس کے بعد فرماتے ہیں فَلَیْسَتْ حَیْبُوَانِیْ وَاَلِیُوْنُوَانِیْ کہ جب ہم تمہارا کام کر دیتے ہیں اب تم بھی ہمارا کہنا مانو کہ
میری باتوں کی تصدیق کرو اور عملاً اس کی تعمیل کرو لعلکم یورشدون کہ تم کو رشد و فلاح حاصل ہو اور ہدایت میں ترقی ہو (یہ ترجمہ
لفظی نہیں حاصل مطلب ہوا) اس میں بتلا دیا کہ ہم جو تم سے یہ کہتے ہیں کہ ہمارا کہنا مانو تو اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں بلکہ
اس کا نفع بھی تمہارے ہی لئے ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میرا کہنا مانو ایسا ہے جیسا ہم بچے سے کہا کرتے ہیں کہ میاں
ہماری ایک بات مان لو اور وہ یہ ہے کہ کھانا کھا لو اس عنوان سے اس پر گرانی نہ ہوگی اور وہ اپنا کام تمہاری خاطر سے کرے گا
اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے جو کام بتلایا ہے وہ ہمارا ہے ہمارے ہی فائدہ کا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ
اس کو اپنا کام قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہمارا کہنا مان لو یہ تو مختصر طور سے آیت کی تفسیر تھی اور اصل مقصد اکمال کا بیان
کرنا تھا اب میں اصل مقصود کو مختصر طور پر بیان کرتا ہوں پس سنئے کہ اللہ تعالیٰ نے اکمال عدت کی مقصودیت کو بیان فرمایا ہے
کہ ہم نے احکام صوم میں آسانی کی رعایت اس لئے کی ہے تاکہ اس مدت کو جو روزہ کے لئے مقرر کی گئی ہے پورا کر لو ہر
چند کہ اس عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکمال عدت خود مقصود ہے مگر درحقیقت خود اسی مقصود سے بھی مقصود دوسری چیز ہے
جس کے لئے اکمال عدت ذریعہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کی تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ ذرائع کو بھی مقصود بنا کر سکھاتے ہیں تاکہ
مخاطب ذریعہ کا پورا اہتمام کرے تو نتیجہ اس پر خود مرتب ہو جائے گا اور یہی اصول صوفیہ نے قرآن سے سیکھا ہے چنانچہ وہ
طالبین کو یہی تعلیم کرتے ہیں کہ مقصود عمل ہے وصول مطلوب نہیں کیونکہ عمل اختیاری ہے اور وصول غیر اختیاری ہے تم عمل
کے مکلف ہو اسی کو مقصود سمجھ کر بجالاتے رہو اس پر وصول خود مرتب ہو جائے گا اب سمجھئے کہ وہ مقصود کیا ہے جس کے لئے
اکمال عدت کا حکم ہے اکمال عدت اصل میں ذریعہ ہے تقویٰ کا جس کو اللہ تعالیٰ نے صوم کے ذکر میں ابتدا ہی بیان فرمایا۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ اور
تقویٰ کی حقیقت ہے دنیا میں گناہوں سے بچنا اور آخرت میں عذاب سے نجات پانا یہ نفع ہے اکمال کا اس کے بعد یہ بھی

سمجھئے کہ اکمال عدت کے دو درجے ہیں ایک اکمال ظاہری کہ رمضان کا پورا مہینہ روزہ میں تمام ہو جائے ایک اکمال معنوی کہ اس پر یہ غایت مرتب ہو جو اکمال سے مطلوب ہے پس روزہ کا حقیقی پورا کرنا یہ ہے کہ ہم ہر دن یہ دیکھتے رہیں۔ کہ گناہوں سے کس قدر بچے اور آئندہ کے لئے کس قدر اہتمام کیا۔ اگر یہ غایت مرتب نہ ہوئی تو اکمال عدت محض ظاہری ہو گی حقیقی اکمال حاصل نہ ہوگا اسی لئے حدیث میں ہے **مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ أَنْ يَدَعَ شَرَابَهُ وَطَعَامَهُ** جو شخص روزہ میں بے ہودہ باتیں اور بے ہودہ کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کچھ پروا نہیں اس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اکمال عدت کا یہ درجہ مطلوب ہے جس پر تقویٰ مرتب ہو پس ہم کو اپنی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ ہم رمضان میں گناہوں سے کس قدر بچے اور کتنا اس کا اہتمام کیا افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ہم لوگوں کو روزہ میں گناہوں سے بچنے کا ذرا بھی اہتمام نہیں ہماری حالت وہی ہے جو پہلے تھی بلکہ بعضوں کے تو رمضان میں گناہ پہلے سے بھی بڑھ گئے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا مذاق یہ ہو۔

ہر گناہ ہے کہ کئی در شب ادینہ کن تاکہ از صدر نشینان جہنم باشی
یہ وہ بیباک لوگ ہیں جن کو تبرک زمانہ میں بھی تنبہ نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں گناہ کرنے کا وبال اور دنوں سے زیادہ ہے قاعدہ سے تو یہ چاہیے تھا کہ جن لوگوں نے ان تبرک دنوں کو یوں برباد کیا ہے ان کے لئے ان ایام کی مکافات کا کوئی طریقہ نہ ہوتا مگر خدا تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے وہ اب بھی رحمت کرنے کو موجود ہیں اگر ان بقیہ دنوں کی درستی کر لی جائے اور اب تک کے گناہوں سے توبہ کر لی جائے۔ صاحبو! ہمیں اس رحمت کی قدر کرنا چاہیے ورنہ پھر یہ وقت شاید نہ ملے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ایک اور اندیشہ ہے کہ یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا نہ لگ جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو بددعا دی ہے جس نے رمضان میں بھی اپنے گناہوں کی مغفرت نہ کرائی ہو۔

جملہ احکام شریعت آسان ہیں

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں) شبہ یہ ہے کہ بہت سی دشواریاں بھی پیش آتی ہیں اگر یہ عمر با ارادہ (دشواری) حق ہے تو نص مذکورہ کے خلاف ہے کہ **مَثَلًا وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَلِكُمْ غَدًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ** (یعنی آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملادیا کیجئے)

چند تکبیریں بڑھادیں کہ امتیاز علامت ہے اہتمام شان کی اور اسی لفظ سے قرآن میں بھی ارشاد ہے **وَلِيَاكُتِبُوا لِلَّهِ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ** اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہو گیا کہ **لِيَتَكَلَّمُوا الْعِدَّةَ** میں تکمیل رمضان مراد ہو اور لتکبروا سے عید اور ایک حکمت دیکھئے مسلمان میں دو چیزیں ہیں ایک دن اور ایک طبیعت اور جس طرح اس کی طبیعت میں بعض امور کا جوش اور تقاضا پیدا ہوتا ہے اسی طرح اس کے دین کو بھی جوش ہوتا ہے اور ان دونوں کی معدل عقل ہوتی ہے۔

پس خدا تعالیٰ نے جوش دین کا تو یہ انتظام فرمایا کہ نماز مقرر فرمائی اور جوش طبیعت کا یہ انتظام فرمایا کہ اس دن اچھے سے اچھا کپڑا پہننے کی اجازت دی۔ سبحان اللہ شریعت کا کیا پاکیزہ انتظام ہے۔

مجاہدات میں انسانی مزاج کی رعایت

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ - یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت کا ارادہ فرماتے ہیں اور تم پر سختی کا ارادہ نہیں کرتے۔

یہ ابطال ہے اس کوتاہی کا کہ ان کے مجاہدات میں دشواری ہی دشواری ہے یہاں تو یہ بات نہیں ہے چنانچہ جن مجاہدات کی تعلیم کی گئی ہے وہ سب نہایت لطیف اور ہماری طبیعت اور مذاق کے موافق اور نفع میں سب مجاہدوں سے بڑھ کر ہیں آگے ارشاد ہے **وَلْيَتَلَكَّمُوا الْعِدَّةَ** (اور تاکہ تم شمار کو پورا کر لو) اس کوتاہی کا ابطال ہے کہ ان کے مجاہدہ کا کہیں خاتمہ ہی نہیں اور نہ اس میں اکمال ہے۔ یہاں اختتام بھی ہے اور اکمال بھی۔ ایک کوتاہی یہ تھی کہ مجاہدہ کر کے ناز ہوتا تھا اور یہ اس طریق میں سخت مضر ہے اس کو دفع جواب یہ ہے کہ اس آیت میں یرید سے مراد ارادہ تشریحیہ ہے یعنی حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ مشکل احکام مشروع کریں بلکہ آسان آسان احکام مشروع کرنا چاہتے ہیں چنانچہ کہیں کوئی حکم شریعت کا مشکل بتلا تو دو کہیں نہیں بہر حال یہ مراد ہے ارادہ سے۔

جوش دین اور جوش طبیعت کا انتظام

صاحبو! غور کیجئے کہ خدا تعالیٰ ہماری خوشی کو بھی کس انداز پر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں نماز کا حکم فرمایا اکثر اصدقہ کا

حکم فرمایا کہ یہ زکوٰۃ کے مشابہ ہے اور نماز کی بھی ایک خاص ہیئت مقرر فرمائی کہ اس میں فرماتے ہیں

وَلْيَتَلَكَّمُوا وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (یعنی تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تم کو راہ بتائی) **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ** - یعنی

تاکہ تم شکر کرو۔

یہ اس کوتاہی کی تکمیل ہے کہ ان کے مجاہدہ کے اختیار کرنے میں نعم اور لذات سے محرومی تھی تو نعمتوں کا شکر بھی ادا

نہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی آسانی فرمائی کہ خوب سب کچھ کھاؤ پیو اور شکر کرو۔

بعض مفسرین نے **لِيَتَلَكَّمُوا وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ** سے تکبیرات عیدین مراد لی ہیں یعنی روزوں کے شمار کو پورا کرنے کے بعد

اللہ اکبر اللہ اکبر عید کی نماز میں کہو۔ میں نے اس کو اختیار نہیں کیا اس لئے کہ میرا ذوق اس سے آبی ہے اس لئے میں نے

اپنی تفسیر میں بھی اس کو اختیار نہیں کیا لیکن اس سے بھی میرے دعوے کی تائید ہوتی ہے یہ تو اجمالاً اس آیت کا حاصل ہے۔

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِيَتَلَكَّمُوا وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ احکام و قوانین مقرر کرنے

سے دشواری منظور نہیں تاکہ لوگ ایام (ایام قضا) کی تکمیل کر لیا کرو اور تاکہ تم لوگ اللہ کی بزرگی اور شائبان کیا کرو اس پر تم کو

ایسا طریقہ بتلا دیا (جس سے تم برکات و ثمرات ماہ رمضان سے محروم نہ رہو گے) اور تاکہ تم شکر کرو۔

تفسیر رحمتہ للعالمین

اب میں آیت کی تفصیل کیلئے دو حدیثیں پڑھتا ہوں جن میں ایک کو تو لِيَكْمِلُوا الْعِدَّةَ سے مناسبت ہے یعنی ختم رمضان سے اور ایک کو لِشَكَرُوا لِلَّهِ سے تفسیر اول پر یعنی عید کی نماز سے مناسبت ہے۔

پہلی حدیث تو یہ ہے کہ جس کے راوی غالباً ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین شخصوں پر بددعا کی ہے کہ ان کی ناک رگڑی جائے۔ ذلیل و خوار ہو جائیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ حضور ﷺ کی بدعا کیسی ہوگی۔ شاید اس پر کوئی طالب علم یہ کہے کہ ہم حضور ﷺ کی بدعا سے نہیں ڈرتے کیونکہ آپ رحمتہ للعالمین ہیں دوسرے آپ نے حق تعالیٰ سے یہ بھی عرض کیا ہے۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ فَأَيُّمَا مُؤْمِنٍ أَرِيتُهُ أَوْ شَتَمْتُهُ فَافْعَلْهَا لَهُ صَلَوةٌ وَزَكَاةٌ وَقُرْبَانَةٌ تَقْرِبُهُ إِلَيْكَ.

اے اللہ! میں بشر ہی ہوں (اس لئے عوارض بشریہ مجھے بھی لاحق ہوتے ہیں) تو جس شخص کو میں ایذا دوں یا برا بھلا کہوں یا سزا دوں یا کسی پر لعنت (بددعا) کروں تو اس کو اس کے حق میں رحمت اور گناہوں سے پاکیزہ اور قربت کا سبب بنا دیجئے کہ اس کے ذریعے سے آپ اس کو اپنا مقرب بنا لیں۔ تو جب آپ نے اپنی بددعا کے متعلق خود یہ دعا کی ہے کہ وہ سب رحمت و قرب بن جایا کرے تو پھر آپ کی بددعا سے کیا ڈر؟

اس کا جواب یہ ہے وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ میں تو یہی امر محل سوال ہے کہ عالمین سے مراد کیا ہے اور عالمین کے لئے رحمت ہونے کا کیا مطلب ہے۔ مشہور یہ ہے کہ عالمین اپنے عموم پر ہے اور اس عموم میں کفار بھی داخل ہوں گے اور چونکہ آیت میں کوئی تحدید و تقیید نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ کفار کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں سبب رحمت ہیں اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ کفار پر آخرت میں آپ کی رحمت کس طرح ظاہر ہوگی۔

بعض علماء نے جواب دیا ہے کہ اگر ہمارے حضور ﷺ کا وجود نہ ہوتا تو کفار کو آخرت میں اب سے زیادہ عذاب ہوتا۔ حضور ﷺ کی برکت سے اس میں کچھ کمی تجویز کی گئی ہے مگر میرے دل کو یہ جواب نہیں لگتا کیونکہ اس دعوے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی کہ حضور ﷺ نہ ہوتے تو عذاب زیادہ تجویز کیا جاتا۔ دوسرے جہنم کا عذاب قلیل بھی ایسا شدید ہے کہ ہر شخص یوں سمجھے گا کہ سب سے زیادہ عذاب میں ہوں تو اس قلت سے ان کو نفع کیا ہوا۔

میرے ذہن میں جو اس کا جواب آیا ہے وہ یہ ہے کہ عالمین سے مراد تو معنی عام ہی ہیں مگر رحمت سے مراد خاص وہ رحمت ہے جس کا تعلق ارسال سے ہے یعنی رحمت فی الدنیا۔ کیونکہ ارسال دنیا ہی کے ساتھ خاص ہے آخرت سے اس کو کوئی علاقہ نہیں اور دنیا میں جو آپ کی رحمت مومنین و کفار سب کو عام ہے وہ رحمت ہدایت و ایضاح حق ہے چنانچہ قرینہ مقام اسی پر دلالت کر رہا ہے اس لئے کہ پہلے تبلیغ ہی کا ذکر ہے ان فی ہذا البلاغہ اس میں کافی مضمون میں لِقَوْمِهِ عِبْدِينَ ایسے لوگوں کے لئے جو بندگی کرتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر اس میں آپ کی تخصیص کیا ہے۔ ہدایت ایضاح حق میں تو تمام انبیاء آپ کے شریک ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تخصیص محض رحمت کے اعتبار سے نہیں بلکہ مجموعہ رحمتہ للعالمین کے

اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالمین سے مراد تمام مکلفین کے لئے ہادی بن کر آپ ہی مبعوث ہوئے ہیں اور عالمین سے مراد تمام مکلفین ہیں جن میں جن و انس عرب عجم سب داخل ہیں حاصل یہ ہوا کہ بعثت عامہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بخلاف اور انبیاء کے کہ ان کی دعوت خاص خاص اقوام کے لئے تھی۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ دیگر انبیاء کی دعوت خاص تھی تو نوح علیہ السلام کی تکذیب سے تمام عالم کے کفار کیوں غرق کئے گئے بلکہ چاہیے تھا کہ عذاب صرف ان لوگوں پر آتا جن کی طرف خاص طور پر مبعوث ہوئے تھے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ جو دعوت عامہ مخصوص ہے اس سے مراد دعوت عامہ فی الفروع ہے باقی اصول میں تو ہر نبی کا دعوت عام ہوتی ہے کیونکہ اصول تمام انبیاء کے یکساں ہیں اور نوح علیہ السلام کے زمانہ میں تمام عالم کے کفار اصول ہی میں ان کی تکذیب کرتے تھے یعنی توحید و اعتقاد رسالت ہی میں خلاف تھے اس لئے سب پر عذاب نازل ہوا۔ بہر حال اس آیت کی تفسیر اگر وہی ہے جو میں سمجھا جب تو اس میں صرف عموم دعوت کا بیان ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ کی بدعا بھی رحمت ہے جو اس سے بے فکری کی جائے اور اگر دوسری مشہور تفسیر ہے تو وہ منافی عذاب کے نہیں۔ رہی حدیث تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی یہ درخواست اس بدعا کے ساتھ مخصوص ہے جو غلبہ غضب میں بلا عمد صادر ہو اور یہ بدعا تو عمدہ ہے کیونکہ اس میں تو آپ تبلیغ احکام کے ساتھ دغم انفہ فرما رہے ہیں۔ اگر یہ مضمون الخ ہر بد دعا کے لئے عام ہوگا۔ تو پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہوگا۔ اگر آپ کی بدعا مطلقاً قبول نہیں ہوتی تو لعنتہم کے بعد کل نبی مستجاب سے تاکید کیوں کی جا رہی ہے۔

بہر حال یہ شبہ تو رفع ہو گیا۔ اس لئے آپ کی بدعا سے بے فکری نہیں ہو سکتی مگر حضور ﷺ نے اس حدیث میں بد دعا ایسے لفظوں سے کی ہے جن سے دعا بھی نکل سکتی ہے۔ کیونکہ آپ دغم انفہ فرما رہے ہیں۔ اور دغم انفہ نماز میں بھی ہوتا ہے۔ تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے اللہ! ان کو نمازی بنا دیجئے۔ گو محاورہ میں یہ معنی مراد نہیں ہوتے مگر لفظ سے بنا بر لغت نکل سکتے ہیں اور کبھی حضور ﷺ نے بھی ایسا کیا ہے کہ ایک لفظ کو معنی عربی سے صرف کر کے بنا بر لغت دوسرے معنی پر محمول کیا ہے تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس وقت حضور ﷺ عبد اللہ بن ابی رئیس السناقیں کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو روکا کہ آپ ایسے لوگوں کی نماز کیوں پڑھاتے ہیں جن کے لئے استغفار کرنے سے حق تعالیٰ نے آپ کو منع فرمایا ہے **إِسْتَغْفِرُوا لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوا لَهُمْ إِنَّ تَسْتَغْفِرُوا لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ** ان کے لئے دعا کریں یا نہ کریں اگر ستر مرتبہ بھی کریں تب بھی ان کی بخشش نہیں ہوگی۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے عمر! حق تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر سے زیادہ کرنے سے ان کی مغفرت ہو جائے گی تو میں اس سے زیادہ کر لوں گا۔

فلسفی مزاج مصنفین تو اگر حدیث کو سن لیتے ہیں تو موضوع ہی کہہ دیتے کیونکہ اس سے اشکال ہوتا ہے کہ کیا نعوذ باللہ

حضور ﷺ کو عربی محاورہ کی بھی خبر نہ تھی کہ اس قسم کی تردید سے تخیر مراد نہیں ہوتی بلکہ نسوة فی عدم النفع مراد ہوتا ہے اور ذکر سبعین سے تحدید کا قصد نہیں ہوتا بلکہ تکثیر مراد ہوتی ہے مگر حدیث صحیح ہے۔ بخاری مسلم کی روایت ہے اس کو موضوع نہیں کہا جاسکتا۔ باقی علماء نے اس اشکال کے متعدد جوابات دیئے ہیں مگر میں نے ان جوابوں کو یاد نہیں رکھا بلکہ اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کا جواب مجھے بہت پسند آیا وہی یاد رکھا۔

ہمارے استاد علیہ الرحمۃ کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ نے غایت رحمت سے محض الفاظ سے تمسک فرمایا۔ اس جواب کا حاصل وہی ہے کہ آپ نے معنی عربی سے عدول کر کے معنی لغوی پر کلام کو محمول فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں کہ معنی عربی کی آپ نے نفی فرمادی بلکہ لفظی احتمال کے طور پر فرمایا کہ فی نفسہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا۔ ایسے ہی ہم بھی کہتے ہیں کہ گو عرفاً رغم انفسہ بدوعا کے لئے ہے مگر لفظ اس سے دعا بھی نکل سکتی ہے کہ اے اللہ! ان کو نمازی بنا دے تاکہ ان کے یہ عیوب سب مٹ جائیں۔ یہ ایسی تاویل ہے جیسے مثنوی کے اس شعر کی شرح میں

آتش ست این بانگ نامی و نیست باد ہر کہ این آتش ندارد نیست باد

شرح کا اختلاف ہوا ہے۔ بعض نے مصرع ثانی میں نیست باد کو بدوعا محمول کیا ہے جس پر یہ آتش عشق نہ ہو خدا کرے وہ ملیا میٹ ہو جائے اور بعض نے اس کو دعا پر محمول کیا ہے کہ مولانا ان کے لئے مقام فنا کی دعا کر رہے ہیں کہ خدا ان کو بھی فنا عطا فرمادے۔ ایسے ہی رغم انفسہ میں دعا اور بدوعا دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

اہمیت ذکر رسول

اب سنئے وہ تین شخص کون ہیں ایک تو وہ شخص ہے جو حضور ﷺ کا نام سنے اور ﷺ نہ کہے۔ حضور ﷺ کا بڑا حق ہے کہ جب آپ کا نام مبارک لیا جائے یا سنا جائے تو صلی اللہ علیہ وسلم کہنا واجب ہے اگر نہ کہے گا تو گناہ ہوگا ایسے ہی حق تعالیٰ کے نام پاک کے ساتھ جل جلالہ یا کوئی اور لفظ تعبیر کرنا مشعر ہے کہ تعظیم کرنا واجب ہے ورنہ گناہ ہوگا۔ لیکن اگر ایک مجلس میں چند بار نام لیا جائے تو حضور ﷺ کے نام کے ساتھ کہنا اور حق تعالیٰ کے نام کے ساتھ جل جلالہ یا تعالیٰ ایک بار کہنا تو واجب ہے اور ہر بار کہنا مستحب ہے۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ
فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ: اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو (آپ میری طرف سے فرمادیجئے) میں قریب ہی ہوں (اور باسٹھانا مناسب درخواست کے) منظور کر لیتا ہوں (ہر) عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے سوان کو چاہئے کہ میرا کہا مانے اور میرے ساتھ ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پالیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

حدیث میں آتا ہے کہ لوگوں نے رسول ﷺ سے عرض کیا اقریب ربنا فتاجیه ام بعید فتادیہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے نزدیک ہیں تو آہستہ سے عرض معروض کر لیا کریں یا دور ہیں کہ زور سے پکارا کریں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ سلاطین دنیا تک ہر شخص کی بات نہیں پہنچتی ہے مگر ان سوال کرنے والوں کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ زور کی آواز کو سنتے ہوں آہستہ کونہ سنتے ہوں یا تو اس لئے کہ وہ ہم سے دور ہیں اور بعد کا خیال بوجہ عظمت کے ہو (وایضاً فان قوله تعالیٰ فوق العرش منصوص واثبات العولہ لازم شرعا کما ہوا عقیدۃ للفسف من غیر بیان کیفیتہ علوہ و فوقیتہ یا اس لئے کہ وہ بہت سے کاموں میں مشغول ہیں اور شغل کی حالت میں آہستہ آواز مسوع نہیں ہوتی گو سماع قریب ہی ہو آگے اس سوال کا جواب ہے فانی قریب ظاہر حال کا مقتضایہ تھا کہ یہاں فقل انسی قریب ہوتا کیونکہ اوپر اذا سالک میں سوال واسطہ حضور ﷺ کے ہے تو جواب بھی حضور ﷺ کے واسطہ سے دیا جاتا کہ آپ ﷺ اس سوال کے جواب میں فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں دور نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے جواب بلا واسطہ دیا ہے کہ یہاں قل کو حذف کر دیا گو یہ جواب پہنچے گا بواسطہ رسول ہی کے مگر حذف قل میں اس بات کو ظاہر فرمادیا کہ ہم تمہارے سوال کا جواب بلا واسطہ دیتے ہیں گو یہ سوال ہماری شان و عظمت کے خلاف ہے مگر ہم اس خطا کو غفوکر کے بلا واسطہ جواب دیتے ہیں اس طرز و عنوان میں جو کچھ عنایت و کرم مزید ہے ظاہر ہے آگے جواب کے بعد ارشاد ہے اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ اس میں ایک دوسری عنایت کا اظہار ہے کیونکہ سوال کا جواب تو اس سے ہو گیا کہ فانی قریب اس کے بعد سائل کو کسی اور بات کا انتظار نہ تھا مگر کلام علی اسلوب الحکیم کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ جس میں اس پر تشبیہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب علمی یہ تو فانی قریب سے معلوم ہو چکا دوسرے قرب تعلق خصوصیت جیسا ردو میں ہم کبھی تو یوں کہتے ہیں کہ میں پاس ہی ہوں کہو کیا کہتے ہو یعنی سن رہا ہوں اس میں تو پاس ہونے سے قرب علمی و قرب سماع

کا بیان مقصود ہے اور کبھی ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں تو ہمارا قریب ہے یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے نیز کہتے ہیں کہ تم تو دور رہ کر بھی پاس ہی ہو یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے۔ پس اٰجِبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں دوسرے قرب کو یعنی قرب تعلق کو اور اب اس قرب کی خصوصیت بیان کیا گیا کہ میں باعتبار علم کے قریب قریب ہوں کہ سب کی بات سنتا ہوں اور باعتبار شفقت و رحمت و توجہ و عنایت کے بھی قریب ہوں کہ ہر دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔ پس اجیب کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست کو لے لیتے ہیں اس پر توجہ کی جاتی ہے بے توجہی نہیں ہوتی۔

اسی لئے عاشق کو دعا قبول ہونے یا نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ عاشق کے لئے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی بات سن لے عاشق کے لئے یہی بات بہت کافی ہے اس کے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہو جائے تو مزید عنایت ہے تو چاہیے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت بعد نظر آتا ہے صاحبو! پھر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا اور ہم اس سے اس قدر دور ہو رہے ہیں وہ تو قریب ہی ہیں بس ہم دور ہو رہے ہیں اسی لئے نَحْنُ اقْرَبُ الْيَوْمِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ فرمایا انتم اقرب الینا نہیں فرمایا کیونکہ یہاں قرب علمی مراد ہے اور قرب علمی میں طرفین سے قرب لازم نہیں ہے بخلاف قرب حسی کے کہ یہاں طرفین سے قرب لازم ہے پس اس وقت ہماری حالت سعدیؒ کے شعر کی مصداق ہے

دوست نزدیک تر از من بمن است ایں عجب نگرہ من ازوے دورم

اس مقام پر استطراد میں ایک شبہ کو بھی رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں کو پوری آیت نحن اقرب الیہ سے یہ شبہ ہو گیا ہے کہ وساس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ پوری آیت ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۗ وَنَحْنُ اقْرَبُ الْيَوْمِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۔ اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو اس کے دل میں بطور وسوسہ کے آتی ہیں) ان لوگوں نے نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ کو وعید پر محمول کیا ہے اور منشا شبہ کا یہ ہو کہ بہت سی آیتوں میں جیسے وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ انہ خبیر بما تعملون۔ علم وعید کے لئے وارد ہے۔ انہوں نے نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ کو بھی اسی پر قیاس کیا حالانکہ یہاں سیاق و سباق میں نظر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کو وعید سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ دراصل یہاں اوپر سے حق تعالیٰ میعاد کو ثابت فرما رہے ہیں جس کے لئے کمال قدرت کمال علم کی ضرورت ہے۔ پس اولاً کمال قدرت کو ثابت فرمایا اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمٰوٰتِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنٰیہَا الْاٰیہ میں اور اس کے بعد وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ سے کمال علم کو ثابت فرماتے ہیں جس کو انسان کے وساوس کا علم ہو جو دل میں جمتے بھی نہیں پھر اعیان خارجہ و اجزاء اجسام کا علم کیونکہ نہ ہوگا اس کے بعد وَنَحْنُ اقْرَبُ الْيَوْمِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ کو بیان فرمایا ہے کہ ہم انسان کی شہرگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں اور یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو ہمارا اور ہماری حالت کا جس قدر علم ہے ہم کو حق تعالیٰ کا اس قدر علم نہیں بلکہ یوں کہئے کہ ہم کو بجز اسماء کے حق تعالیٰ کا

کچھ بھی علم نہیں بلکہ ہم کو خود اپنی حالت کا بھی پورا علم نہیں کہ ہمارے اندر کتنی رگیں ہیں اور ان سے کیا کیا کام لئے جا رہے ہیں اور یہ اوپر معلوم ہو چکا کہ آیت میں قرب علمی مراد ہے پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے قرب علمی اس درجہ ہے کہ ہم کو بھی اپنے ساتھ نہیں۔ اس کو اس طرح تعبیر فرمایا کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہیں (دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ خالق ہیں تمام اعضا اور تمام قوی انہی کے عطا کئے ہوئے ہیں پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے ہمارے اعضا سے زیادہ قرب ہے)

اجابت کا وعدہ

پس اجابت کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ ان شاء سے مقید ہے کہ اگر مشیت ہو گی تو ایسا ہو جائے گا ورنہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے **بَلْ اِيَاَهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ النَّيْرَ اِنْ شَاءَ بَعْضُ عُلَمَاءِ** **اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ** کو بھی ان شاء سے مقید کیا ہے اور اس کو بعض لوگوں نے حداقت میں شمار کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے **وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ** یہاں سابق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور مرتب ہوتی ہے کیونکہ جواب امر کا ترتب ضروری ہے اس میں ان شاء کی قید خلاف ظاہر ہے نیز یہاں بھی انسی قریب کے بعد اجیب دعوة الداع کو بیان فرمایا جس میں قرب کو محقق و موکد کیا گیا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اجابت مشیت کے ساتھ مقید نہیں ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ کا قریب ہونا محقق ہے علما بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی (لقولہ سبقت رحمتی غضبی وهو المراد بالتعلق پس میرے نزدیک اجابت بالمعنی الاول نہیں ہاں اجابت بالمعنی الثانی ان شاء سے مقید ہے جب دعا اس طرح سے قبول ہے پھر دعا میں کوتاہی کیوں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ آپ استجابت کے یہی معنی لیجئے میں اپنی تفسیر سے رجوع نہ کروں گا میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس آیت میں صرف اتنی ہی بات کا حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو مان لو۔ اور **وَلْيُؤْمِنُوا بِي** تفسیر ہے **فَلَيْسَتْ تَجِيبُوا لِي** کی پس استجابت سے مراد ایمان لانا اور احکام الہیہ کو مان لینا ہے اب یہ آیت نظیر ہے دوسری آیت کی یعنی **يَا يٰقَوْمِ اٰجِبُوا دَاعِيَ الْاٰثُو وَاٰمِنُوا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَاُجِبْكُمْ مِّنْ عَذَابِ الْاَلِيمِ** یہاں بھی اجیبوا کی تفسیر آمنوا سے وارد ہوئی اور اجابت و استجابت دونوں متحد المعنی ہیں پس آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ یہاں استجابت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کو مان لو یہاں عمل کا ذکر نہیں لیکن عدم ذکر سے یہ سمجھ لینا غلط ہے کہ یہاں اعمال کی نفی کی گئی ہے ہرگز نہیں یہاں یوں کہو کہ سکوت ہے اس کا مضائقہ نہیں کیونکہ ایک آیت میں سب باتوں کا ذکر ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک بات کا حکم ایک آیت میں ہے دوسری باتوں کا دوسری آیتوں میں ہے پس **فَلَيْسَتْ تَجِيبُوا لِي وَاٰمِنُوا بِي** کو اجابت بالمعنی الاول پر محمول کرنا تو صحیح مگر اس سے عمل کی نفی کرنا غلط جیسا کہ **اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ** میں ہم نے بھی اجابت بالمعنی الاول کا اثبات کیا ہے مگر اجابت بالمعنی الثانی کی نفی تو نہیں کی بلکہ اس سے آیت کو ساکت مانا ہے پھر تم تفسیر عمل کی زیادت کیسے کرتے ہو۔ دوسرے **اُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ** میں ہم نے بھی اجابت بالمعنی الاول کا اثبات کیا ہے مگر اجابت بالمعنی الثانی کی نفی تو

نہیں کی بلکہ اس سے آیت کو ساکت مانا ہے پھر تم نفی عمل کی زیادت کیسے کرتے ہو۔ دوسرے اَلْجَنَابِ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں تو سکوت عن عطاء المراد کی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ تمہاری درخواست بعض دفعہ نامناسب خلاف مصلحت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں یہ بات نہیں ہے تو ہم کو یہ بھی حق ہے کہ ہم فَلَيْسَتْ جَبَابًا وَلَا يُؤْتُونَ اِيَّانِي کو طلب عمل سے ساکت نہ مانیں کیونکہ جو احکام سرپا خیر اور سرپا مصلحت ہیں ان کو ماننے کے معنی یہی ہیں کہ ان کے موافق عمل کیا جائے۔ اس کے بعد ارشاد ہے لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ بظاہر یہ سب امور مذکورہ کے متعلق ہے مطلب یہ ہوا کہ بندوں کو میرے قرب علمی اور قرب تعلق سے اطلاع دے دیجئے تاکہ وہ اس کو معلوم کر کے میرے احکام کو مانیں اور اس مجموعہ سے توقع ہے کہ ان کو ثواب و رشد حاصل ہو جائے گا۔ یہ جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ صواب و رشد یہی ہے کہ حق تعالیٰ سے اس طرح معاملہ کیا جائے کہ اعتقاد ان کو اپنے سے قریب سمجھے اور عموماً اللہ تعالیٰ سے مانگتے اور دعا کرنے کی عادت کی جائے اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

اجابت کا مفہوم

اَلْجَنَابِ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَا فَلَيْسَتْ جَبَابًا وَلَا يُؤْتُونَ اِيَّانِي کہ میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں اس سے متبادر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دعا کرتا ہے وہ ضرور ہی مستجاب ہوتی ہے تو ایک جواب تو وہی ہے جو مذکور ہوا کہ مطلوب سے زیادہ اچھی چیز مل جانا یہ بھی مطلوب ہی کا ملنا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اجابت کے معنی منظور کردن ہیں عطا کردن نہیں ہیں عطا کرنا قبول کے بعد کا درجہ ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی کلکٹر کو درخواست دے کہ مجھے تحصیلدار کر دو اس کا جواب آ جائے کہ تمہاری درخواست منظور کر لی گئی ہے تو اگر یہ شخص دو چار مہینہ کے بعد کہیں تحصیلداری پر بھیجا جائے فوراً نہ بھیجا جائے تو کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ درخواست مردود ہوگئی؟ نہیں وہ منظور ہوگئی۔ تو پھر اللہ کے فعل میں کیوں انتظار نہیں کرتے کیا خدا کے فعل کو اتنی بھی قدر نہیں۔ وہاں یہ چاہتے ہو کہ فوراً ہو جاوے کسی نے کہا شام کو دعوت ہے تم نے منظور کر لی تو اب اجابت کے معنی یہ ہونا چاہئیں کہ قبول کرتے ہی فوراً کھانا کھا لو شام کا انتظار نہ کرو اگر اجابت کے یہی معنی ہیں کہ فوراً ہی اس کا وقوع ہو تو تم نے اس صورت میں کھانا تو کھایا ہی نہیں پھر اس پر قبول دعوت کیسے صادق آیا۔

قبولیت دعا کا مفہوم

اس طرح سمجھو کہ اَلْجَنَابِ دَعْوَةَ الدَّاعِ کے معنی یہ ہیں کہ میں منظور تو فوراً کر لیتا ہوں پھر موقع پر دے دیتا ہوں کبھی تو اسی شکل میں جیسا کہ مانگا ہے اور کبھی شکل بدل کر اور کبھی فوراً کبھی توقف سے کبھی دنیا میں کبھی آخرت میں۔ دیکھو موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے فرعون کے حق میں بددعا کی تھی جس پر ارشاد ہوا۔ فدا جیت دعوتکما تمہاری دعا منظور کر لی گئی پھر اسی کے متعلق فرماتے ہیں فاستقیما اس کی تفسیر میں لکھا ہے لا تستعجلا جلدی نہ کرنا انتظار کرنا جب چاہیں

گے پورا کر دیں گے تو دیکھئے یہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے اور میرے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس برس کے بعد اس کی قبولیت کا ظہور ہوا۔ پھر آپ تو ان کے مقابلہ میں موسیٰ نہیں تو آپ کی اتنی عجلت کیوں ہے۔

اجابت دعا کی تین صورتیں

فرمایا۔ اجابت دعا کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ بعینہ وہ شے مطلوب مل جائے۔ دوسری صورت یہ کہ کوئی بلا آنے والی نل جائے۔ مگر انسان کو چونکہ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہوا۔ کون سی بلا نل گئی۔ ایسے وقت بہت سے اوہام اور شکوک انسان کو گھیر لیتے ہیں اور عدم قبول کا شبہ ہونے لگتا ہے حالانکہ وعدہ ہے **أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ** حدیث شریف میں آیا ہے دعا مانگتے وقت اجابت کا یقین رکھو۔ جب شک اور شبہ کی ممانعت ہے تو پھر دعا مقبول کیونکر نہ ہوگی۔ البتہ صورت اجابت بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ بلا سے محفوظ ہو گیا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شے مطلوب کا ذخیرہ رکھ دیا جاتا ہے مثلاً کوئی لڑکا نادان اشرافی روپیہ مانگے تو بعض اوقات اس کے نام سے کسی تجارت کی کوٹھی میں جمع کر دیتے ہیں اور بوجہ نادانی خود اس کو نہیں دیتے کہ جب ہوشیار ہوگا۔ لیکر حسب مصلحت خرچ کر لے گا۔ اب لیکر بجز اس کے کہ خراب کر دے اور کیا کرے گا حق تعالیٰ بھی اپنے بندے کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اس مسئول سے اچھی نعمت آخرت میں ذخیرہ فرمادیتے ہیں۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ

ترجمہ: یہی لباس تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو

تفسیری نکات

لباس کا مفہوم

(اس آیت مبارکہ) میں زوجین کو لباس سے تشبیہ دے کر ایک اشارہ تو اس طرف فرمایا کہ ہم نے ادائے حقوق کی تسہیل کے لئے زوجین میں ایسا قوی تعلق پیدا کیا ہے کہ جس کی وجہ سے گویا دونوں متحد ہیں کہ ایک دوسرے کو مشتمل ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ دو قالب یک جان ہیں۔

اور دوسرا اشارہ اس تشبیہ میں اس طرف فرمایا کہ جیسے لباس میں ستر کی شان ہے اسی طرح عورت مرد کی ساتر ہے اور مرد عورت کے لئے ساتر ہے اور یہ ستر کئی طرح پر ہے ایک اس طرح کہ ہر ایک دوسرے کے عیوب کے لئے ساتر ہے کیونکہ نفس میں جو تقاضے پیدا ہوتے ہیں اگر ان کے پورا ہونے کے لئے ایک محل بھی تجویز نہ کیا جائے تو پھر انسان تقاضے کو ہر جگہ پورا کرے گا اور اس طرح اس کی بے حیائی کا عیب نمایاں ہو جائے گا اسی لئے شریعت نے نکاح تجویز کیا ہے اس

ایک محل میں ترک حیا کا یہ انجام ہوگا دوسرے مواقع میں حیا و عفت محفوظ رہے گی پھر معاصی کا تقاضا شدید نہ ہوگا جوش کو سکون ہو جائے گا باقی اگر کوئی یہ چاہے کہ نکاح کے بعد معاصی کا وسوسہ بھی نہ آئے ذرا بھی تقاضا نہ ہو تو یہ نہیں ہو سکتا۔

پس تشبیہ باللباس سے ایک اشارہ اس طرف ہوا کہ شوہر بیوی کا اور بیوی شوہر کی ساتر و محافظ ہے یعنی ایک دوسرے کی حیا و عفت کو محفوظ رکھتا اور بچاتا ہے بشرطیکہ کوئی خود بھی بچنا چاہے اور جو گوہی کھانا چاہے تو اس کے لئے کوئی تدبیر بھی نافع نہیں یہ دو وجہ تشبیہ تو علماء کے کلام میں منقول ہیں۔ ایک وجہ شبہ میرے ذہن میں یہ آئی ہے کہ جیسے بدوں کپڑے کے انسان سے صبر نہیں ہو سکتا اس طرح بدوں نکاح کے مرد و عورت کو صبر نہیں آ سکتا کوئی تقاضا نفس ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اعانت و غیرہ میں عورت اپنے خاوند کی محتاج ہے اور خدمت و راحت رسانی میں مرد عورت کا محتاج ہے۔

ایک وجہ تشبیہ میرے ذہن میں اور آئی کہ جس طرح لباس زینت ہے اسی طرح زوجین میں عورت مرد کے لئے اور مرد عورت کے لئے زینت ہے لباس کا زینت ہونا خود نص سے ثابت ہے یعنی یا بنی ادم خذوا زینتکم و قل من حرم زینة اللہ الیٰ اخرج لعبادہ۔ میں بالاتفاق زینت سے مراد لباس ہے چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے یٰبَنِي اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْآتِکُمْ وَرِیْضًا۔ مرد کی زینت یہ ہے کہ بیوی بچوں والا آدمی لوگوں کی نظر میں معزز ہوتا ہے وہ اگر کسی سے قرض مانگے تو اس کو قرض بھی مل جاتا ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اس کی اکیلی جان نہیں بلکہ آگے پیچھے اور بھی آدمی ہیں یہ کہاں جا سکتا ہے اور اکیلے آدمی کو ادھر قرض (آسانی سے) نہیں ملتا۔

قرآن میں جہاں تک میں نے غور کیا لباس کا لفظ عذاب و ضرر کے واسطے مستعمل نہیں ہوا سوائے ایک جگہ کے فَادْقُمَا اللّٰهُ لِبَاسِ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا یَصْنَعُونَ اور اس کے ساتھ ہی بطور جملہ معترضہ کے ایک فائدہ بتلاتا ہوں کہ لفظ ذوق قرآن میں زیادہ تر عذاب ہی کے واسطے آیا ہے تو اس آیت میں عجیب صنعت ہے کہ عذاب کے لئے لفظ ذوق بھی اور لباس بھی۔ تو ذوق کے لفظ سے تو عذاب کو مطعوم کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے صفت احساس میں کہ اس کا ایسا احساس ہوگا جیسا منہ میں رکھی ہوئی چیز کا ہوتا ہے اور لباس کے لفظ سے عذاب کو تشبیہ دی گئی ہے ملبوس کے ساتھ اشتمال و احاطہ میں۔ تو عورتوں کو لباس کہنے میں اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ عورتوں میں اضرار کی شان بھی ہے گو قلیل ہی ہے۔

عورت میں جہاں بہت سے منافع ہیں کچھ ضرر بھی ہے چنانچہ اس شان ضرر کی طرف اس طرح حدیث میں اشارہ ہے مَا تَخَوَّفُ فِتْنَةَ اضْرَعِ عَلٰی امْتِی مِنَ النِّسَاءِ کہ میں اپنی امت کے لئے عورتوں سے زیادہ خطرناک فتنہ کوئی نہیں سمجھتا۔

ایک نکتہ تشبیہ باللباس کا اور سمجھ میں آیا وہ یہ کہ لباس تابع ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں مردوں کی تابع ہیں پھر لباسیت نساء کا ذکر مقدم کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تابعیت میں عورتیں مقدم ہیں۔ یہاں یہ سوال ہوگا کہ آگے تو مردوں کو بھی عورتوں کا لباس کہا گیا تو کیا وہ بھی عورتوں کے تابع ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں ایک درجہ میں وہ بھی تابع ہیں مگر ان کی تابعیت موخر ہے متبوعیت مقدم ہے اور عورتوں کی تابعیت مقدم ہے متبوعیت موخر ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عورتیں تو فطرتاً اور قانوناً مردوں کی تابع ہیں اور مرد محبت کی وجہ سے تابع ہو جاتے ہیں اور یہ تابعیت محبت کی بقا تک ہے اور محبت کا بقا پردہ کی بقا تک ہے۔

حدود و معاملات

اسی طرح معاملات کو دیکھ لیا جائے ان میں بھی حدود ہیں نکاح کی بھی ایک حد ہے کہ چار بیبیوں سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ اسی طرح ہر عورت سے نکاح جائز نہیں بلکہ بعض حلال ہیں بعض حرام ہیں بہت سی عورتیں نسب کی وجہ سے حرام ہیں بعض رضاع کی وجہ سے بعض مصاہرت کی وجہ سے بیع و شراء کے لئے بھی حدود ہیں بعض صورتیں ربوہ میں داخل ہیں بعض صورتیں بیوع فاسدہ ہیں بعض صورتیں بیوع باطلہ ہیں۔

حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا احکام کو ذکر فرمایا کرا کثر موقعہ پر تلک حدود اللہ (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں) فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ تمام احکام شرعیہ حدود ہی ہیں چنانچہ ارشاد فرمایا ہے تلک حدود اللہ فلا تقربوہا (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں ان کے پاس بھی نہ جاؤ) طلاق کے مسائل کے بعد فرمایا تلک حدود اللہ فلا تعتدوہا۔ (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں پس ان سے تجاوز نہ کرو)

شریعت میں رعایت حدود کا حکم

گویا تمام شریعت میں حدود ہی حدود ہیں ان کو مہمل سمجھنا کتنی بڑی غلطی ہے مگر آج کل اس میں ابتلاء عام ہو رہا ہے لوگ عام طور پر کاموں میں حدود کی رعایت نہیں کرتے اس لئے ضرورت ہے کہ اس بحث پر قدرے گفتگو کی جائے اور احکام کی حدود سے لوگوں کو مطلع کیا جائے چنانچہ اس آیت میں بھی جس کو میں نے ابھی تلاوت کیا ہے حق تعالیٰ نے بعض احکام فرما کر تلک حدود اللہ (یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں) فرمایا ہے مجھے اس آیت میں اخیر کا حصہ مقصود ہے۔ پہلا حصہ مقصود نہیں شاید آپ کو پوری آیت سن کر تعجب ہوا ہوگا کہ طلاق کے ذکر کو اس مقام سے کیا مناسبت۔ مگر میں نے پوری آیت کو تہرکا پڑھ دیا ہے مقصود اخیر کا حصہ ہے کیونکہ اس میں رعایت حدود کی تاکید مخصوص طور پر مذکور ہے جو دوسرے مقام پر نہیں۔

احکام طلاق کے حدود میں حکمت

حق تعالیٰ نے اس جگہ اول طلاق کے احکام بیان فرمائے ہیں اس کے بعد ارشاد ہے۔

تلک حدود اللہ و من يتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسه

یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں اور جو شخص اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔ ظلم اخروی تو ظاہر ہے کہ تعدی حدود سے گناہ ہوتا ہے جس کا نتیجہ آخرت میں بہت سخت ہے تو یہ شخص اپنے ہاتھوں مصیبت آخرت کو خریدتا ہے مگر تعدی حدود میں اپنے نفس پر ظلم دنیوی بھی ہے کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ان حدود کے مقرر کرنے سے یہ بھی مقصود ہے کہ لوگ راحت سے زندگی بسر کریں تو ان سے تعدی کرنے میں دنیوی پریشانی بھی ضرور لاحق ہوتی ہے لہذا اس میں اپنے نفس پر ظلم دنیوی بھی ہے۔ آگے فرماتے ہیں

لا تدری لعل اللہ یحدیث بعد ذالک امرا۔

تم نہیں جانتے ممکن ہے حق تعالیٰ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دیں۔ یہ حکمت ہے ان حدود کی جو طلاق کے متعلق اس جگہ ذکر کئے گئے ہیں اور یہی وہ مضمون ہے جو اس مقام میں خاص طور پر مذکور ہے۔ دوسرے مقام پر مذکور نہیں لاندردی (تم نہیں جانتے) میں خطاب بظاہر حضورؐ کو ہے لیکن حقیقت میں خطاب امت کو ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا

مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۷۰﴾

ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ اور ان (جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ اور تم کو (اپنے ظلم اور جھوٹ کا) علم بھی ہو۔

تفسیری نکات

شفقت کی رعایت

غرض اس آیت میں حق تعالیٰ ہم کو نصیحت کرتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ اور اس آیت میں خدا تعالیٰ نے لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ کہ اپنا مال مت کھاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالِ أَخِيكُمْ کہ اپنے بھائیوں کا مال مت کھاؤ۔ حالانکہ مطلب یہی ہے۔ قرآن شریف کی تعلیم بھی حکمت اور عقل پر اس قدر منطبق ہے کہ کسی کی تعلیم ہو ہی نہیں سکتی اس کی تعلیم ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسے کا کلام ہے جو بڑا حکیم ہے اور شفیقانہ کلام ہے نراضابطہ کا کلام نہیں۔ یہ ایسا ہی کلام ہے جیسے باپ اپنے بیٹے کو خطاب کرتا ہے کہ اس میں ہر پہلو سے شفقت کی رعایت ہوتی اور ایک نراضابطہ کا کلام نہیں ہوتا ہے جیسے کوئی منادی کرنے والا حاکم کی طرف سے اعلان کرتا ہے اس میں نرے ضابطہ کے الفاظ ہوتے ہیں اس میں اس کی کوشش نہیں ہوتی کہ مؤثر الفاظ ہوں اور بلیغ عنوان جو قلب پر اثر کریں۔ ضابطہ کی منادی میں اس کا اہتمام کہاں ہوتا ہے اور شفیقانہ کلام میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن کو سننے سے دشوار کام بھی آسان ہو جاوے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اسی طرح نصیحت فرمائی جیسے باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے۔ اگر یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو یوں ہوتا وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالِ غَيْرِكُمْ۔ یہ کلام ہوتا تو درست مگر اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو آیت کے الفاظ کا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اموالکم اس واسطے فرمایا کہ انسان کو اپنا مال زیادہ محبوب ہوتا ہے دوسرے کے مال سے۔ اگر اپنا مال زیادہ محبوب نہ ہوتا تو پرانے مال کو اپنا مال بنانے کی کیوں کوشش کرتا۔ تو چونکہ انسان کو غیر مال سے چنداں محبت نہ تھی اس لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ایسے عنوان سے کہا جاوے جو داعی ہو حفاظت کا اور اس کی حفاظت کا داعی بجز اس کے اور کوئی

لفظ نہ تھا کہ اس کو اموالکم سے تعبیر فرمائیں یعنی غیر کا مال بھی ایسا ہی سمجھو جیسے اپنا ہی ہے۔ اس کی ایسی ہی حفاظت کرو جیسے اپنے مال کی کیا کرتے ہو۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ یہ تو شاعری ہے کہ غیر کے مال کو اپنا سمجھو غیر کے مال کو تو غیر ہی سمجھا جاوے گا اس کو اپنا کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

مکافات عمل

جواب یہ ہے کہ غیر کا مال تو غیر ہی کا ہے واقعی اپنا نہیں مگر لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ فرمانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ جب کسی کا مال تلف کرو گے تو تمہارا مال تلف ہوگا۔ خواہ دنیا میں یا آخرت میں۔ اس معنی سے بھی دوسرے کا مال تلف کرنا اپنا ہی مال تلف کرنا ہے۔ اکثر تو یہ دنیا ہی میں ہو جاتا ہے کہ جو کوئی دوسرے کا مال تلف کرتا ہے تو اپنا بھی تلف ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا میں نہ ہو تو آخرت میں تو ضرور ہی ہوگا۔ حضرت یہ تجربہ ہوا ہے کہ جو لوگ مال و جوہ باطلہ سے حاصل کرتے ہیں دنیا میں بھی ان کا بھلا نہیں ہوتا۔

سودی مال اور محق کی حقیقت

اب جوہ باطلہ کی کچھ مثالیں سنیں سو اس میں سے ایک سودی معاملہ ہے جس کے بارہ میں يَتَمَسَّقُ اللَّهُ التُّبُؤَا سُدَى مال جمع ہوتا ہے اور ایک دن مٹ کر رہتا ہے اور حقیقتاً تو مٹتا ہی ہے مگر صورتاً بھی مٹتا ہے ایک دن بے طرح مارے جاتے ہیں اور اگر اتفاقاً کبھی نہ بھی مٹے تب بھی اس سے کلام الہی پر اعتراض نہیں آتا۔ کیونکہ يَتَمَسَّقُ اللَّهُ التُّبُؤَا قضیہ مہملہ ہے جو قوت میں جزئیہ کے ہوتا ہے۔ اگر ایک دفعہ بھی مٹ جائے تو وہ صادق آجائے گا معنی یہ ہیں کہ سود والے اکثر مٹتے ہیں اور اس کے بہت سے واقعات ہیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اگر کہیں ظاہر نہ مٹے تو اور طریقہ سے مٹتا ہے۔

محق کی قسمیں مختلف ہیں۔ ایک یہ ہے کہ مال جاتا رہے چوری وغیرہ ہو جائے۔ یہ تو ظاہری محق ہے اور ایک محق ہے معنوی وہ یہ کہ سود والا مال سے خود مستفیع نہیں ہوتا فاقہ بھر بھر کر عمر ختم ہو جاتی ہے۔ سود لینے کا سبب بخل ہے جتنا سود لیتا ہے اتنا ہی بخل بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرتا۔ (احکام المال)

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْإِهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ

تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ

أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۷۲﴾

ترجمہ: لوگ آپ سے چاندوں کی حالت کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ وہ چاند آگے شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آئے اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

تفسیری نکات

چاند گھٹنے اور بڑھنے میں حکمت

اس کے آگے مذکور ہے لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ۔ (یہ کوئی نیک کام نہیں ہے گھروں میں تم پچھواڑوں سے آؤ) کو تو اس کو کیا ربط ہے۔ سو وہ ربط یہ ہے کہ ما قبل میں چاند کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کی کیا وجہ ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں وجہ اور علت نہیں بیان کی گئی بلکہ حکمت بتلا دی گئی۔ اس سے سائنس دانوں کا فضول ہونا یقیناً ثابت ہو گیا۔ فرماتے ہیں کہ لوگ چاند کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق آپ سے سوال کرتے ہیں کہ اس کی علت کیا ہے تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ چنانچہ اس سے لوگوں کو اپنے کار بار کے لئے وقت کا اندازہ ہوتا ہے (یہ تو دنیوی نفع ہے) اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے ہیں یہ دینی نفع ہے تو علت کو چھوڑ کر حکمت بتلانے میں اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ علت کا دریافت کرنا فضول ہے حکمت کو معلوم کرنا چاہیے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا۔ اور گھروں میں پشت کی طرف سے آنا کچھ نیک کام نہیں بلکہ نیک کام تقویٰ کا اختیار کرنا ہے۔ پس اس کا تعلق سابق سے یہ ہوا کہ سوال بر محل اور بے محل کی مثال ایسی ہے جیسے گھر میں دروازہ سے داخل ہونا اور پشت کی طرف سے داخل ہونا۔ پس جس طرح گھر میں بغیر دروازہ کے آنا برا ہے اسی طرح سوال بے محل بھی برا ہے آگے فرماتے ہیں۔ وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا۔ اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ یعنی سوالات بھی بر محل کیا کرو بے محل سوال نہ کیا کرو۔ پس اس صورت میں وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ حکم عام ہوگا اس کو خاص اس واقعہ ہی سے تعلق نہیں ہو گا جو اہل جاہلیت میں رائج تھا کہ وہ حالت احرام میں دروازے سے گھر میں آنا برا سمجھتے تھے بلکہ ایک عام قاعدہ کا بیان ہوگا کہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کیا کرو جس میں وہ واقعہ بھی داخل ہو گیا اور تبجا اس کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ احرام میں غیر دروازہ سے آنا نیک کام نہیں پس

پہلی تفسیر پر تو وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا اور گھروں میں دروازہ سے داخل ہوا کرو۔ میں اہل جاہلیت کے خاص فعل کا حکم مذکور تھا اور دوسری تفسیر پر یہ حکم عام ہوگا اور میرا مقصود جس کو اس وقت بیان کرنا منظور ہے اس دوسری تفسیر پر تو آیت کا مدلول بلا واسطہ ہے۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مِنَ التَّقَىٰ وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص (حرام چیزوں سے) بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آوے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ)

شریعت کو ہر شے میں تصرف کا اختیار ہے

غرض یہ ثابت ہو گیا کہ مباحات میں بھی شریعت کو تصرف کا اختیار ہے چنانچہ اسی بناء پر ارشاد ہے وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا کہ گھر میں دروازہ سے آیا کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ امر عبادات کے متعلق نہیں بلکہ عادات کے متعلق ہے اور اس میں یہ تصرف کیا کہ بدوں حکم شرعی کے کسی عادت کو ناجائز اور کسی کو باعث ثواب نہ سمجھو۔ اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انتظام بھی مطلوب شرعی ہے ہر کام میں خواہ دینی کام ہو یا دنیوی۔ چنانچہ گھر میں پیچھے سے آنا خلاف انتظام ہے اس سے منع کیا گیا اور دروازے سے آنے کا امر فرمایا گیا۔ اس میں رعایت انتظام کی تاکید ہے مگر ایک تاویل پر تو قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ تعلیم کی گئی ہے وہ تاویل یہ کہ وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) میں بیوت عام ہو مقاصد کو اور ابواب عام ہوں ان طرق کو جو ہر عام کے لئے مقرر ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ سب کاموں کو ان کے طریقوں سے کیا کرو۔ اس میں گھروں میں دروازوں سے آنا بھی داخل ہے۔ اور ایک تاویل پر بطور قیاس کے اس پر دلالت ہوگی کہ جس طرح بیت میں باب سے داخل ہونا ایک انتظام ہے اسی طرح ہر مقصود میں اس کے طریق سے داخل ہونا ایک انتظام ہے۔

آیت کا محل

اس آیت کے دو محل ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس کا تعلق خاص رسم جاہلیت سے ہو جو حج کے متعلق تھی اور اس صورت میں ما قبل سے اس کا ارتباط ظاہر ہے دوسرا محل یہ کہ بطریق استعارہ کے اس میں مطلقاً ہر فعل کو صحیح طریق سے کرنے کی تعلیم ہو اور اس کا ربط ما قبل میں چاند سے متعلق اس طرح کہ لوگوں کو اپنے کاروبار کے لئے وقت کا اندازہ ہوتا ہے (یہ تو دنیوی نفع ہے اور حج وغیرہ کے اوقات معلوم ہوتے ہیں یہ دینی نفع ہے) تو علت کو چھوڑ کر حکمت بتلانے میں اس پر تشبیہ کر دی گئی کہ علت کا دریافت کرنا فضول ہے حکمت کو معلوم کرنا چاہیے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا اور گھروں میں پشت کی طرف سے آنا کچھ نیک کام نہیں بلکہ نیک کام تقویٰ کا اختیار کرنا ہے (پس اس کا تعلق ساتی سے یہ ہوا کہ سوال بر محل اور بے محل کی مثال ایسی ہے جیسے گھر میں دروازہ سے داخل ہونا اور پشت کی طرف سے داخل ہونا۔ پس جس طرح گھر میں بغیر دروازہ کے آنا برابر اسی طرح سوال بے محل بھی برابر ہے۔ آگے فرماتے ہیں وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا اور گھروں میں دروازہ سے آیا کرو۔ یعنی سوالات بھی بر محل کیا کرو بے محل سوال نہ کیا کرو۔ پس اس صورت میں وَأَتُوا الْبُيُوتَ

مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازوں سے آیا کرو) حکم عام ہوگا اس کو خاص اس واقعہ ہی سے تعلق نہیں ہوگا جو اہل جاہلیت میں رائج تھا کہ وہ حالت احرام میں دروازہ سے گھر میں آنا برا سمجھتے تھے بلکہ ایک عام قاعدہ کا بیان ہوگا کہ ہر کام کو اس کے طریقہ سے کیا کرو جس میں وہ واقعہ بھی داخل ہو گیا اور تب اس کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ احرام میں غیر دروازہ سے آنا نیک کام نہیں پس پہلی تفسیر پر تو وَ اَنْتُمْ اَلْبَيْوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا (گھروں میں دروازہ سے داخل ہوا کرو) میں اہل جاہلیت کے خاص فعل کا حکم مذکور تھا اور دوسری تفسیر پر یہ حکم عام ہوگا اور میرا مقصود جس کو اس وقت بیان کرنا منظور ہے اس دوسری تفسیر پر تو آیت کا مدلول بلا واسطہ ہے اور پہلے تفسیر پر چونکہ بواسطہ قیاس اس سے مستنبط ہوتا ہے اس لئے مدلول بواسطہ ہے اور وجہ قیاس اس ظاہر ہے کہ ایتان بیوت من الظهور (مکانوں میں پشت سے آنا) ایک بے موقع فعل ہے اور اس لئے مذموم ہے پس ہر فعل بے موقع مذموم ہوگا۔

اصل تقویٰ

پس معلوم ہوا کہ کوئی خاص تکلیف اپنی طرف سے اختراع کر کے برداشت کرنا تقویٰ نہیں ہے لیکن اس سے ان لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے جنہوں نے اپنے نفس کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں اس لئے کہ اول تو وہ حضرات حدب اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے پھر وہ بھی اس کو بطور علاج کے کرتے تھے عبادت اور ذریعہ قریب نہیں سمجھتے تھے ان کے مجاہدے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص گل بنفشہ پینے لگا کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برائے چندے چھوڑے کہ وہ اس دو اپنے اور ترک اطعمہ کو عبادت نہیں سمجھتا بلکہ ذریعہ حصول صحت سمجھتا ہے اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر پینے لگے تو وہ یقیناً گنہگار ہوگا اس واسطے کہ اس نے قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ اپنی طرف سے کیا اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے اگر اس میں غور کیا جائے تو پھر بدعت کے منع میں تعجب نہ ہو روزمرہ میں اس کی مثال دیکھئے اگر کوئی صاحب مطبع گورنمنٹ کے قانون کو طبع کرے اور اخیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کرے اور ملک سلطنت کے لئے بھی حد مفید ہو تب بھی اس کو جرم سمجھا جائے گا اور یہ شخص مستوجب سزا ہوگا پس جب قانون دنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہوگا تو اگر اس طرح سے کوئی گوشت وغیرہ کو ترک کرے گا تو بلاشبہ جرم ہوگا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے بخلاف اس وقت کے جہلاء کے کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور ذریعہ قریب سمجھ کر کرتے ہیں بہر حال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق کو ادا کرنا بھی ضروری ہے اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی ایک حد مقرر کر دی ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابی کا واقعہ ہے کہ وہ رات کو بہت جاگتے تھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو روکا آخر مقدمہ جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سلمان سچ کہتے ہیں اور یہ ارشاد فرمایا ان لنفسک علیک حقاً الخ غرض ایام جاہلیت میں لوگ مجملہ اور تکالیف کے ایک تکلیف اپنے نفس کو یہ بھی دیتے تھے خدا تعالیٰ اس کو فرماتے کہ اصل چیز تقویٰ ہے اس کو اختیار کرو اور گھر میں پس پشت سے آنا کوئی ثواب کا کام نہیں ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا اور یہ گولفظاً خاص ہے ایک ہی امر کو مگر معنایاً عام ہے ایسے امور کو جو اس کی نظیر ہوں وہ معنی مشترک

یہ ہیں کہ جس کام کا جو طریقہ ہے اسی طریقے سے اس کام کو کرو بے طریقے نہ کرو اور یہ مضمون عام ہے لہذا آیت میں معنی تعمیم ہو گئے اور جملہ ثانیہ و اتقوا اللہ الخ سے بدلات مطابقی بھی تعمیم ہو رہی ہے کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ جو بات تقویٰ پر مبنی نہ ہوگی گویا ہر اذہ موجب قربت نظر آئے گی وہ موجب کامیابی نہ ہوگی اور تمہارے ظہور ابواب سے بیوت میں داخل ہونا تقویٰ پر مبنی نہیں ہے لہذا یہ بھی اس کامیابی کا سبب نہیں جو تمہارا مقصود ہے کہ رضاء حق حاصل ہو اب آیت کا مضمون پیش نظر رکھ کر اپنی حالت کو دیکھئے کہ ہم اکثر کام ایسے ہی طریقے سے کرتے ہیں جس میں کامیابی نہیں ہوتی اور مراد اس وقت دنیا کے کام نہیں کیونکہ اسکی کامیابی کے طریقہ کا تعلیم کرنا ہمارا کام نہیں ہم سے یہی بہت غنیمت ہے کہ ہم دنیا کے کام کی اجازت دے دیتے ہیں اس وقت مجھے یہ شعر یاد آتا ہے جس میں اللہ دنیا کے اس انتظار کا جو کہ علماء سے کامیابی دنیا کا طریقہ بتلانے کے متعلق ان کو رہتا ہے جواب ہے کہتے ہیں

نہ شمم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم جوں غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

نہ تو میں شب ہوں اور نہ شب پرست ہوں جو خواب کی کہانی کہوں جب میں آفتاب کا غلام ہوں تو ساری باتیں آفتاب کی کہوں گا۔

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

جو کچھ ہم نے پڑھا ہے سب بھول گئے ہیں علاوہ حدیث یار کے کہ بار بار اس کو دہراتے ہیں۔

یعنی ہم کو خدا تعالیٰ کی باتوں کے سوا کچھ یاد نہیں رہا اور ہم دنیا کی باتیں کچھ نہیں جانتے اور اگر اب تک جانتے تھے تو اب بھول گئے غرض اس وقت گفتگو دین کے کاموں کے متعلق ہے کہ ان میں بھی وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہونے کے سبب اخروی کامیابی سبب نہ ہو۔

قاعدہ کلیہ

وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کام کرو اس میں یہ دیکھ لو ہم خلاف شرع تو نہیں کرتے یعنی دین کا جو کام کرو اس کا طریقہ کامیابی بھی دیکھ لو اور دنیا کا جو کام کرو اس میں بھی یہ دیکھ لو کہ یہ جائز ہے یا نہیں۔
وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا (اور اپنے آپ کو) اپنے ہاتھوں سے تباہی میں مت ڈالو۔

مجاہدین فی العبادات

فرمایا کہ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۝ یہ دلیل ہے مجاہدین فی العبادات کی کیونکہ ان کو تقلیل عبادت سے تکلیف و پریشانی ہوتی ہے۔

عشاق کا حال

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ اپنے بزرگوں کی تحقیقات اور علوم و معارف کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بڑے درجہ کے لوگ تھے اپنے زمانہ کے رازی اور غزالی تھے خصوصاً حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو فن تصوف کے امام اور مجتہد تھے۔ ایک

صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ اب اس زمانہ کے علماء میں رازی اور غزالی نہیں پیدا ہوتے تو میں نے کہا ان سے بڑھ کر موجود ہو سکتے ہیں۔ سب بزرگوں کے ملفوظات اور تحقیقات کو دیکھ لیا جائے معلوم ہو جائے گا۔ پھر حضرت حاجی صاحب کی ایک عجیب تحقیق کو نقل فرمایا وہ یہ کہ بعض اہل ظاہر کثرت عبادت پر نکیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ **وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ** کے خلاف ہے حضرت نے جواب میں فرمایا کہ اہل باطن اور عشاق کہتے ہیں کہ قلت عبادت ہمارے لئے اتقاء الی التہلکة ہے ہم کو اس سے تکلیف شدید ہوتی ہے۔ ہم اسی آیت سے اس کے خلاف پر استدلال کرتے ہیں یہ نمونہ ہے حضرت کے علوم اور معارف کا سبحان اللہ۔ (الافاضات الیومیہ جلد ہشتم)

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (اور جس کو دین کا فہم مل جائے اسکو بڑی خیر کی چیز مل گئی)

علم کا زیادہ حصہ غیر مکتسب ہے

فرمایا وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (بقرہ آیت ۲۶۹)

اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔

صیغہ مجہول سے مفہوم ہوتا ہے کہ زیادہ حصہ علم کا غیر مکتسب اور وہی ہے اور حکمت سے مراد دین کی سمجھ ہے۔

(ملفوظات حکیم الامت ۴۹)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ

عَرَاقٍ فَادْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوا كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ

كُنْتُمْ مِّنَ الضَّالِّينَ ﴿۱۷۶﴾

ترجمہ: تم کو اس میں (ذرا بھی) گنا نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس مزدلفہ میں قیام کر کے خدا کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے اور حقیقت میں تم اس سے قبل ناواقف ہی تھے۔

تفسیری نکات

حج اور تجارت

شبہ یہ ہے کہ اس حدیث سے تو زیادت مال کے حرص کی مذمت معلوم ہوتی ہے اور نص قرآنی سے اجازت معلوم ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ یہ آیت احکام حج کے متعلق ہے۔ جاہلیت میں لوگ حج کو ایک میلہ سمجھتے تھے۔ اس لئے حج کے زمانہ میں باہر کے لوگ تجارت کی نیت سے مکہ آیا کرتے

تھے جب اسلام آیا اور مسلمانوں کو خلوص کی تعلیم دی گئی تو صحابہ کوشبہ ہوا کہ شاید سفر حج میں مال تجارت کو ساتھ لے جانا خلاف خلوص ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس میں کچھ گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا رزق جو تفسیر ہے فضل کی طلب کرو جس میں تجارت کی بحالت حج کی اجازت دی گئی۔ حق تعالیٰ کی بھی کتنی بڑی رحمت ہے کہ خاص اپنے دربار کی زیارت کو آتے ہوئے بھی تجارت کی اجازت دے دی۔

بھلا اگر تم کسی بادشاہ یا ادنیٰ حاکم سے ملنے جاؤ اور ساتھ میں تجارتی مال بھی لے جاؤ تو اس کو یہ بات معلوم کر کے کتنا ناگوار ہوگا اس کے دل میں تمہاری اس ملاقات کی کچھ بھی وقعت نہ ہوگی۔ بلکہ کان پکڑ کے دربار سے نکال دیئے جاؤ گے کہ تم ہم سے ملنے نہیں آئے تھے بلکہ سوداگری کو آئے تھے مگر حق تعالیٰ نے اجازت دے دی کہ سفر حج میں تجارت کرنا گناہ نہیں۔ یہاں تو اباحت ہی ہے مگر قواعد فقہ سے ایک صورت میں یہ تجارت مستحب بھی ہے جب کہ یہ نیت ہو کہ اس سے رقم بڑھے گی تو سفر حج میں سہولت ہوگی۔ فقراء کی امداد کریں گے۔

رہا یہ کہ اس صورت میں خلوص ہوگا یا نہیں اس کے جواب میں تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو جس کی علامت یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ ہوتا جب بھی ضرورت حج کو جاتا۔ تو اس صورت میں خلوص محفوظ ہے اور ثواب حج بھی کم نہ ہوگا اور اگر حج اور تجارت دونوں کی نیت برابر درجہ میں ہے تو اس حالت میں تجارت جائز تو ہے مگر خلوص کم ہوگا۔ اور جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حج کے ساتھ ایک فعل مباح ہی کو منضم کیا ہے فعل حرام کو تو منضم نہیں کیا اور اگر تجارت اصل مقصود ہے اور حج تابع ہے تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص ریاکار ہوگا کیونکہ یہ مخلوق کو دھوکا دے رہا ہے کہ جاتا تجارت کے لئے ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ میں حج کو جا رہا ہوں۔

رہا یہ کہ اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو تو اس صورت میں مال تجارت لے جانا افضل ہے یا نہ لے جانا افضل ہے تو اگر ذرا ہر بقدر کفایت موجود ہی ہے بقدر کفایت نہیں اور نیت تجارت تابع ہے تو اس نیت سے کہ سفر میں سہولت و اعانت ہوگی مال تجارت لے جانا موجب ثواب ہے۔

اب اصل سوال کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں اور اس آیت میں تعارض کچھ نہیں۔ کیونکہ حدیث میں طلب معاش سے منع نہیں کیا گیا جو مدلول ہے آیت کا بلکہ انہماک اور زیادت حرص سے منع کیا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں طلب مال کی مطلقاً اجازت نہیں بلکہ اس قید سے اجازت ہے کہ وہ ابتغاء فضل کا مصداق بھی ہو اور ابتغاء معاش ابتغاء فضل میں اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب کہ اس میں ابتغاء رضا بھی ہو جس کا قرینہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ابتغاء فضل کے ساتھ بعض جگہ ذکر اللہ کو بھی بڑھایا ہے سورہ جمعہ میں فرماتے ہیں **وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ** واذکروا اللہ کثیراً۔ تو **وَاذْکُرُوا اللہ** کو بڑھانا بتلا رہا ہے کہ طلب معاش کو ابتغاء فضل جیسی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ساتھ ذکر اللہ ہو ورنہ وہ ابتغاء فضل نہیں بلکہ ابتغاء فضول ہے بلکہ طلب نقصان ہے اور جو شخص طلب معاش میں ابتغاء رضا کر رہا ہے وہ گناہ کا مرتکب نہیں بلکہ ثواب کا کام کر رہا ہے اور حدیث میں اس طلب کی ممانعت ہے جو حد سے تجاوز ہو۔ خوب سمجھ لو۔

سفر حج میں مال تجارت ہمراہ لے جانے کا حکم

فرمایا کہ سفر حج میں مال تجارت ساتھ نہ لے جانا بہتر ہے لیکن اگر زادراہ کم ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ میرا دل پریشان ہوگا اور نیت ڈگمگا جاوے گی قوت توکل نہ ہونے سے خدا تعالیٰ کی شکایت دل میں پیدا ہوگی تو مالی تجارت ساتھ لینے میں مضائقہ نہیں اور قرآن مجید میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَبِّكُمْ مِنْ أَذْنِ تِجَارَتٍ فِي الْحَجِّ کا اسی حکمت کے لئے ہے۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیے۔

تفسیری نکات

لفظ حسنہ کا مفہوم

بعض محرفین نے اس آیت میں حسنہ اول انگریزی سے منسوخ کیا ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ حسنہ کہتے ہی اچھی حالت کو اور اچھی حالت یعنی خوشحالی صرف انگریزی پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہوگا ہمیں بھی آخرت میں انگریزی والوں کا ساتھ نصیب ہو یہ محض تحریف ہے بلکہ یہاں حسنہ سے مراد اعمال حسنہ ہیں اور دونوں جگہ مراد ہیں مگر ایک جگہ باعتبار صورت کے اور ایک جگہ باعتبار حقیقت، نعماء جنت کی حقیقت یہی اعمال حسنہ ہیں اور اتنے فرق کا مضائقہ نہیں فرق تو ضروری کیونکہ نکرہ کے اعادہ میں مغائرت فی الجملہ لازم ہے۔ حسنہ سے اعمال حسنہ مراد لینے میں اور ایک جگہ صورت اعمال اور دوسری جگہ حقیقت اعمال سے تفسیر کرنے میں اتحاد کے ساتھ مغائرت فی الجملہ بھی موجود ہے دوسرے یہاں حسنہ سے دنیوی خوشحالی مراد لینا اس لئے بھی غلط ہے کہ آیت میں دنیا کو حسنہ کا ظرف بنایا گیا ہے اور ظرف و مظروف میں تغایر لازم ہے تو فی الدنيا حسنہ کا لفظ چاہتا ہے کہ وہ حسنہ دنیا سے مغائر ہے تو کلام کی تقدیر یہ ہوگی رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا - دنیا اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور دنیوی خوش حالی بھی دنیا ہی ہے وہ دنیا سے مغائر نہیں اس لئے تفسیر صحیح نہیں ہو سکتی پس انگریزی کو حسنہ کا مصداق بنانا بالکل غلط ہے یہاں تک دو قسمیں مذکور ہوئیں پہلی قسم کا مصداق تو کافر ہے اور دوسری قسم کا مصداق عام مومنین ہیں اور چونکہ سابق کلام بتلا رہا ہے کہ یہ تقسیم موقع حج ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اور عام آدمیوں میں بعض منافق بھی ہوں گے اس لئے تیسری قسم منافقین کی بھی ذکر کر دی گئی۔

وَلَا تَلْقُوا بِأَبْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو)

حضرات صوفیا کا استدلال

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرات چشتیہ کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کو سب غیر اللہ سے ذہول ہو گیا تھا ایک کے سوا سب کو فنا کر دیا تھا اس فنا کے غلبہ میں بعض اوقات بعض اہل ظاہر کو ان حضرات پر شبہ ہو گیا ہے خلاف شریعت عمل کرنے کا حالانکہ واقعی شان انکی بالکل اسکی صداق ہے۔ واصطنعتہ لنفسی یعنی اللہ نے تم کو اپنا لیا اس شبہ کی ایک مثال ہے کہ شدت شوق میں تمام شب جاگے اسکو اہل ظاہر نے خلاف سنت میں داخل کیا اور بدعت کہا حالانکہ حقیقی عشاق پر اعتراض کرنا ہی بدعت ہے گو بعض اہل ظاہر نے کثرت عبادت کو بدعت کہا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہیں وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ مگر وہ حضرات بھی اس ہی آیت سے استدلال کرتے ہیں ان کے لئے اسکا مدلول اسکا عکس ہے آیت وہی ہے وہ استدلال میں یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم کثرت سے عبادت نہ کریں تو ہلاک ہو جائیں تو تقلیل عبادت تہلکہ ہے کیسا عجیب اور لطیف استدلال ہے جسکا معترض کے پاس کوئی معقول جواب نہیں۔ یہ استدلال حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ سبحان اللہ۔ (الاقاضات الیومیہ)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي

قَلْبِهِ وَهُوَ الذُّخْمَانُ الضَّامِرُ ۚ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ

الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۚ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ

بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهَا جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْبِهَادُ ۚ

ترجمہ: اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزیدار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر بتاتا ہے اپنے دل کی بات پر حالانکہ وہ مخالفت میں شدید ہے۔ جب پیٹھ پھیرتا ہے تو اس فکر میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کرے اور کھیتیاں اور جائیں تباہ کرے اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو نخوت اس کو اس گناہ پر آمادہ کرتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے۔

تفسیری نکات

حق تعالیٰ کی رحمت عظیمہ

آگے چوتھی قسم بیان فرماتے ہیں جس کا مصداق مومن کامل ہے اور اس کو اس لئے الگ بیان فرمایا تاکہ پہلی صورت میں مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً کو کوئی مومن کامل مخصوص نہ کرے پس حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ مومن کامل کو مستقل بیان فرمادیا چنانچہ ارشاد ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُشِيرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ

وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ اور بعض آدمی وہ ہے جو اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کے لئے بیچ دیتا ہے اس میں دو قول ہیں کہ شراء سے یہاں کیا مراد ہے بعض نے بشری کو بشری کہا یعنی ومن الناس من يشتري نفسه من المهالك والمخاوف ایسا ہوگا جیسے بنسما اشتروا به انفسهم (وہ حالت بری ہے جس کو اختیار کر کے وہ جانوں کو چھڑانا چاہتے ہیں) میں اشتراء نفس مذکور ہے اس تفسیر پر ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض آدمی وہ ہیں جو (اعمال صالحہ کر کے) اپنے آپ کو خطرات اور خوفناک امور سے بچا لیتے ہیں مگر اس تفسیر میں اتنا بعد ہے کہ اشتراء تو اس چیز کا ہوتا ہے جو اپنے پاس نہ ہو اور جان تو اپنے پاس ہے گو اس جگہ کلام میں مجاز ہے مگر مجاز میں بھی قرب ہو تو بہتر ہے اور گو بیع کے معنی مراد لینے کے بھی مجاز ہے مگر وہ بعید نہیں کیونکہ بیع کے معنی مراد لینے کے مجاز صرف یہ ہوگا بیع میں طرفین سے مالیت ہوتی ہے اور یہاں نفس مال نہیں سو یہ مجاز تو دونوں صورتوں میں مشترک ہے باقی یہ بات بیع حقیقی کی باقی رہے گی کہ بیع ایسی چیز کی ہوتی ہے جو بائع کے پاس تھی اور وہ بعد بیع کے ثمن کا مستحق ہو جاتا ہے سو یہ بات یہاں متحقق ہے کیونکہ جان اپنے پاس تھی اب اس کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیع کر دیا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کی جان حق تعالیٰ کی ملک ہو جاتی ہے کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں رہا یہ کہ یہاں تو بیع کے بعد بھی ہماری جان ہمارے پاس ہی رہتی ہے سو یہ وجہ بعد نہیں کیونکہ تمام بیع کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بیع بائع کے قبضہ سے نکال دی جائے بلکہ بلا تسلیم بیع ہو جاتی ہے دوسرے یہاں تو تسلیم بھی متحقق ہے کیونکہ مومن کامل اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔

ایک آیت پر منطقی اشکال اور اس کا جواب

ارشاد فرمایا قرآن کریم میں ہے ولو علم الله فيهم خيرا لسمعهم ولو اسمعهم لتولوا وهم معرضون۔ منطقی قاعدے سے یہ قیاس کی شکل اول ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے ولو علم الله فيهم خيرا لتولوا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان میں کوئی بھلائی معلوم ہوتی تو یہ منہ پھیر کر بھاگتے حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ نتیجہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کہ جواب اس کا یہ ہے کہ مشکل اول کا نتیجہ جب صحیح نکلتا ہے جب حد اوسط مکرر ہو یہاں مکرر نہیں ہے کیونکہ لفظ اسمعہم جو مکرر آیا ہے وہ درحقیقت مکرر نہیں ہے کیونکہ ان دونوں لفظوں کے معنی الگ الگ ہیں کیونکہ پہلے جملے میں اسمعہم سے مراد وہ سماع ہے جو علم خبر کے ساتھ جمع ہوتا ہے یعنی سماع مقبول ومؤثر اور دوسرے جملے میں سماع سے وہ سماع مراد ہے جو علم خبر کے ساتھ جمع نہیں ہوتا یعنی صرف کانوں سے سنا اور دل میں کوئی اثر نہ لینا۔ اس لئے تقدیر عبارت دوسرے جملے کی یہ ہے ولو اسمعهم مع عدم علم الخیر لتولوا یعنی اگر اللہ تعالیٰ یہ جانتے ہوئے کہ ان کی حق بات سنانا مفید نہیں ہوگا پھر بھی سنا لیں تو وہ سننے کے باوجود منہ پھیر کر بھاگے لیکن جیسے آیت ولو شاء الله ما اشر كنا جو اہل جہنم بشور عذر کے کہیں گے یہ غلط ہوگا اور تقریباً یہی الفاظ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں ولو شاء الله ما اشر كوا۔ یہ غلط نہیں وجہ یہ ہے کہ شاء الله کا مفہوم دونوں جملوں میں الگ الگ ہے پہلے جملے میں مشیت معنی رضا سے یعنی اہل جہنم یہ عذر کریں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے شرک و کفر پر راضی نہ ہوتا تو ہم شرک کر ہی نہ سکتے تھے اور دوسرے جملے میں مشیت بمعنی

ارادہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اگر ارادہ یہ ہوتا کہ لوگ شرک نہ کریں تو انکو شرک کرنے کی قدرت ہی نہ ہوتی کیونکہ اللہ کے ارادہ پر کسی کا ارادہ غالب نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر اللہ کے ارادہ کے دنیا میں نہ کوئی اچھا کام ہو سکتا ہے نہ برا۔ البتہ رضا اللہ تعالیٰ کی اچھے کاموں کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔ برے کاموں سے رضا متعلق نہیں ہوتی بلکہ برے کاموں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ

(ترجمہ) (اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزے دار معلوم ہوتی

ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر بتاتا ہے وہ آپ کی مخالف میں نہایت شدید ہے)

اعتبار عموم الفاظ

اس پر نظر کر کے تو تفسیر آیت کی یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ نے یہاں تقسیم کی ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو معجب بالحوۃ الدنیا ہے۔ دوسرے وہ جو حیات دنیا کو ابتغاء رضا الہی میں بیچ کر چکا ہے۔ اس کا بیان وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُشِيرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ النِّعِ فِيهَا ہے اور اس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ وہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ النِّعِ یہ آیت مع اپنے توابع کے ایک منافق کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس کا نام غالباً انھیں تھا۔ گو حکم مذکور میں اس کی تخصیص نہیں بلکہ جو بھی ویسا ہو اس کا وہی حکم ہے جو یہاں بیان ہوا ہے۔

جو لوگ استرسال نفس کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں وہ تخصیص شان نزول سے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ جہاں کسی فعل شنیع پر وعید نظر آئی انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ تو فلاں شخص یا فلاں جماعت کے بارہ میں نازل ہوئی ہے ہم سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ مگر خدا جزائے خیر دے اصولیین کو کہ انہوں نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہے خصوص سبب نزول کا اعتبار نہیں پس جہاں کسی فعل پر کوئی وعید عموم الفاظ کے ساتھ وارد ہوگی یا کوئی حکم مرتب ہوگا اس کو عام ہی کہا جائے گا۔ مورد کے ساتھ خاص نہ کیا جائے ورنہ چاہیے کہ لعان کا حکم حضور ﷺ کے بعد نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کا نزول ایک خاص واقعہ میں ہوا ہے مگر خود حضور ﷺ نے بھی اس واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ میں اس حکم کو جاری کیا ہے اور خلفاء نے بھی ہمیشہ اس کو جاری رکھا ہے اسی طرح یہاں رکھا جائے گا کہ گو نزول آیت کا ایک خاص منافق کے باب میں ہے مگر حکم اسی کے ساتھ خاص نہیں۔ شان نزول صرف محرک نزول ہو جاتا ہے مقصود اصلی وہی نہیں ہوتا۔

لسانی کا طبعی اثر

غرض وہ منافق بڑا لسان تھا ایسا کہ کبھی کبھی حضور ﷺ پر بھی طبعاً اس کی لسانی کا اثر ہو جاتا تھا۔ اسی لئے تو بعجبک قولہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ باوجود یہ کہ حضور ﷺ ایسے عاقل تھے۔ کہ میں آپ ﷺ کے عاقل ہونے پر ایک لطیفہ بیان کیا کرتا ہوں وہ یہ کہ مسلمان تو آپ ﷺ کو عاقل مانتے ہی ہیں وہ تو غلام ہیں اپنے آقا کو اچھا کہیں ہی گے اور جتنا کچھ کہیں تھوڑا ہے مگر لطیفہ یہ ہے کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ آپ ﷺ کو عاقل مانتے ہیں کیونکہ اس کا اقرار کفار کو بھی ہے۔ حضور ﷺ نے تھوڑی سی مدت میں اتنے بڑے بڑے کام کئے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا۔ عرب کے جاہلوں کو تھوڑے ہی دنوں میں ایسا شائستہ اور مہذب بنا دیا کہ تمام تعلیم یافتہ قومیں ان کے سامنے پست ہو گئیں پھر اس کے ساتھ

قواعد متعلقہ معاش و معاد ایسے مہمہ کئے جن کی نظیر نہیں مل سکتی یہ سب باتیں کفار کو تسلیم ہیں مگر ہم تو حضور کو محض سلطان نہیں کہتے بلکہ نبی بھی کہے ہیں اور ان فیوض و شرکات کو تائید من اللہ اور نبوت کی برکت سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ محمد عربی ﷺ کو نبی نہیں مانتے وہ حضور کے ان سب کارناموں کو آپ کی عقل سے ناشی سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ محمد عربی ﷺ بہت بڑے عاقل انسان تھے۔ کہ تھوڑی سی مدت میں آپ نے ایسے ایسے کام انجام دیئے تو وہ آپ ﷺ کو ہم سے زیادہ عاقل مانتے ہیں کہ جو کام ہمارے نزدیک خدا کے کرنے کا تھا۔ ان کے نزدیک وہ حضور ﷺ کی عقل کا نتیجہ ہے غرض حضور ایسے عاقل تھے کہ موافق و مخالف سب کو آپ کا عاقل کامل ہونا مسلم ہے مگر وہ منافق ایسا لسان تھا کہ حضور ﷺ جیسے عاقل پر بھی اس کی لسانی کا طبعاً اثر ہو جاتا تھا۔ طبعاً اس لئے کہا کہ عقلاً آپ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا کیونکہ عاقل دھوکہ نہیں کھایا کرتا۔ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تفسیر موجود ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَنْ لَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَهُمْ قُلُوبَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ
بِسِيئَتِهِمْ وَلَكُنْ عَرَفْتَهُمْ فِي سِنِّ الْقَوْلِ

ترجمہ: جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا اور ہم تو اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتہ بتلا دیتے۔ سو آپ ان کو جلیہ سے پہچان لیتے اور آپ ان کو طرز کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے۔

عقلاً آپ ﷺ کو ہرگز دھوکہ نہیں ہو سکتا

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا۔ طرز کلام سے آپ ہر شخص کو پہچان لیتے تھے کہ یہ مومن ہے یا منافق۔ سچا ہے یا جھوٹا کیونکہ ولتعرّفنہم میں لام تاکید اور نون تاکید کے ساتھ کلام کو مؤکد کیا گیا ہے یعنی آپ ضرور پہچان لیں گے۔ پس عقلاً آپ کو ہرگز دھوکہ نہ ہوتا تھا اور یہاں جو فرمایا ہے يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا اس سے طبعی اثر مراد ہے کہ آپ پر اس منافق کی لسانی کا طبعاً ایک گونہ اثر ہو جاتا تھا اور یہ بشری خاصہ ہے کہ فصیح و بلیغ زور دار کلام سے تھوڑی دیر کے لئے انسان ضرور متاثر ہو جاتا ہے (جیسے کوئی شاعر عمدہ غزل سنا دے تو سننے والا ضرور متاثر ہوتا ہے) گو اس سے عقلاً دھوکہ نہیں ہوتا کیونکہ جانت ہے کہ شاعر مبالغہ بہت کیا کرتے ہیں اسی طرح کوئی بلیغ آدمی زور دار تقریر کرے تو کلام کا اثر تھوڑی دیر کے لئے ضرور ہوگا گو یہ بھی جانتے ہوں کہ یہ شخص جھوٹی باتیں بہت بنایا کرتا ہے اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ ان من الشعر لحكمة و ان من البيان لسحرا۔ پس اب دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا ایک میں طبعی تاثر کا اثبات ہے دوسری میں عقلی تاثر کی نفی ہے۔

آثار طبعیہ

اور یہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے ان آثار طبعیہ و لوازم بشریہ کو ظاہر کر دیا تاکہ آپ پر الوہیت کا شبہ نہ ہو۔ گو بعض جہال نے اس پر آپ کو الوہیت تک پہنچا دیا ہے بلکہ اب تو جہلاء نے

حضرت غوث اعظمؒ کو بھی الوہیت پر پہنچا رکھا ہے۔

يُغِيْبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزیدار معلوم ہوتی ہے)

آرام دہ اشیاء

آجکل کی باتیں لوگوں کی چکنی چپڑی تو ضرور ہوتی ہیں مگر ان میں نور نہیں ہوتا اور ان حضرات کے کلام میں ایسا نور ہوتا ہے گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آفتاب نکل آیا آخراً مقبولین اور غیر مقبولین میں کوئی فرق تو ہونا ہی چاہیے مگر اس نور کے اور اک کے لئے بصیرت کی ضرورت ہے کیونکہ بعض اوقات ظاہراً باطل میں آ ب دتاب ہوتی ہے اور حق میں ظاہراً کم رونق اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کبھی پیشاب صاف ہوتا ہے اور پانی بمقابل اس کے گدلا ہوتا ہے اسی طرح مقبولین اور غیر مقبولین کے اقوال و افعال میں جو فرق ہوتا ہے وہ صورت کا نہیں ہوتا بلکہ بعض مرتبہ صورت غیر مقبولین کا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے الفاظ نہایت بڑے بڑے اور چست ہوتے ہیں۔ يُغِيْبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس کی دلیل ہے بلکہ ان میں فرق جو ہوتا ہے وہ حقیقت کا ہونا ہے جیسے میں نے پیشاب اور پانی کی مثال بیان کی۔ پیشاب ہے صاف مگر ہے ناپاک۔ پانی گدلا ہے مگر ہے پاک۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ

رَعُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ: اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہے۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے شدت محبت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ۔ یعنی لوگ مختلف ہیں اوپر کئی قسم کا بیان ہو چکا انہی میں سے ایک قسم یہ ہے کہ بعضے بیچ دیتے ہیں اپنے آپ کو حق تعالیٰ کی مرضی کی تلاش میں بیچ ایک امر ہے جس کا تحقق بدلیں سے ہوتا ہے جب ایک طرف سے اپنے نفس کو بیچ کی تو دوسری طرف سے بھی عوض ہوگا جس کا بیان اس جملہ میں واللہ روف بالعباد یعنی حق تعالیٰ بڑے مہربان ہیں بجائے تصریح عوض کے یہ مضمون لایا گیا جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے عوض ہوگا جو حق تعالیٰ کے شانِ رافت کے مناسب ہوگا جس کا ترجمہ ہے شدت رحمت حق تعالیٰ کی رحمت اگر خفیف ہی ہو تو بہ بھی بہت ہے چہ جائیکہ شدید ہو اور الف لام العباد میں یا تو عہدی ہے اس کے معنی یہ ہونگے کہ حق تعالیٰ ایسے بندوں کے ساتھ شدت رحمت سے محبت کرنے والے ہیں اور اگر جنس کا بھی لیں تب بھی ظاہر ہے کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ عام طور سے بندوں کے ساتھ مہربان ہیں اس سے التزاما نکلتا ہے کہ ایسے خاص بندوں کے ساتھ تو اولی رافت کا برتاؤ کریں گے معلوم

ہوا کہ ادھر سے عوض وہ چیز یہ عطا ہوگی جس سے اس بدل کو کچھ مناسبت ہی نہیں پھر یہ نہیں کسی عوض کی نہ معلوم کیا عطا ہوگا بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عدم کی وجہ یہ ہے کہ وہ عوض سمجھ میں آنے کی چیز نہیں کہ اس کا بیان کیا جاوے پس بد لین میں کچھ مشابہت اور مناسبت ہی نہیں ہوگی جن کی نسبت کہا ہے شعر

چند دادم جاں خریدم چند پیسوں میں جان خریدی ہے
بنام ایزد عجب ارزاں خریدم خدا کی قسم بڑی سستی خریدی ہے

یہی معاملہ حق تعالیٰ کا ہے اس وقت کے مال کے یعنی لذات کے مشتری بنتے ہیں مگر جتنا لیں گے اس کا عوض نہیں بلکہ اضعافاً مضاعفہ اور ہزاروں گنا زیادہ دیں گے محبت میں ظاہر ہیں۔

ہرگز نمیر و آنکہ دلش زندہ شد بعشق مثبت است بر جریدہ عالم دوا ما

یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی زندگی حاصل ہوگی وہ اگر مر بھی جائے تو واقعہ میں اس کو زندہ کہا جائے۔

نیم جاں بستاند صد جاں دہد آنکہ دروہمت نیاید آں دہد

فانی اور حقیقت جان لیتے ہیں اور اسکے بدلے باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم گماں میں بھی نہیں ہوتا عنایت کرتے ہیں۔ غرض یہ بیع بھی فرض ہے اور درحقیقت عطا ہی عطا ہے۔ بہر حال فرماتے ہیں کہ بعض لوگ وہ ہیں جو بیچتے ہیں اپنی جان کو ابتغاء مرصاة اور اس کے دام ادھر سے کیا ہیں۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعَبَادِ۔ اپنے بندوں کے ساتھ بہت ہی مہربان ہیں۔ ترجمہ آپ نے فرمایا میں بتاتا ہوں وہ یہ کہ وہ انتہائی مرتبہ کیا ہے جس کا اس آیت کو میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا پس جان لو کہ سلوک جس کا یہ مسئلہ ہے اس کے ماہرین اور محققین نے اکثر علامات اعمال باطنہ میں ترتیب کا حکم کیا ہے اور ان مقامات کی مثال درسیات کے سبق کی سی ہے کوئی سبق تو ایسا ہے کہ اس میں اور اسباق میں ترتیب ضروری ہے جیسے الف بے اور سپارہ کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ الف بے کو سپارہ پر مقدم نہ کیا جاوے اور بعضے سبق ایسے ہیں جو کئی کئی ہو سکتے ہیں جیسے کافیہ اور قطبی لوگ اس فن سے چونکہ بالکل نا آشنا ہو گئے ہیں اس واسطے قاعدہ اور طریقہ جانتے نہیں جو چال سمجھ میں آ جاتی ہے اختیار کر لیتے ہیں اور مدتوں پریشان رہتے ہیں اور کچھ بھی نہیں جیسے کوئی یہ نہ جانتا ہو کہ الف بے اور سپارہ میں ایک ضروری ہے اور وہ بلا الف بے پڑھے سپارہ شروع کر دے ایک حصہ عمر کا گزار دے مگر سپارہ میں کما حقہ کامیاب نہ ہوگا جبکہ اس کو ایک شخص ترتیب سے پڑھے تو اس کو اتنی محنت کرنی پڑے گی نہ اتنا وقت صرف ہوگا اور کامیاب بھی ہو جاوے گا دوسرے کے نزدیک سپارہ اس قدر مشکل چیز ہے کہ اس کے پڑھنے میں وقت بھی بہت زیادہ صرف ہو گیا اور دماغ بھی خالی ہو گیا اور کچھ بھی نہیں آرام سے پڑھا اور وقت زیادہ لگا اور کامیابی بھی خاطر خواہ ہوئی یہ طریقہ اچھا ہے۔

بیع کا مفہوم

اس میں دو قول ہیں ایک ثراء سے یہاں کیا مراد ہے بعض نے بشری کو بمعنی مشتری کہا ہے یعنی وَ مِنْ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ مِنَ الْمَهَالِكِ وَالْمَخَافِ اَوْ يَبِئْسَ مَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ فِيْ سِوَا نَفْسٍ مَّذْكُوْرَةٍ اس تفسیر پر ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض آدمی وہ ہیں جو (اعمال صالحہ کر کے) اپنے آپ کو خطرات اور خوفناک امور سے خرید لیتا ہے یعنی بچا لیتا ہے مگر اس تفسیر میں اتنا بعد ہے کہ اشتراء تو اس چیز کا ہوتا ہے جو اپنے پاس نہ ہو اور جان تو اپنے پاس ہے

گو اس جگہ کلام میں مجاز ہے مگر مجاز میں بھی قرب ہو تو بہتر ہے اور گو بیع کے معنی مراد لینے میں بھی مجاز ہے مگر وہ بعید نہیں کیونکہ بیع کے معنی مراد لینے میں مجاز یہ ہوگا کہ بیع میں طرفین سے مالیت ہوتی ہے اور یہاں نفس مال نہیں سو یہ مجاز تو دونوں صورتوں میں مشترک ہے باقی یہ بات بیع حقیقی کی باقی رہے گی کہ بیع ایسی چیز ہوتی ہے جو بائع کے پاس تھی اور وہ بعد بیع کے ثمن کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات یہاں متحقق ہے کیونکہ جان اپنے پاس تھی اب اس کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیع کر دیا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کی جان حق تعالیٰ کی ملک ہو جاتی ہے کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

رہا یہ کہ یہاں تو بیع کے بعد بھی ہماری جان ہمارے پاس ہی رہتی ہے سو یہ وجہ بعید نہیں کیونکہ تمام بیع کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بیع بائع کے قبضہ سے نکال دی جائے بلکہ یہ بیع بلا تسلیم بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہاں تو تسلیم بھی متحقق ہے کیونکہ تسلیم کے لئے دوسرے کے قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو قادر کر دینا کافی ہے جس کو فقہا تخلیہ سے تعبیر کرتے ہیں پس مومن کامل اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اس پر ہر طرح قادر ہیں اب یہ ان کی عنایت ہے کہ وہ بیع کو ہمارے ہی پاس امانت چھوڑ دیں۔ غرض بشری نفسہ میں بیع کے معنی بعید نہیں ہیں البتہ مالیت کے اعتبار سے مجاز ضرور ماننا پڑے گا۔

ہاں ایک اشکال یہ ہوگا کہ جیسے اشتراء میں مشتری وہ شئی ہوتی ہے جو پہلے سے اپنے پاس نہ ہو ایسے ہی بیع وہ شئی ہوتی ہے جو پہلے سے مشتری کی ملک نہ ہو اور ہماری جان تو پہلے ہی سے حق تعالیٰ کی ملک ہے جو اب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے مگر چونکہ ہم اس کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اس لئے ہمارے زعم کے موافق بیع کا اطلاق صحیح ہے اور جو لوگ اپنی جان کو خدا کی ملک سمجھتے ہیں ان کو یہ علم کرمی طہین جان کو اپنی ملک سمجھتے ہیں بعد سماع لفظ بیع کے حاصل ہوا ہے پہلے حاصل نہیں ہوا۔ ابن عطاء کا قول ہے **إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ** کون کر عوام تو خوش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلہ میں ہماری جانیں خرید لی ہیں ہم کو اس کے عوض جنت ملے گی مگر خواص شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے کہ ہمارے اندر دعویٰ مالکیت تھا جسے تو اشتراک فرمایا اس سے میرے جواب کی تائید ہو گئی کہ یہاں ہمارے مذاق کی رعایت کی گئی ہے پس راجح یہی ہے کہ بشری نفسہ میں بیع مراد ہے میں نے اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ بعض وہ لوگ جو طلب رضا الہی کے لئے اپنی جان (تک) بیع دیتے ہیں یہ تک میں نے اس لئے بڑھایا ہے کہ شان نزول اس آیت کا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو آ رہے تھے راستہ میں کفار نے گھیر لیا تو انہوں نے کہا تم جانتے ہو کہ میں کیسا تیر انداز ہوں (تیر اندازی کے فن میں یہ بہت مشہور تھے) اگر مقابلہ کرو گے تو میں تیروں سے سب کو مار ڈالوں گا باقی اگر تم کو مال کی ضرورت ہو تو مکہ میں میرا مال بہت ہے لاؤ میں تم کو رقعہ لکھ دوں تم جا کر میرے وکیل سے مال لے لو۔ کفار نے اسی کو غنیمت سمجھا کیونکہ مقابلہ میں ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا چنانچہ انہوں نے رقعہ لکھ دیا اور وہ سب واپس چلے گئے۔ سو یہاں تو حضرت صہیب نے جان بچائی تھی اور جان بچانے کو مال دیا تھا جان دی نہیں تھی سو شان نزول کو دیکھ کر معنی بیع پر اشکال ہوتا ہے کہ واقعہ نزول میں جان کی بیع کہاں ہوئی تھی بلکہ وہاں تو جان کو بچایا گیا تھا (اسی وجہ سے بعض مفسرین نے بشری نفسہ کو تفسیر بشری نفسہ من المہالک والمخاوف کی ہے) مگر میں نے لفظ تک بڑھا کر اشکال کو رفع کر دیا ہے کہ گو حضرت صہیب نے اس واقعہ میں بظاہر مال ہی دیا تھا مگر حقیقت

میں وہ اپنی جان تک کو اللہ کی رضا کے لئے بیچ کر چکے تھے جس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تن تنہا ہجرت کے لئے چل کھڑے ہوئے اور یہ وہی کر سکتا ہے جو اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کر چکا ہو کیونکہ کفار کے نرغہ میں سے تن تنہا ہجرت کر کے نکلنا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چلنا ہے پھر یہ تو ایک اتفاقی بات تھی کہ کفار مال لینے پر راضی ہو گئے اگر وہ مقابلہ پر آمادہ ہوتے تو حضرت صہیبؓ اللہ کے لئے جان دینے پر بھی تیار تھے اور اس کے لئے تیار ہو کر ہی نکلے تھے شاید کوئی یہ کہے کہ حضرت صہیبؓ مقابلہ کرتے تو واقعی کمال تھا یا مال کو صدقہ کرتے تو یہ بھی ایک کمال تھا باقی جان بچانے کو مال دے دینا کیا بڑا کمال ہے یہ تو ہر شخص کیا کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ کہ دوسرے تو جان بچاتے ہیں اپنی جان کی محبت سے اور حضرت صہیبؓ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان بچائی تھی جیسا کہ ابتغاء مرضاة اللہ سے معلوم ہو رہا ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ وَإِذْ كَرِهَ اللَّهُ فِي آبَائِهِمْ تَعْدُدَ فِي مَن تَعْبَلُ فِي يَوْمَئِذٍ فَلَا لِأَنفُسِهِمْ عَلَيْهِمْ وَأَمَّن تَأَخَّرَ فَلَا أَلَمَ عَلَيْهِمْ لَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَتَقَىٰ اللَّهَ ۗ وَأَعْلَمُوا أَنكُمُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۗ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ ۗ وَهُوَ الَّذِي خَصَّصَ لِي الْأَرْضَ وَإِذَا تُؤَلَّىٰ سَئِئًا فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ ۗ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهَا جَهَنَّمُ ۗ وَلَيْسَ الْبِهَادُ ۗ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ۗ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا خُلْتُمْ فِي السِّلَعِ كَآلِفَةً ۗ وَلَا تَكُونُوا خُطُوبَ الشَّيْطَانِ ۗ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۗ

ترجمہ: سو بعض آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں دے دیجئے اور ایسے شخص کو آخرت میں کوئی حصہ نہ ملے گا اور بعض آدمی ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچائیے ایسے لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا ان کے اس عمل کی بدولت اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کوئی روز تک پھر جو شخص دودن میں جلدی کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو شخص دو دن میں تاخیر کرے اس پر بھی گناہ نہیں اس شخص کے واسطے جو ڈرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور خوب یقین کرو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو صرف دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزیدار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر مانتا ہے اپنے دل کی بات پر حالانکہ وہ سخت جھگڑا لو ہے۔ اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوزخ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کرے اور تباہ کر دے کھیتیاں اور جانیں اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتے۔ اور جب اس سے کوئی کہتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو نخوت اس کو اس گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے اور بعض آدمی ایسا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کر ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بقدم مت چلو واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

مکلف کی دو قسمیں ہیں

مومن اور کافر اور ان میں سے ہر ایک دو دو قسم پر ہے تو چار قسمیں ہوتیں۔ خلاصہ یہ کہ ایمان اور کفر کے اعتبار سے مکلف کی چار قسمیں ہیں یہ مضمون ان آیات کے بعض اجزاء میں مذکور ہے جہاں جہاں لفظ من ہے وہاں ایک ایک قسم ہے اس بیت میں تین جگہ من ہے اور ایک جگہ منہم ہے اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ کہیں من مظہر پر داخل ہے اور کہیں مضمہر پر اور معنی من الناس اور منہم کے ایک ہی ہیں۔ غرض چار قسمیں کی گئی ہیں۔ مقسم وہی مکلف ہے باعتبار ایمان اور کفر کے تقسیم اول یہ ہے کہ مکلف یا مومن ہے یا کافر اور دونوں کی دو دو قسمیں ہیں۔ توکل قسمیں یہ ہوتیں مطلق مومن اور مطلق کافر اور کافر شدید اول مطلق مومن اور مطلق کافر کا بیان ہے اور ان دونوں میں سے مقدم ہے کافر کا بیان اور اس کے بعد بطور مقابلہ مومن کا بیان مطلق کافر کا بیان یہ ہے **فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا** یعنی ایک قسم ان میں سے وہ لوگ ہیں جو صرف دنیا کے طالب ہیں ان کی نسبت ارشاد ہے۔ **مآلہ فی الآخرة من خلاق آخرت میں ان کا کچھ بھی حصہ نہیں یہاں نگرہ ہے بعد نفی کے جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ذرا بھی حصہ ان کے واسطے آخرت میں نہیں ہوگا اس میں کافر کی ایک حالت تو دنیا کی بیان ہوئی اور ایک آخرت کی جو کہ دنیاوی حالت پر بطور نتیجہ مفترع ہے اور مومن کا ذکر گواہ کے صریح آتا ہے۔**

مطلق مومن کا شان

مگر اتنی بات یہیں سے معلوم ہو سکتی ہے کہ جب مومن کافر کا مقابل ہے تو اس کی دنیاوی حالت اس کی دنیاوی حالت کے مقابل ہوگی اور اخروی اور اس کی اخروی کے مقابل ہوگی یعنی مطلق مومن کی شان یہ ہوگی خواہ وہ فاسق و فاجر ہی کیوں نہ ہو کہ نہ تو وہ دنیا میں محض دنیا کا طالب ہوگا اور نہ آخرت میں اس کے واسطے **مآلہ فی الآخرة من خلاق** ہوگا۔

مومن کے لئے خلود فی النار نہیں

یعنی ہر مومن کی نجات ضرور ہے گواخیر میں ہو اور اولاً جزا اور سزا اعمال کی بھگتی پڑے چنانچہ حدیث میں اس معنی کی تصریح موجود ہے **لا یسقى فی النار من کان فی قلبه مقال ذرة من ایمان** (نہیں باقی رہے گا دوزخ میں کوئی ایسا شخص جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہو) کہ دوزخ میں کوئی وہ شخص نہیں رہے گا۔ دوزخ اس کے رہنے کا مکان نہیں ہے۔ مکان اصلی اس کا جنت ہے مگر بعارض دوزخ میں آ گیا ہے غرض جس کے دل میں ذرہ سا بھی ایمان ہے جس کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہہ سکیں اس کے واسطے بھی جنت ثابت ہے اور خلود فی النار نہ ہوگا اور کبھی نہ کبھی دوزخ سے نکال لیا جائے گا حتیٰ کہ اس قدر ضعیف اور قلیل الایمان شخص بھی جس کے دل میں اس قدر تھوڑا حصہ ایمان کا ہوگا جس کا پتہ انبیاء اور ملائکہ کو بھی نہ لگے گا اور اس کی اطلاع فقط اللہ تعالیٰ کو ہوگی وہ بھی نکال لیا جاوے گا چنانچہ ایک حدیث ہے جو شفاعت کے بارہ میں وارد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ اخیر میں فرمائے گا کہ سب لوگ شفاعت کر چکے انبیاء بھی اور ملائکہ بھی اور مومنین بھی۔

حدیث شفاعت میں ایک لطیف تحقیق

اور جس جس کو شفاعت کا حق تھا سب کر چکے یہ لفظ ہے حدیث کا کہ بقی ارحم الراحمین یعنی اب شفاعت حق تعالیٰ کی باقی رہی اس کو شفاعت مجازاً فرمایا۔ دراصل تو رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو کسی دوسرے سے سفارش کرنا نہیں ہے۔ یہ فرما کر ایک لپ پھر کر دوزخیوں کی جنت میں داخل کر دیں گے۔ یہ لپ بھر کرنا یہ ہے تعداد کثیر سے۔ اس حدیث میں غور کرنا یہ ہے کہ تھوڑے تامل سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ اس سے میرے اس دعوے کا اثبات ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے قلب میں اتنا ضعیف ایمان ہوگا جس کا پتہ کسی شفاعت کرنے والے کو حتیٰ کہ انبیاء اور ملائکہ کو بھی نہ چلے گا اور ان کو بھی نجات ہوگی۔ یہ بات ذرا غامض معلوم ہوتی ہے مگر تھوڑی تقریر کے بعد غامض نہ رہے گی وہ تقریر یہ ہے کہ نص قطعی موجود ہے اس پر کہ کافر کی کبھی مغفرت نہ ہوگی۔ چنانچہ سورہ بینہ میں ہے إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا (جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے) اور اس مضمون کی آیتیں صد ہا قرآن شریف میں موجود ہیں چنانچہ عقیدہ اہل سنت کا یہی ہے کہ کافر کے لئے خلود فی النار ضرور ہوگا اور اس کی کبھی مغفرت نہ ہوگی تو اب یہ لوگ جن کو حق تعالیٰ نے اخیر میں دوزخ سے نکالا وہ اس دلیل سے مومن تو ضروری ہیں تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کسی نے ان کی سفارش کیوں نہیں کی مومنین کے لئے سفارش کی اجازت ہو چکی اس کی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہی کہ یہ لوگ اس قدر ضعیف الایمان ہوں گے کہ کسی کو ان کے ایمان کا احساس نہ ہو سکے گا باوجودیکہ سب حدید الہصر ہیں مومن کے لئے حدیث میں وارد ہے اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله یعنی مومن کے تاز لینے سے ڈرو کیونکہ وہ نور خدا سے دیکھتا ہے۔ غرض کسی مومن پر مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ۔ صادق نہیں آ سکتا یہ شان صرف کافر کی ہے۔

کافر کی دو حالتیں

تو کافر کی حالتیں دو ہوئیں دنیا میں یہ کہ وہ فقط طالب دنیا ہو اور آخرت میں یہ کہ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ کا مصداق ہو اب سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

کفر ذرا سا بھی موجب خلود فی النار ہے

اس جزو آیت میں یعنی فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ میں مطلق کافر کا ذکر ہے اور اس کے درجات کا بیان نہیں کیونکہ ضعیف سے ضعیف کفر کا بھی یہ حکم مشترک ہے کہ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ یعنی آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہرگز اس کی نجات نہیں ہو سکتی اور راز اس میں یہ ہے کہ کفر اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس درجہ قبیح ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی خوبی موثر نہیں کہ اس پر کوئی حصہ آخرت میں اس کو ملتا اور وہ حقیقت بغاوت ہے جس کا یہ اثر مسلم ہے۔

غرض یہ شبہ محض بے اصل ہے کہ کافر کی کسی خوبی کا اعتبار کفر کے ہوتے ہوئے ہو سکتا ہے کافر کے واسطے چاہے وہ تمام اوصاف کا مجموعہ ہو عقلاً یہی حکم ہونا چاہیے کہ اس کی سب خوبیاں بے سود ہیں اور نتیجہ یہی ہے کہ مَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ بعض لوگ انکار تو حید پر تو اس سزا کے ترتب کو موافق عقل کے سمجھتے ہیں مگر انکار رسالت پر شبہ کرتے ہیں کہ مقصود اعتقاد رسالت سے بھی اعتقاد تو حید ہی ہے کہ انبیاء اسی واسطے آگے ہیں پس جب مقصود حاصل ہے تو طریق کے انکار سے کیا ضرر پس اصل دین یعنی تو حید اس میں موجود ہے محض ایک رسالت کے متعلق اس کا خیال غلط ہے سو یہ غلطی ایسے شخص کو معاف ہونا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ منکر تو حید کی نسبت تو اس سزا کا استحقاق تم کو بھی مسلم ہے صرف منکر رسالت کے بارے میں شبہ ہے سو ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ جو شخص منکر رسالت ہو گا وہ منکر تو حید بھی ہو گا پس اب منکر رسالت کے استحقاق پر بھی شبہ نہ رہا۔ غرض یہ جزو آیت کا یعنی مَالَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ مطلق کافر کی شان میں ہے۔

مکلفین کی دوسری قسم

دوسری قسم مکلف کی اس دوسرے جملہ میں ہے وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک گروہ آدمیوں کا وہ ہے جو کہتا ہے اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی نیکی دیجئے اور آخرت میں بھی۔ ترجمہ ہی سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مومن مطلق کی شان میں ہے کیونکہ اعتقاد آخرت ہر مومن میں مشترک ہے۔

آیت فی الدنيا حسنة سے ترقی دنیا مراد نہیں

اور یہاں ایک بات پھر یاد آئی کہ اس آیت کو آج کل کے تعلیم یافتہ بہت پڑھتے ہیں اور اپنا ایک مدعا اس سے ثابت کرتے ہیں وہ مدعا کیا ہے ترقی دنیا کہتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم تو یہ ہے کہ آخرت کی ترقی کے ساتھ دنیا میں بھی ترقی کرو اور خشک مغز مولوی دنیا کی ترقی کو بالکل روکتے ہیں یاد رکھئے کہ آیت ہی میں اس کا جواب موجود ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے من الدنيا حسنة نہیں فرمایا بلکہ فی الدنيا حسنة فرمایا اگر من الدنيا حسنة فرمایا ہوتا تو یہ معنی ہو سکتے تھے کہ دنیا کی وہ حالت دیجئے جو اچھی ہو۔ جس کو بلفظ دیگر ترقی کہہ سکتے ہیں جس کے ثبوت کے لئے یہ آیت پیش کی جایا کرتی ہے اور فی الدنيا حسنة کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں بھی ہم کو اچھی چیز دیجئے اور اس اچھی چیز کا جزو دنیا ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ انظ حسنة میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دنیا کی چیز نہیں کیونکہ یہی لفظ حسنة آگے بھی موجود ہے اور ظاہر یہی ہے جو معنی اس کے وہاں ہیں وہی یہاں بھی ہوں گے اور ظاہر ہے کہ وہی الاخرة حسنة میں مراد ترقی مصطلح نہیں ہے بلکہ نیکی مراد ہے تو اس دعا میں دنیا کی اچھی حالت نہیں مانگی بلکہ دنیا میں نیکی مانگی اور دنیا میں وہ نیکی اعمال صالحہ ہیں اور آخرت میں وہ نیکی ان کی جزا ہے تو حسنة دنیا میں جس کی طلب کی گئی ہے وہ انگریزی پڑھنا نہیں ہوئی بلکہ توفیق اعمال صالحہ ہوئی۔

ترقی دین کی دعا

قرآن شریف میں فی الدنیا کا لفظ ہے نہ کہ من الدنیا کا تو حسرت کے معنی نیک کام کے ہوئے تو معنی یہ ہوئے کہ اے اللہ ہم کو دنیا میں نیک کام کی توفیق دیجئے اور آخرت میں ان کی جزا دیجئے بلکہ اشارۃً ترقی متعارف کی نفی ہے اس کا قرینہ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ہے ورنہ اس کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةٌ كَانِي تَهَا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی مانگنے کے ساتھ دوزخ میں لے جانے والی برائی سے بچنے کی بھی دعا ہے جس میں وہ ترقی بھی داخل ہے جو موجب معصیت ہو غرض اس آیت میں دعا ترقی دین ہی کی ہے اور ظاہر ہے کہ دین کی دعا کرنا یہ شان مومن کی ہے اتنا تو بہت ہی صاف ہے البتہ اس میں مومن کا درجہ کا بیان نہیں کہ ادنیٰ ہے یا کامل مگر میرا مدعا ہر طرح محفوظ ہے کہ اقسام اربعہ مکلفین میں سے اس آیت میں ایک قسم یعنی مومن مطلق کا بیان ہے جیسا کہ اس سے اوپر کافر مطلق کا بیان تھا باقی دو قسمیں آگے آتی ہیں بیچ میں چند جملے اور ہیں جن کا مضمون مقام کے ساتھ گورمبہ ہے مگر اس کو تقسیم سے تعلق نہیں۔

مکلفین کی تیسری قسم

لہذا آگے کی آیتوں سے بقیہ اقسام اور ان کے احکام بیان کرتا ہوں تیسری قسم یہ ہے کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْجَهَنَّمَ۔ ترجمہ یہ کہ بعض آدمی وہ ہیں جن کی بات دنیا کے بارہ میں آپ کو اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو اپنی قلبی حالت پر گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ بڑا جھگڑالو ہے۔ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ترجمہ یہ ہے اور جب وہ یہاں سے جاتا ہے تو اس کا کام یہ ہے کہ زمین میں قتل اور غارت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَاسِدَ (اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اور اس کی حالت یہ ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُ لَهُمْ جَهَنَّمُ وَأَلْيَسَ الْيَهُادُ۔ یعنی جب اس کو اس پر نصیحت کی جاتی ہے اور خدا کا خوف دلایا جاتا ہے تو اس کو گناہ کرنے پر حمیت اور عار مجبور کرتی ہے یعنی باوجودیکہ گناہ ہونا اس کے قلب میں ثابت ہو جاتا ہے مگر حمیت اور عار اور ضد سے گناہ کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فَحَسْبُ لَهُمْ جَهَنَّمُ وَأَلْيَسَ الْيَهُادُ اس کے لئے جہنم کافی ہے۔ اور وہ بری جگہ ہے اس کے شان نزول سے معلوم ہوا ہے کہ یہ آیت مطلق کافر کے بارہ میں نہیں ہے کیونکہ یہ آیت اخس نامی منافق کے بارہ میں اتری ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے اور دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ ملائے کہ منافق اشد ہے کافر مجاہد سے اور اسی واسطے منافق کا عذاب مطلق کافر سے اشد ہے کیونکہ یہ دھوکہ دیتا ہے اس لئے قرآن شریف میں منافق کے بارہ میں وارد ہے إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَجَةِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ یعنی منافقین دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوں گے ہر دو مقدموں کے ملانے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس آیت میں معمولی کافر کا ذکر نہیں ہے بلکہ اشد کافر کا ہے نیز جن اعمال کا اس آیت میں ذکر ہے وہ نہایت شدید جرائم ہیں مثلاً فساد فی الارض اور اہلاک حرث و النسل یعنی قتل و غارت سب جانتے ہیں کہ یہ شدید جرائم ہیں چنانچہ خود حق تعالیٰ نے بھی فرمایا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَاسِدَ

یعنی خدا تعالیٰ کو یہ اعمال پسند نہیں اس بھی ثابت ہوتا ہے کہ آیت مطلق کافر کے بارہ میں نہیں بلکہ شدید کافر کے بارہ میں ہے شدید ہونا تو تقریر مذکور سے معلوم ہوا باقی یہ کہ یہ شخص کافر ہے سو اس کا پتہ مال سے چلتا ہے وہ مال یہ ہے فَحَسْبُكَ جَهَنَّمُ وَلَيْسَ الْبِهَادُ۔ یعنی اس کے لئے جہنم کافی ہے جو بری جگہ ہے یہ حکم کافر ہی کا ہو سکتا ہے نہ کہ مومن کا غرض آیت کے اس ٹکڑے میں کافر شدید کا ذکر ہے۔ نہ مطلق کافر کا جیسا کہ اوپر کافر مطلق کا ذکر آچکا ہے یہ تین قسمیں ہو گئیں۔

مکلفین کی چوتھی قسم

اس کے بعد آیت ہے وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ یہ عطف دور سے چلا آ رہا ہے اور یہ جملہ اس واسطے میں نے دور سے اس آیت کو شروع کیا وہیں سے وَمِنَ النَّاسِ كَاسِلٌ فَلا آ رہا ہے۔ قرآن شریف روزمرہ پڑھا جاتا ہے مگر پڑھنے والے کی نظر کبھی نہیں جاتی اس پر کہ یہ سب ایک ہی سلسلہ میں مرتبط ہیں اول کی دو قسموں پر تو نظر پڑ جاتی ہے کیونکہ ان کا عطف قریب قریب ہے اور یہ دو قسمیں جملہ ساتھ معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان کا عطف بعید ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان قسموں کو ماقبل سے کوئی تعلق نہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ سب جملے باہم مرتبط ہیں اور ایک ہی قسم کی چاروں قسمیں آیت میں موجود ہیں۔ غرض چوتھی قسم یہ ہے کہ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ۔ بمعنی بیع کے ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ ایک قسم آدمیوں کی وہ ہے جو اپنی جان کو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے بیچ ڈالتے ہیں ان کا کام تو یہ ہے اور حق تعالیٰ کا ان کے ساتھ برتاؤ یہ ہے وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ اس کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہی اشخاص کی شان میں ہے جو کمال درجہ ایمان پر پہنچے ہوئے تھے جن کو مومن کامل کہنا چاہیے اور لفظ بِالْعِبَادِ بھی بتاتا ہے کہ آیت مطلق مومن کے بارے میں نہیں ہے بلکہ بڑے مومن کے بارہ میں ہے کیونکہ رُؤْفُ مبالغہ کا صیغہ ہے رافت خود شدت رحمت کو کہتے ہیں اور اس سے مبالغہ کا صیغہ بنا تو اور رحمت میں شدت ہو گئی پس ایسی رحمت اسی شخص کے واسطے ہو سکتی ہے جو بدرجہ کمال اس کا مستحق ہو اور وہ مومن کامل ہی ہے اور لفظ بِالْعِبَادِ بھی بتاتا ہے کہ مومن کامل ہی مراد ہے کیونکہ اعلیٰ درجہ کمال عبدیت ہی ہے غرض ہر ہر لفظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس آیت میں بیان مومن کامل کا ہے تو کل قسمیں مکلفین کی چار ہوئیں یہ تو مولول لفظی تھا ان آیات کا اب اس مدعائے مستبط کو بیان کرتا ہوں تقریر مذکور میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ ایمان کے مراتب بھی مختلف ہیں اور کفر کے مراتب بھی مختلف ہیں ایک کفر کامل (کامل تو کیوں کہوں کیونکہ کفر تو بدترین عیب اور بدترین نقص ہے اس کی جگہ لفظ کفر شدید اختیار کرتا ہوں) دوسرا غیر شدید اور ظاہر ہے کہ آخری وہ درجہ جس کو کامل اور شدید کہا جائے انتہائی درجہ ہوتا ہے پھر اس کے مقابل جو سب میں اول ہو ابتدائی کہلاتا ہے جیسے درسیات میں ہدایہ امور عامہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے کہ پہلی کتاب ہے اسی کو ابتدائی کتاب بھی کہہ سکتے ہیں غرض کمال کو انتہاء اور پہلے درجہ کو ابتداء کہتے ہیں اور جب کفر میں یہ مراتب ہیں تو ضرور ایک مراتبہ اخیر ہوگا جس کو میں نے شدت کفر کہا تھا اور ایک درجہ سب سے کم ہوگا جس کو ابتدا کہہ سکتے ہیں غرض کفر میں دوسرے نکلے ابتدا اور انتہاء اور ایسے ہی ایمان میں بھی ابتداء اور انتہاء ہوئی اور مجھ کو اس وقت صرف ایمان کے ان

مراتب کا بیان مقصود ہے اور یہی ہے وہ مضمون مستبط جس کی تمہید کو گویا تو ہوا مگر ضرورت کی وجہ سے ہوا کیونکہ ایمان کے ان مراتب کا ثابت کرنا اس سب بیان پر موقوف تھا غرض تقسیم مذکورہ تو مکلفین کی قرآن سے ثابت ہوئی اور اس کے ساتھ ایک مقدمہ عقلی ملایا گیا جو بہت ظاہر ہے پس اس طرح سے آیت میں ابتدائی اور انتہائی درجہ کا بیان ہو گیا اور سوق کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اولاً بیان ہے ابتدائی مرتبہ کا اس کے بعد انتہائی کا اور ذکر مراتب میں اسی طرح تدریجاً ترقی کیا کرتے ہیں اور کمال کو بعد میں بیان کیا کرتے ہیں اکثر عادت یہی ہے گویا قرآن میں کوئی لفظ صریح نہیں اس ترتیب کے بارہ میں مگر ایسی ترتیب بلغاء کی عادت ہے اور قرآن بلیغ ہے تو قرآن میں بھی یہی ترتیب ہونا بہت قزین قیاس ہے پھر اقسام کی حقیقت میں نظر کرنے سے بھی یہی ترتیب واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ اول مطلق کا درجہ مذکور ہو۔ پھر کمال کا پس اس طور پر آیت کے مجموعی مضمون سے یہ دعویٰ مستبط ہو گیا کہ کفر کی طرح ایمان میں بھی یہ مراتب ہیں یعنی ابتدائی اور انتہائی اور اس وقت میری بحث کا تعلق صرف ایمان سے ہے میں درجات کفر سے تعرض نہ کروں گا غرض ایمان کا ایک درجہ تو ابتدائی ہو اور ایک انتہائی اور آگے کی ایک آیت ہے یہ دلالت بہت ہی واضح ہو جائے گی اور وہ آیت یہ ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً**۔ یہ صاف ہے اس بارہ میں کہ دوسرے ہیں اسلام میں کیونکہ اس میں خطاب ہے ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں اور ان کو حکم ہے دخول فی السلم کافۃ کا معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد بھی کوئی مرتبہ باقی ہے جس کو دخول فی السلم کافۃ کہہ سکتے ہیں اور اس سے پہلے یہ مرتبہ حاصل نہیں غرض ایمان کے دو درجہ ہونا بہت ہی صراحت کے ساتھ ثابت ہو گیا۔ ایک مطلق جو ابتدائی درجہ پر بھی صادق ہے اور چونکہ تفاوت ایمان کا اعمال سے ہوتا ہے چنانچہ بعض اعمال سے نفس ایمان کا وجود ہوتا ہے مثلاً کلمہ شریف کا پڑھنا اور بعض اعمال سے کمال ایمان ہوتا ہے جیسے دوسرے اعمال پس ایمان میں ان دو درجے کے ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ ایمان سے جن اعمال کا تعلق ہے ان اعمال میں دو درجے میں ایک اول الاعمال دوسرا آخر الاعمال۔ حق تعالیٰ نے حج کے احکام کے ساتھ فرمایا ہے۔

وَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا كُنْتُمْ أَبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا

ترجمہ: یعنی جب تک مناسک حج پورا کر چکو تو خدا تعالیٰ کو یاد کرو جیسا اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے تھے یا ان کے ذکر سے بھی زیادہ یاد کرو۔

مسلمان طالبِ حسنہ ہیں

زمانہ جاہلیت میں حج کے بعد منیٰ میں اہل عرب قیام کرتے اور وہاں مشاعرہ ہوتا۔ اور مفاخرت کے طور پر اپنے خاندانی فضائل کا مذاکرہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ذکر اللہ سے بدل دیا کہ اب بجائے ذکر دنیا کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ جاہلیت کا طریقہ چھوڑ دو۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اب ذکر اللہ یعنی دین کے اعتبار سے لوگوں کی چند قسمیں ہیں چنانچہ ارشاد ہے **فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن خَلْقٍ** یعنی بعض آدمی تو وہ ہے جو (دعا میں) یوں کہتا ہے اے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں ہی دے دے اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں

یہ تو کافر ہے کیونکہ جس کو آخرت میں کچھ نہ ملے وہ کافر ہی ہے مسلمان اس کا مصداق نہیں ہو سکتا آگے دوسری قسم ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۳﴾ اس آیت کا سیاق

کلام بتلا رہا ہے کہ اس کے مصداق وہ مسلمان ہیں جو طالب آخرت ہیں اس پر شاید سوال ہو کہ جب یہ لوگ مسلمان طالب

آخرت ہیں۔ تو انہوں نے دنیا کیوں مانگی۔ اور اس سے بعض انگریزی خوانوں نے طلب دنیا کا مضمون سمجھ کر یہ کہا ہے کہ

دنیا جس کی مذمت کی جاتی ہے اور جس کی طلب سے علماء منع کرتے ہیں۔ ایسی چیز ہے جس کی طلب نص میں بیان کی گئی

ہے اور اس پر مدح کی گئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دنیا کو کہاں مانگا گیا ہے حق تعالیٰ نے رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا فرمایا

ہے۔ دنیا تو نہیں فرمایا اگر یوں فرماتے تو بے شک طلب دنیا مفہوم ہوتی۔ مگر نص میں تو رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وارد

ہے جس میں مطلوب حسنہ ہے اور دنیا محض ظرف ہے پس اس سے طلب دنیا لازم نہیں آتی بلکہ طلب حسنہ فی الدنيا

لازم آئی۔ اس لئے ان کو طالب دنیا کہنا غلط ہے بلکہ وہ تو طالب حسنہ فی الدنيا ہیں۔ اس پر شاید سوال ہو کہ پھر ان کو

طالب آخرت کہنا بھی صحیح نہ ہوگا بلکہ طالب حسنہ فی الآخرة کہنا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ طلب آخرت کے تو

معنی یہی ہیں کہ طلب حسنہ ہو۔ اب چاہے تم اس کو طالب آخرت کہو یا طالب حسنہ فی الآخرة کہو۔ دونوں برابر ہیں۔

اس پر اگر تم کہو پھر ہم بھی طالب دنیا نہیں بلکہ طالب حسنہ فی الدنيا ہیں۔ یعنی مال و دولت حسنہ ہے اور ہم اس کے

طالب ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حسنہ سے مراد حسنہ واقعیہ ہے نہ کہ حسنہ مزعومہ اور یہ شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے کہ

حسنہ واقعیہ کیا ہے اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ تمہارے نزدیک حسنہ ہے مگر شرعاً تو وہ حسنہ نہیں ہے پس شریعت پر فیصلہ ہے پس

اس آیت کا مصداق وہی شخص ہو سکتا ہے جو حسنہ شریعت کا طالب ہو اور حسنہ شریعت سے بھی وہ مراد ہے جو حقیقتاً حسنہ شرعیہ ہو۔ محض

سورۃ ہی حسنہ ہو کیونکہ بعض افعال صورۃ دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقتاً دین نہیں ہوتے ہم ان سے بھی منع کرتے ہیں۔

بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ پہلی آیت کا مصداق کافر ہے اور دوسری آیت کا مصداق مومن عام مفسرین نے تو یہی دو

قسمیں سمجھی ہیں اور آگے مِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ سے مستقل کلام لیا ہے مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے مجموعہ کلام میں چار

قسمیں سمجھی ہیں دو تو وہ ہیں جو ابھی مذکور ہوئیں اور دو مِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ السَّخِوٰۃُ وَ مِنَ النَّاسِ مَن يُكْثِرُ مِنَ السَّخِوٰۃِ

خلاصہ فرق دونوں تو جیہوں کا یہ ہے کہ عام مفسرین کے نزدیک تو یہاں پر دو تقسیمیں ہیں۔ تقسیم اول انسان کی تقسیم ہے۔ مومن

و کافر کی طرف تقسیم ثانی انسان کی تقسیم ہے منافق اور مخلص کی طرف مگر یہ اقسام باہم جمع ہو سکتی ہیں چنانچہ کافر و منافق جمع ہو سکتے

ہیں اور مومن و مخلص جمع ہو سکتے ہیں۔ اس تقسیم کی ایسی مثال ہے جیسے نحاۃ نے کلمہ کی تقسیم کی ہے اسم و فعل و حرف کی طرف۔ پھر

دوبارہ تقسیم کی ہے مذکر و مؤنث کی طرف و علیٰ ہذا تو یہ اقسام باہم جمع ہو سکتی ہیں۔ یہ تو جمہوری مفسرین کی توجیہ کا حاصل ہے۔

اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں ایک ہی تقسیم ہے اور مقسم بھی واحد ہے۔ یعنی انسان مقسم ہے اور

اس کی دو قسمیں ہیں مومن و کافر۔ پھر کافر کی دو قسمیں ہیں۔ مجاہد و منافق اور مومن کی دو قسمیں ہیں ایک طالب آخرت

اور ایک طالب حق پس کل چار قسمیں متبائن ہو گئی کافر مجاہد اور کافر غیر مجاہد۔ اور مومن طالب آخرت اور مومن طالب حق

بدون التفات الی الآخرة (بدوں اس کے کہ آخرت کا طالب ہو)

فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن خَلْقٍ - میں کافر مجاہد کا ذکر ہے جو کہ دنیا محض کا طالب ہے اور مِنْهُمْ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً الْخَيْرِ - میں مومن طالب آخرت کا ذکر ہے اور مِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ لِيُرِيَنَّهُ وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشْرِي نَفْسَهُ بِمِثْقَلِ ذَرَّةٍ مِّنَ النَّاسِ لِيَكُونَ مِنَ الْمُخْسِرِينَ - حق کا ذکر ہے جو محض طالب رضا ہے آخرت اور دنیا دونوں کی طرح ملتفت نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ

ترجمہ: کہ بعض لوگ وہ ہیں جو اپنے نفسوں کو بدل کر دیتے ہیں یعنی خرچ کر دیتے ہیں اللہ کی مرضی طلب کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت مہربان ہیں۔

شراء نفس کی فضیلت اور غایت

حاصل یہ ہے کہ اس جگہ ایک عمل کی فضیلت مذکور ہے یعنی شراء النفس کی اور ایک اس کی غایت مذکور ہے یعنی ابتغاء مرضات اللہ اور گو غایت بھی ایک فعل ہی ہے مگر اس میں جہت مقصودیت غالب ہے اس لئے یہ نسبت عمل کہنے کے اس کو غایت کہنا زیادہ زیبا ہے اور ایک ثمرہ مذکور ہے وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ کہ اس فعل اور غایت کا ثمرہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت اور رافت متوجہ ہوتی ہے یہ تین مضمون اس آیت میں مذکور ہیں اور اس کی تفسیر میں سیاق و سباق پر نظر کر کے مفسرین نے اس کی توجیہ بیان کی ہے بعض نے ایک توجیہ بیان کی ہے اور بعض نے دوسری توجیہ بیان کی ہے اس میں بھی سیاق و سباق پر نظر ہے مگر دور تک نہیں انہوں نے صرف قریب کی آیت سر نظر کی ہے سیاق کا لفظ ویسے ہی زبان سے نکل گیا مقصود صرف سباق ہے کیونکہ ان توجیہات میں سباق ہی کو دخل ہے اور سباق پر نظر کرنا بھی تفسیر کا بڑا جزو ہے خصوصاً ربط سمجھنے کے لئے اس کی بہت ضرورت ہے ورنہ بعض اشکالات ہونے لگتے ہیں اس کی نظیر میں ایک آیت اس وقت یاد آئی جس میں سباق پر نظر نہ کرنے سے اشکال واقع ہوا ہے آیت یہ ہے وَلَنَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا - یعنی حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصود کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلاف مشاہدہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا اور اچھا جواب ہے کہ غلبہ سے غلبہ فی الحجت مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی غلبہ نہ ہوگا اور یہ مشاہدہ کے موافق ہے حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گویا جواب فی نفسہ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سباق میں نظر کرے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور یہ جملہ اسی فیصلہ کے متعلق ہے پوری آیت یوں ہے فَالَّذِينَ يَخْتَفُونَ بَيْنَ يَدَيْكُمْ يُوقِنُ أَنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَن يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا - یعنی پس اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرے قیامت کے دن اور (اس فیصلہ میں) حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دے گا۔ دیکھئے سباق میں نظر کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدنیا کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے علماء کو یاد کر لینا چاہیے کہ تفسیر آیت کے وقت صرف آیت کے اسی ٹکڑے کو نہ دیکھیں جس کی تفسیر مقصود ہے

قرآن کا نزول اسی طرز محاورہ پر ہوا ہے معقولین یا مصنفین کے طرز پر نہیں ہوا لہذا یہاں ربط سمجھنے اور تفسیر دریافت کرنے کے لئے دور تک آیات کو دیکھنے کی ضرورت ہے لطف تفسیر کا اسی میں ہے اور اس سے سب اشکالات حل ہو جاتے ہیں ایسے ہی یہاں بھی سباق میں نظر کر کے آیت کی تفسیر کرنا چاہیے گو یہاں سباق میں نظر نہ کرنے سے کوئی شکال تو واقع نہ ہوگا مگر لطف بھی حاصل نہ ہوگا اس لئے مفسرین نے سباق پر نظر کر کے اس کی دو توجیہیں کی ہیں بعض نے سباق قریب پر نظر کی ہے اور وہ یہ ہے **وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ الَّذِي الْخَصَّاصُ** الایہ اس پر نظر کر کے تو تفسیر آیت کی یہ ہوتی کہ حق تعالیٰ نے یہاں تقسیم کی ہے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو معجب بالحوۃ الدنیا ہے دوسرے وہ جو حیات دنیا کو ابتغاء رضاء الیہ میں بیع کر چکا ہے اس کا بیان **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي نَفْسَهُ** الخ میں ہے اور اس پر سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ **وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ** الخ یہ آیت مع اپنے توابع کے ایک منافق کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جس کا نام غالباً اخص تھا۔ گو حکم مذکور میں اس کی تخصیص نہیں بلکہ جو بھی ویسا ہو اس کا وہی حکم ہے جو یہاں بیان ہوا ہے جو لوگ استرسال نفس کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں وہ تخصیص شان نزول سے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ جہاں کسی فعل شنیع پر وعید نظر آئی انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ یہ تو فلاں شخص یا فلاں جماعت کے بارہ میں نازل ہوئی ہے ہم سے اس کا کچھ تعلق نہیں مگر خدا جزائے خیر دے اصولین کو کہ انہوں نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے **العبرة لعموم اللفظ** لالخصوص السبب کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہے خصوص سبب نزول کا اعتبار نہیں پس جہاں کسی فعل پر کوئی وعید عموم الفاظ کے ساتھ وارد ہوگی یا کوئی حکم مرتب ہوگا اس کو عام ہی کہا جائے گا مورد کے ساتھ خاص نہ کیا جائے گا۔

ور نہ چاہیے کہ لعان کا حکم حضور ﷺ کے بعد نہ ہوتا کیونکہ اس کا نزول ایک خاص واقعہ میں ہوا ہے مگر خود حضور ﷺ نے بھی اس واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ میں اس حکم کو جاری کیا ہے اور خلفاء نے بھی ہمیشہ اس کو جاری رکھا ہے اسی طرح یہاں رکھا جائے گا گو نزول آیت کا ایک خاص منافق کے باب میں ہے مگر حکم اس کے ساتھ خاص نہیں شان نزول صرف محرک نزول ہو جاتا ہے مقصود اصل وہی نہیں ہوتا غرض وہ منافق بڑا انسان تھا ایسا کہ کبھی کبھی حضور ﷺ پر بھی طبعاً اس کی لسانی کا اثر ہو جاتا تھا اسی لئے تو یہ عجب کہ قولہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے **بأوجودیکہ حضور ﷺ** ایسے عاقل تھے کہ میں آپ کے عاقل ہونے پر ایک لطیفہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ مسلمان تو آپ کو عاقل مانتے ہی ہیں وہ تو غلام ہیں اپنے آقا کو اچھا کہیں ہی گے اور جتنا کچھ کہیں تھوڑا ہے مگر لطیفہ یہ ہے کہ کفار مسلمانوں سے زیادہ آپ کو عاقل مانتے ہیں کیونکہ اس کا اقرار کفار کو بھی ہے کہ حضور ﷺ نے تھوڑی سی مدت میں اتنے بڑے بڑے کم کئے ہیں جو دوسرا نہیں کر سکتا عرب کے جاہلوں کو تھوڑے ہی دنوں میں ایسا شائستہ اور مہذب بنا دیا کہ تمام تعلیم یافتہ تو میں ان کے سامنے پست ہو گئیں پھر اس کے ساتھ قواعد متعلقہ معاش و معاد ایسے مہذب کئے جن کی نظیر نہیں مل سکتی یہ سب باتیں کفار کو تسلیم ہیں مگر ہم تو حضور ﷺ کو محض سلطان نہیں کہتے بلکہ نبی بھی کہتے ہیں اور ان فیوض و برکات کو تائید من اللہ اور نبوت کی برکت سمجھتے ہیں اور کفار حضور ﷺ کو نبی نہیں مانتے وہ حضور کے ان سب کارناموں کو اپنی عقل سے ناشی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد عربی ﷺ بہت

بڑے عاقل انسان تھے کہ تھوڑی سی مدت میں ایسے ایسے کام انجام دیئے تو وہ آپ کو ہم سے زیادہ عاقل مانتے ہیں کہ جو کام ہمارے نزدیک خدا کے کرنے کا تھا ان کے نزدیک وہ حضور ﷺ کی عقل کا نتیجہ ہے غرض حضور ﷺ ایسے عاقل تھے کہ موافق و مخالف سب کو آپ کا عاقل کامل ہونا مسلم ہے مگر وہ منافق ایسا لسان تھا کہ حضور جیسے عاقل پر بھی اس کی لسانی کا طبعاً اثر ہو جاتا تھا طبعاً اس لئے کہا کہ عقلاً آپ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا کیونکہ عاقل دھوکہ نہیں کھایا کرتا چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تفسیر موجود ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَقْرَضٌ أَنْ لَنْ يُخْرِجَهُ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَتَعْرِفْتَهُمْ بِسِيمَاهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ (ترجمہ) جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا اور ہم تو اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتہ بلا دیتے سو آپ ان کو حلیہ سے پہچان لیتے اور آپ ان کو طرز کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو دھوکہ نہ ہوتا تھا طرز کلام سے آپ ہر شخص کو پہچان لیتے تھے کہ یہ مومن ہے یا منافق سچا ہے یا جھوٹا کیونکہ ولتعرّفنہم میں لام تاکید اور نون تاکید کے ساتھ کلام کو موکد کیا گیا ہے یعنی آپ ضرور پہچان لیں گے پس عقلاً آپ کو ہرگز دھوکہ نہ ہوتا تھا۔

خاصہ بشری

اور یہاں جو فرمایا ہے يُعْجِبُكَ قَوْلُكَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا اس سے طبعی اثر مراد ہے کہ آپ پر اس منافق کی لسانی سے طبعاً ایک گونہ اثر ہو جاتا تھا اور یہ بشری خاصہ ہے کہ فصیح و بلیغ زوردار کلام سے تھوڑی دیر کے لئے انسان ضرور متاثر ہو جاتا ہے (جیسے کوئی شاعر عمدہ غزل سنا دے تو سننے والا ضرور متاثر ہوتا ہے گو اس سے عقلاً دھوکہ نہیں ہوتا کیونکہ جانتا ہے کہ شاعر مبالغہ بہت کیا کرتے ہیں اسی طرح کوئی بلیغ آدمی زوردار تقریر کرے تو کلام کا اثر تھوڑی دیر کے لئے ضرور ہوگا گو ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ یہ شخص جھوٹی باتیں بہت بنایا کرتا ہے اسی کو حضور فرماتے ہیں ان من الشعر لحكمة و ان من البيان لسحرا) پس اب دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں رہا ایک میں طبعی تاثر کا اثبات ہے دوسری میں عقلی تاثر کی نفی ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے ان آثار طبعیہ و لوازم بشریہ کو ظاہر کر دیا تاکہ آپ پر الوہیت کا شبہ نہ ہو گو بعض جہال نے اس پر بھی آپ کو الوہیت تک پہنچا دیا ہے بلکہ آپ تو آپ جہلاء نے حضرت غوث اعظم کو بھی الوہیت تک پہنچا رکھا ہے چنانچہ ایک حکایت مشہور کی جاتی ہے کہ آپ کے پاس ایک بڑھیا آئی جس کا لڑکا مر گیا تھا کہ حضرت اس کو زندہ کر دو آپ نے فرمایا کہ اس کی عمر تو ختم ہو چکی اب زندہ نہیں ہو سکتا وہ رونے اور اصرار کرنے لگی تو آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا کہ اس لڑکے کو زندہ کر دیا جائے وہاں سے خطاب ہوا کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں اس لئے اب زندہ نہیں ہو سکتا تو حضرت غوث اعظم حق تعالیٰ سے کہتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے یہ حق تعالیٰ سے باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت آپ سے کہنے کی تو اسی لئے ضرورت ہوئی کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں اگر اس کی تقدیر میں کچھ اور زندگی ہوتی تو آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی پھر تو پ مجبور ہو کر خود ہی زندہ کرتے (نعوذ باللہ منه) وہاں سے حکم ہا کہ پھر تقدیر کے خلاف تو نہیں ہو سکتا اس پر غوث اعظم کو جلال آیا اور اپنے قوت کشفیہ سے ملک الموت کو ٹولا کہ

کہاں ہیں آخر نظر آئے تو دیکھا کہ وہ ایک تھیلے میں اس دن کے مردوں کی روئیں بھر کر لے جا رہے ہیں ابھی تک ہیڈ کوارٹر پر نہ پہنچے تھے کہ غوث اعظم نے ان کو ٹوکا اور کہا بڑھیا کے لڑکے کی روح واپس کر دو تم اس کو نہیں لے جا سکتے وہ انکار کرنے لگے آپ نے وہ تھیلا ان کے ہاتھ سے چھین کر کھول دیا جتنی روئیں تھیں سب پھر پھراڑ گئیں اور اس دن جتنے آدمی مرے تھے وہ سب زندہ ہو گئے تو غوث اعظم نے حق تعالیٰ سے کہا کہ کیوں اب راضی ہو گئے ایک مردے کے زندہ کرنے پر تو راضی نہ ہوئے اب بہت جی خوش ہوا ہو گا جب ہم نے سارے مردوں کو زندہ کر دیا تو توبہ توبہ استغفر اللہ۔

کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کی کسی کو مجال ہے مگر یہ سب حکایتیں جاہلوں نے گھڑی ہیں اور ان کو بیان کر کے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ غوث اعظم وہ کام کر سکتے ہیں جو خدا بھی نہیں کر سکتا بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس کفر کا جب جاہلوں نے غوث اعظم رضی اللہ عنہ کو اس رتبہ پر پہنچا دیا تو اگر حضور ﷺ کی نسبت آثار طبعیہ اور لوازم بشریہ کو ذکر نہ کیا جاتا ہے تو نہ معلوم یہ لوگ حضور ﷺ کو کہاں پہنچاتے اور اب اگر کوئی ایسی غلطی کرے تو یہ محض حماقت ہے کیونکہ قرآن میں سب باتیں بیان کر دی گئیں کہ آپ کھاتے بھی تھے سوتے بھی تھے بیوی کی بھی آپ کو ضرورت تھی آپ لسان آدمی کی بات سے متاثر بھی ہوتے تھے ان آثار کے ہوتے ہوئے الوہیت کا احتمال کہاں؟ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجاہدہ سے لوازم بشریت اور امور طبعیہ زائل نہیں ہوا کرتے اس میں بعض لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجاہدہ سے لوازم بشریت و تقاضاء طبعیہ مسلوب ہو جاتا ہے پھر بعد اعتدال و تمکین کے جب ان آثار کا عود ہوتا ہے تو پریشان ہوتا ہے کہ ہائے میری ساری محنت برباد اور میرا سارا مجاہدہ ضائع گیا حالانکہ یہ اعتقاد غلط ہے مجاہدہ سے امور طبعیہ مسلوب نہیں ہوتے بلکہ جوش مجاہدہ سے صرف مغلوب ہو جاتے ہیں پھر بعد اعتدال کے جب ہنڈیا پک جاتی ہے تو وہ جوش نہیں رہتا بلکہ سکون ہو جاتا ہے (فناء النفوس فی رضا القدوس)

آیت ربنا اتنا فی الدنیا حسنة پر رفع اشکال

ارشاد ہے فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا اتنا فی الدنیا وَمَا لَہِ فی الآخرة مِن خلاقٍ یعنی بعض آدمی تو وہ ہے جو (دعا میں) یوں کہتا ہے کہ اے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہے) دنیا ہی میں دے دے اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں یہ تو کافر ہے کیونکہ جس کو آخرت میں کچھ نہ ملے وہ کافر ہی ہے مسلمان اس کا مصداق نہیں ہو سکتا آگے دوسری قسم ہے وَمِنْهُمْ مَن يَقُولُ رَبَّنَا اتنا فی الدنیا حسنةً وَفِی الآخرة حسنةً وَقِنَا عذاب النار (ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے رب ہمیں دنیا میں خیر دیجئے اور آخرت میں بھی خیر دیجئے اور نار کے عذاب سے بچائیے) اس آیت کا سیاق کلام بتلا رہا ہے کہ اس کے مصداق وہ مسلمان ہیں جو طالب آخرت ہیں۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ جب یہ لوگ مسلمان طالب آخرت ہیں تو انہوں نے دنیا کیوں مانگی اور اس سے بعض انگریزی خوانوں نے طلب دنیا کا مضمون سمجھ کر یہ کہا ہے کہ دنیا جس کی مذمت کی جاتی ہے اور جس کی طلب سے علماء منع کرتے ہیں ایسی چیز ہے جس کی طلب نص میں بیان کی گئی ہے اور اس پر مدح کی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دنیا کو کہاں مانگا گیا ہے۔ حق تعالیٰ نے رَبَّنَا اتنا فی الدنیا دینا۔ تو نہیں فرمایا گیا۔ اگر یوں فرماتے تو بے شک طلب دنیا مفہوم ہوتی مگر نص میں تو رَبَّنَا اتنا فی

الدُّنْيَا حَسَنَةً (اے رب ہمیں دنیا میں خوبی دیجئے) وارد ہے جس میں مطلوب حسنہ ہے اور دنیا محض ظرف ہے پس اس سے طلب دنیا لازم نہیں آتی، بلکہ حسنة فی الدنيا لازم آئی اس لئے ان کو طالب دنیا کہنا غلط ہے بلکہ وہ طالب حسنة فی الدنيا ہیں۔ اس پر شاید سوال ہو کہ ان کو طالب آخرت کہنا بھی صحیح نہ ہوگا بلکہ طالب حسنة فی الآخرة کہو۔ دونوں برابر ہیں۔ اس پر اگر تم کہو کہ پھر بھی طالب دنیا نہیں ہیں بلکہ طالب حسنة فی الدنيا ہیں۔ یعنی مال و دولت حسنہ ہے اور ہم اس کے طالب ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں حسنہ سے مراد حسنہ واقعہ ہے نہ کہ حسنہ مزعومہ اور یہ شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حسنہ واقعہ کیا ہے اور جس چیز کے تم طالب ہو وہ تمہارے نزدیک حسنہ ہو مگر شرعاً تو وہ حسنہ نہیں ہے پس شریعت پر فیصلہ ہے۔ پس اس آیت کا مصداق وہی شخص ہو سکتا ہے جو حسنہ شرعیہ کا طالب ہو اور حسنہ شرعیہ سے بھی وہ مراد ہے جو حقیقتہً حسنہ شرعیہ ہو۔ محض صورت ہی حسنہ نہ ہو کیونکہ بعض افعال صورتہً دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقتہً دین نہیں ہوتے ہم ان سے بھی منع کرتے ہیں اس سے آپ کو ہمارے انصاف کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم صرف صورت دنیا ہی کے مخالف نہیں بلکہ دنیا بصورت دین کے بھی مخالف ہیں۔ جیسے بدعات وغیرہ کہ گونا گویا میں وہ دین کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر ان سے بھی منع کرتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کہتے ہیں مانع عن اللہ کو اور یہ مال و دولت ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض ایمان بھی مانع عن اللہ ہوتا ہے۔ جیسے وہ ایمان جس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ۔ یعنی ظاہری ایمان جس میں حقیقت کا پتہ نہ ہو۔ ایسے ہی بعض اعمال بھی جو صورتہً دین ہیں مگر حقیقت دین ان میں موجود نہیں مانع عن اللہ ہیں۔ یہاں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم صرف طالبان دنیا ہی کی مذمت نہیں کرتے بلکہ بعض طالبان دین کی بھی مذمت کرتے ہیں جو حقیقت میں دین کی صورت میں دنیا ہی کے طالب ہیں۔

بہر حال اس میں تو شک نہیں کہ پہلی آیت کا مصداق کافر ہے اور دوسری آیت کا مصداق مومن عام مفسرین نے تو یہی دو قسمیں سمجھتی ہیں اور آگے مِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ سے مستقل کلام لیا ہے مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے مجموعہ کلام میں چار قسمیں سمجھتی ہیں دو تو وہی جو ابھی مذکور ہوئیں اور دو مِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ الخ اور مِنَ النَّاسِ مَن يُشْرِي الخ خلاصہ فرق دونوں تو جیہوں کا یہ ہے کہ عام مفسرین کے نزدیک تو یہاں پر دو قسمیں ہیں تقسیم اول انسان کی تقسیم ہے۔ مومن و کافر کی طرف تقسیم ثانی انسان کی تقسیم ہے۔ منافق اور مخلص جمع ہو سکتے ہیں اور مومن و مخلص جمع ہو سکتے ہیں اس تقسیم کی ایسی مثال ہے جسے نحاۃ نے کلمہ کی تقسیم کی ہے اسم فعل و حرف کی طرف پھر دوبارہ تقسیم کی ہے۔ مذکر و مؤنث کی طرف و علیٰ ہذا۔ تو یہ اقسام باہم جمع ہو سکتی ہیں یہ تو جمہوری مفسرین کی تیجہ کا حاصل ہے اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یہاں ایک ہی تقسیم ہے اور مقسم بھی واحد ہے۔ یعنی انسان مقسم ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ مومن و کافر پھر کافر کی دو قسمیں ہیں۔ مجاہد و منافق اور مومن کی دو قسمیں ہیں ایک طالب آخرت اور ایک طالب حق۔ پس کل چار قسمیں متبائن ہو گئیں۔ کافر مجاہد اور کافر غیر مجاہد اور مومن طالب آخرت اور مومن طلب حق بدوں التفات الی الآخرة (بدن اس کے کہ آخرت کا طالب ہو) فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِن خَلْقٍ میں کافر مجاہد کا ذکر

ہے جو کہ دنیائے محضہ کا طالب ہے اور مِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً الْآخِرَةِ میں مومن طالب آخرت کا ذکر ہے اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُمْ كَافِرٍ غَيْرِ مُجَاهِدٍ لِعَنِ مَنَافِقٍ كَاذِبٍ اور مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ میں مومن طالب حق کا ذکر ہے جو محض طالب رضا ہے آخرت اور دنیا دونوں کی طرف ملتفت نہیں۔ (ماخوذ البدر الخ)

وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ
وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے۔

تفسیری نکات

تمنی کا علاج

فرماتے ہیں **عَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ** یعنی ممکن ہے تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے واسطے بہتر ہو اسی طرح ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھا سمجھو اور وہ تمہارے لئے مضر ہو اور ممکن ہمارے اعتبار سے فرمایا یعنی تم اس بات کا احتمال رکھو آگے فرماتے ہیں **وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** کہ اللہ تعالیٰ کو (ہر خیر و شر کا) علم ہے اور تم نہیں جانتے۔ اس ترجمے کے سننے سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ آیت ہمارے ایک مرض کی اصلاح کر رہی ہے جس کو ہم بہت ہی ہلکا سمجھتے ہیں یعنی تمنی ہماری نظر تو اس طرف جاتی نہیں لیکن آیت بتلا رہی ہے کہ ہم جو یہ کہا کرتے ہیں کہ یوں نہ ہوتا تو اچھا ہوتا اور یوں ہوتا تو اچھا ہوتا یہ سب ناپسندیدہ بات ہے اور یہاں سے غلطی کو ظاہر فرما رہے ہیں کہ تم کو کیا خبر ممکن ہے کہ جس کو تم نے مضر سمجھا ہے وہ واقع میں تمہارے لئے نافع ہو اور جس کو تم نے نافع سمجھا ہے وہ واقع میں مضر ہو یہ تو محض احتمال عقلی کے طور پر فرمایا تھا آگے فرماتے ہیں **وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ**۔ یعنی شاید کسی کو یہ احتمال ہوتا کہ ممکن ہے وہی نافع ہو اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ جانتا ہے یعنی جو شخص خدا کا قائل ہوگا وہ صفت علم کا بھی قائل ہوگا اور کمال اس کا یہ ہے کہ کوئی اس کے برابر علم میں نہ ہو تو اپنے علم کے اثبات سے استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ نے جو کہ واقعی نفع و ضرر کو جانتے ہیں اس کو واقع فرمایا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ وہ حکیم بھی ہیں تو ان کا واقع کرنا دلیل اس کی ہے کہ یہی بہتر تھا تو دوسرا احتمال بالکل قطع ہو گیا اور معلوم ہوا کہ تمہاری رائے غلط ہے اگر اس میں مصلحت ہوتی تو خدا تعالیٰ اس کو واقع فرماتے۔

ہماری غلطی پر تنبیہ

خدا تعالیٰ نے ہم کو ہماری ایک غلطی پر تنبیہ فرمائی اب دو باتیں دیکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ آیا ہم میں یہ غلطی ہے

یا نہیں سوا اس کا ہم میں ہونا تو اس قدر ظاہر ہے کہ شاید کوئی قلب اس سے خالی ہو اور یہ اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ تگوینات سے گزر کر تشریعیات تک اس کی نوبت پہنچی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ احکام دو قسم کے ہیں ایک احکام تشریحیہ جیسے نماز روزہ کا فرض ہونا۔ چوری غضب جھوٹ تقاخر یا بخل کا حرام ہونا۔ دوسرے احکام تکوینیہ جن کو حوادث کہتے ہیں جسے مرنا جینا قحط طاعون یا اور کوئی وبا۔ مال کا ضائع ہو جانا آگ لگ جانا اور ان دونوں قسم کے امور کا صدور خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے تو ہم کو یہاں تک تمنیٰ کا ہیضہ ہوا ہے کہ دونوں قسموں کے متعلق تمنائیں کرتے ہیں یعنی جس طرح یہ کہتے ہیں کہ فلانا اور جیتا تو اچھا ہوتا اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ روزہ فرض نہ ہوتا سو حرام نہ ہوتا تو خوب ہوتا تفرق اتنا ہے کہ جو علم دین پڑھے لکھے ہیں وہ احکام تشریحیہ میں ایسی بیباکی نہیں کرتے اور جو آزاد و بیباک ہیں وہ دونوں میں ایسی تجویزیں کرتے ہیں چنانچہ ایک نوجوان نے تو یہاں تک نوبت پہنچائی کہ نماز کے متعلق یہ رائے ظاہر کی اسلام میں اگر نماز نہ ہوتی تو اسلام کی خوب ترقی ہوتی کیونکہ نماز سے اکثر لوگ گھبراتے ہیں نموداراً باللہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بھی رائے دیتے ہیں۔

امور تشریحیہ و تکوینیہ

لفظ شبنا اس آیت میں عام ہے امور تشریحیہ اور امور تکوینیہ سب کو کیونکہ اس سے پہلے ارشاد ہے کَتَبَ عَلَيْنَكُمُ الْقِتَالَ وَهُوَ كَذَلِكَ (یعنی تم پر جہاد فرض کیا گیا اور تم اس کو ناپسند کر رہے ہو) ہوگی ضمیر یا تو قتال کی طرف راجع ہے جو کہ امر تکوین ہے یا کتابت قتال کی طرف جو کہ امر تشریحی ہے یا ترجیح بلا مرجح سے بچنے کے لئے عام کہا جائے دونوں کو مرجع قتال ہو باعتبار وجود تشریحی اور تکوینی کے اور بہتر یہی ہے کہ عام کہا جائے اور معنی عام کی تعلیل میں اس جملہ و عسی الخ کو کہا جائے۔

دعاء کو مشروع فرمانے میں حکمت

اصل مضمون یہ تھا کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج پیش آئے اس کو مصلحت سمجھے اور اس پر خدا کا شکر کرے خواہ بلائے ظاہری ہو خواہ بلائے باطنی ہو۔ یہ تھا بیان مرض تمنیٰ کا جس میں اہل سلوک بھی کم و بیش مبتلا ہیں اس کی ممانعت اس حدیث میں ہے کہ ایاکم و لوفان لو یفتح عمل الشیطان ہم نے ہزاروں مرتبہ یہ آیت شریف پڑھی ہوگی لیکن آج جو بات اس سے سمجھ میں آئی وہ آج تک سمجھ میں نہ آئی تھی۔

الحمد لله اور ایک بڑی رحمت اس کے ساتھ یہ فرمائی ہے کہ طبیعت انسانی کا بھی لحاظ فرمایا یعنی تمنا خود بخود طبیعت سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کی تعدیل فرمادی وہ یہ کہ دعا کو مشروع فرمادیا کہ اگر کسی چیز کی تمنا پیدا ہو تو بجائے اس کے خدا تعالیٰ کو رائے دو وہ ارمان اس طرح نکالو کہ دعا کر لیا کرو کہ تمنا سے وہ بہتر ہے کیونکہ تمنا کے معنی تو خدا کو رائے دینا ہے کہ اس طرح کرنا مناسب تھا بخلاف دعا کے کہ وہ عرض ہے جناب باری میں اور ساتھ ہی اس پر رضا ہے کہ اگر یہ اس طرح نہ ہوگا تو میں اسی کو مصلحت سمجھوں گا حاصل مضمون عَسَىٰ اَنْ تَكْرَهُوا الْاٰیةَ کَا یہ ہے کہ پس دعا غبار نکالنے میں تو تمنیٰ کے ہم پلہ ہے اور عرض میں اس کے خلاف مثلاً جب بیمار ہو تو صحت کی دعا کرو اسی طرح صبر کی دعا کرو تو اس سے غبار تو نکل جائے گا۔ جو بات پسند آئے کہہ لے اور حسرت نہیں ہوگی جیسے تمنیٰ میں ہوتی ہے کیونکہ حسرت مافات پر ہوتی ہے۔

غرض دعا کو بھی مشروع فرمایا جیسا دوسرے نصوص میں ہے اور تمنیٰ کو منع فرمایا جیسا اس آیت میں وَعَسَىٰ أَنْ تَمْنُوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ الْخَبْرُ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے جتنے احکام ہیں تکوینی یا تشریحی ان کے خلاف تمنا نہ کرے بلکہ ان پر صبر اور جو دل میں کوئی تمنا پیدا ہو بجائے اس کے دعا کرتا رہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ
وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا

ترجمہ: یعنی لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں آپ فرمادیں کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں لوگوں کو بعض فائدے بھی ہیں اور وہ گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔

تفسیری نکات

خلاصہ آیت

اول بطور تمہید کے اس جزو آیت کا خلاصہ عرض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جناب رسول ﷺ سے لوگوں نے خمر اور قمار کا حکم پوچھا تھا اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے ان میں منافع بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت تحریم خمر و میسر سے پہلے کی ہے اور اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے لیکن لفظوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ تسامح ہوا ہے اس لئے کہ باوجود لفظ اثم کبیر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا پس بظاہر یہ آیت بھی تحریم کے بعد ہی کی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے بعد والی آیت یعنی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ الْخَبْرُ (یعنی اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جو اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیرے سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں) اس کی زیادہ تاکید ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت کو سن کر بعض لوگوں نے لفظ منافع پر نظر کر کے شراب کے ترک میں سستی کی ہو اور فیہما اثم کبیر (ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں) میں کچھ تاویل کر لی ہو مثلاً یہ کہ ان کو خود اثم نہیں فرمایا بلکہ متضمن اثم فرمایا ہے اس طرح سے کہ کبھی یہ مفیضی الی المعاصی ہو جاتے ہیں تو جب ایسا انتظام کر لیا جائے کہ یہ احتمال نہ رہے تو جائز ہوگا جیسے قبیح لغیرہ کی بات ہوتی ہے مگر یہ تاویل بہت بعید ہے اس لئے نہایت شدومد سے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْخَبْرُ نازل ہوئی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے قبل تحریم نہیں ہوئی تھی اور منافع للناس سے جواز پر تمسک نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کسی محرم شے میں منافع کے وجود سے اس کی اباحت پر استدلال نہیں ہو سکتا بلکہ منافع کا ذکر منشا شبہ کو رفع کرنے کے واسطے ہے یعنی اگرچہ ان دونوں میں منافع بھی ہیں چنانچہ خمر میں قوت غریزیہ اور میسر میں کثیر مال بہ سہولت ہے لیکن مفاسد ان کے منافع سے زیادہ ہیں اس لئے حرام ہیں یہ حاصل ہے آیت کا۔ (ترجیح المدعی علی المدعی)

پاکیزہ طرز کلام

سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز کا جواب ہے یعنی لوگوں کو شراب اور جوئے کی حرمت میں یہ دوسوہ ہو سکتا تھا کہ ان میں منافع دنیویہ بہت ہیں اسی لئے ان کو حرام نہ کرنا چاہیے تو حق تعالیٰ اس شبہ کے اصل سے انکار نہیں فرماتے بلکہ اس کو تسلیم فرماتے ہیں کہ واقعی ان میں لوگوں کے لئے نفع بھی ہے اور ایک ہی نفع نہیں بلکہ ہم صیغہ واحد کی بجائے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں کہ ان میں بہت سے منافع ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان میں ایک گناہ بھی ہے۔

اس جگہ یہ بات قابل غور ہے کہ حق تعالیٰ نے منفعت کے بیان میں تو جمع کا صیغہ اختیار فرمایا یعنی منافع للناس اور مضرت کے بیان میں صیغہ واحد یعنی اثم۔ اگر یہ کلام بشر کا ہوتا تو مقابلہ کے لئے یہاں بھی جمع کا صیغہ اثم ہوتا مگر حق تعالیٰ نے اس جگہ صیغہ واحد ہی اختیار فرمایا جس سے اس حقیقت پر متنبہ فرمانا منظور ہے۔ اگر کسی چیز میں ہزاروں منفعتیں ہوں مگر اس میں ایک گناہ بھی ہو یعنی ادنیٰ شائبہ ناراضی حق کا ہو تو وہ ہزاروں منفعہتیں ایک گناہ کے سامنے ہیچ ہیں کیونکہ جس طرح خدا کی رضا خواہ ذرا ہی سی ہو بڑی دولت ہے چنانچہ ارشاد ہے **وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ**۔۔۔ خدا کی ناراضی بھی بڑی وبال چیز ہے خواہ اس ناراضی کا سبب ایک ہی گناہ کیوں نہ ہو۔ اس لئے اس جگہ اثم بصیغہ واحد لایا گیا مگر اس کو کبیر کے ساتھ موصوف کر دیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ شراب اور جوئے میں منافع تو بہت ہیں مگر ایک گناہ بھی ہے اور وہ ایک ہی گناہ اتنا بڑا ہے جس نے ان سب منافع کو گاو خور کر دیا ہے اس لئے آگے منافع کا لفظ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ نفع کا لفظ اختیار فرمایا۔ **وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِمَّنْ نَّفَعَهُمَا** کہ ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بہت بڑا ہے۔ یہاں صیغہ واحد اختیار کرنے کی وجہ یہی ہے کہ پہلے کلام سے یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ ان منافع کے مقابلہ میں ایک گناہ بھی ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ اگر ایک من مٹھائی میں تولہ بھر ملا ہوا ہو تو وہ ساری مٹھائی اس ایک تولہ زہر کی وجہ سے خاک میں مل جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ منافع ایک گناہ کی وجہ سے خاک میں مل گئے تو اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ ان کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا جائے۔ اس لئے فرماتے ہیں **وَ اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِمَّنْ نَّفَعَهُمَا** اس آیت نے فیصلہ کر دیا کہ کسی چیز کے حرام ہونے اور گناہ ہونے کا مدار دنیا کے نفع و نقصان پر نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھے ہوئے ہیں اور بعض دفعہ زبان سے بھی کہہ دیتے ہیں کہ اس کام میں کیا حرج ہے یہ تو نفع کی چیز ہے۔ چنانچہ تعویذ اور عملیات میں بہت لوگ اسی دھوکا میں پڑے ہوئے ہیں کہ جس عمل سے کسی کو نفع ہوتا ہو وہ جائز ہے۔ خواہ اس میں شیاطین سے استعانت ہو یا کیسے ہی بے ہودہ کلمات استعمال کرنے پڑتے ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ شراب اور جوئے کی نسبت حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ان میں لوگوں کے لئے ایک نفع نہیں بلکہ بہت سے منافع ہیں مگر پھر بھی یہ حرام ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ خدا تعالیٰ ان کو پسند نہیں فرماتے ان سے ناراض ہوتے ہیں اب یہ مسئلہ بالکل حل ہو گیا کہ حرمت کا مدار خدا تعالیٰ کی ناراضی پر ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ الْآيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۰﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآٰخِرَةِ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: (یعنی اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف صاف اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ) دنیا و آخرت میں فکر کرو۔

گناہ میں مصلحت

میں کہتا ہوں کہ آج کل عقل پرستی کا بہت زور ہے لیکن افسوس ہے کہ اس عقل کو دین کے اندر صرف نہیں کیا جاتا آپ مصلحت کی وجہ سے ایک شے کو جائز کہتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ چونکہ اس میں یہ مصلحت مضرت تھی اسی واسطے تو ضرورت ممانعت کی ہوئی کیونکہ جس میں کوئی مصلحت نہ ہوئی اس کے منع کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ منع ہمیشہ اسی امر کو کیا جاتا ہے کہ جس میں کچھ مصلحت بھی ہو جس کے سبب سے اس کے کرنے کی رغبت ہو مگر اس میں مفاسد دقیق ہوتے ہیں کہ ان مفاسد تک ہماری عقل نہیں پہنچتی پس گناہ ایسا ہی ہے کہ جس میں کوئی مصلحت باعث علی الفعل ہوتی ہے اور وقوع اس کا ہمیشہ اسی مصلحت کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر یہ نہ ہوتا تو منع کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ امن کو تو ہر ذی ہوش شخص واجب ترک سمجھتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مصلحت گناہ کی منافی نہیں ہے چنانچہ **وَإِنَّهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا** (ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) میں اول بیان ہو چکا ہے کہ یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں نفع ضرور ہے لیکن نقصان زیادہ ہے باقی یہ کہ وہ نقصان کیا ہے تو اس کا ہم نہ جانتے تب بھی ماننا جاننے پر موقوف نہ تھا دیکھو حکام جو قوانین مقرر کرتے ہیں۔ تو قوانین کا علم تو ہر شخص کو ضروری ہے لیکن اس کی لم اور مصالح کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری نہیں پس حق تعالیٰ کا اجمالاً یہ فرما دینا کافی ہے کہ اس میں نقصان ہے باپ کا بیٹے کو یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ہم کو تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ فلاں شے منفر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس مضرت کی وہ تفصیل بھی بیان کرے۔ پس خداوند جل جلالہ کو بطریق اولیٰ یہ حق حاصل ہے لیکن باوجود اس حق کے حاصل ہونے کے پھر بھی کچھ دینی و دنیوی مضرتیں ضرور میسر کی بیان فرمادیں چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے **إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْغَنِيِّ وَالْيَتِيمِ وَيُضِلُّكُمْ عَنِ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ** (یعنی شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے پس میں بغض اور عداوت واقع کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو باز رکھے) بہر حال **وَإِنَّهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا** (ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھا ہوا ہے) سے معلوم ہو گیا کہ گناہ میں مصلحت ہو سکتی ہے چنانچہ شراب کے اندر قوت اور یہ کہ شرابی سیر چشم ہو جاتا ہے۔ بخل جاتا رہتا ہے چنانچہ شعراء جاہلیت نے اپنے اشعار میں اس کا ذکر بھی کیا ہے اور میسر میں اگر بیت ہو تب تو حصول مال اور اگر ہار ہو تو مال سے بے رغبتی ہو جانا پس گناہ میں بعض اوقات امر محمود کا منضم ہو جانا بعید نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ گناہ نہ رہے اسی طرح جی بھر کر گناہ کرنا اگر اس میں یہ مصلحت ہو بھی کہ وہ سبب توبہ اور اطاعت کا ہو جائے تب بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ گناہ حرام نہ ہو بلکہ گناہ حرام رہے گا۔

حاصل جواب کا یہ ہوا کہ اگرچہ ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ اس میں مصلحت ہے لیکن چونکہ مفاسد بھی ہیں اسی لئے حرام ہے۔ (ترجمہ المفہومہ ملحقہ مواضع مفاسد گناہ)

تفکر فی الدنیا کی دو لطیف تفسیریں

یہاں تفکر فی الدنیا کی تاکید ہے اس پر یہ اشکال ظاہر میں ہوتا ہے کہ دنیا میں تفکر کی کیا ضرورت ہے بلکہ اس سے تو

فکر کو ہٹانا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کے اندر جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل دنیا کے لئے ہو اس کو مقصود بالذات سمجھ کر اور اگر مقصود بالذات نہ سمجھے تو وہ فکر بھی جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے طلب الحلال فریضة بعد الفریضة (حلال روزی کا طلب کرنا فرضوں کے بعد ایک فرض)

دوسری تفسیر اس سے لطیف ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں تفکر کرو موازنہ کے لئے کہ ان میں کون قابل اختیار کرنے کے ہے اور کون قابل ترک ہے یعنی جو فکر ترک دنیا کے لئے ہو وہ مطلوب ہے اسی لئے اہل اللہ نے دنیا میں فکر کر کے اس کی حقیقت کو سمجھا ہے اس لئے انہیں دنیا سے سخت نفرت ہے۔

فکر فی الدنیا کی ایک عمدہ تفسیر

دنیا کی تکالیف اور دنیا کی لذات میں غور کرے کہ یہاں کی لذات سب ایک دن فنا ہو جائیں گی اور دنیا کی زندگی تکالیف سے بھری ہوئی ہے اور فکر آخرت سے اس کا عکس ثابت ہوگا اس مجموعہ سے سوچنے سے دنیا کی بے قدری ہوگی اور آخرت کی طرف رغبت بڑھے گی جب دونوں کا موازنہ کرے گا تو معلوم ہوگا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا لاشیء محض ہے اور اس مراقبہ سے دنیا کی تکالیف میں بھی کمی ہوگی کیونکہ جب سوچے گا کہ دنیا میں بالفرض اگرچہ تکالیف ہیں مگر ایک روز یہ فنا ہو جائے گی اور آخرت میں راحت ہی راحت ہے تو وہ تکالیف نہ معلوم ہوں گی۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَآخِوَانُكُمْ وَاللَّهُ

يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٠٥﴾

ترجمہ: اور لوگ آپ سے یتیم بچوں کا حکم پوچھتے ہیں آپ فرمادیتے ہیں کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا زیادہ بہتر ہے اور اگر تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور اللہ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو جانتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم کو مصیبت میں ڈال دیتے اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

تفسیری نکات طریق اصلاح

چنانچہ اسی مقام پر دیکھئے۔ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ (آپ سے یتامی) کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ. آپ ان کے سوال کے جواب میں کہہ دیجئے حقیقی جواب تو آگے آئے گا۔ پوچھا تو واقعہ جزئیہ۔ اس کے جواب میں پہلے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں۔ پوچھا ایک بتائیں سو کہ شاید ادب کی وجہ سے بار بار نہ پوچھ سکیں۔ اس لئے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں کہ اسے یاد رکھیں۔ وہ یہ ہے اصلاح لهم خیر (یعنی ان کے حال کی درستی کرنا) یہ ہے بڑی اچھی بات۔ آگے جواب ہے وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَآخِوَانُكُمْ.

(اگر تم ملا جلا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں) غیر نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ حرج نہیں مگر یہ قاعدہ کلیہ پیش نظر رہے۔ اصلاح لہم۔ یہ کھانا ان کی مصلحت کے لئے ہو۔ اصلاح لکم۔ نہ ہو۔ یعنی تمہاری مصلحت کے لئے نہ ہو کیونکہ مخالفت میں دو مصلحتیں ہیں۔ ایک اپنی کہ اپنا کم ملایا ان کا زیادہ ملایا اور ان کی مصلحت ہے کہ یوں بچا ہوا بگڑتا ہے اور اب ملا جلا جا کر کھالو۔ اگلے وقت ان کی کم جنس سے لیس گے۔ یا خود اپنی ہی جنس میں ان کو شریک کر لیس گے۔ تو مخالفت کرو مگر ان کی مصلحت سے اپنی مصلحت سے نہیں تو فرماتے ہیں اس طور پر مخالفت کر لو کہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ واقعی اگر اتنی بھی مخالفت نہ ہوگی تو آپس میں یک جہتی نہ ہوگی اور وہ بھی غیر سمجھ کر الگ تھلگ رہیں گے۔ ان کی شفقت بھی ظاہر نہ ہوگی۔ بس دل میں حساب کتاب رہے کہ خود سمجھ رہے ہیں کہ یہ ان چیز ہے اور یہ ہماری ہے۔

اب ایک سوال باقی رہا تھا کہ نیت تو اصلاح کی ہے مگر اس طرح کرنے سے ممکن ہے کہ کچھ ان کے ہمارے ہاں صرف ہو جائے۔ شاید اس کا مواخذہ ہو۔ اس کا جواب ارشاد ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (یعنی خدا جانتا ہے مفسد اور مصلح کو)

مطلب یہ کہ کوڑی کوڑی کا حساب نہیں دیکھتے صرف نیت دیکھتے ہیں اگر نیت اصلاح کی ہے اور ان کا کچھ اپنے ذمہ صرف ہو گیا تو وہ معاف ہے نیت تو کھلانے کی ہے اگر اس پر بھی کچھ کھالیا گیا تو وہ ہمارے یہاں معاف ہے اور اس قسم کے کھانے کی اجازت ہے۔

اللہ اکبر! کس قدر رعایتیں ہیں ایسی تعلیم تو کسی بڑے سے بڑے حکیم کی بھی نہیں ہو سکتی حق یہ ہے کہ ذرا سے غور میں ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ واقعات پیش آنے کے بعد ان احکام کی اچھی طرح قدر ہوتی ہے جیسے ایک اور مقام پر والدین کے حقوق کے ضمن میں فرمایا ہے لَا تَقُلْ لَهُمَا آفٌ (یعنی انہیں "ہوں" بھی نہ کہو) وَلَا تَنْهَرُهُمَا (انہیں مت جھڑکو الی قولہ تعالیٰ قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا) یعنی ان کے ساتھ کرم کرو۔ تو اضع سے پیش آؤ ان کے حق میں دعا کرو۔

جامعیت کلام الہی

چنانچہ اس مقام میں بھی آگے ارشاد ہے وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَ اللَّهِ بِأَقْسَرِّ حَالٍ وَأَلْسَنُ حَالٍ (اور خدا کو منظور ہوتا تو تمہیں خوب مشقت میں ڈالتے یعنی مخالفت کی اجازت ہی نہ دیتے اور حفاظت اموال کا امر فرماتے تو ظاہر ہے بے انتہا مشقت ہوتی اس میں دو دعوے ہیں ایک تو یہ کہ اسے مشقت میں نہیں ڈالا آگے دونوں کی دلیل علی الترتیب فرماتے ہیں۔ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے غالب ہے اس لئے کہ مشقت ڈالنے کی قدرت ہے حکمت والا ہے دانا ہے اس لئے کہ مشقت میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا)

یہ ان آیات کا ترجمہ ہے اور اس ترجمہ سے مفصل مضمون معلوم ہو گیا ہوگا۔ اس وقت مجھے قل اصلاح لہم خیر کے متعلق بیان کرنا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں اصلاح جو مبتداء ہے نکرہ ہے اور خیر جو خبر ہے وہ بھی نکرہ ہے مگر خبر میں

اصل نکارت ہی ہے اور مبتداء میں اصل تعریف ہے کیونکہ مثلاً رجل جاء نی ایک آدمی میرے پاس آیا کہنے سے مخاطب کو کوئی نفع نہیں ہوتا تا وقتیکہ کہ رجل کی تعریف یا تخصیص نہ کر دی جاوے اس لئے مبتداء کا معرفہ ہونا یا کسی صفت یا ظرف کے ساتھ مقید ہو کر اس میں تخصیص ہونا ضروری ہے یہاں پر اصلاح اگرچہ نکرہ ہے مگر لہم کی قید نے اسے مبتداء بننے کے قابل کر دیا اور یہاں معرفہ بھی فرما سکتے تھے یعنی اصلاح لہم کی بجائے اصلاً مگر نکرہ ہی لائے۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ اصلاح کی تنوین تفلیل کی ہے کہ اگر تھوڑی بھی اصلاح ہو تب ہی خیر ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ اصلاح کتنا بڑا حق ہے اور اس کے لئے کس قدر اہتمام کی ضرورت ہے آگے فرماتے ہیں خیر یہ فعل التفصیل کا صیغہ ہے مبتداء میں تفلیل اور خبر میں نکشیر سبحان اللہ! کیا رعایت ہے یعنی تھوڑی بھی اصلاح بہتر ہے اور اس کا اتنا اجر ہے کہ ہزاروں عبادتوں سے بڑھ کر ہے سبحان اللہ!

یوں تو بتائی پر توجہ کے لئے بہت مضامین ہیں مگر اس چھوٹے سے جملہ کی نظیر نہیں اور کوئی نظیر کہاں سے لائے۔ نہ وہ خدا ہو گا نہ ایسے جملے لائے گا۔ واقعی قرآن عجیب چیز ہے

علوم قرآن

یہ ہیں قرآن کے علوم (اصلاح لہم خیر) کیا عجیب و غریب جملہ ہے اور کتنا بڑا اہتمام ہے کہ اصلاح کو نکرہ لائے جس سے اصلاح کی تعین نہ رہی تو اصلاح کی جوئی قسم چھوٹی ہو یا بڑی، خواہ جسمانی، خواہ روحانی سب کی خیریت حق تعالیٰ نے بیان فرمادی ہے۔ اصلاح لہم بالکل عام ہے اس میں نہ قید ہے بدن کی نہ روح کی بلکہ یہ دونوں کی جامع ہے۔ سبحان اللہ! جیسے وہ خود جمیع صفات کمالیہ کے جامع ہیں ویسا ہی ان کا کلام بھی کیا جامع ہے اس لئے نام ہی نہیں لیا کسی خاص اصلاح کا۔ اب اصلاحات کی فہرست سنئے ان اصلاحات کے ایک بدن کی ہے کہ نہیں کھلایا جاوے پلایا جاوے سردی گرمی سے بچایا جاوے مگر اس کھلانے پلانے کے آداب کا خیال رکھا جاوے۔

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مَشَكَّيْنًا وَآيَاتُهُمَا وَأَسِيرًا

میں اسی کھلانے پلانے کا ادب بیان کیا گیا ہے بعض ادب تو علیٰ حجبہ میں ہیں اس طرح سے کہ اس کی ضمیر میں کئی احتمال ہیں یا تو اس کا مرجع حق تعالیٰ ہے تو مطلب یہ ہے کہ کیوں کھلاتے ہیں؟ حق تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کھلاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ کھلانے پلانے میں ناموری یا تفاخر مقصود نہیں ہوتا بلکہ محض خدا کی محبت اس کا سبب ہے سو یہ بھی ادب ہے جس کا حاصل اخلاق ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کا مرجع الطعام ہو اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ کھانا کھلاتے ہیں باوجود اس کھانے کے محبوب و مرغوب ہونے کے حاصل یہ ہے کہ بچا کھچا گرا پڑا جو بالکل اپنے کام نہ آسکے نہیں کھلاتے بلکہ خود کو بھی مرغوب ہے اور اس کے حاجت مند بھی ہیں وہ کھلاتے ہیں یہ نہیں کہ کھانا خراب ہو گیا لاؤ یتیم کو دے دیں۔ مؤذن کو دے دیں۔

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ ان کو وہ کھانا دینا چاہیے جسے دینے کو جی بھی چاہتا ہو یہ نہیں کہ جو لا محالہ پھینکنا پڑے گا وہ

دے دیا یہ دونوں احتمال تو منقول تھے۔

ایک تیسرا احتمال جو میری سمجھ میں آیا ہے اور کہیں منقول نہیں دیکھا یہ ہے کہ جملہ کی ترتیب یہ ہے سب سے پہلے فعل اور اس کے بعد فاعل پھر مفعول بہ اور اس کے بعد ظرف وغیرہ ہوتا ہے یہاں الطعام کو تو جو مفعول بہ اول ہے موافق قاعدہ کے مقدم کیا اس کے بعد علیٰ حبہ لائے پھر مسکینا و یتیمان و اسیرا کو لائے جو معطوف علیہ سب مل کر مفعول بہ ثانی ہے اور اس سے وجہ اسے علیٰ حبہ پر لفظانہ سہی مگر معنایاً تقدم حاصل ہے اور اب علیٰ حبہ کی ضمیر بہ تاویل کل واحد کے ان کی طرف پھر سکتی ہے اور اب اضمار قبل الذکر کا اشکال بھی نہیں رہا کیونکہ اضمار قبل الذکر وہ تا جائز ہے جو لفظاً اور ترتیباً ہو یہاں اگرچہ لفظاً ہے مگر ترتیباً اضمار قبل الذکر نہیں ہے اب معنی یہ ہوئے کہ ان کو جو کھلاتے ہیں ان کی محبت کر کے کھلاتے ہیں تو تیسرا ادب یہ ہوا کہ انہیں محبت و شفقت سے کھلائے۔

غرض پہلا ادب یہ ہوا کہ خدا کی محبت کی وجہ سے کھلاؤ تا موری شہرت اور تقاخر کی نیت سے نہ کھلاؤ دوسرا یہ ہوا کہ عمدہ کھانا کھلاؤ۔ تیسرا ادب یہ ہوا کہ محبت اور شفقت سے کھلاؤ۔

یہ نہیں کہ کھلا پلا کے اور دے کر ان سے شکر یہ کے متوقع ہو۔ اے خدمت کرنے والو! مصارف خیر میں رقم دے کر کسی سے متوقع شکر یہ کے مت ہو۔ اگر تم نے توقع شکر یہ کر رکھی تو یاد رکھو اس کا حق ادا نہ کیا کیونکہ دینے والے کا ادب تو یہ ہے۔

لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا (کہ ہم جو کچھ دیتے ہیں تم سے اس کا اجر اور شکر یہ نہیں چاہتے)

اور اے مہتممان یتیم خانہ و مدارس و انجمن تم بھی کسی کا شکر یہ ادا نہ کرو کیونکہ شکر یہ تو اسے ادا کرنا چاہیے جس کے ساتھ احسان کیا جائے۔

من لم يشكر الناس لم يشكر الله

کا مطلب یہی ہے کہ اگر ہو سکے تو احسان کی مکافات کرو۔ اگر استطاعت نہ ہو مکافات دعا اور تعریف سے کر دو اور یہی شکر یہ ہے مگر یہ شکر یہ خواہ مکافات کے طور پر ہو یا دعا و تعریف کے طور پر اس شخص کے ذمہ ہے جس کے ساتھ احسان کیا جائے بلکہ تمہارے شکر یہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں دیا ہے اس سے ایک فہم شخص کی حوصلہ افزائی کے بدلے اسے بدظنی کا موقع مل سکتا ہے کہ شکر یہ ادا کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کھا جائیں گے بلکہ بجائے آپ کے انہیں آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ ایک کام میں جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ ان کا ہاتھ بٹا رہے ہیں مال کا موقع پر صرف کرنا حساب کتاب کو مرتب کرنا جھگڑے اور دشواری کے کام ہیں جنہیں بجائے ان کے آپ نے اپنا ذمہ لیا ہے اس لئے آپ کا ممنون ہونا چاہیے نہ یہ کہ آپ ان کا ناشکر یہ ادا کریں۔ (اصلاح الیتامی)

الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ

مُوتُوا قَدْ نَحَىٰ لَكُمْ اللَّهُ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ

لَا يَشْكُرُونَ ﴿۲۰۹﴾

ترجمہ: کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے موت سے بچنے کے لئے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فرما دیا کہ مر جاؤ پھر ان کو جلا دیا بے شک اللہ تعالیٰ بڑے فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

تفسیری نکات

شان نزول

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ** کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں سنی جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے یہ استفہام تعجب کے لئے ہے کہ قصہ بہت عجیب ہے چنانچہ ہمارے محاورات میں بھی ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں خبر بھی ہے آج ایسا ہو گیا اس سوال و استفہام سے محض تعجب دلانا مقصود ہوتا ہے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ قصہ بنی اسرائیل کی ایک بستی کا ہے جہاں طاعون ہوا تھا جس سے گھبرا کر لوگ بھاگ گئے مگر حق تعالیٰ نے **حَذَرَ الْمَوْتِ** (موت سے ڈر کر) فرمایا ہے **حَذَرَ الطاعونِ** (طاعون سے ڈر کر) نہیں فرمایا کیونکہ خوف تو اصل موت ہی کا ہے اور طاعون کا خوف بھی اسی لئے ہے کہ وہ اسباب موت سے ہے۔ **فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا** حق تعالیٰ نے ان سب سے کہا مر جاؤ سب مر گئے موت ہی سے بھاگے تھے اور موت ہی نے پکڑ لیا۔ واقعی خدا تعالیٰ کے سوا کسی جگہ پناہ نہیں مل سکتی بھاگنے سے کیا ہوتا ہے بلکہ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ طاعون سے بھاگنے والے بہت کم بچتے ہیں وہ دوسری جگہ جا کر بھی مبتلائے طاعون ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ دوسروں کی نظروں میں ذلیل بھی ہوتے ہیں دوسری بستی والے ان سے ملنے ملانے سے پرہیز کرتے ہیں پھر ذلت گوارا کرنے پر موت سے وہاں بھی بچاؤ نہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گر گریز بے امید راجح ہم ازاں جا پشت آید آفتے

(اگر کچھ راحت کی امید پر بھاگے تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

بچ سکنے بے دود بے دام نیست جز خلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بغیر دوز دھوپ کے نہیں ہے سوائے خلوت گاہ حق کے آرام نہیں ہے)

ثُمَّ أَحْيَاهُمْ یعنی پھر حق تعالیٰ نے ان کو دفعۃً زندہ کر دیا بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حزقیل علیہ السلام کی دعا سے زندہ ہوئے ایک تو ان سب کا دفعۃً مرنا عجیب تھا پھر سب کا دفعۃً زندہ ہو جانا اس سے بڑھ کر عجیب ہوا کیونکہ موت کے لئے

تو اہل طبعیات ظاہر میں کوئی سبب تراش بھی سکتے تھے مثلاً یہی کہ طاعون کی جگہ سے آرہے تھے وہاں کب آب و ہوا اثر کر چکی تھی اس لئے مر گئے مگر زندہ ہونے کے لئے کون سا سبب نکالا جائے گا اور اگر اس کا بھی کوئی سبب ہوتا تو لوگ اس کو بھی اختیار کرتے اور اگر کسی کو دعویٰ ہو کہ اس کا بھی کوئی طبعی سبب تھا تو میں ان سے کہتا ہوں کہ ذرا مہربانی کر کے آج کل بھی اس سے کام لے کر دکھا دیجئے اور حقیقت میں تو ان کی موت بھی بلا سبب ظاہری تھی کیونکہ تبدیل آب و ہوا کو اور طاعون کی جگہ سے چلے جانے کو اطباء یا ڈاکٹر تو سبب موت کہہ نہیں سکتے بلکہ وہ اس کو سبب حیات بتلاتے ہیں رہا اثر سابق سوا اول تو موثر سے بعد میں اس کے اثر کو ضعیف ہو جانا چاہیے نہ کہ قوی۔ دوسرے اتنی بڑی جماعت میں ایک وقت میں او ایک درجہ میں اثر ہونا یہ خود قانون طبعی کے خلاف ہے پس واقع میں زندگی اور موت سب اللہ کے قبضہ میں ہے۔

سب کا دفعہ مر جانا اور دفعہ زندہ ہو جانا دونوں واقعے عجیب اور خلاف عادت ہی تھے جن سے حق تعالیٰ کو اس امر کا اظہار مقصود تھا کہ احیاء و اماتت ہمارے قبضہ میں ہے کہ خلاف مقتضاء اسباب بھی واقع کر سکے ہیں فرار سے کچھ نہیں ہوتا۔ اور پہلی امتوں میں ایسے ایسے عجائبات بہت ہوتے تھے آج کل کھلی کھلی نشانیاں ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ اب تو جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے درجہ میں ہوتا ہے کیونکہ کھلم کھلا واقعات کے بعد انکار کرنے پر عذاب بھی بہت سخت ہوتا تھا اور اس امت پر رحمت زیادہ ہے اس لئے اب جو کچھ نشانات ظاہر ہوتے ہیں اسباب کے پردہ میں ہوتے ہیں اس سے عدم تذکیر پر عذاب بھی کم ہوتا ہے دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس امت کے کفار پر رحمت ہے کہ پہلی امتوں کے کفار کی طرح ان پر سخت عذاب نہیں آتا اسکے بعد فرماتے ہیں۔ لَئِنَّ اللّٰهَ لَذُو فَضْلٍ عَلٰی النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت فضل فرماتے ہیں لیکن اکثر شکر نہیں کرتے) یہاں مفسرین نے الناس کو عام لیا ہے اور یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ لوگوں پر بہت فضل کرنے والے ہیں کہ ایسے ایسے عجائبات و واقعات سے ان کو ہدایت فرماتے ہیں یا یہ کہ قہر کے بعد لطف بھی بے انتہا ہوتا ہے تو فضل سے مراد یہ لطف شامل ہو جاوے گا مگر میرے ذوق میں الناس سے یہاں مراد امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ سنا کر یہ مضمون حق تعالیٰ نے ہم کو سنایا ہے کہ تم پر اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ پہلے لوگوں کے قصے سنا کر تم کو عبرت دیتے ہیں یہ نہیں کیا کہ تم کو معذرت کر کے دوسروں کو عبرت دیں۔

طاعون سے بھاگنے کے احکام

حدیث شریف میں آتا ہے الطاعون من اعداء کم الجن۔ (طاعون تمہارے دشمن جنوں کی ایذا اور طعن سے ہے) مگر قتال میں مدافعت بالمثل ہے اور اس کی اجازت بھی ہے بلکہ امر ہے اور یہاں اس مدافعت کی کوئی صورت نہیں کیونکہ و خزا و خزا کا ہم کو ادراک ہی نہیں ہوتا ہاں مدافعت بالعلاج کی اجازت ہے کہ دوا دارو کرو۔ طبی تدابیر کا استعمال کرو۔ یہ تو مشابہت حقیقت میں ہے دوسری مشابہت طاعون کو قتال سے کہ فرغ ہے پہلی مشابہت کی وہ مشابہت حکم میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جس طرح فرار من الزحف (میدان جنگ سے بھاگنا) حرام ہے اسی طرح طاعون سے بھاگنا بھی حرام ہے اور حدیث شریف فرار من الطاعون کو فرار من الزحف (میدان جنگ سے بھاگنا) حرام ہے اسی طرح طاعون سے بھاگنا بھی حرام ہے اور حدیث شریف فرار من الطاعون کو فرار من الزحف (میدان جنگ سے

بھاگنا) کے مثل قرار دیا گیا ہے اور یہ تو فعل قبیح نقلی ہے پھر طاعون سے بھاگنا عقلاً بھی قبیح ہے کیونکہ مفید تو ہے نہیں کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ بھاگنے والوں کی موت بھی طاعون ہی میں ہوتی ہے اور اس کے علاوہ اس میں ذلت بھی ہے جہاں یہ لوگ جاتے ہیں وہاں کے باشندے ان سے پرہیز بلکہ نفرت و وحشت کرتے ہیں اور کہتے ہیں ان سے دور رہو یہ طاعون کی جگہ سے آئے ہیں اور مان بھی لو کہ بھاگنا مفید ہے لیکن اخیر بات یہ ہے کہ جان حق تعالیٰ کی ہے جہاں جس طرح حکم ہو ہم کو اس کی تعمیل ضروری ہے۔ کہیں حق تعالیٰ نے احتیاط کی اجازت دی ہے اور یہاں یہی حکم ہے کہ اس طریقہ سے احتیاط نہ کرو جیسے فوج میں تم خود کہتے ہو کہ بھاگنا قانوناً ناجرم ہے حالانکہ وہ بھی احتیاط ہی ہے یہ اہل فلسفہ کا منہ بند کرنے کے لئے جواب ہے کہ وہ اس حکم عدم فرار پر عقلی اعتراض کیا کرتے ہیں البتہ چونکہ مسئلہ فرعی ہے اعتقادی اور اصولی نہیں اس لئے اس میں محل فرار کی تعیین میں اجتہاد سے اختلاف کی گنجائش ہوگئی ہے اکثر علماء اس حکم کو علت خاصہ کے ساتھ معلل کرتے ہیں پھر ان میں سے بعض نے تو یہ کہا ہے فرار فی نفسہ حرام نہیں بلکہ غلط فی الاعتقاد کی وجہ سے حرام ہے یعنی جس کا یہ اعتقاد نہ ہو کہ یہاں سے بھاگ کر طاعون سے بچ جاؤں گا اور عدم فرار سے ہلاک ہو جاؤں گا اس کو بھاگنا جائز نہیں اور جس کا یہ اعتقاد ہو اس کو چلا جانا جائز ہے مگر اول تو حدیث شریف میں جو اس فرار کو فرار من الزحف سے تشبیہ دی گئی ہے وہ اس تعلیل سے آبی ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ فرار من الزحف میں بھی یہی تفصیل ہو دوسرے یہ کہ اس اعتقاد سے تو ہر مرض اور ہر بلا سے فرار حرام ہے طاعون ہی کیا کیا تخصیص ہے حالانکہ حدیث سے صریح تخصیصی مفہوم ہوتی ہے تیسرے یہ کہ جس کا اعتقاد درست ہوگا وہ بھاگے گا ہی کیوں بھاگے گا تو وہی جس کا اعتقاد کمزور ہوگا تو تفصیل بھی بے معنی ٹھہرتی ہے اور بعض نے اس ممانعت کی علت یہ بتلائی ہے کہ بھاگنے کی صورت میں پیچھے رہنے والوں کو تکلیف ہوگی اس علت کی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ اگر سب کے سب بھاگ جائیں تو جائز ہے اور انفراداً بھاگنا حرام ہے اور ان لوگوں نے ایک واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لشکر ایک مقام میں فروکش تھا وہاں طاعون شروع ہو گیا اور حضرت عمرؓ نے لشکر کو وہاں سے منتقل ہونے کا امر فرمایا مگر یہ علت بھی اسی شبہ سے مخدوش ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ جہاد میں بھی یہی تفصیل کر کے سب کا بھاگ جانا جائز ہو بعض کا ناجائز ہو اسی طرح یہ استدلال بھی تام نہیں کیونکہ وہ مقام لشکر مسکن نہ تھا عارضی قیام گاہ تھی اور فرار مسکن سے حرام ہے نہ کہ عارضی قیام گاہ سے مثلاً کوئی شخص مسافر ہو کر کسی مقام پر جائے اور طاعون شروع ہو جائے تو وہاں پر رفع طاعون تک قیام کرنا اس پر واجب نہیں دوسرے یہ کہ کیا معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ نے طاعون کی وجہ سے ان کو انتقال کا حکم دیا ممکن ہے کسی دوسری وجہ سے حکم دیا ہو کیونکہ لشکر تو ہوتا ہی ہے تبدیل و تفرج کے لئے اس لئے استدلال تام نہیں راجح اور صحیح یہی ہے کہ ان علل کے حکم میں کوئی اثر نہیں بلکہ اقرب العلیل وہ ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ چونکہ اس میں کفار جن سے مقابلہ ہے اس لئے فرار ناجائز ہے البتہ اتنی گنجائش ہے کہ جس شہر میں طاعون ہو وہاں ہستی سے نکل کر فناء شہر میں آ پڑیں۔ ہمارے اکابر نے بھی اتنی اجازت دی ہے گو یہ اجازت بھی اجتہادی ہے اس میں بھی اختلاف رائے کی گنجائش ہے مگر ظاہر اس کی ممانعت کی کوئی وجہ نہیں اور اس کی نظیر یہ ہے کہ جیسے لشکر اسلام کا خرگاہ اس میدان جنگ میں بدل دیا جاوے تو یہ فرار نہیں ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ بلا دمق فناء بقعہ واحدہ ہے اس کے ہر جزو میں رہنا اس بقعہ ہی میں رہنا ہے۔

قرض حسن

آگے فرماتے ہیں مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضْعِفَ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً کون شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دے یہاں قرض حسن سے وہ معنی مراد نہیں جو عوام میں مشہور ہیں۔ عوام بے سودی قرض کو قرض حسن کہتے ہیں جس میں اتنا ہی ملتا ہے جتنا دیا تھا بلکہ قرض حسن سے مراد وہ ہے کہ خلوص محبت کے ساتھ طوع و رغبت سے دے پھر اس کا معاوضہ مساوی نہ ملے گا بلکہ بہت زیادہ ملے گا جیسا کہ ابھی آگے آتا ہے تو مخلوق کے ساتھ معاملہ کرنے میں تو قرض حسن قرض بلا زیادت ہے اور خالق کے ساتھ معاملہ کرنے میں قرض حسن قرض مع الزیادت ہے یہاں ایک بات طالب علموں کے کام کی ہے وہ یہ کہ اس آیت کے ربط میں لوگوں کو اشکال پیش آیا ہے کہ ما قبل سے اس کا کیا ربط ہے مشہور یہ ہے کہ اس آیت کے ربط میں لوگوں کو اشکال پیش آیا ہے کہ ما قبل سے اس کا کیا ربط ہے مشہور یہ ہے کہ اوپر بذل نفس کا ذکر تھا یہاں بذل مال کا ذکر ہے اور قتال میں دونوں کی ضرورت ہوتی ہے نیز تہیو للقتال میں اصلاح ہے نفس کی اور اس اصلاح نفس میں بذل مال کو بھی بڑا دخل ہے بلکہ بعض لوگ نفس کے لئے تیار ہوتے ہیں مگر بذل مال ان پر گراں ہوتا ہے چنانچہ اسی مذاق کے ایک شخص کا قول ہے

گر جاں طلبی مضائقہ نیست و زر طلبی سخن دریں ست

(اگر جان مانگو مضائقہ نہیں اور اگر مال مانگو اس میں کلام ہے)

ممکن ہے شاعر کا خود یہ مذاق نہ ہو اس نے دوسروں کا مذاق بیان کیا ہو تو بہت لوگ اس مذاق کے بھی ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے مجاہدہ بذل النفس کے ساتھ ہر جگہ مجاہدہ بذل المال کا بھی ذکر فرمایا ہے تاکہ اصلاح کامل ہو جائے اور نسخہ مکمل ہو جائے یہ ربط بہت عمدہ ہے مگر اس کی ضرورت اسی وقت ہے جبکہ قرض کا استعمال بذل نفس میں نہ ہو سکتا ہونہ حقیقت نہ مجازاً اور نہ اس کو بذل مال کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں میں اس کو عام کہوں گا اور اس صورت میں بذل نفس سے بے تکلف ربط ہو جائے گا کیونکہ قرض میں بذل نفس بھی داخل رہے گا خواہ حقیقتہً خواہ مجازاً مطلب یہ ہوگا کہ اوپر بذل نفس کی ترغیب بصورت امر تھی یہاں دوسرے عنوان سے اسی کی ترغیب ہے کہ تم اپنی جان اللہ تعالیٰ کو ادھار ہی دے دو پھر تم کو ہی مع الزیادت واپس دیدی جائے گی مگر میں اس تفسیر پر اس لئے جرأت نہیں کرتا بلکہ صرف احتمالاً اس تو جیہ کو بیان کر رہا ہوں کہ مجھے لغت یا محاورہ کی تحقیق نہیں کہ قرض کا استعمال بدل نفس میں ہو سکتا ہے یا نہیں۔

أَضْعَافًا كَثِيرَةً كَمَا مَفْهُوم

فَيُضْعِفُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً۔ یعنی پھر اللہ اس قرض کو بڑھا کر ادا کریں گے دو گنے چو گنے کر کے دیں گے دوسری آیت سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ سات سو تک بڑھائیں گے مگر اس آیت میں بقرینہ سبب نزول أَضْعَافًا كَثِيرَةً (بڑھا چڑھا کر) سے سات سو سے بھی زیادہ مراد ہے کیونکہ لباب النقول میں اس آیت کے تحت میں ایک حدیث لکھی ہے کہ

جب آیت مثل الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ (جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت ایسی ہے جیسے ایک دانے کی حالت جس سے سات بالیں جمیں اور ہر بالی کے اندر سو دانہ ہوں) نازل ہوئی جس میں سات سو تک تضاعف کا ذکر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رب زدنی۔ ہمیں اس سے بھی زیادہ دیجئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضْعِفُهُ لَهٗ أَضْعَافًا كَثِيرَةً (اور کون شخص ہے کہ اللہ کو دے قرض کے طور پر قرض دینا اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر بہت حصے کو دیوے) معلوم ہوا اس آیت میں سات سو سے زائد تضاعف کا ذکر ہے اس بناء پر کم از کم سات سو سے دو گنا تو ہوگا اضعاف کی جمعیت اور اس کے اتصاف بالکثرت پر نظر کی جاوے تو پھر کچھ حد نہیں رہتی۔ اور ایک حدیث سے تو صریح معلوم ہوتا ہے کہ تضاعف فوق المتعارف ہے وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے راستہ میں ایک چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے یمن میں لے کر اس کو پرواں فرماتے ہیں یہاں تک کہ وہ جبل احد سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے تو اب خیال کیجئے جبل احد میں اگر تمر کے مساوی حصے فرض کئے جاویں تو کتنے اجزاء نکل سکتے ہیں ان کا کیا عدد ہوگا پھر اگر وہ حصے تمر کے مساوی حصے فرض کئے جائیں تو اور زیادہ عدد بڑھ جاوے گا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ احد سے بھی زیادہ ہوگا تو معلوم ہوا کہ تضاعف کی کوئی حد نہیں بلکہ لا الی النہایت ہے مگر یہ لاتناہی متناہی متعارف ہے لاتناہی عقلی نہیں پھر اگر قرض کو بذل مال کے ساتھ خاص کیا جائے تب تو تضاعف میں کوئی اشکال نہیں اور اگر بذل نفس کے لئے بھی عام کیا جائے تو وہاں تضاعف کی کیا صورت ہے کیا ایک جان کی ہزار جانیں ہو جائیں اول تو قدرت حق سے یہ بھی بعید نہیں کہ اس پر مجھے مولانا کا شعر یاد آتا ہے

نیم جان بستاند و صد جاں دہد انچہ درو ہمت نیاید آل دہد

(ضعیف و حقیر اور فانی جان لیتے ہیں جان باقی دیتے ہیں جو تمہارے وہم و گمان میں نہیں آسکتا وہ دیتے ہیں)

صد جان دہد (سو جانیں دیتے ہیں) کے کیا معنی ہیں۔ بعض نے تو کہا ہے کہ جان تو ایک ہوگی مگر قوت سو کے برابر ہوگی مگر صوفیہ اس سے آگے بڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں اگر حقیقتہً ایک جان سو جان ہو جائیں تو یہ بھی بعید نہیں کیونکہ وہ دنیا میں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر آخرت میں اس کا وقوع مستبعد کیوں ہے۔ حضرت قضیب البان کا قصہ ہے کہ کسی نے ان کے متعلق کسی امر منکر کی قاضی شہر کو اطلاع دی وہ درہ لے کر تعزیر کی نیت سے چلے وہ سامنے اس طرح نمودار ہوئے کہ بجائے ایک قضیب البان کے سو قضیب البان قاضی کے سامنے آگئے اور کہا ان میں سے ایک کو پکڑ لو جو تمہارا ملزم ہے۔ قاضی صاحب یہ کہ امت دیکھ کر معتقد ہو گئے تو وہاں سچ مچ ایک جان کی سو جان اور ایک جسم کے سو جسم ہو گئے تھے۔

وهو العلی العظیم (البقرہ) اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے

ملفوظ فرمایا کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد کے نام کو بجائے مملوک علی کے مملوک العلی

یعنی لام کے ساتھ لکھا ہے کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام پر الف لام نہیں داخل کیا جاتا۔ گو علی اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے لیکن بلا الف لام داخل کئے اسکا ایہام تھا کہ لفظ علی کو بجائے اللہ تعالیٰ کے نام کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام سمجھ لیا جاتا۔ اسی ایہام سے بچنے کے لئے الف لام داخل کر دیتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا جو نام علی ہے وہ الف لام کے ساتھ بھی مستعمل ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا خود ارشاد ہے وهو العلی العظیم نیز بلا الف لام بھی مستعمل ہے جیسے اس آیت میں انہ علی حکیم لیکن لفظ علی جو حضرت علی کا حکم ہے۔ وہ ہمیشہ بلا الف لام ہی کے ہوتا ہے۔ اس لئے الف لام داخل کرنے کے بعد اسکا اشتباہ ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ اللہ کا نام نہیں ہے۔ (الافاضات ایومیج ۲۷ ص ۲۰)

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ

لَا انفصامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۰۸﴾

ترجمہ: سو جو شخص کہ شیطان کے ساتھ کفر کرے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو کسی طرح شکستگی نہیں (ہو سکتی) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اور) خوب جاننے والے ہیں۔

تفسیری نکات

کفر محمود

معلوم ہوا کہ ہر کفر نہ مومن نہیں ہے بلکہ ایک کفر محمود بھی ہے یعنی کفر بالطاغوت (شیطان کے ساتھ کفر کرنا) تو کافر بھی بائیں معنی محمود ہے اور صوفیہ کی اصلاح میں بھی کافر کے معنی اسی کے قریب ہیں کیونکہ وہ فانی کو کافر کہتے ہیں جو غیر حق سے نظر قطع کر چکا ہو تو اس کا حاصل بھی وہی ہے جو کافر بالطاغوت کا حاصل ہے کیونکہ صوفیہ کے نزدیک ہر غیر حق طاغوت ہے جس کو وہ صنم اور بت سے تعبیر کرتے ہیں اور مسلمان ان کی اصلاح میں باقی کو کہتے ہیں اور کفر و اسلام فنا و بقا کو کہتے ہیں اس معنی کہ حضرت خسر فرماتے ہیں۔

کافر عشقِ مسلمان در کار نیست ہر گ من تار گشت حاجت زنا ر نیست

(میں عشق میں فانی ہوں مجھ کو بقا کی خواہش نہیں ہے میری ہر گ تار ہو گئی ہے زنا کی ضرورت نہیں ہے)

الْمَرْتَرِ إِلَى الَّذِي حَاجَبَ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ

رَبِّی الَّذِی یُنِجِی وَیُؤْتِی قَالِ اَنَا اُحْجِی وَ اُمِیْتُ قَالِ اِبْرَاهِیْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِی

بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاتِّبِعْهَا مِنْ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِی كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا

یَهْدِی الْقَوْمَ الظَّالِمِیْنَ ﴿۲۱۵﴾

ترجمہ: اے مخاطب تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود) کے بارے میں جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے کہنے لگا میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روز کے روز) مشرق سے نکالتا ہے تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال دے اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن پایا) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ پر چلنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

تفسیری نکات نمرود کی کج فہمی

اسی طرح نمرود بھی منکر صانع تھا۔ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کیا تھا کہ تم جو خدا کی ہستی کے مدعی ہو بلاؤ خدا کیسا ہے **قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّی الَّذِی یُنِجِی وَ اُمِیْتُ**۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا رب ایسا ہے کہ وہ ہی جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ (یعنی مارتا اور جلاتا اس کے خاص کمالات میں سے ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں کر سکتا اور عالم میں ان دونوں فعلوں کا وقوع مشاہد ہے پس خدا کا وجود بھی ضروری ^{لتسلیم} ہے) وہ کوڑھ مغز جلانے اور مارنے کی حقیقت کو تو سمجھا نہیں کہنے لگا کہ یہ کام تو میں کر سکتا ہوں یہ کوئی خدا کی خاص صفت نہیں جس کے وجود سے خدا کا وجود تسلیم کرنا لازم آ جائے کیونکہ میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارتا ہے اور جس کو چاہوں چھوڑ دوں یہ جلاتا ہے پھر جیل خانہ میں سے دو واجب القتل قیدیوں کو بلا کر ایک کو رہا کر دیا اور ایک کو مار ڈالا۔ ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ تو بالکل ہی بھدی عقل کا ہے اسے جلانے اور مارنے کی حقیقت بھی معلوم نہیں حالانکہ جلانے کی حقیقت یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈالنے نہ یہ کہ جاندار کو چھوڑ دے اسی طرح مارتا یہ ہے کہ زندہ کی جان اپنے اختیار سے نکالے اور گردن کاٹنے میں قاتل کے اختیار سے جان نہیں نکلتی اس کا کام تو صرف گردن کاٹنا ہے۔ اس کے بعد بدوں اس کے اختیار کے جان نکلتی ہے ورنہ پھر یہ بھی اختیار ہونا چاہیے کہ گردن الگ کر دے اور جان نہ نکلنے دے اور یہ گفتگو حضرت ابراہیم نے اس لئے نہ چھیڑی کہ قرآن سے معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھے گا نہیں یا سمجھ بھی گیا تو

تسلیم نہ کرے گا اور خواہ مخواہ اس میں الجھے گا اس ضرورت سے دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ آفتاب کو روز کے روز مشرق سے نکالتا ہے تو (اگر بزم خود خالق ہے تو ایک ہی دن) مغرب سے نکال کر دکھلا دے۔

نمرود کی مرعوبیت

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ اس پر وہ کافران کا منہ تھکنے گا اور کچھ جواب بن نہ آیا پھر اس نے بھی وہی کیا جو فرعون نے کیا تھا کہ سلطنت کے زور سے کام لینے لگا اور حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈلوادیا جس کی گزند سے خدا تعالیٰ نے ان کو بچا لیا اور آگ کا مطلق اثر نہ ہوا اس جگہ دو سوال وارد ہوتے ہیں ایک یہ کہ نمرود کو یہ کہنے کی تو گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی سورج کو مغرب سے نکال دے پھر اس نے یہ کیوں نہ کہا جواب اس کا یہ ہے کہ اس کے قلب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر سے بلا اختیار یہ بات پڑ گئی کہ خدا ضرور ہے اور یہ مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے۔ اور یہ بھی بے اختیار اس کے دل میں آ گیا کہ یہ شخص پیغمبر ہے اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا اور ایسا ہونے سے جہان میں انقلاب عظیم پیدا ہوگا کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ یہ لوگ اس خارق عادت کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ان کی راہ پر ہو لیں اور ذرا سی حجت میں سلطنت ہاتھ سے جاتی رہے یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور کوئی دوسرا جواب تو تھا نہیں اس لئے حیران ہو کر منہ دیکھتا رہ گیا دوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم نے اپنی حجت کیوں بدلی یہ تو آداب مناظرہ کے خلاف ہے کیونکہ اس طرح تو گفتگو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا پس جہاں مدعی کی دلیل پر نقض وارد ہوا ہو وہ اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری بیان کرنے لگے گا پھر اس پر نقض وارد ہوگا تو تیسری دلیل پیش کر دے گا و علی ہذا القیاس یوں تو سلسلہ غیر متناہی ہو جائے گا اسی لئے اہل مناظرہ نے مدعی کے لئے تبدیل حجت کو منع کیا ہے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اہل مناظرہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ مدعی کو اپنی مصلحت سے تبدیل دلیل کی اجازت نہیں باقی خصم کی مصلحت سے کہ مثلاً وہ غبی ہے اور دلیل اول کو غموض کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتا۔ حجت کا بدلنا اور دوسری صحیح دلیل بیان کرنا جائز ہے بلکہ جہاں سمجھانا مقصود ہو وہاں ایسا کرنا واجب ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھانا ہی مقصود تھا وہاں ایسا کرنا دلیل غامض کو بدل کر سہل دلیل اختیار کی اور گواہل مناظرہ نے اس کی تصریح نہیں کی مگر ان کے قول کو اس پر محمول کرنا ضروری ہے کیونکہ جس طرح ایک مصلحت عقلیہ تبدیلی کے عدم جواز کو متقنسی ہے اسی طرح ایک مصلحت عقلیہ بھی فہم مخاطب اس کے جواز کو متقنسی ہے اور ظاہر ہے کہ ہم نے پہلے قاعدہ کو محض اقتضاء عقل کی وجہ سے تسلیم کیا ہے ورنہ محض اہل مناظرہ پر کوئی وحی تھوڑا ہی نازل ہوئی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اقتضائے عقل کی وجہ سے اس قاعدہ میں استثناء کا قائل نہ ہو جائے یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق تھی۔

احیاء و اماتت کا مفہوم

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ - کہ میرا خدا احیاء و اماتت کرتا ہے تو اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلا کر ایک کو مار ڈالا ایک کو رہا کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ یہ تو محض گدھا ہے اس پر گھوڑے کا پالان کیوں لا دا۔ تو آپ نے دوسری دلیل بیان فرمائی کہ میرا خدا تو

آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال دے اس پر وہ مبہوت ہو گیا اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔
اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ نمرود اس کے جواب میں کہہ سکتا تھا کہ مشرق سے تو میں نکالتا ہوں اگر خدا کوئی ہے تو اس سے کہو کہ مغرب سے نکالے۔

اس کا جواب ہمارے بعض اساتذہ نے یہ دیا ہے کہ ہاں اس کو اس کہنے کی گنجائش تھی مگر خدا تعالیٰ نے یہ جواب اس کے دل میں نہیں ڈالا کیونکہ اگر وہ یہ جواب دیتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا تعالیٰ سے دعا کرتے اور آفتاب مغرب سے طلوع ہو جاتا اور یہ علامت قیامت سے ہے تو اسی وقت قیامت قائم ہو جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو ابھی عالم کا بقاء مقصود تھا۔ اس لئے نمرود کے دل میں یہ سوال نہیں ڈالا۔

وہی میرے استاد یہ بھی فرماتے تھے کہ فہمت الذی کفر۔ میں بھت بھینڈہ مجہول اسی لئے ایسا کہ اس کا فر مجہول کو حیران بنا دیا گیا اس لفظ میں اشارہ ہے کہ اس کو سوال کی گنجائش تھی مگر اس کو حیران بنا دیا گیا مگر یہ نکتہ اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ بھت معروف بھی متعدی حیرت میں ڈالنے کے معنی میں مستعمل ہو۔ میرا خیال یہ ہے کہ بھت مجہول ہی حیرت کے معنی میں ہے اور اس کا معروف متعدی مستعمل نہیں۔

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُنْفِي وَيُؤَيِّنُ اس مقام پر ایک علمی اشکال ہے میں اس کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ علم مناظرہ میں یہ طے ہو چکا ہے کہ مناظرہ کو ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز نہیں ورنہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسری دلیل کی طرف کیوں انتقال کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال اپنی مصلحت سے ممنوع ہے اور مخاطب کی مصلحت سے جائز ہے جب کہ وہ بلا دلت فہم کی وجہ سے دلیل اول کو نہ سمجھ سکے۔ نمرود احمق تھا وہ سمجھا نہیں کہ احياء و اموات کے معنی ایجاد حیات و ایقاع موت کے ہیں اور ابقاء حیات کو احياء نہیں کہتے نہ قتل کو اموات کہتے ہیں کیونکہ قتل عین موت نہیں بلکہ سبب موت ہے اور بعض دفعہ قتل سے موت کا تخلف بھی ہو جاتا ہے۔

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُنْفِي وَيُؤَيِّنُ کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔

نمرود کا احمقانہ ذہن

تو نمرود کہنے لگا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یہ کہہ کر اس نے قید خانہ سے دو قیدیوں کو بلایا جن میں سے ایک واجب القتل تھا اس کو تو رہا کر دیا اور ایک قیدی رہائی کے قابل تھا اس کو قتل کر دیا۔ حالانکہ یہ احياء و اموات نہ تھا کیونکہ احياء کے معنی حیات بخشنے کے ہیں جس قیدی کو نمرود نے رہا کیا تھا اس کو پہلے سے حیات حاصل تھی نمرود نے اس کو اپنے گھر سے حیات نہ دی تھی اور اموات از ہاق روح کا نام ہے اور جس قیدی کو اس نے قتل کیا تھا اس میں نمرود کا فعل صرف اس قدر تھا کہ اس نے اس کی گردن جدا کر دی اب یہ عادیۃ اللہ ہے کہ انگلی یا ہاتھ کے جدا کر دینے سے جان نہیں نکلتی اور گردن کے جدا کر دینے سے جان نکل جاتی ہے پس گردن کا جدا کرنا نمرود کا فعل تھا اس کے بعد جان خود بخود عادیۃ اللہ کے موافق نکل گئی انسان کا اس

میں کچھ دخل نہ تھا پس نمرود کی یہ حماقت تھی کہ اس نے تفریقِ جزاء و عدم تفریقِ اجزاء کو احیاء و اماتت سمجھا جب ابراہیم علیہ السلام نے اس کی کور مغزی دیکھی تو آپ نے دوسری دلیل کی طرف اس کو بجز عن الفہم (فہم کے عاجز ہونے) کے سبب نہ کہ اپنے بجز عن الجواب کے سبب انتقال کیا کیونکہ آپ نے یہ دیکھا کہ اگر میں اس کا جواب دوں اور احیاء و اماتت کی حقیقت بیان کروں اور یہ بتلاؤں کہ تیرا فعل احیاء و اماتت میں داخل نہیں تو یہ کور مغزی اس فرق کو نہ سمجھ سکے گا۔ اس لئے آپ نے دوسری دلیل اس سے بھی زیادہ واضح بیان فرمائی وہ یہ کہ میرا خدا وہ ہے جو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو خدا کا منکر ہے تو مغرب سے آفتاب کو نکال اس پر وہ کافر مبہوت ہو کر ان کا منہ تکنے لگا اور اس کا کچھ جواب نہ دے سکا۔

اہل مناظرہ کے اشکال کا جواب

یہاں سے اہل مناظرہ کے ایک اشکال کا جواب بھی ظاہر ہو گیا۔ اشکال یہ ہے کہ فن مناظرہ کا مسئلہ ہے کہ ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال کرنا مناظرہ کو جائز نہیں اور یہ ایک مسئلہ عقیلہ ضروری ہے کیونکہ اگر ایک دلیل سے دوسری دلیل کی طرف انتقال جائز کر دیا جائے تو اس طرح سلسلہ مناظرہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ تم نے ایک دلیل بیان کی خصم نے اس کو توڑ دیا تم نے اس سے انتقال کر کے دوسری دلیل بیان کر دی اس نے اس کو بھی توڑ دیا تم نے تیسری دلیل بیان کر دی تو یہ تو غیر متناہی سلسلہ ہو جائے گا۔ پھر حق کبھی ظاہر ہی نہ ہو سکے گا اس لئے علماء مناظرہ نے انتقال الی دلیل آخر کو ناجائز مانا اور کوئی شخص اس اشکال کا یہ جواب نہ سمجھے کہ یہ تو علم مناظرہ کا ایک مسئلہ ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں ان کا ذمہ ہمارے اصول کا ماننا کب لازم ہے بلکہ ہم کو نبی ان کی بات کا ماننا لازم ہے جو اب ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ محض ہمارے اصول مسلمہ کی قسم سے نہیں بلکہ عقلی مسئلہ ہے جس کا تسلیم ربانی نفع ضروری ہے۔ پس اب اس اشکال کا صحیح جواب سنئے۔ بات یہ ہے کہ مناظرہ میں انتقال الی دلیل آخر اپنی مصلحت سے تو ناجائز ہے لیکن خصم کی مصلحت سے جائز ہے مثلاً ہم نے ایک دلیل غامض بیان کی جس کو خصم نہیں سمجھ سکتا تو اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ دلیل غامض کو پہل عنوان سے بیان کیا جائے سو اگر اس میں تطویل زیادہ نہ ہو نیز مخاطب تسہیل کے بعد سمجھنے پر قادر ہو تب تو اس کی تسہیل کر دینی چاہیے اور اگر تسہیل میں تطویل ہو یا مخاطب ایسا بلید ہو کہ تسہیل کے بعد بھی دلیل غامض کو نہ سمجھ سکے تو اب دوسری صورت یہ ہے کہ اس دلیل غامض سے انتقال کر کے دوسری واضح دلیل بیان کر دی جائے جس کو خصم بخوبی سمجھ سکے تو ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت میں مخاطب کی مصلحت سے انتقال کیا تھا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ مخاطب بڑا ہی کور مغز ہے۔ اس لئے اس سے کیا امید تھی کہ وہ اماتت و احیاء کو سمجھے گا اور جھک جھک نہ کرے گا۔ اگر نمرود کو کچھ بھی علم و فہم ہوتا تو اس کی بات کا جواب بہت سہل تھا ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ سکتے تھے کہ از ہاق روح تیری قدرت میں نہیں تیرا کام صرف گردن جدا کر دینا تھا اس کے بعد روح کا نکل جانا مادۃ اللہ کے موافق ہوا تیرا اس میں کچھ دخل نہیں کیونکہ قاعدہ عقلیہ ہے القدرۃ تتعلق بالضدین کہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوا کرتی ہے جو شخص جان نکالنے پر قادر ہو گا وہ اس کے روکنے پر بھی ضرور قادر ہو گا پس تفریق گردن کے بعد اگر زہوق روح تیرے اختیار سے تھا تو اس پر بھی تجھ کو قدرت ہونی چاہیے کہ ایک شخص کی گردن جدا

کر کے اس کی جان کو نہ نکلنے دے اگر تو اس پر قادر ہے کہ گردن کاٹنے کے بعد جان کو روک لے اور نہ نکلنے دے تو ایسا بھی کر دکھا اس کا جواب اس کے پاس ہرگز کچھ نہ تھا۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دلیل کمزور نہ تھی اور نہ اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ نے دوسری دلیل کی طرف انتقال کیا تھا بلکہ محض اس وجہ سے انتقال کیا کہ پہلی دلیل کے سمجھنے کی اس کو مغز سے امید نہ تھی غرض انسان کا کام محض تحلیل و ترکیب ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۗ قَالَ أُولَٰئِكَ تُؤْمِنُونَ ۖ قَالَ بَلَىٰ ۗ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبُكَ ۗ قَالَ فَنُحِذُّ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ أَجْعَلُ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْهُنَّ أَدْعُهُنَّ يَا أَيُّهَا سَعْيَاءُ ۗ وَاعْلَمَنَّ اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝۶

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۗ قَالَ أُولَٰئِكَ تُؤْمِنُونَ ۖ قَالَ بَلَىٰ ۗ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبُكَ ۗ قَالَ فَنُحِذُّ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ أَجْعَلُ عَلَىٰ كُلِّ

جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا مِّنْهُنَّ أَدْعُهُنَّ يَا أَيُّهَا سَعْيَاءُ ۗ وَاعْلَمَنَّ اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝۶

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ کو دکھا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے ارشاد فرمایا کہ تم ایمان نہیں لائے انہوں نے عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا لیکن اس غرض سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے ارشاد ہوا کہ اچھا تم چار پرندے لے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلا لو پھر ہر پہاڑ پر ان میں ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر ان سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس سب دوڑے (دوڑے) چلے آئیں گے اور خوب یقین رہو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

تردد کے اقسام

وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبُكَ ۗ آخِر لطمین کا کیا مطلب ہے خود واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کو کس درجہ کا تردد تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں۔ فرمائیے کہ ابراہیم کو کون سا تردد تھا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ تردد تو ہو نہیں سکتا جو منافی ایمان ہو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان کے نہیں۔ ایک فرد تردد کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان ہو۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان کے نہیں۔ ایک فرد تردد کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان نہیں۔ تردد کی بہت سی قسمیں ہیں۔ یہ تردد جو حضرت ابراہیم کو تھا ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے اول تو ابراہیم علیہ السلام کی شان ایسی ہے کہ ان کی نسبت یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا کہ ان میں ایسا تردد تھا جو کہ ایمان کے منافی ہے اور پھر قرآن میں اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ اولم تو من کہ کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ ہلی یعنی ایمان کیوں نہیں۔ میں تو صرف اس لئے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان ہو جاوے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین آپ کو پورا تھا شک ذرا بھی نہ تھا۔ ہاں تردد کا وہ درجہ تھا جو اطمینان کے مقابل ہے اور وہ منافی ایمان نہیں۔

قرآن اور ترجمہ

اطمینان عربی کا لفظ ہے جس کے معنی سکون کے ہیں یہ یقین کا مرادف نہیں ہے البتہ اردو میں اطمینان بمعنی یقین مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ قرآن شریف کے کسی ترجمہ میں اطمینان کا لفظ دیکھ کر اس سے دھوکا ہوا ہو۔ اور آج کل تو ایسے ترجمے بھی ہو گئے ہیں کہ ان کے اندر ایسے دقیق فرقوں کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ یہی توجہ ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں بہت علوم جاننے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو ترجمہ دیکھنا بھی نہ چاہئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اس آیت کے متعلق مجھ کو پوچھنا ہے مگر اول اس کا ترجمہ کر دیجئے۔
وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ضالاً کا ترجمہ گمراہ کروں گا اور گمراہ فارسی میں تو عام ہے۔ اس کو بھی جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور اس کو جو واقف ہو کر راہ سے بھٹکا ہو۔ لیکن اردو میں گمراہ اسی کو کہا جاتا ہے جو قصد راہ سے الگ ہو گیا ہو کسی مترجم نے ضالاً کا ترجمہ لفظ گمراہ سے کر دیا ہے۔ بس اس کو دیکھ کر دل میں اعتراض آیا ہوگا میں نے کہا سنیے ترجمہ یہ ہے پایا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ناواقف پھر واقف بنا دیا اس کو سن کر چپکے ہی تو ہو گئے۔

اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن میں بہت سے علوم کی ضرورت ہے۔ ترجمہ کے مطالعہ کے لئے صاحب کشف نے مفسر کے لئے چودہ علوم کی ضرورت لکھی ہے۔ میں نے ایک موقع پر (فتح پور کے وعظ میں) ثابت کر دیا تھا کہ اگر نحو نہ جانتا ہوگا تو ترجمہ میں یہ غلطی کرے گا اور فلاں علم سے واقف نہ ہوگا تو یہ غلطی کرے گا۔ خوب واضح طور سے ثابت کر دیا تھا کہ اتنے علوم کی ضرورت ہے قرآن شریف کے ترجمہ کے لئے آج کل ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے جیس کہ لفظ گمراہ ہے اسی طرح لفظ اطمینان بھی ہے یہ اردو میں تو مرادف ہے ایقان کا مگر عربی میں اس کا مرادف نہیں بلکہ عربی میں اس کے معنی ہیں سکون قلب اور اس کا مقابل ہے تردد یعنی اضطراب قلب یعنی قلب میں حرکت سکون کی قسم کے خلاف ظاہر ہونا۔

وساوس اور اسباب

مطلب یہ ہے کہ اس کا تو یقین ہے کہ آپ زندہ کرنے پر قادر ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کیسے کریں گے۔ یہ دکھا دیجئے۔ جیسے حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا تھا انسی بکون لی غلام کہ یہ تو یقینی ہے کہ آپ بیٹا دینے پر قادر ہیں مگر یہ بتلا دیجئے کہ کس طرح ہوگا۔ آیا ہم میاں بیوی جوان کئے جاویں گے یا اسی حالت میں ہوگا انی استبعاد کے لئے نہیں انی بمعنی کیف یعنی سوال عن الکفایت کے لئے ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کرتے ہیں کہ رَبِّ اٰیٰتِیْ کَیْفَ تُثَبِّتِیْ الْمَوْتٰی کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔ اس کی کیا نظیر دکھا دیجئے۔ اس پر حکم ہوا اَلْحٰنُ اَرْبَعَةٌ مِّنَ الطَّیْرِ۔ الخ ان کو ہلا لو۔ پھر ذبح کرے خوب ان کا قیمہ کر لو اور چار حصے کر کے چار جگہ رکھ دو پھر ان کو پکارو سب دوڑے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور پکارا بس سب زندہ ہو کر ان کی طرف چلے آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھ سے تماشا دیکھ لیا بس اس سے معلوم ہو گیا کہ

مطلق تردد نہ ایمان کے منافی ہے اور نہ کمال ولایت کے۔

یہ سائلین کے کام کی بات ہے

اطمینان اور ایمان اور چیز ہے

فرمایا اطمینان اور چیز ہے اور ایمان اور چیز ہے ان میں فرق قرآن مجید سے سمجھنا چاہیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى اَرْشَادًا هُوَا اَوْ لَمْ تُؤْمِنْ عَرْض کیا بَلَىٰ وَلٰكِنْ لَّيَطْمِئِنَنَّ قَلْبِي اِس سے معلوم ہوا کہ ایمان تو تھا یعنی تصدیق مگر اطمینان کی طلب تھی اور وہ فرق یہ ہے کہ ایمان تو فقط تصدیق سے ہے اور اطمینان وہ کیفیت خاص ہے جو بعد مشاہدہ کے ہوتی ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ

اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَاٰبِلٌ فَاتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ

فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَاٰبِلٌ فَطَكَ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ ﴿۲۲۱﴾

ترجمہ: اور ان لوگوں کے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں کو عمل شاق کا خوگر بنا کر ان میں پختگی پیدا کریں مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ دگنا چکنا پھل لایا ہو اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار بھی کافی ہے اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں۔

تفسیری نکات

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں (تاکہ آئندہ انفاق بھی اور دوسرے اعمال صالحہ بھی سہولت سے صادر ہوا کریں) ان لوگوں کے صدقات و نفقات کی حالت مثل ایک باغ کی حالت کے ہے جو بلند زمین پر ہے اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زمین تو نشیب کی اچھی ہوتی ہے جس میں پانی ٹھہرے بلند زمین میں پانی کیونکر ٹھہرے گا۔ جواب یہ ہے کہ زمین بلند سے یہ کیونکہ سمجھ لیا گیا کہ وہ گنبد ہے بلکہ بلند بھی ہے اور مسطح بھی ہے کیونکہ بلندی پر ہوا لطیف ہوتی ہے اس کے بعد ارشاد ہے اصابھا و ابل اس کو موسلا دھار بارش نصیب ہوگی تو وہ اپنا پھل دو چند لایا چار چند۔ دو باتیں اس لئے کہی کہ ضعف کے معنی میں اختلاف ہے بعض نے کہا کہ ضعف کہتے ہیں مجموعہ مثلین کو تو ضعفین ثنیہ ہے اس کے معنی چار مثل یعنی چار چند کے ہو

گئے اور بعض نے کہا ہے کہ ان مثلین میں سے ہر مثل کو ضعف کہتے ہیں ان کے نزدیک ضعفین کا ترجمہ دو چند ہوگا جیسے زوج کبھی ہر فرد کو کہتے ہیں جس کا تشبیہ زوجین بمعنی ضعفین آتا ہے اور کبھی مجموعہ فردین کو کہتے ہیں جیسے دو کے عدد کو زوج کہتے ہیں بمعنی مجموعہ عددین آگے فرماتے ہیں **فَلَنْ لَّحْمِيصِيهَا وَابِلًا فَطَلٌ** اور اگر اس کو موسلا حار بارش نہ پہنچے تو پھوار بھی کافی ہے ای فطل یکفہ ظل یا تو ظل مبتدا ہے خبر محذوف ہے یا فاعل ہے جس کا فعل مقدر ہے اور نکرہ کا مبتدا ہونا جو ممنوع ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ مفید نہیں ہوتا اور اگر مفید ہو تو مبتدا ہونا جائز ہے اور یہاں مفید ہے وجہ افادہ کی یہ ہے کہ یہ سورۃ نکرہ ہے اور معنی نکرہ موصوفہ ہے کیونکہ ظل سے مراد مطلق ظل نہیں بلکہ وہ ظل ہے جو اس باغ سے لگے اس کو پہنچے اس کے بعد ارشاد ہے **وَاللَّهُ يَكْتُمُونَ بَصِيرًا**۔ اس کا ربط آیت کے اجزاء کی تحلیل سے معلوم ہوگا بدوں اس کے معلوم نہ ہوگا۔

اخلاص کی تشبیہ

ہمیں اعمال اختیاریہ کی تحصیل کا مکلف کیا ہے اور شارع کے ذمہ تسہیل کی رعایت نہیں مگر محض عنایت کی وجہ سے بعض دفعہ تسہیل کی بھی رعایت فرمالتے ہیں جیسا کہ اس آیت میں کیا گیا ہے پس سالکین کی یہ بڑی غلطی ہے کہ وہ سہولت کے طالب ہیں اور طلب تحصیل میں کوتاہی کرتے ہیں اس میں مقصود بالذات کو تابع اور مقصود بالعرض کو اصل قرار دینا ہے نیز صفت اختیار کا ابطال ہے جو اہانت الہیہ ہے اب میں مختصراً تشبیہ کے متعلق جو اس آیت میں مذکور ہے کچھ عرض کرتا ہوں حق تعالیٰ نے یہاں نفقات کو جنات سے تشبیہ دی ہے وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جس طرح باغ میں پھل کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح نفقات میں زیادت ہوتی ہے اور وائل سے اخلاص کی تشبیہ مقصود ہے جس کی دلیل اوپر کی آیات ہیں کیونکہ اوپر رباء فی الانفاق کی مذمت ہے **كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ الْاِيَّه**۔ اس کے بعد اخلاص فی انفاق کی فضیلت بیان فرمائی گئی اور جب وائل سے مراد اخلاص ہے اور اس کے مقابلہ میں ظل مذکور ہے اور وائل کہتے ہی موسلا دھار بارش کو اور ظل کہتے ہیں پھوار کو تو اس تقابل سے معلوم ہوا کہ وائل سے اخلاص کامل مراد ہے اور ظل سے اخلاص قلیل مراد ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر اخلاص کامل ہو تو نفقات میں ترقی زیادہ ہوگی اور اگر اخلاص قلیل ہو تو وہ بھی ترقی کے لئے کافی ہے گو زیادہ ترقی نہ ہو اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل بھی مطلوب ہے بلکہ اس سے وہمیوں کا علاج کیا گیا ہے کیونکہ اگر اخلاص کامل کا مطلوب ہونا ان کے ذہن نشین ہو جائے تو ان سے کوئی عمل نہ ہو سکے گا کیونکہ پہلے ہی دن اخلاص کامل میسر نہیں ہو سکتا۔

جیسے ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے سامنے ایک جنازہ کی نماز شروع ہوئی اور وہ شریک نہ ہوئے کسی نے پوچھا کہ آپ نے نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھی فرمایا کہ میں نیت کی تصحیح میں مشغول رہا یہی سوچتا رہا کہ اس وقت اس میت کی نماز پڑھنے میں کیا نیت ہے کیونکہ نماز جنازہ میں مختلف نیتیں ہوتی ہیں کبھی اعزہ واقرباء کی خاطر سے پڑھی جاتی ہے کبھی میت کی وجاہت کا اثر ہوتا ہے کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ میت محلہ دار ہے اگر نماز نہ پڑھیں گے تو اہل محلہ ملامت کریں گے یہی وجہ ہے کہ رئیس یا عالم کے جنازہ کا بہت اہتمام کیا جاتا ہے غریبوں کے جنازہ کا اس قدر اہتمام نہیں ہوتا اگر اخلاص منشاء ہوتا تو یہ فرق کیوں ہوتا۔ اسی طرح حافظ اگر تراویح میں سوچتا رہے کہ میں تراویح میں جو بنا سنوار کر قرآن پڑھ رہا ہوں اس میں کیا

نیت ہے کیونکہ تہا نماز پڑھتے ہوئے ایسا اہتمام نہیں ہوتا تو ظاہر ہے کہ وہ تراویح ہرگز نہ پڑھا سکے گا پس اس وہم کا علاج کر دیا گیا کہ تم کس وہم میں پڑے ہو ہمارے یہاں اخلاص قلیل بھی کافی ہے بس تم اپنی طرف سے برا قصد نہ کرو اس کے بعد بے فکر ہو کر کام میں لگو اور اخلاص کامل کے لئے سعی کرتے رہو اسی طرف سے ایک دن اخلاص کامل بھی میسر ہو جائے گا اور اگر پہلے ہی دن اخلاص کامل پر عمل کو موقوف رکھا تو تم سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا یہ مطلب ہے فَإِنْ لَمْ يُصَيِّهَا وَأَهْلًا فَطَلِّكَ كَا کہ ابتداء میں اخلاص قلیل ہی کو کافی سمجھو اور عمل شروع کر دو یہ مطلب نہیں کہ اخلاص قلیل ہی مطلوب ہے بلکہ مطلوب تو اخلاص کامل ہے مگر اس کے حصول کا طریقہ یہی ہے کہ اول قلیل ہی سے عمل شروع کر دو۔

بعض نے جو ارشاد خداوندی اَنْتَبَهْتُمْ سَبْعَ سَنَائِلٍ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ قِيَادَةُ حَبَّتَيْهَا سے تضاعف حسنت کی تحدید سات سو تک نکالی ہے سو آیت میں درحقیقت تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک تمرة جو راہ خدا میں دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی تربیب فرماتا رہتے ہیں یہاں تک کہ جبل احد کے برابر ہو جاتا ہے اور جبل احد کے اگر ایک تمرة کے برابر اجزا بنائے جائیں تو سات سو گئے کیا کروڑوں اربوں گئے تک نوبت پہنچے گی پس معلوم ہوا کہ آیت میں تحدید مراد نہیں بلکہ تکثیر اجر الہی ما یحصی مقصود ہے۔ محاورات میں ایسے اطلاقات ہوتے ہیں کیونکہ بسا اوقات بول چال میں عدد مخصوص بولا جاتا ہے اور مراد عدد معین نہیں ہوتا بلکہ تکثیر مراد ہوتی ہے جیسا ہمارے محاورے میں بھی بولا جاتا ہے کہ بیسیوں دفعہ یہ کام کیا۔ پچاس دفعہ کھایا۔ باوجودیکہ عدد معین بولا گیا ہے لیکن مراد صرف کثرت ہے نہ عدد مخصوص۔ اسی طرح عربی زبان میں بھی سبع۔ سبعین وغیرہ اکثر بول کر مراد کثرت لی جاتی ہے۔ پس بعض ظاہرین کو تاہ نظر جو شبہ کیا کرتے ہیں کہ احادیث و روایات میں بعض نعمائے جنت اور عذاب و دوزخ کے بیان میں ستر ستر کی تحدید کیوں ہے اس کا جواب ہو گیا۔ کہ بدالمت محاورہ عرب تحدید مراد نہیں بلکہ تکثیر مراد ہے اور ہر زبان کے محاورات اور خواص جدا ہوتے ہیں۔

عمل کے بعض ثمرات خاص عامل ہی کو ملتے ہیں

عمل کی بعض خاصیتیں وہ ہیں کہ ان کا ثمرہ خاص عامل ہی کو حاصل ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشِينًا قُلُوبِهِمْ أَنفُسِهِمْ۔ یعنی مثل ان لوگوں کی جو اپنے مالوں کو اللہ کی رضا مندی کی طلب کرنے اور اپنے نفسوں کو نیک کاموں پر جمانے کے لئے خرچ کرتے ہیں دیکھئے اس آیت میں مال کے خرچ کرنے کی خاصیتیں ارشاد فرمائی ہیں اول تو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی طلب کرنا یعنی ثواب دوسرے اپنے نفس کو جمانا یعنی اس میں سخاوت کا ملکہ پیدا کرنا جس کا حاصل اخلاق کی درستی ہے۔

چنانچہ واؤ عاظمان دونوں کے تغائر پر دال ہے۔ پس ثواب تو وہ شے ہے کہ دوسرے کے کرنے سے بھی مل جاتا ہے اور نفس عمل کو جو خاصیت ہے یعنی نفس میں ملکہ اور قوت پیدا ہونا یہ بغیر اپنے کئے نہیں ہو سکتا دیکھو پہلوان درست دشمن ہے بچاؤے گا لیکن تمہارے اندر وہ قوت پیدا کر سکتا قوت ہی ہوگی جب تم خود ورزش کرو گے خلاصہ یہ ہے کہ بدوں اپنے کئے نفس کے اندر قوت نیک اعمال کی پیدا نہیں ہو سکتی اور اس قوت ہی کا نام خال ہے سو لوگوں کو بالعموم اس کی فکر ہی نہیں۔ نماز پڑھتے

ہیں لیکن اس کا فکر نہیں کہ اس کی دھن لگ جائے۔ روزہ رکھتے ہیں حج کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں مگر اترے دل سے اس کا شوق نہیں کہ بعض فرائض و واجبات سے ترقی کر کے ذکر بھی کرتے ہیں لیکن ان کا ذکر صرف زبان پر ہے قلب میں کچھ اثر نہیں اور اس اثر نہ ہونے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی ان عبادات کو دوام نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ ان کی جز قلب میں پیدا نہیں ہوئی اگر نماز قضا ہو جائے تو ہو جائے کچھ غم نہیں۔

وَلَا تَيْمَمُوا الْغَيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخِيذِينَ إِلَّا أَنْ تَغِيضُوا فِيهِ اس میں تیمم اور قصد کی ممانعت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے چھانٹ کر بری چیز کا قصد نہ کرو تیمم کی قید میں بھی رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ جانتے ہیں کہ بعض لوگ غریب بھی ہوں گے جن کے پاس گھنیا ہی مال ہوگا تو اگر وہ گھنیا دیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ وہ گھنیا کا انتخاب اور قصد نہیں کرتے بلکہ اس لئے گھنیا دیتے ہیں کہ ان کے پاس اور ہے ہی نہیں پھر آگے اس کا معیار بتلاتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہر شخص کے اعتبار سے گھنیا کا درجہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں وَلَسْتُمْ بِأَخِيذِينَ یعنی بس یہ دیکھ لو کہ اگر ایسی چیز کوئی تم کو دے تو تم بھی خوشی سے اس کو لے سکتے ہو لحاظ کر لینا معتبر نہیں اس لئے آگے إِلَّا أَنْ تَغِيضُوا فِيهِ بھی بڑھا دیا پس جو چیز تم دوسرے سے خوشی کے ساتھ لے سکتے ہو اس کو اللہ کے نام پر بھی دے سکتے ہو اور ظاہر ہے کہ جس غریب کے پاس سب گھنیا ہی مال ہے وہ دوسرے سے بھی اس جیسی چیز کو لے سکتا ہے لہذا ان کو گھنیا جانور کی قربانی جائز ہے اور جو لوگ ایسے نازک ہیں کہ بیمار اور دبے جانور کا گوشت بھی نہیں لیتے ہمیشہ عمدہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں اگر یہ دبلا پتلا جانور قربانی کریں گے تو اس کی ممانعت ہوگی کیا رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے معیار بھی خود ہی بتلا دیا تمہاری رائے پر نہیں چھوڑا آگے فرماتے ہیں وَاللَّهُ غَنِيٌّ عَنِ خَدَاتِ الْعَالِي عَنِي ہے اس کو تمہارے مال کی ضرورت نہیں پس خدا کے نام پر ایسا مال دو جیسا اغنیاء کو دیا کرتے ہیں اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جب خدا تعالیٰ کو احتیاج نہیں پھر ہم جیسا چاہیں خرچ کر دیں تو فرماتے ہیں حمید یعنی گوان کو احتیاج نہیں مگر کرتے تو ان کی رضا کے لئے ہو جب یہ ہے تو وہ محمود بھی ہیں اس لئے ان کے نام پر ہر حال میں مال محمود ہی خرچ کرنا چاہیے پھر بعض کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ تو سب کچھ ہے کہ اللہ کے لئے مال محمود خرچ کرنا چاہیے کیونکہ وہ غنی حمید ہے مگر عمدہ مال میں روپے بھی تو بہت خرچ ہوتے ہیں پھر محتاج ہو جاویں گے اس کا جواب دیتے ہیں الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفِتْنَةِ کہ یہ شیطان کا دھوکہ ہے وہ تم کو فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کی بات بتلاتا ہے فحشاء سے مراد یہاں مفسرین کے نزدیک بخل ہے واقعی یہ کیسی بے حیائی کی بات ہے کہ خدا ہی کا مال اس کے حکم سے دینا نہیں چاہتا آگے زیادہ ہمت بڑھاتے ہیں وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا اور اللہ تعالیٰ تم سے (انفاق پر) مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں اور ترقی (مال و دولت) کی امید دلاتے ہیں پس مطمئن رہو کہ صدقہ خیرات سے مال میں کمی نہ آئے گی بلکہ ترقی ہوگی (حدیث میں اس کی زیادہ تصریح ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا) آگے وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ بھی ایک اشکال کا جواب ہے ہے کہ حق تعالیٰ بڑے وسعت والے ہیں ان کے یہاں کچھ کمی نہیں اس لئے وعدہ فضل پر شبہ نہ کرو اور وہ ہر شخص کے عمل کو خوب جانتے ہیں اس لئے یہ

دوسرے نہ کرو کہ اتنے آدمیوں میں ہمارے عمل کی کیا خبر ہوگی ان سے ذرہ برابر کسی کا عمل مخفی نہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ

مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخِيذِيهِ إِلَّا أَنْ

تُغِيضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَنِّي حَمِيدٌ ۝ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ

وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ

عَلِيمٌ ۝ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا

كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! (نیک کام میں) خرچ کیا کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہے اور ردی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں تعریف کے لائق ہیں شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے اور تم کو بری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں خوب جاننے والے ہیں دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جاوے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں)

تفسیری نکات

رعایت غربا

اس میں غرباء کی رعایت کی گئی ہے اگر طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ نہ فرماتے بلکہ أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مطلقاً فرماتے تو غرباء کو فکر ہوتی کہ ہمارے پاس تو جتنا کچھ ہے امیروں کی نظروں میں سب بیچ ہے تو طیبات کاملہ ہم کہاں سے لائیں اس لئے حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ طیبات کاملہ کی ضرورت نہیں بلکہ تمہارے پاس جو کچھ ہے اس میں سے پاکیزہ مال خرچ کرو اور اس میں سے چھانٹ کر دی مال اللہ کے واسطے نہ نکالو۔

اب یہاں ایک اشکال واقع ہوتا ہے وہ یہ کہ حدیث میں ہے کہ جب نیا کپڑا پہنے تو پرانے کو خیرات کر دے اور نیا جوتا پہنے تو پرانے کو اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ردی مال صدقہ کیا جائے گا تو میں اس حدیث کا مطلب یہ سمجھا ہوں کہ

پرانے کپڑے اور جوتے کو اللہ کے نام پر ثواب کی نیت سے نہ دیا جائے بلکہ اعانت غریب کی نیت سے صدقہ کیا جائے تم اعانت غریب کے سوا کچھ قصد نہ کرو۔ چاہے اللہ تعالیٰ تم کو ثواب بھی دیدیں خوب سمجھ لو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد اس سے وہ پرانا ہو جو ردی کے درجہ تک نہ پہنچا ہو بہر حال تحصیل برکے لئے احب الاشیاء کا انفاق ضروری نہیں اور حضرت ابو طلحہؓ کا احب الاشیاء کا خرچ کرنا یہ اس غرض سے تھا کہ وہ خیر کامل کے قصد سے انفاق اعلیٰ کرنا چاہتے تھے کیونکہ حضرات صحابہؓ کی یہی شان تھی کہ وہ ہر کام میں اعلیٰ درجہ کا قصد کرتے تھے۔ دوسرے خود نص میں ایک قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حصول برکے لئے انفاق احب الاشیاء ضروری نہیں اور وہ قرینہ **وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يَبْذُرُهُ اللَّهُ بِهِ عَلَيْكُمْ**۔

اس آیت کی مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ آیت سابقہ کی علت ہے کہ تم کو انفاق پر ثواب کیونکر نہ ملے اللہ تعالیٰ تمہارے انفاق کو خوب جانتے ہیں اس تفسیر پر تو اس کا حاصل آیت سابقہ سے متحد ہے مگر میری سمجھ میں خود بخود یہ بات آئی تھی کہ یہ آیت پہلی آیت کے مقابل ہے کہ پہلی آیت میں انفاق محبوب پر برکات کے حصول کو موقوف کیا گیا تھا اور اس آیت میں **مَا تُنْفِقُوا** عام ہے محبوب و غیر محبوب دونوں کا مطلب یہ ہے کہ برکات تو انفاق محبوب ہی سے حاصل ہوگی اور ویسے جو کچھ بھی تم خرچ کرو خواہ محبوب ہو یا غیر محبوب بشرطیکہ ردی نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتے ہیں یعنی ثواب کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔ گو برکات کامل حاصل نہ ہو۔ یہ تفسیر میرے ذہن میں آئی تھی مگر میں اس پر مطمئن نہ ہوا بلکہ تفاسیر میں تلاش کیا تو بیضاوی نے یہی لکھا ہے جو میں سمجھا تھا اس سے میرا جی بہت خوش ہوا اور اطمینان ہو گیا کہ یہ تفسیر بالرائے نہیں۔

وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (اور جس کو دین کا فہم مل گیا اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی)

حکمت موہبت خداوندی ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص حکمت یعنی علم دین عطا کیا جاوے تو اس کو بیشک خیر کثیر مل گئی اب یہ سمجھئے کہ آیت میں **يُؤْتِ الْحِكْمَةَ** فرمایا۔ یہ نہیں ارشاد فرمایا **من تعلم الحكمة** یا **من حصل الحكمة**۔ یعنی حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جو شخص حکمت دیا جاوے اس کو خیر کثیر مل گئی یہ نہیں فرمایا جو حکمت سیکھے یا جو حکمت حاصل کرے اس کو خیر کثیر مل گئی اس میں یہ رمز ہے کہ کہیں طالب علم و محصل کو زعم اور عجب اور ناز نہ پیدا ہو جاوے کہ میں نے اپنی فطانت و ذہانت و محنت سے علم حاصل کیا ہے پس **من یوت** میں یہ بتلادیا کہ یہ محض موہبت خداوندی ہے جس کو چاہیں عطا فرمادیں گو اس کے اسباب مکتبہ ضرور ہیں اور اسی بناء پر انسان اس کی تحصیل کا مکلف قرار دیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے **طلب العلم فریضة علی کل مسلم** (قال الجامع رواہ ابن عبد اللہ باسناد صحیح) سچ یہ ہے کہ بعد سعی کے علم دین کا حاصل ہو جانا یہ محض موہوب من اللہ ہے کہ سبب نہیں ہے جیسے نکاح فعل اختیاری ہے اور اسی طرح مجامعت بھی فعل اختیاری ہے مگر اولاد کا ہونا بالکل غیر اختیاری ہے اگر حق تعالیٰ چاہیں عطا فرمادیں اور چاہیں محروم فرمائیں سوا اسی طرح کتاب پڑھنا محنت کرنا سامان تحصیل مہیا کرنا افعال اختیاریہ ہیں لیکن حصول علم دین غیر اختیاری ہے کیونکہ درحقیقت علم دین حقائق دیدیہ کا قلب پر وارد ہونا ہے اور وہ محض موہوب ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ دو طالب علم لیجئے جو ہر طرح ظاہری اسباب تحصیل

میں مساوی درجہ کے ہوں یعنی استاد دونوں کا ایک ہو توجہ بھی استاد کی دونوں پر مساوات کے ساتھ ہو تدریس و تفسیر و تصنیف وغیرہ کا کام بھی دونوں سے برابر درجہ میں لیا گیا ہو مدت تکمیل بھی دونوں کی ایک ہو عمر بھی ایک ہو فطانت و ذہانت میں بھی برابر ہوں مگر ایک میں تقویٰ زیادہ ہو تو ضرور ہے کہ متقی کا علم لطیف اور بڑھا ہوا ہوگا اور یہ امر مشاہدہ ہے لاریب فیہ بلکہ بعض اوقات متقی اس درجہ کا ذہین نہیں ہوتا جس درجہ کا وہ دوسرا شخص ذہین ہوتا ہے جو اس سے تقویٰ میں کم درجہ کا ہے مگر باوجود اس کے متقی کا علم زیادہ اور لطیف ہوتا ہے پھر اسباب ظاہریہ کی مساوات کے ہوتے ہوئے تقویٰ سے علم کا زیادہ لطیف ہو جانا یہ موہوب ہونے کے سبب نہیں ہو سکتا تو اور کیا ہے پس معلوم ہوا کہ حصول علم دین محض وہی ہے۔

بنی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و دستا

(اگر شبہ ہو کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا سبب ہے اور وہ ایک شخص میں کم ہے اسی لئے اس کے علم میں کمی ہے پھر موہوب علم کہاں رہا اور مساوات کہاں متحقق ہوئی تو جواب یہ ہے کہ اول تو یہی مسلم نہیں کہ تقویٰ بھی تحصیل علم کا ایک سبب ہے چنانچہ کوئی شخص خاص اس نیت سے تقویٰ کر کے دیکھے کہ ہمارے علم میں ترقی ہوگی سو کچھ لے گا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے علم میں خاک بھی ترقی نہ ہوگی ترقی تو عاڈہ ہو جاتی ہے جبکہ مقصود تقویٰ سے خالص رضائے الہی ہو اور بر تقدیر تسلیم یہ اسباب ظاہریہ میں سے نہیں ہے اور یہاں ذکر اسباب ظاہریہ کا ہے اور جو اسباب کو عام لیا جاوے تو اسباب غیر ظاہری تو رحمت خداوندی بھی ہے جو سبب ہے موہبت کا تو پھر یہ بھی کہا جاوے گا کہ ایک کے شامل رحمت الہیہ ہے اور وہ سبب ہے زیادت کا اور دوسرے کو یہ میسر نہیں فلا مساواة حالانکہ یہ اعتراض کوئی فہیم نہیں کر سکتا ۱۲)

اسی طرح مجامعت بھی فعل اختیاری ہے مگر اولاد کا ہونا بالکل غیر اختیاری ہے اگر حق تعالیٰ چاہیں عطا فرمادیں اور چاہیں محروم فرمائیں سو اسی طرح کتاب پڑھنا محنت کرنا سامان تحصیل مہیا کرنا افعال اختیاریہ ہیں لیکن حصول علم دین غیر اختیاری ہے کیونکہ در حقیقت علم دین حقائق دینیہ کا قلب پر وارد ہونا ہے اور وہ محض موہوب ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دعویٰ سے کہتا ہوں کہ آپ دو طالب علم لیجئے جو ہر طرح ظاہری اسباب تحصیل میں مساوی درجہ کے ہوں یعنی استاد دونوں کا ایک ہو توجہ بھی استاد کی دونوں پر مساوات کے ساتھ ہو تدریس و تفسیر وغیرہ کا کام بھی دونوں سے برابر درجہ میں لیا گیا ہو مدت تکمیل بھی دونوں کی ایک ہو عمر بھی ایک ہو فطانت و ذہانت بھی برابر ہوں مگر ایک میں تقویٰ زیادہ ہو تو ضرور ہے کہ متقی کا علم لطیف اور بڑھا ہوا ہوگا اور یہ امر مشاہدہ ہے لاریب فیہ۔

اور ایک یہ بات سمجھنے کی ہے کہ آیت میں حکمت یعنی علم دین کو خیر کثیر کہا گیا حالانکہ صرف خیر کا لفظ بھی کافی تھا کیونکہ یہ لفظ موہبم تفصیل ہے اس کے معنی ہیں بہت اچھا اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جیسی عظیم الشان ذات جس چیز کو بہت اچھا فرمائے اس کی خوبی کس درجہ کی ہوگی مگر صرف اسی لفظ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مزید مبالغہ کے لئے کثیر کا لفظ بھی اضافہ فرمایا یعنی علم دین بہت ہی بڑی نعمت ہے اور بہت اچھا ہونے کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ کوئی چیز بہت سی چیزوں سے یا کسی خاص چیز سے بہت اچھی ہو اور دوسرے یہ کہ تمام چیزوں سے زیادہ عمدہ ہو اور یہاں ظاہر آدوسری صورت مراد ہے کیونکہ

یہاں مفضل علیہ مذکور نہیں ہے پس مراد یہ ہے کہ علم دین تمام اچھی چیزوں سے زیادہ بڑھ کر ہے واضح ہو کر اس خیر کے مفضل علیہ میں تمام واقعی عمدہ چیزیں داخل ہیں اور مال و دولت تو واقع میں کمال ہی نہیں اور نہ وہ کچھ زیادہ اچھا ہے بلکہ بقدر حاجت روائی محمود ہے اور وسیلہ ہے مقصود کا خود بذاتہ کچھ محمود مقصود نہیں اس لئے اس خیر کے مفضل علیہ میں اس کے داخل ماننے کی ضرورت ہی نہیں اب رہا ایمان سو وہ خود ایمان اس علم ہی میں داخل ہے کیونکہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علم ہے۔ اب رہی جنت سو وہ اس خیر کے مفضل علیہ میں داخل ہے کیونکہ ایمان کہ علم دین کی ایک فرد ہے جنت سے افضل ہے گو بعض لوگوں نے جنت کو ایمان سے افضل کہا ہے اور یہ دلیل بیان کی ہے کہ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ بِهَا خَيْرٌ مِّمَّا يَعْنِي جَوْفُخْصٍ نِيْلِي كَرَّةً تُوَاسِ كُوَاسِ نِيْلِي كَرَّةً جَزَادِي جَاوِي كَرَّةً اس سے معلوم ہوا کہ علم سے جزاء افضل ہے اور اعمال میں ایمان بھی ہے لہذا ایمان کی جزاء یعنی جنت ایمان سے افضل ہوئی لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں خیر سے مراد جنت نہیں بلکہ نفسِ سنہ ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آدمی جو نیکی کرتا ہے خواہ وہ ایمان ہو یا دیگر اعمال اللہ تعالیٰ اس عمل کو بڑھا دیتے ہیں مثلاً ایک نیکی کو بڑھا کر دس نیکی کر دیں پھر ان دس نیکی پر جزاء مرتب ہوتی ہے اور دوسری آیت میں تصریح ہے کہ وہ بڑھائی ہوئی چیز حسنہ ہی ہے چنانچہ فرمایا ہے۔ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتِثَالِهَا اور ظاہر ہے کہ امثالہا میں ضمیر مضاف الیہ کا مرجع حسنہ ہے تو حسنہ کے امثال حسنات ہی ہیں مثلاً کسی نے دو رکعت نماز پڑھی تو اس کو اول بیس رکعت یعنی دس گنا فرمایا پھر اس بیس رکعت کا ثواب مرحمت فرمایا کام کمزور تھا لیکن لکھا گیا قوی، تھوڑا کیا تھا تحریر میں لایا گیا زیادہ پس حسنات مضاعفہ کا حسنہ معمول بہا سے افضل ہونا لازم آیا نہ کہ جزاء کا عمل سے۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي

الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيَاهِهِمْ

لَا يَسْئَلُونَ النَّاسَ إِعْجَافًا وَكَانُوا مُنْفِقُونَ خَيْرٌ فَاِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ

ترجمہ: ان فقراء کے لئے جو کہ اللہ کے راستے میں کھڑے ہوئے ہیں زمین میں چلنے کی طاقت نہیں رکھتے جاہل ان کو غنی گمان کرتے ہیں ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو (کہ فکر و فاقہ سے چہرے پر اثر ضرور آ جاتا ہے) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پکرتے اور جو مال خرچ کرو گے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے۔

تفسیری نکات

امور دین میں مصروف لوگوں کا حق

دیکھو! لام للفقراء میں استحقاق کا ہے یعنی یہ لوگ اس کا استحقاق رکھتے ہیں کہ اگر نہ دو تو نالاش کر کے سکتے ہیں گو

دنیا میں نالش نہ ہو سکے لیکن خدا تعالیٰ کے ہاں قیامت میں دیکھئے گا کتنی ڈگریاں آپ پر ہوتی ہیں۔

خدا تعالیٰ نے آیت میں ان لوگوں کو بلفظ فقراء ذکر فرمایا ہے فقیر آج کل کے عرف میں ایک ذلیل لفظ ہے مگر یہ ذلت

اگر ذلت ہے جیسا کہ تمہارے نام معقول عرف نے سمجھ لیا ہے تو صرف انہی لوگوں کو نہیں ساری دنیا کے لئے فرماتے ہیں

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ (اے لوگو! تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو) تو ہم کو تو فخر ہے کہ ہم خدا کے فقیر ہیں

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیانہ ایم

(ہم اگر مفلس اور دیوانہ ہیں لیکن پھر اس ساقی اور اس پیانہ میں مست ہیں)

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ

أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَطُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْئَلُونَ النَّاسَ إِلْحَاقًا (البقرہ آیت ۲۷۳)

صدقات اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مقید ہو گئے ہیں۔ ان کو زمین میں سفر کرنے کی

طاقت نہیں۔ ناواقف ان کو بے سوالی سے تو مگر خیال کرتا ہے تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو کہ فقر و فاقہ کا چہرہ پر

ضرور اثر نمایاں ہوتا ہے وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے۔

اس میں احصروا فرمایا ہے جس کا ترجمہ سہل یہ ہے کہ محبوس ہو گئے دین کے کام میں اور تجارت وغیرہ کے لئے سفر

نہیں کر سکتے۔ مجھے خوب یاد آیا کہ آج کل بعض لوگ مولویوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں کھانے کمانے کے قابل

نہیں۔ مگر یہ اپاہج کا خطاب ان کو خدائی دربار سے ملا ہے فرماتے ہیں لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ یعنی ان کو زمین

میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ پس اس کہنے پر برانہ مانا کرو بلکہ یہ پڑھا کرو۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم۔ مست آں ساقی و آں پیانہ ایم

ہم اگر مفلس و دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے۔ محبوب حقیقی اور اس کی محبت کے متوالے ہیں۔

اے گروہ علماء و طلباء اگر کوئی تمہیں دیوانہ کہے تو برانہ مانو۔ پس یہ اپاہج ہی ایسا وصف ہے کہ سب انبیاء اس سے

متصف تھے۔

انبیاء درکار دنیا جبری اند کافراں درکار عقبے جبری اند

یعنی انبیاء علیہم السلام تو کار و دنیا میں جبری اور تارک اسباب ہیں اور کفار کا عقبی میں جبری اور تارک اسباب ہیں۔

انبیاء راکار عقبے اختیار کافراں راکار دنیا اختیار

یعنی انبیاء علیہم السلام کو کار عقبے اختیار ہوا ہے کہ اس کے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔ کفار کو کار دنیا اختیار ہوا ہے کہ

اس سے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔ (حق الاطاعة ملحقہ مؤ اعظ نظام شریعت)

غرض جو لوگ دین کے کاموں میں وقف ہیں ان کا حق آپ کے ذمہ ہے اور علامت وقف ہونے کی یہ ہے کہ

لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ۔ یہ وہی بات جس کو آپ بروئے طعن مولویوں سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپاہج ہو جاتے

ہیں صاحبو! بیشک اپانج ہیں اور کیوں نہ ہوں جب خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان میں طاقت ہی نہیں کہ دوسرے کام کریں اگر طاقت سے مراد شرعی طاقت ہے کہ ان کو اجازت نہیں کہ یہ دوسرے کام میں لگیں اس مسئلے کو میں ایک مثال دے کر زیادہ واضح کرتا ہوں ہمارے اطراف میں ایک صاحب نے جو کہ سرکاری ملازم تھے ایک مطبخ کر لیا شدہ شدہ حکام کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے نام ایک پروانا آیا کہ یا تو نوکری سے استعفیٰ دیدو ورنہ مطبخ بند کر دو۔ آخر اس حکم کی کیا وجہ وجہ یہی ہے کہ مطبخ کرنے کی صورت میں وہ نوکری کا کام پورے طور پر انجام نہیں دے سکتے تھے اب تو غالباً تسکین ہو گئی ہوگی کیونکہ سفید رنگ والوں کا بھی اس پر اتفاق ہے یہ تو شرعی طور پر تھا اب میں تمدنی طور پر اس مسئلے کو بیان کرتا ہوں کہ بادشاہ اور پارلیمنٹ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام قوم کا ایک ایک پیسہ دو دو پیسہ جمع کر کے جس کو خزانہ کہا جاتا ہے کیونکہ خزانہ واقع میں اسی مجموعے کا نام ہے جو کہ تمام قوم سے جن جن جمع کیا جاتا ہے کسی نے پوچھا تھا کہ بیوی فوج کس کو کہتے ہیں اس نے کہا کہ میرا میاں تیرا میاں بس یہی فوج ہے تو آپ کا پیسہ ان کا پیسہ اسی کے مجموعے کا نام خزانہ ہے تو واقع میں خزانہ قوم کی چیز ہے اب سمجھئے کہ اس خزانہ سے جو تنخواہ دی جاتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ بادشاہ اور پارلیمنٹ ایسے قوم کاموں میں مصروف ہیں کہ وہ دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتے اس لئے قوم کے مجموعہ مال میں سے اس کو نفع دیا جاتا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ جو قومی کام میں مشغول ہو اس کا حصہ قوم کے اموال میں ہے اگر کہا جائے کہ خزانہ تو سلطنت کی ملک ہو گیا تو سمجھو کہ وہ سلطنت مجموعہ افراد قوم کی نائب ہے تو سلطان کے ہاتھ سے جو کچھ پہنچ رہا ہے وہ واقع میں قوم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہا ہے اگرچہ قوم کا ہاتھ ایک حجاب میں دست سلطان کی آڑ میں آ گیا ہے اب تو غالباً آپ پورے طور پر اس کو سمجھ گئے ہوں گے۔

صدقات کے مستحق

صدقات اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مقید ہو گئے ہیں۔ ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ نادائق ان کو بے سوائی سے تو نگر خیال کرتا ہے تم ان کو ان کے طرز سے پہچان سکتے ہو کہ فقر و فاقہ کا چہرہ پر ضرور اثر نمایاں ہوتا ہے وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانتے پھرتے۔

اس میں احصا فرمایا ہے جس کا ترجمہ سہل یہ ہے کہ محبوس ہو گئے دین کے کام میں اور تجارت وغیرہ کے لئے سفر نہیں کر سکتے۔ مجھے خوب یاد آیا کہ آج کل بعض لوگ مولویوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ اپانج ہیں کھانے کمانے کے قابل نہیں مگر یہ اپانج کا خطاب ان کو خدا کی دربار سے ملا ہے فرماتے ہیں لَا يَسْتَطِيعُونَ حَضْرًا فِي الْأَرْضِ یعنی ان کو زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں۔ پس اس کہنے پر برانہ مانا کرو بلکہ یہ پڑھ دیا کرو۔

ما اگر قلاش و مگر دیوانہ ایم مست آں ساقی و آں پیانہ ایم

ہم اگر مفلس و دیوانہ ہیں تو کیا غم ہے۔ محبوب حقیقی اور اس کی محبت کے متوالے ہیں۔

اے گروہ علماء و طلباء اگر کوئی تمہیں دیوانہ کہے تو برانہ مانو۔ پس یہ اپانج ہی ایسا صنف ہے کہ سب انبیاء اس سے متصف تھے۔

انبیاء درکار دنیا جبری اند کافراں درکار عقبے جبری اند

یعنی انبیاء علیہم السلام تو کار دنیا میں جبری اور تارک اسباب ہیں اور کفار کا عقبی میں جبری اور تارک اسباب ہیں۔

انبیاء راکر عقبے اختیار کافراں راکر دنیا اختیار

یعنی انبیاء علیہم السلام کو کار عقبے اختیار ہوا ہے کہ اس کے اسباب میں سعی کرتے ہیں کفار کو کار دنیا اختیار ہوا ہے کہ اس

سے اسباب میں سعی کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو ہر کام میں قرآن پر نظر کرنی چاہیے تھی اور اسی سے سبق لینا چاہیے تھا اور یوں کہنا چاہیے تھا کہ حسبنا کتاب اللہ یعنی ہم کو قرآن شریف ہی کافی ہے) مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ حدیث و فقہ کوئی چیز نہ ہوئی کیونکہ قرآن ایک متن ہے حدیث و فقہ سب اس کے لئے شروع ہیں۔ اسی کو فقہا نے کہا ہے القیاس مظہر لا مثبت (یعنی قیاس حکم کا ظاہر کرنے والا ہے ثابت کرنے والا نہیں ہے) تو حدیث و فقہ نے قرآن کے مطالب کو ظاہر کر دیا ہے کوئی حکم قرآن کے خلاف نہیں بیان کیا۔

اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صندوق مقفل ہے اور کنجی سے اسے کھول دیا اور بہت سے جواہرات نظر آنے لگے تو یہ جواہرات کنجی سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ وہ صندوق میں موجود تھے مگر پوشیدہ تھے کنجی نے ان کو ظاہر کر دیا تو حدیث و فقہ قرآن کے لئے کنجی ہیں۔ جتنے علوم ہیں سب قرآن ہی سے نکلے ہیں اس کی تو یہ شان ہے۔

عبار اتنا شتی و حسنک واحد وکل الی ذاک الجمال یشیر

یعنی عنوانات مختلف ہیں اور حسن یعنی قرآن ایک ہی ہے ہر عنوان اس ایک ہی حسن کی طرف مشیر ہے

ایک محبوب ہے جس نے صبح کو دھانی جوڑا پہنا۔ شام کو دوسرا جوڑا پہنا تو جو عاشق نہیں وہ تو نہیں پہنچانے گا مگر عاشق کہے گا

بہر رنگے کہ داعی جامہ سے پوش من انداز قدت رامی شناسم!

آیت میں فقراء سے کیا مراد ہے

تو قرآن میں جو فرمایا ہے اٰحْصِرُوْا فِی سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ الْاِيَةَ کہ وہ مقید اور اپناج ہیں وہ جو کچھ نہیں کر سکتے۔ یعنی دنیا کے کاموں سے اپناج ہیں ورنہ دینی کام میں ان سے بڑھ کر چست کون ہوگا اور اگر غور کیا جائے تو یہ اپناج ہاتھ پیر چلانے والوں سے بدرجہا افضل ہیں۔ باقی عرف کا تو کوئی علاج نہیں اور اب تو عرف بھی بدل گیا۔ غرض جب ہندوؤں نے یہ عہد کر لیا کہ ان کے مذہب (باطل) کی خدمت کے لئے ایک جماعت وقف کر دی جائے جس کو دنیاوی امور سے کچھ سروکار نہ ہو تو کیا مذہب حق کی خدمت کے لئے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں پس ان لوگوں کے لئے جو خدام دین ہیں کسب ناپسندیدہ ہے اوروں کے لئے نہیں بلکہ اوروں سے ترک کسب پر باز پرس ہوگی۔

فقراء کی شان

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا کہ صدقہ ان لوگوں کا حق ہے کہ اللہ کے کام میں گھر سے ہوئے ہیں۔ وہ نہ تجارت کرتے ہیں نہ زراعت کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک شخص سے دو کام نہیں ہوتے تو للفقراء میں لام استحقاق کا ہے کہ ان کا حق ہے تو حق تعالیٰ کی تصریح سے ان کا قرض دینا واجب ہے پس جب کہ ان کا حق ہے تو وہ مطالبہ بھی کر سکتے ہیں مگر غیرت علم کی وجہ سے مطالبہ نہیں کرتے کیونکہ علم وہ چیز ہے کہ صاحب علم کے دماغ میں اس سے علو اور استغناء پیدا ہو جاتا ہے اور یہ جو لوگ اس وقت ادھر ادھر وعظ کے ذریعہ سے مانگتے اور علماء کے طبقہ کو ذلیل کرتے پھرتے ہیں ان میں دینداری تو کیا استعداد علمی بھی نہیں ہے تو یہ علماء نہیں ہیں۔ بس یہی ہے کہ ادھر ادھر کے مضامین یاد کر لئے ہیں۔ اب انہی پر لوگ اور علماء کو بھی قیاس کرتے ہیں حالانکہ جو عالم ہوگا گو باعمل نہ ہو پھر بھی وہ ایسی حرکتوں سے علم کی تذلیل نہ کرے گا۔

لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا (وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے)

دباؤ سے چندہ لینا ناجائز ہے

فرمایا کہ مدارس کے چندوں کے بارے میں ہمیشہ سے میری رائے یہ ہے کہ زور دے کر اور دباؤ ڈال کر وصول نہ کئے جائیں اور اس لمرز کو میں سدا سے ناجائز کہتا تھا لیکن اب اس کے متعلق ایک عجیب تاہید تفصیل کے ساتھ قرآن شریف کی آیت سے مل گئی جس پر اس کے قبل کبھی نظر نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ ہے کہ چندہ لینے میں ایک سوال کا مرتبہ ہے اور وہ ناجائز ہے اور ایک ترغیب کا مرتبہ ہے اور وہ جائز ہے اور سدا اس کی کلام مجید کی اس آیت سے ملتی ہے خدا تعالیٰ مذمت سوال میں فرماتے ہیں کہ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا اس سے معلوم ہوا کہ سوال نہ کرنا چاہیے اور دوسری جگہ فرماتے ہیں وَلَتَكُنَّ مِنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ. اس لئے چندے میں ترغیب کا مضائقہ نہیں کیونکہ حفاظت دین ضروری امر ہے اور بغیر سلسلہ تعلیم و تعلم ممکن نہیں اور یہ سلسلہ اس وقت عادتاً بدوں اعانت نہیں چل سکتا۔ پس اعانات ایک امر خیر کا مقدمہ اور موقوف علیہ ہے لہذا خیر ہے بلکہ ایک امر ضروری کا مقدمہ ہونے کی وجہ سے ضروری ہے۔ پھر فرمایا کہ جس طرح علماء کو دباؤ ڈال کر سوال نہ کرنا چاہیے اسی طرح اہل دنیا کو ترغیب پر انکار بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

إِنَّهَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا الْعِيبُ وَالْهُوْءُ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ إِنَّ يَسْأَلْكُمْ مِمَّا فِيْكُمْ تَبْخُلُوا وَيُعْرِجْ أَمْوَالَكُمْ هَآءُنْتُمْ هَآءُنْتُمْ هَآءُنْتُمْ تَدْعُونَ لِنُفْسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخُلُ وَمَنْ يَبْخُلْ فَإِنَّمَا يَبْخُلْ عَنِ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم لوگ ایمان لا کر متقی بن جاؤ تو خدا تعالیٰ تم کو اجر بھی دے گا اور تم سے تمہارے مال کا سوال نہ کرے گا کیونکہ اگر تم سے تمہارے مال کا خدا تعالیٰ سوال کرے اور سوال میں مبالغہ بھی کرے تو تم ضرور بخل کرو گے

اور تمہارے بخل کو یہ سوال ظاہر کرے گا (گویا اڑ کر سوال کرنے کا خلاصہ یہ ہے کہ اس پر دینے کو جی نہیں چاہتا اور انسان انکار ہی کر دیتا ہے اور اسی طبعی خاصہ کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ خدا تم سے تمہارے مال کا سوال نہ کرے گا لیکن اس سوال نہ کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بالکل چھٹکارا ہو گیا اور اب کوئی بات بھی ہمارے ذمہ نہیں رہی کیونکہ باوجود سوال نہ کرنے کے) اے لوگو تم کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت (ترغیب) دی جائے گی اور تم لوگوں کی محبت مال اور دینی بے پروائی سے یہ خیال ہے کہ کچھ لوگ تم میں سے ترغیب پر دینے میں بھی بخل کریں گے لیکن یہ سمجھ لو کہ وہ لوگ اپنا ہی نقصان کریں گے (کیونکہ اس اعطاء کا ثواب ان ہی کو ملتا ہے) خدا (تو تمہارے مالوں سے) بالکل غنی ہے اور تم (اس کے افضال اور انعامات کے) سراپا محتاج ہو اور (سن رکھو کہ) اگر تم لوگ (اس طرح بھی دینے سے) پھر دو گے تو خدا تعالیٰ (تم کو نیست و نابود کرے) تمہاری جگہ دوسری ایسی قوم پیدا کرے گا کہ وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ پس اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر اڑ کر سوال کرنے پر انکار کیا جائے تو چنداں عیب نہیں کیونکہ انسان کا طبعی خاصہ ہے لیکن اگر محض ترغیب پر انکار کیا جائے تو سخت وبال کا اندیشہ ہے پس چندہ مانگنے والوں کو بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہیے فرمانے سے کام نہ لیں محض ترغیب کا مضائقہ نہیں اور اس کی دو صورتیں خاص ہوئی ہیں اور یا اگر خاص خطاب ہو تو ایسے بے تکلف دوست تکلف تم سے انکار بھی کر سکے۔

سوال اور الحاف برائے

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم لوگ ایمان لا کر متقی بن جاؤ تو خدا تعالیٰ تم کو اجر بھی دے گا اور تم سے تمہارے مال کا سوال نہ کرے گا کیونکہ اگر تم سے تمہارے مال کا خدا تعالیٰ سوال کرے اور سوال میں مبالغہ بھی کرے تو تم ضرور بخل کرو گے اور تمہارے بخل کو یہ سوال ظاہر کر دے گا (گویا اڑ کر سوال کرنے کا یہ خاصہ ہے کہ اس پر دینے کو جی نہیں چاہتا۔ اور انسان انکار ہی کر دیتا ہے اور اس طبعی خاصہ کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ایک گونہ ان لوگوں کو معذور رکھ کر یہ فرمایا کہ خدا تم سے تمہارے مال کا سوال نہ کرے گا لیکن اس سوال نہ کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بالکل چھٹکارا ہو گیا اور اب کوئی بات بھی ہمارے ذمہ نہیں رہی کیونکہ باوجود سوال نہ کرنے کے) اے لوگو! تم کو انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت (ترغیب) دی جائے گی (اور تم لوگوں کو جو محبت مال اور دینی بے پروائی ہے اس کے سبب) کچھ لوگ تم میں سے ترغیب دینے میں بھی بخل کریں گے لیکن یہ سمجھ لو کہ وہ لوگ اپنا ہی نقصان کریں گے (کیونکہ اس دینے کا ثواب انہیں کو ملتا اور انہیں کی دینی اور دنیوی ضرورتیں اس سے پوری ہوتیں) خدا (تمہارے مالوں سے) بالکل غنی ہے اور تم (اس کے افضال اور انعامات کے) سراپا محتاج ہو اور (سن رکھو کہ) اگر تم لوگ (اس طرح بھی دینے سے) پھر دو گے تو خدا تعالیٰ (تم کو نیست و نابود کرے) تمہاری جگہ دوسری ایسی قوم پیدا کر دے گا کہ وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔ پس اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر اڑ کر سوال کرنے پر انکار کیا جاوے تو چنداں عیب نہیں کیونکہ یہ انسان کا طبعی خاصہ ہے لیکن اگر محض ترغیب پر انکار کیا جاوے تو سخت وبال کا اندیشہ ہے اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سوال والحاف برائے اور دعوت و ترغیب حسن ہے۔

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيهِ الصَّدَقَاتُ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿۲۳۳﴾

ترجمہ: اللہ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو (اور) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو۔

تفسیری نکات

سود کے مال میں برکت نہیں ہوتی

ارشاد فرمایا ہے **يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا** محق سے مراد محق برکت ہے نہ محق ذات ربوا۔ کیونکہ ذات ربوا اکثر ربوا خواروں کے پاس موجود رہتی ہے یہی روپیہ حاصل کردہ سود بنفسہ قائم رہتا ہے لیکن برکت اس سے مسلوب ہوتی ہے یعنی مالک کے حوائج ضروریہ میں کارآمد نہیں ہوتا بلکہ فضولیات میں صرف ہوتا ہے مثلاً عمارت تیار کرنا۔ بیاہ شادی میں اثاثا اس کے لوازمات میں خرچ کرنا اگرچہ ہاتھ ہی سے اٹھتا ہے لیکن اس کے کارآمد نہیں ہوتا سو ثابت ہو گیا کہ ربوا سے مراد برکت ربوا ہی ہے ذات ربوا نہیں اور ربوا کی کوئی تخصیص نہیں ہر شے حرام کی یہی حالت ہے۔

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ

(یعنی اگر مقروض تنگ دست ہو تو اس کو مہلت دینی چاہیے جب تک کہ وہ دے سکے)

قرض کا ایک ضروری حکم

اور آپ کے اس قرض کا وقت وہ مقرر ہے جبکہ شادی ہو خواہ کسی کے پاس ہو یا نہ ہو اور ایک حکم یہ ہے کہ مدیون جس وقت ادا کرنا چاہے تو ادا ہو سکتا ہے اگر کوئی ایک مدت کا وعدہ بھی کر کے قرض لے اور اس مدت سے پہلے ادا کرے تو دائن کو نہ لینے کا اختیار نہیں اسی وقت لینا پڑے گا اور آپ کے اس نیوتہ کو اگر کوئی بلا تقریب کے واپس کرنا چاہے تو نہیں لیا جاتا یہ کیسا قرض ہے۔ یہ حق تعالیٰ کے احکام میں مداخلت ہے اور ایک فساد اس میں بہت بڑا یہ ہے کہ جب نیوتہ قرض ہو تو قرض میں میراث جاری ہوتی ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ عورت مر جاتی ہے تو اس کے وارث خاوند پر نالش کر کے مہر کا روپیہ وصول کر لیتے ہیں تو نیوتہ کے روپیہ میں بھی میراث جاری ہونی چاہیے اور حصہ شرعی کے موافق سب وارثوں کو پہنچنا چاہیے مگر اس کا کوئی اہتمام نہیں کرتا یہ میراث کے احکام کو بدلنا ہے جس کی نسبت قرآن شریف میں ہے۔

فَرِيضَةٌ مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا یعنی میراث کی تقسیم خدائے تعالیٰ کی مقرر کردہ ہے اور خدائے

تعالیٰ علیم و حکیم ہیں

تقسیم کے مواقع اور مقادیر حصص کو تم سے زیادہ جانتے ہیں اسی کے آگے دوسری آیت ہے۔

وَصِيَّةٌ تُوَصَّوْنَ بِهَا أَوْ دِينَ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَّةً أَوْ امْرَأَةً أَوْ أَخًا أَوْ أُخْتًا
فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا التُّدْبُوسُ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُوَصَّى بِهَا أَوْ دِينَ غَيْرِ مُضَآءٍ وَصِيَّةٍ مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ
وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيمُ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿

یعنی خدائے عظیم حلیم کے مقرر کردہ احکام ہیں جو کوئی اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کو مانے گا اس کو جنت میں داخل کریں گے اور جو کوئی اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو نہ مانے گا اس کو دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈالیں گے۔

اس آیت میں وصیۃ من اللہ سے احکام میراث میں تشدد پیدا ہوتا ہے پھر حکم ماننے پر وعدہ ہونے اور حکم نہ ماننے پر وعید ہونے سے اس میں اور تاکید ہوتی ہے اور وعید بھی کیسی کہ جس کی شدت ظاہر ہے اب دیکھئے کہ نبوتے میں کیا ہوتا ہے۔ اگر دینے والا بہت جگہ نبوتہ چھوڑ کر مر جاتا ہے تو وہ نبوتہ بڑے بیٹے کی شادی کے وقت ادا کیا جاتا ہے اور وہ اس کو اپنی شادی کے خرچ میں لاتا ہے حالانکہ یہ سب وارثوں کا مال ہے جو ایک کے خرچ میں آ رہا ہے اس سے کھانا کیا جاتا ہے اور سب برادری کھاتی ہے اس میں دوسرے وارثوں کی حق تلفی ہوئی۔ اور بلا اجازت ان کے ان کھانے والوں نے کھایا یہ حق العبد ہو اور اگر ان وارثوں میں کچھ نابالغ بچے بھی ہیں تو ان کا حصہ بھی کھانے والوں نے کھایا۔ اس میں حق العبد ہونے کے ساتھ اتنا اور اضافہ ہے کہ یتامی کا مال ہے جو ظلماً کھایا گیا جس کی نسبت قرآن شریف میں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ غُلْمًا إِنَّا يَا كُلُّونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا یعنی جو لوگ یتیموں کا مال بلا کسی حق کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ آگے سے بھرتے ہیں اور عنقریب دوزخ میں جائیں گے۔

یہ آپ کے نبوتہ کے مختصر نتائج ہیں جن میں ساری برادری والے گرفتار ہوتے ہیں کیا کوئی مسلمان ان وعیدوں کے سننے کے بعد اس کے جاری رکھنے کی جرأت کرے گا دینا تو درکنار یہ ایسی وعیدیں ہیں کہ ان کے خوف سے عجب نہیں کہ اپنا آتا ہوا بھی وصول کرنا بھول جائے۔ یہ تو ایسی رسم کا حال ہے جس کو سب سے اچھی رسم کہا جاتا ہے اور جن رسموں کو آپ خود بھی برا کہتے ان کا حال کیا ہوگا یہ تو خوشی کی رسمیں ہیں اسی کے قریب قریب غمی کی رسمیں ہیں۔

جب کوئی مرتا ہے تو اس کی فاتحہ تیجہ اور دسواں سب اس کے مال میں سے ہوتا ہے حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ وہ مال وارثوں کا حق ہو چکا سب سے اول تو اس قرض میں دینا چاہیے جو کوئی چیز گروی رکھ کر لیا گیا ہے۔ تجہیز و تکفین بھی اس کے بعد ہے وہ گروی چیز چھڑا کر بیچی جاوے اور اس میں سے تجویز و تکفین کی جاوے اور بعد تجہیز و تکفین کے اور قرض دیئے جاویں اور میراث بعد ادائے قرض ہے رہی میت کی فاتحہ اور ایصال ثواب اس کا شریعت میں کہیں پتہ نہیں ہے اس کو کوئی حق میت کے مال کے متعلق نہیں قرار دیا گیا اگر میت کسی مصرف میں صرف کرنے کی وصیت بھی کر جائے تب بھی ایک

تہائی سے زیادہ میں نافذ نہیں اور اس تہائی سے مراد بھی اس مقدار کا تہائی ہے جو بعد ادائے قرض بچے اگر قرض میں سب آ جائے تو وصیت بھی نافذ نہیں۔

اب دیکھ لیجئے کہ آپ کے یہاں میت کا مال کس طرح اڑایا جاتا ہے نہ کسی کو قرض کی خبر نہ وصیت کی نہ میراث کی بلا سوچے سمجھے سب سے پہلے تیجہ اور دسویں پر لگا دیا جاتا ہے جس کا شرعی حکم ہوا کہ اگر میت قرض دار ہے تو تیجہ اور دسویں کے کھانے والے ان قرض خواہوں کا حق مارتے ہیں اور اگر میت قرض دار نہیں بھی ہے تو وارثوں کا حق اس مال کے ساتھ متعلق ہو چکا ان کا حق مارنے والے ہیں۔ غرض ہر صورت میں حق العبد کے دین دار ہیں یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ وارثوں کی تو اجازت ہوتی ہے کیونکہ میں بارہا بیان کر چکا ہوں کہ رکی اور شرما حضور کی اجازت معتبر نہیں۔ اجازت جب معتبر ہے کہ مال تقسیم کر کے سب کو دیدیا جائے پھر ان سے کہا جائے کہ اتنا اتنا سب مل کر دو تو فاتحہ کی جائے یہ اجازت معتبر ہو سکتی ہے مگر یاد رکھئے کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو ایک وارث بھی آیا ہو ا پیسہ دینا گوارا نہ کرے گا یہ حکم بھی بالغین کا ہے اور اگر وارثوں میں کوئی نابالغ ہے تو بعد تقسیم کے بھی اس کا خوشی سے دینا معتبر نہیں۔

فقہ کا مسئلہ ہے کہ نابالغ کے تصرفات تبرعات کے متعلق نافذ نہیں غرض یہ مال جو تیجہ اور دسویں پر لگایا جاتا ہے مال محت ہے غنی کو یا فقیر کو کسی کو بھی اس کا کھانا جائز نہیں کیونکہ حق غیر ہے خاص کر اس صورت میں کہ جب وارث نابالغ ہوں کہ اس میں حق غیر ہونے کے ساتھ اتنا اور اضافہ ہے کہ مال یتامی ہے جس پر قرآن شریف کی یہ وعید ہے۔ **إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا**۔

آثم قلبہ کا مفہوم

وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (اور جو شخص اس کا انخفاء کرے گا اس کو قلب گناہ گار ہوگا) فرمایا کہ آثم قلبہ میں قلب کی تخصیص اس لئے کی کہ ستمان اصل فعل قلب کا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جوارح کو سزا نہ ہوگی بلکہ جوارح کو بھی سزا دی جائے گی۔

قرض دیتے وقت لکھنے کا حکم

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے **وَلَا تَسْمِعُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا** الایہ۔ یعنی لکھنے سے اکتاؤ نہیں چھوٹا معاملہ ہو یا بڑا اور فرمایا کہ لوگ خدا تعالیٰ کی وسعت رحمت پر **لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ** وغیرہ سے استدلال کرتے ہیں لیکن میں اس آیت **يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ** الخ۔ سے استدلال کرتا ہوں کیونکہ خداوند کریم کے نزدیک دنیا نہایت ذلیل ہے تو جب اس کی حفاظت کے لئے یہ طرق بتلائے تو معلوم ہوا کہ خدائے کریم ہماری آخرت میں تو ذرا بھی کمی نہ فرمائیں گے غرض ہر شے میں ایک طریقہ خاص ہے اسی کے موافق اس کو انجام دینا چاہیے۔

يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ يَدِينُ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسَقًّى فَالْكَتُبُوهُ (اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا

ایک معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو) آخر رکوع تک یہ بہت بڑی آیت ہے حتیٰ کہ اس سے بڑی کوئی اور آیت قرآن شریف میں نہیں ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ جب ادھار کا کوئی معاملہ کرو تو اس کو لکھ لو اس کے بعد کاتب کے لئے کچھ ہدایات ہیں پھر یہ ارشاد ہے کہ دو گواہ کر لو پھر گواہوں کے متعلق کچھ ہدایات ہیں پھر آگے دین کا ذکر ہے اور اس کے متعلق کچھ ہدایات ہیں غرض اس آیت میں اول سے آخر تک کہیں عذابِ ثواب کا ذکر نہیں صرف بعض معاملات کا ذکر ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا

لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَانَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ

عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَاطَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا

وَاعْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ٥

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو ثواب بھی اس کا ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر دارو گیر نہ فرمائیے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے۔ جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے۔ اے ہمارے رب ہم کو کوئی ایسا بار (دنیا یا آخرت) نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو اور درگزر کیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کو اور رحم کیجئے ہم پر آپ ہمارے کارساز ہیں آپ ہم کو کافروں پر غالب کیجئے۔

تفسیری نکات

بیان اعذار میں حکمت

جیسے ایک شخص نمازی ہے نماز کو ضروری سمجھتا ہے اس کی پابندی بھی کرتا ہے وضو کو بھی ضروری سمجھتا ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ وہ بیماری کی حالت میں بھی وضو کو ترک نہیں کرتا وہاں ضرورت ہے اعذار شرعیہ بتلانے کی کہ ان اعذار سے وضو ساقط ہو کر تیمم جائز ہو جاتا ہے تطہیر شیب معاف ہو کر ناپاک کپڑوں ہی سے نماز درست ہو جاتی ہے استقبال قبلہ معاف ہو کر جس طرح بھی نماز پڑھ سکے نماز صحیح ہے اور قیام پر قادر نہ ہو تو قعود سے اور قعود پر قدرت نہ ہو تو اضطجاع سے نماز صحیح ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں بیان اعذار کی ضرورت کا راز یہ ہے کہ اگر ایسے شخص کو اعذار نہ بتلائے جائیں تو اس کو اعتقادی اور عملی تنگی پیش آئے گی۔ اعتقادی تنگی تو یہ ہوگی کہ اس کو لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں دوسرے اور شبہ ہو گا جو کہ زوال یا ضعف ایمان کا سبب ہے اور عملی تنگی یہ پیش آئے گی کہ اگر اس کو تیمم کا قاعدہ نہ بتلایا گیا تو وہ عذر کے وقت مجبور ہو کر وضو ترک کرے گا اور چونکہ وضو کو شرط سمجھتا ہے اس لئے بے وضو نماز پڑھے گا نہیں یہ عملی تنگی ہے پس ایسے شخص کے

سلامت ایمان اور سلامت اعمال کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اعذار شرعیہ کے احکام سے مطلع کیا جائے اس سے اس کا ایمان یوں سلامت رہے گا کہ اس کو لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا کے صدق میں وسوسہ نہ ہوگا اور عمل یوں سلامت رہے گا کہ وہ کسی عذر کے وقت عمل کو فوت نہ کرے گا۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے بلکہ ثواب و عذاب کا مدار کسب و اکتساب پر ہے معلوم ہوا کہ انسان اختیارات کا مکلف ہے اور احوال اختیاری نہیں اس لئے ان کا مکلف نہیں اور یہ بات اس آیت کے شان نزول سے زیادہ واضح ہو جائے گی کیونکہ اس کا نزول احوال کی تحقیق میں ہے۔ شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ جب آیت **لَنْ تُبَدُّ فَا مَأْتِي أَنْفُسِكُمْ** اَوْ تُخْفَوْنَ بِمَا كُنْتُمْ بِنُفْسِكُمْ بِاللَّهِ نَازِل ہوئی تو صحابہ اس سے ڈر گئے کیونکہ **مَا فِي أَنْفُسِكُمْ** بظاہر عام ہے وسواس غیر اختیاریہ و عزائم اختیاریہ سب کو تو صحابہ یہ سمجھے کہ شاید ان سب پر مواخذہ ہوگا اور اس خیال کا منشا صحابہ کی قلت علم نہ تھا بلکہ اس کا منشا غلبہ عشق تھا جس کی شان یہ ہے

باسایہ ترانی پسند عشق ست و ہزار بدگمانی

عاشق کو ضعیف احتمالات پر بھی بڑی فکر رہتی ہے ورنہ صحابہ قواعد سمعیہ و عقلیہ سے جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ فرمائیں گے کیونکہ مقتضائے رحمت کے خلاف ہے مگر عشق و محبت کی وجہ سے خشیت کا غلبہ تھا آیت میں عموم دیکھ کر ڈر گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم **سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا** کہنا چاہتے ہو۔ **سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا** کہو کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کریں گے صحابہ نے ادب سے کام لیا اور **سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا** کہا گوزبان بڑھکراتی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ وسواس غیر اختیاریہ میں شاید اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکے مگر ادب کی وجہ سے اطاعت کا وعدہ کر ہی لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادائپند آگئی اس پر **أَمِنَ الرَّسُولُ** سے آخر سورۃ تک آیت نازل ہوئیں اور ادب کی برکت سے آیت کی تفسیر کر دی گئی۔ ادب بڑی چیز ہے۔ مولانا نے ادب کے متعلق قصہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی اور ان پر عتاب ہوا اور حضرت آدم نے **رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا** کہا اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی تو بعد میں ان سے پوچھا کہ اے آدم خالق افعال تو میں ہوں تم نے **ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا** کیونکر کہا۔ آدم علیہ السلام نے جواب دیا۔

لیک من پاس ادب نلکذا شتم گفت من ہم پاس آنت و اشتم

اسی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہاں ادب سے کام لیا کہ خود اس آیت کی تفسیر نہ کی ورنہ آپ خود بھی تفسیر کر سکتے تھے مگر آپ نے وحی کا انتظار کیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کی تعریف ہے کہ سب نے ایمان پر استقامت ظاہر کی اور **سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا** کہا اور جس کو کوتاہی کا اندیشہ تھا اس سے استغفار کیا **عُفِّرْنَا كَمَا لَبَّيْنَاكَ يَا أَرْحَمَ الرَّحِيمِينَ** اس تعریف کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر کی گئی **لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا** میں جس کا حاصل یہ ہے کہ مدار تکلیف کا صرف اختیار ہے اور خطرات اختیاری نہیں تو عبدان کا مکلف بھی نہیں۔ اب اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس سے کیونکر معلوم ہوا کہ غیر اختیاری کا مکلف تو نہ ہوگا اس پر مواخذہ ہوگا اس کا جواب آئندہ جملہ میں ارشاد فرمایا گیا۔

امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ ہوگا

لَهُمَا كَسْبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كَتَبْنَا کیونکہ کسب و اکتساب کے معنی عمل بالاختیار کے ہیں اور لہا و علیہا میں لام اور علی کا مدلول ثواب و عقاب ہے پھر دونوں میں مجرور کو مقدم کیا گیا ہے جو مفید ص ہے اس حصر سے معلوم ہو گیا کہ استحقاق ثواب و عقاب صرف امور اختیاریہ ہی پر ہے۔ پس آیت بالا کی تفسیر ہو گئی کہ مراد مَا فِي أَنْفُسِكُمْ سے اعمال اختیاریہ ہیں اور مسئلہ کا منصوص ہونا ثابت ہو گیا جس کا میں نے دعویٰ کیا تھا اسی مسئلہ پر اپنے مقصود کی پھر تصریح کرتا ہوں کہ جب ثواب و عقاب کا مدار اختیار پر ہے اور مقصود عبد کا صرف حصول ثواب اور نجات عن العقاب ہے پھر غیر اختیاری کے فکر میں کیوں پڑے یہاں ایک اور سوال کے جواب پر بھی متنبہ کرتا ہوں وہ سوال یہ ہے کہ بعض مصائب ایسے آتے ہیں جو تحمل سے زیادہ ہوتے ہیں جو اب یہ ہے کہ یہاں تکلیف سے مراد تکلیف شرعی ہے تکلیف تکوینی مراد نہیں سو اس کی یہاں نفی نہیں پس امور تکوینیہ میں فوق طاقت کا وقوع ہو سکتا ہے شاید اس پر یہ سوال کہ جب تشریحات میں رحمت کی وجہ سے یہ قاعدہ ہے لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا تو تکوینیات میں بھی رحمت کا یہ مقصود کیوں ظاہر نہ ہوا جو اب یہ ہے کہ تکوینیات میں بوجہ زیادت اجر کے فوق طاقت کا وقوع خلاف رحمت نہیں (ہاں یہ سوال کہ پھر تشریحات میں بھی زیادت اجر کے لئے ایسا کیا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تشریح سے عمل مقصود ہے اور فوق طاقت کا صدور کیونکر ہوتا اور تکوینیات میں صدور اس کا فعل نہیں ایک دوسری بات مطلوب ہے جو کہ وہ اختیاری ہے یعنی صبر کہ خدا تعالیٰ کی شکایت نہ کرے اور اس میں بھی اتنی توسیع ہے کہ حقیقی شکایت نہ کرے گو صورت شکایت ہو جائے تو وہ معاف ہے۔

بس شکایت حقیقی نہ ہونا چاہیے اور یہ امر اختیاری ہے اور تکوینیات میں انسان اسی کا مکلف ہے اس کے سوا کسی عمل وغیرہ کا مکلف نہیں۔ پس تکوینیات میں فوق طاقت کا وقوع جائز ہے اور تشریحات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں تکوینیات کے بارہ میں آگے دعا کی تعلیم ہے کہ فوق طاقت مصائب سے بچنے کی بھی دعا مانگا کرو چنانچہ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِضْرًا كَثِيرًا بَعْدَ جُودِكَ تَشْرِيحَاتِ كَبَابِ مِیْنِ هِیْ اس کا اضافہ بھی فرمایا گیا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ۔ ایک نکتہ اس مقام میں قابل غور یہ ہے کہ لَهُمَا كَسْبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كَتَبْنَا میں دو عنوان کیوں اختیار کئے گئے حالانکہ دوسری جگہ ارشاد ہے وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ قُلُوبِكُمْ اور ایک مقام پر ارشاد ہے لَهُمَا كَسْبَتْ وَلٰكِنْ تَاكْسِبْتُمْ۔ ان جگہوں میں اکتساب نہیں فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ اکتساب میں کسب سے زیادت ہے کیونکہ افعال کی خاصیت تکلف ہے اب خیر کے لئے کسب اور شر کے لئے اکتساب اختیار کرنے میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاصی کے لئے انسان کو اہتمام زیادہ کرنا پڑتا ہے گو وقوع اس کا سہولت سے ہو جائے مگر اہتمام شر کے لئے زیادہ ہوتا ہے اور خیر کے لئے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان کی اصلی فطرت خیر ہے جیسا کہ حدیث کل مولود یولد علی الفطرة۔ سے معلوم ہوتا ہے اور فطریات کے لئے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی نیز خیر سے مانع کوئی قوی قوت انسان کے اندر نہیں رکھی گئی اور شر سے مانع ایک قوی قوت اس کے اندر موجود ہے یعنی عقل، عقل خود معاصی سے روکتی ہے اسی لئے بعد

معاصی کے انسان کو ندامت بے حد ہوتی ہے اس لئے شر کے واسطے اکتساب فرمایا اور خیر کے لئے کسب اور جو حدیث میں ہے حفت الجنة بالمکارہ و حفت النار بالشہوات۔ وہ اس تقریر کے منافی نہیں کیونکہ شر میں فی نفسہ سہولت نہیں ہاں عادت کے غلبہ سے وہ سہل اور مرغوب ہو جاتی ہے اور خیر میں فی نفسہ دشواری نہیں ہاں عادت نہ ہونے سے اس میں عارضی دشواری ہو جاتی ہے اور اسی درجہ کے لحاظ سے ان کا مکارہ کہا گیا ہے اب کچھ اشکال نہ رہا (میں کہتا ہوں کہ یہاں کسب و اکتساب میں تبدیلی عنوان کی توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خیر میں مطلق کسب پر اجر ملے گا خواہ اتفاقاً خیر کا صدور ہو جائے اور شر میں مطلق کسب پر عذاب نہیں بلکہ تعدد کسب پر مواخذہ ہوتا ہے چنانچہ خطا و نسیان غفو ہے واللہ اعلم)

ایک سوال و جواب یہاں حصر کے متعلق ہے جو لہا اور علیہا کی تقدیم سے حاصل ہوا ہے وہ یہ کہ اس حصر سے لازم آتا ہے کہ جیسے عقاب بلا کسب نہیں ہونا چاہیے کہ ثواب بھی بلا کسب نہ ہو حالانکہ ثواب کبھی بلا عمل محض فضل سے بھی مل جاتا ہے جیسا کہ نصوص میں وارد ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ حصر باعتبار حصول کے نہیں بلکہ باعتبار استحقاق کے ہے یعنی استحقاق تو ثواب کا بھی بدوں کسب نہیں گوعطا ہو جاوے اور اوپر میرے کلام میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لِطَآئِفَةٍ لَنَا بِهٖ (اے ہمارے رب! ہم پر دارو گیر نہ فرمائیے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجے جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہا نہ ہو)

جو چیزیں اس آیت میں مذکور ہیں یعنی نسیان اور خطا وغیرہ ان پر مواخذہ نہ ہونا اس کا لوگوں سے وعدہ ہو گیا تھا اور پہلی آیت یعنی

إِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبُكُمْ بِهِ اللَّهُ جَوَابَاتٍ لِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (اے لوگو! اگر تم ظاہر کرو گے یا کہ پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے۔)

بالمعنی العام منسوخ ہو گئی تھی نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمادیا ہے کہ رفع عن امتی الخطاء والنسیان میری امت سے خطا اور بھول معاف کر دی گئی۔

مگر پھر بھی یہ حکم ہوا کہ یوں ہی مانگے جاؤ اور یہ دعا تعلیم کی گئی تو بات یہ ہے کہ منسوخ ہونے کے قبل تو یہ سوال طلب کے لئے تھا کہ ہم سے یوں مانگا کرو اب بطور شکر کے ہے کہ جیسے ہم ملنے سے پہلے محتاج تھے اب بھی محتاج ہیں۔

غیر اختیاری وساوس پر مواخذہ نہیں

ایک نکتہ اس مقام پر قابل حل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا کی ہم کو تعلیم فرمائی ہے اور حدیث میں ہے کہ یہ دعا قبول ہو چکی ہے چنانچہ حضور فرماتے ہیں رفع عن امتی الخطاء والنسیان۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ نسیان و خطا امر اختیاری ہے یا غیر اختیاری ظاہر یہ ہے کہ غیر اختیاری ہے اور لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا الخ

سے معلوم ہو چکا ہے کہ غیر اختیاری پر مواخذہ نہیں پھر بعد رفع مواخذہ آئندہ کے لئے دعائے عدم مواخذہ کی تعلیم کے کیا معنی جبکہ مواخذہ کا احتمال ہی نہیں دوسرا اشکال یہ ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے رفع خطا و نسیان اس امت کے ساتھ مخصوص ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ دوسری امتوں پر مواخذہ تھا اور یہ عقل کے خلاف ہے کہ دوسری امتوں کو تکلیف مالا یطاق دی گئی ہے نیز نص لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا مِّنْ نَّفْسٍ عام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشریعیات میں تکلیف لا یطاق کسی کو نہیں دی گئی اور عقل بھی عموم کو چاہتی ہے اس کے جوابات علماء نے مختلف دیئے ہیں مگر میرے ذہن میں جو جواب آیا ہے میں اس کو عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ خطرات و وساوس میں دو درجے ہیں ایک درجہ حدوث کا ہے وہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک درجہ بقاء کا ہے یہ بعض اوقات اختیاری ہوتا مثلاً کسی راحبہ کا دل میں بلا قصد خیال آ گیا تو یہ غیر اختیاری ہے مگر اس دوسرے کا کچھ دیر تک باقی رہنا یہ بعض اوقات اختیاری ہوتا اور یہ بقاء کبھی قصیر ہوتا ہے اور کبھی طویل اور یہ بقاء اکثر ہوتا ہی ہے۔ کیونکہ دوسرے کا ایسا وقوع نادر ہی ہے کہ حدوث کے ساتھ ہی فنا ہو جاوے زیادہ یہی ہے کہ دوسرے کچھ دیر کو ضرور باقی رہتا ہے مگر انسان کو اکثر بقاء قصیر کا احساس کم ہوتا ہے بقاء طویل ہی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ ابتداء میں اس کو اس پر التفات نہیں ہوتا کہ دوسرے درجہ حدوث سے تجاوز کر کے درجہ بقاء حاصل کر چکا ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھو کہ درجہ حدوث پر تو کسی سے مواخذہ نہیں کیونکہ وہ تو من کل وجہ غیر اختیاری ہے اور تیسرے درجہ پر سب سے مواخذہ ہے یعنی بقاء طویل پر کیونکہ وہ من کل وجہ اختیاری ہے اب ایک درجہ بیچ کا ہے یعنی جبکہ دوسرے کو بقاء قصیر ہو یہ امت محمدیہ سے عفو ہے اور پہلی امتوں سے اس پر مواخذہ تھا کیونکہ یہ درجہ فی نفسہ اختیاری ہے اس لئے نخل مواخذہ ہونے کے قابل ہے مگر مشبہ غیر اختیاری کے ہے اس لئے امت محمدیہ سے اس کے متعلق مواخذہ مرتفع ہو گیا رہا یہ سوال کہ جب یہ درجہ مشابہ غیر اختیاری کے ہے تو پہلی امتیں اس سے کس طرح بیچیں ہوں گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب فی نفسہ اختیاری ہے تو وہ اہتمام مزید کر کے بچے ہوں گے اور نہ بچتے ہوں تو ان پر اس سے استغفار واجب ہوگا اور امت محمدیہ پر اس سے استغفار کا وجوب نہ ہوگا گو استجاب ضرور ہے اور یہی دو درجہ خطا و نسیان میں ہیں کہ خود خطا و نسیان تو غیر اختیاری ہے مگر اس کا منشاء یعنی عدم استحضار یا نہ کرنا اختیاری ہے اگر نہ کرنا استحضار کامل ہو تو پھر خطا و نسیان کا صدور نہیں ہو سکتا ان کا صدور جب بھی ہوگا عدم استحضار و غفلت ہی سے ہوگا چنانچہ اگر دن میں ہر وقت روزہ کا دھیان رہے تو نسیان طاری نہ ہوگا نماز میں اگر افعال صلوٰۃ پر پوری توجہ ہو تو سہو نہ ہوگا اور یہ امر اختیاری ہے کہ توجہ رکھو تو اس کے ترک پر مواخذہ ہو سکتا ہے اب آیت و حدیث رفع عن امتی الخ پر تو اشکال نہ رہا لیکن ایک مستقل اور اشکال وارد ہوگا کہ رسول اللہ علیہ وسلم کو جو نماز میں سہو ہوا ہے کیا اس کا منشاء بھی عدم استحضار افعال صلوٰۃ تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں سہو نبوی کی علت بھی یہی ہے لیکن علت عدم استحضار افعال صلوٰۃ ہم میں اور ہے اور حضور اقدس میں اور یعنی ہماری عدم توجہ الی الصلوٰۃ کا منشاء تو یہ ہے کہ ہم کو ایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی ہے جو نماز سے ادنیٰ ہے یعنی دنیا اور حضور کی عدم توجہ الی الصلوٰۃ کا منشاء یہ ہے کہ آپ کو ایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی تھی جو نماز سے اعلیٰ ہو۔ یعنی ذات حق خوب سمجھ لو (الفصل والانفصال ص ۳۸)

نگاہ بد اختیار کی ہے

فرمایا کہ ایک صاحب کو اسی میں کلام تھا کہ نگاہ بد اختیار میں نہیں۔ اس پر بہت ہی اصرار کرتے رہے۔ میں نے کہا کہ سوچو تو بعد کو انہوں نے لکھا کہ واقعی میں غلطی پر تھا نگاہ اختیار میں ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ نفس سے تکلیف گوارا نہیں ہوتی۔ نگاہ ہٹانے میں الجھن ہوتی ہے تکلیف گوارا نہیں کرتے نفس کے ساتھ ہو لیتے ہو تمہارا جو خیال ہے اس سے تو شریعت پر اعتراض لازم آتا ہے کہ اس نے ایسی چیز کا مکلف کیا ہے جو اختیار میں نہیں۔

احقر عرض کرتا ہے کہ اس گفتگو کے وقت احقر بھی حاضر تھا۔ یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر عورت کی چھاتی پر سوار اور زنا کا مرتکب ہونے والا ہو اس وقت بھی ہٹنا اختیار میں ہے گو مشقت چاہے جتنی ہو۔ کیونکہ اس وقت بھی اس کو شریعت حکم کرتی ہے کہ اس سے باز آ جاؤ ایسی حالت میں اگر اختیار نہ مانا جائے تو اس سے نعوذ باللہ قرآن کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ ارشاد ہے لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا الْخِ سَوْجَةً تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنْ كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ شَيْءٍ فَاذْكُرُوا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ

ہم کو اسی قدر کا مکلف کیا گیا ہے کہ جس قدر طاقت ہو اگر اس پر کوئی کہنے لگے کہ ہم کو تو صرف ایک ہی وقت کی نماز کی طاقت ہے تو جواب یہ ہے کہ تم نے صرف اسی کو دیکھا ہے دوسرے مقام کو نہیں دیکھا کہ حق تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز کا مکلف فرمایا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا اس سے صاف معلوم ہوا کہ جتنے کا مکلف فرمایا ہے اس کی طاقت ضرور ہے پس اب جو یہاں فرمایا ما استطعتم مطلب یہ ہوا کہ جتنا تم کو بتلایا سب کرو اور یہ عنوان دل بڑھانے کے لئے فرمادیا جیسے کوئی نوکر سے کہے کہ تم سے یہ کام تو ہو سکتا ہے تو جو ہو سکتا ہے وہ تو کرو تو گویا تصریحاً متنبہ کیا کہ تم سے تو ہو سکتا ہے تو یہ شہ تودفع ہو گیا۔

عدم توجہی

اب ایک اور شبہ رہا کہ یہ تو مشاہدہ ہے کہ نہیں ہو سکتا تو یہ دعویٰ مشاہدہ کا بالکل غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ ہمت نہیں کرتے اس لئے کچھ ثقل معلوم ہوتا ہے جس کو انسان کو اسکی طاقت کے مطابق ہی مکلف کیا گیا۔ آپ نے سمجھ لیا کہ نہیں ہو سکتا اس کی مثال ایسا ہے کہ آپ کو رات کے وقت خفیف ترشح میں پیاس لگی مگر سردی کی وجہ سے آپ کو باہر جانا ایسا دشوار ہوا کہ یوں سمجھے کہ ہم جا ہی نہیں سکتے لیکن رات کو دو بجے کے وقت ایک سوار آیا اور پروانہ دیا کہ کلکٹر صاحب نے بلایا ہے پس آپ نے معاً حکم دیا کہ گھوڑا سو اور بارانی پہن کر دو میل چلے گئے اور راستہ میں رعد و برق بھی ہوا سب کچھ ہوا مگر گئے ضرور تو اگر اس وقت پانی پینے کے لئے باہر نکلنا مشکل تھا تو اسی وقت دو میل چلنا کیسے آسان ہو گیا تو بات یہ ہے کہ فرق فقط ہمت کا ہے کہ اول پیاس کے وقت عزم و ارادہ نہ کیا تھا اور اب ارادہ کیا ہے تو جتنے کاموں کو آپ کہہ رہے ہیں کہ نہیں ہو سکتا ان سب میں آپ نے ارادہ ہی نہیں کیا بس یہ ہے وجہ حضرت مولانا استاذنا کی حکایت یاد آئی کہ نماز کے بارہ میں ایک حدیث ہے کہ ایسی نماز ہو کہ جس میں حدیث النفس دوسرہ نہ دلاوے وہ حدیث

سبق میں آئی ایک طالب علم نے کہا کہ حضرت کیا ایسی نماز ہو سکتی ہے مولانا نے کہا خوب فرمایا کیا کبھی ارادہ کیا تھا کہ نہیں ہوئی ویسے ہی سمجھ لیا کہ نہیں ہو سکتی کر کے دیکھا ہوتا۔ (التقویٰ بالحقہ مواضع حقیقت تصوف و تقویٰ)

وسوسے آنے پر مواخذہ نہیں

(۳۳) فرمایا۔ معصیت اگر غلطی سے ہو جاوے تو اس کے اثر سے ظلمت مانع نہ ہوگی کیونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (۱) رفع عن امتی الخطاء والنسیان اور اس رفع عن امتی کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاء اور نسیان پر مواخذہ تو ہو سکتا تھا مگر رفع کر دیا گیا کیونکہ یہ مواخذہ تکلیف مالا یطاق نہیں ہے جیسا ابھی معلوم ہوگا لیکن رحمت خداوندی سے یہ خطاء و نسیان معاف فرما دیا گیا ہے جب ہے کہ اس نسیان و خطاء کے رفع کی دعا بھی تعلیم فرمائی۔ (۲) ربنا لاتؤاخذنا ان نسینا او اخطانا (البقرہ: ۲۸۶) اور نسیان و خطاء پر مواخذہ کا تکلیف مالا یطاق نہ ہونے کی وجہ سے پیشتر کے دونوں اختیار سے باہر نہیں جیسا مولانا رومؒ ایک مقام پر فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ نسیان و خطا بھول سے ہوتا ہے۔ اگر ہر وقت تیقظ رہے تو نسیان و خطا کا ہونا ممکن ہی نہیں اور ہر وقت تیقظ رکھنا گو مشکل ہے مگر ہے اختیاری اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم فرمائی (۳) ربنا لاتؤاخذنا ان نسینا او اخطانا (البقرہ آیت ۲۸۶) اور اس دعا کو قبول فرما کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری فرمادیئے۔ رفع عن امتی الخطاء والنسیان۔ بخلاف امم سابقہ کے کہ ان سے خطاء و نسیان پر بھی مواخذہ ہوتا رہا کیونکہ یہ مالا یطاق نہیں جیسا ابھی مذکور ہوا اسی طرح حدیث میں ہے میری امت سے وسوسہ پر مواخذہ نہ ہوگا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وسوسہ پر مواخذہ ہو سکتا ہے اور وہ بھی مالا یطاق ہے اگر مالا یطاق ہوتا تو اس میں اس امت کی کیا تخصیص ہوتی۔ اس کے مایطاق ہونے کی تحقیق یہ ہے کہ وسوسہ جو ذہول و عدم تنبیہ سے ہو سو حدوث وسوسہ تو غیر اختیاری ہے۔ اور اس پر کسی سے مواخذہ نہیں ہے اس امت کو بھی تخصیص نہیں اور بقاء وسوسہ جو عدم تنبیہ سے ہو سو یہ درجہ تنبیہ نہ ہونے تک امم سابقہ سے معاف نہ تھا اور ہماری اس امت سے معاف ہے۔ باقی تنبیہ ہو جانے کے بعد پھر وسوسہ وغیرہ کا امتداد یہ کسی سے بھی معاف نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت)

سُورَةُ آلِ عِمْرَانَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

زَيْنَ النَّاسِ حُبِّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَاِبِ ۝

ترجمہ: خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی) مثلاً عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے نمبر (یعنی نشان) لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیاوی زندگی میں اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

تفسیری نکات

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان چیزوں کو دیکھا تو جو اثر ان پر ہو اور جو رائے انہوں نے ظاہر کی وہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد ان پر یا ان کے پیروکاروں پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مطلقاً ترک دنیا سکھاتے ہیں۔ پہلے تو آپ ان ذخائر و غنائم کو دیکھ کر روئے اور پھر یہ دعا کی کہ اے اللہ یہ تو ہم نہیں عرض کرتے کہ آپ ان چیزوں کی محبت ہمارے دل سے نکال دیجئے کیونکہ آپ کا ارشاد ہے زَيْنَ النَّاسِ حُبِّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔ جب آپ نے خود ان چیزوں کی محبت کو ہمارے قلوب میں مزین فرما دیا ہے تو اس کے زائل ہونے کی دعا کرنا تو سخت گستاخی ہے لیکن یہ عرض ہے کہ ان چیزوں کی محبت کو آپ اپنی محبت کی معین بنا دیجئے۔ سبحان اللہ کیا اچھی دعا فرمائی کیسا حقیقت کو سمجھا۔

زین کی دو مختلف تفسیریں

زین کی دو مختلف تفسیریں ہیں اور وہ اختلاف اس میں ہے کہ زین جوئی للمفعول ہے اس کا فاعل کون ہے ان چیزوں کی

جو محبت مزین (بفتح الیاء) کر دی گئی تو اس کا مزین بکسر الیاء) کون ہے یعنی اس تزمین کا فاعل کون ہے۔ یعنی اس میں اختلاف ہے کہ اس تزمین کے فاعل حق تعالیٰ ہیں یا شیطان ہے اب یہاں ضرورت علم کی ہے۔ افعال میں ایک مرتبہ تو خلق کا ہے اور ایک کسب کا سو مرتبہ خلق میں تو اللہ تعالیٰ فاعل ہیں اور مرتبہ کسب میں شیطان۔ یعنی اس زینت کے پیدا کرنے والے اور خالق تو حق تعالیٰ ہیں۔ انہوں نے یہ چیز قلب میں پیدا فرمادی اگر تم اس کو اپنے محل میں استعمال کرو تو وہ خیر ہے۔ اگر غیر محل میں استعمال کرو تو وہی شر ہے۔ یہ استعمال مرتبہ کسب کا ہے اور اس مرتبہ میں شیطان متصرف ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرتبہ خلق پر نظر تھی کیونکہ عارف کی غلبہ تو حید میں اول اسی پر نظر جاتی ہے۔ اسی کے غلبہ میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا کہ ان چیزوں کی محبت تو آپ نے طبع میں پیدا کر دی ہے یہ کیسے زائل ہو سکتی ہے اور اس سے ہم اپنا تم یہ کیسے کر سکتے ہیں۔ ہر شخص کو ان چیزوں کی طرف طبعی میلان ہے۔ روپیہ پیسہ کیا کسی کو برا لگتا ہے اگر برا لگتا تو انبیاء علیہم السلام دوسروں کو بانٹتے نہ اگر سانپ بچھو سمجھتے تو کیا دوسروں کو سانپ بچھو بانٹتے جاتے ہیں۔ ہمارے حضور اقدس ﷺ نے سو سو اونٹ ایک ایک شخص کو ایک ایک وقت میں عطا فرمائے ہیں۔ کوئی بادشاہ بھی ایسی داد و دہش کیا کرے گا جیسی حضور نے کی ہے تو کیا آپ نے سانپ بچھو بانٹے۔ بہر حال ان چیزوں کی ہر شخص کو طبعی محبت ہے اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دعا نہیں کی کہ ان کی محبت زائل فرما دیجئے بلکہ یہ دعا کی کہ آپ نے جو ان چیزوں کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا کر دی ہے وہ معین ہو جاوے آپ کی محبت کی۔ غرض دنیا کی محبت میں بھی بڑی مصلحتیں ہیں۔ مولانا رومیؒ اسی مصلحت کو فرماتے ہیں۔

شہوت دنیا مثال گل سخن است کہ ازو حمام تقوی روشن است

اموال دنیا کی طرف طبعی میلان

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی طرف میلان اور رغبت اور ان کی محبت آپ نے طبعی طور پر نفوس میں رکھی ہے (یہ ایک خاص تفسیر پر مبنی ہے کہ تزمین کا فاعل اللہ تعالیٰ کو قرار دیا جاوے اور اس صورت میں یہ تزمین حکمت کے لئے ہوگی خواہ وہ حکمت کچھ ہی ہو) اور جب یہ محبت طبعی ہے تو اس سے ہم بھی بری نہیں اور نہ اس کے ازالہ کی ہم دعا کرتے ہیں البتہ یہ ضرور دعاء کرتے ہیں کہ اس کی محبت معین ہو جائے آپ کی محبت میں اللہ اکبر ان حضرات کی حقائق پر یہی نظر تھی۔ (ملفوظات جلد ۴)

ملکات اور وداعی اپنی ذات میں مذموم نہیں

حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں جب عراق فتح ہوا۔ کسریٰ کے خزان مسجد نبوی میں لا کر ڈھیر کر دیئے گئے تو حضرت فاروق اعظمؓ نے بارگاہ حق تعالیٰ میں عرض کیا یا اللہ آپ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ یعنی لوگوں کے دلوں میں خواہشات نفسانی کی چیزیں عورتیں بچے سونے چاندی کے ڈھیر وغیرہ کی محبت ڈال دی گئی ہے۔

اس لئے میں یہ دعا تو نہیں کرتا کہ یہ فطرت بدل دی جائے گی مگر یہ دعا کرتا ہوں کہ ان چیزوں کی محبت آپ کے راستہ اور آپ کی رضا جوئی میں ہمارے لئے معین و مددگار ہو جائے۔ حضرت نے اس واقعہ کو نقل کر کے فرمایا کہ اسی لئے ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ رذائل کا ازالہ مقصد نہیں۔ امالہ مقصود ہے یعنی رذائل کے جذبات و داعی کو خیر و طاعت کی طرف مائل کر دینا مطلوب ہے اصل داعیہ کو زائل کرنا نہیں کیونکہ ملکات اور واداعی مثلاً شہوت و غضب وغیرہ۔ یہ اپنی ذات میں مذموم نہیں۔ شہوات کو حلال میں صرف کیا جائے اور قوت غضب کو شیطان اور کفر کے مقابلہ میں خرچ کیا جائے تو یہی درجات عالیہ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ حضرت مولانا روٹی نے خوب فرمایا ہے۔

شہوت دنیا مثال کلخن ست کہ ازو حمام تقوی سوشن است

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

ترجمہ: بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے

تفسیری نکات

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ کہ دین خدا تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔ اہل علم اس کو سمجھتے ہیں کہ یہ ترکیب مفید حصر ہے جس سے ایک گونہ قوت پیدا ہوگئی مضمون میں۔ اس سے اسلام کی فضیلت ظاہر ہے کہ وہ ایسا دین ہے کہ خدا کے نزدیک وہی مقبول ہے۔ یہاں یہ شبہ ظاہر میں ہو سکتا ہے کہ ادیان تو بہت ہیں۔ پھر اس کا کیا مطلب کہ خدا کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے یوں فرمانا چاہیے تھا کہ دین حق صرف اسلام ہی ہے مطلق دین کو اس میں منحصر کرنا کیسا؟ میں کہتا ہوں کہ حصر کے علاوہ یہ وہ دوسرا مبالغہ ہے کیونکہ قاعدہ ہے المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل کہ مطلق سے فرد کامل مراد ہوا کرتا ہے پس ہر چند کہ مطلب تو یہ ہے کہ دین کامل اسلام ہی ہے اور یہ بلا کلام صحیح ہے کیونکہ دوسرے بعض ادیان تو اصل ہی سے حق نہیں اور یا منسوخ ہیں مگر مطلق کو منحصر کرنے میں ایک قسم کا دعویٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام ایسا کامل دین ہے جس کے سامنے اور مذاہب اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو دین کہا جائے چنانچہ محاورات میں بولا جاتا ہے کہ بس حسین تو فلاں شخص ہے جس میں دعویٰ ہے کہ اس کا حسن ایسا کامل ہے کہ دوسرے حسین اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو ان کے سامنے حسین کہا جائے اس ادعا کی وجہ سے مطلق کا حصر کر دیا جاتا ہے یہی صورت اس جگہ ہے پس حاصل ہی ہوا کہ گو ادیان اور بھی ہیں مگر اسلام ایسا کامل و مکمل دین ہے کہ اس کے سامنے دوسرے ادیان کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ فضیلت تو اس آیت میں مذکور ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ جَوْشَنِ اسلام کے سوا کسی دین کو طلب کرے گا وہ ہرگز قبول نہ ہوگا۔ یہاں حقیقت کے موافق کلام فرمایا گیا ہے کہ دوسرے مذاہب کو بھی دین کہہ دیا گیا، مگر اسلام کے مقابلہ میں ان کو غیر مقبول قرار دیا گیا۔ یعنی اسلام کے بغیر کسی دین کے اختیار کرنے سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

تدبیر حسن خاتمہ

امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے کہ اگر ایمان پر خاتمہ چاہتے ہو تو ہمیشہ نعمت ایمان پر خدا کا شکر کرتے رہو کیونکہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ لَیْسَ بِشُکْرِكُمْ لَّا زَیْدٌ لَّكُمْ اِغْرَامٌ لَّكُمْ اِذَا شُكِرْتُمْ اَلَا تَشْكُرُوْنَ اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں نعمت کو بڑھاؤں گا اسے زیادہ کروں گا۔ سبحان اللہ یہ نہیں فرمایا لَیْسَ بِشُکْرِكُمْ لَّا اَسْلَبْکُمْ بِالْاَنْفُسِ لَکُمْ اَلَا تَشْكُرُوْنَ کہ اگر شکر کرو گے تو میں نعمت سلب نہ کروں گا بلکہ لَّا زَیْدٌ لَّكُمْ فرمایا جس میں زیادت کا وعدہ ہے وعدہ زیادت سے نقصان کی نفی ہوگئی اور نفی نقصان سے سلب کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگئی کیا بلاغت ہے کہ ایک لفظ ایسا فرمادیا جس سے نقصان و سلب دونوں کی نفی بھی ہوگئی اور ترقی کا وعدہ بھی ہوگیا۔ کوئی کلام ایسا بلوغ ہے جس کے ایک لفظ سے اتنے معانی حاصل ہوتے ہوں اگر خدا فہم دے تو قرآن کا لفظ لفظ اعجاز سے بھرا ہوا ہے جب شکر پر وعدہ زیادت ہے تو جو شخص نعمت ایمان پر شکر ادا کرتا رہے گا اس کا ایمان کبھی زائل یا کم نہ ہوگا بلکہ دن بدن بڑھتا رہے گا پس یہ ورود دستور العمل بنانے کے قابل ہے اگر اپنا ایمان دنیا سے سلامت لے جانا چاہتے ہو تو ایمان کا شکر کبھی نہ بھولو۔

اللهم فلك الحمد ولك الشکر علی ما اتیتی من نعمته الاسلام ولك الحمد ولك الشکر علی ما اكرمتی بنعمة الايمان. اللهم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین خیر خزایا ولا مفتونین امین ۱۲ جامع حضور ﷺ کو معلوم تھا کہ میری امت غافل ہے یہ از خود ایمان و اسلام کا شکر بہت کم ادا کریں گی۔ (محاسن الاسلام ص ۲۵۶-۲۵۸)

قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكِ الْمَلِكِ تُؤْتِي الْمَلِكَ مِنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ مِنْ تَشَاءُ وَ

تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذَلُّ مَنْ تَشَاءُ يُبْدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ: آپ ﷻ اللہ تعالیٰ سے یوں کہتے کہ اے اللہ مالک تمام ملک کے آپ ملک جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس سے چاہیں ملک لے لیتے ہیں اور جس کو چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو چاہیں پست کر دیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔

تفسیری نکات

آداب سوال

ارشاد فرمایا کہ اس وقت تلاوت کے وقت اس آیت قُلِ اللّٰهُمَّ مَلِكِ الْمَلِكِ تُؤْتِي الْمَلِكَ مِنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ مِنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذَلُّ مَنْ تَشَاءُ يُبْدِكَ الْخَيْرُ کے متعلق ایک نکتہ خیال میں آیا ہے وہ یہ کہ اوپر سے اضاہد کو بیان فرمایا ہے اور اس کی تعلیل میں ارشاد ہے بیدک الخیر حالانکہ اوپر دونوں ضدوں کا ذکر ہے۔ خیر کا بھی شر کا بھی۔ تعزیر ہے تذل شر ہے اس کا مقتضی یہ ہے کہ بیدک الخیر والشر فرماتے چنانچہ مفسرین نے والشر مقدر کہا ہے مگر مقدر ماننے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ قدرت ضدین کے ساتھ متعلق ہوتی ہے پس یہ کہنا کہ بیدک الخیر یہ خود ہی بیدک الشر ہے لیکن مجملہ

آداب سوال کے یہ بھی ہے کہ صرف مطلوب کو ذکر کرتے ہیں۔ اس کو ضد کو ذکر نہیں کرتے۔ گو مسئول عند دونوں پر قادر ہوتا ہے مثلاً سائل ملازمت یہ نہیں کہتا۔ آپ کے اختیار میں ملازمت دینا بھی ہے اور موقوف کرنا بھی۔ (اشرف البیان)

محبت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں

راز اس کا یہ ہے کہ اس سرکار میں محبت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں جہاں محبت ہے وہاں محبوبیت بھی ہے اور جہاں محبوبیت ہے وہاں محبت بھی ہے اسی معنی کو کہا ہے

ہر کہ عاشق بینیش معشوق داں گو بوہ نسبت ہست ہمیں وہم آں

اور اسی واسطے مشورہ دیتے ہیں

آب کم جو تشنگی آور بدست تا بچو شد آیت از بلاؤ پست

پیاسے کو مشورہ دیتے ہیں کہ تو پانی کا طالب ہے تو سمجھ لے کہ تو مطلوب بھی ہے جیسے تو پانی کو ڈھونڈتا ہے ایسے ہی پانی بھی تجھ کو ڈھونڈتا ہے چنانچہ صاف فرماتے ہیں

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

یعنی جیسا کہ پیاسے پانی کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں ایسے ہی پانی بھی خود پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے دیکھ لیجئے پیاسوں کے پیدا ہونے سے پہلے پانی پیدا ہوا تو پانی جو مطلوب کہا جاتا ہے وہ درحقیقت طالب اور پیاسا جو طالب سمجھا جاتا ہے اس اعتبار سے مطلوب ہے تو طالبیت اور مطلوبیت دونوں طرف سے ہوئی یہ حالت تو مخلوق کی باہم ہے اور جو کوئی خدا تعالیٰ کے ساتھ علاقہ پیدا کرے تو خدا تعالیٰ تو بہت کریم ہیں ذرا سا بہانہ ڈھونڈتے ہیں ادھر سے ارادہ ہوا اور ادھر سے خود کرم فرماتے ہیں تو جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت کرے گا خدا تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ محبت کریں گے جب ادھر سے محبت ہوئی تو یہ محبوب ہو گیا نتیجہ یہی ہوا کہ محبت کے لئے محبوبیت لازم ہے چنانچہ ایک جگہ صاف فرماتے ہیں یحبکم اللہ اس سے اوپر ارشاد ہے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی اور یہ اس کا ثمرہ ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے محبت ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو حق تعالیٰ تم کو محبوب بنالیں گے یہاں بظاہر موقع تحب اللہ کا تھا یعنی تمہارا محبت ہونا اس وقت معتد بہ ہوگا جب تم اتباع کرو اس سے تم اللہ کے محبت میں شمار ہو سکتے ہو سو یہ نہیں فرمایا بلکہ یحبکم اللہ فرمایا یعنی ایسا کرنے سے تم کو حق تعالیٰ اپنے محبوبین میں داخل کر لیں گے یہ آیت تو بالکل ہی صریح ہے اس باب میں کہ محبت کے لئے محبوبیت لازم ہے اور بہت سی آیتوں میں یہ مضمون آیا ہے مثلاً واللہ یحب المحسنین اور واللہ یحب الصابریں وغیرہ وغیرہ اس قسم کی بہت سی آیات ہیں محبت کے معنی یہی تو ہیں کہ محبت رکھیں گے اس کی ضمیر حق تعالیٰ کی طرف ہے تو فاعل اس کی ذات حق ہوئی اور محبت کے فاعل کو محبت کہتے ہیں اور مفعول اس کا صابریں یا شاکرین ہیں بلفظ دیگر مومنین ہیں اور محبت کے مفعول کو محبوب کہتے ہیں تو مومنین کے لئے بشارت ہوئی محبوب بنالینے کی یہ مضمون جا بجا آیات میں موجود ہیں اور یحبکم اللہ میں تو بالکل ہی صاف موجود ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔ کتنی بڑی بات ہے اس پر تو عاشق کو شادی مرگ ہو جائے تو عجب نہیں عاشق

کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر اتنا بھی سن لے کہ محبوب نہ میرا نام لیا تو پھولا نہیں سماتا اور کہاں اتنا بڑا لفظ کہ مجھ کو پسند کر لیا۔

اداء حق محبت عنایتی است زد دوست وگرنہ عشق مسکین بچ خور سند است

محبوبیت کا لفظ تو بہت ہی بڑا ہے عاشق کے لئے تو حسین ہی میں شمار ہو جانا بڑے سے بڑا درجہ ہے وہ کہتا ہے۔

ببینم بس کہ داند ماہر ویم کہ من نیز از خریداران اویم

ببینم بس اگر کاسد قشام کہ من نیز از خریداران ہاشم

عاشق کا حوصلہ تو اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو محبت اور بلفظ دیگر عاشق کہہ دیا جائے اور اگر خود محبوب ہی اس کی

نسبت یوں کہہ دے کہ یہ میرا عاشق ہے تو شاید مرا ہوا بھی جی جائے یا جیا ہوا مرا جائے اور دوسرے محبوبوں سے تو اتنی بھی توقع

ہونا مشکل ہے کہ اپنے طالب کو عاشق ہی کہہ دے لیکن حق تعالیٰ کا فضل ہے اور غایت کرم ہے کہ اپنے ناچیز بندوں کو محبوبیت

کی بشارت سناتے ہیں ان کی رحمتوں اور راحتوں کی کیا حد ہو سکتی ہے۔ (الاسلام التحقیقی لمحمد موعظ رحمت دو عالم ﷺ ۲۶۰ تا ۲۵۸)

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحِبُّكُمْ اللَّهُ

تَرْجُمہ: آپ فرمادیجئے کہ تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

اعمال صالحہ سے حق تعالیٰ شانہ کی محبت پیدا ہوتی ہے

فرمایا عمل سے حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے جیسے روزمرہ کسی کے پاس آنے جانے سے اس سے محبت ہو جاتی

ہے آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحِبُّكُمْ اللَّهُ یعنی اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری (یعنی رسول اللہ ﷺ کی)

پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

محبت کو اتباع پر مرتب فرمایا اور اتباع عمل ہے تو عمل سے محبت آئے گی۔ بظاہر اشکال ہے کہ یوں چاہیے تھا

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحِبُّكُمْ اللَّهُ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا سے تم کو

محبت ہو جائے گی۔

جواب یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ کی محبت نہیں کیونکہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور ہم کو معرفت کامل ہی نہیں۔

(الکلام الحسن ج ۲ ص ۳۰ ص ۳۱)

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَمْرِئُ أُنَى لَكَ

هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

ترجمہ: سو جب کبھی زکریا علیہ السلام ان کے پاس عبادت خانہ میں تشریف لاتے تو آپ کے پاس تشریف لاتے تو ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے پاس کہاں سے آئیں وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب رزق عطا فرماتے ہیں۔

تفسیری نکات

حضرت مریم علیہا السلام کا کمال فہم

حضرت مریم علیہا السلام جب حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں تھیں تو جب حضرت زکریا علیہ السلام تشریف لاتے تو تازہ پھل مریم علیہا السلام کے پاس دیکھتے تو پوچھتے قَالَ يَمْرِئُ أُنَى لَكَ هَذَا اے مریم یہ کہاں سے آئے؟ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ یعنی مریم علیہا السلام فرماتیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بغیر حساب رزق دیتے ہیں۔ اس آیت کی اسی وقت ایک عجیب تفسیر سمجھ میں آئی ہے کہ مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ ان اللہ یرزق من یشاء حق تعالیٰ کا مقولہ ہے لیکن اگر اس کو قالت کے تحت میں داخل کر کے مریم علیہا السلام کا مقولہ بنایا جاوے تو حضرت مریم کے کمال فہم کی دلیل ہوگی کہ جزئیہ کے بعد کلیہ بھی بیان کر دیا۔ اے مریم (علیہا السلام) اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والیاں ہیں۔

تحصیل تواضع کا طریق

اب تم یہ سمجھو کہ حضرت مریم علیہا السلام آخر تم سے تو بزرگی میں زیادہ ہی تھیں باوجود اتنے کمالات کے پھر ان کو یہ حکم ہے کہ اے مریم تواضع کرو اپنے رب کے سامنے اور سجدہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ قلب کو بھی مشغول رکھو اور جوارح کو بھی کہ نماز پڑھو چونکہ تمام ارکان صلوٰۃ میں اعظم مقصود سجدہ ہے۔ اس لئے اس کی تخصیص فرمائی اور وَازْكِعِي مَعَ الزَّاكِعِينَ میں یا تو رکوع اصطلاحی مراد ہے اور یا لغوی معنی ہیں اور میں اخیر احتمال پر تفسیر کوٹنی کرنا چاہتا ہوں۔ پس مطلب یہ ہے کہ جھکو یعنی عاجزی کرو۔ اس کے بڑھانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ سب کچھ کرو مگر اپنے کو بڑا نہ سمجھو۔ اپنے کو پست کرو۔ خدا کے سامنے کمزور سمجھو اور مَعَ الزَّاكِعِينَ کے بڑھانے میں یہ نکتہ ہے کہ تواضع کے حاصل ہونے کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی تحصیل کا کیا طریقہ ہے۔ حاصل طریق کا یہ ہے کہ تواضع کرنے والوں کے ساتھ رہو یعنی نیک صحبت اختیار کرو۔ صحبت نیک اخلاق کی درستی کا نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔ بغیر صحبت کے اخلاق کی درستی نہیں ہوتی۔ اور چونکہ مستورات کو اس کا

موقع بہت کم ملتا ہے اسی واسطے ان کے اخلاق عموماً درست نہیں ہوتے۔ پس ان کو صحبت نیک کی بہت ہی ضرورت ہے کہ
 وَازْكِبْ مَعَ الزَّاكِيْنَ میں تواضع کے حاصل ہونے کا طریقہ بھی ارشاد ہوا ہے اور دوسری توجیہ اور ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے
 کہ اقلتی میں تواضع للرب مراد ہے جیسا کہ لوبک کی تقیید سے ظاہر ہے اور وارکعی سے تواضع للمخلوق مراد
 ہے خلاصہ یہ ہوا کہ خدا کے سامنے بھی عاجزی کرو اور مخلوق سے بھی تواضع سے پیش آؤ۔ اس صورت میں یہ آیت تواضع مع
 اللہ اور تواضع مع المخلوق دونوں کو جامع ہو جاوے گی۔

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ

ترجمہ: اور لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے اچھے ہیں۔

تفسیری نکات

عربی اور اردو کے معنی کا فرق

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ سے بعض لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ اس میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انہوں
 نے بھی مکر کیا۔ اور خدا نے بھی مکر کیا اور خدا سب سے بہتر مکر کرنے والا ہے۔ اشکال کا حاصل یہ ہے کہ دیکھو اس سے خدا کا
 نعوذ باللہ مکار ہونا لازم آتا ہے تو منشاء اس اشکال کا صرف یہی ہے کہ انہوں نے عربی لفظ کا ترجمہ اردو محاورہ کے موافق کیا
 اردو میں مکر کرنا فریب دینے کو کہتے ہیں جو کہ عیب کی صفت ہے اگر یہ لوگ اس عربی کے لفظ کا ترجمہ محاورہ عربیہ کے موافق
 کرتے تو اشکال کچھ بھی نہ تھا عربی میں مکر کے معنی تدبیر خفی کے بھی آتے ہیں اور تدبیر خفی کرنا یہ عیب نہیں بلکہ صفت کمال
 ہے ترجمہ آیت کا یہ ہوا کہ کافروں نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ نے ان کو بچانے کے
 واسطے مخفی تدبیر کی اور حق تعالیٰ سب تدبیر کرنے والوں میں بہتر ہے کہ کسی کی تدبیر اس کی تدبیر پر غالب نہیں آ سکتی اس
 ترجمہ کے بعد کچھ بھی اشکال نہیں اسی طرح ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے مجھ کو کچھ پوچھنا ہے مگر اول اس
 آیت کا ترجمہ کر دو وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ میں نے کہا کہ اس کا ترجمہ یہ ہے اور پایا خدا نے آپ کو ناواقف پس
 واقف بنا دیا سن کر میرا منہ دیکھنے لگے میں نے کہا جو پوچھنا ہو پوچھئے کہنے لگے۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا! میں نے کہا کہ کیا
 آپ مجھ سے یہ امید کرتے ہیں کہ میں اس جگہ ضالا کا ترجمہ گمراہ سے کرونگا، بعض تراجم میں گمراہ سے ترجمہ کیا ہے جس
 سے لوگوں کو اشکال پڑ جاتا ہے لیکن ان حضرات پر کوئی الزام نہیں ممکن ہے اس وقت گمراہ کے معنی ناواقف بھی مستعمل ہوتے
 ہوں جیسا کہ عربی میں ضلالت کے معنی غیبت اور فقدان کے بھی آتے ہیں چنانچہ کھوئی ہوئی چیز کو ضالہ کہتے ہیں جس کے
 معنی مفقود والخمر کے ہیں اسی طرح ضال کا اطلاق فاقہ الخمر پر بھی آتا ہے جس کا ترجمہ ناواقف ہے لیکن اب فارسی وارد ہوا
 محاورہ بدل گیا اب گمراہ اسے کہتے ہیں جو باوجود راستہ جاننے کے ٹیڑھے راستہ پر چلے آجکل بے خبر اور ناواقف کو گمراہ

نہیں کہتے اس لئے اب گمراہ سے ترجمہ کرنا صحیح نہیں اور حضور ﷺ کا نبوت سے پہلے بعض علوم سے ناواقف ہونا کچھ عیب نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ جو علوم نبوت کے بعد آپ کو عطا ہوئے نبوت سے پہلے آپ ان سے ناواقف تھے اگرچہ اس وقت بھی دنیا بھر کے عقلاء سے زیادہ آپ واقف کار تھے لیکن علوم قرآن و احکام سے تو خبردار نہ تھے یہ علم تو نبوت کے بعد ہی آپ کو حاصل ہوا! اسی کو حق تعالیٰ دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بَأْذَانِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّكَ عَلَىٰ حَكِيمٍ مُّبِينٍ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحَنَا مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (اور کسی بشر کی (بجائت موجودہ) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمادے مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے یا حجاب کے باہر سے یا کسی فرشتہ کو بھیج دے۔ کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے۔ بے شک وہ بڑا عالی شان بڑی حکمت والا ہے اسی طرح (یعنی اسی قاعدہ کے موافق ہم نے آپ کے پاس (بھی) وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (اور اس کے قبل آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان و معرفت کا اعلیٰ درجہ جو کہ اب آپ کو حاصل ہے وہ) کیا چیز ہے (گو نفس ایمان ہر نبی کو ہر وقت نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے) لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ آپ (اس قرآن اور وحی کے ذریعہ سے عام لوگوں کو) ایک سیدھے راستے کی ہدایت کرتے ہیں) (سورۃ الشوری) پارہ ۲۵

حضور ﷺ کا پہلے علوم سے بے خبر ہونا عین کمال ہے

پس وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ میں ضال کے معنی وہی ہیں جو آیت مَا كُنْتَ تَدْرِي اِنِّج سے معلوم ہوتا ہے یعنی خدا کی تعلیم و ہدایت سے پہلے آپ ان علوم سے بے خبر تھے اور یہ حضور ﷺ کے لئے کوئی نقص نہیں بلکہ عین کمال ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے بتلانے سے پہلے انبیاء کو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا نہ ان کے پاس کمالات بدوں اعطاء الہی کے ہوتے ہیں گو ہم کو ایسا کہنا زیبا نہیں دیتا کہ انبیاء کے پاس کچھ کمالات نہ تھے کیونکہ اس سے ایہام بے ادبی کا ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ کے ذمہ تو حضور کا ادب لازم نہیں آپ تمام عالم کے سردار اور سب سے افضل ہیں مگر حق تعالیٰ کے تو بندے ہی ہیں اس لئے حق تعالیٰ آپ کو ناواقف اور بے خبر جو چاہیں کہہ سکتے ہیں تو دیکھئے اس سائل کو حقیقت نہ معلوم ہونے کی وجہ سے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ میں اشکال پڑا کیوں کہ اس نے ترجمہ میں گمراہ کا لفظ دیکھا اور اس کے وہ معنی سمجھا جو آج کل کے محاورہ میں گمراہ کے معنی ہیں اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ ترجمہ عوام کو خود نہ دیکھنا چاہیے بلکہ علماء سے پڑھنا چاہیے ورنہ ایسے ایسے اشکالات ترجمہ دیکھنے سے پیدا ہوں گے جن کا جواب عوام کے ذہن میں نہ آئے گا چنانچہ قرآن میں حق تعالیٰ کی صفت استغناء کو دیکھ کر بعض لوگ یہی سمجھے کہ حق تعالیٰ ایسے مستغنی ہیں جیسے ہمارے محاورہ میں کسی کو مستغنی کہا کرتے ہیں حالانکہ استغناء کے معنی عربی میں یہ ہیں کہ اس کو کسی کی حاجت نہیں وہ کسی کا محتاج نہیں اور ہمارے محاورہ میں مستغنی اسے

بھی کہتے ہیں جسے کسی کے نفع و ضرر کی پروا نہ ہو! اب لوگ غضب کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو بائیں معنی بھی سمجھتے ہیں چنانچہ ایسے مقام پر اس صفت کو استعمال کرتے ہیں جہاں سو اس کے اور کچھ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ

وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا

فَقُولُوا الشُّهُدُؤُا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک بات سنو جو ہمارے تمہارے نزدیک برابر (درجہ میں ماننے کے قابل) ہے وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں پھر اگر وہ لوگ (حق سے) اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے) اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔

تفسیری نکات

یہ عنوان ایسا ہے جس سے وحشت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کفار بھی شرک کو برا سمجھتے تھے۔ گواہی شرک کو برا نہ سمجھتے تھے۔ اس کے بعد ارشاد ہے فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا الشُّهُدُؤُا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (یعنی اگر وہ اس بات کو مان لیں تب تو گویا اسلام کو مان لیا کیونکہ اسلام کی تعلیم یہی ہے) اگر وہ اس سے اعراض کریں تو (صاف) کہہ دو۔ کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔ اس میں تالیف قلب کی رعایت نہیں جب کہ مخاطب کسی طرح سمجھنے پر آتا ہی نہیں۔ سبحان اللہ! اس آیت میں ایسی بات بتلائی گئی ہے جس کا فیصلہ عقلاء ہزاروں برس میں بھی نہ کر سکتے تھے کیونکہ عقلاء میں بعض کی رائے تو اصلاح میں تالیف قلب کی طرف مائل ہوتی ہے اور بعض کی رائے صفائی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ مگر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ بتلایا ہے کہ ابتداء میں تو تالیف قلب کرو اور انتہا میں صفائی سے کام لو۔

چنانچہ اس آیت میں ابتداء تو ایسے عنوان سے ہے جس میں تالیف قلب ہے اور انتہا میں صفائی کی تعلیم ہے مگر آج کل حالت یہ ہے کہ اگر مصالح کی رعایت ہے تو عمر بھر مصالح ہی مصالح چلتے جائیں گے۔ کبھی صاف بات منہ پر نہ آئے گی اور اگر صفائی اختیار کرتے ہیں تو شروع ہی لٹھ سا مار دیتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ

اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (آل عمران آیت ۷۷)

ترجمہ: یقیناً جو لوگ معاوضہ حقیر لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو اللہ تعالیٰ سے (انہوں نے) کیا ہے اور بمقابلہ اپنی قسموں کے ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں وہاں کی نعمت کا نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ ان سے لطف کا کلام فرمائیں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

گناہگار مسلمانوں کا دخول جہنم میں تڑکیہ کے لئے ہوگا

یہاں کفار کی نسبت وَلَا يُزَكِّيهِمْ فرمایا ہے اور وعید میں مفہوم مخالف بالاتفاق معتبر ہے۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں جس کے لئے جہنم کا دخول تڑکیہ کے طور پر ہوگا جیسے یہاں حمام کا دخول تنظیف کے لئے ہوتا ہے۔ گو اس میں کچھ تکلیف بھی ہوتی ہے مگر پھر بھی خوشی زائل نہیں ہوتی۔ دیکھئے مسہل اور اپریشن میں کیسی تکلیف ہوتی ہے۔ بعض لوگ رونے لگتے ہیں مگر خوش بھی ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اپریشن کا انجام صحت و راحت ہے۔ اسی طرح گناہگار مسلمان کو بھی موت پر خوش ہونا چاہیے اور یہ سمجھ لے کہ اگر جہنم میں جانا بھی ہو تو تڑکیہ اور اپریشن کے لئے جانا ہوگا جس کا انجام راحت و عافیت ہے ہاں کافر کے لئے کچھ خوشی نہیں کیونکہ اس کے واسطے جہنم تڑکیہ نہیں بلکہ دائمی قید خانہ ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ

كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّنَ بِمَا كُنْتُمْ

تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمائیں پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر لیکن (کہے گا کہ) تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ پڑھتے ہو۔

تفسیری نکات

ربانی بننے کی ضرورت

وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّنَ تقدیر کلام اس طرے وَلَكِنْ یبغیٰ لہ ان یقول کونوا ربانین یعنی رسول سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کا امر کرے ہاں رسول کی شان یہ ہے کہ وہ حکم دے۔ کُونُوا رَبَّانِيِّنَ جس کے معنی یہ ہیں اللہ والے ہو جاؤ ربانی میں یا نسبت ہے اور الف و نون مبالغہ کے لئے بڑھایا گیا ہے قرآن میں ایک مقام پر اصل کے موافق والرہیون بھی آیا ہے اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی شان یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو اللہ والا بننے کا حکم فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔

فَمَا آتَىٰ حَدِيثٌ بَعْدَ ذَلِكَ يُؤْتُونَ سب مسلمانوں کو عموماً اور اہل علم کو خصوصاً ضروری ہے اس پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ اس میں ان سے کیا کوتاہی ہو رہی ہے غور کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ وہ کوتاہی کیا ہے آگے اس امر کو اس امر کے ساتھ معلل فرماتے ہیں اس پر بھی اہل علم کو غور کرنا چاہیے وہ علت یہ ہے۔

بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ حاصل یہ ہوا کہ چونکہ تم کتاب پڑھتے پڑھاتے ہو اس لئے تم کو اللہ والا بنا چاہیے کتاب معبود سے یا تو کتاب مراد ہے (یعنی قرآن) یا جنس کتاب مراد ہے یعنی کتب دیدیہ لیکن لام جنس کی صورت میں بھی ہر قسم کی کتابیں خواہ ان کو دین سے تعلق ہو یا نہ ہو مراد نہیں ہو سکتیں بلکہ کتب دیدیہ مراد ہیں کیونکہ اس جگہ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ 'علت بنایا گیا ہے' کُونُوا رَبَّانِينَ کا پس اسی کتاب کی تعلیم و تدریس مراد ہو سکتی ہے جس کو اللہ والا بنانے میں دخل ہو اور ظاہر ہے کہ یہ اکثر کتب دیدیہ ہی کی تعلیم میں ہے نہ کہ اور کتب کی تعلیم و تعلم میں لہذا جنس کو عموم کلی پر محمول نہیں کیا جاسکتا یہ تفصیل میں نے اس لئے کی کہ آج کل تعلیم کا لفظ نئی تعلیم پر بھی اطلاق ہونے لگا ہے بنی انگریزی تعلیم پر چنانچہ اخباروں اور رسالوں میں جب تعلیم کے اہتمام پر زور دیا جاتا اور انگریزی کی ضرورت کو ظاہر کیا جاتا ہے تو جہل کی مذمت و علم کی فضیلت و ضرورت میں جو آیات و احادیث وارد ہیں ان کو استدلال میں پیش کیا جاتا ہے جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان آیات و احادیث میں علم سے مراد عام علم ہے جس کا مصداق علم دنیا بھی ہے یاد رکھو یہ سراسر تحریف ہے اور اصطلاحات شرعیہ کا بدل دینا ہے اس سے امام غزالی کی پرانی شکایت تازہ ہو گئی وہ فرماتے ہیں بمجملہ احداثات کے ایک احداث یہ بھی ہے کہ الفاظ شرعیہ کو ان کے معانی شرعیہ سے بدلا جاتا ہے چنانچہ اے عزیز تم نے فقہ کے نئے معنی گھڑ لئے ہیں کہ صرف مسائل حیض و صلوٰۃ وغیرہ کا نام فقہ رکھ لیا ہے اور اس کا نام فقہ رکھ کر تمام ان فضائل کو اپنے اوپر منطبق کر لیا جو فقہاء کے لئے وارد ہوئے ہیں حالانکہ نص میں فقہ سے مراد مجموع علم و عمل ہے اور وہ فضائل علماء عالمین کے لئے مخصوص ہیں مگر تم نے اصطلاح شرع کو بدل کر صغریٰ تو خود گھڑ لیا کہ نحن فقہاء اور کبریٰ نصوص و احادیث سے اخذ کیا۔ ومن كان فقيها فقد اراد الله به خيرا وهو كذا وكذا پھر ان سے نتیجہ نکال لیا فنحن قدار ادالله بنا خيرا و نحن كذا وانحن كذا العملاء ورثة الانبياء و فضل العالم على العابد كفضلى على ادناكم وفقه واحد اشد على الشيطان من الف عابد وغيره۔ یاد کر کے اپنے آپ کو بھی علماء و فقہاء میں داخل کر لیا حالانکہ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن نے بھی آپ کو عالم کہا ہے یا نہیں۔

حقیقی علم

سو سنئے قرآن نے علماء بنی اسرائیل کی نسبت اول تو: وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ کہا پھر فرمایا وَلَيْسَ مَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ اول لقد علموا ان کی اصطلاح کے موافق فرمایا کیونکہ وہ بھی محض جان لینے اور لکھ پڑھ لینے کو علم کہتے تھے پھر لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ اپنی اصطلاح کے موافق فرمایا جس میں ان سے علم کی نفی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح شریعت سے علم الفاظ و معانی کا نام علم نہیں ورنہ یہ تو علماء بنی اسرائیل کو بھی حاصل تھا اس سے نفی ان سے کیونکر ہو سکتی ہے بلکہ علم الفاظ کے ساتھ جب عمل بھی ہو اس وقت وہ علم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے (حقوق و فرائض)

انبیاء کا طریق تعلیم

اس مقدمہ کے بعد واضح ہو گیا ہوگا کہ تعلیم بہ نسبت تعلم کے کونوار بائین کو زیادہ مقتضی ہے اس لئے تعلمون کو

تدرسون پر مقدم کیا گیا نیز یہ بھی نقطہ ہو سکتا ہے کہ تعلم سے مقصود تعلیم ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں
 فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ
 اور مقصود کو حسام مؤخر ہو مگر قصد مقدم ہوتا ہے اس لئے تعلمون کو مقدم فرمایا کہ وہ غایت ہے تدرسون کی اس
 سے علماء بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ اس غایت پر تو ہمارا پورا عمل ہے کہ پڑھنے کے بعد ہم پڑھانے میں مشغول ہیں
 حضرات آپ خوش نہ ہوں کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں بما کنتم تدرسون العلوم و بما کنتم تدرسون نہیں فرمایا بلکہ
 کنتم تعلمون فرمایا اور آپ درس کے بعد تدریس میں مشغول ہیں تعلیم میں مشغول نہیں ہیں تعلیم کی حقیقت وہ ہے جس کو دوسری
 آیت میں حق تعالیٰ نے نذر سے تعبیر کیا ہے۔ وَ لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ .

اور وہ اصل میں وعظ کا کام ہے جو میں اس وقت آپ کے سامنے کر رہا ہوں جس سے آج کل علماء متنفر ہیں اور اس کے
 اصل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ حضرت انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کیا طرز تھا کیا وہ کتابیں پڑھایا کرتے تھے
 ہرگز نہیں ان کی تعلیم کا طریقہ یہی وعظ تھا اور اصل مقصود یہی ہے مگر وعظ کہنے کے لئے ہم جیسوں کو ضبط علوم کی ضرورت ہے
 حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم تو علوم وہی تھے۔ ان کو نہ کتاب پڑھنے کی ضرورت تھی۔ نہ وہ اس کے محتاج تھے کہ کتاب کو
 سامنے رکھ کر دوسروں کو پڑھائیں کیونکہ وہ حقائق کو بدوں اصطلاحات کی مدد کے سمجھانے پر قادر تھے وہ معقول کو محسوس بنا
 دیتے تھے اس لئے ان کو کتابیں پڑھنے اور پڑھانے کی ضرورت نہ تھی پھر بعد میں صحابہ بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کے
 ساتھ سب سے زیادہ مشابہ تھے وہ بھی اس کے محتاج نہ تھے بعد میں جب حفظ میں کمی آئی اور علوم و ہبہ کی استعداد کم ہو گئی تو
 علوم کو کتابوں میں مدون کیا گیا اور اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کتابیں پڑھی اور پڑھائی جائیں مگر اس کی ضرورت اس بات
 کے واسطے ہوئی کہ کتابوں سے علم حاصل کر کے عوام کو صحیح علوم کی تبلیغ کریں غلط سلط باتیں نہ بنائیں۔

وَ إِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ

رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَ لَتَنْصُرُنَّهُ

ترجمہ: یعنی حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا ہے کہ اگر ہم تم کو کتاب و حکمت دیں پھر تمہارے پاس کوئی
 رسول آئے جو تمہاری کتاب کا مصدق ہو تو تم اس کی تصدیق و نصرت ضرور کرنا

تفسیری نکات

رسول اکرم ﷺ کی شان

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ جو مفسر القرآن ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے لئے دعا بھی
 فرمائی ہے اللھم علمہ الكتاب اس لئے ان کی تفسیر حجت ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں رسول سے مراد رسول ﷺ ہیں

اور یہ عہد جملہ انبیاء سے حضور ﷺ کے متعلق لیا گیا ہے کہ جو نبی حضور ﷺ کا زمانہ پائے اس کے ذمہ ضروری ہے کہ آپ کی تصدیق و نصرت کرے۔ پھر یہ بات ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نے بھی آپ کا زمانہ نہیں پایا تو یہ عہد ان سے کیوں لیا گیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہر وقت اور ہر زمانہ میں حضور ﷺ کے اتباع و تصدیق کے لئے تیار رہنا چاہیے خواہ وہ آپ کا زمانہ پائیں یا نہ پائیں مگر اپنی طرف سے ہر وقت اس کے لئے آمادہ رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بھی حضور ﷺ سے کسی وقت اپنے تعلق کو قطع نہیں کر سکتے۔

دوسرے اگر یہ عہد بھی نہ لیا جائے جب بھی انبیاء علیہم السلام حضور ﷺ سے تعلق قطع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مسئلہ شرعیہ اصولیہ ہے۔ من لم يشكر الناس لم يشكر الله (جس نے (ان) لوگوں کا شکر نہیں کیا (جو واسطہ نعمت ہیں) اس نے خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کیا)

اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ انبیاء علیہم السلام کے لئے واسطہ فی الكمالات ہیں گوئی الثبوت سہی تو اس قاعدہ کے موافق انبیاء علیہم السلام حضور سے کبھی تعلق قطع نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے شکر الہی میں نقصان لازم آتا ہے جس سے وہ حضرات مبرا ہیں اور انبیاء علیہم السلام پر آپ کے تعلق کا وجود بالقوہ تو اس حدیث سے ظاہر ہے۔

لو كان موسى حيا لما وسعه الاتباعي اور بالقبول اس سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزول الی الارض کے وجوداً آپ کا اتباع فرمادیں گے اور کسی کو وَالتَّبَعُ مِلَّةَ اِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا سے اس کے خلاف کا شبہ نہ ہو کیونکہ ملت ابراہیم خود آپ کی ملت کا بوجہ تناسب لقب ہے جس میں حکمت ترغیب ہے تمام اہل ملل کی اس ملت کے اختیار کرنے پر کیونکہ ابراہیم علیہم السلام کی جلالت متفق علیہ تھی اس لئے اتباع ابراہیم نہیں فرمایا۔ اسی طرح بعد ذکر انبیاء علیہم السلام کے حضور کو جو خطاب کیا گیا ہے قِهْدُ لَهُمْ اَقْتِدَاةَ يُونُسَ فَمَا فَبِهِمْ اَقْتَدِهْ۔ پس ہداهم سے مراد ہدی اللہ ہے اس کو ملا بہت کے سبب ہداهم فرمادیا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ

فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۱۰﴾

تَنْجِيحًا: تم خیر (کامل) کو ہرگز نہیں پاسکتے جب تک وہ چیز خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے اور جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں۔

تفسیری نکات خبر کامل

البر سے مراد یہاں پر خیر کامل ہے اولاً اس لئے کہ المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل مسئلہ عقلیہ ہے دوسرے دیگر نصوص و قواعد شرعیہ سے بھی اسی کو تائید ہوتی ہے کہ یہاں خیر کامل مراد ہے۔ حَتَّى تُنْفِقُوا یہ غایت ہے اور عربی میں

غایات افعال کو صیغہ اثبات سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور اردو میں صیغہ نفی سے تعبیر کیا جاتا ہے پس ترجمہ یہ ہوگا کہ جب تک خرچ نہ کروا لیں تو ترجمہ ہے اور بظاہر لفظ انفاق خاص ہے انفاق مال کے ساتھ مگر میرے دل میں ایک بار یہ آیا تھا کہ یہ عام ہے انفاق مال و بذل نفس جاہ و بذل علم وغیرہ سب کو۔

شان نزول

پھر میں نے علامہ قسطلانی کا ایک قول دیکھا جس سے میرے خیال کی تائید ہوئی اور قسطلانی کا قول اس طرح نظر سے گزرا کہ میں اس آیت کی تفسیر حدیث میں دیکھ رہا تھا کیونکہ حدیث میں اس کے متعلق حضرت ابو طلحہ کا قصہ مذکور ہے کہ وہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سبحان اللہ! حضرات صحابہ کا بھی کیا حال تھا کہ ہر آیت کے نزول کے بعد یہ مستعد تھے کہ ہم سے اس پر عمل ہوا ہے یا نہیں دوسرا کمال یہ تھا کہ عمل میں رسول اللہ ﷺ سے مشورہ کرتے تھے چنانچہ اس مشورہ کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حضور ﷺ کبھی تو کسی صحابی کی رائے کی تصویب فرماتے اور کبھی اس میں ترمیم فرمادیتے حضرت کعب بن مالک نے اپنی توبہ قبول ہونے پر اپنا تمام مال صدقہ کرنا چاہا اور حضور سے مشورہ لیا تو حضور ﷺ نے تمام مال کے صدقہ کرنے سے منع فرمایا۔ یہ فائدہ ہے کا ملین سے مشورہ لینے میں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ طبعاً قبیح سنت واقع ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے بھی ایک شخص کو تمام جائیداد کے وقف کرنے سے منع فرمایا تھا جس میں ایک سنت نبویہ سے بلا قصد موافقت ہو گئی غرض حضرت ابو طلحہ حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ انی اری اللہ تعالیٰ یقول لن تناولوا البر حتی تنفقوا مما تحبون وان احب اموالی الی بئرحاء فہی صدقة اللہ تعالیٰ فضعه یا رسول اللہ حیث اراک اللہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم بئربخ مال رابع اور انح واری ان نضعہ فی عشیرتک الاقربین۔ (او کمال قال)

یعنی یا رسول اللہ ﷺ میں دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے نیل بر یعنی نیکی کے حصول کو انفاق محبوب پر موقوف فرمایا ہے اور میرے اموال میں سب سے زیادہ محبوب مجھے میرا باغ ہے (جو ایک باغ کا نام ہے) تو میں اس کو اللہ کے نام پر صدقہ کرتا ہوں آپ جہاں مناسب سمجھیں اس کو صرف کر دیں حضور نے فرمایا شاباش یہ مال نفع دینے والا ہے یا ختم ہونے والا (اس لئے کسی مصرف خیر میں صرف کر دینا اچھا ہے) مگر میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے قریب قرابت داروں میں تقسیم کر دو حضرت انس کہتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہ نے حضور ﷺ کے ارشاد کے موافق اس باغ کو حضرت حسان و ابی بن کعب کے درمیان تقسیم کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ان کے قریب تھے اور ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ حضرت انس نے فرمایا کہ میں ان دونوں سے زیادہ قریب تھا مگر مجھے اس میں سے کچھ نہیں دیا۔ ان روایتوں میں بظاہر تعارض ہے مگر محدثین نے دونوں میں تطبیق یوں دی ہے کہ حضرت انس باعتبار خدمت و اختلاط کے قریب تھے کیونکہ ہر وقت ایک ہی گھر میں ان کے پاس رہتے تھے۔ اور حضرت حسان و ابی بن کعب باعتبار نسب کے قریب تھے۔ سبحان اللہ خوب تطبیق ہے۔ غرض میں حدیث میں حضرت ابو طلحہ کا یہ قصہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہی علامہ قسطلانی کا یہ قول نظر سے گزرا انفاق محبوب میں بذل جاہ و بذل

نفس و بذل علم بھی داخل ہے اس سے میرا دل بہت خوش ہوا لیکن اگر لغت سے اس کی تائید نہ ہو اور انفاق ان سب کو عام نہ ہو تو علامہ قسطلانی پر پھر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے عموم لفظ کی وجہ سے بذل نفس و بذل جاہ و بذل علم کو اس آیت میں نہیں داخل کیا بلکہ دلالتہ النص کی وجہ سے داخل کیا ہے کیونکہ مال بمقابلہ جاہ و نفس و علم کے اومن ہے تو جب انفاق مال سے برکامل حاصل ہوتی ہے جو ادنیٰ ہے تو بذل اعلیٰ سے بدرجہ اولیٰ برکامل حاصل ہوگی۔ غالباً اسی بنا پر بیضاوی نے وَجَّاهُ زَقَمَهُمْ يَتَفَقَّوْنَ کی تفسیر میں بعض صوفیہ کا قول نقل فرمایا ہے وَمِنْ اَنْوَارِ الْمَعْرِفَةِ يَفِيضُونَ کہ انہوں نے افاضتہ انوار معرفت کو بھی انفاق میں داخل کیا کیونکہ یہ انفاق مال سے اعلیٰ ہے تو جب ادنیٰ کا انفاق محمود ہے اعلیٰ کا انفاق کیوں محمود نہ ہوگا اور بیضاوی کی نقل اس بات کی کافی حجت ہے کہ یہ قول محتمل صحت ہے اب چاہے انفاق کو لغتہ عام کہا جائے یا دلالتہ النص کی وجہ سے عام کہا جائے بہر حال تعمیم غلط نہیں بلکہ اگلی آیت کے ربط کے لئے تعمیم ضروری ہے بغیر اس کے چارہ نہیں کیونکہ اس کے بعد یہ آیت ہے كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلاَلًا لِّبَنِي اِسْرَائِيْلَ اِلَّا مَا حَزَمْنَا لِنَسْرِ اَنْ يَلُوعَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَةُ۔ جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ قصہ جیسا مفسرین نے عام طور پر بیان کیا ہے یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو ایک دفعہ مرض عرق النساء ہوا تھا جس کے علاج میں آپ کو اونٹ کے گوشت سے بہت نفع ہوا تھا تو آپ نے نذر کی تھی کہ اگر مجھے اس مرض سے شفا ہوگئی تو اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دوں گا حالانکہ وہ آپ کو محبوب تھا کیونکہ مرض میں نافع ہوا تھا مگر آپ نے ترک مرغوب کی اس لئے نذر کی کہ ترک مرغوب خدا کو محبوب ہے تو اس قصہ کا ربط سابق سے جب ہی ہوگا کہ انفاق کو عام کیا جائے اور ترک مرغوب کو بھی انفاق میں داخل کیا جائے اور اگر انفاق کو مال ک ساتھ خاص کیا گیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس قصہ کو لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ سے ربط نہ ہوگا یعنی ربط ظاہر نہ ہوگا ورنہ ربط خفی ممکن ہے غرض بیضاوی اور قسطلانی کا قول دیکھ کر مجھے تعمیم انفاق کی ہمت ہوئی ورنہ اس سے پہلے اس خیال کے اظہار کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

مجاہدہ کا مقصود

مجاہدہ اس واسطے کیا جاتا ہے تاکہ ریا اختیاری کی مدافعت سہل ہو جائے۔ کیونکہ اس کا بار بار دفع کرنا قدرے دشوار ضرور ہے مجاہدہ سے یہ مشقت دفع ہو جاتی ہے۔ نیز وسوسہ ریا جو کہ مضرت نہیں بعض دفعہ اعمال کے ساتھ مزاحمت کرتا ہے اور اس کے ساتھ عمل دشوار ہو جاتا ہے مجاہدہ سے وسوسہ ریا بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔ بہر حال تم جن احوال غیر اختیار یہ کے طالب ہو ان کو چھوڑ دو ان کی طلب کو قطع کر دینا بھی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ میں داخل ہے کہ ان ہوسوں کو قطع کرو۔ لیکن مِمَّا تُحِبُّوْنَ کی ما اس قدر عام نہیں کہ سارے بچے اس کے اندر آ جائیں کہیں تم یہ کہنے لگو کہ ہم کو جنت کی بھی ہوس ہے ہم کو رضائے حق بھی مطلوب ہے تو کیا اس کو بھی قطع کر دیں۔ اس کا جواب میں قرآن ہی سے دیتا ہوں وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے مِمَّا تُحِبُّوْنَ فرمایا ہے۔ مما احب نہیں فرمایا اور جنت و رضائے حق تو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اس کا قطع کرنا مقصود نہیں۔ حاصل یہ ہوا کہ جو حالت تم کو محبوب ہو اور اللہ تعالیٰ کو من حیث المملو بہت محبوب نہ ہو اس کی طلب قطع کرو

اب اشکال نہ رہا دوسری قید یہ بھی ضروری ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ ہو کہ مطلق انفاق کافی نہیں یعنی احوال و کیفیات وہو سات کی ترک طلب رضائے الہی کے واسطے ہو راحت نفس کے واسطے نہ ہو یعنی اپنے محبوب کو خدا کے محبوب پر فدا کرنا یہ ہے۔ انفاق ممانعہ جو ن ایک بات یہ بھی سمجھو کہ آیت سے کس قدر مفہوم ہوتا ہے جو چیز خرچ کرو اس کا محبوب ہونا تو ضرور ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ سب اشیاء میں احب: دیگر حدیث ابو طلحہؓ سے ظاہر اشرط احبیت بھی مفہوم ہوتی ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا تھا انی اری اللہ تعالیٰ یقول لن تنالوا البرا حتی تنفقوا ممانعہ جو ن و ان احب الاموال الی بیروحا اس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تک محبوب! چیز خرچ نہ کرو گے اس وقت تک برکات حاصل نہ کر سکو گے اور مجھے سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیروحا ہے تو گویا ان کی فہم میں برکات کا حصول احب اشیاء کے انفاق پر موقوف تھا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے فہم کی تقریر فرمائی اس سے احب الاشیاء کے انفاق پر حصول برکات توقف پختہ ہو گیا اس غلطی میں بہت روز تک میں بھی رہا ہوں مگر پھر خدا نے ہدایت کی اور یہ سمجھ میں آیا کہ احب الاشیاء کے انفاق پر حصول بر موقوف نہیں کیونکہ نص مطلق ہے نص میں تو ممانعہ جو ن ہے احبیت کی قید نہیں اور حدیث میں جو حضرت ابو طلحہؓ کا قول وان احب الاموال الی بیروحا وارد ہے تو کسی دلیل سے اس کا ممانعہ جو ن کی تفسیر ہونا ثابت نہیں بلکہ حضرت ابو طلحہؓ نے از خود یہ ظاہر کرنا چاہا کہ گو حصول بر نفس محبوبیت شے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے مگر احب الاشیاء کا انفاق کرنا چاہتا ہوں غرض مطلق محبوب کے انفاق سے بھی بر حاصل کر لو گے خواہ حب ہو یا نہ ہو ہاں رد دل خذل نہ ہو (انفاء المحبوب)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلٌّ مِنَ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَا سِوَا فَتَدَىٰ بِهِ أَوْلِيَا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝۹۱

اس میں تو یہ بتلایا گیا ہے کہ کفار کو اس مال سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ اب اس کے مقابل مسلمانوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کو اپنے اموال سے نفع حاصل ہوگا وہ یہ کہ مسلمانوں کو انفاق مال سے خیر کامل حاصل ہوگی مگر اس کے لئے کچھ شرائط ہیں غرض حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار کے ذکر کے ساتھ مسلمانوں کا ذکر فرماتے ہیں اور بالعکس اور اسی معاملہ کے متعلق ذکر ہوتا ہے جس کے متعلق کفار کا ذکر تھا۔ اور ایک کے ساتھ قہر کا خطاب اور عین اسی موقع پر دوسرے کے ساتھ لطف کا خطاب فرماتے ہیں۔

فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلٌّ مِنَ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَا سِوَا فَتَدَىٰ بِهِ (آل عمران آیت نمبر ۹۱)

ترجمہ: سو ان میں سے کسی کا زمین بھر سونا بھی نہ لیا جائے گا اگر چہ وہ معاوضہ میں اسی کو دینا بھی چاہے۔

یہ آیت کفار کے بارے میں ہے مطلب یہ نہیں ہے کہ کافر سے اس کے جرم کے فد یہ میں تمام زمین بھر بھی سونا نہیں قبول کیا جائے گا اگر چہ وہ دینا چاہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قیامت میں ایسا ہوگا کہ کافر زمین بھر کر سونا دے گا مگر قبول نہ کیا جائے گا بلکہ یہی مطلب ہے کہ ایسا نہ ہوگا اور بالفرض ایسا ہوتا بھی تب بھی قبول نہ کیا جاتا اور کافر کو روزِ خبی میں ڈالا جاتا۔ (جلا بالقلوب)

امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر خصوصی انعامات

پس حسب قاعدہ مذکورہ ان کو تو فضیلت ذبح و لد کی حاصل ہوگئی۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہیے بیٹے کے ذبح

کرنے اور اللہ کی راہ میں نثار کرنے کا کتنا ثواب ہے تو قواعد شرعیہ سے یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ جس شے کو خرچ کیا ہے وہ جس قدر زیادہ محبوب ہوگی اسی قدر زیادہ ثواب ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (تم ہرگز بھلائی حاصل نہ کر سکو گے جب تک کہ اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر زیادہ محبوب کا انفاق ہوگا اسی قدر بر حاصل ہوگی اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے تو نفس بر کا حاصل ہونا معلوم ہوا، فضیلت اس سے کیسے معلوم ہوئی جواب یہ ہے کہ بر سے مراد بر کامل ہے اور دلیل اسکی اگلی آیت ہے فرماتے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ یعنی یوں جو بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والے ہیں یعنی اس کا ثواب دے ہی دیں گے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ خواہ محبوب شے خرچ کی جائے یا غیر محبوب ثواب تو ہر صورت میں ہوتا ہے اس لئے کہ شے بیان ہے ما کا اور وہ عام ہے شامل ہے ہر قلیل و کثیر کو پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ نفس ثواب تو تم کو ہر شے کے انفاق میں مل جائے گا لیکن بر خاص محبوب ہی کے انفاق میں ہے تو یہ اسلوب دال ہے اس پر کہ بر سے مراد ثواب کامل ہے پس وہ مدعا ثابت رہا کہ شے منفق جس درجہ محبوب ہوگی اسی درجے کا ثواب زیادہ ہوگا پس جب یہ امر ثابت ہو چکا تو دیکھنا چاہیے کہ بیٹے سے آدمی کو کس قدر محبت ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹے کے ساتھ اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اپنے لئے جو کمال انسان کو محبوب ہوتا ہے وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ دوسرے کو ہو لیکن بیٹے کے لئے چاہتا ہے کہ ہر کمال میں مجھ سے بڑھ جائے۔ ان مقدمات سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہم السلام نے وہ کام کیا کہ اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا تو ظاہر ہے کہ اس کا ثواب نہایت ہی عظیم الشان ہوگا۔

اس کے بعد معلوم کرنا چاہیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضحیہ کو سنت ابراہیم علیہ السلام فرمایا ہے حالانکہ جو عمل ابراہیم علیہ السلام نے کیا وہ اور ہے اور تضحیہ دوسرا عمل ہے ابراہیم علیہ السلام کا عمل ذبح ولد ہے اور تضحیہ ذبح حیوان ہے پھر اضحیہ سنت ابراہیمی کیسے ہوئی تو یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم کو اضحیہ میں اسی قدر ثواب ملے جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دونوں عملوں کی غایت کی اتحاد کی وجہ سے دونوں عمل کو ایک فرمایا گو عمل متغائر ہوں گویا یہ فرمایا اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جانور کے ذبح میں وہی اجر ملے گا جو ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دیکھئے کہ کس قدر فضیلت اضحیہ کی اس حدیث سے معلوم ہوئی اور ایک نکتہ اس سے اور معلوم ہوا وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ انعام تقسیم کرتا ہے جو لوگ زیادہ مقرب ہوتے ہیں اور مرتبہ ان کا زیادہ ہوتا ہے ان کو ان کے مرتبے کے موافق انعام ملا کرتا ہے پھر ان سے جو کم درجے کے ہیں ان کو اسی درجے کا انعام ملے گا مثلاً وزراء و دارکان دولت کو بہت بڑا انعام ملے گا اور ادنیٰ ادنیٰ چیز اسیوں اور خدام کو کم۔ پس حق تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب مخلوق سے زیادہ ہے اور انبیاء علیہم السلام میں ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے جلیل القدر ہیں کہ خلیل اللہ ہیں تو جو انعام ان کو دیا گیا ہوگا ظاہر ہے کہ بہت بڑا انعام ہوگا کہ باوجود اتحاد فعل کے بھی دوسرے شخص کو اتنا انعام نہ دیا جاتا چاہیے یعنی اگر یہی فعل ذبح ولد کا دوسرا کرتا تو وہ اس قدر

انعام پانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا جس قدر کہا ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا ہے اور جہاں فعل بھی اس فعل سے اُدُن ہو وہاں تو اتنا ملنے کی گنجائش ہی نہیں مگر باوجود اس کے یہ عمل ہمارا ذبح و لد سے بدرجہا اِدُن ہے پھر وہی انعام ہمارے لئے تجویز ہوا ہے اللہ اکبر کتاب انعام ہے اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لطف و کرم ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا
وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم بجز اسلام کے کسی حالت پر جان نہ دو۔

تفسیری نکات

حسب استطاعت تقویٰ اختیار کرو

یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ (اللہ تعالیٰ سے جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے خدا کی شان کے لائق تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے تو آیت میں تکلیف مالا یطاق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حق تقاتہ سے مراد غایۃ ما تقدرون علیہ (جس قدر تم اس پر قادر ہو) ہے کہ جتنا تم کر سکتے ہو اتنا تقویٰ کرو۔ چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دوسری جگہ اس مضمون کو ایک سہل عنوان سے بیان فرمایا کیونکہ ہم سے اپنی استطاعت کے موافق بھی عمل نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم استطاعت رکھتے ہو) جس میں بجائے قدرت کے استطاعت کا لفظ وارد ہے اور استطاعت کہتے ہیں قدرۃ یسیرہ کونہ قدرت ممکنہ کو بعض مفسرین نے دوسری آیت کو پہلی کے لئے نسخ فرمایا ہے اس سے بعض طلبہ خوش ہو گئے ہوں گے کہ اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ منسوخ ہو گیا چلو چھٹی ہوئی۔ ارے منسوخ تو وہ ہو جس میں نسخ کی قابلیت بھی ہو بھلا ایمان بھی کہیں منسوخ ہوا ہے اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ (اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اس شان کا امر ہے جیسے امنوا باللہ (اللہ پر ایمان لاؤ) میں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی عظمت کا متقاضی یہی ہے کہ تقویٰ حق تقاتہ کیا جائے اور مقتضائے عظمت بدل نہیں سکتا بلکہ بات یہ ہے کہ صحابہ کے عرف میں لفظ نسخ بیان تبدیل کے ساتھ خاص نہیں بلکہ وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ کہتے ہیں پس قواعد شرعیہ سے اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ کا مطلب ہی یہ تھا کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو یہ تو طالب علمانہ اشکال کا جواب تھا مگر افسوس یہ ہے کہ طلبہ تو صرف تفسیر میں پڑ گئے اشکالات اور جوابات حل کرنے کے درپے ہو گئے اصل مقصود پر نظر ہی نہیں کہ یہاں امر کس چیز کا ہے اور ہم کو کیا کرنا چاہیے (الدوام علی الاسلام)

مسلمان کون ہے؟

یہ کیا بات ہے کہ امر میں تو تقویٰ کا لفظ اختیار کیا گیا اور نہی میں إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۷﴾ فرمایا گیا کہ مرتے وقت

تک مسلمان رہنا۔ پس یہ صاف دلیل ہے کہ اتقوا اللہ اور مسلموں دونوں کا حاصل ایک ہی ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ مسلم وہ ہے کہ حق تقویٰ کو حاصل کر چکا ہو اور اسی پر قائم رہے ورنہ وہ مسلم کامل نہیں علیٰ ہذا اسلام کامل حق تقویٰ ہے اور جب اسلام کامل یہ ہے تو اب دیکھئے کہ آپ میں یہ اسلام ہے یا نہیں سو اس کے لئے حق تقویٰ کی تفسیر کو دیکھ لیجئے اگر وہ حاصل ہے تو اسلام کامل حاصل ہے ورنہ نہیں تو مفسرین میں سے بعض نے تو اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے ان بطاع ولا يعصی اور بعض نے یہ لکھا ہے ان يشكروا ولا يكفروا اسی طرح اور بھی تفسیریں ہیں مگر ان میں کچھ تعارض نہیں سب کا اتباع مقصود ہے خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اعمال اسلام کو کامل کر لیا جائے سو اس کا ایک جز و اطاعت و ترک معصیت بھی ہے ایک جز و شکر و ترک کفر بھی ہے اور ان کی تخصیص بطور تمثیل کے ہے مقصود یہ ہے کہ سب اعمال کو جمع کرنا چاہیے۔ پس اسلام کامل تو یہ ہے مگر اس وقت لوگوں نے اسلام کی حقیقت کو دوسرے طور پر سمجھ رکھا ہے اہل سائنس نے دواؤں کا ست نکالا تھا مگر اس وقت کے عقلاء نے اسلام کا ست نکالا ہے کہ اپنے خیال کے موافق کچھ چیزیں اسلام میں داخل رکھ لیں کچھ چیزوں کو خارج کر دیا مگر صاحبوست اس چیز کا نکلا کرتا ہے جس میں کوئی فضول جزو بھی ہو تو کیا آپ کے نزدیک اسلام میں کوئی فضول جزو بھی موجود ہے اگر کسی کا یہ خیال ہے تو اس سے تو خدا تعالیٰ پر اعتراض لازم آتا ہے۔ صاحبو! اسلام کا کوئی جزو بھی قابل ترک کے نہیں حتیٰ کہ حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک مرتبہ یہ خیال ہوا کہ اگر میں اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں تو اسلام کے خلاف نہ ہوگا کیونکہ کچھ فرض نہیں اور تورات پر بھی عمل ہو جائے گا اس پر یہ آیت نئی شدود کے ساتھ نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلَاحِ كَآفَّةً ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَخ (اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ شیطان کے قدم بقدم مت چلو) خیال کیجئے کہ گوشت کھانا بھی کیا کوئی رکن اعظم تھا مگر اس کے ترک کو قربت سمجھنے پر کس قدر شدود ہوا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا اتنا جزو بھی ترک کے قابل نہیں پھرست کیسے نکل سکتا ہے اورست اسلام کا اس طرح نکالا ہے کہ بعض نے تو صرف عقیدوں کو کافی سمجھا اور اعمال وغیرہ کی کچھ بھی ضرورت نہ سمجھی اگرچہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے عہدوں میں بھی انتخاب کیا ہے لیکن وہ بہت اقل و نادر ہیں مگر ہیں چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز کی ضرورت اب نہیں رہی یہ عرب کے واسطے مقرر ہوئی تھی کہ وہ نامہذب تھے اب متمدن ہیں ہم میں کوئی توحش کی شان باقی نہیں رہی لہذا (نعوذ باللہ) اس کو اسلام سے حذف کر دیا جائے۔ اناللہ۔ اس مشورے کا سیدھا اور صحیح جواب یہ ہے کہ یہ قرآن شریف کے خلاف ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ آجکل اس جواب کی قدر نہیں کرتے اس کو بجز اور دفع الوقتی پر محمول کرتے ہیں اور علماء سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ قطع نظر حوالہ قرآن و حدیث سے ہر قانون کی لم بیان کرو۔ صاحبو! قوانین ظاہری جن میں بہت سے خلاف عقل عوام بھی ہیں ان کی لم کیوں نہیں تلاش کی جاتی۔ صرف وجہ یہ ہے کہ اس قانون کی وقعت دلوں میں ہے اور قانون اسلام کی وقعت نہیں ورنہ اگر اس کی بھی وقعت ہوتی تو ہرگز اس میں چوں و چرا نہ کی جاتی بلکہ یہ کہا جاتا کہ

زبان تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت ازکار تو

(زبان کو ہر وقت تیرے ذکر سے تازہ رکھنا چاہیے تیرے کام کے لئے کوئی وجہ اور شرط نہ ہونی چاہیے) اور یہ شان ہوتی ہے کہ

زندہ کنی عطاے تو دریکشی فدائے تو جاں شدہ بتلاے تو ہرچہ کنی رضائے تو
اگر تو زندگی بخشے تو یہ تیری مہربانی ہے اور تو موت دے تو ہم خود تجھ پر فدا ہیں میری جاں تیرے حوالہ ہے جو تیرے
مرضی چاہے وہ کر میں ہر حالت میں راضی ہوں۔ (تکمیل الاسلام)

قدر استطاعت حصول تقوی کا حکم

جب آیت **فَاتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ** نازل ہوئی تو صحابہ یہ سمجھے کہ امر کا صیغہ اس میں فور کے واسطے ہے کہ اسی
وقت اللہ سے ایسا درجہ تقوی کا حاصل کر لو۔ جو حق ہے اس کا اور قاعدہ تو یہی ہے کہ امر فور کے لئے نہیں ہوتا۔ لیکن گاہ گاہ قرآن
سے فور بھی محتمل ہوتا ہے۔ پس صحابہ اسی احتمال سے کانپ اٹھے اس لئے کہ جو حق ہے تقوی کا وہ فوراً کیسے حاصل ہو سکتا ہے تو
اس کے بعد یہ آیت **فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ** بطور اس کی تفسیر کے نازل ہوئی۔ مطلب یہ ہوا کہ حق تقاۃ درجہ منتہی کا
ہے اور اس مامور بہ کا حاصل کرنا علی الفور واجب نہیں ہے بلکہ بقدر استطاعت تقوی اختیار کرو اور بتدریج آسمیں جتنی جتنی ہو
سکے ترقی کرتے رہو۔ حتیٰ کہ جو تقوی مطلوب ہے اس پر جا پہنچو گے پس اس تقریر پر ان دونوں آیتوں میں نسخ اصطلاحی نہیں
ہوا اور بعض روایات میں جو نسخ کا لفظ آیا ہے وہ بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بالمعنی الاعم ہے جو تفسیر مبہم کو بھی شامل ہے۔

تصوف کا حاصل کرنا فرض ہے

مولانا سے سوال کیا گیا کہ کیا تصوف حاصل کرنا فرض ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں ہر مسلمان کے لئے فرض ہے
کیونکہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ** کہ اللہ سے حق ڈرنے کا ذرہ اس کا دوسرا اصطلاحی نام تصوف
ہے۔ صیغہ امر کا ہے جس سے وجوب ثابت ہوتا ہے اس پر بعض نے شبہ کیا ہے کہ یہ تو منسوخ ہے چنانچہ روایات میں ہے
کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ پر سخت گزری اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حق ڈرنے کا کون ڈر سکتا ہے یہ تو طاقت
سے باہر ہے اس پر آیت نازل ہوئی کہ **فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ**۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ آیت پہلی کے لئے ناخ
ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے منسوخ ہونا حسب اصطلاح اہل اصول کے لازم نہیں آتا کیونکہ سلف کی
اصطلاح میں لفظ نسخ کا اطلاق مطلق تغیر پر آتا ہے گو وہ بیان تفسیری ہو چنانچہ یہاں بیان بھی یہی ہے کہ ظاہراً اتقوا اللہ حق
تقاۃ سے فور مستفاد ہوتا تھا اور یہی صحابہ پر شاق ہوا۔ اس کی تفسیر کے لئے دوسری آیت نازل ہوئی۔ یعنی حسب استطاعت
اس کا اہتمام رکھو فی الفور تحصیل درجہ کمال کا مامور نہیں۔

کامل تقوی کیلئے حسب استطاعت کوشش کا حکم

فرمایا کہ ایک جگہ تو اللہ کا ارشاد ہے **فَاتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ** اور دوسری جگہ ارشاد ہے **فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ**
عموماً مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ دوسری آیت پہلی کی ناخ ہے لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر
مظہری میں ان آیتوں کی عجیب تفسیر لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ دوسری آیت میں پہلی آیت کے حکم کی توضیح ہے نہ کہ نسخ۔

چونکہ اس میں امر کا صیغہ اختیار فرمایا گیا تھا اور امر گواہی حقیقت میں عموماً فوراً کو متقاضی نہیں ہوتا لیکن محاورات میں مینا در فور ہی ہوتا ہے اس لئے صحابہ غایت خشیت سے یہی سمجھے کہ حق تقویٰ اختیار کرنے کا جو حکم ہے وہ فوری ہے اور فوری طور پر حق تقویٰ اختیار کر لینا استطاعت سے باہر تھا لہذا اس آیت کو سن کر گھبرا گئے کہ فوراً اس درجہ کا تقویٰ کیونکر اختیار کر سکیں گے۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی جس میں یہ تفسیر کر دی گئی کہ کامل تقویٰ اختیار کرنے کا فوری حکم نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حسب استطاعت کوشش کرو اور رفتہ رفتہ کامل تقویٰ اختیار کر لو۔ رہا روایات میں اس کو نسخ کہنا سوخ متقدمین کی اصطلاح میں عام ہے رفع حکم تو وضع حکم کو یعنی صرف رفع حکم ہی کو نسخ نہیں کہتے بلکہ تو وضع حکم کو بھی نسخ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ترجمہ: اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جانیں نہ دینا۔

اسلام کی حقیقت

یہ ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کیا ہے دو چیزوں کا جن میں سے ایک امر ہے اور دوسرا نہی ہے۔ امر یہ ہے کہ خدا سے ڈرو اور نہی یہ کہ بجز اسلام کے کس حالت پر مت مرو۔ یہاں چند امور قابل غور ہیں ایک یہ کہ یہ خطاب جو ایمان والوں کو ہے تو اس سے یہ مقصود نہیں کہ دوسرے لوگ نہ ڈریں بلکہ اوروں کو خطاب اس لئے نہیں کیا کہ یہ خطاب ان کے لئے قبل از وقت تھا اور اسی سے فیصلہ ہو جائے گا کہ کفار جزئیات کے مخاطب ہیں یا نہیں سو قبل از وقت وہ مخاطب جزئیات کے نہیں ہیں البتہ جب وہ اس زمرے میں داخل ہو جائیں اس وقت وہ بھی مخاطب ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کالج میں ایک کورس بنایا گیا اور یہ خطاب کر کے اس کو پیش کیا گیا کہ اے طالب علمو! اس کو سیکھو۔ تو یہاں جو خاص طالب علموں کو خطاب ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اوروں سے سیکھنے کا مطالبہ نہیں کیونکہ یہ پرنسپل اوروں کو بھی کالج میں داخل ہو کر طالب علمی کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ تو مطلوب ہر ایک سے ہوا لیکن جو شخص ہنوز کالج کا طالب نہیں بنا اس کو یہ خطاب قبل از وقت ہے اس کو یہ کہیں گے کہ تم طالب علم ہو جاؤ۔ اس کے بعد وہ نام لکھ لے گا تو اس کو یہ خطاب کیا جائے گا تم فلاں کورس سیکھو۔

اسی طرح کلام مجید کے اس خاص خطاب کا یہ مطلب نہیں کہ غیر اہل اسلام سے تقویٰ مطلوب نہیں۔ لیکن ان کو یہ خطاب کرنا قبل از وقت ہے ان سے اول یہ کہا جائے گا کہ تم ایمان لے آؤ۔ اس کے بعد تقویٰ کا حکم کیا جائے گا اور اگر کہیں قرآن میں خطاب عام سے اتقوا فرمایا ہے تو وہاں اتقوا سے آمنوا مراد ہے کیونکہ ایمان بھی تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں ایک بات کا تو امر فرمایا ہے اور ایک سے نہی چنانچہ ترجمے سے ظاہر ہے۔ اس کا قائل ہونا ممکن نہیں کہ مضامین میں ارتباط نہیں اور یہ تو ایک ہی آیت کے دو جملے ہیں۔ خود آیتوں میں بھی اس کا قائل ہونا صحیح نہیں کیونکہ اگر آیتوں میں نہ ہوتی۔ تو ترتیب تلاوت کی ترتیب نزول کے خلاف کہنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ نازل تو کہیں ہوئی اور رکھی گئی کسی دوسری جگہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مناسب مضامین کے لحاظ سے ترتیب مقرر ہوئی ہے اور جب آیتوں میں ارتباط

ہے تو اجزائے آیات میں علیٰ سبیل الاولیت ارتباط ہوگا اور جب یہ ہے تو بظاہر امر و نہی دونوں میں عنوان ایک ہونا چاہیے تھا۔ یہ کیا بات ہے کہ امر میں تقویٰ کا لفظ اختیار کیا گیا اور نہی میں **إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** مگر در آں حالیکہ تم مسلمان ہو۔ فرمایا گیا ہے مرتے وقت تک مسلمان رہنا اور ربط کا ہونا ضروری ہے پس یہ صاف دلیل ہے اس کی کہ اتقوا اللہ اور مسلمون دونوں کا حاصل ایک ہی ہے پس اس سے معلوم ہوا کہ مسلم وہ ہے کہ حق تقویٰ کو حاصل کر چکا ہو اور اسی پر قائم رہے ورنہ وہ مسلم کامل نہیں علیٰ ہذا اسلام کامل حق تقویٰ ہے اور جب اسلام کامل یہ ہے تو اب دیکھئے کہ آپ میں یہ اسلام ہے یا نہیں۔ اس کے لئے حق تقویٰ کی تفسیر کو دیکھ لیجئے اگر وہ حاصل ہے تو اسلام کامل حاصل ورنہ نہیں۔ تو مفسرین میں سے بعض نے تو اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے ان بطاع ولا يعصیٰ یہ کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے اور بعض کے لکھا ہے ان یشکروا ولا یکفر شکر کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔ اسی طرح اور بھی تفسیریں ہیں مگر ان میں کچھ تعارض نہیں۔ سب کا اجتماع مقصود ہے۔

شان نزول

یہ آیتیں ہر چند کہ ایک خاص قصہ میں نازل ہوئی ہیں مگر مقصود اسی قصہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے ان میں ہم کو ایک دستور العمل بتلایا ہے تاکہ پھر ایسے قصے رونمانہ ہوں اور دیگر آفات سے بھی محفوظ رہیں۔ قصہ یہ ہے کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے دو خاندانوں میں جن کا نام اوس و خزرج ہے سخت عداوت تھی۔ جب مدینہ والے مسلمان ہو گئے تو یہ عداوت اتحاد سے اور وہ بغض و نفرت دوستی اور محبت سے مبدل ہو گئی اور جب سیدنا رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے اس وقت تو یہ اتحاد اور بھی زیادہ مستحکم ہو گیا اور یہ اتحاد یہود کو بہت ناگوار گزارا اور ایک یہودی نے جو اوس و خزرج دونوں قبیلوں کے آدمیوں کو ایک جلسہ میں باہم شیر و شکر دیکھا تو حسد سے جل مرا اور اس نے ایک شخص کو اس کام پر مقرر کیا کہ اوس و خزرج میں جو قانع و حروب ہوئے ہیں اور ان کے متعلق ہر قبیلے کے شعراء نے جو اشعار کہے ہیں وہ اشعار انصار کی مجلسوں میں پڑھ دے چنانچہ اس میں وہ کسی قدر کامیاب ہو گیا کہ اشعار کا پڑھنا تھا فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی یہاں تک کہ لڑائی کا موقع اور وقت بھی مقرر ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جو اطلاع ہوئی آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا یہ کیا اندھیر ہے کہ میرے سامنے ہی کہ میں تمہارے اندر زندہ موجود ہوں پھر مسلمان ہو جانے اور باہم متفق و متحد ہو جانے کے بعد یہ واہیات حرکت۔ کیا تم اسلام کے بعد پھر اسی حالت کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو۔ حضور ﷺ کے ارشاد سے سب کو خنبہ ہوا اور سمجھے کہ یہ شیطانی حرکت تھی اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی جس سے حاسدین کی کوشش اکارت گئی۔ **وَإِذْ ذُو الْوَيْهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمْ الْأَخْسَرِينَ** (ان لوگوں نے ان کے ساتھ برائی کرنا چاہا تھا سو ہم نے ان ہی لوگوں کو ناکام کر دیا) کیونکہ اب پہلے سے بھی زیادہ اتحاد ہو گیا اور صحابہ کو معلوم ہو گیا کہ نفسانیت کی بناء پر باہم قتال و جدال عملی کفر ہے اس لئے ہمیشہ کے واسطے اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ جس سے دشمنوں کی تدابیر الٹی ہو گئیں اور صحابہ میں پہلے سے بھی زیادہ

محبت و الفت قائم ہوگی مصلین کو بھی بعض دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ ایک کام کرتے ہیں اہل حق کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کا انجام خیر ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ شیطان کو بھی جو رئیس المصلین ہے دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ بندہ سے ایک معصیت کرانا چاہتا ہے تاکہ خدائے تعالیٰ سے اس کو بعد ہو جائے مگر اس کو پہلے سے بھی زیادہ قرب بڑھ جاتا ہے بعض دفعہ تو اس طرح کہ وہ گناہ کا ارادہ کر کے پھر خدا کے خوف سے رک جاتا ہے اور بعض دفعہ گناہ کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے مگر اس کے بعد ندامت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ بندہ روتے روتے ہلاکت کے قریب ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کو یہ عجز و نیاز پسند ہے وہ اس کو پہلے سے بھی زیادہ مقرب بنا لیتے ہیں پھر یہ شخص آئندہ کو اس گناہ کے وہ دروازے بالکل بند کر دیتا ہے جن کی وجہ سے شیطان کے دھوکہ میں آیا تھا غرض شیاطن الانس والجن دونوں کو بعض دفعہ دھوکہ ہو جاتا ہے جیسا کہ اس یہودی کو ہوا جس نے اوس و خزرج میں نفاق و شقاق ڈالنا چاہا تھا اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ میری سعی کا انجام یہ ہوگا تو وہ کبھی ایسا نہ کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوشش کو صرف اسی واقعہ میں ناکام نہیں کیا بلکہ آئندہ کا بھی انتظام فرما دیا اور جدال و قتال کے دروازے بالکل بند کر دیئے چنانچہ اس سے پہلے جو آیات ہیں ان میں اول تو اہل کتاب پر ملامت ہے جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی اس فعل پر ملامت کرنے سے پہلے ان کو کفر پر ملامت کی گئی جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم خود بھی مسلمان ہو جاتے نہ یہ کہ الٹا دوسروں کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگ رہے ہو پھر مسلمانوں کو خطاب اور فہمائش ہے کہ اہل کتاب کو تمہارا اتحاد و اتفاق جو ذریعہ ہے دین و دنیا کی ترقی کا سخت ناگوار ہے وہ تم کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں اور اگر تم ان کا کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے (اور دشمنوں کے فریق میں آ کر اپنا نقصان کرنا اور ان کا دل خوش کرنا سخت جہالت و حماقت ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَاَنْتُمْ تُثَلِّىٰ عَلٰیكُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَفِيكُمْ رَسُوْلٌ وَّمَنْ يَتَّخِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اور بھلا تم کیسے کفر کر سکتے ہو حالانکہ اسباب مانعہ عن الکفر (کفر سے روکنے والے اسباب) پورے طور پر جمع ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں او (پھر) تم میں اللہ کے رسول ﷺ بھی موجود ہیں اور یہ دونوں قوی ذرائع ہیں ایمان پر قائم رہنے کے پس تم کو چاہیے کہ کتاب اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیم کے موافق ایمان پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو اور (یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے پکڑتا ہے (یعنی اس کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے مخالف کی اطاعت نہیں کرتا) تو ایسا شخص ضرور راہ راست کی طرف مائل کیا جاتا ہے (الدوام علی الاسلام)

اس آیت میں کفر سے مراد معنی عام ہیں جو کفر اعتقادی و عملی دونوں کو شامل ہے اور قتال و جدال کفر عملی ہے کیونکہ فعل قریب کفر ہے اس سے نا اتفاقی پیدا ہوتی ہے جو گناہ بھی ہے اور قوت و ترقی کی زائل کرنے والی بھی پران بکھیزوں میں پڑ کر دین حق سے بعد ہو جاتا ہے۔ نا اتفاقی میں ہر شخص دوسرے کو زک دینے کے لئے ہر ممکن سے ممکن تدبیر کو کام میں لاتا ہے خواہ جائز ہو یا ناجائز۔ انسائنت سے قریب ہو با بعید۔

اسی واسطے حدیث میں فساد ذات البین کو حائق فرمایا ہے کہ یہ موٹڈ نے والی چیز ہے پھر حضور ﷺ نے اس کی تشریح

بھی خود ہی فرمائی۔ لا اقول تحلق الشعر بل تحلق الدين میں یہ نہیں کہتا کہ بالوں کو موٹتی ہے بلکہ دین کو موٹتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب مسلمان کو دین سے بعد ہوگا تو کفر سے قرب ہوگا (اور قاعدہ عقلیہ ہے القریب من الشیء یاخذ حکمہ کہ جو جس سے قریب ہو اسی کا حکم لے لیتا ہے اسی وجہ سے فقہاء نے اقرب الی القعود (بیٹھنے کی طرف قریب تر) کو قاعد اور اقرب الی القیام (کھڑے ہونے کے قریب) کو قائم اور غالب الغش (کھوٹ غالب) کو مغشوش اور غالب الفضہ (چاندی غالب) کو فضہ (چاندی) فرمایا ہے۔ اس قاعدہ سے فعل قریب من الکفر (قریب کفر کے) کو کفر کہنا اور اس کے مرتکب کو عملاً کافر کہنا صحیح ہے کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے قال وشقاق کو نکفرون سے تعبیر فرمایا ہے یہ استعمال محاورات کے موافق ہے حقیقت پر محمول نہیں۔ خوارج و معتزلہ کی جہالت ہے کہ انہوں نے محاورات کی تدریق پر محمول کرنا شروع کر دیا اس لئے متکلمین کو علم کلام مدون کرنے کی ضرورت ہوئی اور یہاں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آج کل جو ہم لوگوں میں یعنی مسلمانوں میں نا اتفاقی ہے دیکھ لیا جائے کہ یہ کیسی سخت حالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ حضرات صحابہ اس کو سن کر چونکے اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے ان کو دستور العمل بتلایا کہ خیر جو ہو چکا ہو چکا گزشتہ تو گزشتہ ہو آئندہ کا بندوبست کرو تا کہ پھر اس معصیت کا خطرہ نہ رہے۔ چنانچہ اول تقویٰ اور اسلام پر مداومت کا امر ہے پھر اختتام بحبل اللہ کا امر ہے پھر ارشاد ہے **وَ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَةِ اِخْوَانًا** (اور تم پر جو اللہ کا انعام ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم دشمن تھے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے) جس میں نعمت اتفاق کے یاد کرنے کا حکم ہے کہ اس نعمت کو اور اس کی برکات کو یاد کرو اور موازنہ کرو کہ تمہاری پہلے کیا حالت تھی اور اس کا نتیجہ کیا وخیم تھا اور اتفاق کے بعد کیا حالت ہو گئی اور اس کا انجام نعمت مقیم ہے۔

اسلام کا مفہوم

اسلام کے معنی لغت میں سپرد کرنے کے ہیں جس کو تسلیم بھی کہتے ہیں جس کو صوفیہ نے تقویٰ سے تعبیر کیا ہے۔ یہی اسلام کی حقیقت ہے مگر اب لفظ اسلام سے اس کی طرف ذہن ہی نہیں جاتا قرآن میں کہیں اسلام کا ذکر مجمل ہے کہیں مفصل ہے اور مفصل بمعنی تقویٰ ہی ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **بَلَىٰ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُّحْسِنٌ اِلَیْهِ** (جو شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو) دوسری جگہ ہے **وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُّحْسِنٌ وَ اَتَّبَعْتَهُ اِبْرٰهِيْمَ حَنِیْفًا** (اور ایسے شخص سے اچھا زیادہ کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ شخص مخلص بھی ہو اور ملت ابراہیم کا اتباع کرے جس میں کمی کا نام نہیں)

اور ایک جگہ ہے **وَ مَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُّحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی** (اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا) یہاں اسلام وجہ کے ساتھ اتباع ملت ابراہیم کا بھی ذکر ہے اور اس کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے **وَ مَنْ يَّرْتَبِعْ عَنِ اِبْرٰهِيْمَ الْاِمْنِ سَفِيْةٌ نَفْسًا وَ لَقَدْ اصْطَفَيْنَا فِي الدُّنْيَا**

وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ - اور ملت ابراہیم سے وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات سے احمق ہو اور ہم نے ان کو دنیا میں منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جبکہ ان کے پروردگار نے ان سے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی جس سے معلوم ہوا کہ ملت ابراہیم بھی اسلام وجہ رب العالمین ہے کہ اپنے کو خدا کے سپرد کرے جس کو ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے **إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا** (میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں) سے بیان فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن میں اسلام کی تفسیر اسلام وجہ ہے جس کے پورے معنی نماز روزہ کے نہیں ہیں بلکہ اسلام وجہ بمعنی تفویض ہے یعنی اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دینا اور اپنے کو ہر تصرف الہی کے لئے آمادہ کر دینا کہ وہ جو چاہیں کریں جو چاہیں حکم دیں سب منظور ہے نماز روزہ بھی اس تفویض کا ایک فرد ہے لیکن عین نہیں اگر قرآن میں اسلام کا استعمال اطلاق ہی کے ساتھ ہوتا اور اس کے ساتھ **وجه الله** یا **وجهه الى الله** مذکور نہ ہوتا تو یہ بھی احتمال تھا کہ اسلام بمعنی اطاعت ہے مگر ان قیود کے ساتھ اطاعت کے معنی نہیں بنتے بلکہ تفویض ہی کے معنی مستقیم ہوتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ آیات میں بعض بعض کی مفسر ہوتی ہیں تو اب جہاں اسلام بلا قید مذکور ہے وہاں بھی مقید ہی مراد ہے۔ جیسے احادیث میں علم کے فضائل بلا قید مذکور ہیں حالانکہ علم مصدر ہے جس کے لئے قید کی ضرورت ہے خواہ بصورت مفعول ہو یا مضاف الیہ اس لئے لفظ کے اطلاق سے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فضائل مطلق علم کے ہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ علم سے علم دین مراد ہے ایسے ہی نصوص میں اسلام سے اسلام وجہ مراد ہے یعنی تفویض یہی وہ چیز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمالات و فضائل ہیں جا بجا حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

پس ان آیات میں اصل مقصود **وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** (بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان مت دو) ہے اور **اتَّقُوا اللَّهَ** (اللہ سے ڈرو) **وَإِذْ كَرُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ** (اللہ کے انعام کو یاد کرو) **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ** (اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو) یہ سب اسی کے لقب ہیں۔ اس لئے میں نے اس بیان کا نام **الدوام علی الاسلام والا اعتصام بالانعام** تجویز کیا ہے جس میں اصل مقصود کے ساتھ اس کے دوسرے عنوانات پر بھی دلالت ہے جیسے مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی کا جمع میں نے کہا تھا ثاقب از لطف محمد اسحاق جس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ اسحاق علیہ السلام محمد ﷺ کے لطف سے روشن ہوئے ہیں مگر اس میں لطیفہ یہ بھی ہے کہ اس مصرع میں مولوی محمد اسحاق صاحب اور ان کے والد کا اور دادا کا نام بھی آ گیا ہے کیونکہ ان کے والد کا نام لطف اللہ یا لطف الہدی تھا اور دادا کا محمد ثاقب ایسے ہی اس وعظ کے نام میں اسلام بھی ہے اور اعتصام بھی ہے اور نعمت پر بھی دلالت ہے جس سے وہ تمام عنوانات جمع ہو گئے جو اس آیت میں اختیار کئے گئے ہیں بہر حال اس جگہ اول تو **اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ** (تو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) فرمایا گیا ہے جس میں تفویض کی کسی قدر تفصیل ہے پھر **وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** (اور تم اسلام کے سوا کسی حالت میں جان مت دو)

میں جملہ تفویض کا ذکر ہے اس کے بعد پھر تفصیل ہے **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ - وَادْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ** (اللہ کے سلسلہ کو مضبوط پکڑو اور اللہ کے نام کو یاد کرو) میں کیونکہ مقصود کی علامت یہی ہے کہ اس کا ذکر شروع میں بھی ہو۔ درمیان میں بھی ہو تو یہاں اول ترکیب ہے پھر جمع ہے۔ پھر تحلیل ہے جس کا لطف اہل علم کو خاص طور سے حاصل ہوگا۔

موت کے وقت تفویض کامل کا حکم

بہر حال یہاں مراد دو مواعلیٰ الاسلام (اسلام پر مداومت کرو) ہے مگر اس کو **لَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ** (اسلام کے علاوہ اور کسی حالت میں جان مت دو) کے عنوان سے اس لئے ظاہر کیا گیا کہ دو مواعلیٰ الاسلام (اسلام پر مداومت کرو) کو سن کر عشاق پر مصیبت آ جاتی کہ حکم تو دوام علیٰ التفویض کا ہے اور ہم سے اس میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس عنوان میں ان کی تسلی کر دی گئی کہ اگر موت کے وقت بھی تفویض کامل ہو جائے تو کافی ہے۔ عوام تو اس کو سن کر بے فکر ہو گئے ہوں گے کہ بس مرتے ہوئے تفویض کامل حاصل کر لیں گے۔ ارے اس کے ساتھ یہ مقدمہ بھی تو ملاؤ کہ مرتے وقت تفویض کلی عادت اسی کو حاصل ہوتی ہے جو زندگی بھر اس میں مشغول رہا ہو۔ ورنہ موت کا وقت تو سخت نازک ہے۔ وہ تحصیل نسبت (طے مقامات و تکمیل تفویض کا وقت تھوڑا ہی ہے کہ اسی وقت کام شروع کرو اور اسی وقت حاصل بھی کر لو اور یوں خلاف عادت حق تعالیٰ جو چاہیں کر دیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام و آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام کو بدوں ماں باپ کے بنا دیا، ورنہ عادت یہی ہے کہ بدوں مرد و عورت کے مباشرت کے بچہ پیدا نہیں ہوتا اسی طرح عادت مرتے ہوئے انہی کو مقامات حاصل ہوتے ہیں جو زندگی بھر انہی کی فکر میں لگے رہے تھے (الدوام علیٰ الاسلام)

اتفاق کی حقیقت

حق تعالیٰ فرماتے ہیں **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا** (ترجمہ: اس کا یہ ہے کہ تم سب لوگ مل کر دین اللہ کے ساتھ تمسک کرو) اور سب کے سب دین پر قائم رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود دین ہے۔ اتفاق بھی وہی مطلوب ہے جو تمسک بالدين کے ساتھ ہو۔

آج کے عقلاء نے صرف اتفاق کا نام سن لیا ہے اور اس کی رٹ میں دن رات مصروف رہتے ہیں تو ان کے نزدیک اتفاق کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک شخص دوسرے کے ہم خیال ہو جائے کہ جو شخص حق کو چھوڑ کر باطل پرست کے ساتھ ہو جائے وہ بھی اتفاق سمجھا جاتا ہے حالانکہ کوئی صحیح العقل اس کا طالب نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کا اتفاق برادری کا اتفاق ہے۔ مثلاً ناچ برابر کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ برا بھی سمجھتے ہیں اگر منع کرو تو کہتے ہیں کیا کریں برادری تو نہیں بگاڑی جاتی۔ خلاف وضع کیسے کریں بزرگوں کا طریقہ چلا آ رہا ہے تو ایک اتفاق یہ بھی ہے۔

قرآن پاک نے فیصلہ کر دیا کہ اتفاق مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ اتفاق کے خاص فرد کی طلب ہے یعنی باطل کے ساتھ نہ ہو اور عکس کی صورت مطرود ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ عزاسمہ نے اجتماعاً نہیں فرمایا بلکہ **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا** فرمایا کہ وہ اتفاق مطلوب ہے جس میں زمام دین ہاتھ سے نہ چھوٹے اور اس کی پوری توضیح مثالوں سے ہو جاتی ہے مثلاً دو سلطنتوں میں

جنگ ہو اور بازار گرم ہو۔ اب خواہاں قوم کیا اتفاق اتفاق وہاں بھی پکاریں گے اور اتفاق کی صورت یہ تجویز کریں گے کہ ایک سلطنت بلا کسی ترجیح کے اپنی حکومت سے دستبردار ہو جائے اور دوسری سلطنت بائبل مرام واپس پھرے تو کیا یہ اتفاق ہے؟ یا ایک ظالم شخص ایک مظلوم سے لڑنے لگے۔ اب یہاں اتفاق کی صورت ایک یہ بھی ہے کہ مظلوم محض ساکت کھڑا پتار ہے تاکہ اتفاق ہاتھ سے نہ جائے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ اتفاق نہیں بلکہ اتفاق مطلوب کے معنی یہ ہیں کہ ظالم اس فعل شنیع سے باز رہے اور مظلوم کے ساتھ اتفاق کرے۔ نہ کہ مظلوم بیچارہ مصیبت میں مبتلا رہے۔

ان سب باتوں سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ مطلق اتفاق مطلوب نہیں بلکہ مطلوب و مرغوب فی وہی اتفاق ہے جس میں ناحق کو حق کے تابع کیا جائے نہ کہ بالعکس۔ لہذا یہ عنوان کہ آپس میں اتفاق سے رہو نہایت یہ مہمل عنوان ہے اول تعین حق کی ضرورت ہے اس کے بعد جو ناحق پر ہو اس سے فہمائش کی جائے کہ اہل حق کے ساتھ متفق ہو کر رہے نہ کہ علی الاطلاق اتفاق اتفاق پکارنا شروع کر دیا۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا۔ سبحان اللہ! کیا قرآن پاک کی بلاغت ہے اوپر تو خود تفرق سے نفی فرمائی اب یہاں ارشاد ہے کہ تفرق کی مشابہت بھی نہ کرو کیونکہ مشابہت کرنے سے تم متفرقین کی طرح بن جاؤ گے چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے من تشبه بقوم فهو منهم گو بعض لوگوں نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے لیکن آیت تو تضعیف نہیں۔ خوب سمجھ لو۔ آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ لَا تَكُونُوا كَالْكَافِرِ كَيْونَكَ الَّذِينَ تَفَرَّقُوا كاصداق کفار ہی ہیں اور یہ ممانعت اعمال میں تھی جو ہر وقت مشابہت بھی نہیں اور جو امور ہر وقت مشابہت بھی ہیں (اور جو امور ہر وقت ظاہر رہتے ہیں) جیسے لباس وغیرہ اور ان میں مشابہت کیسے جائز ہو سکتی ہے۔

آیت میں اجتمعوا کا لفظ نہیں فرمایا بلکہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ فرمایا جیسے کے پہلے علوم ہو چکا ہے کہ مطلق اجتماع مراد نہیں بلکہ وہ اجتماع جس میں دین اللہ فوت ہوتا ہو اس کو دور ہی سے سلام کرنا چاہیے اگرچہ ساری قوم کے خلاف وضع اختیار کرنی پڑے مگر دین اللہ سے ہرگز منہ نہ موڑے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔

تفسیری نکات

ہر شخص امر بالمعروف کرنے کا اہل نہیں

ایک صاحب نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ ایک حافظ صاحب مسجد میں باتیں بہت کیا کرتے تھے میں نے ان سے کہا کہ آپ مسجد میں باتیں نہ کیا کریں کیا آپ کو اپنے حافظ ہونے پر گھمنڈ ہے اس پر وہ حافظ صاحب بیٹھے رہے اور دو دن تک

مسجد میں نہیں آئے مولانا نے فرمایا کہ ان کے بیٹھے رہنے کا گناہ آپ پر بھی ہوا پھر فرمایا کہ بعض مفسرین نے جو لکھا ہے
وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ بِنَامِيٍّ كَذَّبُوا عَنْ رُءُوسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ سَمِعُوا لَكُمْ شَيْئًا لَّمْ يَكُنْ لَكُمْ فِى الْحَدِيثِ مِنْكُمْ
نہیں ہوتا اور اسی واسطے ہر شخص کا کہنا گوارا نہیں ہوتا (اشرف المقالات)

انتظام شریعت

وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ یعنی ایک جماعت تم میں سے ایسی ہونی چاہیے جو داعی الی الخیر
ہو۔ یعنی جو دین کی بقا میں کوشاں ہو اور شرعی امور اور دینی معاملات کا انتظام کرے اور امة منکم اس لئے فرمایا کہ اگر سب
یہی کرنے لگیں تو کھیتی کون کرے گا اور نوکری تجارت وغیرہ کون کرے گا۔ یہ شریعت کا انتظام ہے کہ زراعت تجارت وغیرہ
کو فرض کیا ہے۔ اگر سب چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں کیونکہ مجموعہ کو اسباب معیشت کی بھی حاجت ہے ورنہ
سب ہلاک ہو جائیں اور نہ دنیا رہے نہ دین اور جو لوگ تارک اسباب ہیں ان کی جمعیت تو کل بھی مباشرین اسباب ہی کی
بدولت ہے گو ان احاد کی تعیین نہیں مگر مجموعہ میں ایسے احاد کا ہونا ضروری ہے خصوصاً ہم جیسے ضعیفوں کے لئے تو اگر ظاہری
سامان نہ ہو تو تشویش سے دین ہی میں خلل پڑنے لگے۔

حاصل یہ ہے کہ دنیا سے سب کو تعلق ہے کوئی سگا ہے کوئی سوتیلا اور مطلق مذموم بھی نہیں کیونکہ دنیا مطلقاً بری نہیں ہے
بلکہ دنیا جو معصیت ہے صرف وہ بری ہے۔ اس لئے باری تعالیٰ نے ولتکن فرمایا کونوا نہیں فرمایا۔ جیسا کہ اوپر وَاغْتَصِمُوا
بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا فرمایا۔ اس لئے مقصود تو یہ کہ دین تو سب میں ہو لیکن ایک ایسی ہی جماعت ہو جو مولویت ہی کا کام کریں
اور کچھ دوسرا کام نہ کریں۔

وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ۔ لفظ منکم سے معلوم ہوتا ہے کہ سب اس کام کے لائق نہیں ہیں
اور یہ تجربہ ہے کہ جو لوگ اس کے اہل نہیں سمجھے جاتے۔ ان کا کہنا لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے اور جو لوگ اہل ہیں ان کا کہنا
چند اہل گراں نہیں گزرتا۔ نیز علماء جو کچھ کہتے ہیں تہذیب سے اور شائستگی سے کہتے ہیں۔ غرض یہ طعن و تشنیع کا شیوہ مناسب
نہیں ہے اپنے کام میں لگے رہو اگر کوئی برا ہو تم اس پر ترجم کرو اور اس کے لئے دعا کرو۔

تبلیغ کا ایک درجہ سب کے ذمہ ہے

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ تو یوں فرمایا وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ کہ اے مسلمانو! تمہارے اندر ایک
جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے۔ یہاں تو دعوت کو ایک جماعت کے ساتھ خاص فرمایا اور اس کے بعد ارشاد
ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ کہ اے مسلمانو! تم بہترین امت ہو
جو لوگوں (کی ہدایت) کے لئے ظاہر کئے گئے ہو۔ تم نیک کاموں کا حکم کرتے ہو برے کاموں سے روکتے ہو۔

یہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو سب کے لئے عام کیا گیا ہے اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ امر
بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک درجہ ایسا بھی ہے جو سب کے ذمہ ہے اور علماء کے ساتھ خاص نہیں۔ (آداب تبلیغ)

اہل علم کی شان

جن کو اس آیت میں فرماتے ہیں وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں) اس آیت میں یدعون (بلاویں) کا مفعول ذکر نہیں فرمایا یہ ذکر نہ کرنا مشیر (اشارہ کرنے والا) ہے اس کے عموم کی طرف مطلب یہ ہے کہ یدعون الناس یعنی عام لوگوں کو خیر کی طرف بلاویں تو یہ شان اہل علم کی ہے یعنی ان لوگوں کی جنہوں نے سب علوم کا بقدر ضرورت احاطہ کیا اور فرض یہ بھی ہے مگر فرض علی الکفایہ ہے۔ کہ امت میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونا چاہئیں کہ جن سے عوام امت کا کام چلے اسی لئے محققین نے من کو اس آیت سے تبعیضہ کہا یعنی تم میں بعض ایسے ہونے چاہئیں۔

دعوت عامہ کے اقسام

یہ ایک خاص جماعت کا کام ہے ساری امت کا کام نہیں ہے اور دعوت الی الخیر اور دعوت الی اللہ کے ایک ہی معنی ہیں سو اس میں تو اس کو صرف ایک خاص جماعت کا کام فرمایا گیا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ کہ فرمادیتے ہیں یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں میں اللہ کی طرف بصیرت پر ہو کر میں اور جتنے میرے تتبع ہیں اور حق تعالیٰ تمام برائیوں سے پاک ہیں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ دیکھئے یہاں پر مطلقاً ومن اتبعنی ہے یعنی جتنے میرے تتبع ہیں سب حق کی طرف بلاتے ہیں اس میں عموم ہے۔ اس خصوص اور اس عموم سے معلوم ہوا کہ اس کے درجات و مراتب ہیں ایک درجہ کا پہلی آیت میں ذکر ہے اور ایک درجہ کا دوسری آیت میں اور وہ درجات دو ہیں ایک دعوت عامہ ایک دعوت خاص پھر دعوت عامہ کی دو قسمیں ہیں ایک دعوت حقیقیہ اور ایک دعوت حکمیہ۔ دعوت حکمیہ وہ جو کہ معین ہو دعوت حقیقیہ میں نے آسانی کے لئے یہ لقب تجویز کئے ہیں ان میں اصل دو ہی قسمیں ہیں دعوت الی اللہ کی۔ دعوت عامہ دعوت خاصہ۔ اور ایک قسم معین ہے دعوت عامہ کی۔ تو اسی طرح یہ کل تین قسمیں ہو گئیں۔ تو ہر شخص کے متعلق جدا جدا مراتب کے لحاظ سے ایک ایک دعوت ہوگی۔ چنانچہ دعوت خاصہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور وہ وہ ہے جس میں خطاب خاص ہوا اپنے اہل و عیال کو دوست احباب کو اور جہاں جہاں قدرت ہو اور خود اپنے نفس کو بھی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کلکم راع و کلکم مسئول۔ کہ تم میں ہر ایک راعی و مگر ان ہے اور تم میں ہر ایک (قیامت میں) پوچھا جائے گا کہ رعیت کیساتھ کیا کیا۔ یہ دعوت خاصہ ہے اور قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔

يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَوْلًا أَنفُسُهُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَادُوا. اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو عذاب دوزخ سے بچاؤ۔ یہ بھی دعوت خاصہ ہے کہ اپنے اہل و عیال کو عذاب دوزخ سے بچانے کا حکم ہے سو اس کا تو ہر شخص کو اپنے گھر میں اور تعلقات کے محل میں اہتمام کرنا چاہیے۔

عمومی دعوت میں تخصیص کا راز

ایک اور دعوت عام ہے جس میں خطاب عام ہو یہ کام ہے صرف مقتداؤں کا۔ جیسا کہ وَلَتَكُنَّ مِنْكُمْ آئَةٌ الْآيَةِ سے معلوم ہو رہا ہے اور اس تخصیص میں ایک راز ہے۔ وہ یہ کہ دعوت عامہ (یعنی وعظ) اسی وقت مؤثر ہوتی ہے کہ جب مخاطب کے قلب میں داعی کی وقعت ہو۔ بلکہ مطلق دعوت میں بھی اگر داعی کی وقعت نہ ہو تو وہ مؤثر نہیں ہوتی تو عام دعوت میں عام مخاطبین کے قلب میں داعی کی وقعت ہونی چاہیے اور ظاہر ہے کہ بجز مقتداء کے کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو عام لوگوں کے دل پر اثر ڈال سکے اور ایسے لوگ کتنے ہوتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہوں کہ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال اور یہ سمجھتے ہوں کہ

مرد باید که گیرد اندر گوش در بنشت است پند بر دیوار

(انسان کو چاہیے کہ نصیحت پر عمل کرے۔ وہ نصیحت کی بات خواہ دیوار پر لکھی ہوئی کیوں نہ ہو)

تو ایسے لوگ تو بہت کم ہی ہوتے ہیں۔ ورنہ عموماً یہ دیکھتے ہیں کہ واعظ یا داعی با وقعت ہے یا نہیں اگر وقعت نہیں ہوتی تو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ جب ہمارے برابر کا ہو کے ہم کو نصیحت کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ترفع چاہتا ہے اور ہم سے بڑا بننا چاہتا ہے اور واقع میں اکثر ہوتا بھی یہی ہے۔ اس وجہ سے دعوت عامہ میں مقتداء ہونے کی ضرورت ہے۔ (دعوت الی اللہ)

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے حکم کرتے ہو نیکیوں کا اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان)

فضائل امت محمدیہ ﷺ

اس آیت میں اس امت کی تین فضیلتیں بیان فرمائی ہیں جن میں فضیلت ایمان باللہ کی تو ہر شخص کے پاس اپنے لئے ہے اور باقی دو فضیلتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ دوسروں کے نفع کے لئے ہیں کیونکہ اس سے دوسروں پر نفع کا اثر پہنچتا ہے اور مقتضائے قواعد کا یہ تھا کہ یہاں تو مومن باللہ کو مقدم فرماتے کیونکہ وہ اساس اعمال ہے مگر مؤخر کرنے میں غالباً یہ نکتہ ہے کہ عوارض پر نظر کر کے اصلاح ہمہ گیر کا اہتمام زیادہ مقصود ہے کیونکہ اپنی ضرورت کا اہتمام تو ہر شخص خود ہی کر لے گا۔ ورنہ فی نفسہ اپنی اصلاح غیر کی اصلاح سے مقدم ہے مگر اس تقدیم کے یہ معنی نہیں کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی واجب نہیں بلکہ یہ تو محض عمل کی ترتیب ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرنا چاہیے۔ پھر دوسرے کی کرے یہ نہیں کہ اگر مقدم کام نہ کیا ہو تو مؤخر کو بھی نہ کرے کیونکہ دراصل یہ دو کام الگ الگ ہیں اور ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں۔ ایک کو بھی ترک کرے گا تو اس کے ترک کا گناہ ہوگا اور دوسرے کو ترک کرے گا تو دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا اور دونوں کو ترک کرے تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا۔

تو یہ غلطی ہے کہ اپنی اصلاح نہ ہوئی تو دوسروں کو بھی تنبیہ نہ کے۔ بعض اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ اَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھلاتے ہو) وہ اس سے یہی

سمجھے گا کہ اگر اپنی اصلاح نہ کرے تو دوسرے کی اصلاح بھی نہ کرے۔ کیونکہ ہمزہ تامرون پر انکار کے لئے داخل ہوا ہے تو امر بالبر (نیکی کا حکم) منکر ہوا۔ یعنی جس حالت میں تم اپنے نفسوں کو بھولے ہوئے ہو لوگوں کو امر بالبر کیوں کرتے ہو مگر یہ محض غلط ہے بلکہ ہمزہ مجموعہ پر داخل ہوا ہے اور انکار مجموعہ کے دوسرے جزو کے اعتبار سے ہے کہ اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے۔ اس آیت کا تو یہ جواب ہو گیا۔

اب ایک دوسری آیت کا مطلب بھی سنئے جس سے ان لوگوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ بے عمل کو وعظ و نصیحت نہ کرنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ كَبُرُ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ (کہ تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے کہ جو کام خود نہ کرو اسے کہو) دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دھوکے میں پڑ گئے ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے کہ جو کام خود نہ کرے وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے۔

اصلاح غیر کے مدارج

البتہ اصلاح غیر کے بقدر استطاعت مدارج ہیں چنانچہ ایک درجہ یہ ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ) اس درجہ کا حاصل اپنے خاص متعلقین کی اصلاح ہے۔ انفس اس بات میں بھی ہم سے کتنی کوتاہی ہو رہی ہے خود تو نماز پڑھ بھی لیتے ہیں مگر کبھی بیوی بچوں کو نوکروں کو اور متعلقین کو نہیں کہتے بچے اگر امتحان میں نفل ہو جائیں تو رنج ہوتا ہے مگر نماز قضاء کر دیں تو کچھ بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ سات برس کے بچے کو نماز پڑھنے کا حکم دو اور دس برس کے بچے اگر کہنے سے نہ پڑھیں تو مار کے پڑھاؤ اگر کوئی دس برس کا بچہ سرپرست کی غفلت کی وجہ سے بے نماز ہوگا تو اس کا سرپرست گنہگار ہوگا تو اگر اصلاح غیر کی ضرورت نہ ہوتی تو قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ (اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ) میں اہلیکم کے کیا معنی ہوں گے۔

دوسرا درجہ یہ ہے وَلْيَتَلَطَّنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ (کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کا کام صرف یہی ہو کہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے) اس درجہ کا حاصل تبلیغ عام ہے اور ایک جگہ ہے کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (ایک دوسرے کو حق کی فرمائش کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو پابندی کی فرمائش کرتے رہتے ہیں) اس میں بھی تخصیص نہیں اہل و عیال کی۔ یہ تو قرآن میں اس امر و نہی کی تاکید ہے۔ اسی طرح حدیث میں تاکید ہے ارشاد ہے كلکم راع و كلکم مسئول عن رعیتہ (یعنی ہر ایک تم میں سے نگہبان ہے اور ہر ایک تم میں سے اپنی رعیت کے بارہ میں پوچھا جاوے گا) اس سے بھی معلوم ہوا کہ دوسرے کی اصلاح بھی ضروری ہے اگر دوسرے کی اصلاح ضروری نہیں ہے تو پھر ان آیات اور احادیث کے کیا معنی ہیں۔

غرض یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے کہ اب زیادہ تفصیل سے شرم آتی ہے مگر کیا کروں۔ اس وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی خبریں اخباروں میں آپ کو بھی معلوم ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کو دو قومیں مرتد بنا رہی ہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک آیت یاد آئی۔ وَذُو الْوَكْفُرُونِ كَمَا لَفَّوْا فِئْتَلُوْنَ سِوَاہِ فَلَ تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ حَتّٰی يُہَاجِرُوْا فِی سَبِيْلِ اللّٰهِ

اس کے ترجمہ سے اس وقت کی حالت کا اندازہ کر کے آپ کو عبرت ہوگی۔ ترجمہ یہ ہے (کہ کفار تو دل سے پسند کرتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ تا کہ سب برابر ہو جاویں) جیسے ایک کبڑے سے کسی نے پوچھا تھا کہ تو اپنا اچھا ہونا چاہتا ہے یا دوسروں کا کبڑا ہونا کہنے لگا کہ دوسروں کا کبڑا ہونا تا کہ میں بھی دوسروں کو اس نظر سے دیکھ لو جس نظر سے لوگوں نے مجھ کو دیکھا ہے۔ تو کفار تو یہ چاہتے ہیں کہ تم سب ان کے برابر ہو جاؤ۔ آگے مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ (ان سے دوستی اور اتحاد مت کرو) کیونکہ جب ان کی یہ حالت ہے کہ وہ دل سے تمہارا کافر ہونا پسند کرتے ہیں تو لامحالہ وہ تم سے مل کے اس کی کوشش کریں گے۔ افسوس مسلمانوں کو تو ان سے ملتے ہوئے اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کو مسلمان بنا دیں اور وہ ہر وقت دل میں یہی خیال رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بنا دیں۔

ترجمہ: یہ سب برابر نہیں ان اہل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو قائم ہیں۔ اللہ کی آیتیں اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

کثرت تلاوت و نقل کی ترغیب

يَتْلُونَ آيَاتِ اللّٰهِ اَوْ هُمْ يَسْمَعُونَ حقیقت تلاوت و سجدہ کی حاصل ہونے کی کوشش کرو اور اس کا طریق یہی ہے کہ حقوق ان دونوں عبادتوں کے ادا کرو۔ قبل اس کے کہ میں ان کے حقوق بیان کروں ایک بات بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس مقام پر ایک سوال اور اشکال متوجہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جن اعمال کی فضیلت بیان کی گئی ہے آیا یہ اعمال فرض ہیں یا نہیں اگر فرض نہیں ہیں تو فرض کا ذکر بہ نسبت نقل کے اہم ہے اور ذوق لسانی اور قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مراد نقل ہے اس لئے کہ اسلوب کلام اور الفاظ سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ مقصود کثرت تلاوت و نقل ہے تو کثرت تلاوت و نقل دونوں فرض نہیں ہیں اور اگر کہا جاوے کہ مراد صلوٰۃ تہجد ہے تو صلوٰۃ تہجد بھی فرض نہیں ہے۔ غرض بہر صورت نقل ہے پھر فرائض کو چھوڑ کر نقل کی فضیلت کیوں بیان فرمائی اور اگر کہو کہ مراد فرض ہے تو میں عرض کر چکا ہوں کہ ذوق لسان اور قرآن اس سے آبی ہیں اس اشکال کا جواب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مراد تو نقل ہی ہے باقی رہی یہ بات کہ فرائض کی اہمیت ان کے ذکر کو مقتضی ہے یہ صحیح ہے لیکن ذکر کے انواع مختلف ہیں صریح اور لازمی۔ فرائض کی اہمیت اس نقل کی فضیلت بیان کرنے سے اور زیادہ بڑھ گئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب وہ لوگ نقلوں میں کوتاہی نہیں کرتے تو فرائض میں تو بطریق اولیٰ کوتاہی نہ کریں گے۔ پس فرائض کا ذکر کو عبارتہ النص سے نہیں ہے لیکن دلالتہ النص سے فرائض کی اہمیت زیادہ محفوظ ہو گئی ہے اور اس زمانہ کے لوگ ایسے نہ تھے جیسے آج کل بعض ہیں کہ نوافل کا تو اہتمام کریں فرائض کی پرواہ نہ کریں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ میں اپنے پیر کا اس قدر اتباع کرتا ہوں کہ فرض نماز چاہے قضا ہو جائے مگر پیر کا بتلایا ہوا وظیفہ ناغہ نہیں ہوتا اگر ایسے ہی لوگ اس وقت بھی ہوتے تو واقعی فرض کی اہمیت پر اس آیت کی دلالت ظاہر نہ ہوتی۔ حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں مراد نقل ہے پس اس تفسیر کے موافق اس آیت میں قیام لیل یعنی تہجد کا ذکر ہوا اور تراویح کا لقب ہے قیام رمضان۔ قیام میں تو بعینہ محفوظ رہا۔ اس میں صرف ایک مضاف الیہ اور بڑھ گیا یعنی قیام لیلۃ رمضان۔ جبکہ اس آیت کا مدلول قیام لیل ہے تو قیام لیل

رمضان بھی اس میں ضرور داخل ہوگا پس اب میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس آیت سے تراویح کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور وہ بھی مدار خیریت کا ہے پس ان کو ایسے پڑھئے کہ آپ کی خیریت محفوظ رہے اور جو اس میں منکرات ہیں اس سے بچئے (الہدیب)

عقائد

یعنی یہ اہل کتاب سب برابر نہیں ہیں سب کو ایک لکڑی سے نہ ہانکنا۔ ان میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق پر قائم و ثابت ہیں۔ یہ تو عقائد کی طرف اشارہ ہے آگے یَتْلُونَ آیت اللہ .

اعمال

یہ اعمال کی طرف اشارہ ہے یعنی پڑھتے ہیں وہ اللہ کی آیتوں کو ساعات شب میں اور وہ نماز پڑھتے ہیں اس ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان آیتوں میں دونوں چیزوں کا ذکر ہے تلاوت قرآن کا اور نماز کا بھی لیکن مفصلاً ذکر نہیں بلکہ اجتماعی طور سے ذکر ہے یعنی نماز میں قرآن پڑھنے کا ذکر ہے اس لئے کہ اس آیت کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ

تراویح

وَهُمْ يَسْجُدُونَ میں واو عاطفہ ہے۔ اس وقت تو اقتران پر یہ آیت نصف نہ ہوگی گو تحمل ہو دوسری تفسیر یہ ہے کہ واو حالیہ ہو اور ذوق ارتح یہی معلوم ہوتا ہے اس صورت میں اقتران اس کا مدلول ہوگا یعنی مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی آیتیں ساعات لیل میں تلاوت کرتے ہیں اس حالت میں کہ سجدہ کرتے ہیں پس اس تفسیر کے موافق اس آیت کا مضمون تراویح کے نہایت مناسب ہو گیا۔ بہر حال اس آیت سے اس عمل کی بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور نیز دوسری وجہ فضیلت کی یہ ہے کہ شروع رکوع۔

اعمال خیر

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ میں اس امت کی خیریت کا ذکر ہے۔ پس آگے ان اعمال کا ذکر ہوگا۔ جن کو خیریت میں دخل ہوگا اور یہاں خیریت کے معنی یہ نہ سمجھنا جو لوگ بولا کرتے ہیں کہ تمہارے یہاں خیریت ہے بلکہ خیریت کے معنی ہیں بہت اچھا ہونا خیر صیغہ الفعل التفضیل کا ہے۔ پس حاصل یہ ہوگا کہ اگر تم یہ اعمال کرو گے تو بہت اچھے ہو جاؤ گے حق تعالیٰ جن کو بہت اچھا کہے ان سے بڑھ کر کون ہوگا۔ (الہدیب)

يَخْتِزُونَ لِلَّذِينَ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا اس سے معلوم ہوتا ہے بکاء اور خشوع تلاوت قرآن کے وقت ہونا چاہیے یہاں پر طالب علموں کو ایک شبہ ہوگا وہ یہ کہ رونا تو اختیاری نہیں اور سائلین کو یہ شبہ ہوگا کہ جب یہ صفت ایمان والوں کی ہے اور ہم کو رونا آتا نہیں تو ہمارے اندر ایمان نہیں ہے ایک دوست نے بھی مجھ کو لکھا تھا کہ جب سے میں حج کر کے آیا ہوں رونا نہیں آتا اور پہلے رونا آتا تھا۔ میں نے ان کو جواب لکھا کہ رونے سے مراد آنکھوں کا رونا نہیں اس لئے کہ

وہ غیر اختیاری ہے۔ اور غیر اختیاری کی اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتے۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا بلکہ مراد دل کا رونا ہے۔ پس تم کو آنکھوں سے رونا نہیں آتا لیکن دل کا رونا تم کو حاصل ہے۔ باقی اختیار سے رونے کی عورتیں مشتاق ہیں۔ کسی کے یہاں تعزیت کے لئے جائیں گے اور اپنے کسی مردہ کو یاد کر کے بس رونا شروع کر دیں گی۔ اور ان کا کوئی تازہ مرا ہوانہ ہوگا تو یہ حکمت کریں گی کہ کپڑے سے منہ چھپالیں گی اور جھوٹ موٹ ہوں ہوں کرنے لگیں گی۔ لیکن مردوں کا رونا اختیاری نہیں ہے اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ رونا نہ آوے تو رونے کی شکل بنا لو۔ یہاں بھی دل کا ہی رونا مقصود ہے اس لئے کہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑتا ہے جب رونے کی شکل بنائے گا تو دل میں بھی رونا آتی جائے گا۔

ترجمہ: اللہ پر اور قیامت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام تلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ تھے شائستہ لوگوں سے ہیں۔

مدار اصلاح

اس آیت میں بعض آیات کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور آیت کے خاتمہ پر ان اعمال کو مدار اصلاح قرار دیا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ صلاحیت اور درستی حال منظور ہو تو ان اعمال کو اختیار کرنا ہے۔

علماء کی قسمیں

وحی کے بتانے والے جن کو علماء کہتے ہیں دو قسم کے ہیں علماء ظاہر اور علماء باطن ظاہر جو ہر چیز کا حکم بتاتے ہیں۔ لیکن علماء باطن کی تعلیم اثر میں ان سے بڑھی ہوئی ہے۔ علماء ظاہر دعوت عام سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ضابطہ کی تبلیغ کرتے ہیں بس اتنا بتا دیتے ہیں کہ اگر یہ صورت ہے تو یہ حکم ہے اور یہ صورت ہے تو یہ حکم ہے۔ مثلاً ایک شخص اچھا کپڑا پہنتا ہے اور علماء ظاہر سے اس کا حکم پوچھے گا تو بتائیں گے کہ اگر نیت تکبر کی نہ ہو تو جائز ہے اور ہو تو ناجائز علماء باطن چونکہ خاص تربیت کا بھی تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ تعلیم میں اس کا بھی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس خاص شخص کی نیت تکبر کی ہے یا نہیں اور اس کو وہ کپڑا پہننا جائز ہے یا نہیں۔ نیز وہ اپنی تعلیم میں اصل منشاء کو دیکھتے ہیں اور اسی کا علاج کرتے ہیں اور آثار کی طرف ان کی توجہ زیادہ نہیں ہوتی اور اہل ظاہر زیادہ تر آثار کو دیکھتے ہیں اور اسی اختلاف طرز تعلیم کے سبب علماء باطن بعض اوقات ظاہری احتساب کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے جس سے کبھی اہل ظاہر ان پر طعن کرتے ہیں کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے۔ ڈاڑھی موٹے ان کے یہاں آتے ہیں اور کچھ روک ٹوک نہیں کرتے۔ حقیقت اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ حکیم ہیں ایسا راستہ ڈھونڈتے ہیں جس سے اس منکر کا منشاء ہی ندارد ہو جاوے پھر وہ منکر ہی نہ رہے گا۔ وہ علاج پورا کرتے ہیں مگر مریض کو بھڑکاتے نہیں۔ جیسے شفیق طبیب کہ دوا بھی دیتا ہے اور بوجہ شفقت مریض کے مذاق کی بھی رعایت رکھتا ہے کہ اس کا منہ بھی کڑوانہ ہونے پائے بتا شہ مقدر میں رکھ کر دوا کھلا دیتا ہے یا کوئی ایسی چیز ملا دیتا ہو کہ اس سے تلخی زائل ہی ہو جاتی ہے طیبیان الہی طبائع کی خصوصیات کو سمجھتے ہیں اور اس کی رعایت سے دوا دیتے ہیں مگر غلٹ نہیں کرتے مولانا جامی فرماتے ہیں

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند کہ بر نڈازرہ پنہاں بحرم قافلہ را

(نقشبندی حضرات قافلہ کے عجیب سردار ہیں کہ لوگوں کو خفیہ راستہ سے قافلہ کو حرم کی طرف لے جاتے ہیں) تمام مشائخ کا یہی طرز ہے۔ ان حضرات کے یہاں امر و نہی سب کچھ ہے لیکن تدبیر کے موافق ان کے معالجات بہت مفید اور مرض کا استیصال کرنے والے ہوتے ہیں مگر ان کے معالجات اور اہل ظاہر کے معالجات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً کبر کا ایک مریض ہو تو اہل ظاہر اسکے عمل کو دیکھ کر جو اس شخص سے صادر ہوا کہہ دیں گے تم نے یہ فعل مذموم کیا اس کا علاج یہ ہے کہ توبہ کر لو۔ یہ علاج مفید ہے کیونکہ توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے لیکن آپ خیال کر سکتے ہیں کہ دس برس کے مرض کے علاج کے لئے یہ توبہ استیصال میں کیسے کافی ہو سکتی ہے۔ اس علاج سے صرف ایک خاص فعل کا گناہ جاسکتا ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ آج اس فعل سے بچ گیا تو کل اس کبر سے کسی دوسرے فعل میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس فعل سے توبہ کرائی جائے گی تو پرسوں کو اور ایسے ہی گناہ میں طول ہو جائے گا تو ساری عمر توبہ بھی رہے گی اور گناہ بھی ہوتا رہے گا۔ معالجہ ہو رہا ہے مگر مرض سے نجات نہیں ملتی اور اہل باطن کیا کریں گے کہ اس فعل کی طرف زیادہ توجہ نہ کریں گے مگر کسی اور تدبیر سے اس رذیلہ کا یعنی اس کے غلبہ اور قوت کا اخراج قلب میں سے کر دیں گے جو منشا ہے اس فعل کا۔ جب منشا ہی نہ رہا تو یہ فعل بھی نہ رہے گا اور آئندہ کے لئے بھی اس جیسے افعال سے اطمینان ہو جائے گا یہ علاج کام کا ہے یا وہ اور یہ نئی ابلغ ہے یا وہ۔ میں کرانہ گیا تھا ایک صاحب آئے اس شان سے کہ خدمت گار ساتھ مٹھائی لئے ہوئے اور فرمائش کی مجھے بیعت کر لیجئے۔ میں اس حرکت کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ان میں مرض تکبر اور ترفع کا ہے میں نے کہا جلدی نہ کیجئے مجھے اس وقت وعدہ کے سبب ایک اور جگہ جانا ہے وہاں میرے ساتھ چلئے اور یہ مٹھائی بھی لے چلئے وہ خود مٹھائی لیکر میرے ساتھ چلے دوسرے مکان پر میں اسی طرح وہاں سے ایک اور مکان پر گیا اور وہاں سے اور مکان پر۔ اسی طرح بہت سے مکانوں پر گیا اور ایسی جگہ سے قصداً گذرا جو خوب آباد ہیں۔ اسی طرح خوب چکر لگوا یا ان کا علاج ہو گیا ترفع اور تکبر سب ملیا میٹ ہو گیا۔ یہ عملی علاج ایک ہی جلسہ میں ان کے لئے اکسیر ہو گیا اور مرض کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ دیکھئے اتنی سی دیر میں مزاج درست ہو گیا اتنی ذرا سی تدبیر نافع ہو گئی۔ زبان سے اس حرکت کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا گیا لیکن اس حرکت کا منشاء بمع تمام اس جیسے اور حرکات کے رخصت ہوا۔ دیکھئے یہ نئی ابلغ اور نفع ہوئی یا یہ نہیں ہوتی کہ اس حرکت سے توبہ کرائی جاتی مگر منشاء کے باقی رہنے سے اور حرکات ترفع کی صادر ہوتی رہتی ہیں ایسے ہی موقع پر بعض وقت زبان سے کہنے کا وہ اثر نہیں ہوتا جو سکوت کا ہوتا ہے فرماتے ہیں

گرچہ تفسیر زبان رو شکر است لیک عشق بے زبان روشن تراست

(اگرچہ) (عشق کا حال) زبان سے معلوم ہونا چاہیے لیکن واقع می بے زبان کا عشق زیادہ روشن ہے کیونکہ وہ ذوقی امر ہے) اہل اللہ کی نظر بہت دقیق ہوتی ہے اس واسطے ان کے معالجات بھی بہت لطیف ہوتے ہیں لیکن اہل ظاہر کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی اس واسطے ان کے معالجات بھی اس شان کے نہیں ہوتے۔ حاصل اس تمام تقریر کا یہی ہے کہ ان میں وہ دین نہ تھا جو مطلوب ہے۔ دین مطلوب جہی حاصل ہو سکتا ہے کہ وحی کا اتباع کیا جائے اور بلفظ دیگر حضور ﷺ کے آگے ارشاد ہے يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ یعنی پیش قدمی کرتے ہیں نیک کاموں میں۔ یہ بھی صفت اہل کتاب کی اسی جماعت کی

ہے جس کو مذمت سے مستثنیٰ کیا اور اس میں بھی وہی کلام ہے جو پہلے مشنوں میں تھا یعنی **يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** (اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں) اور **يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں بری بات سے) میں۔ آگے ارشاد **وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ** (یہی لوگ صالحین سے ہیں) اس میں اس جماعت اہل کتاب کا ذکر فرمایا جس جماعت میں یہ اوصاف ہیں یعنی وہ صالحین میں سے ہیں یہاں پر ایک اور بات قابل غور ہے اس دوسری جماعت کے واسطے جو فرمایا ہے **وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ** (یہی صالحین میں سے ہیں) ظاہر صالحین کے لفظ سے کچھ ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کے لئے کچھ زیادہ فضیلت نہیں کیونکہ صالحین کا درجہ مومنین کے سارے درجوں سے سب سے کم درجہ ہے جیسا کہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں کہ صالحین کے اوپر شہداء کا درجہ ہے اور ان کے اوپر صدیقین کا تو اس سے ثابت ہوا کہ یہ جماعت مومنین کے ادنیٰ درجہ میں سے شمار کی جائے گی حالانکہ واقع میں اس کے خلاف ہے اس لئے کہ جو کوئی ایمان لایا وہی مومن ہے۔ خواہ پہلے اہل کتاب رہا ہو یا بت پرست یا مجوس غرض کچھ بھی رہا ہو اسلام لانے کے بعد اسے یہ سب درجات مل سکتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ محاورات کے درجات سے اس قسم کے اوہام پیدا ہوا کرتے ہیں چنانچہ اس شبہ کی بناء بھی یہ ہے کہ لفظ صالحین کو اسی معنی پر محمول کیا گیا جو ایک درجہ والوں کا لقب ہے حالانکہ اس کا استعمال دوسرے معنوں میں بھی آیا ہے حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں بھی اس کا استعمال قرآن میں موجود ہے **وَإِنِّي نَذَرْتُ لَكُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّ فِي الْآخِرَةِ لَكُمُ الصَّالِحِينَ** (دنیا میں ہم ان کو بھلائی عطا کریں گے اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالحین سے ہوں گے) یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں ہے جو انبیاء علیہم السلام میں بعد حضور ﷺ کے سب سے بڑے نبی ہیں ان کو بھی صالحین میں سے فرمایا یہاں معنی صالحین کے وہ ہو ہی نہیں سکتے جو ادنیٰ درجہ ہے نیز اس کے ساتھ فرمایا ہے فی الآخرة جس کے معنی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آخرت کی صلاحیت ہے۔ علمائے اتفاق کیا ہے اس بات پر کہ انبیاء علیہم السلام کو آخرت میں بھی برابر ترقی ہوتی رہے گی اور اس سب کو حق تعالیٰ نے صلاح فرمایا تو معلوم ہوا کہ صلاح ایک ایسا مفہوم ہے جو بڑے اور چھوٹے مراتب کو شامل ہو سکتا ہے اس درجہ کے لئے بھی صلاح ثابت جو مومنین کا ادنیٰ درجہ ہے جس سے یہ دھوکہ ہوا اور اس درجہ کو بھی حاصل ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آخرت میں ہوگا اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں کیونکہ درجات بلند ہو جائیں گے اور صلاح کا لفظ سب میں استعمال کیا جاتا ہے۔ غرض صالحین کا درجہ ادنیٰ بلکہ بڑے بڑے مدارج کو بھی شامل ہے تو اب وہ ہم دفع ہو گیا کہ اس جماعت اہل کتاب کو کوئی بڑی فضیلت ثابت نہ ہوئی۔ ایک تو جیہہ یہ تو اس وہم کے دفع کی یہ ہوئی اور ایک تو جیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل (مطلق جب بولا اس سے مراد فرد کامل ہوا کرتا ہے) صالحین کے آگے یہاں کوئی قید نہیں ہے تو ہم اس صالحین سے انہیں لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو اس کے فرد کامل ہیں تو معنی آیت **أُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ** کے یہ ہوئے کہ اس جماعت کا شمار ان صالحین میں ہوگا جو اعلیٰ درجہ کے صالحین ہیں اب وہم جاتا رہا کہ اس جماعت کی زیادہ فضیلت ثابت نہیں ہوئی بلکہ پورے طور سے ثابت ہو گئی کہ یہ سب اعلیٰ درجہ میں شمار ہوں گے

اور اس تقریر سے غلط فہمی میں نہ پڑ جانا کہ انبیاء علیہم السلام کی مساوات لازم آگئی کیونکہ ان کے لئے بھی مِنَ الصَّالِحِينَ (صالحین میں سے) کا لفظ آیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے بھی یہی لفظ مستعمل ہوا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ صالحین ایک مفہوم ہے جو ادنیٰ درجہ والوں پر بھی بولا جاسکتا ہے اور اعلیٰ درجہ والوں پر بھی۔ اس کے بعض افراد وہ بھی ہیں جو مومنین کے ادنیٰ درجہ میں ہیں اور وہ بھی ہیں جو اعلیٰ درجہ میں ہیں میں نے محض آپ لوگوں کے وہم کو دفع کرنے کے لئے (کہ ان کے لئے کچھ زیادہ فضیلت نہیں ثابت ہوئی) قرآن شریف سے اس لفظ کا استعمال دکھلایا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ والے کے لئے بھی یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اور ادنیٰ درجہ والے کے لئے بھی غرضیکہ جب أَوْلِيَاكَ مِنَ الصَّالِحِينَ (اور یہ صالحین میں سے ہیں) میں صالحین کو مطلق رکھا ہے تو ہم باقاعدہ المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل (جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد فرد کامل ہوا کرتا ہے اعلیٰ ہی درجہ کیوں نہ مراد لیں جیسا کہ حضرات انبیاء علیہ السلام کے لئے ثابت ہے اور اس استدلال سے ہمیں ان سے مساوات نہیں ثابت کرنا ہے اور نہ ہو سکتی ہے ہمارے لئے تو یہ معراج ہے ہم ان کے خدام میں شامل ہو جائیں یہ بسا غنیمت ہے۔ مساوات کا تو نام ہم کیا لے سکتے ہیں ہمارے لئے تو ان کی معیت و تبعیت ہی باعث فخر ہے اور یہی ہمارے لئے اعلیٰ درجہ ہے۔ سواتباع سے ان شاء اللہ یہ ضرور حاصل ہوگی اس لئے یہ معیت قرآن شریف کی نص قطعی سے ثابت ہے فرماتے ہیں وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا (اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں پس یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین (کے ساتھ) اور یہ لوگ اچھے رفیق ہیں) اس آیت میں اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرنیوالوں کے لئے ان حضرات کے ساتھ معیت ثابت کی گئی ہے جن پر خدا کا انعام ہوا اور منعم علیہ کون ہیں اور صدیقین و شہداء اور صالحین۔ گو بطریق تابعیت ہی ہو مگر یہ بھی کتنی بڑی بات ہے

فی الجملہ نسبتے تو کافی بود مرا بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اگر اللہ تعالیٰ یہ معیت نصیب فرماویں تو بہت ہی بڑی خوش قسمتی ہے کہ یہ درجہ کس کو نصیب ہوتا ہے الحمد للہ کہ لفظ صالحین کے لفظ کے متعلق ایک بہت بڑا وہم رفع ہوا اب میں بیان ختم کرنا چاہتا ہوں جو مدعا ہے اسے سن لیجئے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے أَوْلِيَاكَ مِنَ الصَّالِحِينَ جس کا ترجمہ یہ ہے لوگ صالحین میں سے ہیں اور لفظ اولیٰک کا اشارہ اہل کتاب کی وہ جماعت ہے جس میں یہ صفات ہوں يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يَا مَرْوَنَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَتَّقُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ (اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھی بات کا حکم کرتے ہیں اور بری بات سے منع کرتے ہیں اور نیکیوں میں پیش قدمی کرتے ہیں) مگر اس حکم میں خصوصیت اہل کتاب کی نہ سمجھی جاوے کیونکہ گو مورد آیت کا خاص ہو مگر عموم الفاظ یا علت سے حکم عام ہوا کرتا ہے اسکا حاصل یہ ہوا کہ اصلاح کامل اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو ان صفات کے ساتھ متصف ہو گو یا دوسرے کے حق میں حکم بیان کر کے اس امت کو بھی سنانا ہے کہ اگر اصلاح

کامل چاہیے ہو جس سے انبیاء علیہ السلام کی رفاقت نصیب ہو تو یہ صفات حاصل کرو جو آیت میں مذکور ہیں اور بناء ان سب کی حضور ﷺ اور وحی کی اتباع ہے چاہے وہ بواسطہ ہو یا بلا واسطہ اس طرح سے کہ کسی حالت میں اپنی رائے کا اتباع نہ کیا جائے چنانچہ اہل کتاب کی دونوں جماعت میں جو ایک کی تعریف اور ایک کی مذمت فرمائی گئی ہے ان کا منشاء یہی ہے۔ جس جماعت کی مذمت ہوئی انہوں نے حضور ﷺ کا اتباع نہ کیا اور اپنی رائے کو کافی سمجھ کر اس پر عمل کرتے رہے اور دوسری جماعت نے اپنی رائے کو چھوڑ کر حضور ﷺ اور وحی کا اتباع کی اب انہیں واقعات سے لوگ اپنی حالتوں کا موازنہ کر لیں کہ کہاں تک ان میں وحی الہی اور حضور ﷺ کا اتباع ہے اور کہاں تک خود رائی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کے سارے اعمال گندے اور قابل اصلاح ہیں اور اصلاح ہر ایک پر واجب ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہر کام میں حضور ﷺ کا اتباع کیا جائے اور اپنی رائے وہوائے نفسانی کو چھوڑ دیا جائے بلا اس کے کام نہیں چلتا۔

محال است سعدی کہ راہ صفا . تو اں رفت جز در پئے مصطفیٰ

(سعدی محمد ﷺ کی پیروی کے بغیر راہ صفا پر چل سکتا محال ہے)

اور فرماتے ہیں

دریں راہ جز مرد داعی نرفت گم آں شد کہ دنبال داعی نرفت

مراد داعی سے حضور ﷺ ہیں سو جس نے حضور ﷺ کا پیچھا پکڑا اور حضور ﷺ کا اتباع کیا وہ منزل مقصود کو پہنچ گیا اور جس نے حضور ﷺ کے اتباع کو چھوڑ کر اپنی رائے اور خواہشات نفسانی کو اپنا رہنما بنایا وہ گمراہ ہو کر جادہ مقصود سے بالکل دور ہو گیا۔ اب دعا کیجئے حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور توفیق اعمال صالحہ کی ہدایت عطا فرمائیں۔ (آمین)

اوصاف صالحین

اور اس میں بھی وہی کلام ہے جو پہلی صفتوں میں تھا یعنی يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا هَذِهِ السُّبُلَ وَاللَّهِ عَزِيزٌ عَلِيمٌ وَبَيْنَهُمْ عَيْنُ الْمُنْكَرِ میں آگے ارشاد ہے أُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ . اس میں اس جماعت اہل کتاب کا حکم بیان فرمایا جس جماعت میں یہ اوصاف ہیں یعنی وہ صالحین میں سے ہیں یہاں ایک بات اور قابل غور ہے اس دوسری جماعت کے واسطے جو فرمایا ہے وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ظاہر صالحین کے لفظ سے کچھ ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کے لئے کچھ زیادہ فضیلت نہیں کیونکہ صالحین کا درجہ مومنین کے سارے درجات میں سب سے کم درجہ ہے جیسا کہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں کہ صالحین سے اوپر شہدا کا درجہ ہے اور ان کے اوپر صدیقین کا تو اس سے ثابت ہوا کہ یہ جماعت اہل کتاب کی مومنین کے ادنیٰ درجہ میں شمار کی جائے گی حالانکہ واقع میں ہے اس کے خلاف ہے اس لئے کہ جو کوئی ایمان لایا وہی مومن ہے خواہ وہ پہلے اہل کتاب رہا ہو یا بت پرست یا مجوسی غرض کچھ بھی رہا ہو اسلام لانے کے بعد اسے یہ سب درجات مل سکتے ہیں جو اب یہ ہے محاورات کے نہ جاننے سے اس قسم کے اوہام پیدا ہوا کرتے ہیں چنانچہ اس شبہ کی بناء بھی یہی ہے کہ لفظ صالحین کو اسی معنی پر محمول کیا گیا جو ایک درجہ والوں کا لقب ہے حالانکہ اس کا استعمال دوسرے معنوں میں بھی آیا ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان

حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں بھی اس کا استعمال قرآن میں موجود ہے۔ **وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَآتَيْنَاهُ فِي الْآخِرَةِ لَيَسَّ لِلَّذِينَ الظَّالِمِينَ** یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں ہے جو انبیاء علیہم السلام میں بعد حضور ﷺ کے سب سے بڑے نبی ہیں ان کو بھی صالحین میں سے فرمایا یعنی معنی صالحین کے وہ ہوں نہیں سکتے جو ادنیٰ درجہ ہے نیز اس کے ساتھ فرمایا **فِي الْآخِرَةِ** جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آخرت کی صلاحیت ثابت ہے۔ علماء نے اتفاق کیا ہے اس بات پر کہ انبیاء علیہم السلام کو آخرت میں بھی برابر ترقی ہوتی رہے گی اور اس صفات کو اس خاص جماعت میں موجود مانا گیا جن میں یہ صفات اس طرح موجود ہیں جس طرح ہونی چاہئیں۔ اس سے قاعدہ کا استنباط بالکل ظاہر ہے یہ بیان ہوا **يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** کا آگے فرماتے ہیں **يَا مَرْءُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَتَّقُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ** یعنی حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں بری بات سے یہ بھی صفت ہے اہل کتاب کی اس جماعت کی جس کو مذمت سے مستثنیٰ کیا ہے اس میں وہی کلام ہے جو **يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** میں تھا کہ یہ صفت اگرچہ اس دوسری جماعت میں بھی تھی جس کی مذمت کی گئی لیکن اس وجہ سے کہ ان میں یہ صفت بلا اتباع حضور ﷺ کے تھی تو اس طرح نہ ہوئی جس طرح مطلوب تھی لہذا اس کا وجود کالعدم ہوا اور یہ کہا جاوے گا کہ یہ صفت قبل اسلام لانے کے گو صورت ہو مگر حقیقتاً ان میں تھی ہی نہیں خلاصہ یہ کہ گوان میں دین تھا مگر وہ دین جو مطلوب ہے نہ تھا اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت تھی بھی ایسے ہی گو وہ بظاہر دین کا کام کرتے تھے۔ لیکن دین کو من حیث الدین نہ کرتے تھے بلکہ ان میں اغراض کو بھی شامل کر دیتے تھے مثلاً غریب کو مسئلہ کچھ اور بتاتے تھے اور امیر کو کچھ اور جیسا کہ ایک مولوی نے ہزار روپیہ دینے والے کے لئے ساس کے ساتھ نکاح کو جائز کر دیا اگر کوئی غریب ہوتا اور کچھ نہ دیتا تو وہ شخص قیامت تک اس کے جواز کا فتویٰ نہ دیتا اس کی نسبت فرمایا گیا ہے **وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا** اگرچہ ہزار روپیہ کی رقم بظاہر کثیر معلوم ہوتی ہے۔

پھر اس کو قلیل کیسے کہا جائے مگر آخرت کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی قلیل کیا بلکہ اقل ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا **قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ** دین تو حکم الہی کا نام ہے امیر و غریب سب اس کے بندے ہیں حکم الہی میں کوئی تخصیص کسی کی نہیں تو اس میں تخصیص کرنا نفس اور ہوی کا اتباع ہو دین کا اتباع نہ ہو حاصل اس تمام تقریر کا یہی ہے کہ ان میں وہ دین نہ تھا جو مطلوب ہے دین مطلوب جہی حاصل ہو سکتا ہے کہ وحی کا اتباع کیا جائے اور بہ لفظ دیگر حضور ﷺ کا آگے ارشاد ہے **يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ** یعنی پیش قدمی کرتے ہیں نیک کاموں میں یہ بھی صفت اہل کتاب کی اسی جماعت کی ہے جس کو خصوصاً اس صورت میں کہ آیت سابقہ میں باوجود الفاظ تانیث موجود ہونے کے بھی تعمیم تھی۔ غرض وہ بیان بھی مشترک تھا مردوں اور عورتوں کے لئے اور آج کا بیان بھی مشترک ہے دونوں کے لئے یہ دوسرا تناسب ہوا۔

دونوں بیانات میں یہ مصلحت اور وجہ نکل آئی اس آیت کے اختیار کرنے کے لئے یہ عجیب اتفاقی تناسب پیدا ہوا ہے کہ عورتیں مضمون رجال میں شریک اور رجال مضمون عورتوں میں شریک یہ تمہید ہوئی۔

اب آیت کا مضمون سنئے فرماتے ہیں **يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ** (وہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں نیک کاموں کو بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں سبقت کرتے ہیں یہی لوگ صالحین سے ہیں) اس کے کچھ اوپر کمالات امت محمدیہ ﷺ کے بیان فرمائے۔ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ** اس سے قبل کمالات امت محمدیہ کے ذکر فرماتے ہیں۔ گو مومنین کے اوصاف کمال بہت ہیں مگر اس آیت میں بیان ان اوصاف کا کیا گیا ہے جو ام الاوصاف ہیں وہ یہ ہیں **تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ**۔ آگے اس امت کے مخالفین اہل کتاب کی مذمت کا بیان ہوا ہے لیکن عادت الہیہ یہ ہے کہ مخالفین کی مذمت کے ساتھ مومنین کے استثناء کو بھی ذکر فرمادیتے ہیں یعنی کسی قسم کے لئے کوئی حکم ایسا نہیں فرمادیتے کہ بس اچھوں اور بروں کو عام ہو بلکہ ان میں جو برے ہیں ان کے لئے برائی کا حکم فرماتے ہیں اور جو اچھے ہیں ان کے لئے اچھائی کا حکم فرماتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ جس قوم سے خفا ہوئے تو ایک عام حکم لگا دیا کہ وہ ساری قوم ایسی ہے کسی شخص کو اس میں مستثنیٰ نہیں کرتے اور اگر کسی شخص سے خفا ہوئے تو اس کی ہر بات پر برائی کا حکم لگا دیا گو یا وہ سر تا پا عیب ہی عیب ہو گیا کوئی ادا اس کی پسند نہیں رہی۔ اور اگر کسی کو کسی خطا کی معافی بھی دے دیں تو اس میں بھی کچھ نہ کچھ کدورت باقی رہتی ہے ایسا دل صاف نہیں ہوتا جیسا اس خطا سے پہلے تھا اور وہاں یہ شان ہے کہ چاہے کتنی ہی خطائیں کرو اور ایک دفعہ دل سے توبہ کر لو بس راضی ہو جاتے ہیں بلا کسی ناخوشی کے اور ان خطاؤں کو ایسا محو کر دیتے ہیں کہ گویا اس نے کوئی خطا کی ہی نہ تھی اور کسی کو ایک خطا کی وجہ سے ہمہ عیب نہیں کر دیتے اور کسی خاص فرد کی خطا سے ساری قوم پر الزام نہیں لگا دیتے دیکھئے اہل کتاب کے بعض آحاد کی مذمت بیان فرمائی۔ لیکن ان آحاد کی وجہ سے تمام قوم کو مذموم نہیں کر دیا بلکہ جو برے ہیں ان کی مذمت فرمائی اور جو اچھے ہیں ان کی مدح فرمائی۔

موصل الی المقصود

مقصود کے حاصل کرنے کے لئے جو تکلیفیں پیش آتی ہیں عقلمند آدمی ان کو برداشت کرتا ہے چونکہ شریعت کی پابندی موصل الی المقصود ہے پس جس شخص کی نظر مقصود پر ہے وہ اس پابندی کو چھوڑ نہیں سکتا ان آیات میں اس شریعت موصل الی المقصود کی پابندی کا ذکر فرماتے ہیں اور پابند و غیر پابند کے فرق کو بیان فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے **لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۚ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ** یعنی اہل کتاب سب برابر نہیں ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دین پر قائم ہے وہ خدائے تعالیٰ کی آیتوں کو رات کے اوقات میں پڑھتی ہیں (تو دن میں تو بدرجہ اولیٰ) اور وہ سجدہ کرتے ہیں یعنی نماز پڑھتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیک کاموں میں پیش قدمی کرتے ہیں اور یہ لوگ صالحین میں سے ہیں حق تعالیٰ نے

اس جماعت کو دیگر اہل کتاب میں جن کی مذمت بیان فرمائی تھی مستثنیٰ کیا اور ان کو صالحین میں سے فرمایا انہیں سب سے پہلے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ اہل کتاب کی اس جماعت صالحین میں اور دوسری جماعت میں جس کی مذمت فرمائی گئی کیا فرق تھا وہ گمراہ جماعت بھی گو بعض پیغمبروں کو ابن اللہ کہتے تھے چنانچہ بعض حضرات عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے اور بعض حضرات عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے لیکن یہ عقیدہ کسی کا بھی نہ تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں اور نہ یہ کہ ابن اللہ من کل الوجوه خدا کے مقابل ہیں۔ واجب مطلق کو سب ایک مانتے تھے مگر ہاں ایسی بات ثابت کرتے تھے جو خدائے تعالیٰ پر محال ہے یعنی بیٹے کا ہونا لیکن ان دونوں عقیدوں سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مومنین باللہ نہ تھے اللہ پر ایمان ضرور رکھتے تھے ہاں بعض ایسی باتوں کے قائل ضرور تھے جو غلط اور بے ثبوت ہیں۔ غرض وہ لوگ بھی مومن باللہ اور آخرت کے بھی قائل تھے سب جانتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کا کوئی فرد بھی یہ نہیں کہتا تھا کہ قیامت نہیں آئے گی۔

اصل الاصول

حاصل یہ کہ وہ گروہ جس کی مذمت فرمائی گئی اللہ پر بھی ایمان رکھتا تھا اور قیامت کا بھی قائل تھا تو اس گروہ میں اور اس گروہ میں جن کی مدح فرمائی گئی ہے ان دونوں میں تو اختلاف نہ تھا اختلاف تھا تو اس بات میں کہ یہ گروہ جناب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آیا تھا اور وہ گروہ حضور پر ایمان نہیں لاتا تھا تو اس لحاظ سے یہاں دونوں کے فرق بیان کرنے کے لئے بظاہر یہ مناسب تھا کہ یوں فرماتے یومنون بالرسول بجائے یومنون باللہ کے کیونکہ دونوں میں یہی ماہہ الفرق تھا مگر اللہ رے بلاغت قرآن شریف کی کہ ایسا عنوان اختیار کیا جس میں مخاطب کے حالات کی بے حد رعایت ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ اصلاح کا اصل الاصول یہ ہے کہ جس کی اصلاح کا قصد ہوتا ہے اس کو شرمندہ نہیں کیا کرتے یہ ایسا پاکیزہ طرز ہے کہ دشمن کو بھی دوست بنا لیتا ہے کیسا ہی دشمن ہو مگر اس رعایت کو دیکھ کر وہ دشمنی سے باز آ جائے گا۔ اگر یوں تصریح فرماتے یومنون بالرسول تو وہ لوگ اس وجہ سے کہ ابھی قریب ہی زمانہ میں رسول ﷺ کی مخالفت کر چکے ہیں اور اب ایمان لائے ہیں تو اس مخالفت کو یاد کر کے آپ کے سامنے آنکھیں نیچی ہوتیں کہ ابھی تو ہم نے آپ کو ایذا میں دی تھیں اب کیا منہ لے کر آپ کے سامنے جائیں اور مطیع و دولت ہونے کا دم بھریں تو ممکن تھا کہ یہ خیال شرمندگی کا مانع عن الایمان ہو جاتا اس وجہ سے بجائے یومنون بالرسول کے یومنون باللہ جس میں اس ایذا سے کچھ تعرض ہی نہیں بلکہ یہ تعلیم ہوگی کہ تمہارا وہ ایمان باللہ جو اب تک رکھتے رہے کافی نہیں بلکہ دوسرے طریق سے ایمان لانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ بات ایسے شخص سے کہی جاتی ہے جو ایمان باللہ کا خود مدعی ہے تو اس کے معنی یہی ہو سکتے کہ گو تم ایمان باللہ کے مدعی ہو لیکن یہ ایمان تمہارا ایمان باللہ نہیں ہے ایمان باللہ صحیح معنی میں وہ ہے جو حضور ﷺ کے ذریعہ سے حاصل ہوا اور جس پر اہل اسلام عامل ہیں اور جس میں حضور ﷺ کی تصدیق بھی شرط ہے۔ اس عنوان میں یہ خوبی ہوئی کہ ایمان بالرسول کی تعلیم بھی کر دی اور ان کی اس قدر رعایت بھی ہوگئی کہ رسول ﷺ کا نام نہیں آیا جس سے وہ شرمندہ ہوتے اور ایمان سے رہ جاتے یہ کس قدر رحمت و شفقت ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ

قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۲۸۶﴾

ترجمہ: جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیاوی زندگی میں اس کی حالت اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی ہو وہ لگ جاوے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنہوں نے اپنا نقصان کر رکھا ہو پس وہ اس کو برباد کر ڈالے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے ہیں۔

تفسیری نکات

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کفار حیوة الدنیا میں جو خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسی کسی کافر قوم کی کھیتی میں پالا پڑ جائے اور اس کو تباہ کر دے۔ تو جیسے وہ کھیتی ہری بھری ہونے کے بعد بالکل ضائع ہو جاتی ہے یونہی کفار کا خرچ کیا ہوا مال بوجہ عدم ایمان کے ضائع محض ہوتا ہے یہ تو آیت کا حاصل تھا۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس مثال میں حَرْثٌ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ کیوں فرمایا۔ حالانکہ پالہ کافر کی کھیتی کو بھی تباہ کر دیتا ہے اور مسلمان کی کھیتی کو بھی تو بات یہ ہے کہ مسلمان کی کھیتی کا پالہ سے کامل طور سے نقصان نہیں ہوتا گو کھیتی برباد ہو جائے مگر اس مصیبت سے اجر صبر بڑھ جائے گا اور آخرت میں جو ثواب اس کا بدلہ ملے گا وہ اس کھیتی سے لاکھ درجہ افضل ہوگا کیونکہ اجرا آخرت کی تو شان یہ ہے

نیم جاں بستاندو صد جاں دہد آنچہ درد ہمت نیایداں دہد
خود کو باید این چنین بازار را کہ بیک گل می خری گلزار را

پس ضیاع اعمال کافر کے لئے کافر ہی کی کھیتی مثال ہو سکتی ہے کہ پالہ سے فناے کامل اسی کو ہوتا ہے کیونکہ اس کا بدلہ بھی نہیں ملتا۔ مسلمان کو کامل اور حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ اس لئے ظلموا انفسہم کی قید بڑھادی۔ واللہ یہ بڑے مزے کی قید ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے بڑی خوشی کی بات ہے کہ دنیا کے کسی نقصان سے بھی ان کا حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ حقیقی نقصان صرف کافر کو ہوتا ہے۔ مسلمان کے لئے ہر وقت خوشی اور مسرت ہی ہے راحت میں بھی اور مصیبت میں بھی (مظاہر الامال) پس اس وجہ سے بھی قلق نہ ہونا چاہیے۔

البتہ اعمال صالحہ اگر فوت ہوں اس کا قلق ہونا چاہیے مگر اس میں بھی ایک تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اعمال صالحہ کے فوت ہونے کا عوام تو جس قدر چاہیں قلق کریں ان کو تو مفید ہے اور سائلین زیادہ اس کا بھی قلق نہ کریں بلکہ تھوڑی دیر تک رنج کر لیں پھر جی بھر کے توبہ کر لیں اور اپنے کام میں لگیں اور ماضی کی فکر میں نہ پڑیں کہ ہائے یہ کام کیوں فوت ہوا ہائے یہ خطا کیوں ہوئی۔ ہر وقت اسی کا شغل رکھنا سائل کو مضر ہے کیونکہ یہ فکر ترقی تعلق مع اللہ میں حجاب ہو جاتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تعلق مع اللہ بڑھتا ہے نشاط قلب سے اور یہ قلق نشاط کو کم کر دیتا ہے لیکن تھوڑی دیر تک تو قلق کرنا چاہیے اور خوب رونا دھونا چاہیے تاکہ

نفس کو کوتاہی کی سزا تو ملے۔ پھر توبہ کر کے اور اچھی طرح استغفار کر کے اس سے التفات کو قطع کرے اور کام میں لگے۔ آج کل زیادہ قلق کرنے میں ایک اور بھی نقصان ہے وہ یہ کہ قلوب اس وقت بے حد ضعیف ہیں۔ زیادہ قلق سے ان کا ضعف بڑھ جاتا ہے جس سے بعض اوقات تعطل کی نوبت آ جاتی ہے جو کھلا ضرر ہے۔ بہر حال جب بعض منافع باقیہ کا فوت بھی زیادہ محل قلق نہیں تو منافع فانیہ یعنی منافع دنیویہ تو بالکل ہی محل قلق نہ ہوں گے تو ان پر تحسر بالکل ہی بے معنی ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ مسلمان کی جو چیز بھی ضائع ہوتی ہے سب حق تعالیٰ کے ہاں جمع ہو جاتی ہے جس کا اسے ثواب ملتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کاٹا بھی چبھ جائے تب بھی ثواب سے محروم نہیں رہا (جب اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے رسول ﷺ کا بھی بدل ہے تو اور کیا رہ گیا۔ اب کوئی مصیبت ایسی نہیں جس سے خدا کے ہوتے ہوئے مسلمان پریشان ہو۔ ہاں دین میں کمی ہو تو قلق ہونا چاہیے کیونکہ اس کا عوض کچھ نہیں مگر اس میں بھی اعتدال ہونا چاہیے جیسا کہ اوپر بتلایا گیا کیونکہ نقصان دین کی تلافی بھی توبہ اور استغفار اور گریہ و زاری سے ہو سکتی ہے۔

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۶۰﴾

ترجمہ: اور خوشی سے کہا مانو اللہ اور رسول ﷺ کا تاکہ تم پر رحم کیا جائے

تفسیری نکات

حُب رسول

بہر حال یہ وہ آیت ہے کہ اس میں شریعت و طریقت دونوں کو بھر دیا ہے۔ یہ تمہیدی تھی اب ترجمہ اور مقصد بیان ہوتا ہے کہ خدا کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو۔ یہی مضمون قرآن میں جا بجا مختلف طور پر مذکور ہے کہیں صرف اطیعوا اللہ (خدا کا کہنا مانو) کہیں فقط اطیعوا الرسول (رسول کا کہنا مانو) اور کہیں دونوں کو ساتھ ذکر کیا ہے اس سے ایک عجیب مسئلہ ظاہر ہو گیا کہ اطاعت تو فقط اللہ تعالیٰ کی ہے اور واسطہ اس میں حضور ہیں۔ تو جہاں اطیعوا اللہ کے ساتھ و الرسول بھی فرمایا دیا وہاں معنی یہ ہیں کہ رسول کا کہنا مانو ان کے ذریعے سے اللہ کی اطاعت ہوگی اور کہیں اطیعوا الرسول ہی فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کو خدا کے ساتھ تعلق ہو اس کے ساتھ تعلق کرنا خدا کے ساتھ تعلق کرنا ہے۔ اس سے صاف طور پر اہل سلوک کا ایک شبہ کھل گیا وہ یہ کہ ذکر لا الہ الا اللہ (خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) میں لا الہ کہتے وقت جو ما سوائے اللہ کی محبت کو قلب سے نکالا جاتا ہے تو کیا رسول کی محبت کو بھی نکالا جائے۔

جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت خدا کی محبت کا غیر نہیں کیونکہ حضور سے محبت اسی لئے ہے کہ وہ ذریعہ ہیں وصول الی اللہ (اللہ تعالیٰ تک پہنچنے) کا تو یہ تو بعینہ خدا کی محبت ہے تو یہ لا الہ کے تصور سے خارج نہ کی جائے گی۔

مولانا نے ایک مقام پر اس کی ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص نے لعل سے پوچھا کہ تو کس کو زیادہ محبوب رکھتا

ہے؟ اپنے کو یا آفتاب کو۔ اس نے کہا کہ جس کو زیادہ محبوب بتلاؤں اس سے دوسرے کا محبوب ہونا لازم آتا ہے کیونکہ اگر اپنے نفس سے محبت ہے تو بوجہ لعل ہونے کے وصف کے ہے اور اس کا یہ وصف آفتاب سے آیا ہے تو آفتاب سے محبت ہوئی اور اگر آفتاب سے محبت ہے تو اسی لئے کہ اس نے یہ وصف میرے نفس کو عطا کیا ہے تو اپنے نفس کی محبت ہوئی۔

اس تمثیل سے یہ مسئلہ خوب حل ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے اسی واسطے محبت ہے کہ آپ مظہر (ظاہر ہونے کی جگہ) صفات خداوندی ہیں حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ آپ نور من انوار اللہ (انوار الہی کا ایک نور ہیں) آپ موصل (الی اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے) ہیں تو یہ بعینہ خدا ہی کی محبت ہے۔

پس اَطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ (اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو) سب صحیح ہو گیا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اطاعت کا حکم دیا ہے اور اس کا ثمرہ یہ بیان فرمایا لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

اس آیت کے متعلق دو مضمون ہیں۔ مختصر بیان کرنا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اس میں اطاعت کا حکم ہے۔ لوگ اس کے معنی کہنا ماننا سمجھتے ہیں مگر اس میں ایک جزو اور بھی ہے جس کو لوگ بیان نہیں کرتے یعنی اطاعت کے معنی خوشی سے کہنا ماننا ہے کیونکہ طوع اس کا مادہ ہے اور طوع کے معنی رضا و خوشی کے ہیں تو اس میں حکم صرف کہنا ماننے کا نام نہیں بلکہ خوشی اور رضامندی کے ساتھ کہنا ماننے کا ہے۔

اب ٹولنا چاہیے کہ رغبت اور خوشی سے کہنا ماننے والے کتنے ہیں بہت کم ہیں۔ اکثر تو اس واسطے نماز روزہ کرتے ہیں کہ اگر نہ کریں گے تو پیشیں گے عذاب ہوگا۔ اس مذاق کے لوگوں کو اگر عذاب کا ڈر نہ ہو تو کبھی کہنا نہ مانتے سوا اس کا نام اطاعت نہیں یہ تو سزا کے خوف سے کام کرنا ہوا۔

تسلیم و رضا

اور دوزخ نہ ہوں تب بھی کہنا مانے۔ چاہے کچھ انعام ملے یا نہ ملے سزا کی وعید ہو یا نہ ہو۔ ہر حال میں سر تسلیم خم رہے کیونکہ اس کی ذات کی عظمت کا یہی مقتضا ہے صاحب کمال کی اطاعت کرے کو خود بخود جی چاہا کرتا ہے اس کی طرف خود قلب مائل ہوا کرتا ہے اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کون صاحب کمال ہوگا جس میں ظاہری اور باطنی ساری خوبیاں جمع ہیں اور سب خوبیوں کے دینے والے بھی وہی ہیں۔

صاحبو! اگر غلام سے کہا جائے کہ یہ کام کرو اور وہ ساتھ ہی یہ کہے کہ کیا ملے گا۔ تو انصاف سے کہو وہ بے ہودہ ہے یا نہیں۔ بیشک ایسا غلام گردن زنی (گردن مارنے کے لائق) ہے جو بدلہ لے کر اپنے آقا کا کام کرے اس کی تو حالت یہ ہونی چاہیے تھی

زندہ کنی عطائے تو و ربکشی فدائے تو دل شدہ بتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

یعنی زندگی عطا فرمائیں تو آپ کی مہربانی ہے اور اگر آپ قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں۔ دل آپ پر آ گیا جو تصرف کریں میں راضی ہوں۔

تو بندگی چوگدایاں بشرط مزد مکن کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تم اللہ کی اطاعت مزدوروں کی طرح مزدوری کی وجہ سے مت کرو۔ یعنی ثمرات کے لئے عبادت و اطاعت مت کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی وجہ سے کرو۔ ثمرات خود مرتب ہو جائیں گے۔ اس لئے آقائے حقیقی خود بندہ پروری کی روش کو جانتے ہیں۔

خدا کو خدا سمجھ کر عبادت کرو۔ یہ ہے خوشی سے کہنا ماننا اور یاد رکھو خوشی سے کہنا وہ ماننے کا جس کو محبت ہو۔ ظاہر اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ محبت تو قلبی کیفیت ہے اور دل پر کیا اختیار ہے مگر یہ خیال غلط ہے دل کی حرکت کا ارادہ کرو۔ دیکھو حرکت ہوتی ہے یا نہیں تم نے نہ ارادہ کیا نہ سیکھا پہلے ہی سے خیال پکا لیا دل پر کیا اختیار ہے۔

دیکھو! بچہ کو پہلے پہل چلنا نہیں آتا مگر ماں باپ کو چلتا دیکھ کر وہ بھی سیکھ جاتا ہے۔ اگر ماں باپ سے نہ سیکھے تو ہرگز نہیں چل سکتا۔ آپ صاحبوں نے تحصیل کا قصد نہیں کیا۔ اگر طلب ہوتی تو ڈھونڈتے اور کامیاب ہوتے مگر افسوس کہ ناامید ہو کر بیٹھے رہے شریعت نے کم ہمتی کی تعلیم نہیں دی۔ حضور نے عالی ہمتی کا حکم فرمایا۔

ایک شخص آپ کے فیصلہ میں ہار گیا تو اس نے حسبی اللہ ونعم الوکیل (یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو کافی ہیں اور وہ اچھے کارساز ہیں) حضور نے فرمایا کہ تدبیر کرو اور جب کچھ نہ بنے تب کہو حسبی اللہ ونعم الوکیل دنیا کے بارے میں سب حضور کی اس تعلیم پر عمل کرتے ہیں کہ پہلے اپنی طرف سے انتہا درجہ کی کوشش کر لیتے ہیں مگر دین کے بارے میں یہ حکم یاد نہیں رہتا اس میں آپ ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔

اسباب محبت

چنانچہ یہ شبہ بھی اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ دل پر کیسے اختیار ہوگا۔ تو سنو واقعی محبت کی کیفیت قلبی ہے اور براہ راست تمہارے اختیار میں نہیں مگر اس کے لئے چند اسباب ہیں۔ وہ تمہارے اختیار میں ہیں۔ تو دارمداران اسباب پر ہے اور وہ موقوف محبت پر نہیں۔ وَمَا جَعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ * دین میں تنگی نہیں جب محبت کا حکم ہے تو اس کی تحصیل کے اسباب بھی آسان فرمائے ہیں۔ سنئے! میں اسباب کو بیان کرتا ہوں جن سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے چند باتوں کا التزام کرنا چاہیے۔

ایک تو اس کا کہ کسی وقت خاص میں خدائے تعالیٰ کے انعامات کو سوچا کرے اور اس کے ساتھ ہی اپنی نالائق حرکتوں کا مطالعہ کرے اور غور کرے کہ اگر احکام ظاہری کی اتنی مخالفتیں کرتا تو کیا انجام ہوتا اور ان کی نگاہوں میں کیسی ذلت ہوتی۔ مگر حق تعالیٰ نے باوجود میری سرکشی کے اپنے انعامات مجھ سے بند نہیں کئے۔

ولیکن خداوند بالاد پست بھیاں در رزق بکس نہ بست

یعنی خدائے عالی نے گناہوں کی وجہ سے کسی پر رزق کا دروازہ بند نہیں کیا۔

ایک جزو تو یہ ہے۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ احکام ظاہریہ شرعیہ کو بھٹکلف شروع کر دے یہ تجربہ ہے کہ اعمال میں محبت کرنے کا خاصہ ہے کہ اگر اول اول محبت نہ بھی تو بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے مقناطیس کی کیفیت ہے کہ لوہا جب دور

ہے تو کچھ نہیں اور جہاں پاس آیا تو یہ خود کھینچ لیتا ہے۔ اعمال میں بھی مقناطیسی اثر ہے۔ تیسرا جزو یہ ہے کہ کچھ وقت ذکر کے لئے بھی نکال لے خواہ تھوڑی ہی دیر ہو خواہ بلا مرید بنے ہو۔ مگر خلوت میں ہو ذرا توجہ کے ساتھ۔ چوتھا جزو یہ ہے کہ اہل اللہ کے پاس بیٹھا کرے۔ ان شاء اللہ ان کی صحبت کا اثر یہ ہوگا کہ بہت جلد دنیا کی محبت دل سے کم ہو جائے گی۔ اور اہل اللہ کی پہچان یہی ہے کہ ان میں دنیا کی محبت کم ہو اور ان میں خدا کی محبت ہو۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (تاکہ تم پر رحم کیا جائے) اس میں ایک بہت باریک بات ہے۔ وہ یہ کہ جتنے حکام دنیا میں ہیں ان کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر اطاعت نہ کرو تو سزا ہوتی ہے اور اطاعت کرو تو کچھ انعام نہیں اور جہاں معاوضہ ہوتا ہے وہ زیادہ کام کرنے کا ہوتا ہے۔ نفس اطاعت پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ پابندی قوانین بلا معاوضہ ہر شخص کے ذمہ ہوتی ہے اگر پابندی نہ کرے تو مستحق سزا ہوتا ہے اور کوئی پابندی کرے تو اپنے فرض منصبی کو ادا کر رہا ہے۔ مستحق معاوضہ نہیں ہوتا تو کیا اس کو ظلم کہا جاسکتا ہے کیا کوئی اسے خلاف انصاف کہہ سکتا ہے جو شخص حکومت کا راز جانتا ہے وہ اس کو ظلم نہیں کہہ سکتا بلکہ خود حکومت کا حق سمجھتا ہے تو دنیا میں تو ہوتا ہے کہ کام لیا جاوے اور کچھ نہ دیا جاوے مگر یہ نہیں ہوتا کہ بغیر کام کے صرف اطاعت پر کچھ دیا جائے۔

اب گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو نماز پڑھنے سے منتظر ہیں کہ کچھ ملے گا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی قدر دل میں نہیں وَاَقْدَرُوا لِلّٰهِ حَقَّ قَدْرٍ (جیسی اللہ تعالیٰ کی قدر ہونی چاہیے ویسی انہوں نے قدر نہیں کی) اگر اتنی بھی خدا کی قدر ہوتی جتنی حکام دنیوی کی تو کیا خدا کا ہم پر حق نہیں ہے۔ پھر کیا منہ لے کر ہم معاوضہ و انعام کے متمنی ہیں۔ معلوم ہوا کہ خدا کی عظمت دل میں نہیں ہے۔ اگر عظمت ہوتی تو اگر کچھ بھی نہ ملتا تب بھی اطاعت کرتے مگر حق تعالیٰ کے قربان جانیے کہ اطاعت کا بدلہ صرف سزا نہ دینا گوارا نہ کیا بلکہ فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (تاکہ تم پر رحم کیا جائے) اور رحمت کا لفظ فرمایا جو جنت دیدار بقاء سب کو شامل ہے اور پھر شفقت تو دیکھئے کہ تُرْحَمُونَ فرمایا بِرَحْمَتِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ تم پر رحم کریں) نہیں فرمایا۔ نکتہ یہ ہے کہ اتنا بھی شرمندہ نہ کیا کہ ہم تم پر احسان کریں گے تاکہ عبادت کے ساتھ احسان کے بھی زیر بار نہ ہوں۔ بلکہ بے بیخبر مجھول فرمایا کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

شاہی محاورہ

ایک نکتہ اور یہ گیا لعلکم کیوں فرمایا کیونکہ لعل تو امید و شک کے مقام پر استعمال کیا جاتا ہے اور حق تعالیٰ اس سے بری ہیں۔ تو نکتہ یہ ہے کہ شاہی محاورہ ہے۔ محاورہ میں شاید اور امید کا لفظ یقین ہی کے لئے ہوتا ہے بادشاہ یوں ہی خطاب کیا کرتے ہیں کہ تم کو امید رکھنی چاہیے اگر عظمت باری کو پیش نظر رکھا جائے تو اشکال وارد ہی نہ ہوتا۔ شاہی خطوط میں کثرت سے یہ محاورہ مستعمل ہے۔ لکھتے ہیں امیدوار بودہ بدانند (تم کو امیدوار رہنا چاہیے) اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن مجید سب کتابوں سے پہلے پڑھے جب تک طرز تصنیفی کا دماغ خوگر نہ ہو۔

یہ مضمون تو آیت کے متعلق تھا۔ مقصود یہ ہے کہ احکام خداوندی کو مانو اور ان کا ماننا ان کے جاننے کے اوپر موقوف ہے بدوں جاننے قانون کی پابندی کیسے ممکن ہے۔ پس علم دین حاصل کرو۔ میں نے علم دین کی فضیلت بیان نہیں کی کیونکہ

ضرورت کا بیان کافی ہے اور ضرورت آپ کو معلوم ہوگئی کہ بدوں علم دین حاصل کئے اطاعت خدا ناممکن ہے۔

اب ایک فضیلت بھی بیان کرتا ہوں تاکہ زیادہ رغبت ہو فرماتے ہیں العلماء ورتہ الانبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں) امام محمد کو کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا جیب میں درگاہ رب العزت میں حاضر ہوا مجھ سے فرمایا گیا کہ کیا مانگتے ہو میں نے عرض کیا رب اغفر لی (اے پروردگار مجھ کو بخش) ارشاد ہوا کہ اے محمد! اگر میں نے تم کو عذاب دینا ہوتا تو تم کو یہ علم عطا نہ کرتا اور اسی سے بعض نے استنباط کیا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے۔ بجز علماء کے کیونکہ ارشاد ہے من یرد اللہ بہ خیرا یفقیہ فی الدین (جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا کر دیتے ہیں) اب سمجھ میں آیا کتنی بڑی ضرورت ہے اور کیسی فضیلت ہے علم دین کی کہ خدا تعالیٰ بدوں اس کے خوش نہیں ہو سکتے۔ رضاء حق علم دین حاصل کرنے پر موقوف ہے۔ ہاں اگر کوئی خدا ہی کو خوش کرنے کی ضرورت نہ سمجھے تو ایسے لوگ میرے مخاطب نہیں مگر ایسا ہو نہیں سکتا جس انسان کو بیوی بچوں سے صبر نہیں وہ خدا سے صبر کرنے کے کیوں چین سے بیٹھ سکتا ہے عرفا وہ شخص بہت باہمت سمجھا جاتا ہے جس کو بیوی بچوں کا صبر آ جائے مگر نہیں اس سے بڑھ کر باہمت گو نہ موم سہی وہ ہے جس نے خدا کو چھوڑ دیا اور صبر آ گیا۔

اے کہ صبرت نیست از فرزند وزن صبر چوں داری زرب الحسن

تم کو جب بیوی بچوں سے صبر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ سے تم کو کیوں کر صبر آ گیا

اے کہ صبر نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری از نعم المعاہدوں

جنت کی طرف کشش کا سبب

أَعْدَاتُ الْمُتَّقِينَ کہ جنت خدا سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو خواہ مخواہ اس کی طرف کشش ہوتی ہے اور تقویٰ کو جی چاہتا ہے۔ مسلمانوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی بعد میں پیدا ہوگی اور وہ اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ ابھی سے اس کا پیدا ہونا عبث ہے اور خدا تعالیٰ فعل عبث سے پاک ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے جس کو اولاً نص قرآنی أَعْدَاتُ الْمُتَّقِينَ (تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے) رد کر رہی ہے کیونکہ صیغہ ماضی کو مستقبل کے معنی میں لینا مجاز ہے حقیقت یہی ہے کہ اپنے معنی پر محمول ہو اور بلا وجہ معنی مجازی لینا جائز نہیں اور جو وجہ وہ بیان کرتے ہیں وہ صحیح نہیں کیونکہ میں نے ابھی اس کی حکمت بتلا دی ہے جس کو دوبارہ اعادہ کرتا ہوں۔ وہ حکمت یہ ہے کہ جنت کے پیدا کرنے کے بعد تو حق تعالیٰ ہم کو ان الفاظ سے خوشخبری سنار ہے ہیں کہ أَعْدَاتُ الْمُتَّقِينَ (جنت متقیوں کے واسطے تیار کی گئی ہے اور اگر پیدا نہ ہوتی تو بجائے اس کے یہ فرماتے تعاد للمتقين (یعنی جنت متقیوں کے واسطے تیار کی جائے گی) اور ان دونوں کی تاثیر فی الطبیعة میں جو فرق ہے اس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس وقت ایک شے موجود کی طرف راغب ہے اور اس وقت شے معدوم کی طرف رغبت ہوتی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے پس جس فعل میں اتنی بڑی حکمت ہو اس کو عبث کون کہہ سکتا ہے اور یہ حکمت تو ہمارے ذہن میں آگئی ہے اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔

معبود ہونے کے لئے خالق ہونا ضروری ہے

حاصل استدلال کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان کے سوا صانع و خالق کوئی نہیں تو معبود بھی وہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ معبود کے لئے کامل الصفات و جامع الکمالات ہونا ضروری ہے اور خلق بہت بڑی صفت کمال ہے پس جو خالق نہیں وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا اور جو خالق ہوگا وہ یقیناً تمام صفات کمال کا جامع ہوگا کیونکہ خلق کے معنی اعطاء و جود کے ہیں اور ظاہر ہے کہ تمام کمالات و جود کے تابع ہیں۔ پس جو ذات معطی و جود ہے یقیناً اس کے قبضہ میں خزانہ و جود ہیں اور جس کے قبضہ میں و جود کے خزانہ ہوں وہ تمام صفات کمال کا جامع ہوگا۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے اکثر مواقع میں توحید کی دلیل میں صفت خالقیت کو بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ صفت خالقین تمام کمالات کو مستلزم ہے حق تعالیٰ نے توحید کے دلائل میں زیادہ دقیق دلائل نہیں فرمائے بلکہ نہایت سہل دلائل بیان فرمائے ہیں جن کو تھوڑی سی عقل والا بھی بہت جلدی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اکثر جگہ صرف خالقیت سے توحید کو ثابت فرمایا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ تہذیبیات سے مخاطب ساکت تو ہو جاتا ہے مگر اس کی تسلی نہیں ہوتی اور سہل عنوانات سے تسلی خوب ہو جاتی ہے جیسا کہ اس آیت میں کتنا سہل عنوان ہے کہ کیا تم نے اس بات کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کام میں لگا رکھا ہے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں تو ذہن توحید کی طرف جلد منتقل ہو جاتا ہے۔

اس میں انفاق غیظ و غفوا و احسان کا بیان ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ
وَابْنِ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا
وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۹۰﴾

کچھ سارا کمال اس میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کو۔ لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ تعالیٰ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہد کریں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی اور بیماری میں اور جنگ میں تو یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اس میں تمام ابواب تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے جس میں اول محض صورت بے معنی کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے (دل علیہ قولہ لیس البر ان تولوا وجوهکم) جیسا کہ منافقین و یہود نے تحویل قبلہ کی گفتگو کا شغل بنا لیا تھا۔ اس کے بعد ایمان باللہ و ایمان بالمعاد اور ایمان بالملئکة اور ایمان بکتاب سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا امر ہے۔ یہ تو اعتقادات کے متعلق ہے۔ پھر حجب مال کو انفاق سے زائل کرنے کا امر ہے (یا محبت الیہ میں مال خرچ کرنے کی

ترغیب ہے) یہ اصلاح قلب کے متعلق ہے۔ پھر اقامت صلوٰۃ کا امر ہے۔ یہ طاعت بدنیہ ہے پھر ایفاء الزکوٰۃ کا یہ اطاعت مالیہ ہے اور اوپر جو ایفاء مال کا ذکر ہوا ہے وہ انفاق تطوع ہے جس کی حدیث ترمذی میں تصریح ہے۔

ان فی المال لحقاسوی الزکوٰۃ۔ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں محتاجوں کا حق ہے (اور علی حبہ اس کا قرینہ بھی ہے کیونکہ اگر اس کا مرجع مال ہے تو حب مال کے ازالہ کے لئے فقط ایفاء زکوٰۃ کافی نہیں کچھ زائد انفاق کرنا چاہئے اور اگر اللہ تعالیٰ مرجع ہیں تو حب الہی کا مقتضا بھی یہی ہے کہ فرض کے علاوہ کچھ مال محض محبت کی وجہ سے خرچ کیا جائے)

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَٰفِيْنَ عَنِ النَّٰسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکو کاروں کو محبوب رکھتا ہے۔

تفسیری نکات

عفو کی فضیلت

عفو بھی بہت بڑی فضیلت ہے۔ اگر غضب نہ ہوتا اس سے محروم رہتے۔ پس نہ یہ فضیلت ہے کہ بالکل ہی غصہ نہ آوے اور نہ یہ فضیلت ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں میں خفا ہو جائیں تحمل و عفو جانتے ہی نہ ہوں۔ فضیلت تو یہ ہے کہ اذا ما غضبوا ہم یغفرون مگر یہ واضح رہے کہ عفو اور تحمل کے مواقع ہیں ہر محل و موقع میں نہ غضب مناسب ہے اور نہ عفو بلکہ جو محل عفو کا ہے وہاں عفو کرنا چاہیے اور جو موقع غضب کا ہے وہاں غضب نافع ہے۔

غصہ کا آنا غیر اختیاری امر ہے

سخت غلطی ہے اس شخص کی جو غصہ کو بالکل دور کرنا چاہے کہ وہ بالکل ہی ملیا میٹ ہو جائے اگر یہ مطلوب ہوتا تو یوں نہ فرماتے وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَٰفِيْنَ عَنِ النَّٰسِ اور یہ ارشاد نہ ہوتا وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ اور لا تعصب صیغہ نہی کا ارشاد نہ ہوتا اس لئے کہ جو ہو جانے کے وقت مادہ ہی غضب کا نہ رہتا تو اس سے نہی ہی کی ضرورت نہ رہتی پس جوش اور غصہ کا آنا منہی عنہ نہیں ہے اس لئے کہ یہ امور غیر اختیاریہ میں سے ہے اور امر و نہی امور اختیاریہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور امور اختیاریہ نہ محمود ہیں نہ مذموم۔ ہاں اس اعتبار سے ان کو محمود کہا جاسکتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کی فضا سے پیش آئے ہیں جیسے حافظ شیرازی اسی مضمون کی نسبت کہتے ہیں

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر ادست بر صراط مستقیم اے دل کے گمراہ نیست

بہر حال یہ درجہ تو منہی عنہ نہیں ہے اب دو درجہ باقی رہ گئے ایک تو جوش کے موافق کارروائی کرنا دوسرے جوش کو دبا کر عقل اور شرح کی اقتضاء کے موافق عمل کرنا۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا

لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ اللَّهُ نُوْبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَ

هُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۲۹۳﴾

ترجمہ: اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے اور ہو جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی سخت گناہ کرتے ہیں یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں (یعنی صغائر کا ارتکاب کرتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اس کے بعد اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ صاحبو! ایسا بھی کوئی آقا اور مولیٰ دیکھا ہے کہ اس کی نافرمانی کریں اور وہ خود تعلیم کرے کہ ہم سے معافی چاہو اور اسی پر بس نہیں۔ اگر کوئی توبہ کرنے اور بخشش چاہنے سے شرمائے کہ کس منہ سے توبہ کروں میرا کیا منہ رہا ہے جو اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگوں تو اس کو ارشاد ہے وَمَنْ يَغْفِرِ اللَّهُ نُوْبَ إِلَّا اللَّهُ یعنی شرمانے کا موقع تو جب تھا کہ خدا کے سوا کوئی اور ٹھکانا ہوتا۔ خدا کے سوا کون گناہوں کو بخشنے والا ہے۔

تعلق مع اللہ کبھی نہ چھوڑو

مولانا رومی رحمۃ اللہ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص آلودہ نجاسات چلا جا رہا تھا دریا نے کہا کہ میرے پاس آ میں تجھے پاک کر دوں۔ اس نے کہا میں تو آلودہ ہوں کیسے آؤں پاک ہو کر آؤنگا۔ دریا نے کہا کہ میاں صاحب شرم کو چھوڑو جب پاک ہو گے مجھ ہی سے یا میرے کسی جزو سے ہو گے اور اگر شرم ہی شرم میں رہو گے تو تمام عمر ناپاکی اور آلودگی میں گزر جاؤ گے۔ تو صاحبو خدا تعالیٰ کا تعلق ہی ایک ایسی شے ہے کہ جو تم کو پاک صاف کرے گی پھر تعلق و توجہ میں پاکی کا انتظار کیا معنی۔ پس کیسے ہی برے ہو جاؤ مگر اللہ تعالیٰ سے تعلق نہ چھوڑو۔ گناہوں کا ہو جانا عجیب نہیں۔ مگر خدا کے ساتھ تعلق اور اللہ والوں سے تعلق یہ بھی خدا ہی سے تعلق رکھنا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَأَبْرَأُ كَمَا أُوْقِيَتْ

الْقُلُوبُ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ

شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴿۲۹۵﴾

ترجمہ: اور محمدؐ نرے رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں سو اگر آپ کا انتقال ہو جاوے یا آپ ﷺ شہید ہی ہو جاویں تو کیا تم لوگ اٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ جلد ہی عوض دے گا حق شناس لوگوں کو۔

تفسیری نکات

ثبوت وصال رسول اکرم ﷺ

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَأَبْرَأُ كَمَا أُوْقِيَتْ
نے ان شرطیہ کے ساتھ ان مات او قتل فرمایا ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ ان شرطیہ مقام شک میں لایا جاتا ہے۔ تو کیا صحابہ کو حضور ﷺ کی وفات واقع ہونے میں شک تھا کیا وہ حضور کے متعلق خلود کے معتقد تھے کہ آپ کو موت آئے ہی گی نہیں۔ ایسا گمان صحابہ کے متعلق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بات یہ تھی کہ غایت محبت کی وجہ سے حضور کا کسی وقت زندہ نہ ہونا ان کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ اور آپ کو جو ایک خاص امتیاز تمام مخلوق سے کمالات نبوت وغیرہ کی وجہ سے حاصل تھا۔ اس کا اثر عام طبائع پر حالاً یہ تھا کہ موت تو عوام کو آیا کرتی ہے۔ نبی کو کیا موت آتی ہے۔ گو اس کا اعتقاد نہ ہو۔ مگر تاہم حضور ﷺ کی موت ان کو کچھ مستبعد ہی معلوم ہوتی تھی اور اجلہ صحابہ کو گو موت نبوی مستبعد نہ معلوم ہوتی ہو مگر ان کا خیال یہ تھا کہ حضور ﷺ اپنا کار منصبی پورا کرنے سے پہلے تشریف نہیں لے جاسکتے تکمیل دین سے پہلے آپ کا وصول نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ وفات میں حضور کی موت سے انکار کیا۔ اور تلواریں لے کر کھڑے ہو گئے کہ خبر دار میں کسی کے منہ سے یہ لفظ نہ سننے پاؤں کہ حضور کا وصال ہو گیا۔ ابھی حضور کا وصال نہیں ہو سکتا بلکہ آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی ہے۔ آپ اس وقت تک دنیا سے نہیں جاسکتے جب تک اسلام تمام عالم میں نہ پھیل جائے اور دین کی ہر پہلو سے تکمیل نہ ہو جائے اور منافقین کا قلع قمع نہ ہو جائے۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ ابھی فروع دین کی تکمیل نہیں ہوئی۔ چنانچہ قرآن کی ترتیب بھی نہ ہوئی تھی۔ گو اصولاً تکمیل ہو چکی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ تکمیل فروع بھی حضور ﷺ ہی کے ہاتھوں سے ہوگی اس لئے وہ وصال نبوی کا انکار کر رہے تھے۔ اور کفار و منافقین کو دھمکا رہے تھے کہ من قال ان محمدا مات ضربت عنقه۔ مگر ان کو یہ خبر نہ تھی کہ جس کام کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے میں حضور کی وفات کا انکار کر رہا ہوں حق تعالیٰ کو

وہی کام مجھ سے اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے لینا ہے۔ بحمد اللہ حضرات صحابہ کے زمانہ میں خصوصاً حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں اسلام کی فروعی تکمیل بھی کمال کے درجہ پر ہو گئی۔ خدا تعالیٰ کو یہ فضیلت شیخین رضی اللہ عنہما کو دینا منظور تھی۔ اس لئے حضور کو قبل تکمیل فروع بلا لیا۔ واقعی اگر حضور اس وقت تک زندہ رہتے تو علماء امت سے جو کام حق تعالیٰ نے لیا ہے وہ کام ان سے کیونکر لیا جاتا۔ قتال مرتدین و اصلاح اہل عرب کا فخر حضرت صدیق کو کہاں نصیب ہوتا سب کام حضور ہی کے ہاتھ سے ہوتا۔ اسی طرح حضور کے ہوتے ہوئے امام ابو حنیفہ اور شافعی کو اجتہاد کی کیا ضرورت ہوتی۔ بس ہر مسئلہ حضور سے دریافت کر کے معلوم ہو جایا کرتا۔ ان حضرات کو یہ فضائل و کمالات حضور کی وفات ہی کی بدولت حاصل ہوئے اسی کو حتمی کہتا ہے۔

ولا فضل فيها للمساحة والندی وفضل الفتی لو لا لقاء شعوب

خوش اعتقادی

یہ محرک آپ کی خبر موت کے بعد کہاں باقی رہ سکتا تھا اس لئے بعض کے قدم اکھڑ گئے یہ تو واقعہ تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی **وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ نَكَتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۗ أَلَا يَهْدِي اللَّهُ الْبَاطِلَ إِلَىٰ الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيمِ ۗ الَّذِي مَلَكَ سَمْعًا وَبَصَرًا ۗ وَحَسَبًا ۗ أَلَا يَرَىٰ أَنَّهُ يُفْرَقُ ۗ نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ فِي سُبْحَانَ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَارُ ۗ** حق تعالیٰ نے ان شرطیہ کے ساتھ ان مسات او قتل فرمایا اور اہل علم جانتے ہیں کہ ان شرطیہ مقام شک میں لایا جاتا ہے تو کیا صحابہ کو حضور ﷺ کی وفات کے واقع ہونے میں شک تھا کیا وہ حضور کے متعلق معتقد خلود تھے کہ آپ کو موت آئے ہی گی نہیں ایسا گمان صحابہ کے متعلق ہرگز نہیں کیا جاسکتا بلکہ بات یہ تھی کہ غایت محبت کی وجہ سے حضور کا کسی وقت زندہ نہ ہونا ان کے ذہن میں نہ آتا تھا اور آپ کو جو ایک خاص امتیاز تمام مخلوق سے کمالات نبوت وغیرہ کی وجہ سے حاصل تھا اس کا اثر عام طبائع پر حالاً یہ تھا کہ موت تو عوام کو آ یا کرتی ہے نبی کو کیا موت آتی گو اس کا اعتقاد نہ ہو مگر تاہم حضور کی موت ان کو کچھ مستجدی سی معلوم ہوتی تھی جیسے ایک بیوہ عورت نے مجھ سے اپنا حال بیان کیا جس کو اپنے خاوند کے انتقال کا بہت زیادہ صدمہ تھا کہ ایسا صدمہ عموماً نہیں ہوا کرتا تو اس نے اس کا سبب یہ بیان کیا کہ میرے میاں مولوی تھے اور میرا خیال یہ تھا کہ مولوی مرا نہیں کرتے تو میں ان سے بیاہ کر کے بڑی خوش تھی کہ بس ساری عمر سہاگن ہی رہوں گی ایسے ہی صحابہ کو حضور کی موت کا تصور ہی نہ آتا تھا اس لئے ان کے ساتھ اسی طرح کلام کیا گیا جس طرح متردد اور صاحب شک کے ساتھ کیا جاتا ہے مگر یہ حالت اکثر صحابہ کی تھی سب کی یہ حالت نہ تھی چنانچہ ایک بڑھیا صحابیہ کا قصہ حدیث میں آتا ہے کہ وہ حضور کے پاس کسی کام کو آئی تھی حضور نے فرمایا پھر کسی وقت آنا اس نے کہا یا رسول اللہ اگر میں آپ کو نہ پاؤں تو پھر کس کے پاس جاؤں اس میں اس نے حضور ﷺ کی وفات سے کنا یہ کیا تھا تو آپ نے فرمایا فان لم تجدینی فاتنی ابابکر کہ اگر تو مجھے نہ پائے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آنا۔

سَلِّقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ

سُلْطَانًا وَمَا لَهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ﴿۵﴾

ترجمہ: ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں ہول کافروں کے دلوں میں بسبب اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ایسی چیز کو شریک ٹھہرایا جس پر کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی اور ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے بے انصافوں کی۔

تفسیری نکات

مراتب شرک

بعضے گناہ اور بھی ہیں جو ان تشرک کو باللہ (یعنی اللہ کا شریک کرنا اور ان تقولوا علی اللہ یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنا کے اندر داخل ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ مومنین میں نہیں کفار ہی کے اندر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کفار جیسے کفر کے اندر اشد تھے اسی طرح ان کے اندر یہ گناہ بھی اعلیٰ درجہ میں تھے اور مومنین کے اندر بھی ان کی حقیقت پائی جاتی ہے گو اس درجہ کی نہ ہو مثلاً وہ قصد اشْرک کرتے تھے اور مسلمان قصد اشْرک نہیں کرتے گو لازم آ جاوے مثلاً نذر لغیر اللہ بغضے لوگ بزرگوں کے نام کی فاتحہ دلو اتے ہیں اور ان کو حاجت روا سمجھتے ہیں یہ بحث بہت طویل ہے اس کے مراتب مختلف ہیں جس کو کچھ شبہ ہو تحقیق کر سکتے ہیں اسی طرح اور بہت سی رسوم شرکیہ ہیں جو مسلمانوں میں رائج ہیں۔ غرض شرک کے مراتب مختلف ہیں کہ اعلیٰ درجہ ان کا کفار میں پایا جاتا ہے اور یہ ادنیٰ مرتبہ مومنین میں بھی متحقق ہے۔

اتباع ظن

اس مقام پر ایک بات طالب علموں کے کام کی یاد آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جو فرمایا ہے وَأَنْ تَعْبُدُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطَانًا یعنی حرام فرمایا ہے اللہ کے ساتھ ایسی شے کے شریک کرنے کو جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ اگر دلیل اتارتے تو شرک جائز ہوتا۔ حالانکہ شرک قبیح ہے اس میں کسی وقت بھی احتمال جواز کا نہیں ہے جو سب بدعات ہیں اسی طرح یہ مشہور ہے کہ شب برات کے حلوے سے اگر پہلا روزہ افطار کیا جائے تو بہت ثواب ہے یہ بالکل غلط ہے۔ مولوی عبدالرب صاحب واعظ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ حلوے کی تین قسمیں ہیں۔ ایک اب کا ایک جب کا ایک تب کا۔ اب کا تو گڑ کا ہے جو مسجد کے ملائوں اور موذنوں کا اور جب کا شکر سفید کا ہے وہ خالہ اماں کے ہاں اور پھوپھی اماں کے ہاں جاوے گا اور تب کا وہ مصری کا ہے جو کس کے لئے ہے وہ اپنے لئے ہے اس سے پہلا روزہ افطار کیا جاوے گا واقعی انہوں نے بات بڑی سچی سچی اور لقب بھی خوب تراشے ہیں اس لئے کہ اب قریب کے لئے ہے اور جب بعید کے لئے اور تب ابعید کے لئے بولتے ہیں واللہ خوب ہی لطیفہ ہے۔

ایک اور اعتقاد ہے وہ یہ ہے کہ کسی کی افطاری سے روزہ نہ کھولو سارا ثواب اسی کو مل جاوے گا غرض اس قسم کی بہت سی بدعات ہیں جو اَنْ تَقُولُوا عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں داخل ہو سکتی ہیں۔ بطور فہرست کے مختصراً پھر عرض کرتا ہوں سو بات یہ ہے کہ مقصود یہ ہے کہ بندہ کو چاہیے کہ جو کام کرے وہ کام ایسا ہو کہ اس پر دلیل موجود ہو اور شرک ممالا دلیل لہ سے ہے بلکہ اس کے خلاف کے دلائل بکثرت موجود ہیں پس ایسا کام کرنا جس پر دلیل نہ ہو یہ تو برا ہے ہی اور ایسا کام کرنا اور بھی زیادہ برا ہے جس کے خلاف پر دلائل ہوں پس مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا سُلْطٰنًا کننا یہ ہے اس بات سے کہ اس کے خلاف پر دلائل ہیں۔

یہاں پر ایک شبہ اور ہوتا ہے کہ بہت سے احکام قیاسیہ و مجتہد فیہا بلکہ کل ایسے ہی ہیں کہ ان کی اللہ تعالیٰ نے دلیل نہیں اتاری پس اس سے منکرین قیاس اچھی خاصی طرح استدلال کر سکتے ہیں جو اب یہ ہے کہ سلطانا عام ہے اس لئے کہ نکرہ اور تحت میں نفی کے ہے پس معنی یہ ہیں۔

مالم ينزل به سلطانا ما ای لا خاصاً به ولا يرجع الیه والاحکام القاسیة و ان لم ينزل به سلطانا خاصاً به ولكن فنزل به سلطانا مما يرجع الیه ای النص المقيس علیہ ولهذا قالو القياس مظهر لا مثبت اور یہاں سے جواب ہو گیا اس شبہ کا بھی جو لا تقف ما لیس لك به علم سے ابطال قیاس پر استدلال کیا کرتے ہیں کہ جس کا علم یقینی نہ ہو اس کے درپے نہ ہونا چاہیے اور احکام قیاسیہ ظنی ہیں تقریر جواب کی یہ ہے کہ علم نکرہ ہے اور تحت میں نفی کے ہے پس فائدہ عموم کا دے گا۔ مطلب یہ ہے۔ ولا تقف ما لیس لك به علم یعنی اس بات کی پیروی نہ کرو جس کا کسی درجہ میں علم نہ ہونے یقین کے درجہ میں اور نہ ظن کے۔

اور یہاں سے ایک اور آیت کی بھی تفسیر اور ایک شبہ کا جواب ہو گیا وہ یہ ہے کہ منکرین قیاس آیت اِنْ يَكْفُرُوْا اِلَّا الظَّنُّ سے بھی ابطال قیاس پر استدلال کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قیاس بھی ظنی ہے اس کا اتباع کرنا بھی قابل ملامت و شکایت ہوگا تقریر جواب کی یہ ہے کہ جس ظن کے اتباع کی شکایت ہے وہ ظن ہے کہ بنفسہ و باصلہ ہر طرح ظن ہو یعنی نہ خود یقین ہو اور نہ وہ یقینی ہو جس کی طرف یہ راجع ہے باقی جو کسی قطعی کی طرف راجع ہو گورا جمع ہونا اس کا محض ظنی ہو وہ اس سے خارج ہے اور قیاس میں یہی ہے کہ مقیس علیہ توفی بنفسہ قطعی اور یقین ہوتا ہے اگرچہ طریق اس کا ظنی ہو اور اتباع اسی کا مقصود ہے باقی راجع ہونا اس حکم قیاسی کا اس اصل کی طرف یہ ظنی ہے اور اس کے ظنی ہونے سے کچھ اعتراض لازم نہیں آتا۔

اور ایک جواب اور ہے وہ یہ ہے کہ ظن کے معنی وہ نہیں ہیں جو ملا حسن اور قاضی میں لکھے ہیں یعنی الطرف الراجح اس لئے کہ قرآن شریف تو لغت عرب میں نازل ہوا ہے عرب ظن کا اطلاق وہم اور جانب مغلوب سب پر بھی کرتے تھے چنانچہ آیت اِنْ تَظُنُّ اِلَّا الظَّنَّ میں ظن سے وہم مراد ہے اس لئے کہ یقینی بات یہ ہے کہ ان کو قیامت کا ظن بمعنی معروف نہیں تھا پس اِنْ يَكْفُرُوْا اِلَّا الظَّنُّ میں بھی ظن کے معنی یہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ وہم پرستی میں مشغول ہیں۔ خیر یہ ایک طالب علمی تحقیق تھی۔

بدعات رمضان

اسی طرح ان تفولوا علی اللہ کے مراتب بھی مختلف ہیں۔ اعلیٰ درجہ تو اس کا کفار میں پایا جاتا ہے اور ادنیٰ درجہ اس کا بدعات ہیں جو مسلمانوں میں رائج ہیں اور **أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ** میں اس لئے داخل ہیں کہ ان کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں تو گویا لسان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بتلائی ہیں منجملہ ان بدعات کے رمضان کی بدعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ منگلے روزہ کو افضل سمجھتے ہیں اور اس کے کچھ احکام بھی تراش رکھے ہیں۔

مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ حَرَفَكُمْ

عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى

الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض تم میں سے وہ تھے جو آخرت کے طلب گار تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے اپنی نصرت کو بند کر دیا اور پھر تم کو ان کفار سے ہٹا دیا تاکہ خدا تعالیٰ تمہاری آزمائش فرمادے اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر بڑے فضل والے ہیں۔

تفسیری نکات

ارادہ دنیا مطلقاً نہ موم نہیں

مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا کو چاہتے تھے اور بعض تم میں سے وہ تھے جو آخرت کے طلب گار تھے یہ قرآن شریف کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض صحابہ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن اعطاء اسکندری کا ہے وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب یہ ہے کہ ارادہ دنیا مطلقاً نہ موم نہیں۔ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا لدا اور ایک ارادہ دنیا لآخرة۔ پہلا ارادہ نہ موم ہے۔ دوسرا نہ موم نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبید اللہ احرار کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے گئے۔ خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت تھی۔ مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بے باک ہوا ہی کرتا ہے اس وجہ سے ان کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرعہ پڑھا نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد اور واپس چلے آئے۔ اور مسجد میں آ کر سو رہے۔ خواب میں دیکھا کہ میدان حشر برپا ہے۔ اسی حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آ کر ان کو پکڑ لیا اور کہا کہ دو پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں تمہارے ذمے رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند پیچھا چھڑاتے ہیں۔ وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آئی آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں

تک کر رکھا ہے ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا ہے وہ کس واسطے ہے۔ ان کے ذمے جتنا مطالبہ ہے اس میں سے ادا کر دو۔ ان کے کہنے سے انہیں رہائی ملی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آ رہی ہے۔ اب یہ بہت ہی محبوب ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار کرنے پر پڑھا (نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد) آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ نا تمام ہے۔ اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہیے (اگر دارد برائے دوست دارد) دنیا اگر ہو بھی تو اپنے واسطے نہ ہو دوست کے واسطے ہو۔ ایسی دنیا میں کیا حرج ہے۔ ان حضرات کے پاس جو دنیا ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے لئے ہوتی ہے۔ انہیں کے حکم سے اس کو اپنے پاس رکھتے ہیں چنانچہ وہ اس میں مالکانہ تصرف نہیں کرتے بلکہ جہاں ان کا حکم ہوتا ہے وہاں صرف کرتے ہیں (الحیوة)

فرمایا۔ غزوه احد میں جو یہ آیت نازل ہوئی **مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ** ترجمہ: تم میں سے بعض تو وہ شخص تھے جو دنیا کو چاہتے تھے اور بعض تم میں وہ تھے جو آخرت کے طلبگار تھے۔

آیت کی تفسیر لطیف

اس کی لطیف تفسیر یہ ہے کہ منکم من یرید الدنیا للآخرة و منکم من یرید الآخرة الخالصة۔ کیونکہ احد میں جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین مرکز کو چھوڑ گئے تھے وہ مراد ہیں یرید الدنیا سے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان سے یہ بعید ہے کہ صرف دنیا کو مقصود ہو۔ نیز قواعد سے ردہ اور مدد کو بھی غنیمت میں شریک کیا جاتا ہے تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اگر نہ جاتے تو بھی غنیمت میں شریک تھے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مرکز کو چھوڑنا اجتہادی غلطی تھی کہ اب یہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ غنیمت جمع کرنے والے کی امداد کریں۔ یہ بھی دین تھا مگر بذریعہ دنیا اور جو جماعت حضور ﷺ کے فرمانے سے وہاں رکی رہی وہ دین تھا خالص۔

إِذْ تَصْعِدُونَ وَلَا تُلُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَ الرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أَخْرَاكُمْ

فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمِّ لَكَيْلًا تَخَزِنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ

وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ

ترجمہ: وہ وقت یاد کرو جب کہ تم چڑھے چلے جاتے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول ﷺ تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے سو خدا تعالیٰ نے تم کو یاد دلا کہ تم کو یاد دلا کہ تم مغموں نہ ہو کرو نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر جو تم پر مصیبت پڑے اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمہارے سب کاموں کی۔

إِذْ تَصْعِدُونَ وَلَا تُلُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَ الرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أَخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمِّ لَكَيْلًا

تَخَزِنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک غم دیا یہ سبب اس کے کہ ہمارے رسول ﷺ کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا اس لئے کہ غم تو اس لئے دیا جاتا ہے تاکہ حزن ہونہ کہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لازماً ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا تاکہ تم کو حزن ہو۔

شان نزول

یہ کہ غزوہ احد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس تکہ پر حضور ﷺ نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطا اجتہادی کے اس پر قائم نہ رہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے۔

حضرات صحابہ کی حیثیت خداوندی

الحمد للہ میری سمجھ میں اس کی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر پر لانا ماننے کی ضرورت نہیں ہے اور معنی بے تکلف درست ہیں وہ یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالیٰ سے نہایت شرماتے تھے جب ان سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ ہم کو سزا کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو جاوے اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں اگر سزا نہ ہوتی تو ساری عمر رنجیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جانکاہ و جان فرسا تھا اس بناء پر فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ سزا دے دی تاکہ تم کو غم نہ ہو غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سزا کا نام سن کر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے تو جو بے حیا تھے وہ تو یوں رکے کہ يعلم میں اشارہ سزا کی طرف بھی ہے چنانچہ مفسرین ایسے مقام پر لہجہ یکنم بہ فرماتے ہیں اور دوسرے مذاق والے اس لئے رکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ اکبر وہ جانتے ہیں بہر حال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے عید ہے۔ (غض المہر)

إِذْ تَصْعَدُونَ وَلَا تَلُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالتَّسْوِيلُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمِّ لَكِن لَّا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا كَانَتْكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ۔

تصفیہ باطن

اس میں مشہور تفسیر یہی ہے کہ لازماً ہے اور مطلب یہ ہے کہ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمِّ لَكِن لَّا تَحْزَنُوا۔ کہ تم کو غم پر غم اس لئے دیا تاکہ تم کو رنج ہو اور رنج کیوں دیا؟ اس کی وجہ تھوڑی دیر آگے مذکور ہے وَلِيُبَيِّنَ لَكُمْ أَنَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُبَيِّنَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ۔ جس کا حاصل وہی تصفیہ و تجلیہ باطن ہے اور تصفیہ و تجلیہ باطن سے مقصود رفع درجات ہے اور یہی اصل مقصود ہے۔ سزا بعض دفعہ رنج کم کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔

آداب اعصاب برائے دفع رنج

لَكِن لَّا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا كَانَتْكُمْ سزا بعض دفعہ رنج کم کرنے کے لئے آداب اعصاب دی جاتی ہے تاکہ تم کو

(انتقام لینے کے بعد) اس بات پر (زیادہ) رنج نہ ہو۔ جو تم سے فوت ہو گئی تھی۔ یہ وہی بات ہے کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے اور انتقام لینے سے ندامت کم ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہے کہ ہم نے تم کو تھوڑی سی مصیبت اس لئے دے دی تاکہ بدوں سزا کے معافی دینے سے تم پر ندامت و رنج کا زیادہ غلبہ نہ ہو۔ بعض مفسرین نے اس جگہ لکھیلا تحزنوا میں لائے نافیہ کو زائد مانا ہے۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ موقع عتاب کا ہے اور سزا تو رنج دینے ہی کے لئے دی جاتی ہے۔ پھر اس کا کیا مطلب کہ تم کو اس لئے غم دیا تاکہ تم مافات پر رنج نہ کرو ان کے نزدیک لا کو اپنے معنی پر رکھ کر مطلب نہ بن سکا اس لئے انہوں نے لا کو زائد کہہ کر یہ مطلب بیان کیا کہ تم کو غم دیا تاکہ تم کو مافات پر رنج ہو مگر جس نے اس حالت کو سمجھا ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے وہ سمجھے گا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم خدا اور رسول کے عاشق تھے۔ اگر ان کی خطا بدوں کسی انتقام کے معافی کر دی جاتی تو عمر بھر مارے ندامت کے آنکھ نہ اٹھا سکتے۔ اس لئے ان کو تھوڑی سی مصیبت دے دی گئی تاکہ زیادہ رنج غالب نہ ہو۔ پس یہ کہنا غلط ہے کہ سزا ہمیشہ رنج دینے ہی کے لئے ہوا کرتی ہے بلکہ بعض دفعہ رنج کم کرنے کے لئے بھی سزا دی جایا کرتی ہے۔ اس حالت پر نظر کر کے تفسیر نہایت صاف ہے اور لا کو زائد کہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ (ذم النسیان)

وَلِيُبَيِّنَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُبَيِّنَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (آل عمران)

ترجمہ: اور جو کچھ ہو اس لئے ہوا تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے اور تاکہ تمہارے دلوں کی بات کو صاف کر دے اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں۔

شان نزول

اس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جب غزہ احد میں مسلمانوں کی صف بندی کی تو ایک گھائی کا جو مسلمانوں کی پشت پر تھی اور وہاں سے دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا یہ انتظام فرمایا کہ ایک دستہ مختصر جماعت کا اس کی حفاظت کے لئے مقرر فرما دیا کہ تم یہاں سے بدوں میری اجازت کے نہ ہٹنا۔ گو ہمارے اور کچھ ہی گزر جائے انبیاء علیہم السلام ہر قوت میں کامل ہوتے ہیں۔ انتظام میں بھی کامل ہوتے ہیں۔ انبیاء بھولے ہیں ہوتے۔ ان میں ضروری انتظام سب کامل ہوتا ہے۔

تمحیص و ابتلاء کا فرق

اس کے بعد وَلِيُبَيِّنَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ فرمانے میں نکتہ یہ ہے کہ تمحیص و ابتلاء میں فرق ہے جس کو ایک مثال سے سمجھو کہ سونے چاندی کو پرکھنے کا قاعدہ یہ ہے کہ اول کسوٹی پر رکھتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سونا چاندی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد اس کو آگ پر رکھتے ہیں تاکہ میل کچیل کو الگ کر دیا جائے پس وَلِيُبَيِّنَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ کا حاصل تو یہ تھا کہ نفس ایمان کی آزمائش کی جاتی ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے یا نہیں اور تمحیص کا حاصل یہ ہے کہ مصیبت کے ذریعہ سے ایمان کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے۔

رہا یہ کہ ایمان کے میل کچیل سے کیا مراد ہے تو سنئے بعض لوگوں کا ایمان و سواوس و معاصی سے مشوب ہوتا ہے۔ مصیبت کے ذریعہ سے سواوس و معاصی کا میل دھو دیا جاتا ہے کیونکہ مصیبت کی خاصیت یہ ہے کہ دل کو اللہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور وہ غفلت جو سواوس و معاصی سے قلب میں پیدا ہو گئی تھی مصیبت کے وقت دور ہو جاتی ہے۔ یہی تمحیص ہے اور یہ تفسیر اہل سنت کے مذہب پر سب سے زیادہ منطبق ہے کیونکہ وہ ایمان خالص و ایمان غیر خالص کے قائل ہیں بخلاف معتزلہ و خوارج کے کہ وہ معاصی کو مزیل ایمان یا موجب کفر کہتے ہیں۔ پس ان کے نزدیک یا ایمان اور عدم ایمان ہے خواہ ایمان و کفر۔ وہ ایمان ناقص و کامل کا فرق نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک معاصی سے ایمان زائل ہو جاتا ہے یا کفر بھی لازم آ جاتا ہے۔

غرض! مصائب میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے اور ایمان کے اندر معاصی و سواوس سے جو میل کچیل آ جاتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے اور اس تمحیص سے بندہ پر عبدیت غالب ہو جاتی ہے اور دعویٰ اور غرور اور تکبر کا میل و کچیل کم ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقت منکشف ہو کر سمجھ میں آ جاتا ہے کہ آدمی کبھی دعویٰ نہ کرے۔

اصلاح قلب

خلاصہ یہ کہ مصائب میں ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے استحضار عظمت ہوتا ہے اور عبدیت حاصل ہوتی ہے اس کی طرف **لِيُنَبِّئَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحَّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ** میں اشارہ کیا گیا ہے۔ رہا یہ کہ اس آیت میں ایک جگہ صدور کم اور ایک جگہ قلوبکم کیوں فرمایا اس میں اسلم یہ ہے کہ تفسیر پر محمول کیا جائے جیسا کشاف نے کہا ہے اور اگر نکتہ ہی کی ضرورت ہو تو احسن یہ ہے کہ کہا جاوے کہ دو لفظ اس لئے اختیار کئے گئے تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے۔ ای فعل ما فعل من واقعات جملة مصالح كثيرة منها ان يبئلي الله ما في صدوركم یعنی جو کچھ یہ واقعات ہوئے ہیں ان میں بہت سی حکمتیں ہیں منجملہ ان کے ایک حکمت یہ ہے کہ اس سے تمہارے دل کی بات کا امتحان مقصود تھا۔ دل کی بات سے مراد ایمان ہے کہ ان واقعات میں تمہارے ایمان کی آزمائش تھی کہ دیکھیں مصیبت کے وقت بھی ہم سے تعلق رکھتے ہو یا نہیں کیونکہ احسان کے وقت تو ہر شخص آقا سے راضی رہتا ہے۔ ہاں! جب وہ تنخواہ بند کر دے اس وقت بھی علاقہ رہے تو کہا جائے گا کہ واقعی اس کو تعلق ہے۔

کہ صدر باعتبار اپنی حقیقت کے ظاہر ہے کہ قلب بہ اعتبار اپنی حقیقت کے باطن ہے تو اس میں اشارہ اس پر ہے کہ کبھی ظاہر کی اصلاح سے باطن کی اصلاح ہوتی ہے اور کبھی باطن کی اصلاح سے ظاہر کی اصلاح ہوتی ہے یعنی کبھی اجلاء سے اولاد صدر کی اصلاح کی جاتی ہے جو کہ جوارج ہے اور اس کا اثر باطن تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی تمحیص سے قلب کی اصلاح کی جاتی ہے جو کہ باطن ہے اور اس کا اثر ظاہر تک پہنچ جاتا ہے۔ پس دو لفظ اختیار کرنے میں اشارہ اس پر تنبیہ کر دی گئی کہ کسی جانب میں ظاہر کی اصلاح سے باطن کی سہل ہو جاتی ہے اور کسی حالت میں برعکس غرض جس طرح بھی ہو اصلاح کرنا چاہیے۔

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔ اللہ سب باطن کی چیزوں کو خوب جانتے ہیں۔ میرے ذوق میں اس جملہ سے ایک شبہ کا جواب دیا گیا ہے وہ یہ کہ بعض لوگوں کو **لِيُنَبِّئَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحَّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ** سے یہ دوسرے

ہوسکتا ہے کہ دوا سے تو علاج اسی مرض کا ہوتا ہے جس کا ہم کو علم ہو اور ہم اس کے علاج کا قصد کریں۔ اور اگر ہم نے ایک مرض کا علاج کیا جس کا ہم کو علم تھا تو اس سے دوسرے مرض کا تو ازالہ نہ ہوگا جس کا علم نہیں۔ جیسے بعض لوگوں کو استغفار میں بھی یہی خیال ہے کہ توبہ و استغفار سے وہی گناہ معاف ہوتا ہے جس کا نام لیا جائے۔ یاد دل میں خیال کیا جائے اور جس گناہ کا اس وقت خیال بھی نہ ہو وہ معاف نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ ان لوگوں کو یہ دوسرے ہوا کہ مصائب سے تنجیص کامل نہ ہوگی کیونکہ ہم کو اپنے بہت سے امراض کا علم نہیں ہوتا اور بہت سے گناہ ہم کر کے بھول جاتے ہیں تو یہ گناہ کیونکر معاف ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذٰاتِ الصُّدُوْرِ میں اس شبہ کا جواب دیا ہے۔ تمہارا یہ گمان صحیح نہیں کہ علاج سے اسی مرضی کا ازالہ ہوتا ہے جس کا مریض کو علم ہو بلکہ طبیب کا علم کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلوب کی پوری حالت معلوم ہے۔ تو وہ ان مصائب سے سب امراض کا علاج کر دیں گے اور سارے گناہ دھو دیں گے اور استغفار میں بھی یہی بات ہے کہ اجمالی استغفار سب گناہوں کی مغفرت کے لئے کافی ہے۔

اسی طرح حدیث میں ہے وَاَسْتَغْفِرْ كَمَا تَعْلَمُ وَلَا تَعْلَمُ یہ دوسری رحمت ہے جو مصائب سے حاصل ہوتی ہے۔ پس ان منافع و مصالح کو پیش نظر رکھ کر مصیبت کی پریشانی کو ہلکا کرنا چاہیے اور مایوس نہ ہونا چاہیے اور آئندہ کے لئے بھی اعمال صالح کی پابندی کا عہد کرنا چاہیے کہ ہمیشہ عبدیت کا یہی برتاؤ رکھوں گا جو مصیبت میں تھا اور ان مضامین کو یاد کر کے غم و حزن کو کم کرنا چاہیے۔

وَلِيَّبْتَلِيَّ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيَّبْخَبْرَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذٰاتِ الصُّدُوْرِ

آیت غزوہ احد کے متعلق ہے جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جب غزوہ احد میں مسلمانوں کی صف بندی کی تو ایک گھائی کا جو مسلمانوں کی پشت پر تھی اور وہاں سے دشمن کے حملہ کا خطرہ تھا یہ انتظام فرمایا کہ ایک دستہ مختصر جماعت کا اس کی حفاظت کے لئے مقرر فرما دیا کہ تم یہاں سے بدوں میری اجازت، کے نہ ہٹنا۔ گو ہمارے اوپر کچھ ہی گزر جائے انبیاء علیہم السلام ہر قوت میں کامل ہوتے ہیں۔ انتظام میں بھی کامل ہوتے ہیں۔

غرض! حضور نے نقشہ جنگ کا اس طرح انتظام فرمایا کہ اس گھائی پر ایک دستہ فوج مقرر فرما دیا کہ اس طرف سے کفار نہ آسکیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو کفار پر حملہ کا حکم دیا تو تھوڑی ہی دیر میں کفار کو شکست ہوئی (اور ان کا جھنڈا زمین پر گر پڑا۔ سات دفعہ اس کو اٹھایا گیا مگر ہر دفعہ سرنگوں ہوا اور کفار بری طرح بھاگے) اب اس دستہ فوج میں جو گھائی پر متعین تھا اختلاف ہوا۔ اکثر کی یہ رائے ہوئی کہ اب ہم کو یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے بھائیوں کا پورا غلبہ حاصل ہو چکا ہے اور وہ کفار کے تعاقب میں جا رہے ہیں۔ ہم کو بھی اس جہاد و غنیمت میں حصہ لینا چاہیے۔ ان کے افسر نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور نے ہم کو یہاں سے بدوں اجازت کے ہٹنے سے منع فرما دیا ہے تم کہ یہاں سے نہ ہلنا چاہیے مگر بجز دس پانچ آدمیوں کے کسی نے افسر کی رائے نہ مانی اور زیادہ تعداد وہاں سے ہٹ کر قتال و غنیمت میں مشغول ہو گئی۔ یہاں سے آپ کو کثرت رائے کی حقیقت واضح ہوگی کہ کثرت رائے کا ہمیشہ حق پر ہونا ضروری نہیں

حضرت خالد کی قابلیت

یہاں اتنی بات سمجھ لینا چاہیے کہ ان صحابہ کا یہ خیال تو نہ تھا کہ اگر ہم غنیمت جمع نہ کریں گے تو غنیمت سے ہم کو حصہ نہ ملے گا کیونکہ شرکت غنیمت کے لئے شرکت جنگ لازم نہیں۔ غنیمت میں محافظان فوج بھی شریک کئے جاتے ہیں حالانکہ وہ جنگ میں شریک نہیں ہوتے بلکہ ان حضرات کو یہ خیال ہوا کہ بدوں شرکت جنگ کے شاید ہم کو جہاد کا ثواب نہ ملے یا کم ملے۔ اس خیال سے وہ گھائی چھوڑ کر تعاقب میں اور مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اس وقت تک حضرت خالد بن ولیدؓ مسلمان نہ ہوئے تھے بلکہ کفار کے ساتھ تھے اور جنگ آزمودہ ہمیشہ سے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کے جاسوس بہت چھپے ہوئے تھے (اور یہ ان کی جنگی قابلیت کی دلیل ہے کہ عین معرکہ کے وقت بھی جاسوس محکمہ کو اپنے فرائض انجام دینے پر مامور کر رکھا تھا) عین اس وقت جب کہ کفار بھاگے جا رہے تھے اور مسلمان ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ حضرت خالد کو جاسوس نے اطلاع دی کہ مسلمانوں کے عقب کی گھاٹ خالی ہو چکی ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت خالد نے اپنے کافی تعداد سواروں کو ساتھ لے کر گھائی کا رخ کیا اور دس پانچ صحابی جو وہاں جمع ہوئے تھے ان کو تیغ کر کے مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا حالت دیکھ کر کفار کا باقی ماندہ لشکر بھی بھاگتے بھاگتے رک گیا اور اس نے مڑ کر مسلمانوں پر حملہ کیا۔

اجتہادی غلطی

اب مسلمان دو طرف سے گھر گئے اور سخت مصیبت کا سامنا ہوا اس حالت میں شیطان لعین نے پکار دیا الا ان محمداً قد قتل کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے اس آواز کا صحابہ کے کانوں میں پڑنا تھا کہ ان کے قدم اکھڑ گئے کیونکہ قدم کا جتنا تو دل کے تابع ہے جب دل ہاتھ سے نکل گیا تو قدم کیونکر جمیں۔

پس صحابہ کے قدم اکھڑنے پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر ان کے قدم نہ اکھڑتے تو بعض کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان کے دل میں محبت نہ تھی رہا یہ کہ پھر اللہ تعالیٰ نے کیوں عتاب فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھاگنے اور قدم اکھڑنے پر عتاب نہیں فرمایا بلکہ معصیت رسول پر عتاب فرمایا ہے جو کہ فعل اختیاری تھا اور قدم کا اکھڑ جانا مغلوب الحال لوگوں کے لئے غیر اختیاری تھا اور گو اس معصیت میں بھی اجتہادی غلطی تھی (کہ گھائی والے صحابہ نے ثواب کا مدار مباشرت عمل کو سمجھا حالانکہ اس کا مدار محض اطاعت پر ہے خواہ بصورت عمل ہو یا بصورت ترک عمل) مگر اجتہادی غلطی پر بھی عتاب لطیف ہو سکتا ہے ہاں عتاب نہیں ہوتا۔

اجتہادی غلطی پر عتاب کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ تم نے پوری طرح سمجھ سے کام نہیں لیا۔ بہر حال واقعہ احد کی مصیبت میں حق تعالیٰ نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ اس سے تمہارے ایمان کی آزمائش مطلوب تھی کہ کون مخلص ہے کون منافق ہے۔ کیونکہ اس مصیبت کے وقت منافقین میں باہم سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ ان کو معرکہ میں آنے سے رنج تھا۔

کبھی کہتے۔ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ کہ ہمارا کچھ اختیار بھی ہے اور کبھی کہتے لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ

شئاً مَأْتِيْنَا هُنَا اگر ہمارا بس چلتا تو ہم یہاں اس طرح نہ قتل کئے جاتے اور صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ عین اس پریشانی میں بھی ان کو نیند آرہی تھی۔ چنانچہ ایک صحابی کے ہاتھ سے کئی بار تلوار گر پڑی۔ ایسے سو رہے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے چاروں طرف سے اسباب تخفیف جمع فرمادئے کہ معرکہ میں مسلمانوں کو سلا بھی دیا بعد میں عتاب کر کے رلا بھی دیا پھر ہنسنا بھی دیا۔ اور غور کیا جائے تو عتاب میں بھی عنایت تھی کیونکہ خطا پر اگر عاشق کو کچھ کہہ لیا جائے تو اس کے دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ بس محبوب نے دل کی بات ظاہر کر کے بدلہ لے لیا ہے۔ اب اس کے دل میں کچھ نہیں رہا اور اگر اس کو کچھ نہ کہا جائے تو سخت بے چین رہتا ہے اور بار بار یہ کہتا ہے کہ بدوں سزا کے چین نہ آئے گا۔ بدوں اس کے میری تسلی نہ ہوگی جیسے بعض صحابہ سے زنا کا صدور ہو گیا تھا۔ ان کو بدوں اجزائے حد کے چین نہ آیا۔ پس یہ عتاب بھی درحقیقت اسباب تخفیف ہی سے تھا)

اب آپ کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ ان مع العسر يسرا ان مع العسر يسرا کا مطلب کہ واقعی حق تعالیٰ مصیبت کے ساتھ ہی ایک راحت بھی دیتے ہیں اور اگر عسر کو واحد اور يسر کو متعدد مانو۔ جیسا مشہور قاعدہ ہے تو ایک عسر کے ساتھ دو يسر ہوئے۔

تلافی مصائب کی صورت

صاحبو! جو لوگ اہل ایمان ہیں ان کے لئے اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ عسر واحد پر يسرین کا ترتب ہوتا ہے۔ یہ آیت صحابہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ سب کے لئے عام ہے۔ پس مصیبت سے پریشان نہ ہوں بلکہ اس کو ہلکا کرنے کی کوشش کرو چنانچہ ایک تدبیر تو یہ ہے کہ اس وقت اپنے اعمال کو یاد کرے کیونکہ اکثر مصائب بوجہ اعمال سیدہ کے آتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبْتُمْ أَيْدِيَكُمْ تَمَّ كَوَاغِبًا رُوَّ جَوْ كَچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے۔

کہ جو مصیبت تم پر آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اس پر انبیاء کے مصائب سے شبہ نہ کیا جائے کیونکہ وہاں صرف صورتاً مصیبت ہوتی ہے حقیقتاً مصیبت نہیں ہوتی۔ کیونکہ گوانبیاء علیہم السلام کو مصیبت کے وقت بوجہ ادراک لطیف اور صفائی قلب کے رنج تو ہوتا ہے مگر پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ وہ معصوم ہیں ان تکالیف کا ورود معاصی کے سبب نہیں ہوتا پھر وہ پریشان کیوں ہوں پریشانی تو گناہ کا نتیجہ ہے۔

پس ہم کو مصیبت کے وقت اول تو اپنے گناہوں کو یاد کرنا چاہیے تاکہ اپنی خطا کا استحضار ہو کر مصیبت سے پریشان زیادہ نہ ہو کیونکہ اپنی خطا پر جو سزا ہوتی ہے اس سے دوسرے کی شکایت نہیں ہوتی بلکہ انسان خود نادم ہوتا ہے کہ میں اسی قابل تھا۔ پھر اجر کو یاد کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت کا بہت ثواب رکھا ہے حدیث میں آتا ہے کہ مسلمان کو جو ایک کانٹا لگتا ہے وہ بھی اس کے لئے ایک حسنہ ہے۔

ایک دفعہ حضور ﷺ کے گھر میں چراغ گل ہو گیا۔ آپ نے اناللہ پڑھا۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا یہ بھی مصیبت ہے فرمایا ہاں! جس چیز سے مسلمان کو تکلیف ہو وہ مصیبت ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ ہے جب ادنی ادنی

تکلیف پر ثواب کا وعدہ ہے تو زیادہ کلفت پر ثواب کیوں نہ ہوگا۔ پس ثواب کو یاد کر کے غم کو ہلکا کرنا چاہیے۔ پھر اس بات کو سوچے جو اس آیت میں بتلائی گئی ہے **وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ** کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت دے کر ہمارے ایمان کو آزمایا ہے کہ اس کو مصیبت میں بھی ہم سے تعلق ہے یا نہیں۔ پس مصیبت میں ثابت قدم رہنا چاہیے خدا کی شکایت نہ کرے۔ کوئی بات ایمان کے خلاف زبان و دل پر نہ لائے۔

غزوه احد

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنَةً نُّعَاسًا يَغْشَى طَآئِفَةً مِنْكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنْ الْأَمْرُ كُلُّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحَّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ

ترجمہ: پھر تم پر اتارا تنگی کے بعد امن کو۔ وہ اونگھ تھی کہ گھیر رہی تھی تم میں سے بعضوں کو اور بعضوں کو فکر پڑی تھی اپنی جان کی۔ خیال کرتے تھے اللہ پر جھوٹے خیال جاہلوں کے سے۔ کہتے تھے کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں تو کہہ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے اپنے جی سے چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں اگر کچھ کام ہوتا ہمارے ہاتھوں میں تو ہم مارے نہ جاتے اس جگہ آپ کہہ دیجئے اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھا تھا مارا ہی جانا اپنے پڑاؤ پر۔ اور اللہ کو آ ز مانا تھا جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور نکھارنا تھا جو کچھ تمہارے دل میں ہے اور اللہ کو معلوم ہے دل کی بات۔

سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے

یہ حاصل ہے مدلول آیات کا غزوه احد میں اول غلبہ مسلمانوں کو تھا اور آثار فتح کے نظر آتے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں سے بے حکمی ہوئی اور شکست ہوئی۔ اس میں بہت سے شہید ہو گئے اور جو میدان میں باقی رہے ان پر اونگھ آئی اور اس کے بعد سب رعب و دہشت جاتی رہی۔ سب نے حضور ﷺ کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی۔ جو لوگ اس میں ضعیف الایمان تھے انہوں نے کہا ہل لنا من الامر من شیء۔ ظاہر معنی تو اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار ہے اور یہ معنی نہایت اچھے ہیں مگر ان کی نیت میں یہ نہ تھا۔ بلکہ نیت میں تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے مشورہ پر عمل نہ کیا جو اتنے لوگ مرے اگر ہمارے مشورہ پر عمل کرتے تو کیوں مارے جاتے۔ حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ فرماتے ہیں **يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ** کہ دل کی بات آپ سے ظاہر نہیں کرتے ان کے دلوں میں تو یہ ہے **لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هُنَا** کہ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ آگے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم گھروں میں بھی ہوتے تو بھی موقع پر آ کر مارے جاتے بچ نہیں سکتے یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اس آیت میں جو یہ کلمہ ہے **هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ**۔ یہ کلمہ تو حق ہے (جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں اللہ نے جو چاہا سو کیا) مگر انہوں نے اس سے باطل مراد لیا کیونکہ ان کی نیت میں دوسری بات تھی کیونکہ ان کی مراد یہ تھی کہ **لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قَتَلْنَا هَهُنَا** (پس یہ قول) **هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ** (کیا کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں منافقین کا ہے اور وہ علی الاطلاق کفر کی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ ذو وجہین بات کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات انہوں نے ذو وجہین کہی۔

اس کا ایک عمل تو حق ہے۔ وہ عمل حق یہ ہے کہ وہ اعتقاد قدر ظاہر کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں۔ سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو اس نے چاہا وہ کیا۔ ظاہر تو یہ کر رہے ہیں مگر ان کے دل میں تھا کہ اگر ہمیں اختیار ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ پس وہ ظاہر تو کچھ کر رہے تھے اور دل میں ان کچھ اور تھا۔ سامنے تو اعتقاد حق ظاہر کیا جو اسلام کے موافق ہے اور دل میں یہ کہہ کر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا یعنی اگر ہمیں اختیار ہوتا تو مارے نہ جاتے۔ یہ اعتقاد اسباب کے مؤثر ہونے کا ہے۔ اور یہی ان کا عقیدہ تھا کہ اسباب مؤثر بالذات ہیں۔ پس اسی پر **يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مِمَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ** اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تم سے ظاہر نہیں کرتے۔ مرتب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں تو کچھ ہے اور ظاہر کچھ کر رہے ہیں۔ آگے اس کو بیان فرماتے ہیں **يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قَتَلْنَا هَهُنَا** کہتے ہیں کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں۔ کہ ان کے دلوں میں یہ ہے کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم مارے نہ جاتے آگے اس کا رد ہے۔ **قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَخ** دیجئے اگر تم گھروں میں بھی ہوتے اٹخ

مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارا خیال باطل ہے۔ تم کہیں بھی ہوتے جن کے لئے قتل لکھا گیا تھا وہ یہیں آ کر قتل ہوتے جا نہیں سکتے تھے غرض اس آیت سے ان کی تائید ہو گئی کہ سچی بات سے جھوٹی بات مراد لینا کس قدر برا ہے۔ یہی حال ہے اس شخص کا جو المرء مع من احب سے غرض باطل یعنی عدم ضرورت عمل پر تمسک کرتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَيْنِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۗ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ لَئِن لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا

ترجمہ: یقیناً تم میں جن لوگوں نے پشت پھیر دی جس روز کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئیں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دی ان کے بعض اعمال کے سبب سے اور یقیناً سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرمادیا۔ واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑے حلم والے ہیں۔

سابقہ گناہوں کے غم میں مبتلا رہنا مضر ہے

حاصل بیان کا یہ ہے کہ گناہوں کے غم میں مبتلا ہو جانا بعض اوقات بجائے نفع ہونے کے ضار ہو جاتا ہے اس میں مبالغہ نہ کرے ہاں ضروری تو بہ کر کے کام میں لگ جاوے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم چونکہ بعد توبہ کے بھی اس غم میں

بتلا تھے اور یہ کسی وقت میں مضر ہوتا حق تعالیٰ نے ان آیات میں اور ان کے سیاق و سباق میں اس غم کو خفیف فرمایا ہے چنانچہ ایک تسلی اور فرمائی فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بُغْيًا لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا الْآيَةَ اور اس تقریر پر لا کو زائد لکھنے کی بھی ضرورت نہیں بلکہ مطلب صاف ہے کہ ہم نے تم کو غم اس لئے دیا تھا کہ اس کو پاداش سمجھ کر تمہارا حزن ہلکا ہو جاوے کیونکہ مطیع کے لئے یہ بھی ایک موت ہے کہ اس کی خطا پر سزا نہ ہو وہ اس سے کچھ ہلکا ہو جاتا ہے کچھ سزا بھی دے دی جاوے دوسری تسلی اس آیت میں فرمائی لَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ تیسری تسلی بعد میں فرمائی فَبِأَنِ اللّٰهُ الْآيَةَ اور اگر غور کیا جاوے ان آیات میں اور بھی وجوہ تسلی کے متعدد ہیں مثلاً ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنًا ۗ وَرِثًا لِّمَن لَّمْ يَرْجُوا يَوْمَ الْحِسَابِ اور مثلاً قَدْ أَصَابَكُمْ مِثْلُهَا اور مثلاً وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ الْآيَةَ بس مقصود اس بیان سے یہ تھا اور انما استزلهم الخ سے ایک یہ فائدہ بھی ماخوذ ہوا کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب ہو جاتا ہے اس لئے جو گناہ چھوٹ جائے چھوڑ دو اس کے کچھ گناہوں کا سلسلہ تو کم ہوگا۔ اس کا انتظار نہ کرو کہ سب ہی چھوٹیں تو چھوڑو سبحان اللہ قرآن مجید کی کیا تربیت ہے اب وعدہ فرمائیے حق تعالیٰ فہم وتوفیق دے آمین (الجماع)

تفسیر عجیب آیت اذ تصعدون

اسی بنا پر ایک آیت کی تفسیر یاد آگئی وہ یہ کہ غزوہ احد کے قصہ میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو حضور کے علم میں کچھ خطا واقع ہوئی تھی وہ یہ کہ جس تا کہ پر حضور نے ثابت اور قائم رہنے کا امر فرمایا تھا بوجہ خطا اجتہادی کے اس پر قائم نہ رہے اس کے بارہ میں ارشاد ہے إِذْ تَصْعَدُونَ وَلَا تَلُونَ عَلَى لَحْدِ الرَّسُولِ يَدْعُوكُمْ فِي أَخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بُغْيًا لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک غم دیا بہ سبب اس کے کہ ہمارے رسول ﷺ کو تم نے غم دیا اور غرض اس غم دینے کی یہ فرمائی کہ تم لوگ غمگین نہ ہو تو بظاہر یہ فہم میں نہیں آتا اس لئے کہ غم تو اس لئے دیا جاتا ہے تاکہ حزن ہو نہ کہ اس لئے کہ غم نہ ہو اسی واسطے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لازماً ہے مطلب یہی ہے کہ غم اس لئے دیا تاہم کو حزن ہو لیکن الحمد للہ میری سمجھ میں اس کی تفسیر ایسی آئی ہے کہ اس تقدیر پر لامانے کی ضرورت نہیں ہے اور معنی بے تکلف درست ہیں وہ یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حق تعالیٰ سے نہایت شرماتے تھے جب ان سے یہ خطا واقع ہوئی تو ان کا جی چاہتا تھا کہ ہم کو سزا اس کی دنیا میں مل جائے تو ہماری طبیعت صاف ہو جاوے اور اپنے مالک حقیقی سے سرخرو ہو جائیں اگر سزا نہ ہوتی تو ساری عمر رنجیدہ رہتے اور یہ غم ان کے نزدیک نہایت جانکاہ و جان فرسا تھا اس بناء پر فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اس خطا کی یہ سزا دیدی تاکہ تم کو غم نہ ہو غرض کہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک تو وہ جو سزا کا نام سن کر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے تو جو بے حیا تھے وہ تو یوں رکے کہ یعلم میں اشارہ کی سزا کی طرف بھی ہے چنانچہ مفسرین ایسے مقام پر فہم جازیکم بہ فرماتے ہیں اور دوسرے مذاق والے اس لئے رکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ اکبر وہ جانتے ہیں بہر حال یہ دونوں مذاق والوں کے لئے وعید ہے اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مرض نہایت اہتمام کے قابل ہے۔

بدزگاہی سے بچنے کے اہتمام کی ضرورت

اب ہم کو اپنی حالت دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اندر اس معصیت سے بچنے کا کتنا اہتمام ہے میں دیکھتا ہوں کہ شاید ہزار میں ایک اس سے بچا ہوا ہو ورنہ ابتلائے عام ہے اور اس کو نہایت درجہ خفیف سمجھتے ہیں جو جوان ہیں ان کو تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جن کی قوت شہویہ ضعیف ہو گئی ان کو احساس بھی نہیں ہوتا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو شہوت ہی نہیں اس لئے کچھ حرج نہیں ہے سو ان کو مرض کا بھی پتہ نہیں لگتا اور بعضوں کو اور دھوکہ ہوتا ہے وہ یہ کہ شیطان بہکاتا ہے کہ جیسے کسی پھول اچھے کپڑے اچھے مکان وغیرہ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے ایسے ہی اچھی صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے سو یہ بالکل دھوکہ ہے۔

فِيمَا رَحِمَةً مِّنَ اللَّهِ لَئِن لَّهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا

مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا

عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۳۱۰﴾

ترجمہ: بعد اس کے کہ خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خوخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ ﷺ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر لو اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔

تفسیری نکات

احباب سے مشورہ

بس فِيمَا رَحِمَةً مِّنَ اللَّهِ لَئِن لَّهُمْ اس کی تمہید ہے اور فاعف عنهم مقصود ہے اور سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اسی پر اقتصار نہیں فرمایا۔ آگے اس کے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ بڑھایا یعنی آپ بھی معاف فرما دیجئے کہ ہم سے بھی درخواست کیجئے کہ ہم معاف کر دیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی معاف فرمادیا تھا تو وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اب تحصیل حاصل ہے بات یہ ہے کہ وہ معافی تو قانونی ہے اس کا اثر تو یہ ہے کہ عذاب سے نجات ہو جاوے گی اب دوسری قسم جو معافی کی ہے یعنی دفع کدورت جس کا سبب فاعف عنهم ہوگا لیکن سبب کا وجود تو وجود مسبب کے لئے علت تامہ نہیں یعنی آپ کے معاف کر دینے سے بدوں حق تعالیٰ کے تصرف کے دفع کدورت تو ضروری نہیں کیونکہ وہ آپ کے اختیار میں تو نہیں اس لئے حق تعالیٰ نے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ کا امر فرمایا یعنی مغفرت کی قسم دوم کے وجود کی ہم سے درخواست کیجئے اور یہاں تک قسمیں متحقق ہو گئیں لیکن اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ حالت اصلی انشراح کی لوٹ آئی مگر یہاں اور چیز کی بھی

ضرورت ہے وہ کیا یعنی اس انشراح کی ترقی کیوں کہ اعمال میں آئندہ کو ترقی موقوف ہے زیادہ انشراح پر پس رحمت پر رحمت اور نعمت پر نعمت حق تعالیٰ کی دیکھئے کہ آگے اس کی تدبیر بھی ارشاد فرماتے ہیں تاکہ ہماری یہ مقبول جماعت کسی پہلو سے ناقص نہ رہے چنانچہ فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ لِيُنَبِّئَكَ مِنْ شِئْنِهِمْ وَتُصْلِحَ لَكَ أَمْرُكَ إِنَّكَ لَا تُلَاقِيَهُمْ بِغَيْرِ الْمَعْرَافَةِ (سورہ آل عمران)۔

ترقی پذیر ہو کر وسیلہ ترقی مراتب کا ہوگا اس لئے کہ مشورہ کے اندر جو مصلحتیں خاص نفس مشورہ کے اعتبار سے ہیں ان کے علاوہ ایک اور عجیب خاصہ ہے وہ یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دیکھئے مشورہ کس سے لیا کرتے ہیں مشورہ اس شخص سے لیا کرتے ہیں کہ جس میں وہ وصف پائے جاویں اول تو اس پر پورا وثوق اور نہایت اطمینان اور اعتماد ہو اور اس کو اپنا خیر خواہ اور اس سے خصوصیت سمجھی جاوے دوسرے جس امر میں مشورہ کیا جاوے اس کے اندر وہ صاحب بصیرت ہو اسی واسطے بعض مرتبہ بھائی سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ دوست سے کرتے ہیں۔

اصلاح میں نرمی اور سختی دونوں درکار ہیں

واقعہ تبوک میں اصلاح کے لئے سختی کی گئی اور واقعہ احد میں اصلاح کے بعد فاعف عنہم (پس آپ ان کو معاف کر دیجئے) فرمایا بعض مہلین کو وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظًا لَفَقَطْنَا مِنَ الْقَلْبِ لَا نَفْضُوا مِنْ حَوْلِكَ (اگر آپ تند خو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے) سے غلطی ہو گئی کہ انہوں نے مطلقاً نرمی کو مطلوب سمجھا حالانکہ نرمی مطلقاً محبوب نہیں ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ فَرَأَيْتَ فِي حِكْمَتِ

اللہ تعالیٰ نے جب عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ فرمادیا تو حضور ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کی خطا کو کیوں معاف نہ فرماتے بس فقط تطیب قلب صحابہ کے لئے اس کی اطلاع کی ضرورت تھی کہ حضور ﷺ نے بھی معاف کر دیا کیونکہ صحابہ کے اس طبیعی رنج کے ازالہ کا طریقہ یہی تھا کہ حضور ﷺ بھی زبان مبارک سے معاف فرمادیں کہ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ (میں نے تم کو معاف فرمادیا کیونکہ عاشق کی اس کے بغیر تسلی نہیں ہوتی)

جلالت شان رسول اکرم ﷺ

وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے) میں اول حضور اکرم ﷺ کی جلالت شان کا اظہار ہے کہ مسلمانوں کو متنبہ کر دیا گیا کہ تمہاری معافی کی تکمیل حضور اکرم ﷺ کے استغفار کے بعد ہوگی دوسرے اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا تطیب قلب ہے کیونکہ وہ اکثر خطاؤں کے لئے حضور ﷺ سے استغفار کی درخواست کیا کرتے تھے اور اس واقعہ میں خطا ایسی ہوئی تھی جس سے حضور ﷺ ہی کو ملال پہنچا اس لئے اس واقعہ میں وہ خود استغفار کی استدعا کرتے ہوئے شرماتے مگر طبعاً ان کو یہ ضرور خیال ہوتا کہ اگر حضور ﷺ نے ہمارے لئے استغفار نہ کیا تو اس درجہ کی معافی نہ ہوگی جو حضور کے استغفار کے بعد ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے کہ کریم کے بیٹے کی سفارش پر کچھ زائد ہی مل جاتا ہے اور حق تعالیٰ تو اولاد

سے پاک ہیں مگر حضور ﷺ سے حق تعالیٰ کو ایسی محبت ہے کہ کسی باپ کو اولاد سے بھی نہیں ہو سکتی اس لئے حضور ﷺ کی سفارش کے بعد مغفرت کاملہ کی یقینی امید ہے۔

عظمت صحابہ

واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں اس کے حروف سے بھی زیادہ علوم ہیں اور یہ بات بالکل بلا مبالغہ ہے مگر ان علوم کے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے توفیق خداوندی کی۔ جس کا ایک شعبہ علم عربیت بھی ہے تو یہ علوم محض توفیق سے عطا ہوتے ہیں۔ تیسرا نکتہ **وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ** (آپ ان کے واسطے استغفار کیجئے) میں یہ ہے کہ حضور ﷺ کی معافی سے صحابہ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ نے خطا معاف کر دی مگر اس سے وہ اجنبیت کیسے دور ہو گئی جو خطا سے پیدا ہو گئی تھی اس کے لئے تو خصوصیت کی ضرورت ہے ورنہ معافی کی تو ایک یہ بھی صورت ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے کر کہہ دے کہ ہم نے سب خطا میں معاف کیس کیا اس معافی سے تعلقات شکستہ ہو گئے ہرگز نہیں تو حق تعالیٰ نے **فَاعْفُ عَنْهُمْ** (آپ ان کو معاف کر دیجئے) کے بعد **وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ** (آپ ان کے لئے استغفار کیجئے) بڑھا کر یہ بتلایا ہے کہ صرف عفو خطا کافی نہیں بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ آپ صحابہ سے خصوصیت کا برتاؤ کریں کہ پہلے کی طرح اس واقعہ میں بھی ہم سے ان کی مغفرت کی درخواست کریں۔ و نیز ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ اوپر جیسا دوسرے نکتہ میں بیان ہوا ہے کہ اس واقعہ میں صحابہ یہ خود کیسے کہتے کہ ہمارے واسطے استغفار کر دیجئے وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضور ﷺ ہی خود ہم سے خفا ہیں۔ پس جب وہ یہ عرض نہ کر سکے تو خدا نے ان کا کام کر دیا۔ حاصل اس نکتہ کا صحابہ کی شان تفویض کا اور اس کی برکات کا اظہار ہے جیسا کہ بچہ کے سب کام کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ خود نہیں کر سکتا۔

طفل تا گیراتا پویا نبود مرکبش جز گردن بابا نبود

(بچہ جب تک ہاتھ سے پکڑنے کے اور پاؤں سے چلنے کے قابل نہیں ہوتا تو بابا کی گردن پر چڑھا چڑھا پھرتا ہے) یعنی چونکہ بچہ ہاتھ پاؤں سے کچھ کام نہیں کر سکتا اس لئے حق تعالیٰ خود اس کے سارے کام بنا دیتے ہیں اور جب خود کرنے لگے اس کا بوجھ اسی پر ڈال دیتے ہیں۔ بس جس نے یہ نکتہ سمجھا وہ مفلوج ہو گیا مگر تم خود اپنی رائے سے مفلوج نہ بننا بلکہ کسی محقق شیخ کی اجازت سے ایسا کرنا چاہیے اور حضرات صحابہ پر اپنے کو قیاس نہ کرنا چاہیے کیونکہ صحابہ حدود کو جانتے تھے اس لئے ان کی خاموشی بدوں صریح اجازت کے بھی محدود تھی بہر حال **وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ** (آپ ان کے لئے استغفار کیجئے) میں خصوصیت کے برتاؤ کا امر ہے اور انہیں خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ **وَلَشَأَوْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (اور آپ خاص خاص باتوں میں سے ان سے مشورہ کر لیا کیجئے) کہ بعض معاملات میں جو محل ہیں مشورہ کے ان سے مشورہ کیا کیجئے۔ یہاں الامر میں لام عہد کا ہے اس کی توضیح کے لئے ایک مسئلہ بتاتا ہوں وہ یہ کہ مشورہ ہر کام میں نہیں ہوا کرتا چنانچہ جو کام خیر محض ہو کہ اس میں کسی ضرر کا احتمال ہی نہ ہو اس میں مشورہ کی کوئی ضرورت نہیں مثل مشہور ہے۔ درکار خیر حاجت یج استخارہ نیست (کار خیر میں استخارہ کی کچھ ضرورت نہیں ہے) میں نے اس میں تصرف کر کے اس مصرعہ کو اس طرح بنایا ہے

درکار خیر حاجت ہیج استشارہ نیست (کار خیر میں مشورہ لینے کی ضرورت نہیں ہے) اور دونوں کا ایک ہی حکم ہے اگر شرکا احتمال نہ ہو تو استشارہ اور استخارہ دونوں مسنون ہیں ورنہ نہیں۔

مشورہ میں حکمت

غرض مشورہ کی ہر جگہ ضرورت نہیں اس لئے لام عہد سے فرمایا وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ای فی بعض الامر المعلوم لک (آپ ان سے مشورہ لیتے رہا کریں یعنی بعض امور میں جو آپ کو معلوم ہیں) اور جہاں لام استغراق کا نہ ہو وہاں عہد ہی کا ہوتا ہے ائمہ فن نے اس کی تصریح کی ہے بلکہ محققین کا قول یہ ہے کہ لام میں اصل عہد ہی ہے جہاں عہد نہ بن سکے وہاں دوسرے معانی پر محمول کیا جاتا ہے اور یہاں کوئی شخص یہ سوال نہیں کر سکتا کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی حاجت تھی یا نہ تھی کیونکہ یہ امر تو صحابہ کی تطیب کے لئے تھا باقی اصل مشورہ کی ضرورت سے سکوت ہے اور اس میں روایتیں مختلف ہیں ان میں تطبیق دیتا ہوں۔ ایک روایت میں تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو مشورہ کی ضرورت نہیں مگر امت پر رحمت کے لئے تطیب قلب بھی اس میں داخل ہے کر لیتا ہوں اخرجہ ابن عدی او البیہقی فی الشعب بسند حسن عن ابن عباس لما نزلت و شاورهم فی الامر قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اما ان الله ورسوله یغنیان ولكن جعلها الله تعالیٰ رحمة لامتی کذا فی روح المعانی (ابن عدی اور بیہقی شعب الایمان میں ابن عباس سے مسند حسن سے روایت کیا ہے جبکہ آیت شاورهم فی الامر نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ تو مسطنی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے رحمت اس کو بنا دیا ایسے ہی روح المعانی میں ہے) اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حاجت مشورہ کی نہ تھی اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابو بکر، عمر رضی اللہ عنہما کے مشورہ کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے اخرجہ الامام احمد عن عبد الرحمن بن غنیم ان رسول الله ﷺ قال لابی بکر و عمر لو اجتمعما فی مشورة ما خالفتكما کذا فی روح المعانی ایضا (امام احمد نے عبد الرحمن بن غنیم سے روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے ابو بکر و عمر سے فرمایا اگر تم دونوں کسی مشورہ میں متفق ہو جاؤ گے تو میں تمہاری مخالفت نہ کروں گا ایسے ہی روح المعانی میں ہے) مراد انتظام و بعث عسا کرو غیرہ کا کام۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی ضرورت ہوتی تھی دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ حضور ﷺ کو غالب اوقات میں تو مشورہ کی حاجت نہ ہوتی تھی کبھی کبھی اتفاقاً ضرورت پڑ جاتی تھی اور یہ بات شان نبوت کے خلاف نہیں بلکہ مناسب شان ہے۔ میں نے اس میں ایک نکتہ نکالا ہے کہ حضور ﷺ کو مشورہ کی حاجت ہونے میں ولو فی بعض الاحوال (اگرچہ بعض حالتوں میں ہو) حکمت ہے کیونکہ حاجت منافی الوہیت ہے اس میں حضور ﷺ کی شان شریف کا اظہار تھا کہ حضور ﷺ نبی ہیں اللہ نہیں اور بعض علماء نے حضور ﷺ کے مشورہ کی حکمت تعلیم امت بیان کی ہے۔

اب مشورہ کے بعد حضور ﷺ کے اختیارات کی وسعت بیان فرماتے ہیں فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدا پر اعتماد کیجئے) اس میں مطلقاً یہ فرمایا کہ مشورہ کے بعد جدھر آپ کا عزم ہوا اپنے عزم پر عمل

کیجئے اس میں قید نہیں ہے کہ حضور ﷺ کی رائے سب کے خلاف ہو یا ایک کے موافق اور اکثر کے خلاف ہو ہر حال میں تو کلا علی اللہ (اللہ پر بھروسہ کر کے) اپنے عزم پر عمل کرنے کے واسطے حکم فرمایا۔

قرآن حکیم سے سلطنت شخصی کا ثبوت

یہاں سے جڑ کھتی ہے سلطنت جمہوری کی کیونکہ اس میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور محض مشورہ کرنے سے کثرت رائے پر فیصلہ کرنا لازم نہیں آتا اس لئے و مشاور ہم سے سلطنت جمہوری پر استدلال نہیں ہو سکتا اور اگر کھینچ تان کر کوئی اس سے استدلال کرتا بھی تو **فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ** (پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدا پر اعتماد کیجئے) نے اس کو بالکل ہی اڑا دیا اور اس سے مشورہ کو بیکار نہ کہا جاوے کہ جب اس پر عمل نہ کیا تو نفع ہی کیا ہوا دراصل مشورہ میں یہ فائدہ ہے کہ اس سے معاملہ کے ہر پہلو پر نظر پہنچ جاتی ہے اس کے بعد جو رائے ہوگی اس میں سب مصالح کی رعایت ہوگی اسی واسطے کہا گیا ہے **رَايَانَ خَيْرٌ مِنَ الْوَاحِدِ** (دو رائیں ایک رائے سے بہتر ہے) یہ حاصل ہے مشورہ کا نہ یہ کہ عوام کی رائے کو بادشاہ کی رائے پر ترجیح دی جائے جیسا کہ جمہوری سلطنت میں ہوتا ہے وہ بادشاہ ہی کیا ہوا جو رعایا کی رائے پر مجبور ہو گیا۔ اسلام میں یہ حکم نہیں بلکہ اس کو پورے اختیارات ہیں۔ ہاں البتہ انتخاب سلطان کے وقت جمہور اہل حل و عقد کی کثرت رائے معتبر ہے جبکہ وہ رائے خلاف شرع نہ ہو بہر حال **وَنَشَاؤُهُمْ فِي الْأَمْرِ** (آپ بعض بعض باتوں میں ان سے مشورہ لیتے رہا کریں) تو جمہوری سلطنت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ البتہ ایک اور آیت سے بظاہر اس پر استدلال ہو سکتا ہے شاید وہ کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی ہو مگر میں اس کو بیان کرتا ہوں مع جواب کے کوئی صاحب فقط **لَا تَقْرَبُوا** (مت قریب جاؤ) کو نہ دیکھیں بلکہ **وَأَنْتُمْ سُكَّارِي** (اس حال میں کہ نشہ کی حالت میں ہوں) کو بھی دیکھیں یعنی جواب کو بھی ساتھ ہی ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔ وہ آیت یہ ہے **وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقْوِمُوا ذِكْرًا وَانْعَمُوا لِلّٰهِ عَلَيْهِ كَمَا إِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلْنَاكُمْ مَلُوكًا** (اور جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم میں نبی بنائے اور تم سب کو بادشاہ بنایا) اس میں حق تعالیٰ شانہ نبی اسرائیل پر انعام نبوت کے مضمون میں تو ارشاد فرماتے ہیں **جَعَلْنَا فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ** یعنی تم میں نبی بنائے اور انعام سلطنت کے بارے میں ارشاد ہے **جَعَلْنَاكُمْ مَلُوكًا** یعنی تم سب کو بادشاہ بنایا (اس سے معلوم ہوا کہ ان کی بادشاہت جمہوری تھی اور نہ یہاں بھی یوں فرمایا جاتا جعل فیکم ملوکا کہ تم میں بادشاہ بنائے جیسا کہ نبوت کے متعلق فرمایا یہ تو دلیل ہوئی اور اس کے دو جواب ہیں ایک عقلی ایک نقلی۔ عقلی جواب تو یہ ہے کہ فاتح قوم کا رعب شاہی عام ہوتا ہے نیز جس قوم میں بادشاہت ہوتی ہے اس کے ہر فرد کا حوصلہ بڑھا ہوا ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے کو فاتح اور سلطان سمجھتا ہے قوم مفتوح کے مقابلہ میں اس لئے جعلکم ملوکا (تم سب کو بادشاہ بنایا) فرمایا یہ نہیں کہ وہ سب کے سب بادشاہ تھے اور نقلی دلیل یہ ہے کہ جب ہماری شریعت میں شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اگر نبی اسرائیل کے لئے جمہوری سلطنت بھی مان لیں تو وہ منسوخ ہو چکی اور ہمارے لئے حجت نہیں ہو سکتی۔ غرض قرآن شریف سے تو سلطنت شخصی ہی ثابت ہوتی ہے۔ اب جو اہل اسلام میں جمہوریت کے مدعی ہیں وہ یاد

رکھیں کہ ہمارے ذمہ شخصیت پر دلیل قائم کرنا لازم نہیں بلکہ دلیل ان کے ذمہ ہے اور ہم تو مانع ہیں پس جب وہ دلیل لاویں گے اس کا جواب بھی ان شاء اللہ ہم دیں گے اور میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ وہ اپنے دعوے پر کوئی دلیل نہیں لا سکتے۔

توکل اور اس کے درجات

اور فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (خدا ہی پر اعتماد رکھئے) میں یہ بھی بتلا دیا کہ باوجود مشورہ کرنے سے جو کہ اسباب رویت صواب سے ہے خدا ہی پر اعتماد رکھئے مشورہ کے بعد کام بنانے والا وہی ہے۔ مشورہ پر اعتماد نہ کرنا چاہیے آگے فرماتے ہیں إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (بے شک اللہ تعالیٰ اعتماد رکھنے والوں کو پسند فرماتے ہیں) اس میں مسلمانوں کو امر و جوبی ہے توکل کا ہر کام میں خدا ہی پر نظر رکھیں دلیل و جوب کی یہ ہے کہ یہاں یسحب فرمایا ہے جس سے مقابلہ کی بناء پر لازم آیا کہ لا یسحب غیر المتوکلین وہ غیر اعتماد رکھنے والوں کو پسند نہیں فرماتے ہیں اور قرآن کا محاورہ یہ ہے کہ لا یسحب اپنے لغوی معنی پر مراد نہیں بلکہ بغض کے معنی میں ہے پس یسحب المتوکلین کو یبغض غیر المتوکلین (غیر اعتماد رکھنے والے کو مبغوض رکھتے ہیں) لازم ہے اور عدم توکل کا مبغوض ہونا دلیل ہے توکل کے وجوب کی البتہ توکل کے مراتب مختلف ہیں اس کا ہر درجہ فرض نہیں اس لئے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ فرض کا درجہ کیا ہے۔ اس کی تفصیل سنو توکل کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ اعتقاداً ہر حال میں خالق پر نظر رہے اسی پر اعتماد ہو یہ تو فرض ہے یعنی اسباب ہوں یا نہ ہوں ہر حال میں بھروسہ خدا پر ہو اصلی کارساز اسی کو سمجھیں اسباب پر نظر نہ رکھیں۔ دوسرا درجہ توکل کا عملی ہے یعنی ترک اسباب اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ سبب کسی ضروری مقصود دینی کے لئے ہے تو اس کا ترک حرام ہے۔ جیسا کہ اسباب جنت میں سے نماز وغیرہ ہیں ان کا ترک جائز نہیں اور اگر مقصود دنیوی کا سبب ہے تو پھر اس میں بھی تفصیل ہے کہ اگر عاۓہ اس مقصود کا توقف ثابت اور وہ مسبب مامور بہ ہے تو اس کا ترک بھی حرام ہے جیسے کھانا سبب شبع ہے اور پانی پینا سبب ارتواء ہے ان اسباب کا ترک جائز نہیں اور اگر سبب پر مقصود دنیوی کا ترتب ضروری اور موقوف نہیں تو اتویا کے لئے اس کا ترک جائز بلکہ بعض صورتوں میں افضل ہے اور اگر اشتغال میں کوئی دینی ضرر ہے تو اس کا ترک واجب ہے۔ مقصود آیت کا یہ ہے کہ حضور ﷺ ہمارے حق میں رحمت ہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نہایت رحیم کریم بنایا ہے۔

یارب تو کریم و رسول تو کریم صد شکر کہ ہستم میان دو کریم

لیکن آیت کو ختم فرمایا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ پر جس سے مفہوم ہوا کہ تدبیر تو کرے لیکن اصل مقصود تدبیر کے وقت بھی توکل اور خدا پر نظر رکھنا چاہیے۔ تدبیر کی مشروعیت کی علت تو محض ہمارا ضعف ہے اور اظہار ہے غایت افتکار کا کہ اے اللہ ہم ایسے مضبوط نہیں کہ آپ کی بنائی ہوئی چیزوں کے محتاج نہ ہوں (التوکل)

فِيمَا رَحِمْتَهُمْ مِنَ اللَّهِ لَئِن لَّوَكُنْتَ فَعَا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ إِنَّ يَنْصُرْكُمْ
اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَنْصُرْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرْكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

ترجمہ: بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خوخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے۔ سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں سو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے بے شک اللہ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہی جو تمہارا ساتھ دے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے۔

شان نزول

یہ دو آیتیں ہیں جو اپنی خصوصیت شان نزول کے اعتبار سے ایک خاص مقصود کے واسطے نازل ہوئی تھیں جس کا حاصل جناب رسول ﷺ سے خطا معاف کرانا ہے بعض مقصرین صحابہ رضی اللہ عنہم کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ میں سے بعض سے حضور ﷺ اس لئے ناخوش ہو گئے تھے کہ ان سے کچھ کوتاہی جس کا حاصل کسی قدر تجاوز ہے حدود شرعیہ سے ہو گئی تھی گو صحابہ اس میں معذور تھے اس لئے کہ بقصد تجاوز ان سے وہ کوتاہی نہیں ہوئی تھی اور حضور ﷺ بھی حق بجانب تھے اس لئے کہ گو تعدد نہ تھا لیکن تاہم غفلت تو تھی اس لئے حضور ﷺ قدرے ناخوش ہو گئے تھے مگر حق تعالیٰ کی تو بڑی رحمت ہے اور نیز نظر ہے بندے کے عذروں پر بلکہ بندہ کو اپنے بعضے وہ عذر معلوم بھی نہیں جو حق تعالیٰ کو معلوم ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندہ کو اپنے نفس پر وہ رحمت نہیں ہے جو خالق تعالیٰ شانہ کو اس کے حال پر ہے۔

باری عز اسمہ چاہتے ہیں کہ ہمارے رسول ﷺ کے صحابہ اس سے بھی پاک ہو جاویں اور یہ کیفیت ان میں نہ رہے اس لئے ارشاد ہے کہ آپ بھی معاف فرمادیں پس فَمَا رَحِمْتُمْ قَبْلَ اللَّهِ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ اور فَاَعْفُ عَنْهُمْ مقصود ہے سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اسی پر اقتصار نہیں فرمایا آگے اس کے واستغفر لہم بڑھایا یعنی آپ ہی معاف فرما دیجئے اور ہم سے بھی درخواست کیجئے کہ ہم معاف کر دیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی معاف فرمادیا تھا تو وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اب تحویل حاصل ہے بات یہ ہے کہ وہ معافی تو قانونی ہے اس کا اثر تو یہ ہے کہ عذاب سے نجات ہو جاوے گی اب دوسری قسم جو معافی کی ہے یعنی دفع کدورت جس کا سبب فاعف عنہم ہوگا لیکن سب کا وجود تو وجود سبب کے لئے علت تامہ نہیں یعنی آپ کے معاف کر دینے سے بدون حق تعالیٰ کی تصرف کی دفع کدورت تو ضرور نہیں کیونکہ وہ آپ کے اختیار میں تو نہیں اس لئے حق تعالیٰ نے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ کا امر فرمایا یعنی مغفرت کی قسم دوم کے وجود کی ہم سے درخواست کیجئے اور یہاں تک دونوں قسمیں متحقق ہو گئیں لیکن اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ حالت اصلی انشراح کی لوٹ آئی مگر یہاں اور چیز کی بھی ضرورت ہے وہ کیا یعنی اس انشراح کی ترقی کیونکہ اعمال میں آئندہ کو ترقی موقوف ہے زیادہ انشراح پر پس رحمت پر اور نعمت پر نعمت حق تعالیٰ کی دیکھئے کہ آگے اس کی تدبیر بھی ارشاد فرماتے ہیں تاکہ ہماری یہ مقبول جماعت کسی پہلو سے ناقص نہ رہے چنانچہ فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی ان سے کام میں مشورہ بھی کیجئے کہ اس

سے ان کا انشراح ترقی پذیر ہو کر وسیلہ ترقی مراتب کا ہو گا اس لئے کہ مشورہ کے اندر جو مصلحتیں خاص نفس مشورہ کے اعتبار سے ہیں ان کے علاوہ ایک اور عجیب خاص ہے وہ یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ دیکھئے مشورہ کس سے لیا کرتے ہیں مشورہ اس شخص سے لیا کرتے ہیں کہ جس میں دو وصف پائے جاویں اول تو اس پر پورا وثوق اور نہایت اطمینان اور اعتماد ہو اور اس کو اپنا خواہ اور اس سے خصوصیت سمجھی جاوے دوسرے جس امر میں مشورہ کیا جاوے اس کے اندر وہ صاحب بصیرت ہو اسی واسطے بعض مرتبہ بھائی سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ دوست سے کرتے ہیں۔ غرض مشورہ ہر شخص سے نہیں لیا جاتا پس جس شخص سے مشورہ لیا جاوے گا تو اس کو پہلے سے اور زیادہ تعلق بڑھ جاوے گا اس لئے کہ وہ اس سے استدلال کرے گا کہ ہماری بات پر اس کو پورا اطمینان ہے ہماری دیانت پر اس کو اعتماد ہے اور ہم کو اس قابل سمجھتا ہے کہ ہم سے امر خاص میں مشورہ لیا جاوے اس سے دل بڑھ جاوے گا اور دل کے بڑھ جانے کو بڑا داخل ہے اعمال صالحہ کی ترقی میں پس یہ راز ہے اس کا کہ حضور ﷺ کو امر فرمایا کہ ان سے مشورہ لیجئے تاکہ وہ انشراح ان کا اور زیادہ بڑا ہو کر سبب ہو جاوے اعمال صالحہ کے اندر ترقی کا جو سبب ہے قرب کا۔

سلطنت جمہوری کا ثبوت قرآن پاک سے نہیں ملتا

غضب یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے اور دلیل ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ كُوْشٍ كَرْتِے ہیں اس استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص نے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا مِمَّا أَوْشَتَاكُمْ سے یہ فتویٰ لکھا تھا اور وہ فتویٰ میں نے بھی دیکھا تھا کہ جمع ہو کر کھانا واجب ہے۔ اگر سلطنت جمہوری کی حقیقت صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ جس میں صرف مشورہ ہو تو بے شک یہ استنباط صحیح تھا سلطنت جمہوری میں تو یہ ہوتا ہے کہ مشورہ کے بعد کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور بادشاہ کی رائے دورائے کے برابر سمجھی جاتی ہے اور اس آیت سے اس کے خلاف سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ كُوْشٍ كَرْتِے کے بعد ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ صِيغَةً مفرد مخاطب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مشورہ تو کیجئے لیکن مشورہ کے بعد عمل اس پر کیجئے جس کا آپ عزم کر لیں اور اس میں کوئی قید ہے نہیں تو اس میں سب مختلف صورتیں آگئیں ان صورتوں میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ سب کی رائے ایک جانب ہو اور حضور ﷺ کی رائے ایک طرف تو اس صورت میں بھی آپ ہی کے عزم اور ترجیح پر مدار رہا پس اس سے تو سلطنت جمہوری کا اثبات نہیں ہوتا بلکہ سلطنت جمہوری کی بناء ہی اس سے منہدم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایسا نہیں ہوتا غرض اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کثرت رائے سے ہو گا بلکہ سلطان مشورہ کے بعد مستقل و مستعد ہے کہ اپنی بصیرت خدا داد سے جس صورت کو چاہے اختیار کر لے۔

مشورہ کی مصلحت

اور مشورہ کا فائدہ یہ ہو گا کہ کام کرنے والے کی نظر سے کوئی پہلو اس امر کا مخفی نہ رہے گا اور نہ بسا اوقات ایک شخص کی نظر

تمام پہلوؤں کو محیط نہیں ہوتی ہے اور ایک دوسری آیت سے بھی سلطنت جمہوری کا ابطال اور سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَاِذَا كَانُوْا مَعًا عَلٰى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اَوْ لِيْكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْئِهِمْ فَاذْنٌ لِّمَنْ يَشِئْتَ** اسی اخیر جملہ سے سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے اس لئے کہ فرض کرو مجلس میں دس آدمی ہیں اور وہ دس اعلیٰ طبقہ کے ہیں اور سردار قوم ہیں ان سب آدمیوں نے اجازت چاہی تو سلطنت جمہوری کا مقتضا تو یہ ہے کہ چونکہ سب اہل مجلس ایک طرف ہو گئے تو بادشاہ کو اجازت دینا واجب ہوگا حالانکہ اس صورت میں بھی ارشاد ہے **فَاذْنٌ لِّمَنْ يَشِئْتَ** کہ جس کو آپ چاہیں اجازت دیں یہ صاف دلیل ہے کہ حضور ﷺ مستقل بادشاہ ہیں اگر قرآن حدیث میں اور زیادہ غور کیا جاوے تو بہت دلائل نکلیں گے ایک فائدہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ آیت میں مشورہ کا بھی ذکر ہے اور عزم کا بھی جو کہ منجملہ تدابیر کے ہیں۔

اسلام اور جمہوریت

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت اسلام میں ٹھونسا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں **وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ** مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کے دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقا نے آزاد کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو خیار عتق کہتے ہیں۔ اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے بہت محبت تھی وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کو چوں میں روتے پھرا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ سے آپ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہوا اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے تو حضرت بریرہ نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس مشورہ کو قبول نہیں کرتی لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو بدرجہ اولیٰ حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں۔ بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہ نے حضور ﷺ کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور ﷺ ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب ہوا تو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس **شَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ** سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان

کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک نَشَاوَزْهُمْ فِي الْأَمْرِ سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیونکر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ہمارے پاس حدیث بریرہ سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں۔ خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے **فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** کہ مشورہ کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں۔ یہاں اذا عزمتم صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور ﷺ مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے ہوتا تو اذا عزمتم نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے اذا عزمکم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ فرماتے پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعوے کی تردید کر رہا ہے مگر ان کی حالت یہ ہے حفظت شینا و غایت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

دوسرا اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا کہ تم از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کر ڈچا ہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں الی مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وهو حقکم علیہم کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لڑوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے۔ چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے یہاں تک کہا اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے۔ ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے اور جس آیت سے یہ لوگ استدلال کرتے ہیں میں نے بتلا دیا کہ اس سے استدلال نہیں ہو سکتا بلکہ اگر غور کریں تو اسی آیت سے شخصی حکومت کا ثبوت ہو رہا ہے۔ اور اسی آیت میں **فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اس میں ایک عجیب حکمت ہے۔ یہ بات اسی وقت ذہن میں آئی ہے وہ حکمت یہ ہے کہ بعض لوگوں کا جو خیال ہے کہ ایک شخص کی تنہا رائے کبھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ ضرور اسی میں غلطی ہوگی اس کا جواب **فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** میں دیا گیا ہے۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ کو معلوم تھا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آوے گا جس میں مادہ پرستی غالب ہوگی اور بعض لوگوں کا یہ اعتقاد ہوگا کہ شخص واحد کی رائے ضرور غلطی کرے گی۔ اس لئے پہلے ہی سے اس کا بھی جواب دے دیا اور ایسا جواب دیا جس میں گفتگو کی مجال نہیں۔ اس خیال کا ایک جواب تو یہ تھا کہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے تم تجربہ کر کے دیکھ لو معلوم ہو جائے گا بعض دفعہ ایک شخص کی رائے تمام دنیا کے خلاف صحیح ہوتی ہے مگر اس

سے گفتگو قطع نہیں ہوتی اور تو تو میں میں شروع ہو جاتی ہے چنانچہ آج کل یہ جواب دے کر دیکھ لو جو کبھی گفتگو قطع ہو۔ مخاطب کبھی اس کو اتفاق پر محمول کرے گا۔ کبھی یہ کہے گا کہ واقع میں اکثر ہی کی رائے صحیح تھی مگر بعض موانع کی وجہ سے ان کو کامیابی نہیں ہوئی اور شخص واحد کی رائے واقع میں غلط تھی۔ مگر اسباب خارجہ ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس کی رائے کامیاب ہو گئی۔ و علیٰ هذا کچھ نہ کچھ تو تو چہیں نکال لی جائیں گی مگر حق تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جواب ایسا دیا کرتے ہیں جس سے مخاطب کی تسلی ہو جائے۔ قرآن میں مقدمات اور صغریٰ کبریٰ اور قیاسی اشکال سے جواب نہیں دیا گیا کیونکہ اس سے گفتگو قطع نہیں ہوتی۔ مخاطب مقدمات میں گفتگو کرنے لگتا۔ بلکہ قرآن میں جواب ایسی مختصر بات سے دیا جاتا ہے جو دل میں گھس جائے اور مخاطب کو گفتگو کی جگہ نہ ملے چنانچہ اس خیال کا دوسرا جواب وہ ہے جو **فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** میں دیا گیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حاکم کا قلب مشورہ کے بعد جب ایک شق کی طرف مائل ہو جائے تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل شروع کر دے۔ تمہارے ہاتھ میں خزان کامیابی نہیں ہیں بلکہ سب خزان ہمارے ہاتھ میں ہیں تم خدا پر بھروسہ کر کے عمل کرو حق تعالیٰ شخص واحد کی رائے کو بھی کامیاب کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر وہ رائے غلط بھی ہوگی تب بھی توکل کی برکت سے صحیح ہو جائے گی اور اگر عقل اس کو تسلیم نہ کرے تو تم عقل کے فتوے پر عمل نہ کرو بلکہ ہمارے قانون پر عمل کرو۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ مشورہ کے بعد حاکم کی رائے جس طرف قائم ہو جائے اس کو اپنی رائے کے موافق عمل کرنا چاہیے اور خدا پر نظر رکھنی چاہیے۔ وہ ایک آدمی کی رائے کو بھی تمام عالم کی رائے پر غالب کر سکتے ہیں۔ عقل اگر یہ کہے کہ ایک کی رائے صحیح نہیں ہو سکتی تو اس کی بات پر التفات نہ کرو عقل بیچاری ہے کیا چیز جو قانون خداوندی میں اس کے فتویٰ سے مزاحمت کی جائے۔ (تقلیل الاختلاط)

حضرات صحابہؓ حضور اکرم ﷺ کے عاشق تھے

حق تعالیٰ نے اس واقعہ میں مسلمانوں پر مصیبت آنے کا سبب ان صحابہ کی غلطی اجتہادی کو قرار دیا جو حضور ﷺ کی اجازت کے بغیر گھائی سے ہٹ گئے تھے چنانچہ ارشاد ہے **وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا أَرْسَلْنَاكُمْ كَاتِبِينَ** (اور تم کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات دکھادی گئی تھی)

اس کے بعد بطور عتاب کے فرماتے ہیں **فَأَنبَأَكُمْ غَنَائِبَكُمْ لِكَيْلَا تَتَّخِذُوا عَلَيَّ مَا فَاتَكُمْ** یعنی پھر خدا تعالیٰ نے تم کو بھی غم دیا بدلہ (اس) غم کے (جو تم نے نافرمانی کر کے رسول ﷺ کو دیا تھا) اس کے بعد اس انتقام کی حکمت ارشاد فرماتے ہیں **لِكَيْلَا تَتَّخِذُوا عَلَيَّ مَا فَاتَكُمْ** تاکہ تم کو (انتقام) لینے کے بعد اس بات پر زیادہ رنج نہ ہو جو تم سے فوت ہو گئی تھی یہ وہی بات ہے جو میں نے ابھی بیان کی تھی کہ بعض شریف طبیعتوں پر خطا کا انتقام نہ لینے سے ندامت زیادہ غالب ہوتی ہے۔

شانِ رحمةِ العالمین ﷺ

چونکہ رسول ﷺ مظہر اتم صفات باری ہیں اس لئے حضور ﷺ کی بھی یہی شان ہے کہ آپ میں رحمت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو رؤف رحیم فرمایا اور سخت کلامی و سنگ دلی سے آپ کی براءت کی ہے۔ **فَمَا رَحْمَةً مِّنَ اللَّهِ لَئِنْتَ لَهُنَّ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ**۔ پس خدای ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند و سخت طبیعت ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

یہ حضور کی اصلی صفت ہے اور غضب۔ حدت آپ کی اصلی صفت نہیں بلکہ کسی عارض و متقاضی کی وجہ سے اس کا ظہور ہوا۔ اب بتلائیے کہ حضور کا اتباع آپ کی صفات اصلیہ کا اتباع ہے یا صفات عارضیہ کا یقیناً ہر شخص یہی کہے گا کہ حضور ﷺ کا اتباع یہی ہے کہ صفات اصلیہ میں آپ کا اتباع کیا جائے ورنہ حضور ﷺ سے بعض دفعہ نماز فجر بھی قضا ہوئی ہے تو کیا تم بھی اس عارض کا اتباع کر کے ہر روز نماز فجر قضا کیا کرو گے ہرگز نہیں! یہ مثال عجیب ذہن میں آئی کہ جس نے راستہ کو واضح کر دیا۔

بل احياء عند ربهم يرزقون (آل عمران)

بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق ملتا ہے۔

حیات نبوی ﷺ پر ایک نکتہ

فرمایا ایک شخص نے حیات نبوی ﷺ میں مجھ سے گفتگو کی میں نے کہا جو لوگ مقتول فی سبیل اللہ ہیں ان کے حق میں ارشاد ہے بل احياء عند ربهم اور جو لوگ فی سبیل اللہ سے بڑھ کر مقتول فی اللہ ہیں وہ کیونکر زندہ نہ ہوں گے اور اس نکتہ پر مدار مسئلہ کا نہیں اس میں حدیث صریح موجود ہے اور یہ تائید کے درجہ میں ہے۔ (الافاضات البیومیہ ج ۳ ص ۳۱۱)

سلطنت شخصی میں بھی مشورہ واجب ہے

فرمایا بعض لوگ آیت **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ سلطنت شخصی ہونا خلاف قرآن کے ہے۔ شاور ہم سے کثرت رائے مفہوم ہوتی ہے جو حاصل ہے سلطنت جمہوری کا۔ مگر اس استدلال کی غلطی خود اس آیت کے اگلے جزو سے ظاہر ہے فاذا عزمتم فتوکل علی اللہ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو مشورہ مطلوب ہے مگر بعد مشورہ مدار محض آپ کے عزم اور رائے پر ہے اس سے تو بالعکس سلطنت کا شخصی ہونا ثابت ہوا البتہ یہ ضرور ہے کہ شخص واحد پر مشورہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے لیکن مدار کثرت رائے پر نہیں رکھا گیا بلکہ اس مستثیر کو اطلاق آیت سے اس کی بھی اجازت ہے کہ وہ مقابلہ جماعت کے ایک کے مشورہ کو قبول کر کے اس کے موافق عزم کرے۔ (مقالات حکمت ص ۶۳)

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي
 الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ
 وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا
 سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

ترجمہ: بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اہل عقل کے لئے دلائل ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار تو نے ان کو لایعنی پیدا نہیں کیا پس ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجئے۔

تفسیری نکات

ترغیب ذکر و فکر

یہاں دو عملوں کی ترغیب ہے ایک ذکر کی ایک فکر کی اور ان ہی دونوں میں کوتاہی کرنا ہماری دنیوی اور دینی خرابی کا سبب ہے ہر چند کہ اس آیت میں خاص فکر کا ذکر ہے جو کہ آسمان وزمین کی پیدائش اور بناوٹ میں کیا جائے کیونکہ یہ موقع اثبات توحید کا ہے اور مقصود مقام یہی ہے اور اثبات توحید میں تفکر فی السماء والارض کو خاص دخل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان مخلوقات میں غور کرو کہ یہ سب حادث ہیں اور حادث کے وجود کے لئے موجد کی ضرورت ہے اگر موجد بھی حادث ہو تو اس کے لئے پھر موجد کی ضرورت ہوگی اور سلسلہ غیر ختم ہی چلے گا اور تسلسل محال ہے پس ضروری ہے کہ انتہا واجب پر ہوگی اور اس کو ہم اللہ کہتے ہیں غرض فکر اس جگہ مقید ہے مگر مجموعی آیات سے جو اس باب میں وارد ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ہر چیز میں فکر ہونا چاہیے رسالت میں بھی توحید میں بھی اسی طرح اور کوئی عمل بھی فکر سے خالی نہ ہونا چاہیے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں ہمارا کیا حال ہے سو ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو کسی کام میں فکر نہیں ہوتی اپنی ہر حالت کو یاد کر کے دیکھ لو کوئی وقت بھی ایسا ہوتا ہے جس سے ہم فکر کرتے ہوں یا کسی کام میں سوچ سے کام لیتے ہیں یقیناً آپ اپنے سب اوقات کو فکر سے خالی پائیں گے حالانکہ قرآن و حدیث میں تو توحید و رسالت تک بھی فکر کی تاکید ہے گو توحید و رسالت کے حاصل ہوتے ہوئے ان میں فکر نہ کرنے کی شکایت نہ ہو کیونکہ اس فکر کا نتیجہ بھم اللہ ہم سب کو حاصل ہے کیونکہ بھم اللہ سب مومن مسلمان ہیں یہ اور بات ہے کہ خلل اعمال کی وجہ سے ایمان کی نواز نیت بعض میں کم ہے باقی نفس ایمان میں کمال و نقص نہیں ہے بھم اللہ نفس ایمان سب کو حاصل ہے حتیٰ کہ نفس ایمان فاسق کو بھی حاصل ہے بعض عارفین کا

قول ہے کہ ضعیف الایمان کا نور بھی اگر ظاہر ہو جائے تو آسمان وزمین سب کو چھپالے بہر حال یہ فکر اگر نہ ہو تو کچھ شکایت نہیں کیونکہ اس فکر کا حاصل یہ ہوگا کہ شے موجود کو قوی کیا جائے گا اور موجود کو قوی کرنا مفقود کے حاصل کرنے سے موخر ہے مقدم یہ ہے کہ مقصود کو حاصل کیا جائے۔

جزاوسزا میں فکر کی ضرورت

میں اسی فکر کو بتلانا چاہتا ہوں جس کی ہر عمل میں ضرورت ہے اور فکر یہ ہے کہ جزاوسزا میں فکر کیا جائے چنانچہ سورۃ رحمن میں اول سے آخر تک اسی کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نعمتیں اور عقوبتیں بیان فرما کر بار بار سوال کیا ہے **فَيَأْتِي آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ** جس کا حاصل یہی ہے کہ ان نعمتوں کو اور عقوبتوں کو سوچنا اور یاد کرنا چاہیے مگر اس مقام پر کسی طالب علم کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ نعمتوں کے ساتھ تو **فَيَأْتِي آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ** موقع پر ہے مگر عذاب کے ساتھ اس کے ذکر کا کیا موقع ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عذاب کے ذکر سے انسان کو تنبیہ ہوتی ہے اور وہ عذاب کو سوچ کر نافرمانی سے بچتا ہے اس حیثیت سے اس کا ذکر بھی نعمت ہے اگر ہم کو فکر کی عادت ہوتی تو یہ راز معلوم ہو جاتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاکم منادی کراتا ہے کہ جو شخص سرکاری درخت کاٹے گا اس پر اس قدر جرمانہ ہوگا اور سزا دی جائے گی عاقل اس منادی کو بھی نعمت سمجھے گا کہ اس منادی کی وجہ سے ہم جیل خانہ سے بچ گئے اگر ہم کو خبر نہ ہوتی تو قید بھگتنا پڑتی یا طبیب کسی مضر شے کی مضرت سے ہم کو اطلاع دے۔ عاقل اس کی بھی قدر کرے گا اسی طرح یہاں سمجھو کہ عذاب کوئی نافرمانی سے ہم کو اس سے مطلع کر دینا ضرور نعمت ہے پس اب **فَيَأْتِي آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ** کسی جگہ بے موقع نہیں ہے بہر حال سارا قرآن فکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے کہیں قیامت کے بارہ میں ارشاد ہے **أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** کہ ان کو قیامت کے امکان کو سمجھنے کے لئے **مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** میں نظر چاہئے نظر و فکر ایک ہی ہے

تفکر فی الدنیا

ایک جگہ ارشاد ہے **لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ** فی الدنیا والآخرۃ کہ اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف صاف اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ دنیا و آخرت میں فکر کرو۔ یہاں تفکر فی الدنیا کی بھی تاکید ہے اس پر یہ اشکال ظاہر میں ہوتا ہے کہ دنیا میں تفکر کی کیا ضرورت ہے بلکہ اس سے تو تفکر کو ہٹانا چاہیے اشکال سننے کے بعد اب دو تفسیریں سنو! جن میں ایک دوسرے سے لطیف ہے ایک تفسیر تو یہ ہے کہ دنیا کے اندر جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل دنیا کے لئے ہو اس کو مقصود بالذات سمجھو اور اگر مقصود بالذات نہ سمجھو تو وہ فکر بھی جائز ہے کیونکہ حدیث میں ہے **طلب الحلال فریضة بعد الفریضة** کو اور طلب کے لئے فکر لازم ہے مگر یہ فکر مقصود مطلوب نہیں بلکہ جمعا ہے کیونکہ دنیا بقدر ضرورت کو دین کی تکمیل و تحصیل میں دخل ہے دوسری تفسیر اس سے لطیف ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں تفکر کرو موازنہ کے لئے ان میں کون اختیار کرنے کے لئے ہے اور کون قابل ترک ہے اور دنیا میں جو فکر مذموم ہے وہ وہ ہے جو تحصیل کے لئے ہو اور جو فکر ترک دنیا

کے لئے ہو وہ تو مطلوب ہے پہلی تفسیر کا حاصل یہ تھا کہ دنیا میں جمعاً تفکر کرو اور آخرت میں مقصوداً اور دوسری تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دونوں میں مقصوداً تفکر کرو موازنہ کے لئے اہل اللہ نے دنیا میں فکر کر کے ہی اس کی حقیقت کو سمجھا ہے اسی لئے ان کو دنیا سے سخت نفرت ہے۔

باوجود وعدہ کے خوف

حاصل یہ ہے کہ باوجود وعدے کے بھی خوف ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے اسی واسطے یہ دعا سکھلائی گئی ہے رَبَّنَا وَإِنَّا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ جس کا ترجمہ ہے کہ اے اللہ جن باتوں کا آپ نے رسولوں کی زبان پر ہم سے وعدہ کیا وہ ہم کو دینا اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کرنا اس میں ظاہر ایہ اشکال ہے کہ جس چیز کا وعدہ کیا گیا اس میں خلاف تو ہو ہی نہیں سکتا پھر اس کے مانگنے کی کیا ضرورت ہے جس سے وہم ہوتا ہے کیا وعدہ پورا ہونے پر ایمان نہیں۔ اور یہ دعا خود حق تعالیٰ نے تعلیم فرمائی ہے تو یہ کیا بات ہے۔

اس کی وجہ علماء نے یہی لکھی ہے کہ جس قید کے ساتھ وعدے کئے گئے ہیں ممکن ہے کہ وہ قید ہم میں باقی رہے یا نہ رہے اور ہم محل وعدہ رہیں یا نہ رہیں خدا نخواستہ حالت ایسی متغیر ہو جاوے کہ ہم اس وعدہ کے مصداق ہی نہ رہیں۔ مثلاً وعدہ کیا گیا ہے کہ جو کوئی ایمان لائے گا اور عمل صالح کرے گا تو اس کو جنت ملے گی۔ اس میں وعدہ ہے جنت کا مگر مقید ہے بقاء ایمان اور عمل صالح کے ساتھ فرض کر لیجئے ہم میں اس وقت ایمان بھی ہے اور عمل صالح بھی ہے اور اس وقت ہم اس وعدہ کے مصداق ہیں۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ خاتمہ کے وقت یہ حالت نہ رہے اور اس وعدہ کے مصداق نہ رہیں اور جنت نہ مل سکے تو وعدہ بھی سچا رہا اور موعود ظاہری کے خلاف کا وقوع میں آنا بھی ممکن ہو گیا کیونکہ وہ حقیقتاً موعود ہی نہ تھا اس واسطے سوال کیا جاتا ہے اب اس آیت پر وہ اشکال نہ رہا کہ جس چیز کا وعدہ ہے اس کا سوال کیوں کیا جاتا ہے حاصل جواب کا یہ ہوا کہ سوال اس بات کا کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے اندر ان قیود کو پیدا کر دیں اور باقی رکھیں جن کے ساتھ وہ وعدہ مقید ہے تو اتنا ما وعدتنا کا حاصل یہ ہوا کہ ہم کو ان لوگوں میں سے کر دیجئے جو اس وعدہ کے مصداق ہیں۔ غرض وعدہ سچا ہے لیکن کبھی واقعہ میں وہ وعدہ مقید ہوتا ہے اور یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ قید ہم کو بتلا بھی دی جائے۔ (الاسلام الحقیقی)

رَبَّنَا وَإِنَّا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ

اے ہمارے پروردگار جو آپ نے وعدہ کیا ہے اپنے رسول ﷺ کی معرفت وہ عنایت کیجئے اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کیجئے بلاشبہ آپ کا وعدہ خلاف نہیں۔

وعدہ کا اہل بنانا

یہ تو ظاہر ہے کہ جس امر کا وعدہ حق تعالیٰ فرما چکے ہیں وہ ملے ہی گا خدا تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے پھر کیا معنی ہیں واتنا ما وعدتنا کے اس کی توجیہ بعض نے یہ کی ہے کہ ہم کو اس وعدہ کے اہل بنا دیجئے مگر یہ تاویل بعید ہے کیونکہ یہ تو مومن

سے وعدہ ہے اور وہ تو اس وعدہ کا اہل ہے ہی پھر یہ کہ لا تخلف الميعاد کیوں بڑھایا گیا واقع یہ ہے کہ یہ تذکیر ہے نعمت کی اور عبدیت کی کہ جیسے وعدہ میں محتاج تھے وعدہ کے بعد بھی محتاج ہی رہے۔ بعد وعدہ کے بھی یونہی کہا کریں
وَإِنَّمَا وَعَدْنَاكَ وَإِنَّكَ لَا تَخْلِفُ الْمِيعَادَ.

بہر حال نقوص قرآنیہ اور حدیث مؤید ہیں اس کے کہ بعد عطا کے بھی طاعت کو نہ چھوڑا جائے جب نقوص سے ایک قاعدہ کلیہ نکل آیا تو اس کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ بعد عزم کے اگر بارش بھی ہو جائے تو نماز استسقاء کو ترک نہ کیا جائے۔ پہلے طلب کے لئے تھی اب شکر کے لئے ہے حاصل یہ ہے کہ بعد عطا کے وہ فرد ہوگی شکر کی۔ اس لئے اس کو کرنا چاہیے اور یہ بات میں عید گاہ میں بیان کر چکا ہوں کہ سبب بارش نہ ہونے کا عصیان ہوتا ہے اس لئے گناہوں سے توبہ کرنا چاہیے اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق مرحمت فرمادیں۔ (شکر العطاء بلحقہ مواظبہ حقیقت عبادت ۳۶۷)

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّمَّنْ ذَكَرَ وَأُو

أُنثَىٰ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ

وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ

حُسْنُ الثَّوَابِ ۝

ترجمہ: سو منظور کر لیا ان کی درخواست کو ان کے رب نے اس وجہ سے کہ میں کسی شخص کے کام کو جو کہ تم میں سے کرنے والا ہوا کارت نہیں کرتا خواہ کہ مرد ہو یا عورت ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو سو جن لوگوں نے ترک وطن کیا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور تکلیفیں دیئے گئے اور جہاد کیا اور شہید ہو گئے میں ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں معاف کر دوں گا اور ضرور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ عوض ہے اللہ کے پاس اور اللہ ہی کے پاس اچھا عوض ہے۔

تفسیری نکات حقیقت عمل

اول سمجھ لیجئے کہ اس سے اوپر حق تعالیٰ نے کچھ ذکر کیا ہے اہل طاعت کا اور ان کے بعض اقوال و افعال ذکر فرمائے ہیں کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ وہ ذکر کرتے ہیں حق تعالیٰ کا اور کائنات میں تفکر کرتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں وہ دعائیں

نقل فرمائی ہیں اور نقل کیا اور فرمائی ہیں بلکہ تعلیم فرمائی ہیں۔ نہایت پاکیزہ اور جامع دعائیں ہیں اس کے بعد یہ آیت ہے فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ السَّخَّ جَس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دعا قبول ہوئی اور ان کی درخواست منظور کی گئی اگلے جملے اس کی وجہ ارشاد ہے اِنِّي لَا اُضِيْعُ عَمَلًا عَامِلًا فَمَنْكُم مِّنْكُمْ یہاں لام مقدر ہے یعنی تقدیر لانی ہے مطلب یہ ہوا کہ درخواست ان کی اس وجہ سے منظور ہوئی کہ میری عادت یہی ہے کہ میں کسی شخص کا عمل اور کسی کام کرنے والے کا کام ضائع اور برباد نہیں کیا کرتا چونکہ دعا بھی عمل ہے اس واسطے اس کو بھی میں نے ضائع نہیں کیا بلکہ اس کو منظور کر لیا اور وہ جو سوال کرتے ہیں وہ میں پورا کروں گا۔ ایک تو یہ توجیہ ہے اور ایک یہ ہے کہ الہی کی تقدیر لانی نہیں ہے اور یہ علت نہیں ہے فاستجاب کی بلکہ یہ جملہ مفعول ہے استجاب کا اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ حق تعالیٰ نے اس بات کو منظور فرمایا کہ ان کا کوئی عمل ضائع نہیں کریں گے۔ اس میں دعا بھی آگئی اور اعمال بھی آگئے اور گواہی پر اعمال کے ضائع نہ کرنے کی درخواست نہیں تھی پھر استجاب کے کیا معنی مگر اعمال تو مذکور ہیں ید کروں اور یتفکرون میں جواب اعمال کو شامل ہے۔ لَمَّا قَالُوا كَلِمْطَبِعِ اللّٰهِ لَهٗوَ ذَاكِرٌ اور جو شخص عمل کرتا ہے بہ نیت قبول کے کرتا ہے تو عمل بھی درخواست ہے ضائع نہ کرنے کی پس اس طرح سے عدم اضاعتہ استجاب کا مفعول بہ ہو گیا یہ تو توجیہ کا اختلاف ہے لیکن ہر حال میں خلاصہ مشترک اس کا یہ ہے کہ یہ بات معلوم کا دی گئی کہ خدا تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے یہ مضمون ایسا ہے کہ سب جانتے ہیں اور جا بجا آیتوں میں مذکور ہے چنانچہ کئی جگہ آیا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اور مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ بهر حال اس میں کسی کو اختلاف نہیں اور اس میں کوئی اشتباہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کسی کام کو ضائع نہیں کرتے چونکہ یہ بہت ہی ظاہر اور مسلم بات ہے لہذا اس وقت یہ بیان سے مقصود بھی نہیں۔

ضرورت عمل

چنانچہ اللہ تعالیٰ شاندار فرماتے ہیں فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اِنِّي لَا اُضِيْعُ عَمَلًا عَامِلًا فَمَنْكُم مِّنْكُمْ ذَكَرٌ اَوْ اُنْثَىٰ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ اس وقت مقصود بیان صرف تقسیم رحمت حق کا ظاہر کرنا ہے جس پر من ذکر او انسی کا لفظ دال ہے اور اسی جزو کا مجھے بیان کرنا مقصود ہے۔ فرماتے ہیں میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت یعنی ہمارے یہاں نیک عمل ہر مومن کا مقبول ہے یہ نہیں کہ عورت کے عورت ہونے کی وجہ سے کوئی عمل مردود ہو جائے یا مرد کے مرد ہونے کی وجہ سے کوئی عمل مقبول ہو جائے۔ دوسری آیت میں فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَاَنجِزِيْنَا لَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو حیات طیبہ نصیب کریں گے اور اس کو جزا دیں گے اچھے عمل کی آپ کو معلوم ہوگا کہ اصول کا قاعدہ ہے کہ جن آیات میں کوئی تصریح عورت یا مرد کی نہیں ہوتی ان کا مضمون مردوں اور عورتوں سب کو عام ہوتا ہے اس بناء پر اس تصریح کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ عمل کرنے والا مرد ہو یا عورت پھر ان آیتوں میں لفظ من ذکر اَوْ اُنْثَىٰ کے لانے کا کیا سبب ہے؟ اس کا پتہ شان نزول سے چلتا ہے۔ شان نزول حسب روایت ترمذی یہ ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے ایک

دفعہ بطور حسرت کے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ قرآن شریف میں عورتوں کا ذکر کہیں نہیں آتا ان کی خاطر سے حق تعالیٰ نے بعض آیات میں صراحتاً عورتوں کا ذکر فرمادیا تاکہ یہ حسرت نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یاد نہیں فرماتے دیکھو عورتوں کی خاطر اللہ میاں کو کس قدر منظور ہے کہ باوجود ضرورت نہ ہونے کے تصریح کے ساتھ عورتوں کا ذکر بھی کر دیا اس کی قدر ہم کو اس وجہ سے نہیں کہ جب سے ہوش سنبھالا قرآن سنا تو اس میں بہت جگہ ایسے الفاظ سنے جو عورتوں کی شان میں ہیں بس سنتے سنتے مساوات ہو گئی۔ اب جب ایسی آیتیں پڑھتے ہیں تو کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی اس کی قدر ان عورتوں کے دل سے پوچھو جن کو یہ حسرت ہو چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ذکر نہیں فرماتے پھر ان کی حسرت کو حق تعالیٰ نے پورا کیا یہ بیچاری قرآن میں ہر جگہ مردوں کا ہی ذکر پاتی تھیں اس سے ان کا دل مرجاتا ہوگا اور یہ خیال ہوتا ہوگا کہ کیا ہم عورتیں حق تعالیٰ کے نزدیک کسی شمار میں بھی نہیں جو کہیں ہمارا ذکر نہیں فرماتے اب سوچئے کہ جس وقت ان کی تمنا کے موافق قرآن میں الفاظ اترے ہوں گے تو ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اس کا لطف دوسرا کوئی کب سمجھ سکتا ہے؟

جوشِ محبت

ایک صحابی ہیں حضرت ابی کعب شینخین کی روایت میں ہے کہ ان سے ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے ابن کعب خداوند تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں تم کو سورہ لم یکن پڑھ کر سناؤں۔ یہ سن کر ان کو وجد سا آ گیا اور عرض کیا اللہ سمانی یعنی کیا اللہ میاں نے میرا نام لیا، حضور ﷺ نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لیا واقعی اس وقت جو حالت بھی ان کی ہوئی ہو کم ہے سوچئے تو سہمی کہ جس وقت حضور ﷺ نے یہ پیغام ان کو سنایا ہوگا۔ اگر ان کو شادی مرگ ہو جاتی تو بجا تھا پھر جب حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا نعم اللہ سماک یعنی ہاں اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام لے کر فرمایا بس یہ سن کر وہ پھوٹ کر رو پڑے اس حالت کا اندازہ کوئی کیا کر سکتا ہے رہا یہ کہ پھر رونا کس لئے تھا تو حضرت نے فرمایا یہ رونا شادی کا تھا نہ رنج کا تھا بلکہ گرمی عشق کا تھا اس کی تحقیق مشکل ہے بعضے سمجھتے ہیں کہ خوشی کا رونا تھا مگر یہ بات نہیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تحقیق ہے کہ یہ رونا محبت کے جوش کا تھا کہ ان کو یہ خیال ہوا کہ اے اللہ! میں اس قابل کہاں تھا کہ آپ میرا نام لیں۔ اس خیال سے محبت کا جوش اٹھا اور گریہ طاری ہوا۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

غرض اس وقت اس لفظ او انسی کی اس لئے قدر نہیں محسوس ہوتی کہ تمام عمر سے ہمیں قرآن میں یہ لفظ موجود ملا ہے اس کی قدر ان سے پوچھی جائے جن کی حسرت و تمنا کے بعد یہ لفظ نازل ہوا اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عاشق کو محبوب کے دربار کے قریب تک پہنچنے کا موقع تو ملتا ہے مگر محبوب کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا دوسروں سے ہی بات چیت کرتا رہتا ہے اور یہ اس حسرت میں گھلا جاتا ہے کہ افسوس میرا نام بھی تو کبھی اس کی زبان پر آتا اس نے کسی خاص مقرب بارگاہ سے اپنی حسرت کو ظاہر کیا اس نے محبوب کے کان تک بات پہنچادی دوسرے وقت محبوب نے مجلس میں کوئی چیز مثلاً پان تقسیم کئے اور خادم سے کہا کہ سب صاحبوں کو پان دے دو اور فلاں صاحب کو ضرور دینا عاشق کا نام لے کر کہا تو آپ اندازہ کیجئے

کہ اس وقت اس عاشق کی کیا حالت ہوگی یقیناً اس کو وجد آ جاوے گا اور ناچتا پھرے گا مگر دوسرے حضار مجلس کے نزدیک یہ بات بھی کچھ نہ ہوگی وجہ یہ ہے کہ اس کو بڑی تمنا کے بعد یہ دولت نصیب ہوئی ہے اور دوسروں کو بلا تمنا کے نصیب تھی۔

خواتین اور قرآن حکیم

صاحبو! ہم لوگوں کو قرآن پورا مکمل جمع شدہ مل گیا ہے۔ ہم اس قسم کی آیتیں ہر دور میں پڑھتے ہیں اور کبھی اس طرف خیال بھی نہیں جاتا کہ ان میں کیا دولت بھری ہوئی ہے اس کو حضرت ام سلمہؓ سے یا اس وقت کی دوسری بیبیوں سے پوچھنا چاہیے کہ ان آیتوں کو سن کر ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اے بیبیو! کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو خاص طور سے یاد فرمایا اور یاد بھی کس طرح فرمایا کہ مردوں کے برابر بٹھا دیا کیونکہ اس آیت میں جن باتوں کا وعدہ کیا ہے ان میں مردوں اور عورتوں میں کچھ فرق نہیں کیا تو یہ کہنا صحیح ہے کہ عورتوں کو مردوں کے برابر بٹھا دیا۔ گوبائیں طرف بٹھایا ہے کیونکہ آیت میں پہلے لفظ من ذکر ہے اس کے بعد او انشی ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ قرآن عربی زبان ہے اور عربی زبان کا خط دائیں سے بائیں طرف کو ہوتا ہے تو دائیں طرف والے کو اول اور بائیں طرف والے کو دوم کہہ سکتے ہیں۔ قرآن کی تحریر انگریزی نہیں ہے کہ بائیں طرف سے دائیں طرف کو ہو اور بائیں طرف والے کو اول اور دائیں طرف والے کو دوم کہہ سکیں۔ یہ اس واسطے کہہ دیا کہ آج کل انگریزیت کا غلبہ ہے کوئی ذہن بی بی یہ استدلال نہ کر بیٹھے کہ بائیں طرف والا اول اور دائیں طرف والا دوم ہوتا ہے خیر یہ ایک لطیفہ سا ہے مگر یہ بات شریعت میں ثابت ہے کہ عورت کسی قدر مرد سے درجہ میں گھٹی ہوئی ہے (بدلیل وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَمِثْلَهَا مِنَ الْآيَاتِ جَامِعٍ) اور گواس آیت میں کسی بات میں مرد عورت میں فرق نہیں کیا گیا لیکن چونکہ ترتیب عبارت میں عورتیں مؤخر ہیں مردوں سے اس واسطے میں نے یہ کہا کہ ان کو بائیں طرف بٹھایا یوں سمجھ لو کہ عورتیں جسم میں بائیں آنکھ ہیں اور مرد دائیں آنکھ ہیں اور بائیں آنکھ کسی بات میں داہنی سے کم نہیں نہ ضروری ہونے میں نہ کام دینے میں باقی یہ بات ضروری ہے کہ شریعت نے عورتوں کو مردوں کے ساتھ من کل الوجوه مساوات نہیں دی جیسا کہ اس زمانہ کے نئے تعلیم یافتہ طبقہ کا خیال ہے۔

مسئلہ مساوات مرد و زن

وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ نا انصافی ہے کہ ایک صنف کو دوسری صنف سے گھٹا دیا جائے۔ بیبیو! تمہارا بائیں طرف رہنا یہ بہتر ہے ہر چیز ایسے موقع پر اچھی ہوتی ہے سر کی چیز سر ہی پر اچھی ہوتی ہے اور پاؤں کی چیز پاؤں میں اور وجہ اس میں سلامتی ہونے کی یہ ہے کہ عورت میں عقل کم ہوتی ہے اور جس میں عقل کم ہو اس سے ہر کام میں غلطی کرنیکا احتمال ہے لہذا اس کے واسطے سلامتی اسی میں ہے کہ وہ زیادہ عقل والے کا تابع ہو اسی واسطے حق تعالیٰ نے مردوں کو ان پر حاکم بنایا چنانچہ فرماتے ہیں۔ الرِّجَالُ كَوَالِدٍ عَلَى النِّسَاءِ تاکہ ان کے کام سب ان کی نگرانی میں ہوں اور غلطی سے حفاظت رہے اس کا نام سختی نہیں بلکہ یہ تو عین عدل و حکمت و شفقت ہے دیکھو بچے ناقص العقل ہوتے ہیں اب اگر ان کو خود سر بنا دیا جاوے

اور وہ کسی کے تابع ہو کر نہ رہیں تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ پس یہ حق تعالیٰ کی نہایت رحمت ہے کہ عورتوں کو خود سر نہیں بنایا اور نہ ان کا کوئی کام بھی درست نہ ہو تا دین اور دنیا سب کاموں میں ان سے غلطیاں ہوا کرتیں خود سری میں بڑی مصیبت ہے حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں **وَاعْلَمُوا أَن فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأُمُورِ لَغَيَّبْتُمْ**۔ یعنی خوب سمجھ لو اے مسلمانو! کہ تمہارے پاس اللہ کے رسول ﷺ موجود ہیں۔ اگر بہت سی باتوں میں یہ تمہارا کہنا مانتے تو تم بڑی مصیبت میں پر جاتے مطلب یہ ہے کہ تم کو رسول ﷺ کا تابع ہو کر رہنا چاہیے نہ یہ کہ رسول ﷺ تمہارے تابع ہوں اگر ایسا ہوتا کہ رسول ﷺ تمہارے تابع ہوتے تو تم مصیبت میں پڑ جاتے معلوم ہوا کہ عافیت اور سلامتی اسی میں ہے کہ چھوٹا بڑے کا اور ناقص العقل کامل کا تابع ہو کر رہے غور کرنے کی بات ہے کہ آیت میں یہ نہیں فرمایا اگر حضور ﷺ تمہارے تابع ہو کر رہیں تو حضور ﷺ کو تکلیف پہنچے گی بلکہ یہ فرمایا کہ خود تم مصیبت میں پڑ جاتے معلوم ہوا کہ چھوٹے کو بڑے کا تابع ہو کر رہنے میں خود چھوٹے کا نفع ہے اسی طرح اگر تم مردوں کے تابع رہو تو یہ تمہارے ہی واسطے سلامتی اور عافیت ہے۔ غرض اس کو بڑی رحمت سمجھو کہ حق تعالیٰ نے تم کو خود سر نہیں بنایا اور نہ تمہارے لئے بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اول تو عورتوں میں سمجھ کم ہوتی ہے۔ دوسرے ان میں ضد کا مادہ بھی ہے کہ جس کام پر اڑ جائیں گی اس کو کر کے ہی چھوڑیں گی تو ان کو دو وجہ سے تکلیف پہنچتی ہے ایک تو عقل کم ہونے سے کہ جو کام کرتیں بے سوچے سمجھے اور بلا غور و فکر کے کرتیں پھر ضد کا مادہ ان میں اس قدر ہے کہ جو چڑھ گئی سو چڑھ گئی گو معلوم بھی ہو جاوے کہ یہ کام مضر ہے مگر اس کو چھوڑ نہیں سکتیں (چنانچہ دیکھا ہوگا کہ ذرا ذرا سی بات پر عورتیں کنویں میں کود پڑتی ہیں۔ اس حماقت کا منشاء کم عقلی اور ضد ہی تو ہے) پس عورتوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو تابع بنایا جاوے ان کے اوپر کوئی ایسا حاکم مسلط رہے جو ان کو ہر وقت سنبھالتا رہے۔ جیسے پیر مرید کی اصلاح کیا کرتا ہے مگر ان کے لئے بیعت کا پیر کافی نہیں کیونکہ وہ ہر وقت ان کے پاس کیسے رہ سکتا ہے۔ ان کے لئے بیت کا پیر چاہیے یعنی گھر کا پیر جو گھر میں ہر وقت موجود رہے وہ کون ہے؟ وہی گھر والا یعنی خاوند۔ یہ پیر اور قسم کے پیروں سے بہتر اور افضل اور ان کے لئے نفع ہے اور اسی کا رتبہ سب سے زیادہ ہے اور بعض عورتوں کے لئے بجائے بیعت کا بیت کا پیر بہت نافع ہے یعنی جو عورتیں مہذب اور شائستہ سمجھدار ہیں ان کے لئے تو بیت کا پیر کافی ہے یعنی خاوند اور جو عورتیں غیر مہذب اور کم سمجھ اور بد تمیز ہیں ان کے واسطے بیت کا پیر ہونا چاہیے جو آلہ ضرب ہے۔ رتبہ کے لفظ پر ایک کام کی بات یاد آگئی عورتوں میں مشہور یہ ہے کہ پیر کا رتبہ خاوند اور باپ سب سے زیادہ ہے یہ محض غلط ہے اس میں بہت سی غلطیاں ہیں۔

درجات مردوزن

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے جو عورتوں کو محکوم اور خاوند کو حاکم بنایا ہے اس کو سختی اور ظلم نہ سمجھنا چاہیے بلکہ عورتوں کے حق میں یہ عین رحمت و حکمت ہے کیونکہ تابع ہونے میں بڑی راحت ہے اور مساوات میں کبھی نظام اور تمدن قائم نہیں ہو سکتا ہمیشہ جھگڑا اور فساد ہی ہوتا ہے خوب یاد رکھو کہ دنیا اور دین دونوں کا نظام اسی طرح قائم رہ سکتا ہے کہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو۔ لوگ آجکل اتفاق و اتحاد لئے بڑی لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں اور تجویزیں پاس کرتے ہیں مگر جڑ کو

نہیں دیکھتے یا درکھوا اتفاق و اتحاد کی جڑ یہ ہے کہ ایک کو بڑا مان لیا جاوے اور سب اس کے تابع ہوں جس جماعت میں متبوع اور تابع کوئی نہ ہو سب مساوات ہی کے داعی ہوں ان میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو مساوات کا خیال تو عورتوں کو اپنے دل سے نکال دینا چاہیے کیونکہ یہی فساد کی جڑ ہے۔ اب دو ہی صورتیں رہیں یا تو عورتیں متبوع ہوں یا مرد تابع یا مرد متبوع اور عورتیں تابع اس کا فیصلہ انصاف کے ساتھ خود عورتوں کو ہی اپنے دل سے کر لینا چاہیے کہ متبوع بننے کے قابل وہ ہیں یا مرد ہیں سلیم الفطرت عورتیں کبھی اس کا انکار نہیں کر سکتیں کہ عقل اور طاقت میں مرد ہی بڑھے ہوئے ہیں وہی عورتوں کی حفاظت و حمایت کر سکتے ہیں۔ عورتیں مردوں کی ہرگز حفاظت نہیں کر سکتیں۔ پس مردوں کو ہی متبوع اور عورتوں کو تابع ہونا چاہیے یہی شریعت کا فیصلہ ہے اور اسی لئے اس جگہ بھی مردوں کا ذکر عورتوں سے مقدم کیا گیا چنانچہ فرماتے ہیں من ذکر او انشی اور یہ کیا تھوڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ساتھ ہی عورتوں کا ذکر فرمایا آگے پیچھے کا فرق تو بہت تھوڑا فرق ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عورتوں کی قدر ہمت بڑھائی ہے کہ سرسری نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مردوں کی برابر ہی ہیں گو میں نے دوسری آیتوں کی وجہ سے اصل مسئلہ کی تحقیق بیان کر دی کہ فی الجملہ دونوں کے رتبہ میں فرق ہے ورنہ اس آیت سے تو مساوات کا بھی شبہ ہو سکتا ہے گو تقدیم و تاخیر پر نظر کر کے مساوات کے استدلال کو روکا جاسکتا ہے بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں مرد و عورت دونوں اس قانون میں برابر ہیں کہ ہم کسی کا عمل ضائع نہ کریں پھر آگے بعضکم من بعض میں اس کی اور بھی تائید فرمادی یعنی تم سب ایک دوسرے کے جزو ہو یہ جملہ بمنزلہ تعلیل کے ہے ماقبل کے لئے کہ مرد و عورت اس قانون میں برابر کیوں نہ ہوں یہ تو آپس میں سب ایک ہی ہیں ایک ہی نوع کے دونوں افراد ہیں خلقت میں بھی برابر کیونکہ مردوں کی خلقت عورتوں پر موقوف ہے اور عورتوں کی خلقت مردوں پر وہ ان کے لئے سبب ہیں اور یہ ان کے لئے۔

مساوات حقوق مرد و زن

اس مقام پر میں ایک علمی اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قرآن مجید میں بعض آیتیں اس قسم کی بھی ہیں جن سے سرسری نظر میں مردوں اور عورتوں کی مساوات ثابت ہوتی ہے مثلاً وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمَنْ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَمِنْ قَبْلِكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ جس کا حاصل یہ ہے کہ اوپر محرکات کا بیان تھا اس کے بعد بیان فرمایا کہ ان کے سوا جن عورتوں سے چار نکاح کر سکتے ہو ہاں مہر دینا ہوگا اور جن کو آزاد عورتیں میسر نہ ہوں بوجہ ان کے اخراجات زیادہ ہونے کے تو ان کو چاہئے کہ مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لیں۔ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ اور تمہارے ایمان کا پورا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہی ہے (لیکن ظاہری ایمان کے اعتبار سے) تم سب ایک دوسرے سے بنے ہو غرض یہاں بھی وہی لفظ ہے بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ یعنی تم سب ایک ہی ہو مگر یہ آیت اپنے سیاق سے مساوات میں بظاہر اس سے زیادہ صاف ہے پہلی آیت میں تو (جس کا بیان ہو رہا ہے یعنی فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِ) بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ کے ساتھ اس کا بھی بیان ہے کہ مساوات اس بات میں ہے کہ کسی کا

عمل ضائع نہ کیا جاوے گا چاہے مرد ہو یا عورت عدم اضاعت عمل میں سب مساوی ہیں مگر اس آیت میں بظاہر کوئی بھی قید نہیں کہ کس بات میں مساوات ہے بس مطلقاً فرمادیا **بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ** پھر مساوات بھی ایسی عام کہ لوٹدی باندی کو آزاد مسلمانوں کے ساتھ غرض اس آیت سے بھی بظاہر عدم تفاوت ثابت ہوتا ہے جو جواز نکاح میں بعض ائمہ کے قول پر من کل الوجوه مساوات نہ ہو کیونکہ آیت میں یہ قید لگی ہوئی ہے کہ جس کو آزاد عورتوں کی متسدرت نہ ہو وہ باندیوں سے نکاح کرے معلوم ہوا کہ آزاد عورت اور باندی برابر نہیں سو یہ تفاوت ایک امر خاص میں ہے یہ اس مساوات میں حارج نہیں جس کو میں ثابت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ خاص خاص صفات میں تو مردوں میں بھی تفاوت ہو سکتا ہے مثلاً بڑے چھوٹے میں یا امیر غریب میں باپ بیٹے میں عالم جاہل میں وغیرہ وغیرہ سو اس قسم کا تفاوت قابل اعتبار نہیں آخر **بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ** کے کچھ تو معنی ہیں ایک آیت اور یاد آئی **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ** یعنی عورتوں کے حقوق بھی ویسے ہی ہیں جیسے ان کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں یہ وہ آیات جس سے عورتوں کی مساوات مردوں سے مفہوم ہو سکتی ہے مگر اس کے ساتھ دوسری آیتوں کو بھی ملانا چاہئے جن میں مردوں کی فوقیت عورتوں پر ثابت ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے **الزَّوْجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ نِزَارِشَادِ هُوَ وَلِلزَّوْجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ** اور یہ آیات مردوں کی فوقیت اور فضیلت ثابت کرنے میں بالکل صریح ہیں اور جن آیات سے مساوات ثابت ہوتی ہے وہ اس مدلول میں صریح نہیں بلکہ قرآن مقامیہ سے خاص امور میں مساوات بتلاتی ہیں چنانچہ **أَنِّي لَأَظُنُّكَ عَمَلٌ عَامِلٌ مِثْلُكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَذُنُغِي بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ** میں عدم اضاعت عمل میں مساوات بتلاتی گئی اور **وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَنَّكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ** میں انسانیت اور آدمیت یا ایمان میں مساوات بتلاتی گئی ہے کہ باندی کو حقیر نہ سمجھو تم سب آدم و حوا کی اولاد ہو یا سب اللہ ایمان ہو اور **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ** کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق بھی لزوم و وجوب میں مردوں کے حقوق کے برابر ہیں گو باعتبار نوعیت کے دونوں کے حقوق میں تفاوت ہو ورنہ مساوات کلی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورتوں پر بھی مردوں کے لئے مہر اور نان نفقہ لازم ہو حالانکہ کوئی اس کا قائل نہیں باقی اس سے انکار نہیں کہ بعض حقوق اور بعض امور میں یعنی حقوق مشترکہ میں عورتیں مردوں کے برابر ہیں وہ ایسی گھٹیا نہیں ہیں جیسا مردوں نے انہیں سمجھ رکھا ہے مگر افسوس آجکل عام طور سے یہ شکایت سنتے ہیں کہ غریب عورتیں

کہتی ہیں کہ مردوں کے تو کیا کچھ حقوق ہمارے اوپر ہیں اور ہم بالکل جانوروں کی طرح ان کے ہاتھ میں ہیں کہ وہ ماریں پیشیں یا ذبح کریں ہم کچھ نہیں بول سکتیں پس سن لو کہ اللہ سبحانہ کیا فرما رہے ہیں اور مرد بھی سن لیں ذرا کان کھول لیں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جیسے ان کے اوپر مردوں کے حقوق ہیں ویسے ہی ان کے بھی مردوں پر ہیں پھر یہ کہنے کی گنجائش کہاں رہی کہ ہم جانوروں کی طرح ہیں اس شکایت کی اصل وجہ یہ ہے کہ مردوں نے ان کے کان میں اتنا ہی ڈالا ہے کہ ہمارے حقوق تمہارے اوپر اس قدر ہیں اور یہ بات بالکل ان کے کان تک نہیں پہنچائی کہ تمہارے بھی کچھ حقوق ہمارے اوپر ہیں اور عام مرد تو ایسی بات ان کے کان تک کیوں ہی پہنچتے دیتے کیونکہ اپنے خلاف ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ

لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ﴿۳۳۲﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پورے کامیاب ہو جاؤ

تفسیری نکات

فلاح آخرت کے لئے ایمان شرط ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا (اے ایمان والو!) سے ایمان کی ضرورت معلوم ہوئی لیکن اس کو بصورت امر آمنوا (تم ایمان والو) کہہ کر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب اہل ایمان ہی ہیں ان کو آمنوا (ایمان لاؤ) کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ احکام کی دو قسمیں ہیں ایک وہ احکام جو ان لوگوں سے متعلق ہیں جنہوں نے ایمان قبول کر لیا ہے پہلی قسم میں اول ایمان کا حکم کیا جائے گا اور دوسری قسم میں ایمان کا حکم صیغہ امر سے نہ کیا جائے گا جیسے طلب علم کے متعلق ایک تو غیر طالب علم کو خطاب کیا جائے اور ایک طالب علم کو تو جس وقت غیر طالب علم کو خطاب کیا جائے گا اس وقت اسے کہنے کی ضرورت ہے کہ علم طلب کرو جس وقت طالب علم مخاطب ہو اس وقت اس شرط کے اظہار کی ضرورت نہیں قرآن میں بھی اس طرح دونوں قسم کے خطاب ہیں اور یہ مثالیں میں نے اس لئے دے دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے

مضامین میں کوئی نئے نہیں ہیں اگر غور کیا جائے تو جس طرح ہم لوگ محاورات میں گفتگو کرتے ہیں اسی طرح قرآن میں بھی کلام کیا جاتا ہے ہاں طرز تعلیم ایسا عجیب ہے کہ دوسرے کسی سے ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہوتی ہے بہر حال چونکہ اس صورت میں زیادہ احکام اور اکثر خطابات مومنین کو ہیں اس لئے آمنوا (ایمان لاؤ) بصیغہ امر نہیں لایا مگر يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ہی سے ایمان کا شرط ہونا معلوم ہو گیا جیسا کہ اوپر چند مثالوں سے میں نے اس کو سمجھا دیا ہے مجھ کو اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ آجکل بہت سے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ فلاح کے لئے ایمان کو بھی شرط نہیں سمجھتے اس وقت ہم کو دنیوی فلاح سے تو بحث نہیں اس کے متعلق تو ہماری حالت یہ ہے

ماقصہ سکندرو دارانہ خواندہ ایم از ماجز حکایت مہر وفا پیرس

ہم نے دارا اور سکندر کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے تو محبت اور وفا کے علاوہ کچھ نہ پوچھو ہم دنیوی ترقی سے منع بھی نہیں کرتے مگر اس کے ساتھ ہی ہم کو اس کے احکام بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں تو ہم اس سے بحث نہیں کرتے کیونکہ دنیوی فلاح و کامیابی کے لئے بھی ایمان شرط ہے یا نہیں بلکہ اس وقت فلاح آخرت سے بحث ہے افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان فلاح آخرت اور وصول الی اللہ کے لئے بھی اس کو ضروری نہیں سمجھتے چنانچہ بہت لوگ ایسے بھنگڑوں کے پیچھے

پھرتے ہیں جن کو نہ ایمان سے ربط ہے نہ نماز روزہ سے اور کہتے ہیں کہ درویشی کا راستہ ہی دوسرا ہے چنانچہ اگر کوئی ہندو جوگی آجائے اور دو چار شعبہ ظاہر کر دے اور کسی پر اس کی توجہ سے کچھ اثر بھی ہونے لگے تو اس کو ولی سمجھنے لگتے ہیں اور بہت سے لوگ معتقد ہو جاتے ہیں غرض **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** (اے ایمان والو) سے یہ مسئلہ مستنبط ہو گیا کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان یقیناً شرط ہے اور اس سے قرآن کی جامعیت معلوم ہوتی ہے کہ ذرا سے لفظ سے کتنا بڑا مسئلہ ثابت ہو گیا گو یہاں اس پر کوئی زور نہیں دیا گیا نہ صیغہ امر سے اس کو تعبیر کیا گیا مگر طرز خطاب سے یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے کہ فلاح کے لئے سب سے اول ایمان شرط ہے۔ پس اول درجہ تو ایمان کا ہے۔

دنیا کی فلاح بھی اعمال صالحہ سے ہوتی ہے

دوسرا درجہ اس کے بعد مراتب متوسط کا ہے جن کو **اصْبِرُوا وَاصْبِرُوا وَارْطَبُوا وَارْتَقُوا** اللہ (صبر کرو خود تکالیف اور کفار کے مقابلہ پر صبر کرو اور مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو) میں بیان کیا گیا ہے یہ چار چیزیں ہیں اور تیسرا درجہ نتیجہ کا ہے جس کا بیان **لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ** (تا کہ فلاح پاؤ) میں ہے جو شمار میں چھٹی چیز ہے گو ترتیب کا متقضا یہ تھا کہ میں اول مراتب متوسطہ کو بیان کرتا لیکن میں ضرورت کی وجہ سے نتیجہ کو مقدم کرتا ہوں کیونکہ آجکل ترقی و فلاح پر بہت گفتگو ہو رہی ہے اور ہر شخص اس کا طالب ہے تو سنئے حق تعالیٰ ایمان اور چند احکام کا بیان فرما کر بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں **لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ** کہ امید ہے تم کو فلاح حاصل ہو اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اخیر چیز اور مقصود فلاح ہے دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس کا وعدہ ان اعمال مذکورہ پر کیا گیا ہے اور یہاں فلاح مطلق ہے جس کو فلاح دین وغیرہ کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا تو اس درجہ میں عموم الفاظ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فلاح خواہ دین کی ہو یا دنیا کی ان احکام پر ہی عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اعمال شرعیہ سے مقصود تو محض فلاح دین ہے مگر ترتیب فلاح دنیا کا بھی ہوتا ہے پس فلاح دین تو اس لفظ کا مدلول مطابقی اور فلاح دنیا مدلول التزامی ہے یعنی اعمال شرعیہ کے لئے فلاح دنیا لازم ہے گو مقصود نہ ہو۔ اب سنئے کہ اس زمانہ میں ہر شخص فلاح کا طالب ہے فلاح دنیوی کے طالب تو بہت کثرت سے ہیں حتیٰ کہ اس کے لئے دین کو بھی برباد کر دیا جاتا ہے اور اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک دین کو برباد نہ کریں اس وقت تک فلاح دنیوی حاصل نہیں ہو سکتی (یہ بالکل غلط ہے) آجکل زیادہ تر فلاح دنیا کے طالب ہیں تو میں نے بتلا دیا کہ فلاح دنیا بھی دین ہی کے اتباع سے مل سکتی ہے اس کے بغیر مسلمان کو تو مل نہیں سکتی۔ یہ مسئلہ **لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ** (تا کہ تم کامیاب ہو) سے مستنبط ہے۔

لَعَلَّ كَامِفْهُوم

اور یہاں لعل شک کے لئے نہیں ہے بلکہ ترجیحی یعنی امید دلانے کے لئے ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ اعمال بجا لا کر فلاح کے امیدوار ہو لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں کوئی وعدہ تو ہے ہی نہیں تو شاید ایسا نہ بھی ہو کیونکہ یہ شاہانہ کلام ہے اور بادشاہ کسی کو امید دلا کر نا امید نہیں کیا کرتے۔ شاہانہ کلام میں امیدوار باشد (امیدوار رہو) ہزار پختہ وعدوں سے زیادہ ہوتا

ہے پھر رفع شک کے لئے بعض مقامات پر حق تعالیٰ نے پختہ وعدہ بھی فرمایا چنانچہ ارشاد ہے حَقًّا عَلَيْكَ نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (ہم پر مومنین کی مدد کرنا حق ہے) رہا یہ کہ پھر سب جگہ حَقًّا عَلَيْكَ (ہم پر حق ہے) ہی کیوں نہ فرمایا لیکن لعلکم کس لئے فرمایا تو اس میں ایک راز ہے جو اہل سنت نے سمجھا ہے وہ یہ کہ پختہ وعدہ کے بعد بعض جگہ لعل فرما کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ہم وعدہ کر کے مجبور نہیں ہو گئے بلکہ اب بھی جزا کا دینا نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے تمہاری مجال نہیں کہ ہم پر تقاضا کرنے لگو اور ہم کو ایفاء وعدہ پر مجبور سمجھ کر کچھ سے کچھ ہانکنے اور بکنے لگو ہماری شان یہ ہے لَا يُسْئَلُ عَنَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ (جو وہ کرتا ہے اس سے اس کو نہ پوچھا جائے گا اور نہ ان سے دریافت کیا جائے گا) یہ اور بات ہے کہ ہم وعدہ کر کے ایفاء ضرور کریں گے مگر اس پر مجبور بھی نہیں ہیں بلکہ وعدہ کے بعد بھی ویسے ہی مختار ہیں جیسے قبل وعدہ تھے اس لئے تم تو لعلکم ہی کے مفہوم پر نظر رکھو لان پر ناز نہ کرو گو ہمارے یہاں لعل بھی لان ہی کے حکم میں ہے اس نکتہ کو اہل سنت ہی نے سمجھا ہے۔

اعمال کی دو قسمیں

اعمال دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جن کا وقت آ گیا ایک وہ جن کا وقت نہیں آیا سو یہاں ایک حکم قسم اول کے متعلق ہے اور ایک حکم قسم دوم کے متعلق ہے۔ قسم اول کے متعلق تو اصبروا ہے یعنی جس عمل کا وقت آ جاوے اس وقت صبر سے کام لو یعنی پابندی اور استقلال سے رہو تو حق تعالیٰ نے اس میں اعمال حاضرہ میں مستقل رہنے کا حکم فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دینداری کے یہی معنی ہیں کہ ہر کام کو پابندی اور استقلال سے کیا جاوے۔ آج کل بعض لوگ ولولے اور جوش میں بہت سا کام شروع کرنے میں ساتھ دیتے ہیں پھر نباہ نہیں ہوتا تو یہ دیندار کامل نہیں ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اتنا ہی بتلایا ہے جس پر نباہ ہو سکے واجبات و فرائض و سنن موکدہ پر نباہ کچھ دشوار نہیں اس سے زیادہ کام کرنے میں البتہ بعض سے نباہ نہیں ہوتا تو انکو اپنے ذمہ اتنا ہی کام بڑھانا چاہیے جس پر نباہ اور دوام ہو سکے تو اصبروا کا حکم ان اعمال کے متعلق ہے جن کا وقت آ گیا ہے پھر ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے دوسرے وہ جن کا تعلق دوسروں سے بھی ہے ان کے متعلق صابر و صابروا فرمایا ہے دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو بعض لوگ اپنے ذاتی کام تو کر لیتے ہیں مگر دوسروں کے متعلق باہمت نہیں ہوتے اور اگر کچھ ہمت بھی کی تو وہ اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کوئی دوسرا مزاحم نہ ہو اور اگر کوئی مزاحم ہو تو پھر مستقل نہیں رہتے جیسے نکاح وغیرہ کی رسموں میں اکثر لوگوں کی یہی حالت کہ بیٹے والا بیٹی والوں کی مزاحمت کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو نچاتا ہے پھر یہ دین پر مستقل نہیں رہ سکتے اس کے متعلق صابر و صابروا میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں بھی ثابت قدم رہو اسی طرح اگر کبھی اعداء اللہ دین میں مزاحمت کرنے لگیں تو ان کے مقابلہ میں بھی مستقل رہنے کا صابر و صابروا میں حکم ہے۔ غرض ایک تو وہ افعال ہیں جن میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا ان پر مداومت و استقلال کرنے کا حکم تو اصبروا میں ہے اور جن میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان میں ثابت قدم رہنے کا حکم صابر و صابروا میں ہے۔ یہ تو وہ افعال تھے جن کا وقت آ گیا ہے اور ایک وہ افعال ہیں جن کا ابھی وقت نہیں آیا ان کے متعلق حکم رابطوا ہے جس کا حاصل ہے کہ ان کاموں کے لئے تیار و مستعد رہنا چاہیے اور یہ میں نے اس

سے سمجھا کہ لغت میں رباط کے معنی اعداء کے مقابلہ میں سرحد پر گھوڑے باندھنا ہے یعنی مورچہ بندی اور ظاہر ہے کہ مورچہ بندی حفظ ما تقدم کے لئے اور پہلے سے مقابلہ کو تیار و مستعد رہنے کے واسطے کی جاتی ہے۔ عام لغت کے موافق ایک تفسیر تو رباط کی یہ ہے دوسری ایک تفسیر حدیث میں آئی انتظار الصلوة بعد الصلوة یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے لئے منتظر رہنا۔ حضور ﷺ نے اس کے متعلق بھی فرمایا ہے فذلکم الرباط فذلکم الرباط یہی رباط ہے یہی رباط ہے اور اس تفسیر میں اور پہلی تفسیر میں کچھ منافات نہیں بلکہ اس میں حضور ﷺ نے ہم کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ رباط اعداء ظاہری کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ جیسے اعداء ظاہری کے مقابلہ میں رباط ہوتا ہے اسی طرح کبھی اعدا باطنی یعنی نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی رباط ہوتا ہے وہ مجاہدہ ظاہری کا رباط ہے اور یہ معاہدہ باطنی کا رباط ہے۔ اسی کو ایک حدیث میں حضور ﷺ نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

المجاهد من جاهد نفسه والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور مهاجر وہ جو گناہوں اور خطاؤں سے بچتا ہے) یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے مقابلہ میں مجاہدہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کی ایک قسم مجاہدہ نفس بھی ہے اور اس کیلئے بھی ایک رباط ہے جیسے اعداء ظاہر کے مقابلہ کی پہلے سے تیاری کی جاتی ہے اسی طرح نفس و شیطان کے مقابلہ میں بھی مورچہ بندی کی ضرورت ہے کیونکہ یہ بھی بڑے سخت دشمن ہیں جو بدوں مورچہ بندی کے قابو میں نہیں آتے اسی کو فرماتے ہیں۔

اے شہاں کشتم ما نھمے بروں ماند نھمے زوتر دراندروں

(اے بزرگو ہم نے ظاہری دشمن کو تو ہلاک کر دیا مگر ایک دشمن جو اس سے بھی بدتر اور زیادہ ضرر رساں ہے باطن میں رہ گیا جس کو نفس کہتے ہیں) اور فرماتے ہیں

کشتن این کار عقل و ہوش نیست شیر باطن سحرہ خرگوش نیست

(اس باطنی دشمن کو ہلاک کرنا محض عقل و ہوشیاری کا کام نہیں ہے کیونکہ شیر باطن خرگوش کے قابو کا نہیں ہے) یعنی اس کا زیر کرنا عقل و ہوش کا کام نہیں کیونکہ شیر خرگوش کے پھندے میں نہیں آیا کرتا بلکہ ان کو زیر کرنے کے لئے شارع علیہ السلام کی تعلیم کا اتباع ضروری ہے چنانچہ اس کا ایک شعبہ یہ رباط ہے یعنی نماز کا انتظار کرنا بعد ایک نماز کے یہ نفس پر سب سے زیادہ گراں ہے کیونکہ اس میں کوئی حظ نہیں ہے۔ بس نماز پڑھ کر خالی بیٹھتے ہیں اور دوسری نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج کل بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس خالی بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ میں کہتا ہوں اس میں دو فائدے ہیں ایک تو نفس کو طاعات پر جمانا دوسرے وہ فائدہ ہے جس کو حضور ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔

ان العبد فی الصلوة ما انتظر الصلوة کہ بندہ جب تک نماز کے انتظار میں ہے اس وقت تک وہ نماز میں رہتا ہے یعنی اس انتظار میں وہی ثواب ملتا ہے جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے۔ بہر حال اصبروا و صابروا کا تعلق تو ان اعمال سے ہے جن کا وقت آ گیا اور رباطوا کا تعلق ان اعمال سے جن کا وقت نہیں آیا اب سمجھو کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں

ایک ظاہر۔ ایک باطن اعمال ظاہر کی یہ تقسیم تھی جو میں نے اب تک بیان کی کہ ان میں ایک قسم تو وہ ہے جس کا وقت آ گیا اور پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک اپنے متعلق ایک دوسرے کے متعلق اور دوسری قسم وہ ہے جس کا وقت نہیں آیا ان سب اقسام کے احکام تو اَصْبِرُوا وَاصْبِرُوا وَرَابِطُوا میں مذکور ہوئے اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان احکام کا تعلق تمام شریعت سے ہے کیونکہ کوئی عمل اس قسم سے باہر نہیں ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مصالح دنیویہ سے ان احکام کو پورا تعلق ہے کیونکہ دنیا کے کام بھی دو ہی قسم کے ہیں ایک وہ جن کا وقت آ گیا ان میں استقلال و ثبات قدم کی ضرورت ہے دوسرے وہ جن کا وقت نہیں آیا ان کے لئے تیاری و مستعدی کی ضرورت ہے۔ اب ایک قسم رہ گئی یعنی اعمال باطنہ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں وَاتَّقُوا اللَّهَ کہ خدا سے ڈرتے رہو یہ تمام اعمال باطنہ کی جڑ ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَاصْبِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

رَابِطُوا کا مفہوم

ارشاد ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَاصْبِرُوا اے ایمان والو! صبر کرو اور مقابلہ میں بھی صبر کرو۔ دو لفظ اس واسطے اختیار کئے گئے کہ صبر کبھی لازم ہوتا ہے کبھی متعدی یعنی جس حالت پر صبر کیا جاوے کبھی اس کا تعلق صرف اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے جیسے مرض وغیرہ کبھی دوسروں سے تعلق ہوتا ہے جیسے محاربہ وغیرہ تو دونوں حالتوں میں صبر کا امر ہے اس کے بعد ارشاد ہے وَرَابِطُوا اصبروا و صابروا اس کی تمہید ہے اور وَاتَّقُوا اللَّهَ تکمیل ہے اور لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ تتمیم ہے اب رابطوا کے معنی سنئے۔ بیضاوی نے اس کی تفسیر داوم اور رابطوا کی ہے یعنی عمل پر مداومت اختیار کرو کیونکہ رابط کے معنی لغت میں باندھنا ہے اور مواظبت و دوام میں بھی نفس کو باندھنا ہے اور اسی واسطے بعض نے اس تفسیر مرابطۃ الخیل سے بھی کی ہے کیونکہ اس سورت کے زیادہ حصہ میں محابہ باللسان کا ذکر ہے اس کے مناسب رباط الخیل ہی ہے تو اس لفظ کی تفسیر میں دو احتمال ہو گئے یہاں صبر و مصابرت و مرابطت کا امر ہے اور تقویٰ اس کی تکمیل ہے۔ صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ماتکرہ یعنی نفس کو ناگوار امور پر جمانا اور مصابرت کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ناگوار امور پر نفس کو ثابت قدم رکھنا اور مرابطت کے معنی یہ ہیں کہ صبر و مصابرت پر مواظبت کی جائے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ عمل ان سب میں مشترک ہے مطلب یہ ہوا کہ عمل میں مستعد رہو اور اسی پر برابر لگے رہو اب بعض اعمال تو اپنے کرنے سے ہیں جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ ان کو دیانات کہا جاتا ہے ان پر جمنا تو صبر ہے اور بعض اعمال میں دوسروں سے واسطہ ہے جیسے نکاح و بیع و جہاد وغیرہ یہ معاملات ہیں ان میں احکام شرعیہ پر جمنا ہنا مصابرت ہے۔ پھر دیانات میں تو صبر سہل ہے کیونکہ ان میں حظ نفس بھی ہے زکوٰۃ میں حظ یہ ہے کہ دوسروں پر احسان ہے حج میں حظ یہ ہے کہ سیر و تفریح ہوتی ہے (نماز میں حظ یہ ہے کہ اس سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے جو موجب راحت ہے روزہ میں طبیعت ہلکی ہلکی رہتی ہے اس سے بھی راحت ہوتی ہے) مگر معاملات میں صبر دشوار ہے اس لئے وہاں بھی صاف طور سے مصابرت کا امر کیا گیا ہے کہ نفس کو معاملات میں بھی شریعت کے موافق عمل کرنے پر مجبور کرو اور یہ حکم صبر و مصابرت اعمال باطنیہ کو بھی

شامل ہے کیونکہ وہ بھی اعمال کی ایک قسم ہیں عمل کہتے ہیں فعل اختیاری کو اس لئے اعمال باطنیہ بھی عمل میں داخل ہیں چنانچہ ایمان کو نصوص میں عمل کہا گیا ہے پھر جس طرح نماز روزہ کا شریعت میں امر ہے اسی طرح محبت و شکر وغیرہ کا امر ہے اور جیسے چوری زنا وغیرہ سے منع کیا گیا ہے اسی طرح ریا و حسد و کبر سے ممانعت ہے۔ پھر جس طرح اعمال ظاہرہ میں بعض اعمال اپنے متعلق ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے اسی طرح اعمال باطنیہ بھی دو قسم کے ہیں بعض اپنے کرنے کے ہیں بعض میں دوسروں سے واسطہ ہے پس وہاں بھی صبر و مصابرت دونوں کا امر ہے بلکہ اعمال باطن میں صبر و مصابرت کی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ باطن میں بعض دفعہ ایسے مصائب و مصاعب پیش آتے ہیں جن کا تحمل اہل ظاہر ہرگز نہیں کر سکتے۔

تقویٰ شرعی

آگے ارشاد ہے **وَ اتَّقُوا اللَّهَ** یعنی خدا سے ڈرو یہ تکمیل ہے مضمون سابق کی کیونکہ اگر خدا کا خوف نہ ہو تو نہ مرابطہ ہو گا نہ مشارطہ نہ معاتبہ نہ محاسبہ۔ ان سب کی بنیاد خدا کا خوف ہی ہے پس **وَ اتَّقُوا اللَّهَ** اس لئے بڑھایا کہ مدار ان سب اعمال کا اسی پر ہے۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ جب تقویٰ سب اعمال کی بنیاد ہے تو پھر **وَ اتَّقُوا اللَّهَ** کو مقدم کرنا چاہیے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تقویٰ شرعی مراد ہے تقویٰ شرعی وہ ہے کہ خوف خدا کے ساتھ عمل بھی ہوا اگر عمل نہ ہو محض خوف ہی ہو وہ تقویٰ شرعی نہ ہو گا اور قاعدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ایسی عظمت ان اعمال ہی سے قلب میں پیدا ہوتی ہے پس یہ تقویٰ اعمال کا اثر ہوا اس لئے **وَ اتَّقُوا اللَّهَ** کو مؤخر کیا گیا حاصل یہ ہوا کہ ان اعمال سے جو عظمت حق تمہارے قلب میں پیدا ہوگی اس کا استحضار رکھو تو یہ اعمال سہل ہو جائیں گے پس تقویٰ ان اعمال کا نتیجہ بھی ہے اور ان کو سہل کرنے والا بھی ہے اب میں یہاں بمناسبت مقام تقویٰ کے متعلق ایک اشکال کا جواب دینا چاہتا ہوں ترجمہ دیکھنے والے ذرا اس کا حل کریں وہ یہ کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں تو تحصیل حاصل ہے جو لوگ پہلے سے متقی ہیں ان کو تو ہدایت حاصل ہے پھر ان کے واسطے ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں تقویٰ لغوی مراد ہے یعنی قرآن ان لوگوں کے واسطے ہدایت ہے جن کے دل میں خدا کا خوف ہو دوسرا جواب یہ ہے کہ مان لیا کہ تقویٰ شرعی ہی مراد ہے اور یہی مدار تھا اشکال کا کہ تقویٰ شرعی کے بعد ہدایت کے کیا معنی ہدایت تو ایسے شخص کو پہلے ہی سے حاصل ہے پس اس معنی کو تسلیم کر کے دوسرا جواب دیا جاسکتا ہے ایک بار ہر دوئی میں ایک مولوی صاحب کو چند جملہ مسلمینوں نے اس اشکال سے پریشان کر رکھا تھا اور وہ اس کو تسلیم کر رہے تھے کہ مراد تقویٰ شرعی ہی ہے مگر اشکال کو حل نہ کر سکے تھے میں بھی اس جلسہ میں آ گیا اور میں نے اسی کی تائید کی تاکہ مولوی صاحب کی بات سچی نہ ہو مگر اس اشکال کو سہل عنوان سے حل کر دیا جس سے سامعین کا شبہ زائل ہو گیا وہ عنوان یہ تھا کہ میں نے ان سے کہا کہ **هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ** ایسا ہے جیسے آپ لوگ کہا کرتے ہیں کہ یہ کورس بی اے کا ہے۔ تو آپ بتلائیے کہ اس قول کے کیا معنی ہیں کیا یہ مطلب ہے کہ اس کو وہ پڑھتا ہے جو بی اے کا ہو چکا کہنے لگے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کورس ایسا ہے کہ جو اس کو پڑھ لے گا وہ بی اے ہو جائے گا۔ میں نے کہا پس یہی مطلب اس کا ہے کہ یہ کورس ایسا ہے کہ جو اس کو پڑھے گا بی اے ہو جائے گا میں نے کہا پس یہی مطلب اس کا

ہے کہ یہ قرآن متقین کے واسطے ہدایت ہے یعنی جو اس پر عمل کرے گا وہ متقی بن جائے گا۔ اس تقریر سے وہ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ اس مضمون کی تعبیر کرنا چاہتے تھے مگر قادر نہ تھے میری تعبیر سن کر ان کی خوشی کی حد نہ رہی اور یہ جواب میرا گھڑا ہوا نہیں بلکہ منقول ہے جلالین میں الصائرين الى التقوى سے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے لوگ تقویٰ کے درجہ کو پہنچ جاتے ہیں مگر لوگ جلالین پڑھتے پڑھاتے تو ہیں سمجھتے نہیں ہیں۔

ترغیب فلاح

اس کے بعد اشاد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ اس میں ترغیب ہے کیونکہ سہولت عمل میں دو ہی چیزوں کو زیادہ دخل ہے ایک ترہیب کی دوسرے ترغیب کو وَاتَّقُوا اللَّهَ میں ترہیب تھی۔ اس جملہ میں ترغیب ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال مذکورہ کو سہل فرما دیا ہے اور اس کی اس واسطے ضرورت تھی کہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ سے دو طرح کا ہے ایک محکومیت کا ایک محبت کا محکومیت کا متقضا تو یہ ہے کہ تسہیل اعمال کا طریقہ نہ بتلایا جائے کیونکہ خود محکوم ہونا و جوہ امتثال کے لئے کافی ہے مگر محبت کا متقضا یہ ہے کہ تسہیل کا طریقہ بھی بتلادیا جائے کیونکہ محبت خاص رعایت کو متقضا ہوتی ہے خواہ حاکم کی جانب میں محبت ہو خواہ محکوم کی جانب میں اور دونوں طرف ہو تو نُورٌ عَلَيَّ نُورٌ پھر اس کی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ ترغیب کے لئے اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے کسی وصف کی طرف متوجہ فرماتے مثلاً یوں فرماتے کہ میں تم سے راضی ہو جاؤں گا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم کو ہمارے وصف کی طرف متوجہ کیا جائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے دوسری صورت اختیار فرمائی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف تو ہم سے غائب ہیں اور اپنے اوصاف کو ہم زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ تمام احکام کو ذکر کے اخیر میں ایک ایسا گر بتلاتے ہیں جو گویا تمام سورت کا موضوع ہے جس کو اس کے سب احکام سے تعلق ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِرُوا وَأَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

ترجمہ: اے ایمان والو! (تکالیف پر) صبر کرو اور (جب کفار سے مقابلہ ہو تو) مقابلہ میں صبر کرو اور (احتمال مقابلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (حدود شرعیہ سے باہر نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب ہو جاؤ (آخرت میں تو ضرور ہی اور اکثر اوقات ان اعمال پر محافظت کی بدولت دنیا میں بھی پوری کامیابی ہوتی ہے)

احکام شرعیہ مصالح دنیویہ کو بھی متضمن ہیں

جن باتوں کا اس آیت میں ذکر ہے یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کو اس صورت کے احکام سے تو تعلق ہے ہی میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس قدر بھی احکام شرعیہ ہیں سب سے ان کا تعلق ہے اور اس سے آگے میں اور ترقی کرتا ہوں کہ اتفاق سے ہم کو یہ بات بھی ثابت ہوگی ہے کہ جیسے ان کو احکام شرعیہ سے تعلق ہے اسی طرح تمام دنیوی مصالح معاشیہ سے بھی ان کو تعلق ہے مگر نہ اس وجہ سے کہ یہ شریعت کا موضوع و مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ شریعت تکمیل آخرت کے ساتھ ہماری دنیا کی بھی تکمیل ساتھ ساتھ کرتی ہے۔ اس لئے احکام شرعیہ اس طور سے مقرر کئے گئے ہیں جو تبعاً مصالح دنیویہ کو بھی متضمن

ہیں۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا** یعنی اے ایمان والو! صبر کرو اور صبر کرو اور تعلق تو اعمال لازمہ سے ہے جن میں دوسروں سے کچھ تعلق نہیں۔ ان میں حکم ہے صبر کا۔ اور ایک صبر ہے دوسرے مقام پر۔ وہ یہ کہ کسی عمل میں مخالفت کی مزاحمت ہو اس کے متعلق ارشاد ہے **وَصَابِرُوا** کہ مقابلہ میں بھی صبر کرو یعنی استقلال کے ساتھ رہو۔ آگے ارشاد ہے **وَرَابِطُوا** اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ سرحد کی حفاظت کرو دوسرے یہ کہ مستعد رہو۔ پہلے معنی خاص عمل کے متعلق ہیں اور دوسرے معنی سب اعمال کو عام ہو سکتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں **وَإِن تَوَلَّوْا لَعَلَّكُمْ تَكْفُرُونَ** اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم کو فلاح حاصل ہو جائے۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ اس مقام پر ایک تو صبر کا حکم ہے اور صبر کے دو درجے ہیں اور ایک رباط کا حکم ہے اور ایک تقویٰ کا تو چار حکم ہوئے۔ ایک پانچویں اور ایک چھٹی چیز اور ہے جن میں سے ایک کا اول میں ذکر ہے اور ایک کا آخر میں۔ اول میں ایمان ہے اور آخر میں فلاح ہے۔ ایک چیز بطور مبداء کے ہے اور ایک صورت نتیجہ میں ہے اور چار حکم درمیان میں ہیں کل چھ ہوئے اور ان کے مراتب میں فرق ایسا ہے جیسے سفر اور مسافت اور منزل میں فرق ہے کہ سفر کی ایک ابتداء ہوتی ہے اور ایک درمیانی مسافت ہوتی ہے جس کے بعد کے لئے کچھ مراتب ہوتے ہیں اور ایک نتیجہ ہوتا ہے یعنی منزل مقصود پر پہنچنا۔

پس یہ کلام ایسا ہے جیسے ہم کسی سے یوں کہیں کہ اے مسافر فلاں راستہ جانا اور فلاں مقامات پر ٹھہرنا اور چوروں سے اپنی حفاظت رکھنا تو وہی پہنچ جائے گا۔ اس کلام سے تین باتیں معلوم ہوں گی۔ ایک یہ کہ وہی پہنچنے کے لئے سفر کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ وعدہ مسافر ہی سے کیا گیا ہے مگر اس کو بصورت امر اس لئے ظاہر نہیں کیا کہ مخاطب خود ہی سفر شروع کر چکا ہے۔ اب اس سے یہ کہنا کہ اے مسافر سفر کرنا تحصیل حاصل ہے اور بلا ضرورت کلام کو طول دینا ہے۔ بس سفر کی ضرورت اس کو مسافر کہہ کر خطاب کرنے ہی سے معلوم ہوگئی۔ یہ مختصر کلام ہے اور دلالت اس کی علی التمام ہے۔ غرض ایک تو سفر کرنا ضروری ہوا اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ منازل پر سے گزرنا اور اپنی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے تیسرا وعدہ ہے کہ اس طرح تم وہی پہنچ جاؤ گے۔ تو سفر شرط وصول ہے اور درمیانی باتیں احکام وصول ہیں اور تیسری بات نتیجہ ہے۔ ہر مقصود کے لئے ان تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

اس کی ایک مثال اور لیجئے مثلاً کوئی کہے کہ اے طالب علم رات کو جاگنا اور محنت کرنا تو علم آوے گا۔ اس کلام سے اول تو طلب علم کا ضروری ہونا معلوم ہوا۔ دوسرے رات کو جاگنے اور محنت کرنے کی ضرورت معلوم ہوئی۔ تیسرے نتیجہ کا وعدہ ہے کہ اس طرح کرنے سے علم حاصل ہو جائے گا مگر یہاں بھی طلب علم کو بصورت امر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب خود ہی طلب میں مشغول ہے۔

اسی طرح یہاں بھی **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** سے ایمان کی ضرورت معلوم ہوئی لیکن اس وقت بصورت امر **آمَنُوا** کہہ کر اس لئے ظاہر نہیں کیا گیا کہ مخاطب اہل ایمان ہی ہیں ان کو **آمَنُوا** کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ احکام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ احکام جو ان لوگوں کے متعلق ہیں جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور دوسرے وہ جو ان کے متعلق ہیں جنہوں نے ایمان

قبول کر لیا ہے۔ پہلی قسم میں اول ایمان کا حکم کیا جائیگا اور دوسری قسم میں ایمان کا حکم صیغہ امر سے نہ کیا جائے گا۔ جیسے طالب علمی کے متعلق ایک تو غیر طالب کو خطاب کیا جائے اور ایک طالب علم کو۔ تو جس وقت غیر طالب کو خطاب کیا جائے اس وقت یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ علم طلب کرو۔ اور جب وقت طالب علم مخاطب ہو اس وقت اس شرط کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ قرآن میں بھی اسی طرح دونوں قسم کے خطاب ہیں۔

یہ مثالیں میں نے اس لئے دے دیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ قرآن کے مضامین کوئی نئے نہیں ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو جس طرح ہم لوگ محاورات میں گفتگو کرتے ہیں اسی طرح قرآن میں بھی کلام کیا جاتا ہے۔ ہاں طرز تعلیم ایسا عجیب ہے کہ دوسرے سے ممکن نہیں کیونکہ قرآن میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت ہوتی ہے بہر حال چونکہ اس سورت میں زیادہ احکام اور اکثر خطابات مومنین کو ہیں اس لئے امنوا بصیغہ امر نہیں کہا گیا۔ مگر يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ہی سے ایمان کا شرط ہونا معلوم ہو گیا جیسا کہ اوپر چند مثالوں سے میں نے اس کو سمجھا دیا ہے۔ مجھ کو اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ آج کل بہت سے لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ فلاح کے لئے ایمان کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ اس وقت ہم کو دنیوی فلاح سے تو بحث نہیں اس کے متعلق تو ہماری حالت یہ ہے

ماقصہ سکندر و دارانہ خواندہ ایم از ما بجز حکایت مہر و وفا میرس

فلاح آخرت کے لئے ایمان شرط

غرض يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا سے یہ مسئلہ مستنبط ہو گیا کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان یقیناً شرط ہے اور اس سے قرآن کی جامعیت معلوم ہوتی ہے کہ ذرا سے لفظ سے کتنا بڑا مسئلہ ثابت ہو گیا۔ گو یہاں اس پر کوئی زور نہیں دیا گیا نہ صیغہ امر سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر طرز خطاب ہی سے یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کر رہا ہے کہ فلاح کے لئے سب سے اول ایمان شرط ہے۔ پس اول درجہ تو ایمان کا ہے۔ دوسرا درجہ اس کے بعد مراتب متوسطہ کا ہے۔ جن کا اَصِدُّوْا وَاَصَابِرُوْا وَاَبْرَاطُوْا وَاَتَّقُوا اللّٰهَ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ چار چیزیں ہیں اور تیسرا درجہ نتیجہ کا ہے جس کا بیان لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ میں ہے جو شمار میں چھٹی چیز ہے۔ گو ترتیب کا مقتضایہ تھا کہ میں اول مراتب متوسطہ کو بیان کرتا لیکن میں ضرورت کی وجہ سے نتیجہ کو مقدم کرتا ہوں کیونکہ آج کل ترقی و فلاح پر بہت گفتگو ہو رہی ہے اور ہر شخص اس کا طالب ہے تو سنئے! حق تعالیٰ ایمان اور چند احکام کا بیان فرما کر بطور نتیجہ کے فرماتے ہیں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کہ امید ہے کہ تم کو فلاح حاصل ہو۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ اخیر چیز اور مقصود فلاح ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس کا وعدہ ان اعمال مذکورہ پر کیا گیا ہے اور یہاں فلاح مطلق ہے جس کو فلاح دین وغیرہ کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا۔ تو اس درجہ میں عموم الفاظ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فلاح خواہ دین کی ہو یا دنیا کی ان احکام پر ہی عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اعمال شرعیہ سے مقصود تو محض فلاح دین ہے مگر ترتیب فلاح دنیا کا بھی ہوتا ہے پس فلاح دین تو اس لفظ کا مدلول مطابقی ہے اور فلاح دنیا مدلول التزامی ہے یعنی اعمال شرعیہ کے لئے فلاح دنیا لازم ہے گو مقصود نہ ہو۔

رسالة و هبزة و مفيدة في ربط الآيات

سبق الغايات في نسق الآيات

تأليف

حضرت حكيم الأمت نبذ الملت جامع الكلمات شبع الحسنة ماهر العلوم القرآنية واقف الأسرار الفرقانية،
رأس المفسرين مقدم الراسخين تمامب الشريعة والطريقة، بحر المعرفة والحق كاشف الأسرار النفي منهار الجاهل اعنوه به

مولانا محمد اشرف علي الشهانوي

نور الله مرقده و جعل الجنة مشواه

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورة الفاتحة

(اعلم) ان مراتب احوال الخلق خمسة اولها الخلق وثانيها التربية فى مصالح الدنيا وثالثها التربية فى تعريف المبدأ ورابعها التربية فى تعريف المعاد وخامسها نقل الارواح من عالم الاجساد الى دار المعاد فاسم الله تعالى منبع الخلق والايجاد والتكوين والابداع واسم الرب يدل على التربية بوجوه الفضل والاحسان واسم الرحمن يدل على التربية فى معرفة المبدأ واسم الرحيم فى معرفة المعاد حتى يحترز عما لا ينبغى ويقدم على ما ينبغى واسم الملك يدل على انه ينقلهم من دار الدنيا الى دار الجزاء ثم عند وصول العبد الى هذه المقامات انتقل الكلام من الغيبة الى الحضور فقال اياك نعبد كأنه يقول انك اذا انتفعت بهذه الاسماء الخمسة فى هذه المراتب الخمس وانتقلت الى دار الجزاء صرت بحيث ترى الله فحينئذ تكلم معه على سبيل المشاهدة لاعلى سبيل المغائبة ثم قل اياك نعبد واياك نستعين كأنه قال اياك نعبد لانك الله الخالق واياك نستعين لانك الرب الرازق اياك نعبد لانك الرحمن واياك نستعين لانك الرحيم اياك نعبد لانك الملك واياك نستعين لانك المالك واعلم ان قوله مالك يوم الدين دل على ان العبد منقل من دار الدنيا الى دار الآخرة ومن دار الشرور الى دار السرور فقال لا بد لذلك واليوم من زاد واستعداد وذلك هو العبادة فلا جرم قال اياك نعبد ثم قال العبد الذى اكتسبه بقوتى وقدرتى قليل لا يكفينى فى ذلك اليوم الطويل فاستعان بربه فقال ما معى قليل فاعطنى من خزائن رحمتك ما يكفينى فى ذلك اليوم الطويل فقال واياك نستعين ثم لما حصل الزاد ليوم المعاد قال هذا سفر طويل شاق والطرق كثيرة والخلق قد تاهوا فى هذه البادية

فلا طريق الا ان اطلب الطريق ممن هو بارشاد السالكين حقيق فقال اهدنا الصراط
المستقيم ثم انه لا بد لسالك الطريق من رفيق ومن بدرقة ودليل فقال صراط الذين
انعمت عليهم والذين انعم الله عليهم هم النبيون والصديقون والشهداء والصلحون
فالانبياء هم الادلاء والصديقون هم البدرقة والشهداء والصلحون هم الرفقاء ثم قال
غير المغضوب عليهم ولا الضالين وذلك لان الحجب عن الله قسمان الحجب النارية
وهى عالم الدنيا ثم الحجب النورية وهى عالم الارواح فاعتصم بالله سبحانه وتعالى
من هذين الامرين وهو ان لا يبقى مشغول السر لا بالحجب النارية لا بالحجب النورية.
(وجه المناسبة بين آخر الفاتحة واول البقرة ان العبد لما سال الهداية من الله تعالى بقوله
اهدنا الصراط المستقيم الخ. اجاب الله تعالى سؤاله فقال ذلك الكتب لاريب فيه هدى
للمتقين انى خذ ما سئلت من الهداية فهذا الكتاب هو الهداية الكبرى ١٢ عفى عنه).

سورة البقرة

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

آلم ذلك الكتب لا ريب فيه هدى للمتقين بيانه انه نبه اولاً على انه الكلام المتحدى به ثم اشير اليه بانه الكتب المنعوت بغاية الكمال فكان تقريراً لجهة التحدى ثم نفى عنه ان يثبت به طرف من الريب فكان شهادة بكماله ثم اخبر عنه بانه هدى للمتقين فقرر بذلك كونه يقيناً لا يحوم الشك حوله الذين يؤمنون بالغيب وقيمون الصلوة ومما رزقنهم ينفقون الاقرب ان يكون هذه الاشياء تفسيراً لكونهم متقين وذلك لان كمال السعادة لا يحصل الا بترك الا ينبغي وفعل ما ينبغي فالترك هو التقوى والفعل اما فعل القلب وهو الايمان او فعل الجوارح وهو الصلوة والزكوة والذين يؤمنون بما انزل اليك وما انزل من قبلك وبالآخرة هم يوقنون اعلم ان قوله الذين يؤمنون بالغيب عالم يتناول كل من آمن بمحمد صلى الله عليه وسلم سواء كان قبل ذلك مؤمناً بموسى وعيسى عليهما السلام او ما كان مؤمناً بهما ودلالة اللفظ العام على بعض ما دخل فيه التخصيص اضعف من دلالة اللفظ الخاص على ذلك والبعض لان العام يحتمل التخصيص والخاص لا يحتمله فلما كانت هذه السورة مدينة وقد شرف الله تعالى المسلمين بقوله هدى للمتقين الذين يؤمنون بالغيب فذكر بعد ذلك اهل الكتاب الذين آمنوا بالرسول كعبد الله بن سلام وامثاله بقوله والذين يؤمنون بما انزل اليك وما انزل من قبلك لان في هذا التخصيص بالذكر مزيد تشریف لهم كما في قوله تعالى من كان عدواً لله وملئكته ورسله وجبريل وميكال ثم تخصيص عبد الله بن سلام وامثاله بهذا التشریف ترغيب لامثاله في الدين فهذا هو السبب في ذكر هذا الخاص بعد ذلك العام اولئك على هدى من ربهم واولئك هم المفلحون في كيفية تعلق هذه الآية بما قبلها وجوه ثلاثة احدها ان ينوي الابتداء بالذين يؤمنون بالغيب وذلك لانه لما قيل هدى للمتقين فخص المتقين بان الكتب هدى لهم كان لسائل ان يسأل فيقول ما السبب في اختصاص المتقين بذلك فوقع قوله الذين يؤمنون بالغيب الى قوله واولئك هم المفلحون جواباً عن السؤال كانه قيل الذي يكون مشتغلاً

بالايمان واقامة الصلوة وايتاء الزكوة والفوز بافلاح والنجاة لابد ان يكون على هدى من ربه وثانيها ان لا ينوى الابتداء به بل يجعله تابعا للمتقين ثم يقع الابتداء من قوله اولئك على هدى من ربهم كانه قيل اى سبب فى ان صار الموصوفون بهذه الصفات مختصين بالهدى فاجيب بان اولئك المصوفين غير مستبعد ان يفوز وادون الناس بالهدى ماجلا وبالفلاح آجلا وثالثها ان يجعل الموصول الاول صفة المتقين ويرفع الثانى على الابتداء واولئك خبره ويكون المراد جعل اختصاصهم بالفلاح والهدى تعريضا باهل الكتب الذين لم يؤمنوا بنبوّة رسول الله صلى الله عليه وسلم وهم ظانون انهم على الهدى وطامعون انهم ينالون الفلاح عند الله تعالى ان الذين كفروا سواء عليهم انذرتهم ام لم تنذرهم لا يؤمنون كلام مستأنف سيق لشرح احوال الكفرة الغواة المردة العتاة اثر بيان احوال اضدادهم المتصفين بنعوت الكمال الفائزين بمباغيهم فى الحال والمآل (ربط هذه الآية من ابي المسعود) ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم وعلى ابصارهم غشاوة ولهم عذاب عظيم اعلم انه تعالى لما بين فى الآية انهم لا يؤمنون خبر فى هذه الآية بالسبب الذى لاجله لم يؤمنوا وهو الختم ومن الناس من يقول الخ اعلم ان المفسرين اجمعوا على ان ذلك فى وصف المنافقين قالوا وصف الله الاصناف الثلاثة من المؤمنين والكافرين والمنافقين فبدأ بالمؤمنين المخلصين الذين صحت سرائرهم وسلمت ضمائرهم ثم اتبعهم بالكافرين الذين من امتهم الاقامة على الجحود والعتاد ثم وصف حال من يقول بلسانه انه مؤمن وضميره يخالف ذلك يخادعون الله الخ اعلم ان الله تعالى ذكر من قبائح افعال المنافقين اربعة اشياء احدها ما ذكره فى هذه الآية وهو انهم يخدعون الله والذين آمنوا واذا قيل لهم لا تفسدوا الخ اعلم ان هذا هو النوع الثانى من قبائح افعال المنافقين واذا قيل لهم آمنوا الخ اعلم ان هذا هو النوع الثالث من قبائح افعال المنافقين وذلك لانه سبحانه لما نهاهم فى الآية المتقدمة عن الفساد فى الارض امرهم فى هذه الآية بالايمان لان كمال حال الانسان لا يحصل الا بمجموع الامرين اولهما ترك ما لا ينبغى وهو قوله لا تفسدوا وثانيها فعل ما ينبغى وهو قوله آمنوا واذا لقوا الذين آمنوا الخ هذا هو النوع الرابع من افعالهم القبيحة اولئك الذين اشتروا الضلالة الخ الجملة مسوقة لتقرير ما قبلها وبيان لكمال جهالتهم فيما حكى عنهم من الاقوال والافعال باظهار غايت سماجتها وتصويرها ما لا يكاد يتعاطاه من له ادنى تميز فضلا عن العقلاء (ربط هذه الآية من

ابى السعود) مثلهم كمثل الذى استوقد الخ لما بين حقيقة صفات المنافقين عقبها بضرب مثلين زيادة في الكشف والبيان احدهما هذا المثل او كصيب من السماء الخ اعلم ان هذا هو المثل الثانى للمنافقين يا ايها الناس اعبدوا الخ ان الله لما قدم احكام الفرق الثلاثة اعنى المؤمنين والكفار والمنفقين اقبل عليهم بالخطاب من باب الالتفات وان كنتم في ريب الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما اقام الدلائل القاهرة على اثبات الصانع وابطل القول بالشريك عقبه بما يدل على النبوة ولما كانت نبوة محمد صلى الله عليه وسلم مبنية على كون القرآن معجزا اقام الدلالة على كونه معجزا وبشر الذى امنوا الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما تكلم في التوحيد والنبوة تكلم بعدهما في المعاد وبين عقاب الكافر وثواب المطيع ومن عادة الله تعالى انه اذا ذكر آية في الوعيد ان يعقبها بآية في الوعد ان الله لا يستحي الخ اعلم انه تعالى لما بين بالدليل كون القرآن معجزا او ردهنا شبهة اوردها الكفار قدحا في ذلك واجاب عنها وتقرير الشبهة انه جاء في القرآن ذكر النحل والذباب والعنكبوت والنمل وهذه الاشياء لا يليق ذكرها بكلام الفصحاء فاشتمال القرآن عليها يقدر في فصاحته فضلا عن كونه معجزا فاجاب الله تعالى عنه بان صغر هذه الاشياء لا يقدر في الفصاحة اذا كان ذكرها مشتملا على حكم بالغة كيف تكفرون بالله الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما نكلم في دلائل التوحيد والنبوة والمعاد الى هذا الموضوع فمن هذا الموضوع الى قوله يا بني اسرائيل اذكروا نعمتى التى انعمت عليكم في شرح النعم التى عمت جميع المكلفين وهى اربعة اولها نعمة الاحياء وهى المذكورة في هذه الآية هو الذى خلق لكم الخ اعلم ان هذا هو النعمة الثانية التى عمت المكلفين باسراهم وما احسن ما راعى الله سبحانه وتعالى هذا الترتيب فان الانتفاع بالارض والسماء انما يكون بعد حصول الحياة فلماذا ذكر الله امر الحيوة اولاً ثم اتبعه بذكر السماء والارض واذ قال ربك الخ اعلم ان هذه الآية دالة على كيفية خلقة آدم عليه السلام وعلى كيفية تعظيم الله تعالى اياه فيكون ذلك انعاما ما على جميع بنى آدم فيكون هذا هو النعمة الثالثة من تلك النعم العامة التى اوردها في هذا الموضوع وعلم آدم الاسماء الخ اعلم ان الملكة لما سألت عن وجه الحكمة في خلقة آدم عليه السلام وذريته واسكانه تعالى اياهم فى الارض واخبر الله تعالى عن وجه الحكمة فى ذلك على سبيل الاجمال بقوله انى اعلم ما لاتعلمون اراد تعالى ان يزيدهم بيانا وان يفصل لهم ذلك المجمل فيبين

تعالى لهم من فضل آدم عليه السلام ما لم يكن ذلك معلوما لهم وذلك بان علم آدم الاسماء كلها ثم عرضهم عليه ليظهر بذلك كمال فضله وقصورهم عنه في العلم فيتأكد ذلك الجواب الاجمالي بهذا الجواب التفصيلي قالوا سبحانك الخ استيناف واقع موقع الجواب كانه قيل فماذا قالوا حينئذ هل خرجوا من عهدة ما كلفوه اولا فقيل قالوا (ربط هذه الآية من ابي السعود) واذ قلنا للملائكة اسجدوا الخ اعلم ان هذا هو النعمة الرابعة من النعم العامة على جميع البشر وهو انه سبحانه وتعالى جعل ايانا مسجودا للملائكة وذلك لانه تعالى ذكر تخصيص آدم بالخلافة اولا ثم تخصيصه بالعلم الكثير ثانيا ثم بلوغه في العلم الى ان صارت الملائكة عاجزين عن بلوغ درجته في العلم وذكر الامن كونه مسجودا للملائكة وقلنا يا آدم اسكن الخ ان الله تعالى لما امر الكل بالسجود لآدم وابى ابليس السجود صيره الله ملعونا ثم امر آدم بان يسكنها مع زوجية بينى اسرائيل اذكروا نعمتى الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما اقام دلائل التوحيد والنبوة والمهاد اولا ثم عقبها بذكر الانعامات العامة لكل البشر عقبها بذكر الانعامات الخاصة على اسلاف اليهود كسرا لعنادهم ولجاحتهم بتذكير النعم السالفة واستمالة لقلوبهم بسببها وتنبئها على ما يدل على نبوة محمد صلى الله عليه وسلم من حيث كونها اخبارا عن الغيب واعلم انه سبحانه ذكرهم تلك النعم اولا على سبيل الاجمال فقال يا بنى اسرائيل اذكروا نعمتى التى انعمت عليكم وافرأوا بعهدى اوف بعهدكم وفرع على تذكيرها الامر بالايمان بمحمد صلى الله عليه وسلم فقال وآمنوا بما انزلت مصدقا لما معكم ثم عقبها بذكر الامور التى تمنعهم عن الايمان به ثم ذكرهم تلك النعم على سبيل الاجمال ثانيا بقوله مرة اخرى يا بنى اسرائيل اذكروا نعمتى التى انعمت عليكم تنبيها على شدة غفلتهم ثم اردف هذا التذكير بالترغيب البالغ بقوله وانى فضلتكم على العلمين مقرونا بالترهيب البالغ بقوله واتقوا يوما لاتجزى نفس عن نفس شيئا الى آخر الآية ثم شرع بعد ذلك فى تعديد تلك النعم على سبيل التفصيل ومن تأمل وانصف علم ان هذا هو النهاية فى حسن الترتيب لمن يريد الدعوة وتحصيل الاعتقاد فى قلب المستمع وآمنوا بما انزلت الخ اعلم ان قوله سبحانه وتعالى وآمنوا بما انزلت امر بترك الكفر والضلال وقوله ولا تلبسوا الحق بالباطل امر بترك الاغواء والاضلال واعلم ان اضلال الغير لا يحصل الا بطريقتين وذلك لان ذلك الغير ان كان قد سمع دلائل الحق فاضلاله لا يمكن الا بتشويش

تلك الدلائل عليه وان كان ما سمعها فاضلا له انما يمكن باخفاء تلك الدلائل عنه ومنعه من الوصول اليها فقله ولا تلبسوا الحق بالباطل اشارة الى القسم الاول وهو تشويش الدلائل عليه وقوله وتكتموا الحق اشارة الى القسم الثاني وهو منعه من الوصول الى الدلائل واقيموا الصلوة الخ اعلم ان الله سبحانه وتعالى لما امرهم بالايمن او لا ثم نهاهم عن لبس الحق بالباطل وكتمان دلائل النبوة ثانيا ذكر بعد ذلك بيان ما لزمهم من الشرائع وذكر من جملة الشرائع ما كان كالمقدم والاصل فيها وهو الصلوة التي هي اعظم العبادات البدنية والزكوة التي هي اعظم العبادات المالية اتأمرون الناس الخ تجريد للخطاب وتوجيه له الى بعضهم بعد توجيههم الى الكل (هذا الرط لهذه الآية من ابي السعود) واعلم انه سبحانه وتعالى لما امر بالايمن والشرائع بناء على ما خصهم به من النعم رغبتهم في ذلك بناء على ماخذ آخر وهو ان التغافل عن اعمال البر مع حث الناس عليها مستقبح في العقول اذ المقصود من امر الناس بذلك اما النصيحة او الشفقة وليس من العقل ان يشفق الانسان على غيره او ان ينصح غيره ويهمل نفسه فحذرهم الله تعالى من ذلك بان قرعهم بهذا الكلام واستعينوا بالصبر الخ لما امرهم بالايمن ونترك الاضلال وبالتزام الشرائع وهي الصلوة والزكوة وكان ذلك شاقا عليهم لما فيه من ترك الرياسات والاعراض عن المال والجاه لاجرم عالج الله تعالى هذا المرض فقال واستعينوا بالصبر والصلوة كانه قيل واستعينوا على ترك ما تحبون من الدنيا والدخول فيما تستثقله طباعكم من قبول دين محمد صلى الله عليه وسلم بالصبر اى بخميس النفس عن اللذات فانكم اذا كلفتم انفسكم ذلك ومرنت عليه وخف عليها ثم اذا ضمتتم الصلوة الى ذلك تم الامر لان المشتغل بالصلوة لا بد وان يكون مشتغلا بذكر الله عز وجل وذكر جلاله وقهره وذكر رحمته وفضله فاذا تذكر رحمته صار مائلا الى طاعته واذا تذكر عقابه ترك معصيته فيسهل عند ذلك اشتعاله بالطاعة وتركه للمعصية بينى اسرائيل اذكروا الخ اعلم انه سبحانه وتعالى انما اعاد هذا الكلام مرة اخرى توكيدا للحجة عليهم وتحذيرا من ترك اتباع محمد صلى الله عليه وسلم ثم قرنه بالوعيد وهو قوله واتقوا يوما كانه قال ان لم تطيعوني لاجل سوائف نعمتى عليكم فاطيعونى للخوف من عقابى فى المستقبل واذا نجيناكم الخ اعلم انه تعالى لما قدم ذكر نعمه على بنى اسرائيل اجمالا بين بعد ذلك اقسام تلك النعم على سبيل التفصيل ليكون ابلغ فى التذكير واعظم فى

الحجة فكانه قال اذكروا نعمتى واذكروا اذ نجيناكم واذكروا اذ فرقنا بكم البحر وهى انعمات والمذكور فى هذه الآية هو الانعام الاول واذ فرقنا بكم الخ هذا هو النعمة الثانية واذ واعدنا الخ ان هذا هو الانعام الثالث واذ آتينا الخ اعلم هذا هو الانعام الرابع واذ قال موسى الخ اعلم ان هذا هو الانعام الخامس واذ قلتيم موسى الخ اعلم ان هذا هو الانعام السادس وظللنا الخ اعلم ان هذا هو الانعام السابع واذ قلنا الدخلوا الخ اعلم ان هذا هو الانعام الثامن واذ استسقى الخ اعلم ان هذا هو الانعام التاسع واذ قلتيم موسى لن نصبر الخ تذكير بعناية اخرى لاسلافهم وكفرانهم لنعمت الله عز وجل واخلادهم الى ما كانوا فيه من الدناءة والخساسة (ربط هذه الآية من ابى السعود) ان الذين آمنوا الخ واعلم ان عادة الله اذا ذكر وعدا ووعدا عقبه بما يصاده ليكون الكلام تاما فهنا لما ذكر حكم الكفرة من اهل الكتاب وما حل بهم من العقوبة اخبر بما للمؤمنين من الاجر العظيم والثواب دالاً على انه سبحانه وتعالى يجازى المحسن باحسانه والمسيى باساءته واذ اخذنا ميثاقكم الخ اعلم ان هذا هو الانعام العاشر وذلك لانه تعالى انما اخذ ميثاقهم لمصلحتهم فصار ذلك من انعامه عليهم ولقد علمتم الذين الخ اعلم انه تعالى لما عدد وجوه انعامه عليهم اولاً ختم ذلك بشرح بعض ما وجه اليهم من التشديدات وهذا هو النوع الاول واذ قال موسى لقومه الخ اعلم ان هذا هو النوع الثانى من التشديدات افتطمعون الخ اعلم انه سبحانه لما ذكر قبائح افعال اسلاف اليهود الى ههنا شرح من ههنا قبائح افعال اليهود الذين كانوا فى زمن محمد صلى الله عليه وسلم واذ القوا الذين آمنوا الخ اعلم ان هذا هو النوع الثانى من قبائح افعال اليهود الذين كانوا فى زمن محمد صلى الله عليه وسلم ومنهم اميون الخ اعلم ان المراد بقوله ومنهم اميون اليهود لانه تعالى لما وصفهم بالعناد وازال الطمع عن ايمانهم بين فرقهم فالفرقة الاولى هى الفرقة الضالة المضلة وهم الذين يحرفون الكلم عن مواضعه والفرقة الثانية المنافقون والفرقة الثالثة الذين يجادلون المنافقين والفرقة الرابعة هم المذكورون فى هذه الآية وهم العامة الاميون الذين لا معرفة عندهم بقراءة ولا كتابة وطريقتهم التقليد وقبول ما يقال لهم فبين تعالى ان الذين يمتنعون عن قبول الايمان ليس سبب ذلك الامتناع واحدا بل لكل قسم منهم سبب اخر وقالوا لن تمسنا النار الخ اعلم ان هذا هو النوع الثالث من قبائح اقوالهم وافعالهم وهو جزمهم بان الله تعالى لا يعذبهم الا اياما قليلة بلى من كسب الخ

جواب عن قولهم المحكى وابطال له من جهته تعالى وبيان لحقيقة الحال في ضمن تشريع كلى شامل لهم ولسائر الكفرة بعد اظهار كذبهم اجمالا (ربط هذه الآية من ابي السعود) والذين آمنوا الخ اعلم انه سبحانه وتعالى ما ذكر في القرآن آية في الوعيد لا وذكر بجانبها آية في الوعد واذ اخذنا ميثاق بنى اسرائيل الخ اعلم ان هذا نوع آخر من انواع النعم التي خصهم الله تعالى بها وذلك لان التكليف بهذه الاشياء موصل الى اعظم النعم وهو الجنة والموصل الى النعمة نعمة فهذا التكليف لامحالة من النعم واذ اخذنا ميثاقكم الخ اعلم ان هذه الآية تدل على نوع آخر من نعم الله تعالى عليهم وهو انه تعالى كلفهم هذا التكليف وانهم اقرؤا بصحته ثم خالفوا العهد فيه ولقد آتينا موسى الكتاب الخ اعلم ان هذا نوع آخر من النعم التي افاضها الله عليهم ثم انهم قابلوه بالكفر والافعال القبيحة ولما جاءهم كتب من عند الله الخ اعلم ان هذا نوع من قبائح افعال اليهود واذ قيل لهم الخ اعلم ان هذا النوع ايضا من قبائح افعالهم ولقد جاءكم موسى الخ من تمام التكبيت والتوبيخ داخل تحت الامر لا تكرير لما قص في تضاعيف تعداد النعم التي من جملتها العفو عن عبادة العجل واذ اخذنا ميثاقكم الخ توبيخ من جهة الله تعالى وتكذيب لهم في ادعائهم الايمان بما انزل عليهم بتذكير جنائياتهم الناطقة بكذبهم (ربط هاتين الآيتين من ابي السعود) قل ان كانت لكم الدار الآخرة الخ اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم وادعائهم ان الدار الآخرة خالصة لهم من دون الناس ولتجدنهم احرص الناس الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما اخبرنا عنهم في الآية المتقدمة انهم لا يقنون الموت اخبر في هذه الآية انهم في غاية الحرص على الحياة قل من كان عدوا لجبريل الخ اعلم ان هذا النوع ايضا من انواع قبائح اليهود ومنكرات اقوالهم وافعالهم ولقد انزلنا اليك الخ اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم وفضائحهم او كلما عاهدوا الخ اعلم ان هذا نوع آخر من قبائحهم واتبعوا ما تتلوا الخ ان هذا نوع آخر من قبائح افعالهم وهو اشتغالهم بالسحر واقبالهم عليه ودعاءهم الناس اليه ولو انهم آمنوا الخ انه تعالى لما بين فيهم الوعيد بقوله ولبئسما شروا به اتبعه بالوعد جامعا بين الترهيب والترغيب لان الجمع بينهما ادعى الى الطاعة والعدول عن المعصية يا ايها الذين آمنوا لا تقولوا الخ اعلم ان الله تعالى لما شرح قبائح افعالهم قبل مبعث محمد عليه الصلوة والسلام اراد من ههنا ان يشرح قبائح افعالهم عند مبعث محمد صلى الله عليه وسلم وجدهم واجتهادهم في القدح فيه والظعن في دينه

وهذا هو النوع الاول من هذا الباب ما يود الذين كفروا الخ واعلم انه تعالى لما بين حال اليهود والكفار فى العداوة والمعاندة حذر المؤمنين منهم فقال ما يود الذين كفروا فنفى عن قلوبهم الود والمحبة لكل ما يظهر به فضل المؤمنين ما ننسخ من آية الخ ان اعلم ان هذا هو النوع الثانى من طعن اليهود فى الاسلام فقالوا الاترون الى محمد يامر اصحابه بامر ثم ينهاهم عنه ويأمرهم بخلافه ويقول اليوم قولا وغدا يرجع عنه فنزلت هذه الآية الم تعلم ان الله له ملك الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما حكم بجواز النسخ عقبه بيان ان ملك السموات والارض له لا لغيره وهذا هو التبيه على انه سبحانه وتعالى انما حسن الامر والنهى يكونه مالكا للخلق ام تريدون ان تسألوا الخ لما حكم بجواز النسخ فى الشرائع فلعلهم كانوا يطالبونه بتفاصيل ذلك الحكم فمنعهم الله تعالى عنها وبين انهم ليس لهم ان يشتغلوا بهذه الاسئلة كما انه ما كان لقوم موسى ان يذكروا اسئلتهم الفاسدة ود كثير من اهل الكتب الخ اعلم ان هذا هو النوع الثالث من كيد اليهود مع المسلمين واقيموا الصلوة الخ اعلم انه تعالى امر بالعتق والصفح عن اليهود ثم عقبه بقوله تعالى واقيموا الصلوة وآتوا الزكوة تنبيها على انه كما الزمهم لحظ الغير وصلاحة العفو والصفح فكذلك الزمهم لحظ انفسهم وصلاحتها القيام بالصلوة والزكوة الواجبتين ونبه بهما على ما عداهما من الواجبات وقالوا لن يدخل الخ اعلم ان هذا هو النوع الرابع من تخليط اليهود والقاء الشبه وفى قلوب المسلمين وقالت اليهود الخ بيان لتضليل كل فريق صاحبه بخصوصة اثر بيان تضليله كل من عداة على وجه العموم (ربط هذه الآية من ابي السعود) ومن اظلم ممن منع الخ فى كيفية اتصال هذه الآية بما قبلها وجوه فاما من حملها على النصرى وخراب بيت المقدس قال تتصل بما قبلها من حيث ان النصرى ادعوا انهم من اهل الجنة فقط فليل لهم كيف تكونون كذلك مع ان معاملتكم فى تخريب المساجد والسعى فى خرابها هكذا واما من حملة على المسجد الحرام وسائر المساجد قال جرى ذكر مشركى العرب فى قوله كذلك قال الذين لا يعلمون مثل قولهم وقيل جرى ذكر جميع الكفار ودمهم فمرة وجه النعم الى اليهود والنصرى ومرة الى المشركين والله المشرق والمغرب الخ فان منعم من اقامة العباداة فى المسجد الاقصى او اسجد الحرام فايضا تولوا اى ففى اى مكان فعلتم تولية وجوهكم شطر القبلة فثم وجه الله اى هناك جهته التى امر بها (ربط هذه الآية من ابي السعود) وقالوا اتخذ الله ولدا

الخ اعلم ان هذا هو النوع لحدادي عشر من قبائح افعال اليهود والنصرى والمشركين وقال الذى لا يعلمون الخ اعلم ان هذا هو النوع لحدادي عشر من قبائح اليهود والنصرى والمشركين انا ارسلتك بالحق الخ اعلم ان القوم لما اصرروا على العناد واللجاج الباطل واقترحوا المعجزات على سبيل التعنت بين الله تعالى لرسوله صلى الله عليه وسلم انه لا مزيد على ما فعله فى مصالح دينهم من اظهار الادلة وكما بين ذلك انه لا مزيد على ما فعله الرسل فى باب الابلاغ والتنبيه لكيلا يكثروا عمه بسبب اصرارهم على كفرهم ولن ترضى عنك الخ بيان لكمال شدة شكيمة هاتين الطائفتين خاصة اثر بيان ما يعمها والمشركين من الاصرار على ما هم عليه الى الموت وفيه من المبالغة فى اقناطه صلى الله عليه وسلم من اسلامهم ما لا غاية وراءه (ربط هذه الاية من ابي السعود) الذين آتيناهم الكتب الخ لما ذم طريقتهم وحكى عنهم سوء افعالهم اتبع ذلك بمدح من ترك وطريقتهم بل تأمل التوراة وترك تحريفها وعرف مناصحة نبوة محمد صلى الله عليه وسلم يا بنى اسرائيل اذكروا الخ وتخصيصهم بتكرير التذكير واعادة التحذير للمبالغة فى التصحح والايذان بان ذلك فذلقة القضية والمقصود من القضية لما ان نعم عز وجل عليهم اعظم وكفرهم بها اشد واقح (ربطها من ابي السعود) واذا ابتلى ابراهيم الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما استقصى فى شرح وجوده نعمه على بنى اسرائيل ثم فى شرح قبائحهم فى اديانهم واعمالهم وختم هذا الفصل بما بدء وهو قوله يا بنى اسرائيل اذكروا نعمتى الى قوله ولا هم ينصرون شرع سبحانه ههنا فى نوع آخر من البيان وهو ان ذكر قصة ابراهيم عليه السلام وكيفية احواله والحكمة فيه ان ابراهيم عليه السلام شخص يعترف بفضله جميع الطوائف والملل فالمشركون كانوا معترفين بفضله متشرفين بانهم من اولاده ومن ساكنى حرمة وخادمى بيته اهل الكتب من اليهود والنصارى كانوا ايضا مقرين بفضله متشرفين بانهم من اولاده فحكى الله تعالى عن ابراهيم عليه السلام امورا توجب على المشركين وعلى اليهود والنصارى قبول قول محمد صلى الله عليه وسلم والاعتراف بدينه والانقياد لشرعه وفى ابي السعود شروع فى تحقيق ان هدى الله ما عليه النبى صلى الله عليه وسلم من التوحيد والاسلام الذى هو ملة ابراهيم عليه السلام وان ما عليه اهل الكتابين اهواء زائفة وان ما يدعونه من انهم على ملته عليه السلام قرية بلا مرية ببيان ما صدر عن ابراهيم وابنائهم الانبياء عليهم السلام من الاقاويل والافاعيل الناطقة بحقيقة التوحيد

والاسلام وبطلان الشرك وبصحة نبوة النبي صلى الله عليه وسلم وبكونه ذلك النبي الذي استدعا ابراهيم واسماعيل عليهما الصلوة والسلام بقولهما ربنا وابعث فيهم رسولا منهم الآية واذ جعلنا البيت مثابة الخ اعلم انه تعالى بين كيفية حال ابراهيم عليه السلام حين كلفه بالامامة وهذا شرح التكليف الثاني وهو التكليف بتطهير البيت واذ قال ابراهيم رب اجعل الخ اعلم ان هذا هو النوع الثالث من احوال ابراهيم عليه السلام التي حكاهما تعالى ههنا واذ يرفع ابراهيم الخ اعلم ان هذا هو النوع الرابع من الامور التي حكاه الله تعالى عن ابراهيم واسماعيل عليهما السلام وهو انهما عند بناء البيت ذكرا ثلاثة من الدعاء ومن يرغب الخ انكار واستبعاد لان يكون في العقلاء من يرغب عن ملته التي هي الحق الصريح والدين الصحيح (ربطها من ابي السعود) اذ قال له ربه الخ اعلم ان هذا هو النوع الخامس من الامور التي حكاهما الله تعالى عن ابراهيم عليه السلام ووصى بها ابراهيم الخ اعلم ان هذا هو النوع السادس من الامور المستحقة التي حكاهما الله تعالى ابراهيم ام كنتم شهداء الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن ابراهيم عليه السلام انه بالغ في وصيته بنيه في الدين والاسلام ذكر عقبيه ان يعقوب وصى بنيه بمثل ذلك تاكيدا للحجة على اليهود والنصرى ومبالغة في البيان وقالوا كونوا هودا الخ اعلم انه تعالى لما بين بالدلائل التي تقدمت صحة دين الاسلام حكى بعدها انواعا من شبه المخالفين الطاعنين في الاسلام الشبهة الاولى حكى عنهم انهم قالوا كونوا هودا او نصارى تهتدوا وفي ابي السعود شروع في بيان فن آخر من فنون كفرهم وهو اضلالهم لغيرهم اثر بيان ضلالهم في نفسهم قولوا امنا الخ لما اجاب بالجواب الجدلي اولاً ذكر بعده جوابا برهانيا في هذه الاية وهو ان الطريق الى معرفة نبوة الانبياء عليهم السلام ظهورا لمعجز عليهم ولما ظهر المعجز على يد محمد صلى الله عليه وسلم وجب الاعتراف بنبوته والايمان برسالته وفي ابي السعود خطاب للمؤمنين بعد خطابه عليه السلام برد مقالتهم الشنعاء على الاجمال وارشاد لهم الى طريق التوحيد والايمان على ضرب من التفصيل اى قولوا لهم بمقابلة ما قالوا تحقيقا وارشادا ضمينا لهم اليه فان آمنوا بمثل ما امنتم الخ اعلم انه تعالى لما بين الطريق الواضح في الدين وهو ان يعترف الانسان بنبوة من قامت الدلالة على نبوته وان يحترز في ذلك عن المناقبة رغبتهم في مثل هذا الايمان فقال فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا صبغة الله الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الجواب الثاني

وهو ان ذكر ما يدل على صحة هذا الدين ذكر بعده ما يدل على ان دلائل هذا الدين واضحة جلية فقال صبغة الله قل اتحاجوننا الخ في ابي السعود تجريد الخطاب للنبي صلى الله عليه وسلم عقيب الكلام الداخلة تحت الامر الوارد بالخطاب العام لما ان المأمور به من الوظائف الخاصة به عليه الصلوة والسلام تقولون ان ابراهيم الخ في ابي السعود اما معادلة للهمزة في قوله تعالى اتحاجوننا داخلة في حين الامر على معنى اى الامرين يودون اقامة الحججة وتنوير البرهان على حقية ما انتم عليه والحال ما ذكر ام التشبث بذيل التقليد والافتراء على الانبياء وتقولون ان ابراهيم الخ واما منقطة عقرة ببل والهمزة دالة على الاضراب والانتقال من التوبيخ على حاجة اى التوبيخ على الافتراء على الانبياء عليهم السلام تلك امة قد خلت الخ في ابي السعود تكرير للمبالغة في لزجر عما هم عليه من الافتخار بالآباء والاتكال على اعمالهم وقيل الخطاب السابق لهم وهذا لنا تحذيرا عن الاقتداء بهم وقيل المراد بالامة الاولى الانبياء عليهم السلام وبالثانية اسلاف اليهود. سيقول السفهاء الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الثانية من الشبه التي ذكرها اليهود والنصارى طعنا في الاسلام وكذلك الخ في ابي السعود توجيه للخطاب الى المؤمنين بين الخطابين المختصين بالرسول صلى الله عليه وسلم التائيد ما في مضمون الكلام من التشریف وما جعلنا القلبية الخ في ابي السعود جرد الخطاب للنبي صلى الله عليه وسلم رمزا الى ان مضمون الكلام من الاسرار الحقيقية بان يخص معرفته به عليه السلام ولئن اتيت الذين الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية الاولى ان الذين اتوا الكتب يعلمون ان هذه القبلة حق بين بعد ذلك ان صفتهم لا تتغير في الاستمرار على المعاندة الذين اتينهم الكتب الخ انه تعالى في الآية المتقدمة لما حذرامة محمد صلى الله عليه وسلم عن اتباع اليهود والنصارى بقوله ولئن اتبعت اخبر المؤمنين بحال عليه السلام في هذه الآية فقال اعلموا يا معاشر المؤمنين ان علماء اهل الكتب يعرفون محمد او ما جاء به وصدقته ودعوته وقبلته لا يشكون فيه كما لا يشكون في ابناءهم ولكل وجهة الخ والمراد منه ان للشرائع مصالح فلا جرم التلفت الشرائع بحسب اختلاف الاشخاص وكما اختلفت بحسب اختلاف الاشخاص لم يبعد ايضا اختلافها بحسب اختلاف الزمان بالنسبة الى شخص واحد فلهذا اصح القول بالنسخ والتغيير ومن حيث خرجت الخ في ابي السعود تاكيد لحكم التحويل وتصريح بعدم تفاوت الامر في حالتى السفر

والحضر والتكوير لما ان القبلة لها شان خطير و النسخ من مظان الشبهة والفتنة
 فبالحرى ان يؤكد امرها مرة غب اخرى مع انه قد ذكر في كل مرة حكمة مستقلة
 كما ارسلنا فيكم الخ في ابي السعود متصل بما قبله اى ولا تم نعمتى عليكم فى امر
 القبلة اوفى الآخرة اتما ما كائنا كاتمامى لها بار سال رسول كائن منكم فان ارسال
 الرسول لا سيما المجانس لهم نعمة لا يكافى نعمة قط وقيل متصل بما بعده اى كما
 ذكرتم بالارسال فاذا كرونى الخ الفاء للدلالة على ان ترتب الامر على ما قبله من
 موجباته ياايها الذين امنوا استعينوا الخ اعلم انه تعالى لما اوجب بقوله فاذا كرونى
 جميع العبادات وبقوله واشكرو الى ما يتصل بالشكر اردفه ببيان ما يعين عليها فقال
 استعينوا بالصبر والصلوة ولا تقولوا لمن يقتل الخ وجه تعلق الآية بما قبلها كانه قيل
 استعينوا بالصبر والصلوة فى اقامة دينى فان احتجتم فى تلك والاقامة الى مجاهدة
 عدوى باموالكم وابدانكم ففعلتم ذلك فتفلت نفوسكم فلا تحسبوا انكم ضيعة
 انفسكم بل اعلموا ان قتلاكم احياء عندى ولنبلونكم الخ متعلق بقوله واستعينوا بالصبر
 والصلوة اى استعينوا بالصبر والصلوة فانا نبلونكم بالخوف وبكذا الذين اذا اصابتهم
 الخ اعلم انه تعالى لما قال وبشر الصبرين بين فى هذه الآية ان الانسان كيف يكون
 صابرا وان تلك البشارة كيف هى ان الصفا والمروة الخ ان الله تعالى بين انه انما
 حول القبلة الى الكعبة لىتم انعامه على محمد صلى الله عليه وسلم وامته باحياء شرائع
 ابراهيم ودينه على ما قال والاتم نعمتى عليكم وكان السع بين الصفا والمروة من
 شعائر ابراهيم على ما ذكر فى قصة بناء الكعبة وسعى هاجر بين الجبلين فلما كان الامر
 كذلك وذكر الله تعالى هذا الحكم عقيب تلك الآية ان الذين يكتمون الخ قال
 العبد المسكين هذه مرتبطة بقوله تعالى الذين آتيناهم الكتب يعرفونه كما يعرفون
 ابناءهم وان فريقا منهم ليكتمون الحق الخ بين ثمة ان منهم كاتمين للحق وبين ههنا
 الوعيد لهم الا الذين تابوا الخ اعلم انه تعالى لما بين عظيم الوعيد فى الذين يكتمون
 ما انزل الله كان يحوز ان يتوهم ان الوعيد يلحقهم على كل حال فبين تعالى انهم
 اذا تابوا تغير حكمهم ودخلوا فى اهل الوعد ان الذين كفروا الخ فى ابي السعود
 جملة مستانفة سفت لتحقيق بقاء اللعن فيما وراء الاستثنا وتاكيد دوامه واستمراره
 على غير التائبين جسما يفيد الكلام والهكم اله واحد الخ فى ابي السعود قيل كان
 للمشركين حول الكعبة المكرمة ثلثمائة وستون صنما فلما سمعوا هذه الآية تعجبوا

وقالوا ان كنت صادقاً فأت بآية نعرف بها صدقك فنزلت ان في خلق الخ قال العبد المسكين فهذا مرتبط بقصة الكعبة كان المقصود ثمة رد زعم الذين فرطوا في امرها بنفى صلاحية القبلة عنها وههنا رد زعم الذين افراطوا في امرها باشراك من حولها مع الله تعالى فاثبت التوحيد وابطل الشرك ان في خلق السموات الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما حكم بالفردانية والوحدانية ذكر ثمانية انواع من الدلائل التي يمكن ان يستدل بها على وجوده سبحانه اولاً وعلى توحيده وبراءته عن الاضداد والانداد ثانياً ومن الناس من يتخذ الخ في ابي السعود بيان لكمال ركافة آراء المشركين اثر تقرير وحدانيته سبحانه وتعالى وتحرير الآيات الباهرة الملجئة للعقلاء الى الاعتراف بها الفائضة باستحالة ان يشاركه شيء من الموجودات في صفة من صفات الكمال فضلاً عن المشاركة في صفة الا الوهية اذ تبرء الذين الخ اعلم انه تعالى لما بين حال من يتخذ من دون الله اندادا بقوله ولو يرى الذين ظلموا اذ يرون العذاب على طريق التهديد زاد في هذا الوعيد بقوله تعالى اذ تبرء الذين اتبعوا من الذين اتبعوا فيبين ان الذين افنوا عمرهم في عبادتهم واعتقدوا انهم من اوكد اسباب نجاتهم فانهم يترؤن منهم عند احتياجهم اليها الناس كلوا الخ قال المسكين هذا ابطال لبعض اعمال المشركين مما يوجب الشرك من تحريم الحلال والتقليد الباطل بعد ابطال عقائدهم ومثل الذين كفروا الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن الكفار انهم عند الدعاء الى اتباع ما انزل الله تركوا النظر والتدبر واخذوا الى التقليد وقالوا بل نتبع ما الفينا عليه آباءنا ضرب لهم هذا المثل تنبيها للسامعين لهم انهم انما وقعوا فيما وقعوا فيه بسبب ترك الاصغاء وقلت الاهتمام بالدين فصيرهم من هذا الوجه بمنزلة الانعام يابها الذين آمنوا كلوا الخ ان الله سبحانه وتعالى تكلم من اول السورة الى ههنا في دلائل التوحيد والنبوة واستقصى في الرد على اليهود والنصارى ومن هنا شرع في بيان الاحكام انما حرم عليكم الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما امرنا في الآية السابقة بتناول الحلال فصل في هذه الآية انواع الحرام ان الذين يكتمون الخ الحكم الثاني ان الذين الخ قال المسكين كان المقصود سابقا بيان المحرمات الحسية وفي هذه الآية بيان المحرم المعنوي من الرشوة ونحوها كالهدايا التي يأخذها علماء اهل الكتب من اتباعهم على تبديل الكتاب وكتمان الحق اولئك الذين اشتروا الخ اعلم انه تعالى لما وصف علماء اليهود بكتمان الحق وعظم في الوعيد عليه وصف ذلك الجرم

ليعلم ان ذلك العقاب انما عظم لهذا الجرم العظيم ذلك بان الله الخ لما حكم على
الذى يكتمون بالوعيد بين ان ذلك الوعيد انما كان لان الله نزل الكتب بالحق
وان هؤلاء اليهود والنصارى يحقونه فلا جرم استحقوا ذلك ليس البر الخ الحكم
الثالث يا ايها الذين آمنوا كتب عليكم القصاص الخ الحكم الرابع كتب عليكم اذ حضر
الخ الحكم الخامس فمن بدله الخ اعلم انه تعالى لما ذكر امر الوصية ووجوبها وعظم
امرها اتبعه بما يجرى مجرى الوعيد فى تغييرها فمن خاف الخ اعلم انه تعالى لما توعد من
يبدل الوصية بين ان المراد بذلك التبديل ان يبدله عن الحق الى الباطل اما اذا غيره
عن باطل الى حق على طريق الاصلاح فقد احسن يا ايها الذين آمنوا كتب عليكم
الصيام الخ الحكم السادس واذا سألك عبادى الخ فى ابى السعود لما امرهم الله
تعالى بصوم الشهر ومراعاة العدة وحثهم على القيام بوظائف التكبير والشكر عقبه
بهذه الآية الكريمة الدالة على انه تعالى خير باحوالهم سميع لاقوالهم مجيب لدعاتهم
مجازيهم على اعمالهم تاكيذا له وحثا عليه ثم شرع فى بيان احكام الصيام ولا
تباشروهن الخ الحكم السابع ولا تأكلوا اموالكم الخ هذا الحكم الثامن يستلونك
عن الاهلة الخ الحكم التاسع وليس البر الخ فى ابى السعود وجه اتصاله بما قبله انهم
سألوا عن الامرين او انه لما ذكر انها مواقيت للحج ذكر عقبين ما هو من انعام فى
الحج استطرادا او انهم لما سألوا عما لا يعينهم ولا يتعلق بعلم النبوة فانه عليه الصلوة
والسلام مبسووث لبيان الشرائع لا لبيان حقائق الاشياء وتركوا السؤال عما يعينهم
ويختص بعلم الرسالة عقب بذكره جواب ما سألوا عنه تنبيها على ان اللائق بهم ان
يسألوا عن امثال ذلك ويهتموا بالعلم بها الحكم العاشر ما يتعلق بالقتال قوله تعالى
وقاتلوا فى سبيل الله الخ وانفقوا فى سبيل الله الخ فى ابى السعود امر بالجهاد بالمال
بعد الامر به بالانفس واتموا الحج والعمرة لله الخ قال المسكين هذا هو الحكم
الحادى عشر فمن الناس من يقول الخ فى ابى السعود تفصيل للذاكرين الى من لا يطلب
بذكر الله تعالى الا الدنيا والى من يطلب خير الدارين والمراد به الحث على الاكثار
والانتظام فى سلك للآخرين ومن الناس من يعجبك الخ اعلم انه تعالى لما بين
ان الذين يشهدون مشاعر الحج فريقان كافر وهو الذى يقول ربنا آتنا فى الدنيا و
مسلم وهو الذى يقول ربنا آتنا فى الدنيا حسنة وفى الآخرة حسنة بقى المناق فذكره
فى هذه الآية وشرح صفاته وافعال ومن الناس من يشرى الخ اعلم انه تعالى لما وصف

في الآية المتقدمة حال من يبذل دينه لطلب الدنيا ذكر في هذه الآية حال من يبذل دنياه ونفسه وماله لطلب الدين فقال ومن الناس من يشري نفسه يايتها الذين آمنوا ادخلوا الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن المنافق انه يسعى في الارض ليفسد فيها ويهلك الحرث والنسل امر المسلمين بما يضاد ذلك وهو الموافقة في الاسلام وفي شرائعه فقال يايتها الذين آمنوا ادخلوا في السلم سل بني اسرائيل الخ بيان هذا الكلام انه تعالى قال يايتها الذين آمنوا فامر بالاسلام ونهى عن الكفر ثم قال فان زلتم اى فان اعرضتم عن هذا التكليف صرتم مستحقين للتهديد بقوله فاعلموا ثم بين ذلك التهديد بقوله هل ينظرون ثم ثلث ذلك التهديد بقوله سل بني اسرائيل يعنى سل هؤلاء الحاضرين انا لما آتينا اسلافهم آيات بينات فانكروها لاجرم استوجبوا العقاب من الله تعالى وذلك وتنبه لهؤلاء الحاضرين على انهم لوزلو عن آيات الله تعالى لوقعوا في العذاب كما وقع اولئك المتقدمون فيه زين للذين كفروا الخ اعلم انه تعالى لما ذكر من قبل حال من يبذل نعمة الله من بعد ما جاءته وهم الكفار الذين كذبوا بالدلالة والانبياء وعدلوا عنها اتبعه الله تعالى بذكر السبب الذى لاجله كانت هذه طريقته فقال زين الخ كان الناس الخ اعلم انه تعالى لما بين في هذه الآية المتقدمة ان سبب اصرار هؤلاء الكفار على كفرهم هو حب الدنيا بين في هذه الآية ان هذا المعنى غير مختص بهذا الزمان بل كان حاصله فى الازمنة المتقدمة لان الناس كانوا امة واحلة قائمة على الحق ثم اختلفوا وما كان اختلافهم الا بسبب البغى والتحاسد والتنازع فى طلب الدنيا ام حسبتم الخ فى ابى السعود وخو طب به رسول الله صلى الله عليه وسلم ومن معه من المؤمنين خالهم على الثبات على المصابرة على مخالفة الكفرة وتحمل المشاق من جهتهم اثر بيان اختلاف الامم على الانبياء عليهم السلام وقد بين فيه مآل اختلافهم وما لقي الانبياء ومن معهم من قبلهم من مكابدة الشدائد ومقاساة الهموم وان عاقبة امرهم النصر يسألونك ما ذا ينفقون الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما بالغ فى بيان انه يجب على كل مكلف ان يكون معرضا عن طلب العاجل وان يكون مشتغلا بطلب الآجل وان يكون بحيث يبذل النفس والمال فى ذلك شرع بعد ذلك فى بيان الاحكام وهو من هذه الآية الى قوله الم تر الى الذين خرجوا لان من عادة القرآن ان يكون بيان التوحيد وبيان الوعظ والنصيحة وبيان الاحكام مختلطا بعضها ببعض ليكون كل واحد منهما مقويا للآخر ومؤكدا له فالحكم الاول

هو هذه الآية الحكم الثانى قوله تعالى كتب عليكم القتال الخ الحكم الثالث قوله عز وجل يستلونك عن الخمر الخ الحكم الرابع قوله ويستلونك ما ذا ينفقون الخ الحكم الخامس قوله تعالى ويستلونك عن اليتامى الخ الحكم السادس قوله تعالى ولا تنكحوا المشركات الخ الحكم السابع قوله تعالى ويستلونك عن المحيض الخ الحكم الثامن قوله تعالى نساءكم حرث لكم الخ الحكم التاسع قوله تعالى ولا تجعلوا الله عرضة الخ الحكم العاشر قوله تعالى للذين يؤلون الخ الحكم الحادى عشر قوله تعالى والمطلقات يتربصن الخ اعلم انه تعالى ذكر فى هذا الموضوع احكاما كثيرة للطلاق فالحكم الاول للطلاق وجوب العدة وبعولتهن احق الخ اعلم ان هذا هو الحكم الثانى للطلاق وهو الرجعة الطلاق مرتان الخ اعلم انه هذا هو الحكم الثالث من احكام الطلاق وهو الطلاق الذى ثبت فيه الرجعة ولا يحل لكم الخ اعلم ان هذا هو الحكم الرابع من احكام الطلاق وهو بيان الخلع فان طلقها الخ اعلم ان هذا هو الحكم الخامس من احكام الطلاق وهو بيان الطلقة الثالثة قاطعة لحق الرجعة واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن فلا تعضوهن الخ اعلم ان هذا هو الحكم السادس من احكام الطلاق وهو حكم المرأة المطلقة بعد انقضاء العدة الحكم العاشر (ينظر الى هذا العاشر بعد اى تاسع ١٢ منه) قوله والوالدات يرضعن اولادهن الخ الحكم الحادى عشر عدة الوفاة قوله تعالى والذين يتوفون منكم الخ الحكم الثانى عشر خطبة النساء قال تعالى ولا جناح عليكم الخ الحكم الثالث عشر حكم المطلقة قبل الدخول قوله تعالى لا جناح عليكم ان طلقتم الخ الحكم الرابع عشر قوله تعالى حافظوا على الصلوات الخ وفى ابى السعود لعل الامر بها فى تضاعيف بيان احكام الازواج والاولاد قبل الاتمام للايذان بانها حقيقة بكمال الاعتناء بشانها والمثابرة عليها من غير اشتغال عنها بشانهم بل بشان انفسهم ايضا كما يفصح عنه الامر بها فى حالة الخوف ولذلك امر بها فى خلال بيان ما يتعلق بهم من الاحكام الشرعية المتشابهة الآخذ بعضها بحجزة بعض فان خفتم فرجالا الخ اعلم انه تعالى لما اوجب المحافظة على الصلوات والقيام على ادائها باركانها وشروطها بين من بعد ان هذه المحافظة على هذا الحد لا تجب الا مع الامن دون الخوف فقال فان خفتم فرجالا او ركبانا الحكم الخامس عشر قوله تعالى والذين يتوفون منكم الخ الحكم السادس عشر قوله تعالى وللمطلقات متاع بالمعروف. الم تر الى الذين خرجوا الخ اعلم ان عادته تعالى فى القرآن ان يذكر

بعد بيان الاحكام القصص ليفيد الاعتبار للسامع ويحمله ذلك الاعتبار على ترك
التمر والعناد ومزيد الخضوع والانقياد فقال الم تر الخ وقاتلوا الخ في ابي السعود
عطف على مقدر يعينه ما قبله كأنه قيل فاشكروا فضله بالاعتبار بما قص عليكم
وقاتلوا في سبيله لما علمتم ان الفرار لا ينجي من الحمام وان المقدر لامرده فان كان
قد حان الاجل فمرت في سبيل الله والا فنصر عزيز وثواب من ذا الذي يقرض الخ
في ابي السعود المراد ههنا إما الجهاد الذي هو عبارة عن بذل النفس والمال في
سبيل الله عز وجل ابتغاء لمرضاته واما مطلق العمل الصالح المنتظم له انتظاما اوليا.
القصة الثانية القصة طالوت قوله عز وجل الم تر الى الملاء الخ قوله تعالى تلك آيات
الله الخ في ابي السعود اشارة ابي ما سلف من حديث الالوف وخبر طالوت على
التفصيل المرقوم وانك لمن المرسلين فهي شهادة منه سبحانه برسالته عليه الصلوة
والسلام اثر بيان ما يستوجبها تلك الرسل الخ في ابي السعود فيه رمز الى انه عليه
الصلوة والسلام من افاضل الرسل العظام عليهم الصلوة والسلام اثر بيان كونه من
جملتهم وفي الكبير عزى الله رسوله عمار اى من قومه من التكذيب والحسد فقال
هؤلاء الرسل الذين كلم الله تعالى بعضهم ورفع الباقين درجات وايد عيسى بروح
القدس قد نالهم من قومهم ما ذكرناه بعد مشاهدة المعجزات وانت رسول مثلهم
فلا تحزن على ما ترى من قومك فلو شاء الله لم تختلفوا انتم واولئكم ولكم ما قضى
الله فهو كائن يا ايها الذين آمنوا انفقوا الخ اعلم ان اضعف الاشياء على الانسان بذل
النفس في القتال وبذل المال في الانفاق فاما قدم الامر بالقتال عقبه بالامر بالانفاق
الله لا اله الا هو الخ اعلم ان من عاداته سبحانه وتعالى في هذا الكتاب الكريم انه يخلط
هذه الانواع الثلاثة بعضها ببعض اعنى علم التوحيد وعلم الاحكام وعلم القصص
والمقصود من ذكر القصص اما تقرير دلائل التوحيد واما المبالغة في الالتزام والاحكام
والتكاليف وهذا الطريق هو الطريق الاحسن لا ابقاء الانسان في النوع الواحد لانه
يوجب الملل فاما اذا انتقل من نوع من العلوم الى نوع آخر فكانه يشرح به الصدر
ويفرح به القلب فكانه سافر ممن بلد الى بلد آخر وانتقل من بستان الى بستان آخر
وانتقل من تناول طعام لذيد الى تناول نوع آخر ولا شك انه يكون الذواشهي ولما
ذكر فيما تقدم من علم الاحكام ومن علم القصص ما رآه مصلحة ذكر الآن ما يتعلق
بالتوحيد فقال الله لا اله الا هو الخ لا اكراه في الدين الخ في ابي السعود جملة

مستأنفة جئ بها اثر بيان تفرده سبحانه وتعالى بالشؤون الجليلة الموجبة للايمان به وحده ايذانا بان من حق للعاقل ان لا يحتاج الى التكليف والالزام بل يختار الدين الحق من غير تردد وثلثه وقيل هو خير في معنى النهي اى لا تكثرهوا في الدين فقيل منسوخ بقوله تعالى جاهد الكفار وقيل خاص باهل الكتب حيث حصنوا انفسهم باداء الجزية الم تر الى الذى حاج الخ اعلم انه تعالى ذكر ههنا قصصا ثلاثا الاولى منها فى بيان اثبات العلم بالصانع والثانية والثالثة فى اثبات الحشر والنشر والبعث وفى ابى السعود استشهاد على ما ذكر من ان الكفرة اولياءهم الطاغوت وعلى ما ذكر من ولايته تعالى للمؤمنين مثل الذين ينفقون الخ اعلم انه سبحانه وتعالى لما ذكر من بيان اصول العلم بالمبدأ وبالمعاد ومن دلائل صحتها ما اراد اتباع ذلك ببيان الشرائع والاحكام والتكاليف فالحكم الاول فى بيان التكاليف المعتبرة فى انفاق الاموال الذين ينفقون اموالهم الخ اعلم انه تعالى لما عظم امر الانفاق فى سبيل الله اتبعه ببيان الامور التى يجب تحصيلها حتى يبقى ذلك الثواب منها ترك والمن والاذى ايود احدكم الخ ان هذا مثل آخر ذكر الله تعالى فى حق من يتبع انفاقه بالمن والاذى يا ايها الذين آمنوا انفقوا من طيبات الخ اعلم انه رغب فى الانفاق ثم بين ان الانفاق على قسمين منه ما يتبعه المن والاذى ومنه ما لا يتبعه ذلك ثم انه تعالى شرح ما يتعلق بكل واحد من هذين القسمين وضرب لكل واحد منهما مثلا يكشف عن المعنى ويوضح المقصود منه على ابلغ الوجوه ثم انه تعالى ذكر فى هذه الآية ان المال الذى امر بانفاقه فى سبيل الله كيف ينبغي ان يكون فقال انفقوا من طيبات ما كسبتم الشيطان يعدكم الفقر. اعلم انه تعالى لما رغب الانسان فى انفاق اجود ما يملكه حذره بعد ذلك من وسوسة الشيطان فقال الشيطان يعدكم الفقر اى يقول ان انفقت الاجود صرت فقيرا فلا تبال بقوله فان الرحمن يعدكم مغفرة منه وفضلا يؤتى الحكمة الخ اعلم انه تعالى لما ذكر فى الآية المتقدمة ان الشيطان يعد بالفقر ويامر بالفحشاء وان الرحمن يعد بالمغفرة والفضل نبه على ان الامر الذى لاجله وجب ترجيح وعد الرحمن على وعد الشيطان هو ان وعد الرحمن بالحكمة والعقل ووعد الشيطان الشهوة والنفس من حيث انهما يامر ان بتحصيل اللذة الحاضرة واتباع احكام الخيال والوهم ولاشك ان حكم الحكمة والعقل هو الحكم الصادق المبرأ عن الزيغ والخلل وحكم الحس والشهوة والنفس يوقع الانسان فى البلاء

والمحنة فكان حكم الحكمة والعقل اولى بالقبول فهذا هو الاشارة الى وجه النظم وما انفقتم الخ في ابي السعود بيان لحكم كلي شامل لجميع افراد النفقات وما في حكمها اثر بيان حكم ما كان منها في سبيل الله ان تبدوا الصدقات الخ ذكر في هذه الآية ان الانفاق قد يكون ظاهرا وقد يكون خفيا وذكر حكم كل واحد من القسمين ليس عليك هذهم الخ هذا هو الحكم الرابع من احكام الانفاق وهو بيان ان الذى يجوز الانفاق عليه من هو للفقراء الذين احصروا الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية الاولى انه يجوز صرف الصدقة الى اى فقير كان بين في هذه الآية ان الذى يكون اشد الناس استحقاقا بصرف الصدقة اليه من هو الذين ينفقون الخ لما بين في الآية المتقدمة ان اكمل من تصرف اليه النفقة من هو بين في هذه الآية ان اكمل وجوه الانفاق كيف هو فكلما نزلت بهم حاجة محتاج عجلوا قضاءها ولم يؤخروها ولم يعلقوها بوقت ولا حال الحكم الثانى من الاحكام الشرعية المذكورة فى هذا الموضوع من هذه السورة حكم الربا قوله تعالى الذين يأكلون الربوا الخ اعلم ان بين الربى وبين الصدقة مناسبة من جهة التضاد وذلك لان الصدقة عبارة عن تنقيص المال بسبب امر الله تعالى بذلك والربا عبارة عن طلب الزيادة على المال مع نهى الله عنه فكانا متضادين فلا جرم ذكر عقيب حكم الصدقات حكم الربوا يمحق الله الربوا الخ ذكر هنا ما يجرى مجرى الداعى الى ترك الصدقات وفعل الربا وكشف عن فساد ان الذين آمنوا الخ اعلم ان عادة الله تعالى فى القرآن مطردة بانه مما ذكر وعيدا ذكر بعده وعدا فلما بالغ ههنا فى وعيد المرابى اتبعه بهذا الوعد يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله الخ اعلم انه تعالى لما بين فى الآية المتقدمة ان من انتهى عن الربوا فله ما سلف فقد كان يجوز ان يظن انه لا فرق بين المقبوض منه وبين الباقي فى ذمة القوم فقال تعالى وذروا. الحكم الثالث من الاحكام الشرعية المذكورة فى هذا الموضوع من هذه السورة آية المدانية قوله تعالى يا ايها الذين آمنوا اذا تداينتم بدين الخ لما ذكر قبل هذا الحكم نوعين من الحكم احدهما الانفاق فى سبيل الله وهو يوجب تنقيص المال والثانى ترك الربوا وهو ايضا سبب تنقيص المال اتبع ذلك بان ندبه الى كيفية حفظ المال الحلال وصونه عن الفساد والبوار فان القدرة على الانفاق فى سبيل الله وعلى ترك الربوا وعلى ملازمة التقوى لا يتم ولا يكمل الا عند حصول المال والوجه الثانى لما منع الربا اذن فى السلم مع ان جميع المنافع المطلوبة من الربا حاصلة فى

السلم وان كنتم على سفر الخ لما امر فى آخر الآية المتقدمة بالكتابة والاشهاد وانه ربما تعذر ذلك فى السفر ذكر نوعا آخر من الاستيثاق وهو اخذ الرهن لله ما فى السموات الخ اعلم انه تعالى لما جمع فى هذه السورة اشياء كثيرة من علم الاصول وهو دليل التوحيد والنبوة واشياء كثيرة من علم الاصول ببيان الشرائع والتكاليف ختم الله تعالى هذه السورة بهذه الآية على سبيل التهدى وقال الشعبى وعكرمة ومجاهد انه تعالى لما نهى عن كتمان الشهادة واوعد عليه بين ان له ملك السموات والارض فيجازى على الكتمان والاظهار آمن الرسول الخ قال المسكين وجه الارتباط ظاهر من شان النزول وفى ابى السعود لما ذكر فى فاتحة السورة الكريمة ان ما انزل الى الرسول صلى الله عليه وسلم من الكتب العظيم الشأن هدى للمتقين بما فصل هناك من الصفات الفاضلة التى من جملتها الايمان به وبما انزل قبله من الكتب الالهة وانهم حائزون لاثرتى الهدى والفلاح من غير تعيين لهم بخصوصهم ولا تصريح بتحقيق اتصافهم بها اذ ليس فيما يذكر فى حيز الصلة حكم بالفعل وعقب ذلك ببيان حال من كفر به من المجاهرين والمنافقين ثم شرح فى تضاعيفها من فنون الشرائع والاحكام والمواعظ والحكم واخبار سوائف الامم وغير ذلك مما يقتضى الحكمة شرحه عين فى خاتمها المتصفون بها وحكم باتصافهم بها على طريق الشهادة لهم من جهته عز وجل بكمال الايمان وحسن الطاعة لا يكلف الله نفسا الخ فى ابى السعود جملة مستقلة جى بها اثر تليتهم لتكاليفه تعالى بحسن الطاعة اظهارا لماله تعالى عليهم فى ضمن التكليف من محاسن آثار الفضل والرحمة ابتداء لا بعد السؤال كما سيجى هذا. ربنا لاتؤاخذنا الخ فى ابى السعود شروع فى حكاية بقية دعواتهم اثر بيان سر التكليف.

سُورَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ

(وجه تعلق اولها بآخر ما قبلها ان السورة المتقدمة ختمت على سوال النصر على الكافرين وفي مفتح هذه السورة بين لصرتهم على الكفار باللسان والسنان ١٢ منه عفى عنه).

الم الله لا اله الا هو الخ اعلم ان مطلع هذه السورة له نظم لطيف عجيب وذلك لان اولئك النصارى الذين نازعوا رسول الله صلى الله عليه وسلم كانه قيل لهم اما ان تنازعوه في معرفة الآله او في النبوة فان كان النزاع في معرفة الآله وهو انكم تثبتون انه ولدا وان محمدا لا يثبت له ولدا فالحق معه بالدلائل العقلية القطعية فانه قد ثبت بالبرهان انه حي قيوم والحي القيوم يستحيل عقلا ان يكون له ولدا وان كان النزاع في النبوة فهذا ايضا باطل لان بالطريق الذي عرفتم ان الله تعالى انزل التوراة والانجيل على موسى وعيسى فهو بعينه قائم في محمد صلى الله عليه وسلم وما ذاك الا بالمعجزة وهو حاصل ههنا فكيف يمكن منازعته في صحة النبوة فهذا هو وجه النظم وهو مضبوط حسن جدا ان الله لا يخفى عليه شئ الخ قال المسكين تقرير التوحيد وابطال الألوهية عيسى عليه السلام هو الذي انزل الخ في ابي السعود شروع في ابطال شبهتهم الناشئة عما نطق به القرآن في نعت عيسى عليه السلام بطريق الاستيناف اثر بيان اختصاص الربوبية ومناطها به سبحانه وتعالى تارة بعد اخرى وكون كل من عداه مقهورا تحت ملكوته تابعا لمشيئته ربنا لا تزغ قلوبنا الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن الراسخين انهم يقولون آمنة به حكى عنهم انهم يقولون ربنا لا تزغ انك الخ اعلم ان هذا الدعاء من بقية كلام الراسخين في العلم ان الذين كفروا الخ اعلم ان الله سبحانه وتعالى لما حكى عن المؤمنين دعائهم وتضرعهم حكى كيفية حال الكافرين وشديد عقابهم في ابي السعود الر ما بين الدين الحق والتوحيد وذكر احوال الكتب الناطقة به وشرح شأن القرآن العظيم وكيفية ايمان العلماء الراسخين شرع في بيان حال من كفر به قل للذين كفروا الخ قال المسكين هذا بيان لعقاب الكفار في الدنيا والآخرة قد كان لكم آية الخ هذه الآية

كالدلالة على صحة قوله قل للذين كفروا استغلبون زين للناس الخ فى ابى السعود
 كلام مستأنف سبق لبيان حقارة شان الحظوظ الدنيوية باصنافها وتزهيد الناس بها
 وتوجيه رغباتهم الى ما عنده تعالى اثر بيان عدم نفعها للكفرة الذين كانوا يتعززون
 بها قل او نبئكم بخير الخ فى ابى السعود اثر ما بين شان من خرافات الدنيا وذكر ما
 عنده تعالى من حسن المآب اجمالا امر النبي صلى الله عليه وسلم بتفصيل ذلك
 المجمل للناس مبالغة فى الترغيب شهد الله الخ اعلم انه تعالى لما مدح المؤمنين
 واثنى عليهم بقوله الذين يقولون ربنا آتنا آمانا اردفه بان بين ان دلائل الايمان ظاهرة
 جليلة فقال شهد الله ان الدين عند الله الخ فى ابى السعود جملة مستأنفة مؤكدة للاولى
 اى لادين مرضيا لله تعالى سوى الاسلام الذى هو التوحيد والتدرف بالشرعية الشريفة
 وما اختلف الذين الخ الغرض من الاية بيان ان الله تعالى اوضح الدلائل ازال الشبهات
 والقوم ما كفروا الا جل التقصير فان حاجوك الخ اعلم انه تعالى لما ذكر من قبل
 ان اهل الكتاب اختلفوا من بعد ما جائهم العلم وانهم اصرروا على الكفر مع ذلك بين الله
 تعالى للرسول صلى الله عليه ما يقوله فى حاجتهم فقال فان حاجوك الخ ان الذين
 يكفرون الخ اعلم انه تعالى لما ذكر من قبل حال من يعرض ويتولى بقوله وان تولوا
 اردفه بصفة هذا المتولى الم تر الى الذين الخ اعلم انه تعالى لما نبه على عناد القوم
 بقوله فان حاجوك بين فى هذه الآية غاية عنادهم وهو انهم يدعون الى الكتاب الذين
 يزعمون انهم يؤمنون به وهو التوراة ثم انهم يتمردون ويتولون وذلك يدل على
 غاية عنادهم قل اللهم مالك الخ امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بدعاء وتمجيد
 يدل على مبانية طريقه وطريق اتباعه لطريقة هؤلاء الكافرين المعاندين المعرضين
 فقال معلما نبيه كيف يمجد ويعظم ويدعو ويطلب قال المسكين لعل الاقرب انه
 اوعد الكفار فيما قبل انهم سيغلبون فاستبعدوه وتعجبوا منه فاشار الله تعالى الى قرب
 وقوعه بانه تعالى مالك الملك وكل شئ بمشيئته وقدرته فلا غر و اى يغلب المغلوب
 ويغلب الغالب لا يتخذ المؤمنون الخ لما بين انه تعالى مالك الدنيا والآخرة بين
 انه ينبغى ان تكون الرغبة فيما عنده وعند اولياءه دون اعدائه قل ان تخفوا الخ فى
 ابى السعود من الضمائر التى من جملتها ولاية الكفرة يوم تجد كل نفس الخ اعلم
 ان هذه الآية من باب الترغيب والترهيب ومن تمام الكلام الذى تقدم قل ان كنتم

تحبون الله الخ اعلم انه تعالى لما دعا القوم الى الاليمان به والاليمان برسوله على
سبيل التهديد والوعيد دعاهم الى ذلك من طريق آخر وهو ان اليهود كانوا يقولون
نحن ابناء الله واحبائه فنزلت هذه الآية ان الله اصطفى الخ اعلم انه تعالى لما بين
ان محبته لا تتم الا بمتابعة الرسل بين علو درجات الرسل وشرف مناصبهم فقال ان
الله اصطفى آدم في ابي السعود لما بين الله تعالى ان الذين المرضي عنده هو الاسلام
والتوحيد وان اختلاف اهل الكتابين فيه انما هو للبغي والحسد وان الفوز برضوانه
ومغفرته ورحمته منوط باتباع الرسول صلى الله عليه وسلم واطاعته شرع في تحقيق
رسالته وكونه من اهل بيت النبوة القديمة فبدأ بيان جلاله اقدار الرسل عليهم الصلوة
والسلام كافة واتبعه ذكر مبدأ امر عيسى عليه الصلوة والسلام وامه وكيفية دعوته
للناس الى التوحيد والاسلام تحقيقاً للحق وابطالاً لما عليه اهل الكتابين في شأنهما
من الافراط والتفريط ثم بين بطلان محاجتهم في ابراهيم عليه الصلوة والسلام وادعائهم
الانتماء الى ملته وتره ساحتها العلية عما هم عليه من اليهودية والنصرانية ثم نص على
ان جميع الرسل عليهم الصلوة والسلام دعاة الى عبادة الله عز وجل وحده وطاعته
منزهون عن احتمال الدعوة الى عبادة انفسهم او غيرهم من الملكة وان امهم قاطبة
مامورون بالاليمان بمن جاءهم من رسول مصدق لما معهم تحقيقاً لوجوب الاليمان
برسول الله صلى الله عليه وسلم وكتابه المصدق لما بين يديه من التوراة والانجيل
وتحتم الطاعة له جسماً سيأتى تفصيله اذ قالت امرأة عمران الخ في ابي السعود لتقرير
اصطفاء آل عمران وبيان كفيته هناك الخ في ابي السعود كلام مستأنف وقصة
مستقلة سقت في تضاعيف حكاية مريم لما بينهما من قوة الارتباط وشدة الاشتباك
مع ما في ايرادهما من تقرير ما سقت له حكايتها من بيان اصطفاء آل عمران فان فضائل
بعض الاقرباء دالة على فضائل الآخرين واذ قالت الملكة يمرم ان الله اصطفى
الخ في ابي السعود شروع في شرح بقية احكام اصطفاء آل عمران اثر الاشارة الى
نبذ من فضائل بعض اقاربهم اذ قالت الملكة يا مريم ان الله يبشرك الخ اعلم انه
تعالى لما بين شرح حال مريم عليها السلام في اول امرها وفي آخر امرها شرح كيفية
ولادتها بعيسى عليه السلام فلما احس الخ شرع في بيان ان عيسى لما شرح لهم
تلك المعجزات واطهر لهم تلك الدلائل فهم بماذا عاملوه فقال تعالى فلما احس

فاما الذين كفروا الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الى مرجعكم بين بعد ذلك مفصلاً ما في ذلك الاختلاف ذلك نتلوه الخ قال المسكين اشارة الى اثبات نبوة محمد عليه السلام في تضاعيف القصة كمنظائرهما فيما قبل لان المحاجة كانت في التوحيد والرسالة فمن حاجك فيه الخ بعد هذه الدلائل الواضحة والجوابات اللائحة فاقطع الكلام معهم وعاملهم بما يعامل به المعاند وهو ان تدعوهم الى الملاعنة قل يا اهل الكتاب تعالوا الخ واعلم ان النبي صلى الله عليه وسلم لما اورد على نصارى نجران انواع الدلائل وانقطعوا ثم دعاهم الى المباهلة فخافوا وما شرعوا فيها وقبلوا الصغار باداء الجزية وقد كان عليه السلام حريصاً على ايمانهم فكانه تعالى قال يا محمد اترك ذلك المنهج من الكلام واعدل الى منهج آخر يشهد كل عقل سليم وطبع مستقيم انه كلام مبنى على الانصاف وترك الجدال قل يا اهل الكتاب لم تحاجون الخ قال المسكين هو من بقية الكلام مع اهل الكتاب ودت طائفة الخ اعلم انه تعالى لما بين ان من طريقة اهل الكتاب العدول عن الحق والاعراض عن قبول الحجة بين انهم لا يقتصرون على هذا القدر بل يجتهدون في اضلال من آمن بالرسول عليه السلام بالقاء الشبهات يا اهل الكتب لم تكفرون الخ ويا اهل الكتاب لم تلبسون الخ اعلم ان علماء اليهود والنصارى كانت لهم حرفتان احدهما انهم كانوا يكفرون بمحمد صلى الله عليه وسلم مع انهم كانوا يعلمون بقلوبهم انه رسول حق من عند الله والله تعالى نهاهم عن هذه الحرفة في الآية الاولى وثانيتها انهم كانوا يجتهدون في القاء الشبهات وفي اخفاء الدلائل والله تعالى نهاهم عن هذه الحرفة في هذه الآية الثانية فالمقام الاول مقام الغواية والاضلال والمقام الثاني مقام الاغواء والاضلال وقالت طائفة من اهل الكتب الخ اعلم انه تعالى لما حكى عنهم انهم يلبسون الحق بالباطل اردف ذلك بان حكى عنهم نوعاً واحداً من انواع تلبيساتهم وهو المذكور في هذه الآية ومن اهل الكتاب الخ في ابي السعود شروع في بيان خيانتهم في المال بعد بيان خيانتهم في الدين ان الذين يشترون بعهد الله الخ اعلم انه تعالى ذكر في الآية السابقة خيانتهم في اموال الناس ثم ذكر في هذه الآية خيانتهم في عهد الله وخيانتهم في تعظيم اسمائه حين يحلفون بها كذبا وان منهم لفريقاً الخ قال المسكين هذه بقية خيانات اليهود في الاحكام الالهية ما كان لبشر الخ في ابي السعود بيان لافترائهم على الانبياء عليهم

السلام حيث قال نصارى نجران ان عيسى عليه السلام امرنا ان نتخذه رباحا شاه عليه السلام وابطال له اثر بيان افترائهم على الله سبحانه وابطاله واذ اخذ الله ميثاق الخ اعلم ان المقصود من هذه الآيات تعديد تقرير الاشياء المعروفة عند اهل الكتاب مما يدل على نبوة محمد صلى الله عليه وسلم قطعا لعذرهم واطهار العنادهم ومن جملتها ما ذكره الله تعالى فى هذه الآية اذ اذخر دين الله الخ اعلم انه تعالى لما بين فى الآية الاولى ان الايمان بمحمد صلى الله عليه وسلم شرع شرعه الله تعالى ووجهه على جميع من مضى من الانبياء والامم لزم ان كل من كره ذلك فانه يكون طالبا دينا غير دين الله قل آما بالله الخ اعلم انه تعالى لما ذكر فى الآية المتقدمة انه انما اخذ الميثاق على الانبياء فى تصديق الرسول الذى يأتى مصدقا لما معهم بين فى هذه الآية ان من صفتة صلى الله عليه وسلم كونه مصدقا لما معهم ومن يتبع غير الاسلام الخ اعلم انه تعالى لما قال فى آخر الآية المتقدمة ونحن له مسلمون اتبعه بان بين فى هذه الآية ان الدين ليس الا الاسلام وان كل دين سوى الاسلام فانه غير مقبول عند الله تعالى كيف يهذى الله الخ اعلم انه تعالى لما عظم الامر الاسلام والايمان يقوله ومن يتبع اكد ذلك التعظيم بان بين وعيد من ترك الاسلام فقال كيف يهذى الله قوما الخ الا الذين تابوا الخ وان الذين كفروا بعد ايمانهم الخ ان الذين كفروا وماتوا الخ اعلم ان الكافر على ثلاثة اقسام احدها الذى يتوب عن الكفر توبة صحيحة مقبولة وهو الذى ذكره الله تعالى فى قوله الا الذين تابوا من بعد ذلك واصلحوا وثانيها الذى يتوب عن ذلك الكفر توبة فاسدة وهو الذى ذكره الله تعالى فى الآية المتقدمة وقال الله لن يقبل توبة وثالثها الذى يموت على الكفر من غير توبة البتة وهو المذكور فى هذه الآية لن تنالوا البر الخ اعلم انه تعالى لما بين ان الانفاق لا ينفع الكافر البتة علم المؤمنين كيفية الانفاق الذى ينتفعون به فى الآخرة كل الطعام كان حلالا الخ اعلم ان الآيات المتقدمة الى هذه الآية كانت فى تقرير الدلائل الدالة على نبوة محمد صلى الله عليه وسلم وفى توجيه الالتزامات الواردة على اهل الكتاب فى هذا الباب واما هذه الآية فهى فى بيان الجواب عن شبهات القوم وفى ابي السعود وهو رد على اليهود وتبكييت لهم فى صنع النسخ والطعن فى دعوى الرسول صلى الله عليه وسلم موافقة لابراهيم عليه السلام بتحليله لحوم الابل والبانها ان اول بيت وضع الخ فى

ابى السعود شروع في بيان كفرهم ببعض آخر من شعائر ملته عليه السلام اثر بيان كفرهم بكون كل المطعومات حلاله عليه السلام وفي الكبير المراد منه الجواب عن شبهة اخرى وذلك لانه عليه السلام لما حول الى الكعبة طعن اليهود في نبوته فاجاب الله تعالى بقوله ان اول بيت الخ وان اليهود والنصارى زعم كل فرقة منهم انه على ملة ابراهيم وقد سبقت هذه المناظر في الآيات المتقدمة فالله تعالى بين كذبهم من حيث ان حج الكعبة كان ملة ابراهيم واليهود والنصارى لا يحجون فيدل هذا على كذبهم في ذلك والله على الناس الخ اعلم انه تعالى لما ذكر فضائل البيت ومناقبه اردفه بذكر ايجاب الحج قل ياهل الكتاب لم تكفرون الخ لما اورد الدلائل على نبوة محمد صلى الله عليه وسلم ثم ذكر عقيب ذلك شبهات القوم فالشبهة الاولى ما يتعلق بانكار النسخ واجاب عنها بقوله كل الطعام والشبهة الثانية ما يتعلق بالكعبة ووجوب استقبالها في الصلوة ووجوب حجها واجاب عنها بقوله وان اول بيت فعند هذا تمت وظيفة الاستدلال وكمل الجواب عن شبهات ارباب الضلال فبعد ذلك خاطبهم بالكلام اللين وقال لم تكفرون بآيات الله بعد ظهور البينات وزوال الشبهات يا ايها الذين آمنوا ان تطيعوا الخ واعلم انه تعالى لما حذر الفريق من اهل الكتاب عن الاغواء والاضلال حذر المؤمنين عن اغوائهم واضلالهم ومنعهم عن الالتفات الى قوله يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله الخ اعلم انه تعالى لما حذر المؤمنين من اضلال الكفار ومن تلبساتهم في الآية الاولى امر المؤمنين في هذه الآيات بجماع الطاعات ومعاهد الخيرات ولتكن منكم امة الخ اعلم انه تعالى في الآيات المتقدمة عاب اهل الكتاب على شيئين احدهما انه عابهم على الكفر ثم بعد ذلك عابهم على سعيهم في القاء الغير في الكفر فلما انتقل منه الى مخاطبة المؤمنين امرهم اولا بالتقوى والايمان ثم امرهم بالسعى في القاء الغير في الايمان والطاعة فقال ولتكن الخ كنتم خير امة الخ في ابى السعود كلام مستأنف سيق لتثبيت المؤمنين على ما هم عليه من الاتفاق على الحق والدعوة الى الخير ولو آمن اهل الكتب الخ المقصود من هذا الكلام ترغيب اهل الكتاب في هذا الدين ضربت عليهم الذلة الخ اعلم انه تعالى لما بين ان قاتلوا رجعوا مخذولين غير منصورين ذكر انهم مع ذلك قد ضربت عليهم الذلة ليسوا سواء الخ في ابى السعود جملة مستأنفة سيق تمهيد التعداد محاسن مؤمن اهل

الكتاب وتذكيرا لقوله تعالى منهم المؤمنون ان الذين كفروا لن تغني الخ لما وصف من آمن من الكفار بما تقدم من الصفات الحسنة اتبعه تعالى بوعيد الكفار مثل ما ينفقون الخ اعلم انه تعالى لما بين ان اموال الكفار لا تغني عنهم شيئا ثم انهم ربما انفقوا اموالهم في وجوه الخيرات فيخطر ببال الانسان انهم ينتفعون بذلك فزال الله تعالى بهذه الآية تلك الشبهة يابها الذين آمنوا لا تتخذوا الخ اعلم انه تعالى لما شرح احوال المؤمنين والكافرين شرع في تحذير المؤمنين عن مخالطة الكافرين في هذه الآية هاتم اولاء الخ اعلم ان هذا نوع آخر من تحذير المؤمنين عن مخالطة المنافقين ان تمسكم الخ في ابي السعود بيان لتناهي عداوتهم الخ واذ غدوت الخ اعلم انه تعالى لما قال وان تصبروا وتتقوا لا يضركم كيدهم شيئا اتبعه بما يدلهم على سنة الله فيهم في باب النصر والمعونة ودفع مضار العدو اذاهم صبروا واتقوا وخلاف ذلك فيهم اذا لم يصبروا ولقد نصركم الله بيد الخ في ابي السعود جملة مستانفة سقت لايجاب الصبر والتقوى بتذكير ما ترتب عليهما من النصر اذ تذكير ما ترتب على ما عدمهما من الضرور وقيل لايجاب التوكل على الله تعالى بتذكير ما يوجهه وما جعله الله الا بشرى الخ مسوق من جنابة تعالى لبيان ان الاسباب الظاهرة بمعزل من التاثير وان حقيقة النصر مختص به عز وجل ليثق به المؤمنون ولا يقنطوا منه عند فقد ان اسبابه ليس لك من الامر الخ في ابي السعود اعتراض لتحقيق ان لا تاثير للمنصورين اثر بيان ان لا تاثير للناصرين يابها الذين آمنوا لا تأكلوا الخ في ابي السعود كلام مبتدأ مشتمل على ما هو ملاك الامر في كل باب لاسيما في باب الجهاد من التقوى والطاعة وما بعدهما من الامور المذكورة على نهج الترغيب والترهيب جيى به في تضاعيف القصة مسارعة اى ارشاد المخاطبين الى ما فيه وايدان بكمال وجوب المحافظة عليه فيما هم فيه من الجهاد فان الامور المذكورة فيه مع كونها مناطا للفوز في الدارين على الاطلاق عمدة في امر الجهاد عليها بدر فللك النصر والغلبة كيف لا ولو حافظوا على الصبر والتقوى وطاعة الرسول صلى الله عليه وسلم لما لقوا ما لقوا ولعل ايراد النهى عن الربا في اثائها لما ان الترغيب في تحصيل المال فكان مظنة مبادرة الناس الى طرق الاكتساب ومن جملتها الربا فنهوا عن ذلك قد خلت من قبلكم الخ في ابي السعود رجوع الى تفصيل بقية القصة بعد تمهيد مبادئ الرشد والصلاح وترتيب

مقدمات الفوز والفلاح ولا تهنوا الخ في ابي السعود تشجيع للمؤمن وتقوية لقلوبهم
وتسليية عما اصابهم يوم احد من القتل والقرح ان يمسسكم الخ هذا من اتمام قوله
ولا تهنوا ام حسبتم الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية الاولى الوجوه التي هي الموجبات
والمؤثرات في مداولة الايام ذكر في هذه الآية ما هو السبب الاصلى لذلك فقال
ام حسبتم ان تدخلوا الجنة بدون تحمل المشاق وما كان لنفس الخ في ابي السعود
كلام مستأنف سبق للتنبية على خطاهم فيما فعلوا حذرا من قتلهم وبناء على الارجاف
بقتله عليه السلام وكاين من نبى الخ في ابي السعود كلام مبتدأ ناع عليهم تقصيرهم
وسوء صنيعهم في صدورهم عن سنن الربانيين المجاهدين في سبيل الله مع الرسل
الخالية عليهم السلام وما كان قولهم الخ في ابي السعود كلام مبين لمحاسنهم القولية
معطوف على ما قبله من الجمل المبينة لمحاسنهم الفعلية فاتاهم الله ثواب الدنيا الخ
اعلم انه تعالى لما شرح طريقة الربيين في الصبر وطريقتهم في الدعاء ذكر ايضا ما
ضمن لهم في مقابلة ذلك في الدنيا والآخرة يا ايها الذين آمنوا ان تطيعوا الخ واعلم
ان هذه الآية من تمام الكلام الاول وذلك ولان الكفار لما ارجفوا ان النبى صلى
الله عليه وسلم قد قتل ودعا المنافقون بعض ضعفة المسلمين الى الكفر منع المسلمين
بهذه الآية عن الالتفات الى كلام اولئك المنافقين سنلقى في قلوب الخ اعلم ان
هذه الآية من تمام ما تقدم ذكره فانه تعالى ذكر وجوها كثيرة في الترغيب في الجهاد
وعدم المبالاة بالكفار ومن جملتها ما ذكر في هذه الآية انه تعالى يلقي الخوف في
قلوب الكفار ولاشك ان ذلك مما يوجب استيلاء المسلمين عليهم ولقد صدقكم
الخ لما وعدهم الله تعالى في الآية المتقدمة القاء الرعب في قلوبهم اكد ذلك بان
ذكرهم ما انجزهم من الوعد بالنصر في واقعة احد ثم انزل عليكم الخ انه تعالى لما
بين انه نصر المؤمنين اولا فلما عصى بعضهم سلط الخوف عليهم ثم ذكر انه ازال
ذلك الخوف عن قلب من كان صادقا في ايمانه مستقرا على دينه بحيث غلب
النعاس عليه يا ايها الذين آمنوا لا تكونوا الخ اعلم ان المنفقين كانوا يعيرون المؤمنين في
الجهاد مع الكفار بقولهم لو كانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا ثم انه لما ظهر عن بعض
المؤمنين فتور وفشل في الجهاد حتى وقع يوم احد ما وقع وعفا الله بفضله عنهم ذك
في هذه الآية ما يدل على النهي عن ان يقول احد من المؤمنين مثل مقالتهم فيما رحمة

من الله الخ في ابي السعود تلوين للخطاب وتوجيه له الى رسول الله صلى الله عليه وسلم والفاء لترتيب مضمون الكلام على ما ينسب عنه السياق من استحقاقهم اللاتمية والتعنيف بموجب الجبلية البشرية او من سعة مساحة مغفرته تعالى ان ينصر كم الله الخ في ابي السعود جملة مستأنفة سقت بطريق تلوين الخطاب تشريفا للمؤمنين لايجاب توكلهم عليه تعالى وحثهم على اللجا اليه وتحذيرهم عما يفضى الى خذلانه وما كان لنبي الخ اعلم انه تعالى لما بالغ في الحث على الجهاد اتبعه بذكر احكام ومن جملتها المنع من الغلول افمن اتبع الخ اعلم انه تعالى لما قال ثم توفي اتبعه بتفصيل هذه الجملة وبين ان جزاء المطيعين ما هو وجزاء المسيئين ما هو لقد من الله على المؤمنين الخ لما بين خطاهم من نسبه الى الغلول والخيانة اكد ذلك بهذه الآية وذلك لان هذا الرسول ولد في بلدهم ونشأ فيما بينهم ولم يظهر منه طول عمره الا الصدق والامانة والدعوة الى الله والاعراض عن الدنيا فكيف يليق بمن هذا حاله الخيانة او لما اصابكم الخ في ابي السعود كلام مبتدأ مسوق لابطال بعض ما صدر عنهم من الظنون الفاسدة والاقاويل الباطلة الناشئة منها اثر ابطال بعض آخر منها وما اصابكم الخ اعلم ان هذا متعلق بما تقدم من قوله او لما اصابكم فذكر في الآية الاولى انها اصابهم بذنبهم ومن عند انفسهم وذكر في هذه الآية انها اصابتهم بوجه آخر وهو ان يتميز المؤمن عن المنافق الذين قالوا لاخوانهم الخ اعلم ان الذين حكي عنهم انهم قالوا لو حلم قتالا لاتبعناكم وشفهم الله تعالى بانهم كما قعدوا واحتجوا القعود هم فكذلك ثبطوا غيرهم واحتجوا لذلك ولا تحسبن الذين قتلوا الخ في ابي السعود كلام مستأنف مسوق لبيان ان القتل الذي يحذرونه ويحذرون الناس منه ليس مما يحذر بل هو من اجل المطالب التي يتنافس فيها المتنافسون اثر بيان ان الحذر لا بجدى ولا يغنى يستبشرون بنعمة الخ في ابي السعود كر لبيان ان الاستيثار المذكور ليس بمجرد عدم الخوف والحزن بل به وبما يقارنه من نعمة عظيمة لا يقادر قدرها وهي ثواب اعمالهم وقد جواز ان يكون الاول متعلق بحال اخوانهم وهذا بحال انفسهم بيانا لبعض ما اجمل في قوله تعالى فرحين الذين استجابوا الخ اعلم ان الله تعالى مداح المؤمنين على غزوتين تعرف احدهما بغزوة حمراء الاسد والثانية بغزوة بدر الصغرى وكلاهما متصلة بغزوة احدا ما غزوة حمراء الاسد فمهي المراد من هذه الآية الذين قال لهم الناس الخ نزلت

في غزوة بدر الصغرى ولا يحزنك الخ في ابي السعود تلوين للخطاب وتوجيه له الى رسول الله صلى الله عليه وسلم لتشريفه بتخصيصه بالتسليية والا لان باصالته في تدبير امور الدين والاهتمام بشؤنه ولا يحسبن الذين كفروا الخ قال المسكين له جواب عن ما يتوهم ان الكفار الذين اوعدو الله تعالى نراهم في خصب وسعة فكيف هذا فاجاب عنه في هذه الآية ما كان الله ليذر المؤمنين الخ هذه الآية من بقية الكلام في قصة احد ولا يحسبن الذين يبخلون الخ اعلم انه تعالى لما بالغ في التحريض على بذل النفس في الجهاد في الآيات المتقدمة شرع ههنا في التحريض على بدل المال في الجهاد وبين الوعيد الشديد لمن يبخل ببذل المال في سبيل الله لقد سمع الله الخ لما امر المكلفين ببذل النفس والمال في سبيل الله شرع بعد ذلك في حكاية شبهات القوم في الطعن في نبوته فاشبهه الاولى انه تعالى لو طلب الانفاق في تحصيل مطلوبه لكان فقيرا ولما كان الفقر على الله تعالى محالا كان ذلك يدل على كذب اسناد هذا الطلب الى الله تعالى الذين قالوا الخ اعلم ان هذه هي الشبهة الثانية للكفار في الطعن في نبوته صلى الله عليه وسلم كل نفس الخ في ابي السعود وعد ووعيد للمصدق والمكذب لبتلون في اموالكم الخ في ابي السعود شروع في تسليية رسول الله صلى الله عليه وسلم ومن معه من المؤمنين عما سيلقونه من جهة الكفرة من المكاراة اثر تسلييتهم عما قد وقع منهم ليوطنوا انفسهم على احتماله عند وقوعه واذ اخذنا ميثاق الخ في ابي السعود كلام مستأنف سيق لبيان بعض اذياتهم وهو كتمانهم من شواهد نبوته عليه السلام وغيرها لا يحسبن الذين يفرحون الخ في ابي السعود الجملة مسوقة لبيان ما تستتبعه اعمالهم المحكية من العقاب الاخرى اثر بيان قباحتها وقد ادمج فيها بيان بعض آخر من شنائعهم وهو اصرارهم على ما هم عليه من القبائح وفرحهم بذلك ومحبتهم لان يوصفوا بما ليس فيهم من الاوصاف الجميلة ان في خلق السموات الخ اعلم ان المقصود من هذا الكتاب الكريم جذب القلوب والارواح من الاشتغال بالخلق الى الاستغراق في معرفة الحق فلما طال الكلام في تقرير الاحكام والجواب عن شبهات المبطلين عاد الى اناة القلوب بذكر ما يدل على التوحيد والالهية والكبرياء والجلال الذين يذكرون الخ اعلم انه تعالى ذكر دلائل الالهية والقدرة والحكمة وهو ما يتصل بتقرير الربوبية ذكر بعدها ما يتصل بالعبودية فاستجاب لهم

الخ بين فى هذه الآية انه استجاب دعاءهم لا يفرنك الخ اعلم انه تعالى لما وعد المؤمنين بالثواب العظيم وكانوا فى الدنيا فى نهاية الفقر والشدة والكفار كانوا فى النعم ذكر الله تعالى فى هذه الآية ما يسليهم ويصبرهم على تلك الشدة لكن الذين اتقوا الخ لما ذكر الوعيد اتبعه بالوعد وان من اهل الكتب الخ اعلم انه تعالى لما ذكر المؤمنين وكان قد ذكر حال الكفار من قبل بان مصيرهم الى النار بين فى هذه الآية ان من آمن منهم كان داخل فى صفة الذين اتقوا فى ابي السعود جملة مستانفة سقت لبيان ان اهل الكتاب ليس كلهم كمن حكيت هنتهم من نبد الميثاق وتحريف الكتاب وغير ذلك بل منهم من له مناقب جليلة يابها الذين آمنوا الخ فى ابي السعود اثر ما بين فى تضاعيف السورة الكريمة فنون الحكم والاحكام ختمت بما يوجب المحافظة عليها.

(جلد اول مكمل)

فہرست مضامین

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

۴۸	استعانت کا مفہوم
۴۹	إِيَّاكَ نَعْبُدُ اِلخ ان شاء ہے
۴۹	ضَالِّينَ کا مفہوم
<h3>سُورَةُ الْبَقَرَةِ</h3>	
۵۰	قرآن میں شک نہ ہوئے کا مفہوم
۵۰	حروف مقطعات
۵۱	قرآن پاک میں کوئی بات موجب خلجان نہیں
۵۱	درجات ہدایت
۵۲	قرآن غیر متقیوں کے لئے بھی ہے
۵۲	کورس تقویٰ
۵۲	متقین کا معنی
۵۳	آیت کی تفسیر پر شبہ اور اس کا جواب
۵۳	درجات تقویٰ میں ترقی
۵۳	ہدی للمتقین پر اشکال کا جواب

۵۴	۲۶ رمضان المبارک ۱۶۳۰ھ مجلس شام
۵۵	رقم باطن کے انفاق پر آیت قرآنی سے استدلال
۵۵	صراط مستقیم ہونے کا نفع
۵۶	ہدایت کا دنیوی نعمت ہونا
۵۶	اعمال صالح کے ثمرات
۵۷	راہ پر آگاہ کرنا بڑی چیز ہے
۵۷	ایک آیت کی تفسیر اور شبہ کا ازالہ
۵۷	حضور علیہ السلام کو تبلیغ میں بہر صورت ثواب ہے
۵۸	ثمرات جنت دنیا کے مشابہ ہونگے
۵۹	فساد سے مراد تحلیل ہے
۵۹	فساد کے لغوی معنی
۶۰	تخلیق آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا حاکمانہ اور حکیمانہ جواب
۶۱	تعلیم اسماء کی استعداد
۶۲	خاصیت اور استعداد
۶۲	جواب اشکال
۶۳	فہم کی ایک مثال
۶۳	شیطان کے مردود ہونے کا سبب
۶۵	ابلیس کا سجدہ نہ کرنا آدم کے کمال کی دلیل
۶۵	لا تقربا فرمانے میں حکمت
۶۶	اہل کتاب سے خطاب
۶۶	جب مال اور حسب جاہ کا علاج
۶۶	ازالہ کبر کی تدبیر
۶۷	امر بالمعروف اور نسیان النفس

۶۸	اپنی برائیوں پر نظر رکھنے کی ضرورت
۶۸	اپنی صلاح ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت
۶۸	آیت اتامرون الناس کا مطلب
۶۹	نماز کی گرانی کا علاج
۷۰	لقائے رب کا استحضار مشکل نہیں
۷۰	خشوع کی حقیقت
۷۰	خشوع کی ضرورت
۷۱	قرآن شریف اور محاورات عرب میں ظن کے وسیع معنی
۷۱	نماز روزہ سے زیادہ مشکل ہے
۷۲	نماز کی گرانی دور کرنے کا طریقہ
۷۲	خشوع قلب حاصل کرنے کا طریق
۷۵	حکیم کے احکام حکمت سے خالی نہیں
۷۵	درس عبرت
۷۶	قرآن کو ہمیشہ مذاق عربیت پر سمجھنے کی ضرورت
۷۶	بے ادبی کی سزا
۷۷	ان شاء اللہ کی برکت
۷۸	تشبیہ نفس
۸۰	احکام خداوندی میں حجیتیں نکالنا بڑا جرم ہے
۸۰	اعتقال امر پر رحمت خداوندی
۸۱	علم اعتبار کی حقیقت
۸۲	قیاس اور تشبیہ
۸۲	علم اعتبار کا سلف سے ثبوت
۸۳	نفس کشی کا امر

۸۳	نفس کے تین اقسام
۸۳	خود رائی کی مذمت
۸۴	قلب معانی کا ادراک کرتا ہے
۸۵	نَزَلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ کی عجیب و غریب تفسیر
۸۶	قصہ ہارون و ماروت
۸۷	حقیقت قصہ ہاروت و ماروت
۸۹	علوم نافعہ
۹۰	تہذیب نفس ابتداء میں کامل نہیں ہوتی
۹۱	ہماری فلاح کا مدار
۹۱	غلط دعویٰ پر رد
۹۲	بلاغت قرآن مجید
۹۵	ویرانی مساجد کا مفہوم
۹۸	بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے میں حکمت
۹۹	علم کلام کی ضرورت
۹۹	تلاوت کرنے والوں کی مدح
۱۰۱	حقوق تلاوت
۱۰۲	اسلام مسلمان کو انہماک فی الدنیا سے مانع ہوتا ہے
۱۰۳	تشریح دعائے ابراہیمی
۱۰۳	دعائے ابراہیمی کی تشریح
۱۰۵	دین کے ضروری شعبے
۱۰۸	اسلام کی حقیقت
۱۰۹	مسلمانوں کو تلقین
۱۰۹	ایک آیت کی عجیب تفسیر

۱۰۹	تفسیر کے اشکال کامل
۱۱۰	تفسیر عجیب لِنَعْلَمَ
۱۱۰	تفسیر آیت
۱۱۱	ترقی کو شرعاً واجب فرمانا
۱۱۲	ذکر اللہ کا ثمرہ
۱۱۲	ذکر اللہ کا مقصود
۱۱۳	اللہ کے ذکر سے قرب خداوندی نصیب ہوتا ہے
۱۱۳	فوائد و نتائج
۱۱۳	حصول صبر کی سہل تدبیر
۱۱۵	ثمرات کی ایک تفسیر
۱۱۸	حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے امتحان
۱۱۶	حضرات کا ملین کے عشق و محبت کا امتحان
۱۱۷	إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُونَ کا مفہوم
۱۱۷	رنج طبعی کم کرنے کی تدبیر
۱۱۸	بے صبری امتحان میں ناکامی کی دلیل ہے
۱۱۹	حقیقت بلاء نعمت
۱۱۹	صیغہ جمع موجب تسلی
۱۲۰	مصیبت کا ایک ادب
۱۲۱	لطف بشارت
۱۲۲	مصائب غیر اختیاریہ پر ثواب کی بشارت
۱۲۳	صابرین کو بشارت
۱۲۵	صابرین کو دنیوی جزا
۱۲۵	تیسری بشارت

۱۲۶	ایک آیت کی تفسیر سے شبہ کا ازالہ
۱۲۶	اہل اللہ کی شان
۱۲۶	تقلیل غم اور تسہیل حزن کا طریقہ
۱۲۷	مصیبت کا آنا یقینی ہے
۱۲۷	تمام غموم اور احزان کا علاج
۱۲۸	جذبات طبیعہ کی رعایت
۱۳۰	ایمان کے لئے شدت محبت الہی لازم ہے
۱۳۱	محبت کا طبعی اثر
۱۳۲	محبت خداوندی کا رنگ سب پر غالب آنا چاہیے
۱۳۲	حق سبحانہ تعالیٰ سے منشاء محبت
۱۳۳	وَاشْكُرُوا سے مراد
۱۳۳	اولیاء اللہ کے نام پر نذر نیاز کا حکم اور اس کی علمی تحقیق
۱۳۶	منشادین فروشی کتمان حق
۱۳۷	اسباب مغفرت کو اختیار کرنے کی ضرورت
۱۳۹	گناہوں کا سبب جہالت اور عذاب سے بے خوفی ہے
۱۳۹	نیکی محض استقبال قبلہ نہیں
۱۴۰	کمال اسلام کی شرائط
۱۴۰	صبر کی تین حالتیں
۱۴۰	مفہوم آیت
۱۴۱	صبر کی تعریف
۱۴۱	مقبول کون؟
۱۴۲	روزہ ایک عظیم نعمت خداوندی
۱۴۳	ادراک اوامر

۱۴۳	محکمہ نفع و ضرر
۱۴۳	مقصود روزہ
۱۴۴	احکام اسرار
۱۴۵	شاہانہ محاورہ
۱۴۶	تقویٰ دو انا مطلوب ہے
۱۴۸	احکام عشرہ اخیرہ رمضان
۱۴۸	قرآن شریف لوگوں کے لئے بہت بڑی ہدایت ہے
۱۴۹	اہتمام تلاوۃ
۱۴۹	مجاہدہ میں آسانیاں اور سہولتیں
۱۵۰	عجب کی مذمت
۱۵۳	روزہ کو شروع فرمانے کے مصالح
۱۵۴	ہمارے جذبات کی رعایت
۱۵۴	ربط آیات
۱۵۷	جملہ احکام شریعت آسان ہیں
۱۵۸	مجاہدات میں انسانی مزاج کی رعایت
۱۵۸	جوش دین اور جوش طبیعت کا انتظام
۱۵۹	تفسیر رحمۃ للعالمین
۱۶۱	اہمیت ذکر رسول
۱۶۳	اجابت کا وعدہ
۱۶۵	اجابت کا مفہوم
۱۶۵	قبولیت دعا کا مفہوم
۱۶۶	اجابت دعا کی تین صورتیں
۱۶۶	لباس کا مفہوم

۱۶۸	دوای دلی حکم دلی میں ہے
۱۶۹	حدود معاملات
۱۶۹	شریعت میں رعایت حدود کا حکم
۱۶۹	احکام طلاق کے حدود میں حکمت
۱۷۰	شفقت کی رعایت
۱۷۱	مکافات عمل
۱۷۱	سودی مال اور محق کی حقیقت
۱۷۲	چاند گھنٹے اور بڑھنے میں حکمت
۱۷۳	شریعت کو ہر شے میں تصرف کا اختیار ہے
۱۷۳	آیت کا محل
۱۷۴	اصل تقویٰ
۱۷۵	قاعدہ کلیہ
۱۷۵	مجاہدین فی العبادات
۱۷۵	عشاق کا حال
۱۷۶	علم کا زیادہ حصہ غیر مکتسب ہے
۱۷۶	حج اور تجارت
۱۷۸	سفر حج میں مال تجارت ہمراہ لے جانے کا حکم
۱۷۸	لفظ حسنہ کا مفہوم
۱۷۹	حضرات صوفیا کا استدلال
۱۷۹	حق تعالیٰ کی رحمت عظیمہ
۱۸۰	ایک آیت پر منطقی اشکال اور اس کا جواب
۱۸۱	اعتبار عموم الفاظ
۱۸۱	لسانی کا طبعی اثر

۱۸۲	عقلاً آپ ﷺ کو ہرگز دھوکہ نہیں ہو سکتا
۱۸۲	آثار طبعیہ
۱۸۳	آرام دہ اشیاء
۱۸۳	حق سبحانہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے شدت محبت
۱۸۳	بیع کا مفہوم
۱۸۷	مکلف کی دو قسمیں ہیں
۱۸۷	مطلق مومن کا شان
۱۸۷	مومن کے لئے خلود فی النار نہیں
۱۸۸	حدیث شفاعت میں ایک لطیف تحقیق
۱۸۸	کافر کی دو حالتیں
۱۸۸	کفر ذرا سا بھی موجب خلود فی النار ہے
۱۸۹	مکلفین کی دوسری قسم
۱۸۹	آیت فی الدنيا حسنة سے ترقی دنیا مراد نہیں
۱۹۰	ترقی دین کی دعا
۱۹۰	مکلفین کی تیسری قسم
۱۹۱	مکلفین کی چوتھی قسم
۱۹۲	مسلمان طالب حسنہ ہیں
۱۹۳	شراء نفس کی فضیلت اور غایت
۱۹۷	خاصہ بشری
۱۹۸	آیت ربنا اتنا فی الدنيا حسنة پر رفع اشکال
۲۰۰	تمنیٰ کا علاج
۲۰۰	ہماری غلطی پر تنبیہ
۲۰۱	امور شرعیہ و تکوینیہ

۲۰۱	دعاء کو مشروع فرمانے میں حکمت
۲۰۲	خلاصہ آیت
۲۰۳	پاکیزہ طرز کلام
۲۰۴	گناہ میں مصلحت
۲۰۴	تفکر فی الدنیا کی دو لطیف تفسیریں
۲۰۵	تفکر فی الدنیا کی ایک عمدہ تفسیر
۲۰۵	طریق اصلاح
۲۰۶	جامعیت کلام الہی
۲۰۷	علوم قرآن
۲۱۰	طاغوتوں سے بھاگنے کے احکام
۲۱۲	قرض حسن
۲۱۲	أَضْعَافًا كَثِيرَةً کا مفہوم
۲۱۳	کفر محمود
۲۱۵	نمرود کی کج فہمی
۲۱۶	نمرود کی مرعوبیت
۲۱۶	احیاء و اماتت کا مفہوم
۲۱۷	نمرود کا احقناذ بن
۲۱۸	اہل مناظرہ کے اشکال کا جواب
۲۱۹	تردد کے اقسام
۲۲۰	قرآن اور ترجمہ
۲۲۰	وساوس اور اسباب
۲۲۱	اطمینان اور ایمان اور چیز ہے
۲۲۱	انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت

۲۲۲	اخلاص کی تشبیہ
۲۲۳	عمل کے بعض ثمرات خاص عامل ہی کو ملتے ہیں
۲۲۵	رعایت غربا
۲۲۶	حکمت موہبت خداوندی ہے
۲۲۸	امور دین میں مصروف لوگوں کا حق
۲۳۰	صدقات کے مستحق
۲۳۱	آیت میں فقراء سے کیا مراد ہے
۲۳۲	فقراء کی شان
۲۳۲	دباؤ سے چندہ لینا ناجائز ہے
۲۳۳	سوال اور الحاف برا ہے
۲۳۴	سود کے مال میں برکت نہیں ہوتی
۲۳۴	قرض کا ایک ضروری حکم
۲۳۶	آثم قلبہ کا مفہوم
۲۳۶	قرض دیتے وقت لکھنے کا حکم
۲۳۷	بیان اعذار میں حکمت
۲۳۹	امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ ہوگا
۲۴۰	غیر اختیاری وساوس پر مواخذہ نہیں
۲۴۲	نگاہ بد اختیار ہے
۲۴۲	عدم توجہی
۲۴۳	وسوسے آنے پر مواخذہ نہیں
۲۴۴	سُورَةُ اَلْعَمْرٰن
۲۴۴	زین کی دو مختلف تفسیریں
۲۴۵	اموال دنیا کی طرف طبعی میلان

۲۳۵	ملکات اور وداعی اپنی ذات میں مذموم نہیں
۲۳۷	مدیر حسن خاتمہ
۲۳۷	آداب سوال
۲۳۸	محبت اور محبوبیت دونوں متلازم ہیں
۲۳۹	اعمال صالحہ سے حق تعالیٰ شانہ کی محبت پیدا ہوتی ہے
۲۵۰	حضرت مریم علیہا السلام کا کمال فہم
۲۵۰	تحصیل تو اضع کا طریق
۲۵۱	عربی اور اردو کے معنی کا فرق
۲۵۲	حضور ﷺ کا پہلے علوم سے بے خبر ہونا عین کمال ہے
۲۵۳	گناہگار مسلمانوں کا دخول جہنم میں تزکیہ کے لئے ہوگا
۲۵۳	ربانی بننے کی ضرورت
۲۵۵	حقیقی علم
۲۵۵	انبیاء کا طریق تعلیم
۲۵۶	رسول اکرم ﷺ کی شان
۲۵۷	خبر کامل
۲۵۸	شان نزول
۲۵۹	مجاہدہ کا مقصود
۲۶۰	امت محمدیہ علیہا الصلوٰۃ والسلام پر خصوصی انعامات
۲۶۲	حسب استطاعت تقویٰ اختیار کرو
۲۶۲	مسائل کون ہے؟
۲۶۳	تدریجاً استطاعت حصول تقویٰ کا حکم
۲۶۳	تہ و نف کا حاصل کرنا فرض ہے
۲۶۳	کامل تقویٰ کیلئے حسب استطاعت کوشش کا حکم

۲۶۵	اسلام کی حقیقت
۲۶۶	شان نزول
۲۶۸	اسلام کا مفہوم
۲۷۰	موت کے وقت تفویض کامل کا حکم
۲۷۰	اتفاق کی حقیقت
۲۷۱	ہر شخص امر بالمعروف کرنے کا اہل نہیں
۲۷۲	انتظام شریعت
۲۷۲	تبلیغ کا ایک درجہ سب کے ذمہ ہے
۲۷۳	اہل علم کی شان
۲۷۳	دعوت عامہ کے اقسام
۲۷۳	عمومی دعوت میں تخصیص کا راز
۲۷۳	فضائل امت محمدیہ ﷺ
۲۷۵	اصلاح غیر کے مدارج
۲۷۶	کثرت تلاوت و نقل کی ترغیب
۲۷۷	عقائد
۲۷۷	اعمال
۲۷۷	تراویح
۲۷۷	اعمال خیر
۲۷۸	مدار اصلاح
۲۷۸	علماء کی قسمیں
۲۸۲	اوصاف صالحین
۲۸۳	سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان
۲۸۳	موصل الی المقصود

۲۸۵	اصل الاصول
۲۸۷	حُب رسول
۲۸۸	تسلیم و رضا
۲۸۹	اسباب محبت
۲۹۰	شاہی محاورہ
۲۹۱	جنت کی طرف کشش کا سبب
۲۹۲	معبود ہونے کے لئے خالق ہونا ضروری ہے
۲۹۳	عفو کی فضیلت
۲۹۳	غصہ کا آنا غیر اختیاری امر ہے
۲۹۳	تعلق مع اللہ کبھی نہ چھوڑو
۲۹۵	ثبوت وصال رسول اکرم ﷺ
۲۹۶	خوش اعتقادی
۲۹۷	مراتب شرک
۲۹۷	اتباع ظن
۲۹۹	بدعات رمضان
۲۹۹	ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں
۳۰۰	آیت کی تفسیر لطیف
۳۰۱	حضرات صحابہؓ کی حیثیت خداوندی
۳۰۱	تصفیہ باطن
۳۰۱	آداب اعصاب برائے دفع رنج
۳۰۲	تخصیص و ابتلا کا فرق
۳۰۳	اصلاح قلب
۳۰۵	حضرت خالد کی قابلیت

۳۰۵	اجتہادی غلطی
۳۰۶	تلافی مصائب کی صورت
۳۰۷	غزوہ احد
۳۰۷	سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے
۳۰۸	سابقہ گناہوں کے غم میں مبتلا رہنا مضر ہے
۳۰۹	تفسیر عجیب آیت اذ تصعدون
۳۱۰	بدنگاہی سے بچنے کے اہتمام کی ضرورت
۳۱۰	احباب سے مشورہ
۳۱۱	اصلاح میں نرمی اور سختی دونوں درکار ہیں
۳۱۱	جلالت شان رسول اکرم ﷺ
۳۱۲	عظمت صحابہ
۳۱۳	مشورہ میں حکمت
۳۱۳	قرآن حکیم سے سلطنت شخصی کا ثبوت
۳۱۵	توکل اور اس کے درجات
۳۱۶	شان نزول
۳۱۷	سلطنت جمہوری کا ثبوت قرآن پاک سے نہیں ملتا
۳۱۷	مشورہ کی مصلحت
۳۱۸	اسلام اور جمہوریت
۳۲۰	حضرات صحابہ حضور اکرم ﷺ کے عاشق تھے
۳۲۱	شان رحمۃ اللعالمین ﷺ
۳۲۱	حیات نبوی ﷺ پر ایک نکتہ
۳۲۱	سلطنت شخصی میں بھی مشورہ واجب ہے
۳۲۲	ترغیب ذکر و فکر

۳۲۳	جزا و سزا میں فکر کی ضرورت
۳۲۳	تفکر فی الدنیا
۳۲۳	باوجود وعدہ کے خوف
۳۲۳	وعدہ کا اہل بنانا
۳۲۵	حقیقت عمل
۳۲۶	ضرورت عمل
۳۲۷	جوش محبت
۳۲۸	خواتین اور قرآن حکیم
۳۲۸	مسئلہ مساوات مرد و زن
۳۲۹	درجات مرد و زن
۳۳۰	مساوات حقوق مرد و زن
۳۳۲	فلاح آخرت کے لئے ایمان شرط ہے
۳۳۳	دنیا کی فلاح بھی اعمال صالحہ سے ہوتی ہے
۳۳۳	لَعْلُ کا مفہوم
۳۳۳	اعمال کی دو قسمیں
۳۳۶	رَابِطًا کا مفہوم
۳۳۷	تقویٰ شرعی
۳۳۸	ترغیب فلاح
۳۳۸	احکام شرعیہ مصالح دنیویہ کو بھی متضمن ہیں
۳۳۰	فلاح آخرت کے لئے ایمان شرط

قرآن کریم کے معانی و مطالب سے واقف کرانے کیلئے، واضح عربی متن تحت اللفظ
بامحاورہ آسان ترجمہ، عام فہم، مختصر اور جامع تفسیر پر مشتمل آسان تعلیمی

درس قرآن

تسہیل شدہ ترجمہ

از حکیم الامت ڈالملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

تفسیر مخلص از تفسیر ابن کثیر، معارف القرآن، بیان القرآن و دیگر تفاسیر

اگر آپ روزانہ پندرہ بیس منٹ قرآن پاک کو دیں اور اس ”درس قرآن“ سے ایک درس پڑھیں
تو انشاء اللہ آپ قرآن کریم کے معانی و مطالب کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اے ابو ذر! اگر تو صبح کو ایک آیت کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے، اور
اگر علم کا ایک باب سیکھ لے تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے افضل ہے۔

آئیے! ہم بھی روزانہ ایک درس قرآن پڑھنے کا معمول بنائیں اور اجر و برکات حاصل کریں۔

ادارہ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان 061-540513-519240
Email: Taleefat@mul.wol.net.pk/Website: www.taleefat-e-ashrafiya.co

پاکستان میں پہلی بار جدید کمپیوٹر کتابت کے ساتھ بڑے سائز میں

تفسیر بیان القرآن

مکمل
کامل ۳ جلد
۱۴۳۴ھ

رفع الشكوك ودرت مسائل السؤك من كلام ملك الملوك
وجوه المثاني مع توجيه الكلمات والمعاني (ولي)

حضرت حکیم الامت مجدد ملت جامع الکالات منبع المسائل مآثر العلوم القرآنیۃ وواقف الاسرار الفرقانیۃ،
زاس الفسرين مقدم الراغبين صاحب الشریعۃ والطریقۃ، بحر العرفۃ والحقیقۃ کاشف الاسرار لغی منہا والہای اعنہ سے بہ

مولانا محمد اشرف علی التھانوی
نور اللہ مرقدہ ومبعل الجنة مشواہ

تعارف و تقدیر فقہ العصر حضرت مولانا مفتی

عبد الشکور ترمذی

تفسیر بیان القرآن اور اس کے متعلقہ تمام رسائل کی جدید اشاعت کھنے کی پوزنگ و ترتیب اس
قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ جو خود حضرت حکیم الامت قدس سترہ کا نظر فرمودہ ہے اور اس
پر حضرت کی تصدیق اور دستخط ہیں نیز حضرت مولانا بشیر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دستخط موجود ہیں
یہ نسخہ ۱۳۵۳ھ میں مطبع اشرف المطابع عمائد جموں سے شائع ہوا تھا۔

ادارہ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان 061-540513-519240
E-mail: ishaq90@hotmail.com/Website: www.taiefat-e-ashrafiya.co

میر تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی کے
کے جملہ خطبات و خطبات اور تقریریں جملہ تصانیف
سے منتخب سیکڑوں الہامی آئینہ نجات

شرف المآثر

تقدیم و کاوش

شیخ الحدیث مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

نظر ثانی

علم ربانی حضرت مولانا مفتی محمد امجد علی صاحب مدظلہ العالی

طبعة

ادارہ تالیفات شریفیہ

چوک فوارہ گلستان پاکستان

519240-540513-8061

عظیم الشان دستِ بدایتِ حضرت مولانا شرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
کے جملہ خطبات ملفوظات اور تقریباً جملہ تصانیف
سے منتخب سینکڑوں الہامی تفسیری نکات

اشرف التفسیر (جلد ۲)

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

سورۃ النساء - تا - بنی اسرائیل

تقریب و تالیف

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

تقدیم

علم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

صوفی محمد اقبال قریشی صاحب

ابوحذیفہ محمد اسحاق ملتانی

ادارۃ تالیفات اشرفیہ

بجگ ذرہ گستان پاکستان فون: 540513-519240

Email: Taleefat@mul.wol.net.pk

نام کتاب..... اشرف التفاسیر (جلد-۲)
تاریخ اشاعت..... صفر الفظفر ۱۳۳۵ھ
ناشر..... ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
طباعت..... سلامت اقبال پریس ملتان

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کونڈ
کتب خانہ شہید پہ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
دارالاشاعت اردو بازار کراچی
بک لینڈ اردو بازار لاہور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121- HALLWELL ROAD
BOLTON BL3NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران غلطی کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رو جانے کا امکان ہے۔ لہذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایجنیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نئی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

اشرف التفاسیر

کا جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

الحمد للہ ”اشرف التفاسیر“ بہت مقبول ہوئی، اہل علم نے خاص طور پر اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جزا ہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ نے حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات میں سے مزید بہت سارے تفسیری نکات جمع کر کے ہمیں ارسال فرمائے ہیں جو اس ایڈیشن میں شامل کتاب کر دیئے گئے۔

اس مبارک اضافہ کے علاوہ خود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا عربی رسالہ **”سبق الغیبات فی نسق الآیات“** بھی سورتوں کی ترتیب کے مطابق آخر میں لگایا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ اضافہ جات تمام علم دوست حضرات کے لئے مزید علمی و عملی برکتوں کا باعث ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

اجمالي فهرست

٥	سورة النساء
٨٠	سورة المائدة
١١٣	سورة الانعام
١٥١	سورة الاعراف
١٩٤	سورة الانفال
٢٠٤	سورة التوبة
٢٧٤	سورة يونس
٢٥٦	سورة هود
٢١٨	سورة يوسف
٢٢٧	سورة الرعد
٢٤١	سورة ابراهيم
٢٥٦	سورة الحجر
٢٧٢	سورة النحل
٢٩٨	سورة بني اسرائيل

سُورَةُ النِّسَاءِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً

تَنْجِئُكُمْ: پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو

قرآن کریم کی اس آیت پر ایک اشکال اور اس کا جواب

فرمایا سید احمد نے کہا اور پھر ڈپٹی نذیر احمد نے اس کے اتباع کیا یہ دعویٰ کیا کہ ایک عورت سے زیادہ نکاح کرنا جائز نہیں اور دلیل یہ پیش کی کہ فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة اس سے معلوم ہوا کہ اگر عدل نہ ہو سکے تو ایک سے زائد نکاح کرنا جائز نہیں ایک مقدمہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے وہ دوسری جگہ ہے۔ ولن تستطيعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم اس سے معلوم ہوا عدل کی قدرت ہی نہیں ایک تو مونا جواب ہے کہ اللہ میاں کو اتنے ہیر پھر کی ضرورت ہی کیا تھی صاف کہہ دیتے کہ ایک سے زائد نکاح جائز نہیں دوسرا یہ کہ چودہ سو برس تک کسی نے اس آیت کو نہ سمجھا حتیٰ کہ حضور ﷺ نے بھی نہ سمجھا آپ ہی نے سمجھا یہ تو موٹی بات تھی۔ باقی حقیقت دلیل کی یہ ہے کہ ایک تو ہے عدل فی المعاملہ اور ایک ہے عدل فی المحبة تو فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة جو ممانعت ہے وہ یہ کہ اگر عدل فی المعاملہ نہ ہو سکے تو ایک سے زائد نکاح نہ کرو اور دوسری آیت میں جو ہے ولن تستطيعوا ان تعدلوا الا یہ وہاں مراد عدل فی المحبة ہے۔ جب یہ اس کی قدرت میں ہے نہیں تو اس پر دوسرا مقدمہ ملاتا ہوں۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها کہ عدل فی المحبة کے حکم ہی نہیں وہ غیر اختیاری ہے جب میل ہو گا ایک جانب ہو گا تو فرماتے ہیں فلا تعیلوا کل المیل یعنی محبت کی وجہ سے بعض المیل کی تو اجازت ہے جو کہ عدل فی المعاملہ کو مانع نہیں باقی کل المیل نہ ہو جس سے عدل فی المعاملہ بھی نہ ہو سکے۔ فتسروہا کا معلقہ ضمیر مجال عنہا کی طرف راجع ہے کہ اس کو بالکل معلقہ چھوڑ دو فتسروہا کا معلقہ صریح قرینہ ہے اس بات کی کل المیل کی ممانعت ہے بعض المیل کی اجازت ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵)

میاں بیوی کے مال پر بھی طیب نفس شرط ہے۔ یہ آیت ازواج کے متعلق ہے کہ اگر وہ اپنے مہر میں سے کچھ تم کو طیب نفس کے ساتھ دیدیں تو اس کا کھانا اور لینا جائز ہے۔ ظاہر ہے میاں بیوی کا تعلق کیسا کچھ ہوتا ہے کہ اس تعلق سے زیادہ کوئی تعلق بے تکلفی کا نہیں ہو سکتا۔ جب یہاں بھی طیب نفس کی شرط ہے تو اور جگہ طیب نفس کی ضرورت کیوں نہ ہوگی اور حدیث میں ہے۔

الا لا یحل مال امرء مسلم الا بطیب نفس منه

اور اذن بطیب نفس کی حقیقت یہ ہے کہ دوسرے کے عدم اذن پر بھی قدرت ہو اور تجربہ یہ ہے کہ یہاں مرید پیر کے استیذان کے بعد عدم اذن پر قادر نہیں ہوتا اس لئے اذن معتبر نہیں (ارضاء الحق حصہ دوم)

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَّةً أَوْ امْرَأَةً أَوْ أَخًا أَوْ أُخْتًا

فَلِكُلٍّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ إِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ

فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا

أَوْ دِينَ غَيْرِ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ١٧

ترجمہ: اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا پھر اگر یہ لوگ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب تہائی میں شریک ہوں گے۔ وصیت نکلنے کے بعد جس کی وصیت کردی جائے یا دین کے بعد بشرطیکہ کسی کو ضرر نہ پہنچا دے یہ حکم کیا گیا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں۔ حکیم ہیں۔

دوسری آیت یہ ہے إِنْ امْرَأَةٌ آهْلَكَ كَيْسَ لِدَوْلَىٰ لَوْلَا أُولَٰئِكَ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهِيَ بِرُثَتَا إِنْ كُنَّا لَهَا وَوَلَدًا فَإِنْ كَانَتِ الثَّلَاثَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثِيَيْنِ ترجمہ: اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو (اور نہ ماں باپ) اور اس کے (ایک بیٹی یا علاتی بہن) ہو تو اس کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا اور وہ شخص اس (اپنی بہن) کا وارث ہوگا اور اگر (وہ بہن مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو اور (والدین بھی نہ ہوں) اور اگر بہنیں دو ہوں یا زیادہ تو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا اور اگر وارث چند بھائی بہن ہوں مرد و عورت تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر ملے گا۔

آیت کلالہ سے متعلق ایک عجیب نکتہ

قرآن مجید میں دو آیتیں فرائض کے متعلق جس میں کلالہ کا حکم مذکور ہے ایک عجیب نکتہ بیان کیا سب کا اجماع ہے کہ پہلی آیت میں اخوات و اخوات اخیا فیہ کا حکم مذکور ہے اور دوسری میں اعمیانیہ و علاتیہ کا اور دلیل اس کی ہمارے لئے اجماع ہے اور اہل اجماع کے لئے پہلی آیت میں قرأت بزیاہ من ام ہے نکتہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ غور کرنے سے خود قرآن میں بھی اس کا قوی اور قریب قرینہ ہے وہ یہ کہ پہلی آیت سے کچھ اوپر سہام ابوین کے مذکور ہوئے ہیں۔ وَلَا بَوَّيْهُ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الشُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَةٌ أَبَوَاهُ فَلِأَخِيهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِلْإِخْوَةِ الشُّدُسُ پس اس میں ماں کو ہر حالت میں ذی فرض فرمایا ہے اور فرض دو قسم کا ہے سدس اور ثلث اور باپ کو ایک حالت میں ذی فرض اور ایک حالت میں عصبہ فرمایا ہے آگے آیات کلالہ میں بھی ایک جگہ اخوة و اخوات کو ہر حال میں ذی فرض قرار دیا ہے سدسا و ثلثا اور یہی حالت تھی ان کی تو یہ قرینہ اس کا ہے کہ یہ من الام ہیں کہ ان کا حکم مستفاد ہوا ماں سے اور دوسری جگہ اخوة اور اخوات کو بعض حالات میں ذی فرض اور بعض حالات میں عصبہ قرار دیا ہے اور یہی حالت تھی باپ کی اور یہ قرینہ ہے اس کا کہ یہ اخوة و اخوات باپ میں تو ضرور شریک ہیں خواہ مع الاشرک فی الام خواہ بدونہ

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّرُوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ

يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ⑩

ترجمہ: توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں سو ایسوں پر تو خدا تعالیٰ توبہ فرماتے ہیں اور یہ اللہ خوب جانتے ہیں حکمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

جہالت کی حقیقت

فرمایا إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّرُوءَ بِجَهَالَةٍ میں صوفیہ کے نزدیک جہالت کی قید واقعی ہے احترازی نہیں پس وہ فرماتے ہیں کہ جہالت کے بغیر کوئی گناہ ہو ہی نہیں سکتا وہ گناہ عمد کو بھی جہالت ہی سے صادر

ہونے والا سمجھتے ہیں کیونکہ علم جو مقابل ہے جہل کا اور اس کی تعریف ان کے ہاں اعتقاد جازم مطابق للواقع مع غلبہ الحال ہے اور گناہ کرنے کے وقت غلبہ حال مفقود ہوتا ہے اس لئے گناہ جہل ہی سے ہوگا۔ یعنی جس وقت عقوبت گناہ کا کامل احتضار ہو اس وقت گناہ ہو ہی نہیں سکتا۔ الزانی و هو مومن میں ایمان کی نفی اسی حال کی نفی ہے پس غلبہ حال ہی سے گناہ سے رک سکتے ہیں اور یہ شبہ کہ یہ غلبہ حال اختیاری چیز نہیں اس طرح مدفوع ہے کہ یہ غلبہ تکرار مراقبہ اور احتضار سے حاصل ہو جاتا ہے اور تکرار احتضار اختیاری ہے۔ پس اس سے جو حال پیدا ہو وہ بھی اختیاری ہے جیسا البصار (فتح عین) تو اختیاری ہے اور نظر آتانی نفسہ غیر اختیاری ہے مگر فتح العین اس کا سبب جو کہ اختیاری ہے اس لئے البصار کو بھی اختیاری ہی کہا جاسکتا ہے (فیوض الخالق)

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّوْءَ الْبَخْسَ (ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ان لوگوں کے لئے ہے جو جہالت سے برے کام کرتے ہیں یا پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں پس یہ لوگ ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے توجہ فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جاننے والے اور حکمت والے ہیں۔

نص کا مدلول چار طرح سے ثابت ہے

اہل علم کو معلوم ہے کہ نص کا مدلول چار طرح سے ثابت ہوتا ہے اول عبارت النص دوم اشارۃ النص سوم اقتضاء النص چہارم دلالہ النص آیت میں مدلول عبارت النص تو اور مضمون ہے اور اس سے میرا مدعا ثابت نہیں میرا مدعا مدلول با اشارۃ النص سے ہے عبارت النص کو اور اشارۃ النص کو اصطلاحاً تو اہل علم جانتے ہی ہیں لیکن عوام کے فہم کے لئے یہاں صرف ان دونوں کی حقیقت مختصر آبیان کرتا ہوں جس مضمون کے لئے متکلم نے کلام کو وارد کیا ہے وہ تو مدلول عبارت النص ہے اور مدلول با اشارۃ النص یہ ہے کہ اس کے لئے کلام کا مسوق تو نہیں ہوا لیکن وہ مضمون نص کے الفاظ ہی سے نکلتا ہے اب سمجھئے کہ عبارت النص کا مدلول تو یہاں صرف یہ ہے کہ قبول توبہ کی شرط بیان کرنا منظور ہے کہ قبول توبہ جب ہوگا کہ گناہ جہالت سے ہو جاوے اور فوراً توبہ کر لے اور اس سے دوسرا مضمون اشارۃ ایک اور معلوم ہو گیا گو اس کے لئے کلام وارد نہیں کیا گیا وہ یہ کہ صدور معصیت ہمیشہ جہالت سے ہوگا اور اسی سے میرا مدعا ثابت ہوگا اور یہ مضمون بھی صریح لفظوں سے مدلول آیت کا ہے مگر عبارت النص سے نہیں اس لئے کلام مسوق نہیں ہے۔ بلکہ اشارۃ النص سے ثابت ہے جو قطعیت میں عبارت النص کے برابر ہے باقی خود یہ مضمون کہ صدور معصیت کا ہمیشہ جہالت سے ہونا ہے اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے وہ یہ ہے کہ نص کے اندر جو یہ جہالت کی قید ہے یہ قید واقعی ہے احترازی نہیں ہے دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر قید احترازی لی جاوے گی تو اس کا قائل ہونا پڑیگا کہ اگر کوئی جان کر گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہ ہو حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ گناہ خواہ جان کر ہو یا انجان پن سے ہو توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کفر اور شرک جو جان کر ہی کئے جاتے ہیں ان

سے بھی تو بہ ہو جاتی ہے پس یہ قید واقعی ہے استرازی نہیں پس معنی یہ ہیں کہ گناہ ہمیشہ جہالت سے ہوتا ہے اب اگر کوئی کہے کہ جب گناہ ہمیشہ جہالت ہی سے ہوتا ہے تو اس کے بتلانے سے کیا فائدہ۔

فائدہ اس کے بتلانے میں یہ ہے کہ بغیر اس قید کے بتلائے علاج کی طرف متنبہ نہ ہوتا یہ قید گویا مادہ مرض ہے مرض کا اگر مادہ نہ بتلایا جاوے تو معالجہ کے اندر اشکال ہوتا ہے مثلاً سودا ویت کی وجہ سے مرض ہو اور اطلاع نہ کی جاوے تو ممکن ہے کہ بلغم کا مسہل پی لے اور بجائے نفع کے ضرر ہو اور کار بتلا دیا جاوے گا تو مریض سودا ہی کی دوا پی لے گا۔ پس جہالت کی قید سے یہ بتلا دیا کہ گناہ ہمیشہ جہالت سے ناشی ہوتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جاوے کہ جہل کا ازالہ گناہوں کا علاج ہے اب غور کرنا چاہئے کہ جہالت کے یہاں کیا معنی ہیں جو گناہ کے لئے لازم ہے سو قرآن مجید میں جہل کا لفظ بہت جگہ آیا ہے اور ہر جگہ ایک معنی نہیں اسی طرح علم کا لفظ بہت متعدد معانی میں آیا ہے اور علم و جہل میں تقابل ہے جس قدر علم کی اقسام نکلیں گے اسی قدر جہل کی بھی اور علم کے تعین سے جہل کی بھی تعین ہو جائے گی اس لئے میں علم کی اقسام بیان کئے دیتا ہوں۔

علم و جہل کے معنی

علم کے ایک معنی تو دانستن ہیں۔ جس کو سب جانتے ہیں اس کے مقابلہ میں جہل کے معنی نادانستن ہیں دوسرے معنی علم کے عمل ہیں قرآن شریف میں اس معنی میں بھی علم کا استعمال آیا ہے چنانچہ علماء یہود کے بارہ میں ارشاد ہے وَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ یعنی یہود جانتے ہیں کہ جو شخص سحر اختیار کرتا ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ان کے لئے ایک علم ثابت کیا ہے آگے ارشاد ہے وَلَيْسَ مَا اشْتَرَا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ یعنی جس شے کے بدلہ انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے وہ بری شے ہے کاش وہ جانتے یہاں علم کی ان سے نفی فرمائی ہے معلوم ہوا کہ اس علم سے مراد دوسری قسم ہے علم کی ورنہ اجتماع نفی میں لازم آوے گا اور وہ قسم ترک عمل ہے پس معلوم ہوا کہ علم کے دو معنی ہیں علم بمعنی دانستن اور عمل بالعلم پس جہل کے بھی دو معانی ہوئے ایک نادانستن دوسرے عدم العمل اور معنی ثانی جہل کے دوسرے مقام پر بھی آئے ہیں چنانچہ ارشاد قُلْ اَفَعْبُدُوْا لِلّٰهِ تَمَرُّوْنَ وَيُكْفَرُوْنَ بِهَا لَوْلَا اَنَّہُمْ لَآتَمُرُّوْنَ بِهَا لَعَلَّہُمْ يَرْجَعُوْنَ اِلَيْہَا اَعْبُدُوْا لِلّٰهِ تَعْبُدُوْنَ اِنَّہَا الْبُہْلُوْنَ یہاں کفار کو جاہل فرمایا ہے یہاں جہل کے معنی نادانستن نہیں ہیں اس لئے کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَحَدِّثْہَا بِہَا وَاَسْتَفِیْضْہَا اَنْفُسُہُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا اس سے معلوم ہوا کہ وہ خوب جانتے تھے پس معلوم ہوا کہ اِنَّہَا الْبُہْلُوْنَ میں جہل سے مراد نادانستن نہیں بلکہ ترک عمل بالعلم ہے اور دیکھئے معجزات کی فرمائش کے بارہ میں ارشاد ہے وَلٰکِنْ اَکْثَرُہُمْ یُجْہَلُوْنَ یہاں بھی جہل کے مشہور معنی نہیں اس لئے کہ جہل بمعنی نادانستن تو مرتفع ہو چکا تھا اس لئے کہ حضور ﷺ کو حکم تھا بِاللَّغْظِ مَا اَنْزِلَ اِلَیْکَ مَعْلُوْمٌ ہُوَا کہ یجھلون سے مراد لا یعلمون نہیں بلکہ لا یعملون ہے پس دو معنی تو علم اور جہل کے یہ تھے اب تیسرے معنی اور ہیں جس جگہ یہ دونوں معنی نہیں بن سکتے وہاں یہ تیسرے معنی مراد ہوتے ہیں اب میں کہتا ہوں کہ اس آیت

میں دونوں معنی نہیں بن سکتے اول معنی تو اس لئے نہیں ہو سکتے کہ اس سے لازم آوے گا کہ گناہ ہمیشہ نادانستگی سے ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے اس لئے کہ گناہ بسا اوقات جان کر بھی ہوتا ہے اور دوسرے معنی یعنی عدم العمل اس لئے نہیں ہو سکتے کہ بجهالة قید بعملون السوء کی ہے۔ پس اگر جہالت کے معنی علم پر عمل نہ کرنے کے ہوں گے تو مقید اور قید کا حاصل ایک ہی ہو جاوے گا اور یہ کلام قوت میں اس کے ہوگا بعملون السوء عاملین السوء اور قرآن پاک ہے اس سے کہ اس میں ایسا بے معنی کلام ہو۔ پس جب جہل کے دونوں معنی نہیں بن سکتے تو معنی ثالث متعین ہو گیا اب کوئی صاحب مہربانی فرما کر بتلائیں کہ وہ تیسرے معنی جہالت کے کیا ہیں جو اس آیت میں مراد ہیں ورنہ میں عرض کرتا ہوں کہ وہ معنی ثالث بجز غلبۃ الحال کے اور کچھ نہیں یعنی احکام شرعیہ کی محبت اور منہیات شرعیہ سے نفرت قلب میں رچ جائے اسی کا نام حال ہے اور اسی کو صوفیہ یقین بھی کہتے ہیں جس جگہ کتاب و سنت میں یقین کی تحصیل کا امر ہے اس سے یہی کیفیت مراد ہے پس جب گناہ صادر ہو گا اسی حال کے نہ ہونے سے ہوگا اور حال کے ہوتے ہوئے گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا اور یہی میرا مدعا تھا کہ ہماری ساری خرابیاں حال کے نہ ہونے سے ہیں یہ تو مجملاً اس کا اثبات آیت سے ہو باقی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مومن کے اندر دو قوتیں رکھی ہوئی ہیں ایک قورت تو اس کو خیر پر حامل ہوتی ہے اور دوسری شر سے روکتی ہے اگر یہ دونوں قوتیں مغلوب ہیں اور کالعدم ہیں تو گناہ کا ہمیشہ صدور ہوگا اور اگر کسی وقت غالب ہیں اور کسی وقت مغلوب تو مغلوبیت کے وقت اس کیفیت مانعہ کا مشاہدہ نہیں ہوتا اس لئے اس وقت بھی گناہ اس سے صادر ہوگا اور غالبیت کے وقت صادر نہ ہوگا اور اگر قریب قریب ہر وقت ان کا غلبہ ہے کسی وقت مغلوبیت نہیں ہوتی الا نا درآسی کا نام حال ہے ایسے شخص سے گناہ کا ارتکاب نہ ہوگا۔ دیکھئے ہر مسلمان جانتا ہے کہ زنا حرام ہے شراب پینا حرام ہے ترک صلوة حرام ہے۔ مگر یہ علم بہت سے مسلمانوں کو گناہ سے نہیں روکتا تو اس کی کیا وجہ ہے وجہ یہی ہے کہ حال نہیں ہے اور جو مغلوب الحال ہے وہ خدا کی نافرمانی نہ کرے گا۔

دوام ترک معاصی عاۃ حال کے پیدا کرنے پر موقوف ہے

پس معلوم ہو گیا کہ دوام ترک معاصی عاۃ حال کے پیدا کرنے پر موقوف ہے اور ترک معاصی علی الدوام واجب ہے اور مقدمۃ الواجب واجب تو حال کی تحصیل ہر مسلمان پر ضروری ہے دیکھو حدیث شریف سے اس مضمون کی صاف تائید ہوتی ہے ارشاد لایزنی الزانی حین یزنی وهو مومن ولا یسرق السارق حین یسرق وهو مومن معتزلہ کو اس مقام پر لغزش ہوئی وہ اس حدیث سے کہتے ہیں کہ زنا اور دیگر کبائر سے ایمان نہیں رہتا حالانکہ نصوص قطعہ شاہد ہیں کہ عصاة مومنین بھی مومن ہیں چنانچہ بہت سے آیتوں میں ان کو یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا سے خطاب ہے اس لئے اہل سنت کا عقیدہ ہے اور حق یہی ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا اور یہ حدیث اپنے ظاہر پر نہیں ہے اس کے معنی اور کچھ ہیں۔ محققین علمائے ظاہر نے اس معنی کو سمجھا

لیکن اس کی پوری شرح نہ کر سکے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ مومن سے مراد حدیث میں مومن کامل ہے اور اس میں نفی ایمان کامل کی ہے مطلق ایمان کی نہیں ہے۔ یہ معنی نہایت لطیف اور بالکل صحیح ہیں لیکن ان حضرات نے یہ نہ بتلایا کہ وہ شے کونسی ہے کہ جس کے نہ ہونے سے اس کا ایمان ناقص ہو اور اس کے ہونے سے کامل ہو جاتا ہے کہ جو اس کو گناہ نہ کرنے دیتی صوفیہ کرام نے اس راز سر بستہ کو کھولا اور انہوں نے فرمایا کہ ہم بتلاتے ہیں ہم سے سنو وہ شے حال ہے اس کے نہ ہونے سے ایمان میں نقصان رہتا ہے اور اسی کے نہ ہونے سے آدمی گناہ سے رکنا اور سوائے حال کے کوئی اور شے نہیں ہے جو گناہ سے روک سکے اور بدوں اس کے اعمال اور عبادات کرنا ایسا ہے جیسے بجانجن کی گاڑی ہوتی ہے کہ اس کو مزور ٹھیلے ہیں جب تک وہ ٹھیلے رہیں چلتی رہتی ہے اور جب ٹھیلنا موقوف کر دیں تو رک جاتی ہے اسی طرح ہمارے روزہ نماز کی گاڑی ہے کہ ہم اپنی طبیعت پر جبر کر کے اس کو چلاتے ہیں اور بعض مرتبہ جب عاجز ہو جاتے ہیں تو رک جاتی ہے اور اگر انجن کے اندر چنگاری ڈال کر اس کو گاڑیوں سے متصل کر دیں پھر دیکھئے وہ روکنے سے نہ دیکھیں گی وہ چنگاری کیا ہے۔ حال بس وہ چنگاری ہمارے اندر نہیں ہے اگر وہ ہوتی تو اعمال شرعیہ ہم سے بے تکلف صادر ہوتے بلکہ بغیر عبادات کے ہم کو چین نہ آتا اس لئے کہ وہ آگ ہر وقت ہم کو حرکت دیتی۔

بز میں چو سجدہ کرم ز زمین ندا برآمد کہ مرا خراب کر دی تو ز سجدہ ریائی
جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے ریا کا سجدہ کر کے مجھے خراب کیا
بطواف کعبہ رتم بحرم رہم نداوند تو بردن درجہ کردی کہ درون خانہ آئی
(جب میں خانہ کعبہ کے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا کہ تو نے حرم کے باہر کیا کیا ہے جو
خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوتا ہے۔

ایک آیت کی تفسیر بے نظیر

فرمایا إِنَّهَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّرُوءَ بِجَهَالَةٍ (۱) (توبہ کرنا جس کا قبول اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے گناہ کر بیٹھتے ہیں) میں صوفیہ کے نزدیک جہالت کی قید واقعی ہے احترازی نہیں پس وہ فرماتے ہیں کہ جہالت کے بغیر کوئی گناہ ہو ہی نہیں سکتا وہ گناہ (جو جان بوجھ کر کئے) عمدہ کو بھی جہالت ہی سے صادر ہونے والا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ علم جو مقابل ہے۔ جہل کا اس کی تعریف ان کے ہاں اعتقاد و جازم (سکون دینے والا یقین) مطابق للواقع مع غلبہ المال ہے اور گناہ کرنے کے وقت غلبہ حال مفقود ہوتا ہے اس لئے گناہ جہالت ہی سے ہوگا۔ یعنی جس وقت عقوبت گناہ کا کامل استحضار ہو اس وقت گناہ ہی نہیں سکتا الزانی و هو مومن میں ایمان کی نفی ہے پس غلبہ حال ہی سے گناہ سے رک سکتے ہیں (ملفوظات حکیم ہدایت ص ۶۳۶-۶۳۷)

وَعَاثِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا

وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝۱۹

ترجمہ: اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کیا کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شخص کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔

تفسیری نکات

مستورات کے لئے سفارش قرآن میں

یہ ہے کتاب اللہ کہ اس کی ایک اسی تعلیم کو دیکھ کر عقل سلیم والا کہہ اٹھے گا بے شک قرآن کتاب اللہ ہے فرماتے ہیں عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور اگر کسی وجہ سے وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم کو کوئی چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ اس میں بہت بھلائیاں رکھ دیں۔ ظاہر ہے کہ ناپسند ہونا کسی وجہ ہی سے ہوگا اور زیادہ تر عورتوں کے ناپسند ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے اور یہ بات مرد کے لئے باعث اذیت ہے مگر اللہ تعالیٰ کا گویا وعدہ ہے کہ عورتوں کی بد اخلاقی وغیرہ کو بھی خیر کثیر کا سبب بنا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مثلاً اس سے اولاد ہی ہو جائے گی جو قیامت میں اس شخص کی دشگیری کرے گی (کیونکہ قیامت میں ایسا بھی ہوگا کہ کسی شخص کے گناہ اس قدر ہوں گے جس کی وجہ سے اس کو دوزخ میں ڈال دینے کا حکم ہوگا مگر اس کا کوئی بچہ صغیر سن مر گیا ہوگا وہ کہے گا کہ میں اس وقت تک جنت میں نہ جاؤں گا جب تک میرا باپ نہ جائے گا چنانچہ اس کی خاطر سے باپ کو جنت مل جائے گی۔ حدیث میں اس قسم کی خبریں بکثرت آئی ہیں کاتب) نیز عورتوں کی زبان درازی کی صورت میں خیر کثیر اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ مرد اس کی ایذا رسانی پر صبر کرے اور صبر کی جزا جنت ہے ہی اور جنت کا خیر کثیر ہونا ظاہر ہے کیونکہ دنیا میں جو عورت سے تکلیف پہنچی وہ تھوڑی تھی چند روزہ تھی اور اس کے عوض جو راحت آخرت میں حاصل ہوگی وہ یقیناً زیادہ ہوگی کیونکہ وہ باقی اور دائمی ہوگی تو عورتوں کا سبب خیر کثیر ہونا صحیح ہو گیا ان صورتوں میں مرد کو چاہئے کہ حق تعالیٰ کے اس وعدہ پر نظر رکھے اور بیوی کی بد اخلاقی پر نظر نہ کرے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیوی کو روک ٹوک بھی نہ کرے اصلاح ضرور کرے مگر نرمی کے ساتھ کبھی دھمکانا بھی برا نہیں مگر ستاؤ نہیں اور زیادہ دھمکانا بھی اچھا نہیں جناب رسول ﷺ کے اخلاق بیہیوں کے ساتھ ایسے عجیب تھے کہ آج کل کے مدعیان تہذیب سنیں تو شاید حیرت کریں مگر ہمیں ان کی حیرت و استعجاب کی پرواہ نہیں ہم ان کی بیوقوفی پر

ہنسیں گے اور حضور ﷺ کے حالات واقعات کو کسی کی نکتہ چینی کے خوف سے مخفی نہ رکھیں گے ہمارا مذہب ایسا نہیں جس کی باتوں کو چھپا چھپا کر رکھا جاوے ہم علی روئے الشہادان کو پیش کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دنیا میں سب لوگ بے خوف ہی نہیں بستے بہت سے اہل عقل بھی دنیا میں موجود ہیں جو ان باتوں کی قدر کریں گے۔

شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عورت کو راحت دواس کو پریشان اور تنگ مت کرو مان نفقہ فراغت کے ساتھ اس کی دلجوئی کرو اس کی بہت سی ایذاؤں پر صبر کرو اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ پر نظر رکھو: **فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَمَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُنَّ إِنَّمَا يَجْعَلُ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا** مسلمانوں کو بیبیوں کے ساتھ حضور ﷺ کے طرز عمل و معاشرت کی موافق عمل کرنا چاہئے متانت وغیرہ کو بالائے طاق رکھنا چاہئے متانت وہی ہے جو حضور ﷺ کے اعمال و افعال میں ہے خوب سمجھ لو!

مسئلہ تساوی

بیان یہ ہو رہا تھا کہ قرآن میں عورتوں اور مردوں کے متعلق آیتیں مختلف مضامین کی آئی ہیں ایک وہ آیت ہے جس کا بیان ہو رہا ہے جس سے مردوں عورتوں کی تساوی معلوم ہوتی ہے اور بعض آیتوں سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے مثلاً **الرجال علیہم درجہ** کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے زیادہ ہے اس کے آگے ہے۔ واللہ عزیز حکیم یہ جملہ تعلیل ہے جس کا حاصل یہ ہوا اس فضیلت میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیوں کہ یہ اللہ کی دی ہوئی ہے جو غالب ہیں ان کے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں اور یہ حکم نرا حاکمانہ بھی نہیں کیونکہ وہ حکیم بھی ہیں انہوں نے جو کچھ بھی حکم دیا ہے حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا لہذا کچھ چوں و چرا کی گنجائش نہیں ایک آیت اور یاد آئی وہ یہ ہے **وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبْنَ وَسُئِلُوا اللَّهَ** جس کا شان نزول یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت ام سلمہ نے حسرت کے ساتھ تمنا کی کہ کاش ہم بھی مرد ہوتے تو مردوں کی طرح جہاد کرتے اس پر یہ آیت اتری جس میں حق تعالیٰ نے ایسی تمنا کرنے سے منع فرمایا ہے اور ممانعت کا عنوان یہ ہے کہ ہم نے جو تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اس کی تمنا ایک دوسرے کو نہ کرنی چاہئے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اسی لئے تو حضرت ام سلمہ نے مرد ہونے کی تمنا کی تھی آگے اس آیت میں ہے **لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبْنَ** یعنی مردوں کو ان کے عمل کی جزا ملے گی اور عورتوں کو ان کے عمل کی اس جملہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مدار عمل پر ہے اور جب مدار عمل پر ہے تو اگر عورت عمل زیادہ کرے تو مرد سے بھی بڑھ سکتی ہے حاصل یہ کہ یہ تین آیتیں ہیں ایک سے تساوی ثابت ہوتی ہے مرد و عورت میں اور ایک سے فضیلت مردوں کو عورتوں پر اور ایک سے یہ کہ عورت مرد سے بھی بڑھ سکتی ہے۔ ان آیتوں میں سے کسی ظاہر بین کو تعارض

کاشبہ ہو سکتا ہے مگر حقیقت میں تعارض نہیں ہے۔ اور اس کا فیصلہ خود قرآن کی آیتوں میں موجود ہے اور یہ خاص شان ہے قرآن کی کہ یفسر بعضہ بعضا یعنی قرآن اپنی شرح خود کرتا ہے اس کو دیکھ کر بے اختیار زبان پر آتا ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید ازوے رومتاب

سورج کے وجود کی دلیل یہی ہے کہ دیکھ لو سورج نکلا ہوا ہے اور دلیل کیا ہوتی ہے یہی قرآن کی شان ہے کہ جہاں کوئی اشکال پیدا ہو غور کرو وہیں اس کا حل بھی ہوگا اب آیتوں میں غور کیجئے پہلے میں ایک قاعدہ بیان کرتا ہوں اس کو سمجھ لیجئے پھر دیکھئے کہ آیتوں میں تعارض کہاں ہے.....؟

اقسام فضائل

وہ قاعدہ یہ ہے کہ فضائل دو قسم کے ہیں ایک خلقی اور ایک مکتسب خلقی کہتے ہیں پیدائشی کو اور مکتسب کہتے ہیں ان صفات کو جو اختیار اور کسب سے حاصل ہوتی ہیں تو صفات خلقیہ میں تو مرد و عورتوں سے بڑھے ہوئے ہیں جیسے کمال عقل شجاعت قوت عمل تدبیر ان ملکات میں حق تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے عورت چاہے کیسی امیر زادی ہو کتنی ہی حسین و جمیل ہو چونکہ ان صفات میں وہ مردوں سے گھٹی ہوئی ہے اس لئے فرمایا لِلرِّجَالِ عَلَيْهِمْ دَرَجَةٌ اور جو صفات مکتسب ہیں یعنی جو حاصل ہوتی ہیں اور عمل اور اختیار سے جیسے اصلاح اخلاق و اعمال وغیرہ ان میں نہ مرد کو بڑھا ہوا کہہ سکتے ہیں نہ عورت کو بلکہ جو زیادہ کام کرے اور اخلاق فاضلہ اختیار کرے گا وہی بڑھا ہوا ہوگا اگر مرد کوشش کرے گا تو مرد بڑھ جاوے گا عورت کوشش کرے گی تو عورت بڑھ جاوے گی۔ یہ حاصل ہے لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبْنَ کا ان دونوں کے علاوہ ایک قسم فضیلت کی اور ہے جس کو اصطلاح میں فضیلت اضافی کہنا چاہئے کیونکہ اس فضیلت کا منشاء خالق و عبد کا تعلق ہے یعنی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہ ہونا سو یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے اس میں مرد و عورت دونوں مساوی ہیں عمل کسی کا ضائع نہ ہوگا۔

یہ اور بات ہے کہ ہر عامل میں تفاوت ہو لیکن اس قانون میں مساوات رہے گی کہ کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ حاصل یہ کہ تین قسم کے فضائل ہوئے فضائل خلقیہ اور فضائل مکتسبہ اور فضائل اضافیہ اول میں مرد بڑھے ہوئے ہیں دوسرے میں کبھی مرد بڑھے ہوئے ہوں گے کبھی عورتیں تیسرے میں دونوں برابر ہیں اب جو فضائل خلقیہ ہیں ان کی تمنا کرنا اور نہ حاصل ہونے پر دل شکستہ ہونا فضول بات ہے جیسے عورتیں یوں کہیں کہ کاش ہم بھی مرد ہوتے اور اس حسرت میں رات دن رویا کریں تو اللہ تعالیٰ اس سے منع فرماتے ہیں وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ کیونکہ جو چیز محض وہی ہے اور ہمارے اختیار کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں نہ ہم اس کو اپنی سعی و کوشش سے حاصل کر سکتے ہیں تو اس کے لئے رونارنج کرنا بے ہودہ حرکت نہیں تو اور کیا ہے؟ سوائے تضرع وقت کے اس میں کچھ بھی نہیں پھر

اس کی دھن میں آدمی دوسرے ضروری کاموں سے بھی رہ جاتا ہے جن کا حصول اختیاری ہے تو کون غفلت اس صورت کو پسند کرے گا کہ وہی غیر اختیاری کے فکر میں رات دن مرے اور اس کے لئے رویا کریں اور تعطل سے مضرت میں پڑیں پس شریعت کی یہ تعلیم عین مطابق عقل اور بالکل صحیح تعلیم ہے کہ ایسی باتوں کی فکر میں مت پڑو جو تمہارے اختیار سے باہر ہیں مثلاً کوئی رات دن اس رنج میں رویا کرے کہ ہائے ہم نبی ہوتے یہ تو یقیناً احمق ہے کیونکہ نبوت تو ایک وہی چیز ہے کسب سے کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی رونے سے کیا فائدہ؟ اور فضائل مکتبہ میں تمنا کرنا جائز ہے مگر صرف تمنا کرنا کافی نہیں بلکہ عمل کسب اور ہمت کی ضرورت ہے اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں

لِلرَّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَا وَاللِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَا ۗ كَرِهَ اللَّهُ لِسَاءِ النَّاسِ لَمَّا سَأَلُوا أَن يُعْطُوا مِنْهُ قَلِيلًا فَنُصِيبُوا مِنْهُ قَلِيلًا ۗ وَكَرِهَ اللَّهُ لَمَّا سَأَلُوا أَن يُعْطُوا مِنْهُ كَثِيرًا فَنُصِيبُوا مِنْهُ كَثِيرًا ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۗ

کہ ان کا مدار صرف کسب پر ہے ہمت کرو زنی تمنا سے کچھ نہیں ہوتا۔

امور اختیاری و غیر اختیاری

غرض خلاصہ تعلیم کا یہ ہوا کہ امور غیر اختیاریہ کی تو تمنا بھی نہ کرو اور امور اختیاریہ میں ہمت کرو اور یہ وعدہ یاد رکھو کہ کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ یہ کیسی پاکیزہ تعلیم ہے اور یہ تعلیم سالکین کے لئے نہایت کارآمد ہے سالک کو چاہئے کہ اس کو ہر وقت پیش نظر رکھے یہ ایک بڑا بھاری دستور العمل ہے کہ جو بات اس کے اختیار میں نہ ہو اس کے درپے نہ ہو اور جو بات اختیار میں ہو اس میں ہمت کرے مثلاً ذکر و شغل ہے ذوق و وجد ہے ان میں ذکر و شغل اختیاری چیزیں ہیں اور ذوق و وجد اختیاری نہیں تو سالک کو چاہئے کہ ذکر و شغل جس قدر ہو سکے کرے یعنی جس قدر اس کا مربی تعلیم کرے اس کی پابندی رکھے اور ذوق و وجد کے پیچھے نہ پڑے بعض لوگ جب ذکر و شغل کرتے ہیں اور ذوق و وجد پیدا نہیں ہوتا دلگیر ہوتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ صاحب ہم کو ذکر و شغل کرتے ہوئے اتنے دن ہوئے اب تک کوئی بات ہی نہیں پیدا ہوئی یعنی ذوق و وجد کشف وغیرہ وغیرہ حاصل نہیں ہوا میں کہتا ہوں خدا کے بندے اگر یہ امور اختیاری ہیں (حالانکہ یہ غلط ہے) تو شکایت کیوں کرتے ہو کوشش کئے جاؤ پیدا ہو جائیں گے اور غیر اختیاری ہیں تو ان کے پیچھے کیوں پڑے اور کیوں رنج کیا۔ غرض رنج کرنا اور شکایت کرنا تو ہر حال میں بے سود ہے کام کرنا چاہئے جس کسی کو یہ امور حاصل ہوتے ہیں ان کے اختیار اور کسب کو اس میں دخل نہیں ہوتا ایسے ہی امور کے بارے میں ارشاد ہے وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ ۚ كَذَلِكَ يَفْضِلُ اللَّهُ سُبُلَ الْبَرِّ ۚ

کہ ان باتوں کی تمنا مت کرو اپنا کام کئے جاؤ غیر اختیاری امور تمنا سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ ان کے درپے ہونے سے بے حد پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔ کبھی اس پریشانی میں قبض ہو جاتا ہے پھر آدمی ذکر و شغل سب کچھ کرتا ہے مگر دل نہیں کھلتا کیونکہ یکسوئی نہیں ہوتی ہر وقت دل میں ایک بند لگا ہوا معلوم ہوتا ہے کبھی آدمی ان پریشانیوں سے گھبرا کر کام ہی کو چھوڑ بیٹھتا ہے حتیٰ کہ ضروری اعمال سے بھی محروم ہو جاتا ہے حاصل یہ کہ آیت وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ

میں یہ تعلیم ہے کہ امور غیر اختیار یہ کے پیچھے نہ پڑنا چاہئے یہ بات سالکین کے لئے بڑے ہی کام کی ہے اس کی قدر کرنی چاہئے۔ یہ بات درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر آگئی۔

تمنا کی حقیقت

اصل بیان عورتوں کے متعلق ہو رہا تھا کیونکہ آیت لَا تَتَمَنَّوْا کی اصل مخاطب عورتیں ہی ہیں جیسا کہ شان نزول سے معلوم حضرت ام سلمہؓ نے تمنا کی تھی کہ ہم مرد ہوتے تو اچھا تھا اس پر یہ آیت اتری جس میں بتا دیا گیا کہ ایسی تمنا فضول ہے یہ تو قانونی جواب ہے کہ منع کر دیا گیا کہ ایسی تمنا فضول ہے۔ اور اس میں ایک راز بھی ہے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے جس کو مرد بنایا اس کے لئے یہی مناسب تھا اور جس کو عورت بنایا اس کے لئے بھی یہی مناسب تھا ہر شخص کو خدا تعالیٰ نے وہی دیا جو اس کے لئے مناسب تھا اس کی تفصیل کہاں تک کی جاوے اہل بصیرت خود سمجھ سکتے ہیں اور ذرا سے غور سے ہر موقع پر سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جس کو جیسا حق تعالیٰ نے بنا دیا ہے اس کے لئے وہی مناسب تھا۔ گو ہر شخص دوسرے کو دیکھ کر یہ تمنا کرتا ہے کہ میں ایسا ہوتا اور اپنی حالت پر قناعت نہیں ہوتی لیکن غور کر کے دیکھئے اور سوچئے تو اس کو معلوم ہوا گا کہ میرے مناسب وہی حالت ہے جس میں خدا نے مجھ کو رکھا ہے آج کل بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ دوسروں کی حالتوں کو سن کر تمنا کرتے ہیں کہ ہم فلاں ہوتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرْتَابُوا النِّسَاءَ كَمَا كُذِّبَتْ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ لِيَتَذَكَّرَ أَلْفٌ مِّنْكُمْ وَمَا تَعْلَمُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ وَعَالِمُ الْغُيُوبِ فَإِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَعَسَىٰ أَنْ تَكُونُوا لِلنِّسَاءِ وَالنِّسَاءِ لَكُمْ فِيهِ خَيْرٌ كَثِيرٌ (النساء آیت ۱۹)

ترجمہ: اے ایمان والوں تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورت کو جبراً مالک ہو جاؤ اور ان کو اس غرض سے مقید مت کرو جو کچھ تم لوگوں نے ان کو دیا ہے اس میں کا کوئی حصہ وصول کر لو مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور ان کے ساتھ خوبی گزران کرو اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس میں بڑی منفعت رکھ دے۔

حرۃ کی مملو کیت جائز نہیں

یہ ہے اس کا ترجمہ اب دیکھئے کہ قرآن میں اس رسم کو مٹایا گیا ہے یا نہیں اور کس رہا کی قید و آفتی ہے۔ احترازی نہیں کیوں کہ عورتیں اس وراثت سے راضی بھی نہیں ہوتی تھیں اور اگر وہ راضی بھی ہوں تب بھی حرۃ کی مملو کیت جائز نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد بہو کا حصہ دے کر اس کے ماں باپ کے سپرد کر دو مگر خبردار اس کا حق مت دبانا آگے بھی سن لو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلَا تَعْضَلُوهُنَّ أَنْ يَنْصُرْنَ لَكُمْ مِنْ مَّا كُنْتُمْ تُبْغُونَ (النساء آیت ۲۰)

مال چھوڑ کر مر جاتا تو اس کی بیوی کو نکاح نہ کرنے دیتے تاکہ اس کا مال اسی کے پاس رہے اور یہ رسم ہندوستان میں بھی ہے کہ بیوہ کا نکاح نہیں کرنے دیتے تو اکثر اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کی جائیداد علیحدہ کرنی پڑے گی۔ لوگ یوں کہتے ہیں کہ جائیداد اچھی چیز ہے مگر صاحبو! عورت کے لئے تو حقیقت میں سخت مصیبت ہے کیونکہ ان کی جائیداد کی وجہ سے ہر شخص ان پر جال ڈالتا ہے۔ اور میں نے تو زمین کی وجہ سے عورتوں کو ہمیشہ مصیبت ہی میں دیکھا کہ ہر شخص ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو صاحبو ان کو حصہ دے کر ماں باپ کے سپرد کر دو اپنے گھر میں نہ رکھو کیونکہ جب تک اپنے گھر میں رکھو گے یہ خیال دل سے نہ نکلے گا تو واجب ہے کہ حصہ دے کر ماں باپ کے سپرد کر دو خواہ وہ اس کو بٹھلا دیں یا کہیں نکاح کر دیں اگر کوئی کہے کہ جہاں شوہر کچھ چھوڑ کر مرے یہ حکم اس کے لئے ہے اور جہاں کچھ چھوڑ کر ہی نہ مرے اس صورت میں اگر عورت کو روکا جائے تو قرآن سے ممانعت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ آیت میں نہیں مقید ہے۔ وَلَا تَعْضَلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَّا آتَيْنَهُنَّ مِمَّا تَرْتَدُّوا بِهِ لَوْلَا إِذْ تَرْتَدُّوا بِهِ لَمَسَّ لَكُم مِّنْهُنَّ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔

روکنا جائز نہیں تو بغیر مال کے روکنا بدرجہ اولیٰ جائز نہ ہوگا کیونکہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو کسی باعث سے ایک بغیر کسی باعث کے پہلا کسی درجہ میں ہلکا ہے عقلاً بھی شرعاً بھی اور دوسرا گناہ بڑا گناہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ تین شخصوں کو خدا بہت ہی مبغوض رکھتا ہے ملک کذاب شیخ زانی عاقل متکبر یعنی جھوٹا بادشاہ زنا کار بڈھا اور متکبر فقیر اس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں ان معاصی کا کوئی داعی نہیں ہے اور پھر یہ لوگ گناہ کرتے ہیں بادشاہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے جھوٹ اسی واسطے لوگ بولا کرتے ہیں کہ اس سے کارروائی کریں۔ بادشاہ کی قدرت کارروائی کے لئے کافی ہے۔ اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے اسی طرح زنا بوجہ شدت باہ کے ہوتا ہے بڑھے کو کیا مستی سوار ہوئی اگر وہ ضبط کرنا چاہے تو کچھ بھی دشوار نہیں۔ اسی طرح غریب آدمی تکبر کرے تو اس کی حماقت ہے اس کے پاس بڑائی کا کونسا سامان ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو گناہ بغیر داعی کے ہو وہ زیادہ گناہ ہے تو یہ تقید شبہ کرنے والے کو مفید نہیں بلکہ مضرت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت کے پاس کچھ مال ہو تو اس وقت حرص کی وجہ سے یہ تقاضا ہو سکتا ہے کہ اس کو بھی حق تعالیٰ نے منع فرمادیا تو جس کے پاس مال بھی نہ ہو وہاں روکنا تو محض پابندی رسم ہے اس میں روکنے کا کوئی داعی بھی موجود نہیں تو بہت ہی بڑا گناہ ہے۔

وَنُدْخِلْكُمْ مَدْخَلًا كَرِيمًا

ترجمہ: ہم تمہیں بہترین جگہ داخل کریں گے۔

تفسیری نکات بے برکت نیکی

اب ضرورت ہے اس حدیث اور آیت کے معنی سمجھنے کی تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفار ات لعا بینہن ما اجتنب الکبائر اور ما عام ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ سارے گناہوں کا کفارہ تو جب ہی ہے کہ کبائر سے بچے ورنہ سب کا نہیں بلکہ صرف صغائر کا ہوگا یہ لازم نہیں آتا کہ صغیرہ بھی معاف نہ ہو اور آیت کے معنی اس سے بھی زیادہ صاف ہیں یعنی ان لجتبوا میں ایک شرط کی دو جزائیں ہیں نکفر اور ندخلکم مدخلا کریمًا (ہم تمہیں بہترین جگہ داخل کریں گے) پس اس مجموعہ کے لئے جزا میں بیشک یہی شرط ہے کہ کبائر سے بچے اور اگر کبائر صادر ہوئے تو مجموعہ مرتب نہ ہوگا۔ یعنی مدخلا کریمًا بمعنی دخول جنت بلا عقاب و عتاب توبہ یا فضل پر موقوف ہوگا۔ پس اب وہ شبہ نہ رہا اور یہ ثابت رہا کہ گناہ معاف ہوتے ہیں حسنات سے تو اگر نیکیاں قبول نہ ہوتیں اور اس میں یہ اثر کہاں سے ہوا پس معلوم ہوا کہ قبول تو ہوئیں لیکن ان میں برکت نہیں ہوئی اور یہ برکت نہ ہونا اس حدیث سے ثابت ہے جس کو میں نے روزے کے باب میں پڑھا ہے چنانچہ اب میں اس حدیث سے اس کو ثابت کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اگر گناہوں سے نہ بچے تو کھانا پینا چھوڑنے سے کیا فائدہ حضور ﷺ فائدہ کی نفی فرما رہے ہیں اور یہ میں پہلے بدلیل کہہ چکا ہوں کہ روزہ ہو جاتا ہے باوجود گناہوں کے بھی تو جو فائدہ منفی رہا وہ روزے کی برکت ہے اور اس سے وہ مقصود بھی ثابت ہوا جس کے لئے مقصود اس حدیث کو پڑھا ہے یعنی گناہ کے ترک کا اہتمام بالخصوص روزے میں ضروری ہے۔ (مضار المصیبت لمحقہ مواظبہ مفاسد گناہ ص ۱۹۰)

پھوہڑ عورتوں میں ایک کمال

فرمایا عادتاً عورتیں پھوہڑ ہو جاتی ہیں وہ اکثر عقیف ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ ایسے ہی امور کے متعلق فرماتے

ہیں وَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُنَّ أَكْثَرَ تِلْكَ أَلَّا تَكْرَهُنَّ اللَّهُ فِيهِ خَيْرٌ كَثِيرٌ (ملفوظات حکیم الامت ص ۱۱۰ ج)

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ

نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبُوا وَاللِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَ

وَسَأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝

ترجمہ: اور تم ایسے کسی امر کی تمننا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعض پر فوقیت دی ہے مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

مطلوب کی دو قسمیں

میرا ذوق یہ ہے کہ اس آیت میں مطلوب کی دو قسمیں کی گئی ہیں ایک موہوب جس کو مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ اور وَسَأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ میں فضل سے تعبیر کیا گیا ہے دوسرے مکسوب جس کو لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبُوا وَاللِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَ میں اکتساب کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے اب حاصل یہ ہوا کہ موہوب کی تمننا کرنا چاہئے بلکہ مکسوب کا اہتمام و فکر کرنا چاہئے۔ مدارج نجات اعمال مکسوبہ ہیں۔

اب رہا تمنائے موہوب سے جو ممانعت ہے اس میں نبی تحریم کے لئے ہے یا کراہت تحریم یا کراہت تنزیہ کے لئے اس سے مجھے بحث نہیں عشاق سے پوچھو کہ جب محبوب کسی کام سے منع کر دے تو کیا عاشق محبوب سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ حضور یہ بات آپ کو کس درجہ میں ناپسند ہے کس قدر ناگوار ہے اگر کوئی ایسا سوال کرے گا تو محبوب اس کو نکال باہر کرے گا کہ تو عاشق نہیں۔

اس کے بعد حق تعالیٰ ہمارے جذبات کی رعایت فرماتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ موہوب کے لئے ان کا دل لپچائے گا ضرور اس لئے دعا کی اجازت دیتے ہیں وَسَأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ کہ دعا کر سکتے ہو آگے بعض اوقات عدم قبول دعا سے پریشان نہ ہونے کی تعلیم ہے إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا کہ اگر دعا قبول ہونے میں دیر ہو اور قبول کے آثار معلوم نہ ہوں تو گھبراؤ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو اچھی طرح جانتے ہیں یعنی وہ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں پس اس بات کو بھی وہی خوب جانتے ہیں کہ یہ نعمت موہوبہ تمہارے لئے مناسب ہے یا نہیں اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے (اتباع العلماء دعوت و تبلیغ)

عنایتِ رحمتِ خداوندی

حق تعالیٰ نے ہر چیز کے اندر حکمت اور مصلحت رکھ دی ہے خواہ عطاء ہو یا منع ہو اسی لئے فرماتے ہیں
 وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۗ يَهْدِي سُبُلَ الْبَرِّ ۗ (وہی طور پر) فوقیت بخشی ہے آگے فرماتے ہیں
 لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَا وَاللِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا كَتَبْنَا ۗ لِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ
 ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ثابت ہے پس جب سوہوب میں دخل نہیں تو کیوں پیچھے پڑے اور
 فرماتے ہیں وَسْئَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ ۗ عَنِ اللَّهِ تَعَالَىٰ سِ اس کے فضل کی درخواست کیا کرو یہ فرما کر تعجب سے بچایا
 ہے کہ اگر ایسی چیز کو جی چاہے تو مانگ لو تحصیل کے درپے مت ہو إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۗ یعنی بلاشبہ اللہ
 تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں دیکھئے جذبات کو روکا نہیں یہ بھی گوارا نہ فرمایا کہ جذبات کو روکا جائے کیا ٹھکانا ہے حق
 تعالیٰ کی اس رحمت کا یعنی اگر جی چاہے مانگ لو اگر مناسب ہو گا دے دیں گے ورنہ خیر تو دیکھئے تعجب کیسا بچایا
 نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ
 أَمْوَالِهِمْ ۗ فَالضَّلِيلَةُ قِنْتُ حَفِظْتُ لِلْفَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللهُ

ترجمہ: مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر (قدرتی)
 فضیلت دی ہے اور سب سے کہ مردوں نے اپنے مال (عورتوں) پر خرچ کئے ہیں (اس میں بتلا دیا گیا کہ عورتیں
 تمہارے قبضہ میں ہیں ان کی اصلاح کچھ مشکل نہیں طلاق کی کیا ضرورت ہے اول تو خدا نے تم کو قدرتی طور پر
 عورتوں کا حاکم بنایا ہے دوسرے تم ان پر مالی احسانات کرتے ہو) تو جو عورتیں نیک اور لائق ہیں مرد کی عدم
 موجودگی میں بھی بحفاظت و توفیق الہی (اس کی آبرو اور مال کی) نگہداشت کرتی ہیں۔

عورتوں سے مساویانہ سلوک نہ کرنے کا حکم

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم دو باتوں کی رعایت کرو تو شائستہ اور نیک عورتیں تو فوراً تمہارے تابع دار ہو جائیں گی
 ایک یہ کہ تم حاکم بن کر رہو برابر اور غلامی کے ساتھ نہ رہو کیونکہ جو شخص ابتداء میں عورتوں کے ساتھ برابری کا
 برتاؤ کرتا یا ان کی غلامی اختیار کرتا ہے تو پھر وہ ساری عمر اسی برتاؤ کی منتظر رہتی ہیں لہذا تم کو اول ہی سے ایسا برتاؤ
 کرنا چاہئے جیسا کہ حاکم محکوم سے کرتا ہے۔

دوسرے تم ان کے ساتھ مالی احسانات کرو مثلاً مہر کی ادائیگی میں جلدی کرو نفقہ اور کپڑے میں تنگی نہ کرو
 ان کی دلداری اور دل جوئی کا خیال رکھو اس برتاؤ کی خاصیت ہے کہ شریفوں کے دل کو مسخر کر لیتا ہے ہاں اگر کوئی

بہت بد طینت عورت ہو وہ ممکن ہے کہ اس برتاؤ سے سخر نہ ہو اس کے لئے آگے دوسری تدبیر بتلاتے ہیں کہ اگر کوئی عورت بد دماغ ہے تو اس کو بھی طلاق دینے کی ضرورت نہیں بلکہ حکمت اور تدبیر سے کام لو۔

بد طینت عورت کا طریق تنبیہ

وَالَّذِي يَتَخَفُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاصْبِرْنَ فِيهِنَّ فِي الْمَضَاهِعِ وَاصْبِرْنَ فِيهِنَّ وَأَصْبِرْنَ فِيهِنَّ (قرآن سے) ان کی بد دماغی کا احتمال (قوی) ہو (محض گمان اور خیال ہی نہ ہو) تو ان کو (اول) زبانی نصیحت کرو اور (اگر اس سے نہ مانیں تو) ان کو خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو اس کا بھی عورت پر بہت اثر ہوتا ہے) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو) ان کو (اعتدال سے مارو) حدیث میں اس کی تفسیر آئی ہے ضرباً غیر مبرج کہ ایسا مارو جس سے ہڈی پر صدمہ نہ پہنچے خون نہ نکلے سبحان اللہ کسی حدود ہیں) **وَإِنْ أَطَعْتَكُمْ فَمَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلاً** پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقع) مت ڈھونڈو ان اللہ کان علیا کبیراً کیونکہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی رفعت و عظمت والے ہیں۔

یہ عجیب مراقبہ بتلایا گیا یعنی اگر تم عورتوں پر زیادتی کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈو گے تو یہ سمجھ لو کہ تمہارے اوپر بھی ایک حاکم ہے وہ کون خدا تعالیٰ ان کے حقوق اور علم و قدرت سب سے زیادہ ہیں۔ اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنے لگیں اور تم کو مجرم بنانے کے لئے تو بہانے ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں واقعی جرائم بے انتہا ہیں تو تمہارا کہاں پتہ رہے پس تم کو اپنے مخلکوں کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہئے جو حق تعالیٰ تمہارے ساتھ کرتے ہیں کہ باوجود تمہاری نافرمانی کے توبہ و استغفار کے بعد سب معاف کر دیتے ہیں اور پچھلے گناہوں کا کچھ اثر نہیں رکھتے نیز چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو ویسے ہی معاف کرتے رہتے ہیں چنانچہ وضو اور نماز اور جماعت وغیرہ سے گناہ صغیرہ معاف ہوتے رہتے ہیں۔

طلاق سے قبل ضرورت پہنچ

اگر اس سے بھی کسی عورت کو تنبیہ نہ ہو تو اس کے لئے کیا عجیب بات بیان فرماتے ہیں **وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَاذِكُمْ مِنْ أَهْلِهَا وَحَكْمًا مِنْ أَهْلِهَا** اس میں خطاب زوجین کو نہیں ہے بلکہ اوپر والے آدمیوں کو خطاب ہے۔ کہ اگر قرآن سے تم کو ان دونوں میں میاں بیوی کی (ایسی) کشاکش کا اندیشہ ہو (جس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں) تو تم لوگ ایک ایسا آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی ایسا ہی عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس بھیجو) کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں اور جو بے راہی پر ہو اس کو سمجھا دیں) دیکھئے یہ کیسی اچھی ترکیب ہے کہ جب تک زوجین اپنے معاملہ کو خود سلجھا سکیں اس وقت

تک خود سلجھانے کی کوشش کریں اور جب ان سے سلجھ نہ سکے تو کسی کو حکم مقرر کریں کیونکہ اپنا معاملہ فریقین سے طے نہیں ہو سکتا اس لئے بیچ کی ضرورت ہوئی۔

آگے حق تعالیٰ ان بچوں کی بابت ارشاد فرماتے ہیں **لَنْ يُرِيدَ اِلْحَاكِمًا لِّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا** اگر ان دونوں بچوں میں اصلاح معاہدہ منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان دونوں زن و شوہر کو اصلاح کی توفیق دے دیں گے اس میں اپنی اعانت کا وعدہ ہے کہ اس صورت میں ہم بھی معاملہ سلجھنے میں امداد کریں گے مگر اس کے لئے ایک شرط ہے وہ یہ کہ اگر ان دونوں بچوں کے درمیان خوشی سے صلح اور اصلاح معاملہ منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق پیدا کریں گے (بشرطیکہ وہ ان دونوں کی رائے پر بھی عمل کریں **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا** بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں۔ یعنی جس طریق سے زوجین میں باہم مصالحت ہو سکتی ہے اس کو وہ خوب جانتے ہیں پس جب حکمین کی نیت ٹھیک دیکھیں گے وہ طریق ان کے قلب میں القا فرمادیں گے دیکھئے حق تعالیٰ نے طلاق سے بچنے کی کتنی عمدہ ترکیبیں بتلائی ہیں اگر لوگ ان طریقوں سے کام لیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی طلاق کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اور اگر بدوں طلاق کے چارہ ہی نہ رہے تو اس کے لئے یہ تعلیم ہے کہ اول ایک طلاق دو اس سے عورت کا ناز ٹوٹ جائے گا اور اگر اس میں کچھ بھی صلاحیت ہوگی تو وہ سنور جائے گی شریعت نے نہ تو طلاق سے ممانعت کی کہ چاہے باہم کیسا ہی اختلاف ہو طلاق دے ہی نہ سکے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو شوہر ہمیشہ اندر ہی اندر گھٹا کرتا اپنے غصہ کا بھڑاس نہ نکال سکتا اس لئے غصہ نکالنے کی اجازت دی کہ ضرورت کے وقت دے سکتے ہو مگر حدود کے ساتھ شریعت میں جذبات کی بہت رعایت کی گئی ہے۔

احکام شرعیہ میں رعایت جذبات

چنانچہ ایک حدیث میں **لا بحل لا حد ان یہجر اخاه فوق ثلاثة ايام** کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال وغیرہ موقوف رکھے دیکھئے یہ حکم نہیں دیا گیا کہ چاہے آپس میں کیسا ہی رنج و تکرار ہو بولنا مت چھوڑو حالانکہ شریعت کو یہ بھی اختیار تھا کہ ایسا حکم دے دیتی چنانچہ بعض مشائخ نے طالبین کی اصلاح کے لئے کبھی ایسا حکم دیا پھر اس میں سوال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ضعیف کیوں پیدا فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں تمدن کی حفاظت ہے تاوقتیکہ ایک کو دوسرے کا تابع اور محتاج نہ بنایا جائے تمدن محفوظ نہیں رہ سکتا اور طبعیت مساوی میں ہوتی نہیں اسی واسطے فرماتے ہیں **اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ** یعنی مرد عورتوں پر سردار ہیں اور وہ اس کے آگے ارشاد فرمائی ہے **فَقَضَلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ**۔

یعنی بسبب اس بات کے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور جن لوگوں نے برعکس اس حکم کے عورتوں کو متبوع بنا لیا وہاں کی خرابیاں پوشیدہ نہیں ہیں آج کل **اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ** کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ

مرد عورتوں کے مزدور ہیں۔ سبحان اللہ! کیا تفسیر دانی ہے ان مفسر صاحب سے کوئی پوچھے کہ فضل اللہ بعضهم (اللہ تعالیٰ نے بعض کو فضیلت دی کے کیا معنی ہیں؟ اگر جرات کر کے یہ کہیں کہ اس میں بھی بعضهم سے مراد عورتیں ہی ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے مسلم لیکن آگے جو فرماتے ہیں وَبِمَا أَنْفَعُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ اور اس سبب سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں) اس میں تو ضمیر یقیناً رجال ہی کی طرف ہے کیونکہ منفق وہی ہیں تو کیا پھر فضل اللہ کی وہ تفسیر سراسر مہمل اور تحریف قرآن نہ ہوگی اگر یہ معنی ہوتے تو للنساء فرماتے ہیں علی جو کہ تسلط کے لئے ہے نہ فرماتے

خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر خلقہ بھی فضیلت ہے چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے
 أَوْ مَنْ يُنْكَأ فِي الْوَالِيَةِ وَهُوَ فِي النِّصَامِ عِنْدَ مُبِينٍ مُشْرِكِينَ جوملائکہ کو بنات اللہ کہتے تھے ان کا رد اس طرح فرماتے ہیں کیا تم ایسی مخلوق کی حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہو جو کہ پست خیال ہے اور ہمیشہ بناؤ سنگار اور زیور میں نشوونما پاتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان میں مقابلہ کے وقت قوت بیانہ نہیں ہے واقعی یہ دو صفتیں جو عورتوں کی ارشاد فرمائی ہیں کھلم کھلا نظر آتی ہیں۔ زیور اور آرائش اور بناؤ سنگار میں شب و روز رہتی ہیں۔ اس سے آگے ان کا خیال ترقی ہی نہیں کرتا غایہ مقصود اپنا اسی کو سمجھتی ہیں۔ اور مقابلہ اور مناظرہ کے وقت ان کے دلائل میں قوت بالکل نہیں ہوتی ادھر ادھر کی باتیں بہت کریں گی لیکن کسی امر پر دلیل صحیح ہرگز نہ بیان کر سکیں گی۔

کوئی عورت یہ نہ کہے کہ یہ زیور تو ہم کو ماں باپ نے پہنا دیا اس سے عادت ہو گئی اس سے میلان کہاں ثابت ہوا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر ماں باپ بھی نہ پہنا دیں تب بھی ان کا طبعی میلان نمائش و آرائش کی طرف ہے چنانچہ بہت سے واقعات اس کے مشاہد ہیں اور اسی طرح اگر کوئی صاحب دوسری جزو میں یعنی قوت بیانہ میں کمی کے بارے میں فرمادیں کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ ہماری عورتوں کی تعلیم نہیں ہوتی اگر تعلیم و تربیت کامل ہو تو یہ نقصان ہرگز نہ رہے یہ بھی غلط ہے اس لئے کہ جو عورتیں تعلیم یافتہ کہلاتی ہیں وہ بھی معلوم ہوا کہ لیکچروں میں ناقص تقریر کرتی ہیں ان کے شوہر اس لیکچر کی تکمیل کرتے ہیں یہ حکمت تبرعاً بیان کر دی گئی ورنہ یہ کہنا کافی ہے کہ خدا تعالیٰ کی کوئی حکمت ہوگی ہمارا کوئی فائدہ اس کی تعین پر موقوف نہیں اسی واسطے جو چیزیں فضول ہیں ان کی تحقیق و تفتیش سے منع کر دیا گیا ہے۔ ہم کو اس تحقیق سے کیا فائدہ ہے کہ فلاں ناقص کیوں ہے فلاں کامل کیوں ہم کو تو اس کے نتائج و احکام پر عمل کرنا چاہئے بہر حال تقریر سے معلوم ہو گیا کہ نقصان عقل اضطراری اور خلقتی ہے اور دوسرا نقصان یعنی نقصان صلوة جس کو نقصان دین فرمایا ہے جس کا سبب حیض کا آنا فرمایا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے کہ خلقتی ہے اور تین امر اخرا ان کی طرف منسوب فرمائے کہ ان کا ازالہ ان کے اختیار میں ہے۔ وہ کفران عشیر و اذہاب لب رجل حازم و اکثار لعن چونکہ یہ اختیاری ہیں اس لئے ان کو نقص نہ کہنا

دیکھنا چاہئے آیا محض وسیلہ سمجھ کر سوال کرتے ہیں یا کوئی امر اس سے زائد ہے۔ سو مشرکین عرب بھی بتوں کی عبادت وسیلہ قرب الہی سمجھ کر کرتے ہیں چنانچہ مذکور ہے مَا تَعْبُدُونَ إِلَّا لِيُقَرِّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ نہ خدا سمجھ کر مگر پھر بھی وہ مشرک قرار دیئے گئے سو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وسیلے میں بھی دو صورتیں ہیں مثال سے فرق معلوم ہوگا مثلاً ایک کلکٹر ہے اس کے پاس ایک منشی نہایت زیرک عاقل ہے کلکٹر نے اپنا سارا کاروبار حساب و کتاب اس منشی کے سپرد کر دیا ہے اور اس کے ذمہ چھوڑ دیا ہے اور ایک دوسرا کلکٹر ہے اس کے پاس بھی منشی ہے مگر کلکٹر زبردست عادل ہے اپنا کاروبار خود دیکھتا رہتا ہے منشی کے ذمہ نہیں چھوڑا اب اگر کوئی شخص اس منشی زیرک کے پاس سے جو پہلے کلکٹر کے پاس ہے جس کے سپرد سب کام ہے کوئی درخواست پیش کرے تو کیا سمجھ کر پیش کریگا یہ ظاہر ہے کہ منشی کو کاروبار میں دخل سمجھ کر پیش کرے گا۔ اور اسی واسطے اس کو خوشامد کرے گا کہ یہ خود سب کام کر دیں گے کیونکہ ان کے کل کام سپرد ہیں۔ کلکٹر تو فارغ بیٹھا ہے گو ضابطہ کے دستخط وہی کرے گا مگر اس منشی کے خلاف کبھی دستخط نہ کرے گا اور اگر دوسرے کلکٹر کے منشی کے یہاں عرضی دی جائے گی تو محض اس خیال سے کہ کلکٹر زبردست ہے۔ رعب والا ہے اس کے سامنے کون جاسکتا ہے اس منشی کے ذریعہ سے درخواست کرنی چاہئے کیونکہ اس منشی کو تقرب حاصل ہے یہ وہاں پر پیش کر دے گا کیونکہ کل کام خود کلکٹر دیکھتا ہے اب دیکھئے ان دونوں صورتوں میں کس قدر فرق ہے عوام اہل مزار سے اکثر پہلی صورت کا سا برتاؤ کرتے ہیں ان کے افعال اعمال سے ظاہر ہے پھر مشرک نہیں تو اور کیا ہے برخلاف محض وسیلہ سمجھنے کے پس شرع شریف میں عبادت غیر اللہ جہاں صادق آئے گا گو بہ نیت تو سل ہی سہی وہ مشرک ہوگا غرض تو سل جائز مگر تعبد التوسل مشرک۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ۗ بَاقِي جَن آيَاتِ مِثْلِ اَفْعَالِ كَبِيْرَهٗ كَا عِقَابٍ مَّذْكُوْرَهٗ وَهٰٓ اِسْتِقَاقٍ مَّرَادٍ لِّرُومٍ وَّقُوْعٍ مَّرَادٍ نِّهَيْسٍ كِبَارٍ سَهٗ وَهٗ شَخْصٍ عَذَابٍ كَا مَسْتَحَقٍّ هُوَ جَا تَا هٗ۔ وَّقُوْعٍ عِقَابٍ لَّا زَمٍ نِّهَيْسٍ مُمْكِنٍ هٗ حَقِّ تَعَالٰى وِيَسٖ هٗى بَخْشِ دِيں بَاقِي وَّقُوْعٍ كَهٗ مَتَعَلِّقٍ آيَاتِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ اِلْحٖ سَهٗ صَافٍ مَّعْلُوْمٍ هُوَ كِيَا كَهٗ سَبِّ گِنَا هُوں پَر عَذَابٍ لَّا زَمٍ نِّهَيْسٍ بَجَرِّ شَرِكٍ وَكُفْرٍ كَهٗ كَهٗ اِن پَر عَذَابٍ لَّا زَمٍ هٗ (يعنى شرعاً) غرض گِنَا كَبِيْرَهٗ تَوَبْدُوْنِ عِقَابِ كَهٗ مَعَاْفٍ هُوَ سَكْتَا هٗ مَكْرُ كُفْرٍ وَشَرِكٍ كَا اِرْتِكَابِ بَدُوْنِ عَذَابِ كَهٗ نِّهَيْسٍ رَهٗ سَكْتَا اِسٖ پَر عَذَابٍ لَّا زَمٍ هٗ اَوْرُوْهٗ بَهِى اَبْدَالَا آبَادِ كَهٗ لَهٗ جَسٖ كَا اِنْقِطَاعِ كَبْهٖى نَهٗ هُوَ كَا يَهٗ جَرْمٍ كَسِي طَرَحٍ مَعَاْفٍ نَهٗ هُوَ كَا نَهٗ عَذَابِ سَهٗ نَهٗ بَغْيِرِ عَذَابِ كَهٗ۔

مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ۗ خدا تعالیٰ مشرک کو معاف نہیں فرمائیں گے اس کے سوا دوسرے گناہ جس کے لئے چاہیں معاف فرمائیں گے۔

اس آیت میں بھی حق تعالیٰ نے مغفرت و اجر عظیم کا قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ کن کن شرطوں کے بعد یہ دونوں حاصل ہو سکتے ہیں سب سے پہلے ایمان و اسلام کو بیان فرمایا ہے یہ اصل شرط ہے اس کا چھوڑنا اصولی جرم ہے یہ ہرگز معاف نہ ہوگا اور اس کے تارک کو کبھی نجات حاصل نہ ہوگی اس کے بعد دیگر فروعی شرائط مذکور ہیں جن کے پورا نہ کرنے سے انسان عذاب کا تو مستحق ہوتا ہے مگر بعد چندے نجات پا جائے گا پس جو لوگ مغفرت و اجر عظیم کے طالب ہیں وہ اس آیت کے مضمون کو بغور سن لیں کہ مغفرت کن اعمال سے حاصل ہوگی ہم لوگ صرف اسی پر اکتفا کئے بیٹھے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہم یقیناً مستحق مغفرت و اجر عظیم ہو گئے یہ بڑا دھوکہ ہے کہ جس نے ہم کو اصلی کام سے روک رکھا ہے جو کہ شرائط کو بجالانا اور پورا کرنا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ

مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا

ترجمہ: اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول ﷺ کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اولی الامر ہیں ان کا بھی پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ و رسول ﷺ کے حوالہ کر دیا کرو اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو یہ امور سب سے بہتر ہیں اور ان کا انجام خوش تر ہے۔

تفسیری نکات

اپنی رائے کی اتباع کی مذمت

غرض ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ بجائے خدا و رسول ﷺ کے صوی کا اتباع کر رہے ہیں اور دنیا کو ترجیح دے رہے ہیں اور ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے اور بڑا سخت مرض یہ ہے کہ دنیا کے امور میں تو اپنی رائے لگاتے ہیں دین کے اندر بھی کہتے ہیں کہ ہماری رائے یہ ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے اور ریاست شعاعا مطاعا و ہوی متبعا و اعجابات کل ذی رای ہر ایہ فعلیک بنخاصة نفسک یعنی خواہش نفسانی کا اتباع لیا جاتا ہے اور ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے تو ایسے وقت اپنے نفس کی فکر کرو اور عوام کے حال سے تعرض چھوڑو (اطلعة الاحکام)

حدیث شریف حجت مستقلہ ہے

اب اس آیت کے اسلوب سے ایک اور امر ضروری مستنبط ہوتا ہے اس کو بھی اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں تین ذاتوں کی اطاعت کا حکم فرمایا ہے اپنی ذات پاک کا اور جناب رسول ﷺ کا اور اُولی الامر منکم (جو لوگ تم میں سے جو اولی الامر ہیں) کی اطاعت کا رسول ﷺ کے لئے تو کمر اطیعوا لائے اور اولی الامر کے لئے کمر اطیعوا نہیں کیا سو اس کی وجہ یہ تو ہے نہیں کہ حق تعالیٰ کی اطاعت علیحدہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت جدا بلکہ اس اسلوب میں ایک فائدہ کی طرف اشارہ لطیف یہ ہے کہ ہر چند کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے لیکن بعض خصوصیات کے اعتبار سے من وجہ استقلال ظاہری کا حکم رکھتی ہے پس اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جیسے قرآن مجید حجت مستقلہ ہے اسی طرح حدیث شریف بھی حجت مستقلہ ہے اور میں قرآن مجید کے ساتھ حدیث شریف کی برابری کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں۔ لیکن اس اعتبار سے دونوں برابر ہیں کہ جیسے قرآن مجید کے احکام کو ماننا ضروری ہے اسی طرح احادیث سے جو احکام ثابت ہیں ان پر بھی ایمان و ایقان واجب ہے کسی کو کہنا جائز نہیں کہ جو مسئلہ قرآن شریف میں نہیں ہے اس کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قرآن شریف میں نہیں احادیث سے ہی ثابت ہوتے ہیں (اطلاع الاحکام)

غرض بہت سے احکام احادیث سے بھی ثابت ہوئے ہیں۔ اور بعض مسائل وہ ہیں جو اجماع و قیاس ملحق کتاب و سنت کے ساتھ ہیں اس لئے کہ اجماع دو طور سے ہوتا ہے ایک تو یہ کہ کسی مسئلہ کے متعلق خبر واحد ملحق پھر اس مسئلہ پر اجماع ہو گیا اور دوسرے یہ ہے کہ وہ مسئلہ قیاس سے ثابت تھا اور اس پر اجماع ہوا پہلی صورت میں تو اجماع کا ملحق بالسنۃ ہونا ظاہر ہے اور دوسری صورت میں الحاق اس لئے ہے کہ قیاس و ہی حجت ہے جو مستنبط من الکتاب والسنۃ (قرآن و حدیث سے مستنبط ہے) ہو تو اگر وہ مسئلہ جس پر اجماع ہوا ہے قیاس مستنبط من الکتاب سے ثابت ہے تو یہ اجماع ملحق بالکتاب ہے اور اگر قیاس مستنبط من السنۃ سے ثبوت ہوا تو ملحق بالسنۃ ہے اور اسی تقریر سے قیاس کا الحاق بھی کتاب و سنت سے معلوم ہو گیا اس لئے کہ اس میں قید استنباط من الکتاب والسنۃ کی موجود ہے۔ اور اسی وجہ سے قیاس کو علماء نے مظہر کہا ہے مثبت نہیں مانا مثبت اصل میں کتاب و سنت ہی ہے پس ثابت ہو گیا کہ حدیث شریف میں من وجہ استقلال ہے۔ بہ خلاف اجماع و قیاس کے کہ وہ محض تابع و ملحق ہیں صرف کتاب و سنت کی حجیت میں صرف ہمارے اعتبار سے اس قدر فرق ہے کہ قرآن شریف چونکہ تو اتر سے ثابت ہے اس لئے وہ قطعی ہے اور احادیث میں بھی جو متواتر ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے۔ البتہ بعض جو خبر واحد ہیں وہ قطعی نہیں مگر ماننا ان کا بھی واجب و ضروری ہے باقی جن حضرات نے خود حضور ﷺ سے سنا ہے ان کے حق میں یہ بھی فرق نہیں بلکہ حضور ﷺ کا فرمایا ہوا بھی مثل قرآن ہی کے حجت قطعاً ہے بہر حال نفس حجیت میں سب احادیث مشترک ہیں پس بڑی حسرت ہے ان لوگوں پر جو احادیث کو حجت نہیں مانتے وہ بڑے نور سے محروم ہیں۔ اس کا عجیب نور ہے حتیٰ کہ اس میں اور عامہ بشر کے کلام میں کھلا فرق ہے۔ عام کلام کے سامنے تو احادیث مثل کلام اللہ کے معلوم ہوتی ہیں ہاں کلام اللہ کے مقابلے میں جب رکھ کر دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی بندے کا کلام ہے حضرات محدثین کی شان یہ بھی کہ وہ اکثر اپنی فراست سے حدیث

موضوع کون کر پہچان لیتے تھے کہ یہ موضوع ہے پھر تحقیق سے موضوع ہونا اس کا ثابت ہوتا تھا۔ (اطاعہ الاحکام)
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا
 ترجمہ: اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول ﷺ کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اولی الامر ہیں ان کا بھی پھر اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ و رسول ﷺ کے حوالہ کر دیا کرو اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو بے شک وہ بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے۔

اطاعت کی دو قسمیں

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمانبرداری کا حکم فرمایا ہے وہ کون سے قسم کی فرمانبرداری ہے۔ اطاعت کی دو قسمیں ہیں ایک تو ضابطہ کی اور ایک دل سے اور خوشی سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب دوسری نوع ہے اس لئے کہ اطیعوا کا ماخذ طوع ہے اور طوع کے معنی رغبت ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت رغبت اور خوش دلی سے کرو یعنی ہر امر دین کے اندر رغبت اور خوش دلی ہو کسل اور کراہیت نہ ہو یہ تو مختصر سا بیان تھا
 أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (خوشی سے اللہ کا کہنا مانو اور خوشی سے رسول ﷺ کا کہنا مانو)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۱۵﴾

ترجمہ: قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں پھر اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کر لیں۔

تفسیری نکات

حضور اکرم ﷺ کی شان محبوبیت

فَلَا وَرَبِّكَ اس میں لا حرف نفی کے بعد قسم لے آئے اور نفی کا ذکر بوجہ قرینہ مقام کے چھوڑ دیا گیا یعنی یہ بات نہیں جو منافقین سمجھے ہوئے ہیں کہ باوجود دعویٰ ایمان کے حکیم الی الطاغوت کو اختیار کریں اور حضور ﷺ کے حکم

سے اعراض کریں اور قبل از مقصود نفی کا لانا نہایت بلاغت ہے اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ قبل ذکر مقصود کے اس کی ضد کی نفی کر دیتے ہیں تاکہ اس سے یکسوئی ہو کر ذہن خالی ہو جائے اور مقصود کی طرف متوجہ ہونے کے لئے آمادہ ہو جائے (شرط الایمان)

پس فرماتے ہیں کہ اے محمد ﷺ آپ کے رب کی قسم ہے یہاں چند امور قابل غور ہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو قسم کھا کر کیوں فرمایا دوسرے یہ کہ اگر قسم ہی کھانا تھا تو اپنے اسماء میں سے اسم رب کو کیوں خاص فرمایا تیسرے یہ کہ اس کو حضور ﷺ کی طرف کیوں مضاف کیا بات یہ ہے کہ جو مضمون اس آیت میں ارشاد ہوا ہے وہ چونکہ نہایت قابل اہتمام ہے اور قسم کھا کر جو بات کہی جاتی ہے طبعی بات ہے کہ وہ نفس میں اچھا اثر کرتی ہے اس لئے تو قسم کھائی باقی رہی یہ بات کہ وربک کیوں فرمایا واللہ یا والرب کیوں نہ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود اصلی اس آیت کا آپ کا مطاع یعنی واجب الاطاعت ہونا بیان کرنا ہے چنانچہ الایطاع میں اس کی تصریح ہے اور آدمی جو دوسرے کی اطاعت کرتا ہے اس کی تمن وجہ ہوا کرتی ہیں یا تو احسان کہ انسان کا طبعی امر ہے کہ محسن سے اس کو محبت ہوتی ہے اور یا عظمت شان خواہ محسن بھی نہ ہو چنانچہ حکام کی جو اطاعت کی جاتی ہے اس کا سبب ان کی عظمت ہے اور تیسری وجہ محبت ہے گو نہ احسان کچھ ہوا اور نہ حکومت و عظمت ہو مگر محبت کا بھی خود اقتضایہ ہے کہ محبوب کی اطاعت کی جائے۔ جناب برای تعالیٰ کو وربک سے حضور ﷺ کا تینوں وجہ سے مطاع ہونا بیان کرنا منظور ہے۔ (شرط الایمان)

محسن کائنات

فَلَا وَرَبِّكَ کے اس تقدیر پر یہ معنی ہوئے کہ قسم ہے آپ کے مربی کی اور تربیت ایک اعلیٰ درجہ کا احسان ہے پس مربی بہ معنی محسن ہوا پس حاصل یہ ہوا کہ قسم ہے آپ کے محسن کی اور ظاہر ہے کہ آپ کی طبیعت اور فطرت ہے سلیم اور طبائع سلیمہ کا مقتضی یہ ہے کہ اس صلے میں کہ خالق کا اس پر احسان ہے وہ خلق خدا پر احسان کرتا ہے پس اس قاعدہ سے آپ خلق کے محسن ہوئے یہ تو محسن ہونا آپ کا قاعدہ عقلیہ سے ہوا دوسری وجہ بطرز فن تصوف آپ کے محسن ہونے کی اور بھی ہے وہ یہ کہ صفات حمیدہ حقیقتاً ذات باری تعالیٰ نے لئے ہیں اور مخلوق کے اندران کا نکل ہے مثلاً مخلوق کسی مجرم کا تصور محاف کر دے تو یہ صفت غلو کا پر تو ہے اور اگر کوئی کسی کو کچھ دے تو یہ جو ادیت کا اثر ہے اور یہ مسلم ہے کہ جناب رسول ﷺ تمام افراد بنی آدم میں سے صفات باری تعالیٰ کے مظہر اکمل و اتم ہیں پس صفت احسان کے بھی آپ مظہر اتم ہوئے تو آپ تمام جہان کے محسن ہوئے اور تربیت کا فناء چونکہ ہمیشہ محبت ہوتا ہے اور اس کی اضافت ہے حضور ﷺ کی طرف تو گویا ہی فرمایا فلا و محبک (آپ کے محبت کی قسم) اور

پوچھتے ہیں یہ صاف دلیل ہے کہ حاکم شرع کی دل میں عظمت نہیں ہے صاحبِ افسوس ہے کہ مسلمان ہو کر احکام میں چوں چرا کر داور لا یجہدوا فی انفسہم حرجاً (یعنی آپ کے فیصلہ کے بعد اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں) محبوبیت کا مقتضی ہے کہ محبوب محبت کو اگر یہ کہے کہ اپنے سر میں جوتیاں مارتے ہوئے بازار میں نکل جاؤ تو اگر محبت صادق ہے تو اس سے عار و تنگ نہ کرے گا اس لئے کہ محبت کا یہ خاصہ ہے کہ عار و تنگ نہیں رہا کرتی بلکہ یہ بھی ثابت ہو جائے کہ یہ امر عقل کے خلاف ہے تب بھی اس کے امتثال میں کوئی تنگی نہ ہوگی بلکہ تنگی تو کیا اس امر کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور یُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (پورے طو پر تسلیم کر لیں) عسیت پر متفرع ہے کہ طبع سلیم کا مقتضی محسن کے امر کو تسلیم کرنا اور اس میں چوں و چرا نہ کرنا ہے اس مقام پر ایک طالب علمانہ شبہ یہ ہے کہ کیا اگر ان امور مٹلاشہ میں سے کوئی امر کسی کے اندر مغفود ہوگا تو وہ مومن نہ ہوگا۔ بات یہ ہے کہ حکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم کے مراتب مختلف ہیں۔ جس مرتبے کی حکیم اور عدم وجدان حرج اور تسلیم ہوگی اسی مرتبے کا مومن ہوگا اور مراتب تین ہیں ایک مرتبہ اعتقاد کا ہے الحمد للہ کہ سب مسلمانوں میں یہ مرتبہ امور مٹلاشہ کا موجود ہے اور یہ ادنیٰ ایمان ہے اگر کسی کے اندر مرتبہ اعتقاد میں بھی یہ امور نہ ہوں تو وہ واقعی مومن نہیں دوسرا مرتبہ عمل کا ہے کہ امور مٹلاشہ پر عمل بھی ہو یعنی اپنے مقدمات و منازعات میں شریعت کی طرف رجوع ہو عقلاً تنگی نہ ہو اور اس پر عمل ہو اگر چہ طبعاً تنگی ہو اور یہ اوسط درجہ ایمان کا ہے تیسرا مرتبہ طبیعت کا ہے یعنی امور مٹلاشہ طبعی ہو جائیں یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے اور ایسا شخص مومن اکمل ہے بہر حال جیسے ایمان کے درجات ہیں ایسے ہی ان امور کے بھی درجے ہیں اب ہر شخص کو اپنے اندر غور کر لینا چاہئے کہ میں کس درجہ کا مومن ہوں اور کس درجے کی ضرورت ہے ظاہر ہے کہ ضرورت تو ہر مطلوب میں کمال ہی کی ہے اب اپنی حالت دیکھ لے کہ اگر صرف درجہ اعتقاد کا ہی ہے تو اس کو گو مومن کہا جائے گا لیکن کمال ایمان کے اعتبار سے وہ مومن نہ کہلائے گا اور عرفاً بھی وہ مومن کہلانے کا مستحق نہیں ہے دیکھو اگر کسی کے پاس ایک روپیہ ہو تو اس کو مالدار نہیں کہتے مالدار اسی کو کہتے ہیں جس کے پاس بہت سا مال ہو پس ایسے شخص کو کمال کی طرف ترقی کرنا چاہئے۔ صاحبو! غضب کی بات ہے کہ مال دنیا اگر قلیل ہو تو اس پر تو قناعت نہیں اور ہر وقت یہی فکر ہے کہ یہ بڑھ جائے اور دین کی ترقی کی فکر نہیں

اری الملوك بارنی الدین قد قنعوا وما اراهم رضوا فی العیش بالدون

(بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ ادنیٰ قلیل دین پر قانع ہیں اور میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ قلیل دنیا پر انہوں نے اکتفا کیا ہو)

فاستغن بالدین عن دنیا الملوك كما استغنی الملوك بدنیام عن الدین

(سو تم دین کی وجہ سے بادشاہوں کی دنیا سے مستغنی رہو جیسا کہ بادشاہ اپنی دنیا کی وجہ سے دین سے مستغنی ہیں)

حالانکہ دین کا کمال تو اس سے زیادہ اہتمام کے قابل ہے۔ غرض ایمان جب ہی کامل ہوگا کہ حکیم اور عدم

وجدان حرج اور تسلیم کا درجہ کامل ہو (شرط الایمان)

کمال ایمان کی تحصیل کا طریقہ اور دستور العمل

اس پر عمل کرنے سے یہ درجہ ایمان کا میسر ہووہ طریقہ مرکب ہے تین اجزاء سے اول تو علم دین خواہ کتب درسیہ کی تحصیل سے ہو یا اردو کے رسائل سے یا علماء سے سن کر دوسرے صحبت اہل اللہ کی تیسرے یہ کہ جو میں گھنٹہ میں سے ایک گھنٹہ نکل کر اس میں بیٹھ کر یہ سوچا کرو کہ ہم کو ایک روز یہ دنیا چھوڑنا ہے اور قبر میں جانا ہے اور وہاں دفن فرماتے آئیں گے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم بنانے کا امر

فرماتے ہیں فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ لَوْلَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا اس آیت کو سن کر ذرا مسلمانوں کے کان کھڑے ہو جانے چاہئیں اور بدن پر لرزہ پڑ جانا چاہئے اس میں ایمان مطلوب کا معیار بیان کیا گیا ہے اور اس بات کی ایک پہچان بتلائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان مطلوب ہے یا نہیں جس کو اپنی قلبی حالت ایمان کے متعلق معلوم کرنی ہو وہ اس علامت سے بہت آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتا ہے مطلب آیت مذکورہ بالا کا یہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اپنے ہر کام میں حکم نہ بنائیں اللہ تعالیٰ نے حصر فرمایا مومن ہونے کو اس بات میں کہ آپ کو جملہ امور میں حکم بنایا جائے حکم اس کو کہتے ہیں جس کا فیصلہ بلا دلیل مان لیا جاوے اور اس میں چوں و چرا نہ کیا جاوے اب ہم غور کر لیں کہ ہم میں یہ علامت ایمان کی موجود ہے یا نہیں اگر موجود ہے تو آیا درجہ مطلوبہ میں ہے یا نہیں۔ اگر انصاف کو دخل دیں گے تو غالباً یہی کہنا پڑے گا کہ اگر محدود نہیں جو کہ کفر ہے مگر کالعدم تو ضرور ہے جو اگر کفر نہیں مگر ناقص ہونے میں تو شبہ ہی نہیں پھر معلوم نہیں کس بات پر ہم کوناز ہے اور کس کروت پر پھولے ہوئے ہیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان حقیقی سے جو کے مطلوب ہے ہم لوگ بالکل کورے نہیں بلکہ کور ہیں۔ اگر یہ بات محض اجمالی طور سے سمجھ میں نہ آتی ہو تو تفصیلی نظر سے دیکھئے اس سے بخوبی سمجھ میں آ جائیگا کہ میرا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی ایک ایک حالت کو لیجئے اور اس کو حضور کے ارشادات پر منطبق کرتے جائیے کہ ہم کو اس حالت میں حضور ﷺ کے ارشادات پر انشراح اور تسلیم حاصل ہے یا نہیں اس سے خود بخود پتہ چل جائے گا اور آپ خود ہی یہ کہیں گے خود غلط بود آنچہ ما پند شتم حضور ﷺ کے تمام ارشادات منضبط ہیں یہ فقہ و حدیث و تصوف اور اخلاق کی کتابیں سب آپ ہی کے ارشادات کا مجموعہ ہیں۔ اور ہمارے حالات کی تقسیم پانچ چیزوں کی طرف ہے عبادات، معاملات، عادات، اخلاق، معاشرت ان پانچوں میں سے جس شعبہ کو کتاب پر پیش کریں گے تو یہی معلوم ہوگا کہ کتاب کہہ رہی ہے پچھم کی طرف چلنے کو اور ہم جارہے ہیں پورپ کی طرف اور کتاب کہہ رہی ہے دکھن کی طرف جانے کو ہم جارہے ہیں اور ترکی طرف

ہم کو جانا ہے کلکتہ اور ہم اس ریل میں بیٹھے ہیں جو شملہ کو جا رہی ہے اور جی میں خوش ہیں کہ اب کلکتہ پہنچ جائیں گے حالانکہ واقعہ میں دمدم کلکتہ سے بعد ہو رہا ہے۔ یہ حالت کم و بیش ہر شعبہ میں نظر آئے گی اور ظاہر ہے کہ اگر انشراح و تسلیم کامل ہو تو ان شعبوں میں یہ نقصان ہرگز پیش نہ آوے مگر جب ہر شعبہ میں یہ نقصان ہے تو کیسے مان لیا جائے کہ ہم میں انشراح و تسلیم کامل ہے۔ غرض تفصیل سے دیکھو اجمال سے دیکھو تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ ہم میں ایمان مطلوب کی علامت موجود ہے۔ پھر کیا فتویٰ ہوا ہمارے بارہ میں قرآن کا اس کا جواب ہر شخص کا دل خود ہی دے رہا ہے۔ اور حضور ﷺ کے حکم بنانے کے متعلق قرآن میں جہاں تذکرہ ہے وہاں صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا کہ لوگ حضور ﷺ کو محض زبانی اور ظاہری طور پر حکم بنا لیں بلکہ فرماتے ہیں۔

ہمارے سارے کام ناقص ہیں

لَوْلَا يَجِدُ ذَاتِيَّ أَنفِيهِ مِنْ حَرَجٍ مَّا قَضَيْتَ لِي عِنِّي عَمَّا نَدَىٰ نَفْسِي بَلْ كَانَتْ هِيَ حَالِي
 چاہئے کہ حضور نے جو حکم کیا ہو اس سے کسی قسم کی تنگی دلوں کے اندر نہ پائیں اور ذرا بھی انقباض نہ ہو پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ اس مضمون کی اور تاکید پر تاکید ہے فرماتے ہیں وَيَسْأَلُونَكَ لِمَا نَقَصْتَهُ لِي عَمَّا نَدَىٰ نَفْسِي
 یعنی صرف یہی نہیں کہ اس سے انقباض نہ ہو جیسا لَوْلَا يَجِدُ ذَاتِيَّ أَنفِيهِ مِنْ حَرَجٍ مَّا قَضَيْتَ لِي عَمَّا نَدَىٰ نَفْسِي
 اب ہم لوگ دیکھ لیں کہ ہماری یہ حالت ہے یا نہیں کیا کہا جائے۔ سوائے اس کے کہ جواب نفی میں ہے افسوس صد افسوس اس آیت سے کمر ٹوٹ جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایمان مطلوب سے بالکل خالی ہیں اور ایسے ایمان سے خالی ہونے والے کا جو لقب ہے وہ سب کو معلوم ہے اس لفظ کو منہ سے نکالتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے یعنی غیر مومن بدرجہ خاص ہے لیکن منہ کے نہ نکالنے سے کیا ہوتا ہے اگر ہماری حالت اس کے اطلاق کے قابل ہے تو وہ ہے ہی کانے کو کوئی زبان سے کانانہ کہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اس نہ کہنے سے کیا عیب اس کا مٹ جائے گا جب ایک آنکھ نہیں ہے تو کانانہ تو ہے ہی چاہئے کوئی کہے یا نہ کہے اب یہ سمجھئے کہ ہم لوگوں نے اپنی براءت کے لئے ایک اور ترکیب نکال رکھی ہے جس سے دل کو سمجھا لیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس آیت میں ونیز اس کے مثل دوسری آیتوں میں ایمان سے مراد کامل ایمان ہے تو معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ کمال ایمان اس وقت حاصل ہوگا جب یہ علامت موجود ہو اور جب یہ علامت موجود نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان کامل نہیں ہے مگر نفس ایمان تو جب بھی رہے ہی گا خدا بھلا کرے اس تاویل کا کہ اس کی بدولت ذرا سہارا تو ہے اور یہ امید ہوتی ہے کہ ہم لوگ بھی کچھ پٹ پٹا کر عذاب سے نجات پا جائیں گے کیونکہ ایمان کامل نہ سہی ناقص سہی کچھ تو موجود ہے میں اس ترکیب کو باطل نہیں کہتا مسئلہ صحیح ہے لیکن یہ حفاظت شینا و غابت عنک اشیاء کا مصداق ہے یہ بھی تو دیکھو کہ تم ایمان لا کر کس شمرہ کے طالب ہو کامل کے یا ناقص کے جواب ظاہر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ شمرہ

کامل ایمان کامل ہی پر مرتب ہو سکتا ہے اور تمام مقاصد اور ذرائع میں یہی قاعدہ ہے۔ اسی لئے عادات میں ثمرات ہی پر نظر کر کے جو طریق ترتیب ثمرہ مطلوبہ میں ناقص ہو اس کو محاورات میں کالعدم ہی قرار دیا جاتا ہے چنانچہ کسی کو مالدار کہا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کسی کے پاس ایک کوڑی یا ایک پیسہ ہے تو وہ بھی مالدار ہے اگرچہ لختہ اس حالت میں بھی مالدار کا اطلاق اس پر صحیح ہے لیکن اپنے محاورہ کو دیکھئے آپ اس شخص کو کبھی مالدار نہیں کہیں گے۔ علی ہذا جتنی صفات ہیں سب میں یہی قاعدہ جاری ہے کہ جب صفت کا اطلاق کسی چیز پر کیا جاتا ہے تو اس کا ادنیٰ درجہ بلکہ اوسط درجہ بھی مراد نہیں ہوتا بلکہ کامل ہی درجہ مراد ہوتا ہے جیسے شجاع، سخی، حسین وغیرہ کہ ان صفتوں میں ادنیٰ درجہ والے کو شجاع سخی حسین نہیں کہہ سکتے جب یہ بات ہے تو مومن ہونا بھی ایک صفت ہے اس کا اطلاق بھی عادات میں کسی شخص پر جمی کیا جائے گا کہ اس میں صفت ایمان کی بدرجہ کمال موجود ہو ورنہ آپ کے محاورہ مذکور کے موافق اس پر عدم ایمان کا اطلاق اقرب ہوگا تو پھر وہی بات لوٹ آئی کہ ہم سے جس ایمان کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ ہم میں موجود نہیں تو پھر کس بات سے دل خوش کیا جائے اگر قیامت کے دن یہی سوال ہو کہ ہم نے تم سے جس صفت ایمان کا مطالبہ کیا تھا وہ تم نے حاصل کی یا نہیں تو کیا اس کے جواب میں آپ اس ضعیف اور ناقص ایمان کو جس پر آپ خود عدم کا حکم لگا چکے ہیں پیش کر سکتے ہیں۔ اور اگر آپ فرضا پیش بھی کر دیں اور ادھر سے یہ کہا جائے کہ تم اپنے واسطے تو ہر صفت کا اطلاق اس وقت کافی سمجھتے تھے جبکہ وہ کمال کے درجہ میں موجود ہو اور ہمارے مقابلہ میں یہ صفت ناقص کس منہ سے پیش کرتے ہو تو کوئی صاحب ذہن سے ذہن مجھے بتائیں کہ اس کا کیا جواب ہوگا۔ میرے نزدیک کچھ جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض جب ہمارا ایمان باوجود ہونے کے کالعدم ہے تو وہ تو حضرت حق کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہے نہ اپنے ہی دل کی تسلی کے لئے کافی ہے مگر خیر بالکل نہ ہونے سے جیسی کفار کی حالت ہے ناقص ہی ہونا غنیمت ہے جہاں ہمارے سارے کام ناقص ہیں ایمان بھی ناقص سہی اس طرح دل کو سمجھا لو کوئی جز تو ایمان کا ہے ہی اگر ذرا برابر بھی ایمان موجود ہے تو ان شاء اللہ وہ بھی اپنا اثر ضرور دکھلائے گا۔ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ اَبَدًا نَه سب سے نجات ہو ہی جائے گی اور بڑی بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے اگر وہ ہمارے ضعف اور اپنی قدرت پر نظر فرما کر رحم فرما دیں تو ان کو کون روکنے والا ہے اس کے علاوہ ایک اور امید گاہ ہے وہ یہ کہ ہم کو محض اپنے فضل و کرم سے اپنے محبوب کی امت میں پیدا کیا ہے اس سے بہت کچھ امید ہوتی ہے کیا عجب ہے کہ پہلے ہی سے رحمت ارادہ ہو۔

رسول اکرم ﷺ کی محبوبیت کے دلائل

اور حضور ﷺ کی محبوبیت کے مستقل دلائل تو ہیں ہی خود اس آیت میں اس محبوبیت پر ایک عجیب دلالت ہے وہ یہ کہ اس آیت میں یعنی فَاَلَا وَرَبِّكَ اِنَّ مَقْسَمَ بَدَا تِ حَقِّ هِيَ اور انہوں نے اپنی ذات کی قسم کھائی مگر ایک

عجیب عنوان سے جو حضور کی محبوبیت پر دل ہے۔ کیونکہ قسم کے لئے تو اور بھی الفاظ ہو سکتے تھے مثلاً واللہ تاللہ جیسا کہ اور دوسرے مقامات پر موجود ہیں۔ تَاللّٰهُ لَقَدْ اَنْسَلْنَا اِلٰی اُمِّرٍ مِّنْ قَبْلِكَ یعنی یہ کہ حق تعالیٰ نے قسم کھائی اپنی یا مثلاً یوں ہی فرمادیے تو نفسی و امثال ذالک مگر سارے عنوان کو چھوڑ کر یہ عنوان اختیار کیا فلَا وَرَتَّلَا جس کے معنی ہیں قسم ہے آپ کے رب کی اور ظاہر ہے وہ رب خود ہی ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ مجھے اپنی قسم ہے مگر اس حیثیت سے کہ میں آپ کا رب ہوں کیا ٹھکانا ہے حضور کی محبوبیت کا کہ حضرت حق اپنی ذات کی قسم من الذات نہیں کھاتے بلکہ اس حیثیت سے قسم کھاتے ہیں کہ وہ رب ہیں۔ حضور کے اس ابلغ کون سا لفظ محبوبیت کے معنی ادا کرنے کے لئے ہو سکتا ہے۔ اور بظاہر تو یہ خیال میں آتا ہے کہ اگر اس قسم کے موقع پر وہ رب العلمین فرماتے تو باعتبار موقع کے بہت ابلغ ہوتا کیونکہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے وہ حضور کی ذات سے متعلق نہیں بلکہ ایک مسئلہ بتاتا ہے جس میں ایمان کے معیار کو ظاہر کیا گیا ہے اور جس کا تعلق عامۃ الناس سے ہے تو اس موقع پر ربوبیت عامہ کو جتلا نا زیادہ مناسب تھا۔ لیکن بجائے اس کے یہ عنوان اختیار کیا گیا کہ رب العالمین کی جگہ وربک فرمایا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صحیح معیار ایمان کا یہی ہے کہ حضور کے فیصلہ کو بدل و جان تسلیم کیا جاوے سو اس کے لئے یہی زیادہ مناسب تھا کہ لوگوں پر یہ بات ظاہر کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضور ﷺ کا مرتبہ جس کی بناء پر آپ کے فیصلہ کو تسلیم کرانا ہے کیا ہے جب یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ حضور کا مرتبہ حق تعالیٰ کے نزدیک یہ ہے تو حضور کے فیصلہ کی پوری وقعت ہوگی اور پھر کسی کی یہ مجال نہ ہوگی کہ اس کو بخوشی تسلیم نہ کرے اس واسطے وَرَتَّلَا فرمایا گیا پس اس میں قسم کے ساتھ حضور ﷺ کی عظمت بھی ظاہر ہو گئی یعنی یہ ظاہر ہو گیا کہ حضور کا درجہ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ حق تعالیٰ اپنی قسم بلحاظ اس علاقہ کے کھاتے ہیں جو حضرت حق کو حضور کے ساتھ ہے اور یہ علاقہ اتنا بڑا ہے کہ جب عامۃ الناس کو اس کی اطلاع ہو جائے گی تو پھر حضور کے فیصلہ میں ان کو کسی چون و چرا کی گنجائش نہ رہے گی۔ اس بیان سے اس کا نکتہ واضح ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم حضور کے علاقہ سے کیوں کھائی اب ایک سوال اور باقی رہتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ سے تو کئی قسم کے تعلقات ہیں مثلاً سب سے بڑا علاقہ الوہیت کا ہے جو ام العلاق ہے تو بجائے وربک کے والہک کیوں نہ فرمایا سبحان اللہ قرآن کی بلاغت قابل ملاحظہ ہے چنانچہ اس میں بھی ایک نکتہ ہے جو اس وقت سمجھ میں آیا اور یہ آپ لوگوں کی برکت ہے بعض وقت بیان کرنے والا بالکل خالی الذہن ہوتا ہے مگر سامعین کی طلب اور کشش کی برکت سے اس کے قلب میں کسی نئے مضمون کا القا ہو جاتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ماں کی چھاتیوں میں دو دھاس وقت آتا ہے جب پیٹنے والا ہو جاتا ہے جس کی بابت مولانا فرماتے ہیں۔

تانہ گریدار کے قد د چن تاگر ید طفل کے جو شد لبن

یعنی جب تک بادل نہیں برستا چمن سرسبز و شاداب نہیں ہوتا اور جب تک بچہ نہیں روتا ماں کے پستانوں میں دودھ نہیں اترتا اور جب تک دودھ پینے والا نہیں ہوتا تب تک وہ بھی نہیں آتا۔

اصل موثر فضل الہی ہے

غرض حاصل یہ ہوا کہ پستانوں میں دودھ پینے والے کی کشش سے آیا مگر اس پر آپ غرہ نہ ہوں کہ ہم ایسے طالب صادق اور حبرک ہیں کہ ہماری طلب سے مضامین کا القا ہوتا ہے کیونکہ محض آپ کا یہ خیال کر لینا آپ کے دعوے کے لئے کافی نہیں ہوگا جب یہ کہ بچہ کی طلب اور کشش سے دودھ جمی آتا ہے جب کہ چھاتی میں موجود ہو کسی بچہ کے ذریعہ سوکھی لکڑی میں سے تو دودھ نکلوا لیجئے غرض اس میں آپ کی کشش کا بھی اثر ہے مگر اصل موثر فضل الہی ہے بہر حال یہ نکتہ اس وقت سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ اگر والہک فرماتے تو اس میں اتنی لطافت نہ پیدا ہوتی جتنی کہ وَرَيْكَ کے لفظ میں پیدا ہوئی کیونکہ صفت الوہیت کا مقتضا یہی ہے کہ تمام عالم بحیثیت عبد ہونے کے بلاچوں و چراں سارے حقوق بندگی کے ادا کریں تو الوہیت کا تعلق ایک حاکمانہ تعلق ہے۔ کوئی شفیقانہ تعلق نہیں۔ برخلاف صفت ربوبیت کے کہ وہ شفیقانہ تعلق ہے تو ربک کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اس علاقہ سے قسم کھاتے ہیں جس کی رو سے ہم تمہاری خاص رعایتیں کرتے ہیں۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ لفظ الہک و ربک میں کیا فرق ہوا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان محبوبیت

اب غور کیجئے کہ جب حق تعالیٰ خود ہی حضور کی خاص رعایتیں فرماتے ہیں تو عامۃ الناس کا کیا منہ ہے کہ وہ حضور کی رعایت نہ کریں اور اس رعایت کی حقیقت اور حقوق جس کا حاصل اطاعت ہے مستقل دلائل سے ثابت ہے اور خود اس آیت میں بھی ہے حَتَّىٰ يُحَكِّمُوْا۟ اِس سے حضور کی محبوبیت کی تاکید پر اور تاکید ہو گئی کیا بلاغت ہے قرآن کی کہ ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف اس کا موتی کی لڑی کی طرح پروردیا ہوا ہے غرض یہ آیات حضور کی شان محبوبیت سے لبریز ہے جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے ایسے محبوب کی امت میں پیدا کیا ہے تو اس سے جس قدر لطف و کرم کی ہم امید رکھیں وہ ہر صورت سے کم ہے گو ہماری حالت اس قابل نہ ہو۔

یا رب تو کریمی و رسول تو کریم صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

اے رب تو بھی کریم ہے اور تیرا رسول بھی کریم ہے سینکڑوں شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان ہیں۔

اصل بیان یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں مومن ہونے کا معیار اور دل میں ایمان ہونے کا نشان بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے لَاۤیُؤْمِنُوْنَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوْا۟ فِیْمَا بَیْنَہُمْ یعنی یہ لوگ مومن جب ہی کہلائیں گے جب کہ آپ کو ہر بات میں اپنا حکم قرار دیں اور اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ فرماتے ہیں

تَوَلَّوْا يَجِدُ وَا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيَكْلِبُوْا تَسْلِيْمًا ' وہ حکیم ظاہری حکم تھا اور یہ تسلیم باطنی ہے۔
مطلب یہ ہوا کہ آپ کے فیصلہ پر عمل بھی کریں اور دل سے خوشی کے ساتھ اسے تسلیم بھی کریں خواہ کوئی
قضیہ ہو حضور ہی کی طرف سے اس میں رجوع کریں خواہ وہ حق سلطنت ہو یا حق دشمن اور خواہ حق مشترک ہو یا
منفرد حتیٰ کہ حقوق بہائم میں بھی حضور ہی کی طرف رجوع کریں اور حضور ہی کے فیصلہ کا اتباع کریں جو حضور
بتائیں اس کو بطیب خاطر تسلیم کریں اور اس کے موافق عمل کریں اور یہ بتلانا حضور کا صحابہ کے لئے تو بلا واسطہ تھا
مگر ہمارے لئے بواسطہ ہے گو حضور ﷺ اب موجود نہیں مگر دین کا سارا کام چل رہا ہے اور قیامت تک چلا
جائے گا جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں

چونکہ گل رفت و گستان شد خراب بوئے گل را از کہ جو نیم از گلاب
چوں کہ شد خورشید و مارا کرد داغ چارہ نبود در مقاش جز چراغ
جب پھول کا موسم چلا گیا اور چمن اجڑ گیا تو اب پھول کی تمنای فضول ہے ہاں پھول سے اثر ایسا ہی موجود
ہے جب سورج غروب ہو گیا اور ہم کو داغ دے گیا اب اس کی جگہ میں سوائے چراغ کے چارہ کار نہیں ہے۔

اسلام کیلئے صرف اعتقاد کافی نہیں

فرمایا اسلام کے لئے صرف اعتقاد کافی انقیاد اور اطاعت ہونی چاہئے یعرفون کما یعرفون ابناء
ہم، ابوطالب حضرت ﷺ کے بہت محقق تھے مگر مسلمان نہیں تھے بحکم مکہ فیما شجر بینہم ثم لا
يجدوا فی انفسہم حرجا، مما قضیت و یسلموا تسلیماً یہ ہونا چاہئے جب اعتقاد ہے تو اناسم کیوں
نہیں کہتا یہی تو کفر ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ص ۵۵)

وَمَنْ يُطِيعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُوْلٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ

عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالشّٰهِدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ

وَحَسُنَ اُوْلٰٓئِكَ رَفِيْقًاۙ

ترجمہ: اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے شخص بھی ان حضرات کیساتھ ہوں گے جن پر
اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات ایسے رفیق ہیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

حدیث میں ایک صحابی حضرت ثوبان کا واقعہ آیا ہے کہ وہ حضرت سرور کائنات ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر ہم جنت میں گئے بھی تو ہم کو وہ درجہ تو نصیب نہیں ہو سکتا جو درجہ آپ کا ہوگا اور جب ہم اس درجہ پر نہ پہنچ سکیں گے تو آپ کے دیدار سے محروم رہیں گے اور جب آپ کا دیدار نصیب نہ ہوگا تو ہم جنت کو لے کر کیا کریں گے حضور کرام ﷺ نے یہ سن کر سکوت فرمایا آخر وحی نازل ہوئی وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَإِنَّ فِي ذَلِكَ لَفَضْلًا مَّا يُبْصَرُ (جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرتا ہے وہ قیامت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔ جب حضور ﷺ نے ان کی تسلی فرمائی یعنی یہ ضرورت نہیں کہ اس درجہ میں عارضی طور پر پہنچنے کیلئے اسی درجہ کے اعمال کی ضرورت ہو صرف اتباع اور محبت نبی کافی ہے جیسے دربار شاہی میں خدمت گار محض معیت و خدمت شاہ کی وجہ سے دیگر رؤساء سے پہلے پہنچتا ہے اس لئے مَعَ الَّذِينَ فرمایا آگے ذَلِكَ الْفَضْلُ میں بھی تصریح فرمادی ہے کہ اس کو اپنے اعمال کا اثر مت سمجھنا یہ محض فضل ہے اور واقع میں اگر غور کیا جاوے تو صاف معلوم ہوگا کہ ہمارا دین اور ایمان ہماری دنیا اور سب سامان ہماری نماز ہمارا روزہ ہمارا ثواب درجات جو بھی کچھ ہے سب حضور ﷺ کا ہی طفیل ہے۔ چنانچہ ان آیات کے شان نزول کے انضمام سے صاف معلوم ہوتا ہے جن میں ارشاد ہوتا ہے ذَلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عِلْمًا اس کا یا تو یہ مطلب ہے کہ اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں یہ محض فضل خداوندی یہ ہے کہ تم کو ایک بہانہ محبت سے بازیابی کی دولت نصیب ہو گئی اور یا یہ مطلب ہے کہ ذالک الفضل سے بعض مغلوب الیاس لوگوں کی ناامیدی دور کرنا ہے کہ شاید کسی کو خیال ہو جاوے کہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ ہم اس درجہ تک پہنچ سکیں تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے کہ اگرچہ تم اس قابل نہیں لیکن نعمت تمہارے اعمال کی جزا نہیں ہے کہ تم ان پر نظر کر کے اس نعمت سے مایوس ہو جاؤ یہ تو محض خدا تعالیٰ کا فضل وجود میں ہے جس کے لئے تمہارے اعمال کامل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سبحان اللہ قرآن پاک بھی کیا عجیب چیز ہے کہ دو متعارض شے ایک عجب دوسرا یاس اور ایک جملہ میں دونوں کا جواب خواہ یوں کہہ لو خواہ یوں کہہ لو۔

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا ۗ ابورافع ایک صحابی ہیں ان کو پاک بار یہ غم ہوا کہ یہاں تو جب چاہتے

ہیں حضور اقدس ﷺ کے دیدار سے مشرف ہو جاتے ہیں مگر جنت میں آپ بڑے درجہ میں ہوں گے اور ہم چھوٹے درجہ میں جہاں ہماری رسائی کس طرح دیدار میسر ہوگا اور اس خیال سے ان کو بے حد قلق ہوا اس پر یہ آیت نازل ہوئی جب انہوں نے یہ سنا تو بے حد خوش ہوئے کہ الحمد للہ جنت میں بھی حضور ﷺ کی زیارت کیا کریں گے۔ اسی طرح دوسرے دوستوں سے جن کا ذکر صدیقین و شہداء و صالحین میں ہے ملا کریں گے ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت اس صورت میں تو کم درجہ والے بڑے درجوں میں پہنچ جائیں گے فرمایا کہ پہنچ جائیں تو حرج اور نقص کیا واقع ہوا یہاں پر بھی تو ایسا ہوتا ہے کہ کم درجہ والے بڑے درجوں والوں کے پاس ملنے کے لئے پہنچ جاتے ہیں یہاں پر معیت کے وہ معنی نہیں جو آپ سمجھے کہ اس درجہ پر مستقلاً پہنچ جائیں گے۔ اب فرمائیے کیا شبہ ہے عرض کیا اب کوئی شبہ نہیں رہا، عرض کیا کہ کیا جنت میں پہنچ کر حسرت ہوگی اور حسی چاہے گا کہ ہم بڑے درجوں میں ہوتے فرمایا کہ حسی ہی نہیں چاہئے گا جو جس کے لئے تجویز ہوگی اس پر دل سے ارضی رہیگا۔

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا

ترجمہ: اور جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء و صدیقین و شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں)

معیّت سے مراد

کہ جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ (جنت میں ہوں گے اور یہ لوگ اچھے رفیق) اور اچھے دوست) ہیں۔ ساتھ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ سب کے سب ان کے درجہ میں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے قریب ہوں گے اور ان سے زیارت و ملاقات کیا کریں گے۔ آگے ناز کو قطع کرتے ہیں کہ اپنے عمل پر ناز نہ کرنا ذلک الفضل من اللہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محض فضل ہوگا۔ اس کے بعد فضل پر تکیہ کو توڑا و کفّی بالذکر علیہما فضل پر تکیہ کر کے بے فکر نہ ہو جانا اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ فضل کس پر ہوگا کس پر نہیں ہوگا۔ جس کو دوسرے مقام پر صراحت کے ساتھ بتلا دیا گیا ہے إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُتَّسِعِينَ (کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و فضل نیکو کار بندوں سے قریب ہے)۔

ہم بہ قاعدہ المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل اعلىٰ من درجہ کیوں نہ مراد لیں جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے ثابت ہے اور اس استدلال سے ہم ان سے مساوات نہیں ثابت کرنا چاہتے اور نہ ہو سکتی ہے ہمارے لئے تو یہی معراج ہے کہ ہم ان کے خدام میں شامل ہو جائیں یہ بسا غنیمت ہے مساوات کا تو نام ہم کیا

لے سکتے ہیں ہمارے لئے تو ان کی معیت و تعین ہی باعث فخر ہے اور یہی ہمارے لئے اعلیٰ درجہ ہے سو اتباع سے ان شاء اللہ یہ ضرور حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ یہ معیت قرآن شریف سے جو کہ نص قطعی ہے ثابت فرماتے ہیں
 وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ
 وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا اس آیت میں اللہ ورسول کی اطاعت کرنے والوں کے لئے ان حضرات کے ساتھ معیت ثابت کی گئی ہے جن پر خدا کا انعام ہو اور منعم علیہ کون ہیں؟ نبیین وصدیقین و شہداء و صالحین گو بطریق تبعیت ہی ہو مگر یہ بھی کتنی بڑی بات ہے۔

فی الجملہ نصیب جو کافی بود مر بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

فی الجملہ تمہارے ساتھ مجھ کو نسبت ہی کافی ہے بلبل کو یہی کافی ہے کہ گل کا قافیہ ہو جائے۔

اگر اللہ یہ معیت نصیب فرمادیں تو بہت ہی بڑی خوش قسمتی ہے یہ درجہ کس کو نصیب ہوتا ہے۔

الحمد للہ کہ صالحین کے لفظ کے متعلق ایک بہت بڑا وہم رفع ہوا اب میں بیان ختم کرنا چاہتا ہوں جو اصل مدعا ہمارے سن لیجئے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے **أُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ** جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ صالحین میں سے ہیں اور لفظ اولیک کا مشار الیہ اہل کتاب کی وہ جماعت ہے جس میں یہ صفات ہوں **يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
 الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ** ہوا یا فعلوا مگر اس حکم میں خصوصیت محض اہل کتاب کی نہ سمجھی جاوے کیونکہ گو مورد آیات کا خاص ہو مگر عموم الفاظ یا علت سے حکم عام ہوا کرتا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اصلاح کامل اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو ان صفات کے ساتھ متصف ہو گیا دوسروں کے حق میں حکم بیان کر کے اس امت کو بھی سنانا ہے کہ اگر اصلاح کامل چاہتے ہو جس سے انبیاء علیہم السلام کی رفاقت نصیب ہو تو یہ صفات حاصل کرو جو آیات میں مذکور ہیں اور بناء ان سب کی حضور ﷺ اور وحی کی اتباع ہے چاہے وہ بواسطہ ہو یا بلا واسطہ اس طرح سے کسی حالت میں اپنی رائے کا اتباع نہ کیا جائے چنانچہ اہل کتاب کی دونوں جماعتوں میں جو ایک کی تعریف اور ایک کی مذمت فرمائی گئی ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ جس جماعت کی مذمت ہوئی انہوں نے حضور کا اتباع نہ کیا اور اپنی رائے کو کافی سمجھ کر اس پر عمل کرتے رہے اور دوسری جماعت نے اپنی رائے کو چھوڑ کر حضور ﷺ کی وحی کی اتباع کیا۔ اب انہیں واقعات سے لوگ اپنی حالتوں کا موازنہ کر لیں کہ کہاں تک ان میں وحی الہی اور حضور ﷺ کا اتباع ہے اور کہاں تک خود رائی ہے۔

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا

ترجمہ: بے شک شیطانی تدبیر لچر ہوتی ہے۔

تفسیری نکات

فرمایا بعض نے استنباط کیا ہے کہ عورتوں کا مکر شیطان سے بھی بڑھا ہوا ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے (۱) ان کید الشیطان کان ضعیفا (بے شک شیطان کا مکر کمزور ہے) میں شیطان کے کید کو تو ضعیف فرمایا اور (۲) ان کید کن عظیم (بیشک تمہاری چالاکیاں ہی غضب کی ہوتی) میں عورتوں کے کید کو عظیم فرمایا مگر میرے یہ استنباط درست نہیں شیطان کے کید کو حق تعالیٰ کی قوت کے مقابلہ میں ضعیف فرمایا جیسا کہ آیہ کے شروع سے معلوم ہوتا ہے (۳) الذین امنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت فقاتلوا اولیاء الشیطان (جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کے رستہ میں قتال کرتے ہیں ان کافروں سے جو شیطان کے رستہ میں لڑتے ہیں پس شیطان کے دوستوں سے قتال کرو) ورنہ عورتوں کو تو خود شیطان ہی شیطان بناتا ہے۔ تو اس کا کید ان سے زیادہ ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۳ صفحہ ۱۳۸)

چالاکی اور عقل دونوں الگ الگ ہیں

فرمایا چالاکی اور چیز ہے اور عقل اور چیز چالاکی تو مذموم ہے اور عقل محمود ہے دیکھئے ان کید کن عظیم (۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں کید اور چالاکی بہت ہے اور باوجود اس کے ان کو من نالصات العقل والذین فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوْ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى

الرَّسُولِ وَالْإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۳۰﴾

ترجمہ: اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں اور اگر تم لوگوں پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے۔

تفسیری نکات

احوال منافقین

سومنافقین کی یہ کیفیت تھی کہ جیسی خبر ان کو پہنچی مشہور کر دیتے یہ نہ خیال کرتے کہ کون سی خبر عوام میں شائع کرنے کے قابل ہے اور کونسی نہیں سب خبروں کو یکساں شائع کر دیتے ہیں حق تعالیٰ اس بات پر ان کی اس آیت میں شکایت فرماتے ہیں **وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوْ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ** آگے ان کو مشہور دیتے ہیں **وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَالْإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ** کہ ان کو یوں چاہئے تھا کہ رسول اور اُولی الْأَمْرِ (یعنی جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ہے اور وہ صاحب اختیار اور تجربہ کار ہیں ان کے حوالے کر دیتے بس جن میں قوت استنباطیہ ہے وہ ان خبروں میں استنباط کرتے کہ یا یہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں اور پھر یہ منافقین ان کی رائے کے مواقع عمل کرتے۔

پس جب معمولی خبروں میں قوت استنباطیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں بلکہ اہل استنباط کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے تو جو احکام غامض اور دقیق ہیں ان میں کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ لے اور ان سے استنباط کی طرف رجوع کرنے کی اس کو ضرورت نہ ہو یہی وجہ ہے کہ احکام کے سمجھے اور اس کے اندر استنباط کرنے کو عام طور سے جائز نہیں قرار دیا گیا کہ ہر شخص ان کو کرے پس یہ حصہ قرآن شریف کا غامض ہے اور دوسرا جو تذکیر کا حصہ ہے جس میں ترغیب ترہیب اور عقائد کا بیان ہے اس میں کچھ خفاء نہیں ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **وَمَنْ يَفْتُلْ مُؤْمِنًا مِّنْهُمَا فَجُزْأُوهَا جَعَلَهُ خَالِدًا فِيهَا** (کہ اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کو عداوت اور جہل کر دے تو قاتل کی سزا یہ ہے کہ وہ قاتل ہمیشہ دوزخ میں رہے گا)

قتل عمد کی سزا

تو اس کا مطلب بعض لوگوں نے یہی سمجھا ہے جو بظاہر آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل ہمیشہ دوزخ میں رہے گا لیکن محققین نے دوسرا مطلب لیا ہے۔ یعنی اس آیت میں جو حق تعالیٰ نے فجزاء فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یعنی اس قاتل کی فی نفسہ تو سزا یہی تھی کہ قاتل ہمیشہ دوزخ میں رہے لیکن یہ سزا دی نہیں جائے گی بلکہ اس سے ہلکی سزا دی جاوے گی کہ ایک عرصہ دراز تک قاتل کو جہنم میں رکھا جاوے گا جیسے کہ دوسری نصوص قطعہ میں تصریح ہے البتہ بقول مشہور حضرت ابن عباسؓ اسی کے قاتل ہیں کہ قاتل عمد کو خلود ہوگا لیکن ان سے تاویل رجوع بھی منقول ہے یہ بات طالب علموں کے سمجھنے کی ہے۔

ہر اخبار کی اشاعت کی مضرت

میں نے یعنی جامع نے ایک مولوی صاحب سے پوچھا تھا جو بہت اخبار دیکھتے تھے تو ان مولوی صاحب نے جواب دیا کہ اس سے عقل بڑھتی ہے سیاسی امور میں معلومات پیدا ہوتی ہے میں نے کہا کہ وہی واسطے علماء منع کرتے ہیں اخبار بینی کو کہ تم سمجھتے نہیں اس پر حضرت والا نے فرمایا کہ ہر اخبار کی اشاعت کی مضرت تو قرآن مجید میں موجود ہے کہو لہ تعالیٰ وَلَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَكَوَذَّبُوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَاللَّيْ أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا مطلب ہے کہ جب ان لوگوں کو یعنی منافقین کو کسی امر جدید کی خبر پہنچتی ہے تو خواوہ موجب امن ہو یا موجب خوف تو اس خبر کو فوراً مشہور کر دیتے ہیں حالانکہ وہ بعض اوقات غلط نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہوتی ہے بعض اوقات اس کا مشہور کرنا خلاف مصلحت انتظامیہ ہوتا ہے۔ اور اگر بجائے خود مشہور کرنے کے یہ لوگ اس خبر کو رسول ﷺ کی اور جو حضرات صحابہؓ ان میں سے ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کی رائے کے اوپر رکھتے اور خود دخل نہ دیتے تو صحت و غلطی ہونے کا اور قابل تشہیر ہونے نہ ہونے کا وہ پورا اندازہ کر سکتے اس کی پوری تفصیل تو تفسیر میں دیکھ لینے کے قابل ہے یا کسی عالم محقق سے سمجھنی چاہئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اخبار کے بالعموم مشہور کرنے کی ممانعت قرآن مجید میں موجود ہے اور حدیث میں بھی وارد ہے کافی بالمرء کذبها ان يحدث بكل ما سمع (انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے کہ جو سنے (اسے آگے بغیر تحقیق کے) بیان کر دے) (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ صفحہ ۱۳۱)

وانهم اليه راجعون کا مشاہدہ کا مراقبہ کیا جائے یعنی موت کا اور موت کے واقعات راستہ دن مشاہدہ سے فرض ہے محض ظن کافی نہیں مگر چونکہ مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقاء اللہ ورجو الی اللہ کا استحضار کیا جائے اور یہ استحضار درجہ

ذوق میں لازم نہیں بلکہ اس کا ظن اور تصور بھی نماز میں کافی ہے کہ گویا میں اسی وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مر گیا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں اس وقت عالم آخرت میں حاضر ہوں اس واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا اس طرح نماز پڑھنے سے خشوع خاص ہو جائے گا اور تمام خیالات و وساوس قلب سے نکل جائیں گے واللہ تعالیٰ اعلم (جامع)

قرآن عجیب کیسیا ہے

صاحبو! قرآن عجیب کیسیا ہے۔ جس میں سارا کام مفت ہی ہے مگر ذرا سی نگہداشت ہمارے ذمہ ہے اور جتنے طریقے سلوک کے ہیں جو دوسرے مذاہب میں معمول بہا ہیں ان کی مثال اس کیسیا کے مشابہ ہے جس میں اکیس روپے خرچ کئے جائیں اور مال بیس کا بھی حاصل نہ ہو اور شریعت مقدسہ کی کیسیا ایسی ہے جس میں نفع ہی نفع ہے نقصان کچھ نہیں شریعت مقدسہ نے بڑے سے بڑے کام کو بھی ایسا آسان کر دیا ہے کہ پھول سے زیادہ ہلکا ہو گیا ہے مگر توفیق نہ ہو تو وہ بھی سخت مشکل ہے غور تو کیجئے کہ اسلام میں کیا دشواری ہے رحمت ہی رحمت اور سہولت ہی سہولت ہے مگر توفیق رفیق نہ ہو تو بہت مشکل ہے ایک تو یہ جزو ہے اجزاء ثلاثہ مذکورہ فی الحدیث میں سے جس کا بیان کرنا مقصود نہ تھا مگر چونکہ جزو مقصود الحج یهدم ما کان قبلہ کے لئے معین تھا جیسا عنقریب اس کا بیان ہوتا ہے اس لئے اس کا مفصل بیان کر دیا گیا۔

دارالکفر کی دو قسمیں

دوسرا جزویہ ہے الهجرة نھلم ما کان قبلھا کہ ہجرت بھی پہلے گناہ گرا دیتی ہے ہجرت کے معنی ہجرت دار خوف سے دار امن کی طرف کیونکہ دارالکفر دو قسم کے ہیں ایک دارالظوف جس میں شعار اسلام ظاہر کرنے پر مسلمانوں کو قدرت نہ ہو بلکہ اس اظہار میں جان و مال کا خطرہ ہو دوسرا دارالامن جہاں سلطنت تو کافر کی ہے مگر مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے کہ وہ شعار اسلام کو بے خوف و خطر ظاہر کر سکتے ہیں اور ہجرت اس دارالکفر سے فرض ہے جو دارالظوف بھی ہو اور دارالکفر دارالامن ہو وہاں سے ہجرت فرض نہیں تو جاہلوں کا یہ شبہ دور ہو گیا کہ اگر ہندوستان دارالکفر ہے تو یہاں سے ہجرت کیوں نہیں کی جاتی اس شبہ کا جواب ہمارے استاد محقق و مدقق مولانا محمد یعقوب صاحب نے خوب دیا تھا کہ مکہ معظمہ سے جبکہ وہ دارالحرب تھا پہلی ہجرت صحابہ نے حبشہ کی طرف کی جہاں اس وقت تک اسلام موجود نہ تھا پس حبشہ بھی اس وقت دارالحرب تھا اور وہاں جانے والوں کو مہاجر کہا گیا اور صحابہ وہاں ہجرت کر کے اسی واسطے گئے کہ وہ دارالامن تھا اور ان کی یہ ہجرت معتبر ہوئی اور ان کو ہجرت کا ثواب بھی ملا پھر ان صحابہ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو ان کا کالقب ذوالحجرتین ہوا پس معلوم ہوا کہ دارالامن گو دارالایمان نہ ہو بلکہ دارالکفر ہی ہو وہاں سے ہجرت کرنا فرض نہیں بلکہ وہ تو خود ہجرت گاہ بن سکتا ہے

ہاں اس میں شک نہیں کہ دارالایمان کی طرف ہجرت کرنا افضل ہے مگر اداء فرض کے لئے دارالامن کی طرف ہجرت بھی کافی ہے جو شخص دارخوف سے دارالامن کی طرف بھی ہجرت نہ کرے وہ تارک فرض ہے اور اسی کے لئے سخت وعید ہے۔ ان الذين توليهم الملكة ظالمة ظالمتهم قالوا اقيم كتم قالوا كنا مستضعفين في الارض قالوا الم تكن ارض الله واسعه فتهاجروا فيها فاوليك ما واهم جهنم وساءت مصيراً الا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلاً فاولئك عسى الله ان يعفو عنهم وكان الله عفواً غفوراً (ترجمہ) جن لوگوں کی جانیں فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر (ترک ہجرت سے) ظلم کرنے والے تھے ان سے ملائکہ نے کہا کہ تم کس کام میں تھے انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس سر زمین میں محض مغلوب اور کمزور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین فراخ نہ تھی کہ تم اس کے کسی حصہ میں ہجرت کر جاتے (اس کا ان کے پاس کچھ جواب نہ تھا) ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری بجائے بازگشت ہے ہاں مگر وہ مرد اور وہ عورتیں اور بچے جو واقعی مغلوب و کمزور تھے جو نہ کوئی تدبیر (ہجرت کی) کر سکتے تھے۔ اور نہ ان کو کوئی راہ ملتی تھی ان کو امید ہے کہ خدا تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ تو معاف کرنے والے مغفرت کرنے والے ہی ہیں (وہ عذاب کے لئے بہانہ نہیں ڈھونڈتے بلکہ اسی کو عذاب کرتے ہیں جو بلا وجہ گناہ کا مرتکب ہو) جو لوگ محض ترجمہ دیکھ کر محقق بننے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو عسی اللہ ان يعفو عنهم میں امید کے لفظ سے یہ شبہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے اس مضمون کو شک کے ساتھ کیوں بیان فرمایا ان کو تو اپنے فعل کا یقین ہے پھر یقینی بات کو یقین کے لفظ سے بیان کرنا چاہئے تھا اس کا جواب یہ ہے کہ تم نے محض ترجمہ دیکھا ہے قرآن کو سمجھا نہیں اس واسطے یہ شبہ ہوا تم کو چاہئے کہ پہلے یہ بھی دیکھ لو کہ یہاں مشکلم کون ہے اور مخاطب کون ہیں سو ظاہر ہے کہ مشکلم حق تعالیٰ شانہ احکم الحاکمین ہیں۔

شہانہ محاورات

پس خدا تعالیٰ کے کلام کو شہانہ محاورات پر منطبق کر کے دیکھو یہ عامیانہ محاورات بر منطبق نہ کرو اور شہانہ محاورات میں وعدہ جازمہ کے لئے بھی امید ہی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اسی سے ڈپٹی صاحب دہلوی کے ترجمہ کی غلطی معلوم ہو گئی جنہوں نے دہلی کی بازاری زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا چنانچہ ایک جگہ ٹاک ٹوئیاں مارنا استعمال کیا ہے اگر جگہ کبڑی کھیلتا لکھا ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ الفاظ شاعری زبان میں استعمال نہیں ہوئے مترجم قرآن کو لازم ہے کہ ترجمہ میں شہانہ طرز و انداز کو ہاتھ سے نہ دے جو قرآن کا خاص طرز ہے عربی دان طبقہ خوب جانتا ہے کہ قرآن کی زبان کیسی پر شوکت اور کس قدر باسلطوت ہے دوسرے یہ دیکھو کہ مخاطب کلام کے کون ہیں سو ظاہر ہے کہ مخاطب بندے ہیں اور بندہ کا فرض یہ ہے کہ اخیر دم تک امید وہم ہی میں رہے کسی وقت

جلال شامی سے بے خوف نہ ہو اسی لئے حکام مقدمات میں اخیر تک فریقین کو امید وہم ہی میں رکھتے ہیں فیصلہ کے دن ظاہر ہوتا ہے کہ کون کامیاب ہے اور کون ناکام ایسے ہی یہاں بھی فیصلہ کے دن سے پہلے یعنی قیامت کے دن سے پہلے بندوں کو امید وہم ہی میں رکھا گیا ہے اتنا فرق ہے کہ حکام تو اپنی غرض کے واسطے ایسا کرتے ہیں اور حق تعالیٰ نے بندوں کے فائدہ کے لئے ایسا کیا ہے کوینکہ بندے کو اگر کسی وقت اطمینان ہو جائے کہ میں جنتی ہوں تو وہ جرائم سے نڈر ہو جائے گا اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں جہنمی ہوں تو وہ ناامید ہو کر بھلائی سے بالکل دور جا پڑے گا اور اس میں علاوہ اس کے نقصان کے نظم عالم کے درہم برہم ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے کیونکہ کثرت جرائم سے نظام کا درہم برہم ہونا ظاہر ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ

اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۗ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

غَفُورًا رَحِيمًا ۗ وَلَا تَجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَانًا أَلِيمًا ۗ

ترجمہ: بے شک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے واقع کے موافق تاکہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلادیا ہے اور پ ان خائنوں کی طرفداری کی بات نہ کیجئے اور آپ استغفار فرمائیے بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب دہی کی بات نہ کیجئے جو کہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتے جو بڑا خیانت کرنے والا بڑا گناہ کرنیوالا ہو۔

تفسیری نکات

ایک اشکال کا جواب

اس سے ظاہری نظر میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ سے خائنین کی طرفداری صادر ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے آپ کو اس سے نہی کی گئی مگر سب کا عمدہ جواب یہ ہے کہ نہی اور امر میں زمانہ استقبال کا ہوتا ہے ماضی اور حال کا نہیں ہوتا تو لَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا کے معنی یہ ہیں کہ آپ آئندہ کبھی ان کے طرفدار نہ ہوں جیسے کہ اب

تک نہیں ہوئے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ طرفدار ہوئے ہوں بلکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ جیسے آج تک نہیں ہوئے آئندہ بھی یہ طرز رکھے اس کی ایسی مثال ہے جیسے وَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُضْتَرِّينَ فرمایا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ نعوذ باللہ آپ کو شبہ تھا؟ اور آپ سے منہیات کے صادر نہ ہونے کی صاف دلیل یہ ہے جو ایک جگہ فرماتے ہیں وَكُلُّوْا اَنْ تَبْتَغِيَ لِقَدْ كَذَّبْتَ تَرْكُنُ الْبُيُوتِ شَيْئًا وَّلَيْلًا یعنی اگر ہم آپ کو نہ سنبھالے رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف کسی قدر مائل ہو جاتے تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور کو غیر حق کی طرف کبھی میلان نہیں ہوا تو اب کیا شبہ رہا غرض حضور ﷺ کی عصمت میں کبھی ذرا بھی فتور نہیں پڑا۔ (الفضل العظيم)

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ یعنی وہ آپ کو غلطی میں کیسے ڈال سکتے ہیں آپ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور ایسی ایسی باتیں سکھائی ہیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے اور اس آیت میں جو تین چیزوں کا علم دینا مذکور ہے کتاب اور حکمت اور مَا لَمْ يَكُنْ يَعْلَمُ سمجھ میں یوں آتا ہے کہ علوم تین قسم کے ہیں ایک کا نام کتاب رکھا اور ایک کا حکمت اور ایک کو مَا لَمْ يَكُنْ يَعْلَمُ سے تعبیر فرمایا تفصیل اس کی یہ ہے کہ علم کی اصل میں دو قسمیں ہیں ایک علم احکام اور ایک علم واقعات اور یہ تقسیم خصوصاً جناب رسول مقبول ﷺ کی شان میں تاویل کرنے سے بہت زیادہ سمجھ میں آ جائے گی کیونکہ حضور ﷺ صاحب سلطنت بھی تھے تو حضور کو دو قسم کے علم کی ضرورت تھی۔ ایک حکم کے علم کی اور ایک واقعات کے علم کی جیسے حکام کو دونوں باتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے کیونکہ اگر واقعہ معلوم نہ ہو تو نرے قانون سے کیا ہوتا ہے یا اس کا عکس ہو کہ قانون نہ معلوم ہو تو صرف واقعہ معلوم ہو جانے سے کیا ہوتا ہے۔ فیصلہ میں دونوں ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے واقعہ کا بھی علم ہو اور اس کے حکم کا بھی علم ہو لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور ﷺ کو ہر واقعہ کا علم وحی سے عطا ہوا ہو خاص خاص ضروری واقعات کا علم دینا مراد ہے جیسے یہاں اس واقعہ کا علم ہے جس میں منافقین نے چوری کا الزام بے قصور پر لگایا تھا۔ تمام واقعات کا علم مراد نہیں ہے چنانچہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے فَلَعَلَّ بَعْضُكُمْ يَكُوْنُ الْحَنِّ بِحُجَّةٍ مِنْ بَعْضٍ فَاِذَا اَمَرْتُمْ لِحَدِيْمٍ بِشَيْءٍ فَاِنَّمَا اِقْطَعْ لَهٗ بِقِطْعَةٍ مِنْ نَارٍ (پس آپ کو تمام واقعات کا علم نہیں دیا گیا)

رسول اکرم ﷺ کی عصمت

ایک جگہ فرماتے ہیں وَلَوْ لَا اَنْ تَبْتَغِيَ لِقَدْ كَذَّبْتَ تَرْكُنُ الْبُيُوتِ شَيْئًا وَّلَيْلًا یعنی اگر ہم آپ کو نہ سنبھالے رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف کسی قدر مائل ہو جاتے تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو غیر حق کی طرف کبھی میلان نہیں ہوا تو اب کیا شبہ رہا غرض حضور ﷺ کی عصمت میں کبھی ذرا بھی فتور نہیں پڑا اس وقت مختصر میں نے بیان کر دیا ہے اپنی تفسیر میں میں نے اس کو مفصل لکھا ہے یہ تو پہلا رکوع اور دوسرا رکوع ہے

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ ۗ (اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا) اس سے بھی آپ کی عصمت میں شبہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ فرماتے ہیں یعنی اگر حق تعالیٰ کا آپ پر فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ارادہ کرتا ایک گروہ یہ کہ آپ کو غلطی میں ڈال دے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ارادہ کا مرتبہ بھی نہیں ہوا کیونکہ ہم اس کو کہتے ہیں جس کے بعد صدور فعل کا ہو جاوے اور وہ مرتبہ عزم کا ہے اور بعض نے ہم کو عزم سے قبل کہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ قرآن میں وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهَا وَهَمَّ بِهَا (اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال عزم کے درجہ میں جم رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا خیال ہو چلا تھا) بھی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ہم بالمرءة (آپ کے دل میں اس عورت کا خیال ہو چلا تھا) اور انبیاء چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لئے عزم معصیت ان سے محقق نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اس کے قائل ہو گئے کہ ہم عزم سے پہلے ہوتا ہے۔

قرآن پاک کے ایک مشکل مقام کی تفسیر

مگر محققین نے کہا ہے کہ اس کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ آگے لَوْلَا أَنْ ذَا بُرْهَانَ رَبِّهَا (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) ہے جو شرط موخر ہے ہَمَّتْ بِهَا کی یعنی اگر برہان رب نہ دیکھتے تو ارادہ کر لیتے تو یہاں ہم کا اثبات ہی نہیں جو اس کی ضرورت ہو کہ ہم کو عزم سے قبل مانا جاوے بلکہ ہم کی نفی مقصود ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّؤَالَ وَالْفِطْنَةَ (اسی طرح ہم نے ان کو علم دیا تا کہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو دور رکھیں) تو اس میں ان سے صغائر اور کبائر کی نفی فرما رہے ہیں یہ قرینہ ہے اس کا کہ ہم کی یہاں نفی کی جارہی ہے نہ کہ اثبات اور گو بعض نے کہا کہ لولا کی جزا مقدم نہیں ہوتی لیکن اول تو اس میں اختلاف ہے دوسرے اگر مان بھی لیں کہ لولا کی جزا مقدم نہیں ہوتی تو یہ لَوْلَا أَنْ ذَا بُرْهَانَ رَبِّهَا (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) دال علی الشرط (شرط پر دلالت کرنے والا) ہوگا اور شرط محذوف مقدم ہوگی بہر حال یہاں ہم کا اثبات نہیں اس لئے ہم کو عزم سے قبل ماننے کی بھی ضرورت نہیں غرض ہم کا مرتبہ اکثر علماء کے نزدیک وہ ہے جس کے بعد فعل کا صدور ہوتا ہے لیکن حضور ﷺ کے متعلق اس کا تحقق نہیں ہوا کیونکہ یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کا آپ پر فضل نہ ہوتا تو ایک جماعت ان میں سے ایسا ارادہ کر لیتی تو حق تعالیٰ کا فضل مانع ہے پھر مجال ہی کیا ہے کہ کوئی ایسا ارادہ کر سکے اور اگر کسی مفسر نے اس کے خلاف کہا ہے تو ہم قرآن کے مقابلہ میں اس کا اعتبار نہ کریں گے بعض تفاسیر میں بعض باتیں بلا سند نقل ہو گئی ہیں وہ قابل اعتبار نہیں اسی طرح اقلک کے قصہ میں بھی بعض تفاسیر محض بے سند نقل ہو گئی ہیں۔ چند مقامات

قرآن شریف میں مشکل ہیں ان میں سے ایک یہ مقام بھی ہے چنانچہ اس مقام پر جو اشکال تھا وہ رفع ہو گیا۔ غرض ان آیات میں ان منافقین کی شرارت اور ان کی تدابیر کا بے سود ہونا بیان کیا گیا ہے آگے اس کی تسمیح ہے وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الآیہ) یعنی وہ آپ کو غلطی میں کیسے ڈال سکتے ہیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور ایسی باتیں سکھلائی ہیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے اور اس آیت میں جو تین چیزوں کا علم دینا مذکور ہے کتاب اور حکمت اور عالم تکن تعلم (اور باتیں جن کا آپ کو علم نہ تھا) سمجھ میں یوں آتا ہے کہ علوم تین قسم کے ہیں ایک کا نام کتاب رکھا اور ایک کا حکمت اور ایک کو مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (وہ باتیں جن کا آپ کو علم نہ تھا) سے تعبیر فرمایا:

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر کتاب اور علم کی باتیں بھی نازل فرمائیں اور آپ کو وہ باتیں بتلائی ہیں جو آپ ﷺ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔

مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ کی جو تصوف کے خاص شعبہ اسرار سے تفسیر کی گئی ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ اب تو قواعد سے معلوم ہو گیا کہ اس سے وہ علوم مراد ہیں جو مقصود ہیں شریعت کے چنانچہ حق تعالیٰ رسول مقبول ﷺ سے فرماتے ہیں وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَيْكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ظاہر ہے کہ انزل سے مقصود ان علوم کا سکھانا ہے جو کتاب و حکمت میں موجود ہیں پس مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (وہ باتیں جن کی آپ کو خبر نہ تھی) میں اس کتاب و حکمت کے متعلق اس کا بیان ہے کہ یہ آپ کو پہلے سے معلوم نہ تھا انزل کے بعد معلوم ہوا اسی طرح ایک مقام پر امت کو خطاب ہے۔ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا وَمِنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمُ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول کو کہ تلاوت ہماری آیتوں کی تمہارے سامنے کرتا ہے اور تم کو پاک کرتا ہے اور وہ چیزیں تم کو بتلاتا ہے جن کو تم نہیں جانتے ہو) یعنی اسے امتیو تمہیں سکھاتے ہیں وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے) ان دونوں کا ایک ہی مقصد ہے اور مضمون و مدلول بھی دونوں کا ایک ہی ہے اور جس طرح يُعَلِّمُكُمُ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (تم کو وہ چیزیں بتلائی جن کی آپ کو خبر نہیں) کو بعض نے تصوف پر محمول کیا ہے یہاں بھی يُعَلِّمُكُمُ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (وہ چیزیں تم کو بتلاتے ہیں جن کی تم کو خبر نہیں ہے) تصوف پر محمول کیا ہے مگر واقع میں وہاں بھی علمک (سکھائی تجھ کو) سے علم مکاشفہ مراد نہیں کہ وہ مقصود نہیں بلکہ ایسا علم مراد ہے جس کی اشاعت کا اور نشر کا اہتمام واجب ہے اور یہاں یعلمکم (سکھاتا ہے تم کو) سے یہی علوم مقصود مراد ہیں۔ اب معلوم ہو گیا کہ علوم مکاشفہ سے تفسیر کرنا صحیح نہیں کیونکہ علم تصوف باعتبار اپنے ایک شعبہ خاص یعنی علوم معاملہ کے گو علوم مقصودہ میں سے ہے کیونکہ یہ بھی نص کا مدلول ہے جیسا اہل فن جانتے ہیں مگر ان لوگوں نے غلطی کی کہ تصوف کی جو حقیقت یہ سمجھے ہیں یعنی علوم مکاشفہ و اسرار وہ نہ نص کا مدلول ہے اور نہ تصوف کا اور اسی لئے

(ان لوگوں کو بھی ہمت نہ ہوئی کہ اس کو کتاب و حکمت میں داخل کرتے تو انہوں نے کہا الا وَا سے مَا لَمْ يَكُنْ تَعْلَمُ (وہ باتیں جن کی تم کو خبر نہ تھی) میں داخل کر دو اب اس کا حاصل انہی کی تسلیم پر یہ ہوا کہ تصوف کتاب و حکمت میں بلا واسطہ بھی داخل نہیں اور بواسطہ بھی ان کا مدمول نہیں حالانکہ تصوف میں جو اصل چیز ہے یعنی علم معاملہ وہ دیننا کتاب و حکمت کا مدلول ہے کیونکہ تصوف کا علم معاملہ کے سب مسائل اور احکام اور آداب اور قواعد یہ سب قرآن و حدیث ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنے معاملہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ درست کرنا تعمیر النظاہر و الباطن یعنی اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح کرنا درحقیقت یہ سب فقہ ہی میں داخل ہے جس کا کتاب و حکمت میں داخل ہونا معلوم و مسلم ہے چنانچہ امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تعریف یہی کی ہے معرفۃ النفس مالھا و ما علیھا کہ نفس کا یہ پہنچانا کہ اس کے لئے کیا چیزیں نافع ہیں کیا چیزیں مضر ہیں سو یہ تعریف ظاہر و باطن دونوں قسم کے احکام کو عام ہے البتہ علم مکاففہ نہ تو نافع ہے نہ مضر مثلاً کسی کو تجمد و امثال تو حید و جودی تنزلات ستہ وغیرہ منکشف نہ ہوں تو ذرا بھی قرب الہی میں مانع نہیں لیکن اگر معاملہ درست نہ ہو تو قرب حاصل نہیں ہو سکتا چنانچہ حضرت جنید کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا گزری فرمایا کہ فنیت الرموز و الاشارات و نفدت الحقائق و العبادات و ما نفعنا الا رکیعات فی جوف الیل (یعنی حقائق و معارف متعارفہ سب قیل ہو گئے صرف چند رکعتیں جو پچھلی رات میں پڑھ لیا کرتا تھا وہ کام آئیں اور علمی تحقیقات کچھ کام نہ آئیں حالانکہ ان کے پاس کتنے بڑے علوم تھے مگر وہ فقہ نہیں تھے بلکہ علوم مکاففہ تھے جو کچھ بھی کارآمد نہیں ہوئے علوم مکاففہ اور علوم معاملہ کی ایسی مثال ہے جیسے دیوار سے پیچھے ایک بادشاہ ہے اور کسی طریقہ سے ہماری نگاہ دیوار توڑ کے اس تک جاسکتی ہے جیسے اس زمانہ میں بجلی کے ذریعہ سے بکس کے اندر کار پر کار نظر آتا ہے اور بکس نظر نہیں آتا۔ بجلی شعاع کو اجسام ثقیلہ کے پار کر دیتی ہے اس لئے درمیانی چیز نہیں دکھائی دیتی اور جو اس کے آگے ہے وہ نظر آئے گا چنانچہ یوں ہی کسی طریقہ سے دیوار کے پیچھے بادشاہ نظر آنے لگا اور ایک شخص وہ ہے جسے بادشاہ تو نظر نہیں آتا مگر وہ خالی نام سن کر اطاعت کرتا ہے اور وہ پہلا شخص بادشاہ کو دیکھ کر اطاعت کرتا ہے تو ان دونوں میں بتلائے کون زیادہ مقبول ہوگا آیا وہ جو بغیر دیکھے اطاعت کرتا ہے یا وہ صاحبو! بادشاہ کے دیکھنے سے گویا تو زیادہ ہوگا مگر قرب نہیں بڑھے گا کیونکہ قرب دو قسم کا ہوتا ہے ایک رضا و مقبولیت کا دوسرا معائنہ کا سو یہ دوسرا درجہ خود مقصود بالتحصیل نہیں کیونکہ یہ اس کا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے قبضہ و اختیار سے باہر ہے گو اس کے بعض افراد جو موہوب ہیں بدالالت نصوص سب درجات مکسوبہ سے افضل ہوں جیسے نبوت و ولایت موہوبہ مگر مامور بہ نہیں اور یہ مکلف ہے امور اختیار یہ کا ہاں اسے ایک اصطلاح پر وصول کہہ سکتے ہیں تحصیل نہیں کہہ سکتے۔ اور مامور بہ تحصیل ہے وصول مامور بہ نہیں اور جو قرب بمعنی مقبولیت و اجبۃ التحصیل ہیں تحصیل مامور بہ پر مرتب ہوتا ہے سو دنیا میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات

کے اسرار کا منکشف ہونا یہ قرب مقصود نہیں نہ اس پر شمرہ مرتب ہوگا جو قرب مقصود و مامور بہ جو وہ اطاعت و اعمال میں ہوتا ہے اور ان کا شمرہ آخرت میں مرتب ہوگا غرض قرب کی اس قسم میں مقصودیت بالکل نہیں ہے مقصود تو وہ شئی ہے جس کی تحصیل کے لئے کوئی طریقہ شرعاً وضع کیا گیا ہو اور اس کی تحصیل کے لئے طریقہ وضع نہیں کیا گیا اس لئے یہ مقصود نہیں ہو سکتا اور اگر یہ مکاشفہ مقصود ہوتا تو عالم ملکوت مومنین کو نظر آتا تا نا فرمانوں کو نظر نہ آتا۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ جنگ بدر میں شیطان مثل انسان آیا اور اس نے کفار کو بہکایا لیکن فَلَمَّا تَرَأَتْهُ الْفِتْنَةُ نَكَبَتْ عَلَىٰ عَقَبَيْهَا یعنی جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں اور شیطان نے فرشتوں کو دیکھا تو بھاگا کہ انسی اری مالا ترون میں وہ شے دیکھ رہا ہوں جو تمہیں دکھائی نہیں دیتی تو دیکھتے ملائکہ کے منکشف ہونے سے ابو بکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی محروم رہے اور شیطان لعین کو یہ مکاشفہ حاصل ہوا اس سے معلوم ہوا کہ کشف مقصود نہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ قیامت میں حقائق منکشف ہو جائیں گے اور قیامت میں وہ خوب آنکھوں والے ہو جائیں گے چنانچہ ارشاد ہے اَنۡبِئُوهُمۡ بِمَوۡعِذِ رَبِّہِمْ یَۡوۡمَآءَ اَیۡسُرَ یَۡوۡمَآءَ اَتُوۡنَہُمۡ لٰکِنَ الظَّالِمِیۡنَ الْیَۡوۡمَ فِیۡ ضَلٰلٰتِہُمۡ یُحٰیۡرُوۡنَ (کیسے شنوا ہو جائیں گے لیکن یہ ظالم آج صریح غلطی میں ہیں) اگر مکاشفات مقصود ہوتے تو مسلمانوں کو خوب حاصل ہوتے اس سے معلوم ہوا کہ مقصود صرف اعمال ظاہری و باطنی یعنی نماز روزہ وغیرہ اور توکل وغیرہ ہیں کہ قلب کو اعمال باطنہ سے اور جوارح کو اعمال ظاہرہ سے آراستہ کیا جاوے بس یہی تصوف ہے گو بعض نے اپنی اصطلاح و عرف میں تصوف صرف فن اصلاح باطن کا نام رکھ لیا ہے جو لوگ علوم دینیہ اور اس کے حاملین یعنی علماء کو نظر تحقیر سے دیکھتے ہیں وہ ذرا اس آیت کو تو دیکھیں جس کو میں نے تلاوت کیا ہے دیکھو اس میں حق تعالیٰ نے علم کتاب و حکمت کو فضل عظیم فرمایا ہے اس سے مراد یقیناً علوم دینیہ ہیں جو تمام علوم دنیا سے افضل ہیں اور افضل العلوم اور اشرف العلوم ان ہی کو کہہ سکتے ہیں۔ جب یہ علوم افضل ہیں تو اس علم کے علماء بھی افضل ہوں گے۔ اب جو لوگ علماء کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں وہ ذرا بتلائیں تو کہ ان بیچاروں نے ان کا کیا تصور کیا ہے کچھ نہیں بلکہ وہی بات ہے جس کو حق تعالیٰ نے فرمایا وَمَا نَقَمُوۡا مِنْہُمْ اِلَّا اَنْ یُّؤْمِنُوۡا بِاللّٰهِ الْعَزِیۡزِ الْحَمِیۡدِ الَّذِیۡ لَہٗ مُلٰکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیۡدٌ ؕ

یعنی کافروں نے مسلمانوں میں کوئی عیب نہیں پایا۔ بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو غالب اور مزادار حمد ہے وہ کہ اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی تو مطلب یہ ہوا کہ وہ بلاوجہ محض عناد کی بناء پر ان پر طعن کرتے ہیں اسی مضمون پر کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

ولا عیب فہم غیر ان سیو فہم بہن فلول من قراع الکتاب

(ان میں سوائے اس کے کوئی عیب نہیں ہے کہ ان کی تلواروں کی دھار شمشیر زنی سے گر گئی ہے) صاحبو! اسی طرح علماء کا بس یہی جرم ہے کہ انہوں نے علم دین حاصل کر لیا ہے اور آج کل لوگوں نے علم دین کو حقیر سمجھ

رکھا ہے افسوس اس تحقیر کی وجہ سے لوگوں کی مشغولی علم دین سے ٹوٹ گئی ہے اور جو بچارے اللہ کے نیک بندے مشغول بھی ہوتے ہیں تو ان پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ مولوی تنگ خیال ہیں علماء کو وسیع الخیال ہونا چاہئے۔

اور جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا بعد اس کے اس کو امر حق واضح ہو چکا تھا۔

اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے

حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے یا نہیں اس کے جواب کے لئے آپ نے چار دفعہ کلام مجید ختم کیا جب یہ آیات خیال میں آئی وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ جِس سے اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا ثابت ہوتا ہے بس جو کچھ محنت اس آیت کے ڈھونڈنے میں پڑی وہ صرف حضرت امام شافعیؒ پر پڑی اس کے بعد سب کے لئے راستہ صاف ہو گیا اور اب تک اس مسئلہ میں ہر عالم اسی آیات کو پیش کرتا چلا آتا ہے کسی کو پھر کوئی زحمت ہی نہیں اٹھانی پڑ۔

فرماتے ہیں وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ۝
دوسری جگہ ارشاد ہے فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

بعثت محمدیہ ﷺ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان مواقع میں فضل اللہ ورحمة کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے تو معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اگر محمد ﷺ کو مبعوث فرما کر خدا تعالیٰ تم پر اپنا فضل ورحمت نہ فرماتے تو تم ناکام اور محروم رہتے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعثت محمدیہ سے تم پر رحم و کرم نہ فرماتے تو تم شیطان کا اتباع کرنے لگتے سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے اس جگہ ایک اشکال طالب علمی ہو سکتا ہے کہ الا قلیلا کے بڑھادینے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بدوں بعثت محمدیہ کے بھی راہ مستقیم پالیتے ہیں جواب یہ ہے کہ اتباع سے مراد اتباع مطلق ہے نہ کہ مطلق اتباع پس معنی یہ ہوئے کہ تم شیطان کے پورے تابع ہوتے۔ صرف بعضے لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے عقل کامل و سلیم عطا فرمائی ہے وہ البتہ کامل اتباع شیطان کا نہ کرتے یعنی ایسے امور میں جن میں عقل کام دے سکتی ہے صرف ان میں اتباع شیطان کا خاص ایسے لوگ نہ کرتے گو مطلق اتباع شیطان سے یہ بھی نہ بچتے کیونکہ جن میں عقل کام نہیں دیتی ان میں کوئی مانع اتباع شیطان سے نہ تھی (راس الرہین)

تفصیل امور مذکورہ کی یہ ہے کہ بعض احکام شریعت کے بدیہی اور ظاہر بھی ہیں تو ذکر کے لئے آسان ہے اجتہاد کے لئے ہر ایک کو آسان نہیں اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ واقعات جو کہ احکام کی برابر غامض

(باریک) نہیں ان کے باب میں فرماتے ہیں وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوْ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ سُبْحَانَ اللَّهِ إِنَّا كُنَّا عَلَيْهِمْ غَافِلِينَ (باریک) جب کہیں لشکر بھیجتے اور وہاں سے کوئی خبر آتی تو وہ اس کو مشہور کر دیتے اس پر یہ آیات نازل ہوئی یعنی جب ان کے پاس کوئی خبر امن کی یا ڈر کی پہنچتی ہے تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر اس کو رسول اور اپنے اہل حکومت کے حوالے کرتے تو اہل تحقیق ان میں سے ان کی تحقیق کر لیتے (کہ یہ خبر قابل اشاعت ہے یا نہیں) پس جبکہ معمولی خبروں میں قوت استنباطیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص اس کا اہل نہیں تو احکام جو کہ غامض (باریک) اور دقیق ہیں ان میں کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ لے اب یہ سمجھنا کیا کوئی آسان بات ہے قرآن شریف میں مہاجرین کی نسبت جنہوں نے مکہ سے مدینے کو ہجرت کی تھی فقراء کا لفظ وارد ہوا تھا۔ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ (ان حاجت مندوں مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے جدا کر دیئے گئے ہیں) اس سے فقہانے استنباط کیا کہ استیلا (غالب آنا) کفار سب ہوتا ہے اس کی ملک کا کیونکہ مہاجرین کے اموال اہل مکہ کے پاس رہ گئے تھے تو اگر وہ ان کی ملک نہ ہو جاتے بلکہ انہیں کی ملک میں رہتے تو ان کو فقراء کیوں کہا جاتا۔ فقیر تو اسی کو کہتے ہیں جس کی ملک میں کچھ نہ ہو یہ ایک جزئی مثال کے طور پر ہے ورنہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ اجتہاد اور استنباط بہت مشکل ہے غرض علوم اجتہاد یہ بھی علم دین ہیں اور اس سے ایک مسئلہ یہ بھی ثابت ہوا کہ علوم اجتہاد یہ بھی نازل من اللہ (اللہ کی طرف سے اترے) ہیں اور اس کی شرح فقہاء کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ القیاس مظهر لا مثبت (قیاس حکم شرعی کو ظاہر کر دیتا ہے اس کے لئے مثبت نہیں) تو یہ بھی منزل من اللہ ہے (اللہ کی طرف سے نازل کیا ہوا) اور ایک اور مسئلہ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ فرماتے ہیں وَلَا تَلْمِزُوا عِلْمَ اللَّهِ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ لَكُمُ الْكَيْفُؤُةُ مِنْكُمْ لَئِنْ كُنْتُمْ إِلَّا رِجَالًا سَلِيمًا (یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت آپ پر نہ ہوتی تو ایک گروہ ان میں سے آپ کو غلطی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا) تو گمراہی سے بچانے والا افضل کو فرمایا اور اس آیت سے کہ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ عَظِيمًا (آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے) معلوم ہوا کہ فضل علیم دین ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا تو ثابت ہوا کہ علم دین میں یہ خاصیت ہے کہ وہ گمراہی سے بچاتا ہے اور جو علم دین جان کر بھی عملی غلطی کرے تو اس کو صاحب علم نہ کہا جاوے گا۔

علم دین سے دین و دنیا کا نفع

اور ایک مسئلہ یہ مستنبط ہوا کہ علم دین سے دین اور دنیا دونوں کو نفع ہوتا ہے اور یہ اس طرح کہ اول آپ کو اس واقعہ میں علم دینے کا ذکر فرمایا اور پھر اس کے لئے دو لفظ فرمائے ایک فضل اور ایک رحمت چنانچہ ارشاد ہے وَلَا تَلْمِزُوا عِلْمَ اللَّهِ وَرَحْمَتُهُ أَرْخٌ وَأَرْضٌ لَئِنْ كُنْتُمْ إِلَّا رِجَالًا سَلِيمًا (آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے) معلوم ہوتا ہے کہ فضل کا استعمال تو اکثر منافع دنیویہ

میں آیا ہے اور رحمت کا استعمال منافع اخروی میں چنانچہ مسجد میں داخل ہونے کا وقت جو کہ منافع آخرت حاصل کرنے کا ہے اس کا ذکر رحمت کے لفظ سے وارد ہے اللھم انی اسئلك من رحمتك (یعنی اے اللہ آپ سے آپ کی رحمت کی درخواست کرتا ہوں) اور مسجد سے نکلنے کا وقت جو کہ منافع دنیوی حاصل کرنے کا ہے اس کا ذکر لفظ فضل سے ہے اللھم انی اسئلك من فضلك (اے اللہ آپ سے آپ کا فضل مانگتا ہوں) اور ارشاد ہے فاذا قضیت الصلوة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت اجازت ہے کہ تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو) اور لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم (تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ معاش کی تلاش کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے) تو جب فضل سے مراد منافع دنیوی ہوئے اور رحمت سے مراد منافع اخروی اور علم دین کے لئے دونوں لفظ لائے گئے تو معلوم ہوا کہ علم دین سے دین اور دنیا دونوں کو نفع ہوتا ہے مگر اس میں ای کفعلی ہوتی ہے اس کو میں ذکر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگ ان منافع دنیا کو بھی احکام کا ثمرہ مقصود سمجھتے ہیں یہ غلط ہے اور اگر اس سے شبہ ہو کہ بعض علماء نے کہا کہ احکام کے اندر منافع دنیوی بھی ہیں تو سمجھ لو کہ ان کی یہ غرض نہیں ہے کہ احکام سے دنیا کے منافع مقصود ہیں ہرگز نہیں بلکہ مقصود تو احکام سے صرف حق تعالیٰ کی رضا اور جنت ہی ہے ہاں دنیا کے منافع بھی بطور خاصیت کے خود بخود اس سے حاصل ہو جاتے ہیں۔

تنزیل کتاب کا مفہوم

حق تعالیٰ نے جو کتاب نازل فرمائی اس سے مقصود محض تنزیل ہی نہ تھی بلکہ تنزیل سے مقصود تعلیم تھی یہ نکتہ ہے عنوان کے جدا جدا ہونے میں آگے فرماتے ہیں الكتاب والحكمة ایک عنوان یہ ہے کہ اس کے بعد اس کو مالم تکن تعلم سے تعبیر فرمایا ایک عنوان یہ ہے اول عنوان میں ذات کا بیان ہے کہ وہ ایک کتاب حکمت کی اور دوسرے میں اس کے ایک وصف کا اول عنوان سے معطی کی وقعت و عظمت بتلانا ہے اس کے لئے اس کو کتاب و حکمت فرمایا اور دوسرے عنوان سے اس کے ایک خاص وصف یعنی مالم تکن تعلم سے ایک خاص امتنان پر دلالت کرنا ہے کہ ہم نے آپ کو ایسی چیز دی ہے کہ اس کے قبل آپ کو اس کی خبر بھی نہ تھی ہمارے خبر کرنے سے خبر ہوئی تو پھر ذات میں بھی دو عنوان ہیں۔

کتاب و حکمت

کتاب اور حکمت بعض نے اس کا فرق یہ بیان کیا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد سنت (حدیث) پھر اس پر ایک سوال پیدا ہوا ہے کہ اس پر انزل کا حکم فرمایا گیا ہے اور حکمت کو اگر سنت کہا جاوے تو یہ

نازل نہیں ہوئی پھر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تنزل عام ہے نزول ظاہری و نزول باطنی کو میں کہتا ہوں کہ ایک توجیہ یہ بھی لطیف ہے کہ خود کتاب ہی کو عام کہا جاوے قرآن و حدیث دونوں کے لئے چنانچہ حدیث میں ہے کہ اقص ینسا بکتاب اللہ یعنی ایک صحابی نے حضور ﷺ سے ایک مقدمہ میں عرض کیا تھا کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے موافق فیصلہ فرمادیجئے پھر آپ نے جو فیصلہ فرمایا قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں مگر اس پر بھی آپ نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ بھائی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر چیز قرآن میں ہو سو آپ نے یہ نہیں فرمایا بلکہ خود ہی فیصلہ فرمادیا اور پھر فیصلہ کرانے والے نے بھی کوئی شبہ نہیں کیا کہ یہ فیصلہ تو قرآن میں نہیں اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ دونوں کو عام ہے۔ قرآن کو بھی حدیث کو بھی اسی طرح حکمت کو بھی سنت کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں یہ بھی دونوں کو عام ہے اور یہ عطف تفسیری ہے کتاب کا کہ ایسے علوم دیئے جو کتاب و حکمت دونوں کے ساتھ متصف ہیں رہا یہ کہ جب کتاب و حکمت دونوں کو عام ہے تو سنت پر انزلنا کیسے صادق آوے گا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ انزال کو بھی عام کہا جاوے گا کہ انزال دو قسم کا ہے حسی اور معنوی چنانچہ اس بناء پر وحی کی بھی دو قسمیں ہیں ایک جلی جو بواسطہ جبرئیل کے آتی ہے اور ایک معنوی کہ براہ راست قلب پر القاء ہوتا تھا۔ بس اسی طرح تنزیل کی بھی دو قسمیں کہیں گے اور جس طرح قرآن و حدیث کو اس میں اشتراک ہے دونوں پر تنزیل کا حکم صحیح ہے جیسا ابھی مذکور ہوا اسی طرح ان دونوں کو ایک اور وصف میں بھی اشتراک ہے وہ یہ کہ حدیث کا محل ورود تو سب کے نزدیک قلب ہی ہے مگر ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا محل ورود بھی قلب ہی ہے وہ آیت یہ ہے **فَاِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ** پس حکم تنزیل اور محل تنزیل یعنی قلب قرآن و حدیث دونوں کو شامل ہو گیا اور **نَزَّلَهُ عَلٰی قَلْبِكَ** پر ایک شبہ کیا ہے طہرین نے جو کہتے ہیں کہ الفاظ قرآن کے نزل نہیں کیونکہ الفاظ کا محل و رود تو مسامح ہیں نہ کہ قلب قلب پر صرف معنی کا ورود ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے معانی تو منزل من اللہ ہیں الفاظ خود حضور اقدس ﷺ کے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ تنزیل علی القلب کے حکم سے نفی لازم نہیں آتی تنزیل علی السامع کی دونوں جمع ہو سکتے ہیں باقی تنزیل علی القلب کا عنوان کیوں اختیار کیا گیا۔

زبانوں کی دو قسمیں

سو اس میں نکتہ یہ ہے کہ زبانیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک مادری اور ایک مکتب ان دونوں کے احکام میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ زبان جو کہ مکتب ہوتی ہے اس کی خاصیت تو یہ ہے کہ جب اس زبان میں آپ سے کوئی گفتگو کرتا ہے تو اول التفات اس میں الفاظ کی طرف ہوتا ہے جس کا مد رک سمع ہے اور اس کے بعد معانی کی طرف اور مادری زبان میں اس کے برعکس ہوتا ہے کہ اول ہی سے التفات معانی کی طرف ہوتا ہے۔ پھر بعض

اوقات الفاظ کی طرف چنانچہ میں جو مضمون اس وقت آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں یہ آپ کی مادری زبان میں ہے اس لئے اول التفات آپ کو معانی کی طرف ہو رہا ہے اور پھر الفاظ کی طرف قصد کرنے سے ہوتا ہے تو نکتہ عَلٰی قَلْبِكَ میں اس پر دلالت ہے کہ قرآن آپ کی مادری زبان یعنی عربی میں ہے تاکہ آپ کے فہم میں کوئی کمی نہ رہے اور گو عربی بھی اس معنی کو مفید ہو سکتا تھا مگر یہ خاص بات نہ پیدا ہوتی جو عَلٰی قَلْبِكَ میں پیدا ہوئی کہ تصریح ہو گئی کہ اول التفات آپ کے قلب کو ہوتا ہے اس لئے فہم میں کوئی کمی نہیں رہ سکتی غرض کتاب و حکمت دونوں میں تعلیم ہو گئی قرآن و حدیث دونوں کے لئے چنانچہ قرآن کو ایک جگہ کتاب حکیم بھی فرمایا ہے اور یہاں زید عدل کے قاعدہ سے الحکمت کہہ دیا رہ گئی یہ بات کہ حکمت کیا چیز ہے سو حکمت کا مفہوم تو وہی چیز ہے جو حکماء نے بیان کیا ہے یعنی العلم بحقائق الاشياء على ما هي عليه بقدر الطاقة البشرية البتہ اس حکمت اور اس حکمت کے مصداق میں ضرور فرق ہے وہ فرق یہ ہے کہ قرآن میں تو اصالتہ ان اشیاء کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے جن کو نجات و قرب میں دخل ہے اور اس حکمت میں مطلق اعیان خارجیہ سے بدوں قید مذکور بحث کی گئی ہے تو اب حکمتیں دو ہو گئیں ایک وہ جس میں امور شرعیہ سے بحث کی جاوے اور ایک وہ جس میں امور تکوینیہ سے بحث کی جاوے مثلاً فلسفہ ریاض منطق اقلیدس وغیرہ کہ سب حکمت تکوینیہ ہیں اور جو فلاسفہ بھی اپنی حکمت میں الہیات سے بحث کرتے ہیں اور اس کو علم اعلیٰ کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عقول و واجب کے ساتھ جس حکمت کا تعلق ہے وہ سب سے افضل ہے مگر ان کی بحث کی حیثیت وہ نہیں جو شریعت کی بحث کی ہے بلکہ دلائل صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے بعض مباحث خلاف حق بھی ہیں مثلاً عقول کا قابل ہونا جو بعض نادانوں نے ان کی حمایت کی ہے کہ عقول کی تفسیر ملائکہ سے لے کر ان مباحث کو شریعت پر منطبق کیا ہے مگر واقع میں عقول کا ترجمہ ملائکہ سے کرنا خود بھی صحیح نہیں کیونکہ شریعت کے نزدیک ملائکہ اجسام ہیں ان میں حرکت بھی ہے اور حکماء عقول کو مجرد اور منزہ عن الحركة مانتے ہیں تو دونوں کی حقیقت متحد کیسے ہوئی البتہ عقول کی نفی سے مطلق مجردات کے استحالة کا حکم صحیح نہیں جیسا بعض نے کہا ہے کہ کیونکہ بکثرت صوفیہ نے بھی روح اور قلب اور لطائف کو مانا ہے اور ان کے نزدیک عالم امر عالم مجرد کہتے ہیں جو بعض متکلمین نے اس شخص کی تکفیر کی ہے جو ان کے مجرد کا قائل ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ مقدمہ مسلمہ ہے کہ مجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے اور ظاہر ہے کہ اخص صفات باری میں کسی کو شریک ماننا محض کفر ہے۔ مگر صوفیہ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ مجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے بلکہ اخص صفات حکماء کے نزدیک تو صرف وجوب بالذات ہے اور اہل حق کے نزدیک وجوب بالذات کی طرح قدم بھی اخص صفات میں سے ہے بلکہ وجوب بالذات اور قدم دونوں متلازم ہیں اور یہ جو فلاسفہ کہتے ہیں کہ قدم کی دو قسمیں ہیں قدم بالذات اور قدم بالزمان اور قدم بالزمان کو

واجب کے ساتھ خاص نہیں کہتے تو میں کہتا ہوں کہ دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ قدم بالزمان ممکن کے لئے کوئی چیز نہیں اسی لئے تو کہتا ہوں ممکن چیز قدیم بالزمان بھی نہیں بہر حال حکماء بھی اس کے قائل ہیں کہ جس حکمت کا تعلق واجب کی ذات و صفات و احکام سے ہے وہ سب سے افضل ہے مگر واقع میں وہ حقائق صحیحہ تک نہیں پہنچے اس لئے ان کی حکمت کو حکمت الہیہ کہنا بھی صحیح نہیں اسی طرح گو انہوں نے اپنے یہاں اخلاق سے بھی بحث کی ہے مگر شریعت کے مقابلہ میں بالکل بیچ ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ شریعت مصطفویہ نے علم اخلاق کی حاجت کو پورا کر دیا اور اس کی بحث سے ہم کو مستغنی کر دیا بہر حال انہوں نے تکوین کے احکام و آثار بیان کئے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر مادیات کے متعلق اور اس میں بھی بہت غلطیاں کی ہیں اور تشریعیات میں تو حکماء بالکل چل ہی نہیں سکے کیونکہ اس کا تعلق وحی سے ہے اور وہ اس کے اتباع سے محروم ہیں۔ غرض یہ حاصل تھا حکمت کا جو بقدر ضرورت بیان کیا گیا۔

حاصل آیت

اب حاصل آیت کا یہی ہوا کہ ایسے علوم عطا فرمائے جنہیں نجات و قرب میں دخل ہے پھر اس کے بعد فرماتے ہیں **وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا** یعنی آپ پر خدا تعالیٰ کا بڑا فضل ہے یوں تو تمام نعماء فضل ہی ہیں چنانچہ **وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ** میں رزق کو فضل فرمایا ہے کیونکہ اسی آیت میں **كَانَتْ تُنَشَرُ فِي الْأَرْضِ** **وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ** بھی ہے اور انتشار فی الارض پر جس فضل کی طلب مرتب ہوتی ہے ظاہر ہے کہ وہ طلب رزق ہی ہے لیکن سب افراد فضل کے برابر نہیں اسی لئے اس امر کو یعنی **وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ** کو مفسرین نے اباحت پر محمول کیا ہے کیونکہ اس کے اوپر ہے **وَفَرُوا الْبَيْعَ** اس سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید ترک بیع کا امر ستر ہو پس **كَانَتْ تُنَشَرُ فِي الْأَرْضِ** **وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ** سے بتلا دیا گیا کہ بعد فراغ صلوة کے وہ اب جائز ہو گیا ہے کیونکہ امر بعد النظر اباحت کے لئے ہوتا ہے غرض یہاں سب کے نزدیک تفسیر فضل کی رزق ہی ہے اسی لئے اس کے بعد یوں بھی فرمایا کہ **وَإِذْ كَرِهَ اللَّهُ** کہ خدا کی بھی یاد رکھو یہ نہ ہو کہ رزق کو فضل مقصود بالذات سمجھ کر اس کی تلاش میں خدا کو بھول جاؤ نہیں بلکہ دنیا غالب نہ ہو

حق تعالیٰ رسول ﷺ سے فرماتے ہیں **وَإِنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمْنَاكَ مَا لَمْ يَكُن لَكَ تَعْلَمُ** **وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا** (اور نازل کی حق تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور حکمت اور وہ چیزیں بتائیں جن کی آپ کو خبر نہ تھی اور حق تعالیٰ کا آپ پر بڑا فضل ہے **وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا** یہ تذیل ہے مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا بڑا فضل ہے کہ آپ پر کتاب و حکمت نازل فرمائی۔ یہی کتاب حکمت فضل ہے حق تعالیٰ کا یعنی انزل اللہ سے **وَالْحِكْمَةَ** تک پر علمک سے تعلم تک کا عطف تفسیری ہے اگرچہ علمک میں

مادہ علم کا ہے اور علم ہی کے لئے نزول بھی ہوتا ہے واقع میں عَلَمُكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ عطف تفسیری ہے کہ جو معنی اور جو مقصود اَنْزَلَ اللهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ سے ہے وہی اس سے بھی مقصود ہے۔ گو اس میں اور اقوال بھی ہیں یعنی بعض لوگوں نے یہاں واؤ کو عطف تفسیری کے لئے نہیں مانا بلکہ تغائر کے لئے لیا اور کہا ہے کہ نازل کی اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب و حکمت اور وہ علوم جن کی آپ کو خبر نہ تھی یعنی تین چیزیں نازل فرمائیں کتاب، حکمت، علوم غیر معلومہ اور یہ تیسری چیز جو عالم تکن تعلیم میں مذکور ہے وہ تصوف ہے۔

قال بينوم لا تاخذ بليحتى ولا براسى (طہ آیت ۹۵)

ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میرے میا جاتم میری داڑھی مت پکڑو اور نہ سر پکڑو

کسی نے داڑھی کا ثبوت قرآن سے دیا

ایک صاحب نے داڑھی کا ثبوت قرآن شریف سے دیا اس لفظ سے لا تاخذ بليحتى ولا براسى یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میری داڑھی نہ پکڑے معلوم ہوا کہ حضرت ہارون کی داڑھی تھی میں نے کہا جناب اس سے وجود لہجہ کا ثبوت ہوا نہ وجوب لہجہ کا اور وجود کے لئے اتنا تکلف ناحق کیا اپنی داڑھی دکھا دینی تھی۔ وجود کا ثبوت ہو جاتا اور اگر وجود کا ثبوت دیا ہے تو وہ تو آیت سے بھی نہ ہوا۔

(ملفوظات حکیم الامت ج ۲ صفحہ ۱۸۵)

ومن اعرض عن ذکری فان له معیشتہ ضنکاً و نحسبہ یوم القیمة اعمیٰ
یعنی جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو پستی ہے گزران تنگی کی یعنی دنیا میں اور قیامت کے روز اس کو اندھا ٹھائیں گے۔

غفلت ذکر کا انجام

یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت وہاں بھی مصیبت چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دنیا داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے یہ حال ہے کہ مال و دولت تو ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت جس کا نام ہے وہ میسر نہیں، بعض اوقات تو انکی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں اور اعمال صالحہ سے حال کا عیش بھی اور مال کا عیش بھی دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی اصلی مال اس کو کہنا چاہئے دنیوی مال کو تو مال اسی لئے کہتے ہیں یعمیل الیہ القلب یعنی اس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی مال کہنا اس وجہ سے درست ہے

کہ وہ اس قابل ہیں کہ قلب ان کی طرف مائل ہو۔ (خیر المال المر جاہ بالمعنی موعظہ حقیقت مال و جان صفحہ ۲۸۹)

اب رہی بات یہ کہ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے) میں صرف ایک

لفظ کیوں فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس کو عام لے لیا ہے جو شامل ہے دونوں کو علمک مالک تکن تعلیم (جو باتیں آپ نہ جانتے تھے ان کا بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا کر دیا۔) میں بعض نے لفظ ما کو عام لیا ہے کہ تمام مجہولات کا آپ کو علم دے دیا تو اول تو آیت میں کوئی دلیل نہیں عموم کی رہا لفظ ما کا کلمات عموم میں سے ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عموم اس کے لئے لازم نہیں مخصص میں بھی مستعمل ہوا ہے جیسے يُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ان باتوں کا علم دیا جن کو تم نہ جانتے تھے) اور عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا) دوسرے اگر لفظ ما یہاں عام بھی ہو تو عموم ان ہی امور کا ہوگا جو اس مقام کے مناسب ہیں مثلاً امور متعلقہ نبوت و سیاست۔

تنبیہ ثانی

علم کو فضل فرمانا اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علم میں محض اکتساب ہی کافی نہیں فضل خداوندی کی بھی ضرورت ہے۔ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ تفسیری ہے کہ معطوف علیہ معطوف کا مصداق ایک ہے۔

تنزیل اور تعلیم

اور عنوان دو ہیں اسی طرح انزل و علم میں بھی باوجود معنوں کے اتحاد کے ایک خاص نکتہ کے لئے دو جداگانہ عنوان ہیں وہ نکتہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ہم نے محض تنزیل ہی پر بس نہیں کہ بلکہ تعلیم بھی فرمادی۔

فضل عظیم صرف علوم دینیہ ہیں

صاحبو! واللہ اگر تم آزادی چاہتے ہو تو خدا کی غلامی کرو کہ اس غلامی میں تمہیں دوسرے ہم جنسوں کی غلامی سے آزادی ہو جائے گی۔ اور فطری طور پر تم غلامی سے تو کسی حال میں بچ نہیں سکتے اور جب نہیں بچ سکتے تو انہیں کی غلامی کیوں نہ قبول کرو جن کی غلامی سے بادشاہوں کو بھی فخر ہے ان کی غلامی کے یہ معنی ہیں کہ شریعت سے آزاد نہ ہو اب میں اس مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت خوش عیشی وغیرہ ہے تو سب فضل، مگر فضل عظیم نہیں ہے فضل عظیم صرف علوم دینیہ ہی ہیں البتہ جب کمائی مطلق فضل ہے تو اس کے حاصل کرنے کے لئے اسی کے مناسب علوم کی بھی ضرورت ہوگی بشرطیکہ وہ شریعت کے اندر ہوں تو اسے علوم کا حاصل کرنا بھی جائز بلکہ لغیرہ مستحسن ہوگا مگر ان علوم شریعت سے اعظم واہم نہ سمجھو کیونکہ رزق کو مطلق فضل فرمانے اور علوم شریعہ کو فضل عظیم فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ علوم شریعت افضل ہیں ان علوم سے اور راز اس میں یہ ہے کہ وہاں بھی علوم سے خاص اعمال پیدا ہوتے ہیں اور یہاں بھی تو علوم و اعمال تو دونوں جگہ ایک

دوسرے سے وابستہ ہیں مگر اب دیکھ لو کہ علوم شریعت سے کون سے اعمال پیدا ہوتے ہیں اور علوم معاش سے کون سے اعمال ظاہر ہے کہ علوم شرعیہ سے اعمال آخرت پیدا ہوتے ہیں اور علوم معاش سے اعمال دنیا اور اعمال آخرت یقیناً مقدم ہیں اعمال دنیا سے کیونکہ مسلمان کے نزدیک دین یقیناً دنیا سے مقدم ہے نیز اعمال آخرت کا ثمرہ دائم اور عظیم ہے۔ اعمال دنیا کا ثمرہ فانی اور حقیر ہے اور اسباب کی فضیلت مسببات کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے جب علوم شرعیہ کا مسبب علوم دنیا کے مسبب سے افضل ہے تو یقیناً علوم شرعیہ علوم دنیا سے افضل ہیں۔ نیز دنیا واسطہ ہے آخرت کے لئے خود مقصود نہیں ہے اور مقصود واسطہ سے افضل ہوتا ہے۔ تو مقصود کا علم بھی واسطہ کے علم سے افضل ہوگا اور یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ دنیا کے علوم وہی جائز ہوں گے جو مقصود کے لئے مزاحم نہ ہوں اور اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جب یہ علوم افضل ہیں تو اس علم کے علماء بھی افضل ہوں گے۔

لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزِيهِ

وَلَا يُجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ

مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ

الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ۝

ترجمہ: نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا اور اس شخص کو خدا تعالیٰ کے سوانہ کوئی یار ملے گا اور نہ مدد گار ملے گا اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

تفسیری نکات

شان نزول

شان نزول آیت کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہود اور اہل اسلام میں قبلہ کے تقدم و تاخر پر تقاضا ہو رہا تھا یہود کہتے تھے کہ ہمارا قبلہ مقدم ہے مسلمان کہتے تھے ہمارا قبلہ مقدم ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ خدا کا قرب اور دخول جنت نہ تمہاری تمناؤں سے حاصل ہو سکتا ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے بلکہ ہمارے یہاں تو یہ قانون ہے کہ جو کوئی

برا کام کرے گا اس کو اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اور جو نیک کام کرے گا اس کو جنت ملے گی۔ تو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ عمل کا اہتمام کرو۔

اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ نری تمنا سے کام نہیں چل سکتا اور نری تمنا کا درجہ وہی ہے جس کے ساتھ عمل کا اہتمام نہ ہو معلوم ہوا ہے کہ مقصود اعمال ہیں ان کو اختیار کرنا چاہئے اس کے بعد جو تمنا ہوگی وہ رجاء کا درجہ ہوگا خلاصہ یہ ہے کہ جب عمل کا مقصود ہونا ثابت ہو گیا تو اس کا اہتمام سب مسلمانوں کو کرنا چاہئے رہا اس کا طریقہ تو اس کے لئے ساری شریعت موجود ہے شریعت سے پوچھ پوچھ کر عمل کرو اور اعمال پر مداومت و استقامت کی سہولت اور ان کی اصلاح و تکمیل یہ موقوف ہے اہل اللہ کی صحبت پر چنانچہ اسی آیات لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَّا فَأَمِنْنَا لَهُ وَأَجْمَلُ لَنَا وَهُوَ قَسِينٌ وَاللَّهُ يَوْمَهُ حَنِيفًا اور اس شخص سے اچھا کون ہے جو اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دے در ان حالیکہ وہ صاحب اخلاص ہو اور ملہ ابراہیم کا تابع ہو جو کہ حنیف تھے یعنی ماسوائے اللہ سے یکسو تھے یہاں اسلام وجہ سے مراد فنا ہے کیونکہ کامل سپردگی اسی سے ہوتی ہے جس کے بعد نسبت احسان عطاء ہو جاتی ہے چنانچہ وہو محسن میں نسبت احسان ہی کی طرف اشارہ ہے۔ مقام اخلاص جب کامل ہو جاتا ہے تو اسی کو نسبت احسان سے صوفیہ کی اصطلاح میں تعبیر کیا جاتا ہے۔

آگے بتلاتے ہیں کہ یہ دولت کس طرح حاصل ہوگی۔ ارشاد ہے وَاللَّهُ يَوْمَهُ حَنِيفًا یعنی جو شخص ملہ ابراہیم کا اتباع کرے گا اسے یہ دولت عطا ہوگی اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اتباع ابراہیم علیہ السلام سے یہ نعمت عطا ہوگی حتیٰ کہ یہ شبہ ہو کہ بس جو لوگ ابراہیم علیہ السلام کی امت میں نہیں ان کو یہ دولت نہ ملے گی بلکہ اتباع ملت ابراہیم پر اس نعمت کو موقوف کیا گیا ہے۔ جس سے مراد ان کے مذاق کا اتباع ہے اور ان کا مذاق فنا تھا اور یہ دولت ہر نبی کو عطا ہوتی ہے (الاباب لادلی الباب)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ أذُوا الْقُرْآنَ أُولَٰئِكَ يَكُونُ اللَّهُ لِيَعَذَّبَهُمْ وَلَا يَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا
بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو منزل مقصود یعنی بہشت کا راستہ دکھائیں گے۔

ارتداد کی خاصیت

حالانکہ ثُمَّ أذُوا الْقُرْآنَ کے بعد بھی ثم آمنوا کی گنجائش تھی مگر اس کے بعد حق تعالیٰ نے ثم آمنوا نہیں فرمایا کیونکہ اس پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ اس فعل میں خاصیت یہ ہے کہ اس کے بعد اکثر توفیق ایمان نہیں ہوتی پس ایمان کی قدر کرو اور اس کی حفاظت کی کوشش کرو۔

بَشِّرِ الْمُنَافِقِينَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝۱۶۱ الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ
 الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ اِيْتَعُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ
 الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا ۝۱۶۲ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ
 اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى
 يَخْرُجُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهَا اِنَّكُمْ اِذَا قَمِيتُمْ اَنَّ اللّٰهَ جٰمِعٌ
 لِّلْمُنٰفِقِيْنَ وَالكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيعًا ۝۱۶۳ اِلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ
 فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فِتْنَةٌ مِّنَ اللّٰهِ اَلْوَالَمْ يَكُنْ مَعَكُمْ وَاِنْ كَانَ لِّلْكٰفِرِيْنَ
 نَصِيْبٌ ۙ اَلْوَالَمْ نَسْتَعِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعَكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
 فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاَلَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَلٰى
 الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝۱۶۴

ترجمہ: منافقین کو خوشخبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا ہے جن کی یہ
 حالت ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا ان کے پاس معزز رہنا چاہتے ہیں سو
 اعزاز تو سارا خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام
 الہیہ کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہو اسنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جبکہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کر
 دیں کہ اس حالت میں تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو
 دوزخ میں جمع کر دیں گے وہ ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر رہتے ہیں پھر اگر تمہاری فتح منجانب
 اللہ ہوگی تو باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ حصہ مل گیا تو باتیں
 بناتے ہیں کہ کیا ہم پر غالب نہ آنے لگے تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا سو اللہ تعالیٰ
 تمہارا اور ان کا قیامت میں (عملی) فیصلہ فرمادیں گے اور (اس فیصلہ میں) ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو
 مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے۔

تفسیری نکات منافقین کو ملامت

اس مقام پر جن لوگوں کی یہ شکایت ہے وہ جماعت منافقین کی ہے کہ گو وہ زبان سے کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے مگر وہ واقع میں مومن نہ تھے اسی وجہ سے ان کو فروع کا مکلف نہ کہا جائے گا پس باوجود غیر مکلف ہونے کے جس امر پر ان کی شکایت کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ جرم بہت شدید ہے تو جو مدعی اطاعت ہیں یہ اگر مرتکب اس جرم کے ہوں تو بہت زیادہ اقل شکایت ہیں پس وہ امر کہ جس پر منافقین کو اس آیت میں ملامت کی گئی ہے افسوس ہے کہ وہ ہم میں بھی موجود ہے اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہوا کہ اس مضمون کو اختیار کیا جاوے پس تین حیثیتوں سے اس مضمون کی ضرورت ثابت ہوئی اول تو فی نفسہ ضروری ہونا دوسرے اس میں غلطی واقع ہونا تیسرے ہم میں وہ غلطی ہونا اب سنئے کہ وہ مضمون کیا ہے ارشاد ہے **إِنَّهُمْ عِنْدَ اللَّهِ لَكَاذِبُونَ** یعنی کیا یہ منافقین کفار کے پاس جا کر عزت کے طالب ہوتے ہیں عزت تو تمام کی تمام اللہ تعالیٰ کی ملک ہے یہ ترجمہ ہے۔ آیت کا قصہ اس کے نزول کا یہ تھا کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ایک جماعت تھی منافقین کی وہ بظاہر مومن تھے اور واقع میں کافر تھے تو ان کا یہ شیوہ تھا کہ مسلمانوں کے فریق کے مقابل بن کر کفار سے میل جول رکھتے تھے اس لئے کہ اپنے زعم فاسد میں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اسلام بڑھنے والا تو ہے نہیں یہ دو چار دن کا شور و غل ہے پھر بدستور کفار کا ہی پلہ بھاری رہے گا تو کیا ضرورت ہے کہ ہم ان سے بگاڑیں اور پھر مسلمانوں سے اس لئے ملتے تھے کہ ان کے حملوں سے محفوظ رہیں اور شاید ان کو غلبہ ہو جائے تو کہنے کو موقعہ رہے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی شکایت فرماتے ہیں اور ان کی رائے کا غلط ہونا ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا یہ منافقین یہ سمجھتے ہیں کہ کفار کے پاس عزت ہے اس لئے ان سے میل جول رکھ کر عزت کے طالب ہیں خوب سمجھ رکھو کہ غلبہ اور عزت تو ہماری ملک ہے پس جو اس کا طالب ہو وہ ہم سے میل جول کرے اس لئے کہ قاعدہ ہے کہ جو شے جس کی ملک ہو اور تم اس کے طالب ہو تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی اطاعت کرو یہ عجیب بات اور قلب موضوع ہے کہ اس کو ناراض کر کے اس سے وہ لینا چاہیں یہ دوسری بات ہے کہ کسی مصلحت سے وہ شے پھر بھی اس کو دیدے مقصود یہ ہے کہ طریقہ اس کا یہی ہے کہ اس کی اطاعت بھی اختیار کی جاوے یہاں سے یہ شبہ رفع ہو گیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ غیر مومنین کو بھی عزت اور غلبہ حاصل ہے تقریر اندفاع کی یہ ہے کہ لام اللہ میں ملک کا ہے تو حاصل یہ ہے کہ عزت اور غلبہ اللہ کی ملک ہے یہ مطلب نہیں کہ عزت اور غلبہ ہم کسی کو نہیں دیتے ممکن ہے کہ کسی مصلحت اور حکمت کی وجہ سے غیر مطیع کو بھی دے دیں اور وہ حکمت یہ ہے کہ یہ دنیا امتحان اور ابتلاء کا گھر ہے پس اگر دنیا میں مسلمانوں ہی کو غلبہ ہوتا تو یہ

حکمت ابتلاء فوت ہو جاتی اس لئے کہ اسلام قبول کرنے والوں کا کوئی امتحان اور ابتلاء نہ ہوتا اس واسطے کہ جب کہ غلبہ انہیں کو ہوتا تو پھر مسلمان ہونا کوئی کمال نہ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسا ملا جلا قصہ رکھا ہے کہ ظاہری نظر میں کوئی امتیاز نہ ہو کبھی کسی قوم کو غلبہ دے دیا کبھی کسی کو تاکہ اس کا امتحان ہو کہ دیکھیں ہمارے بندے کس طرف رخ کرتے ہیں آیا دنیا کی شان و شوکت پر مائل ہوتے ہیں یا ہماری طرف آتے ہیں۔ پس باوجود اس کے اگر کوئی اسلام قبول کرتا ہے اس کا منشاء محض اخلاص ہوتا ہے کوئی دوسری غرض نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو یعنی خانہ کعبہ کو وادی غیر ذی زرع میں بنایا ہے کہ وہاں نہ کھیتی باڑی ہوتی ہے نہ سرسبزی کا نام و نشان ہے نہ نہریں اور چشمے اور کنوئیں ہیں بجز خشک میدانوں اور پہاڑوں کے کوئی شے نہیں اگر بیت اللہ شریف خطہ کشمیر میں ہوتا تو وہاں مسلمانوں کا جانا کوئی کمال نہ تھا۔ حق تعالیٰ نے ایسی جگہ بنایا کہ وہاں ہر شے کی کمی ہے تاکہ جو کوئی وہاں جاوے ہماری ہی محبت کی وجہ سے جاوے چنانچہ مسلمان وہاں مشقتیں اٹھا اٹھا کر مال خرچ کر کے جو جاتے ہیں اس کا منشاء سوائے اخلاص اور حق تعالیٰ کی محبت کے کوئی شے نہیں ہے اسی واسطے حضور ﷺ نے اپنی اولاد کے لئے زکوٰۃ کو حرام فرما دیا ورنہ کم فہموں کو یہ شبہ ہوتا کہ یہ سب ترغیب اور دعوۃ الاسلام اپنی غرض کے لئے ہے کہ ہم اور ہماری اولاد کو دنیا حاصل ہو اب یہ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو صدقات واجبہ ہیں جیسے زکوٰۃ عشر فیہ وغیرہ یہ تو سب اپنے خاندان پر حرام ہی فرمادیئے ہیں اب رہ گئے صدقات نافلہ کہ ان میں اختیار ہے خواہ دو یا نہ دو ان میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ صدقات ہی خود ضروری نہیں کہ ضرور دیئے جائیں۔ پس حق تعالیٰ کی یہ حکمت اور شان ہے کہ جہاں ذرا بھی خود غرضی کا شبہ ہوا ہے اسی کو دفع فرما دیا ہے پس اگر تعم اور عیش و دولت اور عزت و جاہ غلبہ اسلام کے ساتھ مخصوص ہوتا تو اسلام لانے میں پھر کوئی کمال نہ ہوتا اور مخلص وغیر مخلص میں اشتباہ ہو جاتا اور اب جو کوئی ادھر آتا ہے وہ اخلاص ہی کی وجہ سے آتا ہے۔

قیامت میں مسلمانوں ہی کو کفار پر غلبہ حاصل ہوگا

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا یعنی حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے اگر اسی آیت کے الفاظ پر نظر کو مقصود کر دیا جائے تو اس پر اشکال ہوتا ہے کہ یہ تو خلاف مشاہدہ ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ کفار کو مسلمانوں پر غلبہ ہو گیا ہے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے اور اچھا جواب ہے کہ غلبہ سے غلبہ فی الحجت مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ حجت میں کافروں کو کبھی بھی غلبہ نہ ہوگا اور یہ مشاہدہ کے موافق ہے۔ حجت میں ہمیشہ اسلام ہی کو غلبہ ہوا ہے اور ہوتا ہے گو یہ جواب فی نفسہ صحیح ہے مگر کیا اچھا ہو کہ اشکال ہی نہ پڑے جو جواب دینے کی ضرورت ہو تو سبق میں نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ یہاں اوپر سے فیصلہ قیامت کا ذکر ہے اور یہ جملہ اسی فیصلہ کے متعلق ہے پوری آیت یوں ہے۔

فَاللّٰهُ يَخْتَلِمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ مَبِئًْا ۗ يَعْنِيْ پس اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے قیامت کے دن اور (اس فیصلہ میں) حق تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے۔ دیکھئے سباق میں نظر کرنے سے یہ قائدہ ہوا کہ اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں غلبہ فی الدنیا کا ذکر ہی نہیں بلکہ فیصلہ قیامت میں غلبہ نہ ہونے کا ذکر ہے۔ (فتاویٰ المنفوس)

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ مَبِئًْا ۗ اس میں شبہ ہوتا ہے کہ ہم تو کفار کو مسلمانوں پر مسلط غالب ہوتا ہوا دیکھتے ہیں پھر اس آیت کے کیا معانی اس شبہ کا منشاء یہی ہے کہ اوپر سے غور نہیں کیا گیا اس سے پہلے ارشاد ہے فَاَللّٰهُ يَخْتَلِمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ مَبِئًْا معلوم ہوا کہ یہ حکم فیصلہ قیامت کے متعلق ہے عام نہیں ہے اور یہ شبہ ہوا غور نہ کرنے سے اور غور نہ کرنے کا سبب یہ ہوا کہ یوم القیمة پر وقف کیا جاتا ہے جس سے وہ متانف کلام سمجھا گیا کاش کہ یہاں طانہ لکھی ہوتی تو یہ شبہ نہ پڑتا اسی طرح لاریب فیہ میں جو شبہ واقع ہوتا ہے کہ قرآن میں تو بہت کفار نے شہادت کئے ہیں اس کا جواب مولانا کی طرف سے مشہور ہے کہ حق تعالیٰ نے لاریب فیہ ہی تو فرمایا ہے لاریب فیہم تو نہیں فرمایا تو کفار بے شک شبہ کرتے تھے مگر اس کا منشاء خود ان کے اندر تھا یعنی حسن و عمدت و جہل وغیرہ قرآن میں منشاء ریب کچھ نہیں ہے اس کی توضیح میں نے اس طرح کی ہے کہ جیسے یرقان والا ہر چیز کو زرد دیکھتا ہے مگر باوجود اس کے یہ کہنا صحیح ہے لا صفرۃ فیہ کیونکہ منشاء صفرۃ کارائی میں ہے اسی طرح یہاں کجھو علی ہذا لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون میں شبہ واقع ہوتا ہے مولانا نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے لا خوف لہم و بہم تو نہیں فرمایا بلکہ لا خوف علیہم فرمایا مطلب یہ ہے کہ ہماری طرف سے ان پر کوئی واقعہ اندیشناک واقع نہ ہوگا گو وہ خود اپنی سعادت مندی سے ڈرتے رہیں تو اس کی نفی نہیں کی جاتی اسی طرح امیر شاہ خان صاحب نے امیر الروایات میں مولانا کی ایک حکایت لکھوائی ہے کہ کسی نے مولانا سے آ کر عرض کیا کہ ایک پادری کہتا تھا کہ مسلمان خواہ مخواہ انجیل و تورات کو محرف مبدل کہتے تھے حالانکہ قرآن سے خود اس کی نفی ہوتی ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ کلام اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اور انجیل و تورات کا کلام اللہ ہونا مسلمانوں کو مسلم ہے۔ پھر وہ ان میں تبدیلی کے قائل کیونکر ہو سکتے ہیں امیر شاہ خان صاحب نے یہ اشکال تو لکھوایا ہے مگر جواب کچھ نہیں لکھوایا کہ مولانا نے اس کا کیا جواب دیا نیز وہ آیت بھی اس کی جگہ منقول نہ تھی جس میں عدم تبدیلی فی کلام اللہ کا دعویٰ ہے اس لئے یہاں پر حاشیہ لکھنے کی ضرورت ہوئی چنانچہ غور کرنے سے آیت بھی مل گئی جو پارہ ولواننا میں ہے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِنَا ۗ اور جواب اشکال کا یہ ہے کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے اوپر سے قرآن کی حقانیت کا بیان فرمایا چنانچہ اس سے اوپر کی آیت یہ ہے

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِيْ حَكْمًا وَهُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۗ وَالَّذِينَ اتَّيٰهُمُ الْكِتٰبُ

يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنْزَلٌ مِّنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۶۶﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۗ لَوْلَا آيَةُ
 آیت اولیٰ میں اَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ میں کتاب سے مراد یقیناً قرآن ہے (کیونکہ حضور کے مخاطبین اولین پر
 اسی کا نزول ہوا ہے اور اسی کے متعلق جا بجا یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اہل کتاب کو اس کے منزل بالحق ہونے کا خوب
 علم ہے وہی دعویٰ یہاں بھی ہے پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۗ لَوْلَا آيَةُ
 سے بھی قرآن ہی مراد ہے اور مثل اوصاف سابقہ کے یہ عدم تبدیلی بھی اسی کی صفت ہے اب کچھ اشکال نہیں رہا
 اس کا ایک جواب ہماری جماعت کے بعض اکابر سے دوسری طرح منقول ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ کلام اللہ میں
 تبدیلی نہیں ہو سکتی اور کتاب اللہ میں ہو سکتی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن تو کلام اللہ ہے
 اور دوسری کتابیں کلام اللہ نہیں بلکہ محض کتاب اللہ ہیں۔ یہ جواب میری سمجھ میں نہیں آیا اس لئے میں اس کو بیان
 کرنا بھی پسند نہیں کرتا ممکن ہے کہ اصل مجیب کی دلیل کے تمام مقدمات ملا کر یہ جواب صحیح ہو جائے اور راوی نے
 سب مقدمات نقل نہ کئے ہوں مگر چونکہ ہم کو یہ جواب نا تمام ہی پہنچا ہے اس لئے ہمیں اس سے تسلی نہیں ہوئی
 غرض یہاں بھی اشکال کا منشاء یہی ہوا کہ سیاق سابق میں غور نہیں کیا یا صرف لَوْلَا آيَةُ لِكَلِمَتِهِ كَوَدِيكِهِ كَرَعَمُومٍ سمجھ
 لیا گیا (اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی لبس من البر الصيام فی السفر کو عام سمجھ لے حالانکہ قرآن سے اس
 کا حکم سفر مشقت کے ساتھ مخصوص ہونا ظاہر ہے) اگر اس سے اوپر کی آیت کو دیکھ لیا جاتا تو اشکال واقع نہ ہوتا اور
 معلوم ہوتا کہ یہ حکم عام نہیں بلکہ قرآن کے ساتھ خاص ہے۔

قرآن سمجھنے کیلئے ضروری علوم

فرمایا درسیات پڑھو سمجھ پیدا ہو جائے گی اس سلسلہ میں فرمایا تو اعداد صرف و نحو سمجھ کر پڑھنے کے بعد قرآن
 شریف پڑھا جائے اس کے بعد صرف ایک کتاب فقہ کی پڑھ لی جائے تو بس کافی ہے اور جو خود عالم تبحر و محقق نہ
 ہو اس کو تو دوسرے کی تقلید و اتباع کرنی چاہئے زنجیری نے لکھا ہے کہ چودہ علم پڑھنے کے بعد یعنی تمام علوم سے
 فارغ ہونے کے بعد قرآن پاک پڑھا جائے یہ اس کی رائے ہے فرمایا میری رائے تو یہ ہے کہ قرآن و فقہ
 احادیث کا سمجھنا منطق کے بغیر مشکل ہے اس لئے منطق پڑھنی ضروری ہے فرمایا او امر و نواہی کا سمجھنا تو آسان
 ہے لیکن استنباط مسائل اور تحقیق کے لحاظ سے قرآن کا سمجھنا بدوں منطق اور علوم آلیہ کے دشوار ہے اس لئے علوم
 عالیہ کے لئے علوم آلیہ کی ضرورت ہے بعدہ اصطلاحات منطق کے ماتحت حضرت والا نے چند آیات قرآن سے
 اس کی توضیح فرمائی مثلاً آیہ کریمہ (پ ۹)

ولو علم الله فيهم خير الا سمعهم ولو اسمعهم لتولوا وهم معرضون (انفال)

(اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں خوبی دیکھتے تو ان کو سننے کی توفیق دیتے اگر ان کو اب سنا دیں تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے)

اس میں شبہ ہوتا ہے کہ یہ قیاس منطقی کی ایک شکل ہے اور حد اوسط حذف ہونے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے ولو علم اللہ فیہم خیر التولوا لیکن ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ بالکل غلط ہے تو اب اشکال یہ ہے کہ نتیجہ غلط کیوں نکلا تو پھر فرمایا کہ ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ حد اوسط کا مکرر ہونا جو شرط انتاج ہے وہ اس شکل میں موجود نہیں کیونکہ پہلا اسمعہم سماع بمعنی القبول سے مشتق ہے اور دوسرا اسمعہم سماع حاسہ کے معنی میں ہے اس لئے دو جگہ اسمعہم کا لفظ اگرچہ مکرر ہے مگر معنی الگ الگ ہیں اس لئے ہیچہ تکرار اوسط نہیں ہو اس لئے نتیجہ غلط نکلا اب اگر کسی کو منطقی نہ آتی ہو تو اشکال کا حل سمجھانا اس کو دشوار ہے۔

(آیہ) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون (پے ۱)
(اور ہم کتابوں میں لوح محفوظ کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے)
کے متعلق ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ آج کل یہ واقعہ اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ عموماً زمین پر کفار و فجار کا تسلط ہے سوال کرنے والے ایک مولوی صاحب تھے میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سا قضیہ ہے محصورہ یا مہملہ کہنے لگے مہملہ ہے میں نے کہا کہ قضیہ مہملہ حکم میں جزیہ کے ہوتا ہے کلیہ نہیں ہوتا اس لئے اس آیت کا یہ مفہوم ہی نہیں کہ ہمیشہ اور ہر وقت اور ہر زمانہ میں یہی حال رہیگا کہ صالحین زمین کے وارث ہوں گے بعض مرتبہ ایسا ہونا اس قضیہ کے صدق کے لئے کافی ہے (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۶)

اسی طرح ایک اور آیت ہے ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ کافر مسلمانوں پر کبھی غالب نہ آئیں گے پھر اس پر بڑا اشکال کہ قرآن شریف میں تو یہ ہے اور واقعہ اس کے خلاف ہے وہ یہ کہ کفار کو بہت دفعہ دنیا میں مسلمانوں پر غلبہ ہوا ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا مشاہدہ کا کیا انکار مگر حقیقت میں آیت کا یہ مطلب ہی نہیں جو سمجھا گیا ہے یہ آیت دنیا کے متعلق ہے ہی نہیں یہ تو آخرت کے متعلق ہے کیونکہ اوپر ذکر منافقین کا ہے ان کا ذکر کر کے فرماتے ہیں فاللہ یحکم بینکم یوم القیمة ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً مطلب یہ ہے کہ آخرت میں فیصلہ کے وقت ڈگری مؤمنین کی ہوگی اور منافقین ہاریں گے خود فاللہ یحکم بینکم یوم القیمة بتلا رہا ہے کہ یہ حکم آخرت کے متعلق ہے یعنی قیامت میں جب مقدمہ پیش ہوگا تو اس میں مسلمان مغلوب نہ ہوں گے اب کوئی اشکال نہیں (المال والجاه ملحقہ مواضع حقیقت حال وجاہ صفحہ ۱۸۳)

ایک اشکال یہ ہے پڑھنے والوں کو اس آیت پر ہوتا ہے۔ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً اور ہرگز نہیں دیں گے حق تعالیٰ مسلمانوں پر کوئی راہ یعنی غلبہ

اشکال یہ ہوتا ہے کہ ہم تو بار بار مشاہدہ کرتے ہیں کہ کفار مسلمانوں پر غالب ہو جاتے ہیں اس کے بہت سے جواب علماء نے دیئے ہیں لیکن اگر قرآن کے ساتھ ذوق و مناسبت ہو تو وہ ضرور یہ سمجھ گا کہ کلام اللہ غیر مرجح نہیں ہے پھر جب اس کو مرجح سمجھے گا تو ہر مقام پر سیاق و سباق کو بھی دیکھے گا چنانچہ اس آیت پر اشکال اس لئے ہوا کہ لوگوں نے لن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا کے سباق کو نہ دیکھا اس میں یہ حکم آخرت کے ساتھ مخصوص ہے چنانچہ اس سے پہلے یہ ارشاد ہے فالله يحكم بينكم يوم القيمة حق تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے یعنی قیامت میں کفار و مسلمان کا فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا کون ناحق پر اس کے بعد فرماتے ہیں ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا اور اللہ تعالیٰ کفار کو مسلمانوں پر ہرگز غلبہ نہ دیں گے یعنی اس فیصلہ میں جو آخرت میں ہو گا اب کوئی اشکال نہ رہا (تعلیم التعلیم لملحقہ مومناہ علم عمل ص ۲۱۸)

الفاظ کو صحیح معنوں میں محمول کرنے سے بہت جگہ قرآن مجید میں مجاز و غیرہ کی بھی ضرورت نہیں رہتی مثلاً و مکرو لو مکرو اللہ میں تہج کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہیں لازم آتی جس کے لئے تاویل کی ضرورت ہو کیونکہ مکر اور کید کی حقیقت مولانا محمد یعقوب صاحب یہاں یہ فرماتے تھے کہ مکر و کید کہتے ہیں تدبیر خفی کو تدبیر خفی کبھی محمود بھی ہوتی ہے کبھی مذموم بھی نہ کسی مجاز کی ضرورت نہ توجیہ کی ضرورت۔

اسی اصل کی ایک فرع یہ ہے کہ الا ان اولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون کے متعلق یہ اشکال ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ تو اکثر بہت خائف اور محزون رہتے ہیں اس اشکال کا جواب بھی اسی اصل پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لا خوف لہم یا لا خوف بہم نہیں فرمایا بلکہ لا خوف علیہم فرمایا یعنی ان پر آخرت میں خوف واقع نہیں ہو گا یہ نہیں کہ ان میں خوف نہیں خلاصہ اس توجیہ کا یہ ہے کہ ان میں خوف ہے ان پر خوف نہیں اسی طرح ذالک الكتاب لا ریب فیہ پر جو اشکال ہوتا ہے قرآن مجید میں تو بہت لوگوں کو شک ہے پھر یہ کیوں فرمایا گیا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں اس کی توجیہ بھی مولانا نے اسی اصل پر یہ فرمائی کہ وہ شک اس کتاب میں نہیں ہے بلکہ جن کو شک ہے خود ان میں خیانت ہے درحقیقت ان کے فہم میں کھوٹ ہے اس کتاب میں کوئی کھوٹ نہیں یہ تو حضرت مولانا کی تحقیق ہے اور مجھ کو اس کی ایک مثال مل گئی جس سے مولانا کا مقصود اور واضح ہو گیا وہ مثال یہ ہے کہ یرقان اصفر والے کو جو سب چیزیں زرد ہی زرد نظر آتی ہیں تو اس کی آنکھوں میں زردی ہوتی ہے نہ کہ ان چیزوں میں جب وہ کسی چیز کو دیکھ کر یہ کہتا ہے کہ اس میں زردی ہے تو اس سے یہی کہا جاتا ہے کہ لاصفرۃ فیہ کہ اس چیز میں زردی نہیں ہے تیری آنکھوں میں ہے۔ اسی طرح درحقیقت قرآن میں کوئی شک نہیں ہے اور جو اس میں شک کرتا ہے اس کے فہم کا قصور ہے۔ مولانا یوں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن مجید میں جہاں کوئی شبہ ہو وہیں ایک لفظ ایسا ہے جس میں اس شبہ کا جواب ہے جیسے تکوین

نظام میں جہاں..... ڈنک کا درخت ہوتا ہے اسی کی جڑ میں ایک اور درخت لگتا ہے جو اس کا علاج ہے اور اسی کے پاس ہوتا ہے اسی طرح چونکہ آم ثقیل ہوتا ہے اس لئے اسی موسم میں جامن بھی ہوتی ہے جو اس کی مصلح ہے اور خود جامن میں بھی جو ایک ثقل ہے اس کا آم میں علاج ہے غرض آم کی مصلح جامن ہے اور جامن کا مصلح آم ہے چنانچہ اس آیت پر بھی ایک اشکال مشہور ہے۔ لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا یعنی مؤمنین پر کافروں کا ہرگز غلبہ نہ ہوگا حالانکہ مؤمنین

کافروں کا غلبہ بہت جلد مشاہد ہے اس اشکال کا بھی جواب وہیں موجود ہے چنانچہ جس سلسلہ میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت میں کفار اور مؤمنین کے درمیان جو فیصلہ کیا جائے گا اس فیصلہ میں مومن پر کافر غلب نہ ہوں گے پوری آیت اگر پڑھی جاوے تو وہیں اس اشکال کا جواب بھی موجود ہے۔ اسی لئے غیر محقق کا قرآن مجید سے استدلال سراسر بے محل اور مضرب ہو گا چنانچہ قصبہ رام پور میں حضرت مولانا گنگوہی نے ایک واقعہ میں طلاق کے متعلق کوئی فتویٰ دیا تھا کسی عورت نے قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اس کے خلاف یہ فتویٰ دیدیا کہ قرآن میں یہ لکھا ہے کہ حکیم ضیاء الدین صاحب سے کسی نے بیان کیا فرمایا کہ وہ کیا جانے مسئلہ چڑو کہیں کی کہہ داس سے کہ اگر زبان درازی کرے گی تو ناک چوٹی کاٹ دی جائیں گی۔

إِنَّ الْمُنْفِقِينَ يُخِذُ عُنُقَ اللَّهِ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا

إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ

اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ۗ

ترجمہ: بلاشبہ منافق لوگ چال بازی کرتے ہیں اللہ سے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا ان کو دینے والے ہیں اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں صرف آدمیوں کو دکھلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر۔

تفسیری نکات

اعمال صالحہ میں ہمیشہ مشقت رہتی ہے

بہر حال خوب سمجھ لو کہ اعمال صالحہ میں مشقت ہمیشہ رہتی ہے کیونکہ وہ اعمال نفس کی خواہش کے خلاف ہیں

نفس ان میں منازعت ضرور کرتا ہے۔ قلیل یا کثیر اس لئے مخالفت نفس کی عمر بھر ضرورت ہے اور یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ اور یہاں سے بعض واعظین کی غلطی معلوم ہوگئی کہ وہ یہ آیت یعنی وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالِيٍّ کو مسلمانوں کے حق میں پڑھ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو نماز میں کسل کرے وہ منافق ہے بات یہ ہے ان لوگوں کو قرآن کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ کسل کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ عمل میں مشقت کا سامنا ہو مگر عقیدہ میں ضعف یا شک نہ ہو تو یہ وہ کسل نہیں ہے جو منافقین کی شان تھی یہ تو کسل طبعی ہے اور طبعی کسل اعمال شرعیہ میں مخلصین کو بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اعمال نفس پر گراں ہیں نفس ان میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے اور اعمال شرعیہ میں مشقت کا سامنا ہونا آیت وَمَا جَعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ کے خلاف نہیں کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دین فی نفسہ آسان ہے دشواری نہیں یہ اور بات ہے کہ منازعت نفس کی وجہ سے اس میں دشواری آجائے کیونکہ یہ ضرور ہے کہ اعمال شرعیہ میں نفس کی خواہشوں کو پامال کیا جاتا اور اس کی مخالفت کی جاتی ہے اور یہ نفس کو ضرور گراں ہے تو اس منازعت و کشاکش کی وجہ سے دشواری آ جانا سیر فی نفسہ کے خلاف نہیں اسی لئے قرآن میں وَمَا جَعَلْ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ سے پہلے وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ بھی آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ دین میں مجاہدہ کی بھی ضرورت ہے پس ایک جز وہی کومت دیکھو دونوں جزوں کو ملاؤ تو حاصل وہی نکلے گا جو میں نے عرض کیا ہے اب سنئے ایک تو طبعی کسل ہے جس کا منشا منازعت نفس ہے یہ منافقین کے ساتھ خاص نہیں اور ایک اعتقادی کسل ہے کہ اس شخص کو نماز کی فرضیت پر اور خدا و رسول ﷺ پر ہی ایمان نہیں ہے محض کسی مصلحت کی وجہ سے نماز پڑھ رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ دل سے نہ پڑھے گا بلکہ بیگاری ٹالے گا اور کسل کے ساتھ نماز ادا کرے گا یہ کسل منافقین کی شان ہے اور خدا نہ کرے کہ کسی مسلمان کی ایسی شان ہو۔

کسل اعتقادی

فرمایا کہ کلام مجید میں جو ارشاد ہے إِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالِيٍّ اس میں کسل سے مراد وہ کسل ہے جو ضعف اعتقاد سے ہو جیسا کہ منافقین میں تھا کہ چونکہ نماز کو فرض نہ سمجھتے تھے صرف مصلحت دینی کی وجہ سے پڑھتے تھے اس لئے وہ ان کو قلیل معلوم ہوتی تھی کسل طبعی مراد نہیں پس کسی مسلمان کی حالت پر اس کو پڑھ دینا صحیح نہیں جیسا بعض کم فہم واعظ کرتے ہیں کیونکہ مسلمان اگر عبادت میں کسل بھی کرے تو وہ طبعی ہوگا اعتقادی نہ ہوگا۔

غیر محقق واعظین کی ایک غلطی

واعظین میں بعضے غیر محقق واعظ ایسی چھری پھیرتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناتے چلے جاتے ہیں چنانچہ جو لوگ نماز میں سستی کرتے ہیں ان کو منافق کہہ دیتے ہیں اور یہ آیت پڑھ دیتے ہیں وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالِيٍّ

یہ آیت منافقین کی شکایت میں ہے کہ جب وہ نماز کے واسطے کھڑے ہوتے ہیں تو اس حالت میں کھڑے ہوتے ہیں کہ کامل ہوتے ہیں خوب سمجھ لو کسل اعتقادی اور شے ہے اور کسل طبعی جدا منافقین میں کسل اعتقادی تھا یعنی ان کو نماز کے فرض نہ سمجھنے کے سبب کسل تھا اور مسلمانوں میں کسل طبعی ہے فرض ہونے میں تردد نہیں اس کو دوسرے عنوان سے سمجھئے کہ بعض مرتبہ لازم اعم ہوتا ہے اس کا تعلق طرزومات متعدد سے ہوتا ہے کسل ایک لازم ہے منافقین میں اس کا طرزوم اعتقادی سستی ہے اور مسلمانوں میں طبعی ہے مسلمان کیسا ہی ضعیف الایمان ہو اس کو کسل اعتقادی کبھی نہ ہوگا تو یہاں مطلق کسل مراد نہیں ہے لیکن ہمارے واعظین سب کو ایک لکڑی سے ہانک دیتے ہیں۔

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ﴿۷۱﴾

ترجمہ: حق تعالیٰ تم کو عذاب کر کے کیا کریں گے اگر تم خدا کا شکر کرو یعنی ایمان (کامل اختیار کرو)

تفسیری نکات

شکر کی اہمیت

سبحان اللہ اس آیات میں یہ لفظ مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ اس قابل ہے کہ اس پر جان قربان کر دی جائے فرماتے ہیں کہ ہم کو تمہارے عذاب کرنے میں کیا نفع ہے ہم تو تم پر رحمت ہی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر تم نافرمانی کر کے خود ہی عذاب کو مول لیتے ہو تو اس عنوان سے کس درجہ شفقت چمکتی ہے یہاں ایک ضروری تہیہ بطور جملہ معترضہ کے ہے بعض لوگ اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ حق تعالیٰ کو مخلوق سے بے پرواہ بے معنی بے توجہ سمجھتے ہیں اور اس غلطی کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے غناء کا مطلب غلط سمجھا اس میں تو شک نہیں کہ غناء حق تعالیٰ کی صفت نہیں ہے چنانچہ خود ارشاد فرماتے ہیں فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿۷۱﴾ - وَتَوَلَّوْا وَاسْتَغْفَى اللَّهُ لَكُمْ لَكِن لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۷۲﴾ لیکن لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ان آیات میں مستغنی کے معنی وہ مراد لیتے ہیں جو ہمارے محاورہ میں مستعمل ہیں کہ ہمارے محاورہ میں مستغنی اس کو بھی کہتے ہیں جو دوسروں سے بالکل بے پرواہ جو کسی کے نفع نقصان کی اسے رعایت نہ ہو حالانکہ مستغنی کے معنی آیات میں صرف یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کو کسی کی احتیاج نہیں وہ کسی کا محتاج نہیں پس محتاج نہ ہونا اور بات ہے اور بے پرواہ ہونا اور رعایت مصالح نہ کرنا دوسری بات ہے غناء جو حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے معنی عدم احتیاج کے ہیں اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل جو لوگ محض ترجمے دیکھ کر محقق بن جاتے ہیں وہ کیسا تم ڈھاتے ہیں پھر غضب یہ کہ یہ لوگ ترجمے دیکھ کر محققین سے مزاحمت کرتے ہیں اور معارضہ میں کہتے ہیں کہ صاحب مشارق الانوار میں تو یہ لکھا ہے مظاہر حق میں یہ لکھا ہے میں کہتا ہوں کہ اس میں

وہی لکھا ہے جو محقق بیان کرتا ہے مگر تم ترجمہ دیکھ کر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالشُّوْرِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ

تَفْسِيرًا : اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے

تفسیری نکات

غیر محبوب کا مبغوض ہونا مسلم ہے

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَتُورًا اور لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالشُّوْرِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلَمَ اور إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ اور لَا يُحِبُّ الْفٰسِقِينَ وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ سب اعمال مبغوض ہی ہیں تو لاسحب کے معنی صرف یہی نہیں کہ یہ محبوب نہیں گو مبغوض بھی نہیں جیسا امور مباحہ ہوتے ہیں بلکہ یہی مراد ہے کہ یہ مبغوض ہیں پس جب ترک دوام کا غیر محبوب ہونا ثابت ہوا تو اس محاورہ سے معلوم ہوا کہ ترک دوام غیر محبوب بمعنی مبغوض ہے اور جو شے خدا تعالیٰ کو مبغوض ہو وہ حرام ہے اور حرام کی ضد واجب ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ مستحبات پر دوام واجب ہے تو ترک دوام پر رنج کرنا بھی مثل ترک واجب کے جائز ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ غیر محبوب کا مبغوض ہونا تو مسلم ہے مگر ہر مبغوض کا حرام ہونا مسلم نہیں یہ کبریٰ کلیہ نہیں بلکہ بعض مبغوض مباح بھی ہوتے ہیں جیسے ابغض الحلال عند اللہ الطلاق اس میں طلاق کو حلال بھی فرمایا اور ابغض بھی فرمایا ہے معلوم ہوا ہے کہ بغض کا اجتماع اباحت کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے میاں کے لئے طلاق دینا فی نفسہ تو جائز ہے مگر بلا ضرورت طلاق دینا خدا تعالیٰ کو پسند نہیں اسی طرح یہاں سمجھئے کہ اعمال مستحبہ پر دوام کرنا حق تعالیٰ کو محبوب ہے اور ترک دوام غیر محبوب ہے یعنی مبغوض ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فی نفسہ گو ترک دوام جائز ہے مگر بلا ضرورت شرعیہ یا طبعیہ دوام کا ترک کرنا حق تعالیٰ کو پسند نہیں۔

تکبر کی صورتیں

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَتُورٍ اللہ تعالیٰ تکبر فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے اور إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے یہ تین صیغے ہیں مختال اور فخور اور مستکبرین اور تینوں کی نسبت لا یحب (نہیں پسند کرتے) کا لفظ ہے کیا یہ جامع کلام ہے ان تین لفظوں کی شرح یہ ہے کہ

کبر کے آثار کبھی تو ظاہر ہو جاتے ہیں اور کبھی تہذیب کی وجہ سے دل میں رہتے ہیں تو یہ مستکبر ہیں کیونکہ استکبار کے معنی بڑا سمجھنا اور یہ دل سے ہوتا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں ان الله لا يحب المستكبرين یعنی جن لوگوں کے دل میں تکبر ہے خواہ وہ ظاہر نہ ہو خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی مبغوض ہیں اور کبھی تہذیب کم ہوئی تو کبر کا اثر ظاہر بھی ہو جاتا ہے مثلاً کوئی آدمی فیشن بنانا اور طرح طرح کی وضع اختیار کرتا ہے جس سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے اس کے متعلق ارشاد ہے لَا يُحِبُّ كُنُفُوتًا إِلَّا آدَمِي بَعْضُ دَفْعِهِ اس دھوکے میں رہتا ہے کہ مجھ میں تکبر نہیں ہے کیونکہ ان لوگوں نے اسی کا نام تکبر رکھا ہے کہ زبان سے بڑائی کا کلمہ کہا جائے حالانکہ یہ فیشن اور وضع بنانا سب تکبر ہی ہے زبان سے نہ سہی مگر ان کی ہر ہر ادا سے تکبر نکلتا ہے بعضوں کی حال تو فیشن میں آ کر بالکل ایسی ہو جاتی ہے جیسے لقا کو تراپنی دم کو سنبھال سنبھال کر حرکت کرتا ہے ایسی ہی چال یہ لوگ چلتے ہیں کہ قدم قدم پر دیکھتے جاتے ہیں کہ کہیں سے فیشن تو نہیں بگڑ گیا غرضیکہ ان افعال کا کرنے والا گو خود ان کو تکبر نہ سمجھے لیکن واقع میں ہی سب تکبر ہے اور ان کے تکبر ہونے کو کیسا ہی چھپا دے مگر اہل فہم کو معلوم ہو جاتا ہے یہ سب مختال کے اندر داخل ہیں اور بعضوں کی زبان سے بھی تکبر کے کلمات نکلنے لگتے ہیں ان کو فحور فرمایا پس مختال تو وہ ہے جس کے دل میں تکبر ہو اور افعال سے بھی ظاہر ہو مگر اقوال سے ظاہر نہ ہو اور فحور وہ ہے جس کی زبان سے بھی ظاہر ہونے لگے تو تین مرتبہ ہوئے ایک مستکبرین ایک مختال اور ایک فحور تینوں کے واسطے لفظ لا يحب فرمایا خلاصہ یہ ہے کہ تکبر کا ظہور ہو یا نہ ہو یعنی زبان سے تکبر ہو یا قلب سے افعال سے ان سب کو إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُنُفُوتًا فَحُورًا (اللہ تعالیٰ تکبر فخر کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتے) اور ان الله لا يحب المستكبرين (اللہ تعالیٰ تکبر فخر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) سے منع فرمادیا ان میں سے ایک درجہ کی بھی اجازت نہیں دی اب یہ سمجھے کہ اس مقام پر اس پر کسی عذاب کی وعید نہیں فرمایا صرف لا يحب فرمادیا سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اس آیت نہ سہی دوسری آیتوں میں تکبر پر عذاب کی وعید بھی موجود ہے۔ مثلاً أَلَيْسَ فِي عَذَابِكُمْ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ (کیا غرور کرنے والوں کا دوزخ میں ٹھکانہ نہیں ہے) دوسرے یہ کہ یہ وعید کیا تھوڑی وعید ہے کہ لا محب فرمایا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہو غور سے دیکھئے تو وعید کی اصل یہی ہے کیونکہ وعید اسی پر ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو مرضی کے خلاف ہونا کسی کام کا اور ناپسند ہونا ایک ہی بات ہے پس لا يحب اصل ہوگئی توحید کی بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کو دشمنی ہے اس شخص سے جو تکبر ہے یا مختال ہے یا فحور ہے کیونکہ محبت گولفت کے اعتبار سے عداوت کی ضد ہے نفیض نہیں لیکن مجاورت میں جس پر اطلاقات قرآنیہ ہیں وہ عداوت کی نفیض ہے لا يحب میں محبت کی نفی کر کے اس کی نفیض کا اثبات ہے تو یہ کہنا کہاں صحیح رہا کہ اس پر کوئی وعید نہیں آئی کیا عداوت کا اثبات وعید نہیں بلکہ یہ تو وعیدوں کا

اصل الاصول ہے اگر کسی ایک معین عذاب کی وعید ہوتی وہ وعید کا ایک فرد خاص ہوتا اور اس میں تو کسی فرد کو عذاب کی خصوصیت نہیں رہی بلکہ وہ وعید فرمائی جو بڑے تمام وعیدوں کی یعنی عداوت تو اس سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ اس کی جزا میں کسی فرد عذاب کی خصوصیت نہیں ہر قسم کا عذاب بلکہ بڑے بڑے عذاب اس جرم پر ہو سکتا ہے۔

حب اور بغض

رہی یہ بات کہ لا یحب سے اگر عداوت کا ثابت کرنا مقصود ہے تو پھر بجائے لا یحب کے بغض کیوں نہ فرمادیا تاکہ تصریح ہو جاتی سو اس میں ایک نکتہ ہے جو اسی وقت قلب پر وارد ہوا کہ جو زیادہ تر طالب علموں کے کام کا ہے اور سمجھ میں آجائے تو سب کے کام بھی ہے بات یہ ہے کہ افعال کے تین مرتبہ ہیں ایک محبوب ایک غیر محبوب گو مبغوض بھی نہ ہو ایک مبغوض یعنی ایک تو کسی کا پسند ہونا اور ایک کسی کام کا نہ پسند ہونا گو ناگوار بھی نہ ہو اور ایک ناگوار ہونا ظاہر ہے کہ تکبر قسم اول کا عمل تو نہیں ہے یعنی محبوب قسمین اخیرین میں سے کسی ایک قسم کا عمل ہے اور دوسری آیتوں اور نیز حدیثوں پر نظر کرنے کے بعد یہ ظاہر ہے کہ قسم آخری کا عمل ہے۔ یعنی مبغوض ہے اس لئے کوئی طالب علم یہ کہہ سکتا ہے کہ اس جگہ لا یحب کے بدلے بغض ہونا چاہئے تھا سواتا تو مفسرین نے بھی لکھا کہ بناء علی المحاورات مراد لا یحب سے بغض ہے مگر یہ کہ اس میں نکتہ کیا ہے لفظ بغض ہی کیوں نہ لایا گیا یہ کہیں نظر سے نہیں گزرا وہ نکتہ اس وقت سمجھ میں آیا جس کو وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو مذاق محبت رکھتا ہو دوسرا کوئی نہیں سمجھ سکتا اور قریب علم میں کوئی سمجھ بھی لے تو اس کو حظ نہیں آ سکتا اس کا پورا حظ وہی شخص پاسکتا ہے جس کے دل میں محبت کی آگ لگی ہوئی ہو اس بلکہ لفظ کو اختیار کرنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ مبغوض ہونا تو بڑی بات ہے عاشق کے لئے تو لا یحب کا لفظ بھی مرجانے کی بات ہے۔ ہائے وہ بندہ کیسے زندگی بسر کرتا ہے جس سے خدا تعالیٰ کو محبت نہیں ہے واللہ مرجانے کی بات ہے دنیا میں آدمی احکام کی اور محبوبین کی نظروں میں محبوب ہونے کے لئے کیا کچھ مصیبتیں اٹھاتا ہے دیکھئے سپاہی بادشاہ کے حکم سے جان بازی کرتے ہیں اور سر کٹواتے ہیں صرف اس امید پر کہ بادشاہ ہم سے خوش رہے کسی تک حلال نوکر کو جب یہ بات معلوم ہو جائے کہ آقا کو مجھ سے آج کل ہمدردی اور محبت نہیں تو کیسا قلق ہوتا ہے خاص اس نوکر کو جس سے آقا کو پہلے محبت رہی ہو اس کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھ سے محبت کچھ کم ہو گئی ہے تو دیکھئے اس پر کیا گزرتی ہے حالانکہ اسے یہ تھوڑا ہی ثابت ہو گیا ہے کہ مجھ سے آقا کو دشمنی ہو گئی ہے بلکہ صرف اسی مرتبہ کی نوبت آئی ہے جس کے واسطے لفظ لا یحب بولا جاتا مگر یہی درجہ اس کی پریشانی کے لئے کافی ہے تو ایسے شخص کو اگر آقا کسی فعل سے منع کرنا چاہتا ہے تو ایسا لفظ نہیں اختیار کرنا چاہتا جو بغض کے مرادف ہو بلکہ یہی لفظ انتہائی لفظ ہے کہ ہم کو یہ کام پسند نہیں

اور انتہائی اس واسطے کے اکثر تو ایسے نوکر کے لئے جس سے محبت کا برتاؤ رہا ہو اس لفظ کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کسی لفظ کی بھی ضرورت نہیں صرف آقا کی نظر کا پھرا ہوا ہونا کافی ہوتا ہے اسی سے اس کا دم فنا ہو جاتا ہے یہ واقعات دن رات نظروں میں ہیں دیکھئے ایک پیش کار ایسا ہو جس سے کلکٹر کسی قدر انس ہو وہ اگر ایک دن اجلاس میں صرف اتنی بات نئی دیکھے کہ آج کلکٹر صاحب نے انس سے بات نہیں کی تو سہم کر رہ جاتا ہے اور احباب میں کہتا پھرتا ہے کہ آج صاحب کی نظرس کچھ پھر ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ خدا خیر کرے معلوم نہیں کیا بات خلاف طبع ہوئی اس صورت میں اگر کلکٹر صاحب زبان سے کہہ دیں کہ ہم کو تمہارا فعل پسند نہیں پھر تو کیا کہتا مر ہی تو جائے گا اور کبھی بھی اس کام کے پاس نہیں جائے گا اور یہ لفظ کہ ہم کو تمہارا فلانا کام پسند نہیں لاسحب ہی تو ترجمہ ہے جو حقیقت لغویہ کے اعتبار سے بیخض سے کم مرتبے کا لفظ ہے مگر یہ اتنا اثر کیوں رکھتا ہے بات یہی ہے کہ جس کو تعلق ہے اس کے لئے تو یہی لفظ سب کچھ ہے اور تعلق نہ ہو تو کوئی لفظ بھی موثر نہیں۔

کبر قلبی

اور قرآن شریف میں ہے إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُنُفُؤًا فَخْتُورًا (اللہ تعالیٰ مستکبر شیخی باز کو پسند نہیں کرتے) اور إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے) یہ تین لفظ اس واسطے ہیں کہ کبر قلبی کبھی تہذیب کی وجہ سے مخفی رہتا ہے اس کے واسطے لفظ مستکبرین ہے اور تہذیب کی کمی سے اس کا ظہور ہونے لگتا ہے پھر اگر زبان سے ظہور ہو تو اس کی نسبت لفظ فخور ہے اور اگر صرف افعال سے ہو تو اس کے لئے مختال ہے فیشن بنانا بھی مختال میں داخل ہے۔ اس تکبر پر وعیدیں بہت ہیں مگر اس آیت میں لاسحب آیا ہے یہ بھی کچھ کم نہیں بلکہ سب سے زیادہ ہے کیونکہ تمام وعیدوں کی انتہا اسی پر ہوتی ہے اور اس میں بجائے بیخض کے لایحب فرمایا گیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ جملہ کاموں میں تین مرتبے ہیں پسند ہونا اور پسند نہ ہونا اور گویا کبر بھی نہ سمجھا جائے اور برا سمجھنا ظاہر ہے کہ کبر قسم اول کا عمل تو یہ ہے نہیں اور قسمیں اخیرین میں سے بھی اخیر کا ہے مگر اس کے واسطے بجائے بیخض کے درمیانی قسم کا لفظ یعنی لایحب فرمایا اس میں اشارہ ہے کہ محبت خدا کو تیسری قسم کے لفظ سنانے کی نوبت ہی نہیں آسکتی درمیانی لفظ بھی اس کے مرجانے کے لئے کافی ہے۔ دیکھئے حکام کی نظر پھری ہوئی دیکھ کر اہلکاروں پر کیا گزرتی ہے اور محبت خدا ہر مسلمان ہے خواہ وہ کیسا ہی عاصی اور گناہ گار کیوں نہ ہو اس محبت کا ظہور عوام سے بھی جان بازی کے وقت ہوتا ہے کہ خواص سے بھی زیادہ کام کر جاتے ہیں تو مسلمان کے لئے لایحب انتہائی لفظ ہے کیا بلاغت ہے اور ہر مسلمان کو جو میں نے محبت خدا کہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اول حق تعالیٰ کو عہد سے محبت ہوتی ہے پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ عہد کو حق تعالیٰ سے محبت ہو جاتی

ہے اور اس اولیت کی دو دلیلیں ہوتی ہیں ایک نقلی اور ایک عقلی، عقلی تو یہ ارشاد ہے وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ (ہم نہیں چاہ سکتے مگر جو اللہ چاہیں) تو اول ادھر سے توجہ ہوئی اور عقلی اس طرح کہ محبت موقوف ہے معرفت پر اور معرفت نامہ حق تعالیٰ کی ہو نہیں سکتی کیونکہ وہ مرئی نہیں نہ اس کا کوئی نمونہ ہے لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (اس کی مثل کوئی چیز نہیں) اور آثار سے پتہ چلتا ہے کہ انسان میں محبت خدا ضرور ہے تو ضرور وہ با ارادہ و توجہ باری تعالیٰ ہوئی یہاں سے اہل ظاہر کا بھی جواب ہو گیا۔ انہوں نے محبت خدا کا انکار کیا ہے بدلیل مذکور یعنی وہ مرئی نہیں ہے نہ اس کا کوئی مماثل و مشابہ ہے نیز اس واسطے کہ محبت نام ہے خاص تعلق کا جو موقوف ہے طرفین کی مناسبت پر اور ممکن اور واجب میں مناسبت نہیں تو ان کی محبت کیسے ہو سکتی ہے جو اب یہ ہوا کہ محبت محال جب ہی ہے کہ بندہ کی طرف سے مانی جاوے اور جبکہ حق تعالیٰ کی طرف سے مانی جاوے تو محال نہیں تو قدرت کے سامنے کوئی چیز محال نہیں اور حق تعالیٰ کی تو بڑی شان ہے اہل اللہ سے محبت بھی انہی کی طرف سے شروع ہوتی ہے اس کا شاہد یہ ہے کہ مرید کو اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا ان کو ہوتا ہے۔ غرض محبت حق بندہ کی غذا ہے تو اس کی ضد یعنی بغض تو بہت دور ہے بندہ کے مرجانے کے لئے تو عدم محبت بھی کافی ہے جو ترجمہ ہے لاسحب کا جیسے مرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ظاہر کھایا جاوے بلکہ منع غذا بھی قاتل ہے۔ یہ بیان ہے لاسحب کے انتہائی لفظ ہونے کا پس جبکہ کبر مغفوض ہو تو اس کی ضد یعنی تواضع محبوب اور محمود ہوئی نیز تواضع علاج بھی ہے کبر کا اس وجہ بھی ضروری ہے مگر تواضع کے معنی سے لوگ علی العموم ناواقف ہیں جبلاء تو خاطر داری کو کہتے ہیں اور نئے تعلیم یافتہ اکثر تو لفظ تک بھی صحیح نہیں جانتے اور جو جانتے بھی ہیں تو وہ تصنع اور جھک جھک کر سلام کرنے کو سمجھتے ہیں حالانکہ تصنع تواضع نہیں بلکہ درحقیقت تکبر ہے جو ضد ہے تواضع کی تواضع کے حقیقی معنی پستی اور انکسار اختیار کرنا نہ صرف ظاہر بلکہ قلب سے اسی لئے متواضعین جھک جھک کر سلام نہیں کرتے بلکہ کوئی ان کی مدح کرے تو اس پر بھی انکار نہیں کرتے۔

وَاتَيْنَا مُوسَىٰ سُلْطٰنًا مُّبِينًا ۝

ترجمہ: اور موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے بڑا عرب دیا

تفسیری نکات

سلطانا کے معنی اور آیت کا صحیح مفہوم

فرمایا وَاٰتَيْنَا مُوسٰى سُلْطٰنًا مُّبِينًا کے معنی اقبال اور ہیبت جیسے بعض بزرگوں کو اللہ تعالیٰ عنایت فرماتے ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ

ترجمہ: یعنی اے اہل کتاب تم لوگ اپنے دین میں حد سے مت بڑھو اور اللہ پر بجز حق بات کے مت کہو

تفسیری نکات

مخلوق کی شان میں تجاوز اللہ تعالیٰ کی تنقیص ہے

اور لا تقولوا علی اللہ الا الحق میں ایک نکتہ عجیب اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور وہ میرے مقصد کی پوری دلیل ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے تو اس کا مقتضی تو یہ تھا کہ یہ فرماتے لا تقول علی عیسیٰ الا الحق ”یعنی عیسیٰ پر سوائے حق بات کے مت کہو پھر علی اللہ کیوں فرمایا؟ پس سمجھئے کہ علی اللہ فرمانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ جب مخلوق کی شان میں حد سے تجاوز کرو گے تو یہ ضرور خدا تعالیٰ کی تنقیص ہوگی پس عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا یہ تنقیص ہے باری تعالیٰ کی یہاں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ہم لوگ جو بدنام ہیں کہ یہ رسول کی مدح سے منع کرتے ہیں تو جو مدح حد کے اندر ہو اس کو ہم اپنا ایمان سمجھتے ہیں ہاں ہم خدا تعالیٰ کی تنقیص کو منع کرتے ہیں پس رسول کی اتنی مدح کرنا کہ جس سے حق تعالیٰ کی شان میں بے ادبی ہو یہ رسول کی تو ظاہر مدح ہوگی لیکن واقع میں اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہوگی۔ ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کسی کی اتنی مدح کرے کہ اس کے باپ کی اہانت ہو جاوے پس ایسی مدح کو وہ بیٹا بھی پسند نہ کرے گا بلکہ اس سے ناراض ہوگا۔

پس لا تقولوا علی اللہ الا الحق سے صاف ظاہر ہو گیا کہ مدح کے اندر حد شرعی سے بڑھنا یہ خدا تعالیٰ کی تنقیص ہے آگے جو ارشاد ہے اس سے میرا مقصود جو نکتہ کے عنوان سے بیان کیا ہے بہت صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ لا تقولوا علی اللہ الا الحق بھی اس مدح عیسوی ہی کے متعلق ہے اور وہ ارشاد یہ ہے کہ

انما المسيح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ

”یعنی مسیح عیسیٰ ابن مریم اور کچھ نہیں ہیں صرف اللہ کے رسول ہیں“

پس اگر آیت کے یہ معنی نہ ہوں جو میں نے بیان کئے ہیں تو درمیان میں لا تقولوا علی اللہ الا الحق بالکل بے ربط معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اول و آخر میں تو عیسیٰ علیہ السلام کا بیان ہے اور درمیان میں لا تقولوا علی اللہ الا الحق کے کیا معنی ہیں پس صاف ظاہر ہے کہ مدعا یہی ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی جزیت کے قائل ہو گے تو اللہ تعالیٰ پر بہتان ہوگا اور اس سے تنقیص جناب باری تعالیٰ کی لازم آئے گی۔ پس مدح بھی اسی وقت تک جائز ہوگی کہ حد سے نہ گزرے۔

حدود مدح

اسی طرح حضور ﷺ کی شان میں بھی سمجھ لو کہ حضور کی نعت اسی حد تک جائز ہوگی کہ حد شرعی سے متجاوز نہ ہو۔
باقی اس کی حد کیا ہے اس کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے بہت مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ یہ ہے
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

یعنی خواص ربوبیت کے علاوہ سب کمالات حضور کے لئے امر کانا تو سب ثابت اور وقوعاً جس میں روایت وارد ہو وہ ثابت اور خواص ربوبیت کے علاوہ اگر کوئی ایسا امر ثابت کرو گے جو روایت سے ثابت نہ ہو تو یہ کذب اور گناہ تو ہوگا لیکن اس سے تنقیص حق تعالیٰ کی لازم نہ آوے گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدح نبوی کے اندر دو چیزوں کی رعایت رکھو ایک تو یہ کہ حضور کو خدا کے درجہ مت پہنچاؤ

دوسرے یہ کہ وہ امر ثابت کرو کہ روایات ثابتہ اس کی مساعد ہوں ان دو اموروں کی رعایت کے بعد جو چاہو ثابت کرو کوئی منع نہیں کرتا۔ مختصر یہ ہے کہ اس باب میں نسبت الوہیت اور کذب سے احتراز رکھو لیکن چونکہ بنائے زماں ان دونوں باتوں سے اجتناب نہیں کرتے حضور کی شان کو ایسا بڑھاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتے ہیں اور حکایات و واقعات وہ بیان کرتے ہیں کہ روایات صحیحہ میں ان کا پتہ بھی نہیں اور اس کی اصلاح ضروری ہے۔ اس لئے ہم حکایات و واقعات سے زیادہ ضروری مضمون بیان کرتے ہیں جس کو میں نے راز ولادت سے تعبیر کیا ہے اور اگر یہ غلو ہم نہ دیکھتے تو ہم بھی صرف واقعات صحیحہ بیان کرتے اس لئے کہ

اذکر نعمان لنا ان ذکرہ ہو المسک ما کر دتہ بتضرع

(نعمان کے ذکر کا اعادہ کر اس لئے کہ اس کا ذکر مشک ہے جتنا اس کو مکر کرو گے مہکے گا)

اور اس لئے کہ محبوب کا ذکر بھی مایہ تسلی ہے جو ائے حکایت

دید مجنوں را یکے صحرا نورد	در بیابان غمش بشتہ فرد
ریگ کا ذغ بود انگشتان قلم	می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنوں شیدا چیت این	می نویسی نامہ بہر کیست این
گفت مشق نام لیلی می کنم	خاطر خود را تسلی میدہم

پس حقیقت یہ ہے کہ محبوب کا ذکر بھی محبوب ہے لیکن کیا کیا جاوے اسی محبوب کے آمر کی وجہ سے یہ بھی اختیار کیا جاتا ہے کہ محبوب کے احکام کا ذکر زیادہ اہتمام سے ہو اس لئے واقعات بیان نہ کروں گا نیز وقت بھی نہیں اور ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ بفضلہ تعالیٰ وہ واقعات جو علماء محققین نے صحیح روایات سے مدون کر دیئے ہیں مشہور اور السنہ پر مذکور ہیں اس لئے میں بجائے حضور کی تشریف آوری کے واقعات کے وہ حکمت اور راز بیان

کرنا چاہتا ہوں جو حضور کے تشریف لانے سے مقصود ہے اور نیز حضور کے واقعات اور حکایات کا بھی مقصود اور غایت اصلی وہی ہے۔

غایات قصص القرآن

اور قرآن مجید کے اندر بھی غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جتنے واقعات اور قصص حق تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں مطمح نظر ان سے ان کی غایات ہی ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

کتاب انزلہ الیک لتخرج الناس من الظلمت الی النور

(یعنی یہ کتاب ہے ہم نے اس کو آپ کی طرف اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالیں)

ارشاد ہے **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَىٰ الدِّينِ كُلِّهِ**

(یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا کہ اس

دین کو تمام دینوں پر غلبہ دے دیں)

اور فرماتے ہیں: **قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ أُمَّةً بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَ**

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے

ایک یادداشت یعنی رسول کو کہ وہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتے ہیں کہ وہ آیات (حق کو ظاہر کرنے والی ہیں)

تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کئے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالیں)

آیت مؤخر الذکر میں اللہ تعالیٰ نے ذکر اور رسول کو مبدل منہ اور بدل واقع کر کے گویا ایک قرار دیا ہے

اس سے عقلاء سمجھ سکتے ہیں کہ حضور کی ذات مقدس سے مقصود ذکر ہے بہر حال قرآن شریف کے اندر جہاں حضور

کا ذکر ہے وہاں غایت بھی حق تعالیٰ نے بیان فرمائی اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضور کی ذات بابرکات سے اور

آپ کے واقعات سے وہ غایت ہی مطلوب ہے۔

پس الحمد للہ میرا یہ بیان اور دعویٰ بے دلیل نہیں رہا پس راز و غایت کو بیان کرنا عین امتثال ہے اللہ تعالیٰ کے

ارشادات کا اور نیز یہ اس حیثیت سے افضل ہوگا صرف واقعات کو بیان کرنے سے یہ تو اجمالی تعین تھی مقصود کی۔

(الظہور ما حقہ مواعد عید میلاد النبی)

سُورَةُ الْمَائِدَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَلَحْمُ الْخِزْيُرِ وَمَا أُهْلِكَ

لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ

وَمَا أَكَلَ السَّبْعُ إِلَّا مَا ذُكِّرْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ

تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَلِكُمْ فَسُقُ الْيَوْمِ يَسِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ

دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ

وَآمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنْ اضْطُرَّ

فِي مَخْصَصَةٍ غَيْرِ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۵﴾

ترجمہ: تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو اور جو گلہ گھٹنے سے مر جائے اور جو کسی ضرب سے مر جائے اور جو اونچے سے گر کر مر جائے اور جو کسی کی ٹکڑی سے مر جائے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے لیکن جس کو ذبح کر ڈالو اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جاوے اور یہ کہ تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کے یہ سب گناہ ہیں آج کے دن ناامید ہو گئے کافر لوگ تمہارے دین سے سوان سے مت ڈرنا مجھ سے ڈرتے رہنا آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کیلئے پسند کر لیا ہے پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہو جاوے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

شرک کی حقیقت

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت جو لوگ اولیاء اللہ کے نام سر کسی جانور کو ذبح کرتے ہیں یا ان کے مزار پر نذر و نیاز کی مشائی وغیرہ چڑھاتے ہیں اس میں دو قسم کے عقائد کے لوگ ہیں ایک تو یہ کہ ان کو حاجت روا سمجھ کر ایسا کرتے ہیں اس کے تو شرک ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ایک صورت یہ ہے کہ ذبح تو کرتے ہیں اللہ ہی کے نام پر مگر اولیاء کو ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور ان کو مقبول سمجھ کر ان سے دعا کے طالب ہوتے ہیں اس میں کیا حکم ہے فرمایا کہ اس کی حرمت کی کوئی دلیل نہیں مگر عوام کا کچھ اعتبار نہیں اس لئے اس میں بھی احتیاط ضروری ہے سو یہ ایک واقعہ میں اختلاف ہے حکم میں اختلاف نہیں وہ کہتے ہیں کہ سب عوام کی نیت شرک نہیں ہوتی اور ہم کہتے ہیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کی نیت شرک کی ہوتی ہے تو یہ ایک واقعہ میں اختلاف ہوا حکم میں اختلاف نہیں باقی غالب واقعہ یہی ہے کہ نیت عوام کی یہی ہوتی ہے کہ وہ راضی ہو کر خوش ہو کر ہماری حاجت کو پورا کر دیں گے بس یہی شرک ہے اور بعض اہل کی تفسیر ذبح سے کر کے اس مذبح پر نیت تقرب الی غیر اللہ و علی اسم اللہ کو حلال کہتے ہیں سو یہ ان کی غلطی ہے اور اگر ان کی تفسیر کو مان لیا جاوے اور مَا أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ (اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو) میں داخل نہ مانا جاوے تب بھی وہ ذبح علی النصب (اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو) میں داخل ہونا تو قطعی ہے اس لئے کہ وہ عام ہے ہر منوی لغیر اللہ (جس میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی رضا مقصود ہو) کو۔

تفسیر مَا أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ

احقر اشرف علی کہتا ہے کہ ضابطہ ملفوظات اس مضمون کو کافی طور پر ضبط نہیں کر سکے اس لئے میں خلاصہ لکھ دیتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ مَا أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ کو بعض نے خاص کیا ہے اس جانور کے ساتھ جس کو غیر اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جاوے اور جو اللہ کا نام لیکر ذبح کیا جاوے گو اس میں نیت تقرب الی غیر اللہ کی ہو اس کو حلال کہا ہے اور غشا اس کا یہ ہے کہ بعض مفسرین نے اہل میں عند الذبح (ذبح کے وقت) کی قید لگا دی ہے مگر یہ قول محض غلط ہے دوسری آیت مَا ذُبحَ عَلَى النُّصُبِ میں ما عام ہے اور وہاں کوئی قید نہیں اور مذبح باسْمِ اللَّهِ کو بھی شامل ہے سو اس کی حرمت کی علت بجز نیت تقرب کے کیا ہے پس اسی طرح وَمَا أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ بھی عام ہوگا اور دونوں کے مفہوم میں اتنا فرق ہوگا کہ مَا أَهْلًا لِغَيْرِ اللَّهِ میں غیر اللہ کے لئے نامزد ہونا قرینہ ہوگا قصد تقرب

غیر اللہ کا اگر چہ انصاب (بتوں) پر ذبح نہ کیا جاوے اور مَا ذُكِرَ عَلَى النَّصَبِ میں ذبح علی الانصاب اس مقصد کا قرینہ ہوگا اگر چہ غیر اللہ کے لئے نامزد نہ کیا گیا ہو پس دونوں میں عموم و خصوص من وجہ ہوگا اور یہی تغایر منی ہوگا ایک کے دوسرے پر معطوف ہونے کا سورہ مائدہ میں پس علت حرمت کی قصد مذکور ہوگا یہ تو قرآن مجید سے استدلال ہے مَا أَهْلًا لِيَغْزِيَ اللَّهُ فِي عِنْدِ الذَّبْحِ کی قید نہ ہونے کی اور فقہاء نے مذبح بوج تقدوم الامیر (جو امیر کے آنے کے وقت اس کے تقرب کے لئے ذبح کیا ہو) کی حرمت میں اس کی تصریح کی ہے وان ذبح علی اسم اللہ تعالیٰ (اگر چہ اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو) اور یہ علت بیان کی ہے لَانَهُ مَا أَهْلًا لِيَغْزِيَ اللَّهُ بس معلوم ہوا کہ عند البدیع کی قید اتقائی جریا علی العادة ہے یا اس قید سے یہ مقصود ہے کہ ذبح کے وقت تک وہ نیت تقرب کی رہی ہو یعنی اگر ذبح کے قبل توبہ کر لی تو پھر حرمت نہ رہے گی اور تفسیر احمدی میں جو بقدر مندورة الاولیاء (اولیاء اللہ کو ثواب پہنچانے کے لئے جو جانور ذبح کیا جاوے) کو حلال کہا ہے وہ اس تحقیق کے خلاف نہیں ہے کیونکہ منیہ میں یہ تاویل کی ہے کہ ذبح اللہ ہے اور نذر سے مقصود ان کو ایصال ثواب ہے تو یہ اختلاف واقعہ تحقیق میں ہوا کہ ان کے نزدیک عوام کی نیت تقرب کی نہیں نہ کہ منوی للتقرب (جس میں تقرب کی نیت کی گئی ہو) کی حرمت میں اس تاویل سے خود ظاہر ہے کہ منوی للتقرب کو بھی حرام سمجھتے ہیں اور بعض نے ما لھل بہ کو ایسا عام کہا ہے کہ حیوان اور غیر حیوان دونوں کو شامل ہے یعنی طعام و شیرنی بھی اس میں داخل ہے مگر تاویل و قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مقصود بیان کرنا احکام حیوان کا ہے رہا ما کے عام ہونے سے استدلال سو محقق یہ ہے کہ اس عموم میں ایک قید بھی ہے وہ یہ کہ مراد تکلم سے متجاوز نہ ہو اور یہاں متجاوز ہو جائے گا مگر اس سے حلت لازم نہیں آتی بلکہ اشتراک علت سے حکم بھی مشترک ہوگا حیوان میں نص قطعی سے اور غیر حیوان میں قیاس ظنی سے۔ واللہ اعلم

وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَنَّكَ كَافٍ سِنَةً وَمَا تُعَدُّونَ۔

امراض روحانی کا انجام

امراض قلب کے واسطے اس سے بھی امراض باطنہ کا اثبات ہوتا ہے غرض یہ جہل بھی ایک مرض ہے اور مرض بھی شدید بلکہ اشد کیونکہ امراض جسمانی کا انجام تو صرف ہلاک دنیوی ہی ہے اور ہلاک دنیوی کی حقیقت کیا ہے کچھ بھی نہیں بلکہ وہ تو دراصل جملہ امراض سے فارغ ہو جاتا ہے اس کے بعد وہ حیات ہے جو بنا پر اخبار صادقہ منقطع ہی نہیں ہو سکتی بخلاف مرض روحانی کے کہ اس کا انجام اخروی ہے جو یا ابدی ہے یا غیر ابدی محمد ارشاد ہے..... وہاں تو ایک دن کی سزائے قید ہزار برس کے برابر ہے اور پھر امتداد کے ساتھ وہاں کی قید

میں استاد بھی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ وہاں کی آگ یہاں کی آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے جب اس آگ کی برداشت نہیں ہو سکتی تو اس کی کیسے ہوگی۔ تمام بدن تو درکنار ایک دیا سلائی کی آگ انگلی تک پہنچ جائے تو تحمل نہیں ہوتا اور وہ آگ تو محیط ہوگی کہ انسان اس میں غرق ہوگا اور رگ و پے تک آگ پہنچے گی اس کی برداشت کیسے ہو سکتی ہے اور کون برداشت کر سکتا ہے اور کافر کے لئے تو عذاب ابدی ہے یعنی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ہرگز ہرگز کسی طرح نہ ہو سکے گی۔

دین کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے

اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کافر وہ ہے جو کفر کا کام کرے یا کفر کی بات کہے اگرچہ عقائد کفریہ نہ ہو کہ پس اگر کوئی مسلمان کفر کا کام کرے گا جیسے بلا عذر زنا یا پھن لینا وہ بھی کافر ہو جاوے گا یا جب زبان سے کلمہ کفر کا کہا فوراً کفر عائد ہو جائے گا اس سے بھی آج کل نہایت بے پروائی ہو رہی ہے مثلاً بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ روزہ وہ رکھے جس کے پاس کھانے کو نہ ہو اور کچھ خیال نہیں ہوتا کہ ہم نے کس درجہ کا گناہ کیا حالانکہ وہ کافر ہو گیا اب یا تو اس کو اپنے کفر کی خبر نہیں یا خبر ہے تو کفر کو خفیف خیال کرتا ہے اور درحقیقت یہ کلمہ بہت شدید اور سخت ہے۔

وقت نزول آیت مذکور

حق تعالیٰ فرماتے ہیں الْيَوْمَ يَكْفُرُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَغْشَوهُمْ وَأَخْشَوْنِ كَمَا آج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے یعنی اس بات سے کہ اس کو مٹائیں یا اس پر غالب آ جائیں یہاں بدل اشتمال محذوف ہے اِی الْیَوْمَ یَنْسُ الذِّیْ کَفَرُوا مِنْ دِیْنِکُمْ اِنْ یَغْلِبُوْهُ یَا اِنْ یَمْحَقُوْهُ اور وہ کیوں مایوس ہوئے لکثرة شیوعه و لنصرته تعالیٰ یعنی بجز اللہ اس وقت اسلام اس قدر پھیل بھی گیا ہے کہ عادت الہیہ میں اب مٹ نہیں سکتا اور نیز اللہ تعالیٰ نے وعدہ بھی فرمایا ہے کہ یہ قیامت تک قائم رہے گا چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے چند دعائیں کی تھیں کہ میری امت عامہ عذاب سے ہلاک نہ ہو یہ دعا قبول ہو گئی۔ دوسری یہ دعا کی تھی کہ اس پر قحط مہلک نہ ہو یہ بھی دعا قبول ہوئی۔ تو اس میں وعدہ ہو گیا قیامت تک بقاء دین کا۔ تیسرے یہ کہ میری امت میں نا اتفاقی نہ ہو یہ قبول نہ ہوئی تو فرماتے ہیں کہ آج کے دن کفار مایوس ہو گئے تمہارے دین سے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حدیث میں ہے کہ وہ دن حجۃ الوداع کا تھا یعنی نویں تاریخ ذی الحجہ کو عرفہ کے میدان میں جمعہ کے روز نازل ہوئی وقت بھی عصر کا تھا۔ تو گویا جب یہ آیت نازل ہوئی وہ وقت تقریباً سال کا بھی آخر تھا دن کا بھی آخر تھا حضور کی عمر شریف کا بھی آخر تھا کیونکہ حجۃ الوداع کے بعد محرم صفر اور ربیع الاول کی چند تاریخوں تک آپ زندہ رہے۔

ابتداع فی الدین

کسی یہودی نے حضرت عمر سے کہا تھا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔ پہلے یہ مرض یہودیوں میں تھا۔ اب مسلمانوں میں بھی یہ مرض ہو گیا ہے کہ ہر بات کی یادگار میں عید کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ آیات کب نازل ہوئی اور کس جگہ نازل ہوئی یعنی عرفات میں جمعہ الوداع میں جمعہ کے روز نازل ہوئی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جہاں یہ آیت نازل ہوئی ہے وہ مقام ہمیشہ سے من جانب اللہ جائے عید ہے اور جس وقت نازل ہوئی ہے وہ زمانہ بھی من جانب اللہ عید کا ہے۔ ہمیں اور عید کی ضرورت نہیں۔ بس یہی عید کافی ہے یہ تو حقیقت تھی جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ظاہر فرمادی۔ مگر اب مسلمانوں میں ایک یہ رسم پیدا ہو گئی ہے کہ وہ یہودی کی طرح ہر بات کی عید اور ہر چیز کی ایک یادگار بنانا چاہتے ہیں یاد رکھو یہ ابتداع فی الدین ہے جن ایام کو شریعت نے عید بنا دیا ہے ان کے علاوہ کسی دن کو عید بنانا حرام و بدعت ہے اور پہلے تو صرف یادگار کا یہی طریقہ تھا کہ اس دن کو عید بناتے تھے حتیٰ کہ کسی کے مرنے کے دن کو بھی عرس کا دن بناتے تھے اور اب اس کے علاوہ ایک نئی ایجاد ہوئی ہے کہ یادگار کے لئے ہڑتال کر دیتے نہ معلوم یہ ہڑتال کیسا نام ہے ہڑتال سے تو بال صاف کئے جاتے ہیں ہڑتال تو ان کی اور سرمنڈتا ہے غریبوں اور مزدوروں کا کہ وہ بیچارے اس دن کھائیں کہاں سے کمائیں کیسے۔ کیونکہ اس دن بازار اور تمام کاروبار بند ہو جاتا ہے جس سے غریبوں اور مزدوروں کو بے حد تکلیف ہوتی ہے مگر ان کو اس کی ذرا پروا نہیں۔

یہ رسم بھی بعض کفار ہی سے لے لی ہے۔ نہ معلوم مسلمانوں میں اتباع طریقہ کفار کا اتنا شوق کیوں پیدا ہو گیا اپنے بزرگوں کی حالت نہیں دیکھتے کہ وہ کیا کر گئے ہیں اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اس وقت سال کا آخر تھا، ہفتہ کا آخر تھا دن کا بھی آخر تھا، حضور ﷺ کی عمر کا بھی آخر تھا۔ ان سب چیزوں کا آخر تھا۔ اس کے متعلق ایک بات طالب علموں کے کام کی ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں کہ اس آخر سے آخر حقیقی مراد نہیں بلکہ قریب آخر کے مراد ہے۔ چنانچہ سال بھی قریب آخر کے تھا۔ حضور کی عمر بھی قریب آخر کے تھی دن بھی قریب آخر کے تھا اور جیسے یہ چیزیں قریب آخر کے تھیں اسی طرح اس آیات کو بھی جو آخر آیات کہا جاتا ہے وہ بھی قریب آخر کے ہے آخر حقیقی نہیں ہے۔ چنانچہ اس کے بعد فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمِهِ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ نازل ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہو جائے۔ بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحم کرنے والے ہیں تو ان سب میں (آخر حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ قریب آخر مراد ہے)

احکام کی آخری آیت

اور مجھ کو اس سے ایک فائدہ نکالنا مقصود ہے وہ یہ کہ یہاں پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ جب دین کامل اور تام ہو چکا تو پھر حکم اضطرار اور غمضہ کا اس کے بعد کیسا اور اس کا یہ جواب نہیں دیا جاسکتا ہے کہ احکام کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان میں یہ آخر ہے اس کے بعد کوئی اور حکم نازل نہیں ہوا کیونکہ قَمِنَ اضْطُرَّافِي مَخْمَصَةٍ (الآیۃ) تو احکام ہی میں سے ہے اور یہ الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ کے بعد میں نازل ہوا ہے تو پھر آخر کہاں ہوا پس جواب صحیح وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ آخر سے مراد قریب آخر ہے اس پر کوئی خدشہ نہیں وارد ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ لوگ قرآن کو اصطلاحات منطقیہ پر اتارتے ہیں محاورہ کو نہیں دیکھتے۔ محاورہ میں قریب آخر کو بھی آخر کہا جاتا ہے مثلاً کوئی کسی دوست سے ملنے جاتا ہے تو کہتا ہے اب تمہارے ساتھ میری یہاں آخری ملاقات ہے اور اس کے بعد دو گھنٹہ تک بیٹھتا رہتا ہے غلامہ یہ ہے کہ الیوم سے مراد خاص آج ہی کا دن نہیں جس پر یہ شبہ ہو کہ جب آج اکمال دین ہو گیا تو اس کے بعد کوئی حکم نازل نہ ہونا چاہئے اور آیات احکام میں یہاں آخری آیت اور احکام ہونا چاہئے سو یہ شبہ اس لئے وارد نہیں ہوتا کہ الیوم سے مراد خاص آج ہی کا دن نہیں بلکہ الیوم سے مراد زمانہ حاضرہ مع متصل ما قبل و ما بعد کے ہے اور محاورہ میں اس مجموعہ کو زمانہ حاضرہ کے منافی نہیں۔ الغرض حق تعالیٰ فرماتے ہیں الْيَوْمَ يَسِّرُ الَّذِينَ كَفَرُوا کہ آج سے کافر مایوس ہو گئے تمہارے دن سے کہ اسکو مٹادیں یا اس پر غالب آجائیں جب یہ بات ہے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنَ تو تم ان سے ڈرو مت تمہارا کچھ کر نہیں سکتے۔ اگر اسلام سے تم کو محبت ہے تو اس میں پختہ رہو کسی سے مت ڈرو۔ افسوس اب بہت لوگوں کو دعویٰ ہے محبت اسلام کا اور کفار سے ڈر کر ان سے دوستی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ ساتھ نہ ہوں تو ہمارا دین قائم نہیں رہ سکتا اس لئے ان سے مدد لیتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کا رد فرماتا ہے کہ اب وہ تمہارے دین سے مایوس ہو گئے۔ پھر تم کیوں ڈرتے ہو۔ افسوس کفار تو سمجھ گئے کہ ہم اس دین کو دنیا سے نہیں مٹا سکتے۔ چنانچہ ان کا یاں اس سمجھنے کی دلیل ہے اور مسلمان نہیں سمجھتے پس ارشاد ہے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنَ تو تم ان سے مت ڈرو مجھ سے ڈرو یعنی ان کی خوشامد میں شریعت کے خلاف نہ کرو دین کو جاہ مت کرو کوئی اس دین کو مٹا ہی نہیں سکتا اسلام تو وہ چیز ہے کہ

چرانے را کہ ایزد بر فروزد ہر آنگس تف زندریش بسوزد

اسلام کا معجزہ

کیا یہ اسلام کا معجزہ نہیں کہ قسطنطنیہ میں چنگیز خان نے اپنے نزدیک اسلام کو فنا کر دیا تھا کیونکہ خلافت کی

جز اکھاڑ دی تھی مگر یہ اس کی حماقت تھی کہ خلافت کے مٹانے کو اسلام کا مٹانا سمجھا۔ آخر خلافت کیا ہے وہ تو اسلام کی ایک شاخ ہے خدا نخواستہ خلافت کے مٹ جانے سے اسلام نہیں مٹ سکتا بلکہ کبھی ہیڑ کی ایک شاخ کٹنے سے ایک اور شاخ نکل آتی ہے جو پہلی شاخ سے اچھی ہوتی ہے خلافت تو فرع ہے اسلام کی۔ اس کے جانے سے کہیں اسلام مٹ سکتا ہے؟ غرض چنگیز خاں نے خلافت کی جڑ کاٹ ڈالی تھی مگر خدا نے یہ کیا کہ جنہوں نے اسلام کو مٹانا چاہا تھا انہیں سے اسلام کی خدمت کرائی۔ چنانچہ وہی اب اسلام کو مخالفین کے حملوں سے بچا رہے ہیں یعنی ترک جو چنگیز خاں کی اولاد اور خاندان اور قوم سے ہیں میں نے بعض مورخین سے سنا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر کوئی ترک نہیں جو مسلمان نہ ہو اور انہوں نے اتنی بڑی خدمت اسلام کی کی ہے جس سے لوگوں کو ان کے متعلق گمان ہو گیا خلافت کا کہ وہ خلیفہ ہیں اسی لئے کہتے ہیں

چراغے راہ کہ ایزد بر فرورد
ہر آنکس تف ز ندر ریش بسوزد

جس چراغ کو خدا روشن کرے وہ گل نہ ہوگا اس کی بیخ کٹی کوئی کر ہی نہیں سکتا اور یاد رکھو جس دن یہ ڈوبے گا اس دن سب ڈوب جائیں گے۔ اسلام وہ مذہب نہیں جو دنیا سے تمہارا رخصت ہو بلکہ اس کا مٹانا تمام مذاہب اور تمام عالم کا مٹنا ہے اس کی تو وہ شان ہے کہ ہم تو ڈوبیں گے مگر تم کو بھی لے ڈوبیں گے صاحبو! جس روز اسلام نہ رہے گا اس دن عالم فنا ہو جائے گا اور راز اس کا یہ ہے کہ اگر کسی شہر میں سب باغی نہ ہوں بلکہ مطیع بھی ہوں تو بادشاہ ایک طرف سے اس شہر کو نہیں اڑایا کرتا بلکہ پہلے مطیعین کو وہاں سے الگ کرتا ہے پھر شہر کو اڑاتا ہے تو جب تک شہر میں مطیعین موجود ہیں اس وقت تک اطمینان رہتا ہے کہ یہ شہر ابھی نہیں اڑایا جائے اور جس دن مطیعین کو وہاں سے الگ کر لیا جائے پھر بستی کی خیر نہیں کیونکہ اب اس میں سارے باغی ہی باغی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں جس کی رعایت سے شہر کو باقی رکھا جائے چنانچہ قرآن میں لوط علیہ السلام کے قصہ میں بھی اسی اصل کا ذکر ہے لَقَاتِلَآءَ دُوۡلَآءِ اَبْرٰهٖمَ ۙ اَلْبٰسِرِیۡمَ ۗ کَالۡوَاۡیۡمٰتِہُمُ لَکَآءِ اٰہْلِ ہٰذَا ۗ الْقُرۡۡبٰنِ اٰہِلِہَا کَانُوۡا ظٰلِمِیۡنَ ۗ ابراہیم علیہ السلام سے فرشتوں نے کہا کہ ہم اس بستی کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے باشندے بڑے ظالم و شریر ہیں قَالَ اِنَّ فِیۡہَا لَۡوٰطٰٓءَ اِبْرٰہِیۡمَ عَلِیۡہِ السَّلَامِ نَہیٰ کہہ ان میں لوط علیہ السلام بھی تو موجود ہیں اس حالت میں بستی کو کیسے ہلاک کرو گے قَالَ اِنۡہُمۡنۡ اَعۡلَمُوۡۤا بِمَنۡ فِیۡہَا فرشتوں نے کہا کہ جو وہاں رہتے ہیں ہم کو سب معلوم ہیں لَنُنۡصِبَکَآ وَ اٰہِلَکَآ اِلَّا اَمۡرًاۗنَۙ کَانَتَ مِنَ الظَّٰلِمِیۡنَ ہم ان کو اور ان کے خاص متعلقین قبضین کو پچالیس گے۔ مگر ان کی عورت کو کیونکہ وہ بھی نافرمانوں میں تھی۔ دوسری جگہ اس عجیب کی صورت فرماتے ہیں فَاۡخۡرَجۡنَا مَنۡ کَانَ فِیۡہَا مِنَ الْمُؤۡمِنِیۡنَ ۗ فَمَا وَجَدۡنَا فِیۡہَا غَیۡرَ بَیۡتٍ مِّنَ الْمُسٰلِمِیۡنَ ۗ کہ ہم نے جتنے ایماندار تھے۔ سب کو وہاں سے نکال دیا علیحدہ کر دیا

اور مسلمانوں کا بجز ایک گھر کے اور کوئی گھر نہ پایا جب ان کو الگ کر دیا اب قہر خدا نازل ہوا۔ غرض یہ خدا کی رحمت ہے کہ اگر کسی بستی میں ایک مطبخ بھی موجود ہو تو وہاں قہر عام نازل نہیں فرماتے یہ ان کی عنایت ہے رحمت ہے۔ جب یہ سمجھ گئے تو اگر دنیا میں ایک اللہ اللہ کہنے والا بھی موجود ہوگا تو حق تعالیٰ عالم کو فنا نہ کریں گے عالم باقی رہے گا اور اگر ایک بھی مسلمان نہ رہے تو پھر اسی دم عالم کو فنا کر دیں گے جب بقائے عالم بقائے اہل اسلام پر موقوف ہے تو تمام دنیا کو اس کی خوشامد کرنا چاہئے نہ کہ مسلمان کسی کی خوشامد کریں اس لئے فرماتے ہیں **فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ** یعنی کفار کی خوشامد کر کے اور ان سے دوستی بڑھا کر اسلام کو مت کھو بیٹھو۔ ہماری خوشامد کرو ہم سے ڈرو وہ ہیں کیا چیز۔ آگے اس کے بعد فرماتے ہیں **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** وَاكْمَلْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي اب ہم نے دین کو کامل کر دیا دین ایسا کامل ہو گیا کہ اس کو دیکھ کر کسی کی ہمت نہ ہوگی اس کے مٹانے کی وَاكْمَلْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي یعنی تم پر اپنی نعمت پوری کر دی دو اعتبار سے ایک قوت سے دوسرے قواعد و احکام سے قوت کے اعتبار سے تو اتنا مضبوط کر دیا کہ **الْيَوْمَ يَكْفُرُ الَّذِينَ كَفَرُوا** کفار مایوس ہو گئے ان کے اندر اتنی قوت نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکیں سو اب اس کو مٹانے کی ان کو ہمت نہ ہوگی اور قواعد کے اعتبار سے **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** یعنی قواعد و احکام کے اعتبار سے اتنا کامل کر دیا کہ قیامت تک کے جتنے احکام ہیں سب اس سے نکل سکتے ہیں کوئی حادثہ ایسا پیش نہ آوے گا جس کا حکم اس میں نہ ملے اگر کوئی کہے پھر اور دلائل کی کیا ضرورت ہے حدیث و اجماع امت و قیاس تو یہ بات نہیں حدیث تو خود دین کا جزو ہے اور دینکم میں داخل ہے دینکم کا مقابل نہیں باقی قیاس مظہر ہے مثبت نہیں وہ احکام قیاسیہ بھی قرآن و حدیث ہی سے ثابت ہیں۔ رہا اجماع امت سو وہ اجماع کسی آیت یا حدیث ہی کے مضمون پر ہوتا ہے تو یہ سب حقیق میں ایک ہی چیز ہوئے یعنی دین صرف نام الگ الگ ہیں ایک لحاظ سے اس کا نام قرآن ہے اور ایک اعتبار سے حدیث ایک اعتبار سے اجماع امت ایک اعتبار سے قیاس

عبارتنا شتى وحسنك واحد وكل الى ذالك الجمال يشير
بہر رنگے کہ خواہی جامہ سے پوش من از رفتار پابت سے شناسم

دین اسلام کبھی ناسخ ہونے والا نہیں

یہ سب ایک ہی چیز ہے کسی وقت کسی رنگ میں ہے کسی وقت کسی لباس میں اسی کی نسبت فرماتے ہیں **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** یعنی تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور اپنی نعمت پوری کر دی ظاہر ابھی اور باطن ابھی کسی قسم کا نقص کوئی کمی اس میں نہیں رہی وَرَضِينَا لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا اور پسند کیا میں نے تمہارے

لئے دین اسلام کو یہی دین خدا کے نزدیک مرضی اور پسندیدہ ہے یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ رضیت کا عطف ظاہر ہے کہ اکملت والعمت پر ہے اور معطوف علیہ مقید ہے الیوم کے ساتھ یعنی اکمال اور اتمام دین اب ہوا تو رضیت معطوف میں بھی وہ قید ہوگئی ہے معطوف علیہ میں تو کچھ اشکال نہیں کیونکہ وہ واقعی ابھی متحقق ہوا لیکن رضیت میں کیا کہا جاوے گا۔ کیا یہ رضا بالا سلام بھی آج ہی ہوئی کیونکہ عطف کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ جیسے اکمال و اتمام اب ہوا ایسے ہی یہ رضا بالا سلام بھی ابھی ہوئی حالانکہ اسلام کو ان کے لئے پسند کرنا پہلے سے ہے یہ اشکال ہے اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ اکملت پر عطف نہیں بلکہ الیوم پر ہے اب کوئی اشکال نہیں مگر یہ ضعیف توجیہ ہے کیونکہ اس میں متبادر کا ترک لازم آتا ہے محققین کہتے ہیں کہ اس تکلیف کی ضرورت نہیں کہ الیوم پر عطف ہے بلکہ ہل تفسیر یہ ہے کہ یہاں ایک قید ہے یعنی رَضِينَا لَكَوَالْاِسْلَامَ وَرَضِينَا مَطْلَبُ يَهْ كہ ہمیشہ کے لئے ہم نے اسی کو پسند کیا ہے یہ دنیا سے کبھی زائل نہ ہوگا کوئی اسکا مٹانے والا نہیں کوئی اس کا تارخ نہیں جیسے اور اریان کے بعد دیگرے منسوخ ہوتے گئے یہ ایسا نہ ہوگا ہمیشہ رہے گا۔ سو یہ خبر بقضاء الیوم القیامہ کی تصریح آج ہی ارشاد فرمائی گئی اگرچہ ختم نبوت کی خبر سے لڑو ما یہ بھی معلوم ہو گیا تھا یہاں شاید کسی کو وہم ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام تو آخر زمانہ میں آویں گے اور وہ اپنے خاص احکام جاری کریں گے۔ مثلاً جزیہ کا قانون اٹھادیں گے جو کہ حکم اسلام ہے یا خنزیر کی نسل کو مٹادینے کا حکم فرمادیں گے اور یہ سب ظاہر نسخ ہے جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اس حیثیت سے نہ آویں گے کہ ان کو اس وقت نئی نبوت یا شریعت اسلامیہ کے خلاف کوئی شریعت عطا ہوگی لانسبی بعد کے یہی معنی ہیں کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی جدید نبوت نہیں۔ یعنی بعد حضور کی وفات کے کسی کو جدید نبوت یا شریعت اسلامیہ کے خلاف کوئی شریعت عطا نہ ہوگی یہ مطلب نہیں کہ کوئی پہلے کی نبوت عطا کیا ہوا نبی بھی شریعت اسلامیہ کا قیام ہو کر بھی دنیا میں نہ آوے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام تو پہلے سے نبی تھے اور شریعت اسلامیہ ہی کے تابع ہو کر تشریف لائیں گے ان کا حضور کے بعد آنا اور قیام ہو کر آنا لانسبی بعدی کے خلاف نہیں سو وہ آ کر حضور ہی کی شریعت کے موافق عمل کریں گے تو لانسبی کے یہ معنی نہیں کہ کوئی پرانا نبی بھی حضور کے دین کی خدمت کے لئے نہ آوے گا۔

غرض عیسیٰ علیہ السلام نازل بھی ہوئے اور اس وقت نبی بھی ہوں گے مگر اعطائے نبوت ان کے لئے پہلے ہو چکی ہے اور آپ ﷺ کی نیابت کے طور پر آویں گے نہ کہ مستقل بنکر اور حاکم ہو کر بلکہ حضور ﷺ کے منگوم ہو کر آویں گے۔

اس میں تو حضور کی اور فضیلت بڑھ گئی کہ نبی بھی حضور کے خادم ہوں گے۔ حدیث میں ہے لو کان موسیٰ حیا لما وسعه الا اتباعی کہ اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو وہ سوائے میری اتباع کے

اور کچھ نہ کرتے آپ نے یہ نہیں فرمایا لسلبت نبوتہ کہ ان کی نبوت چھن جاتی بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ قبیح ہو کر رہتے غرض رضیات کے یہ معنی ہوئے کہ ہم نے ہمیشہ کے لئے اسی دین کو پسند کیا ہے پس حدیث میں جو ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو کر جزیہ کو موقوف کر دیں گے اور اس وقت دو ہی باتیں رہ جائیں گی یا اسلام لاؤ یا قتال کرو تو وہ نسخ نہیں ہے بلکہ اس وقت کے لئے شریعت محمدیہ کا یہی قانون ہوگا جس کو عیسیٰ علیہ السلام جاری فرمادیں گے اور بڑے حرہ کا لطیفہ ہے کہ عیسائی لوگ مسئلہ جہاد کے اوپر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے اس کو کیوں رکھا میں کہتا ہوں کہ اپنے پیغمبر سے ہی پوچھو وہ عنقریب آنے والے ہیں وَانْتظِرُوا يَوْمًا مَّا تُنْتَظِرُونَ حضور نے تو پھر بھی تمہاری رعایت کی ہے کہ جزیہ دے کر بیچ سکتے ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے تو اس کی بھی پروا نہ کی۔ ان کے عہد میں دو ہی باتیں ہوں گی یا اسلام یا سیف غرض عیسیٰ علیہ السلام حکم اسلامی قدیم کو منسوخ نہ فرمائیں گے کہ پہلے جزیہ کا حکم تھا اور آپ اس کو اٹھادیں گے تاکہ ان کو ناسخ کہا جائے۔

پھر رَحْمَتًا لِّكُلِّ اِسْلَامٍ دُنِيَا تا بیدار پر شبہ کیا جائے کہ تا بید تو جب ہوتی ہے کہ اسلام کا ہر حکم قیامت تک رہتا۔ سو جواب ظاہر ہے کہ اس حکم کو عیسیٰ علیہ السلام نے منسوخ نہیں کیا بلکہ حضور ہی نے منسوخ کیا ہے پس اس حدیث میں کہ نصح الجزیہ خبر بمعنی انشاء ہے۔ یعنی حضور ہی خود یہ حد مقرر کر گئے ہیں کہ اے عیسیٰ جب تم آؤ اس وقت کفار کے ساتھ یہ معاملہ برتنا اس کی مثال ایسی ہے کہ طبیب نے کسی مریض کو مسہل دیا اور اس سے کہہ دیا کہ مسہل لینے کے بعد یہ ٹھنڈائی پیئے گا تو اب مریض جو ٹھنڈائی پیتا ہے یہ اس کی ایجاد نہیں بلکہ طبیب ہی کا کہنا پورا کرتا ہے طبیب ہی نے بتلا دیا تھا کہ تین روز کے بعد تیر تجویز ہوگی اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو حکم ہے کہ اس وقت آپ جزیہ کو موقوف کر دیں عیسیٰ علیہ السلام اپنی طرف سے ایجاد نہیں کریں گے بلکہ آپ ہی کے فرمان کو بجالادیں گے غرض اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین پسندیدہ اسلام ہی ہے) اور رَحْمَتًا لِّكُلِّ اِسْلَامٍ دُنِيَا کے معنی یہی ہیں کہ ہمیشہ ہی دین رہے گا آگے ایک نکتہ ہے اہل علم کے لئے وہ یہ کہ قَمِنَ اِضْطْرَّتِيْ مَخْنَصَةً یہ حکم یہاں بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے ماقبل کے ساتھ اس آیت کا ربط نہیں معلوم ہوتا کہ یا تو اوپر تکمیل اسلام کی بشارت دی جا رہی ہے یا اب قَمِنَ اِضْطْرَّتِيْ مَخْنَصَةً کا حکم نازل فرما دیا اور پھر اس مضمون کو فاء کے ساتھ لائے جو ترتیب کے لئے آتا ہے تو بعض نے تو اس اشکال سے گھبرا کر یہ کہہ دیا کہ فاء ترتیب ذکر کے لئے ہے ترتیب حکمی کے لئے نہیں لہذا حکم مرتب ہونا اور مسلسل ہونا ضروری نہیں مگر الحمد للہ میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ یہاں پر فاء ترتیب حکمی ہی کے لئے ہے اور پھر بھی اشکال نہیں چنانچہ عنقریب مذکور ہوگا باقی جن لوگوں نے فاء کو ترتیب ذکر کے لئے قرار دیا ہے ان پر ایک اشکال پھر بھی باقی رہتا ہے وہ یہ کہ اس مضمون کو ماقبل سے کیا جوڑ ہوا اس بے ربطی کا کیا جواب ہے انہوں نے اس کا بھی ایک جواب دیا وہ یہ کہ

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي يَوْمَ الْيَوْمِ الْكَافِرِينَ
 میں حلال و حرام چیزوں کا ذکر تھا حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِنَ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ
 وَالْمُنْفِقَةُ وَالْمُؤَفَّقَةُ وَالْمُتَكَذِّبَةُ وَالنَّظِيمَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُكِرَ عَلَى النُّصَبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا
 بِالْآزْوَاجِ ذَلِكُمْ فَنَقُ بِهِ أَحْكَامَ اللَّهِ تَعَالَى نَعْمَتِي يَوْمَ الْيَوْمِ الْكَافِرِينَ یہ احکام حق تعالیٰ نے پہلے ذکر فرمائے ہیں ان احکام کے ساتھ فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْصَصَةٍ
 مَرْتَبَتٍ فِي حَيْثُ جُزِيَ جُزِيَ فِيهَا مَا فِيهَا حُرِّمَ مَرْتَبَتٍ فِي حَيْثُ جُزِيَ جُزِيَ فِيهَا مَا فِيهَا حُرِّمَ مَرْتَبَتٍ فِي حَيْثُ جُزِيَ جُزِيَ فِيهَا مَا فِيهَا حُرِّمَ
 میں جملہ معترضہ ہے اور جملہ معترضہ کو بھی اول سے کچھ مناسبت ہوتی ہے وہ مناسبت یہ ہے کہ دیکھو اسلام میں
 کیسے کیسے قواعد ہیں اور چونکہ خدا تعالیٰ کو اسلام کا اکمال مقصود ہے۔ اس لئے دیکھو اللہ میاں نے سارے
 ضروری احکام بتا دیئے تاکہ کسی طرح کمی نہ رہ جاوے یہ تو مشہور جواب ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر فاء ترتیب
 حکمی ہی کے لئے ہو پھر بھی کچھ اشکال نہیں اور جو اشکال کیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ
 فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْصَصَةٍ غَيْرِ مَرْتَبَتٍ لَمْ يَكُنْ لِيَوْمِ الْيَوْمِ الْكَافِرِينَ لَمْ يَكُنْ لِيَوْمِ الْيَوْمِ الْكَافِرِينَ لَمْ يَكُنْ لِيَوْمِ الْيَوْمِ الْكَافِرِينَ لَمْ يَكُنْ لِيَوْمِ الْيَوْمِ الْكَافِرِينَ
 حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے تمہارے دین کو مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کیا اور تمہارے لئے
 اس دین کو ہمیشہ کے لئے پسند کیا آگے ارشاد ہے فَمَنْ اضْطُرَّ فِي مَخْصَصَةٍ لَمْ يَكُنْ لِيَوْمِ الْيَوْمِ الْكَافِرِينَ یعنی ہم اتنے کامل العفو ہیں اور تم
 سے اتنے خوش ہیں اور ہماری اس قدر تم پر رحمت ہے بعض حالات میں تمہاری راحت و سہولت و مصلحت کے لئے
 حرام کو بھی حلال کر دیتے ہیں اس پر فاء کا ترتیب نہایت لطیف اور چسپاں ہو گیا اور اس میں ایک اور لطیفہ بھی حاصل
 ہو گیا وہ یہ کہ اسمیں اشارہ ہے سبقت رحمتی علی غضبی کی طرف چنانچہ آیت کو ختم بھی رحمت پر کیا ہے یعنی
 غفور رحیم پر گویا اشارہ ہے اس طرف کہ اے بندو! ہمارے احکام کو تنگ مت سمجھو احکام میں کوئی تنگی نہیں
 ہے جہاں تنگی کا وہم ہے جیسے تحریک محرمات وہاں بھی رحم کی رعایت ہوتی ہے۔ بخدا میں دعوے سے کہتا
 ہوں کہ دین میں کوئی تنگی اور حرج نہیں ہے۔ میرا ایک وعظ ہے نفی الحرج وہ چھپ گیا ہے اس میں ثابت کر دیا
 گیا ہے کہ دین میں تنگی بالکل نہیں ہے کسی قسم کی رکاوٹ اس میں نہیں ہے۔ اس کا جواب دے کر بیان کو ختم
 کرتا ہوں وہ یہ کہ میں نے تو کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت پر اپنے کلام کو ختم فرمایا ہے چنانچہ تکمیل دین کے
 مضمون کو اس پر ختم کیا ہے کہ ہماری اتنی رحمت ہے کہ کبھی حرام کو بھی حلال کر دیتے ہیں اور غفور رحیم میں
 رحمت کی تصریح فرمادی۔ مگر یہ ثابت ہے کہ سب سے آخر آیات قرآن کی یہ ہے وَالْقَوْلُ يُومَأُ تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى
 اللَّهُ ثُمَّ تَوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ یعنی ڈرو تم اس دن سے جس روز تم اللہ تعالیٰ کی پیشی میں
 لائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اپنے کئے ہوئے کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا اور اس میں ظاہر
 ہے کہ وہ عید کا مضمون ہے سو اس سے تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو عید پر ختم کیا ہے۔

اور یہاں کلام کو وعید پر ختم کرنے کی ایک وجہ یہ بھی علماء نے لکھی ہے کہ جو کلام آخر میں ہوتا ہے وہی نقش دل رہتا ہے اور اس کا اثر قلوب پر زیادہ رہتا ہے تو اس نقل میں اور میرے قول میں تعارض ہو گیا کیونکہ میں نے تو لکھا تھا کہ مضمون رحمت پر کلام ختم ہوا ہے اور اس نقل سے معلوم ہوا وعید پر ختم ہوا ہے۔ سورف اس تعارض کا یہ ہے کہ کلام تو رحمت ہی پر ختم ہوا ہے مگر اس مصلحت سے کہ اس رحمت پر نظر کر کے کوئی بالکل لا پرواہی نہ کرنے لگے ذرا سی دھمکی بھی دے دی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے احکام میں تو بالکل تنگی نہیں بہت آسان احکام ہیں لیکن اگر سہل سہل احکام پر بھی عمل نہ کرو گے تو تمہاری کبختی آوے گی کہ اتنی تو تم پر رحمت کی کہ بالکل ہلکے ہلکے احکام نازل کئے پھر اگر اس میں بھی کاہلی برتو گے تو بس جان جا ہی میں آ جائے گی تو یہ آیت ہماری تقریر کے مخالف نہ ہوئی بلکہ اس سے رحمت کی اور تائید ہو گئی اسکی ایسی مثال ہے کہ بچہ کو سبق آسان بتلا دیا اور اس کی یاد کی بھی آسان صورت بتلا دی پھر اگر اس میں بھی وہ شوخی اور سستی کرے تو اس کے کان کھینچ لئے تاکہ اس ڈر کے مارے سبق جلدی یاد کر لے اور پھر دس روپیہ انعام کے لئے اس صورت میں سبق تو اس کا بالکل آسان تھا مگر وہ لا پرواہی سے یاد نہیں کرتا اس لئے سمجھا اس کے کان کھینچ لئے تاکہ اس کو یاد کرے تو یہ گوشالی بھی رحمت ہی کا اثر ہے بہر حال تعارض نہ رہا۔

حاصل آیت

خلاصہ اس آیت کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نعمت اسلام کا کامل اور تام ہونا ذکر فرمایا ہے تاکہ اس نعمت پر متنبہ ہو کر اس کا شکر بجالا دیں اور شکر یہ ہے کہ اس کے فضائل و برکات خود بھی حاصل کریں اور دوسروں کو بھی اس سے بہرہ ور کریں دوسروں کے سامنے بھی اس کے فضائل و برکات بیان کریں تبلیغ کریں جس کی خصوصاً اس وقت سخت ضرورت ہے خلاصہ یہ کہ اپنی بھی اصلاح کریں اور دوسروں کی بھی اصلاح کریں ان کو ترغیب دیں ادھر متوجہ کریں قرآن میں جہاں نماز روزہ زکوٰۃ کا حکم ہے وہاں امر بالمعروف کا بھی حکم ہے اس لئے امر بالمعروف بھی کریں مگر خوبصورتی کے ساتھ کسی سے لڑے بھڑے نہیں اور جیسے نماز باوجود فرض ہونے کے کبھی کبھی کسی عذر سے ساقط ہو جاتی ہے جیسے حائض سے نماز ساقط ہو جاتی ہے اسی طرح یہاں بھی اعذار و قیود ہیں اسی لئے میں نے کہا ہے کہ جو کچھ کہ علماء سے پوچھ کر کرو۔ وہ ہر ایک کے مناسب کام بتا دیں گے۔ کسی کے تصنیف کا کام سپرد کر دیں گے۔ کسی کو زبانی تبلیغ و اشاعت کے لئے تجویز کریں گے کسی کو مالی امداد کا مشورہ دیں گے۔ کسی کو زبانی تبلیغ و اشاعت کے لئے تجویز کریں گے کسی کو دعا کا حکم کریں گے کہ تم دعا ہی کرتے رہو اور دعا کا کام تو سب ہی کر سکتے ہیں اور کام کرنے والے بھی اس میں شریک رہیں گے اب دعا کیجئے کہ خداوند کریم تمہیں سلیم عطا فرمادیں اور ہم کو ظاہری و باطنی اصلاح کی توفیق بخشیں۔ آمین

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ الْإِسْلَامَ فَاعْبُدُوا اللَّهَ حَتَّىٰ تَخْرُجُوا مِنَ الْكُفْرِ فَإِنَّكُمْ كُنْتُمْ أَكْثَرًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ تَلَاكُمُ الْمَوْتُ وَلَٰكِن لَّا تُؤْمِنُونَ إِلَّا بِاللَّهِ فَاعْبُدُوهُ فَكُلُّكُمْ عَلَىٰ نَهْجٍ مُّسْتَقِيمٍ

روحانی مایوس الطلاج ہوتا تو سب سے زیادہ مستحق اس کے وہ لوگ تھے جن کے بارہ میں ختم اللہ علی قلوبہم نازل ہوا ہے مگر ان کا کفر بھی فی نفسہ لا علاج نہ تھا۔ بلکہ ان کی بد پرہیزی کی وجہ سے یہ پیشین گوئی کی گئی ہے۔

خاتمہ کا حال

بعض مفسرین کا قول تو یہ ہے کہ یہ آیات خاص خاص لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے جن کا نام حضور اقدس ﷺ کو بتلادیا گیا تھا اور بعض کا قول یہ ہے کہ بلا تعین یہ ان سب لوگوں کے بارے میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے اور خاتمہ سے پہلے کسی کو بھی حتیٰ کہ ابو جہل کو بھی علی الاطلاق کافر نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ شاید اخیر میں اسلام لے آتا۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں۔

پیچ کافر رانجواری منگرید کہ مسلمان بودنش باشد امید

مگر اس وقت وحی کا زمانہ تھا اس وقت خاتمہ کا حال معلوم ہو سکتا تھا کہ کس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے اس لئے جن کفار کی نسبت صحابہ کورسول ﷺ کے ارشاد سے یہ معلوم ہو گیا ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے ان کے نام صحابہ نے اس آیت کی تفسیر میں تمثیلاً بیان کر دیئے۔

بے ہوشی کا قول و فعل شرعاً معاف ہے

اور مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ان جیسے لوگوں کے بارہ میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہوگا سب کافروں کے بارہ میں نہیں ہے مگر اب تو خاتمہ کا حال معلوم ہونا دشوار ہے اگر ظاہر میں کسی کا کفر ہی پر خاتمہ ہو جب بھی یقینی طور پر کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم کو دل کا حال کیا معلوم ہے شاید وہ دل میں مسلمان ہو اور زبان سے اقرار کرنے کا موقع نہ ملا ہو یا ملا ہو اور اس نے تساہل کیا ہو تو بہت سے بہت گنہگار ہوگا مگر کافر نہ ہوگا۔ بلکہ عند اللہ ایسا شخص مسلمان ہے اسی طرح اگر کوئی مسلمان مرتے ہوئے کلمہ کفر کہتا ہوا جائے جب بھی کفر کا حکم مشکل ہے فقہاء نے اس کا راز سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مرتے ہوئے کسی کے منہ سے کلمہ کفر نکل جائے تو اس کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے شاید نزع کی وجہ سے اس کی عقل درست نہ ہو اور بے ہوشی کی غفلت میں یہ کلمہ زبان سے نکلا ہو اور شریعت میں ایسا شخص مکلف نہیں رہتا بے ہوشی میں جو فعل و قول بھی صادر ہو شرعاً معاف ہے یا ممکن ہے کوئی ہوش ہی میں کلمہ کفر کہہ رہا ہو مگر اس کا مطلب وہ نہ ہو جو تم سمجھے بلکہ کچھ اور مطلب ہو پھر اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے حکم کفر کیونکر لگایا جاسکتا ہے۔

روحانی مطلب میں کوئی مرض لا علاج نہیں

غرض اس وقت تو کسی کے کفر پر یقین نہیں ہو سکتا مگر جس زمانہ میں ختم اللہ علی قلوبہم کا مشاہدہ ہو سکتا تھا اس وقت بھی یہ لوگ مایوس العلاج اور ان کا کفر لا علاج نہ تھا۔ بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں تھا اس طرح سے کہ ایمان لے آتے گو اس کا عدم وقوع حق تعالیٰ کو معلوم تھا مگر عدم وقوع کے یقینی ہونے سے اس کا اختیاری ہونا منفی نہیں ہوا اور میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا بھی ہے تو مریض کو مجبور نہیں کرتا بلکہ بعض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مریض بچے گا نہیں اس کو دوا مت دو اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبر ادا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں وہ اپنے قواعد ظنیہ سے اس مرض کو لا علاج سمجھتا ہے مگر یہ سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں وہ قدرت خدا تعالیٰ پر نظر کر کے امیدوار ہے۔

عقل در اسباب میدارد نظر عشق میگوید مسبب را مگر

مگر حق تعالیٰ کو تو علم غیب ہے اگر ختم اللہ علی قلوبہم سے ان لوگوں کے لا علاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی تو یہ دلالت قطعی ہوتی کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے متعلق علم ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا کے خلاف ہے تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے کیونکہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ فِي خُفْيَةٍ مِّنْكُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ اور یہ آیت کی ہے پھر لفظ يَا أَيُّهَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو تو حید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں ختم اللہ علی قلوبہم فرمایا گیا ہے پھر اس پر اجماع بھی ہے کہ ابو جہل و ابوطالب وغیرہ ایمان کے مکلف تھے اگر وہ ایمان کے مکلف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے ختم اللہ علی قلوبہم نازل فرما دیا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ ختم اللہ علی قلوبہم کے ساتھ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس سے مستثنیٰ نہ تھے اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق ختم اللہ علی قلوبہم نازل ہوا ان کا مرض روحانی لا علاج نہ تھا اگر روحانی مطلب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کبھی لا علاج نہیں۔

کلام اللہ میں صیغہ واحد اور جمع کے استعمال حکمت

فرمایا کلام اللہ میں کہیں صیغہ واحد متکلم کا ہے کہیں جمع کا مثلاً الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ میں واحد متکلم ہے وَلَئِنْ يَشَاءِ اللَّهُ هَبْكَ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ میں جمع متکلم ہے غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس مقام پر رحمت اور شفقت کا مضمون ہے وہاں واحد متکلم کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں تکمیل دین کا ذکر تھا جو سراسر رحمت ہے اس لئے اکملت فرمایا اور جہاں شان جلال واستغنا و عظمت کا بیان ہے وہاں جمع کا صیغہ آیا ہے کہ تم نے ایسا کیا ہم ایسا کریں گے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى

الرِّافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ

تَرْجَمًا: اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھنے لگو تو اپنے چہروں کو دھو اور اپنے ہاتھوں کو بھی کہیوں سمیت اور اپنے سروں پر ہاتھ پھیرو اور دھو اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت۔

تفسیری نکات

نحوی قاعدہ سے ایک اشکال کا جواب

بعض اشکالات کا جواب نحوی قاعدہ سے دیا جاتا ہے چنانچہ میرے پاس ایک ملائی آئے اور کہنے لگے کہ وضو میں پاؤں دھونا جو فرض ہے اس کی دلیل کیا ہے قرآن میں تو پیروں کے واسطے مسح کا حکم ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن میں کہاں ہے۔ کہنے لگے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ مترجم قرآن میرے پاس لائے اور آیت دکھائی۔

فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الرِّافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ

ترجمہ: یہ لکھا ہوا تھا پس دھو اپنے مونہوں کو اور ہاتھوں کو کہیوں تک اور ٹھو اپنے سروں کو اور پیروں کو دو ٹخنوں تک شاہ صاحب نے یہاں فعل مقدر کو ظاہر نہ کیا تھا اور مسح کا ترجمہ محاورہ کے موافق کر دیا ورنہ بعض تراجم میں تقدیر فعل کو ظاہر کر کے اس طرح ترجمہ کیا ہے اور دھو اپنے پیروں کو دو ٹخنوں تک اور بعض تراجموں میں مسح کا ترجمہ مسح ہی سے کیا ہے اس طرح کہ مسح کرو اپنے سروں کا تو اس میں لفظ کو نہیں آیا۔ اس ترجمہ پر کچھ

اشکال نہیں ہو سکتا مگر شاہ صاحب کے ترجمہ میں ملاجی کو یہ شبہ ہوا کہ پیروں کے لئے بھی مسح کا حکم ہے میں بہت پریشان ہوا کہ اس اشکال کا جواب تو نحوی قاعدہ پر موقوف ٹھہرا اگر میں ان کو نحوی قاعدہ سے جواب دوں تو اس کے یہ معنی ہیں ان کے سامنے عطف اور تقدیر کی تحقیق بیان کروں جس کو یہ سمجھ ہی نہیں سکتے آخر میں نے ان سے کہا کہ جس کلام کا یہ ترجمہ ہے یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کلام اللہ ہے بولے کہ علماء کے کہنے سے معلوم ہوا میں نے کہا افسوس یا تو علماء اتنے ایمان دار ہیں کہ وہ ایک عربی عبارت کو کلام اللہ کہہ دیں تو سچے اور یا اتنے بے ایمان ہیں کہ اگر وہ ایک فعل کو مرض کہیں تو جھوٹے اس پر چپ ہوئے میں نے کہا خبردار جو تم نے کبھی ترجمہ دیکھا ایسوں کو ترجمہ دیکھنا بیشک ناجائز ہے۔

اسی طرح بہت سے اشکالات ہیں جن کے جواب علوم الیہ پر موقوف ہیں اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عوام کو ترجمہ خود نہ دیکھنا چاہئے۔ بلکہ اگر شوق ہو تو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھنا چاہئے غرض اس اشکال کا جواب یہ تھا کہ یہاں ار جملکم کا عطف وجوہ حکم پر ہے خیر یہ اشکال تو کچھ نہیں بڑا اشکال اس جگہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قراءت متواترہ میں وار جملکم بالجزم بھی آیا ہے اور اس صورت میں بظاہر اس کا عطف رؤسکم کے اوپر اور فامسحوا کے تحت میں ہے اس کا جواب علماء نے یہ دیا ہے کہ اس میں جر جرار ہے ورنہ حقیقت میں اس کا عطف فامسحوا کے تحت میں ہے اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا عطف فامسحوا کے تحت میں ہے جب بھی پیروں کے لئے مسح کا حکم لازم نہیں آتا کیونکہ محاورات میں بعض دفعہ دو ایسی چیزوں کو جن کے ساتھ دو فعل متعلق ہوتے ہیں اختصار کے لئے ایک ہی فعل کے تحت میں بیان کر دیتے ہیں۔

مثلاً دعوت کے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ کچھ دانا پانی ہمارے یہاں بھی کھا لیجئے گا حالانکہ پانی تو پینے کی چیز ہے کھانے کی چیز نہیں اصل کلام اس طرح تھا کچھ دانا کھا لیجئے گا پانی پی لیجئے گا مگر اختصار کیلئے ایک فعل کو حذف کر کے دونوں چیزوں کو ایک فعل کے تحت میں ذکر کر دیتے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی پوچھے کہ تم نے دعوت میں کیا کھایا تھا تو جواب میں کہا کرتے ہیں پلاؤ زردہ دودھ دینی گوشت کھایا تھا حالانکہ دودھ پینے کی چیز ہے یوں کہنا چاہئے تھا کہ دودھ پیا تھا باقی چیزیں کھائی تھیں جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھو ار جملکم کا عطف ار فامسحوا کے تحت میں بھی مان لیا جائے تو یہ لازم نہیں آتا کہ پیروں کے لئے مسح کا حکم ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ رؤس وار جمل کا تعلق اصل میں دو فعلوں سے تھا ایجاز ایک فعل کو حذف کر دیا گیا اور ظاہر میں دونوں کو فامسحوا کے متعلق کر دیا گیا اور مطلب وہی ہے کہ مسح کرو اور پیروں کو دھوؤ عربی میں اس کی نظیر یہ کلام ہے علفته لبنا و ماء اباردا۔ اور اگر فامسحوا کے حکم کو بھی ار جملکم کے متعلق مان لیا جائے تب بھی کچھ اشکال نہیں کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ دو قراءتیں بمنزلہ

دو آیتوں کے ہوا کرتی ہیں جس طرح دو آیتیں اپنے اپنے حکم کو مستقلاً ثابت کرتی ہیں اور دونوں پر عمل ضروری ہے اسی طرح دو قراءتیں بھی معمول بہا ہوتی ہیں پس اگر جلکم میں قراءت بالجبر ہونے سے معلوم ہوا کہ بیروں کے لئے مسح کا بھی حکم ہے۔

رہا یہ کہ غسل کا حکم نہیں ہے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کیونکہ قراءت نصب غسل کو لازم کر رہی ہے تو مجموع قراءتیں سے یہ ثابت ہوا کہ بیروں کے لئے مسح اور غسل دونوں کا حکم ہے اس طرح کہ قراءت جبر بحال لبس خف ہے اور قراءت نصب بحالت عدم خف ہے یہ تاویل بھی بہت عمدہ ہے۔

اور ایک توجیہ میرے ذہن میں ایک سوال کے وقت آئی۔ وہ یہ کہ مسح کہ معنی ملنے ہیں خواہ بدوں غسل کے یا مع غسل کے پس دھونا تو ایک قراءت سے حدیث متواتر سے فرض ہوا اور ملنا قراءت جبر سے مامور بہ ہوا بمعنی مستحب اس کی وجہ یہ ہے کہ بیروں کی کھال سخت ہوتی ہے تو عادتاً اکثر اس پر پانی بہانا کافی نہیں ہوتا ملنے سے پانی پہنچتا ہے چنانچہ فقہانے اسی اہتمام کے لئے اس کو بھی مندوب کہا ہے کہ وضو کے قبل پاؤں کو تر کر لیا جاوے پھر آخر وضو میں دھویا جاوے فرض آپ نے معلوم کر لیا کہ نحو کی کس قدر ضرورت ہے کیونکہ بعض اشکالات اسی سے رفع ہوتے ہیں۔

نکتہ در مسح از جل

سوال: ایک مجتہد شیعہ میرے شاناسا ہیں ایک دن وہ ایک آبشار کے کنارے پاؤں سکھلا رہے تھے تاکہ وضو کریں میرا ان سے ذرا مذاق بھی ہے میں نے مذاقہ کہا کہ کیوں تمام دنیا سے الٹا وضو کرتے ہو سیدھے ہو جاؤ اس نے فوراً کھڑے ہو کر کہا کہ اس مسئلہ کو تم لوگوں نے نہیں سمجھا لو۔

فَلْيَسْلُوا وُجُوهُكُمْ الْاَيْه پڑھ کر کہا کہ چار فرض ہیں دو کا دھونا فرض اور دو کا مسح کرنا فرض ہے اس کی تشریح تیمم کے مسئلہ نے کر دی جن کا دھونا فرض تھا وہ تیمم میں رہ گئے اور جن کا مسح فرض تھا وہ معاف کئے گئے اگر پاؤں کا دھونا فرض ہوتا تو تیمم میں معاف نہ ہوتے چونکہ سر کا مسح معاف ہے معلوم ہوا کہ پاؤں کا بھی مسح تھا جو سر کی طرح معاف ہو گیا اتنی کلامہ اس کی اس گفتگو کا مجھ سے کچھ جواب نہ بن پڑا مذاق میں ٹلانا پڑا البتہ اس وقت سے ایک کٹک سی دل میں ہے۔

جواب: یہ تو محض ایک نکتہ تھا جو خود موقوف ہے پاؤں کی مسح ہونے کے ثبوت پر پھر اس کے ثبوت پر پھر اس کے ثبوت کو اس نکتہ پر مبنی کرنا دور صریح ہے کیا اس التزام کی کوئی دلیل ہے کہ ساقط ہونا مستلزم ہے مسحیت کو تعجب ہے ایسے صریح حکم سے آپ متاثر ہو گئے۔ (ماخوذ بوادرا النوادر)

اختلاف قراءۃ

اگر ہم جرجوار کے بھی قائل نہ ہوں اور ارجل کے مسح ہی کو مان لیں تب بھی اس کا غیر مغسول ہونا لازم نہیں آتا بلکہ احتمال ہے کہ یہ وہ مسح ہو جو عین غسل کے وقت کیا جاوے یعنی دلک بوجہ اس کے کہ پاؤں کی جلد سخت ہوتی ہے اس لئے غسل کے ساتھ کہ مفہوم ہے ایک قراءۃ کا دلک کا حکم کہ مفہوم ہے دوسری قراءۃ کا فرمایا ہو (ماخوذ بواور النوادر)

إِعْدِلُوا تَقْوَىٰ لِلتَّقْوَىٰ

تسبیح: عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

کفار و مشرکین سے بھی عدل کا حکم

کفار کو نوکر رکھنا یا انکی نوکری کرنا یا انکو قرض دینا یا ان سے قرض لینا قال الله تعالى لا يذمكم الله عن الذين لم يقاتلواكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم ان تبروهم وتقسطوا اليهم ان الله يحب المقسطين حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے کفار کی یہاں مزدوری کرنا ثابت ہے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار سے قرض لینا اور مثلاً مظلوم کی دادرسی کہ یہ نہ صرف مباح ہے بلکہ مستحسن اور واجب اور ضروری ہے قال الله تعالى واذا قاتلتم فاعدلوا الخ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان کو ذمی کافر کے قصاص میں قتل کیا اور مثلاً احسان کا بدلہ احسان کے ساتھ دینا قال تعالى اهل جزاء الاحسان الخ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کافر لوٹڈی سے پانی لیا تھا تو اسکو کھجوریں دیں اور اس کے تمام گانوں کو قتال سے چھوڑ دیا حالانکہ اس لوٹڈی کا کچھ احسان بھی نہ ہوا تھا حضور کے اعجاز سے پانی اس کا اتنا ہی رہا تھا اسی جنس سے نرم گفتاری بھی ہے قال تعالى ولو كنت فظا غليظ القلب الخ اسلام میں جس قدر اسکی تعلیم ہے دنیا پر آشکارا ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگ کیسے کیسے برے لفظ کہتے تھے ان تتبعون الارجلا الخ مگر کبھی حضور ﷺ نے برے لفظ کے جواب میں برا لفظ نہیں کہا غایت سے غایت یہ لفظ تھا لا حجة بنينا الخ غرض نرم برتاؤ کے قسم اول کے سب مراتب محمود ہیں۔ الا آنك متقضي الى الشر هو جاوین مثلاً کفار سے امداد لینا جبکہ اپنی توہین یا توہین اسلام کی موجب ہو جیسے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جب غزوہ تبوک سے رہ گئے اور حضور ﷺ نے ان سے بولنے چاہنے کو منع فرما دیا تو شاہ غسال نے ان کے پاس رقعہ بھیجا کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہاری صاحب نے (ﷺ) تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا

ہے اور تمہاری قدر نہیں جانی آپ یہاں آ جائے آپ کی قدر افزائی کی جائے گی تو انہوں نے اس رقعہ کو تنور میں جموئیک دیا یا مثلاً کفار کا احسان لینے میں اندیشہ ہوا کہ ان کے ساتھ بھی بے موقعہ شرکت کرنا پڑے گی مثلاً وہ کسی مدرسہ یا مسجد کے چندہ میں شریک ہونا چاہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی ان کے مندر میں شریک ہونا پڑے گا تو یہ مسل درست نہیں جیسے ایک مرتبہ ہندو مسلمانوں میں اتفاق کی ہوا چلی تھی کہ ہندو تعزیہ داری میں شریک ہوئے اور مسلمان ہولی میں یہ سب قصور فہم ہے اور وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ کے خلاف ہے اور من کثر سواد قوم فہم منہم کا مصداق ہے یا کفار سے بے موقعہ نرم بولنا جیسے بروقت مناظرہ ضرورت سے زیادہ نرمی اختیار کی جائے جس کا انجام خود بھی ذلیل ہونا اور دین کو بھی ذلیل کرنا ہے ایسے ہی موقعہ کے لئے وارد ہے واغلط علیہم حضور ﷺ نے باجوہ رحمت مجسم ہونے کے مرتدین عربین کو یہ سزا دی کہ ان کو ہاتھ پیر کٹوا کر اور آنکھوں میں گرم سلائیاں پھر وادیں کہ آنکھیں پھوٹ گئیں اور ان کو گرم زمین پر ڈلوادیا یہاں تک کہ مر گئے کیونکہ انہوں نے چرواہوں کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔

کوئی بابدان کردن چنان است کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

اور قسم دوم یعنی زائد از ضرورت کفار کی طرف میلان کے بھی چند مراتب یہ ہیں مثلاً تشبہ بالکفار ان کے رسوم قبیلہ میں شرکت بیجا خوشامد متعصب کفار کی چالوسی اور ابلہ فریبوں میں آ جانا کہ

من تشبه بقوم فهو منهم اور من کثر سواد قوم فهو ومنہم اور ما انتم ولاء تحبونہم ولا یحبونکم اور فتری اللین فی قلوبہم مرض یسارعون فیہم بقولون نخشی ان تصینا دائرة ان کے بارہ میں وارد ہیں یہ سب صبیح اور ممنوع ہیں حال آنکہ کوئی ضرورت شدید یا اکراہ داعی ہو تو مجبوری ہے اختیار اور ارادہ سے اور ان افعال کو جائز سمجھ کر کرنا کسی حالت میں درست نہیں الغرض حسن خلق اور چیز ہے اور مودۃ و محبت اور تولی اور حسن خلق کی نسبت دار ہے وانک لعلی خلق عظیم اور مودۃ اور تولی کی نسبت وارد ہے لا یتخلفون المؤمنون اولیاء من دون المؤمنین ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شنی الا ان تقوا منہم نقة ومن یتولیہم منکم فانه منہم ان اللہ لا یہدی القوم الظلمین حسن خلق کفار کے ساتھ مندوب و مستحسن ہے اور مودہ و محبت ممنوع اور مذموم ہندوؤں سے ملنا اور مزاج پرسی وغیرہ کرنا جیسے حضرت والا نے کیا حسن خلق ہے اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا اور ان سے نفرت ظاہر کرنا سوء خلق اور تکبر بلکہ تصنع ہے کہ درحقیقت تو مقصود ان کو اور راغب کرنا اور ان پر اپنا اثر ٹھکانا ہے اور صوت بے نیازی سے کیسے اختیار کی جاتی ہے اور اگر کوئی ہندو کوئی رقم دینے لگے تو انکار نہ ہو اور سوجیلوں سے اس کو جائز کر لیا جاوے۔

عارف کو حقیقت پر نظر چاہئے نہ کہ صورت پر مکالموں پر بلانے کی صورت تو تہمک تھی مگر حقیقت صرف پابندی رسم

۴- ہر ایک ہدیہ بھی لے لینا سنت نہیں جو ہدیہ کسی دینی و دنیاوی خرابی کو مستلزم نہ ہو اس کا قبول کرنا سنت ہے دینی خرابی جیسے طمع حرام و حلال میں تمیز کرنا حق پوشی میں جتلا ہونا وغیرہ اور دنیاوی جیسے نظروں میں ذلیل ہونا وغیرہ ایسے ہی ہدیہ کی نسبت عارف شیرازی کا قول ہے

ما بروے صبر و قناعت نے بریم بابادشہ بگوئے کہ روزی مقدار است

ہدیہ کے شرائط حضرت والا کے مواعظ میں بارہا ذکر ہوئے ہیں۔

(۵) دعا مانگنا ہر حاجت کے لئے مندوب و مستحسن ہے ایک شخص نے مدتوں ایک حاجت کے لئے دعا مانگی حالانکہ کبھی وہ حاجت پوری نہیں ہوئی کسی نے کہا کہ جب مدت گزر گئی اور حاجت پوری نہیں ہوئی تو معلوم ہوتا ہے کہ منظور خدا نہیں ہے کہ وہ حاجت پوری ہو پھر دعا سے کیا فائدہ بلکہ گونہ گستاخی ہے اگر دینا ہوتا تو اب تک دیدی ہوتی اور جب نہیں دی تو اب دعا مانگنا مجبور کرنا ہے اور یہ گستاخی ہے اس نے کہا میرا کام یہی ہے کہ میں مانگوں دینا نہ دینا ان کا کام ہے میں اپنے کام کا ذمہ دار ہوں ان کے کام کا ذمہ دار نہیں اگر وہ کام میرا ہو جاتا تو مانگنا ختم ہو جاتا اور جب وہ کام نہیں ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھے منگوانا ہی منظور ہے مجھے اسی میں حظ آتا ہے کہ جو کام مجھ سے وہ چاہیں وہ مجھ سے ہوتا ہے اور وہ مجھے تڑپا دیں میں تڑپتا رہوں۔

بوقت ذبح اپنا اپنا انکے زیر پائے ہے کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

خدا کرے کہ حرا انتظار کا نہ مٹے مرے سوال کا دیں وہ جواب برسوں میں

تڑپ میں اس سے زیادہ حظ حاصل ہے جو اس کام کے پورا ہونے میں ہوتا ہے

جو حرا انتظار میں دیکھا پھر وہ وصل یار میں دیکھا

اور حدیث میں وعدہ ہے کہ جس دعا کی قبولیت ظاہر نہیں ہوتی وہ ذخیرہ ہو جاتا ہے آخرت کے لئے تو

فانی کی جگہ باقی کے ملنے کی انشاء اللہ تعالیٰ امید ہے جس کو حاجت کی طرف سے اطمینان بھی ہو اس کو بھی دعا

مانگنی چاہئے۔ ثواب مفت ہاتھ آتا ہے۔ (مجالس الحکمت صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۷)

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ﴿۵﴾

ترجمہ: تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح (یعنی قرآن مجید)

تفسیری نکات

دو نعمتیں

یہ ایک مختصر سی آیت ہے اس میں حق سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی دو نعمتوں کا عطا فرمانا اور ان دونوں نعمتوں پر اپنا احسان ظاہر فرمانا بیان فرمایا ہے ان دونوں نعمتوں میں ایک تو حضور ﷺ کا وجود باوجود ہے اور دوسری نعمت قرآن مجید کا نزول ہے۔ ایک کو لفظ نور سے ذکر فرمایا ہے اور دوسرے کو کتاب کے عنوان سے ارشاد فرمایا ہے اور یہ توجیہ اس آیت کی ایک تفسیر کی بناء پر ہے یعنی جب کہ نور سے حضور ﷺ کا وجود مراد لیا جائے اور اگر دوسری تفسیر اختیار کی جاوے یعنی نور اور کتاب دونوں سے قرآن مجید ہی مراد لیا جاوے تو توجیہ بدل جاوے گی اور اس صورت میں عطف کتاب کا نور پر باوجود اتحاد ذات کے تغایر حیثیت و صفت کے اعتبار سے ہوگا کہ ایسی کتاب عطا فرمائی کہ اس میں ایک صفت نوریت کی ہے اور دوسری صفت کتابیت کی ہے اور اس توجیہ کی بناء پر بھی وہ تعدد نعمت فوت نہ ہوگی یعنی وہ دو نعمتیں اب بھی رہیں گی لیکن ایک پر دلالت مطابقی ہوگی اور دوسری پر دلالت التزائی یعنی قرآن پر تو دلالت مطابقی ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور چونکہ قرآن کا نزول حضور ﷺ پر ہوا اور حضور ﷺ کی برکت سے ہم کو یہ نعمت عطا ہوئی ہے اس لئے بہر حال دونوں بطریق مطابقت مذکور ہوں یا ایک بطریق مطابقت اور دوسری بطریق لزوم مگر ہر حال میں اس آیت میں دو نعمتوں کا ذکر ہے۔ الفاظ دانی کا نام علم ہوتا تو وہ معاصی کے ساتھ بھی جمع ہو جاتا بلکہ کفر کے ساتھ بھی ورنہ بیروت اور جرمن میں عیسائی عرب کے ادیب کیسے ہوتے۔ ان کا حافظہ بھی قوی ہے ذہن بھی تیز ہے۔

حقیقت علم

حقیقت میں علم کی حقیقت نور ہے جس کی نسبت قرآن میں ہے قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ﴿۵﴾ ان کو روح بھی فرمایا وَآتَاكُمْهُمُ نُورٌ وَفَضْلٌ بس حقیقت میں یہی چیز علم ہے امام ابو حنیفہ نے کتابیں زیادہ نہیں پڑھی تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے قلب میں ایک نور بخشا تھا کہ جس چیز کو بیان فرماتے تھے بالکل صحیح فرماتے تھے۔ اور اب کسی کو کتابی متجر ہو جاوے مگر وہ علم نصیب نہیں جو امام صاحب کو حاصل تھا اس حالت میں اگر کوئی کہنے لگے

کہ میں ابوحنیفہؒ سے علم میں زیادہ ہوں تو وہ جاہل ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانًا لَّسُبُلَ السَّلَامِ وَمُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ صراط مستقیم بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نور اور کتاب آئی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضامندی کا اجماع کرتے ہیں سلامتی کے راستے بتلاتے ہیں اور اپنی مشیت سے ان کو تارکیوں سے روشنی کی طرف نکالتے اور سیدھے راستے کی ہدایت کرتے ہیں۔

نور سے کیا مراد ہے

اس آیت کی دو تفسیریں ہیں جن کی طرف پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے اس میں بعض نے نور سے بھی قرآن ہی مراد لیا ہے اور ان کے پاس وجہ ترجیح یہ ہے کہ آگے یَهْدِي بِهِ اللَّهُ میں ضمیر واحد ہے اگر نور سے مراد حضور اور کتاب سے مراد قرآن ہو تو یہدی بہما اللہ بصیغہ تثنیہ ہوتا گو دوسرے حضرات یہ جواب دے سکتے ہیں کہ چونکہ حضور ﷺ اور قرآن باہم متلازم ہیں اس لئے ان میں سے ایک کی ضمیر میں لزوماً دوسرے کا ذکر بھی ہو گیا۔ دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ نور سے حضور ﷺ مراد ہیں ان کی وجہ ترجیح یہ ہے کہ یہاں نور کی طرف جاء کی اسناد کی گئی ہے اور اصل میں یہ ہے کہ محجی کی اسناد ذوی العقول کی طرف ہو چنانچہ اسی بناء پر دوسری ایک آیت ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا سے مراد رسول ﷺ ہیں اور نور سے مراد قرآن ہے کیونکہ انزال کی اسناد میں اصل یہ ہے کہ کتاب کی طرف ہو اور اس سے معلوم ہوا کہ نور قرآن کی بھی صفت ہے اور حضور کی بھی اسی طرح برهان قرآن کی بھی صفت ہے اور رسول اللہ ﷺ کی بھی بہر حال یہ وجوہ ترجیحات ہیں ہر قول کی گوان میں یہ احتمال باقی ہے کہ بعض جگہ اسناد محجی قرآن کی طرف ہے۔ جیسے قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَمِنْ رَّبِّكُمْ آيَاتٌ مُبِينَاتٌ لِّيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ میں اور اس کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ یہ اسناد مجازی ہے اور اصل وہی ہے کہ اسناد محجی کی حضور کی طرف ہو اور اسناد انزال کی قرآن کی طرف اب اس اصل کو کسی قرینہ صارفہ کی وجہ سے چھوڑا جاسکتا ہے جو اس جگہ موجود نہیں تو گو تفسیریں سب صحیح ہیں مگر محجی یہ چاہتا ہے کہ نور سے مراد حضور ﷺ ہوں لیکن میں اس پر زور نہیں دیتا کیونکہ ہر قول کی طرف مفسرین کی ایک جماعت ہے اور ہر ایک کے پاس وجوہ ترجیح ہیں مگر اس جگہ میرے ذوق میں ترجیح ان حضرات کے قول کو ہے جو نور سے حضور کو مراد لیتے ہیں مگر اس پر زور دینے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ہمارا مطلب ہر طرح حاصل ہے خواہ حضور نور کے مصداق ہوں یا قرآن ہر ایک کا نور ہونا دوسرے

کے نور ہونے کو مستلزم ہے میں پھر وہی کہوں گا۔

بخت اگر مدد کنا دانش آورم بکف گر بکشد زہے طرب و بکشم زہے شرف
اور یوں کہوں گا۔

عبار اتنا شتی و حنک واحد دکل الی ذاک الجمال یشیر
اور جب حضور بھی نور ہیں اور قرآن بھی نور ہے تو اب ہمارے پاس نور علی نور ہے جیسا کہا گیا ہے۔
نہی خود نور اور قرآن ملا نور نہ ہو پھر مل کے کیوں نور علی نور

اس حالت میں ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو حضور سے محبت زیادہ ہے یا قرآن سے ہر اک کی محبت دیکھو اپنی طرف کھینچتی ہے ہم کو تو حضور ﷺ سے بھی تعلق محبت ہے اور قرآن سے بھی وہ اپنی طرف کھینچتی ہیں وہ اپنی طرف بس ہمارا تو وہ حال ہے کہ لعل سے کسی نے پوچھا کہ تو اپنے کو چاہتا ہے یا آفتاب کو کہا کچھ نہ پوچھو اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اپنے سے محبت ہے تو وہ بھی آفتاب ہی کی محبت ہے کیونکہ میرے اندر جو کچھ نور اور رونق ہے سب اس کی بدولت ہے اور اگر کہوں کہ آفتاب سے محبت ہے تو یہ بھی اپنے ہی ساتھ محبت ہے کیونکہ آفتاب سے اسی لئے محبت ہے کہ اس نے مجھ کو لعل بنایا تو وہ اپنی ہی محبت ہوئی تو بعض جگہ دونوں طرف سے تلازم ہوتا ہے وہاں ہر ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے اس پر کسی عاشق کا شعر یاد آتا ہے واقعی تلازم محبتیں کو خوب ہی ظاہر کیا۔

قاصد رسید و نامہ رسید و خبر رسید در حیرتم کہ جاں بکد امی کنم ثار

ہائے قاصد بھی محبوب کا ہے اور نامہ بھی محبوب کا ہے اب کیا کہیں کہ کسی سے مسرت زیادہ ہے یہی حال یہاں ہے حضور ﷺ قاصد ہیں اور قرآن نامہ حق ہے ہر ایک اپنی طرف دل کو کھینچ رہے ہیں بس یوں کہنا چاہئے کہ ہمارے لئے ہر ایک میں دوسرا موجود ہے حضور نہ ہوتے تو ہم کو قرآن کیسے ملتا اور قرآن ملنے والا نہ ہوتا تو حضور کیوں تشریف لاتے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں دونوں شاخیں موجود ہیں قرآن میں حضور کی بھی شان ہے یعنی نور کی اور حضور میں قرآن کی شان موجود ہے یعنی کتاب مبین کی شاید تم کہو کہ حضور میں کتاب کی شان کیونکر ہے میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ حضرت علیؑ تو ہر انسان کے متعلق فرماتے ہیں۔

دوائک فیک و ما تشعر ودائک منک و اما تبصر

وانت الكتاب المبین الذی با حرفه یظهر المضمّر

وتزعم انک جرم صغیرہ وفیک الطوی العالم الاکبر

سو حضرت علیؑ تو ہر شخص کی نسبت فرماتے ہیں کہ تم کتاب مبین ہو کیونکہ انسان مظہر اتم ہے الہیات کا اور ملکوت کا اس میں ہر شے کی نظیر موجود ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ

جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ

أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب پیدا کئے تم میں نبی اور کر دیا تم کو بادشاہ اور دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو جہاں میں۔

تفسیری نکات

ارشاد فرمایا کہ جناب مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو فرماتے ہیں کہ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ اور اس کے آگے فرماتے ہیں وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا یعنی ملوک تو سب کو فرمایا اور انبیاء میں فیکم فرمایا کہ انبیاء بعض ہیں اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت تو بعض افراد کے ساتھ خاص ہوتی ہے مگر سلطنت جس قوم کی ہوتی ہے اس کا ہر فرد عرفاً صاحب سلطنت سمجھا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا

فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ضرورت شیخ نص کی روشنی میں

فرمایا کہ لوگ شیخ طریقت کی ضرورت ہیں یہ آیت پیش کیا کرتے ہیں وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ حالانکہ اس میں شیخ مراد نہیں بلکہ اعمال صالحہ مراد ہیں البتہ ضرورت شیخ دوسری آیت سے ثابت ہو سکتی ہے وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ اور یہ جو مشہور ہے (۲) الشَّيْخُ فِي قَوْمِهِ النَّبِيُّ فِي امْتِهِ (شیخ اپنی قوم میں ایسا ہے جیسا نبی اپنی امت میں) اس سے مراد شیخ طریقت نہیں بلکہ بوزھا آدی مراد ہے۔ کیونکہ یہ مقولہ حدیث کہا جاتا ہے اور اس زمانہ میں شیخ کا لفظ شیخ طریقت کے معنی میں قطعاً استعمال نہیں ہوا۔ کیونکہ یہ حرف بالکل مستحدث ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت جلد نمبر ۱۳ ص ۳۷-۳۸)

وَالْقِيَابَ بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

ترجمہ: اور ہم نے ان میں باہم قیامت تک عداوت و بغض ڈال دیا۔

تفسیری نکات

اہل کتاب کے اتحاد کی غرض

اور اہل کتاب میں آج کل بظاہر بہت اتحاد اور اتفاق دیکھا جاتا ہے اس واقعہ کی تکذیب تو ہو نہیں سکتی تو اس سے اس آیات میں شبہ ہو سکتا ہے جو اب یہ ہے کہ اس سے اوپر یہود کا ذکر ہے تو اول تو جب تک ان میں اتحاد ثابت نہ کیا جائے آیت کے مضمون پر کوئی شبہ نہیں دوسرے اگر اس کے قبل اہل کتاب کا ذکر ہونے کی وجہ سے مطلق اہل کتاب کی طرف بھی ضمیر کو راجع کیا جائے تو جواب یہ ہے کہ اس عداوت سے مراد مذہبی عداوت ہے اور اب جن لوگوں میں اتحاد دیکھا جاتا ہے وہ مذہب سے بالکل علیحدہ ہیں۔ ان میں جو اتحاد ہے وہ اغراض دنیوی ہی میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ

فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الَّتِي هِيَ

الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: اے رسول پہنچادے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام اور اللہ تجھ کو بچالے گا لوگوں سے بیشک اللہ راستہ نہیں دکھلاتا قوم کفار کو۔

تفسیری نکات

عجیب و غریب ربط

پھر چونکہ وَاللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الَّتِي هِيَ الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۳﴾ سے آپ کو غایت حرص علی ایمان الکفار سے طمع ہو سکتی تھی کہ بس اب تو سب کافر مسلمان ہو جائیں گے۔ کیونکہ جب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو میں ہر کافر کو قرآن سناؤں گا اور وہ بھی آپ کی زبان سے بھلا کون کافر ہے۔ مگر ایسا ہونا مقدر نہیں تھا اس لئے آگے تسلی کے لئے فرماتے ہیں إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۳﴾ کہ سب کے اسلام کی طمع نہ کیجئے بعضوں کو حق تعالیٰ ہدایت نہ کریں گے اس اخیر جملہ کا یہ ربط ہے ماقبل سے جو شاید بہت لوگوں کے ذہن میں نہ آیا ہو۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمَّةُ

صِدْقٍ كَانَ يَأْكُلُ الطَّعَامَ أَنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ

أَنْظُرْ أَتَى يُؤْفَكُونَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: نہیں ہے مسیح مریم کا بیٹا مگر رسول گذر چکے اس سے پہلے بہت رسول اور اس کی ماں ولی ہے دونوں کھاتے تھے کھانا دیکھ ہم کیسے بتلاتے ہیں ان کو دلیلیں پھر دیکھ وہ کہاں لٹے جا رہے ہیں۔

تفسیری نکات

اسی لئے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ و مریم علیہما السلام کی نسبت گانا یا اکلن الطعام فرمایا جنو طمان و یبولان نہیں فرمایا کیونکہ اکل و شرب ان کا جدا مجہد ہے جو بول و براز کرے گا وہ پہلے کھائے پئے گا بھی ضرور تو اکل و شرب ہی سبب ہے بول و براز کا اس لئے حق تعالیٰ نے سبب کو بیان فرما دیا کہ اس سے مسبب پر خود دلالت ہو جائے گی صریح نہ فرمانا اس وجہ سے ہے کہ قرآن میں تہذیب کی بہت رعایت کی گئی ہے اسی لئے بول و براز کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ سبب کے ذکر سے اسی پر دلالت کر دی گئی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جنت میں تو اکل کو بول و براز سے مفارقت ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا دعویٰ یہ نہیں کہ اکل بول و براز سے مفارقت نہیں بلکہ دعویٰ یہ کہ بول و براز اکل سے مفارقت نہیں دوسرے یہاں گفتگو اکل و شرب فی الدنیا میں ہے اور دنیا میں طرفین سے تلازم ہے اور یہاں عیسیٰ و مریم علیہما السلام کے متعلق دنیا ہی میں اکل طعام کا ذکر ہے پس اس بول و براز پر کتنا یہ صحیح ہے علاوہ ازیں یہ کہ اگر اس طعام کے بعد بول و براز دنیا میں بھی نہ ہوتا جب بھی اکل و شرب صفات نقص ہے تو اس لئے ہے کہ

ابرو ما دومه و خورشید و فلک در کارند تا تو تانے بکف آری بہ غفلت نہ خوری

یعنی اس میں احتیاج سب سے زیادہ ہے۔ سارے عالم کو چکر لگنے کے بعد انسان کی غذا حاصل ہوتی ہے دوسرے جیسا اوپر مذکور ہوا تو شہادت حالیہ اس کے ادون ہونے پر دال رہی ہے کہ انسان اس کو خود حقیر سمجھتا ہے اور دوسروں کے سامنے کھانے پینے سے ایسا شرماتا ہے گویا کوئی عیب کا کام کر رہا ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَنْزَالُ

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۰۶﴾

يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ

وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ قُلْ أَنْتُمْ تُنْتَهُونَ ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ: ایمان والوں بات یہی ہے کہ شراب اور جو اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم کو فلاح ہو شیطان کی جوئے اور شراب سے یہ غرض ہے کہ آپس میں دشمنی ڈال دے اور ذکر اللہ سے اور نماز سے روک دے حق تعالیٰ نے اس آیت میں جوئے اور شراب کے دو نقصان بتلائے ہیں ایک یہ ہے کہ شیطان اس کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں نفاق ڈال دے گا دوسرے یہ کہ خدائے تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے روک دے گا۔ سو اب بھی باز نہ آؤ گے۔

تفسیری نکات

ایک غلطی کا ازالہ

یہ ایک آیت ہے لیکن جملہ خاص اس کے پہلے جزو کی تفسیر کرنا اور جس بارے میں یہ جزو آیت ہے خصوصیت سے اسی کو بیان کرنا مقصود ہے اور مجھ کو اس سے ایک غلطی کے رفع کا استنباط کرنا منظور ہے جس کو میں عرض کروں گا اول بطور تمہید کے اس جزو آیت کا خلاصہ عرض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جناب رسول ﷺ سے لوگوں نے ضرور تمنا کا حکم پوچھا تھا اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے ان میں منافع بھی ہیں اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے بعض مفسرین نے کہا کہ یہ آیات تحریم خمر و میسر سے پہلے کی ہے اور اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی ہے لیکن لفظوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ تسامح ہوا ہے اس لئے کہ باوجود لفظ اثم کبیر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا پس بظاہر یہ آیت بھی تحریم کے بعد ہی کی ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے بعد والی آیات **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ** (یعنی اے ایمان والوں بات یہی ہے کہ شراب اور جو اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں) اس کی زیادہ تاکید ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت کو سن کر بعض لوگوں نے لفظ منافع پر نظر کر کے شراب کے

ترک میں سستی کی ہو اور فیہما آنتہما لہذا (ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں) میں کچھ تاویل کر لی ہو مثلاً یہ کہ ان کو خود اٹم نہیں فرمایا بلکہ مضمین اٹم فرمایا ہے اس طرح سے کہ کبھی یہ مفہمی الی المعاصی ہو جاتے ہیں تو جب ایسا انتظام کر لیا جائے کہ یہ احتمال نہ رہے تو جائز ہوگا جیسے قبیح لغیرہ کی شان ہوتی ہے مگر یہ تاویل بہت بعید ہے اس لئے نہایت شدد سے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** الخ نازل ہوئی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے قبل تحریم نہیں ہوئی تھی اور منافع للناس سے جواز پر تمسک نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کسی محرم شے میں منافع کے وجود سے اس کی اباحت پر استدلال نہیں ہو سکتا بلکہ منافع کا ذکر فشاء شبہ کو رفع کرنے کے واسطے ہے یعنی اگرچہ ان دونوں میں منافع بھی ہیں چنانچہ خمر میں قوۃ عزیز یہ اور میسر میں نکشیر مال بہ سہولت لیکن مفاسد ان کے منافع سے زیادہ ہیں اس لئے حرام ہیں۔ یہ حاصل ہے۔

دور حاضر کی رسومات کا حال

صاف ظاہر ہے کہ عداۃ اور بغضاء اور نماز اور ذکر اللہ سے غافل کرنے کے لئے یہ دونوں چیزیں آلہ ہیں اور آلہ اور علت ایک ہی چیز ہیں اسی واسطے اس کی شرح میں فرماتے ہیں جناب رسول ﷺ **كُلُّ مَا الْهَاكُ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ فَهُوَ مَيْسِرٌ** یعنی جو چیز تجھ کو ذکر اللہ سے غافل کرے وہ سب جو ہے ظاہر ہے کہ لفظ میں تو اس کو جوائیں کہتے حدیث میں جو اس کو فرمایا گیا وہ با شراک علت ہے اس میں تصریح ہو گئی کہ **نَهَى عَنْ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ** کی علت الہاء عن ذکر اللہ ہے۔

پس جہاں الہاء عن ذکر اللہ پایا جاوے گا وہ سب حکماء خمر اور میسر ہوگا اب اس سے اپنی رسوں کا حکم نکال لیجئے۔ حدیث کے الفاظ صاف کہتے ہیں کہ ان کا حکم بھی شراب اور جوئے کا سا ہے کیونکہ نماز سے غافل ہونے کا سبب ہو گئیں اگر اور دلیلوں سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو یہ دلیل میں نے ایسی پیش کی ہے کہ اس کے سامنے کسی دلیل کی حاجت نہیں اور اس کا جواب آپ کچھ بھی نہیں دے سکتے جب چاہے مشاہدہ کر لیجئے کہ جہاں یہ رسمیں روا ہوتی ہیں وہاں نماز کی گت نہیں ہوتی تو بموجب ارشاد حضور ﷺ کے میسر یعنی جوئے کے حکم میں ہوئیں اور میسر کو قرآن شریف میں رجز اور عمل شیطان فرمایا گیا ہے تو میں نہیں کہتا بلکہ قرآن ان کو عمل شیطان کہتا ہے پس اور دلیلوں کو جانے دیجئے یہی کیا کم خرابی ہے کہ اس کا نام عمل شیطان ہوا حکم شرعی تو یہی ہے جس کے لئے ایسی دلیل بتلائی گئی کہ موٹی سے موٹی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے لیکن سمجھے تو وہ جس کی طبیعت میں یہ کچھ کھلیں۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا

طَعِبُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا

ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ: ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں جبکہ وہ لوگ پرہیز رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکو کاروں سے محبت رکھتے ہیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

شان نزول آیت کا یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے شراب کو مسلمانوں پر حرام کر دیا تو بعض صحابہ کو یہ خیال ہوا کہ ہم میں جو لوگ تحریم سے پہلے شراب پیتے تھے مر گئے ہیں کہیں ان کو گناہ نہ ہوا ہو (یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس وقت تک شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تھی تو انہوں نے حرام کا ارتکاب ہی نہ کیا تھا پھر صحابہ کو ان پر گناہ کا فہم کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اتنی بات تو صحابہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت حرمت خمر کا نزول نہ ہوا تھا لیکن ممکن ہے ان کو یہ خیال ہوا ہو کہ نامعلوم اس وقت تک جو شراب کی حرمت نازل نہ ہوئی تو اس کا سبب یہ ہے کہ شراب اب تک واقع میں حلال تھی یا یہ سبب ہے کہ واقع میں تو وہ پہلے بھی حرام تھی لیکن چونکہ ہم لوگ اس کے عادی بہت زیادہ تھے تو دفعۃً اس کی تحریم اس وجہ سے نازل نہیں کی گئی کہ ہم اس پر عمل نہ کر سکیں گے پھر تدریجاً جب ہمارے اندر قابلیت عمل زیادہ ہو گئی اس وقت حکم تحریم نازل ہو گیا پس صورت اول میں جن لوگوں نے تحریم سے پہلے شراب پی تھی انہوں نے حلال ارتکاب کیا لیکن دوسری صورت میں حرام کا ارتکاب لازم آتا ہے گو بوجہ نص نازل نہ ہونے کے ان کو گناہ نہ ہوا ہو لیکن شاید ان کے درجات میں کچھ کمی اس لئے ہو گئی کہ وہ حرام فی نفسہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دنیا سے گئے ہیں۔)

اس شبہ کا ازالہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر کچھ گناہ نہیں ہے اس چیز میں جو انہوں نے (اب تک) کھایا یا پی ہے (یعنی حکم تحریم سے پہلے شراب پینے میں تو ان پر کچھ گناہ

نہیں ہوا) جب کہ وہ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں اور نیک اعمال کرتے رہے ہوں پھر وہ تقویٰ کرتے رہے ہوں اور ایمان دار رہے ہوں اور اخلاص سے کام لیتے رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ اہل اخلاص سے محبت رکھتے ہیں۔

اس جگہ اصل مقصود تو یہ بتلانا تھا کہ نزول تحریم سے پہلے جن لوگوں نے شراب پی ہے ان پر اس فعل کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا لیکن لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعَمُوا سے چونکہ بظاہر گناہ کی نفی مطلقاً ہو رہی ہے اس لئے آگے قاعدہ کلیہ کے طور پر وہ شرائط بھی بیان فرمادیں جن کے اجتماع کے بعد گناہ کی نفی مطلقاً صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ اگر کسی شخص نے تحریم خمر سے پہلے شراب بھی پی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو یہ کہنا صحیح ہے کہ شراب کی وجہ سے اس کو گناہ نہیں ہوا لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کو کچھ بھی گناہ نہیں ہوا پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جب وہ لوگ دوسرے گناہوں سے بچتے رہے ہوں جن کی حرمت اس وقت نازل ہو چکی تھی نیز ان اعمال صالحہ کو بھی بجا لاتے رہے ہوں جن کا امر اس وقت نازل ہو چکا تھا تو پھر ان کو شراب پینے کی وجہ سے کچھ گناہ نہیں ہوا۔

اب اس جگہ ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کا ذکر تین مرتبہ ہوا ہے اس کا کیا مطلب ہے جب ان کو ایک بار مومن کہہ دیا گیا اور اس کے بعد تقویٰ سے ان کو موصوف کر دیا گیا تو پھر دوبارہ امسوا واتقوا کے ذکر سے کیا مقصود ہے یہ ایمان کے بعد ایمان لانا اور تقویٰ کے بعد پھر تقویٰ کرنا کیسا ہے تکرار ایمان کا جواب تو یہ ہے کہ ایمان کے مختلف مراتب ہیں ایک مرتبہ ایمان کا یہ ہے کہ کفر و شرک سے توبہ کرے یہ درجہ تو ایمان کا وہ ہے جو صحت کے لئے شرط ہے کہ اس کے بغیر کوئی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا اور ایک مرتبہ ایمان کا وہ ہے جو اعمال صالحہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس کے دل میں پیوستہ اور جاگزین ہو جانا اور اس پر ثبات استقامت حاصل ہو جانا دوبارہ لفظ امسوا اس درجہ کی طرف اشارہ ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ ایک مرتبہ ایمان لا کر وہ اعمال صالحہ کرتے رہے اور محرمات سے بچتے رہے تو اس سے ان کو ایمان پر مداومت و استقامت حاصل ہوئی پھر اس کے بعد جیسے اعمال ہوتے ہیں ویسا ہی ایمان ان سے پیدا ہوتا ہے مطلق مداومت و ثبات علی الایمان کہ اعمال صالحہ کے ہمیشہ بجالانے سے ہر شخص کو حاصل ہو جاتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جس شخص کے اعمال ناقص ہیں ان سے جو ایمان پیدا ہوگا وہ بھی ناقص ہوگا اور جس کے اعمال کامل ہیں ان سے کامل ایمان پیدا ہوگا۔

تیسری مرتبہ ذکر ایمان سے اس درجہ کی طرف اشارہ ہے کہ بعد ثبات علی الایمان کے حسب اعمال ان کو ایمان میں ترقی حاصل ہوتی رہتی ہے اس کے بعد پھر ایمان کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ احسان کا ذکر فرمایا جس کے معنی شریعت میں اخلاص کے ہیں اور یہ اعلیٰ درجہ ایمان کا ہے اسی کو صدق سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور صدیق بھی

صاحب احسان ہی کو بولتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کے بعد ترقی اعمال سے درجہ احسان کا عطا ہوتا ہے اور یہی درجہ ایمان کا مطلوب ہے اور جو شخص اس درجہ میں قائل ہوتا ہے وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے پھر اس کو کچھ عذاب اور گناہ نہیں ہوتا کیونکہ محبوب مطہج کو کوئی بھی عذاب نہیں دیا کرتا یہ جواب تو تکرار ایمان کے اشکال کا ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! لازم پکڑو اپنے نفسوں کو نہ نقصان پہنچا سکے گا تمہارا وہ شخص جو گمراہ ہے جبکہ تم نے ہدایت پائی اللہ تعالیٰ کی طرف تم سب کو لوٹا ہے پس اللہ تعالیٰ تم کو آگاہ کرے گا جو تم لوگ عمل کرتے ہو۔

تفسیری نکات

علوم کی دو قسمیں

ایک جملہ انشائیہ ہے اور دوسرا جملہ خبریہ جو کہ معنی انشائیہ ہے کیونکہ ہر جگہ خبر مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ حاصل یہ ہے کہ علوم دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ خود وہ علوم ہی مقصود بالذات ہیں جیسے عقائد مثلاً قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اور وَالْوَدُنُ يُؤْمِنُونَ الْعِزَّةُ آپ فرمادے گئے اللہ تعالیٰ ایک ہے وزن (اعمال کا تولا جاتا) اس دن حق ہے اس میں تو خود خبر ہی مقصود ہوتی ہے کیونکہ ان کے متعلق کوئی عمل نہیں ہوتا دوسرے وہ علوم ہیں کہ خود وہ علم مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس علم سے عمل مقصود ہوتا ہے خواہ وہ امر ہو یا نہی ایسے مقام پر اگر خبریہ ہو تو وہ معنی انشاء ہوگا جس کی تعیین قرآن سے ہو جائے گی مثلاً اس مقام پر خدا تعالیٰ نے اول ایک جملہ ذکر فرمایا ہے اس کے بعد جملہ خبریہ ذکر فرمایا ہے جس سے مقصود اس امر کی تاکید ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ اس امر کی مخالفت نہ کرو پس معلوم ہوا کہ اعمال میں وہ خود مقصود نہیں ہوتی لہذا میں اس خبر سے تعرض نہیں کرتا بلکہ صرف دو مضمونوں کو لیتا ہوں ایک امر کو دوسرے نہی کو جو کہ جملہ خبریہ سے مقصود ہے یعنی لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ سے کیونکہ مقصود یہ ہے کہ تم دوسروں کی فکر میں نہ پڑو لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ علیکم انفسکم کے بیان کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ مسوق لہ الکلام صرف لا يضرکم ہے لیکن جملہ الی اللہ مرجعکم جمیعاً کا زیادہ تعلق عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ سے ہے کیونکہ دوسروں کو فکر کرنا کچھ ایسا گناہ نہیں جس پر اس جملہ الی اللہ مرجعکم کو مرتب فرمایا جائے پس علیکم انفسکم کے ساتھ مرجعہ ہے اور اس پر مرتب ہے اور اس ترتیب سے

معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ بھی مقصود ہے کیونکہ حاصل اس کا یہ ہے کہ چونکہ تم کو خدا کے پاس جانا ہے اس لئے تم اپنی فکر کرو اور غفلت میں نہ پڑو اپنی اصلاح کرو۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يُعِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ

أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ

ترجمہ: وہ وقت قابل یاد ہے جبکہ حواریین نے عرض کیا کہ اے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کیا آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں کہ ہم پر آسمان سے کچھ کھانا نازل فرمائیں؟

آیت هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ کے ایک لطیف معنی

پوچھا گیا آیت هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ ان ينزل علينا مائدة من السماء کے کیا معنی ہیں ظاہر تو ثابت ہوتا ہے کہ حواریین خدا تعالیٰ کو اتنا بھی قادر نہ مانتے تھے کہ مائدہ کو اتارے اس سے تو ان کے ایمان میں بھی شبہ ہوتا ہے فرمایا اس کا بیان باقاعدہ تو یہ ہے کہ دو معنی ہیں ایک بمعنی قدرت جو قبل الفعل ہے۔ دوسرا استطاعت حقیقہ جو مع الفعل ہے جس کے بعد وجود فعل لازم آتا ہے یہاں مراد یہ دوسرے معنی ہیں یعنی ہر اہل نبی نزل ربک علینا مائدة اور اس مضمون کو عام فہم کرنے کے لئے مجھے یہ نیا محاورہ بہت کارآمد معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اوپر مائدہ اتار سکتا ہے یہ ایسا ہے جیسے آج کل کہتے ہیں کیا آپ میرے یہاں آ سکتے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۲ ص ۲۰۳)

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ

تَكُونُ لَنَا عَيْدًا لِأَوْلَانَا وَأَخْرِنَا وَأَيُّهُم مِّنكَ وَأَرْسُلْنَا وَأَنْتَ

خَيْرُ الرَّزُقِينَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: عیسیٰ بن مریم نے دعا کی کہ اے اللہ ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائیے کہ وہ ہمارے لئے یعنی ہم میں جو بول ہیں اور جو بعد میں سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے اور آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے اور آپ ہم کو عطا فرمائیے اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں۔

تفسیری نکات

روح عید

اس آیات سے بعض نے عید میلاد النبی بھی استدلال کیا ہے مگر چونکہ اس کا جواب وعظ السورہ میں بیان ہو چکا ہے اس لئے اس وقت اس کے متعلق بیان کرنا مقصود نہیں ہے اس وقت اس سے صرف یہ استنباط کرنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے عید کو نزولِ مائدہ پر مرتب کیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ عید کا مقتضا ایک درجہ میں اتران ہے عید اور نزولِ مائدہ کا چنانچہ امتِ عیسیٰ علیہ السلام کو مائدہ کے نزول پر عید ملی پس اس امت کو عید عطا ہونے سے بھی باقتضائے مذکور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی ایک مائدہ ملا ہے جس کی ایک صورت ہے کھانا پینا خوشی کرنا اور ایک معنی ہے مشاہدہ پس اس طرح سے یہ آیات دال ہے روح عید پر مگر بنی اسرائیل کے مائدہ میں اور ہمارے مائدہ میں یہ فرق ہے کہ ان کو محض مائدہ صوری ملا تھا جس میں احتمالِ رد و نکس (لوٹنا ۱۲) کا تھا اور چونکہ ہمارا مائدہ مقرون ہے مائدہ معنوی کے ساتھ اس لئے اس میں کوئی رد و نکس رجوع و سقوط و حور نہیں ہو سکتا چنانچہ بنی اسرائیل کو اسی لئے ارشاد ہوا تھا قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنزِلُهَا عَلَيْكُمْ كَمَنْ يَكْفُرُ بَعْدَ مَا كَفَرْتُمْ فَإِنِّي أَخَذْتُ الْعَذَابَ بِأَعْيُنِي وَأَنَا آتِيهَا الْعَذَابَ لِمَنْ كَفَرَ بِالْعَلَمِينَ کہ ہم مائدہ نازل تو کر دیں گے لیکن اس کے بعد جو کوئی ناشکری کرے گا اس کو ایسا سخت عذاب ہوگا کہ کبھی کسی کو نہ ہوا ہوگا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ناشکری کی اور عذاب الہی میں گرفتار ہوئے الحمد للہ ہم کو دو مائدے عطا ہوئے ایک جسمانی ایک روحانی یا ایک صوری ایک معنوی یا ایک ظاہری ایک باطنی تاکہ اگر مائدہ جسمانی سے کم ناشکری کرنا چاہیں تو روحانی ہم کو سنبھالے رہے اور ناشکری نہ کرنے دے اور وہ روحانی مائدہ کیا چیز ہے وہ محبت و معرفت ہے حق تعالیٰ کی جس کا دوسرا عنوان مشاہدہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

سُورَةُ الْأَنْعَامِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهُمْ وَكَذَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ

يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور جی بہلانا اور آخرت کا گھر بہتر ہے پرہیزگاروں کے لئے کیا تم نہیں سمجھتے۔

تفسیری نکات

لہو اور لعب کا مفہوم

یہاں حق تعالیٰ نے دنیا کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں ایک لہو اور ایک لعب اور دونوں کے مفہوم میں لفظ کچھ فرق ہے وہ یہ کہ لہو کہتے ہیں شغل کو اور لعب کہتے ہیں عبث کو اس سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ اس میں دو صفتیں ہیں ایک تو لہو ہونے کی کہ یہ لوگوں کو اپنی طرف لہاتی اور مشغول کرتی ہے اور دوسرے لعب یعنی عبث ہونے کی کہ اس میں مشغول ہونا عبث یعنی بے نتیجہ ہے۔ اس پر کوئی معتد بہ ثمرہ مرتب نہیں ہوتا جیسے بچوں کا کھیل کہ اس پر بھی کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

اصلاح زاہد خشک

اس سے ایک اور دقیق علم کی طرف بھی اشارہ ہے وہ یہ کہ تمام حیات دنیا مذموم نہیں بلکہ وہ حیات دنیا مذموم ہے جس میں محض لہو و لعب ہو یعنی جو بے نتیجہ ہو اور اس کا کوئی معتد بہ ثمرہ نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ دنیا

صوری کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب ہو اور ایک وہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو کہ جس پر ثمرہ مرتب نہ ہو وہ مذموم ہے اور جس پر ثمرہ مرتب ہو وہ واقع میں دنیا ہی نہیں۔

یہاں سے اصلاح ہے عالی فی الزہد اور زاہد خشک کی کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز مذموم ہے عمدہ کپڑا اچھا کھانا ٹھنڈا پانی سب مذموم ہے بعض لوگ اسی خیال سے نکاح بھی نہیں کرتے کہ عورت بھی دنیا ہے اور بعض کر بھی لیتے ہیں تو نان و نفقہ نہیں دیتے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتے کیونکہ وہ بیوی کی طرف التفات کرنے کو التفات الی الدنیا سمجھتے ہیں۔

اور ایک دفعہ کفار نے کوئی خاص معجزہ مانگا تھا کہ ایسا نشان ظاہر ہو ہم مانیں آپ ﷺ کا دل چاہا کہ ان کی درخواست کے مطابق ہی معجزہ ظاہر ہو جائے تو اچھا ہے اس پر حق تعالیٰ نہایت تشدید کے ساتھ فرماتے ہیں۔

وَلَا يَكُنْ مِنَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الَّذِينَ اتَّخَذُوا عِبَادًا لَهُمْ فَلَا تَكُونُ مِنَ الْغَالِبِينَ
وَلَا يَكُنْ مِنَ الَّذِينَ اتَّخَذُوا عِبَادًا لَهُمْ فَلَا تَكُونُ مِنَ الْغَالِبِينَ

یعنی اگر آپ پر ان کافروں کا اعراض اور انکار ایسا ہی گراں ہے (اور اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ کسی طرح مان ہی جائیں) تو اگر آپ سے ہو سکے تو زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر کوئی معجزہ (ان کی خواہش کے موافق لے آئیے ہم تو ایسا نہ کریں گے)

ضرورت زبان دانی

آگے فرماتے ہیں فَلَا تَكُونُ مِنَ الْغَالِبِينَ یہاں زبان دانی کی ضرورت ہے اس جگہ ہمارے محاورہ کے اعتبار سے جاہل کے ساتھ ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ یہاں ترجمہ یہ ہے کہ بس آپ نادان نہ بنئے بچوں کی سی ضد نہ کیجئے دیکھئے اس ترجمہ سے کیسی شفقت نکلتی ہے جو اس ترجمہ سے ہرگز ظاہر نہ ہوتی کہ بس آپ جاہلوں کیسی باتیں نہ کیجئے بات ایک ہی ہے نادان اور جاہل الغیۃ مرادف ہیں مگر ہمارے محاورہ میں جاہل تحقیر کے موقع میں اور نادان شفقت کی جگہ بولا جاتا ہے اور یہ مقام شفقت ہی کا ہے اس لئے یہاں جاہل کا ترجمہ نادان ہی کرنا ضروری ہے۔ آگے آپ کی نیت کا جواب دیتے ہیں کہ آپ خود ان کی خواہش کے موافق معجزہ کو اس لئے چاہتے ہیں کہ یہ لوگ مان جائیں گے تو اس خیال کو دل سے دور کیجئے یہ ماننے والے نہیں ہیں۔

إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ بات تو وہی مانتے ہیں جو (کان لگا کر) سنیں بھی اور یہ کم بخت تو مردوں کی طرح سنتے ہی نہیں اگر یہ توجہ سے قرآن کو سن لیں تو پھر اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے معجزے کی بھی ان کو ضرورت نہ رہے پھر خیال ہو سکتا تھا کہ جب یہ ایسے ہیں تو پھر ان کم بختوں کو سزا ہی دجائے تو فرماتے ہیں

وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ لَعَلَّآ يَرْجِعُونَ اور مردوں کو خدا تعالیٰ (ایک دن) اٹھائیں گے پھر سب اس کے پاس لوٹ کر جائیں گے (اسی دن ان مردوں کو بھی دیکھ لیا جائے گا) آپ سزا کی فکر میں کیوں پڑتے ہیں ہمارا ان کا معاملہ ہے ہم خود دیکھ لیں گے چاہے ہم جلدی سزا دیں یا دیر میں آپ کو اس سے کچھ مطلب نہیں۔ اس کے یہ معانے نہیں کہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی تمنا کو پسند نہیں کیا بلکہ آپ کے حزن و فکر کو پسند نہ فرمایا کہ آپ اپنی پھول سی جان کو کیوں پریشانی میں ڈالتے ہیں بس ان کا معاملہ ہمارے سپرد کر کے بے فکر ہو جائیے۔

وَإِنْ كَانَ كِبْرُكَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ

نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلْمًا فِي السَّمَاءِ فَتَاتِيهِمْ بِآيَةٍ

ترجمہ: اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لے لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ تو کرو۔

تفسیری نکات آیات تسلی

حتی کہ آپ کے غلبہ غم کی وجہ سے آپ کو تسلی دینے کے لئے خاص اس مضمون کی بار بار آیتیں نازل فرمائیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے لعلک باخ نفسک ان لا یكونوا مومنین (جس کا حاصل یہ ہے کہ اے محمد ﷺ آپ کی حالت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کے غم میں اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے لا تسئل عن اصحاب الجحیم کہ آپ سے ان لوگوں کی حالت کا سوال نہ کیا جائے گا یعنی پھر آپ کیوں غم کرتے ہیں اگر یہ ایمان نہیں لاتے نہ لائیں ایک اور جگہ ارشاد ہے لست علیہم بمصیطر کہ آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ ضرور ہی ان سے قتل کر لیں آپ کا کام صرف تبلیغ ہے کیونکہ آپ مبلغ ہیں رہا عمل کرانا یہ کام مصیطر کا ہے اور آپ مصیطر مقرر نہیں ہوئے پھر اگر یہ لوگ عمل نہیں کرتے اور تبلیغ کو نہیں مانتے تو آپ کو کیا غم ہے ایک اور جگہ فرماتے ہیں وان کان کبر علیک اعراضہم فان استطعت ان تبغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیہم بایة (اور اگر آپ کو ان کا اعراض گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین کی کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ لو پھر کوئی معجزہ لے آؤ) ایک جگہ فرماتے ہیں ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلہم جمیعاً افانت تکرہ الناس حتی یكونوا مومنین کہ آپ زبردستی تو ان کو ایمان دار نہیں بنا سکتے گوان کی قسمت میں

دولت ایمان نہ ہو ایک اور جگہ ارشاد ہے وَلَا تَحْزَنُ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ کہ آپ ان کی حالت پر غم نہ کیجئے اور ان کے مکروں سے تنگدل نہ ہوئے۔ ایک جگہ ارشاد ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرَكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ کہ ہم جانتے ہیں ان لوگوں کے اقوال سے جو تنگدلی آپ کو ہوتی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ عشق کے مطابق ایک آیت کی تفسیر

حق تعالیٰ فرماتے ہیں قَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُ لِيَحْزَنَكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يَكْلَبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بَايَاتِ اللَّهِ يَجْحَلُونَ ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کافروں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے آگے مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ اور میں نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ فَإِنَّهُمْ لَا يَكْسِبُونَكَ عِلَّتْ بِهِيَ جَمَلَةٌ مَحْذُوفَةٌ كِي تَقْرِيْرِيُوْنَ هِيَ فَلَا تَحْزَنُ وَكُلُّ أَمْرٍ هُمَ إِلَى اللَّهِ فَإِنَّهُمْ لَا يَكْلَبُونَكَ اِلْحَافِيْعِنِيْ أَيْ غَمٌ نَهْ سَيَجِيْءُ وَأَنَّ كَامِعَالِمِ اللّٰهِ تَعَالَى كِ سِرْدِ سَيَجِيْءُ كِيُوْنَكُ يَهْ لُوْكَ اَيْ كُو تُو نَهِيْ سِ جَمَلَاتِيْ (كِيُوْنَكُ اَيْ كُو تُو مَحْمُودِيْنَ كِهْتِيْ هِيْ صَادِقِ مَانْتِيْ تَهِيْ) بَلَكُ يَهْ ظَالِمٌ تُو خِدَا كِيْ اَيْ تُو كُو جَمَلَاتِيْ هِيْ (سُو اَيْ كُسْ لِيْ رَنْجِ كِرْتِيْ هِيْ وَهْ اَيْ كُو تُو كُجْمُ نَهِيْ كِهْتِيْ هَامَارِيْ اَيْ تُو سِيْ) (الانعام ۳۳)

سو آپ تسبیح و تحمید میں لگ گئے اور عبادت کو اپنا مشغلہ بنا لیجئے کہ اس سے یہ تنگدلی دفع ہو جائے گی اور یہ غم ہلکا ہو جائیگا۔

رسول اکرم ﷺ کے غم و حزن کا منشاء

غرض بہت سی آیتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کفار کی حالت پر بہت ہی حزن و غم تھا نیز ان آیات سے اس کے منی کا بھی پتہ لگتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں اور اپنے کفر و ضلالت سے باز آ جائیں تو معلوم ہوا کہ آپ کو ان لوگوں سے نفسانی عداوت اور بغض نہ تھا بلکہ ان کی اس ردی حالت پر رحم آتا تھا اور دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے کیونکہ اگر آپ کو ان کے ساتھ اس قسم کی عداوت اور بغض ہوتا تو آپ ہرگز ان کے ایمان لانے اور راہ راست پر آ جانے کی تمنا نہ کرتے بلکہ یوں چاہتے کہ یہ لوگ ساری عمر اس کفر و گمراہی کے تیرہ و تار یک غار میں پڑے رہیں اور کبھی ان کو اس سے نکلنا نصیب نہ ہو کیونکہ قاعدہ ہے کہ اپنے دشمن کے لئے انسان خیر خواہی نہیں کیا کرتا بلکہ عادتاً اس کی بدخواہی کے درپے ہوتا ہے اور اگر بدخواہی کے درپے بھی نہ ہو تو خیر خواہی کی تو گنجائش نہیں ہوتی اور آپ کی یہ حالت تھی کہ یوں چاہتے تھے گو مجھے تکلیف ہو لیکن ان لوگوں کو تکلیف نہ ہونے پائے حتیٰ کہ جس معجزے کے وہ طالب ہوتے تھے حضور ﷺ چاہتے تھے کہ وہ معجزہ ہو ہی جائے تاکہ اسی کو دیکھ کر یہ لوگ سنبھل جائیں درست کر لیں پس معلوم ہوا کہ نماز میں ایسا قوی قرب و مشاہدہ ہوتا ہے جو کسی اور امر سے نہیں ہوتا اور نہ حق تعالیٰ تسلی کے لئے اسی امر کی تعلیم کو اختیار فرماتے

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ اذا خربیه امر فزع الصلوة کہ جب حضور کو کوئی بڑا فکر پیش آیا تو آپ جلدی سے نماز میں مشغول ہو جاتے کیوں اسی لئے تاکہ حق تعالیٰ سے باتیں کر کے دل بہلائیں اور تسلی و سکون حاصل کریں واقعی تجربہ و مشاہدہ ہے کہ رنج و فکر میں نماز میں مشغول ہو جانے سے رنج بہت کم ہو جاتا ہے اور اگر موانع قرب کم ہوں تو بالکل رنج کا ازالہ ہو جاتا ہے تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے زیادہ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال نماز میں جو حق تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی ہے اور ان کی تسبیح اور تقدیس ہے یہی مشاہدہ کافی ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کی طرف بشرائشہ متوجہ ہو جائے اگر اس میں کمی ہو تو البتہ مشاہدہ میں کمی ہے اس کی تلافی کرنا چاہئے پھر جب یہ مرتبہ حاصل ہو جائے گا کہ نماز میں حق تعالیٰ کے سوا کسی طرف توجہ نہ رہے تو آپ کو خود ہی اس کا لطف حاصل ہوگا اور اس وقت آپ سمجھیں گے کہ میں نے جو اس مشاہدہ کو کافی کہا ہے یہ صحیح تھا دنیا میں بڑی کامیابی بندہ کی یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف یکسوئی کے ساتھ نماز میں توجہ نصیب ہو جائے۔ (اصولات فی الصلوات صفحہ ۲۷)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَآخَذْنَا مِنْهُم بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ

لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ﴿۱۷﴾ فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ

قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۸﴾ فَلْيَا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا

بِهِ فَفَتِنَّا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا

أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَاذَاهُمْ مُبْلِسُونَ ﴿۱۹﴾ فَقَطَّعْ دَابِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ

ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: اور ہم نے امتوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے گزر چکی ہیں پیغمبر بھیجے تھے سو ہم نے ان کو تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تا کہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے لیکن ان کے قلوب تو سخت ہی رہے اور شیطان ان کے اعمال کو ان کے خیال میں آراستہ کر کے دکھلاتا رہا پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیئے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھی وہ اتر آگئے ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا تو وہ بالکل حیرت زدہ ہو گئے پھر وہ ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گی اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کی تعریف کے لائق ہیں جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

تفسیری نکات کلفتوں کی قسمیں

کلفتیں اور مصیبتیں دو طرح کی ہوتی ہیں داخلی دوسری خارجی یا یوں کہو کہ ایک نفسی ایک آفاقی آفاقی یہ ہے کہ مثلاً کوئی دشمن چڑھائی کر کے چلا آوے نفسی وہ کہ خود اپنے بدن میں کوئی مرض ہو یا ساء سے مراد آفاقی ہے اور ضراء سے مراد نفسی بلیات ہیں اور یہاں ایجاز ہے حاصل کلام اس طرح ہے **وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَكَفَرُوْا ثُمَّ**۔

حَتّٰى اِذَا جَاءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفْرِطُوْنَ ﴿۱۱﴾

ترجمہ: یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے قبض کر لیتے ہیں اور ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔

تفسیری نکات لغو قصے

فرمایا کہ بعضے قصے جو مشہور ہیں کہ کوئی شخص مر گیا اور تھوڑی دیر میں وہ زندہ ہو گیا اور دوسرا اس نام کا مر گیا اور اس زندہ ہونے والے نے بیان کیا کہ مجھ کو کسی مقام پر لے گئے وہاں حکم ہوا کہ نہیں اس کو نہیں بلایا بلکہ فلانے کو بلایا تھا تو فرمایا کہ بالکل لغو قصے ہیں عزرائیل غلطی نہیں کر سکتے اگر یہ ممکن ہو تو پھر جبرئیل سے بھی ایسی غلطی ممکن ہوگی تو شیعہ کے اس قول کے صحیح ہونے کا بھی احتمال ہوگا کہ جبرئیل غلط کردہ و مقصود علی بود نیز کلام مجید میں ہے **حَتّٰى اِذَا جَاءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفْرِطُوْنَ ﴿۱۱﴾** میں نے چار عالموں کو شبہ میں جنلا دیکھا ایک تو مر چکے تھے اور ان کی تصنیف میں یہ مضمون تھا اور ایک کے زمانے میں میں بچہ تھا اور دو کی خدمت میں میں نے عرض کیا اور انہوں نے قبول کر لیا باقی ایسے قصے کاراوی مریض اگر کوئی ثقہ ہو تو یہ کہا جائے گا کہ اس مریض کو سرسام ہو گیا تھا اس میں ایسے خیالات نظر آ گئے۔

فَلْتَأْتِنَّ عَلَيْهِ الْبَلُ رَأَى كَوْكَبًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلْتَأْتِنَّ أَفَلَّ قَالَ

لَا أُحِبُّ الْأَفْلِينَ ﴿۱۱۹﴾ فَلْتَأْتِنَّا الْقَمَرَ بَارِئًا قَالَ هَذَا رَبِّي فَلْتَأْتِنَّا أَفَلَّ

قَالَ لَيْنَ لَمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿۱۲۰﴾ فَلْتَأْتِنَّا

الشَّمْسَ بَارِئَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا الْكَبَرُ فَلْتَأْتِنَّا أَفَلَّتْ قَالَ يَقَوْمِ

لِئِنِّي بِرَبِّي لَغَفِيرٌ ﴿۱۲۱﴾

ترجمہ: پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا آپ نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا پھر جب چاند کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرنا تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں پھر جب آفتاب کو دیکھا چمکتا ہوا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے یہ تو سب سے بڑا ہے سو جب وہ غروب ہو گیا آپ نے فرمایا اے میری قوم بے شک میں تمہارے شرک سے بے زار ہوں۔

تفسیری نکات

مرآة خداوندی

مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ یہاں خدا عزوجل بطور انعام ہے کہ ستاروں کو دیکھ کر فرمایا ہاں بھائی ہاں تو یہ خدا ہے پھر جب وہ غروب ہو گئے تو ان کے نقائص کو ظاہر کر کے توحید کو ثابت کیا کہ خدا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی عالی کبھی سافل مگر ہمارے حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ ابراہیم کو کعب میں اول ظاہر پر نظر پڑی اس کی نسبت فرمایا ہذا ربی پھر منظر کی طرف التفات ہوا اس کی نسبت فرمایا لَا أُحِبُّ الْأَفْلِينَ مطلب یہ تھا کہ اس کو کعب کے اندر جو مجھے نظر آ رہا ہے وہ میرا خدا ہے اور تم جو کعب کی پرستش کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔

غرض عارفین مخلوق کو مرآة سمجھتے ہیں۔ سو دوسرے لوگ تو اول مرآة کو دیکھتے ہیں اور عارفین اول مرآة کے اندر محبوب کو دیکھتے ہیں جو مرآة پر بھی نظر پڑ جاتی ہے۔

عقل اور حقیقت شناس ابراہیمی المشرب لوگ ہیں یعنی اہل ایمان میں کہ وہ تمجیح ہیں ابراہیم علیہ السلام کے چنانچہ خود حضور کو ارشاد ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے اور ابراہیم علیہ السلام کا مشرب یہ تھا کہ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَى الْكَوْكَبَ قَالَ هَذَا رَبِّي قَالَ هَذَا رَبِّي تُو كَمَا کہ میں نے فرض کیا کہ یہ رب ہے یہ بطور مجازات خصم کے فرمایا، فَلَمَّا أَفَلَ جَبَّ وَهُوَ حَمِيمٌ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ۗ وَهُوَ خَدَا كَيْسًا جَسَّ كُو زوال ہو میں ایسے خدا کو پسند نہیں کرتا۔ فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِعًا قَالَ هَذَا رَبِّي جَبَّ جَانِدٌ كُو دیکھا تو کہا فرض کرو۔ شاید یہ رب ہو۔ فَلَمَّا أَفَلَ جَبَّ وَهُوَ حَمِيمٌ قَالَ لَيْنٌ كَمَا يَعْقِدُ رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ۗ معلوم ہوا یہ بھی خدا نہیں فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِعَةً قَالَ هَذَا رَبِّي هَذَا الْكَبَرُ جَبَّ سُو رَجَّ كُو دیکھا تو کہا یہ سب سے بڑا ہے۔ اگر اس کی خدائی باطل کر دی تو سب کو پکڑ لیا، فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يُعْوِدُنِي رَبِّي أَيُّ مَرْمَرًا يَشْرِكُونَ ۗ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۗ حضرت اسی طرح ہر مومن کی نظر مصداق اس قول کا ہے۔ اول ما آخر ہر منتہی است۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ

فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرِبُهُ مِنْهُ حَبًّا مَّا تَرَ كِبَاءً وَمِنَ النَّخْلِ

مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنَّاتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ

وَالزُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ انظُرُوا إِلَى ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ

إِنَّ فِي ذَٰلِكُمْ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

ترجمہ: اور اسی نے اتارا آسمانوں سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے اگے والی ہر چیز پھر نکالی اس میں سے سبز کھیتی جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک پر ایک چڑھا ہوا اور کجور کے گانھے میں سے پھل کے کچھے جھکے ہوئے اور باغ انگور کے اور زیتون کے اور انار کے آپس میں ملتے جلتے ہیں جدا جدا بھی دیکھو ہر ایک درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو ان چیزوں میں نشانیاں ہیں۔ واسطے ایمان والوں کے۔

تفسیری نکات

تقسیم مال و عقل میں حکمت خداوندی

پس حق تعالیٰ کی یہ تقسیم عین حکمت ہے کہ اہل عقل کو مال کم کر دیا اور کم عقلوں کو مالدار بنا دیا۔ کیونکہ کم عقل جب اتنی بڑی دولت سے محروم ہیں تو کیا وہ چند روز دنیا میں بھی بہار نہ دیکھ لیں پس قارون کے خیال کی غلطی آپ کو معلوم ہوگئی کہ اس نے مال و دولت کو اپنی سعی سے پیدا کیا ہوا سمجھا حالانکہ نہ یہ سعی پر ہے نہ علم و سلیقہ پر بلکہ خدا کی عطا پر ہے اور نقد میں تو کسب کے سبب کچھ دھوکا بھی ہے زمین کی پیداوار کو تو عام طور پر کوئی بھی اپنا پیدا کیا ہوا نہیں سمجھتا۔ اس کے اسباب تو ظاہر ابھی غیر اختیاری ہیں۔

حقوق اللہ

اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو چیز ہماری دی ہوئی ہماری پیدا کی ہوئی ہے اس کو ہمارے نام پر خرچ کرتے ہوئے کیوں جان نکلتی ہے۔

اس کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ مجموعہ کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ کیونکہ زمین اور انار کے پتے تو یکساں ہیں مگر پھل مختلف ہیں اور بعض کا یہ قول ہے کہ یہ ہر واحد کے اعتبار سے فرمایا کہ زمین و زمین میں بھی تشابہ اور اختلاف ہوتا ہے اور انار انار میں بھی اس کے بعد ارشاد ہے کہ جب پھل آجائے تو اس کو کھاؤ کام میں لاؤ اور اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرو پھل کاٹنے کے وقت کیونکہ جب سب کچھ خدا کا پیدا کیا ہوا ہے تو پھر اس کے نام پر خرچ کرتے ہوئے کیوں جان نکلتی ہے۔

ارے بے وقوف! اگر یہ کھیتی اور پھل پیدا ہی نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس وقت تم اپنے گھر میں کیا لے آتے؟ ابھی کا قصہ ہے کہ ایک گاؤں میں آگ لگ گئی تو ساری کھیتی جل کر خاک سیاہ ہوگئی۔ اسی لئے اسی کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ﴿۱﴾ إِنَّكُمْ تَزْرَعُونَهَا أَمْ حَسِبْتُمْ أَنَّهَا تَنْبَتُ بِحَسْبَابِهَا ﴿۲﴾
فَطَلَّكُمْ نَارًا كَالْحَمِيمِ ﴿۳﴾ إِنَّ الْمَغْرُومِينَ ﴿۴﴾ بِلِئَالِ الْمُتْرَمِينَ ﴿۵﴾

(بتلاؤ جو کھیتی کرتے ہو کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں اگر ہم چاہیں تو اس کو (جلا پھونک کر سکھا کر) ریزہ ریزہ کر دیں پھر حیرت زدہ ہو کر کہنے لگو کہ اب کے تو بڑے خسارے میں رہے بلکہ محروم ہی رہ گئے) واقعی آدمی کیا کر سکتا ہے؟ کچھ بھی نہیں خصوصاً زراعت میں کہ اس کا معاملہ تو بالکل توکل پر ہے آدمی روپیہ جمع کر سکتا ہے بیج کا انتظام کر سکتا ہے بالدی کیرے لگا سکتا ہے مگر بیجوں کا کیا انتظام کر سکتا ہے۔ پالے

اور اولے کا کیا بندوبست کر سکتا ہے اسی طرح باغ کا کبھی اندھا ہو جاتا ہے اس کا کیا انتظام کر سکتا ہے غرض کھیت اور باغ کا معاملہ اور مدار بالکل توکل پر ہے اگر تم خدا کے حق میں کوتاہی کرو گے تو ڈرتے رہو کہیں خدا تعالیٰ بھی تمہارے حق میں کمی نہ کر دیں اور جو کچھ صدقہ زکوٰۃ تم دیتے ہو وہ تو مجازاً خدا کا حق کہلاتا ہے ورنہ حقیقت میں وہ تمہارے ہی نفع کے واسطے مقرر کیا گیا ہے تاکہ دنیا میں تمہارے مال میں برکت ہو اور آخرت میں ثواب ملے۔ قرآن کریم میں ایک واقعہ بھی ایسے لوگوں کا مذکور ہے۔ جو خدا کا حق ادا کرنے میں جان چراتے تھے۔

عشر ادا نہ کرنے کا عبرتناک واقعہ

قصہ یہ ہے کہ ایک شخص کھیتی باڑی اور باغ والا تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ جب کھیت کا ثنایا باغ کا پھل توڑتا تو غریبوں کے واسطے ایک حصہ الگ کر دیتا جو اللہ واسطے تقسیم کیا جاتا جب غریبوں کو اس کی یہ عادت معلوم ہو گئی تو وقت پر خود ہی اس کے کھیت اور باغ پر جمع ہو جاتے اور وہ خوشی کے ساتھ ان کا حق نکال کر دے دیتا۔ ایک عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے بیٹوں نے کہا کہ ہمارا باپ بے وقوف تھا جو مسکینوں کو اپنی محنت کی پیداوار میں سے ایک معقول حصہ دے دیا کرتا تھا ہم ایسا نہیں کریں گے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم تو محنت کریں مشقت کریں اور بڑی مصیبت کے بعد محنت کا پھل دیکھیں اور یہ غریب لوگ بیٹھے بٹھائے ہمارے مال میں حق دار بن جائیں۔ مگر اس زمانہ میں کچھ آنکھ میں شرم و لحاظ بہت تھا اس لئے ان لڑکوں کو یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ اگر غرباء حسب عادت جمع ہو گئے منہ توڑ کے جواب دینا بھی ممکن نہیں اس لئے کوئی ایسی صورت اختیار کرنا چاہئے کہ غریبوں کے آنے سے پہلے ہی باغ اور کھیت کے کاٹنے سے فراغت ہو جائے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ صبح کو سورے چلیں گے تاکہ غریبوں کے آنے سے پہلے خفیہ طور پر غلہ کاٹ کر لے آئیں اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا مگر ایک لڑکے نے اختلاف کیا اس نے کہا کہ باپ کے طریقہ کو نہ بدلنا چاہئے کیونکہ غرباء کو خیرات دینے سے اپنا ہی بھلا ہے اور اس سے کچھ کمی نہیں آتی آخر ہمارا باپ بھی تو خیرات ہمیشہ کرتا رہا اور کبھی اس کو پریشانی کا سامنا نہیں ہوا لیکن اس ایک کی رائے نہ چلی کثرت رائے پر یہی فیصلہ ہوا کہ سورے چل کر غریبوں کے آنے سے پہلے باغ اور کھیت کاٹ لینا چاہئے یہ رائے طے کر کے چلے مگر وہاں یہ معاملہ ہوا کہ نیت بدلتے ہی خدا تعالیٰ کا معاملہ بدل گیا اور راتوں رات باغ اور کھیت پر عذاب نازل ہوا کہ ایک آگ آئی اور ساری کھیت اور باغات کو جلا پھونک کر رکھ گئی۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچے اور باغ اور کھیت کو جلا ہوا پایا تو اول تو خیال کیا شاید راستہ بھول کر کسی دوسرے کھیت پر آ گئے ہمارا کھیت یہ نہیں ہے مگر جب صبح کی روشنی پھیل گئی تو معلوم ہوا کہ اپنا ہی کھیت اور اپنا ہی باغ ہے مگر جلا ہوا ہے۔

اب کہنے لگے کہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی پھر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ کہ تیری برائی کا نتیجہ ہے۔ دوسری نے کہا تیرے مشورہ کا ثمرہ ہے۔ اب وہ لڑکا بولا جس نے اس تدبیر سے مخالفت کی تھی اور کہنے لگا کہ آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے سے کیا نفع اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو تو امید ہے کہ خدا اس سے بہتر کھیت اور باغ ہم کو دے دے۔ اب سب نے توبہ کی اور آئندہ کے لئے باپ کے طریقہ پر چلنے کا عہد کیا تو دفعتاً سارا باغ کھیت ہرا بھرا ہو گیا۔

صاحبو! صدقہ خیرات سے مال کم نہیں ہوتا۔ اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کنواں کہ اگر اس میں سے پانی نکلتا رہے بھرائی ہوتی رہے تو پانی کی آمد ہوتی رہتی ہے اور اگر بھرائی نہ ہو تو کچھ دنوں کے بعد سوت بند ہو جاتا اور کنواں سوکھ جاتا ہے۔

اسراف کی حقیقت

اب میں ایک جملہ نبی کی تفسیر عرض کر کے وعظ ختم کرنا چاہتا ہوں تاکہ لطف کامل ہو جائے وہ جملہ یہ ہے

وَلَا تُسْرِفُوا اِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

یہ جملہ **وَاَنْتَوَا حَقًّا يَوْمَ حَصَادِہ** سے متصل ہے ترجمہ یہ ہے کہ (اسراف نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے) ترجمہ تو سب کی سمجھ میں آ گیا ہو گا مگر قابل غور یہ ہے کہ **وَاَنْتَوَا حَقًّا يَوْمَ حَصَادِہ** سے اس کا کیا ربط ہے۔

عام طور پر مفسرین نے فرمایا ہے کہ ربط یہ ہے کہ اوپر حکم ہے فقراء کو دینے کا اس جملہ میں یہ فرمایا گیا ہے فقراء کو اتنا نہ دو کہ اپنا بھی خیال نہ رکھو بلکہ کچھ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے واسطے بھی بچالو اگر ایسا نہ کرو گے بلکہ سب خیرات کر دو گے تو یہ اسراف ہو گا۔ اور اللہ تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں کرتے۔

میں اس تفسیر کی صحت میں کلام نہیں کرتا واقعی یہ مسلح صحیح ہے کہ بعض دفعہ فقراء کو زیادہ دے دینا یا کل پیداوار دے دینا اسراف میں داخل ہوتا ہے۔ جبکہ دینے والے میں قوت توکل کامل نہ ہو اور پریشانی کا اندیشہ ہو مگر یہ حکم کلی نہیں کہ ہر شخص کے لئے کل مال کا خیرات کرنا اسراف میں داخل ہو کیونکہ حدیث سے حضرت صدیق کا واقعہ ثابت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنا کل مال خیرات کر دیا اور حضور ﷺ نے ان کی مدح فرمائی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سارا مال خیرات کر دینا علی الاطلاق اسراف نہیں پس جو ربط مفسرین نے عموماً بیان کیا ہے۔ وہ بعض صورتوں میں ترجیح ہے مگر بعض صورتوں پر منطبق نہیں دوسرے خود نص میں موجود ہے۔ **وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ** جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حد معین سے زیادہ خیرات کرنا مطلقاً مذموم نہیں اس لئے میں ان دو جملوں میں دوسرا ربط بیان کرتا ہوں جو عام تفسیر سے لطف ہے اور ان شاء اللہ قواعد سے صحیح ہے۔

رابط ماسبق

میرے نزدیک ربط یہ ہے کہ جملہ امر میں تو فقراء کے حق ادا کرنے کا امر ہے اور جملہ نہی میں فقراء کا حق کھا جانے کی ممانعت ہے۔ (واقعی حضرت حکیم الامت بیان کرنے کے امام ہیں حضرت کو ایسا ربط القاء ہوتا ہے جو کتابوں میں تلاش کرنے سے بھی نہیں مل سکتا۔ اور خوبی یہ ہے کہ بے تکلف ربط ارشاد فرماتے ہیں جو دل کو لگ جائے و هذا من آیات ذوقه فی القرآن فله در، حاصل یہ ہوا کہ پیداوار میں سے فقراء کا حق ادا کرو اور سارا کا سارا خود ہی نہ کھا جاؤ کہ مسکینوں کا حق بھی کھا لو کہ یہ اسراف ہے اور حق تعالیٰ سرفین کو پسند نہیں فرماتے اور یہ اسراف اس لئے ہے کہ اس میں حد شرعی سے تجاوز ہے اور اسراف کی حقیقت یہی ہے تجاوز عن الحد پس مطلب یہ ہوا کہ مساکین کا حق ادا کرو اور اتنا نہ کھاؤ کہ مسکینوں کا حق بھی نہ بچے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جملہ نہی میں زیادہ خیرات کرنے کی ممانعت نہیں بلکہ زیادہ کھا جانے کی ممانعت ہے۔ اور اسراف جیسے انفاق میں ہوتا ہے اکل میں بھی ہوتا ہے چنانچہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا۔ اور ایک آیت میں دوسرے کا مال کھا جانے کو خصوصیت کے ساتھ اسراف فرمایا ہے وَلَا تَأْكُلْهُمَا إِنَّمَا آتَاكُمَا ذَلِكُمَا وَبَاطِنُ الْأَنْفِ وَأَنْ يَكْفُرُوا بِهِ اور خود ہی سارا مال کھا جانا اسراف نہیں کہلاتا بلکہ اس کو بخل کہتے ہیں مگر لغتہ و شرعاً یہ بھی اسراف ہی کا فرد ہے اور عرفی بخل کو اسراف سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ نفس انسانی کو مال سے محبت زیادہ ہے اس لئے اس کو اسراف کی مذمت زیادہ معلوم ہے بخل کی مذمت اس کی نظر میں زیادہ نہیں اس لئے حق تعالیٰ نے بخل کو بھی اسی عنوان سے بیان فرمایا جس سے نفس انسانی کو کراہت زیادہ ہے۔ اس لئے میرے خیال میں یہ تفسیر اللطف ہے امید ہے کہ اہل علم اس سے محفوظ ہوں گے (سبحان اللہ یہ ربط تو سنانہ کتابوں میں دیکھا عجیب بے تکلف ربط ہے جس سے آیت کی تفسیر بالکل آئینہ ہوئی)

ادراک کی قسمیں

فرمایا آیت لَا تَلْمِزْهُم بِالْأَبْصَارِ وَهُوَ يَلْمِزُكَ بِالْأَبْصَارِ سے جو معتزلہ نے استدلال کیا ہے اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں ایک یہ کہ ادراک بالکلیت نہیں ہوتا ایک یہ کہ ادراک دو قسم ہے ایک یہ کہ رائی مرئی تک چلاوے۔ دوسرے یہ کہ مرئی رائی کے قریب آ جاوے آیت میں پہلی قسم کی نفی ہے اور دوسری کے ثبوت کا ہے۔ اور آیت کا آخری حصہ اس کے نہایت مناسب ہے کیونکہ آخری حصہ ہے وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ فرمایا ہے پس لطیف لا تَلْمِزْهُم بِالْأَبْصَارِ کے مناسب ہے اور خبر یدرک الابصار کے مطابق ہے۔ (الکلام الحسن جلد ۱ صفحہ ۸۵)

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ

عَدُوًّا وَإِغْيِرْ عَلَيْهِمْ كَذَلِكَ زَيْنًا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَلَيْهِمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ

مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۵﴾

ترجمہ: اور تم برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا پس وہ برا کہنے لگیں اللہ کو بے ادبی سے بدوں سمجھے اسی طرح ہم نے مزین کر دیا ہر ایک فرقہ کی نظر میں ان کے اعمال کو پھر ان سب کو اپنے رب کے پاس پہنچانا ہے تب وہ جتنا دے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے۔

تفسیری نکات

سبب معصیت ممنوع ہے

دیکھئے بتوں کی برائی کرنا مباح بلکہ طاعت ہے تاکہ لوگوں کو ان سے نفرت ہو مگر جب احتمال اس کا ہو کہ یہ سبب ہو جائے گا اللہ تعالیٰ کو برا کہنے کا اس حالت میں منہی عنہ ہے یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ جو مباح بلکہ مندوب بھی سبب ہو جاوے گا معصیت کا وہ بھی معصیت ہے اس سے زیادہ کون سی دلیل ہوگی کہ سبب اصنام عین طاعت تھا اور وہ ممنوع ہو گیا۔ اور حدیث لہجے حدیث میں ہے کہ جناب رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ سب سے برا وہ شخص ہے جو اپنے ماں باپ کو گالی دے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ماں باپ کو کون گالی دیا کرتا ہے۔ فرمایا کہ یہ کسی کے ماں باپ کو گالی دے اور وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے معلوم ہوا کہ جو فعل سبب معصیت کا ہو وہ بھی اسی کے حکم میں ہے یہاں کوئی طالب علم شبہ نہ کرے کہ اس حدیث سے اس مسئلہ پر تو استدلال جب ہو سکتا جبکہ وہ فعل مباح ہو اور حدیث میں تو کسی کے ماں باپ کو گالیاں دینا ہے جو خود بھی معصیت ہے بات یہ ہے کہ میرا مطلب قاعدہ کو ثابت کرنا ہے اور قاعدہ کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ معصیت کا سبب من حیث البیت معصیت ہے خواہ پہلے سے مباح ہو یا معصیت اس سے بحث نہیں علاوہ اس حدیث و آیت کے اگر میں غور کروں تو بہت احادیث و آیات اس مدعا پر ملیں گی غرض قرآن سے حدیث سے فقہ سے یہ مسئلہ ثابت ہے۔

وَذُرُّوا ظَاهِرَ الْأَثْمِ وَبَاطِنَهُ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْأَثْمَ
سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ۝

ترجمہ: تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ بلاشبہ جو لوگ گناہ کرتے ہیں ان کو ان کے کئے کی سزا عنقریب ملے گی۔

تفسیری نکات

گناہ کی دو قسمیں

پس اس میں یہ بات بھی بتلا دی کہ بڑی بات یہ ہے کہ گناہ کو چھوڑا جائے اور سب کو چھوڑا جائے اور یہ بھی بتلا دیا کہ گناہ دو قسم کے ہیں ظاہری اور باطنی یعنی جو ارح کے متعلق بھی اور قلب کے متعلق بھی گناہ کی فہرست تو بہت بڑی ہے مگر میں مثال کے طور پر مختصراً کہتا ہوں کہ مثلاً آنکھ کا گناہ ہے کسی نامحرم کو دیکھنا امر کو دیکھنا یا اجنبی کا ایسا بدن دیکھنا کہ اس کا دیکھنا شرعاً ناجائز ہے جیسے عورت کے سر کے بال اور یہ مسئلہ عورتوں کو بھی بتلانا چاہئے کیونکہ وہ اس میں بہت مبتلا ہیں ایک گناہ آنکھ کا یہ ہے کہ کسی کی چیز دیکھ کر حرص کرے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (ہرگز مت اٹھاؤ اپنی آنکھوں کو اس چیز کی طرف جو ہم نے کفار کو ان کی آزمائش کے لئے نفع کے واسطے دی ہیں یعنی دنیا کی رونق وغیرہ) اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ مال حاصل نہ کرو بلکہ مطلب یہی ہے کہ مال کو قبلہ و کعبہ نہ بناؤ کہ اس کی بدولت دین ہی ہاتھ سے جاتا رہے اسی طرح زبان کا گناہ چغلی خوری ہے غیبت ہے جھوٹ بولنا ہے آج کل کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں الا ماشاء اللہ اس کا علاج یہ ہے کہ جو کچھ بولو سوچ کر بولو کہ میں کیا کہوں گا اور وہ بات خلاف مرضی حق تو نہ ہوگی پھر ان شاء اللہ تعالیٰ زبان کا کوئی گناہ نہ ہوگا۔ کان کا گناہ یہ ہے کہ چھپ چھپ کر کسی کی بات سنے گا ناسنے ہاتھ کا گناہ یہ ہے کہ کسی نامحرم کو چھوئے کوئی ناجائز مضمون لکھے پھر کا گناہ یہ ہے کہ کسی ناجائز موقع پر چلا جائے اور ایک پیٹ کا گناہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روزی حلال مل ہی نہیں سکتی جب حلال نہیں مل سکتی تو حرام حلال سب برابر پھر کہاں تک بچیں! صاحبو! یہ گمان بالکل غلط ہے جس کو فقہ حلال کہہ دے وہ بلاشبہ حلال ہے وَذُرُّوا ظَاهِرَ الْأَثْمِ وَبَاطِنَهُ۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں ظاہری گناہ اور باطنی گناہ ظاہر گناہ کی تفسیر یہ ہے کہ جو محسوس ہو دوسروں کو اور باطنی گناہ وہ ہے جو دوسروں کو محسوس نہ ہو پس معلوم ہوا کہ یہ جو ظاہر گناہ ہیں صرف یہی گناہ نہیں ہیں بلکہ اور بھی گناہ ہیں جو محسوس نہیں اور یہ جو محسوس گناہ ہیں ظاہر کے یہ محسوس کیوں ہیں محسوس اس لئے ہیں کہ ان کا محل محسوس ہے یعنی ہاتھ پاؤں آنکھ زبان وغیرہ ان جوارج سے جو گناہ ہوتے ہیں چونکہ یہ جوارج محسوس ہیں اس واسطے ان کے افعال بھی محسوس ہوتے ہیں۔ اور باطنی گناہ ایسے محل کے ہیں جو خود محسوس نہیں اس لئے وہ بھی غیر محسوس ہیں۔ وہ محل کون ہے وہ محل ہے قلب اور نفس تو معلوم ہوا کہ بعضے گناہ قلب اور نفس کے بھی ہیں۔

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَكْرِهْ صِدْقَةً لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ

أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صِدْقَةً ضَيْقًا حَرْجًا كَاتِبًا يَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ

كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۲۷﴾

وَهَذَا صِرَاطٌ رَيْبٌ مُسْتَقِيمًا قَدْ فَضَّلْنَا الْآيَةَ لِقَوْمٍ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں اور جس کو بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو تنگ بہت تنگ کر دیتے ہیں جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر پھنکار ڈالتا ہے اور یہی تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کر دیا۔

تفسیری نکات

صراط مستقیم فقط اسلام ہے

پہلی آیت میں تو اسلام کا لفظ ہی موجود ہے اور دوسری آیت میں اسلام کا لقب صراط مستقیم ہے اور تیسری آیت میں ثمرہ مذکور ہے۔ پہلی آیت **فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَكْرِهْ صِدْقَةً لِلْإِسْلَامِ** میں صریح لفظ اسلام موجود ہے اور دوسری آیت **وَهَذَا صِرَاطٌ رَيْبٌ مُسْتَقِيمًا** میں صراحتاً اشارہ ہے اس کے لئے اشاریہ چاہئے وہ اشاریہ یہاں سوائے اسلام کے کچھ نہیں جس سے معلوم ہوا کہ جو اسلام ہے وہی صراط مستقیم ہے۔

حاصل آیت

تیسری آیت لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَيْلُهُمْ مِمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ میں تفریح کے طور پر یہ نتیجہ بیان کیا گیا اس میں ضمیریں جمع کی ہیں جو راجع ہیں من کی طرف من کو لفظ مفرد ہے مگر معنی جمع ہیں لہذا جمع کی ضمیر اس کی طرف پھیرنا جائز ہے جیسا کہ نحو جاننے والے سمجھتے ہوں گے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جس کو ہدایت کرنا حق تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے اس کو اسلام کے متعلق شرح صدر دیتے ہیں اور دوسرے جملہ میں اس کا مقابل مذکور ہے کہ جس کو گمراہ کرنا مقصود ہوتا ہے اس کے دل کو تنگ کر دیتے ہیں۔

دارالسلام کی عجیب و غریب تفسیر

تو اب دارالسلام کو لیجئے کہ وہ گھر بنایا ہے آفات سے محفوظ ہونے کے لئے دارالسلام کے معنی یہ ہوں گے کہ سلامت و حفظ عن الافات کی صفت میں وہ کامل ہے اور پھر اس کے ساتھ یہ دیکھا جائے کہ وہ گھر بنایا کس نے ہے حق تعالیٰ نے جس کو تکمیل سے کوئی مانع نہیں کیونکہ مانع دو ہوتے ہیں علم نہ ہونا یا قدرت نہ ہونا اور وہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں حق تعالیٰ کا علم بھی کامل اور قدرت بھی کامل پھر یہ کیسے خیال کیا جاتا ہے کہ جس گھر کو حق تعالیٰ نے سلامتی اور حفاظت عن الافات کے لئے بنایا ہے اس میں کوئی بھی وہ چیز چھوٹ گئی ہوگی جس کو اس موضوع میں دخل ہو تو ثابت ہو اور وہاں ہر قسم کی تکالیف سے حفاظت رہے گی کہ جو تکالیف اس وقت ہمارے خیال میں بھی ہو اور کبھی آئندہ ہو سکتی ہوں جس کا علم حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نہیں وہ بھی نہیں ہیں۔

اصل مقصود یہ تھا کہ دنیا میں جب ادنیٰ ثمرہ پر اکتفا نہیں کرتے تو وہاں کے ثمرات کے درجہ کامل کو کیوں نہیں طلب کرتے اور یہاں تو معطی کا کرم محدود ہوتا ہے اس لئے بعض اوقات زیادہ طلبی ناگوار ہونے لگتی ہے اور وہاں تو معطی وہ ذات ہے جس کا کرم غیر محدود ہے کما بھی کہ جتنا زیادہ لو خوش ہوتے ہیں وہ کیفایاً بھی چنانچہ ایک کرم یہ بھی ہے کہ جہاں ثمرات کا وعدہ کیا ہے وہاں یہ بھی کہتے جاتے ہیں۔

اعمال کا صلہ

جَزَاءُ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ اور اِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً تَاكُ بِنْدِهِ شَرْمَنْدِه نِه هُو چنانچہ خود اس آیات میں بھی جس کا بیان ہو رہا ہے هُو وَيْلُهُمْ مِمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ اور جا بجا اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آخرت میں جو کچھ درجات اور نعمتیں ملیں گی وہ سب مومنین کے اعمال کا صلہ ہے یہ غایت کرم ہے کہ خود نعمتیں دیتے ہیں لیکن احسان جتلا نا نہیں چاہتے ایسے موقع پر بھی کوئی چوک جائے تو بڑا ہی کم

قسمت ہے سچ تو یہ ہے کہ ایسی جگہ تو لوٹ مچانی چاہئے قناعت چہ معنی الایہ دار العمل ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ثمرات کی سندیں ایک جگہ تیار کر کے رکھ دی ہیں اور اذن عام دے دیا ہے کہ جتنے چاہو لو اور ثمرات بے تعداد لوٹ لو پھر حیرت ہے کہ آدمی کیوں نہ لے اور کیوں بڑھ کر ہاتھ نہ مارے اور کیوں کامل درجہ کی کوشش نہ کرے ادنیٰ درجہ پر بس کر کے کیوں بیٹھ رہے یا اتنی ہمت کیوں ہارے کہ کچھ عذاب ہی بھگت کر جنت مل رہے گی۔ کامل درجہ کیوں نہ حاصل کرے۔ کہ جنت ابتداء اور بلا عذاب ملے یہ بیان ہوا لَهُمْ ذَاوُ السَّلَامِ کا خلاصہ یہ ہوا کہ اس کے معنی ہیں کامل سلامتی کا گھر لفظ دار السلام ہی اس کمال پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ اول تو سلام مطلق ہے اور مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے پھر دار کے لفظ کو اس کی طرف مضاف کیا گیا ہے جو محاورہ کے اعتبار سے اسی معنی کو مفید ہے اور مراد اس سے جنت ہے جس کو حق تعالیٰ نے کامل امن کا گھر بنایا ہے وہاں خوف و خطر کا نام بھی نہیں آگے عنبر بہم کو سمجھئے اس کے معنی ہیں ان کے رب کے پاس مراد اس سے فی الآخرة تو معنی یہ ہوئے کہ ان کو دار السلام ملے گا آخرت میں اس کو میں بیان کروں گا کہ عنبر بہم سے مراد دار آخرت قرآن کے محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے۔ میں نے جس بناء پر اس کا ترجمہ وار آخرت کیا ہے وہ آگے بیان کروں گا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عنبر بہم کا اطلاق متعدد معانی پر آتا ہے۔

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ

بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَضَعْنَا لَكُمْ لَعْنَةً تَتَّقُونَ ۝

ترجمہ: اور حکم کیا کہ یہ راہ ہے میری سیدھی سواس پر چلو اور مت چلو اور راستوں پر کہ وہ تم کو جدا کر دیں گے اللہ کے راستے سے اور یہ حکم کر دیا ہے تم کو تا کہ تم بچتے رہو۔

تفسیری نکات

ترجمہ سے معلوم ہوا کہ راستے بہت ہیں جن میں ایک خدا کا بتلایا ہوا راستہ ہے اور دوسرے خود بندوں کے تراشے ہوئے ہیں پس ان سب راستوں میں ایک تو اتباع کے قابل ہو گا باقی سب ترک کے قابل لیکن یہ ضرور ہے کہ طریق الہی کو دوسرے طرق سے ممتاز اور جدا کرنے کے لئے کوئی معیار ہو جس سے ہم کو معلوم ہو سکے کہ فلاں راستہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا اور قابل اتباع ہے اس کے سوا دوسرے قابل ترک جس طرح معاملات حکام و رعایا میں معیار تعیین و تصحیح کا قانون ہے اسی طرح طریق نجات کے لئے بھی معیار صحیح قانون الہی ہے جس کو وحی کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتے ہی اِنَّ مَّا اَوْحٰی اِلَيْنَا مِنْ

الرَّكِبِ وَأَقْبِرَ الضَّلُوءَةَ کہ جو آپ پر وحی ہوا ہے اس کو پڑھئے تو خلاصہ دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نکلا کہ جو وحی سے ثابت ہو وہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اور **هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا** میں صراط کو جو اپنی طرف منسوب و مضاف فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ تک پہنچانے والا اور میرا بتلایا ہوا راستہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو راستہ خدا تک پہنچانے والا ہو گا وہ مستقیم ہی ہوگا مستقیماً فرمایا اور مستقیم کے یہ معانی نہیں کہ کوئی خط مستقیم ہے نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم راستہ بھی ہے جس سے احتراز کرنے کو اس کی صفت مستقیم لائے ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کا ایک ہی راستہ بتلایا ہوا ہے جو کہ مستقیم ہی ہے تو آج کل چونکہ لوگوں نے اس طریق کو معیار نہیں بنایا اس لئے بہت سے فرقے ہو گئے اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ فرقوں سے مراد مسلمانوں کے فرقے ہیں۔

ترجمہ اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو

وَإِنَّ هَذَا صِرَاطِي کہ واقعی یہ میرا راستہ ہے خدا کا اشارہ اوپر کے احکام کی طرف ہے۔ جو اسماء احکام ہیں جو تمام دین کا خلاصہ ہیں مگر وہ تو اجمال بصورت تفصیل تھی اور یہ یعنی آیت **إِنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا** اجمال بعد تفصیل ہے۔

رفع اشکال

قبل ازیں کہ میں اس آیت کے عنوان میں طرز شفقت کو واضح کروں ایک اشکال کو رفع کر دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید کسی ذہین کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر بھی قادر ہے کہ ہم کو بدوں ابتلاء بالا احکام کے جنت عطا فرمادیں اور شفقت کا مقتضی بھی بظاہر یہی تھا کہ ابتلاء سے محفوظ رکھ کر ہم کو نجات عطا فرماتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدوں ابتلاء و امتحان کے سب کچھ عطا فرما دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلاء و تکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطا فرمادیتے ہیں۔ اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بعد کا نام ہے۔

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کتھاں گفت فراق یار نہ آں می کند کہ بنوان گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر کنایتی ست کہ از روزگار بھراں گفت

محبت کا اثر

وَإِنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا جس میں اس راستہ کو اپنی طرف اس لئے

منسوب فرمایا کہ سننے والوں کو حظ آئے کہ یہ محبوب کا راستہ ہے اس عنوان سے سب کو اس کی طرف حرکت ہوگی خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا میرا بتلایا ہوا ہے یا یہ مطلب ہو کہ اس پر چل کر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہنچ سکتے ہو خواہ کچھ ہی مطلب ہو مگر ہر حال میں محبت کا یہی اثر ہے کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کام کرنے سے محبوب مجھ سے راضی ہو جائے گا تو اس کو اس کام میں سب مشقتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اگر محبوب کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو مگر اس کا عمل ہو جاوے کہ وہ میرے مشقتوں کو دیکھ رہا ہے تب بھی یہی اثر ہوتا ہے چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا۔ اور ذرا اف نہ کرنا نانوے کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ نانوے کوڑوں پر آہ نہ کی اخیر میں ایک کوڑے پر آہ کی کہا نانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا میری حالت کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبت میں مجھ پر یہ مصیبت آئی تو اس وقت تک مجھے مصیبت کا احساس ہی نہیں ہوا بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا۔

کرم عشق تو امی کشد دغو غایت . تو نیز بر سر بام آ کہ خوشنما شایسع

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا تو اس وقت مجھے کلفت کا احساس ہوا جب اطلاع محبوب کے علم میں یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم میں تو کیا کچھ اثر ہوگا۔ اسی بناء پر جب یہاں بندوں کو یہ بتلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے یعنی میری رضا کا راستہ ہے یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے یہ سن کر اس کی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں ان کو کوئی مشقت محسوس نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں ہے اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھولوں کا سا ہلکا کر دیا یہی وہ بات ہے جس کو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے اول تو دین کوئی نفسہ آسان کیا پھر نفس کی کشاکشی سے جو اس میں عارضی گرانی اور مشقت آ جاتی ہے نہ اس کو اس طرح دور کیا کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے جس سے ساری مشقت دور ہوگئی کہ اس کو اپنا راستہ فرمایا اپنی طرف اس کی نسبت فرمائی اس کا لطف عشاق سے پوچھو کہ محبوب کے نام لگے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔

بعض سنیا سیوں پر ذکر و شغل کا اثر

اِنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ کون کر ایک دفعہ تو کافر کو بھی اس کی طرف حرکت ہوگی اور وہ اس راستہ پر چلنا چاہئے گا کیونکہ خدا سے محبت کافر کو بھی ہے چنانچہ میں دیکھتا ہوں اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ بعض سنیا سی ذکر و شغل کرتے ہیں اور لڈائڈ کو ترک کر دیتے ہیں اس کا فشاء وہی محبت ہے گو وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں اور یہاں سے ایک بات اور بتلاتا ہوں وہ یہ کہ کفار کو ذکر الہی سے گو آخرت میں کچھ نفع نہ ہو اور یہ ذکر وہاں

ان کے لئے نجات کا سبب نہ ہو مگر دنیا میں ان کو بھی کچھ مل جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
 إِنَّ اللَّهَ لَا يُضَيِّعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ کہ وہ کسی اچھے کام کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں فرماتے بلکہ
 اگر ذکر طالب آخرت ہے تو اس کو آخرت میں بھی اجر عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں بھی طالب دنیا ہے تو اس کو
 دنیا میں کیفیات نفسانیہ ذوق و شوق وغیرہ عطا ہو جاتا ہے یہ اس کا اجر ہے۔

ترجمہ: یہ دین میرا سیدھا راستہ ہے سو اس پر چلو جو کہ مستقیم ہے دوسری راہوں پر مت چلو وہ تم کو اللہ کی
 راہوں سے جدا کر دیں گی۔

ضرورت تدبیر

یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے اس سے اوپر خدا تعالیٰ نے بعض احکام اعتقاد یہ اور بعض احکام عملیہ بیان فرمائے
 ہیں ان کے بعد یہ جملہ ارشاد ہوا ہے ترجمہ اس کا یہ ہے۔

خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے اس کا اتباع کرو دوسرے طریقوں کا اتباع نہ کرو
 کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے دور کر دیں گے۔

کِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ بِاللُّغَةِ مُبِينَةٍ لِيَذَكِّرَ الَّذِينَ لَا يَذَكَّرُونَ وَاللَّذِينَ كَفَرُوا الْأَكْبَابُ ترجمہ: یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم
 نے آپ کے اوپر نازل کیا تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

دوسری جگہ شکایت فرماتے ہیں۔ لَقَدْ يَذَكِّرُونَ الْقُرْآنَ لَعَلَّ عَلَى قُلُوبٍ لَقَفَّا لَهَا تُو كَمَا يَهِيَ لُوكَ قَرَّآنَ مِيسُ غُورِ
 نہیں کرتے یا دلوں میں قفل لگ گیا ہے۔ یہ لوگ قرآن میں غور ہی نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ گئے ہیں کہ
 تدبیر کی قدرت ہی نہیں رہی کیونکہ تدبیر کرتے تو یہ حالت ہرگز نہ رہتی تدبیر کا خاصہ ہے کہ اس سے رحمت کے
 دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور بغیر اس کے کچھ نہیں ہوتا چنانچہ فرماتے ہیں۔

أَنْزَلْنَا مَائِدَتَهُمْ وَأَنْتُمْ لَهَا كُفْرُونَ ۝ یعنی کیا ہم ان کو زبردستی اپنی رحمت چمادیں گے اگرچہ وہ کراہت
 کرتے ہیں۔

سو اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔ کیا ہمارے یہاں اس کے رکھنے کی جگہ نہیں اگر ہزار بار چاہیں تو ہم بھی
 متوجہ ہوں گے اور تمہاری توجہ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اور کام بھی ہماری ہی توجہ سے چلتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بچہ کو آپ لینا چاہئیں اور لینے کو ہاتھ بڑھائیں تو اگر بچہ اپنی بساط کے
 بموجب دوزے اور کوشش کرے اگرچہ گری جائے تو آپ خود دوزے کراٹھا لیتے ہیں اور یہ مسافت آپ ہی کے
 بڑھ کراٹھا لینے سے طے ہوتی ہے ورنہ اس بچے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ خود مسافت کو طے کر سکے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی طرف بلا تے ہیں اگر یہ بھی کچھ ہاتھ پیر ہلائے اور کوشش کرے تو
 اس جانب سے جذب ہوتا ہے اور اس جذب کی بدولت یہ وہاں پہنچتا ہے اور یہ فرلانگ دو فرلانگ کی مسافت تو

ممکن ہے کہ بچہ قطع کرے برخلاف اس بعد کے جو ممکن اور واجب میں ہے کہ اگر ادھر سے جذب نہ ہو تو کبھی یہ مسافت طے ہی نہیں ہو سکتی لیکن ادھر سے جذب ہونا آپ کی طلب پر موقوف ہے جس کو افسوس ہے کہ آپ نے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہر وقت ہدایت دینے کو تیار ہیں مگر افسوس کہ ہم ہی قاصر ہیں اور وہ طلب بھی ہے کہ ہم تذبذب کریں اور سوچ لیا کریں اس سے خدا تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوتا ہے۔

ایک مشترک مرض

غرض خدا تعالیٰ اس مقام پر فرماتے ہیں **لَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمًا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تَكْفُرُوا السَّبِيلَ فَتَنْزَلَنَّا بِكُمْ عَنِ السَّبِيلِ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمًا** میں عامل اشیر ہے جو کہ خدا سے مفہوم ہے ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ میرے اس سیدھے راستے کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ جن میں ایک خدا کا بتلایا ہوا راستہ ہے اور دوسرے خود بندوں کے تراشے ہوئے ہیں پس ان سب راستوں میں ایک تو یہ اتباع کے قابل ہوگا باقی سب ترک کے قابل لیکن یہ ضرور ہے کہ طریق الہی کو دوسرے طریق سے ممتاز اور جدا کرنے کے لئے کوئی معیار ہو جس سے ہم کو یہ بات معلوم ہو سکے کہ فلاں راستہ خدا کا بتلایا ہوا اور قابل اتباع ہے اور اس کے سوا دوسرے قابل ترک اگر غور کیا جائے تو اسی آیت کے پورے مضمون سے اس معیار کا پتہ چل جائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ اس معیار کو چھوڑ دینے ہی سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی کہ بعض لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ ہم نے طریق الہی کو چھوڑ دیا یا لئے ہوئے ہیں چنانچہ اس جزو آیت سے اوپر کا جزو اس کے ساتھ ملا جائے تو اس سے معلوم ہو جائے گا فرماتے ہیں **فَلَنْ تَعَالَوْا آتِلْ مَا لَكُمْ مِنْكُمْ عَلَيْهِمْ إِلَّا تَشْرِكُوا بِهِ شِيئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِسْقَاتًا** نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے کہ آپ فرمادیجئے کہ آؤ میں تم کو احکام خداوندی بتلاؤں اور وہ فلاں اور فلاں ہیں اس ارتباط باہمی سے اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ معیار طریق خداوندی کے دوسرے طریق سے ممتاز ہو جانے کا یہ ہے کہ جس بات کو نبی کریم ﷺ فرمائیں اور پڑھ کر سنائیں اور طریق خداوندی ہوگا اور حضور جو کچھ فرمائیں وہ وحی ہوتا ہے تو خلاصہ یہ نکلا کہ وحی سے جو ثابت ہو وہ طریق الہی ہے تو وحی معیار ہوئی مختلف طریق کے ممتاز کرنے کی اور اسی پر دارومدار ہوا۔

اب میں اس مضمون کا انطباق آیت ملتوہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں **وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ** (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو) یہ معنی معطوف ہے **فَلَنْ تَعَالَوْا آتِلْ مَا لَكُمْ مِنْكُمْ عَلَيْهِمْ** (آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سنائوں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے) جو قل کے

تحت میں ہے تقدیر یہ ہوئی قُلْ تَعَالَوْا لِنُحْ وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ اِلٰح (آپ کہہ دیجئے یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) اور اس کا مقتضایہ تھا کہ اس جگہ ان مسمورہ ہونا کیونکہ قول کے تحت میں ان مسمورہ ہی آیا کرتا ہے اور ایک قراءت میں مسمورہ ہے بھی مگر ہماری قراءت میں ان مفتوحہ ہے جن کی وجہ صحت یہ ہے کہ اس قراءت میں یہاں اخیر (خبر دے دیجئے) مقدر ہے جس کے ملانے کے بعد لفظ یہ قیل کے اوپر معطوف ہے اس لئے منصوب ہو گیا گو معنا تعالیٰ پر عطف ہے ترجمائے کابریہ ہے کہ (لوگوں کو) بتلا دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کا اتباع کرو ہلما سے مذکور سابق کی طرف اشارہ ہے اوپر تقریباً اس احکام اور انواعی کا مجموعہ مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا كُفِّرُكُمْ عَنْكُمْ اَلَا تَشْعُرُوْنَ اِيَّاهُ شَيْكَاؤُ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ فَمِنْ اِمْلَاقٍ ثَمَنٌ نُّزِّلَ لَكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَّلَا تَقْرُبُوْا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنٌ وَّلَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذَلِكُمْ وَضَعَتْ لَكُمْ لَعْنَتُهُمْ تَعْقُلُوْنَ هُوَ لَا تَقْرُبُوْا مَالَ الْيَتَامَى اِلَّا بِالْحَقِّ مِنْ اِحْسَانٍ سَالِي سَبِيْلَةٍ اَشْكُكَا وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْيَمْيَانَ بِالْقِسْطِ اَلَا تَكْفِيْكُمْ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ قَاعِدَلُوْا وَاَوْفُوا ذَا قُرْبٰنِي وَاَوْفُوا ذَلِكُمْ وَضَعَتْ لَكُمْ لَعْنَتُهُمْ تَذَكَّرُوْنَ هُوَ لَنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمًا

ترجمہ: آپ (ان سے) کہئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (پس شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور دوسرے یہ کہ ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان سے بری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو (زمانہ جاہلیت میں اس کی عادت تھی کہ اولاد کو زندہ درگور کر دیتے تھے) کیونکہ ہم تم کو اور ان کو دونوں کو رزق (مقدر) دیں گے (وہ تمہارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں پھر کیوں قتل کرتے ہوئے پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہو یا پوشیدہ اور (پانچویں یہ کہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق (شرعی) پر قتل جائز ہے مثلاً قصاص یا رجم میں پس قتل ناحق حرام ہوا اس سبب کا تم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تا کہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہے) جو شرعاً مستحسن ہے (مثلاً اس کے کام میں لگانا اس کی حفاظت کرنا اور بعض اولیاء و اوصیاء کو اس میں یتیم کے لئے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے جس کا حکم فقہ میں مذکور ہے) یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جاوے (اس کے بعد اس کا مال اس کو دیدیا جائے گا بشرطیکہ سفید یعنی بے وقوف نہ ہو پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا) اور ساتویں یہ کہ ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو

انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے اور نہ آدے پس آپس میں دعا کرنا حرام ہو اور آگے بتلاتے ہیں کہ یہ احکام کچھ دشوار نہیں جن پر عمل دشوار ہو کیونکہ ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کی کیا وجہ) اور آٹھویں یہ کہ جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق) کوئی بات کیا کرو تو (اس میں) انصاف (کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہو) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو جیسے قسم یا نذر اس کو پورا کیا کرو (بشرطیکہ وہ نذر و قسم خلاف شرع نہ ہو پس اس کا عدم ایفاء حرام ہو) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس کا اتباع کرو پس اس کا عدم ایفاء حرام ہو) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس کا اتباع کرو پس گو خدا کا مرجع یہ امور مذکورہ ہیں لیکن یہ اشارہ علی سبیل التخصیص نہیں بلکہ علی سبیل التعمیم ہے یعنی وہ دین جس کے یہ احکام بطور نمونہ کے ہیں سب کا سب واجب الاتباع ہے اور اشارہ میں تعمیم کی وجہ ظاہر ہے کہ وجوب اتباع کچھ انہی احکام میں منحصر نہیں اور نہ حضور ﷺ کا راستہ انہی کے ساتھ مخصوص ہے پس خدا کے بعد صراطی فرمانا خود تعمیم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس صراط کا دیگر احکام پر مشتمل ہونا سب کو معلوم ہے خود قرآن میں ان کے علاوہ اور بہت سے احکام مذکور ہیں اور احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ لوگوں سے بھی کہہ دیجئے کہ کچھ انہی احکام کی تخصیص نہیں بلکہ دین اسلام اور اس کے سب احکام جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے ہیں میرا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو پس ہذا سے حقیقت میں دین اسلام کی طرف اشارہ ہے جو احکام مذکورہ کے ضمن میں اجمالاً مفہوم ہو چکا ہے اور ان احکام سے مذکورہ کے ذکر کے بعد خدا سے مجموعہ دین کی طرف اشارہ کی وجہ صحت یہ بھی ہے کہ یہ احکام مذکورہ گویا ظاہر میں چند احکام ہیں مگر حقیقت میں یہ سارے اسلام کا خلاصہ ہے کیونکہ ان میں عقائد و معاملات و معاشرت و عبادات کے مہتم بالشان امور سب مذکور ہیں اور اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام سب حکوم ہیں جو کسی شریعت میں کبھی منسوخ نہیں ہوئے اس طرح یہ گویا تمام شریعت کا خلاصہ ہے پھر اِنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا (یہ دین میرا راستہ ہے) میں صراحتہ تعمیم کر دی گئی جس سے بقیہ احکام غیر محکمہ بھی اجمالاً سب مذکور ہو گئے اور صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حق تعالیٰ نہیں ہیں بلکہ حضور ﷺ ہیں کیونکہ یہاں حضور ﷺ کو حکم ہو رہا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ یہ آیت معنی تعالو پر معطوف ہے جو قل کے تحت میں ہے اور لفظاً یہاں اخیر محذوف ہے پس خطاب قل و خبر (آپ کہہ دیں اور خبر دیدیں) کے بعد ضمیر متکلم کا مرجع قائل ہی ہو سکتا ہے اور قائل حضور ﷺ ہیں تو اس ضمیر کا مرجع بھی آپ ہی ہیں چنانچہ اس کی نظیر دوسری جگہ بھی مذکور ہے کہ وہاں بھی دین اسلام کو حضور ﷺ کا راستہ کہا گیا ہے۔

صراط الرسول ﷺ واصل صراط اللہ ہے

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (آپ فرمادیجئے یہ میرا طریق ہے میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھ والے بھی) اور اسلام کو حضور ﷺ کا راستہ کہنا بطور دعوت کے ہے کہ آپ اس طریق کے داعی ہیں ورنہ حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے چنانچہ بعض جگہ حقیقت کے موافق ارشاد ہے۔ إِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ صِرَاطِ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے راستے کی ہدایت کر رہے ہیں یعنی اس خدا کے راستے کی کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) اس پر یہ سوال وارد ہوگا کہ جب حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے تو پھر ہر جگہ حقیقت کے موافق کلام کیوں نہ فرمایا بعض جگہ مجازاً اس کو صراط رسول ﷺ اور بعض جگہ حقیقت کے موافق صراط اللہ کیوں فرمایا تو جواب اس کا یہ ہے کہ بعض جگہ حضور ﷺ کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا تاکہ سامعین کو اس پر عمل کرنے کی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستے کو طے کر سکتے ہیں اگر پہلے ہی یہ فرمادیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبرا جاتے۔

تفسیری نکتہ

ایک بات یہاں اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلے تو صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حضور ﷺ تھے جس میں اس راستے کی طرف اضافت حضور ﷺ کی طرف تھی اور یہاں عن سبیلہ ضمیر غائب فرمایا گیا ہے اس کا مرجع حق تعالیٰ ہیں حضور ﷺ نہیں ہیں ورنہ سبیلی بیاہ متکلم فرماتے سو اس کی توجیہ کی اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ یہ اضافت تو حقیقت کے موافق ہے۔ توجیہ کی ضرورت تو صراطی میں تھی جس کا نکتہ میں بیان کر چکا ہوں اس کے بعد ارشاد ہے

وَصَّكُم مَّا مَفْهُومٌ

ذَلِكُمْ وَصَّكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ اس کی خدا تعالیٰ نے تم کو وصیت فرمائی ہے تاکہ تم تقویٰ حاصل کر سکو وصیت کرنے سے مراد تاکید کی حکم دینا ہے کیونکہ وصیت اصل میں اس بات کو کہتے ہیں جو انسان اپنے مرنے کے وقت عزیزوں اور وارثوں سے کہا کرتا ہے چونکہ وہ انسان کا آخری وقت ہوتا ہے اس لئے اس وقت جو بات کہتا ہے وہ خاص ضرورت کی باتیں ہوتی ہیں جن کی تعمیل کو وہ بہت مؤکد و لازم کیا کرتا ہے چونکہ حق تعالیٰ عدم و فنا سے پاک ہیں اس لئے یہاں پر وصیت کے معنی متعارف تو ہونے نہیں سکتے بلکہ اس کا لازم مراد ہے یعنی حکم تاکید

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ یہ نتیجہ ہے اتباع صراط مذکور کا مطلب یہ ہے کہ تم اس راستہ پر چلو تو امید ہے کہ تم کو وصال مقصود حاصل ہو جائے گا اس طرح سے تم نجات آخرت سے کامیاب ہو جاؤ گے کیونکہ تقویٰ کے معنی لغت میں بچنے کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ تم عذاب سے بچے رہو گے۔

خلاصہ نجات

اور یہی خلاصہ ہے نجات کا اور شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کمال دین کو کہتے ہیں چنانچہ موارد و نصوص میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اس تفسیر پر مطلب یہ ہوا کہ اس راستہ پر چلنے سے تم کو کمال دین حاصل ہو جائے گا اور یہی حاصل ہے مقصود پر پہنچنے اور منزل پر وصول ہو جانے کا اس کے بعد میں اس آیت کو مضمون پر منطبق کرنا چاہتا ہوں گو اس تفصیل کے بعد تقریر انطباق کی ضرورت نہیں رہی مگر میں تمہارا اس کو بھی بیان کئے دیتا ہوں تاکہ پوری تسلی ہو جائے کہ آیت مضمون مقصود پر بسہولت منطبق ہے سوا پر معلوم ہو چکا ہے کہ ہذا صراطی سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اسلام کو بالغتہ ہے مجموعہ اعمال کا اور عقائد اس میں مجاز داخل ہیں اور عقیدہ عقائد ایمان کا مدلول ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے اور اسلام فعل جوارح اور یہ اصطلاح لغوی ہے کیونکہ ایمان کے معنی تصدیق کے ہیں جو اولاً بالذات قلب سے صادر ہوتی ہے اور اسلام کے معانی گردن نہادان بطاعت ہیں جس کا محل جوارح ہیں اور بعض نصوص میں بھی اسلام و ایمان کا اطلاق اس حقیقت کے موافق وارد ہے۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا (اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے آپ کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لائے) لیکن یہ حقیقت لغویہ ہے اصطلاح شرعی میں اسلام نام ہے۔ مجموعہ عقائد و اعمال کا اور ایمان نام ہے مجموعہ عقائد کا تو شرعاً اسلام عام ہے اور ایمان خاص اور یہاں پر ہذا صراطی سے جو اسلام کی طرف اشارہ ہے اس سے یہی اسلام شرعی مراد ہے جو عقائد و اعمال سب کو شامل ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ اوپر قل تعالوا (آپ کہیے کہ آؤ) میں عقائد و اعمال دونوں کا ذکر ہے اس کے بعد وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) فرمایا گیا ہے تو اس میں مجموعہ عقائد و اعمال کی طرف اشارہ ہونا مناسب ہے اور ان اعمال و عقائد کو جو صراط فرمایا گیا تو تخصیص ان ہی اعمال و عقائد کی مقصود نہیں یہ تو بطور تمشل کے فرمایا ہے مقصود اتباع صراط اسلام کا ہے جو تمام اصول و فروع کو شامل ہے البتہ ایک تحقیق سمجھنے کی یہاں ضرورت ہوگی وہ یہ کہ اوپر بعض نواہی کا ذکر ہے جیسے لا تشرکوا - ولا تفتلوا - ولا تقرہوا (مت شریک کرو اور مت قتل کرو اور نہ قریب جاؤ اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو) اور بعض مامورات کا ذکر ہے جیسے یا للذین احسانا - وأوفوا النکیل - ولذا اقلنہ فاعملوا (والدین کے ساتھ احسان کرو ناپ تول پوری کرو) اور ان سب کو صراطی فرمایا اس کے اتباع کا امر فرمایا تو

صراط کہیں فعل ہوگا کہیں ترک اور اتباع فعل سے ہوگا کہیں ترک سے غرض حد اصراطی سے مراد تمام وہ اعمال و مامورات ہیں جو معین آخرت و مفید مقصود ہیں جن کا مفید ہونا مستقیماً میں مدلول ہے کہ استقامت کے لئے موصل الی المقصود ہونا لازم ہے اور وَلَا تَكْفُرُوا الشُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ (دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی) میں تمام وہ اعمال آگئے جو مانع عن الآخرت و مضر للمقصود ہیں اور مضر ہونا تفرق سے ظاہر ہے۔ پس ان مقدمات سے حاصل یہ ہوا کہ وہ ہم کو ہر کام میں دیکھنا چاہئے کہ یہ فعل معین آخرت ہے یا مضر آخرت ہے اب اس میں تمام شریعت آگئی کوئی مضمون شریعت کا اس سے خارج نہیں رہا۔

آگے فرماتے ہیں مستقیماً یعنی یہ راستہ مستقیم ہے لفظ مستقیم کے معنی ایک تو لغوی ہیں یعنی القصر العطو الواصلة بین النقطتین (دو نقطوں کے درمیان میں جو خطوط واصل ہو سکیں ان میں جو سب سے چھوٹا ہو وہ مستقیم لغوی ہے) اور ایک معنی عرفی ہیں یعنی بے خوف و خطر راستہ عرف میں راہ راست کو کہتے ہیں جس میں کوئی خطرہ نہ ہو چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں گاؤں کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ اس کو چلے جاؤ حالانکہ اس میں موڑ بھی آتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ بے خطر ہے اس میں تم کو غلطی پیش نہ آئے گی۔ صاف سڑک پڑی ہوئی ہے اور یہی عرفی معنی اس شعر میں مراد ہیں۔

راہ راست برد اگرچہ دور است (بے خطر راستہ پر چلو اگرچہ دور ہو)

بے خطر راستہ صراط حق ہے

اگر راہ راست کے معنی عرفی نہ لئے جائیں تو لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ دور راست (اگرچہ دور ہو) نہیں بن سکتا کیونکہ جو راستہ لغتاً مستقیم ہوگا وہ دوروں سے دور کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے اقصر الطرق ہونا لازم ہے جن لوگوں کو مستقیم کے لغوی اور عرفی معنی میں فرق معلوم نہیں وہ اس شعر کو حل نہیں کر سکتے مگر اس تحقیق کے بعد مطلب صاف ہے کہ بے خطر راستہ کو اختیار کرو اگرچہ دور ہی کیوں نہ ہو یہ تو لفظ کی تحقیق تھی اب میں کہتا ہوں کہ صراط حق یعنی اسلام کے متعلق یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ صراط مستقیم بے خطر بھی ہے اور وصول الی اللہ میں وہ تمام طرق سے اقرب و اقصر بھی ہے تو آپ کو اختیار ہے کہ چاہے مستقیم کو لغوی معنی پر محمول کیجئے یا عربی پر (یا دونوں پر) یہاں سب کی گنجائش ہے اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا تَكْفُرُوا الشُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ یعنی اس راستہ (اسلام) کا اتباع کرو اور دوسرے مختلف راستوں کا اتباع نہ کرو ورنہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا اور دور کر دیں گے اور دور ہونا اس طرح کا نہیں ہے کیونکہ وہ موصل تو ہوتے ہیں نقطہ مقصود سے دور تو نہیں کرتے بلکہ اس طرح کی دوری ہے جیسے مثلث کی ایک ساق کو چھوڑ کر اگر دوسری ساق پر چلنے لگے تو ساق اول سے وقتاً

فوقاً بعد ہی بڑھتا جاتا ہے جیسے اقصر الخطوط کے سوا تمام خطوط واصلہ دور دراز ہوا کرتے ہیں اور جدا ہونا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ بے خطر راستہ کو چھوڑ کر خطرناک راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مقصود تک وصول میسر نہیں ہوتا بیچ ہی میں ہلاک ہو جاتا ہے۔

تینوں آیات کے آخر میں ذالکم و صکم کا عجیب نکتہ

اب یہاں آیت کے متعلق ایک نکتہ ہے اس کو بیان کر کے میں ختم کئے دیتا ہوں نکتہ یہ ہے کہ اس جگہ **قُلْ تَعَالَوْا اتْلُ مَا كُتِبَ عَلَيْكُمُ** (آپ کہہ دیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے) سے **وَإِنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمًا** (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) تک تین آیتیں ہیں اور ہر آیت کے ختم پر حق تعالیٰ نے **ذَلِكُمْ وَصَّيْكُمْ بِهِ** (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) فرمایا ہے لیکن پہلی آیت کے اخیر میں تو **وَصَّيْكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) فرمایا اور دوسری آیت کے ختم پر **ذَلِكُمْ وَصَّيْكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ** (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو) فرمایا اور اس تیسری آیت کے اخیر میں **ذَلِكُمْ وَصَّيْكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ** فرمایا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وصیت سب کی مقصود ہے تو اس تفرق عنوان کی کیا ضرورت ہے گو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مقصود تفسیر کلام ہے جو ایک شعبہ ہے بلاغت کا اور کسی نکتہ کے بیان کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر بعض لوگ چلبے ہوتے ہیں وہ اتنی بات پر کفایت نہیں کرتے بلکہ ان کا ذہن اس سے آگے چلتا ہے تو انہوں نے اس تفرق عنوان میں یہ نکتہ بتلایا ہے کہ پہلی آیت میں جن پانچ امور کا ذکر ہے ان میں سے بجز اساءة بالوالدین یعنی ماں باپ کے ساتھ براسلوک کرنے) کو اعتقاداً اچھا نہ سمجھتے تھے اس کے سوا سب میں ان کی اعتقادی غلطی تھی اس لئے باعتبار اکثر کے وہاں تعقلون فرمایا کیونکہ اعتقادیات کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہے اور دوسری آیت میں مخاطبین کی کوئی اعتقادی غلطی نہ تھی بلکہ وہ احکام عمل کے متعلق ہیں جن میں وہ تغافل و سوہ کرتے تھے اس لئے وہاں تذکرون مناسب ہوا اور تیسری آیت میں کسی خاص حکم کا بیان نہیں بلکہ عام حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا تو وہاں تصفون مناسب ہوا کیونکہ تقویٰ بھی شرعاً عام ہے جس کا تعلق عقائد و اعمال وغیرہ سب سے یکساں ہے۔

وَإِنْ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمًا فَالْتَمِذُوا وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ

اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسروں کی راہوں پر مت چلو کہ وہاں راہیں تم کو اللہ کی راہوں سے جدا کر دیں گی۔

محبت کا اثر

اور چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے اس لئے اس مقام پر فرماتے ہیں 'وان هذنا صراطی مستقیماً' کہ یہ میرا سبب ہے سیدھا جس میں اس راستہ کو اپنی طرف اس لئے منسوب فرمایا کہ سننے والوں کو حظ آئے کہ یہ محبوب کا راستہ ہے اس عنوان سے سب کو اس کی طرف حرکت ہوگی خواہ اس اضافت کا یہ مطلب ہو کہ یہ راستہ میرا ایجاد کیا ہوا میرا بتلایا ہوا ہے یا یہ مطلب ہو کہ اس پر چل کر تم مجھ تک یعنی میری رضا تک پہنچ سکتے ہو خواہ کچھ ہی مطلب ہو مگر ہر حال میں محبت کا یہی اثر ہے کہ جب عاشق کو یہ معلوم ہو جائے فلاں کام کرنے سے محبوب مجھ سے راضی ہو جائے گا تو اس کو اس کام میں سب مشقیں آسان ہو جاتی ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اگر محبوب کی تجویز رضا کا بھی علم نہ ہو مگر اس کا علم ہو جاوے کہ وہ میری مشقتوں کو دیکھ رہا ہے تب بھی یہی اثر ہوتا ہے چنانچہ ایک عاشق رسوائی عشق کی وجہ سے پٹ رہا تھا اور ذرا آف نہ کرتا نانا نوے کوڑوں کے بعد جو ایک کوڑا اور لگا تو آہ کی کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی کہ ننانوے کوڑوں پر آہ نہ کی آخر میں ایک کوڑے پر آہ کی کہا ننانوے کوڑوں تک تو محبوب میرے سامنے تھا میری حالت کو دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبت میں مجھ پر یہ مصیبت آئی ہے تو اس وقت تک مجھے مصیبت کا احساس ہی نہیں ہوا بلکہ میں یوں کہہ رہا تھا

بجرم عشق تو ام می کشند و غوغایست تو نیز بر سر بام آ کہ خوشنما شایست

اس کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا تو اس وقت مجھے کلفت کا احساس ہوا جب اطلاع محبوب کے علم میں یہ اثر ہے تو رضا و تجویز محبوب کے علم میں تو کیا کچھ اثر ہوگا۔ اسی بناء پر جب یہاں بندوں کو یہ بتلایا گیا کہ یہ میرا راستہ ہے یعنی میری رضا کا راستہ ہے یا میرا تجویز کیا ہوا راستہ ہے یہ سن کر اس کی محبت کو حرکت ہوئی اور اب اس راستہ میں ان کو کوئی مشقت محسوس نہ ہوگی کیونکہ وہ سمجھیں گے کہ یہ کلفت محبوب کے راستہ میں ہے اور محبوب کے راستہ میں تو جان بھی جاتی رہے تو کچھ زیادہ نہیں تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے طریق کی گرانی کو کیسا پھولوں کا ہلکا کر دیا۔ یہی وہ بات ہے جس کو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی رحمت ہے کہ اول تو دین کو فی نفسہ آسان کیا پھر نفس کی کشاکشی سے جو اس میں عارضی گرانی اور مشقت آ جاتی ہے نہ اس کو اس طرح دور کیا کہ اس آیت میں تمام دین کا خلاصہ ایسے عجیب عنوان سے بیان فرمایا ہے جس سے ساری مشقت دور ہو گئی کہ اس کو اپنا راستہ فرمایا۔ اپنی طرف اس کی نسبت فرمائی اس کا لطف عشاق سے پوچھو کہ محبوب کے نام لگنے کی کیسی محبت ہوتی ہے۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مَثَلِهَا

ترجمہ: یعنی جو شخص نیکی لائے اسکے لئے اسکی دس مثل اور جو برائی کرے تو اسکے برابر جزا ملے گی۔

اس سے مضاعفت اور خیریت مذکور آیت سابقہ کی تعین ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قانون عام ہے اس لئے لفظ من عام ہے کوئی اس سے مخصوص نہیں پس مضاعفت دس سے کم تو کسی حال میں نہ ہوگی اور جو حدیث میں نے اول پڑھی تھی اس سے منعہائے اکثری بھی اس مضاعفت کا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اخلاص کے تفاوت سے سات سو تک مضاعفت ہوتی ہے یعنی اگر کوئی ایک پیسہ دے تو سات سو پیسوں کا اگر ایک روزہ رکھے تو سات سو روزوں کا ثواب لگتا ہے علیٰ ہذا ایک آیت پڑھے تو سات سو آیت کا ایک قرآن ختم کرے تو سات سو قرآن کا ثواب ملتا ہے۔

اس منعہا کو جو میں نے اکثری کہا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ لیکن یہ کثرت اضافی نہیں بلکہ فی نفسہ کثرت مراد ہے کہ قرآن و حدیث میں غور کرنے سے سات سو کی تحدید معلوم نہیں ہوتی بلکہ غیر متناہی مضاعفت ہوتی ہے اور متناہی سے مراد غیر متناہی بالفعل مراد نہیں بلکہ بمعنی لا نقف عند حد (یعنی کسی پر موقوف نہیں) مراد ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی راہ میں خرچ کرنے اولوں کی ایک مثال ارشاد فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مضاعفت کا انتہا نہیں چنانچہ ارشاد ہے مثل الذین ینفقون اموالہم فی سبیل اللہ کمثل حبة انبت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائة حبة جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے ایک دانہ ہو وہ سات بالیں اگادے اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔

اس کے آخر میں ارشاد ہے: واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم

یعنی اللہ جس کے واسطے چاہیں اس سے بھی زیادہ بڑھادیں اللہ تعالیٰ وسعت والے علم والے ہیں۔

یہ جملہ ماسبق کی علت ہے کہ اس مضاعفت سے حیرت اور تعجب نہ کرو اللہ تعالیٰ صاحب وسعت ہیں ان کے یہاں تنگی نہیں اور اس کے ساتھ ہی دھوکا میں پڑنے والے کا علاج بھی ارشاد فرمادیا کہ وسعت پر مغرور مت ہو جاؤ اور یہ مت سمجھو کہ ہماری نیکی قابل مضاعفت ہے اس کے لئے وہ عظیم بھی ہیں یعنی یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی کی نیکی مضاعفت کے قابل ہے اور کسی کی نہیں۔ جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا اسی قدر مضاعفت ہوتی جائے گی اور چونکہ اخلاص کی کوئی حد نہیں لہذا اس مضاعفت کی بھی تعین نہیں کی جاسکتی ہے۔

نیکی کا قانون

الحاصل نیکی کا قانون عام کہ جس سے کوئی مومن مخصوص و مستثنیٰ نہیں یہ ہوا کہ ایک نیکی کے بدلے دس ملتی

ہیں اور باعتبار اکثر کے سات سو تک مضاعفت ہوتی ہے اور سات سو سے آگے (غیر حد تک) مضاعفت ہو سکتی ہے یہ تو آیت سے مضاعفت کا غیر محدود ہونا معلوم ہوا ہے۔

اب حدیث لیجئے حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص ایک چھوہارا صدقہ کرے تو اللہ تعالیٰ کو اس کو اپنے دست مبارک میں لیتے ہیں اور اس کی پرورش فرماتے ہیں کما یروی احد کم فلوہ یعنی ایسے پرورش فرماتے ہیں یعنی اس کو بڑھاتے ہیں جیسے ایک تمہارا اپنے پچھیرے کو پرورش کرتا ہے اور بڑھاتا ہے۔

پچھیرے کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ عرب کے لوگ گھوڑوں کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ اور وہ اس کی یہ ہے کہ یہ ایک جنگ جو اور بہادر قوم ہے اور گھوڑا جنگ میں بڑا کام آنے والا ہے قرار میں بھی اور فرار میں بھی اگر میدان میں قائم رہ کر حرب میں مشغول رہیں تو اس میں بھی گھوڑا کام دینے والا ہے۔ اور اگر مغلوب ہونے کی حالت میں بھاگنے کی ضرورت ہو تو اس موقع پر بھی گھوڑے سے زیادہ کوئی جانور کام کا نہیں اور حرب میں یہی دو موقع ہوتے ہیں کبھی قرار ہوتا ہے اور کبھی فرار اور جیسے قرار فی الحرب (لڑائی میں برقرار رہنا) شجاعت شمار ہوتی ہے اس لئے موقع سے اپنی جان بچا کر نکل بھاگنا یہ بھی درستی حواس سے ہوتا ہے اور درستی حواس جب ہی ہوگی جب کہ قلب ضعیف نہ ہو آدمی دلیر اور بہادر ہو چنانچہ عرب جہاں اشعار میں قرار پر یعنی جمع رہنے پر فخر کرتے ہیں اسی طرح فرار یعنی میدان سے بھاگ جانے پر بھی فخر و ناز کرتے ہیں اس لئے کہ عرب کی شاعری نہایت سادہ رنگ لئے ہوئے ہے عجم کے تکلفات وہاں نہیں ہیں۔ غرض گھوڑا قرار اور فرار دونوں وقت میں چونکہ کام آتا ہے اس لئے وہ عرب کو بہت محبوب تھا اور ظاہر ہے کہ بچہ تو ہر شے کا پیار معلوم ہوتا ہے خاص کر محبوب کا بچہ تو اور بھی زیادہ محبوب ہوگا۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جیسے تم پچھیرے کو پالا کرتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ اس چھوہارہ کو پرورش فرماتے ہیں آگے فرماتے ہیں۔

حتیٰ یكون اعظم من احد یعنی اس چھوہارہ کی اتنی تربیت فرماتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑا ہو جاتا ہے۔

اس حدیث کے اندر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سات سو کی تخصیص تحدید کے لئے نہیں اس لئے کہ چھوہارہ کے برابر احد پہاڑ کے ٹکڑے کئے جائیں تو سات سو کیا سنکھوں مہا سنکھوں سے بھی زیادہ پر نوبت پہنچے گی اور وزن کے اعتبار سے اگر چھوہارہ کے برابر حصے کئے جائیں تو اور بھی زیادہ ہو جائیں گے۔ مولانا فرماتے ہیں

خود یابد این چنین بازار را کہ بیک گل سے خری گزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد ہر چہ درو ہمت نیا ید آں دہد

(الصوم بالحقہ مواظبہ فاضل صوم و صلوة صفحہ ۹۱ تا ۸۹)

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتْرُكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ رہا یہ کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ سو اس کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے ان کا طریقہ یہ ہے ابھمو ما ابھمه اللہ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاعت بدوں ابتلاء مقصود ہوتی تو اسکے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے۔ انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ میں اطاعت بدوں ابتلاء ہی ہے ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر مقاومت و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے۔

ترجمہ اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے سو اس پر چلو

تمام دین کا خلاصہ

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام دین کا خلاصہ ارشاد فرمایا ہے دین اس کی تفسیر ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسے خاص عنوان سے بیان فرمایا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ اس کو سن کر عمل کی رغبت ہوتی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ وہ احکام جو فی نفسہ آسان ہیں مگر مخالفت نفس اور منازعت نفس کے عارض سے دشوار ہو گئے ہیں ان کو نہایت سہل عنوان سے بلکہ شوق دلانے والے عنوان سے بیان فرمایا ہے تاکہ یہ عارضی دشواری شوق کی حرکت سے مغلوب ہو جائے اور یہ دلیل ہے حق تعالیٰ کے شفیق ہونے کی حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ ضابطہ کا تعلق نہیں رکھا ہے اور جتنے ضوابط و قواعد حق تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ان میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب بندوں کی مصلحت کے لئے ہیں۔ وہ ضابطہ محض نہیں بلکہ عین شفقت ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بچہ کنویں میں گرنے لگے تو اس کو گرنے سے اس طرح روکتے ہیں کہ ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور دو چار ٹھانچہ لگا کر وہاں سے ہٹا دیتے ہیں شفقت کا ہٹانا یہی ہے نہ یہ کہ اہل حکومت کی طرح ضابطہ بنا دیا جائے جسے حکام و سلاطین اور ان کے نواب کا طریقہ ہے کہ منادی کرنے والا ایک طرف سے

منادی کرتا چلا گیا چاہے کوئی سنے یا نہ سنے سمجھے یا نہ سمجھے اور رغبت ہو یا نہ ہو سو یہ ضوابط ہیں اور حق تعالیٰ کے احکام میں ایسے ضوابط نہیں ہیں ہاں صورت ضوابط کی ہے سو اس کی ایسی مثال ہے جیسے حکیم دوا کی مقدار معین کرتا ہے وقت مقرر کرتا ہے پرہیز متعین کرتا ہے تو ظاہر میں یہ بھی ضوابط ہیں مگر حقیقت میں یہ محض ضوابط نہیں ہیں کیونکہ اگر یہ ضوابط مرتفع ہو جائیں تو حقیقت میں ابھلاک ہوگا۔ طبیب یہ قیدیں صرف مریض کی مصلحت سے لگاتا ہے اپنی مصلحت کے لئے نہیں لگاتا اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے اپنی شان حکومت کے لحاظ سے ضوابط مقرر نہیں فرمائے بلکہ بندوں کی مصالح اور منافع کے لئے متعین فرمائے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا تو بندوں ہی کا ضرر تھا پس احکام میں بظاہر جو کچھ قواعد و ضوابط ہیں ان کا مبنی شفقت ہے اور اسی شفقت کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام کو ایسے عنوان سے بیان فرماتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو ان کو اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہوئی اور شوق پیدا ہو جاتا ہے جیسے باپ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے اس کی رعایت کرتا ہے کہ بیٹا سمجھ لے اور اس کی سمجھ میں بات آجائے چنانچہ اس آیت میں بھی اس طرز شفقت کی پوری رعایت ہے۔

قُلْ إِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ

الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ

الْمُسْلِمِينَ ۝

ترجمہ: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمادیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اس طرح حکم ہوتا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔

تفسیری نکات

اسلام کامل کی تفسیر

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو ارشاد فرمایا ہے کہ اپنا مشرب ظاہر کر دیجئے اس واسطے کہ صیغہ امر لایا گیا ہے اور حضور ﷺ کو ایسا امر کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہم لوگ بھی امتثال کریں۔ بجز اللہ ہم صفت اسلام کے ساتھ متصف تو ہیں اور اسلام ہم میں موجود ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کامل ہے یا ناقص؟ تو اب پہلے کامل کو سمجھئے اس سے خود معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں وہ درجہ ہے یا نہیں فرماتے ہیں اپنا

مسلك ظاہر کر دیجئے کہ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَعْيَايَ وَمِمَّا قَرَّبْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لِي فِي دِينِي ۝ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ اور میں سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں ہوں۔ یہ لفظ مسلمین کو خوب مل گیا ہے یہ لفظ دلالت کرتا ہے کہ آیت میں اسلام ہی کی شرح کی گئی ہے کیونکہ مامور بہ باجزاء بیان کرنے کے بعد اس کی تفسیر کرنے والوں کا لقب مسلمین فرمایا گیا ہے تو اس کے یہی معانی ہوئے کہ اس مامور بہ کے اجزاء جمع کرنے سے یہ لقب مسلم حاصل ہوتا ہے اور مسلم وہی ہے جس میں یہ امور ہوں جن کا یہاں ذکر ہے تو یہ معنی ہوئے کہ یہ مامور بہ کا مجموعہ عین اسلام ہے لیجئے تصریح ہو گئی کہ آیت میں اسلام کامل کی تفسیر بتائی گئی ہے۔ فَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَىٰ ذٰلِكَ

اس کی مثال یہ ہے کہ کسی کو تعلیم کی جاوے کہ کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہو پھر الحمد اور سورت پڑھو پھر کمر جھکاؤ پھر کھڑے ہو پھر زمین پر ماتھا رکھو پھر کھڑے ہو جاؤ اور اسی ترکیب سے چار دفعہ ان سب کاموں کو کرو اور بعد میں کہہ دیا جائے کہ جب تم چار دفعہ ایسا کر لو گے تو سمجھ لینا کہ نمازی بن گئے تو اس تعلیم میں گو اس نے شروع سے یہ نہیں کہا کہ میں تم کو نماز سکھاتا ہوں لیکن اخیر میں یہ لفظ کہہ دینے سے کہ ان افعال کے کرنے سے تم نمازی بن جاؤ گے۔ صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان افعال کا کرنے والا نمازی ہے اور ان افعال کا مجموعہ نماز ہے۔ اور یہ سب اجزاء نماز کے ارکان ہیں اسی طرح یہ تعلیم فرما کر کہ اپنا مسلک یہ رکھئے کہ نماز بھی خدا کے لئے ہو اور ہر عبادت بھی خدا کے لئے ہو اور مرنا بھی خدا کے لئے ہو اور جینا بھی خدا کے لئے ہو اس کے بعد یہ فرمانا کہ بس مجھے اسی کا امر ہے اور میں اپنے آپ کو سب سے پہلا مسلم کہتا ہوں یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے مثال میں کہا گیا تھا کہ ان افعال کے کرنے سے تم نمازی بن جاؤ گے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلک اختیار کرنا مسلم بننا ہے اور یہ مسلک اسلام ہے اور یہ اجزاء اسلام کے اجزاء ہیں اور اول کا لفظ صاف بتلاتا ہے کہ اسلام کامل مراد ہے کیونکہ اولیت سے مراد اولیت زمانی نہیں ہے بلکہ اولیت فی الرتبہ ہے جس کا ترجمہ ہے سب سے بڑھ کر مسلمان ہونا یہی عینہ ترجمہ ہے اسلام کامل کا جیسا کہ ظاہر ہے لیجئے اب تو میرے مدعا کے لئے بالکل صاف صاف الفاظ مل گئے۔

اسلام کامل کے اجزاء

اب سمجھئے کہ یہاں اسلام کامل کی حقیقت چار اجزاء میں بیان فرمائی گئی ہے کہ یہ چار چیزیں اللہ ہی کے

لئے خالص کر دو نماز عبادت موت حیات ان سب کو اللہ ہی کا کر دو بس اتنی حقیقت ہے اسلام کامل کی اجمال تو یہ ہے جو بہت ہی ذرا سا ہے مگر اس کی تفصیل کچھ شرح اور طول چاہتی ہے اور تفصیل بھی ایک تو اختصار کے ساتھ ہو سکتی ہے اور ایک طول وسط کے ساتھ اختیار کے ساتھ تو یہ ہے کہ یہاں جو حقیقت اسلام کامل کی چار اجزاء میں بتلائی گئی ہے کہ ان چار کو یعنی نماز اور عبادت اور موت اور حیات کو اللہ ہی کے لئے خالص کر دو اس کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ ان چاروں کو صرف عقیدہ کے مرتبہ میں اللہ کی سمجھتے رہو کیونکہ اس سے تو کوئی ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی خالی نہیں ہر مسلمان ان چار چیزوں کو ہی کیا بلکہ ہر چیز کو اعتقاد اللہ ہی کی سمجھتا ہے تو پھر کامل اور ناقص میں فرق ہی کیا ہوا؟ بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان چار چیزوں کو اعتقاد اللہ کی سمجھ کر حالاً بھی ان کو ان کے ہی سپرد اور تابع کر دو جب اپنے کو اللہ کی ملک سمجھتا تو ان کو اعتقاداً بھی تصرف کا مستحق سمجھو اور حالاً بھی منقاد ہو جاؤ یعنی دل سے عقیدہ یہ رکھو کہ یہ سب چیزیں خدا کی ہیں اور حالاً بھی ان کے تصرف کو تسلیم کر کے بالکل منقاد اور مطیع اور فرماں بردار بن جاؤ کہ ان چاروں میں جس طرف چلائیں اسی طرف کوچلو تو حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ جو تصرف بندہ کی نماز میں عبادت میں حیات میں موت میں کریں اس کا اعتقاداً و حالاً منقاد اور فرماں بردار ہونا اسلام کامل ہے۔ یہ تفصیل ہوئی اختصار کے ساتھ

کمال اسلام کے بارے میں تفصیل

اب قدرے طول اور وسط کے ساتھ تفصیل سنئے وہ یہ ہے کہ یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں چنانچہ میں نے ابھی کہا ہے کہ حق تعالیٰ کو تصرف کا مستحق سمجھو اور تم انقیاد کرو تو یہ چیزیں دو ہوئیں تصرف اور انقیاد تصرف تو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور انقیاد ہمارا فعل ہے اب خدا کے فعل یعنی تصرف کی حقیقت بھی سمجھنا اور اس کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور اپنے فعل یعنی انقیاد کی حقیقت معلوم کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے تو چار چیزیں ہوئیں تصرف کی حقیقت سمجھنا اور عقیدہ رکھنا تصرف پر اور اپنے فعل یعنی انقیاد کی حقیقت سمجھنا اور عمل کرنا اس پر بس اسی سے اسلام کامل ہوگا ان چاروں کو ترتیب وار سن لیجئے اول حقیقت سمجھنا تصرف حق کی ان چار چیزوں میں یعنی نماز میں عبادت میں موت میں حیات میں اس کی تفصیل عنقریب آتی ہے مگر اس کے قبل اس کے متعلق ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ یہ جو چار چیزیں بتلائی گئیں یہ چار برائے نام ہیں۔ عنوانات چار ہیں ورنہ معنوں حقیقت میں تین ہیں یادو اس طرح کہ صلوٰۃ کے معنی ہیں نماز اور نسک کے معنی ہیں عبادتیں اور نماز بھی عبادت میں داخل ہے تو یہ تعظیم بعد تخصیص ہے اس کے لئے دراصل صرف نسک کا لفظ بھی کافی تھا نماز بھی اس میں آ جاتی لیکن نماز کا نام جدا لیا گیا بغرض اہتمام کے تو یہ معنی ہو گئے کہ ساری عبادتیں ملک ہیں اللہ کی تو اب ان دو جزو

میں سے ایک جزورہ گیا یعنی عبادت جس میں نماز بھی آگئی جب چار جزو میں سے ایک کم ہو گیا تو تین جزورہ گئے یہ تو تین جزو ہونے کی تقریر ہوئی اور دو جزو ہونے کی تقریر یہ ہے کہ اس کے بعدو محیای و معانی آیا ہے اس کے معنی ہیں میرا مرنا اور میرا جینا اس میں دو احتمال ہیں ایک تو یہ ہے کہ ان سے حالت حیات اور حالت موت مراد ہو دوسرا یہ کہ حیات و موت کے احکام مراد ہوں اگر حالت حیات اور حالت موت مراد ہو تو پھر یہ دنوں مل کر ایک ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ دنوں غیر اختیاری امور ہیں اور صفت غیر اختیاری دنوں میں مشترک ہے اور پیشتر صلونی و نسکی کا متحد ہونا معلوم ہو چکا ہے تو معنوں کے درجہ میں بجائے چار کے دو جزورہ گئے اس طرح کہ موت اور حیات تو حالت غیر اختیاری ہوئی اور عبادت فعل اختیاری ہے تو معنی آیت کے یہ ہو جائیں گے کہ ہمارے تمام حالات اختیار یہ وغیر اختیار یہ اللہ تعالیٰ کے ملک ہیں اور دوسری شق پر یعنی جب کہ حیات اور موت سے مراد احکام ہیں جو بعد موت کے جاری ہوتے ہیں اور احکام حیات تمام ان احکام کو شامل ہے جو زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اس میں تمام عبادتیں آگئیں نماز بھی آگئی اور بقیہ احکام متعلقہ حیات بھی آگئے۔ تو اس طرح سے تین چیزیں تو احکام حیات میں آگئیں یعنی نماز اور عبادتیں اور بقیہ احکام متعلقہ حیات اور ایک چیز احکام موت میں آگئی تو پھر بھی دو چیزیں ہو گئیں۔ غرض تین چیزیں کہو یا دو کہو سب کا حاصل یہ ہوا کہ ہمارے حالات اختیار یہ اور غیر اختیار یہ پھر وہ حالات موت کے ہوں یا حیات کے سب ملک اللہ کے ہیں یہ حاصل ہے آیت کا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مضمون بہت مختصر الفاظ میں بھی آسکتا تھا مثلاً یوں ہوتا کہ احوالنا الاختیاریہ وغیرہ الاختیاریہ لہذا پھر ان سب کو الگ الگ کیوں بیان کیا گیا ایجاز کی جگہ اطناب کو کیوں اختیار کیا گیا اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں اور ان سب مذاقوں پر اصلاح مقصود ہے سو ایک مذاق جو آج کل غالب ہے یہ بھی ہے کہ ان کے خیال میں عبادت تو حقوق اللہ ہیں اور ان میں ہر طرح اللہ کو اختیار تصرف کا ہے جس فعل کو چاہیں عبادت قرار دے دیں اور جس کیفیت سے چاہیں اس کو مقرر فرمادیں نماز میں چار رکعتیں رکھ دیں تو یہی ٹھیک ہے اور تین رکھ دیں تو وہی ٹھیک ہے اور دو رکھ دیں تو وہی ٹھیک ہے۔ غرض عبادت میں ہر قسم کے تصرف کا حق تعالیٰ کو حق حاصل ہے۔

آیت کی بلاغت

حاصل یہ ہے کہ مقصود بیان کرنا اس بات کا ہے کہ ہمارے حالات اختیار یہ وغیر اختیار یہ سب اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں اس کے واسطے اتنے لمبے الفاظ کو کیوں اختیار کیا۔ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ كِيُوْنُ كَمَا اس کے لئے کوئی مختصر لفظ بھی ہو سکتا تھا مثلاً کوئی ایسا لفظ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہمارے حالات

اللہ کے ملک ہیں کافی ہو جاتا تو اس کو اتنا طول کیوں دیا اس کے لئے دو تو جہیں بیان کی گئی ہیں خلاصہ ان کا یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق مختلف ہیں ایک مذاق یہ ہے کہ عبادات تو حقوق اللہ ہیں اور ان میں حق تعالیٰ کو تصرف کا اختیار ہے اور اس کے احکام کا نام دین ہے رہے احکام موت و حیات یعنی معاشرت اور تمدن تو ان سے دین کو کچھ علاقہ نہیں اس مذاق کی تردید کے لئے لفظ محیای و مماتی بڑھایا۔ اس صورت میں محیای و مماتی سے مراد احکام حیات و موت ہوں گے اور دوسرا مذاق یہ ہے کہ موت اور حیات میں تو تصرف حق تعالیٰ کا مانتے ہیں کیونکہ مشاہد ہے اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس صورت میں محیای و مماتی سے نفس حیات اور موت مراد ہے احکام حیات و موت مراد نہیں مگر یہ لوگ احکام اور عبادات میں حق تعالیٰ کے تصرف کو نہیں مانتے اور اس کے معنی میں نے بیان کر دیئے ہیں کہ گوزبان سے اس تصرف کا انکار نہیں کرتے اور حق تعالیٰ کو حاکم مانتے ہیں مگر ان احکام کی بناء اپنی اختراعی مصالح پر مانتے ہیں جس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی حکم کا اختیار نہیں ہے بلکہ حکم ہمیشہ مصلحت کے موافق ہوتا ہے اور مصلحت ہی پر احکام کی بنا ہے۔ اس مذاق کی تردید کے لئے صَلَاتِي وَنُسُكِي کو بڑھایا تو ایک توجیہ پر محیای و مماتی کو بڑھایا اور ایک توجیہ پر صَلَاتِي وَنُسُكِي بڑھایا تو کیا مزہ کا مضمون ہو گیا جس کے ہر جملہ سے ایک ایک مذاق فاسد کی تردید ہو رہی ہے یہ بات اختصار میں حاصل نہ ہوتی اس واسطے ایجاز کو چھوڑ کر اطناب کو اختیار کیا گیا حاصل یہ ہے کہ ان چاروں اجزاء میں حق تعالیٰ کو تصرف کا حق ہے ان چاروں کے نام یہ ہیں صلاحی اور نسکی اور محیای اور مماتی ان کا خلاصہ دو لفظوں میں بھی آ جاتا ہے وہ دو لفظ یہ ہیں حالات اختیار یہ وغیر اختیار یہ میں نماز وغیرہ آگئیں۔ اور موت و حیات غیر اختیار یہ میں۔

غرض ہمارے تمام حالات حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں اور ان کو ہر قسم کے تصرف کا حق حاصل ہے میں نے بیان کیا تھا کہ اسلام کامل کے دو جزو ہیں ایک یہ کہ ان چاروں باتوں میں حق تعالیٰ کے تصرف کو ماننا یہ تو فعل حق تعالیٰ کا ہے دوسرے اس تصرف کو ماننے کا حق ادا کرنا ہے جس کا نام انقیاد ہے یہ فعل بندہ کا ہے۔

رَبِّ الْعَالَمِينَ كَوْزِ كَرِكْرَنِ كَا فَا نَدَه

حق تعالیٰ یہ حالت نصیب کریں کہ حقیقت سمجھ میں آ جائے اور ہر وقت یہ امر منکشف ہوتا رہے کہ ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے ہے دیکھئے قرآن شریف میں کیا بلاغت ہے یہاں رب العالمین کا لفظ موقع سے بڑھایا ہے جس کے معنی ہیں تمام جہانوں کا پالنے والا اور وہ رب العالمین ہیں ہمارے بد خواہ نہیں ہیں جو کچھ امر نگوئی کرتے ہیں یا تشریحی وہ سب ہمارے لئے خیر ہی خیر ہے اگر اس حقیقت کا انکشاف ہو جاوے تو آدمی دل و جان سے کہہ

اٹھے گا اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اور تشریحات کو بہت خوشی سے سر پر رکھے گا اور تکوینیات میں بھی دل و جان سے تفویض کرے گا یہ فائدہ ہوا لفظ رَبِّ الْعَالَمِينَ کا اب ایک دوسرے ہو سکتا ہے کہ کیا کسی اور بادشاہ کی سلطنت بھی ایسی ہے جس میں عنایت ہی عنایت ہو اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

لفظ لَا شَرِيكَ لَهٗ كِي حِكْمَت

لَا شَرِيكَ لَهٗ ان کا کوئی شریک نہیں کسی بات میں کوئی ان کا مماثل نہیں تو اس صفت ربوبیت میں بھی جس کا متعنی افت اور رحمت اور بھی خواہی تھا کوئی ان کے برابر نہیں بلکہ دیگر یوں کہتے کوئی بھی ہمارے واسطے اتنا رؤف ورحیم اور بھی خواہ نہیں ہو سکتا جتنے حق تعالیٰ ہیں جب یہ بات ہے تو ان کے تجویز کردہ احکام کے ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ اب سارے شبہات دور ہو گئے اور کوئی داعیہ ایسا نہ رہا جو مانع عن الانقیاد ہو۔ آگے فرماتے ہیں وَيَذَرُكَ اَمْوَالُ الْاٰنِ صَلَاتِي فِي تَوْبِيَانِ تَهَا شَرْبِ كَا اِس مِي تَصْرِيْحِ هِي اِس كِي مَامُوْر بِهٗ هُوْنِي كِي حَاصِلِ يِهِي هِي كِي پهلے ارشاد فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میرا شرب اور طریقہ یہ ہے کہ میں اپنے تمام حالات اختیار یہ اور غیر اختیار یہ کو حق تعالیٰ کی ملک سمجھتا ہوں مومنین کو تخریض کے لئے یہی بات کافی تھی حضور ﷺ کے ساتھ مومنین کو تعلق عشق و محبت کا ہے ان کو صرف اتنا معلوم ہو جانا ہی کافی ہے کہ یہ بات حضور کو پسند ہے اور یہ وہ طریقہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس کو خود بھی اختیار کیا ہے محبت کا مذاق رکھنے والوں کے لئے تو اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن بہت سے آدمی ضابطہ کے قبیح اور قانونی بھی ہوتے ہیں ان کے واسطے تصریح بھی کر دی کہ اس شرب کا رکھنے کا مجھ کو حکم بھی ہوا یعنی میں نے از خود یہ شرب اختیار نہیں کیا بلکہ بامر خداوندی اختیار کیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ حضور ﷺ کو حکم ہو اور ہم کو نہ ہو کیونکہ آپ محبوب تھے جب محبوب سے احکام میں تخفیف نہیں کی گئی تو ہم سے کیسے ہو سکتی ہے۔

اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَا مَطْلَب

اس کے آگے ارشاد ہے وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ترجمہ اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں ظاہر ہے کہ اپنے دور میں سب سے پہلے مسلمان آپ ہی ہیں دوسرا جو کوئی بھی مسلمان ہوا وہ آپ ہی کی بدولت ہوا اس قول پر تو حضور ﷺ کے لئے اولیت فی الاسلام اس امت میں ثابت ہوئی ہے جس کو اولیت زمانی اضافی کہنا چاہئے۔ اور اہل لطائف کا قول یہ ہے کہ حضور کو اولیت فی الاسلام بالمعنی لکھتی بھی حاصل ہے کیونکہ روز الست

میں جب ارشاد ہوا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ تو سب سے پہلے حضور ﷺ ہی نے جواب دیا میں تو حضور ﷺ تمام اولین و آخرین سب سے اول ہوئے اسلام میں اور یہ تو اولیت ہے اسلام تشریحی میں اور بھی دلائل سے ثابت ہے کہ حضور تکوین میں بھی سب سے یعنی سب انسانوں سے بلکہ تمام کائنات سے اول ہیں کیونکہ سب سے پہلے حق تعالیٰ نے حضور ﷺ ہی کے نور کو پیدا کیا اور تمام کائنات کو حضور ﷺ ہی کے نور سے بنایا اور ہر سکون کے لئے انقیاد تکوینی لازم ہے تو سب سے پہلے اسلام و انقیاد تکوین کے ساتھ بھی حضور ﷺ ہی متصف ہوئے یہ اولیت ہے اسلام تکوینی میں آپ اول ہیں اسلام تشریحی میں بھی اور اسلام تکوینی میں بھی بلفظ دیگر درجہ حال میں بھی آپ اول ہیں اور درجہ قال میں بھی آپ ہی اول ہیں اور جملہ ان اول المسلمین کے لانے سے یہ مقصود نہیں کہ تم بھی اس اولیت فی الاسلام میں میری تقلید کرو کیونکہ اس میں تو تقلید ہو ہی نہیں سکتی بلکہ تحریض مقصود ہے۔

یہ ایسا ہے جیسا چندہ مانگنے کے وقت کوئی بڑا آدمی کہے کہ پہلے میں دیتا ہوں کہ اس سے تحریض مقصود ہوتی ہے دوسروں کو اور اس سے ایک عام تحریک پیدا ہو جاتی ہے یا جیسے ایک فوج کو کوئی حکم ہوتا ہے اور اس کا سر دار بول اٹھے کہ اس حکم کی تعمیل کے لئے سب سے پہلے میں تیار ہوں تو اس سے یہ اثر ہوتا ہے کہ اس حکم کو سب خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ آیت میں ایسے بلوغ انداز میں تعلیم کی گئی کہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا۔

سُورَةُ الْأَعْرَافِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

التَّصَّ ۱

تفسیری نکات

قرآن اصطلاحات فنون پر وارد نہیں

اس لئے اہل علم کو چاہئے کہ محاورہ کو دیکھ کر قرآن کو سمجھا کریں کیونکہ قرآن اصطلاحات فنون پر وارد نہیں ہے اور اگر اصطلاح ہے بھی تو اصطلاحات شرعیہ پر ہے اور نہ فنون کی اصطلاح پر ہے مثلاً حدیث شریف میں ہے کہ قرآن کے ہر حرف کے بدلے دس دس نیکیاں ملتی ہیں مثلاً اگر کسی نے الم پڑھا تو اس کی تیس نیکیاں مل گئیں آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں لا اقول الم حرف بل الف حرف ولام حرف ومیم حرف تو دیکھئے الف اور لام اور میم کو حرف فرمایا گیا حالانکہ اصطلاح نحاۃ کے نزدیک حرف ہے اور الم میں جو الف ہے وہ اسم ہے مگر محاورہ یا اصطلاح شرع کے اعتبار سے یہ الف بھی حرف ہے یہ ایسی اصطلاح ہے جیسے عام محاورہ ہے یہ محاورہ حضور ﷺ کے ارشاد کے موافق ہے غرض شارع علیہ السلام کی کلام میں الف حرف ہی ہے گو نحاۃ کے نزدیک اسم ہو بعض اہل علم حدیث میں اس الف سے بھی مسمی سمجھ گئے اور مسمی بالالف مراد لیا یعنی الف جو نام ہے حرف کا اس میں جو تین جزو ہیں الف اور لام اور فاء حدیث میں یہ الف مراد ہے اور اس پر محمول کر کے کہنے لگے کہ اس حساب سے الم میں نوے نیکیاں ہوں گی اور یہ محض تکلف ہے اگر حساب بڑھانے کے لئے یہ توجیہ کی ہے تو میاں وہاں کا تو تھوڑا بھی کافی ہے اس تکلف کی کیا ضرورت ہے حاجی صاحب فرماتے ہیں۔

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں گر چہ کرتے ہیں بہت نالہ و فریاد ہم

اور ذوق سے اگر کام لیا جاتا تو صاف معلوم ہوتا ہے اگر الف سے مسمی مراد ہوتا تو حضور ﷺ اس طرح فرماتے بل الف حرف لام حرف فاء حرف اسی طرح لام حرف و الف و میم حرف ایسا ہی میم حرف و یا حرف و میم

حرف جب آپ نے اس طرح نہیں فرمایا تو معلوم ہوا کہ مراد شارع کی وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو اور اگر اختصار کی وجہ سے تین ہی حرف کا بتلانا تھا اور پورے نو کو بیان فرمانا تطویل کی وجہ سے مد نظر نہیں تھا تو اسم اول ہی کے تین حرف بیان فرمادیتے یہ کیا کہ ہر ایک سے ایک ایک حرف لیا گیا کہ الف سے الف لیا اور لام سے لام اور میم سے میم یہ تو کچھ جی کو نہیں لگتا اور یوں تو ملاں آں باشد کہ جب نہ شوڈ کچھ نہ کچھ جواب نکال ہی لیں گے مگر ہمارے جی کو تو نہیں لگتا ہمارے جی کو تو وہی لگتا ہے کہ حضور ﷺ نے یہاں مسی کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اسم کا ذکر فرمایا ہے اور محاورہ کے لحاظ سے اسم نحوی کو حرف فرمایا گیا ہے غرض محاورہ اور اصطلاح کے خلط سے یہ ہوتا ہے کہ مطلب اور مراد متکلم میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ إِلَّا تَسْبُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي

مِنْ تَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝۸ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ

لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّغِيرِينَ ۝۹

ترجمہ: حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کون سا امر مانع ہے کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے حق تعالیٰ نے فرمایا تو اس (آسمان) سے اتر تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر سے اس (آسمان) میں رہ سو نکل تو بے شک ذیلیوں میں شمار ہونے لگا۔

تفسیری نکات

شیطان کو حاکمانہ جواب

قرآن میں زیادہ تر حاکمانہ ہی جواب دیئے گئے ہیں چنانچہ شیطان سے جب انکار سجدہ کی وجہ پوچھی گئی اور اس نے جواب دیا **خَلَقْتَنِي مِنْ تَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ (پ ۸)** تو اس کی اس دلیل کا حاکمانہ ہی جواب دیا گیا **فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝۸ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ**۔

اسی طرح مقبولین کو بھی حاکمانہ جواب دیا ہے یعنی فرشتوں کو جب کہ انہوں نے آدم علیہ السلام کی خلافت پر سوال کیا تو فرمایا **إِنِّي أَنزَلْتُ مَاءً لَاتَعْلَمُونَ (پ ۱)** کہ تم نہیں جانتے میں جانتا ہوں اور یہی تو قرآن کی خاص بات ہے جس سے اس کا کلام الہی اور شاہانہ کلام ہونا معلوم ہوتا ہے ورنہ اگر ہر سوال کا حکیمانہ جواب دیا جاتا تو شاہانہ کلام نہ معلوم ہوتا بلکہ فلسفی کا کلام معلوم ہوتا اس لئے حکیمانہ جوابات کم دیئے گئے ہیں اور اگر دیئے بھی ہیں تو

حاکمانہ جواب کے ساتھ دیئے ہیں۔

مگر انہوں نے ان کو قرآن کا پورا لطف نہیں آتا اور نہ عجیب پر لطف کلام ہے پس إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (پہ) میں اس شبہ کا حاکمانہ جواب دیا گیا ہے۔

يَبْنِيٰ اٰدَمَ لَا يَفْتِنٰكُمْ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَ اٰبُوۡنِكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ

يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا اِنَّكَ يٰرَبُّكَ هُوَ وَقَبِيْلُهُ

مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيْطٰنَ اَوْلِيَاءَ لِلَّذِيۡنَ لَا

يُؤْمِنُوۡنَ ﴿۱۷﴾

تفسیر: یعنی اے نبی آدم تم کو شیطان گمراہی میں نہ ڈالے جیسا کہ تمہارے ماں باپ کو اس نے جنت سے نکالا یعنی ایسا کام کرایا جس سے وہ جنت سے نکلے اور اس حالت میں کہ ان سے ان کا لباس اتارتا تھا تا کہ ان کو ان کے مستور بدن دکھلائے وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھتے ہو ہم شیطانوں کو انہیں لوگوں کا رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان نہیں لائے۔

تفسیری نکات

خطا اجتہادی

اس میں حق تعالیٰ نے کئی باتیں بیان فرمائیں ایک تو یہ کہ شیطان تمہارا بہت پرانا آبائی دشمن ہے اس سے بہت بچنا چاہئے دوسرے یہ کہ گناہ کا مقصد یہ ہے کہ جنتی کپڑے بدن سے اتر جائیں اور لیسر بیہما لام عاقبت کا ہے یعنی انجام شیطان کے کہنا ماننے کا یہ ہوا کہ آدم و حوا کو ان کا ستر دکھلا دے اس میں ایک باریک مسئلہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہے کہ آدم و حوا علیہما السلام دونوں میاں بیوی ہیں اور یہ بھی کہ اپنا بدن دیکھنا جائز ہے اور نیز اپنی بیوی کا بدن دیکھنا بھی جائز ہے پھر اس میں کیا حرج تھا کہ آدم و حوا نے آپس میں اپنا دوسرے کا بدن دیکھا انجام تو کوئی ایسا امر بیان فرمانا چاہئے تھا کہ جو کوئی امر مذموم ہوتا یہ تو امر مباح ہے تو بات یہ ہے بعض مباحات ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے انسان کو طبعی نفرت ہوتی ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آدم و حوا علیہما السلام کا گناہ خطا اجتہادی تھی گناہ نہیں تھا لیکن فحوائے مقربان را بیش بود حیرانی عتاب

اس پر ہوا کہ عزم اور احتیاط کا درجہ کیوں فرو گذاشت ہو اس لئے اس کا انجام و اثر بھی ایسا ہی امر ہوا کہ وہ فی نفسہ مباح تھا قبیح و شنیع نہیں تھا لیکن ان کی شان کے خلاف تھا یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدم و حوا تقدس کے اس درجہ میں تھے کہ ان کے لئے یہ امر مباح بھی باعث تکدر ہو اور نیز یہ مسئلہ بھی مستفاد ہوا کہ اراء عورة زوجین میں گوجائز ہے لیکن ادب کے خلاف ہے۔ اور بلا ضرورت ایسا کرنا نامناسب ہے۔

قُلْ مَنْ حَزَمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ

الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ

الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نَفِصِلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۱۵۳﴾

ترجمہ: آپ ﷺ کہڑوں کو جن کو اس اللہ نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ یہ اشیاء اس طور پر کہ قیامت کے روز بھی خالص رہیں دنیوی زندگی میں بھی خاص اہل ایمان ہی کے لئے ہیں۔ ہم اس طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

دنیا کی نعمتوں کو اہل ایمان کیلئے پیدا کیا گیا

دیکھئے یہاں کافروں کا ذکر ہی نہیں اس سے معلوم ہوا کہ حیات دنیا میں بھی یہ نعمتیں اصل میں اہل ایمان ہی کے لئے پیدا فرمائی گئی ہیں اور ان کو انہیں کے طفیل میں مل جاتی ہیں مگر اہل ایمان کے لئے ان طیبات کا خاص ہونا مقید ہے ایک قید کے ساتھ اور وہ یہ ہے خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی اس قید کی ساتھ ان کے لئے مخصوص ہیں کہ قیامت کے روز بھی خالص رہیں کہ دورات سے تو مومنین کے ساتھ یہ نعمتیں حیات دنیا میں اس طرح خاص ہیں کہ وہ ان کو اس طرح برتیں کہ وہ قیامت میں بھی کہ دورات سے خالص رہیں اور ان سے وہاں کوئی ضرر نہ ہو اور کفار جو ان چیزوں کو برتتے ہیں تو وہ اس قید سے نہیں برتتے پس خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ کے مصداق مومنین ہی ہیں جو برتنے میں یہ قید بھی ملحوظ رکھتے ہیں پھر جو اس کی تحریم کا اعتقاد رکھے اس کی اللہ تعالیٰ ہی مذمت فرماتے ہیں پھر آگے فرماتے ہیں کہ اور کون سی چیزیں ممنوع ہیں قُلْ إِنَّمَا حَزَمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ وَإِلَهُمُ الْبَغِيُّ يُغَيِّرُ السُّقُوتَ وَأَنْ تَرْكَبُوا بِاللَّهِ مَا لَكُمْ يُنَزِّلُ بِهِ سُلْطٰنًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ

مَا لَا تَعْلَمُونَ غرض ان سے بچو کھانے پینے سے کس نے منع کیا ہے۔ دیکھئے قرآن کی تو یہ تعلیم ہے تو اس تفسیر کے سمجھنے سے پہلے خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ کی ترکیب میں میں بہت پریشان تھا اللہ کا شکر ہے کہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آ گیا کہ مومنین کی تخصیص اس قید کے ساتھ ہے کہ ان کے لئے قیامت کے روز بھی یہ نعمتیں کدورات سے خالی اور بے خطر ہوں گی۔ یہ بات اور کسی کو نصیب نہیں پس یہ حال ہے اور حال قید ہوتی ہے۔ عامل کی

زینت کی دو قسمیں

ایک روز سالکین میں سے ایک شخص سیاہ پانجامہ اور سیاہ عمامہ اور سیاہ صدری پہن کر آئے جو کہ ہیئت تزئین کی تھی مولانا نے فرمایا کہ تم لوگ جس غرض کے لئے یہاں آئے ہو یہ وضع اس کے مناسب نہیں بالکل اس کے بالک خلاف ہے اس ہیئت سے تکبر کی شان پیدا ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑے رئیس ہیں پھر فرمایا کہ صدری پہننے کی کیا غرض ہے سوائے اس کے کہ زینت ہو خاص کر اس وقت کہ گرمی کا بھی وقت ہے اس شخص نے اقرار کیا کہ میں نے زینت کے لئے پہنی ہے فرمایا کہ جاؤ اور اس وضع کو بدلو اور فرمایا کہ حدیث میں آیا ہے الْبِذَاذَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ یعنی سادگی ایمان کی بات ہے اس طرف کسی کو خیال نہیں ہوتا اور فرمایا کہ یہ ہیئت اگر چہ نصاب مذموم نہیں ہے لیکن وجدان سلیم سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کون سی ہیئت کس نیت سے بنائی ہے فرمایا کہ لباس فاخر اگر اپنی تفریح و طبع کے لئے ہو تو جائز ہے اور وہ اس آیت کے تحت میں داخل ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ لِلّٰهِ الْاَتْمَنِ الْاَخْرَجَ لِيُجَاوِزَ الْاَلْحَ اور اگر فاخر عند الناس کی غرض سے ہو تو حرام ہے اور اس آیت کے تحت میں داخل ہے وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ اس تقریر سے معلوم ہوا کہ زینت کی دو قسمیں ہیں۔

قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی اے محمد ﷺ آپ فرمادیجئے کہ یہ نعمتیں اہل ایمان کے لئے ہیں دنیا میں اس سے معلوم ہوا جب ہمارے لئے تیار کی گئی تو ہم اگر نہ کھائیں گے تو یقیناً یہ نامرضی اور غیر پسندیدہ ہوگا۔

دیکھو اگر کوئی میزبان بڑے اہتمام سے مہمان کے لئے کھانے تیار کرائے اور وہ مہمان نہ کھائے تو میزبان کا دل ضرور ناخوش ہوگا۔

انتفاع طیبات

یہاں پر ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں تو مومن اور کافر سب کے لئے ہیں پھر یہ کیوں فرمایا۔ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اس کا جواب موقوف ہے اس آیت کی ترکیب سمجھنے پر اس آیت کی ترکیب میں بہت سے اقوال ہیں اور ان اقوال ہی کے اعتبار سے تفسیر بھی آیت کی بدلے گی میرے ذہن میں جو اس آیت کی ترکیب و تفسیر آتی ہے وہ یہ ہے کہ خالصہ حال ہے مہمی ضمیر مقدر سے جو مہمی مفلوظ کی خبر ثابۃ

میں مقدر ہے اور فاعل ہے ثابتہ کی اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حال ذی الحال کے لئے بمنزلہ قید کے ہوتا ہے پس یہ تخصیص مومنین کی مطلق انتفاع کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ مطلق انتفاع تو عام ہے مومن و کافر سب کو پس یہ تخصیص انتفاع کی اس قید خالصۃً یَوْمَ الْقِيَامَةِ کے لحاظ سے ہے مطلب یہ ہے کہ یہ طیبات جس حال میں کہ کدورات و جمعات و معاقبات قیامت سے خالص ہوں یہ مومنین کے ساتھ دنیا میں مخصوص ہیں اور کفار جو ان سے متمتع ہوتے ہیں وہ معاقبات و جمعات قیامت کے ساتھ مشوب ہیں یعنی مومنین کو ان طیبات کے متعلقہ کوئی سزا و عقاب نہ ہوگا اور کفار کو ہوگا اور یہ خلوص عن العقاب تو آخرت کے اعتبار سے ہے جو یہاں مذکور ہے باقی مشاہدہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں بھی خالص لذت از کدورت مومنین ہی کے لئے ہے اور کفار کے لئے کدورت سے خالی نہیں گوان کو اس کدورت کا احساس نہ ہو اور غایت بے حسی سے ان کی ایسی مثال ہو گئی ہے جیسے ایک شخص کل مثلاً پھانسی ہوگی آج سلطان وقت کی طرف سے اس کو کھانے پینے کو دیا جا رہا ہے اور اس کو خبر نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور مومنین کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ ان سے راضی ہے اور ان کو اپنی عطا سے سرفراز فرما رہا ہے پس اب واضح ہو گیا کہ طیبات کو اللہ تعالیٰ نے مومنین ہی کے لئے پیدا کیا ہے پس ترک کرنا ان کا افضل نہ ہوا بلکہ کھانا ہی افضل ہے اور اسی واسطے اس سے پہلے جو کَلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ہے اس کے معنی میرے نزدیک یہ ہے ولا تسرفوا عن حدود الشرع ای تحریم الحلال غرض سیاق و سباق دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تنگی نہیں ہے بلکہ توسیع ہے خوب کھاؤ پیا اگر حلال کو حرام سمجھو گے تو اسراف ہو جاوے گا مجھ کو اس تفسیر پر بالکل اطمینان ہے اس لئے اسی کو میں نے اپنی تفسیر میں اختیار کیا ہے یہاں تک ذکر تھا ان چیزوں کا جو حلال تھیں اور وہ لوگ ان کو حرام سمجھتے تھے اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حصر اضافی مراد ہے یعنی اے اہل مکہ وہ اشیاء حرام نہیں جن کو تم حرام کرتے ہو بلکہ میرے رب نے تو وہ چیزیں حرام کی ہیں جن کو تم حلال سمجھتے ہو یہ مطلب نہیں کہ یہی چیزیں حرام ہیں اور کوئی اور شے حرام نہیں ہے۔

مفتاح سعادات

اور ربی میں عجیب رحمت کا ظہور ہے وہ یہ ہے کہ حرم سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اشیاء مرغوب نفس کو ہم سے روکتے ہیں تو اس میں محبت کی کمی کا شبہ ہو سکتا تھا جیسے کوئی کہے کہ دیکھو جی ایک روپیہ لینا زیادہ مت لینا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کم ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جو حرم فرمایا تو بس بدگمانی معلوم ہوتی ہے ہماری آزادی سلب کی جاتی ہے حالانکہ

بدگمانی کردن و حرص آوری کفر باشد نزد خوان مہتری

پس ربی سے اس کو دفع فرماتے ہیں کہ ارے وہ حرام کرنے والی ایسی ذات ہے جس نے تم کو پالا ہے تمہارا ربی ہے تمہارا وجود نہ تھا وہ تم کو وجود میں لایا ہے تم تھے اور پھر تم پر رحمت فرمائی۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ وَإِلَٰثِمَ

وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطٰنًا

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۵۷﴾

ترجمہ: آپ ﷺ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو ان میں جو اعلانیہ ہیں وہ بھی اور ان میں جو پوشیدہ ہیں وہ بھی اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ تعالیٰ نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کو تم نہیں جانتے۔

شان نزول

سبب نزول اس کا ایک خاص قصہ ہے وہ یہ ہے کہ اہل جاہلیت میں منجملہ دیگر رسوم جہالت کے یہ بھی ایک بے حیائی کی رسم تھی کہ وہ بیت اللہ شریف کا برہنہ طواف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نافرمانی کرتے ہیں ان میں طواف نہیں کرتے دیکھئے ظاہر میں تو کیسی خوبصورت بات ہے لیکن ان احمقوں نے جہالت میں یہ نہ سمجھا کہ برہنہ طواف کرنے میں کس قدر بے حیائی اور بیت اللہ شریف کی بے ادبی ہے۔

اہل نظر کو گناہ کا ادراک ہو جاتا ہے

اور نیز کپڑوں کے اتارنے سے کیا ہوتا ہے چاہئے کہ کھال اتار دیا کریں اس لئے کہ اصل اثر تو گناہ کا بدن کے اندر ہے گو اس شخص کو ادراک اس کا نہ ہو چنانچہ بعض اہل نظر آنکھ کی پتلی کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ شخص بدنکاحی میں مبتلا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ پڑھ رہے تھے چند آدمی آئے اور وہ کسی کو بری نظر سے دیکھ کر آئے تھے آپ نے فرمایا کہ کیا حال ہے لوگوں کا کہ مسجد میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ صحابہ کی شان تو بڑی ہے طاعت کا نور اور معصیت کی ظلمت گورے چٹے یا کالے ہونے پر موقوف نہیں وہ نور و ظلمت دوسرا ہے بعضے لوگ رنگ کے کالے ہوتے ہیں لیکن چہرہ پر ان کے ایسا نور طاعت چمکتا ہے کہ بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں حق تعالیٰ نے اسی نور کی نسبت ارشاد فرمایا ہے۔ **يَسِيئَاتِهِمْ فِي وُجُوهِهِمْ قُرْنَ اَثْرُ السُّجُودِ** اور

مولانا اسی نور کی نسبت فرماتے ہیں۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی نیک میں باشی اگر اہل دلی

(ولی کے اندر نور حق ہوتا ہے اگر تو اہل دل ہے تو تو بھی اس نور کو دیکھ لے)

غرض گناہ کا اثر کپڑوں پر اتنا نہیں ہوتا جس قدر کہ بدن میں ہوتا ہے تو اگر ایسا ہی ادب تھا تو بدن سے کھال اتارنا چاہئے تھا اور جن اعضاء سے گناہ کئے تھے ان کو پارہ پارہ کرنا تھا اور وہ اپنی اس بے حیائی کی نسبت یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا ہے۔

زینت کا لباس پہننے کی اجازت

حق تعالیٰ اس سب کا رد فرماتے ہیں اول بطور تمہید ارشاد ہے **يَذَرْنِي اَدْمًا مَّقْدِرًا لِّمَا عَلَيَّ كَمَا لَبِاسًا اَوْ اَبْرًا** **سَوَاتِرِكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ** یعنی اے اولاد آدم ہم نے تم پر لباس اتارا ہے جو تمہارے شرمگاہوں کو چھپاتا ہے اور زینت کا لباس بھی اتارا ہے حق تعالیٰ کی رحمت تو دیکھئے کہ کس قدر ہے گویا ارشاد ہے کہ ارے ظالمو اللہ تعالیٰ کپڑے اتارنے کی اجازت تو کیا دیتے انہوں نے تو تمہارے لئے زینت کا لباس عطا فرمایا ہے اور زینت کی بھی اجازت دی ہے سبحان اللہ کیا بلاغت ہے آگے لباس کی مناسبت سے ایک دوسرے مہتمم بالشان لباس کی طرف انتقال فرماتے ہیں اور اس کی اطلاع دیتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے **وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَيْرٌ** یعنی جبکہ ہم لباس باطنی کے اتارنے کو پسند نہیں کرتے جس کا اتارنا اعلانیہ بے حیائی بھی نہیں تو اس لباس ظاہر کے اتارنے کو کیسے پسند کریں گے اور نیز اس تمہاری حرکت سے لباس حقیقی و لباس ظاہری دونوں اترتے ہیں۔ کیونکہ ظاہری لباس کا اتارنا تقویٰ میں بھی نخل ہے اس مضمون کو حق تعالیٰ نے **اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ لِبَاسًا** میں ایک عام اور عقلی عنوان سے ذکر فرمایا ہے کہ جس سے یہ مسئلہ عقلی ہو گیا حاصل اس کا یہ ہے کہ لباس کو جب ہم نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے یعنی یہ امر فطری ہے تو فطرۃ بھی عقل اس کو گوارا نہیں کرتی کہ اس کو اتارا جاوے اور اس کے ضمن میں تقویٰ کی تاکید جو کہ اصل مبحث ہے قرآن شریف کا اور روح ہے شریعت کی نیز بعنوان لباس ایک نہایت عجیب طریقہ ہے **وَلِبَاسُ التَّقْوٰی** میں ارشاد فرمائی کہ جس میں لفظاً بھی رعایت مقصود مقام کی رہی گویا نہ جزی مقصود کو چھوڑا اور نہ کلی مقصود کو اس میں بے حد بلاغت ہے کہ زبان اس کے بیان سے کوتاہ ہے اگر اہل علم غور کریں گے تو سمجھ لیں گے یہاں تک تو لباس سے اپنے بدن کو چھپانے کو محبوب عند الحق ہونے کا بیان تھا۔ اب آگے نزع لباس کا محبوب عند الشیطان ہونا بیان فرماتے ہیں۔ **يَذَرْنِي اَدْمًا لَا يَفْتِنُكَ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَ اٰبُوۡنَا اٰدَمَ مِنَ الْجَنَّةِ يٰۤاٰدَمُ اَنْزَعْ عَنۡهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا اِنَّ يٰۤاٰدَمَ هُوَ وَاٰلُ قَبِيْلَتِهٖ اٰمِنٌ حٰثِرٌ لِّاٰتِوَابِهِمْ** یعنی اے بنی آدم تم کو شیطان گمراہی میں نہ ڈالے جیسا کہ تمہارے ماں باپ کو اس نے جنت سے نکالا یعنی ایسا کام کرایا جس سے وہ جنت سے نکلے اور اس

حالت میں کہ ان سے ان کا لباس اتارنا تھا تاکہ ان کو ان کے مستور بدن دکھائے اس میں حق تعالیٰ نے کئی باتیں بیان فرمائیں ایک تو یہ کہ شیطان تمہارا بہت پرانا آبائی دشمن ہے۔ اس سے بہت بچنا چاہئے دوسرے یہ کہ گناہ کا مقتضی یہ ہے کہ جتنی کپڑے بدن سے اتر جائیں اور لیر بھما میں لام عاقبت کا ہے یعنی انجام شیطان کے کہنا ماننے کا یہ ہوا کہ آدم و حوا علیہم السلام کو ان کا ستر دکھلا دے اس میں ایک باریک مسئلہ کی طرف اشارہ ہے کہ آدم و حوا علیہما السلام دونوں میاں بیوی ہیں یہ بھی ہے کہ اپنا بدن دیکھنا جائز ہے اور نیز بیوی کا بدن دیکھنا بھی جائز ہے پھر اس میں کیا حرج تھا کہ آدم و حوا علیہما السلام نے آپس میں اپنا یا دوسرے کا بدن دیکھا یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ آدم و حوا تقدس کے اس درجہ میں تھے کہ ان کے لئے یہ امر مباح بھی باعث تکدر ہوا اور نیز یہ مسئلہ بھی مستفاد ہوا ارادة سورة زوجین کو جائز ہے مگر ادب کے خلاف ہے۔ بوقت محبت اللهم جنبنا الشيطان و جنب الشيطان ما رزقتنا اور کوئی سمجھے اس دعا پڑھنے میں شیطان کا خیال ضرور آئے گا بات یہ ہے کہ ایک تو کسی شے کا خیال اس کو مقصود و مرغوب بنا کر لانا ہے اور ایک مہرب عنہ بنا کر دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس دعا کا حاصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا گیا ہے کہ اے اللہ ہم کو اور ہماری اولاد کو شیطان سے بچائیے تو اس کا تصور بحیثیت تفر کے ہوا۔ پس اثر اسی کے مناسب ہو گا چنانچہ اس دعا کا اثر یہ آیا ہے فانہ لن یضرہ الشیطن یعنی شیطان اس کو ضرر نہ پہنچائے گا اولاد پاک اور مقدس ہوگی اور یوں اپنے ہاتھوں بگڑیں وہ دوسری بات ہے پس ہم کو اس تصویر کے ہوتے ہوئے کسی اور تصویر کی حاجت نہیں بہر حال بیوی کو برہنہ دیکھنے سے اخلاق پر اولاد کے اثر پڑتا ہے اور اس میں آدم و حوا کے رتبہ کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔

لفظ قل لانے میں حکمت

آگے اس تمہید کے بعد صریح عنوان عام میں ان کا ذکر فرماتے ہیں وَلَئِن لَّمْ يَظُنُّوا فَاحِشَةً كَالَّذِينَ جَدُّنَا عَلَيْهَا الْبَلَاءَ نَا وَاللَّهُ أَمْرًا بِمَا قُلْنَا إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ یعنی جب وہ کوئی بے حیائی کی بات کرتے ہیں جیسے برہنہ طواف کرنا تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اس پر پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کا حکم کیا ہے آپ فرمادیتے کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں فرماتے آگے ارشاد ہے۔ قُلْ أَمْرًا بِالْقِسْطِ الخ اس میں مامورات کی تقسیم ہے اور قل سے اشارہ نہایت اہتمام کی طرف ہے اس لئے کہ حضور ﷺ تو بغیر قل کے بھی تبلیغ فرماتے پس قل لانا نہایت اہتمام کی دلیل ہے۔

مامورات کی تین قسمیں

قسط میں حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے اور اَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ میں حقوق اللہ آگے اور

مجاہدہ میں غلو مذموم ہے

قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا بِعِزَّةِ اللَّهِ وَالْحَمْدِ لَكُمْ فِيهَا مَعَاذٌ مِنَ النَّارِ وَرِزْقٌ كَثِيرٌ وَسَبْحٌ مُبَارَكٌ لِقَدَرِ الْوَقْتِ لَكُمْ فِيهَا مَعَاذٌ مِنَ النَّارِ وَرِزْقٌ كَثِيرٌ وَسَبْحٌ مُبَارَكٌ لِقَدَرِ الْوَقْتِ لَكُمْ فِيهَا مَعَاذٌ مِنَ النَّارِ وَرِزْقٌ كَثِيرٌ وَسَبْحٌ مُبَارَكٌ لِقَدَرِ الْوَقْتِ

لئے ہیں دنیا میں اس سے معلوم ہوا کہ ترک کرنا مناسب نہیں بلکہ افضل و اولیٰ استعمال ہی کرنا ہے اس لئے کہ جب ہمارے لئے طیار کی گئی تو ہم اگر نہ کھائیں گے تو تھینا یہ نامرضی اور غیر پسندیدہ ہوگا دیکھو اگر کوئی میزبان بڑے اہتمام سے مہمان کے لئے کھانے تیار کرے اور وہ مہمان نہ کھائے تو میزبان کا دل ضرور ناخوش ہوگا۔

اشیاء حرام کی پانچ اقسام

اب آگے آیت میں چند چیزیں مذکور ہیں جن پر تحریم وارد ہوئی ہے فواحش اثم نہیں شرک اَنْ تَقُولُوا عَلٰى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ظاہر میں تو یہ پانچ قسمیں ہیں لیکن جیسے اوامر کی تین قسمیں تھیں واقع میں یہ پانچ بھی تین قسموں کی طرف راجع ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اوامر میں پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کل تین قسمیں ہیں۔ عقائد حقوق اللہ حقوق العباد یہاں بھی یہی قسمیں ہیں فواحش ما ظہر ہوں یا ما بطن ہوں اثم میں داخل ہیں اور اثم کا اطلاق اعمال متعلقہ دیانات پر زیادہ آتا ہے۔ اس لئے یہ حقوق اللہ ہوئے یعنی ان کا ارتکاب کرنے سے اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور نبی کے معنی کسی پر ظلم کرنا ہے یہ حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے اور ان نشر کو ان میں ان کے عقائد فاسدہ آگئے۔ باقی فواحش کو جدا گانہ لائے حالانکہ الاثم کے اندر داخل ہے اس لئے کہ خصوصیت مقام اور سبب نزول اس کو مقتضی ہے اور نیز اسی اہتمام کی وجہ سے اس کی تقسیم بھی فرمائی۔

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ - مَا ظَهَرَ میں تو کھلی بے حیائی داخل ہے جیسے برہنہ رہنا اور برہنہ طواف کرنا اور ما بطن میں وہ بے حیائیاں ہیں جو چھپ کر کرتے تھے جیسے زنا کرنا اور اَنْ تَقُولُوا عَلٰى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ کا فساد عقیدہ ہے اس لئے یہ بھی حکماً ان نشر کو داخل ہے یہ تو تفسیر ہے الفاظ آیت کی اس آیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے سب قسم کے گناہ اور سب زمانوں میں حرام فرمائے ہیں۔ رمضان شریف کی کوئی تخصیص نہیں مگر فرق اتنا ہے کہ رمضان المبارک میں حرمت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ جیسے کہ شرف مکان و زمان سے نیکی کا ثواب بڑھ جاتا ہے اسی طرح گناہ کے اندر بھی شدت زیادہ ہو جاتی ہے بعضے گناہ اور بھی ہیں جو ان نشر کو باللہ (یعنی اللہ کا شریک کرنا اور اَنْ تَقُولُوا عَلٰى اللّٰهِ یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنا کے اندر داخل ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ مومنین میں نہیں ہیں کفار ہی کے اندر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کفار جیسے کفر کے اندر شدت سے اسی طرح ان کے اندر یہ گناہ بھی اعلیٰ درجہ میں تھے اور مومنین کے اندر بھی ان کی حقیقت پائی جاتی ہے گو اس درجہ کی نہ ہو مثلاً وہ قصد اشْرک کرتے تھے اور مسلمان قصد سے شرک نہیں کرتے گو لازم آ جاوے مثلاً نذر غیر اللہ

ترجمہ: اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تمہارے میں سے کچھ رسول آئیں جو میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھیں تو پھر جو شخص (ان کے حکم کے موافق) تقویٰ اختیار کرے اور (اعمال کی) اصلاح کریگا ان پر کچھ اندیشہ نہ ہوگا۔ نہ وہ غمگین ہوں گے (سورہ اعراف رکوع ۳۷)

خطابات قدیم

اس آیت کے الفاظ پر نظر کر کے بعض اہل باطل نے استدلال کیا ہے کہ ارسال رسل کا باب منقطع نہیں ہوا۔ کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ جملہ بنی آدم کو جن میں امت محمدیہ بھی داخل ہے خطاب فرما رہے ہیں کہ اگر تمہارے پاس رسول آئیں اگر باب رسالت مسدود ہو چکا ہے تو اب اس قسم کے خطاب کے کیا معنی ہوئے یہ اشکال اس لئے ہوا کہ ان لوگوں نے محض اسی آیت کے الفاظ کو دیکھا اگر سابق پر نظر کی جائے تو پھر قصہ بہل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ اوپر سے آیات میں نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے اوپر آدم علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے کہ وہ پیدا کئے گئے پھر جنت میں رکھے گئے۔

پھر وہاں سے زمین پر اتارے گئے اور اس وقت آدم علیہ السلام کو اور ان کی ذریت کو کچھ خطابات ہوئے چنانچہ قَالَ أَهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۗ قَالَ فِيهَا تُخَيَّوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَفِيهَا تُخْرَجُونَ ۗ میں آدم ذریت آدم دونوں کو خطاب ہے اسی وقت اولاد آدم کو خطاب ہوا ہے اسی وقت کے خطاب کا یہ بھی ترجمہ ہے يٰبَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُؤَارِي سَوَاتِكُمْ وَرِيشًا ۗ وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ذَٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ يَذَكَّرُونَ ۗ يٰبَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسًا لَّهُمَا سَوْآتُهُمَا (الایہ) يٰبَنِي آدَمَ إِنَّمَا يَلْتَمِزُكُمُ الرَّسُولُ فَمَنْ مِنْكُمْ مِنْكُمْ مِمَّنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۗ اس خطاب میں بجز اس وقت کا خطاب ہونے کے اور کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا پس ایسے ہی یہاں بھی یہ خطاب يٰبَنِي آدَمَ إِنَّمَا يَلْتَمِزُكُمُ الرَّسُولُ فَمَنْ مِنْكُمْ مِمَّنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۗ سے مربوط ہے جو بیچ میں اور مضامین بھی آگئے ہیں اس کا کچھ مضائقہ

نہیں کیونکہ بات میں سے بات نکل آیا ہی کرتی ہے بلاغت کا مسئلہ ہے الکلام بحر بعضہ بعضا چنانچہ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ ایک بات کو شروع کرتے ہیں اس سے دوسری بات نکل آئی تو جہاں اس کو بھی بیان کر دیا اس کے بعد پھر دوسری بات کی طرف عود کرتے ہیں قرآن کا نزول اسی طرز محاورہ پر ہوا ہے۔ معقولین یا مصنفین کے طرز پر نہیں ہوا لہذا یہاں ربط سمجھنے اور تفسیر دریافت کرنے کے لئے دور تک آیات کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لطف تفسیر کا اسی میں ہے اور اس سے سب اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ اسی حکمت کی بناء پر ہمارے حضرت حاجی صاحب نے پانی پی کر مجھے خاص خطاب کیا کہ میں اشرف علی جب پانی پیو تو خوب ٹھنڈا پینا کہ ہر بن موسیٰ الحمد للہ نکلے روز گرم پانی پینے پر زبان تو کہتی ہے الحمد للہ لیکن قلب نہیں کہتا آہ حضرت حاجی صاحب کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ آخر اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈا پانی اور گرم کھانا اپنے بندوں ہی کے لئے تو پیدا فرمایا ہے یا صرف یہود و نصاریٰ کے لئے خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده والطيبات من الرزق قل هي للذين امنوا في الحيوٰة الدنيا خالصه يوم القيمة دیکھئے یہاں کافروں کا ذکر ہی نہیں اس سے معلوم ہوا کہ حیات دنیا میں بھی یہ نعمتیں اصل میں الہ ایمان ہی کے لئے پیدا فرمائی گئی ہیں اوروں کو انہیں کے طفیل میں مل جاتی ہیں۔ مگر الہ ایمان کے لئے ان طیبات کا خاص ہونا مقید ہے۔ ایک قید کی ساتھ اور وہ ہے خالصۃ یوم القیامہ یعنی اس قید کی ساتھ ان کے لئے مخصوص ہیں کہ قیامت کے روز بھی خالص رہیں کدورات سے تو مومنین کے ساتھ یہ نعمتیں حیات دنیا میں اس طرح خاص ہیں کہ وہ ان کو اس طرح برتیں کہ وہ قیامت میں بھی کدورات سے خالص رہیں اور ان سے وہاں کوئی ضرر نہ ہو اور کفار جو ان چیزوں کو برتتے ہیں تو وہ اس قید سے نہیں برتتے پس خالصۃ یوم القیامہ کے مصداق مومنین ہی ہیں جو برتنے میں یہ قید بھی ملحوظ رکھتے ہیں پھر جو اس کی تحریم کا اعتقاد رکھے اس کی اللہ تعالیٰ ہی مذمت فرماتے ہیں پھر آگے فرماتے ہیں کہ اور کونسی چیزیں ممنوع ہیں قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن والائم والبعی بغير الحق وان تشرکوا بالله ما لم ينزل به سلطانا وان تقولوا علی الله ما لا تعلمون غرض ان سے بچو کھانے پینے سے کس نے منع کیا ہے دیکھئے قرآن کی تو یہ تعلیم ہے تو اس تفسیر کے سمجھنے سے پہلے خالصۃ یوم القیامہ کی ترکیب میں بہت پریشان تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آ گیا کہ مومنین کی تخصیص اس قید کے ساتھ ہے کہ ان کے لئے قیامت کے روز بھی یہ نعمتیں کدورات سے خالی اور بے خطر ہوں گی یہ بات اور کس کو نصیب نہیں پس یہ حال ہے اور حال قید ہوتی ہے عامل کی جس کی کافی تقریر ابھی گزری جب علماء کی یہ تحقیق قرآن مجید سے ہے تو ان پر یہ شبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ مطلقاً تحصیل دنیا سے منع کرتے ہیں مگر اس پر بھی معترضین کی یہ حالت اور جہالت ہے کہ دنیا میں کوئی کمی

ہو کوئی کوتاہی ہو کوئی پستی ہو ہر معاملہ کو مولویوں ہی کے ذمہ تھوپتے ہیں بس وہی مثل صادق آتی ہے کرے گا کوئی پنے گا کوئی، لیکن اہل علم کو اس ملامت سے رنج ہرگز نہ کرنا چاہئے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ خوش ہونا چاہئے کیونکہ تجربہ ہے کہ ملامت سے آدمی دین میں زیادہ پختہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ حمیت ضد اور بیچ انسان کا طبعی امر ہے۔ جب چاروں طرف سے لتاڑ پڑتی ہے تو اپنی بات کی بیچ پڑ جاتی ہے کہ اب تو یہی کریں گے اس لئے لوگوں کی ملامت سے علماء کو دل گیر نہ ہونا چاہئے اس سے ان کا دین پختہ ہو جائے گا۔ میں نے تو اسی ملکہ پر نظر کر کے ایک خاص علاج کیا تھا جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ ایک بریلی کے خان صاحب کا پوتا علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا۔ خان صاحب نے میرے سامنے اسے پیش کیا کہ یہ نماز نہیں پڑھتا اس کو سمجھا دیجئے میں نے بلا کسی تمہید کے سادگی اور ہمدردی کے ساتھ پوچھا کہ بھائی تم نماز کیوں نہیں پڑھتے تو اس نے بے تکلف کہا کہ بیچ کہہ دوں میں نے کہا ہاں بیچ ہی کہہ دو کہنے لگا بات یہ ہے کہ میں خدای کا قائل نہیں نماز کس کی پڑھوں اور اس کہنے کے ساتھ ہی رونے لگا اور کہنے لگا کہ اس کے ذمہ دار خود میرے والدین ہیں جنہوں نے شروع ہی سے مجھے انگریزی میں لگا دیا اور دین کی کوئی تعلیم ہی نہ دی میں نے خان صاحب سے کہا کہ ابھی آپ تو نماز کو لئے پھرتے ہیں اس شخص میں تو ایمان بھی نہیں پہلے اس کے ایمان کی فکر کیجئے خواہ بے نمازی ہی ہے۔ وہ بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ اس کا کیا علاج میں نے کہا کہ اس کا علاج تو ہے لیکن اگر اس کی لم نہ پوچھی جاوے اور بلا دلیل اس پر عمل کیا جاوے تو بتاؤں انہوں نے یہ شرط مان لی میں نے کہا کہ ان کو علی گڑھ کالج سے ہٹا کر کسی سرکاری سکول میں داخل کرادیا جاوے چنانچہ انہوں نے یہی کیا تقریباً سال بھر کے بعد پھر جب بریلی جانے کا اتفاق ہوا وہ پھر ملے اور بیان کیا کہ اب وہ لڑکا پکا دیندار اور نمازی ہو گیا اس وقت خان صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب تو اس کی وجہ بتا دیجئے میں نے کہا کہ علی گڑھ کالج میں تو سب آزاد خیال مسلمان ہی لڑکوں کا مجمع تھا آزادی سے جو چاہتے تھے بک دیتے تھے۔ اسلامی کے جذبہ کا کوئی محرم نہ تھا جب سرکاری سکول میں داخل ہو گیا تو وہاں زیادہ تر ہندوؤں کے لڑکوں سے سابقہ پڑا اور ان میں عادت چھیڑ چھاڑ کی ہوتی ہے وہ مذہبی گفتگو اسلام کے خلاف کرتے تھے۔ یہ حمیت قوی میں جواب دیتا تھا اس ضد میں آ کر یہ دین پر پختہ ہو گیا اس کو سن کر خان صاحب کہنے لگے کہ جی ہاں یہ ہی واقعہ بھی ہے پھر تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ اس نے مجھ سے بیعت ہونے کی درخواست کی گو میں نے مرید نہیں کیا کیونکہ میں ایسی جلدی کسی کو بیعت نہیں کیا کرتا مگر وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا تو میری اسی پر نظر ہو گئی کہ انسان کے اندر بیچ کا مادہ ہے چنانچہ اس موقع پر یہ بیچ ہی کام آئی جو ملامت اور اعتراض سے ابھری تو علماء کو بھی جہلاء کے ملامت سے بدل نہ ہونا چاہئے اور اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی دیکھیری ہے کہ اس کے لئے جو تجویز نافع تھی وہ ہی ذہن میں آئی حالانکہ بظاہر یہ الٹی سی

بات تھی اور قبل عمل دوسروں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی اسی لئے میں اس پر تفریحاً یہ ایک بات بھی کہا کرتا ہوں کہ جس پر اعتماد ہو اس سے قبل و قال نہیں کرنا چاہئے کہ اس کی کیا وجہ اس کی کیا وجہ اگر مریمس طیب سے ہر نسخہ کی وجہ پوچھے گا تو طیب بدل ہو جائے گا البتہ اگر کسی طیب پر اعتماد نہ رہے تو اس کو چھوڑ دینا تو برا نہیں لیکن اس سے ہر درد و اکی وجہ پوچھنا یہ بالکل خلاف معمول ہے اور ہرگز مناسب نہیں اب آپ اسی علاج کو دیکھئے جو اس لڑکے کا میں نے کیا بھلا آپ عقلاء زمانہ سے سن تو لیں یہ علاج جس اس کی مرض کی لم منجانب اللہ سمجھ میں آگئی مگر یہ بھی نہیں ہے کہ ہر جگہ اسی علاج کو برتنے لگے بعض جگہ یہی بیخ معزز بھی ہو جاتی ہے یہ طیب ہی کا کام ہے کہ نبض دیکھ کر ذوقی طور پر مرض کی تشخیص کرے تشخیص ایک ذوقی چیز ہے اسی طرح امراض روحانی کی تشخیص بھی ایک ذوقی چیز ہے۔ (ملاحظاۃ الیوم ص ۱۰۷)

وَنَادَى أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَ نَاهُمْ لِيَسْمِعَهُمْ قَالُوا مَا آغَى

عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿۹۱﴾

تَسْتَكْبِرُونَ: اور پکاریں گے اعراف والے ان لوگوں کو کہ ان کو پہچانتے ہیں ان کی نشانی سے کہیں گے نہ کام آئی تمہارے جماعت تمہاری اور جو تم تکبر کہا کرتے تھے۔

تفسیری نکات

اہل اعراف

بہر حال قرآن محاورہ پر نازل ہوا ہے محاورہ کے موافق کسی کافر کو عذاب خفیف نہیں ہوگا کیونکہ محاورہ میں خفیف دعی ہے جس کی برداشت ہو سکے اور وہاں برداشت نہیں ہوگی۔ اسی معنی کو ہلکا کسی کا بھی عذاب نہ ہوگا۔ نیز یہاں دنیا میں تو کسی کو کوئی تکلیف زیادہ دنوں سے ہو تو کچھ دنوں کے بعد ایک عادت سی ہو جاتی ہے اس سے برداشت ہونے لگتی ہے مگر وہاں یہ بھی نہیں ہو سکے گی۔ کَلِمًا نَقِيبًا جَلْدًا هُمْ يَكْتُمُونَ جَلْدًا غَيْرَهَا یعنی وہاں ایک کھال ہی نہ رہے گی بلکہ جہاں ایک گلی معاد دوسری کھال نئی پیدا کر دی جائے گی تاکہ احساس زیادہ ہو ورنہ پہلی کھال جلتے جلتے عادت ہو جاتی پھر تکلیف نہ ہوتی مگر وہاں تو یہ بھی نہیں آگے تبدیل کی وجہ بتلاتے ہیں لِيَسْمِعُوا الْعَذَابَ تاکہ عذاب کو چکھیں بلکہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ يَذُوقُوا الْعَذَابَ فَاتُفَوِّقُ الْعَذَابَ یعنی عذاب زیادہ ہی ہوتا چلا جائے گا مگر پھر بھی شدید و اشد کافرق ضرور ہوگا گوئی تخفیف مشترک ہو تو کسی مسلمان کی نیکیاں جو کافر کو ملیں گی یہ نہیں کہ وہ عبت اور بے کار ہوں گی نہیں ہر چیز کا ایک اثر ہے ان سے عذاب میں کچھ کمی

ہوگی مگر اس کی سے وہ خفیف نہ ہوگا لہذا نہ اس کا بھلا ہوانہ اُس کا بھلا۔ اور اگر مسلمان کو یہ نیکی ملتی تو نفع ہوتا اس واسطے کہ قیامت میں تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ جن کی نیکیاں زیادہ ہوں اور بدی کم ہو وہ تو جنتی ہے اور ایک وہ جن کی نیکی کم اور بدی زیادہ وہ دوزخی ہے۔

تیسرے وہ جن کی نیکی اور بدی دونوں برابر ہوں گی وہ اہل اعراف ہیں چنانچہ ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں اہل اعراف وہ ہیں کہ من استوت حسناتہ و مسیناتہ چند روز اعراف میں رہ کر ان کی نجات ہو جائے گی کیونکہ جب بہت سے اہل نار کو نجات ملے گی اور وہ جنت میں داخل ہوں گے تو اہل اعراف کو تو بدرجہ اولیٰ نجات و دخول جنت ہونا چاہئے۔

کفار ذی اخلاق کے اہل اعراف ہونے کی کوئی دلیل نہیں

بعض لوگوں نے بلا دلیل کہہ دیا کہ اعراف میں کفار ذی اخلاق جائیں گے اور ان میں سے نوشیرواں اور رستم اور حاتم کو بھی شمار کر لیا ہے کیونکہ نوشیرواں عادل تھا اور رستم شجاع اور حاتم کی سخاوت کے سبب ہی معتقد ہیں مگر یہ سب واہیات ہے اس کی کچھ اصل نہیں ہے رستم میں اول تو جو کچھ کمال ہے صرف شاہ نامہ اس کی دلیل ہے لو سنئے خود ہی شاہ نامہ والے نے اس کا فیصلہ کیا ہے کہتے ہیں کہ

منش کردہ ام رستم پہلواں دگر نہ لیے بود در سیناں

تو اس کے کمال کی حقیقت اس شعر ہی سے ظاہر ہے کہ رستم کس قدر شجاع تھا دوسرے شجاعت کا نفع تو عدل و سخاوت کے برابر بھی نہیں اب عدل و سخاوت کو سنو نوشیرواں کی بابت کہا جاتا ہے کہ بڑا عادل تھا تو دیکھنا یہ ہے کہ عدل کہتے کس کو ہیں عدل کے معنی ہیں حقوق کو حدود پر رکھنا پھر یہ دیکھو کہ حدود کیا ہیں سو حدود وہ ہیں جن کو خدا اور رسول نے بتلایا ہے کیونکہ بغیر ان کے بتلائے ہم کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ حدود ہیں یا نہیں تو جو ان حدود سے متجاوز ہوگا وہ عادل نہیں بلکہ ظالم ہے اس کو عادل کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہاں ظلم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ظالم بقصد ظلم دوسرا ظالم بلا قصد ظلم تو اگرچہ نوشیرواں ظالم بقصد ظلم تو نہیں مگر عادل بھی نہیں ہاں یہ کہہ سکتے ہو کہ نیت سے عادل تھا اور عمل سے ظالم تو نیت سے حقیقت تو نہ بدلی رہی سخاوت حاتم تو اس کے مخالف کوئی روایت اب تک نظر سے نہیں گذری۔

انفاق کے لئے محل کا ہونا ضروری ہے

لیکن یہ دیکھنا چاہئے کہ سخاوت کی حقیقت کیا ہے آیا مطلق انفاق سخاوت ہے یا اس کا کوئی محل بھی ہے اگر اس کے لئے کوئی محل نہیں تو اگر دریا میں کوئی شخص ایک لاکھ روپیہ پھینک دے تو کیا اس کو بھی سخی کہو گے حالانکہ

اس کو کوئی سخی نہیں کہتا بلکہ جاہل محض سمجھتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ انفاق کے لئے محل کا ہونا ضروری ہے اگر محل میں خرچ ہو تو سخی ہے۔ والا فلا اور محل معلوم ہوتا ہے شریعت سے جب اس کو محل ہی معلوم نہ تھا اور شریعت کی اس کو خبر ہی نہ تھی تو وہ سخی کیسے ہوا پس اول تو وہ سخی نہیں اور اگر ہو بھی تو کیا ہوا جب باغی تھا اور باغی کا کوئی کمال کمال نہیں پھر وہ سخاوت کس کام کی دیکھئے اب جو شورش ہوئی تھی اس میں اگر کوئی باغی ہوا اور وہ بہت بڑا تعلیم یافتہ تبحر عالم ہو تو کیا سرکار کے نزدیک اس کے کمال کی کوئی وقعت ہوئی تھی ہرگز نہیں بلکہ اس پر تو اور زیادہ غیض ہوا کہ جان بوجھ کر اس نے بغاوت کی ایسے ہی جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے اس کا کوئی کمال مقبول نہیں جب تک کہ ایمان نہ ہو پھر وہ دوزخ سے کیوں بچے گا اور جب اس سے نہ بچا پھر اعراف میں کیوں جائے گا بس اعراف میں تو وہی لوگ جائیں گے جن کو دوزخ سے نجات مل چکی ہے اور جنت میں جلدی جانے کا سرمایہ پاس نہیں چنانچہ ابن عباسؓ سے روایت ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور وہ روایت غیر مدرک بالقیاس ہے اس لئے وہ حکم میں مرفوع کے ہے اور اہل اعراف کی مغفرت کی ایک عام دلیل تو اوپر مذکور ہوئی ہے کہ جب اہل نار کی مغفرت ایمان کے سبب ہو جائے گی تو اہل اعراف کی بدرجہ اولیٰ ہوگی دوسری خاص دلیل قرآن کی ایک آیت ہے ایک خاص تفسیر پر وہ یہ ہے وَنَادَى الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَ نَبَهُمْ بِئِنَّهُمْ الْأَيَّةُ كَرِهُوا أَعْرَافَ يُكَارِيں گے چند لوگوں کو جن کو وہ پہچانتے ہیں ان کے نشان سے اس کے آگے ہے۔ اَدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا تَخْوَفُوا عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ایک تفسیر اس کی یہ ہے کہ قیل لهم ادخلوا الجنة کہ اہل اعراف کو کہا جائے گا کہ جنت میں چلے جاؤ تو وہ جنت میں چلے جائیں گے علماء نے اس تفسیر پر بھی نکیر نہیں کیا تو عدم نکیر (انکار نہ کرنا) سے اجماع ہوگا ان کے دخول جنت پر یہ مضمون مناسبت کے سبب مذکور ہو گیا اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کسی مسلمان کو نیکی ملے تو خیر اپنے ایک بھائی کا تو بھلا ہو گیا ممکن ہے کوئی مسلمان ایسا ہو جس کے حسنات و سیئات برابر ہوں اور وہ ایک نیکی تم سے لے کر بہشت میں فوراً چلا جائے گا۔ چنانچہ قیامت میں ایک شخص ایسا بھی آئے گا جس کی نیکی بدی بالکل برابر ہوگی کہ اگر ایک نیکی مل جائے تو وہ فوراً جنت میں چلا جائے وہ بیچارہ سب کے پاس جائے گا کوئی اسے نیکی نہ دے گا کہ تیرا تو ایک نیکی کی کمی کی وجہ سے یہ حال ہے اور یہاں تو کتنے گناہ کے انبار ہیں ہم پر نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں آنے والی ہیں ہم کیونکر نیکی دے دیں آخر اس کو ایک شخص صاحب دروٹے گا وہ کہے گا کہ میرے پاس کل ایک ہی نیکی ہے اس کو تو ہی لے جا کیونکہ جب تیرا ایک نیکی کے کم ہو جانے سے کام نہیں چلا پھر میرا ایک نیکی سے کیا بھلا ہوگا اتنے معاصی کے مقابلہ میں لے بھائی اسے تو ہی لے جا تیرا تو بھلا ہو جائے وہ نیکی لائے گا اور جنت میں چلا جائے گا اس واقعہ میں اس دینے والے کی بھی اس سخاوت کی وجہ سے بخشش ہو جائے گی کیونکہ اس نے بہت بڑی ہمت

اور ہمدردی کی تو دیکھو ایک نیکی کے مل جانے سے وہ مسلمان پار ہو گیا غرض وہاں پر نیکیاں مومنین کے کام آئیں گی کفار کو کچھ کام نہ دیں گی اس کا یہ مطلب نہیں کہ لہذا کفار کے حق دبا لینے کی بجائے مسلمانوں کے ہاں چوری شروع کر دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ چوری دعا بازی تو مسلمانوں کے مال میں بھی کرنا بہت بری بات ہے مگر کفار کے مال کی اس سے بھی زیادہ برا ہے۔

قرآن حکیم میں صرف دو فریق کا ذکر ہے

فرمایا اور اس سے بھی صاف لیجئے کہ فریق فی الجنة و فریق فی السعیر ایک فریق جنت میں ہوگا ایک فریق دوزخ میں ہوگا تو دو فریق فرماتے ہیں تیسرا فریق نہیں فرمایا اور یہ یقین ہے کہ دوزخ سے بچے رہیں گے تو اب اگر وہ جنت میں نہ جاویں تو تیسرا فریق ہونا لازم آتا ہے نہ وہ فریق فی الجنة (جنت کے فریق) میں داخل ہوئے نہ فریق فی السعیر (دوزخ کے فریق) میں اب رہی یہ بات کہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اعراف میں بھی رہیں پس تیسرے فریق کا بھی ثبوت ہوا مگر یہ شبہ بہت جلد زائل ہو جاوے گا کیونکہ اسی مقام پر فرماتے ہیں ادخلوا الجنة لا خوف علیکم ولا انتم تحزنون (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں نہ تم رنجیدہ ہو گے) اس میں دو تفسیریں ہیں۔ ایک تو وہ جو میں اختیار کرتا ہوں کہ یہ اہل اعراف کا قول ہے اور دوزخیوں کو چڑانے کے لئے اہل جنت کے بارہ میں کہیں گے۔

اہل اعراف امیدوار جنت ہوں گے

اهولاء الذین القستم لا ینالہم اللہ برحمۃ (کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کرے گا۔ قبل لہم ادخلوا الجنة الخ دیکھو انہیں تو یہ کہہ دیا گیا کہ تم جنت میں چلے جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم رنجیدہ ہو گے دوسرا ایک قول اور ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اہل اعراف کے لئے ادخلوا الجنة یعنی تم بھی جنت میں داخل ہو جاؤ سو اس آیت میں تو دونوں احتمال ہیں مگر میں دوسری آیت سے استدلال کرتا ہوں فرماتے ہیں بینہما حجاب و علی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیماہم و نادوا أصحاب الجنة ان سلام علیکم لم یدخلوا ہا وہم یطمعون (ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے السلام علیکم ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے) اس سے معلوم ہوا کہ اہل اعراف کو جنت میں داخل ہونے کی امید ہوگی اور عالم آخرت عالم انکشاف حقائق ہے وہاں غلط امید نہیں ہو سکتی دوسرا استدلال اور ہے کہ سورۃ

حدیث میں ہے فضرِبَ بَیْنَهُم بِسُورَلِہِ بَابٌ بَاطِنُہِ فِیہِ الرَّحْمَةُ وَ ظَہْرُہِ مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَابُ (پھر ان کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جاوے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا کہ اس کے اندرونی جانب میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب میں عذاب ہوگا۔)

اہل اعراف

مگر اس سے قبل سمجھتے کہ حدیث میں ہے کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ کہ ان کے حسنات زیادہ ہوں گے سینات سے وہ جنت میں جائیں گے یہ لوگ اعراف میں ہوں گے اب سنئے بسورۃ باب کو مفسرین نے بالا جماع اعراف کہا ہے تو اس کے دوزخ ہیں ایک طرف عذاب ہے اور ایک طرف رحمت ہے تو وہاں دونوں طرف کا اثر ہے اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ مومن میں سے جو جاویں گے وہ گناہوں کی سزا ملنے کے بعد جنت میں جاویں گے تو اہل اعراف جو ان سے اسلحہ حالاً ہیں وہ کیوں جنت میں نہ جاویں گے اور گنہگاروں جنوں میں ہو رہی ہے جو صالح ہوں ہاں اس کے ہم بھی قائل ہوں گے کہ جنوں میں بھی تین قسم کے لوگ ہوں گے اس میں سے ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہیں جن کے حسنات و سینات برابر ہوں گے اور وہ اولاً اعراف میں ہوں گے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر جنت میں جاویں گے اور اعراف کے متعلق ایک اور بات یاد آئی جو عوام میں مشہور ہے اور بالکل غلط ہے وہ یہ کہ رستم اور نوشیرواں اور حاتم طائی یہ سب اعراف میں رہیں گے لوگوں کی بھی عجیب حالت ہے اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں گویا یہاں محکمہ کے حاکم ہیں کہ ان کے اختیار میں ہے جس کو چاہیں بھیج دیں خوب سمجھ لو کہ اگر ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے تو محض سخاوت یا شجاعت یا عدالت کی وجہ سے جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ کسی کے اندر کتنی ہی خوبیاں خوبیاں ہوں جب تک ایمان نہ ہوگا بیکار ہیں۔ مجھے یہ شعر یاد آتا ہے۔

شاید آں نیست کہ موئے دیمانے دارد بندہ طلعت آج باش کہ آنے دارد

(محبوب وہ نہیں جو پتلی کمر اور عمدہ بال رکھتا ہو بلکہ محبوبیت ایک آن اور ادا میں ہوتی ہے)

آج کل بعض لوگ کفار کی ظاہری خوبیاں دیکھ کر ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہیں مگر سمجھئے کہ ان کا ایک ایمان سب کے مقابلہ میں ہے ان میں ایک ایمان کی آن ایسی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دوسروں کی ساری خوبیاں بیچ ہیں کیونکہ

شاہداں نیست کہ موئی دیمانے دارد بندہ طلعت آج باش کہ آنے دارد

(محبوب وہ نہیں جس کے عمدہ بال اور پتلی کمر ہو بلکہ محبوب وہ ہے جس کے ایک آن اور ادا ہو)

(اجابت الداعی بلحقتہ مواعظ جلد)

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۱﴾

ترجمہ: یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا۔

تفسیری نکات

اصطلاحات قرآن

اس میں الا تو تنبیہ کے لئے ہے اور لہ کو حصر کے لئے مقدم کیا گیا ہے کیونکہ تقدیم ماحقہ الخیر حصر کو مفید ہے اور خلق و امر کی تفسیر لفظ ظاہر ہے خلق کے معنی پیدا کرنا اور امر کے معنی حکم کرنا حاصل یہ ہوا کہ تکوین و تشریح دونوں قسم کے تصرفات اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں وہی خالق ہیں وہی حاکم ہیں پس ہر قسم کے تصرفات انہی کے لئے مخصوص ہیں یہ تو لغت کے اعتبار سے خلق و امر کی تفسیر ہے جو ظاہر بھی ہے اور صحیح بھی مگر بعض لوگوں میں یہ مرض ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات کو قرآن میں ٹھونکتے ہیں یہ بڑی جہالت ہے چنانچہ صوفیہ کی ایک اصطلاح ہے عالم مادی کو عالم خلق کہتے ہیں اور مجردات کو عالم امر جس کی تفصیل یہ ہے کہ تجرد عالم کے بارہ میں تین مذاہب ہیں متکلمین کے یہاں تو اشیاء عالم میں مجرد کوئی نہیں سب مادی ہیں اور فلاسفہ کے نزدیک بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور زیادہ مادی ہیں مگر مجردات کو قدیم مانتے ہیں تیسرا مذہب صوفیہ کا ہے کہ عالم میں بعض اشیاء مجرد بھی ہیں اور مادی بھی مگر سب حادث ہیں کوئی مجرد قدیم نہیں متکلمین نے نئی تجرد پر یہ استدلال کیا ہے کہ تجرد اخص صفات باری تعالیٰ سے ہے حکماء و صوفیہ نے اس مقدمہ کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس قول میں خود مصادره علی المطلوب ہے کہ چونکہ تم کسی شے کو مجرد نہیں مانتے اس لئے تجرد کو اخص صفات سے کہتے ہو ورنہ اس مقدمہ کی کوئی دلیل نہیں صوفیہ و حکماء کہتے ہیں کہ اخص صفات باری سے وجوب بالذات ہے واجب بالذات بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اور مجرد عن المادہ مخلوقات میں بھی ہیں مگر صوفیہ اور فلاسفہ میں فرق یہ ہے کہ صوفیہ مجردات کو حادث مانتے ہیں اور فلاسفہ قدیم کہتے ہیں بہر حال صوفیہ کا مذہب یہ ہے کہ بعض اجزاء عالم مجرد عن المادہ ہیں چنانچہ روح کو وہ مجرد کہتے ہیں اور اس کے علاوہ انسان میں بعض لطیفے ان کو اور مکشوف ہوئے ہیں اور ان کے نزدیک حقیقت انسان ان مجردات اور جسد مادی سے مرکب ہے ان لطائف کو بھی صوفیہ نے مجرد کہا ہے اور یہ ان کو کشف صحیح سے معلوم ہوا ہے بجز کشف کے اس کی اور کوئی دلیل نہیں مگر ان میں نفس مادی ہے بمعنی حالی فی المادی اس کو لطائف میں تعلیماً شمار کر لیا ہے نیز صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ان کا مقام فوق العرش ہے اور اس کا یہ

مطلب نہیں کہ فوق العرش انکا تیز ہے تاکہ مجرد کے لئے مکان و تیز لازم آئے بلکہ فوق العرش سے مراد یہ ہے کہ ان کا کوئی مکان نہیں تو جیہ اس ارادہ کی یہ ہے کہ عرش منتہی ہے املکہ کا اور فوق کے لئے خارج ہونا لازم ہے پس فوق العرش کے معنی یہ ہوئے خارج عن الامکنہ باقی رہی یہ تحقیق کہ دراء العرش مکان تو نہیں لیکن پھر کیا ہے آیا خلاء ہے یا خلاء بھی نہیں تو دونوں امر ممکن ہیں لیکن حکماء نے بلا دلیل دعویٰ کیا ہے کہ محدود جہات کے ادھر نہ خلاء ہے نہ ملا خلاء تو اس لئے نہیں کہ محال ہے اور یہ دعویٰ خود بلا دلیل ہے اور ملا اس لئے نہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت نہیں یہ عجیب دلیل ہے کہ جس شے کی آپ کو ضرورت نہ ہو وہ معدوم محض ہے یہ حال ہے ان کے دلائل کا جو مضحکہ خیز ہیں غرض صوفیہ نے عالم کی تقسیم مجردات و مادیات کی طرف کر کے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ مجردات کو عالم امر سے تعبیر کرتے ہیں اور مادیات کو عالم خلق کہتے ہیں سو اول تو یہ ایک اصلاح ہے ولا مشابہ فی الاصطلاح لیکن اس تسمیہ میں ایک مناسبت بھی ہے وہ یہ کہ خلق کے معنی لغت میں مادہ میں صورت پیدا کرنا اور اس کے مقابل ہے ابداع یعنی خود مادہ کو پیدا کرنا جس کا ذکر اس آیت میں ہے بصدیع السموات والارض چنانچہ اس کے متصل ہی واذا قضی امر ا فانما یقول له کن فیکون اس پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ قضاء محض کن سے ہے اس میں مادہ کا توسط نہیں اور اللہ تعالیٰ تو مادہ کے بھی خالق ہیں اور صورت و ہیئت کے بھی باقی مادہ میں صورت بنانا یہ ایک درجہ میں بندہ سے بھی ممکن ہے چنانچہ رات دن ایجادات میں یہی ہوتا ہے کہ مادہ کے اندر نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتی ہیں مگر مادہ کا خالق سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں اسی واسطے قرآن میں فبارک اللہ احسن الخالقین فرمایا ہے احسن المبدعین نہیں فرمایا کیونکہ مبدع بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں بہر حال مادیات کو عالم خلق اس لئے کہا کہ ان کا وجود مادہ اور صورت کے ملانے سے ہوا ہے ان میں مادہ اور صورت کی ترکیب ہوتی رہتی ہے اور مجردات کو عالم امر اس لئے کہا کہ وہاں مادہ و صورت کی ترکیب نہیں ان کا وجود صرف کلمہ امر اور خلق کو متقابل ٹھہرایا گیا ہے یہ قرینہ ہے اس کا کہ امر سے مراد امر تکوین نہیں بلکہ تشریحی ہے یہاں تک الحمد لله الا له الخلق والامر کی تفسیر تو واضح ہوگی۔

علمی اشکال

اب میں تمہیم فائدہ کے لئے اس کے بعد کی آیات کی بھی تفسیر کرتا ہوں کیونکہ ان کو اس مضمون کی تمہیم میں دخل ہے اور اس سے پہلے ایک شبہ کو جو کلام سابق کے متعلق ہے رفع کرتا ہوں جو کہ خلق پر وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جو معدوم کو موجود کرتے ہیں تو اس کی صورت دوسری آیات میں یہ وارد ہے کہ کن کہہ دیا اور موجود ہو گیا تو کن میں خطاب کس کو ہے کیا معدوم کو امر ہے میرے پاس ابھی ایک خط آیا تھا جس میں یہ سوال تھا کہ کن

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسْكِرَاتٍ بَأْمُرِهِ فِي بِيَانِ فَرَمَا يَاتَا تَحَا۔ اب اس تفصیل سابق کو بطور اجمال کے فرما رہے ہیں کہ خلق اور امر جس کا ذکر سابق میں ہوا وہ تو میرے قبضہ میں ہے۔

وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا

وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۷۳﴾

ترجمہ: اور دنیا میں بعد اسکے کہ درستی کر دی گئی ہے فسادت پھیلاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار ہوتے ہوئے بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے۔ نیک کام کرنے والوں سے۔

تفسیری نکات

فساد فی الارض

اس میں ایک امر ہے اور ایک نہی، نہی ہے فساد فی الارض سے اور امر ہے طاعت کا ادعوا مشتق ہے دعا سے اور دعا ایک فرد ہے طاعت کا پس مراد طاعت ہے۔ بعض خصوصیات کی وجہ سے ایک فرد کو یہاں ذکر کیا گیا جو اکمل افراد ہے اس وقت ان خصوصیات سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے اصل مدعا یہ ہے کہ ان دونوں نہی اور امر میں ارتباط کیا ہے جس کی وجہ سے دونوں یکجلا لائے گئے ظاہر اے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے کہ فساد سے منع کر کے فرماتے ہیں اور خدا کا نام لیا کرو (عبادت کیا کرو) سو ان میں جوڑ یہی ہے کہ ایک سبب ہے اور اصل ہے اور دوسرا سبب اور فرع ہے یعنی عبادت سبب اور اصل ہے عدم فساد کا اس لئے فساد سے منع کر کے عبادت و طاعت کا امر کیا گیا کہ فساد فی الارض سے بچنا چاہتے ہو تو طاعت کو اختیار کرو پس اصل مقصود و ادعوا ہے یعنی عبادت اس کی کمی سے فساد پیدا ہوتا ہے اور اس کی ترکی سے انسداد فساد یعنی اصلاح کو ترقی ہوتی ہے پس معصیت و فساد میں باہم تعلق ہے اور طاعت اور اصلاح میں باہم ارتباط اور ان دونوں کے تعلق میں کچھ سائل نہیں ہیں بہت کھلی ہوئی بات ہے وہ یہ کہ عبادت صرف روزہ اور نماز ہی کا نام نہیں ہے عبادت جملہ نیک کاموں کو شامل ہے اس میں معاملات بھی داخل ہیں اور معاشرت بھی اور عادات بھی اور اخلاق بھی اگر یہ سب طریق پر پورے ادا کئے جاویں یعنی اس طریق سے جس کی شریعت نے تعلیم کی ہے تو ان کا لازمی نتیجہ ہے کہ فساد نہ رہے اسی لئے آگے وادعوا سے بھی بڑھ کر ایک چیز لائے ہیں اور فرماتے ہیں إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ یعنی رحمت اللہ تعالیٰ کی قریب ہے ان سے جو عبادت میں عمل احسان بھی اختیار کرتے ہیں احسان کے معنی وہی ہیں جو حدیث میں آئے ہیں کہ ان تعبد اللہ کانک تراہ یعنی خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر عبادت کرو جس کے لئے

مختصر لفظ خلوص ہے تو مطلب یہ ہوا کہ نری عبادت پر بھی یہ وعدہ نہیں کہ رحمت قریب ہے بلکہ اس عبادت پر ہے جس میں خلوص محض ہو اب آپ انصاف سے دیکھیں کہ اگر ایک جماعت ایسی ہو جو سب کے سب خلوص محض کے ساتھ شریعت کی تعلیم کے موافق عبادات کے اور عادات کے معاملات کے معاشرات کے اخلاق کے پابند ہوں تو کیا ان میں کبھی فساد ہوگا یا کسی کو ان سے اذیت پہنچے گی حاشا وکلا وہ فرشتہ صفت انسان ہوں گے اور کسی کو ان سے ناگواری تو کیسی وہ ہر لعزیز ہوں گے چنانچہ جو افراد اس کے مصداق ہوئے ہیں یعنی اللہ ان کے حالات تو تاریخ میں موجود ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کا وجود دنیا میں کیسا تھا کیا ان سے کسی کو تکلیف پہنچتی تھی یا ان کا وجود باعث فساد تھا نہیں بلکہ ان کا وجود باعث رحمت اور باعث رفع فساد ہوتا ہے اسی وجہ سے عالم کا عالم ان پر فدا ہوتا ہے اور ہر شخص کا قلب ان کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے یہ بات ان میں کا ہے سے پیدا ہوئی اسی چیز سے جس کا نام عبادت یا طاعت ہے اس سے ثابت ہوا کہ طاعت کو رفع فساد میں ضرور دخل ہے اور فساد اسی کے نہ ہونے سے ہوتا ہے یہ علاقہ ہوا لا تفسلوا اور وادعوا میں کہ طاعت کو دخل ہے رفع فساد میں۔

فساد اور اصلاح کا مفہوم

اب ان آیتوں سے اس کو ثابت کرتا ہوں تو سمجھئے کہ ان دو آیتوں میں یہ بھی ارشاد ہے کہ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا اور یہی جزد ہے جو اس وقت مقصود بالبیان ہے یعنی اصلاح کے بعد زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔

اب یہ دیکھئے کہ فساد کیا ہے اور اصلاح کیا ہے۔ اسی کے فیصلے کے لئے میں نے یہ دونوں آیتیں پوری پڑھ دی ہیں تاکہ سیاق و سباق سے اس کی تعین ہو جائے تو پہلے تو یہ فرمایا ہے کہ اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً اور بعد میں یہ فرمایا کہ وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا اور دعا میں دو احتمال ہیں یا تو دعا کے وہی معنی ہوں جس کو عرف میں دعا کہتے ہیں یا دعا کے معنی عبادت کے ہوں کیونکہ قرآن میں دعا کے معنی عبادت کے بھی آئے ہیں چنانچہ بعض نے اُدْعُوهُ اسْتَجِبْ لَكُمْ میں عبادت کے معانی لئے ہیں اور بعض نے دعا کو اپنے معنی میں رکھ کر لفظ عبادت کو جو إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي میں ہے دعا کے معنوں میں لیا ہے نیز دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ يَحْتَسِبُ بِمَا كَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ أُولَٰئِكَ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ دعا بمعنی عبادت ہے غرض دعا دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تو اس آیت میں اگر عبادت کے معنی لئے جائیں تب تو خلاصہ یہ ہوگا کہ اول بھی عبادت کا حکم ہے اور بعد میں بھی اور درمیان میں فساد کی ممانعت ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبادت نہ کرنا فساد ہے اور اس سے اصلاح کی بھی تعین ہوگئی کہ بعد انتظام عبادت ترک عبادت نہ کرو۔

اگر دعا کے معنی عبادت کے لئے جائیں بلکہ اپنے ظاہری معنی پر رکھا جائے تو اس وقت بظاہر یہ آیت اس دعویٰ کے اثبات کے لئے مفید نہ ہوگی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس صورت میں بہت زیادہ مفید ہے کیونکہ عبادت دو قسم کی ہیں ایک تو وہ عبادت جس سے مقصود دین ہی ہے اور ایک وہ عبادت جس سے کبھی دنیا بھی مقصود ہوتی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ پہلی عبادت اپنے عبادت ہونے میں زیادہ قوی ہے۔

اب سمجھئے کہ دعا عبادت کی ایسی فرد ہے کہ اس سے دنیا کی بھی طلب ہو سکتی ہے تو اس اعتبار سے دعا دوسرے درجے کی عبادت ہوگی۔ تو جب اس کے ترک کو فساد فرمایا گیا ہے تو جو عبادت خالصہ ہے اس کا ترک تو کیوں موجب فساد نہ ہوگا تو قرآن اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ عبادت کا ترک کرنا موجب فساد فی الارض ہے اور انتظام عبادت کو اصلاح فی الارض فرما رہا ہے۔

باقی یہ کہ جس وقت یہ ارشاد ہو رہا ہے اس وقت بہمہ وجوہ اصلاح کہاں تھی جس کے بعد فساد سے منع فرماتے ہیں کیونکہ کفار کی کثرت تھی جو ہر وقت فساد میں ہی رہتے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اصلاح سے سامان اصلاح کی کہ نبی کریم ﷺ کو بھیج کر سامان اصلاح کر دیا اگر تم ان کو چھوڑو گے تو تم فساد کرو گے یہ تو آیت کا مدلول ہوا جس کا حاصل یہ ہوا کہ عبادت یعنی دین نہ ہونا موجب فساد ہے۔

دین کی حقیقت

لیکن اول اس کو سمجھئے کہ دین کیا چیز ہے تاکہ آپ کو پھر مدلول آیت میں تعجب نہ ہو تو دین حقیقت میں چند چیزوں کے مجموعے کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے اس وقت دین کا یہ ست نکالا ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ لی اور بس بعض نے تو یہ بھی نہیں رکھا بلکہ محض من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة اپنی مزعوم تفسیر کے اعتبار سے ان کا مذہب ہے اور اس پر غضب یہ ہے کہ بعض نے محمد رسول ﷺ کی بھی ضرورت نہیں سمجھی میں نے اس کی تفسیر دیکھی ہے کہ (نعوذ باللہ) رسالت کا ماننا نجات کا موقوف علیہ نہیں۔

صاحب مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے لیکن آپ کو خبر نہیں صاحبو: غضب ہے کہ غیر قوم میں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی جاتی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے دین واقع میں چند چیزوں کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں۔

۱۔ عقائد ۲۔ عبادات ۳۔ معاملات ۴۔ آداب معاشرت ۵۔ اخلاق باطنی

یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو، یا نہ ہو تو واضح ہو، اخلاص ہو، قناعت ہو، شکر ہو، صبر ہو، علی ہذا پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے حاصل آیت کا یہ ہے کہ ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچ کے اخلال کو فساد فی الارض میں دخل ہے۔

تصرف و حکمت

الْآلَةُ الْخَلْقِ وَالْأَمْرُ سے ثابت ہو چکا ہے کہ خالق بھی اللہ تعالیٰ ہیں حاکم بھی وہی ہیں یعنی پس ان کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے کیونکہ ان کو ہر تصرف کا اختیار ہے اس پر یہ ایہام ہوتا ہے کہ ہر تصرف پر راضی ہونا جب ممکن ہے جب کہ ہر تصرف مفید اور گوارا اور موافق مصلحت ہو اور اگر کوئی تصرف مضر یا خلاف حکمت ہو تو اس پر کون راضی ہوگا ہر چند کہ اس شبہ کا ایک جواب الْآلَةُ الْخَلْقِ وَالْأَمْرُ میں بھی آ گیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ غالب علی الحکمت ہیں مغلوب عن الحکمت نہیں وہ اپنے تصرفات و احکام میں حکمتوں کے تابع نہیں بلکہ حکمت ان کی تصرف کے تابع ہے یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ حکمت کو سوچ کر تصرف کریں بلکہ وہ جو تصرف کرتے ہیں حکمت خود ادھر ہی ہو جاتی ہے مگر یہ جواب اذہان عامہ سے بالا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق گفتگو فرمایا کرتے ہیں۔ اس لئے آگے اس شبہ کا دوسرا جواب دیتے ہیں جو اذہان عامہ کے قریب ہے فبارک اللہ رب العلمین یعنی اللہ تعالیٰ خوبیوں کے بھرے ہیں ان کا کوئی قول و فعل حکمت سے خالی یا حکمت کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے آگے اس کی دلیل مذکور ہے کہ وہ رب ہیں پالنے والے ہیں یعنی ان کو تمہارے ساتھ پاصمط کی محبت ہے پھر یہ احتمال کیوں ہے کہ ان کا کوئی تصرف خلاف حکمت یا مضر ہوگا پھر یہاں ربکم کی جگہ رب العلمین فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ایسے پروردگار ہیں کہ انہوں نے تمہاری تربیت کی یہ صورت کی کہ محض تمہارے واسطے تمام عالم کی پرورش کرتے ہیں بلاشبہ یہ شان ہے۔

کشد از برائے دلے بار ہا خورند از برائے گلے خار ہا

خدا تعالیٰ بار و خار سے منزہ ہیں یہ شعر صرف اسی معنی کی تشبیہ و توضیح کے لئے پڑھ دیا ہے کہ ایک انسان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا سامان پیدا کیا ہے اور اتنا بڑا کارخانہ جاری کیا ہے۔

دعا و تقویض

پھر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہر تصرف حق تعالیٰ کا حکمت کے موافق ہے تو اب تقویض کے ساتھ دعا کیونکر جمع ہوگی بس دعا کو چھوڑ دینا چاہئے چنانچہ بعض صوفیہ کو جن پر تقویض غالب ہے یہ شبہ ہوا کہ تقویض و دعا جمع نہیں ہو سکتا میں کہتا ہوں کہ دونوں جمع نہ ہو سکتے تو یہاں تقویض و دعا کو جمع کیونکر کیا جاتا ہے کہ اول تعلیم تقویض کی گئی پھر دعا کا امر کیا گیا۔

غرض آگے اس شبہ کو دفع کیا جاتا ہے کہ تقویض سے ترک دعا لازم نہیں آتا بلکہ ہم حکم دیتے ہیں کہ

تفویض کے ساتھ دعا بھی کرو اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً اپنے پروردگار سے الحاح کے ساتھ دعا کرو زلت ظاہر کرتے ہوئے بھی اور آہستہ آہستہ بھی میرے نزدیک تضرع و خفیہ دونوں کے مجموعہ سے الحاح و اظہار عبدیت مقصود ہے کیونکہ الحاح اور اظہار بندگی کے وقت لہجہ ایک نہیں رہتا کبھی آواز بلند ہوتی ہے کبھی آہستہ ہوتی ہے اس لئے دو لفظ لائے گئے جس سے اس پر تشبیہ کر دی گئی کہ ایک لہجہ اور ایک وضع کے پابند نہ ہو کیونکہ تقید سے عبدیت سے خشوع فوت ہو جاتا ہے اس میں تشبیہ کر دی گئی کہ دعا تفویض کے منافی نہیں کیونکہ تفویض کا منشا بھی عبدیت ہے اور دعا کا منشا بھی عبدیت ہے بلکہ دعا میں شکستگی اور عجز و نیاز زیادہ ظاہر ہوتا ہے جو عین مقتضائے عبدیت ہے پھر یہ تفویض کے خلاف کیونکر ہو تفویض کے خلاف تو وہ دعا ہے جس سے مقصود یہ ہو کہ جو ہم نے تجویز کر لیا ہے جو ہم مانگ رہے ہیں وہی ہو جائے تو راضی ہیں ورنہ ناراض ہیں اور جس دعا سے محض اظہار عبدیت مقصود ہو اور دعا کرنے والا دل سے ہر شق پر راضی ہو کہ خواہ دعا منظور ہو یا نہ ہو یعنی جو مانگا جا رہا ہے وہ عطا ہو یا نہ ہو میں ہر صورت میں راضی ہوں تو یہ دعا تفویض کے خلاف کیونکر ہو سکتی ہے پس تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً کے بڑھانے سے متنبہ کر دیا گیا کہ دعا اظہار عجز و عبدیت کے لئے ہونا چاہئے اور خفیہ کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تضرع سے مراد اعلان ہے۔ مگر بعض دفعہ اعلان میں بے ادبی کا لہجہ ہو جاتا ہے اسی لئے رفع صوت عند انبسی کی ممانعت ہے تو اعلان کو تضرع سے تعبیر کر کے بتلادیا گیا کہ دعا اعلانا ہو تو مدلل کے ساتھ ہو

خلاف تفویض و دعا

آگے ارشاد ہے اِنَّكَ لَا يُجِيبُ الْمُعْتَدِينَ اس میں متنبہ کر دیا گیا ہے کہ دعا کے لئے حدود ہیں ان سے تجاوز کرنا چاہئے مثلاً دعا میں استعجال نہ کرے عدم ظہور اثر سے گھبرائے نہیں اور حرام چیزوں کی دعا نہ کرے اور مستحیل عادی و عقلی کی دعا نہ کرے جیسے یوں کہنے لگے کہ اے اللہ مجھے نبی کرے وغیرہ وغیرہ کیونکہ نبوت مانگنے سے نہیں ملا کرتی۔

اب ایک شبہ اور رہا کہ جب تفویض کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہر تصرف پر راضی رہنا چاہئے تو پھر گناہ بھی ترک نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ بھی تصرف حق ہی ہے اس شبہ کو رفع کرتے ہیں کہ خبردار گناہ مت کرنا وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا کہ زمین میں فساد نہ کرنا بعد اس کے کہ اس کی درستی کر دی گئی ہے مطلب یہ کہ گناہ موجب فساد ہے اور ہم نے فساد کو نبوت اور تشریح احکام کے ذریعہ سے ممنوع قرار دیا ہے پس اب تم اصلاح کے بعد فساد نہ کرو اور گناہ بھی خدا کا پیدا کیا ہوا ہے کیونکہ خالق خیر و شر وہی ہے مگر یہ تصرف بلا واسطہ حق تعالیٰ کا تصرف نہیں بلکہ اس کے اندر تم واسطہ ہو کیونکہ بندہ کا سب افعال ہے اور واسطہ مذموم ہے اور گناہ میں بندہ کے واسطہ ہونے پر لا تفلسوا میں خطاب کے صیغہ سے بھی دلالت ہو رہی ہے جس سے معلوم ہوا کہ فساد و گناہ

میں بندوں کے ارادہ و اختیار کو بھی دخل ہے خلاصہ تعلیم کا یہ ہوا کہ تفویض کے معنی یہ ہیں کہ جو تصرف حق تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ ہو اس پر راضی رہو اور جو تصرف ایسا ہو جس میں تمہارے فعل قبیح کا واسطہ ہو اس پر راضی ہونا بایں معنی کہ گناہوں پر جرات کرنے لگو اور ان سے بچنے کا اہتمام نہ کرو تفویض نہیں۔

امن عامہ

اور اوپر جو میں نے کہا ہے کہ بعد اصلاحہا کے معنی یہ ہیں کہ اوامر و نواہی کے نزول اور نبی کے مبعوث ہونے سے زمین کی اصلاح کر دی گئی اس میں ایک بڑے مسئلہ کا فیصلہ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ اوامر شرعیہ پر عمل کرنا اور نواہی شرع سے بچنا یہ جڑ ہے امن کی اور یہی رافع ہے فساد کا۔

قَالُوا يَمُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقَىٰ وَإِمَّا أَنْ نَكُونَ نَعْنُ الْمُلْقِينَ ﴿۱۷﴾

قَالَ الْقَوَا فَلَئِنَّا لَنَكُونُ نَعْنُ الْقَوَا سَعَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا

بِسِحْرِ عَظِيمٍ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام سے ساحروں نے پوچھا کہ تم اپنا عصا ڈالتے ہو یا ہم ڈالیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم ہی ڈالو۔ پس جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی نظر بندی کر دی اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھلایا۔

تفسیری نکات

ساحران کو عاجز کرنے کیلئے

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجازت دی

موسیٰ علیہ السلام نے ساحران فرعون سے فرمایا تھا الْقَوَا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ﴿۱۷﴾ (جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ڈالو)

بظاہر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ساحران فرعون کا سحر تو کفر یا معصیت تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس سحر کی اجازت کیوں دی جو اب یہ ہے کہ یہ اجازت ابقاء کفر کے لئے نہ تھی بلکہ اس سے احتقاق حق اور ابطال باطل مقصود تھا کیونکہ

جب وہ لوگ اولاً اپنا سحر ظاہر کریں گے اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا سب کو فنا کر دے گا تو اس طرح اظہار حق کا حل طور سے ہوگا۔ اس مصلحت اظہار حق کے لئے انہوں نے فرمایا تھا۔ الْقَوْمَا مَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ۝ وَعِنْدِي جَوَابٌ لِّمَا أَنْتُمْ سَآئِرُونَ ۝ فَخَرُّوا سُجَّدًا وَسَبِّحُوا بِحَمْدِ رَبِّكَ نهارًا وَنَهَارًا ۝ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ ۝

(میرے نزدیک ایک دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں پر اجازت دینا ان کو عاجز کرنے کے لئے تھا یعنی تم جو کچھ سحر بندی کر سکتے ہو کرو میں پہلے سے تم کو روکتا نہیں تاکہ ان کی کامل سحر بندی کے بعد اس کو تار عنکبوت کی طرح ختم کر دیں اور وہ عاجز ہو کر اقرار کریں حق کا) تو یہ اجازت ابتداء سحر کو مٹانے کے لئے تھی کیونکہ اس کے مٹانے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا کہ اول وہ اپنی کوشش کو ظاہر کریں بعد میں موسیٰ علیہ السلام کا عصا نہایت سہولت سے دفعہ سب کو مٹا دے یہ آیت صوفیہ کے اس طرز عمل کی دلیل ہے جس سے بعض اہل ظاہر متوحش ہوتے ہیں کہ انہوں نے منکر شرعی کی اجازت دی حالانکہ وہ منکر کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اس کو جڑ سے مٹانا چاہتے ہیں جس کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔

سحر عظیم اور نظر بندی

فرمایا کہ یہ تو مسلم ہے کہ جادو میں حق تعالیٰ نے اثر رکھا ہے مگر اب اس میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ اثر کیا ہے آیا جادو کے ذریعہ سے کسی چیز کے عین کی تبدیلی بھی ہو سکتی ہے یا صرف نظر بندی تک ہی جادو کا اثر محدود ہے تو جو لوگ اس کے قائل ہوئے ہیں کہ تبدیل عین نہیں ہوتی صرف نظر بندی ہوتی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے سحران فرعون کے متعلق فرمایا ہے۔ فَلَمَّا آتَوْا مَدْيَنَ وَارْتَدَّوْا الْعَيْنَ الثَّالِثِينَ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَزِيمٍ ۝

جس میں نظر بندی کو بڑا جادو فرمایا گیا سوا اگر تبدیل عین سحر سے ممکن ہوتا تو سحر عظیم وہ ہوتا اور جو لوگ سحر سے تبدیل عین کے قائل ہیں وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے سحران فرعون کے اس سحر کو عظیم ہی تو فرمایا ہے ممکن ہے کہ اس سے بھی کوئی اعظم ہو اور وہ تبدیل عین ہے تو اس کے عظیم ہونے سے اعظم کی کیسے نشی ہوئی۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ
إِلَيْكَ قَالَ لَنْ نَرِيكَ وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ
مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَبَيَّنَ لِجِبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا
وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبَّتْ إِلَيْكَ
وَإِنَّا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۸۰﴾

ترجمہ: اور جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے وقت (موعود) پر آئے اور ان کے رب نے ان سے بہت ہی (لطف و عنایت کی) باتیں کیں تو عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو سو اگر یہ اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تجلی نے اس کے پر نچے اڑادیئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر جب آفاقہ میں آئے تو عرض کیا بے شک آپ کی ذات منزہ ہے میں آپ کی جناب میں معذرت کرتا ہوں اور سب سے پہلے میں اس پر یقین کرتا ہوں۔

تفسیری نکات

لَنْ تَرَانِي کی عجیب تفسیر

جب موسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا اور تجلی کی درخواست کی اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ لَنْ تَرَانِي یعنی تم ہم کو نہیں دیکھ سکتے ہم میں تو مرنے کی قابلیت نام ہے کوئی شے ہماری رویت سے مانع نہیں اس لئے لن اری (ہرگز مجھ کو دیکھا نہیں جاسکتا) نہیں فرمایا مگر تم میں اس وقت رائی کی قابلیت نہیں کیونکہ ہم نور محض ہیں اور تم جسم کثیف سے متلبس ہو جو ہمارے نور کا متحمل نہیں ہو سکتا گویا بتلا دیا کہ اس وقت تم میں اتنی استعداد نہیں کہ ہم کو دیکھنے کے بعد صحیح و سالم رہو اور ہر چند کہ یہ یہاں بھی نہ ہونے کے سبب کو صاف سے بتلا رہا تھا اور اس کے سن لینے کے بعد ہر ایک مومن کو عقیدہ اپنی عدم قابلیت کا کافی طور سے ہونا لازم ہے چہ جائیکہ موسیٰ علیہ السلام چونکہ موسیٰ علیہ السلام عاشق تھے اس لئے گو عقیدہ کے اعتبار گردان کو اپنی عدم استعداد کا ہو گیا تھا لیکن شوق اور جذبہ رویت الہی کا حد سے بڑھاوا تھا اس کی اب تک کمی نہ ہوئی تھی لہذا آگے خود ہی

ان کی اس حالت کی رعایت سے ارشاد فرماتے ہیں کہ لیکن اگر تمہیں اب یہی شوق ہے تو انظر لی الیہم الایۃ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو اگر یہ پہاڑ صحیح و سالم رہا اور ہماری تجلی کا تحمل ہو گیا تو تم کو اس سے نہ محروم رکھا جائے گا۔ چنانچہ فَلَمَّا تَبَسَّلَىٰ رَبُّهَا جَبَّ اس پر تجلی فرمائی پہاڑ کھڑے کھڑے ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر گئے اور اطمینان وانی ہو گیا اور عدم قابلیت کا مشاہدہ بھی ہو گیا کہ جب پہاڑ باوجود اس قدر حجم جسدہ اور شدت کے نہ ٹھہر سکا تو میں کیا ٹھہر سکوں گا۔ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ پہاڑ کو موسیٰ علیہ السلام سے کیا نسبت تھی یہ جماد محض وہ ایک انسان با کمال صاحب نبوة کلیم اللہ لہذا یہ قیاس اور تلازم سمجھ میں نہیں آتا جو کہ قُلْ اِنِ اسْتَفْزَمُ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرٰی نَبِیَّ (سوا اگر اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے) میں استقرار جبل و رویت موسیٰ کے درمیان ثابت کیا گیا ہے ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی روحانی قوت کی وجہ سے تجلی کے تحمل ہو جاتے تو جواب اس کا یہ ہے کہ جس تجلی کا موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ سے زیادہ تحمل تھا وہ تو ان کو اس درخواست سے پہلے ہی حاصل تھی یعنی تجلی با قلب بالروح مگر اس وقت تو انہوں نے آنکھ سے دیکھنے کی درخواست کی تھی اور آنکھ کی رویت تجلی بالروح نہیں بلکہ بالجسم ہے تو اس صورت میں تجلی خداوند تعالیٰ کی موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ آنکھ کے ہوتی اور آنکھ ایک جسمانی شے ہے مگر نہایت ضعیف اور نازک عضو ہے اور پہاڑ بھی ایک جسم ہے اگرچہ غیر جاندار ہی سہی مگر آخر جسمیت میں آنکھ مشارک ہے ہی اور پہاڑ باوجود اس کے نہایت ثقیل و قوی ہے کہ ہر ایک بھاری بھاری بوجھ کو سہہ سکتا ہے اس صفت میں یہ تمام جسم انسانی اور اس کے جمیع افراد سے بڑھا ہوا ہے چنانچہ خود خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّكُمْ اَشْدُّ خَلْقًا اَمَّ السَّمَاوَاتِ وَبَدَا (بھلا تمہارا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بڑا اور فرماتے ہیں لَخَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْاَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (اللہ تعالیٰ کا آسمان اور باعتبار زمین پیدا کرنا سخت تر ہے لوگوں کے پیدا کرنے سے) اشدیت و اکبریت سماوات اور ارضین سے اس آیت سے ظاہر ہے کہ باعتبار مادہ کے آسمان و زمین انسان سے سخت تر ہیں اور جلال و جمال خداوندی کے جلوہ کا تحمل جب ایک ایسا جسم سخت و قوی نہ کر سکا تو موسیٰ علیہ السلام کی آنکھ تو کیا جمال جہاں آراء کی تاب لاسکتی تھی اور وہ خود کیونکہ قائم رہ سکے لہذا اپنے ضعف اور پہاڑ کی شدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب انہوں نے پہاڑ کا حال دیکھا تو ان کو مشاہدہ سے اطمینان اپنے غیر تحمل ہونے کا ہو گیا اور یہاں بظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ تجلی نہ ہوئی لیکن لفظ تجلی جو آیت میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو تجلی ہوئی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تجلی کے بعد بے ہوش ہوئے آیت میں فَلَمَّا تَبَسَّلَىٰ رَبُّهُ لِيَسْبَلْ جَعَلْنَا دَعْوَاهُ وَخَدَّ مَوْسَىٰ صَوْعًا (پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تجلی نے اس کے پر نچے اڑائے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے) سے صاف ظاہر ہے کہ اول تجلی ہوئی اور اس کے بعد

پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو اور موسیٰ علیہ السلام بھی بے ہوش ہوئے لہذا موسیٰ علیہ السلام کیلئے ثبوت تجلی اس آیت سے واضح ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش ہونا تجلی سے موخر ہے موخر کی دو قسمیں ہیں ایک زمانی دوسرے ذاتی تو موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش ہونا تجلی سے موخر ہے ذاتاً نہ کہ زماناً لہذا زمان میں بجائے تاخر کے اقدر ان تھا اگر تاخر زمانی کا ثبوت ہو جاتا تو تجلی کا ثبوت ہوتا مگر محض تاخر ذاتی سے اس کا ثبوت دشوار ہے کیونکہ زمانا معیت پر تجلی کے معنی ظہور کے ہیں اور ظہور مستلزم ادراک و رویت کو نہیں پس ذات خداوندی کا ظہور تو ضرور ہوا چنانچہ اس کے اثر سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا لیکن اس کا موسیٰ علیہ السلام کو ادراک نہیں ہوا بلکہ آپ فوراً بے ہوش ہو گئے لہذا تجلی خداوند تعالیٰ کی فی نفسہ ممکن ہے اور ہو سکتی ہے مگر ہمیں ابھی اتنی قابلیت نہیں کہ ہم اس کے متحمل ہو سکیں بلکہ وہاں تجلی کا خود تقاضا ہے چنانچہ عارف جامی فرماتے ہیں۔

نور و تاب مستوری ندارد چودر بندی سر از روزن برارد
(حسین مستور سونے کی تاب نہیں رکھتے اگر تم دروازہ بند کر لو تو روزن سے سر نکالتے ہیں)

ان الفاظ کا ظاہر مدلول مراد نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ادھر سے تو ظہور ہی کا تقاضا جاری ہے بوجہ غایت رحمت و رافت کے کہ آؤ اور ہماریت تجلی سے مستفیض ہو مگر کیا کریں ہم مجبور ہیں ہم میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں اگر ہم میں ہمت ہوتی تو ضرور مستفیض ہوتے چنانچہ تجلی کلامی لفظ کے تحمل کی طاقت ہم میں تھی لہذا ہم کو اس سے فیض یاب کیا گیا لیکن یہ نہ سمجھنا کہ یہ ہماری ذاتی قابلیت کا طفیل ہے اور ہمارے اندر بھی کوئی جوہر اگرچہ بقدر قلیل ہو رکھا ہوا ہے جس سے ہم خود اس کے متحمل ہو گئے بلکہ درحقیقت شدت اور طاقت بھی خداوند تعالیٰ ہی نے ہم کو دی ہے یہ بھی انہیں کی عنایات کا ثمرہ ہے اس نور کی بدولت ہمارے قلوب روشن ہیں نیز اس تحمل سے یہ بھی نہ خیال کرنا چاہئے کہ اس نے اپنی عظمت کو چھوڑ کر نقص اختیار کر لیا ہے جس کی بناء پر ہم تحمل ہوئے بلکہ وہ اسی شدت و صلوت پر باقی ہے جیسے اصل میں تھی جس کا یہ اثر ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ حضرت زید بن ثابتؓ کے زانو پر سر رکھے ہوئے بیٹھے تھے کہ نزول وحی ہونا شروع ہوا وہ صحابی فرماتے ہیں کہ اس وقت ثقل سے یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ میرا زانو پھٹ جاوے ایک مرتبہ آپ اونٹنی پر سوار تھے کہ آپ پر نزول وحی ہوا اور اونٹنی اس شدت کو برداشت نہ کر سکی اور بیٹھ گئی۔

تقدم ذاتی

ایک صاحب علم نے سوال کیا قَلَمًا تَجَلَّى رَبُّهُ، الی خَدَّ مُؤَنَّى سے معلوم ہوتا ہے کہ خروار بعد تجلی کے ہوا۔ پس رویت ثابت ہوئی پھر لرن ترانی کے کیا معنی جواب یہ دیا کہ یہ تقدم زمانی نہیں تقدم ذاتی ہے پس تجلی اور خروار میں کوئی زمانہ نہیں ہوا جس میں رویت ہو۔

نور مخلوق

آیت میں یہ سوال کیا گیا کہ وادی ایمن میں موسیٰ کو جو نور نظر آیا وہ اگر نور مخلوق نہ تھا تو رویت میسر ہوگئی تھی پھر رَبِّیْ أَنْظِرْ لِّیْكَ کی درخواست کی کیا وجہ اور اگر نور مخلوق تھا تو موسیٰ علیہ السلام میں اور ہم میں کہ دوسرے انوار مخلوقہ کو مثل نور شمس و قمر دیکھتے ہیں کیا فرق ہوا۔

جواب دیا کہ وہ نور غیر مخلوق نہ تھا مخلوق تھا مگر چونکہ مخلوق بلا واسطہ تھا اس لئے اس کو بہ نسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس و تعلق تھا کہ اس تلبس زائد سے اس کو یہ نسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس و تعلق تھا کہ اس تلبس زائد سے اس کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا یعنی ایک معنی میں نور حق کہنا بھی صحیح ہے جیسے کلام لفظی کہ ما ترید یہ کے نزدیک گو مخلوق ہے مگر اس خاص تلبس کی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہنا صحیح ہے بخلاف کلام زید و عمرو کے کہ اس کو کلام اللہ کہنا جائز نہیں پس سب اشکالات رفع ہو گئے۔

غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکثار خیر کا سبب ہو سکتا ہے

بس حق تعالیٰ کی یہی بڑی رحمت ہے کہ سب کام اپنے قبضہ میں رکھا اور ہم کو کچھ بھی خبر نہیں دی کہ کل کو کیا ہونے والا ہے۔ لوگ علم غیب کی تمنا کیا کرتے کشف کو کمال سمجھتے ہیں مگر دیکھ لیجئے کہ یہ ایسی چیز ہے کہ بعض دفعہ وبال جان ہو جاتی ہے غیب کا علم محیط شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ قرآن میں تو علم غیب کو استکثار خیر و دفع مضرت کا سبب بتلایا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ کشف بعض دفعہ وبال جان ہو جاتا ہے قرآن کی آیت یہ ہے وَكَوْنَتْ لَكُمْ الْغَيْبُ لَا تَسْأَلُونَ مِنْ الْخَيْرِ وَمَا مَسْنِيَ السُّوءُ اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو خیر بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی مضرت نہ پہنچتی اس کے چند جوابات ہیں اول تو یہ کہ آیت میں قضیہ کلیہ نہیں ہے بلکہ جزئیہ ہے یعنی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ خیر ہی خیر حاصل ہوتی اور شرمس بھی نہ کرتا (دوسرے یہ کہ آیت میں غیب سے مراد جمیع الغیب ہے حاصل یہ ہوا کہ اگر مجھ کو غیب کا علم محیط حاصل ہوتا لُح اور ظاہر ہے کہ غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکثار خیر و دفع مضرت کا ضرور سبب ہو سکتا ہے۔

قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرَ إِلَيْكَ

ترجمہ: عرض کیا کہ اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے

تفسیری نکات

رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرَ إِلَيْكَ میں یہ سوال کیا گیا کہ وادی ایمن میں موسیٰ کو جو نور نظر آیا وہ اگر نور مخلوق نہ تھا تو رویت میسر ہوگئی تھی پھر قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرَ إِلَيْكَ کی درخواست کی کیا وجہ اور اگر نور مخلوق تھا تو موسیٰ علیہ السلام میں اور ہم میں کہ دوسرے انوار مخلوقہ کو مثل نور شمس و قمر دیکھتے ہیں کیا فرق ہوا۔ جواب دیا کہ وہ نور غیر مخلوق نہ تھا مخلوق تھا۔ مگر چونکہ مخلوق بلا واسطہ تھا اس لئے اس کو بہ نسبت دوسرے انوار کے حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تلبس و تعلق تھا کہ اس تلبس زائد سے اس کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا یعنی ایک معنی میں نور حق کہنا بھی صحیح ہے جیسے کلام لفظی کہ ماترید یہ کے نزدیک مخلوق ہے مگر اس خاص تلبس کی وجہ سے اس کو کلام اللہ کہنا صحیح ہے بخلاف کلام زید و عمرو کے کہ اس کو کلام اللہ کہنا جائز نہیں پس سب اشکالات رفع ہو گئے۔ (مقالات حکمت ۱۴۳)

وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ

ترجمہ: اور (جلدی سے) تختیاں ایک طرف رکھ دیں۔

تفسیری نکات

قذف کے معنی اور عجیب و غریب تفسیر

فرمایا کہ بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مغلوب الغضب تھے تختیاں پھینک دیں جواب یہ ہے کہ ”القاء“ اور ”قذف“ کے معنی ایک ہی ہیں فاقذفہ میں قذف کے معنی یہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ علیہ السلام کو پھینک دیا بلکہ معنی یہ ہے کہ جلدی سے دریا میں رکھ دیا اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے الواح کو جلدی سے رکھ دیا تھا۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا يَأْتِيهِم مِّنْ اللَّهِ مُهْلِكُهُمْ

أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُم وَلَعَلَّهُمْ

يَتَّقُونَ ﴿۱۸۵﴾

ترجمہ: اور اس وقت کا حال جبکہ ان میں سے ایک جماعت نے یوں کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جن کو اللہ تعالیٰ بالکل ہلاک کرنے والے ہیں یا سخت سزا دینے والے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے رب کے دروےز کو معذرت کرنے کے لئے اور اس لئے شاید یہ ڈر جاویں۔

تفسیری نکات تبلیغ میں دو نیتیں

ہمیں اس سے کیا بحث قرآن مجید میں حکایت ہے وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا يَأْتِيهِم مِّنْ اللَّهِ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا کہ اصحاب السبت میں سے ایک جماعت نے دوسری جماعت سے کہا کہ تم ایسی جماعت کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو خدا تعالیٰ ہلاک کرنے والے ہیں۔ یا جن پر عذاب شدید نازل فرمانے والے ہیں ایسے لوگوں کو خطاب کرنے سے کیا فائدہ؟ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُم وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۵﴾ انہوں نے کہا کہ صاحب ہم اس لئے نصیحت کرتے ہیں تاکہ ہمارے لئے ایک عذر ہو خدا کے نزدیک کہ یا اللہ ہم نے تو کہا تھا انہوں نے مانا نہیں جو ہمارا کام تھا وہ ہم نے ادا کر دیا تھا ایک تو یہ بات ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ کہ ممکن ہے یہ لوگ ڈریں شاید ان میں سے کسی کو ہدایت ہو جاوے کیونکہ نرمی کے ساتھ سمجھانے سے امید تو ہے ان کے ایمان کی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں یہ حکایت ہے بس یہی دو نیتیں آپ بھی تبلیغ میں رکھئے ایک معذرت عند اللہ اور دوسری ان کے ایمان لانے کی توقع جن میں سے پہلا مقصود تو قطعی الحصول ہے ان شاء اللہ تعالیٰ اور دوسرا محتمل و متوقع ہے بس تم ان کو اسلامی محاسن سناتے رہو ان شاء اللہ بہت کچھ اصلاح کی امید ہے اور اس سے بہت اصلاح ہوئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ ظِلْفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا
فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ﴿۱۸۲﴾

ترجمہ: یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے پیش آ جاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں۔ سو یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

تفسیری نکات خوف کی حقیقت

خوف کے یہ معنی نہیں کہ گناہ کی طرف میلان ہی نہ ہو بلکہ یہ معنی ہیں کہ جب میلان ہو تو فوراً عذاب کا تصور کر کے گناہ سے رک جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ ظِلْفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فرمایا ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ ظِلْفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ نہیں فرمایا سو یہ تو خوف عقلی تھا۔ اور ایک خوف ہے بمعنی دل دھڑھکنے کے سو یہ غیر اختیاری ہے یہ کسی وقت بھی مطلوب نہیں گو محمود اور مفید ہے اور نہ بندہ اس کا مکلف ہے مگر لوگ آج کل اسی کو مطلوب سمجھتے ہیں اور یہ ساری خرابی و اعظوں کی ہے انہوں نے عوام کا تاس کیا ہے چنانچہ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ تم لوگ تھانہ دار سے تو ڈرتے ہو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے حالانکہ تھانہ دار نے جو خوف ہے وہ طبعی ہے جیسا سانپ بچھو سے خوف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے عقلی خوف ہے کیونکہ وہ نظر نہیں آتے بلکہ ان کی صفات کو یاد کر کے ان سے ڈرا جاتا ہے۔ اور غائب سے خوف عقلی ہی ہو سکتا ہے پھر خدا تعالیٰ سے طبعی خوف کا مکلف انسان کو کیونکہ کیا جاسکتا ہے۔

ترجمہ: یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آ جاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

متقین کی شان

جو لوگ اللہ علم ہیں اور علم معانی سے مس رکھتے ہیں وہ اس آیت کے الفاظ میں غور فرمائیں کہ اذا اور ان میں فرق یہ ہے کہ اذا شرط یقینی پر آتا ہے اور ان شرط مشکوک پر ثابت ہوا کہ مس شیطان متقین کے لئے بھی یقینی الوقوع ہے ایک تو یہ اور دوسرے فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (سو یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) کو خیال فرمائیے وہاں تو مس فرمایا اور نتیجہ میں فرمایا مبصرون معنی یہ ہوئے کہ متقین کی شان یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا

ذرا بھی اثر ہو جائے تو فوراً ہی متنبہ ہو جاتے ہیں غیر متقین اور متقین میں یہ فرق ہو گیا کہ مس شیطان تو دونوں میں موجود ہے مگر متقین میں متنبہ بھی ہے غیر متقین میں متنبہ نہیں بلکہ مس کا لفظ بتلاتا ہے کہ متقین شیطان کے ذرا سے اثر سے بھی کامل طور پر متنبہ ہو جاتے ہیں مس چھوئے کو کہتے ہیں اور غیر متقین ہم جیسے چھوئے سے تو کیا متنبہ ہوں گے صریح گناہ کرنے سے بھی ڈر کر نہیں لیتے غرض اس آیت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نفس و شیطان کے داؤں میں متقین کا آجانا بھی تعجب کی بات نہیں اسی بناء پر حضرت معاذ بن مالک سے گناہ ہو گیا اس سے ان کی شان میں کوئی معصت لازم نہیں آئی بلکہ الَّذِينَ اتَّقَوْا (جو لوگ خدا ترس ہیں) کی بشارت ان کے واسطے ثابت ہے کیونکہ مس شیطان کے ساتھ ان میں فاذا هم مبصرون (سو یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) کا وجود بھی ہوا اور یہی شان یہ متقین کی ہے اور ایسا متنبہ ہوا کہ گناہ کی توبہ میں بدوں جان دیئے چلین ان کو نہ آیا حتیٰ کہ حضور ﷺ فرما لٹھے کہ معاذ نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ستر گناہ گاروں پر ڈال دی جائے تو سب کو کافی ہو جائے۔

اہل تقویٰ کی حالت

حق تعالیٰ نے اس آیت میں إِذَا مَسَّهُمْ ظَلَمٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ وَذَكَرُوا لِعِزَّتِ اللَّهِ اهل تقویٰ کی حالت یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہو جاتا ہے (میں بتا چکا ہوں کہ وہ اثر غفلت ہے بقرینہ تذکرہ اور توجہ تذکرہ اختیار کرتے ہیں تو علاج غفلت کا تذکرہ ظہرًا تذکرہ و کا مفعول یہاں مذکور نہیں میں اس کی حکمت تو شروع میں بیان کر چکا ہوں اب میں اس کی تعیین بتاؤں گا کہ وہ مفعول کیا مخدوف ہے پہلے آیت کا خلاصہ سمجھ لیجئے وہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ بندگان خدا کی شان یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہوتا ہے یعنی غفلت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ تذکرے سے اس کا علاج کرتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ فاذا هم مبصرون پس ناگہاں ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اس میں گناہ کی مذمومیت اور اثر کا بھی بیان ہو گیا اس طرح کہ جب علاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنکھیں کھل گئیں معلوم ہوا کہ گناہ سے نہیں بند ہو گئی تھی اور معصیت کے تقاضے کے وقت اندھے ہو گئے تھے واقعی گناہ میں یہی اثر ہے آدمی تقاضے کے وقت اندھا ہو جاتا ہے قتل تک کر گزرتا ہے حالانکہ معلوم ہے کہ پھانسی ہوگی اس وقت اس سے دھول ہو جاتا ہے نیز فاذا هم مبصرون سے یہ بھی معنی پیدا ہوتے ہیں وہ چیز فی نفسہ مخفی نہ تھی بلکہ یہ اثر جو ہو گیا تھا یہ اس کی آنکھ کا تصور ہے کہ اس میں شعاع نہ رہی تھی جو اس پر پڑتی اور دیکھ لیتی تذکرے سے شعائیں پیدا ہو گئیں اور وہ آنکھوں والے ہو گئے اور وہ چیز تو اس کی موجود تھی ہی اب نظر آنے لگی اور امتناع عن المعصیت اس پر مرتب ہو گیا اور وہ چیز جو مفعول ہے تذکرہ کو جس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے اب اس کی تعیین بتلاتا ہوں اس کا دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے وہ آیت یہ ہے وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا

اَنْفَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ اللَّهُ ذُنُوبًا إِلَّا الْاِلَهَ الَّذِي لَا يُجَارُ عَلَيْهِ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ

اس میں بھی متعین کی شان کا بیان ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ گناہوں سے استغفار کرتے ہیں اور گناہوں کا بخشنے والا سوائے اللہ کے کون ہے اور وہ اپنے اس فعل پر (جان بوجھ کر) اصرار نہیں کرتے۔ دیکھئے اس میں صاف مذکور ہے کہ وہ یاد کرنے کی چیز کیا ہے وہ بس ایک چیز ہے اللہ مفسرین نے ذکر اللہ کی تفسیر کی ہے ذکر و اعذاب اللہ کیونکہ عذاب ہی کا خوف سبب ہوتا ہے استغفار اور کف عن المعصیت کا میں کہتا ہوں لفظ عذاب محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں اس میں کیا اشکال ہے کہ اللہ کو یاد کرتے ہیں یاد خدا کافی معصیت سے روکنے کو بلکہ عذاب کا خوف اتنا مانع نہیں ہو سکتا جتنا کہ خدا کی یاد مانع ہوتی ہے اہل بصیرت اس کو خوب سمجھتے ہیں یہ تو جب ہے کہ ذات کی طرف توجہ مراد لی جاوے اور خدا کی یاد کی ایک توجیہ اور بھی ہو سکتی ہے جس میں اس یاد کی کسی نوع کی تخصیص ہی نہ رہے اور وہ توجیہ یہ ہے کہ دیکھئے خدا کی یاد کس کو کہتے ہیں کیا صرف اللہ اللہ زبان سے کہنے کو کہتے ہیں نہیں بلکہ خدا کی ہر بات کی یاد کو خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں توجہ الی الذات کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں لفظ اللہ اللہ زبان سے کہنے کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں اور عذاب اور دوزخ کی یاد کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں کیونکہ خدا نے اس کو یاد دلایا ہے اور ثواب اور نعمائے آخرت اور جنت کی یاد کو بھی خدا کی یاد کہہ سکتے ہیں (اسی لئے صاحب حصن حصین نے کہا ہے کہ کل مطیع لله فهو ذاکر) (تو آیت کے یہ معنی ہوئے کہ جب ان پر شیطان کا اثر ہو جاتا ہے تو وہ خدا کی یاد کرتے ہیں یعنی خدا کی کسی چیز کو یاد کر لیتے ہیں خواہ ذات کو یاد کرتے ہیں خواہ ذکر اللہ بلسان سے کرنے لگتے ہیں یا عذاب کو یاد کرتے ہیں یا ثواب اور جنت کو یاد کرتے ہیں یہ اپنا اپنا مذاق ہے بعضوں کو تقھائے معصیت مقلوب کرنے کے لئے صرف ذکر اللہ ہی بالمعنی التبادر کا کوئی ہوتا ہے اور بعضوں کو عذاب کے استعمار کی ضرور پڑتی ہے۔ اور بعضوں کو جنت کا یاد کرنا مفید ہوتا ہے بلکہ میں یہاں تک تعلیم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو یاد کرنا یہ بھی اللہ ہی کی یاد ہے کیونکہ جس طرح جنت دوزخ اللہ ہی کی چیزیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مذکر ہیں اسی طرح مقبولین و صلحاء اللہ کی چیزیں ہیں اور اس کی مذکر ہیں چنانچہ مشاہدہ ہے کہ صلحائے کے اقوال افعال اخلاق کے ذکر سے طاعت کی رغبت اور معصیت سے نفرت ہوتی ہے اور اس تعلیم سے ایک بڑا مسئلہ حل ہوا وہ یہ کہ ایک ذاکر نے مجھ سے پوچھا کہ ذکر لا الہ الا اللہ میں تعلیم کی جاتی ہے کہ لا الہ کے ساتھ سب غیر اللہ کی نفی کی جاوے تو غیر اللہ میں تو حضور ﷺ بھی آگئے تو مطلب یہ ہوا کہ ذاکر کو اللہ سے بھی قطع تعلق کرنا چاہئے وہ حل یہ ہے کہ غیر اللہ سے مراد وہ ہے جو حق تعالیٰ سے حاجت ہو اور حضور ﷺ کا تعلق ہادی اصل ہونے کا ہے اس لئے آپ اس نفی میں داخل نہیں ہو اس خاص تعلق کے سبب حضور ﷺ کا

ذکر غیر اللہ کا ذکر نہیں بلکہ اللہ ہی کا ذکر ہے غرض خدا تعالیٰ کے تعلق کی چیزوں کا ذکر ذکر اللہ ہی ہے (اسی لئے حدیث میں ہے السُّبْحُ مَعْلُونَةٌ وَ مَلْعُونَةٌ مَا فِيهَا إِلَّا ذِكْرُ اللَّهِ وَ مَا وَالَا جَمْلُهُ وَالْآهَ فِيهِ وَهُوَ تَمَامٌ حَيْثُ دَاخِلٌ فِيهِ جَوْزُ ذِكْرِ اللَّهِ فِي مَعْنَى هُنَّ فِيهِمْ وَهُوَ بَعْضُ ذِكْرِ اللَّهِ فِي حَقِّهِمْ) تو ذکر اللہ میں جنت اور دوزخ اور ذکر لسانی وغیرہ یہ سب آگئے تو کوئی ضرورت لفظ عذاب کے تخصیص کی نہ رہی کیونکہ اس میں مانع کی تخصیص ہوئی جاتی ہے کہ صرف ترہیب ہی مانع عن المعصیۃ ہوتی ہے حالانکہ یہ واقع کے خلاف ہے بعضوں کو ترغیب زیادہ نافع ہوتی ہے اس لئے ذکر اللہ کو عام ہی رکھا جاوے جس میں سب داخل رہیں ترغیب بھی اور ترہیب بھی اور خود یاد خدا بھی چنانچہ بعضوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ان کو ترغیب کام دے نہ ترہیب جس پر غلبہ ہوتا ہے فناء کا اور توحید کا وہ جو معصیت سے رکتا ہے اس کو نہ جنت روکتی ہے نہ دوزخ اس کو صرف یاد خدا روکتی ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ بے حیائی کا کام باپ کے سامنے بیٹے سے نہیں ہو سکتا۔ گو اس کو یہ بھی ڈرنہ ہو کہ یہ مجھے مارے پیٹے گا۔ یہاں خوف نے نہیں روکا بلکہ باپ کی عظمت سے روکا اسی طرح بعضوں کا علاقہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ خیال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ دیکھ رہے ہیں تو شرماتے ہیں اور اس وقت ان سے معصیت ہو ہی نہیں سکتی یہاں صرف ذکر اللہ مانع ہوا اور بعضے ایسے حیا دار نہیں ہوتے بلکہ محتاج ہوتے ہیں ترغیب کے ان کے لئے یہی کارآمد ہے کہ تقاضائے نفس کے وقت عذاب الہی کو یاد کریں اور بعضے ترہیب سے متوحش ہوتے ہیں ان سے اگر ترغیب سے کام لیا جائے تو رجوع ہوتے ہیں تو ان کو جنت کا ذکر چاہئے بعضوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ احسان کا اثر ان پر بہت زیادہ ہوتا ہے اگر وہ حق تعالیٰ کی نعمتیں یاد کریں تو شرماتے ہیں احسان سے دبے جاتے ہیں ان کے واسطے حق تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہی گناہ سے رکنے کے لئے طریق نافع ہے کیونکہ وہ نعمتوں کو گناہ میں استعمال کرنے سے شرماتے ہیں۔

غرض اس کو بھی یاد کر کے بعض لوگ شرماسکتے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ذکر اللہ کو بمعنی ذکر اللہ عذاب اللہ کے لیں غرض جب کسی کو عذاب کے تذکر سے نفع ہوتا ہے اور کسی کو ثواب کے اور کسی کو احسان کے تذکر سے لہذا تذکر کو بلا قید ہی رکھنا چاہئے اب ایک دوسری بات سمجھو کہ آیت میں تذکر فرمایا اور اس کی کچھ حد نہیں فرمائی سو باب تفضل تذکر کو چاہتا ہے پس تذکر کے معنی یہ ہوئے کہ بتدریج تذکر میں بڑھتے چلے جائیں اور حد نہ ہونے سے اس تذکر کا قطع نہ ہونا مفہوم ہوا پس دو مسئلہ کی طرف اشارہ ہو گیا ایک تو یہ کہ اضطراب نہ کریں سکون کے ساتھ چلتے رہیں دوسرا یہ کہ سلوک کو کہیں ختم نہ کریں ہمیشہ چلتے ہی رہیں اس میں سالکین دو غلطیاں کرتے ہیں ایک اضطراب دوسری اس سے بڑھ کر انقطاع یعنی کسی مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں اور قناعت کر لیتے ہیں مثلاً حضور قلب حاصل ہو گیا اور مجاہدہ کرنے سے یہ ملکہ پیدا ہو گیا کہ جب چاہیں خیال کو ایک طرف کر

لیں تو بس حضور قلب کو چھوڑ بیٹھے اس اعتبار پر کہ ہم کو قدرت تو حاصل ہے ہی کیوں صاحب وہ قدرت کس کام کے لئے حاصل ہوئی ہے قوت سے فعل میں لانے کے لئے یا فقط دل کو سمجھانے کے لئے۔

مجاہدہ سے مادہ قطع نہیں ہوتا

خود اس آیت سے بھی میری اس تقریر کا ثبوت ملتا ہے کہ مجاہدہ سے مادہ کا قطع نہیں ہو جاتا کیونکہ آیت میں صاف موجود ہے کہ تقویٰ کے بعد بھی مس شیطان ہو جاتا ہے فرماتے ہیں إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَا لَهُمْ ظِلْمٌ لِّعَيْنِ مُتَّقِينَ پر بھی مس واقع ہوتا ہے مگر فرق ہوتا ہے اس مس میں اور اس مس میں جو غیر متقین پر واقع ہوتا ہے غیر متقین اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور متقین پر یہ اثر ہوتا ہے کہ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُنْتَبِهُونَ یعنی وہ فوراً چونک اٹھتے ہیں اور صاحب بصیرت ہو جاتے ہیں دیکھئے کتاب بڑا فرق ہے ڈاکو ایک اناری اور غافل پر چھاپہ مارتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب مال و اسباب لوٹ کر لے جاتے ہیں بلکہ اس کو بھی مار کر ڈال دیتے ہیں یا باندھ کر لے جاتے ہیں اور کبھی ایک کار کردہ اور تجربہ کار اور ہوشیار پر چھاپہ مارتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے غل تو بچ جاتا ہے اور تماشاخیوں کا مجمع ہو جاتا ہے لیکن اس کی ذات کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا بلکہ یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ہوشیار ہو کر پھر سے چوکی کو اور درست کر لیتا ہے بلکہ کبھی ڈاکوؤں کو بھی باندھ لیتا ہے چھاپہ مارنا دونوں جگہ ہوا مگر اثر میں فرق ہے اسی طرح فرق ہے متقین پر مس شیطان کے اثر میں اور غیر متقین پر اثر میں اور اس آیت میں تو مس شیطان کو مجملاً ہی بیان فرمایا ہے اور اس کے کسی خاص اثر کا بیان نہیں کیا کہ اس مس سے کچھ اثر بھی ہوتا ہے یا نہیں بس اتنا فرمایا ہے کہ مس شیطان متقین کو بھی ہوتا ہے مگر ایک دوسری جگہ اس اثر کے بعض افراد کی تعین بھی فرمادی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ یہ بھی متقین کی شان میں ہے ترجمہ یہ ہے کہ جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں یہاں مس شیطان کا ایک اثر غضب مذکور ہے کہ جب ان کو غصہ آتا ہے جو شیطان کا اثر ہے تو وہ شیطان کے کہنے پر عمل کر کے مقتضائے غضب پر عمل نہیں کرتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں یہاں سے معلوم ہوا کہ متقین کو غصہ بھی آجایا کرتا ہے کیونکہ اذا اور ان میں فرق ہے اذا یقیدیات پر آتا ہے اور ان محتملات پر اور یہاں لفظ اذا لایا گیا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ متقین کو بھی غصہ آتا غالب ہے مگر اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہوتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں غصہ مس شیطان کا ایک فرد ہے اس آیت میں اس کی تصریح ہو گئی۔

اس تحقیق کی بناء اس پر ہے کہ مادہ شر کا سلب مطلوب نہیں ہے بلکہ اس پر غلبہ حاصل کر لینا مطلوب ہے جس سے وہ اعتدال پر رہے اور یہی کمال ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ تقویٰ کے بعد

مس شیطان ہی نہیں ہوتا اور ان کو معصیت کا خیال ہی نہیں آتا بلکہ تذکرہ فرمایا کیا معنی کہ وہ سنبھل جاتے ہیں اور ہوشیار ہو جاتے ہیں حاصل یہ کہ مس تو ہوتا ہے مگر اس مس کو قیام نہیں ہوتا اور اس مس کرنے والی چیز کو طائف سے تعبیر فرمایا اس کے معنی ہیں گرد پھرنے والا یعنی آیا اور بھاگ گیا بس متقی کی حالت تو یہ ہے کہ وساوس اس کے دل میں جتتے نہیں اور غیر متقی کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں وہ خیالات جتتے ہیں اور طائف کا ترجمہ جو میں نے گرد پھرنے والا کیا اس میں ایک اور اشارہ بھی ہے کہ اس کو قدرت آس پاس ہی پھرنے کی ہے قلب کے اندر نہیں جاسکتا یہ ایسا ہے جیسے ایک شاعر نے کہا ہے

عدل العو اذل حول قلب التاءه وهوى الاحبة منه فى سوداءه

یہ حالت تو وساوس کی ہے اور تقویٰ کی شان یہ ہے کہ وہ اندرون قلب میں جاگزیں ہوتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے *الا ان التقویٰ ههنا و اھنا الی صلرہ* یعنی حضور ﷺ نے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے اور سینہ کی طرف اشارہ کیا یعنی قلب کے اندر ہے اور طائف کے معنی آس پاس پھرنے والے کے ہیں تو آیت اور حدیث کو ملا کر یہ بات ثابت ہوگئی کہ متقی کے دل میں تقویٰ ہی کا غلبہ ہوتا ہے اور شیطان اندر نہیں جاسکتا اس میں شیطان کے ضعیف ہونے کو بیان فرمایا اور سالک کو تسلی دی کہ اے قلعہ دار ڈرنا نہیں خندق کے باہر ہی شیطان ہے اسی واسطے عارف شیطان کی بالکل پروا نہیں کرتا حتیٰ کہ اس کے دفع کی طرف بھی زیادہ التفات نہیں کرتا ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ اعوذ باللہ پڑھتے تو شیطان کو مخاطب کر کے کہتے کہ چونکہ شریعت کی تعلیم ہے ایسے موقع پر اعوذ پڑھنے کی سوا اس واسطے پڑھتا ہوں تیرے ڈر سے نہیں پڑھتا تجھ سے کیا خوف قرآن شریف میں موجود ہے۔ *إِنَّكَ لَيْسَ لَكَ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا* کہ شیطان کو کسی قسم کی قدرت اور اختیار نہیں ایمان والوں پر بلکہ عارف کو بعض وقت بجائے نقصان کے شیطان سے النافع پہنچ جاتا ہے عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد اور شیطان کو بڑا ہی عاقل اور تجربہ کار ہے مگر کبھی اس سے غلطی بھی ہو جاتی ہے وہ اس لالچ سے کہ انسان اس کے کہنے میں آ جاوے گا بھکا تا برابر ہے کبھی اس سے نہیں چوکتا مگر کبھی اس کو دھوکہ ہو جاتا ہے کہ کسی کو خوب بھکایا اور اس میں بڑا وقت صرف کیا اور اس میں ایسا مشغول ہوا کہ اور کاموں سے رہ گیا اور یہاں اس شخص کو جس پر اتنی محنت کی تھی تذکرہ ہو گیا بس ساری محنت ضائع گئی بلکہ اتنا اور نقصان پہنچا کہ وہ شخص بمتقضائے *وَإِذَا هُمْ مُنْحَرُونَ* کے اور صاحب بصیرت ہو گیا اور آئندہ کو بھی اس کے فریب میں آنے کی امید کم ہوگئی اس وقت شیطان پچھتا تا ہے کہ میں ایسا نہ کرتا تو اس وقت اور کاموں سے بھی ندرہ جاتا اور آئندہ کو اس سے امید تو مغالطہ میں آنے کی رہتی اور ہمت اس کی ٹوٹ جاتی ہے مگر بے حیا ہے کہ پھر تھوڑی دیر میں آتا ہے اور گو کامیابی کی امید نہیں مگر پھر بھی اپنا کام کرتا ہی ہے ہمت میں تو شیطان استاد بنانے کے قابل ہے کہ تھکتا ہی نہیں۔

تذکر کی اہمیت

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا جُلُوجَ مَتَىٰ هِيَ ان کی شان یہ ہے کہ لَذَائِمُهُمْ ظَلَمَتْ مِنَ الشَّيْطَانِ جب ان کو شیطان کا ذرا سا بھی اثر ہو جاتا ہے تو تذکرہ یاد کر لیتے ہیں اور ہوشیار ہو جاتے ہیں تذکرہ کا مفعول ذکر نہیں کیا اس میں اشارہ ہے کہ یاد کر لینے کی چیز کو یاد کر لیتے ہیں اس کے بیان کی ضرورت نہیں مقصود یہ ہے کہ اس وقت یاد سے کام لیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اس وقت کا علاج یاد ہے مطلقاً قطع نظر اس کے کسی خاص فرد سے اور اس کے افراد وغیرہ کی تعیین مستقل مسئلہ ہے اگر کسی فرد کو یہاں ذکر کر دیتے تو وہی تعیین ہو جاتا باقی افراد کی نفی ہو جاتی مگر کسی فرد کی تعیین نہیں کی گئی اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی فرد کا بھی ذکر ہوتا تو بے محل ہوتا کیونکہ محط فائدہ یہاں صرف ضرورت تذکرہ ہے نہ کہ تعیین افراد کی اس کی کسی قدر تفصیل یہ ہے کہ سب جانتے ہیں کہ علاج بالعد ہوتا ہے مثلاً حرارت کا علاج برودت سے اور برودت کا حرارت سے ہوتا ہے۔ یہاں دیکھنا چاہئے کہ شیطان کے اثر سے کیا مرض پیدا ہوا جو مرض پیدا ہوا ہو اس کی ضد کا پیدا کرنا علاج ہو گا سو شیطان کے اثر سے بہت سے امراض پیدا ہوتے ہیں مگر ان سب امراض کی جڑ غفلت ہے یعنی شیطان کے اثر سے اولاً غفلت ہی پیدا ہوتی ہے مگر آیت میں اس کا بیان صراحتاً نہیں ہے اور اس کی وجہ دو ہیں ایک تو یہ کہ یہ بہت ظاہر ہے دوسرے یہ کہ تذکرہ کے لفظ سے اس کا پتہ چل جاویگا کیونکہ ایک مقابل سے دوسرے مقابل پر تشبیہ ہو جاتی ہے اور خود بخود دوسری کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے جیسے اندھے کا ذکر سن کر سوان کہے کی طرف خود ذہن چلا جاتا ہے اسی طرح تذکرہ سے غفلت خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے تو چنداں حاجت اس کے بیان کی نہ رہی اور کلام کی بلاغت اسی میں ہے کہ زائد اذکار بات بالکل نہ ہو پس آیت میں مقابلہ ہے غفلت اور یاد کا باقی اس سے بحث نہیں کہ کس کی یاد یہ ایسا ہے جیسے اگر بھوکے کو علاج بتا دیں تو کہیں گے کہ کچھ کھاؤ اور اس وقت یہ کہنا بے موقع ہو گا کہ پلاؤ یا فوراً یا فیرنی کھاؤ اس وقت اجمال میں جو بلاغت ہوگی تفصیل میں ہرگز نہ ہوگی بلکہ جتنی تفصیل بڑھتی جاوے گی کلام بلاغت سے گرتا جاوے گا مثلاً کوئی بھوکے سے یوں کہنے لگے کہ علاج تمہارا یہ ہے کہ گوشت کو لے کر پانی سے دھو کر بخنی پکاؤ اور اس میں سونف و حنیاں گرم مصالح اتنا اتنا ڈالو اور اتنی دیر تک پکاؤ پھر ہاتھ تین دفعہ دھو اور دسترخوان بچھا کر بیٹھو اور اس پلاؤ کو کھاؤ تو ظاہر ہے کہ اس طویل تقریر کو کوئی بھی نظر احسان سے نہ دیکھے گا اس وقت بلوغ جواب یہی ہے کہ بھوک کا علاج یہ ہے کہ کچھ کھاؤ اور یہ مستقل بات ہے کہ کیا کھاؤ اس کے لئے مستقل علم موجود ہے یعنی علم طب غرض آیت پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ تذکرہ کے مفعول کی تعیین نہیں کی جواب یہی ہے کہ مقصود کی اہمیت کی وجہ سے اس کا ذکر نہیں کیا اور یہاں مقصود نفس تذکرہ ہے دوسرے تذکرہ کی اہمیت بتلانا بھی مقصود ہے یہ نکتہ ہوا تذکرہ کے مفعول کے حذف ہونے کا۔

ازیں یہ کہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمل میں اصل جملہ انشائیہ ہی ہے وہی مقصود ہوتا ہے جملہ خبر یہ خود مقصود نہیں ہوا اور جس خبر سے محض خبر مقصود ہو اور کسی معنی انشائی پر دلالت نہ ہو وہ عقلاء کے نزدیک مہمل ہے پس یہاں ان دونوں قسموں کے بیان کرنے سے صرف ایک واقعی بات کی خبر دینا مقصود نہیں ہو سکتی کہ معلوم کر لو کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں کیونکہ یہ تو فعل زائد ہے جو کسی ادنیٰ عاقل سے بھی بعید ہے چہ جائیکہ خدا تعالیٰ کے کلام میں ایسا ہو بلکہ مقصود انشاء ہے یعنی امر کرنا اس بات کا کہ تم اول گروہ کے موافق بنو اور دوسرے کے موافق نہ بنو اور گناہ کے ترک کی ترکیب بتانا اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے سبب پر مطلع کرنا منظور ہے کہ اس طرح گناہ سے بچ سکتے ہیں اور فلاں طریق اختیار کرنے سے گناہ میں پڑ جاتے ہیں سو متیقن کی حالت یہ بیان کی کہ جب ان کو ذرا سا بھی اثر شیطان محسوس ہوتا ہے تو وہ تہذیب اختیار کرتے ہیں۔

فرمایا آج رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک طالب علم میرے پاس یہ آیت شریف پڑھ رہا ہے
 هَذَا بَصَائِرُ مِنْ نَبِيِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ آیت آخر سورہ اعراف میں نے خواب ہی میں اس سے پوچھا کہ بصائر کون جمع کیوں لائے ہیں اور ہدی ورحمۃ کو مفرد کیوں لائے ہیں اس نے جواب دیا تاکہ راستہ چلنے والے پریشان نہ ہوں میں نے کہا کہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہوا اس کے بعد میں نے خود کہا کہ راستہ چلنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے ایک ضیاء کی دوسرے طریق کی تیسرے منزل کی لیکن ضیاء سے کام لینے کے لئے آنکھیں شرط ہیں اور آنکھیں ہر شخص کے لئے علیحدہ ہونی چاہئے اس کے لئے بصائر کو جمع لایا گیا اور ہدی مثل طریق کے واحد ہے اس لئے وہ مفرد لایا گیا اور رحمت مثل ثمرہ طریق یعنی منزل کے ہے وہ بھی متعین اور واحد ہے اس واسطے اس کو بھی واحد لایا گیا۔

سُورَةُ الْأَنْفَالِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا

وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے تو ان کو سننے کی توفیق دیتے اور اگر ان کو سنا دیں تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے۔

تفسیری نکات

وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ كَا مَفْهُوم

وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۱۵﴾ بظاہر اس آیت میں شکل اول کی صورت معلوم ہوتی ہے ترجمہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ ان (کفار) میں کچھ بھلائی اور خیر دیکھتے تو ان کو (دین کی باتیں) سنا دیتے اور اگر ان کو سنا دیتے تو وہ اعتراف کرتے ہوئے پیٹھ موڑ دیتے۔ شکل اول کے قاعدہ پر اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے لو علم اللہ فیہم خیراً لتولوا یعنی اگر حق تعالیٰ ان میں بھلائی دیکھتے تو وہ پیٹھ موڑ دیتے حالانکہ یہ نتیجہ مجال کو مستلزم ہے کیونکہ جس صورت میں حق تعالیٰ کو ان کے اندر بھلائی معلوم ہوتی ہے اس صورت میں تو وہ حق بات کو قبول کرتے اس حالت میں اعراض کیونکر ممکن تھا کیونکہ اعراض تو شر ہے خیر کے ساتھ اس کا اجتماع نہیں ہو سکتا اور نہ لازم آئے گا کہ ان میں خیر ہی نہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں شکل اول ہی نہیں کیونکہ یہاں حد اوسط مکرر نہیں

لاسمعہم اول سے مراد تو یہ ہے لاسمعہم فی حالۃ علم الخیر فیہم اور ثانی سے مراد یہ ہے کہ لو

اسمعہم فی حال عدم علم اللہ فیہم خیراً حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اگر خدا تعالیٰ کو ان میں بھلائی کا

ہونا معلوم ہوتا تو وہ ضرور ان کو دین کی باتیں سنا دیتے اور وہ ان کو قبول بھی کر لیتے اور اگر اس حالت میں کہ خدا کو معلوم ہے کہ ان میں بھلائی نہیں ہے سرسری طور پر ان کو دین کی باتیں سنادی جائیں تو وہ اعراض ہی کریں گے۔ اب وہ اشکال رفع ہو گیا اس سے آپ کو منطق کی ضرورت معلوم ہو گئی ہوگی۔

مذمت کفار

وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ ذُرْوًا مِّنْهُمْ لِيَتَوَلَّوْاْ وَهُمْ يُعْرَضُونَ ﴿۱۹۵﴾ اس آیت میں کفار کی مذمت کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ علم خیر کے لئے اسماع لازم ہے اور اسماع کے لئے تولى لازم ہے اور قاعدہ عقلمیہ ہے کہ لازم کا لازم لازم ہوا کرتا ہے تو علم خیر کے لئے تولى لازم ہوئی جس کا مطلب اس قاعدہ مذکورہ کی بناء پر یہ ہوا کہ اگر حق تعالیٰ کو ان کفار کے متعلق خیر اور بھلائی کا علم ہوتا تو ان کفار سے تولى اور اعراض کا صدور ہوتا اور اس کا استحالہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے علم کا واقع کے مطابق نہ ہونا لازم آتا ہے جو محال ہے اب اس کا شبہ کا رفع کرنا اس شخص کے لئے جو علوم درسیہ سے واقف نہ ہو بہت دشوار ہے اور جو علوم درسیہ پڑھ چکا ہو اس کے لئے ایک اشارہ کافی ہے وہ یہ کہ یہ شبہ تو جب صحیح ہوتا کہ یہاں اسماع حد اوسط ہوتا حالانکہ اسماع حد اوسط نہیں اس لئے کہ وہ مکر نہیں کیونکہ پہلا اسماع اور ہے اور دوسرا اسماع اور ہے۔ لہذا تولى کو جو لازم کا لازم سمجھا گیا اور اس بناء علم خیر کے لئے تولى کو لازم قرار دیا گیا خود یہی غلط ہوا پس حق تعالیٰ کے علم کے متعلق واقعہ کے غیر مطابق ہونے کا جو شبہ ہوا تھا وہ رفع ہو گیا اب آیت کا صحیح مطلب یہ ہوا کہ اگر حق تعالیٰ ان کے اندر کوئی خیر دیکھتے تو ان کو باسماع قبول سنا تے مگر جبکہ حق تعالیٰ کے علم میں ان کے اندر کوئی خیر نہیں ہے ایسی حالت میں اگر ان کو نصیحت سنادیں جو اسماع قبول نہ ہوگا کیونکہ یہ اسماع حالت عدم خیر میں ہوگا تو وہ لوگ اس کو ہرگز قبول نہ کریں گے بلکہ تولى اور اعراض کریں گے اسی طرح قرآن کی آیت پر ایک دوسرا شبہ اور اس کا جواب یاد آیا اس کا واقعہ یہ ہے کہ جنگ بلقان کے زمانہ میں جب ایڈریانو پل پر کفار کا قبضہ ہوا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت پریشانی ہوئی اور طرح طرح کے خیالات فاسدہ آنے لگے حتیٰ کہ بعض کو نصوص پر کچھ شبہات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر دہلی کے مسلمانوں نے ایک بڑا جلسہ کیا اور مجھ کو اس جلسہ کے اندر مدعو کیا اور صدر بنایا اور لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی نیت سے مجھ سے وعظ کی درخواست کی چنانچہ میری اس جلسہ میں تقریر ہوئی جب وعظ ہو چکا تو باآواز بلند میں نے کہا کہ اگر کسی کو کوئی شبہ ہو یا کسی کو کچھ دریافت کرنا ہو تو دریافت کر لے تاکہ بعد میں کوئی شیخ یہ نہ کہے کہ مجھ کو یہ پوچھنا تھا اور نہ پوچھ سکا۔ یہ سن کر ایک ولایتی منتہی طالب علم کھڑے ہوئے یہ لوگ معقول زیادہ پڑھتے ہیں قرآن سے معلوم ہوتا تھا کہ معقولی ہیں کہنے لگے کہ قرآن شریف میں وعدہ ہے **وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ** مگر باوجود اس کے پھر ایڈریانو پل پر کفار کا قبضہ ہو گیا تو اس کی کیا وجہ میں نے کہا کہ مولانا یہ تو بتلائے کہ

موجہات میں سے یہ کونسا قضیہ ہے بس میرے اس کہنے پر ہی وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے پھر میں نے ہی خود ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ شبہ ہوا کہ یہ قضیہ ضرور یہ یاد آئے ہے تو اس کی کیا دلیل ہے ممکن ہے کہ مطلقہ عامہ ہو جس کا ایک بار بھی وقوع کافی ہوتا ہے جو ہو چکا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو گیا اس کے بعد پھر کوئی شخص نہیں کھڑا ہوا تو دیکھئے چونکہ یہ طالب علم علوم درسیہ پڑھے ہوئے تھے اور مبادی ان کے ذہن میں تھے اس لئے میرے ایک لفظ سے ان کا شبہ حل ہو گیا۔ اسی طرح ایک اور مولوی صاحب کو قرآن شریف کی ایک آیت کے متعلق شبہ تھا وہ یہ کہ آٹھویں پارہ میں ارشاد ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْلَا إِذْهَبَ اللَّهُ مَّا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَمَلْنَا مِنْ شَيْءٍ وَكَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذُكِّرُوا بِمَا كَانُوا يُشْرِكُونَ
إِلَّا الظُّلُمَٰتُ وَلَنْ تُنصِرَهُنَّ أَحَدٌ مِّنَ الْعَالَمِينَ

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اول کفار مشرکین کا مقولہ نقل فرمایا ہے کہ اگر حق تعالیٰ یہ چاہتے کہ ہم سے شرک کا وقوع نہ ہوتو ہم شرک نہ کرتے (مگر جب ہم سے شرک وقوع ہوا تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہی نے چاہا ہے کہ ہم سے شرک ہو تو پھر ہم پر کیوں ملامت کی جاتی ہے کیونکہ ہم نے وہ کام کیا ہے جو حق تعالیٰ کا چاہا ہوا تھا) پھر اس مقولہ کے نقل فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے کذ لک سے تخریصوں تک کفار کے اس مقولہ کا رد فرمایا اور ساتویں پارہ میں ہے ولو شاء الله ما اشرکوا یعنی حق تعالیٰ حضور ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں کہ ان مشرکین کی حالت پر تارخ و غم نہ کیجئے کیونکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں ہماری مشیت سے کر رہے ہیں اگر ہم چاہتے کہ یہ شرک نہ کریں تو یہ شرک نہ کرتے تو آٹھویں پارہ میں جو آیت ہے وہاں تو شرک کے متعلق مشیت کی نفی فرمائی اور اس دوسری آیت میں اس مشیت کا اثبات فرما رہے ہیں تو ان دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے وہ مولوی صاحب مجھ سے اس کے جواب کے طالب ہوئے اب وہ لوگ جو بلا علوم درسیہ پڑھے ہوئے محض ترجمہ قرآن کو بطور خود دیکھ کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے قرآن کو سمجھ لیا ذرا اس شبہ کا تو جواب دیں میں نے یہ جواب دیا کہ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ تعارض تو جب ہوتا کہ جس مشیت کی ایک جگہ نفی کی گئی ہے اسی مشیت کا دوسری جگہ اثبات کیا جاتا حالانکہ ایسا نہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مشیت کی دو قسمیں ہیں ایک مشیت تشریحی جس کا دوسرا نام رضا اور دوسرے مشیت تکوینی جس کا نام ارادہ ہے تو آٹھویں پارے میں جس مشیت کا اثبات کیا گیا ہے اس سے مراد مشیت تکوینی یعنی ارادہ ہے کیونکہ پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کا عقیدہ بیان فرمایا ہے تو کفار اپنے سے شرک کے متعلق مشیت تشریحی یعنی حق تعالیٰ کی رضا کے معتقد تھے اور دوسری آیت میں ایک عقیدہ شرعیہ بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ حضور ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں اور وہ عقیدہ شرعیہ یہی ہے کہ عالم میں جس سے بھی کفر و شرک کا وقوع ہو رہا ہے وہ حق تعالیٰ کے علم و ارادہ سے ہو رہا ہے گو مشیت تشریحی نہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ

عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کرے گا۔ اور تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے

اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایہ بشارت بتلایا ہے جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہے اور اسی لئے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے جو لوگ حق پر ہوں۔ ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کے ساتھ فصل کا حکم ہے پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آج کل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں دونوں کو مورد ملامت بنانے لگتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہیں جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بددین ہو جانا چاہئے اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کر لے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو اول یہ معلوم کیا جائے کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون جب حق متعین ہو جائے تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جائے بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے۔ فقاتلوا التي تبغى حتى تفسى الى امر الله

فَلَمَّا تَرَأَتْ الْفِئْتَانِ يَنْكَصُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكُمْ

إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: پھر جب سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹا پھر اپنی ایزدوں پر اور بولا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔

تفسیری نکات

کشف بلا اتباع شریعت شیطانی چیز ہے

اب دیکھ لیجئے کہ بہت سے صحابہ تو فرشوں کو نہ دیکھ سکے اور شیطان نے دیکھ لیا قبر میں جب عذاب ہوتا

جائے تو تدبیر سے مسلمانوں میں اتفاق ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ نزی تدبیر سے مسلمانوں میں اتفاق نہیں ہو سکتا اور میں نے یہ آیت پڑھی هو الذی ایدک بنصرہ و بالمومنین و الف بین قلوبہم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً ما الفت بین قلوبہم و لکن اللہ الف بینہم؛ دیکھئے حضور ﷺ جیسے مدبر اور تدبیر کا اتنا بڑا سامان کہ تمام ما فی الارض کا اتفاق، مگر ان سب تدبیروں کا نتیجہ اور حاصل دیکھئے کیا ارشاد ہے کہ ما الفت بین قلوبہم وہ فاضل بیحد مطمئن ہوئے کہنے لگے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کبھی میری نظر سے نہ گزری تھی اور چونکہ اتفاق کا تعلق تدبیر سے نہیں اسی لئے میں نے اس اتفاق کا بیان آج تک وعظوں میں مستقلاً بیان نہیں کیا اس لئے کہ بیکار ہے جو چیز اصل ہے اتفاق کی وہ اعمال صالحہ ہیں اگر مسلمان ان کو اختیار کریں خود بخود اتفاق ہو جائے گا۔

عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ مل کر کام ہوتا ہے دیکھئے هو الذی ایدک بنصرہ میں و بالمومنین بھی بڑھا دیا گیا ہے ورنہ مومنین کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی اس میں حق تعالیٰ نے ہٹا دیا کہ اتنی بڑی ہستی کی نصرت میں منت یہی ہے کہ مل کر کام کیا جائے غرض ہر حال میں کام کرنے کی ضرورت ہے محض زبانی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا (الافاضات الیومیہ ص ۲۸ ج ۷)

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا آخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اگر خدائے تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا تو جو عمل تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی۔

تفسیری نکات

کثرت رائے کے غیر صحیح ہونے کی دلیل

کثرت رائے کے غیر صحیح ہونے کی ایک خاص دلیل نہایت قوی یہ ہے کہ جنگ بدر میں سترہ قیدی حضور ﷺ کے حضور میں لائے گئے اس وقت تک اس کے متعلق کوئی نص تھی نہیں کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاوے حضور نے صحابہ سے مشورہ کیا خود حضور ﷺ کی رائے مبارک یہ تھی کہ کچھ فدیہ لے کر سب کو چھوڑ دیا جائے آپ تو بڑے رحیم و کریم تھے۔ خود صحابہ کی بھی زیادہ تر یہی رائے ہوئی کیونکہ اسی میں مصلحت معلوم ہوئی اور مصلحت کھلی ہوئی تھی کیونکہ وہ سب قیدی بڑے بڑے سردار تھے۔ یہ خیال ہوا کہ اگر ان کو چھوڑ دیا جائے گا تو اس کی تالیف قلب ہوگی ممکن ہے کہ حضور کی شان کرم کو دیکھ کر ان لوگوں کو محبت ہو اور اسلام لے آئیں اور یہ

رائے محض اس وجہ سے نہ تھی کہ خود حضور اقدس ﷺ کی بھی رائے مبارک یہی تھی بلکہ خود صحابہ کی بھی آزادانہ رائے اس مصلحت سے جس کا ابھی ذکر کیا گیا یہی تھی اور مشورہ اسی لئے کیا بھی جاتا ہے کہ مختلف رائیں معلوم ہوں جن میں سے پھر مستشیر یا امیر ایک کو ترجیح دے سکے اور مشورہ کا حاصل یہی ہے کہ سب کی رائے ظاہر ہو جائے اس لئے سب صحابہ نے آزادانہ اپنی رائے پیش کی تھی اتنی بڑی جماعت میں صرف حضرت عمرؓ اور سعد بن معاذ اس رائے میں موافق نہ تھے کہ ان قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ سارے مجمع میں ان دو بزرگوں کی یہ رائے تھی کہ یہ بڑے بڑے سردار ہیں ان سب کو قتل کر دیا جائے تاکہ کفر کی شوکت ٹوٹ جائے اور مسلمانوں کی یہ دھاک بیٹھ جائے کہ افواہ ان میں اتنی قوت ہے کہ کسی جماعت کی پرواہ نہیں کی اور کسی کو تدبیر و تالیف سے اپنے میں مدغم کرنا نہیں چاہتے سب سے مستغنی ہیں جب رائے کا انتخاب ہوا تو یہی رائے منتخب ہوئی کہ فدیہ لے کر سب کو چھوڑ دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اس وقت دیکھے صاف اسی کثرت رائے کی صورت تھی اگر یہ طریقہ کثرت رائے کا حق ہوتا تو اس کے خلاف آیت کیوں نازل فرمائی گئی اور آیت بھی کیسی سخت۔ ارشاد ہوا لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِیْہَا اَذُنٌ مِّنْ عَذَابٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰﴾ یعنی اگر تمہاری تقدیر میں پہلے سے خیر نہ لکھ دی گئی ہوتی تو تم نے جو عمل کیا اس پر عذاب عظیم آتا جب یہ آیت نازل ہو چکی تو حضور کو دیکھا گیا کہ رو رہے ہیں حضرات صحابہؓ نے پریشان ہو کر پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب قریب آ گیا تھا لیکن رک گیا اور اگر نازل ہو جاتا تو سوائے عمر اور سعد بن معاذ کے کوئی نہ بچتا سب ہلاک ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ نے غلظی دکھلانے کے لئے عذاب دکھلا دیا اور یہ دکھلانے کے لئے اجتہادی غلظی معاف ہے عذاب کو نال دیا۔ اور حضرت عمرؓ بجائے اس کے کہ فخر کرتے کہ میری رائے کے مطابق وحی نازل ہوئی بہت مغموم اور شرمندہ تھے کہ میں اس قابل کہاں کہ میری رائے کے موافق وحی نازل ہوئی خیر یہ قصہ تو ہوا لیکن جن کو فدیہ دے کر چھوڑ دیا گیا ان میں سے اکثر نے بعد کو اسلام قبول کر لیا انہیں میں حضرت عباسؓ بھی تھے اگر وہ قتل کر دیئے جاتے تو ان کے اولاد کہاں ہوتی اور بنو عباس کی خلافت کہاں ہوتی اور جو ان سے اسلام کی رونق اور قوت ہوئی وہ کہاں ہوتی بہر حال کثرت رائے کا باطل ہونا اس سے زیادہ کسی دلیل سے ثابت ہو سکتا ہے۔ ترجمہ اے پیغمبر ﷺ آپ کے قبضہ میں جو قیدی ہیں اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلب میں ایمان معلوم ہوگا تو جو کچھ تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے دنیا میں تم کو اس سے بہتر دے دے گا۔ اور آخرت میں تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

مصیبت کی حقیقت

جو تم سے (اس وقت فدیہ میں) لیا گیا ہے اور تمہاری مغفرت فرمادیں گے مراد یہ ہے کہ اس جملہ میں

اعطاء فی الدنیا مراد ہے اور جملہ ثانیہ میں اجر آخرت مراد ہے و مغفر لکم یعنی آخرت میں تمہاری مغفرت فرما دیں گے واللہ غفور رحیم کہ اللہ تعالیٰ تو بہت مغفرت فرمانے والے اور رحم فرمانے والے ہیں (اس لئے تم کو اس وعدہ میں تردد نہ کرنا چاہیے)

حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر تمہارے دل میں ایمان ہو تو تم کو اس مالی نقصان کا اندیشہ نہ کرنا چاہیے جو فدیہ سے اس وقت پہنچا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تم کو دنیا و آخرت میں اس کا نعم البدل عطا فرمائیں گے اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر نقصان و مصیبت کا نعم البدل ملتا ہے۔ اور ہر چند کہ مورد آیت کا خاص ہے مگر جس امر پر اس وعدہ کو مرتب فرمایا ہے وہ مورد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اس لئے آیت سے یہ قاعدہ مفہوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر مصیبت کا نعم البدل ملتا ہے۔ یہاں تو تعمیم پر کوئی صیغہ صراحتہ دال نہیں مگر دوسری نصوص سے اس تعمیم کی تائید ہوتی ہے اس وعدہ اور قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ وہ یہ کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے یہی حقیقت ہماری نظر سے غائب ہوتی ہے اس لئے مصیبت سے رنج زیادہ ہوتا ہے۔

اب دیکھو کہ تجارت میں انسان یہ چاہا کرتا ہے کہ میرے مال کی نکاسی ہو کہ جو چیزیں میرے ہاتھ کے تلے ہیں کوئی ان کا لینے والا خریدنے والا ہو۔ اگر خریدار کوئی نہ آئے تو تاجر گھبرا جاتا ہے خاص کر ایسی اشیاء میں جو باقی رہنے والی نہیں جیسے کل کے روز برف بہت ارزاں دہلی کے بھاؤ پر مل گئی تھی۔ کیونکہ خریدار کم ہوئے اور برف کا رہنا دشوار تھا اس لئے دہلی کے بھاؤ پر یعنی اپنی خریداری پر ہی دے گیا شہروں میں تو ایسا بہت ہوتا ہے کہ شام کو برف نہایت ارزاں ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ تاجر اپنے مال تجارت کپڑا رہنے پر رنجیدہ ہوتا ہے نکل جانے پر رنجیدہ نہیں ہوتا حالانکہ وہ اپنے خریداروں کے ہاتھ ایک محدود نفع پر پہنچتا ہے مگر پھر بھی وہ خریداروں کا مشتاق رہا ہے کہ کوئی میرا مال لے لے مرا سجدہ نہ ہو تو تولیہ ہی ہو تو تولیہ نہ ہو تو میلی کھلی صافی ہی سہی لیکن نفع نہ ہو تو کچھ خسارہ ہی سی چنانچہ بعض دفعہ ایسے مال کو جس کا خریدار کوئی نہ ہو کسی قدر خسارہ سے بھی فروخت کر دیتا ہے۔

جب تجارت کی یہ حقیقت ہے تو صاحبزادہ اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ یہ واقعات رنج و مصیبت تمام تر تجارت ہی ہیں اور تجارت بھی ایسی جس سے بڑھ کر نفع کسی تجارت میں نہیں ہوتا تو کیا پھر بھی نالہ و شیون باقی رہے گا میں رنج طبعی کا منکر یا مانع نہیں جو فطری طور پر ہوتا ہے بلکہ میں آگے اس کی ضرورت پر کلام کروں گا کہ طبعی رنج تو ہونا چاہئے ورنہ ثواب و اجر ہی نہ ہوگا۔ مگر میں اس وقت رنج عقلی کے متعلق گفتگو کر رہا ہوں کہ واقعات رنج و مصیبت کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد رنج عقلی نہ ہونا چاہئے۔

عمل صبر و شکر

خلاصہ یہ ہے کہ حالات کی دو قسمیں ہیں گوار و ناگوار پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں اختیاری و غیر

اختیاری یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے جن میں سے ہر ایک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں اور مومن اگر ان کے حقوق ادا کرتا رہے تو اس کو نعم البدل ملتا ہے ہی لئے مومن کسی حالت میں نقصان میں نہیں بلکہ ہر حالت میں نفع میں ہے اس لئے حدیث میں ہے۔

نعم الرجل المؤمن ان اصابته ستراء حمد و ان اصابته ضراء صبر و فی کل اجر او کما قال یعنی مومن آدمی بڑی اچھی حالت میں ہے اگر اس کو راحت پہنچتی ہے حمد و شکر کرتا ہے اگر تکلیف پہنچتی ہے صبر کرتا ہے اور ہر ایک میں اس کو اجر ملتا ہے یعنی شکر میں بھی اجر ہے اور صبر میں بھی

اس حدیث سے بھی یہ معلوم ہوا گیا کہ امور غیر اختیار یہ میں جو اجر ہے وہ ان اعمال کی وجہ سے جو اختیاراً اس وقت مومن سے صادر ہوتے ہیں یعنی راحت میں حمد۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنَّ

يَعْلَمُ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا لِّأَيُّوتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أَخَذَ مِنْكُمْ

ترجمہ: کہ ان قیدیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تمہارے دلوں میں خیر ہوگی (یعنی ایمان) تو اللہ تعالیٰ تم کو اس سے بہتر چیز دیں گے جو تم سے لی گئی ہے

تفسیری نکات

مؤمن کی بشارت

یہاں مومن کو بشارت بھی نقصان مالی پر نعم البدل کا وعدہ ہے جس کو ایمان کے ساتھ مشورہ کیا گیا ہے حاصل یہ ہوا کہ مومن کو ہر نقصان کا عوض اور نعم البدل ملتا ہے اور ان نصوص مذکورہ پر نظر کر کے ہم کو اس نص اخیر کی تعمیم کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ دوسری نصوص سے تعمیم ثابت ہے گو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اخذ منکم میں ما عام ہے مال کو اور غیر مال کو جس میں سب اعمال اور اعیان داخل ہیں خصوصاً جبکہ قاعدہ فقہ یہ ہے کہ اعتبار عموم نص ہے خصوصاً مورد کا اعتبار نہیں مگر مجھے خود اس قاعدہ ہی کے عموم میں کلام ہے اس لئے میں اس آیت پر تعمیم کا مدار نہیں کرتا بلکہ مجموعہ نصوص کے اعتبار سے اس مضمون کو عام کرتا ہوں۔ مگر اس کی تلاوت اس لحاظ سے ہوئی ہے کہ ایک مناسب سے دوسرے مناسب کی طرف اشارہ کرنا بلغ ہے اور تمام نصوص کا پڑھنا دشوار تھا۔

کسی ایک کا اختیار ضروری تھا جس کے لئے وجہ مرجع میں نے بالکل تمہید کے بیان کر دی۔

خلاصہ یہ کہ معاملات تشریحیہ کا تجارت ہونا تو ظاہر ہے کہ ایک عمل ہم نے پیش کیا ادھر سے اس کی قیمت مل گئی

مگر اس کے علاوہ ہمارے ساتھ جس قدر معاملات تکوین میں بھی ہوتے ہیں ان سب کی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر غم بہت ہلکا ہو جائے گا باقی طبعی میں انکار نہیں کرتا وہ تو ہوگا اور ہونا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے اجڑتا ہے اور اس سے شانِ عبدیت ظاہر ہوتی ہے اگر انسان پر رنج و غم وارد نہ ہو فرعون بے سامان ہو جائے مگر ضرورت اس کی کہ ایک اس غم کو ہلکا کیا جائے غم کا بڑھنا خود مصیبت ہے جس سے راحت فوت ہونے کے علاوہ بعض اوقات جو اصل دولت ہے اجڑا وہ بھی ضائع ہو جاتی ہے اور غم ہلکا ہونے کی وہی تدبیر ہے جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی جب انسان یہ سمجھے گا کہ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ مجھ کو نعم البدل عطا فرماتے ہیں تو غم ہلکا ہو جائے گا۔ پھر وہ نعم البدل بھی اس قدر کہ اس کا اندازہ لکھنا دشوار ہے اور مصائب پر صبر کرنا تو نہایت دشوار ہے اس پر تو وہ غیر متناہی ملے تو کیا عجب ہے جس پر آیت

انما یوفی الصبرون اجرہم بغير حساب (مستقل رہنے والوں کا صلہ بے شمار ہی ملے گا)

میں متنبہ بھی فرمایا ہے وہاں تو خفیف خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجزل جاتا ہے چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے آسمان وزمین کی درمیانی فضا بھر جاتی ہے اور سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل اور الحمد للہ سے پوری میزان عمل بھر جاتی ہے۔

یہ اس لئے فرمایا کہ شاید کسی کو اللہ اکبر کا ثواب سن کر یہ احتمال ہو کہ نہ معلوم میزان عمل بھی کسی چیز سے بھری ہوگی۔ کیونکہ ممکن ہے وہ آسمان وزمین کی فضا سے بھی زیادہ ہو تو ایک عمل سے اگر فضا بھی بھر جاتا ہے تو ممکن ہے وہ آسمان وزمین بھرنے کے لئے کافی نہ ہو اور ہم کو سابقہ پڑھنے کا میزان ہی سے۔ خصوصاً طالب علموں کو ایسے احتمالات بہت ہوتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تو کٹورا بھی حوض کے برابر ہو سکتا ہے۔

سُورَةُ التَّوْبَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَإِنْ تَكْفُرُوا أَيَّامًا مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ

فَقَاتِلُوا أَيْمَةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین (اسلام) پر طعن کریں تو تم لوگ اس قصد سے کہ یہ باز آ جائیں ان پیشوایان کفر سے (خوب) لڑو ان کی قسمیں نہیں رہیں۔

تفسیری نکات

کفر سے حربی نہیں ہوتا

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اس میں اختلاف ہے کہ ذمی اگر حضور ﷺ کی شان میں گستاخی یا کسی قسم کی اہانت کرے تو وہ حربی ہو جاتا ہے یا نہیں، میں اس کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ گستاخی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ بطریق مناظرہ رسالت کی نفی کرے سو یہ کفر تو ہے مگر کفر سے حربی نہیں ہوتا اور ایک صورت یہ ہے کہ بطریق طعن و ستہزاء کے رسالت کی نفی کرے اس صورت میں عہد ٹوٹ جاتا ہے اس باب میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَإِنْ تَكْفُرُوا أَيَّامًا مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ اس تفصیل سے اقوال مختلفہ میں تطبیق ہوگی۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَنَ بِاللَّهِ

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ

تَفْسِيرًا: کیا تم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور (اللہ کے واسطے) انہوں نے ترک وطن کیا ہو اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو یہ لوگ برابر نہیں اللہ کے نزدیک۔

تفسیری نکات

سبب افضلیت معیار ایمان ہے

تو آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہ افضلیت کی اور اس کا معیار ایمان ہے۔ یعنی جس چیز کو ایمان سے زیادہ تلبس ہو گا وہ زیادہ افضل ہوگی اور اسی وجہ سے ایمان کے ساتھ ایک دوسری صفت یعنی جہاد فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں اس نے جہاد کیا) کو بھی ذکر کر دیا کیونکہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ کا باعث اور اسلام کے پھیلانے میں معین ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ کوئی عمل ایسا نہیں کہ بدوں اس کے دوسرے عمل بالکل مقبول نہ ہوں مثلاً ایسا نہیں کہ نماز بدوں زکوٰۃ کے قبول نہ ہو اور زکوٰۃ بدوں حج کے بجز ایمان کے کہ اس پر تمام اعمال موقوف ہیں پس اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ متحدی کو من کل الوجوه افضل کہنا غلطی ہے چنانچہ ایمان عمل متعدی نہیں اور پھر سب سے افضل ہے اور یہیں سے یعنی ایمان کے افضل الاعمال ہونے سے ان لوگوں کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جو کہ غیر ایمان کو اہل ایمان پر فضیلت دیتے ہیں اور کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے فلاں قوم اچھی ہے البتہ اگر ایسے مضامین سے مسلمانوں کو غیرت دلانا مقصود ہو تو مضائقہ نہیں بعض لوگ بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص مسلمان ہو کر بھی فلاں عیب کو نہیں چھوڑتا اس سے تو مسلمان ہی نہ ہوتا تو بہتر تھا یہ سخت غلطی اور جہل ہے۔ ایک شخص مجھ سے کہنے لگے کہ رنڈیوں کو مسلمان نہ کرنا چاہئے اسلام کو ایسے مسلمانوں سے عیب لگتا ہے میں نے کہا کہ اگر اسے مسلمانوں کو نکالے تو تم کو ان سے بیشتر نکال دے گا تمہارے اعمال کہاں کے اچھے ہیں بعضے لوگ ہمارے بھنگی کے مسلمان ہونے کو بوجہ تحقیر کے پسند نہیں کرتے مگر یاد رکھو جب قیامت کا دن ہوگا اس روز معلوم ہو جائے گا کہ ہم جن کو ذلیل سمجھتے تھے ان کی کیا حالت ہے اور ہماری کیا گت

فسوف تری اذا انكشف الغبار الفرس تحت رجلک ام حمار

(پس عنقریب تو اے مخاطب دیکھے لے گا جس وقت کہ غبار ختم ہو جائے کہ آیا تیرے پیروں کے نیچے

گھوڑا ہے یا کہ گدھا میدان جنگ میں کس قسم کے سوار پر فتح پائی ہے۔ اسی طرح دنیا کی زندگی ایک قسم کا غبار جب موت واقع ہوگی اور دنیاوی پردہ ختم ہو جائے گا۔ اس وقت حقیقت حال ظاہر ہو جائے گی۔

اسی طرح مومن عیب دار کو کافر باکمال کے مقابلے میں آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص جو صرف ایمان لایا تھا اور کوئی عمل اس نے اچھا نہیں کیا اس کو تھوڑی مدت کے بعد عذاب سے نجات ملے گی اور کہا جائے گا اَدْخَلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (جنت میں داخل ہو جاؤ اب نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا نہ کسی کا غم) اور اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص جو کہ دنیا میں بڑا خلیق مہربان باکمال تھا لیکن دولت ایمان سے محروم تھا وہ ابدالاً آبد جہنم میں رہے گا اور کبھی اس کو نکلتا نصیب نہ ہوگا۔

مسلمان اور کافر کی مثال

اس کو واضح طور سے یوں سمجھو کہ اگر گورنمنٹ کی رعایا میں دو شخص ارتکاب جرم کریں ایک تو چوری میں ماخوذ ہو اور دوسرا بخلت میں تو اگرچہ سزا دونوں کو دی جائے گی لیکن چور کی سزا محدود اور کم ہوگی ایک دن ایسا ضرور ہوگا کہ وہ سزا بھگت کر پھر اپنے گھر آئے اور چین سے بسر کرے پردہ باغی کبھی عذاب سے نجات نہیں پائے گا اور زندگی بھر سزا کی تکلیف میں رہے گا یا فوراً پھانسی کا حکم ہوگا کہ زندگی ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ گو وہ کتنا ہی بڑا لائق فائق ہو اور چور بالکل جاہل کندہ ناتراش ہو۔

صاحبو! ایمان ایک آفتاب ہے اگر ہزاروں بدلی کے ٹکڑے اس پر حائل ہوں تب بھی اس کا نور فائض ہو کر رہے گا اور جھلک جھلک کر روشنی پڑے گی اور کفر کی خوش اخلاقی آئینہ کی سی چمک ہے جو کہ بالکل عارضی ہے۔ دوسری مثال لیجئے اگر ایک گلاب کی شاخیں کسی گملہ میں لگا دی جائیں اور اس کے مقابل کاغذ کے ویسے ہی پھول بنا کر رکھ دیئے جائیں تو اگرچہ اس وقت کاغذ کے پھولوں میں زیادہ رونق اور شادابی ہے اصل گلاب کی وہ حالت نہیں لیکن چھینٹا بارش ہو جائے پھر دیکھئے کہ گلاب کیارنگ لاتا ہے اور کاغذ کے پھول کیسے بد رنگ ہوتے ہیں پس اگر مسلمان اگرچہ دنیا میں کسی حالت میں ہوں لیکن قیامت میں جب ابر رحمت بر سے گا تو دیکھنا کہ اس کا اصلی رنگ کیسا کچھ نکھرتا ہے اور کافر کی زرق برق حالت پر کیا پانی پڑتا ہے صاحبو غیرت آنی چاہئے کہ مسلمان ہو کر اسلام کی حقیقت جان کر اپنے منہ سے کافر کو مسلمان پر فضیلت دو اور مسلمان کی مذمت اور کافر کی تعریف کرو۔ جب معلوم ہوا کہ ایمان ایسی بڑی چیز ہے تو اس کے ساتھ جن چیزوں کو زیادہ تلبس ہوگا وہ افضل ہوں گی لیکن تلبس بالایمان کو سمجھنا زرادشوار ہے۔ کیونکہ بعض ایسے اعمال ہیں کہ وہ خود اسلام کا مبنی ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ وہ اسلام پر مبنی ہیں۔

تو معیار وہ اعمال ہیں جو کہ بنی ہوں اسلام کا چنانچہ آیت میں ایمان کے ساتھ اسی عمل کو ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے اسلام کو قوت پہنچتی ہے۔ اور مسجد حرام کی تعمیر خود اسلام پر مبنی ہے۔ پس یہاں سے معلوم ہو گا کہ مسجد کی خدمت سے دین کی مدد اور اس کو قوی بنانا زیادہ افضل ہے اسی طرح اور جس قدر اعمال ہیں سب میں یہی دیکھنا چاہئے جیسے تعلیم و تعلم و عطا و عطا یعنی اصلاح خلق۔

پس وظیفہ و وظائف سے اصلاح خلق میں زیادہ فضیلت ہوگی کیونکہ یہ مبنی ہے ایمان کی تکمیل کا مگر یہ افضلیت باعتبار معیار مذکور کے فی نفسہ ہے ورنہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو عمل فی نفسہ افضل نہیں وہ کسی عارض کی وجہ سے زیادہ قابل توجہ ہو جائے اور کسی خاص وقت میں اس کی طرف توجہ کرنا زیادہ افضل ہے جیسے وضوء کہ نماز سے افضل نہیں لیکن بعض اوقات بوجہ شرطیت نماز کے زیادہ ضروری ہو جاتی ہے۔ یا مثلاً و عطا کہنا کہ فی نفسہ تخلیہ للعبادة سے افضل ہے۔

لیکن جبکہ و عطا پر مقصود بقدر ضرورت مرتب ہو چکے تو بلا ضرورت ہر وقت اس میں مشغول رہنے سے یہ بہتر ہو گا کہ کسی وقت عبادت کے لئے تخلیہ بھی تیار کرے اور کسی وقت اپنی بھی فکر کرے اور خدا کی یاد میں لگے اور اسی کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے۔

واقیموا الصلوة والاکونوا امن المشرکین (الروم آیت ۳۱)
(اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے مت ہو)

تارک نماز کے لئے وعید

آگے فرماتے ہیں ولا تكونوا امن المشرکین جس کا ترجمہ یہ ہے کہ مشرکین میں سے مت ہو اس میں غور کرنے کی یہ بات ہے کہ نماز کے حکم میں اور اسی میں جوڑ کیا ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ مشرکین عرب حج کرتے تھے مگر نماز نہ پڑھتے تھے چنانچہ حج کرنے والوں کو نہ روکتے تھے اور نماز پڑھنے والوں کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے سو وہ حج کے تو خلاف نہ تھے مگر نماز کے بالکل خلاف تھے اور یہود و نصاریٰ نماز پڑھتے تھے۔ حج نہ کرتے تھے اس لئے حج نہ کرنے پر حدیث میں یہودی یا نصرانی ہو کر مرنے کی وعید کی گئی ہے۔ اور یہاں آیت میں بے نمازی کو مشرک سے تشبیہ دی گئی اور گو یہ دونوں فرقے ہیں کافر لیکن یہود و نصاریٰ سے مشرک اور زیادہ برے ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ موحد تو ہیں گو ان کی توحید کارآمد اور کافی نہیں اور عدم مغفرت میں دونوں برابر ہیں تو نماز کا ترک کرنا دوسرے عبادات کے ترک سے زیادہ برا ہوا۔ پس مطلب یہ ہوا کہ نماز چھوڑ کر مشرکوں کے مشابہ نہ بنو اور اس عنوان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا کوئی کام نہ کرنا چاہئے جس میں کفار کے ساتھ مشابہت ہو اب رہا یہ کہ آیت میں واقیموا الصلوة پر کیوں نہیں اکتفا کیا تو اس میں نکتہ یہ

ہے کہ مسلمان بے نمازی سے نفرت پیدا ہو کیونکہ کوئی ایسا نہیں جس کو شرک سے نفرت نہ ہو کیونکہ توحید ہر شخص کو محبوب ہے اور توحید کی ضد مبغوض ہے۔ جب فرمایا کہ نماز پڑھو اور شرک نہ بنو تو اس لفظ سے وحشت ہو گی یہ ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ اطاعت اختیار کرو اور باغی نہ بنو تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اطاعت اختیار کرو اور باغی نہ بنو تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اطاعت اختیار کرنا بغاوت سے بچنا ہے اور ترک اطاعت بغاوت ہے ایسے ہی نماز پڑھنا شرک سے بچنا ہے۔ اور نہ پڑھنا شرک بننا ہے۔ گو اس کے معنی یہ نہیں کہ نماز نہ پڑھنے سے آدمی کافر اور مشرک ہو جاتا ہے کیونکہ یہ عقیدہ اہل سنت کے خلاف ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ یہ عمل مشرکوں کا سا ہے جیسے حدیث میں وارد ہے **مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مَتَعَمَدًا كَفَرَ عَمَلًا** یعنی کام کافروں کا سا کیا جیسے کہتے ہیں کہ فلانا چمار ہو گیا اس کے یہ معنی نہیں کہ واقعی چمار ہو گیا بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چماروں کے سے کام کرنے لگا تو نماز نہ پڑھنے والے کو شرک فرمانا بمعنی حقیقی تو نہیں ہے مگر جس معنی میں بھی ہو لفظ نہایت موحش ہے شرک سے برا کوئی نہیں اس واسطے اللہ تعالیٰ نے نفرت دلانے کے لئے **اقِيمُوا الصَّلَاةَ** کے ساتھ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ** بھی بڑھا دیا۔ کیونکہ صرف نماز کے حکم سے اتنی تاکید نہ ہوتی اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ شرک بننا ترک نماز سے بہت زیادہ برا ہے۔ کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے تو وجہ شبہ مشبہ بہ میں زیادہ ہوتی ہے خواہ زیادتی کسی حیثیت سے ہو مثلاً کہتے ہیں کہ زید شیر ہے۔ یعنی ایسا بہادر ہے جیسا شیر تو اس میں ضرور ہے کہ بہادری شیر میں زید سے زیادہ ہے۔ ایسے ہی جب ترک نماز کو شرک بننے کے ساتھ تشبیہ دی گئی تو یہ بات مسلم ہوئی کہ شرک ترک نماز سے بھی زیادہ برا ہے۔ تو شرک کس قدر بری چیز ہوئی۔ (ادب الاسلام ملحقہ مؤاعظ خیر الاعمال)

وَإِذَا قَرَعْتَ كَأَن تُصَبُّ وَوَالِي رَيْتِكَ فَارْتَعَبْ ۗ کہ ایک وقت ایسا بھی نکالنے کے لئے کہ صرف خدا ہی کی یاد

میں اس وقت مشغول ہوں کوئی دوسرا کام نہ ہو

۔ بفرانغ دل زمانے نظر بماہ روے بہ از آنکہ چتر شامی ہمہ روز باؤ ہوئے

(ایک زمانہ فرانغ دلی کے ساتھ نظر کرنا اس خوبصورت کی طرف بہتر ہے چتر شامی سے اور تمام دن کی باؤ سے)

اور ۔

خوشا وقع و خرم روزگارے کہ یارے بر خورد از وصل یارے

(مبارک ہے وہ وقت اور گھڑیاں جب ایک محبت اپنے محبوب کے وصل سے سرفراز ہو)

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر شے کے بقاء کے لئے ایک سبب ہوتا ہے اور نسبت جس کی بدولت وعظ بھی

مؤثر ہو گیا ہے اس کی بقاء کا سبب یہ ہے کہ کسی وقت صرف مشغول مع اللہ ہے اور یہاں سے ان لوگوں کی غلطی بھی

معلوم ہوگئی ہوگی جو کہ مشیت تک پہنچ کر اپنا کام بالکل چھوڑ دیتے ہیں اس سے ان کی نسبت ضعیف ہو جاتی ہے اور فیض بند ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو اعمال اسلام کا مبنی ہوں وہ افضل ہوں گے اس قاعدہ کو محفوظ کر کے اعمال میں فیصلہ کر لینا چاہئے اور جس کو اس قدر قوت نہ ہو کہ خود فیصلہ کر سکے وہ کسی عالم سے پوچھ لے کیونکہ ہر شخص کچھ نہ کچھ عمل کرتا تو ضرور ہے اور ہر شخص کو اس کی تمیز نہیں ہو سکتی جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ بعض اوقات اعمال غیر فاضلہ بھی کسی عارض کی وجہ سے افضل ہو جاتے ہیں تو ایسے مواقع پر دریافت کر لینا چاہئے کہ البتہ اگر کوئی عمل ایسا ہو کہ اس کی ضرورت محسوس ہو اور کوئی دوسرا عمل اس وقت اس کے مقابلے میں ایسا ضروری نہ ہو تو اگرچہ یہ مفضول ہی ہو اس کو کرنا چاہئے مثلاً ایک آباد مسجد گرگنی اور نمازی پریشان ہیں یا عید گاہ گرگنی تو ایسے مواقع پر اس کا کرنا زیادہ ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جن اعمال کی ضرورت متعین ہو اور وہ معلوم بھی ہو جائے وہاں تو اس کو کر لینا چاہئے اگرچہ مفضول ہو اور جہاں ضرورت نہ ہو وہاں اپنی رائے سے ایک عمل کو دوسرے عمل پر ترجیح نہ دینا چاہئے۔ بلکہ کسی عالم سے استثناء کرنا چاہئے جیسے مثلاً بخاری شریف کا وقف کرنا یا کئی غریب کو کھانا کھلا دینا۔ اب اس کے مقابلے کے لئے یہ بھی بیان کر دینا مناسب ہے کہ جس طرح حسنت میں تقاضا ہے اسی طرح گناہوں میں بھی تفاوت ہے۔ لیکن جس طرح حسنت میں استثناء کرنے کی ضرورت ہے کہ کس عمل کو کیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے اسی طرح سینات میں استثناء کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سب کو چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ چھوٹے بڑے گناہ سب گناہ ہیں اور حرام ہیں۔ اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ فلاں کام بہت ہی گناہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر چھوٹا ہو تو ہم کر لیں یا در کھو اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی ایک چنگاری کی نسبت پوچھے کہ کیا یہ چنگاری بہت بڑی ہے یا انکارا تو صاحبو جس طرح ایک بڑا انکارا مکان بھر کو پھونک دے گا اسی طرح ایک چنگاری بھی گھر بھر کو پھونک دے گی تو ایمان کے قصر کو ایک چھوٹا گناہ بھی ویسا ہی برباد کر دے گا جس طرح بہت بڑا گناہ تو سب سے بچنا چاہئے بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ رشوت لینا زیادہ گناہ یا سود کھانا میں کہتا ہوں کہ یہ کیوں نہیں پوچھا جاتا کہ پیشاب زیادہ گندہ ہوتا ہے یا پاخانہ تاکہ جو کم گندہ ہو اس کو تناول فرمائیں غرض یہ ہے کہ حسنت میں تو تقاضا کو دریافت کرو اور گناہ سب چھوڑ دو

افضل الاعمال

اب مناسب ہے کہ اصلی اور صحیح معیار بیان کر دیا جائے خدا تعالیٰ فرماتے ہیں **أَجْعَلْتُكُمْ بِيَقَايَةِ الْعَاجِبَةِ وَعِبَارَةِ السَّنَنِ الْحَرَامِ كَمَنْ أَمَّنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهِدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَوِينَ عِنْدَ اللَّهِ** (کیا تم نے

حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کی تعمیر کرنے والوں کو ان لوگوں کے برابر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں)

اس کی شان نزول میں مختلف قصے آئے ہیں جن کی تفصیل اس وقت متحضر نہیں اتنی قدر مشترک ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں بعض لوگوں میں گفتگو ہو گئی تھی کہ ایک جماعت اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے کو افضل سمجھتی تھی دوسری جماعت اپنے تئیں خدا تعالیٰ اس آیت میں افضل اعمال کا فیصلہ کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ کونسی جماعت افضل ہے ترجمہ آیت کا یہ ہے۔

کیا تم حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد کی تعمیر کرنے کو اس شخص کے اعمال کے برابر کرتے ہو جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے دین کو نفع پہنچایا ہو یہ دونوں جماعتیں ہرگز برابر نہیں مطلب یہ ہے کہ عمارت مسجد اور سقایہ حاج ایمان باللہ و اعلائے کلمۃ اللہ کی برابر نہیں ہے کیونکہ جعلتم کا مفعول سقایہ کو قرار دیا ہے جو کہ عمل ہے تو مقصود اعمال کا تفاضل بیان کرنا ہے رہی یہ بات کہ ایک جانب میں تو جعلتم کا مفعول اعمال کو بنایا اور دوسری جانب میں کاف کا مدخول مومنین کی ذات کو قرار دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ابھی ذہن میں آئی کہ جو لوگ معمرین مسجد تھے وہ اس وقت تک کافر تھے اور عمل ان کا نیک تھا اگرچہ خصوصیت محل کی وجہ سے اس پر کوئی ثمرہ مرتب نہیں تھا تو اس جانب میں اعمال کو ذکر کر کے یہ بتلادیا کہ اب بوجہ عامل کے مومن نہ ہونے کے یہ اعمال مقبول ہی نہیں لیکن اگر اس سے قطع نظر بھی کی جائے اور نفس اعمال کو دیکھا جائے تب بھی اپنے مقابل اعمال سے کم ہیں اور دوسری جانب میں ذات کو کاف کا مدخول بنا کر یہ بتلادیا کہ ان اعمال کی یہ حالت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے خود عمل کرنے والا بھی مقبول ہو جاتا ہے الغرض اس آیت میں افضلیت سقایہ و عمارت کے دعوے کی تغلیط ہے اور مبنی اس دعویٰ کا وہی تھا جو آج کل عوام الناس میں ہے یعنی عمل کا نفع عاجل ہو اور عام ہو اور عمل کی صورت عبادت کی ہی ہو سقایہ الحاج میں تو نفع عام اور نفع عاجل تھا اور تعمیر مسجد کی صورت عبادت کی تھی اس لئے ظاہراً معنی افضلیت کے اس میں زیادہ تھے اور اس کی تغلیط کر کے خدا تعالیٰ بتلاتے ہیں کہ فضیلت فلاں فلاں عمل میں ہے لیکن اس میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ جن اعمال کو اللہ تعالیٰ نے افضل بتایا ہے ان میں وجہ اس افضلیت کی کیا ہے اور اس میں غور کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا کہ نفع لازم سے نفع متعدی افضل ہے یا نہیں اور تعدیہ یا لزوم پر افضلیت کی بنا ہو سکتی ہے یا نہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ
وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ
وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ ۗ وَاللَّهُ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ٥٤

ترجمہ: یعنی فرمادے کہ باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبے والے اور وہ مال جس کو تم نے محنت کیا ہے اور وہ تجارت جس کے گھانٹے کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور وہ گھر جو تمہیں محبوب ہیں تمہارے نزدیک خدا اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کے راستہ میں جہاد کرنے سے یہاں تک کہ اللہ اپنے حکم کو لاوے اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

تفسیری نکات

یہ محل و عید میں ہے مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں مذکور ہوئی ہیں خدا سے اور اس کے احکام سے زیادہ محبوب ہیں تو ان کا حکم اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ محض حب مساکین پر اور نہ رضا بالساکن پر و عید ہے یعنی مکان کو پسند کرنے پر بھی و عید نہیں ہے اس لئے کہ اچھا اور پسندیدہ مکان بنانے کی اجازت ہے اب و عید کا ہے پر صرف احب پر ہے کہ وہ خدا سے زیادہ محبوب ہوں تب محل و عید ہیں اس میں بھی مطلق محبوب ہوئے تو مکان کا نہ مرضی پر ہونا محل و عید ہے نہ محبوب ہونا بلکہ احب من اللہ ہونا (یعنی اللہ سے زیادہ محبوب ہونا) محل و عید ہے۔ اگر کوئی شخص بقدر ضرورت مکان بنوالے جس میں اسراف نہ ہو تو کوئی خرچ نہیں اور یہ ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس کو کتنا مکان ضروری ہے کیونکہ ضرورت کے درجات مختلف ہیں اور انہیں درجات کے لحاظ سے ضروریات بھی مختلف حجرہ آسائش و راحت کے لئے کافی ہو جاتا ہے اور کسی کو ایک بڑا مکان بھی مسئلہ ہوتا ہے بہر حال عمدہ پختہ اور بڑا مکان بنانا شرعاً مازون فیہ (اس میں اجازت ہے چنانچہ اس کے عدم جواز کسی کا بھی مذہب نہیں ہے ایک شخص زیادہ سردی میں لحاف اوڑھتا ہے اور ایک شخص کا جاڑا ہلکی ہلکی رضائی میں چلا جاتا ہے دونوں کا سال گزر جاتا ہے بہر حال ہر شخص اپنی ضرورت کو خود ہی سمجھ سکتا ہے وہ بھی جائز ہے بشرطیکہ اس میں اسراف اور حدود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو اور عجب کا اختلاط نہ ہو کیونکہ یہ درجہ نمائش کا ہے جو

نا جائز ہے اور اسراف میں کہ مٹی عنہ کا ارتکاب نہ ہو اور جو خرچ بھی ہو وہ معصیت میں خرچ نہ ہو اس میں یہی تفصیل ہے بعض دفعہ ایک ہی شی ایک شخص کے اعتبار سے اسراف اور دوسرے شخص کے اعتبار سے اسراف نہیں ہوتی مثلاً ایک شخص کو عمدہ کپڑا پہننے کی وسعت ہے اور ایک شخص کو ایک روپیہ گز کے کپڑے کی بھی وسعت نہیں یہ اگر دس روپیہ گز کا کپڑا خریدے گا تو ضرور قرض دار ہوگا اب دونوں نے کام تو ایک ہی کیا لیکن جس کو وسعت ہے اس کے لئے تو کچھ خرچ نہیں نہ اس پر اسراف کا الزام اور جس نے بے ضرورت گردن پھنسانے کی کوشش کی وہ گناہ گار ہوگا صرف شمار ہوگا کیونکہ بلا ضرورت گناہ ہے دیکھئے دس روپیہ گز کا کپڑا خریدنا ایک ہی فعل ہے مگر ایک کے لئے جائز ہے اور ایک کے لئے گناہ ہے بات یہ ہے کہ واقع میں تو وہ فعل مباح ہے مگر اس کی وجہ سے اس کے لئے موجب گناہ بن گیا اور وہ عارض کیا تھا بلا ضرورت اگر یہ اس قدر قیمتی لباس نہ پہنتا تو بے ضرورت قرض کی معصیت میں مبتلا نہ ہوتا اس لئے اس کے لئے اتنا اچھا اور قیمتی پہنتا بھی گناہ ہے کیونکہ مقدمہ گناہ بھی گناہ ہے بہر حال ہر چیز میں تین درجے ہیں۔ ایک آسائش اور ایک آرائش ایک نمائش ہر ایک کے لئے مستحب ہے اور آسائش یا زیبائش میں اگر معصیت کا مثلاً بلا ضرورت کا ارتکاب نہ کرنا پڑے تو یہ بھی مباح ہے گو اس کا ترک اولیٰ ہے اور نمائش کو عجب و فخر ہوتا ہے یہ حرام ہے اب اس کا فیصلہ ہر شخص کے تدین پر ہے کہ وہ کیا ہے اگر دل میں غور کر کے یہ دیکھے کہ یہ کام میں نے نمائش کے لئے کیا ہے تو اس کے لئے وبال ہے مگر اس کے ساتھ دوسرے کے فعل کو بھی خواہ مخواہ ان میں داخل نہ کرے کہ ہر ایک کے فعل کو نمائش پر محمول کرنے لگے بلکہ حسن ظن کا یہ ہوا کہ مساکن مرضیہ اگر احب من اللہ (اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب) ہوں تب اور نہ نہیں سودا رو عید مساکن مرضیہ نہیں پس قید تر ضونہا (وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو) بیان فرما کر پھر اس پر عید کا مدار نہ رکھ کر اپنے پسند کا مکان بنانے کی اجازت مستطہ ہوتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ پھر اس سے محبت کرنے کی بھی اجازت ہے بشرطیکہ وہ محبت اللہ اور رسول اکرم ﷺ کی محبت سے زیادہ نہ ہو ورنہ گناہ ہوگا۔ اس پر فرماتے ہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَاتُ

تَنفُسِكُمْ كَسَبْتُمْهَا وَمَلِكُن تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ

فرمادے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جن کو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس کے مند پڑ جانے کا تم کو خطرہ رہتا ہے اور وہ گھر جن کو پسند کرتے ہیں تم کو اللہ اور رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی حکم (تمہاری سزا کے متعلق) بھیجیں۔

رضا با مسکن پر عید نہیں

اور اس میں بیوی بچوں اور مال و دولت کی مطلق محبت پر عید نہیں فرمائی بلکہ اجیت پر عید ہے کہ یہ

چیزیں اللہ اور رسول ﷺ سے زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں اور ان کی محبت اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت سے مانع نہ ہونا چاہئے چنانچہ مساکن ترصوفھا فرمانے کے بعد احب اليكم من الله ورسوله فرماتا اس کا صریح قرینہ ہے جس سے معلوم ہوا کہ رضا بالمسکن پر وعید نہیں بلکہ اس کے بعد احبیت من اللہ ورسولہ پر ملامت ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں رضا بالحمیۃ الدنیا میں وعید نہ تھی بلکہ اطمینان و دلچسپی پر وعید تھی اور اس میں اطمینان و احبیت کا منشا وہی موت سے غفلت ہے اگر موت کا خیال رہے تو ان چیزوں کے ساتھ اطمینان اور دلچسپی اور احبیت کا درجہ تو ہرگز نہ پیدا ہوگا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ

أَعَجَبْتُمْ أَكْثَرًا مِنكُمْ

ترجمہ: یعنی حق تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد فرمائی ہے اور غزوہ حنین میں بھی جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے۔

تفسیری نکات

حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو غزوہ حنین میں عجب و غرور پیدا ہو گیا تھا کہ ہم اتنے زائد ہیں اسی لئے عجب کی وجہ سے شکست ہوئی اور جب اس گناہ سے توبہ کر لی اور معافی مانگ لی تو اسی میدان میں یہ ہزیمت خوردہ لشکر اسلام غالب آ گیا جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے۔

ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ

جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا

ترجمہ: یعنی شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول مقبول ﷺ اور مسلمانوں پر اپنی خاص تسلی نازل فرمائی اور قلوب کی تقویت کے لئے فرشتوں کا لشکر بھیجا جو نظر نہیں آتا تھا۔

تفسیری نکات

کس قسم کی حب دینا مذموم ہے

ان سب حالات اور آیات و احادیث ملا کر پھر علماء کے کلام کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی ممانعت سے

علماء کی بھی یہی مراد ہے کہ جو دنیا مضر دین ہے اس کو چھوڑو پھر ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ علماء کی ممانعت کو ایک ہی جلسہ میں سن کر فیصلہ کر لیا گیا انہوں نے کسی دوسرے جلسہ میں یہ بھی تو کہا ہوگا کہ حب دنیا وہ مذموم ہے جو غالب ہو حسب دین پر اور جو تالیخ ہو وہ مذموم نہیں چنانچہ خود قرآن ہی میں ہے **قل ان كان ابائكم و ابناءكم و اخوانكم السی قولہ احب اليكم من الله و رسوله الا یہ** دیکھئے خود قرآن ہی کی تصریح سے حب دنیا منع نہیں بلکہ احبیت دنیا یعنی اللہ و رسول سے زیادہ محبوب ہونا منع ہے تو علماء اس کے خلاف کب تعلیم دے سکتے ہیں بعضوں کو یہ غلطی ہوگئی کہ مطلق محبت کو مذموم سمجھا چنانچہ ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ بیوی بچوں کی محبت دل سے نہیں جاتی میں نے لکھا کہ بیوی بچوں کی محبت سے تو گھبراتے ہو لیکن بہت سی اور چیزیں بھی تو ہیں جن سے محبت ہے ان کو کیوں نہیں چھوڑتے یا چھوڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔ پیاس میں پانی سے محبت ہے بھوک میں کھانے سے محبت ہے نیند میں سونے سے محبت ہے ان چیزوں کے بارہ میں کبھی نہ پوچھا کہ ان کی محبت نہیں جاتی کیا بیوی بچے ہی عشق کے لئے رہ گئے ہیں اگر تمہارے نزدیک عارف وہی ہے جس کو غیر اللہ کی محبت بالکل نہ رہی ہو تو عارف تو تم بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھی نہ ہوئے کیا اور ضروریات زندگی سے محبت ہوتے ہوئے تم اپنے معیار کے مطابق عارف ہو سکتے ہو بس تو معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی بھی مطلق محبت ہونے کے منافی نہیں ہے بشرطیکہ اللہ اور رسول کے محبت کے مزاجم اور معصوم نہ ہو یہ سب موٹی موٹی باتیں ہیں کوئی الجھن کی بات نہیں ہے دیکھئے حضرت عمرؓ سے بڑھ کر تو ہم زاہد اور تارک غیر اللہ ہو نہیں سکتے لیکن جب فارس کی سلطنت پر قبضہ ہوا ہے اور وہ اتنی بڑی اور دولت مند سلطنت تھی کہ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کی سلطنت کی کوئی حقیقت نہ تھی جس کا ظاہری سبب یہی تھا کہ وہاں ایک ہی خاندان میں سلطنت مدت دراز سے برابر چلی آ رہی تھی اور جگہ تو عارت و تاراج سے حکومتیں بدلتی رہیں لیکن وہاں کیانیوں ہی کی سلطنت برابر قائم رہی اور انقلابات سے محفوظ رہی غرض وہ بڑی پرانی سلطنت تھی جب وہ فتح ہوئی تو وہاں سے ایسی عجیب و غریب چیزیں مال غنیمت میں آئیں کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں بھی نہیں آئی تھیں بڑے بڑے ذخائر و خزانم مسجد نبویؐ میں لا کر ڈھیر کئے گئے جن کو دیکھ کر بھی آنکھیں چکا چوند ہوتی تھیں۔ ان میں ایک قالین ایسا تھا کہ جس میں پھول بوئے ایسے خوشما بنے ہوئے تھے کہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ قالین ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک نہایت سرسبز و شاداب باغ ہے جس میں طرح طرح کے درخت ہیں اور اس میں پھل لگے ہوئے ہیں پھول کھلے ہوئے ہیں معلوم تو باغ ہوتا تھا اور تھا قالین صنعتیں پہلے بھی تھیں لیکن پہلے وہ آلہ تجارت نہیں تھیں بلکہ ان کو کمال سمجھا جاتا تھا اور بجائے اس کے کہ ان کو بازاروں میں لا کر بیچا جائے اور نفع حاصل کیا جائے ان کو چھپایا جاتا تھا دوسروں کو سکھانے اور بتانے سے بخل کیا جاتا تھا تو اس ڈھیر میں ایسی ایسی صنعتوں کی چیزیں تھیں حضرت عمرؓ نے ان چیزوں کو دیکھا تو جو اثر ان پر ہوا اور جو رائے انہوں نے ظاہر کی وہ دیکھنے کے قابل ہے اس کے بعد کیا

ان پر یا ان کے بیرون پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مطلقاً ترک دنیا سکھاتی ہیں پہلے تو آپ ان ذخائر و غنائم کو دیکھ کر روئے اور پھر یہ دعا کی کہ اے اللہ یہ تو ہم نہیں عرض کرتے کہ آپ ان چیزوں کی محبت ہمارے دل سے نکال دیجئے کیونکہ آپ کا ارشاد ہے **زین للناس حب الشهوات من النساء والنبيين والقناطير المقنطرة** من الذهب الفضة والخيال المسومة والانعام والحراث جب آپ نے خود ان چیزوں کی محبت کی ہمارے قلوب میں مزین فرمادیا ہے تو اس کے زائل ہونے کی دعا کرنا تو سخت گستاخی ہے لیکن یہ عرض ہے کہ ان چیزوں کی محبت کو آپ اپنی محبت کی معین بنادیں سبجان اللہ کیا اچھی دعا فرمائی اور کیسا حقیقت کو سمجھائیں کی دو مختلف تفسیریں ہیں اور وہ اختلاف اس میں ہے کہ زین جو مفعول ہے اس کا فاعل کون ہے ان چیزوں کو جو محبت مزید (فتح الیاء) کر دی گئی تو اس کا مزید (بکسر الیاء) کون ہے یعنی اس تزئین کا فاعل کون ہے یعنی اس میں اختلاف ہے کہ اس تزئین کے فاعل حق تعالیٰ ہیں یا شیطان ہے اب یہاں ضرورت علم کی ہے افعال میں ایک مرتبہ تو خلق کا ہے اور ایک کسب کا، سو مرتبہ خلق میں تو اللہ تعالیٰ فاعل ہیں اور مرتبہ کسب میں شیطان یعنی اس زینیت کے پیدا کرنے والے اور خالق تو حق تعالیٰ ہیں انہوں نے یہ چیز قلب میں پیدا فرما دی اگر تم اس کو اپنے محل میں استعمال کرو تو وہ خیر ہے اور اگر غیر محل میں استعمال کرو تو وہی شر ہے۔ یہ استعمال مرتبہ کسب کا ہے اور اس مرتبہ میں شیطان متصرف ہوتا ہے (الافاضات الیومیہ ج ۱۰ ص ۲۳۶-۲۳۷)

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا

ترجمہ: بلاشبہ مشرک نرے ناپاک ہیں سو یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آنے پائیں۔

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ رِجْ كِي عَجِيبٌ تَحْقِيقٌ

فرمایا **إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ** اس کے معنی ہیں ان کے قلوب ناپاک ہیں کیونکہ اگر کسی کافر کا خوب نہلا دیں پھر بھی یہ آیات صادق ہے اور کلمہ پڑھ لے تو نجس نہیں کہا جاوے گا اس سے معلوم ہوا نجاست ظاہری مراد نہیں بلکہ اعتقادی مراد ہے جیسے محاورات میں کہتے ہیں تم بڑے ناپاک ہو یعنی تمہارے عقائد خراب ہیں دوسرے قرینہ یہ ہے کہ اگر **فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا** اگر نجس العین ہے تو اس ایک سال کی قید کیسی اس کے بعد فرمایا کہ ہندو سے کھانا لینا تو جائز ہے لیکن اگر ان سے نہ لیا جاوے تو میں بڑا خوش ہوں سچی بات یہ ہے کہ ہماری قوم میں نہ دنیا کی لیاقت رہی نہ دین کی۔ اگر ان میں قابلیت ہو تو کیا خدا بخیل ہے۔ ان کو سلطنت نہ دیتا جب ان میں قابلیت تھی اس وقت کسی کی آنکھ نہ اٹھتی تھی اور اب کچھ نہیں رہی۔ (ملفوظات حکیم الامت ۷ ج ۱۵ صفحہ ۳۷)

اسلامی لشکر کے شکست کی علت

بارہ ہزار کا لشکر کسی علت کے سبب شکست کھا سکتا ہے فرمایا ایک بار حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ
 لَنْ يَغْلِبَ اِنَّا عَشْرَ الْفَا عَن قَلَّةٍ
 یعنی حضرت رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر قلت تعداد کی وجہ سے کبھی دشمنوں کے
 مقابلہ میں مغلوب نہ ہوگا اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا حالانکہ ثابت ہے کہ بارہ ہزار مسلمانوں کی تعداد کی وجہ سے
 کبھی شکست کھا گئے۔

حضرت مولانا کی برکت سے میرے ذہن میں فوراً جواب آ گیا میں نے عرض کیا کہ حدیث شریف کا
 مضمون بالکل بے غبار ہے آنحضرت ﷺ عن قلة فرمایا ہے کہ قلت کی وجہ سے مغلوب نہ ہوگا عن علت نہیں فرمایا
 کہ کسی اور سبب سے بھی مغلوب نہ ہوگا لہذا جہاں بارہ ہزار یا بارہ ہزار سے زائد کے لشکر شکست کھا گئے اس کی
 وجہ قلت نہیں بلکہ کوئی دوسری علت ہوگی۔

چنانچہ اس کی تائید کتب حدیث و تاریخ سے بھی ہوتی ہے بلکہ قرآن شریف میں بھی مسلمانوں کا غزوہ حنین
 میں اولاً مغلوب ہونا بالتصريح مذکور ہے حالانکہ غزوہ حنین میں مسلمان بارہ ہزار تھے لیکن پھر بھی اولاً مغلوب ہو
 گئے اور اس کی وجہ قلت نہیں تھی بلکہ ایک قلبی مرض خود پسندی و عجب تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے۔

يُضَاهُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتِلْهُمْ اِنَّهُمْ اِيُّ يُوْفِكُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: یعنی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں خدا ان کو عارت
 کرے یہ کدھر جا رہے ہیں۔

تفسیری نکات

کلام الہی میں جذبات انسانی کی رعایت

اللہ تعالیٰ نے احکام میں ہمارے جذبات کی کسی رعایت فرمائی ہے ایک بات اور یاد آئی جو مجھ سے
 لڑکیوں نے ترجمہ قرآن کے درس میں پوچھی تھی میں ان کو سورۃ براءت کا ترجمہ پڑھا رہا تھا جب یہ آیت آئی
 يَضَاهُونَ يَتَوَفَكُونَ (یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں خدا ان کو عارت
 کرے یہ کدھر لٹے جا رہے ہیں) خدا ان مدعیان فرزند سیح و عزیر کو تباہ کرے یہ کہاں لٹے جا رہے ہیں تو
 ایک لڑکی سے سوال کیا کہ یہ تو کونسا ہے اللہ میاں جب سب کچھ کر سکتے ہیں پھر وہ کیوں کوستے ہیں؟ یہ سوال اس

سے پہلے کسی نے مجھ سے نہ کیا تھا نہ کسی کتاب میں اس کا جواب دیکھا تھا مگر الحمد للہ کہ سوال کے ساتھ ہی معاً میرے دل پر جواب القا ہو گیا میں نے کہا کہ اللہ میاں تو کوسنا نہیں دیتے مگر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرن میں ہمارے جذبات کی بہت رعایت فرمائی ہے۔ تو اوپر جو یہود و نصاریٰ کا حال مذکور ہے اس کو قرآن میں پڑھ کر سن کر انسان کو غصا آتا ہے جس سے کوسنا منہ سے نکلنے کو ہوتا ہے مگر قرآن پڑھتے ہوئے غیر قرآن میں داخل کرنا پڑتا جو ان کے خلاف تھا اس لئے انسان اپنے اس جذبہ کو پورا نہ کر سکتا اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف سے خود ہی کوسنے کا مضمون بڑھا دیا تاکہ پڑھنے والے کو اپنا جذبہ دبانا نہ پڑے اور وہ دل کھول کر اس تقاضا کو پورا کر لے اور یہ کہہ دے **فَاَنكَرُوا لَكُمْ اَتَىٰ بُرُؤُكُمْ** اور واقعی اس جواب کے بعد جو قرآن پر نظر کی جاتی ہے تو جا بجا رعایت جذبات کی نظر میں قرآن میں کثرت سے ملتی ہیں چنانچہ قرآن میں جہاں کبھی لفظ عسی و لعل فرمایا ہے اس میں بھی ہمارے جذبات ہی کی رعایت ہے کہ جہاں ہم لوگ اپنے محاورہ میں عسی و لعل کہتے ہیں وہاں حق تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا جو یا حق تعالیٰ کے علم کامل کے لحاظ سے وہاں ان اور لام تاکید کا موقعہ تھا اور یہ رعایت ایسی ہے جیسے بچہ کے ساتھ لبا جان بھی پانی کو م اور روٹی کو روٹی کہنے لگتے ہیں اور اس سے زیادہ عجیب ایک دوسرا قصہ ہے اور یہ کہ میں نے ایک مسماۃ سے آیت **وَالْاَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ** (ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں) کا ترجمہ پڑھاتے ہوئے سوال کیا کہ حق تعالیٰ نے جو یہاں فرمایا ہے کہ زمینیں سب اللہ کی مٹھی میں ہوں گی اور آسمان داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے ظاہر ہے کہ اس کی حقیقت تو مراد نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ مٹھی سے اور اعضاء سے پاک ہیں بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی قدرت کی تحت میں ہوگی مگر قبضہ کی تعبیر میں جو اختلاف ہے کہ جب زمین کے ساتھ قبضہ اور سموات کے ساتھ بیمنہ کا عنوان اختیار کیا گیا اس کی کیا وجہ ہے ایک ہی عنوان کافی تھا یہ سوال بہت دقیق تھا مگر اس کا جواب اس مستورہ نے عجیب حیرت انگیز دیا کہا کہ یہاں حق تعالیٰ نے ہماری عادت کے موافق کلام فرمایا ہے اور عادت یہی ہے کہ ہم چھوٹی چیز کو مٹھی میں لیتے ہیں اور بڑی کو ہاتھ میں بدوں مٹھی بند کئے لے لیتے ہیں پس چونکہ زمین آسمان سے چھوٹی ہے اس لئے وہاں قبضہ فرمایا اور آسمان بڑا ہے اس کے لئے بیمنہ فرمایا مجھے یہ جواب بہت ہی پسند آیا چنانچہ میں نے اپنی تفسیر میں بھی اس کو لکھ دیا ہے تو یہ بھی وہی بات ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآن میں ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی ہے مفسرین نے بھی افراد ارض اور جمع سموات میں بھی نکتہ بیان کیا ہے کہ اس میں ہمارے جذبات کی رعایت ہے کہ تعدد سموات تو اذہان عامہ میں پہلے سے تھا تعدد ارض لوگوں کے ذہن میں نہ تھا تو حق تعالیٰ نے بھی ان کے ذہن کو مانوس کرنے کے لئے سارے قرآن میں ار کو بصیغہ مفرد اور سموات کو جمع استعمال کیا ہے البتہ تعدد ارض کو حقیقت واضح کرنے کیلئے ایک مقام پر اس طرح مقصوداً ظاہر فرما دیا۔ **اِنَّ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ**

سَوَابِ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ (وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے سات آسمان اور مثل ان کی ساتھ زمین بنائیں)

نبی رانبی سے شناسد

اسی طرح بعض مصنفین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان معنی ربی کہنے کے مفہولیت اور آپ کے ان اللہ معانا کہنے کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے ایسے وجوہ بیان کئے جن سے موسیٰ علیہ السلام کی نظر کا حقائق سے قاصر ہونا مترشح ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ اگر یہ مصنف ایسی مجلس میں حاضر ہوں جس میں رسول ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام تشریف رکھتے ہوں تو کیا اس شخص کی یہ جرات ہوگی کہ اس مضمون کو ان کے سامنے بیان کر سکے۔ ہرگز نہیں علاوہ اس کے کہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف مزاج ہو خود آنحضرت کے بھی خلاف ہو حقیقت اس امر کی یہ ہے کہ اس موقع پر آنحضرت پر اور وارد تھا اور اس مقام کا بھی مقتضاء تھا اور یہ سالک اور عارف کے اختیار میں نہیں اگر وہ وارد جو موسیٰ علیہ السلام پر تھا ہمارے آنحضرت پر بھی اس وقت وہ وارد ہوتا تو آنحضرت بھی یہی **إِنِّ مَعِيَ رَبِّي سَيِّدُنِي** فرماتے اور اگر موسیٰ علیہ السلام پر وہ ہوتا جو ہمارے آنحضرت پر تھا تو وہ بھی ان اللہ معانا فرماتے باقی ان واردوں کی تعیین اس میں بھی ظن و تخمین سے کلام مناسب نہیں اس لئے کہ شیخ اکبر کا ارشاد ہے کہ چونکہ ہم نبی نہیں اس لئے انبیاء کے مذاق کا ادراک ہم نہیں کر سکتے پس جیسا کہ ولی راوی می شناسد مسلم ہے اسی طرح نبی رانبی می شناسد واجباً تسلیم ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ أَنْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ

أَنْقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿۵﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کوچ کرو تو تم زمین کو سختی سے تمام لیتے ہو کیا تمہیں آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی پسند ہے سو آخرت کے حساب میں دنیا کی زندگی بالکل کم درجہ ہے۔

تفسیری نکات

جہاد میں سستی کا ایک سبب

یہ ایک آیت ہے جس میں حق سبحانہ و تعالیٰ نے دین کے ایک خاص کام میں سستی کرنے پر ملامت فرمائی ہے۔ ہر عمل کی کوتاہی کو فرماتے ہیں تم دین کے کام میں سستی کرتے ہو کیا حیات دنیا پر راضی ہو گئے ہو اور یہ سستی جو تم میں آگئی ہے تو کیا آخرت کی ضرورت اور خیال تم کو نہیں رہا پھر فرماتے ہیں کہ آخرت کے مقابلے میں حیات دنیا کی متاع تو بالکل ہی قلیل ہے کچھ بھی نہیں اور باوجود اس کے تم پر دنیا پھر راضی ہو یعنی اس سے اتنی محبت ہے کہ اس کو اپنا قرار گاہ سمجھتے ہو اور اسی لئے اس دینی کام سے گھبراتے ہو سو یہ تو ایسی چیز نہیں کہ آدمی اس کی حیات پر راضی ہو جائے یہ ہے مضمون اس علت کا اور اسی کو بیان کرنا مقصود ہے اس کا حاصل اس کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں پر ملامت کر رہے ہیں جنہوں نے دنیا پر قناعت کر لی ہے اور آخرت کو بھول گئے ہیں اور دنیا کو محبوب سمجھتے ہیں مسلمان ایسا تو کوئی نہیں ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں مگر حالت ضرور ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ اور معاملات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی منکر ہو کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے آخرت کی وہ محبت اور اس کا اتنا شوق نہیں ہے چنانچہ دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیں کہ دنیا میں قیام کی بابت ہم لوگ کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ ہم یوں رہیں گے یوں بیس گے بہو آئے گی جائیداد ہوگی یوں ہم ملازم ہوں گے ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ اب انصاف سے دیکھ لو کہ آخرت کے متعلق بھی کبھی ایسی انگلیں ہوتی ہیں کہ مرجائیں گے تو خدا کے سامنے جائیں گے جنت ہوگی اس میں باغات اور مکانات ہوں گے یوں حوریں ہوں گی غالباً کبھی بھی یہ انگلیں نہیں ہوتیں بلکہ خیال بھی بہت ہی کم آتا ہے۔

غم خلاف امید ہونے سے ہوتا ہے تو جو شخص کسی چیز کے بارے میں یہ امید رکھے کہ یہ ہم سے جدا نہ ہوگی اس کو اس چیز کے جدا ہونے کا غم ہوگا ورنہ کوئی بھی غم نہ ہونا چاہئے ہاں طبعی رنج دوسری بات ہے جس پریشانی کے غم کی نفی کر رہا ہوں۔ یہ ہے فرق ان لوگوں میں جو دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ان میں جو دنیا کو اپنا گھر نہیں سمجھتے اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں **أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ** اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ساری خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے اس کو دل سے نکالنا چاہئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آخرت کو کثرت سے یاد کیا جائے اس سے دنیا کی محبت دل سے نکل جائے گی اور آخرت کی نعمت کی محبت اور آخرت کے عذاب سے خوف یوں پیدا کرو کہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ ہم کو مرنا ہے اور خدا کے سامنے جانا ہے پھر ایک دن ہمارا حساب ہوگا اگر اچھی حالت ہے تو بڑی بڑی نعمتیں ملیں گی ورنہ سخت سخت

عذاب ہوں گے اور نفس سے کہا کرو کہ اے نفس تو دنیا کو چھوڑنے والا قبر میں تجھ سے سوال ہوگا اگر مجھے جواب دے سکا تو ابد الابد کا جہنم ہے ورنہ سدا کی تکلیف ہے پھر تجھے قیامت کو اٹھانا ہے اور اس روز تمام نامہ اعمال اڑائے جائیں گے تجھے پل صراط سے گزرنا ہوگا پھر آگے یا جنت ہے اور یا دوزخ ہے اس کو روزانہ سوچا کرو اس سے آخرت کے ساتھ تعلق ہوگا اور دنیا سے دل سرد ہو جائے گا اور موت کے مراقبے سے ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلجان ہو کہ اس سے تو وحشت ہوگی اور جی گھبرائے گا اس کا علاج یہ ہے کہ جب وحشت ہونے لگے تو خدا تعالیٰ کی رحمت کو یاد کیا کرو اور سوچا کرو کہ اس کو اپنے بندوں سے اتنی محبت ہے کہ ماں کو بھی اپنے بچے سے اتنی محبت نہیں ہے تو اس کے پاس جانے سے وحشت کی کوئی وجہ نہیں اور اگر اس مراقبے کے بعد پھر کبھی دنیا کی طرف دل راغب ہو اور گناہ کو جی چاہے اور کوئی گناہ صادر ہو چکا ہو تو مراقبے کی تجدید کے ساتھ توبہ کر لیا کرو اور توبہ کا تم یہ بھی ہے کہ اگر کسی کا حق تمہارے ذمے ہو اس کو بہت جلدی ادا کرو اس سے ان شاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سب گناہوں کو معاف کر دے گا پھر ان شاء اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آخرت کا دائمی عیش ہوگا اور آخرت کا شوق پیدا ہونے کی میں نے ایک کتاب لکھی ہے اس کا نام ہے شوق وطن اس کا مطالبہ بھی بہت مفید ہوگا حاصل سب کا یہ ہوا کہ دنیا کی محبت ایک مہلک مرض ہے اور اس کا علاج موت کی یاد ہے اور اس سے تو حشر سے بچنے کے لئے خدا کی رحمت کامل یقین اور اس کا استھار ہے۔

يَخْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيَرْضَوْكُمْ وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ

أَنْ يُرْضَوْهُ إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: یہ لوگ تمہارے سامنے (جھوٹی قسمیں) کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کر لیں (جس میں مال و جان محفوظ رہے) حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کر لیں۔

تفسیری نکات

ارضاء رسول ﷺ کی دو جہتیں

آیت میں وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ نہیں فرمایا کیونکہ حضور ﷺ میں دو جہتیں ہیں ایک نسبت مع اللہ ایک خصوصیت ذات اور مقصود فی الدین آپ کا راضی کرنا بحیثیت رسالت ہے نہ بلحاظ ذات گو یہ ارضاء بلحاظ نسبت رسالت کے حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ بھی محبت کو تسلیم ہوگا اور اس وقت آپ کی

ذات من حیث ہی کے ارضاء کو بھی دل چاہئے گا مگر واسطہ اس ثانی کا بھی وہ اول ہی ہے غرض یہ لحاظ نسبت رسالت کے آپ کا ارضاء عین ارضاء حق ہے اور اسی وجہ سے یرضوه میں ضمیر واحد کی لائی گئی ہے جو راجح ہے حق تعالیٰ کی طرف اور یہاں عین سے مراد معنی فلسفی نہیں جس میں اتحاد من کل وجہ کا تحقق مثل انسان و حیوان ناطق کے شرط ہے بلکہ یہ صوفیہ کی خاص اصطلاح ہے ان کے نزدیک حق کا عین وہ ہے جس کو وصول الی الحق میں داخل ہو اور غیر وہ ہے جو وصول الی الحق میں قفل ہو مولانا فرماتے ہیں - اصطلاحاً حائیت مراد بال را

رضائے معتبر

ہاں اس جگہ یہ ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ منافقین تو رسول اللہ ﷺ ہی کی رضاء کے واسطے قسمیں کھاتے تھے پھر وَاللَّهِ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ مِنْ رَسُولٍ كَذِبٍ كَمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ بِهِ إِذْ جَاءَهُمْ مِنَ اللَّهِ الْحَقُّ وَرَضُوا بِهِ لِيُطِيعُوا أَهْلَ بَيْتِهِ وَاللَّهُ يَخْتَارُ اور رضی کرنے کا اہتمام نہ کرتے تھے اس شبہ کا جواب سمجھ لیجئے مشہور جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی رضائے حق تعالیٰ کی رضاء کو مستلزم ہے تو جب انہوں نے حق تعالیٰ کو رضی کرنا نہیں چاہا تو گویا حضور ﷺ کو بھی رضی کرنا نہیں چاہا کیونکہ انتقاء لازم سے ملزوم کا انتقاء لازم ہے۔

دوسرے چونکہ حضور ﷺ ان کی شرارتوں سے واقف تھے اس لئے آپ ظاہر میں بھی ان سے رضی نہ ہوتے تھے لیکن ان کی قسموں کے بعد آپ گرفت کو موقوف کر دیتے تھے وہ لوگ اسی کو کافی سمجھتے تھے ورنہ دل میں وہ بھی جانتے تھے کہ حضور ﷺ ہماری قسموں سے رضی نہیں ہوئے۔

مگر میرے نزدیک اہل جواب یہ ہے کہ رسول کی ارضاء کو دو حیثیتیں ہیں ایک ارضاء بہ حیثیت سلطنت دوسرا ارضاء بہ حیثیت نبوت و رسالت اس کے بعد سمجھئے کہ منافقین کا قصد یہ تو ضرور تھا کہ حضور ﷺ ہم سے رضی رہیں مگر یہ قصد محض بہ حیثیت سلطنت اس غرض سے تھا کہ ان کے اموال و انفس محفوظ رہیں اور اس حیثیت سے آپ کی رضائے دوسرے مسلمانوں کو رضاء کے غلط تھی اور یرضوکم میں داخل نہ کہ رضائے خالق اور حضور ﷺ میں جو دوسری حیثیت رسالت اور مظہر حق ہونے کی تھی اور اسی حیثیت سے آپ ﷺ کی رضاء عین ارضاء حق ہے اس کی ان کو پرواہ نہ تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ مخلوق کی رضاء کو رضائے خالق پر ترجیح دیتے تھے اور وہ رسول ﷺ کو بھی بہ حیثیت مخلوق محض ہونے کے رضی کرنا چاہتے تھے حالانکہ حضور ﷺ کی رضاء شرعاً یہ حیثیت نائب حق ہونے کے مطلوب ہے جس کی منافقوں کو پرواہ نہ تھی اسی لئے وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ مِنْ رَسُولٍ كَذِبٍ کا ذکر کیا گیا اور بتلادیا گیا کہ جس حیثیت سے تم حضور ﷺ کو رضی کرنا چاہتے ہو وہ مطلوب نہیں اور جو مطلوب ہے اس حیثیت سے تم ان کو رضی نہیں کرنا چاہئے پس اللہ و رسول من حیث مورسول اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ

ان کو راضی کرو پس اب اشکال رفع ہو گیا۔

اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ رسول ﷺ کی رضاء و محبت وہی محبت مطلوب ہے جو اس حیثیت ہے ہو کہ آپ رسول ﷺ اور مظہر حق ہیں دوسری حیثیت سے آپ کی رضاء و محبت مطلوب نہیں۔

ہاں اگر پہلی حیثیت کے ساتھ دوسری حیثیات بھی جمع ہو جائیں تو نور علی نور ہے ورنہ صرف دوسری حیثیات کافی نہیں مثلاً ابوطالب کو حضور ﷺ سے بہت محبت تھی مگر وہ صرف اس حیثیت سے تھی کہ آپ ان کے بھتیجے تھے یا بعض کفار کو آپ سے اس لئے محبت تھی کہ آپ عاقل کامل تھے اور اب بھی بعض مصنفان یورپ آپ کی عقل و ہمت استقلال وغیرہ کی تعریف بہت شد و مد کے ساتھ کرتے ہیں ان حیثیات سے آپ ﷺ کی محبت و رضاء شرعاً کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ رسول ﷺ ہونے کی حیثیت سے آپ کے ساتھ محبت کی جائے اور اس ہی حیثیت سے آپ کی رضاء شرعاً مطلوب ہے۔

الَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ

وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ يَسْخَرُ اللَّهُ

مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۵﴾

ترجمہ: یہ ایسے ہیں کہ نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جن کو بجز محنت و مزدوری کے اور کچھ میسر نہیں ہوتا یعنی ان سے تمسخر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اس تمسخر کا بدلہ دے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی۔

تفسیری نکات

شان نزول

اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے چندہ کی ترغیب دی تھی تو حضرت عبدالرحمن بن عوف تو اتنا لائے کہ اٹھ بھی نہ سکا اور ایک صحابی جو کہ دانے لائے۔ منافقین دونوں پر ہنسے۔ ایک کو ریا کار بنایا ایک کو بے شرم حق تعالیٰ اس کو بھلا کیا دیکھ سکتے تھے۔ ایک قدسی میں فرماتے ہیں۔ میں نے تفسیر مظہری میں یہ حدیث

دیکھی ہے کہ مجھے اپنے مقبول بندے کو چھیڑنے پر ایسا غصہ آتا ہے جیسے شیر کے بچوں کے چھیڑنے پر شیر کو۔
دوسری حدیث قدسی میں ہے: من عاوی ولیاً فقد اذنتہ بالحرب (کہ جو میرے ولی سے عداوت رکھنے
اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے)

بس تجربہ کر دیم دریں دیر مکافات باورد کشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد
اور فرماتے ہیں

بچ تو سے را خدا رسوا نہ کرو تادل صاحب دلے نامہ بدرد

ایک مقول بندے کے ستانے پر شہر کے شہر تباہ کر دیئے گئے ہیں حق تعالیٰ اپنے مقبول بندے پر طعن کو
نہیں دیکھ سکتے۔ فوراً اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ اسی طعن کے بارے میں فرماتے ہیں۔

الَّذِينَ يَلْمُزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ
مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ اِسْتَغْفِرُ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ

کہ جو لوگ طعن کرتے ہیں ان لوگوں پر بھی جو رغبت ظاہر کرتے ہیں صدقات میں اور وہ مومن ہیں اور
ان لوگوں پر بھی جو نہیں پاتے خرچ کرنے کو مگر اپنی طاقت کے موافق۔ تو جو ان سے تمسخر کرتے ہیں خدا ان کے
تمسخر کا بدلہ لے گا اور وہ بدلہ یہ ہے۔ ولہم عذاب الیم۔ کہ ان کو سخت عذاب ہوگا۔ آگے اس کو اچھی طرح
موکد فرماتے ہیں کہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے۔ اگر آپ ستر مرتبہ بھی استغفار کریں
گے تو خدا تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھیں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے کہ وہ توبہ و استغفار سے بھی نہیں بخشا جاسکتا۔ کیونکہ اس
آیت میں تو حضور کو ارشاد ہے کہ آپ ان کے واسطے کتنا ہی استغفار کریں ہم نہ بخشیں گے۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ
خود استغفار نہ کرتے تھے اور حضور ﷺ کی دعا و استغفار اسی وقت مفید ہو سکتی ہے کہ گناہ کرنیوالا خود بھی توبہ کرنا
چاہے۔ حق تعالیٰ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ یہ لوگ استغفار کریں یا نہ کریں ہم بخشیں گے۔ اگر یہ فرماتے تو شبہ کی
گنجائش تھی کہ کیا بعض گناہ استغفار سے بھی معاف نہیں ہو سکتے تو اگر وہ خود استغفار کرتے تو ایک مرتبہ اللہم اغفر لی
کہنا بارود کی طرح گناہوں کو اڑا دیتا ہے (حقوق السراء والضرراء بلحقہ مواعظ حقوق و فرائض ص ۲۷۲ تا ۲۷۳)

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ

مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَهُمْ ذَلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ

وَرَسُوْلِهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ٥٤

ترجمہ: آپ چاہے ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں اگر آپ ستر دفعہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت نہ کریں گے کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

تفسیری نکات

یہاں عدد سبعین سے مراد کثرت ہے

یہاں ایک اشکال طالب علمانہ رہ گیا ساتھ میں اس کو بھی حل کئے دیتا ہوں اشکال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ کو تخییر پر محمول فرمایا حالانکہ سیاق کلام سے یہ جملہ تسویہ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ چاہے آپ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ استغفار کریں اگر آپ ستر دفعہ بھی استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کبھی نہ کریں گے یعنی دونوں باتیں ان کے حق میں مساوی ہیں چنانچہ اہل محاورات اس کو خوب سمجھتے ہیں۔

نیز اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً میں عدد سبعین سے کثرت مراد ہے عدد خاص مراد نہیں اور مطلب یہ ہے کہ چاہے آپ کتنا ہی استغفار کریں ان کی مغفرت نہ ہوگی مگر حضور ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ میں ستر سے زیادہ استغفار کر لوں گا اس کی کیا وجہ ہے آپ کو تو اصح العرب ہیں آپ نے آیت کو تخییر پر اور عدد کو متحدید پر کیوں محمول فرمایا۔

اس اشکال کا جواب شافی میں نے کہیں منقول تو دیکھا نہیں اور نہ کتابوں پر میری نظر زیادہ ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے میں نے جو جواب سنا ہے وہ بیان کرتا ہوں ممکن ہے کہ نقل سے بھی اس کی تائید ہو جائے اور اگر نقل سے تائید نہ بھی ہو تو حضرت مولانا کو حق تعالیٰ نے فن تفسیر سے خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ ان کے جواب کو ہم حجت سمجھتے ہیں۔ مولانا نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ بے شک اسلوب کلام تو تسویہ ہی کے لئے ہے اور عدد سبعین سے بھی خصوصیت عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے۔ مگر حضور ﷺ پر اس وقت رحمت کا

حال غالب تھا غلبہ رحمت سے آپ نے صورت کلام تمسک فرمایا تو اس جواب سے اشکال تو رفع ہو گیا مگر اس سے صوفیہ کے ایک قول کو مقید کرنا پڑے گا۔ وہ یہ کہ صوفیہ کا قول ہے کہ کاطمین پر غلبہ حال نہیں ہوتا تو اس میں یہ قید لگانا پڑے گی یعنی اکثر نہیں ہوتا کبھی کبھی ہوتا ہے اور یہ تقید محض مولانا کے جواب کی وجہ سے نہیں بلکہ احادیث صحیحہ اس کی تائید کرتی ہیں

چنانچہ واقعہ بدر میں جب مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہونے والا تھا حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت رسول ﷺ عریش مبارک میں نہایت الحاح کے ساتھ دعا فرما رہے تھے کہ اے اللہ اپنے وعدہ نصرتہ کو پورا فرمائیے اور مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمائیے حتیٰ کہ جوش میں یہ بھی فرمایا

اللهم ان تهلك هذه العصابة لم تعبد بعد اليوم

(اے اللہ اگر یہ تھوڑی سے جماعت (مسلمانوں کی) ہلاک ہوگئی تو پھر زمین میں آپ کی عبادت نہ ہوگی۔ اللہ اکبر خدا تعالیٰ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر مسلمان اس واقعہ میں مغلوب ہو گئے تو پھر کوئی آپ کا نام نہ لے گا صاحبو آخر یہ کیا تھا علماء قشر تو تھک جائیں گے تاویل میں کرتے کرتے مگر ان سے کچھ جواب نہ آئے گا ہاں صوفیہ اس کا جواب نہایت سہولت سے دے دیں گے کہ اس وقت آپ پر غلبہ حال تھا مقام ناز کی کیفیت غالب تھی لیجئے سارا اشکال مرفوع ہو گیا مگر یہ جواب اس کو مقتضی ہے کہ صوفیاء کے اس قول مشہور کو مقید کیا جائے۔

محرومی ایمان کا اثر

اب ایک اشکال اور رہ گیا۔ وہ یہ کہ ہم نے تسلیم کیا کہ آیت کی صورت تخییر کو متحمل نہیں مگر اس سے محض جواز معلوم ہوا و جب تو نہیں معلوم ہوا تخییر سے جس طرح منافقین کی نماز پڑھنے کا جواز نکلتا ہے ترک صلوة کا جواب بھی نکلتا ہے پھر حضور ﷺ نے صلوة کو ترک صلوة پر کیوں ترجیح دی آپ نے نماز پڑھی کیوں اس کے لئے کوئی مرجع بتلانا چاہے ورنہ آپ کے فعل کا عبث ہونا لازم آئے گا۔

اس کا جواب ایک تو مورخین نے دیا ہے کہ اس دن حضور ﷺ کی اپنے سخت ترین دشمن پر یہ رحمت و شفقت دیکھ کر بہت لوگ مسلمان ہو گئے تھے تو گویا آپ کے فعل میں یہ فائدہ اور یہ حکمت تھی اور دشمنوں کو یہ دکھلانا منظور تھا کہ رسول ﷺ کو اپنے نفس کے لئے کسی سے بھی عداوت نہیں بلکہ وہ دل سے اپنے دشمنوں کے لئے بھی رحمت و مغفرت کے خواہاں ہیں (جب تک حق تعالیٰ ممانعت نہ فرمادیں) اگر نفس کے لئے کسی سے آپ کو دشمنی ہوتی تو عبد اللہ بن ابی کے کفن میں اپنا قمیص مبارک ہرگز نہ دیتے نہ اس کی نماز پڑھتے نہ دفن میں شریک ہوتے کیونکہ شرعاً آپ کے ذمہ ان میں سے ایک کام بھی نہ تھا مگر آپ نے شفقت و رحمت سے سب کچھ کیا اور اس کی دشمنی پر کچھ بھی التفات نہیں فرمایا۔

ایک جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے دیا ہے کہ حضور ﷺ نے عبد اللہ بن ابی کے واقعہ میں اس مسئلہ کو حل فرمایا ہے کہ تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے بدوں ایمان کے سب بے کار ہیں چنانچہ دیکھ لو کہ ابن ابی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہو گئے تھے حضور ﷺ نے اپنا قمیص مبارک اس کے کفن میں دیا بھلا یہ بات کس کو نصیب ہوتی ہے آج کل کوئی بہت کرے گا غلاف کعبہ کا ٹکڑا رکھ دے گا مگر غلاف کو حضور ﷺ کی قمیص سے کیا نسبت حضور ﷺ کا جسد اطہر عرش و کعبہ سب سے افضل ہے اور اگر غلاف کعبہ کو قمیص نبوی کے برابر مان بھی لیا جائے تو یہ دولت کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ حضور ﷺ کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑے عبد اللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ نے اپنا لعاب بھی اس کے منہ میں ڈال دیا تھا وہ تو آپ کا جزو تھا جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ ہے پھر آپ نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی گویا اس کے لئے دعائے مغفرت فرمائی بھلا یہ شرف آج کس کو نصیب ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ صحابہ گولے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبد اللہ بن ابی کو ان تبرکات سے کچھ بھی نفع نہ ہوا کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا۔ حق تعالیٰ نے صاف فرمادیا۔ اِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ وَرِسُوْلِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ لٰمِيْنُونَ۔

سَبْعِيْنَ مَرَّةً تَكْثِيْرًا كَلِمَةً لِئَلَّا يَكُوْنُوْا مِمَّنْ ذَلُوْا

حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے عبد اللہ بن ابی منافق کے جنازہ کی نماز پڑھائی حضرت عمر فاروق نے ادب کے ساتھ اختلاف کیا اور عرض کیا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِسْتَغْفِرُوْا لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْا لَهُمْ اِنْ اَسْتَغْفِرُوْا لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ حضور نے جواب ارشاد فرمایا خیرنی فاخترت یعنی مجھ کو اللہ تعالیٰ نے منع نہیں فرمایا بلکہ اختیار دیا ہے اور فرمایا سازید علی السبعین یعنی میں ستر سے زیادہ استغفار کروں گا۔ اب یہاں پر دو اشکال ہیں ایک اشکال یہ ہے کہ حضور تو اہل زبان ہیں اور اِصْحَابُ الْعَرَبِ اس درجہ کے ہیں کہ کفار خدا تعالیٰ کے کلام کی فصاحت و بلاغت کو حضور کی طرف نسبت کرتے تھے کہ یہ آپ کا کلام ہے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اِسْتَغْفِرُوْا لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرُوْا لَهُمْ تَخِيْرًا کے لئے نہیں بلکہ تسویہ کے لئے ہے جس کی تصریح سورہ منافقون میں کر دی گئی ہے سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنَّ سَبْعِيْنَ مَرَّةً كَلِمَةٌ لِّئَلَّا يَكُوْنُوْا مِمَّنْ ذَلُوْا چنانچہ سورہ منافقین ہی میں اس کی بھی تصریح ہے بدوں عدد کے لَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ واقع ہے جب معمولی اہل زبان اس کو سمجھ سکتا ہے تو حضور نے تَخِيْرًا تَحْدِيْدًا کیسے سمجھی اس کا جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ ارشاد فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ نے غایت رحمت کی وجہ سے لفظوں سے تمسک فرمایا معنی کی طرف التفات نہیں فرمایا۔

واعظین کی ایک غلطی پر تشبیہ

عام واعظوں کی ایک غلطی یاد آئی وہ یہ کہ قرآن مجید میں ہے **فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا** (پس چاہئے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں) واعظین اس کو امر سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ تم واجب کو ترک کرتے ہو قرآن میں تو کثرت بکا کا امر ہے اور تم بالکل نہیں روتے مگر یہ ان واعظین کی غلطی ہے یہاں معنی امر مراد نہیں بلکہ امر بمعنی خبر ہے جس میں کفار کی سزا اور عذاب کا ذکر ہے جس کی دلیل سیاق و سباق ہے چنانچہ اس سے پہلے ارشاد ہے (کہ تم گرمی میں مت نکلو کہ جہنم کی آگ زیادہ گرم ہے کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے اور اس کے بعد ارشاد ہے (پس چاہئے کہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں) جس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ بکا سزا ہے اور ظاہر ہے کہ سزا وہ چیز ہو سکتی ہے جو سزا پانے والے کے اختیار میں نہ ہو بلکہ سزا دینے والے کے اختیار میں ہو اگر یہاں معنی انشاء مراد ہوں گے تو ضحک و بکا مخاطب کے اختیار میں ہوگا اور وہ جزا نہیں ہو سکتا پس ثابت ہو گیا کہ یہاں معنی انشاء مراد نہیں بلکہ خبر دینا مقصود ہے کہ ان مشرکین کی سزا یہ ہے کہ وہ تھوڑے دنوں میں ہنس کھیل لیں اور اس کے بعد زیادہ روئیں گے اپنے اعمال کی سزا میں اور خبر کو انشاء کی صورت میں استعمال کرنا ایسا ہے جیسا کہ ہمارے محاورہ میں بھی کہا کرتے ہیں کہ اب سر پکڑ کر روؤ تمہاری یہی سزا ہے یعنی اب روؤ گے اور اپنے کئے کی سزا بھگتو گے۔ پس اسی طرح قرآن کا یہ محاورہ ہے جس سے معنی امر مقصود نہیں اور اگر بفرض محال امر ہی مقصود ہوتا تو سیاق و سباق کی وجہ سے مخاطب کفار ہی ہوتے مسلمانوں کو پھر بھی خطاب نہ ہوتا اس لئے واعظین کا اس سے مسلمانوں کے لئے کثرت بکا کا ماوربہ ہونا ثابت کرنا غلط ہے یہ بیچ میں اسطر ادا ایک فائدہ تفسیر یہ پر بیان کر دیا گیا ہے۔

شریعت میں ہنسنے کی ممانعت نہیں

بعض لوگوں نے **فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا** سے یہ سمجھا ہے کہ شریعت میں ہنسنے کی ممانعت ہے یہ استدلال غلط ہے کیونکہ یہاں ضحک و بکا دنیا مراد نہیں بلکہ فی الاخرۃ مقدر ہے اور **فَلْيَضْحَكُوا** امر بمعنی خبر ہے کہ آخرت میں یہ لوگ زیادہ روئیں گے جیسے ہمارے محاورہ میں بولا کرتے ہیں اب سر پکڑ کے روؤ یعنی اب روؤ گے یہ بھی خبر ہے امر بمعنی طلب نہیں اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد **جَزَاءً لِّمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ** مذکور ہے جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں وہ ضحک قلیل و بکا کثیر مراد ہے جو ان کے اعمال پر بطور جزا کے مرتب ہوگا ضحک و بکا دنیاوی مراد نہیں۔

علاوہ ازیں یہ کہ دوسری نصوص بھی اس معنی کی نفی کر رہی ہیں جو ان لوگوں نے اس آیت سے سمجھے ہیں

کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ حضرات صحابہ اپنی مجالس میں ہنستے بھی تھے مگر اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ رات کو خلوت میں رویا کرتے تھے۔ کانو الیوث النهار و رہبان اللیل نیز حضور ﷺ بھی ہنستے تھے مگر حضور ﷺ کی آواز ہنسی کے وقت نہ نکلتی تھی صرف دندان مبارک نمایاں ہو جاتے تھے۔ کان جل طحکہ التسم اور اس کا منشاء میرے خیال میں یہ ہے کہ حضور ﷺ پر غم کا غلبہ تھا کان مواصل الحزان دائم الفکرة اور غلبہ حزن میں کھل کر ہنسی نہیں آیا کرتی ہے۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا کہ ہنسنا کم چاہئے اور رونا بہت چاہئے۔

اس سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں یہ آیت منافقین کے بارہ میں ہے۔ انہی کے متعلق پہلے سے بیان چلا آ رہا ہے فلیضحکوا میں ہم کی ضمیر منافقین کی طرف ہے اور خبر بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑے دنوں ہنستے رہیں پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے اس آیت میں منافقین کی اخروی حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت میں رونا ہی رونا ہے یہ مطلب تھا آیت کا نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور ہنسنے کی مذمت جیسا آج کل کے مدعی سمجھے ہیں اور قلیلاً سے دنیا کی زندگی مراد ہے اور اس کے ماقبل کثیراً سے آخرت کی زندگی مراد ہے مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روؤ گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہوگا جَزَاءُ يَوْمَئِذٍ كَسِبْتُمْ اس کا قرینہ ہے غرض یہ آیت آخرت کے متعلق ہے فلیضحکوا، و لیکو امر ہے لفظاً اور خبر ہے معنی۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا شروع کر دیا نہ ماقبل کی خبر ہے نہ ما بعد کی اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس کے بعد آیت نازل ہوئی۔

جس میں منافقین پر نماز جناہ پڑھنے اور ان کے دفن وغیرہ میں شرکت کرنے کی صاف صاف ممانعت ہے حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مجھے بعد میں بڑی ندامت و شرمندگی ہوئی کہ میں نے حضور ﷺ کے ساتھ کیسی جرات کی آپ کو ایک کام سے روکنے لگا (میرا کیا منصب تھا حضور ﷺ تو سب سے زیادہ ہر ایک بات کو جاننے والے ہیں)

حضور ﷺ نے منافق کے منہ میں لعاب مبارک کیوں ڈالا؟

خیر یہ تو واقعہ تھا۔ اس میں بہت گفتگو اور کلام ہے کہ آپ ﷺ نے باوجود کہ یَغْفِرُ اللَّهُ لَهُمْ و وارد ہو چکنے کے پھر اس منافق کی نماز کیوں پڑی مگر یہ تو طالب علمانہ مباحث ہیں طالب علم ان کو خود حل کر لیں گے مگر اس میں اس بات کا بتلانا مقصود ہے کہ حضور ﷺ نے اس منافق کو اپنا کرتہ کیوں پہنایا اور اس کے منہ میں لعاب دہن مبارک کیوں ڈالا۔

شرح حدیث نے تو یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے اس کے بیٹے کی خاطر سے جو قلمس مومن تھے یہ سب کچھ کیا (تا کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ حضور ﷺ کی طرف سے اس کی نجات کی سعی میں کوئی کوتاہی نہیں رہی آپ نے دعا بھی کر دی نماز بھی پڑھ دی اپنے تبرکات بھی عطا فرمادے اب بھی اگر اس کی مغفرت نہ ہو تو یہ خود اسی کا قصور ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ اس منافق نے جنگ بدر کے موقع پر حضرت عباس (عم رسول ﷺ) کو ایک کرتہ پہنایا تھا۔ آپ نے اس کی مکافات میں مرنے کے بعد اسے کرتہ پہنایا (بلکہ مع شے زائد) یہ سب توجیہات شرح نے کی ہیں مگر ان باتوں سے ہم کو شفا نہیں ہوئی ہمیں تو اپنے استاد علیہ الرحمۃ کی بات پسند آئی کہ حضور ﷺ نے اس منافق کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے فرمایا تا کہ امت کو یہ ضروری مسئلہ بتلا دیں کہ اگر کسی میں ایمان نہ ہو تو پھر چاہے اس کے پاس لاکھ تبرکات ہوں اور چاہے رسول ﷺ جیسا شخص اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھ دے اور رسول ہی کا قیام اس کا کفن ہو جائے اور حضور ﷺ کا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں پڑ جائے جب بھی نجات نہیں ہو سکتی اس لئے تھا ان تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ ہے۔

شان نزول

یہ ایک آیت ہے سورہ توبہ کی اس کا شان نزول ایک خاص قصہ ہے مگر مجھ کو اس سے ایک عام مضمون استنباط کرنا مقصود ہے اور وہ مضمون ہے فی نفسہ قدیم مگر چونکہ کانوں میں اس عنوان اور طرز خاص سے نہیں پڑا اس لئے نیا معلوم ہوگا اور یہ میں نے اس لئے کہہ دیا ہے کہ عوام کو عادت ہو گئی ہے کہ سن کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں تو میں اول ہی کہہ دیتا ہوں کہ گو باعتبار معنوں کے یہ مضمون نیا ہو لیکن یہ مضمون جو کہ ان کی امیدوں کے باغ کو سرسبز کرنے والا اور کوتاہیوں کی اصلاح کرنے والا اور شکستہ دلوں کو قوی کرنے والا ہے اس معنی کو جدید ہوگا کہ اس اسلوب خاص سے ان کے کان اس کے آشنا نہیں ہوئے اولاً میں اس آیت کا شان نزول بیان کرتا ہوں۔ اس کے بعد اس مقصود کو مصرحاً بیان کروں گا مصرحاً اس لئے کہا کہ شان نزول سے اس کی اشارۃً تعین ہو جاوے گی اور نیز شان نزول سے یہ آیت حل بھی ہو جاوے گی اور اسی پر میرا مقصود موقوف ہے قصہ یہ ہوا تھا کہ جناب رسول ﷺ نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے مقام تبوک کا سفر فرمایا تھا۔ یہ مقام مدینہ طیبہ سے دور ہے شام کی جانب ہے اور گرمی کی اس زمانہ میں شدت تھی اور نیز مسلمانوں پر اس وقت تلخی بھی تھی غرض بہت سے مواعظ جمع تھے اس لئے حضور ﷺ نے اس غزوہ میں معمول سے زیادہ اہتمام فرمایا اور روانگی اس طرف ہو گئی بہت سے صحابہؓ ساتھ گئے اور بعض رہ گئے رہنے والے اکثر تو منافقین تھے ان کے رہنے کی وجہ تو نفاق تھا اور بعض صحابہؓ بھی بوجہ کسل کے رہ گئے اور نیز بعضے کام کرنے والے بوجہ قرآن مقامیہ و حالیہ یہ بھی سمجھا کرتے ہیں کہ سب کی شرکت اس واقعہ میں ضروری نہیں لیکن چونکہ حضور ﷺ نے اس سفر کا اہتمام

فرمایا تھا اس لئے متخلفین پر ملامت بھی ہوئی لیکن منافقین پر تو اور قسم کی ملامت ہوئی اور متخلفین پر ملامت بطور شکوہ کے ہوئی اس لئے کہ شکایت محل و دپر ہی ہوا کرتی ہے لیکن اس سے متخلفین کی شان میں کسی قسم کا شبہ نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ایسا عتاب منافی محبت کے نہیں۔ خود حضور ﷺ جو کہ احب الخلق الی اللہ ہیں کہ ملائکہ اور جنات اور انسانوں میں کوئی آپ سے افضل نہیں۔ خود آپ کے بھی ایسے شکوے ہوئے ہیں اور چونکہ اس وقت میرے مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضور ﷺ کی رسالت کو تسلیم کئے ہوئے ہیں یعنی اہل اسلام اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو صحابہ کے بارے میں شبہات نکالتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں اس لئے ان پر احتجاج کے لئے حضور کی اس قسم کا شکایت کا ہونا کافی ہے چنانچہ سورہ بقرہ میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف ملتفت نہ ہونے پر حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی پھر جب حضرت عبداللہ تشریف لاتے تو حضور فرماتے مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی یعنی آئیے آئیے میاں تمہاری وجہ سے تو مجھ پر میرے رب کا عتاب ہوا تھا۔ پس ایسا عتاب موجب نقص شان تو کیا ہوتا بلکہ زیادتی خصوصیت کی علامت ہے اور اس میں بڑا لطف ہے وہ شخص خوب جانتا ہے جو محبت کی چاشنی سے آشنا ہے کہ محبوب کے عتاب و شکایت میں کیا مزہ ہوتا ہے۔ بنو سلمہ و بنو حارثہ دو قبیلے ہیں غزوہ احد میں جبکہ ہزیمت ہوئی تو کچھ ان میں بھی سستی آئی تھی لیکن ظاہر میں کوئی امر مقتضی سستی کا واقع نہ ہوا تھا حق تعالیٰ نے ان کے بارہ میں نازل فرمایا لِيَذْهَبَتْ ظِلْفَتُنْ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلُوا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمْ اَعْنِي يَادِ كُرُوْا جَبْكَ دُوْ جَمَاعَتُوْنَ نِي تَمِّمْ مِيْنَ سِيْ اِرَادِهِ كَمْ هَمَّتِيْ اُوْر بَزْدَلِيْ كَا كِيَا تَا اُوْر اللّٰهُ تَعَالٰى اِن كَا وِلِيْ هِيْ اَعْنِيْ اِن سِيْ اِس كَا ظَهْر نِيْ هِيْ هُوْنِيْ دِيَا۔

شان مرادیت

یہاں سے بطور جملہ معترضہ کے ایک کام کی بات سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ اس سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے جس کو صوفیہ کرام نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ بعض بزرگوں کے اندر مرادیت کی شان ہوتی ہے اس کا مقتضی یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ گناہ کرنا بھی چاہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ رکھتے ہیں۔ گناہ کا صدور ان سے ہونے نہیں دیتے ایسے حضرت کو محفوظ کہا جاتا ہے بنو سلمہ اور بنو حارثہ کی بھی یہی شان معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یوں نہیں فرمایا اذ فسلت بلکہ یہ فرمایا ہمت ان تفتنکما یعنی ان سے فتنل کا وقوع نہیں ہوا بلکہ ہم فتنل ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہے اس لئے ان کی حفاظت فرمائی۔ پس اس آیت میں ان پر ایک عتاب کی صورت اور بظاہر ان کے ایک نقص کا اظہار ہے مگر وہ واللہ لیہما کے نزول سے اس قدر بٹاش تھے کہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم سے ہم فتنل نہ ہوتا اور یہ آیت نازل نہ ہوتی تو ہم کو اس قدر مسرت نہ ہوتی جس قدر کہ اب ہے پس ایسا عتاب اور ایسے شکوے شکایت سے تو ان حضرات کی اور زیادہ علو شان ثابت ہوتی ہے حضرت ابوذر غفاریؓ کے بارہ میں حضور ﷺ نے فرمایا وَاِنْ رَغِمَ

انف ابسی ذر یعنی ضرور ایسا ہی ہوگا اگرچہ ابوذر کی ناک مٹی میں ملے یعنی گو تہہاری مراد کے خلاف ہو جب ابوذر یہ حدیث بیان فرماتے تو مزہ لینے کے لئے وان رغم انف ابی ذر بھی فرما دیا کرتے تھے۔

فَلْيَصْحُقُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا کہ ہنسنا کم چاہئے اور رونا بہت چاہئے یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔ اس سے ہنسنے اور رونے کا حکم ثابت کیا ہے کہ رونا افضل ہے ہنسنے سے حالانکہ اس آیت کا یہ مدلول نہیں یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے انہی کے متعلق پہلے سے بیان چلا آ رہا ہے فليصحقوا میں ہم کی ضمیر منافقین کی طرف ہے اور یہ خبر ہے بصورت انشاء اور حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑے دنوں ہنستے رہیں پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے اس آیت میں منافقین کی اخروی حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت میں رونا ہی رونا ہے یہ مطلب تھا آیت کا نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور ہنسنے کی مذمت جیسا آج کل کے مدعی سمجھتے ہیں اور قلیلاً سے دنیا کی زندگی مراد ہے اور اس کے مقابل کثیر سے آخرت کی زندگی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روؤ گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہو گا۔ جزاء بما كانوا يعملون خود اس کا قرینہ ہے غرض یہ آیت آخرت کے متعلق فليصحقوا وليبكوا امر ہے لفظاً اور خبر ہے معنی۔

مگر مصیبت تو یہ ہے کہ لوگوں نے ذرا سی آیت دیکھ لی اور نتیجہ نکالنا شروع کر دیا نہ ماقبل کی خبر ہے نہ مابعد کی اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ قرآن کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں۔ (المال والجاه بلحقه مواظبة حقیقت مال و جاہ)

وَآخِرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخِرَ سَيِّئًا

عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۱۰ خذ من

أموالهم صدقة تطهرهم وتزكّيهم بها وصلّ عليهم إنك

صلواتك سكن لهم والله سميعٌ عليم ۝۱۱

ترجمہ: اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقرر ہو گئے جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے اور کچھ برے، سو اللہ سے امید ہے کہ ان کے حال پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمادیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے جس کے ذریعہ سے آپ ان کو پاک صاف کر دیں گے اور ان کے لئے دعا کیجئے بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان ہے اور اللہ سنتے ہیں اور جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَىٰ اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
 شروع رکوع سے ان مخلصین کی فضیلت کا بیان کہ جو ہمراہ حضور ﷺ کے گئے اور اس کے بعد منافقین کا ذکر ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جس کا حاصل یہ ہے اور ایک گروہ اور ہے جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا گو فعلاً سبھی انہوں نے عمل صالح اور عمل بد دونوں کو خلط کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرما دیں گے اور اللہ بخشنے والے رحم فرمانے والے ہیں اور بعضے ایسے تھے کہ پہلے سے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کریں مگر تشریف آوری کے بعد سچ کہہ دیا اور ان کو مہلت دی گئی ان کی شان میں ارشاد ہے
 وَالَّذِينَ آمَنُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَىٰ اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ
 یعنی ایک گروہ اور ایسا ہے کہ اللہ کے حکم کے واسطے معاد دیئے گئے ہیں یا تو ان پر اللہ تعالیٰ رجوع فرمادیں یعنی ان کی توبہ قبول فرمادیں اور یا ان کو عذاب دیں اور ان کیلئے یہ حکم ہوا کہ ان سے کوئی نہ بولے نہ بیوی نہ بچے نہ دوست اب جدھر جاتے ہیں سناٹا ہے جماعت کی نماز پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔ لیکن کوئی ان سے نہ بولتا تھا۔

حضرت کعب بن مالک اور ان کے احباب کے واقعات

ان میں سے ایک کعب بن مالک اور ان کے دو دوست تھے کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ میں توجری تھا اپنے سب کام کرتا تھا۔ اور سب جگہ آتا تھا جاتا تھا اور حضور ﷺ کی خدمت میں بھی جاتا تھا۔ حضور ﷺ منہ پھیر لیتے تھے لیکن جس وقت میں نہ دیکھتا تھا تو حضور مجھ کو دیکھتے تھے اور میرے جو دو دوست تھے وہ ذرا ضعیف تھے انہوں نے یہ کیا کہ بس گھر میں بیٹھ کر رونا شروع کیا اور فرماتے ہیں کہ مجھ کو زیادہ فکر اس کا تھا کہ اگر اس مدت میں مر گیا تو کیا حشر ہوگا اور حضور کی اگر اس معیاد میں وفات ہوگی تو پھر اس حکم کا منسوخ کرنے والا کون ہوگا۔ یہ تصور بندہ کر سخت قلق تھا۔ حق تعالیٰ نے بھی ان کی اس حالت کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے
 إِذْ أَصَابَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَلَمُوا أَن لَّا مَلَأَتْ أَمِنَ اللَّهُ إِلَّا لِلَّهِ
 یعنی ان پر تلک ہوگئی زمین باوجود اس کی کشادگی کے اور تلک ہوگئی ان پر ان کی جانیں اور انہوں نے یقین کر لیا کہ کوئی ٹھکانہ نہیں اللہ سے مگر اس کی ہی طرف اللہ اکبر ان حضرات کو کیا عشق تھا اور کیا استقامت تھی اسی مدت میں شاہ غسان کو اس واقعہ کی خبر ہوئی اس نے کعب بن مالک کے نام خط لکھا کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا ہے اور تمہاری قدر نہیں جانی آپ یہاں آ جائیے آپ کی قدر افزائی کی جاوے گی اور غشا اس کا یہ تھا کہ یہ سازش تھی اس بات کے لئے کہ ان میں سے بڑے بڑے آدمیوں کو میں

توڑ لوں پس جب آدمی خط لے کر آیا تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کعب بن مالک کہاں ہیں تو لوگ بولے نہیں اللہ اکبر اتباع اور اطاعت اور احتیاط اس کو کہتے ہیں کہ ان کے متعلق بھی اگر کوئی شخص پوچھتا تو جواب نہ دیتے تھے اشارہ کر دیا کہ یہ ہیں اس طرح کعب بن مالک ایک اور قصہ بیان فرماتے ہیں کہ میرا ایک چچا زاد بھائی تھا ایک مرتبہ وہ باغ میں تھا میں بھی وہاں جا پہنچا تو مجھ سے بولے نہیں مجھ کو سخت رنج ہوا پس جب انہوں نے یہ خط دیکھا تو بہت پھوٹ کر روئے کہ اللہ اکبر اب میں اس حالت کو پہنچ گیا کہ غیر لوگ میرے بارہ میں طمع کرنے لگے ہیں اور کچھ جواب نہیں دیا اور خط تنور میں جھونک دیا فرض اس طرح پچاس دن گزرے اس کے بعد حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی چنانچہ آیت **وَ الْخٰرُونَ مُرْجُوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ** کے بعد آیت **لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَی النَّبِیِّیْنَ وَالْمُطْمِئِنِّیْنَ** الخ میں ان ہی کی قبول توبہ کا ذکر ہے اور آیت **وَ الْخٰرُونَ اَعْتَرَفُوْا بِالْحَقِّ** میں ان ستون سے بندھنے والوں کے لئے قبول توبہ کی بشارت ہے **وَ الْخٰرُونَ** اس آیت میں مبتدا ہے اور **مَنْ** ابتدا آیت کے لئے قوم مقدر ہے **خَلَطُوا** حال ہے **اعترافوا** کی ضمیر سے ترجمہ آیت کا پہلے گزر چکا ہے یہاں اس کی کچھ تفسیر عرض کی جاتی ہے اعتراف یہاں اعتراف فعلی کو فرمادیا کہ ستونوں سے اپنے آپ کو بندھوا دیا عملاً دکھلا دیا کہ ہم سے بڑا جرم ہوا ہے اور حالت ان کی یہ ہے کہ عمل صالح یعنی اعتراف ذنوب کو عمل بد یعنی تخلف عن غزوه تبوک کے ساتھ ملا دیا۔

جہاد فرض عین اور فرض کفایہ

اس مقام پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاد میں جانا تو فرض کفایہ ہے جب ایک جماعت نے اس فرض کو ادا کر لیا تو سب کی طرف سے ادا ہو گیا پھر وخریبتا کے کیا معنی ہیں جواب اس کا یہ ہے کہ حضور نے اس غزوه کے لئے امر عام فرمایا تھا اس لئے وہ فرض عین ہو گیا تھا اور حضور کی شان تو اعلیٰ و ارفع ہے اگر امام المسلمین کسی امر مباح کا بھی امر کر دے تو وہ فرض عین ہو جاتا ہے آگے ارشاد ہے **عَسَى اللّٰهُ اَنْ یُّتُوْبَ عَلَیْکُمْ** امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رجوع فرمادیں گے۔ یہ شاعی محاورہ ہے چنانچہ حکام کہتے ہیں کہ تم کو امید رکھنا چاہئے اور کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ تمہارا یہ کام ہو جاوے اور مقصود وعدہ حتمی ہوتا ہے اور یہاں تو وعدہ سے بڑھ کر وقوع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ستونوں سے کھلوادے گئے تھے اور اس محاورہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بادشاہی عطا فرماتے ہیں اس میں ایک خاص شان اور آن پیدا ہو جاتی ہے۔

کلام الہی کی ایک عجیب شان

جس کا مقتضایہ ہوتا ہے کہ اس کے فعل اور قول میں ایک انداز حاکمانہ ہوتا ہے پس وعدہ بھی اگر کسی سے کرتے ہیں تو وعدہ کے صیغہ سے نہیں کرتے اس لئے کہ وعدہ ہو تو پھر دوسروں کو مطالبہ کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور یہ ایک

قسم کی مغلوبیت ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ تم کو امید رکھنا چاہئے اور کہتے ہیں کہ شاید ہم ایسا کر دیں اور چونکہ حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین اور سب بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اس لئے یہی ان کے کلام کا بھی انداز ہے بلکہ مخلوق کے کلام میں خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو کسی نہ کسی جگہ مغلوبیت اور مقصودیت کا انداز ضرور آ جائے گا۔ اس لئے کہ وہ فطرۃ ایک زبردست قوت کا مغلوب ہے اور حق تعالیٰ کے کلام میں اول سے آخر تک دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا منکلم کسی سے دبنے والا نہیں اور سب پر غالب ہے۔

تفسیری نکتہ

الحاصل جن حضرات کی توبہ قبول ہوئی تھی اس خوشی میں وہ اپنا سب مال روپیہ پیسہ پھول لائے اور حضور کی خدمت میں جمع کر دیا۔ حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے فوراً آیت نازل فرمائی خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا یعنی ان کے مالوں میں سے تھوڑا سا صدقہ لے لیجئے کہ اس سے آپ ان کو پاک کریں اور ان کو صاف کر دیں بیجا اس آیت میں علی سبیل التمايع تطہیر اور تزکی دونوں کے متعلق ہے یہاں پر ایک سوال ہوتا ہے کہ تطہیر اور تزکیہ تو ایک ہی شے ہے اگر صرف تطہیر پر ہی اکتفا فرماتے تو کافی تھا تزکی میں کیا نکتہ ہے نکتہ اس میں یہ ہے کہ دو چیزیں ہیں ایک تو آگ دوسرے آگ کا اثر یا یوں کہو کہ دیا سلائی اور ایک اس سے آگ نکلنا یعنی ایک تو معصیت ہے جو آگ ہے اس کا ازالہ تو تطہیر ہے اور دوسرے معصیت کا مادہ ہے اس کا ازالہ تزکیہ ہے تو مطلب یہ ہے کہ صدقہ قبول کرنے سے ان کے گناہ بھی پاک کیجئے اور گناہوں کا مادہ بھی دور کر دیجئے آگے ارشاد ہے وصل علیہم اور ان کے لئے دعا بھی کیجئے یہاں سے ایک بات کام کی معلوم ہوئی وہ یہ کہ آج کل جو یہ رواج ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مصرف خیر میں کچھ روپیہ دیتا ہے تو کھڑے ہو کر اس کا شکر یہ ادا کرتے ہیں یہ بالکل بے موقع ہے ہم کو ایسے موقع میں اس کے لئے دعا سکھائی گئی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا وصل علیہم اس کے لئے شکر یہ وہ ادا کرے جس کے ساتھ احسان کیا ہو وہ شخص ہم کو نہیں دیتا اسلام کی خدمت کرتا ہے اور اسلام کے ساتھ اس کو ہم کو برابر تعلق ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ یعنی بیشک حسنات سینات کو دور کر دیتی ہیں اس پر نظر کرنے سے بھی اس شبہ کو تقویت ہوتی ہے بلکہ اس آیت کے معنی اگر یہ مان لئے جاویں کہ ملکہ اور مادہ گناہ کا جاتا رہتا ہے تو شبہ اور زیادہ قوی ہوتا ہے اور ارشاد ہے إِنَّ الصَّالَاتِ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ اور حدیث شریف میں ہے ان رحمتی سبقت علی غضبی ان آیات سے اور اس حدیث کے عموم سے یہ شبہ بہت ہی قوی ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ حسنات کے ہوتے ہوئے سینا کیوں رہتے ہیں حسنات کا مقضا تو یہ ہے کہ سب دور ہو جائیں چنانچہ صحابہ کے اندر وہ خلط نہیں تھا پس ایسی تدبیر کون سی ہے جس سے یہ خلط کی حالت نہ رہے اور

حسانت کو غلبہ ہو جائے سو دلائل شرعیہ اور نیز اس آیت میں غور کرنے سے اس کا معالجہ سمجھ میں آتا ہے اگر قرآن مجید کو تدبر سے نہیں دیکھتے تو حق تعالیٰ نے اس کی شکایت بھی فرمائی چنانچہ ارشاد ہے **أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ** قرآن شریف ہی میں سب کچھ ہے جہاں امراض کا ذکر ہے وہاں ہی اس کا معالجہ بھی ہے۔

مرض خلط کا علاج

تھوڑے سے غور کی ضرورت ہے سنے اور غور سے سنے کہ اس کا معالجہ بھی خود اسی آیت میں ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس میں غور فرمائیے کہ عسی اللہ ان توب کا ترحب اللہ تعالیٰ نے کس شے پر کیا ہے وہ کیا شے ہے کہ جس پر رحمت کا وعدہ فرمایا ہے جب تم اس پر عمل در آمد کرو گے یقیناً مورد رحمت ہو گے اور ہرگز تخلف نہ ہوگا اور وہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ذنوب اور سینا کے ساتھ تو اعتراف فرمایا اور اس ترکیب کو صالحا کے ساتھ مقید فرمایا ہے پس حاصل معالجہ کا یہ ہوا کہ ذنوب کے ساتھ تو اعتراف ہونا چاہئے اور عمل کے اندر صلاحیت کی صفت ہونا ضروری ہے۔ پس معالجہ دو جزو سے مرکب ہوا عمل صالح اور اعتراف ذنوب شاید کسی کو شبہ ہو کہ ہمارے اندر تو یہ دونوں صفتیں ہیں پھر بھی مرض نہیں جاتا صاحبو میں اس واسطے کہتا ہوں کہ تدبر سے کام نہیں لیتے واقع میں ہمارے اندر دونوں جزو مفقود ہیں اگر یہ دونوں جزو ہوتے تو کوئی وجہ نہیں کہ **عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ** کا ظہور نہ ہوتا غور کیجئے کہ صالح عمل کی صفت ہے اب دیکھنا چاہئے کہ صالح کس کو کہتے ہیں صالح صلاح سے مشتق ہے اور صلاح کے معنی درستی کے ہیں درست شے وہ ہے کہ اس کے کسی جزو میں کسر نہ ہو درست گاڑی وہ کہلائے گی جس کے پیچھے اور تمام کل پرزے درست ہوں۔ اگر ایک جزو کے اندر بھی خرابی ہے تو پھر وہ درستی کے ساتھ موصوف نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ناقص اور کامل کا مجموعہ ناقص ہی ہے اگر کسی کو ذرا زکام یا سر میں درد ہو تو کہتے ہیں کہ آج طبیعت درست نہیں پس عمل کو صالح جب کہیں گے جب کہ وہ من کل الوجودہ درست ہو۔ اب یہ سمجھنا چاہئے کہ عمل کس شے سے درست ہوتا ہے سوا اس کے معنی بھی کلام اللہ ہی سے تلاش کرنا چاہئے حق تعالیٰ نے اس کو دو لفظوں میں بیان فرما دیا ہے اگر جنید و شبلی جیسے بھی جمع ہو کر برسوں فکر کر کے بیان کرتے تو ایسا جامع بیان نہ کر سکتے ارشاد ہے۔ **وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشْفِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَذْوَةٍ بَرِيءَةٍ وَأَصْلَابِهَا وَأَبْلِ فَا تَأْتِ أَكْهَابًا ضَعْفَيْنِ** یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضا مندی اور اپنے نفسوں کے اندر استقلال پیدا کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے کی ٹیلہ پر ایک باغ ہو کہ اس پر بارش ہووے تو وہ اپنا پھل دو چند دے **ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشْفِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ** یہ دونوں منفقون کے مفعول لہ ہیں اور **مِنْ أَنْفُسِهِمْ** بواسطہ من کے **تَشْفِيتًا** مصدر کا مفعول بہ ہے حاصل یہ ہے کہ درستی عمل کے دو جزو ہیں جب وہ دونوں پائے جاویں تو صلاحیت

کمال ہوگی وہ دو جزو اپنے خالق مصلحت اللہ اور تشبیہاً من انفسہم ہیں یعنی جو عمل کرے اس میں دو باتوں کی نیت ہونا چاہئے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ خوش ہوں دوسرے یہ کہ نفس کے اندر اس عمل کا ملک ہو جائے کہ جس سے نفس کے اندر استغلال پیدا ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کی خوشنودی تو مقصود اصلی ہے اور تکلیف اس کا ذریعہ ہے اب ہم لوگ اپنا حال دیکھیں کہ نماز پڑھتے ہیں تلاوت قرآن بھی کرتے ہیں روزہ بھی رکھتے ہیں صدقہ خیرات بھی بقدر وسعت دیتے ہیں لیکن ان اعمال میں ہماری نیت کچھ بھی نہیں ہوتی پس اعمال تو ہیں لیکن صلاحیت ان میں نہیں ہے۔

صدقات واجبہ کا امر

چنانچہ ارشاد ہے **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اِنَّا جِئْنَاكَ الرَّسُوْلَ فَقَدْ تُوَابِنَ يَدِنِ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لِيُعْطِيَكَ مِنْ رِزْقِنَا مَا تَمَنَوْنَ** یعنی اے ایمان والو جب تم جناب رسول ﷺ سے پوشیدہ بات کرنا چاہو تو پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو مناجات رسول ﷺ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں سے ہے پس اس کے ارادہ پر صدقہ دینے کا حکم ہوا اور سبحان اللہ کیا بلاغت ہے یوں نہیں فرمایا **فَقَدْ تُوَابِنَ يَدِنِ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا لِيُعْطِيَكَ مِنْ رِزْقِنَا مَا تَمَنَوْنَ** بلکہ مطلق بنی ہاشم کے لئے کہ اس میں کسی طرح کو یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ ان کے رسول ﷺ نے بھی اپنی کمائی کے بھی خوب ڈھنگ نکال رکھے تھے اب یہ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ صدقات واجبہ کا مال جیسا کہ صیغہ امر سے اس صدقہ کا وجوب معلوم ہوتا ہے۔ حضور ﷺ اور حضور ﷺ کی اولاد کے لئے بلکہ مطلق بنی ہاشم کے لئے حرام تھا اس لئے کہ صدقہ کو اوساخ الناس فرمایا ہے ہاں صدقات ناقض بنی ہاشم کے لئے جائز ہیں اور آپ کے لئے وہ بھی حرام تھے۔

تطہیر اور تزکیہ

الحاصل جن حضرات کی توبہ قبول ہوئی تھی اس خوشی میں وہ اپنا سب مال روپیہ پیسہ بٹور لائے اور حضور ﷺ کی خدمت میں جمع کر دیا حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے فوراً آیت نازل فرمائی۔ **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا** یعنی ان کے مالوں میں سے تھوڑا سا صدقہ لے لیجئے کہ اس سے آپ ان کو پاک کریں اور ان کو صاف کریں۔

آیت میں علی سبیل التنازع تطہیر اور تزکی دونوں کے متعلق ہے یہاں پر ایک سوال ہوتا ہے کہ تطہیر اور تزکیہ تو ایک ہی شے ہے اگر صرف تطہیر پر ہی اکتفا فرماتے تو کافی تھا۔ تزکی میں کیا نکتہ ہے اس میں یہ ہے کہ دونوں چیزیں ہیں ایک تو آگ دوسرے آگ کا اثر یا یوں کہو کہ دیا سلامی اور اس سے آگ نکلتا یعنی ایک تو معصیت ہے جو آگ ہے اس کا ازالہ تو تطہیر ہے اور دوسرے معصیت کا مادہ ہے اس کا ازالہ تزکیہ ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ صدقہ قبول کرنے سے ان کے گناہ بھی پاک کیجئے اور گناہوں کا مادہ بھی دور کر دیجئے آگے

ارشاد ہے وصل علیہم اور ان کے لئے دعا بھی کیجئے یہاں سے ایک بات کام کی معمول ہوئی وہ یہ کہ آج کل جو یہ رواج ہے اگر کوئی شخص کسی مصرف خیر میں کچھ روپیہ دیتا ہے تو کھڑے ہو کر اس کا شکر یہ ادا کرتے ہیں یہ بالکل بے موقع ہے۔ ہم کو ایسے موقع میں اس کے لئے دعا سکھلائی گئی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا وصل علیہم اس لئے کہ شکر یہ وہ ادا کرے جس کے ساتھ احسان کیا ہو وہ شخص ہم کو نہیں دیتا ہے اسلام کی خدمت کرتا ہے اور اسلام کے ساتھ اس کو اور ہم کو برابر تعلق ہے۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک باپ کے چند بیٹیوں اور ایک بیٹا باپ کی کچھ خدمت کرے اور بیٹے اس کا شکر یہ ادا نہ کریں گے اس لئے کہ جیسا ہمارا باپ ہے ایسے ہی اس کا بھی ہے۔ ہم پر اس نے کیا احسان کیا ہے۔ جو شکر یہ ادا کریں پس شکر یہ ایسے موقع پر بالکل بے محل ہے شکر یہ تو جب ادا کیا جاوے جب کہ ان کو کوئی کچھ دے شکر یہ ادا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کھا جائیں گے یا یہ شخص یہ سمجھتا ہے کہ اسلام میرا ہے دوسرا مسلمان ہی نہیں یہ اہل یورپ کی تقلید ہے کہ وہ اپنے جلسوں میں شکر یہ ادا کرتے ہیں تو ان کی دیکھا دیکھی یہ بھی ایسا ہی کرنے لگے اور اس پر کیا منحصر ہے۔ اب تو ہر کام انہیں کے طریقہ پر کرنا چاہتے ہیں چنانچہ کسی کی تقریر میں جب کوئی مضمون پسند آتا ہے تو اس پر تالیاں بجاتے ہیں حالانکہ تالیاں تو اہانت کے موقع پر بجائی جاتی ہیں۔ یہ اچھی تہذیب ہے تہذیب کیا تعذیب ہے۔

ترجمہ: آپ ﷺ ان کے مالوں سے صدقہ (جس کو یہ لائے ہیں) لے لیجئے جس کے لینے کے ذریعے سے آپ ﷺ ان کو گناہ کے آثار سے معاف کرنے والے ہیں بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان (قلب) ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سنتے ہیں اور خوب جانتے ہیں۔

آیت مملوکا شان نزول

کہ رسول ﷺ غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے تھے۔ اور بجز معذورین کے سب کو ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر کچھ لوگ غزوہ میں نہیں گئے مدینہ ہی میں رہ گئے جن میں زیادہ تر تو منافقین تھے اور دو چار مخلصین بھی تھے۔ آپ کی واپسی پر منافقین نے تو آ کر جموٹے بہانے کر دیئے کہ ہم کو فلاں عذر مانع تھے۔ یہ سب پیش آ گیا تھا مگر مخلصین نے اپنے خطا کا صاف صاف اقرار کر دیا کہ ہم کو کوئی عذر مانع نہ تھا۔ محض کاہلی اور سستی سے پیچھے رہ گئے حضور ﷺ نے منافقین کا عذر سن کر ان کو تو معذورین میں داخل کر کے رخصت فرما دیا اور ان مخلصین سے فرمایا کہ تمہارا معاملہ خدا کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادیں یا سزا تجویز کر دیں چنانچہ پچاس روز تک سب مسلمانوں کو ان سے قطع تعلق کا حکم دیا گیا کہ کوئی ان سے بات چیت اور سلام و کلام نہ کرے پچاس دن کے بعد ان کو توبہ نازل ہوئی تو یہ حضرات خوش خوش حضور ﷺ کے پاس آئے اور شکر یہ قبول توبہ میں اپنا مال حضور ﷺ کے پاس لائے کہ اس کو کار خیر میں سے صرف فرما دیا جائے حضور ﷺ کو ان کا مال قبول کرنے

میں سوچ ہوئی آپ ﷺ نے فوراً نہیں لیا کیونکہ آپ ﷺ کو کیا خبر کہ ان کی حالت کیسی ہے اس وقت محض جوش میں دے رہے ہیں کہ بعد کو پچھتائیں گے یا اخلاص قلب سے دے رہے ہیں تو حق تعالیٰ ان مخلصین کی سفارش فرماتے ہیں کہ ان کے اموال سے صدقہ وصول فرمائیے کہ یہ لوگ مخلص ہیں۔

اور من اموالہم میں ظاہر یہ ہے کہ من تجزیہ ہے گوا احتمال یہ بھی ہے کہ بیانیہ ہو تو من تجزیہ کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کا کوئی جزو قبول کر لیا جائے جس سے معلوم ہوا کہ کل مال نہ لیا جائے کیونکہ یہ ہر شخص کی حالت کے مناسب نہیں۔ صدیقی اکبری اور شان ہے وہ تو عاشق تھے۔ ان کی سخاوت تو جان دینا ہے پھر ان کا کل مال لینے سے کیا انکار ہے مولانا فرماتے ہیں۔

مال دادن خود سخائے صادق ست جان دادن خود سخائے عاشق ست

صَدَقَةٌ تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا، جس میں حضور ﷺ کو ارشاد ہے کہ صدقہ اتنا لیا جائے کہ ایسا ہونا چاہئے کہ جس سے آپ ان کو پاک کریں اور ظاہر کریں بھا میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تزکیہم کے متعلق ہو تطہرہم کے متعلق نہ ہو۔ اس صورت میں تطہرہم میں خطاب نہ ہوگا بلکہ یہ صیغہ غائب کا ہے جو صدقہ کی صفت ہے کہ وہ صدقہ ایسا ہو کہ گناہوں سے پاک کرنے والا ہو اور آپ ﷺ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تزکیہ فرمائیں اور صورت میں اولاً صدقہ کی صفت مذکور ہوئی پھر حضور ﷺ کا فعل مذکور ہوا اور آپ ﷺ جو مسلمانوں کے صدقات قبول کر لیتے ہیں تو نہ اپنی مصلحت کے لئے بلکہ مسلمانوں کے تزکیہ کے لئے اور ظاہر ہے کہ تزکیہ اسی کا ہو سکتا ہے جو خود بھی طالب تزکیہ ہو تو اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص صدقہ سے طالب تزکیہ نہ ہو اس کا صدقہ قبول نہ کیا جائے۔

ایک احتمال یہ ہے کہ بھا دونوں کے متعلق ہو تطہرہم کے بھی اور تزکیہم کے بھی اور یہی میرے نزدیک ظاہر ہے کہ دونوں صیغے خطاب کے ہیں اور بھا دونوں کے متعلق ہے اس میں تناسب و تناسق کلام بھی باقی رہے گا۔ بہر حال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں ایک تو یہ کہ پاک صاف ہونا کوئی ضروری چیز ہے دوسرے یہ کہ مال خرچ کرنے کو پاکی میں دخل ہے۔

تبلیغ اور سوال

چنانچہ جا بجا انجمنیں بھی ہیں جن میں ایک صدر ہے ایک سیکرٹری ہے کوئی ناظم اور اور کوئی کیا خاک بلا ہے۔ سو ان لوگوں سے کام کچھ نہیں ہوتا البتہ سب سے پہلے چندہ مانگنے کو تیار ہیں حالانکہ اس طرح چندہ مانگنے سے ہم کو روکا گیا ہے خود حضور ﷺ کو حکم ہے اَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا فَقُلْ خَيْرٌ (الایۃ) اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ارشاد ہے لَا اسْأَلُكُمْ عَلَيْهِمْ اَجْرًا کہ ہمیں تبلیغ کے معاوضہ میں مال نہیں چاہئے کہ ہم تم سے روپے پیسے نہیں

مانگتے ہیں اور جہاں مال لینے کا حکم ہے مثلاً ارشاد ہے خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ یعنی ان کے مال سے صدقہ لے لیجئے انہیں کے تزکیہ اور تطہیر کے لئے یعنی اس میں آپ کا کوئی نفع نہیں ہے تو اگر کسی کو خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ (الایۃ) سے شبہ چندہ کا ہو تو اس کا شان نزول دیکھ لیجئے اسی سے معلوم ہو جائے گا کہ غزوہ تبوک میں بعضوں سے کوتاہی ہو گئی تھی جب ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے کچھ مال حاضر کر کے اس کے قبول کی درخواست کی اس پر یہ ارشاد ہوا سو اس سے چندہ مانگنے کا کیا تعلق کہاں اخذ اور کہاں سوال اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر وہ خود لادیں تو لے لو انکار نہ کرو اور سوال یہ ہے کہ مانگ کر لوگوں سے روپیہ جمع کیا جاوے سو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی بطیب خاطر کوئی چیز لادے تو لے لو تو خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ سے چندہ مانگنا کیسے نکلا اللہ میاں نے تو خذ فرمایا ہے اصل تو نہیں فرمایا اور چندہ تو سوال ہے نہ کہ اخذ اگر اصل فرماتے تو تمہارا مدعا حاصل ہو جاتا مگر سوال کے متعلق تو یہ آیا ہے۔

وَلَنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِيَكُمْ جُورَكُمْ وَلَا يَسْتَأْذِنُكُمُ أَمْوَالُكُمْ، اگر تم ایمان لاؤ اور خدا سے ڈرو تو اپنے پاس سے اجر دیں گے اور تم سے تمہارا مال نہیں مانگیں گے بے فکر رہو آگے فرماتے ہیں اِنْ يَنْتَظِرُكُمْ فَاتُخِفِكُمْ يَخْلُوا وَيُخْرِجُوهم اَضْعَانُكُمْ کیونکہ اگر تم سے اصرار کے ساتھ مانگا جائے تو تم بخل کرنے لگو واقعی یہ خدا ہی کا کلام ہے کیونکہ وہ تو تمہارے رگ پٹھے سے واقف ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر یہ رسول کا بھی کلام محض رائے سے ہوتا تو اس میں اتنی گہری گہری باتیں نہ ہوتیں فرماتے ہیں ہم تم سے کیا مانگتے اِنْ يَنْتَظِرُكُمْ فَاتُخِفِكُمْ دیکھئے یہاں سوال میں فبعضکم بڑھایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں عادتاً اخفاء ہوتا ہے چنانچہ مانگنا اسی کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کو لپٹ جائیں اور شریعت میں یہ حرام ہے تو فرماتے ہیں کہ اگر ہم مانگنے لگیں تو تم بخل کرنے لگو گے اور تمہاری دلی کدورت ظاہر ہو جائے گی۔ ضغینہ کے اصل معنی کینہ کے ہیں۔ یہاں مراد کدورت ہے یعنی انفاق میں جودل پر تنگی ہوتی ہے وہ ظاہر ہو جائے گی۔ اس لئے ہم تم سے سوال نہیں کرتے اگر سوال کریں تو یہ خرابیاں ہوں گی یہ حاصل ہے آیت کا ہاں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان کر دینا اور بات ہے یہ سوال میں داخل نہیں اس لئے ہم اس کو نصوص میں جا بجا ہٹا چکے ہیں اگر کسی کو ثواب لینا ہولے لئے اسی کو فرماتے ہیں هَآئِنتُمْ هُوَ لَآءُ تَدْعُونَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ہم بے شک تمہیں اس طرف بلا تے ہیں کہ خرچ کرو اللہ کے راستہ میں اس میں تمہارا ہی نفع ہے مگر مانگتے تب ہیں ہم تو تم سے ایک کوڑی بھی نہیں مانگتے البتہ خرچ کا راستہ بتلائے دیتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو کسی سے کہا دس روپے لادو یہ تو سوال ہے اور ایک یہ کہ کسی کو رائے دی کہ میاں دس روپے سے فلاں چیز لے لو تو نفع ہو گا یہ مشورہ ہے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے بلکہ خود اس کے نفع کی

ایک صورت بتلادی ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے تو فرماتے ہیں کہ نصوص میں اس کی ترغیب تو ہے کہ خرچ کرو اگر خرچ کرو گے تو اس کا ثواب یہ ہے **كُلُّ حَبَّةٍ حَبَّتْ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ قِلَاصَةٌ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ** ایک دو اور سات سو بلکہ اس سے بھی زیادہ ۔

خود کہ یا بداریں چنیں بازار را کہ بیک گل مخری گلزار را

اور فرماتے ہیں

نیم جاں بتا ندو صد جاں دہد انچہ در و ہمت نیاید آں دہد

تو یہ ایک تجارت سکھلائی تھی کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو بڑے منافع حاصل ہوں گے مگر تم کنجوس ہو تجارت میں بھی کنجوسی کرتے ہو اس کا خمیازہ تم ہی بھگتو گے ہمارا کیا نقصان ہم نے تو تمہارے نفع کی بات بتلائی تھی نہیں مانتے مت مانو ایسی تیسی میں جاؤ اسی کو ارشاد فرماتے ہیں **فَمَنْ لَمْ يَنْعَمْ فَسَوْفَ نَبْتَلُ وَمَنْ يَبْتَغِ الْوَعْدَ الْمُبْتَغَىٰ عَنِ غَيْبِہِ** یعنی اس بخل سے خدا کا کچھ ضرر نہیں تمہارا ہی ضرر ہے۔ **وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ** خدا غنی ہے اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہاں تم محتاج ہو تمہاری حاجت ہی کو دیکھ کر یہ رائے دی گئی تھی کہ اللہ کے راستہ میں دو گے تو مال مال ہو جاؤ گے۔ نہیں مانتے تو تمہارا ہی نقصان ہے ہمارا کیا بگڑا اس آیت کی یہ تقریر ایک عالم صاحب نے سن کر بہت خوشی ظاہر کی اور دعائیں دیں اور کہا آج اس کا مطلب سمجھا ہوں۔ پہلے تو بڑے تردد میں تھا کہ اس آیت میں یہ کیسا تعارض ہے کہ اول آیت میں تو سوال کی نفی معلوم ہوتی ہے اور آخر میں خود سوال ہے اب معلوم ہوا کہ کوئی تعارض نہیں کیونکہ دوسری آیت میں سوال نہیں ہے بلکہ ترغیب ہے۔ اتفاق فی سبیل اللہ کی اور پہلی آیت میں نفی ہے سوال کی اس ترغیب سے سب مشکلات ختم ہو گئے مگر ایک شبہ رہ گیا تھا وہ یہ کہ اگر ہم خرچ نہ کریں تو دین کا سب کام چھوٹ ہو جاوے یہ مدارس کیسے قائم رہیں اور مسجدوں کی خدمت کون کرے۔ اگر ہم خرچ نہ کریں تو رفتہ رفتہ دنیا سے دین رخصت ہو جاوے تو اس اعتبار سے ہم محتاج الیہ ٹھہرے۔ اس ناز کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہاں بے شک بظاہر تمہاری ہی مدد سے یہ کام چلتے ہیں اگر روپیہ نہ ہو تو مثلاً مدرسے قائم نہ رہیں روپیہ کی اور دینے والے کی تو واقعی ضرورت ہے مگر خاص تمہاری ذات شریف کی خدا کو ضرورت نہیں۔ اگر تم اس کام کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو بدل دیں گے کہ بجائے تمہارے وہ اس دینی خدمت کو کرے گی۔ اسی مضمون کو فرماتے ہیں **وَإِنْ تَوَلَّوْا يَتَّبِعْهُنَّ قَوْمًا غَيْرَكُمْ تَلُوا بِمَا لَمْ يَكُونُوا لَكُمْ مَطْلُوبِينَ** یہ ہے کہ واقعی دین کا کام خرچ کرنے سے چلتا ہے مگر وہ خرچ کرنا تم پر موقوف نہیں سبحان اللہ کیا بلاغت ہے۔ مستبدل میں اشارہ ہے اس طرف کہ یہ خرچ کرنا ایک عہدہ ہے تم مالک نہیں ہو۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٍ
 أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ
 فِي نَارِ جَهَنَّمَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ لَا يَزَالُ
 بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ
 وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

ترجمہ: پھر آیا ایسا شخص بہتر ہے جس سے نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد خدا سے ڈرنے اور
 خدا کی خوشنودی پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی (یعنی غبار) کے کنارے پر
 جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو پھر وہ (عمارت) اس (بانی) کو لے کر آتش دوزخ میں گر پڑے اور اللہ
 تعالیٰ ایسے ظالموں کو (دین کی) سمجھ نہیں دیتا ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں
 میں (کاشاسا) کھکتی رہے گی ہاں مگر ان کے (وہ) دل ہی اگر فنا ہو جائیں تو خیر اللہ تعالیٰ بڑے علم
 والے بڑی حکمت والے ہیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَى تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ** یہ آیت ایک خاص قصہ اور ایک
 خاص مسجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر مجھے اس علت مشترکہ نکال کر دیگر مساجد اور مدارس کی تعمیر کا حکم
 بیان کرنا ہے اور اس پر پھر تعمیرات کو قیاس کرنا ہے غرض یہ آیت مسجد خاص کے قصہ میں نازل ہوئی ہے۔
 شخص قصہ کا یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک محلہ ہے قبا اس کا نام ہے رسول ﷺ جب ہجرت کر کے
 مدینہ منورہ تشریف لائے ہیں تو اول اسی محلہ میں قیام فرمایا۔ پھر شہر میں تشریف لائے تھے تو زمانہ قیام میں جس
 جگہ آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے وہاں اس محلہ کے مومنین مخلصین نے ایک مسجد بنالی اور اس میں نماز پڑھا
 کرتے کسی نے خوب کہا ہے کہ

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد با خاک آستانش داریم مرجبائے

منافقین نے جو کہ اسلام کی بیخ کنی کی تدبیروں میں ہر وقت لگے رہتے تھے یہ سوچا کہ ایک مکان مسجد کے نام سے جداگانہ بنایا جاوے اور ظاہر میں وہ مسجد کی شکل ہو اور واقع میں انجمن ہو اور اس کا پریذیڈنٹ ابو عامر راہب بنایا گیا جو کہ اسلام کا سخت دشمن تھا اور ابو عامر کا ہر قل شاہ روم سے میل جول تھا ابو عامر نے مسلمانوں کے ضعف پر نظر کر کے یہ کہا کہ میں ہر قل سے اہل اسلام کے مقابلہ کے لئے لشکر لاؤں گا۔ جس سے اسلام نیست و نابود ہو جاوے گا۔

ان لوگوں نے اپنی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھ کر یہ خیال پختہ کر لیا تھا مگر یہ نہ سمجھے کہ خربوزوں کی چاہے کتنی ہی کثرت ہو مگر چھریوں کی قلت بھی ان کے نیست و نابود کرنے کے لئے کافی ہے مسلمانوں کے ساتھ تو ایک چھری ان اللہ معنا کی تھی کہ کفار کی صورت سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور افسوس کہ آج کل یہی چھری مسلمانوں کے پاس نہیں رہی اور اگر ہے بھی تو تیز نہیں ہے کند ہو رہی ہے۔ کیونکہ مرضیات الہی سے مسلمان بہت کچھ ہٹ رہے ہیں اس لئے مخالفوں کا کبھی ان پر غلبہ ہو جاتا ہے اگر مسلمان اس چھری کو تیز کر لیں یعنی خدا تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کریں تو پھر وہی نمونہ سامنے آ جائے جو کبھی پہلے تھا۔

غرض ان لوگوں نے انجمن کی نیت سے مسجد کی شکل میں ایک مکان اس غرض سے بنایا کہ اس میں تخریب اسلام کا مشورہ کیا کریں گے۔ مسجد کی نیت سے نہیں بنایا تھا۔ صرف صورت مسجد کی شکل تھی غرض جب وہ مکان تیار ہوا تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ ایک بار وہاں چل کر نماز پڑھ لیجئے تو پھر وہاں نماز ہونے لگے گی۔ تو گویا مقصود رجسٹری کرانا تھا جیسے بیچ نامہ کی رجسٹری کرائی جاتی ہے۔

حضور ﷺ نے جداگانہ مسجد بنانے کی وجہ پوچھی کہنے لگے کہ ہماری نیت بالکل نیک ہے۔ محض عام مسلمانوں کی آسائش کی غرض سے بنائی تھی تا کہ وسعت و سہولت ہو گرمی سردی میں سایہ کی ضرورت ہوتی ہے ایک مسجد میں سب سائیں نہیں سکتے۔ اس سے گنجائش ہوگی۔ نیز کوئی بیمار ضعیف دور نہ جاسکے تو پاس کے پاس اس میں نماز پڑھ لے حضور ﷺ نے بناء بر حسن ظن تصدیق فرما کر وعدہ کر لیا۔ غرض حضور ﷺ نے وعدہ فرمایا کہ تبوک سے آ کر اس میں نماز پڑھوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقیقت حال کی اطلاع کر دی اور وہاں نماز پڑھنے سے منع فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَمْسَدُوا أُخْرَارًا أَكْفَرُوا وَتَفَرَّقْنَا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالرَّصَادَاتِ لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ
وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ وَالَّذِينَ آمَنُوا لَآتُونَ اللَّهَ بِحَسَنَاتٍ لَّيْلًا نَّكَذِبُونَ ﴿۱۰﴾ لَا تَقْرَأُوا
الْكِتَابَ أَلْفًا بِأَلْفٍ عَلَى الْتَقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ رَبِّعَالٍ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَّطَهَّرُوا
وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَهَّرِينَ ﴿۱۱﴾

اور بعض ایسے ہیں کہ جنہوں نے ان اغراض کیلئے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں

اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس کے قبل سے خدا اور رسول کا مخالف ہے اور قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے ہماری اور کچھ نیت نہیں اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ ﷺ اس میں کبھی نہ کھڑے ہوں البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض آیت میں خدا کے یہاں سے اس مسجد کی مذمت ظاہر کی گئی ہے کہ یہ مسجد صرف سورۃ ہے اور واقع میں کفر کی قوت کے واسطے اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانے اور ان میں تفریق ڈالنے کے واسطے تیار ہوئی ہے اور ابو عامر راہب کے ٹھہرنے کے لئے اور اس کی پناہ کے واسطے تیار کی گئی ہے اور یہ لوگ قسمیں کھا جاویں گے کہ بجز بھلائی کے اور کچھ نیت نہیں حالانکہ یہ لوگ جھوٹے ہیں آپ اس مسجد میں نہ کھڑے ہو جائیے اور نہ نماز پڑھیے۔ البتہ آپ اس مسجد میں نماز پڑھئے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس میں ایسے آدمی ہیں کہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غرض اس مسجد میں نماز کی نیت سے جانے سے ممانعت ہو گئی چنانچہ حضور ﷺ نے بوجہ اس کے کہ وہ مسجد کی نیت سے نہ بنائی گئی تھی اور اس کے علاوہ مفاسد کثیرہ اس سے ناشی ہوتے تھے چند صحابہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوادی اور منہدم کرا دی اس مسجد کا لقب مسجد ضرار مشہور ہے کیونکہ وہ اضرار کے لئے بنائی گئی تھی۔

قرآنی طرز نصیحت

اس سے آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلْمَنْ اَنْتَسَ بُنْيَانَهُ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْرِ مَنْ اَنْتَسَ بُنْيَانَهُ عَلٰى شَيْءٍ اِجْرَافٍ هَالِكًا نَهَارًا بِهٖ فِى نَارٍ جَهَنَّمَ۔ ہمزہ استفہام کا ہے اور فاعل جرح کا ہے اور دو قسم کی مساجد کا ذکر فرمایا ہے اب یہ بتلا کر کہ ان میں سے ایک کی تو بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے اور دوسری کی کفر پر اس پر تفریح فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان میں سے کون افضل ہے جب بناؤں کہ حالت معلوم ہو گئی تو اس سے بانی کی بھی فضیلت معلوم ہو گئی اور بنیان مصدر ہے معنی میں اور حا کی ضمیر من کی طرف راجع ہے اور من اللہ تقویٰ کی قید ہے تاکہ کوئی متقی ایسی پاکی پر ناز نہ کرے کہ ہم نے پاکی حاصل کی اس واسطے کہ تقویٰ من جانب اللہ اور رضوان بھی مقید ہے من اللہ کے ساتھ۔

مطلب یہ ہے کہ آیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خوف خدا و خوشنودی خدا پر رکھی ہو یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھائی کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو رکھی ہو یہ طرز بلاغت ہے کہ فیصلہ مخاطب کے اوپر چھوڑ دیا پس دونوں کے افعال بیان کر دیئے۔ اور مخاطب کے ذمہ فیصلہ چھوڑ دیا کہ تم سوچ لو یہ بہتر ہے یا یہ

بہتر ہے۔ یہ طرز نصیحت کا بڑا مؤثر ہے اور اگر ناصح خود ہی فیصلہ کر دے تو اس سے مخاطب پر گرائی ہوتی ہے۔ ایک طرز تو یہ ہے کہ ان کے اقوال و افعال اچھیانہ طور پر بیان کر دیئے جائیں اور کسی خاص شخص کو مخاطب نہ کیا جائے پھر خود ان سے ہی فیصلہ دریافت کر لیا جائے تو یہ طرز زیادہ موثر ہوتا ہے اور ایک طرز یہ ہے کہ خود فیصلہ کر کے حکم لگا دو کہ تم ملعون ہو!

تو حق سبحانہ تعالیٰ بھی یہی پہلا طرز اختیار فرما کر دریافت فرماتے ہیں کہ بتلاؤ ان دونوں میں کون خیر ہے یعنی جس شخص نے اپنی بنیاد تقویٰ اور خدا کی رضا پر رکھی ایک شخص تو یہ ہے اور ایک شخص وہ ہے جس نے بنیاد کسی گھائی کے کنارہ پر جو گرنے ہی کو ہو رکھی ہو یعنی ڈھانگ پر رکھی ہو جس کی عمارت میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ ڈھانگ پر رکھی ہے اور پھر یہ خرابی ہے کہ وہ ڈھانگ گرنے ہی کو ہے۔ تیسری خرابی یہ ہے کہ بانی کو لے کر گرے گی جب مکان گرا تو بانی جو اس میں رہتا تھا وہ بھی گر گیا یہ سب سے زیادہ ضرر ہے اور اگر بانی سلامت رہے تو کیا غم ہے۔ اگر بانی رہ جاوے اور مکان گر جاوے تو ایسا ضرر نہیں مکان بہت بن سکتے ہیں اصل ضرر یہ ہے کہ بانی کو لے کر مکان بیٹھ گیا۔

ختم آیت پر فرماتے ہیں **وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ** کہ حق تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ہدایت نہیں کرتے۔

یہ اپنے عموم سے اس کو بھی شامل ہے آگے ان منافقوں کی عمارت کا حال بیان فرماتے ہیں کہ اس کے گرنے کے بعد ان کے قلب کی کیا حالت ہونے والی ہے۔ فرماتے ہیں **لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوْبِهِمْ اِلَّا اَنْ تَنْقَطِعَ قُلُوْبُهُمْ** وَاللّٰهُ عَلَيْهِمْ حٰكِمٌ ان کی یہ عمارت یعنی وہ مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا بن کر کھکتی رہے گی کیونکہ جس غرض سے بنائی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور نیت کی قلعی کھل گئی وہ الگ اور پھر اوپر سے منہدم کر دی گئی غرض کوئی ارمان نہ نکلا اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا ہاں ان کے وہ دل جن میں یہ ارمان ہے اگر وہی فنا ہو جاوے تو وہ ارمان بھی اس وقت ختم جاوے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں۔ ان کی غلی شرارتوں کو جانتے ہیں حکمت والے ہیں مناسب سزا دیں گے تو آدمی جس چیز کو مقصود سمجھتا ہے اس کے عدم حصول سے جو حالت ہوتی ہے وہی حالت ان کی تھی جنہوں نے یہ انجمن تخریب اسلام کے لئے بنائی تھی اور یہ علت بھی مشترک ہے تمام عمارت میں کہ جن لوگوں نے اپنی عمارت ایسے ناپاک اغراض کے لئے ایسے مواقع پر بنائی ہیں وہ سب برباد بھی ہوئیں اور ان لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ بے چینی ان کے لازم حال ہو گئی چنانچہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ بری نیت سے جو عمارت بنائی گئی ہے اس کو قیام نہیں ہوتا۔ اب میں **اِلَّا اَنْ تَنْقَطِعَ قُلُوْبُهُمْ** کے متعلق ایک نکتہ بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔

قلب اور موت

اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہی ہے کہ یہ ارمان لوگوں کے دل سے کبھی نہ نکلے گا بجز اس کے کہ ان کے دل ہی قطع ہو جاویں اور یہ مر جاویں تب تو یہ حسرت نکل سکتی ہے کیونکہ جب دل نہ رہے گا جو نکل ہے حسرت کا تو پھر ارمان اور حسرت کس طور سے باقی رہے گا۔ پس ایک تو یہ توجیہ ہے **إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ** کی کہ بعد فنا و موت کے اس خاص حسرت سے رحمت ہو جاوے گی۔

ایک توجیہ یہ بھی بیان ہو سکتی ہے اور یہ نہایت لطیف ہے کہ **إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ** تاکید ہے الم حسرت اور ارمان کی کہ ان کو حسرت اور ارمان ہمیشہ رہے گا اور یہ کھٹک ہمیشہ رہے گی۔ موت سے بھی یہ کھٹ دور نہ ہوگی کیونکہ قلب کو موت نہیں آ سکتی اس لئے کہ قلب کی دو قسمیں ہیں ایک تو قلب جو مضمضہ صنوبری ہے۔ دوسرا قلب حقیقی جو نکل اور اکات ہے عقائد وغیرہ کا حصول بھی اسی قلب سے ہوتا ہے۔

یہ قلب جس چیز کو ادراک کرتا ہے اس کی بقاء ضروری ہے اس وجہ سے کہ یہ قلب ہمیشہ باقی رہتا ہے اس لئے کفر بھی باقی رہتا ہے اخلاق جو ناپاک ہیں وہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں عشق کا زب بھی باقی رہتا ہے اگر کوئی کسی پر عاشق ہو جاوے تو یہ عشق مرنے سے چھوٹا نہیں بلکہ مرنے کے بعد بھی اس مصیبت میں گرفتار رہتا ہے بعض عشاق مرنے کے بعد اس غم سے دستگار ہو جانے کا دعویٰ کرتے پھرتے ہیں بالکل غلط ہے اس غم سے واقع میں جدائی مشکل ہے کیونکہ قلب حقیقی پر موت نہیں آتی اور نہ اس کی کیفیات زائل ہوتی ہیں غرض کہ اگر قلب کی تفسیر قلب حقیقی کی جاوے تو چونکہ قلب حقیقی کو موت نہیں۔ اس لئے اس کے ارمان اور حسرت کو بھی دوام رہے گا۔ اس تقدیر پر **إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ** میں استثناء ایسا ہوگا جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

ولا عیب فہم غیران سیوہم ہم فلول من قراع الکتاب

ای ان کان فہم فہو ذاک وھذا لیس بعیب فلا عیب فہم اصلا

اسی طرح یہاں پر مطلب ہے کہ ان کے ارمان جب نکلیں جب کہ قلب ہلاک ہو جاوے اور عدم ہلاک قلب ثابت ہے لہذا دوام حسرت و ارمان بھی دواماً ثابت ہے۔

حاصل یہ ہے کہ یہ نتیجہ ہے ان کی عمارت کے غیر تقویٰ و رضوان حق کے لئے ہونے کا تو جو عمارت غیر تقویٰ رضوان حق پر مبنی ہوں گی ان کے بانیوں کے لئے بے چینی لازم حال رہے گی۔ مگر تقویٰ اور رضوان اور جس عمارت کی بنیاد تقویٰ اور رضوان پر وہ البتہ خیر ہی خیر بہتر ہے واللہ اعلم اور اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں کہ کس شخص کی کیا نیت ہے اور وہ حکیم بھی ہیں کہ قوانین حکمت سے مقرر کرتے ہیں اور عامل و تارک کو مناسب جزا و سزا دیتے ہیں۔

ترجمہ: کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان و مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔

عارفین کی محبت و معرفت میں اضافہ

تو دیکھئے اپنے کو مشتری قرار دیا اور خریدنے والا ظاہر ہے کہ پہلے سے مالک نہیں ہوتا تو گویا یوں فرماتے ہیں کہ جان و مال سب تمہارا ہی ہے مگر ہمارے ہاتھ فروخت کر دو اللہ اکبر آپ نے شفقت خداوندی کو دیکھ لیا ایسی شفقت کسی کو بھی ہو سکتی ہے ہرگز نہیں اس جگہ عارفین نے ایک نکتہ خوب بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو اپنے آپ کو خریدار ٹھہرایا اس کو سن کر عوام تو خوش ہوئے کہ اس جان و مال کے بدلے بڑی دولت ہم کو ملے گی مگر اہل تحقیق اس آیت کو سن کر شرمندہ ہو گئے کہ حق تعالیٰ اپنی مملوک جان اور مال کو ہماری جان و مال فرماتے ہیں اس سے شرمندہ اس لئے ہوئے کہ ہم لوگ ان چیزوں کو چونکہ اپنا سمجھتے ہیں حق تعالیٰ نے بھی اسی کے موافق کلام فرمایا اور پردہ پوشی کی ہمارے خیال کی غلطی ظاہر کر کے ہم کو رسوا نہیں فرمایا فضیحت نہیں کیا بلکہ رحمت سے اس خیال کو بظاہر صحیح کر دیا کہ ہاں یہ جان و مال تمہارا ہی ہے ہم اپنا نہیں کہتے مگر تم اس کو جنت کے بدلے ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو عارفین پر یہ اثر ہوا اس آیت کا جس سے مارے شرمندگی کے ان کے سراو پر نہیں اٹھتے اور اس سے حق تعالیٰ کی محبت اور معرفت ان کو زیادہ ہو گئی۔

بذل نفس

اب میں طالب علموں کے کام کی ایک بات بتلاتا ہوں کہ اس مقام پر شبہ ہو سکتا ہے کہ بذل نفس تو خاص خاص کاموں میں ہوتا ہے یعنی قتال میں جس کا آگے ذکر بھی ہے یقاتلون فی سبیل اللہ تو بذل نفس کیسے ہوا تو سمجھو کہ خدا تعالیٰ نے خود آگے چل کر فرما دیا ہے۔

الْكَاذِبُونَ الْعَاهِدُونَ الْعَاهِدُونَ السَّاعُونَ السَّاعُونَ وَهَٰؤُلَاءِ يَسْتَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ حَمَلٌ مُّثْقَلٌ يُضْرَبُونَ
روزہ رکھنے والے رکوع کرنے والے۔

یہ آیت اس شبہ کو بالکل زائل کر کے بتلا رہی ہے کہ یہ سب کام بذل نفس ہی میں داخل ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ دلیل ہے کہ آگے ارشاد ہوتا ہے وبشر المؤمنین مسلمانوں کو بشارت دیجئے۔

یہ المؤمنین اسی من المؤمنین سابق کا اعادہ ہے۔ پس ان اعمال کے بعد یہ حکم دینا کہ اے محمد ﷺ ان مؤمنین مذکورین کو بشارت دے دیجئے صریح طور سے دال ہے۔ کہ جس اشتراء النفس و اموال کا اوپر ذکر تھا وہ یہ اعمال ہیں پس یہ سب بذل نفس ہو گیا اس تقریر سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ تمام شریعت مطہرہ بذل نفس اور بذل مال کی تفصیل ہے۔

توبہ عبادات پر مقدم ہے

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآثَارِهِمْ لَعَنَ الْجَنَّةَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔) یہ تو معاملہ کا بیان ہوا کہ حق تعالیٰ نے مومنین سے بیع و شرا کا معاملہ کیا ہے۔ اور بدلیں کا ذکر بھی ہے آگے ان کی اس حالت کی تفصیل ہے وہ یہ ہے الْكَافِرُونَ الْعَيْدُونَ الْمَأْمُودُونَ (وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے حمد کرنے والے ہیں) اس میں تائبوں کو مقدم کیا سب صفات پر حتیٰ کہ عابدوں پر بھی قرآن شریف ابلغ کلام ہے اس کی ترتیب کے اندر بھی ضرور کوئی بات ہے وہ یہی ہے کہ توبہ مقدم ہے تمام صفات پر اور تمام صفات کمال اور جمعی عبادات کا لطف اور کمال بھی توبہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے ایک آیت اور یاد آئی اس میں بھی یہی مضمون ہے وہ یہ ہے عَسَىٰ رَبُّهُ إِن طَلَفَكَ لَأُنزِلَنَّ إِلَيْكَ مَائِدًا مِّنَ السَّمَاءِ مِثْلًا مِّمَّا يُنَزِّلُ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِرَبِّهِ أَيُّهَا الْمَلَأُ الْأَعْيُنُ أَنزِلُوا إِلَيَّ الْكِتَابَ فَآتَيْنَاهُ إِلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ (اگر پیغمبر ﷺ تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں) اس میں بھی تائبانہ مقدم ہے عبادت پر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ عبادات پر مقدم ہے اور ظاہر ہے کہ توبہ بھی عمل ہے اور عبادات بھی اعمال ہیں اور یہ عبادات سے مقدم ہے تو توبہ اول اعمال ہوئی اس آیت پر ایک شبہ ہے وہ یہ کہ اس میں تائبانہ کا لفظ عبادات پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا ہے مگر اول اعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیوں کہ آیت میں اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں اور توبہ کا اعمال اول ہونا جب مستفیض ہوتا جب کہ آیت التائبون کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم التائبانہ ہوتا اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے تصریح کر دی ہے کہ توبہ کے اول اعمال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بجز ایمان و اسلام کے سب اعمال پر مقدم ہے اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلم ہے ان کے بغیر تو اعمال کیسے بھی اچھے ہوں مگر ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ سلطنت کی امداد بھی کرتا ہے اور رفاہ عام کے کام بھی بہت کرتا ہے مگر ہے باغی تو یہ سب کام اس کے بیکار ہیں اسی طرح ایمان و اسلام ہے کہ کوئی عمل بدوں ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رہی اب ایک شبہ اور ہے کہ مسلمان اور مومنات کا تقدم تائبانہ پر صحیح ہو گیا مگر آیت میں ایک لفظ قانتات بھی تائبانہ پر مقدم ہے جس سے توبہ کا اول اعمال ہونا پھر باطل ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قنوت فعل قلب ہے یہ بھی توبہ سے مقدم ہے اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں اور ندامت جسمی ہوگی جبکہ قنوت ہو کیونکہ جب تک نرمی جھک جانا بجز قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ

ہے قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی تو عقلاً ثابت ہو گیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے اس واسطے قانات کو بھی اس آیت میں تا سبات پر مقدم کیا تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول الاعمال ہونے کا کہ اعمال مامور بہا میں سے جن اعمال پر توبہ مبنی نہیں ان سب سے مقدم توبہ ہے سو قنوت چونکہ توبہ کے لئے شرط عقلی ہے لہذا وہ توبہ پر مقدم ہوئی ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی طاعت صحیح نہ ہوگی بلا توبہ کے گو بعض افراد توبہ کے ایسے بھی ہیں جو شرط صحت ہیں تمام اعمال کے لئے او وہ توبہ عن الکفر ہے چنانچہ سب جانتے ہیں کہ بلا اس کے کوئی عمل بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ

لَهُمُ الْجَنَّةُ

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔

تفسیری نکات نفس و مال

اسی وقت اس میں ایک لطیف ذہن میں آیا فرماتے ہیں **أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ** یہ نہیں فرمایا اعمالہم - و اموالہم؛ اشارہ اس طرف ہے کہ اعمال تو نہیں نفس و مال تو ہے ذکوۃ دی مال خرچ ہوا نماز پڑھی نفس پر تعب ہوا بس وہی خرید لیا گو وہ نفس و مال عبادت معتد بہانہ سہی مگر بشرطیکہ تم انہیں اعمال میں مصروف کرو پھر چاہئے وہ عمل کامل نہ ہو کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ گھوڑا مر گیا جھول کے وہ دام دیئے جو گھوڑے کے تھے انفسہم میں یہ لطیفہ اسی وقت سمجھے میں آیا بہر حال یہ چاہے اس کی تفسیر نہ ہو مگر میری تقریر اس تفسیر پر موقوف بھی نہیں دوسری نصوص میں بھی یہ مضمون موجود ہے **يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ** سیئات کو حسنات سے بدل دیں گے۔

وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ

ترجمہ: اور اللہ کی حدود کا خیال رکھنے والے

تفسیری نکات

ہر کام میں حفظ حدود کی اہمیت

فرمایا کہ حق تعالیٰ نے صلحاء کی بہت سی تعریفیں سورہ توبہ کی اس ایک آیت میں جمع فرمائی ہیں جس میں التائبون الحمدون سے شروع ہو کر بہت سی صفات محمودہ بیان فرمانے کے بعد فرمایا (الحافظون لحدود اللہ) اس سے معلوم ہوا کہ تمام صفات محمودہ اس وقت محمودہ ہیں جبکہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہیں ان میں افراط و تفریط یا غلو ہو گیا تو صفت محمودہ نہیں رہتی اور ہر کام اس وقت صحیح و مقبول ہوگا جبکہ وہ حفظ حدود کیساتھ ہو۔

توبہ عبادات پر مقدم ہے

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی) یہ تو معاملہ کا بیان ہوا کہ حق تعالیٰ نے مومنین سے بیع و شرا کا معاملہ کیا ہے اور بدلین کا ذکر بھی ہے آگے ان کی اس حالت کی تفصیل ہے وہ یہ ہے التائبون العابدون الحامدون (وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے حمد کرنے والے ہیں) اس میں تائبون کو مقدم کیا سب صفات پر حتیٰ کہ عابدوں پر بھی قرآن شریف ابلغ کلام ہے اس کی ترتیب کے اندر بھی ضرور کوئی بات ہے وہ یہی ہے کہ توبہ مقدم ہے تمام صفات پر اور تمام صفات کمال اور جمیع عبادات کا لطف اور کمال بھی توبہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے ایک آیت اور یاد آئی اس میں بھی یہی مضمون ہے وہ یہ ہے عَسَىٰ رَبُّهُ إِنْ طَلَقَكُنَّ أَنْ تُبَدِّلَنَّهُ أَنْزِلًا خَيْرًا مِنْكَ مُسْلِمًا مُمِئِنًا قَبِيْلًا تَبِيْعًا عِيْلًا سَبِيْعًا تَبِيْعًا وَابْتِكَارًا (اگر پیغمبر ﷺ تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی۔ کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں اس میں بھی تائبات مقدم ہے۔ عابدات پر اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ عبادات پر مقدم ہے اور ظاہر ہے کہ توبہ بھی عمل ہے اور عبادات بھی اعمال ہیں۔ اور یہ عبادات سے مقدم ہے تو توبہ اول اعمال ہوئی اس آیت پر ایک شبہ ہے وہ یہ کہ اس میں تائبات کا لفظ عبادات پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا

ہے مگر اول اعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیوں کہ آیت میں اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں اور وہ یہ ہے مسلمات مومنات قانتات ترتیب کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ چوتھا مرتبہ تائبات کا ہے توبہ کا اعمال اول ہونا جب مستفیض ہوتا جب کہ آیت التائبون کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم التائبات ہوتا اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے تشریح کر دی ہے کہ توبہ کے اول اعمال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بجز ایمان و اسلام کے سب اعمال پر مقدم ہے اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلم ہے ان کے بغیر تو اعمال کیسے بھی اچھے ہوں مگر ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ سلطان کی امداد بھی کرتا ہے اور رفاہ عام کے کام بھی بہت کرتا ہے مگر ہے باغی تو یہ کام اس کے بیکار ہیں اسی طرح ایمان و اسلام ہے کوئی عمل بدوں ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رعب اب ایک شبہ اور ہے کہ مسلمات اور مومنات کا مقدم توبہ تائبات پر صحیح ہو گیا مگر آیت میں ایک لفظ قانتات بھی تائبات پر مقدم ہے جس سے توبہ کا اول ہونا پھر باطل ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قنوت فعل قلب ہے یہ بھی توبہ سے مقدم ہے اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں اور ندامت جسمی ہوگی جبکہ قنوت ہے کیونکہ جب تک نرمی جھک جانا بجز قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی تو عقلاً ثابت ہو گیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے۔ اس واسطے قانتات کو بھی اس آیت میں تائبات پر مقدم کیا تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول الاعمال ہونے کا کہ اعمال مامور بہا میں سے جن اعمال پر توبہ مبنی نہیں ان سے مقدم توبہ ہے سو قنوت چونکہ توبہ کے لئے شرط عقلی ہے لہذا وہ توبہ پر مقدم ہوئی ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی طاعت صحیح نہ ہوگی۔ بلا توبہ کے گو بعض افراد توبہ کے ایسے بھی ہیں جو شرط صحت ہیں تمام اعمال کے لئے اور وہ توبہ عن الکل ہے چنانچہ سب جانتے ہیں کہ بلا اس کے کوئی عمل بھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

توبہ عن المعاصی شرط کمال ہے

لیکن باقی افراد توبہ کے یعنی توبہ عن المعاصی محققین کے نزدیک شرط کمال ہیں یعنی نورانیت کسی عمل کی بلا اس کے نہیں ہوتی گو عمل قبول ہو جائے جیسے ایک باورچی ہو کہ وہ آقا کی نافرمانی کرتا ہے اور آقا اس سے کشیدہ ہے لیکن آقا بخیر ایسا ہے کہ کھانا اس کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھا لیتا ہے۔ یہ صفت رحم اور غفو کی ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آقا دل میں کشیدہ ہے۔ اور خود باورچی کا دل بھی رکا ہوا ہے کھانا کھلاتا ہے مگر کھل کر بات بھی نہیں کر سکتا اور جب یہ ہے کہ جب اس کو محبت ہو آقا سے ورنہ اگر ضابطہ کا نوکر ہے تب تو غیرت چہ کئی است کہ پیش مر داں بیاد اس کو اپنی نوکری پوری کرنے کا خیال ہوگا آقا انبساط کے ساتھ کھانا کھائے یا انقیاض کے ساتھ اسے تنخواہ لینے سے مطلب خیر ایسے آدمی کا تو ذکر نہیں ذکر اس کا ہے جو غیرت اور محبت ہو سو ایسا شخص آقا کے سامنے غیر

۱ گناہوں سے توبہ ۲ غیرت کیا کہتی ہے کتا دمیوں کے سامنے آئے ۳ خوشی

مطیع ہونے کی حالت میں خدمت میں حلاوت اور انبساط اور کفایت اور راحت فرحت اور نشاط بدوں توبہ اور تصحیرات کے معافی ملے ہوئے نہیں پاسکتا اور یہ بات ثابت ہے کہ خدمت اس کی ویسے بھی قبول ہوگئی جسے آقائے کھانا کھا تو لیا ہے اور پھینک نہیں دیا اس کو یہ حکم نہیں کیا کہ توبہ کر کے پھر دوبارہ پکاوے اور اس نفس عمل کی مقبولیت پر نفس موجود ہے میں اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں۔ من يعمل مثقال ذرة خیراً یروہ (پس جو شخص ذرا برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) اس میں حق تعالیٰ نے شرط نہیں کی توبہ کی برخلاف اس کے ایمان کو بہت جگہ شرط بنایا ہے صحت اعمال کے لئے اور توبہ عن المعاصی کو کہیں شرط نہیں کیا۔

بلا توبہ کے عمل میں نورانیت نہیں ہوتی

جس سے یہ حاصل ہوا کہ نفس عمل تو قبول مگر نورانیت اس میں نہیں ہو سکتی اور اسی نورانیت نہ ہونے کو بعض نصوص میں حبط سے تعبیر فرما دیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے من فاتته صلاة العصر فقد وتر اہلہ وصالہ (جس شخص کی عصر کی نماز فوت ہوگئی تو گویا اس کے اہل و عیال تباہ ہو گئے۔) اور ایک روایت میں اس کی تفسیر ہے حبط عملہ (یعنی اس کے اعمال ہی ضائع ہو گئے۔) اور حبط عمل ظاہراً خاصہ کفر ہے مگر یہاں ایک عمل فرعی کو بھی حابط فرمایا اسی طرح اور بعض اعمال کو بھی حابط فرمایا ہے۔ (اول الاعمال بمعنی مواعظ راہ نجات)

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُمُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۗ

يَتَّقُونَ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت کے بعد گمراہ کر دے جب تک کہ ان کے لئے مایتقون کو بیان نہ کر دے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔

تفسیری نکات

ایک شبہ کا جواب

اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ خفیہ کے یہاں تو توحید بدوں ارسال رسول کے بھی واجب ہے اور اس کے ترک سے ہلال و عذاب کا وقوع ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ یہاں پر یہ نہیں فرمایا ہے یوحیٰ تو نہیں فرمایا اور بیان ارسال رسول پر موقوف نہیں عقل سے بھی ہو سکتا ہے پھر اس کے متعلق بعض فروع ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی شخص کی عقل کامل نہ ہو اور وہ مجنون و مستوحہ بھی

نہیں لیکن اس کی عقل تہا بدوں رسول کے توحید کے پہچاننے کو کافی نہیں اس کو عذاب ہوگا یا نہیں اس میں اختلاف ہے۔ بعض اس طرف گئے ہیں کہ ایسے شخص کو عذاب نہ ہوگا گو وہ عاقل ہے مگر قلت عقل کی وجہ سے معذور ہے اور بعض نے کہا کہ عذاب ہوگا اور یہ مسئلہ وَمَا لَكُمْ مَعَذِبِينَ حَتَّىٰ بُعِثَ رَسُولًا (پ ۱۵) کے معارض نہیں کیونکہ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ اس میں عذاب دنیا مراد ہے اور گفتگو عذاب آخرت میں ہے گو یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ نفی عذاب دینا بدرجہ اول مستلزم ہے نفی عذاب آخرت کو کیونکہ عذاب دینا ہون ہے جب بدوں بعثت رسل کے عذاب دینا نہیں ہوتا تو عذاب آخرت بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا اور جواب ثانی یہ ہے کہ یہاں رسول عام عقل کو بھی اور پیغمبر کو بھی یہ مسئلہ کے چند فروع ہیں ان کے علاوہ اور بھی فروع ہیں مگر میں نے اجمالاً اشارہ کر دیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَمَا لَكُمْ مِمَّنْ

دُونِ اللَّهِ مِنْ قَلْبٍ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی وہی جلالتا اور مارتا ہے اور تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی یار ہے نہ مددگار۔

تفسیری نکات

احکام تکوینیہ و تشریحیہ کا پورا اختیار حق سبحانہ و تعالیٰ کے قبضہ میں ہے
 إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ سے ثابت ہوا کہ احکام تشریحیہ کے مقرر کرنے کا حق تعالیٰ کو پورا اختیار ہے کیونکہ وہ صاحب سلطنت ہیں اور اسی سے دوسرا مقدمہ یہ مفہوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو احکام تکوینیہ کے مقرر کرنے کا بھی پورا اختیار ہے کیونکہ إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ہر قسم کے احکام کو عام ہے تشریحیہ کو بھی اور تکوینیہ کو بھی مگر کوئی شاید عموم کو تسلیم نہ کرے کیونکہ عموم و خصوص کا سمجھنا مجتہد ہی کا کام ہے مگر اس آیت میں ایک جملہ ایسا موجود ہے جس سے آیت کا عموم واضح ہو گیا اور وہ یُحْيِي وَيُمِيتُ ہے کیونکہ احیاء و اماتت تو احکام تکوینیہ ہی سے ہیں۔

تمام عموم و افکار کا علاج

اس آیت میں تمام عموم و افکار کا علاج بتلایا ہے۔ إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر طرح تصرف کا حق ہے تم کو کسی تجویز کا کوئی حق نہیں تو اس آیت میں ہم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم کو تشریحیات تو تکوینیات کے مطابق کوئی تجویز اپنی طرف سے نہ کرنا چاہئے۔

وہ جب چاہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں تم کو اس میں دخل در معقول کا کوئی حق نہیں یہی تعلیم ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے اس پر عمل کرنے سے غم کی جڑی کٹ جائے گی ہاں طبعی غم ہوگا مگر وہ دیر پا نہیں ہوتا اور طبعی غم بھی اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں حکمتیں ہیں ہمارے لئے بڑی حکمت یہ ہے کہ غم سے شکستگی کی شان پیدا ہوتی ہے جس سے تکبر و غرور وغیرہ کا علاج ہو جاتا ہے اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں ہیں۔

غرض اولاد کو بھی خدا تعالیٰ کی چیز سمجھو کہ اس کی امانت چند روز ہمارے پاس ہے پھر اس کے فوت ہونے پر زیادہ ملال نہ ہوگا۔

رَبطَ آيَاتٍ

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِن قَوْلٍ وَلَا تَحْسِبُوا أَنَّهُمْ يُبْغِضُونَ قَوْلًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ (پ) سے بھی ہے اور اس اعتبار سے یہ جملہ آیت سابقہ کے مضمون کی دلیل ہے کہ تم کو قبل نبی کے استغفار کرنے سے گناہ اس لئے نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست یا مددگار نہیں ہے اور یہ بات محبت و ولایت کے خلاف ہے کہ نبی سے پہلے کسی فعل کے ارتکاب پر عذاب کیا جائے گا یا گناہ کی فرد جرم قائم کی جاوے نیز اس میں ان لوگوں کو بھی تنبیہ ہے جو کسی کے گھمنڈ پر منافی کا ارتکاب کرے کہ ہم فلاں کی شفاعت یا استغفار سے بچ جائیں گے۔

جواب کا حاصل یہ ہوا کہ خدا کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں دوست نہیں اس لئے کسی دوسرے کے بھروسہ اور گھمنڈ پر گناہوں کا ارتکاب نہ کرنا چاہئے۔ مگر اس سے شفاعت کی نفی لازم نہیں آتی کیونکہ شفاعت تو خدا تعالیٰ کے اذن سے ہوگی۔ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَ إِلَّا إِلَٰهٍ ذِي الْعَرْشِ الْمَغْلُوبِ (پ) تو اجازت اسی شخص کے متعلق ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ خود بخشنا چاہیں گے اور جس کی ولایت و نصرت وہ نہ چاہیں گے اس کے لئے اذن شفاعت ہی کیوں دیں گے۔ نیز اس آیت میں اس شبہ کا حکیمانہ جواب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کو اور مسلمانوں کو استغفار للمشرکین سے کیوں منع فرمایا بلکہ ان کو استغفار کرنے دیتے اور خود استغفار کو قبول کرتے یا نہ کرتے۔ اس کا حکیمانہ جواب اس طرح دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست و مددگار نہیں پس تم بھی دوستی اسی سے کرو جو خدا کا دوست ہو اور جو خدا کا دشمن ہو اس سے دشمنی کرو پس کفار سے دوستی نہ کرو اور استغفار بھی اسی کی فرد ہے۔ اس لئے کفار کے واسطے استغفار ہرگز نہ کرو کیونکہ اعداء اللہ ہیں تم بھی ان سے عداوت ظاہر کرو غرض یہاں تین مضمون تھے یعنی نبی عن الاستغفار بحیثیت حاکمیت و نبی عن الاستغفار بحیثیت حکمت و عدم تاشیم قبل انہی تینوں پر اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ (پ) بے شک اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمینوں کی۔

اس کا ربط ماقبل سے یہ ہے کہ اس جگہ یہ سوال ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ و صحابہ کو استغفار للمشرکین سے کیوں منع فرمایا بلکہ یوں ہوتا ہے کہ وہ استغفار کرتے رہتے پھر اللہ تعالیٰ چاہے اس کو قبول کرتے یا نہ کرتے اور مشرکین کو بخشے یا نہ بخشے اس سوال کا جواب **إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ** میں دیا گیا ہے اور جواب حاکمانہ ہے کہ ہماری سلطنت آسمانوں اور زمینوں میں ہے اس لئے ہم کو حق ہے کہ تم کو استغفار سے روک دیں۔

مالکیت اور ملکیت

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ** یعنی مالک بھی وہی ہے ملک بھی انہی کا ہے یہاں ملک سے ملک کامل مراد ہے جس کے ساتھ ملک بھی جمع ہو کیونکہ بدوں اس کے ملک ناقص ہے اور خدا نقصان سے بری ہے اسی لئے ملک یوم الدین میں مالکیت اور ملکیت دونوں کو جمع کیا گیا ہے دونوں قراءتوں میں اور قراءتین بمنزلہ آیتین کے ہیں۔

ہر ایک کا مفہوم ثابت کرنا لازم ہے کیونکہ ضرورت دونوں کی ہے ایک جہت سے ملکیت میں قوت ہے اور ایک جہت سے مالکیت میں اس لئے مقصود دونوں کو جمع کرنا ہے اسی لئے میں نے کہا کہ یہاں ملک سے مراد ملک کامل ہے یا یوں کہو کہ لام لام میں ملک کے لئے ہے تو مالک ہونا اسی سے ثابت اور ملک ہونا لفظ ملک سے ثابت اور ایک آیت میں دو قراءتوں کو ایک ساتھ عمل میں جمع کرنا فقہاء کے عمل سے ثابت ہے۔

چنانچہ **حَشَىٰ يَعْطُرُونَ** میں فقہانے دونوں قراءتوں کو جمع کر کے احکام مستحب کئے ہیں اسی طرح میں نے **وَأَزْجَلُكَ إِلَى الْكَعْبَيْنِ** میں دونوں قراءتوں کو جمع کیا ہے کہ دونوں کے مجموعہ کا مطلب یہ ہوا کہ بیرون کو مل کر دھویا کرو کیونکہ ان پر پانی بہا لینا عموماً کافی نہیں ہوتا۔ اسی لئے فقہانے دلک کو مطلقاً اور دلک رجلین کو خصوصاً مستحب کہا ہے اسی طرح مالک یوم الدین میں دونوں کو جمع کیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ مالک بھی ہیں ملک بھی ہیں۔

تو اب جہاں اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ ملک مطلق آیا ہے وہاں یہی مجموعہ مراد ہو گا ورنہ محض ایک کے اعتبار میں نقص لازم آتا ہے اور یہی نکتہ ہے **مِنْ قَلْبِي وَلَا نَصِيْبِي** میں دو لفظوں کے جمع کرنے میں کیونکہ ولی دوست کو کہتے ہیں خواہ وہ نصرت پر قادر ہو یا عاجز ہو اور نصیر مددگار و معاون کو کہتے ہیں خواہ دوست ہو یا نہ ہو اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جمع کر کے بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کو تم سے تعلق بھی ہے اور وہ تمہاری نصرت و اعانت پر بھی قادر ہیں اور اس مضمون کو صیغہ حصر کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی یار و مددگار نہیں اس حصر میں اس طرف اشارہ ہے کہ بس اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق رکھو اور کسی سے بالذات تعلق نہ رکھو۔

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خَلَفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا

رَحَبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمُ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ

إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب (ان کی پریشانی کی یہ نوبت پہنچی کہ) زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ (اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوئے) پھر ان کے حال پر (بھی خاص) توجہ فرمائی تاکہ وہ آئندہ بھی رجوع رہا کریں بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان پر بہت ہی شفیق مہربان ہے۔

تین صحابہ کا واقعہ توبہ

اس آیت میں ان حضرات کی توبہ قبول ہونے کی بشارت بھی دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کی دردناک حالت کو بھی بیان کیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان تین صاحبوں کی توبہ بھی قبول کر لی جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان کے اوپر زمین باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہو گئی اور وہ اپنی جان سے بھی تنگ آ گئے تو حق تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور دوبارہ ان کے حال پر توجہ کی تاکہ وہ آئندہ بھی ایسے مواقع میں توبہ کرتے رہیں بیشک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان ہیں حضرت کعب کی اس بات پر کہ مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس حالت میں اگر مر گیا تو حضور ﷺ میری نماز نہ پڑھیں گے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی ایک تقریر یاد آئی مولانا نے حدیث سوال قبر کے اس جملہ کی شرح میں کہ میت سے پوچھا جائے گا من هذا الرجل یہ کون صاحب ہیں اور بعض اہل کشف کے اس قول کی حکمت میں کہ قبر میں حضور ﷺ کی صورت ہر شخص کے سامنے پیش کی جائے گی اور دکھلا کر سوال کیا جائے گا کہ یہ کون صاحب ہیں مسلمان تو صورت دیکھتے ہی تعلق قلبی کی وجہ سے پہچان لے گا اور بے ساختہ کہے گا ہذا محمد نبینا جا ئنا با لبینت والہدی

کہ ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ ہیں جو ہمارے پاس معجزات و ہدایات لے کر تشریف لائے تھے یہ فرمایا کہ دراصل ہماری محبت کا متقاضی تو یہ تھا کہ ہم سب حضور ﷺ کے سامنے مرتے اور حضور ﷺ ہمارے جنازے کی نماز پڑھتے مگر بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ صورت مقدر نہ ہوئی تو اب کم از کم محبت کا یہ اثر تو ہونا چاہئے کہ حضور ﷺ ہماری قبر ہی میں تشریف لائیں گے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿١٩﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو

تفسیری نکات

اس آیت کے دو جزو ہیں۔

اعجاز قرآن

۱- اتَّقُوا اللَّهَ ۲- كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ

یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ دو جملوں میں دریا کو بھر دیا چنانچہ ابھی تفصیل معلوم کر لینے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان دو جملوں میں کتنے بڑے مضمون کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے قرآن کے جملوں کی تفسیر مختلف عنوانات سے ہو سکتی ہے اس لئے ممکن ہے کہ اس آیت میں بھی کسی مفسر نے دوسرا عنوان اختیار کیا ہو مگر وہ اختلاف محض عنوان ہی کا ہوتا ہے معنوں میں ایک ہوتا ہے اس آیت کے معنی جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہیں کہ اتَّقُوا اللَّهَ میں مقصود کا ذکر ہے اور كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ میں اس مقصود کے طریق کا ذکر ہے کیونکہ جن لوگوں نے قرآن کو بنظر غائر دیکھا ہے وہ خوب سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ قرآن میں مقاصد کے ساتھ طرق کا ذکر بھی اکثر فرما دیا کرتے ہیں اور یہ ان کی غایت شفقت و رحمت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کسی بات کا حکم فرما کر حیران و پریشان نہیں چھوڑتے بلکہ اس کا طریق بھی ساتھ کے ساتھ بتلا دیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح سے ہوگا یہ طریقہ اختیار کرو اس عادت پر نظر کر کے میرا ذوق یہ بتلاتا ہے کہ اس آیت میں بھی جملہ اولیٰ میں مقصود کا بیان ہے اور ثانیہ میں طریق کا یعنی تقویٰ مقصود ہے اور معیت صادقین اس کے حصول کا طریق ہے بعبارت دیگر یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ نے دین کامل حاصل کرنے کا امر فرمایا ہے اور معیت کاملین اس کا طریق بتلایا ہے۔

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو

امر تقویٰ

اس میں اول تقویٰ کا امر ہے یہ بات تو اوپر ثابت ہو چکی کہ ہر مقصود میں درجہ کمال مطلوب ہوا کرتا ہے اب یہ بات ثابت کرنا رہی کہ تقویٰ کمال دین ہے یا نہیں، نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ تقویٰ کا امر اور فضل قرآن میں جس قدر ہے غالباً کسی چیز کا اتنا نہیں۔ اس سے اس کا ہتم بالشان ہونا معلوم ہوا اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تقویٰ کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے ایک ڈرنا دوسرے بچنا

اور تامل کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو بچنا ہی ہے یعنی معاصی سے مگر سب اس کا ڈرنا ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے۔ جیسی اس سے بچا جاتا ہے۔ تقویٰ کا معنی اول میں استعمال **إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتُوا** میں ہے اور بچنے کے معنی میں استعمال نصوص کثیرہ میں اور اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے **اتقوا النار ولو بشق تمرة** بچو جہنم سے اگر چہ ایک ٹکڑا چھوہارے کا دے کر یہاں بچنے ہی کے معنی بن سکتے ہیں ڈرنے کے معنی نہیں بن سکتے۔

غرض استعمال دونوں معنی میں وارد ہے لیکن اصل مقصود احتراز عن المعاصی ہے اور خوف علی الاطلاق مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ ذریعہ اور سبب ہے احتراز عن المعاصی کا۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اصل مقصود تقویٰ بمعنی احتراز عن المعاصی ہے۔ اور خدا کی نافرمانی سے بچنے کا کمال دین ہونا ظاہر ہے کیونکہ اس میں ادائے فرائض و واجبات و اجتناب عن المحرمات سب داخل ہیں کوئی مقصود شرعی اس سے خارج نہیں مطلب یہ ہوا کہ نماز بھی پڑھو کیونکہ ترک صلوة معصیت ہے۔ زکوٰۃ بھی دو کیونکہ ترک زکوٰۃ معصیت ہے۔ اسی طرح تمام مامورات کا چھوڑنا معصیت ہے تو اس میں مامورات کے ادا کا حکم بھی ہے اور محرمات کے ترک کا بھی اور کمال دین کے یہی دو اجزاء ہیں تو تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہو گیا۔

دوسری دلیل ایک اور ہے جس سے تقویٰ کا کمال دین ہونا ثابت ہے وہ یہ کہ حدیث میں ہے **الا ان التقوی ہنا و اشار الی صدرہ**

رسول ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سن لو تقویٰ یہاں ہے یعنی تقویٰ کا محل قلب ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کے ساتھ دوسری حدیث کو ملائیے۔

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا وہی القلب

یعنی جسم میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے سن لو وہ قلب ہے۔

(اس حدیث سے بعض جاہل صوفیوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس اصل مقصود اصلاح قلب ہے اعمال ظاہرہ کی کچھ ضرورت نہیں یہ بالکل غلط اور صریح زندقہ ہے اور اس کا غلط ہونا خود اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں کہ جب دل صالح ہوتا ہے تو تمام بدن صالح ہو جاتا ہے اور جب دل بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اعمال ظاہرہ صلاحیت قلب و فساد قلب کی دلیل ہیں جس شخص سے اعمال صالحہ صادر ہوں یہ اس کے قلب کی صلاحیت کی دلیل ہے اور جس کے اعمال سیدھا صادر ہوں یہ اس کے

قلب کے فساد کی دلیل ہے پس صلاحیت قلب کے بعد اعمال صالحہ کا ترک ممکن نہیں اور جو شخص اعمال صالحہ کو ترک کر کے صلاحیت قلب کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے پس یہ مسلم کہ اصل مقصود اصلاح قلب ہے مگر وہ اعمال صالحہ کی مداومت اور اعمال سیدہ سے اجتناب سے متفق نہیں ہو سکتی ہے لہذا اعمال ظاہرہ ہرگز بیکار نہیں (فانہم ۱۲ جامع)

اس حدیث سے اصلاح قلب کا صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہے اور پہلی حدیث سے یہ معلوم ہو چکا کہ تقویٰ کا اصل محل اور موصوف قلب ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ تقویٰ سے اول اصلاح قلب کی ہوتی ہے تو ان دونوں مقدمات سے تقویٰ کا مستلزم صلاحیت کاملہ ہونا ثابت ہو گیا اور صلاحیت کاملہ یہی کمال دین ہے۔ پس یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ تقویٰ کمال دین ہے اور (قلب کو محل تقویٰ اس حدیث میں اس لئے فرمایا کہ تقویٰ بمعنی الا اجتناب عن المعصیت کا سبب خوف خداوندی ہے اور ظاہر ہے کہ خوف کا اصلی محل قلب ہے) یہاں تک جملہ بولی کے متعلق کلام تھا۔

صادقین کی تشریح

دوسرے جملہ کی بابت میں نے یہ کہا تھا کہ نواع الصدقین بیان ہے۔ مقصود مذکور کے طریق کار کہ حاصل اس کا معیت مع المتقین ہے۔ پس صادقین اسی کا ایک عنوان ہے اور متقی کے معنی کاملین فی الدین کی معیت ہے پس صادقین کے بھی وہی معنی ہوں گے یعنی کمال فی الدین کا طریق کاملین فی الدین کی معیت ہے پس کَوْنُوا مَعَ الصَّادِقِينَ کی توجیہ کو نواع الکاملین ہوئی ہے کیونکہ صادقین سے معنی مشہور صادقین فی القول مراد نہیں بلکہ راسخ فی الدین مراد ہیں۔ جیسے ہمارے محاورہ میں بھی کہے آدی کو سچا کہتے ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو صدیق فرمایا ہے۔

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ بِيْرِهِمْ أَتَىٰ كَانَ صِدْقَاتِيًّا اور اسی صدمتیت کا درجہ بعد نبوت کے ہے پھر شہداء و صالحین کا درجہ چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اسی ترتیب سے ان درجات کو بیان فرمایا ہے۔

فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا اور رسوخ فی الدین بھی کمال فی الدین ہے پس مع الصدقین کی توجیہ مع الکاملین ثابت ہو گئی نیز اس کی دلیل ایک اور آیت ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لیس البران تولو او جو حکم بلکہ یہ آیت اتفاق سے میرے دونوں دعویوں کو ثابت کر رہی ہے یعنی اس سے تقویٰ اور صدق دونوں کے معنی کمال دین ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ پوری آیت اس طرح ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ

يَعْتَدِلُهُمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالظَّالِمِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالْفُرْقَاءِ وَجِئْنَا بِالْبَأْسِ أَوْلِيَاكَ الَّذِينَ صَدَقْتُمْ
وَأَوْلِيَاكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۵﴾

کچھ ساری خوبی اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کی طرف لیکن (اصل خوبی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی (ذات و صفات) پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر (بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر (بھی) اور (سب) کتب (سموویہ) پر بھی اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور مال دینا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو اور دوسرے غریب محتاجوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لا چاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرنا ہو) اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی امر جائز کا) عہد کر لیں اور وہ لوگ مستقل مزاج رہنے والے ہوں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور (معرکہ) قتال میں یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آ گیا ہے دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا پس یہ اوصاف کمال دین کو متضمن ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان اوصاف سے متصف ہیں وہی صادق اور وہی متقین ہیں۔ اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہو گئی کہ صادق اور متقی وہی شخص ہے جو دین میں کامل ہو پس صدق اور تقویٰ کی حقیقت کمال دین ہونا ثابت ہو گیا۔

تفسیر آیت البر

اس آیت میں تمام اجزاء دین کا ذکر آ گیا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت میں کل احکام کا حاصل تین

چیزیں ہیں۔

۱۔ عقائد ۲۔ اعمال ۳۔ اخلاق

اور تمام جزئیات انہی کلیات کے تحت میں داخل ہیں اور اس آیت میں اقسام ثلاثہ کے بڑے بڑے شعبے ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ آیت مجملہ جوامع کلم کے ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْۙ بَرَّكَ الْمَعْنَى بَعْلَانِي كَيْ هِيَ اَوْرَام عَهْد كَاهِي۔ مَعْنَى يَهِي هُوَيْ لَيْسَ الْبِرُّ الْكَاْفِي اَنْ تَوَلُّوْا وُجُوْهُكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ يَعْنِي مَشْرِقٍ وَمَغْرِبٍ كِي طَرْفِ نَمَازٍ مِّنْهُ كَرِيْمَا هِيَ كَاْفِي نَهِي هِيَ كَه اَسِي طَرْقَاعَت كَرَلِي جَائِي اَس تَوَجِيه سِي يَه اَشْكَال رَفْع هُو كِيَا كَه اَسْتِقْبَال قَبْلَهِي تَوَا مَوْرِبَه شَرْعَا اَوْرَا مَوْرِبَه شَرْعِي كَا بَر هُوْنَا لَازِم هِيَ بَحْر اَس كِي نَسْبَت لَيْسَ الْبِرُّ كِيُوں فَرْمَا يَا۔ اَس اَشْكَال كِي جَوَاب لَو كُوں نِي مَخْتَلَف وُجُوْه سِي دِيئِي هِي لَيْكِن جُو تَوَجِيه مِي نِي بِيَان كِي هِيَ يَه بَهت آ سَا ن هِيَ اَوْرِيه تَوَجِيه اَسِي وَقْت سَبْجِه مِي آ كِي هِيَ۔ حَا صِل اَس كَا

یہ ہے کہ اس میں استقبال سے مطلق خیریت کی نفی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے برکاتی ہونے کی نفی مراد ہے۔ رہا یہ کہ اس مضمون کی اس جگہ ضرورت کیا تھی۔ استقبال مشرق و مغرب سے برکاتی کی نفی کیوں کی گئی۔ سو بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تحویل قبلہ کا مسئلہ مذکور ہوا ہے۔ جس میں کفار و مشرکین نے بہت شور و غل کیا تھا اور اس وقت ان کی تمام تر بحث اسی میں رہ گئی تھی کہ مسلمانوں کا بھی عجب دین ہے کبھی کسی طرف منہ کرتے ہیں کبھی کسی طرف، تو حق تعالیٰ ان کو تنبیہ فرماتے ہیں کہ تم تو اس بحث میں ایسے پڑ گئے کہ گویا مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا کوئی بڑا مقصود ہے۔ حالانکہ یہ مقصود نہیں بلکہ شرائط و وسائل مقصود میں ہے پس یہ حماقت ہے کہ مقاصد کو چھوڑ کر غیر مقاصد کی بحث پر اکتفا کر لیا جاوے۔ مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا یہ برکاتی نہیں بلکہ برکاتی وہ ہے جس کا آگے بیان آتا ہے اس کا اہتمام کرو۔

مشرق و مغرب کے ذکر میں نکتہ

مشرق و مغرب کی تخصیص ذکر میں ایک نکتہ کی وجہ سے ہے اس سے قبلہ کا مشرق و مغرب میں منحصر کرنا مقصود نہیں کیونکہ جن لوگوں سے مکہ معظمہ کا رخ جانب شمال میں ہے ان کا قبلہ شمال ہے۔ اور جس جگہ سے مکہ کا رخ جنوب میں ہے اس جگہ کا قبلہ سمت جنوب ہے چنانچہ مدینہ والوں کا قبلہ جنوب ہے اسی لئے حدیث میں اہل مدینہ کو فرمایا گیا ہے ولکن شرقوا اور غربوا کہ استنجا کے وقت تم لوگ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کیا کرو اس سے معلوم ہو گیا کہ قبلہ مشرق و مغرب میں منحصر نہیں پس اس جگہ مشرق و مغرب کی تخصیص میں نکتہ یہ ہے کہ تمام جہات میں سے یہی دونوں جہتیں عرفاً زیادہ مشہور ہیں جب ان کا غیر مقصود ہونا بیان کر دیا تو دوسری جہات کا مقصود نہ ہونا بھی اس سے واضح ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مشرق و مغرب کی جہت میں امتیاز بوجہ تقابل حسی کے زیادہ محسوس ہے۔ پس اولاً و بالذات انہی دو جہات کا علم حاصل ہوتا ہے اور دوسری جہات کا علم ان کے واسطے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مشرق و مغرب کی جہت کا سمجھنا شمال و جنوب کے جاننے پر موقوف نہیں ہر شخص جانتا ہے کہ مشرق وہ جہت ہے جدھر سے آفتاب نکلتا ہے اور مغرب وہ ہے جدھر آفتاب ڈوبتا ہے اور شمال و جنوب کی معرفت بدوں مشرقی و مغرب کے نہیں ہو سکتی چنانچہ شمال و جنوب کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونے سے داہنے ہاتھ کی سمت جنوب ہے اور بائیں ہاتھ کی سمت شمال ہے پس یہ دونوں جہتیں اصل ہوئیں اور جنوبی و شمالی ان کی فرع ہیں اور ظاہر ہے کہ اصل کے غیر مقصود ہونے سے فرع کا غیر مقصود ہونا خود ہی سمجھ میں آ جاتا ہے علاوہ ازیں یہ کہ شریعت میں قلیل انحراف مفید صلوة نہیں تو مشرق و مغرب جن کا قبلہ ہے وہ اگر قدرے شمال و جنوب کی طرف مائل ہو جاویں نماز فاسد نہ ہوگی اس طرح گویا مشرق و مغرب میں شمال و جنوب بھی آگئے۔

پس مطلب صرف یہ ہے کہ کسی جہت کی طرف بھی منہ کرنا برکافی نہیں بلکہ برکافی وہ ہے جس کا آگے ذکر ہے وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ اٰلِخٰنِ يٰۤهٰذَا الَّذِيْنَ هُمْ يٰۤاٰمِنُوْنَ جہتیں جائز ہیں ایک یہ کہ مسند الیہ کی جانب میں مضاف کو مقدر کیا جائے۔ وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ يٰۤاٰمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اٰلِخٰنِ ایک یہ کہ مسند کی طرف مضاف مقدر مانا جاوے۔ یعنی وَلٰكِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ يٰۤاٰمِنُوْنَ بِاللّٰهِ اٰلِخٰنِ اور حاصل دونوں کا ایک ہے۔

عقائد کا بیان

خواہ یہ کہا جائے کہ بھلائی کافی اس شخص کی بھلائی ہے یا کافی بھلائی والا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں ذات و صفات کے متعلق جس قدر احکام ہیں سب آگئے۔ اور قیامت کے دن پر ایمان لانے میں جزا و سزا و حساب و کتاب و جنت و دوزخ وغیرہ کے سب احکام آگئے۔ وَالْمَلَائِكَةُ اور فرشتوں پر ایمان لائے یعنی ان کے وجود کا قائل ہو اس میں تمام مغیبات داخل ہیں اور فرشتوں کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ شریعت کے معلوم ہونے کا مدار واسطہ ملائکہ ہی ہیں والکتاب اور کتاب پر ایمان لائے یہاں کتاب بصیغہ مفرد لایا گیا ہے حالانکہ کتب ساویہ متعدد ہیں اور ایمان لانا سب پر واجب ہے (گو عمل منسوخ پر جائز نہیں) اور اسی وجہ سے دوسری آیتوں میں صیغہ جمع اختیار کیا گیا ہے۔ کَلَّ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ و کتبه و رسله اٰلِخٰنِ لیکن یہاں صیغہ مفرد اختیار کرنے میں اشارہ ہے ایک امر کی طرف وہ یہ کہ قرآن ایسا جامع ہے کہ وہ تمام کتب ساویہ پر حاوی ہے اس لئے اس پر ایمان لانا گویا سب پر ایمان لانا ہے یا یہ کہا جاوے کہ کتب ساویہ میں سے ہر کتاب دوسری کتاب پر ایمان لانے کا امر کرتی ہے پس وہ سب مل کر بمنز کتاب واحد کے ہیں ان سب پر ایمان لانا بمنزلہ کتاب واحد پر ایمان لانے کے ہے (اور جو شخص ایک کتاب کو مان کر دوسری کا انکار کر دے وہ حقیقت میں پہلی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتا) لیکن یہ حکم ایمان کا ہے اور عمل کرنا سب کتابوں پر جائز نہیں بلکہ عمل صرف مؤخر پر ہوگا کیونکہ وہ مقدم کے لئے ناسخ ہے والنہین اور پیغمبروں پر ایمان لائے یہاں تک تو امہات عقائد مذکور ہیں آگے اخلاق و اعمال کا ذکر ہے۔

اعمال شرعیہ کی اقسام

اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ طاعات و دیانات دوسرے معاملات (معاملات کی پھر دو قسمیں ہیں ایک متعلق اموال کے دوسرے متعلق غیر اموال کے ہیں۔ ان میں نکاح و طلاق و عتاق و حدود وغیرہ داخل ہیں) اور دیانات کی بھی دو قسمیں ہیں ایک طاعات بدنہ دوسرے طاعات مالیہ اسی طرح اخلاق کی دو قسمیں ہیں حسنہ و سیئہ اخلاق حسنہ کے ساتھ موصوف ہونا مقصود شرعی ہے اور اخلاق سیئہ سے خالی و منزہ ہونا مطلوب

ہے۔ عقائد سے آگے ان سب کے اصول مذکور ہیں جن میں طاعات مالیہ کا ذکر مقدم کیا گیا کیونکہ بہت لوگ طاعات بدنہ میں ہمت والے ہوتے ہیں اور طاعات مالیہ میں ان کا یہ حال ہوتا ہے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست گزر طلبی سخن دریں ست

چنانچہ ارشاد ہے **وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰی حُبِّهِ** اور دیتا ہو مال اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو علیٰ حبہ کی ضمیر اگر اللہ کی طرف راجع ہو جیسا کہ یہی ظاہر ہے تو اس علم اخلاق کا بھی ایک اصل عظیم مذکور ہو گا یعنی مال خدا کے راستہ میں محبت الہی کی وجہ سے دینا چاہئے۔ اس میں ایک تو محبت الہی کے حاصل کرنے کی تعلیم ہوئی کہ خدا سے محبت پیدا کرنی چاہئے محض ضابطہ کا تعلق نہ ہونا چاہئے دوسرے اخلاص کی تعلیم اور ریا و ناموری کی ممانعت ظاہر ہوئی کہ مال خرچ کرنے میں کسی کی مدح و ثنا و شکر یہ وغیرہ کا منتظر نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت اس کا سبب ہونا چاہئے اور اخلاص بھی اخلاق باطنیہ کا ایک بڑا رکن ہے۔

اگر مرجع ضمیر مال ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ایسا مال جس سے محبت ہو اور دل کو تعلق ہو خدا کے لئے خرچ کر دے اس میں ایک تو خرچ کرنے کا ادب مذکور ہوا کہ اللہ کے واسطے عمدہ مال خرچ کرنا چاہئے رومی مال نہ دینا چاہئے دوسرے علم سلوک کا یہ مسئلہ بھی اشارۃً مذکور ہوا کہ محبت مال جو کہ خلیق ذمیم ہے اس کا علاج یہ ہے کہ جس چیز سے محبت ہو اسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دے دو چار بار ایسا کرنے سے جب مال کا مرض جاتا رہے گا۔

ذُوِي الْقُرْبٰى میں تمام قرابت دار داخل ہیں۔ بیوی بچے بھی ان میں آگئے۔ جن کا نفقہ مرد پر واجب ہوتا ہے اور دوسرے غریب رشتہ دار بھی آگئے جن کو کچھ دیتے رہنا اور ان کا خیال رکھنا مستحب ہے۔

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسْكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ اور یتیموں کو بھی دے اور مسکینوں کو بھی دے اور مسافروں کو بھی یہ سب صدقات نافلہ ہیں کیونکہ زکوٰۃ کا بیان آگے آ رہا ہے۔

اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ طاعات مالیہ کا ذکر طاعات بدنہ سے کیوں مقدم ہوا۔ اس کا جواب تو میں نے دے دیا کہ بعض طبائع میں بخل کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ طاعات بدنہ کی ہمت خوب کر لیتے ہیں اور مال دینے سے جان چراتے ہیں اس لئے طاعات مالیہ کو اہتماماً مقدم کر دیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ طاعات مالیہ میں سے صدقہ نافلہ کو صدقہ واجبہ یعنی زکوٰۃ پر کیوں مقدم کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ سے ایسا ضابطہ کا تعلق رکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مفروضہ کے علاوہ اور کچھ خیرات نہیں کرتے۔ اس میں گناہ نہیں مگر ضعف تعلق مع الحق کی دلیل ضرور ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے صدقات نافلہ کو زکوٰۃ سے مقدم فرمایا جس سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ زکوٰۃ واجب ہے وہ تو تم ادا کرو ہی گے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ صدقہ خیرات موقع بہ موقع کرتے رہنا چاہئے ہا

دیکھئے اگر کوئی محبوب یا کوئی بادشاہ ہم سے یہ کہہ دے کہ اس موقع میں تم دو روپیہ خرچ کر دو تو غور کیجئے اس وقت ہمارے دل کی کیا حالت ہوگی کیا ہم دو روپیہ ہی پر اکتفا کریں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ محبوب کو خوش کرنے یا بادشاہ کی نگاہ میں جانثار بننے کے لئے ہم دو کی جگہ دس خرچ کریں گے ورنہ چار تو دے ہی ڈالیں گے اس لئے خدا تعالیٰ سے ضابطہ کا تعلق نہ رکھنا چاہئے۔

اس نکتہ کی وجہ سے صدقات نافلہ کو صدقہ مفروضہ مالیہ سے مقدم کیا بلکہ طاعت بدنہ یعنی صلوة سے بھی مقدم کر دیا لیکن بعد میں جب زکوٰۃ کا ذکر فرمایا تو نماز کو اس سے مقدم کیا تاکہ یہ معلوم ہو جاوے کہ رتبہ کے اعتبار سے نماز ہی مقدم ہے چنانچہ دیکھ لو ہم نے زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد کیا ہے اور جن صدقات مالیہ کو نماز اور زکوٰۃ سے پہلے بیان کیا ہے وہاں تقدیم کی وجہ محض اہتمام بالشان ہے نہ کہ رتبہ کا زیادہ ہونا رتبہ نماز کا طاعات مالیہ سے بڑھا ہوا ہے اور زکوٰۃ کا رتبہ صدقات نافلہ سے بڑھا ہوا ہے سبحان اللہ خدا تعالیٰ کے کلام میں ہر چیز کے درجہ کا کتنا لحاظ ہے۔ یہی تو باتیں ہیں جن کی وجہ سے بشر کی عقل اس کلام کو دیکھ کر چکراتی ہے کہ اتنی رعایتیں انسان ہرگز نہیں کر سکتا۔

وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ اور مانگنے والوں کو بھی دے اور گردن چھڑانے میں بھی یہ بھی صدقات نافلہ کی ایک فرد ہے اس میں اس قدر تفصیل ضروری ہے کہ دیگر نصوص شرعیہ سے سائلین کا لفظ ان سوال کرنے والوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے جو مجبوری کی وجہ سے سوال کرتے ہوں جن کا پیشہ سوال نہ ہو گیا ہو جو لوگ مضبوط ہٹے کئے سوال کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں ان کو دینا جائز نہیں نہ ان کو سوال کرنا جائز ہے۔

وَفِي الرِّقَابِ اور گردن چھڑانے میں یہ قیدیوں اور غلاموں کے متعلق ہے اور اسی کے حکم میں یہ صورت بھی ہے کہ جو شخص قرض کے اندر بندھا ہوا ہو اس کی امانت کر دجائے کہ یہ بھی گردن چھڑانے میں داخل ہیں۔
وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ اور نماز کی پابندی کرے اور زکوٰۃ ادا کرے یہاں زکوٰۃ کو نماز سے اصل کے مطابق موخر کر دیا جس کا نکتہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

حقوق العباد کی اقسام

یہاں تک طاعات بدنہ و طاعات مالیہ کے اصول عظام مذکور ہوئے۔ آگے حقوق العباد کا بیان ہے۔
وَالْمُؤْمِنُونَ يَعْهَدُونَ إِذَا عَاهَدُوا اور وہ لوگ عہد کو پورا کر نوالے ہیں جب عہد کر لیتے ہیں ہر چند کہ حقوق العباد میں بعض حقوق ایسے ہیں جو ایفائے عہد سے مقدم ہیں مثلاً قرض کا ادا کر دینا امانت میں خیانت نہ کرنا لیکن اس جگہ حق تعالیٰ نے صرف ایفائے عہد کو بیان فرمایا ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جب وہ لوگ ایسے حقوق العباد کو ادا کرتے ہیں جن کا مطالبہ کرنے والا ان سے کوئی بھی نہیں (کیونکہ ایفائے عہد قضاء لازم نہیں گودیتا بعض

کے نزدیک واجب ہے) تو اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہوگئی کہ جن حقوق کا مطالبہ کرنے والا موجود ہو ان کو تو ضرور ادا کریں گے اور اسی نکتہ کی وجہ سے مواریت میں وصیت کو دین پر مقدم فرمایا ہے اس سے حقوق العباد کا درجہ معلوم ہو گیا کہ جب حق تعالیٰ کو ان حقوق کا بھی اہتمام ہے جس کا مطالبہ کوئی نہ ہو تو جن حقوق کا مطالبہ بھی موجود ہو وہ تو کس قدر قابل اہتمام ہوں اور یہاں بطور مثال کے بعض حقوق کا ذکر فرمایا گیا ہے ورنہ حقوق العباد اور بھی ہیں۔ اگرچہ لوگ فقط مال کو حقوق العباد سمجھتے ہیں۔

صبر کی حقیقت اور اس کے اقسام

آگے اخلاق کا ذکر ہے۔ وَالظَّالِمِينَ فِي الْمَأْثَمِ وَالظَّالِمِينَ فِي الْمَأْثَمِ وَالظَّالِمِينَ فِي الْمَأْثَمِ اور وہ لوگ صبر کرنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال کے وقت۔

ہر چند کہ اخلاق باطنیہ بہت ہیں لیکن حق تعالیٰ نے ان میں سے اس مقام پر صرف صبر کو بیان فرمایا ہے اور اس کے تین مواقع بیان فرمائے ہیں وجہ اس تخصیص کی یہ ہے کہ صبر ایسی صفت ہے جس کے حاصل ہو جانے کے بعد بقیہ اخلاق کا حصول خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ صبر کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ عزیز و قریب کے مرنے پر مستقل مزاج رہے یہ بھی صبر کی ایک فرد ہے لیکن صبر کی حقیقت اس سے عام ہے صبر کے معنی لغت میں جس کے ہیں۔ یعنی روکنا اور یہی معنی شریعت میں بھی ہیں۔ صرف ایک قید زیادہ ہے یعنی حبس النفس علی ما نکرہ انسان کا اپنے نفس کو اس کی ناگوار بات پر روکنا اور ناگواری کے اقسام پر شرعاً صبر کی تین قسمیں ہیں۔

صبر کی اقسام

۱۔ صبر علی العمل ۲۔ صبر عن العمل ۳۔ صبر فی العمل

صبر علی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اس پر جم جانا اور قائم رہنا مثلاً نماز کو زکوٰۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلا تاغوان کو ادا کرتے رہنا۔

صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجالاتا مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ بچہ جی اتنی دیر تک تم سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے اتنی دیر تک تجھ کو نماز یا ذکر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہئے۔ جب یہ ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو سب اعمال ٹھیک ٹھیک ادا ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو فرائض شرعیہ کی پابندی تو نصیب ہے اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو صبر علی العمل کا درجہ حاصل ہے لیکن اعمال کو بجالاتے وقت وہ ان کے آداب و حقوق کی رعایت نہیں کرتے گڑبڑ کر دیتے ہیں جس

کی وجہ یہ ہے کہ ان کو صبر فی العمل حاصل نہیں ہوا۔

تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو مانی اللہ عنہ سے روکنا شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رکنا جن میں سب سے اہم صبر عن الشهوت ہے کہ نفس کے تقاضائے شہوت کو روکا جاوے اور یہ سب سے اہم اس لئے ہے کہ نفس کے دوسرے تقاضے تو ایسے ہیں کہ ان سے اگر نہ روکا جاوے تو بعد میں اس کو خود ہی بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت کا خیال کر کے نفس ان تقاضوں سے خود ہی رک جاتا ہے آگے صبر کے چند مواقع جو بہتم بالشان ہیں بیان فرماتے ہیں۔

فِي الْمَأْسَاءِ وَالْفَقْرِ وَجِنِّ الْبَلَاءِ یعنی وہ صبر کرتے ہیں باساء میں اور ضراء میں اور باس کے وقت ان الفاظ کی تفسیر مفسرین نے اس طرح کی ہے کہ باساء سے فقر و تنگدستی مراد ہے اور ضراء سے بیماری اور باس سے حرب لیکن عموم الفاظ پر نظر کر کے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ باساء سے تو فقر و تنگدستی ہی مراد ہو جس کا حاصل یہ ہوگا کہ فقر و تنگدستی میں صبر کرے یعنی خدا پر نظر رکھے مخلوق کے مال و دولت پر نظر نہ کرے نہ ان سے کچھ توقع رکھے اس میں قناعت و توکل کی تعلیم ہوگی۔

اور ضراء سے مطلق بیماری مراد ہو خواہ ظاہری ہو یا باطنی ظاہری مرض میں تو صبر یہ ہے کہ لوگوں سے شکایت نہ کرتا پھرے خدا سے دل میں نکدر نہ ہو اس میں تسلیم و رضا کی تعلیم ہوگی اور باطنی بیماریوں میں صبر یہ ہے کہ امراض قلبیہ کے مقتضائے عمل نہ کرے۔ اور ہمت سے ان کا مقابلہ کرے۔ مثلاً کسی میں شہوت بالنساء یا بالرجال کا مرض ہے تو اس کے مقتضائے عمل نہ کرے اور ہمت کر کے عورتوں اور مردوں کی طرف نگاہ نہ اٹھائے۔ ان سے اختلاط نہ کرے بلکہ بعد اختیار کرے اسی طرح بخل کا مرض ہو تو اس کے مقتضائے عمل نہ کرے حکلف خدا کے راستہ میں مال خرچ کر دیا کرے و علی ہذا تمام امراض کو اسی پر قیاس کر لیا جاوے۔

اور باس سے مراد مطلق شدت و پریشانی ہو تو یہ تعین بعد تخصیص کے ہو جائیگی۔ یعنی فقر و فاقہ اور امراض ظاہریہ و باطنیہ میں بھی ہمت سے کام لے اور اسی طرح جو پریشانی بھی لاحق ہو اس میں مستقل مزاج رہے جس کا ایک فرد صبر عند الحرب بھی ہے کہ جہاد کے وقت لڑائی میں ثابت قدم رہے پس اب صبر کا حاصل یہ ہوا کہ موحّد کامل بن جانا چاہئے جس کی یہ شان ہوتی

چہ فولاد ہندی نمی بر سرش

موحد چہ بر پائے ریزی زرش

ہمیں ست بنیاد توحید و بس

امید و ہر اش نباشد زکس

جب مقام صبر کامل ہو جاتا ہے تو توحید بھی کامل ہو جاتی ہے ان تمام اجزاء شریعت کو بیان فرما کر آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں۔ اُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَاُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ یہی لوگ ہیں جو صادق ہیں اور یہی

لوگ متقی ہیں یہ جملہ گویا بمنزلہ مہر کے ہے کہ سارا مضمون بیان فرما کر اخیر میں مہر لگادی کہ یہی لوگ صادق و متقی ہیں چونکہ تفصیل سابق سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس آیت میں جو اوصاف مذکور ہیں وہ تمام اجزاء دین کو جامع ہیں تو اب جملہ اُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَاُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ سے یہ مسئلہ بخوبی ثابت ہو گیا کہ صادق و متقی کامل فی الدین کو کہتے ہیں اور یہ کہ تقویٰ و صدق کمال فی الدین کا نام ہے لہذا آیت مذکورہ میں جو میں نے دعویٰ کیا تھا کہ اتقوا اللہ و کونوا مع الصالحین کے یہ معنی ہیں اکملوا فی الدین و کونوا مع الکاملین، یہ دعویٰ بالکل بے غبار ہو گیا اور قرآن ہی سے اس دعویٰ کی تائید مل گئی۔ (اور ظاہر ہے کہ جس تفسیر کی تائید قرآن کی دوسری آیتوں سے ہو جائے وہ زیادہ اولیٰ ہے)

کامل بننے کا طریقہ

معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اے مسلمانوں دین میں کامل ہو جاؤ جس کا طریقہ بھی آگے بتلاتے ہیں کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ کاملین کے ساتھ ہو جاؤ، صاحبو جو طریقہ کمال حاصل کرنے کا حق تعالیٰ نے بتایا ہے واللہ کوئی سالک کوئی محقق ہرگز نہیں بتلا سکتا یہ بات کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی کہ کاملین کی معیت سے بھی کمال حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاملین کی معیت ہی معیت حصول کمال کے لئے کافی ہے ممکن ہے بعض لوگ یہی سمجھے ہوں مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر کوئی شخص سالہا سال کاملین کے ساتھ رہے اور خود کچھ نہ کرے تو اس کو کمال حاصل نہیں ہو سکتا حقیقت یہ ہے کہ اصل طریق تو کمال فی الدین حاصل کرنے کا یہ ہے کہ اعمال میں کمال حاصل کرو اعمال میں کمال حاصل کرنا یہ ہے کہ طاعت کو بجا لاؤ اور معاصی سے اجتناب کرو چنانچہ آیت لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَتُؤْتُوا مَالَكُمْ الخ میں انہی اعمال کو برکافی فرمایا ہے اور ان کو بیان فرمایا کہ ان لوگوں کو متقی اور صادق ہونا بتلایا ہے جو ان اعمال کو اختیار کئے ہوئے ہیں جس سے اعمال پر مدار کمال ہونا بخوبی ظاہر ہے۔

صادق کے معنی و تفسیر

اس آیت میں صدق سے مراد محض زبان سے سچ بولنا نہیں ہے کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جس صدق کو کمال دین بتلایا ہے وہ تو ہم کو حاصل ہے کیونکہ ہم سچ بولتے ہیں پس سمجھ لیجئے کہ صدق کے معنی سچائی کے ہیں اور اسی سے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام احوال و افعال و اقوال میں مرتبہ رسوخ حاصل کر چکتا ہے صدق کے معنی جو اصلاح لغاۃ و بلغاء میں بیان کئے گئے ہیں مطابقت الخبر للمحکم عنہ، یہ معنی اصطلاح شرعی سے خاص ہیں شریعت میں صدق عام ہے افعال کو بھی اقوال کو بھی۔ احوال کو بھی

اقوال کا صدق تو یہی ہے کہ بات سچی ہو یعنی واقع کے مطابق ہو سچی بات نہ ہو جو کہ واقع کے خلاف ہو

جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں۔
 افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو حکم شرعی کے خلاف نہ ہو پس جس شخص کے افعال ہمیشہ
 شریعت کے موافق ہوں اس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے۔
 احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنت کے موافق ہوں۔ پس جو احوال خلاف سنت ہوں وہ احوال کا ذہبہ ہیں
 اور جس شخص کے احوال و کیفیات سنت کے موافق ہوتے ہوں اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔
 نیز صدق احوال کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے یہ نہ ہو کہ
 آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا جیسا کہ بعض لوگوں کو کسی وقت خوف کا یا
 توکل کا غلبہ اپنے اوپر معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا اس کو صادق الاحوال نہ کہیں گے یہ
 مطلب نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہئے کہ جو حالت طاری ہو وہ
 بعد میں مقام ہو جائے اس میں سالکین کو بہت دھوکا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ محض وہم سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو
 تسلیم و رضایا توکل و رجا کا حال حاصل ہے مگر تھوڑے عرصہ کے بعد اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا جس سے اس
 حالت کا ان کا وہم ہونا ظاہر ہو جاتا ہے فرض صدق شریعت میں صرف اقوال کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ عام
 طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس سمجھنے سے بہت سے اغلاط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اب ایک بات یہ رہ گئی کہ جب تقویٰ اور صدق دونوں کا کمال دین ہونا ثابت ہو گیا تو سوال یہ ہوتا ہے
 کہ اس آیت میں تقویٰ کا ذکر مقدم اور صدق کو مؤخر کیوں کیا گیا کیونکہ آیت کا مقصود تو اس طرح بھی حاصل ہو
 سکتا ہے کہ یوں فرمادیتے یا ایہا اللہین امنوا صدقوا و کونوا مع المتقین۔
 اس کے بھی وہی معنی ہوئے کہ اے مسلمانو دین کامل حاصل کرو اور کاملین کے ساتھ رہو جب یہ مضمون
 صدق کو مقدم اور تقویٰ کو مؤخر کرنے سے بھی حاصل ہو سکتا تھا تو پھر تقویٰ کو مقدم کیوں کیا گیا ہے؟
 میرے نزدیک اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کے تتبع سے تقویٰ کے تو درجات چند در چند
 معلوم ہوتے ہیں اور صدق کے درجات مختلف نہیں بلکہ اس کا ایک درجہ متعین ہے۔

عورتوں اور مردوں کو حکم مشترک

جس طرح مردوں کو کمال دین حاصل کرنے اور اپنی اصلاح کرنے کا حکم فرمایا ہے وہ حکم عورتوں میں بھی
 مشترک ہے گو خطاب صیغہ کے اعتبار سے بظاہر مردوں کو ہے۔ لیکن حکم مشترک ہے۔ پس کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ
 حق تعالیٰ کو مردوں ہی کی طرف توجہ ہے عورتوں کا اعتناء نہیں ہے یہ وہم پہلے بھی ہو چکا ہے اور منشاء اس وہم کا
 محبت ہے حدیث میں آتا ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں دیکھتی ہوں

کہ حق تعالیٰ احکام میں مردوں ہی کا ذکر فرماتے ہیں ہمارا (یعنی عورتوں کا) ذکر نہیں فرماتے ازواج مطہرات کو یہ خیال اس لئے بھی ہوا کہ وہ صاحب زبان تھیں عربی زبان کو خوب سمجھتی تھیں اور عربی میں مذکر و مونث کے لئے جدا جدا صیغے استعمال کئے جاتے ہیں تو ان کو تمام احکام میں مذکر صیغے دیکھ کر یہ خیالی پیدا ہوا کہ حق تعالیٰ ہم کو خطاب نہیں فرماتے نہ ہمارا ذکر فرماتے ہیں اور ہماری مستورات تو عربی زبان حاصل ہی نہیں کرتیں اور یہ بھی ایک بڑی کمی ہے جس کا افسوس ہوتا ہے کیونکہ پہلے زمانہ میں عورتیں بھی مثل مردوں کے عربی کی تحصیل کرتی تھیں تو عربی زبان سے ناواقف ہونے کے سبب مذکر و مونث کے صیغوں کا فرق وہ نہیں سمجھ سکتیں اور اگر ترجمہ پڑھیں گی تو اس میں ان صیغوں کا اردو ترجمہ نظر سے گزرے گا اور اردو میں خطاب میں صیغہ مردوں و عورتوں میں مشترک ہے دونوں کے لئے الگ الگ صیغہ موضوع نہیں مثلاً وَالْقِيْنَ اللّٰهُ وَالْقَوَا اللّٰهُ کا ترجمہ یکساں ہوگا دونوں جگہ اردو میں یہی بولتے ہیں کہ خدا سے ڈرو خواہ اس کے مخاطب مرد ہوں یا عورتیں اس لئے اوامر و نواہی کے صیغوں میں وہ ترجمہ دیکھ کر یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ یہ خطاب خاص مردوں کو ہے لیکن پھر بھی بعض جگہ اردو ترجمہ سے بھی مردوں کی تخصیص سمجھ میں آ سکتی ہے مثلاً يَا أَيُّهَا النَّاسُ کا ترجمہ ہے اے لوگو اور يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا کا ترجمہ اے ایمان والو یہ لفظ اردو میں بھی مردوں کے لئے مخصوص ہے عورتوں کو اے لوگوں یا اے ایمان والو کہہ کر ندا نہیں کر سکتے بلکہ اگر ان کو خطاب خاص ہوگا تو اے عورتو! اے ایمان والیو کہا جائے گا پس ہر چند کہ اوامر و نواہی کے صیغوں میں ترجمہ دیکھ کر ان کو تخصیص رجال کا وہم نہیں ہو سکتا مگر ندا کے صیغوں میں ان کو بھی وہم ہو سکتا ہے اور ازواج مطہرات تو اس فرق کو خطاب کے مواقع میں بھی سمجھتی تھیں اس لئے ان کو غایت محبت کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہائے اللہ تعالیٰ ہم کو خاص طور پر خطاب نہیں فرماتے جیسا مردوں کو خطاب فرماتے ہیں دیکھئے وہ عورتیں کیسی تھیں اللہ اکبر! ان کا کیا مذاق تھا اگر آج کل کی عورتوں جیسی وہ ست اور کم ہمت اور کام چور ہوتیں تو یوں سمجھتیں کہ اچھا ہوا ہم ان احکام سے بچ گئے کیونکہ ان میں تو خاص مردوں کو مخاطب بنایا گیا ہے مگر اس زمانہ میں مستورات کو اس کا وہم بھی نہیں ہوا کہ یہ احکام ہمارے لئے نہیں ہیں بلکہ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ احکام سب کو عام ہیں (بجز چند مخصوص باتوں کے جن کا مردوں کے ساتھ خاص ہونا دوسرے دلائل سے ان کو معلوم ہو گیا تھا اور ایسی خصوصیت عورتوں کے لئے بھی ہے کیونکہ بعض احکام صرف عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہیں مردوں کے لئے نہیں ہیں ان کے علاوہ بقیہ احکام میں جن کا کسی کے لئے خاص ہونا دلائل سے معلوم نہ ہوا تھا انہوں نے یہی سمجھا کہ مردوں اور عورتوں سب کے لئے مشترک ہیں گو لفظاً خطاب خاص مردوں کو کیا گیا ہے (۱۲) اور عموم احکام پر نظر کر کے پھر ان کو یہ تمنا ہوئی کہ جب یہ احکام سب کو عام ہیں تو ان میں ہمارا تذکرہ بھی ہوتا تو اچھا تھا ان کے دل نے اس کو گوارا نہ کیا کہ اللہ تعالیٰ تمام احکام میں مردوں کے واسطے ہی سے ان کو خطاب فرماویں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ کبھی کبھی ہم کو مردوں سے جدا کر کے بھی خطاب

فرمادیا کریں اور وجہ اس تمنا کی یہ تھی کہ ان کو خدا تعالیٰ سے محبت تھی (اور عاشق کا دل چاہا کرتا ہے کہ اس کا تذکرہ کبھی تو محبوب کی زبان پر آ جایا کرے۔

۔ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے (اجامع)

خدا تعالیٰ کا کسی کو اپنے احکام کا مخاطب بنانا ایک بڑا شرف ہے جو مردوں کو حاصل تھا تو ازواج مطہرات کو اس کی تمنا ہوئی کہ اس شرف سے ہم بھی محروم نہ رہیں۔

غرض وہ عورتیں دین کی عاشق تھیں وہ اپنے اوپر بوجھ لادنا چاہتی تھیں وہ یہ نہ چاہتی تھیں کہ ہم احکام کے مخاطب نہ بنیں تو اچھا ہے کیونکہ ان کو دین کے ثمر پر اطلاع تھی اور وہ جانتی تھیں کہ دین کے ثمرات ایسے ہیں کہ ان کے لئے محنت کرنا کوئی چیز نہیں اسی پر یہ آیات نازل ہوئی فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيقُ الْعَمَلِ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ لَمْ يَأْتِ بِعُضْكَ مِنْ بَعْضٍ؛ یعنی احکام میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں جو کوئی بھی عمل کرے مرد ہو یا عورت سب کو اجر ملے گا۔ اور کسی کا عمل ضائع نہ ہوگا۔ باقی رہی خصوصیت خطاب کی وجہ سے وہ یہ ہے بعضکم من بعض؛ کہ تم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے جڑو ہو پس حکم بھی دونوں کا یکساں ہے اس لئے ضرورت جدا خطاب کرنے کی نہیں اس کے بعد بعض جگہ خاص عورتوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جیسے يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اَنْتُنَّ كَاٰحِلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ اِنَّ النِّسَاءَ اَرْحٌ مِنْ ذٰلِكَ فَاصْبِرْنَ اِنَّ الْاٰلَافَ مِنْكُمْ كُنَّ عٰمِلَاتٍ اَلَمْ يَجْعَلْ لَكُمْ دِيْنًَا وَرَحْمَةً يَّخْتَصِمْنَ مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُمْ وَاسْتَجَابَ لَكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ اِنَّ رَبَّكُمْ عَلِيمٌ اَلَمْ يَجْعَلْ لَكُمْ دِيْنًَا وَرَحْمَةً يَّخْتَصِمْنَ مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُمْ وَاسْتَجَابَ لَكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ اِنَّ رَبَّكُمْ عَلِيمٌ

قرآن اور ذکر نسواں

چنانچہ اس آیت میں اِنَّ السُّلَمِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَنِيْنَ وَالْقَنِيْنَ وَالطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبَاتِ وَالضُّبَيْرِيْنَ وَالضُّبَيْرِيْنَ وَالنُّشَيْبِيْنَ وَالنُّشَيْبِيْنَ وَالْمُصَدِّقِيْنَ وَالْمُصَدِّقَاتِ وَالْعَمَلِيْنَ وَالْعَمَلِيْنَ وَالْمُطَفِّلِيْنَ وَالْمُطَفِّلَاتِ وَالذَّاكِرِيْنَ وَالذَّاكِرَاتِ اَعَدَّ اللهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا

ترجمہ: بے شک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے

والی عورتیں اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے اس آیت میں مردوں اور عورتوں دونوں کا ذکر دوش بدوش کیا گیا ہے (اور عورتوں کی تمنا کا مقصد یہ تھا کہ اس جگہ صرف عورتوں ہی کا ذکر ہوتا مردوں کا ذکر ان کے ساتھ مخلوط نہ کیا جاتا مگر اس خلط میں اشارہ ہو گیا جو اب کی طرف چونکہ اکثر احکام مردوں اور عورتوں میں مشترک ہیں چنانچہ یہی احکام دیکھ لو کہ ان میں کسی کی کچھ تخصیص نہیں اس لئے عورتوں کا ذکر جدا کرنے کی ضرورت نہیں جو احکام مردوں کے لئے ہیں وہی عورتوں کے لئے ہیں (۱۲ جامع)

رہی یہ بات کہ ہر جگہ ایسا ہی کیوں نہ کیا گیا جیسا اس آیت میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے اس کی دو وجہ ہیں ایک وجہ صحیح کی اور ایک وجہ ترجیح کی صحیح کی وجہ تغلیب ہے تغلیب کے معنی یہ ہیں کہ ایک نوع کو دوسری نوع پر غلبہ دے کر ایک کو ذکر کر کے دونوں کا ارادہ کر لیا جائے (۱۲ جامع) مثلاً باپ ماں کو والدین یا ابویں کہا کرتے ہیں اسی طرح اہل عرب چاند اور سورج کو قمرین کہہ دیتے ہیں حالانکہ ابویں کا لفظی ترجمہ ہے دو باپ اور قمرین کا ترجمہ ہے دو چاند ظاہر میں باپ ماں کو ابویں کہنا غلط معلوم ہوتا ہے ان کو اب وام کہنا چاہئے اسی طرح چاند اور سورج کو قمرین کہنا بھی بظاہر غلط ہے ان کو شمس و قمر کہنا چاہئے۔ لیکن چونکہ اس طرح عبارت طویل ہو جاتی ہے اس لئے اہل زبان اب وام کی جگہ تغلیباً بغرض اختصار ابویں اور شمس و قمر کی جگہ قمرین کہہ دیتے ہیں اسی طرح اگر قرآن میں مردوں اور عورتوں کے لئے جدا جدا صیغہ استعمال کیا جاتا تو کلام میں طول ہو جاتا اس لئے تغلیباً صیغہ مذکر ہی میں مونث کو بھی داخل کر لیا گیا جس سے کلام میں اختصار پیدا ہو گیا البتہ ایک دو جگہ عورتوں کے وہم مذکور کو دفع کرنے کے لئے ان کے واسطے جدا صیغے بھی استعمال کئے گئے تاکہ ان کی تسلی ہو جائے اور اتنی مقدار سے ایجاز کلام بھی فوت نہیں ہوتا۔

درجات مردوزن

اور ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں تابع ہیں مردوں کی ہر طرح سے خلقت کے اعتبار سے بھی چنانچہ آدم علیہ السلام کے ایک جزو سے حوا علیہا السلام کی پیدائش ہوئی ہے۔ یعنی حق تعالیٰ نے ان کی بائیں پسلی میں سے کوئی مادہ نکالا پھر اس مادہ سے حوا علیہا السلام کو پیدا کیا جس کا اثر یہ ہے کہ عورتیں عموماً مردوں سے خلقتاً کمزور ہوتی ہیں ان کے تمام قوی جسمانی اور دماغی مردوں کے برابر نہیں ہوتے نیز تربیت کے اعتبار سے بھی وہ مردوں کے تابع ہیں چنانچہ کمانا اور کھیتی کرنا تجارت کرنا محنت و مشقت کے کام کرنا مردوں کے متعلق ہے اور پکانا کھانا عورتوں کے متعلق ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ عورتوں کی اصل یہ ہے کہ وہ پروردار ہوں اور تعلقات انتظامیہ کے لئے پردہ مانع ہے اس لئے امور انتظامیہ ان کے متعلق نہیں ہو سکتے انتظام کا تعلق مردوں ہی سے ہو سکتا ہے اس وجہ سے تمام تر تعلق انتظام کا مردوں کے سپرد کیا گیا پس جہاں دیگر انتظامات ان کے متعلق ہیں وہاں عورتوں کی اصلاح کا انتظام بھی مردوں کے سپرد کیا گیا اور

جب مردوں کے متعلق عورتوں کی اصلاح کا انتظام ہے تو وہ ان کے سردار ہوئے اور یہ قاعدہ ہے کہ سلطنت کی طرف سے جو احکام صادر ہوا کرتے ہیں ان کے مخاطب سردار ہوتے ہیں رعایا کو مخاطب نہیں کیا جاتا نہ اس کی کچھ ضرورت سمجھی جاتی ہے کیونکہ لوگ خود سمجھ لیں گے کہ جب سردار ان احکام کے مخاطب ہیں تو چھوٹے بھی ان کے ساتھ ضرور شریک ہیں پھر سردار اپنے ماتحت لوگوں کو ان احکام کی اطلاع بھی کر دیتے ہیں اور ان سے کام بھی لیتے ہیں اسی طرح قرآن میں اکثر مردوں کو احکام کا مخاطب بنایا گیا ہے چونکہ وہ عورتوں پر سردار ہیں تو ان کے مخاطب ہونے سے عورتوں کا ان احکام میں شریک ہونا خود سمجھ میں آ جاتا ہے پھر مردوں کے ذمہ ہے کہ عورتوں کو احکام سے بھی اطلاع کریں اور ان سے کام بھی لیں۔

کیونکہ سرداروں کے ذمہ یہ کام ہمیشہ ہوتا ہے کہ اپنے ماتحت لوگوں کو احکام سلطنت سے مطلع کرتے رہیں اور ان سے کام لیں اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو ان سے بھی باز پرس ہوگی افسوس ہے کہ آج کل مردوں نے یہ بات تو یاد کر لی ہے کہ ہم عورتوں کے سردار ہیں مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ سردار کے فرائض کیا ہوتے ہیں وہ نہ تو عورتوں کو احکام سے مطلع کریں اور مطلع کریں کس طرح سردار صاحب کو خود ہی خبر نہیں اور نہ ان سے کام لیں یعنی جن کو احکام معلوم بھی ہیں اور وہ عورتوں کو احکام سے مطلع بھی کرتے ہیں اور اس کی نگہداشت نہیں کرتے کہ ہمارے گھروں میں ان احکام پر عمل بھی ہو رہا ہے یا نہیں غرض جو احکام ایسے ہیں جن میں اشتراک کی خاصیت ہے جیسے نماز روزہ وغیرہ ان میں مردوں کو خطاب کافی ہے۔

دین و خواتین

اس تمہید کے بعد یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اس آیت میں جو کہ میں نے اس وقت تلاوت کی تھی جس طرح حق تعالیٰ نے مردوں کو تکمیل دین کا حکم فرمایا ہے اسی طرح وہ حکم عورتوں کے لئے بھی ہے اور جو طریق کمال دین کے حاصل کرنے کا مردوں کے لئے اس میں مذکور ہے وہ طریق عورتوں کے لئے بھی ہے پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ

ترجمہ: اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو (خدا سے ڈرو) اور سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ یہ تو اس آیت کا ترجمہ ہے اور پہلے بیان میں اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا گیا ہے کہ تقویٰ اور صدق سے کمال دین مراد ہے۔

پس حاصل یہ ہوا کہ اے مسلمانو! دین میں کمال حاصل کرو اور کاملین کے ساتھ رہو پس اس میں اولاً حق تعالیٰ نے تکمیل دین کا حکم فرمایا ہے پھر اس کا طریق بتلایا ہے کہ دین میں کامل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ راسخ فی الدین ہیں ان کی صحبت حاصل کرو (احقر جامع عرض کرتا ہے کہ اس آیت سے اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جب تک دنیا میں قرآن اور اسلام کا وجود ہے اس وقت تک ہر زمانہ میں کاملین کا بھی وجود ضرور

رہے گا کیونکہ جب تک دنیا میں قرآن ہے اس وقت تک ہر شخص اس آیت کا مخاطب ہے اور اس آیت میں کمال دین کا طریقہ صحبت کا ملین بتلایا گیا ہے بصورت امر جس کا احتمال بدون تحقق کا ملین کے نہیں ہو سکتا اور اوامر شرعیہ کے لئے معذرا لاقبال ہونا خلاف اصل ہے اس لئے یہ مدعی ثابت ہو گیا کہ ہر زمانہ میں کا ملین کا وجود ضرور رہے گا گو وہ قلیل ہی ہوں پس جو لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب آج کل اہل کمال کہاں ہیں اب تو کمال کا حاصل ہونا دشوار ہے۔ یہ آیت اشارہ پر رد کرتی ہے (فہم ۱۲ جامع) کیونکہ کا ملین کی صحبت سے اعمال میں سہولت بھی ہوتی ہے اس طرح سے کہ ان کی برکت سے تقاضائے نفس مضائل ہو جاتا ہے جو کہ اکثر اعمال میں مزاحم ہوتا ہے نیز ان کی صحبت سے طریق عملی بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس عمل کو کس طرح ادا کرنا چاہئے یہ بات محض مسائل جاننے سے حاصل نہیں ہوتی جب تک کسی کو عمل کرتے ہوئے نہ دیکھا جاوے اور یہ بات کچھ دین ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دنیوی کاموں میں بھی طریق عمل معلوم کرنے کے لئے اہل کمال کی صحبت ضروری ہے اگر کوئی شخص یوں چاہے کہ محض کتاب دیکھ کر قسم قسم کے کھانے پکانے سیکھے لے تو ایسا نہیں ہو سکتا جب تک وہ کسی ماہر فن سے ہر کھانے کی ترکیب عملی نہ سیکھے گا۔ اس وقت تک کبھی اس کو کھانا پکانے کا طریقہ معلوم نہ ہوگا اور اگر کسی نے کتاب دیکھ کر عمل شروع بھی کر دیا تو اس کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں گی چنانچہ جب چاہے اس کا تجربہ کر لیا جائے اور یہی حال ہر عمل کا ہے کہ محض ترکیب جان لینے سے کسی عمل میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ استاد سے سیکھنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ

لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور کیا ان کو نہیں دکھلائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں مگر پھر بھی باز نہیں آتے اور نہ کچھ سمجھتے ہیں۔

تفسیری نکات

شامت گناہ

مگر لوگ اس قسم کے مصائب کو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ فلاں گناہ کی سزا ہے چنانچہ اکثر ایسے وقت کہا کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کون سا گناہ ہوا تھا جس کے سبب یہ تکلیف جھیلنی پڑی اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سب جانتے ہیں کہ تکلیف گناہ کے سبب ہوا کرتی ہے مگر تعجب صرف اس پر ہے کہ کونسا گناہ ہم سے ہو گیا تھا مجھے لوگوں

کے اس تعجب ہی پر تعجب ہے کیوں کہ ہم میں وہ ایسا کون ہے کہ ہر وقت کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا نہیں رہتا اور جب ہر وقت گناہ میں مبتلا رہیں تو تعجب تو آفات میں مبتلا نہ ہونے پر کرنا چاہئے تھا بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ گناہ کرنے سے دنیا کی بھی پریشانی ہوتی ہے اور آخرت کی الگ رہی اب خدا تعالیٰ کی رحمت کو دیکھئے کہ فرماتے ہیں کہ اس معصرت سے بچو وَذُرُوا ظَاهِرَ الْأَرْضِ وَبَاطِنَهُ (تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑو) آپ نے دیکھا کہ کتنی بڑی معصرت سے خدا تعالیٰ نے بچایا ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ

حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس میں سے ہیں جن کو تمہاری معصرت کے بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہے ہیں ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔

رُؤْفٌ رَّحِيمٌ كَمَا مَفْهُومٌ

اس آیت جو حق تعالیٰ شانہ دو لفظ ارشاد فرمائے رُؤْفٌ كَمَا مَفْهُومٌ جس کے معنی ہیں شدت رحمت اور شدت ایک کیفیت ہے تو اس میں مبالغہ کیفیتاً ہے اور رحیم میں بھی مبالغہ ہے اور بوجہ تقابل کے شاید اس میں ہو کما پس مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ آپ میں رحمت کیفیتاً بھی زیادہ ہے اور کما بھی۔

سُورَةُ يُونُسَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا
بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غٰفِلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ مِنَ النَّارِ
بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

ترجمہ: جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کٹھکا نہیں ہے اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں (آخرت کی طلب اصلاً نہیں کرتے) اور اس میں حسی لگا بیٹھے ہیں (آئندہ کی کچھ خبر نہیں) اور جو لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ ہے۔

تفسیری نکات

چار افعال پر لتاڑ

اب وہ باتیں بھی سن لیجئے جن پر اس آیت میں لتاڑا گیا ہے فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایسے ہیں کہ ہمارے پاس آنے کا یقین نہیں رکھتے سو اس سے تو ہم بری ہیں لیکن اس سے بے فکری نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے نہ ہونے سے گوسزا کم ہو لیکن ہوگی تو ضرور اور دوسری بات یہ فرمائی کہ وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غٰفِلُونَ ۝ کو جو حیواۃ الدنیا پر راضی ہیں اور اس پر مطمئن ہو گئے ہیں اور جو ہمارے احکام سے غافل ہیں یہ کل چار چیزیں ہیں ان پر فرماتے ہیں أُولَٰئِكَ مَا لَهُمْ مِنَ النَّارِ ۝ ترجمے سے معلوم ہوا ہوگا کہ چار پر سزا ہے تو ان چاروں کا مذموم ہونا ثابت ہو اور احتمال نہ کیا جائے کہ شاید مجموعہ پر یہ سزا ہوگی اور ہم مجموعہ سے بری ہیں کیونکہ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ۝ یہ جزو ہم میں نہیں پایا جاتا سو بات یہ ہے کہ یہاں اول تو اس

احتمال کی کوئی دلیل نہیں اور عطف بالواو میں ہی ہر واحد بھی مقصود بالا فادہ ہوتا ہے۔ اور شاید اس سے بے فکری ہو نہیں سکتی دوسرے اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی لایر جون پر اکتفا نہ کرنا اور دوسرے اعمال کا بھی ذکر کرنا ظاہر ہے کہ عبث تو نہیں ہے اور اگر ان کو حکم جزی میں کچھ دخل نہ ہو تو محض عبث ہونا لازم آئے گا پس سب دخل ہوا پس سب کا مذموم اور مؤثر فی العفو ہونا ثابت ہو گیا ان چار چیزوں میں سے ایک تو یقیناً ہم میں نہیں ہے اس دفعہ سے تو ہم یقیناً بری ہیں اور ایک میں شبہ ہے یعنی اخیر کا جرم اس میں شک ہے کہ ہم میں ہے یا نہیں کیونکہ اس کی تفسیریں دو ہیں ایک تو یہ کہ عقیدہ نہیں اس لئے غفلت ہے اور التفات نہیں ہوتا اس سے تو ہم بچے ہیں یا مطلق غفلت مراد ہو تو اس میں ہم مبتلا ہیں رہے بچ کے دو جرم ان میں ہم یقیناً مبتلا ہیں اور وہ دونوں ایک ہیں مگر قدرے تفاوت ہے یعنی ایک تو مرتبہ عقل کا ہے اور ایک مرتبہ طبع کا کیونکہ رضا تو امر عقلی ہے اور اطمینان امر طبعی ہے تو بعض دفعہ تو ایک فعل کو عقلاً پسند کرتا ہے مگر دلچسپی نہیں ہوتی جیسے کڑوی دوا یا شہادت کے لئے سفر کہ عقلاً تو پسند ہے مگر اس کے ساتھ دلچسپی نہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دلچسپی تو ہوتی ہے مگر عقلاً ناپسند کرتا ہے جیسے زنا وغیرہ غرض کبھی رضا ہوتی ہے اور اطمینان نہیں ہوتا اور کبھی بالعکس لیکن وہ حالت نہایت سخت ہے کہ رضا اور اطمینان دونوں ہوں تو کفار کو تو علی العموم یہ بات ہے مگر اکثر مسلمانوں کو ہے چنانچہ پسند کی تو کھلی دلیل یہ ہے کہ اگر دنیا اور دین میں تزام ہو جیسے مقدمات میں یا رشوت لینے میں یا جیسے بعضوں کے پاس زمینیں دبی ہوئی ہیں تو ان سب کو جانتے ہیں کہ گناہ ہے مگر دل سے پسند ہے کہ جی برائیں ہونا بلکہ جب ان کی اصلاح کی رائے دی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ ریاست کے معاملے میں ناصح کیا جانیں غرض عقل سے پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں اگرچہ عقیدہ ایسا نہیں ہے۔

رضا بال دنیا سے بہت کم لوگ خالی ہیں

خلاصہ یہ کہ رضا بال دنیا کی ان خرابیوں سے بہت کم لوگ خالی ہیں حتیٰ کہ مولوی اور درویش بھی اور مولویوں اور درویشوں سے ایسا ہونا زیادہ برا ہے کیونکہ یہ دھوکہ دے کر کہتے ہیں مگر ہر جماعت میں کچھ لوگ مستثنیٰ بھی ہیں دنیا داروں میں بھی اور دینداروں میں بھی یہ تو رَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا تھا آگے فرماتے ہیں وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا کہ دنیا میں جی بھی لگایا اور دنیا ان کے دل میں گھس گئی اس کا ازالہ ذرا مشکل ہے دنیا سے تو دل گھبراتا چاہئے مگر ہر مسلمان بتلائے کہ روزانہ کتنی مرتبہ دنیا میں رہنے سے اس کا جی گھبراتا ہے اور کب وحشت ہوتی ہے ہاں اگر وحشت ہوتی ہے تو آخرت میں جانے سے ہوتی ہے حالانکہ دنیا سے وہ تعلق ہونا چاہئے کہ جو مظفر نگر کی سرانے سے کہ اگرچہ وہاں سارے کام کرنے ہوتے ہیں مگر دل جلال آباد میں پڑا رہتا ہے۔ اس کا مطلب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مولوی دنیا چھڑاتے ہیں یہ بالکل غلط ہے بلکہ مولوی یہ کہتے ہیں کہ دنیا سے سرانے کا تعلق رکھو۔

رضا بالدنیا کا حکم

جو امور اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں اگرچہ سارے ہمارے اندر موجود نہ ہوں مگر بعض کا پایا جانا محقق ہے گو کفار کی برابر نہ پائے جاتے ہوں چنانچہ آیت کے جزو اول یعنی 'إِنَّ الَّذِينَ لَا يُرْجُونَ لِقَاءَنَا' سے تو مسلمان بے شک بری ہیں کیونکہ حق سبحانہ تعالیٰ کی لقا کا تو ہر مسلمان کو اعتقاد ہے یہ جزو تو بحمد اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں ہے۔ نہیں مگر دوسرا جزو یعنی 'رَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا' تو موجود ہے گو کفار سے کم درجہ میں ہو مگر ہے ضرور اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ جس رضا بالدنیا پر وعید ہے شاید یہ مشروط بعدم رجاء اللقاء یعنی مشروط بالکفر ہو پھر مسلمان اس کا مورد نہ ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ذوق لسان کے بالکل خلاف ہے ہر اہل لسان سن کر یہی سمجھے گا کہ ان اعمال کی بھی تصحیح مقصود ہے بلا شرط اقتران بالمکفر کے آگے ارشاد ہے 'وَاطْمَأْنَنُوا بِهَا' رَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا کی تفسیر ہے اور عجیب پر شفقت موقعہ ہے تفسیر کا کیونکہ رضائیات دنیا انسان کا امر طبعی ہے جو اختیار میں نہیں اگر مطلق رضائیات دنیا معصیت ہوتی تو کوئی فرد انسانی بھی اس سے نہ بچ سکتا کیونکہ دنیا کی زندگی سے کون راضی نہیں اس لئے ضرورت واقع ہوئی تفسیر کی اگر تفسیر ساتھ کے ساتھ نہ ہوتی تو اس آیت سے لوگوں کی کمر ٹوٹ جاتی پس شفقت اسی میں ہے کہ ساتھ کے ساتھ تفسیر کر دی جائے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں 'رَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأْنَنُوا بِهَا'۔ اس قید کے بڑھانے سے معلوم ہو گیا کہ رضائیات دنیا معصیت و مذموم وہ ہے جس کے ساتھ اطمینان بھی ہو ورنہ معصیت نہیں کیونکہ یہ تو امر طبعی ہے چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تصریح ہے 'قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنْ لِقَائِ رَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ' یعنی آپ کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں تمہارے قبیلے اور تمہارے وہ اموال جن کو تم نے حاصل کیا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکان جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کے راستہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہوں ارح' یہاں وعید اس پر ہے کہ یہ چیزیں اللہ و رسول ﷺ سے زیادہ محبوب نہ ہوں تو ان پر وعید نہیں کیونکہ ان چیزوں کا محبوب ہونا امر طبعی ہے معلوم ہوا کہ ان چیزوں کو پسند کرنا اور ان پر خوش ہونا اور مطلق رضائل وعید نہیں البتہ حیات دنیا پر مطمئن ہونا محل وعید ہے اگر اطمینان کی حالت ہو تو قابل علاج ہے ورنہ نہیں اب یہ سمجھنا چاہئے کہ اطمینان کس کو کہتے ہیں کہ جس پر وعید وارد ہے اطمینان کے معنی سکون کے ہیں جو مقابل ہے حرکت کا مطلب یہ ہوگا کہ حیوۃ دنیا پر اتنا قرار ہو گیا ہے کہ اس سے قلب و ذہن کو آگے حرکت ہی نہیں ہوتی آگے خیال ہی نہیں چلتا جیسے کوئی چیز مرکز پر ٹھہر جاتی ہے کہ آگے نہیں بڑھتی اس پر وعید ہے سو آج کل اکثر ہماری یہی حالت ہو رہی

ہے کہ جو جس حالت پر ہے اسی پر ٹھہرا ہوا ہے آگے قدم ہی نہیں بڑھاتا ہم کو ساری فکر حیات دنیا ہی کی ہے منہمکنین فی الدنیا کی یہ حالت ہے کہ جب کبھی تذکرہ کرتے ہیں تو دنیا ہی کا حتیٰ کہ ریل میں ہوتے ہیں تب بھی دنیا ہی کا تذکرہ ہے یہی پوچھتے ہیں کہ تمہارے یہاں اناج کا کیا حال ہے بارش کیسی ہوئی نرغ کیا ہے غرض ہر مجلس میں دنیا کا ہی تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ ریل کا موقع تو بے فکری اور فرحت کا ہے مگر ان کو اس میں بھی دنیا ہی کی فکر ہے اس سے آگے حرکت ہی نہیں ہوتی دنیا ہی پر سکون و قرار ہو گیا ہے حاصل یہ ہے کہ آخرت کی فکر نہیں آگے ارشاد ہے هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ یہ ہے کہ باوجودیکہ ہماری نشانیوں کو دیکھتے ہیں مگر پھر غافل ہیں ان تینوں جملوں کا یہ حاصل تھا جس سے اصل جرم یہ ثابت ہوا کہ ہم کو حیات دنیا پر اطمینان ہو گیا یعنی حرکت الی الاخرت نہیں ہوتی اب یہ سمجھئے کہ حرکت الی الاخرت جو کہ مقابل ہے سکون کا تین قسم کی ہوتی ہے ایک حرکت اعتقادی دوسری عملی تیسری حالی یعنی آخرت کی دہن میں ہر وقت بے چین رہنا اور اسی کا دوش ہونا کفار کو تو کسی قسم کی حرکت بھی نہیں کیونکہ ان کا اعتقادی درست نہیں مسلمانوں کو حرکت اعتقادی تو حاصل ہے مگر حرکت عملی اور حالی نہیں یعنی نہ اعمال آخرت کا اہتمام ہے نہ اس کی دہن ہے اس کی کاوش ہی نہیں یہ مرض قریب قریب عام ہے اور عوام تو عوام خود لکھے پڑھوں کی حالت یہ ہے کہ ہمارے قلوب آخرت کے لئے بے چین نہیں ہیں جیسے کسی پر کوئی مقدمہ دائر ہوتا ہے اور اس وقت بے چینی ہوتی ہے کہ کسی وقت بھی قلب کو قرار نہیں ہوتا ہر وقت اس کی دہن اور اسی کا فکر اور خیال ہوتا ہے۔

بڑا علاج اس کا یہی ہے کہ آخرت کے تمام امور کو سوچا کر وہ میں مر کر قبر میں جاؤں گا وہاں سوالات ہوں گے اگر ٹھیک جواب دے دیا تو راحت ہوگی ورنہ عذاب ہوگا اسی طرح میدان قیامت کی سختیوں کو سوچے کہ اللہ تعالیٰ کے روبرو حساب کے لئے کھڑا کیا جاؤں گا اس کے بعد پل صراط پر چلنا ہوگا پھر جنت یا دوزخ میں ڈالا جاؤں گا غرض سارے امور کو سوچا کرے اور اس کے ساتھ ہی کسی بزرگ سے تعلق قائم کرے اور اگر ممکن ہو سکے تو اس کی صحبت میں رہو اور اس کے حقوق صحبت ادا کرو۔

حب دنیا کے مراتب

حب دنیا کے بھی مراتب مختلف ہیں کسی میں کم ہے کسی میں زیادہ کفار میں زیادہ ہے۔ مسلمانوں میں کم مگر ہیں ضرور اور یہی جڑ ہے تمام گناہوں کی کیونکہ حب دنیا میں فکر دین کم ہوتی ہے جس درجہ کی حب دنیا ہوگی اسی درجہ کی فکر دین کم ہوگی اگر کامل درجہ کی حب دنیا ہے تو کامل درجہ کی دین سے بے فکری ہوگی جیسا کہ کفار میں متحقق ہے اور مسلمانوں میں جس درجہ کی حب دنیا ہے اسی درجہ کی دین سے بے فکری ہے تو یہ دخل ہے حب دنیا کو ان امور میں جن کا میں ذکر کر رہا ہوں اور کفار میں تو یہ مرض ہے ہی افسوس یہ ہے کہ ہم میں بھی پایا جاتا ہے۔

اور اگر یہ اعتراض کیا جاوے کہ اس آیت کو کیوں اختیار کیا گیا۔ یہ کفار کے بارہ میں ہے چنانچہ
 إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِعَذَابِنَا اس میں صریح ہے مسلمانوں کو اس سے کیا علاقہ؟ یہ شبہ بہت لوگوں کو ہوا ہوگا
 کیونکہ اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ جو آیتیں کفار کے بارہ میں ہیں مسلمانوں سے ان کو کچھ علاقہ نہیں اور اسی
 لئے لوگ بے فکر بھی ہو گئے ہیں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ جو وعیدیں کفار کے بارہ میں وارد ہیں ان
 وعیدوں کی بناء کیا ہے آیا کفار کی ذات ہے یا کفار کے اعمال ہیں۔ ظاہر ہے کہ بناء ان وعیدوں کی اعمال ہی
 ہیں جو کفار میں پائے جاتے ہیں اور راز اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہ تو کسی کی ذات سے محبت ہے نہ کسی کی
 ذات سے بغض ہے من حیث الذات خدا تعالیٰ کے نزدیک سب برابر ہیں۔

طالب علمانہ اشکال کا جواب

یہاں ایک اور طالب علمانہ شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ آیت کفار کے بارہ میں ہے اور وعید
 جن اعمال پر وارد ہے ان میں بعضے فرعی بھی ہیں اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کفار مکلف بالفروع ہوں حالانکہ
 فقہاء اصولیین کے نزدیک کفار مکلف بالفروع نہیں اسی لئے انہوں نے تصریح کی ہے کہ اگر کافر قبل اسلام
 لانے کے نماز پڑھے تو اس کی نماز نہ ہوگی کیونکہ وہ مکلف ہی نہیں اسی طرح بعد اسلام کے ان نمازوں کی قضاء
 واجب نہیں اس سے کفار کا مکلف بالفروع ہونا لازم نہیں آتا وہ اس طرح کہ کفار کو جو عذاب ہوگا وہ اصل میں
 نفس کفر پر ہوگا بخلاف مسلمان کے کہ اس کو جو سزا ہوگی وہ ترک فروع پر ہوگی ہاں کافر کی سزا میں بوجہ ترک
 فروع کے اضافہ ہو جائے گا اور عقوبت بڑھ جائے گی یہ نہیں کہ نفس ترک فروع پر سزا ہوگی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو باغی ہوں جو حکومت کی اطاعت نہیں کرتے مگر ان میں ایک تو وہ ہے کہ
 بغاوت بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ملک میں شورش بھی کرتا ہے اور دوسرا باغی تو ہے مگر تا فرمانی اس کی ذات ہی
 تک ہے شورش نہیں کرتا ظاہر ہے کہ بغاوت پر سزا دونوں کو ہوگی مگر جو بغاوت کے ساتھ شورش بھی کرتا ہے اس کی
 سزا میں بہ نسبت شورش نہ کرنے والے کے اضافہ ہوگا اس صورت میں اصل سزا تو بغاوت پر ہے مگر بوجہ شورش
 کے اس میں اضافہ ہو گیا ہے۔

کافر تارک فروع کی مثال شورش کرنے والے باغی کی سی ہے کہ کفر تو کرتا ہی ہے لیکن باوجود کفر کے
 فروع کو بھی بجا نہیں لاتا تو اس کو اصل سزا تو کفر پر ہوگی مگر ترک فروع کی وجہ سے سزا میں زیادتی ہو جائے گی
 اور اس کافر کی مثال جو بعض فروع کو ادا کرتا ہے جو مشروط بالا ایمان نہیں جیسے عدل و تواضع و سخاوت اس باغی کی
 سی ہے جو شورش نہیں کرتا اس کو اصل سزا کفر پر ہوگی ترک فروع سے اضافہ اور زیادتی نہ ہوگی اب شبہ کفار کے
 مکلف ہونے کا جاتا رہا اور مسلمان کی مثال اس مجرم کی سی ہے جو باغی نہیں اس کو صرف ترک فروع پر سزا ہوگی

بغاوت کی سزا اس کو نہ ہوگی کیونکہ وہ باغی نہیں ہے آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفار کو فروع کے مکلف نہیں مگر پھر بھی ترک فروع پر عتاب ہوگا گو تقویتِ عی کے لئے سہی تو مسلمان جو کہ فروع کے مکلف ہیں وہ آیت سے زیادہ موردِ وعید ثابت ہوں گے کیونکہ جب غیر مکلف بالفروع کو بھی ان فروع کے ترک سے ضرر ہوتا ہے تو جو ان فروع کا مکلف ہے اس کو ان کے ترک سے کیوں ضرر نہ ہوگا۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّكَانُ لَمْ يَدْعُنَا إِلَى ضُرِّهِمْ كَذَلِكَ

زَيْنَ الْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی بیٹھے بھی کھڑے بھی پھر جب ہم اس کی وہ تکلیف اس سے ہٹا دیتے ہیں تو پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے کہ گویا جو تکلیف اس کو پہنچتی تھی اس کے ہٹانے کے لئے کبھی ہم کو پکارا ہی نہ تھا ان حد سے نکلنے والوں کے اعمال ان کو اچھی طرح مستحسن معلوم ہوتے ہیں جس طرح ہم نے ابھی بیان کیا ہے۔

تفسیری نکات

مصیبت کے وقت انسان کا حال

حضرت ﷺ نے ایک کافر سے پوچھا کہ تمہارے کتنے خدا ہیں اس نے کہا سات ہیں چھ زمین میں اور ایک آسمان میں آپ نے فرمایا کہ مصیبت کے وقت کا خدا کون ہے اس نے کہا آسمان والا تو مشرکین عرب بھی مصیبت کے وقت ایک خدا کو ہی پکارتے تھے مگر ہندوستان میں مصیبت کے وقت بھی دوسروں ہی کو پکارتے ہیں تیسری قسم وہ ہے کہ گناہ کو یاد کر کے تدارک بھی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن وہ حالت ہوتی ہے

الہکاراں بوقت معزولی شبلی وقت وبا یزید شوند

باز چوں سے رسند بر سرکار شمر ذی الجوش و یزید شوند

(سرکاری ملازم نوکری سے علیحدہ کر دیئے جائیں تو وہ ایسے نیک بن جاتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اپنے زمانہ کے حضرت شبلی اور بایزید کے جیسے بہت بڑے ولی ہیں اور پھر جب اپنی ملازمت پر آ جاتے

ہیں تو اس قدر برے اعمال کرتے ہیں جیسے کہ شمر جس نے حضرت امام حسین کو شہید کیا اور جیسا کہ یزید تھا کہ جس کی اس وقت حکومت تھی۔)

یعنی جب تک مصیبت رہے اللہ بھی یاد رہے رسول بھی یاد رہے اور جب مصیبت ٹلی تو ایسے آزاد کہ گویا خدا تعالیٰ کی حدود حکومت ہی سے نکل گئے اسی کو فرماتے ہیں إِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا، کہ مصیبت کے وقت تو خوب پکارتا ہے اور جب مصیبت دور کر دیتے ہیں تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ گویا تعلق ہی نہ رہا اور اس کی وجہ فرماتے ہیں۔ كَذَلِكَ نُزِيلُ لِلْمُتَّعِبِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ^{۱۰} یعنی وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ لوگ حدود سے باہر ہو گئے ہیں اور یہ خاصیت ہے کہ نیک عمل میں بصیرت ٹھیک رہتی ہے اور جب گناہ کرتا ہے تو بینش جاتی رہتی ہے اسی لئے فرماتے ہیں کہ ان کو اپنے اعمال خوش معلوم ہوتے ہیں پس علت اس کی اسراف ہے کہ اس کی وجہ سے بری باتیں مزین معلوم ہونے لگتی ہے اس کو سن کر ہر شخص اپنی حالت کو لے کم و بیش سب کی یہ حالت ہے اور دوسری جگہ بھی ایسا ہی مضمون ارشاد ہے وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِلَٰهًا فَلَمَّا بَلَغْتُمْ إِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ، یعنی جب مصیبت آتی ہے اس وقت تو سب کو بھلا کر کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اس سے نجات ہو جائے تو ہم خدا تعالیٰ کی اطاعت کریں گے مگر جب اس سے نجات ہو جاتی ہے تو اعراض کرنے لگتے ہیں آگے فرماتے ہیں وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا۔ کہ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے اس کے بعد فرماتے ہیں أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يُخَفِّفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا يَجِدُ وَالَكُمْ وَكَيْلًا^{۱۱} یعنی تم کیا اس سے امن میں ہو گئے ہو کہ تم کو زمین ہی میں دھنسا دیں (یا تم پر کوئی ایسی تندہوا بھیج دیوں جو کنکر پتھر برسائے لگے پھر تم کسی کو اپنا کار ساز نہ پاؤ) چنانچہ قارون کو دھنسا دیا گیا تھا اور اس واقعہ پر گوسب کو ایمان تھا لیکن عین یقین نہ تھا مگر اب چند ہی سال ہوئے کہ کانگڑہ کے قریب زلزلہ میں ایک بہت بڑے حصے کو دھنسا دیا گیا کہ لوگ اب بھی دیکھ لیں آگے فرماتے ہیں یا تم پر تندہوا میں بھیج دیں کہ پھر تم اپنے لئے کوئی وکیل نہ پاؤ غرض ہر طرح تم ہمارے قبضے میں ہو کسی طرح بچ نہیں سکتے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دریائی اندیشہ تو کٹ گیا اس کو فرماتے ہیں أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَى یا تم اس سے بے فکر ہو گئے کہ خدا تعالیٰ پھر تم کو دریا ہی میں دوبارہ لے جاویں (دیکھو روز مرہ یہ بات پیش آتی ہے کہ انسان ایک جگہ نہ جانے کی قسم کھاتا ہے مگر پھر مجبوراً جانا پڑتا ہے اور یہ اوپر بتلا دیا ہے کہ اگر دریا میں بھی نہ جانا ہو تو دوسری جگہ بھی تو ہلاک کر دینا ممکن ہے کیونکہ اس کی قدرت خشکی اور دریا میں برابر ہے مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک ملاح سے ایک شخص نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے اس نے کہا دریا میں ڈوب کر کہنے لگا اور دادا کہا کہ دریا میں کہنے لگا کہ پھر بھی تم دریا میں رہتے ہو ڈرتے نہیں ملاح نے کہا کہ تمہارے باپ کہاں مرے کہنے لگا کہ گھر میں پوچھا اور دادا کہنے لگا گھر میں ملاح نے کہا کہ پھر بھی تم گھر میں رہتے ہو ڈرتے نہیں تو

خدا تعالیٰ کی قدرت ہر جگہ موجود ہے بلکہ دریا میں تو بہت سی تدابیر بچنے کی ممکن بھی ہیں خشکی میں اگر کوئی آفت آئے تو اس سے بچنے کی تو کوئی تدبیر ہی نہیں مثلاً اگر دوریل گاڑیوں میں تصادم ہو جائے تو کوئی صوت بچنے کی ہو ہی نہیں سکتی برخلاف جہاز کے کہ اگر ٹوٹ جائے تو غرق ہوتے ہوئے بھی اس کو بہت دیر لگ جاتی ہے۔ دوسرے جہاز اکثر کنارے کے قریب ہی ہوتا ہے کہ وہاں سے مدد کا آ جانا بھی ممکن ہوتا ہے تو جو شخص سمندر میں خدا سے ڈرے اور خشکی میں نہ ڈرے وہ کس قدر نادان ہے دوسرے اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ سمندر میں زیادہ خطرہ ہے تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ دوبارہ سمندر ہی میں بھیج دیں اور اگر ایسی ہو کہ مسلط کر دیں کہ وہ کشتی کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے کر دے اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں **أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ فِيهِ تَارَةً أُخْرَىٰ** اور یہ کچھ اسی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر صاحب مصیبت کو کہا جاسکتا ہے کہ کیا پھر ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ پھر اسی قصہ میں تم کو پھنسا دیں صاحبو اپنے کو کسی وقت خدا تعالیٰ کے قبضے سے نکلا ہو انہ سمجھو سب گناہوں کو چھوڑ دو دیکھو گناہ میں مصیبت اس لئے آتی ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ ناراض ہیں اور یہ بات سب گناہوں کو عام ہے اگرچہ وہ کسی قسم کا گناہ ہو تو جب خدا تعالیٰ ناراض ہوئے اور ہر قصہ ان کے قبضہ میں ہے تو ممکن ہے کہ پھر کسی قصہ میں مبتلا کر دے دیکھو اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوا تو نمرود کو ایک چمھر سے پریشان کر دیا اہل سیر نے لکھا ہے کہ نمرود کی یہ حالت تھی کہ سر پر چوٹ لگتی تھی تو چین آتا تھا تو وہ چمھرا ب بھی تو موجود ہے اور خدا تعالیٰ کو اب بھی تو وہی قدرت ہے دیکھو کہاں نمرود اور کہاں چمھر مگر خدا تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ ہمارا ایک معمولی سپاہی بھی کافی ہے ایک چوٹی اگرچہ بظاہر نہایت چھوٹی اور معمولی چیز ہے لیکن جب خدا تعالیٰ چاہتے ہیں تو اسی سے ہلاک کر دیتے ہیں اور جب ان کی حفاظت ہوتی ہے تو کسی سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا میں نے متعدد مرتبہ دیکھا ہے کہ سر میں تیل ڈال کر سر کے نیچے رومال رکھ کر سو گیا ہوں اٹھ کر دیکھا رومال پر چوٹیاں چڑھی ملیں لیکن سر میں ایک چوٹی بھی نہیں پائی گئی سو اس سے بچانے والا کون ہے۔ بجز خدا کے اور اگر وہ نہ بچائے تو ادنیٰ ذرہ پریشان کرنے کو کافی ہے ایک بادشاہ کا قصہ ہے کہ اس کی ناک پر بار بار ایک مکھی آ کر بیٹھتی تھی اس نے تنگ آ کر کہا کہ معلوم نہیں مکھی کو کیوں پیدا کیا ہو گا وزیر نے کہا کہ اس واسطے پیدا کیا ہے کہ متکبرین کا تکبر ٹوٹے حاصل یہ ہے کہ ذرا سنبھل کر خدا تعالیٰ کی مخالفت کرو تم میں تو ایک مکھی کی مقاومت کی بھی تاب نہیں بس اگر بچنے کی کوئی صورت ہے تو یہی کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

خلاصہ آیت

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا تو کوئی انسان نہیں جس کو کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ اور کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو انسان تحت القدرۃ ہے مستقل نہیں ہے اگرچہ ہر امر میں انسان کی ایک مستقل تجویز ضرور ہوتی

ہے جیسے اس کا ذہن اختراع کر لیتا ہے۔ مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ ہر امر اس کی خواہش کے موافق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے **أَفَلَا لِلإِنسَانِ مَا كَفَىٰ** یعنی انسان کو اس کی ہر تمنا نہیں ملتی تمنائیں انسان کی بہت کچھ ہوتی ہیں مگر ملتی کم ہیں بلکہ جو خدا تعالیٰ چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے وہی انسان کے لئے بہتر ہوتا ہے اگرچہ اول نظر میں اس کی بہتری انسان کو محسوس نہ ہو لیکن اس کے نتیجہ پر اگر غور کیا جائے تو اس کی حکمت معلوم ہو جاتی ہے اور اول نظر میں چونکہ حکمت پر نظر نہیں ہوتی اس لئے خلاف تمنا کو مصیبت کہتے ہیں ورنہ اگر مصلحت اور حکمت پر نظر نہیں ہوتی اس لئے خلاف تمنا کو مصیبت کہتے ہیں ورنہ اگر مصلحت اور حکمت پر نظر ہو تو کوئی مصیبت مصیبت نہیں بلکہ ہر مصیبت نعمت ہے مگر مراد مصیبت غیر اختیار یہ ہے اور اسی میں گفتگو ہو رہی ہے برخلاف ان کے جن کو اپنے ہاتھوں اختیار کرتے ہیں یعنی گناہ کہ ان کو انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے سو اس میں کوئی حکمت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اس کو گناہ اور مصیبت قرار دیا گیا یعنی اس سے روکا گیا اور یہی فرق ہے درمیان فعل عبد فعل حق کے کہ کوئی فعل شرکاء خدا تعالیٰ سے صادر نہیں ہوتا فعل شرعی ہے جو اپنے اختیار سے خلاف رضائے حق کرتا ہے تو امور اختیار یہ عبد تو خیر اور شردونوں ہیں اور غیر اختیاری جو محض منجانب اللہ ہے وہ خیر محض ہے۔

مسلمانوں کی ایک قابل اصلاح کمی

ایک دوست نے پوچھا تھا کہ حق تعالیٰ نے کفار کے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے **وَإِذَا مَسَّ الإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَا إِنَّا لِلَّهِ أَشِدُّ مِنْهُ وَآؤُنَا إِلَيْهِ إِنَّا إِلَيْهِ مُرْجِعُونَ** لیکن کفار کے لئے یہ دعا تو یہی حالت یعنی مسلمانوں کی ہے کہ جب کوئی مصیبت ہوتی ہے تو خدا کو پکارتے ہیں اور جب وہ مصیبت جاتی رہتی ہے پھر غفلت میں پڑ جاتے ہیں تو کیا مسلمان بھی اس آیت میں داخل ہیں اگر داخل ہیں تو مفسرین الانسان کی تفسیر کفار کے ساتھ کیوں کرتے ہیں۔ میں نے اس کا یہی جواب دیا کہ مسلمان کے اندر اس کا منشاء اور ہے کافر کے اندر اور کافرین کا منشاء تو اس سے اعراض اور غفلت اور انکار اور کفر ہے اور مسلمین کا طبیعت ہے اگرچہ یہ بھی کمی اور قابل اصلاح لیکن کلام اس میں ہے کہ اس غفلت سے کفر لازم نہیں آتا غرض احکام عقلیہ اور طبیعیہ میں جب تعارض ہوگا تو جزائے شرعی میں ترجیح عقل کو ہوگی اس لئے اشتراک حالت سے جو آیتیں منافقین و کفار کے بارہ میں ہیں وہ مسلمانوں پر جاری نہ کی جاویں گی اور اس سے کفر و نفاق کا حکم نہ کیا جاوے گا۔

إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِرُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ جب ان کی معیاد (معلوم یعنی موت) آ جائے گی تو اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

تفسیری نکات

موت کا ایک وقت معین ہے

جس کا حاصل یہ ہوا کہ موت کے وقت سے نہ کوئی آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے اور مقصود یہ ہے کہ موت آنے کے بعد اس سے کوئی بچ نہیں سکتا اب یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ اس آیت سے جو مضمون مقصود ہے یعنی موت سے محفوظ نہ ہو سکتا اس سے لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً کا دخل تو ظاہر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کا وقت آنے کے بعد اس سے بچ نہیں سکتے اور بچنے میں تاخیر کو دخل ہو سکتا ہے مگر لَا يَسْتَقْدِرُونَ کو اس میں کیا دخل ہے یہ جملہ کیوں بڑھایا گیا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت سے پہلے کوئی بھی نہیں مر سکتا سو یہ حکم تو صحیح ہے مگر جو مقصود ہے اس میں کیا دخل کیونکہ تقدیم میں نافع ہونے کا کیا احتمال ہے وہ تو اور الٹا معترض ہوگا پھر خصوص بنی اجل کے بعد تو عقلاً بھی اس کا احتمال نہیں ہاں تاخیر کا احتمال ہو سکتا تھا اس لئے اس کی نفی بے شک مفید ہے تو یہ جملہ بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں مگر حضرت استاد رحمۃ اللہ نے ایک عجیب جواب دیا تھا جو میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا ممکن ہے کسی نے لکھا ہو مگر میری نظر سے نہیں گزرا اور نہ مجھ کو اس کی تلاش کا اہتمام ہے ہمیں تو خدا تعالیٰ نے مشائخ ہی ایسے دیئے تھے جن کی باتوں سے ایسی تسلی ہو جاتی تھی جس سے کتب نبی سے استفہانہ ہو گیا مولانا نے فرمایا کہ اس اشکال کا منی تو یہی ہے کہ تقدیم نافع نہیں ہو سکتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقدیم ممکن ہوتی تو وہ بھی نافع ہو سکتی اسی طرح موت سے بچنے کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ وقت موت سے مقدم وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن موت کے لئے مقرر ہو اور وہ وقت آیا اور یہ شخص جمعرات کے دن میں داخل ہو جائے دوسرے یہ کہ وقت سے موخر وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن آنے کے بعد موت کے آثار دیکھ کر سنبھرنے کے دن میں پہنچ جائے تو دونوں صورتیں موت میں موت نہ آئے گی لیکن وقت مقررہ تو جمعہ کا تھا اور جمعہ سے دونوں صورتوں میں فرار ہو گیا تو حق تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ دونوں صورتیں نافع ہو سکتی تھیں مگر چونکہ حرکت من الزمان ممکن نہیں اس لئے کسی صورت کا وقوع نہیں ہوتا خیر یہ تو لطائف ہیں جو ضمناً بیان کر دیئے ورنہ

اصل مقصودیت کا صرف یہ ہے کہ موت آنے کے بعد اس سے بچنا ناممکن ہے جس کو محاورہ میں اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں لَا يَسْتَأْخِرُونَ - وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ جیسے وَمَا يُبْدِيُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ میں ابداء و اعادہ کے معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ باطل کارآمد نہیں ہوتا اس مقصود کو اس عبارت میں محاورہ کے موافق بیان کر دیا گیا اسی طرح یہاں بھی کر سکتے ہیں کہ تاخر تقدم کی حقیقت نئی مراد نہیں بلکہ حاصل مراد ہے اور محاورات میں کسی شے سے نہ بچ سکنے کو اسی طرح بیان کیا کرتے ہیں اس تقدیر پر آیت کو حرکت زمانی فی الزمان کی بحث سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ یہ محض ایک لطیفہ ہوگا مگر قرآن میں ایسی جامعیت ہے کہ

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صوت راہو اربا معنی را

سلوک میں ہر حال میں ترقی کرنے کی ضرورت

یہی مضمون قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ فِي غَدَاةٍ مُّغْرَضُونَ (ان لوگوں سے ان کا حساب نزدیک آ پہنچا اور یہ غفلت میں ہیں) اور ایک تفسیر یہ بھی ہے حافظ کے اس شعر کی مراد منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم جس فریادی دارد کہ بر بند یہ مملہا (مجھ کو منزل محبوب میں امن و سکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو) اس کی ایک تفسیر یہی کی گئی ہے کہ دنیا میں امن و عیش کہاں جبکہ ہر دم دنیا کی حالت یہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسباب باندھ لو اور چلنے کی تیاری کرو کیونکہ واقعی ہمارا ہر سانس جو گزر رہا ہے وہ اس کی خبر دے رہا ہے کہ تم آخرت کی طرف اتنے نزدیک ہو گئے ہو جس کی عمر میں سال کی ہے اس نے آخرت کی طرف بیس سال کی مسافت طے کر کے قرب حاصل کر لیا جس کی عمر زیادہ اس نے زیادہ قرب حاصل کر لیا ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ: یعنی اے محمد ﷺ آپ فرمادیں کہ اللہ کے فضل اور رحمت ہی کے ساتھ بس صرف چاہئے کہ خوش ہوں (اس لئے) کہ وہ بہتر ہے اس شے سے کہ جس کو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

ایک عجیب نکتہ

یعنی متاع دنیا سے یہ بہتر ہے اور عجیب بلاغت ہے کہ پہلے مضمون کا تو حق تعالیٰ نے خود اپنی طرف سے خطاب فرمایا چنانچہ ارشاد ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ الخ اور اس دوسرے مضمون کی نسبت حضور کو حکم دیا کہ آپ کہئے۔

اس میں ایک عجیب نکتہ ہے وہ یہ کہ یہ طبعی بات ہے کہ احکام یعنی امر و نہی انسان کو ناگوار اور گراں ہوتے ہیں اس لئے احکام تو خود ارشاد فرمائے تاکہ حضور کی محبوبیت محفوظ رہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ فرحت کے امر کو حضور کے سپرد فرمایا کہ اس سے حضور کے ساتھ اور زیادہ محبت مخلوق کو بڑھے باقی اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ بہت جگہ حضور کو بھی احکام پہنچانے کا حکم ہے اس لئے کہ یہ نکتہ اس مقام کے متعلق ہے اور دوسری جگہ دوسرا نکتہ اور حکمت ہو سکتی ہے۔

بہر حال دو چیز پر خوش ہونے کا حکم ہے فضل اور رحمت اور یہ فضل بھی رحمت ہی کے افراد میں سے ہے صرف فرق اس قدر ہے کہ فضل کے اندر معنی زیادتی کے ہیں خلاصہ یہ ہے کہ رحمت بمعنی مہربانی کے دو مرتبہ ہیں ایک نفس مہربانی اور ایک زائد۔ یا یوں کہو کہ ایک وہ مرتبہ ہے جس کا بندہ بحیثیت جزاء کے اپنے کو مستحق سمجھتا ہے اور ایک زائد اگرچہ پہلے مرتبہ رحمت کا اپنے کو مستحق سمجھنا بندہ کی جہالت ہے اور وجہ اس زعم استحقاق کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر ہر شخص کو ایک ناز ہوتا ہے بلکہ اگر غور کیا جاوے تو ہم لوگوں میں نازی کی شان رہ گئی ہے نیاز بالکل نہیں رہا اس لئے اگر نیاز ہوتا تو ہم سے نافرمانی نہ ہوتی دیکھ لیجئے کہ حکام دنیا کے ساتھ نیاز ہے اس لئے اس کی نافرمانی نہیں کرتے نہ ان پر نخرے کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ بالعکس ہے جس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ رحمت ہی کی انتہا ہے حتیٰ کہ فوری سزا نہیں دی جاتی سو جس قدر رحمت بڑھتی جاتی ہے اس رحمت و عنایت کو معلوم کر کے اسی قدر اعراض ان حضرات کا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

لیکن حق تعالیٰ کے کرم اور رحمت بے انتہا سے ہماری عادتیں بگڑ گئی ہیں چاہیے تو یہ تھا کہ جس قدر رحمت ہوتی شرماتے اور تضرع و نیاز زیادہ ہوتی مگر یہاں معاملہ برعکس ہے۔

اب قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر دیکھنا چاہئے کہ ان دونوں لفظوں سے کیا مراد ہے تو جاننا چاہئے کہ قرآن مجید میں یہ دونوں لفظ بکثرت آئے ہیں کہیں دونوں سے ایک معنی مراد ہیں کہیں جدا جدا چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے

فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَائِرِينَ یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک فضل اور رحمت سے حضور کا وجود مراد ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَ لَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا یہاں بھی بقول اکثر مفسرین حضور ہی مراد ہیں۔

ایک مقام پر ارشاد ہے وَ لَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ یہاں مراد فضل اور رحمت سے قرآن مجید ہے اور بعض آیات میں فضل سے مراد رحمت دنیوی اور رحمت سے رحمت دینی مراد ہے چنانچہ فضل بمعنی رزق و نفع دنیوی قرآن مجید میں آیا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِمَّنْ رَزَقَكُمْ يَهَاں فضل سے مراد تجارت ہے اس لئے کہ یہ آیت حج کے موقع کی ہے۔ بعض لوگ مال تجارت حج کے سفر میں ساتھ لے جانے کو مکروہ جانتے تھے ان کو ارشاد ہے کہ اس میں کچھ گناہ نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل طلب کرو حدیث شریف میں بھی رحمت سے رحمت دینی اور فضل سے رحمت دنیوی یعنی رزق یا اسباب رزق مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو یہ کہو اللھم الفتح لنا ابواب رحمتک یہاں رحمت سے رحمت دینی مراد ہے اس لئے کہ مسجد میں دینی مطلوب ہے جب مسجد سے نکلو تو یہ کہو اللھم الفتح لنا ابواب فضلک اس لئے کہ مسجد سے باہر جا کر تحصیل معاش میں لگ جاتے ہیں تو وہاں اس کی طلب ہے اور لیجئے سورۃ جمعہ میں ارشاد ہے

وَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ يَهَاں فضل سے مراد رزق ہے پس مجموعہ تمام تفاسیر کا تمام دنیوی رحمتیں اور دینی رحمتیں ہو اس مقام پر ہر چند کہ آیت کے سابق پر نظر کرنے کے اعتبار سے قرآن مجید مراد ہے لیکن اگر ایسے معنی عام مراد لئے جائیں کہ قرآن مجید بھی اس کا ایک فرد رہے تو یہ زیادہ بہتر ہے وہ یہ ہے کہ فضل اور رحمت سے مراد حضور کا قدم مبارک لیا جائے اس تفسیر کے موافق جتنی نعمتیں اور رحمتیں ہیں خواہ وہ دنیوی ہوں یا دینی اور اس میں قرآن بھی ہے سب اس میں داخل ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ حضور کا وجود باجود اصل ہے تمام نعمتوں کی اور مادہ ہے تمام رحمتوں اور فضل کا پس یہ تفسیر اجمع التفاسیر ہو جائے گی۔ (السرور ملحقہ مواضع میلاد النبی ﷺ ص ۶۸-۷۳)

خوشی کی دو قسمیں

ایک مولوی صاحب نے استفسار کیا کہ بعض دفعہ غسل یا جدید کپڑا پہننے سے خوشی معلوم ہوتی ہے سو یہ عجب تو نہیں فرمایا خوشی دو قسم کی ہوتی ہے ایک فرح بطرح جس کی نسبت ارشاد ہے لا تفرحوا فرح شکر جس کی نسبت ارشاد ہے قُلْ يَفْضِلُ اللَّهُ وَيَرْحَمُهُ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا سوا اگر یہ خوشی بطور اظہار و شکر نعمت کے ہے تو محمود ہے۔

قُلْ يَفْضِلُ اللَّهُ وَيَرْحَمُهُ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہئے اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے

لَا تَفْرَحُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ خدا پسند نہیں کرتا زیادہ خوش ہونے والوں کو۔

مسرت کی دو قسمیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش نہ ہونا چاہئے پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے مگر دراصل

ان میں تعارض نہیں بلکہ یہ دونوں حالتیں جدا جدا ہیں۔ جن کے متعلق تشبیہ کی گئی ہے ایک خوشی اضطرابی ہے جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری ایک ہسیانی روپے یا اثرائیوں کی کھو گئی جس سے آپ بہت پریشانی میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ دفعہ کسی نے ہاتھ میں لاکر دی ایک خوشی تو اس وقت ہے یہ اضطرابی اور بے اختیاری خوشی ہوگی اور ایک یہ صورت ہے کہ ہسیانی گم ہونے پر تم نے نوکروں کو خوب مارا پینا اب خدا جانے وہ ان کو ملی یا نہیں مگر بے چاروں نے ڈر کے مارے لاکر دی ایک خوشی اس پر ہے یہ اختیاری خوشی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے پہلی خوشی جو آپ کو ہوگی وہ اترانے کی نہ ہوگی بلکہ شکر کی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کھوئی ہوئی چیز ملی گئی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز و تکبر کی ہوگی کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی ورنہ یہ ہسیانی کیسے ملتی۔

عید میلاد النبی ﷺ کے دلائل اور ان کے جوابات

اب موجدین عید کے دلائل کی تقریر اور اس کا جواب سنئے اور ان کی طرف نسبت دلائل کی میں نے اس احتمال سے کر دی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے بلکہ اگر وہ تو برسوں بھی کوشش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو اسی واسطے جی تو نہ چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیئے جائیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش نہ رہے اس لئے میں ان دلائل کو بھی مع جواب نقل کئے دیتا ہوں۔

اول یہ آیت **قُلْ يَفْضِلُ اللَّهُ وِجْهَتَهُ فَيُؤَخِّرُهُ فَيُنَالُ فَيُفْرِحُوا** سے استدلال کر سکتے ہیں کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا ثابت ہو اور یہ عید میلاد النبی ﷺ بھی اظہار فرحت ہے لہذا جائز ہے۔

جواب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا نکلا اور گفتگو اس بیت خاص میں ہے لہذا اس آیت سے اس کو کوئی مس نہیں اور اگر اس کلیہ میں داخل کرنا اس کا صحیح ہو تو فقہاء نے کتب فقہ میں جن بدعات کو رد کا ہے وہ بھی کسی نہ کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہو سکتی ہیں چاہئے کہ وہ بھی جائز ہو جاویں حالانکہ کتب فقہ جو مسلم عند الفریقین ہیں ان میں ان کی ممانعت مصرحاً مذکور ہے اور ان اہل زلیخ کو ہمیشہ یہ دھوکا ہوتا ہے اور یہ تجائل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قضیہ کا موضوع ایک ہے اسی بناء پر اہل حق پر اعتراض کر دیتے ہیں چنانچہ یہاں بھی مقالہ ہے ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں وہ بیت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت فلیرحوا سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلقہ ہے پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں حالانکہ صحیح نہیں بلکہ اگر غور سے کام لیا جائے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں اس لئے کہ یہ موجدین تو سال بھر میں ایک ہی مرتبہ خوش ہوتے ہیں اور درمیان میں ان کی فرحت منقطع ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت خوش

ہیں پس جو فرح کو منقطع کر دیں وہ آیت کے تارک ہیں ہم تو کسی وقت بھی قطع نہیں کرتے، پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی عمل کرتے ہیں اور دلائل منع بدعات پر بھی عامل ہیں اور اہل بدعت کو دونوں امر نصیب نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ فرح مامور بہ کے تین درجے ہیں۔ ۱- افراط ۲- تفریط ۳- اعتدال
تفریط تو یہ ہے کہ تجدید بالجاء الہملمہ کر دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ختم ہوگئی جیسا بعض خشک مزاجوں کے کلام سے مترشح ہو گیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جاری رکھیں مگر حدود شرعیہ سے تجاوز کریں جیسا اہل تجدید باجمہ ائمہ کا طریق متعارف ہو گیا اور اعتدال ادامتہ میں ہے پس ہم نہ محدود ہیں نہ مجدد بلکہ مدیم ہیں
والحمد لله على ذلك

دوسرا استدلال موجدین کا اس حدیث سے ہو سکتا ہے کہ جب ابولہب نے حضور ﷺ کی ولادت کی خبر سنی تو خوشی میں آ کر ایک بانڈی آزاد کر دی تھی اور اس پر عقوبت میں تخفیف ہوگئی۔ پس معلوم ہوا کہ ولادت پر فرح جائز و موجب برکت ہے۔

جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس پر ہر وقت عامل ہیں۔ گفتگو تو اس ہیئت کذائیہ میں ہے

تیسرا استدلال اس آیت سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يُعِيسِي ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ اَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ (الی قولہ) رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عَيْدًا لِاَوْلَانَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِنْكَ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادیں (عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعا تک) کہ اے اللہ! ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جاوے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا کہ امم سابقہ کے شرائع اگر حق تعالیٰ ہم پر نقل فرما کر ان پر انکار نہ فرمادیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطاء نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے۔ اور حضور ﷺ کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظیمہ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو جہاں وہ منقول ہے دیکھئے وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَؑ مِمْسُوْخٌ ہے اور سجدہ تحسینہ و سجدہ تعظیسی ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا لیکن یہاں اس پر انکار منقول نہیں۔ اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیت واحادیث ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں۔

یہ جواب تو اس تقریر پر ہے جب کہ آیت کے معنی یہی ہیں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول ماندہ کی تاریخ کو عید بنا دیں۔ اس لئے کہ نیکون میں ضمیر ماندہ کی طرف راجع ہے۔ پس اس سے یوم نزول الماندہ لینا مجاز ہوگا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا پس معنی یہ ہیں تكون المائدة سرور النائی یعنی وہ ماندہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہو جاوے عید کے معنی متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی ﷺ ہی مراد ہو۔

جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م ت ع آتا ہے اس سے متعہ کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک گویا شیخ سعدی کے شعر ۔ تمتع زہر گوشہ یا فتم سے بھی متعہ نکلتا ہے اور آیت رَبَّنَا اسْمَعْ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ کے بھی یہی معنی ہیں کہ اے رب! ہمارے بعض نے بعض سے متعہ کیا ہے ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع ی د آوے اس سے عید میلاد النبی ﷺ کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

چوتھا استدلال اس قصہ سے یہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے ہی دن نازل ہوئی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوئی ہے اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے نزلت عنی یوم جمعة و یوم عرفة یہ حدیث کا مضمون ہے تقریر استدلال کی اس حدیث سے یہ ہے کہ حضرت عمر و ابن عباس نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا، معلوم ہوا کہ عطائے نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک بھی نہ سوجھتا لیکن ہم نے تمبر عاقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گنجائش ہو سکتی ہے۔

اس کے دو جواب ہیں ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو چنانچہ ہمارے فقہاء نے تعریف یعنی یوم عرفہ میں حجاج کی مشابہت سے جمع ہونے پر انکار فرمایا ہے یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں نیز حضرت ابن عباس نے تھیب کو لبس بشیء کہا ہے حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر صرف عادت کو عبادت سمجھنے سے انہوں نے یہ انکار فرمایا تو غیر منقول کو قربت سمجھنا تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا اور حضرت عمرؓ کا انکار اجتماع علی شجرة الحدیبیہ پر مشہور ہی ہے پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہو گیا کہ ہر ہر مقام پر منقول نہ ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا یہودی تھا اس کو خاص طور پر الزامی جواب دیا کہ ہمارے

یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنانا جائز نہیں، یعنی مطلب حضرت عمرؓ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں چونکہ تعید جائز نہیں ہے اس لئے ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے مگر خدا تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس یوم کو عید بنا دیا۔

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ یہ کر سکتے ہیں کہ جناب رسول ﷺ نے پیر کے دن روزہ رکھا کسی نے وجہ پوچھی تو یہ ارشاد فرمایا ذالک الیوم اللہی ولدت فیہ یعنی میں اس دن پیدا ہوا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم الولادة عبادت اور قربت کا دن ہے اور فرحت و سرور علی الولادة قربت ہے لہذا یہ جائز ہے۔ اس کے بھی دو جواب ہیں اول تو یہ کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یوم ولادت ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے کہ دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جمعرات اور پیر کو نامہ اعمال پیش ہوتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزہ کی حالت میں پیش ہوں اس سے صاف معلوم ہوا کہ علت صوم کی عرض اعمال ہے پس جب یہ علت ہوئی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت ہوگا اور مدار حکم کا علت ہوتی ہے اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہو تو تم نے حکمت اصل علت کو ٹھہرا دیا حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے مورد کے ساتھ خاص ہو ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ بھی ہو اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہما کیوں منقول نہیں اور نیز مثل صوم یوم الاثنین کے کہ یوم ولادت ہے تاریخ ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے روزہ رکھنا چاہئے دوسرے یہ کہ نعمتیں اور بھی ہیں مثلاً ہجرت فتح مکہ معارج وغیرہ آپ نے ان کی علت سے کوئی عبادت کیوں نہ فرمائی۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام نہیں ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادت کو ذکر فرمایا اور نہ دوسری نعمتوں کے دن بھی روزہ و تعید چاہئے اور اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے تمام نعمتوں کی پس ولادت اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص کی گئی تو ہم کہتے ہیں کہ حمل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرانا چاہئے۔

پھر حیرت یہ ہے کہ یوم الولادة دو شنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تاریخ الولادة یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید مناویں یوم الاثنین میں تو حضور ﷺ نے ایک عبادت بھی کی ہے اور تاریخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس دلیل کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہر پیر کو عید کیا کریں غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجدین عید کا ثابت نہیں ہوتا یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے۔

عقلی تردید

اب ہم اس بات میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں سے بعض عقل پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے ہیں جو راجع ہیں ملک اور قوم کی طرف اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ جس قدر عبادات شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس اعتبار سے مامور بہ کی چند قسمیں نکلتی ہیں۔ اول تو یہ کہ سبب میں بھی تکرار ہو یعنی سبب بار بار پایا جاتا ہو تو سبب کے تکرار ہونے سے سبب بھی تکرار پایا جاوے گا۔ مثلاً وقت صلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت آوے گا صلوٰۃ بھی واجب ہوگی اسی طرح صیام رمضان کے لئے سبب ہے جو شہود شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کے لئے فطر اور اضحیہ کے لئے یوم اضحیہ بھی اسی باب سے ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ سبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے بیت اللہ شریف حج کے لئے چونکہ سبب ایک ہے اس لئے مامور بہ یعنی حج عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے یہ دونوں قسمیں تو مدرک بالعقل ہیں اس لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار اور تو حد سے سبب تکرار اور متوحد ہو۔

تیسری قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور سبب کے اندر تکرار ہو جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب ارادة قوت تھی اب وہ ارادة قوت تو ہے نہیں اس لئے کہ قصہ اس کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ آئے تو مشرکین نے کہا تھا کہ ان لوگوں کو یرب کے بخار نے صعیف اور بودا کر دیا ہے تو حضور ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں یعنی شانے ہلاتے ہوئے اکڑ کر طواف کرو تا کہ ان کو قوت مسلمین کی مشاہد ہو اب وہ سبب تو نہیں لیکن مامور بہ یعنی رمل فی الطواف بحالہ باقی ہے۔ یہ امر غیر مدرک بالعقل ہے اور جو امر خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ عید میلاد النبی کا سبب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی ولادت کی تاریخ ہونا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گزر گئی یا بار بار آتی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ ختم ہوگئی کیونکہ اب جو تاریخ الاول کی تاریخ آتی ہے وہ اس خاص یوم الولادة کے مثل ہوتی ہے۔ نہ کہ عین؟ اور یہ ظاہر ہے پس مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل عقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مدرک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا۔

لیکن یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ ولادت سے فرمائی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہو سکتا ہے کہ یوم الولادة گزر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم اصل کا کیوں ہو جواب یہ ہے کہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہو سکتا۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَمَحُزْنُوْنَ ۝

الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُوْنَ ۝

ترجمہ: یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ (خطرناک واقعہ پڑنے والا) ہے اور نہ وہ (کسی مطلوب کے فوت ہونے پر) مغموم ہوتے ہیں وہ اللہ کے دوست (ہیں جو ایمان لائے اور) معاصی سے پرہیز رکھتے ہیں۔

تفسیری نکات ولایت کی دو قسمیں

فرمایا ولایت دو قسم کی ہے ایک عام دوسری خاصہ ولایت عامہ کو اس آیت میں اللہ ولی اللین آمنوا الآیة میں بیان فرمایا یہ ولایت عامہ صرف ایمان سے حاصل ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اس آیت میں عمل صالح کی بھی قید نہیں اور ولایت خاصہ اس آیت میں الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَمَحُزْنُوْنَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُوْنَ ۝ میں بیان فرمایا اس ولایت خاصہ کے دو لوازم ہیں۔

۱- کثرت ذکر ۲- دوام طاعت اور ذکر میں بجائے دوام کے کثرت اس لئے کی گئی کہ دوام کی تکلیف سخت مشقت ہے جو مد فوع ہے (صوفی الخالق)

قَالَ قَدْ أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمْ فَاَسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعْنَ سَبِيلَ

الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ: حق تعالیٰ نے فرمایا تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی سو تم (اپنے منہجی کام یعنی تبلیغ پر) مستقیم رہو اور ان لوگوں کی راہ نہ چلنا جن کو علم نہیں۔

تفسیری نکات

دعا کو فوراً قبول ہونا ضروری نہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لئے بدعا کی تھی اور اس پر أُجِيبَتْ دَعْوَتُكُمْ بھی فرما دیا گیا تھا مگر

موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کی اس قبولیت کا ظہور چالیس برس بعد ہوا تھا۔ بڑی ہی دلیری کی بات ہے کہ ادا ہر دعاء کی اور ادا ہر مستعجلانہ انتظار یہ بات تو انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی نہیں ہوئی جن کی شان یہ تھی کہ مستجاب الدعوات تھے۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ

بَغْيًا وَعَدُّوا الْحَشَىٰ إِذَا آدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ أَمِنْتُ أَنَّهُ لَآ إِلَهَ

إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ⑩

الَّذِينَ وَقَدُ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ⑪

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو اس دریا سے پار کر دیا پھر ان کے پیچھے پیچھے فرعون ہے۔ اپنے لشکر کے ظلم اور زیادتی کے ارادے سے (دریا میں) چلا یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا (اور ملائکہ عذاب کے نظر آنے لگے) تو (سراسیمہ ہو کر) کہنے لگا میں ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس کے کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں داخل ہوتا ہوں جو اب دیا گیا کہ اب ایمان لاتا ہے اور (معاذ آخرت کے) پہلے سے سرکشی کرتا رہا اور مفسدوں میں داخل رہا (اب نجات چاہتا ہے)

تفسیری نکات

فرعون نے صرف تکلم بکلمۃ الایمان کیا

فرمایا آیت سورہ یونس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے تکلم بکلمۃ الایمان کیا جو تصدیق پر کوئی کلمہ دال نہیں سو اس سے عند اللہ اس ایمان کا مقبول ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر مان لیا جاوے کہ تصدیق بھی تھی تو یہ تصدیق اضطراری تھی جو کہ اکثر کفار کو حاصل ہے کما قال اللہ تعالیٰ یَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ اور خود فرعون کو بھی قبل سے تھی وَجَعَلُوا بِهَا أَسْتِيقَاتَهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا مگر فرق اتنا تھا کہ اس سے پہلے تکلم نہیں کیا تھا اس وقت تکلم کیا سو یہ تکلم ممکن ہے کہ عذاب غرق سے بچنے کے لئے ہونہ انقیاد و تسلیم کے طور پر جس طرح اس کی نظیر پہلے بھی ہوئی تھی۔ قَالَ يُوسُفُ إِذْ دَعَاكَ رَبُّكَ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا عَذَابَ الْجُحْرِ لَأُؤْتِيَٰنَكَ وَلَنُؤْتِيَٰنَكَ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ اٰلِ آخِرَةٍ اور ایمان مامور بہ اور مقبول وہ ہے جس میں تصدیق اختیاری ہو اور تکلم انقیادی ہو اس لئے اس آیت سے اس کا مومن مقبول الایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا اور جو قول حضرت شیخ اکبر قدس اللہ سرہ کی طرف منسوب ہے حسب تحقیق شیخ عبدالوہاب شعرانی جیسا کہ

الیواقیت والجوہر میں ہے وہ شیخ اکبر کے کلام میں مدسوس ہے دوسرے نصوص سے اس کا ناری ہونا صاف ثابت ہوتا ہے جس میں تاویلات کی گنجائش نہیں اور خود شیخ کی آخری تصنیفات میں فرعون کا ناری ابدی ہونا درج ہے۔ جیسا کہ الیواقیت والجوہر میں ہے اور ایسے احتمالات و تاویلات سے تو کوئی کلام خالی نہیں۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کا بغض فرعون

نیز احادیث سے بھی ملائکہ میں عشق و محبت کے وجود کا پتہ چلتا ہے چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا فرعون کے منہ میں کچھ ٹھونسنا غلبہ محبت حق ہی کی وجہ سے تھا۔ جس سے فرعون کے ساتھ بغض فی اللہ بدرجہ غلبہ پیدا ہو گیا کیونکہ جب وہ ڈوبنے لگا تو کہنے لگا اَمَنْتُ اِنَّكَ اِلَهٌ اِلَّا الَّذِيْ اَمَنْتُ بِهٖ بَنُوْا لِيْ اَرْسُلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰﴾

حضرت جبرائیل علیہ السلام کو غصہ آیا کہ کم بخت نے ساری عمر تو خدائی کا دعویٰ کیا۔ اب مرتے ہوئے ایمان لاتا ہے وہ اس کم بخت کے لئے رحمت کو گوارا نہ کرتے تھے اس لئے منہ میں کچھ ٹھونس دیا تاکہ زبان سے پوری طرح بات نہ نکل سکے مبادا کہیں رحمت متوجہ ہو جائے چنانچہ ترمذی کی روایت میں خود حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے فَاَدْمَسَ فِيْ فِیْهِ مَخَافَةَ اَنْ تَدْرِكَهُ الرَّحْمَةُ

حضرت جبرائیل نے اس کے منہ میں کچھ ٹھونس دیا مبادا رحمت خدا اس کی طرف متوجہ ہو جاوے۔ اور اگر اس پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت جبرائیل نے ایک شخص کو اسلام سے روکا حالانکہ اسلام سے روکنا جائز نہیں۔ سو اس کا علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذاب دیکھنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَلَمَّا رَاكَ يَنْفَعُكُمْ اِيْمَانُهُمْ لِقَارِ وَاَوْهَابُ سَوَانَ كُوَانِ كَا يِه اِيْمَانِ لَانَا نَافِعٌ نَه هُوَا جِب اِنُهَوْنَ نَه هَمَارَا
عذاب دیکھا۔

تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورت اسلام سے روکتے تھے جس پر گورحمت فی الاخرۃ مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہو سکتی ہے جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل و اسر سے محفوظ رہے اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق و اہلاک سے بچ جاتا۔

پھر اس پر اگر کوئی سوال کرے کہ اس آیت میں باسنا سے مراد عذاب دنیا تو ہے نہیں کیونکہ عذاب دنیا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں اور ظاہر ایہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے چنانچہ بعض مختصرین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی پہچانا چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں

تم ان سے پردہ کرو تو ابتداء انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے اور فرعون کے واقعہ سے ظاہر ابھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے چنانچہ اس کا قول امنت بالذی امنت بہ بنوا اسرائیل بتلا رہا ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل کا حق پر ہونا اور ان کا مومن ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کا ہوش ضرور تھا لیکن اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے پس اس دلیل سے انکشاف آخرت کی نفی نہیں ہو سکتی اور یہ انکشاف مانع ہے قبول ایمان سے پس اشکال رفع ہو گیا۔

اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان سے اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشاف آخرت کے مقبول نہ تھی اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جاوے پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جائے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہئے اگرچہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو اور یہاں عجز ہو گیا کچھ کی وجہ سے تو وہ اقرار مفید تحقق ہو گیا پھر کچھ ٹھونسنے سے کیا فائدہ ہوا؟

سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گزرا کہ جبرائیل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس لئے گوارا نہیں کیا اگرچہ رحمت ظاہر کا ایک گونہ ظہور نعش کو محفوظ رکھنے سے ہو گیا جیسا کہ ارشاد ہے **قَالِیَوْمَ نُنْفِیْکَ بِمَدَنِکَ الْاٰیۃ** آج ہم تیرا بدن مثال کے لئے قائم رکھتے ہیں۔

مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اسی ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا۔ اس کا جواب وہی ہے جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا انشاء غلبہ بغض فی اللہ تھا اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا اس مبغوض حق سے ایسا بغض بدوں غلبہ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔ اسی طور پر حدیث سے معلوم ہو گیا کہ ملائکہ میں محبت عشقیہ ہے اور شیطان میں یہ محبت نہ تھی اس لئے وہ کم بخت سجدہ نہ کر سکا پس محبت کا ہونا ضروری ہوا بغیر محبت کے نری طاعات و عبادات و علوم کافی نہیں کیونکہ ان کا بھروسہ کچھ نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ محبت طبعی ہی کا غلبہ ہو بلکہ محبت عقلی کا غلبہ بھی کافی ہے۔

سُورَةُ هُود

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا

﴿تَنْجِیۡ۟﴾: اور کوئی (رزق کھانے والا) جاندار روئے زمین پر نہیں کہ اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو۔

تفسیری نکات

اس جگہ ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ **وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا** اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

ہر شخص کی روزی اللہ کے ذمہ ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا رزق خدا کے ذمہ ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ قحط کے زمانہ میں بھوکوں مرجاتے ہیں اس کا جواب یہ ہے رزق تمام اضافت ہے جس سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کا رزق مقدر ہے اس کا پہنچانا خدا کے ذمہ ہے اب جو لوگ بھوکوں مرجاتے ہیں ان کا رزق ہی نہ رہا تھا۔ اس لئے وہ فاقہ سے مر گئے اگر ان کا رزق باقی ہوتا تو کبھی فاقہ سے مرتے۔

واعظین کی ایک غلطی

اور اسی طرح بعض واعظین کہہ دیا کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے وعدہ رزق کا فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے **وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا** تو پھر لوگ پریشان کیوں ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اس آیت پر ایمان نہیں ہے سو یاد رکھو کہ یہ الزام بھی محض غلط ہے کہ اس آیت پر مسلمانوں کا ایمان نہیں ہے نہیں ضرور سب کا ایمان ہے اور باوجود ایمان ہونے کے پریشانی بھی اس کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے تفصیل

اس اجمال کی یہ ہے کہ وعدے دو قسم کے ہیں۔ ایک مبہم اور ایک معین اللہ تعالیٰ نے مبہم وعدہ فرمایا ہے کہ رزق ملے گا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ کب ملے گا اور کہاں سے ملے گا اور کس طریق سے ملے گا اور کتنا ملے گا تو پریشانی بوجہ ابہام کے ہے اور ساتھ ہی اس مبہم وعدے پر پورا یقین ہے کہ وقت مقدر پر ضرور ملے گا بعض واعظین اسی الزام کے موکد کرنے کے لئے مثال دیا کرتے ہیں کہ اگر کوئی دوست دعوت کر دے تو اطمینان ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اطمینان نہیں یہ بھی غلط اور قیاس مع الفارق ہے اور خواہ مخواہ مسلمانوں کو کافر بنانا ہے واللہ اعظیم اگر حق تعالیٰ کے کلام مجید میں معین وعدہ ہوتا تو ہرگز ہرگز کسی کو بھی پریشانی نہ ہوتی اور اگر دعوت میں وقت معین نہ کیا جاوے مبہم کہہ دیا جاوے کہ کسی وقت کی دعوت ہے تو وہاں بھی اطمینان نہ ہوتا یہی بات فرمائی ہے کہ رزق ملے گا اس پر ایمان ہے شریعت میں غلو نہ کرنا چاہئے۔ جس قدر جو بات ثابت ہو اس پر رہنا چاہئے اہل کتاب کو ارشاد ہے باہل الكتاب لا تغلوا فی دینکم یعنی اے اہل کتاب دین میں غلو نہ کرو باوجود ان کے غیر مکلف بالفروع ہونے کے ان کو خطاب کیا گیا تو ہم تو بطریق اولیٰ اس مامور بہ کے مکلف ہوں گے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا

اتباع دین میں ضرورت سعی

ہر جاندار کی روزی خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے جو بدوں سعی کے بھی اس کو مل سکتی ہے مگر اس پر بھی لوگ دنیوی مقاصد میں سعی کو ضرور سمجھتے ہیں اور آخرت کے ثمرات کا وعدہ تو بدوں سعی کے ہے ہی نہیں چنانچہ صاف ارشاد ہے مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔

یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کا ثمرہ ملے گا جیسا کریگا ویسا بھرے گا پھر تعجب ہے کہ لوگ دین میں سعی کو کس لئے ضروری نہیں سمجھتے جب کہ بدوں سعی کے اس کے حصول کا وعدہ نہیں اہل اللہ نے اس فرق پر نظر کر کے دنیوی مقاصد کے لئے سعی کو ترک کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ روزی کا ذمہ تو حق تعالیٰ نے لے لیا ہے اس کے لئے سعی کی کیا ضرورت ہے اور دین کے کاموں کو ہمارے اوپر چھوڑ دیا ہے ہم کو اس کے لئے سعی کرنا چاہئے۔

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ دنیا خدا کا ایک گھر ہے اور ہم یہاں مہمان ہیں اور حدیث میں وارد ہے الضیافة ثلاثة ایام کہ مہمانی تین دن تک کرنی چاہئے جب ہم دنیا میں آئے تو تین دن تک تو ہم خدا تعالیٰ کے مہمان ہیں اور خدا تعالیٰ کے یہاں ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وان یوما عند ربک کالف سنة مما تعدون تو ہم کو تین ہزار سال کے لئے تو بالکل بے فکری ہے اگر اس سے زیادہ عمر ہوئی تو پھر کچھ انتظام سوچ لیا جائے گا۔

طبعی و عقلی خوف کا فرق

اب یہاں سے واضحین کی غلطی معلوم ہوگئی کہ وہ اپنے وعظوں میں اس قسم کے مضامین بیان کیا کرتے ہیں کہ فسوس ہے مسلمانوں کو خدا پر اتنا توکل بھی نہیں جتنا ایک دوست پر بھروسہ ہوتا ہے اگر ایک دوست یہ کہہ دے کہ شام کو تمہاری دعوت ہے تو فوز چولہا ٹھنڈا کر دیں گے اور خدا تعالیٰ فرماتے ہیں **وَمَا صِرْتُ إِلَّا رَجُلٌ بِالْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رُزُقُهَا** اور کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو مگر خدا کے وعدہ پر ایسا اطمینان نہیں ہوتا یہ ان کی غلطی ہے اس لئے کہ دوست کی دعوت پر اس واسطے چولہا ٹھنڈا کیا ہے کہ اس نے وقت کی تعیین کر دی تھی کہ شام کو دعوت ہے اور تعیین میں یہ خاصہ طبعی ہے اور خدا تعالیٰ کا وعدہ مطلق ہے کسی وقت کی اس میں تعیین نہیں ہے اگر یہاں بھی تعیین ہوتی تو کوئی مسلمان ہرگز چولہا گرم نہ کرتا۔ یہاں اہل توکل کو بھی عقلی توکل ہے۔

خوف طبعی

یہاں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے انبیاء کی نسبت فرمایا ہے **يَخْشَوْنَ اللَّهَ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ** کہ وہ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں آیا ہے کہ وہ اژدہا سے ڈر گئے تھے جو اب یہ ہے کہ وہ خوف طبعی تھا۔ اور نص میں خوف عقلی مراد ہے اور خوف عقلی انبیاء کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ہوتا کیونکہ ان کا اعتقاد یہ ہے **وَمَا هُمْ بِضَالِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا يَخْشَوْنَ اللَّهَ** کہ بدوں خدا کے حکم کے کوئی چیز ضرر نہیں دے سکتی۔ وہ ضار و نافع حق تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں۔

اس آیت میں صراحتاً بیان فرمایا ہے جو سورہ ہود کی آیت ہے

وَلَيْنَ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَكَفُورٌ ۝ وَلَيْنَ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَحٍ لَمَسْتَهُ لَيُكْفُرْنَ بِالْبَنَاتِ عَنِّي إِنَّهُ لَكَفُورٌ فَخُورٌ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝

(اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھائیں تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب دکھ درد رخصت ہوا (اب) وہ اترانے لگتا ہے اور شیخی بگھارنے لگتا ہے۔ مگر جو لوگ مستقل مزاج ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (اور وہ ان کی طرح نہیں ہوتے ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے)

رحمت ظاہرہ و باطنہ

اس میں حق تعالیٰ نے انسان کا ایک طبعی خاصہ بیان فرمایا ہے کہ اس کی حالت یہ ہے کہ اگر ہم اس کو کسی

رحمت کا مزہ چکھا کر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکر ہو جاتا ہے یہاں رحمت عام ہے رحمت ظاہرہ و باطنہ دونوں کو کیونکہ اس جگہ اس کو اطلاق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

رحمت کی دو قسمیں

دوسری جگہ تصریح فرمائی ہے کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں چنانچہ ارشاد ہے **وَاسْبِغْ عَلَيْنَا نِعْمَةً ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً** کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر اپنی نعمتوں کو کامل کیا ہے ظاہری بھی اور باطنی بھی نعمت ظاہرہ کے معنی یہ ہیں کہ محسوس ہو اور باطنہ وہ ہے جو محسوس نہ ہو خواہ دینی نعمت ہو یا دنیوی نعمت باطنہ دیدیہ کی مثال تو شوق و ذوق وغیرہ سے ایسے ہی انس واطمینان وغیرہ رنگ مختلف ہیں کسی نعمت کا رنگ کیفیت عشقہ جذبہ کے ساتھ ہے اور کسی کا سلوک و معرفت عقلیہ کے طور پر باقی نعمت ہونے میں دونوں برابر ہیں اور نعمت باطنہ دنیویہ کی مثال عقل و شعور و ادراک و تمیز و ذکاوت و فطنت و علم وغیرہ ہے بہر حال یہاں نعمت باطنہ سے اصطلاح تصوف تو مراد ہے نہیں مگر صوفیہ جن کو نعم باطنہ کہتے ہیں وہ بھی اس میں داخل ضرور ہیں گو ان میں انحصار نہ ہو اور منا کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رحمت غیر مکتبہ موہوبہ مراد ہے جس میں اختیار انسان کو دخل نہ ہو۔ کیونکہ نعمت مکتبہ اختیار یہ کے سلب پر رنج کرنے کی ممانعت نہیں نہ اس پر یہ وعید ہے مثلاً کوئی شخص نماز پڑھتا روزے رکھتا ہے پھر کسی دن یہ نعمت سلب ہو جائے کہ نماز روزہ فوت کر دے تو اس پر رنج ہونا چاہئے اور اس رنج کرنے پر کوئی وعید نہیں ہے یہ وعید تو رحمت موہوبہ غیر مکتبہ کے سلب پر رنج و پریشانی کرنے کے متعلق ہے چنانچہ منارحمتہ اس کا قرینہ ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امور غیر اختیار یہ پر مواخذہ نہیں ہے نہ سلہا نہ وجوداً اگر کوئی نعمت موہوبہ بدوں اس کے اختیار کے سلب ہو جائے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا نہ قرب میں کمی ہوگی اور اگر کوئی مصیبت و تمسک بدوں اس کے اختیار کے پیدا ہو جائے تو اس پر بھی مواخذہ نہ ہوگا نہ قرب میں کمی آئے گی بشرطیکہ اپنے اختیار کو ذرا دخل نہ دے مثلاً برے برے دوسرے سے از خود آنے لگیں۔

آگے فرماتے ہیں **أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ** اس میں اول مغفرت کو مقدم فرمایا اس کا مزہ عشاق سے پوچھو غیر عشاق کو اس کی زیادہ قدر نہ ہوگی وہ تو سمجھیں گے کہ بس صبر اور اعمال صالحہ کا صلہ کیا ملا کہ گناہ بخش دیئے گئے نہ جنت کا ذکر ہے نہ حور و قصور کا مگر عشاق کے دل سے اس کی قدر پوچھو کہ وہ اس کو سنتے ہی زندہ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ تو طلب رضای میں مرتے ہیں اور جنت کی طلب بھی اور رضای کے لئے کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

باتو دوزخ جنت است اے دلربا بے تو جنت دوزخ ست اے جانغز

اَنْلِزْمَكُوهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ

ترجمہ: کیا (اس دعویٰ یا دلیل کو) تمہارے گلے مزہ دیں گے اور تم نفرت کئے جاؤ؟

تفسیری نکات

نفی جبر

کہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ میں مشہور یہ ہے کہ یشاء کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے کہ اللہ میاں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور یہ عقیدہ بالکل حق ہے مگر بعضے کج فہم اس سے جبر پر اور ترک سعی پر استدلال کرنے لگے کہ جو جواب ظاہر ہے کہ اس مشیت سے مشیت عبد کی نفی لازم نہیں آئی کہ جبر پر استدلال ہو سکے لیکن ایک دوسرا جواب بھی جو ایسے اخصیاء کے لئے زیادہ اہل ہے میرے خیال میں آیا کہ یشاء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو یعنی جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کر دیتے ہیں اور یہ امر مشاہد ہے کہ جو شخص ہدایت چاہتا ہے اس کو ہدایت فرمائی دیتے ہیں

اگرچہ یہ تفسیر کسی سے منقول نہ ہو مگر تاہم اس کی دوسری آیت سے ہوتی ہے

اَنْلِزْمَكُوهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كِرْهُونَ یعنی عادت خداوندی یہی ہے کہ جب آدمی ارادہ کرتا ہے اس وقت حق تعالیٰ کی مشیت بھی متعلق ہو جاتی ہے۔

مسئلہ تقدیر

پھر اگر کوئی اس پر اشکال وارد کرے کہ خود ارادہ اس کا بھی تو مشیت حق پر موقوف ہے یعنی ہم نے یہ مانا کہ جب یہ ارادہ کرتا ہے اس وقت خدا تعالیٰ چاہتے ہیں بلا اس کے ارادہ کئے ہوئے خدا تعالیٰ کسی پر اپنی ہدایت کو نہیں چمٹاتے مگر خود اس کا ارادہ بھی تو خدا تعالیٰ ہی کی مشیت پر موقوف ہے یعنی بدوں خدا کی مشیت کے تو یہ ارادہ بھی نہیں کر سکتا بلکہ پہلے خدا کی مشیت ہوگی پھر بندہ کا ارادہ ہوگا چنانچہ صاف ارشاد ہے

وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ تو اصل یہ ہے کہ بے شک بندہ ارادہ اسی وقت کرتا ہے جب خدا کی مشیت ہو اور بدوں خدا کی مشیت کے بندہ ارادہ نہیں کر سکتا۔ مگر تم کو تو پہلے سے معلوم نہیں کہ خدا تعالیٰ کی مشیت نہ ہوگی بس تم مشیت کر کے تو دیکھو اور چاہ کر دیکھو جب تم اپنی مشیت پوری کر لو اور اس وقت بھی اگر خدا کی مشیت نہ ہو تب بے شک تم مجبور سمجھے جاؤ گے بس تمہاری مشیت خدا تعالیٰ کی مشیت کی دلیل انی ہوگی یعنی قبل سے تمہیں کیا معلوم کہ خدا کی مشیت نہیں ہوگی یہ تو بعد میں معلوم ہوگا اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس

وقت تمہاری طرف تمہارا کام نہ کرنا یہ دلیل لمبی ہے تمہاری بد معاشی اور شیطنیت کی کیونکہ اس وقت تمہیں خدا کی عدم مشیت کی کیا خبر، غرض اگر مشیت کے وجود یا عدم کی ایسی ہی تحقیق مطلوب ہے تو تم مشیت کر کے دیکھو کہ خدا کی مشیت ہوئی یا نہیں اس وقت معلوم ہوگا کہ مشیت ہوئی اور بدوں اپنی مشیت کے تم نے مشیت حق کی نفی کا کیسے حکم لگا دیا یہ تو تحقیقی جواب ہے۔

اور الزامی جواب یہ ہے کہ مشیت الہی عام ہے دنیوی اور اخروی تمام افعال کو تو جیسا اخروی افعال میں یہ عذر ہے کہ اگر حکم خداوندی ہوگا اور خدا کی مشیت ہوگی تو کار خیر کر لیں گے تو دنیاوی افعال میں بھی ایسا ہی کیا کرو مگر دنیاوی افعال میں تو ایسا نہیں کرتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق مقصود نہیں ہے محض شرارت ہے۔

قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَىٰ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَجْرِمُونَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ قرآن میں نے اپنی طرف سے بنا لیا ہے تو اس کا جرم میرے ذمہ ہے اور میں تمہارے جرموں سے بری ہوں یعنی جو کرے گا بھرے گا نہ تم میرے ذمہ دار ہونہ میں تمہارا۔

مسئلہ کی دلیل بیان کرنا ہمارے ذمہ نہیں

فرمایا جب کوئی ہم سے مسئلہ پوچھتا ہے تو ہم بتا دیتے ہیں اور خوب سمجھا دیتے ہیں اور دلیل نہیں بیان کرتے کیونکہ دین کا بتانا جس قدر واجب ہے جس کے کتمان پر عید ہے صرف فتویٰ ہے دلیل کا بیان کرنا واجب نہیں 22 شوال روز دو شنبہ در مسجد

فوائد و نتائج ۱۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت والا مسئلہ کی دلیل کبھی بیان نہیں فرماتے تمام تصانیف موعظ حضرت والا کے اس کے شاہد ہیں کہ کس وضاحت اور ثبوت کے ساتھ ہر بات کو بیان فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہر جگہ دلیل کے بیان کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے بہت سے موقع پر اسے بھی ہوتے ہیں کہ دلیل کا بیان کرنا بیکار ہوتا ہے بلکہ بعض جگہ معضرت ہوتا ہے تو حال یہ ہوا کہ مفتی کو موقع محل کا سمجھنا اور مستفتی کی حالت کا اندازہ کرنا از حد ضروری ہے قکلموا الناس علیٰ قدر عقولہم جہاں دلیل کے بیان کرنے سے نفع ہو بیان کرے ورنہ نہ کرے بلکہ بعض موقعوں پر نفس مسئلہ کا جواب دینا بھی غیر ضروری بلکہ معضرت ہوتا ہے علماء کو اس کا بہت خیال چاہئے جیسا کہ رائج ہے کہ جو کچھ بھی پوچھا جاوے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا جاتا ہے جو سوال سینکڑوں دفعہ کئے گئے اور وہ مسائل ضرورت سے زیادہ منفتح ہو چکے لوگ پھر بار بار پوچھتے ہیں اور نا تجربہ کار عالم اس کی از سر نو تنقیح کرنے لگتے ہیں گڑا ہوا فتنہ پھر ادا کھڑا آتا ہے اور سوائے تو تو میں میں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا راقم سے ایک جگہ پوچھا گیا کہ کوئے کی نسبت تیرا کیا خیال ہے راقم کو معلوم تھا کہ یہ لوگ صرف بک بک

کرنے والے ہیں نہ تحقیق کی قابلیت ہے نہ تحقیق مقصود جواب دیا کہ اس باب میں دو فریق ہیں محرم اور بیح ایک کے ساتھ مجھے بھی سمجھ لیجئے اور اگر دوبارہ پوچھو گے تو جواب یہ ہے کہ میں نہیں بتاتا کہ میرا کیا خیال ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی سوال کا جواب نہ دینا من مثل عن علم فکتمة الجہم بلجام من النار کے مصداق بنا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے سوال سوال بھی علم ہی نہیں کیونکہ مقصود علم نہیں مقصود فتنہ پرداز ہی ہے مجاہدین کے جواب میں خود حضور ﷺ کو حکم ہوا کہ سوال جیسا جواب دے کر ٹال دیجئے کہیں فرماتے ہیں لا حجة بیننا و بینکم اور کہیں التحریتہ فعلیہ اجرامی وانا بری ما تجرمون اور کہیں قل ان التحریتہ فلا تملکون لی من اللہ شینا وغیرہ من الآیات ہاں طالب علموں اور سمجھدار لوگوں سے اور تحقیق پسندوں سے دلیل بیان کرنا اور تشریح کر دینا مناسب ہے واجب یہ بھی نہیں حالانکہ معلم تنخواہ اسی کی پاتا ہو حضرت والا کے پاس ایک سال آیا کہ اوج بن عنق اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کا عصا کتنے کتنے لے لے تھے جواب لکھا کہ جیسا یہ سوال غیر ضروری ہے جواب کی بھی ضرورت نہیں کسی سال کے جواب میں تحریر فرمادیتے ہیں مجھے فرصت نہیں کسی کو لکھ دیتے ہیں کسی اور عالم سے پوچھ لو کسی کا جواب نہیں دیتے اور اگر جواب کے لئے ٹکٹ بھیجا ہو تو اس کو واپس کر دیتے ہیں۔ کسی کو لکھ دیتے ہیں کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق منظور نہیں لہذا تضرع وقت سمجھ کر سکوت کیا جاتا ہے کسی سے ایک دفعہ اصل مسئلہ کی تقریر کر کے فرما دیا اس سے زیادہ مجھ کو معلوم نہیں آپ کی تشریح مجھ سے۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَهُ

ترجمہ: حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں لیکن جس پر وہی رحم کرے۔

تفسیری نکات

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے ایک آیت کی تفسیر

فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں جو یہ آیت آتی ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَهُ اس کی تفسیر میں اکثر آئمہ تفسیر نے یہ فرمایا ہے کہ یہاں عاصم بمعنی معصوم ہے فرمایا کہ اس میں تکلف ہے اور بے تکلف تفسیر یہ ہے کہ یہاں اصل میں دو جملے تھے ایک لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ دُورًا لَا مَعصوم الا من رحم ان دونوں کو ملا کر ایک جملہ میں ادا کر دیا گیا۔ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَهُ

وَيَقَوْمٍ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ

مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا جُرْمِيْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کرو (یعنی ایمان لاؤ) پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارش برسا دے گا اور (ایمان و عمل کی برکت سے) تم کو اور قوت دے کر تمہاری (موجودہ) قوت میں ترقی کر دے گا۔ (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو ۱۲۔

تفسیری نکات

اصلاح کے دو درجے

حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم کو ارشاد فرماتے ہیں اے میری قوم اپنے رب سے مغفرت مانگو پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ خلاصہ ارشاد کا اصلاح کے دو درجے ہیں اول اپنے گناہ معاف کرانا اس کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف طاعت کے ساتھ متوجہ ہونا اس پر کیا ثمرہ مرتب ہوگا يُرْسِلِ السَّمَاءَ الْسَخِ یعنی استغفار اور رجوع الی اللہ کا ثمرہ دنیا میں تم کو یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ تم پر بارش بھیجیں گے اور تمہاری قوت موجودہ کے اندر اور قوت بڑھادیں گے قوم عاقبت کے اندر مشہور ہیں آگے ارشاد ہے اور خدا تعالیٰ کے حکم سے روگردانی مت کرو جرم کرتے ہوئے یہ آیت کا ترجمہ ہوا ترجمہ سے مضمون کی اجمالی تعیین ہوگئی ہوگی کہ اس کے دو جز ہیں اول مغفرت مانگنا دوسرے طاعت کی طرف رجوع کرنا خلاصہ حاصل یہ ہے کہ آیت میں دو امور بہ ہیں استغفار اور رجوع الی الطلحہ اور دو اس کے ثمرے ہیں۔

اصلاح کے دو ثمرات

اور دو اس کے ثمرے ہیں بارش ہونا اور قوت بڑھ جانا اور کمزوری اور ضعف کا جانا رہنا اور ایک منہی عنہ ہے وہ مجرم ہو کر اعراض کرنا ہے ہود علیہ السلام نے جو اس میں فرمایا یا باعتبار مقصود ایراد کے یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا ہم کو ارشاد ہے گویا اللہ تعالیٰ ہم کو ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم کو کسی قسم کی شکایت قحط کی یا کمزوری یا اور باریا تنزل کی ہو تو اس کی تدبیر اور اس کا علاج وہ ہے جو ہم نے بتلایا ہے۔

توبہ کے لوازم

اب دوسرا جزو اصلاح کا جو آیت میں مذکور ہے یہ ہے ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ یعنی پھر بعد استغفار کے حق تعالیٰ

کی طرف طاعت کے ساتھ رجوع ہو جاؤ یہ بھی توبہ کے لوازم سے ہے۔

اصلاح کا ثمرہ

آگے اس اصلاح کا ثمرہ بیان فرماتے ہیں **يُزِيلُ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ قُتُوبًا رِازًا** یعنی تم پر بارش بہت برسنے والی بھیجیں گے یہ بارش خواہ ظاہر میں ہو یا اگر ظاہر میں دیر بھی ہوگی تو اس بارش کی روح تو ضرور ہی ہوگی اور اس کو باطن کی بارش کہنا چاہئے یعنی قلب پر رحمت کی بارش ہوگی جس کی تفصیل اوپر آچکی ہے کہ کامیابی کی غایت طمانیت قلب و راحت روح ہے **وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ** یعنی دوسرا ثمرہ یہ ہوگا کہ تمہاری موجودہ قوت کو بڑھا دیں گے اس وقت تو قوت مالی و جاہی ہے اصلاح کے بعد قوت قلب عطا فرمادیں گے پھر جو بھی مصیبت آوے گی وہ صورت مصیبت ہوگی اور حقیقت میں یہ حالت ہوگی کہ اس مصیبت پر ہزار راہیں قربان کرو گے اور زبان حال سے کہو گے۔

ہر چہ از دوست میر سد نیکوست

(جو کچھ محبوب کی جانب سے پیش آئے وہ خیر ہی ہوتا ہے)

آگے ارشاد ہے **وَلَا تَتَوَكَّلُوا بِالْغُبُورِينَ** یعنی اعراض مت کرو مجرم ہو کر مطلق ولا تھولوا نہیں فرمایا۔

تولی کی قسمیں

اس سے معلوم ہوا کہ تولی کی دو قسمیں ہیں ایک صورت تولی ایک حقیقت تولی صورت توبہ کہ بشریت سے غلطی ہوگئی ایسی غلطیوں سے انسان بچ نہیں سکتا اور حقیقت تولی ہوتی ہے مقابلانہ و باغیانہ تو فرماتے ہیں کہ باغیانہ تولی مت کرو یعنی باغی مت بنو اور گناہ سے تو کیسے پاک ہو سکتے ہو لیکن اگر گناہ ہو جائے تو ساتھ کے ساتھ توبہ کر لو حدیث شریف میں ہے **كلكم خطانون و خیر الحطائین التوابون** یعنی تم سب خطاوار ہو اور بہتر خطاوار توبہ کرنے والے ہیں۔ یہ تعلیم ہے حق تعالیٰ کی اور یہ طریق وہ ہے کہ جس سے قومی مالی جسمی دینی دنیوی ترقی ہوتی ہے اس کو پلے باندھو یا درکھو کہ ہماری دینی دنیوی فلاح دین کے ساتھ وابستہ ہے جب کبھی اس کے خلاف ہوا ہے تنزل اور پستی ادا بار اور قسط سب ہی بلائیں مسلط ہو جاتی ہیں۔

ترجمہ: اور اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ۔ (یعنی ایمان لاؤ) پھر (ایمان لا کر) اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارشیں برسا دے گا اور (ایمان و عمل کی برکت سے) تم کو اور قوت دے کر تمہاری (قوت) موجودہ میں ترقی دے گا (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے) اعراض مت کرو

خلاصہ آیت

حضرت ہود علیہ السلام کا ارشاد نقل کرنے میں ایک خاص مصلحت ہے وہ یہ کہ آپ صاحب کو معلوم ہو جاوے کہ یہ مضمون بہت ہی اہتمام کے قابل ہے اس لئے کہ قوم عاد بہت پرانی قوم ہے پس جبکہ وہ بھی اس مضمون کے مخالف ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات کوئی نہیں نہیں ہے بلکہ یہ وہ بات ہے کہ ہمیشہ سے انبیاء اپنی اپنی قوم کو کہتے آئے ہیں۔

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُّوا فِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ۖ خَلِيدِينَ

فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ

فَعَالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَلِيدِينَ

فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءٌ

غَيْرِ مَجْدُودٍ ۖ

ترجمہ: سو جو لوگ شقی ہیں و دوزخ میں ایسے حال سے ہوں گے کہ اس میں ان کی چیخ پکار پڑی رہے گی ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ آسمان وزمین قائم ہیں اگر خدا ہی کو منظور ہو تو دوسری بات ہے آپ کا رب جو کچھ چاہے اس کو پورے طور سے کر سکتا ہے۔ اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کور ہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو منظور ہو تو دوسری بات ہے وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا۔

آخرت میں دوام تحت المشیت ہوگا

یہاں دو سوال ہیں ایک یہ کہ آیت میں خداوند تعالیٰ نے دونوں مقام میں خَلِيدِينَ فِيهَا کے بعد مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ، فرمایا ہے یعنی خلود و دوام جب تک ہوگا جب تک آسمان وزمین باقی ہیں اور ظاہر ہے کہ حشر و نشر کے وقت جب صور پھونکا جائے گا تو جمیع مخلوقات کی طرح آسمان وزمین بھی فنا ہو جائیں گے۔ تو جبکہ سموات والارض فنا ہوئے اور ان کے واسطے دوام نہ ہوا تو جو خلود اس کے ساتھ ہوگا وہ خلود غیر محدود نہ ہوا تو یہ خلود نہ کفار کے واسطے دوزخ میں ہوا نہ مومنین کے واسطے جنت میں اس کا جواب یہ ہے کہ

جن آسمان وزمین کے ساتھ تحدید اور ظرفیت دوام کی اس جگہ فرمائی گئی ہے وہ آسمان وزمین ہمارے اس عالم فانی کے سموات والارض نہیں ہیں بلکہ ان سے اس عالم کے سموات والارض مراد ہیں اورن کا دوام غیر محدود ہے اور اس پر تعجب نہ کرو کہ کیا وہاں بھی آسمان وزمین ہوں گے۔ سو سمجھ لو کہ وہاں کیا آسمان وزمین تو یہاں کے آسمان وزمین سے بھی بڑے ہیں اسی کو مولانا رومی فرماتے ہیں۔

غیب را برے و پادے دیگرست آسمانے آفتابے دیگرست

وہاں کا بادل اور پانی اور ہی پانی ہے وہاں کا آسمان و آفتاب ہی جدا ہے بلکہ میں اس سے بھی زیادہ عجیب بات سناؤں خود اس عالم میں ایسی چیز موجود ہے یعنی روح میں آسمان وزمین اس آسمان وزمین سے زیادہ عجیب موجود ہیں اس کو حکیم سنائی فرماتے ہیں۔

آسمان ہاست در ولایت جاں کار فرمائے آسمان جہاں

یہاں مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کا جنت میں اور کافرین کا دوزخ میں ہمیشہ رہنا یقینی نہیں مشیت سے ہے اس میں استثناء بھی ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اگر چاہیں نکال بھی دیں گے ساری عمر کا وعدہ نہیں ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ جس سے جنتیوں کی تو کمر ٹوٹ گئی ہوگی کہ ہماری ساری تمناؤں اور آرزوں کا مدار یہی دوام تھا لیکن قسمت سے یہاں پر بھی دوام سے محروم اور خلود کو ترستے رہے۔ اور دوزخیوں کے غنچہ آرزو کھل گئے ہوں گے کہ بھائی خلود فی النار کو سن کر تمام دنیا کے مزے تلخ ہو رہے تھے چلو اس کھلنے سے نجات ملی سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں پر ما مصدریہ بمعنی ظرف ہے پس ماشاء ربک کے معانی یہ ہیں الا ان یشاء ربک یعنی خلود تو ہمیشہ رہے لیکن اگر خدا تعالیٰ کی مشیت اس کے خلاف کے ساتھ متعلق ہو جاوے تو خلود نہیں ہوگا لیکن چونکہ دلائل سے یہ امر یقینی ہے کہ مشیت رب کبھی اس کی مقتضی نہ ہوگی کہ مومنین کو جنت سے یا مشرکین کو دوزخ سے نکالا جاوے لہذا خلود کے خلاف کبھی واقع نہ ہوگا تو خلود ثابت رہا اور کوئی خدشہ خلود میں نہیں رہا باقی یہ کہ نکتہ اس استثناء میں کیا ہوا اور الا ماشاء ربک کے زائد کرنے کا فائدہ کیا ہوا تو وہ فائدہ یہ ہے کہ اس سے مخلوق کے بقاء اور رب العزت کے بقاء میں فرق ظاہر ہو گیا تاکہ کسی غیر محقق کو یہ خیال نہ ہو کہ ادوہ اب تو ہم کو بھی دوام کا سرٹیکٹ مل گیا چلو اب تک جو ہم وجوب کے درہ سے گرے ہوئے تھے اس فرق کی علت یہ ہے کہ گر انما یہ موتی دوام کا تھا جو آج ان کی فیاضی سے ہم کو مل گیا جس کے باعث آج امتیاز کا پردہ اٹھ گیا اور آج سے ہم بھی واجب بن گئے اور ان تخیلات و توہمات کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں لہذا اس قسم کے تخیلات موجبہ للشرک سے بچانے کے لئے الا ماشاء ربک فرمایا کہ اس عنوان خالدين فيہا کے معنوں دوام سے بھول نہ جانا یہ نہ سمجھنا کہ ہم مساوی واجب کے ہو کر

مملکت کے پیراہن سے خارج ہو گئے نہیں بلکہ تم ممکن ہی ہو اور ہم واجب ہی ہیں دوام اگرچہ تمہارے حصہ میں بھی آ گیا لیکن تمہارا یہ دوام تو داخل تحت المشییۃ ہے ہمارے ارادہ پر موقوف ہے کہ جب تک ہم چاہیں تم کو اس دوام میں رکھیں اور جب چاہیں کان پکڑ کے نکال باہر کریں گو نکالیں گے نہیں مگر پھر بھی تحت المشییۃ ہے بخلاف ہمارے دوام کے کہ ہمارا دوام مستقل بالذات ہے کسی کی مشیت پر موقوف نہیں کوئی احتمال اس دوام کے فنا ہونے کا نہیں ہے اس نکتہ کی طرف شاہ عبدالقادر صاحب نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سہل عنوان سے اشارہ فرمایا ہے کہ اس سے مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ یہ دوام تحت المشییۃ ہے۔

ترجمہ: اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کور ہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ہاں اگر خدایٰ کو منظور ہو تو دوسری بات ہے وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا۔

سعادت و نحوست کی حقیقت

سعادت کی حقیقت لغت میں نیک بنتی ہے جس کے معنی ہیں خوش قسمتی مطلب ہی ہوا کہ جو لوگ اچھے نصیب والے ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے اور اس حقیقت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دخول جنت میں عمل کو دخل نہیں بلکہ جس کا نصیب اچھا ہے جس کی تقدیر بھلی ہے وہی جنت میں جائے گا سو یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جنت میں جانے کے لئے عمل کی ضرورت نہیں اگر ایسا ہوتا تو قرآن و حدیث دو قومی کی تاکید اور گناہوں پر وعید کیوں ہوتی؟ کیا یہ تاکید و وعید بے کار ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ جس کے نصیب اچھے ہیں جس کی تقدیر بھلی ہے اس کے متعلق وہاں یہی لکھا جاتا ہے کہ فلاں شخص چونکہ عمل نیک کرے گا اس لئے جنت میں جائے گا پس صاحب نصیب وہی ہے جو نیک عمل کرتا ہے اور بد نصیب وہ ہے جو برے عمل کرتا ہے نصیب کا اچھا ہونا تقدیر کا بھی ہونا عمل صالح پر موقوف ہے قانون اور قاعدہ یہی ہے۔

یوں خلاف قاعدہ کسی پر فضل ہو جائے وہ اور بات ہے مگر وہ بھی صرف ہمارے نزدیک خلاف قاعدہ ہوگا کیونکہ ہم کو اس کے عمل کی خبر نہیں باقی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی خلاف قاعدہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر شخص کی پوری خبر ہے تو جس کو باوجود بد عملی کے بدوں عذاب جنت میں بھیجا جائے گا اس کے پاس کوئی عمل صالح اتنا بڑا ہوگا جو تمام گناہوں پر غالب آ گیا ہے جس کی خبر خدا تعالیٰ کو تھی ہم کو خبر نہ تھی۔

سعادت کے دوسرے معنی اور بھی ہیں جو نحوست کے مقابل ہیں یعنی بابرکت ہونا اس کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ بابرکت ہیں وہ جنت میں جائیں گے اور جو منحوس ہیں وہ جہنم میں جائیں گے اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ حقیقی منحوس کون ہیں؟ صرف وہ ہیں جو کہ جہنم میں جائیں گے۔ اور یہ جو مشہور ہے نحوست کہ بعض لوگ قمری کو یا الو کو یا کیلے کے درخت کو منحوس سمجھتے ہیں یا بعض ایام کو منحوس سمجھتے ہیں یہ کوئی چیز نہیں میرٹھ

میں ایک بنیا منحوس گھوڑوں کو خریدتا تھا اور بہت نفع کمانا تھا اس کے حق میں وہی بابرکت تھے بعض لوگوں کو قرآن کی اس آیت **فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْجًا صَرْصَرًا فَاِذَا كَانُوا فِيْهَا يَخْتَصِمُونَ** تو ہم نے ان پر ایک ہوائے تند ایسے دنوں میں بھیجی جو (ان کے حق میں) منحوس تھے سے شبہ ہو گیا ہے کہ بعض ایام بھی منحوس ہوتے ہیں مگر انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ایام نحسات کی تفسیر دوسری آیت میں **سَبْعَ لَيَالٍ وَ ثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ** وارد ہوئی ہے تو اس کو ملا کر یہ لازم آئے گا کہ کوئی دن بھی مسعود نہیں بلکہ سب ایام منحوس ہی ہیں اور اس کا کوئی قائل نہیں لہذا اس سے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا دراصل ایام میں مسعود شخص کا مسئلہ اہل نجوم کا اختراع ہے اور شیعہ نے حضرت علیؑ کی طرف بھی اس کو منسوب کیا ہے مگر وہ روایت موضوع ہے شریعت میں بعض ایام متبرک تو ہیں مگر منحوس کوئی دن نہیں رہا یہ سوال کہ پھر ایام نحسات کے کیا معنی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے معانی نحسات علیہم ہیں یعنی قوم عاد کے حق میں وہ ایام منحوس تھے کیونکہ ان پر ان ایام میں عذاب آیا تھا اور وہ عذاب مسبب تھا کفر و معصیت سے پس معلوم ہوا کہ اصل نحوست کی چیز معصیت ہے بہر حال خود اس آیت سے معلوم ہوا کہ سعادت نام ہے طاعت کا اور نحوست نام ہے معصیت کا اب بتلاؤ کہ منحوس ہم ہیں یا اللوا اور قمری اور کیلا ظاہر ہے کہ یہ چیزیں معصیت سے مبرا ہیں تو یہ کیسی غلطی ہے کہ ہم اپنی نحوست کو دوسری چیزوں پر ٹالتے ہیں بس ہماری وہ حالت ہے۔

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد ہچوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

سعد و امیں نکتہ

اب میں اس آیت کے متعلق چند علمی نکات بیان کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں میرے خیال میں اس جگہ سعد و البصیغہ مجہول میں ایک راز یہ سمجھ آتا ہے بشرطیکہ لغت سے اس کی تائید ہو جائے اور سعد کا متعدی ہونا معلوم ہو جائے مجھے یہاں قاموس نہیں ملی ورنہ تحقیق کر لیتا (لغت سے اس کی تائید نہیں ملی سعد و سعد بالفتح و بالضم بمعنی واحد ہے متعدی اسعد اللہ ہے مگر مفعول نہیں بلکہ مسعود ہے کافی القاموس میں کہتا ہوں کہ اس تحقیق کے بعد اس نکتہ کو اس طرح بدل دیا جائے گو سعد و متعدی نہیں مگر صورت متعدی کی رکھتا ہے اس صورت میں اس نقطہ کا الہام ہے گو دلالت نہیں (اشرف علی) کہ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ تم جو کامیاب اور نیک بخت کئے گئے ہو یہ تمہارا کیا ہوا نہیں بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے محض عنایت ہی عنایت ہے کیونکہ ہر چند کہ سعادت کا مدار عمل صالح پر ہے مگر عمل صالح کی توفیق محض حق تعالیٰ کے فضل سے ہے یہ جو آپ کو نماز کا شوق ہے اور رات کو تہجد میں اٹھتے ہیں یہ آپ کا کام نہیں بلکہ کوئی اور ہی اٹھا رہا ہے بس ہماری حالت یہ ہے۔

رشتہ در گرد نم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ است

یہ تو سعد و امیں نکتہ تھا۔

دو علمی نکتے

اس کے بعد مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ کے متعلق دو علمی نکتے عرض کرتا ہوں کیونکہ اس پر بظاہر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت کا جنت میں خلود آسمان و زمین کے دوام کے برابر ہوگا اور آسمان و زمین کا دوام محدود ہے تو اہل جنت کا خلود بھی محدود ہوا۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہاں پر سموت والارض سے مراد جنت کے آسمان و زمین ہیں دنیا کے آسمان و زمین مراد نہیں مطلب یہ ہوا کہ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے جب تک جنت کی زمین و آسمان رہے اور جنت کی زمین و آسمان کا دوام غیر محدود ہے ان کے لئے کبھی فنا نہیں تو اب کسی شبہ کی گنجائش نہیں اور اس کی دلیل کہ جنت کی زمین و آسمان کا دوام محدود نہیں وہ آیات ہیں جن میں خلدین فیہا ابدا وارد ہے اور احادیث ہیں جن میں یا اهل الجنة خلود ولا موت و یا اهل النار خلود ولا موت وغیرہ وارد ہے۔

رہا یہ سوال کہ مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایسا جیسے کسی کو انعام میں کوئی گاؤں دیا جائے اور یوں کہا جائے کہ جب تک یہ گاؤں باقی ہے اس وقت تک تم اس کے مالک ہو تو اسی طرز سے مخاطب کی پوری تسلی ہو جاتی ہے کہ مجھ سے اس کا چھیننے والا کوئی نہیں یہی مقصود اس جگہ مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ کے بڑھانے میں ہے۔

اس کے بعد إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ کے متعلق ایک اشکال کو دفع کرنا چاہتا ہوں بظاہر إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ۔ خَلْدِينَ فِيهَا سے استثناء ہے ترجمہ یہ ہوا کہ اہل سعادت جنت میں ہمیشہ رہیں گے مگر جب خدا چاہے تو اسی سے شبہ ہوتا ہے کہ کسی وقت اہل جنت کا خلود منقطع بھی ہو جائے گا یا انقطاع کا احتمال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ خالدین سے مستثنیٰ نہیں بلکہ اللذین سعدوا سے استثناء ہے اور ما بمعنی من ہے حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ اہل سعادت ہیں وہ جنت میں جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے وہ جنت میں نہ جائے گا یعنی بعض اہل سعادت ایسے بھی ہیں جن کو ہم لوگ سعید سمجھتے ہیں مگر خدا کے نزدیک وہ سعید نہیں ہیں واللہ یہ بات قاصمۃ الظہر ہے اس نے عارفین کی کمر توڑ دی ہے کیونکہ اس کی کسی کو خبر نہیں ہے کہ ہم خدا کے نزدیک کیسے ہیں۔

تایا ر کرا خواہد و میلش بکہ باشد

ابن عباس نے دوسری جگہ سورہ اعراف میں إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ میں ما کو بمعنی من فرمایا ہے اس میں اور اس میں بظاہر کچھ فرق نہیں اس لئے یہاں بھی ما کو بمعنی من کہنے میں کچھ حرج نہیں اور اس کے بعد خلود اہل جنت میں کچھ اشکال باقی نہیں رہتا کیونکہ اس میں خلود سے استثناء نہیں ہے۔

مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کی ایک اور تفسیر کی ہے جو بہت ہی عجیب ہے وہاں تک کسی کا ذہن نہیں پہنچ سکتا اس کا حاصل یہ ہے کہ الاما شاء ربک سے اللہ تعالیٰ کو فرق کرنا منظور ہے اپنی ابدیت اور اہل جنت کی ابدیت سے کہ خدا تعالیٰ کی ابدیت کسی کی مشیت کے تابع نہیں اور اہل جنت کی ابدیت داخل مشیت ہے **إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ** سے فقط یہ بات بتلانا مقصود ہے کہ اہل جنت کی ابدیت مستقل نہیں بلکہ تابع مشیت الہیہ ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ ابدیت کسی وقت منقطع ہو جائے گی کیونکہ دوسری نصوص سے یہ امر معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی مشیت جو غلو د اہل جنت کے متعلق ہے وہ کبھی منقطع نہ ہوگی یہ حاصل ہے شاہ صاحب کی تفسیر کا۔ مگر ان کی عبارت سے یہ مضمون ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ وہی سمجھے گا جس کو یہ معلوم ہو کہ اس مقام پر ایک اشکال ہے جس کو شاہ صاحب رفع کرنا چاہتے ہیں واقعی شاہ صاحب نے اس کو بہت سہل اور مختصر عنوان سے رفع کر دیا ہے جو ان کے تبحر علم کی دلیل ہے۔

ایک آریہ نے یہ اعتراض دوسرے عنوان سے شائع کیا تھا کہ خدا کا وجود بھی غیر متناہی ہے اور جنتیوں کا وجود بھی غیر متناہی ہے تو دونوں برابر ہو گئے۔

میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا وجود غیر متناہی بالفعل ہے اور جنتیوں کا وجود غیر متناہی بمعنی لائق عند حد ہے مگر شاہ صاحب کا جواب سب سے عمدہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا وجود غیر متناہی بالذات ہے اور اہل جنت کا وجود غیر متناہی بالغیر ہے یعنی مشیت کے تابع ہے یہ چند نکات تھے جو اس آیت کے متعلق تھے اب میں آیات کا خلاصہ عرض کر کے بیان کو ختم کر دوں گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو آخرت کی راحتوں کی طرف متوجہ فرمایا ہے تاکہ ان کو مستحضر کر کے ہم آخرت کی طرف رغبت کریں اور اس کے لئے سعی کریں اور طریقہ راحت اخرویہ حاصل کرنے کا یہ بتلایا ہے کہ سعادت حاصل کریں جس کا خلاصہ عمل صالح ہے۔

اور یہاں سے میں اہل علم کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ اہل علم آج کل علم حاصل کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں عمل کا اہتمام اور تکمیل عمل کی کوشش نہیں کرتے اور حیرت ہے کہ اس پر وہ اپنے آپ کو نائب رسول ﷺ سمجھتے ہیں کیا یہی علم مجرد عن العمل وہ شے ہے جس سے تم نیابت رسول ﷺ چاہتے ہو اس علم خالی عن العمل کی تو وہ حالت ہے جس کے متعلق اہل تحقیق یوں فرماتے ہیں۔

علم رسی سر بسر قیل است قال	نے ازو کینچے حاصل نہ حال
علم چه بود آں کہ رہ ہما یدت	زنگ گمراہی زدل بزد ایدت
ایں ہوں ہا از سرت بیروں کند	خوف و خشیت در دولت افزوں کند

تو ندانی جز بجز ولا بجز! خود ندانی کہ تو حوری یا عجز
علم ہنود غیر علم عاشقی ماہی تلیس ابلیس شقی!
علم چوں بردل زنی یارے شود علم چوں برتن زنی مارے شود

حقیقی علم

حقیقی علم وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ بدوں عمل کے نہیں ہو سکتی پس علم بدوں عمل کے جہالت کی مثل ہے۔ علم کے رہ حق نہ نماید جہالت ست
غرض علم محض پر کفایت کرنا بڑی غلطی ہے۔ علماء و طلباء کو عمل کا پورا اہتمام کرنا چاہئے جب ہی ان کو سعادت حاصل ہوگی چونکہ اس بیان میں اہل علم و طلباء بھی شریک ہیں اس لئے یہ مضمون طالب علموں کی ضرورت کا بیان کر دیا گیا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا و آخرت کا چین چاہتے ہو تو سعادت حاصل کرو اور ایسی سعادت جس سے جنت کا دخول اولی حاصل ہو اور حق تعالیٰ کا قرب کامل عطا ہو علم دین مع العمل ہے گو سعادت کا ایک درجہ مجرد علم سے اور مجرد عمل سے بھی حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ نجات مطلق کے لئے نفس ایمان و اسلام بھی کافی ہے مگر ناقص درجہ پر کفایت کرنا غلطی ہے۔

فِيهَا نَوْمٌ شَقِيقٌ وَسَوْءٌ ۝ كَأَمْثَلِ الَّذِينَ سَقَطُوا فِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ۝ خَلِيدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ
السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ إِنَّ رَبَّكَ فَكَالٌ لِّمَا تُرِيدُ ۝ وَأَنَّ الَّذِينَ سُودُوا فِي الْجَنَّةِ خَلِيدِينَ
فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ عَطَاءٌ غَيْرَ مَجْذُوذٍ ۝

اس میں اہل جنت و اہل جہنم دونوں کے لئے خلیدین فیہا کے ساتھ مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ کی قید ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ جنت و نار میں خلود مطلق نہ ہوگا بلکہ مقید ببقاء سموات و ارض ہوگا اور اگر اس میں کچھ تاویل بھی کر لی جائے تو آگے إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ میں دوام سے استثناء ہے یہ بھی خلود کو مقید بالمشیت کر رہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ خلود لازم نہیں بلکہ مشیت پر ہے کہ جب چاہیں باہر نکال دیں۔

لطیفہ قلب

اب سنئے کہ مادامت السموات والارض کی تو دو توجیہ ہیں ایک علماء ظاہر کے قول پر ایک صوفیہ کے قول پر یہ مطلب نہیں کہ جواب ثانی میں کچھ اصول تصوف کو دخل ہے بلکہ چونکہ وہ توجیہ علماء صوفیہ سے منقول تھی اس لئے میں نے علماء صوفیہ کی طرف اس کو منسوب کر دیا علماء ظاہر نے تو یہ کہا ہے کہ سموات و ارض سے اس آیت میں یہ آسمان و زمین مراد نہیں بلکہ جنت و دوزخ کے آسمان و زمین مراد ہیں کیونکہ عالم آخرت میں بھی آسمان و زمین

موجود ہیں مولانا فرماتے ہیں

غیب را ابرے و آبے دیگر است آسمانے آفتابے دیگر است
حکیم سنائی فرماتے ہیں ۔

آسمان ہاست در ولایت جان کار فرمائے امان جہاں
در رہ روح پست و بالا ہاست کو ہائے بلند و صحرا ہاست

گو ان اشعار میں جنت و دوزخ کا بیان نہیں بلکہ لطیفہ قلب کی وسعت کا ذکر ہے کہ اس میں بھی عالم محسوس کا نمونہ موجود ہے مگر میں نے مناسبت کی وجہ سے ان کو پڑھ دیا ہے کیونکہ اس کو عالم آخرت سے بہت مناسبت ہے بہر حال اب وہ اشکال مرتفع ہو گیا کیونکہ جب جنت و دوزخ کے لئے خلود ثابت ہے تو ان کے مساوات و ارض کے لئے بھی خلود ہو گا فنا نہ ہو گا پس اب سہاء و اشیاء کے خلور فی الجنة والنار کو ماد اُمّت السموات و الارض کے ساتھ محدود کرنے سے اشکال تحدید کا نہیں ہو سکتا رہا یہ شبہ کہ سموات و ارض کا لفظ تو عربی لفظ ہے عربی لفظ سے وہی معنی مراد ہو سکتے ہیں جو لفظ اس سے مفہوم ہو سکیں اور ان الفاظ سے تو لفظ عالم سموات کے آسمان و زمین مفہوم ہوتے ہیں نہ کہ جنت و دوزخ کے پھر یہ تاویل کیونکہ صحیح ہوگی جو اب یہ ہے کہ سماء و ارض کا اطلاق لفظ ان پر ہو سکتا ہے گو اہل لغت نے اس کو نہ لکھا ہو کیونکہ لفظ عام ہے السماء ما یضلک والارض ما یقلک (اور عموم کی دلیل یہ ہے کہ سماء و ارض کو اہل لغت نے اس آسمان اور اس زمین کا علم نہیں قرار دیا اور نہ پھر چاہئے کہ آسمان دوم و سوم تا ہفتم کو اور اس طرح طبقات ست ارض کو سماء و ارض نہ کہہ سکیں کیونکہ اول اول تو لوگوں کو ایک ہی آسمان اور ایک ہی زمین کا علم ہوا تھا تو سماء و ارض انہی کے علم ہو گئے بقیہ سموات و ارضین کا علم تو بعد میں ہوا پھر ان پر یہ لفظ کیونکر صادق آیا پس جس طرح ان پر صادق آتا صحیح ہے اسی طرح اگر اور کوئی فرد سماء یا ارض کا محقق ہو جائے اس پر بھی ان لفظوں کا اطلاق لفظ صحیح ہوگا۔ ۱۲) دوسرے اسی میں اختلاف ہے کہ وضع لغت کون ہے راجح یہ ہے کہ حق تعالیٰ وضع لغت ہیں اور انہوں نے آدم علیہ السلام کو سب اسماء کی تعلیم فرمادی تھی و علم ادم الاسماء کلھا تو حق تعالیٰ نے سماء و ارض کو بمعنی عام ہی وضع فرمایا ہے جس میں جنت و نار کے سماء و ارض بھی داخل ہیں گو اہل لغت کو ان افراد کا علم نہ ہو چنانچہ جنت کے متعلق ارض کا اطلاق تو خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں وَأَوْدَعْنَا الْأَرْضَ نَجَبًا وَمِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ اور بقیہ اطلاعات کی صحیح کے لئے یہ نظیر کافی ہے رہا یہ کہ اس تنقید سے فائدہ کیا ہوا کہ اول ماد اُمّت السموات و الارض کی قید لگائی پھر اس پر شبہ وارد ہوا پھر جواب کی ضرورت ہوئی تو بات یہ ہے کہ اس قید کا فائدہ محاورات میں غور کرنے سے معلوم ہوگا مگر محسوس یہ ہے کہ لوگ آج کل علوم درسیہ پہلے پڑھتے ہیں پھر قرآن کے الفاظ کو اصطلاحات درسیہ پر محمول کرنا چاہتے ہیں اس لئے اشکالات میں مبتلا ہوتے ہیں حالانکہ نزول قرآن کا محاورات پر ہے (اس وقت ان درسی اصطلاحات کا کہیں وجود بھی نہ تھا ۱۲)

فنا اور بقاء

اب محاورات میں غور کر کے دیکھئے کہ اگر ہم کسی شخص کو اپنا مکان رہنے کے لئے دیں اور وہ یہ کہے کہ جناب! یہ مکان مجھے کتنی مدت کے واسطے دیا گیا ہے اور یہ میرے پاس کب تک رہے گا اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب تک یہ مکان رہے گا اس وقت تک تمہارے پاس رہے گا بتلائے کیا محاورات میں اس سے زیادہ کوئی عنوان دوام و بقاء سکونت کو ظاہر کر سکتا ہے ہرگز نہیں گو اس جگہ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اس مکان کو فی نفسہ دوام و بقاء ہے یا نہیں مگر سائل کو جو یہ تردد ہوا تھا کہ شاید ایسا بھی ہو کہ یہ مکان رہے اور ہم اس میں نہ رہیں یہ شبہ اس جواب سے بالکل رفع ہو گیا اور اس عنوان سے زیادہ کوئی صورت تسلی کی نہیں اسی طرح یہاں بتلایا گیا ہے کہ جب تک جنت و دوزخ موجود ہیں کیونکہ وجود عمارت کا سقف و ارض ہی سے ہوتا ہے تو سموات و الارض جنت و نار کا وجود خود ان کا وجود ہے ۱۲۔ اس وقت تک اہل جنت جنت میں اور اہل نار نار میں رہیں گے یہ نہیں ہو سکتا کہ جنت کے ہوتے ہوئے جنتی اس سے نکال دیئے جائیں یا دوزخ کے ہوتے ہوئے دوزخ والے (یعنی کفار ۱۳) اس میں نہ رہیں اس عنوان سے اہل دار کا لزوم دار کے ساتھ بتلا دیا گیا جو اس کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتا تھا رہا یہ کہ لزوم دائم و مستمر ہے یا محدود اس سے دوسرے مقام پر تعرض کیا گیا ہے اور جہاں خالد بن فیہا کے ساتھ ابد کی بھی تصریح ہے یہ توجیہ تو علماء سے منقول ہے اور بعض صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ سموات و ارض سے مراد سموات و ارض ملکوت نہیں بلکہ یہی عالم ناسوت کے سموات و ارض مراد ہیں مگر بحالت موجودہ نہیں بلکہ بعد تبدیل کے کیونکہ جس طرح قیامت میں اموات زندہ ہوں گے اور مردے قبروں سے اٹھیں گے اسی طرح آسمان و زمین بھی دوبارہ پیدا ہوں گے۔ ارشاد ہے **يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ** (اور ظاہر ہے کہ مردے جو زندہ ہوں گے وہ عینہ وہی ہوں گے جو مرنے سے پہلے تھے اسی طرح آسمان و زمین بھی سعد حشر و نشر کے عینہ یہی ہوں گے اور زمین کو جو نص میں غیر الارض کہا گیا ہے اس سے مغایرت بعض صفات میں مراد ہے مثلاً اس وقت جبال و اشجار اور پستی و بلندی نہ ہوگی بلکہ ساری زمین ہموار ہوگی اور مغایرت وصف سے تغایر ذات لازم نہیں آتا دیکھو اگر کوئی کالا آدمی گورا ہو جائے تو یہ نہ کہیں گے کہ یہ دوسرا آدمی ہو گیا وہ نہیں رہا ۱۴) اور شیخ اکبر کا کشف ہے کہ یہ سموات و ارض ناسوت بعد حشر و نشر کے پھر فنا نہ ہوں گے جیسے اہل سموات و ارض یعنی جن و انس بھی بعد حشر و نشر کے فنا نہ ہوں گے پس خلود کو **مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ** کے ساتھ نص میں مقید کرنا عدم خلود اہل جنت وغیرہ کو مستلزم نہیں ہے کیونکہ خالد مذکورہ کے بعد یہ سموات و ارض بھی دائم و مستمر ہوں گے اور نص میں ان کی اسی حالت کے ساتھ خلود اہل جنت و نار کو مقید کیا گیا ہے۔ قانع الاشکال اور شیخ اکبر کا

یہ کشف کسی نص کے بھی خلاف نہیں اور کوئی نص اس کی مصادم بھی نہیں اس لئے اس کے مان لینے کا مضائقہ نہیں مگر میں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ ہر کشف اپنی ذات سے ظنی ہے اس پر جزم نہ کیا جائے کیونکہ اس میں امر غیر مجزوم فی نفسہ کے ساتھ جزم ہوگا جو کہ شرعاً جائز نہیں۔

ارضاء رسول

ایک جواب **مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ** کے اشکال کا یہ بھی دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے کلام اللہ میں ہمارے جذبات کا بہت لحاظ فرمایا ہے چنانچہ اس بناء پر حق تعالیٰ نے لفظ ارض کو سارے قرآن میں بصیغہ مفرد بیان فرمایا ہے حالانکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ ارض بھی مثل سموات کے متعدد ہیں مگر قرآن میں سموات تو بصیغہ جمع ہیں اور ارض ہر جگہ بصیغہ مفرد ہے اس کا یہی جواب دیا گیا ہے کہ جو بہت لطیف ہے کہ حق تعالیٰ نے سموات و ارض کا ذکر اثبات توحید کے لئے مقام استدلال میں فرمایا اور اہل عرب کو سموات کا تعدد تو معلوم تھا زمین کا تعدد معلوم نہ تھا اگر ارض کو بصیغہ جمع لایا جاتا تو آپس میں شور و شغب شروع ہو جاتا اور مقدمات ہی میں خلط مبحث ہو جاتا اور ہدایت میں تاخیر ہوتی یا کمی رہتی اس لئے حق تعالیٰ نے مخاطبین کے مذاق کی رعایت فرما کر تمام قرآن میں ارض بصیغہ مفرد ہی بیان کیا سبحان اللہ کتنی بڑی عنایت ہے حق تعالیٰ کی کہ وہ زائد باتوں میں ہدایت کو مؤخر کرنا نہیں چاہتے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سمجھئے کہ یہاں بھی حق تعالیٰ نے ہمارے مذاق کے موافق دوام و استمرار کو بیان فرمایا ہے یعنی سموات و ارض سے یہی آسمان زمین بحالت موجودہ مراد ہیں پھر بھی اشکال کچھ نہیں کیونکہ گو یہ زمین و آسمان فنا ہونے والے ہیں مگر اذہان عامہ میں ان کا فنا مستحضر نہیں ہے چونکہ اس کی ابتداء کسی نے دیکھی نہیں اور قرن گزر گئے کہ اس پر ابھی تک فنا بھی طاری نہیں ہو اس لئے اذہان عامہ میں اس کا فنا ہونا مستحضر نہیں ہوتا گو اعتقاد دوام بھی نہ ہو پس اس صوت میں خلود اہل جنت کی بقاء سموات و ارض کے ساتھ تحدید کرنا اس اثر کے اعتبار سے جو اذہان عامہ پر ہے دوام و استمرار ہی کو مستلزم و مفید ہوگا کیونکہ عوام کے مذاق میں بیان تام کی یہی صورت ہے اسی لئے شیطان کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے **وَلَا تَعْلَمُ عَلَيْكَ لَعْنَتِي اِلٰى يَوْمِ الدِّينِ** (تجھ پر قیامت تک میری لعنت ہے) اس سے مراد یہ نہیں کہ قیامت کے بعد لعنت نہ رہے گی بلکہ دوام مراد ہے اور محاورات میں دوام کو یوں ہی تعبیر کیا کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ بخدا میں قیامت تک یہ کام نہ کروں گا اسی طرح الی یوم الدین اس نص میں بیان دوام و استمرار کے لئے ہے اور ایسے ہی مادامت السموات والارض عام بول چال اور عام محاورہ کے اعتبار سے دوام ہی کو مفید ہے گو اہل معقول کے نزدیک مفید نہ ہو۔

بہر حال **مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ** کی قید کے تو متعدد جواب دیئے گئے ہیں مگر الا ماشاء ربک کی تاویل میں لوگ بہت چکرا گئے ہیں بعض نے تو کمال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ استثناء زیادت کے لئے ہے نقص و

اخراج کے لئے نہیں مطلب یہ ہوا کہ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں بقا سموات وارض تک رہیں گے مگر یہ کہ خدا چاہے تو اور بھی زیادہ رکھے کیونکہ بقا سموات وارض تو محدود ہے اور خلود جنت غیر محدود ہے اور ثانی کالول سے زائد ہونا ظاہر ہے مگر نہ معلوم یہ زیارت علی المستسفی منہ استثناء کی کوئی قسم ہے اور میرے نزدیک صحیح جواب اور لطیف وہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحب نے بیان فرمایا ہے جس کو میں اصطلاحی الفاظ میں بیان کرتا ہوں ورنہ شاہ صاحب نے تو ایسے سلیس عنوان سے بیان کیا ہے کہ عامی دیکھنے والا یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس جگہ شاہ صاحب نے اتنا بڑا مضمون حل کیا ہے۔

خلود اور مشیت

حاصل اس کا یہ ہے کہ الاما شاء ربک میں ما مصدر یہ ہے ای الا وقت مشینة کما فی قولہ التیک خفوق النجم ای وقت خفوقہ پس معنی یہ ہوئے کہ یخلدون فیہا الا ان یشاء ربک عدم خلودہم فینقطع خلودہم، رہی یہ بات کہ اس قید کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کا جواب شاہ صاحب نے دیا ہے کہ اس میں تو حید کی حفاظت کی گئی کہ خلود واجب اور خلود ممکن میں فرق ظاہر کر دیا گیا تاکہ کوئی خلود کی خبر سن کر بقاء دائم میں شریک ہو کر مساوات مع الواجب کا دعویٰ نہ کرنے لگے کہ گو ہم جہنم میں جائیں گے سہی مگر یہ فخر تو ہمارے لئے ثابت ہو گیا کہ ہم مثل واجب کے خلود دوام کے ساتھ متصف ہو جائیں گے۔ تو بتلا دیا گیا کہ مساوات کا دعویٰ کیا لئے پھرتے ہو تمہارے خلود میں اور واجب کے خلود میں زمین آسمان کا فرق ہوگا واجب کا خلود کسی کی مشیت کے تابع نہیں اور تمہارا خلود ہماری مشیت کے تحت میں ہے جب چاہیں سب کو کان پکڑ کر نکال سکتے ہیں اور سب کو فنا کر سکتے ہیں گویا سنا نہ کریں مگر ایسا نہ کرنے کی صورت میں بھی تم کو وہ خلود اس طرح نصیب ہوگا کہ ہر دم ہماری طرف سے افاضہ وجود ہوگا ورنہ تم کیا وجود اپنے باپ کے گھر سے لائے تھے۔

نیاور دم از خانہ چیزے نخست تو وادی ہمہ چیز دمن چیز تست

تو حاصل یہ ہوا کہ خلود تو ہوگا لیکن اگر ہم چاہیں تو خلود نہ رہے سبحان اللہ کسی عجیب بات فرمائی ہے او ر آپ کو حیرت ہوگی اگر شاہ صاحب کے الفاظ دیکھیں کہ انہوں نے اصطلاحی الفاظ کو چھوڑ کر سلیس لفظوں میں کس طرح اس دقیق مضمون کو بیان فرمایا ہے اور یہ واقعی بڑا کمال ہے۔

اور دوسرا جواب میرے ذہن میں آیا ہے کہ اما شاء ربک میں ما بمعنی من ہے اور محققین نے لکھا ہے کہ لفظ ما اصل لغت میں ذوی العقول وغیر ذوی العقول دونوں کے لئے عام ہے اردو کی ماں بھی تو عام ہے (کہ انسان کی ماں بھی ماں ہے اور جانور کی ماں بھی ماں ہے ہاں من ذوی العقول کے لئے خاص ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ غیر ذوی العقول کے لئے خاص ہے صحیح نہیں پس الاما شاء ربک کے معنی ہیں الامن شاء ربک ایک مقدمہ تو یہ ہوا کہ ما بمعنی من ہے۔

سعید اور شقی

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ متکلمین نے عقائد میں یہ مسئلہ طے کر دیا ہے السعید قلیشقی والشقی قلیسعد شرح عقائد میں اس کی تصریح ہے اور اس میں شقی و سعید سے وہ مراد نہیں جو علم الہی میں شقی یا سعید ہو بلکہ ظاہری سعید و شقی مراد ہے جس کو خاص حالات سے شریعت کافر و مومن کہتی ہے تو ایسا شقی یعنی کافر کبھی علم الہی میں سعید یعنی مومن ہوتا ہے اور اسی طرح کبھی سعید علم الہی میں شقی ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص ظاہر میں کافر معلوم ہوتا ہے ہمارے نزدیک تو وہ خالد بن فی النار سے ہے لیکن ممکن ہے کہ مرتے ہوئے اس کو اسلام نصیب ہو جائے اور علم الہی میں وہ سعید ہو جیسے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے نانوتہ میں ایک بنیامرا مولانا محمد قاسم صاحب نے اس کو خواب میں دیکھا کہ جنت میں پھر رہا ہے پوچھا لالہ جی تم یہاں کہاں کہاں مولوی جی میں نے مرتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھ لیا تھا وہ قبول ہو گیا اور خدا تعالیٰ نے مجھے بخش دیا تو دیکھے ساری عمر تو لالہ جی نے سو بیٹا کھایا اور سو ہی میں جنت بھی لے لے مر ایسی نظیریں اور بھی نہ معلوم کتنی ہوں گی اب آیت کا حل یوں ہوگا۔ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُّوا (و کفر وافی الظاہر) ففی النار لہم فیہا زبیرٌ و شہیقٌ ۝ خَلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَ الْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ (ای الامن ربک من الاشقیاء فیسعد ویومن ویدخل جنة ۱۲) واما الذین سعدوا (فی الظاہر ۱۲) ففی جنة خالدین فیہا ما دامت السموات والارض الا ما شاء ربک (ای الا من شاء من السعداء فیسقی ویدخل النار ۱۲)

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ ظاہر میں سعداء ہیں وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے مگر جس کو خدا چاہے گا کہ بعضے سعید علم الہی میں شقی ہیں ان کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے وہ جنت میں نہ رہیں گے اور جو لوگ ظاہر میں اشقیاء ہیں وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے مگر جس کو خدا چاہے کیونکہ بعضے شقی علم الہی میں سعید ہیں ان کا خاتمہ اسلام پر ہونے والا ہے وہ جہنم میں نہ رہیں گے اب اشکال کچھ نہیں رہا مگر میں یہ پھر کہوں گا کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا جواب بہت عجیب اور نہایت زور دار ہے اور میں نے جو ما کو بمعنی من لیا ہے یہ کچھ تاویل بعید نہیں بلکہ وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوَّاهَا - وَ السَّمَاءُ وَ مَا بَنَاهَا وَ غَیْرَہ میں خود مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہاں ما بمعنی من ہے دوسرے ابن عباس سے ایک ایسی ہی آیت کی تفسیر میں ما کا بمعنی من کے ہونا منقول ہے پارہ ولو اننا کے دوسرے رکوع کے اخیر میں یہ آیات ہے وَقَالَ اُولَیئِهِمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَ بَلَّغْنَا الْاَلَمَنَ الَّذِیْ اَجَلَتْ لَنَا قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَلِدِينَ فِيهَا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ ۗ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِیْمٌ ۝ یہاں بھی کفار کے لئے خلود کو ثابت کر کے الا ماشاء اللہ سے استثناء کیا گیا ہے پس یہاں بھی بعینہ وہی اشکال ہے جو خَلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَوَاتُ وَ الْأَرْضُ اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ پر ہے جب وہاں ما بمعنی من صحیح ہو سکتا ہے تو یہاں صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں پر میرا جواب ابن عباس کے قول سے موید ہے اور مجھے اس کی بہت مسرت ہوتی ہے کہ

اپنے قول کی تائید سلف کے اقوال میں مل جائے بعض لوگ تو سلف سے اپنا علم منقول دیکھ کر افسردہ ہو جاتے ہیں کہ ہائے ہمارا تفرق باطل ہو گیا اور میں خوش ہوتا ہوں کہ الحمد للہ وہیں ذہن گیا جہاں مقبولان الہی کا ذہن گیا تھا۔

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ

دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿۳۱۷﴾

ترجمہ: اور اے مسلمانو! ان ظالموں کی طرف مت جھکو، کبھی تم کو دوزخ کی آگ لگ جائے اور خدا کے سوا کوئی تمہارا رفاقت کرنے والا نہ ہو پھر حمایت تو تمہاری ذرا بھی نہ ہو۔

تفسیری نکات

تشبہ میلان باطنی کے بغیر نہیں ہوتا

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ بعض اہل لطائف نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص مکاری سے صوفی بنے اور صوفیوں کی وضع اختیار کرے اس کی بھی تحقیر نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ تشبہ علامت اس کی ہے کہ اس کے قلب میں اس جماعت کی عظمت ہے کیونکہ تشبہ اسی کے ساتھ کیا جاتا ہے جس کی قلب میں عظمت اور وقعت ہوتی ہے اور اسی سے تشبہ باطل باطل کا مسئلہ حل ہو گیا اور اس بناء پر علاوہ حدیث میں ہونے کے وہ مسئلہ خود نص قرآنی میں موجود ہے ارشاد فرماتے ہیں وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ یعنی مائل مت ہو تم ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا کبھی تم کو بھی آگ پہنچ جائے اس سے معلوم ہوا کہ اہل باطل کی طرف میلان حرام ہے اور تشبہ بدوں میلان قلبی کے ہوتا نہیں قلب میں اول اس کی عظمت آتی ہے اور اس کے استحسان کا درجہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی طرف میلان ہوتا ہے اس کے اثر سے تشبہ ہوتا ہے پس جب یہ میلان حرام ہے تو تشبہ بھی حرام ہے یہ ہے وہ مسئلہ جس کو آج کل نجری کہتے ہیں کہ من تشبہ بقوم فهو منهم کجھ میں نہیں آتا گھور کھپور میں ایک مرتبہ جانا ہوا وہاں پر بیان کیا گیا بڑا مجمع تھا میں نے کہا کہ صاحبو یہ مسئلہ تشبہ کا صرف نقلی ہی نہیں عقلی بھی ہے اگر کوئی جنٹل مین اپنی بیگم صاحبہ کا زمانہ رنگین جوڑا پہن کر اجلاس میں کرسی پر آ بیٹھے کیا خود اس کو یا دوسرے دیکھنے والوں کو ناگوار نہ ہوگا تو آخر ناگواری کی وجہ بجز تشبہ کے کیا سوا ایک عورت مسلمان جو دینداری میں شاید تم سے بھی بڑھی ہوئی ہو اس کی تشبہ سے تو ناگواری ہوتی ہے اور کفار فجار کے تشبہ سے ناگواری کیوں نہ ہو ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ جب ہم نے ترکی ٹوپی پہن لی تو سب لباس میں تو تشبہ نہ ہوا میں نے کہا کہ ترکی ٹوپی پہن کر باقی لباس زمانہ پہن لو اور کہہ دو کہ ٹوپی تو ترکی ہے تو تشبہ کہاں بات یہ ہے کہ تشبہ کبھی ناقص ہوتا ہے کبھی کامل اور دونوں مذموم ہیں گودونوں کے درجہ میں تفاوت ہو۔

سُورَةُ يُوسُفَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۱﴾

ترجمہ: بلاشبہ شیطان آدمی کا صریح دشمن ہے۔

تفسیری نکات

مسلمانوں نے دوست دشمن کو نہیں پہچانا

ملفوظ ایک سلسلہ گفتگو میں بعض طواغیت کفر کی نسبت فرمایا کہ بڑا ہی چالاک اور دشمن اسلام ہے اس نے مسلمانوں کو دھوکا دیا شیریہ بات تو معمولی ہے کہ دشمن اپنی سی کیا ہی کرتا ہے۔ اس کا کام تو نقصان پہنچانے کا ہوتا ہے حق تعالیٰ بھی فرماتے ہیں إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ مگر افسوس تو مسلمانوں کی حالت پر ہے کہ انہوں نے دوست دشمن کو نہ پہچانا، مسلمانوں کی قوم بہت ہی بھولی ہے اور زیادہ تر دھوکہ عام مسلمانوں کو ان لیڈروں کی وجہ سے ہوا یہ ناعاقبت اندیش مسلمانوں کی کشتی کے ناخدا بنے ہوئے ہیں ان کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کے ایمان کو تباہ اور برباد کر دیا دیکھ لیجئے مشاہدات اور واقعات اس کے شاہد ہیں جس کے نعرے لگائے قشتے پیشانی پر لگائے ہندوؤں کی ارٹھی کو کندھا دیا ان کے مذہبی تہوار دن کا انتظام مسلمان والیٹیو یوں نے کیا یہ تو ایمانی نقصان ہوا اور جانی نقصان سنئے ہزاروں مسلمان ان قصوں کی بدولت موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ہجرت کرائی ہزاروں مسلمان بے خانمان ہو گئے مکان جائیداد غارت ہو گئیں بڑی بڑی ملازمتیں چھوڑ دیں موپلوں کی قوم کو تباہ کر دینے کا ان ہی کا کام تھا اب پچاسوں برس بھی وہ نہیں سنبھل سکتے اور جس بری طرح وہ پے گئے ہیں سن کر دل کانپ اٹھتا ہے یہ سب ان لیڈروں کی بدولت مسلمانوں کو نقصانات کا شکار ہونا پڑا مگر ان کے کیک بسکٹ انڈے چائے اور فسٹ کلاس کے سفر میں کوئی فرق

نہ آ یا لاکھوں روپیہ جو بیوہ عورتوں نے چکی پیس پیس کر اور مسلمانوں نے اپنے خراجات میں تنگی کر کے دیا سب غتر بود کر دیا جلے بدوں بٹالوں کے نہیں ہو سکتے ان میں ہزاروں روپیہ مسلمانوں کے خون پسینے کی کمائی کا برباد کیا اور پھر دوسروں پر ظن ہے کہ یہ قوم کی خبر گیری نہیں کرتے رہبری نہیں کرتے ایسوں ہی کی بدولت ملک اور قوم تباہ ہوا کسی نے خوب کہا

گر بہ میرسگ وزیر و موش را دیوان کنند
 انا ذہبنا نستبق (ہم آپس میں دوڑنے بھی لگ گئے)

نستبق کا ترجمہ

ذہبنا نستبق ہم آپس میں دوڑنے لگے گئے۔

استباق: کا ترجمہ ان مترجم صاحب نے کبڈی کھیلنا کیا ہے۔ یہ ترجمہ نقل بھی بالکل غلط ہے۔ اور عقلاً بھی نقل تو اس لئے کہ لغت میں دیکھ لیجئے کہ استباق کے کیا معنی کیا خلاف لغت ترجمہ بھی معتبر ہوگا استباق کے معنی آپس میں دوڑنا ہیں کہ دیکھیں کون آگے نکلے اور چونکہ عقل پرستی کا آج کل زور ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ عقلاً بھی یہ ترجمہ غلط ہے اس لئے کہ کبڈی کھیلنے میں اتنی دوڑ نہیں جایا کرتے کہ جس سے محافظ بچہ کی نسبت بھیڑنے کے کھا جانے کا احتمال ہو اگر ایسا ہوتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام ضرور جرح فرماتے۔

بہر حال وعلى اللین یطبقونہ کی یہ تفسیر نہیں ہے اور نہ فدیہ دینے والے بری ہو سکتے ہیں اور نہ یہ کہہ کر بری ہو سکتے ہیں کہ روزہ تہذیب نفس کے لئے ہے ہم تو خود مہذب ہیں اس لئے کہ اول تو یہ کہنا غلط ہے کہ ہم مہذب ہیں اور دوسرے تہذیب نفس روزہ کی حکمت ہے نہ کہ تباہ و علت یہ خرابی اس کی ہے احکام کی مختصر حکمتوں پر مبنی کرتے ہیں یہ تو ان کا ذکر ہے جو تاویل میں کر کے روزہ رکھتے ہی نہیں۔ (الصوم لمحقة، مؤلفہ فضائل صوم، ص ۱۰۳) (۹۱۰۳)

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۳۱﴾

ترجمہ: اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ کچھ خیال ہو چلا تھا اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا تو زیادہ خیال ہو جانا عجب نہ تھا ہم نے اسی طرح ان کو علم دیا تاکہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ کو دور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔

تفسیری نکات

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکی کا ثبوت اور وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر بدیع

سو کہتے ہیں صغیرہ کو اور فحشاء سے مراد کبیرہ ہے بس صاف دلالت ہے کہ یوسف سے نہ صرف صغیرہ صادر ہوا نہ کبیرہ اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ

یوسف نے ارادہ گناہ کا کیا تھا اور یہ آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا سے استدلال کرتے ہیں ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ پر کلام ختم ہو گیا اور هَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهٖ علیحدہ کلام ہے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ حضرت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ برائی کا کیا اور یوسف بھی کر لیتے اگر اپنے رب کا برہان نہ دیکھتے اور اسی واسطے مولانا فرماتے تھے کہ وہم بھا پر میں وقف نہیں کرتا پس اس سے ہم کی نفی ہوتی ہے نہ کہ اثبات اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے کذٰلک لنصرف عنه السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَ کہ اس میں صغیرہ اور کبیرہ دونوں کی نفی ہے اور جو لوگ ہم بھا پر وقف کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کے مراتب مختلف زلیخا نے جو ہم کیا وہ ان کے مرتبہ کے موافق تھا اور یوسف علیہ السلام سے جو ہم ہوا وہ ان کے مرتبہ کے موافق ہے جو صغیرہ سے بھی بہ مراتب کم ہے غرض صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہونا سب کا متفق علیہ ہے یوسف علیہ السلام سے کوئی عمل ایسا کہ جس سے گناہ لکھا جاوے ظہور میں نہیں آیا جمہور کی تفسیر پر دوسرے گناہ ہوا کہ وہ گناہ نہیں ہے۔

یوسف علیہ السلام کے تبریہ پر ایک بزرگ کا لطیفہ

ایک بزرگ نے عجیب لطیفہ لکھا ہے کہ اے عزیز یوسف علیہ السلام کی آلودگی کا وہم بھی مت کر ان کے دامن عصمت کو ذرہ برابر بھی داغ نہیں لگا اور اگر تجھ کو اس کی شہادت چاہئے تو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۗ اَوْرَاكَ مَخْلُوقِ كِي شَهَادَاتٍ چاہتا ہے تو اس شیر خوار لڑکے کی شہادۃ کافی ہے جس نے یوسف علیہ السلام کی براءۃ کی گواہی دی اور اگر اس کی شہادت قبول نہیں کرتا تو خود زلیخان کی شہادت موجود ہے وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۚ یعنی میں نے یوسف علیہ السلام سے ان کے نفس کی درخواست کی تھی وہ باز رہے اور ان کی شہادت بھی منظور نہیں تو زنان مصر کی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے کہا مَا عَلِمْنَا عَلَيْكَ مِنْ سُوءٍ ۚ یعنی ہم نے ان پر کوئی برائی معلوم نہیں کی اور اگر ان کی شہادت بھی تیرے نزدیک قابل قبول نہیں تو شیطان کی شہادت موجود ہے اس نے کہا تھا لَا تُؤَيِّبُكُمْ اَجْمَعِينَ ۗ الْاَعْبَادُ لِرَبِّهِمْ اَخْلَاصٌ ۗ یعنی میں ضرور ان سب کو بھکاؤں گا مگر جو ان میں سے تیرے تخلص بندے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ وہ تخلصین میں سے ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہے اِنَّا مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ ۗ مگر باوجود اس قدر تقدس اور پاکی کے پھر یہ فرماتے ہیں وَمَا اِيْرِي نَفْسِي اِنَّ النَّفْسَ لَافْتَارَةٌ ۗ يٰۤاَسُوْءُ ۗ یعنی میں اپنے نفس کی براءۃ کا دعویٰ نہیں کرتا نفس تو برائی کا کثرت سے امر کرتا ہے لیکن تو اضع چونکہ بعض مرتبہ ناشکری کی طرف مفسی ہو جاتی ہے اس لئے آگے بطور استثناء کے فرماتے ہیں اِلَّا مَا رَجَحَ رُبِّيْ ۗ یعنی مگر وہ شخص جس پر میرا رب رحم کرے اور ان کا مرحوم ہونا یقینی ہے۔

یوسف علیہ السلام نے کہا یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کی پھلاتی تھی اور (اس موقع پر اس عورت کے خاندان میں سے ایک نے گواہی دی کہ ان کا کرتہ دیکھو کہاں سے پھٹا ہے اگر آگے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹے اور اگر وہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے (تو عادتاً یقینی یہ ہے کہ عورت جھوٹی اور یہ سچے

قرینہ پر مجرم قرار دینا جائز نہیں

راندیر میں مولوی غلام محمد صاحب ایک عالم تھے وہ ابن تیمیہ و ابن قیم وغیرہ کے بہت معتقد تھے معتقد تھے معتقد تو ہم بھی ہیں مگر بڑے معتقد نہیں ہیں انہوں نے مجھ کو ابن تیمیہ کی ایک کتاب دکھائی جس میں انہوں نے یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے اس مسئلہ پر استدلال کیا تھا کیونکہ شاہد زلیخان نے براءت یوسفی کا طریقہ قرینہ سے بتلایا تھا اِنْ كَانَ قَبِيْضُهُ قَدْ مِنْ قَبْلِ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۗ وَاِنْ كَانَ قَبِيْضُهُ قَدْ مِنْ دُبُرٍ فَكَذٰبَتْ

وَهُوَ مِنَ الضَّالِّينَ اس سے معلوم ہوا کہ قرینہ پر کسی کو مجرم قرار دینا جائز ہے اور یہاں حق تعالیٰ نے اس امر پر کوئی انکار نہیں فرمایا اس کا جواب میری تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ گو اس جگہ انکار نہیں مگر دوسری جگہ انکار موجود ہے چنانچہ ارشاد لَا تَقْعُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اور ارشاد ہے وَذَلِمَ يَأْتُوا بِالشُّهَادَةِ فَأُولَئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ اس میں صدق و کذب مدعی کا مدار محض شہادت شرعیہ پر رکھا گیا ہے لہذا نص میں نکتہ موجود ہوتے ہوئے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا (علاوہ ازیں یہ کہ یہاں جو قرینہ شاہد زلیخا نے بتلایا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اس واقعہ خاص میں جس کے اندر قرینہ اور علامت موجود ہو وہ یقیناً کاذب یا صادق اس لئے ہے کہ میرا بیان منجانب اللہ بطور اعجاز کے ہے نہ یہ کہ یہ قرینہ ہر جگہ مفید علم ہو سکتا ہے ۱۲ ص) اسی لئے ہمارے علماء سب اس پر متفق ہیں کہ قرآین سے عقوبت کرنا صحیح نہیں ہاں متاعن نے تعزیر متہم کو جائز کہا ہے مگر یہ مسئلہ ظالموں کو بتلانے کا نہیں ہے (پھر اس میں بھی اول جس کا حکم ہے جرمانہ اور ضرب نہیں ہے اس کے بعد جب ثبوت ہو جائے تو سزا دینے کا حکم ہے کذا احفظ واللہ اعلم ۱۲ اور تحکیم قد قمیص کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اگر مدعی علیہ کسی ایسے ظنی پر راضی ہو جاوے تو اس نے اپنا خود حق چھوڑ دیا۔

ہم کا مفہوم

ہم اس کو کہتے ہیں جس کے بعد صدور فعل کا ہو جاوے اور وہ مرتبہ عزم کا ہے اور بعض نے ہم کو عزم سے قبل کہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ قرآن میں وَلَقَدْ هَمَّتْ بِه وَهَمَّ بِهَا (اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال عزم کے درجہ میں جم رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا خیال ہوا چلا تھا) بھی ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے ہم بالمرآة (آپ کے دل میں اس عورت کا خیال ہوا چلا تھا) اور انبیاء چونکہ معصوم ہوتے ہیں اس لئے عزت معصیت ان سے محقق نہیں ہو سکتا اس لئے وہ اس کے قائل ہو گئے کہ ہم عزم سے پہلے ہوتا ہے۔

قرآن پاک کے ایک مشکل مقام کی تفسیر

مگر محققین نے کہا ہے کہ اس کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ آگے لولا ان رای برہان ربہ (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) ہے جو شرط موخر ہے ہم بھا کی یعنی اگر برہان رب نہ دیکھتے تو ارادہ کر لیتے تو یہاں ہم کا اثبات ہی نہیں جو اس کی ضرورت ہو کہ ہم کو عزم سے قبل مانا جاوے بلکہ ہم کی نفی مقصود ہے۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ (اسی طرح ہم نے ان کو علم دیا تا کہ ہم ان سے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو دور رکھیں) تو اس میں ان سے صغائر اور کبائر کی نفی فرما رہے ہیں یہ قرینہ ہے اس کا کہ ہم کی یہاں نفی کی جا رہی ہے نہ کہ اثبات اور گو بعض نے کہا کہ

لو لاک جزا مقدم نہیں ہوتی۔ لیکن اول تو اس میں اختلاف ہے دوسرے اگر مان بھی لیں کہ لو لاک جزا مقدم نہیں ہوتی لیکن اول تو اس میں اختلاف ہے دوسرے اگر مان بھی لیں کہ لو لاک جزا مقدم نہیں ہوتی تو یہ لولا ان راہی ہرہان رہہ (اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا) دل علی الشرط (شرط یہ دلالت کرنے والا) ہوگا اور شرط محذوف مقدم ہوگی۔ بہر حال یہاں ہم کا اثبات نہیں اس لئے ہم کو عزم سے قبل ماننے کی بھی ضرورت نہیں! (المختل العظیم لمحمد موانعہ فضائل علم صفحہ ۲۶۷)

قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْكَافِرِينَ إِنَّ كَيْدَكَ عَظِيمٌ

ترجمہ: کہنے لگا کہ یہ تم عورتوں کی چالاکی ہے۔ بے شک تمہاری چالاکیاں بھی غضب ہی کی ہیں۔

عورتوں کا مکر عظیم

ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ہمیں تو اس پر فخر ہے کہ مسلمانوں کے برابر کوئی بھی نہیں گو بعضے بھولے ہیں یعنی چالاک نہیں مکار نہیں عاقل ہونا اور بات ہے چالاک ہونا اور بات ہے جو اس کی حقیقت نہیں جانتے انہوں نے ایک طاغوت کو مشہور کیا ہے کہ بڑا عاقل ہے مگر عقل کی تو اس کو ہوا بھی نہیں لگی ہاں چالاک ہے دونوں میں فرق کی سہمی دلیل قرآن پاک میں ہے جس میں عورتوں کے بارہ میں ان کید کن عظیم فرمایا باد جو اس کے کہ حدیث میں ان کو ناقص العقل کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ چالاک اور کید کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ایک مولوی صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ حدیث شریف میں مومن کی مدح آئی ہے المؤمن غر کریم میں نے کہا کہ حدیث میں احمق ہونے کی مدح نہیں آئی اگر یہ معنی ہوتے تو قرآن شریف میں جا بجا ارشاد ہے إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ عاقل ہونے کی مدح کیوں فرمائی جاتی۔ اور یہ دشمنی محض مسلمانوں کے مال اور جان ہی تک محدود نہیں بلکہ ایمان سے بھی دشمنی ہے اگر کوئی غیر مسلم عاقل ہوتا جیسا کہ خیال ہے تو وہ پہلے اپنی آخرت کی فکر کرتا ایمان لانا جب یہ نہیں تو عقل کہاں چالاک ہے تو چالاک اور عقل سے کیا واسطہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں إِنَّ كَيْدَكَ عَظِيمٌ عورتوں کے مکر کو عظیم فرما رہے ہیں اور دوسری طرف حدیث میں ان کو ناقص العقل فرمایا گیا ہے معلوم ہو گیا کہ عقل اور چیز ہے اور کید اور چیز ہے وہ یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ بعض کی نسبت ارشاد ہے وَإِنْ كَانُ مَكْرُهُمْ لِيُرْطَلَّ مِنْهُ الْبَعَالُ۔

قدرت خداوندی

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص کنعان سے مصر میں قحط کے زمانہ میں قافلے آتے جاتے تھے۔

چنانچہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر غلہ لینے کے لئے پہنچے اور چوری کے قصہ میں وہاں ایک بھائی روک لئے گئے تو بقیہ بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام سے آ کر عرض کیا واسئل القریۃ الّتی کنا فیہا والعبیر الّتی اقبلنا فیہا وانا لصلفون یعنی آپ پوچھ لیجئے ان ہستی والوں سے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جس میں ہم آئے ہیں اور بے شک ہم سچے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کنعان سے مصر کو برابر آمد و رفت تھی بس جس حالت میں کہ اس قدر ذرائع علم کے یعقوب علیہ السلام کے پاس موجود تھے اس پر بھی یعقوب علیہ السلام کو پتہ نہ لگا اور یہی فرمایا بنی اذہبوا فتحسبوا من یوسف واخلہ ولا ینسوا من روح اللہ تملائے وہ کشف کہاں گیا اس قدرت کا نام خدائی ہے۔

غیبی رہنمائی

اور اس مقام پر ایک اور کام کی بات سمجھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ برا ارادہ کیا تو اس قصہ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ولقد ہمّت بہ وہم بہا لولا ان راہرہان ربہ یعنی بے شک زلیخا نے ارادہ کر لیا یوسف علیہ السلام کے ساتھ اور یوسف علیہ السلام بھی ارادہ کر لیتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے برہان ربہ کی تفسیر میں مفسرین اور اہل سیر نے لکھا ہے ہر ای صورتہ یعقوب علیہ السلام یعنی یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا اور شرما گئے۔

تو اس قصہ سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دشواری کے وقت بعض لوگ جو اپنے شیخ کی صورت دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے اس وقت ہماری دیکھیری کی اور ان کو ہماری اس مصیبت کا علم ہو گیا یہ اعتقاد صحیح نہیں شیخ کو خبر تک بھی نہیں ہوتی جیسے اس قصہ میں یعقوب علیہ السلام کو اطلاع تک نہ ہوئی۔ ورنہ اس قدر پریشانی نہ ہوتے بلکہ اس شخص کی تسلی اور رہبری کے لئے اللہ تعالیٰ فرشتہ کو کسی ایسے مقبول بندہ کی صورت میں متسلّم کر کے دکھاتے ہیں جس کے ساتھ اس شخص کو انس اور اعتقاد ہوتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک مشکل میں مبتلا تھا سر کی طرف سے حضرت حاجی صاحب کی آواز آئی کہ اس کام کو اس طرح کر لو اس کے بعد فرمانے لگے کہ میں یقیناً جانتا ہوں کہ یہ آواز حضرت حاجی صاحب کی نہیں ہے حضرت کو تو خبر بھی نہیں ایسے ہی یوسف علیہ السلام کو خود یعقوب علیہ السلام نظر نہیں آئے۔ ورنہ اگر یعقوب تھے تو پھر ان کی بے خبری اور پریشانی کے کیا معنی حضرت سید احمد صاحب بریلوی سے کسی نے عرض کیا کہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا اور راستہ بھول گیا آپ نے مجھ کو رہبری فرمائی سید صاحب نے قسم کھا کر فرمایا کہ میں نہیں تھا مجھ کو تو خبر بھی نہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے میری صورت میں کسی کو بھیج کر تم کو راہ دکھلا دیا۔

کار زلف تست مشک افشانی امان عاشقان مصلحت را جمع برآ ہوئے چمن بستہ اند
کام کوئی کرتا ہے نام کسی کا ہو جاتا ہے اگر آج کل کے کوئی دکاندار پیر ہوتے تو سن کر اور زیادہ خوش
ہوتے اور پھولے نہ ساتے اور اس قصہ کو اپنی کرامت شمار کرتے اور سچے پھروں کے ہاں یہ حلت ہے کہ جو سچی
اور واقعی کرامتیں اور تصرفات ہیں ان کی طرف بھی التفات نہیں فرماتے بلکہ روک دیتے ہیں۔

وَمَا أْبْرِيْ نَفْسِيْ اِنْ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ

رَبِّيْ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو بری اور پاک نہیں بتلاتا کیونکہ نفس (ہر ایک کا) بری بات بتلاتا ہے۔
بجز اس (نفس) کے جس پر میرا پروردگار رحم کرنے بلاشبہ میرا رب بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا ہے

تفسیری نکات

نفس کے میلان الی الشر ہونے کا ثبوت

یعنی نفس کی دو قسمیں نہیں بتائیں ایک امارہ بالسوء اور ایک امارہ بالخیر یہ بتایا نفس کی ایک ہی قسم ہے کہ وہ
امارہ بالسوء ہے یعنی نفس ہمیشہ برائی ہی کا حکم کرنے والا ہے مگر جب خدا تعالیٰ رحم فرمائیں یعنی جب خدا کی رحمت
متوجہ ہوتی ہے تو اس وقت اس عارض و قوی کی وجہ سے نفس برائی کا حکم نہیں کرتا اور جب یہ رحمت متوجہ نہیں ہوتی تو
پھر بدستور اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے یعنی برائی کا امر کرنے لگتا ہے بہر حال استثناء سے نفس کی کوئی جدا گانہ قسم
بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ امر بالسوء کے اوقات میں سے ایک وقت کو مستثنیٰ کرنا مقصود ہے حاصل یہ ہوا کہ

وَمَا أْبْرِيْ نَفْسِيْ اِنْ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ وَمِنْ رَحْمَةِ تَعَالٰی عَلَيْهَا
(بلاشبہ نفس بری بات کا حکم کرنے والا ہر وقت میں مگر اللہ تعالیٰ کے اس پر رحم کرنے کے وقت میں یہاں

ماصدر یہ ہے)

شاید کسی کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے کہ ان النفس لا مارة
بالسوء الا ما امر بالسوء (بلاشبہ نفس نیکی کا حکم کرنے والا ہے) تو کیا حرج تھا۔

جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ معنی نہ پیدا ہوتے جو اب ہوئے کیونکہ محاورہ یہ ہے کہ مغلوب حالت کو
غالب حالت سے استثناء کیا کرتے ہیں مثلاً اگر زیادہ جماعت نے کھانا کھا لیا تو یوں کہتے ہیں کہ سب لوگوں نے کھانا
کھا لیا مگر زید و عمر نے اس جملہ سے یہ سمجھا گیا کہ جماعت کثیر کھانا کھا چکی اور قلیل یعنی دو شخص باقی رہ گئے اور اگر اسی

کو یوں تعبیر کریں کہ فلاں فلاں نے کھانا نہیں کھایا مگر سب نے تو محاورہ کے اعتبار سے یہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ مستثنیٰ مغلوب نہ تھا بلکہ مستثنیٰ منہ پر غالب تھا تو معلوم ہو گیا کہ غالب حالت سے مغلوب حالت کو استثناء کیا جاتا ہے اگر کھانے والے زیادہ ہیں تو انہیں مستثنیٰ منہ نہیں کہے بہر حال غالب حالت کا اعتبار استثناء میں ضروری ہے۔

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھئے کہ لَا تَخَافُ الْعَسْفَةَ (برائی کا حکم کرنے والا ہے) یہاں پر مستثنیٰ منہ ہے اس لئے بقاعدہ مذکورہ غالب حالت یعنی امر بالسوء کو مستثنیٰ منہ اور مغلوب یعنی عدم امر بالسوء کو مستثنیٰ بنا نا چاہئے سو قرآن میں ایسا ہی ہے کیونکہ غالب صفت نفس کی امارہ بالسوء ہی ہے۔

واقعی قرآن کے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ زبان کو ذوق بھی ہو اور عادات و محاورات میں بھی کامل دخل ہو محض علوم عقلیہ سے قرآن حل نہیں ہو سکتا بلکہ عرف و عادات کو حکم بنا کر تب قرآن کو دیکھنا چاہئے ورنہ غلطی ہو جانے کا قوی احتمال بلکہ یقین ہے کیونکہ قرآن کا نزول عرف و محاورات کی رعایت کے ساتھ ہوا ہے۔

بہر حال نفس کی حالت غالبہ امر بالسوء ہے اس لئے جب اس کو کام میں نہ لگایا جاوے تو یہ اپنے لئے خود مشغلہ تجویز کرے گا اور جو مشغلہ یہ خود اپنے لئے تجویز کرے گا چونکہ اس میں غلبہ ہے شر کا اس لئے وہ اکثر برائی ہوگا اور مضریٰ کو تجویز کرے گا۔

اسی واسطے مالا یعنی کے ترک کو جناب رسول مقبول ﷺ نے حسن اسلام فرمایا کیونکہ معرکوں تو ہر شخص معرکہ سمجھتا ہے ہی خفا صرف لایعنی میں ہے پس مقصود حضور ﷺ کا یہ ہے کہ معرکے چھوڑنے کے بعد لایعنی سے بچے اور وہ تجربہ سے موقوف ہے اس پر کہ مالا یعنی میں نفس کو لگا دے پس اس ترک کے لئے یہ فعل بھی لازم ہے۔

بہر حال نفس کا میلان الی الشر (برائی کی طرف مائل ہونا) تو قرآن سے ثابت ہے اور یہ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ نفس جب خالی ہوگا تو معصیت ہی تجویز کرے گا اور جب یہ بے کار ہوگا تو کسی نہ کسی بلا ہی میں مبتلا ہوگا تو ان دونوں مقدموں سے اس کی ضرورت ثابت ہوگئی کہ ترک معرکے بعد اشغال بالنافع ضروری ہے سو قرآن مجید کی تعلیم کا یہی حاصل ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اپنے نفوس کا تبریہ نہیں فرماتے

اور اولیاء تو علیحدہ انبیاء علیہم السلام بھی باوجود معصوم ہونے کے اپنے نفوس کا تبریہ نہیں فرماتے۔ دیکھئے یوسف صدیق علیہ السلام کیا فرماتے ہیں وَمَا أْبْرَأِي نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَكْبَارُةٌ يُأْتِيكَ بِالسُّوءِ جَنِّكَ نَزَاهِتٍ كِي خُودِ حَقِّ تَعَالَى كَوَاعِي دَعْرَهْ هِي هِي چنانچہ ارشاد ہے كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ سَوء كَهْتَهْ هِي صَغِيرَه كَو اور فحشاء سے مراد کبیرہ ہے بس صاف دلالت ہے کہ یوسف علیہ السلام سے نہ صغیرہ صادر ہوا نہ کبیرہ اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ارادہ گناہ کا کیا تھا اور یہ آیت وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا سَعِ اسْتِدْلَال كَرْتَهْ هِي

ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ **وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهَا بِرَکَامٍ خَتْمٌ هُوَ كَمَا** اور **هَمَّتْ بِهَا لَوْلَا أَنْ رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهَا عَلِيمٌ** کلام ہے۔

حاصل آیت کا یہ ہوا کہ حضرت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ برائی کا کیا اور یوسف علیہ السلام بھی کر لیتے اگر اپنے رب کا برہان نہ دیکھتے اور اسی واسطے مولانا فرماتے تھے کہ وہم بہا پر میں وقف نہیں کرتا پس اس سے ہم کی نفی ہوتی ہے نہ کہ اثبات اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے **كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ الشُّؤْمَ وَالْغَشَاءَ** کہ اس میں صغیرہ اور کبیرہ دونوں کی نفی ہے اور جو لوگ ہم بھا پر وقف کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم کے مراتب مختلف ہیں زلیخا نے جو ہم کیا وہ ان کے مرتبہ کے موافق تھا اور یوسف علیہ السلام سے جو ہم ہوا وہ ان کے مرتبہ کے موافق ہے جو صغیرہ سے بھی بمراتب کم ہے غرض صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہونا سب کا متفق علیہ ہے۔ یوسف علیہ السلام سے کوئی عمل ایسا کہ جس سے گناہ لکھا جاوے ظہور میں نہیں آیا۔ جمہور کی تفسیر پر دوسرے گناہ ہوا کہ وہ گناہ نہیں ہے۔

براءت یوسف علیہ السلام کا عجیب استدلال

ایک بزرگ نے عجیب لطیف لکھا ہے کہ اے عزیز! یوسف علیہ السلام کی آلودگی کا وہم بھی مت کر ان کے دامن عصمت کو ذرا برابر بھی داغ نہیں لگا اور اگر تجھ کو اس کی شہادت چاہئے تو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں **كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ الشُّؤْمَ وَالْغَشَاءَ** اور اگر مخلوق کی شہادت چاہتا ہے تو اس شیر خوار لڑکے کی شہادت کافی ہے جس نے یوسف علیہ السلام کی براءت کی گواہی دی اور اگر اس کی شہادت قبول نہیں کرتا تو خود زلیخا کی شہادت موجود ہے **وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ** یعنی میں نے یوسف علیہ السلام سے ان کے نفس کی درخواست کی تھی مگر وہ باز رہے اور ان کی شہادت بھی منظور نہیں تو زمان مصر کی شہادت موجود ہے کہ انہوں نے کہا **مَا عَلِمْنَا عَلَيْكَ مِنْ سُوءٍ** یعنی ہم نے ان پر کوئی برائی معلوم نہیں کی اور اگر ان کی شہادت بھی تیرے نزدیک قابل قبول نہیں تو شیطان کی شہادت موجود ہے اس نے کہا تھا **لَا أُظْهِرُكُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادًا لَّهِ مِنْهُمْ مَخْلُوصِينَ** یعنی میں ضرور ان سب کو بہکاؤں گا مگر جو ان میں سے تیرے تخلص بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں کہ وہ تخلصین میں سے ہیں چنانچہ ارشاد ہے **إِنَّهَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ** مگر باوجود اس قدر تقدس اور پاکی کے پھر یہ فرماتے ہیں **وَمَا أَبْرَأِي نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَفْكَارَةٌ بِالشُّؤْمِ** یعنی میں اپنے نفس کی براءت کا دعویٰ نہیں کرتا نفس تو برائی کا کثرت سے امر کرتا ہے لیکن تو وضع چونکہ بعض مرتبہ ناشکری کی طرف منحصر ہو جاتی ہے اس لئے آگے بطور استثناء کے فرماتے ہیں **إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي** یعنی مگر وہ شخص جس پر میرا رحم کرے اور ان کا مرحوم ہونا یقینی ہے۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْكُمْ ۝

ترجمہ: یعنی مجھ کو ملک کے غلہ کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے میں اس کی خوب نگرانی کروں گا میں اس کے طریقوں کو جانتا ہوں۔

تفسیری نکات

احکام مال و جاہ

حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے کہ جب بادشاہ نے ان سے کہا تھا کہ اتنا بڑا کام یعنی قحط عام کا انتظار کون سر دھرے تو انہوں نے فرمایا کہ میں کر سکتا ہوں۔ چنانچہ ان کا مقولہ یہ ہے کہ **إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْكُمْ** تو گو اس موقع پر یوسف علیہ السلام اپنی تعریف خود کر رہے ہیں میں ایسا ہوں اور ایسا ہوں **لَا وَحُكُومَتِ** مجھ کو دے دو مگر آپ کو یہ یقینی طور سے معلوم تھا کہ یہ کام ضروری اور عظیم الشان ہے اور انتظام کا اہل کوئی ہے نہیں اس لئے آپ نے اس موقع پر تواضع سے کام نہیں لیا اور نہ ساری مخلوق تباہ ہو جاتی۔ بلکہ آپ نے اظہارِ نعمت کے طور پر اپنے واقعی اوصاف بیان فرمادیئے تاکہ بادشاہ کو پورا اطمینان ہو جاوے کہ یہاں یہ کام آپ خود کر سکتے ہیں آپ کو بھروسہ تھا کہ میں اس کام کو بخوبی کر سکتا ہوں اس لئے آپ نے خود درخواست کی پس اگر کسی زمانہ میں کسی شخص کو اپنی نسبت یہ معلوم ہو کہ میں اپنے بھائیوں کو راحت پہنچا سکتا ہوں اور مخلوق اگر کسی دوسرے کے قبضہ میں پہنچے گی تو راحت نہیں مل سکتی اور اس کو بھروسہ ہو کہ میں آرام پہنچا سکتا ہوں اور شریعت کے موافق حکومت و انتظام کر سکتا ہوں اور اس کو مال و جاہ کی بالکل پروا نہ ہو تو ایسے شخص کو اب بھی حکومت کی درخواست کرنا جائز بلکہ مستحسن ہے اور ہمارے نزدیک عالمگیر کا اپنی سلطنت کے لئے سعی کرنا بھی اسی وجہ سے تھا یا یہ صورت ہو کہ کوئی حاکم نہ ہو تو غیر قوم سے ہو جائے گا اور اس صورت میں مسلمانوں کی بری گت بنائی جائے گی۔ تو درخواست کرنا حکومت کی اس صورت میں بھی جائز ہے مگر اس میں بھی دو شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ مال مقصود نہ ہو۔ دوسرے جاہ مقصود نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ مال و جاہ از خود حاصل ہو جائے مگر مقصود نہیں

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا

أَنْ تُفَقِدُونُ ﴿۳۱﴾

ترجمہ: اور جب قافلہ چلا تو ان کے باپ نے کہا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بھی بائیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف علیہ السلام کی خوشبو آ رہی ہے۔

تفسیری نکات

کشف امر غیر اختیاری ہے

حضرت یعقوب علیہ السلام کی شیخ شیرازی نے یہ حالت لکھی ہے۔

گھے برطارم اعلیٰ نشینم گھے برپشت پائے خود نہ بینم

ایک تو وہ وقت تھا کہ مصر سے قاصد پیراہن یوسفی لے کر چلا اور کنعان میں آپ کو اس کی خوشبو پہنچ گئی اور حاضرین مجلس سے فرمایا اِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَقِدُوْنَ ﴿۳۱﴾ یعنی اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے سے حواس میں خور آ گیا ہے تو میں ایک بات کہوں وہ یہ کہ مجھے یوسف کی خوشبو آ رہی ہے یہاں تو مصر سے پیراہن کی خوشبو کا احساس ہو گیا اور ایک وہ وقت تھا کہ خود یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنعان کے جنگل میں ایک کنوئیں کے اندر قید کر دیا اور چند روز تک وہ اسی میں رہے مگر یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی یہ بھی خبر نہ تھی کہ یوسف زندہ ہیں یا نہیں صدمہ فراق میں اتاروئے کہ آنکھیں جاتی رہنے کے قریب ہو گئیں۔

یعقوب علیہ السلام کے متعلق بعض محققین کی رائے یہی ہے کہ وہ نابینا نہ ہوئے تھے بلکہ روتے روتے بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ انہوں نے اَبْيَضَّتْ عَيْنَاهُ كَوْضَعٍ بَصِيرًا سے اسی ضعف کا زوال مراد لیا ہے ولا بعد ارادته للحكمة التي ذكرناها پس بعیدی نہیں لوٹ آنا بینائی کا بوجہ حکمت کے ہو جو ہم نے ذکر کی تو دیکھئے یعقوب علیہ السلام کو بتداء میں یوسف علیہ السلام کی اطلاع نہ ہوئی کہ وہ کس حال میں ہیں حالانکہ وہ اس وقت کنعان ہی کے کنوئیں میں تھے پھر اس کے بعد عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں اور بعد میں مصر سے قیس کے روانہ ہوتے ہی خوشبو پہنچ گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کی ایک وقت میں اور شان تھی اور ایک وقت میں اور شان تھی۔ یہی میں کہہ رہا تھا کہ تکوین انبیاء علیہم السلام کو بھی پیش آئی ہے ایک ہی مختلف اوقات میں مختلف حالات پیش آتے تھے اور بہت سے سالکین کو بھی پیش آتے ہیں۔

حالت یعقوب علیہ السلام

یاد رکھو! اول تو کشف ہونا ہر بزرگ کو ضروری نہیں انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں حضرت یعقوب علیہ السلام نبی ہیں اور بڑے صاحب کشف ہیں جب حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر سے بھائیوں کو قیام دیا ہے کہ اس کو باپ کی آنکھوں پر ڈال دو اور ادھر وہ کرتے لے کر چلے اور درمیان میں سینکڑوں مراحل اس لئے کہ کہاں شہر کنعان یعقوب علیہ السلام کا مسکن اور کہاں مصر بہت دور دراز کی مسافت درمیان میں ہے لیکن آپ فرماتے ہیں **لَئِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا اَنْ تَفْقِدُوْنَ** یعنی بے شک میں یوسف کی بو پاتا ہوں اگر تم مجھ کو بہکا ہوا نہ کہو قالو قاله انك لفي ضلالك القديم بیٹوں نے کہا تم ہے خدا کی کہ آپ بے شک اپنی پرانی غلطی میں ہیں۔ **فَلَمَّا اَنَّ جَاءَ الْبَشِيرَ الْقَاهُ عَلٰى وَجْهِهِ** **فَاَنْتَدَبَ بَصِيْرًا قَالَا لَمْ اَقْلُ لَكُمَا لَئِنَّا اَعْلَمُوْا مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ** یعنی جب خوش خبری دینے والا آیا کرتا تو یعقوب علیہ السلام کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ بیٹا ہو گئے اور فرمایا میں نے تم کو کہا نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ذرائع علم کے باوجود یعقوب علیہ السلام کا عدم علم

اللہ اکبر! اتنا بڑا کشف اور باوجود اس کے یوسف علیہ السلام نے مصر میں سا لہا سال سلطنت کی اور صاحب سلطنت کے واقعات اور اس کے حالات سے دور دور تک واقفیت ہوتی ہے اور یوسف علیہ السلام یوسف ہی کے نام سے مصر میں مشہور تھے۔ یہ بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ نام بدل لیا ہوگا چنانچہ عزیز مصر نے زلیخا کے قصہ میں یوسف علیہ السلام کو اس طرح خطاب کیا یوسف اعرض عن هذا اور دوسری جگہ ارشاد ہے **يُوسُفُ اِنَّمَا الصِّدْقُ اِنَّا كُنَّا اَنْ اَتَيْنَا مِنْ صَافٍ مَّعْلُومٍ** ہوتا ہے کہ یوسف کے ہی نام سے مشہور تھے اور یہ بھی نہ تھا کہ آمدورفت ایک ملک سے دوسرے ملک میں نہ ہوتی ہو برابر قافلے آتے جاتے تھے چنانچہ ارشاد ہے **جَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَاِوَادَهُمْ** **الْخِصْمُ** **فَلَمَّا كَانَتْ فِي قَوْمِلٍ كِيَا مَدُودٌ** بہت ہی تمہی قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص کنعان سے مصر میں قحط کے زمانہ میں قافلے آتے جاتے تھے چنانچہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر غلہ لینے کے لئے پہنچے اور چوری کے قصہ میں وہاں ایک بھائی روک لئے گئے تو بقیہ بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام سے آ کر عرض کیا **وَسَّئِلُ الْقَرْيَةِ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعَيْدِ الَّتِي اَقْبَلْنَا فِيهَا وَبِئْسَ الصِّدْقُوْنَ** یعنی آپ پوچھ لیجئے ان بستی والوں سے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے جن میں ہم آئے ہیں اور بے شک ہم سچے ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کنعان سے مصر کو برابر آمدورفت تھی۔ بس جس حالت میں کہ اس قدر ذرائع علم کے یعقوب علیہ السلام کے پاس موجود تھے اس پر بھی یعقوب علیہ السلام کو پتہ نہ لگا اور یہی فرمایا

يَبْنِي لَذَهَبًا فَتَحْتَسِبُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَأْتِسُوا مِنَ زُجُوجِ اللَّهِ جَلَاءُ وَهُ كَشَفَ كَهَاں گيا۔ اس قدرت کا نام خدائی ہے۔

اور اس مقام پر ایک اور کام کی بات سمجھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ جب زلیخا نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ برا ارادہ کیا تو اس قصہ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهَا وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّا بَرَّهَانَ نَبَاہُ یعنی بے شک زلیخا نے ارادہ کر لیا یوسف کے ساتھ اور یوسف بھی ارادہ کر لیتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے۔ بَرَّهَانَ نَبَاہُ کی تفسیر میں مفسرین اور اہل سیر نے لکھا ہے رای صوره یعقوب علیہ السلام یعنی یوسف علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کا چہرہ نظر آیا اور شرمائے۔

اعتقاد صحیح

تو اس قصہ سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ یہ ہے کہ دشواری کے وقت بعض لوگ جو اپنے شیخ کی صورت دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمارے شیخ نے اس وقت ہماری دنگیری کی اور ان کو ہماری اس مصیبت کا علم ہو گیا یہ اعتقاد صحیح نہیں شیخ کو خبر تک بھی نہیں ہوتی جیسے اس قصہ میں یعقوب علیہ السلام کو اطلاع تک نہ ہوئی ورنہ اس قدر پریشان نہ ہوتے بلکہ اس شخص کی تسلی اور رہبری کے لئے اللہ تعالیٰ فرشتہ کو کسی ایسے مقبول بندہ کی صورت میں متمثل کر کے دکھاتے ہیں جس کے ساتھ اس شخص کو انس اور اعتقاد ہوتا ہے۔

واقعہ مولانا یعقوب وسید بریلویؒ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ایک مشکل میں مبتلا تھا سر کی طرف سے حضرت حاجی صاحب کی آواز آئی کہ اس کام کو اس طرح کر لو اس کے بعد فرمانے لگے کہ میں بھینا جانتا ہوں کہ یہ آواز حضرت حاجی صاحب کی نہیں ہے حضرت کو تو خبر بھی نہیں ایسے ہی یوسف علیہ السلام کو خود یعقوب علیہ السلام نظر نہیں آئے ورنہ اگر یعقوب علیہ السلام تھے تو پھر ان کی بے خبری اور پریشانی کے کیا معنی حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ سے کسی نے عرض کیا کہ میں ایک مرتبہ جنگل میں تھا اور راستہ بھول گیا آپ نے مجھ کو رہبری فرمائی سید صاحب نے قسم کھا کر فرمایا کہ میں نہیں تھا مجھ کو تو خبری بھی نہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ میری صورت میں کسی کو بھیج کر تم کو راہ دکھلا دیا۔

انبیاء علیہم السلام کو ہر امر پر مطلع ہونا ضروری نہیں

بہر حال یعقوب علیہ السلام کے قصہ سے ثابت ہو گیا کہ کشف ضروری نہیں ہے اور دیکھتے یوسف علیہ السلام کنعان کے کنوئیں میں رہے لیکن یعقوب علیہ السلام کو خبر نہ ہوئی جب بیٹوں نے کہا يَا كَلْبَةَ الدَّيْثُوبِ تو

اجمالاً یہ معلوم ہوا کہ یہ جھوٹے ہیں۔ بھڑیے نے نہیں کھایا۔ لیکن مفصلاً یہ معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں چنانچہ فرمایا
قال بل سولت لکم انفسکم امر الفصبر جمیل بس جب انبیاء کو اطلاع ہونا ہر امر کی ضروری نہیں تو
پیروں پر بھروسہ کرنا کہ ان کو ہمارے حال کی اطلاع ہے نہایت جہل اور شائبہ شرک کا ہے۔

ایک تفسیر برہان

اس برہان رب کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو
اس تنہائی میں سامنے انگشت بدنداں دیکھا یہی برہان رب تھی جس کی وجہ سے ان کی حفاظت ہوئی اگر یہ تفسیر صحیح
ہو تو یہ بات ظاہر ہے کہ یہ یعقوب علیہ السلام کی کرامت یا معجزہ تھا مگر یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر بھی تھی
کیونکہ اگر یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کا یہ پتہ نشان معلوم ہو جاتا کہ وہ عزیز مصر کے گھر میں ہیں تو
بعد میں یہ نہ فرماتے۔

يَبْنَؤُا اَذْهَبُوا فَتَحَسَّبُوا مِنْ يُوسُفَ وَآخِيهِ يَعْنِي اے میرے بیٹو! جاؤ تم یوسف اور اسکے بھائی کو تلاش کرو۔
وَكَأَيِّنْ مِنْ اَيُّوْفِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝

ترجمہ: اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں جن پر ان کا گزر رہتا ہے اور وہ ان کی
طرف اصلاً توجہ نہیں کرتے۔

عالم میں حق کا آئینہ بننے کی استعداد ہے

یہی معنی ہیں اس آیت کے وَكَأَيِّنْ مِنْ اَيُّوْفِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝
شکایت فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ بہت سی نشانیاں عالم میں ایسی ہیں کہ لوگ ان پر نظر ڈالتے چلے جاتے ہیں اور
ان کی طرف توجہ نہیں کرتے یعنی ان کو آیات اللہ اور مراۃ حق (حق کا آئینہ) نہیں بناتے معلوم ہوا کہ اگر ان کو
مراۃ حق بنانا چاہتے تو بنا سکتے تھے کیونکہ شکایت امور اختیار یہی میں ہوتی ہے معلوم ہوا کہ عالم میں قابلیت مراۃ
حق بننے کی ہے اگر بنانے والا چاہے پس ثابت کہ عالم کی طرف توجہ اس حیثیت مذکورہ سے مذموم نہیں بلکہ محمود
اور مطلوب ہے کیونکہ اس کے خلاف پر یعنی اعراض پر شکایت کی گئی ہے ہاں جانچ لیا جائے کہ آیا یہ حیثیت
حاصل بھی ہے جب طبعاً و ذوقاً یہ بات پیدا ہو جائے کہ

حسن خوشی از روئے خوباں آشکار کردہ پس پشیم عاشقاں خود راتما شا کردہ

(تو نے اپنی خودی کو خوبصورتی کے چہروں سے ظاہر کر دیا ہے مگر عاشقوں کی نظر میں تماشا بن گیا ہے)

تو پھر اس کے لئے ہر چیز میں نظر کی اجازت ہوگی اور توجہ الی العالم اس کے لئے توجہ الی اللہ ہی ہوگی۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً لِأُولِي الْأَلْبَابِ

ترجمہ: ان (انبیاء و امم سابقین) کے قصہ میں سمجھدار لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔

مصیبت گناہوں کی ہی وجہ سے آتی ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً لِأُولِي الْأَلْبَابِ (یعنی انبیاء علیہم السلام و امم سابقین کے قصے میں سمجھدار لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے) حالانکہ قصہ یوسف علیہ السلام سے کوئی نتیجہ نفلوں میں نہیں بتلایا تھا مگر پھر بھی فرمایا دیا کہ یہ قصہ عبرت ہے تو جہاں نتیجہ نصاباً مذکور ہو وہاں قیامتاً عبرت ہی کے لئے ہے چنانچہ اس آیت میں جو قصہ مذکور ہے اس پر یہ نتیجہ مرتب فرمایا کہ فَلَؤَلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا کہ ان لوگوں نے بعد نزول عذاب تضرع کیوں نہ کیا صاف صاف شکایت فرما رہے ہیں اور ہم نے اور امتوں کی طرف بھی جواب سے پہلے گزر چکیں رسول بھیجے تھے سو ہم نے ان کو پکڑ لیا) تاکہ تضرعوا کے مقابل کوئی شے مذکور ہو یعنی ان لوگوں نے تضرع نہ کیا بلکہ تکذیب کی تو ہم نے اس کو عذاب دیا جب انہوں نے سرکشی کی تو ہم نے ان کو مصائب میں گرفتار کیا اس سے ایک فائدہ مستقلہ نکل آیا وہ یہ کہ مصیبت جب آتی ہے تو گناہ کی وجہ سے آتی ہے خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے پہلی امتوں کے پاس رسول بھیجے تو انہوں نے سرکشی کی ہم نے ان کو مصائب میں مبتلا کیا تاکہ وہ تضرع کریں یہ تو بیان تھا مصائب کے آنے کا اس کے بعد ان مصائب سے ان کے متاثر نہ ہونے کا ذکر مع الشکایت ہے کہ اس وقت انہوں نے تضرع کیوں نہ کیا جبکہ ہم نے ان کو باساء میں گرفتار کیا تھا باساء یہاں عام ہے یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ بعد بلا آنے کے تضرع کرتے اور زاری کرتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ ان کے دل اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال کو حیرین کر دیا یعنی اپنے اعمال سیدہ کی طرف ان مصائب کو منسوب نہیں کیا۔

حکایت حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوہیؒ

فرمایا شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ایک مرید کے گھر شادی تھی حضرت شیخ امتحان کے لئے رات کے وقت لباس تبدیل کر کے فقراء کی صف میں جا بیٹھے جب گھر والے نے خیرات تقسیم کی تو پیر (حضرت شیخ عبدالقدوس) کو بھی ایک فقیر سمجھ کر دے دی صبح کو اس سے سخت ناراض ہوئے فرمایا کہ اگر تم کو میری محبت ہوتی تو تم کو میری خوشبو آ جاتی اور خوشبو سے مجھ کو پہچانتے چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی خوشبو سے یہ فرمایا تھا (۱) انسی لا جلیریح یوسف لولا ان تفلنون (سورہ یوسف) اس پر شبہ نہ کیا جاوے کہ محبت کے لئے خوشبو کا آنا لازم ہے بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہر بندہ کے ساتھ جدا ہے ممکن ہے کہ شیخ کے لئے عادت اللہ

یہی ہو کہ ان کے محبت کو ان میں سے خوشبو کا آنا ضروری ہو۔ (الافاضات الیومین ۹۳ ص ۲۳۲-۲۳۳)

علم اعتبار کی حقیقت

اور جو سچے معتقد اور محقق تھے انہوں نے یہ کہا کہ صوفیہ کی مراد تفسیر کرنا نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اے قرآن پڑھنے والے تو قرآن کے قصوں کو محض قصہ سمجھ کر نہ پڑھ بلکہ ان سے سبق حاصل کر کیوں کہ قرآن میں جو قصے مذکور ہیں وہ عبرت حاصل کرنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں جیسا خود قرآن میں ارشاد ہے

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۲۹﴾ (سورۃ یوسف آیت)

پس جب تو موسیٰ علیہ السلام کے قصہ پر پہنچے تو اس سے یہ سبق حاصل کر کہ تیرے اندر بھی ایک چیز موسیٰ کے اور ایک چیز فرعون کے مشابہ ہے یعنی روح اور نفس دوسری عبارت میں یوں ہو کہ انسان کے اندر دو قوتیں ہیں ایک داعی الی الخیر جو مشابہ موسیٰ علیہ السلام کے ہے دوسری داعی الی الشر جو مشابہ فرعون ملعون کے ہے پس تو بھی اپنی روح کو نفس پر غالب کر جس کا طریقہ مجاہدہ اور تبلیغ ہے پس تو نفس کو آیات الہیہ یاد دلانا کہ اس کو خوف الہی پیدا ہو اور نافرمانی سے باز آ جائے یہ علم اعتبار ہے کہ دوسرے کے قصہ کو اپنی حالت پر منطبق کر کے سبق حاصل کیا جائے پس اس آیت سے روح و نفس کی حالت پر حکم کرنا استدلال کے طور پر نہیں بلکہ بطور اعتبار کے ہے استدلال تو مفہوم لغوی سے ہوتا ہے ان طرق کے ساتھ جو اہل معانی و اصول نے بیان کئے ہیں اور اعتبار کتبہ و اشارہ کے طور پر ہوتا ہے اور ان دونوں کی اصل قرآن سے ثابت ہے لیکن قرآن میں دلیل و استدلال کا لفظ صراحتہ نہیں آیا بلکہ اس کے مرادفات آئے ہیں چنانچہ ارشاد ہے قل ھاتوا برھانکم اور ارشاد ہے قل ھل عندکم من علم چونکہ برحان اور علم دلیل کے معنی میں ہے اس لئے اس کا نام استدلال رکھنا صحیح ہو گیا جیسے اقموا الصلوٰۃ کے معنی میں یوں کہنا کہ حق تعالیٰ نے نماز کو فرض کیا ہے صحیح ہے حالانکہ اقموا الصلوٰۃ میں اللہ اور فرض کا لفظ صراحتہ نہیں مگر اس کا قائم مقام موجود ہے اور دوسرے طریق کا نام خود قرآن ہی میں اعتبار آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے فاعتبروا یا ولی الابصار اس سے اوپر بنی نصیر کے (جو یہود کا ایک قبیلہ ہے) جلا وطن کئے جانے کا قصہ مذکورہ ہے جس کے بیان کرنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ اے بصیرت والو! اس سے عبرت حاصل کرو یعنی اگر تم ایسی حرکت کرو گے جو ان لوگوں نے کی تو اپنے واسطے بھی اس عذاب کو تیار سمجھو اور یہی تو علم اعتبار ہے کہ دو چیزوں میں مشابہت ہو تو ایک نظیر سے دوسری نظیر کا استخراج کیا جائے اور یہی عبرت حاصل کرنے کے لئے معنی ہیں کہ دوسرے کی حالت کو اپنے اوپر منطبق کیا جائے کہ اگر ہم نے اس کے جیسے اعمال کئے تو ہمارا بھی وہی حال ہوگا جو اس کا ہوا ہے رہا یہ سوال کہ جس طرح صوفیہ نے علم اعتبار کا استعمال کیا

ہے کیا نصوص میں بھی ایسا استعمال آیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ بجز اللہ اس کی نظیر نصوص میں بھی موجود ہے اور میں یہ بات خود نہیں کہتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے قول سے میں اس کا ثبوت دیتا ہوں اور وہ اتنے بڑے محقق ہیں کہ بعض لوگوں نے ان کو غیر مقلد سمجھ لیا ہے کہ وہ ائمہ کی تقلید بھی نہ کرتے تھے۔ مگر یہ غلط ہے وہ مقلد ہی ہیں مگر مقلد محقق ہیں لیکر کے فقیر نہیں جیسے سالکین و مجذوبین کے سلوک و جذب میں مراتب ہیں کہ بعض سالک مجذوب ہیں بعض مجذوب سالک محض ہیں بعض سالک محقق ہیں۔ ایسے ہی تقلید و تحقیق کے بھی مراتب ہیں کہ بعض مقلد محض ہیں بعض محقق محض یعنی مجتہد ہیں اور بعض مقلد محقق ہیں بعض محقق مقلد ہیں تو شاہ صاحب مقلد محض نہ تھے بلکہ مقلد محقق تھے اسی لئے بعض کو ان پر غیر مقلدی کا شبہ ہو تو اتنے بڑے محقق نے دو حدیثوں کے متعلق فوزاً الکبیر میں یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے صحیحین میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ تقدیر کا مسئلہ ارشاد فرمایا۔

امامنکم من احد الا وقد کتب له مقعده من النار و مقعده من الجنة قالوا یا رسول اللہ افلا تکتل علی کتابنا و ندع العمل یعنی ہر شخص کا ٹھکانا جنت میں یا دوزخ میں پہلے ہی سے لکھ دیا گیا ہے۔ اس پر حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اعلمو انکم لمیسر لما خلق له اما من کان من اهل السعادة فیسروا بعمل السعادة و اما من کان من اهل الشقاوة فیسروا العمل الشقاوة ثم قراء فاما من اعطى و اتقى صدق بالحسنی (الایہ متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۱۱)

کہ عمل کرتے رہو ہر شخص کے لئے وہ عمل آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے جو شخص الہی سعادت سے ہوگا اس کے لئے عمل سعادت آسان ہوگا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے جو شخص الہی سعادت سے ہوگا اس کے لئے عمل سعادت آسان ہوگا جو الہی شقاوت سے ہوگا اس کے لئے عمل شقاوت آسان ہوگا اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی۔

فاما من اعطى و اتقى و صدق بالحسنی فیسروہ' للیسری و اما من بخل و استغنی و کذب بالحسنی فیسروہ' للیسری

(ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو شخص (اللہ کی راہ میں) صدقہ دے اور تقویٰ اختیار کرے اور اچھی بات (یعنی دین اسلام) کی تصدیق کرے تو ہم اس کے لئے راحت کی چیز (یعنی جنت) کا سامان کر دیں گے اور جو بخل کرے اور بے پروائی اختیار کرے اور اچھی بات (یعنی دین اسلام) کی تکذیب کرے ہم اس کے لئے تکلیف کی چیز (یعنی جہنم) کا سامان کر دیں گے (۱۲)

اب اس پر سوال ہوتا ہے کہ اس آیت میں تقدیر کا ذکر کہاں ہے آیت مدلول تو یہ ہے کہ اعطاء و تقویٰ

سے جنت آسان ہو جاتی ہے اور بخل و استغناء سے دوزخ آسان ہو جاتی ہے اس کا جواب شاہ صاحب نے یہ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بطور علم اعتبار کے اس آیت کے مضمون سے حدیث کے مضمون پر استشہاد فرمایا اور مقصود تشبیہ دینا ہے کہ جیسے بواسطہ اعمال کے بعض کے لئے جنت اور بعض کیلئے دوزخ کو آسان کر دیا ہے اسی طرح بواسطہ تقدیر کے بعض کے لئے اعمال صالحہ کو بعض کیلئے معاصی کو آسان کر دیا ہے اور یہ تشبہ محض توضیح کے لئے ہے کہ تقدیر سے تیسرہ وہی ہو جاتی ہے جیسی اس آیت میں تیسرے اعمال سے مذکور ہے پس مقصود تشبیہ سے توضیح ہے مشبہ کی اس لئے تشبیہ میں شرط ہے کہ مشبہ بہ میں وہ صفت اوضح و اشہر ہو گو اقوی بہ ہوا ب یہاں سے تشبیہ کے متعلق ایک مشہور سوال کا بھی حل ہو گیا وہ یہ کہ اللہم صل علی محمد و علی ال محمد کما صلیت علی ابراہیم و علی ال ابراہیم میں جو صلوٰۃ علی رسول اللہ ﷺ کو صلوٰۃ علی ابراہیم کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

تشبہ میں مشبہ کا افضل ہونا ضروری نہیں

تو اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے صلوٰۃ ابراہیم کے افضل و اکمل ہونے کا صلوٰۃ محمد سے اور غشا اس کا وہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ و افضل ہونا شرط ہے حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے بلکہ صرف اوضح و اشہر ہونا ضروری ہے افضل و اکمل ہونا ضروری نہیں اور اس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں۔

اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیہا مصباح اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ نور مصباح لوگوں کے ذہن میں پہلے سے حاضر ہے اس پر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن تو نور شمس و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقویٰ ہے مگر سورج میں ایک عیب کہ اس پر نگاہ نہیں جیتی اس کی ساتھ تشبیہ دی جاتی تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا کہ اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور قمر سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس تو ان کی ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہونا کہ نور حق بھی کسی سے مستفاد ہے۔ پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو یہی منورہ و منور بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس کے نور میں کچھ کی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہنچتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شے نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے۔ (غایت الکناح فی آیت الکناح ملحقہ)

سُورَةُ الرَّعْدِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ

تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کا اطمینان ہو جاتا ہے۔

تفسیری نکات

اطمینان قلب صرف ذکر اللہ میں ہے

یاد رکھو سمجھ رکھو (یہ دلول ہے کلمہ الا کا) حصر کے ساتھ فرماتے ہیں (یہ دلول سے تقدیم محمول کا کہ خدا ہی کی یاد کے ساتھ دلوں کو چین ملتا ہے تمام عالم میں چراغ لے کر ڈھونڈھ آؤ کوئی دوسری چیز نہ ملے گی کیونکہ ظاہر حصر سے حقیقی ہی ہے

خلاصہ بیان کا یہ ہوا کہ بس ذکر اللہ ہی ایک چیز ٹھہری جس میں چین اور اطمینان ہے۔

تکرار ذکر سے عذاب غم سے نجات ہوگی

اور جس مرتبہ کا ذکر ہوگا اسی مرتبہ کا اطمینان عطا ہوگا۔ اور اس اطمینان کا حاصل یہ نہ ہوگا کہ غم بالکل زائل ہو جائے گا بلکہ یہ حاصل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ ہوگا عاقل اس پر راضی ہو جائے گا یہ سمجھے گا کہ جو ہوا عین حکمت ہوا۔ اسی ذکر کے تکرار سے غم کا غلبہ کم ہو جائے گا جس سے تکلیف کا درجہ جاتا رہے گا تو کیا ٹھکانہ ہے رحمت کا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا طریقہ بتلایا کہ عذاب غم سے بھی بچ جاؤ اور ثواب سے بھی محروم نہ ہو مگر تم یہ چاہتے

ہو کہ غم ہی نہ رہے جس کے معنی یہ ہیں کہ صبر کا ثواب نہ ملے۔

بیماری میں آہ کا منہ سے نکالنا خلاف صبر نہیں

جیسے یعقوب علیہ السلام کا قول ہے العما اشکوبشی و حزنی الی اللہ اسی طرح آنسو بہانا آہ آہ منہ سے نکالنا بھی خلاف صبر نہیں ورنہ حضور ﷺ سب سے زیادہ اس کے مستحق تھے بلکہ رو لینے سے صبر حقیقی زیادہ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ دل کا غبار نکل جاتا ہے تو دل میں خدا سے شکایت پیدا نہیں ہوتی بعض لوگوں کو تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے وہ بیماری میں آہ آہ کرنے کو خلاف صبر سمجھتے ہیں اس لئے اللہ اللہ کرتے ہیں تاکہ قوت قلب ظاہر ہو مگر یہ معرفت کے خلاف ہے اس پر مولانا مفتی الہی بخش صاحب کی شکایت مجھے یاد آئی کہ ایک بار وہ بیماری میں اللہ اللہ کر رہے تھے کہ اس کے بھائی آگے وہ بھی بڑے بزرگ تھے انہوں نے فرمایا بھائی جی آہ آہ کرو کیونکہ اللہ اللہ مظہر الوہیت ہے اور آہ آہ مظہر عبدیت ہے اور اس وقت وہ عبدیت کو دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے آہ آہ شروع کی اور بہت جلد صحت ہو گئی کیونکہ مقصود پورا ہو گیا تھا اللہ تعالیٰ کو عجز و نیاز اور تضر زاری بہت پسند ہے اور یہ بات آہ ہی میں ہے اللہ کرنے میں نہیں مولانا فرماتے ہیں ۔

تا مگر یہ کودک حلوا فروش بحر بخشا لیش نمی آید بجوش
جب تک حلوائی کا لڑکانہ روئے اس کی بخشش کا دیراجوش میں نہیں آتا۔

(الفصل والافتصال فی الغفل والافتصال ملحقہ مواعدتہ ہر وقت کل ۱۹۶)

تدریجی تعلیم

فرماتے الدین آمنوا وتطمئن قلوبہم بذكر اللہ

ترجمہ: یعنی جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کے دلوں کو چین ہوتا ہے خدا کے ذکر سے اور اس میں حصر اس لئے نہیں کہ خدا ہی کے ذکر ہے۔

چین ہوتا ہے۔ کیونکہ مخاطب ابھی سمجھ رہا تھا کہ چین اور چیزوں سے ہوتا ہے تو اسے بالفعل صرف اتنا ہی بتا دیا کہ چین خدا کے ذکر سے بھی ہوتا ہے۔

سبحان اللہ! کیا تدریجی تعلیم ہے کہ مخاطب قبول ہی کرے۔ اگر ابتدا ہی سے حصر کے طور پر فرماتے تو ایک قسم کا معارضہ ہو جاتا۔ یہ نہیں کیا پہلے یہ بتایا کہ اور چیزوں سے چین ہونے کی ہم نفی نہیں کرتے مگر خدا کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے۔ جب مخاطب نے یہ سمجھ لیا کہ خدا کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے۔ تو آگے فرمایا الا بذكر اللہ تطمئن القلوب کہ آگاہ ہو جاؤ۔ اور خبردار ہو جاؤ کہ خدا کے ذکر سے دلوں کو چین ہوتا ہے اور کسی چیز سے چین نہیں ہوتا پہلے جملہ میں تو بذكر اللہ جو ظرف ہے تطمئن کا اپنی جگہ پر ہے یعنی مؤثر ہے اور آگے

قرار و سکون صرف ذکر اللہ میں ہے

لہذا خدا کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ سوائے اس کی یاد کے چین کی کوئی چیز ہے ہی نہیں قرار و سکون اگر ملتا ہے تو خدا ہی کی یاد سے اس کے بیان فرمانے میں بہت اہتمام فرمایا ہے چنانچہ الا سے کلام شروع کیا یعنی دیکھو ہوشیار ہو کر سن لو اور سمجھ لو یاد رکھو خدا ہی کی یاد ایک ایسی چیز ہے جس کے قلوب کو چین ملتا ہے دنیا بھر میں کوئی اور چیز ایسی نہیں جو قلب کو راحت پہنچا سکے واقعی بہت بڑا دعویٰ ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس میں قلوب کا چین منحصر ہے غرض حصر کے ساتھ فرماتے ہیں اَلَا يَذْكُرُ اللّٰهُ تَنْظِمِۦنُ الْقُلُوْبِ ؕ کہ سوائے یاد خدا کے کسی چیز میں قلوب کا چین نہیں۔ اور ہر چند کہ ترجمہ سے مقصود ترغیب ہی ہے ذکر کی لیکن قرینہ مقام سے خود ترغیب سے مقصود اس کا امر کرنا اور اس کا ضروری بتلانا ہے دو چیزوں کو جاننا یہاں ضروری ہے ایک تو یہ کہ ذکر اللہ ضروری چیز ہے دوسرے یہ کہ اس کے سوائے اور کوئی چیز ایسی نہیں جس میں قلوب کو چین حاصل ہو سکے اول جزو ضروری ہوتا ہے سو ضرورت اس کی بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس میں دنیا کا بھی نفع ہے اور دین کا بھی نفع ہے پھر اس سے زیادہ کیا ضرورت کی چیز ہوگی۔

سُورَةُ اِبْرَاهِيمَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوِيٍّ لِّيُبَيِّنَ لَهُمْ

فِيْضِكُ اللّٰهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِیْزُ

الْحَكِیْمُ ①

ترجمہ: اور ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ ان سے (احکام الہیہ کو) بیان کریں پھر جس کو اللہ تعالیٰ چاہیں گمراہ کرتے ہیں اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں اور وہی (سب امور پر) غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔

تفسیری نکات

قرآن پاک رسول پاک ﷺ کی قوم کی زبان میں اترا ہے

ارشاد فرمایا کہ الہ آباد میں ایک دفعہ جانا ہوا اور سید اکبر حسین حج اس زمانہ میں کسی ختمی طالب علم سے عربی پڑھتے تھے انہوں نے طالب علم مذکور سے سوال کیا کہ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوِيٍّ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر رسول کی زبان اس کی قوم کی زبان ہوتی ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ ہمارے رسول ﷺ کی زبان عربی تھی اس بنا پر یہ ہونا چاہئے کہ رسول ﷺ کی قوم یعنی جن کی طرف آپ مبعوث ہوئے صرف اہل عرب ہوں حالانکہ خود قرآن میں آپ کا رسول الہی کا فتنہ الناس ہونا مصرح ہے اور عقیدہ بھی یہی ہے اور یہ مصرح تعارض ہے طالب علم مذکور نے جواب دیا مگر ان کی تشفی نہ ہوئی اس طالب علم نے آ کر مجھ سے ذکر کیا میں نے اس کی زبانی کہلا بھیجا کہ قرآن میں بلسان قومہ آیا ہے بلسان لمتہ نہیں آیا جو یہ شبہ ہوا اور

قوم کہتے ہیں برادری اور خاندان کو پس وہ امت کا مرادف نہیں ہے اور قوم رسول ﷺ کی بلاشک عرب قریش ہی تھے مگر اس سے امت کا خاص عرب ہونا کیسے لازم آیا پس رسالت عام ہے قوم اور غیر قوم کو اس جواب کو انہوں نے بہت ہی پسند کیا۔

دو آیات اور ان میں تعارض کے شبہ کا حل

(ملفوظ) ایک صاحب نے سید اکبر حسین صاحب حج مرحوم کا تذکرہ کیا فرمایا کہ جی ہاں وہ بڑے متین آدمی تھے اور اچھے شاعر تھے ان کے اثر اشعار حکمت پر مشتمل ہیں اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے ان اشعار کے اندر معائب بیان ہوتے ہیں خود وہی لوگ ان اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے ہیں میرے ساتھ بہت محبت کرتے تھے اور ان کے میرے تعلقات کی ابتداء یوں ہوئی کہ ایک صاحب مولوی یعقوب تھے سید صاحب ان سے ایک زمانہ میں عربی پڑھا کرتے تھے اور گو سید اکبر حسین صاحب نے عربی زیادہ نہ پڑھی تھی مگر چونکہ ذہین آدمی تھے اس لئے اچھی قابلیت پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہ تو یوں کہا کرتے تھے کہ انگریزی کے اندر جو قابلیت مجھ کو حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ یہی تعلیم عربی ہی ہے ایک بار میں الہ آباد گیا ہوا تھا مولوی یعقوب میرے پاس آئے اور کہا کہ آج میں سید صاحب کو سبق پڑھا رہا تھا انہوں نے قرآن کی ایک آیت پر ایسا شبہ پیش کیا کہ جس کا مجھ سے جواب نہیں بن پڑا۔ میں نے کہا کہ وہ شبہ کیا ہے۔ کہنے لگے کہ قرآن میں آیا ہے وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اور اس کی قوم کی زبان ایک ہوتی ہے اور حضور کی ہم زبان صرف قوم عرب تھی تو معلوم ہوا کہ حضور کی قوم صرف اہل عرب تھے پس اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور کی بعثت صرف قوم عرب کی طرف تھی عام نہ تھی اور ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے وما ارسلناک الا کافۃ للناس اس سے معلوم ہوا کہ حضور کی بعثت عام تھی تو ان دونوں آیتوں میں تعارض ہو رہا ہے میں نے کہا کہ کچھ بھی تعارض نہیں کیونکہ قرآن میں تو یہ آیا ہے وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ یہ تو نہیں فرمایا بلسان لمة اور لفظ قوم ایک عربی لفظ ہے اس کے معنی برادری اور خاندان کے ہیں بلسان قومہ سے صرف اتنا ثابت ہوا کہ حضور کی برادری جو تھی وہ اہل عرب تھی عجمی آپ کی برادری نہ تھے مگر اس سے دوسری قوموں کے امتی ہونے کی کیسے نفی ہو گئی اور دوسری آیات میں سب کے امتی ہونے کا اثبات ہے پہلی آیت میں ایک بات کا ذکر ہے اور دوسری میں دوسری بات کا تو دونوں آیتوں میں تعارض کہاں ہوا تب ان مولوی صاحب کو اطمینان ہوا اور جا کر انہوں نے سید صاحب سے یہ جواب نقل کیا تو سید صاحب اس جواب کو سن کر بہت خوش ہوئے اور دریافت کیا کہ یہ جواب کس نے دیا ہے انہوں نے میرا نام لیا تو فوراً گاڑی میں سوار ہو کر میرے پاس آئے اور بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اس کے بعد سے سید صاحب برابر

شبهات مجھ سے بیان کیا کرتے اور میں جواب دیا کرتا تھا جس سے ان کو شفا ہوتی تھی۔ ایک واقعہ ان کے انتقال کے بعد کا یاد آیا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نے ان کا دیوان مرتب کرنا چاہا تو ان کے دو شعر میرے پاس بھیجے اور لکھا کہ ان اشعار کو میں نے ہندوستان کے بڑے بڑے شعراء کے پاس بھیجا کہ اس کی شرح کرو مگر کوئی بھی ان اشعار کی شرح پر قادر نہ ہو سکا بلکہ یہ جواب دیا کہ یہ اشعار مہمل ہیں۔ میں نے ان کو لکھا کہ اگر یہ شعر اور کسی کے ہوتے تو میں بھی ان کو مہمل کہتا مگر سید صاحب کو میں جانتا ہوں کہ وہ ایسے نہ تھے کہ مہمل شعر کہتے لہذا ان کا کلام مہمل نہیں ہو سکتا اس کے بعد میں نے ان اشعار کی شرح لکھ کر ان کو بھیج دی سنا ہے کہ اس شرح کو بے حد پسند کیا گیا جینہ وہ شرح انہوں نے شائع کر دی۔ (الافاضات الیومیہ ج ۱۰ ص ۲۶)

لَیْنٌ شَکْرْتُمْ لَا زَیْدٌ لَّکُمْ وَلَیْنٌ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابَ لَشْدِیْدٍ ۝

ترجمہ: اگر تم شکر کرو گے تو تم کو زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

تفسیری نکات

نعمت اسلام پر اظہار تشکر

اشارت بتلایا گیا ہے کہ تم ایسے نہیں ہو جو مستحلاً اسلام کا شکر ادا کرو اس لئے بچوں کی طرح روٹیوں کے بعد شکر اسلام کی تعلیم فرمائی کہ میاں اور کسی وقت شکر نہ کرو تو روٹیاں کھانے کے بعد تو اسلام کا شکر ادا کر لیا کرو کیونکہ اس وقت ایک ظاہری نعمت تمہارے سامنے ہوتی ہے اس کا شکر تو تم طبعاً ادا کرو ہی ہو گے اس کے ساتھ ساتھ نعمت اسلام کا شکر بھی ادا کرو جس سے یہ سب کھانا پینا بھی نعمت ہو گیا اور اسلام کی بدولت آخرت میں بھی تم کو یہ نعمتیں نصیب ہوں گی اگر نعمت اسلام نہ ہوتی تو کھانا پینا سب وبال جان ہوتا اور اس کی لذت چند روزہ ہوتی پس روٹیوں کے ساتھ شکر اسلام تعلیم فرمانا ایسا ہے جیسے بچوں کو تماشہ میں دوادیتے ہیں افسوس ہم ایسے غافل ہیں کہ حضور ہم کو بچوں کی طرح بہلا پھسلا کر شکر اسلام کی تعلیم فرما رہے ہیں اور اسی طرح اپنے کھانے کے میل میں کھانے کے بعد حضور نے ایک اور مفید دعا بھی تعلیم فرمائی ہے کہ جب کسی دوسرے کے گھر کھانا کھاؤ تو یوں کہو اللھم اطعم من اطعمنی واسق من سقانی یعنی دعوت کرنے والے کو دعا دو کہ اے اللہ جس طرح اس نے ہم کو کھلایا پلایا ہے آپ بھی اس کو ہمیشہ کھلاتے پلاتے ہیں (یا جنت کے طعام و شراب سے ممتاز فرمائیں۔ حضور کی تو یہ تعلیم ہے مگر یہاں یہ عادت ہے کہ کھانا کھانے کے بعد دعا تو کیا دیتے اس کا شکر تو کیا ادا کرتے الٹا کھانے میں عیب نکالتے ہیں خصوصاً رسوم کے کھانوں میں تو اکثر یہی ہوتا ہے ایک بچے نے اپنی لڑکی کی شادی میں بہت بڑی بارات بلائی تھی اور دعوت کا سامان بہت بڑھیا کیا تھا اس کے علاوہ چلتے ہوئے ہر

باراتی کو ایک ایک اشرفی بھی دی تھی یہ سب کچھ کر کے اس کو خیال ہوا کہ آج بارات والے میری خوب تعریف کرتے جائیں گے وہ اپنی تعریف سننے کے لئے اس راستہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جہاں سے بارات گزر رہی تھی مگر وہاں بالکل سناٹا تھا کسی نے بھی تو بننے کی دریا دلی کی داد نہ دی آخر بہت دیر کے بعد ایک گاڑی میں سے آواز آئی کہ کوئی شخص دوسرے سے کہہ رہا ہے کہ بھائی! لالہ جی نے بڑی حوصلہ کی دعوت کی اچھے اچھے کھانے کھلائے اور چلتے ہوئے ایک ایک اشرفی دی تو دوسرا کیا کہتا ہے کہ میاں کیا کیا؟ سرے کے یہاں اشرفیوں کے کوٹھے بھرے پڑے ہیں۔ دو دو بانٹ دیتا تو اس کے کیا کمی آ جاتی، لیجئے ایک ایک اشرفی بانٹ کر تو سرے کا خطاب ملا زیادہ بانٹتا تو معلوم کیا خطاب ملتا؟

حب جاہ کی حقیقت

اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ اس شخص سے زیادہ کوئی احمق نہیں جو طالب جاہ ہو کیونکہ یہ کمال محض وہی انتزاعی ہے اور انتزاعی بھی ایسا جو اس شخص کے ساتھ خود قائم نہیں بلکہ دوسرے کے خیال کے ساتھ قائم ہے کیونکہ جاہ نام ہے دوسروں کی نظروں میں معزز ہونے کا جس کا مدار محض دوسرے کے خیال پر ہے جو کہ اپنے وجود میں خود اس دوسرے کے تابع ہے وہ جب چاہے بدل دے تو ساری جاہ خاک میں مل جاتی ہے مگر طالب جاہ خوش ہے کہ آہا لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں جیسے چوہا خوش ہوتا کہ بننے کی دکان میں میرے واسطے غلہ آیا ہے؟ جی ہاں ذرا منہ تو ڈالو! ابھی تو چوہے دان آتا ہے جس سے ساری خوشی کرکری ہو جائے گی۔

اسی طرح دوسرے شخص کا اپنا خیال بدل دینا یہ جاہ کے لئے چوہے دان ہے۔ ایک نقص تو جاہ میں یہ ہے کہ وہ سراسر دوسرے کے تابع ہے وہ ایسا کمال نہیں جو اپنے قبضہ کا ہو دوسرا نص یہ ہے کہ اس سے نفع جو حاصل ہوتا ہے وہ محض وہی ہے یعنی بڑائی اور عزت؟ کیونکہ عزت و بڑائی سے نہ گھر میں روپیہ آتا ہے نہ جائیداد بڑھتی ہے۔ محض دل خوش کر لو ورنہ جاہ سے تو اچکن میں ایک بن بھی نہیں لگتا اور جو لوگ جاہ سے نفع مالی حاصل کرتے ہیں جیسے بعض لوگ بڑا بن کر غریبوں سے بیکار لیتے ہیں یا جاوید فرمائش کرتے رہتے ہیں ان کی جاہ بہت جلد زائل ہو جاتی ہے غرض اس سے بدوں خیالی نفع کے اور کچھ فائدہ نہیں

ایک رئیس نے دیوبند میں بڑی دھوم کی دعوت کی تھی جس میں بڑا روپیہ صرف ہوا تھا حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی نے دعوت کے بعد ان رئیس صاحب کو اس فراخ حوصلگی کی داد اس طرح دی کہ شیخ صاحب! واقعی آپ بڑے حوصلہ کا کام کیا مگر افسوس یہ ہے کہ اتنا روپیہ خرچ کر کے آپ نے ایسی چیز خریدی جو بازار میں پھوٹی کوڑی کو بھی نہیں بک سکتی، یعنی نام اور اگر بدنامی ہو گئی تو وہ خیال جاہ بھی جاتی رہی بس جاہ کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی منہار پونلا باندھے ہوئے چوڑیوں کا لیجا رہا تھا ایک گنوار نے لاشی کا کھوادا مار کر پوچھا کہ

میاں اس میں کیا ہے؟ (گانوں والوں کی عادت ہے کہ وہ لاشمی مار کر پوچھا کرتے ہیں) اس منہار نے جواب دیا کہ اس میں ایسی چیز ہے کہ ایک ہودا اور مار دو تو کچھ بھی نہیں اسی طرح جاہ ایسی چیز ہے کہ ذرا سی ٹھیس میں جاتی رہتی ہے اس لئے جو لوگ نام کے واسطے روپیہ برباد کرتے ہیں وہ بڑی غلطی کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر غلطی کھانے والوں کی ہے کہ وہ دوسروں کا مال کھا کر شکر نہیں ادا کرتے نہ اسے دعا دیتے ہیں۔

ہاں آج کل مردوں کو فاتحہ میں دعا دی جاتی ہے وہاں بھی کھلانے والوں کو کوئی دعا نہیں دیتا حالانکہ پہلے کھلانیوالے کو دعا دینی چاہئے اگر وہ نہ کھلاتا تو مردوں کو ثواب کیسے پہنچتا بلکہ کھانیوالوں کو بھی دعا دینی چاہئے اور ان کا مشکور ہونا چاہئے کیونکہ وہ نہ کھاویں تب بھی مردوں کو ثواب نہیں پہنچ سکتا۔

میرٹھ میں ایک لطیفہ ہوا کسی جگہ مردوں کی فاتحہ دی جا رہی تھی اور ایک لمبی فہرست پڑھی جا رہی تھی جس میں نمبر دار مردوں کے نام درج تھے جب فہرست کے ختم ہونے میں دیر لگی تو ایک صاحب بولے کہ میاں اس میں ہمارا نام بھی تو لکھا ہوتا کیونکہ خدا کی قسم اگر ہم نہ کھاویں تو ان میں سے ایک کو بھی تو ثواب نہ ملے گا اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور وہ فہرست مختصر کی گئی۔

ان رسوم میں ایک بات ایسی ضرور موجود ہوتی ہے جو ان کے لغو و باطل ہونے پر خود دلالت کرتی ہے چنانچہ کھانے سے پہلے مردوں کے نام ترتیب وار لیا جانا یہ محض لغو حرکت ہے آخر یہ نام کے سنائے جا رہے ہیں اگر کھانے والوں کو سنائے جاتے ہیں کہ تم ان لوگوں کی نیت کر کے کھانا تو ظاہر ہے کہ کھانے والے جب ہاتھ دھو کر بیٹھتے ہیں ان کو سوا کھانے کے اور کچھ یاد نہیں رہتا اور نہ اتنی لمبی فہرست یاد رہ سکتی ہے اور اگر خدا کو سنانا ہے تو اس کا لغو نا بالکل ظاہر ہے خدا تعالیٰ کو تو ہر شخص کی نیت کا حال معلوم ہے ان کو سنانے کی کیا ضرورت ہے مگر پھر بھی بعض لوگ اپنی اغراض کے لئے فاتحہ وغیرہ کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک صاحب کہنے لگے کہ مولوی خواہ مخواہ فاتحہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ سورہ فاتحہ خاص اسی واسطے اترنی ہے چنانچہ اس کا نام ہی فاتحہ ہے سبحان اللہ کیا پاکیزہ دلیل ہے پھر یہ لوگ علماء سے بحث کر کے وقائق علمیہ کو سمجھنا چاہتے ہیں اور جب نہیں سمجھتے تو علماء پر الزام لگاتے ہیں یہ ہم کو سمجھا نہیں سکتے غرض حضور ﷺ نے ہم کو کھانے کے بھی سب آداب بتلائے ہیں جن میں ضمناً اسلام پر بھی شکر کی تعلیم فرمائی۔

شکر کے معنی

اب سمجھے کہ شکر کے معنی ہیں قدر دانی کے اسی واسطے خدا تعالیٰ کا نام شکر ہے کہ وہ اعمال کی قدر کرتے ہیں قدر کی دو صورتیں ہیں اگر یہ شخص حاجت مند ہے تو اس کی قدر تو یہ ہے کہ اس سے منفعت حاصل کرے اور منعم کا احسان مند رہے اور اگر حاجت مند نہیں ہے تو اس کی قدر یہ ہے کہ اس فعل کی جزا وصلہ عطا کرے چنانچہ

حق تعالیٰ کو شکر اسی معانی کے اعتبار سے کہتے ہیں ان کی قدر دانی یہی ہے کہ وہ بندوں کے اعمال کا صلہ دیتے ہیں اور بندہ کی قدر دانی یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں سے وہ منافع حاصل کرے جن کے لئے وہ موضوع ہیں مثلاً روٹی کی قدر یہ ہے کہ اسے کھاؤ پانی کی قدر یہ ہے کہ پیو اور برف کی قدر یہ ہے کہ اس سے ٹھنڈک حاصل کرو اگر کوئی شخص برف کو پانی میں گھول کر معمولی برتن کے اندر رکھ دے تو کہا جاتا ہے کہ اسے برف کی قدر نہیں ہے یعنی جس منفعت کے لئے وہ موضوع تھی اس سے وہ نفع حاصل نہ کیا اس لئے ناقدری کی اسی طرح اسلام کا شکر یہ ہے کہ اس کی قدر کرو اور قدر یہ ہے کہ اس کی برکات و منافع حاصل کرو۔ (محاسن اسلام ۳ ملحقہ مواضع محاسن الاسلام صفحہ ۲۵-۲۶)

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ

أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۗ تُؤْتِي أَكْثَرَ طَيِّبَاتٍ حِينَ

يَأْذَنُ رَبُّهَا وَيُضْرَبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

يَعْتَدِلُونَ ۗ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ وَإِجْتَنَبْتَ

مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۗ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا

بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ

الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ۗ

ترجمہ: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ (توحید و ایمان) کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں۔ وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہو اور اللہ تعالیٰ (ایسی) مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھ لیں اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر و شرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جاوے اس کو کچھ ثبات نہ ہو اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس کی بات (یعنی کلمہ طیبہ کی برکت) سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں (یعنی کافروں) کو (دین میں اور امتحان میں) گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

تفسیری نکات

شجرہ طیبہ سے شجرہ نخلہ مراد ہے

اس میں کلمہ طیبہ کی مثال بیان فرمائی ہے جس سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔

حدیث میں اس کی تصریح ہے اور محمد رسول ﷺ کے تابع ہے وہ بھی مراد ہی ہے کیونکہ متبوع کے ساتھ تابع کا ہونا لازم ہے مگر چونکہ اہل ایمان اس امت سے پہلے بھی گزرے ہیں اور جو فضائل ایمان کے ہیں وہ ان کے لئے بھی ثابت ہیں اور لا الہ الا اللہ کا قرین ہر امت میں بدلتا رہا ہے کوئی لا الہ الا اللہ کے ساتھ نوح نبی اللہ کوئی ابراہیم خلیل اللہ کہتا تھا کوئی موسیٰ کلیم اللہ کوئی عیسیٰ روح اللہ اور ہم محمد رسول اللہ کہتے ہیں تو یہ جملہ متبدل ہے اور لا الہ الا اللہ غیر متبدل ہے جس میں تمام اہل ایمان مشترک ہیں اس لئے اکثر احادیث میں لا الہ الا اللہ پر اکتفا کیا گیا ہے باقی مطلب وہی ہے کہ لا الہ الا اللہ مع اپنے قریب کے جو ہر امت مسلمہ کے لئے الگ الگ ہے اور صوفیہ کا ادب دیکھئے کہ وہ جب اپنے مریدوں کو ذکر لا الہ الا اللہ کی تعلیم کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کا ذکر تو اتنی مقدار میں کیا کرو دو سو یا پانچ سو دفعہ اور کبھی کبھی محمد رسول اللہ ﷺ بھی کہہ لیا کرو یہ نہیں بتلاتے کہ ہر دفعہ پورا کلمہ کہا کرو اس طرح انہوں نے تابع و متبوع دونوں کا حق ادا کر دیا تو فرماتے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے شجر طیبہ (پاکیزہ درخت) شجرہ طیبہ سے مراد شجر نخلہ ہے اس کو مثال کے لئے یا تو اس واسطے خاص کیا کہ اہل عرب کے نزدیک وہ اطیب الاشجار ہے مگر میرے نزدیک حقیقت میں وہ عرب و عجم سب میں اطیب شجرہ ہے ایک تو اس کی پیدائش سہل ہے بعض دفعہ تو خود ہی آگ آتا ہے چنانچہ سینکڑوں درخت کھجور کے خورد و موجود ہیں پھر اس کی خدمت کی جائے تو ان کا پھل نہایت عمدہ اور لذیذ ہے پھر اس کی کوئی چیز ضائع نہیں ہر ایک میں منافع بینہ موجود ہیں لکڑی کڑیوں میں کام آتی ہے پتوں سے پتکھے اور بورے بنتے ہیں جیسے گنے کا رس نکالا جاتا ہے) اور بینہ کی قید اس لئے لگائی کہ منافع خفیہ تو ان چیزوں میں بھی ہیں جن کو ہم بیکار سمجھتے ہیں جیسا کہ گلزار ابراہیم میں ایک حکیم کا قصہ لکھا ہے کہ اس کو ایک دن پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے خیال ہوا کہ یہ پاخانہ کا کیزا کس کام آتا ہے اس میں ظاہر ہے کوئی منفعت نہیں معلوم ہوتی اس خیال کا آنا تھا کہ چند روز میں اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں بڑا گھبراہٹ بہت علاج کئے مگر کچھ نفع نہ ہوا اتفاق سے ایک دفعہ کوئی دوسرا حکیم اس کی بستی میں آیا جو آنکھوں کا علاج کرتا تھا اس اندھے حکیم نے بھی اس سے رجوع کیا اس نے کوئی دوا اس کی آنکھ میں لگادی جس سے بہت جلد آنکھیں کھل گئیں اور اچھی طرح نظر آنے لگا اس نے حکیم سے پوچھا کہ اس دوا کے کیا اجزا ہیں دوسرے حکیم نے کہا کہ اس کا

جز اعظم گوہ کا کثیرا ہے اس وقت اس کو تنبہ ہوا کہ یہ غیب سے مجھ کو مزادی گئی تھی کیونکہ میں نے اس کو بیکار خیال کیا تھا حق تعالیٰ نے اس طرح مجھ کو اس کا نفع بتلایا پس منافع خفیہ سے تو کوئی چیز بھی خالی نہیں گوہم کو علم نہ ہو مگر کھجور کے تو ہر جزو میں منافع بینہ ہیں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس لئے وہ عرب و عجم سب کے نزدیک اطیب ثمر ہے آگے فرماتے ہیں **أَصْلُهَا ثَابِتٌ** کہ اس کی جڑ تو جمی ہوئی ہے یعنی زمین میں **وَفَرَعُهَا فِي السَّمَاءِ** اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ نخلہ میں اس صفت کا ہونا تو ظاہر ہے اور کلمہ طیبہ کے لئے یہ صفت اس طرح ثابت ہے کہ اس کی بھی ایک جڑ ہے جو مومن کے قلب میں جمی ہوئی ہے پس قلب مومن منزلہ ارض کے ہے اور اعتقاد و توحید جو اس میں راسخ ہے وہ کلمہ طیبہ کی جڑ ہے اور قلب مومن کو ارض سے تشبیہ قرآن میں دوسری جگہ مصرح ہے **سُورَةُ حٰدِیْدٍ** میں ہے۔

الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّيَّرِينَ أَنْ مَخَشَعَهُمْ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ۝ اِعْلَمُوا أَنَّ لِلَّهِ يَمِينُ الْأَرْضِ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ: کیا مسلمانوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد اور اس دین حق پر عمل کے لئے جھک جائیں جو اللہ کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی تھی پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور زیادہ تر ان میں سے فاسق ہیں جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو مردہ ہوئے پیچھے زندہ کر دیتا ہے حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تفسیر میں صراحت فرمایا ہے کہ ارض سے قلب مراد ہے اوپر جو اہل کتاب کی قساوت کا ذکر تھا جس سے ان کے مایوس اور ناامید ہو جانے کا احتمال تھا اس آیت سے مایوسی کو قطع کیا گیا ہے۔ کہ گو تمہارے دل سخت تو ہو گئے مگر ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں

ایمان قبول عمل کیلئے شرط ہے

اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو بھی زندہ کر دیتے ہیں اور **وَفَرَعُهَا فِي السَّمَاءِ** یہ ہے کہ وہ عالم ملکوت کی طرف بلند ہوتا ہے جس کی تفصیل دوسری آیت میں ہے **الَّذِينَ يَصْعَدُ الْكَلِمَ الطَّيِّبَ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ أَجْمَعًا** کلام اسی تک پہنچتا ہے (یعنی حق تعالیٰ ہی اس کو قبول فرماتے ہیں اور اچھا کام اس کو بلند کرتا اور پہنچاتا ہے صعود سے مراد تو قبول اور رفع سے مراد ذریعہ قبول بنتا ہے اب اگر عمل صالح سے مراد ایمان ہے تب تو قبول سے مراد نفس قبول ہے کیونکہ ایمان ہر عمل کے قبول کیلئے شرط ہے اور اگر دیگر اعمال صالحہ مراد ہیں تو وہ نفس قبول کے لئے شرط نہیں مگر کمال قبول کے لئے شرط ہیں آگے فرماتے ہیں **وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ** چونکہ مثال عجب تھی اس لئے اس کی حکمت بتلاتے ہیں کہ حق تعالیٰ لوگوں کے واسطے مثالیں اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھ لیں کیونکہ مثال سے توضیح مقصود خوب ہو جاتی ہے آگے کلمہ کفر کی مثال ہے

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ وَاجْتِنَانٍ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر و شرک کی) ایسی مثال ہے جیسے خبیث درخت ہو (حدیث میں اس کی تفسیر آئی ہے کہ وہ حنظل کا درخت ہے) جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اس کو کچھ ثبات ہی نہ ہو (چنانچہ حنظل کے درخت کی جڑ تک نہیں ہوتی نیز حنظل اور اس کا پھل بو اور مزہ میں بھی تلخ ہوتا ہے اسی طرح کلمہ کفر سے دل کو بے چینی ہوتی ہے راحت نہیں ملتی اور اس کی جڑ گو کافر کے دل میں ہے مگر حق کے سامنے باطل ایسا مضحل و مغلوب ہے کہ گویا اس کے جڑ ہی نہیں اور جب اس کے جڑ ہی نہیں تو پھل وغیرہ کیا ہوتے اس لئے نہ یہاں شاخوں کا ذکر فرمایا نہ پھل کا اور یہ عجب نکتہ ہے اس مقام میں کہ چونکہ کفر کا کچھ تو وجود اس لئے اس کا کچھ ذکر فرمایا اور چونکہ اس کا معتد بہ وجود نہیں اس لئے بقیہ آثار کو ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ذکر اس شے کا ہوتا ہے جو کچھ تو ہو اور یہ فی الجملہ وجود بھی دنیا میں ہے اور آخرت میں تو کفر معدوم ہی ہو جائے گا کیونکہ وہاں سب کو ایمان حاصل ہو جائے گا گو کفار کا وہ ایمان معتبر نہیں کیونکہ بالاضطرار ہوگا اختیار سے نہ ہوگا آگے اس آیت میں کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کے اثر کا ذکر ہے۔ اوپر تو دونوں کی مثال تھی یہاں دونوں کے اثر کا بیان ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات کی برکت سے (مراد کلمہ طیبہ ہے جس کی جڑ مضبوط ہے) دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں مضبوط رکھتا ہے دنیا میں تو اس طرح کہ مومن کلمہ کی برکت سے شیاطین الانس والجن کے اغوائے محفوظ رہتا ہے اور مرتے دم تک ایمان پر قائم رہتا ہے اور آخرت میں اس طرح کہ قبر میں نکیرین کے سوال کا صحیح صحیح جواب دے دے گا آگے کلمہ کفر کے اثر کا بیان ہے وَيُضِلُّ اللهُ الظَّالِمِينَ یعنی اس کلمہ خبیثہ کی نحوست سے کافروں کو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں بچلا دیتے ہیں دنیا میں تو ان کا بچلنا ظاہر ہے اور آخرت میں بچلنا یہ ہے کہ قبر میں ان سے نکیرین کے سوال کا جواب نہ بن پڑیگا۔ بلکہ حیرت زدہ ہو کر کہیں گے افسوس ہم کچھ نہیں جانتے غرض قول ثابت سے مراد کلمہ طیبہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں تھا اسی کی بدولت آخرت میں نجات ہوگی جس کی ایک جڑ ہے اور کچھ شائیں ہیں جڑ تو عقیدہ توحید ہے اور شائیں اعمال صالحہ ہیں ان سب کا مجموعہ قول ثابت ہے پس عقیدہ توحید کو پختہ کرو جس کا طریقہ کثرت ذکر ہے اور اعمال کو صالحہ کرو جس کا طریقہ یہ ہے کہ علم دین حاصل کرو مسائل کی کتابیں دیکھو وعظ کی کتابوں کا مطالعہ کرو اور ان کے موافق عمل شروع کرو جس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے کہ دین پر عمل کرنے میں اگر کوئی ملامت کرے تو کسی کی پرواہ نہ کرو پھر ان شاء اللہ آپ کو وہ دولت ملے گی کہ تمہارے اقوال و اعمال و احوال میں نورانیت ہوگی اور کثرت ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی کی تربیت و تعلیم حاصل ہے تب تو اس سے پوچھ کر کوئی ذکر شروع کرو اور اگر کسی کی تربیت نہیں ہے تو چلتے پھرتے لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے رہو کام کے وقت زبان سے کسی قدر جہر کرتے رہو تا کہ یاد رہے اور خالی وقت میں تسبیح ہاتھ میں رکھو یہ مذکورہ ہے اس سے ذکر یاد رہتا ہے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ بعد کمال کے تسبیح ہاتھ میں رکھتے تھے

کسی نے کہا حضرت اب تو آپ کو اس کی ضرورت نہیں رہی فرمایا جس رفیق کی بدولت یہ بات حاصل ہوئی ہے کیا اب اس کو چھوڑ دوں یہ تو بڑی بے مروتی ہے۔ غرض تسبیح سے غفلت نہیں ہوتی ذکر کا دھیان رہتا ہے اس کو ہاتھ میں رکھو اور کسی طعن کی پرواہ نہ کرو لوگوں میں مرض ہے کہ جہاں کسی نے تسبیح ہاتھ میں لی اور اس پر طعن شروع کیا مگر جب تم کو تسبیح سے دولت ملتی ہو تو مخلوق کو بکنے دو کیا کسی کے طعن سے ڈر کر اپنا نقصان کر لو گے یہ تو قول ثابت کے حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔

عالم برزخ

سید اکبر حسین صاحب حج نے عالم برزخ کے متعلق دریافت کیا کہ جو لوگ توپ و تفنگ سے اڑادیئے گئے ہیں ان کی قبر کہاں ہے؟ فرمایا کہ قبر نام ہے عالم برزخ کا اور وہ ایک حیات ہے مثل نوم کے کہ اس میں بھی ادراک ہوتا ہے الم و نعیم کا پھر سید صاحب نے دریافت کیا کہ کیا وہاں مثل نوم کے عدم ادراک و ذہول بھی ہو سکتا ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ وہاں ذہول نہیں پھر پوچھا کہ کیا قبر کا افتنان قرآن سے بھی ثابت ہوتا ہے فرمایا قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہوتا یُنَبِّئُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّالِثِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ اس کی بابت حضور ﷺ نے فرمایا نزلت فی عذاب القبر دوسری آیت ہے اَلْكَافِرُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ تُو بَعْرَضُونَ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ سے پہلے ہے۔

علیین سے مراد

سید صاحب نے فرمایا کہ قرآن میں ہے وَمَا أَدْرَاكَ مَا عَلَيْنُونَ ۚ كَذَّبَ قَوْمٌ ۚ اس میں علیین کتاب کو کہا گیا ہے حالانکہ وہ مقام کا نام ہے مولانا نے فرمایا کہ کتاب کا نام بھی ہے اور مقام کا بھی پھر سید صاحب نے کہا کہ کیا میں اس کتاب کو علم الہی سمجھوں یا کتاب ذی جسم؟ مولانا نے فرمایا کہ وہ کتاب ذی جسم ہے اور عالم آخرت بھی مادی ہے مثل عالم دنیا کے اور عالم برزخ بھی آخرت میں داخل ہے گو عالم برزخ کا مادہ لطیف ہے بلکہ عالم آخرت میں بہ نسبت دنیا کے مادیت زیادہ ہے کیونکہ دنیا کا مادہ تو متغیر فانی ہے اور وہ باقی ہے تو اس کا مادہ زیادہ شدید ہے گو لطافت کے ساتھ ہے۔

مراقبہ کی ضرورت و حقیقت

گو حق تعالیٰ نے صراحتاً یہاں کسی مراقبہ کا ذکر نہیں فرمایا مگر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کیونکہ یہاں صراحتہ تو کسی خاص عمل کے امر کا ذکر نہیں بلکہ محض ایک خبر مذکور ہے مگر اس پر علماء و مفسرین کا اجماع ہے کہ اخبار قرآنیہ سے محض خبر ہی مقصود نہیں بلکہ مقصود کوئی انشاء ہوتا ہے اور اخبار قرآنیہ ہی کی کیا تخصیص ہے میرے

نزدیک تو خبر من حیث ہو خبر کسی عاقل کے کلام میں بھی مقصود نہیں ہوتی بلکہ عقلاء کو ہر جملہ خبریہ سے کوئی انشاء ہی مقصود ہوتا ہے اور جس جملہ خبریہ سے کوئی انشاء مقصود نہ ہو وہ لغو ہوتا ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو یہاں خبر سے محض خبر مقصود نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ چونکہ ایسا ایسا ہونے والا ہے لہذا اس واقعہ سے ڈرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں یعنی ایمان والوں میں داخل ہونا چاہئے ظالمین میں سے نہ ہونا چاہئے پس یہاں بھی تصریح تو اس کی ہے کہ حق تعالیٰ کے خاص بندوں کی یہ فضیلت ہے کہ دنیا و آخرت میں حق تعالیٰ ان کو ثابت رکھتا ہے اور کافروں کی یہ مذمت ہے کہ ان کو بچلا دیتا ہے اس سے ایک مراقبہ کی طرف اشارہ بھی ہو گیا۔ کہ اس وقت سے ڈرنا چاہئے جس میں کافر بچیں گے اس لئے ایمان و عمل کا اہتمام کیا جائے بظاہر اس آیت پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ ہی ثابت رکھتے ہیں اور وہی بچلا دیتے ہیں تو الزام کس پر؟ اس کا جواب ظالمین کے لفظ سے ہو گیا کہ انہوں نے ظلم کیا تھا اس لئے اس کی نحوست سے بچ گئے یہ تو حکیمانہ جواب تھا مگر اس پر بھی کوئی شغب کرے تو آگے حاکمانہ جواب بھی دیدیا۔ وَيُطْعِلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ کہ کسی کے باوا کا کچھ اجارہ نہیں جاؤ اللہ تعالیٰ جو چاہیں کرتے ہیں حکیمانہ جواب سے بعض دفعہ شور شغب قطع نہیں ہوتا اس لئے حاکمانہ جواب بھی بیان فرما دیا اب سب کی زبانیں بند ہو گئیں یہ تو ترجمہ آیت کا تھا مگر اس سے وہ واقعہ معلوم نہیں ہوا جس کی نسبت مثبتیت و اضلال کی خبر دی گئی ہے۔ اس کے لئے تفسیر کی ضرورت ہے۔ اور قرآن کی تفسیر کہیں تو قرآن ہی سے ہوتی ہے اور کہیں حدیث سے اس آیت کی تفسیر حدیث سے معلوم ہوئی ہے حدیث کیا ہے ارشاد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جن کی شان یہ ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس لئے حدیث بھی بمنزلہ قرآن ہی کے ہے سو حدیث میں آچکا ہے کہ یہ آیت عذاب قبر کے متعلق ہے پس ثابت ہو گیا کہ یہاں عذاب قبر سے ڈرنے کا اور اس کے استحضار کا امر ہے مگر اس پر ایک طالب علمانہ اشکال ہوتا ہے میں اس کا بھی جواب دئے دیتا ہوں وہ یہ کہ یہ سورت مکی ہے اور احادیث صحاح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو عذاب قبر کا علم مدینہ میں ہوا ہے پھر یہ آیت عذاب قبر کے متعلق کیونکر ہو سکتی ہے اگر اس میں عذاب قبر کا ذکر ہوتا تو حضور ﷺ کو مکہ ہی میں اس کا علم ہو جاتا اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس سورت کی خاص اس آیت کو مدنی مانا جاوے مگر میں نے اس کو کہیں منقول نہیں دیکھا اس لئے میرے نزدیک دوسرا اہل جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو مثبتیت و اضلال فی الاخرۃ کی تفسیر کا ایک جزو تو مکہ میں منکشف ہو گیا تھا یعنی قیامت میں حساب و کتاب کے وقت مسلمانوں کا ثابت قدم رہنا اور کفار کا بچلنا اور ایک جزو یعنی مثبتیت و اضلال فی القبر مدینہ میں منکشف ہوا کیونکہ آیت میں لفظ فی الاخرۃ وارد ہے اور آخرت دو ہیں ایک حقیقی یعنی

قیامت اور ایک اضافی یعنی قبر پس مکہ میں آپ کو تثبیت و اضلال فی الاخرۃ کا پہلا جزو منکشف ہو گیا جو قیامت کے متعلق تھا اور دوسرا جزو مدینہ میں منکشف ہوا یعنی عذاب و نعیم قبر پس اب آیت کے مکی ہونے اور عذاب قبر کے متعلق نازل ہونے میں کچھ تافی نہیں کیونکہ دراصل یہ آیت قیامت اور قبر دونوں کے متعلق تھی مگر مکہ میں آپ کو اس کا علم نہ تھا مدینہ پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ اس آیت میں عذاب قبر کا بھی ذکر ہے اور لفظ آخرت اس کو بھی عام ہے حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ سوال کرتے ہیں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی بہر حال حدیث سے اس کا عذاب قبر کے متعلق ہونا صراحتاً ہو رہا ہے اور اس پر جو اشکالات تھے وہ بھی سب رفع ہو گئے۔

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ
ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس کی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں کو بچلا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ایمان پر ثابت قدم رکھنے کا وعدہ

اب یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ یہ آیت عذاب قبر کے متعلق تو ہے لیکن اس میں تثبیت کا وعدہ دنیا اور آخرت دونوں کے بارہ میں ہے چنانچہ ارشاد ہے يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ اب سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جو اس پوری آیت کو تلاوت فرما کر عذاب قبر کے متعلق فرمایا ہے تو آپ نے معاملہ قبر کو حیات دنیا میں داخل فرمایا یا آخرت میں سو احتمال دونوں طرف سے ہے۔ قبر کو حیات دنیا میں بھی داخل کیا جاسکتا ہے اور آخرت میں بھی دوسرا احتمال تو محتاج تاویل نہیں کیونکہ موت سے حیات دنیا منقطع ہو جاتی ہے اس لئے مابعد الموت حیات دنیا میں داخل نہیں بلکہ وہ آخرت میں داخل ہونا چاہئے البتہ پہلا احتمال محتاج تاویل ہے اس پر کہہ سکتے ہیں کہ گو موت سے حیات دنیا منقطع ہو جاتی ہے مگر حیات اخرویہ بھی شروع نہیں ہوتی کیونکہ حیات اخرویہ وہ ہے جبکہ یہی جسد عنصری دوبارہ زندہ ہوگا اور یہ قیامت میں ہوگا۔ قبر میں جسد عنصری زندہ نہیں ہوتا گو روح کو اس سے تعلق رہتا ہے پس گو موت کے بعد انسان کو نہ حیات اخرویہ حاصل ہوتی ہے نہ حیات دنیویہ بلکہ حیات برزخیہ ہوتی ہے مگر حیات برزخیہ کو حیات دنیا سے بہ نسبت آخرت کے قرب زیادہ ہے اس لئے حکما وہ حیات دنیا میں داخل ہو سکتی ہے لیکن یاد آید منشور میں ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فی الاخرۃ کی تفسیر عذاب قبر سے فرمائی ہے اب کسی تاویل کی ضرورت نہیں رہی نہ دوسرا احتمال رہا البتہ ایک اور اشکال وارد ہوگا۔

وہ یہ کہ ایک حدیث میں آتا ہے روضة من رياض الجنة او حفرة من حفرة النار کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے حالانکہ دخول جنت یا دخول

نار قیامت کے بعد ہوگا عالم برزخ میں دخول جنت و نار نہ ہوگا اس کا ایک جواب تو علماء نے دیا ہے وہ یہ کہ برزخ میں جو مسلمانوں کو راحت اور کفار کو عذاب ہوگا حضور ﷺ نے اس کو نعیم جنت اور عذاب جہنم سے تشبیہ دی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو برزخ میں ایسی راحت ہوگی کہ گویا وہ جنت کے باغ میں ہیں اور کفار کو ایسی تکلیف ہوگی کہ گویا جہنم کے گڑھے میں ہیں اور صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ جنت و جہنم دو ہیں ایک حقیقی اور ایک مثالی اس قول کو مان لیا جائے تو پھر اس حدیث میں تاویل نہ کرنا پڑے گی صوفیہ کہتے ہیں کہ قبر میں مومن کے لئے جس جنت کی طرف کھڑکی کھولی جائے گی وہ جنت مثالیہ ہے اسی طرح کافر کے لئے جس جہنم کی طرف کھڑکی کھلی گی وہ بھی مثالی جہنم ہے پھر قیامت کے بعد حقیقی جنت و جہنم میں دخول ہوگا اور یہ اشکال نہ کیا جائے کہ مومن اور کافر کے لئے جنت و جہنم میں داخل ہونے کے بعد تو پھر خروج نہ ہوگا پھر مسلمان اور کافر اس جنت مثالیہ و جہنم مثالیہ سے قیامت کے دن کیونکر نکلیں گے اس کا جواب یہ ہے کہ عدم خروج وغیرہ یہ احکام جنت و جہنم حقیقیہ کے ہیں مثالیہ کے یہ احکام نہیں اس سے خروج ہو سکتا ہے بلکہ صوفیہ نے تو یہ کہا ہے کہ دنیا میں بھی کفار کو جہنم اور مومنین کو جنت محیط ہے کیونکہ اعمال سیرہ جہنم ہیں اور اعمال صالحہ جنت ہیں اور حقیقی جنت و دوزخ کا ثواب و عذاب انہی اعمال کی صورت جو ہر یہ ہے بس دنیا میں بھی ہر شخص یا جنت میں ہے یا دوزخ میں مگر اعمال کے بعد تو یہ احاطہ معلوم ہو سکتا ہے بدون اعمال کے اس احاطہ کا ادراک دشوار ہے۔

وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہیں کر سکتے (مگر) سچ یہ ہے کہ آدمی بہت ہی بے انصاف اور بڑا ہی ناشکر ہے۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کے لامحدود احسانات

اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بعض غریب مفلس ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس گنی چنی چیزیں ہی ہوتی ہیں جو شمار میں آ سکتی ہیں تو ان کے حق میں لا محصوہا کا حکم کیسے صحیح ہوگا اس کا جواب تو کھلا ہوا ہے کہ ہر آفت سے محفوظ رہنا بھی تو ایک مستقل نعمت ہے اور آفتوں اور تکلیفوں کا احصاء و شمار کوئی نہیں کر سکتا اس لئے غریب سے غریب انسان پر اللہ کی نعمتیں اتنی ہیں کہ وہ شمار کرنا چاہے تو شمار نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ اس آیت کی ایک دوسری تفسیر بھی دل میں آتی ہے وہ یہ کہ لفظ احصاء کے معنی جیسے

شمار کرنے کے معروف و مشہور ہیں اسی طرح ایک معنی احصاء کے پورا پورا استعمال کر لینے کے بھی آتے ہیں یعنی احصاء استعمالاً اس معنی کے اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے جتنی نعمتیں دی ہوئی ہیں وہ ان سب کو بیک وقت استعمال بھی نہیں کر سکتا بلکہ کچھ نہ کچھ نعمتیں اس کے استعمال سے فاضل رہتی ہیں خود انسان کے وجود میں جو نعمتیں عطا کی گئی ہیں وہ اس کی ضرورت سے کچھ زائد رہ گئی ہیں اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دو عطا فرمائیں حالانکہ دیکھنے کا کام ایک آنکھ سے بھی چل سکتا ہے کان دو دیئے اور کام ایک سے بھی چل سکتا ہے ہاتھ پاؤں دو ہرے عطا فرمائے جن میں سے انسان ہر وقت دونوں کو استعمال نہیں کرتا سردی کا سامان گرمی میں اور گرمی کا سامان سردی میں مشغول کار نہیں ہوتا اس لئے ہر غریب سے غریب انسان پر یہ بات صادق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو پورا پورا استعمال بھی نہیں کر سکتا۔

آیت کی یہ تفسیر خیال میں گزرا کرتی تھی مگر کوئی دلیل نہ ہونے کی وجہ سے ذکر نہ کرتا تھا۔ آج الحمد للہ اس کی دلیل ایک حدیث سے سمجھ میں آ گئی کہ اسماء اللہ الحسنى کے متعلق حدیث میں ہے۔

من احصاها دخل الجنة یعنی جو شخص ان اسماء الہیہ کا احصاء کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔

اس حدیث میں لفظ احصاء کے متعلق علماء کے دونوں قول ہیں احصاء حفظاً مراد ہے یعنی ناموں کا حفظ کر لینا یا احصاء استعمالاً مراد ہے۔ کہ ان ناموں کے مقتضی پر عمل کرنا

تو جس طرح لفظ احصاء کی ایک حدیث میں دو تفسیریں کی گئیں ہیں اسی طرح آیت قرآن لائحہ وحا میں بھی دونوں تفسیریں ہو سکتی ہیں۔

وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ تم یاد سے نعمتوں کا احصاء نہیں کر سکتے۔

انعامات الہیہ کا شمار ناممکن ہے

اور ایک محمل اور ہے جو دل کو زیادہ لگتا ہے کہ ضرورت اور حاجت کی صفت سے تم اس کا احصاء نہیں کر سکتے بلکہ بہت چیزیں تم کو بے ضرورت معلوم ہوں گی واقعی بعض دفعات اتنی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ انسان سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کس کام میں لاؤں تو جیسا کہ اس سے خدا تعالیٰ منعم ہونا ظاہر ہوتا ہے ایسے ہی ہماری حرص بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ہم بے ضرورت بھی بہت چیزیں جمع کرتے رہتے ہیں جن کے لئے کوئی مصرف بھی ذہن میں نہیں آتا یہ مادہ عورتوں میں خصوصاً زیادہ ہے۔

مکانات بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے

(ملفوظ) ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی لامتناہی نعمتیں ہیں کہاں تک انسان شکر ادا کر سکتا ہے اسی کو فرماتے ہیں وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها اب میں ان میں سے صرف ایک نعمت کا ذکر کرتا ہوں

والله جعل لكم من بيوتكم مكنا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے بیوت سے تمہارے لئے مسکن بنایا یعنی اللہ نے تم کو ایک ایسی چیز دی جس میں تم رہتے ہو میں نے شہروں میں دیکھا کہ چھوٹی سی کوٹھڑی تاریک آگے آگے گھن نہیں وہیں کھانا وہیں گہنا قصبہ اور گاؤں کے لوگ تو پھر بڑے بڑے مکانات میں رہتے ہیں پھر خود وہ کوٹھڑیاں بھی بالکل نہ ہونے کے اعتبار سے نعمت ہیں اور ان چھوٹے بڑے بیوت کا نعمت ہونا ان لوگوں سے پوچھتے کہ جن کے پاس مکان نہ ہو یا اس کرایہ دار سے پوچھتے کہ برسات میں جس سے مکان خالی کر دیا جائے خصوصی جگہ اس کے پاس کافی سامان بھی ہو جس کا نقل کرنا بھی مصیبت ہو (الاقاضات الیومیہ جلد ۷ صفحہ ۱۵۷-۱۵۸)

بغیر حساب

اسی طرح حق تعالیٰ ہم سے عبادات کا کام لیتے ہیں وہ ان حرکات کو پسند کرتے ہیں لیکن تحمل سے زیادہ خود نہیں کرنے دیتے کتنی بڑی رحمت ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ربنا ولا تحملنا مالا طاقة لنا به

اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسے مصائب اور واقعات نہ ڈالنے جس کو ہم کو برداشت نہیں ہے۔ اس تعلیم کے ضمن میں بتلایا ہے کہ ہم طاقت سے زیادہ کام نہیں لیا کرتے ہیں یہ معاملات بھی خدا تعالیٰ کے ہیں کوئی شخص واقعات دیکھے پھر کتاب اللہ میں غور کرے تو ہر جگہ رحمت ہی رحمت نظر آئے گی غرض وہ ہمارے تحمل سے زیادہ ہم کو کام کی اجازت نہیں دیتے چنانچہ اگر مجاہدہ کی حرص میں کوئی دو پہر کو نماز پڑھے تو مواخذہ ہوگا غرض خدا تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے عمل میں تو حد سے زیادہ ممنوع اور اجر میں زیادتی موجود اسی لئے بغیر حساب بڑھا دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس قدر اجر ملے گا جو ہمارے حساب سے باہر ہے اس لئے کہ فرماتے ہیں وکل شیء احصینہ فی امام مبین یعنی ہم نے ہر چیز کو ایک واضح کتاب میں ضبط کر دیا ہے ان کے احاطہ علمی سے کوئی شے خارج نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم نہیں شمار کر سکتے جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں

وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا یعنی اگر تم نعمت خداوندی کو شمار کرنا چاہو تو نہ شمار کر سکو گے۔

پس جس طرح یہ عدم احصاء (نہ احاطہ کرنا نہ شمار کرنا) بندہ کے اعتبار سے ہے چنانچہ خصوصاً نہیں احاطہ کر سکتے تو ان کا) میں عدم احصاء کی اسناد مخاطب کی اس طرف سے کی واضح دلیل ہے اسی طرح اس آیت میں بغیر حساب کے یہ معنی ہیں کہ تم حساب نہیں کر سکتے۔ ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندازہ سے باہر نہیں ہے وہ تو خوب بالتفصیل جانتے ہیں۔

حاصل یہ کہ عمل محدود اور متناہی ہے اور اجر غیر محدود اور غیر متناہی بمعنی لا تکف عند حد (کسی پر موقوف نہیں

ہے) یہ تو اس آیت کے متعلق بیان تھا۔ (الغفر لمحمد مؤاعظ فضائل صوم و صلوة ص ۱۵۷)

سُورَةُ الْحَجَرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الذِّكْرِ تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَقُرْآنٍ مُّبِينٍ ①

ترجمہ: الذ: یہ آیتیں ہیں (کامل) کتاب اور قرآن واضح کی۔

تفسیری نکات

قرآن اور کتاب کے لغوی معنی

اس جگہ آیات کے دو لقب بیان کئے گئے ہیں ایک قرآن دوسرے کتاب قرآن کے معنی ہیں ماقرأ یعنی پڑھنے کی چیز اور کتاب کے معنی ہیں ماکتب یعنی لکھنے کی چیز اور ظاہر ہے کہ پڑھنے اور لکھنے کی چیز کیا ہے الفاظ ہی تو ہیں معانی کو کون پڑھ سکتا یا کون لکھ سکتا ہے اور ایک مضمون ابھی ذہن میں آیا ہے جو شروع میں نہ آیا تھا اب تک تو ذہن میں یہ بات تھی کہ الفاظ ہی پڑھنے لکھنے کی چیز ہیں معانی کو پڑھ لکھ نہیں سکتے اس پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ نحوین نے کہا ہے کہ ضرب میں ضمیر ہو مستتر ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ظاہر میں ضمیر مذکور نہیں لیکن سمجھنے میں آتی ہے مگر ایک طالب علم یہ سمجھے کہ ضرب کے اندر ضمیر ہو چھپی ہوئی بیٹھی ہے تو آپ نے ضرب کو چھیلنا شروع کیا یہاں تک کہ کاغذ پھٹ گیا اور اتفاق سے دوسرے ورق میں اس جگہ ہو لکھا ہوا تھا یہ بڑے خوش ہوئے کہ واقعی استاد نے ٹھیک کہا تھا کہ اس کے اندر ہو پوشیدہ ہے دیکھو چھیلنے سے نکل آیا۔ پھر دوڑے ہوئے استاد کے پاس آئے کہ دیکھئے میں نے ضرب کو چھیلنا تھا یہ ہو نکل آیا جو اس میں چھپا ہوا تھا استاد بہت ہنسے اور ان کو مطلب دوبارہ سمجھایا غرض یہ طالب علم یوں سمجھتا تھا کہ معانی بھی کتابت میں آسکتے ہیں۔ مگر یہ اس کی غلطی ہے معانی قراءت و کتابت میں نہیں آسکتے ان کا محل صرف ذہن ہے لوگ بے تار کی خبر پر تعجب کرتے ہیں مگر خدا تعالیٰ نے اس کو پہلے سے پیدا کر رکھا ہے کیونکہ الفاظ سے معانی کا سمجھنا یہ بے تار کے ہی تو خبر ہے

کیونکہ معانی کا مرکز قلب ہے اور جہاں الفاظ کسی کی زبان سے نکلے معادہاں معانی سمجھے گئے غرض ان آیتوں میں اشارہ کیا بلکہ صراحت ہے کہ قرآن کے ساتھ پڑھنے کا تعلق رکھو کیونکہ لفظ قرآن کے معانی یہی ہیں اور ظاہر ہے کہ قراءت الفاظ ہی کی ہوتی ہے نہ کہ معانی کی دوسری صفت اس جگہ کتاب ہے جس کے معنی لکھنے کی چیز ہیں اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ قرآن کے ساتھ قراءت کے علاوہ ضبط و کتابت کا بھی رکھنا چاہئے دوسری جو بات اسی وقت ذہن میں آئی یہ ہے کہ کتاب کا مصداق ھیت نہ الفاظ ہیں نہ معانی کیونکہ الفاظ تو زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کا محل زبان ہے لفظ کے معنی لغت میں پھینکنے کے ہیں کہ الفاظ زبان سے پھینکے جاتے ہیں یعنی نکالے جاتے ہیں اس لئے ان کو الفاظ کہا جاتا ہے معانی کا محل صرف ذہن ہے وہ تو کتاب کا مصداق کسی طرح ہے ہی نہیں بلکہ اس کا مذاق دوسری چیز ہے یعنی نقوش جن کو عوام کرم کانٹے کہتے ہیں کیونکہ ان پڑھ آدمی لکھ پڑھ نہیں سکتا نہ سمجھ سکتا ہے اس لئے وہ ان کو کرم کانٹے کہتے ہیں مگر کتاب کا مصداق خلق نقوش نہیں بلکہ وضعی نقوش ہیں جیسا کہ الفاظ کی دلالت معانی پر وضعی ہے طبعی نہیں کیونکہ غیر المل زبان اس کو نہیں سمجھ سکتا اسی طرح نقوش بھی وضعی ہیں اور ان کی دلالت بھی الفاظ پر وضعی ہے اسی لئے پڑھے ہوئے آدمی ان کو سمجھتے ہیں ان پڑھ نہیں سمجھ سکتے جب یہ معلوم ہو گیا کہ کتاب کا حقیقی مصداق نقوش ہیں تو آپ تو الفاظ ہی کو غیر مقصود بتلاتے تھے اور قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ نقوش قرآن بھی قابل حفاظت و مستحق تعظیم ہیں تو الٹی پڑی کہ گئے تھے نماز بخشنا نے روزے بھی گلے پڑ گئے مگر صاحبو یہ گلے نہیں پڑے کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ کسی شخص کو اشرفیاں اور جواہرات دے کر اس سے کہے کہ اس کو حفاظت سے رکھو قفل اور تالہ لگاؤ اگر اس شخص کو روپیہ اور جواہرات کی قدر معلوم ہے تو اس حکم کی قدر کرے گا اور کہے گا۔

جزاک اللہ کہ جسم باز کر دی مرابا جان جان ہماز کر دی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزا دے تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھ کو محبوب حقیقی کے ساتھ ہماز کر دیا)

اور جس کو روپیہ کی قدر نہ ہوگی وہ کہے گا کہ یہ اچھی بلا میرے سر پڑی کہ حفاظت کرو اور قفل لگاؤ اسی طرح جو لوگ معانی کی قدر کرتے ہیں وہ ان الفاظ و نقوش کی بھی قدر کریں گے کیونکہ یہ انہی کی حفاظت کا سامان ہے اور جو قدر نہیں کرتے وہ اس کو سر پڑی بلا سمجھیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ جو تو تعلیم یافتہ الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں درحقیقت وہ معانی قرآن کی قدر نہیں کرتے ورنہ اس کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی صاحبو الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے کیونکہ الفاظ قرآن کا یہ مجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہو جاتے ہیں۔

الفاظ و معانی قرآن دونوں مقصود ہیں

اب میں آیت کی طرف عود کرتا ہوں اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس غلطی کو رفع فرمایا ہے جو بعض لوگ

سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن سے صرف معانی مقصود ہیں یہ خیال غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیات کو قرآن و کتاب فرمایا ہے کہ یہ لکھنے پڑھنے کی چیز ہے اور ظاہر ہے کہ لکھنا پڑھنا الفاظ ہی کے متعلق ہے نہ کہ معانی محض کے اب یہاں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ ایک جگہ تو لفظ قرآن کو مقدم کیا ہے لفظ کتاب سے اور ایک جگہ اس کا عکس ہے جس سے معلوم ہوا کہ من وجہ الفاظ میں مقصودیت زیادہ ہے اور من وجہ معانی میں مقصودیت زیادہ ہے اور یہ نکتہ اس طرح حاصل ہوا کہ قراءت الفاظ کی ہوتی ہے اور الفاظ کا مدلول قریب معانی ہیں اور کتابت نقوش کی ہوتی ہے اور اس کا مدلول قریب الفاظ ہیں اور معانی مدلول بعید پس قراءت کی حالت میں معانی کی طرف اول ہی توجہ ہو جاتی ہے اور کتابت میں اول الفاظ کی طرف اور ان کے واسطے سے معانی کی طرف اور مقصودیت سے مراد بھی مدلولیت ہے پس قراءت میں زیادہ مقصودیت معانی میں ہوئی اور کتاب میں زیادہ مقصودیت الفاظ میں ہوئی پس اس مجموعہ میں اشارہ ہو گیا کہ الفاظ بھی اس درجہ میں مقصود ہیں کہ معانی میں من کل الوجوه مقصودیت بڑھی ہوئی نہیں بلکہ بعض وجوہ سے الفاظ میں بھی مقصودیت بڑھی ہوئی ہے۔

اور اسی مقام سے ایک اور مسئلہ بھی حاصل ہو گیا جس میں علماء کا اختلاف ہے کہ قرآن کو دیکھ کر مصحف میں پڑھنا افضل ہے یا حفظ پڑھنا افضل ہے جو حضرات حفظ پڑھنے کو افضل کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس میں تدریج زیادہ ہوتا ہے الفاظ سے بلا واسطہ معانی کی طرف التفات ہو جاتا ہے اور نقوش سے التفات بواسطہ ہوتا ہے اور بعض نے مصحف سے پڑھنے کو افضل لکھا ہے اس لئے کہ اس میں محل توجہ متعدد ہوتے ہیں الفاظ تو بلا واسطہ نقوش اور معانی بواسطہ الفاظ تو اس میں عبادت متعدد ہوتی ہے یہ تعدد تو باعتبار مدلول کے ہے اور دال کے اعتبار سے بھی تعدد ہے ایک نقوش کے اعتبار سے یعنی عبادت بصر دوسرے الفاظ کے اعتبار سے یعنی عبادت لسان پس اس میں دو عبادتیں مجتمع ہو جاتی ہیں۔

اور ایک نکتہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ قرآن کے محفوظ ہونے میں من وجہ الفاظ مقررہ کو زیادہ دخل ہے کہ خدا نہ کر وہ اگر جمع مصاحف تلف ہو جائیں تو حفاظ قرآن الفاظ از سر نو قرآن کو مدون کر سکتے ہیں اور من وجہ نقوش کو زیادہ دخل ہے کہ اختلاف فی الالفاظ کے وقت کتب کی طرف مراجعت کر کے فیصلہ کر سکتے ہیں اس کے بعد مبین کی قید ہے اس میں یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قرآن کی قراءت و کتابت دونوں واضح اور ظاہر ہونی چاہئیں۔ اسی لئے فقہاء نے قرآن کی تقطیع چھوٹی کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ مستحب یہ ہے کہ قرآن کی تقطیع بڑی ہوتا کہ کتابت واضح اور صاف ہو لیکن متوسط تقطیع کا مضائقہ نہیں جیسے حائل کی تقطیع بڑی ہوتا کہ کتابت واضح اور صاف ہو لیکن متوسط تقطیع کا مضائقہ نہیں جیسے حائل کی تقطیع ہے کہ اس سے سفر میں سہولت ہوتی ہے ہاں یہ جو آج کل بعض تعویذی قرآن شائع ہوئے ہیں یہ بے شک مکروہ ہے۔

اب حروف مقطعات کا نکتہ بیان کرنا ہوں جو ان آیات کے شروع میں وارد ہیں اور میں ان سے بھی اپنا مدعا بیان کروں گا جیسا کہ میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا حروف مقطعات میں بہت سے نکات ہیں ایک نکتہ یہ ہے کہ یہ اسرار ہیں درمیان اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے حضور ﷺ ان کے معانی سے واقف تھے مگر دوسروں پر آپ نے ان کے معانی ظاہر نہیں فرمائے کیونکہ ان کا تعلق محکمہ شراہ عالیہ سے نہیں بلکہ دوسرے محکمہ سے ہے ان اسرار کو اسی محکمہ کے آدمیوں پر ظاہر کیا جاتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء علیہ السلام کو ان سے واقف کیا گیا ہے چونکہ امت کو اس محکمہ سے تعلق نہیں اس لئے ہم لوگوں کو ان اسرار سے مطلع نہیں کیا گیا۔

ایک مرتبہ میں نے درس میں یہی تقریر کی تھی اور اس وقت ایک کورٹ اسپیکر موجود تھے وہ کہنے لگے آپ سچ کہتے ہیں واقع ہر محکمہ کے خاص اسرار ہوتے ہیں جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا آپ تو ایسی تصدیق کر رہے ہیں جیسے آپ پر یہ بات گزری ہو کہ جی ہاں مجھے آج کل ہی میں یہ بات پیش آئی ہے میں ایک دن سپرینٹنڈنٹ کی کونٹری پر گیا ہوا تھا ان کی میز پر ایک کتاب رکھی تھی میں اس کو دیکھنے لگا تو صاحب نے وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے لی اور کہا کہ یہ آپ کے دیکھنے کی نہیں ہے اس میں محکمہ خفیہ پولیس کے اسرار ہیں جن سے دوسرے محکمہ والوں کو مطلع نہیں کیا جاتا اور وہ اسرار کچھ اصطلاحات ہیں کہ سی آئی ڈی والے ان اصطلاحات میں ایک دوسرے کو تار کے ذریعہ سے خبر دیتے ہیں اور دوسرے لوگ ان اخبار پر مطلع نہیں ہوتے اس سے میرا مذاق خوش ہوا کہ حیات میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔

الفاظ قرآنی بھی مقصود ہیں

دوسرا نکتہ اس میں ابھی میرے ذہن میں آیا ہے وہ یہ کہ ممکن ہے اس میں اس مضمون پر سمجھتے مقصود ہو کہ قرآن سے محض معانی مقصود نہیں بلکہ الفاظ بھی مقصود ہیں کیونکہ بعض الفاظ قرآن میں غیر معلوم المعنی ہیں اگر صرف معانی مقصود ہوتے تو قرآن میں یہ ایسے الفاظ کیوں ہوتے حالانکہ وہ جزو قرآن ہیں جن کی قرآنی نیت کا انکار کفر ہے ایک نکتہ اس میں یہ ہے کہ حروف مقطعات میں احاد و عشرات و مآب کو جمع کیا گیا ہے جس سے بعض المل کشف نے بعض حوادث پر بطور پیشین گوئی کے استدلال کیا ہے جو ایک مستقل علم ہے اس کے علاوہ اور بہت سے نکات ہیں۔

قرآن کے دو اوصاف

ارشاد ہے تلک ایات الکتاب و قرآن مبین ظاہر ہے کہ آیات الکتاب اور قرآن مبین دونوں کا مطلب ایک ہی ہے صرف لقب دو ہیں اور نکتہ دو عنوانوں کے اختیار کرنے میں یہ ہے کہ اس سے قرآن کا دو وصفوں کے لئے جامع ہونا ثابت ہوتا ہے ایک وصف کتاب ایک وصف قرآن

حاصل یہ کہ قرآن میں دو حیثیتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ وہ مکتوب ہونے کے قابل ہے جس پر لفظ کتاب دلالت کر رہا ہے اور دوسری یہ کہ وہ مقرر ہونے کے قابل ہے جس پر لفظ کتاب قرآن دلالت کر رہا ہے اور لفظ کتاب میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس کو اپنے پاس لکھ کر رکھو تا کہ عمل کے لئے محفوظ رہے اور لفظ قرآن میں یہ اشارہ ہے کہ اس کو پڑھا بھی کرو تا کہ اس کے محتضار سے عمل کا اہتمام کیا جاوے خالی چھوڑ کر یا لکھ کر رکھ لینا کافی نہیں ہے۔

یہ نکتہ ہے تلک آیات الکتب و قرآن مبین میں کتاب و قرآن دو لفظ اختیار کرنے کا ورنہ مصداق دونوں کا ایک ہی ہے گو اصل عطف میں تغار ہی ہے مگر وہ تغار عام ہے خواہ ذات کا ذات سے تغار ہو یا وصف کا وصف سے تغار ہو چنانچہ عطف تفسیری میں یہ اصل دوسری تغار کے ساتھ صادق آتی ہے کیونکہ جائز ہے کہ مفہوم معطوف علیہ کا اور ہو اور معطوف کا اور ہو مگر مصداق دونوں کا ایک ہی ہو۔

إِنَّمَنْعُنْ نَزْلَنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ①

ترجمہ: ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کے محافظ (اور نگہبان) ہیں۔

تفسیری نکات

حفاظت قرآن کا مفہوم

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **إِنَّمَنْعُنْ نَزْلَنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ** ① جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود قرآن مجید کے محافظ ہیں تو اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ جب خدا تعالیٰ خود قرآن مجید کے محافظ ہیں تو پھر قرآن پاک کا پڑھنا لکھنا چھوڑنا بھی چھوڑ دو تو کیا آج تک مسلمانوں نے ایسا کیا ہے میں اس کی حقیقت بتلاتا ہوں کہ **إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ** ① کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانہ میں ایسے لوگ اور ایسی جماعت پیدا فرماتے رہیں گے کہ اس کی حفاظت کرتی رہے گی اسی طرح پر دین کے سب کاموں کو سمجھ لیا جاوے کہ ان میں توکل کرنا تدابیر سے مانع نہیں بلکہ توکل کے یہ معنی ہیں کہ تدابیر کرو اور اللہ تعالیٰ کو کارساز سمجھو کیونکہ تدبیر کا حکم بھی انہوں ہی نے کیا ہے جیسا قرآن مجید کی حفاظت کی تدابیر کی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو محافظ اعتقاد کیا جاتا ہے کیونکہ اس حفاظت کا حکم بھی انہوں ہی نے فرمایا ہے باقی دنیا کی تدبیر کرنا اور دین کو محض نقدیہ توکل پر چھوڑ دینا یہ بے ڈھنگا پن ہے۔

نَبِيِّ عِبَادِي اِنِّي اَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۱۶﴾ وَاِنَّ عَذَابِيْ هُوَ

الْعَذَابُ الْاَلِيمُ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: میرے بندوں کو خبر کر دو کہ میں غفور الرحیم ہوں اور تحقیق میرا عذاب دردناک ہے۔

تفسیری نکات

اس آیت میں حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو حکم فرمایا ہے کہ میرے بندوں کو دو باتیں پہنچادو اور ظاہر ہے کہ ہر فعل اختیاری کسی غایت کے لئے ہوتا ہے تو اس فعل اخبار کی بھی کوئی غایت ہونا چاہئے یعنی یہ کہ ان باتوں کے پہنچانے سے کیا مقصود ہے اور اس وقت یہ بات میری زبان سے بڑے کام کی نکلے ہے کہ ہر کام اور ہر فعل اختیاری کسی نہ کسی غایت کے لئے مطلوب ہوتا ہے پس ہر بات اور ہر کام میں سوچنا چاہئے کہ اس کی غایت کیا ہے جس بات اور جس کام کی کچھ غایت معلوم نہ ہو وہ فضول ہے اور غایت معلوم ہو مگر مفید نہ ہو وہ بھی فضول ہے اور اگر وہ غایت کوئی ضرر ہو لازم یا مستعدی تو وہ کام مضر ہے اس قاعدے سے آپ کو اپنے افعال و اقوال کا حسن و قبح اور لغو یا مفید ہونا آسانی سے معلوم ہو جائیگا۔

اس کے بعد ارشاد ہے وَاِنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيمُ کہ یہ خبر بھی دے دیجئے کہ میرا عذاب بھی بہت سخت ہے یہ تکمیل ترغیب کے لئے بڑھایا گیا ہے کیونکہ ترغیب کی تکمیل ترہیب سے ہوتی ہے جیسا کہ ترہیب کی تکمیل ترغیب سے ہوتی ہے بدوں ایک دوسرے کے ہر ایک ناقص ہے کیونکہ رجاء احتمال نفع ہے اور احتمال کا مفہوم خود مستلزم ہو رہا ہے۔ دوسرے احتمال کو اسی طرح خوف احتمال ضرر ہے اور اسی طرح یہ بھی مستلزم ہو رہا ہے دوسرے احتمال کو پس کسی کا تحقق بدوں دوسرے کے نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ترغیب و ترہیب دوش بدوش چلتے ہیں پس خوف درجاء ہی سے مل کر ایمان کامل ہوتا ہے اس لئے مومن کو خوف کے ساتھ رجاء اور رجاء کے ساتھ خوف کا ملنا ضروری ہے حضرت عمر فرماتے ہیں کہ اگر حشر میں یہ ندا ہو کہ جنت میں ایک ہی آدمی جائے گا لرجوت ان اکون ہو تو میں یہ سمجھوں گا کہ وہ ایک میں ہی ہوں اور اگر یہ ندا ہو کہ جہنم میں ایک ہی جائے گا لخشفت ان اکون ہو تو میں ڈروں گا کہ شاید وہ ایک میں ہی نہ ہوں گویا رجاء و خوف دونوں کامل درجہ کے تھے بس یہی حاصل ہے آیت کا کہ بندوں کو رغبت و رہبت دونوں جمع کرنا چاہئیں یہ تو مقصود تھا جو ختم ہو گیا اب ایک بات زائد از مقصود اور رہ گئی جو تفسیر کے متعلق ہے بلکہ دو ایک طلبہ علم کے لئے ایک طلبہ العمل کے لئے یعنی ذاکرین کے لئے کیونکہ یہ لوگ عمل کے طالب ہیں جو بات طلبہ العمل کے لئے ہے وہ تو یہ ہے کہ اس آیت

کے بعد دو قصے مذکور ہیں ایک ابراہیمؑ کا جس میں ان کے لئے بڑھاپے کی حالت میں بشارت ولد مذکور ہے دوسرا قصہ قوم لوط کا ہے جس میں ان پر نزول عذاب کا ذکر ہے۔ تو ان قصوں کو اس آیت سے کیا ربط ہے میرے نزدیک ان دونوں قصوں میں لَيْثِي عِبَادِي اِنِّي اَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۱۰﴾ وَاَنْتَ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيمُ ﴿۱۱﴾ (میرے بندوں کو خبر دیدیتے بلا شک میں بڑا بخشنے والا مہربان ہوں اور میرا عذاب بھی دردناک ہے) کی تائید ہے پہلے جزو سے پہلے قصہ کو تعلق ہے اور دوسرے جزو سے دوسرے قصہ کو جس میں بتلایا گیا ہے کہ جب اعمال صالحہ پر ہماری رحمت اور اعمال سیدہ پر ہمارا عذاب دنیا میں بھی آجاتا ہے جو کہ دارالجزا نہیں بلکہ درالعمل ہے تو آخرت میں تو ان کا ظہور کیوں نہ ہوگا جو کہ دارالجزا ہے اگر حق تعالیٰ آخرت میں کسی کو عذاب نہ فرماتے تو دنیا میں بدرجہ اولیٰ کسی پر بھی عذاب نہ آتا کیونکہ یہ دارالجزا نہیں جب یہاں بھی بعض دفعہ وجہ اعمال سیدہ کے عذاب آتا ہے تو سمجھ لو کہ آخرت میں تو اس کا ظہور ضرور ہی ہوگا پس رحمت کی وسعت و سبقت کو سن کر عذاب سے بے فکر ہرگز نہ ہونا اور عذاب کی شدت سن کر رحمت سے بھی مایوس نہ ہونا کیونکہ حق تعالیٰ دنیا میں بھی بعض دفعہ ایسی حالت میں رحمت فرماتے ہیں جبکہ اسباب ظاہرہ سے اس کی امید کچھ نہیں رہتی جیسے ابراہیمؑ کی حالت امید اولاد سے بعید ہو گئی تھی۔ اسی طرح قوم لوط کی ظاہری حالت عیش و عشرت نے ان کو احتمال عذاب سے بے فکر کر دیا تھا (سبحان اللہ کیا خوب ربط ہے قللہ درہ ۱۲ ط) دوسرا نکتہ طلبہ العلم کے لئے یہ ہے کہ اَنْتَ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيمُ ﴿۱۰﴾ (بلا شک میرا عذاب بھی سخت ہے) میں حق تعالیٰ نے طرز عنوان کو بدل دیا ہے کہ انسی انا معذب العظیم (بلا شک میں عذاب دینے والا بھی عظیم ہوں) نہیں فرمایا یعنی صفت تعذیب کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا جیسا کہ اِنِّي اَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۱۱﴾ بلا شک میں بڑا بخشنے والا مہربان ہوں۔ میں مغفرت و رحمت کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے میرے نزدیک اس میں سبقت رحمتی علی غضبی (میری رحمت میرے غضب سے سبقت کر گئی) کا مضمون مخفی ہے جو حدیث میں تو ظاہر ہے مگر قرآن میں مخفی ہے۔

کہ ہر فعل کے لئے ایک غایت ہوتی ہے تو اس فعل کی بھی کچھ غایت ہونا چاہئے جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی اخبار لَيْثِي عِبَادِي اِنِّي اَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۱۰﴾ وَاَنْتَ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيمُ ﴿۱۱﴾ وہ غایت یہ ہے کہ رسول ﷺ کو حق تعالیٰ تعلیم فرماتے ہیں کہ بندوں کی اصلاح میں ترغیب و ترہیب کو بڑا دخل ہے اور امت کو تعلیم ہے کہ تم کو رغبت و رہمت دونوں کو جمع کرنا چاہئے اس سے تم ہم تک پہنچ سکتے ہو اور جنت میں پہنچنے اور جہنم سے بچنے میں اسی کو بڑا دخل ہے اور اس مضمون کے مقصود آیت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اوپر شیطان کے انکار سجد کا ذکر ہے پھر جنت و دوزخ کا ذکر ہے اس کے بعد یہ ارشاد ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں جنت میں پہنچنے اور جہنم سے بچنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

لَئِنْ آتَاكَ الْغَوُثُ الرَّحِيمَةُ کی تعلیم سے اصل مقصود یہ ہے کہ لوگ اعمال صالحہ میں ترقی کریں مگر آج کل بہت لوگوں نے اس کو گناہ میں ترقی کے لئے یاد کر رکھا ہے تو بہ تو بہ میرا تو روٹکا کھڑا ہو جاتا ہے جس موقع میں یہ بے باک لوگ غفور الرحیم کو استعمال کرتے ہیں یعنی جب کوئی گناہ کے عذاب سے ڈراتا ہے تو اس وقت بجائے ندامت کے نہایت بے پروائی سے کہتے ہیں کہ ارے میاں وہ غفور رحیم ہیں یعنی ڈر کی کوئی بات نہیں وہ کچھ بھی نہ کہیں گے جب گناہوں پر حق تعالیٰ کا غضب اور غیرت کرنا منصوص ہے تو اس کی نفی کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

مفہوم سبقت رحمتی علی غضبی

اَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيمُ میں حق تعالیٰ نے طرز عنوان کو بدل دیا ہے کہ اِنِّى اَنَا الْمَعْلُوبُ الْعَظِيمُ نہیں فرمایا یعنی صفت تعذیب کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا جیسا کہ لَئِنْ آتَاكَ الْغَوُثُ الرَّحِيمَةُ میں مغفرت و رحمت کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے میرے نزدیک اس میں سبقت رحمتی علی غضبی کا مضمون مخفی ہے جو حدیث میں تو ظاہر ہے مگر قرآن میں مخفی ہے جیسا عنقریب اس کی تقریر آتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ باطن بھی ہیں ان کے کلام میں صفت باطن کی بھی رعایت ہے جیسا کہ پہلی آیت میں اسی صفت رحمت پر دلالت کرتے ہیں اور ظاہر کی رعایت ہے اسی لئے قرآن سے اہل ظاہر و باطن سب کو حظ آتا ہے گواہ باطن کو زیادہ حظ آتا ہے اسی کو کسی نے یوں کہا ہے۔

بہار عالم حسش دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت راہ بیوارباب معنی را

غرض حق تعالیٰ نے مغفرت و رحمت کا بیان تو اس طرح فرمایا کہ میرے بندوں سے کہہ دو میں بہت بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہوں۔ اور عذاب کی نسبت یوں نہیں فرمایا کہ میں بہت عذاب کرنے والا ہوں بلکہ یوں فرماتے ہیں کہ میرا عذاب بہت سخت ہے میری سزا بہت دردناک ہے اس میں تعذیب کو اپنی صفت کے صیغہ کے طور پر نہیں فرمایا تو اس میں سبقت رحمتی علی غضبی پر دلالت ہے رحمت چونکہ سابق ہے اس لئے صفت کے رنگ میں مذکور ہوئی اور غضب صفت کے رنگ میں مذکور نہیں ہوا یہ نکتہ تو میرے ذہن میں اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے کے اول ہی وہلہ میں آ گیا تھا اس کے بعد ایک دوسرے مضمون کی طرف ذہن منتقل ہوا وہ بہت عجیب ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کے لئے ایک تو افعال ہیں اور ایک صفات ہیں اور ظاہر ہے کہ صفات کا قرب بہ نسبت افعال کے ذات سے زیادہ ہے کیونکہ صفات لا یمن لا غیر ہیں اور افعال اتقا کا غیر ذات ہیں۔ اس لئے افعال کو بہ نسبت صفات کے ذات سے بعد ہے اور اسماء الہیہ میں بعض اسماء تو صفات پر دال ہیں اور بعض اسماء افعال پر دال ہیں پھر آج میں نے بہت غور کیا تو اسماء الہیہ میں کوئی نام ایسا نہیں پایا جو مرتبہ صفت میں غضب پر دال ہو بہت سے بہت قہار و جبار کو پیش کریں گے تو جبار کے معنی تو غضب کے نہیں

بلکہ حق تعالیٰ کی جو صفت جبار ہے وہ جب کر کے معنی میں ہے جس کا حاصل ہے طمانی کرنا شکستگی کو جوڑنا تو اس کی تو دلالت تو خود رحمت ہی پر ہے اور قہار میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ اسم فعلی ہو جو فعل پر وال ہو اسم وضعی نہ ہو جیسے محی و ممیت و خالق و رازق ہے تو اس صورت میں تو شبہ ہی نہیں ہو سکتا دوسرا احتمال یہ ہے کہ اسم صفت ہو مگر لغت عربی میں قہر کے معنی غصہ و غضب کے ثابت نہیں بلکہ غلبہ کے معنی ہیں پس یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غضب حق تعالیٰ کی صفت ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ حق تعالیٰ سے صدور غضب کا نہیں ہوتا ہوتا ہے لیکن درجہ فعل میں ہوتا ہے نہ کہ درجہ صفت میں اور رحمت کا ثبوت درجہ صفت میں ہوتا ہے۔ جو قدیم ہے اور اس قدم کے سبب صفت و موصوف کے تعلق میں ارادہ کو دخل نہیں کیونکہ لازم ذات و ملزوم میں تخیل جعل نہیں ہوا کرتا گو رحمت کا تعلق عباد سے تو بالا ارادہ ہی ہو گا مگر ذات کی طرف اس کا انتساب بلا ارادہ ہے اور غضب کا انتساب بھی ذات حق کی طرف بالا ارادہ ہے اور یہ ایک دوسری توجیہ ہے سبقت رحمتی علی غضبی کی کہ رحمت کو غضب پر سبقت بایں معنی ہے کہ وہ صفت ہے اور یہ فعل ہے اور صفت سابق ہوتی ہے فعل پر یہی وجہ ہے کہ رحمت تو بلا سبب بھی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ مقتضی ذات کا ہے اور غضب بلا سبب نہیں ہوتا۔

اور ایک توجیہ سبقت رحمتی علی غضبی کی وہ ہے جو میں نے حضرت استاد علیہ الرحمۃ سے سنی ہے کہ جس شخص میں مقتضیات رحمت و غضب دونوں مجتمع ہوں اس پر رحمت ہوتی ہے اور ایک صورت سبق کی یہ ہے کہ اعمال حسہ میں تضاعف ہوتا ہے کہ ایک حسہ کو دس حسنات اور الی مالا یتناہی بمعنی لا اتقف عند حد بڑھایا جاتا ہے چنانچہ صوم کے بارے میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کے ثواب کا تضاعف مالا نہایت بمعنی الاتقف عند حد تک ہوتا ہے۔ اور اعمال سیئہ میں تضاعف نہیں ہوتا بلکہ ہر گناہ ایک ہی گناہ شمار ہوتا ہے یہ توجیہ بھی لطیف ہے (مگر آج کی توجیہ الطیف و اشرف ہے ۱۲ ظ) اور اس سے معلوم ہوا کہ رجاء و خوف میں رجاء اصل ہے کیونکہ اس کا تعلق رحمت سے ہے جو صفت حق ہے اور خوف اصل نہیں اس کا تعلق غضب سے ہے جو صفت نہیں بلکہ فعل ہے اور ظاہر ہے کہ صفت بمقابلہ فعل کے اصل ہے اس لئے لازم ہے کہ ان دونوں کی فروع میں بھی جو شے فرع صفت کی ہے وہ اصل ہو اور جو غضب کی فرع ہے وہ اصل نہ ہو پس رجاء و خوف کی ایسی مثال ہے جیسے غذا و دواء کہ غذا اصل ہے اور دواء عارض پس رجاء و غذاب ہے اور خوف دوا ہے۔

خوف کی حد

دوسری وجہ اصالت و ترجیح رجاء کی یہ ہے کہ طریق کا مدار عمل پر ہے اور رجاء سے نشاط پیدا ہوتا ہے اور نشاط موجب از دیاد عمل ہے اور خوف سے انقباض ہوتا ہے اور انقباض موجب عمل ہے گو اصل متعلق خوف کا اعمال سیئہ ہیں جس کا مقتضی یہ تھا کہ خوف سے اعمال سیئہ کی تقلیل ہو کرتی مگر تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ غلبہ خوف

سے جبکہ وہ مفرط جاوے اعمال صالحہ میں بھی تقلیل کا اندیشہ ہو جاتا ہے بلکہ تقلیل کا وقوع ہو جاتا ہے تو جو چیز تقلیل عمل کی طرف مفہمی ہو سکے وہ اصل نہیں ہو سکتی اسی لئے حضور ﷺ نے رجا کے لئے کوئی حد نہیں بیان فرمائی اور خوف کے لئے حد بیان فرمائی جو ابھی آتی ہے اور یہی کافی دلیل ہے حضور ﷺ کے عقل الناس و رئیس العقلاء ہونے کی کیونکہ آپ نے جو خوف کی حد بیان فرمائی ہے وہ کسی عاقل کے کلام میں نہیں مل سکتی (الا ان یکون نبیا مثله) آپ فرماتے ہیں واسئلک من خشیتک ما تحول بینی و بین معاصیک کہ اے اللہ میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں کہ جس سے گناہوں میں آڑے بنے یہ حد آپ نے اس لئے بیان کی ہے کہ غلبہ خوف سے تعطل کا اندیشہ ہے ہم نے تجربہ کیا ہے کہ زیادہ خوف سے مایوسی ہو جاتی ہے کانپور میں ایک وکیل میرے ہم نام تھے انہوں نے احیاء العلوم کا باب الخوف دیکھا تھا ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ نیک خاتمہ ہونے سے مایوس ہو چلے اور اس کا نام سن کر قہراتے اور کانپتے تھے ایک دن وہ میرے پاس کتاب لے کر آئے اور حالت یہ تھی کہ کتاب کو کھولتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپتا آخر میں نے تسلی دی جب کچھ ان کے ہوش و حواس درست ہوئے اور مجھ سے اس تقریر کے ضبط کرنے کی درخواست کی چنانچہ وہ ضبط اور شائع ہو چکی اس کا نام خاتمہ بالخیر ہے اسی طرح ایک انسپکٹر پولیس پر خوف غالب ہو گیا تھا اور وہ اس غلبہ سے اپنی مغفرت سے مایوس تھا آخر کہنے لگا کہ دوزخ میں تو ضرور جاؤں ہی گا پھر ظلم و رشوت میں بھی کیوں کی کروں مگر نہ معلوم حق تعالیٰ کو اس کا کون سا نفع پسند آ گیا ہو گا کہ آخر میں تو بہ نصیب ہوئی اور خاتمہ اچھا ہو گیا۔

لَعَذَابُ اِنْتَاهُمْ لَعْنٌ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ

ترجمہ: آپ ﷺ کی جان کی قسم وہ اپنی مستی میں مدہوش تھے۔

تفسیری نکات

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ کی قسم

یہ آیت قوم لوط (علیہ السلام) کے بارے میں ہے اور پر سے ان کا قصہ چلا آتا ہے پس اسی قصہ کے متعلق حق سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے لَعَذَابُ اِنْتَاهُمْ لَعْنٌ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ یعنی اے محمد ﷺ آپ کی حیات اور جان کی قسم ہے وہ یعنی قوم لوط اپنی مستی اور نشہ میں بھٹک رہے تھے اس قسم سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی حیات شریف کی عظمت اور شان بیان فرمادی اور بیان بھی ایسے طور سے کہ سننے والوں کو حضور ﷺ کی شان محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خوش تر آں باشد کہ سرد لبر آں گفتہ آید در حدیث دیگران

فضیلت کی انواع

بعض لوگ لکھے پڑھتے ہوئے نہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم قرآن کو سمجھ لیں اور چونکہ موقوف ہے دوسرے علوم پر اس لئے شبہات پیدا ہوتے ہیں پھر ان شبہات کو لے کر علماء سے الجھتے ہیں چنانچہ یہ شبہ بھی کہ جب قرآن میں انجیر وغیرہ کی بھی قسم ہے تو اللہ تعالیٰ کا قسم کھانا دلیل عظمت و رفعت شان مقسم بنی نہیں اس کم علمی ہی سے پیدا ہوا ہے۔

اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ عقلی سمجھئے۔ وہ یہ ہے کہ ہر شے کا شرف اسی کی نوع کے اعتبار سے ہوتا ہے تو مقسم بہ ہونا بے شک دلیل ہے شرف کی لیکن نہ مطلقاً بلکہ فی نوع یعنی یہ سمجھا جاوے گا کہ یہ شے اپنی نوع میں سب افراد سے افضل ہے اس کو میں اور واضح کرتا ہوں امام غزالی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ کھانا افضل ہے یا پانی تو وہ مجنون ہے یہ سوال ہی غلط ہے کہ افضلیت اور مفضولیت ایک نوع کے افراد میں ہوتی ہے مثلاً یہ سوال صحیح ہے کہ پلاؤ افضل ہے یا بریانی پانی افضل ہے یا دودھ ہاں اگر انواع ہی میں گفتگو ہو تو وہ دوسری بات ہے لیکن اگر افراد میں ہو تو اس میں یہ رعایت ضرور ہوگی کہ ایک نوع کے تحت میں داخل ہوں مثلاً یوں نہ کہیں گے کہ مسجد افضل یا فلاں کتاب یوں کہیں گے یہ مسجد افضل ہے یا فلاں مسجد یا فلاں گھر

جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا تو اب جواب سمجھئے کہ مقسم بہ ہونا بے شک دلیل اس کے شرف کی ہے یہ مراد نہیں کہ وہ سب انبیاء سے افضل ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی نوع میں افضل ہے پس انجیر بے شک افضل ہے لیکن ثمرات میں اور نجر بلاشبہ اشرف ہے مگر وقت میں پس اس بناء پر آپ کی حیات کے مقسم بہ ہونے کی حضور کی جو فضیلت و عظمت ثابت ہوئی وہ اپنے اخوان یعنی انبیاء میں ثابت ہوئی پس اس سے تمام پیغمبروں سے افضل ہونا ثابت ہوا اور انبیاء سب انسانوں سے افضل ہیں پس حضور ﷺ کا سید و ولد آدم ہونا معلوم ہوا۔ اب رہی یہ بات کہ فضیلت مطلقہ کیسے ثابت ہوئی تو وہ بدیں طور پر کہ باتفاق عقلاً انسان اشرف المخلوقات ہے اور نیز حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ** پس جب کہ نوع انسان تمام انواع سے افضل ہے اور انواع انسان میں انبیاء افضل ہیں اور حضور افضل المرسلین و سید الانبیاء ہیں پس حضور افضل المخلوق ہوئے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جناب رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی دو قسمیں فرمائیں ہیں عرب و عجم ان میں عرب کو فضیلت عطا فرمائی پھر عرب میں قریش کو افضل فرمایا اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب فرمایا پھر ان میں مجھ کو پیدا کیا پس میں افضل ہوں سباً بھی پس اب وہ شہر فح ہو گیا اور لہرک سے فضیلت و محبوبیت حضور ﷺ کی ثابت ہو گئی۔

ترجمہ: آپ (ﷺ) کی جان کی قسم وہ اپنی ہستی میں مد ہوش تھے۔

حیات برزخی رسول اکرم ﷺ

جاننا چاہئے کہ قسم معمولی شے کی نہیں کھائی جاتی مقسم بہ کوئی عجیب اور ذی شرف شے ہونا چاہئے اب دیکھنا چاہئے کہ مقسم بہ یہاں کیا ہے تو مقسم بہ یہاں حضور ﷺ کی حیات ہے اس لئے کہ عمر بفتح و ضم نام ہے حیات اور بقاء کا اور حیات کہتے ہیں ذی حیات کی اس حالت کو جو تولد سے لے کر وفات تک ہے اور اگر نظر کو اور وسیع کیا جاوے تو حضور ﷺ کے لئے بعد وفات کے بھی حیات برزخی ثابت ہے اور وہ حیات شہداء کی حیات برزخی سے بھی بڑھ کر ہے اور اتنی قوی ہے کہ حیات ناسوتی کے قریب قریب ہے چنانچہ بہت سے احکام ناسوت کے اس پر متفرع بھی ہیں دیکھئے زندہ مرد کی بیوی سے نکاح جائز نہیں ہے حضور ﷺ کی ازواج مطہرات سے بھی نکاح جائز نہیں اور زندہ کی میراث تقسیم نہیں ہوتی حضور ﷺ کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی اور حدیثوں میں صلوة و سلام کا سماع وارد ہوا ہے سو یہ تحقیقات ہیں اہل اسرار کی اس سے اصلی راز ان احکام یعنی لا تنکحوا ازواجہ من بعدہ اور لا نورث ما ترکناہ صلوة کا معلوم ہو گیا پھر حیات برزخی کے بعد حیات اخروی ہے وہ تو سب کو شامل ہے تو انبیاء کو بطریق اولیٰ حاصل ہوگی پس حیات کا مصداق حضور ﷺ کی ولادت شریف سے لے کر جنت کے دخول و خلود تک ہے یہ کلام توختی کی جانب میں ہے اور اگر ابتداء کی جانب نظر کو وسعت دی جاوے تو آپ کی نورانیت کی جو حالت عالم ارواح سے بھی پہلے تھی اس کو بھی حیات کہہ سکتے ہیں جس کی نسبت ارشاد ہے کنت لیبیا و ادم بین الروح و الجسد اور عالم ارواح میں جب الست کا عہد لیا گیا اور پوچھا گیا الست ہرکم تو سب نے حضور ﷺ کی طرف دیکھا کہ دیکھیں آپ کیا جواب دیتے ہیں تو سب سے اول حضور ﷺ نے جواب دیا۔ ہلسی انت ربنا اس کے بعد اوروں نے بھی کہا اوروں کی علم و معرفت کے مربی بھی حضور ﷺ ہوئے اور تربیت فی العلوم حیات پر موقوف ہے پس جب سے نور مخلوق ہوا ہے اس وقت سے حیات لی جاسکتی ہے پس اس تقریر پر حضور ﷺ کی حیات کی چار حالتیں ہو گئیں۔

ایک تو نور شریف کے پیدا ہونے سے ولادت شریف تک

دوسرے ولادت شریف سے وفات تک

تیسرے وفات سے حشر و شرب تک

چوتھے اس سے خلود جنت تک

پس اگر لعرک سے یہ حیات جس کے چار حصے ہیں مراد لی جاوے تو مجھ کو ہر حصہ کے متعلق مفصل بیان کرنا پڑے گا اور وقت اتنا وسیع نہیں اس لئے میں وہی حصہ حیات کا لیتا ہوں جس کو اہل عرف حیات کہتے ہیں یعنی ولادت شریف سے لے کر وفات تک پس معنی لعرک کے یہ ہوئے کہ آپ کی اس حصہ عمر کی قسم ہے۔

مدعیان محبت نبویہ کی غلطی

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا یہ حصہ عمر اتار فیع الشان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقسم بہ بنا اور اس حصہ عمر و حیات کا ایک جز و ولادت شریفہ بھی ہے تو اس کا بھی عظیم القدر و رفیع الشان ہونا ثابت ہوا اسی طرح اس کا دوسرا حصہ قوت استعداد و وصول کمالات کا ہے تیسرا حصہ تبلیغ و دعوت کا ہے چوتھا حصہ تکمیل امت کا ہے اور یہ تیسرا چوتھا حصہ بعض احوال میں متعاقب بھی ہے پھر تکمیل کی دو حیثیتیں ہیں ایک تکمیل حاضر کی خود اس کی اصلاح کے لئے دوسری تکمیل حاضر کی اصلاح غایت کے لئے پس ان سب حصص کی رفعت و عظمت ثابت ہوئی اور عظمت و رفعت شے کی جس طرح باعتبار اس کی ذات کے ہوتی ہے اسی طرح باعتبار اس کی غایت کے بھی ہوتی ہے بلکہ زیادہ مقصودیت شے کی اس کی غایت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

پس حضور ﷺ کی تشریف آوری عالم ناسوت میں جمیع الحصص کی بھی کوئی غایت ضرور ہوگی اور وہ غایت ایسی ہے کہ اس کو سن کر مدعیان محبت کی بھی اصلاح ہوگی۔

وَلَقَدْ آتَيْنَكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: اور ہم نے آپ (ﷺ) کو سات آیتیں دیں جو نماز میں مقرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔

تفسیری نکات

اہل علم کی ہوس زر پر اظہار افسوس

ایک روز فرمایا کہ ایسے شخص کی حالت پر نہایت افسوس ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث پڑھ کر جاہ و مال کی محبت رکھے تو اس نے اس کی تعلیمات پر نظر ہی نہیں کیا۔ کما یدل علیہ قوله تعالیٰ: **وَلَقَدْ آتَيْنَكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ﴿۷۹﴾** لَا تَمْدَنَّ عَيْنَيْكَ الْخِ عَلَى مَا ذَكَرَهُ الزَّمخشری فی الکشاف والغزالی فی المنہاج و الحدیث من لم یغن بالقرآن فلیس منا او کما قال علی تفسیر الغنی بالا ستغفال کما فسره العلامة الزمخشری غفر له خادم العلماء و الفقراء السید احمد حسن الحشتی عفی عنہ

ترجمہ: اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں پس اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تمجید کرتے رہئے اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے۔

خلاصہ مفہوم

خلاصہ یہ کہ جب تنگی ہو یعنی خدا کے ساتھ مشغول ہو اس مشغولی جتن سے تنگی جاتی رہے گی اور یہاں جمعیت سے وہ مراد نہیں جو ایک دوسری آیت میں مذکور ہے **الَا يَذْكُرُ لِلّٰهِ تَطْمِئِنُّ الْقُلُوبُ** یہاں پر اس کی تفسیر سیاق و سباق سے معلوم ہوتی ہے کہ اطمینان سے وہ اطمینان مراد نہیں جو ضیق کا مقابل ہے یہاں پر دوسرا اطمینان مراد ہے جس کا نام ایمان ہے چنانچہ قرینہ سیاق بالمورد یہ ہے کہ فرماتے ہیں **وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أُنَابَ** آ کے فرماتے ہیں بطور مبدل منہ الا يذکر اللہ طمئن القلوب

جب یہ من اناب کا بدل ہے تو اس کے ساتھ متحد ہے اور من اناب بوجہ تقابل خیال کے بمعنی مہتدی مومن ہے پس یہ اطمینان متحد ہو ایمان کے ساتھ اور سیاق بالتحیہ یہ ہے **الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ وَحَسُنَ مَا يُبَدَّلُونَ** اور اصل معنی اطمینان کے سکون کے ہیں اور سکون دو طرح کا ہوتا ہے ایک سکون عقلی دوسرا سکون طبعی پس یہاں اطمینان سکون عقلی کے معنی میں ہے۔

پس مقابل ضیق کا نہیں کیونکہ ضیق امر طبعی ہے پس وہ تو اطمینان کفر کے مقابل ہے پس طبعی نہیں اور قرآن میں دونوں استعمال موجود ہیں چنانچہ فرماتے ہیں **وَقُلُوبُهُمْ مُّطْمَئِنُّ بِآيَاتِنَا** یہاں سکون عقلی ہے اور ایک جگہ طبعی ہے ابراہیم کے قصے دعائے احیائے موتی میں۔

بعضوں کی تفسیر نہ جاننے سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں ایک کورٹ انسپکٹریا آیت دیکھ کر کہ **أَوَلَمْ تَرَ مَنْ قَالَ بَلَىٰ وَ لَئِنْ لَمْ يَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةٌ مِنَ السَّمَاءِ فَاكْفُرُوا غَيْرَكُمْ بَلَىٰ أَلَا يَلْمِزُكَ أَتَىٰ مَعَهُ وَعَمَلُوا الصَّالِحَاتِ** کہنے لگے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو احیاء میں اطمینان نہ تھا شک تھا ان کے اس شبہ کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اس آیت میں اطمینان کو مقابل سج کے سمجھے یعنی اطمینان عقلی سمجھ گئے سو یہاں بمعنی اطمینان طبعی مستعمل ہے اور شک کی نفی تو اولم تو من کے جواب میں ان کے ملی کہنے سے ہوئی۔

حاصل اس بے اطمینانی طبعی کا یہ ہے کہ ان کو یہ تو یقین تھا کہ احیاء ہو گا مگر اس کی کیفیت میں جو کہ کئی احتمال تھے اور کسی کیفیت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا اس لئے اس کی تحسین میں تردد تھا اس کو عدم اطمینان فرمایا کیونکہ یہ اطمینان مشاہدہ ہی سے ہوتا ہے کہ طبعاً سکون ہو جاوے یہ کیفیت واقع ہوئی میں نے ان کو یہی جواب دیا بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ واقعی ترجمہ سے قرآن سمجھنا بہت دشوار ہے۔

یہ اثر پیدا ہوتا ہے محققین کے پاس رہنے سے ورنہ کتنا بڑا شبہ تھا ابراہیم علیہ السلام کو تو اطمینان نہ تھا **وَتَطْمِئِنُّ قُلُوبُهُمْ** سے اور **وَقُلُوبُهُمْ مُّطْمَئِنُّ بِآيَاتِنَا** سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ادنیٰ مومن کو اطمینان حاصل ہے تو اس کو اتنا بڑا درجہ ملا کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی حاصل نہ تھا۔

اطمینان کے درجات

تو اس تحقیق سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اطمینان کے دو درجہ ہیں پس ان السین امنوا میں اطمینان عقلی مراد ہے لیکن لیطمئن قلبی میں اطمینان طبعی اور ضیق کا علاج یہی اطمینان طبعی ہے جو مشغولی بحق سے پریشانی کے رفع کرنے میں مؤثر ہے گو اور بہت امور میں تردد کو رفع نہ کرے مثلاً احیاء موتی کی کیفیت میں۔

اب ایک اور قوی شبہ باقی رہ گیا وہ یہ کہ فرماتے ہیں الم نشرح لك صدرک' تو کیا شرح صدر کے بعد بھی حضور ﷺ کو تنگی معلوم ہوئی سو سمجھ لو کہ یہ جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

ضیق کی دو قسمیں

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ سَوْضِيقٍ كِي دُو قَسْمِيں ہيں ايك تو یہ کہ جیسے عوام کو ہوتا ہے حضور ﷺ کو ایسا کبھی نہیں ہوا اور یہ کہ نہایت ضعیف ہو سو یہ ہوا مگر یہ شرح صدر کے منافی نہیں۔

دیکھو آپ کو زکام ہو گیا اور وہ بھی معمولی تو آپ بھی مریض ہیں اور ایک مدقودہ ہے وہ بھی مریض ہے مگر آپ کی بیماری عادت صحت کے منافی نہیں کیونکہ صحت غالب ہے پس حضور ﷺ کا ضیق بھی نہایت خفیف ہوتا تھا جو شرح صدر کے منافی نہیں۔

اب ایک بات اور عجیب قابل تحقیق باقی رہی وہ یہ کہ اطمینان جب حاصل ہوگا تو آیا ضیق زائل ہو جائے گا یا مغلوب ہو جاوے گا تو یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ ضیق زائل نہیں ہوتا بلکہ مغلوب ہو جاتا ہے جس طرح انسان کے اندر سب اخلاط موجود ہیں تو جب صفر ابراہ جاتا ہے مسہل کی ضرورت پڑتی ہے مگر مسہل صفر کو بالکل نہیں نکال دیتا اور اگر بالکل صفر اودیت نہ رہے تو پھر خیریت نہیں۔

حق تعالیٰ نے جب طبیعت عطا فرمائی ہے تو اس کے خواص لازمہ بھی عطا فرمائے ہیں ورنہ انتفاء لازم سے انتفاء لزوم ہو جاتا ہے غرض زائل نہیں ہوتا ہاں مغلوب ہو جاتا ہے اور اس تحقیق سے ایک بڑا تردد سا لکھیں کا رفع ہوادہ یہ کہ بعض اوقات بعد مجاہدہ کے بھی بعض امور طبعیہ سے مذمومہ کا اثر اپنے اندر پاتے ہیں اور اس سے مجاہدہ کے بیکار ہونے کا گمان کر کے مایوس ہو جاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اخلاق ذمیرہ مغلوب ہو جائیں کہ ان کے اقتضاء پر عمل کرنے کو ہا سانی ترک کر سکیں یہ کافی ہے زوال کی توقع نہ رکھیں ورنہ پھر ثواب اور فضیلت ہی کیا ہے یہ امور ذوقیت تھے جو درمیان میں عرض کر دیئے گئے۔

خلاصہ اور اصل مسئلہ یہی ہے کہ ضیق کا مشغولی بحق سے علاج کیا گیا ہے آپ خود بھی دیکھ لیجئے کہ مشغولی حق سے پہلا واقعہ بھول جائیں گے یا نہیں اور میں یہ بتلا چکا ہوں کہ واقعات محزون و پریشان نہیں بناتے بلکہ مشغولی بواقعات پریشان کرتی ہے اور مشغولی بحق سے وہ مشغولی و توجہ نہیں رہتی اس لئے پریشانی نہ رہے گی۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿۳۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ

رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ﴿۳۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ

الْيَقِينُ ﴿۳۹﴾

ترجمہ: کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کا دل ان کے اقوال سے تنگ ہوتا ہے سو آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کرتے رہے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہے اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے یہاں تک کہ آپ کو موت آ جاوے۔

تفسیری نکات

علاج غم

آگے علاج بتاتے ہیں کہ **فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ** یعنی تسبیح کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اللہ کا نام لیجئے نفل پڑھے یا ذکر کیجئے **وَ كُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ** بالخصوص سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائے اور یہ جو ہم نے بتلایا یہ تو دو اتھی چنانچہ فاء تفریحیہ اس کا قرینہ ہے۔

اب آگے فرماتے ہیں کہ اس کے ساتھ ایک غذا بھی ہے کہ اگر تم پر اور تنگ دلی بھی نہ ہو تب بھی اس کو کرتے رہو یعنی **وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ** پس یہ غذا ہے کہ موت آنے تک عبادت کرتے رہو غرض اس آیت سے علاج و غذا دونوں باتیں معلوم ہوئیں باری تعالیٰ نے یہاں تین صیغے اختیار کئے ہیں اور سب کا حاصل قریب قریب ایک ہے یہ صرف اختلاف عنوان ہے اور حاصل سب کا ایک ہے۔

عبارت الناشئ و حسنک واحد و کل الی ذلک اجمال بشر بس عبارتیں مختلف ہیں اور حاصل سب کا ایک ہے یعنی مشغولی بحق خلاصہ یہ کہ اگر آپ پر تنگی آوے اور آپ کا دل تنگ ہو تو مشغول بحق ہوئے یہ اس کا علاج ہے۔

سُورَةُ النَّحْلِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ وہ وہ چیزیں پیدا کرتے ہیں جن کو تم نہیں جانتے۔

تفسیری نکات

جدید مصنوعات کا ذکر قرآن مجید میں

مطلب یہ ہے کہ مخلوقات الہی کا تمہاری معلومات ہی میں انحصار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر نہیں مثلاً زمین کے اندر بعض جراثیم ایسے پیدا ہوتے ہیں جو انسان و حیوان کے لئے قاتل ہیں اور بعض مواد ایسے پیدا ہوتے ہیں جو موزیات کو فنا کرنے والے ہیں ہم کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں ہوتی کہ کون سا مادہ کب پیدا ہوا اور کب فنا ہو گیا یہ تو آیت کی تفسیر تھی اب میں اس کے متعلق چند فوائد ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک فائدہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ایک سواری ریل ایجاد ہوئی بعض ذہنوں کو اس کے متعلق اس کی تلاش ہے کہ ریل کا ذکر بھی قرآن شریف میں کہیں ہے یا نہیں ہر چند کہ اس کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ قرآن حرفت و صنائع اور ایجادات کے بیان کرنے کو نازل نہیں ہوا جیسا کہ بارہا میں نے اس پر متنبہ کیا ہے اور قرآن کو جو تیسرا ناکل لکل شی کہا گیا ہے تو وہاں کل شی سے مراد کل شی عن امور الدین ہے نہ کہ کل شی ولو عن امور الدین اس لئے یہ تحقیق مذکور محض ایک امر زائد ہے لیکن تمہارا میں اس کو بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ اس وقت یہ بیان ایک ایسی ہی نعمت کے شکر یہ میں ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریل کے متعلق ہم کو عطا فرمائی اور جس کو دوسرے مرکوبات کے ساتھ وصف مرکوبیت میں مشارکت بھی ہے سو بعض ذہنوں نے اس کو سورۃ یس کی اس آیت **وَإِنَّ لَهُمْ آتَا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفَلَكِ الْمَشْهُونِ ﴿۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُم مِّن نَّبَاتِهِ مَا يَرْكَبُونَ ﴿۲﴾** میں داخل کیا

ہے کہ اس میں ریل کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ کیونکہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اس بات میں بھی ہماری قدرت کی دلیل موجود ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری بھری کشتیوں میں سوار کیا اور ہم نے ان کے لئے کشتی کے مثل اور چیزیں بھی پیدا کی ہیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں اور ریل سب سے زیادہ کشتی اور جہاز کے مشابہ ہے کہ جیسے جہاز میں انسان اپنی تمام ضروریات کو ساتھ لے کر سفر کرتا ہے ایسے ہی ریل میں کر سکتا ہے مگر یہ قرآن کی تحریف ہے کیونکہ یہاں خلقنا لهم صیغہ ماضی کا ہے تو لازم آئے گا کہ ریل کا وجود حضور ﷺ کے زمانہ میں بھی ہو اور اس کا بطلان ظاہر ہے بلکہ اس سے مراد بعض کے نزدیک تو اونٹ ہے اور اس کا لطف عربیت کے جاننے سے زیادہ آئے گا کیونکہ اہل عرب اونٹ کو سفائن البر یعنی خشکی کا جہاز کہتے تھے چنانچہ یہ مصرعہ مشہور ہے سفائن البرو السراب۔

اور میرے نزدیک اس سے مطلق انعام مراد ہیں کیونکہ سورہ زخرف میں ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ مِنْ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ یہاں فلک اور انعام دونوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انعام و کشتی باہم تناسب ہیں مگر مماثلت کی صورت جب ذہن میں آئے گی کہ کشتی تو چھوٹی لو اور جانور بڑا یہ نہیں کہ جانو چھوٹا لو اور جہاز سے اس کا موازنہ کرو جسے بیرل اور اکبر شاہ کا قصہ ہے کہ اکبر نے بیرل سے کہا تھا کہ مثل مشہور ہے راج ہٹ تریا ہٹ بالکل ہٹ سوادل کی دو ضدیں تو واقعی سخت ہیں باقی تیسری کیا مشکل ہے بیرل نے کہا حضور سب سے سخت تو یہی ہے البتہ اگر عقل ہو تو پھر مشکل نہیں اکبر شاہ نے کہا اس میں عقل کی کون ضرورت ہے۔ بیرل نے کہا بہت اچھا میں بچہ بنتا ہوں آپ میری ضد پوری کیجئے بادشاہ نے کہا اچھا تم بچہ بنا اور ضد کرو ہم ہر ضد کو پورا کریں گے بیرل نے بچوں کی طرح رونا شروع کیا اور کہا ہم تو ہاتھی لیس گے اکبر نے فیل خانہ سے ہاتھی منگوا دیا اس نے پھر رونا شروع کیا اور کہا ہم تو کلیا لیس گے اکبر نے کلیا بھی منگوا دی وہ پھر رونے لگے اور کہا کہ ہاتھی کو کلیا میں رکھو یہاں اکبر عاجز ہو گیا اور کہا اچھا تم جو کہتے تھے کہ اگر انسان عاقل ہو تو بچوں کی ضد پوری کر سکتا ہے یہاں عقل کیا کام دے گی۔ بیرل نے کہا حضور عقل کے ساتھ بچہ کی ضد ضرور پوری کی جا سکتی ہے اکبر نے کہا اچھا لو ہم بچہ بنتے ہیں تم ہماری ضد پوری کرو چنانچہ آپ نے اسی سبق کو دہرایا کہ ہم تو ہاتھی لیس گے بیرل نے بازار سے مٹی کا ننھا سا ہاتھی منگوا دیا پھر کہا ہم تو کلیا لیس گے اس نے بڑی سے کلیا منگوا دی پھر کہا ہاتھی کو اس میں بند کرو بیرل نے ہاتھی کو کلیا میں رکھ دیا اور کہا حضور نے یہ غلطی کی کہ بچہ کی ضد پر فیل خانہ سے ہاتھی منگوا یا آپ کو بچہ ہی کے مناسب ہاتھی منگوانا چاہئے تھا اسی طرح یہاں فلک و انعام میں مناسبت کا لحاظ کر کے کشتی چھوٹی اور جانور بڑا لینا چاہئے اور بعض حضرات نے ریل کو سورہ نحل کی اس آیت وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ میں داخل کیا ہے (کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی چیزیں پیدا کرے گا جن کو تم نہیں

جانتے) گو یہ تحریف تو نہیں ہے مگر بعید ضرور ہے کیونکہ بظاہر صیغہ حال ہے اور ظاہر ہے کہ ان سوار یوں میں جو آج کل ایجاد ہوئی ہیں صحابہ کے زمانہ میں کوئی پیدا نہیں ہوئی اور اگر اس کو مستقبل لیا جائے تو صحابہ کچھ سمجھے ہی نہ ہوں گے پھر یہ ایجادات خلق کے بعد تو معلوم ہو گئیں اور اس آیت کے تحت میں وہی اشیاء داخل ہو سکتی ہیں جو بعد خلق کے بھی معلوم نہ ہو اس لئے اس کی تفسیر میں سہل بات وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کے لئے مثل نعم مذکورہ کے نافع ہیں اور تم کو ان کی خبر بھی نہیں جیسے مواد رضیہ جو موزیات کو فنا کرتے رہتے ہیں اور نافع ہوئے کی قید بقیہ مقام ہے کہ اشیاء نافعہ کا ذکر ہو رہا ہے پس حاصل مقام کا یہ ہوا کہ ہم ایسے نفع رساں ہیں کہ بعض چیزوں کی تم کو خبر بھی نہیں اور ہم ان سے تم کو نفع پہنچا رہے ہیں یہ نہ سمجھو کہ بس وہی چیزیں تمہارے نفع کی پیدا کی ہیں جو تم کو معلوم ہیں جیسے نعم مذکورہ اور اس تقریر پر بخلق مالا تعلمون کا ربط بھی نعم مذکورہ سے ظاہر ہو گیا یعنی ربط تقابل۔

اور بعض حضرات نے مَا يَنْفَعُ لَللَّهِ الْكَافِرِينَ مِنْ تَخْتِئَةٍ فَلَا مَنِيْلًا لَهَا فِي رَيْلٍ كُوْدَاغْلٍ كِيَا هِي كِيُوْنِكِيَا بعض سلف نے فرمایا ہے کہ من رحمۃ میں ہر وہ نعمت داخل ہے جو بندوں کی راحت و آسانی کے لئے ایجاد ہوئی ہے چنانچہ سفند وغیرہ کو بھی انہوں نے اس میں داخل کیا ہے اس میں البتہ زیادہ بعد نہیں اسی واسطے میں نے بھی اپنی تفسیر کے حاشیہ میں اس مقام پر لکھ دیا ہے کہ من رحمۃ کے عموم میں ریل بھی داخل ہے اور اتفاق عجیب یہ ہوا کہ جس دن میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا تھا اسی دن پہلے پہل ہمارے قصبے کے سامنے سے ریل گزری ہے اس لئے میں نے تفسیر کے حاشیہ میں یہ بھی لکھ دیا کہ بحمد اللہ آج ہماری بستی کے سامنے سے عید گاہ کے قریب ریل گزری ہے۔ اور اس کے ساتھ ریل کے جاری ہونے کا سن اور تاریخ بھی لکھ دی تاکہ محفوظ رہے غرض اس آیت میں ریل کا داخل کرنا بعید نہیں اور خود میں نے بھی اسی میں اس کو داخل کیا تھا لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک بات اس سے بھی زیادہ قریب آئی ہے وہ یہ کہ اگر ذکر کو حقیقی اور حکمی کے لئے عام لیا جائے تو میرے نزدیک ریل کا ذکر وَتَحْمِيلُ اَنْعَالِكُمْ اِلَىٰ بَلَدِكُمْ تَكُوْنُوْنَ بِالْفَيْدِ الْاَلَا شِقِي الْاَنْفُسِ میں سب سے اقرب طرق کے ساتھ ہو جاوے گا کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں مراکب میں وجہ نعمت اس غایت کو بیان فرمایا ہے کہ وہ تمہارا بوجھ ایسے بلاؤ تک پہنچاتے ہیں جہاں تم بدوں مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے تو جس سواری میں بھی یہ رعایت موجود ہوگی وہ حکماً اس نعمت میں داخل ہو کر مثل انعام کے نعمت کی ایک فرد ہوگی اور ریل میں یہ رعایت سب سے زیادہ موجود ہے تو وہ بھی حکماً اس نعمت میں داخل ہے۔

میں نے بچپن میں مولانا شیخ محمد صاحب کا (جو تھانہ بھون کے بڑے علماء میں سے تھے ۱۲) ایک وعظ سنا تھا اس وقت میری عمر زیادہ نہ تھی مگر مولانا سے مجھے محبت تھی اور مولانا کو مجھ سے محبت تھی اس لئے میں کوشش کر

کے وعظ میں شرکت کیا کرتا تھا اس لئے مجھے مولانا کے مواعظ کی کچھ کچھ باتیں اب تک یاد ہیں چنانچہ ایک بار مولانا نے وعظ میں فرمایا کہ مجھے ریل کا نعمت ہونا بھی تک محسوس نہ ہوا تھا یعنی اس طرف التفات نہ ہوا تھا مگر ایک دن جو ریل میں بیٹھا اور جلدی سے منزل پر پہنچ گیا تو اس وقت اس نعمت کی بڑی قدر ہوئی اور معلوم ہوا کہ ریل بھی حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو ہم لوگوں کو عطا ہوئی ہے پس میں آپ صاحبوں کو بھی مطلع کرتا ہوں کہ اس کو نعمت سمجھو اور اس کا شکر ادا کرو تو جب بڑے بڑے علماء کو اس کا نعمت ہونا جلدی معلوم نہیں ہوا تو عوام کو اگر اس نعمت ہونا معلوم نہ ہو تو زیادہ شکایت نہیں مگر تنبیہ کے بعد تو احساس ہونا چاہئے اس لئے میں بھی مولانا شیخ محمد صاحب کی طرح کہتا ہوں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھو اور اس پر شکر کرو اور شکر مرا کب کے دو صیغے قرآن میں وارد ہیں۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ۗ وَاِنَّا لَیْ رٰتِلَا الْمُتَّقِیْنَ ۝ جو رکوب انعام کے وقت اللہ تعالیٰ نے ہم کو تعلیم فرمایا ہے اور دوسرے بِسْمِ اللّٰهِ فَجْهَبْهَا وَمُرْسَهٰۤا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ جو رکوب سفینہ کے وقت نوح علیہ السلام نے اختیار فرمایا تھا اور چونکہ ریل کو حمل اٹھال میں انعام کے ساتھ بھی مشابہت ہے اور سرعت سیر وغیرہ میں کشتی کے ساتھ اس لئے بہتر ہے کہ دونوں کو جمع کر لیا جائے۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا تھا کہ ریل کو دیکھ کر مجھے جہنم یاد آتا ہے کیونکہ اس کا انجن جہنم کی صفت کا مصداق ہے وَہِیْ كَفُوْرٌ ۗ تَكَادُ تَمَيِّزُ مِنَ الْغَيْظِ کہ اس قدر جوش کھاتا ہے گویا غصہ اور تہر سے ابھی پھٹ پڑے گا اور ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے کہ ریل کے تیسرے درجہ جہنم کی اس صفت کا مذکور ہوتا ہے کَلَّمَا دَخَلْتَ اُمَّةً لَعْنَتْ اُمَّةً اُخْتَهَا کہ جیسے جہنم میں ایک جماعت دوسری جماعت پر لعنت کرے گی ایسے ہی ریل میں تیسرے درجہ والے آپس میں خوب لڑتے ہیں جب کسی اسٹیشن پر نئے نئے مسافر تھریڈ میں بھرتے ہیں تو پہلے سے بیٹھے ہوتے ہیں وہ انہیں کوستے برا بھلا کہتے ہیں کہ سارے اسی گاڑی میں آ جاؤ تمہارے واسطے اور کہیں جگہ نہیں رہی منہ پر آنکھیں نہیں کہ یہ تو پہلے ہی سے اسی گاڑی میں آ جاؤ تمہاری سزا یہ ہے کہ کھڑے رہو اور جواب میں کہتے ہیں کہ جگہ تو بہت ہے سیدھے ہو کر بیٹھو کیا تم ہی نے کرایہ دیا ہے تم ریل کے مالک ہو پھر خوب گالم گلوچ اور جھگڑا فساد ہوتا ہے اس وقت بالکل یہی منظر رہتا ہے کَلَّمَا دَخَلْتَ اُمَّةً لَعْنَتْ اُمَّةً اُخْتَهَا اور جب کہتے ہیں کہ ہم نے بھی تو ٹکٹ لیا ہے اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے نکل ضعف اور جب کہتے ہیں کہ تم کو ہر پر کیا ترجیح اس وقت اس کا نمونہ ہوتا ہے فَمَا كَانَ لَنْكُرَ عَلَيْكُمْ مِنْ فَضْلِیْ اور ایک شان اس میں جنت کی بھی ہے وہ یہ کہ جنت میں جس چیز کو دل چاہے گا وہ جلدی مل جائے گی اس بات میں ریل جنت کے مشابہ ہے کہ جس چیز کو دل چاہتا ہے ریل کے ذریعہ سے جلدی حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ کلکتہ اور پشاور کے میوے یہاں دوسرے دن پہنچ جاتے ہیں بڑے شہروں میں ہر ملک کی چیزیں ہر وقت ملتی ہیں نیز جیسے جنت

میں جہاں جانے کو دل چاہا فوراً پہنچ گئے اسی کا نمونہ گواہی ہی نمونہ ہو اس میں بھی ہے چنانچہ ظاہر ہے اور اس کے متعلق اسٹیشنوں کا انداز سے تقارب اور ہر اسٹیشن پر ضرورت کی چیزیں ملنا بالکل بلا دسبا کو یاد دلاتا ہے جس کا ذکر اس آیت میں وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا قُرَى ظَاهِرَةً وَقَدَرْنَا فِيهَا السَّيْرَ سِيرُوا فِيهَا لِيَاءٍ وَيَا آيَاتِ اٰمِنِيْنَ اور گو یہ نعمت دنیوی تھی مگر اس پر ناشکری کی مذمت اس طرح فرمائی گئی فَكَأَلُوْا رَبَّنَا بَعْدَ بَيِّنَاتٍ اَنْفُسَنَا وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَبَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مَجْرَجٍ (الایہ) پس اسی طرح یہ ریل بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس کا شکر کرنا چاہئے اور اس کے اندر جو مشابہتیں جنت و دوزخ کی مذکور ہوئیں ان پر اگر نظر کی جائے تو نعمت ظاہرہ کے ساتھ اس سے نعمت باطنیہ یعنی تذکر آخرت بھی حاصل ہوگی۔

مقدم و تالی میں عجیب ربط

وَلَوْ يُؤْخِذُ اللهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهِمْ صَآئِبَةٌ (اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ہیں ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو چھوڑتے)

اس آیت میں بظاہر مقدم و تالی میں ربط نہیں کیونکہ آدمیوں کے افعال پر مواخذہ کرے۔ نتیجہ ظاہر میں آدمیوں ہی کی ہلاکت ہو سکتی ہے نہ کہ تمام حیوانات کی ہاں اگر یہ فرماتے وَلَوْ يُؤْخِذُ اللهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهِمْ صَآئِبَةٌ (اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتی ہے تو روئے زمین پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتے)

یایوں فرماتے وَلَوْ يُؤْخِذُ اللهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْاِنْسَانِ (اور اگر حق تعالیٰ لوگوں سے مواخذہ فرماتے ان سب اعمال پر جو وہ کرتے ہیں تو روئے زمین پر کسی انسان کو نہ چھوڑتے) تو اس صورت میں ربط ظاہر تھا لیکن آیت اس طرح وارد نہیں ہوئی وہاں تو مواخذہ اعمال انسان پر تمام حیوانات اور جاندار چیزوں کی ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ کہ انسان کے گناہوں سے تمام مخلوق ہلاک ہو ان دونوں مقدموں میں جوڑ کیا ہے مگر تقریر گذشتہ کے ملانے سے اب اس اشکال کا جواب ظاہر ہے اس آیت کے ساتھ وہ مقدمہ ملا لیجئے کہ انسان کے لئے سب کائنات پیدا ہوئے ہیں بس اب ربط پیدا ہو گیا۔ حاصل یہ ہوا کہ انسان تو اس صورت میں اپنے گناہوں کی وجہ ہلاک ہوتا اور بقیہ مخلوقات اس لئے ہلاک ہوتیں کہ وہ سب انسان کے لئے پیدا ہوئی تھیں اور قاعدہ اشیء اذا خلا عن غایت اشیء (چیز جب غرض و غایت سے خالی ہوتی ہے تو منشی ہو جاتی ہے)

جب انسان ہی نہ رہا جس کے لئے یہ سب پیدا ہوئے تھے تو اب ان کے باقی رہنے میں کیا فائدہ اس لئے یہ بھی ہلاک ہو جائیں گے۔

فسئلوا اهل الذکر ان کتبم لا تعلمون (ترجمہ) سوا کرتے کو علم نہیں تو اہل علم سے پوچھو۔ مکھو (النحل آیت ۴۳)

فتویٰ کی دلیل پوچھنا خلاف اصول ہے

کی تشریح میں فرمایا کہ بیچ کا جملہ معترضہ ہے اور بالہینات اور فسئلوا کے متعلق نہیں بلکہ ارسلنا کے متعلق ہے اس سلسلہ میں فرمایا کہ سائل مجتہد ہوگا یا غیر مجتہد ہوگا مجتہد تو سوال نہیں کرتا اور غیر مجتہد دلیل نہیں پوچھتا اب جو عام لوگوں نے دستور کر رکھا ہے کہ فتویٰ کی دلیل پوچھتے ہیں یہ خلاف عقل اور خلاف اصول ہے۔

(ملفوظات حکیم الامت جلد ۱۵ صفحہ ۱۲۷)

ریل کا ثبوت آیت قرآن سے

فرمایا ریل قرآن میں اس آیت کے تحت میں داخل ہو سکتی ہے و تحمل افعالکم الی بلد لم تکونوا بملغیہ الا بشق الانفس لیکن بوجہ اشتراک علت کے نہ کہ بوجہ مدلول ہونے کے کیونکہ تحمل کا مرجع ظاہر ہے کہ انعام ہیں لیکن علت میں اشتراک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انعام کے متعلق احسان میں فرمایا ہے تحمل افعالکم یعنی وہ انعام ایسے بوجہ کو دوسرے شہروں کی طرف لے جاتے ہیں کہ تم ان کو نہیں لے جا سکتے تھے اور بوجہ سب سے زیادہ ریل پر جاتے ہیں اس واسطے یہ بھی ویسے ہی نعمت ہوئی (الکلام الحسن ج ۱ صفحہ ۱۰۸)

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ وَلَنْ نُجْزِيَ الَّذِينَ

صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور جو کچھ تمہارے پاس (دنیا میں) ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔

تفسیری نکات

دنیا کی کوئی چیز قابل محبت نہیں ہے

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی شے بھی قابل محبت کے نہیں اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے ایسا عیب سب چیزوں کا بیان فرمایا کہ جو ظاہر الاشتراک اور بدیہی ہے یعنی جو چیز تمہارے پاس ہے وہ فنا ہونے والی ہے جب فنا ہونے والی ہے تو اس قابل نہیں ہے کہ اس سے جی لگایا جاوے

وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بِآقٍ یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والی ہے پہلا جزو یعنی مَا عِنْدَ اللَّهِ یَنْقُذُ تو ہم کو کھلم کھلا نظر آتا ہے کہ کل فلاں مرا تھا آج فلاں اس کے لئے ضرورت اس کی نہیں کہ ایمان والا ہی اس کو سمجھے مومن کافر مشرک سب کھلی آنکھوں فنا و تغیرات کا مشاہدہ کر رہے ہیں باقی اس دوسرے جزو کے مضمون کا یقین اس شخص کو ہوگا جس کو ایمان ہوگا اور کلام الہی کو سچا سمجھے گا وہ یقین کر لے گا کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والی ہیں لیکن اس جملہ خبریہ سے غرض اخبار نہیں جیسے کہ پہلے جملہ سے بھی یہ مقصود نہیں بلکہ غایت اس کی دوسری شے ہے وہ یہ ہے کہ ما عند اللہ سے جی لگاؤ اس سے ایک کلیہ مستنبط ہوا وہ یہ ہے کہ جو شے باقی رہنے والی ہے وہ قابل دل لگانے کے ہے اور یہ اہل دنیا کا بھی مسلمہ ہے کہ دل لگنے کا معنی وہ بقاء کو مانے ہوئے ہیں اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھئے مثلاً دو مکان ہمارے پاس ہیں ایک تو عاریت کا ہے اور اک ہم کو مہیہ ملا ہے کہ ہم کو اس کا مال کبنا دیا گیا ہے مگر دونوں مکان کو اندر جا کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ خراب و خستہ پڑے ہیں دیواریں ٹوٹی ہوئی ہیں کڑیاں گری ہوئی ہیں دونوں مرمت طلب ہیں اب ایک ہزار روپیہ مرمت کے لئے تجویز کیا لیکن اب کلام اس میں ہے کہ یہ ایک ہزار روپیہ کہاں لگانا چاہئے عاریت کے مکان میں یا مکان موہوب میں ظاہر ہے کہ ہر عاقل یہی تجویز کرے گا کہ جو اپنا مکان ہے اس میں لگانا چاہئے اس لئے کہ وہ تو پاس باقی رہنے والی ہے اور مستعار تو قبضہ سے نکلنے والا ہے اس میں روپیہ لگا کر کیا کرنا ہے معلوم ہوا کہ کوشش و سعی کا کرنا اور مال کا خرچ کرنا اسی شے کے ساتھ ہوتا ہے کہ جو شے باقی رہنے والی ہے اور اپنے پاس رہنے والی ہے اگرچہ وہ اچھا محض خیال ہی کے درجہ میں ہو اور جو شے اپنے پاس باقی رہنے والی نہ ہو بلکہ جلدی سے نکل جانے والی ہو اس میں اگر کوئی اپنی ہمت و سعی خرچ کرے تو اس کو بے وقوف کہا جاتا ہے مثلاً ایک شخص سرائے میں ایک شب کے لئے ٹھہرا اور ہزار روپیہ کما کر بیوی بچوں کو جا کر دیں گے اتفاق سے جو کوٹھڑی سرائے میں اس کو ملی وہ خراب تھی اس نے اسی وقت معماروں کو بلا کر وہ ہنر روپیہ اس کو ٹھڑی کی مرمت میں خرچ کر ڈالے بیوی بچے منتظر ہیں کہ میاں باہر سے کمائی لاویں گے میاں صاحب نے یہ حرکت کی تو تم اسے شخص کو بے وقوف کہو گے یا غفلت مند ظاہر ہے کہ بے وقوف ہے تو یہ بے وقوف کیوں ہے صرف اس وجہ سے کہ جلدی قبضہ سے نکل جانے والی شے میں اس نے اپنا سارا سرمایہ غارت کیا۔

اسی طرح تم کو بھی ایک ذخیرہ دوسرا یہ عمر کا حق تعالیٰ کے یہاں سے ملا تھا کہ اس کا ایک ایک منٹ دنیا دہ مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے اور دلیل قیمتی ہونے کی یہ ہے کہ اگر کسی کا دم نکلنے لگے اور اس سے کوئی یہ کہے کہ ہم فی گھنٹہ دس لاکھ روپے لیں گے اور اتنی مہلت تم کو دی جاتی ہے اگر اس کے پاس روپیہ ہوگا تو ہرگز دریغ نہ کریگا بلکہ اس سے زیادہ بھی دریغ نہ ہوگی سلطنت دینے سے بھی انکار نہ ہوگا چنانچہ ایک بزرگ تھے ان کو کسی بادشاہ کو

صحیح کرنا منظور تھا اس لئے انہوں نے اس بادشاہ سے کہا کہ کیوں تم جنگل میں ہو اور رفیقوں سے پھر جاؤ اور پاس تم کو لگے اور کہیں پانی اس جنگل میں نہ ملے یہاں تک کہ پاس کے مارے مرنے لگو اور اس وقت کوئی شخص ایک کٹورہ پانی کا تمہارے سامنے لاوے اور یہ کہے کہ آدمی سلطنت دو تو میں یہ کٹورہ پانی کا تم کو دوں تم اس وقت کیا کرو گے بادشاہ نے کہا میں فوراً دے دوں گا۔ پھر کہا کہ اگر خدا نخواستہ تمہارا پیشاب بند ہو جائے اور تمام اطباء اور حکماء علاج سے عاجز ہو جائیں اور کوئی تدبیر نہ ہو اور کوئی شخص یہ کہے کہ اگر نصف سلطنت مجھ کو دے دو تو تمہارے پیشاب ابھی کھل جائے تم دے دو گے تو اس نے کہا کہ بے شک دیدوں گا ان بزرگ نے فرمایا کہ بس دیکھ لو آپ کی سلطنت کا یہ نرخ ہے یعنی ایک پیالہ پانی اور ایک پیالہ موت معلوم ہوا کہ عموماً اقلیم کی سلطنت سے بھی زیادہ قیمتی ہے پھر دیکھو کہ اس بے بہا سرمایہ کو تم نے کہاں خرچ کیا سرائے کی کوٹھڑی میں کوٹھڑی تو اس واسطے تھی کہ سرائے میں ایک دورات اس میں بسر ہو جائے تم نے سارا سرمایہ ہی اس میں خرچ کر ڈالا اب جب گھر پہنچو گے تو خالی ہاتھ جاؤ گے اس لئے کہ سرمایہ تو کوٹھڑی ہی میں اڑا دیا جس وقت قیامت کے دن بازار لگے گا وہاں حسرت ہوگی۔

کہ بازار چند آنکھ آگندہ تر تمہید ست رادل پر گاندہ تر
(بازار جس قدر مال و متاع سے بھرا ہوگا اسی قدر تنگ دست کا دل پر آگندہ ہوگا۔)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْشَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّاهُ حَيٰوةً

طَيِّبَةً ۗ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اس آیت شریف کا یہ ہے جو شخص عمل نیک کرے مرد یا عورت اور وہ مومن ہو پس بیشک ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا فرما دیں گے اور بیشک ہم ان کو ان کا اجر بدلہ میں دیں گے بسبب ان کے اچھے اعمال کے۔

تفسیری نکات

ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شے ہے

اس آیت شریف میں حق تعالیٰ نے اپنے مطیع بندوں کے لئے اطاعت پر دو بڑی دولت کے عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اور نیز اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے اول ایک مضمون بطور مقدمہ سمجھنا چاہئے اس کے بعد آیت کریمہ کا مضمون بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا دنیا میں جس قدر عقلاء ہیں کہ جن کے افعال کی

غایت ہوتی ہے ان میں ہر ایک شخص ایک شے کا طالب ہے کوئی مال کا طالب کوئی جاہ کا کوئی صحت کا کسی کو درویشی مطلوب ہے کوئی علم کا دیوانہ ہے کسی کو تجارت میں لطف آ رہا ہے کوئی اولاد کی دھن میں ہے کوئی مکانات کی تعمیر کا شوق رکھا ہے کسی کو باغ لگانے کی حرص ہے غرض کوئی ایسا نہیں جو طلب سے خالی ہو بعضے ان میں ہی خدا کے بھی طالب ہیں ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اشیائے متعددہ مختلفہ کے طالب ہیں لیکن اگر غور کیا جائے اور نظر کو عمیق کر کے دیکھا جائے تو فی الواقع ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شے ہے۔

صرف اختلاف اس کے تعیین طرق میں ہے کسی نے سمجھا کہ وہ شے تجارت سے حاصل ہوگی وہ تجارت میں مشغول ہو گیا کسی نے خیال کیا کہ علم سے اس کی تحصیل ہوگی وہ علم کا طالب بن گیا کسی نے اولاد میں اس مطلوب کو گمان کیا وہ اولاد کا شیفتہ ہو گیا آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کا مقصد جدا ہے اور تم کہتے ہو کہ سب کا ایک ہی مقصد ہے اختلاف طرق میں ہے اس لئے اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے ایک شخص کے پاس دس سائل آئے ایک نے روٹی طلب کی دوسرے نے چاول پختہ مانگے تیسرے نے پیسہ مانگا چوتھے نے روپیہ پانچویں نے غلہ چھٹے نے آٹا ساتویں نے کوڑیاں آٹھویں نے پننے بھنے ہوئے نویں نے کچے چاول دسویں نے حلوا پس اس مثال میں بظاہر مطلوب ہر ایک کا جدا ہے لیکن درحقیقت مقصود واحد ہے طرق مختلف ہیں مقصود پیٹ بھرنا ہے کسی نے سمجھا پکانے کا کوئی قصہ کرے اس نے پکی ہوئی روٹی مانگی کسی نے خیال کیا کہ کچی جنس ملے گی تو اپنی مرضی کے موافق پکا کر کھائیں گے کسی نے یوں ہوس کی کہ روپیہ پیسہ ملے گا تو جنس بھی اپنی خواہش کے موافق خرید کر پکائیں گے اس مثال سے آپ کو اختلافات کا جمع کرنا آسان ہو گیا ہوگا اسی طرح ان لوگوں کے مطلوب کو دیکھنا چاہئے کہ ان کا مقصود کیا ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کوشی واحد مقصود ہے اور وہ لذت و راحت ہے طرق کا اختلاف ہے۔ کسی نے سمجھا کہ روپے حاصل ہونے میں مزہ ہے وہ اس کا طالب ہو گیا کسی نے سمجھا کہ جاہ میں مزہ ہے کسی نے اولاد میں کسی نے تجارت میں کسی کی سمجھ میں آیا کہ دنیا کے مزے تو سب فانی ہیں مزہ اصلی تو آخرت میں ہے مگر حال سب کا ایک ہے کہ قلب کو چین ہو چنانچہ کلام اللہ کی ان آیات میں ان دونوں اموروں کا فیصلہ فرما دیا کہ بطور حاصل ارشاد ہے کہ اے بندو تم جو اپنے مقصود یعنی راحت کو مختلف چیزوں میں ڈھونڈتے ہو کوئی مال میں راحت و لذت کا طالب ہے کوئی بیوی بچوں میں اپنے مطلوب کو تلاش کرتا ہے کوئی جاہ میں کوئی مکانات میں مشغول ہے۔

راحت حقیقی

ہم تم کو راحت حقیقی کی تحصیل کا طریقہ بتلاتے ہیں وہ یہ ہے من عمل صالح الخ مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک کام کرتا ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ وہ مومن ہو یعنی عقیدہ اس کا درست ہو ہم اس کو مزہ دار زندگی عطا

فرمادیں گے اور ہم ان کو جزادیں گے بسبب احسن ان اعمال کے جو کیا کرتے تھے اس ترجمہ سے دونوں امر تنقیح طلب جو اوپر مذکور ہوئے معلوم ہو گئے یعنی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود معتبر کیا ہے اور اس کا طریق تحصیل کیا ہے مقصود دو چیزیں ہیں حیات طیبہ اور اجر اور اس کا طریق بھی دو چیزوں کا حاصل کرنا ہے عمل صالح اور عقائد صحیحہ۔

حیات طیبہ کا مصداق

بہر حال اس تقریر سے مقصود یہ ہے کہ ایک عالم اور ہے جس کا نام برزخ ہے کل تین عالم ہوئے عالم دنیا، عالم برزخ، عالم آخرت اس میں اختلاف ہے کہ حیوة طیبہ سے مراد کون سی حیات ہے حیات برزخیہ یا حیات دنیویہ میں کہتا ہوں کہ دونوں مراد ہوں اور لسنجز ینہم کو آخرت کے ساتھ خاص کیا جاوے اس تقدیر پر حاصل آیت کا یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کرے اور عقائد بھی اس کے صحیح ہوں اس کو ہم دنیا میں اور بعد مرنے کے برزخ میں مزہ دار زندگی عطا فرمادیں گے اور آخرت میں بعد قیامت کے ان کے نیک اعمال کی وجہ سے اجر کی جزادیں گے اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حیات طیبہ سے مراد حیات دنیویہ ہو اور برزخ اور آخرت لسنجز ینہم میں داخل ہو کیونکہ برزخ میں جو کچھ ہوگا وہ بھی جزاء ہوگا خلاصہ یہ کہ دو چیزوں کا وعدہ ہے اول حیات طیبہ دوسرے اجر کہ جو کھل ہے حیات طیبہ کا۔

ان میں سے ایک شیء یعنی حیات طیبہ کو تو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں بلکہ مشاہدہ کر سکتے ہیں دلیل تو یہ ہے کہ قاعدہ عقلی ہے کہ تجربے سے جب ایک شخص کا صدق ثابت ہو جائے تو اس کو ہر امر میں صادق مانا جائے گا ہر امر پر دلیل کا مطالبہ اس سے نہ کیا جائے گا جب کہ حق تعالیٰ کے اخبار کا صد ہا ہزار ہا جگہ صدق ہم نے مشاہدہ کر لیا تو یہ خبر بھی بلا تامل صادق ہے مشاہدہ یہ کہ لوگ دو قسم کے ہیں مطیع اور غیر مطیع دیکھ لیجئے کہ ان میں سے راحت اور آرام میں کون ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ غیر مطیعین طالبین دنیا ہر وقت پریشانی میں ہیں کسی وقت ان کو چین نہیں بخلاف مطیعین کے کہ وہ جس حالت میں ہیں راحت میں ہیں شاید ہر شخص کہے کہ میں مطیع ہوں اس لئے کہ نماز پڑھتا ہوں روزہ رکھتا ہوں اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص کہے کہ فلاں بہت خوبصورت ہے کیونکہ اس کے رخسار ایسے ہیں سراپا ہے آنکھیں ایسی ہیں ایک شخص دور سے دیکھنے آوے دیکھا تو میاں تک کئے ہیں تو ان کا سارا احسن و جمال اس ناک نہ ہونے سے کالعدم ہے اور عقلاء اس کو ہرگز حسین نہ سمجھیں گے ایسے ہی ہم لوگوں کا دین ہے کہ دو چار باتیں اسلام کی لے کر سمجھتے ہیں کہ ہم دین دار ہیں تو ایسے دین داروں کی نسبت یہ وعدہ نہیں ہے اگر کوئی پورا دین دار ہو ایمان اور عمل اس کا کامل ہو تو میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اس کو مزہ دار زندگی عطا ہوتی ہے بلکہ کامل الاطاعت کے پاس تک پریشانی نہیں آتی۔

حیات طیبہ سے مراد حیات ناسوتی نہیں

من عمل صالحاً من ذکر فلنحیئنه حیوة طیبة (جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اور وہ

مومن ہو پس ہو اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے)

وہ حیوة ناسوتی مراد نہیں جو فنا سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ حیات ناسوتی ہر شخص کی طیبہ نہیں ہوتی بلکہ بعض کی حیات معیشت خشک (یعنی تنگ زندگی) ہوتی ہے چنانچہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے گھر خیریت ہے تو وہ بہت خفا ہوا اور کہا تم مجھے کوسے ہو خیریت ہوگی تمہارے یہاں کہ نہ کچھ آگے کو نہ پیچھے کو ہمارے یہاں خیریت کیوں ہوتی کہ ماشاء اللہ بیٹوں پوتوں بہو بیٹیوں سے گھر بھرا ہوا ہے آج کسی کے سر میں درد ہے کسی کے پیٹ میں درد ہے کسی کو بخار آتا ہے کسی کو دست آرہے ہیں کسی کے چوٹ لگ گئی ہے تو ہمارے یہاں جب اتنا کنبہ ہے وہاں خیریت کیوں ہونے لگی خیریت تم جیسے کے یہاں ہوگی جس کے اولاد نہ بنیاد سارے گھر منہمک ہوتے ہیں کہ ان کا مذاق بھی بدل جاتا ہے وہ ان تعلقات کو جو حقیقت میں عذاب میں راحت سمجھتے ہیں اور راحت کو کلفت چنانچہ اس شخص نے خیریت کے سوال کو کونا سمجھا اور صاف کہہ دیا کہ ہمارے یہاں اللہ نہ کرے جو خیریت ہو خیریت تمہارے یہاں ہوگی اہل دنیا قیود و علاق میں خود پھنستے جاتے ہیں جس کے ساتھ خدا نے کوئی بھی قید اور تعلق نہ لگایا ہو وہ خود اپنے سر ہزار جھگڑے باندھ لیتا ہے وہی حال ہے ان کا غم نداری بجز (غم نہ رکھے تو بکری خرید) مگر اس وقت تو بوجہ مذاق بدل جانے کے ان کو ان تعلقات و قیوم کی کلفت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا جو حقیقت اب بھی معلوم ہے ایسا بے حس کو نہیں ہو سکتا ہے جس کو کلفت کا کلفت ہوتا بھی معلوم نہ ہو مگر چونکہ زیادت انہماک سے اب ان کی عادت ہو گئی ہے اس لئے تکلیف کا احساس نہیں ہوتا (جیسے کسی شخص کے دو تین سال تک کھلی رہے تو عادت کی وجہ سے اس کو کلفت کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا ابتداء میں تھا اب اسے ہر وقت کھلانے ہی میں مزا آتا ہے مگر حقیقت تو اسے بھی ضرور معلوم ہے۔ ۱۲ جامع)

علاق دنیا کی عبرت انگیز مثال

مگر جب اہل دنیا مرنے لگتے ہیں اس وقت حقائق پوری طرح منکشف ہوتی ہیں اور ان کا عذاب ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ اس وقت تو وہ ان تعلقات سے خوش نظر آتے ہیں اور آزاد لوگوں پر ہنستے ہیں مگر جب پردہ اٹھے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ جن تعلقات سے ہم نے دل لگایا تھا وہ مارا آستین تھے بس وہی قصہ ہوگا۔

کہ باکہ باختہ عشق در شب دیبجور

(کس کے ساتھ محبت میں مشغول ہوا اندھیری رات میں)

کوئی شخص اندھیری رات میں کسی عورت سے مشغول ہو اس وقت تو وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتا رہا کہ میں حسین پری

پیکر کو بغل میں لئے ہوئے ہوں مگر جب صبح ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ ساری رات ایک بڑھیا چڑیل کے ساتھ مشغول رہا تھا اب اس کی حسرت قابل دید ہے کہ وہ اپنے اوپر ہزار نفریں کرتا ہے اور رات کے قصہ کو یاد کر کے اسے خود تے آتی ہے خوب کہا ہے۔

فسوف تری اذا انكشف الغبار الفرس تحت رجلک ام حمار

(غبار ہٹ جانے دو تم کو عنقریب پتہ چل جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر)

ایک شخص آندھی غبار میں گدھے پر سوار ہے اور کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوں دوسرا شخص متنبہ کرتا ہے کہ کم بخت تو گھوڑے پر سوار نہیں بلکہ گدھے پر سوار ہے مگر وہ ایک نہیں سنتا اور ناصح کو بے وقوف بتلاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اچھا بھائی تو یہی سمجھتا رہا ابھی غبار کھلنے پر تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیری ران کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا اسی طرح جو لوگ تعلقات دنیا میں پھنس کر خوش ہیں اور ان کو راحت سمجھتے ہیں ان سے عارفین یہی کہتے ہیں فسوف تری اذا انكشف الغبار (غبار ہٹ جانے دو عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا) حق تعالیٰ اہل دنیا کے ان ہی تعلقات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

عذاب دنیا

فلا تعجبک اموالہم ولا اولادہم انما یرید اللہ ليعذبہم بہا فی الحیوة الدنیا وتزہق انفسہم وہم کفرون یعنی اے مخاطب تجھے ان منافقین کے اموال و اولاد (اولاد نبوی ترقی و عروج ۱۲) اچھے نہ معلوم ہونے چاہئیں کیونکہ حق تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو عذاب دیں (اور ان کی جان کفر کی حالت میں نکل جائے) واقعی اہل دنیا کے لئے تو مال و اولاد عذاب ہی ہے کیونکہ ان کو ان چیزوں سے تعلق اس قدر ہوتا ہے کہ مارے فکر کے رات دن نیند نہیں آتی ہر وقت اسی توڑ جوڑ میں لگے رہتے ہیں کہ آج اتنے روپے میں کل کو اتنے ہو جائیں گے فلاں پر اتنا قرض ہے اس کا اتنا سود آئے گا رات کو سوتے ہیں تو روپیوں کے فکر سے بار بار آنکھ کھل جاتی ہے تو یہ خاک راحت ہے وبال جان ہے بعضوں کو اولاد سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے ان کے لئے کبھی زمین خریدتے ہیں کبھی باغ لگاتے ہیں کبھی جائیداد بڑھاتے ہیں جس میں سینکڑوں مقدمے کرنے پڑتے ہیں وصول باقی کے لئے رات دن نالائشیں ہوتی ہیں گرمی اور برسات میں مصیبت کے ساتھ سفر کرتے ہیں پھر ذرا کسی بچہ کا کام گرم ہو گیا تو بھاگے بھاگے پھرتے ہیں نہ کھانے کے نہ پینے کے نہ نماز کے نہ روزہ کے ہر وقت فکر میں گھلے جاتے ہیں مسلمان کو تو خدا پر بھی نظر ہوتی ہے کافر تو ہر وقت بے چین رہتا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ ہم اموال و اولاد سے ان منافقین کو دنیا میں عذاب دینا چاہتے ہیں تو یہ کیا تھوڑا عذاب ہے اور یہ عذاب دنیا میں ہی ہوتا ہے آخرت کا عذاب الگ ہے۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۳۸﴾

إِنَّمَا سُلْطٰنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَكَّلُونَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهٖ مُشْرِكُونَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ: یقیناً اس کا قانون ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر دل سے بھروسہ رکھتے ہیں پس اس کا قابو تو صرف ان لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر جو اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

اللہ والوں پر شیطان کا قابو نہیں

لیس له سلطان میں نگرہ تحت انہی ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر نظر رکھنے والوں پر اسکا ذرا بھی قابو نہیں تم اس کو منہ لگا کر اس کا قبضہ اپنے اوپر بڑھاتے ہیں۔

لغو باتیں

فرمایا کہ اسی طرح ایک اور قصہ مشہور ہے کہ ایک جاہل فقیر نے اپنے مرید کو یہ تعلیم کیا کہ یا شیطن یا شیطن کا وظیفہ پڑھا کرو اور چالیس دن تک اس کو پڑھو چنانچہ اس نے پڑھا جب چالیس روز پورے ہو گئے تو شیطان اس کے پاس آیا اور کہا کہ مجھ کو کیوں پکارا کرتے ہو اس نے کہا کہ کل بتلاؤں گا اور اپنے پیر سے پوچھا کہ شیطان آیا تھا اب میں اس سے کیا کہوں پیر صاحب نے کہا کہ اول تو اس کو خدا کی قسم دینا اس کے بعد کہنا کہ نزع کے وقت میرے پاس نہ آنا چنانچہ اس مرید نے ایسا ہی کیا شیطان بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کہ خیر اب تو میں نے قسم کھالی ہے اس کے خلاف نہ کروں گا اور نزع کے وقت تمہارے پاس نہ آؤں گا وہ بہت خوش ہوئے کہ اب سب ایمان کا خوف نہیں رہا مولانا نے فرمایا کہ یہ سب لغو باتیں ہیں اس واسطے کہ قرآن مجید میں ہے إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۳۸﴾ إِنَّمَا سُلْطٰنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَكَّلُونَهُ وَالَّذِينَ هُم بِهٖ مُشْرِكُونَ ﴿۳۹﴾ پس اگر کوئی شخص ایمان لائے اور توکل کرے اور شیطان کے ساتھ دوستی نہ کرے اس پر شیطان کا غلبہ ہرگز نہ ہوگا بس یہ ہے شیطان کے عدم تسلط کی تدبیر نہ یہ کہ اس کے نام کا وظیفہ پڑھ کر اس کو بلایا جائے اور پھر اس کو قسم دے کر اس پر بھروسہ کیا جائے جہل سے یہ سب مہملات پیدا ہوتے ہیں۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (النمل آیت ۱۱۲)

اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ امن و اطمینان میں تھے۔

انعامات الہیہ کی ناشکری

ایک مرتبہ بمبئی میں وعظ کا اتفاق ہوا، مجھ کو بڑا تردد ہوا کہ کیا بیان کروں اگر مسائل اختلافیہ بیان کرتا ہوں تو وحشت ہوگی متفق علیہ بیان کروں تو ان کو سب جانتے ہیں یعنی نماز روزہ وغیرہ تو ضرورت کا بیان کونسا کیا جاوے پھر سوچ کر میں نے آیت

وَكُفِرَ بِاللَّهِ مَكَلًا قَرِيَةً كَانَتْ آيَةً تُظَاهِرُونَ

(اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالت عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ امن و اطمینان میں تھے)

پڑھ کر اس کا بیان کیا کہ اللہ نے آپ کو بہت نعمتیں دی ہیں مگر آپ ان کا شکر ادا نہیں کرتے یہ بیان کبھی ان کے بڑوں نے بھی نہ سنا ہوگا اس کو میں نے بہت اچھی طرح ثابت کیا میں نے بیان کرنے میں ایک شرط یہ بھی لگائی تھی کہ عوام الناس کو وعظ میں اجتماع نہ ہو ہاں جو عمائد اور خوش فہم ہوں ان کو بلا یا جاوے اس لئے کہ بڑے درجہ کے لوگ خواہ وہ دوسرے ہی مذہب کے ہوں عالمی حوصلہ ہوتے ہیں اگر ان کے خلاف بھی بیان کیا جاوے وہ ناگواری کا اثر نہیں لیتے اور عوام الناس جاہل اکثر مفسد ہوتے ہیں خصوصاً بمبئی کے عوام الناس تو نہایت ہی مفسد ہیں ایسی جگہوں میں بیان کر کے دل خوش نہیں ہوتا اگر سامعین خالی الذہن ہوں نہ اعتقاد ہونہ عناد ہو تو بھی مضائقہ نہیں مگر وہاں تو کثرت سے معاندین ہیں۔ (الاقاضات المیوہجہ ۱۸۴۷ء)

اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ
 بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ
 وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ
 بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ
 إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ۝
 إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ يُحْسِنُونَ ۝

ترجمہ: آپ ﷺ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیے
 اور اگر بحث آن پڑے تو ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے (کہ اس میں شدت و خشونت نہ
 ہو) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہوا ہے اور وہی راہ پر چلنے والوں
 کو بھی خوب جانتا ہے اور اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے اور اگر صبر
 کرو گے تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا
 خاص خدا ہی کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ مدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگ دل نہ
 ہوں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو پرہیزگار ہوتے ہیں۔

تفسیری نکات

آداب تبلیغ

اس میں پورے آداب تبلیغ کے مذکور ہیں حق تعالیٰ نے اس میں شرائط و آداب تبلیغ کو مفصل طور پر بیان
 فرما دیا ہے چنانچہ اول تو امر ہے اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ سبحان اللہ کیا فصاحت
 ہے ایک ہی آیت میں سب فرقوں کی اصلاح فرماتے ہیں چنانچہ بعض تو وہ لوگ ہیں کہ دعوت کو ضروری نہیں
 سمجھتے اور بعض وہ ہیں کہ ضروری تو سمجھتے ہیں مگر جنگ و جدال کرنے لگتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کی
 اصلاح فرمائی ہے کہ دعوت تو کرنا چاہئے وہ تو ضروری ہے اس میں فرقہ اول کی اصلاح ہو گئی آگے فرماتے ہیں

کہ دعوت تو ہو مگر ایک خاص طریقہ سے آگے وہ طریقہ بتلاتے ہیں کہ طریقہ دعوت کا یہ ہے کہ حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ لوگوں کو بلاؤ، نرمی سے سمجھاتے رہو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کا امر فرمایا ہے ایک حکمت دوسرے موعظتِ حسنہ۔

موعظتِ حسنہ کا مفہوم

اول یہ سمجھو کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے سو حکمت تو کہتے ہیں علم کو اور موعظتِ حسنہ کہتے ہیں ترغیب و ترہیب و ترقیقِ قلب کو یعنی ان کو علمی مضامین سے بلاؤ مضامینِ علمیہ ان کے کانوں میں ڈالتے جاؤ اور ان مضامین کو ترغیب و ترہیب سے مؤثر بناؤ اسی کو فرماتے ہیں کہ حکمت و موعظتِ حسنہ کے ساتھ بلاؤ اور یہ حکمتِ مقابل ہے مناظرہ و جدال کا گو وہ بھی علمی مباحث سے ہوتا ہے مگر وہ حکمت نہیں بلکہ حکمتِ اثبات مدعا کا نام ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک تو ہوتا ہے اثبات مدعا اور ایک جواب ہوتا ہے نقیض مدعا کا یعنی ایک تو ہے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنا دوسرے معترض کے اعتراض کا جواب دینا اس کے خدشات کو دفع کرنا تو حکمت تو اثبات مدعا ہے اور جواب دینا نقیض مدعا کا یہ جدال ہے تو اصل مفید چیز تو دعوت کرنا ہے حکمت کے ساتھ لیکن اس میں اگر کبھی جدال واقع ہو جاوے تو اس کے بھی خاص طریقے ہیں سو آگے ان طریقوں سے خصم کے اعتراض دفع کرنے کی تاکید ہے غرض دعوت الی الاسلام کے لئے حکمت تو لازم ہے بلا حکمت کے دعوت ہوتی ہی نہیں باقی جدال لازم نہیں یہ ضروری نہیں کہ جہاں دعوت ہو وہاں جدال بھی ہو تو مطلب یہ ہے کہ دعوت میں مضامین علمی بیان کرو فوائدِ علمیہ سناتے جاؤ اپنے دعوے کو دلائلِ علمیہ و عقلیہ سے ثابت کرو اس کی خوبی اس کے محاسن بیان کرو لیکن اگر اس میں کوئی دوسرا اعتراض کرے کوئی نقص وارد کرے تو اس وقت ضرورت ہوگی مباحثہ کی تو اس وقت مباحثہ کرو مگر احسن طریقہ سے اسی کو فرماتے ہیں **وَجَاوِزْهُم بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ** یعنی اس طرح جواب دو کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، لعن و طعن نہ ہو، خشونت نہ ہو کسی پر طعن نہ کرو کسی کو ملامت نہ کرو کسی کی ہجو نہ ہو ایسے مباحثہ حسنہ سے مخاطب کو رنج و ملال نہ ہوگا بلکہ وہ اثر پذیر ہوگا یعنی مضامین کے بیان میں کبھی خشونت ہو جاتی ہے کبھی غصہ اور تیزی کے لہجہ سے بیان کیا جاتا ہے اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ ایسے طرق اختیار نہ کرو جس سے مخاطب بھڑک اٹھے اس کے بدن میں آگ لگ جائے سوا یک تقریر تو مقام کی یہ ہوئی۔

دوسری تقریر یہ ہے کہ موعظت بھی ایک مستقل طریق ہے تو اس وقت حاصل مقام کا یہ ہوگا کہ اگر مخاطب میں علمی قابلیت دیکھو اس کے اندر سمجھ کا مادہ ہو تو وہاں حکمت کے ساتھ بلاؤ اس کو مضامینِ علمیہ سناتے جاؤ اور اگر استعداد علمی نہ ہو تو موعظت سے کام لو کیونکہ وعظ کے لئے چنداں ذہین فہیم ہونے کی ضرورت نہیں وعظ کا اکثر معصوم عام فہم ہوتا ہے کیونکہ موعظتِ حسنہ اس کو کہتے ہیں جس سے قلب میں نرمی پیدا ہو رقت طاری ہو تو معنی یہ ہوئے کہ جنت کی ترغیب و دوزخ سے ترغیب کروں نعمائے جنت و آسائش و راحت بہشت کو بیان کرو اس سے رغبت پیدا ہوگی اور دوزخ کے درکات اور نکالیف و عذاب سے ڈراتے رہو اور اس کے بعد بھی اگر کوئی شبہ کرے تو اس

کے لئے حکم ہے وَجَلَدُ لَهْمًا لَبَنِي هِيَ أَحْسَنُ کہ ان سے مجادلہ کرو احسن طریقہ سے جس کی تفسیر اوپر گزر چکی۔ آگے اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ السَّخ بڑھا کر مجموعہ میں ایک بار ایک بات بتلا دی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ طرز تعلیم فرمایا ہے کہ ان کو حکمت اور مواعظت حسنہ کے ساتھ بلاؤ یعنی نرمی سے سمجھاؤ کوئی خشونت نہ ہو درستی نہ ہو ظاہر ہے کہ یہ طرز وہی اختیار کر سکتا ہے جس کے اندر شفقت ہو اگر وہ شفیق نہیں تو اس کو منت سماجت کی کیا پڑی؟ دیکھو جب استاد شفیق ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ پڑھ لے طرح طرح سے اس کو سمجھاتا ہے کبھی پیسہ دیتا ہے کبھی مٹھائی کھلاتا ہے پیار کرتا ہے چکارتا ہے کہ میاں تمہارا ہی فائدہ ہے سبق پڑھو دیکھو اگر پڑھو گے تو درجات ملیں گے تو اس طریق کی تعلیم فرمانا گویا شفقت کا حکم فرمانا ہے مگر اس حکم شفقت میں ایک اشکال بھی تھا وہ یہ کہ شفقت کی وجہ سے جس طرح ابتدائے تعلیم میں نرمی اختیار کرتا ہے ایسے ہی انتہا میں ناکامی سے درخ بھی زیادہ ہوتا ہے چنانچہ اگر کسی بچہ کے ساتھ محنت اور جان کا ہی کی جاوے اور پھر بھی ناکامی ہو تو بزار خ ہوتا ہے کہ ہائے ہماری ساری محنت برباد گئی خاک ہی میں مل گئی پھر رنجیدہ ہو کر کام سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اس لئے اس اشکال کے عمل علاج کے لئے آگے اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ میں اس شفقت کو اعتدال پر لانے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔

شفقت کو اعتدال پر لانے کا طریقہ

اور وہ طریقہ ایک مراقبہ ہے واقعی اخلاق کی میزان سوائے خدا کے کسی نے نہیں بتائی ان کی تعلیم میں افراط تفریط نہیں ہے بالکل اعتدال ہی اعتدال ہے کیونکہ افراط بھی مضر ہے اور تفریط بھی چنانچہ اگر حد سے زیادہ شفقت ہو تو یہ بھی مضر کیونکہ اس سے آخر کو بد دل ہو جاوے گا اور کام بھی چھوڑ بیٹھے گا اور اگر تفریط ہے یہ بھی مضر کیونکہ شفقت کی تعلیم کا اور اثر ہوتا ہے اور بے شفقت کا اور اثر تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اس کی ایک میزان بتا دی تاکہ کسی جانب میں کمی بیشی نہ ہو دونوں پہلو برابر رہیں چنانچہ اول فرماتے ہیں اذْغُرِّاٰی سَبِيْلَ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اس میں تو شفقت کے ساتھ تعلیم کا امر ہے کیونکہ اگر ابتداء میں شفقت نہ ہو تو ایسی تعلیم کم نفع دے گی اور اس کے بعد افراط فی المشفق کی ممانعت ہے اس کے لئے یہ مراقبہ بتلاتے ہیں کہ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَلِبِيْنَ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ لا تحزن علیہم ان لم يؤمنوا یعنی آپ کا فرض منصبی تو دعوت کرنا ہے وہ آپ نے کر دی اب اگر وہ ایمان نہیں لاتے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تو آپ غمگین نہ ہوں کیونکہ ایمان لانا یا نہ لانا یہ تو خدا کے قبضہ قدرت میں ہے آپ کے اختیار میں نہیں پھر آپ غمگین کیوں ہیں؟

اس مضمون کے استحضار سے غلوفی المشفق نہ ہوگا جو کہ مضر ہے اور اس کے مضر ہونے کا ایک راز ہے وہ یہ کہ شفقت سے حزن ہوگا اور حزن کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے قلب ضعیف ہو جاتا ہے اور بد دل ہو کر آدمی کام

چھوڑ دیتا ہے کہ اتنا تو سر مارا اور پھر بھی ناکامی ہوئی چھوڑو اور اس قصہ ہی کو الگ کرؤ اس سے کیا فائدہ؟ تو شدتِ شفقت کی وجہ سے یہ بات ہوگی اور اس سے سلسلہ تبلیغ کا بند ہو جائے گا اس لئے غلو کا بھی علاج کر دیا خلاصہ یہ کہ مسلم کی تبلیغ کا کام شفقت سے ہوتا ہے مگر شفقت سے تبلیغ صرف تکمیل ہوتی ہے یہ خود ہضمہ مقصود نہیں

اصل مقصود تبلیغ ہے

بلکہ اصل مقصود تبلیغ ہے۔ اگر شفقت سے تبلیغ ہی جاتی رہے تو شفقت کی ایسی تہی ایسی شفقت سے کیا فائدہ؟ کیا اس کو لے کر چائیں گے اس کے بعد اس میں ایک اور شبہ رہا وہ یہ کہ ساری دنیا تو مہذب نہیں جو اس طریق کو مان لیں دنیا میں سب قسم کے لوگ ہیں اگر مبلغ سے کوئی لڑنے لگے مار پٹائی ہونے لگے تو کیا کریں؟ اس کے لئے فرماتے ہیں **وَإِنْ حَاقَبْتُمْ فَعَابُوا بِمِثْلِ مَا غَوَّيْتُمْ بِهِ** سبحان اللہ دیکھئے اس میں کیسی بلاغت ہے کہ حضور ﷺ کو مخاطب نہیں بنایا جس میں بتلادیا کہ آپ کو تو تبلیغ میں اس کی نوبت ہی نہ آوے گی کہ آپ سے تبلیغ میں کوئی لڑے جھگڑے یا آپ اس کا بدلہ لیں آپ ﷺ کے ساتھ حق تعالیٰ کی اعانت خاصہ ہے ہاں اگر تابعین اور ان کے خدام ان کے غلاموں کو یہ بات پیش آ جاوے تو ممکن ہے اس لئے تمہیں مخاطب بنا کر کہتے ہیں کہ جتنی تکلیف کسی سے تمہیں ہوئی ہو اتنی ہی اس کو دیجو زیادتی نہ کرنا **وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلظَّالِمِينَ** سبحان اللہ واقعی یہ خدا کا کلام ہے۔ اگر مخلوق کا کلام ہوتا تو وہ صبر کو مقدم کرتا اور معاقبہ کو موخر کرتا مگر خدا تعالیٰ نے صبر کو مقدم نہ کیا اس میں بندہ کی حاجت کی رعایت ہے کیونکہ بشریت کا خاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی غصہ میں بھڑک رہا ہو اس وقت اس کی موافقت کرنے سے غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور مخالفت کی جائے تو وہ اور زیادہ گرم ہو جاتا ہے بالکل آگ ہو جاتا ہے مثلاً کسی کو آپ نے لڑتے دیکھا اور اس سے کہا کہ تو بھی اس کے چار دھول لگا دے یہ کہتے ہی وہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور اگر تم نے یوں کہا کہ کیا نامحسول حرکت ہے کیوں لڑ رہے ہو صبر و تحمل سے رہنا چاہئے تو وہ ایک تو اس پر دانت نہیں رہا تھا اب آپ کی طرف بھی گھورنے لگے گا۔ کہ سبحان اللہ کچھ سمجھے نہ سمجھائے یوں یہ صبر و تحمل کی ہانکنے لگے تو اللہ میاں نے مخاطب کی رعایت کی کہ اگر کوئی تم سے لڑے بھڑے تو تم بھی اس کے چار جو تے لگا دو اب یہ سن کر جب ذرا جی ٹھنڈا ہو گیا تو آگے فرماتے ہیں کہ اگر صبر کرو تو وہ بہت ہی اچھا ہے پھر آگے حضور ﷺ کو خاص طور پر صبر کا خطاب ہے **وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ** کہ آپ تو بالحرور صبر کریں یہ اور صبر ہے جس کا حضور ﷺ سے خطاب ہو رہا ہے اور اس سے پہلے **وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلظَّالِمِينَ** میں اور صبر مراد تھا یعنی آپ ﷺ کو جو رنج ہوتا تھا ان کے برا بھلا کہنے سے و صبر میں تو اس پر صبر کرنا مرد ہے و لسن صبر تم میں لڑائی بھڑائی نہ کرنا اور بدلہ نہ

لینا مراد ہے اور اس واصر کے بڑھانے میں کیا دوسرا نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ مسلمانو سمجھو صبر جس کے لئے تم کو مشورہ دیا گیا ہے ولسن صبر تم میں یہ وہ چیز ہے کہ حضور ﷺ کو بھی باوجودیکہ آپ ﷺ اعلیٰ درجے کے اخلاق پر ہیں اس کا حکم ہوا کہ صبر کیجئے پھر تم کس شمار میں ہو؟ تو اس سے مخاطبین کو صبر اہل ہو جائے گا۔ اس سے آگے ایک اور مرض کا علاج فرماتے ہیں وہ مرض یہ ہے کہ صبر سے دعویٰ پیدا نہ ہو جائے کہ صابر ہیں کہ ہم نے ایسے موقع پر صبر کیا ہم بڑے کامل ہیں اس طرح ازالہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں **وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ** جس میں آپ ﷺ کے خادموں کو سنا ہے کہ میاں کیا دعویٰ کر سکتے ہو تم بے چارے کیا چیز ہو خود رسول کا صبر بھی جب واقع ہو گا وہ بھی خدا ہی کی توفیق سے ہو گا پھر تمہارا ان کے سامنے دعویٰ کرنے کیا منہ ہے؟ تم ہو کیا چیز ان کے کمال کے سامنے تمہارا کمال معدوم ہے ان کے صبر کے مقابلہ میں تمہارا صبر کچھ حقیقت نہیں رکھتا جب ان کا صبر بھی بغیر توفیق مولیٰ نہیں ہو سکتا پھر تم کیا دعویٰ کر سکتے ہو؟

آگے فرماتے ہیں **وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ** اگر ناکامی ہو تو دل میں تنگی نہ ہونا چاہئے آگے اس تنگی کو رفع کرنے کے لئے مراقبہ بتلاتے ہیں اگر یہ مراقبہ پیش نظر رہے تو کبھی تنگی نہ ہوگی پس فرماتے ہیں **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ** یعنی یہ سوچو کہ مقصود تبلیغ سے کیا ہے کیا دوسروں کو خاص مسلمان بنانا مقصود ہے اگر کسی کو یہ مقصود ہوگا تو اگر ایک بھی کافر رہے گا تو رنج ہوگا پس اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تبلیغ سے خاص یہ مقصود نہیں کہ آپ ﷺ کی حسب دلخواہ مراد پوری ہو جایا کرے کہ سب کے سب ولی اور ابدال بن جاویں بلکہ مقصود تبلیغ سے خدا تعالیٰ کا قرب اور معیت حاصل کرنا ہے اگر وہ تم کو حاصل ہو جاوے تو خواہ ساری عمر میں ایک بھی مسلمان نہ ہو ایک جگہ بھی کامیابی نہ ہو کچھ حرج نہیں اور اگر یہ نہیں تو ساری دنیا کی اصلاح سے تمہارا کیا نفع ہوا اس کو فرماتے ہیں **إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ** یعنی اللہ تعالیٰ تو متقین اور محسنین کے ساتھ ہے اگر تقویٰ اور احسان حاصل ہے چنانچہ تبلیغ کی بجا آوری سے یہ حاصل ہو گیا تو معیت خدا نصیب ہوگئی اور یہی کافی ہے اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں اب خواہ کوئی بگڑے یا سنورے تم کو اس کی پرواہ نہیں ہونا چاہئے **فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ** یہ احکام ہیں اسلام کے اور یہ آداب ہیں تبلیغ کے صاحبو افسوس ہے کہ عرصہ سے ہم اتنی بڑی چیزوں کو چھوڑ بیٹھے ہیں کہ نہ اپنے اسلام کی تکمیل کی فکر ہے نہ دوسروں تک تبلیغ اسلام کی فکر ہے لوگ چونکہ اس سے غافل ہیں اس لئے اس وقت اس کے متعلق بیان کیا گیا کیونکہ حلوانہ تنہا بایست خور دپس اب اپنی بھی تکمیل کرو اور تبلیغ بھی کرو اور اس طرح کرو جیسے قرآن میں ہے نو مسلموں اور کافروں کو نرمی سے سمجھاؤ کسی سے لڑو بھڑومت مناظرہ مروجہ مت کرو کہ یہ آداب تبلیغ کے خلاف ہے اور اس سے نفع بھی نہیں ہوتا تجربہ ہو چکا ہے حتیٰ کہ اس کا غیر قوموں نے بھی تجربہ کر لیا ہے وہ بھی اب مناظروں سے کنارہ کش ہونے لگے

بس اسلامی مضامین کان میں ڈالے جاؤ بار بار اسلام کی خوبیاں سناتے رہو یہی طرز قرآن کا ہے چنانچہ جا بجا فرماتے ہیں صرفنا الایات صرفنا فی هذا القرآن واما لهما یعنی بار بار مضامین کو دہراتے ہیں اگر ہم لوگ اس طرز کو اختیار کریں یعنی وقتاً فوقتاً احکام پہنچاے رہیں تو ان شاء اللہ بہت نفع ہو اور اگر نفع نہ بھی ہو ہمارا کیا بگڑا ہم نے تو اپنا فرض اتا رہا جو کام ہمارے ذمہ تھا وہ ادا کر دیا اب نفع ہو یا نہ ہو وہ جانیں اور ان کا کام۔

ترجمہ: آپ ﷺ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائے اور اگر بحث ان پڑے (تو ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے) کہ اس میں شدت و خشونت نہ ہو (آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہو اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ گو یہاں ادع کا خطاب حضور ﷺ کو ہے مگر حکم میں حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے تہمیدین سب اس کے مخاطب ہیں ہاں حضور ﷺ کو خطاب اولاً ہے اور دوسروں کو ثانیاً۔

أذْعُرُّ لِي سَبِيلَ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ یعنی حکمت سے بلائے معلوم ہوا کہ اس میں حکمت کی ضرورت ہے ورنہ مطلق فرماتے بال حکم نہ فرماتے بہر حال اس کے شرائط ضرور ہیں مگر وہ اسی کے لئے ہیں جو کام کرنے کا قصد کرے اور وہ تین چیزیں ہیں دعوت بال حکم دعوت بال موعظة الحسنہ اور مجادلہ

دعوت کی تین قسمیں

یعنی ایک قسم تو دعوت کی یہ ہے کہ حکمت کے ساتھ کی جائے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ موعظة حسہ کے ساتھ دعوت کی جائے اور ایک یہ کہ مجادلہ حس کیا جائے۔ اس کی توجیہ مختلف ہو سکتی ہے جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ عرض کرتا ہوں جب کسی کو سبیل رب کی طرف دعوت ہوگی تو اس میں ایک تو دعویٰ خاص داعی کا مطلب ہوگا اور ایک اس کی نقیض ہوگی جو کہ مذہب مخالف کا ہے پھر گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک اپنے دعویٰ کا اثبات اور دوسرے کے دعویٰ کا ابطال تو حکمت یہ ہے کہ اپنے دعویٰ پر علمی دلائل قائم کئے جاویں اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے مدعی کو باطل کیا جاوے اصلی مقصود تو یہ دونوں ہیں باقی تیسری ایک چیز اور ہے وہ موعظة حسہ

چونکہ اللہ تعالیٰ کو عباد کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے اس لئے موعظة حسہ بھی ایک ایک طریق بتلا دیا اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پری کر دیتا ہے دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے۔ مثلاً ایک تو منادی کا حکم سنانا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے صرف حکم کا پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے اب تم مانو یا نہ مانو اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس

بات کو مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوالوں اس لئے وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے تو دیکھئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسا کوئی شفیق نہیں پھر حضور ﷺ جیسا کوئی خیر خواہ نہیں تو محض شفقت ہی کے مقتضا سے اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور ﷺ کو اور ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو جس کی حقیقت تقابل سے معلوم ہوتی ہے کہ حکمت سے جب علمی دلائل مراد ہیں تو موعظہ حسنہ سے دلائل کے علاوہ کچھ اور مراد ہوگا سو وہ ایسے مضامین مؤثرہ ہیں جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو دل پکھل جاوے اور ان مضامین مرقعہ کا مصداق ترغیب و ترہیب ہے کہ درجات جنت کی ترغیب اور درجات جہنم سے ترہیب کرنا و نحوذک غرض اصل مقصود تو احکام کا سنانا ہے خواہ اصل ہوں یا فروع

باقی ایک درجہ مخاطب کے متاثر کرنے کے لئے ترغیب و ترہیب کا بھی ہے گو وہ بھی ایک حیثیت سے احکام ہی میں سے ہے مثلاً جنت اور دوزخ کا مضمون عقیدہ کے درجہ میں تو احکام ہی میں داخل ہے اور اصول میں ہے مگر دوسری حیثیت سے ترغیب و ترہیب ہے یعنی جہاں احکام سنانا اور جنت و دوزخ کا معتقد بنانا مقصود نہ ہو صرف ترقیق قلب مقصود ہو وہاں ترغیب و ترہیب ہے۔ مثلاً کسی کو کہا کہ اگر نماز پڑھو گے تو ایسی جنت ملے گی جس کی یہ شان ہے یہ حالات ہیں اس کے اندر ایسی ایسی آسائشیں ہیں اور اگر نہیں پڑھو گے تو دوزخ میں جاؤ گے جس کے یہ واقعات ہیں تو یہ مضمون ترغیب و ترہیب کی حیثیت سے محض مرقق ہے قلب کا اس سے مخاطب کے قلب میں صلاحیت احکام قبول کی پیدا ہوگی پھر عمل کرنے کی توفیق ہوگی کیونکہ عمل اول اول تکلف سے ہوتا ہے کیوں کہ طبیعت کے خلاف کام ہے اس واسطے کوئی امر آمادہ کرنے والا اور ابھارنے والا ہونا چاہئے طبیعت کے خلاف دنیا کا کوئی کام بھی بلا طمع یا بغیر خوف کے نہیں ہوتا پھر عادت ہو جاتی ہے تو ترغیب و ترہیب کی چنداں ضرورت نہیں رہتی اس لئے ترغیب کی بھی ضرورت ہوئی اور ترہیب کی بھی شفیق کی تعلیم ایسی ہی ہوتی ہے مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی مضر سے روکتا ہے تو اتنا کہہ دینا کہ یہ چیز مت کھانا، حاکمانہ حق ادا کرنے کے لئے کافی ہے آگے اس کو اختیار ہے چاہے احتراز کرے یا بھاڑ میں پڑے مگر باپ اتنی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ شفقت کی وجہ سے کہتا ہے کہ بیٹا یہ چیز مضر ہے دست آور ہے اسے مت کھانا یہ پیٹ میں درد پیدا کر دے گی اس کے کھانے سے پھسیاں نکل آئیں گی تو اتنا لگنا پلٹنا شفیق ہونے کی حیثیت سے ہے ورنہ اس کو خوف دلانے کی کیا ضرورت پڑی۔ تھی اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لو گے تو تم کو یہ دوں گا۔

خود میرا ایک واقعہ ہے بچپن میں ایک دفعہ بیمار ہوا تو حکیم صاحب نے مسہل تجویز کیا مگر میں پیتا نہ تھا تو

والد صاحب نے کہا اگر دو اپنی لوگے تو تم کو ایک روپیہ دوں گا بس روپے کے لالچ میں پی گیا تو اس واسطے ضرورت ہے ترغیب و ترہیب کی کیونکہ ایسے آدمی بہت کم نکلیں گے جو بال ترغیب و ترہیب کے احتمال امر کر لیں گو بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا ترغیب و ترغیب کے بھی کر لیتے ہیں جیسے ایک صحابی کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا لو لم یخف الله لم یحس' کہ اگر اس کے دل میں خوف خدا بھی نہ ہوتا تب بھی خدا کی نافرمانی نہ کرتا تو بعض کو تو فطری طور پر خدا سے تعلق ہوتا ہے مگر اکثر تو خوف ہی سے کچھ رکتے ہیں پھر وہ درجہ بھی نصیب ہو جاتا ہے لیکن اول ہی سے ایسے کم ہوتے ہیں مثلاً بچہ پہلے پہلے مار دھاڑ سے پڑھتا ہے اور پھر تو اگر سبق کے لئے اپنے پاس سے بھی خرچ کرنا پڑے جب بھی نہ چھوڑے تو اس لئے ترغیب و ترہیب کی ضرورت ہے یہ موعظہ حسہ ہے سبحان اللہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی شفقت ہے کہ حضور ﷺ کو اور امت کو یہ ترکیب بتلائی کہ آپ اس طریقہ سے کام کیجئے کس قدر رحمت ہے کہ دشوار عمل کو کس طرح آسان کر دیا۔

رعایت مخالف

اس کے بعد ارشاد ہے جادلہم یعنی ان سے مجادلہ کیجئے اس میں دو احتمال تھے ایک مجادلہ حسنہ کا ایک سیرہ کا اس لئے احسن کی قید لگادی اور مجادلہ سیرہ سے ممانعت کر دی رہا یہ کہ مجادلہ میں تو احسن کی قید لگائی اور حکمت کے ساتھ حسنہ کی قید کیوں نہیں لگائی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غیر حسنہ کا احتمال ہی نہیں کیوں کہ اپنے دعوے کی دلیل بیان کرنے میں کسی کو ناگواری نہیں ہوتی اور دوسرے کے دعویٰ کو رد کرنے میں اسے کبھی انقباض ہوتا ہے اس لئے وہاں قید نہیں لگائی اور یہاں قید لگائی کہ رد اگر ہو احسن طریقہ سے ہو جس سے کسی کو رنج اور کلفت نہ ہو سبحان اللہ کس قدر شفقت ہے عباد پر کہ مخالف کی اتنی رعایت کہ اس کا رد اگر ہو ایسے طریقہ سے ہو کہ اس پر حقیقت تو منکشف ہو جائے مگر برا بھلا کسی کو نہ کہا جائے۔

اور میں نے جو رد میں یہ قید لگائی کہ حقیقت ظاہر ہو جائے یہ اس لئے ہے کہ بعض دفعہ جو اب ایسا گول مول ہوتا ہے کہ خصم پر حقیقت بھی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ حسن مجادلہ کے خلاف ہے اس لئے چاہئے کہ کہے تو صاف صاف مگر احسن طریقہ سے چنانچہ لاصدع بما تو مر کا یہی مطلب ہے کہ کھول کے صاف صاف بیان کرو ورنہ جہل سے نجات نہیں ہوتی جو شخص گول مول بات کرتا ہے اس سے ہر شخص راضی تو رہتا ہے مگر اس کا اثر برا ہوتا ہے۔ کہ مخاطب جہل مرکب میں جتلا رہتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ بات صاف ہو مگر الفاظ سخت نہ ہوں۔

قُلْ لِيُعَادِيَ يَاقُولُوا اَلَيْسَ مِنِّي اَحْسَنُ كَايِي مَطْلَبُ هِيَ كَه سَخْتِ الْفَاظِ سَه بَحْوِي

اِنَّ رِيكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ صَلَّى عَنْ سَبِيْلِهِ وَهُوَ اَعْلَمُ بِاَلْمُهْتَدِيْنَ ۝ یعنی تبلیغ کر کے نتیجہ کی فکر میں نہ پڑو یہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے یہ بھی ایک درجہ ربط ہے تاہل کو مابعد سے تو گویا اس مقام

میں اللہ تعالیٰ نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے یعنی ایک تو تفریطی تبلیغ سے اس کے مدارک کے لئے فرمایا ادع الی سبیل ربک اور ایک افراطی تبلیغ سے اس کے مدارک کے لئے فرمایا ان ربک هو اعلم غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراط ہو جاتا ہے کبھی تفریط یہ دونوں مضر ہیں اور حضور ﷺ میں شفقت کی کمی کا تو احتمال نہ تھا یہ تو مجموعی انتظام ہم لوگوں کے لئے فرمایا کہ تبلیغ میں افراط کرنا نہ تفریط

طریق تبلیغ

اس کام کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس طرح بیان فرمایا اذْعُرُّاۤی سَبِيۡلَ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالنُّوعِظَةِ الْحَسَنَةِ سبحان اللہ کام بھی بتلا دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا کہ لوگوں کو خوبصورتی اور نرمی و لطافت سے اللہ کی سبیل کی طرف بلاؤ اور راہ راست پر لاؤ یہ ہے وہ کام جو بذریعہ وعظ کے یا مکاتب و مدارس کے ذریعہ سے ہونا چاہئے یعنی مبلغین ان ناواقف مسلمانوں کو اسلام کے محاسن اور احکام جا کر سنائیں اور رفتہ رفتہ کچھ مکاتب و مدارس وہاں پر قائم کر دیئے جائیں ان میں سے جو طریقہ زیادہ مفید معلوم ہو اسے اختیار کرنا چاہئے بس یہ تو ہمارا کام ہے اسے پورا کرنے کے بعد نتیجہ خدا کے سپرد کر دو۔

پس سنئے کہ قرآن مجید میں مطلق کامیابی کی حالت کے متعلق دو ارشاد ہیں قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِۦٓ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوۡا (کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے خوش ہونا چاہئے) اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فضل پر خوش ہونا چاہئے۔

اور ایک جگہ یہ ارشاد ہے لا تفرح ان الله لا يحب الفرحين (بہت مت خوش ہو خدا پسند نہیں کرتا) زیادہ خوش ہونے والوں کو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش نہ ہونا چاہئے پس ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے مگر دراصل اس میں تعارض نہیں بلکہ یہ دو حالتیں جدا جدا ہیں جن کے متعلق تشبیہ کی گئی ہے۔

ایک خوشی اضطراری ہے جس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً تمہاری ایک ہمیانی روپے یا اشرفیوں کی کوئی جس سے آپ بہت پریشان ہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے بہت دق ہو چکے ہیں کہیں پتہ نہیں چلتا کہ دفعہ کسی نے ہاتھ میں لا کر دے دی ایک خوشی تو اس وقت ہے یہ اضطراری اور بے اختیاری خوشی ہوگی۔

ایک صورت ہے کہ ہمیانی گم ہونے پر تم نے نو کروں کو خوب مارا پٹا اب خدا جانے وہ ان کو ملی یا نہیں مگر بے چاروں نے ڈر کے مارے لا کر دے دی ایک خوشی اس پر ہے یہ اختیاری خوشی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے پہلی خوشی جو آپ کو ہوگی وہ اترانے کی نہ ہوگی اور دوسری خوشی اترانے کی اور ناز و تکبر کی ہوگی کہ دیکھا ہم نے کیسی اچھی تدبیر کی ورنہ ہمیانی کیسے ملتی تو ان دونوں میں پہلی خوشی محمود ہے اور دوسری مذموم اسی طرح تبلیغ کی کامیابی پر اضطراری خوشی کا مضائقہ نہیں باقی اپنی تدابیر اور مساعی کو سوچ سوچ کر خوش ہونا کہ ہم نے یوں کیا تو اچھا اثر ہوا یہ

مذموم ہے بہر حال ہم کو کوشش کرنی چاہئے اور نتیجہ خدا کے سپرد کرنا چاہئے اور ناکامی پر مغموم نہ ہونا چاہئے اور کامیابی پر اترانا نہیں چاہئے کام شروع کر دو اس کے سب راستے خود کھل جائیں گے۔ بقول مولانا رومی

گر چہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف داری باید دوید

(اگر چہ عالم میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا یعنی کوشش تو کرنی چاہئے۔)

بس ہمیں تو یہ طریقہ بتلایا گیا ہے اور وہی ہم کو اختیار کرنا چاہئے یعنی

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ
بِمَنْ صَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۝ وَإِنَّ صَبْرَتُمْ
لَهُوَ خَيْرٌ لِلظَّالِمِينَ ۝ وَأَصْبِرُوا مَا صَبَّرَكُمُ اللَّهُ ۝ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُفُ فِي ضَلُوبِ مَا يَمْكُرُونَ ۝
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ ۝

حکم عام

ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ میں عام حکم دے دیا ہے اور یہاں جو بظاہر خطاب حضور کو ہے تو مقصود خاص حضور
ہی کو خطاب کرنا نہیں ہے بلکہ عام ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي ۚ أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۚ كَذَّبُوا بِصِيرَتِي ۚ
اور گو علی بصیرة انا ومن اتبعنی کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ میں بھی بصیرت پر ہوں اور میرے متبعین
بھی اس صورت میں یہ مستقل جملہ ہوگا یعنی علی بصیرة خبر مقدم اور انا مع اپنے معطوف کے متبداء مؤخر اور ادعو کا
معمول نہ ہوگا مگر چونکہ دوسری نصوص میں وعید عدم دعوت کی عام ہے چنانچہ ترمذی ہیں ایک حدیث ہے کہ جو
لوگ امر بالمعروف نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ان کو عتاب عام کرے گا اور آپ نے استشہاد کے لئے یہ آیت پڑھی
وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۝

تو اس کے انضمام سے معلوم ہوا کہ امت کا ہر فرد بھی وجوب دعوت کے حکم میں داخل ہے

تفریط فی التبلیغ کا تدارک

اللہ تعالیٰ اس آیت میں جادلہم کے بعد اس ضرر کا تدارک کیا عجیب فرماتے ہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ صَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝

پڑویہ خدا کے قبضہ میں ہے تمہارے اختیار سے باہر ہے یہ بھی ایک درجہ ربط ہے ماقبل کو مابعد سے اور ممکن ہے

اور کوئی وجہ ربط اس سے بھی عمدہ کسی کی سمجھ میں آ جاوے تو گویا اس مقام میں اللہ تعالیٰ نے دونوں درجوں سے تعرض کیا ہے یعنی ایک تو تفریط فی التبلیغ سے اس کے مدارک کے لئے فرمایا اذاع الی سبیل ربک الایة اور ایک افراط فی التبلیغ سے اس کی ممانعت اس جزو میں مذکور ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ غرض تبلیغ کے اندر کبھی افراط ہو جاتا ہے کبھی تفریط یہ دونوں مضر ہیں اور حضور ﷺ میں شفقت کی کمی کا تو احتمال ہی نہ تھا یہ تو مجموعی انتظام ہم لوگوں کے واسطے فرمایا گیا ہے کہ تبلیغ میں نہ افراط کرنا نہ تفریط چنانچہ اول میں تفریط کا انسداد ہے اور آخر میں افراط کا جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک درجہ تبلیغ کا یہ بھی ہے آخر میں ناکامیابی سے اتنا غم سوار ہوتا ہے کہ یا اس کی نوبت آ جاتی ہے اس کے بعد قفل ہو جاتا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ کو اس سے کیا بحث ثمرہ ہو یا نہ ہو آپ اپنا کام کئے جائے ثمرات کا مرتب کرنا ہمارا کام ہے ہم جانتے ہیں کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت میں ہے۔ ایک اور جگہ لطیف عنوان سے اسکو بیان فرمایا وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ الْمَنَ فِي الْأَرْضِ كَلَّا هُمْ جَمِيعًا آفَاتٌ مَّكْرُوهٌ النَّاسِ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ .

جن کے اندر شفقت ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ مخاطب کے عدم تاثیر سے کس قدر تکلیف ہوتی ہے سو نفس حزن کی ممانعت نہیں وہ تو طبعی اور غیر اختیاری ہے اس میں انسان مجبور ہے بلکہ ممانعت اس کی ہے جو حد ضیق تک پہنچے اس لئے فرماتے ہیں

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ

آپ کو اس سے کیا کوئی مسلمان ہوا یا نہیں ہوا اس کو اللہ جانتا ہے آپ اس کی فکر نہ کیجئے اس کو خدا کے سپرد کر دیجئے اور جہاں اتنی شفقت نہ ہو اور اس لئے تیز لہجہ اور سختی سے تبلیغ کرنے لگیں اس کی بھی ممانعت فرمادی ہے۔ قُلْ لِعِبَادِيَ يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ غرض ایک ہی مقام کی آیتیں افراط تفریط دونوں کی ممانعت کے لئے کافی ہو گئیں امید ہے کہ اب بقدر ضرورت یہاں کافی ہو گیا ہے۔

اسباب حزن کی ممانعت

حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو غم سے منع فرمایا ہے وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي هَيْبَةٍ مِّمَّنْ كَفَرُوا . کہ آپ کفار کو تبلیغ احکام کیجئے اور ان کے اعراض سے مغموم نہ ہو جئے حالانکہ آپ کا حزن شفقت کی وجہ سے تھا اور شفقت سے تبلیغ زیادہ ہوتی ہے تو ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ یہاں حضور ﷺ کو تبلیغ کی زیادت سے روکا گیا ہے لیکن حقیقت میں زیادت سے نہیں روکا گیا بلکہ اس کی تھلیل سے منع کیا گیا ہے کیونکہ غم سے طبیعت پڑمردہ ہو جاتی ہے اور اس سے قفل ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تبلیغ کے وقت خود نفس تبلیغ کو مطلوب

سمجھئے ترتب ثمرات کو مقصود نہ سمجھئے کیونکہ جو شخص ثمرات کو مقصود سمجھ کر عمل کریگا اس کو عدم ترتب ثمرہ سے رنج و غم ہو گا اور حزن و غم کی خاصیت ہے کہ اس سے طبیعت شکستہ پڑ مردہ ہو جاتی ہے پھر کام نہیں ہوتا اب بتلاؤ یہاں زیادت تبلیغ سے کیا گیا ہے یا اس کی تقلیل سے رکا گیا ہے ظاہر ہے کہ جو شخص خود عمل کو مقصود سمجھے گا اور ثمرہ پر نظر نہ کریگا وہ اس شخص سے زیادہ کام کرے گا جو ثمرہ پر نظر کر کے کام کرتا ہے کیونکہ یہ دوسرا شخص جب ثمرہ مرتب ہوتا نہ دیکھے گا عمل میں کوتاہی کر دیا بخلاف پہلے شخص کے کہ وہ ہر حال میں برابر کام کرتا رہے گا کیونکہ اس کا مقصود عمل ہی ہے اور وہ راہ وقت حاصل ہے کیونکہ اپنے اختیار میں ہے تو یہاں بھی حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو امر غیر اختیاری پر نظر کرنے سے منع کیا ہے کہ جو کام آپ کے اختیار میں ہے یعنی تبلیغ آپ اس میں مشغول رہیں اور اسی کو مقصود سمجھیں اور جو آپ کے اختیار میں نہیں یعنی (ترتب ثمرہ) اس پر التفات نہ کریں بلکہ اس کو ہمارے حوالے کیجئے۔

اس تقریر سے یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ حزن و سرور تو غیر اختیاری ہے اور امور غیر اختیاریہ میں امر و نہی وارد نہیں ہوا کرتی پھر یہاں لا تحزن کیوں فرمایا گیا۔

جواب کا حاصل یہ ہے یہاں حقیقت میں حزن پر نہی وارد نہیں بلکہ اسباب حزن سے روکنا مقصود ہے اور اسباب حزن اختیاری ہیں گو حزن اختیاری نہ ہو چنانچہ میں نے بتلا دیا کہ تبلیغ میں حزن کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ثمرہ پر نظر کی جائے اور ثمرہ کو مقصود سمجھ کر عمل کیا جائے اس سے ممانعت مقصود ہے اور یہیں سے سالکین کو سبق لینا چاہئے کہ وہ جو ذکر و شغل اور اطاعت و عبادت کرتے ہیں اس میں خود عمل کو مقصود سمجھا کریں جو اختیار میں ہے ثمرات کو مقصود نہ سمجھیں جو غیر اختیاری ہیں ورنہ جس شخص نے ثمرات کو مقصود سمجھ کر چند روز کے بعد وہ عمل میں کوتاہی کر دے گا جبکہ ثمرات کا ترتب نظر نہ آئے گا اور جو ثمرات پر نظر نہ کرے گا وہ برابر کام میں لگا رہے گا اور روز بروز ترقی کرتا چلا جائے گا۔

سُورَةُ بَنِي إِسْرَائِيلَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنَ الْإِنشَاءَانِ

هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ①

ترجمہ: وہ ذات پاک ہے جو اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو شب کے وقت مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم اُن کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھلاویں بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں۔

آیت معراج کی ایک تحقیق

شب معراج میں ایک سفر تو زمین پر ہوا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک دوسرا سفر وہاں سے آسمانوں کی طرف ہوا مگر قرآن کی آیت اسری بعبدہ لیلًا میں صرف پہلے زمینی سفر کا ذکر ہے آسمانی سفر کا ذکر نہیں وجہ یہ ہے کہ آیت میں لیلًا کی قید لگی ہوئی اور دن اور رات صرف اس زمینی تضاد سے متعلق ہیں آسمانوں میں اس طرح کا دن رات نہیں جو آفتاب کے طلوع و غروب سے متعلق ہو تو لفظ اسراء اور لیل کے مقتضی سے صرف زمینی سفر کے ذکر پر اکتفاء کیا اور سورہ نجم میں آسمانی سفر کا ذکر فرمایا۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى۔

ارضی بلائیں

ایک مہمان رئیس کی طرف جو بعض شبہات کی تحقیق کر رہے تھے مخاطب ہو کر یہ بھی فرمایا کہ حضرت یہ

بلائیں ارضی ہیں سماوی نہیں ہیں یہ خود لوگوں نے اپنے ہاتھوں خریدی ہیں سماوی بلاؤں کا رنگ ہی اور ہوتا ہے یہ وہ بلائیں ہیں جن کے واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ اور رہا یہ شبہ کے اللہ میاں بھی کافروں کے مددگار ہیں جیسا کہ بعض گستاخوں سے جنگ طرابلس میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ بھی ٹیلیٹ کی طرف دار ہیں نعوذ باللہ تو حضرت سنے نافرمانی وہ چیز ہے کہ بھنگی سے شہزاد کے چابک لگوائے جاتے ہیں تو کیا اس صورت میں بادشاہ بھنگی کا طرف دار ہے اور کیا اس سے یہ لازم آ گیا کہ بھنگی مقبول ہے بلکہ بات یوں ہے کہ شہزادہ اپنے مردود ہونے کی وجہ سے مغلوب ہے (چونکہ عصر کی جماعت کھڑی ہو گئی اس لئے ملفوظ بند ہو گیا۔) پھر بعد نماز فرمایا کہ مجھے ایک آیت شریف یاد آئی سورہ بنی اسرائیل میں ہے اور یہ بنی اسرائیل کافر نہیں تھے اہل کتاب تھے انبیاء کے قائل تھے حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں ایک دو پیشین گوئیاں ان کی کتاب میں بیان فرمائیں ہیں وہ کلام اللہ میں منقول ہیں۔ وَقَضِينَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهِمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولَىٰ بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَلِ الدِّيَارِ ۗ وَكَانَ وَعْدًا مَفْعُولًا ۗ مَطْلَب یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بات بتلا دی تھی کہ تم سر زمین میں دوبارہ فساد مچاؤ گے اور بڑا زور چلانے لگو گے پھر جب ان دو باتوں میں سے پہلی مرتبہ کی معیاد آئے گی یعنی تم اول مرتبہ شرارت کرو گے تو ہم تم پر اپنے ایسے بندوں کو مسلط کریں گے جو بڑے خونخوار ہوں گے پھر وہ گھروں میں گھس پڑیں گے اور یہ ایک وعدہ ہے کہ جو ضرور ہو کر رہے گا اب اس دیکھنے کی چند باتیں ہیں ایک تو یہ کہ تفسد فی الارض میں دیکھنا چاہئے کہ ان لوگوں کو جو کہ اہل کتاب ہیں مفسد اور حد سے گزرنے والا فرمایا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جن کو عباد الٰہنا فرمایا ہے یہ کون لوگ ہیں۔ یہ مشرک ہیں بت پرست ہیں ان کو اپنا بندہ فرما رہے ہیں اس حیثیت سے کہ ہماری مملوک ہیں اور ہمارا آلہ عذاب ہیں نہ اس حیثیت سے کہ مقبول ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ تمہارے مردود ہونے کی وجہ سے ان کو تم پر مسلط کر دیا ہے اسی طرح دوسرے وعدہ کو فرماتے ہیں قَوْلُهُ تَعَالَىٰ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُؤَنَّ وَجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أُولَٰئِكَ مَرَّةً وَالْآخِرَةَ ۗ وَقَضِينَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۗ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِنَّا نَعْتَدُ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۗ وَكَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ الْقِصَّةَ الْأُولَىٰ وَلَقَدْ نَعَدْنَا الْبَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ۗ فَزَيَّلْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكُنَّا لَمْ نُفَسِدْ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَقَدْ كُنَّا يَلْذُوقُونَ الْعَذَابَ ۗ وَأَنذَرْنَا قُرُونًا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَهُمْ فِي عَذَابٍ مُّهِينٍ ۗ وَكَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ الْقِصَّةَ الْآخِرَىٰ لِقَوْمٍ كَفَرُوا ۗ فَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَهُمْ فِي عَذَابٍ مُّهِينٍ ۗ وَكَذَلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ الْقِصَّةَ الْآخِرَىٰ لِقَوْمٍ كَفَرُوا ۗ فَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَهُمْ فِي عَذَابٍ مُّهِينٍ ۗ

کی تعظیم کریں خدا پر لازم نہیں کہ کسی کی تعظیم کریں دیکھئے اگر ٹوپی پر نجاست پڑ جاتی ہے تو اسے اتار کر پھینک دیتے ہیں ایک منٹ سر پر نہیں رکھتے اور جوتا اگر نجاست میں بھر جائے تو اسے کوئی نہیں پھینکتا جانتے ہیں کہ یہ تو نجس ہی ہے اگر اور نجاست میں بھر گئی تو کیا ہوا۔ اسی طرح کافر اور مسلم کی مثال ہے کہ مومن مثل ٹوپی کے ہے کہ اگر اس میں ایک دھبہ بھی پڑ جاتا ہے تو ناگوار ہوتا ہے اور کافر مثل پاپوش کے ہے کہ اگر سب بھی بھر جائے تو ناگوار نہیں ہوتا تو کیا اس سے یہ لازم آ گیا کہ جوتا کلاہ سے افضل ہے ان رئیس صاحب نے بعض اہل غلو کے عذر کے طور پر کہا کہ مصیبت کے وقت عقل بھی جاتی رہتی ہے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ سچ ہے مگر کس کی عقل جاتی رہتی ہے جو نافرمان ہے اس کی عقل جاتی رہتی ہے بلکہ اس کی حالت راحت میں بھی ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ راحت کو اپنی ہی عقل کا ثمرہ سمجھتا ہے اور مصیبت کو اوروں کے سر تھوپتا پھرتا ہے۔ اور مطیع مصیبت کے وقت اور بھی زیادہ عاقل اور بیدار ہو جاتا ہے کیونکہ بوجہ طاعت اور تابعداری کے حق تعالیٰ اس میں عرفان کی شان پیدا کر دیتے ہیں اور فوراً رجوع بحق پیدا ہو جاتا ہے اس کو راحت اور مصیبت دونوں مذکور حق ہوتے ہیں (جامع جیسا کہ حضرت عارف معین الدین چشتی نے فرمایا۔)

ازیں مصائب دوراں مثال شاداں باد کہ تیر دوست بہ پہلوئے دوست می آید

اور حضرت بوعلی فرماتے ہیں

كفروا ایمان هو دورا برهم بزن بعد ازیں درباب معنی را بہ فن

یعنی اے خدا کے بندے جب تو طاعت حق ہے تو تجھے راحت اور مصیبت سے بالکل قطع نظر کر لینی چاہئے)

اور حضرت والا نے یہ بھی فرمایا کہ آپ اب اس کا تجربہ کر لیں دو عالموں کے پاس جائیے ایک ان میں متدین اور متقی ہے اور ایک فقط عالم ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ متقی کو عاقل اور فہیم پائیں گے اور غیر متقی کو نہایت خشک اور کورا بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ایک شخص ان پڑھ اور متقی ہو اور دوسرا فقط عالم آپ اس ان پڑھ میں جو فہم دیکھیں گے وہ اس عالم میں ہرگز نہ ہوگی چنانچہ حضرات صحابہ میں اکثر وہ لوگ تھے کہ پڑھنا جانتے تھے نہ لکھنا مگر جب بادشاہوں کے دربار میں دعوت اسلام دینے جاتے تھے اور شاہان دنیا سے خطاب کرتے تھے بڑے بڑے بادشاہ ان کی باتیں سن کر حیران ہو جاتے ہیں حضرت عمرؓ کی خلافت میں جب سفیر اسلام ہرقل کے دربار میں تشریف لے گئے ہیں اور اس نے حضرت عمرؓ کے حالات دریافت کئے ہیں کہ تم اپنے خلیفہ کے حالات سناؤ وہ کیسے ہیں اور کیا کرتے ہیں تو ایک شخص ان پڑھ معمولی لباس میں سے جواب دیتے ہیں کہ ہمارے خلیفہ کا مختصر یہ حال ہے کہ لا ینخدع والا ینخدع دیکھئے ایک ان پڑھ شخص نے دو جملوں میں وہ جواب دیا ہے کہ بادشاہ حیران ہو گیا تو بات کیا تھی طاعت کی برکت سے عرفان حق حاصل تھا حق تعالیٰ ان

کے حامی اور مددگار تھے مسلم ہے من كان الله كان الله له حضرت وہ تعلیم حق تھی اور انہیں طاعات کی بدولت تھی جن کو آج ہم چھوڑ رکھا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۳ صفحہ ۱۵۹ تا ۱۶۱)

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ

كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝

ترجمہ: اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جتنی سعی کرنی چاہئے ویسی ہی سعی بھی کرے گا جبکہ وہ شخص مومن بھی ہو پس ایسے لوگوں کے لئے یہ سعی مقبول ہوگی۔

تفسیری نکات

محض تمنائے آخرت کافی نہیں

بہت لوگ ارادہ آخرت کے بارے میں اسی کو کافی سمجھتے ہیں کہ زبان سے یوں کہہ لیا جائے کہ نیت کرتا ہوں میں طلب آخرت کی اللہ اکبر یعنی بہت لوگ محض تمنائے آخرت کو طلب آخرت سمجھتے ہیں اور اس کے اسباب کو اختیار نہیں کرتے (اور یہ حالت آخرت ہی کے ساتھ ہے دنیا کے ساتھ یہ کسی کا برتاؤ نہیں کہ محض تمنا کو کافی سمجھ لے اسی واسطے مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ (جو شخص محض دنیا ہی کا طالب ہو) کے بعد وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا (اور اس کے لئے کما بینہی کوشش بھی کرے) نہیں بڑھایا گیا کیونکہ وہاں تو ارادہ کے معنی بھی عام طور پر یہ ہیں کہ خوب سعی کی جائے پس اب یہ شبہ نہ رہا کہ ارادہ عاجلہ میں تو سعی کی قید نہیں اور یہاں سعی کی قید ہے۔ تو آخرت کی فضیلت دنیا پر پوری طرح واضح نہ ہوئی اگر یہاں بھی محض ارادہ سے بحث ہوتی تو مقابلہ کامل ہوتا جو اب کا حاصل یہ ہے کہ سَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا دونوں جگہ مراد ہے مگر وہاں اس کے بیان کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہاں ارادہ کے معنی میں لوگوں نے غلطی نہیں کی اور یہاں بیان کی ضرورت تھی کیونکہ یہاں معنی ارادہ میں غلطی کا وقوع ہو رہا ہے (۱۲ ظ) اور سَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا (اس کے لئے اس کی موافق کوشش بھی کرے) فرمایا سَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا (اس کے لئے اپنی ہمت کے موافق کوشش بھی کرے) نہیں فرمایا کہ آخرت کے لئے اپنی ہی کوشش کرے کیونکہ اس میں کم ہمتوں کو موقع مل جاتا ہے کہ ہر شخص ذرا سا کام کر کے کہہ دیتا کہ بس میری ہمت تو اتنی ہی ہے تو ان کم ہمتوں کے بہانے قطع کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ آخرت کے لئے آخرت کے مناسب کوشش کرے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی طاقت سے زیادہ کوشش کرے جیسا کہ ظاہر میں شان آخرت کی عظمت سے مفہوم ہوتا ہے بلکہ مطلب وہی ہے کہ اپنی ہی کوشش کرے اور اپنی

ہمت کے موافق سعی کرے چنانچہ دوسری جگہ اس کی تفسیر **فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ** (پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اپنی ہمت کے موافق) سے کی گئی ہے پس حاصل سعی **لَهَا سَعْيُهَا** سعی کرے اس کی سعی کرنے کے موافق) **وَسَعَى لَهَا سَعْيَهُ** (اور سعی کرے اپنی کوشش کے موافق) کا ایک ہی ہے لیکن سعی لَهَا سَعْيُهَا کے بعد سعی لَهَا سَعْيَهُ کا مفہوم جو ذہن میں آئے گا وہ یہ ہوگا کہ اپنی ہی کوشش ختم کر دے اور اسکے بغیر کم ہمتوں کو بہانہ کا موقع مل جاتا ہے خوب سمجھ لو چنانچہ اس حکمت کی وجہ سے حق تعالیٰ نے **فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ** (پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اپنی استطاعت کے موافق) کو اول نازل نہیں فرمایا بلکہ اول **اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ** (پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) کا نزول ہوا جس سے صحابہ گھبرا گئے کہ حق تعالیٰ کی شان کے مناسب تقویٰ کس سے ہو سکتا ہے تب تسلی کے لئے **فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ** نازل ہوا اور یہ اس کے لئے ناسخ نہیں بلکہ مفسر ہے کہ **اتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ** کا مطلب یہ ہے کہ اپنی استطاعت کے موافق تقویٰ اختیار کرو اور سلف کے کلام میں اگر اس کو کہیں ناسخ کہا گیا ہے تو اس سے بھی مراد تفسیر ہی ہے لیکن سلف کے کلام میں بیان تبدیل و بیان تفسیر سب کو نسخ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے بہر حال مقصود تو تقویٰ بقدر استطاعت ہے لیکن اس کو **اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ** (پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے) کے بعد اس کی تفسیر میں بیان فرمانے سے کم ہمتوں کے بہانے قطع ہو گئے اور اول ہی اس کا نزول ہو جاتا تو کم ہمتوں کو بہانہ ڈھونڈنے کا موقع مل جاتا ایسا ہی یہاں سمجھو کہ سعی لَهَا سَعْيُهَا کو **فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ** سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کا حاصل سعی لَهَا سَعْيَهُ کی طرف لوٹتا ہے مگر سعی لَهَا سَعْيَهُ نہ فرمانے میں حکمت وہ ہے جو ابھی بیان ہوئی واللہ اعلم باسرار کلامہ بہر حال ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آخرت کا طالب ہو تو اس کی جزا یہ ہے کہ **فَأُولَئِكَ كَانَتْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ مَكْشُورًا** ان کی سعی کی قدر کی جائے گی بظاہر یہاں کچھ انعام کا ذکر نہیں مگر قرآن شامی کلام ہے اس میں شایان محاورات کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے اور شامی محاورہ میں یہ لفظ بہت بڑا ہے یہ ہزاروں تفصیل سے بڑھا ہوا ہے جب بادشاہ کسی سے یہ کہہ دے کہ ہم نے تمہاری خدمت کی قدر کی ہے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ بہت کچھ ملے گا۔ اور امید سے زائد ملے گا اب سمجھ لو کہ جس کی سعی کی احکم الحکمین قدر دانی فرمائیں اس کو تو کیا کچھ ملے گا۔

علم صرف و نحو کی ضرورت

ایک آیت میں تو طلب دنیا پر بھی ترتب ثمرہ کا وعدہ ہے فرماتے ہیں **مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا** (جو شخص

آخرت کی کھتی کا طالب ہو، ہم اس کو اس کی کھتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا میں دیدیں گے) اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں وعدہ ہے تو منہا کے ساتھ ہے جس میں من بعضیہ ہے تو کل کا وعدہ کہاں ہوا جزو قلیل کا وعدہ ہوا اس پر شاید یہ سوال ہو کہ ایک آیت میں آخرت کے متعلق بھی منہا آیا ہے وَمَنْ يُؤْذِ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّكُورِينَ (اور جو شخص دنیاوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ دیدیتے ہیں اور جو شخص اخروی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو آخرت کا حصہ دیں گے اور ہم بہت جلدی حوض دیں گے حق شناسوں کو) جواب یہ ہے کہ وہاں قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ من ابتدائیہ ہے بعضیہ نہیں اور یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن وحدیث سمجھنے کے لئے نحو صرف کی بھی ضرورت ہے۔

ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں

طلبہ کو ایک اشکال ہو گا وہ یہ کہ قرآن میں تو ارادہ دنیا کی مطلقاً مذمت وارد ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيدِ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلُهَا مَذْمُومًا مَذْمُورًا اور ایک جگہ ہے وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَأَمْأَلَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَشِيبٍ (وامثالها من الايات)

سوان آیات میں ارادہ دنیا پر وعید وارد ہے طلب اور سعی تو ارادہ سے بھی آگے ہے وہ تو بدرجہ اولیٰ مذموم ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ القرآن بفسر بعضہ بعضا پس دیگر نصوص کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مطلق ارادہ پر وعید کا ترتیب نہیں ورنہ پھر أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الزُّبْنَ کے کیا معنی ہوں گے اگر ارادہ دنیا مطلقاً مذموم ہے تو بیع و شرا کی اجازت کیوں ہے اور شریعت نے کھتی پر عشر وغیرہ کیوں واجب کیا اموال میں اور جانوروں میں زکوٰۃ کیوں مقرر کی۔ کیونکہ جب دنیا رکھنا ہی جائز نہ ہوگا تو ان حقوق کے وجوب کی نوبت ہی کہاں آوے گی بلکہ اس تقدیر پر تو صاف یہ کہہ دیا جاتا تجارت بھی ممنوع ہے اور زیادہ مال جمع کرنا اور بہت سے جانور پالنا بھی حرام ہے حالانکہ نصوص میں زراعت و تجارت اور زیادہ مال جمع کرنے کی کہیں ممانعت نہیں ہاں ممانعت کے بجائے ان کے لئے احکام زکوٰۃ وغیرہ مشروع ہیں پس دیگر نصوص کے ملانے سے ان آیات کا مطلب یہ ہے مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ جو شخص صرف دنیا کا ارادہ کرے اس کے لئے یہ وعید ہے یعنی ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں ایک تو دنیائے محض کا ارادہ کرنا کہ اس کے ساتھ آخرت کا ارادہ بالکل نہ ہو یہ مذموم ہے اور موجب وعید دوسرے دنیا کا ارادہ کرنا آخرت کے لئے کہ تجارت و زراعت و ملازمت بطریق حلال اس کے لئے کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے المل حقوق کے حقوق ادا کرے اور اطمینان سے آخرت کے کام بجالائے اس صورت میں اصل ارادہ آخرت ہے اور دنیا کا ارادہ اس کے تابع ہے اس کی مذمت نہیں نہ یہ

موجب وعید ہے بلکہ یہ ارادہ تو ایک درجہ میں فرض ہے جس کو یہ حدیث بیان کرتی ہے طلب الحلال فریضة بعد الفریضة (رواه البیهقی والطبرانی و دہلمی عن ابن مسعود و انس و ابن السخاوی و بعضها یوقد بعضها لا یسما و شواہدھا کثیرة مقاصد و حسنہ ص ۱۳۸ از حضرت مولانا مولوی ظفر احمد صاحب دامت فریضہم) اور اگر ارادہ دنیا مطلقاً مذموم ہوتا تو قرآن میں صحابہ کی طرف اس کو منسوب نہ کیا جاتا حالانکہ غزوہ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو حق تعالیٰ نے صحابہ کو اس کے سبب پر متنبہ فرماتے ہوئے بتلایا کہ یہ شکست اس لئے ہوئی کہ ایک جماعت نے جس کو رسول ﷺ نے درہ کوہ پر متعین فرما کر یہ حکم دیا تھا کہ تم یہاں سے نہ ہٹنا خواہ ہم غالب ہوں یا مغلوب اس حکم کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو غالب اور کفار کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر درہ کوہ پر ٹھہرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور غنیمت کا مال لوٹنے میں مشغول ہو گئے اس کے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں **مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفْنَا عَنْهُمْ غَيْرَهُ لِيَبْلِيَكُمْ** کہ تم سے (یعنی صحابہ میں سے) بعض دنیا کا قصد کرتے تھے اور بعض آخرت کا قصد کرتے تھے اس میں صحابہ کی طرف دنیا کی نسبت کی گئی ہے اور جو شخص صحابہ کے فضائل و مقامات سے واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ارادہ مذمومہ کی نسبت صحابہ کی طرف دشوار ہے صحابہ محض دنیا کا ارادہ کبھی نہیں کر سکتے پھر یہاں کیا مطلب ہے ابن عطاء نے اس کی تفسیر بیان کی ہے یعنی منکم من یورد الدنیا للآخرة ومنکم من یرید الآخرة الصرفة کہ تم میں سے بعضے دنیا کا آخرت کے لئے ارادہ کرتے تھے اور بعضے محض آخرت کا قصد کرتے تھے۔ اس پر یہ سوال ہوگا کہ جب صحابہ کا ارادہ دنیا آخرت کے لئے تھا تو وہ مذموم نہ تھا پھر اس کو شکست کا سبب کیوں بنایا گیا جواب یہ ہے کہ وہ ارادہ تو فی نفسہ مذموم نہ تھا لیکن وہ اجتہادی غلطی سے مفضی ہو گیا تھا مخالفت حکم رسول کی طرف اس لئے عتاب ہوا اب یہ مسئلہ بالکل منسوخ ہو گیا کہ مذمت ارادۃ الدنیا کی ہے ارادۃ الدنیا للآخرة مذموم نہیں۔

اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہئے ویسی سعی بھی کرے گا جبکہ وہ شخص مومن بھی ہو پس ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی آپ کے رب کی عطا میں سے تو ہم ان کی بھی امداد کرتے ہیں اور ان کی بھی اور آپ کے رب کی عطا بند نہیں آپ دیکھ لیجئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فوقیت دی ہے اور البتہ آخرت آخرت کے درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔

ثمرہ ارادہ آخرت

مگر طلب دنیا کے ساتھ آخرت اس طرح نہیں مل سکتی اب بتلایئے کہ طالب دنیا ہونا عقل مندی ہے یا طالب آخرت ہونا حالانکہ آپ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی حقیر ہے کہ اگر آخرت سے محرومی کی صورت میں اس کے ملنے کا پورا بھروسہ بھی نہ ہو کیونکہ ارشاد فرماتے ہیں **مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا**

لَهُ فِيهَا مَا نَشَأُ لِإِمَنِ تَزِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مِمَّا قَدْ خُوِّرَ ۗ وَمَنْ أَرَادَ
 الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ فَاكِهُمُ ۗ فَكَشَرْنَا لَهُ
 ارادہ (وطلب) کر لے ہم اس کو دنیا ہی میں فی الحال جس قدر چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں
 پھر اس کے لئے جہنم مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ برائی اور ذلت کے ساتھ داخل ہوگا اور جو لوگ کہ آخرت کا
 ارادہ کریں اور اس کے لئے سعی کریں جو اس کیلئے ہو کرتی ہے دراصل ایک وہ مومن بھی ہوں تو ان لوگوں کی کوشش
 کی قدر کی جائے گی اب ذرا دونوں مضمونوں میں غور کر لیا جائے کہ طلب دنیا و طلب آخرت دونوں کے ثمرات
 کو کس طرح بیان کیا گیا ہے طالب دنیا کی بابت تو ارشاد ہے **عَمَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَأُ لِإِمَنِ تَزِيدُ** یعنی ہم
 طالبان دنیا میں سے جس کو چاہتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں دے دیتے ہیں معلوم ہوا کہ نہ سب کا کامیاب
 ہونا ضروری کہ جو وہ چاہا کریں وہی مل جایا کرے۔ بلکہ جو حق تعالیٰ چاہیں گے دیدیں گے اور طالبان آخرت کے
 متعلق ارشاد ہے **فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ فَاكِهُمُ** کہ جو آخرت کی طلب کی کوشش عملی اور ایمان کے ساتھ
 کرتے ہیں ان کی کوشش کی قدر کی جائے گی ایمان اور سعی کی قید استرازی نہیں اور یہ دراصل بیان ہے حسن ادا
 الاخرة کا کہ ارادہ آخرت کہتے ہی ہیں ایمان اور عمل صالح میں سعی کرنے کو کیونکہ اس کے بدوں طلب آخرت
 تحقق ہی نہیں ہو سکتی ہے اور یہاں سے رد ہو گیا ان لوگوں کا جو کہ اپنے کو طالب آخرت سمجھتے ہیں مگر عمل صالح نہیں
 کرتے کہ دراصل یہ لوگ طالب آخرت ہی نہیں طلب کے لئے علامت بھی چاہئے طلب آخرت کی علامت یہی
 ہے کہ ایمان اور عمل صالح اختیار کیا جائے اور میں نے یہ مضمون کہ **سَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ** (اس کے
 لئے سعی کریں جو اس کے لئے ہو کرتی ہے دراصل ایک وہ مومن بھی ہوں) قید واقعی ہے اسی لئے بیان کیا تا کہ یہ
 شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت میں جو ثمرہ ارادہ آخرت کے متعلق مذکور ہے وہ صرف ارادہ کا ثمرہ کہاں ہے بلکہ سعی
 اور ایمان اور ارادہ اس سب مجموعہ کا ثمرہ ہے اور دعویٰ تمہارا ارادہ آخرت کے ثمرہ کا ہے تو اس تقریر سے یہ شبہ ازل
 ہو گیا کیونکہ میں نے بتلادیا کہ یہ قید واقعی ہے اور یہ ارادہ کا بیان اور اس کی شرح ہے رہا یہ سوال کہ پھر اس کے
 مقابل ارادہ عاجلہ کی تفسیر کیوں نہ بیان کی گئی اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ آخرت کی اس تفسیر سے مقصود یہ ہے کہ
 تا کہ ارادہ آخرت کا اہل ہونا معلوم ہو جائے کہ اس میں معمولی سعی اور ایمان کی ضرورت ہے تا کہ اس کے بعد
 آخرت کی طلب کے لئے رغبت دل میں پیدا ہو بخلاف ارادہ دنیا کے کہ اس کی ترغیب مقصود نہیں اس لئے اس کی
 تفسیر بیان نہیں فرمائی علاوہ ازیں یہ کہ ارادہ آخرت کی تفسیر کے متعلق تو لوگ غلطی میں مبتلا ہیں کوئی کسی طریقہ کو
 طلب آخرت سمجھتا ہے کوئی کسی طریقہ کو اس لئے اس کی تفسیر کی ضرورت تھی اور ارادہ دنیا کو تو ہر شخص سمجھتا ہے اس
 کے بیان کی حاجت نہ تھی پس ارادہ دنیا و آخرت میں ایک تو فرق یہاں یہ بتلایا کیونکہ طلب دنیا سے یہ کچھ

ضروری نہیں کہ وہ مطلوب حاصل ہی ہو جاوے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کو حاصل ہو جائے اور طلب آخرت کی ہمیشہ قدر ہوتی ہے وہ ضائع نہیں ہو سکتی دوسرا ایک لطیف اشارہ ایک خاص فرق کی طرف اس آیت میں اور بھی ہے جو اسی وقت سمجھ میں آیا ہے اور ابھی تک اس آیت کی تفسیر میں نظر سے نہیں گزرا ممکن ہے کسی نے لکھا بھی ہو وہ یہ کہ اس جگہ دو جملے شرطیہ ہیں اور ہر ایک میں تعلق شرط کا جزاء کے ساتھ مختلف عنوان سے بیان کیا گیا ہے ارادہ دنیا کی تو ارشاد ہے **مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ مَا شَاءَ لِيَمُنَّ وَيُجِدْ** یہ صیغہ استمرار کا ہے ترجمہ یہ ہوا کہ جو کوئی دنیا کو طلب کرتا رہے اور ہمیشہ طلب میں منہمک رہے تب کچھ ملتا ہے اور ارادہ آخرت کے متعلق من ارادہ بدوں لفظ کان کے ارشاد فرمایا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ ثمرہ اخروی حاصل ہونے کے لئے طلب میں مرنا کھپنا نہیں پڑتا بلکہ کچھ ارادہ کرنے سے بھی وہ ثمرہ حاصل ہو جاتا ہے اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ طالب آخرت کا ارادہ اور طلب مستمر نہیں ہوتا کچھ دنوں کے بعد ارادہ و طلب زائل ہو جاتا ہے نہیں حقیقت میں تو وہ بھی مستمر رہتا ہے مگر تھوڑی سی سعی و طلب کے بعد وہ حکم میں خبر مستمر کے ہو جاتا ہے کیونکہ محبت الہی پیدا ہو جانے کے بعد وہ ارادہ اتنا سہل ہو جاتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے کے لئے اہتمام کرنا نہیں پڑتا وہ ارادہ خود بخود پیدا ہوتا رہتا ہے اگرچہ پیدا اختیار سے ہوتا ہے مگر بوجہ اعانتِ غیبی کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود بدوں اختیار کے پیدا ہو رہا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آخرت کی طلب محبوب سرکار ہے اس میں سعی کرنے والے کی اس طرف سے امداد ہوتی ہے جس سے وہ بالکل سہل ہو جاتی ہے حدیث شریف میں ہے **مَنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ حُبْرًا جَنَّتْ إِلَيْهِ ذُرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ إِلَيْهِ بَاعًا وَمَنْ آتَانِي بِمِثْرَةٍ أَتَيْتُهُ هَرَوَانَةً** اور دنیا مردوں بارگاہ الہی ہے اس میں ہمیشہ وقت و تعب ہی رہتا ہے اس کے لئے ہمیشہ اہتمام و انہماک از خود کرنا پڑتا ہے اور یہ طلب ہمیشہ جھکھکف از سر نو پیدا کرنی پڑتی ہے پس **هَيِّئْ** تو دونوں ارادے مستمر ہوتے ہیں مگر بوجہ سہولت و اعانتِ غیبی کے ارادہ آخرت یا مستمر نہیں رہا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا خود بخود اس کے دل میں ان اعمال کا تقاضا پیدا کر دیتا ہے اور ارادہ دنیا **هَيِّئْ** اور حکم دونوں کے اعتبار سے مستمر ہے اسی لئے اس کے ساتھ کان استمرار کے لئے بڑھایا گیا اور ارادہ آخرت کے بیان میں کان نہیں بڑھایا گیا اور شرح اس سہولت و اعانت کی یہ ہے کہ طلب آخرت میں قدر سعی کرنے سے جب نسبت مع اللہ پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے ایک کیف اور حال ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے اسی کو عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

صنماہ قلندر سزدار بمن نمائی کہ دراز و دور و دیدم رہ درسم پارسائی

(طریق زہد خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو طریق عشق میں چلائے)

رہ قلندر سے یہی طریق عشق و نسبت مع اللہ مراد ہے اور رسم پارسائی سے وہ طریق عبادت جو بدوں

نسبت و محبت ہو مراد ہے جس میں اعمال کی یہ حالت ہوتی ہے جو بعد میں مذکور ہے۔

بطواف کعبہ رتم بحرم رہم ندادند تو مردن درجہ کردی کہ درون خانہ آئی

بز میں چو سجدہ کردم ز زنی نداد آمد کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی

(کعبہ کے طواف کو گیا تو حرم نے مجھ کو راستہ نہ دیا اور کہا تو نے حرم سے باہر کیا کیا ہے جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے ریا کا سجدہ کر کے مجھ کو بھی خراب کیا۔) وہ کیف نسبت مع اللہ کا ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد کام نہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کام کرنا کچھ دشوار نہیں رہتا اور اس طریق میں کچھ باطنی مشقت بھی پیش آتی ہے مگر وہ اس سے بدل نہیں ہوتے بلکہ اس میں بھی ان کو بڑا لطف آتا ہے اسی کی بت ارشاد ہے ۔ از محبت تلخا شیریں بود اور ارشاد ہے

تا خوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یا دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو طبیعت ناگوار ہی کیوں نہ ہو میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں۔) اور کہا گیا کہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک حیفت سردوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے) اور کہا

زندہ کنی عطائے تو در بخشی فدائے تو دل شدہ جتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر قربان ہو دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے رضی ہوں) اور اس نسبت مع اللہ سے اور سب کام تو آسان ہو ہی جاتے ہیں جو سب سے بڑی خوفناک چیز ہے جس سے سب لوگ ڈرتے ہیں یعنی موت وہ بھی ان کے لئے ایسی خوشگوار ہو جاتی ہے کہ اس کی یہ لوگ تمنائیں کرتے ہیں عارف شیرازی فرماتے ہیں

خرم آاں روز کزین منزل ویراں مردم راحت جاں طلعم وز پے جاں مردم

نذر کردم کہ گر آید بسرا میں غم روز تا در میکدہ شاداں و غزل خواں مردم

(جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے راحت جان طلب کروں)

دنوی مراد کا حصول مشیت حق پر موقوف ہے

کہ حق تعالیٰ نے دین کے کاموں میں ثمرہ کا وعدہ فرمایا ہے اور اسباب دنیویہ میں اس کا وعدہ نہیں فرمایا چنانچہ دنیا کے متعلق ارشاد ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ یعنی جو کوئی دنیا کا قصد کرے گا ہم اس کو دنیا میں جس قدر ہم چاہیں گے اور جس کے لئے چاہیں گے سروسٹ دے دیں گے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیوی مراد کا حصول مشیت پر موقوف ہے یہ وعدہ نہیں کہ جو تم چاہو وہی مل جائے اور یہ بھی وعدہ نہیں کہ ہر ایک کا مقصود پورا ہو جائے بلکہ بعض کا مقصود حسب مشیت الہی حاصل ہو جاتا ہے اور بعض کا مقصود بالکل حاصل نہیں ہوتا۔

اور اعمال آخرت کے متعلق ارشاد ہے

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ لَشُكْرٍ ۝

اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرے اور مومن بن کر اس کے لئے وہ کوشش کرے جو اس کے مناسب ہے تو ان لوگوں کی کوشش مشکور ہے یعنی حق تعالیٰ اس کی قدر فرمائیں گے۔ اس آیت میں وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا ارادہ کا بیان ہے یعنی ارادہ سے مراد محض تمنا نہیں کیونکہ خالی تمنا کافی نہیں بلکہ ارادہ سے مراد قصد جازم ہے جس کے لئے سعی لازم ہے۔ آگے اس کے جزا مذکور ہے فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ لَشُكْرٍ ۝ کہ ان کی سعی کی قدر کی جائے گی اور ظاہر ہے کہ شاعی محاورہ میں یہ جملہ بہت امید افزا ہے جب کوئی بادشاہ اپنے کسی خادم سے یہ کہہ دے کہ ہم تمہاری خدمات کے قدر دان ہیں تو اس کو انعامات جلیلہ کی پختہ امید ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھ کو میری خدمات سے بدرجہا زائد صلہ ملے گا۔ جب ادنیٰ سے ادنیٰ حاکم کے کلام میں ایسے جملہ سے بہت کچھ امیدیں پختہ ہو جاتی ہیں تو احکم الحاکمین کے کلام میں اس جملہ سے کیا کچھ امیدیں پیدا ہونی چاہئیں اس کا فیصلہ اہل ذوق خود کر سکتے ہیں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا

دنیا کے متعلق نودہ منها فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا قصد کرتا ہے اس کو ہم کچھ دے دیتے ہیں یہ وعدہ نہیں کہ جو وہ چاہے وہی دے دیں اور آیت سابقہ کی قید لمن یشاء یہاں بھی ہے اور آخرت کے متعلق ترقی کا وعدہ ہے اور وعدہ بھی اطلاق کے ساتھ ہے جس میں مشیت وغیرہ کی قید مذکور نہیں نہ من بمعنی لایا گیا ہے جس سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ارادہ آخرت کے بعد تو مراد ضرور حاصل ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عطا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ دنیا کے متعلق تو یہ بھی وعدہ نہیں کہ جو مانگے وہی مل جائے اور یہاں

زیادہ کا بھی وعدہ ہے اور یہ ترقی محض آخرت ہی میں نہیں بلکہ دین اختیار کرنے والوں کو دنیا میں بھی ان کے اعمال سے زیادہ جزا مل جاتی ہے دین داروں کو دنیا میں بھی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ان کو پہلے سے خبر بھی نہیں تھی۔ آخرت کے متعلق تو مسلمانوں کو اس کا عمل عام طور پر ہے سب جانتے ہیں کہ آخرت میں عمل سے زیادہ صلہ ملے گا کیونکہ وہ یہ حدیث سنے ہوئے ہے۔

اعددت لعبادی الصالحین ملا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر
میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ
کسی بشر کے دل پر ان کا خطرہ گزرا لیکن دنیا میں زیادت اور ترقی کا علم بہت لوگوں کو نہیں ہے۔

رموز و نکات

ایک نکتہ یہ ہے کہ طالبین دنیا کے بارے میں پہلے یہ فرمایا گیا ہے **عَمَلْنَا لَهُ فَمَا نَنْشَأُ لِمَنْ تَشْرِيْدُ** کہ طالبان دنیا میں سے ہم جس کو چاہیں اور جس قدر چاہیں عطا کر دیتے ہیں اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے مقابلہ میں طالبین آخرت کے لئے یہ فرمایا جاتا اعطینا ما يشاء کہ ہم طالب آخرت کو جو کچھ وہ چاہے گا وہی دیں گے کیونکہ جب دنیا والوں کے لئے یہ فرمایا گیا کہ ان کو جو ہم چاہیں گے وہ دیں گے تو بظاہر اس کے مقابل طالبین آخرت کے لئے فضیلت پوری اس طرح معلوم ہوگی کہ ان کو ان کی طلب کے موافق سب کچھ دیا جائے۔ مگر بخلاف اس کے اس آیت میں مایشاء نہیں فرمایا گیا بلکہ بجائے اس کے **فَاُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ فَشْكُورًا** فرمایا گیا تو بات یہ ہے کہ اگر اس جگہ حق تعالیٰ اللہ آخرت کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کو جو کچھ وہ چاہیں گے وہی دیا جائے گا تو اس میں درحقیقت کچھ یادتی نہ ہوتی بلکہ وعدہ گھٹ جاتا کیونکہ نعمائے آخرت کی شان یہ ہے۔
ملا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر یعنی نہ ان کو آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی بشر کے قلب پر خیال گزرا۔

تو ہٹلائیے کہ جب وہاں کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو اگر یہ فرمایا جاتا کہ طالبین آخرت کو جو کچھ وہ چاہیں گے دیا جائے گا اس سے زیادتی ہوتی یا کمی؟ بہت کمی ہو جاتی کیونکہ وہاں کی نعمتوں کا ہم کو وہم بھی نہیں ہو سکتا پھر ہماری خواہش کے موافق جو ہم کو ملتا وہ تو بہت ہی کم ہوتا حق تعالیٰ شانہ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ ہمارے واسطے انہوں نے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کا ہم کو خطرہ بھی نہیں ہو سکتا اور وہاں کا ثواب ہماری خواہش پر موقوف نہیں فرمایا بلکہ اپنی رحمت سے خواہش سے بہت زیادہ عطا فرمائیں گے اسی کے بارہ میں مولانا کا ارشاد ہے۔

خود کہ یابد این چشم بازار را کہ بیک گل سے خری گزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد آنچه در و ہمت نیاید آن دہد

اب آپ نے سمجھا کہ مایشاء نہ فرمانا ہی ہمارے لئے رحمت ہے اس وجہ سے حق تعالیٰ شانہ نے اجمالاً فرما دیا **فَاُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ فَشْكُورًا** یعنی ان لوگوں کی کوشش کی اس دربار میں قدر ہوگی اسی سے سمجھ جاؤ کہ جن کی کوشش کی قدر دانی ایسے عظیم الشان قدر دان بادشاہ کے دربار میں ہو ان کو کیا کچھ ملے گا۔ اس کا اندازہ اس سے کر لو کہ بادشاہان دنیا جب کسی کی قدر دانی کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کیسا معاملہ کرتے ہیں وہ یہ نہیں کیا کرتے کہ خدمت کی حیثیت پر انعام و اکرام کریں بلکہ وہ اپنی حیثیت کے موافق انعام و اکرام کیا کرتے ہیں جس کا اس کو وہم بھی نہیں ہوتا پھر جس کی قدر دانی حق تعالیٰ شانہ اپنی عظمت کے موافق فرمائیں گے اندازہ کر لو اسے کیا کچھ ملے گا اس وقت اس کی تفصیل سمجھ میں نہیں آسکتی۔

دوسرا اشارہ **وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا** میں ہے کہ یہ کلام اس سعی کے سہل ہونے پر دال ہے۔ جیسا کہ اردو محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے کہ اس کام کے لئے جو تدبیر ہے وہ کرنی چاہئے اس تدبیر کو بیان نہ کرنا اور اجمالاً کہہ دینا کہ جو تدبیر اس کی ہے وہ کرنی چاہئے اس سے اس تدبیر کا معلوم اور سہل ہونا معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح یہ کلام یہاں پر وارد ہوا ہے کہ ”جو لوگ طالب آخرت ہیں اور اس کے لئے وہ سعی کرتے ہیں جو اس کی سعی ہے ان کی کوشش کی قدر ہوگی“ اس طرز کلام سے اس سعی کا معلوم ہونا اور سہل ہونا سمجھا جاتا ہے مطلب یہ کہ وہ سعی مختصر اور مستہر ہے بیان کی ضرورت نہیں۔

تیسرا اشارہ مشکور میں اس بات کی طرف ہے کہ جو کچھ آخرت میں ملے گا وہ محض قدر دانی ہے عمل کو اس میں دخل نہیں اس سے ناز کرنے والوں کو تنبیہ مقصود ہے کہ اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہئے جو کچھ وہاں ملے گا محض انعام ہوگا ورنہ تم عمل سے اس کے مستحق نہیں ہو سکتے وجہ یہ کہ طاعت ادائے حق خداوندی اور اس کے حقوق غیر متناہی ہیں اور حقوق غیر متناہی کا ادا کرنا موقوف ہے عمل غیر متناہی پر اور ہم بوجہ حادث و متناہی ہونے کے عمل غیر متناہی سے عاجز ہیں تو عقلاً انسان ادائے حق خداوندی سے عاجز ہے تو اب جو کچھ بھی اسے ملے وہ محض قدر دانی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہاں سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا ہوگا جو بعض رحم دل لوگوں کے دلوں میں آیا کرتا ہے کہ کافروں کے لئے ہمیشہ کیلئے خلود فی النار کیوں مقرر ہوا کفر تو اس نے کیا تھوڑی مدت تک یعنی دنیا کی زندگی میں اور سزا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم یہ تو بظاہر عدل کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ کافر نے حق تعالیٰ کے ساتھ جب شرک و کفر کیا تو اس نے حق تعالیٰ شانہ کے حقوق غیر متناہیہ کو ضائع کیا اور حقوق غیر متناہیہ ادا نہیں ہوتے اور کفر سے حقوق غیر متناہیہ ضائع ہو جاتے ہیں پس عمل متناہی کے بدلے جزا غیر متناہی جو مومنین کو عطا ہوگی یہ البتہ عقل سے آگے ہے عقل یوں کہتی ہے کہ جب عمل متناہی ہے تو جزا بھی متناہی ہونی چاہئے۔ لوگ آج کل عقل عقل گاتے پھرتے ہیں مگر یہ عقل ان کی خیر خواہ نہیں دشمن ہے۔

۔ آزمودم عقل دور اندیش را ۔ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را
یہ لوگ ہمیں بے عقل بتلاتے ہیں مگر ہمیں ایسی عقل کی ضرورت نہیں اس سے ہم بے عقل ہی اچھے مگر خبر
بھی ہے یہ بے عقلی کس کے لئے ہے۔

۔ ما اگر فلاش وگر دیوانہ ایم ۔ مست آج ساقی و آں پیانہ ایم

خدا کا دیوانہ ہزار عاقلوں سے بہتر ہے۔ ۔ اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

پس مشکور فرمانے سے بتلا دیا کہ عقل تو چاہتی ہے کہ تمہارا اجر کم ہوتا مگر یہ ہماری قدر دانی ہے ایک
حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں اپنے عمل سے کوئی نہ جائے گا ہاں
رحمت الہی ہو جائے تو اور بات ہے حضرت عائشہ نے عرض کیا اور اس سوال کی ہمت بھی انہیں کوئی یا رسول اللہ ﷺ
ولانت کیا آپ بھی اپنے عمل سے جنت میں تشریف نہ لے جاویں گے؟ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میرا اس
سوال پر حضور ﷺ پر خوف غالب ہو گیا اور آپ نے سر مبارک پر ہاتھ رکھ کر فرمایا ولا الا ان یتصدقہ
اللہ برحمۃ کہ میں بھی عمل سے جنت میں نہ جاؤں گا مگر یہ کہ خدا کی رحمت میری دست گیری کرے۔

صاحبو! اب کس کی ہمت ہے جو اپنے عمل کو کچھ سمجھے ہماری تو وہ مثال ہے جو کسی بزرگ نے بیان فرمائی ہے

چو آں کرے کہ درنگے نہانست زمین و آسمان دے ہانست

مولانا نے اس کی مثال میں ایک اور حکایت بیان فرمائی ہے ایک بدوی کی جس نے بجز اپنے گاؤں کے
گڑھوں کے کبھی پانی نہ دیکھا تھا اور قحط میں ان کے خشک ہو جانے سے دنیا سے پانی کو ناپید سمجھتا تھا کہ وہ کسی
خلیفہ بغدادی کے پاس زمانہ خشک سالی میں ایک گھڑا شیریں پانی کالے گیا تھا۔ بڑی دور دراز مسافت سے وہ
گھڑا سر پر رکھے ہوئے جب پہنچا تو خلیفہ کے دربار میں اس کو پہنچا دیا گیا خلیفہ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ
اے امیر المومنین! یہ جنت کا پانی ہے خلیفہ نے بہت قدر دانی سے وہ گھڑا لے لیا اور حکم کیا کہ سونے سے پر کر
کے اس گھڑے کو واپس کر دیا جائے اور حکم دیا کہ اس کو نہر دجلہ کی طرف واپس کیا جائے تاکہ اسے معلوم ہو
جائے کہ یہ ہم نے محض اس کی محبت کی قدر کی ہے ورنہ آب شیریں کی ہمارے یہاں کی نہیں۔

اسی طرح قیامت میں جب ہم اپنے اعمال کی جزا دیکھیں گے کہ اس قدر بے شمار نعمت ہے تو معلوم ہوگا
کہ یہ سب محض قدر دانی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ اپنے مومن بندے کا حساب
چھپا کر لیں گے اور فرمائیں گے کہ ہم نے تم پر یہ یہ انعام فرمائے تھے تم نے پھر بھی نافرمانی کی فلاں گناہ کو یاد کرو
تم نے فلاں دن یہ کام کیا تھا۔ اس دن یہ کیا تھا غرض گناہوں کی فہرست شمار فرمائیں گے یہاں تک کہ مومن یہ
سمجھے گا کہ بس میں ہلاک ہوا اور ہر طرف سے اپنے کو جہنم کے قریب دیکھے گا اس وقت حق تعالیٰ شانہ فرمائیں گے

کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی یہاں بھی ہم پردہ پوشی کرتے ہیں پھر اس کے نامہ اعمال میں سے گناہوں کو محو فرمادیں گے اور ان کی جگہ اعمال حسنہ درج فرمادیں گے یہ ہے **كَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ** کا مضمون کچھ ٹھکانا ہے اس رحمت کا کہ مسلمانوں کو پانی رحمت سے دوسروں کے سامنے ذلیل نہ فرمائیں گے بلکہ دوسروں کے سامنے اس کی عزت بڑھائی جائے گی اور یوں ظاہر کیا جائے گا کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

صاحبو! ایسے خدا کو چھوڑ کر کہاں جاتے ہو کیا اس کا حق تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں جو یوں نافرمانی پر کمر بستہ ہوئے ہو ایسے رحیم و کریم خدا کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا کرو اور اس کی محبت میں کوشش کرو بس اب میں وہ ترکیب بتلا کر جس سے حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ پیدا ہو۔

اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ ہے چنانچہ ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ

”یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں دے دیتے ہیں پھر ہم اس کا ٹھکانہ جہنم کو بناتے ہیں“

ارادہ خاص برائے آخرت

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ آگے فرماتے ہیں **وَمَنْ ارَادَ الْآخِرَةَ** پس معلوم ہوا کہ وہ ارادہ دنیا ہے جو مقابل ہے ارادہ آخرت کے یعنی جس میں ارادہ آخرت نہ ہو پس ارادہ دنیا کی وہ صورتیں ہوں گی ایک وہ ارادہ دنیا جس کے ساتھ لم یرد الآخرة ہو پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے ایک اور موقع پر ہے **مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ**

یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ **مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا** ولم یرد حَرْثَ الْآخِرَةِ تقابلی قرینہ ہے اس کا اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور ہو تو اس کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا **مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَّا لَهَا لُذُنَّ نُوْفِ الْيَوْمِ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُخْسِرُونَ** اولئك الذين ليس لهم في الآخرة والانا وحبط ما صنعوا فيها وباطل ما كانوا يعملون گو کہ یہاں لفظوں میں تقابلی نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے **مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزَيَّنَّا لَهَا لُذُنَّ نُوْفِ الْيَوْمِ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُخْسِرُونَ** ہے اور کسب دنیا مذموم نہیں سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھڑوانا چاہتے ہیں میرے بیان سے ان کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معترفین بھی اتنے معتقد نہیں آپ تو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری کہتے ہیں لہذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے مگر ضروری ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے وہ یہ کہ الضروری يتقلد بقدر الضرورۃ کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے سو دنیا ہے ضرورت کی چیز مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہئے بس بقدر ضرورت اس کو حاصل کر لو اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت ہے نہیں اس لئے وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں جو قاعدہ مذکورہ کی بناء پر قابل ترک ہے آیت میں بھی وزینتها کاللفظ جو بڑھایا ہے اس سے بھی اس کا مذموم ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔ بس طلب کے دو درجے ہوئے ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہو جاوے اور ایک طلب زینت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد ہو سواول کی مذمت نہیں ثانی کی مذمت ہے۔ کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے۔ اب جو دنیا اس کے لئے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھے گا تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا یہی قابل مذمت ہے۔

(امیاء المحققین علی حقیقت مال وجہ مطبوعہ ۱۳۵۵ھ ۱۳۵۷ھ)

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا

إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَيْهِمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا

أَفٍّ وَلَا تُنْهَرُهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝۱۰ وَأَخْفِضْ لَهُمَا

جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِي

صَغِيرًا ۝۱۱ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ

فَاتَّهَ كَانَ لِلَّهِ وَابَيْنَ غُفُورًا ۝۱۲

ترجمہ: اور تیرے رب نے حکم کر دیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو اور تم (اپنے) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کیا کرو اگر تیرے ان میں سے ایک یا دونوں کے دونوں بڑھاپے کو پہنچ جاویں تو ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کرنا اور نہ ان کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور یوں دعا کرتے رہنا کہ میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا انہوں نے مجھ کو بچپن میں پالا پرورش کیا ہے تمہارا رب تمہارے مافی الضمیر کو خوب جانتا ہے اگر تم سعادت مند ہو تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

تفسیری نکات

حقوق والدین

اس کے علاوہ حق تعالیٰ نے والدین کا ایسا حق رکھا ہے جس کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو خبر نہیں ہوتی وہ کیا ہے؟ دعا چنانچہ ارشاد ہے **وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْتَنِي صَغِيرًا** دعا بھی ایسی تعلیم فرمائی ہے جس میں اولاد کے زمانہ احتیاج کو یاد دلایا ہے کہ اس طرح دعا کرو کہ اے پروردگار میرے والدین پر رحم کیجئے جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا اور شفقت و رحمت سے (پرورش کیا ہے اس میں بتلادیا کہ والدین کے زمانہ احتیاج میں تم اپنے زمانہ احتیاج کو یاد کرو کہ کبھی تم بھی نہایت کمزور ضعیف تھے نہ اپنے ہاتھ سے کھا سکتے تھے نہ پی سکتے تھے نہ چلنے پھرنے کی طاقت تھی پھر بھی والدین نے اس

وقت کس محبت و شفقت سے تمہارے ناز نخر اٹھائے اور کس شفقت سے پالا کہ آج تم اس قابل ہوئے کہ دوسروں کی خدمت کرو اب تم ان کی ضعفی میں بات بات پر کیوں جھلاتے ہو پھر الفضل لمتقدم تمہارے اندر جو آج خدمت کی صلاحیت آگئی ہے اس میں تو والدین کو دخل ہے اور ان کی خادمیت میں تم کو کوئی دخل نہ تھا مگر با-نہمہ وہ تو تمہاری خدمت سے ایک دن بھی نہ گھبرائے اور تم گھبرائے۔

بڑھاپے کی قید اس لئے لگائی کہ جوانی میں تو تمہاری خدمت کے محتاج نہ ہوں گے بلکہ خود تم ہی ان کے محتاج ہو گے کیونکہ ماں باپ کی جوانی میں اولاد کا بچپن ہوتا ہے ہاں جب اولاد جوان ہوتی ہے تو اس وقت والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں اب اولاد کو ان کی خدمت کرنا چاہئے

شریعت یہ نہیں کہتی کہ طبعی ناگواری بھی نہ ہو بلکہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ اگر بوڑھے ماں باپ کی باتوں سے طبعاً ناگواری ہو تو اس کو ظاہر نہ کرنا چاہئے عقل سے کام لے کر ان کو معذور سمجھنا چاہئے اس طرح سے عقلی ناگواری نہ ہوگی چنانچہ حق تعالیٰ کی کیسی عنایت ہے چونکہ وہ جانتے ہیں کہ انسان میں طبعاً بوڑھے آدمی کی بے ذہنگی بات سے تغیر آئی جاتا ہے اس لئے آگے فرماتے ہیں۔

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنَّكُمْ أَنْتُمْ لَأُولُواْ أَلْبَابٍ فَأَنَّ كُنَّ كَالْإِنسَانِ غَفُورًا

یعنی حق تعالیٰ تمہارے دلوں کے حال کو خوب جانتے ہیں۔ (کہ تم کو بعض دفعہ طبعاً ناگواری ضروری ہوگی اس لئے اس کے متعلق قانون بتلاتے ہیں کہ) اگر تم صالح ہو گے (یعنی اس طبعی اقتضا پر عمل نہ کرو گے) تو حق تعالیٰ معذرت کرنے والوں کو بخش دیں گے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ لئلا وائین میں لتوائین سے ایک فائدہ ہمہ زائدہ ہے وہ یہ کہ توائین میں صرف معذرت پر دلالت ہے اور اوائین میں خاص تعلق پر دلالت ہے یعنی جو حالت محبت و خدمت کی پہلے تھی وہی اختیار کر لی مطلب یہ کہ فوراً ہی معذرت کر لی جائے تو مواخذہ نہ ہوگا۔

نیز رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ میں بڑی رحمت کا اظہار کیا گیا ہے کہ خدائے تعالیٰ تو دلوں کو دیکھتے ہیں اگر تمہارے دل میں اختیاراً و عقلاً ادب و تعظیم کی صفت موجود ہو اور ظاہر میں کسی وقت غلطی سے سختی ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ ہوگا۔

ناظر قلبیم گر خاشع بود گر چہ گفت لفظ نا خاشع بود

خدا تعالیٰ تو دل کو دیکھتے ہیں اگر چہ کسی وقت غلطی سے نامناسب لفظ ادا ہو جاوے

ماہ بروں رائنگریم و قال را مادروں رائنگریم و حال را

ہم ظاہری حالت اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن کو اور حال دیکھتے ہیں

ترجمہ: تمہارا رب تمہارے مافی الضمیر کو خوب جانتا ہے اگر تم سعادت مند ہو تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔

امر طبعی میں بندہ معذور ہے

پارہ سبحان الذی میں حقوق والدین کو ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنَّ كُنُوزَنَا صَلَاحِينَ وَأَنَاكَ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا ۝ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ والدین کی ہر وقت کی تنگ مزاجیوں سے جو گھبراہٹ تمہارے دلوں میں پیدا ہو گئی ہے یہ تو امر طبعی ہے اگر کوئی خشک کلمہ منہ سے نکل جاوے اس میں معذور ہو لیکن خدائے تعالیٰ دل کی نیت کو جانتا ہے اگر دل میں ان کی اطاعت ہے اور غالب تم میں صلاحیت ہے تو ایسی بے اعتنائی سے معذرت کرنے کو بخش دیتا ہے صاحبو! ظاہر نظر میں اس جگہ پر یہ آیت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے لیکن تقریر بالا سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مضمون بالا سے کس قدر چسپاں ہے۔

إِنَّ الْمُبَدِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ

لِرَبِّهِ كَفُورًا ۝

ترجمہ: بے شک بے موقع اڑانے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے۔

تفسیری نکات

مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب

مسلمانو کیا حالت ہے تمہاری اپنے ہاتھوں اس قدر تباہی مول لی ہے کہ دن بدن گرتے جاتے ہو یہ واویلا تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ مسلمان تباہ حال ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس مال کی اتنی کمی نہیں ہے جتنا شور و غل ہے ہاں خرچ زیادہ ہے اس کی کمی کرنی چاہئے اور اس کیلئے معیار شریعت سے اچھا کوئی بھی نہیں ہے شریعت کے موافق چلئے دیکھئے پھر کتنی شکایت کم ہو جاتی ہے غرض کہ مال کو نفیست سمجھو اور اس کو عطیہ الہی خیال کرو جس کے خرچ کا حساب دینا ہوگا بے دھڑک اور بے سوچے سمجھے خرچ مت کرو میری تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مال کو عطیہ الہی نہ سمجھنا یہی سبب ہے اس کے مفاسد کا اسی طرح قرآن کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ وَلَا تُبَدِّرْ بِنُورِهِ إِنَّ الْمُبَدِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا (اور زیادہ فضول

خرچی مت کرو، دینا فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکر ہے (مبذریں کو اخوان الشیاطین فرمایا اور شیطان کی صفت کفور فرمائی تو مبذریں کے لئے بھی یہ صفت کفور ثابت ہو گئی اور کفور کفران سے مشتق ہے جس کے معنی ناشکری کے ہیں اس کا مقابل شکر ہے جب ناشکری سبب ہوئی اسراف و اخساعت مال کی تو شکر سبب ہوگا حفظ مال کا اور ناشکری کی مذمت ہے اور اس سے نہی ہوئی ہے تو شکری کی مذہب ہوئی اور اس پر تحریض ہو گئی دیکھئے آیت میں میرے قول کی تائید موجود ہے کہ قلت شکر سبب ہے اسراف کا اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝

نہ اپنے ہاتھوں کو گردن سے باندھ لو (کچھ خرچ ہی نہ کرو) اور نہ پوری طرح کھول دو پھر تم نشانہ طامت ہو جاؤ گے (یعنی بخل کی صورت میں) اور مفلس کنال ہو جاؤ گے (اسراف کی صورت میں) دوسری جگہ فرماتے ہیں وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا اور (وہ نیک بندے) جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ کرنا اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

انفاق و اقرار میں اعتدال مطلوب ہے

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ نہ انفاق مطلقاً محمود ہے نہ اقرار بلکہ دونوں میں اعتدال مطلوب ہے جس کی تفصیل فقہاء کے کلام میں ملتی ہے۔ فضول خرچی یہ ہے کہ معصیت میں خرچ کیا جائے اسراف میں صرف رعوی مجزوں میں خرچ کرنا ہی داخل نہیں بلکہ تقاخر اور ناموری کے لئے خرچ کرنا بھی معصیت کی فرد ہے اس طرح مباحات میں بلا ضرورت اپنی استطاعت سے زیادہ خرچ کرنا بھی اسراف میں داخل ہے اسی طرح طاعات ضرور یہ میں استطاعت سے زیادہ صرف کرنا جس کا انجام اخیر میں بے صبری اور حرص و بدنہی ہو یہ بھی اسراف ہے کیونکہ حرص و بدنہی اور بے صبری یہ امور معصیت ہیں اور اس کا سبب ہوا استطاعت سے زیادہ صرف کرنا اور مفسی الی المعصیت (گناہ کی طرف پہنچانے والا) بھی معصیت ہوتا ہے لہذا یہ انفاق معصیت ہوا۔

خلاصہ یہ کہ معصیت میں خرچ کرنا تو مطلقاً اسراف ہے اور طاعات ضرور یہ میں بالکل خرچ نہ کیا جائے یا حکم شرعی سے کم ادا کیا جائے اسی طرح مستحبات و مباحات میں اتنی تنگی کی جائے جس سے اپنے کو یا اہل و عیال کو تکلیف ہو یہ بھی ناجائز ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ

كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿۳۱۸﴾

ترجمہ: مت اتباع کر اس شے کی جس کی تجھ کو تحقیق نہیں ہے شک کان اور آنکھ اور قلب ان میں سے ہر ایک سے سوال کیا جائے گا۔

تفسیری نکات

چار چیزوں کی حفاظت کا حکم

اس آیت کے سیاق و سباق میں بعض ضروری نصائح و مواعظ مفیدہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں اور سب کے آخر میں بطور امتنان کے فرمایا ذَلِكُمْ بِمَا أَوْسَى إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ یعنی اے محمد ﷺ یہ سب مذکورہ نصائح ان حکمت کی باتوں سے ہیں کہ تمہارے رب نے تمہاری طرف وحی فرمائی ہے اس امتنان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام نصائح جو یہاں مذکور ہیں نہایت اہتمام کے قابل ہیں مجملہ ان کے یہ آیات ہے۔

اس آیت میں چار چیزوں کی حفاظت کا حکم کیا ہے قلب، آنکھ، کان یہ تین چیزیں تو بالصریح بیان فرمائیں چوتھی چیز بقیہ جوارح یعنی ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ کی حفاظت ہے وہ بالصریح اس آیت میں مذکور نہیں ہیں بلکہ ان چیزوں کی حفاظت کو وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ میں دلالت ذکر فرمایا ہے چنانچہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ کی حقیقت میں بلا تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں تمام جوارح کی حفاظت بھی آگئی ہے اس لئے کہ اس کی حقیقت ہے بلا تحقیق کسی امر کا اتباع کرنا اب اس کی تحقیق کی چند صورتیں ہیں مثلاً کوئی شے گم ہو جائے بلا تحقیق قرآن موہومہ پر کسی کو چور کہہ دیا چور کہنا زبان کا گناہ ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اس گناہ سے روکتا ہے دیکھے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ پر عمل نہ ہونے سے زبان کا گناہ ہو گیا۔

حاصل یہ ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ میں بطریق مذکور زبان کی حفاظت کا حکم بھی داخل ہو گیا ہے اور ہاتھ کی حفاظت اس طور داخل ہوئی کہ بلا تحقیق جرم کسی پر ظلم کرنا حرام ہے۔ اور اس میں بھی مخالفت ہوئی وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ الایہ کی اسی طرح پاؤں کی حفاظت اس طرح داخل ہے کہ بلا تحقیق ضرورت از شرعی کسی ناجائز مجمع میں جانا حرام ہے اسی طرح سب جوارح کی حفاظت اس میں داخل ہوگئی اور سمع و بصر و فؤاد کی حفاظت تو بالصریح ہے اس میں مذکور ہے مثلاً کان کو غیر مشروع اصوات و مضامین سے بچانا آنکھ کو

غیر محارم کی طرف نظر کرنے سے بچانا قلب کو گمان بد وغیرہ سے بچانا اور اس سے کسی کو شبہہ قیاس فقہی کے بطلان کا نہ ہو کہ ظاہر اوہاں بھی اتباع ہے ایسے امر کا جس کی تحقیق یقینی نہیں کیونکہ حکم مجتہد فیہ ظاہر ہے کہ ظن ہوتا ہے خصوصاً جب کہ دوسری آیت میں بھی اتباع ظن کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ ان يتبعون الا الظن وان الظن لا يغني من الحق شيئاً وہ لوگ اتباع کرتے ہیں مگر خیالی باتوں کا اور خیالی چیز ان پر حق سے علیحدہ اور مطمئن نہیں ہو سکتے) جواب شبہہ کا یہ ہے کہ جب دلائل شرعیہ مستقلہ سے یہ مسئلہ تحقیق کو پہنچ گیا کہ قیام سے اجتہاد جائز اور واجب العمل ہے تو اس پر مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ صادق نہ آوے گا بلکہ وہ مالیس لک بہ علم کا مصداق ہوگا کیونکہ علم کے عموم میں وہ دلائل شرعیہ مستقلہ مشتبہ حجۃ قیاس بالیقین داخل ہیں اگر قیاس کے متعلق اس علم کا تحقق نہ ہوتا تو بے شک اس کا اتباع مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ کا اتباع ہوتا اور اب تو وہ اتباع مالک بہ علم کا ہو گیا خوب سمجھ لو اور اتباع ظن کی جو مذمت آئی ہے وہاں ظن کے معنی مصطلح فقہی نہیں ہیں بلکہ ظن اصطلاح قرآن میں عام ہیں باطل یقینی اور مخالف دلیل صحیح کو بھی چنانچہ منکرین کے قول میں ان نظن الا ظناً آیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اس کا احتمال بھی نہ تھا چہ جائے کہ احتمال راجح بلکہ وہ اس کو اپنے زعم میں علم صحیح کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی اس کو ظن کہا گیا پس ثابت ہوا کہ اصطلاح قرآن میں ظن عام ہے امور باطلہ کو بھی پس آیت ذم ظن کے یہ ہیں ان يتبعون الا ما خالف الدليل القطعي وکل ما خالف الدليل القطعي لا يغني من الحق شيئاً بل ہوا باطل قطعاً (وہ نہیں پیروی کرتے ہیں مگر اس چیز کی جو دلیل کے خلاف ہو اور جو قطعی دلیل کے خلاف ہو وہ حق بات سے بے پرواہ نہیں کر سکتا بلکہ باطل ہے۔) پس اس آیت سے بھی شبہ کی گنجائش نہ رہے فقط جامع التماس کرتا ہے کہ بعض عوارض سے میں پورا نہ لکھ سکا جس قدر ضبط ہوا اس کو صاف کر دیا کہ خالی از نفع نہ تھا خصوصاً تحقیق اخیر کی بے حد لطیف و نافع ہے خصوصاً طلبہ کے لئے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اور ارشاد ہے إِلَّا الظنُّ وَإِنْ الظنُّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئاً اس آیت پر بھی بعض اشکالات علمیہ واقع ہوتے ہیں میں ان کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں اور ان کا منشا بھی وہی اتباع اصطلاحات درسیہ ہے حاصل اشکال کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان الظن لا يغني من الحق شيئاً

ظن مسائل شرعیہ میں حجت ہے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظن مفید حق نہیں ہے حالانکہ ظن مسائل شرعیہ میں مفید بلکہ حجت ہے جیسے خبر واحد و قیاس ان معترضین نے ظن کے معنی یہاں وہ مراد لئے جو ملا حسن میں انہوں نے پڑھے تھے یعنی کسی حکم کی جانب راجح پھر استاد پر اشکال کیا کہ یہ ظن تو مفید ہے وہ غریب بھی اصطلاحات درسیہ کا قبیح تھا اس لئے بغلیں جھانکنے لگا حالانکہ یہاں منشاء اشکال ہی سرے سے غلط ہے کیونکہ قرآن کا نزول محاورات میں ہوا ہے اصطلاحات درسیہ میں

نہیں ہو پس قرآن کو محاورات سے سمجھنا چاہئے اور محاورات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظن کے معنی صرف وہ نہیں ہیں جو ملا حسن وغیرہ میں مذکور ہیں اور گو میں المل عربیت کے کلام پر زیادہ نظر نہیں رکھتا مگر قرآن ہی کے چند مقامات کو دیکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ محاورات میں ظن کے معنی عام ہیں محض حکم کی جانب راجح کے ساتھ مختص نہیں چنانچہ ایک مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **وَإِنَّمَا الْكِبْرِيَاءُ إِلَّا عَلَى الْغَشِيِّينَ ۗ وَالَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبَّهُمْ** یہاں ظن سے مراد یقین ہے کیونکہ لقاء رب کا یقین جازم واجب ہے اور ایک جگہ حق تعالیٰ نے قیامت کے متعلق کفار کا مقولہ نقل فرمایا ہے۔ **إِن تَطَّلُنُ إِلَّا أَكْثَاكًا مَّا كُنْتُمْ بِمُسْتَيْقِنِينَ** یہاں بھی ظن سے مراد یعنی اصطلاحی نہیں ہیں کیونکہ کفار کو وقوع معاد کا ظن غالب و راجح بھی نہ تھا وہ تو بالکل منکر و مذبذب تھے چنانچہ خود قرآن ہی میں ہے **بَلْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كَذِبًا مُّكْتَبًا ۖ وَالشَّاعِرُ سَعِيدًا ۖ بَلْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كَذِبًا مُّجْتَبَا ۖ وَالتَّائِبِينَ يُنَادُوا بِهَا كَذِبًا ۖ وَمَا كُنْتُمْ بِمُسْتَيْقِنِينَ** پس یہاں ظن سے مراد جانب مرجوح یعنی وہم ہے کہ کفار یوں کہتے ہیں کہ ہم کو قیامت کا کچھ یوں ہی وہم سا ہوتا ہے بلکہ غور کیا جاوے تو یہاں تصدیق کا کوئی درجہ نہیں یعنی جانب مرجوح بھی مراد نہیں کیونکہ ان کو قیامت کا احتمال بھی نہ تھا بلکہ محض تصور ہی مراد نہیں جس میں کوئی حکم ہی نہیں ان سب موارد کو دیکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ محاورہ میں اسی کے معنی خیال ہیں خواہ وہ خیال صحیح ہو یا باطل قوی ہو یا ضعیف اس کو پیش نظر رکھ کر آیات کو دیکھئے سب حل ہو جائیں گے اور کوئی اشکال نہ رہے گا چنانچہ **إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا** میں بھی ظن سے مراد مجرد خیال بلا دلیل ہے کہ اس سے ثبوت حق میں کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور ظن اصطلاحی جو کہ مفید ہے وہ خیال مع الدلیل ہے کہ اس کا مفید ہونا اس آیت کے معارض نہیں۔

علوم مکاشفات میں خطرہ ہے

فرمایا علوم معاملات (شرعی احکام) نافع ہیں اور علوم مکاشفات (تکوینی میں خطرہ ہے خصوصاً مکاشفات الہیہ بہ نسبت مکاشفات کونیہ زیادہ خطرناک ہیں۔ کیونکہ یہ ظنی ہیں ان کے مقتضاء پر عمل کرنا آیت **لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ** جس کا تجھ کو عمل نہ ہو اس پر مت ٹھہر کے خلاف ہے اسی واسطے علم کلام میں جو مباحث ہیں وہ حقیقتاً درجہ منع میں ہیں اور وہ فلاسفہ کے جوابات ہیں کہ تم جو کہتے ہو وہ غلط ہے کیونکہ اس میں تمہارے قول کے علاوہ اور بھی چنداں احتمال ہیں تو تمہارا کہنا معیا اور قطعی نہ ہو اور اگر مباحث کلامیہ درجہ منع میں نہ ہوں تو ان مباحث کے یقینی ہونے کا دعویٰ کرنا نہایت خطرناک ہے کیونکہ نسبت کا علم موضوع کے علم پر موقوف ہے اور موضوع کا علم چونکہ ہے نہیں اس واسطے نسبت کا علم بھی نہ ہوگا اور جب نسبت کا علم نہیں تو علم کا دعویٰ کرنا **لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ** کے خلاف ہوگا مثلاً اس کلام میں کہ **”کلام اللہ لایعین ولا ینیر“** اس میں علم نسبت موقوف ہے علم موضوع پر اور موضوع اس قول میں **کلام اللہ** ہے ہم موضوع ہی کو نہیں جانتے تو لایعین ولا ینیر کا قطعی ثبوت اسی کے لئے کیسے ہوگا؟ اسی

واسطے سلف نے ایسے مباحث میں گفتگو نہیں کی اور نہ ان کو حاجت ہوئی مشکلمین نے ضرورت کے لئے گفتگو کی ہے وہ بھی حق یہ ہے کہ درجہ منع میں ہونی چاہئے اور ان کو مستعمل و عادی نہ قرار دیا جاوے کیونکہ یہ نہایت خطرناک ہے لیکن مشکلمین متاخرین کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مباحث کلام کو مستعمل و عادی قرار دے کر ان پر دلائل قائم کئے ہیں مگر یہ ہے کہ نہایت خطرناک اور صفات کے بارے میں ابن عربی نے فرمایا ہے کہ صفات کو عین ذات کہنا اقرب ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر صفات میں کوئی کلام کرے تو لا عین ولا غیر سے عین کہنا اقرب ہے ورنہ مسلم ان کے نزدیک بھی یہی ہے کہ اس میں گفتگو نہ کی جائے۔ (الکلام الحسن ج ۲ صفحہ ۱۳۳-۱۳۵)

فلا یسرف فی القتل انہ کان منصوراً (بنی اسرائیل) سو اس قتل کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہئے وہ شخص طرفداری کے قابل ہے۔

عہد نصرت بوجہ مظلوم ہونے کے ہے

فرمایا فلم یسرف فی القتل (سو اس کو قتل کے بارہ میں حد (شرع) سے تجاوز نہ کرنا چاہئے۔ کے بعد انہ کان منصوراً (وہ شخص طرفداری کے قابل ہے) فرمانے میں اشارہ ہے کہ عہد نصرت (مدد کا وعدہ) بوجہ مظلوم ہونے کے ہے اس میں ترغیب ہے کہ تم اسراف سے عہد نصرت کو ضائع مت کرو

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ①

ترجمہ: یعنی ہم نے قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں تاکہ وہ سمجھیں

تفسیری نکات

حق تعالیٰ شانہ کا شفقت کا برتاؤ

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو ضابطہ کا برتاؤ کرنا نہیں ہے بلکہ دل میں اتار دینا منظور ہے۔ اور اس شفقت کے دواثر ہیں کہ اس بناء پر ایک بات کو بار بار دہراتے ہیں دوسرا عمل کرنے کے لئے دستور العمل بھی ارشاد فرماتے ہیں۔

وَقُلْ رَبِّ ادْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مَخْرَجَ صِدْقٍ

وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۳۰﴾

ترجمہ: اور آپ یوں دعا کیجئے کہ اے رب مجھ کو خوبی کے ساتھ پہنچاؤ اور مجھ کو خوبی کے ساتھ لے جاؤ اور مجھ کو اپنے پاس سے ایسا غلبہ دیجو جس کے ساتھ نصرت ہو۔

تفسیری نکات

تبادلہ کرانے کا عمل

ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ملازمت کے لئے فرمایا رَبِّ ادْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مَخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۳۰﴾ مع اول و آخر سات سات بار درود شریف ستر بار بعد نماز عشاء پڑھا کریں اور مدخل صدق پر جہاں کا تبادلہ مطلوب ہو تصور کریں اور مخرج صدق پر جہاں سے جانا مطلب ہو اور سلطان نصیر آپریہ کہ عزت کے ساتھ تبادلہ ہو۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ

مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۳۱﴾

ترجمہ: اور یہ لوگ آپ سے روح کو (امتحاناً) پوچھتے ہیں آپ فرمادیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم یا گیا ہے۔

تفسیری نکات

حقیقت روح

فرمایا کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ میں جہلاء صوفیہ نے عجب گڑبڑ کی ہے جسکی تو ابن تیمیہ وغیرہ صوفیہ پر خفا ہوتے ہیں ایک اصطلاح ہے کہ عالم دو ہیں عالم امر یعنی مجردات اور عالم خلق یعنی مادیات اس اصطلاح پر آیت کی تفسیر کر لی کہ روح عالم امر سے ہے یعنی مجرد ہے تو اس کا مجرد قرآن سے ثابت کیا مگر یہ استدلال محض لغو ہے کیونکہ اصطلاح خود مقرر کی اور پھر قرآن کو اس کا تابع بنایا قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ سے تو مقصود یہ ہے کہ تم روح کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے اتنا سمجھ لو کہ روح اللہ تعالیٰ کے امر سے پیدا ہوئی بس اس سے آگے کسی تفسیر کا دعویٰ محض گھڑت ہے۔

وَلَيْنَ شِئْنَا لَنُدْهِبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَآتِيكَ بِهِ

عَلَيْنَا وَكَيْلًا ۝

ترجمہ: اور اگر چاہیں تو اس وحی کو بالکل سلب کر لیں جو آپ کی طرف بھیجی گئی ہے پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو کارساز نہ پائیں۔

تفسیری نکات

دعویٰ سے بچنے کی ضرورت

آنحضور ﷺ کو ایسا خطاب دلیل ہے قرآن کے کلام اللہ ہونے کی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی ہمت نہیں کہ حضور ﷺ کو ایسا خطاب کر سکے نہ حضور ﷺ مضمون خود بنا سکتے تھے۔ جس سے آپ کے کمالات کے زوال کا امکان ظاہر ہو پھر چونکہ اس سے حضور ﷺ کے کانپ اٹھنے کا موقعہ تھا اس لئے آگے تسلی فرماتے ہیں **إِلَّا رَحْمَةً مِن رَّبِّكَ** یعنی صرف رحمت کارساز کر سکتی ہے پھر چونکہ رحمت مشیت کے تابع ہے اور مشیت ہر مقدور کے ساتھ متعلق ہو سکتی ہے تو یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں مشیت کا تعلق بصورت رحمت ہی ہوگا اس لئے آگے تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں **إِنْ فَضَّلْنَا كَانَ عَلَيْكَ كَيْدًا** بے شک خدا تعالیٰ کا فضل آپ کے حال پر بہت کچھ ہے اب پوری تسلی ہوگئی کہ کو حق تعالیٰ کو سلب وحی پر پوری قدرت ہے مگر بوجہ کمال فضل کے سلب کا وقوع کبھی نہ ہوگا۔ پس وہ ممتنع بالذات نہیں تو ممتنع بالغير ضرور ہے اور فضل و رحمت کے ساتھ سلب پر قدرت ہونا یہی علامت ہے غایت رحمت و فضل کی کہ ایک بات پر قدرت ہے مگر فضل و انعام کی وجہ سے قدرت کو ظاہر نہیں کرتے اور اگر سلب پر قدرت نہ ہوتی تو اضطراب ہوتا اور اضطراب کی صورت میں وحی کا سلب نہ ہوتا دلیل رحمت و فضل نہ ہوتی غرض ایک دفعہ کو حق تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ سے بھی فرمادیا کہ ہم ایسے قادر ہیں کہ آپ جیسے کامل و اکمل کے کمالات بھی سلب کر سکتے ہیں گو کریں گے کبھی نہیں جب حضور ﷺ کے لئے یہ ارشاد ہے پھر ہم تو کیا چیز ہیں۔ جو دعویٰ کر سکیں ہماری نماز کیا اور ہمارا علم کیا اگر حق تعالیٰ چاہیں تو دم بھر میں سب سلب کر لیں۔

حق تعالیٰ حضور ﷺ سے فرماتے ہیں

ترجمہ: اگر ہم چاہیں تو جتنی وحی آپ کی طرف بھیجی ہے سب کو سلب کر لیں پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کسی کو اپنا کارساز و مددگار نہ پائیں گے۔

کلام الہی کی شوکت و صولت

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کلام الہی ہے کیونکہ اتنی شوکت و صولت سوائے کلام الہی کے کسی کلام میں نہیں ہو سکتی کہ ایسی معظّم ہستی کو کس طرح بے ہرک خطاب ہے۔ اب سوچئے کہ حضور ﷺ کے دل پر اس کو سن کر کیا کچھ گزری ہوگی کیونکہ وہاں شرطیات کا وہ اثر نہ تھا جو ہم پر ہے تو قضایا شرطیہ کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ صدق شرطیہ کے لئے وقوع مقدم ضروری نہیں مگر حضور ﷺ پر عظمت حق منکشف تھی آپ جانتے تھے کہ حق تعالیٰ کے چاہنے ہی میں کیا دیر لگ سکتی ہے کچھ بھی نہیں اس لئے آپ تو نہ معلوم یہ سن کر کیا کچھ نہ سہم گئے ہوں گے مگر آگے فوراً تسلی دی گئی کہ ہم کو اس پر قدرت ہے مگر اس کا وقوع نہ ہوگا۔ **إِلَّا رَحْمَةً مِن رَّبِّكَ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَإِيمَانٍ** کیونکہ آپ پر خدا کا فضل بہت بڑا ہے ایک جگہ اسی طرح اپنی عظمت و قدرت ظاہر کرنے کے لئے فرماتے ہیں **فَإِنْ يَشَأْ اللَّهُ يُخْتِمْ عَلَى قَلْبِكَ**۔

اللہ اللہ کہنا سخت کلمہ ہے مگر آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ نعوذ باللہ حضور ﷺ کو خدا بنا دیں میں کہتا ہوں کہ تم حضور ﷺ کی تنقیص کرتے ہو کیونکہ ہم آپ کو عبد اللہ کہتے ہیں اور عبد بھی کیا عبد کمال صاحبو! نہ علوم **فَإِنْ يَشَأْ اللَّهُ يُخْتِمْ عَلَى قَلْبِكَ**

سن کر حضور ﷺ کے دل پر کیا گزری ہوگی اس کو اہل نسبت خوب سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ان پر یہ حالت خوب گزرتی ہے ان کو رات دن ایسے چمکے لگتے رہتے ہیں جن سے ان کی اصلاح و تہذیب مقصود ہوتی ہے پھر جوان پر گزرتی ہے ان کو وہی جانتے ہیں۔

عبادت پر ناز مناسب نہیں

اکثر لوگوں کو جو اپنی عبادت یا کسی اپنی حالت پر ناز ہو جاتا ہے اس کی بابت فرمایا کہ جب خداوند کریم حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں **وَلَيْنَ شِئْنَا لَنذَهِبَنَّهُ بِالنِّفْيِ أَوْ حِينَا لَنَكْفُرَنَّ لَكَ يَا عَلَيْنَا وَكَيْلَانَا** **إِلَّا رَحْمَةً مِن رَّبِّكَ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَإِيمَانٍ** یعنی اگر ہم چاہیں تو یہ سب علوم جو وحی کے ذریعے آپ کو عطا کئے ہیں آپ سے سلب کر لیں تو دوسرا کون شخص ہے کہ اپنی کسی حالت پر ناز کر سکتے بلکہ ہر وقت تغیر و زوال سے ترساں لرزاں رہنا چاہئے۔

فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ ایک آدمی میں دو خوف جمع نہ ہوں گے جو شخص دنیا میں خائف رہے گا اور قیامت میں لا خوف علیہم کا مصداق ہوگا اور جو دنیا میں بے باک رہے گا وہ آخرت میں خوف میں مبتلا ہو گا تو انسان کو چاہئے کہ خائف اور امیدوار رہے۔

رسالة وجيزة ومفيدة في ربط الآيات

سبق الغايات في نسق الآيات

تأليف

حضرت حكيم الأفت محمد بلالت جامع الكمال منجج المسائل فاهم العلوم القرآنية، واقف الأسرار الفرقانية
رئيس المفسرين قدام المراديين صاحب الشريعة والطريقة، بحر المعرفة والحقيقة كاشف الأسرار الخفية منها والجلي المعنى به

مولانا محمد أشرف علي الشهانوي

نور الله مرقده وجعل الجنة مثواه

سورة النساء

يايها الناس اتقوا الخ اعلم ان هذه السورة مشتملة على انواع كثيرة من التكليف و ذلك لانه تعالى امر الناس في اول هذه السورة بالتعطف على الاولاد والنساء والايام والرافة بهم وايصال حقوقهم اليهم و حفظ اموالهم عليهم و بهذا المعنى ختمت السورة و هو قوله تعالى يستفتونك و ذكر في اثناء هذه السورة انواعا اخر من التكليف و هي الامر بالطهارة والصلوة و قتال المشركين و لما كانت هذه التكليف شاقة على النفس لتقلها على الطباع لاجرم افصح السورة بالعلة التي لاجلها يجب حمل هذه التكليف الشاقة و هي تقوى الرب الذي خلقنا والاله الذي او جدنا فلماذا قال يايها الناس اتقوا الخ واتوا اليتيم الخ اعلم انه تعالى لما افصح السورة بذكر ما يدل على انه يجب على العبدان يكون منقادا لتكليف الله تعالى محترزا عن مساخطة شرع بعد ذلك في شرح اقسام التكليف فالنوع الاول ما يتعلق باموال اليتامى و هو هذه الآية و ان ختمت ان لا تقسطوا الخ اعلم ان هذا هو النوع الثاني من الاحكام التي ذكرها في هذه السورة هو حكم الانكحة ولاتوتوا السفهاء الخ واعلم ان هذا هو النوع الثالث من الاحكام المذكورة في هذه السورة في ابي السعود رجوع الى بيان بقية الاحكام المتعلقة باموال اليتامى وتفصيل ما جعل فيما سبق من شرط ابتاءها ووقته و كيفية وابتلوا الخ اعلم انه تعالى لما امر من قبل بلدغ مال اليتيم اليه بقوله و اتوا اليتامى بين في هذه الآية متى يؤتيهم اموالهم للرجال نصيب الخ اعلم ان هذا هو النوع الرابع من الاحكام المذكورة في هذه السورة و هو ما يتعلق بالمواريث والفرائض وليخش الذين الخ في ابي السعود امر للاوصياء بان نحشوا الله تعالى ان الذين ياكلون الخ في ابي السعود استيناف جيء به لتقرير مضمون ما فصل من الاوامر والنواهي يوصيكم الله الخ في ابي السعود شروع في تفصيل احكام المواريث لجملة في قوله تعالى للرجال نصيب الخ تلك حدود الله الخ انه تعالى بعد بيان سهام المواريث ذكر الوعد والوعيد ترغيبا في الطاعة و ترهيبا عن المعصية واللاتي ياتين الخ في ابي السعود شروع في بعض اخر من الاحكام المتعلقة بالنساء اثر بيان احكام المواريث انما التوبة الخ اعلم انه تعالى لما ذكر في الآية الاولى ان المرتكبين للفاحشة اذا تابوا واصلحوا زال الاذى عنهما و اخبر على الاطلاق ايضا انه تواب رحيم ذكر وقت التوبة و شرطها و

ل وجه تعلق اولها ما حرمها قبلها ان كليهما مشترك في الامر بالتقوى ۱۲ منه

رغبهم في تعجيلها لثلاياتهم الموت وهم مصرون فلا تنفعهم التوبة وليست التوبة الخ اعلم
 انه تعالى لما ذكر شرائط التوبة المقبولة اردفها بشرح التوبة التي لا تكون مقبولة يايتها الذين
 امنوا الخ اعلم انه تعالى بعد وصف التوبة عادالى احكام النساء و اعلم ان اهل الجاهلية كانوا
 يؤذون النساء بانواع كثيرة من الايذاء و يظلمونهن بضروب من الظلم فالله تعالى نهاهم
 عنها في هذه الآيات فالنوع الاول قوله تعالى يحل لكم النوع الثانى ولا تعضوهن الخ النوع
 الثالث وعاشروهن الخ والنوع الرابع قوله تعالى و ان اردتم الخ النوع الخامس من الامور
 المتعلقة بالنساء ولا تنكحوا ما نكح الخ النوع السادس قوله تعالى حرمت عليكم امهاتكم
 النوع السابع قوله تعالى و من لم يستطع يريد الله الخ فى ابى السعود استيناف مسوق
 لتقرير ماسبق من الاحكام و بيان كونها جارية على مناهج المهتدين من الانبياء والصالحين
 والله يريد الخ فى ابى السعود جملة مبتدأة مسوقة لبيان كمال منفعة ما اراده الله تعالى و
 كمال مضرة ما يريد الفجرة لالبيان اراد تعالى التوبة عليهم حتى يكون من باب التكرير
 لتقرير النوع الثامن قوله تعالى يايتها الذين امنوا لا تاكلوا الخ لما شرح كيفية التصرف فى
 النفوس بسبب النكاح ذكر بعده كيفية التصرف فى الاموال ولا تقتلوا انفسكم الخ فى
 ابى السعود قد جمع فى التوصية بين حفظ النفس و حفظ المال لما انه شقيقها من حيث انه
 سبب لقوامها و تحصيل كمالها ان تجتنبوا الخ اعلم انه تعالى لما قدم ذكر الوعيد اتبعه
 بتفصيل ما يتعلق به ولا تتموا ما فضل الخ فى ابى السعود قال الفقهاء لما نهاهم الله تعالى
 عن اكل اموال الناس بالباطل و قتل الانفس عقبه بالنهى عما يؤدى اليه من الطمع فى اموالهم
 و تمنيتها و قيل نهاهم اولا عن التعرض لاموالهم بالجوارح ثم عن التعرض لها بالقلب على
 سبيل الحسد تطهيرا اعمالهم الظاهرة والباطنة للرجال نصيب الخ فى ابى السعود لكل
 من الفريقين فى الميراث نصيب معين المقدار مما اصابه بحسب استعداده و لكل جعلنا
 موالى الخ فى ابى السعود جملة مبتدأة مقررة لمضمون ما قبلها الرجال قوامون الخ فى ابى
 السعود كلام مستأنف مسوق لبيان سبب استحقاق الرجال الزيادة فى الميراث تفصيلا اثر
 بيان تفاوت استحقاقهم اجمالا النوع التاسع و اعبدوا الله الخ اعلم انه تعالى لما ارشد كل
 واحد من الزوجين الى المعاملة الحسنة مع الآخر الى ازالة الخصومة و الخشونة ارشد
 فى هذه الآية الى سائر الاخلاق الحسنة و ماذا عليهم الخ فى ابى السعود اى على من ذكر
 من الطوائف قال المسكين اى غير المؤمنين و غير المخلفين فى الانفاق ان الله لا يظلم الخ
 اعلم ان تعلق هذه الآية هو بقوله تعالى ماذا عليهم فكيف اذا الخ وجه النظم هو انه تعالى
 بين ان فى الآخرة لا يجرى على احد ظلم و انه تعالى يجازى المحسن على احسانه و يزيده
 على قدر حقه فبين تعالى فى هذه الآية ان ذلك يجرى بشهادة الرسل الذين جعلهم الله

الحجة على الخلق و يكون هذا و عيد الكفار و وعد المظيعين النوع العاشر يا ايها الذين امنوا لا تقربوا الصلوة الخ قوله تعالى الم ترالى الذين اوتوا نصيبا الخ قال المسكين لعله مرتبط بقوله تعالى و يكتمون ما اتاهم الله من فضله اى من العلم و نعت النبي صلى الله عليه وسلم بقريظة قوله تعالى ثمه و اعتدنا للكافرين لان كتمانهم هذا كفر لا كتمان الاموال فقرر فى هذه الآية ما يتعلق بهذا الكتمان من اخذ حطام الدنيا عليه و تحريف الكتاب و معاداة صاحب النعت يا ايها الذين اوتوا الكتب الخ بعد ان حكى عن اليهود انواع مكرهم و ايداءهم امرهم بالايمان و قرن بهذا الامر الوعيد الشديد على الترك ان الله لا يغفر الخ فى ابى السعود كلام مستأنف مسوق لتقرير ما قبله من الوعيد فان الشرح قد نص على اشراك اهل الكتب قاطبة الم ترالى الذين يزكون الخ اعلم انه تعالى لما هدد اليهود بقوله ان الله لا يغفر قالوا لسنا من المشركين بل نحن من خواطر الله تعالى كما حكى تعالى عنهم انهم قالوا نحن ابناء الله و احباؤه فذكر تعالى فى هذه الآية انه لا عبرة بتزكية الانسان نفسه و انما العبرة بتزكية الله الم ترالى الذين اوتوا الخ اعلم انه تعالى حكى عن اليهود نوعا اخر من المكروه هو انهم كانوا يفضلون عبدة الاصنام على المؤمنين و لا شك انهم كانوا اعلمين بان ذلك باطل فكان اقدامهم على هذا القول بحض العناد و التعصب ام لهم نصيب الخ اعلم انه تعالى وصف اليهود فى الآية المتقدمة بالجهل الشديد و هو اعتقادهم ان عبادة الاوثان افضل من عبادة الله و وصفهم فى هذه الآية بالهخل و الحسد فمنهم من امن الخ و المعنى ان اولئك الانبياء مع ما خصصتهم به من النبوة و الملك جرت عادة انهم فيهم ان بعضهم امن به و بعضهم بقوا على الكفر فاتت يا محمد لا تتعجب مما عليه هؤلاء و ذلك تسلية من الله ان الذين كفروا الخ اعلم انه تعالى بعد ما ذكر الوعيد بالطائفة الخاصة من اهل الكتاب بين ما يعلم الكافرين من الوعيد و الذين امنوا الخ اعلم انه قد جرت عادة الله تعالى فى هذا الكتب الكريم بان الوعد و الوعيد يتلازمان فى الذكر على سبيل الاغلب ان الله يا مكرم الخ لما حكى عن اهل الكتب انهم كتموا الحق امر المؤمنين فى هذه الآية باداء الامانات فى جميع الامور سواء كانت تلك الامور من باب المناهب و الديانات او من باب الدنيا و المعاملات يا ايها الذين امنوا الخ اعلم انه تعالى لما امر بالعبادة و الولاية بالعدل فى الرعية امر الرعية بطاعة الولاية الم ترالى الذين الخ اعلم انه تعالى لما اوجب فى الآية الاولى على جميع المكلفين ان يطيعوا الله و طيعوا الرسول ذكر فى هذه الآية ان المنافقين و الذين فى قلوبهم مرض لا يطيعون الرسول ولا يرضون بحكمه و انما يريدون حكم غيره و ما ارسلنا من رسول الخ اعلم انه تعالى لما امر بطاعة الرسول فى قوله و اطيعوا الرسول رغب فى هذه الآية مرة اخرى فى طاعة الرسول و لو اننا كتبنا الخ اعلم ان هذه الآية متصلة بما تقدم من امر المنافقين و ترغيبهم فى الاخلاص و ترك النفاق و المعنى انا لو شددنا

التكليف على الناس لصعب ذلك عليهم وحينئذ يظهر كفرهم و عنادهم فلما لم نفعل ذلك رحمة منا على عبادنا بل اكتفينا بتكليفهم في الامور السهلة فليقبلوها بالاخلاق حتى ينالوا خير الدارين و من يطع الله الخ اكدار الامر بطاعة الله و طاعة الرسول في هذه الآية مرة اخرى يا ايها الذين امنوا اخلوا الخ اعلم انه تعالى عاد بعد الترغيب في طاعة الله و طاعة الرسول الى ذكر الجهاد الذي تقدم لانه اشق الطاعات و لانه اعظم الامور التي بها يحصل تقوية الدين فليقاتل الخ اعلم انه تعالى لم ادم المبطئين في الجهاد عاد الى الترغيب فيه و مالكم لا تقاتلون الخ اعلم انه المراد منه انكاره تعالى لتركهم القتال فصار ذلك توكيداً لما تقدم من الامر بالجهاد الذين امنوا يقاتلون الخ قال ابو السعود كلام مبتدأ سبق لترغيب المؤمنين في القتال و تشجيعهم بيان كمال قوتهم بامداد الله تعالى و نصرته و غاية ضعف اعدائهم الم تر الى الذين قيل لهم الخ قال ابو السعود تعجيب لرسول الله صلى الله عليه وسلم من احجامهم عن القتال مع الهم كانوا قبل ذلك راغبين فيه حرصاً عليه اين ما تكونوا الخ و المقصود من هذا الكلام تكبيت من حكى عنهم الهم عند فرض القتال يخشون الناس الخ فيبين تعالى انه لا خلاص لهم من الموت فبان يقع على وجه يكون مستقبلاً للسعادة الابدية كان اولي و ان تصبهم الخ لما حكى عن المنافقين كونهم متشاققين عن الجهاد حكى عنهم في هذه الآية خصلة اخرى فيبحة افيح من الاولى و ارسلنا للناس الخ قال ابو السعود بان لجلاله منصفه عليه السلام و مكانته عند الله عز وجل لعله بيان بطلان زعمهم الفاسد في حقه عليه الصلوة و السلام بناء على جهلهم بشانه الجليل من يطع الرسول الخ قال ابو السعود بيان لاحكام رسالة عليه الصلوة و السلام الر بيان تحققها و ثبوتها و يقولون طاعة الخ قال ابو السعود شروع في بيان معاملتهم مع الرسول صلى الله عليه وسلم بعد بيان وجوب طاعة افلا يتدبرون القران الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن المنافقين انواع مكرهم و كيدهم و كان كل ذلك لاجل انهم كانوا يحقدون كونه محقالي اداء الرسالة صادقاً فيه بل كانوا يحقدون انه مفتر متخرف فلاجرم امرهم الله تعالى بان ينظرو او يفكروا في الدلائل الدالة على صحة نبوته و اذا جاء هم امر من الامن او الخوف الخ اعلم انه تعالى حكى عن المنافقين في هذه الآية نوعاً اخر من الاعمال الفاسدة و هو انه اذا جاء هم الخ فقاتل في سبيل الله الخ اعلم انه تعالى لما امر بالجهاد و رغب فيه اشد الترغيب في الآيات المتقدمة عاد في هذه الآية الى الامر بالجهاد من يشفع شفاعة الخ قال ابو السعود جملة سقت لبيان انه له عليه الصلوة و السلام فيما امر به من تحريض المؤمنين حظامو فوراً و اذا حييتم الخ في النظم و جهان الاول انه لما امر المؤمنين بالجهاد امرهم ايضا بان الاعداء لورضوا بالمسالمة فكونوا انتم راضين بها الثاني ان الرجل في الجهاد كان يلقي الرجل في دار الحرب او ما يقار بها فيسلم عليه فقد لا يلتفت الى سلامه عليه و

يقتله وربما ظهر انه كان مسلماً فمنع الله المؤمن عنه لا اله الا هو الخ اكد بالوعيد في قوله ان الله كان على كل شيء حسيباً ثم بالغ في تأكيد ذلك الوعيد بهذه الآية فمالكم في المنافقين الخ اعلم ان هذانوع اخر من احوال المنافقين ودواؤكفرون الخ لما قال قبل هذه الآية اتريدون قور ذلك الاستعداد بان قال انهم بلغوا في الكفر الى انهم يتمنون ان تصيروا ايها المسلمون كفارا فلما بلغوا في تعصبيهم في الكفر الى هذا الحد فكيف تطمعون في ايمانهم وما كان لمؤمن الخ اعلم انه تعالى لما رغب في مقابلة الكفار وحرص عليها ذكر بعد ذلك ما يتعلق بهذه المحاربة فمنها انه قد يتفق ان يرى الرجل رجلاً يظنه كافراً حربياً فيقتله ثم يتبين انه كان مسلماً فذكر الله تعالى حكم هذه الواقعة في هذه الآية ومن يقتل مؤمناً الخ اعلم انه تعالى لما ذكر حكم القتل الخطاء ذكر بعده بيان حكم القتل العمدوله احكام وقد ذكر تعالى ذلك في سورة البقرة فلا جرم همنا اقتصر على بيان ما فيه من الاثم والوعيد يا ايها الذين امنوا اذا ضربتم الخ اعلم ان المقصود من هذه الآية المبالغة في تحريم قتل المؤمنين وامر المجاهدين بالثبوت فيه لئلا يفسكروا اذا حراماتا ويل ضعيف لا يسوى القاعدون الخ قال ابو السعود بيان لطاوت طبقات المؤمنين بحسب تفاوت درجات مساعيهم في الجهاد بعدما مر من الامر به و تحريض المؤمنين عليه ليانف القاعد عنه و يترفع بنفسه عن انحطاط رتبته فيهتزله رغبته في ارتفاع طبقته ان الذين توفاهم الخ قال ابو السعود بيان لحال القاعدين عن الهجرة اثر بيان حال القاعدين عن الجهاد ومن يهاجر الخ قال ابو السعود ترغيب في المهاجرة وتانيس لها واذا ضربتم في الارض الخ اعلم ان احدا الامور التي يحتاج المجاهد اليها معرفة كيفية اداء الصلوة في زمان الخوف والاشتغال بمحاربة العدو فلهذا المعنى ذكره الله تعالى في هذه الآية واذا كنت فيهم الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية المتقدمة حال قصر الصلوة بحسب الكمية في العدد بين في هذه الآية حالها في الكيفية ولا تهتوا الخ اعلم انه تعالى لما ذكر بعض الاحكام التي يحتاج المجاهد الى معرفتها عادمة اخرى الى الحث على الجهاد انا انزلنا اليك الخ لما شرح احوال المنافقين على سبيل الاستقصاء ثم اتصل بذلك امر المحاربة واتصل بذكر المحاربة ما يتعلق بهامن الاحكام الشرعية رجع الكلام بعد ذلك الى احوال المنافقين و ذكر انهم كانوا يحاولون ان يحملوا الرسول عليه الصلوة والسلام على ان يحكم بالباطل و يذرا الحكم الحق فاطلع الله رسوله عليه وامره بان لا يلتفت اليهم ولا يقبل قولهم في هذا الباب و من يشاقق الرسول الخ اعلم ان تعلق هذه الآية بما قبلها هو ما روى ان طعمة بن ابيرق لما راى ان الله تعالى هتك ستره و برا اليهودى عن تهمة السرقة ارتدو ذهب الى مكة و نقب جدار انسان لاجل السرقة فتهدم الجدار عليه ومات فنزلت هذه الآية ان الله لا يغير الخ انما يحسن اتصالها بما قبلها لو كان المراد ان ذلك السارق لو لم يرتد لم يصر محروماً

عن رحمتي ولكنه لما ارتدوا شرك بالله صار محروما قطعاً عن رحمة الله ثم انه تعالى بين كون المشرك ضلالاً بعيداً فقال ان يدعون الخ ليس بامانيكم الخ قال المسكين ابطال للاماني المذكورة سابقاً في قوله تعالى يعلمهم و يمنيهم وذكر امان في اهل الكتب استطراد او تسميماً للفائدة ثم ذكر كون الايمان والاعمال معتبراً بقوله من يعمل الخ و من احسن ديننا الخ اعلم انه تعالى لما شرط حصول النجاة والفوز بالجنة بكون الانسان مؤمناً شرح الايمان و بين فضله و يستفتونك في النساء الخ اعلم ان عادة الله تعالى في ترتيب هذا الكتاب الكريم وقع على احسن الوجوه و هو انه يذكر شيئاً من الاحكام ثم يذكر عقبيه آيات كثيرة في الوعد والوعيد والترغيب والترهيب و يخلط بما آيات دالته على كبرياء الله و جلال قدرته و عظمة الهية ثم يعود مرة اخرى الى بيان الاحكام و هذا احسن انواع الترتيب و اقربها الى التأثير في القلوب لان التكليف بالاعمال الشاقة لا يقع في موقع القبول الا اذا كان مقروناً بالوعد والوعيد والترغيب والترهيب لا يؤثر في القلب الا عند القطع بغاية كمال من صدر عنه الوعد والوعيد فظهر ان هذا الترتيب احسن الترتيبات اللاتفة بالدعوة الى الدين الحق اذا عرفت هذا فنقول انه سبحانه ذكر في اول هذه السورة انواعاً كثيرة من الشرائع و التكاليف ثم اتبعها بشرح احوال الكافرين و المنافقين و استقصى في ذلك ثم ختم تلك الآيات الدالة على عظمة جلال الله و كمال كبرياءه ثم عاد بعد ذلك الى بيان الاحكام فقال و يستفتونك الخ و ان امرأة خافت الخ اعلم ان هذا من جملة ما اخبر الله تعالى انه يفتيهم به في النساء مما لم يتقدم ذكره في هذه السورة ولله ما في السموات الخ لما ذكر انه يغني كلاماً من سعة و انه واسع اشارة الى ما هو كالتفسير لكونه واسعاً يابها الذين امنوا كونوا الخ تقدم في هذه السورة امر الناس بالقسط و امرهم بالاشهاد عند دفع اموال اليتامى اليهم و امرهم بعد ذلك ببذل النفس و المال في سبيل الله و اجري في هذه السورة قصة طعمة بن ابيرق و اجتماع قومه على الذب عنه بالكذب و الشهادة على اليهودى بالباطل ثم انه تعالى امر في هذه الآية بالمصالحة مع الزوجة و معلوم ان ذلك امر من الله لعباده بان يكونوا قائمين بالقسط شاهدين لله على كل احد بل و على انفسهم فكانت هذه الآية كالمؤكد لكل ما جرى ذكره في هذه السورة من انواع التكاليف يابها الذين امنوا الخ لما بين الاحكام الكثيرة في هذه السورة ذكر عقبيها اية الامر بالايمان ان الذين امنوا الخ اعلم انه تعالى لا امر بالايمان و رغب فيه بين فساد طريقة من يكفر بعد الايمان بشر المنافقين الخ قال المسكين ذكر المنافقين اثر ذكر الكافرين يابها الذين امنوا لا تتخذوا الكافرين الخ اعلم انه تعالى لما ذم المنافقين بانهم مرة الى الكفرة و مرة الى المسلمين من غير ان يستقروا مع احد الفريقين نهى المسلمين في هذه الآية ان يفعلوا مثل فعلهم لا يحب الله الجهر الخ

قال المسكين نهى الله تعالى فيما سبق عن موالاته الكفار ونهى فى هذه الآية عن معاداتهم بمالم ياذن به الشرع ان الذين يكفرون بالله ورسوله الخ اعلم انه تعالى لما تكلم على طريقة المنافقين عادىكلم على مذاهب اليهود والنصرى و مناقضاتهم و ذكر فى اخر هذه السورة من هذا الجنس انواعا النوع الاول من اباطيلهم ايمانهم ببعض الانبياء دون البعض والذين امنوا الخ لما ذكر الوعيد اردفه بالوعد يسألك اهل الكتاب الخ اعلم ان هذا هو النوع الثانى من جهالات اليهود فبظلم الخ اعلم انه تعالى لما شرح فضائح اعمال اليهود و قبائح الكافرين ذكر عقيبه تشديده تعالى عليهم فى الدنيا والآخرة لكن الراسخون الخ اعلم انه تعالى لما وصف طريقة الكفار والجهال من اليهود وصف طريقة المؤمنين منهم انا اوحينا اليك الخ اعلم انه تعالى لما حكى ان اليهود سالوا الرسول صلى الله عليه وسلم ان ينزل عليهم كتابا من السماء و ذكر تعالى بعده انهم لا يطلبون ذلك لاجل الاسترشاد ولكن لاجل العناد والدجاج و حكى انواعا كثيرة من فضائحهم و قبائحهم و امتد الكلام الى هذا المقام شرع الآن فى الجواب عن تلك الشبهة فقال انا اوحينا الخ والمعنى انا توافقنا على نبوة نوح و ابراهيم واسماعيل و جميع المذكورين فى هذه الآية و على ان الله تعالى اوحى اليهم ولا طريق الى العلم بكونهم انبياء الله و رسل الا ظهور المعجزات عليهم ولكل واحد منهم نوع اخر من المعجزات على التعيين وما انزل الله على كل واحد من هؤلاء المذكورين كتابا بتمامه مثل ما انزل الى موسى فلما لم يكن عدم انزال الكتاب على هؤلاء دفعة واحدة قادحا فى نبوتهم بل كفى فى البات نبوتهم ظهور نوع واحد من انواع المعجزات عليهم علمنا ان هذه الشبهة زائلة و ان اصرار اليهود على طلب هذه المعجزة باطل لكن الله يشهد الخ لما قال انا اوحينا اليك قال القوم نحن لانشهد لك بذلك فنزل لكن الله يشهد ان الذين كفروا و اصدوا الخ اعلم ان هذا من صفات اليهود الذين تقدم ذكرهم بايها الناس قد جاءكم الرسول الخ اعلم انه تعالى لما اجاب عن شبهة اليهود على الوجود الكثيرة و بين فساد طريقة هم ذكر خطابا عاما يعمهم و يعم غيرهم فى الدعوة الى دين محمد عليه الصلوة والسلام يا اهل الكتاب لا تغلوا الخ و اعلم انه تعالى لما اجاب عن شبهات اليهود تكلم بعد ذلك مع النصرى فى هذه الآية بايها الناس قد جاءكم برهان الخ اعلم انه تعالى لما اورد الحجة على جميع الفرق من المنافقين والكفار واليهود والنصرى و اجاب عن جميع شبهاتهم عمهم الخطاب و دعا جميع الناس الى الاعتراف برسالة محمد عليه الصلوة والسلام يستفتونك الخ اعلم انه تعالى تكلم فى اول السورة فى احكام الاموال و ختم اخرها بذلك يكون الآخر مشا كلالاول و وسط السورة مشتمل على المناظرة مع الفرق المخالفين للدين.

سورة المائدة

احلت لكم الخ اعلم انه تعالى لما قرر بالآية الاولى جميع المكلفين انه يلزمهم الانقياد لجميع تكاليف الله تعالى و ذلك و كالاصل الكلى والقاعدة الجمالية شرع بعد ذلك في ذكر التكاليف المفصلة فبدأ بذكر ما يحل و ما يحرم من المطاعم بايها الذين امنوا الاتحلوا الخ اعلم انه تعالى لما حرم الصيد على المحرم في الآية الاولى اكد ذلك بالمنهى في هذه الآية عن مخالفة تكاليف الله تعالى حرمت عليكم الخ اعلم انه تعالى قال في الاول السورة احلت لكم بهيمة الانعام ثم ذكر فيه استثناء اشياء تلت عليكم فهنا ذكر الله تعالى تلك الصور المستثناة عن ذلك العموم اليوم ينس الذين الخ لما عدا فيما مضى ما حرمه و ما احله حرضهم على التمسك بما شرع لهم باكمل ما يكون يسألونك ما اذا حل الخ و هنا ايضا متصل بما تقدم من ذكر المطاعم والماكل اليوم احل لكم الخ اعلم انه تعالى اخبر في الآية المتقدمة انه احل الطيبات و كان المقصود من ذكره الاخبار عن الحكم ثم اعاد ذكره في هذه الآية والغرض من ذكره انه قال اليوم اكملت لكم الخ فبين انه كما اكمل الدين و اتم النعمة في كل ما يتعلق بالدين فكذلك اتم النعمة في كل ما يتعلق بالدنيا و منها احلال الطيبات والغرض من الاعادة رعاية هذه النكتة و من يكفر الخ المقصود منه الترغيب فيما تقدم من التكاليف والاحكام بايها الذين امنوا اذا قمتم الخ قال ابو السعود شروع في بيان الشرائع المتعلقة بدينهم بعد بيان ما يتعلق بدينهم و اذكروا نعمة الله الخ لما ذكر هذا التكليف اردفه بما يوجب عليهم القبول والانقياد و ذلك من وجهين الاول كثرة نعمة الله عليهم والثاني هو الميثاق بايها الذين امنوا كونوا الخ قال ابو السعود شروع في بيان الشرائع المتعلقة بما يجرى بينهم و بين غيرهم الر بيان ما يتعلق بانفسهم بايها الذين امنوا اذكروا الخ قال السعود تذكير نعمة الانجاء من الشرائع بعد تذكير نعمة ابصال الخير الذي هو نعمة الاسلام و ما يتبعها من الميثاق و لقد اخذ الله ميثاق بنى اسرائيل الخ لما خاطب المؤمنين فيما تقدم فقال والذكروا نعمة الله عليكم و ميثاقه ثم ذكر ان انه اخذ الميثاق من بنى اسرائيل لكنهم نقضوه و تركوا الوفاء به فلا تكونوا ايها المؤمنون مثل اولئك اليهود في هذا الخلق ما لديهم لنلا تصيروا مثلهم فيما نزل بهم من المن والذلة والمسكنة و من الذين قالوا انا نصارى الخ

ل وجه الارتباط بين اولها و آخرها قبلها ان الله تعالى ختم السورة المتقدمة بقوله بين الله لكم ان تضلوا و في

هذه السورة بين الاحكام الضرورية ۱۲ منه عفى عنه

المراد ان سبيل النصارى مثل سبيل اليهود في نقض المواثيق يا اهل الكتاب قد جاءكم رسولنا الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن اليهود و عن النصارى نقضهم العهد و تركهم ما امروا به دعاهم عقيب ذلك الى الايمان محمد صلى الله عليه وسلم و اذ قال موسى لقومه الخ قال ابو السعود جملة مستأنفة مسوقة لبيان ما فعلت بنو اسرائيل بعد اخذ الميثاق منهم و كيفية نقضهم له و اتل عليهم نبا ابني ادم الخ قال المسكين هذا تو طئته لما هو المقصود ههنا من ذكر جنایات بنی اسرائيل كما قال ابو السعود عند قوله تعالى من اجل ذلك كتبنا على بنی اسرائيل الخ شروع فيما هو المقصود من تلاوة النبأ من بيان بعض اخر من جنایات بنی اسرائيل و معاصيهم انما جزاء الذين يحاربون الخ اعلم انه تعالى لما ذكر في الآية الاولى تغليظ الالتم في قتل النفس بغير قتل نفس و لا فساد في الارض اتبعه ببيان ان الفساد في الارض الذي يوجب القتل ما هو فان بعض ما يكون فسادا في الارض لا يوجب القتل يا ايها الذين امنوا اتقوا الله الخ قال ابو السعود لما ذكر عظم شان القتل و الفساد و بين حكمها و اشير في تضاعيف ذلك الى مغفرته تعالى لمن تاب من جنایة امر المؤمنون بان يتقره تعالى في كل ما يترون و ما يذرون بترك ما يجب اتقاءه من المعاصي التي من جملتها ما ذكر من القتل و الفساد و يفعل الطاعات التي من زمرتها السعي في احياء النفوس و دفع الفساد و المسارعة الى التوبة و الاستغفار ان الذين كفروا الخ قال ابو السعود كلام مسوق لتاكيد و جوب الامتثال بالاوامر السابقة و ترغيب المؤمنين في المسارعة الى تحصيل الوسيلة اليه عزوجل قبل انقضاء او انه و السارق و السارقة الخ قال ابو السعود شروع في بيان حكم السرقة الصغرى بعد بيان احكام الكبرى و قد عرفت انقضاء المال لا يراد ما توسط بينهما من المقال الم تعلم ان الله الخ اعلم انه تعالى لما اوجب قطع اليد و عقاب الأخرى على السارق قبل التوبة ثم ذكر انه يقبل توبة ان تاب اردفه ببيان ان له ان يفعل ما يشاء و يحكم ما يريد يا ايها الرسول لا يحزنك الخ اعلم انه تعالى لما بين بعض التكاليف و الشرائع و كان قد علم من بعض الناس كونهم متسارعين الى الكفر لاجرم صبر رسوله على تحمل ذلك فان جاء و ك الخ قال ابو السعود لما بين تفاصيل امورهم الواهية و احوالهم المختلفة الموجبة لعدم مبالاة بهم و بافاعيلهم جسما امر به عليه السلام خو طب عليه الصلوة و السلام ببعض ما يتنى عليه من الاحكام بطريق التفريع و الفاء فصيحة اى و اذا كان حالهم كما شرح فان جاء و ك الخ و كيف يحكمونك الخ قال ابو السعود تعجيب من تحكيمهم لمن لا يؤمنون به و بكتابه و الحال ان الحكم منصوص عليه في كتابهم الذي يدعون الايمان به و تنبيه على انهم ما قصدوا بالتحكيم معرفة الحق و اقامة الشرع و افاطلبوا به ما امرهون عليهم و ان لم يكن ذلك حكم الله على زعمهم انا انزلنا التوراة الخ اعلم ان هذا تنبيه من الله تعالى لليهود المنكرين لوجوب الرجم و ترغيب لهم في ان يكونوا

اكتفديهم من مسلمي احبارهم والانبياء المبعوثين اليهم و كتبنا عليهم فيها الخ المعنى انه تعالى بين في التوراة ان حكم الزاني المحصن هو الرجم واليهود غيره وبدلوه و بين في هذه الآية ايضا انه تعالى بين في التوراة ان النفس بالنفس و هؤلاء اليهود غيرو هذا الحكم ايضا ففضلوا بنى النضير على بنى قريظة و خصصوا ايجاب القوديبني قريظة دون بنى النضير و قفينا على اثارهم الخ قال ابو السعود شروع في بيان احكام الانجيل اثر بيان احكام التوراة و انزلنا اليك الكتاب بالحق الخ قال المسكين شروع في بيان احكام القران اثر بيان احكام الكتابين لكل جعلنا الخ قال ابو السعود كلام مستأنف جي به لحمل اهل الكتابين من معاصره عليه الصلوة والسلام على الانقياد لحكمه بما انزل اليه من القران الكريم بيان انه هو الذي كلفوا الحمل به دون غيره من الكتابين و انما الذين كلفوا الحمل بهما من مضي قبل نسخهما من الامم السالفة يا ايها الذين امنوا لاتخذوا الخ قال المسكين نهى المؤمنين عن موالة اهل الكتابين اثر ذكر اوصاف الفريقين التي هي ضد لصفات المؤمنين و من اقوى الزواجر عن موالاتهما فترى الذين الخ قال المسكين بيان المداهنة المنافقين في موالة الكفار واعتذارهم الباطل في ذلك يا ايها الذين امنوا من يرتد الخ قال ابو السعود شروع في بيان حال المرتدين على الاطلاق انما وليكم الله الخ لما نهى في الآيات المتقدمة عن موالة الكفار امر في هذه الآية بموالة من يجب موالة يا ايها الذين امنوا لاتخذوا الذين اتخذوا الخ اعلم انه تعالى نهى في الآيات المتقدمة عن اتحاذا اليهود والنصارى اولياء و ساق الكلام في تقريره ثم ذكرهنا النهى العام عن موالة جميع الكفار و اذا ناديتم الخ لما حكى في الآية الاولى عنهم انهم اتخذوا دين المسلمين هزوا ولعبا ذكرهنا بعض ما يتخذونه من هذا الذين هزوا ولعبا قل يا اهل الكتاب هل تنقمون الخ لما حكى عنهم انهم اتخذوا دين الاسلام هزوا ولعبا قال لهم ما الذي تنقمون من هذا الدين وما الذي تجدون فيه مما يوجب اتخاذه هزوا ولعبا قل هل انبئكم الخ لما امر عليه السلام بالزامهم ان ملارنقمهم الدين انما هو اشتماله على ما يوجب ارتضاءه عندهم ايضا وكفرهم بما هو مسلم لهم امر عليه الصلوة والسلام عقبيه بان ييكتهم بيان ان الحقيق بانقم والعيب حقيقة ما هم عليه و اذا جاء و كم قالوا الخ قال المسكين ذم لمن نافق من المذكورين و ترى كثيرا منهم الخ قال المسكين ذم لبعض اخر منهم يا ايها الرسول الخ امر الرسول بان لا ينظر الى قلة المقتصددين و كثرة الفاسقين ولا يخشع مكرورهم يا اهل الكتاب لستم الخ قال المسكين من حملة التبليغ ان الذين امنوا الخ قال المسكين لما امر بالايمان فيما قبل بين فضيلة الايمان ههنا لقد اخلنا ميثاق الخ قال ابو السعود كلام مبتداء مسوق لبيان بعض اخر من جنائياتهم المنادية باستبعاد الايمان منهم لقد كفر الذين قالوا الخ اعلم انه تعالى لما استقصى الكلام مع اليهود شرع ههنا في الكلام مع النصارى

قل اتعبدون الخ وهذا دليل اخر على فساد قول النصارى قل يا اهل الكتاب لا تغفلوا الخ لما تكلم اولاً على اباطيل اليهود ثم تكلم ثانياً على اباطيل النصارى فعند ذلك خاطب مجموع الفريقين لعن الذين كفروا الخ لما خاطب اهل الكتاب بهذا الخطاب وصف السلافهم ترى كثيراً منهم الخ اعلم انه تعالى لما وصف اسلافهم بما تقدم وصف الحاضرين منهم بانهم يتولون الكفار وعبدة الاوثان لتجدن اشد الناس الخ لما ذكر من احوال اهل الكتاب من اليهود والنصارى ما ذكره في هذه الآية ان اليهود في غاية العداوة مع المسلمين يا ايها الذين امنوا لا تحرموا الخ اعلم انه تعالى لما استقصى في المناظرة مع اليهود والنصارى عاد بعده الى بيان الاحكام وذكر جملة منها النوع الاول ما يتعلق بحل المطاعم والمشارب واللذات النوع الثاني من الاحكام المذكورة في هذا الموضوع قوله تعالى لا يؤخذكم الله الخ قال المسكين اخذ من الكبير وجه المناسبة بينه وبين ما قبله قول الصحابة فكيف نضع بايماننا اى على ترك الطيبات قوله تعالى يا ايها الذين امنوا انما الخمر الخ اعلم ان هذا النوع الثالث من الاحكام المذكورة في هذا الموضوع ووجه اتصاله بما قبله انه تعالى قال فيما تقدم لا تحرموا طيبات الخ وكلوا مما رزقكم الله الخ ثم مما كان من جملة الامور المستطابة الخمر والميسر لا جرم انه تعالى بين انهما غير داخلين في المحللات بل في المحرمات وقال المسكين لعل الاقرب ان يقال كان ما تقدم نهياً عن تحريم الحلال وهذا نهى عن تحليل الحرام الى قوله تعالى ما جعل الله من بحيرة الخ بل لا يبعد ان قيل الى حكم الايضاء وما يتعلق به ليس على الذين امنوا الخ روى انه لما نزلت اية تحريم الخمر قالت الصحابة ان اخواننا كانوا قد شربوا الخمر يوم احد ثم قتلوا فكيف حالهم فنزلت هذه الآية يا ايها الذين امنوا ليلونكم الخ اعلم ان هذا نوع اخر من الاحكام ووجه النظم انه تعالى لما قال لا تحرموا الطيبات ثم استثنى الخمر والميسر عن ذلك وكذلك استثنى هذا النوع من الصيد عن المحللات وبين دخوله في المحرمات جعل الله الكعبة الخ اعلم ان اتصال هذه الآية بما قبلها هو ان الله تعالى حرم في الآية المتقدمة الاصطياد على المحرم فبين ان الحرام كما انه سبب لامن الوحش والطير فكذلك هو سبب لامن الناس عن الافات والمخالفات وسبب لحصول الخيرات والسعادات في الدنيا والاخرة اعلموا الخ قال ابو السعود وعيد لمن انتهك محارمه ووعلا لمن حافظ على مراعاة حرمة ما على الرسول الخ قال ابو السعود تشديد في ايجاب القيام بما امر به اى الرسول فداتى بما وجب عليه من التبليغ بما لا مزيد عليه وقامت عليكم الحججة ولزمتكم الطاعة فلا عذر لكم من بعد في التفريط قل لا يستوى الخ قال ابو السعود حكم عام في نفي المساواة عند الله تعالى بين الردى من الاشخاص والاعمال والاموال وبين جيلها قصد به الترغيب في جيد كل منها والتحذير عن رديها يا ايها الذين امنوا لا تمسوا الخ

لما قال ما على الرسول الا البلاغ صار التقدير كأنه قال ما بلغه الرسول اليكم فخلوه وكونوا منقادين له وما لم يبلغه الرسول اليكم فلا تستلوا عنه ولا تخوضوا فيه ما جعل الله من بجيرة الخ قال المسكين اخذا من ابي السعود رد و ابطال لما ابتدعه اهل الجاهلية اثر ابطال بعض اعمالهم من تناولهم الخمر والميسر وغيرهما يا ايها الذين امنوا عليكم انفسكم الخ لما بين انواع التكليف والشرائع والاحكام ثم قال ما على الرسول الا البلاغ الى قوله واذا قيل لهم تعالوا الخ فكانه تعالى قال ان هؤلاء الجهال مع ما تقدم من انواع المبالغة في الاعتذار والانذار والترغيب والترهيب لم ينضعوا بشيء منه بل بقوا مصرين على جهلهم مجدين على جهالتهم وضلاتهم فلا تبالوا ايها المؤمنون بجهالتهم وضلاتهم بل كونوا منقادين لتكليف الله مطيعين لا وامره ونواهيه فلا يضركم ضلاتهم و جهالتهم يا ايها الذين امنوا شهادة بينكم الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لبيان الاحكام المتعلقة بامور دنياهم الر بيان الاحوال المتعلقة بامور دينهم يوم يجمع الله الرسل الخ اعلم ان عادة الله تعالى جارية في هذا الكتاب الكريم انه اذا ذكر انواعاً كثيرة من الشرائع والتكليف والاحكام اتبعها اما بالالهيات واما بشرح احوال الانبياء او بشرح احوال القيامة ليصير ذلك مؤكداً لما تقدم ذكره من التكليف والشرائع فلا جرم لما ذكر فيما تقدم انواعاً كثيرة من الشرائع اتبعها بوصف احوال القيامة اولا ثم ذكر احوال عيسى عليه السلام اذ قال الله يعيسى ابن مريم اذكر الخ اعلم انا بينا ان الغرض من قوله للرسول ما اذا اجبتم تو بيخ من تمرد امهم و استدالام افتقار الى التوبيخ والملامة النصارى لان طعن سائر الامم كان مقصود اعلی الانبياء و طعن هؤلاء تعدى الى جلال الله و كبرياءه فلا جرم ذكر تعالى انه يعدد انواع نعمه على عيسى فان كل واحدة من تلك النعم المعدودة تدل على انه عبد وليس باله اذ قال الحواريون الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لبيان بعض ماجرى بينه عليه السلام و بين قومه منقطع عما قبله و اذ قال الله يعيسى ابن مريم انت الخ قال ابو السعود اي اذكر وقت قول الله تعالى عليه السلام في الأخرى تو بيخا للكفرة و تبكيثالهم باقراره عليه السلام على رؤس الاشهاد بالعبودية وامره لهم بعبادة عز و جل قال الله هنا يوم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف ختم به حكاية ما حكى مما يقع يوم يجمع الله الرسل عليهم الصلوة والسلام واشير الى نتيجه و ما له لله ملك السموات الخ ان السورة اشتملت على انواع كثيرة من العلوم فمنها بيان الشرائع والاحكام والتكليف ومنها المناظرة مع اليهود في انكارهم شريعة محمد عليه الصلوة والسلام ومنها المناصرة مع النصارى في قولهم بالتثليث فنجم السورة بهذه النكتة الوافية باثبات كل هذه المطالب

سورة الانعام

الحمد لله الخ قال المسكين اخذ من ابي السعود بيان لموجبات توحيد و بطلان اشراكهم به مع معاينتهم لها هو الذي خلقكم من طين الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لبيان بطلان كفرهم بالبعث مع مشاهدتهم لما يوجب الايمان به اثر بطلان اشراكهم به تعالى مع معاينتهم لموجبات توحيد و هو الله الخ قال ابو السعود جملة مسوقة لبيان شمول احكام الهية تعالى لجميع المخلوقات و احاطة علمه بتفاصيل احوال العباد و اعمالهم المؤدية الى الجزاء اثر الاشارة الى تحقق المعاد و ماتاتهم من آية الخ قال ابو السعود كلام مستانف و ارد لبيان كفرهم بايات الله و اعراضهم عنها بالكلية بعد ما بين في الآية الاولى اشراكهم بالله سبحانه و اعراضهم عن بعض آيات التوحيد و في الآية الثانية امتراء هم في البعث و اعراضهم عن بعض آية فقد كذبوا بالحق الخ قال ابو السعود فان الحق عبارة عن القران الذي اعرضوا عنه حين اعرضوا عن كل آية آية منه عبر عنه بذلك ابانة لكمال قبح فافعلوا به فان تكذيب الحق مما لا يتصور صدوره عن احد الم يرواكم اهلكنا الخ اعلم ان الله تعالى لما منعهم عن ذلك الاعراض و التكذيب و الاستهزاء بالتهديد و الوعيد اتبعه بما يجرى مجرى الموعظة و النصيحة في هذا الباب فوعظهم بسائر القرون الماضية كقوم نوح و عاد و ثمود و غيرهم و لو نزلنا عليك الخ قال ابو السعود جملة مستانفة سقت بطريق تلوين الخطاب لبيان شدة سكرتهم في المكابرة و ما يتفرع عليها من الاقاديل الباطلة اثر بيان اعراضهم عن آيات الله و تكذيبهم بالحق و استحقاقهم بذلك لنزول العذاب و لبة التنزيل ههنا اليه عليه السلام مع نسبة اتيان الآيات و مجى الحق فيما سبق اليهم للاشعار بقدهم في نبوة عليه السلام في ضمن قدحهم فيما نزل عليه صريحا و قالوا لولا نزل الخ قال ابو السعود شروع في قدحهم في نبوة عليه السلام صريحا بعد ما اشير الى قدحهم فيها ضمنا و لقد استهزى برسول الخ قال ابو السعود تسلية لرسول الله صلى الله عليه وسلم عما يلقاه من قومه قل سيروا الخ قال ابو السعود بعد بيان ما فعلت الامم الخالية و ما فعل بهم خوطب رسول الله صلى الله عليه وسلم بانذار قومه و تذكيرهم باحوالهم القطيعة تحذير الهم عما هم عليه و تكملة لتسلية بما في ضمنه من العدة اللطيفة بانه سيحقق بهم مثل ما حاق باضرابهم الاولين قل لمن ما في السموات الخ قال المسكين عود الى تقرير التوحيد و ابطال الشرك قل اي شىء اكبر شهادة الخ قال

ل وجه المناسبة بين اولها و اخرها بقها ان كليهما مشترك في البات التوحيد ۱ ۲ منه عفى عنه

ابو السعد روى ان قريشا قالو الرسول الله صلى الله عليه وسلم يا محمد لقد سألنا عنك اليهود والنصارى فزعموا ان ليس عندهم ذكر ولا صفة فارنا من يشهد لك انك رسول الله فنزلت قال المسكين فهو عود الى الجواب عن قدحهم فى النبوة الذين اتينا هم الخ قال ابو السعد جواب عما سبق من قولهم لقد سألنا عنك والخ و من اظلم الخ لما حكم على اولئك بالخسران بين سبب الخسران و يوم نحشرهم الخ قال المسكين بيان حال اهل الشرك يوم الجزاء و منهم من يستمع اليك الخ قال ابو السعد كلام مبتدأ مسوق لحكاية ما صدر فى الدنيا عن بعض المشركين من احكام الكفر ثم بيان ما سيصدر عنهم يوم الحشر تقرير الما قبله و تحقيقا لمضمونه و هم ينهون عنه الخ قال المسكين بيان لسعيهم فى كفر غيرهم مع كفر انفسهم ولوترى اذ وقفوا على النار الخ قال ابو السعد شروع فى حكاية ما سيصدر عنهم يوم القيامة من القول المناقض لما صدر عنهم فى الدنيا من القبايح المحكية مع كونه كذبا فى نفسه و قالوا ان هى الخ قال المسكين هذا توطئة لما سياتى من قوله تعالى و لو ترى اذ وقفوا على ربهم الخ بين فى هذه الآية كيفية حالهم فى القيامة قد خسر الذين كذبوا الخ اعلم ان المقصود من هذه الآية شرح حالة اخرى من احوال منكرو البعث والقيامة و هى امران احدهما حصول الخسران والثانى حمل الاوزار العظيمة و ما الحيلة الدنيا الخ قال ابو السعد لما حقق فيما سبق ان وراء الحياة الدنيا حياة اخرى يلقون فيها من الخطوب ما يلقون بين بعده حال تينك الحياتين فى انفسهما قد نعلم انه ليحزنك الخ قال ابو السعد استئناف مسوق لتسلية رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحزن الذى يعتريه مما حكى عن الكفرة من الاصرار على التكذيب المبالغة فيه بيان انه عليه السلام بمكانة من الله عز وجل و ان ما يفعلون فى حقه فهو راجع اليه تعالى فى الحقيقة و انه ينتقم منهم لا محالة اشد انتقام و لقد كذبت رسل الخ قال ابو السعد افتتان فى تسليمه عليه الصلوة والسلام فان عموم البلية ربما يهون امرها بعض تهوين و ارشاد له عليه الصلوة والسلام الى لاقتداء بمن قبله من الرسل الكرام عليهم الصلوة والسلام فى الصبر على ما اصابهم من امهم من فنونه الاذية و عدة ضمنية له عليه الصلوة والسلام بمثل ما منحوه من النصر و ان كان كبر عليك الخ قال ابو السعد كلام مستأنف مسوق لتأكيد ايجاب الصبر المستفاد من التسلية بيان انه امر لا محيد عنه اصلا انما يستجيب الذين الخ اعلم انه تعالى بين السبب فى كونهم بحيث لا يقبلون الايمان ولا يتركون الكفر وقالوا لو لانزل الخ قال ابو السعد حكاية لبعض اخر من اباطيلهم بعد حكاية ما قالوا فى حق القرآن الكريم و بيان ما يتعلق به و ما من دابة فى الارض الخ لما قدم ذكر الكفار و بين انهم يرجعون الى الله و يحشرون بين ايضا بعده بقوله و ما من دابة الخ انهم يحشرون و المقصود بيان ان الحشروا

لبعث كما هو حاصل في حق الناس فهو ايضاً حاصل في حق الهائم قال المسكين فالمراد
 تفضيع شان الحشر والذين كذبوا الخ قال المسكين بيان لجهلهم و عنادهم مع اقامة البراهين
 لمصلحة من يشأ الله يضلله الخ قال ابو السعود تحقيق للحق و تقرير لما سبق من حالهم ببيان
 انهم من اهل الطبع لا يتاتي منهم الايمان اصلاً قل ارايتكم ان اتكم الخ قال ابو السعود امر
 لرسول الله صلى الله عليه وسلم بان يكتهم ويلقهم الحجر بما لا سبيل لهم الى النكير ولقد
 ارسلنا الى امم الخ اعلم انه تعالى بين في الآية الاولى ان الكفار عند نزول الشدائد يرجعون
 الى الله تعالى ثم بين في هذه الآية انهم لا يرجعون الى الله عند كل ما كان من جنس الشدائد
 بل قديقون مصرين على الكفر منجملين عليه غير راجعين الى الله تعالى فلما نساوا ما ذكروا
 به الخ اعلم ان هذا الكلام من تمام القصة الاولى قل ارايتم ان اخذ الله الخ قال ابو السعود
 امر رسول الله صلى الله عليه وسلم تكرير التبيكيت عليهم و نشية الالتزام الاول قل ارايتكم
 ان اتاكم عذاب الله بغتة الخ قال السعود بتبيكيت اخر لهم بالجاتهم الى الاعتراف باختصاص
 العذاب بهم و ما نرسل المرسلين الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لبيان وظائف
 الرسالة على الاطلاق و تحقيق ما في عهدة الرسل عليهم السلام و اظهار ان ما يتقرحه الكفرة
 عليه عليه السلام ليس مما يتعلق بالرسالة اصلاً قل لا اقول لكم الخ قال ابو السعود استيناف
 مبني على ما اسس من الستة الالهية في شان ارسال الرسل و انزل الكتب مسوق لاظهار تبرية
 عليه السلام عما يدور عليه مقترحاتهم و انذره الذين يخافون الخ قال ابو السعود بعد ما
 حكى لرسول الله صلى الله عليه وسلم ان من الكفرة قوما لا يتعظون ولا يتأثرون امر عليه
 الصلوة والسلام بتوجيه الانذار الى من يتوقع منهم التأثير في الجملة ولا تطرد الذين الخ قال
 ابو السعود لما امر صلى الله عليه وسلم بانذار المذكورين لينتظمو في سلك المتقين نهى
 صلى الله عليه وسلم عن كون ذلك بحيث يؤدي الى طردهم و كذلك فتنا الخ قال
 ابو السعود استيناف مبين لمانشأ عنه ما سبق من النهي هو قديمه تعالى لفقراء المؤمنين في
 امر الدين بتوفيقهم للايمان مع ما هم عليه في امر الدنيا من كمال سوء الحال و اذا جاءك
 الخ قال المسكين امر بتقريبهم اثر النهي عن تبعيدهم و كذلك فصل الخ قال المسكين
 بيان لعادته تعالى المستمرة في تفصيل المهمات اثر التفصيل المذكور قل اني نهيت الخ
 قال ابو السعود امر عليه الصلوة والسلام بالرجوع الى مخاطبة المصرين على الشرك
 الرما امر بمعاملة من عداهم من اهل الانذار والتبشير بما يليق بحالهم قل اني بينة الخ
 قال ابو السعود تحقيق للحق الذي عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم و بيان لاتباعه اياه
 اثر ابطال الباطل الذي عليه الكفرة و بيان عدم اتباعه له ما عندي ما تستعجلون الخ قال
 ابو السعود استيناف مبين لخطأهم في شان ما جعلوه منشأ لتكذيبهم بها و هو علم مجي ما

وعد فيها من العذاب الذي كانوا يستعجلونه و عنده مفاتيح الغيب الخ قال ابو السعود بيان
لاختصاص المقلوبات به تعالى من حيث العلم الربى بيان اختصاص كلها به تعالى من حيث
القدرة و هو الذي يتوفاكم الخ اعلم انه تعالى لما بين كمال علمه بالآية الاولى بين كمال
قدرة بهذه الآية و هو القاهر فوق عباده الخ اعلم ان هذا نوع اخر من الدلائل الدالة على
كمال قدرة الله تعالى و كمال حكمة قل من ينجيكم الخ قال ابو السعود اى قل لهم تقرير الهم
بانحطاط شركائهم عن رتبة الالهية قل هو القادر الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لبيان
انه تعالى هو القادر على القائم فى المهالك الربى بيان انه هو المنجى لهم منها و فيه وعيد
ضمنى بالعذاب لاشراكهم و كذب به الخ قال ابو السعود ايدان لعنهم و مكابرتهم و اذا
رايت الذين يخوضون الخ اعلم انه تعالى فى الآية الاولى بين ان الذين يكذبون بهذا الذين
فانه لا يجب على الرسول ان يلازمهم و ان يكون حفيظا عليهم ثم بين فى هذه الآية ان
اولئك المكذبين ان ضموا الى كفرهم و تكذيبهم الاستهزاء بالدين و الطعن فى الرسول
فانه ينجب الاحتراز عن مقارنتهم و ترك مجالستهم و ما على الذين يتقون الخ قال ابن
عباس قال المسلمون لئن كنا كلما استهزأ المشركون بالقران و خلصوا فيه فناعنهم لما
قلنا على ان نجلس فى المسجد الحرام و ان نطوف بالبيت فنزلت هذه الآية و خصت
الرخصة فيها للمؤمنين بان يفعلوا معهم و يذكروهم و يفهمونهم و ذر الذين اتخلوا الخ قال
المسكين بيان لسوء حالهم فى ضمن الامر بالاعراض عنهم و تذكير لهم بالقران قل اندعوا
من دون الله الخ اعلم ان المقصود من هذه الآية الرد على عبدة الاصنام و هى مؤكدة لقوله
قل انى نهيت و هو الذى خلق السموات الخ اعلم انه تعالى لما بين فى الآيات المتقدمة فساد
طريق عبدة الاصنام ذكر ههنا ما يدل على انه لا معبود الا الله وحده و اذ قال ابراهيم لابه
الخ اعلم انه سبحانه و تعالى كثيرا يحتج على مشركى العرب باحوال ابراهيم عليه السلام
قال ابو السعود الذى يدعون انهم على ملة و تلك حججتنا ايناها الخ اعلم انه تعالى لما حكى
عن ابراهيم عليه السلام انه اظهر حجة الله تعالى فى التوحيد و نصرها و ذب عنها عدد وجوه
نعمه و احسانه عليه فاولها قوله و تلك حججتنا و ثانياها انه تعالى خصه بالرفعة و ثالثها انه جعله
عزيزا فى الدنيا و ذلك لانه تعالى جعل اشرف الناس و هم الانبياء و الرسل من نسله و ذريته
و ما قدره الله حق قدره الخ اعلم انا ذكرنا ان مدار امر القران على البات التوحيد و النبوة
و المعاد و انه تعالى لما حكى عن ابراهيم عليه السلام انه ذكر دليل التوحيد و ابطال الشرك
و قرر تعالى ذلك الدليل بالوجه الواضح شرع بعلمه فى تقرير امر النبوة و هنا كتاب انزلناه الخ
اعلم انه تعالى لما ابطال بالدليل قول من قال ما انزل الله على بشر من شى ذكر بعلمه ان
القران كتاب الله انزل الله تعالى على محمد عليه الصلوة و السلام و من اظلم ممن اتى الخ

اعلم انه تعالى لما شرح كون القرآن كتاباً نازلاً من عند الله ذكر عقبه ما يدل على و عيد من ادعى النبوة والرسالة على سبيل الكذب والافتراء ولقد جئتمونا فرادى الخ قال المسكين توبيخ لهم من الله تعالى بعد التوبيخ من الملكة ان الله فائق الحب الخ اعلم انه تعالى لما تكلم في التوحيد ثم ارد فيه بتقرير امر النبوة ثم تكلم في بعض بتقاريع هذا الاصل عادهنا الى ذكر الدلائل الدالة على وجود الصانع و كمال علمه و حكمته تنبيها على ان المقصود الاصل من جميع المباحث العقلية والتقليدية و كل المطالب الحكمية انما هو معرفة الله تعالى بذاته و صفاته و افعاله فائق الاصباح الخ هذا نوع اخر من الدلائل و هو الذي جعل لكم الخ هذا هو النوع الثالث من الدلائل و هو الذي انشاكم الخ هذا نوع رابع و هو الذي انزل الخ هذا النوع الخامس و جعلوا لله شركاء الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما ذكر هذه البراهين الخمسة من دلائل العالم الاسفل و العالم الاعلى على ثبوت الالهية و كمال القدرة و الرحمة ذكر بعد ذلك ان من الناس من اثبت الله شركاء بديع السموات و الارض الخ اعلم انه تعالى لما بين فساد قول المشركين شرع في اقامة الدلائل على فساد قول من يثبت له الولد ذلكم الله ربكم الخ قال المسكين كانه فذلكه لجميع ما سبق مبينة لتوحده و عظمته قد جاءكم بصائر الخ قال المسكين بيان لفخامة الآيات المذكورة الدالة على تحقيق الحق و ابطال الباطل و كذلك نصرف الخ قال المسكين بيان لحسن تصريف الآيات و ضلال بعض و هداية بعض اتبع ما اوحى اليك الخ قال المسكين امر له عليه السلام بالثبات على تلك الآيات اثر بيان فحامتها و حسن تصريفها و قدح المشركين فيها و بعدم الاعتداد بهم و بابا طيلهم و لو شاء الله الخ قال المسكين كانه تسلية له عليه السلام في اشراكهم معرضين عن الآيات و لا تسبوا الذين يدعون الخ قال المسكين لما ذكر في الآيات السابقة جهلهم و عنادهم فلا يبعدان يفضب بعض المسلمين و يشتموهم و الهتهم فنهى الله تعالى عنه و اقسما بالله الخ لما ذكر فيما قبل ان الآيات المنزلة لم تنفع المشركين ذكر ههنا انهم طلبوا الآيات المفترحة تعصباً و عناداً و ذكر جوابه و نقل الخ قال المسكين مقرر لمضمون الجواب المذكور و لو اتنا نزلنا اليهم الخ اعلم انه تعالى بين في هذه الآية تفصيل ما ذكره على سبيل الاجمال بقوله ما يشعركم و كذلك جعلنا الخ قال ابوالسعود كلام مبتدأ مسوق لتسلية رسول الله صلى الله عليه وسلم عما كان يشاهده قال المسكين من اعراضهم عن الآيات الالهية واصغائهم الى زخرف القول و لتصغى اليه الخ قال المسكين هو متمم للآية الاولى اذ اذغير الله ابتغى الخ اعلم انه تعالى كما حكى عن الكفار انهم اقسما الخ و اجاب عنه بانه لا فائدة في اظهار تلك الآيات لانه تعالى لو اظهرها لبقوا مصرين على كفرهم ثم انه تعالى بين في هذه الآية ان الدليل الدال على نبوة قد حصل و كمل فكان ما يطلبونه طلباً للزيادة و ذلك مما

لا يجب الالتفات اليه و انما قلنا ان الدليل الدال على نبوة قد حصل بوجهين الاول قوله و هو الذى انزل اليكم الكتاب والثانى قوله والذين اتيناهم الكتاب و قال ابو السعود قوله تعالى و الذين اتيناهم الكتاب كلام مستأنف غير داخل تحت القول المقدر مسوق من جهة تعالى لتحقيق حقية الكتاب الذى نيط به امر الحكمة قال المسكين و لعل هذا هو الاقرب لان الكلام فى تحقيق كون الآيات حقة صادقة لا فى امر النبوة و تمت كلمة ربك الخ قال ابو السعود شروع فى بيان كمال الكتاب المذكور من حيث ذاته اثر بيان كماله من حيث اضافة اليه تعالى بكونه منزلا منه بالحق و تحقيق ذلك بعلم اهل الكتاب به و ان تطع اكثر من فى الارض الخ قال المسكين تحذير عن اتباع من اعرض عن الآيات التامة الصادقة العادلة ان ربك هو اعلم الخ قال المسكين تقرير لما قبله اى لما كان الله تعالى عالما بالواقع فمن حكم عليه بالضلال فهو ضال لاشك فكلوا مما ذكر اسم الله عليه الخ قال ابو السعود امر مرتب على النهى عن اتباع المضلين الذين من جملة اضلالهم تحليل الحرام و تحريم الحلال قال المسكين اى خلاف الآيات و خذوا الخ اعلم انه تعالى لما بين انه فصل المحرمات اتبعه بما يوجب تركها بالكلية او من كان ميتا الخ اعلم انه تعالى لما ذكر فى الآية الاولى ان المشركين يجادلون المؤمنين فى دين الله ذكر مثلا يدل على حال المؤمن المهتدى و على حال الكافر الضال و كذلك جعلنا الخ قال المسكين تامة لحال المضلين المجادلين و فى ضمنه تسلية لرسول الله صلى الله عليه وسلم و اذا جاءهم اية قالوا ان تؤمن الخ قال المسكين رجوع الى بيان حال المعرضين عن الآيات المصرين على الجهالات فمن يرد الله ان يهديه الخ قال المسكين بيان ان الانتفاع بالآيات بمحض فضل الله تعالى فلا فائدة فى اظهار مقترحاتهم و هذا صراط ربك الخ قال المسكين بيان لكون مدلول الآيات حقا فاعالمتذكرين المستحقين لدار السلام و ولاية الله تعالى و يوم نحشرهم جميعا الخ اعلم انه تعالى لما بين حال من يتمسك بالصراط المستقيم بين بعده حال من يكون بالضد من ذلك لتكون قصة اهل الجنة مردفة بقصة اهل النار يمعشرا الجن والانس الخ قال ابو السعود شروع فى حكاية ما سيكون من توبيخ المعشرين و تفرغهم بتفريطهم فيما يتعلق بخصوصة انفسهم الر حكاية توبيخ معشر الجن باغواء الانس و اضلالهم و بيان مال امرهم ذلك ان لم يكن الخ اعلم انه تعالى لما بين انه ما عذاب الكفار الابدان بعث اليهم الانبياء و الرسل بين بهذه الآية ان هذا هو العدل و الحق و لكل درجات الخ اعلم انه تعالى لما شرح احوال اهل الثواب و الدرجات و احوال اهل العقاب و الدرجات ذكر كلاما كلييا و ربك الفنى الخ بين ان تخصيص المطيعين بالثواب و المذنبين بالعذاب ليس لاجل انه محتاج الى طاعة المطيعين او ينتقص بمعصية المذنبين قل يقوم اعمالوا الخ اعلم انه لما

بين بقوله انما توعلون امر رسوله من بعده ان يهدد من ينكر البعث من الكفار و جعلوا الله الخ اعلم انه تعالى لما بين قبح طريقتهم في انكارهم البعث والقيامة ذكر عقيبه انواعا من جهالاتهم و ركازات اقوالهم وكذلك زين الخ اعلم ان هذا هو النوع الثاني من احكامهم الفاسدة و مذاهبهم الباطلة قالوا هذه انعام الخ اعلم ان هذا نوع ثالث من احكامهم الفاسدة وقالوا اما في الخ هذا نوع رابع من انواع قضاياهم الفاسدة وهو الذي انتاجت الخ قال ابو السعود تمهيد لما سيأتي من تفصيل احوال الانعام اى هو الذي انشا من غير شركة لاحد في ذلك بوجه من الوجوه و من الانعام حمده قال ابو السعود شروع في تفصيل حال الانعام و ابطال ما تقولوا على الله تعالى في شأنها بالتحريم والتحليل قل لا اجد فيما اوحى الخ اعلم انه تعالى لما بين فساد طريقة اهل الجاهلية فيما يحل ميحرم من المطعومات اتبعه بالبيان الصحيح في هذا الباب يقول الذين اشركوا الخ قال ابو السعود حكاية لئن اخر من كفرهم قل هلم شهداء كم الخ اعلم انه تعالى لما ابطال على الكفار جميع انواع حججهم بين انه ليس لهم على قولهم شهود البتة قل تعالوا الخ اعلم انه تعالى لما بين فساد ما يقوله الكفار ان الله حرم علينا كذا وكذا اردفه ببيان الاشياء التي حرمها عليهم و ان هذا صراطى الخ اعلم انه تعالى لما بين في الايتين المتقلمتين ما وحي به اجمل في اخره اجمالا يقتضى دخول ما تقدم فيه و دخول سائر الشريعة فيه ثم اتينا موسى الخ قال ابو السعود كلام مسوق من جهة تعالى تقرير اللوصية و تحقيقا لها و تمهيدا لما يعقبه من ذكر انزال القران المجيد كما بينى عنه تغيير الاسلوب بالالفاظ الى التكلم هل ينظرون الخ اعلم انه تعالى لما بين انه انزل الكتاب ازالة للعنبر وازاحة للعلة بين انهم لا يؤمنون البتة و شرح احوالا توجب الباس عن دخولهم في الايمان ان الذين فرقوا الخ قال ابو السعود استيناف لبيان احوال اهل الكتابين اثر بيان احوال لمشركين من جاء بالحسنة الخ قال ابو السعود استيناف مبين لمقادير جزية العاملين قل اننى هدنتى الخ قال ابو السعود امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بان يبين لهم ما هو عليه من الدين الحق الذى يدعون انهم عليه وقد فارقه بالكلية قل ان صلاتى الخ قال ابو السعود عيد الامر لما ان الما موربه معلق بفروع الشرائع و ما سبق باصولها قل اغير الله ابغى الخ اعلم انه تعالى لما امر محمدا صلى الله عليه وسلم بالتوحيد المحض امره بان يذكر ما يجرى مجرى الدليل على صحة هذا التوحيد ثم بين انه لا يرجع اليه من كفرهم و شركهم ذم ولا عقاب ثم بين تعالى ان رجوع هؤلاء الشركين الى موضع لاحاكم فيه ولا امر الا الله تعالى وهو الذى جعلكم الخ قال المسكين بين في هذه الآية الامور الحاملة على امتثال جميع الاوامر من النعم والاجتناب عن جميع النواهي من النقم فكانها تأكيد و تقرير لجميع ما في السودة مع غيرها والله اعلم

سورة الاعراف

اتبعوا ما انزل الخ اعلم ان امر الرسالة انما يتم بالمرسل و هو الله سبحانه و تعالى و المرسل و هو الرسول و المرسل اليه و هو الامة فلما امر في الآية الاولى الرسول بالتبليغ و الانذار مع قلب قوى و عزم صحيح امر المرسل اليه و هو الامة فلما امر في الآية الاولى الرسول بالتبليغ و الانذار مع قلب قوى و عزم صحيح امر المرسل اليه و هم الامة بمتابعة الرسول و كم من قرية اهلكناها الخ اعلم انه تعالى لما امر الرسول عليه الصلوة و السلام بالانذار و التبليغ و امر القوم بالقبور و المتابعة ذكر في هذه الآية ما في ترك المتابعة و الاعراض عنها من الوعيد فلنستلن الذين الخ قال ابو السعود بيان لعذابهم الاخرى الربيان عذابهم الدنيوى خلا انه قد تعرض لبيان مبادئ احوال المكلفين جميعاً لكونه ادخل في التهويل و الوزن يومئذ الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية الاولى السؤال و الحساب بين في هذه الآية وزن الاعمال و لقد مكنناكم في الارض الخ اعلم انه تعالى لما امر الخلق بمتابعة الانبياء عليهم السلام ثم خوفهم بعذاب الدنيا ثم خوفهم بعذاب الآخرة رغبتهم في هذه الآية بطريق اخر وهو انه كثرت نعم الله عليهم و كثرة النعم توجب الطاعة و لقد خلقناكم الخ قال ابو السعود تذكير لنعمة عظيمة فاتضة على ادم عليه السلام سارية الى ذرية موجبة لشكرهم كاف يا بنى ادم قد انزلنا الخ في نظم الآية و جهان الاول انه تعالى لما بين انه امر ادم و حواء بالهبوط الى الارض و جعل الارض مستقرا بين بعده انه تعالى انزل كل ما يحتاجون اليه في الدين و الدنيا من جملتها اللباس الوجه الثانى انه تعالى لما ذكر واقعة ادم في انكشاف العورة و انه كان يخصف الورق عليها اتبعه بان بين انه للخلق اللباس للخلق ليستروا بها عورتهم و نبيه على المنته العظيمة على الخلق بسبب انه اقدرهم على التستر يا بنى ادم لا يفتنكم الخ اعلم ان المقصود من ذكر قصص الانبياء عليهم السلام حصول العبرة لمن يسمعها فكانه تعالى لما ذكر قصة ادم و بين فيها شدة عداوة الشيطان لأدم و اولاده اتبعها بان حذر اولاد ادم من قبول وسوسة الشيطان و اذفعلوا فاحشة الخ قال المسكين بيان لولاية الشيطان للكافرين في فعلهم الفاحشة و تقليدهم الباطل و افتراء هم على الله تعالى قل امر ربي بالقسط الخ اعلم انه تعالى لما بين

لما بين في اخر السورة المقدمة ملك النبي صلى الله عليه وسلم و ما هو عليه من الدين الحق بقوله قل
 البنى هلاني الخ امر في اول هذه السورة بتبليغ دينه ذلك الى الناس و ايضا كان المذكور في خاتمة السورة الاول
 كونه تعالى سريع الحساب و ذكر في اول هذه السورة سوال الامم و الانبياء و الوزن فحصلت المناسبة بهذين
 الوجهين ۱۲ منه عفى عنه

امر الامر بالفحشاء بين تعالى ان يأمر بالقسط والعدل و اقيموا و جوهكم الخ قال المسكين هذا من جملة القسط و كذا قوله و ادعوه ثم اشار بقوله كما برأكم الى وقوع الجزاء ثم بين حال القائمين بالقسط و الناكبين عنه بقوله فريقاً هدى ثم عال ضلالتهم بقوله انهم اتخذوا الخ يا بنى آدم خذوا الخ اعلم ان الله تعالى لما امر بالقسط في الآية الاولى و كان من جملة القسط امر اللباس و امر الماكول و المشروب لاحرم اتبعه بذكرهما قل انما حرم ربي الفواحش الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية الاولى ان الذى حرّمه ليس بحرام بين في هذه الآية انواع المحرمات و لكل امة اجل الخ انه تعالى لما بين الحلال و الحرام و احوال التكليف بين ان لكل احد اجلا معينا لا يتقدم ولا يتأخر و اذا جاء ذلك الاجل مات لامحالة و الغرض منه التخويف ليتشدد المرء في القيام بالتكليف كما ينبغي يا نبى آدم اماياتينكم الخ اعلم انه تعالى لما بين احوال التكليف و بين ان لكل احد اجلا معينا لا يتقدم ولا يتأخر بين انهم بعد الموت انه كانوا مطيعين فلا خوف عليهم و لا حزن و ان كانوا متمردين و اقموا فى اشد العذاب فمن اظلم من القري الخ اعلم ان قوله تعالى فمن اظلم يرجع الى قوله و الذين كذبوا قال ادخلوا فى امم الخ اعلم ان هذه الآية من بقية شرح احوال الكفار و هو انه تعالى يدخلهم النار ان الذين كذبوا الخ اعلم ان المقصود منه اتمام الكلام فى وعيد الكفار و الذين امنوا و عملوا الخ اعلم انه تعالى لما استوفى الكلام فى الوعيد اتبعه بالوعد فى هذه الآية و نادى اصحاب الجنة الخ اعلم انه تعالى لما شرح وعيد الكفار و ثواب اهل الايمان و الطاعات اتبعه بذكر المناظرات التى تلور بين الفريقين و لقد جئناهم بكتاب الخ اعلم انه تعالى لما شرح احوال اهل الجنة و اهل النار و اهل الاعراف ثم شرح الكلمات الدائرة بين هؤلاء الفرق الثلاث على وجه يصير سماع تلك المناظرات حاملا للمكلف على الحذر و الاحتراز و داعياله الى النظر و الاستدلال بين شرف هذا الكتاب الكريم و نهاية منفعة هل ينظرون الخ اعلم انه تعالى لما بين ازاخة العلة لست انزال هذا الكتاب المفصل الموجب للهداية و الرحمة بين بعده حال من كذب ان ربكم الله الخ اعلم انا بينا ان مدار القرآن على تقرير هذه المسائل الاربعة و هى التوحيد و النبوة و المعاد و القضاء و القدر و لا شك ان مدار اثبات المعاد على اثبات التوحيد و القدرة و العلم فلما بالغ الله تعالى فى تقرير المعاد عاد الى ذكر الدلائل الدالة على التوحيد و كمال القدرة و العلم لتصرى تلك الدلائل مقررة لاصول التوحيد و مقررة ايضا لاثبات المعاد و ادعوا ربكم الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الدلائل الدالة على كمال القدرة و الحكمة و الرحمة اتبعه بذكر الاعمال اللاتفة بتلك و هو الذى يرسل الرياح الخ لما ذكر دلائل الالهية و كمال العلم و القدرة من العالم العلوى اتبعه بذكر الدلائل من بعض احوال العالم السفلى قال

المسكين واستدل في ضمنه على صحة البعث بقوله كن لك نخرج الموتى والبلدة لطيب الخ قال ابو السعود و هذا كما ترى^١ مثل لارسال الرسل عليهم السلام بالشرائع التي هي ماء حيلة القلوب الى المكلفين المنقسمين الى المقتبسين من نوارها والمحرومين من مغانم الثارها و قد عقب ذلك بما يحققه و يقرره من قصص الامم الخالية بطريق الاستيناف فقيل و لقد ارسلنا نوحا الخ في الكبير^٢ اعلم انه تعالى لما ذكر في تقدير المبدأ والمعاد دلائل ظاهرة و بينات قاهرة و براهين باهرة البعها بذكر قصص الانبياء عليهم السلام و فيه فوائد احدها التبيه على ان اعراض الناس عن قبول هذه الدلائل من خواص قوم محمد عليه الصلوة والسلام بل هذه العادة المذمومة كانت حاصلة في جميع الامم و السالفة و المصيبة اذا عمت خفت فيفيد تسلية الرسول عليه السلام و ثاليها انه تعالى يحكى في هذه القصص ان عاقبة المنكرين كان الى الكفر واللعن والخسارة و عاقبة امر المحققين الى الدولة والسعادة و ذلك يقوى قلوب المحققين و يكسر قلوب المبطلين و ثالثها التبيه على انه تعالى و ان كان يمهل هؤلاء المبطلين ولكنه لا يهملهم بل ينتقم منهم على اكمل الوجوه و رابعها بيان ان هذه القصص دالته على نبوة محمد عليه الصلوة والسلام لانه عليه السلام كان اميا و ما طالع كتابا ولا تلمذ استاذ فاذا ذكر هذه القصص على الوجه من غير تحريف ولا خطأ دل ذلك على انه انما عرفها بالوحى من الله و ذلك يدل على صحة نبوته و ما ارسلنا في قرية الخ قال ابو السعود اشارة اجمالية الى بيان احوال سائر الامم اثر بيان احوال الامم المذكورة تفصيلا ولو ان اهل القرى الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية الاولى ان الذين عصوا و تمردوا اخذهم الله بغتة بين في هذه الآية انهم لو اطاعوا الفتح الله عليهم ابواب الخيرات او لم يهدل للذين يرتون الخ اعلم انه تعالى لما بين فيما تقدم من الآيات حال الكفار الذين اهلكهم الله تعالى بالاستيصال مجملا و مفصلا اتبعه بيان الغرض من ذكر هذه القصص حصول العبرة لجميع المكلفين في مصالح اديانهم و طاعتهم ثم بعثنا من بعدهم موسى^٣ الخ اعلم ان هذا هو القصة السادسة من القصص التي ذكرها الله تعالى في هذه السورة و ذكر في هذه القصة من الشرح والتفصيل ما لم يذكر في سائر القصص لاجل ان معجزات موسى كانت اقوى و جهل قومه كان اعظم و الفحش الذين يتبعون الرسول النبى الامى الخ اعلم انه تعالى لما بين ان من صفة من يكتب له الرحمة التقوى و ايتاء الزكوة و الايمان بالآيات ضم الى ذلك ان يكون من صفة اتباع النبى الامى فكانه تعالى بين بهذه الآية ان هذه الرحمة لا يفوز بها من بنى اسرائيل الامن

١ له بصورته مناسب لقوله فانزلنا به الماء فاخرجنا به من كل الثمرات بمعناه مناسب لقوله و لقد جنتاهم بكتاب فصلناه بحيث المادوجه الضييد بقوله لقوم يؤمنون ١٢ منه^٢ صرح به لتلايشته على الناظر بانه من تفسير الى السعدا^٣ الى اخر القصة ١٢ منه

انقى واتى الزكوة وامن بالدلائل في زمن موسى و من هذه صفت في ايام الرسول اذا كان مع ذلك متبعاً للنبي الامي في شرائعه قل يا ايها الناس الخ قال ابو السعود لما حكى ما في الكتابين من نعوت رسول الله صلى الله عليه وسلم و شرف من يتبعه من اهلها و نيلهم السعادة الدارين امر عليه الصلوة والسلام ببيان ان تلك السعادة غير مختصة بهم بل شاملة لكل من يتبعه كائناً من كان ببيان عموم رسالة للفقيرين مع اختصاص رسالة سائر الرسل عليهم السلام باقوامهم و من قوم موسى امة الخ قال ابو السعود كلام مبتدأ مسوق لدفع ما عسى يوهمه تخصيص كتب الرحمة والتقوى والايمان بالآيات بمتبعي رسول الله صلى الله عليه وسلم من حرمان اسلاف قوم موسى من كل خير و بيان ان كلهم ليسوا كما حكيت احوالهم بل منهم امة الخ و قطعناهم اثنتي عشرة الخ قال المسكين هذا بقية من حكاية قصة بنى اسرائيل واسألهم عن القرية التي الخ قال المسكين هذا ايضاً بعض قبائح اليهود و اذا ذن ربك الخ قال المسكين هذا بيان الجزاء من الذل والصغار اثر بيان قبائحهم و قطعناهم في الارض الخ هذا ايضاً من بقايا احوالهم الى قوله تعالى واذنقنا الجبل الخ و اذا حل ربك الخ لما شرح قصة موسى عليه السلام مع توابعها على اقص الوجوه ذكر في هذه الآية ما يجري مجرى تقرير الحجة على جميع المكلفين و اتل عليهم نبأ الذي الخ قال المسكين هذا تقييح لمن ضل بعد العلم والهدى كبعض علماء بنى اسرائيل الذين ذكرت اخبارهم فيما قبل او كل من ذكره الله تعالى باياته و موثيقه التي اخذها في عالم النرك كما يدل عليه قوله تعالى ذلك مثل الذين كذبوا الخ ساء مثلاً القوم الذين الخ اعلم انه تعالى لما قال بعد تمثيلهم بالكلب ذلك مثل القوم الذين كذبوا باياتنا و زجر بذلك عن الكفر والتكذيب الكره في باب الزجر بقوله ساء مثلاً من يهدى الله الخ اعلم انه تعالى لما وصف الضالين بالوصف المذكور و عرف حالهم بالمثل المذكور بين في هذه الآية ان الهدايت والضلالة من الله تعالى و لقد ذرانا لجهنم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مقرر لمضمون ما قبله بطريق التذييل و لله الاسماء والحسنى الخ قال ابو السعود تنبيه للمؤمنين على كيفية ذكره تعالى و كيفية المعاملة مع المخلين بذلك الغافلين عنه سبحانه و عما يليق به اثر بيان غفلتهم التامة و ضلالتهم الطامة و ممن خلقنا امة يهدون الخ اعلم انه تعالى لما قال و لقد ذرانا فاخبر ان كثيرا منهم مخلوقون للنار اتبعه بقوله و ممن خلقنا امة ليبين ايضاً ان كثيرا منهم مخلوقون للجنة والذين كذبوا باياتنا الخ اعلم انه تعالى لما ذكر حالي الامة الهادية العادلة اعاد ذكر المكلفين بايات الله تعالى و ما عليهم من الوعيد اولم يتفكروا الخ قال ابو السعود كلام مبتدأ مسوق لانكار عدم تفكرهم في شأنه عليه الصلوة والسلام وجهكهم بحقيقة حال الموجبة للايمان به وبما انزل عليه من الآيات التي كذبوا بها اولم ينظروا في ملكوت الخ قال ابو السعود استيناف

آخر مسوق للانكار والتوايخ باخلالهم بالتامل في الآيات التكوينية المنصوبة في الأفاق
والانفس الشاهدة لحصة مضمون الآيات المنزلة اثر ما فعى عليهم باخلالهم بالتفكر في
شانه عليه الصلوة والسلام من يضل الله الخ قال ابو السعود استيناف مقرر لما قبله مني
عن الطبع على قلوبهم يستلونك عن الساعة الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لبيان
بعض احكام ضلالهم و طغيانهم قل لا املك الخ قال ابو السعود شروع في الجواب عن
السؤال ببيان عجزه عن علمها اثر بيان عجز الكل عنه وابطال زعمهم الذي بنوا عليه سؤالهم
من كونه عليه الصلوة والسلام ممن يعلمها هو الذي خلقكم من نفس واخذة الخ اعلم انه
تعالى رجع في هذه الآية الى تقرير امر التوحيد وابطال الشرك خذ العفو الخ قال ابو السعود
بعد ما علمنا اباطيل المشركين و قبايحهم مالا يطاق تحمله امر عليه السلام بجامع مكارم
الاخلاق التي من جملتها الاغضاء عنهم و اما ينزغتك الخ قال ابو زيد لما نزل قوله و اعرض
عن الجاهلين قال النبي صلى الله عليه وسلم كيف يارب والغضب فنزل قوله و اما ينزغتك
ان الذين اتقوا الخ قال ابو السعود استيناف مقررهما قبله ببيان ان ما امر به عليه السلام من
الاستعاذة بالله تعالى سنة مسلوكت للمؤمنين و الاخلال بهاديدن الغاوين و اذا لم تأتهم باية الخ
قال المسكين عود الى اثبات حقيقة الآيات المنزلة عليه السلام و كفايتها في امر الايمان و
اغنائها عن الآيات المقترحة و اذا قرئ الخ قال ابو السعود ارشاد الى طريق الفوز بما
اشير اليه من المنافع الجليلة التي ينطوي عليها القران و اذكر ربك الخ قال المسكين
لما كانت التلاوة المذكورة منه عليه السلام بالجهر ليتمكن السامع من استماعه امر في
هذه الآية بالذكر الخفي لفي حق الجلوة و الخلو ان الذين عند ربك الخ لما رغب الله
رسوله في الذكر و في المواظبة عليه ذكر عقيه ما يقوى دواعيه في ذلك

سورة الانفال

انما المؤمنون الذين الخ اعلم انه تعالى لما قال واطيعوا الله ورسوله ان كنتم مؤمنين و اقتضى ذلك كون الايمان مستلزما للطاعة شرح ذلك فى هذه الآية مزيد شرح و تفصيل و بين ان الايمان لا يحصل الا عند حصول هذه الطاعات كما اخرجك ربك الخ قال المسكين عود الى حكم الانفال و التشبيه فى الكراهة حالا و الموافقة للحكمة مالا و اذيعدكم الله الخ قال المسكين تفصيل لقصة بدر يايتها الذين امنوا اذا القيم الخ قال ابو السعود خطاب للمؤمنين بحكم كلى جار فيما سيقع من الوقايح و الحروب جى به فى تضاعيف القصة اظهار الاعتناء بشانه و مبالغة فى حضهم على المحافظة عليه فلم تقتلوهم الخ قال ابو السعود رجوع الى بيان بقية احكام الواقعة و احوالها و تقرير ما سبق منها ان تستفتحوا فقد الخ قال ابو السعود خطاب لاهل مكة على سبيل التهكم بهم و ذلك انهم حين ارادوا الخروج تعلقوا باستار الكعبة و قالوا اللهم انصر على الجندين و اهدى الفتتين و اكرم الحزبين يايتها الذين امنوا اطيعوا الخ قال المسكين لما خاطب اهل مكة بالتهكم امر المؤمنين بان لا يكونوا امثلهم بل يطيعوا الله و رسوله و اتقوا فتنة الخ قال المسكين لما امر فى الآية الاولى بالطاعة و الاستجابة امر فى هذه الآية بحمل غيرهم عليها بالامر بالمعروف و النهى عن المنكر و اذكروا اذا اتم الخ قال المسكين بيان لموجبات الطاعة من النعم الجليلة يايتها الذين امنوا لا تخونوا الله الخ قال المسكين لما امر فيما قبل الطاعة نهى ههنا عن المعصية و الخيانة و لما كان الحامل عليها فى الاغلب حب المال و الولد شرح كونهما فتنة يايتها الذين امنوا ان تقوا الله الخ قال المسكين فيه الحض على التقوى و بيان كونه مدار السعادة الدنيا و الاخرة اثر الا مر به فيما قبل و اذيعدكم الخ اعلم انه تعالى لما ذكر المؤمنين نعمه عليهم بقوله و اذكروا اذا اتم قليل فكذلك ذكر رسوله نعمه عليه و اذا تلخ عليهم ايثنا الخ اعلم انه تعالى لما حكى مكرهم فى ذات محمد حكى مكرهم فى دين محمد صلى الله عليه وسلم و ما كان الله ليعذبهم الخ

ل لما ابطال طريقة المشركين فى خاتمة السورة السابقة و هو الجهاد باللسان بين فى هذه السورة احكام الجهاد

قال ابو السعود جواب لكلمتهم الشفاء و بيان للموجب لامهالهم والتوقف في اجابة دعائهم و مالهم ان لا يعذبهم الخ قال ابو السعود بيان لاستحقاقهم العذاب بعد بيان ان المانع ليس من قبلهم و ما كان صلاتهم الخ قال ابو السعود مساق الكلام لتقرير استحقاقهم العذاب او عدم ولايتهم للمسجد فانها لاتليق بمن هذه صلاته ان الذين كفروا ينفقون الخ اعلم انه تعالى لما شرح احوال هؤلاء الكفار في الطاعات البدنية اتبعها بشرح احوالهم في الطاعات المالية قال المسكين و حسن موقعها ههنا نزولها في المطعمين يوم بدر قل للذين كفروا الخ اعلم انه تعالى لما بين صلاتهم في عباداتهم البدنية و عباداتهم المالية ارشدهم الى طريق الصواب و قاتلوهم حتى الخ اعلم انه تعالى لما بين ان هؤلاء الكفار ان اتوا عن كفرهم حصل لهم الغفران و ان عادوا فهم متوعدون بسنة الاولين اتبعه بان امر بقتالهم اذا اصرروا واعلموا ان ماغنمتم الخ اعلم انه تعالى لما امر بالمقاتلة في قوله و قاتلوهم و كان من المعلوم ان عند المقاتلة قد تحصل الغنيمة لاجرم ذكر الله تعالى حكم الغنيمة اذ انتم بالعدوة الدنيا الخ قال المسكين متعلق ببدر يا ايها الذين امنوا اذا القيمتم الخ اعلم انه تعالى لما ذكر انواع نعمه على الرسول و على المؤمنين يوم بدر علمهم اذا التقوا الثبات و ان يذكروا الله كثيراً و اذنين لهم الشيطان الخ قال المسكين هذا ايضا متعلق ببدر ولو ترى اذ يتوفى الخ اعلم انه تعالى لما شرح احوال هؤلاء الكفار شرح احوال موتهم و العذاب الذي يصل اليهم كذاب ال فرعون الخ لما بين ما انزله باهل بدر من الكفار عاجلا و اجلا اتبعه بان بين ان هذه طريقة و سنته في الكل فقال كذاب الخ ثم ذكر ما يجري مجرى العلة في العقاب الذي انزله بهم فقال ذلك بان الله الخ ان شر الدواب الخ قال ابو السعود بعدما شرح احوال المهلكين من شرار الكفرة شرع في بيان احوال الباقيين منهم و تفصيل احكامهم فاما ثقتهم الخ قال ابو السعود شرع في بيان احكامهم بعد تفصيل احوالهم و لا يحسن الذين كفروا سبقوا الخ اعلم انه تعالى لما بين ما يفعل الرسول في حق من يجده في الحرب و يتمكن منه و ذكر ايضا ما يجب ان يفعله فيمن ظهر منه نقض العهديين ايضا حال من فاته في يوم بدر و غيره و اعدوا لهم الخ اعلم انه تعالى لما اوجب على رسوله ان يشرد من صدر عنه نقض العهد و ان يبذال العهد الى من خاف منه النقض امره في هذه الآية بالاعداد لهؤلاء الكفار قال ابو السعود او لقتال الكفار على الاطلاق و هو الانسب لسياق النظم الكريم و ان جنحوا الخ اعلم انه لما بين ما يرهب

به العدو من القوة والاستظهار بين بعده انهم عند الارهاب اذا جنحوا الى مالوا الى الصلح
فالحكم قبول الصلح قال المسكين ثم لما كان في الصلح احتمال الخداع و غلبه بحسبانه
تعالى اياه و علله بنصره وبالمؤمنين في قوله و ان يريدوا الخ يا ايها النبي حسبك الله و من
اتبعتك الخ قال ابو السعود شروع في بيان كفاية تعالى اياه عليه الصلوة والسلام في جميع
اموره وامور المؤمنين او في الامور الواقعة بينهم و بين الكفرة كافة اثر بيان كفايته تعالى اياه
عليه الصلوة والسلام في مادة حاصته يا ايها النبي حرض الخ بعد ما بين كفايته اياهم بالنصروا
لامداد امر عليه الصلوة والسلام بترتيب مبادئ نصره و امداده ما كان لنبي ان يكون الخ
واعلم ان المقصود من هذه الآية تعليم حكم اخر من احكام الغزو والجهاد في حق النبي صلى
الله عليه وسلم يا ايها النبي قل لمن في ايديكم الخ اعلم ان الرسول لما اخلا لقتاء من الاسارى و
شق عليهم اخذ اموالهم منهم ذكر الله تعالى هذه الآية استماله لهم ان الذين امنوا وهاجروا
الى اخر السورة اعلم انه تعالى قسم المؤمنين في زمان الرسول صلى الله عليه وسلم الى اربعة
اقسام و ذكر حكم كل واحد منهم و تقرير هذه القسمة انه عليه السلام ظهرت نبوة بمكة
ودعا الناس هناك الى الذين ثم انتقل من مكة الى المدينة فحين هاجر من مكة الى المدينة
صار المؤمنون على قسمين منهم من واقعه في تلك الهجرة و منهم من لم يوافقها فيها بل
بقى هناك اما القسم الاول فهم المهاجرون الاولون و قد وصفهم بقوله ان الذين امنوا الخ
و انما قلنا ان المراد منهم المهاجرون الاولون لانه تعالى قال في اخر الآية والذين امنوا من
بعدها جروله و اما القسم الثاني من المؤمنين الموجودين في زمان محمد صلى الله عليه
وسلم فهم الانصار او وانصروا القسم الثالث من اقسام مؤمنى زمان الرسول عليه السلام
و هم المؤمنون الذين ما وافقوا الرسول في الهجرة و بقوا في مكته و هم المعنيون بقوله والذين
امنوا ولم يهاجروا القسم الرابع من مؤمنى زمان محمد صلى الله عليه وسلم هم الذين لم
يوافقوا الرسول في الهجرة الا انهم بعد ذلك هاجروا اليه و هو المراد من قوله تعالى والذين
امنوا من بعد قال المسكين لما كانت الوظيفة هو الجهاد وقت القدرة والهجرة عند العجز
ذكر الهجرة و بعض احكامها بعد ذكر الجهاد

سورة التوبة

ما كان للمشركين ان يعمرُوا مساجد الله الخ اعلم انه تعالى بدء السورة بذكر البراءة عن الكفار و بالغ في ايجاب ذلك و ذكر من انواع فضائحهم و قبائحهم ما يوجب تلك البراءة قال المسكين و اشعر ذلك باهانتهم اجاب عما افتخروا بها يا ايها الذين امنوا لا تتخذوا اباءكم الخ قال المسكين اخذ من الكبير لما بالغ في البراءة عن الكفار كان مظنة ان يقال ان البراءة عن الاقارب صعب جدا فذكرها في هذه الآية لقد نصركم الله في مواطن الخ قال المسكين لما امر الله تعالى فيما قبل بترجيح موالة الله تعالى على موالة غيره و القطع عما سواه الكد به بتذكير واقعة حنين و اضرابها بان كثرة جماعتكم لم تغن شيئا و انما نفعكم نصر الله تعالى فحق عليكم التوكل عليه لا على غيره يا ايها الذين امنوا انما المشركون الخ لما امر صلى الله عليه وسلم عليا ان يقرأ على مشركي مكة اول سورة براءة و ينذالهم عهدهم قال الناس ستعلمون ما تلقونه من الشدة لانقطاع السبل و فقد الحمولات فنزلت هذه الآية و اجاب الله تعالى بقوله و ان خفتم علياً قاتلوا الذين قال ابو السعود امرهم بقتال اهل الكتابين الرامرهم بقتال المشركين و قالت اليهود الخ قال ابو السعود جملة مبتدأة سيقف لتقرير ما مر من عدم ايمان اهل الكتابين بالله سبحانه و انتظامهم بذلك في سلك المشركين اتخذوا احبارهم الخ قال ابو السعود زيادة تقرير لما سلف من كفرهم بالله تعالى يريدون ان يطفوا الخ اعلم ان المقصود منه بيان نوع من الافعال القبيحة الصادرة عن رؤساء اليهود و النصراني و هو سعيهم في ابطال امر محمد صلى الله عليه وسلم هو الذي ارسل رسوله الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن الاعداء هم يحاولون ابطال امر محمد صلى الله عليه وسلم و بين تعالى انه يابى ذلك الابطال و انه يتم امره بين كيفية ذلك الاتمام يا ايها الذين امنوا ان كثيرا الخ قال ابو السعود شروع في بيان حال الاحبار و الرهبان في اغوائهم لارذالهم الر بيان سوء حال الاتباع في اتخاذهم لهم اربابا ان عدة الشهور الخ قال المسكين رجوع الى بيان بعض

۱ اعلم ان كلتا السورتين مشتملة على بيان احكام الجهاد و ما المناسبة ظاهرة ۱۲ منه على عنه

۲ سقطت هنا كلمة ۱۲ مصحح

قبائح المشركين و ضلالاتهم و جهالاتهم من تغيير احكام الله تعالى الموجبة لقتالهم يا ايها الذين امنوا منكم الخ اعلم انه تعالى لما شرح مصائب هؤلاء الكفار و فضائحهم عاد الى الترغيب في مقاتلتهم انفروا اخفافا و ثقالا الخ قال ابو السعود تجريد الامر بالنفور بعد التوبيخ على تركه و الانكار على المساهلة فيه لو كان عرضا الخ قال ابو السعود صرف للخطاب عنهم و توجيهه له الى رسول الله صلى الله عليه وسلم تعديد الماصد عنهم من الهنات قولاً و فعلاً على طريق المبالغة و بيان لدناءة همهم و سائر ذائلهم قال المسكين شرع الله تعالى من ههنا قبائح المنافقين و فضائحهم في غزوة تبوك و امتد هذا البيان الى اخر السورة الا ما وقع من بعض احوال المنافقين في التضاعيف استطراداً الا قوله و ما كان الله ليضل فكانه تسلياً للذين استغفروا للمشركين قبل ذلك قوله تعالى لقد جاءكم رسول من انفسكم الخ اعلم انه تعالى لما امر رسوله عليه السلام ان يبلغ في هذه السورة الى الخلق تكاليف شاقة شديدة صعبة يعسر تحملها الا من خصه الله تعالى بوجوه التوفيق و الكرامة ختم السورة بما يوجب سهولة تحمل تلك التكاليف فان تولو الخ قال ابو السعود نتوين للخطاب و توجيهه له الى النبي صلى الله عليه وسلم تسلياً له

سورة يونس

ان ربكم الله الذي الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن الكفار انهم تعجبوا من الوحي والبعثة والرسالة ثم انه تعالى ازال ذلك التعجب بانه لا يبعد البتة في ان يبعث خالق الخلق اليهم رسولا يشرهم على الاعمال الصالحة بالثواب وعلى الاعمال الباطلة الفاسدة بالعقاب كان هذا الجواب انما يتم ويكمل بالثبات امرين احدهما اثبات ان لهذا العالم الها قاهر اقادر انا فذا الحكم بالامر والنهي والتكليف والثاني اثبات الحشر والنشر والبعث والقيامة حتى يحصل الثواب والعقاب اللذان اخبر الانبياء عن حصولهما فلا جرم انه سبحانه ذكر في هذا الموضوع ما يدل على تحقيق هذا المطلوبين هو الذي جعل الشمس ضياء الخ قال ابو السعود تنبيه على الاستدلال على وجوده تعالى ووحدته و علمه وقدرته وحكمته باثار صنعه في النيرين بعد التنبيه على الاستدلال بما مر من ابداع السموات والارض والاستواء على العرش وغير ذلك و بيان لبعض افراد التدبير الذي اشير اليه اشارة اجمالية و ارشاد الى انه حيث دبرت امورهم المتعلقة بمعاشهم هذا التدبير البديع فلان يدبر مصالحهم المتعلقة بالمعاد بارسال الرسل و انزال الكتاب و تبين طرأيق الهدى و تعيين مهاوى والرذى اولى واخرى ان الذين لا يرجون لقاء الخ اعلم انه تعالى لما اقام الدلائل القاهرة على صحة القول بالثبات الاله الرحيم الحكيم و على صحة القول بالمعاد والحشروا انه شرع بعده في شرح احوال من يكفربها و في شرح احوال من يؤمن بها ولو يعجل الله للناس الشر الخ ان الذي يغلب على ظنى ان ابتداء هذه السورة في ذكر شبهات المنكرين للنبوة مع الجواب عنها فالشبهة الاولى ان القوم تعجبوا من تخصيص الله تعالى محمداً عليه السلام بالنبوة فزال الله تعالى ذلك التعجب بقوله اكان للناس عجا ثم ذكر دلائل التوحيد و دلائل صحة المعاد و حاصل الجواب انه يقول انى ما جتكم الا بالتوحيد والاقرار بالمعاد و قد دلت على صحتها فلم يبق للتعجب من نبوتى معنى والشبهة الثانية للقوم انهم كانوا ابداء يقولون اللهم ان كان ما يقول محمد حقا فى ادعاء الرسالة فامطر علينا حجارة من السماء او اتنا بعداب اليم فاجاب الله تعالى عن هذه الشبهة

۱ خاتمته ما قبلها و فاتحتها تشر كان فى اثبات الرسالة ۱۲ منه عفى عنه

بما ذكره في هذه الآية و اذامس الانسان الضر الخ انه تعالى حكى عنهم انهم يستعجلون في نزول العذاب ثم بين في هذه الآية الهم كاذبون في ذلك الطلب والاستعجال لانه لو نزل بالانسان ادنى شيء يكرهه و يؤذيه فانه يتضرع الى الله تعالى في ازالة عنه و في دفعه عنه و ذلك يدل على انه ليس صادقا في هذا الطلب و لقد اهلكنا القرون الخ بين في هذه الآية ما يجرى مجرى التهديد وهو انه تعالى قد ينزل عذاب الاستيصال ولا يزيله و اذا تلى عليهم آياتنا بينات الخ اعلم انه هذا الكلام هو النوع الثالث من شبهاتهم و كلماتهم التي ذكروها في الطعن في نبوة النبي صلى الله عليه وسلم حكاها الله تعالى في كتابه و اجاب عنها فمن اظلم ممن افترى الخ اعلم ان تعلق هذه الآية بما قبلها ظاهر و يعبدون من دون الله الخ قال ابو السعود حكاية لجناية اخرى لهم نشأت عنها جنابتهم الاولى قال المسكين اى قولهم انت بقران غير هذا او بدله لان في القران ابطال الوهية اصنامهم و ما كان الناس الامة الخ اعلم انه تعالى لما اقام الدلائل القاهرة على فساد القول بعبادة الاصنام بين السبب في كيفية حدوث هذا المذهب الفاسد والمقالة الباطلة و يقولون لولا الخ اعلم ان هذا الكلام هو النوع الرابع من شبهات القوم في انكارهم نبوة و اذا اذقنا الناس رحمة الخ اعلم ان القوم لما طلبوا امن رسول الله صلى الله عليه وسلم آية اخرى و اجاب الجواب و هو قوله انما الغيب لله ذكر جوابا اخر و تقريره ان عادة هؤلاء الاقوام المكرو اللجاج والعناد و عدم الانصاف و اذا كانوا كذلك فيتقير ان اعطوا ما سألوه من انزال معجزات اخرى فانهم لا يؤمنون بل يقفون على كفرهم هو الذى يسركم في البحر الخ قال المسكين هذا متهم لما قر قبله انما مثل الحيوة الدنيا الخ اعلم انه تعالى لما قال يا ايها الناس انما بغيكم الخ اتبعه هذا المثل العجيب الذى صر به لمن يفتى في الارض و يفتى بالدنيا و يشتدتمسكه بها والله يدعوا الى الخ اعلم انه تعالى لما نفر الغافلين عن الميل الى الدنيا بالمثل السابق رغبتهم في الاخرة هذه الآية للذين احسنوا الخ اعلم انه تعالى لما دعا عباده الى دار السلام ذكر السعادات التي تحصل لهم فيها والذين كسبوا السيئات الخ اعلم انه كما شرح حال المسلمين في الآية المتقدمة شرح حال من اقدم على السيئات في هذه الاربعة و يوم نحشرهم جميعا الخ اعلم ان هذا نوع اخر من شرح فصائح اولئك الكفار الذين كسبوا السيئات هنالك نبلوا الخ هذه الآية كالتمة لما قبلها قل من يرزقكم من السماء الخ اعلم انه تعالى لما بين فصائح عبدة الاوثان

اتبعها بذكر الدلائل الدالة على فساد هذا المذهب و ما كان هذا القرآن الخ قال ابو السعود
شروح في بيان ردهم للقران الكريم الر بيان ردهم للدلة العقلية المندرجة في تضاعيفه
قال المسكين كانه عود الى تقرير مضمون قوله تعالى في اول السورة و اذا تطلعت عليهم
ايتنا بينات قال الذين لا يرجون لقاء نائت بقران غير هذا الآية و منهم من يؤمن به الخ قال
المسكين ببيان لمعاملة الكفار مع القران و صاحب القران على انحاء شتى و يوم نحشرهم
كان لم يلبثوا الخ اعلم انه تعالى لما وصف هولاء الكفار بقلة الاصفاء و ترك التدبر اتبعه
بالوعيد و لكل امة رسول الخ اعلم انه تعالى لما بين حال محمد صلى الله عليه وسلم فع
قومه بين ان حال كل الانبياء مع القوامهم كذلك و يقولون متى هذا الخ اعلم ان هذا هو
الشبهة الخامسة من شبهات منكري النبوة فانه عليه السلام كلما هتتم بنزول العذاب و
مرزمان ولم يظهر ذلك العذاب قالوا متى هذا الوعد الخ قل ارايتم ان اتاكم الخ اعلم ان
هذا هو الجواب الثاني عن قولهم متى هذا الوعد ويستبينك احق هو الخ قال المسكين
هي تامة لا قبلها و كذا قوله تعالى الا ان لله ما في السموات و الارض الخ تامة للجواب
المذكور ببيان ان الله تعالى ما لك العلويات و السفليات و وعده حق و الاحياء و الاماتة
بيده فهو قادر على نزول العذاب متى شاء و انه ينزل لامحالة يا ايها الناس قد جاءكم الخ
اعلم ان الطريق الى اثبات نبوة الانبياء عليهم السلام امر ان الاول ان يقول ان هذا الشخص
قد ادعى النبوة و ظهرت المعجزة على يده و كل من كان كذلك فهو رسول من عند الله
حقا و صدقا و هذا الطريق مما قد ذكره الله تعالى في قوله و ما كان هذا القران ان يفترى
الخ فنقول انه تعالى لما بين صحة نبوة محمد صلى الله عليه وسلم بطريق المعجزة فله
هذه الآية بين صحة نبوة بالطريق الثاني و هذا الطريق طريق كاشف عن حقيقة النبوة معترف
لما هيها فاستدلال بالمعجزة هو الذي يسميه المنطقيون برهان الان و هذا الطريق هو الطريق
الذي يسمونه برهان اللم و هو اشرف و اعلى و اكمل و افضل قل ارايتم ما اتزل الله الخ
لما ذكر الدلائل الكثيرة على صحته النبوة و بين فساد مسؤالاتهم و شبهاتهم في انكارها
اتبع ذلك ببيان فساد طريقهم في شرائعهم احكامهم و ما تكون في شأن الخ اعلم انه لما
اطال الكلام في امر الرسول بايراد الدلائل على فساد مذاهب الكفار و في امره بايراد الجواب
عن شبهاتهم و في امره بتحمل اذا هم بالترفق معهم ذكر هذا الكلام ليحصل به تمام السلوة

والسرور للمطيعين و تمام الخوف و الفزع للمذنبين و هو كونه سبحانه و تعالى عالما بعمل كل واحد و بما في قلبه من الدواعي و الصوارف الا ان اولياء الله الخ اعلم انا ببيان قوله تعالى و ما تكون في شان و ما تتلوامنه من قرآن مما يقوى قلوب المطيعين و مما يكسر قلوب الفاسقين فاتبعه الله تعالى بشرح احوال المخلصين الصادقين الصديقين في هذه الآية و يحزنك قولهم الخ قال ابو السعود تسلية للرسول عليه الصلوة و السلام عما كان يلقاه من جهتهم من الاذية الناشئة عن مقالاتهم الموحشة و تبشير له عليه الصلوة و السلام بانه عزوجل ينصره و يعزه عليهم الر بيان ان له و لاتباعه امنا من كل محذور و فوزا بكل مطلوب الا ان الله الخ قال ابو السعود و هو مع ما فيه من التاكيد لما سبق من اختصاص العزة لله تعالى الموجب لسوته عليه السلام و عدم مبالاة بالمشركين و بمقالاتهم تمهيد لما لحق من قوله تعالى و ما يتبع الذين الخ و برهان على بطلان ظنونهم و اعمالهم المبنية عليها هو الذي جعل لكم الخ قال ابو السعود تنبيه على تفردة تعالى بالقدرة الكاملة و انعمة الشاملة ليلهم على توحيله سبحانه باستحقاق العبادة و تقرير لما سلف من اختصاص العزة به سبحانه و قالوا اتخذ الله الخ اعلم ان هذا نوع اخر من الاباطيل التي حكاها الله تعالى عن الكفار قل ان الذين يفترون الخ اعلم انه تعالى لما بين بالدليل القاهر ان اثبات الولد لله تعالى قول باطل ثم بين انه ليس لهذا القائل دليل على صحة قوله فقد ظهر ان ذلك المذهب افتراء على الله و نسبة لما لا يليق به اليه فيبين ان من هذا حاله فانه لا يفلح البتة و اتل عليهم نبأ نوح الخ قال ابو السعود ليتنبرو اما فيه من زوال ما تمتعوا به من النعيم و حلول عذاب الفرق الموصول بالعذاب المقيم فينزجروا بذلك عما هم عليه من الكفر او تنكسر شدة شكيمتهم او يعترف بعضهم بصحة نبوتك بان عرفوا ان ما نزلوه موافق لما ثبت عندهم من غير مخالفة بينهما اصلا مع علمهم بانك لم تسمع ذلك من احد ليس الا بطريق الوحي و فيه من تقرير ما سبق من كون الكل لله سبحانه و اختصاص العزة به تعالى و انتفاء الخوف و الحزن عن اولياءه عز و علاقطة و تشجيع النبي صلى الله عليه وسلم و حملة على عدم المبالاة بهم و باقوالهم و المعاليم ما لا يخفى و لقد بوأنا بني اسرائيل الخ قال ابو السعود كلام مستأنف سيق لبيان النعم الفائضة عليهم الر نعمته الانجاء على وجه الاجمال و اخلالهم بشكرها و اداء حقوقها فان كنت في شك الخ اعلم انه تعالى لما ذكر من قبل اختلافهم عندما جاء هم اورد على

رسول الله صلى الله عليه وسلم في هذه الآية ما يقوى في صحة القرآن والنبوة ان الذين حقت عليهم الخ قال ابو السعود شروع في بيان سراسر الكفرة على ما هم عليه من الكفر والضلال كلام مستأنف لتقرير ما سبق من استحالة ايمان من حقت عليهم كلمة تعالى لسوء اختيارهم مع تمكنهم من التدارك فيكون الاستثناء الاثني بيان الكون قوم يونس عليه السلام ممن لم يحق عليه الكلمة لاهتدائهم الى التدارك في وقته ولو شاء ربك لأمن الخ قال ابو السعود عقب لدوران ايمان كافة المكلفين وجود او عدما على قطب مشيئة تعالى مطلقا الر بيان تبعية كفر الكفرة لكلمة قل انظروا ماذا في السموات الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآيات السالفة ان الايمان لا يحصل الا بتخليق الله تعالى و مشيئة امر بالنظر والاستدلال في الدلائل حتى لا يتوهم ان الحق هو الجبر المحض فهل ينتظرون الخ قال المسكين تقرير لما سبق من علم اغناء الآيات والنذر عنهم بيان انهم لا يؤمنون حتى يقع عليهم العذاب فيؤمنون حيث لا ينفعهم الايمان قل يا ايها الناس ان كنتم في شك الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الدلائل على اقصى الغايات و ابلغ النهايات امر رسوله باظهار دينه و باظهار المبينة عن المشركين لكن تزلزل الشكوك والشبهات في امره و تخرج عبادة الله تعالى من طريقة السرا الى الاظهار وان يمسك الله بضر الخ قال ابو السعود تقرير لما اورد في حيز الصلة من سلب النفع من الاصنام و تصوير لاختصاصه به سبحانه قل يا ايها الناس قد جاءكم الحق الخ قال المسكين اتمام للحجة بعد تبليغ الدين و اتبع الخ قال المسكين امره عليه الصلوة والسلام بالاتباع والصبر على التبليغ الر الامر بالتبليغ

سورة هود العنكبوت

ان لا تعبدوا الخ ابوالسعود كانه قيل كتاب احكمت آياته ثم فصلت لئلا تعبدوا الا الله اى
 لتتركوا عبادة غير الله عز و جل ولمحضو في عبادته فان الاحكام والتفصيل على ما فصل من
 المعانى مما يدعوهم الى الايمان والتوحيد وما يضرع عليه من الطاعات قاطبة الا انهم يشون
 صدورهم الخ قال المسكين بيان للتولى واشارة الى جزاءه و ما من ذابة فى الارض الخ اعلم
 انه تعالى لما ذكر فى الآية الاولى انه يعلم ما يسرون و ما يعلنون اردفه بما يدل على كونه تعالى
 عالما بجميع المعلومات فذكر ان رزق كل حيوان انما يصل اليه من الله تعالى فلولم يكن عالما
 بجميع المعلومات لما حصلت هذه المهمات و هو الذى خلق السموات الخ اعلم انه تعالى
 لما اثبت بالدليل المتقلم كونه عالما بالمعلومات اثبت بهذا الدليل كونه تعالى قادرا على كل
 المقصورات ولئن قلت انكم الخ اعلم انه تعالى لما بين انه خلق هذا العالم لاجل ابتلاء المكلفين
 و امتحانهم فهذا يوجب القطع بحصول الحشر والنشر فعند هذا خاطب محمدا عليه الصلوة
 والسلام و قال ولئن قلت الخ ولئن اخبرنا عنهم العذاب الخ قال المسكين اخذ من ابى السعود لما
 اوعدهم الله تعالى بالعذاب فى قوله و ان تولوا فانى اخاف عليكم عذاب يوم كبير تعجبوا من
 تاخيرها فاجاب الله تعالى فى هذه الآية ولئن اذقنا الانسان منارحمة الخ قال ابوالسعود ووجه
 تعلق الآيات الثلث بما قبلهن من حيث ان اذا قته النعماء و مساس الضراء فصل من باب الابتلاء
 واقع موقع التفصيل من الاجمال الواقع فى قوله ليلوكم ايكم احسن عملا والمعنى ان كلامن
 اذاقة النعماء و نزعها فى كونه ابتلاء للانسان ايشكرام يكفر لا يهتدى فيه الى سنن الصواب
 بل يحيد فى كلتا الحالتين عنه الى مهاوى الضلال فلا يظهر منه باحسن عمل الامن الصابرين
 الصالحين او من حيث ان انكارهم بالبعث و استهزاء هم العذاب بسبب بطرهم و فخرهم
 كانه قيل انما فعلوا ما فعلوا لان طبيعة الانسان مجبولة على ذلك فلعلك تارك الخ اعلم
 انه هذا نوع اخر من كلمات الكفار والله تعالى بين ان قلب الرسول ضاق بسببه ثم انه تعالى
 قواه و ايلده بالاكرام و التأييد ام يقولون افتراه الخ اعلم ان القوم لما طلبوا منه المعجز قال معجزى
 هذا القران و لما حصل المعجز الواحد كان طلب الزيادة بغيا و جهلا ثم قلر كونه معجزا بان

١ فاتحة هذه و خاتمة ما قبلها تشتملان على بيان الرسالة ١٢ منه

٢ فهو تقرير بقوله تعالى فيما قبل و هو على كل شىء قدير ١٢ منه

٣ لقولهم لولا انزل عليه كثر ارجاء معه ملك ١٢ منه عفى عنه

تحدثهم بالمعارضة من كان يريد الحياة الدنيا الخ قال ابو السعود لما امر نبيه عليه الصلوة والسلام والمؤمنين بان يزدادوا علما و يقينا بان القرآن منزل بعلم الله و بان لا قدرة لغيره على شئ اصلا و هيجهم على الثبات على الاسلام والرسوخ فيه عند ظهور عجز الكفرة و ما بدعون من دون الله عن المعارضة و تبين انهم ليسوا على شئ اصلا فتضى الحال ان يتعرض لبعض شئونهم الموهمة لكونهم على شئ في الجملة من نيلهم الحفظ العاجته واستيلائهم على المطالب الدنيوية و بيان ان ذلك بمعزل عن الدلالة عليه و لقد بين ذلك اى بيان ثم اعيد الترغيب فيما ذكر من الايمان بالقران والتوحيد والاسلام فقيلا فمن كانه على بينة من ربه الخ و تقديره افمن كان على بينة من ربه كاولئك الذين ذكرت اعمالهم و بين مصيرهم و ما لهم يعنى ان بينهما تفاوتا عظيما و من اظلم ممن افترى الى قوله هم الا خسرون قال ابو السعود و هذه الآيات كماترى مقررة لما سبق من انكار المماثلة بين من كان على بينة من ربه و بين من كان يريد الحياة الدنيا ابلغ تقرير فانهم حيث كانوا اظلم من كل ظالم و اخسر من كل خاسر لم يتصور مماثلة بينهم و بين احد من الظلمة الا خسرين فما ظنك بالمماثلة بينهم و بين من هو فى اعلى مدارج الكمال و لما ذكر فريق الكفار و اعمالهم شرح فى بيان حال اضدادهم اعنى فريق المؤمنين و ما يول اليه امرهم من العواقب الحميدة تكملة لما سلف من محاسنهم المذكورة فى قوله تعالى افمن كان على بينة من ربه الآية يتبين ما بينهما من التباين البين حالا و مالا فليل ان الذين امنوا الخ و بعد بيان حالهما عقلا اريد بيان تباينهما حسا فليل مثل الفريقين كالا عمى الخ و لقد ارسلنا نوحا الى قوله الى اخر القصص المذكورة فى السورة قال ابو السعود و لما بين من فاتحة السورة الكريمة الى هذا المقام انها كتاب محكم الآيات مفصلها نازل فى شان التوحيد و ترك عبادة غير الله سبحانه و ان الذى انزل عليه نذير و بشير من جهة تعالى و قرر فى تضاعيف ذلك ماله مدخل فى تحقيق هذا المرام من الترغيب و التهيب و الزام المعاندين بما يقارنه من الشواهد الحقبة الدالة على كونه من عند الله تعالى و تسلية الرسول صلى الله عليه وسلم مما عراه من ضيق الصدر العارض له من افتراحتهم الشنيعة و تكذيبهم له و تسميتهم للقران تارة سحرا و اخرى مفتري و تشبيه عليه الصلوة والسلام والمؤمنين على التمسك به والعمل بموجبه على ابلغ وجه ابداع اسلوب شزع فى تحقيق ما ذكر و تقرير بذكر قصص الانبياء صلوات الله عليهم اجمعين المشتملة على ما اشتمل عليه فاتحة السورة الكريمة ليتأكد ذلك بطرق احدها ان ما اضربه من التوحيد و فروعه مما اطبق عليه الانبياء قاطبة والثانى ان ذلك انما علمه رسول الله صلى الله عليه وسلم بطريق الروحى فلا يبقى فى حقيقة كلام اصلا و ليتسلى بما

بشاهده من معاناة الرسل قبله من امهم و مقاساتهم الشداء من جهتهم ان في ذلك لآية لمن الخ قال المسكين ذكر اعظم منافع بيان القصص ثم اتبعه بذكر يوم الآخرة واحواله و ما يلقى الناس فيه من سعداء و اشقياء فلاتك في مرية الخ قال ابو السعود و لما كان مساق النظم الكريم قبيل الشروع في القصص لبيان غاية سوء حال الكفرة و كمال حسن حال المؤمنين و قد ضرب لهم مثلاً فقيل مثل الفريقين الخ و قد قص عقيب ذلك من انباء الامم السالفة مع رسلم المبعوثة اليهم ما يتذكر به المتذكر نهي رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كونه في شك من مصير امر هؤلاء المشركين في العاجل و الأجل ثم علل ذلك فقيل ما يعبدون الخ اي هم و اباؤهم سواء في الشرك و قد بلغك ما لحق بابائهم فيسلحقتهم مثل ذلك فان تماثل الاسباب يقتضى تماثل المسببات و لقد اتينا موسى الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية الاولى اصرار كفار مكة و بين تعالى ان هؤلاء الكفار كانوا على هذه السيرة الفاسدة مع كل الانبياء عليهم السلام ضرب لذلك مثلاً و هو انه لما انزل التوراة اختلفوا فيه و ذلك يدل على ان عادة الخلق هكذا فاستقم الخ قال ابو السعود لما بين في تضعيف القصص سوء عاقبة الكفرو عصيان الرسل و ان كل واحد من المؤمنين و الكافرين يو في جزاء عمله امر رسوله الله صلى الله عليه وسلم بالاستقامة كما امر به و اقم الصلوة الخ اعلم انه تعالى لما امره بالاستقامة اردفه بالامر بالصلوة و ذلك يدل على ان اعظم العبادات بعد الايمان بالله هو الصلوة فلولا كان من القرون الخ اعلم انه تعالى لما بين ان الامم المتعلمين حل بهم عذاب الاستيصال بين السبب فيه و لو شاء ربك الخ قال المسكين كان المذكور في الآية الاولى السبب الظاهري و في هذه الآية السبب الحقيقي و كلا نقص عليك الخ انه تعالى لما ذكر القصص الكثيرة في هذه السورة ذكر في هذه الآية نوعين من الفائدة و قل للذين لا يؤمنون الخ اعلم انه تعالى لما بلغ الغاية في الاعذار و الانذار و الترغيب و التهيب اتبع ذلك بان قال للرسول و قل الخ

سورة يوسف عليه السلام

ذلك من انباء الغيب الخ اعلم ان المقصد من هذا اخبار عن الغيب فيكون معجزا و ما اكثر الناس ولو حرصت الخ اعلم ان وجه اتصال هذه الآية بما قبلها ان كفار قريش و جماعة من اليهود اطلبوا هذه القصة من رسول الله صلى الله عليه وسلم على سبيل التعنت و اعتقد رسول الله صلى الله عليه وسلم انه اذا ذكرها فربها امنوا فلما ذكرها اصر و اعلى كفرهم فنزلت هذه الآية قال المسكين لم ذكر غفلتهم عن الآيات الكونية كغفلتهم عن الآيات المنزلة و ذكر الوعيد بالعذاب على الغفلة ثم امر عليه السلام باظهار حقيقة سبيل الحق الذي بعث به و الدعوة اليه ثم دفع الاستبعاد في كونه عليه الصلوة و السلام رسولا لكونه بشرا و ذكر عاقبة المكذبين للرسول من حلول العذاب بهم و لو بعد حين ثم نبه على فائدة ذكر القصص في القران و قرر كون القران المشتمل على هذه القصص حقا و صدقا

۱ احدهما للرسول و ثانيهما للمؤمنين ۱۲ منه ۲ لما قال في اخر السورة التي نقلت و كلاتقص من انباء الرسل الخ بين في هذه السورة القصة التي هي احسن القصص ۱۲ منه عفى عنه

سورة الرعد

الله الذي رفع السموات الخ اعلم انه تعالى لما ذكر ان اكثر الناس لا يؤمنون ذكر عقبيه ما يدل على صحة التوحيد والمعاد وهو الذي مد الارض الخ اعلم انه تعالى لما قرر الدلائل السماوية اردفها بتقرير الدلائل الارضية و في الارض قطع الخ قال ابو السعود جملة مستانفة مشتملة على طائفة اخرى من الآيات و ان تعجب الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الدلائل القاهرة على ما يحتاج اليه في معرفة المبدء ذكره بعده مسئلة المعاد و يستعجلونك بالسنة الخ اعلم انه صلى الله عليه وسلم كان يهدم تارة بعذاب القيامة و تارة بعذاب الدنيا والقوم كلما هدم بعذاب القيامة انكروا القيامة والبعث والحشر والنشرو هو الذي تقدم ذكره في الآية الاولى و كلما هدم بعذاب الدنيا قالوا له فجتنا بهذا العذاب فلماذا بسبب حكى الله عنهم انهم يستعجلون و يقول الذين كفروا الخ اعلم انه تعالى حكى عن الكفار انهم طعنوا في نبوة بسبب طعنهم في الحشر والنشرا و لا ثم طعنوا في نبوته بسبب طعنهم في صحته ما ينذرهم به من نزول عذاب الاستيصال ثانيا ثم طعنوا في نبوته بان طلبوا منه المعجزة والبينة ثالثا و هو المذكور في هذه الآية الله يعلم ما تحمل الخ قال المسكين هذا الركوع بكماله تقرير للتوحيد و ابطال للشرك مرتبط بقوله الله الذي رفع السموات الخ و في تضاعفه جعل قول ان الله لا يغير ما بقوم الخ غاية للحفظ المذكور في قوله يحفظونه من امر الله و ضرب امثالا للحق والباطل و بين جزاء الحق والمبطل ثم ذكر اوصاف المحقين والمبطلين بقوله افمن يعلم انما انزل اليك الى قوله اولئك لهم اللعنة ولهم سوء الدار. قوله تعالى الله يبسط الخ اعلم انه تعالى لما حكم على نقض عهد الله في قبول التوحيد والنبوة بانهم ملعونون في الدنيا و معذبون في الآخرة فكانه قيل لو كانوا اعداء الله لما فتح الله عليهم ابواب النعم واللذات في الدنيا فاجاب الله عنه بهذه الآية و يقول الذين كفروا الخ قال المسكين كان المذكور الى ههنا امر التوحيد و ما يتعلق به و الآن شرع في اثبات الرسالة و الجواب عن شبهاتهم فيها و تقريرهم على انكارها ففي هذه الآية اجاب عن شبهتهم المشورة لولا انزل عليه آية من ربه حاصل الجواب انا اعطيناك آية عظيمة هي الذكر اى القران الذي تطمئن به قلوب المؤمنين و يضل به المردة من الطاغين كذلك ارسلناك في امة الخ

۱ و المناسبة بين اول هذه السورة و آخرة المتقدمة ان كليهما يشترك في اثبات حفية القران ۱۲ منه عفى عنه

۲ اى من مقترحاتهم الواهية ۱۲ منه

قال المسكين فيه تصريح بالمقصود واما قوله وهم يكفرون بالرحمن فلعل المراد به تسليية النبي صلى الله عليه وسلم اى لا تحزن لو كفروا بك فانهم يكفرون بالرحمن فتوكل عليه ولا تهتم بهم ولو ان قرانا سيرت به الجبال الخ قال المسكين فيه اثبات لامر القران الدال على النبوة و اقنط من ايمانهم و بيان الجزاء هم على الكفرو لقد استهزى برسول الخ قال المسكين فيه تسليية للنبي صلى الله عليه وسلم عما لقي من المشركين من التكليب والاقتراح على طريقة الاستهزاء به ووعيد لهم ثم اشار الى استحقاقهم العذاب فى قوله الفمن هو قائم على كل نفس الخ بيان ان امر التوحيد عقلى بديهى لا عذر لاحد فى الاعراض عنه و اهمال امره مثل الجنة التى وعد الخ اعلم انه تعالى لما ذكر عذاب الكفار فى الدنيا والآخرة اتبعه بذكر ثواب المتقين والذين اتيناهم الكتاب الخ قال المسكين هذا دليل اخر على حقيقة القران الذى جاء به الرسول بان اهل الكتاب يصدقونه ثم اشار الى ركافة راي المنكرين بقوله قل انما امرت الخ اى ليس فيما انزل الى الامر التوحيد وهذا مما لا ينكرو وكذلك انزلناه الخ قال المسكين فيه تصريح ايضا بالمقصود من انزال القران على الرسول ولقد ارسلنا رسلا من قبلك الخ اعلم ان القوم كانوا يذكرون انواعاً من الشبهات فى ابطال نبوة فالشبهة الاولى قولهم ما لهد الرسول يأكل الطعام ويمشى فى الاسواق وهذه الشبهة انما ذكرها الله تعالى فى سورة اخرى والشبهة الثانية قولهم الرسول لا بدوان يكون من جنس الملكة فاجاب الله تعالى عنه ههنا بقوله ولقد ارسلنا لا الشبهة الثالثة عابوا رسول الله صلى الله عليه وسلم بكثرة الزوجات فاجاب الله تعالى عنه بقوله ولقد ارسلنا الخ والشبهة الرابعة قالوا لو كان رسولا من عند الله لكان اى شىء طلبنا منه من المعجزات اتى به ولم يتوفق فاجاب الله تعالى عنه بقوله و ما كان لرسول الخ الشبهة الخامسة انه عليه السلام كان يخوفهم بنزول العذاب ثم ان ذلك الموعود كان يتاخر فاجاب الله عنه بقوله ولكل اجل كتاب الشبهة السادسة قالوا لو كان فى دعوى الرسالة محققا لما نسخ الاحكام التى نص الله تعالى على ثبوتها فى الشرائع المتقدمة فاجاب الله سبحانه عنه بقول يمحو الله ما يشاء و اما نرينك بعض الذى نعدهم الخ قال المسكين كانه تفصيل و توضيح لقوله و ما كان لرسول ان ياتى باينة الا باذن الله لكل اجل كتاب اولم يروا انا نأتى الخ اعلم انه تعالى لما وعد رسوله بان يره بعض ما وعدوه او يتوفاه قبل ذلك بين فى هذه الآية ان اثار حصول تلك المواعيد و علاماتها قد ظهرت و يقول الذين كفروا الخ اعلم انه تعالى حكى عن القوم انهم انكروا كونه رسولا من عند الله ثم انه تعالى احتج عليهم بامرين الاول شهادة الله والمراد انه تعالى اظهر المعجزات والثانى قوله و من عنده علم الكتاب

سورة ابراهيم العنكبوت

وما ارسلنا من رسول الخ قال المسكين كانه قسيم لقوله لتخرج الناس من الظلمات اى كافتهم فكان الحاصل انا بعثنا جميع الرسل الى اقوامهم خاصة وارسلناك الى الناس عامة ولقد ارسلنا موسى الخ قال ابو السعود شروع في تفصيل ما اجمل في قوله عز وجل ولقد ارسلنا واذتاذن الخ قال ابو السعود من جملة مقال موسى عليه الصلوة والسلام لقومه الم ياتكم نبا الذين الخ قال المسكين هذا ترهيبه من عليه السلام غيب ترغيب و يحتمل ان يكون ابتداء مخاطبة من الله تعالى لقوم الرسول صلى الله عليه وسلم ثم ذكر تعالى المناظرة التى وقعت بين الانبياء عليهم السلام و اقوامهم الى خاتمة الركوع ثم ذكر تعالى جزاء المكثبين فى قوله تعالى فاحي اليهم ربهم الى اخر الركوع و اشار فى تضعيف بقوله تعالى الم تر ان الله خلق السموات والارض الخ الى ان من هذاشانه حقيق بان يؤمن به و يرجى ثوابه و يخشى عقابه و قال الشيطان لما قضى الامر الخ اعلم انه تعالى لما ذكر المناظرة التى وقعت بين الرؤساء والاتباع من كفره الانس اردفها بالمناظرة التى وقعت بين الشيطان و بين اتباعه من الانس و ادخل اللين امنوا الخ اعلم انه تعالى لما بالغ فى شرح احوال الاشقياء من الوجوه الكثيرة شرح احوال السعداء الم تر كيف ضرب الله الخ اعلم انه تعالى لما شرح احوال الاشقياء و احوال السعداء ذكر مثالا بين الحال فى حكم لهلين القسمين يثبت الله الخ قال المسكين بيان كيفية المشية واثاره الم تر الى الذين بدلوا الخ اعلم انه تعالى عادالى وصف احوال الكفار فى هذه الآية قل لعبادى الذين امنوا الخ اعلم انه تعالى لما امر الكافرين على سبيل التهديد و الوعيد بالتمتع بنعيم الدنيا امر المؤمنين فى هذه الآية بترك التمتع بالدنيا و المبالغة فى المجاهدة بالنفس و المال الذى خلق السموات الخ اعلم انه تعالى لما اطال الكلام فى وصف احوال السعداء و احوال الاشقياء و كانت العمدة فى حصول السعادات معرفة الله تعالى بذاته و بصفاته و فى حصول الشقاوة فقدان هذه المعرفة لاجرم ختم الله تعالى وصف احوال السعداء و الاشقياء بالدلائل الدالة على وجود الصانع و كمال علمه و قدرته و اذ قال ابراهيم الخ اعلم انه تعالى لما بين بالدلائل المتقدمة انه لامعبود الا الله سبحانه و تعالى و انه لايجوز عبادة غيره تعالى البتة حكى عن ابراهيم عليه السلام مبالغة فى انكار عبادة الاوثان و لا تحسبن الله غافلا الخ قال المسكين هنا عود الى ذكر جزاء المكثبين بالتوحيد و النبوة و يمتد الى خاتمة السورة فخلاصة السورة كلها تقرير امر النبوة و وعيد المنكرين لها و الله اعلم ثم فختتم شان الكتاب الكافى لما ذكر بقوله هذا بلغ للناس و بين فوائد العلمية و العملية

۱ بين امر الرسالة فى اخر المتقدمة و اول هذه فهذا هو وجه الربط بينهما ۱۲ منه

۲ وقد مر مراراً ما فى ذكر القصص من الحكم ۱۲

سورة الحجر

ربما يود الذين الخ قال ابو السعود لما بين كون السورة الكريمة بعضا من الكتاب والقران لتوجيه المخاطبين الى حسن تلقي ما فيها من الاحكام والقصص والمواعظ شرع في بيان ما تضمنه فقيل ربما وقال هذا بيان حقارة شان الكفار و عدم الاعتداد بما هم فيه من الكفروا التكذيب كما ينطق به قوله تعالى فرهم ياكلوا و ما اهلكنا من قرية الخ قال ابو السعود شروع في بيان سرتاخير عذابهم وقالوا يا ايها الذي نزل الخ قال ابو السعود شروع في بيان كفرهم بمن انزل عليه الكتاب بعد بيان كفرهم بالكتاب وما يؤول اليه حالهم انا نحن نزلنا الذكر الخ قال ابو السعود ردلا نكارهم التزليل واستهزاء هم برسول الله صلى الله عليه وسلم و تسلية له ولقد ارسلنا من قبلك الخ اعلم ان القوم لما اساءوا في الادب و خاطبوه بالساهة وقالوا انك لمجنون فالله تعالى ذكر ان عادة هؤلاء الجهال مع جميع الانبياء هكذا كانت ولك اسوة في الصبر ولو فتحنا عليهم بابا الخ ان القوم لما طلبوا نزول ملائكة بين الله تعالى في هذه الآية ان بتقليد ان يحصل هذا المعنى لقال الذين كفروا هذان باب السحر ولقد جعلنا في السماء بروجا الخ اعلم انه تعالى لما اجاب عن شبهة منكري النبوة و كان قد ثبت ان القول بالنبوة مضرع على القول بالتوحيد اتبعه بدلائل التوحيد فقال ولقد جعلنا في السماء الخ والارض مدحنا ها الخ وجعلنا لكم فيها معاش الخ وان من شيء الا عندنا الخ و ارسلنا الرياح لواقع الخ و انا نحن نحى الخ ولقد علمنا المستقدمين الخ و ان ربك هو يحشر الخ ولقد خلقنا الانسان الخ واذ قال ربك للملائكة الخ اعلم انه تعالى لما ذكر حدوث الانسان الاول واستدلال بذكره على وجود الاله القادر المختار ذكر بعده واقعته ان المتقين في جنات الخ اعلم انه تعالى لما شرح احوال اهل العقاب اتبعه بصفة اهل الثواب و نبههم عن ضيف ابراهيم الخ قال ابو السعود المقصود اعتبارهم بما جرى على ابراهيم عليه الصلوة والسلام مع اهله من البشرى في تضاعيف الخوف و بما حل بقوم لوط من العذاب و نجاته عليه الصلوة والسلام مع اهله التابعين له في ضمن الخوف

القول كان فيما قبل بيان الكفار السابقين و ههنا ذكر حال الموجودين منهم ۱۲ منه ۲ ختم السورة التي مرت ببيان جزاء المكلبين بين في الؤل هذه السورة تمنهم الاسلام اذاراوا الجزاء ۱۲ منه عفى عنه

و تنبيههم بحلول انتقامه تعالى من المجرمين و علمهم بان عذاب الله هو العذاب الاليم و في
الكبير اعلم انه تعالى لما بالغ في تقرير النبوة ثم اردفه بذكر دلائل التوحيد ثم ذكر عقبيه احوال
القيامة و صفة الاشقياء و السعداء اتبعه بذكر قصص الانبياء عليهم السلام ليكون سماعها مرغبا
في الطاعة الموجبة للفوز بدرجات الانبياء و محذرا عن المعصية لاستحقاق دركات الاشقياء
فبدأ اولاً بقصة ابراهيم عليه السلام و ما خلقنا السموات و الارض الخ اعلم انه تعالى لما ذكر
انه اهلك الكفار فكانه قيل الاهلاك و التعذيب كيف يليق بالرحيم الكريم فاجاب عنه باني
انما خلقت الخلق ليكونوا مشغولين بالعبادة و الطاعة فاذا تركوها و اعرضوا عنها و جب في
الحكمة اهلاكهم و تطهير وجه الارض منهم و لقد اتيناك سبأ الخ اعلم انه تعالى لما صبره
على اذى قومه و امره بان يصفح الصفح الجميل اتبع ذلك بذكر النعم العظيمة التي خص الله
تعالى محمد صلى الله عليه وسلم بها لان الانسان اذا ذكر كثرة نعم الله عليه سهل عليه
الصفح و التجاوز لا تمدن عينك الخ لما عرف رسوله عظم نعمه عليه فيما يتعلق بالدين نهاه
عن الرغبة في الدنيا و قل اني انا الخ اعلم انه تعالى لما امر رسوله بالزهد في الدنيا او خفض
الجناح للمؤمنين امره بان يقول للقوم اني انا النذير المبين فيدخل تحت كونه نذيراً كونه مبلغاً
لجميع التكاليف و لقد نعلم انك يضيق الخ اعلم انه تعالى لما ذكر ان قومه يسفهون عليه قال
له و لقد نعلم لان الجبلة البشرية و المزاج الانساني يقتضى ذلك فعندنا قال له فسبح الخ

سورة النحل

اتى امر الله فلا تستعجلوه الخ قال المسكين لعل المقصود الاصلى منه اثبات التوحيد وفتححه بالوعيد على الاعراض عنه واتبعه ببيان انه دين اجمع عليه جمهور الانبياء عليهم الصلوة والسلام و امروا بدعوة الناس اليه خلق السموات الخ اعلم انه تعالى لما بين فيما سبق ان معرفته الحق مطلع السعادات اتبعه بذكر الدلائل على وجود الصانع الاله تعالى و كمال قدرته و حكمته افمن يخلق كمن لا يخلق الخ قال المسكين هو كا لنتيجة لما سبق من الدلائل التى هى نعم ايضا و اذا قيل لهم ماذا انزل الخ اعلم انه تعالى لما بالغ فى تقرير دلائل التوحيد و اورد الدلائل القاهرة فى ابطال مذاهب عبدة الاصنام ذكر بعد ذلك شبهات منكرى النبوة مع الجواب عنها فالشبهة الاولى ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما احتج على صحة نبوة نفسه بكون القرآن معجزة طعنوا فى القرآن و قالوا انه اساطير الاولين و ليس هو من جنس المعجزات و لما ثبت كون القرآن معجزا مرارا كثيرة لاجرم اقتصر فى هذه الآية على مجرد الوعيد فدمكر الذين من قبلهم الخ اعلم ان المقصود من هذه الآية المبالغة فى وصف وعيد اولئك الكفار و قيل للذين اتقوا الخ اعلم انه تعالى لما بين احوال الاقوام الذين اذا قيل لهم ماذا انزل ربكم قالوا اساطير الاولين اتبعه بذكر وصف المؤمنين هل ينظرون الا ان الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الثانية لمنكرى النبوة فانهم طلبوا ان ينزل الله تعالى ملكا من السماء يشهد على صدقه فى ادعاء النبوة و قال الذين اشركوا الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الثالثة لمنكرى النبوة و تقريرها انهم تمسكوا بصحة القول بالجبر على الطعن فى النبوة فالكل من الله و لا فائدة فى مجيئك و ارسالك فكان القول بالنبوة باطلا و اقساموا بالله جهد ايمانهم الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الرابعة لمنكرى النبوة فقالوا القول لبعث والحشر والنشر باطل فكان القول بالنبوة باطلا والذين هاجروا الخ اعلم انه تعالى لما حكى عن الكفار انهم تمادوا فى العى والجهن والضلال و فى مثل هذه الحالة لا يبعد اقدمهم على ايداء المسلمين و حينئذ يلزم على المؤمنين ان يهاجروا فذكر تعالى حكم تلك الهجرة و ما ارسلنا من قبلك الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الخامسة لمنكرى النبوة كانوا يقولون الله اعلى و اجل من ان يكون رسوله و احدا من البشر فامن الذين مكروا الخ قال المسكين اخذ من الكبير لعله راجع الى بيان حال الذين اضطروا المسلمون الى الهجرة من ايدائهم فهدم الله تعالى اولم يروا الى ما خلق الله الخ قال المسكين رجوع الى اثبات التوحيد و اقامة الدلائل و ابطال اقوال

التي ختمت السورة السابقة باليات الرسالة وفتح هذه ببيان التوحيد و ايضا لما قال فى تلك ولقد علمت انك يضيق صدرك اخبر فى هذه بانه اتى امر الله الخ لتلايق صدره ۱۲ منه عفى عنه

المشركين من اتخاذ الولد له تعالى ونحوه و تهديدهم بقوله ولو يؤاخذ الله الناس و فساد
 منذهب عبدة الاصنام بالامثال من قوله ضرب الله مثلا عبدا الخ و ضرب الله مثلا رجلين
 الخ و اختصاص علم الغيب به تعالى في قوله ولله غيب السموات والارض و كمال قدرته
 على كل شيء من الامور التي يؤيد مطلب التوحيد و امتدت هذه الدلائل الى قوله تعالى و
 الله جعل لكم مما خلق ظللا وجعل لكم من الجبال اكنانا الى اخر الآية ثم نبه على كون تلك
 الامور نعمتا تاما بقوله كذلك يتم نعمة عليكم لعلمكم تسلمون ثم سلى رسوله الله صلى الله
 عليه وسلم ان تولوا وانكروا بعد المعرفة بقوله فان تولوا وقوله يعرفون نعمة الله الخ و يوم
 نبعث من كل امة شهيد الخ اعلم انه تعالى لما بين من حال القوم انهم عرفوا نعمت الله ثم
 انكروها اتبعه بالوعيد فذكر حال يوم القيامة قال المسكين و امتد ذلك الى قوله و يوم نبعث
 المكرر ولما كان المبين لهله المهمات هو القرآن ختمه بالشاء على القرآن بقوله و نزلنا عليك الخ
 ان الله يامر بالعدل الخ قال المسكين اخذ من ابي السعد كانه دليل لكون القرآن تبيانا
 لكل شيء يعنى امر الله تعالى في هذا القرآن بكل محمود و نهى فيه عن كل مذموم فصدق
 كونه تبيانا و هدى الخ و يحتمل ان يكون اجمالا لما سبق من تفصيل الاحكام و اوقوا بعهد
 الله الخ اعلم انه تعالى لما جمع كل المامورات والمنهيات في الآية الاولى على سبيل الاحمال
 ذكر في هذه الآية بعض تلك الاقسام ولو شاء الله الخ قال المسكين هذا بيان حكمة تخصيص
 النبيين بيوم القيامة ما عندكم ينفذ الخ قال ابو السعد تعليلا للخيرية بطريق الاستيناف من
 عمل صالحا من ذكر الخ قال ابو السعد شروع في تحريض كافة المؤمنين على كل عمل
 صالح غيب ترغيب طائفة منهم في الثبات على ما هم عليه من عمل صالح مخصوص دفعتوهم
 اختصاص الاجر الموفور بهم و بعملهم للذكور فاذا قرأت القرآن الخ اعلم انه تعالى لما قال
 قبل هذه الآية ولتجزينهم اجرهم باحسن ما كانوا يعملون ارشد الى العمل الذي به تخلص
 اعماله عن الوسوس فقال فاذا قرأت القرآن قال ابو السعد و تخصيص قراءة القرآن من
 بين الاعمال الصالحة بالاستعاذة عند اذاعتها للتبنيه على انها لغيره عليه السلام و في سائر
 الاعمال اهم فانه عليه السلام حيث امر بها عند قراءة القرآن الذين لا ياتيه الباطل من بين
 يديه ولا من خلفه فما ظنكم بمن عداه عليه السلام فيما عدا القراءة من الاعمال و اذا بدلنا
 اية الخ اعلم انه تعالى شرع من هذا الموضع في حكاية شبهات منكري نبوة محمد صلى
 الله عليه وسلم من كفر بالله من بعد ايمانه الخ قال ابو السعد هو ابتداء كلام لبيان حال من
 كفر بايات الله بعدما امن بها بعد بيان حال من لم يؤمن بها رأسا ثم ان ربك للنين هاجروا الخ
 لما ذكر في الآية المتقدمة حال من كفر بالله و حال من اكراه على الكفر ذكر بعده حال من
 هاجر من بعدما فتن قال المسكين ثم ذكر اليوم الذي يجازى فيه الكافر والمؤمن فقال يوم
 تاتي كل نفس الخ و ضرب الله مثلا قرية الخ اعلم انه تعالى لما هدد الكفار بالوعيد الشديد

في الآخرة هددهم ايضا باقات الدنيا و هو الوقوع في الجوع والخوف ولقد جاءهم رسول منهم الخ قال ابو السعود من تنمة المثل جئى بهما لبيان ان مافعلوه من كفران النعم لم يكن مزاحمة منهم لقضية العقل فقط بل كان ذلك معارضة لحجة الله على الخلق ايضا فكلوا مآرزكم الله الخ يعنى ان ذلك الجوع انما كان بسبب كفركم فاتركوا الكفر حتى تاكلوا انما حرم عليكم الميتة الخ يعنى انكم لما امنتتم و تركتم الكفر فكلوا الحلال الطيب واتركوا الخبائث و لا تقولوا الماتصف الخ اعلم انه تعالى لما حصر المحرمات بالغ في تأكيد ذلك الحصر و على الذين هادوا الخ قال ابو السعود هو تحقيق لما سلف من حصر المحرمات فيما فصل بابطال ما يخالفه من قرية اليهود و تكذيبهم في ذلك فانهم كانوا يقولون لسنا اول من حرمت عليه و انما كانت محرمة على نوح و ابراهيم و من بعدهما حتى انتهى الامر لنا قال المسكين يمكن ان يكون هذا تائيدا لما سلف من وقوع الجوع والخوف على القرية بسبب كفرهم و حيث لم يحط الفائدة قوله تعالى و ما ظلمناهم الخ ثم ان ربك للذين عملوا الخ اعلم ان المقصود بيان ان الافتراء على الله و مخالفة امر الله يامنهم من التوبة و حصول المغفرة و الرحمة ان ابراهيم كان امة الخ اعلم انه تعالى لما زيف في هذه السورة مذاهب المشركين في قولهم بالثبات الشركاء و طعنهم في نبوة الانبياء و قولهم تحليل اشياء و تحريم اشياء و كان ابراهيم عليه السلام رئيس الموحدين و قدوة الاصوليين و المشركون كانوا مفتخرين به لاجرم ذكره الله تعالى في اخر هذه السورة ليصير ذلك حاملا على الاقرار بالتوحيد و الرجوع عن الشرك انما جعل السبب الخ قال ابو السعود تحقيق لذلك النفي الكلى و توضيح له بابطال ما عسى يتوهم كونه قادحا في كلية فان اليهود كانوا يدعون ان السبب من شعائر الاسلام و ان ابراهيم عليه السلام كان محافظا عليه اى ليس السبب من شرائع ابراهيم و شعائر ملة التي امرت بالتباعها حتى يكون بينه عليه الصلوة و السلام و بين بعض المشركين علاقة في الجملة و انما شرع ذلك لنبى اسرائيل بعد مدة طويلة ادع الى سبيل ربك الخ اعلم انه تعالى لما امر محمد صلى الله عليه وسلم بالتباع ابراهيم عليه السلام بين الشئ الذى امره بمتابعته فيه فقال ادع الخ و ان عاقبتهم فعاقبوا الخ قال ابو السعود بعدما امره عليه الصلوة و السلام فيما يختص به من شان الدعوة بما امره به من الوجه اللائق عقبه بخطاب شامل له و لمن شايعه فيما يعم الكل فان الدعوة المأمور بها لا تكاد تنفك عن ذلك كيف لا وهى موجبة لصرف الوجوه عن القبل المعبودة و ادخال الاعناق في فلاة غير معهودة قاضية عليهم بفساد ما ياتون و ما يدرون و بطلان دين استمرت عليهم اباؤهم و قد ضاقت عليهم الحيل و عييت لهم العلل و سدت عليهم طرق المحاجة و المناظرة و ارتجت دونهم ابواب المباحثة و المحاوره

سورة بنى اسرائيل

واتينا موسى الكتاب الخ ذكر الله تعالى في الآية الاولى اكرامه محمد صلى الله عليه وسلم بان اسرى به وذكر في هذه الآية انه اكرم موسى عليه الصلوة والسلام قبله بالكتاب الذى اتاه ذرية من حملنا الخ قال ابو السعود والمراد تاكيد الحمل على التوحيد بتذكير انعامه تعالى عليهم فى ضمن انجاء اباؤهم من الغرق فى سفينة نوح عليه السلام انه كان عبداشكورا الخ قال ابو السعود فيه ايدان بان انجاء من معه كان بركة شكره عليه الصلوة والسلام وحث للذرية على الاقتداء به وزجر لهم عن الشرك الذى هو اعظم مراتب الكفران وقضينا الى بنى اسرائيل الخ اعلم انه تعالى لما ذكر انعامه على بنى اسرائيل بانزال التورته عليهم وبانه جعل التوراة هدى لهم بين انهم ما اهدوا ابهاده بل وقعوا فى الفساد ان احسنتم الخ اعلم انه تعالى حكى عنهم انهم لما عصوا سلط عليهم اقواما ولما تابوا ازال عنهم تلك المحنة فعند ذلك ظهر انهم ان اطاعوا فقد احسنوا الى انفسهم وان اصرروا على المصيبة فقد اساؤا الى انفسهم ان هذا القران يهدى الخ انه تعالى لما شرح ما فعله فى حق عباده المخلصين وهو الاسراء برسول الله صلى الله عليه وسلم وابتاع الكتاب لموسى عليه السلام وما فعله فى حق العصاة والمتمردين وهو تسليط انواع البلاء عليهم كان ذلك تنبيها على انه طاعة الله توجب كل خير وكرامة ومعصية توجب كل بلية وغرامة لاجرم اثنى على القران ويدع الانسان بالشر الخ قال ابو السعود بيان لحال المهدي اثر بيان الهادى و اظهار لما بينهما من التباين والمراد بالانسان الجنس اسند اليه حال بعض افراده او حكى عنه حاله فى بعض احيائه فالمعنى على الاول ان القران يدعو الانسان الى الخير الذى لاخير فوقه من الاجر الكبير ويحذره من الشروراء من العذاب الاليم وهو الكافر يدعو لنفسه بما هو الشر من العذاب المذكور اما بلسانه حقيقة كذاب من قال منهم انهم ان كان هذا هو الحق من عندك فامطر علينا حجارة من السماء او اتنا بعذب اليم واما باعمالهم السيئة المضينه اليه الموجبة له مجازا كما هو ديدن كلهم وعلى الثانى ان القران يدعو الانسان الى ما هو خير وهو فى بعض احيائه كما عند الغضب يدعه ويدعو الله تعالى لنفسه

لما صلى الله تعالى رسوله صلى الله عليه وسلم فى اخر السورة المتصلة اراده تسلية فى هذه بيان اكرامه بالاسراء كيلا يلفت الى اعداءه ۱۲ منه عفى عنه

و اهله و ماله بما هو شرو جعلنا الليل و النهار الخ لما بين في الآية المتقدمة ان هذا القرآن يهدى للتي هي اقوم و ذلك الاقوم ليس الا ذكر الدلائل الدالة على التوحيد و النبوة لاجرم اردفه بذكر دلائل التوحيد و هو عائب العالم العلوى و السفلى و كل انسان الزمناه الخ قال المسكين لما بين تعالى ان القرآن يهدى للتي هي اقوم و بين حال المكلفين به في هذه الآية ان امر الاعمال ليس مهملا بل يسئلون عنه يوم القيامة من اهتدى فانما الخ قال ابو السعود فذلك لما تقدم من بيان كون القرآن هاديا لا قوم الطرائق و لزوم الاعمال لاصحابها و لا تزروا زرة الخ قال ابو السعود تأكيد للجملة الثانية و ما كنا معنيين الخ قال ابو السعود بيان للعناية الربانية اثر بيان اختصاص اثار الهداية و الضلال باصحابها و علم حرمان المهتدى من ثمرات هداية و علم مواخذة النفس بجناية غيرها و اذا اردنا الخ قال ابو السعود بيان لكيفية وقوع التعذيب بعد البعثة التي جعلت غاية لعد صحته من كان يريد العاجلة الخ قال المسكين لما ذكر فيما سبق جزاء الاعمال ذكر في هذه الآية شرط قبولها و هو ارادة الآخرة بالعمل و بين علم الاغترار بالدنيا و زخارفها بانها من العطاء العالم الذي لا يدل على القبول لا تجعل مع الله الها اخر الخ لما بين ان الناس فريقان منهم من يريد بعمله الدنيا فقط و هو اهل العقاب و العذاب و منهم من يريد به طاعة الله و هم اهل الثواب ثم شرط ذلك بشرائط ثلاثة اولها ارادة الآخرة و ثانيها ان يعمل عملا و يسعى سعيا موافقا لطلب الآخرة و ثالثها ان يكون مؤمنا لاجرم فصل في هذه الآية تلك المجملات فبدأ اولاً بشرح الايمان و اشرف اجزاء الايمان هو التوحيد و نفى الشركاء و الاضداد فقال لا تجعل مع الله الها اخر ثم ذكر عقبيه سائر الاعمال التي يكون المقدم عليها و المشتغل بها ساعياً سعياً يليق بطلب الآخرة و صار من الذين سعدوا بهم و حسن بختهم و كملت احوالهم ذلك مما اوحى اليك ربك الخ اعلم انه تعالى جمع في هذه الآية خمسة و عشرين نوعاً من التكاليف بعضها او امر و بعضها نواه جمعها الله تعالى في هذه الآيات و جعل فاتحتها قوله و لا تجعل مع الله الها اخر فتعلمون ما مخنولاً و خاتمتها قوله و لا تجعل مع الله الها اخر فتلقى في جهنم ملوماً مدحوراً و لقد صرفنا الخ قال المسكين اخذ من ابي السعود هذاتاكيد لاثبات الاوهيا اى كررنا هذا المعنى في هذا القرآن بحيث لا يلقى التباس فيه قل لو كان الخ قال المسكين عود الى ابطال الشرك و اذا قرأت القرآن الخ اعلم انه تعالى لما تكلم في الآية المتقدمة في المسائل الالهية تكلم في هذه الآية فيما يتعلق بتقرير النبوة قالوا اذا كنا الخ اعلم انه تعالى لما تكلم اولاً في الالهيات ثم اتبعه بذكر شبهاتهم في النبوات ذكر في هذه الآية شبهات القوم في انكار المعاد و البعث و قد ذكرنا كثيراً ان

مدار القرآن على المسائل الاربعة و هي الالهيات والنبوات والمعاد والقضاء والقدر و قل لعبادى الخ لما ذكر الحجة اليقينية فى ابطال الشرك و فى صحة المعاد قال فى هذه اذار دتم ايراد الحجة على المخالفين فاذكروا تلك الدلائل بالطريق الاحسن و هو ان لا يكون ذكر الحجة مخلوطاً بالشتم والسب ربكم اعلم بكم الخ قال المسكين كانه تعليل للقول الاحسن و علم الخشونة بانه لافائدة فيها لان الهداية والضلال متعلقان بالمشيئة الازلية و ربك اعلم بمن الخ بمعنى انه غير مقصور عليكم و لا على احوالكم بل علمه بجميع الموجودات و المعدومات فيعلم حال كل واحد و يعلم ما يليق به من المصالح و المفاسد فلهذا السب فضل بعض النبيين على بعض و اثنى موسى التورة و داؤد الزبور و عيسى الانجيل فلم يعد ايضا ان يوتى محمد القرآن و ان يفضله على جميع الخلق قل ادعوا الذين زعمتم الخ قال المسكين رجوع الى ابطال الشرك ببيان ان الذين تعبدونهم محتاجون الى الاله الحق فكيف تتخلونهم الهة و ان من قرية الانحن الخ قال ابو السعود بيان لتحتم حلول عذابه تعالى بمن لا يحضره اثر بيان انه حقيق بالحذر و ان اساطين الخلق من الملكة و النبيين عليهم الصلوة و السلام على خد من ذلك و ما معنا الخ قال المسكين عود الى مسئلة النبوة بالجواب عن اقتراحهم بالآيات الدالة على النبوة على زعمهم و اذ قلنا لك ان ربك الخ قال المسكين اخذ من ابي السعود هذا متمم للجواب المذكور فى الآية الاولى و حاصله ان الله محيط بجميع الاشياء و قد علم ان هؤلاء يكذبون و لو ظهرت لهم مقترحاتهم كما كذبوا بالرويا التى اريناك و كما كذبوا بالشجرة التى جعلت فى القرآن للملعونين تنبت فى اصل الجحيم فلوانا ارسلنا بما افترحوه من الآيات لفعلوها ما فعلوا بنظائرهما و فعل بهم ما فعل باشياعهم و قد قضينا بتاخير العقوبة العامة لهذه الامة الى الطامة الكبرى و هو معنى قوله و نخوفهم فما يزيدهم الاطغيانا كبيرا و اذ قلنا للملكة اسجدوا الخ قال المسكين لما قرأ الله تعالى امر التوحيد و النبوة و كيفية الاعمال شرع الآن فى تعبد النعم الباعثة على الايمان و الرادعة عن الكفر فذكر اول قصة اكرام بنى ادم بذكر اكرام ابيهم ادم عليه السلام و تضمنت هذه الحكاية تحقيق مضمون قوله تعالى اولئك الذين يدعون ببيان ان للملكة امتثلوا و اطاعوا من غير تردد و تلعثم و تحقيق مضمون قوله تعالى فما يزيدهم الاطغيانا كبيرا ببيان عناد ابليس و عتوه عن امر الله تعالى ربكم الذى يزجى لكم الخ قال ابو السعود و هذا تكبير لبعض النعم التى هى دلائل التوحيد و تمهيد لذكر توحيدهم عند مساس الضر تكملة لما مر من قوله تعالى فلا يملكون الخ و لقد كررنا بنى ادم الخ اعلم ان المقصود من هذه الآية

ذكر نعمته اخرى جليلة رفعية من نعم الله تعالى على الانسان يوم ندعوا كل الناس الخ اعلم انه تعالى لما ذكر انواع كرامات الانسان في الدنيا ذكر احوال درجاته في الآخرة قال المسكين و ايضا هو تقرير لما مر من البات البعث والحساب و ان كادوا ليفتونك الخ قال المسكين هذا بيان لعداوة الكفار مع النبي صلى الله عليه وسلم في امر الدين و هو المذكور في هذه الآية و في الامر الدنيا و هو فيما بعد في قوله تعالى و ان كادوا ليستفزونك الخ و هو راجع الى بحث النبوة فكان المذكور فيما سبق هو التكذيب و ههنا العداوة اقم الصلوة لدلوك الشمس الخ لما قال و ان كادوا ليستفزونك امره تعالى بالاقبال على عبادته تعالى لكي ينصره عليهم فكانه قيل لاقبال لسعيهم في اخراجك من بلدتك ولا تلغت اليهم واشتغل بعبادة الله تعالى و دوام على اداء الصلوات و نظيره قوله تعالى فاصبر على ما يقولون واسبح بحمد ربك قال المسكين ثم ذكر ثمره اقباله عليه السلام على عبادة تعالى تطيبا لقلبه و شغلا له عن عداوتهم والاهتمام بهم فقال عسى ان يعثك ربك مقاما محمودا ثم امره عليه الصلوة والسلام بان يفوض امره خوله و خروجه اليه تعالى في كل حال و يطلب منه العزو النصر و لا يبالي بكيدهم ولا يدبر لنفسه فقال و قل رب ادخلني مدخل صدق الخ ثم بشره الله تعالى باجابة دعائه بالنصر فقال و قل جاء الحق و زهق الباطل و نزل من القران ما هو شفاء الخ قال المسكين هذا دليل لنبوته عليه السلام ببيان معجزته التي فاقت كل معجزة فهو ايضا عائد الى تقرير النبوة التي ذكرت في الآيات السالفة ثم انه تعالى ذكر السبب الاصل في وقوع هؤلاء الجاهلين الضالين في اودية الضلال و مقامات الخزي والنكال و هو الاستكبار والبطور والياس والقنوط و يجمعها الغفلة والقسوة فقال و اذا انعمنا على الانسان الخ ثم بين في قوله قل كل يعمل الخ ان اعمال المؤمنين من قبول الهدى والرحمة و اعمال الكافرين من الغفلة والقسوة على طريقتهم التي تشاكل حالهم و يستلونك عن الروح الخ قال المسكين هذا ايضا متعلق بمسئلة النبوة و جواب عما اراد اليهود بالسؤال عنه ابطال امر نبوة عليه السلام و الزام الحجة عليه و لئن شئنا لنذهبن الخ قال المسكين هذا ايضا تقرير لنبوته عليه السلام بكونه عليه السلام مؤيدا بالوحي و ثباته من الله تعالى قل لئن اجتمعت الانس الخ قال المسكين هذا ايضا تقرير لنبوته عليه السلام ببيان كون وحيه معجزا و لقد صرفنا الخ قال المسكين بيان لجلالة القران العظيم بانه كاف شاف واف للمقصود و ذكر لشدة عاد الكفار المنكرين و قالوا لن نؤمن الخ قال المسكين هذا جواب عن قدجهم في نبوة عليه السلام باقتراح الآيات عناد او حاصل الجواب اني بشر لا اقدر بنفسى على الايتان بالآيات لكنى رسول يكفى

للدلالة على رسالتي دليل مالان الدليل الواحد السالم عن القادح يكفى في اثبات المطلوب ولا يلزم اجتماع الدلائل الكثيرة والالم يثبت شيء من المطالب لان المخاصم لا ينتهي الى حد بل لا يزال يطالب مدة عمره بالدلائل الغير المتناهية وهذه سفسطة بينة و ما منع الناس ان يؤمنوا الخ اعلم انه تعالى لما حكى شبهة القوم في اقتراح المعجزات الزائدة واجاب عنها حكى عنهم شبهة اخرى و هي ان الله تعالى لو ارسل رسولا الى الخلق لوجب ان يكون من الملكة فاجاب الله تعالى عن هذه قل كفى بالله الخ تقريره ان الله تعالى لما اظهر المعجزة على وفق دعواى كان ذلك شهادة من الله تعالى على كوني صادقا فبعد ذلك قول القائل بان الرسول يجبان يكون ملكالا انسانا تحكم فاسدو من يهدى الله فهو المهتد الخ اعلم انه تعالى لما اجاب عن شبهات القوم في انكار النبوة و اردفها بالوعيد الاجمالى و هو قوله انه كان بعباده الخ ذكر بعده الوعيد الشديد على سبيل التفصيل قال المسكين و علل الوعيد بشين الكفر بالآيات الدالة على التوحيد والنبوة و انكار البعث ثم اجاب عن استبعادهم للبعث بقوله او ثم يروان الله الخ فمدار الكلام ههنا على امر النبوة والمعاد قل لو انتم تملكون الخ ان الكفار لما قالو ان تؤمن لك الخ طلبوا اجراء الانهار والعيون فى بلدتهم لتكثر اموالهم و تتسع عليهم معيشتهم فبين الله تعالى لهم انهم لو ملكوا خزائن رحمة الله لبقو على بخلهم و شحهم ولما اقلعوا على اىصال النفع الى احدو على هذا التقدير فلا فائدة فى اسعافهم بهذا المطلوب الذى التمسوه قال المسكين خلاصة المرام ان اظهار المقترحات اما للدلالة على النبوة فجوابه مامر فى قوله هل كنت الابشرا رسولا و اما لاتساع الارزاق فجوابه على ما ذكر ههنا ان الاتساء لا يكون حسب قانون التمدن الابان يعاون بعضهم بعضا و هؤلاء بنخلهم ما كانوا لعيان فانفتت هذه الفائدة ايضا فكان اظهار المقترحات عبثا محضاً فافهم والاحسن والاقرب ان يفسر والرحمة بالنبوة و يقال انه تعالى لما بين فيما قبل انكارهم للنبوة الدال على المكراهة فرع على هذه الكراهة انكم لو تملكون فرضا امر النبوة لما اعطيتموها احدا و لقد اتينا موسى الخ قال المسكين تنظير لاثبات الرسول بالآيات العظام و عناد الكفرة الجهلة اللئيم بالحق انزلناه الخ عادالى تعظيم حال القران و جلالة درجة قل ادعوا الله الخ قال المسكين تقرير للتوحيد والعبادة فى الخاتمة كما كان فى الفاتحة فتاسب الاول والاخر

فہرست مضامین

۵	سُورَةُ النِّسَاءِ
۵	قرآن کریم کی اس آیت پر ایک اشکال اور اس کا جواب
۷	آیت کلالہ سے متعلق ایک عجیب نکتہ
۷	جہالت کی حقیقت
۸	نص کا مدلول چار طرح سے ثابت ہے
۹	علم و جہل کے معنی
۱۰	دوام ترک معاصی عادیہ حال کے پیدا کرنے پر موقوف ہے
۱۱	ایک آیت کی تفسیر بے نظیر
۱۲	مستورات کے لئے سفارش قرآن میں
۱۳	مسئلہ تساوی
۱۳	اقسام فضائل
۱۵	امور اختیاری و غیر اختیاری
۱۶	تمنا کی حقیقت
۱۶	حرۃ کی مملوکیت جائز نہیں
۱۸	بے برکت نیکی
۱۸	پھو ہڑ عورتوں میں ایک کمال
۱۹	مطلوب کی دو قسمیں
۲۰	عنایت رحمت خداوندی
۲۰	عورتوں سے مساویانہ سلوک نہ کرنے کا حکم

۲۱	بدطینت عورت کا طریق تنبیہ
۲۱	طلاق سے قبل ضرورت بیچ
۲۲	احکام شرعیہ میں رعایت جذبات
۲۳	شرک کی حقیقت
۲۵	معفرت اور اجر عظیم کا وعدہ
۲۶	اپنی رائے کی اتباع کی مذمت
۲۷	حدیث شریف حجت مستقلہ ہے
۲۸	اطاعت کی دو قسمیں
۲۸	حضور اکرم ﷺ کی شان محبوبیت
۲۹	محسن کائنات
۳۰	احکام شرعیہ کے بارے میں دل میں تنگی محسوس ہونا علامت کفر ہے
۳۰	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان عظمت و جلال محبوبیت اور محبت
۳۲	کمال ایمان کی تحصیل کا طریقہ اور دستور العمل
۳۲	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم بنانے کا امر
۳۳	ہمارے سارے کام ناقص ہیں
۳۳	رسول اکرم ﷺ کی محبوبیت کے دلائل
۳۶	اصل موثر فضل الہی ہے
۳۶	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان محبوبیت
۳۷	اسلام کیلئے صرف اعتقاد کافی نہیں
۳۸	شان نزول
۳۹	معیت سے مراد
۴۱	چالاکی اور عقل دونوں الگ الگ ہیں
۴۲	احوال منافقین
۴۳	قتل عمد کی سزا

۴۳	ہر اخبار کی اشاعت کی مضرت
۴۴	قرآن عجیب کیسا ہے
۴۴	دارالکفر کی دو قسمیں
۴۵	شاہانہ محاورات
۴۶	ایک اشکال کا جواب
۴۷	رسول اکرم ﷺ کی عصمت
۴۸	قرآن پاک کے ایک مشکل مقام کی تفسیر
۵۲	اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے
۵۲	بعثت محمدیہ ﷺ
۵۳	علم دین سے دین و دنیا کا نفع
۵۴	تنزیل کتاب کا مفہوم
۵۴	کتاب و حکمت
۵۵	زبانوں کی دو قسمیں
۵۷	حاصل آیت
۵۸	کسی نے داڑھی کا ثبوت قرآن سے دیا
۵۸	غفلت ذکر کا انجام
۵۹	تنبیہ ثانی
۵۹	تنزیل اور تعلیم
۵۹	فضل عظیم صرف علوم دینیہ ہیں
۶۰	شان نزول
۶۱	ارتداد کی خاصیت
۶۳	منافقین کو ملامت
۶۳	قیامت میں مسلمانوں ہی کو کفار پر غلبہ حاصل ہوگا

۶۶	قرآن سمجھنے کیلئے ضروری علوم
۶۹	اعمال صالحہ میں ہمیشہ مشقت رہتی ہے
۷۰	کسل اعتقادی
۷۰	غیر محقق واعظین کی ایک غلطی
۷۱	شکر کی اہمیت
۷۲	غیر محبوب کا مبغوض ہونا مسلم ہے
۷۲	تکبر کی صورتیں
۷۳	حب اور بغض
۷۵	کبر قلبی
۷۶	سلطانا کے معنی اور آیت کا صحیح مفہوم
۷۷	مخلوق کی شان میں تجاوز اللہ تعالیٰ کی تنقیص ہے
۷۸	حدود مدح
۷۹	غایات قصص القرآن
۸۰	سُورَةُ الْمَائِدَةِ
۸۱	شُرک کی حقیقت
۸۱	تفسیر مَا أَهْلٌ لِّغَيْرِ اللَّهِ
۸۲	امراض روحانی کا انجام
۸۳	دین کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے
۸۳	وقت نزول آیت مذکور
۸۳	ابتداء فی الدین
۸۵	احکام کی آخری آیت
۸۵	اسلام کا معجزہ

۸۷	دین اسلام کبھی تاسخ ہونے والا نہیں
۹۱	حاصل آیت
۹۲	خاتمہ کا حال
۹۲	بے ہوشی کا قول و فعل شرعاً معاف ہے
۹۳	روحانی مطلب میں کوئی مرض لا علاج نہیں
۹۳	کلام اللہ میں صیغہ واحد اور جمع کے استعمال حکمت
۹۳	نحوی قاعدہ سے ایک اشکال کا جواب
۹۶	نکتہ دروح از جل
۹۷	اختلاف قراءۃ
۹۷	کفار و مشرکین سے بھی عدل کا حکم
۱۰۰	دو نعمتیں
۱۰۰	حقیقت علم
۱۰۱	نور سے کیا مراد ہے
۱۰۳	ضرورت شیخ نص کی روشنی میں
۱۰۳	اہل کتاب کے اتحاد کی غرض
۱۰۳	عجیب و غریب ربط
۱۰۶	ایک غلطی کا ازالہ
۱۰۷	دور حاضر کی رسومات کا حال
۱۰۸	شان نزول
۱۱۰	علوم کی دو قسمیں
۱۱۱	آیت هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ کے ایک لطیف معنی
۱۱۳	سُورَةُ الْأَنْعَامِ
۱۱۳	لہو اور لعب کا مفہوم

۱۱۳	اصلاح زاہد خشک
۱۱۴	ضرورت زبان دانی
۱۱۵	آیات تسلی
۱۱۶	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان عشق کے مطابق ایک آیت کی تفسیر
۱۱۶	رسول اکرم ﷺ کے غم و حزن کا غشاء
۱۱۸	گفتوں کی قسمیں
۱۱۸	لغوی قصے
۱۱۹	مراۃ خداوندی
۱۲۱	تقسیم مال و عقل میں حکمت خداوندی
۱۲۱	حقوق اللہ
۱۲۲	عشر ادا نہ کرنے کا عبرتناک واقعہ
۱۲۳	اسراف کی حقیقت
۱۲۳	رہبہ ماسبق
۱۲۳	ادراک کی قسمیں
۱۲۵	سبب معصیت ممنوع ہے
۱۲۶	گناہ کی دو قسمیں
۱۲۷	صراط مستقیم فقط اسلام ہے
۱۲۸	حاصل آیت
۱۲۸	دارالسلام کی عجیب و غریب تفسیر
۱۲۸	اعمال کا صلہ
۱۳۰	رفع اشکال
۱۳۰	محبت کا اثر
۱۳۱	بعض سنیا سیوں پر ذکر و شغل کا اثر

۱۳۲	ضرورت تدبیر
۱۳۳	ایک مشترک مرض
۱۳۶	صراط الرسول ﷺ دراصل صراط اللہ ہے
۱۳۶	تفسیری نکتہ
۱۳۶	وَصَلُّمُکُمْ کَا مَفْہُوم
۱۳۷	خلاصہ نجات
۱۳۸	بے خطر راستہ صراط حق ہے
۱۳۹	تینوں آیات کے آخر میں ذالکم و صکم کا عجیب نکتہ
۱۴۰	محبت کا اثر
۱۴۱	نیکی کا قانون
۱۴۳	تمام دین کا خلاصہ
۱۴۴	اسلام کامل کی تفسیر
۱۴۵	اسلام کامل کے اجزاء
۱۴۶	کمال اسلام کے بارے میں تفصیل
۱۴۷	آیت کی بلاغت
۱۴۸	رب الغلیمین کو ذکر کرنے کا فائدہ
۱۴۹	نَقَطَ لَا تُسَوِّیْکَ لَهَا کِی حِکْمَت
۱۴۹	أَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَا مَطْلَب
۱۵۱	سُورَةُ الْأَعْرَافِ
۱۵۱	قرآن اصطلاحات فنون پر وارد نہیں
۱۵۲	شیطان کو حاکمانہ جواب
۱۵۳	خطا اجتہادی
۱۵۴	دنیا کی نعمتوں کو اہل ایمان کیلئے پیدا کیا گیا

۱۵۵	زینت کی دو قسمیں
۱۵۵	اشفاق طیبات
۱۵۶	مفتاح سعادات
۱۵۷	شان نزول
۱۵۷	اہل نظر کو گناہ کا ادراک ہو جاتا ہے
۱۵۸	زینت کا لباس پہننے کی اجازت
۱۵۹	لفظ قل لانے میں حکمت
۱۵۹	مامورات کی تین قسمیں
۱۶۱	مجاہدہ میں غلو مذموم ہے
۱۶۱	اشیاء حرام کی پانچ اقسام
۱۶۲	خطابات قدیم
۱۶۵	اہل اعراف
۱۶۶	کفار ذی اخلاق کے اہل اعراف ہونے کی کوئی دلیل نہیں
۱۶۶	انفاق کے لئے محل کا ہونا ضروری ہے
۱۶۸	قرآن حکیم میں صرف دو فریق کا ذکر ہے
۱۶۸	اہل اعراف امیدوار جنت ہوں گے
۱۶۹	اہل اعراف
۱۷۱	علمی اشکال
۱۷۲	خلق و امر
۱۷۳	فساد فی الارض
۱۷۳	فساد اور اصلاح کا مفہوم
۱۷۵	دین کی حقیقت
۱۷۶	تصرف و حکمت

۱۷۶	دعا و تفعیض
۱۷۷	خلاف تفعیض دعاء
۱۷۸	امن عامہ
۱۷۸	ساحران کو عاجز کرنے کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجازت دی
۱۷۹	سحر عظیم اور نظر بندی
۱۸۰	لَنْ تَرٰیہِیْ کی عجیب تفسیر
۱۸۲	تقدم ذاتی
۱۸۳	نور مخلوق
۱۸۳	غیب کا علم محیط حاصل ہونا استکار خیر کا سبب ہو سکتا ہے
۱۸۳	قذف کے معنی اور عجیب و غریب تفسیر
۱۸۵	تبلیغ میں ذوق نہیں
۱۸۶	خوف کی حقیقت
۱۸۶	متعین کی شان
۱۸۷	اہل تقویٰ کی حالت
۱۹۰	مجاہدہ سے مادہ قطع نہیں ہوتا
۱۹۲	تذکر کی اہمیت
۱۹۳	سُورَةُ الْاَنْفَالِ
۱۹۳	وَلَوْ اَسْمَعْتَهُمْ کا مفہوم
۱۹۵	مذمت کفار
۱۹۷	قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے
۱۹۸	کشف بلا اتباع شریعت شیطانی چیز ہے
۱۹۸	اتفاق کا تعلق تدابیر سے نہیں

۱۹۹	کثرت رائے کے غیر صحیح ہونے کی دلیل
۲۰۰	مصیبت کی حقیقت
۲۰۱	عمل مبر و شکر
۲۰۲	مؤمن کی بشارت
۲۰۳	سُورَةُ التَّوْبَةِ
۲۰۴	کفر سے حربی نہیں ہوتا
۲۰۵	سبب افضلیت معیار ایمان ہے
۲۰۶	مسلمان اور کافر کی مثال
۲۰۷	تارک نماز کے لئے وعید
۲۰۹	افضل الاعمال
۲۱۲	رضا باسکس پر وعید نہیں
۲۱۳	کس قسم کی حب دینا مذموم ہے
۲۱۵	إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ رِجٌّ كَيْبِ عَمِيقٍ
۲۱۶	اسلامی لشکر کے شکست کی علت
۲۱۶	کلام الہی میں جذبات انسانی کی رعایت
۲۱۸	نبی رانہ سے شناسد
۲۱۹	جہاد میں سستی کا ایک سبب
۲۲۰	ارضاء رسول ﷺ کی دو جہتیں
۲۲۱	رضائے معتبر
۲۲۲	شان نزول
۲۲۳	یہاں عدد سبعین سے مراد کثرت ہے
۲۲۵	محرومی ایمان کا اثر

۲۲۶	سَبْعِينَ مَرَّةً تَكْثِيرَ كَلِمَةٍ لَمْ يَأْتِ فِيهَا
۲۲۷	واعظین کی ایک غلطی پر تنبیہ
۲۲۷	شریعت میں ہنسنے کی ممانعت نہیں
۲۲۹	حضور ﷺ نے منافق کے منہ میں لعاب مبارک کیوں ڈالا؟
۲۲۹	شان نزول
۲۳۰	شان مرادیت
۲۳۲	حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے احباب کے واقعات
۲۳۳	جہاد فرض عین اور فرض کفایہ
۲۳۳	کلام الہی کی ایک عجیب شان
۲۳۴	تفسیری نکتہ
۲۳۵	مرض خلط کا علاج
۲۳۶	صدقات واجبہ کا امر
۲۳۶	تطہیر اور تزکیہ
۲۳۷	آیت تلوک کا شان نزول
۲۳۸	تبلیغ اور سوال
۲۳۹	شان نزول
۲۳۳	قرآنی طرز فصاحت
۲۳۵	قلب اور موت
۲۳۶	عارفین کی محبت و معرفت میں اضافہ
۲۳۶	بذل نفس
۲۳۷	توبہ عبادات پر مقدم ہے
۲۳۸	نفس و مال
۲۳۹	ہر کام میں حفظ حدود کی اہمیت

۲۴۹	توبہ عبادات پر مقدم ہے
۲۵۰	توبہ عن المعاصی شرط کمال ہے
۲۵۱	بلا توبہ کے عمل میں نورانیت نہیں ہوتی
۲۵۱	ایک شبہ کا جواب
۱۵۲	احکام تکوینیہ و تشریحیہ کا پورا اختیار حق سبحانہ و تعالیٰ کے قبضہ میں ہے
۲۵۲	تمام غموم و افکار کا علاج
۲۵۳	ربط آیات
۲۵۳	مالکیت اور ملکیت
۲۵۵	تین صحابہ کا واقعہ توبہ
۲۵۶	اعجاز قرآن
۲۵۶	امر تقویٰ
۲۵۸	صادقین کی تشریح
۲۵۹	تفسیر آیت البر
۲۶۰	مشرق و مغرب کے ذکر میں نکتہ
۲۶۱	عقائد کا بیان
۲۶۱	اعمال شرعیہ کی اقسام
۲۶۳	حقوق العباد کی اقسام
۲۶۳	صبر کی حقیقت اور اس کے اقسام
۲۶۳	صبر کی اقسام
۲۶۶	کامل بننے کا طریقہ
۲۶۶	صادق کے معنی و تفسیر
۲۶۷	عورتوں اور مردوں کو حکم مشترک
۲۶۹	قرآن اور ذکر نسواں

۲۷۰	درجات مردوزن
۲۷۱	دین و خواتین
۲۷۲	شامت گناہ
۲۷۳	رؤف رحیم کا مفہوم
۲۷۴	سُورَةُ يُونُس
۲۷۴	چار افعال پر لٹاؤ
۲۷۵	رضا بال دنیا سے بہت کم لوگ خالی ہیں
۲۷۶	رضا بال دنیا کا حکم
۲۷۷	حب دنیا کے مراتب
۲۷۸	طالب علمانہ اشکال کا جواب
۲۷۹	مصیبت کے وقت انسان کا حال
۲۸۱	خلاصہ آیت
۲۸۲	مسلمانوں کی ایک قابل اصلاح کمی
۲۸۳	موت کا ایک وقت معین ہے
۲۸۳	سلوک میں ہر حال میں ترقی کرنے کی ضرورت
۲۸۳	ایک عجیب نکتہ
۲۸۶	خوشی کی دو قسمیں
۲۸۶	مسرت کی دو قسمیں
۲۸۷	عید میلاد النبی ﷺ کے دلائل اور ان کے جوابات
۲۹۱	عقلی تردید
۲۹۲	ولایت کی دو قسمیں
۲۹۲	دعا کو فوراً قبول ہونا ضروری نہیں

۲۹۳	فرعون نے صرف تکلم بکلمۃ الایمان کیا
۲۹۳	حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بغض فرعون
۲۵۶	سُورَةُ هُود
۲۵۶	ہر شخص کی روزی اللہ کے ذمہ ہے
۲۹۶	واعظین کی ایک غلطی
۲۹۷	اتباع دین میں ضرورت سہی
۲۹۸	طبعی و عقلی خوف کا فرق
۲۹۸	خوف طبعی
۲۹۸	رحمت ظاہرہ و باطنہ
۲۹۹	رحمت کی دو قسمیں
۳۰۰	نفسی جبر
۳۰۰	مسئلہ تقدیر
۳۰۱	مسئلہ کی دلیل بیان کرنا ہمارے ذمہ نہیں
۳۰۲	حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ایک آیت کی تفسیر
۳۰۳	اصلاح کے دو درجے
۳۰۳	اصلاح کے دو ثمرات
۳۰۳	توبہ کے لوازم
۳۰۳	اصلاح کا ثمرہ
۳۰۳	تولی کی قسمیں
۳۰۵	خلاصہ آیت
۳۰۵	آخرت میں دوام تحت المشیت ہوگا
۳۰۷	سعادت و نحوست کی حقیقت

۳۰۸	سعد و امیں نکتہ
۳۰۹	دو علمی نکتے
۳۱۱	حقیقی علم
۳۱۱	لطیفہ قلب
۳۱۳	فتا اور بقاء
۳۱۴	ارضاء رسول
۳۱۵	خلود اور مشیت
۳۱۶	سعید اور شقی
۳۱۷	تسبہ میلان باطنی کے بغیر نہیں ہوتا
۳۱۸	سُورَةُ يُوسُفَ .
۳۱۸	مسلمانوں نے دوست دشمن کو نہیں پہچانا
۳۱۹	نستیق کا ترجمہ
۳۲۰	حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکی کا ثبوت اور وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهَا وَهَمَّ بِهَا کی تفسیر بدیع
۳۲۱	یوسف علیہ السلام کے تمزیہ پر ایک بزرگ کا لطیفہ
۳۲۱	قرینہ پر مجرم قرار دینا جائز نہیں
۳۲۲	ہم کا مفہوم
۳۲۲	قرآن پاک کے ایک مشکل مقام کی تفسیر
۳۲۳	عورتوں کا مکر عظیم
۳۲۳	قدرت خداوندی
۳۲۳	غیبی رہنمائی
۳۲۵	نفس کے میلان الی الشر ہونے کا ثبوت
۳۲۶	حضرات انبیاء علیہم السلام بھی اپنے نفوس کا تمزیہ نہیں فرماتے

۳۲۷	براءت یوسف علیہ السلام کا عجیب استدلال
۳۲۸	احکام مال و جاہ
۳۲۹	کشف امر غیر اختیاری ہے
۳۳۰	حالت یعقوب علیہ السلام
۳۳۰	ذرائع علم کے باوجود یعقوب علیہ السلام کا عدم علم
۳۳۱	اعتقاد صحیح
۳۳۱	واقعہ مولانا یعقوب وسید بریلوی
۳۳۱	انبیاء علیہم السلام کو ہر امر پر مطلع ہونا ضروری نہیں
۳۳۲	ایک تفسیر برحان
۳۳۲	عالم میں حق کا آئینہ بننے کی استعداد ہے
۳۳۳	مصیبت گناہوں کی ہی وجہ سے آتی ہے
۳۳۳	حکایت حضرت شیخ عبدالقدوس صاحب گنگوئی
۳۳۳	علم اعتبار کی حقیقت
۳۳۶	تشہ میں مشہہ کا افضل ہونا ضروری نہیں
۳۳۷	سُورَةُ الرَّعْدِ
۳۳۷	اطمینان قلب صرف ذکر اللہ میں ہے
۳۳۷	تکرار ذکر سے عذاب غم سے نجات ہوگی
۳۳۸	بیماری میں آہ کا منہ سے نکالنا خلاف صبر نہیں
۳۳۸	تدریجی تعلیم
۳۳۹	اعمال آخرت میں دنیاوی منافع
۳۳۹	گناہوں سے دنیا کا نقصان
۳۴۰	قرار و سکون صرف ذکر اللہ میں ہے

سُورَةُ اِبْرٰهِيْمَ

۳۴۱

۳۴۱

قرآن پاک رسول پاک ﷺ کی قوم کی زبان میں اترا ہے

۳۴۲

دو آیات اور ان میں تعارض کے شبہ کا حل

۳۴۳

نعمت اسلام پر اظہار تشکر

۳۴۴

حب جاہ کی حقیقت

۳۴۵

شکر کے معنی

۳۴۷

شجرہ طیبہ سے شجرہ نخلہ مراد ہے

۳۴۸

ایمان قبول عمل کیلئے شرط ہے

۳۵۰

عالم برزخ

۳۵۰

علمین سے مراد

۳۵۰

مراقبہ کی ضرورت و حقیقت

۳۵۲

ایمان پر ثابت قدم رکھنے کا وعدہ

۳۵۳

حق سبحانہ و تعالیٰ کے لامحدود احسانات

۳۵۴

انعامات الہیہ کا شمارنا ممکن ہے

۳۵۴

مکانات بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے

۳۵۵

بغیر حساب

۳۵۶

سُورَةُ الْحَجْرِ

۳۵۶

قرآن اور کتاب کے لغوی معنی

۳۵۷

الفاظ و معانی قرآن دونوں مقصود ہیں

۳۵۹

الفاظ قرآنی بھی مقصود ہیں

۳۵۹

قرآن کے دو اوصاف

۳۶۰

حفاظت قرآن کا مفہوم

۳۶۳	مفہوم سبقتِ رحمتی علیٰ غنصی
۳۶۴	خوف کی حد
۳۶۵	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ کی قسم
۳۶۶	فضیلت کی انواع
۳۶۷	حیاتِ برزخی رسول اکرم ﷺ
۳۶۸	مدعیانِ محبتِ نبویہ کی غلطی
۳۶۸	اہل علم کی ہوسِ زر پر اظہارِ افسوس
۳۶۹	خلاصہ مفہوم
۳۷۰	اطمینان کے درجات
۳۷۰	ضیق کی دو قسمیں
۳۷۱	علاجِ غم
۳۷۲	سُورَةُ النَّحْلِ
۳۷۲	جدید مصنوعات کا ذکر قرآن مجید میں
۳۷۶	مقدم و تالی میں عجیب ربط
۳۷۷	فتویٰ کی دلیل پوچھنا خلاف اصول ہے
۳۷۷	ریل کا ثبوت آیت قرآن سے
۳۷۷	دنیا کی کوئی چیز قابلِ محبت نہیں ہے
۳۷۹	ہر شخص کا مطلوب صرف ایک شے ہے
۳۸۰	راحتِ حقیقی
۳۸۱	حیاتِ طیبہ کا مصداق
۳۸۲	حیاتِ طیبہ سے مراد حیاتِ ناسوتی نہیں
۳۸۲	علاقہ دنیا کی عبرت انگیز مثال
۳۸۳	عذابِ دنیا

۳۸۴	اللہ والوں پر شیطان کا قابو نہیں
۳۸۴	لغوباتیں
۳۸۵	انعامات الہیہ کی ناشکری
۳۸۶	آداب تبلیغ
۳۸۷	موعظہ حسنہ کا مفہوم
۳۸۸	شفقت کو اعتدال پر لانے کا طریقہ
۳۸۹	اصل مقصود تبلیغ ہے
۳۹۱	دعوت کی تین قسمیں
۳۹۳	رعایت مخالف
۳۹۳	طریق تبلیغ
۳۹۵	حکم عام
۳۹۵	تفریطی تبلیغ کا تذکرہ
۳۹۶	اسباب حزن کی ممانعت
۳۹۸	سُورَةُ بَنِي إِسْرَائِيلَ
۳۹۸	آیت معراج کی ایک تحقیق
۳۹۸	ارضی بلائیں
۴۰۱	محض تمنائے آخرت کافی نہیں
۴۰۲	علم صرف دُخویٰ کی ضرورت
۴۰۳	ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں
۴۰۳	ثمرہ ارادہ آخرت
۴۰۸	دنوی مراد کا حصول مشیت حق پر موقوف ہے
۴۰۹	رموز و نکات
۴۱۲	ارادہ خالص برائے آخرت

۳۱۳	حقوق والدین
۳۱۶	امر طبعی میں بندہ معذور ہے
۳۱۶	مسلمانوں کی جاہلی کا اصل سبب
۳۱۷	انفاق و اقرار میں اعتدال مطلوب ہے
۳۱۸	چار چیزوں کی حفاظت کا حکم
۳۱۹	ظن مسائل شرعیہ میں حجت ہے
۳۲۰	علوم مکاشفات میں خطرہ ہے
۳۲۱	عہد نصرت بوجہ مظلوم ہونے کے ہے
۳۲۱	حق تعالیٰ شانہ کا شفقت کا برتاؤ
۳۲۲	تبادلہ کرانے کا عمل
۳۲۲	حقیقت روح
۳۲۳	دعویٰ سے بچنے کی ضرورت
۳۲۳	کلام الہی کی شوکت و صولت
۳۲۳	عبادت پر ناز مناسب نہیں



میر تقی عثمانی صاحب مدظلہ کے جملہ خطبات و خطبات اور تقریریں جملہ تصانیف سے منتخب سیکڑوں الہامی آنسیری نکات

شرف الائمہ

تقدیم و کاوش

شیخ الحدیث مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

نظر ثانی

علم ربانی حضرت مولانا مفتی محمد امجد علی صاحب مدظلہ

طائر

ادارہ تالیفات شریفیہ

چوک فوارہ گلستان پاکستان

519240-540513-8061

حکیم الامت ذہانت حضرت مولانا شرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
کے جملہ خطبات ملفوظات اور تقریباً جملہ تصانیف
سے منتخب سینکڑوں الہامی تفسیری نکات

اشرف التفسیر (جلد ۳)

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

سورۃ الکہف - تا - سورۃ الشوریٰ

تقدیم و پیش

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

تقدیر و ثناء

علم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

صوفی محمد اقبال قریشی صاحب
ابو حذیفہ محمد اسحاق ملتانی

ادارۃ تالیفات اشرفیہ

بک فوڈ، نئی دہلی، پاکستان فون: 519240-540513
Email: Taleefat@mul.wol.net.pk

نام کتاب..... اشرف التفاسیر (جلد-۳)
تاریخ اشاعت..... صفر القمطر ۱۴۲۵ھ
ناشر..... ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
طباعت..... سلامت اقبال پریس ملتان

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوسہ
کتاب خانہ شہیدہ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک اینجینیئر خیر بازار پشاور
دارالاشاعت اردو بازار کراچی
بک لینڈ اردو بازار لاہور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121- HALLWELL ROAD
BOLTON BL3NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران غلطی کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

اشرف التفاسیر

کا جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

الحمد للہ ”اشرف التفاسیر“ بہت مقبول ہوئی، اہل علم نے خاص طور پر اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا، جزا، ہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ نے حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات میں سے مزید بہت سارے تفسیری نکات جمع کر کے ہمیں ارسال فرمائے ہیں جو اس ایڈیشن میں شامل کتاب کر دیئے گئے۔

اس مبارک اضافہ کے علاوہ خود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا عربی رسالہ ”سبق الغایات فی نسق الآیات“ بھی سورتوں کی ترتیب کے مطابق آخر میں لگایا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ اضافہ جات تمام علم دوست حضرات کے لئے مزید علمی و عملی برکتوں کا باعث ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

اجمالي فهرست

٥	سورة الكهف
٢٠	سورة مريم
٤٢	سورة طه
٥٦	سورة الانبياء
٦٦	سورة الحجر
٨٧	سورة المؤمنون
٩٢	سورة النور
١٣١	سورة الفرقان
١٤٢	سورة الشعراء
١٤٨	سورة النمل
١٥٠	سورة القصص
١٧٢	سورة العنكبوت
١٩٦	سورة الروم
١٠٤	سورة لقمان
٢١٧	سورة الاحزاب
٢٥٥	سورة سبا
٢٦١	سورة فاطر
٢٧٦	سورة يس
٢٧٩	سورة الصافات
٢٨٤	سورة ص
٢٩٢	سورة الزمر
٢٢٢	سورة المؤمن
٢٢٨	سورة هم السجدة
٢٤٥	سورة الشورى

سُورَةُ الْكَهْفِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوَا إِلَى الْكَهْفِ

يُنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُمْ مِزْفَقًا ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے ہو اور ان کے معبودوں سے بھی مگر اللہ سے تو تم (فلاں) غار میں چل کر پناہ لو۔ تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لئے تمہارے اس کام میں بھی کامیابی کا سامان درست کر دے گا۔

تفسیری نکات

قصہ اصحاب کہف

یہ قصہ اصحاب کہف کا ہے۔ میں مفصل قصہ ان کا نہ بیان کروں گا۔ قرآن مجید میں بقدر ضرورت ہی ہے۔ اکثر واعظین قصے ہی بیان کیا کرتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا مشرب تو موافق قرآن کے یہ ہے

ماقصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم از ماجز حکایت مہر و وفا پرس

ترجمہ: ہم نے دارا و سکندر کا قصہ نہیں پڑھا ہم سے تو محبت و وفا کا قصہ تو پوچھ۔

اصحاب کہف ایک مشہور جماعت کا لقب ہے۔ یہ سات آدمی تھے ایک کافر بادشاہ کے زمانے میں وہ

بادشاہ بتوں کو سجدہ کرایا کرتا تھا ان سات کو اللہ تعالیٰ نے خود بخود ہدایت کی اور تو حیدان کے دل میں گھر کر گئی اب ان کو پریشانی ہوئی کہ اگر ہم یہاں رہتے ہیں تو بادشاہ ہم سے شرک کرائے گا اور مقابلہ کریں تو کیسے کر سکتے ہیں سات آدمی ایک سلطنت کا کس طرح مقابلہ کریں ایسی صورت میں آدمی اپنی جان اور ایمان مخفی ہو جانے اور بھاگ جانے ہی سے بچا سکتا ہے ہاں شاذ و نادر اتفاق سے ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کسی حکمت عملی سے حق بھی ظاہر ہو جائے اور جان و ایمان بھی بچ جائے۔

اسی لئے ان حضرات نے اسی میں سلامتی سمجھی کہ سب سے خفیہ طور سے رہو چنانچہ چند روز تک مخفی طور سے رہے ایک مرتبہ مشورہ کیا کہ یوں کب تک رہیں گے اگر کسی دن ظاہر ہو گئے تو پھر آفت آوے گی اور نیز یہاں اگر اسی طرح رہتے رہے تو ان کی صحبت کا اثر نہ ہم پر ہو جاوے اس لئے کہیں ایسی جگہ چل دو کہ ان کو ہماری مطلق خبر نہ ہو چنانچہ مشورہ کر کے وہ ایک غار میں جا چھپے اور ان کے ہمراہ ایک کتاب بھی چلا گیا اور وہاں پر ان پر اللہ تعالیٰ نے نوم مسلط کر دی چنانچہ تین سو برس سوتے رہے اس کے بعد آنکھ کھلی آگے پورا قصہ ان کا اس سورۃ میں ہے عجیب قصہ ہے مجھ کو اتنا ہی بیان کرنا تھا غرض اس مقام کی یہ آیت ہے اس آیت میں ان کے مشورہ کا ذکر ہے۔ ترجمہ اس آیت کا یہ ہے کہ جب تم ان سے علیحدہ ہو گئے اور ان کے معبودوں سے سو اللہ کے۔ الا اللہ میں دو احتمال ہیں اول تو یہ کہ یا تو ان میں بعبلون عامل ہے اس وقت تو یہ معنی ہوں گے کہ تم لوگ ان کفار سے اور جن کی وہ سوائے اللہ کے عبادت کیا کرتے تھے ان سے علیحدہ ہو گئے لیکن اس توجیہ پر ان کا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ اس کلام سے معلوم نہیں ہوا۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ الا اللہ اعتزلتموہم کا معمول ہو یعنی جب کہ تم لوگ ان سے علیحدہ ہو گئے مگر اللہ سے کہ اس سے علیحدہ نہیں ہوئے اس صورت میں استثناء منقطع ہو گا اور الا اللہ کی یہ تقدیر ہوگی لکن اللہ فلم تعزلوہ فاوالی الکھف یعنی جب ان سے علیحدہ ہو گئے تو اب غار کی طرف چلو نتیجاً اس کا کیا ہوگا ینشر لکم ربکم من رحمته یعنی نتیجہ یہ ہے کہ تمہارے لئے تمہارا رب اپنی رحمت کا حصہ پھیلائیں گے۔ یہ لوگ کیسے مؤدب تھے کہ ان کو حالانکہ نہ شرائع معلوم تھے نہ کسی سے تعلیم پائی تھی نہ کسی کے صحبت یافتہ تھے لیکن مؤدب اس درجہ کہ واذا اعتزلتموہم الخ سے وہم ہوتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بھی چھوڑ دیا ہو اس لئے کہ کلام اس طرح کا ہے جیسے ہمارے محاورہ میں کہا کرتے ہیں کہ میاں جب تم نے سب معبودین کو چھوڑ دیا جس میں اللہ تعالیٰ بھی بظاہر داخل ہیں کیونکہ وہ سب ہی کے معبود ہیں بت پرست بھی ان کی عبادت کے مدعی ہیں گو اگر الا اللہ نہ ہوتا تب بھی یہ معلوم تھا کہ ان سب کو اللہ ہی کی واسطے چھوڑا ہے تو پھر خدا کو کیسے چھوڑتے لیکن تاہم کلام میں ادب ملحوظ رکھنے کے لئے الا اللہ بڑھایا اس سے ان کا اللہ تعالیٰ کا محبت ہونا اور نہایت مؤدب ہونا معلوم ہوتا ہے اور دوسری عجیب بات یہ ہے کہ تعلیم تو کہیں پائی نہ تھی ان کے دل میں یہ کیسے

آیا کہ دین کے بچانے کی ضرورت ہے یہ نہایت درجہ ان کے متادب ہونے کو بتلا رہا ہے تیسرے یہ کہ غار میں جانے کے ثمرات کو بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرماویں گے اور حقیقت شناسی ملاحظہ کیجئے کہ یوں کہا پنشر لکم ربکم رحمتہ بلکہ من بڑھایا جس سے یہ مسئلہ مستفاد ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت غیر متناہی ہے جس پر رحمت ہوگی کوئی حصہ اس کا ہوگا باقی اس کی صفت رحمت کا کیا ٹھکانا ہے اس قدر وسیع ہے کہ جس کی نہایت نہیں ہے حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے چالیس برس تک رحمت کا بیان کیا ایک روز قہر کا بیان فرما دیا تو کئی آدمی مر گئے الہام ہوا کہ اے عبدالقادر کیا ہماری اتنی ہی رحمت تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہو گیا پس رحمت کی اور اسی طرح حق تعالیٰ کی ہر صفت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے

غرض حق تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے اس لئے رحمت پر من بڑھایا ایک ثمرہ تو غار میں جانے کا یہ ہوا دوسرا ثمرہ یہ ہے کہ یھینی لکم من امرکم موافقاً اور مہیا کر دے گا تمہارے امر دین میں کامیابی کا سامان پس دوسرے بیان کے ایک تو اشارہ مقصود کی طرف ہے اور دوسرے میں اس مقصود کے مقدمات کی طرف تفصیل اس کی یہ ہے کہ مقصود رحمت حق ہے جو ہاوا الی الکھف پر مرتب ہے لیکن یہ مقصود عادتاً اس پر بلا واسطہ مرتب نہ ہوگا گو کلام میں بوجہ اہتمام شان اور بسبب اس کی مقصودیت کی اظہار کے اس کو بلا فصل ہاوا الی الکھف کے بعد ذکر کر دیا ہے لیکن صورت اس کے ترتیب کی یہ ہوگی کہ کہف میں جانے کے بعد اسباب مہیا ہوں گے تکمیل دین کے اور بواسطہ اس کے رحمت کا ترتیب ہوگا پس رحمت کا مقدمہ تکمیل دین کے اسباب کا مہیا ہونا ہے اور تکمیل دین کا مقدمہ کہف میں جانا ہے پس کہف میں جانا مقدمہ کا مقدمہ ہے اور یہ آیت شرح اور اعادہ ہے اس اجمال کا جو اول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے یعنی اول حق تعالیٰ نے اجمالاً قصہ اصحاب کا بیان فرمادیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

اذا وى الفتية الى الكهف فقالوا ربنا اتنا من لدنك رحمة وهينى لنا من امرنا وشهدنا فضرنا على اذانهم فى الكهف سنين عدداً ثم بعثناهم لنعلم اى الحزبين احصى لما لبثوا امداً۔

یہ قصہ ہے اجمالاً گویا متن ہے آگے لحن نقص علیک نباہم بالحق سے اس کی شرح ہے متن کے اندر جو اصل مغز تھا قصہ کا وہ بیان فرمادیا شرح میں اس کی تفصیل ہے سبحان اللہ کیا عجیب طرز ہے مصنفین کی عادت ہے کہ اول مختصر بطور فہرست کے مقصود بیان کرتے ہیں حق تعالیٰ نے ان اسالیب کی اپنے کلام پاک میں رعایت فرمائی ہے اور دوسرے مقامات میں بھی ایسے امور کی بہت رعایت ہے دیکھئے خطیبو اور واعظین کی عادت ہوتی ہے کہ اس کے بعد خطبہ پڑھتے ہیں اس کے بعد مقصود شروع کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بھی ایک مقام پر دلائل توحید سے پہلے خطبہ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے قل الحمد لله وسلام على عباده الذين

اصططفسے یہ ایک خطبہ ہے اس کے بعد مقصود یعنی بیان دلائل توحید شروع ہوا ہے اور یہاں متن کے موقع پر ایک دعا آئی ہے ربنا اتنا من لدنک رحمةً وهیئ لنا من امرٍ رشداً۔ اس آیت میں جو کہ شرح کے موقع پر ہے ینشر لکم ربکم من رحمته سے اس کی طرف اشارہ ہے یہاں اضافت کی وجہ سے رحمت کی تکثیر نہ ہو سکتی تھی اس لئے یہاں من بڑھا دیا اور متن کے موقع پر من لدنک کی وجہ سے تعریف کی ضرورت نہ تھی اس لئے رحمت کو منکر لائے جو تکثیر کے سبب مترادف ہے من رحمته کا متن میں جس رحمت کی درخواست کی تھی شرح میں بھی اس کی امید کو فساوا الی الکھف کا ثمرہ کر کے ظاہر کیا ہے گویا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ جس رحمت کا ہم نے آپ سے سوال کیا تھا وہ ہم کو عنایت فرمائیے سبحان اللہ کلام میں کیا تناسب ہے اور فساوا الی الکھف ینشر لکم ربکم الخ میں ایک مسئلہ لطیف کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ اعمال کو گونہرات میں دخل ہے لیکن بدوں مشیت حق کے ان کا ترتب ضروری نہیں ہے بعض مرتبہ بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور ثمرہ کچھ مرتب نہیں ہوتا اس لئے ہر حالت میں یہ ضروری ہے کہ حق تعالیٰ پر نظر رکھے عمل کرے اور عمل پر نظر نہ ہو۔ الحاصل اصحاب کھف کو اپنے عمل پر ناز نہیں ہوا بلکہ حق تعالیٰ پر نظر رہی اور اول جو دعا کی تھی ربنا اتنا من لدنک رحمة الخ اس کو یہاں بطور ثمرہ دوسرے عنوان سے بیان کیا اور اس عنوان بدلنے میں بہت اسرار اور غوامض ہوں گے جو غور کرنے سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔

پس جاننا چاہیے کہ اس آیت سے چند امور ثابت ہوئے (اول) تو فساوا الی الکھف سے یہ سمجھا گیا کہ کسی درجہ میں خلوت مقصود ہے (دوم) فساوا اعتزلتموہم پر مرتب کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ خلوت جب نافع ہے جبکہ جلوت سے مضرت ہو (سوم) اشارہ اس طرف ہوا کہ مسلم کی شان یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو جب باطناً عزلت ہے تو ظاہراً بھی عزلت ہونا چاہیے (چہارم) خلوت فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ رحمت حق مقصود ہے کما یدل علیہ ینشر لکم الخ (پنجم) جب ناجنسوں کی صحبت میں ہو تو ایسے وقت خلوت ممکن دین ہے۔

قرآن شریف میں ہے فلا تماء فیہم الامراء ظاہراً (سو آپ ان کے بارے میں بجز سرسری بحث کے زیادہ بحث نہ کیجئے) اس میں مراد بالحق ہی مراد ہے کیونکہ مراد بالباطل کی اجازت کسی درجہ میں نہیں ہو سکتی اور اس آیت میں مراد ظاہر کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے تو اس کو صورتہ مراد کہہ دیا گیا بوجہ مشکلاتہ کے ورنہ حقیقی مراد حرام ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدْوَةِ وَالْعَشِيِّ

يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

وَلَا تَطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرًا فُرْقَانًا

ترجمہ: اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام (یعنی علی الدوام) اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں۔ اور دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں (یعنی توجہات) ان سے ہٹنے نہ پائیں۔ اور ایسے شخص کا کہنا مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا (یہ) حال حد سے گزر گیا ہے۔

تفسیری نکات

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم الخ (یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے کو ایسے لوگوں کے ساتھ جما کر ٹھلائیے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں اور آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں۔ (یعنی آنکھیں بھی ادھر ہی متوجہ رہیں) اس سے بھی میں ایک دوسرا مسئلہ استنباط کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بزرگوں کی توجہ سے بھی نفع ہوتا ہے تو گویا اول جملہ میں تعلیم کا بھی اشارہ ہوا کہ پاس بیٹھنے کے احکام بھی حاصل ہوں گے اور دوسرے میں تربیت کا۔ آگے فرماتے ہیں تو یبد زينة الحياة الدنيا (دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے) اس کو بعض نے مستقل جملہ کہا ہے یعنی کیا آپ دنیا کی زینت چاہتے ہیں مگر میں نے اس کو جملہ حالیہ سمجھا ہے اور لا تعد میں منعی کو اس کا عامل اور عیناک کو بوجہ اقامت عین مقام ذات ذوالحال اور مقید کی نفی یہاں قید اور ذمی قید دونوں کے ارتقاع سے ہے یعنی جو عددان بارادۃ زینت حیوة دنیا ہوتا ہو متروک ہے اس طرح سے کہ عددان ہے نہ ارادہ زینت پس اس سے وقوع زینت کا لازم نہیں آتا آگے دوسری نبی ہے لا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا والبع هواہ وکان امرہ فرطاً یعنی ان کا کہنا نہ مانو جن کو ہم نے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور اس نے اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اس کا کام حد سے نکلا ہوا ہے یہاں سے ایک تیسری بات بھی معلوم ہوئی کہ مشورہ بھی ایسے شخص کا قبول کرے جس کی یہ حالت نہ ہو۔

اغفلنا قلبه الخ (ہم نے اس کے دل کو غافل کر دیا ہے) کیونکہ بے دین کے مشورہ میں بھی برکت نہیں

ہوتی۔ چنانچہ رؤساء کفار کے اس مشورہ تخصیص مجلس کے قبول سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ممانعت فرمادی۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ اس میں تعلیم اور تربیت دونوں کا بذریعہ صحبت نافع ہونا بتلایا ہے اور شیوخ کا بھی علاج کر دیا ہے کہ آپ بھی بے پروائی نہ کریں سبحان اللہ کیا عجیب جامع جملہ ہے۔

اہل اللہ خلوت کو پسند فرماتے ہیں

یہاں حق تعالیٰ نے صبر کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اور صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ما کرہہ یعنی نفس کو ایسی بات کا پابند کرنا جو اس کو ناگوار ہو اور اس سے معلوم ہو کہ آپ مجمع سے گھبراتے تھے مگر لوگوں کی مصلحت کے لئے مجبوراً بیٹھتے تھے۔ صاحبو! ہمیں تو دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے مگر اہل اللہ کو پریشانی ہوتی ہے کیوں کہ ان کی نظر تو اور ہی طرف ہے جس کو جامی فرماتے ہیں

خوشا دقتی و خرم روز گارے کہ یارے بر خور داز وصل یارے

اور ان کی یہ شان ہوتی ہے

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندام گوش را نیز حدیث شنیدن ندام

ان کو تو خود اپنا نفس بھی حجاب معلوم ہوتا ہے تو دوست تو کیوں نہ موجب پریشانی ہوں گے۔ لوگ ان کو تعظیم و تکریم کی شان میں دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ بڑے چین میں ہیں مگر کوئی انہیں کے دل سے پوچھے کہ ان پر کیا گزرتی ہے اے ترا خارے پان شکستہ کے دانی کہ چوست حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورد کسی کو کیا خبر ہے کہ وہ کس طرح ان مصائب کو یعنی مخلوق کی مجانست و مخالفت کو برداشت کرتے ہیں درنیابد حال پختہ ہیج خام پس سخن کوتاہ باید والسلام غرض ان کو اپنے اوپر قیاس مت کرو کہ جس طرح تمہیں دوستوں میں بیٹھ کر حظ آتا ہے اسی طرح انہیں بھی آتا ہوگا۔

کار پاکاں را قیاس از خود مکبر گرج ماند در نوشتن شیر و شیر

انہیں بے حد انقباض ہوتا ہے دوستوں سے اور وہ اس سے اس قدر پریشان ہوتے ہیں کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا مگر باوجود اس کے وہ ظاہر میں سب سے بول رہے ہیں اور انس بھی رہے ہیں۔

الْمَالِ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ

عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرًا أَمْلاً ۝

ترجمہ: مال اور اولاد حیات دنیا کی ایک رونق ہے اور جو اعمال صالحہ باقی رہنے والے ہیں وہ آپ ﷺ کے نبی کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی ہزاروں گنا بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی ہزاروں گنا بہتر ہیں۔

تفسیری نکات

آرٹش دنیا

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دنیائے مذموم سے منع فرمایا ہے اور آخرت کی ترغیب دی ہے مگر عنوان دونوں جگہ ایسا عجیب ہے جس سے دنیا و آخرت دونوں کی اصلی حقیقت تھوڑے سے لفظوں میں ظاہر فرمادی واقعی خدا تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ اس آیت سے پہلے دنیا کا بے حقیقت ہونا ایک مثال سے ظاہر فرمایا ہے واضرب لهم مثل العیوۃ الدنیا کماء الزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الارض فاصبح ہشما لندروہ الریاح و کان اللہ علی کل شیء مقتدرا (اور تھلا دیجئے ان کو مثل دنیا کی زندگی کی جیسے پانی اتارا ہم نے آسمان سے پھر رلا ملا نکال اس کی وجہ سے زمین کا سبزہ پھر کل کو ہو گیا چورا چورا ہوا میں اڑتا اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے) اس کے بعد یہ آیت ہے المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا (مال اور اولاد حیوۃ دنیا کی زینت و آرٹش ہیں) اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ زینت ہر چیز کی اس کے تابع ہوا کرتی ہے اور جب تابع ہے تو اس کا مرتبہ اصل سے کم ہوا اور متبوع کا بے حقیقت ہونا پہلے یعنی اوپر کی آیت میں بیان ہو چکا ہے اس سے خود ہی معلوم کیا گیا کہ اس کا تابع کیسا کچھ ہوگا تو ایک لفظ زینت سے اس قدر ان کی بے وقعتی کو واضح بیان کر دیا ہے عجیب فصاحت و بلاغت ہے اور اس کے علاوہ اس میں ایک اور بھی نکتہ ہے اور وہ یہ کہ آرٹش اور زینت کی چیزیں اکثر فضول اور زائد اور بے ضرورت ہوا کرتی ہیں تو حق تعالیٰ نے مال اور بنون کا بے حقیقت و بے ضرورت ہونا لفظ زینت سے ظاہر فرمادیا ہے یہ سب زینت ہی زینت ہیں اور کچھ نہیں پس مطلب یہ ہے کہ جو مال و اولاد تم کو مطلوب ہے جس میں عبادت کو تم منہمک ہو رہے ہو وہ بے ضرورت اور زائد چیزیں ہیں کیونکہ مال سے مقصود رفع ضرورت ہے اور رفع ضرورت سے مطلوب بقاء النفس ہے تو اصل مقصود کے لئے یہ واسطہ در واسطہ ہے پھر ایسے واسطہ کو مطلوب بنا لینا حماقت ہی نہیں کہ رات دن اسی

میں منہمک لگا ہو اور بقاء نفس جو مطلوب ہے وہ بھی بے حقیقت ہے کیونکہ اس کا بقاء چند روزہ ہے جو قابل اعتبار نہیں غرض مال خود مطلوب بنانے کے قابل ہرگز نہیں اور اولاد تو اس سے بھی گھٹیا ہے کیونکہ وہ تو بقاء نفس کے لئے بھی نہیں صرف بقاء نوع کے لئے مطلوب ہے اور بقا نوع کے لئے اسی کی کیا ضرورت ہے کہ آپ ہی کے اولاد ہو اگر میرے اولاد نہ ہوئی اور آپ کے دو ہو گئیں تو اس سے بھی بقاء نوع ہو سکتی ہے دوسرے بقاء نوع کی آپ کو کیوں فکر ہے جب تک حق تعالیٰ کو انسان کی آبادی دنیا میں مطلوب ہے اس وقت تک وہ اس کی تدبیریں کریں گے آپ اس میں رائے دینے والے کون ہیں کہ خواہ مخواہ آپ کی نوع باقی ہی رہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ آپ ہی کے اولاد ہو یہاں ایک بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے بنون کو زینت حیوة الدنیا بتلایا ہے بنات کو بیان نہیں فرمایا اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہوں گی دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ بنات زینت دنیا نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو بھی بیان فرماتے پس صرف بنون کو زینت دنیا فرمانا اور بنات کو ذکر نہ فرمانا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی بھی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفان زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت ہے اور وہ ایسی زینت نہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے لئے پھر اور سب دیکھیں کہ ان کے اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کو پردہ کرایا جائے کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں جس سے معنی لغت میں چھپانے کی چیز تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورتوں کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے تو یہ قول لغو ہے کہ عورتوں کو پردہ نہ کراؤ ان کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علمی سے رکی ہوئی ہیں میں نے کہا جی ہاں اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے کیونکہ عوام کے لئے یکسوئی اور اجماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اسی واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشہ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں جیسا کہ طلباء کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم

کے لئے معین ہے نہ کہ مانع نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں ہاں علوم تجارت اور علوم تجارت کے لئے سیر و سیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے پاس سیر و سیاحت سے تجربہ میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی اسی لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں مرد تو برسوں میں کسی بہت ہی بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورتوں کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو یہ تو ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادی کر لیا کرتیں (جیسا کہ آجکل یورپ میں ہو رہا ہے) بس عورتوں کے لئے یہی سیر و سیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں جن تجربوں کی ان کو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی ان کو حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں نظر حقیقت سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں اگر سیر و تماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے دل کی آنکھوں سے دیکھ لو تم کو اپنے ہی اندر تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلوار یوں سے استغناء ہو جائے گا۔

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو دمن درا تو زغچہ کم ند میدہ در دل کشا نمن درا
(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھانک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کر لو)
چوں کوئے دوست ہست بھمرا چہ حاجت ست خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت ست
جب محبوب کے دربار میں ہو جنگل کی کیا ضرورت ہے خلوت نشین کو تماشا کی کیا حاجت یعنی تارکان تعلق
ماسوی اللہ کو دوسری طرف التفات نہ چاہیے اس سے بے التفاتی کے لئے اس کی ضرورت نہیں کہ بستی چھوڑ کر
جنگل میں جا رہیں بلکہ توجہ الی الحق کافی ہے۔

عورتیں زینت دنیا نہیں

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ بے پردگی کے بہت برے نتائج ہو رہے ہیں اور یہ کم عقلی اور بد فہم لوگ اس وقت سمجھیں گے جب بات ہاتھوں سے نکل جائے گی اس وقت تو دماغ کو چڑھ رہی ہے بدحواس ہو رہے ہیں کچھ خبر نہیں مگر یہ نشہ بہت ہی قریب اتر جانے والا ہے یورپ کا تو اتر گیا اور ان کا تو دیر میں بھی اتر ان کا بہت جلد اتر جائے گا اس لئے کہ ان کا ہر کام جوش کے ماتحت ہوتا ہے وہ چاہے دین کا کام ہو یا دنیا کا اور جوش کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے میں نے تو اس کے متعلق اپنے ایک بیان میں نہایت سطر کے ساتھ تقریر کی ہے اور اس میں ایک لطیف نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں المال والبنون زينة الحياة الدنيا اور یوں نہیں فرمایا کہ المال

والبنات اس سے معلوم ہوا کہ جو چیز عام منظر پر لانے کی نہیں ہوتی وہ حیوۃ دنیا کی زینت نہیں کیونکہ زینت کے لئے تو ظہور ضروری ہے اس لئے بنون فرمایا کہ یہ ہے حیوۃ دنیا کی زینت۔

باقیات صالحات

مجھے اس وقت زیادہ تر آیت کے اسی جزو کا بیان مقصود ہے والباقیات الصلحت خیر عند ربک ثوابا و خیرا مالا۔ کیونکہ یہ بیان مدرسہ کے جلسہ میں ہو رہا ہے اور مدرسہ باقیات صالحات سے ہے سو سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ باقی رہنے والی چیزوں سے (مراد اچھے اعمال ہیں) ثواب کے اعتبار سے اور امید کے اعتبار سے تمہارے پروردگار کے نزدیک زیادہ بہتر ہے یہاں حق تعالیٰ نے لفظ اعمال کو مقدر فرمادیا ہے کیونکہ مقصود بقاء کا مدار خیریت بتلانا ہے گو تحقیق اس کا مادہ اعمال ہی میں ہو۔ پس اگر اعمال کا ذکر ہوتا تو باقیات کا مفہوم اس کی صفت واقع ہو کر تابع ہو جاتا تو مقصود مذکور میں صریح نہ ہوتا۔

یہاں چند نکات طالب علمانہ ذہن میں اور ہیں ان کو مختصراً ذکر کرتا ہوں ایک یہ کہ یہاں حق تعالیٰ نے اعمال شرک و کفر نہیں فرمایا حالانکہ وہ بھی باقیات سے ہیں کیونکہ جس طرح اعمال صالحہ کی جزا جنت ہے اور وہ باقی ہے ایسے ہی اعمال شرک و کفر کی سزا جہنم ہے اور وہ بھی باقی ہے تو جب یہاں اعمال کی بقاء کا ثابت کرنا مقصود ہے تو ان کو بھی بیان کرنا چاہیے تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان کو بقاء علی الاطلاق نہیں کیونکہ بعض اعمال شرک و کفر باقی ہے اور بعض کو باقی ہے جیسے کفر و شرک کی مگر چونکہ اس جزا والوں کی یہ حالت ہے کہ لایسموت فیہا ولا یحییٰ کہ نہ ان کو وہاں موت ہے نہ زندگی ہے تو ایسی حیات جس کے متعلق لاجبی بھی ارشاد ہے اس قابل نہیں کہ اس کو باقیات کے ساتھ موصوف کیا جاوے اور ان کے لئے بقاء ثابت کیا جائے کیونکہ وہ بقاء مثل عدم بقاء کے ہے۔

دوسری باقیات صالحات جو ہیں ان کی بقاء محض لغوی نہیں بلکہ بناء بر ایصال الی الباقی کے ہے اور حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق خیر ہی کو ہے شرک و کفر نہیں بلکہ وہ تو اس سے تعلق کو قطع کرنے والی ہے اس لئے اعمال صالحہ ہی باقیات کے ساتھ موصوف کرنے کے قابل ہیں پس صالحات کی قید محض توضیح کے لئے ہے ورنہ صرف لفظ باقیات ہی اعمال صالحہ پر دلالت کے لئے کافی ہے اور یہ جو میں نے کہا کہ اعمال صالحہ کی بقاء بوجہ تعلق بحق کے ہے یہ ایک تفسیر کی بناء پر نص سے بھی موید ہے کل شیء ہالک الا وجہہ کی تفسیر ایک تو ذالہ سے کی گئی ہے اور ایک تفسیر ماکان لاجلہ سے بھی کی گئی ہے۔ اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اعمال صالحہ کی بقاء عالم کے وقت بھی باقی رہیں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کے نزدیک کچھ دیر کونفا ہو جائیں گے مگر چونکہ وہ ساعت قلیلہ ہے اس لئے

عرفادہ گویا باقی ہی ہیں کیونکہ عرفا انقطاع قلیل کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص صبح سے شام تک چلتا رہا تو اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے راستہ میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہو تو کوئی اس پر یہ اعتراض نہیں کرتا کہ واہ صاحب وہ تو پانچ منٹ بیٹھا بھی تھا۔ اور مثال لیجئے شعلہ جو الہ سے حرکت کے وقت ایک پورا دائرہ روشن نظر آتا ہے حالانکہ زیادہ حصہ اس کا تاریک ہے مگر عرفا اس تاریکی کا اعتبار نہیں کیا جاتا عدم الاحساس اور اگر اس کو خط مستدیر پر نہ گھمایا جائے بلکہ یمن سے یسار کو اور پھر رجعت یمن سے یسار کو اور پھر رجعت قہقری سے حرکت دی جائے تو رجعت کے وقت تو یسار سے یمن کو ضروری تاریکی ہوگی لتحلل السكون بين الحركتين یعنی دو حرکتوں کے درمیان سکون کا ہونا ضروری ہے لیکن عرفا یہی کہا جاتا ہے کہ یہ روشنی مستمر معلوم ہے کیونکہ سکون محض آنی ہے اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ پس ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ ساعت قلیلہ میں فنا ہو جانا اعمال صالحہ کے بقاء و عرفا مضمر نہیں کیونکہ زیادہ حصہ تو بقاء ہی کا ہے اور گو غیر خیر میں بھی ایسا ہی بقاء ہے مگر اوپر ان دونوں میں فرق بیان ہو چکا ہے۔

اعمال باقی

اب ایک شبہ اور رہا۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ شانہ نے یہاں اعمال کو باقی فرمایا ہے حالانکہ وہ تو اعراض ہیں وہ کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

لان العرض لا بقاء له بالذات بل تبعاً للمعروض والمعروض ليس بباقي بفتائہ بالموت مثلاً پھر بقاء تبعاً للمعروض بھی اعراض لازمہ کو ہے نہ کہ غیر لازمہ کو اور اعمال صالحہ ظاہر ہے کہ اعراض لازمہ نہیں بلکہ غیر لازمہ ہیں ان کا بقاء تبعاً للمعروض بھی نہیں رہ سکتا مثلاً نماز پڑھ کر جہاں فارغ ہوئے بس عمل ختم ہوا۔ اب اس کا بقاء نہ اصلۃ سے نہ تبعاً۔

اس جگہ سب معقولی تھک گئے مگر علامہ جلال الدین دوانی نے رسالہ زوراء میں لکھا ہے کہ آخرت میں یہ اعراض جو اہر ہوں گے یعنی جو عمل ہم کرتے ہیں وہ یہاں تو عرض ہے مگر عالم آخرت میں (جو کہ مکانا اس وقت بھی موجود ہے) جو اہر ہوں گے فقط اور اس کے لئے یہ صورت جو ہر یہ صدوری کے وقت سے حاصل ہو جاتی ہے اور وہ صورت جو ہر یہ باقی رہے گی۔

اب کوئی اشکال نہیں۔ عارفین تو کشفی طور پر اس کے قائل ہیں مگر ایک معقولی عقلی طور پر بھی اس کا قائل ہے اور عقلاً اس کو جائز و ممکن سمجھتا ہے تقریب الی الفہم کے لئے میں طلباء کے واسطے ایک معقولی مثال سے اس کو واضح کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ حصول اشیاء بانفسہا فی الذہن بہت حکماء کے نزدیک حق ہے اور ظاہر ہے کہ حصول بانفسہا سے مراد یہ تو

نہیں ہے کہ عینہ یہی شے جو خارج میں ہے ذہن میں حاصل ہوتی ہے اگر عینہ حصول ہو تو تصور جہاں سے ذہن کا اشتقاق اور تصور نار سے احراق لازم ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت شے کی ذہن میں حاصل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ حقیقت جوہر کی جوہر ہے حالانکہ صورتہ حاصل فی الذہن عرض ہے تو جو نسبت ذہن کو خارج سے ہے ہم کہتے ہیں کہ وہی نسبت دنیا کو آخرت سے ہے جس طرح اعراض ذہنیہ خارج میں جوہر ہیں اسی طرح اعراض ونبویہ آخرت میں جوہر ہوں تو اشکال کیا ہے۔

ایک نکتہ اس جگہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے الباقیات الصالحہ نہیں بلکہ الباقیات الصالحات فرمایا ہے۔ اس عنوان میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان اعمال میں ہر عمل میں مستقل صلاحیت ہے اس لئے صالحہ کا مصداق بھی متعدد ہو کر صالحات صادق آدے گا یہ نہیں کہ مجموعہ میں صلاحیت ہوتا کہ ان کو مجموعہ بنا کر صالحہ صفت مفردہ سے تعبیر کیا جائے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو بعض اعمال صالحہ کو حقیر سمجھتے ہیں۔

دنیا کی حقیقت

غرض باقیات کے ساتھ صالحات کے جمع لانے میں ہر عمل کی وقعت کا اظہار ہے اور جب اعمال آخرت باقی رہنے والے ہیں اور اس کے مقابلہ میں مال و ہون کو زینت فرمایا گیا ہے تو اس لفظ سے اس پر تشبیہ ہے کہ دنیا کی چیزیں فنا ہونے والی ہیں اور جب دنیا کے اموال و اولاد فانی ہیں تو اگر وہ آپ سے پہلے اور آپ کے سامنے ہی فنا ہو جائیں تو غم نہ کرو کیونکہ وہ تو فنا ہونے والے تھے ہی۔

قرآن مجید میں ہے و اما عملوا حاضراً (جو جو اعمال انہوں نے کئے ہیں ان میں موجود پائیں گے ۱۲)

اعمال قیامت میں اپنی شکل میں ظاہر ہوں گے

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی بھی تفسیر فرمائی تھی۔ مشہور تفسیر تو اس کی مکتوب فی الصحیفہ (نامہ اعمال میں لکھا ہوا ۱۲) سے کی ہے مگر مولانا فرماتے تھے کہ خود اعمال حاضر ہوں گے جب ظاہر الفاظ و وجد و اما عملوا حاضراً سے معلوم ہوتا ہے یعنی قیامت کے روز سارے اعمال کو حاضر پائیں گے اس پر اشکال یہ ہے کہ جو اعمال ختم ہو چکے وہ کیسے عود کریں گے محقق دوانی نے اسے اس طرح رفع کیا ہے کہ انہوں نے اپنے رسالہ ذوراء میں یہ ثابت کیا ہے کہ حقائق اعمال کے جوہر ہیں یہ رسالہ حضرت نے میرے پاس بھیجا تھا شاید سمجھنے سے یہ مقصود ہو کہ ان کی تحقیق حضرت کو پسند آئی ہو واللہ اعلم میں اس کو یقیناً کہہ نہیں سکتا کیونکہ کچھ فرمایا نہیں میں نے اس رسالہ کو دیکھا میری سمجھ میں یہ بات تو نہیں آتی کہ حقائق اعمال جوہر ہیں ہاں اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ معنی مصدری قیامت میں نہ ہوں گے بلکہ حسب تحریر مولانا محمد یعقوب صاحب ان اعمال کے اثر قیامت کے روز

شکلیں بن کر اہل محشر کو نظر آئیں گی مثلاً جو چوری کر چکا ہے وہاں نظر آئے گا کہ چوری کر رہا ہے زنا کر چکا وہاں نظر آئے گا کہ زنا کر رہا ہے غرض جو آثار اعمال کے اس کے بدن میں جمع ہیں سب وہاں اعمال بن کر نظر آئیں گے۔ اس کی مثال یہاں بھی خدا نے پیدا کر دی ہے یعنی جس طرح بائیسکوپ کے اندر گزشتہ واقعات کی صورتیں نظر آتی ہیں اسی طرح قیامت کے دن یہ بھی بائیسکوپ بن جائے گا اور اس کے ہاتھ پیر گراموفون کی طرح جو کچھ اس نے کیا ہے بولیں گے ایک زانی کی حکایت ہے کہ زنا کر کے غسل کر رہا تھا غسل کا پانی تالی سے بہ رہا تھا ایک بزرگ کا ادھر سے گزر ہوا اس پانی کو دیکھ کر کہا اس میں زنا بہ رہا ہے پوچھا حضرت آپ کو کیونکر معلوم ہوا فرمایا کوئی زانی غسل کر رہا ہے مجھے پانی کے ہر قطرہ میں زنا کی تصویر پر نظر آتی ہے۔

اہل کشف کی صورتیں اعمال کی نظر آ جاتی ہیں حضرت عثمان کی مجلس میں ایک شخص کسی نامحرم عورت کو دیکھ کر آیا تھا آپ نے فرمایا کہ کیا حال ہے لوگوں کا کہ ہماری مجلس میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے اسی طرح جب کوئی طاعت کرتا ہے تو اس کا ایک اثر اس میں پیدا ہوتا ہے جس کا اہل کشف کو علم ہوتا ہے فرشتوں کو تو اعمال ماضیہ کا نامہ اعمال دیکھنے سے علم ہوتا ہے اور اہل کشف کے لئے یہ شخص اپنا آپ نامہ اعمال ہے اسی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

غدا انک فیک و ما تبصر دوانک منک و ما تشعر

(تمہاری غذا خود تمہارے اندر ہے اور تم دیکھتے نہیں تمہاری دوا تم ہی سے ہے اور تم نہیں شعور کرتے ۱۲)

وانت الکتاب المبین الذی باحرفہ یظہر المضمیر

(تم وہ کتاب ہو کہ اس کے حروف سے پوشیدگیوں کا ظہور ہوتا ہے ۱۲)

وتزعم انک جرم صغیر ولیک تطوی العالم الاکبر

(تم اپنے آپ کو جرم صغیر سمجھتے ہو حالانکہ تمہارے اندر ایک عالم اکبر لپٹا ہوا ہے ۱۲)

تو گویا تم خود کتاب مبین ہو۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ
 حُقُبًا ۚ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنَهُمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ
 سَرِيًّا ۗ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ تَقِدَ لِقِينًا مِّنْ سَفَرِنَا
 هَذَا نَصَبًا ۗ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ
 وَمَا أَنسِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ
 عَجْبًا ۗ قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغُ ۚ فَارْتَدَّ عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ۗ
 فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا
 عِلْمًا ۗ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَيْكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَ مَن يَشَاءُ عِلْمًا
 يُرْسِدُ ۗ قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۗ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا
 لَمْ تُحِط بِهِ خُبْرًا ۗ قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي
 لَكَ أَمْرًا ۗ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَنْ شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ
 لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ۗ فَانْطَلَقَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا ۗ قَالَ
 أَخْرَقْتُهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا ۗ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا ۗ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ
 إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۗ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَ
 لَا تُرهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ۗ فَانْطَلَقَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا الْقِيَاغُلُ مَأْكَلَةٌ
 قَالَ أَقْتَلْتَنِي نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ ۗ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ۗ

قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۖ قَالَ إِنْ
 سَأَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَ مَا قَلَّا تَصِحِّبْنِي ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ
 أَهْلِهَآ فَابْوَا أَنْ يُصَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ
 يَنْقُضَ فَاقَامَهُ ۚ قَالَ لَوْ شِئْتُ لَخَذْتُ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ قَالَ
 هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأَنْبِئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ
 عَلَيْهِ صَبْرًا ۖ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسْكِينٍ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ
 فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ
 غَصْبًا ۖ وَآثَا الْعُلَمُ فَكَانَ أَبُوهُ مُؤْمِنِينَ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا
 طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِمَّنْهُ زَكَاةً وَ
 أَقْرَبَ رُحْبًا ۖ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ
 وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ
 يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ وَمَا
 فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ۚ ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ صَبْرًا ۚ

تَرْجَمَ : اور وہ وقت یاد کرو جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلا
 جاؤں گا یہاں تک کہ اس موقع پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملے ہیں یا یوں ہی زمانہ دراز
 تک چلتا رہوں گا۔ پس جب (چلتے چلتے) دونوں دریاؤں کے جمع ہونے کے موقع پر پہنچے اس وقت
 اپنی مچھلی کو دونوں بھول گئے اور مچھلی نے دریا میں اپنی راہ لی اور چل دی۔ پھر جب دونوں (وہاں

سے) آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ ہمارا ناشتہ تو لاؤ ہم کو تو اس سفر میں (یعنی آج کی منزل میں) بڑی تکلیف پہنچی۔ خادم نے کہا کہ لیجئے دیکھئے (عجیب بات ہوئی) جب ہم اس پتھر کے قریب ٹھہرے تھے سو میں اس مچھلی (کے تذکرہ) کو بھول گیا اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کو ذکر کرتا اور (وہ قصہ یہ ہوا) کہ اس مچھلی نے (زندہ ہونے کے بعد) دریا میں عجیب طور پر اپنی راہ لی۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکایت سن کر فرمایا کہ یہی موقع ہے جس کی ہم کو تلاش تھی سو دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے اٹھ لڑے۔ سو وہاں (پہنچ کر) انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی اور ہم نے اس کو اپنے پاس سے ایک خاص طور کا علم سکھایا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سلام کیا اور ان سے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں اس شرط سے کہ جو علم مفید آپ کو (منجانب اللہ) سکھلایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھ کو بھی سکھلا دیں۔ ان بزرگ نے جواب دیا آپ سے میرے ساتھ رہ کر میرے افعال پر (صبر نہ ہو سکے گا اور (بھلا) ایسے امور پر آپ کیسے صبر کریں گے جو آپ کے احاطہ واقفیت سے باہر ہیں۔ موسیٰ نے فرمایا ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابر (یعنی ضابط) پاویں گے اور میں کسی بات میں آپ کے خلاف حکم نہ کروں گا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو (اتنا خیال رہے کہ) مجھ سے کسی بات کی نسبت کچھ پوچھنا نہیں جب تک میں اس کے متعلق خود ہی ابتداء نہ کر نہ کروں۔ پھر دونوں (کسی طرف) یہاں تک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہوئے تو ان بزرگ نے اس کشتی میں چھید کر دیا موسیٰ نے فرمایا کہ کیا آپ نے اس کشتی میں اس لئے چھید کیا ہوگا کہ اس کے بیٹھنے والوں کو غرق کر دیں آپ نے بڑی بھاری اور خطرناک بات کی ہے۔ ان بزرگ نے کہا کہ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا۔ موسیٰ نے فرمایا کہ (مجھ کو یاد نہ رہا تھا سو) آپ میری بھول چوک پر گرفت نہ کیجئے اور میرے اس معاملہ میں مجھ پر زیادہ تنگی نہ ڈالئے۔ پھر دونوں (کشتی سے اتر کر آگے) چلے یہاں تک کہ جب ایک (کم سن) لڑکے سے ملے تو ان بزرگ نے اس کو مار ڈالا اور وہ بھی بے بدلے کسی جان کے بے شک آپ نے (تو) بڑی بے جا حرکت کی۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ صبر نہ ہو سکے گا۔ موسیٰ نے فرمایا خیر اب اور جانے دیجئے اگر اس مرتبہ کے بعد آپ سے کسی امر کے متعلق کچھ پوچھوں تو آپ مجھ کو اپنے ساتھ نہ رکھئے بے شک آپ میری طرف سے عذر کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں پھر دونوں آگے چلے یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں پر گزر ہوا تو وہاں

والوں سے کھانے کو مانگا کہ (ہم مہمان ہیں) سوانہوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا اتنے میں ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گراہی چاہتی تھی تو ان بزرگ نے اس کو (ہاتھ کے اشارے) سیدھا کر دیا۔ موسیٰ نے فرمایا کہ اگر آپ چاہتے تو اس کام پر کچھ اجرت ہی لے لیتے۔ ان بزرگ نے کہا کہ یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے جیسا کہ خود آپ نے شرط کی تھی میں ان چیزوں کی حقیقت بتلائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ جو کشتی تھی سو چند آدمیوں کی تھی جو اس کے ذریعہ سے دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے سو میں نے سوچا کہ اس میں عیب ڈال دوں اور وجہ اس کی یہ تھی کہ ان لوگوں سے آگے کی طرف ایک (ظالم) بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا اور رہا وہ لڑکا سو اس کے ماں باپ ایمان دار تھے سو ہم کو اندیشہ (یعنی تحقیق ہوا کہ یہ دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر ڈال دے۔ پس ہم کو یہ منظور نہ ہوا کہ بجائے اس کے ان کا پروردگار ان کو ایسی اولاد دے جو پاکیزگی (یعنی دین) میں سے بہتر ہو اور ماں باپ کے ساتھ محبت کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اس شہر میں رہتے تھے اور اس دیوار کے نیچے ان کا کچھ مال مدفون تھا جو ان کے باپ کی میراث سے پہنچا ہے اور ان کا باپ (جو مر گیا ہے وہ) ایک نیک آدمی تھا۔ سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ جاویں اور اپنا دینی نکال لیں اور یہ سارے کام میں نے بالہام الہی کئے ہیں ان میں کوئی کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا۔ لیجئے یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔

سفارش سے خضر علیہ السلام کے واقعہ سے ایک نکتہ

ایک نووارد صاحب نے حاضر ہو کر کسی معاملہ میں حضرت والا سے سفارش کی درخواست کی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ سفارش کے متعلق ایک تمہید سنو۔ خضر علیہ السلام کے پاس جانے کا موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کا حکم ہوا کہ جا کر علوم سیکھو۔ آپ خضر علیہ السلام کے پاس تشریف لے گئے انہوں نے پوچھا کون فرمایا موسیٰ کون موسیٰ فرمایا بنی اسرائیل کا موسیٰ پوچھا کیسے آئے فرمایا اہل تبعک علی ان تعلمن مما علمت رشداً۔ یعنی میں علوم سیکھنے کے لئے تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اتنے بڑے نبی اولوالعزم اور خضر فرماتے ہیں ”ہل تبعک“ میں تمہارے ساتھ ہوں مجھ کو کچھ علوم سکھا دیجئے۔ یعنی بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے علوم کے سامنے خضر کے علوم کیا چیز تھے مگر خیر جو کچھ بھی تھے ان کے سیکھنے کی درخواست کی خیر یہ تو قصہ ہے مگر اس میں دیکھنا یہ ہے کہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس گفتگو میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں یہ فرماتے تو اعلیٰ درجہ

کی سفارش ہوتی سواس سے یہ معلوم ہو گیا کہ آجکل جو سفارش لکھا کر لے جاتے ہیں یا جا کر کسی کا نام لے دیتے ہیں بعض اوقات اس سے دوسرے پر بار ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہی حقیقی علوم کے حامل ہیں۔ دیکھئے یہ نہیں ظاہر فرمایا کہ میں حق تعالیٰ کے ارشاد سے آیا ہوں کیونکہ یہ سن کر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے پھر چوں چراندہ کریں گے۔ آزادی نہ رہے گی چنانچہ خضر علیہ السلام نے نہایت آزادی سے شرطیں لگا دیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بدوں اذن کے کسی کی صحبت سے استفادہ حاصل نہیں کرنا چاہیے۔ نیز دوسرے کے پاس جا کر یہ نہ کہے کہ میں فلاں شخص کا بھیجا ہوا ہوں۔ (الافاضات الیومیہ ص ۱۰۲ ج ۳)

تفسیری نکات

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے

واقعہ پر چند اشکالات اور لطیف جواب

فرمایا کہ قرآن کریم میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بغرض تکمیل علم کے سفر کرنا مذکور ہے اس میں حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہی یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ ان کے کسی کام پر ٹوکیں گے نہیں پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس وعدہ پر کیوں قائم نہ رہے کہ بار بار ان کے کاموں پر ٹوکا۔ حضرت نے فرمایا کہ اصل بات یہ ہے کہ وعدہ کا پورا کرنا اس صورت میں واجب ہے کہ اس میں کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔ خلاف شرع تو وعدہ توڑنا لازم ہو جاتا ہے اسی طرح ایسا وعدہ جس کے خلاف کرنے پر دوسرے فریق کا کوئی ضرر اور نقصان نہ ہو اس کا ایفاء بھی واجب نہیں ہوتا۔

تین واقعے جن پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کو ٹوکا۔ ان میں ایک واقعہ تو ظاہر شرع کے بالکل خلاف تھا کہ لڑکے کو قتل کر دیا اور دو اور واقعے کشتی توڑنے کا اور دیوار سیدھا کرنے کا جو خلاف شرع اور ناجائز نہ تھے مگر جب دوسری مرتبہ بچے کے قتل کا معاملہ سامنے آیا جو ظاہر شریعت کی رو سے بالکل حرام تھا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر شدت سے ٹوکا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام نے پھر پھپھلا قول و قرار یاد دلایا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی نسیان وغیرہ کا عذر بھی نہیں کیا اور آئندہ کے لئے اس وعدہ پر قائم رہنے کا فیصلہ بھی نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ اگر میں آئندہ آپ سے کوئی سوال کروں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ وجہ یہ تھی کہ ایک اللہ کا نبی اپنے منہسی فریضہ کی بناء پر کھلے ہوئے خلاف شرع پر خاموش نہیں رہ سکتا اور نہ اس کا وعدہ کر سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تو شریعت کے آداب کی پابندی اس طرح واضح ہو گئی اور دوسری طرف حضرت خضر علیہ السلام نے بھی ظاہر شریعت کی پابندی کی مگر حالات کے تابع خلاف استحباب و مروت تھے۔ پیغمبران چیزوں پر صبر نہیں کر سکتے اور نہ کرنا چاہیے اس لئے مجبور ہو کر ٹوکا۔ خصوصاً یہ بھی معلوم تھا کہ ان چیزوں پر ٹوکنے میں حضرت خضر علیہ السلام کا کوئی ضرر اور نقصان نہیں۔ (آئی)

یہاں دو یا تین ادب شریعت کے متعلق اور قابل نظر ہیں۔ اول تو یہ کہ شروع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تو معلوم نہیں تھا کہ واقعات ایسے پیش آویں گے جو شریعت کے خلاف ہوں اس لئے یہ وعدہ کر لیا کہ

ستجدلی ان شاء اللہ صابرا ولا اعصی لک امرا۔

یعنی ان شاء اللہ مجھے صابر پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کے خلاف نہ کروں گا۔

پھر جب کشتی توڑنے کا واقعہ پیش آیا تو اس کو مروت و اخلاق کے خلاف سمجھتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام بول اٹھے۔

لقد جنت شیئا امرا یعنی ”یہ کام تو آپ نے بہت عجیب کیا کہ اپنے احسان کرنے والے کشتی بانوں

کو نقصان پہنچا دیا“

اس وقت حضرت خضر علیہ السلام نے وعدہ یاد دلایا تو موسیٰ علیہ السلام نے نسیان کا عذر کر کے آگے کو وعدہ کی پابندی کا اقرار کیا کہ احترام کو مخلوظ رکھا کہ لڑکے کا قتل جو شریعت کی رو سے حرام تھا اس واقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جدا نہیں کیا بلکہ تیسرے واقعہ میں جو دیوار کے سیدھا کرنے کا معاملہ تھا وہ کسی طرح بھی خلاف شرع نہیں تھا۔ خلاف مصلحت کہا جاسکتا تھا اس پر بھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ٹوکا تو اس وقت فرمایا۔

هذا فراق بینی و بینک ”اب ہمارے اور تمہارے درمیان جدائی کا موقع آ گیا“

دیکھئے اس پورے واقعہ میں شریعت کے احترام کا دونوں طرف سے کس طرح اہتمام کیا گیا ہے۔ اب

جاہل مدعیان تصوف نے اس واقعہ کا یہ نتیجہ نکال رکھا ہے کہ شریعت اور چیز ہے طریقت اور چیز جو چیزیں

شریعت میں حرام ہیں وہ طریقت میں جائز ہو سکتی ہیں معاذ اللہ یہ کھلا ہوا انکار شریعت ہے طریقت کی حقیقت

شریعت پر عمل کرنے سے زیادہ کچھ نہیں۔ جو طریقت شریعت کے خلاف ہو وہ الحاد و زندقہ ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ اس واقعہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے خلاف شرع کام کو کیسے اختیار کر لیا جس پر موسیٰ علیہ السلام

کو اعتراض کرنا پڑا اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بھی اللہ کے نبی اور صاحب وحی تھے وہ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے وحی پا کر اس پر عمل کر رہے تھے اور شریعت کے مقررہ قانون میں خود وحی الہی کے ذریعہ تہدیلی اور استثنائی

صورتیں ہونا کوئی امر مستجد نہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وحی کی خبر نہ تھی جس نے حضرت خضر علیہ السلام

کے لئے شریعت کے عام قاعدہ سے اس واقعہ کو مستثنیٰ کر دیا تھا اس لئے انہوں نے ضابطہ شریعت کے مطابق اس

پر اعتراض کرنا ضروری سمجھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جو بھائیوں کی طرف چوری منسوب کرنا مذکور ہے اگرچہ انہوں نے چوری نہیں کی تھی۔ ایسی حالت میں ان کو چور قرار دینا شرعاً جائز نہیں تھا اس کی بھی یہی توجیہ ہو سکتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام صاحب وحی ہیں ان کو بطور استثناء یہ اجازت مل گئی ہوگی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ شکل صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ایسا کرنے والا نبی اور صاحب وحی ہو کوئی ولی صاحب کشف والہام ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کیونکہ کشف والہام کوئی حجت شرعی نہیں اس کے ذریعہ شریعت کے کسی قاعدہ میں ترمیم یا استثناء نہیں ہو سکتا جاہل صوفیوں نے جو اس واقعہ کو خلاف شرع امور کے ارتکاب کے لئے وجہ جواز بنا لیا ہے وہ سراسر گمراہی ہے اب نہ کوئی نبی آ سکتا ہے نہ کسی پر وحی آ سکتی ہے نہ شریعت کے حکم کے خلاف کوئی استثناء ہو سکتا ہے۔

شیطان کا منقش اشیاء کا حال معلوم کر لینا منافی عصمت نہیں

فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد سے دریافت کیا کہ میرے دل میں کیا ہے اور آپ نے آیت دخان کے اپنے دل میں لے لی۔ تو اس نے کہا درخ ہے اب یہاں پر یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر کیسے اطلاع ہو گئی اس کا جواب یہ ہے کہ عصمت کے لوازم سے یہ ہے کہ عمل معصیت نہیں کر سکتا باقی اگر قلب کا حال یا دوسرے اعضاء میں جو چیز منقش ہو اس کو معلوم کر لینا یہ منافی عصمت نہیں اس کا ثبوت اکثر آیات قرآن مجید سے ہوتا ہے چنانچہ ہر اہی موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے وما انسائب الا الشیطان یا ایوب علیہ السلام کا قول انی منی الشیطان بنصب و عذاب وغیرہ اس کے مؤید ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ سے میرے ساتھ مبر نہیں ہو سکے گا۔

دوسری آیت میں لک بڑھانے کا سبب

حضرت موسیٰ و خضر علیہ السلام کے قصہ میں ایک جگہ توالم اقل انک لن تستطیع معی صبرا وارد ہے اور دوسری آیت میں الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرا ہے علماء میں یہ سوال ہوا ہے کہ دوسری آیت میں لک کیوں بڑھایا گیا اس کی وجہ الم بلاغت نے یہ بیان کی ہے کہ جواب سوال کے مثل ہونا چاہیے اگر سوال میں شدت ہو تو جواب بھی تشدید کے ساتھ دیا جائے گا اور سوال میں خفت ہو تو جواب میں بھی خفت کا لحاظ کیا جائے گا چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا پہلا اعتراض خفیف تھا کہ ابتدائی تھا اس لئے خضر علیہ السلام نے بھی اس کا جواب تخفیف کے ساتھ دیا اور دوسرے اعتراض میں شدت تھی کیونکہ بعد ممانعت کے تھا اس لئے خضر علیہ السلام نے بھی جواب میں اسی کے مناسب قوت و شدت اختیار کی اور لک بڑھا دیا۔

ان بزرگ نے فرمایا کہ یہ وقت ہماری اور آپ کی علیحدگی کا ہے۔

عدم مناسبت کے سبب علیحدگی

حضرت خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں جس وقت خضر علیہ السلام نے فرمایا ہذا لراق بینی و بینک ایسے اولوالعزم پیغمبر یعنی موسیٰ علیہ السلام نے کیا کسی معصیت کا ارتکاب کیا تھا محض عدم مناسبت کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو علیحدہ کر دیا۔ اور ان کا باپ نیک شخص تھا تو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ وہ دونوں یتیم جوان ہو کر خود اپنا خزانہ نکال لیں یہ رحمت تھی خدا تعالیٰ کی طرف سے

آباؤ اجداد کی برکت سے اولاد کو نفع پہنچتا ہے

اس جگہ پر مفسرین نے متنبہ فرمایا ہے کہ وکان ابوہما صالحاً سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں باپ کی صلاحیت کو بھی دخل تھا اگرچہ مفسرین کی اس تشبیہ کی ضرورت نہ تھی اور نہ اس تشبیہ پر آیت کی دلالت کا مدار ہے عقل سے خود آیت سے معلوم ہوتی ہے کہ اگر باپ کی صلاحیت کو خضر علیہ السلام کے فعل میں کچھ بھی دخل نہ تھا تو ان کو اس جملہ کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی وکان ابوہما صالحاً مگر خدا تعالیٰ مفسرین کو جزائے خیر دے بد یہی باتوں پر بھی تشبیہ کر دیتے ہیں تاکہ اگر کسی کو اس طرف الہام ہو تو التفات ہو جائے اور سچی بات یہ ہے کہ بعض باتیں تو مفسرین کے بیان کے بعد بد یہی معلوم ہوتی ہیں اگر وہ بیان نہ کرتے تو شاید التفات ہی نہ ہوتا ان کے بتلانے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی غرض اس واقعہ سے معلوم ہوتا کہ آباؤ اجداد کی برکت سے بھی اولاد کو نفع ہوتا ہے مگر یہ مؤمنین کے واسطے ہے اور کفار کے بارے میں یہ ارشاد ہے فلا نساب بینہم یومئذ ولا یتساءلون نہان میں تعلقات رہیں گے نہ آپس میں ایک دوسرے سے حال پوچھیں گے۔ مؤمنین کی اولاد کے بارے میں ایک آیت میں اس طرح موجود ہے والذین امنوا واتبعتہم ذریعتہم بایمان الحقان ابہم ذریعتہم جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی اقتدا کی تو ہم اس اولاد کو آباؤ اجداد ہی سے ملا دیں گے یعنی اگر اولاد کا درجہ کم ہوگا اور باپ کا درجہ بلند ہوگا تو اس اولاد کو بھی باپ ہی کے درجہ میں رکھیں گے تاکہ اولاد کے قریب سے آباء کو اس زیادہ ہوا گے فرماتے ہیں وما التناہم من عملہم من شیء یعنی ان باپ دادوں کے اعمال میں سے ہم کم نہ کریں گے اس میں بعض وہمیوں کے شبہ کا جواب ہے وہ یہ کہ اولاد باپ کے پاس پہنچانے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ اولاد کے اعمال ادنیٰ ملنے کے قابل ہیں اور باپ کے اعلیٰ درجہ کے تو کچھ باپ کے کام کم کر کے اولاد کی طرف لگا دیئے جائیں اور اوسط نکال کر دونوں درمیانی درجہ میں رکھ دیا جائے کچھ باپ کی طرف کم کر دیا اور کچھ اولاد کی طرف بڑھا دیا تو فرماتے ہیں یہ صورت نہ ہوگی آباء کے اعمال میں کمی نہ کی جائے گی بلکہ آباء کے اعمال میں زیادتی کر کے ان کو اسی درجہ میں پہنچادیں گے جہاں ان کے آباء ہیں۔

لم دریافت کرنے کا منشاء کبر ہے

فرمایا ایک شخص نے کہا حلت بیضہ طیور کی کیا دلیل ہے۔ میں نے لکھا اور خود طیور کی حلت کی کیا دلیل ہے الگ الگ لکھو پھر میں پوچھوں گا ہرن کی حلت کی کیا دلیل ہے اور نمل گائے کی حلت کس سے ثابت تاکہ معلوم ہو سوال کی حقیقت منشاء اس کا کبر ہے ہر شخص بڑا بننا چاہتا ہے انقیاد سے عار آتی ہے۔

آداب شیخ

فرمایا اگر دفعہ کوئی آجائے اور بات ہے اور جب اجازت لینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو بلا اجازت نہ آنا چاہیے۔ چاہیے تو دفعہ بھی نہ آئے اس میں جانہن کو لطف رہتا ہے اور یہ قرآن سے ثابت ہے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے ذی رتبہ کون ہوگا اور پھر اللہ میاں کی اجازت بلکہ حکم ہے پھر بھی حضرت خضر علیہ السلام کے پاس جا کر کہتے ہیں هل ابعدک علی ان تعلمن مما علمت رشدا کیا اب مجھے اجازت ہے ساتھ رہنے کا دیکھئے موسیٰ علیہ السلام اتنے بڑے اولوالعزم نبی اور خضر علیہ السلام جن کی نبوت میں بھی کلام ہے ان سے اجازت لیتے ہیں یہ کتنا ادب شیخ کا ہے جب وہ شیخ ہے تو اس کی اتباع کرنا چاہیے اور دیکھئے انہوں نے شرط کیا گائی کہ جو کچھ میں کروں بولنا مت یہ نبی کیلئے سب سے بڑی شرط ہے مگر مان گئے اور پھر جب غلطی ہوئی تو یہ نہ کہنا کہ ایسی ہی ہونی چاہیے بلکہ میں بھول گیا غلطی ہوئی۔ یہاں تک تیسری بار کہہ دیا اگر پھر ہوا تو ساتھ نہیں رہوں گا۔ یہ شبہ نہ ہو کہ اجازت کیوں لی جب اللہ میاں نے کہہ دیا۔ نہیں اللہ میاں کا بھی مطلب یہی ہے کہ جاؤ اور ان سے اجازت لے کر ہی رہو۔ کیا کیا ادب ہے شیخ کا۔ دیکھئے اگر کوئی علامہ ہے، فلسفی بھی ہے ہرن کے اندر کمال رکھتا ہے اور ایک بڑھی کے پاس بخاری سیکھنے گیا تو اس وقت گردن جھکا ہی دے گا کیونکہ اس فن میں تو وہ شیخ ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ کے شیخ امام عاصم ہیں۔ قراءت میں جب وہ بوڑھے ہو گئے تو حضرت امام کے پاس جاتے تھے اور کہتے تھے یا ابو حنیفہ قد جنتنا صغیرا و قد جنتنا کبیرا اور مؤدب بیٹھے تھے۔ شاگرد سے بھی وہی ادب ہے جو شیخ سے کرنا چاہیے کیونکہ اس فن میں وہ شیخ ہیں۔ میں ایک صاحب سے فارسی پڑھتا تھا اور وہ مجھ سے عربی پڑھتے تھے۔ جب میں فارسی پڑھتا تھا ادب کرتا تھا اور جب وہ عربی پڑھتے تھے ادب کرتے تھے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵)

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ

كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر کا (پانی) روشنائی کی جگہ ہو تو رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے (اور باتیں احاطہ نہ آئیں) اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر اس کی مدد کے لئے ہم لے آئیں۔

تفسیری نکات

حق تعالیٰ شانہ نے اپنا نام لینے کیلئے
القاب و آداب کی شرط نہیں لگائی

صاحبو! اگر حق تعالیٰ بھی اپنے نام پاک کے ساتھ القاب و آداب کی شرط لگاتے ہیں تو بتلائیے کہ ہم وہ القاب و آداب جو اس بارگاہ کے لائق ہیں کہاں سے لاتے اگر ازل سے ابد تک ان القاب و آداب کے لانے میں مشغول رہتے تو ان کو ہمارے القاب کی حق تعالیٰ کے اوصاف کے مقابلہ میں وہ نسبت بھی نہ ہوتی جیسی ایک قطرہ کو سمندر سے ہوتی۔

نہ حسن فایتے وارد نہ سعدی را سخن پایاں بگرد تشنه مستقی و دریا بچھاں باقی
(یعنی نہ محبوب حقیقی کے حسن کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی جیسے بلند و بالا امر جاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے ایسے محبوب کے حسن کا بیان باقی رہ گیا)

دامان نگہ و گل حسن تو بسیار گلچمن بہار تو ز داماں گلہ وارد
نگاہ کا دامن نگہ ہے تیرے حسن کے پھول بہت ہیں تیرے بہار کے پھول چمنے والا کوتاہی دامن کی شکایت کرتا ہے یعنی محبوب حقیقی کے کمالات و اوصاف بہت ہی ہیں ان کی انتہا نہیں ہیں ہماری زبان و نظر ان کے بیان کرنے سے قاصر و عاجز ہے۔

سبب قسم

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جاننا چاہیے کہ حق تعالیٰ شانہ کی بے انتہا صفات ہیں چنانچہ ارشاد ہے قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝

اور یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو ایک خاص صفت سے تعبیر فرما کر اور حضور کی طرف مضاف کر کے قسم کھائی ہے جس کا مطلب بعنوان دیگر یہ ہوا کہ ہم اپنی ذات کی اس حیثیت سے کہ ہم آپ کے مربی ہیں قسم کھا کر کہتے ہیں تو یہ جیسے قسم میں آپ کی طرف اعتبار کرنے سے آپ کی عظمت شان ظاہر ہوتی ہے اسی طرح درجہ سے بھی آپ کا عظیم الشان ہونا ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق کی گویا قسم کھائی ہے اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کے مخلوق کے ساتھ بہت سے علاقے میں مثلاً خالقیت رزاقیت ربوبیت وغیرہ ان علاقوں میں سے یہاں ربوبیت کو ذکر فرمایا اور تربیت کے معنی شینا فشینا ایسی شے کو جس کی شان سے تربیت ہے اس کے کمال پر پہنچانا ہیں پس فلاور ہک کے اس تقدیر پر یہ معنی ہوئے کہ قسم ہے آپ کے مربی کی اور تربیت ایک اعلیٰ درجہ کا احسان ہے پس مربی بہ معنی محسن ہوا۔ پس حاصل یہ ہوا کہ قسم ہے آپ کے محسن کی اور ظاہر ہے کہ آپ کی طبیعت اور فطرۃ ہے سلیم اور طبائع سلیمہ کا مقتضی یہ ہے کہ اس صلہ میں کہ خالق کا اس پر احسان ہے وہ خلق خدا پر احسان کرتا ہے پس اس قاعدہ سے آپ خلق کے محسن ہوئے یہ تو محسن ہونا آپ کا قاعدہ عقلیہ سے ہوا دوسری وجہ بطرز فن تصوف آپ کے محسن ہونے کی اور بھی ہے وہ یہ کہ صفات حمیدہ حقیقۃً ذات باری تعالیٰ کے لئے ہیں اور مخلوق کے اندر ان کا نقل ہے۔ مثلاً مخلوق کسی مجرم کا قصور معاف کر دے تو یہ صفت غفور کا ہے اور اگر کوئی کسی کو کچھ دے تو یہ جوادیت کا اثر ہے اور یہ مسلم ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افراد بنی آدم میں سے صفات باری تعالیٰ کے مظہر اکمل و اتم ہیں پس صفت احسان کے بھی آپ مظہر اتم ہوئے تو آپ تمام جہان کے محسن ہوئے اور تربیت کا منشاء چونکہ ہمیشہ محبت ہوتا ہے اور اس کی اضافت ہے حضور کی طرف تو گویا یہ فرمایا فلاور محبک اور جو خدا کا محبوب ہو وہ مخلوق کا بدرجہ اولیٰ محبوب ہونا چاہیے پس آپ محبوب بھی ہوئے تمام مخلوق کے تو فلاورک سے آپ کا عظیم الشان ہونا اور محسن ہونا اور محبوب ہونا سب ثابت ہوا اور چونکہ آپ مظہر صفات حق ہیں اور حق تعالیٰ کی صفت حمیدہ للمریوب ثابت ہوئی پس آپ نے بھی اپنے غلاموں کے ہوں گے پس فلاور ہک ہر سہ وجہ اطاعت کو مع زیادہ صفت الحمیدہ مشتمل ہو گیا۔

مسئلہ تقدیر کی تعلیم

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ درستی عقائد کے بعد اعمال میں کوتاہی زیادہ معزز نہیں اور اس کا منشاء یہ ہے کہ ان لوگوں نے اعتقادات میں محض علم کو مقصود سمجھ لیا ہے اور میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا کہ اعتقادات میں علم ہی مقصود ہے مگر سالہا سال کے بعد ایک آیت نے مجھے اس طرف راہبری کی کہ عقائد فی نفسہ بھی مقصود ہی اور عمل کے واسطے بھی مقصود ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرالها ان ذلک علی اللہ یسیر. لکیلاتا سوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتاکم واللہ لا یحب کل مختال فحور

یہاں پہلی آیت میں تو مسئلہ تقدیر کی تعلیم ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے زمین میں یا تمہاری ذات میں وہ ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے۔ (یعنی لوح محفوظ میں) اس مصیبت کے پیدا ہونے سے بھی پہلے بے شک یہ بات حق تعالیٰ پر آسان ہے (اس کا انکار وہی کر سکتا ہے جس کو قدرت الہیہ کا علم نہ ہو) آگے تعلیم مسئلہ کی تعلیل فرماتے ہیں۔ کہ یہ بات ہم نے تم کو کیوں بتلائی۔ اس لئے تاکہ کسی چیز کے فوت ہونے پر تم کو رنج نہ ہو۔ (بلکہ اس سے تسلی حاصل کر لو کہ یہ مصیبت تو لکھی ہوئی تھی۔ اس کا آثار ضرور تھا ۱۲) اور کسی نعمت کے ملنے پر اتر آؤ نہیں۔ بلکہ یہ سمجھو کہ اس میں ہمارا کچھ کمال نہیں۔ حق تعالیٰ نے پہلے ہی سے یہ نعمت ہمارے لئے مقدر کر دی تھی ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کی تعلیم سے صرف اعتقاد کر لینا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ عمل بھی مقصود ہے کہ مصائب میں مستقل رہے اور ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر یہ پریشان نہ ہو۔ اسی طرح نعمتوں پر تکبر و بطرنہ ہو۔ ان کو اپنا کمال نہ سمجھے۔ جب نص سے اس کا مقصود ہونا معلوم ہو گیا اور قاعدہ ہے کہ لاشئ اذ اخلا عن غایۃ انگی۔ شے جب اپنی حالت سے خالی ہو تو وہ کالعدم ہوتی ہے۔ تو اب جس شخص کا مصائب و نعم کے وقت یہ حال نہ ہو وہ گویا تقدیر کا معتقد ہی نہیں۔ یعنی کامل معتقد نہیں۔ اگر کامل اعتقاد ہوتا تو اس کی غرض ضرور مرتب ہوتی۔

اسی طرح توحید کا مسئلہ تعلیم کیا گیا ہے اس سے بھی صرف علم مقصود نہیں بلکہ قرآن میں فکر کرنے سے توحید کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا خوف اور اس سے طمع نہ رہے۔ اب جو شخص توحید کا قائل ہے مگر غیر اللہ سے خوف و طمع بھی رکھتا ہو وہ گویا توحید کا معتقد ہی نہیں بلکہ مشرک ہے۔ چنانچہ صوفیاء نے اس پر شرک کا اطلاق کیا اور صوفیاء نے کیا حق تعالیٰ نے اس کو شرک فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں

فمن كان يرجو القاء ربه فليعمل عملاً صالحاً ولا يشرك بعبادة ربه احداً

یہ جو کوئی لقاء رب کی امید رکھتا ہو۔ وہ نیک عمل کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ حدیث میں لا بشرک کی تفسیر لایروائی آئی ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ عبادت میں نہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریا مشرک ہے حالانکہ ریا میں غیر اللہ معبود نہیں ہوتا مگر چونکہ فی الجملہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں بڑا بننے کے لئے بنا سنوار کر عبادت کی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو شرک فرمایا اور یہ بالکل عقل کے مطابق ہے کیونکہ عبادت غیر اللہ جوارج سے ہوتی ہے اور جب وہ شرک ہے تو قلب سے غیر اللہ کو مقصود بنانا کیونکر شرک نہ ہوگا۔ یہ تو قلبی عبادت ہے پس غیر اللہ سے خوف و طمع پر صوفیہ کا لفظ شرک اطلاق کرنا غلط نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں توحید کی غایت مفقود ہے۔ اسی طرح تمام عقائد میں غور کرو تو نصوص سے معلوم ہوگا کہ ہر اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہے۔ کہنا اعتقاد مطلوب نہیں اور ہماری عادت میں اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہوتا ہے۔

(المراد بالحقہ مواظبہ و نیا و آخرت ص ۸۷ ص ۸۸)

سُورَةُ مَرْيَمَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا

ترجمہ: فرشتہ نے کہا میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دے دوں۔

تفسیری نکات

ممنوع نام رکھنے کا رواج عام

نبی بخش، علی بخش، رسول بخش وغیرہ ایسے ناموں کو علماء نے منع کیا ہے اور ایک شخص نے غضب ہی کیا کہ اس نے قرآن سے اس قسم کا نام نکالا یعنی اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام جبرئیل بخش مستہبط کیا اس طرح سے کہ قرآن میں ہے لاهب لک غلاماً زکياً کیا یہ حضرت جبرئیل کا قول ہے حضرت مریم سے کہ میں اس لیے آیا ہوں تاکہ آپ کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام جبرئیل کے دیئے ہوئے ہوئے تو جبرئیل بخش ہوئے مگر یہ بھی خبر ہے کہ وہاں حضرت مریم اور حضرت جبرئیل دونوں کا کیا عقیدہ تھا آگے حضرت جبرئیل خود فرماتے ہیں قال كذلك قال ربك هو علي هين و لنجعله آية للناس و رحمة منا و كان امر مقضيا جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ دونوں اس ولادت کو تصرف الہی سمجھتے تھے خیر اس سے بھی قطع نظر کی جاوے تب بھی ایسے ناموں کا جواز نہیں نکلتا کیونکہ وہاں جبرئیل نے ایک فعل تو کیا تھا یعنی نفع فی الحیب تو اسناد الی السہب ہو گئی اور یہاں سالار۔ نبی۔ رسول وغیرہ نے کون سا فعل کیا ہے جس کی وجہ سے وہ نام رکھا گیا ہے اور فعل جبرئیل کا یعنی نفع اس آیت میں مذکور ہے لنفخنا فیہا من روحنا یہاں استطراداً ایک کام کی بات بھی یاد آگئی اس کو سمجھ لینا چاہیے وہ یہ کہ قرآن میں احصنت لرجھا سوء تہذیب کا اشکال

پیدا ہوتا ہے کہ خاص موقع کا صریح نام لے دیا گیا مگر تفسیر میرے ذہن میں نہایت سہل آئی ہے وہ یہ کہ فرج کے معنی یہاں پر چاک گریبان کے ہیں جو خمیض میں عموماً ہوتا ہے جس کو عربی میں جیب بھی کہتے ہیں اور فارسی میں گریبان کہتے ہیں تو احصنت فرجھا کے یہ معنی ہیں کہ حضرت مریم نے اپنے چاک یا گریبان کو پاک و صاف اور باعفت رکھا تھا کہ کسی غیر کا اس میں ہاتھ بھی نہیں لگا تھا اور یہ کنا یہ ہے ان کی پاکدامنی سے اور اب نفع کا محل نصفتنا فیہا بھی یہی فرج بالمعنی المذكور ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ان کے گریبان میں پھونک مار دی اور عموماً عادت بھی یہی ہے تو اب وہ بنا ہی نہ رہی جس سے شبہ پیدا ہوا تھا بہر حال یہاں پیدا کرنے والے کو واقع میں حق تعالیٰ ہیں مگر جبرئیل درمیان میں سبب تو ہیں کیونکہ نفع ظاہری فعل جبرئیلی تھا گو سبب اس نفع کا حکم الہی تھا اس لئے سبب کی طرف اسناد مجازی کر دی گئی ہے اور یہاں سالار بخش وغیرہ میں تو سالار نے کوئی فعل ہی نہیں کیا جس کی وجہ سے اسناد کی گئی ہے اور اگر کوئی کہے کہ سالار صاحب نے بھی ایک فعل کیا تھا یعنی دعا کی تھی تو میں کہتا ہوں کہ اس کی کیا دلیل کہ دعا کی تھی آج کل تو نام ایسے لوگوں کے ہوتے ہیں جنہوں نے کبھی انہیں دور سے بھی نہیں دیکھا تھا پھر دعا کرنا کیسے معلوم ہو گیا پھر اس زمانہ میں نبی بخش بھی تو نام رکھا جاتا ہے تو حضور نے ان صاحبزادہ کے واسطے کس دن دعا کی تھی ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض کا نام محمد نبی ہوتا ہے یہ تو اور بھی برا ہے چنانچہ ایک صاحب کا یہی نام تھا میں نے اسے بدل کر محمد نبیہ کر دیا کہ نبیہ کے معنی رفیع کے ہیں۔

رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَبَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا

ترجمہ: وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو ان دونوں کے درمیان ہیں سو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ۔ بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کی بے انتہا شفقت

اصل محیط فائدہ اور ماسبق لہ الکلام اس آیت میں فاعبد ہے اور اس کا سابق تمہید کے لئے ہے اور سیاق یعنی و اصطر لعبادتہ (اور اس کی عبادت پر قائم رہ) اس کا تمم ہے اور هل تعلم له سميا (بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے) اس کی تائید ہے بہر حال سابق و سیاق تمہید و تائید کے لئے ہے اور اصل مقصود فاعبدہ

(سواں کی عبادت کر) ہے اور ابتداء اس کی جو رب السموات سے کی گئی تو وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے کلام کی عادت ہے کہ جب کوئی مشکل کام بتاتے ہیں تو اس کے آسان کرنے کا بھی اس جگہ اہتمام فرماتے ہیں اور اہتمام میں نے مجازاً کہہ دیا ورنہ اہتمام مشتق ہے ہم بمعنی فکر سے اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہیں مطلب یہ ہے کلام الہی میں یہ بھی التزام ہے کہ سہولت کی بھی رعایت کی جاتی ہے اس کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک شخص تو سکول کا ماسٹر ہے گو بچوں کو وہ تعلیم دیتا ہے مگر چونکہ پبلک کانو کر ہے اس لئے اسے کوئی خاص انس و شفقت نہیں بلکہ محض ضابطہ اور وقت کا پابند ہے اسے اس سے بھی یہ بحث نہیں کہ میں نے جو کچھ پڑھایا وہ بچوں کی سمجھ میں بھی آیا یا نہیں کیونکہ تنخواہ دار استاد کو بچوں سے بالکل اجنبیت ہوتی ہے محض اپنی تنخواہ سے مطلب ہوتا ہے اور ایک تعلیم ہے باپ کی کہ وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح میرا بیٹا سمجھ ہی جائے ان دونوں کی تعلیم میں بڑا فرق ہے ماسٹر تو اپنے گھنٹہ میں آئے اور لڑکوں کو تقریر سنا کر چلے دیئے اور باپ کی تعلیم یہ نہیں کہ الفاظ ادا کر دیئے اور چلے دیئے بلکہ وہ سوچتا ہے کہ کون سے عنوان سے سمجھانا زیادہ مؤثر ہو گا وہ یہی سوچے گا کہ آخر اتنے دن پڑھتے ہوئے ہو گئے نفع کیوں نہیں ہوتا میں کوئی تدبیر اختیار کروں جو نفع ہو کبھی ترغیب دیتا ہے کبھی ترہیب کرتا ہے کبھی یہ سوچتا ہے کہ میرے کہنے کا اثر ہوتا تو لاؤ اس کے کسی دوست سے کہلو اسے حق تعالیٰ کی تعلیم اسی رنگ کی ہے حالانکہ حق تعالیٰ کے غنا کو اگر دیکھا جاوے تو معلوم ہو گا کہ ان کو کیا ضرورت ہے اس قدر اہتمام کی مگر کیا ٹھکانا ہے ان کی شفقت کا کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا کوئی بندہ ہم سے جدا رہے اور کیوں نہ ہوا نہ ہوں ہی نے تو ان تمام شفقتوں کو پیدا کیا بس جس نے باپ کے دل میں اتنی شفقت پیدا کر دی وہ خود کیسا شفیق ہو گا چہ باشند ان نگار خود کہ بندہ اس نگار ہا۔ (وہ کیسا محبوب ہو گا جس نے ایسے محبوب پیدا کئے ہیں) سبحان اللہ مشکل سے مشکل تعلیم کو کیسا سہل کر دیا ہے مقصود تو یہ تھا کہ عبادت کیا کرو یعنی غلام بنو)

رب السموات الخ (وہ رب ہے آسمانوں کا الخ) یہاں پر ہو مبتدا مقدر ہے اور رب السموات اس کی خبر ہے اور اس نے جس صفت کی خبر دی ہے وہ صفت اعبدہ (اس کی عبادت کر) مقتضی ہے اور وہ صفت ہے مسلم تو اس کا اثر یہ ہو گا کہ اب نفس کو امتثال امر میں خلجان نہ رہے گا کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے صفات و کمالات بھی معلوم ہو گئے اور اس کا امر بھی معلوم ہو گیا اور یہ طبعی امر ہے کہ صاحب عظمت و کمال کی اطاعت طبعاً سہل ہوتی ہے اور یوں تو حق تعالیٰ کے صفات کما بے شمار ہیں مگر ان کو فاعبده (پس اس کی عبادت کر) کی تسہیل میں اتنا بین دخل نہیں جتنا صفت ربوبیت ہے کیونکہ محسن کی اطاعت کی طرف آدمی زیادہ دوڑتا ہے چنانچہ حکماء کی بھی اس پر نظر گئی ہے اور اسی لئے ان کا قول ہے الانسان عبد الاحسان (انسان احسان کا بندہ ہے) اور یہ اقتضا صرف قولی ہی نہیں بلکہ عملی ہے کہ محسن کی تعظیم و تکریم صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً بھی کی جاتی ہے کیونکہ احسان میں یہ اثر ہے کہ وہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور ربوبیت سماء وارض سے بڑھ کر کیا احسان ہو گا اور اسی

لئے دہکم (تمہارا رب) یا دہکم (تیرا رب) نہیں فرمایا بلکہ رب السموت والارض (وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا) فرمایا اس واسطے کہ دہکم فرمانے سے یہ ہوتا کہ بعض صورتوں کو تو حق تعالیٰ کا احسان سمجھتے اور بعض کہ نہ سمجھتے مثلاً اس کو تو احسان سمجھتے کہ جنگل میں بھوکے بیٹھے تھے کہ ایک خوان کھانے کا نازل ہو گیا مگر اس کو نہ سمجھتے کہ مثلاً پانچ سو روپیہ کی تنخواہ ہے اور اس سے اجناس خریدے گئے اور طرح طرح کے اسباب معیشت مہیا کئے گئے اور کھاپی رہے ہیں تو یہ ان وسائل کی تربیت پر نظر کر کے یہ سمجھتا کہ میں نے بی اے پاس کیا تھا اس سے پانچ سو کی نوکری ملی اور اس سے کھاپی رہے ہیں اس میں کسی کا کیا دخل اور کیا احسان اور یہ مذہب مسلمان کا تو ہے قارون کا مذہب ہے کیونکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا احسن کما احسن اللہ الیک (تو بھی خلق کے ساتھ) احسان کر جیسا خدا نے تجھ پر احسان کیا) تو اس نے جواب دیا لیسما اوتبعہ علی علم عندی (کہ اور کچھ نہیں صرف یہی بات ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے میرے علم کی بدولت ملا ہے) اس میں خدا کے احسان کو کیا دخل (نعوذ باللہ) اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ وہ علم کیا تھا ایک قول یہ ہے کہ کیمیا ہے کوئی کہتا ہے فن تجارت ہے غرض مختلف اقوال ہیں مگر چونکہ کسی دلیل کی تعیین دلیل صحیح سے نہیں اس لئے علم کو عام ہی رکھا جائے تو مناسب ہو گا خواہ وہ علم کیمیا ہو خواہ علم زراعت ہو خواہ فن تجارت ہو خواہ سود لینا دینا ہو بہر حال کوئی تدبیر ترقی مال کی جس کو اس نے کہا علی علم عندی (میرے علم کی بدولت) خیر وہ تو کافر تھا افسوس تو مسلمان پر ہے (کہ وہ ترقی دنیا کو مطلوب سمجھتے ہیں)

حکم استقامت عبدیت

بہر حال فاعبدہ میں حکم ہے کہ غلام بن جاؤ۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ ہم لوگوں میں ایسے حیلہ جو اور بہانہ باز بھی ہیں کہ صرف فاعبدہ سن کے ایک مرتبہ نماز پڑھ لینے ہی کو یہ سمجھتے کہ بس احتیال امر ہو گیا اس لئے آگے فرماتے ہیں واصطبر لعبادته یعنی اپنی غلامی پر مداومت رکھو پس ایک درجہ غلام بننے کا ہے اور دوسرا درجہ غلامی پر قائم رہنے کا اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ تہمہ ہے ماسبق کا تا کہ کوئی یہ نہ سمجھ سکے کہ فقط غلام ہونا مقصود تھا غلام رہنا مقصود نہ تھا بلکہ غلام غلام بننے کے بعد پھر اللہ میاں نے آزاد کر دیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر واقع میں بھی آزاد کر دیتے تو کیا اس کے یہ معنی ہوتے کہ اعتقہ اللہ من رقبہ یعنی خدا نے غلامی سے آزاد کر دیا یہ معنی ہوتے کہ اعتقہ اللہ من النار یعنی خدا نے عذاب دوزخ سے آزاد کر دیا جیسے آقا اپنے غلام کا بدل جنایت ادا کر کے اس کو سلاسل و اغلال سے آزاد کر دے سو ظاہر ہے کہ یہ معنی تو ہونا محال تھا ہے کہ اس نے اپنی غلامی سے بھی آزاد کر دیا چنانچہ استحال اس کا ظاہر ہے مخلوق و مربوب کے لئے مملوک و محکوم ہونا لازم عقلی ہے جب یہ آزادی محال ہے تو ظاہر ہے کہ

غلام رہنا واجب ہے تو اگر واصطبر بھی نہ ہوتا تب بھی اس کے معنی کا تحقق واجب تھا اور یہاں سے حریت کی بھی تحقیق معلوم ہو سکتی ہے جس کی تمام دنیا میں بالکل ہے اور اس کو مذہبی و فطرتی حق ٹھہرایا جاتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ حریت کوئی آزادی ہے آیا اس حریت کے معنی غیر حق سے آزاد ہونا ہے یا حق سے آزاد ہونا واقع میں غلامی ہی میں ہمارا فخر ہے نہ آزاد میں۔ چنانچہ جن کو اس غلامی کی حقیقت کا مزہ آ گیا وہ کہتے ہیں۔

سیرش نخواهد رہائی زبند شکارش نجومید خلاص از کند

ومن يفعل ذلك يلق الاثام ايضا عاف له العذاب يوم القيمة ويخلد فيه مهانا الا من تاب الخ.
اس آیت میں کسی کو توبہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جب تک مغرب سے آفتاب نہ نکلے اس وقت تک یہی قانون ہے کہ ہر ایک کی توبہ قبول ہے کوئی بھی ہو۔ غرض قانون عام ہے گو اس کا زمانہ محدود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی سے بھی حب ذاتی اور بغض ذاتی نہیں کفار سے بھی ان کی ذات کی وجہ سے بغض نہیں بلکہ ان کے افعال سے بغض ہے جس میں کفر سب سے اشد ہے اور دوسرے افعال بھی موجب بغض ہیں۔

واذا تتلى عليهم اياتنا بينت قال الذين كفر والذين امنوا اي الفريقين خیر مقاما و احسن ندیا و کم اهلکنا قبلهم من قرن هم احسن الاثا و رثیا

پہلی آیت میں کفار کا تقاضا ساز و سامان اور اہل و عیوان پر مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جاہ کا اور دوسری آیت میں ان سے زیادہ سامان و نمود والوں کا مبغوض اور عذاب سے ہلاک کیا جانا مذکور ہے جو حاصل ہے مال و جاہ کے قابل تقاضا نہ ہونے کا۔

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کفار کا ایک مقولہ بیان فرماتے ہیں جس کو وہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے۔ وہ مقولہ یہ ہے ای الفريقین خیر مقاماً و احسن ندیا یعنی جب ہماری آیتیں کھلی کھلی ان لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ کفار ایمان والوں سے یوں کہتے ہیں کہ دونوں فریق میں سے کونسا فریق بہتر ہے۔

تخصیص کی نفی

واذا تتلى عليهم میں ہم کی ضمیر ظاہر ان کفار کی طرف عائد ہے مگر نہ تخصیص کی بناء پر بلکہ تبلیغ عام کے وقت وہ تلاوت ان لوگوں کے سامنے بھی ہو جاتی تھی۔

تخصیص کی نفی اس لئے کی گئی کہ ایسا نہ ہوتا تھا کہ خاص ان کا کوئی جلسہ کر کے اس میں تلاوت ہوتی ہو۔ گو کفار نے جدا جلسہ چاہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کو نہیں مگر ہماری مجلس غرباء سے علیحدہ کر دیجئے ہم ان میں بیٹھنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ ذلیل لوگ ہیں اور ہم

رؤساء ہیں ان میں بیٹھ کر ہماری عزت کو بڑھ لگتا ہے ہماری اہانت ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمام حجت کی غرض سے اس کا کچھ خفیف سا خیال بھی کیا تھا تا کہ ان کے پاس پھر کوئی عذر نہ رہے اور شاید ہدایت ہی ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ
مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ

اور مت دور کرو ان کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام چاہتے ہیں رضامندی اس کی تم پر نہیں ان کے حساب میں سے کچھ اور نہ تمہارے حساب سے ان پر کچھ تم اگر ان کو دور کرو پھر ہو جاؤ گے تم بے انصافوں میں سے۔

وَأصْبِرْ لِنَفْسِكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَ مَا لَا تَعْدُ عَيْنُكَ
عَنْهُمْ تَرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تَطْعَمُ مِنْ غَدَاةِ قَلْبِهِ عَنْ ذِكْرِنَا وَابْعِ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرْطَا

اور روک رکھو اپنی ذات کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام طالب ہیں اس کی رضامندی کے اور نہ ہٹیں تمہاری آنکھیں ان کو چھوڑ کر تلاش میں رونق دنیا کی زندگی کی اور نہ کہا مانو اس کا جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے اور بیروی کی اس نے اپنی خواہش کی اور ہے اس کا کام حد سے نکلا ہوا۔

یہ ترویج مستقل جملہ نہیں ہے کہ جس سے لازم آوے کہ آپ سے اس کا (یعنی ارادہ زینت دنیا کا) صدور بھی ہوا ہو بلکہ نبی کے تحت میں ہے اور ترکیب میں حال ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں ان سے نہ ہٹیں جس کا منشا اور سبب ارادہ حیات دنیا کا ہوتا ہے۔ آگے صاف صاف فرما دیا۔

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ كَذَلِكَ جِئْنَا فِي آيَاتِنَا لِيُؤْمِنَ لِيُؤْمِنَ لِيُؤْمِنَ لِيُؤْمِنَ لِيُؤْمِنَ لِيُؤْمِنَ لِيُؤْمِنَ
آپ ﷺ کو کچھ خوشامد نہیں پڑی۔ غرض آپ ﷺ کو منع فرما دیا کہ کوئی خاص جلسہ ان خمیشوں کے لئے نہ کیا جاوے ان کو سود فحہ غرض پڑے آئیں ورنہ جائیں جہنم میں۔

مقام طالب و مطلوب

امام مالک سے خلیفہ نے درخواست کی تھی کہ شہزادوں کے واسطے حدیث سنانے کا جلسہ علیحدہ کر دیا جاوے کیونکہ عام جلسہ میں پڑھنا ان کے لئے عار ہے۔ آپ نے اس کو منظور نہیں کیا خلیفہ نے پہلے ان سے یہ فرمائش کی تھی کہ آپ شہزادوں کو مکان پر آ کر درس دیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ علم مطلوب ہے طالب نہیں۔ خلیفہ سمجھ دار تھے اور نبوت کا زمانہ بھی قریب تھا اس لئے فوراً سمجھ گئے اور شہزادوں کو حکم دیا کہ امام کے مکان پر جا کر جلسہ عام میں بیٹھا کریں۔

یہ تو تسلی علیہم کے متعلق تحقیق تھی اس کے بعد آیت میں بینات کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھلی کھلی آیتیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسائل مستنبط بھی کھلے ہوئے ہیں بلکہ ظاہر مقصود یعنی عبارت النص بالکل کھلا ہوا ہے

اس میں کچھ اغلاق نہیں باقی دلالتہ انص اور اشارة انص اور اقتضاء انص وہ کھلے ہوئے نہیں کہ ہر کوئی اس کو سمجھ لے۔ چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَالْيَ أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ

اس میں منافقین کی شکایت ہے کہ جب کوئی خبر امن کی یا خوف کی آتی ہے اس کو پھیلا دیتے ہیں جب معمولی خبروں کی حقیقت سمجھنے میں قوت استنباط شرط ہے تو امور امور علمیہ تو جدار ہے ہاں ظاہری مدلول کھلا ہوا ہے ہی۔ غرض کفار اہل ایمان کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ دیکھو گھر کس کا اچھا ہے بیٹھک کس کی اچھی ہے یعنی اپنی زیب و زینت سے مسلمانوں پر کفار فخر کرتے تھے اور مقصود ان کا یہ تھا کہ اگر ہم برے ہوتے تو ہم سے خدا تعالیٰ کو بغض ہوتا اور جب بغض ہوتا تو نہ ایسا اچھا گھر دیتے نہ بیٹھک دیتے نہ مال دیتے نہ اولاد دیتے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ الْأَثَا وَرَنِيَا

کہ ہم نے تم سے پہلے کتنے قرن ہلاک کر دیئے جو سامان اور منظر میں تم سے بڑھے ہوئے تھے یعنی ان کی ظاہری حالت بہت اچھی تھی مال و اسباب بھی بہت تھا۔ اچھے اچھے مکانات تھے نشست گاہیں نہایت آراستہ و پیراستہ تھیں۔ خلاصہ یہ کہ زیب و زینت کی چیزیں ان کے پاس بہت تھیں مگر پھر بھی معذب ہوئے تو ان میں بھی یہی دوسرے تھے حب مال اور حب جاہ۔

حب مال کے اثرات

افسوس ہے کہ آج کل اکثر عورتوں کی یہی حالت ہے کہ مال کی بھی محبت ہے اور جاہ کی بھی۔ میرا مقصود اس کی مذمت سے اس وقت اس پر تنبیہ کرنا ہے کہ کفار کی خصلت مسلمانوں میں نہ ہونا چاہیے اور یہاں گو چند علمی مضامین بھی قابل بیان ہیں مگر اس وقت وہ بیان سے مقصود نہیں کیونکہ مجمع مستورات کا ہے علمی مضامین کو وہ کیا سمجھ سکتی ہیں اس لئے سہل سہل مضامین بیان کر رہا ہوں۔

غرض اس آیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ نہ برتنے کی چیزیں قابل فخر ہیں نہ زینت کی چیزیں قابل فخر ہیں مگر عورتوں کو تو دن رات یہی فکر ہے کہ چیزیں جمع کر لیں جو کہ مال ہے اور اس سے جاہ پیدا کریں اور چونکہ یہ دو بڑے مرض ہیں اس لئے ان کا علاج نہایت ضروری ہے کیونکہ اس سے اور امراض مختلفہ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً انسان کسی کا مال مارتا ہے تو وہ حب مال کی وجہ سے۔ اگر حب مال نہ ہو تو کیوں ایسا کرے گا غیبت اسی وجہ سے کرتا ہے کہ اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے جو کہ جاہ ہے غصہ کو جب ہی جاری کرتا ہے جب اپنے کو بڑا اور اور دوسرے کو حقیر خیال کرتا ہے جو کہ جاہ اور تکبر ہے اور یہ تکبر ایسی بری خصلت ہے کہ اس سے اور بہت سی بری

باتیں پیدا ہوتی ہیں شیطان میں یہی تو تھا اس لئے تو یہ کہا تھا۔

خلقتی من نار و خلقته من طین کہ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔

میں بڑا ہوں یہ چھوٹا ہے۔ لوگو! تم جو بڑا بننا چاہتے ہو تو ذرا اپنی حقیقت کو تو دیکھو۔

ایک بزرگ کے سامنے ایک شخص اکڑتا ہوا گزرا۔ انہوں نے اس کو نصیحت کی۔ اس نے کہا تم مجھے نہیں

جانتے میں کون ہوں۔ وہ بزرگ بولے ہاں جانتا ہوں۔

اولک نطفة ملرہ و اخرک جيفة قلدرہ والت بین ذلک تحمل العذرة

یعنی اول تو ایک نطفہ ناپاک تھا اور اخیر میں سر اہوا مر دار ہو جاوے گا اور درمیانی حالت یہ ہے کہ تیرے

اندر پاخانہ بھرا ہے۔

صاحبو! یہ ساری خرابیاں حب مال اور حب جاہ کی ہیں۔ یہی بات اس آیت میں بیان کی گئی ہے چنانچہ

فرماتے ہیں۔

قال اللین کفر واللین آمنوا ای الفریقین خیر مقاماً و احسن لدیاً.

یعنی کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ہلاؤ ہم دونوں فرقوں میں سے کس کا گھرا چھا ہے اور کس کی مجلس

اچھی ہے۔

آگے ان کا جواب ہے

و کم اهلکنا قبلہم من قرن ہم احسن اثلاً ورنیاً

یعنی ہم نے تم سے پہلے لوگ ہلاک کر دیئے جو تم سے اچھے سامان والے اور اچھے منظر والے تھے۔

جیسے فرعون ہامان شداد قارون وغیرہ۔

شرف باسم شرف مسمی کی دلیل ہے

فرمایا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے آیت سلم نجعل لہ من قبل سمیا سے استدلال کیا ہے اس پر

شرف اسم شرف مسمی کی دلیل ہے ورنہ امتنان کیوں کر ہوگا کہ آدمی نام اچھا رکھے۔ ہاں ایسے نام نہ رکھے جن میں

طرف اور تکبر پایا جائے۔ جیسے آج کل بعض لوگ سوچ سوچ کر ایسے نام رکھتے ہیں جیسے بڑھیس قدر زرع الشان وغیرہ

(ملفوظات حکیم الامت ج ۲۰ ص ۱۸۱)

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ

الرَّحْمَنُ وُدًّا ۝

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کر دے گا۔

تفسیری نکات

حب مال و حب جاہ

ایک تو ہے مال اور ایک ہے حب مال اسی طرح ایک ہے جاہ اور ایک ہے حب جاہ۔ تو مذمت مال کی نہیں بلکہ حب مال کی ہے جس سے برے آثار پیدا ہوتے ہیں تو مذموم دو چیزیں ہوئیں حب مال اور حب جاہ باقی رہے مال اور جاہ سو یہ دونوں مذموم نہیں کیونکہ حق تعالیٰ امتنان (نعمت دنیا) کے طور پر فرماتے ہیں ان اللدین امنوا و عملوا الصلحت سيجعل لهم الرحمن ودا کہ ہم مؤمنین اہل عمل صالح کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے اور محبوبیت ہی کا نام جاہ ہے۔ لوگ جاہ کے معنی بھی غلط سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمارے خوف کی وجہ سے ہماری تعظیم کریں حالانکہ جاہ کی حقیقت ہے ملک القلوب (یعنی دلوں کا مالک ہونا) پس ملک المال (مال کا مالک ہونا) تو تمہول ہے اور ملک القلوب (دلوں کا مالک ہونا) جاہ ہے اور خوف اور ہیبت ہو تو وہ صورت جاہ ہے حقیقت جاہ نہیں اور یہ خود ہی اپنے کو معزز سمجھتے ہیں ورنہ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی ان کی عزت نہیں ہوتی چنانچہ ان کے پیچھے لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں حدیث میں ہے کہ بعضے لوگ اپنی نظر میں بڑے ہوتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کلاب اور خنازیر (کتے اور سور) سے بدتر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے خوف کی وجہ سے لوگ تعظیم کرتے ہیں تو یہ کوئی عزت نہیں ہے کیونکہ ایسی عزت تو سانپ کی بھی ہے۔ ایک مرتبہ دہلی میں میں بیان کر رہا تھا کہ کچھ آہٹ ہوئی جس سے لوگوں کو سانپ کا شبہ ہوا بس سانپ کے ڈر سے سب لوگ کھڑے ہو گئے تو کیا یہ اس کی عزت تھی ہرگز نہیں تو جو تعظیم خوف کی وجہ سے ہو وہ جاہ نہیں جاہ تو یہ ہے

صاحب وہ بادشاہ جسمہاست صاحب دل شاہ دلہائے شہاست

(یعنی گاؤں کا مالک جسموں کا بادشاہ ہے اور اہل دل دلوں کا بادشاہ ہے)

تو جسموں کا شاہ ہونا جاہ نہیں بلکہ دلوں کا شاہ ہونا جاہ ہے اور یہ بات محبوبیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ پس محبوبیت ہی اعلیٰ درجہ کی جاہ ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں سيجعل لهم الرحمن ودا (اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے) پس معلوم ہوا کہ جاہ بری چیز نہیں بلکہ یہ تو ایک اچھی چیز ہے کہ حق تعالیٰ بطور امتنان (نعمت دنیا) اپنے صالح بندوں کو عنایت فرماتا بتلارہ ہیں اسی طرح مال کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ نعم المال الصالح للرجل الصالح (نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے) پس مال اور جاہ مذموم خود نہیں ہیں بلکہ مذموم حب مال اور حب جاہ ہیں جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ما ذئبان جائعان ارسلنا في غنم بافسد لها من حب المال والشرف لدين المرء یعنی حب مال اور حب شرف آدمی کے دین کو ایسا تباہ کرتی ہے کہ اگر دو بھیڑیے بھوکے بھی بکری کے گلے میں چھوڑ دیئے جاویں تو وہ بھی بکریوں کو اس قدر تباہ نہیں کر سکتے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حب کا لفظ تصریحاً فرمادیا تو حب بری چیز ہے اب جہاں مال کی مذمت آوے اور اس کے ساتھ حب کی قید نہ ہو تو سمجھ لیں کہ اس سے مراد وہی حب کا درجہ ہوگا کیونکہ بعض قرآن ایسے موجود ہوتے ہیں جن سے وہ قید معلوم ہو جاتی ہے اور اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو چونکہ غالب عادت یہی ہے کہ جب مال ہوتا ہے تو حب مال بھی ہوتی ہے پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ مال سے مراد وہی ہے جو حب کے درجے میں ہو۔

ان الدين امنوا و عملوا الصالحات سيجعل لهم الرحمن ودا
حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر دو کا ذکر رکھا ہے۔ اس میں بھی دو چیزیں ہیں ایک مقصود جس کا بیان سيجعل لهم الرحمن ودا میں ہے اور ایک طریق یعنی ایمان و عمل صالح جس کا بیان اللہ انما و عملوا الصلحت میں ہے۔

طریق نجات

یہ آیت دو جزو پر مشتمل ہے۔ ایک مقصود و دوسرے طریق مقصود اب سمجھئے کہ طریق مقصود کیا ہے وہ دو چیزیں ہیں۔ امنوا و عملوا الصلحت کیونکہ حق تعالیٰ یہی تو فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کے لئے حق تعالیٰ محبوبیت پیدا کر دیں گے جس میں محبوبیت کو ایمان و عمل صالح پر مرتب کیا گیا ہے تو مقصود اور نتیجہ تو وہ ہے اور ایمان و عمل صالح اس کے رتبہ کی شرط ہے یہی حاصل ہے طریق ہونے کا۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جو محبوب و مقبول بنا چاہے اس کو پہلے ایمان لانا اور عمل صالح اختیار کرنا چاہیے اور یہاں سے یہ ثابت ہو گیا کہ جب ایمان و عمل صالح مقبولیت و نجات کا طریق ہے تو بدوں اس کے تمام نسبتیں نجات کے لئے ناکافی ہیں مثلاً کسی بزرگ کی اولاد ہونا یا اپنے پاس کسی بزرگ کا تمبر ہونا یہ تنہا نجات کے لئے کافی نہیں۔

پس یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے محبوب بن جاویں گے اور اس کے فروغ میں سے یہ بھی بتلا دیا گیا تھا کہ یہ شخص خلق کا بھی محبوب ہو جاوے

ان الذین امنوا و عملوا الصلحت سيجعل لهم الرحمن ودا
حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کر دیں گے یعنی ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے لئے اللہ تعالیٰ ایک وعدہ فرماتے ہیں اور وعدہ بھی قریب کا۔ گویا آخرت کا وعدہ بھی ہو سکتا ہے کہ آخرت بھی قریب ہی ہے مگر جعل سے متبادر یہی ہے کہ دنیا کا وعدہ ہے کیونکہ قرب متعارف دنیا ہی کو ہے چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام جلدی ہو جائے گا تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہو جائے گا۔ پس ہم کو بناء علی القواعد السلیمة یہ حق حاصل ہے جس شے کی نسبت حق تعالیٰ جلدی ہو جانے کا وعدہ فرماویں اس کو دنیا کے وعدہ پر اور دنیا میں بھی بہت جلد حاصل ہو جانے پر محمول کر لیں۔

ودا کا مفہوم

بہر حال ایمان اور عمل صالح پر وعدہ ودا کا جس کا نام محبت ہے فرماتے ہیں۔ یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کی محبت اللہ تعالیٰ پیدا کریں گے اس مقام پر اہل علم اس کو یاد رکھیں کہ میں نے اس حاصل ترجمہ میں ودا کو مصدر مبنی للمفعول یعنی مصدر مجہول لیا ہے۔

محبوبیت کا باطنی سبب

تبرعا اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں کہ ایمان و عمل صالح کی وجہ سے محبت کیوں ہوتی ہے اصل وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں خاصیت ہی یہ رکھ دی ہے جیسے بعض دوائیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہے۔ ایسے ہی یہ بھی ہے لیکن یہ زمانہ ہے تحقیقات کا۔ اس لئے اس پر اکتفا نہ کیا جاوے گا۔ اس لئے میں اس کی دو وجہ بیان کرتا ہوں ایک تو راز ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی کو اول بیان کرتا ہوں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ تمام ملائکہ میں پکار دو کہ فلاں بندہ سے ہم کو محبت ہے تم بھی اس کو دست رکھو پھر حکم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی پکار دو اگر کوئی کہے کہ ہم کو کسی کی نسبت بھی اعلان نہیں۔

سنیے بات یہ ہے کہ فرشتوں کا اعلان قلوب میں ہوتا ہے اور وہ یہی کہ اس کی محبت قلوب میں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ زمین پہ اعلان کیا جاتا ہے۔ فیوضع له القبول فی الارض پس وہ سب کی نظروں میں مقبول ہوتا ہے اس کے بعد حضور نے استشہاد میں یہ آیت پڑھی ان الذین امنوا و عملوا الصالحت سيجعل لهم الرحمن ودا حضور کا یہ آیت پڑھنا صریح دال ہے اس پر کہ ودا یہاں پر مصدر مبنی للمفعول ہے اور میرا اس مضمون کو اس آیت سے استنباط کرنا صحیح ہے۔ دوسرا راز باطنی یہ ہے کہ محل محبت کا قلب ہے اور قلوب حق تعالیٰ

کے قبضہ میں ہیں جب وہ قلوب میں کسی کی محبت پیدا کرنا چاہیں گے بلا اضطراب اس کے سامنے جھک جانا ہی پڑے گا اس کے سامنے پھر کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ ٹیڑھا چلے۔

اور راز ظاہری یہ ہے کہ محبت کے کل تین سبب ہوا کرتے ہیں نوال کمال جمال یعنی عطا و احسان سبب محبت کا ہوتا ہے چنانچہ محسن سے اسی بناء پر محبت ہوتی ہے اور عطا ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کی خطا معاف کر دی جائے یا کسی کا کام کر دیا جائے کسی کو بے ہودگی پر درگزر کی جائے۔ کبھی کمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے خواہ علمی ہو یا عملی یا اخلاقی مثلاً اہل علم سے محبت اسی واسطے ہوتی ہے کہ ان میں کمال علم ہے۔

الحاصل! جو اسباب محبت کے ہیں نوال جمال کمال شریعت نے اس کی مبلغ وجہ تعلیم فرمائی ہے پس جو شخص شریعت پر عمل کرے گا جو کہ عملوا الصلحت کا دلول ہے وہ باطلع محبوب ہو جائے گا اور اپنی قوم میں تو محبوب ہوگا ہی غیر قوموں میں بھی اس کا اعتبار ہوگا اس سے بعض اعمال صالحہ کا دوستی میں دخل ہونا۔ سمجھ میں آ گیا ہوگا جو کہ باب معاملہ و معاشرت و اخلاق سے ہے۔

ایمان و عمل صالح کا محبوبیت میں دخل

اب یہ بات رہ گئی کہ ایمان اور نماز روزہ کو کیا دخل ہے محبوبیت میں سو اس کی نسبت سنو کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ کوئی کام ہو اول اس کا قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کا جوارج سے ظہور ہوتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ کسی امر پر نباہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس کا تقاضا شدید قلب میں راسخ ہو جائے اور اس کے اضداد و موانع قلب سے مرتفع ہو جائیں ورنہ ارادہ ہوگا۔ مگر غیر راسخ جب راسخ نہیں تو اکثر ارادہ بھی نہ ہوگا تو عمل بھی نہ ہوگا پس ثابت ہوا کہ مداومت و استقامت بدون تقاضائے قلب کے نہیں ہوتا پس اس قاعدہ کے موافق اخلاق و معاملات و معاشرت کی درستی بھی جس کا دخل ہونا محبوبیت میں مسلم ہو چکا ہے جب ہی نہ سکتی ہے کہ ان چیزوں کا قلب میں تقاضا رسوخ ہو اور وہ تقاضا رسوخ بغیر ایمان اور روزہ نماز کے نہیں ہو سکتا اس لئے کہ تمام قواعد متعلقہ بصدق و معاملات اللہ و رسول نے ہی ہم کو تعلیم فرمائی ہیں۔ تو جب تک تصدیق اللہ و رسول کی قلب میں راسخ نہ ہوگی تو ان تعلیمات پر استقامت نہ ہوگی۔ یہ تو ایمان کا دخل ہو اور روزہ نماز نہیں ہوتی روزہ سے تو اس طرح کہ اس سے قوت بھیمہ کا انکسار ہوتا ہے اور نماز سے تواضع پیدا ہوتی ہے تکبر ٹوٹتا ہے اور تکبر و بھیمہ ہی اصل ہے بہت سے اخلاق ذمیرہ کی۔ پس صوم و صلوٰۃ سے اس کی اصلاح ہوگی اور اس کی اصلاح سے معاملات وغیرہ درست ہونگے جو مدار ہے محبوبیت کا اور مسبب کا سبب ہے۔ پس نماز و روزہ سبب ہوا محبوبیت کا مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ایمان اور صلوٰۃ و صوم کا موضوع لہ صرف یہی ہے اصلی موضوع لہ تو ان کا قرب الہی ہے لیکن یہ محبوبیت بھی اور سیر خاصہ لازمہ کے طور پر مرتب ہو جاتی ہے چونکہ یہاں بیان تھا محبوبیت و مودۃ اس لئے اس کا بھی اس میں دخل بیان کر دیا گیا۔

سُورَةُ طه

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۝

ترجمہ: وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے

تفسیری نکات

اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کا مفہوم

ایک بات طلبہ کے کام کی یاد آئی۔ وہ یہ ہے کہ مجسمہ (ایک فرقہ ہے جو خدا تعالیٰ کے جسمانی ہونے کا قائل ہے) نے الرحمن علی العرش استوی۔ (اللہ تعالیٰ نے عرش پر باعتبار صفت رحمانیہ کے تجلی فرمائی) کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ خدا تعالیٰ عرش پر ایسے ہی بیٹھے ہیں جیسے ہم چوکی پر بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ قدر نہ جانی اور عرش کو انہوں نے بڑھا دیا کیونکہ مستقر القاف عادیماً مستقر بکسر القاف سے اوسع ہوتا ہے (یعنی جس چیز پر قرار پکڑا جاتا ہے وہ زیادہ وسیع ہوتی ہے قرار پکڑنے والی چیز سے) حالانکہ عرش کو ذات باری تعالیٰ سے کوئی نسبت نہیں ایسی بھی نسبت نہیں جیسے کہ رائی کے دانہ کو ہم سے ہے اگر کوئی رائی کا دانہ ہمارے قدم کے نیچے پڑا ہو تو کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ اور کیا یہ محاورہ صحیح کہا جاسکتا ہے کہ ہم اس پر بیٹھے ہیں رائی کا دانہ بے چارہ کیا چیز ہے۔ پس عرش کہاں اور خالق عرش کہاں پس معنی اس آیت کے یہ نہیں ہیں جو مجسمہ نے یہ سمجھے ہیں۔

اب رہی یہ بات پھر کیا معنی ہیں تو سلف صالحین نے اس آیت اور جو اس کے مشابہ اور آیات ہیں ان کے بارہ میں یہ فرمایا ہے کہ ان کے معنی کے تعین نہ کرو اور ان کے معانی کو اللہ کے حوالہ کرو صرف اتنا اعتقاد رکھو کہ جو کچھ مراد ہے وہ حق ہے اور اسلم طریقہ آیات متشابہات میں یہی ہے باقی متاخرین نے اس میں کچھ تاویل فرمائی ہے بعض نے یہ کہ استوی کے معنی استولی ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہیں اور ایک تاویل احقر کیا کرتا

ہے کہ استوی علی العرش بمعنی بر تخت نشستن (تخت پر بیٹھنا) کنایہ ہے نفاذ امور و تصرف فی الامور سے چنانچہ بعض جگہ اس کے بعد بندہ الامر (وہ امر کی تدبیر کرتا ہے) کا آنا بطور اس کے تفسیر کے ہو سکتا ہے۔
(اور دوسرے مقام میں ہے اللہ الہی خلق السموات والارض فی ستة ایام ثم استوی علی العرش (اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر تخت قائم ہوا) استوی میں ضمیر اللہ کی طرف ہے سو وہاں حسب قاعدہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً (بعض جز قرآن کا بعض جز کی تفسیر کرتا ہے) یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں بھی مراد تجلی الہی باعتبار صفت رحمانیہ کے ہے فافہم ۱۲ منہ)

اور تاویل ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب و غریب فرمائی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا اللہ علی العرش استوی تاکہ یہ لازم آوے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہیں بلکہ الرحمن فرمایا ہے پس مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت عرش کو محیط ہے اور عرش تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس اس تاویل سے یہ آیت وسعت رحمتی کل شیء (میری رحمت ہر چیز سے وسیع ہے) کی مراد ہوگی اور عرش کی خصوصیت اس لئے ہوگی کہ تعلق رحمت کا اولاً بلا واسطہ اس کے ساتھ ہوا ہے اور دوسری اشیاء کے ساتھ بلا واسطہ اس کے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی تجلی اس پر اولاً ہوئی ہے یہاں سے تجلی کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ تجلی کے معنی یہ ہیں کہ کسی صفت کا تعلق تجلی لہ (جس کے لئے تجلی کی گئی ہے) سے ہو جاوے تجلی کے معنی چمک دک کے نہیں ہیں جیسے عوام سمجھتے ہیں۔

عرش اللہ تعالیٰ کا مکان نہیں ہے

الرحمن علی العرش استوی کے معنی عرش پر تجلی رحمانیت ہوتی ہے یہ معنی ہرگز نہیں کہ عرش پر خدا تعالیٰ بیٹھے ہیں اور وہ ان کا مکان ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ مکان کو کمین کے برابر یا کم از کم اس کے مقارب ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص زمین پر بیٹھے اور اس کے نیچے رائی کا دانہ آ جائے تو زمین کے خاص حصہ کو تو اس کا مکان کہا جائے گا رائی کے دانہ کو کوئی شخص اس کا مکان نہ کہے گا کیونکہ انسان سے اس کو کچھ بھی نسبت نہیں پھر وہ اس کا مکان کیونکر ہو سکتا ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ عرش حق تعالیٰ کا مکان نہیں ہو سکتا کیونکہ عرش محدود ہے اور ذات خداوندی غیر محدود ہے محدود کسی طرح غیر محدود کا مکان نہیں ہو سکتا پس۔ استوی علی العرش کے معنی وہی ہیں کہ حق تعالیٰ کی تجلی صفت رحمانیت کے اعتبار سے اس پر ہوتی ہے اسی واسطے الرحمن علی العرش استوی فرمایا اللہ علی العرش استوی نہیں فرمایا کیونکہ اللہ علم ذات ہے اور الرحمن اسم صفت ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ عرش محل ذات نہیں بلکہ صفت رحمت ہے کہ وہاں تجلی رحمت اور مکانات سے زیادہ ہے تو یہ استقبال قبلہ کاراز ہوا۔
الرحمن علی العرش استوی ”اللہ تعالیٰ نے عرش پر باعتبار صفت رحمانیہ کے تجلی فرمائی“

اللہ تعالیٰ عرش پر غالب ہیں اور ایک تاویل احقر کیا کرتا ہے کہ استوی علی العرش بمعنی بر تخت نشستن کنایہ ہے نفاذ امور و تصرف فی الامور میں تصرف کرنا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ اس کے بعد ملہو الامر (وہ ہر امر کی تدبیر کرتا ہے) کا آنا بطور اس کے تفسیر کے ہو سکتا ہے۔

(اور دوسرے مقام میں ہے اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام ثم استوی علی العرش اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر تخت پر قائم ہوا استویٰ میں ضمیر اللہ کی طرف ہے۔ سو وہاں حسب قاعدہ القرآن تفسیر بعضہ بعضاً بعض جز قرآن کا بعض جز کی تفسیر کرتا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی مراد تجلی الہی بہ اعتبار صفت رحمانیہ کے ہے فافہم) ایک تاویل ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب و غریب فرمائی۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ اللہ علی العرش استوی (اللہ عرش پر بیٹھے ہیں) تاکہ یہ لازم آئے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھے ہیں بلکہ الرحمن فرمایا۔ پس مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت عرش کو محیط ہے اور عرش تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ پس حاصل یہ ہے کہ اللہ کی رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے پس اس تاویل سے یہ آیت

وسعت رحمتی کل شیء (میری رحمت ہر چیز سے وسیع ہے)

کی مراد ہوگی اور عرش کی خصوصیت اس لئے ہوگی کہ تعلق رحمت کا اولاً بلا واسطہ اس کے ساتھ ہوا ہے اور دوسری اشیاء کے ساتھ بواسطہ اس کے ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کی تجلی اس پر اولاً ہوتی ہے۔

تجلی کی معنی

یہاں سے تجلی کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ تجلی کے معنی یہ ہیں کہ کسی صفت کا تعلق تجلی لہ (جس کیلئے تجلی کی گئی ہے) سے ہو جائے۔ تجلی کے معنی چمک دک کے نہیں ہیں جیسے عوام سمجھتے ہیں۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ

ترجمہ: (وہ) اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اس کے اچھے اچھے نام ہیں

تفسیری نکات

حوادث اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے مظاہر ہیں

حضرت حاجی صاحب پر توحید کا بہت زیادہ غلبہ تھا وحدۃ الوجود تو حضرت کے سامنے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشاہد ہے یعنی ہے ایک مرتبہ سورۃ طہ سنتے رہے اس آیت پر پہنچ کر لا الہ الا ہولہ الاسماء الحسنی حضرت

پراس کا غلبہ ہو گیا بطور تفسیر کے فرمایا کہ پہلے جملہ پر سوال وارد ہوا کہ جب سوا اللہ کے کوئی نہیں تو یہ حوادث کیا ہیں جو اب ارشاد ہوا لہ الامماء الحسنیٰ یعنی سب اسی اسماء وصفات کے مظاہر ہیں اسی کو کسی نے کہا ہے۔

ہرچہ بنم در جہاں غیر تو نیست
یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۝

ترجمہ: (وہ یہ ہے کہ) میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں تم میری ہی عبادت کیا کرو اور میری ہی یاد کی نماز پڑھا کرو۔

تفسیری نکات

نماز کا ایک عظیم ثمرہ

اب میں اقم الصلوة لذكري میں ایک نکتہ بیان کرتا ہوں جس سے نماز کی فضیلت دیگر عبادات پر بہت زیادہ ثابت ہوتی ہے اور یہ محض نکتہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے وہ یہ کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ثمرہ کے لئے مقصود ہوں اور ثمرہ عمل کا مغائر ہو دوسرے وہ جو ثمرہ کے لئے مقصود نہیں بلکہ بذاتہ مقصود ہے اور جو ثمرہ اس کے ساتھ مذکور ہے وہ اس کا مغائر نہیں بلکہ عین ہے مثلاً ہم کسی حاکم سے ملنے جائیں اور وہ ہم کو کوئی کام بتلائے تو بعض کام تو ایسے ہوتے ہیں جو خود مقصود نہیں بلکہ ان کا ثمرہ مقصود ہے مثلاً حاکم یہ کہے کہ تم انٹرنس پاس کر لو تو ہم تم کو فلاں عہدہ دیدیں گے یہاں انٹرنس پاس کرنا خود مقصود نہیں بلکہ عہدہ مقصود ہے جو اس کا ثمرہ ہے اور یہ ثمرہ عمل کا غیر ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ وہ یوں کہے تم ہمارے پاس ہر روز آیا کرو یہاں یہ عمل خود مقصود ہے کیونکہ حاکم کے دربار میں حاضری نصیب ہو جانا یہ خود بڑی چیز ہے جو اس پر ثمرات بھی مرتب ہوتے ہیں مگر ان ثمرات کے ساتھ خود حاضری دربار بھی بڑا مقصود ہے چنانچہ بہت لوگ اس حاضری ہی کے لئے بڑی بڑی کوششیں کرتے ہیں جو اس کے حصول کے بعد کوئی ثمرہ بھی حاصل نہ ہو۔ اب میں نماز کے متعلق دعویٰ کرتا ہوں کہ نماز میں جتنے اعمال ہیں اور نماز ان اعمال سے مرکب ہے وہ سب اجزا ایسے ہیں کہ اعمال تو ہیں ہی مگر ثمرات بھی ہیں یعنی ان اعمال کے لئے کوئی ایسا ثمرہ نہیں جس کے اعتبار سے ان اعمال کو مقصود بالغرض اور اس ثمرہ کو مقصود بالذات کہا جائے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجزاء صلوة خود مقصود بالذات ہیں جس کو میں ابھی ثابت کئے دیتا ہوں اور جب اجزاء کا یہ حال ہے تو صلوة کا حال بھی اس سے معلوم ہو گیا کہ وہ بھی

مقصود بالذات ہے کیونکہ اجزاء میں اور مجموعہ میں محض اعتباری تغائر ہے اور تغائر اعتباری محض فرض ہی فرض ہے امور واقعہ میں اس کا اعتبار فضول ہے اور کسی عمل کا مقصود بالذات ہونا اور مقصود بالغرض نہ ہونا یہ اس کی بڑی فضیلت اور اعلیٰ درجہ کا کمال ہے اب سنئے کہ نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی محبوب عاشق سے کہے کہ ہم کو دیکھو اور ہم سے باتیں کرو ہر چند کہ دیکھنا اور باتیں کرنا ایک عمل ہے مگر ایسا عمل ہے کہ خود ہی عمل ہے اور خود ہی ثمرہ مقصود ہے اس سے کوئی اور ثمرہ مقصود نہیں عاشق کے دل سے پوچھو وہ اس عمل سے کسی غیر کو مقصود نہ سمجھے گا کیونکہ وہ تو عمر بھرا ہی کو ترستا تھا کہ کسی طرح ایک نگاہ محبوب کو دیکھ لوں اور اس سے ایک دو بات کر لوں تو اب جبکہ محبوب نے اس کو اپنے دیکھنے اور اپنے سے ہم کلام ہونے کا امر کیا ہے یقیناً اس کو اس رویت و کلام سے کسی اور ثمرہ کی طلب نہ ہوگی بلکہ اسی کو مطلوب سمجھے گا رہا یہ اشکال کہ صاحب اصل مقصود تولذت ہے جو رویت و کلام محبوب سے حاصل ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ احکام طہیہ میں لذت و رویت و کلام کا غیر نہیں کیونکہ وہ ان کے ساتھ ساتھ معا حاصل ہوتی ہے دونوں میں تقدم و تاخر زمانی نہیں۔

نماز قیام و قعود و رکوع و سجود و قراءت سے مرکب ہے اور ان ارکان کے ساتھ تسبیح و تقدیس و تکبیر و زکری بھی لگا ہوا ہے۔ یہ نماز کے اجزاء ہیں اب بتلائیے اگر نماز فرض نہ ہوتی تو جو چیزیں نماز کے اندر ہیں کیا آپ ان کو نہ ڈھونڈتے یقیناً آپ خود ان کو ڈھونڈتے اور ان کی طلب و تلاش میں عمر ختم کر دیتے کیونکہ ہر عاشق کو اس کی تمنا ہوتی ہے کہ محبوب کے سامنے اپنا عجز و نیاز ظاہر کرے اور اس کی تعریف و ثناء میں زبان کو تر کرے اور اس کی یاد سے دل کو تسلی دے۔

اب نمازیوں کو متنبہ کرنا ہوں کہ وہ اپنی نماز پر ناز نہ کریں کیونکہ حق تعالیٰ نے محض صل نہیں فرمایا کہ نماز پڑھا کرو بلکہ اقم الصلوٰۃ فرمایا ہے جس میں اقامت کا امر ہے اور اقامت صلوٰۃ یہ ہے کہ اس کے سب ارکان اعتدال و تسویہ کے ساتھ ادا کئے جائیں تو نماز پڑھ کر بے فکر نہ ہو جائیے بلکہ اقامت کی کوشش کیجئے۔

نماز کی روح

لذکری میں لام غایت کا ہے یعنی نماز کی غایت اور روح میری یاد ہے۔

یہاں ذکر کے معنی یاد کے ہیں اس کا اول درجہ یہ ہے کہ سوائے خدا کے کسی اور کا دل میں خیال نہ ہو حتیٰ کہ اس کا بھی کہ میں اس وقت خدا کو یاد کر رہا ہوں حاصل یہ کہ قلب میں مذکور کا خیال ہو ذکر کا خیال نہ ہو۔ دوسرا مرتبہ یہ کہ مذکور کی یاد نہ سہی تو ذکر کی یاد ہی سہی یعنی یہی سہی کہ میں اس وقت یاد کرتا ہوں۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ

أَهْبَسُ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيْ فِيهَا مَأْرَبٌ أُخْرٰى ﴿۱۸﴾

ترجمہ: اور تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ علیہ السلام۔ انہوں نے کہا یہ میری لاٹھی ہے میں کبھی اس پر سہارا لگاتا ہوں اور کبھی اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام نکلتے ہیں۔

تفسیری نکات

امور طبعیہ کے مؤثر ہونے میں حکمتیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا و ما تلک بيمينک یا موسیٰ تو آپ جواب میں عرض کرتے ہیں ہي عصای اتوکؤا علیہا و اہس بہا علی غنمی ولی فیہا مآرب اُخری یہاں آپ نے ایجاز سے کام نہیں لیا بلکہ اطناب سے کام لیا مگر اطناب مہمل نہیں اس کو اسباب کہا جائے بلکہ اطناب مفید جو کہ بلاغت کی ایک نوع ہے اور مفید کس کو موسیٰ علیہ السلام کو کیونکہ اس اطناب سے ان کو اپنے شوق کا اظہار مقصود تھا کہ جب محبوب کے ساتھ بات کا موقع مل گیا تو جہاں تک دائرہ بلاغت میں رہ کر کام میں وسعت ہو سکے اس کو وسعت دینا چاہیے اس لئے آپ نے عصا کے متعلق جتنی باتیں بیان میں آ سکتی تھیں سب بیان کر دیں۔ یہ بھی اہل طریق کا ایک معمول ہے کہ وہ سوال کا جواب مقام ادب میں بھی پورا کر دیتے ہیں گو اس میں اطناب ہی ہو جائے البتہ ایسا اطناب نہ ہو جو بے کار و فضول ہو بلکہ جواب پورا ہو اور اطناب مفید ہو۔

اِنَّ اَقْدِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاَقْدِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ

ترجمہ: یہ کہ موسیٰ کو ایک صندوق میں رکھو پھر اُن کو دریا میں ڈال دو پھر دریا اُن کو کنارے تک لے آویگا

قذف کے معنی اور عجیب و غریب تفسیر

فرمایا کہ بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مغلوب الغضب تھے کہ تختیاں پھینک دیں۔ جواب یہ ہے کہ ”القاء“ اور ”قذف“ کے معنی ایک ہی ہے۔ فاقذفیہ میں قذف کے معنی یہ نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے موسیٰ کو پھینک دیا بلکہ معنی یہ ہے کہ جلدی سے دریا میں رکھ دیا۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے الواح کو جلدی سے رکھ دیا۔ (الکلام الحسن ج ۲ ص ۵۸)

حق تعالیٰ سے ہم کلامی

صاحبو! اگر کوئی محبوب ایک مہمل زبان تصنیف کر کے عاشق سے اس میں باتیں کرے تو عاشق اگر سچا عاشق ہے تو یقیناً اس کی قدر کرے گا اور وہ مہمل زبان ہی اس کی نظر میں فصیح زبان سے زیادہ پیاری ہوگی کیونکہ محبوب کی زبان ہے اور قرآن تو مہمل بھی نہیں بلکہ نہایت فصیح اور بلخ، عجیب و غریب شیریں زبان ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں وہ تو اس کی فصاحت و بلاغت اور شیرینی کو سمجھتے ہی ہیں مگر جو نہیں سمجھتے ان کو بھی اس میں بہت مزہ آتا ہے، تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اور جو لوگ تلاوت قرآن پاک کے عادی ہیں وہ اس کا خوب تجربہ کئے ہوئے ہیں اور اگر کسی وقت کوئی خوش الحان قاری مل جائے تو ذرا اس سے قرآن سن کر دیکھ لو کہ بدوں معنی سمجھے تم کو مزہ آتا ہے یا نہیں۔ واللہ! بعض دفعہ نہ سمجھنے والوں کو بھی ایسا مزہ آتا ہے کہ دل پھٹ جاتا ہے۔ بس قرآن کی یہ حالت ہے

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد
برنگ اصحاب صورت رابو ارباب معنی را
پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے بھی یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن پڑھنا گو اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے پھر حیرت ہے کہ آپ عاشق ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنا نہیں چاہتے حالانکہ محبت وہ چیز ہے کہ عاشق طرح طرح سے اس کے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔

حضرت سیدنا موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال ہوا تھا

وما تملک بيمينک يا موسى (اے موسیٰ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟)

اس کے جواب میں صرف اتنا کافی تھا کہ عصا کہہ دیتے مگر نہیں چونکہ ان کو محبت تھی تو اس وقت کو غنیمت سمجھا کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے تفصیل سے جواب دیا ہی عصای اتو کوا علیہا واہش بہا علی غنمی

یہ میری لاشی ہے میں اس پر سہارا لگالیتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لئے چتے جھاڑتا ہوں۔

کتنی تطویل کی ہے کہ ہسی بڑھایا اور یاء مشکلم کا اضافہ کیا آخر میں پھر اس لاشی کے منافع دو جملوں میں بیان کئے اور اس کے بعد فرمایا ولسی فیہا ما رب اخوی کہ اس میں میرے اور بھی مقاصد ہیں۔ یہ اس واسطے بڑھایا تاکہ آئندہ بھی کلام کی گنجائش رہے کہ شاید حضرت حق دریافت فرمائیں کہ ہاں صاحب وہ اور مقاصد کیا ہیں ذرا وہ بھی بیان کیجئے۔ تو پھر اور باتیں کروں گا۔ یا خود ہی عرض کروں گا کہ حضور اس وقت اس کی شرح نہ ہوئی تھی اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ غرض آئندہ باتیں کرنے کی گنجائش رکھ لی۔ یہ بات ابھی ذہن میں آئی۔

غرض عشاق کو محبوب سے باتیں کرنے میں عجیب مزہ آتا ہے اور بہ دولت مسلمانوں کو گھر بیٹھے ہر وقت نصیب ہے کہ وہ جب چاہیں اللہ تعالیٰ سے باتیں کر لیں یعنی قرآن کی تلاوت کرنے لگیں۔ پھر حیرت ہے کہ قرآن کے بدوں سمجھے پڑھنے کو بے فائدہ بتلایا جائے۔ کیا یہ فائدہ کچھ کم ہے۔ (الفاظ القرآن بلحاظ معنی و اعظم علم و عمل)

وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي ۖ وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ﴿۲۹﴾

ترجمہ: اور میں تمہارے اوپر اپنی طرف سے ایک اثر محبت ڈال دیا اور تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی

فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی فرعون کے گھوڑے پر سوار ہوئے تھے اور اسی کی طرح کپڑے پہنتے تھے بہت خوب صورت تھے اسی واسطے حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) اور خود فرعون دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔ القیت عليك محبة مني میں نے تم پر (یعنی موسیٰ پر) اپنی طرف سے محبت ڈال دی) سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے کہا پھر فرعون نے قتل قبلی پر غصہ کیوں ظاہر کیا۔ انصاف کرنا ضروری تھا اور فرمایا کہ بعد القاء تجلی اور بھی زیادہ خوبصورت ہو گئے تھے۔ اس واسطے جس بزرگ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت ہوتی ہے اس کی طرف دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے جیسے حضرت مدار رحمۃ اللہ علیہ۔ اس واسطے وہ منہ پر پردہ رکھتے تھے تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔

إذ هبنا إلى فرعون إننا طغى ﴿۳۰﴾ فقولا له قولا لئلا نلعنه ليتذكر ﴿۳۱﴾

أوبخشي ﴿۳۲﴾ قال ربنا إننا نخاف أن يفرط علينا أو أن يطغى ﴿۳۳﴾ قال

لأنخاف إني معكم أسمع وأرى ﴿۳۴﴾

ترجمہ: دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت نکل چکا ہے پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ بہ رغبت نصیحت قبول کرے یا عذاب الہی سے ڈر جائے دونوں نے عرض کیا کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت کرنے لگے ارشاد ہوا کہ تم اندیشہ نہ کرو کیونکہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا دیکھتا ہوں۔

تفسیری نکات

امور طبعیہ فطری چیز ہیں

امور طبعیہ فطریہ وہ چیزیں ہیں کہ انبیاء علیہم السلام جو سب سے زیادہ قوی القلب تھے ان پر بھی ان کا اثر ہوتا تھا قرآن پاک میں متعدد جگہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کو ارشاد فرمایا ہے ان میں صریح دلالت ہے کہ ایسی چیزوں سے انبیاء علیہم السلام بھی متاثر ہوتے تھے میں ان واقعات کو عرض کرتا ہوں حق

تعالیٰ فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے اذہبا الی فرعون انہ طغی فقولالہ
قولنا لعلہ یتذکر او یخشی دونوں عرض کرتے ہیں قال ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او ان
یطغی اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں قال لا تخفانا انی معکم اسمع واری اور سنئے موسیٰ علیہ السلام اژدہا
سے طبعاً ڈرے یہ واقعہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں والی عصاک فلما راها تھتز
کانہا جان ولی مدبراً ولم یعقب یموسیٰ لا تخف انی لا ینخاف لیدی المرسلون اور حق تعالیٰ
فرماتے ہیں یموسیٰ اقبل ولا تخف انک من الامنین ایک اور واقعہ قرآن پاک میں مذکور ہے جب
موسیٰ علیہ السلام حکم خداوندی سے عصا کو زمین پر ڈالتے ہیں تو وہ دوڑتا ہوا سانپ بن جاتا ہے اس پر حکم ہوتا ہے
خلعها ولا تخف سمعہا سیر تھا الا ولی پکڑو ڈرو نہیں اور ایک واقعہ مذکور ہے کہ جب جادو گروں نے
اپنا جادو شروع کیا اور سانپ بننے شروع ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خوف کے آثار پیدا ہونے لگے۔
خواہ خوف کا سبب کچھ ہی ہو جس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ قلنا لا تخف
انک انت الاعلیٰ غرض جو چیزیں ڈرنے کی ہیں ان سے ڈرو اور جو نہ ڈرنے کی ہیں ان سے مت ڈرو۔

اور بالکل خوف نہ ہونا نقص ہے فطری کمی ہے کمال یہی ہے کہ خوف بھی ہو اور قوت بھی ہو اور امور طبعیہ کا
اثر ہونے میں بڑی حکمتیں ہیں سب میں بڑی حکمت تو یہی ہے کہ انسان کو اپنا عجز اور ضعف معلوم ہو کہ شان
عبدیت کا استحضار رہتا ہے جو روح ہے تمام مجاہدات اور ریاضات کی ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ
علیہ زمانہ فذر میں شریک جنگ ہوئے اول مرتبہ جو بندوق چلی ثقات نے بیان کیا کہ بے ہوش ہو گئے اس کے
بعد تگوار لے کر خود لڑے سو یہ کوئی نقص کی بات نہیں طبعی بات ہے عقلی بات جو تھی وہ یہ کہ جنگ میں شرکت کی
اس میں خوف نہیں ہو اور دوسری مثال سنئے مثلاً حکم ہے کہ طاعون سے بھاگنا جائز نہیں آگے دو صورتیں ہیں ایک تو
طبعی خوف ہے اس سے اگر وحشت دہشت کے زوال کی تدابیر کرے یا جھلا ہو کر علاج کرے جائز ہے بلکہ
علاج کرنا ضروری ہے دوسرا عقلی خوف ہے وہ مذموم ہے کہ وہاں سے بھاگے امور طبعیہ کے وجود عدم کا مدار
ایمان یا کفر پر نہیں اس میں سب شریک ہیں۔

قَالَ فَمَنْ رَبُّكُمَا يُوسَىٰ ۖ قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ

تَمَهْدِي ۖ

ترجمہ: وہ کہنے لگا پھر (یہ بتلاؤ کہ) تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ، موسیٰ نے کہا کہ (ہمارا سب کا) رب وہ جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی۔ پھر راہنمائی فرمائیں۔

تفسیری نکات

فرعون کا روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے

اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ربنا اللہ اعطى كل شىء خلقه ثم ہدی یہاں بھی ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ کہ فمن ربكما کے بعد مقتضی ظاہر یہ تھا کہ یا موسیٰ وہاں کہا جاتا جب لمن ربكما میں دونوں کو خطاب کیا گیا ہے تو نداء میں بھی دونوں کو خطاب ہونا چاہیے مگر حق تعالیٰ نے صرف ”یا موسیٰ“ فرمایا ہے اس کی کیا وجہ یہ وہ باتیں ہیں کہ ان کا کشف ہونے لگے تو آدمی قرآن کے لفظ پڑھنے لگے لوگ ڈھولکی اور ستار پر کیا ناچتے ہیں واللہ قرآن کا لفظ لفظ نچا دینے والا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بتلا دیا گیا کہ فرعون کا اصل روئے سخن حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف تھا انہی کی طرف متوجہ ہو کر بات کر رہا تھا ہارون علیہ السلام سے جب آتا تھا کہ اصالتاً اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون نے موسیٰ کو تربیت کیا تھا۔

اس کے بعد فرعون نے یہ سوال کیا قال فما بال القرون الاولى کہ پہلے لوگوں کا کیا حال ہے (جو مرچکے ہیں) اس سوال کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام میں یہ حکم تھا ان العذاب على من كذب و تولى جس سے مقصود تکذیب پر وعید سنانا تھا۔ اس پر یہ سوال کیا کہ الوہیت و رسالت کے مکذبین بہت گزرے ہیں ان کی حالت عذاب میں کیا ہوئی قال علمها عند ربى كتاب لا يضل ربي ولا ينسى موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کا علم خدا ہی کے پاس ہے ایک کتاب میں ہے اس نے سب محفوظ کر رکھا ہے محض علم پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اتمام حجت کے لئے سب کو لکھ بھی دیا ہے میرے پروردگار کو غلطی اور بھول نہیں ہوتی پس لکھتا اس غرض سے نہیں ہے کہ یاد رہے بلکہ اور حکمتوں کی بنا پر ہے پس حالت تو ان کی علم الہی میں منضبط ہے۔ اب صرف انتظار وقت موعود آنے کا ہے اس وقت عذاب اکبر کا ظہور ہو جاوے گا آگے حق تعالیٰ کے کمال علم و حکمت کو چند واقعات مشاہدہ سے ثابت کیا ہے تاکہ ان کا قادر ہونا بھی ثابت ہو جاوے اور ایقاع و وعید کے لئے اسی علم و قدرت کی ضرورت ہے چنانچہ ارشاد ہے الذى جعل لكم الارض مهدا و سلك لكم فيها سبلا و النزل من السماء ماء جس نے زمین کو تمہارے لئے بستر بنایا (جو نہ بہت سخت ہے لوہے کے مانند جس پر لیٹنے بیٹھنے سے جسم کو تکلیف ہونہ بہت نرم ہے گارے کی مانند جس پر پاؤں دھنسنے لگے اور یہ کمال حکمت ہے) اور اس میں تمہارے لئے راستے چلا دیئے (اگر زمین بہت سخت یا بہت نرم ہوتی تو اس پر راستوں کے

نشانات یا تو قائم ہوتے یا باقی نہ رہتے تو چلنے کو پتہ نہ چلتا کہ اب راستہ کدھر کو ہے یہ بھی کمال حکمت ہے کہ زمین کو ایسا بنایا ہے جس پر مختلف راستے الگ الگ محفوظ رہتے ہیں (اور آسمان سے پانی اتارا (یہ بھی کمال حکمت پر مبنی ہے) اس کے بعد ارشاد ہے فاخرجنا به ازواجنا من نبات شتى كلوا وادعوا انعامكم ان لم يذلك لايات لاولى النهى پھر ہم نے پانی کے ذریعہ سے قسم قسم کی نباتات پیدا کیں ان میں سے خود بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ اس میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں کمال قدرت الہیہ غیر متناہیہ پر) یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر تو حق تعالیٰ کا ذکر غیبت کے مینگوں سے تھا یہاں تکلم کے ساتھ ہونے لگا۔ اہل ظاہر نے تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ انزل من السماء ماء حکم موسیٰ علیہ السلام کا کلام تھا انہوں نے تو بارش کے نازل ہونے پر گفتگو کو ختم کر دیا تھا حق تعالیٰ نے پیدائش نباتات کا ذکر تمہیں کلام کے لئے بڑھا دیا اور بتلادیا کہ پانی سے نباتات کا پیدا ہونا نہایت عجیب حکمت پر مبنی ہے اور بعض مغلوبین اہل حال نے کہا ہے کہ نہیں یہ بھی موسیٰ علیہ السلام ہی کا کلام ہے اس وقت ان پر وحدت الوجود کا غلبہ ہو گیا تو غائبانہ ذکر چھوڑ کر تکلم کے ساتھ فرمانے لگے کہ پھر ہم نے پانی سے نباتات کو نکالا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا ”فاخرجنا“ فرمانا ایسا ہی تھا جیسا کہ شجرہ طور نے کہا تھا انی انا اللہ رب العلمین یہ اہل حال بہت دور کی بات کہتے ہیں ان کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا طلبہ تو وہی جواب سمجھ لیں جو اہل ظاہر نے دیا ہے وہ اہل حال کی باتوں میں غور نہ کریں مگر ان پر انکار بھی نہ کریں (کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے وہ غلط ہی ہو) بہر حال چاہے موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہو یا حق تعالیٰ نے ان کے کلام کو پورا کیا ہو یہ مضمون اسی گفتگو کے متعلق ہے جو فرعون سے ہو رہی تھی اس لئے یہاں حق تعالیٰ نے مراقبہ ارض ہی کی تعلیم فرمائی کیونکہ فرعون نے ”مراقبہ ارض“ ہی کے قابل تھے مراقبہ سماء کے قابل نہ تھے۔ یہ بھی اس مقام پر ایک نکتہ ہے جس میں ہم پر بھی یہ چھینٹا ہے کہ تم فرعون اور اس کی قوم کی طرح غبی ہو اس لئے تم کو بھی مراقبہ ارض کی تعلیم کی جانی ہے (یہ تیسرا نکتہ ہے ۱۲) مگر حق تعالیٰ کے یہاں ایسے اضیاء کی بھی دوا موجود ہے وہ اذکیا کو مراقبہ سماء تعلیم فرماتے ہیں (جیسا کہ ایک مقام پر ارشاد ہے ویسفکرون فی خلق السموات والارض و قدم فیہ السموات لان المقام مقام مدح اولی الالباب ۱۲ جامع) اور اضیاء کو مراقبہ ارض بتلاتے ہیں وہ زمین ہی کا مراقبہ کر لیں تو ان کے دن بھلے ہو جائیں۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ۝

تفسیر: اور جادو گر کہیں جائے کامیاب نہیں ہوتا

تفسیری نکات

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ پَرِشَبْہ

ارشاد فرمایا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ میں شبہ ہوتا ہے کہ ساحر تو اکثر کامیاب ہوتا ہے پھر باوجود اس کے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ میرے نزدیک یہاں پر ایک قید محذوف ہے جو قصہ موسیٰ علیہ السلام و

ساحرین سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ولا یفلح الساحر فی معارضته المعجزة (یعنی ساحر معجزہ کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا) (الافاضات الیومینج ص ۳۰۴)

ایک شبہ کا حل

ارشاد فرمایا لا یفلح الساحر میں شبہ ہوتا ہے کہ ساحر تو اکثر کامیاب ہوتا ہے۔ پھر باوجود اس کے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ولا یفلح الساحر میرے نزدیک یہاں پر ایک قید محذوف ہے جو قصہ موسیٰ علیہ السلام و ساحرین سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ ولا یفلح الساحر فی معارضة المعجزة (ملفوظ نمبر ۴)

ساحران موسیٰ علیہ السلام کا ایمان کامل

ان نو مسلموں کو کہ فرعون نے جب ان کو یہ دھمکی دی ہے لا قطع من ایدیکم وارجلکم من خلاف ولا صلبکم فی جذوع النخل ولتعملن اینا اشد عذابا وابقی (میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر لٹکواؤں گا اور یہ بھی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم دونوں میں کس کا عذاب سخت ہے اور دیر پا ہے) تو انہوں نے نہایت دلیری سے جواب دیا قالوا ان نؤثرک علی ما جاءنا من البینات والذی فطرنا فاقض ما انت قاض الما تقضی هذه الحیوة الدنیا انا امننا بربنا لیغفر لنا خطایانا وما اکرهتنا علیہ من السحر واللہ خیر و ابقی الہ من یات ربہ مجرما فان له جہنم لا یموت فیہا ولا یموت فیہا ولا یموت فیہا ومن یاتہ مؤمنا قد عمل الصلحت فاولئک لهم الدرجات العلی یعنی ہم کو سولی یا پھانسی کا ڈر نہیں ہم تجھے خدا تعالیٰ پر اور اس کے احکام پر ہرگز ترجیح نہ دیں گے تجھ سے جو ہو سکے کر لے اور تو کر ہی کیا سکتا ہے صرف اس دنیوی زندگی کو ختم کر سکتا ہے اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے ہیں تاکہ ہمارے گناہ معاف فرمادیں خصوصاً گناہ سحر جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا تھا (اور اس ایمان و مغفرت سے حیات جاوید ہم کو حاصل ہوگی) اور اللہ تعالیٰ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے (اس کی عطا بے زوال ہے) جو شخص مجرم ہو کر اپنے رب کے پاس حاضر ہوگا سو اس کے لئے دوزخ ہے اس میں نہ مرے ہی گناہ جی ہی گا اور جو شخص اس کے پاس مومن ہو کر حاضر ہوگا جس نے نیک کام بھی کئے ہوں تو ایسوں کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں اور دوسری جگہ ساحران موسیٰ کا یہ جواب بھی مذکور ہے قالوا الاضیبر انا الی ربنا منقلبون (انہوں نے جواب دیا کہ کچھ حرج نہیں ہم اپنے مالک کے پاس جا پہنچیں گے) اس میں اہل لطائف نے کہا کہ انا الی ربنا منقلبون (ہم اپنے رب کے پاس پہنچ جائیں گے) علت ہے لاضیبر کی مطلب یہ ہے کہ ہم کو سولی وغیرہ سے کچھ ضرر نہیں کیونکہ ہم (اس کے بعد) اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جائیں گے جس کے پاس جانے کے ہم مشتاق ہیں مگر خود کشی حرام ہے اس لئے ہم خود تو جلدی سے خدا تعالیٰ کے پاس نہیں پہنچ

سکتے اچھا ہے تو ہی قتل کر کے ہمیں جلدی پہنچا دے سبحان اللہ ان لوگوں کا کیسا کامل ایمان تھا کہ مسلمان ہوتے ہی لقاء حق کے ایسے مشتاق ہو گئے اور حیات دنیا کی قدر ان کی نگاہ سے فوراً تر گئی صاحبو! یہ محبت اور شوق پیدا کرو اس سے ساری پریشانیاں دفع ہو جائیں گی۔ اس وقت میں اسی کا طریقہ بتلاتا ہوں اور اس سے زیادہ میں آپ سے کچھ نہیں کہتا۔ میں طاعات کو کہوں نہ ترک معاصی کو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک دن میں جنید بغدادی نہیں ہو سکتے۔

وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ

الْقِيَامَةِ أَعْمَى ﴿۵۲﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ﴿۵۱﴾

ترجمہ: اور جو شخص میری اس نصیحت سے اعراض کرے گا تو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے (قبر سے) اٹھائیں گے۔ وہ (تجربے سے) کہے گا کہ اے میرے رب آپ نے مجھ کو اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں تو (دنیا میں) آنکھوں والا تھا۔

تفسیری نکات

دنیا کی تمام اشیاء کا مقصود

اگرچہ اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے معیشتہ ضنکاً سے مراد یہ ہے کہ قبر میں اس کی حیات اخروی تنگ ہوگی لیکن معیشتہ کے لفظ سے متبادریہی ہے کہ دنیا ہی کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ بندہ گناہ کرنے سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے دوسرا جواب عقلی ہے اور اس کی اگرچہ بعد قرآن و حدیث کے ضرورت نہیں ہے لیکن ہم تبرعاً واقعات سے دکھلاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ رزق میں یہ غور کرنا چاہیے کہ کیا شے مطلوب ہے۔ جائیداد اگر مطلوب ہے تو کیوں ہے۔ ڈھیلے تو مطلوب ہیں نہیں۔ مکان طلب کیا جاتا ہے تو کیوں کیا جاتا ہے۔ اگر کہو کہ مطلوب جائیداد سے روٹی کپڑا اور مکان سے اس میں رہنا ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس مقصود کا بھی کوئی مقصود ہے یا کھانا پہننا بذاتہ مطلوب ہے اگر کھانا پہننا بذاتہ مطلوب ہوتا تو عاریت کے کپڑے اور عاریت کے گھر میں ایسا لطف کیوں نہیں آتا جیسا اپنے کپڑے پہننے اور اپنے مکان میں رہنے سے آتا ہے معلوم ہوا کہ نفس پہننا کھانا رہنا مقصود نہیں کوئی اور شے مطلوب ہے وہ کیا ہے وہ ہے لذت راحتِ حلاوت۔ چونکہ اپنا کپڑا پہننے میں اپنے مکان میں رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے اس لئے وہ مطلوب ہے۔

غرض دنیا کی تمام چیزوں سے مقصود جمعیت و سکون قلب ہے اب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جمعیت کسی ایسی شے میں نہیں جس کو راحت و سکون لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ سب عین پریشان ہے۔ چنانچہ الہ دنیا کو دیکھ لو کہ

رات دن ان کی ادھیڑ بن لگی رہتی ہے کسی وقت بھی آرام میسر نہیں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جمعیت و سکون حقیقی صرف حق تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے اگر شک ہو تو تین دن عی فرمانبرداری کر کے دیکھ لو یہ التزام کرو کہ تمام منہیات سے تین دن تک مجتنب رہیں گے پھر قلب کی پہلی حالت میں یقیناً فرق محسوس ہوگا۔

مَا هَذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ﴿۵۲﴾

تَمَثَّلًا : کیا یہ صورتیں ہیں جن پر تم جے بیٹھے ہو

تفسیری نکات

تصور شیخ کا مقصود

(۱) فرمایا کہ حضرت مولانا شہید تصور شیخ (۱) سے منع فرماتے تھے اور اس آیت سے استدلال فرماتے تھے۔
 ما هذه التماثيل التي انتم لها عاكفون (کیا یہ صورتیں ہیں جن پر تم جے بیٹھے ہو) (الانبياء آیت ۵۲)
 اس طرح سے کہ تماثل ذہنیہ صورت خارجہ سے زیادہ موجب اطمینان ہیں۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مستقل مغل قرار دیا ہے۔ بالخصوص مشائخ نقشبندیہ کے ہاں تو اس کا خاص اہتمام ہے۔ اس وقت اس میں مفاسد پیدا نہ ہوئے اس پر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بالمعنی نقل فرمایا کہ مانعین (۲) نے اعتماد ”اعلیٰ القرائن“ (منع کرنے والے) (۳) تفصیل نہیں کی (قرآن پر اعتماد کرے) اس لئے شبہ ہوا کہ جائز ذریعہ کیسے فرما دیا۔ تفصیل یہ ہے کہ اصل مقصود تصور حق تعالیٰ کا ہے۔
 اللہ تعالیٰ چونکہ مربی نہیں ہیں اس لئے جن لوگوں کی قوت فکر یہ ضعیف ہوتی ہے ان کو یہ تصور جتنا نہیں۔
 اس میں ان کے ذہن میں خیالات بہت آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یکسوئی حاصل کرنے کے واسطے تصور تجویز کیا گیا کیونکہ علاج بالضد ہوتا ہے یعنی خیال کے دفع کرنے کے لئے دوسرے خیال کو ذہن میں جمایا جائے گا خواہ وہ کوئی خیال ہو پس اگر خیالات مختلفہ کے دفع کرنے کے واسطے ہر دیکھی ہوئی چیز کا تصور کافی ہو سکے گی خیال جم سکے لیکن ان سب خیالات میں سے شیخ کا تصور ہے کہ وہ محبوب ہونے کی وجہ سے ذہن میں زیادہ جے گا۔ اور اس لئے دفع خیالات میں زیادہ مؤثر ہوگا تو وہ مقصود بالذات نہ ہو مقصود بالغیر ہو۔ اس لئے جب یہ غرض حاصل ہو جاوے تو شیخ کا تصور بھی دل سے نکال دے۔ اور صرف ذات حق کی طرف متوجہ ہو جاوے پھر احياناً اگر خیالات آ جاویں تو پھر شیخ کا تصور کر لے۔ جب خیالات دفع ہو جاویں پھر ذات حق کی طرف متوجہ ہو جاوے کیونکہ مقصود حقیقت یہی ہے۔ (الافاضات الیومینہ ج ۱ ص ۲۹-۳۰)

سُورَةُ الْأَنْبِيَاءِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا

وَكَانُوا لَنَا خَشِيعِينَ ۝

ترجمہ: وہ لوگ نیک کاموں میں مستعدی کرتے تھے اور ہم کو نہایت ہی شوق اور خوف سے پکارتے تھے اور ہم سے ڈرتے تھے۔

تفسیری نکات

علماء انبیاء کے وارث ہیں

اس کے قبل سے حق سبحانہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کا ذکر اور حسب ضرورت مقام کے خاص خاص اغراض کے لئے ان کے کچھ حالات بیان فرمائے ہیں ان حالات کے بعد ان حضرات کے مشترکہ اوصاف کو اس آیت میں ذکر فرمایا ہے۔

پس بیان آیت کا یہ ہے کہ اس میں اول حضرات انبیاء علیہم السلام کے علم کو بیان کیا گیا ہے جس کے برابر کسی کا علم بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے علم کامل کے لئے نبوت لازم ہے یا یوں کہئے کہ ایسا علم کامل نبوت کے لئے لازم ہے یا دونوں طرف سے ملازم مانا جائے بہر حال جو کچھ بھی کہا جائے اتنا قدر مشترک ماننا پڑتا ہے کہ نبوت اور کمال علم میں انفاک نہیں ہوتا تو باوجود علم کے اس کمال مرتبہ پر ہوں گے پھر بھی ان کی مدح کا مدار صرف اس علم کو قرار نہیں دیا۔

صرف کمال علمی مدح نہیں

بلکہ اس کے ساتھ انہم کانوا یسرعون فی الخیرات (یہ سب نیک کاموں میں دوڑتے ہیں) مجموعہ جزئین پر مدح کو ختم فرمایا جس کا حاصل یہ ہوا کہ کمال علمی بھی اگرچہ کمال ہے لیکن وہ کمال تمام اس وقت ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ عمل بھی مقرون ہو کیونکہ اگر عمل کو مدح میں داخل نہ مانا جائے اور صرف صفت علم پر مدح کو مقصود مانا جائے تو صفت علم کو معرض مدح میں ذکر کرنا ایک امر زائد ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ باعث مدح صرف کمال علمی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا کمال بھی ہے اور وہ کمال کمال علمی ہے جس کو اس مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔

اس آیت میں کئی قسم کے حکم بیان کئے گئے ہیں اور سب کا حاصل مشترک یہ ہے کہ اس میں شان عملی کو ذکر کیا گیا ہے۔

جس میں سے مختلف انواع کو ایک ایک جملہ میں بیان فرمایا ہے کہ ان کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں انہم کانوا یسرعون فی الخیرات کہ وہ لوگ مستعدی کرتے تھے نیک کاموں میں یہ ایک جملہ ہے جس میں ایک نوع عمل کو ذکر کیا ہے آگے ارشاد ہے ویدعوننا رغبا ورهبا یعنی ہم کو پکارتے تھے شوق سے اور خوف سے یہ دوسرا جملہ ہے جس میں دوسری نوع کا ذکر کیا گیا تیسرا جملہ ہے وکانوا انسا خشعین جس میں ایک خاص نوع عمل کا بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہر جملہ میں تینوں قسم عمل کے مجموعے کو مراد لیا جائے لیکن پھر بھی اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہر جملہ کو کسی ایک نوع سے زیادہ تعلق ہے یعنی عمل تین قسم کے ہوتے ہیں اعمال جوارح اعمال لسان۔ اعمال قلب مثلاً نماز ہاتھ پاؤں کے متعلق ہے ذکر اللہ زبان کے متعلق ہے خشوع قلب کے متعلق ہے تو ان انواع اعمال میں اگرچہ ہر جملہ کو سب ہی اقسام کے ساتھ ایک طرح کا تعلق ہے لیکن زیادہ تعلق ایک ایک جملہ کو ایک ہی عمل کے ساتھ ہے چنانچہ پہلا جملہ اور اعمال جوارح کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا جملہ عمل لسان کے ساتھ اور دوسرے جملے یعنی بدعوننا میں جو رغبا ورهبا کی قید ہے وہ تابع ہے لہذا اصل مقصود بالذکر بدعوننا ہی ہوا اگرچہ اس جملہ میں دوسرا احتمال بھی ہے کہ قید زیادہ مقصود ہو اور اسی بناء پر میں نے کہا تھا کہ ہر جملہ کو ہر نوع عمل کر کے بھی کہا جاسکتا ہے تیسرا جملہ اعمال قلب کے ساتھ متعلق ہے اور اسی پر ختم کر دیا گیا ہے پس اس جمع کرنے سے لازم آیا کہ عمل کی تینوں قسموں کے جمع کرنے سے عمل کا کمال ہوتا ہے اور اگر ایک جزو کی بھی کمی رہی تو عمل ناقص رہے گا۔

آج کل ہماری حالت تو یہ ہے کہ جوارح اور زبان و قلب اعمال صالحہ کی بجائے عاصی میں مبتلا ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں تینوں نوعوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ انبیاء جوارح کو بھی بچاتے تھے کہ یسرعون فی الخیرات ان کی حالت تھی اور زبان کو بھی معاصی سے روک کر اس کو طاعت میں لگاتے تھے۔ بدعوننا ان کی

شان تھی اور پھر ان کی دعاء بھی رغبت اور رہمت کے ساتھ تھی یعنی ظاہر یہ ہے کہ رغبت اور رہمت کو بطور شرط فرمایا اور مقصود بدعوہ و ندامت معلوم ہوتا ہے اگرچہ دوسری تفسیر بھی اس کی ممکن ہے جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ بھی کیا ہے لیکن مجھے اختیار ہے کہ میں اس تفسیر کو اختیار کر لوں اور قلب کو محاسنی سے پاک رکھتے تھے کہ ان میں خشوع پایا جاتا تھا۔

خشوع عمل قلب ہے

مجھے زیادہ تر اس وقت یہی بیان کرنا بھی ہے کہ یہ تیسرا جزو یعنی خشوع کہ عمل قلب ہے ہم میں بہت کم پایا جاتا ہے حالانکہ یہ ساری طاعت کا اس ہے مگر ہم لوگ اس کی ذرا فکر اور اہتمام نہیں کرتے اور ہماری اس حالت فقدان خشوع کی شکایت نہایت صاف لفظوں میں قرآن شریف میں بھی ہے فرماتے ہیں اللہ یمان للذین امنوا ان تخشع قلوبہم لذكر الله یعنی کیا مسلمانوں کے لئے ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب خشوع کرنے لگیں اور ظاہر ہے کہ شکایت اس امر کے ترک پر ہوتی ہے جس کا کرنا نہایت ضروری اور واجب ہو۔ تو معلوم ہوا کہ خشوع نہایت ضروری عمل ہے اور اس کا مقابل قساوت ہے چنانچہ ارشاد ہے المؤمن شرح الله صدره للإسلام فهو على نور من دبه فويل للقسية قلوبہم من ذكر الله الخ (بملا جس کا سینہ کھول دیا اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے سو وہ اچالے پر ہے اپنے رب کی طرف سے سو خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے قاسی ہیں) اور آگے فرماتے ہیں اللہ نزل احسن الحديث کتاباً متشابهاً مثانی تقشعر منه جلود الذین یخشون ربہم ثم تلین جلودہم و قلوبہم الی ذکر اللہ (اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی بہتر بات (یعنی کتاب جو کما آپس میں ملتی جلتی ہے دہرائی ہوئی ہے اس سے ان لوگوں کے روگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں) تو اس آیت میں قساوت کا مقابل لین ہونا فرمایا ہے اور لین وہی خشوع ہے تو معلوم ہوا کہ خشوع کا مقابل قساوت ہے۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا

وَارِدُونَ ۝ لَوْ كَانَ هَؤُلَاءِ إِلَهًا مَا وَّرَدُوهَا وَكُلٌّ فِيهَا

خَالِدُونَ ۝

ترجمہ: بلاشبہ تم (اے مشرکین) اور جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجو رہے ہو سب جہنم میں جمونگے جاؤ گے اور تم سب اس میں داخل ہو گے (اور یہ بات سمجھنے کی ہے کہ) اگر یہ (تمہارے معبود) واقعی معبود ہوتے تو اس (جہنم) میں کیوں جاتے اور سب (عابدین و معبودین) اس میں ہمیشہ ہمیشہ کورہیں گے۔

تفسیری نکات

شمس و قمر وغیرہ کے جہنم میں ڈالنے کا سبب

حدیث ہے ان الشمس والقمر یکور ان یوم القيمة فی جہنم (او کمال قال) آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی چیزوں کی اللہ کے سوا عبادت کی گئی ہے جیسے اصنام اور شمس و قمر وغیرہ وہ سب جہنم میں ڈالے جائیں گے اور حدیث میں شمس و قمر کی تصریح ہے اس پر بھی وہی سوال ہوتا ہے کہ ان چیزوں نے کیا تصور کیا جب میں بچہ تھا دیوبند میں پڑھتا تھا تو مجھے یاد ہے کہ اس مسئلہ میں دو مولویوں کے درمیان تقریباً دو گھنٹہ تک بحث رہی ایک کہتے تھے کہ ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ یہ جمادات ہیں دوسرے کہتے تھے کہ نہیں ان کو بھی عذاب ہوگا کیونکہ یہ سب شرک تھے۔

اس وقت تو میں کچھ نہ بولا کیونکہ بزرگوں کی بات میں دخل دینا خلاف ادب تھا۔ مگر اب بولتا ہوں کیونکہ شاید اس وقت میری ڈاڑھی کچھ ان سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے (یہ بطور لطیفہ کے فرمایا ۱۲) جو اب وہی ہے کہ ان اشیاء کا دخول جہنم تصور کی وجہ سے نہ ہوگا اور سب بلا قصد کوئی تصور نہیں ورنہ بات بہت دور تک پہنچے گی بلکہ ان کو کفار کی حسرت بڑھانے کے لئے جہنم میں بھیجا جائے گا تا کہ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر اپنی حماقت پر افسوس کرتے رہیں کہ ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا اور جہنم میں کسی کا ہونا ان کے معذب ہونے کو مستلزم نہیں۔

الکفر وما تعبدون من دون الله حصب جهنم انتم لها واردون لو كان هؤلاء الهة
ما وَّرَدُوهَا وَكُلٌّ فِيهَا خَالِدُونَ (سورہ الانبیاء آیت ۹۸)

اور حدیث میں ہے ان الشمس والقمر یکور ان یوم القيمة فی جہنم (او کمال قال) پر وارد ہوتا ہے کہ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی چیزوں کی اللہ کے سوا عبادت کی گئی ہے جیسے اصنام

اور ٹمس و قمر وغیرہ وہ سب جہنم میں ڈالے جائیں اور حدیث میں ٹمس و قمر کی تصریح ہے۔ اس پر بھی وہی سوال ہوتا ہے کہ ان چیزوں نے کیا قصور کیا۔ جب میں بچہ تھا دیوبند میں پڑھتا تھا تو مجھے یاد ہے کہ اس مسئلہ میں دو مولویوں کے درمیان تقریباً دو گھنٹہ تک بحث رہی۔ ایک کہتے تھے کہ ان کو عذاب نہ ہوگا کیونکہ یہ جمادات ہیں اور دوسرے کہتے تھے کہ نہیں ان کو بھی عذاب ہوگا کیونکہ یہ سب شرک تھے۔

اس وقت تو میں کچھ نہ بولا کیونکہ بزرگوں کی بات میں دخل دینا خلاف ادب تھا۔ مگر اب بولتا ہوں کیونکہ شاید اس وقت میری ڈاڑھی کچھ ان سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے (یہ بطور لطیفہ کے فرمایا ۱۲) جو اب وہی ہے کہ ان اشیاء کا دخول جہنم قصور کی وجہ سے نہ ہوگا اور سب بلا قصد کوئی قصور نہیں ورنہ بات بہت دور تک پہنچے گی۔ بلکہ ان کو کفار کی حسرت بڑھانے کے لئے جہنم میں بھیجا جائے گا تا کہ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر اپنی حماقت پر افسوس کرتے رہیں کہ ہم نے کن چیزوں کو معبود بنایا تھا اور جہنم میں کسی کا ہونا اس کے معذب ہونے کو مستلزم نہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ غرض عشاق اگر جہنم میں بھیج بھی دیئے جائیں تو ان کا دوزخ میں جانا اس طرح کا ہو گا۔ معذبین کی طرح نہ ہوگا۔ دیکھو جیل خانہ میں جانا ایک تو مجرم کا ہے اور ایک جیلر کا اور ایک ڈاکٹر کا جانا ہے جو مجرموں کی صحت کا معائنہ کرتا ہے۔ کیا سب کا جانا برابر ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ حیثیات کا فرق موجود ہے۔ گو بظاہر سب جیل خانہ ہی میں ہیں۔ مگر ڈاکٹر اور جیلر گورنمنٹ کے مقرب ہیں اور مجرم معتوب ہیں یہی فرق حیثیات دخول جہنم میں بھی کیوں نہیں مانتے۔ آخر معقول کس لئے پڑھی تھی کیا ماکول بنانے کے لئے پڑھی تھی۔ صاحب اس سے کام لو تو پھر کچھ بھی اشکال نہیں۔ اسی فرق حیثیات سے ایک اور اشکال رفع ہوتا وہ یہ کہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ رضا بالقضاء واجب ہے اور دوسرا مسئلہ ہے کہ خیر و شب سب قضاء و قدر کے تابع ہیں تو کفر بھی قضاء سے ہے اور تیسرا مسئلہ ہے کہ رضا بالکفر کفر ہے تو اب رضا بالقضاء کیونکر ہوا اگر ہر قضاء کے ساتھ رضا لازم ہے تو پھر کفر سے رضا لازم ہوگی حالانکہ رضا بالکفر کفر ہے اس کا ایک جواب تو علماء ظاہر نے دیا ہے کہ قضاء کے ساتھ تو رضا لازم ہے مگر مقضی کے ساتھ لازم نہیں اور کفر مقضی ہے قضاء نہیں تو رضا بالکفر اس لئے کفر ہے کہ اس میں رضا بالمقضی ہے اور رضا بالمقضی مطلقاً واجب بلکہ جائز بھی نہیں بلکہ اگر مقضی خیر ہے تو رضا واجب ہے اور اگر شر ہے تو جائز نہیں مگر اس جواب میں بہت تکلف ہے۔ عارفین نے اس سے بڑھ کر یہ کہا کہ رضا بالکفر میں حیثیات کا فرق ہے یعنی ایک حیثیت تو کفر میں صدور عن العبد کی ہے اور اس درجہ میں یہ شر محض ہے اور اسی درجہ میں اس پر رضا کفر ہے اور ایک حیثیت مخلوقیہ للمحقق کی ہے یعنی وہ حق تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس درجہ میں وہ حکمتوں کو متضمن ہے اور اسی درجہ میں اس پر رضا واجب ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مکسوب للعبد ہونے کی حیثیت سے اس پر رضا جائز نہیں اور مخلوق للمحقق ہونے کی حیثیت سے اس پر رضا واجب ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں

گر بما نسبت کنی کفر آفت است

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست

کفر اس کی مخلوق ہونے کی بناء پر سراسر حکمت ہے اور کفر بندے سے سرزد ہونے کی بناء پر سراسر آفت ہے۔
اور عارف فرماتے ہیں

درکار خانہ عشق از کفر ناگزیر است آتش کرہ بسوزد مگر بولہب نباشد
دنیا میں کفر کا ہونا بھی ضروری ہے اگر کوڑا کرکٹ نہ ہو تو آگ کس طرح روشن ہوگا اگر بولہب جیسے کافر نہ
ہوتے تو آگ کسے جلاتی۔

یعنی حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے کفر میں بھی حکمتیں ہیں کہ اس سے صفت قہر و جلال
اسم منتقم کا ظہور ہوتا ہے۔ نیز اس سے مسلمان اور مؤمنین کی رفعت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اضمداد ہی سے اشیاء کا
ظہور کامل ہوتا ہے نیز اس سے کارخانہ دنیا کی رونق اور ترقی ہے کیونکہ دنیا میں پوری ترقی کافر ہی کر سکتا ہے
جس کو آخرت کی تجھ کو بھی فکر نہیں۔ مسلمان چونکہ آخرت کی فکر میں رہتا ہے وہ دنیا میں پوری طرح منہمک نہیں
ہو سکتا۔ پھر یہ ریل کار قسم قسم کی نئی ایجادیں کیونکر ظاہر ہوتیں تو خدا تعالیٰ نے جو کفر کو پیدا کیا اس میں بہت
حکمتیں ہوئیں اور بندہ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے کفر میں کوئی حکمت نہیں کیونکہ جو شخص کفر کر رہا
ہے اس کا اپنے کفر سے کیا نفع ہے کچھ بھی نہیں بلکہ اس کا تو ضرر ہی ضرر ہے گو اس کے ضرر سے مجموعہ عالم کا نفع
ہے مگر خاص اس کا تو سراپا ضرر ہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا باغی ہو گیا۔ پس کفر اس حیثیت سے کہ خدا کا پیدا کیا ہوا
ہے اس کے ساتھ رضا لازم چنانچہ اگر کوئی یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر کو کیوں پیدا کیا یہ پیدا کرنا برا ہوا یہ کفر
ہے اور اس حیثیت سے کہ یہ بندہ کا فعل ہے اس کے ساتھ رضا کفر ہے مثلاً کوئی یہ کہے کہ بہت اچھا ہوا کہ فلاں
کافر ہو گیا تو یہ کفر ہے خوب سمجھ لو۔ (الوصل والفصل بالحقہ مواضع تسلیم ورضا ص ۳۲۲-۳۲۱)

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا

عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: اور ہم (سب آسمانی) کتابوں میں لوح محفوظ میں لکھنے کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین
(جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہیں۔

تفسیری نکات

ارض جنت

یہ وہ بات ہے جو میں نے دہلی کے ایک جلسہ میں ایک عالم کے جواب میں بیان کی تھی اور یہ وہ وقت تھا جبکہ
یونان نے ترکی حکومت کو شکست دے کر اڈریا نوپل وغیرہ فتح کر لئے تھے جس سے بعض ضعیف الاعتقاد مسلمانوں

کے دلوں میں اضطراب اور تزلزل آ گیا تھا اور ملاحظہ تو بر ملا کہنے لگے تھے کہ خدا بھی نصرانیت کا حامی ہے اسلام اور مسلمانوں کا حامی نہیں۔ اس پر وہابی کے بعض مخلصین نے مجھے بلایا کہ یہاں بیان کی سخت ضرورت ہے تاکہ اس قسم کے شبہات کا ازالہ کیا جائے چنانچہ میں گیا اور اس موضوع پر بیان ہوا جس میں اسی قسم کے شکوک و شبہات کا بہت خوبی کے ساتھ بجز اللہ ازالہ کر دیا گیا اور خاتمہ بیان پر بطور اتمام حجت کے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اب بھی کسی کے ذہن میں کچھ شبہ اور دوسرے ہو تو ظاہر کر دے۔ ایسا نہ ہو کہ میرے جانے کے بعد یوں کہا جائے کہ یہ بات من جانب اللہ اتمام حجت کے لئے میری زبان سے نکل گئی تھی۔ ورنہ میں اس قابل نہ تھا کہ اس طرح تحدی کے ساتھ اعلان کرتا۔ اس پر ایک پنجابی عالم کھڑے ہوئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ اس زمین کے وارث و مالک میرے نیک بندے ہوں گے) پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے مالک کفار ہو گئے ہیں نے کہا مولانا آپ تو عالم ہیں ذرا یہ تو دیکھئے کہ یہ قضیہ دائمہ ہے یا مطلقہ ہے چونکہ وہ عالم تھے اتنی ہی بات سے سمجھ گئے اور کہا بس بس میں سمجھ گیا۔ اب کچھ شبہ نہیں رہا حاصل جواب کا یہ ہوا کہ آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ زمین کے مالک ہمیشہ نیک ہی بندے ہوں گے کفار کبھی مالک نہ ہوں گے بلکہ اس میں اطلاق کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے اور اطلاق کے صدق کے لئے ایک بار وقوع کافی ہے۔ چنانچہ بجز اللہ حضرات صحابہ روئے زمین کے مالک بن چکے ہیں زمانہ عروج اسلام میں کوئی سلطنت مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ رکھتی تھی اور یہ جواب اس تقدیر پر ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ آیت میں ان الارض سے مراد یہی دنیا کی زمین ہے ورنہ ظاہر آیت کے سیاق و سباق سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ارض جنت ہے۔ جنت کی زمین کے مالک نیک بندے ہوں گے۔ اس پر کچھ بھی اشکال نہیں خوب سمجھ لو۔

فرمایا کہ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ سے جو نصرت عباد صالحین معلوم ہوتی ہے وہ کسی دلیل سے دوائی نہیں ہے بلکہ اگر ایک بار بھی اس کا وقوع ہو گیا پیشین گوئی صادر ہوگئی اور یہ پیشین گوئی زبور میں امت محمدیہ کی نسبت ہے۔

جاہ کیلئے خواہش سلطنت مذموم ہے

احکام کی پابندی کے اختیار کئے ہوئے حکومت یا سلطنت کا حاصل کرنا ایسا ہے جیسے بلا وضو کے نماز پڑھنا یا بدوں منتر جانے ہوئے سانپ پکڑنا جس کا انجام ہلاکت ہے اور اگر بالفرض چندے یہاں حکومت کر بھی لی تو آخرت کی زندگی تو برباد ہو جائے گی اصل چیز تو وہی ہے جس کے لئے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی اور وہ ایمان اور اعمال صالحہ ہیں ایمان کی حفاظت کرو اور اعمال صالحہ اختیار کرو پھر اس پر خوشخبری ہے بشارت ہے جس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان الارض یورثها عباد الصالحون (اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے) یہ بیان تو ان کے لئے تھا جو جاہ کے لئے حکومت اور سلطنت کے خواہاں اور جو یاں ہیں باقی المل اللہ اور

خاصان حق جن کو تم نظر تحقیر سے دیکھتے ہو کہ وہ خستہ حالت میں ہیں میلے کھیلے ہیں بے سرو سامانی ان کی رفیق ہے وہ ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتے گو بضرورت سلطنت بھی حاصل کر لیں اور ان میں بھی کوشش کریں کہ اپنے کو اس سے علیحدہ رکھ کر دوسرے کے سپرد کر دیں اور اگر بادل نخواستہ ان کے ذمہ پڑ جاوے تو پھر اس کے پورے حقوق ادا کریں۔ میں بقسم عرض کرتا ہوں کہ یہی حضرات کچھ ساٹھ لیجانیا لے ہیں تم نے جن سامانوں کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے وہ تم ہی کو مبارک ہوں وہ تو ان سامانوں کو حجاب اور وبال جان خیال کرتے ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب باہان ارمنی کے دربار میں اپنے اسیروں کو چھڑانے کیلئے تشریف لے گئے تو آپ نے دربار کا فرش دیا اور حریر کا اٹھا کر پھینک دیا اور اس کے سوال پر جواب میں فرمایا کہ تیرے فرش سے ہمارے اللہ کا فرش افضل ہے۔ حضرت بشرحانی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ مشہور ہے کہ جب آپ نے یہ آیت قرآن پاک کی سنی ”والادض فرسہا“ (اور ہم نے زمین کو فرش بنایا ہے) اسی وقت اپنے پاؤں سے جوتے نکال کر پھینک دیئے کہ خدا کے فرش پر جوتے پہن کر چلنا خلاف ادب ہے (یہ غلبہ ہے حال کا جو خوبی ہے مگر حجت نہیں) اب سنیجے کہ تمام چرند پرند کو حکم ہو گیا جس جس طرف بشرحانی کا گزر ہو کوئی بیٹ نہ کرنے پاویں۔ غرض ہماری عزت اس ظاہری سامان سے تھوڑی ہی ہے۔ اگر عزت ہے تو بے سرو سامانی ہی میں ہے جو عبدیت سے مسبب ہو اسی کو فرماتے ہیں۔

زیر بارند درخشاں کہ ثمر ہادارند اے خوشامرو کہ از بند غم آزاد آمد

ولقریباں نباتی ہمہ زیور بستند دلبر ماست کہ باحسن خداداد آمد

(پھل دار درخت زیر بار رہتے ہیں مبارک ہو سرو کہ کہ وہ تمام غموں سے آزاد ہے حسینان جہاں کو بناؤ سنگھار کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے محبوب کو جس خداداد حاصل ہے)

حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بادشاہ سخر نے ایک مرتبہ لکھ کر بھیجا معلوم ہوا کہ حضرت کے خدمت میں اکثر مجمع خدام کا رہتا ہے اگر اجازت ہو تو ایک ملک کا خدام کے لئے حضرت کی خدمت میں پیش کر دوں حضرت نے جواب میں بھیجا۔

چوں چتر سخری رخ ششم سیاہ باد دردل اگر بود ہوس ملک سخرم

زانکہ کہ یا فتم خبر از ملک نیم شب من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

(اگر میرے دل میں ملک سخر کی ہوس ہو تو جس طرح سخر کا چتر سیاہ ہے میرا نصیب بھی سیاہ ہو اور جس وقت سے ملک نیم شب (یعنی عبادت نیم شب) کی مجھے خبر ہوئی ہے میں تو ملک نیم روز کو ایک جو کے بدلے میں بھی نہ خریدوں)

ایک بزرگ کو کسی بادشاہ نے لکھا تھا کہ ہم مرغ کھاتے ہیں اور تم خشک روٹی ہم دیا اور حریر پہنتے ہیں اور تم گدڑی اوڑھتے ہو تم بڑی مصیبت میں اور تکلیف میں ہو تم ہمارے پاس آ جاؤ ہم تمہاری خدمت کریں گے

اور یہاں پر تم کو کوئی تکلیف نہ ہوگی ان بزرگ نے جواب میں لکھا۔

خوردن تو مرغ مسی دے طعمہ مانا تک جوین ما

پوشش تو اطلس و دیبا حریر بخیہ زوہ خرقہ پشلمین سا

اور آخر میں فرمایا:

نیک ہمیں است کہ سے بگذرد

باش کہ تا طبل قیامت زند

راحت تو محنت دو شین ما

آن تو نیک آید و یارین ما

(الافاضات الیومیہ ص ۲۸ ج ۵)

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: اور ہم نے (ایسے مضامین نافعہ دے کر) آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں کے لئے (مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لئے

تفسیری نکات

شان رحمت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

وما ارسلناک الا رحمة للعالمین میں تو یہی امر محل سوال ہے کہ عالمین سے مراد کیا ہے اور عالمین کے لئے رحمت ہونے کا کیا مطلب ہے۔ مشہور یہ ہے کہ عالمین اپنے عموم پر ہے اور اس عموم میں کفار بھی داخل ہوں گے اور چونکہ آیت میں کوئی تحدید و توقیت نہیں ہے تو لازم آئے گا کہ کفار کے لئے دنیا و آخرت دونوں میں سب رحمت ہیں اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ کفار پر آخرت میں آپ کی رحمت کس طرح ظاہر ہوگی۔

بعض علماء نے جواب دیا کہ اگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نہ ہوتا تو کفار کو آخرت میں اب سے زیادہ عذاب ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اس میں کچھ کمی تجویز کی گئی ہے مگر میرے دل کو یہ جواب نہیں لگتا کیونکہ اس دعوے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو عذاب زیادہ تجویز کیا جاتا۔ دوسرے جہنم کا عذاب قلیل بھی ایسا شدید ہے کہ ہر شخص یوں سمجھے گا کہ میں سب سے زیادہ عذاب میں ہوں۔ تو اس قلت سے ان کو نفع کیا ہوا۔

میرے ذہن میں جو اس کا جواب آیا ہے وہ یہ ہے کہ عالمین سے مراد تو معنی عام ہی ہیں۔ مگر رحمت سے مراد خاص وہ رحمت ہے جس کا تعلق ارسال سے ہے یعنی رحمت فی الدنیا۔ کیونکہ ارسال دنیا ہی کے ساتھ خاص

ہے آخرت سے اس کو کوئی علاقہ نہیں اور دنیا میں جو آپ کی رحمت مومنین و کفار سب کو عام ہے وہ رحمت ہدایت و ایضاح حق ہے چنانچہ قرینہ مقام اسی پر دلالت کر رہا ہے اس لئے کہ پہلے تبلیغ ہی کا ذکر ہے۔

ان فی هذا البلاغاً اس میں کافی مضمون ہیں

لقوم عابدين ایسے لوگوں کے لئے جو بندگی کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ پھر اس میں آپ کی تخصیص کیا ہے۔ ہدایت ایضاح حق میں تو تمام انبیاء آپ کے شریک ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تخصیص محض رحمت کے اعتبار سے نہیں بلکہ مجموعہ رحمة للعالمین کے اعتبار سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالمین سے مراد تمام مکلفین کے لئے ہادی بن کر آپ ہی مبعوث ہوئے ہیں اور عالمین کے لئے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وما ارسلناک الا رحمة للعالمین یعنی نہیں بھیجا ہم نے آپ کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مگر جہانوں کی رحمت کے واسطے۔ دیکھئے عالمین میں کوئی تخصیص انسان یا غیر انسان یا مسلمان یا غیر مسلمان کی نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود ہر شے کے لئے بار رحمت ہے۔ خواہ وہ جنس بشر سے ہو یا غیر جنس بشر سے اور خواہ حضور سیزمانہ متاخر ہو یا مقدم۔

متاخرین کے لئے رحمت ہونا تو بعید نہیں لیکن پہلوں پر رحمت ہونے کے لئے بھی حضور کا ایک وجود سب سے پہلے پیدا فرمایا اور وہ وجود نور کا ہے کہ حضور اپنے وجود نوری سے سب سے پہلے مخلوق ہوئے ہیں اور عالم ارواح میں اس نور کی تکمیل و تربیت ہوتی رہی آخر زمانہ میں اس امت کی خوش قسمتی سے اس نور نے جسد عنصری میں جلوہ گر و تاباں ہو کر تمام عالم کو منور فرمایا۔ پس حضور اولاً آخراً تمام عالم کے لئے باعث رحمت ہیں۔ پس حضور کا وجود تمام نعمتوں کی اصل ہونا عقلاً و نقلاً ثابت ہوا تو ایسا کون مسلمان ہوگا کہ جو حضور کے وجود باوجود پر خوش نہ ہو یا شکر نہ کرے۔

سُورَةُ الْحَكِّ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمُرْتَضَىٰ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ

وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ

ترجمہ: اے مخاطب کیا تجھ کو عقل سے یا مشاہدہ سے یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی اپنی حالت کے مناسب سب عاجزی کرتے ہیں جو کہ آسمانوں میں ہیں اور جو کہ زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے (تو) آدمی بھی۔

تفسیری نکات

ارض وسموات، شمس و قمر وغیرہ سب مطیع ہیں

الم تر ان الله يسجد له من في السموات و من في الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب وكثير من الناس اكران سے عصيان ہوتا ہے جس کے کہ اس قول میں ان کی طرف بھی نسبت ہے اور یہ مکلف ہیں اس لئے ضرور تھا کہ یہ معذب بھی ہوں مگر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عصيان نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے سموات وارض وشمس وقمر ودواب سب کے متعلق بلا استثناء کے يسجد له فرمایا ہے اور ناس کے لئے کثیر کی قید بڑھائی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس میں تو بعض مطیع اور بعض عاصی ہیں مگر اور مخلوقات میں سب مطیع ہیں اور آیت میں ناس سے مراد انس و جن دونوں ہیں کیونکہ ناس کا ترجمہ ہے لوگ جن کو بھی کہتے ہیں مگر ایک طالب علم تھے وہ جانوروں کو بھی لوگ کہا کرتے تھے ایک دفعہ کہنے لگے

کہ بندر لوگ بڑے شریر ہیں مگر محاورہ میں لوگ صرف انس و جن کو کہتے ہیں غرض انس و جن میں تو دو قسمیں ہیں بعض فرمانبردار بعض نافرمان اور جو ان کے سوا ہیں وہ سب فرمانبردار ہیں لہذا شمس و قمر کا غیر معذب ہونا واضح ہو گیا اس کے خلاف کا احتمال ہی نہیں گو طالب علمی کے زمانہ میں ایک شخص مجھ سے جھگڑ رہے تھے کہ یہ بھی معذب ہوں گے اور سب یہ بتلاتے تھے جو چیزیں سبب معصیت ہوئی ہیں وہ بھی معذب ہونی چاہئیں۔

جواب اس کا یہ ہے کہ سبب معصیت ہونا جو بلا اختیار ہو وہ معذب ہونے کو مستلزم ہے نہ وہ جو کہ سبب بلا اختیار ہو چنانچہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ سبب بلا اختیار معصیت نہیں ہے۔ فقہاء اور صوفیہ ہی شریعت کو خوب سمجھنے والے ہیں ان ہی دونوں گروہ نے شریعت کے اسرار کو خوب سمجھا ہے گو بعض فقہاء اور صوفیہ میں لڑائی بھی رہی ہے مگر جو حضرات جامع شریعت و طریقت ہوئے ہیں وہ کبھی نہیں لڑے شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ محقق وہ ہے جس میں تین وصف ہوں۔ فقہیہ ہو محدث ہو صوفی ہو محققین میں لڑائی نہیں ہوتی ہاں غیر محققین میں ہوتی ہے۔

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

غرض فقہاء نے یہ مسئلہ سمجھا ہے کہ مطلق سبب بنا معصیت نہیں اس لئے جو چیزیں بلا اختیار سبب معصیت ہوئی ہیں وہ معذب نہ ہوں گی۔

صورة تعذیب

البتہ اس میں کلام ہے کہ شمس و قمر آیا اپنی جگہ رہ کر جہنم میں ہوں گے یا ان کی اپنی جگہ سے ہٹا کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔ جمہور کی رائے ہے کہ دونوں کو ہٹا کر جہنم میں ڈالا جاوے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم بھی بہت بڑی ہے اس لئے کہ یہ اجرام یعنی شمس و قمر کوئی چھوٹی سی چیز نہیں ہے شمس زمین سے ہزاروں حصہ بڑا ہے ایسے ہی قمر کو سمجھنا چاہیے بایں ہمہ مثل گولے کے جہنم میں پھینک دیئے جاویں گے مگر شیخ اکبر کا کشف ہے کہ شمس و قمر اپنی جگہ رہیں گے اور جہنم میں بھی ہوں گے اور وہ اس طرح کہ جہنم کو ان کی مستقر تک بلکہ اس سے بھی آگے بسط دیا جاوے گا یعنی جہنم کی آگ میں بسط ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی ہانڈی ڈھکی ہوئی پک رہی ہو اور پھر اس کو کھول دیا جاوے تو اس کی گرمی پھیل جاتی ہے اسی طرح جب جہنم کو کھول دیا جاوے گا تو اس کی حرارت پھیل جاوے گی جس سے سمندر و ہوا سب آگ بن جاویں گے حتیٰ کہ آسمان تک حرارت پہنچے گی جو آفتاب و قمر کو بھی محیط ہو جاوے گی اور آفتاب و قمر دونوں اس میں داخل ہوں گے یہ صورت ہوگی شمس و قمر کے اپنی جگہ رہنے کی اور جہنم میں بھی ہونے کی اور پھر جہنم کی آگ متجاوز ہو کر ساتویں آسمان کے مقعر تک پہنچے گی اور وہاں بہت ہی لطیف ہو جائے گی کہ اس کی لطافت میں لذت ہوگی اور جنت کے میوے اسی لطیف گرمی سے پکیں گے اور جنت ساتویں آسمان کے محدب پر ہوگی اس کشف کی قرآن و حدیث نہ تائید ہی کرتا ہے اور نہ تکذیب ہی کرتا ہے

کشفیات میں ہم شیخ اکبر کے تابع نہیں ہیں لیکن اگر کوئی اس کا قائل بھی ہو مگر جزا نہیں تو کچھ حرج بھی نہیں کیونکہ جیسے تائید نہیں ویسے تکذیب بھی نہیں یہ فائدہ کے طور پر بیان کر دیا۔ بہر حال یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کہ کوئی جہنم میں ہو اور معذب نہ ہو تو اس بناء پر ممکن تھا کہ اہل جنت دوزخ میں بھیج دیئے جاتے اور معذب نہ ہوتے مگر حق تعالیٰ کی رحمت کو دیکھئے یہ احادیث میں آتا ہے کہ جب جنت میں اہل جنت داخل ہو چکیں گے پھر اس میں جگہ باقی رہ جاوے گی تو حق سبحانہ تعالیٰ ایک مخلوق کو پیدا کریں گے کہ وہ اس میں رہا کرے گی اسی طرح جب جہنم باوجود اہل جہنم کے داخل ہونے کے ہل من مزید کہتی رہے گی اس کے لئے حق تعالیٰ یہ نہ کریں گے کہ کسی مخلوق کو پیدا کر کے اس میں داخل کریں اور اس کا پیٹ بھر دیں گو وہ باوجود جہنم میں ہونے کے معذب بھی نہ ہوتے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ بلاوجہ عذاب کی صورت کو بھی گوارا نہیں فرماتے کہ کسی کو پیدا کر کے اس میں صورۃ بھی داخل فرمائیں یہ عین رحمت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ دوزخ کے پکارتے رہنے پر حق تعالیٰ اپنا قدم اس پر رکھ دیں گے تو وہ کہے گی بس بس اس حدیث کے معنی اول تو واللہ اعلم کہلائیں گے اور اگر کوئی بات بھی سمجھ میں آوے مگر وہ بات مجلس عام میں کہنے کے قابل نہیں اسلم طریق یہی ہے۔

وَمَنْ يُرِدْ فِيهِ بِالْحَادِ يُظْلِمِ نَفْسَهُ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ

ترجمہ: اور جو شخص اس میں (یعنی حرم میں) کوئی خلاف دین کام (قصداً کفر و شرک) کرے گا تو ہم دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

تفسیری نکات

جس طرح مکہ میں طاعات کا ثواب اور مقامات سے زیادہ ہوتا ہے اسی طرح معاصی کا گناہ بھی اور جگہ سے زیادہ ہوتا ہے۔

مفسرین نے ومن يرد فيه بالحاد بظلم نفسه من عذاب اليم

مکہ میں معاصی کا گناہ اور مقامات سے زیادہ ہے

کی تفسیر میں بیان فرمایا ہے کہ مکہ میں نیت معصیت پر بھی کامل مواخذہ ہوتا ہے اس لئے حاجی صاحب ہر شخص کو ہجرت کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آپ دو قسم کے لوگوں کو ہجرت سے منع کرتے تھے ایک تو کٹے دنیا داروں کو۔ کیونکہ یہ لوگ مکہ کے حقوق کیا ادا کریں گے۔

دوسرے علماء اور مقتداؤں کو علماء کو اس لئے روکتے تھے کہ ان کی ہجرت سے ہندوستان تو بم پلیس ہو جائے گا۔ اگر سارے علماء مکہ چلے جائیں گے تو ہندوستان میں فیض کون پہنچائے گا۔ اس لئے گوان کا دل مکہ

جانے کو کتنا ہی چاہے اور یہ وہاں کے حقوق بھی ادا کر سکیں۔ مگر ان کو ہندوستان ہی میں رہنا ضروری ہے بس قید خانہ ہی میں رہیں اور تڑپتے رہیں۔ ان کی یہی ہجرت ہے ان کو ہجرت کر کے مکہ جانا جائز نہیں جبکہ یہ اندیشہ ہو کہ ہمارے جانے سے یہاں دین کا کام تھل ہو جائے گا۔ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کسی وقت جہاد کا موقعہ ہو تو عالم بلد کو جس کے سوا شہر میں کوئی عالم محقق نہ ہو۔ جہاد میں شرکت جائز نہیں اس کو اپنے گھر ہی پر رہنا چاہیے۔ آج کل لوگ تحریکات کو لئے پھرتے ہیں اور حدود کو نہیں دیکھتے۔

صاحبو! یہاں تو ہر کام کے لئے حدود ہیں۔ چنانچہ جہاد ہجرت کی ہر ایک کو اجازت نہیں۔ بلکہ اس کے لئے بھی حدود ہیں اگر یہ حدود نہ ہوتے اور ان اہل تحریکات کی طرح شریعت بھی بے اصولی سے کام لیتی تو نہ معلوم یہ دین کب کا فنا ہو گیا ہوتا۔ مگر شریعت کے قربان جائیے کہ اس نے ہر کام کے لئے حدود مقرر کر دی ہیں۔

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ

يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۗ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ

وَيَذْكُرُوا أَنَّمَا وَعَدَ اللَّهُ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ

بُحْمَةٍ ۗ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا أَمْرَ الْفَقِيرِ ۗ

ترجمہ: اور (ابراہیم علیہ السلام سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے پیدل بھی دہلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے دینی و دنیوی فوائد کے آ موجود ہوں اور اس لئے آئیں گے تاکہ ایام مقررہ (ایام قربانی) میں ان مخصوص چوپایوں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیں پس ان جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو اور محتاج کو بھی کھلایا کرو۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کا ایک بڑا انعام

اول ترجمہ و تفسیر کیا جاتا ہے اس کے بعد عام اجراء فضیلت پر اس کا انطباق بیان کر دیا جاوے گا حق تعالیٰ کا ارشاد ہے واذن فی الناس بالحج اس میں ابراہیم علیہ السلام کو خطاب ہے ارشاد ہے کہ اے ابراہیم

لوگوں میں پکاروجج کے واسطے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فرمان کی اس طرح تعمیل کی کہ پہاڑ پر کھڑے ہو کر پکارا کہ اے لوگو تمہارے رب نے ایک گھر بنایا ہے اس کا حج کرو حدیث میں آیا ہے کہ اس آواز کو تمام آسمان کے لوگوں نے سنا۔ بزرگوں نے کہا کہ جس نے خود یا اس کی روح نے لبیک کہا اس کو حج نصیب ہوتا اور جس نے نہیں کہا وہ نہیں جاتا آگے ارشاد ہے یاتوک رجالات و علی کل ضامر یعنی اس آواز دینے اور پکارنے کا اثر یہ ہوگا کہ لوگ تمہارے پاس پیادہ اور ہر دہلی سواری پر آویں گے مطلب یہ ہے کہ بڑی بڑی دور سے آویں گے کہ آتے آتے جانور سواری کے دبلے ہو جاویں گے یاتین من کل فج عمیق آویں گی وہ سواریاں ہر راستہ دور دراز سے ایک حکایت یاد آئی کہ بوستان میں جو ہے حوالیہ من کل فج عمیق ایک میاں نے اس کا ترجمہ یہ بتلایا تھا کہ خانہ کعبہ کے گرد بڑی بڑی کھائیاں ہیں لیشہد وامنافع لہم تاکہ حاضر ہوں وہ اپنے منافع پر یعنی یہاں آکر ان کو کچھ منافع ہوں گے اور وہ منافع عام ہیں خواہ اخروی ہوں کہ ثواب ہوتا ہے اور یا دنیوی کہ حج کے اندر لوگ جمع ہوتے ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں اور بہت سے منافع دنیویہ اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی مارذقہم من بہیمۃ الانعام یعنی یہاں آنے پر دو غایتیں مرتب ہوں گی ایک تو منافع اخرویہ اور دنیویہ جس کا بیان لیشہدوا منافع لہم میں ہے اور دوسری یہ کہ اللہ کا نام ذکر کریں۔ چند ایام معلومہ میں ان اہلی جانوروں پر جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر پس ان سے تم بھی کھاؤ اور تنگ دست فقیر کو بھی کھلاؤ ہر چند کہ یہاں ذکر حج کا ہے لیکن قربانی جس کے متعلق یہ آیتیں ہیں یہ تو عمل مشترک ہے اس لئے ان آیتوں سے مطلق قربانی کی فضیلت بھی مستنبط ہو سکتی ہے بہر حال یہ تو تفسیر تھی ان آیتوں کی اب وجوہ فضیلت کا استنباط سنئے علی مارذقہم من بہیمۃ الانعام میں اشارہ ہے اس عمل کی حقیقت جسیہ و نوعیہ کی طرف اس لئے کہ جانور بدوں مال کے خرچ کئے ہوئے نہیں آتا اور ان پر اللہ کا نام لینے سے مراد ذبح کرنا ہے کہ جو اشارہ ہے حقیقت نوعیہ کی طرف فی ایام معلومات سے اس زمانہ کی فضیلت ثابت ہوئی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جانے پہچانے دن فرمایا لیشہدوا منافع لہم سے مکان کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ حاضر ہونا مکان میں ہوتا ہے مشہود مکان ہونا اور شاہد زمان اس میں مشہور مکان کو مشہود منافع سے تعبیر فرمایا ہے رہا بانی کا ذکر وہ اذن فی الناس میں ہے غایت کا ذکر لیشہدوا منافع لہم میں ہے کہ جو حضمین ہے نفع دنیوی و نفع اخروی کو اور علی مارذقہم سے اشارہ اس طرف ہے کہ باوجود ذبح ہونے کی بھی نسبت اس کو ہم سے یعنی ذاکھسین سے قطع نہیں ہوئی چنانچہ آگے فکلوا منها واطعموا اس پر صاف دلیل ہے کہ وہ جانور ملک سے لگتا نہیں ہے اور یہ اس واسطے فرمادیا تاکہ نفس اس بات پر مچلے نہیں اور اس کو سہولت نظر آتی رہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا شکر اگر اپنے انتفاع پر موقوف ہو تو آدمی کو

چاہیے کہ کھایا پیا کرے اور بیکرو اسم اللہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ اللہ کا نام لینا نفع اخروی ہے مگر اس میں ایک نفع دنیوی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ کا نام لینے سے جانور کے اندر حلت آ جاتی ہے اور وہ قربانی کے لائق ہو جاتا ہے اور یہاں سے ایک شبہ بھی دفعہ ہوتا ہے تقریر شبہ کی یہ ہے کہ اہل جاہلیت کہا کرتے تھے کہ اس کی کیا وجہ ہے تمہارا مارا ہوا جانور تو حلال ہو اور اللہ کا مارا ہوا حرام ہو یعنی ذبیحہ حلال ہو اور مردار حرام اس کا جواب یہاں سے نکل آیا کہ ذبیحہ جو کھانے کے قابل ہوتا ہے وہ بھی اللہ ہی کے نام کی برکت ہے پس دونوں اللہ تعالیٰ ہی کے مارے ہوئے ہیں ہمارا مارا ہوا نہیں کیونکہ جان تو وہی نکالتا ہے باقی یہ فرق کہ ایک حلال اور ایک حرام تو وجہ یہ ہے کہ یہاں اللہ کا نام لیا گیا ہے اس کی برکت سے اس میں حلت آ گئی اور وہاں نہیں لیا گیا اس لئے حرام رہی اور دوسرے فرق کی وجہ یہ ہے کہ ذبیحہ میں سے دم مسفوح جو منجس ہے نکل جاتا ہے اور مردار میں وہ خون تمام بدن میں سما جاتا ہے پس حلت دونوں باتوں کے مجموعہ کا یعنی ذکر اسم اللہ اور خروج دم مسفوح کا اثر ہے اور کلو ا سے یہ مسئلہ مستہبط ہوتا ہے کہ غنی کو بھی کھانا جائز ہے یہ حق تعالیٰ کا بڑا انعام ہے جو بہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم کو عطا ہوا ہے ورنہ امم سابقہ میں یہ ہوتا تھا کہ قربانی کو ایک پہاڑ پر رکھ دیتے تھے ایک آگ آتی تھی جس کی قربانی کو اس نے جلا دیا وہ مقبول ہوتی تھی ورنہ مردود الحمد للہ کہ پانچوں وجہ فضائل کے قرآن مجید سے بھی صاف طور پر ثابت ہو گئیں میرا مقصود فضائل بیان کرنے سے یہ ہے کہ لوگوں کو قربانی کی حقیقت معلوم ہو جاوے اور اس کی طرف رغبت ہو باقی احکام اگر کسی کو دریافت کرنا ہو تو مدرسہ میں آ کر دریافت کر لے اب اس سننے کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ جن کے ذمہ واجب ہے وہ تو ضرور ہی کریں اور ان شاء اللہ تعالیٰ کریں گے باقی جن کے ذمہ واجب نہیں لیکن وسعت اس قدر ہے کہ اگر ایک حصہ قربانی کا کر لیں تو اس زائد خرچ کی وجہ سے کسی حق واجب میں فرق نہ آوے وہ لوگ بھی مناسب ہے کہ کریں اس کی فضیلت ایسی ہے کہ اس کا چھوڑنا بہت بڑے نفع سے محروم رہنا ہے اور جس کو بالکل اسی وسعت نہ ہو وہ مجبور ہو اور غریب کو قربانی کرنے کا مناسب اور مستحب ہونا بھی اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ارشاد ہے کہ یا سواک رجلا کہ وہ تیرے پاس پیادہ آئیں گے اور ظاہر ہے کہ جو پیادہ آئے گا وہ غریب ہی ہوگا۔

اسلام کا حاصل

لیشہدوا منافع لہم ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی ما رزقہم من بہیمۃ الانعام تاکہ حاضر ہوں اپنے منافع کے پاس یہ عام ہے خواہ منافع دینی ہوں یا دنیوی اور دینی منافع میں تو بہت بڑا نفع یہ ہے کہ وہاں طاعت کرنے کی کتنی بڑی فضیلت ہے اور دنیوی نفع یہ کہ بہت سی آبادی ہوگی اس میں تجارت کریں گے زراعت کریں گے اور بہت سے فائدے اٹھائیں گے مگر فرق اس مقام کی تجارت میں

اور یہاں کی تجارت میں یہ ہے کہ یہ الاعانة علی الدین (دین کی اعانت کی وجہ سے) ہونا چاہیے یعنی حج میں تجارت کا مال ساتھ لے جانے میں نیت یہ ہو کہ اگر مال ہوگا اطمینان رہے گا ورنہ پریشانی ہوگی۔

اور بھلا حج تو عبادت ہے اس میں دنیا کیا مقصود ہوتی جہاں کسب دنیا کا بھی ذکر ہے وہاں بھی اس کو مقصود نہیں ہونے دیا اس کے ساتھ ہی دین کے مقصود بنانے کا حکم دیا چنانچہ جمعہ کے باب میں جہاں فرمایا۔

فاذا فضيت الصلوة فانشتر والی الارض وابتغوا من فضل الله (پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت اجازت ہے تو تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو) اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا۔

واذکروا الله کثیراً ”خوب کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو“۔

غرض دنیا محض کی کہیں بھی اجازت نہیں اور جب اسلام کا یہ حاصل ہے کہ اس میں دنیا محض ہے ہی نہیں تو مسلمان کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ ہم دنیا دار ہیں اصل دنیا دار تو صرف کافر ہی ہیں تم شرائع کا التزام کرتے ہو یا نہیں کرتے ہو جب تم شرائع کا التزام کرتے ہو تو پھر دین دار ہو دنیا دار کہاں سے آئے۔

فکلوا منها واطعموا البائس الفقیر پھر کھاؤ ان میں سے یہاں سے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔

تین بڑے اعمال

اب تک ابراہیم کو خطاب تھا مگر چونکہ وہ بھی بلا انکار تھا۔ اس لئے ہمیں بھی تھا یعنی ان میں سے تم بھی کھاؤ واطعموا البائس الفقیر اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔

یہ مطلب نہیں کہ اغنیاء کو مت کھلاؤ نہیں اغنیاء کو بھی کھلاؤ چنانچہ کسوا سے یہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اگر کسی غنی نے قربانی کی تو وہ بھی کسوا میں داخل ہے تو غنی کو بھی کھانا جائز ہوا تو اس کو کھلانا بھی جائز ہوا بلکہ چاہے سب کھا لو کسب کو بھی مت کھلاؤ نہ فقیر کو نہ غنی کو مگر مستحب وہی ہے۔

ثم لیقضوا نفسہم پھر اپنا میل کچیل دور کریں یعنی بال منڈائیں ناخن کٹائیں نہائیں دھوئیں بدن کو صاف کریں ولیوفوا لہم و رھم اور چاہیے کہ اپنی منتوں کو پورا کریں مذکور سے مراد مطلق واجبات کہ وجوب میں مثل مندور کے ہیں ولیطوفوا بال بیت العتیق اس کو تئیں اس واسطے کہتے ہیں کہ یہ معنی و محفوظ ہے جبارہ سے حق تعالیٰ نے اسے آزاد رکھا ہے یعنی اور چاہیے کہ بیت عتیق کا طواف کریں۔

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں تینوں عمل مذکور ہیں حج بھی قربانی بھی انفاق مال بھی۔

ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوٰى الْقُلُوْبِ ﴿۷۳﴾

ترجمہ: جو شخص دین خداوندی کے ان (مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا خدا تعالیٰ کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔

تفسیری نکات

علامات دین کی تعظیم کا سبب

خلاصہ پوری آیت کا یہ ہے کہ جو شخص علامات دینی یعنی اعمال کی تعظیم کرے گا یعنی ان کو موافق شریعت کے ادا کرے گا فانہا یعنی یہ ان اعمال کی تعظیم من تقوی القلوب قلوب کے تقویٰ سے ناشی ہونے والی ہے یعنی یہ علامت ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف اس شخص کے دل میں ہے کیونکہ خوف خدا ہی ایک ایسی شے ہے کہ جو تعظیم شعائر اللہ کا باعث ہے۔ اگر کوئی کہے کہ حکومت سے بھی تعظیم شعائر کی متصور ہو سکتی ہے جو اب یہ ہے کہ حکومت سے جو تعظیم ہوگی وہ صورت تعظیم ہوگی۔ تعظیم کی جو حقیقت ہے وہ نہ ہوگی۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین نماز پڑھتے تھے لیکن اس لئے نہ پڑھتے تھے کہ خدا ہم سے راضی ہو بلکہ یہ غرض تھی کہ مسلمان ہم سے راضی ہو جائیں۔ بتلائے کہ حکومت سے حقیقت کہاں پائی گئی پس جو کوئی تعظیم شعائر اللہ کرے گا وہ قلوب کے تقویٰ ہی سے ہوگی یعنی خوف خدا ہی اس کا منشا ہوگا کسی قاعدہ اور قانون اور ضابطے سے نہ ہوگی اور جملہ فالہا من تقوی القلوب (یعنی ان کی تعظیم قلوب کے تقویٰ سے ہوتی ہے) قائم مقام جزا کے ہے اور اس جزا کی علت ہے جزاء محذوف ہے اور جزا یہ ہے فالانہ متق قلبہ (اس کا قلب متقی ہے) یعنی جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے اس کا قلب متقی ہے کیونکہ یہ تعظیم تقویٰ ہی سے ہوتی ہے اور قلوب کا لفظ جو بڑھایا ہے اس سے ایک مسئلہ واضح ہو گیا وہ یہ کہ تقویٰ قلب کی صفت ہے چنانچہ حدیث شریف بھی ہے التقویٰ ہنا و اشار الی صدرہ (یعنی تقویٰ اس جگہ سے اور آپ نے اپنے قلب کی طرف اشارہ کیا) اور یہاں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض اپنے کو متقی جاننے سے متقی نہیں ہوتا جب تک قلب اضمداً تقویٰ سے پاک نہ ہو۔ البتہ دوسروں کی نسبت تو یہ عمل چاہیے کہ

ہر کرا جامہ پارسا بنی پارسا بین و نیک مرد انکار

(جس شخص کو پارسائی لباس میں دیکھو اس کو پارسا اور نیک مرد سمجھو لیکن اپنے کو متقی جاننا جیسا آج کل

مرض ہے یہ آفت ہے)

قاعدہ کلیہ

حق تعالیٰ نے ایک قاعدہ کلیہ جس میں قربانی وغیرہ کے تمام احکام داخل ہو گئے ارشاد فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ذالک یہ مبتداء ہے خبر اس کی محذوف ہے یا خبر ہے مبتداء اس کا محذوف ہے مطلب اس جملہ کا قریب قریب اس کے ہے جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ یہ بات گزشتہ تو ختم ہو گئی اب ایک اور بات سنو اس سے کلام سابق اور کلام لاحق میں فصل ہو جاتا ہے عربی میں اس غرض کے لئے مفید لفظ ذالک ہے اور دوسری کتب مؤلفہ و مصنفہ میں گویا ایسے الفاظ کم وارد ہوتے ہوں لیکن قرآن مجید کا طرز تصنیف و تالیف کا نہیں بلکہ محاورات و عادات کے موافق ہے مصنفین کا طرز دوسرا ہے۔ پس ارشاد ہے کہ دوسری بات سنو کہ جو شخص اللہ کے شعائر یعنی علامات کی تعظیم کرے گا جزا آگے ہے۔

مفہوم شعائر

اول دو چیزیں سمجھنا چاہئیں اول یہ کہ شعائر کیا ہیں اور ان کی تعظیم کیا ہے شعائر بمعنی علامات اعمال ہیں دین کے۔ اس لئے کہ ان اعمال سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دیندار ہے جیسے نماز حج وغیرہ۔ اگر کوئی کہے کہ صلوٰۃ تو خود دین ہے علامت دین کے کیا معنی؟ بات یہ ہے کہ ہر شے کی ایک صورت ہوا کرتی ہے اور ایک حقیقت اور وہ صورت علامت ہوتی ہے وجوہ حقیقت پر اسی طرح دین کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ مثلاً صلوٰۃ ارکان مخصوصہ اس کی صورت ہے اور حقیقت صلوٰۃ جدائشے ہے جس کا تعلق زیادہ قلب سے ہے چنانچہ اگر ایمان و نیت نہ ہو۔ حقیقت نماز کی نہ پائی جائے گی اور ان دونوں کا تعلق ظاہر ہے کہ قلب سے ہے اسی طرح ہر عمل کو سمجھنا چاہیے۔ پس صورت دین اور شے ہے اور حقیقت دین سے آخر۔ اور یہ صورتیں اعمال کی علامات ہیں دین کی ان کو ہی شعائر فرمایا ہے پس مفہوم شعائر کا متعین ہو گیا۔

تعظیم شعائر

اب تعظیم شعائر کی حقیقت معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کیا ہے تعظیم شعائر یہ ہے کہ ان اعمال کا حق جس طرح شریعت مطہرہ نے حکم فرمایا ہے ادا کیا جائے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جو شخص اعمال دین موافق احکام الہیہ ادا کرے اب اس ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون عام ہے قربانی اور غیر قربانی سب اس میں داخل ہیں میں نے جو اول اس مضمون کے عموم کا دعویٰ کیا تھا وہ ثابت ہو گیا

لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لِحُومِهَا وَلَا دِمَاءُهَا وَلَكِنْ بِنَالِ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ انکا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے)

اہل ظاہر کی غلطی

صوفیوں کی یہاں بھی رعایت فرمائی کہ پہلے سن ینال اللہ میں اہل ظاہر کی غلطی بیان فرمائی اور غلطی بھی ایسی بلاغت سے بیان کی کہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔

پھر دوسرے جملہ میں ولکن ینالہ التقویٰ قربانی کی حکمت واللہ کیا بیان کی اور اس تقویٰ کا مصداق اس سے اوپر ارشاد فرمایا ہے۔

ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقویٰ القلوب (جو شخص تعظیم کرے شعائر اللہ و احکام الہیہ کی تو ان کی یہ تعظیم کرنا دلوں کے تقویٰ سے ہے)

یعنی یہ تقویٰ تعظیم ہے شعائر اللہ و احکام الہیہ کی اس حکمت تعظیم شعائر اللہ۔

کی جامعیت پر نظر کر کے مجھے تو وہ شعر شریعت کی شان میں یاد آ جاتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد بہ رنگ اصحاب صورت را بہو ارباب معنی را

(اسکی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو

سے تازہ رکھتی ہے)

قربانی کرنے والوں کی اقسام

یعنی عالمین میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو قربانی کی حکمت سمجھ گئے ہیں دوسرے وہ جو حکمت نہیں سمجھے جو حکمت سمجھ گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ حکمت معلوم ہو جانے سے وقعت بڑھتی ہے حکم کی تو وہ یوں حکم کی تعظیم کریں گے اور جو حکمت نہیں سمجھے انہوں نے اتنی تعظیم کی کہ حکمت بھی نہ سمجھے اور پھر بھی کر ڈالا وہاں تو کسی درجہ میں رائے کا بھی دخل تھا یہاں کچھ بھی نہیں اگر کسی نے کہا کیوں کرتے ہو کہا حکم خدا کا۔

پس آیت ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقویٰ القلوب (جو شخص اللہ تعالیٰ کے شعائر اور اس کے احکام کی تعظیم کرے تو ان کی یہ تعظیم کرنا دلوں کے تقویٰ سے ہے) میں روح بتلادی قربانی کی۔

روح قربانی

آگے اس آیت سن ینال اللہ میں فرماتے ہیں کہ اس روح یعنی تقویٰ خاص کی کہ تعظیم شعار ہے بہت حفاظت کرو اور سمجھو کہ ذبح بالذات مقصود نہیں دیکھو وہاں نہ خون پہنچتا ہے نہ گوشت جو چیز مقصود ہے وہ البتہ پہنچتی ہے یعنی تقویٰ چنانچہ اگر یہ لحم و دم (گوشت و خون) مقصود ہوتا تو سارا جانور اٹھ کر چلا جایا کرتا۔ پس صرف ذبح کو مقصود

مت سمجھو خدا کے یہاں تقویٰ پہنچتا ہے اس کو دیکھو کہ اس ذبح کے ساتھ تقویٰ بھی مقترن (شامل) ہے جو کہ تعظیم شعائر اللہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ایک مدلول من کا یہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح سے کہ تعظیم شعائر مجملہ تقویٰ ہے جب تعظیم بجائے تقویٰ متحقق ہو گیا یا تقویٰ سے تعظیم شعائر اللہ پیدا ہوتی ہے ایک مدلول من کا یہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح کہ تعظیم پیدا ہوتی ہے تقویٰ سے غرض جو چاہو کہو بقول حافظ۔

بخت اگر مدد کندا منش آدم بکف گر بکشد زہے طرب در بکشم زہے شرف
(خوش قسمتی ہے اس کا دامن ہاتھ آ جائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہم کھینچ لیں تب بھی) سو تقویٰ ہر حال میں مقصود بالذبح ہوا۔

اور حضور فرماتے ہیں سینہ کی طرف اشارہ کر کے کہ یہاں ہے تقویٰ اور مانی الصدر (اندرون سینہ) باطن ہے پس معلوم ہوا کہ اس ظاہر کا ایک باطن بھی ہے اس کو حاصل کرو۔

شاید اس کو سن کر اہل باطن پھولتے کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ باطن ہی ہے جو کچھ ہے لہذا آگے ان کی غلطی بیان کرنے کے لئے ایک ظاہر کو فرماتے ہیں۔ کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ہداکم (اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا مسخر کر دیا ہے تاکہ قربانی کر کے اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ تم کو اس طرح قربانی کرنے کی توفیق دی) یعنی ذبح کی توفیق نہیں پوچھے گا تقویٰ مطلق مقبول نہ ہوگا تقویٰ وہ قبول ہوگا جس کو قربانی سے تعلق ہو۔

حکمت تکبیر

یہاں نحر کا مفعول بھی ہو جس سے تکبیر کا فعل بھی متعلق ہو پس اس میں اچھی طرح سے ثابت کر دیا گیا کہ روح سے مراد وہی روح ہے جو اس قلب کے ساتھ ہو اسی کو فرماتے ہیں کہ جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تاکہ تم نعمت ہدایت و توفیق للذبح پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اس میں اللہ اکبر کہنے کی بھی حکمت بتلا دی کہ یہ دراصل شکر ہے اللہ کا کہ اللہ بہت بڑا ہے کہ اس نے توفیق دی کہ ہم حکم بجالا سکیں واقعی اگر خدا کی توفیق نہ ہوتی تو ترحم طبعی ہاتھ کو گردن پر نہیں چلنے دیتا جو طحہ بن کے شہ کے بنا تھی یعنی ذبح کا خلاف ترحم ہونے کے سبب مخالف حکم الہی ہونا ارشاد فرمایا کہ بعض جہلاء کے برتاؤ سے یہ شبہ پڑتا ہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایصال ثواب میں جو چیز دی جاتی ہے وہی پہنچتی ہے چنانچہ بچے کے ثواب پہنچانے میں دودھ اور شہداء کربلا کے ثواب بخشنے میں شربت علی ہذا۔ سو کلام مجید میں اس کا رد صریح موجود ہے لن ینال اللہ لحومها ولا دماءها ولكن ینال التقویٰ منکم کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ہداکم (اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارے زیر حکم کر دیا تاکہ تم اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر کے اللہ کی بڑائی بیان کرو)

تکبیر تشریح

اس آیت میں لتکبر واللہ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ امر ظاہری یعنی ذکر اسم اللہ اور تکبیر اللہ اسی امر باطنی یعنی تعظیم بالقلب و نیت تقرب و اخلاص کا ترجمان ہے یعنی اسی لئے موضوع ہے کہ اس سے اس کا اظہار ہو پس ان میں باہم دال و مدلول کا سا تعلق ہے پس ان میں حقیقی اتحاد اور اعتباری تغایر ہے اس اعتبار سے یہ دونوں حکمتیں ایک ہی حکمت ہیں اور ہر چند کہ ظاہراً علی ما ہذا کم مطلق ہدایت کو شامل ہے لیکن خصوصیت مقام و نقل عن اہل التفسیر سے اس کی تفسیر خاص یہ ہے علی ما ہذا کم من الذبح اللہ تعالیٰ جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو یعنی ذبیحہ پر اللہ اکبر کہو کہ اس نے تم کو اس فعل موجب تقرب کی توفیق دی چنانچہ اگر وہ توفیق نہ دیتے تو ممکن ہے کہ بعض کی طرح تم ذبح ہی میں شبہات نکالتے یا ذبح کرتے مگر غیر اللہ کے نام یا اللہ ہی کے نام پر ذبح کرتے مگر نیت درست نہ ہوتی تو بالکل اخلاص نہ ہوتا یا کامل نہ ہوتا جیسے بعض لوگ ردی جانور ذبح کرتے ہیں جو علامت ہے محبت کی کمی کی اور جس قدر محبت کم ہوگی اسی قدر اخلاص کم ہوتا ہے کیونکہ اس میں آمیزش ہوگی غیر کی محبت کی اور اس غیر کو من وجہ مقصود سمجھنے کی مثلاً مال اگر اس کو مقصود نہ ہوتا تو ردی کیوں ڈھونڈنا غرض یہ عمل اخلاص کے ساتھ کرنا توفیق ہی پر موقوف ہے پس اس توفیق پر تم حق تعالیٰ کی دل سے بھی تعظیم کرو اور زبان سے بھی اللہ اکبر کہہ کر اس کا اظہار کرو۔ پس یہ تفسیر ہے علی ما ہذا کم کی اور اسی تعظیم و تکبیر کی مقصودیت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں دوسرے طرق سے یہ تکبیر مشروع ہوئی ہے چنانچہ ایک تو عید کا دو گانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک تکبیرات انتقالات مشترک تکبیریں ہیں یعنی جیسی اور نمازوں میں ہیں اور ان کے علاوہ تکبیرات زائد بھی ہیں جن کا عدد ائمہ کے نزدیک مختلف ہے امام صاحب کے نزدیک چھ تکبیریں ہیں جو نماز کی گیارہ تکبیروں کے ساتھ مل کر سترہ ہوتی ہے جو رکعات فرائض کے برابر ہونے سے ایک مہتمم بالشان عدد ہے اور دوسرا طریق اس کی مشروعیت کا یہ ہوا کہ یوم عرفہ کے شروع سے ایام تشریق کے خاتمہ تک ہر نماز کے بعد با آواز بلند تکبیر کہی جاتی ہے۔ تیسرا طریق یہ ہے کہ عید گاہ کے راستہ میں بھی کہی جاتی ہے اور اس تکبیر کے اشتراک سے ذبح اور صلوة کا جو باہمی تناسب معلوم ہوتا ہے مولانا رومی کے ارشاد میں اس کی تصریح بھی ہے۔

معنی تکبیر ایں ست اے امیم	کای خدا پیش تو ما قربان شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر میکنی	ہمچنین در ذبح نفس کشتنی
گوی اللہ اکبر و ایں شوم رام	سریر تادار ہد جاں از عنا
تن چو اسلعیل و جاں ہچوں خلیل	کرد جاں تکبیر بر جسم بنیل

ہجو اسمعیل پیش سربہ شادو و خنداں پیش تیغش جاں بدہ
 اور اگر تکریم اللہ کو جو کما آیت میں مذکور ہے ان سب تکبیرات صلوٰتیہ وغیر صلوٰتیہ کیلئے عام لے لیا جاوے جیسا کہ
 واذکروا اللہ فی ایام معلودات میں ان ایام کے سب اذکار و تکبیرات بالا جماع مراد ہیں تو تقریر آیت کی اس
 طرح ہوگی کہ تسخیر انعام اس لئے ہوئی کہ ہم کو تکبیر مقصود ہے چنانچہ ہم نے دوسرے طرق سے اس تکبیر کو شروع فرمایا
 ہے جو علامت ہے اس کے مقصود ہونے کی اور اس تسخیر للذبح سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہے اس لئے اس مقصود کی تحصیل
 کے لئے ہم نے انعام کو مسخر کر دیا پس آیت ہی مشتمل ہو جاوے گی ان ایام کی تمام طاعات کو قربانی کو بھی تکبیرات غیر
 صلوٰتیہ کو بھی اور صلوٰۃ کو بھی جیسا کہ اس کی روایف یعنی عید الفطر کی نماز کو بعض مفسرین نے سورہ بقرہ کی آیت شہر
 رمضان الذی انزل فیہ القرآن الخ میں جو ایسا ہی ایک جملہ یعنی لتکبروا اللہ علی ماہذکم واقع ہے اس کا
 مدلول تفسیری کہا ہے پس اہر دونوں یوم کے بعض احکام کا اشتراک اور اہران دونوں میں اس جملہ کا اشتراک اور پھر
 جملہ سورہ بقرہ کا مفسر بصلوٰۃ العید ہونا اس جملہ سورہ حج کے مشتمل بصلوٰۃ العید ہونے کو قریب کئے دیتا ہے۔

پس اس تقریر پر یہ آیت مشتمل ہوگی ان ایام کی دو قسم کی طاعت کو ایک باطن جس کی تعبیریں ہیں نیت تقرب
 و اخلاص و تعظیم بالقلب اور ایک ظاہر جس کی تعبیریں ہیں صلوٰۃ تکبیرات۔ تسمیہ علی الذبیحہ پس سامعین کو ان ایام میں
 دونوں امر کی رعایت ضروری ہے نہ صرف ظاہر پر کفایت کریں کہ قربانی اور نماز کا نام کر لیا اور بس اور نہ عیان کاذب کی
 طرح نرے باطن پر کفایت کریں کہ اخلاص ہی اصل ہے اور ہم اس اصل کو لئے ہوئے ہیں کہ یہ اعتقاد ہی گمراہی ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ وَإِنَّ يَوْمًا

عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿۷۸﴾

تسجیل: اور یہ لوگ (نبوت میں شبہ نکالنے کے لئے) ایسے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ
 کبھی اپنا وعدہ خلاف نہ کرے گا۔ اور آپ کے رب کے پاس کا ایک دن (یعنی قیامت کا دن امتداد
 میں) برابر ایک ہزار سال کے ہے تم لوگوں کے شمار کے موافق۔

تفسیری نکات

کذب اخبار میں ہوتا ہے

ایک مولوی صاحب کے جواب میں فرمایا کہ کذب اخبار میں ہوتا ہے انشاءات میں نہیں ہوتا اور وعید
 انشاء ہے اگر صیغہ اخبار کا بھی ہو وہ محض صورت ہے معنی انشاء ہی میں داخل ہے اسی سے بعض لوگوں نے کہہ دیا
 ولو خلافاً للجمہور کہ خلف فی الوعد وقوعاً بھی جائز ہے اور اس پر جو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ

قول بوقوع الکذب ہے اس کا یہی جواب دیا ہے کہ کذب اخبار میں ہوتا ہے اور وعید صورتہ اخبار ہے ورنہ حقیقت میں انشاء ہے مگر جمہور کے لئے قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ يستعجلونک بالعذاب ولن يخلف الله وعده یہاں وعدہ سے مراد یقیناً ہے بقرینتہ ذکر العذاب تو قرآن کی نص سے خلف فی الوعدہ کا ممتنع ہونا معلوم ہو گیا۔

مقدار یوم بعث الف و خمسين الف میں تطبیق عجیب

سوال: سورہ حج میں روز حشر کی درازی اس طرح بیان فرمائی گئی ہے ان یوما عند ربک کالف سنة مما تعدون اور سورہ معارج میں ہے فی یوم کان مقداره خمسين الف سنة ان دونوں کی تطبیق بیان القرآن میں اس طرح ہے کہ کچھ امتداد کچھ اشمیداد سے کفار اس قدر طول محسوس ہوگا اور چونکہ حسب تفاوت مراتب کفر اشمیداد میں تفاوت ہوگا اس لئے ایک آیت میں کالف سنة آیا ہے آیت اولیٰ کیلئے پہلی آیت میں عند ربک یہ بتا رہا ہے کہ اس دن کا طول واقعی اتنا ہے یا کم از کم اللہ کے نزدیک اتنا ہے جتنا تم لوگوں کو شمار میں ایک ہزار برس کا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس دن کی مقدار ہی اتنی ہے اور ایسا نہیں ہے کہ واقعی مقدار اس کی کچھ اور ہے امتداد و اشمیداد حسب تفاوت مراتب کفر کی وجہ سے وہ ہزار برس معلوم ہونگے کیونکہ عند ربک اس کا قرینہ ہے ورنہ عند الکفار یا مثل ذلک کوئی اور لفظ ہوتا اور اس کی تائید حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث کے کلام سے بھی ہوتی ہے وہ ازالۃ الخفاء میں اس حدیث کی شرح میں کہ میری امت کو نصف یوم کی مہلت دی گئی (اوکمال قال) تحریر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد عبا سیوں کی خلافت ہے جو پورے پانچ سو سال رہی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن ایک ہزار برس کا ہے اور پانچ سو سال اس کے نصف۔ جب یہ واضح ہو گیا کہ الف سنة سے واقعی الف سنة مراد ہیں نہ کہ اعتباری الف سنة۔ اب میں کہتا ہوں اسی طرح کسان مقدارہ خمسين الف سنة میں فعل ناقص ماضی لایا گیا ہے جو باعتبار زمانہ کے نہیں بلکہ باعتبار تین وقوع فی المستقبل کے ہے اور یہاں نفس وقوع کا تین نہیں دلایا گیا ہے اس لئے یہاں بھی واقعی خمسين مراد ہیں نہ کہ اعتباری خمسين پھر اگر اعتباری ہوتا اس کے لئے عدد کا ذکر کیوں ہوتا کوئی اور لفظ ہوتا جو اس کے امتداد و طول پر دلالت کرتا مثلاً کان مقدارہ طویلا او ممتدا او مثل ذلک اور اگر یہ کہا جاوے کہ الف سنة کے ساتھ مما تعدون کی قید ہے اور یہاں قید نہیں ہے اس لئے تعارض نہیں ہے یعنی وہاں کے ایک ہزار برس سے مراد تمہارے ایک ہزار سال ہیں اور یہاں پچاس ہزار سے کوئی اور حساب مراد ہے جو اسی ایک ہزار کے مساوی ہے مگر جب ایک ہی دن کی مقدار بیان کی جا رہی ہے اور ایک جگہ اس میں مما تعدون کی قید ہے اور دوسری جگہ نہیں کیوں نہ سمجھا جاوے کہ وہی قید یہاں بھی ہے خاص کر اس حالت میں کہ مخاطب بھی ایک ہی ہے پھر کوئی

وجہ نہیں کہ ایک جگہ تو مخاطب کے اعداد کا شمار ہے اور ایک جگہ کسی اور عالم کے اعداد کا اگر خمسین اعتباری مانا جاوے جیسا کہ حضور والا اشارہ ہے تو شاید اس کی تائید اس سے ہو کہ سورہ معارج مکیہ ہے اور وہاں کے لوگوں کا عناد دوسرے کئی زائد تھی اس لئے انہیں خمسین معلوم ہوا اور سورہ حج مدنی ہے وہاں اس چیز میں کمی تھی اس لئے انہیں الف سنہ معلوم ہوا مگر سب نکات ہیں ان سے نہ تسکین ہوتی ہے اور نہ سکوت۔ دل کسی قوی بات کا جو یاں ہے۔ کیونکہ یوں تو تمام عذاب میں یہ شبہ ہوگا کہ واقعی کچھ اور ہے اور امتداد و تشدد کے تفاوت سے فرق اعتباری پیدا ہو گیا۔

الجواب: عند ربک قید نسبت بین الموضوع والحمول کی نہیں ہے تاکہ اس کا یہ مدلول ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یعنی واقع میں ہزار برس کا ہوگا بلکہ یہ قید یوما کی ہے یعنی وہ دن جو تمہارے رب کے پاس کا ہے یعنی آخرت کا دن محاورہ قرآن میں آخرت کی چیزوں کو عند الرب کہا گیا ہے جیسے لہم اجرہم عند ربہم رہا یہ کہ وہ واقع میں کتنا بڑا ہوگا قرآن اس سے ساکت ہے باقی تشبیہ اس کی الف سنہ کے ساتھ اس میں خود دو احتمال ہیں کہ وجہ تشبیہ امتداد ہے یا استداد کما اشرت الیہ فی بیان القرآن البتہ حدیث ظاہر اس پر دال ہے کہ اس کی مقدار واقع میں ہزار برس ہوگی مگر بیان القرآن سے اس کو تعارض نہیں کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بعض کو مقدار واقعی کی برابر معلوم ہوگا بعض کو زیادہ رہا یہ کہ جب واقعی مقدار کی برابر معلوم ہوا تو اس میں کفر کا کیا دخل۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کفر نہ ہوتا تو حسب حدیث مذکور فی بیان القرآن ایسا خفیف معلوم ہوتا جیسا فرض نماز کا وقت اب رہی دوسری آیت کان مقدارہ خمسین الف سنہ سواں میں بھی نصاً کوئی دلالت واقعی مقدار پر نہیں اور جو وجہ دلالت کی سوال میں مذکور ہے وہ مسلم نہیں کیونکہ اگر قرآن کی عبارت یوں ہوتی کان مقدارہ فی اعینہم خمسین الف سنہ تو کیا اس وقت یہ کلام صحیح نہ ہوتا اور کیا آیت کے اجزاء میں تعارض ہوتا کہ کان مقدارہ خمسین الف سنہ میں فعل ناقص ماضی لایا گیا ہے الی قولہ اس کی مقدار کا تین دلا یا گیا ہے جس کا مقتضی یہ ہے کہ مقدار واقعی ہے اور فی اعینہم کا مقتضی اس کے خلاف ہے اسی طرح سے آیت کے اجزاء میں تعارض ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ کان کا یہ مقتضا نہیں ہے اور کلام بھی صحیح ہے جیسے آیت لئنہ نقاتل فی سبیل اللہ واخری کافرة یرونہم مثلہم رای العین۔ علی التفسیر المشہور اور آیت واذیریکم وہم اذا لقیتم فی اعینکم قليلاً ویقللکم فی اعینہم الا بیت البتہ اگر کوئی دلیل معارض نہ ہوتی تو یہ آیت ظاہراً مقدار واقعی پر دال ہوتی مگر جب دوسری آیت معارض ہے تو ظاہر کو ترک کر کے خلاف ظاہر پر محمول کرنا واجب ہوگا جب کہ اس حمل سے کوئی امر مانع بھی نہیں رہا یہ کہ سب نصوص میں ایسا ہی شبہ خیالی ہونے کا ہو جاوے گا سو ظاہر کو بدوں دلیل چھوڑنا جائز نہیں یہاں دلیل ہے اور نصوص میں دلیل نہیں فشتان مابینہا ایسے ہی ظاہر کو دلیل سے چھوڑنے کی اور بھی نظائر ہیں کقولہ تعالیٰ فی

قصہ ذی القرنین وجدھا مغرب فی عین حمئة ووجد عندھا قوما. وجدان کا مادہ دو جگہ آیا ہے مگر اول وجد کو خیال پر محمول کیا جاتا ہے دوسرے کو واقعہ پر اول سے دوسرے میں شبہ واقعی نہیں ہوتا اور یہاں تک ضابطہ کا جواب ہو گیا اب تمہرا ایک دوسرا جواب دیتا ہے جس میں دونوں آیتوں میں واقعیت محفوظ رہے وہ یہ کہ دنیا میں جس طرح معدل النہار کی حرکت یومیہ کسی مقام پر دو لابی ہے کہیں حمایتی کہیں رحوی اور اس اختلاف سے کہیں دن رات کا مجموعہ چوبیس گھنٹہ کا ہوتا ہے کہیں برس روز کا جیسے عرض تسعین میں کہیں ان کے درمیان مختلف مقادیر پر اور سب واقعی ہیں اور یوم نام ہے مابین الطلوع والغروب کا پس جو شخص استواء پر ہے اس کے افق پر جتنے زمانہ میں تین سو بار سے زیادہ طلوع وغروب ہو چکتا ہے اس زمانہ میں عرض تسعین والے افق پر ایک بار طلوع وغروب ہوتا ہے پس یہ دوسرا شخص برس روز کے زمانہ کو ایک لیل ونہار کہتا ہے اور پہلا شخص چوبیس گھنٹہ کو ایک لیل ونہار کہتا ہے اور دونوں صحیح ہیں مگر یہاں دونوں شخصوں کا دو افق پر ہونا شرط ہے اگر آخرت میں بھی ایسا ہی ہو کہ اس کے طلوع وغروب میں ایک افق پر بوجہ بطور حرکت ایک ہزار برس کا فاصلہ ہو اور اس کے واقعات اسی میں طے ہو جاویں اور ایک افق پر اسی طلوع وغروب میں پچاس ہزار برس کا فاصلہ ہو اور اس کے معاملات میں طے ہوں اور کچھ آفاق پر ان دونوں مدتوں کے درمیان میں وہ طلوع وغروب ہو مگر وہاں ان لوگوں کا جدا جدا افق پر ہونا شرط نہ ہو اس میں کوئی استحالہ نہیں اور اس کا حاصل یہ ہوگا کہ واقع میں وہ طلوع وغروب مختلف آفاق پر ہوگا جیسے دنیا میں اگر بطور خرق عادت کے خط استواء پر دو شخصوں میں سے ایک کو اپنا افق منکشف ہو جاوے دوسرے پر اپنا افق مستور ہو جاوے اور عرض تسعین منکشف ہو جاوے تو ایک کا یوم چوبیس گھنٹہ کا ہو جاوے گا دوسرے کا برس روز کا اور دونوں واقعی ہیں مگر یہاں ایسے خارق کا وقوع کم ہوتا ہے وہاں ہر چیز خارق ہی ہوگی اس لئے یہاں کسی امر کا مستبعد ہونا وہاں بھی اس کے مستبعد ہونے کو مستلزم نہیں خوب سمجھ لو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایک قسم کے لوگوں کے آفاق مختلف ہوں یعنی ایک جماعت کا افق وہ ہو جہاں ایک ہزار برس کا دن ہو اور دوسری جماعت کا وہ افق ہو جہاں پچاس ہزار برس کا دن ہو اور کچھ جماعتیں ان کے درمیان ہوں تو اس میں خرق عادت کی بھی ضرورت نہیں صرف بطور حرکت شمس میں مثلاً خرق عادت ہوگا اور یہ سب اس اشکال کا جواب ہے جو کسی خاص تفسیر پر واقع ہوتا ہے اگر دوسری تفسیر اختیار کر لی جاوے تو اصل سے یہ اشکال ہی واقع نہیں ہوتا چنانچہ درمنثور میں دوسری تفاسیر بھی منقول ہیں پس قرآن پر اشکال کے وقوع کا شبہ نہ کیا جاوے۔ واللہ اعلم (ماخوذ از بوادری اور النوادر)

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى

أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ

ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ لَيْتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ کے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو کہ جب اس نے (اللہ کے احکام میں سے) کچھ پڑھا (تب ہی) شیطان نے اس کے پڑھنے میں (کفار کے قلوب میں) شبہ ڈالا پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو (جو بات قاطعہ سے) نیست و نابود کر دیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیات (کے مضامین) کو زیادہ مضبوط کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب علم والا حکمت والا ہے۔

تفسیری نکات

ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ قرآن شریف کی آیت اذاتمنی القی الشیطان فی امنیته سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی شیطان کے وسوسہ کا اثر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے وسوسہ کی وجہ سے آپ نے قرآن کے ساتھ غیر قرآن کو پڑھ دیا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوا کہ حضور کے وحی سنانے کے وقت شیطان نے کچھ اپنی طرف سے القا کیا۔ باقی یہ بات کہ یہ القاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ہوا۔ یا سامعین کے کانوں پر اس آیت سے نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے کہ یہ القاء لوگوں کے کانوں پر ہوا ہو۔ یعنی لوگوں نے یہ کلمات سنے ہوں۔ اگرچہ حضور کی زبان سے نہ نکلے ہوں اور پھر خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں سے مٹا دیا ہو۔ جیسا ارشاد ہے فینسخ اللہ ما یلقى الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا نَسْكَاهُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُبَاذِرُكَ فِي الْأَمْرِ

وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٥﴾

ترجمہ: جتنی امتیں (اہل شرائع گزری ہیں) ہم نے (ان میں) ہر امت کے واسطے ذبح کرنے کا طریقہ مقرر کیا ہے کہ وہ اسی طریق پر ذبح کیا کرتے تھے سو ان معترض لوگوں کو چاہیے کہ آپ سے اس امر (ذبح) میں جھگڑانہ کیا کریں اور آپ (ان کو) اپنے رب (یعنی اس کے دین) کی طرف بلائے رہیے (کیونکہ) آپ یقیناً صحیح راستے پر ہیں۔

تفسیری نکات صلح کا حاصل

فرمایا کہ ایک درویش سے میری گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اس آیت کا ترجمہ کیا جاوے لیکل امة جعلنا منسکاهم ناسکوه فلا یبذیرک فی الامر مقصود یہ تھا کہ اس آیت میں کسی سے نزاع کرنے کی ممانعت ہے یعنی کوئی کسی سے تعرض نہ کرے جو صلح کا حاصل ہے میں نے کہا کہ لا یبذیرک فرمایا ہے لانتازعہم نہیں فرمایا تو اہل باطل کو اہل حق سے جھگڑا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اہل حق کو اہل باطل کے ساتھ جھگڑنے سے منع نہیں فرمایا اس پر شاہ صاحب خاموش رہ گئے۔

فلا یبذیرک فی الامر (الحج آیت نمبر ۶۷)
سوان لوگوں کو چاہیے کہ اس امر میں آپ سے جھگڑانہ کریں

اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کی اجازت نہیں

فرمایا چنانچہ میں ایک دفعہ آلہ آباد گیا تھا والد صاحب کی بیمار پرسی کے لئے وہاں ایک درویش تھے والد صاحب ان کے پاس مجھے لے گئے۔ جب انہوں نے مجھے دیکھا تو مجھ سے کہا کہ اس آیت کا مطلب بتلاؤ لیکل امة جعلنا منسکاهم ناسکوه فلا یبذیرک فی الامر میں نے ترجمہ کر دیا تو کہنے لگے دیکھو حق تعالیٰ منع کرتا ہے منازعت سے پھر ہم کسی کو روک ٹوک کیوں کریں۔ موسیٰ بدیں عیسیٰ بدیں جو جس کے جی میں آوے کرے ہمیں کسی سے تعرض کرنے کی ضرورت کیا پڑی یہ تفسیر کی۔ انہوں نے ان کو جواب دیا میں نے کہا حق تعالیٰ نے لا یبذیرک فرمایا ہے کہ وہ آپ سے منازعت نہ کریں لانتازعہم نہیں کہ آپ بھی ان کو روک ٹوک نہ کریں بلکہ آپ کے لئے تو خود اس کے متصل ہی امر فرماتے ہیں وادع الی ربک انک لعلیٰ ہدیٰ مستقیم یعنی

دو قسم کے لوگ تھے ایک وہ جو باطل پر تھے حق سے ہٹے ہوئے تھے اور ایک وہ جو صراطِ مستقیم پر تھے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اہل باطل کو اہل حق سے منازعات کرنے کی اجازت نہیں۔ پس حاصل آیت کا یہ ہے کہ آپ صراطِ مستقیم پر ہیں آپ کو تو حق ہے منازعتِ صوری یعنی دعوت کا مکران کا حق نہیں کہ آپ سے منازعت کریں میں نے کہا کہ اس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو عدم منازعت کا حکم نہیں بلکہ ان کو حکم ہے کہ آپ سے منازعت نہ کریں۔ پس شاہ صاحب کا ذرا منہ نکل آیا اور ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ والد صاحب بھی میرے جواب سے بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کی لطیف لطیف تفسیریں بھی نظر سے گزریں لیکن یہ تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ مگر یہ مطلب کسی نص کا معارض بھی نہیں اور بعض نے جو اس آیت کی تفسیر میں لاہناز عنک کا مطلب لاہناز ہم لکھ دیا کہ آپ ان سے منازعت نہ کریں۔ یقیناً شاہ صاحب کی اس تفسیر پر نظر نہ تھی۔ ورنہ وہ ضرور اس کو پیش کرتے۔ مگر میں اس وقت یہ جواب دیتا کہ منازعتِ دعوت اور ہے اگر منازعتِ حقیقیہ سے ممانعت ہے تو دعوت سے ممانعت نہیں پس تم منازعت نہ کرو محض دعوت ہی کر دیا کرو مگر غضب تو ہے کہ آجکل تو درویش کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ بس کچھ نہ کرے اور کسی کو کچھ نہ کہے بلکہ سب کے ساتھ صلح و گل ہو کر رہے وہ تو درویشی ہے ورنہ نہیں (آداب التلبیح ص ۲۶۶)

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مَّمْلَةٌ اَيْبِكُمْ

اِبْرَاهِيمُ هُوَ سَبُّكُمْ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى

النَّاسِ فَاَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ

مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿۷۸﴾

ترجمہ: اور (اس نے) تم پر دین (کے احکام) میں کسی قسم کی تکلی نہیں کی تم اپنے باپ ابراہیم کی (اس) ملت پر (ہمیشہ) قائم رہو۔ اس (اللہ) نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے (نزول قرآن سے) پہلے ہی اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں اور (اس شہادت رسول کے قبل) تم لوگوں کے مقابلے میں گواہ (تجویز) ہو سو تم لوگ (خصوصیت کے ساتھ) نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہ تمہارا کارساز ہے (کسی کی مخالفت تم کو حقیقتاً ضرر نہ کرے گی) سو کیا اچھا کارساز ہے اور کیا اچھا مددگار ہے۔

تفسیری نکات

دین اور دشواری

سوایک جواب تو معروض ہو چکا کہ اگر دشواری ہو تو خواص مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل کے لئے قبول کرنا چاہیے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ واقع میں دین میں دشواری ہی نہیں۔ یہاں اسی جواب کو فرماتے ہیں کہ ما جعل علیکم فی الدین من حرج (نہیں کی تم پر دین میں کچھ تنگی) اور کیسی بے فکری سے کہتے ہیں۔ آخر خدا ہیں نا۔ اگر کوئی بندہ ہوتا تو ایسے موقع پر کہ ایک عالم دشواری کا مدعی ہو خدا جانے کتنی تمہیدوں کے بعد جواب دیتا یہاں ایک دم سے نہایت پر زور لہجہ میں حرج کی نفی فرمادی۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بڑا انجینئر جو ٹینل سے ایک بڑے بھاری بوجھ کو اٹھا رہا ہو اور ایک گنوار کہے کہ اس کو یہیں رہنے دو کہ مصلحت ہے تو وہ نہایت لا پرواہی سے کہے گا کہ نہیں یہ وہیں جائے گا اور خدا کی بڑی شان ہے ان کو جوہ تملانی کی کیا ضرورت ہے۔ جب اہل تحقیق اپنی خاص شان میں ہوتے ہیں تو محض عوام کے نہ ماننے کی ضرورت سے اسرار و نکات اور جوہ نہیں لایا کرتے ہاں کبھی اس کے پرزے بھی بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے بھی کہیں کہیں بیان کئے ہیں اس لئے محققین نے کہا ہے کہ

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یعنی مدعی اور ظاہر پرست کے سامنے عشق اور مستی کے اسرار مت بیان کرو ان کو رنج اور خود پرستی میں مرنے دو۔ بخلاف غیر محقق کے کہ اس پر جب اعتراض ہوتا ہے وہ بھڑک اٹھتا ہے اور زور شور کی تقریر شروع کر دیتا ہے اور محقق بھڑکتا نہیں بلکہ سارے جوابوں کو طے کر کے اوپر پہنچتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات جواب ہی نہیں دیتا۔ پس جواب نہ دینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو جواب سے نیچے ہو کہ جواب تک نہ پہنچا ہو یا اوپر ہو کہ اس سے بھی عبور کر گیا ہو محقق کی یہی شان ہوتی ہے پس خدا تعالیٰ کا کلام کہیں تو حکیمانہ ہے اور کہیں حاکمانہ طرز زیادہ شفقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حکیمانہ جواب میں ذرا اجنبیت ہوتی ہے۔

جیسے ایک تو طبیب کہے کہ فلاں وجہ سے مضر ہے اس کو نہ کھاؤ اور ایک باپ کہے کہ خیر دار اس کو مت کھاؤ اور اگر وہ وجہ پوچھے تو کہے گا کہ بکومت بس مت کھاؤ۔ اب اگر کوئی کہے کہ یہ بڑا سخت باپ ہے تو غلطی ہے بلکہ وہ بڑا شفیق باپ ہے تو حاکمانہ انداز بڑی شفقت کی دلیل ہے۔ تو حق تعالیٰ حاکمانہ فرماتے ہیں ما جعل علیکم فی الدین من حرج (نہیں کی تم پر دین کی تنگی) تو اصل میں مجھے اس کا بیان کرنا ہے۔ مگر اس سے پہلے ایک

ایسا جملہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر اس کو ذہن میں رکھ لیں تو پھر جواب میں تفصیل ہی کی ضرورت نہ رہے۔

اسرار شریعت

وہ جملہ یہ ہے ہوا اجتباکم کہ اس نے تم کو مخصوص بنا لیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارے خاص ہو کر تم ہماری بات نہ مانو گے ایک تو مخصوص کہنے میں یہ اثر ہوتا ہے۔ دوسرے خود مخصوص ہونے میں ایک خاص مناسبت بھی ہو جاتی ہے جس سے خود بھی وہاں پہنچنے لگتا ہے جہاں پہنچانا مقصود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تم مجتبیٰ بنو اگر کہو کہ خدا نے مجتبیٰ بنا لیا۔ چنانچہ ہو اجتباکم کا یہی ترجمہ ہے۔ ہم کو کیا ضرور ہے تو سبحان اللہ! اگر کوئی کہے کہ شام کو فلاں شخص نے تمہاری دعوت کی ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ وہی خود تمہارے منہ میں بھی دے گا۔ اس نے تو تمہارے لئے سامان کیا ہے۔ باقی کھاؤ تم خود اسی طرح اجزاء کا سامان تمہارے لئے کر دیا ہے باقی تم اس کو حاصل کرو۔

ملت ابراہیمی دراصل ملت محمدیہ ہی ہے

واقع ملتہ ابراہیم یعنی وہ ملت جو ہم نے آپ ﷺ کو عطا کی ہے اور جو موافق ہے ملت ابراہیمی کے وہ دراصل ملت محمدیہ ﷺ ہی ہے معنی یہ ہیں کہ اس ملت کا اتباع کیجیو! جو ہم نے آپ ﷺ کو عطا کی ہے۔ جو دراصل تو ہے ملت محمدیہ ﷺ ہی لیکن اس کا لقب بوجہ موافق کے ملت ابراہیم ہے ورنہ بظاہر اس میں یہ اشکال تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا حکم ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ واتبع ابراہیم حنیفاً نہیں فرمایا جیسے فاتبعونی یحببکم اللہ میں فاتبعوا طریقاً نہیں فرمایا۔ یہاں طریق کا لفظ نہیں بڑھایا گیا۔ دیکھئے! ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں فہداهم اقتدہ یہ نہیں فرمایا فہدم اقتدہ کیونکہ ایک تو ان کا اقتدا ہے اور ان کے ہدا کا اقتداء ہے ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ جو ہدایت حضور کو عطا ہوئی اتباع اسی کا ہے اس کو ہدایہم سے تعبیر فرمایا۔

مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر ایک آزادی کی شان۔ ناز کی شان، جوش و خروش کی حمیت غیرت یہ مضمون بہت ہے اور نسبت عیسویہ میں زہد اور ترک دنیا کا غلبہ۔ تعلقات کی کمی وغیرہ کا مضمون بہت ہے اور حضور ﷺ میں سب شیون کا مل ہیں۔

سورة المؤمنون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱﴾ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ﴿۲﴾

ترجمہ: تحقیق مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں ۱۲

تفسیری نکات

خشوع لو ازم ایمان سے ہے

پس جب ایمان کے لوازم سے خشوع ہے تو نبوت کے لوازم سے بدرجہ اولیٰ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو استغراق تھا نہیں۔ معلوم ہوا کہ خشوع اور حضور قلب اور شے ہے اور استغراق اور شے ہے اور اگر دونوں ایک ہی ہوں تو اجتماع تفسیرین (دو ضدوں کا جمع ہو جانا ۱۲) لازم آئے گا۔ کیونکہ باقتضائے آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں خشوع ہے اور بدلا لیت حدیث استغراق نہیں اگر یہ دونوں ایک ہی شے سے ہوتے تو ایک ہی شے کا ہونا اور نہ ہونا لازم آئے گا اور یہ محال ہے جو لوگ غلطی سے یہ سمجھ گئے کہ خشوع و استغراق ایک ہی شے ہے اور خشوع ہے روح صلوة تو استغراق بھی روح صلوة ہے اور جب استغراق نہیں تو روح نہیں جب روح نہیں تو بے روح کی نماز کس کام کی تو یہ سمجھے کہ ہماری نماز بے قدر ہے کہ اس میں استغراق نہیں۔ حالانکہ ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ استغراق اور شے ہے اور وہ روح صلوة نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز بھی بے روح ہو۔

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور باوجود دینے کے ان کے دل سے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں۔ یہ لوگ (البتہ) اپنے قائدے جلدی جلدی حاصل کر رہے ہیں اور وہ ان کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

پابندی صوم و صلوة کے باوجود خشیت خداوندی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو گناہ کر کے ڈرتے ہیں؟

فرمایا نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو تصدق اور صلوة و صیام بجالا کر ڈرتے ہیں کہ شاید قبول نہ ہوں اور خدا کے سامنے جا کر ہم کو شرمندگی ہو (وہاں یہ کہا جائے کہ تم نے کیا عمل ہمارے ہاں بھیجا)

حضرت عائشہ کے سوال سے یہ معلوم ہوا کہ اس آیت میں یؤتون اعطاء مال کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر عمل کو شامل ہے جیسی تو انہوں نے اس کو اعمال گناہ پر محمول کیا۔ اور بعض لوگوں نے اس میں یوں کہا ہے کہ حضرت عائشہ نے یہ سوال یاتون کی قراءت کے متعلق کیا ہے جو بمعنی یفعلون ہے اس صورت میں ایفاء سے استدلال ثابت نہ ہوگا کیونکہ ترمذی کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ یؤتون کے متعلق سوال کیا اور قراءت شاذہ بوجہ شذوذ کے ثابت نہیں اور یہ حدیث صحیح ہے پس صحیح کو غیر صحیح پر محمول نہیں کر سکتے اور ان کو مان بھی لیا جاوے۔ تب بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر عام ہونا ضروری ہے ورنہ شاذ کا مفسر اور متواتر کا غیر مفسر رہنا لازم آوے گا تو اس تفسیر کا تعلق ایفاء سے بھی ہوگا۔ پس یہ استدلال باقی رہا۔ جب یہ ہے تو آیت میں ایفاء بمعنی ایفاء مال نہیں ہے بلکہ بمعنی ایفاء الوجود ہے جس کا حاصل ایجاد ہے۔

معنی یہ ہوئے کہ وہ جس عمل صالح کو وجود دیتے ہیں اس کو کر کے ڈرتے رہتے ہیں کہ دیکھئے قبول ہوایا نہیں بے فکر نہیں ہو جاتے تو یہاں لفظ ایفاء بمعنی اعطاء ہے جو تجارت کے مناسب ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۗ لَعَلِّي

أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلِمًا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِن

وَرَأَيْهِمْ يَرْجِعُونَ ۗ

ترجمہ: اے میرے رب مجھ کو (دنیا میں) واپس بھیج دیجئے تاکہ (جس دنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں اس میں (پھر جا کر) نیک کام کروں ہرگز (ایسا) نہیں ہوگا۔ یہ اس کی ایک بات ہی بات ہے جس کو یہ کہے جا رہا ہے اور ان لوگوں کے آگے ایک چیز آڑکی آنے والی ہے (مراد اس سے موت ہے) قیامت کے دن تک۔

تفسیری نکات

قیامت کے دن تک

کسی مردہ روح کا جیسا کہ عوام میں مشہور ہے کسی پر آنا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ گو بعض آثار سے ایسا شبہ ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن میں ہے کافر بعد موت کہتا ہے رب ارجعون لعلیٰ اعمل صالحا فیما ترکت کلا انہا کلمۃ ہو قائلہا و من ورائہم برزخ الی یوم یبعثون اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت اور قیامت کے مابین وہ ایسی حالت میں رہتے ہیں کہ دنیا میں آنے کی تمنا ہوتی ہے۔ لیکن برزخ یعنی حائل دنیا میں آنے سے باز رکھتا ہے اور عقلاً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر تعمم میں مردہ ہے تو اسے یہاں یہاں آ کر لیٹنے پھرنے کی ضرورت کیا ہے اور اگر معذب ہے تو فرشتگان عذاب کیونکر چھوڑ سکتے ہیں کہ دوسروں کو لپٹتا پھرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان رہتا ہے ممکن ہے کہ وہی شیطان ہوتا ہو جس کا لوگوں پر اثر ہوتا ہو اور جس شخص پر مسلط تھا اسی کا نام لے دیتا ہو اور ممکن ہے کہ دوسرا کوئی شیطان ہو اور شیطان کے متعلق حدیث میں آیا ہے بجوی من اللسان مجوی الدم اور کما قال غرضیکہ جنوں اور شیاطین کا اثر کہ وہ بھی شریجن میں ہیں ہوتا ہے اور مردہ روحوں کا اثر جیسا کہ مشہور ہے صحیح نہیں اگر یہ کہا جائے کہ تصرف کرنے کے لئے ارواح کا آنا ضروری نہیں دور سے بھی تصرف ہو سکتا ہے۔ جواب ارشاد فرمایا کہ احتمال تو ہے لیکن جب تک اس کی قوی دلیل نہ ہو اس احتمال کو قبول نہیں کیا جاسکتا محض امکان کافی نہیں۔

حق سبحانہ و تعالیٰ کیلئے صیغہ واحد کا استعمال خلاف ادب نہیں

حق تعالیٰ کا ادب سب سے زیادہ ضروری ہے مگر پھر بھی صیغہ واحد کا استعمال حق تعالیٰ کی جناب میں خلاف ادب نہیں کیونکہ عرف ہو گیا ہے اور عرف میں اللہ تعالیٰ کے لئے صیغہ واحد غالباً اس لئے اختیار کیا گیا کہ اس میں توحید پر زیادہ دلالت ہے اور صیغہ جمع میں توحید کی صراحت نہیں۔

مگر مجھے اپنے استاد رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے صیغہ جمع کے استعمال کی عادت ہو گئی ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ یونہی فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں کیونکہ صیغہ جمع میں تعظیم زیادہ ہے۔ رہا یہ کہ اس میں توحید کی رعایت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ توحید اس میں بھی محفوظ ہے کیونکہ علماء بلاغت نے لکھا ہے کہ مواحد البت الریبع البقل کہے تو اسناد مجازی ہوگی۔ اس طرح یہاں سمجھ لو۔

رہا یہ کہ قرآن میں بھی کہیں اس کی اصل موجود ہے یا نہیں۔ سو صیغہ تکلم میں تو بکثرت صیغہ جمع اللہ تعالیٰ

نے اپنے لئے اختیار فرمایا ہے اور خطاب کی صورت میں بھی ایک جگہ صیغہ جمع آیا ہے۔ قال رب ارجعون (پ ۱۸) اس میں اللہ کو صیغہ جمع کے ساتھ خطاب ہے اور گو اس میں دوسرا احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ جمع سے مراد تکرار فعل ہے رب ارجع رب ارجع مگر تکرار فعل کے لئے صیغہ جمع کا لانا خلاف ظاہر ہے اس لئے یہ احتمال بعید ہے اور اگر بعید بھی نہ ہو تو دوسرا احتمال بھی امت کے نزدیک محتلی بالقبول ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار و اتباع بھی جائز ہے بہر حال اس کی اصل بھی موجود ہے اور اس لئے یہ بھی جائز ہے مگر پھر بھی میں کسی ایک شق کو دوسری پر ترجیح نہیں دیتا کیونکہ ممکن ہے کہ اپنے استاد کی محبت کی وجہ سے اس شق کو پسند کرتا ہوں۔

فَاتَّخَذَ تَمُوهِمُ سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنسُوكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ

تَضَحِكُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: سو تم نے اُن کا مذاق مقرر کیا تھا یہاں تک کہ انکے مشغلہ دو تم کو ہماری یاد بھی بھلا دی اور تم ان سے ہلسی کیا کرتے تھے۔

تفسیری نکات

عباد مقبولین کا کام صبر ہے

غرض یہ احتیاط تھی کہ کسی کی تکفیر کرتے تھے نہ اپنی تکفیر سے برامانتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ جتنا رتبہ بڑھتا جاتا ہے جہلاء انکار کرتے جاتے ہیں حتیٰ کہ کتابوں میں لکھا ہے لا یكون الرجل صلیقاً حتیٰ یشہد علیہ سبعون صلیقاً انہ زندقاً۔ یعنی آدمی صدیق نہیں بنتا تا وقتیکہ ستر صدیق اس کو زندیق نہ کہنے لگیں۔ یعنی ایسے مرتبہ کو پہنچ جائے کہ مدعی صدق بھی نہ کہ حقیقی صدیق اس کی بات کو نہ پہنچیں اور اس وجہ سے اس کو زندیق کہنے لگیں۔ ایک صاحب نے حضرت حاجی صاحبؒ کی تکفیر کی تھی۔ حالانکہ حضرت حاجی صاحبؒ ایسے مغلوب الحال بھی نہ تھے جو یہ احتمال ہو کہ غلبہ حال میں کوئی بات خلاف شرع منہ سے نکل گئی ہوگی۔ آپ نے بیساختہ فرمایا کہ اگر میں عند اللہ مومن ہوں تو سارے جہان کی تکفیر مضر نہیں اور اگر عند اللہ کافر ہوں تو سارے جہان کا مومن کہنا مفید نہیں۔ مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا۔ میں نے کہا کہ ہاں اس شخص کو جائز ہے جس کو یہ یقین ہو جائے کہ میں اس سے بہتر ہو کر مروں گا۔ اس نے کہا کہ یہ مرنے کے قبل کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا تو بس مرنے کے بعد جائز ہوگا ورنہ جب تک خاتمہ نہ ہو لے اس وقت تک تو یہ حالت ہے۔

سگہ رشک برد فرشتہ برپا کی ما گہہ خندہ زند دیوزنا پاکی
ایماں چوسلامت بہ لب گور بریم احسنت بریں چشتی وچالاکی ما
ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی کا مقدمہ پیش ہو رہا ہے اور کچھ خبر نہیں کہ انجام کیا ہوگا۔ وہ شخص اپنے زعم
میں سمجھ رہا ہے کہ ہم پر جرم عائد نہیں ہوتا کیا خبر ہے کہ وہ زعم حاکم کے روبرو صحیح ثابت ہوگا۔ یا غلط چنانچہ اللہ
تعالیٰ خود مجرمین کو جتلائیں گے۔

فما تخلتوہم سخریا حتی السوکم ذکری وکتتم منہم تضحکون الی جزیتہم الیوم بما
صبروا انہم ہم الفائزون۔

اور اس سے اور بات بھی معلوم ہوئی کہ اس میں عباد مقبولین کا فعل صبر فرمایا اتتموا۔ نہیں فرمایا اس سے
معلوم ہوا کہ کسی کی ایذا پر صبر کرنا چاہیے نہ کہ انتقام۔

ایک شخص نے میرے پاس لکھا تھا کہ ایک شخص نے آپ کو گالیاں دیں میں نے اس کو خوب برا بھلا کہا۔
آپ دعا کیجئے کہ اس شخص کو اصلاح ہو جائے میں نے جواب میں لکھا کہ آپ پہلے اپنی اصلاح کیجئے کہ آپ
نے برا بھلا کہا میں نہیں چاہتا کہ میرے بارہ میں دو فرقتے ہوں اس عمل سے تو دو فرقتے ہو جائیں گے۔ ایک
برا کہنے والا۔ اور ایک بھلا کہنے والا۔ پھر دونوں میں خوب لڑائی ہوگی۔ فرقہ بندی ہوگی۔ اس سے تو ہم توبہ توبہ
ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درجہ میں ہو گئے کہ ان کے بارہ میں دو فرقتے ہیں نبی کا انکار تو بیشک کفر ہے اور
صحابہ وغیرہم کا انکار فسق ہے۔ باقی جس کی کشتی خود ہی ڈالو اس ڈول ہے اس کیلئے مجلس بنانا کتنی حماقت ہے۔

سُورَةُ النُّورِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

ترجمہ: زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد سو ان میں ہر ایک کے سوولے مارو

تفسیری نکات

آیت سرقہ السارق کی اور آیت زنا میں الزانیۃ کی تقدیم میں حکمت

اور مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایسے ادیب مشہور نہ تھے مگر مولانا کی تقاریر سے جو بہت سے مقامات مجھ کو منضبط بھی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ عربیت سے اس قدر مناسبت تھی کہ دیکھنے والا پھڑک جاتا ہے چنانچہ اس وقت ایک مقام یاد آ گیا آیت الزانیۃ والزانی اور آیت ہے یح کا اب مولانا کی توجیہ سنئے فرماتے تھے کہ سرقہ کا صدور مرد سے زیادہ عجیب اور قبیح ہے کہ وہ کما کر کھا سکتا ہے اور عورت میں عفت و شرم و حیا زیادہ ہوتی ہے اس سے زنا کا صدور زیادہ عجیب و قبیح ہے میں نے کسی تفسیر میں بات نہیں دیکھی جو حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی۔

والسارق والسارقة کے متعلق (پہلی آیت میں) الزانیۃ کی تقدیم اور (دوسری آیت میں) السارق کی تقدیم کے بارہ میں مشہور سوال ہے جس کا سب سے لطیف جواب منقول ہے کہ سرقہ کی بنا جرات ہے اور وہ مرد میں زیادہ ہے اور زنا کی بنا پر شہوت ہے جو عورت میں زیادہ ہے مگر اس جواب میں یہ خدشہ ہے کہ اس فرق کو بنا کہتے ہیں تو مجرم کی ایک قسم کی معذوری کا اظہار ہے اور یہ مقام

لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِمْ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمَّا يَتُوبُوا بِالشُّهَدَاءِ

فَأُولَئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَذِبُونَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ: واقعہ پر چار گواہ کیوں نہیں لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں۔

تفسیری نکات

واقعہ افک پر منطقی اشکال کا جواب

اسی واقعہ افک میں یہ ارشاد ہے کہ یہ لوگ اس دعوے پر چار گواہ کیوں نہ لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں شاید کسی قاضی مبارک پڑھنے والے کو شبہ ہو کہ یہ آیت تو منطق کے خلاف ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص نے کسی کو ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہو اور اس وقت کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو تو اب یہ شخص اگر اس واقعہ کی حکایت کرے گا تو واقع میں صادق ہوگا اور جب واقع میں صادق ہے تو عند اللہ بھی صادق ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا علم مطابق واقع کے ہے۔ حالانکہ اس آیت کی بنا پر عند اللہ وہ کاذب ہے کیونکہ چار گواہ وہ نہیں لاسکا مگر ان معقولی صاحب سے کہا جائے گا کہ تم آیت کا مطلب نہیں سمجھے یہاں عند اللہ کے معنی فی علم اللہ (اللہ کے علم میں) نہیں بلکہ فی دین اللہ (اللہ کے دین میں) یعنی فی قانون اللہ (اللہ کے قانون میں) مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دعویٰ زنا میں چار گواہ نہ پیش کر سکے تو وہ قانون خدا میں جھوٹا ہے گو واقع میں سچا ہو یعنی اس کے ساتھ معاملہ کاذب کا سا کیا جائے گا تو اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کا گو واقع میں کاذب ہونا متحقق نہ ہو مگر وہ قانون روایت کے موافق کاذب ہو تو اسے کاذب کہنا جائز ہے۔ خواہ عند اللہ بمعنی فی علم اللہ و فی الواقع (عند اللہ معنی فی اللہ کے ہے واقع میں) صادق ہی ہو۔

چنانچہ شریعت نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے۔

الولد للفراش جس کے فراش اور جس کے نکاح میں عورت ہے اولاد اسی کی ہے۔

اور یہی مطلب ہے اس مسئلہ فقیہ کا کہ جس عورت کا خاوند برسوں پردیس میں غائب رہے اور اس کے

اولاد ہو جائے تو وہ ثابت النسب ہے معنی یہ ہیں کہ قانون شرعی سے وہ لڑکا اس کا ہے یعنی اس کو حرامی کہنا اور اس

عورت کو بدکار کہنا حرام ہے اگر وہ شخص پردیس میں مرجائے تو یہ لڑکا اس کا وارث ہوگا ۱۲۔

سُوْطَن كَل لَّو دِلِل كِل ضرورت هَ

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَمَّا ذَلِمُوا بِالشَّهَادَةِ فَاوَلَّكَ عَدَالَةَ هُمُ الْكَلْبُونَ عِنْدَ اللَّهِ سَلَامَةً هِيَ هَاهَا
پرفی الدین اللہنی قانون اللہ یعنی شریعت کے قانون کی رو سے تم جموں لے ہو تمہارا کہنا سب غلط ہے پس اس تقریر کے
بعد یہ شبہ نہ رہا کہ محتمل الصدق کو جزا کیسے کاذب فرمادیتے تھے حکیم محمد مصطفیٰ صاحب نے اس آیت سے ایک عجیب
مسئلہ استنباط کیا ہے کہ حسن ظن کے لئے تو کسی دلیل کی ضرورت نہیں سو ظن کے لئے دلیل کی ضرورت ہے۔

بے تحقیق کوئی بات کرنا بڑا جرم ہے

تفصیل اس کی یہ ہے کہ منافقین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق ایک افتراء و بہتان باندھا تھا
جس کا لوگوں میں چرچا ہوا تو چند مسلمان بھی اس تذکرہ میں ملوث ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس
واقعہ سے سخت تکلیف پہنچی اور آپ وحی کے منتظر رہے مہینہ بھر کے بعد وحی نازل ہوئی اور حضرت صدیقہ کی برأت
نہایت شدد کے ساتھ ظاہر کی گئی اور جن مسلمانوں نے اس بہتان کا تذکرہ اپنی زبان سے کیا تھا ان کو
بہت دھمکایا گیا ان آیات کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند مسلمانوں پر حد قذف جاری
فرمائی انہی آیات میں سے ایک آیت یہ ہے جس کی میں نے تلاوت کی ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں جبکہ تم
اپنی زبانوں سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی
اور تم اس کو معمولی اور سرسری بات سمجھتے تھے حالانکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے (یعنی زبان سے
بے تحقیق کے بات نکالنا) پس تَقُولُونَ بِاللَّهِ حَمْدًا لِّمَّا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (اور اپنے منہ سے ایسی
بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی الخ) یہ ایک عمل کلی ہے جو مورد نزول کے علاوہ بھی بہت سے موارد کو
عام ہے اس وقت میں عمل کلی ہی پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس کے متعلق ایک قانون کلی ہے واقعہ جزئیہ کا بیان
اس وقت مقصود نہیں۔ حاصل اس قانون کلی کا یہ ہے کہ زبان سے بدوں تحقیق کے کوئی بات منہ سے نکالنا اللہ
تعالیٰ کے نزدیک بڑا جرم ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زبان کی احتیاط نہایت ضروری ہے بدوں تحقیق
کے زبان سے بات نکالنا ہرگز نہیں چاہیے۔

بے تحقیق بات کا زبان سے نکالنا جرم ہے

اذتلقونہ بالسننکم و تقولون باللہ الحکم مالیس لکم بہ علم (جبکہ تم اپنی زبانوں سے اس افترا کا
تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی) کیونکہ وہاں بھی تو ایک روای

اول تھا جس نے یہ بہتان تراشا تھا اور اس سے یہ بات مدینہ میں پھیلی تھی کیونکہ اول منافقین نے اس بات کا چرچا کیا تھا پھر کچھ مسلمانوں نے بھی منافقین سے سن کر تذکرہ شروع کیا تھا جس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں یہ نہیں کہا گیا کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ پہلے راوی کی گردن پر ہے) بلکہ یہ فرمایا گیا ہے ان اللین جاوا بالافک عصبه منکم لانحسبوه شر الکم بل هو خیر لکم لکل امرء منهم ما اکسب من الالیم کہ جن لوگوں نے یہ بہتان باندھا ہے وہ تمہارے ہی میں سے ایک جماعت ہے تم اس واقعہ کو اپنے لئے برا مت سمجھو بلکہ اس میں تمہارے لئے خیر ہے (ان میں سے ہر شخص کے لئے وہ ہے جو گناہ حاصل کیا ہے) کیونکہ ایک تو اس سے افتراء (یعنی حد قذف ۱۲) کا حکم معلوم ہو جائے گا دوسرے یہ معلوم ہو جائے گا کہ سنی سنائی بات کا نقل کرنا اور اس کا اعتبار کرنا جائز نہیں تیسرے آئندہ اگر کسی متقی پر اس قسم کا بہتان باندھا جائے گا تو حضرت صدیقہ کا واقعہ اس کے لئے تسلی کا باعث ہوگا کہ مجھ سے پہلے بھی بے گناہ آدمیوں کو بہتم کیا گیا ہے وغیرہ ذلک من الفوائد ۱۲ (اس کے علاوہ اور بھی فائدے ہیں) اس کے بعد ارشاد ہے کہ ان میں سے ہر شخص کے لئے گناہ کا حصہ ہے اس میں حق تعالیٰ نے سب کو گناہ کا قرار دیا راوی کو بھی اور ناقصین کو بھی اس کے بعد فرماتے ہیں والذی تولى کبره منهم له عذاب عظیم کہ جس شخص نے اس میں بڑا حصہ لیا یہ راوی اول ہے اس کے لئے بہت بڑا عذاب ہے پس یاد رکھو کہ اس معاملہ میں حق تعالیٰ تمہارے قانون پر عمل نہ کریں گے کہ دروغ برگردن راوی اول (جھوٹ کا گناہ راوی پر ہے) بلکہ اپنے قانون پر عمل فرمائیں گے جس کا بیان اگلی آیت میں ہے اذاللقونه بالستکم و تقولون بافوا حکم ما لیس لکم به علم ان میں مسلمانوں کو خطاب ہے کہ تم زبان سے اس بہتان کا تذکرہ اور چرچا کرتے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی۔ اس میں بتلادیا کہ بے تحقیق بات کا زبان سے نکالنا جرم ہے اور یہ بھی بتلادیا کہ تحقیق بھی ہو جائے تو اس کا چرچا کرنا اور خواہ مخواہ پھیلا نا دوسرا جرم ہے اگر کسی بات کی تحقیق بھی ہو جائے تو اس کو زبان سے نکالنا اسی حد تک جائز ہے جس حد تک ضرورت ہو اور ضرورت سے زیادہ پھیلا نا اور اس کا بے فائدہ چرچا کرنا پھر بھی جائز نہیں۔ مثلاً کسی کو کسی کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ یہ فلاں جرم کا مرتکب ہے تو امر بالمعروف کے طور پر خود اس شخص سے کہے کہ میں نے تیرے متعلق ایسا سنا ہے اگر یہ بات سچ ہے تو تم کو توبہ کرنا اور اس سے باز رہنا چاہیے اگر اس سے نہ کہہ سکے تو اس کے کسی مربی سے کہہ دے جو اس کو روک سکتا ہو اور یہ بھی اس وقت ہے جب تحقیق ہو جائے اور تحقیق نہ ہو تو پھر کسی سے بھی کہنا جائز نہیں نہ خود اس شخص سے نہ اس کے مربی وغیرہ سے پھر تحقیق کا طریقہ ہر کام کے لئے جدا ہے بعض امور میں دو عادل گواہ ضروری ہیں بعض میں چار پھر ان گواہوں میں بھی مشاہدہ سے گواہی ضروری ہے یہ نہیں کہ سب تمہاری طرح سنی سنائی کہتے ہوں پس جو بات منہ سے نکالنا ہو اس کے متعلق اول نفس سے سوال کیجئے کہ اس

کامنہ سے نکالنا جائز ہے یا نہیں؟ دو حال سے خالی نہیں یا تو آپ عالم ہیں یا جاہل ہیں اگر عالم ہیں تو قواعد شرعیہ سے جواب معلوم ہو جائے گا ورنہ کتابوں سے مراجعت کیجئے اور اگر جاہل ہیں تو آپ کو پہلے کسی عالم سے دریافت کرنا چاہیے یا بقدر ضرورت علم حاصل کرنا چاہیے۔ بہر حال اگر آپ نفس سے یہ سوال کریں گے تو اکثر واقعات میں یہی جواب ملے گا کہ یہ جائز نہیں اور کمتر یہ جواب آئے گا کہ جائز ہے اس پر دوبارہ نفس سے سوال کیجئے کہ اس کے منہ سے نکالنے میں کوئی فائدہ اور مصلحت بھی ہے اس کا جواب بھی اکثر یہی آئے گا کہ کوئی نہیں تو پھر اس بات کو ہرگز منہ سے نہ نکالو اور جس کے متعلق یہ جواب آئے کہ اس کا منہ سے نکالنا جائز ہی نہیں اس کے تو پاس بھی نہ جاؤ مگر یاد رکھو کہ ناجائز باتوں سے اسی وقت بچ سکتے ہو جب اس کی عادت ہو جائے کہ مباح اور ناجائز باتیں بھی بے ضرورت نہ کرو بس زیادہ تر سکوت اختیار کرنا چاہیے حدیث میں ہے من سکت مسلم و من مسلم نجی (جس نے خاموشی اختیار کی سلامت رہا اور جو سلامت رہا اس نے نجات پائی) اور ایک فارسی مصرعہ ہے

خاموشی معنی دار کہ در گفتن نمی آید
(خاموشی ایسے معنی رکھتی ہے جو کہنے میں نہیں آسکتے)

بلا تحقیق بات کرنا بہتان ہے

غرض دینی ضرورت سے اگر کسی کی غیبت کرے تو جائز ہے مگر ضروری ہونے کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ بات محقق ہوگئی ہو جو تم بیان کرنا چاہتے ہو اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی جائز نہیں کہ یہ غیبت محرمہ ہے اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے اسی کی نسبت حق تعالیٰ فرماتے ہیں اذ تلقونہ بالستکم و تقولون بالواہکم مالیس لکم بہ علم و تحسبونہ ہینا و هو عند اللہ عظیم (جبکہ تم اپنی زبان سے اس افتراء کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکالتے تھے جس کی تم کو تحقیق نہ تھی اور تم اس کو معمولی اور سرسری بات سمجھتے تھے حالانکہ خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بہت بڑا جرم ہے) یہ مختصر آداب ہیں کسی کے متعلق کوئی بات نقل کرنے کے۔ اب دیکھ لیا جائے کہ ہم لوگ ان کی کہاں تک رعایت کرتے ہیں عوام تو عوام بخدا اہل علم اور خواص بھی بہت باتیں بے ضرورت کہتے ہیں اور ان میں زیادہ تر بے تحقیق باتیں ہوتی ہیں اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہوتا تو آج کل کے اکثر ثقہ سنی ثابت ہوتے عموماً عادت یہ ہے کہ جہاں کسی سے کوئی بات سنی اور اس کو نقل کرنے لگے اور جوان سے پوچھا جائے کہ میاں اس کی تحقیق بھی کی تو کہتے ہیں تا نباشد چیز کے مردم گویند چیز ہا (جب تک کچھ حاصل ہی نہ ہو لوگ اس کا چرچا نہیں کرتے)

اذ تلقونہ بالستکم و تقولون بالواہکم مالیس لکم بہ علم و تحسبونہ ہینا و هو عند اللہ عظیم
(جب تم اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے ایک دوسرے سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو

کسی دلیل سے مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے) یہ سورہ نور کی آیتیں ہیں جن میں ایک خاص گناہ کو ہلکا سمجھنے کی مذمت کی گئی ہے و بحسبہ نہ ہیناً و هو عند اللہ عظیم (اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی بھاری بات ہے)

گناہ کو صغیرہ سمجھنا

اس میں نص ہے یہ قصہ اُفک کا ہے اس میں قذف اور بہتان کا بیان ہے اور اس کو ہلکا سمجھنے پر توجیح ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا خاص اسی گناہ کو جیسا کہ مقتضاً سبب نزول کا ہے یا ہر گناہ کا خواہ وہ کبیرہ ہو ہلکا سمجھنا برا اور مذموم ہے سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تخصیص کسی گناہ کی نہیں کیونکہ سبب نزول سے تو جگہ کی تخصیص ہو ہی نہیں کرتی۔ رہا شبہ تخصیص کا عظیم سے سو ہر گناہ کو وہ صغیرہ ہو اپنی حقیقت کے اعتبار سے عظیم ہی ہے کیونکہ حقیقت گناہ کی نافرمانی ہے اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی اور ظاہر ہے نافرمانی کو کسی قسم سے ہو زیادہ ہی بری ہے اور گناہوں کے درجات میں چو چھٹائی بڑائی کا تفاوت ہے وہ ایک امراضانی ہے کہ ایک بہت بڑا گناہ ہے اور یہ دوسرا اس سے چھوٹا اور نہ اصل حقیقت کے اعتبار سے سب گناہ ہی ہیں کسی کو ہلکا نہ سمجھنا چاہیے اس چھوٹے بڑے ہونے کی ایسی مثال ہے کہ جیسے آسمان دنیا عرش سے تو چھوٹا ہے مگر درحقیقت کوئی چھوٹی چیز نہیں دوسری مثال ناپاکی اور پلیدی کی ہے کہ پلیدی ناپاکی سے تھوڑی ہو یا بہت مگر حقیقت تو دونوں کی پلیدی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ جتنی کسی کی عظمت اور احسان ہوتا ہے اتنی ہی اس کی نافرمانی کرنا بری بات ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شان کے برابر نہ کسی کی عظمت نہ کسی کا احسان تو اس کی نافرمانی سب سے زیادہ بری ہوگی پس وہ اپنی اس حقیقت اور مقتضی کے اعتبار سے تقسیم ہی ہوگی اور اس کا مقتضایہ تھا کہ گناہ کا ارتکاب نہ کیا جاتا۔

چونکہ اس کی تحقیق اہل علم کے سمجھنے کے قابل ہے اس لئے اس کو بھی بیان کرتا ہوں اس معنی میں عند اس آیت میں ہے **فَاذْلَم يٰۤاَتُوۤا۟ بِالشَّهَادٰۤا۟ فَاوَلٰنٰكۡ عِنۡدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوۡنَ** یہ آیت حضرت عائشہ کے اُفک کے قصہ میں ہے قصہ طویل ہے اس کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں جتنا جزو اس قصہ کا یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو منافقین نے مہتم کیا کئی دن تک اس کا بہت جھچکا ہوا آخر ان کی براءت حق تعالیٰ نے قرآن میں اتاری اور منافقین کے بکواس کو رد کیا اس رد میں یہ آیت بھی ہے۔ **فَاذْلَم يٰۤاَتُوۤا۟ بِالشَّهَادٰۤا۟ فَاوَلٰنٰكۡ عِنۡدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوۡنَ** اس کا ترجمہ یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ گواہ نہیں لاسکے لہذا یہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں اس کا مدلول یہ ہوا کہ ان کے جھوٹے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ چار گواہ نہ لاسکے اب یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ کذب کس کو کہتے ہیں سب جانتے ہیں کہ کذب کے معنی حکایت خلاف واقع کے ہیں یعنی ایک کام واقع میں نہیں ہوا اور بیان کیا کہ ہوا ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ

شہادت نہ لاسکنا مستلزم کذب ہے اب فرض کیجئے کہ ایک شخص نے کسی کو حرام کرتے دیکھا اور اس کی حکایت بیان کی مگر گواہ نہ لاسکا تو اس آیت کی بموجب تو وہ کاذب ہے لیکن یہ حکایت مطابق واقع کے ہے اس پر تعریف کذب کی صادق نہیں آتی اور آیت اس کو کاذب کہتی ہے اور لطف یہ ہے کہ آیت میں عند اللہ کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک اور بلفظ دیگر حق تعالیٰ کے علم میں اور یہ مقدمہ مسلم ہے کہ حق تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے نہ علم صحیح نہ ہوگا تو عند اللہ کے مفہوم پر آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ یہ شخص جس نے حرام کو دیکھ کر حکایت بیان کی واقع میں بھی جھوٹا ہے یعنی اس نے واقع میں حرام نہیں کیا کیونکہ علم الہی میں اس کو کاذب قرار دیا گیا ہے اور علم الہی مطابق واقع کے ہوتا ہے تو اب یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ علم الہی خلاف واقع ہے یہ ایک سخت اشکال ہے قرآن پر مگر الحمد للہ حق تعالیٰ نے اس کا بہت سہل جواب دل میں ڈال دیا جس کو سننے کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ اشکال کچھ بھی نہ تھا اس کی بنا اسی پر ہے کہ قرآن میں محاورات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے صرف لفظی ترجمے اور لغت پر نہ رہنا چاہیے ایک لفظ کے لغوی معنی ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے مخاطب کو کوئی بات قابل شرح صدر حاصل نہیں ہوتی اور اسی کے ساتھ محاورہ کی رعایت کر دی جائے تو بالکل اطمینان ہو جاتا ہے اور سننے والا پھڑک اٹھتا ہے اور بہت سے اشکال رفع ہو جاتے ہیں۔ وہ جواب سنئے وہ یہ ہے کہ عند اللہ کے معنی یہاں فی علم اللہ کے نہیں ہیں بلکہ فی قانون اللہ کے اور فی دین اللہ کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ قانون شرعی اس صورت میں کہ شہادت نہ پہنچ سکی تہمت لگانے والوں کے لئے یہ ہے کہ ان پر حکم کذب کا کیا جائے گا یعنی ان کے ساتھ کاذب کا سا معاملہ کیا جائے گا چاہے واقع میں کچھ بھی ہو۔ اب کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ اشکال تو یہی تھا کہ علم الہی کا خلاف واقع ہونا لازم آتا ہے اور یہاں علم الہی مراد ہی نہیں صرف یہ معنی ہو گئے کہ قانون ان کو جھوٹا کہے گا قانون ایک ایسی چیز ہے جس میں ضابطہ دیکھا جاتا ہے جس کے کچھ قواعد مقرر ہوتے ہیں کہ جب تک ان کی موافق کام نہ ہو اس کو معتبر نہیں مانا جاتا۔

قانون میں ہر بات کے ثبوت کی ضرورت

چنانچہ تمام زمانہ کے عقلا کا قانون ہے کہ کوئی بات بے ثبوت نہیں مانی جاتی خواہ واقع میں وہ بات بالکل صحیح ہی ہو اگر یہ قانون نہ ہو تو دنیا کا نظام ہی بگڑ جائے ایک شخص دوسرے پر دعویٰ کر دے کہ اس نے میرا مال چرایا ہے بس قاضی کو چاہیے کہ اس پر چوری کا جرم قائم کر دے اور سزا دے دے دوسرا دعویٰ کر دے کہ اس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے بس قاضی فوراً اس کو قصاص میں مار ڈالے تو اس طرح تو ایک دن میں دنیا تہ و بالا ہو جائے دنیا کا نظام قانون الہی قواعد کی پابندی ہی سے رہ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شخص پر چار آدمیوں نے زنا کی شہادت دی اور یہاں تک کہا کہ ہم نے مرد اور عورتوں دونوں کو ننگے اور اوپر نیچے دیکھا مگر

یہ نہیں کہا کہ دخول ہوتے دیکھا تو حضرت عمر نے اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا اور مدعا علیہ پر زنا کو ثابت نہیں کیا بلکہ ان گواہوں کو جھوٹا قرار دیا اور ان پر قذف جاری کی اس کی وجہ کیا ہے یہی کہ ضابطہ پورا نہ ہو اور شہادت کی جو شرائط تھیں ایک جزو اس کا رہ گیا وہ یہ ہے کہ کامل فی الکلیہ دیکھا ہو حالانکہ ظاہر تو یہی ہے کہ جب مراد اور عورت ننگے ہو چکے تھے تو زنا بھی ضرور واقع ہوا جب ایسا موقع تھا کہ ننگے ہو سکے تو زنا سے کون مانع موجود تھا یہ بات بظاہر قریب یقین ہی کی تھی لیکن اس پر بھی جب کہ آنکھ سے دخول ہوتے نہ دیکھا گواہوں کے لئے زبان سے ان دونوں کو زانی کہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ چاروں گواہوں پر حد قذف لگائی گئی آج کل لوگ صرف وہم و گمان پر حکم لگا دیتے ہیں اور جو سمجھ میں آتا ہے کسی کی نسبت خیال پختہ کر لیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہ بلا علماء اور مشائخ کے یہاں بہت ہے۔ آج کل حضرت عمرؓ ہوتے تو بکثرت علماء اور مشائخ کے درے لگتے سب کی کرکری ہو جاتی اور یہ جو بڑے بڑے جیوں اور قلوب میں عیب چھپائے بیٹھے ہیں سب کی حقیقت کھل جاتی اس بات میں بڑی احتیاط چاہیے کہ دوسرے کی نسبت کوئی برا خیال قائم کیا جائے اور زیادہ اہتمام کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہ عادت اور طبیعت بات ہے کہ اپنی طرف برا گمان کم ہوتا ہے اور دوسرے کی طرف اچھا گمان کم ہوتا ہے اکثر کوئی شخص جب اپنی طرف دیکھتا ہے تو نظر اپنے ہنروں اور محامد ہی پر پڑتی ہے اور جب دوسرے کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے عیبوں اور برائیوں پر ہی پڑتی ہے جب یہ طبیعت بات ہے تو ان دونوں میں غلطی ہو جانے کا بہت قوی احتمال ہے لہذا سخت اہتمام کی ضرورت ہے کوشش کر کے صحیح طریقہ یہ اختیار کرنا چاہیے کہ اپنے ہنروں کو کبھی نہ دیکھے صرف عیبوں ہی کو دیکھے اور دوسرے کے عیبوں کو کبھی نہ دیکھے صرف ہنروں ہی کو دیکھے، حکف اس کی نگاہداشت بہت اہتمام اور پابندی کے ساتھ کرنے سے کچھ امید کی جاسکتی ہے کہ آدمی کی اصلاح ہو جاوے غرض بے ثبوت بات کہنے سے گناہ بھی ہوگا اور قانون شرعی تا وقتیکہ کہ کافی ثبوت باقاعدہ نہ ہو اس کو جھوٹا ہی کہے گا خواہ وہ بات واقع میں جھوٹی نہ بھی ہو یہ معنی ہیں عند اللہ کے یعنی فی قانون اللہ تو آیت کے معنی یہ ہو گئے کہ تہمت لگانے والے چونکہ اپنے دعویٰ پر باقاعدہ شہادت نہ لاسکے لہذا وہ قانون الہی میں جھوٹے کہے جاویں گے اور کذب کے احکام ان پر جاری ہوں گے چنانچہ تین صحابی کو جو بھولے پن سے اس قصہ میں شریک ہو گئے تھے حد قذف لگائی گئی اور منافقین چونکہ چالاکی سے اس شرارت میں حصہ لے رہے تھے بقول مشہور ثبوت نہ ہونے سے دنیا میں حد سے بچ گئے اور آخرت میں تو حزرہ چکھیں ہی گئے۔ غرض اس تقریر کے بعد آیت پر کوئی اشکال نہیں رہا اور فقہ کے بہت سے احکام کا یہی معنی ہے کہ بسا اوقات ضابطہ کے درجہ میں ایک حکم کو ثابت مانا جاتا ہے خواہ واقع میں کچھ بھی ہو مثلاً دو عادل آدمی گواہی دیں کہ ہم نے 29 کو چاند دیکھا ہے تو اب رمضان یا عید کو ثابت مانا جاوے گا اگرچہ انہوں نے جھوٹی ہی گواہی دی ہو اسی طرح بسا اوقات ایک حکم کو منافی مانا جاتا ہے خواہ واقع میں ثابت ہی ہو مثلاً ایک شخص کا ایک بچہ ہونے پر تہمت لگانے سے لعان ہوا تو اس بچہ کے نسب کی اس شخص سے نفی کی جاوے گی خواہ

واقع میں اسی کا ہوا اس کی صدہا نظیریں موجود ہیں تمام کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں لیکن اس کا علاج کیا کیا جائے۔ بہشتی زیور میں کوئی ایسا مسئلہ لکھ دینا جرم قرار پائے اور وہی مسئلہ اس کے صدہا نظیریں عربی کی کتابوں میں لکھی ہوں بلکہ ان کے اردو ترجمے میں بھی لکھے ہوں تو جرم نہیں۔

شکایت سے متاثر نہ ہونا

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آجکل عدل کا نام و نشان نہیں رہا اس کو تو دین کی فہرست سے خارج ہی سمجھ رکھا ہے۔ الحمد للہ میں ہمیشہ اس کا خیال رکھتا ہوں۔ بھائی مرحوم کے یہاں حاجی عبدالرحیم ملازم تھے۔ بڑے گھر میں سے مجھ سے ان کی کچھ شکایت کی میں نے ان کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے نفی کی۔ میں نے گھر میں سے کہا کہ شرعی ثبوت لاؤ تو انکار کرتے ہیں۔ وہ ثبوت پیش نہیں کر سکیں۔ تب میں نے کہا کہ بدوں شرعی کے کسی پر الزام نہیں لگانا چاہیے۔ انہوں نے توبہ کی ایسے موقع پر بڑی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں دونوں طرف تعلق ہو مگر شریعت کے اصول پر عمل کرنے کی صورت میں کچھ بھی مشکل یا دشواری نہیں ہوتی اور گود و شخص سے جو تعلق ہوتا ہے۔ اس میں فرق ضرور ہوتا ہے مگر عدل کے وقت دونوں کے مساوات ہونا چاہیے۔ میں نے خاص یہ صفت یعنی شکایت سے متاثر نہ ہونا۔ دو بزرگوں میں ایک خاص شان کی دیکھی ہے۔ یوں تو سب ہی بزرگوں میں اچھی صفات ہوتی ہیں مگر پھر بھی تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ ایک حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور ایک حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں سو حضرت مولانا صاحب تو شکایت سنتے ہی نہیں تھے فرمادیتے کہ میں سننا نہیں چاہتا اور حضرت حاجی صاحب سن کر فرمادیتے کہ سب جھوٹ ہے۔ وہ شخص ایسا نہیں حضرت حاجی صاحب کی اس عادت کی دلیل قرآن میں ہے۔ وہ یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے تہمت لگائی۔ حق تعالیٰ اس باب میں فرمادیتے ہیں لولا جازا علیہ باربعۃ شہداء فاذا لم یاتوا بالشہداء فاولئک عند اللہ ہم الکاذبون (یہ لوگ اپنے قول پر چار گواہ نہ لائے۔ سو اس صورت میں یہ لوگ موافق قاعدہ کے گواہ نہیں لائے تو بس اللہ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں۔

اور ”عند اللہ سے مراد ہے فی دین اللہ فی قانون اللہ“ اللہ کے دین میں اللہ کے قانون میں) آگے ارشاد ہے ولولا اذ سمعتموه قلتم ما یكون لنا ان نتکلم بهما سبحانک ہذا بہتان عظیم (اور تم نے جب اس بات کو اول سنا تھا تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہم کو زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے بھی نکالیں معاذ اللہ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے) اس سے صاف معلوم ہوا کہ حسن ظن کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں۔ سو ظن کی دلیل کا نہ ہونا یہی ہی کافی دلیل ہے۔ حسن ظن کی پس حضرت حاجی صاحب پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ بلا دلیل شاک کی کو کیسے کاذب فرمادیا۔ البتہ باوجود غلط سمجھنے کے اگر کسی دوسری بناء پر عمل کیا جاوے تو دوسری بات ہے جیسا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص کے متعلق شکایت کو جھوٹ سمجھا مگر انتظامی مصلحت کی بناء پر ان کو معزول کر دیا۔ (الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۱۹۹)

کشف بلا تلبیس بھی حجت نہیں

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ سے منصوص ہے کہ بعض کشف میں تلبیس بالکل نہیں ہوتی۔ مگر یہ تلبیس نہ ہونا مستلزم حجت کو نہیں یعنی اگر کشف بلا تلبیس بھی ہو تب بھی حجت نہیں جیسا اگر کوئی شخص ۲۹ رمضان کو عید کا چاند دیکھ لے مگر تفریق وجہ سے اس کی شہادت مقبول نہ ہو تو خود اس کو بھی رویت پر عمل جائز نہیں۔ یعنی صبح کو روزہ رکھنا واجب ہوگا۔ دیکھئے یہاں تلبیس نہیں مگر پھر بھی اس پر عمل جائز نہیں اس کی ایک تائید آیت سے ہوتی ہے قرآن پاک میں ہے لولا اذ سمعتموه ظن المؤمنون والمؤمنات الی قولہ تعالیٰ: سبحانک ہذا بہتان عظیم تقریر تائید یہ ہے کہ انہیں یہ فرمایا گیا کہ لولا جاء وا علیہ باربعة شهداء فاذا لم یاتوا بالشهداء فاولئک عند اللہ ہم الکاذبون حالانکہ شہداء کا نہ ہونا مستلزم نہیں کذب واقعی کو مثلاً خود مشاہدہ کر لیا مگر نصاب شہادت پورا نہیں ہوا۔ یہاں تلبیس بالکل نہیں مگر باوجود اس کے یہ مشاہدہ حجت نہیں حتیٰ کہ خود صاحب مشاہدہ کو بھی زبان سے اس کا تکلم کرنا جائز نہیں۔ اور دوسرے پر بھی واجب ہے کہ سنتے ہی کہہ دیں۔ ہذا بہتان عظیم (الاقاضات الیومین ج ۳ ص ۲۶۳)

قانون خدا میں جھوٹا

اب ایک آیت بھی سن لیجئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لولا جاء و اعلیہ باربعة شهداء فاذا لم یاتوا بالشهداء فاولئک عند اللہ ہم الکاذبون (یہ لوگ اس واقعہ پر چار گواہ کیوں نہیں لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں) اسی واقعہ تک میں یہ ارشاد ہے کہ یہ لوگ اس دعوے پر چار گواہ کیوں نہ لائے تو جب یہ گواہ نہیں لائے تو حق تعالیٰ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں شاید کسی قاضی مبارک پڑھنے والے کو شبہ ہو کہ یہ آیت تو منطق کے خلاف ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص نے کسی کو ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا ہو اور اس وقت کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو تو اب یہ شخص اگر اس واقعہ کی حکایت کرے گا تو واقع میں صادق ہوگا اور جب واقع میں صادق ہے تو عند اللہ بھی صادق ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا علم مطابق واقع کے ہے حالانکہ اس آیت کی بنا پر عند اللہ وہ کاذب ہے کیونکہ چار گواہ وہ نہیں لاسکا مگر ان معقولی صاحب سے کہا جائے گا کہ تم آیت کا مطلب نہیں سمجھے یہاں عند اللہ کے معنی فی علم اللہ (اللہ کے علم میں) نہیں بلکہ فی دین اللہ (اللہ کے دین میں) یعنی فی فسالون اللہ (اللہ کے قانون میں) مراد ہے مطلب یہ ہوا کہ جو شخص دعویٰ زنا میں چار گواہ نہ پیش کر سکے تو وہ قانون خدا میں جھوٹا ہے گو واقع میں سچا ہو یعنی اس کے ساتھ معاملہ کاذب کا سا کیا جائے تو اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص کا گو واقع میں کاذب ہونا متحقق نہ ہو مگر وہ قانون روایت کے موافق کاذب ہو تو اسے کاذب کہنا جائز ہے خواہ وہ عند اللہ بمعنی فی اللہ و فی الواقع (عند اللہ معنی فی علم اللہ کے ہے واقع میں) صادق ہیں (مطالعہ الاقوال للتحقیق مؤلفہ اصلاح فاخر ص ۳۰۲ ص ۳۰۵)

حسن ظن محتاج دلیل نہیں ہوتا

فرمایا: حسن ظن محتاج دلیل نہیں ہوتا۔ بلکہ فقدان دلیل سوء ظن بعینہ دلیل حسن ظن ہے۔
 دلیل میں آیت: ولو ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسهم خيراً (مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں
 نے اپنے آپس والوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا) ایک مرتبہ مجھ کو اس ملازمہ میں تردد ہوا کہ فاذا لم ياتوا باربعة
 شهداء فاولئك عندالله هم الكاذبون (سو جس صورت میں یہ لوگ (موافق قاعدہ کے) گواہ ہیں تو بس اللہ
 کے نزدیک جھوٹے ہیں) کس طرح مرتب ہوا۔ جواب یہ سمجھا یا کہ فاولئك عندالله اى عنددين اللهاور
 عند قانون الله و عند الشرع (پس وہ اللہ کے نزدیک یعنی اللہ کے دین اور اس کے قانون اور شریعت کے
 نزدیک) (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۲۵۸، ۲۵۹)

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۰۲﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

تفسیری نکات

منتہی سلوک کا مقام

فرمایا۔ منتہی سلوک طے کر کے اسی مقام پر پہنچتا ہے کہ واللہ يعلم و انتم لاتعلمون اللہ جانتے ہیں
 اور تم نہیں جانتے تو پھر شروع میں ہی کیوں نہ یہ عقیدہ رکھا جائے۔ خصوصاً صفات واجب میں کلام کرنا بہت
 خطرناک ہے سب مقدمات ظنیہ ہیں جن کو متکلمین نے یقینی سمجھا ہوا ہے مثلاً مسئلہ کلام قیاس الغائب علی
 الشاہد ہے اپنے کلام میں جو تعاقب دیکھا تو یوں سمجھنے لگے کہ وہاں بھی تعاقب ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں تعاقب
 نہ ہو حضرات صحابہ اور سلف کا سا عقیدہ رکھنا چاہیے بس اتنا کافی ہے کہ عالم جمیع اجزا حادث ہے اسی میں حیوانی
 اور صورت اور جزو لا يتجزی سب آگئے اور یہ اللہ تعالیٰ کے صفات میں کلام اور ارادہ جب موصوف کا
 ادراک نہیں تو صفت کا ادراک کیسے۔

وَلَا يَأْتِلْ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ

وَالْمَسْكِينِ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا

أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: اور جو لوگ تم میں (دینی) بزرگی اور (دنوی) وسعت والے ہیں اور اہل قرابت کو اور مساکین کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم یہ بات نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

تفسیری نکات

محبت آمیز نکیر

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح کی امداد بند کرنے کا ارادہ فرمایا تھا کیونکہ قصہ انک میں حضرت عائشہ کے متعلق ان کی زبان سے بھی کچھ نکل گیا تھا۔ آج بھی اگر کوئی واقعہ ایسا ہو جائے تو کوئی جنید وقت بھی اپنی زبان کی پوری حفاظت نہ کر سکے گا۔ کچھ نہ کچھ ہر شخص کی زبان سے نکل ہی جاتا ہے۔ یہ حضرات صحابہ ہی کا کمال ہے کہ منافقین کے اس قدر شور و شغب میں صرف دو تین صحابہ کی زبان سے بے احتیاطی ہوئی باقی سب محفوظ رہے۔ مجملہ ان دو تین کے ایک حضرت مسطح بھی تھے۔ ان کی زبان سے بھی کوئی بات نکل گئی۔ جب وحی سے حضرت عائشہ کی براءت ثابت ہو گئی تو حضرت صدیق کو مسطح پر غصہ آیا کیونکہ یہ حضرت صدیق کے قریبی عزیز بھی تھے اور حضرت صدیق ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے اس لئے یہ آپ نے قسم کھالی کہ اب سے میں مسطح کی امداد نہ کروں گا تو حق تعالیٰ نے آیت ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعة ان یؤتوا اولی القربی والمساکین والمہاجرین فی سبیل اللہ میں حضرت صدیق کو اس ارادہ سے منع فرمایا کہ روزی بند کرنے کی قسم نہ کھانا چاہیے اور گویا ہر اس آیت میں حضرت صدیق پر نکیر ہے مگر محبت آمیز نکیر ہے کیونکہ اس میں حضرت صدیق کی اول تعریف بھی کی گئی ہے کہ اصحاب فضل کو یعنی جن کو فضیلت دینیہ حاصل ہے اور اصحاب وسعت کو یعنی جن کو خدا نے مالی وسعت دی ہے اپنے قرابت دار اور مہاجر مسکینوں کی امداد بند کرنے کی قسم نہ کھانا چاہیے اس میں حضرت صدیق کی یہ تعریف ہے کہ ان کو خدا نے دینی فضیلت بھی عطا کی ہے اور دنیوی وسعت بھی عنایت کی ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ وسعت دنیویہ مذموم نہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء کسب کمال سے منع کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے بلکہ اس کے مآل سے منع کرتے ہیں اگر کوئی شخص مآل سے مغلوظ ہونے کا انتظام کر لے تو اس کے لئے وسعت دنیویہ مذموم نہیں۔ پھر اس میں حضرت مسیح کی بھی تعریف ہے کہ وہ مسکین ہیں، مہاجر ہیں مستحق امداد ہیں۔ اس بلیغ عنوان میں جس قدر ترغیب و تخصیص ہے ظاہر ہے۔

اس کے بعد حضرت صدیق کو ایک مراقبہ کی تعلیم ہے۔ **الاحسبون ان يغفر الله لكم والله غفور رحيم**۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائیں۔ یعنی اگر تم اپنے خطا کاروں کی خطا معاف نہ کرو گے تو اگر خدا تعالیٰ بھی ایسا ہی کرنے لگیں تو کیا ہو؟ آخر تم بھی تو کسی کے خطاوار ہو۔ پس اگر یوں چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ تمہاری خطائیں معاف کر دیں تو تم اپنے خطاواروں کو معاف کر دیا کرو۔ یہ سن کر حضرت صدیق ہلہل گئے اور کہا ہلی احب ان يغفر الله لي۔ بیشک میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری خطا معاف فرمادیں۔ اس کے بعد حضرت مسیح کی امداد بدستور جاری کر دی اور مدت العمر کبھی بند نہ کی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ لَأُوذِينَ فِي الدُّنْيَا

وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

ترجمہ: جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاک دامن ہیں اور ایسی باتوں کے کرنے سے (بالکل) بے خبر ہیں اور ایمان والیاں ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی جاتی ہے اور ان کو (آخرت میں) بڑا عذاب ہوگا۔

تفسیری نکات

ضروری تعلیم

اس میں یہی ضروری تعلیم مذکور ہے اور یہ آیت خاص واقعہ میں نازل ہوئی اس واقعہ کے تو بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں حکایات بیان کرنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ ان واقعات میں جو فیصلہ کیا گیا ہے اور وہ فیصلہ ہے ضرورت عامہ کا اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہے غرض آیت گو ایک واقعہ خاص میں نازل ہوئی ہے مگر مخصوص نہیں ہے اس واقعہ کے ساتھ کیونکہ ہر واقعہ کے لئے ایک قانون ہوتا ہے سو اگر قانون اس واقعہ کے قبل بنا ہوا ہے تب تو قبھا اور اگر بنا ہوا نہیں ہے تو اس کے لئے قانون بنایا جاتا ہے اور جب تک حکومتی

رہتی ہے وہ قانون جاری رہتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ واقعات کا انحصار ہو نہیں سکتا اس لئے قوانین کلیہ بنائے جاتے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت واقعات کو ان قوانین میں داخل کر سکیں اس سے فقہاء کے اس کہنے کا راز معلوم ہو گیا کہ۔ لا عبرة لخصوص الموردہ بل لعموم الالفاظ

یعنی خصوص مورد کا اعتبار نہیں بلکہ عموم الفاظ کا اعتبار ہے مثلاً کوئی آیت کسی خاص موقع میں نازل ہوئی تو وہ اسی موقع کے ساتھ خاص نہ ہوگی بلکہ جو واقعہ بھی اس کی مثل پیش آئے گا تو وہ اس کو بھی شامل ہوگی جیسے

وہل للمظلمین اللدین اذا اکتالوا علی الناس بسو فون واذا کالوہم او رزبوہم بخسرون۔
بعض اہل کیل ووزن کے بارہ میں نازل ہوئی ہے مگر ان ہی کے ساتھ خاص نہ ہوگی بلکہ جو بھی کم ناپے تو لے گا سب کو اس آیت کی وعید شامل ہوگی اسی طرح بہت سی آیات ہیں کہ موارد ان کا خاص ہے مگر حکم عام ہے اور یہ عقلی مسئلہ ہے اس میں زیادہ تفصیل کرنے کی حاجت نہیں اسی طرح یہ آیت باوجود یہ کہ واقعہ خاص میں نازل ہو مگر حکم عام ہے اب سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ کیا فرماتے ہیں حق تعالیٰ اس آیت کے اندر ایک مضمون خاص بیان فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو محفوظ ہیں اور جنہیں خبر نہیں اور ایمان والیاں ہیں ان پر دنیا میں بھی لعنت ہوگی اور آخرت میں بھی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا (آخرت میں) یہ تو ترجمہ کا حاصل ہے کہ پاک عورت کو تہمت لگانے والے پر لعنت ہے۔ اب سمجھئے کہ کسی کلام سے جو مقصود ہوتا ہے اس کو اصطلاح میں عبارة الہی کہتے ہیں اور وہ مقصود ہی ہے جو ترجمہ کے حاصل میں بیان کیا گیا مگر مجھ کو اس وقت اس مقصود کا بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کا ایک اور مدلول بھی ہے جو مقصود نہیں مگر آیت اس پر دلالت کرتی ہے جس کو اصطلاح میں اشارة الہی کہتے ہیں۔

صفات نسواں

اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود ہے اور وہ مضمون ہے اور وہ مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں عورتوں کی اچھی صفات بیان کی ہیں اور وہ صفات اعلیٰ درجہ کے ہیں۔ مجھ کو ان صفات میں گفتگو کرنا مقصود ہے تاکہ عورتیں اپنے اندر ان صفات کے پیدا کرنے کی کوشش کریں سو آیت میں غور کرنے سے اور لفظوں کے دیکھنے سے وہ تین صفات ہیں جن سے متصف ہونے والیوں کو تہمت لگانے والے پر لعنوا کو مرتب کیا ہے تو وہ صفات پیدا کرنی چاہئیں پس ایک صفت المحصنات ہے ایک صفت المغفلت ہے اور ایک صفت المومنات ہے حاصل ترجمہ محصنات کا ہے پارسا عورتیں اور لغفلت ترجمہ ہے حفاظت کی گئیں یعنی ان کو پارسائی کے خلاف باتوں سے محفوظ رکھا گیا دوسری صفت یہ ہے غافلالت یعنی بے خبر بھولی بھالیاں تیسری صفت ہے المومنات یعنی ایمان والی سو آیت میں بظاہر یہ صفات منتشر یعنی غیر مربوط اور غیر مرتب معلوم ہوتی ہیں کیونکہ پہلے المحصنات

ہے پھر الغفلت پھر المومنات حالانکہ ظاہر مقتضائے ترتیب یہ تھا کہ المومنات کو پہلے لاتے کیونکہ ایمان کا درجہ مقدم ہے سب چیزوں سے مگر ایسا نہیں کیا بلکہ محسنات کو مقدم کیا مومنات پر اس میں ضرور کوئی بڑا نکتہ ہے بات یہ ہے کہ کلام حق تعالیٰ کا ضروری رعایتوں کا نہایت جامع ہے اور اس میں اس قدر تدریج ہے کہ ضروریات اصلاح کے متعلق جتنے امور ہیں ان کا ضبط اس میں اس قدر کافی ہے کہ کسی کلام میں نہیں ہو سکتا پس نظر غائر کرنے سے یہ صفات آپس میں مربوط بھی ہیں یعنی ان میں باہم علاقہ بھی ہے اور مرتب بھی ہیں۔

کمالات دین دنیا

اس کے لئے پہلے ایک مقدمہ بیان کرنا ہوں وہ یہ کہ انسان میں دو کمال پیدا کئے گئے ہیں اور ان ہی کمالات کو بڑھانا انسان کو ضروری ہے ایک کا نام قوت علمیہ اور دوسرے کا قوت عملیہ اور کوئی شخص ایسا نہیں جو اس میں اختلاف رکھتا ہو خواہ وہ دنیا کا طالب ہو یا دین کا طالب ہو وہ دنیا دار ہو یا دین دار وہ جاہل ہو یا عالم وہ منطقی ہو یا فلسفی ہو۔ آخر کوئی نہ کوئی کام تو کرے ہی گا اور کرنے کا تعلق ہے قوت عملیہ سے۔ اگر قوت عملیہ سے نہ ہو تو اس کام کو کر ہی نہ سکے گا اور قوت علمیہ سے اس کی حقیقت جانے کا اور اگر اتفاقی طور پر اس طرح کرے کہ قصد کو اختیار کو اس میں دخل ہی نہ ہو تو وہ بحث سے خارج ہے مثلاً کوئی تجارت کرتا ہے تو اس کو ایک تو تجارت کے اصول جاننا چاہیے اور پھر وہ اصول برتنا چاہیے کوئی شخص کھیتی کرتا ہے تو پہلے طریقہ کھیتی کا معلوم کرے پھر کھیتی کرتا چاہیے اسی طرح نوکری ہے کہ پہلے اس کے اصول جاننا چاہیے اس کے بعد قوت عملیہ سے کام شروع ہوتا ہے میں کہاں تک مثالیں عرض کروں۔ یہ بات اس قدر ظاہر ہے کہ زیادہ مثالوں کا محتاج نہیں۔ غرض انسان میں ایک قوت علمیہ ہے جس سے نفع و ضرر کو پہچانتا ہے دوسری قوت عملیہ ہے اور انسان میں اصل بھی دو کمال ہیں باقی جتنے کمال ہیں وہ سب اسی کی فرع ہیں اور عورتیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں پس ان کے بھی کمالات یہی دو ہوں گے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن شریف میں اور اسی طرح جتنی کتابیں دین کی ہیں ان میں ان ہی کمالات سے بحث ہوگی جو دین کے متعلق ہوں گو دنیا کے کمالات کی تحصیل بھی ناجائز نہیں سو قرآن شریف کے دو کام ہوں گے ایک تو کمالات دینی کا بتلانا دوسری جس عمل میں مضرت آخرت کی ہو اس سے روکنا جیسے طبیب کا کام ایک پرہیز کا اور دوسرے دوا کا بتلانا ہے۔ یہ اس کے ذمہ نہیں کہ لذیذ کھانوں کی ترکیب بتلایا کرے حکیم محمود خاں کے ذمہ یہ ہے کہ دواء اور پرہیز بتلا دیں گلگلہ پکانے کی ترکیب بتلانا یہ کام حکیم محمود خاں کا نہ ہوگا۔ اگر مریض نے اجازت چاہی کسی کھانے کی تو ترکیب اس کھانے کی خوان نعمت میں ملے گی۔ طبیب ہونے کی حیثیت سے ترکیب کھانے کی ان کے مطب میں نہ ملے گی۔ اگر کوئی ان سے کھانے کی ترکیب پوچھنے لگے تو ان کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ ہمارا کام یہ

نہیں ہے جاؤ کسی باورچی سے سیکھو۔ اگر خوش ہو کر بتلا دیں تو یہ ان کی عنایت ہوگی مگر ان کے ذمہ نہیں ہاں ان کا یہ نصب ہے کہ جو چیز مریض کو معزز نہ ہو اسکی اجازت دے دیں اور اگر معزوزیکھیں تو روک دیں اسی طرح سے علماء کے ذمہ جو کہ قرآن شریف کے نقل کرنے والے ہیں یا یوں کہے کہ قرآن شریف کے ذمہ دو چیزیں ہیں ایک امراض روحانی کی دوا بتلانا دوسرے پرہیز بتلانا اور یہ اس کے ذمہ نہیں کہ وہ دنیا کے کمالات کے طریقے بتلایا کریں کہ بیچ میں فلاں چیز بڑھتی ہے خریف میں یہ بڑھتی ہے مشین یوں چلتی ہے گھڑی یوں بنتی ہے پتلی گھریوں تیار ہوتا ہے کپڑا یوں بنا جاتا ہے۔ یہ قرآن شریف کے ذمہ نہیں ہے ہاں اگر آپ ان چیزوں کو کمال سمجھیں تو قرآن شریف اجازت دیتا ہے کہ ان کے کرنے میں حرج نہیں مگر یہ اجازت ہی تک ہے کہ آخرت کی معزز نہ ہو جیسے طبیب جب کسی غذا میں مریض کے لئے معزز دیکھتا ہے تو اس کو فوراً روک دیتا ہے اسی طرح شریعت جس وقت دیکھے گی کہ فلاں امر میں معزز ہے آخرت کی اویہ بات مریض روحانی کو معزز ہوگی تو فوراً روکے گی سو قرآن شریف کی تعلیم کافی ضرور ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں زراعت بھی ہو تجارت بھی ہو مشین چلانے کی ترکیب بھی ہو کپڑا بننے کا طریقہ بھی ہو بلکہ اس میں آخرت کے قوانین ہیں بعض تو منسل ہیں اور جہاں کلام اللہ مجمل ہے وہاں حدیث سے اس کی تفسیر ہوگئی ہے اور یہ سب قرآن شریف ہے جو مختلف رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے باقی یہ کہ اس میں تجارت بھی ہو زراعت بھی ہو سو یہ عیب ہے کسی فن کی کتاب کے واسطے کہ اس میں مقصوداً دوسرے فن کے مسائل ہوں مثلاً طب اکبر میں امراض کا بیان ہے اس لئے کہ وہ طب کی کتاب ہے ایک شخص نے خیال کیا کہ کبھی ضرورت جوتے سینے کی پڑ جاتی ہے کبھی ضرورت تجارت وزراعت کی بھی واقع ہو جاتی ہے اس لئے اس نے طب اکبر میں یہ تصرف کیا کہ شروع میں دو ورق تو امراض اس کے لکھے پھر جو تیاں سینے کا بیان لکھ دیا۔ پھر دو ورق امراض حق کے لکھ دیئے اس کے بعد تجارت یا زراعت کے متعلق کچھ لکھ دیا یا پھر دو ورق امراض معدہ کے لکھے۔ پھر کچھ مضمون کپڑا سینے کا لکھ دیا بتلائے انصاف سے کہ ایسی کتاب کو دیکھ کر عقلاء کیا کہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اب مذاق اڑائیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ طب اکبر کا کمال نہ ہوگا اس کا کمال تو یہی ہے کہ اس میں طب ہی کے مسائل ہوں اسی طرح قرآن شریف میں اگر ایسا ہوتا تو قرآن شریف کا کمال نہ ہوتا اس کا کمال تو یہی ہے کہ اس میں دین کے طریقے بتلائے جائیں ہاں معاش سے ممانعت نہ ہونی چاہیے جبکہ طریقہ مباحہ سے ہو مقصود میرا یہ ہے کہ میں اپنی اس وقت کی تقریر میں جب لفظ کمال کہوں گا تو اس سے کمال دینی مراد ہوگا۔ سو کمال دینی دو چیزیں ہیں ایک قوت علمیہ اور ایک قوت عملیہ اور یہی دو کمال عورتوں کے لئے بھی ہیں پس حق تعالیٰ نے اس مقام پر تین کلمے ارشاد فرمائے ہیں ایک المحصنات یعنی حفاظت رکھی ہوئی بچائی ہوئی عورتیں دوسرا المؤمنات یعنی ایمان والی تصدیق کرنے والی عورتیں۔ میں پہلے ان ہی دو کلموں کو لیتا ہوں (الغافلہ کا بیان آئندہ ہے) سو سمجھئے کہ ایمان نام ہے خاص

علوم کا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کی اطلاع رسول کی معرفت دی ہے اور ان باتوں کو سچا جاننا۔ ان علوم کا نام درجہ یقین میں ایمان ہے پس اس ایک لفظ میں اشارہ ہے قوت علیہ کی طرف یعنی المؤمنات میں اور دوسرے میں اشارہ ہے قوت عملیہ کی طرف یعنی المحصنات

اور یہ دونوں کمال جب عورتوں کی طرف منسوب ہیں تو معلوم ہوا کہ جیسے مرد کمال ہو سکتے ہیں اسی طرح عورتیں بھی کمال ہو سکتی ہیں اور جیسے خود مردوں کی نوع میں تفاوت ہے ایسے ہی عورتوں کی نوع میں بھی تفاوت ہے۔

اور عورتوں کے کمال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرد جیسے کمال ہوتے ہیں یہ ویسی ہو جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنی استعداد کے موافق کمال ہو سکتی ہیں خواہ مردوں کے برابر نہ ہوں اور عورتوں کے کمال کے حکم پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ تو بروئے نرس ناقص ہیں پھر ان کو کمال کیسے کہا جاسکتا ہے بات یہ ہے کہ عورتوں میں دو قسم کے نقصان ہیں ایک تو مردوں کے نوع کے مقابلہ میں۔ سو اس کا تدارک تو غیر اختیاری ہے اور اکتساب کو اس میں دخل نہیں اور ایک اپنی نوع کے لحاظ سے اس کا تدارک ہو سکتا ہے اور وہ مکتسب اور اختیاری ہے اور یہ نقصان مبدل بکمال ہو سکتا ہے بہر حال عورتوں کو بھی ایک کمال علمی حاصل ہو سکتا ہے جس کو ایمان کہا گیا ہے۔ دوسرا کمال علمی حاصل ہو سکتا ہے جس کو احسان فرمایا ہے اور چونکہ ایمان نام ہے علوم خاصہ کا اور علم مقدم ہوتا ہے عمل پر اس لئے اس کا متقاضیہ تھا کہ المؤمنات کو مقدم لایا جاتا المحصنات پر المحصنات کو مقدم لانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ علم مطلقاً فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ اس کا زیادہ حصہ ذریعہ ہے عمل کا اور مقصود علم سے عمل ہی ہے۔

علم و عمل

پس چونکہ اس اعتبار خاص سے عمل مقدم ہے علم پر اس لئے المحصنات کو پہلے لائے اور المؤمنات کو بعد میں یہاں یہ نکتہ ہے مقدم لانے میں اور اعتبار خاص سے میں نے اس لئے کہا کہ دوسرے اعتبار سے علم مقدم ہے عمل پر وہ یہ کہ بدوں علم کے عمل نہیں ہو سکتا۔ مگر ہیں دونوں ضروری علم بھی اور عمل بھی یہ نہیں کہ جو شخص عمل نہ کرتا ہو وہ علم بھی حاصل نہ کرے جیسا بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ جب عمل ہی نہیں ہو سکتا تو احکام جاننے سے وعظ سننے سے کیا فائدہ بات یہ ہے کہ جب دونوں فرض ہیں تو جس نے علم حاصل کیا گو عمل نہ کیا تو وہ ایک ہی جرم کا مجرم ہوا کیونکہ اس نے ایک ہی ضروری چیز کو چھوڑا اور جس نے علم بھی حاصل نہ کیا ہو وہ دو جرم کا مجرم ہوا کیونکہ اس نے دو ضروری چیزوں کو ترک کیا اور اس کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا کہ علم اس لئے حاصل نہیں کرتا کہ علم سے پھر عمل کرنا پڑے گا کیونکہ عمل تو پھر بھی فرض ہی رہے گا اس جاہلانہ عقیدہ پر ایک حکایت یاد آئی ایک شخص نے مسئلہ سنا تھا کہ چاند دیکھ کر روزہ فرض ہو جاتا ہے آپ گھر کے اندر گھس کر بیٹھ رہے کو اڑ بند کر لئے کہ نہ چاند دیکھوں گا نہ روزہ فرض ہوگا۔ کئی روز وہیں گزر گئے وہاں ہی کھانا وہاں ہی گھنا۔ بی بی پانچخانہ اٹھاتے اٹھاتے تنگ ہو گئی بس ہاتھ پکڑ

کرنکال باہر کیا جنگل میں آپ اپنے قضائے حاجت کی ضرورت ہوئی تالاب کے کنارہ پر پہنچے سر جھکائے ہوئے تھے کہ کہیں چاند نظر نہ پڑ جائے بے چارہ اتنا جانتا تھا کہ پانی کے اندر عکس ہوتا ہے تالاب کے کنارہ بیٹھے تو پانی میں چاند نظر پڑا اور روزہ فرض ہو گیا آپ کہتے بھلے ہیں ہم تو تجھے دیکھتے نہیں تو زبردستی آنکھوں میں گھسا جاتا ہے پس جیسے اس نے سمجھا تھا کہ جو چاند نہ دیکھے روزہ فرض نہیں ہوتا ایسے ہی بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر علم حاصل نہ کریں گے تو عمل ہی فرض نہ ہوگا سو یاد رکھئے کہ فرض دونوں چیزیں ہیں علم بھی اور اس اعتبار سے علم کا حاصل کر لینے والا گو اس نے عمل نہ کیا ہو اس سے اچھا ہے جس نے علم و عمل دونوں حاصل نہ کئے ہوں ہاں زیادہ مقصود بے شک عمل ہے اور اسی وجہ سے المحسنات کو مقدم لائے المؤمنات پر گویا اس میں عمل کی مقصودیت کی طرف اشارہ کر دیا کہ ہم یہاں اس کو اس لئے مقدم کرتے ہیں کہ عمل کو زیادہ مقصود سمجھو اور اس میں رد ہو گیا ان لوگوں کا جو محض تعلیم ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور عمل کا اہتمام نہیں کرتے چنانچہ بعض لوگ علم دین حاصل کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا کمال حاصل کر لیا میں نے اس مذاق کے علماء کو دیکھے ہیں کہ بس علم حاصل کر کے اپنے کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں اور سارے مسلمانوں کو بیچ در بیچ سمجھتے ہیں اور ان کو ناز ہوتا ہے اپنے علم پر حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں فرماتے ہیں فرحوا بما عندہم من العلم کہ جو علم ان کے پاس تھا اس پر اترا نہ لگے۔

صفات نسواں

ایک تو یہ کہ یہاں تین صفتیں بیان ہوئیں المحصنت، الغفلت، المؤمنات دو صفت میں تو صیغہ سلم فاعل کالائے یعنی الغافلوات المؤمنات مگر المحصنات صیغہ اسم مفعول کالایا گیا محصنات صیغہ اسم فاعل کا ارشاد فرمایا گیا بات یہ ہے کہ اس طرح لانے سے ہمیں ایک سبق بھی دیا ہے جس کی ضرورت چودھویں صدی میں آ کر واقع ہوئی وہ یہ کہ اس میں مردوں کو پردہ کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ المحصنات کے معنی ہیں پارسا رکھی ہوئی عورتیں مرد ان کو پارسا رکھیں ان کے ذمہ ہے پارسا رکھنا معلوم ہوا کہ عورت اکیلی کافی نہیں جب تک مرد اس کو محفوظ نہ رکھے اسم فاعل کے صیغے سے یہ بات حاصل نہ ہوتی۔

اس لئے مفعول کا صیغہ لائے دوسری یہ بات کہ بیچ میں غافلوات کالفظ کیوں اس کی کیا ضرورت تھی بات یہ ہے کہ اس کے بیچ میں ہونے سے دونوں صفتوں میں اتصال ہو گیا اشارہ اس طرف ہے کہ قوت علیہ اور عملیہ کا کمال اس پر موقوف ہے کہ وہ غافلوات بھی ہوں یعنی ان کے خیالات محدود ہوں عرفی تبادلہ خیالات نہ ہوں تب ان کا علم و عمل مقصود باقی رہ سکتا ہے مردوں کے لئے تو وسیع خیالات کا ہونا کمال ہے اور عورتوں کے لئے یہ کمال ہے کہ غیر وسیع الخیال ہوں ان کا مکان بھی محدود آنا جانا بھی محدود ہو علم بھی محدود یعنی صرف دین ہی کا علم ہو اس زمانہ میں دونوں نکتوں کے مقتضائے کے خلاف کیا جا رہا ہے ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا

وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تُذَكَّرُونَ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جب تک اجازت حاصل نہ کرو اور ان کے درہنہ والوں کو سلام نہ کرو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

تفسیری نکات

مسئلہ استیذان

یہ مسئلہ استیذان ان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بغیر استیذان ان کے کسی کے گھر میں داخل نہ ہو اور یہ آیت مجمل ہے اس میں استیذان ان کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی کہ کب تک اجازت مانگا کریں۔ حدیث میں اس آیت کی شرح ہے کہ تین مرتبہ اجازت چاہو۔ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ چوتھی بار مت پوچھو کہ مخاطب تنگ ہوگا اور یہ مردانہ اور زنانہ دونوں کے لئے ہے لیکن مردانہ قطعاً مختلف قسم کے ہوتے ہیں بعض ان میں سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہاں آنے کی ہر شخص کو اجازت ہوتی ہے جیسے حکام کی عدالتیں یا مجلس عام وہاں استیذان ان کی ضرورت نہیں ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں استیذان ان کی ضرورت ہے بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ وہاں بیٹھنے کی غرض قرآن سے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خلوت ہے اور علی العموم سب کو آنے کی اجازت نہیں۔ تو شریعت کا حکم ہے کہ اگر قرآن سے معلوم ہو جائے کہ اس وقت اس شخص کو خلوت مقصود ہے تو بغیر استیذان ان وہاں ہرگز نہ جاؤ پھر کیا کوئی صاحب اس پر عمل کرتے ہیں اور اگر کوئی کرتا ہے تو اس کو طعن کیا جاتا ہے نیز حکم ہے کہ اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے آؤ۔ آج یہ حالت ہے کہ ایک مرتبہ کوئی اجازت نہ دے پھر دیکھئے جو عمر بھر اس طرف رخ بھی کریں کیوں صاحب اگر وہ آزاد نہ ہو تو طلب اجازت کیا ہوئی یہ تو محض اطلاع ہوئی کہ ہم آگئے ہیں۔

معاشرت کا ایک علمی نکتہ

معاشرت کا مسئلہ قرآن شریف میں کئی مقام پر مذکور ہے چنانچہ ایک آیت میں ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو

اور اس آیت کا بھی مدلول ہے جس کو شروع میں تلاوت کیا گیا ہے جیسا کہ مذکور ہوا کہ اس میں معاشرت کے دو مسئلے بیان فرمائے گئے ہیں اور یہاں ایک علمی نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ دو حکم یہاں مذکور ہیں اس میں اول کو ثانی پر کیوں مقدم فرمایا۔

سوجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ ان میں دوسرا حکم اول سے اشد و اشدق ہے کیونکہ سچ میں تو مجلس سے نہیں اٹھنا پڑتا اور الشروا میں مجلس سے ہی اٹھا دیا ہے۔ اس لئے نفس حوا کو مقدم کیا تاکہ تعلیم اور عمل میں تدریجی ترقی ہو۔ یعنی اول سہل پر عمل کرنے سے اطاعت کی عادت پڑے پھر اشد کا کرنا بھی آسان ہو اور عجب نہیں کہ حکم ثانی پر رفع درجات کا ترتیب بھی اسی لئے ہوا ہو۔

یعنی چونکہ الشزوا کا حکم نفس پر اسی وجہ سے زیادہ شاق تھا کہ اس میں عار آتی ہے تو اس پر عمل کرنا غایت تواضع ہے اور تواضع کی جزا رفعت ہے۔ اس لئے اس پر رفع کو مرتب فرمایا۔

پس آیت میں دونوں حکموں میں عنوان کے اعتبار سے ایک تفاوت تو یہ ہوا کہ پہلے عمل کو فراخی پر مرتب فرمایا جو کہ عادتاً مال کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے اور مال کم درجہ کا مطلوب ہے اور دوسرے عمل پر رفع درجات کو مرتب فرمایا جو کہ جاہ کے ذریعے سے ہوتا ہے اور جاہ بہ نسبت مال کے اعلیٰ درجہ کا مطلوب ہے سو یہ تفاوت تو اسی لئے ہوا کہ عمل اول نفس پر سہل تھا اس لئے جزاء بھی اس کی دوسرے درجہ کی ہوئی اور عمل ثانی نہایت شاق تھا اس لئے جزاء بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوئی۔ تو عمل ثانی کے متعلق جو وعدہ ہے وہ گویا من تواضع اللہ رفعہ اللہ کا ہم مضمون ہوا کہ غایت تواضع کی وجہ سے رفع درجات کا ثمرہ مرتب ہوا۔

دوسرا تفاوت عنوان میں یہ ہے کہ ثمرہ اول میں لکم بصمیم خطاب فرمایا اور ثمرہ ثانی میں یوفع اللہ اللین امنوا منکم والذین اتوا العلم درجات، یہ تخصیص بعد تقسیم فرمایا۔ یعنی ثمرہ اول میں تمام مؤمنین کی درجہ مساوات میں خطاب عام ہے اور ثمرہ ثانی میں اہل علم کو تخصیص بعد تقسیم کے طور پر اہل ایمان میں سے خاص کر کے بھی خطاب فرمایا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ سچ کوئی امر شاق نہ تھا۔ اس میں بہت کم احتمال تھا نیت کے صاف اور خاص نہ ہونے کا۔ تو اس کے احتمال میں سب مؤمنین قریب قریب یکساں ہوں گے۔ بخلاف دوسرے عمل کے کہ نفس پر بہت شاق ہے اس میں احتمال ہے کہ بعضے لوگ محض وضع داری سے اٹھ کھڑے ہوں اور اس میں وہ مخلص نہ ہوں اور خلوص میں زیادہ دخل ہے علم کو کیونکہ اس سے اس کے وقائق معلوم ہوتے ہیں اس لئے اس میں علم والوں کی تخصیص بعد تقسیم فرمائی کیونکہ اہل علم میں احتمال بدرجہ اول پایا جائے گا اس لئے وہ خلوص میں دوسرے مؤمنین سے زیادہ ہوں گے۔

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ذَلِكَ

أَزْكَى لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے بے شک اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے جو کچھ لوگ کیا کرتے ہیں۔

تفسیری نکات

حفاظت شرم گاہ کا بہترین ذریعہ

یہی نکتہ ہے کہ جس آیت میں غض بصر اور حفاظت فرج دونوں کا حکم ہے اس میں حق تعالیٰ نے امر غض بصر کو مقدم کیا ہے ارشاد ہے قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ یعنی کہہ دیجئے مؤمنین سے کہ اپنی نگاہیں نیچی کریں یعنی نظر سے بچیں اس حکم کو مقدم کیا دوسرے حکم پر یعنی یہ حفظو الفروجہم پر یعنی اصل فعل سے بچنے پر اس کی وجہ یہی ہے کہ غض بصر ذریعہ ہے حفاظت شرم گاہ کا اور ذریعہ آسان ہوتا ہے اسی واسطے اس کو اختیار کیا جاتا ہے معلوم ہوا کہ اصل فعل یعنی زنا سے بچنا اتنا آسان نہیں جتنا نظر کو بچالینا آسان ہے ثابت ہوا کہ غض بصر کوئی زیادہ مشکل کام نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت مقدسہ نے آسانی کے واسطے تدبیر تھلائی ہے اور اسی واسطے پردہ کا حکم رکھا ہے لوگ کہتے تو ہیں کہ پردہ کی کیا ضرورت ہے۔ اصل گناہ یعنی زنا نہ کیا جاوے پردہ ہو یا نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ذرائع کو اختیار کرنے کے بعد بھی اگر مقصود میں کامیاب ہو جائے تو بہت ہے چہ جائیکہ ذرائع کو اختیار ہی نہ کیا جاوے اور کامیابی کی امید رکھی جائے میں کہتا ہوں کہ پردہ کے بعد بھی زنا سے بچ جاؤ تو بڑی بات ہے کیونکہ شیطان کے شر سے کہیں بے پردگی ہو جاتی ہے اور پردہ کو توڑ کر امید رکھنا کہ زنا سے حفاظت رہے گی محض حماقت ہے ان لوگوں نے شرعی انتظام کو بالکل لغو سمجھا ہے۔

پردہ کی ضرورت

ذرا بتائیں کہ یہاں یغضوا کو یحفظوا پر مقدم کرنے میں کیا حکمت ہے سوائے اس کے کہ حفاظت فرج کے لئے وہ ذریعہ ہے شریعت کو اتنا اہتمام حفاظت کا منظور ہے کہ اس کے لئے ذرائع کے اختیار کرنے کا حکم دیا نیز

شریعت کے نزدیک حفاظت فرج اس قدر مشکل ہے جس کے لئے ذریعہ کو ضروری بتلایا اور براہ راست کامیابی کو عادتاً ناممکن قرار دیا مگر یہ شخص جو پردہ کا مخالف ہے شریعت میں صلاح دینا چاہتا ہے کہ وہ تو ایک کام کو اتنا مشکل سمجھتی ہے اور یہ ان کو آسان سمجھیں صاحب تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ جہاں پردہ نہیں ہے وہاں زہانی دعوے جو کچھ بھی ہوں لیکن زنا سے حفاظت مطلق نہیں ہے۔

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارہم ویحفظوا فروجہم ذلک ازکی لہم۔ سب سے اول مقدمہ اس بے ہودگی (یعنی زنا) کا بھی نظر ہے۔ اول نظری پڑتی ہے پھر دوسرے آتے ہیں اس لئے چاہیے کہ ابتدائی مقدمہ کا پورا انسداد کرے۔

یعنی نگاہ کو پست رکھے پھر اور مفسد اس پر مرتب ہی نہ ہوں گے۔ اسی واسطے ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا ہے النظر مہم من مہام ابلیس کہ نظر ایک تیر ہے شیطان کے تیروں میں سے۔ یہ ایسا تیر بے کمان ہے کہ نشانہ سے خطا ہی نہیں کرتا۔ اور پھر یہ کہ تیر تو چلایا اس نے مگر لوٹ کر اسی کے چبھ گیا۔ یہ ایسے غضب کی چیز ہے کہ اس کا مارا ہوا بہت کم بچتا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے اول اسی کا انسداد فرمایا ہے چنانچہ فرمایا

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارہم۔ آپ مومنین سے کہیے کہ وہ اپنی نگاہوں کو پست رکھیں۔

یہ غضب بھر مقدمہ ہے زنا سے محفوظ رہنے کا۔ باقی اگر کوئی شخص کہے کہ اندھے بھی تو زنا میں مبتلا ہوتے ہیں تو میں جواب میں حصر کا دعویٰ کرتا ہوں کہ بدوں نگاہ کے وہ بھی زنا میں مبتلا نہیں ہوتے جہاں کہیں بھی زنا میں ابتداء ہوگا نگاہ ہی کی وجہ سے ہوگا۔ البتہ نگاہ عام ہے خواہ نگاہ حقیقی ہو یا تقدیری۔

اندھوں کی نگاہ تقدیری ہوتی ہے۔ اندھے سوچتے ہیں تصور کرتے ہیں صورت کو نگاہ میں لاتے ہیں۔ یعنی نگاہ قلب سے اس کو دیکھتے ہیں اور تصور سے مزے لیتے ہیں پھر زنا پر اقدام کرتے ہیں۔ عادتاً یہ ممکن نہیں کہ صورت کی طرف بالکل التفات نہ ہو اور پھر ایسی بے ہودگی سرزد ہو محض توجہ بلا واسطہ صورت سے کسی کی طرف رغبت نہیں ہوتی بلکہ یہ اندھے اپنے تصور میں امور خارجیہ سے استدلال کرتے ہیں اس کی صورت پر کہ وہ ایسی ہے اور ویسی ہے اس طرح دل کو رغبت ہوتی ہے۔

غرض میں حصر کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ شہوت کے متعلق جو خرابی ہوتی ہے نگاہ ہی سے ہوتی ہے اس لئے نگاہ کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ نگاہ تو برائے نام نیچی کر لیتے ہیں مگر ذیادہ نظر سے کام کر رہے ہیں بزم خود یغضوا من ابصارہم پر عمل ہے مگر خدا کے خوف سے نہیں بلکہ محض نمائش کے لئے کہ لوگ یوں کہیں گے کہ نگاہ بازی کرتے ہیں نگاہ تو نیچی کر لی مگر شعاعوں کو نہیں ہٹاتے حالانکہ شعاعوں کے ہٹانے پر قدرت ہے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ خود ادھر ادھر گوشہ چشم سے شعاعوں کو نکالتے ہیں اور ان ہی سے

اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں اسی کے بارہ میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں يعلم خائنة الاعین خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مخلوق کے دکھانے کو نیچی نظر کر لینا کافی نہیں مخلص کو تو بہ کالو گے مگر خدا کو کیسے دھوکہ دے سکتے ہو۔

از برائے مسکہ دوغے میزنی	گہہ گہہ آوے ودوغے میزنی
در غلط اندازی تاہر خاص و عام	خلق را گیرم کہ بفریبی تمام
با خدا تزویر و حیلہ کے رواست	کارہا با خلق آری جملہ راست
رایت اخلاص و صدق افراشتن	کاربا اور است باید داشتن

خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صاف رکھنا چاہیے اسی واسطے حق تعالیٰ فرماتے ہیں يعلم خائنة الاعین و ما تخفی الصدور کہ اللہ تعالیٰ خیانت والی آنکھوں اور دلوں کے بھید کو بھی جانتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے کہ ان کی نگاہ تو ایسی آزاد نہیں نہ دیدہ بازی نہ دزدیدہ نظری ہے مگر ان کا مذہب یہ ہے دل کے آئینہ میں ہے تصویر یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی دل ہی دل میں خیال جما کر مرے لے رہے ہیں اس کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں و ما تخفی الصدور کہ جو تمہارے دل میں چھپا ہوا ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

دیکھو! سنبھلو! تعجب ہے کہ تم نے آنکھ کی حفاظت تو مخلوق کی وجہ سے کر لی مگر جس کی اطلاع محض خدا تعالیٰ کو ہے اس کی حفاظت نہ کی یعنی دل کی تو ہم کو خدا تعالیٰ کی شرم نہ ہوئی بلکہ لوگوں کی شرم ہوئی۔ یہ امور ہیں پیش نظر کرنے کے قابل۔ ان امور میں ہدی کو ہوس پر ترجیح دینے کا یہ طریقہ ہے کہ ایسے مواقع میں شریعت کے حکم پر عمل کرے محض اپنی خواہش و ہوی پر عمل نہ کرے۔ اس طرح انتظام رکھو گے تو نگاہ پست ہو جائے گی۔

مراقبہ خشیت

حق تعالیٰ نے اسی جگہ یعنی غرض بصر کی آیت میں قلب کی اصلاح کے لئے ایک طریقہ ارشاد فرمایا ہے یعنی ہم کو ایک مراقبہ سکھلایا ہے اس مراقبہ کو پہنچتے کر تو اس مراقبہ سے خشیت پیدا ہوگی اور وہ خشیت ہی امراض قلب کا علاج ہے۔ خشیت کا ملکہ راسخ ہو جائے تو تقاضا معصیت کا نہیں رہتا اس مراقبہ کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے

قل للمؤمنین یٰٰھذا من ابصارہم و یٰٰحفظو انہم و جہم ذلک ازکی لہم ان اللہ خبیر بما یصنعون
یہ ان اللہ خبیر بما یصنعون وہ مراقبہ ہے بس معصیت کے وقت اس کا مراقبہ کر لیا کرو کہ اللہ کو سب خبر ہے ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ سب سے خبر دار ہیں اس سے خدا تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہوگا پھر معصیت کی ہمت نہ ہوگی کس قدر جامع تعلیم ہے سبحان اللہ! مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محض یہ اعتقاد کر لو

اللہ میاں کو سب خبر ہے بلکہ اس کا استحضار و استمرار کرنا چاہیے یعنی دل میں ہر وقت یہ خیال حاضر رکھو کہ خدا تعالیٰ کو سب خبر ہے اس سے خوف پیدا ہوگا۔ بیبت ہوگی یہ اصلاح قلب جو علم باطن کے متعلق ہے پس علم ظاہری تو محض افعال کا انتظام کرتا ہے اور علم باطن اسباب کا علاج کرتا ہے۔

قل للمؤمنین یغضوا من ابصارہم ویحفظوا فروجہم
دوسری جگہ ارشاد ہے

الذین یمشون علی الارض ہوناً یعنی غاضبین ابصارہم

سمت امن

اہل لطائف نے لکھا ہے کہ شیطان نے بنی آدم کو بھکانے کی چار سمتیں بیان کی ہیں ثم لاینبہم من بین یدیہم و من خلفہم و عن ایمانہم و عن شماء لہم۔ اور دو سمتوں کو بیان نہیں کیا یعنی فوق اور تحت اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سمتیں محفوظ ہیں لیکن اوپر سے مراد دہلی کے چاندنی چوک کا کوٹھا نہیں بلکہ آسمان مراد ہے لیکن ہر وقت اوپر دیکھنا بہت دشوار تھا اس لئے سب سے اسلم سمت تحت ہے باقی چار سمتیں قدام، خلف، یمن، شمال ان کی یہ حالت ہے کہ ان کی طرف دیکھنے میں اکثر انسان فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نظر بد سے بچنا غیر اختیاری نہیں

ایک شخص میرے پاس آئے جو بوڑھے ہو گئے تھے مگر نظر بند میں مبتلا تھے غرض وہ بوڑھے شخص مجھ سے ملے کہ اس میں کوئی سہل تدبیر بتلاؤ کہ میں اس مرض سے نجات پاؤں۔ میں نے کہا کہ سہل کی قید سے تو یہ سلسلہ غیر متناہی چلے گا۔ آج آپ مرض کے ازالہ کی سہل تدبیر پوچھتے ہیں کل کو اس تدبیر کو سہل کرنے کے لئے اگر وہ سہل نہ معلوم ہوئی دوسری تدبیر پوچھیں گے۔ اس میں کچھ دشواری پیش آئی تو پھر اس کی سہولت کے لئے اور تدبیر پوچھیں گے۔ اس طرح تو مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ بس سہولت کی فکر نہ کیجئے۔ بجز ہمت کے اس کا کوئی علاج نہیں۔ ایک دفعہ پختہ عزم کر لیجئے کہ چاہے کتنی ہی تکلیف ہو ہرگز نگاہ اوپر کونہ اٹھاؤں گا اور جو کبھی اٹھ جائے تو فوراً نیچی کر لیجئے۔ اس ترکیب سے ان شاء اللہ مرض زائل ہو جائے گا۔ اس کے بدوں زوال ممکن نہیں وہ کہنے لگا کہ میں چھوڑنے پر قادر ہی نہیں ہمت کیسے کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا کہ یہ آپ غلط کہتے ہیں۔ آپ یقیناً چھوڑنے پر قادر ہیں اور دلیل سے میں نے ان کو سمجھا دیا کہ آپ قادر ہیں۔ وہ دلیل یہ تھی کہ حق تعالیٰ شانہ کا ایک طرف تو یہ ارشاد ہے۔

لا يكلف الله نفسا الا وسعها

کہ حق تعالیٰ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے

دوسری طرف یہ ارشاد ہے

قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم و يحفظوا فروجهم

کہ مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو اپنی نگاہوں کو نیچے رکھیں اور شرم گاہوں کو محفوظ رکھیں۔

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ نگاہ نیچی کرنے پر بندہ قادر ہے۔ اس لئے کہ اس کے متعلق حق

تعالیٰ کا حکم ہے اور ان کا کوئی حکم طاقت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ میرے سامنے تو وہ اس دلیل میں تاویل نہیں نکالتے رہے

مگر گھر جا کر جو انہوں نے اس میں غور کیا اور خط بھیجا کہ واقعی میں غلطی پر تھا۔ انسان ہر گناہ سے بچنے پر قادر ہے۔

البتہ پہلے پہل کلفت ضرور ہوتی ہے اس کے بعد یہ کلفت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پھر عادت ہو جاتی ہے۔

صاحبو! انسان میں ارادہ وہ قوت ہے کہ اس کے ساتھ وہ تمام مخلوق پر غالب آ سکتا ہے۔ صاحبو! تمہارے

ساتھ دو لشکر ہیں۔ ایک ملائکہ اور ایک شیاطین کا اور ان دونوں میں مقابلہ رہتا ہے۔ ایک چاہتا ہے کہ تم کو بدی سے

بچائے اور دوسرا چاہتا ہے کہ تم کو گناہ میں پھنسائے اور ان لشکروں کی ہارجیت تمہارے ارادہ پر موقوف ہے۔ جس

کی طرف تمہارا ارادہ ہو جائے وہی غالب ہو جائے گا۔ اگر آپ نے گناہ کا ارادہ کر لیا تو لشکر ملائکہ پسپا ہو گیا۔ اب

وہ غالب نہیں ہو سکتا اور اگر گناہ سے بچنے کا ارادہ کر لیا تو لشکر شیطان مغلوب ہو گیا۔ اب وہ کبھی غلبہ نہیں کر سکتا۔

افسوس آپ میں اتنی بڑی قوت موجود ہے اور پھر آپ یوں کہتے ہیں کہ ہم گناہ چھوڑنے سے عاجز ہیں۔

ظلمت معصیت

صاحبو! آپ عاجز ہرگز نہیں۔ ہاں یوں کہتے کہ ابھی تک چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور ارادہ نہ کرنے کی وجہ

یہ ہے کہ گناہ کی عظمت اور اس کا خوف دل میں نہیں۔ گناہ کو ایک معمولی چیز سمجھ رکھا ہے اور جس گناہ کی عظمت دل

میں ہے اس میں کسی طرح کی بھی کوئی تاویل منہ سے نہیں نکلتی۔ کیونکہ دیکھئے گناہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو کہ

صرف شریعت مقدسہ میں حرام ہیں۔ دوسرے وہ جو کہ قانون اور شریعت دونوں کے اعتبار سے ناجائز ہیں۔

بتلائیے ان گناہوں میں آپ کیا برتاؤ کر رہے ہیں جو کہ قانون کی رو سے ناجائز ہیں اور موجب سزا ہیں۔ ظاہر

ہے کہ سب اس سے اجتناب کریں گے۔ ڈاکہ کوئی نہیں مارتا۔ چوری شریف آدمی بالکل نہیں کرتے یہاں تک

کہ راستوں میں پیشاب تک نہیں کرتے کیونکہ قانوناً جرم ہے۔ کیوں صاحب اگر کوئی ڈاکو کہنے لگے کہ میں اپنے

عیال کو بدوں ڈاکہ کے پال نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے تو کیا حاکم اس کا یہ عذر قبول کر

لے گا اور کیا اس کو سزا نہ دے گا؟ یا چوری بھی عذر کرنے لگے تو کیا اس کو رہا کر دیا جائے گا؟ حاکم صاف کہہ دیتا ہے

کہ ہم یہ باتیں نہیں سننا چاہتے۔ تم نے خلاف قانون کام کیا ہے تم کو پھانسی دی جائے گی۔
اے اللہ کے بندو! ایک جواب حاکم دنیا کے سامنے نہیں چل سکتا۔ وہ خدا کے سامنے پیش کرتے ہوئے
کچھ تو شرمانا چاہیے۔ (المراد ملحقہ مواعد دنیا و آخرت ص ۲۹ تا ۳۱)

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ

عَلَى جُيُوبِهِنَّ

ترجمہ: اور (اسی طرح) مسلمان عورتوں سے (بھی) کہہ دیجئے کہ (وہ بھی) اپنی نکاحی
رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت (کے مواقع) کو ظاہر نہ کریں مگر جو اس
(موقع زینت) میں سے (غالبا) کھلا رہتا ہے (جس کے ہر وقت چھپانے میں حرج ہے) اور اپنے
دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں۔

تفسیری نکات

چہرہ اور بازوؤں کے پردہ میں داخل ہونے کی مدلل بحث

بعض لوگوں نے آیۃ نور لایسین زینتھن الاما ظہر منها میں ما ظہر منها کی تفسیر جو وجہ اور کفین
کے ساتھ منقول ہے اس سے عدم وجوب استتار وجہ کفین پر استدلال کیا ہے آیا یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں؟
اول ما ظہر منها کی تفسیر متعین نہیں۔ یہ قول ابن عباس سے منقول ہے اور حضرت ابن مسعود سے اس کی
تفسیر ثیاب و جلباب کے ساتھ منقول ہے۔ والقولان مع القوال اخر منقولان فی الدر المنثور۔ جب یہ
تفسیر محتمل ہوئی تو محتمل سے استدلال صحیح نہیں کیونکہ قول اخیر پر آیت میں وجہ کفین کے استثناء کی کوئی دلیل نہیں اور
بعد تسلیم بھی یہ استدلال باطل ہے اور منشاء اس کا جہل ہے پانچ امر سے۔ خود جملہ ظہر منها کے معنی سے بھی
۳۶ اور لایسین کے سابق (بالمواحدہ) و سابق (بالختامیۃ) سے بھی ۵۴ اور اس آیت سے مقدم فی النزول بعض
آیات سے بھی اور دوسری موخر فی التلاوة غیر معلوم المقدم والتاخر فی النزول آیت سے بھی چنانچہ سب کے متعلق
عرض کرتا ہوں۔ امر اول۔ ما ظہر فرماتا اور ما ظہر نہ فرماتا (باوجودیکہ اور سب صبح مذکورہ فی الآیۃ میں فاعل
نساء کو قرار دیا گیا ہے جیسے یعضضن۔ یحفظن۔ لایسین۔ یضربن۔ یخمرھن۔ لایضربن بار جلھن

وال ہے اس پر کہ یہ ظہور من غیر اظہار ہے۔ امرثانی یفرضن من ابصارهن و یحفظن فروجهن۔ امرثالث۔ لایضربن بارجلهن۔ امررابع سورۃ احزاب کی (جو کہ سورۃ نور سے نزول میں مقدم ہے کذا فی الاتقان) آیتیں قولہ تعالیٰ وقرن فی بیوتکن قولہ تعالیٰ واذاسالتموهن متاعا قولہ تعالیٰ یدنین علیہن من جلابیہن۔ امرخامس۔ آیہ والقواعد من النساء اللاتی لا یرجون نکاحا اور چونکہ ان امور خمسہ میں کوئی تعارض نہیں۔ کما سیبضح اور اسی لئے کسی نے ان میں مؤخر کو مقدم کا ناخ نہیں کہا اس لئے یہ پانچوں کے پانچوں واجب الاخذ ہونگے پس مجموعاً مورخسہ پر نظر کر کے تقریر مقام کی یہ ہوگی کہ آیت وقرن فی بیوتکن اور آیت واذاسالتموهن سے عورتوں پر استتار اشخاص کا واجب کیا گیا اور اصل حکم اور عزیمت یہی ہے لیکن کبھی خروج عن البیت کی بھی حاجت واقع ہوتی ہے ایسی حالت میں یدنین علیہن من جلابیہن سے اظہار اشخاص میں رخصت دی گئی اور استتار ابدان کو واجب فرمایا گیا پھر کبھی گھر سے بعض کو جن کے پاس خادم نہ ہوں بعض اسے کاموں کی ضرورت واقع ہو جاتی ہے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں اور اس لئے ہاتھ کا استتار موجب حرج ہوتا ہے اور کام کرنے کے وقت اس کام کے دیکھنے کی بھی حاجت نہیں ہے اور گھونگٹ سے منہ چھپانے میں وہ گھونگٹ ابصار میں حائل ہو جاتا ہے اور اس لئے چہرہ کا استتار بھی موجب حرج ہوتا ہے ایسی حالت میں الاماظہر منها سے بنا بر تفسیر مشہور صرف اظہار وجہ و کفین کی رخصت دی گئی ہے اور بقیہ بدن کے استتار کو واجب فرمایا گیا اور چونکہ یہ ضرورت بوجہ خدمت مولیٰ کی امام میں زیادہ وسیع تھی اس کی رخصت میں زائد توسیع کی گئی۔

کما هو مبسوط فی کتب الفقہ۔ پس جواز اظہار وجہ کفین صرف حالت حرج فی الاستتار کے ساتھ مخصوص ہے اور بعض نے قد میں کو بھی کفین کے ساتھ ملحق کیا ہے اور بعض نے لیس کفین کے مانع مشی نہ ہونے کے دونوں میں فارق بتلایا ہے اور اس تکمید بحالۃ الحرج پر دلائل مستقلہ کے علاوہ خود صیغہ ظہر میں بھی دلالت ہے جس کی توجیہ یہ ہے کہ عورت اپنے کسی عضو کو جو کہ تفسیر ہے زینت کی (خواہ بالطلائقہ کو مجازاً بھی ہو خواہ بالالتزام المستعبر عند اہل العربیۃ اس طرح کہ جب زینت جو کہ مبان ملابس ہے اظہار جائز نہیں۔ تو مواضع زینت کا جو جزو ہے اظہار تو کیسے جائز ہوگا) ہرگز ظاہر نہ کرے (وہذا مدلول قولہ تعالیٰ ولا یدنین زینتھن) لیکن اگر ایسی حالت ہو کہ اس میں وجہ و کفین کا استتار کا قصد و اہتمام بھی کرتی ہے تب بھی وہ اضطراراً بلا قصد اظہار خود بخود ظاہر ہو جاتے ہیں کیونکہ اس ضروری کام کے ساتھ استتار جمع نہیں ہوتا ایسی حالت میں بمعیار الضروری یتقدر بقدر الضرورة اس عارض کے سبب اسی قدر ان کی کشف کی اجازت ہے پس یہ حکم عارض کے سبب ہے اور اصلی حکم وہی استتار ہے۔ پس استثناء کے یہ معنی ہیں نہ یہ کہ اصلی حکم بالقصد وجہ و کفین کا کشف ہو اور استتار کسی عارض سے ہو۔ اور اس کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مقام اپنے سیاق و سباق سے انسداد فقہ کو مقصود بتلار ہا ہے

چنانچہ بغضضن اور یخفظن اور لایحفظن اور لایضربن ہاں جلہن سب اس انسداد کی مقصودیت میں نص ہے اور احادیث نے توفیقہ کے اسباب بعیدہ تک کا انسداد کیا ہے تو ایسی حالت میں وجہ و کفین اور خصوص وجہ کا (جو کہ مٹی ہے تمام فتن کا اور اس کا انکار نہ صرف بصیرت بلکہ بصارت کے فقدان کا بھی اقرار ہے) قصداً انکشاف آیت کا مدلول کس طرح ہو سکتا ہے ورنہ اجزاء آیت میں تعارض ہو جاوے گا کہ ادنیٰ عاقل کے کلام میں بھی ممتنع ہے تو حکیم علی الاطلاق کے کلام میں کیسے جائز ہوگا اور یہ مسئلہ خود مستقل ہے کہ وجوب استتار وجہ و کفین اور وجوب استتار بقیہ بدن یہ دونوں وجوب ایک نوع سے ہیں یا دونوں سے مثل فرض علمی و عملی کے جس کا مشہور عنوان یہ ہے کہ ان میں کوئی عضو عورت فی نفسہ ہے کون نہیں سو یہاں اس سے بحث نہیں۔ جو امر یہاں مقصود ہے یعنی مطلق وجوب استتار اس میں یہ سب برابر ہیں جیسے عورت غلیظہ و غیر عورت غلیظہ نفس وجوب ستر میں برابر ہیں مگر غلط و عدم غلط میں متفاوت ہیں اور چونکہ عادتاً ہاتھ سے کام کرنے میں اگر خاص طور پر خیال نہ رکھا جاوے۔ سر اور گلا کھل جاتا ہے اس لئے ولہضربن بخمرہن سے اس کا انتظام فرما دیا۔ پھر یہ حکم اصلی وجوب استتار وجہ و کفین بنا بر اطلاق الفاظ آیت عام تھا شواب و عجز کیلئے۔ آیت و القواعد من النساء الخ سے اس وجوب سے عجز کو مخصوص و مستثنیٰ کر دیا۔ گواستحاب ان کے لئے بھی ثابت ہے بقولہ تعالیٰ وان يستعلفن خیر لهن۔ باقی وجہ و کفین کے علاوہ بقیہ بدن کا وجوب استتار اب بھی عام ہے چنانچہ سر وغیرہ کھولنا عجز کیلئے بھی حرام اور آیت و القواعد الخ کو مخصوص کہنے کا مٹی وہ اصولی قاعدہ ہے کہ جب خصوص کی دلیل کلام مستقل موصول ہو تو وہ دلیل عام کیلئے تخصیص ہو جاتی ہے اور غیر معلوم التراخی حکم موصول میں ہے۔ پس بعد تخصیص حاصل حکم کا یہ ہوا کہ شواب کیلئے تو استتار وجہ و کفین بجز موقع حرج کے بحالہ واجب رہا اور عجز کیلئے صرف مستحب و رنہ اگر شواب کیلئے وجہ و کفین کا کشف جائز ہوتا تو پھر آیت میں و القواعد کی تخصیص بیکار تھی۔ اس تقریر سے استدلال کا سقوط واضح ہو گیا اور یہ سب احکام اجانب کے اعتبار سے تھے اور محارم و امثالہم کا حکم دوسرے جملہ لایسین زینتہن الخ میں مذکور ہوا ہے جس کی تقریر بیان القرآن میں ہے اس تقریر کے بعد بفضلہ تعالیٰ نہ کسی محقق پر کوئی اشکال و اعضاء رہا نہ کسی مہمل کیلئے مجال مقال کا احتمال رہا فقط۔

(تنبیہ) اور یہ سب تفصیل جواز یا عدم جواز انکشاف لہا جانب یا لہا قارب عورت کے فعل میں ہے باقی مرد کا جو فعل ہے نظر کرنا اس کا جدا حکم ہے یعنی جواز انکشاف جواز نظر کو مستلزم نہیں پس جس صورت میں عورت کو کسی عضو کا کھولنا جائز ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مرد کو اس کا دیکھنا بھی جائز ہو بلکہ وہ محل محترم میں یا احتمال شہوت میں بحالہ غض بصر کا مامور ہے گا۔ چنانچہ خود آیت میں اس عدم التزام کی دلیل موجود ہے یعنی مرد کا بدن بجز ماہین السره الراكبہ جائز الا انکشاف ہے مگر عورت کو پھر بھی حکم ہے بغضضن من ابصارہن خوب سمجھ لو (بوادرا النوادر)

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ نُورِ كَيْشْكُوَةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ

الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِنْ

شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ

وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُورٌ عَلَى نُورٍ يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَنْ يَشَاءُ

وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱﴾

يُوتِي أذنَ اللَّهِ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ

وَالْأَصَالِ ﴿۲﴾ رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ

الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ

وَالْأَبْصَارُ ﴿۳﴾ لِيَجْزِيَ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَيَزِيدَهُمْ مِنْ

فَضْلِهِ وَاللَّهُ يَزِدُّ مَنْ يُشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نور (ہدایت) دینے والا ہے۔ آسمانوں کا اور زمین کا اس کے نور (ہدایت) کی حالت عجیب ایسی ہے جیسے (فرض کرو) ایک طاق ہے (اور) اس میں ایک چراغ (رکھا ہے اور) وہ چراغ ایک قندیل میں ہے (اور وہ قندیل) ایک طاق میں رکھا ہے (اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسا ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے کہ وہ زیتون (کا درخت ہے) کو (کسی آڑکے) نہ پورب رخ ہے ورنہ پچھم رخ ہے اس کا تیل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا (اور جب آگ بھی لگ گئی تب تو) نور علی نور ہے (اور) اللہ تعالیٰ (اس) نور (ہدایت) تک جس کو چاہتا ہے رہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کی ہدایت کے لئے (یہ) مثالیں بیان فرماتا ہے اور ایسے گھروں میں (جا کر) عبادت کرتے ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان

کا ادب کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے۔ ان (مسجدوں) میں ایسے لوگ صبح و شام اللہ کی پاکی (نمازوں) میں بیان کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور (بالخصوص) نماز پڑھنے سے اور زکوٰۃ دینے سے نہ خرید ففقت میں ڈالنے پاتی ہے اور نہ فروخت (اور) ایسے دن (کی دارو گیر) سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جاویں گی۔ انجام (ان لوگوں کا) یہ ہوگا کہ اللہ ان کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا (یعنی جنت) اور (علاوہ جزا کے) ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بے شمار دے دیتا ہے۔

تفسیری نکات

نور چراغ سے تشبیہ

اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیہا مصباح۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت۔ مگر یہہہ وضوح کے تشبیہ دی گئی کیوں کہ نور مصباح لوگوں کے ذہن میں پہلے سے حاضر ہے۔ اس پر اگر یہ سوال ہے کہ لوگوں کے ذہن میں تو نور شمس و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقوی ہے مگر سورج میں ایک عیب یہ ہے کہ اس پر نگاہ نہیں جمتی اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا کہ اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور قمر سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس (اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ نور قمر کا مستفاد من الشمس ہونا تو اہل علم ہی میں مشہور اور چراغ کا نور مستفاد ہونا یا سلائی یا چھماق کی آگ سے ہر شخص کو مشاہدہ ہے اور خود نص میں اسکا ذکر ہے ہکاد زینھا یعنی ولولم تمسسه نار میں۔ پس میرے خیال میں نور قمر سے تشبیہ نہ دینے کی توجیہ یہ کی جائے تو اچھا ہے۔ کہ قمر میں محاق کا عیب ہے کہ کبھی ہلال ہے کبھی بدر کمال ہے کمال کے بعد زوال ہے۔ و لیس نور اللہ کذلک۔ نیز اصل سوال کا جواب اہل یہ ہے نور شمس و قمر دونوں میں یہ نقص ہے کہ اسے روشنی حاصل کرنے میں کسی کے کسب و طلب و اختیار کو دخل نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے نور سے استفادہ کرنے میں کسب و طلب و عمل کو دخل ہے کہ جو کوئی اپنے قلب کو مثل زجاجہ کو کب دری کے صاف شفاف کرے اور اس میں ذکر اللہ و عشق اور اخلاص کا زیت مبارک بھر لے تو نور کہ نور شمس و قمر گوا قوی ہے مگر اس کی طرف انسان کو احتیاج اس قدر قاصر فی الذہن نہیں ہے جس قدر نور مصباح کی احتیاج قاصر فی الذہن ہے کیونکہ شمس و

قمر کا طلوع و غروب عادت کے موافق خود ہوتا رہتا ہے بہت سے آدمیوں کو اس کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا اور مصباح کی ضرورت کی طرف ہر ایک کو التفات ہوتا ہے۔ رات کے وقت ہر شخص کو اس کی طلب ہوتی اور اس کی طرف التفات بھی ہوتا ہے۔ ہذا ما عندی و کل ذلك من قبیل الذکات و لعل هذا احسن واللہ تعالیٰ اعلم از حضرت مرشدی مولانا ظفر احمد صاحب دامت فیوضہم تو اس کے ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہوتا کہ نور حق بھی کسی سے مستفاد ہے پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے نور میں کی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہنچتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شے نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے (اگر کہا جائے۔ کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہو جاتا ہے اور دیوار کو بھی منور کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطہ فی العروض ہوتا ہے۔ واسطہ فی الثبوت نہیں ہوتا اور چراغ واسطہ فی الثبوت ہو جاتا ہے جیسا کہ نور حق واسطہ فی الثبوت ہوتا ہے) مگر یہ تشبیہ من کل الوجوه نہیں کہ اس سے کوئی نعوذ باللہ دوسرا خدا تصنیف کرنے لگے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ نور حق دوسروں کو منور بھی کرتا ہے اور منور بھی گود دوسروں کی تو یہ اس درجہ کی نہ ہو۔ اور یہ بات چراغ ہی میں ہے۔ شمس و قمر میں نہیں ہے۔ (غایت الجراح فی آیہ النکاح ص ۲۹)

لفظ نور کا معنی

نور کہتے ہیں اس کو جو ظاہر لفظہ و مظہر لغیرہ ہو یعنی جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔ بس حقیقت یہ ہے نور کی اب اللہ نور السموات کی تفسیر میں استغارہ کی تاویل کی حاجت ہی نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سموات اور ارض کو ظاہر بھی کر رہا ہے اور ان کے واسطہ سے خود بھی ظاہر ہے۔ بہر حال نور اس کو کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسرے کو بھی ظاہر کرے۔

ترجمہ: خاص بندے ایسے ہیں کہ ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اور وہ ڈرتے ہیں اس دن سے جس میں قلوب اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی ضرور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اچھے کام کا بدلہ دیں گے اور اپنے فضل سے زیادہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب عطا فرماتے ہیں۔

خلاصہ آیت

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ مدح فرماتے ہیں ان خالص لوگوں کی جن میں خاص صفات ہوں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ پس ہم کو چاہئے کہ وہ صفات ہم اپنے اندر پیدا کریں مگر ہم لوگوں کا عجیب مذاق ہے کہ فقط

تذکرہ میں تو ان کی مدح کی جاتی ہے مگر ان صفات مدح کی تحصیل نہیں کی جاتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اکتساب مال پر (مال کمانے پر) قادر ہو اور اس کے اصول بھی اس کو معلوم ہوں مگر ان اصول کی صرف مدح ہی مدح کرتا ہے مگر مال کا اکتساب نہیں کرتا تھلائیے کہ اس کو کیا فائدہ مل سکتا ہے یا ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو کھانے کی حاجت بھی ہے اور سامان بھی کھانے کا موجود ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ کھاؤ مگر وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ باتیں بہت کر رہا ہے کہ اس کھانے سے ایسی قوت آ جاتی ہے اور اس سے یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے خود محروم ہے سب کے منہ تک رہا ہے مگر کھاتا نہیں صرف تعریف کرنے ہی کو کافی سمجھتا ہے۔ انصاف سے کہیے کہ کوئی شخص دنیا میں اس کو عاقل کہے گا ہرگز نہیں مگر تعجب کی بات ہے کہ آج کل دین کے معاملہ میں عقلاء اور اہل الرائے اس بات کو تو سمجھتے ہیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان صفات کی مدح بھی کرتے ہیں جس کی اسلام نے تعلیم فرمائی ہیں مگر جن صفات کی مدح کی جاتی ہے ان صفات کی تحصیل میں سعی نہیں کرتے۔

اعمال قرب حق سبحانہ و تعالیٰ

غرض یہ آیت رجال لا تلهيهم تجارة الخ جن کو تجارت نہیں غافل کرتی الخ جس کی اس وقت تفصیل کی گئی ہے ان ہی اعمال کو شامل ہے جن کو حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے۔ اب وہ صفات سنئے کیا ہیں۔ بعض ایک ہی میں گرفتار ہیں کہتے ہیں کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں۔ ہمیں جنت و دوزخ درکار نہیں اس لئے ہمیں عمل کی کیا ضرورت ہے۔ عمل تو وہ کرے جو جنت کو جائیں اس سے مطلب ہی نہیں ہم تو ذات کے عاشق ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ عاشق کو زیادہ عمل کرنا چاہیے۔ جنت تو تھوڑے عمل میں مل جاتی ہے۔ قرب میں تو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ کے قرب کے لئے اعمال کی ضرورت ہے۔ اب ان اعمال کو سنئے ارشاد فرماتے ہیں لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله الخ (ان کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتی اپنے اچھے بندوں کو ایک صفت یہ ارشاد فرمائی کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ غافل نہیں کرتی تجارت اور بیع ذکر اللہ سے باقی بعضوں کا یہ خیال بالکل ہی غلط خیال ہے کہ پہلے دنیا کے کام پورے کر لیں اس کے بعد دین حاصل کر لیں گے کیونکہ دنیا کا سلسلہ تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ کار دنیا کسے تمام نہ کرو

انوارات مقصود نہیں

آگے ارشاد ہے يخافون يوما تقلب فيه القلوب والابصار (وہ اس دن سے ڈرتے ہیں کہ اس دن دل اور آنکھ الٹ پلٹ ہو جائیں گی) اس میں عجب کا علاج ہے یعنی ان کو عبادت کر کے تازہ نہیں ہوتا باوجود عبادت کرنے کے پھر بھی ڈرتے ہیں۔ یہی مضمون دوسری آیت میں بھی ہے فلو بهم وجلة الهم السی

دہم راجعون۔ (ان کے دل ڈرتے ہیں اس بات سے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں) پہلی آیت کے ترجمہ کا یہ حاصل ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اس دن سے کہ الٹ پلٹ ہو جائیں گے اس میں دل اور آنکھیں۔ مطلب یہ کہ ان میں باوجود عبادت کے بھی خوف ہے عجب نہیں۔ وہ اپنے اعمال کو بچ سکتے ہیں۔ ایک مسئلہ یہاں سے اور مستہط ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جو عمل کو بچ سکتے گا وہ ثمرات کا منتظر نہ ہوگا تو اس میں اس کی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو جیسے آجکل اکثر کی یہ حالت ہے کہ جہاں دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تجلی کے حضرت حاجی صاحب ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد ہیں حجاب ظلمانی سے۔ کیونکہ سالکین کو جو انوار نظر آتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ خدا تو نہیں غیر خدا ہیں۔ مگر یہ عجیب ہونے کے سبب ان کی طرف توجہ کرتا ہے ان سے مرے لیتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات ان کو مقصود سمجھنے لگتا ہے بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ ان کی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا اس لئے وہ اشد ہیں مگر لوگ ان ثمرات مانع ہی کو چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں سو ان کے آنے کا ہرگز قصد نہ کرے اور اگر بلا قصد آویں تو ان کی طرف التفات نہ کرے ان کی مثال ایسی ہے جیسے بچہ کو لڈو دے کر یا پیسہ دے کر بہلاتے ہیں اسی طرح مبتدی سلوک کو اس رنگ آمیزی سے بہلایا کرتے ہیں کہ نشاط سے کام میں لگا رہے سو مقصود کام ہی ہے اسی لئے اکثر یہ انوار عقلاء کو نہیں دکھائے جاتے بلکہ کم عقلوں کو دکھاتے ہیں تاکہ ذکر اللہ کا چمکہ لگ جاوے اور آگے کو قدم بڑھاوے اور میں جو ان انوار کی نفی کر رہا ہوں وہ بدرجہ مقصودیت ہے ورنہ فی نفسہ وہ محمود ہیں گو مقصود نہیں ان کو مذموم نہ سمجھنا چاہیے اگر خود آئیں آنے دو۔ ان کے دور کرنے میں بھی پریشانی مت اٹھاؤ اگر نہ آئیں تو مغموم مت ہو کیونکہ مقصودیت کے درجہ میں تو ہیں نہیں۔ نہیں آتے بلا سے مت آؤ اور اس آیت میں ینخالون یوماً (اس دن سے خوف کرتے ہیں) فرمایا اس سے خوف کرتے ہیں حالانکہ بظاہر ینخالون زیادہ مناسب تھا کیونکہ اصل خوف کی چیز اللہ تعالیٰ ہیں۔ سو بات یہ ہے کہ اس میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ بعض کو عروج کے مقام میں پہنچ کر فنا کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے جس سے وہ ماسوی اللہ سے ایسا مستغنی ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت سمجھنے لگتا ہے کہ نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کا ڈر نہ یوم آخرت سے خوف صرف خدا ہی سے تعلق محبت یا خوف رہتا ہے اور استغناء میں ایسا غلو یہ عبدیت کے خلاف ہے اس وقت شیخ کامل اس کو عروج سے نزول کی طرف لاتا ہے تاکہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت نہ سمجھے اور اپنے کو خدا کی سب چیزوں کا محتاج جانے نہ کہ ان چیزوں کی ذات کی وجہ سے بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے دیکھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا عالی مقام تھا مگر پھر بھی آپ جنت طلب کر رہے ہیں۔ جنت تو جنت کھانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غیر مودع ولا مستغنی عنہ رہنا یعنی ہمیں آپ کی ہر چیز کی حاجت ہے۔ ہم آپ کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں ہم تو بندے ہیں ہر حال اور ہر چیز میں آپ کی عطاؤں کے محتاج ہیں اور اہل طریق کا جو قول

ہے کہ غیر اللہ سے مستغنی ہو جاؤ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی مقصود سمجھنے لگے۔ اس سے استغنا ہونا چاہیے باقی اس حیثیت سے کہ ان چیزوں کو تعلق ہے اللہ تعالیٰ سے اس حیثیت سے ان کے ساتھ تعلق رکھے تو اس سے استغنا نہ ہونا چاہیے بلکہ ان چیزوں کی طرف اپنے کھتاج سمجھے یہ عین عبادت ہے۔

تفسیری نکات

پس آیت میں لفظ یوماً لاکر سالک کو علو سے عبادت کے مقام پر اتارتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ خدا سے تو کیوں نہ ڈرتے وہ تو خدا کی چیزوں تک سے بھی ڈرتے ہیں یوماً لانے میں یہ نکتہ ہے اور بعض مقام پر بخالفون دہم (اپنے رب سے ڈرتے ہیں) فرمایا ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ اصل خوف اللہ ہی سے ہونا چاہئے اسی لئے صوفیا کرام کہتے ہیں کہ اگر عذاب بھی نہ ہو تب بھی خدا سے ڈرنا چاہیے۔ آگے فرماتے ہیں لیجزیہم اللہ اس میں لام عاقبت ہے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات ہوں گے ان کا یہ انجام ہوگا ان کو یہ طے گا احسن ماعملوا میں احسن اور ماعملوا (جو انہوں نے عمل کئے ہیں) ایک ہی چیز ہے حافظ احسن سے یہ بتا دیا کہ ہر عمل تمہارا احسن ہی ہے پس یہ قید واقعی ہے حرازی نہیں۔ جیسے ہم چنوں کو کھاتے ہیں تو پہلے کھلے کھلے کتاب کر کے کھاتے ہیں اور پھر سب کو کھا جاتے ہیں۔ بے کھلے ہوئے بھی ہوؤں کے ساتھ کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ نیک عمل کیسا ہی ہو۔ سب احسن ماعملوا میں داخل ہے۔

سبحان اللہ! کتنی بڑی رحمت ہے اور کتنی بڑی تسلی فرمائی ہے اور کتنا بڑا انعام ہے ہم نا چیزوں پر۔ اور ہماری کتنی ہمت بڑھاتے ہیں قرآن میں تذکر کیا جائے تو جا بجا رحمت اور تسلی نظر آئے گی چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔
واللہ یدعوالی دار السلام کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلا تے ہیں۔

واللہ یدعوالی الصلوٰۃ والزکوٰۃ اور اللہ تعالیٰ نماز اور زکوٰۃ کی طرف بلا تے ہیں۔
اگر ابتداء یوں فرمادیتے تو ہم گھبرا اٹھتے اور دل توڑ دیتے۔ قلب پر بڑا بار ہوتا کہ بڑی مشقتوں کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ پس حق تعالیٰ نے یہ رحمت فرمائی کہ عبادت کی طرف بلانے کو سلامتی کے گھر کی طرف بلانا فرمایا تاکہ دل کو رغبت پیدا ہو جاوے۔ پھر اس رغبت سے عبادت کی طرف دل بڑھے۔ واقعی کیا رحمت ہے۔ اس کے علاوہ رحمت اور دل بڑھانا اور دیکھئے وہ یہ کہ قاعدہ کے موافق جزاء بقدر مجزی بہ کے ہوتی ہے یعنی جیسا عمل ہو ویسی ہی اس کی جزاء ہونی چاہیے۔ سو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم نے جیسے اعمال کئے ہیں۔ ویسی ہی جزا مل جاتی اور ہمارے اعمال کی حالت معلوم ہی ہے جیسے کچھ ہیں۔ چنانچہ اگر ہم بندوں کا کام ایسا ناقص کریں جیسا حق تعالیٰ کا کرتے ہیں تو ہم کو پوری اجرت تو کیا ادھوری بھی نہ ملے بلکہ سزا دی جائے تو قاعدہ مذکورہ کے موافق ہم کو اس صورت میں جزا ملنی چاہیے تھی۔ کہ دس برس یا بیس برس جنت میں رکھ کر پھر باہر کر دیئے جاتے کیونکہ محدود کی

جزا قاعدہ کے موافق محدود ہی ہوتی ہے مگر کیا رحمت ہے اور کیا ہمارا دل بڑھاتے ہیں کہ ارشاد فرماتے ہیں۔
 ویزیلہم من فضلہ اور زیادہ دیں گے ان کو اپنے فضل سے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے زیادہ دیں
 گے مطلب یہ ہے کہ اعمال تو ہمارے اس قابل نہیں مگر یہ ہمارا فضل ہے کہ استحقاق سے زیادہ دیتے ہیں۔ صرف
 تمہارے اعمال پر حصر نہیں رکھتے بلکہ ہم جنت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیں گے۔ اس میں تو شاید کسی کو یہ ناز ہوتا
 کہ ہمارے اعمال شاید بچے جیسے ہوں یعنی ان میں خاصیت ہونو نما کی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا من فضلہ
 کہ تمہارے اعمال بچے وچے کچھ نہیں جتنے بلکہ یہ محض ہمارا فضل ہے اور کچھ نہیں۔ آگے ارشاد ہے۔
 واللہ یوزق من یشاء بغیر حساب اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب روزی دیتے ہیں۔
 یعنی کسی کو حق تعالیٰ پر حق اعتراض نہیں۔ اللہ میاں جس کو چاہیں بے حساب روزی دیں۔ ان کو کوئی
 روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل اور مشیت سے دیتے ہیں جس میں کسی کو مزاحمت کا منصب
 نہیں بس آیت کا بیان ختم ہوا۔ ان اعمال کا آیت میں بیان ہے۔

مؤمن کا مال اصلی

صاحبو! یہ ہے مؤمن کا اصلی مال۔ باقی جس کو ہم مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں بلکہ جو مال میں کام آوے وہ ہے
 مال حقیقی (یعنی اعمال صالحہ) واللہ مال سے وہ راحت نہیں جو ان اعمال سے راحت ہوتی ہے دونوں جہاں میں اسی کو
 ارشاد فرماتے ہیں۔

من عمل صالحاً من ذکراً و انثیٰ و هو مؤمن فلنحییہ حیوة طیبہ ولنجزینہم اجرہم
 باحسن ما کانوا یعملون۔

کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو جو کہ مؤمن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے یعنی ایسی
 زندگی جس میں راحت ہی راحت ہوگی یعنی اس سے دل کو سکون و اطمینان ہوگا اور آخرت میں ان کے نیک
 اعمال کی کامل اجرت دیں گے۔ ایک جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے۔

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشتہ ضنکاً و نحشرہ یوم القیمة اعمیٰ یعنی جس نے
 منہ پھرا میری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی یعنی دنیا میں اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھائیں گے۔
 یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت وہاں بھی مصیبت۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دنیا
 داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے یہ حال ہے کہ مال و دولت تو ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان و راحت
 جس کا نام ہے وہ میسر نہیں۔ بعض اوقات تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں اور اعمال صالحہ
 سے حال کا عیش بھی اور مال کا عیش بھی دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ اصلی مال اس کو کہنا چاہیے۔ دنیوی
 مال کو تو مال اسی لئے کہتے ہیں یمیل الیہ القلب یعنی اس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی

مال کہنا اس وجہ سے درست ہے کہ وہ اس قائل ہیں کہ قلب ان کی طرف مائل ہو۔

آیت کی تفسیر

اب دو ایک باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

ایک بات تو یہ ہے کہ آیت میں رجال کا لفظ آیا ہے عورتوں کا ذکر نہیں کیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو وہ تابع ہیں مردوں کے دوسرے دلالت اللہ کے طور پر وہ خود بخود ہی اس حکم میں اس طرح سے آگئیں کہ یہ صفات جب مردوں کے لئے موجب مدح ہیں اگر کسی عورت میں ہوں تو وہ اور بھی زیادہ قابل مدح ہیں۔ عورت ہو تو ان صفات کو اختیار کرے تو بڑی ہمت کی بات ہے۔

روح آیت کی اور ان سب صفات کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دل کو ایسا تعلق ہو کہ دوسرے تعلقات پر غالب آ جاوے جیسا لائلہم اس میں نص ہے یعنی صفت تو اس کی عبدیت ہو اور تعلق الوہیت سے ہو پس بندہ کا کمال یہی ہے کہ الوہیت اور عبدیت کو اس طرح جمع کیا جائے اور اس کی یہی صورت ہے کہ تعلق تو اللہ سے ہو اور شان عبدیت کی ہو۔

رجال ترکیب میں قائل ہے ایک قراءت پر فعل مفلوظ کا ایک صورت میں مقدر کا جس پر یسبح مائل کا فعل دلالت کر رہا ہے کیونکہ اس جگہ قراءتیں دو ہیں یسبح بصیغہ معروف اور یسبح بصیغہ مجہول ہے۔ اس قراءت پر یہاں یسبح بصیغہ معروف مقدر کیا جائے گا۔

لائلہم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ یعنی تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفت بیان فرما رہے ہیں کہ ان کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی۔ یوں نہیں فرمایا رجال لایتجرون کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت نہیں کرتے۔ اگر دونوں میں منافات ہوتی تو یوں فرماتے۔ پس معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت تو وہ لوگ کرتے ہیں مگر تجارت ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی ذکر اللہ و تجارت کو چھوڑا تا نہیں البتہ غفلت سے روکتا ہے۔

لائلہم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ سے غافل نہیں بناتی۔ کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا خود مقصود نہیں بلکہ دین اصل مقصود ہے اگر دنیا مقصود ہوتی تو یوں فرماتے لائلہم ذکر اللہ عن التجارة یعنی ذکر اللہ کے شغل سے تجارت میں غفلت نہیں ہوتی۔ اب تو یوں فرما رہے ہیں کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین ہے۔

ذکر اللہ

آگے فرماتے ہیں عن ذکر اللہ واقام الصلوة و ایتاء الزکوٰۃ۔ یعنی وہ ایسے بندے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر اللہ اور نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر فعل قلب ہے اور نماز فعل جوارح عبادت بدنی

ہے۔ زکوٰۃ عبادت مالی ہے مطلب یہ ہے کہ تجارت و بیع ان کو نہ قلب کی عبادت سے غافل کرتی ہے نہ بدنی عبادت سے نہ مالی عبادت سے اس میں یہ بھی بتلادیا کہ محض عبادت ظاہری کافی نہیں بلکہ قلب کو بھی عابد و ذاکر بناؤ۔ اور ظاہر ہے کہ ذکر قلبی موقت نہیں کیونکہ اس میں تعین وقت کی قید نہیں۔ وہ تو ہر وقت ہو سکتا ہے کسی کلام میں اس سے حرج ہی واقع نہیں ہو سکتا بخلاف دوسرے اعمال کے جیسے نماز ہی ہے مثلاً اس میں وقت کا اس لئے تعین ہے۔ اگر تعین نہ ہو تو دوسرے ضروریات میں بڑی دقت پیش آئے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی ورنہ مال ہی فنا ہو جاوے جس کا ضرر ظاہر ہے اور تعین دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

پس مجموعہ دلائل سے یہ حاصل ہوا کہ نماز و زکوٰۃ تو وقت معین پر ادا کرو مگر ذکر ہر وقت کرو یعنی دل سے ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہو۔ اس کو کہتے ہیں۔

سلوک کی ابتداء

صبح اسم ربک الاعلیٰ اپنے برتر رب کے نام کی پاکی بیان کرو۔

میں اس طرف اشارہ بیان فرمایا ہے۔ اس میں لفظ اسم بڑھا کر ابتداء بیان فرمائی ہے سلوک کی کہ اول اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو۔ اسی واسطے صبح ربک الاعلیٰ (اپنے برتر رب کی پاکی بیان کرو) نہیں فرمایا بلکہ اسم کا لفظ بھی لائے۔ گویا یہ تعلیم فرمادیا کہ ابتداء نام ہی سے کرو

لَا تَلْهَبُهُمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ الْخ

ان کو اللہ کی یاد سے نہ تجارت غافل کرتی ہے نہ خرید و فروخت کا ایک شعبہ تو حاصل ہو جائے گا اور اگر چند دن ایسا کر کے کبھی اعتراض کرو کہ ہم نے تو ایسا کیا تھا مگر دل میں اثر نہیں ہوا۔ تو وجہ یہ ہوگی کہ آپ نے اس نیت سے نہیں کیا ہوگا کہ دل میں اثر ہو۔ اگر اس نیت سے کرو تو ضرور اثر ہوگا۔ آگے ارشاد ہے۔

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا

ترجمہ: تم لوگ رسول کے بلائے کو ایسا (معمولی بلانا) مت سمجھو جیسا کہ تم میں ایک دوسرے کو بلاتا ہے

تفسیری نکات

ادب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب یہ ہے

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا (پ ۱۸) کہ آپس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اس طرح نہ لیا کرو جس طرح ایک دوسرے کا نام لیتے ہو۔

نیز ارشاد ہے: ان السليمن ينادونك من وراء الحجرات اكثرهم لا يعقلون (پ ۲۶) یعنی جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف رکھتے ہوں تو باہر کھڑے ہو کر آپ کو نہ بلاؤ بلکہ اس کا انتظار کرو کہ آپ خود باہر تشریف لائیں تو اس وقت ملو اور بات چیت کرو۔

ولو انهم صبروا حتى تخرج اليهم لكان خيرا لهم (پ ۲۶)

حضرت عبداللہ بن عباس نے اپنے اساتذہ کا ایسا ہی ادب کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں بعض دفعہ کسی حدیث کے لئے کسی انصاری صحابی کے گھر پر دوپہر کے وقت پہنچا اور دروازہ بند دیکھا تو وہیں بیٹھ گیا اور ان کو آواز نہیں دی سارا وقت دوپہر کا دروازہ سے پرگزار دیا۔ جب وہ خود ہی نماز کے لئے باہر نکلے اس وقت ان سے ملے اور حدیث سنی۔ حالانکہ عبداللہ بن عباس اہل بیت نبوت سے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں۔ اگر کسی کو باہر سے آواز دے لیا کرتے تو ان کو گراں نہ گزرتا بلکہ وہ خوشی کے ساتھ باہر آتے مگر استاد کا ادب یہی ہے کہ اس کو دروازہ پر کھڑے ہو کر نہ پکارا جائے بلکہ اس کے باہر آنے کا انتظار کیا جائے۔ علم اسی طرح آتا ہے (اور جن لوگوں نے استادوں کا ادب نہیں کیا ان کو علم نہیں آیا گو کتابیں ختم ہو گئی ہوں مگر کیا کتابیں ختم کر لینے ہی کا نام علم ہے؟ ہرگز نہیں ورنہ اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو جاہل نہ قرار دیتے اور ان کے لئے مثل السليمن حملوا التوراة لم يحموها كمثل الحمار يحمل اسفارا ارشاد نہ فرماتے۔

جب استاد کا بھی ادب لازم ہے اور اس سے زیادہ باپ کا اور اس سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب ہے تو اب خود سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کا ادب کس درجہ کا ہونا چاہیے لیکن آج کل عام طور پر لوگ مخلوق کا تو ادب بہت کرتے ہیں مگر خالق کا ادب نہیں کرتے اور اس مرض میں بعض اہل علم بھی مبتلا ہیں۔

ادب کا مدار عرف پر ہے

حق تعالیٰ کی شان میں بعض علماء بھی ایسے الفاظ کہہ جاتے ہیں جو حضور کی شان میں وہ استعمال نہیں کر سکتے۔ البتہ صیغہ واحد کا استعمال حق تعالیٰ کے لئے خلاف ادب نہیں کیونکہ اول تو یہ عرف عام ہو گیا ہے اور ادب کا مدار عرف ہی پر ہے ورنہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے لطیفہ سے سب کو خاموش ہونا پڑے گا۔ جیسا ایک عالم کو آپ نے خاموش کر دیا تھا۔

آپ نے اس سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص فرش پر بیٹھا ہو اور قرآن کو رحل پر رکھے ہوئے پڑھ رہا ہو اور دوسرا آدمی پٹنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ جاوے یہ جائز ہے یا نہیں؟ مولوی صاحب نے کہا جائز نہیں کیونکہ اس میں قرآن کی بے ادبی ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ اگر قرآن کے سامنے کوئی کھڑا ہو جائے تو یہ کیسا؟ کہا یہ جائز ہے مولانا نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے چار پائی پر بیٹھنے میں اگر بے ادبی پیروں کی ہے تو پیر تو پٹنگ پر بیٹھنے والے کے بھی نیچے ہیں اور اگر بے ادبی سرین کے اونچے ہونے سے ہے تو سرین کھڑے ہونے والے کے بھی اونچی ہیں۔ وہ مولوی صاحب حیران ہو کر خاموش ہو گئے۔ اگر فقیہ ہوتے تو کہہ دیتے کہ ادب کا مدار عرف پر ہے اور عرف میں پہلی صورت کو بے ادبی اور دوسری کو ادب شمار کیا جاتا ہے مولانا اسماعیل شہید کے مزاج میں شوخی یعنی زندہ دلی بہت تھی اس لئے ان کے یہاں ایسے لطیفے اکثر ہوتے رہتے تھے جن کا جواب کوئی ان ہی جیسا دے سکتا تھا۔ ہر شخص ندے سکتا تھا۔

اور ہمارے ماموں امداد علی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شوخی مزاج دلیل ہے نفس کے مردہ ہونے اور روح کے زندہ ہونے کی اور متانت دلیل ہے روح کے مردہ ہونے اور نفس کے زندہ ہونے کی۔ اکثر اہل اللہ شوخ مزاج یعنی زندہ دل ہوتے ہیں۔

بہر حال ادب کا مدار عرف پر ہے فقہانے اس کو خوب سمجھا ہے چنانچہ لاسقل لہما اف کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ حقیقت اس نمی کی ایذا والدین سے منع کرنا ہے یہاں تاخیف موجب ایذا ہو وہاں حرام ہے اور اگر کسی وقت عرف بدل جائے اور تاخیف موجب ایذا نہ ہو تو حرام نہیں اور فقہانے جو بعض احکام میں تغیر عرف کی وجہ سے بدلنے کا حکم فرمایا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام حقائق کے متعلق ہوتے ہیں اور عرف کے بدلنے سے وہ حقیقت نہیں بدلتی جس سے تعلق حکم کا تھا صرف عرف سے اس حقیقت کی صورت تحقق بدل جاتی ہے۔ سو صورت مدار حکم نہیں۔ مثلاً جس حکم کا مدار ایذا پر تھا وہ ایذا ہی پر مرتب ہوگا۔ بدوں ایذا کے حکم ثابت نہ ہوگا پس اگر ایک لفظ کسی قوم کے عرف میں موجب ایذا ہے وہاں وہ تلفظ حرام ہوگا اور دوسری قوم کے نزدیک موجب ایذا نہیں وہاں تلفظ حرام نہ ہوگا۔

جیسے سر کا ہلانا ہمارے یہاں ایک ہیئت سے یعنی فوق و تحت کو اقرار کے لئے ہے اور ایک ہیئت سے یعنی بیمن و شمال کو انکار کے لئے مگر حیدرآباد میں ہمارے یہاں کی انکاری ہیئت بہت لطیف فرق سے اقرار کے لئے بھی ہے تو وہاں اس فرق کے جاننے والے کی نظر میں اس سے اقرار ہی مفہوم ہوگا انکار مفہوم نہ ہوگا اور جو شخص وہاں کے عرف سے ناواقف ہوگا وہ بڑا پریشان ہوگا۔

سُورَةُ الْفُرْقَانِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلِيكَةُ

أَوْ نُرَى رَبَّنَا لَقَدْ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًا كَبِيرًا ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے (بوجہ اس کے کہ اس کے مکر ہیں) وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد سے بہت دور نکل گئے ہیں۔

تفسیری نکات

یعنی جو لوگ ہمارے سامنے پیش ہونے سے اندیشہ نہیں کرتے وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں اور یہ لوگ حد سے بہت دور نکل گئے (اور دوسری آیت میں ارشاد ہے جاہل لوگ کہتے ہیں کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کیوں نہیں بات کرتے یا ہمارے پاس کوئی (فرمائی) نشانی کیوں نہیں آتی جو لوگ ان سے پہلے ہوئے ہیں وہ بھی ایسے ہی کہا کرتے تھے۔ ان سب کے دل یکساں ہیں ہم نے آیتیں بیان کر دیں اس قوم کے لئے جو یقین کرتے ہیں یعنی بولنے سے مقصود احکام بتانا ہے سو ہم احکام بتا چکے اب ہم کو ہم کلام ہونے کی ضرورت نہیں پس جو ضرورت تھی کلام کرنے سے وہ رفع ہو چکی ہے اب رہی لذت وہ جب ہو کہ یہ ملذذ صاحب حق تعالیٰ کے بولنے کے وقت باقی بھی رہیں سو ہم کلام ہونا تو بہت دور ہے ہاں اگر اپنا کلام بھی کسی شے پر نازل فرمائیں تو وہ فنا ہو جائے چنانچہ فرماتے ہیں لَوِ انزلنا

ہذا القرآن علی جبل لرايته خاشعاً متصدعاً من خشية الله یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

اللہ تعالیٰ سے ہم کلام نہ ہونے میں حکمت اور مصلحت

الحاصل کلام یا رویت کی دنیا میں تمنا کرنا غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مصلحت بھی نہیں ہے اور جن سے کلام ہوا ہے وہ بھی بلا واسطہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحياً او من وراء حجاب او مرسل رسولاً فلو حی باذنه ما یشاء انہ علی حکیم۔ یعنی کسی بشر کی مجال نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بات کرے مگر بطور وحی کے یا پس پردہ یا فرشتہ بھیج دے پس جو چاہے وحی کرے اس لئے کہ وہ اس سے برتر ہے کہ بشر سے کلام فرمائے اور چونکہ حکیم ہے اس لئے مصلحت بھی اسی میں ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا ہم سے ہم کلام نہ ہونا عین مصلحت اور حکمت ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کے دیکھنے اور سننے کا مراقبہ

پس ہمت باندھ کر اپنے ہر فعل میں اس کا مراقبہ کرو کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں کہ دیکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ سنتے ہیں پھر دیکھئے کہ اس کا کیا ثمرہ ہوتا ہے تمام کلفتیں اور ادب مشقتیں آپ کو اہل ہو جائیں گی اور لطف دائم آپ کو ملے گا اور اسی کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے واصر لِحکم ربک فانک باعیننا و سبح بحمد ربک (یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حکم کے لئے جھے رہئے اس لئے کہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور اپنے پروردگار کی تسبیح حمد کے ساتھ کیجئے یعنی آپ ہم سے باتیں کیجئے) جب محبت کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب مجھ کو دیکھتا ہے تو مصیبت میں بھی اس کو لطف آتا ہے۔

بجرم عشق توام میکشد غوغا میکست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا میکست

(یعنی اے محبوب! آپ کے عشق کے جرم میں مجھ کو لوگ مارے ڈالتے ہیں اور ایک بھیڑ لگا رکھی ہے آپ بھی سر سر بام آ جائیے اس لئے کہ خوب تماشا ہے)

ایک عاشق کو لکڑیاں مار رہے تھے ننانوے لکڑیاں کھائیں اور افس نہیں کیا اور ننادے کے بعد ایک لگی تو آہ نکلی لوگوں نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہا کہ ننادے تک تو میرا محبوب بھی تماشا یوں میں تھا تو مجھ کو تکلیف نہ ہوئی اور آخر میں چلا گیا اس لئے تکلیف محسوس ہوئی پس معلوم ہوا کہ دنیا میں ہمارا حصہ یہی ہے کہ ہم اس کی یاد میں رہیں اور ہم کو اس کا یقین ہو کہ وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں اور سنتے ہیں۔

وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ہونا یعنی خدا تعالیٰ کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین

پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

تو اس آیت میں تواضع کا ایک اثر بتلایا ہے کیونکہ کبھی کسی شے کو ماہیت سے بتلایا جاتا ہے اور کبھی اثر سے تواضع و خشوع سے چلنا حقیقت میں اثر ہے تواضع کا۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھتے ہوئے داڑھی سے کھیل رہا تھا جیسا کہ لوگوں کی عادت ہے کہ نماز کے اندر کپڑوں سے یا بالوں سے شغل کیا کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشوع ہوتا تو داڑھی سے نہ کھیلتا۔ تو اس حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ خوف و خشیت قلب میں ہے اور اس کا یہ اثر ہے کہ نماز میں اہو واجب نہ ہو۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۖ

كَذَلِكَ ۖ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝

ترجمہ: اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر یہ قرآن دفعہ واحدہ کیوں نہیں نازل کیا گیا اس طرح (تدریجاً) اس لئے (ہم نے نازل کیا) ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو قوی رکھیں۔ اور (اسی لئے) ہم نے اس کو بہت ٹھیرا ٹھیرا کرنا ہے۔

تفسیری نکات

قرآن مجید کے تدریجاً نزول میں حکمت

یہ آیت مشرکین نصاریٰ کے اس اعتراض پر نازل ہوئی تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں تو ان کو کوئی کتاب دفعہ پوری کی پوری آسمان سے کیوں نہیں دی گئی جس طرح موسیٰ اور عیسیٰ اسلام کو دی گئی تھی۔ خدا تعالیٰ ان کفار کے اعتراض کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ کمالک لتثبت بہ فؤادک جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے کلام مجید کو بتدریج نازل کیا ہے تاکہ اس لئے نازل کیا ہے کہ اس تدریج کے ذریعے سے آپ کے دل کی تشبیہ اور اس کا محفوظ کر لینا اور سمجھ لینا آسان ہو جائے۔

واقعی غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تشبیہ فواد اور ضبط و فہم بتدریج نازل کرنے میں ہو سکتا ہے نزول دفعی میں نہیں ہو سکتا۔ دفعہ نازل کرنے میں احکام جزئیات کا سمجھنا امت کے لئے اس لئے دشوار ہوگا کہ جب دفعہ نازل کیا جائے گا تو یقیناً اس کے احکام امور کلیہ ہوں گے اور ان پر جزئیات کو منطبق کرنا پڑے

گا۔ سو جب تک کہ نبی زندہ ہیں اس وقت تک سوال کرنے سے با آسانی تعلیم ہو جاوے گی لیکن نبی کی وفات کے بعد چونکہ ان کا منطبق کرنا محض امت کے اجتہاد پر رہ جاوے گا اس لئے بہت سی غلطیوں کا ہونا ممکن ہے جیسا کہ نصاریٰ اور یہود سے ہوئیں۔

اس تفاوت کی ایسی مثال ہے کہ ایک مریض کسی طبیب کے پاس آوے اور اپنی حالت بیان کر کے حکیم سے کہے کہ میں آپ کے پاس تو رہ نہیں سکتا نہ میں وقتاً فوقتاً آ کر آپ کو اپنی حالت کی اطلاع کر سکتا ہوں آپ میری حالت کے مناسب کئی نسخے مجھے لکھ دیجئے۔ جوں جوں میری حالت متغیر ہوتی جاوے اور مرض میں کمی یا بیشی ہو میں اس کے مناسب نسخوں کو بدل کر استعمال کرتا جاؤں۔ پس اس صورت میں اگرچہ طبیب کتنا ہی ماہر ہو اور کتنے ہی غور و خوض سے نسخوں کی تجویز کرے لیکن اس مریض کی حالت اس مریض کے برابر بہتر نہیں ہو سکتی جو کہ روزانہ طبیب کے پاس آتا ہے اپنی حالت بیان کرتا ہے پچھلا نسخہ دکھلاتا ہے اور روزانہ اس میں تغیر و تبدل کمی بیشی کرا لے جاتا ہے اس لئے کہ اگرچہ پہلی صورت میں تمام تغیرات کے لئے طبیب نے نسخے لکھ دیئے لیکن تغیرات کی تعیین اور ان کا فہم یہ محض مریض کی رائے پر رہا جو کہ رائے العلیل ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ زیادتی صفا کی ہو اور وہ سودا کا بیجان سمجھ جاوے اور چستی سنبھالنے کی ہو اور وہ مرض کی کمی سمجھ جاوے۔

اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ جس قدر عام اور تمام فائدہ جزئی حالت کے دیکھنے اور حسب ضرورت تغیر تبدیل کرنے میں ہے امور کلیہ سمجھا دینے میں اس قدر فائدہ نہیں۔ اس میں بہت سی غلطیاں ممکن ہیں بس خدا کا ہم پر بڑا فضل ہے کہ اس نے کلام مجید جزاء جزاء نازل فرمایا کہ علماء امت نے اس کو اچھی طرح سمجھا۔ اس کے اسباب نزول پر پوری نظر کی اور اس کو اپنے ذہن میں لے لیا۔

سابقہ کتب کا نزول دفعی میں حکمت

یہاں بظاہر دو شبہات ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ جب تدریجی نزول میں اس قدر فائدہ اور واقعی نزول میں اس قدر نقصان کا احتمال ہے تو خدا نے قرآن سے پہلی کتب کو دفعہ کیوں نازل فرمایا جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ مصلحت اور فرق غلط ہے یا ام سابقہ کے مصالح کی رعایت نہیں کی گئی۔

اس کا جواب تو یہ ہے کہ شرائع سابقہ چونکہ چند روزہ تھیں اور اس زمانہ کے اکثر ایام میں ان کے نبی یا ان کے خاص اصحاب ان میں موجود رہتے تھے جن سے تمام جزئیات حل ہو جاتی تھیں۔ اس لئے کتب سابقہ کا دفعہ نازل ہونا ان لوگوں کے لئے مضر نہیں ہوا۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ باوجود قرآن کے تدریجاً نازل ہونے کے فہم قرآن میں غلطیاں اب بھی ہوتی ہیں۔

چنانچہ اختلاف مجتہدین سے صاف معلوم ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس اختلاف اور خطا میں اور ام سابقہ کے اختلاف اور غلطیوں میں بڑا فرق ہے۔ ان سے زیادہ اور مضر غلطیاں ہوئی تھیں اور اس امت سے ایسی غلطیاں نہیں ہوئیں۔ وجہ یہ کہ اسباب نزول نصوص کی تفسیر ہے جس کو تعین مراد میں خاص دخل ہے اور ظاہر ہے کہ تعین مراد کے بعد کی غلطی خفیف ہوگی اور عدم تعین مراد کی صورت میں عظیم ہوگی۔

یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ بلا تعین مراد ان لوگوں پر احکام کیسے متوجہ ہوئے بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے بیان سے تعین ہو جاتی تھی۔ سوا دل تو انہوں نے اس کی حفاظت نہیں کی دوسرے یہ کہ بیان بھی مواقع سوال ہی میں ہوتا ہے اور سوال کا ہر جگہ اذن تھا مگر قلت توجہ سے ان لوگوں کو اس کی نوبت بھی کم آئی اور اس امت میں جو تعین مراد کے بعد اختلاف پیش آیا اس میں حکمت تھی تو سبب مسالک کی پس وہ رحمت ہوا پس دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا اور آیت۔

الْأَمِنُ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ

سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿۷۵﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ

صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ﴿۷۶﴾

ترجمہ: مگر جو (شُرک و معاصی) سے توبہ کر لے اور ایمان بھی لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گزشتہ گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے تو وہ بھی عذاب سے بچا رہے گا (کیونکہ وہ) اللہ تعالیٰ کی طرف خاص طور سے رجوع کر رہا ہے۔

تفسیری نکات

شریعت میں سخت مرض کا بھی آسان علاج ہے

ان دونوں آیتوں میں سے اول ایک آیت میں ایک بہت بڑے مرض کا ایک نہایت ہی سہل علاج فرمایا ہے اور یہ بھی ایک امتیاز ہے شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے شرائع اور دیگر طریق اصلاح سے کہ اس شریعت میں سخت امراض کے لئے بھی نہایت سہل علاج بتلائے گئے ہیں ورنہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جس درجہ کا مرض ہوتا ہے اسی درجہ کا علاج بھی کیا جاتا ہے حاصل یہ ہے کہ معصیت مرض ہے اور اس میں دو درجے ہیں ایک اس کا حدوث اور ایک اس کا باقی یعنی صدور کے بعد اس سے رجوع میسر نہ ہو۔

تبدیل سینات کی متعدد تفسیریں

اس آیت کے قبل بعضی وعیدوں اور بعضے گناہ کرنے والوں کی حالت کا بیان ہے اس کے بعد فرماتے ہیں الامن تاب وامن الخ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کا علاج توبہ ہے مگر اس کو سن کر آپ سامعین بد اعتقاد نہ ہو جائیں کہ یہ تو معمولی بات نکلے جو پہلے سے موہوم ہے سوا بھی بات تم نے سنی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل نیک کرے تو ان کے گناہوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا تو خدا تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کے باب میں (جبکہ اس کے شرائط بھی پائے جائیں جن میں ایک ایمان ہے کیونکہ کافر کی توبہ مقبول نہیں۔ اور دوسرے عمل صالح ہے) یہ فرمایا ہے کہ اس کی برائیاں مبدل بہ حسنات ہو جائیں گی اور یہ دوسری شرط یعنی عمل صالح قبول توبہ کے لئے تو نہیں ہے کیونکہ بالا جماع خود گناہ معاف ہونے میں اس کی ضرورت نہیں کہ دوسرے نیک عمل بھی کرے صرف توبہ بطریقہ کافی ہے لیکن اولئک یدل اللہ سیناتہم حسنات یہی وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نیکیاں عطا فرمادیتے ہیں) میں اس دوسری شرط کی ضرورت ہے اور تفسیر اس تبدیلی سینات کی مختلف ہے اور یہ مسئلہ اس آیت سے اس تفسیر کی بنا پر ماخوذ ہے جو میں عرض کر رہا ہوں اور دوسری تفسیر کی بناء پر نہیں لیکن اگر کوئی دوسری تفسیر کو بھی اختیار کرے تو ہمارے مقصود میں معترض نہیں کیونکہ اس علاج کا نافع ہونا تجربہ سے بھی ثابت ہو چکا ہے تو ایک تفسیر تو اس کی یہ ہے کہ قیامت کے دن بعض بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے گا کہ اول ان کے بعضے گناہ ظاہر کئے جائیں گے اور وہ ڈریں گے کہ اب دوسروں کی نوبت آئے گی مگر رحمت سے ان کو کہا جائے گا کہ اچھا ہم نے گناہوں کو معاف کیا اور ان کے برابر نیکیاں تم کو دیں اس وقت بندہ عرض کرے گا کہ یا الہی میں نے تو اور بھی گناہ کئے ہیں تو بعض نے اس قصے کی تفسیر کی ہے مگر یہ تفسیر میرے نزدیک اس لئے مرجوح ہے کہ خود اس حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ سب کے ساتھ نہ ہوگا اور یہاں ہر تائب کے لئے حکم فرمایا گیا ہے تو راجح تفسیر وہی ہوگی جو میں عرض کرتا ہوں اور وہ بھی سلف سے منقول وہ یہ ہے کہ سینات سے مراد ملکات سینات ہیں اور حسنات سے مراد ملکات حسنات ہیں۔

یعنی ہر عمل کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اس کو تکلف سے کیا جائے یا اتفاقاً صدور ہو جائے دوسرے یہ کہ اس کا ملکہ ہو جائے۔ اول کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچہ اتفاق سے ایک جیم نہایت اچھی لکھ دے تو یہ ملکہ نہیں بلکہ اتفاق ہے تو جو عمل بے ملکہ کے ہوگا اس کو پائیدار نہیں ہوگی اور جو عمل ملکہ کے ساتھ ہوتا ہے اس کو دوام ہوتا ہے یعنی توبہ کی بدولت ملکہ معصیت جو کہ منشا گناہ ہے بدل دیا جاتا ہے۔

بعض اہل اللہ نے لہا و لئک یدل اللہ سیناتہم حسنات کی تفسیر کی ہے کہ حق تعالیٰ ہماری طاعات کو جو واقع میں سعیات ہیں اپنے کرم سے طاعات ہی شمار کر لیتے ہیں۔

لہا و لئک یدل اللہ سیناتہم حسنات کی تفسیر حضرت مرشدی علیہ الرحمۃ یہ فرماتے تھے کہ سینات سے مراد ہمارا نماز و روزہ ہے کہ درحقیقت یہ عبادت نہیں بلکہ واقع میں گستاخی اور بے ادبی ہے اور ہم

ایسی عبادات کو پیش کر کے بے ادب بنتے ہیں اور ہمارا ایسی عبادات پر اپنے کو مستحق اجر سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کسی آقا کا گستاخ نو کر پکھا جھلے اور ہر دفعہ میں ان کے سر پر پکھا مارتا ہو۔ اور پھر انعام کا طالب ہو۔ اس پر تو اگر وہ آقا سزا ہی نہ دے تو بڑی عنایت ہے۔ اسی طرح ہماری یہ عبادت بے ادبی اور گستاخی ہے اس پر اگر ہم کو سزا بھی نہ ہو تو بڑی رحمت ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی وہ رحمت ہے کہ ہمارے اس گمان کے موافق کہ ہم ان کو عبادات سمجھے ہوئے ہیں سچ سچ عبادت کر کے اس پر بھی ثواب دیں گے امراء کے یہاں دیکھا ہوگا کہ غرباء مٹی کے خربوزے تر بوزینا کر لاتے ہیں ان کو بھی انعام ملتا ہے ایسی ہی یہ ہماری نماز ہے کیا عجب ہے جو اس پر بھی انعام مل جاوے لیکن واقع میں تو ضرورت اسی کی ہے کہ ہماری ایسی نماز ہو۔ جیسی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اور جب تک یہ حاصل نہ ہو سکی کرتے رہیں۔

اولئک یدل اللہ سیناتہم حسنات کہ حق تعالیٰ گناہ کو حسنہ بنا دیتے اور جرم کو اطاعت کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حشر میں اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے دریافت فرمائیں گے کہ تو نے ایسا کیا تھا؟ تو نے فلاں گناہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ بول چھوٹے چھوٹے گناہوں کو گناہیں گے بندہ جس کا اقرار کرے گا اور اپنے دل میں ڈرے گا کہ ابھی سنگین جرائم کا تو ذکر ہی نہیں ہوا دیکھئے ان پر کیسی گرفت ہو مگر حق تعالیٰ کہاڑ کے ذکر سے پہلے یہ فرمادیں گے کہ جاؤ ہم نے تم کو ہر گناہ کے عوض ایک نیکی دی۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہ گنوائے گا کہ الہی میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے ہیں ان کا تو یہاں ذکر ہی نہیں آیا مجھ ان کے عوض بھی نیکیاں دلوایئے۔ یہ تو آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں یدل اللہ سیناتہم حسنات کا مصداق یہ ہے ملکات سیرہ کو تبدیل بہ ملکات حسنہ کر دیتے ہیں۔ بخل کو سخاوت سے اور جہل کو علم سے بدل دیتے ہیں اور حسیات میں یہ صورت ہے کہ پانی کو خون کر دیتے ہیں جیسا کہ عورتوں اور گائے بکری کے پستان میں مشاہد ہے۔

ترجمہ: مگر جو (شکر و معافی) سے توبہ کر لے اور ایمان بھی لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اور جو شخص (جس معصیت سے) توبہ کرتا ہے اور نیک کام کرتا ہے (تو وہ بھی عذاب سے بچا رہے گا) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف خاص رجوع کر رہا ہے۔

توبہ کا طریق

ہر گناہ سے توبہ کرنے کا طریقہ جدا ہے مثلاً اگر نماز نہیں پڑھی تو توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ پچھلی نمازیں قضا کرو اور آگے ادا کرتے رہو اگر حج نہیں کیا تو اب کر لو اور پچھلے گناہ سے توبہ کر لو۔ کسی کے مال کا نقصان کیا ہے تو مالک کو ادا کرو یا واپس کرو یا معاف کراؤ اور آئندہ و برابر حق ادا کرتے رہو۔ آئندہ کسی کا حق ضائع نہ کرو اگر غیبت کی ہو معاف کراؤ۔ اگر وہ شخص جس کی غیبت کی تھی مر گیا ہو یا اس سے ملنے کی امید نہ ہو تو یہ بھی طریقہ ہے کہ اس کے لئے ہمیشہ دعائے مغفرت کرتے رہو اس سے بھی غیبت کا گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ قیامت

میں خدا تعالیٰ اس سے معاف کر دے گا۔ بہر حال ہر گناہ سے توبہ کرنے کا طریقہ جو معین ہے شریعت والوں سے پوچھ کر عمل کرو اور اس طریقہ کو استعمال کرو توبہ میں خاصیت ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا گنہگار ہو کسی نے کتنے ہی زیادہ گناہ کئے ہوں حق تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے سب معاف فرمادیتے ہیں۔ تو غرض من تاب کے تعلق سے یہ مضمون بھی ضروری تھا اور یہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ توبہ عن الشکر کا نام ہے ایمان۔ غرض توبہ ہی میں یہ بھی داخل ہے۔ ایمان بھی توبہ ہی کا ایک فرد ہے۔

نیک اعمال کی تاکید

آگے عمل صالحاً ہے یعنی توبہ کے بعد بے فکر نہ ہو جائے بلکہ آئندہ بھی نیک عمل کرتا رہے۔ اور یہ میں بیان کر ہی چکا ہوں کہ توبہ کے مفہوم میں دو چیزیں ہیں ایک وہ اعمال جن کے کرنے کا حکم ہے ان کو پابندی سے ادا کرتا رہے اور جن سے ممانعت ہے ان کا گویا اہتمام کے ساتھ تارک رہے یہ دونوں عملاً صالحاً میں داخل ہیں اور یہاں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ فعل ترک کو کیسے شامل ہوگا خوب سمجھ لو کہ ظاہر میں گناہوں کا چھوڑنا مفہوم عدی معلوم ہوتا ہے مگر دراصل مفہوم وجودی ہے اس کا معنوں وجودی ہے گو عنوان عدی ہے اس کے سمجھنے کے واسطے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے یوں سمجھئے اس سے بھی آسان تقریر کرتا ہوں انسان جو مکلف کیا گیا ہے تو اعمال اختیار یہ کا مکلف کیا گیا ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ سمجھئے کہ مثلاً ہم جو اس وقت کھڑے ہیں تو نہ چوری کر رہے ہیں نہ شراب پی رہے ہیں نہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ رہے ہیں غرض سینکڑوں گناہ ہیں جن کو ہم اس وقت چھوڑے ہوئے ہیں ایک تو ترک یہ ہے یہ تو ایسا ہے کہ اس ترک کی طرف ہمارا التفات بھی نہیں ہوتا اس کو ترک نہیں کہتے اس واسطے کہ جس ترک کا انسان مکلف بنایا گیا ہے وہ ترک ہے جو اپنے اختیار اور قصد سے ہو اور اختیار اور قصد کا مسبوق بالعلم ہونا ضروری ہے اور یہ ترک مسبوق بالعلم نہیں لہذا یہ وہ ترک ہی نہیں جس کا انسان مکلف بنایا گیا ہے اور یہ ترک مفہوم عدی ہے جب انسان اس کا مکلف نہیں تو اس ترک کا حکم بھی نہیں۔ ایک ترک تو یہ ہے اور ایک ترک یہ ہے کہ یا تو کوئی فی الحال داعیہ ہو مثلاً کوئی عورت چلی جا رہی ہے جی چاہا کہ لاؤ اسے دیکھیں پھر نگاہ کو روک لیا۔ یہ ہے ترک وجودی اس کے لئے ضرورت ہے علم اور قصد کی مثلاً شراب پینے کا قصد تو نہیں لیکن ساتھ ہی یہ خیال ہے کہ کبھی نہیں پیئیں گے ان شاء اللہ یہ ترک وجودی ہے عدی نہیں اور اجزای پر ملتا ہے۔ ورنہ اگر ترک عدی پر بھی اجر ملتا تو یہ لازم آتا کہ ہر لمحہ میں کروڑوں طاعتوں کا اجر مل رہا ہے مثلاً اس وقت ہم ہزاروں گناہوں کو نہیں کر رہے ہیں فرض کرو نا محرم پر نظر کرنا ہی ہے ہم اس وقت کسی نا محرم پر نظر نہیں کر رہے ہیں اب نا محرم ہیں لاکھوں۔ نہ ہم زینب کو دیکھ رہے ہیں نہ ہندہ کو دیکھ رہے ہیں نہ خالدہ کو دیکھ رہے ہیں نہ اور کسی کو دیکھ رہے ہیں غرض دنیا میں جتنی نا محرم عورتیں ہیں ان میں سے ہم اس وقت کسی کو بھی نہیں دیکھ رہے تو چاہیے کیا پرورش فرماتے ہیں اسی سلسلہ میں مجھے اس وقت یہ آیت یاد آگئی اتقوا اللہ وھولوا ھولاً سلید ابصلح لکم ظاہراً اصلاح فعل ہے بندہ کا تو یہاں سوال ہوتا ہے کہ اس کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا اس سے تو متوہم ہوتا ہے کہ آپ ہی آپ اصلاح ہو جائے گی یعنی اللہ تعالیٰ خود ہی مثلاً نماز پڑھو ادیس گے کہیں ایسا ہوا بھی ہے پھر بصلح

لکم کے کیا معنی اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اسناد اس اعتبار سے ہے کہ وہ اصلاح کا سامان پہلے مہیا کر دیتے ہیں اس کے بعد یہ مستلزم ہوتا ہے۔ ترتب اصلاح کو کیونکہ جب ملکات درست ہو گئے تو معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے دشواری نہیں رہتی اس معنی کرو وہ اصلاح حق تعالیٰ کی طرف بھی منسوب ہے اور بندہ کی طرف بھی تو مدد یہ ہوتی ہے حق تعالیٰ کی طرف سے کہ ملکات کو بدل دیتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ بدوں ملکات کے درست ہوئے انسان سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک ملکات درست نہ ہوں، بہت کم توقع ہے کہ افعال شنیعہ کا صدور نہ ہو سکے اور یہ تبدیلی کا قصہ طویل الذیل اور وسیع ہے یعنی اس کے تحقق اور ظہور کا سلسلہ آخرت تک جاری رہتا ہے یہاں بھی تبدیلی ہوتا ہے مختلف حالتوں میں وہاں بھی یہ ایسا جامع وعدہ ہے سبحان اللہ سالکین ہر قدم پر اس کا تحقق دیکھتے ہیں اور واقعی حق تعالیٰ کے وعدہ کی ایسی ہی شان ہونی چاہیے خود فرما رہے ہیں اعلیٰ امور غیر ممنون قطع نظر آخرت کے میں دیکھتا ہوں کہ دنیا ہی میں یہ تبدیلی شروع ہو جاتا ہے یہاں سے استمرار اور ثبات اور دوام سب کی توفیق ہوتی ہے اور اس تبدیلی کا انقطاع ہی نہیں جو تبدیلی ہوتی ہے ہوتی ہی چلی جاتی ہے چونکہ یہ تبدیلی سالکین کو پیش آتی ہے اس لئے ان کو متنبہ کر دینا ضروری معلوم ہوا تا کہ ان کو اس کی بصیرت ہو کتنی بڑی دولت ہم کو حاصل ہوئی ہے اس نے اپنا کام کیا تھا یعنی اعمال صالحہ شروع کئے تھے اور مطلوب ہے اعمال صالحہ کا دوام اس دوام میں وہ خود اس طرح مد فرماتے ہیں کہ اس کے اندر جو ملکات تھے سیرہ ان کو بدل کر ملکات حسنہ کر دیتے مثلاً پہلے بخل غالب تھا اب سخاوت غالب ہو گئی یہیں سے عاقل سمجھ جائیگا کہ ملکات حسنہ کو اور قوی کر دیا جائے اس واسطے کہ جتنا ضعف ملکات حسنہ میں تھا وہ ملکات سیرہ کی آمیزش سے تھا تو ضرور ہوا کہ اب ملکات حسنہ کا حسن اور زیادہ ہو جائے گا کیونکہ حسن کی کمی کی علت قبح کی آمیزش ہی تو ہے غرض اس تبدیلی کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ ملکات حسنہ کو تو پہلے سے بھی زیادہ قوی کر دیتے ہیں اور ملکات سیرہ کو ضعیف اور مضمحل کر دیتے ہیں مضمحل میں نے اس لئے کہا کہ ملکات سیرہ کا بالکل ازالہ نہیں ہوتا اس واسطے کہ اگر بالکل ازالہ ہو جاوے تو یہ حکمت کے خلاف ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ ثواب ملے کیونکہ ازالہ کی صورت میں تو گناہوں سے بچنے میں کوئی ثواب ہی نہیں اس واسطے کہ جب دل میں گناہ کے صدور کی قدرت ہی نہ رہی اس وقت اختیار طاعت اور ترک معصیت کوئی کمال ہی نہیں اس لئے ملکات سیرہ کا ازالہ تو نہیں ہوتا ہاں ان میں اضمحلال ہو جاتا ہے یعنی ان کے تقاضے کی کیفیت اتنی مضمحل ہو جاتی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا کہ نہیں ہے اس لئے بعض سالکین کو یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم میں اب کوئی ملکہ سیرہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جب بعد چندے کسی محرک سے وہ ملکات عود کرتے ہیں تو روتے ہیں سالک صاحب بیٹھ کر روتے ہیں کہ میرا سارا مجاہدہ برباد ہو گیا اور پھر معصیت کے تقاضے ہونے لگے۔

تبدیل ملکات کی حقیقت

اس وجہ سے مجھے متنبہ کرنا ضروری ہے کہ تبدیلی ملکات کی حقیقت کیا ہے اور اس کی صورت کیا ہوتی ہے سالک نے غلطی اس لئے کی کہ وہ حقیقت اس تبدیلی کی نہیں سمجھا وہ تبدیلی ایسی سمجھتا ہے کہ ملکات سیرہ بالکل کی جاتے رہتے ہیں حالانکہ ملکات سیرہ زائل نہیں ہوتے بلکہ ان میں اضمحلال ہو جاتا ہے مگر اس اضمحلال کا اثر ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا

زوال کا تو یہ رحمت ہے کہ دوائی خیر کے تو قوی ہو جاتے ہیں اور دوائی شر کے ضعیف ہو جاتے ہیں۔ نیکی کا تو ہر وقت تقاضا ہوتا رہتا ہے اور برائی کا بالکل تقاضا نہیں ہوتا بلکہ ترک طاعت اور ارتکاب معصیت ایسا دشوار ہو جاتا ہے کہ اگر اس کا قصد بھی کرے تو اس قدر جی برا ہو کہ گویا ذبح کر ڈالا اور اس تہدیل کو فنا بھی کہتے ہیں کیونکہ بجائے ملکات سیئہ کے ملکات حسنہ پیدا ہو گئے اور یہ فنائے حسی ہے۔ فنا کی دو قسمیں ہیں۔ فنائے حسی اور فنائے علمی۔ فنائے علمی اسے کہتے ہیں کہ غیر اس کے علم سے فنا ہو گیا جیسا کہ حق تعالیٰ کا ذکر ایسا غالب ہوا کہ ذکر کے علم سے غیر حق فانی ہو گیا تو وہ غیر واقع میں فانی تھوڑا ہی ہو گیا بلکہ واقع میں تو وہ موجود ہے لیکن اس کے علم سے غائب ہو گیا ہے اور یہاں واقع میں وہ ملکہ سیئہ جاتا ہی رہتا ہے لیکن جاتے رہنے کی حقیقت یہ ہے کہ مضمحل ہو جاتا ہے یعنی اس میں اضمحلال اس درجہ ہو جاتا ہے کہ گویا وہ جاتا ہی رہتا ہے یہاں یہ نہیں ہے کہ اس ملکہ کی طرف سالک کا التفات نہیں رہا۔ بلکہ وہ ملکہ واقع میں زائل ہو گیا لیکن اسی تفسیر کے ساتھ اس کو فنائے حسی اور فنائے ذاتی کہتے ہیں تو بہر حال یہ رحمت ہوتی ہے کہ ملکات سیئہ ملکات حسنہ سے مبدل ہو جاتے ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ معصیت کا بالکل تقاضا ہی نہیں ہوتا اگر کبھی سہواً بھی نسیانا بھی صدور معصیت کا ہو جاتا ہے تو ایک پہاڑ غم کا ٹوٹ پڑتا ہے یہ حالت ہوتی ہے۔

بر دل سالک ہزاروں غم بود گرز باغ دل خلالے کم بود

روتے روتے جان دیتا ہے تو یہ رحمت ہوتی ہے تو خلاصہ کیا ہوتا ہے اس تہدیلی کا۔ یہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ مغلوب کرتے ہیں بری خواہشات کو اور غالب کر دتے ہیں اچھی خواہشات کو اس سے انسان راستہ چلتا ہے ایک تو یہ تہدیلی ہوتی ہے اس کو تہدیلی ذات بھی کہتے ہیں یعنی جو پہلی ذات تھی وہ جاتی رہی اس کے بجائے ایک دوسری ذات اس کے قائم مقام ہو گئی۔ یہ تہدیلی ذات ہی تو ہوئی پھر جب ایک زمانہ اس پر گذر گیا اور جو اس میں حکمت تھی خدا کی کہ بندہ خوگر ہو جائے طاعت کا یعنی نفرت ہو جائے معاصی سے اور دلچسپی ہو جائے طاعات سے جب یہ مقصود حاصل ہو گیا تو بعض اوقات اس میں ایک اور تغیر ہوتا ہے وہ یہ کہ جن ملکات سیئہ کو مغلوب و مضمحل کیا گیا تھا جب ان کی مقاومت بوجہ ملکات حسنہ کے راسخ ہو جانے کے آسان ہو گئی تو اب وہ چاہتے ہیں اپنے بندہ کا اجر بڑھانا اس واسطے اس وقت رفتار حکمت کی یہ ہوتی ہے کہ اول امور طبعیہ دب جاتے ہیں مگر چند روز کے بعد وہ پھر ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں لیکن یہ نہیں کہ ابھرتے ابھرتے غالب ہو جاتے ہوں بلکہ اپنی اصلی فطرت پر آ جاتے ہیں کیونکہ یہ ملکات سیئہ اصل فطرت میں بھی غالب نہ تھے اگر کوئی کہے کہ نہیں ہم تو دیکھتے ہیں کہ بچپن میں بھی یہ ملکات غالب ہوتے ہیں لیکن یہ بات نہیں ہے بچپن میں بھی یہ ملکات موجود تو تھے لیکن غالب نہ تھے مشق کر کر ہم نے شہوت کو غضب کو حرم کو طمع کو قوی کر لیا ہے۔

توبہ کا طریق

حق تعالیٰ نے اس سے قبل کی آیت میں بعض اعمال منہی عنہا یعنی بعض معاصی کا بیان کیا ہے اور اس پر وعیدیں فرمائی ہیں کہ جو شرک کرے گا یا بدکاری کرے گا یا قتل کرے گا اس کو اس طرح عذاب ہوگا پھر اس عذاب

سے استثناء فرماتے ہیں۔ اس آیت میں جس کا یہ حاصل ہے کہ سب کو عذاب ہوگا مگر ان کو نہ ہوگا جن کی یہ شان ہے کہ انہوں نے جملہ معاصی سے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کئے یعنی کفر سے بھی توبہ کی اور کفر سے توبہ یہ ہے کہ کفر چھوڑ کر ایمان لے آئے اور چونکہ اوپر ذکر کفر و شرک کا بھی تھا اس کے متعلق تو یہ ارشاد فرمایا کہ آمن یعنی ایمان لے آئے اور چونکہ بعض اور معاصی بھی مذکور تھے گوان کا وقوع بھی کافروں ہی سے مذکور ہے مگر فی نفسہ ان کی خصوصیت خاص کفار ہی سے نہیں بلکہ جو بھی جلاء ہو اسی کے لئے تدارک اور اصلاح کا طریقہ بھی بتلانا ہے اس لئے آمن کے ساتھ تاب کو فرمایا۔ گو تاب کو مقدم فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ توبہ تو جملہ معاصی سے ضروری ہے مگر بالتخصیص کفر سے توبہ نہایت ہی ضروری ہے یعنی ایمان بھی ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جتنے معاصی ہیں ان سے توبہ کرنا چاہیے اور ان میں سے کفر و شرک بھی ہیں اور توبہ کا طریق یہ ہے۔ یعنی بعض معاصی سے توبہ یہ ہے کہ ایمان بھی لاوے گویا یہ تخصیص بعد تقسیم ہے ورنہ ظاہر یہ تھا کہ ایمان مقدم ہوتا مگر اس میں یہ نکتہ ہے جو میں نے بیان کیا اور یہ بات عکس میں حاصل نہ ہوتی۔ پھر فرماتے ہیں و عمل عملاً صالحاً یہ نہیں کہ توبہ کر کے بیٹھ رہے بلکہ آئندہ کے لئے بھی اہتمام کرے اور نیک کام کیا کرے نیک کام میں دونوں امر آگئے معاصی کا چھوڑنا بھی اور طاعات کا اختیار کرنا بھی جو شخص ایسا کرے گا وہ البتہ عذاب سے بچے گا۔

گنہگاروں کو بشارت

آگے فرماتے ہیں وکان اللہ غفوراً رحیماً اس کی دو تقریریں ہیں ایک دویہ کہ فرما رہے ہیں۔ گنہگاروں کو کہ بشارت سن لو کہ بس تمہاری طرف سے توبہ ہی کی دیر ہے اللہ تعالیٰ غفور ہیں وہ تو توبہ قبول کر ہی لیتے ہیں۔ سب گناہوں کو مٹا ہی دیتے ہیں کیونکہ ہم غفور ہیں اور یہی نہیں بلکہ رحیم بھی ہیں یعنی توبہ کے بعد جو اعمال کرو گے انہیں بھی ہم قبول کریں گے اس تفسیر کے اعتبار سے تو یہ ارشاد تحقق توبہ کے ساتھ متعلق ہے جو الامن قاب میں مذکور ہے اور جو یسدل اللہ سیناتہم حسنات کے ساتھ متعلق کیا جاوے تو وہ ایک نہایت لطیف تفسیر ہوگی اور یہ دوسری تقریر ہے یعنی ایک تبدیل کا تعلق تو ہے رحمت سے اور دوسری تبدیل کا تعلق ہے مغفرت سے یعنی برے ملکات کو مٹا دیا اور ان کی جگہ اچھے ملکات عطا کر دیئے۔ یہ تو مغفرت ہوئی اور یہ رحمت ہے کہ برے ملکات کو مٹایا تو نہیں مگر ایسا کر دیا کہ ان کی خاصیت بدل دی۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی تبدیلی کے متعلق غفور کو کہا جاوے اور دوسری تبدیلی کے متعلق رحیم کو کہا جاوے تو یہ نہایت ہی اچھا مطلب ہو جاتا ہے۔

ظلم ملک بائع نفسک الایکونوا مؤمنین

سو شاید آپ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو غم سے جان دیدیں گے ۱۲

اور فرماتے ہیں

لست علیہم بمصیطر

آپ ان پر مسلط نہیں ہیں ۱۳

اور ارشاد ہے:

فمن اهتدای فانما یهتدی لنفسه

”سو جو شخص راہ پر آویگا وہ اپنے ہی فائدہ کے لئے راہ پر آویگا۔“

اور انا ارسلناک بالحق بشیرا و نذیرا

”ہم نے آپ کو ایک سچا دین دیکر بھیجا ہے کہ خوشخبری سناتے رہے اور ڈراتے رہے“

اور وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر

اور آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہو سو جس کا جی چاہے ایمان لے آوے اور جس کا جی چاہے کافر رہے

اور یا ایہا الذین امنوا علیکم انفسکم ”اے ایمان والو اپنی جان کی فکر کرو“

اور وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ۔ ”اور کسی شخص کو ایمان لانا ممکن نہیں بدون حکم خدا کے“

اس قسم کی آیات کو اگر جمع کیا جاوے تو تقریباً ایک پارہ کی مقدار پر جمع ہو جاویں جن کو حاصل یہ ہے کہ آپ ان کے پیچھے کیوں پڑتے ہیں۔ آپ کا کام تبلیغ شخص ہے اس سے زیادہ اس بوجھ کو اپنے اوپر نہ اٹھایا جاوے کہ جو کام مریض کا ہے وہ بھی آپ ہی کریں کہ آپ میں مشقت اور تکلیف زیادہ ہے جس پر دوام مشکل ہے ہر شخص اپنے عواقب اور انجام کو اچھے طور سے اور سہولت سے سمجھ سکتا ہے لیکن اس میں سخت دشواری ہے کہ دوسرا شخص اس کے بار کو برداشت کرے اور یہ بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ جاوے۔ البتہ اس درجہ شفقت کرنے کی بھی حق تعالیٰ نے ممانعت نہیں فرمائی۔ یہ صرف مشورہ ہے مطلب یہ ہے کہ مصلح کے لئے مشورہ یہی ہے کہ وہ اس قسم کی فکر خاص میں نہ پڑے کیونکہ اس پر دوام ہو نہیں سکتا اور جب دوام نہیں ہوتا۔ تو لامحالہ اس قسم کی فکر خاص کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ تو اس مشقت سے فائدہ ہی کیا ہوا اور اگر اس وقت بھی ترک نہ کیا تو عمر بھر کی مصیبت خریدی۔ اسی لئے عارفین کا قول ہے کہ

آرزو منخواہ لیک اندازہ خواہ برتا بد کوہ را یک برگ کاہ

نیز حضور کا ارشاد ہے

انک لا تہدی من احببت ولكن اللہ یهدی من یشاء

حضور ﷺ حضرت ابوطالب کے درپے تھے۔ آیت نازل ہوئی کہ آپ درپے نہ ہو جیئے

انک لا تہدی الایۃ

لعلک باخع نفسک الایکونوا مؤمنین

یعنی آپ شاید جان دے دیں گے اس رنج میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اس سے صاف ثابت ہے کہ حضور کو نفع رسائی میں اتنا شغف تھا کہ اپنی جان کی بھی پروا نہ تھی۔

غرض! حضور نے نہ فرمایا کہ چولہے میں جاویں ایمان لاویں یا نہ لاویں۔ اسی طرح کاطین کو اپنے متوسلین سے عشق ہوتا ہے اور کوئی خیر خواہی ان سے اٹھا نہیں رکھتے۔ (آخر الاموال لمحمد وواحد علم و عمل)

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَى هَارُونَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی اس لئے ہارون علیہ السلام کے پاس بھی جی بھیج دیجئے۔

تفسیری نکات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کیلئے
رسول بنانے کی دعاء میں حکمت؟

دعا کا جواب یہ ہے کہ عقدہ نگرہ ہے چیز میں اثبات کے تو سب زائل نہیں ہوا۔ کچھ باقی رہا۔ صرف اتنا زائل ہوا کہ مخاطب بات سمجھ سکتا تھا اور دعا پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اولیاء اللہ حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام نے کیوں رضا اختیار نہ کی جواب یہ ہے کہ چونکہ نبی تھے اور جانتے تھے کہ مجھے تبلیغ کا کام کرنا ہے تو اللہ کی رضا اس میں ہے کہ کچھ عقدہ زائل ہو جائے اس واسطے دعا میں لفظ بڑھا دیا کہ یفقهوا قولی یعنی اتنا عقدہ زائل ہو کہ مخاطب بات سمجھ سکے کتنا ادب ملحوظ رکھا کہ جتنی مقدار ضروری تھی اس سے زیادہ کا سوال نہیں فرمایا۔ پھر اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ مخاطب جب بات سمجھ سکتے تھے تو ہارون علیہ السلام کے رسول ہونے کی دعا کیوں کی۔ جواب یہ ہے کہ اس دعاء کی وجہ قرآن شریف سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ تھی کہ میری تصدیق کریں۔ فارسلہ معی رداً یصلقنی ہارون کو میرے ساتھ معاون بنا کر بھیج دیجئے کہ وہ میری تصدیق کریں۔

تو تصدیق کرانا بھی مقصود تھا اور اس میں حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ مدرسہ دوم کے ہوتے ہیں اور وہ کہ تقریر کر دی طلباء سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ ان کی روانی تقریر میں فرق نہیں آتا۔ اور ایک وہ ہوتے ہیں کہ اگر طلباء نہ سمجھیں تو طبیعت میں روانی نہیں ہوتی طبیعت میں تنگی ہوتی ہے موسیٰ علیہ السلام چونکہ طبیعت کے تیز تھے اور فرعون کا انکار دیکھ کر یہ خطرہ تھا کہ طبیعت میں روانی نہ رہے گی اور یہ مقصد تبلیغ کے منافی ہے اس واسطے فرمایا کہ رسول ہو کر تصدیق کریں گے اور تائید میں سر ہلائیں گے تو طبیعت بڑھ جائے گی۔

قَالَ لَهُمْ مُوسَى الْقَوَامَا أَنْتُمْ مُلْقُونَ ﴿۱۳۳﴾

ترجمہ: موسیٰ نے سے فرمایا کہ تم کو جو کچھ ڈالنا ہے ڈالو۔

تفسیری نکات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا

ساحران موسیٰ کو اجازت دینے کا راز

یہی راز ہو سکتا ہے موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا کہ انہوں نے ساحران فرعون سے فرمایا تھا۔ القواما انتم ملقون (جو کچھ تم ڈالنے والے ہو ڈالو) بظاہر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ساحران فرعون کا سحر تو کفر یا معصیت تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس سحر کی اجازت کیوں دی۔ جواب یہ ہے کہ یہ اجازت ابقاء کفر کے لئے نہ تھی بلکہ اس سے احتیاق حق اور ابطال باطل مقصود تھا کیونکہ جب وہ لوگ اولاً اپنا سحر ظاہر کریں گے اور موسیٰ علیہ السلام کا عصا سب کو فنا کر دے گا تو اس طرح اظہار حق کامل طور سے ہوگا۔ اس مصلحت اظہار حق کے لئے انہوں نے فرمایا تھا۔

القواما انتم ملقون و عندی جواب اخر و هو ان الامر هناک للتمجیز القواما انتم ملقون فانی لا اعبا عبہ فافعلوا ماشتم کما فی قولہ تعالیٰ فمن شاء فلیکفر۔

(میرے نزدیک ایک اور جواب یہ ہے کہ یہاں پر اجازت دینا ان کو عاجز کرنے کے لئے تھا۔ یعنی تم جو کچھ سحر بندی کر سکتے ہو کرو۔ میں پہلے سے تم کو روکتا نہیں۔ تاکہ ان کی کامل سحر بندی کے بعد اس کو تار عنکبوت کی طرح ختم کر دیں اور وہ عاجز ہو کر اقرار کریں حق کا)

تو یہ اجازت ابقاء سحر کو مٹانے کے لئے تھی کیونکہ اس کے مٹانے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا کہ اول وہ اپنی کوشش کو ظاہر کریں بعد میں موسیٰ علیہ السلام کا عصا نہایت سہولت سے دفعہ سب کو مٹا دے یہ آیت صوفیہ

کے اس طرز عمل کی دلیل ہے جس سے بعض اہل ظاہر متوحش ہوتے ہیں کہ انہوں نے منکر شرعی کی اجازت دی حالانکہ وہ منکر کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اس کو جڑ سے مٹانا چاہتے ہیں جس کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہ تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔ (نور النور لمحققہ وواعظہ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۲۶۵)

فَاتَّبَعُوهُمْ مُشْرِقِينَ ۝ فَلَمَّا تَرَاءَ الْجَمْعُ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ

إِنَّا لَمُدْرِكُونَ ۝ قَالَ كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝

ترجمہ: پھر جب دونوں جماعتیں (آپس میں ایسی قریب ہوئیں کہ) ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں تو موسیٰ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں کیونکہ میرے ہمراہ میرا پروردگار ہے وہ مجھ کو (دراے نکلنے کا) بھی راستہ بتلا دے گا۔

تفسیری نکات

اصحاب موسیٰ بوجہ ضعیف الیقین

معیت حق سے محروم تھے

انہوں نے اس کو جزم و یقین کے ساتھ ظاہر کیا۔ قال اصحاب موسیٰ انالمدركون جس میں ان اور جملہ اسمیہ اور لام تاکید تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً پکڑے گئے۔ حالانکہ بارہا دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابلہ میں کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نصر کو سن کر چلے تھے۔ ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا ایسا جزم ہو گیا۔ صاف ان کے غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے دھمکا کر فرمایا کلا گویا ایک چپٹ لگا دیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا جس تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کلا میں ہے۔ پھر چونکہ یہ لوگ بدرجہ کامل الیقین نہ ہونے کے معیت حق سے محروم تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لئے مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا کیونکہ قاعدہ ہے نقلہم ما حقه التاخير بفيد الحصر اور اسی وجہ سے معنی بصیغہ مفرد فرمایا۔ صیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ میرے ہی ساتھ میرا پروردگار ہے تم لوگ بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو۔

وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينُ ۖ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينُ ۗ

وَالَّذِي يُبَيِّتُنِي ثُمَّ يُحْيِينُ ۗ

ترجمہ: اور جو کہ مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔ اور جو مجھ کو (وقت پر) موت دیا پھر (قیامت کے روز) مجھ کو زندہ کریگا۔

تفسیری نکات

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں۔ والذی ہو یطعمنی و یسقین و اذا مرضت فهو یشفین اطعام و اسقواء و شفاء کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا اور مرض کو اپنی طرف اس لئے ہو الذی یمرضنی و لیشفین نہیں فرمایا بلکہ اذا مرضت فهو یشفین کہا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو حق تعالیٰ مجھ کو شفا دے دیتے ہیں گویا بیمار تو میں خود اپنی کسی بے اعتدالی کی وجہ سے ہوتا ہوں پھر وہ شفا دے دیتے ہیں چونکہ بیماری طبعاً ناگوار ہے اس لئے ناگوارشی کو محبوب کی طرف منسوب نہیں کرتے اگرچہ حافظ یوں فرماتے ہیں کہ

درد از یارست و درماں نیز ہم دل فدائے اوشد و جاں نیز ہم

یہ درد اور درماں دونوں کو محبوب کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام حافظ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ نیز ممکن ہے حضرت حافظ کے وارد وقت کا بھی متفقنا ہو اور اصل میں مرض کو اپنی ہی طرف منسوب کرنا زیادہ ادب ہو مگر ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد یوں بھی فرماتے ہیں۔ والذی یمیتنی لم یحیین یہاں امانت کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ موت ایسی ناگوار چیز نہیں جس کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب ہو گویا موت بیماری سے بھی کم ہے کہ وہ تو ناگوار ہے اور یہ ناگوار نہیں بلکہ موت تو مرغوب شے ہے حدیث میں آتا ہے الموت تحفة المؤمن۔ موت مومن کے لئے ایک تحفہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحفہ مرغوب ہی شے ہو سکتی ہے نا مرغوب کو تحفہ کوئی نہیں کہتا اور جب ہر مومن کے لئے موت تحفہ ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے تو بالخصوص تحفہ ہے کیونکہ وہ تو سید المومنین ہیں ان کو موت کیونکر ناگوار ہو سکتی ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ گنہگار مسلمان کے لئے بھی موت تحفہ ہے گو کچھ دنوں کے لئے اس کو عذاب بھی بھگتنا پڑے کیونکہ موت ہی کے ذریعے سے اس کو کسی وقت خدا کا قرب حاصل ہوگا۔ رہا یہ اشکال کہ کیا مقرب کو عذاب بھی ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں ہاں ہوتا ہے جیسے تم بادشاہوں کے پاس کپڑوں میں

کو برنگا کر جاؤ تو وہ تم کو حمام میں بھیج دیں گے جہاں گرم پانی سے خوب مل کر تم کو غسل دیا جائے گا اسی طرح مسلمانوں کے لئے دوزخ جیل خانہ اور حوالات نہیں بلکہ مثل حمام کے ہے دوسرے گنہگار مسلمانوں کو دوزخ کے عذاب کا بہت زیادہ احساس بھی نہ ہوگا کیونکہ حدیث مسلم میں ہے **بِسْمِئِهِمْ اَمَانَةٌ** کہ حق تعالیٰ جہنم میں مسلمانوں کو ایک قسم کو موت دیں گے اور اگر عذاب بھی ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ جس نعمت کے زوال کی ہر دم توقع ہو وہ اس نعمت سے افضل ہے جس کے زوال کا ہر وقت اندیشہ لگا ہوا ہو پس مسلمان کے لئے موت ہر حال میں اچھی ہے کیونکہ دنیا کی راحت میں زوال کا خطرہ لگا ہوا ہے اور آخرت کی تکلیف کے منقطع ہونے کی ہر دم توقع ہے پس موت ناگوار چیز نہیں اس لئے ابراہیم السلام نے ہمتینی تم یحییٰ میں احیاء کی طرح امانت کو بھی حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔

سُورَةُ النَّامِلِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تَسْمِعُ الْقُفُومَ الذُّعَالَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہیں (خصوصاً جب وہ پیٹھ پھیر کر چل دیں)

تفسیری نکات

سماع موتی اور اہل قبور سے فیض کا ثبوت

لکھنؤ سے ایک غیر مقلد عالم یہاں پر آئے تھے غالباً دو تین روز یہاں پر قیام کیا۔ تھے سمجھدار ایک روز انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ سماع موتی کے بارے میں آپ کی کیا تحقیق ہے اس لئے کہ نص انکار کر رہی ہے قرآن پاک میں ہے انک لا تسمع الموتی میں نے کہا کہ یہی آیت سماع حسی مشاہدہ ہے صرف سماع قبول منفی ہے پس یہی حالت مشہ بہ کی ہوگی کہ سماع حسی ثابت اور سماع قبول منفی چنانچہ ظاہر ہے کہ مردے سماع مواعظ سے مستفیع نہیں ہوتے تو اس آیت سے نفی سماع پر دلالت کہاں ہوگی۔

دوسرا سوال یہ کیا کہ کیا اہل قبور سے فیض ہوتا ہے میں نے کہا کہ ہوتا ہے اور حدیث سے ثابت ہے اس پر بہت چوکے ہوئے میں نے کہا کہ حدیث شریف میں قصہ ہے کہ ایک صحابی نے قبر پر بھولے سے خیمہ لگا لیا تھا مردہ بیٹھا ہوا قرآن شریف پڑھ رہا تھا۔ انہوں نے سنا اور قرآن سننے سے کہ ثواب ہوتا ہے تو یہ فیض اہل قبور ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَاوِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنِعَ اللَّهُ

الَّذِي أَنْتَقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ ﴿۱۳۹﴾

ترجمہ: اور تو (جن) پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے (اور) ان کو خیال کر رہا ہے کہ یہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کریں گے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑے پھریں گے یہ خدا کا کام ہوگا جس نے ہر چیز کو (مناسب انداز پر) مضبوط بنا رکھا ہے یہ یعنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب افعال کی پوری خبر ہے۔

تفسیری نکات

حضرت عمرؓ بظاہر زیادہ مضبوط اور دلیر و مستقل مزاج نظر آتے تھے مگر اس وقت ان کی بھی یہی حالت تھی کہ جو اس باختہ ہو گئے اور نکوار ہاتھ میں لے کر پکارتے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ اس کی گردن اڑا دوں گا۔ آپ زندہ ہیں اور ابھی منافقین کی خبر لیں گے۔

وصال نبوی کے بعد خطبہ صدیق اکبرؓ

یہ خبر سن کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دوڑے ہوئے عوالی سے تشریف لائے اور سیدھے حضرت عائشہؓ کے گھر میں جا پہنچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو ہی چکا تھا۔ حضرت صدیقؓ نے چادر چہرہ مبارک سے ہٹائی اور بے اختیار پیشانی الور کا بوسہ لیا۔ اس وقت حضرت صدیقؓ سب سے زیادہ مضبوط نکلے ان کی زبان سے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین ہو جانے کے بعد کوئی بات نہیں نکلی سوا اس کے کہ ایک دو دفعہ اتنا کہا واخلیلا

حضرت جنیدؒ ایک صاحب کمال بزرگ

ایک دفعہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں تشریف فرما تھے کسی نے کوئی عجیب شعر پڑھا اس پر ایک صوفی کو سخت وجد ہوا کہ قریب بہ ہلاک ہو گیا اور سارے مجمع پر ایک کیفیت طاری ہو گئی مگر حضرت جنید ویسے ہی وقار سے بیٹھے رہے جیسے تھے ان کو ذرا تغیر نہ ہوا تو کسی نے سوال کیا کہ اے جنید کیا تم کو اس شعر سے لطف نہیں آیا جو ذرا بھی وجد نہ ہوا تو آپ نے جواب دیا وتروی الجبال تحسبها جامدة وهي تمر مر السحاب (یعنی پہاڑوں کو تم (قیامت میں) ایک جگہ پر ٹھہرا ہوا دیکھو گے حالانکہ وہ ایسے تیز چلتے ہوں گے جیسے بادل چلا کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ لوگ ہلکے طرف تھے۔ ان کی حرکت سب کو نظر آ گئی اور کمال پہاڑ کی طرح ہے کہ اس کی حرکت نظر نہیں آتی ظاہر میں وہ ساکن معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہ بہت تیز جا رہا تھا اور ذرا سی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔

سُورَةُ الْقَصَصِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَإِذْ أَخْبَرْنَا آلَ إِمْرَأَتَيْ مُوسَىٰ أَنِ اضْمُرِّي هَاتَيْنِ فَاصْبِرِي عَلَيْهِ

فَالْقِيَتِي فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ

وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۱۵۰﴾

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کیا کہ تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت اندیشہ ہو تو ان کو دریا میں ڈال دینا اور نہ تو اندیشہ کرنا اور نہ غم کرنا ہم ضرور ان کو تمہارے ہی پاس واپس پہنچادیں گے اور ان کو پیغمبر بنا دیں گے۔

تفسیری نکات

ازالہ خوف و حزن کی تدبیر

اب صبر کا مضمون جو پہلی بار کے بیان میں زیادہ مقصود تھا وہ ان دو جملوں سے یعنی لا تخافی اور لا تحزنی سے مستنبط ہوتا ہے یعنی والدہ موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی یعنی جب تم کو یہ اندیشہ ہو کہ موسیٰ علیہ السلام دشمن کے ہاتھ آ جاویں گے اور وہ ان کو قتل کر دے گا تو ایسے وقت میں ان کو دریا میں ڈال دینا اور نہ اندیشہ کرنا نہ غمگین ہونا یعنی ضبط کرنا اور صبر سے کام لینا۔ ایسے موقع پر دو چیزوں کا احتمال ہو سکتا تھا یعنی خوف کا اور حزن کا حق تعالیٰ نے ان دو جملوں میں دونوں احتمالات کو دفع فرما دیا اور خوف و حزن میں فرق یہ ہے کہ خوف کہتے ہیں اس کو کہ کسی آنے والے مضر

واقعہ کا احتمال ہو اور حزن کہتے ہیں اس کو کہ کسی گزشتہ ناگوار واقعہ پر ناگواری اور افسوس ہو۔ یہاں واقعہ گزشتہ تو یہ تھا کہ ہائے میں نے بچہ کو اپنے ہاتوں دریا میں ڈال دیا اس کو یاد کر کے حزن ہو سکتا تھا اور واقعہ آئندہ کا خوف یہ تھا کہ دیکھئے کس کے ہاتھ آوے اور وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے غرض یہاں دو چیزوں کا احتمال تھا حق تعالیٰ نے دونوں کے متعلق فرمایا تم نہ تو دریا میں ڈال کر اپنے فعل پر پچھتاؤ اور نہ ڈالنے کے بعد آئندہ کا اندیشہ کرنا دونوں باتوں سے دور رہنا اور ایسے وقت ضبط اور صبر سے کام لینا۔

ضبط نفس کی تعلیم

صاحبو! اس موقع پر صبر کرنا صبر علی الموت (موت پر صبر کرے) سے بھی اشد ہے کیونکہ موت تو ایسا واقعہ ہے جہاں صرف حزن ہی ہوتا ہے اور خوف نہیں ہوتا اور یہاں دونوں جمع ہیں خوف بھی حزن بھی غرض اکثر واقعات یا موجب حزن ہوتے ہیں یا موجب خوف اور یہ واقعہ خوف اور حزن دونوں کو مضمّن ہے اس لئے ایسے واقعہ پر صبر سخت مشکل ہے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ایسا واقعہ شدیدہ پیش آنا اور پھر عورت ہو کر اس قدر صبر کرنا تعجب خیز امر ہے ایسے وقت میں مردوں کے بھی قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور صبر کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور چونکہ جب یہ دونوں امر مجتمع ہوں یعنی خوف بھی حزن بھی ہو پھر عورت کا جگر اور اس کا تحمل کرنا اور اصلاً دوسری طرف جنبش نہ کرنا عجیب بات تھی اس لئے حق تعالیٰ نے تسلی کے اس موقع کے مناسب نہایت حکیمانہ مضمون ارشاد فرمایا کہ ہر پہلو سے پوری تسلی فرمادی آدمی کے طبائع اور جذبات اولاد کے متعلق مختلف ہوتے ہیں یہاں سب کی پوری رعایت ہے۔ اس لئے صبر کی تعلیم کے لئے واللہ یہ مضمون کافی ہے۔ کوئی نکلند آدمی ایسا نہ ہوگا کہ اس قسم کی حکیمانہ تسلی سن کر رنجیدہ رہے بلکہ یہ سن کر کہ بچہ سے پھر ملنا ہوگا قلب سے ملال بالکل رفع ہو کر کلیجہ میں ٹھنڈک پڑ جاوے گی۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قلب میں جو وساوس پیدا ہوتے سب کو علماً و عملاً دونوں طرح رفع فرما کر مضمون کو کامل کر دیا چنانچہ اول انارادوہ الہک وجاعلوہ من المرسلین (ہم ان کو ضرور تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے اور ان کو مرسلین میں کریں گے) سے عقلی لم بیان فرمائی کہ تم غمگین نہ ہونا کیونکہ ہم ان کو تمہارے پاس واپس لا دیں گے یعنی موسیٰ اس وقت دریا میں بھی ہلاک نہ ہوں گے جو باعث غم ہو اور آئندہ بھی ہلاک نہ ہوں گے جو باعث خوف ہو بلکہ ان کی عمر اتنی دراز کر دیں گے کہ چالیس سال کے بعد ان کو رسولوں میں سے بنادیں گے۔ غرض مصیبت کے وقت ہی دونوں باتیں پیش آتی ہیں خوف اور حزن یہی دو امر اکثر واقع ہوتے ہیں مثلاً بیٹے کا مر جانا اس وقت ایک تو اپنے اعتبار سے رنج ہوتا ہے کہ ہائے ہم سے جدا ہو گیا اور ایک اس کے اعتبار سے رنج ہوتا ہے کہ ہائے وہ ہمارے پاس کھاتا پیتا تھا اب ان باتوں سے روک دیا گیا اب کی مرتبہ آم سے محروم رہا اور آئندہ کے لئے اپنے اعتبار سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کی مفارقت میں ہمارا کیا حشر ہوگا تو

حق تعالیٰ حزن و خوف دونوں کو اس جگہ رفع فرماتے ہیں کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو تمہارے پاس واپس لاویں گے اور ان کو پیغمبر بناویں گے تو آئندہ ہلاک بھی نہ ہونے دیں گے مردد از ہوگی اس سے خوف کو رفع فرمادیا نیز تم سے پھر ملیں گے لہذا یہ بھی غم نہ کرنا کہ میری آنکھوں سے غائب ہو گئے غرض آیت لاسخافی ولا تحزنی (ندانیدیشہ کرنا اور نہ غم کرنا اس سے دونوں قسم کے واقعوں پر ضبط نفس کی تعلیم معلوم ہوگئی جس کا نام صبر ہے)

قواعد شرعیہ جامع مانع ہوتے ہیں

قواعد شرعیہ اس قدر جامع مانع ہیں کہ دونوں قسم کے اثر کا ازالہ فرمادیا اسی قسم کے مضمون کو ایک بدوی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی وفات کے وقت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے بیان کیا تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عباس کا جو کچھ غم تھا اس پر کسی کے قول سے اتنی تسلی نہیں ہوئی جتنی ایک گنوار آدمی کے قول سے تسلی ہوئی وہ مضمون تسلی بخش یہ تھا۔

اصبر لکن بک صابرين فانما صبر الرعية بعد صبر الراس
اب صبر کیجئے ہم بھی آپ کی وجہ سے صبر کریں گے کیونکہ چھوٹوں کا صبر بڑوں کے صبر کے بعد ہے آپ بڑے ہیں پہلے آپ صبر کیجئے۔

خیر من العباس اجرک بعدہ واللہ خیر امنک للعباس
(یعنی اس واقعہ میں نہ تمہارا کچھ نقصان ہوا بلکہ نفع ہی ہے اور وہ نفع یہ ہے کہ تم کو ثواب ملا اور ثواب تمہارے لئے حضرت عباس سے بہتر ہے اور نہ حضرت عباس کا کچھ نقصان ہوا اس لئے کہ وہ خدا تعالیٰ سے مل گئے اور اللہ تعالیٰ عباس کے لئے تم سے بہتر ہیں یعنی تمہارے پاس رہنے سے ان کا اللہ کے پاس رہنا زیادہ بہتر ہے تو کسی کا بھی نقصان اور گھانا نہ ہو اور دونوں نفع میں رہے پھر غم کیسا کہ مومن ہر حال میں یہاں کی حالت سے وہاں آرام ہی میں ہوں گے کیونکہ ایک دن جنت میں واپس ہونے والے ہیں اور ان کو معلوم بھی کرادیا جاوے گا مفارقت کے بعد وصال کی امید جو وہ بحکم وصال ہی ہے اور اس مضمون کو رادوہ الیک (ہم ضرور ان کو تمہارے پاس واپس پہنچادیں گے) سے بھی قیاس صحیح ثابت کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں بھی واپسی ہی ہے تسلی کی گئی تھی کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو پھر تمہارے پاس واپس لوٹادیں گے تاکہ تم پھر مل لو اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا کر اطمینان قلبی حاصل کر لو اس وجہ سے حزن نہ کرو یہی علت دونوں جگہ مشترک ہے اور کسی تسلی کی وجہ واقعہ غم میں ہمارے لئے بھی ہو سکتی ہے کہ مردہ گو ہمارے پاس دنیا میں واپس نہ ہوگا لیکن جب ہم جاویں گے اور اس سے ملیں گے تو یہ بھی واپسی ہی کے حکم میں ہے کیونکہ مقصود جو کہ ملاقات ہے وہ اس صورت میں بھی بدرجہ اتم حاصل ہوگی کیونکہ اس ملاقات کے بعد پھر مفارقت کا اندیشہ ہی نہیں اس لئے ہمیں بھی حزن زیبا نہیں کیونکہ سب کا اجتماع خدا کے یہاں ہوگا۔ چنانچہ حق تعالیٰ اسی کو دوسرے الفاظ میں فرماتے ہیں انا لله وانا الیہ راجعون

کہ ہم سب یعنی مردہ اور اس کے سب متعلقین انہی کے پاس جانے والے ہیں وہاں سب ملیں گے اسی لئے کسی عزیز کی موت کے وقت ہمیں اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (ہم اللہ ہی کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے کے مضمون کو سوچا کریں خدا تعالیٰ کے یہاں سب کا اجتماع ہوگا اور سب آپس میں ہمیشہ کے لئے ملتے جلتے رہیں گے آخرت تو کسی قدر شاندار دور سمجھی جاوے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی سب مل جل لیتے ہیں چنانچہ حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب کوئی مر کر یہاں سے عالم ارواح میں پہنچتا ہے تو روحیں بہت خوش ہوتی ہیں کہ جیسے کوئی عزیز سفر سے آتا ہے اور اس سے مل کر ہم خوش ہوتے ہیں سب کی خیریت دریافت کرتے ہیں کہ ہمارا بھائی اچھا ہے فلاں شخص اچھا ہے یہاں تک کہ ایک شخص کو دریافت کرتے ہیں کہ وہ اچھا ہے یہ مردہ جواب دیتا ہے کہ وہ تو مر گیا تو وہ کہتی ہیں کہ وہ شاید دوزخ گیا ہو گا وہ یہاں نہیں آتا پھر کہتی ہیں کہ بھائی یہ تمکا ماندہ آیا ہے اسے آرام کر لینے دو پھر پوچھ پوچھ لینا پس جب مردہ سے ایک دن ہم کو ملنا نصیب ہوگا تو یہ مفارقت محض عارضی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص حیدرآباد جا کر ملازم ہو جاوے تو اس کی جدائی پر جبکہ وہ حیدرآباد میں یہاں سے زیادہ آرام میں ہو کون اس قدر روتا اور رنج کرتا ہے بلکہ تمنائیں کرتے ہیں کہ وہ حیدرآباد ہی میں ملازم رہے باقی ہم کسی نہ کسی دن مل بھی لیں گے اس استحضار میں عارفین کی یہی شان ہے ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک شخص روتا ہوا آیا اور عرض کیا کہ میری بیوی مر رہی ہے دعا کیجئے کہ تندرست ہو جاوے حضرت نے فرمایا کہ انسوس ایک شخص جیل خانہ سے چھوٹتا ہے اور دوسرا روتا ہے۔ اور فرمایا تم بھی اسی طرح چھوٹ جاؤ گے۔ پھر وہ بولا کہ حضرت میری روٹی کون پکاوے گا ارشاد فرمایا ہاں بھئی جب تم ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے وہ بھی تمہارے ساتھ روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی حضرت نے یہ باتیں اس طرح فرمائیں کہ جیسے یہ مشاہدہ وہ استحضار حضرت کا حال ہو وہ شخص کہنے لگا کہ حضرت ایک شخص مجھے مدینہ طیبہ ہمراہ لے چلنے کو کہتا تھا اب انکار کرتا ہے دعا کیجئے کہ وہ مدینہ طیبہ لے چلے حضرت خفا ہو گئے کہ ہم سے ایسی شرک کی باتیں نہ کرو ظاہر بینوں کے نزدیک تو یہ بات بگڑنے کی نہ تھی مگر جس نے سوئی دیکھی ہو پتلی چمکتی ہے مگر اس کی نوک نہ دیکھی ہو اسے کیا خبر وہ تو سوئی کو یہ سمجھے گا کہ یہ خوبصورت تنکا ہے مگر جس کو سوئی کی نوک کا بھی احساس اور ادراک ہو وہ واقعی معمولی چیز نہ سمجھے گا اس لئے اس واقعہ میں ہمارے نزدیک بگڑنے کی کچھ بھی بات نہیں عارفین کو جن باتوں سے شرک کی بو آتی ہے جیسے اس میں غیر اللہ پر نظر ہونے کا حضرت کو کچھ احساس ہو اوہ تو ان کو نشتر سے بھی زیادہ ایذا دہ سمجھیں گے گو دوسروں کو احساس نہ ہو ایک ایسا ہی۔

کبھی معمولی غلطی پر بھی گرفت ہو جاتی ہے

اور قصہ ہے کہ ایک مرتبہ بارش ہونے پر ایک بزرگ کے منہ سے نکل گیا کہ بڑے موقع سے بارش ہوئی۔ اسی وقت عتاب ہوا کہ اور بد تمیز بے موقع بارش کب ہوئی تھی جو آج کی بارش کو موقع کی کہتا ہے اور واقع

میں وہ خلاف مصلحت کیا کرتے ہیں اللہ میاں تو حکیم ہیں ان کا کوئی فعل خلاف حکمت نہیں ہوتا بظاہر دیکھنے میں یہ بات معمولی تھی مگر سخت گرفت ہوئی اور صحیح گرفت ہوئی اسی طرح بعض دفعہ طالبین پر معمولی بات پر عتاب کرتے ہیں کیونکہ واقع میں وہ معمولی نہیں ہوتی خدا تعالیٰ کے یہاں بھی جو باتیں ہمارے نزدیک ذرا سی اور چھوٹی ہیں اور ہم ان کو معمولی سمجھتے ہیں بعض اوقات ان پر پکڑ ہو جائے گی کیونکہ وہ واقع میں بڑی باتیں ہیں ایک عالم شخص کا قصہ میں نے اپنے ابتدائی کتابوں کے استاد سے سنا ہے وہ بواسطہ شیخ وہاں کی فرماتے تھے کہ ان کا مکہ میں انتقال ہوا کسی ضرورت سے قبر کھولی گئی تو دیکھا اس کی صورت مسخ ہو گئی اس کی بیوی سے دریافت کیا کہ یہ ایسا کیا عمل کرتا تھا معلوم ہوا کہ بیوی سے مشغولی کے وقت نہاتا ہوا گھبراتا تھا اور اس مسئلہ میں عیسوی مذہب کی مدح کرتا تھا ان کے یہاں غسل جنابت فرض نہیں تو ممکن ہے کہ کسی کی ظاہری نظر میں یہ ذرا سی بات ہو مگر فی الواقع ایسی ذرا سی بات ہے جیسی شیطان کی ذرا سی بات تھی کہو کہ ءاسجد لمن خلقت طینا اور خیر منہ خلقتی نار و خلقتہ من طین اور یہی بات تھی جو شیطان نے کہی تھی کہ خدا کے حکم کو خلاف حکمت کہا تھا مگر واقع میں کتنی بڑی بات تھی اسی وجہ سے ابدالآباد کے لئے جہنمی ہو گیا یہ بیچ کا مضمون تو حضرت حاجی صاحب کے ارشاد کی مناسبت سے کہ ہمارے سامنے شرک کی باتیں نہ کرو واسطہ ادا آ گیا اصل مضمون یہ تھا کہ اس دعا کرانے والے سے فرمایا کہ ایک شخص جیل خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور دوسرا الفسوس کر رہا ہے حقیقت میں دنیا جیل خانہ ہی ہے جس کے ختم ہوتے ہی باغ و بہار ہے۔ ہاں جو لوگ یہاں سے پاک صاف ہو کر نہیں گئے وہ کچھ دنوں کے لئے حمام اعظم (دوزخ) میں جاویں گے کوئی ہزار برس کوئی دو ہزار برس مگر ہزاروں برس کو ظاہر نظر میں بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں مگر واقع اور حقیقت میں خلود جنت کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں بہت تھوڑی مدت ہے کیونکہ یہ زمانہ مومنین کے دوزخ میں رہنے کا محدود ہے اور جنت کا قیام غیر محدود ہے پس کوئی مسلمان شخص آخرت میں نقصان میں نہیں اسی طرح اس کے مرنے کے بعد دنیا میں بھی کسی کا نقصان نہیں نہ مردہ کا کہ وہ یہاں سے اچھی جگہ چلا گیا نہ زندوں کا ان کو مردہ سے اچھی چیز مل گئی یعنی ثواب اور پھر چند روز میں خود وہ مردہ بھی مل جائے گا جیسا مفصل بیان ہوا اور یہاں جو لامعانی و لامعزلی (نہ اندیشہ کرنا نہ غمگین ہونا) ارشاد ہے اس کے متعلق ایک نہایت اور مفید مضمون قابل بیان ہے۔

اختیاری غم ممنوع ہے اضطراری نہیں

وہ یہ ہے کہ لامعزلی (نہ غمگین ہونا) کا یہ مقصود نہیں کہ مطلق غم مت کر دو تو امر طبعی غیر اختیاری ہے اس کے ساتھ امر وہی متعلق نہیں ہو سکتا بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اپنے اختیار سے غم نہ کرو باقی جس قدر خود ہوا سے ہونے دو یہاں دو سوال و جواب ضروری ہیں دوسرے سوال کے جواب میں اس کی توضیح ہو جائے گی کہ اختیار سے غم کرنے کی ممانعت ہے اضطراری سے ممانعت نہیں ایک سوال تو یہ ہے کہ اللہ میاں نے غم کو اضطرار اہو پیدا ہی

کیوں فرمایا جب مرنے کے بعد اس شخص کو اپنے وطن پہنچاتا ہے اور اس کا مقتضایہ ہے کہ کسی چیز پر غم نہ ہو تو جس طرح یہ مقتضایہ عقلی ہے اس طرح طبعی و تکوینی بھی رکھا جاتا اور اضطراری غم بھی پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ ایسے وقت بظاہر مناسب یہ تھا کہ حق تعالیٰ بندہ کی مدد فرماتے کہ غم ہی نہ ہونے دیتے دوسرا سوال جو اسی پر متفرع ہے یہ ہے کہ جب اضطرار غم پیدا کر دیا گیا تو پھر غم سے ممانعت ہمیں کیسی ہے اضطراری کا رفع اختیاری کیسے ہو سکتا ہے یہ دوسرا عجیب و غریب ہیں پہلے سے علم میں نہ تھے یعنی اصل مضمون تو ذہن میں تھا مگر ان شاخوں کی طرف ذہن نکل نہ ہوا تھا اسی وقت اس طرف ذہن نکل ہوا اور ساتھ ساتھ جواب بھی القا ہو گیا سنے غم کے پیدا کرنے میں حکمت یہ ہے کہ تمام عالم کا قیام غم پر ہے آپ کو تعجب ہو گا کہ عالم کا قیام غم پر کیوں کر ہے۔ ظاہر تو خوشی پر معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مدار تکوین مخلوق انسان ہے یعنی عالم کے پیدا کرنے سے اصل مقصود انسان کی پیدائش ہے باقی مخلوقات اصل مقصود نہیں گو باقی مخلوقات انسان سے پہلے پیدا ہوئی ہیں مگر ان کا پہلے پیدا ہونا بھی اسی کی دلیل ہے کہ انسان مقصود ہے۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص کہیں مسلمان جاتا ہے تو میزبان سب سامان میزبانی کا پہلے جمع کر دیتا ہے حتیٰ کہ ڈھیلے استنجے کے بھی مہمان کے آنے سے پہلے رکھ دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ تلاش نہ کرے اسی طرح حق تعالیٰ نے گائے بیل مکان وغیرہ غرض تمام ضروری سامان انسان سے پہلے جمع کر دیا تاکہ سکونت ارضی کے وقت انسان پریشان نہ ہو یہی وجہ ہے کہ دنیا میں پہلے سامان پیدا کیا اور آدم بعد میں اترے یہاں پر ایک حکایت یاد آئی میری بیٹی مجھ سے تفسیر پڑھا کرتی تھی ایک مرتبہ اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ اگر آدم گھسے تو زمین میں اترتے یا نہ اترتے اگر نہ اترتے تو لسی الارض خلیفۃ (زمین پر خلیفہ بناؤں گا کے کیا معنی اگر اترتے تو یہ گھسے کھانے کا الزام کس بنا پر ہے میں نے یہ سبق اختیار کیا کہ ضرور اترتے تاکہ خلافت کی تکمیل کی جاوے مگر اس صورت میں اکرام کے ساتھ اترتے اب الزام کے ساتھ اترے چھے سکول میں کوئی طالب علم بھیجا جائے اگر وہ قانون کے موافق چلا آیا تو عزت سے آیا اگر نافرمانی کر کے آیا تو گوا یا اس وقت بھی مگر عزت سے نہیں آیا وہ لڑکی یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئی ایک بچی کے دل میں یہ اشکال ہونا عجیب ہے جو اب تک کسی طالب علم سے بھی سنا گیا اگر کسی غیر طالب علم سے مثلاً ملائی سے تو جواب میں دشواری ہوتی اور یہ شبہ ہمیشہ کے لئے کھٹکتا رہتا۔ اب چونکہ وہ مجھ سے پڑھتی تھی اس لئے یہ شبہ رفع ہو گیا اگر جواب میری سمجھ میں نہ آتا تو میں اور کسی عالم سے دریافت کر کے اس کو بتلاتا۔ بہر حال تمام مخلوقات انسان کے لئے پیدا ہوئی ہیں جس کی ایک لطیف دلیل یہ آیت بھی ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَلَوْ يَؤُاْخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهِمْ صَآءِلًا يَّخْتَضِعُونَ لِمَنْ حَآصِلٌ اٰیٰتُ اللّٰهِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ یعنی اگر اللہ تعالیٰ آدمیوں سے اعمال پر مواخذہ فرماتے تو روئے زمین پر کسی داہہ کو نہ چھوڑتے اس قضیہ شرطیہ کے مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ انسان پر مواخذہ کا مقتضایہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر انسان کو نہ چھوڑا جاتا اب علاقہ ظاہر ہوگی کہ چونکہ مخلوق کی پیدائش سے مقصود بالذات انسان ہے پس جب انسان ہی نہ رہتا تو اور مخلوق کو باقی رکھ کر کیا کرتے وہ سب انسان کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ سب بھی فنا کر دی جاتی پس علاقہ واضح ہو

گیا اور اس سے مقصودیت مذکورہ بدالالت ثابت ہوگئی اب یہ سمجھنا چاہیے کہ انسان کی بقا کس شے پر موقوف ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ تمام دار و مدار تمدن پر ہے کہ سب آدمی جمع ہو کر ایک دوسرے کی مدد کریں کوئی گھر بنا دیں کوئی کھیتی کرے وغیرہ وغیرہ اگر تمدن نہ ہوگی کام اتنے ہیں کہ ایک آدمی سے انصرام سخت دشوار ہے فرض بقاء کا مدار اجتماع پر ہے اجتماع کا تعاون پر اور تعاون کا ترجم پر ترجم کے بغیر کون کسی کی مدد کرتا ہے یہاں پر عبد الرحیم ہے اگر ترجم نہ ہوتا تو انکی کون مدد کرتا اب اہل قصبہ جو اس کی مدد کر رہے ہیں محض ترجم کی بناء پر اور ترجم بدوں کسی کے مصیبت میں پڑے ہوئے پیدا نہیں ہوتا تو ترجم کا سبب غم ہوا اور ایک دوسرے کی اعانت جس کی وجہ سے دنیا کا قیام ہے ترجم پر موقوف ہے تو دنیا کا قیام بھی غم پر ہوا غم ایسی چیز ہے تو اگر خدا کسی کو غم دے تو سمجھو کہ بڑی نعمت دی یہ حکمت ہے غم کی پیدائش میں اب رہا دوسرا سوال کہ پھر شریعت کا یہ حکم کیوں ہے کہ غم نہ کرو اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے متعلق غم سے جس کا ایک درجہ اضطراری ہے ممانعت نہیں کی خود حضور فرماتے ہیں انا بفراقک یا ابراہیم لمحزونون (ہم تمہاری جداء سے اے ابراہیم (علیہ السلام) غمگین ہیں) بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو غم خود ہوا اسے ہونے دوانے اختیار سے نہ بڑھاؤ پس ممانعت اختیاری غم سے ہے اس کا پتہ خود قرآن سے چلتا ہے وہ یہ ہے کہ امر و نہی اعمال اختیاریہ پر ہوتی ہے اگر غم بالکل غیر اختیاری شے ہے تو لا تخافوا ولا تحزنوا (تم نہ اندیشہ کرنا اور نہ غمگین ہونا) میں یہ لانی کا کیا پس حاصل یہ ہے کہ کچھ غم تو اضطراری ہے اس میں تو حکمت ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور کچھ ہم لوگ تدبیروں سے پیدا کر لیتے ہیں اس کی ممانعت ہے کیونکہ یہ ضرر رساں ہے وہ تدبیریں غم بڑھانے کی یہ ہیں کہ واقعہ کو قصداً سوچتے ہو اسکا تذکرہ کرتے ہو اس سے غم بڑھتا ہے اور سوچنا اور بلا ضرورت تذکرہ جو کہ سبب ہے غم کا وہ اختیار میں ہے تو جب ان اسباب کو بند کر دو گے اور اس طرف سے توجہ ہٹالو گے تو اتنا غم نہ ہوگا۔ یہی راز ہے اس کا کہ شریعت نے مواقع غم میں ذکر اللہ کی تعلیم کی ہے جس سے توجہ دوسری چیز کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور دوسری چیز بھی ایسی کہ جس کی شان یہ ہے الا بل ذکر اللہ تطمئن القلوب (یاد رکھو اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) اور جس کی نسبت یہ ارشاد ہے ان اللین قالوا ربنا اللہ لم استقاموا اتتنزل علیہم الملائکة ان لا تخافوا ولا تحزنوا یہاں لا تخافوا ولا تحزنوا (تم نہ اندیشہ کرو اور نہ غم کرو) انشاء بمعنی خبر ہے اور دوسری آیت میں لا خوف علیکم فرماتا اس کا قرینہ ہے یہاں لا خوف علیکم (یہاں حقیقت مراد ہے وہاں لا تخافوا ولا تحزنوا میں مجاز الحمد للہ مدلول آیت کے بیان سے فراغت سبحان اللہ اللہ اکبر کیسی جامع تعلیم ہے کہ قلت صبر کے دو سبب جدا جدا بیان فرمائے حزن خوف پھر ان دو سببوں سے نصاً ممانعت فرمائی اور انا رادوہ الیک (ہم اس کو تمہارے پاس لوٹا دیں گے) میں اپنی اور مرنے والے کی بھلائی کے مراقبہ کی قیاساً تعلیم فرمادی جیسے اس قیاس کی تقریر جس جگہ اعرابی کے اشعار مذکور ہیں اصبر فکن بک صابرین (صبر کرتا کہ تیری وجہ سے ہم بھی صبر کرنے والے ہیں) بیان کی گئی ہے آپ نے دیکھا کہ قرآن مجید کی کیسی جامع تعلیم ہے اور یہ کیسے عنوانات ہیں جن سے وہ تعلیم عقلی بھی اس جامعیت پر کسی نے خوب کہا ہے

بہار عالم حسّ دل و جاں تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت رایہوا ارباب معنی را
اس کے عالم حسن کو بہار ظاہر پرستوں کے دل و جاں کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جاں کو
بو سے تازہ رکھتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ یہ مراقبہ یعنی تمام واقعات مصیبت میں بھلائی کا سوچنا بہت ہی نافع
ہے اس سے غم کا فور ہو جاتا ہے اور وہ بھلائیاں فرضی نہیں بلکہ واقعی ہیں کیونکہ ہر مصیبت میں یقیناً منافع ضرور
ہوتے ہیں وقت نہیں رہا ورنہ مصیبت کے ایک ایک واقعہ کو تفصیل دار بیان کرنا ان واقعات کو ان کے منافع کا
اجمالاً ایک دوسرے موقع پر ذکر فرمایا گیا چنانچہ ان واقعات کا ذکر تو اس آیت میں وَلَسٰلُوْا لَكُمْ بَشِيْرٌ مِّنَ
الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ اور ثمرات کا ذکر اس آیت میں سے
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمُ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اور کافی تعلیم صبر کے متعلق
اس آیت میں بھی مذکور ہے جس کا بیان اس وقت کیا گیا مگر ضمن میں ایک قصہ کے جو اس کا مصداق ہے۔

خوشتر آں باشد کہ مرد لبراں گفتہ آید در حدیث دیگران

(ایسے روز کا دوسرے حکایات اور تمثیلات میں بیان ہونا مناسب ہے)

حق تعالیٰ نے پہلی امت کا ایک قصہ بیان فرما کر اس کے ضمن میں جو مقصود اور مطلوب عمل تھا وہ ہم پر ظاہر
فرمایا کہ دیکھو جن لوگوں نے اس عمل کو کیا ہے ان کو کس قدر ثمرے ملے ہیں تم بھی اگر ایسا کرو گے تم کو بھی اسی طرح
ثمرات ملیں گے۔ قرآن شریف بڑی نعمت ہے اس کی تعلیم کی طرف علماء و عملاً توجید کرو ہمارے ذمہ حق ہے کہ
قرآن شریف نے جو تعلیم کی ہے اس پر عمل کریں۔ بالخصوص جس چیز کا اس وقت بیان کیا گیا ہے یعنی صبر کو بعض
وقت بعض عمل اور بعض احکام مثلاً صبر ہی ہے نفس کو ناگوار ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے فہم میں اس کے مصالح نہیں
آتے مگر واقع میں اس میں مصالح ہوتے ہیں جیسا کہ میرے بچپن کا قصہ ہے کہ مجھے اس وقت کنکوے کا شوق تھا
گوڑا اتانا آتا تھا اور کتابیں بھی پڑھتا تھا جہاں مدرسہ سے آیا کنکوے لے کر باہر چل دیا اپنی تائی صاحبہ کے پاس رہتا
تھا سر پر بال تھے ان کو سرد ہونے کا خیال تھا مگر میں جہاں مدرسہ سے آیا کنکوے لے کر چل دیا کسی طرح ان کے ہاتھ
نسا آتا تھا کہ وہ سرد ہویں ایک روز انہوں نے کھلی کٹورے میں بھگو کر پہلے سے رکھ دی جب میں مدرسہ سے آیا تو فوراً
میرے سر میں ڈال دی پھر میں تو مجبور ہو گیا اور سرد دھلوانا پڑا گو اس وقت ان کا یہ عمل مجھے ناگوار ہوا مگر انہوں نے یہ
سب محبت کے مآل کار پر نظر کر کے میرے نفع کے واسطے ایسا کیا۔ اسی طرح حق تعالیٰ بھی بندہ کے ساتھ بھلائی
کرتے ہیں تو اس پر راضی رہو۔ خصوصاً جب تم کو دعویٰ محبت کا ہے تو راز سے چر کہ سے بھاگنا نہ چاہئے اگر
بلا اختیار کچھ منافع فوت ہو جاوے خواہ ظاہری یا باطنی حتیٰ کہ اگر باطنی حالات و کیفیات بھی چلے جاوے تو اس میں
خدا کی حکمت ہے گھبراؤ نہیں وہ حال یا اس کا بدل لوٹے گا ورنہ یہی کہا جاوے گا۔

تو بیک زخمے گریزانی ز عشق تو بجز نامے چہ میدانی ز عشق
(تم ایک ہی زخم سے عشق سے گریز کرتے ہو تو تم بجز عشق کے نام کے اس کی حقیقت سے ناواقف ہو)
بس یوں سمجھ لیا کرو کہ اس وقت اس کے فوت ہی میں تمہارے لئے مصلحت ہے اگر باقی رہنا ہمارے حق میں
مناسب ہوتا تو کبھی بھی نذائل ہوتا ہمیں خدا سے محبت کا دعویٰ کر کے اس قدر نازک مزاجی تو بھی مناسب نہیں۔

خوف و حزن کا بقاء اختیاری ہے

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ خوف و حزن تو امر غیر اختیاری ہے اور امور غیر اختیاریہ کے ساتھ تکلیف متعلق نہیں ہوتی
کیونکہ نص میں ہے کہ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها تو پھر یہاں لا تخافی ولا تحزنی بیغنی کیوں فرمایا گیا
جس میں خوف و حزن سے ممانعت ہے حالانکہ امر ونہی امور اختیاریہ سے متعلق ہوتی ہے نہ کہ غیر اختیاریہ سے۔

اس کا جواب وہ ہے جو میری تقریر سے ابھی معلوم ہوا حال اس کا یہ ہے کہ خوف و حزن حدوثا تو غیر
اختیاری ہے مگر بقاء اختیاری ہے کہ تذکرہ و تذکر سے بڑھتا اور عدم تذکر سے گھٹتا ہے پس یہاں لا تخافی
ولا تحزنی کا مطلب یہ ہے کہ خوف و حزن کو لے کر نہ بیٹھنا اور اس کا بار بار تذکرہ اور خیال نہ کرنا کہ اس سے
غم بڑھے گا عورتیں اس بات کو خوب جانتی ہیں کیونکہ اس میں تذکرہ بہت ہوتا ہے اسی لئے ان کا غم برسوں رہتا
ہے اور مردوں میں تذکرہ کم ہوتا ہے ان کا غم بہت جلد کم ہو جاتا اور دو چار دن میں گویا مفقود ہو جاتا ہے۔

واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضیعہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی (۲۰)
اس میں حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم دیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال کر
بے فکر ہو جانا۔ خوف و حزن نہ کرنا۔

درجات خوف و حزن

اب یہاں سوال ہوتا ہے کہ کیا عدم خوف و عدم حزن اختیاری ہے ظاہر میں تو غیر اختیاری علوم ہوتا ہے پھر غیر
اختیاری کے ساتھ امر ونہی کا تعلق کیسا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو خوف و حزن کا ابتدائی درجہ ہے۔ وہ تو غیر
اختیاری ہے اور ایک وہ درجہ ہے جو اس سوچ بچار سے پیدا ہوتا ہے کہ ہائے وہ بچہ میرے پاس کھیلتا تھا۔ مجھے لپٹتا
تھا۔ اب میری گود سے الگ ہو گیا نہ معلوم کس حال میں ہوگا۔ نہ معلوم کس نے پکڑا ہوگا۔ یہ درجہ اختیاری ہے اس
سے ان کو ممانعت کی گئی کہ بس دریا میں ڈال کر بے فکر ہو جاؤ ہمارے سپرد کر کے پھر کچھ نہ سوچو کہ اب کیا ہوگا۔

اسی سے سمجھ لو کہ بعض لوگوں کو جو خوف خدا نہ ہونے کی شکایت ہے اس میں یہ لوگ غلطی کرتے ہیں کیونکہ
جو خوف مامور بہ ہے وہ اختیاری ہے جو فکر اور سوچ سے پیدا ہوتا ہے اور جس کے فقدان کی شکایت ہے وہ غیر
اختیاری ہے اور یہ مامور بہ نہیں پس غیر مامور بہ کے فقدان سے غم کیوں ہے۔ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ سوچ
اور فکر قطع کرو کہ ہائے وہ بچہ ایسا تھا ویسا تھا۔ اس کے قطع کرنے سے ان شاء اللہ غم کو ترقی نہ ہوگی۔

اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ بعض لوگ کچھ سوچتے بھی نہیں پھر بھی ان کا غم کم نہیں ہوتا اس کی وجہ بہت کم لوگ سمجھتے ہیں مگر میرے دل میں ابھی اس کی وجہ آئی ہے وہ یہ کہ لوگ جس طرح اس واقعہ کو نہیں سوچتے جس سے غم بڑھتا اسی طرح اسباب تسلی کو بھی نہیں سوچتے جس سے کم ہوتا اس وجہ سے غم میں کمی نہیں ہوتی اور بحالہ رہتا ہے۔ ان کو چاہئے کہ اسباب تسلی کو سوچا کریں مثلاً یہی کہ حق تعالیٰ کے افعال حکمت سے خالی نہیں ہوتے۔ اس میں ضرور حکمت ہے اور یہ کہ موت مسلمان کے لئے باعث راحت ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو جو لانسخالی ولا تحزنی میں قطع خوف و حزن کا امر فرمایا ہے اس کا میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ خود مت سوچنا کہ ہائے اب کیا ہوگا۔ اب بچہ کس حال میں ہوگا بلکہ ان کو دور یا میں ڈال کر بے فکر ہو جانا ہائے ان کا کیا کلیجہ تھا کہ اپنے ہاتھ سے بچہ کو دور یا میں ڈال کر بے فکر ہو گئیں اور کچھ نہیں سوچا کہ اب کیا ہوگا۔

خوف و حزن کے دو درجے

فرمایا ہے ولا تحزنی ولا تحزنی اشکال یہ ہے کہ خوف و حزن اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ شق اول تو مشاہدہ کے خلاف ہے۔ مشاہدہ یہ بتلاتا ہے کہ رنج و واقعات سے طبعی طور پر رنج ضرور ہوتا ہے وہ بندہ کے اختیار سے باہر ہے پس شق ثانی متعین ہوگی یعنی خوف و حزن غیر اختیاری ہے پس اب اشکال یہ ہے کہ جب یہ غیر اختیاری امر ہے تو پھر اس سے نمی کیوں ہے کیونکہ امر و نہی کا تعلق امور اختیار یہ سے ہوتا ہے نہ کہ غیر اختیار یہ سے۔ اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ خوف و حزن کے دو درجے ہیں ایک غیر اختیاری یہ خوف و حزن طبعی ہے اور ایک اختیاری یہ خوف و حزن عقلی ہے۔ مثلاً طبعی حزن تو یہ ہے کہ ایک واقعہ رنج دہ ہو اور دل پر اس سے چوٹ لگی بے قراری ہوئی اور عقلی درجہ یہ ہے کہ اس غم کو لے کر بیٹھ جائے اس میں غور و فکر کرتا رہے قصد اس کو یاد کرتا رہے زبان سے تذکرہ کرتا رہے اس طرح جو شخص غم کو لے کر بیٹھے گا تو غم پہلے سے زیادہ ہوگا تو لانسخالی ولا تحزنی میں طبعی حزن کی ممانعت نہیں جو غیر اختیاری ہے بلکہ عقلی حزن کی ممانعت ہے جو اختیار سے پیدا ہوتا ہے اور گو حزن طبعی کو حدوث غیر اختیاری ہے مگر تدبیر و علاج سے اس میں تقلیل ہو سکتی ہے اور علاج یہ ہے کہ طبیعت کو دوسری چیز کی طرف متوجہ کرے یہ عام قاعدہ ہے کہ دوسری چیز کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے چیز کمزور ہو جاتی ہے اور بعض امور کو تو بعض کے ازالہ یا تصحیح میں خاص دخل ہوتا ہے مثلاً غم کی حالت میں بشارت کو یاد کرنا ازالہ غم میں بہت مفید ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اول تو عقلی حزن و خوف سے منع فرمایا پھر طبعی حزن و خوف کے ازالہ کی یہ تدبیر فرمائی کہ انار آدوہ الیک و جاعلوہ من المرسلین کی بشارت سنائی اس میں مصیبت فراق کی غایت و حد بھی بتلا دی کہ یہ ایک دن ختم ہونے والی ہے اور اس کے ساتھ ایک بشارت عقلی بھی سنادی کہ ہم موسیٰ علیہ السلام کو رسول بنانے والے ہیں تو یہ مصیبت مرتفع ہو کر ایک نفع زائد حاصل ہوگی۔

وَأَنْ أَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَآهَا تَهْتَزُّ كَأَنَّهَا جَانٌّ وَلَّى مُدْبِرًا وَلَمْ

يُعَقِّبْ يَمُوسَى أَقْبَلُ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ ﴿۱۶۰﴾

ترجمہ: اور یہ (بھی آواز آئی) کہ تم اپنی عصا ڈال دو سو انہوں نے جب اس کو لہراتا ہوا دیکھا جیسا پتلا سانپ (تیز) ہوتا ہے تو پشت پھیر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (حکم یہ ہوا) اے موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت تم (ہر طرح) امن میں ہو۔

تفسیری نکات

طبعی خوف نبوت و کمال کے منافی نہیں

جو باتیں طبعی ہوتی ہیں یہ منافی کمال کے نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کیسے قوی القلب تھے مگر قرآن پاک میں قصہ موجود ہے ولی مدبراً ولم یعقب یموسیٰ لا تخف انی لا ینخاف لدی المرسلون۔ یعنی جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کے حکم سے عصا زمین پر ڈالا اور وہ اڑ دھا بن گیا خود موسیٰ علیہ السلام اس سے ڈر کر بھاگے یہ طبعی خوف تھا۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ﴿۱۶۱﴾

ترجمہ: انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب میں نے ان کا ایک آدمی خون کر دیا تھا سو مجھ کو اندیش ہے (کہ کہیں اول وہلہ میں) وہ لوگ مجھ کو قتل کر دیں۔

تفسیری نکات

حربی کے قتل کو ناجائز قرار دینے کا سبب

سورہ قصص کی آیت جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قبلی کو قتل کر دینے اور پھر جناب باری میں اس پر استغفار کرنے اور حق تعالیٰ کی طرف سے مغفرت فرمانے کا تذکرہ ہے اس کے متعلق فرمایا کہ اس میں ایک سوال ہے وہ یہ کہ قبلی کافر تھا اور کافر بھی حربی جس کا خون حسب قواعد شرعیہ مباح ہے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے استغفار کیوں کیا اور حق تعالیٰ کی طرف سے بھی مغفرت کا ذکر فرمایا کہ اس کی تقریر کر دی گئی کہ یہ قتل مناسب نہ تھا تو سوال یہ ہے کہ حربی کافر کے قتل کو ناجائز یا نامناسب قرار دینے کا سبب کیا ہے پھر فرمایا کہ مدت

سے میرا ایک خیال ہے وہ یہ کہ کفار سے جیسے باقاعدہ زبانی یا تحریری عہد ہو جاتا ہے تو اس کی پابندی مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے اسی طرح بعض اوقات عملی عہد ہو جاتا ہے کہ باہمی طرز معاشرت اور تعامل سے فریقین ایک دوسرے سے مامون و بے خطر ہوں باہمی معاملات اور لین دین وغیرہ جاری ہو یہ بھی ایک نوع عہد عملی کی ہے اس کی بھی رعایت کرنا ضروری ہے کہ اگر کسی وقت ایسے لوگوں پر حملہ کرنا ہے تو پہلے ان کو ہذ عہد کے طور پر متنبہ کر دیا جائے کہ اب ہم سے مامون نہ رہیں پھر طرفین کو اپنے اپنے فعل کا اختیار ہے اور بغیر اس ہذ عہد کے اس قسم کا عذر ہے جو شریعت اسلامیہ میں کسی حال کسی کافر سے جائز نہیں قبلی کا واقعہ بھی اسی قبیل سے تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام مع اپنے متعلقین بنی اسرائیل کے اور قبلی کفار و دونوں فرعون سلطنت کے باشندے تھے اور ایک دوسرے سے باہم مامون تھے۔ اسی حالت میں قبلی کا اچانک قتل کر دینا عہد عملی کے خلاف تھا اس لئے اس پر عتاب ہوا اور استغفار و مغفرت کی نوبت آئی۔ رہا یہ سوال کہ جب یہ قتل بحکم خدا اور معصیت تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اولوالعزم رسول اور معصوم ہیں ان سے کیسے صادر ہوا اس کا جواب ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قصداً قتل نہیں کیا معمولی ضرب اس کو ہٹانے کے لئے لگائی تھی اتفاقاً مر گیا اس لئے معصیت کا صدور ان سے نہیں ہوا تاہم صورت معصیت کی تھی اس لئے پیغمبر خدا نے اس کو بھی اپنے حق میں معصیت ہی کے برابر سمجھ کر استغفار کیا۔

(صحیح بخاری کی ایک حدیث بروایت منیرہ ابن شعبہ میں اس کا ثبوت اور قسطلانی شرح بخاری میں اس کی تصریح ہے)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرِي

ترجمہ: اور (دلائل مہویہ دیکھ سن کر) فرعون کہنے لگا کہ اے اہل دربار مجھ کو تو تمہارا اپنے سوا کوئی خدا معلوم نہیں ہوتا۔

تفسیری نکات

نمرود و فرعون خدا کی ہستی کے قائل نہ تھے

چنانچہ نمرود اور فرعون خدا کی ہستی کی نفی کرتے تھے اسی لئے فرعون کہتا ہے ما علمت لكم من الہ غیرہ کہ اپنے سوا میں کسی کو تمہارا معبود نہیں سمجھتا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا قائل ہی نہ تھا کیونکہ یہ تو کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی نہیں کر سکتا کہ خدا کو موجود مان کر پھر اپنے کو اس سے بڑا سمجھے اور اس نے جو انسا ربکم الاعلیٰ کہا ہے اس سے شبہ نہ کیا جائے کہ وہ تو اپنے کو بڑا خدا کہتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا قائل تھا پھر اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا تھا بلکہ منشا اس قول کا یہ ہے کہ جو قاضی شاء اللہ صاحب نے تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ فرعون دھری تھا وہ کہتا تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں بس جو جس کو تربیت کرتا ہے وہی

اس کا رب ہے اولاد کو ماں باپ پالتے ہیں تو والدین ان کے رب ہیں حاکم رعایا کی تربیت کرتا ہے وہ رعایا کا رب ہے اور بادشاہ سب سے بڑا حاکم ہے تو وہ سب سے بڑا رب ہے اس لئے وہ اپنے رب کو رب اعلیٰ کہتا تھا یعنی میں دنیا میں سب تربیت کرنے والوں سے بڑا رب ہوں تو میں سب سے بڑا رب ہوں یہ مطلب تھا اس کے قول کا یہ نہیں کہ وہ خدا کا قائل تھا اور پھر اپنے کو خدا سے بڑا سمجھتا تھا بلکہ وہ دوسرے سے خدای کا منکر تھا اسی لئے اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا و ما رب العالمین (رب العالمین کیا چیز ہے خدا کون ہوتا ہے) وہ کبخت خدا کی کنہ پوچھتا تھا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ منکر صانع تھا۔

شان موسویت

پھر موسیٰ علیہ السلام کا جواب قابل دید ہے آپ چونکہ عارف تھے بلکہ عارف کہنا بھی آپ کی کسر شان ہے اعراف العارفين تھے (بلکہ یہ بھی کسر شان ہے رسول اور نبی تھے جو منجہائے کمالات بشریہ ہے) آپ نے جواب دیا رب السموت والارض و ما بینہما ان کنتم موقنین خدا وہ ہے جو آسمان اور زمین کا جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا تربیت کرنے والا ہے۔ اگر تم یقین کرنا چاہتے ہو تو علم باری کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے) آپ نے اس جواب میں اس مسئلہ پر متنبہ کر دیا کہ کنہ ذات باری مدرك نہیں ہو سکتی بلکہ ادراک ہمیشہ بالوجہ ہوگا پس تیرا کنہ سے سوال کرنا حماقت ہے اور یہ تنبیہ اس طرح ہوئی کہ اگر کنہ ذات کا ادراک ہو سکتا تو موسیٰ علیہ السلام جواب میں کنہ ہی کو بیان فرماتے کیونکہ سوال اسی سے تھا اور جواب کا مطابق سوال ہونا ضروری ہے اگر سوال صحیح ہو خصوصاً ایسے موقع میں جہاں غیر مطابق جواب دینے سے مجیب کا عجز سمجھا جائے اور حق پر تمسخر کیا جائے جیسا کہ یہاں ہوا کہ فرعون نے جواب بالوجہ کوسن کر تمسخر کیا اور قال لمن حوله الاتستمعون اپنے پاس والوں سے کہنے لگا کہ تم سنتے بھی ہو کیسا جواب دیا یعنی میں تو کنہ پوچھتا ہوں آپ وجہ بیان کر رہے ہیں مگر موسیٰ علیہ السلام نے اس پر بھی کنہ بیان نہیں کی بلکہ ایک وجہ اور بیان کر دی۔ قال ربکم و رب آباءکم الاولین۔ فرمایا کہ خدا وہ ہے جو تمہارا رب ہے اور تمہارے گزشتہ باپ دادوں کا بھی رب ہے فرعون اس پر جھلا کر کہنے لگا۔ ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون کہ اے لوگو! تمہاری طرف جو رسول بھیجا گیا ہے وہ تو دیوانہ ہے (کیونکہ ان کو سوال کے مطابق جواب دینا بھی نہیں آتا) میرا سوال کچھ ہے ان کا جواب کچھ ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ کنہ باری کا ادراک ممتنع ہے ورنہ موسیٰ علیہ السلام اس واقعہ پر ضرور بیان فرماتے مگر آپ نے بار بار وجہ ہی بیان کی (اور ایسی وجہ بیان کی جو اثبات وجود صانع کے لئے بالکل کافی تھی چنانچہ اول تو یہ فرمایا کہ وہ آسمان و زمین اور ان کے مابین جو اشیاء ہیں سب کا رب ہے اس میں فرعون پر اس خیال کی غلطی نمایاں کر دی کہ بس جو جس کی تربیت کرے وہی اس کا رب ہے کیونکہ اگر یہی بات ہے کہ تربیت علت ہے

الوہیت کی تو تھلاؤ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا آسمان میں سورج اور چاند اور ستارے اور زمین میں پانی ہوا آگ وغیرہ کس نے پیدا کی ظاہر ہے کہ یہ تو دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان چیزوں کا خالق ہوں کیونکہ یہ چیزیں کسی کے تابع نہیں ہیں اور مخلوق کا خالق کے لئے تابع ہونا ضروری ہے جب ان کا رب نہیں اور کسی نہ کسی رب کا ہونا ضروری ہے اور ضرور کوئی اور ہی رب ہے علیٰ ہذا زمین میں جو درخت اور نباتات پیدا ہوتے ہیں یہ کون پیدا کرتا ہے۔ اگر کہو کا شکار پیدا کرتے ہیں تو یہ بدہمتہ غلط ہے اور کا شکار کا زمین کے درست کرنے اور پانی دینے اور بیج ڈالنے کے سوا کسی بات میں دخل نہیں اگر دخل ہے تو چاہیے کہ جتنا وہ چاہے اور جب چاہے فوراً پیدا ہو جایا کرے حالانکہ اس کی مرضی کے موافق بارہا پیدا اور نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جس کے قبضہ میں یہ تمام چیزیں ہیں اور وہی سب کا خالق ہے جب فرعون اس سے لاجواب ہو کر تمسخر کرنے لگا تو آپ نے دوسری وجہ بیان کی جس میں صراحتاً اس کے قول سابق کا ابطال تھا فرمایا کہ وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے پہلے بزرگوں کا اس میں تھلا دیا کہ تو جو ماں باپ کو اولاد کا رب اور حاکم کو رعیت کا رب کہتا ہے تو تھلا کہ باپ ماں کے مرنے کے بعد اولاد کیونکہ زندہ رہتی ہے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ رب تو مر جائے اور مربوب زندہ رہے اسی طرح حاکم بھی مرتے رہتے ہیں تو ان کے مرنے سے رعایا کیوں نہیں مرجاتی خالق کے بغیر مخلوق کیونکر زندہ رہتی ہے۔ پھر اگر باپ ماں اولاد کے خالق ہیں تو جو سب سے پہلا باپ تھا اس کا خالق کون تھا اگر وہ خود اپنا خالق تھا تو مر کیوں گیا اس نے اپنے آپ کو زندہ کیوں نہ رکھا جب وجود اس کے اختیار میں تھا تو اس نے اپنے وجود کو باقی کیوں نہ رکھا کیونکہ موت کسی کو مرغوب نہیں طبعاً ہر شخص کو اس سے کراہت ہے اور اگر پہلا باپ کوئی نہیں تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ علاوہ ازیں یہی گفتگو ہر باپ کے متعلق ہے کہ اگر وہ اولاد کے خالق ہیں اور وجود ان کے اختیار میں ہے جس کو چاہیں دیدیں تو خود کیوں فنا ہو جاتے ہیں پس معلوم ہوا کہ جب تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا وجود اپنے قبضہ میں نہیں تو یہ نہ اپنے خالق ہو سکتے ہیں نہ کسی غیر کے تو ضرور تمہارا سب کا رب کوئی اور ہے وہی رب العالمین ہے) جب فرعون اس پر بھی لاجواب ہوا اور وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہانکتا رہا کہ یہ تو جواب بالکنہ نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے تیسری وجہ اور بیان فرمائی قال رب المشرق والمغرب وما بينهما ان کنتم تعقلون فرمایا کہ تربیت کرنے والا ہر شخص مشرق کی اور مغرب کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کی بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اسی سے سمجھ لو کیونکہ یقیناً طلوع شمس وغروب شمس پر اور تبدل و تغیر مواسم و فصول پر کسی انسان کی قدرت نہیں انسان تو یہ چاہتا ہے کہ بارہ مہینہ ایسی حالت رہے نہ گرمی زیادہ ہو نہ سردی اور بہت دفعہ جب کوئی کام پورا نہیں ہوتا تو چاہا کرتا ہے کہ ابھی رات نہ آئے تو اچھا ہے مگر ان باتوں میں اس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں معلوم ہوا کہ ان کا کوئی رب ضرور ہے وہی رب العالمین ہے)

صاحب حق مرعوب نہیں ہوتا

غرض موسیٰ علیہ السلام دبے نہیں کیونکہ صاحب حق دبا نہیں کرتا۔ ان پر علم کا رعب تو کیا ہوتا سلطنت کا رعب بھی نہ ہو صاحب حق اظہار حق میں کسی سے مرعوب نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے آپ نے اسی جواب بالوجہ کو مختلف پہلوؤں سے اعادہ کیا (اور ہر دفعہ ایسی چبھتی ہوئی بات کہی جس کا فرعون کے پاس کچھ جواب نہ تھا ۱۲) یہاں سے معلوم ہوا کہ صاحب حق کو کسی مخاطب سے مرعوب ہو کر اپنا طرز نہ بدلنا چاہیے بلکہ حق بات ہی کو بار بار کہنا چاہیے۔ یہ آج کل ہی کا طرز ہے کہ مجیب سائل کا اتباع کر کے اپنا طرز بدل دیتا ہے موسیٰ علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا بلکہ اخیر تک اپنی بات پر جمے رہے کہ جتنی دفعہ بولو گے جواب وجہ ہی سے ملے گا۔ پھر

چو حجت نماںد جفا جوئے را بہ پر خاش درہم کشد روئے را

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بَغْيِرْهُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: اور ایسے شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہو بدوں اس کے منجانب اللہ کوئی دلیل (ان کے پاس نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔

تفسیری نکات

مذمت تریح ہوی

ایک مرض کو حق تعالیٰ ایک خاص عنوان سے جس سے اس مرض کا منشا بھی معلوم ہو جاوے گا اس جگہ بیان فرماتے ہیں چنانچہ وہ مضمون اور اس کا منشا ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا سوار شاد ہے و من اضل ممن اتبع ہوہ بغیر ہدی من اللہ یعنی کون زیادہ گمراہ ہے اس شخص نے جس نے اتباع کیا اپنی خواہش کا بدوں اس کے کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی کوئی ہدایت یعنی دلیل شرعی ہو یعنی بغیر ہدایت اور دلیل شرعی کے اس نے اتباع کیا اپنی خواہش نفسانی کا ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کس بات کی مذمت فرما رہے ہیں اور یہ ذرا توجہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ واقعی ہم لوگوں میں یہ مرض عام ہے یا نہیں سو حق تعالیٰ مذمت فرماتے ہیں خواہش نفسانی کی کہ جس چیز کو جی چاہا کر لی اور ظاہر ہے کہ خواہش نفسانی کا جب ایسا اتباع ہوگا گناہ اس کی نگاہ میں ثقیل اور عظیم نہ ہوگا بلکہ خفیف اور سرسری ہوگا۔ اس سے دونوں باتیں معلوم ہو گئیں مرض بھی یعنی استخفاف معاصی اور

اس کا منشا بھی یعنی اتباع ہوا ہے اور اس کا مرض عام ہونا بھی ظاہر ہے۔

چنانچہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری حالت یہی ہے کہ جو جی میں آیا کر لیا پس ہمارے یہاں مرتج محض اتباع ہوئی ہے خواہ فعل ہو یا ترک فعل..... دونوں میں مرتج یہی ہے اور کچھ نہیں اور مرتج کا اشتراط ظاہر ہے کیونکہ یہی مسئلہ مسلمہ ہے کہ القدرة تعلق بالصدیق یعنی قدرتی کا تعلق صدیق کے ساتھ ہوتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ضد پر تو قدرت ہو دوسری پر نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھنے پر قادر ہے تو اس کے ترک پر بھی ضرور قادر ہوگا افعال مقدورہ میں دونوں جانبوں یعنی فعل ترک پر قدرت ہوتی ہے اور ایک وجہ کو دوسری جانب پر ترجیح کسی خاص وجہ سے دی جاتی ہے۔

غرض فعل ہو یا ترک فعل ہر ایک کے لئے مرتج ہونا چاہیے یعنی کوئی ایسا داعی ہونا چاہیے جس کی وجہ سے انسان اپنی قوت ارادیہ کو ایک جانب کی طرف منحرف کرے اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے افعال یا ترک میں وہ داعی کون ہے عقلاً دو حال سے خالی نہیں یا داعی مذموم ہے اور وہ ہوئی ہے یا داعی محمود ہے اور وہ حدی ہے یہی دونوں چیزیں اس آیت میں بھی مذکور ہیں اور دونوں کے لفظ ہم قافیہ بھی ہیں پس داعی بننے کے قابل یہی دو چیزیں ہیں مگر بندہ کی شان اتباع حدی ہونا چاہئے یعنی حق تعالیٰ کی اجازت اور شریعت کی دلیل سے ایک جانب کو ترجیح دینا چاہیے۔ پس اس آیت میں اسی بات کی مذمت کی ہے کہ ہوئی کو ہدیٰ پر ترجیح دی جاتی ہے یا نہیں۔

ہر چند یہ آیت بدالالت سابق و سیاق کفار کی شان میں ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ مناط مذمت کیا ہے سو ظاہر ہے کہ مناط مذمت وہ صفت ہے جو اس آیت میں مذکور ہے اس لئے جس میں بھی یہ صفت ہوگی وہ قابل مذمت ہوگا وجہ اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی کی ذات من حیث الذات سے نفرت نہیں ہے اگر ذات سے بغض ہوتا تو حق تعالیٰ کفار کو ایمان کا مکلف نہ فرماتے کیونکہ اس حالت میں ایمان کا مکلف بنانا محض بے سود ہوتا کیونکہ اگر کوئی کافر ایمان لے آوے تو ذات تو وہی رہتی ہے اور ذات سے ہوتا بغض تو ایمان لانے سے کوئی نفع نہ ہوتا اور اس کی مخاطبیت کو صبیحہ لازم ہوتی (یعنی حق تعالیٰ کا اس کو مخاطب با ایمان بنانا ایک فعل عبث ہوتا اور حق تعالیٰ فعل عبث سے منزہ ہیں بس ثابت ہو گیا کہ حق تعالیٰ کو کسی کی ذات سے بغض نہیں بلکہ جس سے بغض ہے اس کے افعال کی وجہ سے ہے خواہ افعال باطنی ہوں یا ظاہری جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اس آیت میں جو کفار کی مذمت ہے تو وہ کسی خاص فعل اور خصلت پر ہے اس لئے جہاں وہ خصلت ہوگی وہاں مذمت بھی ہوگی خواہ وہ خصلت مسلمان ہو یا کافر میں اس لئے آیت کا کفار کی شان میں ہونا بے فکری کا سبب نہیں ہو سکتا۔

ومن اضل ممن اتبع ہونہ بغیر ہدی من اللہ

اقسام ہوئی

ہر چند کہ ہوئی لغتاً خواہش محمود مذموم دونوں کو عام ہے مگر اکثر ہوئی کا اطلاق ہوائے مذموم پر ہی ہوتا ہے اس صورت میں بغیر ہدی من اللہ قید واقعی ہوگی اور کبھی ہوئی کا اطلاق ہوائے محمود پر بھی آتا ہے چنانچہ

ایک حدیث میں ہے کہ بعض عورتیں آپ سے کہتی تھیں کہ ہم نے اپنے نفس کو آپ کے لئے بہہ کیا یعنی اپنے کو بلا مہر کے آپ کے نکاح میں دیتی ہیں کیونکہ آپ کا نکاح بلا مہر سے بھی صحیح ہو جاتا تھا حضرت عائشہؓ نے ان عورتوں کو ایک بار سبے حیا کہہ دیا اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

وامرأة مومنة ان وهبت نفسها للنبي الى قوله ترجى من تشاء منهن و تؤى اليك من تشاء
اس پر حضرت عائشہؓ نے آپ سے عرض کیا ما اری ربک الا يسارع فی هواک یہاں بھی لفظ ہوا آیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش محمود ہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کا اطلاق ہوا محمود پر بھی ہوتا ہے اس صورت میں بغیر ہدی من اللہ قید احترازی ہوگی فیصلہ یہ ہوگا کہ ہوئی دو قسم کی ہے ایک وہ جو تابعہ ہدی کے ہو اور ایک وہ جو تابع ہدی کے نہ ہو پس جو ہوئی تابع ہدی کے ہے وہ ہوئی الہی اللہ کی ہے ان کا نفس مطمئنہ ہوتا ہے جس کا تعلق رضا سے ہو چکا ہے وہ یہ بات ہے جو بہلول کی حکایت میں ہے کسی بزرگ سے انہوں نے پوچھا کہ کس حال میں ہوا ان بزرگ نے فرمایا اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف دنیا میں کچھ بھی نہ ہوتا ہو کہا یہ کیسے؟ فرمایا یہ ایسے کہ میں نے اپنی خواہش کو حق تعالیٰ کی خواہش میں فنا کر دیا ہے اب کوئی واقعہ میری خواہش کے خلاف ہوتا ہی نہیں پھر مجھے راحت ہی راحت ہے رنج کیوں ہو۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: آپ جسکو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے اور ہدایت پانے والوں کا علم (بھی) اسی کو ہے۔

تفسیری نکات

ضرورت قصد اصلاح

فرمایا کہ قرآن میں جو ارشاد ہے کہ انک لا تہدی من احببت ولكن اللہ یہدی من یشاء اس آیت میں یشاء کی ضمیر جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے لیکن قواعد عربیہ کے موافق ایک دوسری توجیہ لطیف بھی ہو سکتی ہے کہ یشاء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص خود اپنی ہدایت کا قصد کرے خدا تعالیٰ اس کو ہدایت دیتے ہیں اور اس امر کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے کہ اگر خود قصد کرے تو خدا تعالیٰ بھی امداد فرمادیتے ہیں ورنہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے الذین جاہلوا لینا لنہدینہم سبنا۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے اللزموها وانتم لها كرهون۔ یہ ملفوظ اس پر بیان کیا کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے۔ شیخ اس کی اصلاح نہیں کر سکتا (ملفوظ نمبر ۸۹)

عزم اصلاح

اور قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی ایک تفسیر پر یہ مضمون معلوم ہوتا ہے وہ آیت یہ ہے انك
لا تلهدي من احببت ولكن الله يهدي من يشاء اس آیت کی ایک تفسیر تو مشہور ہے اور ایک تفسیر اس
کی یہ بھی ہے کہ یثاء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو اور معنی آیت کے یہ ہوں کہ بیشک آپ نہیں راہ دکھلاتے جس
کو آپ چاہیں لیکن اللہ ہدایت کرتے ہیں اس شخص کو جو اپنی ہدایت کو چاہے اور دوسرے مقام پر یہ مضمون
تصریحاً ارشاد ہے ومن اراد الاخرة و سعى لها سعيها (اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے اور اس کے
لئے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسے ہی سعی بھی کرے گا۔ مدار آخرۃ کا بندہ کی اور سعی اور ارادہ پر رکھا ہے اور بیشک صحیح
ہے کہ بغیر حق تعالیٰ کی مشیت سے کچھ نہیں ہو سکتا لیکن عاده اللہ یونہی جاری ہے۔ جب کہ بندہ ارادہ کرتا ہے تو
اللہ تعالیٰ بھی چاہتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کو کچھ بھی نہ کرنا پڑے اور آپ سے آپ کام ہو جائے اللہ تعالیٰ
فرماتے ہیں انلزمكموها وانتم لها كارهون یعنی کیا ہم تم کو اپنی رحمت یعنی ہدایت چپکا دیں اور تم اس کو
ناپسند کرنے والے ہو۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تمہاری طرف سے تھوڑی توجہ ہوگی تو اس طرف سے بہت زیادہ ہو
گی لیکن ابتدا تمہاری طرف سے ہونا ضروری ہے حدیث قدسی ہے من تقرب الی شہوا تقربت الیہ
ذواعا ومن تقرب الی ذواعا تقربت الیہ باعا۔ یعنی جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہو میں
اس کی طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ قریب ہو میں اس کی طرف ایک باع
(یعنی دو ہاتھ کھلے ہوئے) قریب ہوتا ہوں تو کوشش کرو اور اپنی اہمیت خرچ کر لو اور پھر بھی وہ کام نہ ہو تو یہ نہ
سمجھنا کہ کوشش اور سعی بیکار گئی بلکہ ثواب ضرور ملے گا کام پر تو ثواب ہوتا ہی ہے صرف ارادہ پر بھی ثواب ملتا ہے
حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ومن ینخرج من بیتہ مهاجرا الی اللہ ورسولہ ثم یندرکہ الموت فقد وقع
اجرہ علی اللہ یعنی جو شخص اپنے گھر سے نکلے اس حالت میں کہ وہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف
ہجرت کرنے والا ہو پس اس کا ثواب اللہ تعالیٰ پر ثابت ہو گیا لیکن ارادہ سوچنے اور تمنا کرنے کو نہیں کہتے۔

غرض اس ضرورت سے اس مضمون کا ذکر ضروری ہوا تو سمجھو کہ ایک تو کعبہ ظاہری اس کا مظہر ہے پس جن
بزرگ نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں
ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعضے خود کو کعبے ہی میں آنا پڑا اور جب ایسوں کو بھی خود کعبے کی طرف
جانے کی احتیاج تھی تو اس سوداگر کو تو کیوں ضرورت نہ ہوگی اور یہ تجارت چھوڑ کر جائیں نہیں تو محض حاجی
صاحب کی دعا سے ان کو کیا نفع ہو سکتا ہے تو جو لوگ کچھ تدبیر کرتے بھی ہیں صرف اس قدر کرتے ہیں۔

شان نزول

صاحبوا خیال کیجئے ابوطالب جو کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں اور بہت بڑے محب کہ جس موقعہ پر تمام قریش نے مخالفت کی اور آپ کے دشمن ہو گئے اس موقعہ پر بھی ابوطالب نے ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور آپ نے بے حد کوشش ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی لیکن محض اس وجہ سے کہ انہوں نے نہیں ارادہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوشش اور محبت کچھ بھی ان کے کام نہ آئی اور آخر کار اپنی قدیم ملت پر ان کا خاتمہ ہو گیا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی انک لا یھدی من اھبیت ولكن اللہ یھدی من یشاء (بیشک آپ ہدایت نہیں دیتے جس شخص کو آپ چاہیں لیکن بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں)

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ

اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جس حکم کو چاہتا ہے) پسند کرتا ہے ان لوگوں کو تجویز (احکام) کو کوئی حق حاصل نہیں اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

تفسیری نکات

اختیار تکوینی اور تشریحی صرف اللہ کیلئے ہے

وربک یخلق ما یشاء و یختار اور آپ کا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے اختیار کرتا ہے) یعنی جس طرح صفت خلق میں کوئی اس کا شریک نہیں اسی طرح صفت اختیار میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ یہاں اختیار تکوینی مراد ہے مگر صحیح نہیں کیونکہ یخلق ما یشاء (جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے) سے اختیار تکوینی خود ظاہر ہے۔ اگر بخمار سے بھی اختیار تکوینی مراد ہوتا تو یخلق ما یشاء کے بعد اس کی ضرورت ہی کیا تھی معلوم ہوا کہ اختیار تشریحی مراد ہے اس کے بعد فرماتے ہیں ما کان لہم الخیرة بندوں کے لئے کچھ اختیار نہیں۔ کیونکہ اوپر بخمار میں اختیار تشریحی کا مراد ہونا متعین ہو چکا ہے اس لئے ما کان لہم الخیرة۔ ان کو کچھ اختیار نہیں ہے۔ میں اسی کی نفی مراد ہونی چاہیے۔ اس صورت میں لام

تعریف عہد کے لئے ہوگا اور اگر لام جنس کے لئے مانا جاوے تو عموم کی وجہ سے ہر اختیار کی نفی ہو جاوے گی۔ معنی یہ ہوں گے کہ اختیار تکوینی اور تشریحی دونوں خدا کے لئے مخصوص ہیں کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں تو تشریحی نہ تکوینی۔ آگے فرماتے ہیں سبحانہ و تعالیٰ عما یشرکون۔ یعنی خدا تعالیٰ شرک تکوینی اور تشریحی دونوں سے پاک ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے الاله الخلق والامر یعنی خدا تعالیٰ ہی کے لئے ہے خالقیت و آمریت۔ یہ آیت تو بہت زیادہ صریح ہے کیونکہ اس میں اختیار تکوینی کا احتمال بھی نہیں کیونکہ امر کا اطلاق جبکہ خلق کے مقابلہ میں ہے شریعت میں امر تشریح ہی پر ہوا کرتا ہے۔ امر کے معنی حکم کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کے سوا حکم کرنے والا اور احکام مقرر کرنے والا کوئی نہیں خلق سے اختیار تکوینی اور امر سے اختیار تشریحی مراد ہے اور دونوں کو بصورت حصر خدا کے لئے ثابت کیا گیا جس سے دونوں کی نفی ماسوا سے لازم آگئی۔ اور یہاں میں ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض لوگوں نے اس آیت سے عالم مجردات کے وجود پر دلیل قائم کی ہے۔ عالم مجردات کو صوفیہ کی اصطلاح میں عالم امر بھی کہا جاتا ہے اس لئے الاله الخلق والامر یعنی خدا تعالیٰ ہی کے لئے ہے خالقیت و آمریت۔ سے لوگوں کو دھوکہ ہوا اور انہوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ خدا ہی کے لئے عالم خلق و عالم امر ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ قرآن کے مخاطب اول الملہ حرب تھے اور وہ عالم امر کو جانتے بھی نہ تھے۔ یہ اصطلاح بعد میں حادث ہوئی۔ نزول قرآن کے وقت عالم امر کو کوئی جانتا بھی نہ تھا مگر لوگوں کی عادت ہے کہ اصطلاحات علیہ کو یاد کر کے ہر جگہ انہی کو چلایا کرتے ہیں۔

و ربک یخلق ما یشاء و ینتار ما کان لہم الخیرة سبحن اللہ و تعالیٰ عما یشرکون
 ما کان لہم الخیرة میں صراحت اختیار عبد کی نفی ہے۔ مگر یہاں اس اختیار کی نفی نہیں جو جبر کے مقابل ہے کیونکہ اس کے تو استعمال کا امر ہے بلکہ اس اختیار کی نفی ہے جس کے استعمال کی اجازت نہیں جس کا عنوان ثانی تجویز و رائے ہے مثلاً بیمار کے متعلق یہ تجویز کرنا کہ یہ اچھا ہی ہو جائے پھر اس کے ظہور و وقوع کا انتظار کرنا کہ کب اچھا ہوگا پھر تاخیر صحت سے پریشانی اور کلفت کا بڑھنا اس کی تو ممانعت ہے۔

ام للسان ما تمنی فلیلہ الاخرة والاولی

میں اس تجویز کی جز کاٹی گئی ہے کہ دنیا و آخرت کے تمام واقعات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں تم کو ان میں تجویز کا کوئی حق نہیں اور تجویز کی علامت یہ ہے کہ اس کے وقوع کا تقاضے کے ساتھ انتظار کیا جائے۔ یعنی ایسا انتظار جس کی جانب مخالف کا تصور ناگوار ہو۔

حقیقت رجاء

یہ اس واسطے کہا تا کہ یہ شبہ نہ ہو کہ میں انتظار انفرج بعد اشدۃ کی نفی کرتا ہوں سو خوب سمجھ لیجئے میں اس

کی نفی کرتا کیونکہ یہ تو رجا ہے بلکہ میں خاص انتظار کی نفی کرتا ہوں مثلاً کسی کا بچہ بیمار ہے تو اگر اس کو اس کی صحت کا ایسا انتظار ہے کہ اس کے نہ اچھا ہونے اور ہلاک ہونے کا تصور بھی ناپسند ہے تو یہ انتظار مذموم ہے اور وہ ناپسندیدگی یہ ہے کہ اس کے نہ اچھا ہونے اور ہلاک ہونے کا تصور بھی ناپسند ہے تو یہ انتظام مذموم ہے اور وہ ناپسندیدگی یہ ہے کہ اس کی عدم صحت سے ناراض ہو اس پر اعتراض کرے اور اگر صحت و عدم صحت دونوں پر راضی ہو اور یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ جو کچھ بھی کریں گے وہ عین حکمت ہے مگر دل چاہتا ہے کہ اس کو صحت ہو جائے اور عدم صحت کے تصور یا وقوع سے رنج ہوتا ہے تو یہ حزن ہے اور حزن مذموم نہیں حزن تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا ہے مگر اس کے ساتھ رضا بھی ہوتی ہے حزن میں پریشانی اور ناراضی نہیں ہوتی۔ گویا ظاہر میں ناگواری کی صورت ہو مگر دل میں ناراضی نہیں ہوتی۔ بلکہ رضا موجود ہوتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ڈاکٹر نے کسی شخص کا اپریشن بدوں کلورافارم سنگھائے کیا ہو تو یہ شخص نشتر لگنے سے روئے گا بھی چلائے گا بھی ناک منہ بھی چڑھائے گا۔ مگر دل میں اندر سے نہایت خوش ہوگا چنانچہ ڈاکٹر کو فیس بھی دیتا ہے اور اس کا شکر یہ بھی ادا کرتا ہے۔ اس مثال سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کراہت ظاہرہ کے ساتھ رضا مجتمع ہو سکتی ہے۔ تو میں اس کراہت کی بھی نفی نہیں کرتا بلکہ میں صرف اس کراہت کی نفی کرتا ہوں جس کے ساتھ رضا مجتمع نہ ہو کہ دل میں بھی ناگواری ہو اور ظاہر میں بھی ناگواری ہو یہاں تک کہ اگر اس پر نسبت فعل الی اللہ منکشف ہو جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ سے بھی عداوت و شکایت ہونے لگے۔

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علواً في الارض ولا فساداً والعاقبة للمتقين. (القصاص آیت ۸۳)
یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں نہ فساد کرنا اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

طب علم مطلقاً مذموم ہے

فرمایا تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علواً في الارض ولا فساداً حق تعالیٰ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے طب علم مطلقاً مذموم ہے گو فساد نہ ہو اور جہاں فساد ہو وہاں تو بالکل منع ہے اور جہاں علو ہو اور اس کے ساتھ علو بلکہ دین سے علو بھی ہو وہ مذموم کیسے نہ ہوگا (غالباً کسی خاص شخص کے متعلق تھا) (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۴۴)

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهًا لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ: سب چیزیں ہلاک ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے اسی کی حکومت ہے اور اسی کے پاس تم سب کو جانا ہے۔

تفسیری نکات

سوائے ذات باری کے سب فانی ہیں

مادہ ارواح ماسوی اللہ کے حدوث کی قطعاً دلیل قرآن ہے یہ ہے کہ کل شیء ہالک الا وجہہ اور قاعدہ عقلیہ ہے ما ثبت قدمہ امتنع عدمہ اور جب سوائے ذات باری کے سب مالک ہیں ان پر عدم طاری ہو سکتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ سب حادث ہیں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کل شیء ہالک الا وجہہ اس کی ایک تفسیر تو مشہور ہے یعنی ہالک فی الاستقبال اور ایک تفسیر اس کی وہی ہے جو صوفیہ نے کی ہے یعنی ہالک فی الحال اور یہ تفسیر صاحب شرح عقائد نے بھی لکھی ہے شرح عقائد میں جس کا جی چاہے دیکھ لے مجھے چونکہ صوفیہ محققین سے محبت ہے اس لئے میں ان کی تائید کی تلاش میں رہتا ہوں اور متجسس ہر جگہ سے اپنا مطلب نکال لیتا ہے اس لئے میں نے اہل ظاہر ہی کی کتابوں سے تائید نکال لی اب علماء ظاہر جو صوفیہ پر اعتراض کرتے ہیں وہ شارح عقائد پر بھی فتویٰ نکاتیں مگر اس کو سب پڑھتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کرتا اور صوفیہ پر اعتراض کیا جاتا ہے جہلا صوفیہ کی تو ہم بھی حمایت نہیں کرتے مگر محققین جس معنی کو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اس پر کیا حق اعتراض کا ہے پس خوب سمجھ لو کہ وحدۃ الوجود کا یہ مطلب نہیں کہ کسی شے کا وجود ہی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وجود تو اختیار کا بھی ہے مگر کالعدم ہے جیسے ستارے دن میں موجود تو ہوتے ہیں جس کو اہل علم جانتے ہیں مگر آفتاب کے سامنے کالعدم ہوتے ہیں نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تحصیلدار چہر اسی پر حکومت کرتا ہے اور اس وقت وہ حاکم معلوم ہوتا ہے مگر وائسرائے کے سامنے بول بھی نہیں سکتا اس وقت اس کی حکومت کالعدم ہو جاتی ہے نیز ایک ماہر فن قاری کے سامنے ایک طفل مکتب کو کوئی قاری نہیں کہتا کہ کسی قدر قراءت اس نے بھی پڑھی ہو مگر ماہر فن کے سامنے اس کو کوئی قاری کہے تو شرم سے گڑ جائے گا ہاں کوئی بے حیا ہو تو اور بات ہے۔

سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الَّذِينَ أَحْسَبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ

لَا يُفْتَنُونَ ۗ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ

اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِينَ ۗ

ترجمہ: الم (یعنی مسلمان جو کفار کی ایذاوں سے گھبراہٹا ہے) ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزما یا نہ جائے گا اور ہم تو (ایسے واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) ہو گزرے ہیں سو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا اور جو ایمان کے دعویٰ میں سچے تھے اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا۔

تفسیری نکات

مصائب کی حکمت جلی اور خفی

احسب الناس ان يتركوا الامية اس امتحان کے علاوہ جو کہ ایک حکمت جلی ہے کی ایک خفی حکمت بھی بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب کوئی بلا آتی ہے تو اخلاق پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے جن نفسانی امراض کا بڑے بڑے مجاہدوں سے علاج ہونا چاہئے تھا ان کا علاج مصائب ورنج و غم سے بہت جلدی ہو جاتا ہے یہ بھی ایک مجاہدہ ہے کیونکہ مجاہدہ دو قسم پر ہے ایک اختیاری ایک اضطراری اختیاری مجاہدہ تو یہ ہے تقلیل الکلام کم بولنا تقلیل الاختلاط مع

الانام۔ لوگوں سے کم ملنا جلنا تقلیل النام کم سونا تقلیل الطعام کم کھانا جس سے اس زمانہ کے لئے صرف اول کے دو جزو کافی ہیں مگر یہ مجاہدہ بعض امراض کے لئے کافی نہیں ہوتا اس کے لئے مجاہدہ اضطراری کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بدوں امداد غیبی کے قصد و اختیار سے نبی شرعی کے سبب ناممکن ہے مثلاً اگر کوئی سنگھیا کھائے یا کسی طرح اپنے کو بیمار ڈالے یا ہلاک کرے تو ناجائز ہے اس لئے وہ خدا کی طرف سے بیمار کیا جاتا ہے اس کے بیوی بچوں کو موت دیدی جاتی ہے اگر یہ خود مارے تو ناجائز ہے پس یہ رحمت ہے کہ تمہارا کام ادھر ہی سے کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہی سے نشتر دلوایا جاتا ہے اپنے ہاتھ سے کوئی نہیں دیتا اور اگر ڈاکٹر کو مشورہ دے کر نشتر نہ دو تو بس علاج ہو چکا خیر خواہ ڈاکٹر مریض کی رائے پر کبھی عمل نہیں کرتا دیکھئے بچہ کو ماں باپ پچاڑ کے چچے سے دوا پلاتے ہیں پھر حلق سہلاتے ہیں کہ اندر اتر جائے اور بچہ چلتا ہے غل مچاتا ہے ہائے رے ہائے رے کرتا ہے مگر اس کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے سننے والے بھی ماں باپ کو ظالم نہیں سمجھتے بلکہ خیر خواہ سمجھتے ہیں افسوس کہ آپ کو ماں باپ پر اعتماد ہے خدا پر بھروسہ نہیں ہے وہاں آپ اپنی عقل سے حکمت دریافت کرتے ہیں اور جب سمجھ میں نہیں آتی تو یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ اس میں کوئی حکمت نہیں تعجب ہے صاحبو! جس طرح اور قوائے مدرکہ ہیں اسی طرح عقل بھی تو صرف ایک قوت مدرکہ ہے اور جس طرح وہ سب محدود ہیں اسی طرح عقل بھی محدود ہے مثلاً کان ایک حد تک سنتے ہیں اس کے آگے نہیں سنتے ان کے آگے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آواز نہیں ہے مثلاً یہ معلوم ہے کہ کلکتہ میں روز بارہ بجے تو پچلتی ہے اگر اس کی آواز یہاں نہ سنائی دے تو اس کا انکار نہیں ہو سکتا اسی طرح نیل گنج میں عطر کی شیشی کھلی اور یہاں خوشبو نہیں آئی تو اس کے کھلنے کا انکار نہیں کیا جاسکتا اسی طرح آنکھ ایک حد تک دیکھتی ہے اس سے آگے کام نہیں کرتی مگر کیا حد نظر سے آگے کچھ ہے نہیں؟ یقیناً اس کا کوئی قائل نہیں جب ہر قوت کے لئے ایک حد ہے تو اس کلیہ کا مقتضایہ ہے کہ عقل کے ادراک کے لئے بھی ایک حد ہونا چاہیے مگر آج کل دماغوں میں بیوقوفی یہ سا گئی ہے کہ کوئی چیز عقل سے غفل نہ رہنا چاہیے ہر چیز عقل میں آجانی چاہئے کیوں صاحب کیوں آنی چاہئے کان آنکھ کی طرح وہ بھی ایک قوت مدرکہ اور دل کی آنکھ ہے جتنی اس کی قوت اور حد ہے اسی کے موافق ادراک کرے گی اور جو اس کی حد اور طاقت سے باہر ہے اس کے ادراک سے عاجز رہے گی تم یہ سمجھتے ہو کہ جو تم نہ سمجھو وہ عقل کے خلاف ہے حالانکہ وہ عقل کے خلاف نہیں بلکہ اس کی حد سے باہر ہے اور ہے صحیح کسی مجذوب سے پوچھا گیا عقل کیا ہے کہا وہ جو خدا کو پاوے پوچھا خدا کون ہے کہا جو عقل میں نہ آوے مطلب یہ ہے کہ عقل وہ ہے جو ہمیشہ اس کی جستجو میں لگی رہے اور اس سے کبھی غافل نہ ہو گو اس کی کنہ اس کی ادراک سے فوق ہے غرض یہ بات ماننا پڑے گی کہ عقل کے لئے یہی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں چل سکتی۔ آپ روح ہی کو نہیں سمجھ سکتے کہ کیا ہے جس طرح یہ سمجھ میں نہیں آتی اسی طرح احکام الہی کی بعض حکمتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں ہاں نظائر سے تسلی ہونا اور بات ہے اسی طرح

بلا میں ایک حکمت امتحان بھی ہے جو حکمت جلی ہے جس کا بیان اول ہوا ہے دو حکمتیں اور یہ ہیں ایک خفی اور ایک
 اخفی سو حکمت خفی تو یہ ہے کہ بیماری اور مرض سے انسان میں شکستگی اور عجز پیدا ہوتا ہے اور یہ علاج ہے غرور ناز اینٹھ
 مروڑ کا مثلاً جب تک کوئی نہ مرے اپنی دولت و قوت کا غرور نہیں جاتا اس سے شکستگی پیدا ہوتی ہے اور یہ بڑی اعلیٰ
 درجہ کی چیز ہے یہ تو خفی حکمت تھی جس کا بیان ابھی ہوا ہے اور حکمت اخفی یہ ہے کہ بلا میں مشاہدہ ہے یہ ذرا بار یک
 بات ہے۔ یہ اہل اللہ کے لئے ہے عاشق کی شان یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ محبوب کا ایک عضو بھی اس سے چھپا نہ
 رہے عاشق کو چین نہیں آتا کہ ہاتھ اور انگلیاں تو دیکھنا چاہتی ہی ہے۔ محبوب کے دستاںہ پر نظر ڈالتا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مینگر م کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا انخواست
 ان سے بڑھ کر خسارہ ہے اگر محبوب ایک چھپالے اور ایک کھول دے تو وہ بے چین ہوگا کہ کسی طرح
 دونوں دیکھوں جس طرح محبوب کے دور خسارے ہیں یہاں حق تعالیٰ کے دو شانیں ہیں ایک جلال ایک جمال۔
 جمال لطف و رحمت وغیرہ ہے اور جلال وہ ہے جسے آپ سختی و قہر سمجھتے ہیں عاشق یہ چاہے گا کہ دونوں کو پہچانوں بغیر
 اس کے اسے صبر نہیں آتا کیونکہ ایک رخ کی معرفت تھی دوسرے کی نہ تھی یہی راز ہے آدم علیہ السلام کے جنت
 سے اخراج میں یعنی جب وہ جنت میں تھے انہیں صفت محسن منعم اور کریم کی بدرجہ عین الیقین معرفت تھی اور عادل
 منتقم غفور و روف کی معرفت بدرجہ علم الیقین تو تھی مگر بدرجہ عین الیقین نہ تھی حق تعالیٰ کو ان کی معرفت کو
 مکمل کرنا مقصود تھا اس کے لئے سامان یہ ہوا کہ ممانعت کے بعد بوسوسہ شیطان گہیوں کا دانہ کھالیا۔

گو اس کا بھی انہیں ثواب ملا کیونکہ یہ ان کی اجتہادی خطا تھی ارشاد ہوا جنت سے باہر ہو جاؤ اس وقت انہیں
 عادل منتقم کی معرفت ہوئی اس کے بعد توبہ کرنے سے توبہ قبول ہوئی تو ثواب کی معرفت ہوئی پھر معاف ہو گیا تو
 غفور کی معرفت ہوئی پھر رحمت خاصہ متوجہ ہوئی تو روف رحیم کی بھی معرفت ہوئی اگر ایسا نہ ہوتا تو آدم علیہ السلام کی
 معرفت اور ان کا علم عین الیقین کے درجہ تک مکمل نہ ہوتا انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں سے ان کے معارف و کمالات
 بڑھائے جاتے ہیں یہی راز ہے کہ جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار آیا ابن مسعود سے فرمایا مجھ کہ یہ
 نسبت تم لوگوں کے دو گنا بخار ہوتا ہے اور اجر بھی دو گنا ہوتا ہے چونکہ ان کی معرفت کامل بلکہ اکمل عطا ہوتی ہے اس
 لئے ان کے لئے بیماری بھی سب سے بڑھ کر ہونی چاہئے صحت بھی اوروں سے بڑھ کر یہی شان ہے انبیاء و صلحاء
 کی اور اسی مشاہدہ کی بدولت انہیں بلا میں اس قدر مسرت ہوتی ہے کہ آپ کو انعام میں بھی نہیں ہوتی حضرت رابعہ
 کے یہاں جب عرصہ تک فاقہ نہ ہوتا تو فرماتیں کہ اللہ میاں خفا معلوم ہوتے کیوں کہ بہت دن سے فاقہ نہیں ہوا جو
 چھیڑ چھاڑ کی دلیل ہے الغرض یہ حکمتیں تھیں جن میں بعض کا حاصل مجاہدہ تھا اور بعض کا حاصل مشاہدہ اور جو بالکل
 جلی یعنی کھلی ہوئی حکمت ہے وہ اس آیت میں مذکور ہے فرماتے ہیں الہم ایک نکتہ اس میں اس وقت سمجھ میں آیا

کہ اسے شروع کیا حروف مقطعات سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ ہمارے چند حروف کی حکمت تو معلوم نہیں بڑا دعویٰ ہے اور بڑے حکمت جاننے والے ہیں تو انہیں کی حکمت بتا دو جب حروف کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے تو ہمارے افعال کی حکمت کیا سمجھو گے یہ تمہیز کے لئے ہے آگے مقصود ارشاد فرماتے ہیں۔

دعویٰ اور دلیل

احسب الناس ان يتركوا ان يقولوا آمنا کیا لوگوں کا گمان ہے کہ امنا کہنے سے چھوڑ دیئے جائیں گے وہم لا یفتنون اور امتحان نہ ہوگا۔ کیونکہ آمنا (ہم ایمان لائے) ایک دعویٰ ہے اور اس کی دلیل امتحان میں کامیابی ہے۔ ولقد لئنا الذین من قبلہم پہلے بھی ہم نے لوگوں کا امتحان لیا ہے اور اس امتحان کا ثمرہ کیا ہے۔
فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین (پ ۲۰)

کہ اللہ تعالیٰ جان لیں گے کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ لیعلمن میں ایک علمی تحقیق ہے مگر اس کی تفصیل کا وقت نہیں ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ دوسروں پر ظاہر کر دیں کون سچا ہے اور کون جھوٹا اور نہ انہیں تو سچے اور جھوٹے کا پہلے سے علم ہے۔ اس امتحان کے متعلق ایک شعر یاد آیا۔

وجائزة دعویٰ لمحبة فی الهوی ولكن لا ینعفی کلام المنافیق

محبت کا دعویٰ عشق میں جائز ہے لیکن منافق کی بات چھپی نہیں رہتی۔

ایک حکایت یاد آئی کہ ایک نوجوان سے ایک شخص نے کہا میں تم پر عاشق ہوں۔ اس نے التفات نہ کیا جب بہت مرتبہ کہا تو ایک دن اس نے کہا اگر تم عاشق ہو تو سیر بھر چونا بے بجھا کھا لو۔ اب تو لگا سوچنے کہ چونا کھاؤنگا تو منہ اور آنتیں سب کٹ جائیں گی۔ اس کے سوچنے پر محبوب نے ایک جوتا رسید کیا کہ میں یہی عشق ہے۔ واقعی اگر عاشق ہوتا تو چونا پیش کرنے پر چوں نہ کرتا اور کھا لیتا۔ بس اس روز سے پھر عشق کا نام نہیں لیا۔

اختتام مثنوی میں ایک حکایت ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے ساتھ ہولیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پوچھا تم کون ہو کہا میں تم پر فریفتہ اور عاشق ہوں۔ کہا مجھ میں کیا رکھا ہے پیچھے میری بہن آ رہی ہے وہ مجھ سے ہزار درجہ زیادہ حسین ہے یہ براہ ہوس اس کے دیکھنے کو پیچھے پلٹے جیسا کسی نے کہا ہے

وقاداری مدار از بلبلان چشم کہ ہر دم بر گلے دیگر سرانجند

بلبل چشم لوگوں سے وفا کی امید نہ رکھ کیونکہ وہ ہر بار دوسرے پھول پر چہچہاتی ہے

یہ حسرت جو نبی پیچھے پلٹے اس نے ایک دھول رسید کی کہ بس یہی عشق ہے۔

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی در بیان دعویٰ خود صادقی

بس چرا بر غیر افگندی نظر ایں بود دعویٰ عشق اے بے ہنر

تو اگر عاشق تھا غیر کی طرف کیوں رخ کیا غرض سچے جھوٹے مدعی امتحان کے وقت معلوم ہو جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے رؤیت باری تعالیٰ کا اثبات

فرمایا: آیت فلما تجلی ربه للجبل موسیٰ علیہ السلام کے لئے رؤیت باری تعالیٰ کا اثبات و استدلال غلط ہے۔ کیونکہ تجلی پر بلا فصل زمانی مرتب ہے۔ کوہ جبل و صق موسیٰ علیہ السلام۔ اور تقدم و تاخر محض ذاتی ہے تو رؤیت کس کی ہوگی۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۲۶۵)

عند الامتحان بکرم الرجل اوبھان

امتحان کی حقیقت

اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آتنا کے معنی عشقنا کے ہیں اور وہ اس طرح کہ اللین امنوا اشد حبائلہ میں ایمان کے لئے سمجھتا ہوں کہ لازماً مقرر ہوا گیا ہے تو اب آتنا کے معنی عشقنا و احینا ہوئے۔ جب تم نے آتنا کہہ کر خدا کی محبت کا دعویٰ کیا تو اس کے لئے امتحان ضروری ہوا اس لئے کبھی آپ کی اولاد کو بیمار کر دیتے ہیں کبھی کسی اور عزیز کو۔ اب یہ کہنا کہ بیٹے کو بیمار کیوں کیا اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے امتحان سے بری کیوں نہ کیا جب بری نہ ہوئے تو اب شہ اور وسوسہ ہونے لگا ایک شبہ یہ ہے کہ خدا کو تو خبر ہے کہ کون کیسا ہے اور کون کیسا ہے۔ امتحان لینے کیا ضرورت۔ امتحان تو وہاں لیا جاتا ہے جہاں حالت مخفی ہوتی ہے اس کا جواب اوپر بھی مذکور ہے کہ یہ امتحان ظہور علی الممتحن کی غرض سے نہیں لیا جاتا بلکہ ظہور علی الناس کی غرض سے لیا جاتا ہے یعنی امتحان اس لئے لیا جاتا ہے کہ اور لوگ اس کی حالت سے واقف ہو جائیں کہ سچا مسلمان ہے یا جھوٹا اور یہ اپنی حالت خود بھی جان لے اور جہل مرکب میں جھلا نہ رہے بعض اوقات آدمی لائق سمجھا جاتا ہے اور خود بھی اپنے کو لائق سمجھتا ہے مگر امتحان کے وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کچھ بھی نہ تھا۔

یہی دراز ہے خدا تعالیٰ کے امتحان کا۔ پل صراط اور میزان کی بھی یہی حکمت ہے مقصود یہ ہے کہ کوئی جھگڑا بھی نہ کر سکے اور جہل مرکب میں جھلا نہ رہے اور حجت تمام ہو جائے۔ معتزلہ نے میزان کا اسی الشکل کی بناء پر انکار کر دیا کہ خدا کو تو معلوم ہے کتنے عمل اچھے ہیں کتنے برے اور یہ نہ سمجھے کہ خدا نے اپنے علم کے لئے ایسا نہیں کیا بلکہ بندوں کی آگاہی کے لئے ایسا کیا تا کہ خدا پر کسی کو الزام رکھنے کا حق نہ رہے۔ دوسری گنجائش یہی ہے کہ کسی جگہ حجت کج بخشی اور جہل مرکب کا احتمال نہ ہو تو بدوں امتحان کے صرف اپنے علم کے موافق عمل درآ کر نے میں بھی کچھ محذور عقلمانی نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے شاگردوں کا ماہواری امتحان نہیں لیتے تھے کیونکہ استعداد ہر ایک کی متعین تھی۔ جب موقع آتا بلا امتحان لئے نمبر بھر دیتے اور فرماتے تھے کہ مجھے سب معلوم ہے کہ کون

کیسا ہے اور کون کیسا ہے اور یہ بھی فرمادیتے تھے کہ اگر کسی کو یہ احتمال ہو کہ مجھے کم نمبر دیئے ہیں تو لاؤ امتحان لے لوں۔ مگر کسی کو یہ کہنے کی ہمت نہ تھی کہ ہاں لے لیا جائے۔

امتحان سے مقصود مدعی کو خاموش کرنا ہوتا ہے

امتحان سے مدعی کی زبان بند کرنا مقصود ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ اس لئے امتحان لیتا ہے کہ لوگوں پر اور خود اس پر بھی یہ ظاہر ہو جاوے کہ محبت کا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا ہے۔ اگر یہ اس امتحان میں نفل ہو گیا تو اسے یہ بھی نفع ہو گا کہ آگے پھر کوشش کرے گا اور کوشش کر کے اعلیٰ لیاقت پیدا کر کے پھر امتحان میں ضرور پاس ہو جاوے گا۔ تو جو کچھ بلا اور مصیبت آتی ہے واللہ سب رحمت ہے اس میں ذرا بھی حرج نہیں البتہ ایسے شخص کے لئے ضروری پریشانی ہے جس کا تعلق خدا سے ضعیف ہے ورنہ سراسر رحمت ہی رحمت ہے چونکہ اس وقت بہت سی پریشانیوں کا ہجوم ہے جن سے خیالات متزلزل ہو رہے ہیں اس لئے میں نے عمر بھر کے لئے علاج بتلا دیا۔ جو شخص اس علاج سے کام لے گا وہ تھوڑے دنوں تک صبر کرتے کرتے پھر بجائے صبر کے شکر کرنے لگے گا۔

شہیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعان گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر

فراق یار نہ آں سے کند کہ بتواں گفت

کنا ہیست کہ از روزگار بجزاں گفت

چنانچہ ایک مقام پر اشاد ہے احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنوا وھم لا یفتنون۔ رہا یہ کہ اس کی وجہ کیا ہے سو اس کے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے ان کا طریقہ یہ ہے ابھموا ما ابھمہم اللہ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔ پس اجمالاً ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلا میں حکمت ضرور ہے گوہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے اطاعت بدوں ابتلاء مقصود ہوتی تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ اطاعت بدوں ابتلاء ہی کرتے ہیں ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر مقاومت و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت منازعت افضل ہے۔

بوجہ مجاہدہ کے وہ درجہ خاص کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو الدین سیر کے خلاف ہوتا اس لئے میں نے یہ قید لگا دی اور یہ منازعت بھی ابتداء ہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الہی امور طبعیہ بن جاتے ہیں حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے چنانچہ مٹی وغیرہ میں ابتداء ہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے اس پر شبہ نہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہوگا کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

یہی ہے کہ ابتدا سے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے چنانچہ ہر مسلمان جو نماز روزہ کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا ہمیشہ روزہ رکھوں گا خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو۔ اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اس واسطے اس کو زوال منازعت کے بعد بھی بوجہ نیت و دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا تو جیسے مٹی کو فعل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتدا میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اس لئے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستقر قرار دیا جائے گا اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا اور نہ عقل کا مقتضایہ ہے کہ جب منازعت ختم ہو جاوے اور عبادت میں لذت و حظ پیدا ہو جاوے تو اس شخص کو اجر نہ ملے کیونکہ اب طاعت مع الابطال نہیں ہے اس وقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ سے محبت نہیں ہے ہم اس کو منازعت ہی کا اجر دیں گے گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو پنشن دیں گے لیکن عقل پنشن کو جائز نہیں کرتی (اشرف الجواب ص ۲۱۴ تا ۲۱۵)

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ وَهُوَ

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

ترجمہ: جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو اللہ کا وہ معین وقت ضروری آنے والا ہے اور وہ سب کچھ شناسا ہے۔

تفسیری نکات

رجا کا مفہوم

لفظ یرجوا کے دو معنی ہیں امید کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے اور خوف کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے دونوں تفسیروں پر جدا جدا ترجمہ ہوگا ایک تفسیر پر یہ ترجمہ ہوگا کہ جس کو خدا سے ملنے کی امید ہو اس کا ایک تفسیر پر یہ ترجمہ ہوگا کہ جس کو خدا سے ملنے کا خوف ہو کہ خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی منہ دکھانا ہوگا اس کا ایک دونوں صورتوں میں فرماتے ہیں وہ میعاد ضرور آنے والی ہے ظاہر میں فان اجل اللہ لات (سو اللہ تعالیٰ کا وہ وقت معین ضروری آنے والا ہے) جزا اس کی معلوم ہوتی ہے مگر واقع میں جزا نہیں حقیقت میں جزا مقدر ہے اور یہ جملہ اس کے قائم

مقام ہے جزا یہ ہے فلیتھنیالہ ولیستعدلہ پس چاہیے کہ اس کے لئے تیاری کرے اور مستعد ہو جائے (حاصل یہ ہوا کہ جو شخص خدا سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو اس کی تیاری کرے کیونکہ وہ پیشی کا دن ضرور آنے والا ہے علیٰ ہذا جس کو خدا کا خوف ہو اس کو بھی تیاری لازم ہے اور وہ تیاری یہ ہے کہ اس کے لئے عمل کرے جیسا کہ دوسری نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے من اراد الاخرة و سعى لها سعيها. جو شخص آخرت کی نیت رکھے گا اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہئے ویسی ہی سعی بھی کرے گا۔ اب حاصل یہ ہوا کہ جس کو خدا سے ملنے کی امید یا خوف ہو وہ عمل کے لئے مستعد ہو جائے یہ تو ترجمہ ہوا اب سمجھئے کہ وہ طریقہ عمل کے آسان کرنے کا کیا بتلایا گیا ہے وہ طریقہ صرف لفظی جو میں بیان کیا گیا ہے یعنی عمل کے لئے مستعد اور تیار ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل میں امید و اشتیاق اور خوف خدا پیدا کرے پس وہ طریقہ امید اور خوف یہ ہے کہ اپنے دل میں امید و اشتیاق اور خوف خدا پیدا کرے پس وہ طریقہ امید اور خوف ہے یا یوں کہتے کہ ترغیب و ترہیب ہے یا وعدہ اور وعید ہے جب دل میں رغبت اور شوق ہوگا تو خواہ مخواہ اس کے حاصل کرنے کا سامان کرے گا اسے امید یا جب خوف ہوگا تو اس کے لئے مستعد ہونا چاہے گا بلکہ دین ہی کی کیا تخصیص ہے یوں کہے کہ ہر کام اور ہر عمل میں یہی دو طریق کارآمد ہو سکتے ہیں خوف یا رغبت ان دونوں کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا نہ دنیا کا نہ دین کا اسی لئے مشہور ہے دنیا با امید قائم ہے میرے نزدیک یوں کہنا چاہیے تھا دنیا با امید و بیم قائم مگر شاید جس طرح عربی میں لفظ رجا خوف اور امید دونوں کے واسطے مستعمل ہے فارسی میں بھی امید کا لفظ دونوں کے واسطے مستعمل ہو اس لئے مشہور مثل میں صرف امید کے لفظ پر اکتفا کیا یا یہ وجہ ہو کہ زیادہ کام امید سے ہوتے ہیں اس لئے اسی کا ذکر کیا کہ جو نیک کام کرنے میں بھی یہ دونوں نافع ہیں اور عمل بد کے چھوڑنے میں بھی اس لئے کہ جب رغبت اور خوف جس کسی کے دل میں ہوں گے تو رغبت کی وجہ سے اعمال صالحہ کو بجالائے گا کیونکہ رغبت کی وجہ سے ان کے ثواب پر نظر ہوگی خدا تعالیٰ کی رضاء قرب کی طلب ہوگی اور چونکہ اس کے دل میں خوف بھی ہے اس لئے اعمال صالحہ کے چھوڑنے پر وعید ہے اس پر نظر کر کے ان کے چھوڑنے سے رکے کا غرض کہ رغبت کو اعمال صالحہ کے فعل میں دخل ہے اور خوف کو ان کے معاصی سے بچنے میں دخل ہے اسی طرح معصیت میں مطلوب یہ ہے کہ اس کو ترک کیا جائے اور معاصی کے ترک پر ثواب و رضاء قرب کا وعدہ ہے تو رغبت کی وجہ سے معاصی کو ترک کرے گا اور خوف کی وجہ سے ان کے فعل سے رکے گا کیونکہ گناہوں کے ارتکاب پر عذاب کی وعید ہے اس طرح سے یہ رغبت اور خوف دونوں مل کر انسان کو طاعات میں مشغول اور معاصی سے متنفر بنادیں گے اور یہ دونوں مستعمل طریقے ہیں ان میں سے اگر ایک بھی حاصل ہو جائے وہ بھی اتباع احکام کے لئے کافی ہو جائے گا کیونکہ اگر صرف خوف ہی ہو اور رغبت نہ ہو تو جب بھی گناہوں سے بچے گا اور طاعات کو ترک نہ کرے گا کیونکہ ان دونوں میں گناہ کا اندیشہ ہے اور اگر صرف رغبت ہی ہو جب بھی طاعات کو بجالائے گا اور گناہوں کو چھوڑ دے گا کیونکہ ان دونوں میں ثواب کا وعدہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ طاعات کے بجالانے اور معاصی کے چھوڑنے میں ان دونوں میں سے ہر واحد کو دخل ہے۔

رجاء و امکان

من كان يرجو لقاء الله فان اجل الله لات وهو السميع العليم یہ آیت راجع الی العقیدہ ہے ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں تو اللہ کا وہ وقت معین ضرور آنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اقوال کو) خوب سنتے اور (ان کے افعال و احوال کو) خوب جانتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اوپر بعض مسلمانوں کو جو کفار کی ایذا سے گھبراتے تھے تنبیہ کی گئی ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ ان کو صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی حالانکہ ہم ان سے پہلے مسلمانوں کو بھی آزمائش سے پرکھ چکے ہیں اس کے بعد جملہ معترضہ کے طور پر کفار کو یہ مضمون سنایا گیا ہے کہ کیا ان کا یہ خیال ہے کہ وہ ہم سے بچ کر بھاگ جائیں گے سوان کی یہ تجویز بہت بے ہودہ ہے اس جملہ معترضہ میں کفار کی تنبیہ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی بھی کر دی گئی کہ کفار کی یہ ایذائیں چند روزہ ہیں پھر ہم ان کو اچھی طرح پکڑنے والے ہیں اس کے بعد پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی امید رکھتے ہیں ان کو تو ایسے واقعات سے پریشان نہ ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کا وہ وقت مقرر ضرور آنے والا ہے (اس وقت سارا غم غلط ہو جائے گا) اور اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں (تو وہ ان کی باتوں کو سنتے اور کاموں کو جانتے ہیں اس وقت ان کی طاعات قولیہ اور طاعات فعلیہ سب کا اجر دیکر ان کو خوش کریں گے) اس آیت میں رجاء سے مراد اعتقاد جازم ہے مگر اس میں ایک لطیفہ ہے جس کی وجہ سے اعتقاد کو بعنوان رجاء بیان فرمایا وہ یہ کہ آیت مکی ہے جس کے مخاطب کفار بھی ہیں جو قیامت کے معتقد نہ تھے منکر تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آیت کو رجاء و امکان سے شروع فرمایا جس سے کفار کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ استحالہ کی تو اس میں کوئی بات ہی نہیں اور جب ممکن ہے تو ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کو لقاء اللہ کا امکان بھی معلوم ہو۔

ہم اس کو بتلاتے ہیں کہ اس کا وقوع بھی ضرور ہونے والا ہے پس ہماری خبر کے بعد اس کے وقوع میں

شک نہ کرنا چاہیے۔

صفات خداوندی

و هو السميع العليم یہ صفات یہاں بہت ہی مناسب ہیں کیونکہ ایمان کے دو جزو ہیں ایک تصدیق بالقلب دوسرے اقرار باللسان کیونکہ قدرت کے وقت اقرار باللسان بھی فرض ہے تو ایمان کے بیان میں ان صفات کا ذکر بہت ہی خوشنما ہے تاکہ بندوں کو اطمینان ہو جائے کہ ہمارا ایمان خدا تعالیٰ سے مخفی نہیں رہ سکتا ان کو ضرور اس کا علم ہوتا ہے تصدیق قلبی کو بھی جانتے ہیں اور اقرار لسانی کو بھی سنتے ہیں۔ یہ آیت تو باب العقائد کے متعلق تھی اس کے بعد دوسری منزل مجاہدہ ہے جو صحیح عقائد سے مؤخر ہے اور تکمیل اعمال سے مقدم ہے یعنی اعمال کی تحریک تو عقائد ہی سے ہو جاتی ہے مگر تکمیل اور رسوخ مجاہدہ سے ہوتا ہے اس کا ذکر دوسری آیت میں ہے و من جاهد فانما يجاهد لنفسه ان الله لفي عن العلمين یعنی جو شخص کچھ محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی واسطے

محنت کرتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ تمام اہل عالم سے بے نیاز ہے (اس کو کسی کی محنت و مجاہدہ کی ضرورت نہیں) میرا مقصود اس جگہ یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اول عقائد کا ذکر فرمایا پھر مجاہدہ کا ذکر اعمال کے ذکر سے جو آئندہ تیسری آیت میں آتا ہے پہلے فرمایا اس کے کچھ تو معنی ہیں۔ سو ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں اور کوئی وجہ ہو میرے ذہن میں اس کی وجہ یہ آئی ہے کہ اس ترتیب سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ عقائد مذکورہ آیت اولیٰ کے صدور اعمال مذکورہ آیت ثالثہ ہیں موثر ضرور ہیں مگر وہ تا شربلا واسطہ کمزور ہوتی ہے اور بواسطہ مجاہدہ کے قوی ہو جاتی ہے اس لئے مجاہدہ کے توسط میں العقائد والاعمال ظاہر کرنے کے لئے یہ ترتیب اختیار کی گئی۔

نصیحت ناصح

اب آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی مجاہدہ کرتا ہے وہ اپنے واسطے مجاہدہ کرتا ہے یہ جملہ اس واسطے فرمایا کہ نصیحت کا اثر کامل ہو کیونکہ جب نصیحت میں ناصح کی کوئی غرض ہوتی ہے اثر کم ہوتا ہے اور دنیا میں بے غرض نصیحت کرنے والا بجز انبیاء علیہم السلام کے کوئی نہیں مگر انبیاء کی نصیحت تو خدا ہی کی نصیحت ہے وہ تو محض مبلغ سفیر ہیں باقی سب کی کچھ نہ کچھ غرض ہوتی ہے اسی لئے امام غزالی نے لکھا ہے کہ جیسا شاگرد کو استاد کا ممنون ہونا چاہیے ایسا ہی استاد کو بھی شاگردوں کا ممنون ہونا چاہیے کیونکہ شاگرد اگر نہ ہوتے تو استاد کے علوم میں ترقی نہ ہوتی کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ بہت سے علوم استاد کے قلب پر درس کے وقت القا ہوتے ہیں اور یہ شاگرد کی کشش سے ہوتا ہے جیسے بچہ ماں کے پستان چوستا ہے تو دودھ اتر آتا ہے اگر بچہ دودھ پینا چھوڑ دے تو چار دن میں اس کے پستان خشک ہو جائیں گے اسی جملہ کے معنی یہ ہیں کہ نعوذ باللہ کارخانہ خداوندی میں بڑا اندھیر ہے مصالح عباد پر مطلق نظر نہیں بس جو جی میں آیا کر دیا جو چاہا حکم دیدیا تو خدائی کیا ہوئی اودھ کی سلطنت یا ان نیا و نگر کاراج ہو اسو یہ کلمہ اس موقع پر تو بہت سخت ہے اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ خدا کو کسی پر رحم نہیں حالانکہ قرآن خدا کی رحمت کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ غرض یہ معنی میں نے اس لئے بیان کر دیئے تاکہ کوئی آیت میں لفظ غنی کو اس معنی پر محمول نہ کرے بلکہ قرآن میں غنی کو دو معنی میں استعمال کیا گیا ہے ایک یہ کہ خدا کو تمہارے عمل صالح سے کوئی نفع نہیں یہاں یہی معنی ہیں دوسرے یہ کہ خدا کا تمہارے کفر و معاصی سے کچھ ضرر نہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم کہ اگر تم کفر کرو تو خدا تعالیٰ کو اس سے ضرر نہ ہوگا۔ تیسری آیت اعمال کے متعلق ہے والذین آمنوا و عملوا الصالحات لنكفرن عنهم سيئاتهم ولنجزينهم احسن الذي كانوا يعملون یہاں ایمان کا مکرر ذکر اس لئے فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ عمل بدوں ایمان مقبول نہیں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرمادیں گے یعنی جہنم سے ان کو نجات دیں گے اور ان کو جزاء حسن دیں گے میرا مقصود جو کچھ تھا وہ بجز اللہ حاصل ہو گیا کہ ایمان و عمل صالح مقصود اصلی ہے اور مجاہدہ اسی کی تکمیل کے واسطے ہے کہ بدوں مجاہدہ کے عمل صالح علی سبیل الکمال حاصل نہیں ہوتا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ

سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۷۰﴾

ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف فرمادیں گے یعنی جہنم سے ان کو نجات دیں گے اور ان کو جزاء حسن دیں گے۔

تفسیری نکات

عمل بغیر ایمان کے مقبول نہیں

لہذا واضح ہو گیا کہ ایمان و عمل صالح مقصود اصلی ہے اور مجاہدہ اسی کی تکمیل کے واسطے ہے کہ بدوں مجاہدہ کے عمل صالح علی سبیل الکمال حاصل نہیں ہوتا۔

یہاں ایمان کا مکرر ذکر فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ عمل بدوں ایمان مقبول نہیں۔

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُم بِبَعْضٍ

وَيَلْعَنُ بَعْضُكُم بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم

مِّن نَّاصِرِينَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ: اور براہیم نے فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو تجویز کر رکھا ہے پس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے۔ پھر قیامت میں تم میں ہر ایک دوسرے کا مخالف ہو جائیگا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور (اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو) تمہارا ٹھکانہ نذرخ ہوگا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

تفسیری نکات

کفر و شرک پر اتفاق نا اتفاق سے بدتر ہے

دیکھئے مودۃ بینکم سے معلوم ہوا کہ بت پرستوں میں اتفاق تھا مگر انجام اس کا دیکھئے کیا ہے کہ وہاں پر ایک کو

دوسرے کی طرف سے لعنت اور پھینکار ہوگی۔ تو کیا ابراہیم علیہ السلام نے ان میں نا اتفاق ڈالنے کی کوشش کی تھی کیا مصلحان قوم کے پاس اس کا کچھ جواب ہے؟ اصول جدیدہ کے موافق تو کامل اتفاق چوروں اور ڈاکوؤں میں ہے یا اور جو بد معاش طائفے ہیں کہ جان مال دین آبرو گنوا کے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں لیکن آج تک کسی مصلح نے نہ تو کسی چور کو انعام دیا نہ کسی ڈاکو کو اتفاق کی وجہ سے رہا کیا۔ ہمارے مصلحان قوم کو ضرورت ہے کہ وہ اتفاق کی تقسیم کریں اور ایک قسم کی تو رغبت دلا دیں اور دوسری قسم کے قلوب میں نفرت بٹھادیں۔ جس اتفاق سے اصلاح ہوتی ہے وہی اتفاق ہے جس میں باطل کو حق کے تابع کیا جائے۔ ورنہ وہ اتفاق نا اصفائی سے بھی زیادہ برا ہو جائے گا۔

أَتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى

عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: جو کتاب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کی گئی ہے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے پڑھا کیجئے اور نماز کی پابندی کیجئے بے شک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روک ٹوک کرتی رہتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے۔

تفسیری نکات

شب قدر میں معمولات سلف

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آج ستائیسویں شب ہے اس کو شب قدر کہتے ہیں اس میں کیا پڑھنا چاہئے فرمایا کہ ایسے موقع پر سلف میں تین چیزیں معمول تھیں اب لوگوں نے دو کو حذف کر کے ایک پر اکتفا کر لیا ہے وہ تین چیزیں یہ تھیں ذکر تلاوت قرآن نفل نماز اس میں سے عابدین نے نفل نماز اور تلاوت قرآن کو حذف کر دیا۔ یعنی اس میں مشغولی بہت ہی کم ہے بس زیادہ تر ضربیں ہی لگاتے ہیں اور اتفاق سے مجھ کو یہ تینوں چیزیں ایک آیت میں جمع مل گئی ہیں۔

نماز اہل فحشاء و منکر کو نمازی کے پاس آنے سے روکتی ہے

ان الصلوة تنهى عن الفحشاء والمنکر کی ایک تفسیر ابھی سمجھ میں آئی۔ مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ نماز مسلمان کو برے کام سے روک دیتی ہے۔ اس پر ظاہر میں اشکال پڑتا ہے کہ ہم تو بہت نمازیوں کو برے کام کرتے دیکھتے ہیں اور اس کا جواب دیا گیا ہے کہ نماز سے برے کام ضرور کم ہو جاتے ہیں۔ اگر اس شخص کی نماز

کامل ہے۔ خشوع، خضوع و جملہ آداب کے ساتھ ہے تب تو یہ شخص بالکل برے کاموں سے محفوظ ہو جائے گا اور اگر اس کی نماز ناقص ہے تو جیسی نماز ہے اسی کے مناسب برے کام چھوڑ جائیں گے۔ غرض جس درجہ کی نماز ہو گی اس درجہ کی نہیں عن الفحشاء ہوگی تجربہ کر لیا جائے۔ کہ دو جماعتوں کا امتحان کر کے دیکھو۔ ایک وہ جو بالکل بے نمازی ہے دوسرے وہ جو نمازی ہو (گو ان کی نماز کسی درجہ کی ہو) یقیناً نمازی جماعت کے اندر برے کام کم ہوں گے اور بے نمازیوں میں ان کی نسبت زیادہ ہوں گے تو مشہور تفسیر پر اشکال واقع ہوتا تھا جس کا جواب دینے کی ضرورت ہوگی مگر جو تفسیر اس وقت القاء ہوئی ہے اس پر کوئی اشکال نہیں پڑتا وہ یہ کہ نماز اہل فحشاء و منکر کو نمازی کے پاس آنے اور اس کے بھٹکانے سے روک دیتی ہے اس کی تائید ایک حدیث سے ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اذان سے شیطان گوز مارتا ہو اور بھاگ جاتا ہے اور اس کا اقرار کفار کو بھی ہے۔ چنانچہ مندر کے پاس اذان دینے سے وہ لوگ روکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اذان کی آواز سے ہمارے دیوتا بھاگ جاتے ہیں پس جبکہ کفار کے دیوتا اذان سے بھاگ جاتے ہیں تو جس گاؤں میں اذان ہوگی وہاں کفار بھی نہ آسکیں گے اور اگر آویں گے بھی تو ان کے حوصلے پست ہو جاویں گے۔ پس یہ تفسیر اس آیت کی بہت عمدہ ہے اور واقعی اس پر کوئی بھی اشکال نہیں چنانچہ اس وقت جو لوگ بھی دشمنوں کے بہکانے سے مرتد ہوئے ہیں یہ وہی ہیں جن کو نماز سے کچھ علاقہ نہ تھا اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ فتنہ ارتداد سے بچنے کے لئے خود بھی نماز کی پابندی شروع کریں اور دیہات میں بھی مسلمانوں کو نمازی بنانے کی کوشش کریں (ایضاً ص ۲۸)

ایک عجیب تفسیری نکتہ

ایک مجلس میں اس کا نکتہ بیان کیا کہ پارہ اکیس کی پہلی آیت میں تلاوت اور صلوة کو تو بصیغہ امر فرمایا اور ان کی کوئی فضیلت نہیں بیان فرمائی اور ذکر کو بعنوان فضیلت ذکر فرمایا۔ اور اس کا امر نہیں فرمایا۔ نکتہ یہ ہے کہ تلاوت اور صلوة تو فرض ہے۔ گواتا فرق ہے کہ صلوة فرض عین ہے اور تلاوت قرآن فرض کفایہ کیونکہ اصل فرض قرآن شریف کا محفوظ کر لینا ہے جو مجموعہ امت پر فرض ہے اور وہ موقوف ہے تلاوت پر اس لئے وہ بھی اسی طرح فرض ہوگی اور بعد ضرورت ظاہر ہونے کے بیان فضیلت کی ضرورت نہیں۔ اس کے ابقاء کے لئے بیان ضرورت ہی کافی ہے بخلاف ذکر کے کہ ماسوائے قرآن اور اذکار صلوة کے اور بقیہ اذکار بالمعنی الہتبار للذکر فرض نہیں اس لئے صیغہ امر کا تو فرمایا نہیں۔ لیکن فضائل اس لئے بیان کئے کہ غیر ضروری ہونے پر نظر کرنا سبب ترک نہ ہو جاوے۔ کیونکہ استماع فضائل سبب ہو جائے گا فعل کا۔

اللہ کا بتلایا ہوا راستہ

خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ امل ما اوحی الیک من الکتب و اقم الصلوة جو آپ کی طرف وحی کی

جاتی ہے اس کو پڑھئے اور نماز کی پابندی کیجئے۔

کہ جو آپ پر وحی ہوا ہے اس کو پڑھئے۔ تو خلا صدیوں آنتوں کے ملانے سے یہ نکلا کہ جو وحی سے ثابت ہو وہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اور ہلکا صراطی مستقیما میں صراط کو جو اپنی طرف منسوب مضاف فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ تک پہنچانے والا میرا بتلایا ہوا راستہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو راستہ خدا تک پہنچانے والا ہو گا وہ مستقیم ہی ہو گا اس لئے مستقیم فرمایا اور مستقیم کے یہ معنی نہیں کہ کوئی خط مستقیم ہے۔ نیز یہ بھی مقصود نہیں کہ خدا تعالیٰ کا بتلایا ہوا کوئی دوسرا غیر مستقیم راستہ بھی ہے جس سے احتراز کرنے کو اس کی صفت مستقیم لائے ہوں بلکہ خدا تعالیٰ کا ایک ہی راستہ بتلایا ہوا ہے جو کہ مستقیم ہی ہے۔

نماز کی روح

بیان یہ ہو رہا تھا کہ ذکر نماز کی روح ہے درمیان میں ایک کام کی بات بھی بیان کر دی اور چونکہ ذکر نماز کی روح ہے اس واسطے نماز کی فضیلت کے موکد کرنے کے لئے فرماتے ہیں ولذکر اللہ اکبر کہ اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے۔ اس لئے نماز میں اگر یہ خاصیت ہو کہ تنہی عن الفحشاء تو تعجب کی بات نہیں بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ ذکر بڑھ کر ہے یعنی نماز سے بھی پس ذکر ہی کر لیا کریں نماز نہ پڑھیں۔

اس کا ایک لطیف جواب میرے عرض سابق سے نکل آیا یعنی ولذکر اللہ اکبر کا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذکر اللہ نماز سے بڑھ کر ہے بلکہ یہ علت ہے ماقبل کی پہلے نماز کی ایک خوبی بیان کی ہے اب آگے اس کی علت بتلاتے ہیں مطلب یہ ہے کہ نماز کی یہ خاصیت ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے مگر یہ خاصیت اس کی کیوں ہوئی اس لئے ہوئی کہ ولذکر اللہ اکبر کہ (اس کی روح سے ذکر اللہ اور) اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور ہر پہلو سے مفید ہے طبع سے عقل سے عشق سے۔

ذکر اللہ کی ضرورت

میں نے جس حصہ آیت کی تلاوت کی ہے اس میں دو جملے میں ایک مقصود بالہیان صرف پہلا جملہ ہے دوسرے کو برکت کے لئے پڑھ دیا۔ مقصود ولذکر اللہ اکبر کا بیان کرنا ہے سامعین غالباً اس کی تلاوت ہی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ مقصود ذکر اللہ کے متعلق کچھ کہنا ہے اور شاید مہتادریہ ہوا ہو میں ذکر اللہ کی فضیلت بیان کروں گا کیونکہ آج کل واعظین زیادہ تر اعمال کے فضائل ہی بیان کرتے ہیں مگر مجھے فضیلت کا بیان کرنا مقصود نہیں کیونکہ آج کل فضائل اعمال سے تو اکثر لوگ واقف ہیں البتہ ان کی ضرورت سے غافل ہیں گو وہ شعائر دین ہی سے کیوں نہ ہوں اور جو اعمال شعائر دین سے نہ ہوں ان کی ضرورت سے تو بہت سے اہل علم بھی غافل ہیں حالانکہ بعض اعمال کو شعائر دین سے نہ ہوں مگر شعائر دین کی اصل اور جڑ ہیں اس لئے ضرورت میں

وہ شعائر سے کم نہیں مگر عام طور پر ان کو ضروری نہیں سمجھا جاتا چنانچہ بہت لوگ پھلوں سے تو واقف ہیں اور باغ میں جا کر پھلوں اور پتوں کو دیکھتے بھی ہیں مگر جڑوں کو کوئی نہیں دیکھتا نہ کسی کا ان کی طرف خیال جاتا ہے کیونکہ جڑوں کے ساتھ پھلوں اور پتوں کا تعلق نظری ہو گیا ہے بوجہ اس تعلق کے مستور ہونے کے۔ تو جیسا حیات میں جڑوں کی طرف توجہ کم ہے اسی طرح شرحیات میں ہماری بعینہ یہی حالت ہے کہ جڑ سے غافل ہے محض فروغ پر نظر ہے اسی لئے فضائل اعمال پر سب کی نظر ہے ضرورت پر بہت کم نظر ہے اور اس میں زیادہ خطا عوام کی نہیں بلکہ خطا ہماری ہے کہ ہم تعلیم کرنے والے بھی زیادہ تر فضائل ہی کو بیان کرتے ہیں ضرورت کو بیان نہیں کرتے اور یہ بڑی کوتاہی ہے میں ضرورت کو بیان کروں گا ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ ذکر اللہ بہت بڑی چیز ہے مگر اس کے علاوہ ذکر اللہ ضرورت کی وجہ سے بھی بڑی چیز ہے اس طرح سے فی نفسہ ضروری ہے اور دیگر ضرورت کی بھی جڑ ہے گو یہ شعائر دین سے نہ ہو مگر حقیقت میں یہ شعائر کی بھی جڑ ہے شعائر دین وہ اعمال ہیں جو اسلام کی کھلی علامات ہیں جن سے دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان اعمال کا بجالانے والا مسلمان ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ جو چیز کھلی علامت نہ ہو وہ ضروری بھی نہ ہو بلکہ ممکن ہے کہ ایک عمل شعائر میں سے نہ ہو لیکن شعائر کی بھی جڑ ہو حیات میں اس کی مثال بال کمانی ہے کہ ظاہر میں وہ گھڑی کا بڑا پرزہ نہیں چھوٹا سا پرزہ ہے جس کو دیکھ کر ناواقف شاید یہ سمجھے کہ معمولی چیز ہے مگر درحقیقت پرزے اسی وقت کارآمد ہیں جب بال کمانی درست ہو ورنہ سب بیکار ہیں یعنی گھڑی جو مقصود ہے دو بدوں اس کے حاصل نہیں ہو سکتا گو اس کی خوبصورتی میں کمی نہ آئے جیب میں رکھنے سے دیکھنے والے بھی سمجھیں گے کہ آپ کے پاس گھڑی ہے اسی طرح ذکر کو سمجھئے کہ گو خود نماز روزہ کے درجہ میں شعائر سے نہیں مگر تمام شعائر کی جڑ اور بنیاد ہے شعائر کی حقیقت تو یہ ہے کہ شریعت کو بعض انتظامات بھی مقصود ہیں اس لئے شریعت نے بعض اعمال کو مصلحت انتظام سے اسلام کی علامات قرار دیدیا ہے جس نے لوگوں کو دوسرے کے اسلام کا علم ہو جائے اور احکام اسلام کا اس پر اجراء کیا جائے یہ علامات ہیں اور یہ ضرورت دین سے ہیں یعنی جن کا جزو دین ہونا خاص و عام ہر کسی کو معلوم ہے ضروریات کا درجہ اتنا بڑا ہے کہ اگر کوئی شخص ضروریات کا منکر ہو خواہ وہ انکار تاویل سے ہو یا بدوں تاویل کے وہ کافر ہے اور اس کا یہ عذر بھی نہ سنا جاوے گا کہ مجھ کو علم نہ تھا بخلاف شعائر کے مثلاً کوئی مسائل رہن وغیرہ کا انکار کرے وہ علی الاطلاق کافر نہ ہوگا بلکہ اس میں یہ تفصیل ہوگی کہ اگر آیت قرآنیہ سننے کے بعد انکار کرے تو کافر ہوگا ورنہ نہیں کیونکہ مسئلہ رہن کا جزو دین ہونا بالعمنی الہد کو ضروریات میں سے نہیں اور نماز روزہ زکوٰۃ حج وغیرہ جزو دین ضروریات سے ہے ان کا انکار مطلقاً کفر ہے یہاں یہ عذر بھی مسوع نہ ہوگا کہ اس کے جزو دین ہونے کا علم نہ تھا گو عند اللہ معذور ہو (اگر واقعی اس کو علم نہ تھا) مگر یہ عذر قفاء مسوع نہ ہوگا حاکم اسلام اس پر کفر کا حکم لگا کر بیہودت زوجہ وغیرہ کا حکم جاری کرے گا ان یکون قد اسلم فی دار الحرب ثم ہاجر فانکارہ قبل الهجرة لایکون کفراً علیرہ فی عدم العلم ۱۲ غرض حکمت انتظام و اجراء احکام کی

وجہ سے بعض اعمال کو شعائر میں سے قرار دیا گیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو شعائر نہ ہوں وہ ضروری نہیں ان میں ایک تصدیق بالقلب ہی ہے گو یہ شعائر اصطلاحیہ میں سے نہیں دیا گیا ہاں اقرار باللسان شعائر میں ہے مگر کیا تصدیق ضروری بھی نہیں یہ عجیب مثال اس وقت ذہن میں آئی جس سے دعویٰ بخوبی ثابت ہو گیا کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شعائر میں سے نہ ہو وہ ضروری نہ ہو کیونکہ ایمان و اسلام کے لئے تصدیق بالقلب کی ضرورت پر سب کا اتفاق ہے مگر اس کو شعائر میں اس لئے شمار نہیں کیا گیا کہ شعائر سے جو مقصود ہے یعنی ظہور ایمان و اجراء احکام وہ اس سے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ تصدیق قلبی کی کسی کو اطلاع نہیں ہو سکتی مگر ضروری ہے کہ تمام اعمال کی جڑ ہے بلکہ ایمان و اسلام کا مدار حقیقی اسی پر ہے بدوں تصدیق بالقلب کے عبد اللہ کوئی شخص مسلمان نہیں گونا گوار میں اس کو مسلمان کہا جاتا ہو پس یہ ہم لوگوں کی کوتاہی ہے کہ ہم نے ضرورت کو صرف شعائر تک محدود کر رکھا ہے اور جو اعمال شعائر میں سے نہ ہوں ان کو ضروری نہیں سمجھتے تصدیق کی مثال نے اس غلطی کو اچھی طرح واضح کر دیا اور بتلادیا کہ جو اعمال شعائر دین سے شمار کئے گئے ہیں ان کو شعائر اسلام صرف اس لئے قرار دیا ہے کہ لوگوں کو ان کے ذریعہ سے ایک دوسرے کا اسلام بہ سہولت معلوم ہو جاتا ہے اس سے یہ سمجھ لینا کہ جو شعائر نہیں وہ غیر ضروری ہیں سخت غلطی ہے پس ولذا ذکر اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ ذکر اللہ اس جہ سے بھی اکبر ہے کہ فضل ہے اور اس واسطے بھی اکبر ہے کہ وہ تمام فضائل کی جڑ ہے نیز تمام اوامر و نواہی کے امتثال و اجتناب کی بھی جڑ ہے اور اکبر میں دو احتمال ہیں یا تو مقطوع عن الاضافۃ ہو مطلب یہ ہوگا کہ ذکر اللہ فی نفسہ بہت بڑی چیز ہے یا مفضل علیہ کی طرف اضافت ملحوظ ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ تمام اعمال سے اکبر ہے یہ تو آیت کی توجیہ تھی اب اس کی ضرورت کو سنئے جس سے بہت لوگ غافل ہیں اول تو لوگوں کو آج دین کا اہتمام ہی کم ہے اور جن کو ہے بھی تو وہ نماز فرض اور نوافل و مستحبات کا تو اہتمام کرتے ہیں مگر ذکر اللہ سے غافل ہیں یہاں شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب تم کو یہ تسلیم ہے کہ لوگوں کو مستحبات کا اہتمام ہے اور مستحبات میں تلاوت قرآن بھی داخل ہے اور تلاوت قرآن کا بہت لوگوں کو اہتمام بھی ہے پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہوا کہ ذکر اللہ کا اہتمام نہیں کیونکہ تلاوت قرآن تو ذکر اللہ کی بڑی فرد ہے اس کا جواب یہ ہے کہ میری مراد ذکر حقیقی ہے اور وہی اکبر کا مصداق ہے اس کا اہتمام بہت کم ہے رہی تلاوت قرآن تو وہ ذکر کی ایک صورت ہے اس کے اہتمام سے یہ لازم نہیں آیا کہ ذکر حقیقی کا بھی اہتمام ہے کیونکہ یہ ممکن ہے۔

ذکر اللہ ہی اصل مقصود ہے

فرمایا۔ سالک کو کسی چیز کی ہوس نہ چاہیے کوئی ذوق شوق کا متنی ہے۔ کوئی رقت قلب کی خواہش کرتا ہے کسی کو کشف و کرامت کی تمنا ہے۔ کوئی جنت کو مقصود سمجھ کر اس کا طالب ہے حالانکہ کسی چیز کی بھی طلب و ہوس نہ کرنا چاہیے کیونکہ عبد کے معنی ہیں مالک کے سامنے سر جھکا دینے کے اور جو حکم ہو اس پر بہ سر و چشم قبول کر کے

عمل کر لینے کے۔ پھر عہد ہو کر کسی چیز کی ہوس کرنا کہ مجھے یہ ملے وہ ملے۔ یہ ہوس حقیقت میں فرمائش ہے مالک پر اور یہ کیونکر جائز ہوگا اگر کوئی شبہ کرے کہ حدیث شریف میں آیا ہے اللھم انی استلک رضاک والجنۃ یہاں پر جنت کا سوال کیا گیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس سوال کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سوال کرے کہ فلاں صاحب سے کہاں ملاقات ہوگی۔ اس پر وہ شخص باغ میں جانے کا آرزو مند ہے تو حقیقت میں وہ باغ مقصود بالذات نہ ہوگا۔ بلکہ مقصود وہ صاحب ہیں مگر چونکہ وہ باغ میں ملیں گے اس لئے اس کی تمنا ہوتی ہے جو اس مقام پر رہتے ہیں۔ اسی طرح حدیث شریف میں مقصود رضا ہے جس کو جنت پر مقدم فرمایا ہے۔ مگر چونکہ اس کا حصول جنت میں ہوگا۔ لہذا جنت کا بھی سوال کیا گیا حق سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں و رضوان من اللہ اکبر یہاں پر رضا کو جنت سے اکبر فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بڑی چیز یہی ہے۔ پھر یہ نکتہ بیان کیا کہ اس اکبر کی تحصیل کے لئے ذریعہ بھی اکبر ہونا چاہیے سو فرماتے ہیں ولذکر اللہ اکبر معلوم ہوا کہ وہ ذریعہ ذکر اللہ ہے تمام احکام پر عمل کرنے سے۔ ذکر اللہ ہی مقصود ہے۔

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ

ترجمہ: بلکہ یہ کتاب بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جن کو علم عطا ہوا ہے۔

تفسیری نکات

آیات بینات

اس میں صوحی ضمیر قرآن مجید کی طرف راجع ہے یعنی قرآن مجید آیات بینات ہیں باوجود یہ کہ قرآن ایک چیز ہے مگر خبر میں فرمایا آیات بینات یعنی بہت سی نشانیاں ہیں۔ پس جمع کے صیغے سے تعبیر فرمانا یا تو اس وجہ سے ہے کہ قرآن مجید مشتمل ہے بہت سی آیتوں کو اور یا اس لئے کہ وہ بہت سے معجزوں کو مشتمل ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے اسے حفظ کر لیتے ہیں تو اس واسطے آیات بینات فرمایا کہ کئی نشانیاں ہیں اور ہیں کہا فی صدور الذین اوتوا العلم ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم عطا ہوا ہے چونکہ علم کے دوسرے ہیں علم الفاظ علم معانی اسی لئے اس کی بھی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر پر علماء مراد ہیں دوسری تفسیر پر حفاظ تو میں اس وقت وہ تفسیر کرتا ہوں جس میں حفاظ کی مدح ہے کہ انہیں الذین اوتوا العلم (وہ لوگ ہیں جن کو علم عطا ہوا ہے) کے لقب سے یاد فرمایا ہے تو اس میں اس تفسیر کے موافق اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انہیں اہل علم فرمایا ہے۔

وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ
لَهِىَ الْحَيَاةُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ: اور دنیوی زندگی فی نفسہ بجز لہو و لعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت ہے اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے۔

تفسیری نکات

حقیقت دنیا

آیت میں دنیا کو لہو و لعب سے تعبیر کیا گیا و ما هذه الحياة الدنيا الا هو و لعب (دنیوی زندگی محض لہو و لعب ہے) گویا دنیا کی حقیقت کو واضح کر دیا صرف دو چیزوں میں ایک لہو اور دوسرا لعب کہ دنیا بجز اس کے اور کچھ نہیں یہاں پر دو لفظوں کا استعمال کیا گیا ایک لہو اور دوسرا لعب اگرچہ یہ دونوں لفظ بظاہر بالکل مرادف معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً ان میں قدر تفاوت ہے لعب کہتے ہیں کسی لغو و عبث فعل کو اور لہو کہتے ہیں غفلت میں ڈالنے والی بات کو حاصل یہ ہوا کہ دنیا میں دو صفتیں ہیں ایک صفت عبث ہونے کی جو موجب غفلت ہونے کی اول کو لعب فرمایا ہے اور دوسری کو لہو لیکن اس پر ایک شبہ پڑتا ہے دنیا مجموعہ اجزا لہو و عبث ہو گئی تو لازم آیا کہ جمیع مخلوقات خداوندی بے فائدہ اور مہمل محض رہ جائے گی حالانکہ خداوند تعالیٰ کی طرف یہ بات منسوب کرنا کہ وہ حکیم ذات ایک ایسی مخلوق کو پیدا کرے جو فضول ہو سخت گستاخی ہی نہیں بلکہ ایک قسم کا جرم ہے علاوہ ازیں خود دوسرے ارشاد ہوتا ہے *الف حسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون*۔ کیا تم نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی مہمل پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس نہیں لائے جاؤ گے) یہ استفہام انکاری ہے یعنی کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تم کو عبث اور لغو محض پیدا کیا ہے نیز ایک آیت میں ارشاد ہے *ربنا ما خلقت هذا باطلاً* (اے ہمارے رب تو نے بیکار پیدا نہیں کیا) جو اب شبہ کا یہ ہے کہ فی الواقع کوئی شے مخلوقات میں سے عبث اور بے کار نہیں البتہ تعین فوائد ایک امر اہم ہے اور اس میں غلطی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ دنیا سے قابل قدر فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں انسان ان کے منافع اور ضروریات کو پورا کرتا ہے یہ سب کچھ دنیا کے منافع میں داخل ہیں لیکن ہم لوگوں نے ان جمیع منافع میں سے بعض منافع کو جو کہ واقعی منافع تھے نظر انداز کر دیا اور دنیا کے منافع کا انحصار صرف ان منافع کے اندر کر دیا جو کہ حظ نفسانی سے لبریز ہوتے ہیں اگرچہ منافع سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہم بدہمتہ دیکھتے ہیں کہ ہر شخص ان سے فائدہ مند ہے۔ آرام پاتا ہے لیکن ان کی

وجہ سے وہ حظ وافر جو نفع اور قابل قدر فائدہ تھا ہم بھول جاتے ہیں اور اس نسیان کے باعث صرف یہی فوائد بنتے ہیں جو چند روز ہم کو حظ نفس کا مزہ چکھا دیتے ہیں اور مقصود اصلی اور اس المنفعت کو چھڑا دیتے ہیں لذتوں اور دلچسپیوں کو ہی فائدہ اور نفع قرار دے لیتا اور انہیں پر قناعت کر لیتا مثال تو عینہ اس شخص کی سی ہے کہ جو ایک دور دراز ریل کا سفر کر رہا ہے اور راستہ میں کہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہوئی سنے اور وہاں جا کر کھڑا ہو جائے اور اس گھنٹی کو مزے لے لے کر سنتا اور بجاتا رہے اور اس طرف گاڑی چھوٹنے والی ہو انجن نے سیٹی دیدی ہو اور جب اسے کہا جائے کہ ارے ظالم گاڑی چھوٹنے والی ہے انجن نے سیٹی دیدی ہے تو وہ یہ کہے کہ مجھ کو تو اس کی ٹن ٹن میں مزہ آ رہا ہے میں تو اس کو نہیں چھوڑ سکتا چاہے گاڑی چلی جائے تو جس طرح اس شخص کو اس گھنٹی کی آواز اور لذت نے ایسا مست کر دیا کہ نتیجہ یہ ہوا کہ گاڑی چھوٹ گئی سفر کھوٹا ہوا اسی طرح اگر آپ بھی ان لذات دنیوی اور دلچسپ کی دلچسپیوں میں پڑے رہیں گے تو آپ کا بھی انجام یہی ہوگا کہ مقصود اصلی سے محروم ہو کر کوئی حظ وافر حاصل کر سکیں گے تو دیکھئے گو آرام پہنچنا اور ان میں ہونا یہ بھی منافع کی فہرست میں داخل ہے لیکن پھر وہ کس قدر معزت رساں نقصان دہ ثابت ہوا کیونکہ اس نے ایک ضروری اور قابل قدر منفعت سے غافل کر دیا اسی طرح دنیا کی ہر چیز فی نفسہ حکم و مصالح و منافع سے لبریز ہے عبث و فضول کوئی نہیں مگر جب وہ مقصود اصلی سے مانع ہو جائے تو اس وقت یہی فائدہ جن کو ہم نے منافع دنیویہ کا اصل اصول سمجھ رکھا ہے اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں انہیں لہو و لعب سے تعبیر کیا جاوے گا یعنی جس صورت سے تم دنیا کے ساتھ انتفاع رکھتے ہو اس صورت میں وہ تمہارے لئے لہو و لعب سے زیادہ نہیں کوئی نفسہ اس میں بہت مصالح و منافع ہیں مگر وہ منافع ایسے نہیں جن میں پڑ کر منافع آخرت کو بھلا دیں جن منافع کے لئے یہ اشیاء وضع کی گئی ہیں ان کے اعتبار سے اس نے عبثیت کی نفی کی گئی ہے اور جو منافع اہل ہوانے خود تراشے ہیں جو کہ واقع میں مضار ہیں ان کے اعتبار سے اس کو لہو و لعب فرمایا ہے بہر حال یہ دنیا اگر بہت سے اغراض کا سبب بن جاوے تو یہ نوع عبث ہے چنانچہ مقابلہ میں اس کے فرماتے ہیں کہ ان السداد الاخرة لہی الحیوان (اصلی زندگی آخرت ہے) اس طرف تو دنیا کو لہو و لعب سے تعبیر فرمایا اور اس طرف دار آخرت کو حیوان سے تعبیر کیا کیونکہ لہو و لعب باعتبار اپنے ثمرات کے مثل مردہ ہیں اور موت ثمرات دلیل ہے موت دنیا کی بخلاف دار آخرت کے کہ اس کو حیوان بمعنی حیوة مراد زندہ سے تعبیر کیا کیونکہ اس کے ثمرات زندہ اور باقی رہنے والے ہیں اور حیات ثمرات دلیل ہے حیات آخرت کی لہذا آخرت خود بھی زندہ ہے باقی فوائد دنیویہ دراصل فانی و مردہ ہی ہیں زندہ فوائد کو چھوڑ کر مردہ فوائد کو کیا کریں کارآمد چیز کو چھوڑ کر بیکار شے کے پیچھے جانا اگر حماقت نہیں تو اور کیا ہے چنانچہ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ لو کانوا یعلمون کاش کہ یہ لوگ اپنی دینی منفعات کا احساس کرتے اور دنیوی معزتوں کو جان لیتے سمجھتے کہ یہ دنیا اور اس کے لواحق سخت معزت رساں ہیں اور آخرت اور اس کے متعلقات

نفع رساں اور راحت بخش ہیں یہاں پر استعمال کیا گیا ہے حرف لو کا جو کہ ان کے واسطے بھی آتا ہے اور یہاں یہی معنی ہیں تو اس سے اجتہاد وجہ کی شفقت و رحمت مترشح ہوتی ہے کہ جیسے ایک شفیق باپ اپنے بچے سے پیار کی باتیں کرتا ہے اور محبت میں اگر بچے کے ساتھ خود بھی تو ملا بن جاتا ہے بلاشبہ اسی طرح خداوند تعالیٰ کی ذات سے کسی امر کی تمنا کرنا بالکل مستجد اور ان کی شان کے خلاف ہے کیونکہ آرزو ہمیشہ ایسی چیز کی کی جایا کرتی ہے جو حاصل نہ ہو اور خود اس کے نفع کا محتاج ہو اور خداوند تعالیٰ قادر قیوم اور مالک کل شئی ہے اس کے واسطے کوئی شے ایسی نہیں جو حاصل نہ ہو دوسرے وہ نفع کا محتاج نہیں پھر آرزو کیسے کرتے لیکن باوجود اسکے محض اپنے بندوں کی ولد ہی کی خاطر ان کے مذاق کے موافق ان سے معاملہ فرمایا جس سے غرض و مقصود محض تقریب اور تقسیم ہے اور اس تقسیم کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تم ہمارے موافق ہو جاؤ دوسرے یہ کہ خیر ہم ہی تمہارے موافق ہو جائیں کیونکہ تم میں اتنی قابلیت و استعداد نہیں کہ تم ہمارے موافق ہو یا ہم سے قریب ہو سکو لہذا چلو ہم ہی تمہاری خاطر تمہارے موافق ہو جاتے ہیں جن مواقع پر قرآن شریف میں الفاظ تمہنی و ترجی مستعمل ہیں ان سے تمہنی ترجی حقیقی مراد نہیں ہوتی۔

دنیا ئے مذموم

پہلے تو یہ مرض بیان فرمایا کہ انسان غیر ضروری امور میں مشغول ہے اور غیر ضروری امور کی سب سے بڑی فردیہ ہے کہ دنیا میں اس کو انہماک ہے اس لئے سب سے پہلے اس کی مذمت بیان فرمادی اور اس کے بعد امر ضروری یعنی دار آخرت کو ذکر کر دیا کہ ذکر آخرت میں مشغول ہونا چاہیے تاکہ اس انہماک کا ازالہ ہو سو غیر ضروری کے ترک کرانے کی دو صورتیں تھیں ایک تو یہ کہ اس مذمت کر دیا جاوے اور اس سے ہٹایا جاوے مگر ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس سے نفع نہیں ہو سکتا کیونکہ مشغلہ ضروری بتانا بھی ضروری ہے ورنہ یہ شخص اس غیر ضروری کو چھوڑ کے دوسرے غیر ضروری میں مبتلا ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر ضروری سے ہٹایا جاوے اور ضروری کی طرف متوجہ کیا جاوے یہی دوسرا طریقہ جو اسلم و احسن ہے یہاں اختیار کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا و ما هذه الحیوة الدنیا الا لہو و لعب کہ نہیں ہے حیوة دنیا مگر لہو و لعب فضول و بیکار ہے۔ دیکھئے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ حیات دنیا کی مذمت کر دیں آگے فرماتے ہیں وان الدار الاخرة لہی الحیوان اور بیشک دار آخرت ہی حیات ہے یعنی زندگی تو واقع میں آخرت ہی کی زندگی ہے دنیا کی کیا زندگی یہ تو اس کے سامنے بالکل سچ ہے تو مذمت دنیا کے بعد آخرت کی طرف متوجہ کیا گیا اس اسلوب ہی سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ مرض ایسا ہے جس کا مریض دائم المرض ہے جس کو آج کل کے جاہلانہ دائم المریض کہتے ہیں۔

غرض دنیا وہ مذموم ہے جو غفلت میں ڈال دے۔

چھست دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و نقرہ و فرزن

یعنی دنیا کے کہتے ہی خدا سے غافل ہونے کو نہ کہ مال دولت اور بیوی کو ایسی ہی دنیا والوں کو کہتے ہیں۔

اہل دنیا چہ کہیں وچہ مہیں لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ اجمعین

(دنیا دار خود بڑے ہوں یا چھوٹے سب پر اللہ تعالیٰ کی لعنت یہاں پر ایک سوال ہے وہ یہ کہ سب اہل دنیا پر لعنت کیسے کر دی جو اب یہ ہے کہ اصل میں یہ ترجمہ ہے ایک حدیث کا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الدنیا ملعون و ملعون ما لہا الا ذکر اللہ و ما والاہ او عالم او متعلم یعنی رحمت سے دور ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ بھی خدا کی رحمت سے دور ہے مگر خدا کا ذکر اور اس کے ساتھ تعلق رکھنے والی چیز یعنی ذکر اللہ اور اس کے مقدمات و متعلقات اور عالم و متعلم کو تو خدا کی رحمت سے دور نہیں ہے باقی سب رحمت سے بعید ہیں اور واقع میں یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ دنیا کے مفہوم میں ذکر اللہ اور عالم و متعلم پہلے ہی سے داخل نہیں تو لعنت یعنی بعد عن الرحمة (رحمت سے دوری) کا حکم خاص ان پر کر رہے ہیں جن کو دین سے تعلق نہ ہو چنانچہ قرینہ اس کا وہ شعر ہے جو بعد میں کہتے ہیں

اہل دنیا کا فران مطلق اند روز و شب و رزق زق و در بق بقاند

(صرف کفار اہل دنیا میں رات دن زق زق بق بق میں گرفتار رہتے ہیں اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ تو لعنت سے بھی بڑھ کر ہے کہ یہاں سب اہل دنیا کو کافر بنا دیا مگر ایک بزرگ نے اس کی خوب توجیہ فرمائی جس کے بعد یہ قرینہ ہو گیا بعد عن الرحمة کے کل کا وہ توجیہ فرمائی کہ اہل دنیا مبتدا اور کافر ان مطلق خبر نہیں ہے بلکہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافر ان مطلق مبتدائے موخر ہے یعنی جو کافر ان مطلق ہیں وہی اہل دنیا ہیں مومن اہل دنیا ہے ہی نہیں کیونکہ ابھی حدیث سے معلوم ہو گیا ہے کہ خدا کے ذکر کے ساتھ تعلقات رکھنے والے ملعون نہیں ہیں کون مومن ایسا ہوگا جو خدا کے ذکر سے کچھ بھی علاقہ نہ رکھتا ہوگا۔ غرض وہی دنیا مذموم ہے جو آخرت بمعنی دین کے مقابلہ میں ہو باقی اسباب دنیا تو اس میں حدیث نے دو قسمیں کر دی ہیں ایک وہ جو آخرت میں کچھ دخل اور اس سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک وہ جو آخرت میں اصلاً دخل نہ رکھتی ہوں تو جو دنیا آخرت میں دخل نہیں رکھتی یہ حقیقت میں دنیا کے محضہ اور مذموم ہے اور اسی کو لہو و لعب فرمایا گیا ہے تو حق تعالیٰ نے اس مقام پر فیصلہ فرما دیا ہے کہ ایسی دنیا متوجہ ہونے کے قابل نہیں بلکہ توجہ کے قابل تو آخرت ہے اسی کو ارشاد فرماتے ہیں وان الدار الاخرة لہی الحیوان کہ حیات آخرت ہی سراپا حیات ہے جس میں حصر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ مرض تھا ہمارے اندر جس کا حق تعالیٰ نے کس خوبی سے فیصلہ فرما دیا ہے کہ دنیا و آخرت دونوں کے حالات یعنی لہو و لعب ہونا اور حیات کاملہ ہونا بتا دیئے تاکہ دونوں کے حالات سننے کے بعد ہر عاقل نہایت آسانی سے خود ہی فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون توجہ کے قابل ہے اور کون عدم توجہ کے قابل اور یہ حالت بتلا کر یہ بھی بتلا دیا کہ جس طرح بعض کام جن کی صورت دنیا ہے اور وہ دخل رکھتے ہیں آخرت میں واقع ہیں دنیا نہیں ہیں کیونکہ وہ لہو و لعب نہیں اسی طرح اس کے مقابلہ و آخرت کا کام جو صورت میں آخرت کے

ہیں اور واقع میں دنیا کے لئے ہیں وہ آخرت نہیں ہیں۔

کلید دروزخ است آن نماز کہ در چشم مردم گذاری دراز
(یعنی وہ نماز دوزخ کے دروازہ کی کنجی ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے دراز کی جائے)

ان الدار الآخرة لہی الحيوان سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ آخرت سراپا حیواۃ ہے کیونکہ زیادہ مستعمل حیوان بمعنی مصدر ہے یہ ایسا ہے کہ جیسے زید عدل اور اگر صفت بھی ہو تو بمعنی ذی حیات ہوگی پس وہاں کی درود یوار میں بھی زندگی ہوگی دیواریں گائیں گی نعمات پیدا ہوں گے درخت گائیں گے اور بظاہر اس لئے کہا کہ کلام میں یہ بھی احتمال ہے کہ الدار کا مضاف مقدر ہو یعنی حیواۃ الدار الآخرة ہی الحیوۃ باقی جنت کا بولنا خود حدیث میں آیا ہی ہے اور وہ بظاہر حقیقت پر محمول ہے یہی صوفیہ کا مسلک ہے بعض اہل ظاہر خشک ہیں وہ کہتے ہیں کہیں جنت مثل بولنے والے کی ہوگی جیسے بے جان تصویر کا کہہ دیتے ہیں کہ ایسی جیسے اب بول پڑے گی۔ یہ حیات کے قائل نہیں مگر یہ محض تاویل ہے صوفیہ کا قول ظواہر نصوص سے متاید ہے ان کے نزدیک دوزخ بھی ذی حیات ہوگی دلیل یہ ہے کہ اہل من مزید پکارے گی نیز اس میں اور بھی آثار حیات کے پائے جاتے ہیں نیز بعض اہل کشف نے جہنم کی شکل کے بارہ میں کہا ہے کہ اس کی شکل اژدھے کی سی ہے اس کے پیٹ میں سانپ بچھو کھنکھو اورے وغیرہ ہیں سارا جہنم اژدھے کی صورت ہے اس سے ایک حدیث کے معنی بلا تاویل کے سمجھ میں آ جاویں گے کہ حدیث میں آتا ہے کہ جہنم میدان قیامت میں لائی جاوے گی جس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوں گے مگر پھر بھی قابو سے نکلی جاتی ہوگی اور کڑکتی ہوگی اور اہل من مزید پکارتی ہوگی اس کے معنی صوفیہ کے قول پر اس طرح سمجھ میں آتے کہ چونکہ وہ ذی حیات ہے اس لئے اس قسم کے آثار اس سے پائے جاویں گے بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو جس سہولت سے اہل باطن سمجھتے ہیں اور لوگ نہیں سمجھتے اور جاندار ہونے کی صورت میں اس کا اثر فرحت میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اہل باطن کے مسلک پر سیرابی کی فرحت صائمین کو بہت زیادہ حاصل ہوگی کیونکہ جب سنیں گے کہ باب الریان ذی حیات ہوگا تو یہ سمجھیں گے کہ دروازہ میں داخل ہونے والے تو خوش ہوں گے ہی مگر وہ دروازہ بھی بوجہ ذی حیات ہونے کے خوش ہوگا اور پھانک کے جاندار ہونے پر خلاف عادت ہونے کے خیال سے تعجب نہ کیا جاوے کیونکہ خلاف عادت بھی نہیں جیسے دنیا میں بچے کے لئے اماں جان پھانک بن جاتی ہیں کہ لڑکا اس کے طریق خاص سے نکلتا ہے ایسے ہی وہ دروازہ ہوگا اور یہ تعجب ایسا ہی ہے جیسے ایک ملحد نے اعتراض کیا تھا کہ جنت میں دودھ کی نہروں کے واسطے اتنی گائیں کہاں سے آئیں گی جواب یہ ہے کہ دنیا میں دودھ تھن میں سے نکلتا ہے اور خدا ہی پیدا کرتا ہے اگر وہاں وہ نہر ہی خاصیت میں ایک بڑا تھن ہو اور اس میں دودھ پیدا کر دیا جاوے تو کیا تعجب کی بات ہے اس طرح جیسے یہاں جاندار پھانک پیدا کئے ہیں وہاں بھی پیدا کر دیں تو کیا محل تعجب ہے

لنہدینہم سبیلنا میں مجاہدہ پر ہدایت سبل کا وعدہ ہے چنانچہ ترجمہ آیت سے ظاہر ہو جائے گا۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ

لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب و ثواب یعنی جنت کے) راستے ضرور دکھا دیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ کی (رضا و رحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیری نکات مقصود طریق

اور یہ ظاہر ہے کہ ہر طریق کا ایک ملغبا ہوتا ہے جس پر سیر ختم ہو جاتی ہے جب کوئی سفر کرتا ہے تو ایک جگہ ایسی آتی ہے جہاں سفر منقطع ہو جاتا ہے اس طرح طریق الہی کی بھی کہیں انتہا ہونی چاہئیں جس پر مجاہدہ ختم ہو۔ یعنی کوئی مقصود ہونا چاہیے جس پر پہنچنے کے لئے ان راستوں کو طے کیا جاتا ہے ہر چند کہ لہدینہم سبلنا (ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں) میں بظاہر ہدایت طریق کا وعدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ کرنے والے کے لئے حق تعالیٰ اپنے راستوں کو کھول دیتے ہیں۔

اور مقصود تک پہنچانا ہدایت کے لئے لازم نہیں۔ کیونکہ ہدایت کبھی اراءت طریق کی صورت سے ہوتی ہے کہ راستہ بتلا دیا اور کہہ دیا کہ اس سڑک کو چلے جاؤ اور کبھی ایصال کی صورت سے ہوتی ہے کہ ایک شخص خود ساتھ ہو کر منزل تک پہنچادے جب ہدایت کی دو صورتیں ہیں تو لہدینہم سبلنا (ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں) میں بظاہر ہدایت طریق کا وعدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ کرنے والے کے لئے حق تعالیٰ اپنے راستوں کو کھول دیتے ہیں۔

اور مقصود تک پہنچانا ہدایت کے لئے لازم نہیں کیونکہ ہدایت کبھی اراءت طریق کی صورت سے ہوتی ہے کہ راستہ بتلا دیا اور کہہ دیا کہ اس سڑک کو چلے جاؤ اور کبھی ایصال کی صورت سے ہوتی ہے کہ ایک شخص خود ساتھ ہو کر منزل تک پہنچادے جب ہدایت کی دو صورتیں ہیں تو لہدینہم سبلنا (ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں) میں بظاہر دونوں احتمال ہونے کی وجہ سے مقصود تک پہنچانے کا بھی یقینی نہیں مگر محققین کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مقصود تک پہنچانے کا بھی وعدہ ہے کیونکہ اس میں حق تعالیٰ نے ہدایت کو مفعول ثانی کی طرف بلا واسطہ متعدی فرمایا ہے اور حسب تصریح محققین اس صورت میں ہدایت کا مدلول وصول

عی ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب دوسرے مقدمہ یہ رہا کہ مقصود کیا ہے تو جو لوگ آیات و احادیث پر نظر رکھنے والے ہیں ان کو اس میں کوئی شک نہ ہوگا کہ مقصود قرب حق جل و علا ہے۔

اصل مطلوب رضائے الہی ہے

والدین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا

اور ظاہر ہے کہ یہ ہدایت ارادۂ طریق نہیں ہے کیونکہ اس میں مجاہدہ شرط نہیں بلکہ ایصال الی المطلوب ہے اور مطلوب ہے رضا پس رضا کاملتا ثابت ہو گیا اور اصل مطلوب یہی ہے۔ والدین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا۔ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مشقت و مجاہدہ کرتے ہیں ہم بیشک ضرور ان کو اپنے راستے بتلا دیں گے۔

مجاہدہ و مشقت پر وعدہ ہدایت ہے

دیکھئے مجاہدہ و مشقت پر وعدہ ہدایت ہے یہ تو ابتدائی حالت ہے اور انتہا یہ ہے وان اللہ لمع المحسنین یعنی بیشک اللہ نیک کاروں کے ساتھ ہے۔ الحاصل آپ کی طرف سے کچھ طلب ہونا چاہیے۔

وصول میں دیر نہیں لگتی

والدین جاہدوا فینا لنہدینہم سبلنا۔ جاہدوا سے مراد غور فکر و عا و التجاسعی و کوشش حق تعالیٰ کے سامنے الحاج و زاری تو واضح و خاکساری یہ چیزیں پیدا کرو رونا اور چلانا شروع کرو نخوت اور تکبر کو دماغ سے نکال کر پھینک دو اس کے بعد وصول میں دیر نہیں لگتی ذرا بطور امتحان ہی کے کر کے دیکھ لو مولانا فرماتے ہیں۔
فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می گیر و فضل شاہ

سُورَةُ الرُّومِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ

هُمْ غٰفِلُونَ ﴿۱۹۶﴾

ترجمہ: یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔

تفسیری نکات

یہ آیت کفار کے لئے مخصوص ہے

وعد الله لا يخلف الله وعده الله تعالى کا وعدہ اور اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں کہ یہ (جو اوپر مذکور ہوا جو ایک پشین گوئی ہے خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے اور خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں کرتے۔ اس کا مقتضایہ ہے کہ اس کا کوئی انکار نہ کرنا۔ مگر ایسے بھی بہت لوگ ہیں جو اس کا انکار کرتے ہیں چنانچہ آگے بطور استدراک کے فرماتے ہیں۔

ولكن اكثر الناس لا يعلمون۔ لیکن زیادہ تر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ یہاں پر گو لا يعلمون کا مفعول مذکور نہیں مگر مقام کا مقتضایہ ہے کہ مفعول وہی ہو جو پہلے مذکور ہے یعنی لا يعلمون ان الله لا يخلف وعده۔ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے۔

اور یہ حالت کفر کی ہے اس لئے یہ آیت کفار سے مخصوص ہوئی آگے فرماتے ہیں يعلمون ظاہر امن الحیوة الدنیا یہ لوگ جانتے ہیں ظاہر حیات دنیا کو۔

اس کا مرجع بھی وہی ہے جو پہلے لا يعلمون میں مذکور ہے ورنہ اس آیت کو ماقبل سے ربط نہ ہوگا اور ضمائر میں بھی انتشار ہوگا۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُومِذُّ يَتَفَرَّقُونَ ﴿۱۹﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: قیامت جب قائم ہوگی تو لوگ جدا جدا ہو جائیں گے جو لوگ ایمان لائے تھے اور انہوں نے اچھے کام کئے تھے وہ تو باغ میں سرور ہوں گے۔

تفسیری نکات

مومن و کافر کی تفریق

یہ جدا جدا ہونا بھی حضور ہی کے نور مبارک کا ایک ثمرہ ہے کیونکہ ایمان و معرفت و اعمال صالحہ کا حصول آپ کی برکت سے ہوا اور ایمان و اعمال صالحہ ہی کی وجہ سے مخلوق کے دو فرقے ہو گئے بعض مومن بعض کافر۔ تو اس تفریق کا اصل منشاء بھی نور محمد ہے۔ اسی تفریق کے ظاہر کرنے کے لئے قیامت قائم ہوگی تو دراصل حقیقی قیامت آپ ہی کی ذات ہے اور عرفی قیامت اس کا ایک اثر اور ثمرہ۔ اسی کو مولانا نے مثنوی میں ایک جگہ بیان فرمایا ہے۔

۔ صد قیامت بود احمد در جہاں

اس لئے حق تعالیٰ نے یوم تقوم الساعة یومئذ یبلس المجرمون فرما کر ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا و یوم تقوم الساعة یومئذ یفرقون۔ یعنی گو جس دن قیامت ہوگی اس دن مجرم نا امید ہو جائیں گے مگر سب کا یکساں حال نہ ہوگا جس دن قیامت آئے گی اس دن لوگ جدا جدا ہو جائیں گے۔ فاما الذین امنوا و عملوا الصلحت فهم فی روضة یحبرون۔

ترجمہ جو لوگ ایمان والے ہیں اور انہوں نے اچھے اعمال کئے ہیں وہ ایک بڑے باغ میں خوش کئے جائیں گے۔

یحبرون کی تفسیر

یوم تقوم الساعة کے بعد یومئذ پھر زیادت تہویل کے لئے مکرر لایا گیا فی روضة میں تنجیم کے لئے ہے یعنی بڑے باغ میں خوش کئے جائیں گے۔ یحبرون احبار سے ہے جو باب افعال کا مصدر ہے۔ بمعنی سر جس کے بے تکلیف معنی اردو محاورہ کے موافق یہ ہوئے کہ وہ بڑے باغ میں سرور ہوں گے کیونکہ سرور بھی لازم نہیں متعدی ہے دیکھے حق تعالیٰ نے اس مقام پر یفرحون نہیں فرمایا کیونکہ فرح لازم ہے اس کے معنی یہ ہوتے کہ ایمان والے جنت میں خوش ہوں گے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر طبعی خوشی انسان کو ہو سکتی ہے اس قدر ان کو خوشی حاصل ہوگی۔ سو یفرحون سے طبعی خوشی پر زیادتی سمجھ میں نہ آتی۔ یحبرون سے یہ بات بتلا دی گئی کہ ان کو طبعی خوشی سے بہت زیادہ خوشی حاصل ہوگی کیونکہ ان کو خوش کیا جائے گا یعنی ان کو خوش

کرنے کا اہتمام ہوگا کوئی خوش کرنے والا ان کو خوش کرے گا۔

جیسا کہ علماء نے یہی نکتہ مطہرہ میں بیان فرمایا ہے کہ ازواج مطہرہ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کو پاک کیا ہے صرف یہی نہیں کہ وہ خود بخود پاک ہیں کیونکہ جو پاک خود بخود حاصل ہوتی ہے وہ کم ہوتی ہے دیکھئے اگر ایک کپڑے کو دن رات نہر میں ڈالے رکھیں تو وہ خود بخود پاک ہو جائے گا مگر جو خوبی اس وقت حاصل ہوگی کہ اس کو کسی شخص کے سپرد کیا جائے اور وہ پانی میں ڈال کر تختہ پر اسے کوٹ پیٹ کر صاف کرے وہ صرف نہر میں ڈالے رکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہی نکتہ یہجرون میں ہو سکتا ہے یعنی یہی صرف نہیں کہ وہ خوش ہوں گے بلکہ خوش کئے جائیں گے اور ان کو حق تعالیٰ خوش کریں گے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کتنے بڑے ہیں۔ ان کی عظمت کے موافق ان کو وہی خوشی بھی عظیم ہوگی اتنا فرق ہوگا کہ حق تعالیٰ کی عظمت تو بالفعل بھی غیر متناہی ہے اور اہل جنت کی خوشی اگرچہ بالفعل متناہی ہوگی مگر لا تقف عند حد کے اعتبار سے وہ بھی ایک طرح غیر متناہی ہوگی اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عظمت الہی داخل مشیت نہیں اور عظمت و سرور اہل جنت داخل مشیت ہے یعنی حق تعالیٰ کے ارادہ اختیار کو اس میں دخل ہے اور حادث کی لامتناہی بالفعل محال اور لا تقف عند حد جائز۔ غرض غیر متناہی دونوں ہیں ایک غیر متناہی بالفعل دوسرا غیر متناہی بمعنی لا تقف عند حد

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے الاماشاء ربک کی تفسیر بھی یہی لکھی ہے کہ خلود اہل جنت و اہل نار داخل تحت القدرت ہے مگر چہ منقطع کوئی بھی نہ ہوگا۔ ورنہ بدوں اس توجیہ کے بظاہر اس استثنیٰ پر شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اہل جنت اہل جہنم کے خلود کے ساتھ الاماشاء ربک کا کیا معنی؟ کیونکہ بظاہر اس کا یہ ترجمہ ہے کہ وہ لوگ جنت اور دوزخ میں رہیں گے مگر جب کہ چاہیں حق تعالیٰ تو اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید کبھی نکالے بھی جائیں گے سو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے خوب تفسیر فرمائی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے مگر خدا جب چاہے تو ان کو نکالنے پر بھی قادر ہے مگر ایسا کیا کبھی نہ جائے گا تو مطلب آیت کا یہ ہے کہ اہل جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے مگر خدا تعالیٰ اس پر مجبور نہیں بلکہ یہ سب اسی کی مشیت سے ہوگا و علیٰ ہذا اہل نار بھی۔

فصل و رحمت

اس آیت میں ایمان و اعمال صالحہ کا ثمرہ مذکور ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ والے جنت میں خوش ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ بغیر انبیاء علیہم السلام کے نہیں معلوم ہو سکتے اسی لئے حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تا کہ لوگوں کو ایمان و اعمال صالحہ کا راستہ بتلا دیں اور اس وقت اول تو کسی اور نبی کی شریعت موجود نہیں اور اگر پہلے انبیاء میں سے کسی کی کوئی شریعت ہے بھی تو محرف ہے جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے پھر اگر غیر محرف بھی ہوئی تو منسوخ تھی۔ اس لئے اس وقت ایمان اور اعمال صالحہ کی دولت صرف ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر حضور تشریف نہ لاتے تو ہم اس دولت سے بالکل محروم رہتے حق تعالیٰ شانہ کا بہت بڑا احسان ہمارے اوپر ہوا کہ آپ کی برکت سے ہم کو اس دولت سے

سرفراز فرمایا۔ اسی کو حق تعالیٰ شانہ نے بطریق امتنان احسان جتلا کر جا بجا قرآن شریف میں ذکر فرمایا ہے کہیں فرماتے ہیں ولولا فضل الله عليكم ورحمته لاتبعتم الشيطان الا قليلا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے ولولا فضل الله عليكم ورحمته لکنتم من الخسرين

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہارے جنس کی بیویاں بنا لیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔

تفسیری نکات

نکاح کا اصل موضوع لہ

یعنی ازواج کو پیدا کیا تاکہ تم کو ان سے سکون قلب حاصل ہو۔ یہ نکاح کا اصل موضوع لہ ہے یعنی سکون حاصل ہونا باقی خدمت وغیرہ یہ سب فرع ہیں۔ وجعل بینکم مودة ورحمة اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی یہ بھی دلائل قدرت میں سے ہے کہ جو دو شخص ابھی ایک ساعت پہلے اجنبی محض تھے اب ان میں نکاح کے بعد کیسی محبت ہو جاتی ہے کہ دوسرے تعلقات میں اسکی نظیر نہیں ملتی اسی لئے حق تعالیٰ نے اس کو میخذا مر سے بیان نہیں کیا کہ تم کو آپس میں مودت ورحمت کا برتاؤ رکھنا چاہئے بلکہ میخذا خبر سے بیان فرمایا کہ ہم نے تمہارے درمیان خاص تعلق پیدا کر دیا یعنی ہم نے تمہاری مدد کی ہے بدوں ہماری مدد کے اجنبیت میں ایسا تعلق نہیں ہو سکتا تھا اور یہاں مودت ورحمت دو لفظ اختیار کئے گئے اس سے مطلب یہ ہے کہ اس تعلق میں کبھی مودت کا غلبہ ہوتا ہے کبھی رحمت و ہمدردی کا چنانچہ ابتدا میں عموماً محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور انتہا میں رحمت و ہمدردی کا اور اس عنوان میں عورتوں کی اس شکایت کا بھی جواب ہو گیا جو عورتوں کو مردوں سے اکثر ہوا کرتی ہے جب نکاح کو چند سال گزر جاتے ہیں تو عورتیں مردوں سے کہا کرتی ہیں کہ اب تمہارے دل میں ہماری ویسی محبت نہیں رہی جیسی شروع میں تھی اب وہ ولولہ اور تقاضا اور جوش عشق نہیں رہا اس شکایت کا منشا جہل ہے اور اگر مرد لاجواب ہو جائے تو یہ اس کا جہل ہے دونوں جاہل ہوں گے تو شکایت بڑھے گی عاقل اس اعتراض کو کبھی تسلیم نہ کرے گا وہ اس کا یہ جواب دے گا۔

جوش کا کم ہونا کمال محبت کی دلیل ہے

کہ قاعدہ یہ ہے کہ قدامت کے بعد جوش کم ہو جاتا ہے مگر جوش کا کم ہو جانا زوال محبت کی دلیل نہیں بلکہ کمال

محبت کی دلیل ہے کیونکہ جوش خود نقص کی دلیل ہے دیکھو ہنڈیا میں جب تک جوش رہتا ہے کچی ہے اور جب کم ہو کر سکون ہو جاتا ہے اس وقت سمجھتے ہیں کہ ہنڈیا پک گئی اسی لئے انبیاء اور کاملین میں کیفیات کا جوش کم ہوتا ہے اور متوسطین میں ان سے زیادہ اور چھٹ بھیموں میں تو سب سے زیادہ جوش ہوتا ہے مگر سب جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کامل ہیں تو ان کی محبت بھی سب سے کامل ہے مگر وہاں جوش نہیں پس عورتوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ بیوی کے پرانے ہو جانے سے اگر مرد کا جوش کم ہو جائے تو یہ محبت کے کم ہو جانے کی دلیل نہیں بلکہ اس کی دلیل ہے کہ محبت کامل ہو گئی ہے مگر رنگ بدل گیا ہے پہلے محبت و عشق کا رنگ تھا اب رحمت و ہمدردی کا رنگ ہے پہلے محبت تھی مگر کسی قدر تکلف اور اجنبیت بھی تھی اب بالکل بے تکلفی ہے کہ ایک دوسرے کا ہمزاد و مساوی اور راحت و غم کا۔

شریک ہے گویا دو قالب ایک جان ہیں یہ نکتہ ہے مودت و رحمت دو لفظوں کے اختیار کرنے میں اس کے بعد ارشاد ہے ان فی ذلک لآیات لقوم یفکرون۔ کہ ان میں لوگوں کے لئے دلائل قدرت ہیں جو سوچ سے کام لیتے ہیں۔

معاملہ نکاح میں دلائل قدرت

اس میں ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس سے وجود صانع پر استدلال ہوتا ہے اس طرح کہ دیکھو عورت اور مرد دونوں انسان ہی ہیں مگر دونوں میں کس قدر تفاوت ہے کہ مرد کی خلقت اور بناوٹ جدا ہے مرد سے بچہ نہیں پیدا ہو سکتا عورت سے بچہ پیدا ہوتا ہے مرد کو مرد سے وہ راحت اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا جو عورت سے حاصل ہوتا ہے تو ایک ہی نوع کے افراد میں ایسا تفاوت اور اس میں مصالح کی اس قدر رعایت بدوں صانع حکیم کے نہیں ہو سکتی اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارا کوئی صانع ضرور ہے ایک اعرابی کہتا ہے البعرة تدل علی البعیر والا ثریدل علی المسیر فالسماذات الابراج والارض ذات الفجاج کیف لایدلان علی اللطیف الخیر۔ کہ اونٹ کی پیٹنی دیکھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں سے کوئی اونٹ گیا ہے اور قدم کا نشان دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے کوئی گیا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقش پاکی

تو یہ بڑے بڑے ستاروں اور چاند سورج والا آسمان اور یہ کشادہ اور فراخ سرکوں والی زمین اپنے صانع حکیم کے وجود پر کیونکر دلالت نہ کرے گی ضرور کرے گی سبحان اللہ! ایک جاہل بدوی کیسی عجیب بات کہتا ہے کہ جب آثار موثر پر دلالت کرتے ہیں دھواں دیکھ کر تم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں آگ ہے نشان قدم دیکھ کر یہ خبر ہو جاتی ہے کہ یہاں سے کوئی ضرور گیا ہے اور ایک نفیس عمارت دیکھ کر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کا بنانے والا کوئی ضرور ہے اور یہ کوئی نہیں کہتا کہ یہ نشان قدم خود ہی بن گیا ہوگا۔ یا یہ مکان خود ہی تیار ہو گیا ہوگا پھر حیرت ہے کہ اتنا بڑا آسمان اور یہ پہاڑ اور زمین دیکھ کر اور اس کے نظام اکمل کا مشاہدہ کر کے تم کو اس کے صانع کا علم نہ ہو اور یوں کہو کہ یہ خود ہی اپنی طبیعت سے بن گئے ہیں اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا بلکہ ایک بدوی بھی اس خیال کو دلیل سے باطل کر رہا ہے۔

مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے

جس سے معلوم ہوا کہ مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے اور قرآن میں جا بجا اسی فطری دلیل سے اور توحید صانع پر استدلال کیا گیا ہے چنانچہ اس مقام پر بھی اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہاری جنس میں سے بیبیاں بنائی ہیں۔ اگر غور سے کام لو تو اس میں تمہارے لئے دلائل قدرت ہیں اور یہی وہ فطری امر ہے جو میثاق الست میں قلوب کے اندر پیوست کر دیا گیا۔

نکاح میں آیات کثیرہ

اب شاید کسی کو یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ خلق ازواج میں آیات کثیرہ کہاں ہیں جو کہ ان فی ذالک لایت لقوم یفکرون میں صیغہ جمع سے مفہوم ہو رہا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو دنیا میں لاکھوں ہزاروں میاں بیوی ہیں ہر فرد کا وجود اور اس کی باہمی محبت مودت و رحمت الگ الگ دلیل ہے جو مجموعہ ہو کر بہت سے دلائل ہیں دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایک ہی میاں بیوی کو لیا جائے تو خود ان میں بھی بہت سے دلائل ہیں کیونکہ نکاح سے انسان کے لئے ایک نیا عالم شروع ہو جاتا ہے جو ہر شخص کی زندگی کا ورق الٹ دیتا ہے یقیناً جس شخص نے کسی بچے کو چار پانچ سال کی عمر میں دیکھا تھا وہ اس شخص کو نکاح کے بعد اس حال میں دیکھے کہ وہ گھر کا سردار بنا ہوا بیوی بچوں کی پرورش کر رہا ہے تو وہ ہرگز یہ نہ سمجھے گا کہ یہ وہی بچہ ہے جو میرے سامنے نکا پھرا کرتا تھا پھر لوگوں کے بتلانے کے بعد اس کو بڑی حیرت ہوگی کہ اللہ کیا سے کیا ہو گیا۔

ترجمہ: آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑے بنائے۔

عورت باورچن نہیں

فرمایا عورت باورچن نہیں ہے۔ جی بہلانے کے لئے ہے۔ قرآن میں لتسکنوا آیا ہے۔ اگر وہ کھانے پکانے سے انکار کر دے تو ان کو قدرت ہے۔ شوہر زور نہیں کر سکتا۔ خاوند کو یہ حق نہیں کہ اس کو ذلیل سمجھے۔

مودۃ ورحمة کا مفہوم

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ بیبیوں کے باب میں جو ارشاد وجعل بینکم مودۃ ورحمة ہے اس کے متعلق کہا کرتا ہوں کہ مودت ہیں ایک تو جو بیوی کا اس میں توجوش خروش کا غالب ہوتا ہے یہ حاصل ہے رحمت کا لوریہ بھی لفظ محبت ہی کی ایک فرد ہے مگر عرف محاورہ میں اس کو محبت کہتے نہیں اس کا نام عرف میں ہمدردی رحم مہربانی ہے لوریہ نکتہ اسی محاورہ پوٹی ہے۔

زوجین میں محبت کا نباہ دائمی نہیں

حق تعالیٰ نے زوجین کے متعلق فرمایا وجعل بینکم مودۃ ورحمة مودۃ کے رحمت کو ہی لئے بڑھایا کہ زوجین میں محبت کا نباہ دائمی نہیں ہے بلکہ اس کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ماند شے ماند شے دیگر نئے ماند

اور کسی کو بہت ہی محبت رہے گی تو جوانی تک رہے گی۔ بڑھاپے میں محبت و عشق باقی نہ رہے گا۔ ہاں شفقت و رحمت باقی رہے گی۔

مستورات پر ظلم کی راہ سے مشقت ڈالنا بے رحمی ہے

عورتوں پر ظلم کی راہ سے مشقت ڈالنا نہایت بے رحمی اور بے مروتی کی بات ہے فرمایا کہ ان بی بی کے خاوند نے ایک مرتبہ مجھ سے خود شکایت کی تھی کہ یہ وظیفہ و وظائف میں رہتی ہے میری خدمت کی پرواہ نہیں کرتیں۔ بندہ خدا ایسی کوئی خدمات ہیں جو بغیر وظائف ترک کئے ہوئے نہیں ہو سکتیں مرد کی خدمات ہی کیا ہیں چند محدود خدمات یہ دوسری بات ہے کہ خدمات کا باب اس قدر وسیع کر دیا جائے جن کا پورا کرنا ہی بے چاری پر دو بھر ہو جائے پھر فرمایا کہ ایک مقولہ مشہور ہے کہ مرد ساٹھا پاٹھا اور عورت بیسی کھسی سو عورت کے اعضاء کا جلد ضعیف ہو جانا اس کا سبب بھی زیادہ یہی ہے کہ اس پر ہر وقت غم اور رنج کا جھوم رہتا ہے۔ سینکڑوں افکار گھیرے رہتے ہیں امور خانہ داری کا انتظار بے چاری کے ذمہ ڈال کر مرد صاحب بے فکر ہو جاتے ہیں وہ غریب کھتی ہے مرتی ہے اگر یہ حضرت دوروز بھی انتظام کر کے دکھادیں ہم تو اس وقت ان کو مرد سمجھیں باوجود ان سب باتوں کے کمال یہ ہے کہ اپنی زبان سے اظہار بھی نہیں کرتی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ یہ سبب ہے عورت کے جلد ضعیف ہو جانے کا یہاں پر بعض عورتیں عیش اور راحت میں ہیں اور عمر ان کی تقریباً چالیس چالیس پینتالیس پینتالیس برس کی کم و بیش مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سال دو سال کی بیاہی ہوئی آئی ہیں اور ان کی کوئی پچیس برس کی عمر سے زائد نہیں بتلا سکتا تو بیوی کو عیش و آرام میں رکھنے میں ایک یہ بڑی حکمت ہے کہ وہ تندرست رہے گی۔ ضعیفی کا اثر جلد نہ ہوگا دراز مدت تک ان کے کام کی رہے گی مگر لوگ اپنی راحت اور مصلحت کا خیال کر کے بھی تو ان کی رعایت نہیں رکھتے اور میں یہ نہیں کہتا کہ جوڑوں کے غلام بن جاؤ۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ حدود کی رعایت رکھو اور ظلم تک نوبت نہ پہنچاؤ اگر کبھی ضرورت ہو دباؤ بھی دھمکاؤ بھی کوئی حرج نہیں حاکم ہو کر رہنا چاہیے اور محکوم کو محکوم بن کر لیکن جیسے محکوم کے ذمہ حاکم کے حقوق ہیں اسی طرح حاکم کے ذمہ محکوم کے بھی حقوق ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے برتاؤ کرنا چاہیے ایک مولوی صاحب فرماتے تھے کہ عورتوں کے ذمہ واجب ہے کھانا پکانا۔ میری رائے ہے کہ ان کے ذمہ واجب نہیں میں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے عدم وجوب پر

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً
حاصل یہ ہے کہ عورتیں اس واسطے بنائی گئی ہیں کہ ان سے تمہارے قلب کو سکون ہو قرار ہو جی بہلے تو عورتیں جی بہلانے کے واسطے ہیں نہ کہ روٹیاں پکانے کے واسطے اور آگے جو فرمایا کہ تمہارے درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی ہے میں کہا کرتا ہوں مودۃ یعنی محبت کا زمانہ تو جوانی کا ہے اس وقت جانین میں جوش ہوتا ہے اور ہمدردی کا زمانہ ضعیفی کا ہے دونوں کا اور دیکھا بھی جاتا ہے کہ ضعیفی کی حالت میں سوائے بیوی کے دوسرا کام نہیں آ سکتا۔ اس ضعیفی اور ہمدردی پر ایک حکایت یاد آئی ایک مقام میں ایک علامتی رئیس تھے گورنمنٹ میں

ان کا بڑا اعزاز اور بڑی قدر تھی یہ کامل سے یہاں آ کر رہے تھے گورنمنٹ نے کچھ گاؤں دے دیئے تھے ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا کلکٹر صاحب تعزیت کے لئے آئے ملاقات ہوئی کلکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہم کو بڑا رنج ہوا اس پر یہ ولایتی صاحب اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں فرماتے ہیں کلکٹر صاحب (کلکٹر صاحب) وہ ہمارا بیوی نہ تھا ہمارا اما تھا ہم کو گرم گرم روتی (روتی) کھلاتا تھا پنکھا جھلاتا تھا تھندا تھندا (تھندا) پانی پلاتا تھا یہ کہتے جاتے اور روتے جاتے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۲ ص ۱۸۲، ۱۸۳)

عورتوں کے ذمہ کھانا پکانا واجب نہیں

ایک صاحب نے سوال کیا کہ عورتیں جو کھانا پکاتی ہیں کیا یہ شرعاً ان کے ذمہ ہے فرمایا کہ میں تو ذمہ نہیں سمجھتا۔ مگر ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ قضاء تو نہیں مگر دیانتہ ان کے ذمہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ دیانتہ بھی ان کے ذمہ نہیں البتہ جس وقت شوہر حکم دے وہ اطاعت زوج کے تحت ملازم ہو جاویگا اور میں اس آیت سے استدلال کرتا ہوں۔ **وَمَنْ آيَاہِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لَتَسْكُنُوا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً لَتَسْكُنُوا** سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت بہلانے کے واسطے ہے روٹیاں پکانے کے واسطے نہیں۔ وہ مولوی صاحب اس کو فی نفسہ واجب فرماتے ہیں میں اس کو فی نفسہ واجب نہیں سمجھتا (الافاضات الیومیہ ج ۳ ص ۲۵۸)

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهِ

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: اور اسی کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں اور اس کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں جو سنتے ہیں۔

تفسیری نکات

لیل و نہار کا تعلق عام ہے

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهِ (اسی کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں اور اسی کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے) میں بعض لوگوں نے باللیل کو منامکم کے ساتھ اور والنہار کو ابتغاءکم کے ساتھ متعلق کیا ہے گویا اصل میں اس طرح تھا منامکم و ابتغاءکم باللیل والنہار فرمایا کہ اس سے بہتر یہ ہے کہ منام کو عام لیا جاوے مطلق لیٹنے کو بھی اور وابتغاءکم من فضلہ سے بھی عام مراد لیا جاوے کہ بعض حصہ میں ہو تو اس تقدیر پر باللیل والنہار دونوں کا تعلق ہر ایک کے ساتھ ہو جاوے۔

سُورَةُ لُقْمَانَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَإِنْ جَاهَدَكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا
وَصَاحِبُهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ
ثُمَّ إِلَىٰ مَرْجِعِكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: اور اگر تجھ پر وہ دونوں اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرا جس کی تیرے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو ان کا کچھ کہنا نہ ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ خوبی سے بسر کرنا اور اسی کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع کرنے والا ہو پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر میں تم کو جتناؤں گا جو کچھ تم کرتے تھے۔

تفسیری نکات

حقوق والدین

حضرت لقمان علیہ السلام نے اسی ایہام خود غرضی سے بچنے کے لئے حقوق والدین کا ذکر نہیں کیا تھا اس لئے حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس کو ذکر فرمایا کہ ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ الایہ (ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی اس کی ماں نے اس کو پیٹ میں رکھا) اور حقوق والدین کے بعد فرماتے ہیں کہ والدین کی اطاعت علی الاطلاق نہیں بلکہ اسی وقت تک ہے جب تک خدا کے خلاف نہ کہیں اور اگر وہ خدا کے خلاف کوئی بات کہیں تو نہ مانو اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کرو یہ تو ربط کے لئے بیان کیا گیا اب آگے وہ جملہ ہے جس کا بیان اس وقت مقصود ہے وہ یہ ہے کہ واتبع سبیل من اناب الی یعنی ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ

ہوئے مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کہ میری طرف سے ہٹاتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرو گویا باپ ہی ہوں بلکہ ان کی اطاعت کرو جو کہ میری طرف متوجہ ہوئے اور اس کے مابعد میں وعید فرمائی کہ چونکہ میرے پاس تم سب کو آنا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے ورنہ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو پھر ہم تم کو بتائیں گے کہ تم نے کیا کام کئے یہ مقام کا حاصل ہوا اختصار کیساتھ۔

ایک جدید مرض اور اس کا علاج

ہم علماء کا کہنا نہیں مانتے یہ آفت ابھی نازل ہوئی ہے پہلے نہ تھی تو اتنا تو جدید مرض مگر اس کا بھی علاج قرآن مجید میں ہے کہ واتبع سبیل من اناب الی (ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) ورنہ آسان بات یہ تھی کہ واتبع دین اللہ (اللہ کے دین کا اتباع کرو) فرمادیتے مگر حق تعالیٰ کو تو خبر تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آوے گا کہ لوگ علماء کے اتباع سے بچنا چاہیں گے اس لئے فرمایا کہ سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا جو میری طرف متوجہ ہیں) کہ ان کا بھی اتباع تمہارے ذمے ضروری ہے تو یہ کتنا عجیب و غریب قصہ ہے اسی لئے حدیث میں ہے کہ قرآن میں ہر امر کا فیصلہ ہے چنانچہ کتنا جدید مرض تھا مگر اس کا علاج مذکور ہے یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ بہت سے عقلاء جو یہ رائے دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں اس کی ضرورت ہے کہ علم کلام جدید تیار ہو علم کلام قدیم آج کل کے لئے کافی نہیں ہے بالکل غلط رائے ہے دیکھئے یہ کتنا جدید مرض تھا مگر پھر بھی قرآن مجید میں اس کا علاج مذکور ہے اسی طرح ہر شبہ کے جواب کے لئے قرآن و حدیث ہی کافی ہے۔

اتباع کا صحیح معیار

ایک جماعت میں تو اتباع ایسا سستا ہے اور ایک میں اتباع بالکل ہی نہیں پس اس میں دو قسم کے لوگ ہوئے ایک تو سب کے تابع اور معتقد ہونے والے اور دوسرے وہ جو کسی کے بھی تابع نہیں پس ایک جماعت میں افراط ہے حق تعالیٰ اس کا فیصلہ فرماتے ہیں واتبع سبیل من اناب الی (جو لوگ میری طرف متوجہ ہیں ان کا راستہ کا اتباع کرو) اتباع سے اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت کو نہیں سمجھتے کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی اور سبیل من اناب سے علاج ہے اس جماعت کا جو ہر کس و ناکس کے معتقد ہونے والے ہیں اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتباع وحی کا حکم

ثم جعلنک علی شریعة من الامر فاتبعھا خود اللہ تعالیٰ شریعت کے اتباع کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

حکم فرماتے ہیں اور من الامر میں الف لام عہد کا ہے پس اس سے مراد امر دین ہے پس معنی یہ ہوئے کہ دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اسی کا اتباع کئے جائیے پس جب اتنے بڑے صاحب علم کو ضرورت ہے اتباع شریعت کی تو ہم کو کیوں نہ ضرورت ہوگی تو ہر ایک کو اپنے بڑے کے اتباع کا حکم ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر تو کوئی تھا نہیں تو آپ کو حکم ہوا۔

اتباع وحی کا اور صحابہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لئے انہیں حکم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں چنانچہ ارشاد ہے فاتبعونی یحببکم اللہ (سو میرا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھیں گے) اور علیکم بسنتی (میری سنت کو اپنے اوپر لازم پکڑو) پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حکم ہے وحی کے اتباع کا اور صحابہ کو حکم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا پھر علماء کو حکم ہے صحابہ کے اتباع کا اور نیچے آ کر عوام کو حکم ہے علماء کے اتباع کا چنانچہ ارشاد ہے واتبع سبیل من اناب الی اور متبوع مستقل سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے کو جو کہا گیا ہے سو وہ اس لئے کہ حق تعالیٰ کا اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید سمجھانے کا وعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کیا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم ان علینا بیانہ (یعنی پھر اس کا بیان کر دینا ہمارا ذمہ ہے) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں علمنی ربی فاحسن تعلیمی (میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی پس اچھی ہوئی تعلیم میری) تو آپ کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ارشاد کے موافق خدا کے احکام کا اتباع کیا جاوے یہی معنی خلفائے راشدین کے اتباع کے ہیں نہ یہ کہ خلفائے راشدین مستقل متبوع ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین کو دین خوب سمجھایا اس وجہ سے دین کا اتباع صحابہ کے فرمانے کے مطابق کرنا چاہیے اور چونکہ خدا تعالیٰ کے احکام کا اتباع صحابہ کے ارشاد کے موافق کیا جاتا ہے اسی لئے اس کو صحابہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے کہ سنة الخلفاء الراشدين (خلفاء راشدین کی سنت) علی ہذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دین کو حضرات ائمہ مجتہدین نے لیا اور سمجھا اور ایسا سمجھا کہ ان کی تحقیقات دیکھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے اس لئے علماء کو ان کی تحقیقات کے موافق اتباع کرنا چاہیے مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ متبوع مستقل ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اگر ہم خود اتباع کرتے تو بہت جگہ احکام الہی کے سمجھنے میں غلطی کرتے اور وہ چونکہ ہم سے زائد سمجھتے تھے اس لئے ہم کو ان کی تحقیق کے موافق اتباع کرنا چاہیے پس جبکہ ثابت ہو گیا کہ متبوع مستقل صرف حق تعالیٰ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور مجتہدین کے اتباع کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع ان کے ارشاد کے موافق کیا جاوے تو خفی کہنے اور محمدی کہنے میں جواز و عدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا کیونکہ اگر اس نسبت سے اتباع بالاستقلال وبالذات مراد لیا جاوے تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح نہ ہوگی کیونکہ ایسا اتباع تو خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اگر اس نسبت کے یہ معنی ہیں کہ ان کے ارشاد کے موافق

حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے اس معنی کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے پھر کیا وجہ کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جاوے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز۔

حنفی کہلانے میں کوئی قباحت نہیں

پس معلوم ہو گیا کہ حنفی کہنے میں کوئی قباحت نہیں اس نسبت کو کفر شرک کہنا غلطی ہے کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ متبوع مستقل ہیں بلکہ یہی معنی ہیں کہ ان کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں ورنہ بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے تو جیسی نسبت ہم ابوحنیفہ کی طرف کرتے ہیں ایسی نسبت تو خدا کے کلام میں بھی دوسروں کی طرف موجود ہے ارشاد ہے واتبع سبیل من اناب الی (جو لوگ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو) قل ہلہ سبیلی ادعوا الی اللہ (آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے خدا تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں) سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یصلون عن سبیل اللہ (وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں) میں سبیل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو یہ ایسا ہے کہ عبادتنا شتی و حسنک واحد (عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی ہے)

بہر رنگے کہ خواہی جامہ سے پوش من انداز قدت راے شناسم

(یعنی جو لباس چاہے پہن لے میں تو چال سے ہی پہچان لیتا ہوں یعنی جو قرآن کا عاشق ہے اس کو حدیث و فقہ میں بھی قرآن نظر آتا ہے۔

حضرت مجتہدین کا اتباع

اس وقت چونکہ صاحب وحی تشریف نہیں رکھتے اس لئے مجتہدین اور علماء کو جو فیوض حاصل ہوئے ہیں اس لئے کوئی چارہ نہیں اور اصل میں یہ علماء کا اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے جس کا طریقہ ان سے معلوم کر لیا جاتا ہے اور گویہ سبیل من اناب (راستہ ان لوگوں کا جو فیض ہیں) کہلاتا ہے مگر واقع میں سبیل اللہ اور سبیل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے علماء چونکہ اسے ہم کو سمجھا دیتے ہیں اس معنی کردہ واسطہ ہیں صرف اس مناسبت سے ان کی طرف منسوب کر کے سبیل من اناب کہا گیا خلاصہ یہ کہ اتباع کے مخاطب تو وہ لوگ تھے جو سرے سے اتباع ہی کو ضرور نہیں سمجھتے اور کسی کا اتباع ہی نہیں کرتے اس سے تو ان لوگوں کی اصلاح کی گئی اب رہ گئے وہ لوگ جو اتباع تو کرتے ہیں مگر کوئی معیار صحیح نہیں مقرر کرتے بلکہ ہر کس و نا کس کا اتباع کرنے لگے ہیں سو

آگے ان کی اصلاح کرتے ہیں کہ سبیل من اناب (ان لوگوں کے راستہ کا جو نیب ہیں) کا اتباع کرو اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھئے کہ واتبع من اناب الی (ان لوگوں کا اتباع جو میری طرف متوجہ ہوئے) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ایہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا واتبع سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) کہ وہ خود متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے وہ ہے متبوع یہ ہے اتباع کا معیار کہ جس شخص کا اتباع کرو اس کو دیکھ لو کہ وہ صاحب انابت ہے یا نہیں جو صاحب انابت (اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا) ہو اس کا اتباع کرو۔ سبحان اللہ کیا عجب معیار ہے پس اتباع اسی معیار کے موافق کرنا چاہیے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں۔

دیکھئے حقوق کی کتنی بڑی عادت ہے اور باپ کا کتنا بڑا حق مقرر فرمایا۔ یہ مضمون اس آیت میں بھی ہے وان جاہداک علی ان تشرک بی مالیس لک بہ علم فلا تطعہما وصاحبہما فی الدنیا معروفاً واتبع سبیل من اناب الی ثم الی مرجعکم فانہنکم بما کتتم تعملون یعنی اگر وہ اس بات پر زور دیں کہ تم شرک کرو تو اس بات میں ان کا کہنا نہ مانو لیکن اس پر بھی دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو پھر تم سب میری طرف اور میرے ہی یہاں آؤ گے پھر میں ایک ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دوں گا۔ اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ جب باپ نے شرک کیا تو وہ باغی ہے اور اسی بغاوت کی طرف بیٹے کو بھی بلاتا ہے اس سے اور بغاوت میں اضافہ ہوا لیکن پھر بھی شریعت میں اس کے کچھ حقوق مقرر ہیں اس سے ایک تو یہ بات نکلی کہ رحمت حق تعالیٰ کی اس قدر وسیع ہے کہ اس نے باغی کے بھی حقوق رکھے ہیں اور مسلمان بیٹے کو اجازت نہیں ہے کہ باپ کے ساتھ برا برتاؤ کرے اور اس بات کو کس لطیف پیرایہ سے بیان فرمایا۔

ثم الی مرجعکم فانہنکم بما کتتم تعملون یعنی ہم جانیں اور وہ جانے وہ جائے گا کہاں آخر آئے گا ہمارے ہی یہاں ہم اس سے سمجھ لیں گے تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو آخر وہ تمہارا تو باپ ہی ہے تم اس کا ادب کرو۔ کسی اور قانون میں آپ یہ بات دکھا سکتے ہیں کہ باغی کے بھی کچھ حقوق ہوں باغی کا ترجمہ دشمن ہے اور دشمن کے حقوق کیسے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو محبین و موافقین کے ساتھ کیسا ہوگا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے

تفسیری نکات

آثار تکبر اور اس کی مذمت

سب سے بڑھ کر بڑی بات تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی برائی جا بجا بیان فرمائی ہے فرماتے ہیں ان اللہ لا یحب کل مختال فخور (اللہ تعالیٰ متکبر فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے اور ان اللہ لا یحب المستکبرین (اللہ تعالیٰ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں) یہ تین الفاظ ہیں مختال اور فخور اور مستکبرین اور تینوں کی نسبت لا یحب نہیں پسند کرتے کیا جامع کلام ہے ان تین لفظوں کی شرح یہ ہے کہ کبر کے آثار کبھی تو ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی تہذیب کی وجہ سے دل میں رہتے ہیں تو یہ تو مستکبر ہیں کیونکہ استکبار کے معنی ہیں بڑا سمجھنا اور یہ دل سے ہوتا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں ان اللہ لا یحب المستکبرین یعنی جن لوگوں کے دل میں تکبر ہے خواہ وہ ظاہر نہ ہو خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی مغفوض ہیں اور کبھی تہذیب کم ہوئی تو کبر کا اثر ظاہر بھی ہو جاتا ہے اس ظہور کے مراتب مختلف ہوتے ہیں کبھی زبان پر تو نہیں آتا مگر چال ڈھال سے ظاہر ہے مثلاً کوئی آدمی فیشن بنانا اور طرح طرح کی وضع اختیار کرتا ہے جن سب کا خلاصہ یہی ہے اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنا چاہتا ہے اس کے متعلق ارشاد ہے لا یحب کل مختال فخور یہ سب مختال کے اندر داخل ہیں اور بعضوں کی زبان سے بھی تکبر کے کلمات نکلنے لگتے ہیں ان کو فخر فرمایا پس مختال تو وہ ہے جس کے دل میں تکبر اور افعال سے بھی ظاہر ہو مگر اقوال سے ظاہر نہ ہو اور فخور وہ ہے جس کی زبان سے بھی ظاہر ہونے لگے تو تین مرتبہ ہوئے ایک مستکبرین مختال اور ایک فخور تینوں کے واسطے لفظ لا یحب فرمایا خلاصہ یہ کہ تکبر کا ظہور ہونہ ہو یعنی زبان سے تکبر ہو یا قلب سے یا افعال سے سب کو ان اللہ لا یحب المستکبرین سے منع فرمادیا ان میں سے ایک درجہ کی بھی اجازت نہیں دی اب یہ سمجھئے کہ اس مقام پر اس پر کسی عذاب کی وعید نہیں فرمائی صرف لاسحب (نہیں پسند کرتے ہیں) فرمادیا ہے سو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ اس آیت میں نہ کسی دوسری آیتوں میں تکبر پر عذاب کی وعید بھی موجود ہے ایس فی جہنم مشوی للمتکبرین (کیا غرور کرنے والوں کا دوزخ میں ٹھکانہ نہیں ہے) دوسرے یہ کہ یہ وعید کیا تھوڑی وعید ہے کہ لاسحب فرمایا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہو غرور سے دیکھئے تو وعید کی اصل یہی ہے کیونکہ وعید اسی پر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو مرضی کے خلاف ہونا کسی کام کا اور ناپسند ہونا ایک بیان تو ہے پس لاسحب اصل ہو گئی وعید کی بلکہ دوسرے لفظوں

میں یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ کو دشمنی ہے اس شخص سے جو متکبر ہے یا مختال ہے یا فخور ہو کر کیونکہ گو لغت کے اعتبار سے عداوت کی ضد ہے نفیض نہیں لیکن محاورات میں جس پر آیات قرآنیہ مبنی ہیں وہ عداوت کی نفیض ہے لایحب میں محبت کی نفی کر کے اس کی نفی کا اثبات ہے تو یہ کہنا کہاں صحیح رہا کہ اس پر کوئی وعید نہیں آئی کیا عداوت وعید نہیں بلکہ یہ تو وعیدوں کا اصل الاصول ہے اگر کسی ایک معین عذاب کی وعید کا ایک فرد خاص ہوتا اور اس میں تو کسی فرد کو عذاب کی خصوصیت نہیں رہتی۔

الْمُتَرَوِّانَ اِنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ

عَلَيْكُمْ نِعْمَةً ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّوَلَّاهُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيرٍ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لئے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ زمین میں موجود ہیں اور کامل کر دیں تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں بدوں علم کے اور بدوں ہدایت کے اور بدوں روشن کے۔

تفسیری نکات

منکرین توحید سے شکایت

یہ ایک آیت ہے سورۃ لقمان کی اس میں حق تعالیٰ نے اپنے بعضے دلائل توحید ارشاد فرما کر منکرین توحید کی شکایت کی ہے اور ان کا انکار چونکہ بلا دلیل خلاف دلیل ہے اس لئے اس کو مجادلہ سے تعبیر فرمایا ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا لیکن میرا مقصود اس وقت مضمون توحید کو بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی مخاطب توحید کا منکر نہیں بلکہ مجھ کو علم دین کی ضرورت اور اس کے بعضے انواع کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ مضمون اگرچہ منطوقاً اس آیت کا مدلول نہیں ہے مگر اس سے مفہوم ضرور ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ تقریر استدلال سے واضح ہو جائے گا پس یہ آیت توحید پر تو صراحت دلاتی کرتی ہے اور علم کی ضرورت اور اس کے اقسام پر اشارہ دلاتی کر رہی ہے اور چونکہ اس وقت ایک علمی مقام میں بیان ہو رہا ہے اور میرا معمول ہمیشہ یہ ہے کہ مناسب محل مضمون بیان کیا کرتا ہوں اس لئے دوسرے مضمون کو جو اشارہ اس آیت سے مستحب ہو رہا ہے اختیار کرنے میں ترجیح دی گئی لیکن ربط کے لئے دلیل توحید کو بھی بیان کر دینا مناسب ہے کیونکہ ضرورت علم کی

طرف اس آیت کے دوسرے جزو میں اشارہ ہے اور پہلے جزو میں صرف توحید کی دلیل مذکور ہے تو پوری آیت کی تفسیر اسی وقت سمجھ میں آوے گی جبکہ دونوں اجزاء کو بیان کر دیا جائے مگر پہلے جزو کا بیان محض ربطی کے لئے ہوگا اور اصل مقصود علم کے متعلق بیان ہے جو کہ دوسرے جزو میں مذکور ہے۔

اب سمجھنا چاہئے کہ وہ توحید کی دلیل کیا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں **الْم تَسْرُوا ان اللہ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِی السَّمَوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ** اس میں خطاب ہے عقلاء کو کیا تم نے دیکھا نہیں کہ حق تعالیٰ نے کام میں لگا رکھا ہے تمہارے لئے تمام چیزوں کو جو کچھ کہ آسمانوں میں موجود ہیں اور جو کچھ کہ زمین میں موجود ہیں یہاں سَخَّرَ لَكُمْ کے معنی وہ نہیں ہیں جو اردو محاورہ میں تسخیر کے لفظ سے متبادر ہوتے ہیں اور وہ معنی محل اشکال بھی ہیں لیکن منشاء اس اشکال کا محض خلط محاورہ ہے اور یہ مزلہ (بھسلنے کی جگہ) ہے اہل علم کے لئے بعض علماء بھی محاورات السنہ میں فرق نہیں کرتے اس لئے اس کو قرآن میں اشکالات پیش آ جاتے ہیں لیکن اہل علم کو پھر بھی یہ غلطی واقع ہوتی ہے کیونکہ ان میں اکثر حضرات محاورات و لغات میں فرق جانتے ہیں البتہ ترجمہ دیکھنے والوں کو یہ غلطی زیادہ پیش آتی ہے کیونکہ وہ محض ترجمہ ہی کو دیکھتے ہیں اور لغات عربیہ و محاورات قرآن سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں پس یہ لوگ اکثر قرآن کے محاورات کو اپنی زبان کے محاورات پر قیاس کر کے غلطی میں پڑ جاتے ہیں سو ممکن ہے کہ کسی نے سَخَّرَ لَكُمْ کا ترجمہ کسی جگہ یہ دیکھا ہو ”سخر کر دیا تھا تمہارے لئے“ پھر اس کو محاورہ اردو عربی میں خلط ہو گیا ہو اور اس نے تسخیر کے لفظ کو اردو محاورہ پر محمول کیا ہو اور دوسرے معنی کی طرف اس کا ذہن بھی نہ گیا ہو کیونکہ اس کے ذہن میں تسخیر کے وہی معنی بے ہوئے ہیں جو محاورہ اردو میں مستعمل ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو بات بسی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت استاذ علیہ الرحمۃ نے دیوبند میں مجھے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق لکھ کر دی تھی کہ اس کو صاف کر دو کسی نے حضرت سے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تھا جس کے جواب میں آپ نے وہ تحقیق لکھی تھی مسئلہ تصور شیخ صوفیہ کا ایک مشغل ہے جو زمانہ قدیم میں رائج تھا لیکن اب محققین نے اس مشغل سے منع کر دیا ہے کیونکہ اب عقول سے سلامتی رخصت ہو گئی ہے۔ بہت لوگ اس مشغل سے غلطی اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں باقی اگر کسی سالک کی فہم سلیم ہو تو اب بھی اس کی تعلیم کا مضائقہ نہیں رفع خطرات و حصول یکسوئی کے واسطے یہ مشغل بہت نافع ہے غرض میں اس مسئلہ کی نقل لکھ رہا تھا کہ ایک نوار طالب علم جواب تک معقول میں منہمک تھے میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا لکھ رہے ہو میں نے کہا کہ تصور شیخ کا مسئلہ لکھ رہا ہوں تو آپ بے ساختہ فرماتے ہیں کہ شیخ بوعلی سینا کا۔ بس اس غریب کے نزدیک وہی ایک شیخ تھا اور تو سب جلا ہے ہی تھے سو اس کا منشا یہی تھا کہ معقول پڑھنے کی وجہ سے ان کے ذہن میں شیخ بوعلی سینا ایسا ہوا تھا کہ شیخ کا لفظ

سن کر ادھر ہی منتقل ہوتا تھا دوسری طرف ان کا خیال نہ گیا کہ کوئی اور بھی شیخ ہو سکتا ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ جب علوم میں وسعت نہیں ہوتی تو ہر شخص ہر بات کو اپنے علم ہی پر محمول کرتا ہے یعنی جو بات اس کے ذہن میں بسی ہوئی ہے اسی کی طرف انتقال ذہن ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض ناقص الفہم لوگوں نے صفات الہیہ کو اپنی صفات پر قیاس کیا قرآن میں حق تعالیٰ کے لئے وجہ وید وسمع و بصر و رحمت و غضب وغیرہ کا ذکر دیکھ کر بعض لوگ تجسیم کے قائل ہو گئے اس کا غشا بھی یہی ہے کہ ان کے ذہن میں صفات بشریہ ہی بسی ہوئی ہیں اس لئے ان الفاظ سے تجسیم کی طرف ان کا ذہن منتقل ہو گیا۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر نہ
چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زوند

(بہتر فرقوں کی جنگ میں تمام کو معذور سمجھو جب ان کو حقیقت کا پتہ نہ چل سکا ڈھکوسلوں کی راہ اختیار کی) اسی طرح ترجمہ دیکھنے والوں نے تسخیر کا لفظ تعویذ گنڈوں ہی میں سنا ہوگا اس کے سوا اور کسی جگہ اس لفظ کو نہ سنا ہوگا پس قرآن میں مسخر لکم کا ترجمہ ”مسخر کر دیا تمہارے واسطے“ دیکھ کر ادھر ہی ذہن منتقل ہوا۔ اب وہ اس معنی کو ذہن میں لے کر علماء کے پاس پہنچے اور اپنے نزدیک بڑا اشکال لے کر آئے کیونکہ تسخیر کے معنی ان کے ذہن میں تابع و مطیع و منقاد کرنے کے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں اگر ہم کو بارش کی ضرورت ہو اور ہم بادل سے کہیں کہ برس جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ برسے گا علیٰ ہذا القیاس اگر سمندر میں طوفان آ رہا ہو اور ہم ہوا سے یہ کہیں کہ تھم جا تو وہ ہمارے کہنے سے کبھی نہ تھمے گا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اسی معنی کے اعتبار سے ہماری مسخر نہیں ہیں۔ اب ان کو قرآن پر اشکال ہوا کہ قرآن میں تو یہ فرمایا ہے کہ تمام چیزوں کو تمہارے واسطے مسخر کیا گیا ہے اور حالت یہ ہے کہ بہت سی چیزیں ہماری تابع و مطیع نہیں ہیں سو بات یہ ہے کہ اس شخص نے تسخیر کا لفظ تو قرآن سے لیا اور معنی اردو محاورہ کے موافق کے لئے اس سے یہ اشکال پیدا کیا اور حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ تسخیر جس زبان کا لفظ ہے اسی زبان کے محاورات کے موافق اس کے معنی لیتا تو یہ اشکال نہ ہوتا۔

مسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض

ترجمہ: کام میں لگا دیا ہے تمہارے نفع کے لئے تمام چیزوں کو جو آسمان و زمین میں ہیں۔

تسخیر کا مفہوم

تسخیر سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام عالم کو انسان کے کام میں لگا رکھا ہے اور وہ معنی مراد نہیں جو تسخیر کے لفظ سے محاورہ اردو میں متبادر ہوتے ہیں اور اس کے ضمن میں حق تعالیٰ نے توحید کی دلیل بیان فرمائی ہے اصل مقصود آیت کا توحید ہی ہے۔

پس جب اہل عرب صانع کے قائل تھے اور شرک میں مبتلا تھے تو ان کے واسطے دلائل توحید ہی کی ضرورت تھی چنانچہ سارا قرآن دلائل توحید سے بھرا ہوا ہے لیکن وہ دلائل منطقی طرز پر صغریٰ و کبریٰ واحد اوسط وغیرہ سے مرکب نہیں ہیں یہ میں نے اس واسطے کہہ دیا تا کہ کوئی معقولی یہ نہ کہے کہ ہم نے تو سارا قرآن دیکھ لیا ہم کو تو ایک جگہ بھی دلیل عقلی نہیں ملی سو بات یہ ہے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ قرآن کا طرز دلائل کے بارہ میں استدلال منطقی کے طرز پر نہیں ہے بلکہ اکثر دلائل قرآن کے اقلی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی اقلی ہی ہیں بلکہ محض طرز کے اعتبار سے اقلی ہیں ورنہ حقیقت میں وہ سب دلائل عقلیہ ہیں جو طرز عقلی پر بخوبی منطبق ہو سکتے ہیں بالخصوص دو موقعوں میں تو یہاں تطابق بہت ہی ظاہر ہے ایک سورہ بقرہ کی اس آیت میں ان فی خلق السموات والارض واختلاف الليل والنهار والفلک التي تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیابہ الارض بعد موتها و بث فیہا من کل دابة و تصریف الريح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایات لقوم یعقلون (آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ہیر پھیر اور کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لئے ہوئے سمندروں میں چلنا آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کر دینا اور اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا ہواؤں کے رخ بدلنا تابع فرمان بادلوں کو آسمان و زمین کے درمیان ادھر ادھر پھرنا عقلمندوں کے لئے قدرت خدا کی نشانیاں ہیں)

اس آیت میں چونکہ لفظ یعقلون موجود ہے جس سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دلیل عقل کے مطابق ہے اس لئے مفسرین کو موقع مل گیا کہ انہوں نے طرز عقلی پر اس کا انطباق خوب بیان کیا۔ دوسرا موقع اس آیت میں ہے لو کان فیہما الہة الا اللہ لفسلتا (اگر ان زمین و آسمان میں چند معبود ہوتے تو البتہ فاسد ہو جاتے) حاصل اس دلیل عقلی کا یہ ہے کہ یہ اشیاء مذکورہ سب ممکن الوجود ہیں۔ بعض تو بداعتہ (ظاہری) بوجہ مشاہدہ کے کیونکہ بعض کی نسبت ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں پھر موجود ہوئیں اور بعض کے احوال میں تغیر و تبدل کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور بعض چیزیں اجزاء سے مرکب ہیں یہ بھی امکان کی علامت ہے اور بعض اشیاء بعض کی محتاج ہیں اور احتیاج بھی ممکن کا خاصہ ہے۔ غرض یہ تمام چیزیں ممکن ہیں اور ممکن کا وجود عدم چونکہ برابر ہوتا ہے اس لئے وہ کسی مرتج کا محتاج ہے وہ مرتج اگر ممکن ہے تو اس میں پھر یہی کلام ہوگا اور اس کے وجود کے لئے بھی کسی مرتج کی ضرورت ہوگی علی ہذا القیاس اور تسلسل محال ہے اس لئے اس کو قطع کرنے کے لئے کسی جگہ یہ ماننا پڑے گا کہ مرتج واجب الوجود ہے (جس کا وجود ضروری اور معدوم ہونا محال ہے وہی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ تو دلیل ہے وجود صانع کی اب رہا اس کا واحد ہونا سواس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ واجب الوجود متعدد مثلاً دو مانے جاویں تو آیا ان میں سے کسی کا عاجز ہونا ممکن ہے یا دونوں کا قادر

کامل ہونا ضروری شق محال ہے کیونکہ عاجز ہو سکنے والا واجب الوجود نہیں ہو سکتا اور دوسری شق پر یہ سوال ہے کہ اگر ان میں سے ایک نے کسی کام کا ارادہ کیا مثلاً زید کے موجود کرنے کا تو دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں اگر نہیں کر سکتا تو اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو کہ وجوب وجود کے منافی ہے اور اگر خلاف کا ارادہ کر سکتا ہے تو اس کے ارادہ پر مراد کا مرتب ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اگر ضروری نہیں تو قادر مطلق کے ارادہ سے مراد کا تخلف لازم آئے گا جو کہ محال ہے اور اگر ضروری ہے تو دو مختلف مرادوں کا اجتماع لازم آوے گا کیونکہ ایک واجب کے ارادہ پر اس کی مراد یعنی زید کا وجود مرتب ہوگا اور دوسرے کے ارادہ پر اس کی مراد جو کہ پہلے کی ضد ہے یعنی زید کا عدم مرتب ہوگا اس صورت میں اجتماع ضدین لازم آوے گا جو کہ محال ہے پس واجب الوجود کا متعدد ہونا ہی محال ہے پس ثابت ہو گیا کہ واجب الوجود ہمیشہ واحد ہی ہوگا اور یہی مقصود ہے خوب سمجھ لو اس جگہ ایک بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اس طرز استدلال سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ توحید کی دلیل کے لئے مطلقاً کسی مصنوع کا بیان کر دینا کافی تھا مگر حق تعالیٰ نے ان مقامات پر خصوصیت کے ساتھ ان چیزوں کا بیان فرمایا ہے جو علاوہ مخلوق و مصنوع ہونے کے ہمارے حق میں نعمت بھی ہیں جس سے حاصل یہ ہوا کہ عبادت جس کی فردا عظیم توحید ہے اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ خدا کے سوا اصانع و خالق کوئی نہیں اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ منعم بھی حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں گویا اس طرح دلیل عقلی کے ساتھ ایک داعی طبعی بھی بیان فرمادیا کیونکہ منعم کے احسان کا ماننا اور اس کا شکر ادا کرنا انسان کا طبعی امر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی دلیل سے متاثر نہیں ہوتے تو خدا تعالیٰ کے انعامات پر نظر کر کے طبعی مؤثر سے تو متاثر ہونا چاہیے۔

واسع علیکم نعمہ ظاہرۃ و باطنۃ

ترجمہ: اور کامل کر دی تمہارے اوپر اپنی نعمتیں جن میں بعض ظاہری ہیں اور بعض باطنی ہیں۔

نعمت کی دو قسمیں ظاہرہ و باطنہ

اس میں نعمت کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں نعمت ظاہرہ وہ ہے جو جو اس ظاہرہ یا باطنہ سے محسوس ہو اور نعمت باطنہ وہ ہے جو عقل سے معلوم ہو یا جو جو اس ظاہرہ سے محسوس ہو وہ ظاہرہ ہے اور جو جو اس باطنہ و عقل سے معلوم ہو وہ باطنہ ہے بہر حال اس میں نعمتوں کا اجمالاً پوری طرح احاطہ کر دیا گیا اور یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انہوں نے نعمت کی تقسیم ظاہر فرمادیں ورنہ نعم باطنہ (باطنی نعمتوں) کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر جاتی کیونکہ اس تقسیم کے بعد بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو نعم باطنہ کو نعمت ہی نہیں سمجھتے اور جو لوگ نعمت سمجھتے ہیں وہ نعم ظاہرہ کی برابر ان کی قدر نہیں کرتے۔

چنانچہ نعمت باطنہ یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنی معرفت عطا فرمائی جس کا فردا عظیم اسلام ہے۔ اب ذرا انصاف سے بتائیے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے ایسے لوگ کتنے ہیں جنہوں نے کبھی زبان سے یوں

کہا ہو کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو اسلام کی دولت عطا فرمائی۔ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے۔ اسی طرح علم اور حب فی اللہ۔ بغض فی اللہ۔ توکل ورضا وغیرہ یہ سب باطن ہیں ان پر شکر بہت کم لوگ کرتے ہیں اور یہ حال تو اس پر ہے کہ حق تعالیٰ نے نعم باطنہ کی طرف متوجہ بھی فرمایا ہے اور اگر وہ نعمت کی تقسیم نہ فرماتے تو شاید کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہ کرتا۔ الا من شاء اللہ (مگر جس کو اللہ چاہے) اور ایک بہت بڑی فہرست نعمتوں کی ہماری نظر سے غائب ہو جاتی چنانچہ خود عقل بھی ایک نعمت ہے جو کہ ایک نور کا نام ہے جو انسان کو حق تعالیٰ عطا فرماتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مدرک کلیات ہے اور یہ بھی نعم باطنہ میں داخل ہے۔

آگے حق تعالیٰ منکرین توحید کی شکایت فرماتے ہیں ومن الناس من يجادل في الله بغير علم ولا هدى ولا كتب منيرة یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جدال کرتے ہیں بجا دل فی اللہ (اللہ تعالیٰ کے بارے میں جدال کرتے ہیں) سے مراد بجا دل فی توحید اللہ (اللہ تعالیٰ کی توحید کے بارے میں جدال کرتے ہیں) مضاف مقدر ہے یعنی خدا کی توحید میں جھگڑا کرتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں اور ان دلائل بینہ میں غور نہیں کرتے اس آیت میں منکرین توحید کی متعدد مذمتیں مذکور ہیں۔

جدال کی دو قسمیں

چنانچہ اول تو جدال ہی فی نفسہ مذموم ہے کیونکہ ہر چند کہ بظاہر جدال کی دو قسمیں ہیں ایک جدال بحق ہے ایک جدال بالباطل جیسا کہ جادلہم بالحق ہی احسن (ان سے احسن طریقہ سے خوش اسلوبی کے ساتھ جدال بحق کرو) سے معلوم ہوتا ہے کہ جدال کا اطلاق جدال بحق پر بھی ہوتا ہے لیکن قرآن کے تتبع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں جدال اور جدل کا اطلاق اکثر جدال بالباطل پر ہی ہوتا ہے یہ بات سارے قرآن کو دیکھ کر بھی نہ ٹوٹے گی اور جہاں جدال بالحق پر جدال کا اطلاق آیا ہے وہ اطلاق صورت جدال پر مشاکلہ ہے کیونکہ خواہ جدال بالحق ہو یا بالباطل صورت دونوں کی ایک سی ہوتی ہے جیسا مشاکلہ جزاء سینۃ مثلاً (برائی کا بدلہ برائی ہے مثل اس کے) فرمایا گیا کیونکہ صورت دونوں یکساں ہوتے ہیں۔

فضائل علم

یہ آیت جو میں نے اس وقت پڑھی ہے قابل سبق لینے کے ہے اس میں حق تعالیٰ نے جدال بالباطل کی مذمت عجیب طرز سے بیان فرمائی ہے جس سے علم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے فرماتے ہیں ومن الناس من يجادل في الله یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جو مجادلہ کرتے ہیں اللہ کے بارے میں یعنی خدا کی ذات و صفات و احکام میں جن میں توحید اعلیٰ فرد ہے اور بقیہ احکام اس کے بعد ہیں سب میں جدال کرنا جدال فی اللہ ہے گو

درجات متفاوت ہیں اور جدال تو خود ہی مذموم ہے پھر جدال فی اللہ تو سب سے زیادہ مذموم ہے آگے فرماتے ہیں بغیر علم ولا ہدی ولا کتب منیر یعنی مجادلہ کرتے ہیں ذات ذات وصفات واحکام الہی میں بدوں علم کے اور بدوں ہدایت کے اور بدوں روشن کتاب کے اب یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ یہ قیود احترام یہ نہیں ہیں کیونکہ جدال فی اللہ کی جو کہ مذموم ہی ہوگا دو قسمیں نہیں ہو سکتیں کہ ایک وہ جو علم و ہدایت اور کتاب کے ساتھ ہو دوسرے وہ جو ان کے بغیر ہو بلکہ جدال بالباطل جب ہوگا ان تینوں کے بغیر ہی ہوگا معلوم ہوا کہ یہ قیود واقعہ ہیں مطلب یہ ہوا کہ جدال فی اللہ یعنی جدال بالباطل کا سبب ان ہدایت و کتاب منیر کا حاصل نہ ہونا ہے پھر اسی کے ساتھ ایک بات اس جگہ یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ علم سے مراد جس میں ہدایت و کتاب منیر بھی داخل ہے مطلق علم نہیں کیونکہ جدال بالباطل کے ساتھ مطلق علم کا اجتماع تو ممکن اور مشاہد ہے بلکہ یہاں وہ علم مراد ہونا چاہیے جو کہ جدال بالباطل کے ساتھ جمع نہ ہو سکے پس یہاں علم سے خاص علم یعنی صحیح و نافع مراد ہے۔ اب یہاں سے علم کی فضیلت معلوم ہوئی کہ علم صحیح و نافع کیسی قدر کی چیز ہے کہ جدال بالباطل اس کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اور جو شخص علم صحیح و نافع سے محروم ہے وہ جدال بالباطل جدال فی اللہ میں جو کہ جدال بالباطل کا اعلیٰ فرد ہے پھنس جاتا ہے اور جدال بالباطل کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے تو جس چیز پر اس سے بچنا موقوف ہے اس کی ضرورت کا انکار نہیں ہو سکتا لہذا یہ مسئلہ ثابت ہو گیا کہ علم نافع و علم صحیح کی سخت ضرورت ہے اور یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہو گئی کہ جب جدال بالباطل علم صحیح کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تو جو لوگ باوجود علم صحیح و ہدایت و کتاب منیر کے حاصل کرنے کے پھر جدال بالباطل میں مبتلا رہتے ہیں یا تو انہوں نے ان تینوں کو سمجھ کر حاصل نہیں کیا یا اگر سمجھ کر حاصل کیا ہے تو جدال کے وقت جان بوجھ کر ان سے اعراض کر لیا ہے ورنہ اگر وہ ہر وقت ان تینوں پر نظر رکھتے اور پوری طرح عمل کرتے اور کسی وقت کسی مسئلہ میں ان سے اعراض نہ کرتے تو وہ ہرگز جدال بالباطل میں مبتلا نہ ہوتے خوب سمجھ لو۔

سُورَةُ الْأَحْزَابِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ

تَنْجِيحًا: اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے

تفسیری نکات

ایک شخص میں دو دل ممکن ہیں یا نہیں

فرمایا کہ امریکہ سے ایک شخص نے اشتہار دیا کہ میرے دو دل ہیں اکثر لوگوں نے اس کا انکار کیا اور تمام عالم میں ایک شور مچ گیا اور لوگوں نے سوالات کر کے بھیجے فضلاً شیعہ میں سے بھی ایک صاحب نے جو علم طب اور ہیئت و ریاضی سے واقف تھے اس کے رد میں ایک طویل تقریر اس دعوے کی تکذیب میں لکھی اور اس کو طبع کرایا میں نے بھی اس کو دیکھا مگر مجھے پسند نہیں آئی کیونکہ محض دلائل طبیہ سے اس کی نفی یا عدم امکان ثابت نہیں ہو سکتا میرے پاس بھی اس کے متعلق سوال آیا تھا میں نے اس کے دو جواب لکھے ایک تو ظاہر نظر میں نہایت وقیح تھا غشاء شبہ کا یہ تھا کہ قرآن مجید میں ہے مَا جَعَلَ اللَّهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ تُوِيْدُ دَعْوَى اس آیت کے خلاف ہے جواب اول تو یہ تھا کہ کلام اللہ میں لفظ ماضی سے ارشاد فرمایا ہے مراد یہ ہے کہ زمان نزول وحی تک ایسا نہیں ہوا تھا اس سے مستقبل میں نفی لازم نہیں آتی دوسرا جواب کہ وہی با وقعت جواب ہے یہ ہے کہ کلام اللہ میں بطور مثال کے فرمایا ہے زید بن حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہنی کی زوجہ کے قصے میں مقصود یہ ہے کہ نبوت اور عدم نبوت دونوں وصف جمع نہیں ہو سکتے جیسے ایک شخص کے دو دل نہیں ہو سکتے اور تمام مثالوں میں اکثریت کا اعتبار ہوتا ہے اس میں کلیت ضروری نہیں اور فرمایا کہ یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور تکذیب واقعہ کی بلا ضرورت اور رد و انکار میرے نزدیک مشکل غیر صحیح ہے اس واسطے کہ اول تو ممکن ہے کہ ان دلائل تکذیب کا کوئی اس سے اتویٰ دلیل سے رد کرے دوسرے دلائل اس شخص کے مقابلہ میں کافی نہیں ہیں جس نے مشاہدہ کیا ہے۔

ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه یعنی خدا تعالیٰ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے۔ اس کا جواب ایک تو یہی ہے کہ اہل اخبار کی خبر کا اعتبار ہی کیا کسی نے اس کے پیٹ کو چیر کر تو نہیں دیکھا محض قیاس اور گمان سے یہ حکم لگا دیا ہے کہ اس شخص کے دو دل ہیں سو ممکن ہے کہ اس شخص کا دل بہت قوی ہو اس لئے دو دل ہونے کا شبہ ہو گیا ہو یہ جواب تو بطور منع کے ہے اور بعد تسلیم کے جواب یہ ہے کہ قرآن میں ما جعل صیغہ ماضی کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت تک خدا نے کسی کے دو دل نہیں بنائے اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ آئندہ بھی کسی کے دو دل نہ بنائیں گے پس اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تب بھی قرآن پر کوئی اشکال نہیں۔

اخبار میں شائع ہوا کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل ہیں اور اخباروں کو آج کل ایسا سمجھتے ہیں جیسے وحی آسانی چاہئے تو یہ تھا کہ اس خبر میں اشکال کیا جاتا مگر وہ اخباری خبر تھی غلط کیسے ہو سکتی تھی بعض مسلمانوں کو اس خبر سے قرآن پر اشکال ہو گیا کہ قرآن میں جو آ گیا ہے

ما جعل الله لرجل من قلبين في جوفه ”کہ حق تعالیٰ نے کسی آدمی کے دو دل نہیں بنائے“ ترجمہ: اے نبی آپ اپنی بیبیوں سے فرمادیں کہ اگر تم دنیوی زندگی کا عیش اور اس کی بہاریں چاہتی ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فطانت

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو سب سے پہلے حضور نے حضرت عائشہ صدیقہ کو یہ آیات سنائیں اور فرمایا جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور کہ یہ خیال ہوا کہ عائشہ کم سن بچی ہیں اور بچپن میں دنیا کی حرص ہونا کچھ بعید نہیں تو ایسا نہ ہو یہ جلدی سے دنیا کو اختیار کر لیں۔ اس لئے فرمایا کہ اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا کیونکہ ان کے متعلق آپ کو اطمینان تھا کہ وہ حضور سے مفارقت کی رائے کبھی نہ دیں گے مگر حضرت عائشہ نے آیات تخییر کو سن کر فوراً جواب دیا اھی هذا استامر ابوی کیا اس معاملہ میں اپنے والدین سے مشورہ کروں گی۔

قد اخترت الله ورسوله والدار الآخرة میں نے اللہ ورسول ﷺ کو اختیار کیا اور دار آخرت کو۔ ان کے اس جواب سے حضور ﷺ کو بہت مسرت ہوئی کیونکہ آپ کو ان سے بہت محبت تھی۔

عشق و محبت

احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ سے حضور کا نکاح اس وقت ہوا تھا جب کہ یہ چھ سال کی تھیں اور حضور کے گھر میں جس وقت آئی تھیں اس وقت ان کی عمر نو سال کی تھی ظاہر ہے کہ نو سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے ہندوستان میں تو نو سال کی لڑکی شوہر کے پاس جانے کے اور گھر داری کے قابل نہیں ہو سکتی مگر عرب میں نشوونما

اچھا ہوتا ہے وہاں نو سال کی لڑکیاں اٹھان (نشوونما) میں اچھی ہوتی ہیں اس لئے حضرت عائشہؓ نو سال کی عمر میں حضورؐ کے گھر آ گئی تھیں مگر اس عمر میں بچپن کی باتیں تو ہوتی ہی ہیں نشوونما اچھا ہونے سے بچپن تو زائل نہیں ہو جاتا تو اس عمر میں گر مال و متاع دنیا کی زیادہ حرص ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ بچوں کو زیور گہنے کی حرص ہوتی ہے۔ مگر حضرت عائشہؓ باوجود اس کم سنی کے بڑی بڑی عورتوں سے عقل و فہم و ادب میں کم نہ تھیں۔ بلکہ سب سے بڑھی ہوئی تھیں بڑے بڑے صحابہ ان سے مشکل مسائل میں رجوع کرتے تھے اور ان کی فہم و سلامت رائے معلوم کرتے تھے اسی عقل و فہم کا یہ اثر تھا کہ نو سال کی عمر میں بھی ان کے اندر بچیوں کی سی حرص و طمع نہ تھی بلکہ دانا عورتوں کی طرح استغناء کی شان تھی۔

بڑی بات یہ تھی کہ جیسے حضورؐ کو ان سے محبت تھی وہ بھی حضورؐ کی عاشق تھیں چنانچہ یہ جواب دے کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ میری ایک درخواست ہے فرمایا وہ کیا؟ کہا وہ یہ کہ آپ میرے اس جواب کو دوسری ازواج سے بیان نہ فرمائیے گا مطلب یہ تھا کہ کہیں میرا جواب سن کر میری تقلید میں سب یہی کہہ دیں اور وہ چاہتی یہ تھیں کہ سب اپنی اپنی رائے سے جواب دیں تو اچھا ہے ممکن ہے کسی کی رائے دینا لینے ہی کی ہو تو وہ الگ ہو جاوے اور رقیبوں کی تعداد کچھ کم ہو جائے مگر حضورؐ نے اس درخواست کو منظور نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے گی کہ عائشہؓ نے کیا جواب دیا تو میں بتلا دوں گا۔ ہاں بدوں پوچھے مجھے بتلانے کی ضرورت نہیں۔

تو حضرت عائشہؓ کی اس درخواست سے ان کی محبت کا رنگ معلوم ہو گیا کہ وہ یوں چاہتی تھیں کہ حضورؐ میں جو اتنے شریک ہیں وہ کم ہو جاویں تو اچھا ہے اور اس میں دوسروں کے ساتھ برائی کا قصد نہ تھا بلکہ اپنے لئے بھلائی کا قصد تھا کہ حضورؐ تنہا میرے ہی لئے ہوں اور اس تمنا میں عاشق معذور ہوتا ہے ایک رنگ تو یہ تھا۔ ایک رنگ یہ تھا کہ حضرت ام حبیبہؓ نے ایک دفعہ حضورؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ میری بہن سے شادی کر لیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا کیا تم کو یہ گوارا ہے؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں آپ کے پاس اکیلی تو ہوں نہیں بلکہ اب بھی میرے شریک بہت ہیں تو اگر اس خیر میں میری بہن شریک ہو جائے تو اس سے بہتر کیا ہے غیروں کی شرکت سے بہن کی شرکت تو پھر اہون ہے حضورؐ نے فرمایا کہ یہ میرے واسطے حلال نہیں۔

عشق کا ایک رنگ یہ بھی ہے جو حضرت ام حبیبہؓ میں تھا کیونکہ وہ بہن کا سوکن ہونا محض اس لئے گوارا کرتی تھیں کہ میری بہن کو بھی حضورؐ سے خاص تعلق ہو جائے جو اس کے لئے سعادت آخرت کا سبب ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ آپ کے تعلق کی کتنی قدر دان تھیں۔

بہر حال جب یہ آیت تجسیم نازل ہوئی تو سب ازواج نے حضورؐ ہی کو اختیار کیا دنیا کو کسی نے بھی اختیار نہیں کیا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس درجہ کی محبت تھی کہ فقر و فاقہ اور تنگی میں

رہنا منظور تھا مگر حضور سے علیحدگی منظور نہ تھی۔ چنانچہ اس محبت ہی کی وجہ سے ان کو حق تعالیٰ نے جہنم وغیرہ کی دھمکی نہیں دی بلکہ صرف اس سے ڈرایا کہ دیکھو کبھی تم کو حضور اپنے سے علیحدہ نہ کر دیں اور تم یہ نہ سمجھنا کہ اگر ہم کو الگ کر دیا تو ہم سے بہتر یہیاں کہاں سے ملیں گی خوب سمجھ لو کہ اگر حضور نے تم کو طلاق دے دی تو حق تعالیٰ قادر ہیں کہ وہ تم سے بہتر یہیاں حضور ﷺ کو دے دیں عسی ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجاً خیراً منکن یہ تو اجمالاً ان کی خیریت کا ذکر تھا آگے اس خیریت کی تفصیل ہے کہ وہ یہیاں کیسی ہوں گی۔

نقشبند یہ اور چشتیہ کے الوان میں مناسبت

فرمایا اہل علم کو مضامین علیہ میں وہ لذت آتی ہے کہ کسی چیز میں نہیں آتی جب کوئی نیا علم حاصل ہوتا ہے تو واللہ سلطنت ہفت اقلیم اس کے سامنے گرد معلوم ہوتی ہے جہتی تو کہتے ہیں

تا بدانی ہر کر ایزداں بخواند از ہمہ کار جہاں بے کار ماند
یقیناً جس کو حق تعالیٰ اپنا خواص بناتے ہیں تمام دنیا کے کاموں سے بے کار فرمادیتے ہیں مگر
نکما ہوا مگر تو مجذوب کیا غم بڑی کار آمد یہ بیکاریاں ہیں

(اسی ضمن میں فرمایا) ویسقون فیہا کاسا کان مزاجہا زنجبیل (۱)

اس کے متعلق میرے قلب پر یہ لطیفہ وارد ہوا کہ یہ محبت کی دو نسبتوں کا لون ہے کافور بارد الزمراج ہے اور زنجبیل کونست شوق سے مشابہت ہے کیونکہ شراب زنجبیل آمیز اس لون محبت کی صورت ہے کیونکہ زنجبیل حار الزمراج ہے اور شوق میں حرارت و التهاب ہوتا ہے لہذا یہ اس کے مناسب ہے جیسا کہ نسبت انس میں برود و خود سکون ہوتا ہے اور کافور اس کے مناسب ہے پس نقشبند یہ کو وہاں شراب کافور زیادہ ملے گی اور چشتیہ کو شراب زنجبیل زیادہ۔

اور دیکھئے جیسے یہاں نسبت سکون اور نسبت عشق کے آثار مختلف ہیں اسی طرح وہاں بھی دونوں کے ساتھ مختلف معاملہ ہوگا چونکہ نسبت سکون میں غلبہ صحو بھی ہوتا ہے اور اسکے اختیار اور ارادہ فنا نہیں ہوتا تو ان کے واسطے فرمایا گیا بشر بون من کاس کان مزاجہا کافورا کہ وہ خود جام شراب پیئیں گے جس کا مزاج کافور ہوگا اور نسبت عشق میں اختیار و ارادہ باقی نہیں رہتا تو ان کے متعلق ارشاد ہے ویسقون فیہا کاسا کان مزاجہا زنجبیل یہ وہاں بھی خود نہیں پیئیں گے بلکہ دوسرے ہی لاکران کو پلائیں گے کہ وہاں بھی مستی ہی میں رہیں گے کیونکہ بشر بون اور یسقون میں جو فرق ہے وہ اہل ذوق پر مخفی نہیں۔

میں پھر کہتا ہوں کہ میں نے اس کو تفسیر کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اعتبار کے طور پر اہل لطافت کے مناسب یہ لطیفہ بیان کیا ہے کہ کافور زنجبیل کو ان دونوں نسبتوں کے رنگ سے مناسبت ہے اور جیسے کافور زنجبیل جنت میں شراب کے ساتھ ملائے جائیں گے جس سے شراب کا اصل اور ان کا فرع ہونا ظاہر ہو رہا ہے اسی طرح یہاں بھی اصل مقصود محبت (الہی) دونوں میں مشترک ہے اور محروم کوئی بھی نہیں (المعرق والرحیق ص ۷۷۷) (۲۲۰)

يُنْسَاءُ النَّبِيَّ مَنْ يَأْتِ مِنْكَ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ يُضَعَفُ

لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۖ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ۝

ترجمہ: اے نبی کی بیویوں کو جو کوئی تم میں کھلی ہوئی بے ہودگی کرے گی اس کو دوہری سزا دی جائے گی اور یہ بات اللہ کو آسان ہے۔

تفسیری نکات

نبی کی بیویوں سے زنا کا صدور نہیں ہوتا

فاحشہ کی تفسیر جاننے سے پہلے سننے والے کا ذہن شاید اس طرف منتقل ہو کر فاحشہ ہے مراد خود باللہنا ہو یا در کھو انبیاء علیہم السلام کی بیویوں میں اس کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جناب باری تعالیٰ کا ارشاد ہے الطیبات للطیبین نبی خود پاک ہوتے ہیں ان کے لئے بیبیاں بھی پاک ہی تجویز کی جاتی ہیں۔ ہاں کسی کسی نبی کی بیویوں سے کفر ہوا ہے۔ مگر زنا کا صدور ان سے نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس سے منصب نبوت میں خلل ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ انبیاء جس قدر ہوئے ہیں صاحب جاہ ہوئے ہیں چنانچہ اسی وجہ سے سب معزز خاندان سے ہوئے ہیں اور حکمت اس میں یہ ہے کہ جو اثر خاندانی آدمی کا قوم پر ہوتا ہے وہ دوسرے کا نہیں ہو سکتا اور اس کے اتباع سے کسی کو عار نہیں ہوتا اور اگر کسی آدمی کی بیوی زانیہ ہو تو اس سے جاہ میں قدح ہوتا ہے اور اگر نماز نہ پڑھے یا کفر کرے تو اس کو عرفاً بے عزتی کا سبب قرار نہیں دیا جاتا اس لئے فاحشہ سے مراد زنا تو ہو نہیں سکتا بلکہ فاحشہ مبینہ سے مراد ایذا رسانی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس لئے کہ قصہ اسکے نزول کا یہ ہوا تھا کہ ازواج مطہرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خرچ مانگا تھا چنانچہ اول آیتوں میں اس کی تصریح بھی ہے ان کنتن تردن الحیوة الدنیا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوئی اور اگر فاحشہ سے مراد زنا ہوتا تو اس کے مقابلہ میں آگے عفت کا ذکر ہوتا ہے حالانکہ اس کے مقابلہ میں یہ ارشاد فرمایا ہے ومن یقنت منکن لله ورسوله اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کو بے حیائی اس لئے فرمایا کہ ایسے محسن کو تکلیف پہنچانا بے حیائی ہی ہے اس واسطے کہ جس کے حقوق کے بہت سے مقتضی موجود ہوں اس کے حقوق کو ضائع کرنا بے حیائی ہے پس جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کے بہت سے مقتضیات موجود تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا بے حیائی ہوئی اور یہاں سے یہ بھی واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے گناہ (نافرمانی) تو بطریق اولیٰ بے حیائی میں داخل ہوں گے پس ثابت ہو گیا کہ ہر گناہ بے حیائی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا اطلاق ان گناہوں پر زیادہ آتا ہے جس کو آدمی چھپاتا ہے۔

يُنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَحْضَعْنَ

بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقَلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۗ

ترجمہ: اے نبی کی بیویوں! تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔ تو تم (نامحرم مرد سے) بولنے میں (جبکہ بضرورت بولنا پڑے) نزاکت مت کرو (اس سے) ایسے شخص کو (طبعاً) خیال (فاسد) پیدا ہونے لگتا ہے جس کے قلب میں خرابی ہے اور قاعدہ (عفت) کے موافق بات کہو۔

تفسیری نکات

ازواج مطہرات کی فضیلت کا سبب

اور آیت یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقین پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ آیت عسیٰ رہ ان طلقن ان یدله ازواجاً خیراً منکن مسلمات مؤمنات قانتات۔ الآیة اس کے معارض ہے کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کی مثل بلکہ ان سے بہتر دوسری عورتیں ہو سکتی ہیں۔ جمہی تک یہ ارشاد فرمایا گیا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو تمہارے بدلہ میں تم سے بہتر عورتیں دے دیں گے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ ازواج مطہرات کی فضیلت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہنے ہی کی وجہ سے ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دے دیتے اور دوسری بیویوں سے نکاح کر لیتے تو آپ کے نکاح کی وجہ سے اب وہ ان سے افضل ہو جاتیں۔

عورت کی تہذیب

دیکھئے اس آیت کے مخاطب وہ عورتیں ہیں جو مسلمانوں کی مائیں تھیں یعنی ازواج مطہرات ان کی طرف کسی کی بری نیت جانی نہیں سکتی تھی مگر ان کے لئے بھی یہ سخت انتظام کیا گیا تو دوسری عورتیں تو کس شمار میں ہیں۔ چنانچہ اس کے شرع میں ہی یہ لفظ موجود ہے لستن کاحد من النساء یعنی تم اور عورتوں جیسی نہیں ہو بلکہ اوروں سے افضل ہو۔ پھر بھی فرماتے ہیں کہ مردوں کے ساتھ نرم لہجے سے بات مت کرو۔ جب بات کرنا ہو تو خشک لہجے سے کرو جس سے مخاطب یہ سمجھے کہ بڑی کھری اور ٹری اور مخ مزاج ہے تاکہ لاجول ہی پڑھ کر چلا جائے نہ یہ کہ نرمی سے گفتگو کرو کہ میں آپ کی محبت کا شکر یہ ادا کرتی ہوں مجھے جناب کے الطاف کریمانہ کا خاص احساس ہے۔ جیسا کہ آج کل کے رسالوں میں عورتوں کے مضامین نکلتے ہیں۔ یہ مضامین زہر قاتل ہیں آفت ہیں طرح طرح کے

مفاسد اس پر مرتب ہوتے ہیں بعض لوگ اس پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ صاحب بتلائے کہ کیا فساد ہو رہا ہے ہم کو تو نظر نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ اول تو فساد موجود ہے اور اگر تم کو نظر نہیں آتا تو ممکن ہے کہ بہت قریب آگے چل کر یہ لہجہ کچھ رنگ لاوے گا اس وقت سب کو معلوم ہوگا اور مجھ کو اس وقت معلوم ہو رہا ہے جیسے کہا گیا ہے

من اذآں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را

اہل نظر شروع ہی میں کھٹک جاتے ہیں کہ یہ چیز کس وقت میں رنگ لائے گی اور اس کی دلیل بھی خود اس آیت ہی میں موجود ہے کہ فلاک خضعن بالقول کے بعد ہی بطور نتیجہ فرماتے ہیں فیطمع الذی فی قلبہ مرض کہ اگر خضوع فی القول یعنی نرم لہجہ سے بات کی گئی تو جس کے دل میں روگ ہے اس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا اور وہ لہجہ کی نرمی سے سمجھ لے گا کہ یہاں قابو چل سکتا ہے پھر وہ اس کی تدبیریں اختیار کرے گا دیکھئے خود حق تعالیٰ لہجہ کی نرمی کا یہ اثر بتا رہے ہیں پھر کسی کی کیا مجال ہے کہ اس اثر کا انکار کرے میں اپنی طرف سے تو نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ الفاظ قرآنی صاف بتاتے ہیں عورتوں کا مردوں سے نرم گفتگو کرنا یہ اثر رکھتا ہے کہ ان کے دلوں میں طمع پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس پر بھی بس نہیں کیا بلکہ اس کے بعد یہ حکم بھی ہے وقلن لولا معروفاً جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب بات کرو بھی تو ایسی بات کرو جس کو شریعت میں اچھا مانا گیا ہو۔ ایک تو یہ کہ بے ضرورت الفاظ مت بڑھاؤ کیونکہ شریعت اس کو کسی کے لئے پسند نہیں کرتی۔ شریعت نے کم بولنے ہی کو پسند کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر بات کو سوچ کر کہو کوئی بات گناہ کی منہ سے نہ نکل جاوے مختصر ترجمہ معروف کا معقول ہے تو یہ معنی ہوئے کہ معقول بات کہو معقول بات وہی ہوتی ہے جس سے کوئی برائی نتیجہ پیدا نہ ہو جب ثابت ہو چکا کہ لہجہ کی نرمی سے بھی عورتوں کے لئے برائی نتیجہ پیدا ہوتا ہے تو محبت پیار کی باتوں سے کیوں برائی نتیجہ پیدا نہ ہوگا جس کو آج کل تہذیب میں داخل سمجھا گیا ہے تو اس قسم کی باتیں عورتوں کے لئے معقول نہیں بلکہ نامعقول ہیں اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک بات اس کے لئے معقول ہو اور دوسرے کے لئے نامعقول ایک کے لئے سختی سے بات کرنا اور بے رخی سے جواب دینا معقول ہو سکتا ہے اور دوسرے کے لئے نامعقول تمہارے لئے یعنی مردوں کے واسطے باہمی کلام کا معقول طریقہ یہ ہے کہ نرمی سے بات کرو کسی کو سخت جواب نہ دو روکھا پن نہ برتو۔ اور عورتوں کے لئے معقول طریقہ یہ ہے کہ اجنبی کے ساتھ نرمی سے بات نہ کریں اور سختی سے جواب دیں اور روکھا برتاؤ کریں۔

اور قوت وہ ہے جس سے بقدر کفایت گزر ہو جاوے کچھ فاضل نہ ہو اور اس میں شک نہیں۔

ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں

ازواج مطہرات بھی آل محمد میں داخل ہیں۔ اس لئے یہ دعا ان کو بھی شامل تھی اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہیں بلکہ اصل متفصلاً لغت یہ ہے کہ ازواج تو آل محمد میں اصلتہ داخل ہوں اور ذریت طبعاً داخل ہو کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو یعنی گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے۔ پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہوں اور ازواج داخل نہ ہوں۔

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علی و فاطمہ حضرات حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اپنی عبا میں داخل فرما کر فرمایا۔

اللهم هؤلاء اهل بيتي كما ان الله يبرئ اهل بيتي مني۔

اس سے بعض عقل مندوں نے یہ سمجھا کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں حالانکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں۔ ان کو بھی اے اللہ لیںہب عنکم الرجس اہل بیت و بطہرکم تطہیرا کی فضیلت میں داخل کر لیا جائے۔ یہاں حصر مقصود نہیں بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور نے ان حضرات کو عبا میں داخل فرما کر یہ دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو عبا میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں تم پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو دوسرے حضرت علیؑ حضرت ام سلمہؓ سے اجنبی تھے۔ ان کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کو عبا میں کیونکر داخل کیا جاسکتا تھا۔ یہ تو اشکالات کا جواب تھا۔

اصل دعا کے لئے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد میں ازواج اولاد داخل ہیں۔

دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جب کہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہ کو اس بشارت پر تعجب ہوا ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے۔

قالوا العجيب من امر الله وبركاته عليكم اهل البيت انه حميد مجيد. (نساء فی القرآن)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ

وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقَاتِ وَالصّٰبِرِيْنَ

وَالصّٰبِرَاتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ

وَالصّٰبِغِيْنَ وَالصّٰبِغَاتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظَاتِ وَالذّٰكِرِيْنَ

اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذّٰكِرَاتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

ترجمہ: اسلام والے مرد اور اسلام والی عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے

مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور تھانے والے مرد اپنی شہوت کی جگہ اور تھانے والی عورتیں اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت اور یاد کرنے والی عورتیں تیار کی ہے خداوند تعالیٰ نے ان سب مردوں و عورتوں کے لئے مغفرت اور اجر بڑا۔

اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے

اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے مگر ہر عمل کے دو درجے ہوتے ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ اسی طرح اسلام زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے اور اس کا دل سے ماننا یہ ایمان ہے تو اسلام اقرار ہو اور ایمان تصدیق قلبی یہ تو سب سے مقدم شرط ہے کہ اقرار تو حید و رسالت زبان سے کرے اور دل میں اسکی تصدیق ہو کیونکہ یہ اصول میں سے ہے البتہ اعمال میں آج کل کوتاہیاں کی جارہی ہیں اس کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے ایک بڑی فہرست ہم کو بتلا دی ہے اس کو کہاں حذف کر دیا گیا۔

عورتوں کو بھی فرماتے ہیں ولقائتات (اور تو واضح کرنے والی عورتیں) عورتوں کو تو واضح حاصل کرنے میں زیادہ کوشش کرنی چاہئے کیونکہ کمزور کا تکبر اور بھی زیادہ برا ہے۔

آگے فرماتے ہیں والصلحین والصلفات اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں۔ یہ بھی آج کل بہت بڑا مرض لوگوں میں ہو گیا ہے کہ بات بات میں جھوٹ بولتے ہیں اور اگر کبھی سچ بھی کہیں گے تو کسی قدر نمک مرچ لگا کر خصوصاً اگر کوئی عجیب مضمون ہو تو اس پر تو جب تک حاشیہ نہ لگا دیں اس وقت تک چین نہیں آتا۔ مگر یہ بہت بڑا مرض ہے اس سے دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے انسان کے یہاں کذابین میں شمار ہو جاتا ہے۔

اس آیت میں اسی کا حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ دین کے لئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ فرماتے ہیں

ان المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات والقانتین والقانت

یعنی اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں۔

معلوم ہوا ہے اسلام و ایمان کے بعد صفت قنوت بھی ضروری ہے جس کے معنی ہیں اطاعت یا عا جزی کے اگر پہلے معنی ہیں تو مراد یہ ہے کہ تمام احکام میں اطاعت کرتے ہیں اور اگر اس کے معنی عجز کے ہیں تو یہ قلب کی اطاعت کا بیان ہوگا جس میں ایک بڑی بھاری گناہ کا علاج ہے جو تمام کبائر کی جڑ ہے یعنی تکبر تمام مفاسد دینی اور تمدنی کی جڑ یہی کبر ہے غصہ اور غیبت اور حسد غرض تمام برے اخلاق اسی سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً کسی چمار کو

بادشاہ سے حسد کرتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا ہوگا کیونکہ وہ غریب اپنے کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس قابل ہی نہیں سمجھتا کہ بادشاہی کی آرزو کرے۔ جو اپنے آپ کو بادشاہی کے لائق اور قابل سمجھتے ہیں وہی بادشاہوں سے حسد کر سکتے ہیں۔ اسی کا نام تکبر ہے کہ اپنی طرف کسی کمال کو منسوب سمجھے۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان تمام مفاسد دینی اور تمدنی کی اصلاح کے لئے تواضع اور عاجزی کی تعلیم دی ہے اور تواضع صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ زبان سے اپنے آپ کو برا بھلا کہہ لے بلکہ تواضع تو یہ ہے کہ دل میں اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے۔

والخشعین والخشعت (اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں) خشوع کہتے ہیں سکون کہ۔ یہ شامل ہے قلب کو اور جوارح دونوں کو اس کو جمعیت قلب و جوارح کہتے ہیں۔ مثلاً نماز میں خشوع ضروری ہے یعنی دل ساکن ہو کہ خیالات ادھر ادھر پریشان نہ ہو اور اعضاء بھی ساکن اور پست ہوں اور دوسرے اوقات میں خشوع اس طرح ہوتا ہے کہ تواضع کے ساتھ سکون اور وقار ملا ہو چھپچھورا پن نہ ہو۔ بعض لوگ تواضع کے چھپچھورے ہو جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ اس کو منع فرماتے ہیں کہ تواضع کے ساتھ سکون اور وقار بھی چاہئے۔

والصبرین والصبرات اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔ اس میں صبر کی تعلیم ہے صبر اس کو نہیں کہتے کہ کوئی مر جاوے تو روئے نہیں۔ رونا تو جائز ہے۔ جسہ کہتے ہیں نفس کو اس کی ناگواری پر مستقل رکھنے کو مثلاً کسی نے بری بات کہی تو ہم اس کا انتقام نہ لیں۔ سخت دست نہ کہیں۔ تو یہ صبر ہے عادات میں اور تکوینیات میں صبر اس کا نام ہے کہ اگر کوئی مر جائے یا مال چوری ہو جائے یا بیماری پیدا ہو جائے تو جزع و فزع نہ کریں اور عبادات میں صبر یہ ہے کہ عبادت میں حظ اور مزہ نہ آئے مگر عبادت کرتے رہیں اس وقت لوگ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں کہ مزہ کے طالب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نہیں۔ اگر عاشق ہوتے تو ان کو لذت عشق ہی کافی ہوتی۔ کسی مزہ کے طالب نہ ہوتے۔ بعض دفعہ لذت عشق ایسی بڑھ جاتی ہے کہ عاشق کو محبوب کے وصال کی بھی پروا نہیں رہتی۔

والمتصدقین والمتصدقات اور صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں صدقہ کا حکم اس لئے فرمایا بعض لوگوں کی نسبت و محبت زبانی ہوتی ہے۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست و زر طلبی سخن درین ست

(یعنی اگر جان مانگو تو مضائقہ نہیں ہے اور اگر مال مانگو تو اس میں کلام ہے)

زبان سے بہت دعوے کرتے ہیں مگر محبوب کے نام پر خرچ کرتے ہوئے جان نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا سے محبت ہی نہیں ہے۔ اگر محبوب مجازی گھر مانگتا ہے تو دے دیتے ہیں اور کچھ بھی گھریا ہر کی پروا نہیں ہوتی۔ یہ کیسی خدا کی محبت ہے کہ خدا کے نام پر خرچ کرنے میں باوجود وسعت کے سوچتا اور تامل کرتا ہے۔ اس لئے فرماتے ہیں خیر خیرات بھی کرتے رہا کرو تا کہ دنیا کی محبت دل سے کم ہو۔ آج کل ہماری تو یہ کیفیت ہے کہ اگر خرچ کرتے ہیں تو ناموری کی جگہ پر نیک مصرف میں شاید ہی کسی کا پیسہ خرچ ہوتا ہوگا اور جو

نیک مصرف میں خرچ بھی کرتے ہیں تو بہت سے مصارف میں سے ایسا مصرف اختیار کریں گے جس میں فخر و مباہات ہو۔ یہ آج کل کے دینداروں کی کیفیت ہے۔ اخلاص تو آج کل بالکل ہی نہیں رہا الا ماشاء اللہ۔

ایک مخلص کی حکایت

میں نے ایک مخلص کی حکایت سنی ہے کہ وہ ایک عالم کے وعظ میں آئے اور ایک ہزار روپیہ کا توڑا ان کی خدمت میں پیش کیا۔ لوگوں نے ہر طرف سے تعریف کرنی شروع کی۔ اس نے جو دیکھا کہ ہر طرف سے تعریف ہونے لگی اور دل میں اخلاص نہیں رہا تو تھوڑی دیر میں پھر آیا اور کہا کہ مولانا وہ روپے میری والدہ کے تھے واپس کر دیجئے۔ اب تو لوگوں نے اسے بہت ہی برا بھلا کہا کہ علماء سے تمسخر کرتا ہے۔ مولوی صاحب نے روپے واپس کر دیئے۔ جب وعظ کی مجلس ختم ہو چکی اور مولوی صاحب اپنے گھر پہنچے تو وہ شخص ان کے مکان پر پہنچا اور عرض کیا کہ مولانا میں نے آپ کو بہت ستایا ہے اور بہت تکلیف دی۔ وہ ہزار روپے میرے ہی تھے اس وقت پیش خدمت کرتا ہوں۔

اس وقت چونکہ لوگوں کی تعریف کی وجہ سے اخلاص میں کمی ہوتی تھی اس لئے میں نے واپس کر لئے جس پر لوگوں نے مجھے خوب برا بھلا کہہ لیا اور نفس کی اصلاح ہو گئی اب تنہائی میں یہ روپیہ لے کر حاضر ہوا ہوں ان کو قبول کیجئے۔ خلوص اس کا نام ہے تو صاحبو! صدقات میں اخلاص ضروری ہے۔

آگے فرماتے ہیں والصائمین والصائمات الایۃ اور روزہ رکھنے والے مرد اور عورتیں۔ یعنی اسلام کے لئے ایک اور بھی جزو ہے روزہ رکھنا۔ عورتوں کے اندر یہ تو کمال ہے کہ وہ روزہ بہت شوق سے رکھتی ہیں اور کچھ بہت کمال بھی نہیں کیونکہ ان میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے اس لئے بھوک پیاس کم لگتی ہے اس بارہ میں مرد زیادہ بیٹی ہیں بہت لوگ روزہ نہیں رکھتے اور بعض تو ایسے بے حیا ہوتے ہیں کہ کھلم کھلا سب کے سامنے حقہ اور پان کھاتے پھرتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ جب خدا کی چوری نہیں تو مخلوق کی کیا چوری۔ میں کہتا ہوں کہ پھر بیوی کے ساتھ بھی سب کے سامنے ملا کر وہ جب خدا کی چوری نہیں تو مخلوق کی کیا چوری۔ اب لوگوں کی شرم جاتی رہی خدا کا خوف نہیں رہا۔ روزہ کا توڑنا تو گناہ تھا سب کے سامنے توڑنا بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ اس سے کھلم کھلا خدا کی مخالفت ہوتی ہے۔ دوسروں کی جرات بڑھتی ہے تو پہلے مرض لازمی تھا اب مرض متعدی ہو گیا۔

آگے ارشاد ہے والحفظین فروجہم والحفظت اور اپنے شرم گاہوں کو حرام سے بچانے والے مرد اور عورتیں شرم گاہوں کا حرام سے بچانا تو عقلاً بھی ہر شخص ضروری سمجھتا ہے اور شریعت نے بھی اس کو فرض کیا ہے اور زنا کو سب برا جانتے ہیں اور شریعت نے بھی اس کو حرام کیا ہے مگر لوگوں نے زنا اسی کو سمجھ رکھا ہے جو مباشرت کے ساتھ ہو حالانکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ سے بھی زنا ہوتا ہے ہاتھ سے بھی زنا ہوتا ہے قلب سے بھی ہوتا ہے کان اور پیر سے بھی ہوتا ہے۔ آنکھ کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کو بری نیت سے دیکھنے ہاتھ کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کو ہاتھ لگائے۔ کان کا زنا یہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کی باتیں سنے۔ اس کی طرف چل کر جانا پیر کا زنا ہے۔ دل میں کسی اجنبی عورت کی محبت اور تصور سے مزہ لینا یہ دل کا گناہ ہے۔

مسلمان شخص کو ان تمام گناہوں سے بچنا چاہئے کیونکہ یہ بھی اسی زنا کے مثل ہیں اور اس کی حفاظت پوری طرح بردہ سے ہوتی ہے مگر سخت افسوس ہے کہ آج کل کا نوجوان اس کو بھی اٹھا دینا چاہتا ہے مگر یہ ان کی بڑی بھاری غلطی ہے اگر خدا نخواستہ ایسا ہو گیا تو بڑی سخت دشواری پیش آئے گی۔

ذکر اللہ کی اہمیت

ان سب کے بعد ارشاد فرماتے ہیں وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ لَعْنَىٰ اٰوْرُوہ لوگ جو خدا تعالیٰ کو بہت یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو خدا کو بہت یاد کرتی ہیں گویا اب تک جتنی باتوں کا بیان تھا وہ سب بمنزلہ درختوں کے ہیں اور یہ ان کے لئے پانی ہے کہ یہ سب درخت ایمان و اسلام و قنوت و خشوع و صدقہ و عفت کب بار آور ہو سکتے ہیں جبکہ ان کو خدا تعالیٰ کی یاد کا پانی پلایا جائے اور یہ تجربہ ہے کہ آدمی کتنا ہی بڑا نیک کیوں نہ ہو مگر اس میں پختگی اسی وقت آتی ہے جب ذکر اللہ بھی کرتا ہو اور اس کے بغیر ایسی مثال ہے جیسے بے جڑ کا پھول کہ اس وقت تر و تازہ ہے مگر تھوڑی ہی دیر میں کھلا جائے گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں اَعْدَا اللّٰه لِهَمْ مَغْفِرَةٌ وَاَجْرًا عَظِيْمًا کہ ان لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ نے مغفرت و اجر عظیم تیار کر رکھا ہے حاصل یہ ہے کہ اپنے دین کو جو درست کرنا چاہے وہ ان باتوں کو حاصل کر لے اس کے بعد مستحق اجر و مغفرت ہوگا (شعب الایمان)

امور معاشیہ میں بھی احکام کی پابندی ضروری ہے

فرمایا کہ احکام نبوت صرف متعلق بہ معاد ہی نہیں ہیں بلکہ ہم کو امور معاشیہ میں بھی ان کا پابند کیا گیا ہے دلیل اس کی ماسکان لمومن ولا مؤمنة الخ اور اس کا سبب نزول ہے۔ رہی حدیث تاہیر سووہ مشورہ تھا نہ کہ حکم اور حدیث بریرہ سے اس تفصیل کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد متعلق نکاح مغیث کے بارے میں عرض کیا کہ آپ سفارش فرماتے ہیں یا حکم۔ آپ نے فرمایا سفارش۔ بریرہ نے کہا مجھ کو قبول نہیں۔ اس سے یہ تفصیل صاف معلوم ہوگئی۔

فروج کا معنی

علیٰ ہذا قرآن میں ہے وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ اور احصنت فرجہا بعض جہلا اس لفظ کو غیر مہذب سمجھتے ہیں یہ بھی حماقت ہے کیونکہ عربی میں لفظ فرج شرم گاہ عورت کے لئے موضوع نہیں بلکہ اس کے اصل معنی شکاف کے ہیں کنڈیہ کبھی شرم گاہ کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے لیکن اصل معنی کے اعتبار سے اس کا استعمال چاک گریباں پر بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ احصنت فرجہا کا ترجمہ یہ ہے کہ مریم علیہا السلام اپنے گریبان کو دست اندازی غیر سے بچانے والی ہیں جس کا مرادف یہ ہے کہ پاک دامن تھیں یہ کتنا نفیس عنوان ہے اس میں بتلائیے

کون سا لفظ غیر مہذب ہے اور لفظ مخالفہ من روحنا کا مطلب یہ ہے ہم نے ان کے گریبان میں دم کر دیا ہے جس سے وہ حاملہ ہو گئیں بتلائے اس میں کیا اشکال ہے کچھ بھی نہیں۔

والحفظین فروجہم کا سلیس ترجمہ

فرمایا ایک دفعہ میں نے مستورات میں وعظہ کہا اور اس آیت والحفظین فروجہم والحفظت پر پہنچا تو بڑا پریشان ہوا کہ اس کا ترجمہ کیا کروں معاً اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا کہ اپنی آبرو کی حفاظت کرنے والے اور اپنی آبرو کی حفاظت کرنے والیاں یا ناموس کہہ دیا جائے۔ (حسن العزیز ج ۱ ص ۴۳۴)

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ

عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ

وَتُخَشِي النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ

ترجمہ: اور جب آپ اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا کہ اپنی بی بی (زینب کو) اپنی زوجیت میں رہنے دے اور خدا سے ڈرا اور آپ اپنے دل میں وہ (بات بھی) چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر میں) ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں (کے طعن) سے اندیشہ کرتے تھے۔

تفسیری نکات

حضرت زینبؓ سے نکاح کے شبہ کا ازالہ

اب یہاں پر بعض لوگوں کو ایک شبہ ہوا ہے وہ شبہ یہ ہے کہ کلام اللہ میں حضرت زینب سے حضور کے نکاح کے واقعہ کے بیان میں ہمارے حضور کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وَتُخَشِي النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ اور انبیاء کے متعلق ارشاد ہے کہ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ اس سے بظاہر اشکال لازم آتا ہے کہ دوسرے انبیاء ہمارے حضور سے اکمل تھے تو جواب اس کا یہ ہے کہ استدلال صحیح نہیں اس لئے کہ دوسرے انبیاء کا حضور سے اکمل ہونا جب لازم آتا کہ جس خشیت کی نفی دوسرے انبیاء سے کی گئی ہے اس خشیت کا اثبات حضور کے لئے کیا جاتا حالانکہ ایسا نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ نکاح کے متعلق وحی کے نزول سے قبل چونکہ حضور کو اس نکاح کے داخل تبلیغ ہونے کی طرف التفات نہ ہوا تھا بلکہ اس میں محض ایک دنیوی مصلحت حضرت زینب کی دلجوئی اور اشک شوقی کی سمجھی تھی اس لئے لوگوں کی ملامت کے اندیشہ سے اس فعل کو

اختیار نہ فرمایا تھا اور امور دنیویہ میں ایسا اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں بعض حیثیتوں سے مطلوب ہے جبکہ اعتراض سے دوسروں کی دین کی خرابی کا احتمال ہو اور ان کو اس سے بچانا مقصود ہو اس کے بعد جب آپ پر اس کے متعلق وحی آئی اور آپ کو اس نکاح کے اندر ایک مصلحت دیدیہ بتلائی گئی جس کا ذکر آگے چل کر لکھیلا یکنون علی المؤمنین حرج الایۃ میں فرمایا گیا ہے تو اس وقت آپ کو معلوم ہوا کہ یہ فعل تبلیغ میں داخل ہے لہذا آپ نے پھر کسی کی ملامت کی پروا نہیں فرمائی اور حضرت زینب سے نکاح فرمایا تو جس خشیت کا اثبات حضور کے لئے فرمایا گیا ہے وہ خشیت تبلیغ میں نہ تھی بلکہ اول میں اس نکاح کو محض ایک دنیوی امر سمجھ کر اس میں یہ خشیت تھی اور جس خشیت کی نفی دوسرے انبیاء سے کی گئی ہے وہ خشیت فی التبلیغ ہے اور قرینہ اس کا کہ مراد ولا یخشون احدا الا اللہ میں خشیت فی التبلیغ ہے یہ ہے کہ یخشونہ سے اوپر فرماتے ہیں اللدین یبلغون رسلت اللہ الایۃ پس نہ حضور کے لئے خشیت فی التبلیغ کا اثبات فرمایا گیا ہے کہ جس سے حضور کے کمال کے اندر نعوذ باللہ کچھ نقص کا شبہ ہو سکے اور نہ دوسرے انبیاء کے لئے ایسے امور مباحہ میں خشیت کی نفی کی گئی جس سے ان کا حضور سے اکمل ہونا لازم آتا پس یہ اشکال دفع ہو گیا اب اس مقام کے متعلق ایک اور شبہ باقی رہ گیا وہ یہ کہ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ حضرت زینب سے حضور کے نکاح کی وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو ایک بار آٹا گوندھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس وقت سے حضور کو ان سے محبت ہو گئی تھی اور بعض اقوال شاذہ غیر مستندہ الی الدلیل صحیح کی بناء پر آیت و تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ کی تفسیر محبت سے کی ہے مگر محققین کے نزدیک یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور حجاب نازل ہونے سے قبل حضور شب و روز ان کو دیکھتے تھے پھر یہ احتمال کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر یہ دلیل نفی کی کسی وہی کے نزدیک کافی نہ ہو تو اس کے لئے نفی دلیل کافی ہوگی یعنی اس دعویٰ محبت کی کوئی دلیل نہیں اور دعویٰ بلا دلیل محض لاشے ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حضرت زینب کے نکاح کی طرف توجہ ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ حضرت زینب کا نکاح حضرت زید سے حضور کی وساطت سے ہوا تھا پھر اس میں طلاق کا واقعہ پیش آیا اس لئے حضور کو اس کا صدمہ بھی زیادہ تھا کہ میری وساطت سے ان کو یہ تکلیف پہنچی اور حضور حضرت زینب کی کسی طرح دلجوئی کرنا چاہتے تھے اور دلجوئی کا طریقہ اس سے احسن نہیں تھا کہ حضور ان سے خود نکاح کر لیں اس لئے حضور نے ان سے نکاح کرنا چاہا لوگوں کی ملامت کی وجہ سے مناسب نہ سمجھا تھا مگر پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکاح ہوا۔ پس تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ میں یہی نکاح مراد ہے نہ کہ محبت اور اس کا ایک کھلا قرینہ یہ ہے کہ ایک مخفی چیز کو اس عنوان سے ارشاد فرمایا ما اللہ مبدیہ اس سے معلوم ہوا کہ اخفاء اس چیز کا ہوا کہ جس چیز کا اللہ تعالیٰ ابداء فرمایا ہے اور ابداء نکاح کا ہوا ہے تو لاشے جو زوجہ نکاح میں ہے اور فعلاً بھی اور وہ وقوع نکاح ہے پس معلوم ہوا کہ جس چیز کا اخفاء ہوا تھا وہ نکاح تھا کہ محبت تو تخفی فی نفسک میں مراد نکاح ہے نہ کہ محبت۔

و فی قصہ زینب ہذا اشکال قد یختلج فی بعض الاذہان ارید ازاحتہ بما افاض اللہ علینا من برکات الشیخ ادام اللہ مجده، تقریر الاشکال ان اللہ تعالیٰ قال فی حقہ علیہ الصلوٰۃ والسلام و تخفی فی نفسک ما اللہ مبلیہ و تخشی الناس واللہ احق ان تخشاه البتہ فی خشیۃ الناس فی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ثم قال فی حق غیرہ من الانبیاء والرسل الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ اظہر فیہ ان رسل اللہ کانوا لا یخشون احداً غیر اللہ و ہذا یقتضی بظاہرہ فضیلۃ سائر الانبیاء علیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ہذا الوصف بعینہ و اجاب عنہ الشیخ بمالضہ ان معنی الآیۃ انک یا محمد اما تخشی الناس فی ہذا الامر لعدم علمک بان ہذا النکاح من قبیل تبلیغ الرسالۃ عملاً ولو علمت ذلک لم تخش احداً بان اللہ احق ان تخشاه فی ترک التبلیغ ولو علمت کونہ من التبلیغ لفعلت کما کان الرسل تفعلہ من انہم کانوا یبلغون رسالات اللہ یخشونہ ولا یخشونہ احداً الا اللہ فان دفع الاشکال راساً و اساساً کان صلی اللہ علیہ وسلم کسائر الانبیاء بعد علمہ بکون ہذا النکاح من تبلیغ رسالات اللہ عملاً لبا درالی النکاح ولم یخش احداً الا اللہ و انما خشی عن الناس و طعنہم فی الدین ما لم یعلم کونہ من تبلیغ الرسالات و اما بعد ذلک فلا فلم یشب من الآیۃ خشیۃ صلی اللہ علیہ وسلم عن الناس فی تبلیغ الاحکام حتی یلزم فضیلۃ سائر الانبیاء علیہ بل غایۃ ما ثبت ان کان یخشی الناس قبل علمہ بکون ذلک من جملۃ التبلیغ و بعد علمہ بہ کان کسائر الرسل ۱۲ جامع (تقلیل الاختلاء)

وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ

ترجمہ: اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

تفسیری نکات

عوام کی رعایت کو سمجھنا بڑے حکیم کا کام ہے

فرمایا عوام کی رعایت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی چنانچہ حکیم کو کعبہ کے اندر داخل نہ فرمانے کی حدیث میں ارشاد ہے لولا قومک حدیث عہد ہانی ہلیۃ تو دیکھئے کہ آپ نے لوگوں کو تشویش میں پڑنے سے بچایا مگر جہاں اس پر عمل کرنے کی ضرورت یا مصلحت قوی ہوتی ہے وہاں عوام کی رعایت نہیں کی جاتی جیسے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح میں۔

حضور کے لوگوں کو تشویش سے بچانے سے پرہیز فرمایا تھا۔ حق تعالیٰ نے اس کی رعایت نہ فرمائی تو یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ کس جگہ عوام کی رعایت کرنا چاہیے اور کس جگہ نہ کرنا چاہیے۔ یہ سمجھنا بڑے حکیم کا کام ہے۔ میری رائے میں تو جہاں رعایت کرنے میں دین کا کچھ نقصان ہو وہاں عوام کی رعایت نہ ہونا چاہیے اور جہاں رعایت کرنے میں دین کا نقصان نہ ہو اور رعایت نہ کرنے میں تشویش ہو جائے وہاں عوام کی رعایت کرے۔ تو حطیم کے واقعہ میں کوئی دین کا نقصان نہ تھا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں تبلیغ میں کوتاہی ہوتی تھی کیونکہ وہ تبلیغ عملی تھی اور ضروری تھی البتہ اس کا تبلیغ ہونا قدرے خفی تھا۔ اس لئے اولاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن مبارک اس طرف نہیں گیا اس لئے آپ نے عوام کی رعایت کا خیال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے اس کا تبلیغ ہونا معلوم ہو گیا۔ پھر آپ نے عوام کی پرواہ بھی نہیں کی اور یہاں سے حضرت زینب کے عقد کے متعلق جو ایک شخص نے اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب بھی ٹھیک سمجھ میں آ گیا۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ اس قصہ کی آیت میں ارشاد ہے تَخَشُّوا النَّاسَ الْيَوْمَ لَا يُخْشَىٰ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ اور دوسرے انبیاء نہیں ڈرتے تھے تو جواب یہ ہے کہ آیت کا مدلول یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ میں نہ ڈرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی تبلیغ میں نہیں ڈرے اور اس میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ڈرے تو اس وقت آپ کے ذہن مبارک میں صرف نکاح کا معاملہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تبلیغ کا فرد نہیں سمجھا تھا مگر حق تعالیٰ کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ یہ بھی تبلیغ کا ایک فرد ہے پھر ڈرانا ثابت نہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۳ ص ۱۹۸-۱۹۹)

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

تفسیری نکات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے روحانی والد ہیں

بلکہ اس سے تو ابوة کی نفی مستہبط ہوتی ہے لیکن بعد تقریر مقصود کے ان شاء اللہ تعالیٰ واضح ہو جائے گا کہ اس سے نہایت صاف طور سے ابوة حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھی جاتی ہے جس میں کلام ہو رہا ہے۔ اول ایک مقدمہ عرض کرنا ہوں وہ یہ کہ نحو کا قاعدہ ہے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد ہوتا ہے اور لکن کا مابعد ایک شبہ کا

جواب ہوتا ہے جو لکن کے قبل سے پیدا ہوا ہے جیسے کہتے ہیں کہ زید آ گیا لیکن اس کا بھائی نہیں آیا۔ اب اس آیت میں غور فرمائیے کہ لکن کے ما قبل اور ما بعد میں تضاد بظاہر سمجھ میں نہیں آتا اس لئے کہ باپ نہ ہونے اور رسول ہونے میں کیا تضاد ہے حالانکہ تضاد ہونا چاہئے تو غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ جب فرمایا

ماکان محمد ابا احد من رجالکم تو اس سے شبہ ہوا کہ جب حق تعالیٰ نے ابوة کی نفی فرمادی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے کسی قسم کے باپ نہیں ہوں گے اس لئے آگے لکن سے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہاں ایک قسم کے باپ ہیں وہ یہ کہ رسول اللہ ہیں یعنی روحانی باپ ہیں کہ تمہاری روحانی تربیت فرماتے ہیں پس اگر رسول کی دلالت معنی ابوة پر معتبر نہ کی جائے تو کلام میں ربط نہ ہوگا۔

ازواج مطہرات مؤمنین کی مائیں ہیں

اس لئے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں ہے وازواجہ امہاتہم یعنی نبی کی ازواج مطہرات مؤمنین کی مائیں ہیں تو آپ ظاہر ہے کہ باپ ہوئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سچا جانشین وہی ہوتا ہے جو باپ کے قدم بقدم ہو ورنہ اس کو فرزند ہی نہیں کہتے پس سچے جانشین اولیاء اور علماء امت ہوئے۔

یہاں پر ایک سوال ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف میں تو حضور کے ابوة کی نفی فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے

ماکان محمد ابا احد من رجالکم جواب یہ ہے کہ اسی آیت سے ابوة حضور کی معلوم ہوتی ہے اور وہ بہت لطیف بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ آگے ارشاد ہے ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین۔ اور اہل علم کو معلوم ہے کہ لکن استدراک یعنی تو ہم ناشی من الکلام السابق کے دفع کرنے کے لئے ہوتا ہے اور یہاں بظاہر کوئی شبہ معلوم نہیں ہوتا جس کا لکن سے دفعیہ مقصود ہو۔ بجز اس کے کہ تقریر آیت کی یہ ہو کہ جب ارشاد ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں تو شبہ ہوا کہ کیا نستعی باپ نہیں تو اور کسی قسم کے بھی باپ نہیں جو علی الاطلاق ابوة کی نفی کی گئی۔ تو اس شبہ کا دفع ہے کہ ہاں! لیکن روحانی باپ ہیں یعنی رسول ہیں اس لئے کہ روحانی تربیت کرتے ہیں قال

آں خلیفہ زادگان مقبلش زادہ انداز عنصر جان و دلش

یعنی آپ کے شاہزادے بلند اقبال آپ کے عنصر خاکی سے نہیں ہیں یعنی نسبی اولاد مراد نہیں ہے بلکہ آپ کے روح و دل کے مبارک عنصر سے ہیں یعنی روحانی اولاد ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ۖ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً

وَأَصِيلًا ۝

ترجمہ: اے ایمان والو تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام (یعنی علی الدوام) اس کی تسبیح و تقدیس کرتے رہو۔

تفسیری نکات

کثرت ذکر اللہ کا حکم

یایہا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر اتنے معنوں کو حاوی ہے کہ ہمارا کوئی مرض چھوٹا یا بڑا، خفی یا جلی ان سے باہر نہیں فرداً فرداً ہر ایک کا کافی علاج نکلتا ہے۔ اب سمجھ لیجئے کہ وہ علاج کیا ہے جو اس آیت میں ارشاد ہوا وہ ذکر اللہ ہے ذکر کے معنی لغت میں ہیں یادداشتیں اس کا مقابل ہے نسیان یعنی بھول جانا۔ یاد رکھنا دو طرح پر ہوتا ہے ایک صوری اور ایک حقیقی۔ صوری زبان سے یاد کرنے اور نام لینے کو کہتے ہیں سبق یاد کر لو یعنی بار بار زبان سے پڑھو اور حقیقی کہتے ہیں اداء حقوق کو ہمارے عرف میں بھی بولا جاتا ہے (تم نے ہمیں بھلا دیا) مراد یہ ہوتی ہے کہ تم ہم سے میل نہیں رکھتے اور ہمارے ساتھ سلوک نہیں کرتے چاہے مخاطب زبان سے یاد کر بھی لیتا ہو جب بھلانے کے معنی ہوئے حقوق ادا نہ کرنا تو اس کے مقابل ذکر کے معنی ہوئے حقوق ادا کرنا یہ ایسی اصطلاح ہے جس سے ہر شخص واقف ہے کچھ شرح اور ثبوت کی ضرورت نہیں تو ذکر اللہ بالمعنی الاخیر کا ترجمہ ہوا اداء حقوق اللہ ذکر اللہ حقیقی اور ذکر اللہ کا فرد کامل یہی ہے ذکر لسانی بھی ذکر اللہ کا ایک فرد ہے مگر ناقص اور صرف صوری ہاں اگر دونوں جمع ہو جائیں یعنی اداء حقوق کے ساتھ ذکر لسانی بھی ہو تو سبحان اللہ درجہ اکمل ہے غرض اس آیت میں ذکر اللہ کو ہمارے مرض کا علاج قرار دیا گیا ہے اجمالاً سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ذکر اللہ کتنے معنوں کو حاوی ہے اگر آپ غور سے دیکھئے تو ظاہر ہو جائے گا کہ کوئی خیر دنیا و آخرت کی نہیں جو اس میں نہ آگئی ہو۔ پس معلوم ہوا کہ حقوق اللہ کی بہت قسمیں ہیں جیسے عقائد اعمال، اخلاق، معاملات، حقوق الناس۔ حقوق الناس کے لفظ پر کوئی صاحب یہ شبہ نہ کریں کہ حق العباد اور چیز ہے اور حق اللہ اور چیز۔ وہ بندوں کی طرف منسوب ہے وہ اللہ کی طرف اور دونوں کے احکام میں فرق ہے۔ حق اللہ توبہ کرنے سے معاف ہو جاتا ہے اور حق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتا۔ (اگر ایسا ہوتا تو پھر کیا تھا بڑی سہولت ہوتی کسی کا مال چھین لیا ہضم کر لیا پھر توبہ کر لی) حق العباد میں صاحب حق کے معاف کرنے کی ضرورت ہے حتیٰ

کہ حج اور شہادت سے بھی اس سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا پس جب حقوق العباد ہیں حقوق اللہ تو تم نے اس کو اور قسم کیسے بنا دیا صل اس شبہ کا یہ ہے کہ پوچھا ہے کہ بندوں کے حقوق کہاں سے پیدا ہوئے بندہ خود مخلوق اور مملوک ہے ان کے حقوق اس کے پیدا کردہ تو ہونے نہیں سکتے دوسرے کے عطا کردہ ہوں گے حق تعالیٰ کے حقوق العباد وہ حقوق ہوئے جن کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کر دیا ہے نظیر اس کی یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ یہ گھر فلاں شخص کا ہے ظاہر ہے کہ کہنے والی کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس کی ذاتی ملک ہے بلکہ ملک حقیقی تو حق تعالیٰ کی ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کو مالک بنا دیا ہے اس سے حق تعالیٰ کی ملک سے گھر نہیں نکل گیا حالانکہ تمام حقوق مالکانہ اسی شخص کی طرف منسوب ہوتے ہیں اسی طرح حقوق العباد حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے حقوق مقرر ہوئے اور حکم دیا گیا ہے اعطوا کل ذی حق حقه اور یا ایہا الذین امنوا اولوا بالعقود (اے ایمان والو معاہدوں کو پورا کرو) حقوق العباد ادا نہ کرنا اس کی مخالفت ہے جو امر اللہ ہے اور امر اللہ کی مخالفت ہی عصیان اور اضاحت حق اللہ کی ہے تو حقوق العباد بھی دراصل حقوق اللہ ہیں۔ یہ سب قسمیں ہیں حقوق کی اور شریعت ان ہی حقوق کی شرح ہے۔ (تفصیل الذکر ص ۶ تا ص ۸)

صبح و شام ذکر الہی کا مفہوم

اس میں تو صبح و شام ذکر کرنے کو بتلایا ہے نہ کہ ہر لحظہ۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف صبح اور شام ذکر کرو اور باقی اوقات میں خالی رہو بلکہ محاورہ ہے کہ اس کام کو ہر وقت کرنا مقصود ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ رات دن کرتے رہو۔ ذکر ضدین سے غصو استیجاب اس جنس کا ہوتا ہے اور ذکر صرف یہی نہیں ہے کہ پس تھوڑی دیر اللہ اللہ کر لیا بلکہ لا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ (یعنی زنا کے پاس نہ چلکو بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے) پر عمل کرنا بھی ذکر ہے۔ کیونکہ یہ بھی فرمایا ہوا ہے اللہ تعالیٰ کا۔

اس پر عمل کرنے کو یوں سمجھو کہ لا تقربوا کے معنی یہ ہیں کہ زنا کرنا تو بہت بری بات ہے تو اس کے پاس بھی نہ چلکو۔ یعنی جو چیزیں دواعی زنا ہیں ان کی طرف بھی متوجہ نہ ہو۔ مثلاً نگاہ کو بھی ادھر متوجہ نہ کرو قلب کو بھی ادھر متوجہ نہ کرو۔ اسی طرح ہر وقت اس وقت کے احکام عامہ و خاصہ کا اہتمام رکھو۔ اس پر وگرام کے منضبط ہو جانے کے بعد اب بتلائے کہ غیبت کا کونسا وقت ہے۔ جھوٹ بولنے کا کونسا وقت ہے۔ ہار مونیم بجانے کا کونسا وقت ہے۔ گراموفون سننے کا کونسا وقت ہے۔

اعتدال شریعت

ہاں البتہ شریعت تنگ نہیں ہے۔ اجازت ہے کہ ورزش کیجئے۔ اجازت ہے کہ ہنسنے بولنے بات کیجئے یہاں

تک اجازت ہے اگر وظیفہ پڑھتے پڑھتے تھک جائے تو چھوڑ دو۔ باہر بیٹھ کر فس لو بول لو مگر ناجائز بات مت کرو۔ شریعت میں یہ تعلیم نہیں کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ بچوں کو عاق کر دو۔ اور بس ایک کونہ میں بیٹھ کر اللہ کرنے لگو۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَا

عِيًّا إِلَى اللَّهِ بِآذِنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝

ترجمہ: اے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے بے شک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) گواہ ہوں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مومنین کو بشارت دینے والے ہیں اور (کفار کے) ڈرانے والے ہیں اور سب کو اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک روشن چراغ ہیں۔

تفسیری نکات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خاص صفت کی تشبیہ کا مفہوم

(اس آیت مبارکہ میں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خاص صفت میں چراغ سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ و اکمل ہونا لازم نہیں البتہ واضح و اشہر ہونا ضروری ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چراغ سے تشبیہ دینے میں یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ اس صفت میں چراغ آپ سے افضل ہے۔ یہاں سے یہ اشکال بھی مرفح ہو گیا جو بہت لوگوں کو صفحہ صلوة اللہم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراہیم و علی آل ابراہیم میں پیش آیا کرتا ہے کہ اس میں حضور پر صلوة کو ابراہیم علیہ السلام کے صلوة سے تشبیہ دی گئی ہے جس سے ابراہیم علیہ السلام کی صلوة کی افضلیت لازم آتی ہے۔ اس اشکال کا منشا یہ ہے کہ تشبیہ کے لئے مشبہ بہ کا افضل ہونا لازم سمجھا جاتا ہے مگر یہ بناء القاسد علی القاسد ہے۔ تشبیہ کے لئے افضلیت مشبہ بہ کا لزوم ہی غلط ہے بلکہ اس کے لئے محض مشبہ بہ کا اشہر و واضح ہونا لازم ہے افضل ہونا لازم نہیں۔ تنوع موارد استعمال سے اس کی تائید ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک مقام پر خود اپنے نور کو مصباح سے تشبیہ دی ہے حالانکہ یہاں مشبہ بہ کی افضلیت کا وہم بھی نہیں ہو سکتا فرماتے ہیں

اللہ نور السموات والارض مثل نوره کمشکوۃ فیہا مصباح المصباح فی زجاجة الزجاجة کالہا کوکب دری یوقد من شجرة مبارکة زیتونة لاشرفیة ولا غریبۃ یکاد ذیتها یضیء ولولم تمسسه نار نور علی نور

گو یہاں مصباح کی بہت کچھ تقویت کی گئی ہے کہ چراغ شیشہ کے (گلاس کے اندر) ہے اور وہ ایسا چمکدار ہے جیسے روشن ستارہ اور اس چراغ میں تیل بھی زیون کا ہے اتنا عمدہ کہ آگ لگنے سے پہلے ہی بھڑکنا چاہتا ہے لیکن گو وہ کتنا قوی ہو حق تعالیٰ کے نور سے اس کو کیا نسبت۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ مشہ بہ کے لئے مشہ سے افضل ہونا ضرور نہیں۔ گو اتفاق سے زید اسد میں اسد زید سے زیادہ ہی بہادر ہو اور واقعی اس جانور کو خدا تعالیٰ نے قوت و شجاعت بہت زیادہ دی ہے اور عجب نہیں ایسی ہی جزئیات سے لوگوں کو یہ غلطی واقع ہو گئی ہو کہ مشہ بہ کو مشہ سے افضل ہونا چاہیے مگر حقیقت میں یہ لازم نہیں اور نہ نور مصباح کو نور خداوندی سے افضل کہنا پڑے گا حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تحقیق یہ ہے کہ مشہ بہ کا صرف اشہر و اوضح ہونا ضروری ہے (افضلیت ضروری نہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ غائب از نظر ہیں کوئی شخص ان آنکھوں سے دنیا میں ان کو نہیں دیکھ سکتا اس لئے خدا کا نور اشہر نہیں اور نور مصباح اشہر ہے اس وجہ سے ان کو نور مصباح سے تشبیہ دے دی گئی ہے۔ خدا کے نور کی تو بڑی شان ہے۔ لوگ عالم کی تعریف میں کہا کرتے ہیں کہ حضرت تو روشن چراغ ہیں۔ اس میں بھی ان کو یہ وہم نہیں ہوتا کہ چراغ نور میں ان سے افضل ہے مگر چونکہ یہ چراغ کوئی بھی خالی از نور نہیں دیکھا گیا اس لئے اس کا نور اشہر ہے اور بشر بعض ظلمانی ہیں، بعض نورانی اس لئے اس کا منور ہونا محتاج دلیل ہے تو اس کا منور ہونا اشہر نہیں۔

مشہ بہ کا مشہ سے افضل ہونا ضروری نہیں

اس تفصیل سے یہ مسئلہ طے ہو گیا کہ مشہ بہ کے لئے مشہ سے افضل ہونا لازم نہیں صرف اشہر و اوضح ہونا ضروری ہے۔ پس حضور کو سراج منیر فرمانے سے افضلیت سراج کا نہیں ہو سکتا۔ الغرض اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تشبیہ روشن چراغ فرمایا گیا ہے تو بناءً بر اصول تشبیہ جو خاص وصف چراغ میں ہے نہ آپ میں ہونا لازم ہے۔

حضور ﷺ کو آفتاب یا چاند سے تشبیہ نہ دینے کی وجہ

اور اسی سے یہ بھی دفع ہو جائے گا کہ آفتاب یا ماہتاب سے حضور کو کیوں نہ تشبیہ دی گئی حالانکہ آفتاب تمام منیرات میں روشن تر ہے اس کے سامنے نہ چاند کی کوئی حقیقت ہے نہ چراغ کی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آفتاب کی روشنی میں حرارت اور تیزی زیادہ ہے جس کی وجہ سے کوئی اس پر نگاہ نہیں جاسکتا اس لئے اس سے تشبیہ نہیں دی گئی تو پھر چاند سے تشبیہ دے دی جاتی۔ چراغ سے تو وہ بدرجہا زیادہ ہے۔ وجہ دفعہ یہ ہے کہ چراغ میں ایک خاص صفت ایسی ہے جو نہ آفتاب میں ہے نہ ماہتاب میں اس لئے حضور کو چراغ روشن فرمایا گیا۔ بات یہ ہے کہ چراغ میں تین صفتیں ہیں۔

۱- ایک اس کا خود روشن ہوتا۔

۲- دوسرے اپنے غیر کو روشنی دینا کہ چراغ کی وجہ سے دوسری چیزیں ظلمت سے نور میں آ جاتی ہیں۔ ان دو صفتوں میں چراغ اور آفتاب و ماہتاب سب شریک ہیں۔ اور یہ دو وصف آفتاب میں بے شک چراغ سے زیادہ ہیں۔

۳- تیسری صفت چراغ میں یہ ہے کہ اس سے دوسرا چراغ اسی کے مثل روشن ہو سکتا ہے چنانچہ ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔

یہ صفت خاص چراغ ہی میں ایسی ہے کہ آفتاب و ماہتاب میں نہیں ہے۔ کیونکہ آفتاب سے دوسرا آفتاب اور ماہتاب سے دوسرا ماہتاب روشن نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آفتاب و ماہتاب دوسری چیزوں کو منور (باسم المفعول) تو کر دیتے ہیں مگر منور (باسم الفاعل) نہیں کرتے اور چراغ دوسری اشیا کو منور بھی کرتا ہے اور منور بھی کر دیتا ہے اس لئے حضور کو آفتاب و ماہتاب سے تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ چراغ روشن فرمایا گیا۔

تو چراغ کی طرح آپ میں بھی علاوہ خود نورانی ہونے کے دو صفتیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ آپ دوسروں کو منور کرتے ہیں دوسرے یہ کہ آپ بعضوں کو منور بنانے والے ہیں۔ پہلا کمال آپ کا امت میں ظاہر ہوا۔ اور دوسرا کمال انبیاء علیہم السلام میں ظاہر ہوا۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام آپ سے فیض حاصل کرتے ہیں جو مستقل چراغ ہو گئے۔ جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن کر لیا جاوے تو وہ بجائے خود مستقل منور ہو جاتا ہے یہی شان انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ امت کی یہ حالت نہیں کیونکہ امتی کے اندر جو نور آپ کے واسطے سے آتا ہے وہ اس میں مستقل نہیں۔

پس آپ انبیاء علیہم السلام کے کمالات کے لئے بمنزلہ واسطہ فی الثبوت کے ہیں کہ ذی واسطہ بھی اس کمال کے ساتھ موصوف حقیقہ ہو جاتا ہے اور واقع میں وہاں دو صفتیں ہوتی ہیں۔ ایک واسطہ کی اور ایک ذی واسطہ کی اور امتیوں کے لئے بمنزلہ واسطہ فی العروض کے ہیں ذی واسطہ حقیقہ اس کمال کے ساتھ موصوف ہی نہیں ہوتا محض مجازاً متصف ہوتا ہے کیونکہ وہاں واقع میں ایک ہی صفت ہوتی ہے صرف واسطہ میں اور ذی واسطہ میں کوئی صفت ہوتی ہی نہیں۔ اسی طرح امتیوں میں واقع میں صفت تنویر کی ہے ہی نہیں وہ حضور کی صفت ہے کہ امتیوں کی طرف مجازاً منسوب کر دی جاتی ہے بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ واقع میں بھی ان میں تنویر کی صفت ہو جاتی ہے گو آپ ہی کی برکت سے تھی۔

رہا یہ کہ حضور سے جمیع کمالات میں انبیاء علیہم السلام کو فیض پہنچنے کی کیا دلیل ہے۔ تو ہم کو اس کے دلائل بتلانے کی کچھ حاجت نہیں کیونکہ یہ مسئلہ اہل تحقیق کا اجتماعی ہے مگر تقریباً ہم کے طور پر بتلانے کا کچھ حرج بھی نہیں۔

جامع کمالات

سوا یک مقدمہ اول سمجھنا چاہئے کہ آپ جمیع کمالات انبیاء علیہم السلام کے جامع ہیں اور اس کی ایک دلیل تو

یہ ہے کہ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم انبیاء کے فضائل میں گفتگو کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ بنایا۔ کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ بنایا۔ کسی نے کہا کہ حق تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ و کلمۃ اللہ بنایا و علیٰ ہذا۔ اور اس گفتگو میں صحابہ کا یہ مقصود نہ تھا کہ انبیاء کو آپ پر فضیلت دیں بلکہ غالباً وہ یہ چاہ رہے تھے کہ جس طرح ہم کو ان انبیاء کے خاص اوصاف معلوم ہیں اسی طرح یہ بھی معلوم کریں کہ ہمارے حضور میں خاص صفت کیا ہے جس کی وجہ سے آپ سب انبیاء سے افضل ہیں۔ صحابہ اسی گفتگو میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرہ سے تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے تمہاری گفتگو سنی۔ واقعی حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ و کلمۃ اللہ ہیں الا ان صاحبکم حبیب اللہ اس واقعہ میں یہ تو ضرور ہے کہ حضور نے اپنی یہ خاص صفت اپنی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے بیان فرمائی ہے۔

محبت اور خلت میں فرق

چنانچہ سیاق کلام اس کو مقتضی ہے مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ لغت میں تتبع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت میں خلت کا درجہ بڑھا ہوا ہے کیونکہ محبت کا اطلاق تو تھوڑی محبت پر بھی ہو سکتا ہے مگر خلت کا اطلاق جمعی ہوتا ہے جبکہ محبت خلل قلب یعنی اندرون قلب میں پہنچ جائے جس کو متبنی نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے

عذل العود اذل حول قلب التاء ہ
وہوی الاحبتہ منہ فی سودانہ

پس خلت اس درجہ کی محبت کا نام ہے جو سویدائے قلب میں پیوستہ ہو جائے۔ تو اب حضور کا یہ فرمانا کہ میں حبیب اللہ ہوں ابراہیم علیہم السلام پر آپ کی فضیلت کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ وہ خلیل اللہ ہیں اور خلت کا درجہ محبت سے بڑھا ہوا ہے۔

اس اشکال کے جواب میں لوگوں نے مختلف تقریریں کی ہیں مگر سہل جواب یہ ہے کہ اس جگہ آپ نے محبت کا اطلاق معنی لغوی کے اعتبار سے نہیں فرمایا ہے بلکہ محاورات کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ پس لغت گو خلت محبت سے بڑھی ہوئی ہے لیکن استعمال و اطلاق محاورات میں گو محبت خلت سے بڑھی ہوئی نہ ہو مگر حبیب کا صیغہ خلیل سے بڑھا ہوا ہے چنانچہ خلیل تو جس طرح معشوق کو کہتے ہیں اسی طرح اس کا اطلاق عاشق پر بھی آتا ہے بخلاف حبیب کے کہ اس کا اطلاق محض معشوق پر ہوتا ہے عاشق پر حبیب کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ اس کو محبت کہتے ہیں پس خلیل اللہ و حبیب اللہ میں یہ فرق ہوا کہ خلیل اللہ خدا کے عاشق کو بھی کہہ سکتے ہیں اور معشوق کو بھی اور حبیب اللہ صرف محبوب ہی کو کہیں گے۔ (گو جو خدا کا محبوب ہو گا وہ محبت بھی ضرور ہوگا) مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں محبوبیت کی شان ابراہیم علیہ السلام سے بڑھی ہوئی ہے۔

حضور علیؑ میں شان محبوبی سب سے زیادہ ہے

جب یہ ثابت ہو گیا کہ حضور میں شان محبوبی سب سے زیادہ ہے تو اب عادات پر نظر کی جائے گی عادت یہ ہے کہ جب کوئی کسی کا محبوب ہوتا ہے تو محبت کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو چیز بھی عمدہ ہو اور محبوب کو دی جاسکتی ہو وہ اس کو ضرور دیتا ہے۔ دی جاسکتی ہے کی قید میں نے اس لئے بڑھائی تاکہ کوئی صاحب اس دلیل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب و خواص الوہیت کو نہ ثابت کرنے لگیں اگر کوئی ایسا کرے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ گفتگو ان امور میں ہے جو محبوب کو دیئے جاسکتے ہوں اور خواص الوہیت کا عطا بشر کو محال ہے (ورنہ یہ بھی ممکن ہوگا کہ حق تعالیٰ کسی کو خدا بنادیں حالانکہ اس کے امکان کا کوئی بھی قائل نہیں) اور یقیناً جتنے کمالات انبیاء علیہم السلام کو دیئے گئے ہیں وہ سب عمدہ ہیں اور قابل عطا ہیں۔ تو اس قاعدہ عادیہ کی بناء پر جو کہ بمنزلہ لازم عقلی کے ہیں حق تعالیٰ نے وہ سب کمالات حضور کو کیوں نہ عطا فرمائے ہوں گے۔ پس ثابت ہوگی کہ جو کمالات جملہ انبیاء میں منفرداً منفرداً موجود ہیں وہ سب حضور میں مجعاً موجود ہیں۔ اسی کو کسی نے کہا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تہاداری

اور چونکہ یہ مقدمات افتاعیہ ہیں اس لئے اگر ان پر کچھ عقلی اشکایات واقع ہوں تو مضرت نہیں۔ کیونکہ مقدمات افتاعیہ سے سامعہ کی تسلی کر دینا مقصود ہوتا ہے اس سے الزام مقصود نہیں ہوتا۔ لہذا اس مقصود پر مقدمات عادیہ سے استدلال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور چونکہ اصل مقصود ان مقدمات پر موقوف نہیں لہذا ان کا افتاعی ہونا اصل مقصود میں بھی مضرت نہیں۔

شاید اس پر کسی کو یہ شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنان مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ حضور میں یہ بات کہاں تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی انواع ہیں۔ حسن کی ایک نوع یہ ہے کہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن ایسا ہی تھا۔ چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے۔ اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے تحمل سے باہر ہوتا جائے جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دل میں گھستا جائے اسی کو ایک شاعر بیان کرتا ہے۔

بیزیدک وجہہ حسنا اذا ما زدته نظراً

(الرفع والوضع بلحقة موا عظ میلا والنبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۳۹۶ تا ۴۰۱)

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۱۰﴾

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیج دیا کرو

تفسیری نکات

درود شریف پڑھنے کا اجر و ثواب بلا استحقاق ہے

جو ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے حق تعالیٰ اس پر دس بار صلوة و سلام بھیجتے ہیں (یعنی رحمت خاص فرماتے ہیں) اور دس نیکیاں اس کو ملتی ہیں اور ایک حدیث میں ہے کہ دس گناہ معاف ہوتے ہیں یہ صلہ دانت گھسائی ہے انسان اللہ میاں سے دانت گھسائی بھی وصول کرتا ہے۔ ورنہ واقع میں درود میں اس کو ثواب کا کیا حق تھا کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان تھوڑی ہی کیا کرتا ہے جو ثواب کا استحقاق ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے درود کی کیا احتیاج ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آپ پر درود بھیجتے ہیں چنانچہ خود نص میں ارشاد ہے ان اللہ و ملائکہ یصلون علی النبی (بلا شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں) اس میں خود اشارہ کر دیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو تمہارے درود کی ضرورت ہے نہیں آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کا درود کافی ہے اور مخلوق میں سے مقدس جماعت ملائکہ کا درود کافی ہے باقی تم کو جو صلوة و سلام کا امر کیا گیا ہے اس میں تمہارے لئے یہی بات کافی تھی کہ تم کو اس کام میں شریک کر لیا گیا جو خدا تعالیٰ اور ملائکہ کرتے ہیں اور ثواب مزید برآں مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مضمون کفایت صلوة حق کو ایک قطعہ میں خوب ظاہر فرمایا ہے۔

خدا در انتظار حمد مانیت محمد چشم بر راہ ثنا نیست
محمد حامد حمد خدا بس خدا مدح آفریں مصطفیٰ بس

یعنی نہ حق تعالیٰ کو ہماری حمد کی ضرورت ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری ثنا کا انتظار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا کی مدح کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کافی ہے بس اب ہم جو حق تعالیٰ کی ثنا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کرتے ہیں اس سے مقصود اپنا ہی فائدہ ہے اسی کو آگے فرماتے ہیں کہ جیسا اپنا فائدہ مد نظر ہے تو بس مناجات کر لو۔

مناجات اگر خواہی بیاں کرد یہ بیتے اکتفا خواہی تو اس کرد

(اگر کوئی مناجات بیان کرنا چاہتے ہو تو ان دو بیتوں پر اکتفا کرو) آگے کیا اچھی مناجات ہے

محمد از قوی خواہم خدا را الہی از تو حب مصطفیٰ را

کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ہم خدا کی محبت مانگتے ہیں اور اے اللہ آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مانگتے ہیں۔ بس خدا نے دیا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا یعنی خدا کا پتہ دیا تو خدا سے رسول کی محبت مانگو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کی معرفت مانگو یہ مناجات کافی ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ اپنے جذبہ شکر کو پورا کرتے ہیں اب اس پر ثواب ملنا یہ محض دانت گھسائی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس دانت گھسائی پر مجھے ایک قصہ یاد آیا ڈھا کہ میں ایک پیر زادہ صاحب اپنے باپ کے مریدوں میں گئے ایک رئیس نے ان کی دعوت کی اور دعوت کے بعد پچاس روپیہ نذرانہ میں دیئے پیر زادہ نے روپے پھینک دیئے کیا ہم اس لائق ہمیں ہمارا نذرانہ دو سو روپے سے کم نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے یہ حکایت سن کر کہا کہ دعوت کے بعد نذرانہ پر اتنا کرا کر کیا؟ ایک ظریف نے کہا کہ یہ دانت گھسائی ہے کیونکہ لقمہ چبانے میں تو دانت گھساتی ہے (مسم العوف عن نم الاوف)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصَلِّحْ

لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ

فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو۔ اللہ تعالیٰ (اس کے صلہ میں) تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرے گا وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔

تفسیری نکات

مشقت اور الجھن دفع کرنے کا طریق

حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کی اس مشقت اور الجھن کو دفع کرنے کے لئے ایک طریقہ نہایت مختصر لفظوں میں ارشاد فرمایا اس آیت کریمہ میں جو میں نے تلاوت کی ہے اسی طریقہ کا بیان یہ حاصل ہے اس تقریر کا اجمال اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول ثابت ہو چکا ہے کہ وہ شے مقصود ہیں اعمال صالحہ کا حاصل کرنا اور

مخوذ نوب اور ان میں بھی گرانی اس کی سہولت کے لئے دو طریق ارشاد فرمائے ہیں کہ ان کو اختیار کر لو تو وہ دو چیزیں جو بڑی مشقت کی تھیں وہ آسان ہو جائیں گی۔ ان میں سے ایک اتقوا اللہ ہے اور دوسرے قولوا قولاً سدیداً ہے یعنی اللہ سے ڈرو اور بات ٹھیک کہو اس پر دو شے مرتب فرمائی ہیں يصلح لکم اعمالکم و یغفر لکم ذنوبکم یعنی اگر تم ان دو باتوں کو اختیار کر لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادیں گے اور تمہارے گناہ بخش دیں گے اور ان ہی میں تم کو گرانی تھی جس کا اوپر بیان ہوا۔ حاصل یہ کہ تقویٰ جس کا ترجمہ خدا کا خوف ہے فعل قلب کا ہے اور کہنا فعل زبان کا ہے خلاصہ طریق کا یہ ہوا کہ دل اور زبان کو تم درست کر لو باقی سب کام ہم کر دیں گے قلب ایک شے ہے اس کے متعلق صرف ایک شے بتلائی ہے کچھ جھگڑے کی بات نہیں ایک نہایت مختصر کام فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کر لو جیسے کسی شخص سے کہا جاوے کہ یہ پچاس گاڑیاں ہیں ان کو ایک دم سے چلاؤ اور وہ سخت پریشان ہو کہ میں کس طرح چلاؤں یہ تو سخت مشکل ہے پھر اس کو طریق ایک بتلا دیا جاوے کہ اسی میں انجن لگا دو سب گاڑیاں خود بخود چل پڑیں گی واللہ العظیم ایسی بے نظیر تعلیم ہے کہ کوئی حکیم، کوئی فلسفی کوئی عاقل اس کے مثل نہیں لاسکتا یہ ایک مطلب ہے ایسی ذات پاک کا جو انسان کے رگ پٹھوں سے ریشہ ریشہ سے واقف ہے اس کو دیکھ کر علاج تجویز کیا۔

خشیت الہی پیدا کرنے کی ضرورت

اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ طریق اصلاح اعمال و مخوذ نوب کا فقط اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کر لو تو اسی سے تمام اعمال درست ہو جائیں گے اور زبان کی درستی بھی اگرچہ اس میں داخل ہے مگر پھر زبان کی درستی کو استقلالاً طریقہ کا جزو کیوں بنایا گیا اس میں کیا راز ہے پس بجائے اتقوا اللہ و قولوا قولاً سدیداً کے یوں فرماتے یا ایہا الذین امنوا اتقوا اللہ یسدد لکم انکم و یصلح لکم اعمالکم الخ یوں نہیں فرمایا بلکہ قولوا قولاً سدیداً کا اتقوا اللہ پر عطف کیا اور اس کو مستقل طریقہ قرار دیا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال بہت سے ہیں ایک وہ جو ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ سے ہوتے ہیں ایک وہ جو زبان سے ہوتے ہیں اور ان دونوں قسموں میں کئی قسم کا تفاوت ہے۔

ایک یہ کہ سوائے لسان کے اور سب جوارح عمل کرنے سے تھک جاتے ہیں پاؤں تھک جاتا ہے کثرت سے چلنے سے ہاتھ تھک جاتا ہے ان اعمال سے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں آنکھ تھک جاتی ہے زیادہ دیکھنے سے مگر یہ لسان بولنے سے نہیں تھکتی اگر لاکھ برس تک بک بک کر دو تو ہرگز نہ تھکے گی۔ یہ بات دوسری ہے کہ بکثرت بولنے سے دل کے اندر بے رونقی سی پیدا ہو کر بولنے سے نفرت ہو جاوے لیکن زبان کوئی نفسہ کوئی نکانہ نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لسانی اعمال سب جوارح کے اعمال سے عدد میں زیادہ ہوں گے پس گناہ بھی

اس سے زیادہ ہوں گے ایک تو یہ تفاوت ہو دوسرے یہ کہ زبان مثل برزخ کے ہے درمیان قلب و جوارح کے قلب سے بھی اس کو مشابہت ہے اور جوارح سے بھی اور یہ مشابہت خلقی بھی ہے اور باطنی بھی خلقی یہ کہ قلب بالکل مخفی و مستور ہے اور جوارح بالکل ظاہر اور زبان مستور من وجہ و مکشوف من وجہ ہے چنانچہ شارع نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے کہ صائم اگر منہ میں کوئی چیز لے کر بیٹھ جائے روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں کے مکشوف ہونے کا اعتبار کیا گیا جو ف میں وہ چیز نہیں گئی اور اگر تھوک نکلے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں اس مستور ہونے کا اعتبار کیا گیا جو ف سے جو ف میں ایک چیز چلی گئی اور غسل میں کلی کرنا فرض ہو یا یہ مکشوف ہونے کا اعتبار فرمایا اور باطنی مشابہت یہ ہے کہ جیسے قلب کی اصلاح سے تمام بدن کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح زبان کی اصلاح سے تمام اعمال جوارح کی اصلاح ہو جاتی ہے جو شخص ساکت ہو کر بیٹھ جاوے اس کے ہاتھ سے نہ ظلم ہو گا نہ زیادتی ہو گی نہ کسی سے لڑائی ہو گی نہ مکرار ہو گا اس لئے کہ زبان چلانے ہی سے نوبت ہاتھ پاؤں تک پہنچتی ہے ان سب سے حدیث کی بھی تنویر ہو گی اذ اصبح ابن ادم فان الاعضاء کلها تکفرا للسان فتقول اتق الله فينا فاننا نحن بك فان استقمنا استقمنا وان اعوججت اعوججتا یعنی جس وقت ابن آدم صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں (اے زبان) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ساتھ ہیں پس اگر تو راست ہو گی تو ہم سب راست رہیں گے اور اگر تو کج ہو گی ہم سب کج ہو جائیں گے۔

تیسرا تفاوت دیگر جوارح اور لسان میں یہ ہے کہ زبان قلب کی معبر ہے زبان سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے پوری حالت قلب کی معلوم ہوتی ہے اور اگر ساکت رہے تو کچھ حال معلوم نہ ہو گا کہ یہ شخص کیسا ہے زبان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متواضع ہے یا متکبر ہے قانع ہے یا حریص عاقل ہے یا احمق دشمن ہے یا دوست خیر خواہ ہے یا بد خواہ بخلاف ہاتھ پاؤں کے سب شبہ ہو سکتا ہے ایک ہی طرح کا فعل ہاتھ پاؤں سے دوست دشمن سے صادر ہو سکتا ہے مثلاً قتل واقع ہوا تو اس سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ قاتل دشمن ہی تھا۔ ممکن ہے کہ دوست ہو اور وہ کسی اور کو قتل کرنا چاہتا ہو اور ہاتھ چوک گیا ہو چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی نے بندوق چلائی دوسرے بھائی کی آنکھ میں ایک چھرہ جا لگا اسی طرح سے مار پیٹ کبھی عداوت سے ہوتی ہے کبھی تادیب کے لئے ہوتی ہے غرض ایک شق متعین کرنے کے لئے خارجی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے بخلاف لسان کے کہ یہ پوری نائب قلب کی ہے۔

چوتھا تفاوت یہ ہے کہ تعلقات دو قسم کے ہیں ایک اپنے نفس کے ساتھ دوسرے غیروں کے ساتھ جو تعلق اخوت محبت عداوت کا ہو گا وہ بدولت زبان کے ہو گا اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں ہم کو دوسروں کی امداد کی ضرورت ہے بغیر دوسروں کی امداد کے ہم رکعت تک نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ نماز کا طریقہ ہم کو کسی نے بتلایا ہو گا اس لئے ہم نماز پڑھتے ہیں قرآن شریف کسی نے پڑھایا اس لئے ہم پڑھتے ہیں روزہ کی فرضیت اور اس

کی تاکید اور اس کی ماہیت کسی نے بتائی اس لئے روزہ رکھتے ہیں علیٰ ہذا تمام اعمال صالحہ اور ان بتلانے سکھانے والوں نے بلا تعلق تو بتلایا نہیں اور وہ تعلق پیدا ہوا ہے لسان سے اور نیز تعلیم بھی ہم کو بذریعہ لسان کے کی گئی ہے تو اس اعتبار سے لسان کو تمام اعمال صالحہ میں دخل ہوا گویا یہ تمام اعمال صالحہ بدولت اس لسان ہی کے ہم سے صادر ہوتے ہیں۔

جبکہ دیگر جو ارج اور لسان میں اس قدر تفاوت ہوئے اور لسان کو اعمال صالحہ کے وجود میں ایک دخل عظیم ہو اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس کو مستقل جزو طریق اصلاح کا بنادیا اگرچہ تقویٰ سے جو درست ہوگی درست لسان بھی اس کا فرد عظیم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ذمہ دو کام ہوئے ایک خدا کا خوف دوسرے زبان کی اصلاح ان دونوں کے جمع ہونے سے آئندہ کے لئے اعمال کی اصلاح ہوگی اور گزشتہ گناہ محو ہو جائیں گے۔

اور صلح کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی حالانکہ بظاہر اصلاح اعمال کام عبد کا ہے تو وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ اشارہ ہے کہ ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہئے اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ نماز مت کرو جو کچھ کرتے ہیں اور خیر اگر کچھ ہمارے اختیار میں بھی ہے تو یہ ہے کہ مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن پوری درستی جو مفہوم ہے صلح کا یعنی یہ کہ جیسے چاہئے اس طرح کی نماز پڑھنا اور قلب کا اس میں حاضر ہو جانا یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور اس نسبت میں ایک اور لطیف نکتہ ہے وہ یہ کہ گویا فرماتے ہیں کہ یہ اعمال تو تم نے کر لئے لیکن ہم اس کی اصلاح کے لئے فرشتوں کی معرفت پیش کرادیں گے جیسے بچہ سے کہا کرتے ہیں کہ یہ شے اٹھا لاؤ اور وہ اٹھا نہیں سکتا تو خود اٹھاتے ہیں اور اس کا ہاتھ بھی لگوا دیتے ہیں اس اٹھانے کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں اور خود ہی انعام عطا فرماتے ہیں۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت ہے اور دوسری شے جو اتقوا اللہ الخ پر مرتب فرمائی وہ بیغفر لکم ذنوبکم ہے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے بیغفر لکم ذنوبکم کے بیجنبکم ذنوبکم فرماتے یعنی تم کو گناہوں سے بچالیں گے یہ نہیں فرمایا اس لئے کہ گناہوں سے بچانا تو بصلح لکم میں آچکا ہے ذنوب ماضیہ باقی تھی ان کی نسبت فرمایا کہ ان کی بھی فکر نہ کرو ان کو بھی اللہ تعالیٰ بخوف مادیں گے۔

خوف حاصل ہونے کا طریقہ

اب میں آپ کو خوف (کہ جس سے تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں) اس کے حاصل ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں اور وہ طریقہ گویا ایک گر اور میرے تمام وعظ کا گویا خلاصہ ہے اور وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ بھی حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے وہ یہ ہے ولتنظر نفس ما قدمت لغد یعنی ذکر آخرت کیا کرو اور فکر آخرت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کر لو مثلاً سوتے وقت روزمرہ بلا ناغہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ معاذ کیا ہے اور مر کر ہم کو کیا پیش آنے والا ہے مرنے سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک جو واقعات ہونے والے ہیں سب کو سوچا کرو

کہ ایک دن وہ آئے گا کہ میرا اس دار فانی سے کوچ ہوگا سب سامان مال اسباب باغ نو کر چا کر اولاد بیٹا بیٹی ماں باپ بھائی خویش اقارب دوست دشمن سب ہمیں رہ جاویں گے میں تنہا سب کو چھوڑ کر قبر کے گڑھے میں جالیوں گا اور وہاں دو فرشتے آویں گے اگر میرے دن بھلے ہیں تو اچھی صورت میں ورنہ خدا نخواستہ ڈراؤنی صورت میں نہایت ہولناک آواز سے آ کر سوالات کریں گے پس اے نفس اس وقت کوئی تیرا مددگار نہ ہوگا تیرے اعمال ہی وہاں کام آویں گے اگر سوالات کے جواب درست ہو گئے سبحان اللہ جنت کی طرف کی کھڑکی کھل جاوے گی اور اگر خدا نخواستہ امتحان میں ناکام رہا تو قبر حفرة من حفرة النار ہوگی اس کے بعد تو قبر سے اٹھایا جائے گا اور اعمال نامہ اڑائے جاویں گے حساب کتاب کے لئے پیش کیا جاوے گا پل صراط پر چلنا ہوگا اے نفس تو کس دھوکہ میں ہے اور ان سب واقعات پر تیرا ایمان ہے اور یقیناً جانتا ہے کہ یہ ہو کر رہیں گے پھر کیوں غفلت ہے اور کس وجہ سے گناہوں کے اندر دلیری ہے کیا دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اے نفس تو ہی اپنا غمخوار بن اگر تو اپنی غم خواری نہ کرے گا تو تجھ سے زیادہ کون تیرا خیر خواہ ہوگا اسی طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ان واقعات کو تفصیل سے سوچا کرے میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ چند ہی روز کے بعد دیکھو گے کہ خوف پیدا ہو گیا اور خوف پیدا ہونے کے بعد آپ کو ماضی سے توبہ کی فکر ہوگی اور آئندہ کے لئے اطاعت کی توفیق ہوگی اس وقت آپ کو مشاہدہ ہوگا اتقوا اللہ پر کیسے اصلاح اعمال و محو ذنوب مرتب ہو گئے آگے فرماتے ہیں ومن يطع الله ورسوله فقد فاز فوزاً عظيماً یعنی جو شخص اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے وہ بیشک بڑی کامیابی کو پہنچا۔ بطبع میں اشارہ ہے جو کہ شخص خوشی سے کہتا مانے اس لئے کہ یہ طلوع سے متعلق ہے اور خوشی سے کہتا مانا بدوں محبت اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہوتا۔

محبت الہی حاصل ہونے کا طریقہ

اور اللہ کی محبت کے حاصل ہونے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنا ہے اس کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر کے سوچا کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں ہیں چند روز کے بعد آپ کو مشاہدہ ہوگا کہ ہم سر تا سر عنایات اور نعمتوں میں غرق ہیں اس سے آپ کے قلب میں حق تعالیٰ کی محبت اور اپنی ناکارگی اور تقصیر جاگزیں ہوگی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بطبع کا تعلق آپ سے بھی ہے آپ کے ساتھ محبت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہمارے لئے مشقتیں اٹھائیں اور اپنی امت پر شفقت فرمائی اس کو سوچا کرو جب محبت پیدا ہوگی۔ اطاعت خوشی سے ہوگی اور ہر محبت ہوگی اور پہلے جو طریقہ بیان کیا اس سے خوف ہوگا یہ دونوں شے آپ کے دین دنیا دونوں درست کر دیں گے اور بڑی کامیابی سے یہی مراد ہے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اصلاح اعمال کی توفیق عطا فرماویں و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ

خیر خلقہ محمداً و آلہ و اصحابہ اجمعین۔ والسلام (تسبیح الاملاح ص ۱۳۱ تا ۲۰)

فقد قال الله تعالى يا ايها الذين امنوا اتقوا الله و قولوا قولا سديداً يصلح لكم اعمالكم و يغفر لكم ذنوبكم و من يطع الله و رسوله فقد فاز فوزاً عظيماً

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے مختصر لفظوں میں ایک کارآمد مضمون پر متنبہ فرمایا ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جو آدمی جو کام کرتا ہے اس سے دو چیزوں میں سے ایک شے مقصود ہوتی ہے یا تو دفع مضرت یا جلب منفعت مثلاً کھانا کھانا ہے لذت و تغذی کے لئے یہ ایک منفعت ہے دوا پیتا ہے دفع مرض کے واسطے یہ مضرت کا دفع ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے جلب منفعت کے لئے کرتا ہے یا دفع مضرت کے واسطے اس میں کسی عاقل کو کلام نہیں اور نہ اس پر براہین و دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہے البتہ منفعت و مضرت کی تعیین میں المل الرائے اور اہل طلت میں اختلاف ہے۔

کونسا نفع قابل تحصیل ہے

اس وقت قابل غور امر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہونا ضرور ہے کہ آیا کون منفعت واقع میں قابل تحصیل کے ہے کون مضرت واقع میں قابل دفع کے لئے تو بعد تامل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ منفعت وہ لائق تحصیل کے ہے جس میں دو صفتیں ہوں ایک تو یہ کہ وہ منفعت زیادہ باقی رہنے والی ہو دوسری یہ کہ خالص ہو مشوب بضر نہ ہو معلوم ہوا کہ مضرت باقیہ و خالصہ زیادہ فکر کے قابل ہے اور مضرت فانیہ زیادہ قابل التفات نہیں ہے پس منفعت و مضرت دونوں کی دو قسمیں ہوئی منفعت باقیہ خالصہ، منفعت فانیہ غیر خالصہ، مضرت باقیہ خالصہ، مضرت فانیہ غیر خالصہ۔ اس کے بعد معلوم کرنا چاہیے کہ دنیا کی منفعت و مضرت تو ہر شخص کے پیش نظر ہے ہم کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور منفعت و مضرت کی بھی خبر دی ہے جو مرنے کے بعد واقع ہونے والی ہے اب محل کے اعتبار سے منفعت و مضرت کی دو قسمیں اور نکلیں۔ منفعت دنیویہ منفعت اخرویہ مضرت دنیویہ مضرت اخرویہ۔

تو سمجھ لیجئے کہ آخرتہ کی منفعت جنت ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریق اعمال صالحہ ہیں اور آخرتہ کی مضرت دوزخ ہے اور اس سے بچنے کا طریق بد اعمالیوں سے بچنا ہے خلاصہ یہ کہ اعمال صالحہ کو اختیار کیا جاوے اور ذنوب سے بچا جاوے اور جو ہو چکے ہیں ان سے توبہ کی جاوے خلاصہ یہ کہ مقصود دوشے ہیں اصلاح اعمال محمود نوب اور محمود نوب کے معنی یہ ہیں کہ گزشتہ سے توبہ کی جائے اور آئندہ بچنے کا عزم کیا جائے لیکن اعمال کی تحصیل اور گناہوں سے بچنا اول کو اکثر لوگوں پر ہمیشہ ہی سے گراں اور ثقیل ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ

أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ

ظَلُومًا جَهُولًا ﴿۱۷﴾

ترجمہ: ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔ وہ انسان بہت ظلوم و جهول ہے۔

تفسیری نکات

اصل مادہ الامتیاز محبت ہے

اگر ان میں ادراک نہ تھا تو عذر کیسے کیا اور پھر ڈرے کیسے ڈرتے تو فعل قلب کا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت کے مناسب قلب بھی ہے اور زبان بھی ہے کیونکہ وہ چیز جس سے بولتے ہیں وہ زبان ہے اور وہ چیز جس سے ڈرتے ہیں وہ قلب ہے باقی و حملہا الانسان کی کیا وجہ تھی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو عقل بھی زیادہ تھی اور ان میں مادہ محبت کا بھی زیادہ تھا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو اصل مادہ الامتیاز انسان میں یہ محبت ہی ہے۔

محبت سبب حمل امانت ہے

حقیقت میں محبت ایسی شے ہے کہ اس کے احکام اور آثار عقل جزوی کے احکام سے بالکل جدا ہیں۔ یہی محبت تو وہ شے ہے جس کے ساتھ نوع انسان کی خصوصیت ہے اور یہی محبت تو سبب حمل امانت ہے جس کی نسبت ارشاد ہے انا عرضنا الامانة على السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها و حملها الانسان. یعنی بے شک ہم نے پیش کیا امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے اس سے اور اٹھالیا اس کو انسان نے اس کی وجہ عارف شیرازی نے ایک شعر کے اندر ایک لفظ سے بیان کی ہے کہتے ہیں

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زوند

لفظ دیوانہ سے اس امانت کے برداشت کرنے کی لم کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان میں محبت اور عشق کا مادہ رکھا ہے اور سوائے اس کے اور مخلوقات میں یہ مادہ اس درجہ کا نہیں ہے۔ یہ امر دوسرا ہے کہ ہر شے کو اپنے خالق کے ساتھ تعلق ہے لیکن وہ تعلق دوسری قسم کا ہے پس چونکہ زمین و

آسمان و جبال میں ایسا مادہ محبت کا نہ تھا اس لئے جب ان پر امانت الہی پیش کی گئی تو بوجہ عدم محبت کے اس خطاب میں ان کو لذت نہ آئی اور اپنی نااہلیت کا اظہار کیا اور حضرت انسان میں چونکہ دیوانگی اور عشق رکھا تھا اس لئے اس نے آگے بڑھ کر فوراً عرض کیا کہ حضرت اس بار کو میں لیتا ہوں مجھے دیدہ بختے یہ سمجھا کہ اور کچھ نہیں تو اس بہانہ سے بات ہی کرنے کا موقع ملا کرے گا۔ بقول کسی شاعر کے

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

موسیٰ علیہ السلام سے جب سوال ہوا و ما تلک بیمینک یا موسیٰ یعنی کیا ہے تیرے داہنے ہاتھ میں اے موسیٰ۔ تو اس کا جواب تو اس قدر تھا عصای۔ یعنی میری لاٹھی ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اقتصار نہیں فرمایا بلکہ اس پر ایک طویل مضمون بڑھایا۔ چنانچہ فرمایا عصای اتو کؤ علیہا واہش بہا علی غنمی یعنی یہ میری لاٹھی ہے میں اس پر سہارا کر لیتا ہوں اور اپنی بکریوں پر اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور چاہتے تھے کہ کچھ فوائد اس کے مفصلاً بیان کریں لیکن کچھ ہیئت اور کچھ فرط و نشاط کے سبب اور کچھ جب یاد نہ آیا تو یہ فرمایا ولی فیہا مارب اخوی یعنی میرے لئے اس میں اور بھی مقاصد ہیں اور اس میں گنجائش اس کی رکھی ہے کہ کسی اور وقت یہ عرض کر سکوں کہ وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں اور بھی فوائد ہیں وہ فوائد یہ ہیں۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ کو ان سب فوائد کی خبر تھی۔ اور نیز سوال بھی صرف یہی تھا کہ کیا شے ہے اس کے فوائد سے سوال نہ تھا لیکن کلام کو اس لئے طول دیدیا کہ پھر ایسا وقت کہاں ملے گا کہ اللہ میاں سے باتیں کرنا نصیب ہوں اچھا ہے جتنا وقت بھی میسر ہو تو جو اہل دل ہیں ان کی غرض تو دعا سے اپنے مولیٰ حقیقی سے مناجات ہوتی ہے اس لئے وہ دیر میں ملنے سے اکتاتے تو کیا اور خوش ہوتے ہیں۔

ازدعا نبود مراد عاشقان جز سخن گفتن باں شیریں وہاں

حامل امانت

حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے قرآن کی امانت کو زمینوں آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن فلاہین ان یحملہا واشفقن منها و حملہا الانسان سونہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔

ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا یعنی اور انسان پر بھی پیش کیا جس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے حملہا الانسان آ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ بدوں عرض کے وہ حامل امانت نہ ہو سکتا تھا اس لئے یہ ماننا لازم ہے کہ عرض میں انسان بھی دوسروں کے ساتھ تھا مگر چونکہ آگے حمل میں اس کا ذکر آ رہا ہے اس لئے یہاں بیان کی ضرورت نہ تھی۔

امانت سے مراد اختیار ہے

(انا عرضنا الامانہ پ ۲۲) کے ذیل میں فرمایا کہ اس سے مراد امانت اختیار ہے پہاڑوں نے زمین نے آسمانوں نے انکار کیا انسان نے فرط محبت سے خود قبول کر لیا۔ عقل پر محبت کا غلبہ ہوا۔ کچھ نہ سوچا یہ بار اٹھالیا اس لئے آگے فرمایا گیا لیعذب اللہ المنافقین الایۃ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ اکثر عارفین کے نزدیک امانت سے مراد عشق ہے اور آگے جو ارشاد ہے کہ انہ کان ظلوما بعض اہل لطائف نے کہا کہ یہ عنوان میں تو قدح ہے لیکن دراصل مدح ہے کہ اس نے بڑا ہی ستم کیا کہ جھٹ کھڑا ہو گیا اور عشق کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا بڑا نادان ہے یہ تفسیر حضرت حاجی صاحب کی ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان کہ ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین و جبال پر پیش کی کہ اس کا تحمل کرتے وہ تو سب نے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا اس امانت سے مراد کیا ہے۔ محققین علماء فرماتے ہیں کہ اس سے تکلیف تشریحی مراد ہے اور تکلیف کے معنی تحصیل عمل بالاختیار کیونکہ مطلق عبادت و اطاعت سے تو کوئی شی خالی نہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم استوی الی السماء وہی دخان فقال لها وللارض انتیا طوعا او کرہا قالتا الینا طائعتین کہ ہم نے زمین و آسمان سے کہا کہ ہمارے حکام (نکوینیہ) کے لئے تیار ہو جاؤ خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے سب نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے تیار ہیں اور لفظ طائعتین سے صاف رد ہو رہا ہے ان لوگوں کا جو سموات و ارض و جمادات کی عبادت کو حالیہ یا قسر یہ کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ قسر و حال میں طوع بھی ہوا کرتا ہے ہرگز نہیں بہر حال عابد و مطیع تو تمام مخلوقات ہیں لیکن مکلف سب نہیں بجز انسان کے اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف و اطاعت میں فرق ہے اور جس امانت سے تمام عالم گھبرا گیا وہ تکلیف ہی ہے جس سے مراد عمل مع الاختیار ہے حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے یہ فرمایا تھا کہ ہمارے کچھ احکام تشریحیہ ہیں ان کا مکلف بالاختیار کون ہوتا ہے یعنی جو شخص ان کا تحمل کرے گا اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کی جاوے گی یعنی اس کی قوت ارادہ ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہ ہوگی بلکہ عمل و عدم عمل دونوں پر قدرت دی جائے گی پھر جو اپنے اختیار سے احکام کو بجالائے اس کو مقرب بنا لیا جائے گا اور جو اپنے اختیار سے احکام میں کوتاہی کرے گا اس کو مطرود کر دیا جائے گا اس سے سموات و ارض و جبال اور تمام مخلوق ڈر گئی انسان اس کے لئے آمادہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مکلف بنا دیا یعنی اس کو صفت اختیار مع عقل کے عطا کر دی گئی باقی مخلوقات میں یہ صفت اختیار اور عقل نہیں ہے (وہ جن

احکام تکوینیہ کو یا عبادت کو بجالاتے ہیں وہ ان کے لئے طبعی ہیں یعنی ان کی قوت ارادہ اس کے خلاف کی طرف مائل ہی نہیں ہوتی بخلاف انسان کے کہ جن احکام کا یہ مکلف ہے وہ اس کے لئے طبعی نہیں بلکہ اس کی قوت ارادہ عمل و عدم عمل دونوں کی طرف مائل ہوتی ہے اب اس کی تکلیف کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ اپنے اختیار سے ایک جانب کو ترجیح دے یعنی جانب عمل کو مامورات اور جانب عدم عمل کو منہیات میں اسی کا نام تحصیل عمل ہے اور اس سے یہ لازم نہیں کہ غیر انسان عاقل نہ ہو ممکن ہے کہ دوسری مخلوقات بھی عاقل ہوں مگر عاقل کامل نہیں یعنی ان کو عقل کا وہ درجہ حاصل نہیں جو تکلیف احکام کے لئے کافی ہو۔ آخر صبی۔ مراحق بھی تو عاقل ہے مگر باوجود عقل کے مکلف نہیں کیونکہ اس کی عقل کامل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو اور چونکہ اس پر کوئی شرعی اشکال لازم نہیں آتا اس لئے میں اس کا قائل ہوں کہ تمام مخلوقات حیوانات و نباتات حتیٰ کہ جمادات بھی عاقل ہیں یہ خیال صحیح نہیں کہ انسان کے سوا سب غیر عاقل ہیں ہاں یہ مسلم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں جو تکلیف کے لئے کافی ہو پس وہ مثل مراحق کے عاقل ہو سکتے ہیں اس کی کسی نص سے نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے آخر ہد کی گفتگو حضرت سلیمان کے ساتھ جو قرآن میں مذکور ہے کیا یہ سب طبعی کلام ہے ہرگز نہیں بلکہ عاقلانہ کلام ہے اور اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ قرار دو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت کے لئے بعض حیوانات کو عقل دیدی تھی تو میں کہوں گا کہ اب بھی بعض حیوانات کی حرکات ایسی ہوتی ہیں کہ خالی از عقل کہنا دشوار ہے۔

آیت مبارکہ میں امانت کا مفہوم

انا عرضنا الامانة (پ ۲۲) ہم نے یہ امانت پیش کی تھی

کے ذیل میں فرمایا کہ اس سے مراد امانت اختیار ہے۔ پہاڑوں نے زمین نے آسمان نے انکار کیا انسان نے فرط محبت سے خود قبول کر لیا۔ عقل پر محبت نے غلبہ پالیا۔ کچھ نہ سوچا یہ بار اٹھالیا۔ اس لئے آگے فرمایا ليعذب الله المنافقين (الآیۃ) انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقین کو سزا دے گا) اسی سلسلے میں فرمایا: کہ اکثر عارفین کے نزدیک امانت سے مراد عشق ہے اور آگے جو ارشاد ہے کہ الہ کان ظلوماً (وہ ظالم اور جاہل ہے) بعض اہل لطائف نے کہا کہ یہ عنوان میں تو قدح ہے۔ لیکن دراصل مدح ہے کہ اس نے بڑا ہی ستم کیا کہ جھٹ کھڑا ہو گیا اور عشق کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا۔ بڑا نادان ہے۔ یہ تفسیر حضرت حاجی صاحب کی ہے اور حافظ شیرازی نے بھی اپنے شعر میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے

آسماں بار امانت تو انت کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان جس بار امانت (حکومت) کو نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام نکلا)

شیطان کے مردود ہونے کا سبب

شیطان اسی لئے مردود ہوا کہ اس کو فناء نفس حاصل نہ تھی۔ کیونکہ محبت سے کورا تھا اور ملائکہ میں محبت تھی اس لئے وہ فوراً سجدہ میں گر پڑے کیونکہ وہاں نفس نہ تھا اور ملائکہ سے زیادہ انسان میں محبت ہے اسی لئے یہ امانت کا حامل ہوا۔ جس کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہم نے قرآن کی امانت کو زمینوں آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن

فابین ان یحملنہا و اشفقن منہا و حملہا الانسان

سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں اور (زمین) اور پہاڑوں پر پیش کیا یعنی اور انسان پر بھی پیش کیا جس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے حملہا الانسان آ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ بدوں عرض کے وہ حامل امانت نہ ہو سکتا تھا اس لئے یہ ماننا لازم ہے کہ عرض میں انسان بھی دوسروں کے ساتھ تھا مگر چونکہ آگے حمل میں اس کا ذکر آ رہا ہے اس لئے یہاں بیان کی ضرورت نہ تھی اور یہی جواب اس اشکال کا ہے کہ بعض لوگوں نے

واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس

جب اللہ نے تمام ملائکہ کو سجدہ آدم کے لئے کہا تو تمام نے فرمان بجالایا مگر شیطان نے انکار کیا پر شبہ کیا کہ شیطان کے مردود ہونے کی وجہ کیا ہے اس کو تو سجدہ کا حکم ہوا ہی نہیں بلکہ واذ قلنا للملائکۃ اسجدوا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم صرف ملائکہ کو ہوا تھا۔ نہ معلوم ان صاحبوں کو شیطان کے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں ہے شاید کبھی رات کو ہم بستر ہوئے ہوں گے۔

جواب اشکال کا یہ ہے کہ عدم ذکر عدم کو مستلزم نہیں اور یہاں اس کے ذکر کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ آگے الا ابلیس میں اس کا ذکر آ رہا ہے۔ یہ اس کا قرینہ ہے کہ وہ بھی مخاطب تھا۔ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کا ذکر آگے موجود ہو تو کلام سابق میں اکتفا باللاحق اس کا ذکر نہیں کیا کرتے جیسا کہ یہاں عرض امانت میں انسان کا ذکر اس لئے نہیں ہوا کہ آئندہ حملہا الانسان میں اس کا ذکر موجود ہے یہ جواب اس اشکال کا بہت سہل ہے اس میں استثناء متصل و منفصل کی بحث کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ اس کا اصل یہ ہے کہ ابلیس کا ذکر کلام سابق میں ایجازاً محذوف ہے اور تقدیر کلام اس طرح تھی واذ قلنا للملائکۃ والابلیس اسجدوا یہ جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور تمام مخلوقات پر پیش کی۔ امانت سے

مراد احکام تکلیفیہ ہیں جن کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ اگر امتثال ہوا تو ثواب ملے گا اور نافرمانی پر عذاب ہوگا۔ عذاب کون کسب ڈر گئے مگر انسان نے ہمت کی اور تحمل کے لئے آمادہ ہو گیا۔

محققین نے لکھا ہے کہ اور مخلوق میں عشق کا مادہ نہ تھا۔ انسان میں عشق کا مادہ تھا۔ یہ خطاب الہی کی لذت سے مست ہو گیا اور اس لذت کے لئے اس نے احتمال عذاب کی بھی پروا نہ کی اور کہہ دیا کہ حضرت یہ امانت مجھے دی جائے میں اس کا تحمل کروں گا۔ بس وہی مثل ہوئی کہ چڑھ جا سولی پر اللہ بھلی کرے گا۔ اس نے سوچا کہ جس امانت کی ابتدا یہ ہے کہ کلام و خطاب سے نوازے گئے اگر اس کو لے لیا تو پھر تو روز کلام و سلام و پیام ہوا کریگا بس ایک سلسلہ چلتا رہے گا کہ آج کوئی حکم آ رہا ہے کل کو دوسرا آ رہا ہے۔ کبھی عنایت ہے کبھی عتاب ہے تو اس چھیڑ میں بھی بڑا مزہ ہے۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی
عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حمل امانت کا راز یہی بتلایا ہے کہ اس کا خشاء محبت کی دیوانگی تھی۔
فرماتے ہیں۔

آساں بار امانت تو انت کشید قرعہ قال بنام من دیوانہ نہ زدند

علاج النفس

بعض لوگوں نے اس راز کو قرآن سے بھی ثابت کرنا چاہا۔ انہوں نے انہ کان ظلوما جھولا (وہ ظالم ہے جاہل ہے) کو اسی پر محمول کیا ہے اور اس کی مدح کہا ہے کہ چنانچہ بعض صوفیاء ظلم کی تفسیر میں لکھا ہے اس کے معنی ظلم لفسہ ہیں مطلب یہ ہے کہ انسان میں فتنائے نفس کی صفت تھی مگر میں اس تفسیر کو نہیں مانتا کیونکہ ظلم لفسہ بھی تو شریعت میں محمود نہیں بلکہ مذموم ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے کفار کے باب میں فرمایا ہے کانوا انفسہم یظلمون وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو کیا وہ بھی فانی تھے؟

اگر آج کل ایک جماعت نکلی ہے جو نفس کی دشمن ہے۔ کہتے ہیں اس کو خوب مارو۔ اس پر خوب ظلم کرو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو کافر بھی کہتے ہیں حالانکہ سارے بدن میں اگر تلاش کرو تو مومن یہی نکلے گا تو حضرت آپ نفس کو کافر کہہ کر خود اپنے ہی کو کافر کہتے ہیں پھر تمہارا کیا اعتبار پس نفس پر ظلم کرنا یہ کچھ تصوف نہیں ہے۔ حضور کا تصوف تو یہ ہے

ان نفسک علیک حقاوان لعینک علیک حقاوان لجسدک علیک حقا
تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے ہے اور تیری آنکھوں اور تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے۔

نفس کے بھی تمہارے ذمہ حقوق ہیں ان کو ادا کرنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ بس ظلم ہی پر کمر باندھ لو۔ بلکہ اس کے ساتھ بچہ کا سا معاملہ کرو کہ بچوں سے جب کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اول اس کو مٹھائی وغیرہ دے کر بہلاتے ہیں۔ اگر اس سے نہ مانے تو دھمکی سے کام لیتے ہیں اگر اس سے بھی نہ مانے تو بس وہ چپت وہ چپت۔ صاحب قصیدہ بردہ فرماتے ہیں

انفس کا لطف ان تاملہ حب علی حب الرضاع وان تفظمہ بنظم

بس اس کے حظوظ کو تو پورا نہ کرو باقی حقوق ادا کرتے رہو۔ خوب کھلاؤ پلاؤ اور اچھی طرح کام لو۔

کہ مزدور خوش دل کند کار پیش

ہاں جب کسی طرح باز نہ آئے تو اب سزا دو مگر خود سزا نہ دو بلکہ کسی کے حوالے کر دو۔ وہ مناسب سزا تجویز کرے گا۔

فکر خودو رائے خود در عالم رندی نیست کفرست دریں مذہب خود بنی و خودرائی

ور نہ جوڑ کا اپنے ہاتھ سے چپت مارے گا وہ تو آہستہ مارے گا اور محقق سزا کافی دے گا مگر حقوق تلف نہ کرے گا۔ بہر حال نفس کو کافر کہنا گویا اپنے کو کافر کہنا ہے۔ شاید یہ لوگ تو اصحا اپنے نفس کو برا بھلا کہتے ہیں۔ مگر ایسی بھی کیا تو واضح کہ مسلمان سے کافر بن گئے۔

سُورَةُ سَبَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ

ترجمہ: اے داؤد کے خاندان والو تم سب شکر یہ میں نیک کام کیا کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔

تفسیری نکات

حضرت سلیمان علیہ السلام پر خصوصی انعامات

یہ ایک آیت ہے اس میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جو سلیمان علیہ السلام کو دی گئی تھیں وہ آیت یہ ہے۔
 ولسلیمن الریح غدوھا شھر ورواحھا شھر واسلناله عین القطر و من الجن من یعمل بین یدیه باذن ربہ و من یزغ منهم عن امرنا نذقه من عذاب السعیر یعملون له ما یشاء من محاریب و تمایل و جفان کالجواب و قدور رسیئت اعلموا آل داود شکرًا و قلیل من عبادی الشکور (اور سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ بھر کی ہوتی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینہ بھر کی ہوتی اور ہم ان کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں بعض وہ تھے جو ان کے آگے کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم سے اور ان میں سے جو شخص ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا اس کو دوزخ کا عذاب چکھادیں گے وہ جنات ان کے لئے وہ چیزیں بناتے جو ان کو منظور ہوتا اور بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں۔ اے داؤد (علیہ السلام) کے خاندان والو تم سب شکر یہ میں نیک کام کیا کرو) اس کے بعد سلیمان علیہ السلام کو اس آیت میں خطاب ہے اور

ان میں ان کو شکر کی تعلیم ہے مجھے مقصود اس وقت صرف اس جزو کا بیان کرنا ہے اعملوا ال داؤد شکر او قلیل من عبادی الشکور اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو شکر کی تعلیم کی گئی ہے مگر عنوان ایسا ہے کہ تمام خاندان کو حضرت سلیمان کے علاوہ بھی شامل ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انعامات تمام خاندان پر ہیں اس لئے شکر کی بھی سب کو تعلیم دی گئی حالانکہ وہ انعامات خاص سلیمان علیہ السلام کے ساتھ مخصوص ہیں پھر عام عنوان کے ساتھ خطاب کیوں کیا گیا بات یہ ہے کہ خاندان میں جب کسی ایک پر انعام ہوتا ہے تو اس سے سارے خاندان کو نفع پہنچتا ہے اس سے گویا ہر ایک خاص ذات پر انعام ہے مگر حقیقت میں وہ سارے خاندان کو شامل ہے۔ بڑے آدمی سے خاندان کو ایک ادنیٰ نفع تو یہی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے سارا خاندان معظم ہو جاتا ہے ان سب کی عظمت لوگوں کی نگاہوں میں ہوتی ہے۔

خاندان میں ایک شخص کے مقبول ہو جانے سے ظاہری اور معنوی دونوں طرح کے فیض خاندان والوں کو دوسروں سے زیادہ حاصل ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ طالب بھی ہوں اور ان فیوض کے برکات سے فائدہ اٹھانا بھی چاہیں اس لئے حق تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے پورے خاندان کو متنبہ فرمایا کہ یہ انعامات تم سب پر ہیں سب کو ان کا شکر ادا کرنا چاہیے اعملوا ال داؤد شکر مفعول نہیں ہے ورنہ اس کے لئے وا شکر و کافی تھا بلکہ یہ مفعول نہ ہے اور اعملو کا مفعول یہاں وہی مقدر ہے جو اس کے قبل مفلوظ ہے یعنی و اعملوا صالحاً یہاں یہ مفعول نہ اس لئے بڑھایا تاکہ اس سے یہ معلوم ہو جاوے کہ شکر ہی غایت ہے اعمال صالحہ کی یعنی اعمال صالحہ اسی کے لئے وضع کئے گئے کہ شکر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اس سے شکر کا ضروری اور مہتمم بالشان ہونا معلوم ہو گیا ہوگا۔

شکر کا تعلق قول و عمل دونوں سے ہے

فرماتے ہیں اعملوا ال داؤد شکر اے آل داؤد شکر کے لئے عمل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ شکر کا تعلق عمل سے بھی ہے صرف قول ہی سے تعلق نہیں۔ اگر شکر کا تعلق صرف قول سے ہوتا تو اعملوا نہ فرماتے شکر فرماتے۔ پس قرآن میں شکر اعملوا کے لئے فرماتا اس کی صاف دلیل ہے کہ شکر کا تعلق عمل سے بھی ہے اور یہی ہمارے حضرات نے لکھا ہے کہ شکر کا محل عام ہے لسان و قلب و اعضاء سب سے شکر ہوتا ہے اس مضمون کو ایک شاعر نے بھی بیان کیا ہے

افادکم النعماء ثلثة یدى ولسانی والضمیر المحجبا

(اور میری نعمتوں میں سے جو تم کو عطا کی گئی ہیں تین نعمتیں لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچتی ہیں ہاتھ، زبان، دل) اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں و قلیل من عبادی الشکور اس میں حق تعالیٰ بندوں کی شکایت فرماتے ہیں اور ایسی شکایت کہ اگر ہم باغیرت ہوتے تو مر جاتے فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں شکر گزار بہت کم ہیں۔ زیادہ ناشکرے ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی آقا اپنے نوکروں کو سنا کر کہے کہ تمک حلال تو بہت کم ہیں

غیرت مند نو کر اس بات سے زمین میں گڑ جائے گا۔ اس سے بھی یہ بات معلوم ہوگئی کہ شکر فقط زبان سے ہی نہیں ہوتا کیونکہ زبان سے تو اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے ہر آدمی کہہ دیتا ہے اگر شکر کی یہی حقیقت ہوتی تو حق تعالیٰ اتنی بڑی شکایت فرماتے کہ میرے بندوں میں شکر گزار کم ہیں معلوم ہوا کہ شکر کا اطلاق عمل سے ہے اور بیشک عمل کرنے والے بہت تھوڑے ہیں اس لئے یہ شکایت کی گئی (تحقیق المفردات ص ۶۲۲)

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ

ترجمہ: بے شک اس (قصہ) میں ہر صابر و شاکر (مومن) کے لئے بڑی عبرتیں ہیں

تفسیری نکات

اس میں نشانیاں ہیں ہر ایسے شخص کے لئے جو صابر اور شاکر ہو۔ یہ جملہ ایک آیت طویلہ کا جزو ہے اس سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں اور اس کا تمہ اس جملہ کو قرار دیا ہے اور اس مختصر جملہ میں فضیلت اور مدح کے ساتھ دو بڑی چیزوں کا ذکر ہے۔

حاصل مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض آیات قدرت کو بیان فرما کر فرماتے ہیں ان فی ذالک لآیات لکل صبار شکور یعنی ہم نے جو اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں ان کو دیکھتے تو سب ہیں لیکن ان کو آیات قدرت سمجھنا پھر اسے سمجھنے سے مستفیع ہونا ہر ایک کے لئے نہیں۔

انتفاع کی دو شرطیں

بلکہ اس انتفاع کی دو شرطیں ہیں ایک کو لفظ صبار سے تعبیر فرمایا اور دوسری کو شکور سے یعنی جس شخص کے اندر دو صفتیں ہوں اول صبر دوسرے شکر وہی ہماری آیات قدرت سے نفع حاصل کرتا ہے یہ ہے اس آیت کا حاصل اس مقام سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صفتوں کی کس درجہ مدح فرمائی ہے کہ ان کو آیات قدرت سے مستفیع ہونے کا موقوف علیہ قرار دیا ہے اور اسی سے دونوں صفتوں کا وجوب بھی مفہوم ہو گیا ہوگا کیونکہ واجب کا موقوف علیہ واجب ہے اور آیات الہیہ سے اعتبار کا واجب ہونا ظاہر ہے۔

صبر کی حقیقت

سمجھ لینا چاہئے کہ صبر کی حقیقت ہے ضبط النفس علی ما نکرہ یعنی ناگوار امر پر نفس کو جمانا اور مستقل رکھنا آپے سے باہر نہ ہونا اور وہ ناگوار امر خواہ کچھ ہو خواہ کسی کا مرنا ہو یا کوئی اور ناگوار امر ہو چنانچہ مواقع صبر کو کسی قدر سہ کے ساتھ عنقریب بیان کیا جاوے گا اس سے اس کی تعلیم سمجھ میں آ جائے گی اور شکر کہتے ہیں حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر

کرنا خواہ وہ نعمت کھانا ہو یا پانی یا اور شے ہو اور قدر کرنا دل سے بھی اور زبان سے بھی اور دیگر جوارج سے بھی۔ لوگ شکر کی حقیقت صرف اتنی ہی سمجھتے ہیں کہ زبان سے کہہ لیا الحمد للہ یا اے اللہ شکر ہے پس شکر ادا ہو گیا۔

شکر کی حقیقت

شکر یہ ہے کہ قلب اس کا معترف ہو اور منعم حقیقی کی نعمتوں سے متاثر ہو اور زبان اور دیگر جوارج پر بھی اس کا اثر ہو۔ آگے اس کے مواقع بھی بیان کئے جاویں گے۔ اب مواقع صبر و شکر کو سمجھ لیجئے دونوں کی تعریف سے اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا ہوگا کہ صبر کا موقع مصیبت ہے اور شکر کا محل نعمت ہے۔ اتنی بات تو سب کو معلوم ہے لیکن اس میں غلطی یہ واقع ہوئی کہ صبر کا موقع ایک خاص مصیبت اور شکر کا ایک خاص نعمت کو سمجھا ہے اس لئے ان دونوں یعنی مصیبت و نعمت کی حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے۔

نعمت کی حقیقت

نعمت کی حقیقت یہ ہے النعمة حالة ملائمة للنفس نعمت وہ حالت ہے جو نفس کے لئے خوش گوار ہو۔

مصیبت کی حقیقت

اور مصیبت کہتے ہیں حالة غیر ملائمة للنفس مصیبت وہ حالت ہے جو نفس کو ناگوار ہو جس کا تعلق دو چیزوں سے ہوا مصیبت سے بھی اور عبادت سے بھی مصیبت میں تو صبر یہ ہے کہ جزع فزع نہ کرنا اور عبادت میں یہی ہے کہ باوجود ناگواری کے نفس کو اس پر جمانا اور ناگواری کی پروا نہ کرنا چاہئے چنانچہ دونوں کی نسبت ارشاد ہے یا ایہا السنین امنوا الصبروا و صابروا و رابطوا اصبروا تو مصائب میں صبر کرنا اور صابر وادومروں کو صبر کی تعلیم کرنا اور رابطوا عبادت کے اندر جمار ہنا۔

رباط کی تفسیر

چنانچہ رباط کی تفسیر حدیث میں آئی ہے کہ ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کی انتظار میں بیٹھے رہنا اور یہ یہی مفہوم صبر کا ہے مصیبت میں اس کا نام صبر ہوا اور عبادت میں اسی کو رباط سے تعبیر فرمایا۔ پس صاف معلوم ہو گیا کہ صبر کے دو محل ہیں مصیبت اور عبادت۔

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ

أَمِنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جِزَاءٌ الضَّعْفُ بِمَا عَمِلُوا وَ

هُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ ﴿۲۵۹﴾

ترجمہ: اور تمہارے اموال اور اولاد ایسی چیز نہیں جو درجے میں تم کو ہمارا مقرب بنا دے (یعنی مؤثر و علت قرب کی بھی نہیں) مگر ہاں جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے (یہ دونوں چیزیں البتہ سبب قرب ہیں) سو ایسے لوگوں کے لئے ان کے (نیک) عمل کا دو نابلہ ہے اور وہ (بہشت کے) بالا خانوں میں چین سے بیٹھے ہوں گے

تفسیری نکات

قرب کا مفہوم

قرب کے معنی یہ نہیں جو دریا و قطرہ میں سمجھا جاتا ہے اور ایسے الفاظ کو لغوی معنی پر محمول کرنا غلطی ہے۔ بلکہ مراد اس قرب سے جو اس آیت میں مذکور ہے رضا ہے یعنی خدا تعالیٰ کا راضی ہونا مراد ہے کیونکہ قرب کے مختلف درجے ہیں ایک تو قرب علمی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کیساتھ ہر چیز کو حاصل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَنَحْنُ اقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تَبْصُرُونَ اور ارشاد ہے وَنَحْنُ اقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ اور ایک قرب رضا کا ہے اور وہ بعض کو حاصل ہے اور اس آیت میں قرب رضا مراد ہے قرب علم مراد نہیں کیونکہ وہ مومن اور صالح کے ساتھ خاص نہیں اور یہ قرب رضا بڑی دولت ہے مگر اس کو اہل دنیا تو کیا مقصود سمجھتے بہت سے اہل دین بھی پورے طور سے مقصود نہیں سمجھتے۔ پس اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کا طریق بیان فرمایا ہے وَمَا أَمْوَالُكُمْ الْآيَةُ یعنی مال اور اولاد جس کی تحصیل کے پیچھے لوگ پڑے ہیں یہ ذریعہ قرب نہیں ہو سکتے بلکہ ایمان اور عمل صالح اس کے ذرائع ہیں اور ظاہر ہے کہ عمل صالح میں وہی درجہ مطلوب ہوگا جو کامل ہو کیونکہ ناقص پورا پسندیدہ نہ ہوگا اور وہ ذریعہ رضا کا کیسے بن سکتا ہے۔

دین کے شعبے

اور اس کا کامل ہونا موقوف ہے تین چیزوں پر علم و عمل دائم حال اور دین کے یہی شعبے ہیں۔ سوا اگر علم نہیں تو احکام کی اطلاع ہی نہ ہوگی اور اگر عمل نہیں تو اس اطلاع کا نفع کیا ہوگا اور اگر علم نہیں تو اگرچہ بظاہر عمل کا ہونا

کافی معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد یہ حالت بھی کچھ مفید نہیں کیونکہ اس میں خلوص اور بقاء کی امید نہیں اور حال سے مراد ملکہ ہے۔ اس کی ایسی مثال سمجھو کہ اگر کسی سے محبت ہو جاوے اور اس کو کھلا ڈپلاؤ و ایک تو یہ حالت دوسرے یہ کہ اس کی محبت میں بے چینی ہونے لگی پہلی حالت عمل ہے دوسری حالت حال ہے اور پہلی حالت یعنی نرا عمل بلا حال پائیدار نہیں اور حال ہو جانے کے بعد پائیدار ہو جاتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نماز روزہ کرتا ہے لیکن صاحب حال نہ ہونے کی وجہ سے نفس پر جبر کر کے کھینچ تان کرتا ہے اگر ایک وقت چھوٹ بھی جاوے تو کچھ زیادہ قلب نہیں ہوتا اور ایک دوسرے کی یہ حالت ہے کہ اگر ایک وقت نماز بھی چھوٹ جاوے تو زندگی وبال معلوم ہونے لگتی ہے تو یہ دوسرا صاحب حال ہے اسی کو کہتے ہیں۔

بر دل سالک ہزار براں عم بود
گر زبان دل خالے کم بود

حواشی قشریہ میں ہے کہ التصوف تعمیر الظاهر والباطن اور باطن کے متعلق دو چیزیں ہیں ایک عقید اور دوسرے اخلاق ان سب کی اصلاح بھی قرآن میں ہے مگر صوفیہ نے اس کو تصوف سے تعبیر کیا ہے قرآن نے ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کیا ہے تو تصوف کی حقیقت یہ ہے ثمرہ اس کا یہ ہے تقربکم عننا زلفی (طریق القرب ص ۱۸۱۹۱۸)

سُورَةُ فَاطِرٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا

اُولٰٓئِ اَجْنَعًا مَّشٰى وَتَلٰكَ وَرُبِعًا يٰزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①

ترجمہ: تمام تر حمد اسی اللہ کو لائق ہے جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جو فرشتوں کو پیام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو تین تین اور چار چار پر دار بازو ہیں وہ پیدائش میں جو چاہے زیادہ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیری نکات

اقسام توحید و رسالت

اس میں انہوں نے اپنی ان صفات و افعال کا بیان کیا ہے جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں پس اس کا تعلق توحید صفاتی و توحید افعال دونوں سے ہوگا اس کے بعد فرمایا ہے یا ایہا الناس اذکروا نعمت اللہ علیکم هل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض لا الہ الا هو فانی تو فکون۔ اس میں توحید ذاتی و توحید صفاتی و توحید افعال تینوں کا تعلق توحید ہے یہاں توحید کے بعد حق سبحانہ نے مسئلہ رسالت کو بیان فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے ان یکلمہوک فقد کنبت رسل من قبلک والی اللہ ترجع الامور اس کے بعد محاد کا بیان فرمایا ہے۔

تین اہمات مسائل

اور ارشاد فرمایا ہے یا ایہا الناس ان وعد اللہ حق فلا تغربکم الحیوة الدنیا ولا یغرنکم باللہ الغرور۔ (یہ تینوں مسئلے اہمات مسائل میں سے ہیں یہی وجہ ہے کہ حق سبحانہ نے قرآن پاک میں ان تینوں کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور ان پر زبردست براہین قائم کی ہیں امام رازی نے اس پر بجا تشبیہ کی ہے اور انہوں نے ثابت کیا ہے کہ تینوں مسئلے اصل ہیں اور باقی مسائل ان کو فروغ اور یہ مضمون بالکل ٹھیک ہیں جو شخص بامعان نظر قرآن کریم کا مطالعہ کرے گا اس کو اس کی قدر ہوگی اور وہ اس کی تصدیق کرے گا ان تینوں میں سب سے اہم مسئلہ توحید ہے اس کے بعد مسئلہ رسالت اس کے بعد مسئلہ معاذ اس لئے حق سبحانہ نے اس مقام پر اول مسئلہ توحید کو بیان فرمایا اس کے بعد مسئلہ رسالت کو اسکے بعد مسئلہ معاذ کو۔ اس گفتگو کا تعلق تو نوعیت مضمون آیت سے تھا اب اس کا مضمون شخصی بیان کیا جاتا ہے اس آیت میں جو حق تعالیٰ شانہ نے ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فرمایا ہے جس میں انہوں نے کلمہ بالاستعمال فرمایا ہے جو ابہام کے ساتھ عموماً کا فائدہ دیتا ہے پھر اس ابہام کی توضیح میں من رحمۃ فرمائی ہے۔ پس حاصل اس جملہ کا یہ ہوگا کہ حق سبحانہ جس رحمت کو بھی کھول دیں اس کا کوئی روکنے والا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا کمال غلبہ و قدرت

اس سے حق سبحانہ کا کمال قدرت و غلبہ ظاہر ہوا اور معلوم ہو گیا کہ اس سے بڑھ کر کوئی قوت اور قدرت والا نہیں جو اس کا مزاحم ہو سکے اور گواہی طور پر اس پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا مگر سطح نظر میں اور محض احتمال عقلی کے طور پر شبہ ہو سکتا تھا اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ فتح حق سبحانہ کے بعد کوئی روکنے والا نہیں لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے روکنے کے بعد کوئی کھول بھی نہیں سکتا اس لئے حق سبحانہ نے اس احتمال کو ہی دفع کر دیا اور فرمایا وما یمسک فلما مرسل لہ یعنی جس کو وہ روک لیں اس کو کوئی چھوڑنے والا بھی نہیں۔ اب یہی ایک احتمال عقلی باقی تھا وہ یہ کہ اس سے تو معلوم ہوا کہ اس کے فتح اور امساک کے بعد اس کی کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود فتح و امساک کی حالت میں بھی اس کا کوئی مزاحم ہو سکتا ہے یا نہیں اس احتمال کے اٹھانے کے لئے فرمایا وهو العزیز یعنی عزت و غلبہ عین منحصر ہیں اس کی ذات میں اور وہی ہر حیثیت سے سب پر غالب ہے اس پر کسی طرح بھی کوئی غالب نہیں اب تمام احتمالوں کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا تفرق بالغلبہ با کمال وجہ ظاہر ہو گیا یہ تو ہو گیا مگر اس پر ایک شبہ اور ہو سکتا تھا وہ یہ کہ جب اس کو ایسی قدرت اور قوت حاصل ہے اور اس کی کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا تو شاید اس کی بھی وہی حالت ہو جو با اقتدار انسانوں کی ہوتی ہے کہ بلا لحاظ مصلحت و منفعت جو جی میں آیا کر بیٹھے اس کے دفع کے لئے اکلیم بڑھا دیا اور ظاہر کر دیا کہ ہمارے افعال لا ابالی حکام و سلاطین کے سے نہیں بلکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں ہم کو مصلحت و حکمت

لمحوظ ہوتی ہے سبحان الذی نکلم بهذا الکلام البلیغ الدقیق الاسرار.

اس بیان سے معلوم ہو گیا کہ جملہ مایمسک فلا مرسل له اور وهو العزیز الحکیم یہ دونوں جملہ تاکید میں مضمون مایفتح اللہ للناس من رحمة فلاممسک له کہ جن سے مقصود تمام اوہام و شکوک کو زائل کر اپنی کمال قدرت و حکمت کا ظاہر کرنا ہے جو اصل مقصود ہے اس آیت کا تو یہ بیان تھا حق سبحانہ کے عموم و کمال قدرت کا جو کہ اس آیت سے مقصود ہے اب سنئے کہ رحمت کے لغوی معنی رقت قلب اور نرم دلی ہیں حق سبحانہ چونکہ دل اور نرمی سے جو کہ ایک خاص قسم کا تاثر اور انفعال ہے پاک اور منزہ ہیں اس لئے یہ لفظ اس مقام پر یا جہاں کہیں وہ حق سبحانہ کے لئے استعمال کیا جاوے جیسے رحمن رحیم وغیرہ اپنے معنی لغوی میں مستعمل نہیں ہو سکتا بلکہ مجازاً و تیسبیت اثر رقت قلب یعنی فضل و انعام احسان مراد ہوگا اس مقام پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حق سبحانہ نے مایفتح اللہ للناس من رحمة فرمایا اور من خیر نہیں فرمایا حالانکہ مطلب من خیر کا بھی وہی ہے جو من رحمة کا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت میں اشارہ ہے اس طرف کہ حق سبحانہ کے تمام انعامات بلا استحقاق منعم علیہم پر ہیں اور یہ اشارہ لفظ خیر میں نہ تھا اس لئے اس کے بجائے اس کو اختیار کیا چونکہ اس مضمون کو سن کر کہ حق سبحانہ کے تمام احسانات بلا استحقاق منعم علیہم پر ہیں کسی کو خلیجان ہونا اس لئے میں اس کو بھی زائل کئے دیتا ہوں یہ شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ حق سبحانہ کے انعامات کو بندوں کے انعامات کے مماثل سمجھا گیا ہے اور اپنی طاعت کو طاعت عباد کی مانند خیال کیا گیا لیکن خود یہ قیاس ہی غلط ہے کیونکہ آدمی جب بندہ کی خدمت کرتا ہے تو وہ اپنے قوی اور اعضاء وغیرہ کو ایک ایسے شخص کے کام میں لگاتا ہے جو اس کے مملوک و مصنوع ہیں اور اس لئے اس کو ان سے انتفاع کا کوئی حق بھی نہیں ہے اس بنا پر خادم مخدوم سے معاوضہ کا مستحق ہوتا ہے بخلاف اس کے کہ جب وہ حق سبحانہ کی خدمت اور اطاعت کرتا ہے تو وہ خود حق سبحانہ کی مملوک چیزوں کو اس کے کام میں لگاتا ہے اور وہ خود بھی حق سبحانہ کا مملوک ہے ایسی صورت میں وہ اپنی خدمت کے کسی معاوضہ کا مستحق نہیں ہو سکتا کیونکہ مملوک من حیث ہو مملوک کا مالک پر کوئی حق نہیں یہ مضمون آپ کی سمجھ میں یوں آسانی سے آجائے گا کہ جب کوئی شخص کسی کی ملازمت کر لیتا ہے تو اب وہ من حیث الخدمت اس کا مملوک ہو جاتا ہے خواہ عارضی ہی طور پر سہی پس جب وہ کوئی اپنا فرض منصبی انجام دیتا ہے تو اس کے معاوضہ میں وہ کسی معاوضہ کا مستحق نہیں سمجھا جاتا ایسی حالت میں اگر آقا اسکی خدمت کا کوئی صلہ دے تو وہ اس کا انعام اور احسان سمجھا جاتا ہے اور اپنی خدمت کو اپنا فرض منصبی خیال کیا جاتا ہے پس جب کہ اس کمزور اور برائے نام ملک کا یہ اثر ہے تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ملک حقیقی پر اپنی خدمت کے کسی معاوضہ کا کیا حق رکھ سکتا ہے اب ہم کو یہ ثابت کرنا رہ گیا کہ بندہ حق سبحانہ کا مملوک محض ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی شخص کی کوئی چیز کسی کی ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے کیونکہ وہ ابتدا میں معدوم محض اور اپنے تمام کمالات حتی کہ اپنی ہستی سے بھی

عاری تھا ایسی حالت میں اس کی کوئی چیز خود اس کی ذاتی کیسے ہو سکتی ہے پس لامحالہ اس کی تمام چیزیں کسی دوسرے کی مملوک ہیں اور خدا کے سوا اگر کوئی اس کے مالک ہونے کا مستحق ہو سکتا ہے تو اس کے ماں باپ ہو سکتے ہیں کیونکہ ان سے زیادہ اس کی ہستی میں کسی کو دخل نہیں ہے حتیٰ کہ اسی دخل کی بنا پر بعض لوگوں کو شبہ ہو گیا اور وہ اپنا خالق اپنے ماں باپ کو سمجھ بیٹھے ہیں۔

آیت متلوہ کی عجیب و غریب تفسیر

کہ حق سبحانہ نے جس طرح اس آیت میں اپنے عموم قدرت و قہر غلبہ کو صراحتاً بیان فرمایا ہے یوں ہی انہوں نے اس میں اپنے کمال جو دو کرم کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ آیت میں جملہ اولیٰ میں فتح کے مقابلہ میں امساک لائے ہیں اور امساک کے مقابلہ میں فتح اور جملہ ثانیہ میں امساک کے مقابلہ میں ارسال لائے ہیں اور ارسال کے مقابلہ میں امساک۔

پس اس میں دو امر خلاف ظاہر ہیں ایک تو جملہ اولیٰ میں فتح کے مقابلہ میں امساک اور امساک کے مقابلہ میں فتح لانا کیونکہ فتح کا مقابلہ غلق ہے نہ کہ امساک اور امساک کا مقابلہ ارسال ہے نہ کہ فتح اور دوسرا یہ کہ جملہ ثانیہ مقابلہ ہے جملہ اولیٰ کا اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فتح کا مقابلہ غلق ہے نہ کہ امساک۔

پس جملہ اولیٰ میں ما یفتح اللہ فرمایا اور اس کے مقابلہ میں جملہ ثانیہ میں ما یسک فرمایا خلاف متضائے تقابل ہے اس بنا پر آیت مذکورہ پر شبہ ہوتا ہے کہ اس میں رعایت نہیں رکھی گئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ رعایت معنوی چونکہ رعایت لفظی پر مقدم ہے اور رعایت معنوی عدم لحاظ تقابل میں تھی اس لئے اس کا لحاظ نہیں کیا گیا تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس آیت سے جس طرح اظہار کمال قدرت مقصود ہے یوں ہی اس میں رعایت کرم اور کمال جو دو کی طرف بھی اشارہ ہے پس جملہ اولیٰ میں بجائے لفظ ارسال کے فتح کا لفظ اس واسطے استعمال کیا گیا ہے کہ گو یہ دونوں لفظ اطلاق پر دلالت کرتے ہیں مگر جو دلالت اطلاق پر لفظ فتح کرتا ہے وہ دلالت لفظ ارسال نہیں کرتا اس لئے ما یفتح اللہ میں اشارہ ہوگا اس طرف کہ جب حق سبحانہ کسی پر رحمت کرتے ہیں تو بہت اور بے دریغ کرتے ہیں اور یہ اشارہ ارسال میں نہ تھا اس لئے بجائے ارسال کے فتح لایا گیا اور بجائے غلق کے امساک کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ جس قدر کمال قدرت نفی مسک سے ظاہر ہوتا ہے اس قدر نفی عالق سے ظاہر نہیں ہوتا کیونکہ غلق خاص ہے اور امساک عام اور نفی عام تو نفی خاص کو مستلزم ہے مگر نفی خاص نفی عام کو مستلزم نہیں اور جملہ ثانیہ میں لفظ امساک بجائے غلق کے اس لئے لایا گیا ہے کہ وہ دلالت کرتا ہے کرم پر کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق سبحانہ جب کسی پر انعام نہیں کرتے تو یہ اس کا بند کرنا نہیں ہوتا کہ نہر جاری نہ ہو بلکہ کسی وجہ سے عارضی طور پر روک لیتا ہوتا ہے اور زوال عارض کے بعد پھر اسکا اجرا ہو جاتا ہے ما یفتح اللہ للناس من رحمة فلا غالق لہا اس لئے نہیں کہا کہ اس میں گو کثرت جو دو کی طرف اشارہ ہے مگر اس سے کمال قدرت کا

اظہار نہیں ہوتا کیونکہ نفی غائق کے لئے نفی مسلک لازم نہیں اور مایرسل اللہ للناس من رحمة فلامسک لها اس واسطے نہیں فرمایا گو اس میں کمال قدرت کا اظہار ہے مگر اس سے کمال جو مفہوم نہیں ہوتا اور مایرسل اللہ للناس من رحمة فلاغائق اس واسطے نہیں فرمایا کہ نہ اس میں کمال قدرت کا اظہار ہے اور نہ کمال جو کی طرف اشارہ اور مایخلق فلاقائق لہ اس واسطے جو کہ ادنیٰ ہے غلق سے نیز اس میں کمال قدرت پر بھی دلالت نہیں ہے کیونکہ نفی فاق مستلزم نفی مرسل نہیں ہے۔

مایخلق فلامرسل لہ اس واسطے نہیں فرمایا گو اس میں کمال قدرت پر دلالت ہے مگر حق سبحانہ غلق رحمت نہیں فرماتے اور مایمسک فلاقائق لہ اس واسطے نہیں فرمایا کہ اس میں کمال قدرت پر دلالت نہیں ہے اس تفصیل کے بعد آیت کا حاصل یہ نکلا کہ حق سبحانہ جب کسی پر کوئی عنایت کرتے ہیں تو بے دریغ کرتے ہیں اور خود ان کی طرف سے کوئی روک نہیں ہوتی اور جس کسی پر وہ عنایت کرتے ہیں اس کا کوئی بند کرنے والا تو درکنار روکنے والا بھی نہیں ہوتا اور جس پر وہ رحمت نہیں کرتے تو وہ اس کو بند نہیں کرتے بلکہ کسی عارض کی وجہ سے روک لیتے ہیں اور اگر وہ عارض زائل ہو جاوے تو پھر جاری فرما دیتے ہیں اور فلامرسل لہ من بعدہ میں مضاف مخدوف ہے ای من بعدہ اس کا کہ چونکہ مضاف بلا ذکر بھی سمجھا جاتا تھا اس لئے اس کو حذف کر دیا گیا غرضیکہ قرآن میں لفظی و معنوی دقایق بے انتہا ہیں۔ اس آیت میں یہ فرما دیا کہ وہ بڑے قادر ہیں جو کام بند ہو اس کو جاری بھی کر سکتے ہیں اور اگر بند ہونے میں یہ شبہ ہو کہ اس سے تو دین میں نقصان ہوگا تو انکیم میں فرما دیا کہ ہم حکیم بھی ہیں اگر بند ہی کر دیں تو اسی میں حکمت ہوگی۔

فِيهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا

ترجمہ: تو تمام تر عزت خدا ہی کے لئے ہے

تفسیری نکات

عظمت خداوندی

کیونکہ ایسی بڑائی تو صرف اللہ ہی کے لئے ہے کہ ان کے ذمہ کسی کا حق نہ ہو چنانچہ ارشاد ہے ولہ الکبرياء في السموات والارض یعنی بڑائی تو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔ یہاں بڑائی کا حصر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کے لئے کیونکہ اس آیت میں لہ معمول مقدم ہے اور معمول کا مقدم کرنا حصر کے لئے مفید ہوتا ہے۔ یہ دلیل ہے حصر کی۔ تو ترجمہ اس آیت کا یہ ہوا کہ خدا ہی کے لئے بڑائی ہے اوروں کے لئے نہیں۔ اس طرح ایک جگہ ارشاد ہے فلي لله العزة جميعا وہاں بھی للہ کو حصر ہی کیلئے مقدم فرمایا گیا ہے اور یہاں ایک شبہ بھی ہو سکتا

ہے اسکو بھی رفع کئے دیتا ہوں کیونکہ ممکن ہے کسی طالب علم کو یہ شبہ پیدا ہوا ہو کہ وہ شبہ یہ ہے کہ جہاں ایک جگہ یہ فرمایا ہے **فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا** وہاں دوسری جگہ یہ بھی فرمایا کہ **وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ** یعنی عزت اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے تو عزت کا حصر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کے لئے کہاں رہا وہ تو رسول کے لئے بھی اور مؤمنین کے لئے بھی ثابت ہوگئی جو اب یہ ہے کہ دوسروں کے لئے جو عزت ہے تو کیوں ہے وہ اس تعلق ہی کی وجہ سے ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ غرض عزت بالذات تو حق تعالیٰ ہی کیلئے ہے لیکن چونکہ ان دوسروں کو تعلق ہے ایک عزت والے کے ساتھ اس لئے اس عزت کی نسبت ان کے ساتھ بھی ہوگئی تو اصل میں تو عزت حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے لیکن چونکہ رسول کو اور مؤمنین کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہے اس لئے وہ ان کو بھی حاصل ہوگئی ہے جیسے اصل میں نور تو آفتاب ہی کا ہے لیکن جن دوسروں چیزوں سے اسکو محاذات کا تعلق ہے وہ بھی منور ہو گئیں۔ اب خود پرستوں نے ان اصولوں کو تو غائب کر دیا اور بس یہ ناز ہے کہ ہم بڑے ہیں شیخ ہیں رئیس ہیں۔ خاک پتھر ہیں۔ اگر اپنے آپ کو مٹایا نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ دیکھئے لو ہے کو بہت دیر تک آگ میں رکھے تو وہ سرخ اور گرم ہو کر آگ کی شکل اور اسکی صفات اختیار کر لیگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ آگ ہو گیا لوہا نہ رہا بلکہ دیر تک آگ میں رہنے سے لوہے کو اوصاف بدل گئے گو ماہیت نہیں بدلی اسی طرح فنا کے اندر ذات نہیں بدلتی اوصاف بدلتے ہیں کیونکہ بہر حال حادث حادث ہی رہتا ہے اور ممکن ممکن ہی۔ اسی کی ذات نہیں بدلتی اوصاف بدلتے ہیں۔ جیسے لوہا آگ میں رہنے سے آگ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اسی رنگ کو کہتے ہیں صبغة اللہ و من احسن من اللہ صبغة اس ناز پر یاد آیا ایک نوجوان اینٹھتا ہوا چلا جا رہا تھا ایک بزرگ نے اسکو نصیحت کی کہ بھائی اینٹھ کر نہ چلو سنبھل کر چلو وہ کوئی بڑا آدمی تھا اس کو ان کا یہ کہنا ناگوار ہوا کڑک کر جواب دیا کہ تم جانتے نہیں میں کون ہوں ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں میں خوب جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔ اولک نطفة مذکورہ۔ و آخرک جيفة قذره۔ دامت بین ذلک تحمل العذره۔ یعنی تمہاری شروع کی حالت تو ایک ناپاک نطفہ کی ہے اور اخیر کی حالت ایک گندی لاش ہے اور ان دونوں کے درمیان کی حالت یہ ہے کہ پانچ سیر پاخانہ بھی شکم شریف میں ہر وقت موجود ہے میں آپ کو خوب پہچانتا ہوں (الافاضات الیومیہ ج ۱ ص ۲۶۶-۲۶۷)

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔ واقعی اللہ زبردست بڑا بخشنے والا ہے۔

تفسیری نکات

علماء صاحب خشیت ہیں

بعض نے اس کے ساتھ ایک اور مقدمہ ملا دیا۔ ذلک لمن خشى ربه (یہ اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے) جس کا حاصل یہ ہوا کہ علماء صاحب خشیت ہیں اور صاحب خشیت کے لئے جنت اور رضائے حق حاصل ہوتی ہے تو علم سے جنت اور رضا حاصل ہوتی ہے۔ یہ حساب تو واقعی درست ہے مگر یہ حد اوسط پہلے تحقق ہونا چاہیے کہ واقع میں بھی تو خشیت ہو ورنہ محض باتوں سے کیا ہوتا ہے کہیں باتوں سے بھی خشیت پیدا ہوئی ہے و جائزۃ دعوی المحبة فی الهوی ولكن لا یخفی کلام المنافق۔

خشیت کی علامت

پس خشیت کے متعلق بھی حدیث و قرآن سے معلوم کرنا چاہیے کہ شریعت نے حصول خشیت کی علامت کیا بتلائی ہے سنیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اسئلک من خشیتک ما تحول به بینی و بین معاصیک

(میں تجھ سے اتنے خوف کی درخواست کرتا ہوں جو میرے اور میرے معاصی کے درمیان حائل ہو جائے)

اس سے معلوم ہوا کہ خشیت مطلوبہ وہ ہے جس سے گناہوں میں حیولت ہو جائے۔ پس جس کو یہ حیولت حاصل نہیں اسے خشیت مطلوبہ حاصل نہیں اور جب خشیت نہیں تو اس کے پاس علم حاصل ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں جس پر وہ علم کا دعویٰ کر سکے۔ بعض علم مطلوب گو کتابی علم حاصل ہو مگر شریعت میں جو علم مطلوب ہے وہ یہ کتابی محض نہیں ہے بلکہ علم مطلوب وہ ہے جو دل میں اتر جائے اور اس علم کے لئے خشیت لازم ہے۔

گو اس آیت کا اول نظر میں یہ مدلول نہیں بلکہ اسکا مدلول تو عکس ہے یعنی خشیت کے لئے علم لازم ہے کیونکہ وہ خشیت کا موقوف علیہ ہے اور وجود موقوف کا مستلزم ہے وجود موقوف علیہ کو تو اس آیت سے علم خشیت کے لئے مستلزم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن ایک حقیق تحقیق سے جو کہ ختم بیان کے قریب مذکور ہوگی۔ خود آیت سے بھی اور قطع نظر اس تحقیق کے دوسرے دلائل سے یہ اتلزام ثابت ہے کہ اگر خشیت حائلہ بین العاصی

وبین المعاصی (گناہ گار اور گناہوں کے درمیان حائل ہونے والی) حاصل نہ ہو تو اسے علم مطلوب بھی حاصل نہیں چنانچہ حدیث۔

لا یزنی الزانی وهو مومن (کوئی زانی زانیہ نہیں کرتا اس حال میں کہ وہ مومن ہو) اس کی دلیل ہے۔ باقی اور اصل مقصود وہ علم ہے جس کے ساتھ قلب میں خشیت بھی پیدا ہو۔ اس کا حاصل کرنا بھی ہر شخص کے ذمہ ضروری ہے۔ مگر عادتاً یہ بدوں صحبت شیخ کے حاصل نہیں ہوتی اس کے لئے قال و قیل کو کچھ دنوں کے لئے ترک کرنا اور کسی شیخ کی جو تیاں سیدھی کرنا شرط ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں۔

از قال و قیل مدرسہ حالے ولم گرفت حالے امالہ ہے حالا کا
از قال و قیل مدرسہ حالے ولم گرفت یک چند نیز خدمت معشوق می کنم
(مدرسہ کے قیل و قال سے اب میرا دل رنجیدہ ہو گیا۔ اب کچھ دنوں شیخ کمال کی خدمت کرتا ہوں)
قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کالے پامال شو
(یعنی قال کو چھوڑو حال پیدا کرو۔ یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑ جاؤ)
مگر اس میں ایک ترتیب بھی ہے اور وہ ترتیب ہر شخص کے لئے جدا ہے اس کو میں اس مجلس میں بیان نہیں
کر سکتا۔ اس کو صحبت شیخ پر رکھو جب تم کسی سے رجوع کرو وہ خود ترتیب بتلا دے گا۔

ایک علمی اشکال

اب میں ایک طالب علمانہ اشکال کا جواب دینا چاہتا ہوں جو اس آیت پر وارد ہوتا ہے۔ یہ جواب ابھی کوئی دس بارہ دن ہوئے قلب پر وارد ہوا ہے اس سے پہلے اس کی طرف ذہن نہیں گیا۔ اشکال کا حاصل یہ ہے کہ میں نے تو اب تک خشیت کو لوازم علم سے کہا تھا کہ علم جب ہوگا خشیت ضرور ہوگی اور انتفاء خشیت انتفاء علم کی دلیل ہے کیونکہ انتفاء لازم سے انتفاء ملزم ضروری ہے مگر آیت کے الفاظ اس کو مفید نہیں کیونکہ۔

انما یخشى الله من عباده العلماء (اللہ تعالیٰ سے عالم ہی اس کے بندوں میں سے ڈرا کرتے ہیں)
میں انما لفظ حصر ہے جس سے یہ معنی حاصل ہوئے کہ خشیت من اللہ علماء میں منحصر ہے یعنی جہلاء کو خشیت نہیں ہوتی (کیونکہ بقاعدہ بلاغت یہاں قصر صفت علی الموصوف ہے جیسے انما یقول زیلاً اور انما یتذکر اولوا الالباب میں۔ کہ مثال اول میں قیام زید کا اثبات اور اس کے ماسوا کی نفی ہے کہ عمرو بکرو غیرہ قائم نہیں ہیں اور مثال ثانی میں تذکر کا عقلاء کے لئے اثبات ہے اور غیر عقلاء سے تذکر کی نفی ہے اسی طرح یہاں خشیت کا علماء کے لئے اثبات اور غیر علماء سے خشیت کی نفی ہے (۱۲)

حاصل جس کا یہ ہوا کہ خشیت علم کے بغیر نہیں ہوتی یعنی خشیت کے لئے علم شرط ہے علت نہیں اور وجود

شرط سے وجود مشروط لازم نہیں۔ ہاں انتفاء شرط سے مشروط معدوم و منتفی ہو جاتا ہے اور علت میں اس کا عکس ہے کہ وجود علت سے وجود معلول ضروری ہے اور انتفاء علت سے انتفاء معلول لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ کسی دوسری علت سے اس کا وجود ہو گیا ہو۔ معلول واحد کے لئے علل متعددہ ہو سکتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے۔ باقی یہ لازم نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں خشیت بھی ضرور ہو تو آیت سے یہ ثابت نہ ہوا کہ علم خشیت کو مستلزم ہے بلکہ یہ ثابت ہوا کہ خشیت علم کو مستلزم ہے کیونکہ وجود مشروط وجود شرط کو مستلزم ہے حالانکہ عام طور پر اس آیت سے علم کی فضیلت اس تقریر سے ثابت کی جاتی ہے کہ علم اس لئے ضروری ہے کہ اس سے خشیت پیدا ہوتی ہے جو کہ ضروری ہے اور اب اس کے برعکس یہ تقریر ہوئی کہ علم اس لئے ضروری ہے کہ بدوں اس کے خشیت پیدا نہیں ہوتی۔ تو مشہور تقریر صحیح نہ ہوئی۔

یہ اشکال ذہن میں عرصہ دراز سے تھا مگر جواب ابھی دس بارہ دن ہوئے ذہن میں آیا ہے۔ نہ معلوم اب تک ذہن میں یہ اشکال کیوں رہا۔ کیا جواب کی طرف التفات نہیں ہوا جواب شافی اب تک نہ ملا تھا۔ بہر حال اب جواب ذہن میں آ گیا ہے۔

حاصل جواب کا یہ ہے کہ قرآن کا نزول محاورات کے موافق ہوا ہے۔ اسالیب معقول پر نہیں ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن سے قضا یا عقلیہ کی نفی ہوتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ قضا یا عقلیہ سے قضا یا نقلیہ کا تعارض جائز نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے دلالات قرآنیہ میں محاورات کا لحاظ کیا گیا ہے اصطلاحات معقول کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ پس یہ ہو سکتا ہے کہ اسلوب معقول سے ایک کلام کی دلالت کسی خاص معنی پر ہو اور اسلوب محاورہ سے دوسرے معنی پر دلالت ہو اور مقصود ثانی ہونہ کہ اول پس بطریق اسلوب معقول تو وہ اشکال وارد ہوتا ہے مگر بطریق اسالیب محاورات یہ اشکال نہیں پڑتا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ گونا گوار میں اس ترکیب سے خشیت کا مستلزم علم ہونا مستفاد ہوتا ہے نہ کہ علم کا مستلزم خشیت ہونا۔ مگر محاورات میں اس ترکیب سے علم کا مستلزم خشیت ہونا بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر دوسری آیت میں ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ادفع بالتي هي احسن فاذا الذي بينك وبينه عداوة كانه ولي حميم وما يلقها الا الذين صبروا
بدی کو اچھے برتاؤ سے دفع کرو۔ پھر دفعہ وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی گویا خالص دوست ہو جائے گا اور یہ بات انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صابر ہیں۔

یعنی بدی کا بدلہ بھلائی سے صابرین ہی کر سکتے ہیں۔ یہاں بھی وہی ترکیب جو انما یخشى الله من عباده العلماء (اللہ تعالیٰ سے علم والے ہی ڈرا کرتے ہیں) میں ہے۔ کیونکہ نفی کے بعد استثناء موجب صبر ہے مگر اس آیت سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ صبر کو اس وصف میں خال دخل ہے اور یہ کہ صبر ہی سے یہ بات

حاصل ہوتی ہے ورنہ بظاہر اسلوب عقلی کے مطابق تو معنی یہ ہوتے ہیں کہ صبر کے بدوں یہ بات نصیب نہیں ہوتی گویا صبر اس صفت کے لئے شرط ہے اور وجود شرط کافی ہے مگر کمال ایمان کے واسطے یہ خشیت کافی نہیں۔ بلکہ اس کے لئے خشیت عالی کی ضرورت ہے جس میں ہر وقت عظمت و جلال خداوندی کا استحضار رہتا ہے جہنم کا عذاب ہر دم پیش نظر رہتا ہے اور اسی درجہ کمال سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لا یزنی الزانی حین یزنی و هو مومن

(نہیں زنا کرتا زانی جب کہ وہ زنا کرتا ہے کہ مومن ہو یعنی زنا کی حالت میں ایمان نہیں رہتا)

یہاں محض ایمان اعتقادی مراد نہیں جس کے ساتھ اعتقادی خشیت ہوتی ہے بلکہ ایمان کامل مراد ہے جس کے ساتھ خشیت حالی ہوتی ہے اب مخالفین اسلام کا یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن زنا نہیں کر سکتا اور ہم بہت سے مسلمانوں کو زنا کار دیکھتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس میں مومن اعتقادی مراد نہیں بلکہ مومن حالی مراد ہے۔

غرض اس آیت میں علماء کی بھی اصلاح ہو گئی اور عوام کی بھی اصلاح ہو گئی اور میری تقریر سے سائلین کے شبہات بھی رفع ہو گئے اور مخالفین اسلام کے بھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دلالت حکمیہ کے اعتبار سے تو اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ علم خشیت کو مستلزم ہے اور دوسری ترکیب سے جس کو دلالت لفظیہ کہنا چاہیے یہ معنی ہوئے کہ خشیت علم کو مستلزم ہے گویا طرفین سے تلازم ہے اگر کسی میں علم ہے تو ان شاء اللہ علم سے خشیت پیدا ہو جائے گی اور کسی میں خشیت ہے تو وہ خشیت علم کی طرف متوجہ کر دے گی تو یہ تلازم ایسا ہو گیا جیسا ایک شاعر نے کہا ہے

بخت اگر مد کندا منش آورم بکف گر بکشد ذہے طرب و رکشم زہے شرف

(خوش قسمتی ہے کہ ان کا دامن ہاتھ آ جائے اور پھر وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہے ہم کھینچ لیں تب بھی)

مقصود دونوں حالتوں میں حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے علم کو مقدم کر دیں اور خشیت کو مؤخر چاہے برعکس اور ایک حقیقت یہاں ایسی ہے کہ اس کے اعتبار سے اگر چاہیں دونوں کو ساتھ کر دیں کیونکہ دو چیزوں میں تقدم و تاخر بالذات اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ایک علت ہو اور ایک معلول ہو اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کسی تیسری شے کے معلول ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ دونوں چیزیں معاً موجود ہوتی ہیں تقدم و تاخر باقی نہیں رہتا تو یہاں بھی ایک تیسری شے ایسی ہے جو علم و خشیت دونوں کی علت بن سکتی ہے وہ کیا ہے جذبہ حق عنایت حق اگر جذبہ حق متوجہ ہو جائے تو اس صورت میں یہ دونوں ایک دم سے پائے جائیں گے۔ علم بھی اور خشیت بھی تو اب حق تعالیٰ سے دعا کرو کہ دونوں کو ایک دم ہی سے عطا فرمادیں۔

خشیت کی ضرورت

صرف ایک جزو آیت کا رہ گیا ہے اس کے متعلق بھی ایک مختصر بات کہہ دوں گا اسکے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان اللہ عزیز غفور بے شک اللہ تعالیٰ زبردست بہت بخشنے والے ہیں۔
 اوپر تو علم کی فضیلت مذکور تھی کہ علماء ہی حق تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ اب اس جملہ میں خشیت کی ضرورت بیان فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے ڈرنے کی بہت ضرورت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں۔ یہ تو ترہیب تھی آگے ثمرہ خشیت مذکور ہے کہ وہ غفور ہیں۔ اپنے سے ڈرنے والوں کو بخش دیتے ہیں اس میں بتلادیا کہ خشیت کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ اس سے مغفرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ترغیب ہے یا یوں کہا جائے کہ عزیز میں اپنا مالک ضرر ہونا بتلایا ہے اور غفور میں مالک نفع ہونا اور ان دونوں سے خشیت کی ضرورت یوں ثابت ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ سے ڈرنا اس لئے ضروری ہے کہ ضرور نفع سب ان کے ہاتھ میں ہے کہیں وہ تم کو مضار میں مبتلا اور منافع سے محروم نہ کریں۔

علم اور خشیت

چنانچہ حق تعالیٰ اس کی تصریح فرماتے ہیں انما یخشى اللہ من عباده العلماء اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علم خشیت کے لئے شرط ہے علت نہیں ہے اس کی تفسیر میں لوگ غلطی کرتے ہیں کہ علم کو علت خشیت سمجھتے ہیں اس لئے اس پر یہ اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ آیت کا مقتضا تو یہ ہے کہ کوئی عالم خشیت سے خالی نہ ہو اور کسی مولوی سے گناہ کا صدور نہ ہو حالانکہ اس کے خلاف مشاہدہ ہوتا ہے یہ اشکال پہلے مجھے بھی ہوتا تھا پھر خود بخود قلب پر یہ بات وارد ہوئی کہ اس حصر کا مفہوم تو یہ ہے کہ لا یخشى اللہ من عباده الا العلماء جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ”لا خشية الا بالعلم نہ کہ لا علم الا بالخشية پس یہ حصر ایسا ہو گیا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لا صلوة الا بطہور کہ نماز بدوں وضو کے نہیں ہوتی جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کا جہاں وجود ہوگا وضو کے ساتھ ہوگا بدوں وضو کے نہ ہوگا یہ تو مطلب نہیں کہ جب وضو کا وجود ہو تو اس کے ساتھ نماز کا وجود بھی لازم ہو اسی طرح یہاں پر علم شرط خشیت ہے کہ جہاں خشیت ہے وہاں علم ضرور ہے گو وہ مولوی بھی نہ ہو کیونکہ جاہل بھی خدا سے ڈرتا ہے تو اسے کم از کم عذاب علی کا علم ہے تو خشیت بدوں علم کے اس کو بھی نہیں ہوتی باقی یہ ضرور نہیں کہ جہاں علم ہو وہاں خشیت لازم ہو کیونکہ خشیت علم کی علت نہیں اور علت کا وجود تو معلوم کے وجود کو مستلزم ہوتا ہے مگر شرط کا وجود شرط کے وجود کو مستلزم نہیں ہوتا ہاں انتفاء شرط انتفاء شرط کو پیشک مستلزم ہوتا ہے سو ایسی نظیر کوئی نہیں دکھا سکتا کہ کہیں خشیت کا وجود بدوں علم کے ہو گیا ہو تو علم لو از م خشیت سے ہوا نہ کہ خشیت لو از م علم سے۔

خشیت کے لئے علم ضروری ہے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ جس وعظ پر میں آج کل نظر اصلاحی کر رہا ہوں اس میں انما یخشى اللہ من عباده العلماء کی تفسیر میں نے بیان کی ہے۔ علم کے لئے خشیت لازم سمجھتے ہیں یہ آیت کا مدلول ہی نہیں

اور دعواً بھی صحیح نہیں تخلص مشاہد ہے البتہ خشیت کے لئے علم شرط ہونے کی وجہ سے لازم ہے اور یہی مدلول ہے آیت کا غرض یہ تو ممکن ہے کہ علم ہو اور خشیت نہ ہو مگر یہ ممکن نہیں کہ خشیت ہو اور علم نہ ہو خواہ وہ علم درس سے حاصل نہ ہوا ہو۔ آخر جب کسی خوف کی چیز کو جانتا ہی نہیں اس کا علم ہی نہیں تو خوف کس چیز سے ہوگا خلاصہ یہ ہے تقریر کا کہ علم خشیت کی شرط ہے اس کی علت نہیں جب یہ بیان ہو رہا تھا طلبہ منہ تک رہے تھے کہ یہ کیا بیان ہو رہا ہے بعد وعظ کے بعض طلبہ نے کہا کہ ہم تو بڑی غلطی میں مبتلا تھے میں نے کہا تم کیا بعض بڑے بڑے علماء اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ علم صحیح دل میں ڈال دیتے ہیں۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ

ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ يُآذِنُ

اللَّهُ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے (تمام دنیا کے بندوں سے) پسند فرمایا پھر بعضے ان میں سے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض ان میں متوسط درجے والے اور بعضے ان میں خدا کے حکم سے نیکیوں میں ترقی کئے جاتے ہیں یہ بڑا فضل ہے۔

تفسیری نکات

نفس کی اہمیت

ظاہر ہے کہ منہم ظالم لنفسہ و منہم مقتصد سابق بالخیرات الذین اصطفینا کی قسم ہیں اور مقسم کا صدق ہر قسم پر واجب ہے پس اصطفی ظالم لنفسہ کو بھی شامل ہوا بھلا جب گناہ کے ساتھ بھی ولایت عامہ اور اصطفی باقی رہتا ہے تو ضروری اختلال دنیا کیسے منافع دین ہو سکتا ہے بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب ہم تو دنیا کے کتے ہیں ہم سے دین کا کام کیا ہو سکتا ہے تعجب ہے کہ اپنے منہ سے اس ذلت و بے حیثی کا اقرار کیا جاتا ہے گو یا خدا تعالیٰ نے ان کو دین کے واسطے پیدا ہی نہیں کیا اور غضب تو یہ ہے کہ ان بھلے مانسوں نے اپنے لئے تو ایسے ناجائز لقب تراشے ہیں اہل دین کے لئے بھی ایسے القاب نازیبا کا بے محابا استعمال کرتے ہیں جیسے مسجد کے مینڈھے اس پر بطور جملہ معترضہ کے ہنسی کی حکایت یاد آگئی ایک طالب علم کو کسی متکبر نے کہہ دیا مسجد کا مینڈھا اس نے کہا بلا سے پھر بھی دنیا کے کتوں سے تو اچھے ہی ہیں اور اس کے جواب میں

لطیفہ یہ ہے کہ اہل دین کے لئے جو وہ لقب تجویز کرتے ہیں وہ تو ایک دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے مگر دنیا کا یہ کتا اقراری لقب ہے اور المرہو خلد باقرارہ بالجملہ ایسے القاب اپنے لئے یا غیر کے لئے تراشا ممنوع ہے قال اللہ تعالیٰ لاتناہزوا بالاللقاب بنس لاسم الفسوق بعد الایمان حدیث شریف میں آیا ہے لیس لنا مثل السوء عجیب ہے کہ بعض لوگ ایسے واہیات القاب کو اکسار اور تو اضع سمجھتے ہیں۔

مقتصدین کی مدح

بس انسان کا بڑا کمال اقتصاد و اعتدال ہے تمام حکماء کا اس پر اتفاق ہے انہی لوگوں کی حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے یعنی مقتصدین کی چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں فمنہم مقتصدو ما یجحد بآیاتنا الاکل ختار کفور اس مقام پر اہل کتاب کے بارہ میں ارشاد ہے منہم امة مقتصدو و کثیر منہم ساء ما یعملون ایک مقام پر ارشاد ہے و کذلک جعلناکم امة و سطا اس سے صاف معلوم ہوا کہ اقتصادی توسط ہی بڑا کمال ہے اور یہی مطلوب ہے پس قرآن و حدیث سے ثابت ہو گیا ہے اقتصاد ہی اعلیٰ درجہ ہے۔ اب میں ایک شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں جو قرآن ہی سے پرہسکتا ہے مگر ان لوگوں کو جو محض ترجمہ دیکھ کر مولانا بن جاتے ہیں اشکال یہ ہے کہ ایک مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم اور لنا الکعب اللین اصطفینا من عبادنا فمنہم ظالم لنفسہ و منہم مقتصد و منہم سابق بالخیرات باذن اللہ پھر ہم نے وارث کئے کتاب کے وہ لوگ جن کو جن لیا ہم نے اپنے بندوں میں سے پھر کوئی ان میں برا کرتا ہے اپنا اور کوئی ان میں سے بیچ کی چال پر اور کوئی ان میں آگے بڑھ گیا ہے خوبیاں لے کر اللہ کے حکم سے۔ یہاں امت محمدیہ کی تعریف کی گئی ہے کہ اہم سابقہ کے بعد ہم نے اپنے ان بندوں کو کتاب الہی کا وارث بنایا جن کو ہم نے برگزیدہ کیا ہے پھر ان میں بعض تو اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں یعنی گناہ گار ہیں اور بعض میانہ رو مقتصد ہیں اور بعض سابقین بالخیرات ہیں۔ یہاں امت محمدیہ کے لئے کیسی بشارت ہے کہ ان کے گنہگار بھی برگزیدہ بندوں میں داخل ہیں تو یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقتصاد اعلیٰ درجہ نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ایک درجہ ہے جن کو سابقین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ذرا اس اشکال کا جواب وہ لوگ بیان تو کریں جو محض لیڈری سے مولانا بن گئے ہیں۔ فہم القرآن آسان نہیں اس کے لئے پورے قرآن کا احاطہ ضروری ہے اور علوم قرآن سے واقف ہونا لازمی ہے اس کا جواب لیڈر نہیں دے سکتے۔ بلکہ یہ شبہ عربی داں علماء ہی سے حل ہو گا۔ ان کے یہاں اس کا جواب بہت اہل کہ قرآن کے محاورہ میں اقتصاد کبھی اعتدال کے معنی میں آتا ہے اور کبھی توسط بین الاعلیٰ والادنی کے معنی میں آتا ہے اور سورۃ قاطر کی آیت مذکورہ میں دوسرے معنی مراد ہیں اس لئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اقتصاد بالمعنی الاول بھی اعلیٰ درجہ نہ ہو۔

أَوَلَمْ نَعْتَبِكُمْ قَالَتْ كَأَيْتُكَرُفِيهِ مَنْ تَذَكَّرُ وَجَاءَكُمْ النَّذِيرُ

ترجمہ: کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کرے۔ اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی پہنچا تھا۔

تفسیری نکات

جوانی کی عمر بھی تذکر کے لئے کافی ہے

اولم نعتکم اور جاء کم التذیر میں عطف من قبیل عطف الخاص علی العام ہے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے تم کو اتنی عمر دی تھی جس میں تذکر ممکن تھا اور اتنی عمر ملنا جوانوں کو بھی عام ہے پھر اس میں بعض پر تو بڑھا پا بھی آ گیا اس سے اس خیال کا رد ہو گیا کہ آیت کے مخاطب بوڑھے ہی ہیں جوان نہیں ہیں خوب سمجھ لینا چاہیے۔

نذیر کی تفسیر

ایک قول یہ ہے کہ نذیر سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ناسخین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن سے تبلیغ احکام الہی ہوتی ہے دوسرا قول یہ ہے جو ایک حدیث کے موافق ہے گویا وہ حدیث اس کی تفسیر کرتی کہ نذیر بڑھا پا ہے خواہ حدیث میں تمثیلاً ہو یا تعیناً ہو یہ ضرور ثابت ہوا کہ بڑھا پا بھی ڈرانے والا ہے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جوانی تو کھوئی ہی تھی بڑھا پے میں بھی تمہاری غفلت نہ گئی اور آنکھ نہ کھلی کہ کچھ سامان آخرت کا کر لیتے۔

آیت میں سب غافلین کو خطاب ہے

یہ خطاب عبارة النص سے خواہ کفار ہی کے لئے ہو مگر بدالات النص خواہ بالقیاس باختلاف مراتب تمام ان اشخاص کے لئے بھی ہو سکتا ہے جو بناء خطاب یعنی غفلت میں شریک ہیں۔

اصلاح کے لئے ایک مراقبہ

اس میں حق تعالیٰ نے اصلاح کے لئے ایک مراقبہ کی تعلیم فرمادی کہ عمر جلد جلد گزرنے اور ختم ہونے کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور ہر وقت کو آخری وقت سمجھے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظُهُرِهِمْ مِنْ دَابَّةٍ

وَلَكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ

كَانَ بِعِبَادِهِ بَصِيرًا ۝

ترجمہ: اگر اللہ میاں لوگوں کے اعمال پر مواخذہ کرتے تو کسی تنفس کو زمین پر نہ چھوڑتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک میعاد معین (یعنی قیامت) تک مہلت دے رہا ہے سو جب ان کی وہ میعاد آ پہنچے گی (اس وقت) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا۔

تفسیری نکات

عجیب و غریب ربط

بظاہر یہ کلام بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ مقدم اور تالی میں بظاہر علاقہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ظاہر تو ہے کہ یوں فرماتے ہیں۔

ولو يؤاخذ الله الناس بما كسبوا ما ترك عليها من بشر

کہ اگر آدمیوں سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کسی آدمی کو نہ چھوڑتے۔

نہ یہ کہ مواخذہ تو صرف آدمیوں سے فرماتے اور ہلاک جانوروں کو بھی کر دیتے۔ بظاہر یہ بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے سو بات یہ ہے کہ عین عتاب میں بھی ان کا شرف بتلایا ہے کہ مقصود بالخلق انسان ہی ہے اور دوسری چیزیں اسی کے واسطے بنائی گئی ہیں تو اگر ان سے مواخذہ کرتے تو ان میں سے کسی کو نہ چھوڑتے اور جب ان کو نہ رکھتے تو جانور زہرے کیا کرتے۔

کیا رحمت ہے کہ عتاب میں بھی ہمارا شرف بیان کیا جا رہا ہے کہ انسان ہی اشرف المخلوقات ہے حق تعالیٰ کا انعام دیکھئے کہ جو تیاں لگائیں مگر قدر و منزلت ہیں گھٹائی بھلا ایسا آقا کا ہی ادب اور یہی معاملہ ہے جیسا ہم کر رہے ہیں؟

سُورَةُ يُسِّس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یُسِّس ۱۰ وَالْقُرْآنِ الْحَکِیْمِ ۱۱ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۱۲

ترجمہ: یُسِّس ۱۰ یسین قسم ہے قرآن با حکمت کی کہ بے شک آپ منجملہ پیغمبروں کے ہیں

سورة یسین کی تلاوت کی فضیلت

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ایک مرتبہ جو شخص سورہ یسین شریف پڑھے اس کو سات قرآن شریف پڑھنے کا ثواب ملتا ہے فرمایا کہ سات نہیں دس کا ثواب ملتا ہے عرض کیا کہ مجھ کو سات ہی یاد تھا مگر عرض کرنے سے عرض یہ ہے کہ ایک شخص نے تو صرف سورہ یسین شریف پڑھی اور ایک شخص نے دس قرآن شریف پڑھے تو کیا اس کا اور اس کا ثواب برابر ہوگا جواب میں فرمایا کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ (یسین شریف پڑھنے سے) اجر تو دس ہی قرآن شریف پڑھنے کا ملے گا مگر وہ انوار میسر نہ ہوں گے جو کامل دس قرآن پڑھنے سے ہوں گے اور صاحب غیب کی کس کو خبر ہے انا عند ظن عبدی ہی کیا کچھ عطا فرمادیں کوئی ان چیزوں میں ضابطہ تھوڑا ہی ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنۡ

اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۱۳

ترجمہ: وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین کے قبیل سے۔ اور (خود) ان آدمیوں میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو (تمام لوگ) نہیں جانتے۔

تفسیری نکات

قرآن کوئی طب اکبر نہیں

ایک صاحب پنجاب میں مجھ سے ملے۔ کہنے لگے کہ تحقیقات جدیدہ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تخم میں

ایک نرا اور ایک مادہ ہوتا ہے میں کہتا ہوں خبر یہی ہو لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ قرآن میں بھی یہ مسئلہ موجود ہو مگر وہ کہنے لگے کہ میں نے سوچا کہ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے یا نہیں۔ کئی مہینے تک سوچتا رہا لیکن کہیں نہ ملا۔ سبحان اللہ! صاحب قرآن میں اس مسئلہ کو ڈھونڈنا ایسا ہے جیسا کوئی طب اکبر میں جوتا بنانے کی ترکیب ڈھونڈنے لگے کیوں صاحبو! اگر کوئی ایسا کرنے لگے تو عقلاء وقت اس کی نسبت کیا فتویٰ دیں گے۔ وہی فتویٰ اس کی نسبت بھی دینا چاہیے۔

غرض کہنے لگے کہ مدت کے بعد ایک روز اتفاق سے میری بیوی قرآن پڑھ رہی تھی جب اس نے یہ آیت پڑھی۔

ازواج کا معنی

وہ ذات پاک ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات کے قبیل سے بھی تو بہت خوش ہوا کہ قرآن میں یہ مسئلہ صراحتاً موجود ہے۔ تو وہ بزرگ ازواج کے معنی خاص یہاں میاں بیوی اور نر و مادہ کے سمجھے۔ حالانکہ ازواج کے لغوی معنی جوڑ کے ہیں خواہ کسی چیز کا جوڑ ہوتی کہ زوجی الخف والاعل بھی کہتے ہیں۔ زوج کے معنی وہی ہیں جس کو فارسی میں جفت اور اردو میں جوڑا کہتے ہیں۔ میاں بیوی کو بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی باہم جوڑا ہوتے ہیں یہ نہیں کہ ہر جگہ میاں بیوی ہی کے معنی ہوں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری جفت پاپوش اٹھالاؤ یہ کہے کہ میرے جوتے کا جوڑا اٹھالاؤ تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میرے جوتے کی میاں بیوی اٹھالاؤ۔ پس معنی آیت کے تو یہ ہیں کہ ہم نے نباتات میں بھی جوڑے پیدا کئے ہیں کہ اگر ایک اٹار کھٹا ہے تو دوسرا بیٹھا ہے علی ہذا۔ لیکن ان مجتہد صاحب نے ان ازواج کا ترجمہ زن و شوہر کیا اور قرآن میں اپنے نزدیک اس مسئلہ کو بھی داخل کر دیا۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

”وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات سے زمین کے قبیل سے بھی اور ابن آدمیوں سے بھی اور ان چیزوں میں بھی جن کو لوگ نہیں جانتے۔“

کسی نے قرآن سے دانہ کا نر مادہ ہونا ثابت کیا ہے

ایک صاحب نے قرآن شریف سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ دانہ میں نصف مادہ اور نصف نر ہوتا ہے یہ بھی سائنس جدید کی تحقیق ہے اس کے لئے ان کو یہ آیت مل گئی۔ سبحان الذی خلق الأزواج کلھا مما تنبت الارض و من انفسہم و مما لا یعلمون معلوم ہوا کہ مما تنبت الارض میں بھی ازواج یعنی میاں بی بی ہیں جو جس کو سمجھ میں آتا ہے وہ کہتا ہے نہ معلوم یہ لوگ و اذا النفوس زوجت کے کیا معنی کہیں گے ترویج تفصیل ہے زوج سے اس کے معنی ان کی تقریر کے موافق میاں بی بی بنانے کے ہوئے تو یہ معنی ہوئے کہ قیامت کے دن لوگوں کے نکاح کرائے جائیں گے۔

سائنس کو دین کے مطابق کرنا چاہئے نہ بالعکس

قرآن شریف کو کیا کھیل بتایا ہے لوگوں نے نہ معلوم عقلیں کیسی تسخ ہوئی ہیں۔ یہ طرف داری دین کی ہے یا سائنس کی۔ موٹی سی بات ہے کہ دین کی طرف داری تو جب ہوتی کہ دین کو تسلیم کر کے سائنس کو اس کے مطابق کرتے یہ طرف داری دین کی کیسی ہوئی کہ سائنس کو تسلیم کر کے دین کو اس کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے علماء اہل حق اور آجکل کے لوگوں کی روش میں علماء اسلام نے بھی احکام شریعت میں عقلی مصالح دریافت کی ہے اور اس بحث پر کتابیں لکھی ہیں جن سے یہ لوگ بھی استدلال کرتے ہیں کہ علماء حال کا جمود اور تعصب ہے کہ ہم پر اعتراض کرتے ہیں جب ہم عقلی اور نقل کو مطابق کر کے دکھاتے ہیں حالانکہ ان کے علماء نے بھی ایسا کیا ہے یہ صرف مغالطہ ہے۔

سائنس کو قرآن میں داخل کرنا ہدم دین ہے

اگلے علماء نے دین کو مقدم رکھ کر عقل سے اس کی مصلحتیں دریافت کی ہیں اور یہ لوگ عقل کو مقدم رکھ کر دین کو اسکے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ سائنس کو قرآن میں داخل کرنا چند روز میں دین کو بالکل منہدم کرنا ہے کیونکہ سائنس کی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں آج جو بات بالاتفاق تسلیم کی جاتی ہے وہ کل کو ایسی غلط ثابت ہوتی ہے کہ اس پر وہی لوگ ہنستے ہیں جن کی وہ تحقیق تھی۔ آج اگر قرآن کو بھی اسکے مطابق کر لیا تو جس وقت اس کی غلطی ثابت ہوگی اس وقت قرآن کریم کا غلط ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ پھر قسمت کو روئیو! لوگ ادھر ادھر کے مسائل کو قرآن شریف سے ثابت کرنے کو فخر سمجھتے ہیں۔

قرآن کا فخر یہ ہے کہ غیر دین اس میں نہ ہو

قرآن کا فخر یہ ہے کہ اس میں غیر دین نہیں ہے جیسا کہ طب اکبر کے لئے فخر ہو سکتا ہے۔ تو یہ ہی کہ اس میں جو تیاں گانٹھنے کا بیان نہیں ہے نہ یہ کہ اس میں کہیں جو تیاں گانٹھنے کی ترکیبیں بھی درج ہیں۔ اگر کوئی طب اکبر میں یہ صنعت بھی شامل کر دے تو واللہ کوئی اس کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ میں نے بکثرت وعظوں میں اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ لوگ ان کو خشک مضامین کہتے ہیں اور تر مضامین وہ ہیں جن میں ڈوب مرنا پڑے گا آجکل کے حامیان اسلام حامیان اسلام نہیں ماحیان اسلام ہیں ان کی یہ حالت ہے

کے بر سر شاخ دین سے برید خداوند بستاں نگہ کردو دید

بگفتا گریں مرد بد میکند نہ باسن کہ بانفس خود میکند

فروغی مسائل اسلام تو عقل سے ثابت کرتے ہیں اور اس کی خبر نہیں کہ اس طرح جزا اسلام کی کتنی جاتی ہے۔ اس مرض میں ہمارے بھائی بند بھی یعنی مولوی لوگ بھی جتلا ہیں اور اس کی وجہ صرف حب شہرت اور بعض میں حب مال اور اپنی ضرورتوں کو اہل دنیا کے پاس لیجانا ہے ان کے عطایا لینے کے بعد ان سے دینا پڑتا ہے اور ان کی حسب خواہش دین کو سائنس کے ساتھ مطابق کرنا پڑتا ہے ورنہ ان کی نظروں میں وقعت نہ ہو اور عطایا میں کمی ہو جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس نے ناس کر رکھا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۲۰ ص ۱۸۶ تا ۱۸۷)

سُورَةُ الصَّافَاتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يٰۤاِبْنٰى اِنِّىۤ اَرٰى فِى الْمَنَامِ اَنِّىۤ اَذُبْحَكَ فَاَنْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۗ قَالَ

يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِىۤ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝۱۵

فَلَمَّا اسْلَمَا وَتَلَّاهُ الْبَعِیْنِ ۝۱۶ وَنَادٰیۤنَهُ اَنْ یَّاِبْرٰهَیْمُ ۗ قَدْ

صَدَقْتَ الرَّعْیَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝۱۷ اِنَّ هٰذَا هُوَ

الْبَلٰۤءُ الْمُبِیْنُ ۝۱۸ وَقَدْ اٰتٰنَاۤیْۤکُمْ بُرْۤحًا عَظِیْمًا ۝۱۹

ترجمہ: (برخوردار) اسمعیل علیہ السلام) میں خواب میں دیکھا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں سو تمہاری کیا رائے ہے وہ بولے ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے غرض جب دونوں نے تسلیم کر لیا اور باپ نے بیٹے کو کروٹ پر لٹایا اور ہم نے کہا اے ابراہیم (علیہ السلام) تم نے خواب کو سچ کر دکھایا وہ وقت بھی عجیب تھا جب ہم مخلصین کو بدلہ دیا کرتے ہیں حقیقت میں تھا بھی بڑا امتحان اور ہم نے ایک بڑا ذبیحان کے عوض میں دیا۔

تفسیری نکات

حقیقت قربانی

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصلی فعل ذبح ولد تھا اور ذبیحہ کا ذبح کرنا حق تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدلہ اور فدیہ تھا باقی اس میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ وہ ولد ذبح کون ہے اسمعیل علیہ السلام ہیں یا اسحاق علیہ

السلام ہیں۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ اسمعیل علیہ السلام ہیں اور یہی صحیح ہے جس کی دلیل تو یہ ہے کہ ذبح ولد کا قصہ بیان فرما کر حق تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے و بشر ناه باسمحق نیامن الصلحین (اور ہم نے ان کو اسحق (علیہ السلام) کی بشارت دی کہ نبی ہو کر صالحین سے ہوگا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بشارت اسحاق سے مقدم ہے۔

سنت ابراہیم کا مصداق

اور اگر لفظ سنت پر نظر کی جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ولد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت نہیں کیونکہ سنت اس فعل کو کہتے ہیں جس پر مواظبت اور دوام ہو اور ذبح ولد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف ایک ہی دفعہ کیا ہے۔ پس سنت ابراہیم کا مصداق وہ فعل ہونا چاہیے جو ان کا دائمی طریقہ ہو اور وہ درحقیقت اسلامی نفس ہے یعنی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا جس کو فنا کہتے ہیں یہی حضرت ابراہیم کا خاص مذاق اور دائمی طریقہ تھا اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العلمین اور ذبح ولد اس کی صورت تھی گو اسلام نفس کے مناسب صورت تو ظاہر میں یہ تھی کہ ان کو قتل نفس کا امر کیا جاتا مگر اس کے بجائے ذبح ولد کی صورت اس لئے اختیار کی گئی کہ یہ قتل نفس سے بھی اشد ہے چنانچہ ہر صاحب حس سمجھتا ہے خصوصاً جو کسی کا باپ بھی بن چکا ہو وہ جانتا ہے کہ باپ کو اپنی موت اور اپنی کلفت بیٹے کی موت اور کلفت سے سہل ہوتی ہے اولاد کی حفاظت کے لئے انسان ہمیشہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے اور ذبح ولد عمر کا سانحہ ہے۔

استعداد نبوت

فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو حضرت اسمعیل علیہ السلام سے یہ فرمایا کہ انسی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا تری اس سے یہ مقصود نہ تھا کہ اگر حضرت اسمعیل راضی نہ ہوئے تو میں اپنے ارادے سے باز رہوں گا بلکہ مقصود امتحان تھا کہ ان کا جواب سنیں مگر سبحان اللہ حضرت اسمعیل علیہ السلام بھی آخر نبی ہونے والے تھے اگر چہ اس وقت کس تھے لیکن استعداد نبوت سے بلا تامل یہ جواب دیا کہ یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصبرین

اصل مقصود تسلیم و رضا ہے

فرمایا کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے اس جواب سے کہ ستجدنی ان شاء اللہ من الصبرین ایک عجیب مسئلے پر استدلال ہو سکتا ہے جو کہ ذکرین کے لئے بے حد مفید ہے یعنی اکثر ذکرین اپنے ذکر میں طالب لذت ہوتے ہیں اور وہ خدا کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ لذات کے طالب ہوتے ہیں حالانکہ مقصود اصلی یہ ہے کہ تسلیم ہو اور طلب رضا ہو گو لذت نہ ہو یہ مسئلہ من الصبرین سے مفہوم ہوا اور حقیقتاً امتثال پر صبر ہو اور نہ اگر لذت مقصود ہوتی تو بجائے من الصبرین کے من المتلذذین فرماتے مگر من الصبرین فرمایا اور صبر ہمیشہ معنی اور نیزگی ہی میں ہوتا ہے اس سے لذت

کا غیر مقصود ہونا ثابت ہو گیا بلکہ بعض محققین کا قول ہے کہ جس عبادت میں لذت نہ ہو وہ ایک حیثیت سے لذت دہلی عبادت سے افضل ہے کیونکہ جب عبادت میں لذت مقصود ہوئی تو ممکن ہے وہ بوجہ لذت کے ادا کی گئی ہو اور امتحان اور کمال اس امر میں ہے جو خلاف طبع ہو مگر آج کل طالبین کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے اور وہ اس کی یہ ہے کہ شیوخ میں خود خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں حالات کے تنبیح سے معلوم ہوتا ہے کہ بیروں میں سے اور مشائخ میں سے اکثر خود بھی فن تصوف سے بے خبر ہیں مگر جبہ مشیخت زیب تن ہے اور تعلیم دیتے ہیں ان کو یہی خبر نہیں ہوتی کہ اصل مرض طالب میں کیا ہے اور اس کا علاج مناسب کیا ہے حالانکہ یہ نہایت ضروری ہے دیکھو اگر طیب جسمانی مرض سے واقف نہ ہو تو اس کا علاج ہمیشہ مضر ہوتا ہے اسی طرح ان خام کاروں سے مدد العمر مریدوں کی تشویش دور نہیں ہوتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان

اس کی نسبت بعض لوگ یہ سمجھے کہ رائے دریافت کرنے کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ تمہاری کیا رائے ہے تو انہوں نے کہا یا بھت افعل ما تومر کہ اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے اور یہ سمجھ کر ان کو یہ شبہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو نعوذ باللہ ترد تھا

کارپا کاں را قیاس از خود بگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(یعنی بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر و شیر یکساں ہیں)

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو ترد نہ تھا کہ انبیاء میں اس کا احتمال ہی نہیں بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہوئے ہیں کہ ترد نہ تھا مگر اس وقت بیٹے میں باپ سے زیادہ استقلال تھا جیسا کہ ان کے سوال ماذا توری (تمہاری کیا رائے ہے) میں اور ان کے جواب افعل ما تومر (وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا) میں موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے پھر اس تفاوت کا ایک نکتہ بیان کیا جو عوام کو پسند بھی آئے گا مگر ابراہیم علیہ السلام کی اس میں تصریح تنقیص ہے۔

وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ابراہیم علیہ السلام کے بدن میں تھا اس کی وہ برکت تھی کہ ابراہیم علیہ السلام میں کس قدر استقلال تھا کہ آگ میں ڈالے گئے اور مضطرب نہ ہوئے جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ نور ان میں منتقل ہو گیا اس واسطے وہ اسی درجہ میں مستقل المزاج ہو گئے تھے مگر اس توجیہ سے میرا تو روکھا کھڑا ہوتا ہے کیا توجیہ کی ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر کی جناب میں گستاخی کی بھی پرواہ نہ کی۔ بس ایسی توجیہ رہنے دیجئے

ز عشق نا تمام ما جمال یار مستغنی است
بآب رنگ و خال و حظ چہ حاجت روئے زیبارا

(یعنی جمال محبوب ہمارے عشق و عرفان نا تمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ خدو خال کی احتیاط نہیں)

نا تمام اس معنی کو کہ اس میں تنقیص ہے ابراہیم علیہ السلام کی نور محمدی کے جدا ہو جانے کے بعد غیر مستقل ہو جانا محض جزاف (خمینی) اور رجم بالغیب ہے غور کرو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی گستاخی ہے کیونکہ آپ کا وہ نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جاوے۔ آگ تنور کے اندر جلائی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنورا سکے اثر سے گرم رہا ہے تو کیا وہ نور اتنا بھی نہ ہوگا کہ اس کے ختم ہونے کے بعد ابلا باد تک اس کا اثر رہے یہ تفاوت ہی نہیں جو ان جزافات کے ماننے کی ضرورت پڑے۔

اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے صرف پدر مشفق اور مربی شفیق ہی نہ تھے بلکہ وہ شیخ بھی تھے۔ سو شیخ ہونے کی حیثیت سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا اس واسطے فرمایا فانظر ماذا تری (تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے) مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں

يَابْتَ اَفْعَلْ مَا تَوْمَرُ سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ

(اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے دیکھیں گے) اور کیا ٹھکانا ان کے عرفان کا اتنا بڑا توکل کہ اپنی قوت پر نظر نہیں یہاں بھی کہتے ہیں ان شاء اللہ کہ اگر خدا کو منظور ہو واپس یہی تو کمال آئیے ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں

شَابَاشْ اَنْ صَدَفْ غَرِچْتَاں پَرورد گھر آباد از و کرم و اينا عزيز تر
ان کی اولاد بھی خدا کی عاشق تھی چنانچہ حضرت اسماعیل نے فرمایا

يَابْتَ اَفْعَلْ مَا تَوْمَرُ سَتَجِدُنِي اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ

کہ اے باپ جو کچھ آپ کو حکم ہوا ہے کر ڈالئے ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابریں میں سے پائیں گے یعنی میں تحمل و استقلال سے کام لوں گا فلما اسلما و تله للجبين

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پیشانی کے بل ڈال کر ذبح کرنا شروع کیا اور پورا زور لگا دیا مگر وہاں اثر بھی نہ ہوا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم تھا اذبح اور سکین کو حکم تھا لا تذبح (مبينا للمفعول) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھلا کر چھری سے کہا کہ تجھے کیا ہوا کاشی کیوں نہیں اس نے کہا اے ابراہیم تم اپنا کام کرو میں اپنا کام کروں گی مجھے اور حکم ہے تم کو اور حکم ہے۔

واقعی ظاہر میں یہ اسباب مؤثر نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں سوائے حضرت حق کے کوئی مؤثر نہیں یہ اسباب بھی ان کے حکم کے بعد ہی کام کرتے ہیں مولانا اسی کو فرماتے ہیں

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہر حال سکین کو حکم تھا کہ کند ہو جاوے کند ہو گئی اور حضرت ابراہیم کو حکم تھا کہ ذبح کرو وہ ذبح کی کوشش میں تھے کہ غیب سے آواز آئی: يا ابراهيم قد صدقت الرؤيا

اے ابراہیم واقعی تم نے اپنے خواب کو سچا کر دیا

اصل مقصود عمل ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل مقصود عمل ہے ترتب نتیجہ مقصود نہیں یہ سالکین کے بہت کام کی بات ہے کیونکہ آج کل بہت سالکین ثمرات کے منتظر رہتے ہیں اور جب اعمال پر کیفیات و ثمرات کا ترتب نہیں ہوتا تو وہ عمل کو بے کار سمجھتے ہیں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ابراہیم علیہ السلام کا فعل ناقص تھا؟ آپ کے مذاق پر تو ناقص ہی ٹھہرے گا کیونکہ ان کو حکم تھا ذبح کا اور ذبح پر ثمرہ کا ترتب و وقوع کہاں ہوا صرف قصد ذبح و سعی فی الذبح کا تحقق ہوا تھا معلوم ہوا کہ مقصود عمل ہے نتیجہ مقصود نہیں کیونکہ عمل تو کسی درجہ میں آپ کے اختیار میں ہے اور نتیجہ صرف حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور ظاہر ہے کہ انسان سے وہی شے مقصود ہو سکتی ہے جو اس کے اختیار میں ہو پس کار خود کن کار بیگانہ کن

تم اپنے کام میں لگے اور نتیجہ کی فکر میں نہ رہو بلکہ نتیجہ کے متعلق یہ مذاق پیدا کرو

یاہم اور ایانیاہم جستوائے من کنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

غرض ابراہیم علیہ السلام کے فعل پر نتیجہ ذبح مرتب نہیں ہوا لیکن پھر بھی حق تعالیٰ نے ان کے فعل کی نہایت تعظیم ظاہر فرمائی ہے کیونکہ جب انہوں نے اپنی طرف سے سب کچھ کر لیا تو بڑا کام کیا وہ جس وقت ذبح ولد کے لئے تیار ہوئے تھے اور ان کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اس وقت تو ان کو یہ علم نہ تھا کہ چھری کو لا تذبح کا حکم ہو جائے گا اور وہ اپنا کام نہ کرے گی بلکہ وہ تو یہ سمجھ کر تیار ہوئے تھے کہ چھری پھیرتے ہی بچہ کا کام تمام ہو جائے گا کیونکہ وہ اس کو خوب تیز کر چکے تھے اب اس کے بعد نتیجہ کا مرتب نہ ہونا ان کے اختیار سے باہر تھا پس واقعی انہوں نے بہت بڑا کام کیا۔

ابتداء قربانی

اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں انا کللتک نجزی المحسنین ان ہلنا لہو البلو المین و فلینہ بلبع عظیم
اس کے بعد ایک دن نبی اسماعیل علیہ السلام کا ندیہ ہو کر آ گیا اور اس کو بجائے ان کے ذبح کیا گیا۔ یہ قربانی کی ابتداء ہے۔

سُورَةُ ص

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اجْعَلِ الْاِلٰهَةَ الْهٰوًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجَابٌ

ترجمہ: اور کیا یہ شخص سچا ہو سکتا ہے کہ اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا واقعی یہ عجیب بات ہے۔

تفسیری نکات

جعل کے دو معنی

آیة اجعل الالهة الهاوا احدًا ان هذا لشیء عجاب

جو لوگ وحدۃ الوجود کے متعارف معنی کے قائل ہیں وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں حاصل اس استدلال کا یہ ہے کہ کفار نے جعل الالهة الهاوا احدًا پر ہمزہ استفہام داخل کر کے اس جعل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا تو ضرور ہے کہ آپ سے اس اتحاد کا دعویٰ کبھی صادر ہوا ہو ورنہ اس نسبت پر قرآن میں انکار ہوتا تو مستدلین کہتے ہیں کہ حضور نے جو لا الہ الا اللہ کی تبلیغ فرمائی ہے اس کلمے کے معنی یہی اتحاد ہیں کہ کوئی معبود باطل غیر اللہ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) سب عین اللہ ہے اور چونکہ اس باب میں اللہ باطل اور غیر آلیہ میں کچھ فرق نہیں لہذا ہر وہ چیز بھی جس کو ہم غیر اللہ کہتے ہیں سب گویا نعوذ باللہ عین اللہ ہوں گی قائلین وحدۃ الوجود کا یہ استدلال ہے میں نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ معنی اس جعل کے یہ ہیں کہ غیر اللہ کی معبودیت کو نفی کر کے صرف ایک خدا کو معبود کہا مگر اس پر یہ قدح کیا گیا کہ آیت میں جعل کے دو مفعول ہیں جس کا مدلول ایک شے کو دوسری شے بنا دینا خواہ وحدۃ یا زعمًا لیکن اس قدح کے باوجود بھی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ معنی آیت کے یہی ہیں لیکن کلام عرب میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی تھی سو بجز اللہ اب سمجھ میں آگئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں

ومن جعل همومه هماً واحداً كفاه الله همومه كلها اس حدیث میں ظاہر ہے کہ جعل کے یہی معنی ہیں کہ تمام ہموں دنیاوی کو چھوڑ کر صرف ایک آخرت کے ہم کو اختیار کرے نہ یہ کہ ہم دنیا کو ہم آخرت بنا دے۔
اجعل لا الهة الا هو واحداً سے بعض غلاۃ فی التوحید نے اپنی توحید معلوم پر استدلال کیا ہے کہ کفار لسان کے اس انکار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صاحب وحی کا دعوے سب اللہ کو الہ واحد کے ساتھ متحد قرار دینے کا تھا۔
جواب یہ ہے کہ یہ جعل تسمیہ کے لئے نہیں کہ مفید دعائے مذکور ہو بلکہ اس کا حاصل مفعول اول کا ابطال اور مفعول ثانی کا اثبات ہے اس محاورے کی نظیر حدیث ہے من حصل العموم هماً واحداً هم الاخرة كفاه الله همومه
کلیا ظاہر ہے کہ حدیث میں اتحاد ہموں کا ہم واحد کے ساتھ مقصود نہیں بلکہ ہموں دنیاوی کی نفی اور ہم آخرت کا اثبات مقصود ہے۔ (مقالات حکمت ص ۱۷۱-۱۷۲)

إِنَّ هَذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَجَّةً وَلِي نَجَّةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ

أَكْفَلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ۝

ترجمہ: پھر ایک شخص بولا کہ صورت مقدمہ کی یہ ہے کہ یہ شخص میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنیاوی ہیں اور میرے پاس (صرف) ایک دنیوی ہے۔ سو یہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھ کو دے ڈال اور بات چیت میں سمجھ کو دباتا ہے۔

تفسیری نکات

حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ امتحان

اب تمہیں واقعہ کی تحقیق کرنا چاہیے اور یہیں سے آپ کو حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ کی ایک لطیف تفسیر معلوم ہو جائے گی جو قرآن میں مذکور ہے۔ ان ہذا احسی لہ تسع و تسعون نعمة و لی نعمة جس کے متعلق واعظوں نے ایک بڑا طومار اختراع کیا ہے اور ریا کا قصہ بیان کیا ہے سو خوب سن لیجئے کہ تفسیر قرآن میں اس واقعہ کا کچھ دخل نہیں بلکہ وہ قصہ ظاہر اشان نبوت کے بھی خلاف ہے اسی لئے محققین نے اس کو رد کر دیا ہے اور اس کو اسرعیلیات میں سے کہا ہے اس آیت میں جو حضرت داؤد کا امتحان مذکور ہے اس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ ان کے پاس دو شخص مدعی و مدعی علیہ بن کر آئے ایک نے دعویٰ کیا کہ میرے اس بھائی کے پاس ننانوے دنیاوی ہیں اور میرے پاس ایک دنیوی ہے یہ میری دنیوی چھین کر اپنے پاس سو پوری کرنا چاہتا ہے حضرت داؤد علیہ السلام نے صرف مدعی کا بیان سن کر یہ فرمایا اس نے تجھ پر ظلم کیا اور واقعی اکثر شرکاء کی یہی

حالت ہے کہ زبردست کمزور کو دبانا چاہتا ہے اگرچہ داؤد نے یہ کلام بطور جملہ شرطیہ کے فرمایا تھا۔ فیصلہ کے طور نہیں فرمایا تھا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر یہ بیان صحیح ہے تو تجھ پر ظلم ہوا مگر چونکہ سورۃ وہ جملہ حملیہ سے شرط نہیں اور شرطیہ بھی ہوتا تب بھی مجلس قضاء کے مناسب نہ تھا بلکہ اول مدعی علیہ سے دریافت فرماتے پھر شہادت یا حلف کے بعد فیصلہ فرماتے مگر اس لغزش پر بہت جلد تنبیہ ہوئی اور سجدہ میں گر پڑے و ظن داؤد انما فتہ فاستغفر ربہ و خرد اکعاً و اناب (اور منشاء اس لغزش کا ایسا امر تھا جس میں ان مراجعہ کرنے والوں کی بھی غلطی کو دخل تھا وہ یہ کہ ان لوگوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے یہ مراجعہ برسر اجلاس نہیں کیا بلکہ ایسے دن اور ایسے موقع پر مراجعہ کیا کہ اس دن اور اس موقع پر حضرت داؤد علیہ السلام فصل مقدمات کے عادی نہ تھے کیونکہ یہ دن ان کی عبادت کا تھا جس میں وہ مقدمات کا فیصلہ نہ کرتے تھے اور یہ موقعہ اجلاس کا موقعہ نہ تھا بلکہ عبادت گاہ تھی جس کے دروازے بند تھے مدعی اور مدعی علیہ دیوار سے پھاند کر آئے داؤد علیہ السلام کو ان کے اس طرح بے قاعدہ آنے سے وحشت و پریشانی بھی ہوئی و هل انک نباء الخصم اذ تسور المحراب اذ دخلوا علی داؤد ففزع منهم قالو الاتخف ان تمام امور کے اجتماع سے یہ اثر ہوا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی کے ساتھ اس طرح گفتگو فرمائی جس طرح نجی ملاقات میں گفتگو کیا کرتے ہیں چونکہ اجلاس فصل مقدمات کا نہ یہ موقعہ تھا نہ دن تھا نہ اہل مقدمات اس طرح آیا کرتے تھے اس لئے آپ سے لغزش ہو گئی گفتگو میں ان قواعد کا استحضار نہ تھا جو فصل مقدمات اور اجلاس کے وقت ضروری ہوتے تھے پس ہر چند کہ حضرت داؤد علیہ السلام معاملہ میں امور مذکورہ بالا کی وجہ سے معذور بھی تھے مگر انبیاء علیہم السلام کی بڑی شان ہے ان کو ایسے عوارض کی وجہ سے بھی احکام میں ذہول نہ ہونا چاہیے اس لئے فوراً تنبیہ ہوا کہ مجھ سے لغزش ہوئی اور اس سے استغفار و توبہ کی۔

يٰۤاٰدُۤا اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاٰحْكَمۡ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْتَلُوْنَ

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ يَّمَّا سُوۤا يَوْمِ الْحِسَابِ ۝

ترجمہ: اے داؤد (علیہ السلام) بے شک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے پس تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفسانی کا اتباع نہ کرو یہ تم کو اللہ کے راستہ سے بے راہ کر دے گی بیشک جو لوگ اللہ کی راہ سے گم ہوئے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا بسبب اس کے کہ وہ یوم آخرت کو بھول گئے۔

تفسیری نکات

اتباع ہوی کی مذمت

اس آیت شریفہ میں ہر چند کہ خطاب داؤد علیہ السلام کو ہے لیکن مضمون عام ہے کچھ داؤد علیہ السلام کی تخصیص نہیں ہے بلکہ داؤد علیہ السلام کی طرف خطاب کرنے سے معنی اس مضمون کے اور زیادہ تقسیم ہو گئے اس لئے کہ جب بڑوں کو کسی امر کا خطاب کیا جاتا ہے اور ان کو باوصف ان کی صفت کے اس امر پر وعید کی جاتی ہے تو چھوٹے بطریق اولی مخاطب ہو جاتے ہیں طبیب اگر صحیح توئی کو کہے کہ فلاں شے نہ کھاؤ تم کو مضر ہوگی تو مریض ضعیف کو بطریق اولی اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت مفہوم ہوگی اسی طرح سے یہاں داؤد علیہ السلام کو خطاب ہے گویا مطلب یہ ہے کہ جب داؤد علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے اس حکم کے مامور ہیں اور مضمون بھی کوئی خصوصیات نبوت سے نہیں تو اوروں کو تو بطریق اولی اس حکم کی پابندی کرنی چاہیے اور وہ حکم جو کہ داؤد علیہ السلام کو اس آیت شریفہ میں کیا گیا ہے اتباع ہوی سے نہیں ہے اتباع ہوی کی مذمت ہے یعنی اپنی جی چاہی بات پر عمل کرنا۔ اب ظاہر ہے داؤد علیہ السلام پیغمبر ہیں اور پیغمبر بھی صاحب کتاب کہ زبور شریف ان پر نازل ہوئی ہے اور پیغمبر علیہ السلام عموماً اور ان میں جو صاحب کتاب ہیں خصوصاً ان کے تمام ملکات محمود اور جذبات ظاہر مطہر اور نفوس نہایت مہذب ہوتے ہیں جب باوجود ان کے ان کو منع کیا جاتا ہے کہ تم اپنی نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا حالانکہ ان کا نفس بالکل مہذب ہے مگر اس میں خواہش بھی ہوگی تو ظلمانی نہ ہوگی تو ہم تو جو کہ سر سے پائے گند درگند ہیں اگر خواہش نفسانی کی پیروی کریں گے بالکل ہلاک ہو جائیں گے اللہم احفظنا (اے اللہ ہم کو اس سے محفوظ رکھ)

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اسی واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

تفسیری نکات نزول قرآن کی غرض

اس میں خدا تعالیٰ نے تصریحاً فرمادیا کہ یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس سے علم و عمل کا فائدہ حاصل کریں۔ لید بروا میں علم کی طرف اشارہ ہے اور لیتذکرہ میں عمل کی طرف رب ہب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی یعنی مجھے ایسا ملک عطا ہو جو میرے بعد والوں کیلئے ملنا مناسب نہ ہو۔

ضعفاء کے حق میں عین رحمت

مولانا رومی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ظاہر اس سے حرص و حسد کا شبہ ہوتا ہے مگر واقعہ میں یہ ضعفاء کے حق میں انہوں نے اس دعا میں عین رحمت فرمائی جس کی توجیہ یہ ہے کہ من بعدی میں بعدیت زمانہ مراد نہیں بلکہ بعدیت رتبہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ایسا ملک مجھے عطا کیا جائے جو میرے درجہ والوں کے لئے خواہ مخواہ مناسب ہو مگر مجھ سے کم درجہ والوں کے لئے غیر مناسب ہوگا یعنی ان کو عطا نہ کیا جائے کیونکہ وہ ایسی سلطنت سے کفر و تکبر میں مبتلا ہو جائیں گے اب اس تفسیر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ اشکال نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ تو سلیمان علیہ السلام کے اعتبار سے من معی بلکہ من قبلی (مجھ سے پہلے) ہیں یعنی آپ تو ان کے ہم رتبہ نبوت و رسالت میں اور درجہ میں ان سے بھی افضل ہیں۔

ہر نبی کا معجزہ اس کے زمانے کے مطابق ہے

فرمایا کہ ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کو وہ معجزہ دے کر بھیجا گیا جس کی جنس کا شیوہ اس زمانہ میں زیادہ تھا جیسے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر کا زور تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا زور تھا۔ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں سلطنت کا زور تھا اس لئے سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی رب ہب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی یہ دعا طلب معجزہ ہے کیونکہ معجزہ میں دوسرے کی شرکت نہیں ہوتی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عہد مبارک میں فصاحت و بلاغت زوروں پر تھی اس لئے حضور ﷺ کو باوجود امی ہونے کے فصاحت کا معجزہ دیا گیا۔

هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ: یہ ہمارا عطیہ ہے سو خواہ دو یا نہ دو تم سے کچھ دارو گیر نہیں

ایک وعظ میں ان خاص لوگوں کے لئے فرمایا جو کہ خالص توبہ کر کے ذکر و مشغل میں مشغول ہوں کہ بار بار گناہ کا یاد کرنا ان لوگوں کی حالت کے مناسب نہیں کیونکہ توبہ تو ہو چکی ہے جس کی قبول کی امید غالب ہے اب پھر بار بار کے گناہ کے یاد کرنے سے ذکر میں ایک قسم کا حجاب حائل ہو جاتا ہے اور ذکر میں نشاط نہیں رہتا۔ ہر چند کہ گناہ کا یاد کرنا فی نفسہ امر محمود ہے۔ مگر اسکی بھی ایک حد ہے۔ حد سے آگے کیسا ہی امر محمود ہو محمود نہیں رہتا۔ دیکھیے طبیب اگر کسی بیمار کے نسخے میں چھ ماٹھے سنا لکھے اور وہ مریض یہ خیال کر کے کہ یہ چیز مفید ہے جب طبیب نے لکھی ہے تو جتنی بڑھائی جائے گی فائدہ ہوگا تو لہ بھر اس سے زیادہ ڈال لے تو ظاہر بات ہے کہ سنا فائدے کی چیز تھی اور طبیب نے مفید سمجھ کر لکھی تھی مگر خاص ہی مقدار تک مفید ہے اور اس سے زائد مریض کے لئے سخت مضر ہوگی یہی حال اعمال باطنی کا ہے۔ نصوص میں تدبیر کرنے سے اسکا پتہ لگتا ہے چنانچہ اسی بناء پر حضرت شیخ اکبر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ارشاد ہے کہ قبول توبہ کی علامت گناہ کا بھول جانا ہے یعنی اسکا خیال پر غالب نہ رہنا۔ مگر بعد توبہ ہو اور اگر قبل ہے تو وہ غفلت ہے اور دیکھا بھی جاتا ہے کہ جن دوستوں میں کبھی مخالفت رہ چکی ہو اگر دوستی میں اسکا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ایک دوسرے کے دل پر میل آ جاتا ہے اور عورتوں میں یہ عادت زیادہ ہے کہ اتفاق و محبت کی حالت میں دشمنی کے زمانہ کے تذکروں کو لئے ٹٹھکتی ہیں جس سے محبت مکرر ہو جاتی ہے اور وہ نصوص جن میں غور و فکر کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہے یہ بین لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخرا اس میں ایک توبہ بحث ہے کہ ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ صاحب نبوت کے حق میں جو کہ معصوم ہے یہ بحث جداگانہ ہے اسکو مسئلہ مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پر مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ پہلے گناہوں کی معافی تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن پچھلے گناہوں کی معافی جو ابھی تک ہوئے ہی نہیں کیا معنی۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ خوف و خشیت کا غلبہ تھا اگر آپ کو آئندہ گناہوں کی معافی دے کر تسلی نہ دی جاتی تو اندیشہ تھا کہ غلبہ خوف سے اسی فکر میں آپ پریشان رہتے کہ کہیں آئندہ کوئی امر خلاف مرضی نہ ہو جائے۔ اس لئے آپ کو آئندہ کے لئے بھی مطمئن کر دیا گیا۔ دوسری آیت اسکی موید یہ ہے کہ حق جل و علی سلیمان علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ هذا عطاءنا فامنن او امسک بغیر حساب انہیں ایک احتمال تو یہ ہے کہ بغیر حساب کو عطاءنا کے متعلق کیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ عطا بے حساب ہے یعنی کثرت سے ہے اور دوسرا احتمال اور وہ بہت موجب معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ بغیر حساب کو فامن اور امسک دونوں کے متعلق کیا جائے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ آپ پر دینے اور روک رکھنے میں کوئی حساب اور مواخذہ نہیں چونکہ سلیمان علیہ السلام کو بوجہ غلبہ خوف کے ہر عطاء و امساک

میں یہ خیال رہتا کہ شاید یہ اعطاء یا امساک بر محل ہوا ہے یا نہیں۔ کہیں دین میں اسراف یا امساک میں بخل نہ ہو گیا ہو اور یہ خلیجان مانع حضور خاص تھا تو اس لئے سلیمان علیہ السلام کو مطمئن کر دیا کہ اعطاء و امساک میں مطلقاً آپ سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا آپ اس کی فکر نہ کریں اور اصل کام میں لگے رہیں۔ مگر ایسے اشارات اہل خوف کے لئے ہیں کیونکہ اس سے خلاف امر اور بھی عیبان کلمدور ہی مستبعد ہے۔ اب اس سے زیادہ خوف ان کے حق میں مضر ہے اس لئے ان کو اطمینان دلایا جاتا ہے۔
لائخو خواہست نزد خانقان

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے استغفار میں و ما انت اعلم بہ منی یا استغفرک مما تعلم ولا اعلم مطلب یہ کہ جو گناہ مجھ کو معلوم ہیں ان سے بھی معافی چاہتا ہو اور جو معلوم نہیں اور آپ ان کو جانتے ہیں اس سے بھی۔ تو معلوم ہوا کہ توبہ کے وقت تمام گناہوں کا استحضار ضروری نہیں کہ خواہ نخواہ کرید کرید کر تلاش کیا جائے کہ یہ خود ایک مشغلہ مانع حضور ہے۔ بس یہ کافی ہے کہ سب گناہ سے اجمالاً مغفرت مانگ لے اور توبہ کر کے اپنے کام میں لگے۔ دوسری جگہ آنحضرت ارشاد فرماتے ہیں۔ دعا میں کہ ومن خشیتک ما تحول بیننا و بین معاصیک یعنی اے اللہ اس قدر خشیت چاہتا ہوں کہ مجھ میں اور تیری نافرمانی میں آڑ ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ خشیت مقصودہ کی بھی ایک حد ہے اس سے زیادہ یا تو مضر بدن ہے کہ آدمی مر جائے یا مضر روح ہے کہ مایوس ہو جائے۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شوق کی بھی ایک حد بیان فرمائی ہے اسئلک شو قالی لقاءک فی غیر ضراء مضرة ولا فتنة مضلة چونکہ شوق اور عشق کا غلبہ کبھی ہلاکت اور مضریت کی نوبت پہنچاتا ہے جس سے اعمال میں خلل پڑ جاتا ہے اور اصل مقصود اور ذریعہ قرب اعمال اور امتثال اوامر ہی ہے اور کبھی غلبہ شوق میں ادب کی حد سے گزر جاتا ہے اور حسن بے ادب جیسے اکثر عشاق غلبہ حالت میں کہتے ہیں کہنے لگتا ہے اور یہ بے ادبی موجب ضرر دین ہے۔ گو غلبہ کی حالت میں غنہ ہو مگر کمال نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جامع ہیں ادب و اطاعت و محبت کے۔ اس لئے دعا میں فرماتے ہیں کہ اسئلک شو قالی لقاءک فی غیر ضراء مضرة اس سے تو ضرر اول کی نفی ہو گئی جو سب انقطاع اعمال ہو جائے اور اس کے بعد فرمایا ولا فتنة مضلة اس سے ضرر ثانی کی نفی ہو گئی جو بے ادبی کی طرف مقتضی ہو جائے۔ ان سب آیات احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر چیز محمود اپنی خاص تک ہے۔ حد سے بڑھ جائے تو محمود نہیں رہتی۔ بس شیخ اکبر کی تحقیق کا ماخذ در حقیقت غور اور تعق سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث ہی ہے البتہ سخن شناسی اور فہم صحیح کی ضرورت ہے۔

چو بشنوی سخن اہل دل گولہ کہ خطاست
و کم من غائب قولاً صحیحاً
سخن شناس نہ دلیرا خطا انجاست
وانت من طبع القیم

وَإِذْ كُرِعْنَا لِلْأَيْتِوبِ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسْتَنِي الشَّيْطَانَ بِنُصْبٍ وَعَدَّ ابْنُ

تَسْحِيحًا : جبکہ انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزاد پہنچایا ہے

تفسیری نکات

آداب اسناد

بظاہر یہاں شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے فال حقیقی کو چھوڑ کر فاعل مجازی کی طرف فعل کی نسبت کی اس مصیبت کو شیطان کی طرف منسوب کرنے لگے۔ حالانکہ صوفیہ کی بعض حکایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اسناد الی الخیر بھی شرک ہے چنانچہ حضرت بایزید بسطامیؒ کا انتقال ہوا اور وہ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے تو سوال کیا گیا کہ ہمارے واسطے کیا لائے۔ انہوں نے بہت سوچ کر عرض کیا کہ توحید لایا ہوں ارشاد ہوا اما تذکر لیلۃ اللبیب وہ دودھ کی رات یا دہنیں رہی قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک رات آپ نے دودھ پیا تھا صبح کو پیٹ میں درد ہو گیا تو ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا کہ رات دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا اس پر مواخذہ ہوا کہ اسی برتے پر توحید کا دعویٰ کرتے ہو کہ درد کو دودھ کی طرف منسوب کرتے ہو مگر اس طریق کے آداب بہت ہیں واقعی ایک وقت میں غیر کی طرف نسبت کرنا بے ادبی ہے اور ایک وقت فاعل حقیقی کی طرف نسبت کرنا بے ادبی ہے چنانچہ آدم علیہ السلام فرماتے ہیں رہنا ظلمنا انفسنا انہوں نے ظلم کی اسناد اپنے نفس کی طرف کی سیر میں ہے کہ ان سے سوال ہوا کہ تم نے اس فعل کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا آدم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا۔

لیک من پاس ادب نکذاشم گفت من ہم پاس آنت داشتم

یعنی میں نے ادب کی رعایت کی اس لئے سیدہ کو اپنی طرف منسوب کیا آپ کی طرف منسوب نہ کیا اس پر جواب عنایت ہوا کہ پھر میں نے تمہارے ادب کی رعایت کی ہے۔

سُورَةُ الزُّمَرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى

اللَّهِ زُلْفَىٰ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ

اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۱﴾

تفسیر: اور جن لوگوں نے خدا کے سوا اور شرکاء تجویز کر رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں تو ان کے (اور ان کے مقابل اہل ایمان کے) باہمی اختلاف کا (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو راہ پر نہیں لاتا جو (توالاً) جھوٹا اور (اعتقاداً) کافر ہو۔

تفسیری نکات

شرک پر وعیدیں اور مشرکین کی حالت

ایسے لوگوں کو کفار فرمایا ہے غرض یہ دونوں مشرک ہیں اسی واسطے میں نے دو لفظ عطف کے ساتھ کہے کہ کمال میں اور اس کے آثار و مقتضیات میں جب تک کسی کی بالکل یہ نفی نہ کی جاوے اس وقت تک پوری تعظیم نہیں ہو سکتی اگر ایک میں بھی کمی مانی جاوے گی تو پوری تعظیم نہ ہوگی خواہ کمال میں ہو یا اس کے آثار و مقتضیات میں یہ دونوں منافی ہیں حق تعالیٰ کی عظمت کے ان میں سے کسی ایک کا بھی قائل ہونا شرک ہے پوری بڑائی یہی ہے کہ نہ کمال میں کسی کو مانا جاوے اور نہ مقتضیات کمال میں غرض شکایت کرتے ہیں کہ ماقدروا اللہ حق قدرہ ان لوگوں نے

خدائے تعالیٰ کی پوری عظمت نہیں کی حالانکہ پوری پوری عظمت کرنی چاہیے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ زمین اس کی ایک مٹھی میں ہے اور آسمان ایک ہاتھ میں لپیٹ لئے جاویں گے اور صور پھونکا جاوے اور قیامت قائم ہوگی اور کفار جہنم میں جاویں گے اور مومنین کو جنت ملے گی غرض حق و باطل پر اس اہتمام کے ساتھ جزا و سزا ہونے والی ہے پھر یہ لوگ کس خیال میں ہیں اور کیوں خدائے تعالیٰ کی عظمت کما حقہ نہیں کرتے اور شرک کئے جاتے ہیں اول تو قرآن شریف میں اس عنوان کو اختیار کیا گیا ہے کہ توحید کے بیان کے ساتھ معاد کو بیان کیا گیا کہ اب ایسا ہونے والا ہے یوم الفصل آنے والا ہے اور وہاں یہ ہوگا باوجود اس کے تعجب ہے کہ مشرکین پوری تعظیم نہیں کرتے اور شرک سے باز نہیں آتے جیسے بچہ سے کہیں کہ کل کو امتحان ہونے والا ہے اور ایسی ایسی تمجیحات لائی گئی ہیں اور ایسے ایسے جلا دہائے گئے ہیں جو بالکل بے رحم ہیں اگر اس کے بعد بھی وہ یاد نہ کرے تو تعجب کیا جاوے گا کہ کس قدر دلیر اور بد طبیعت ہے کہ علم اول تو ایسے ہی قدر کی چیز ہے بے علم آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہے قطع نظر اس سے کہ بے حیا کو ایسی مار کا بھی خوف نہ ہوا ظاہر ہے کہ بچہ کے سامنے یہ ہولناک چیزیں سنانے سے غرض اس کو علم سکھانا ہے اسی طرح آیت میں مقصود توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرنا ہے اسی کے لئے معاد کا ذکر فرمایا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں متن قرآن یعنی اس کے اصول مسائل تین چیز ہیں توحید و رسالت اور معاد یہ تینوں اصول اور متن ہیں باقی سب ان کی شرح ہیں ان میں سے دو مسئلے اس آیت میں مذکور ہیں یعنی توحید اور معاد اور غور کیا جاوے تو تیسرا مسئلہ یعنی مسئلہ رسالت بھی اس آیت میں مذکور ہے کیونکہ ان ہی آیات میں صاف موجود ہے **السم یا لکم رسل منکم** یعنی فرشتے کفار سے بطور سرزنش کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس پیغمبر نہیں آئے تھے اور وہ حسرت سے جواب دیں گے کہ **ہلسی ولكن حقت کلمة العذاب علی الکفورین** یعنی پیغمبر آئے تو بیشک تھے مگر قسمت ہماری کہ یہ عذاب چکھنا تھا ان کی بات کونہ مانا معلوم ہوا کہ مسئلہ رسالت بھی ضروری اور ماننے کی چیز ہے تو تینوں اصول دین اس آیت میں مذکور ہیں اور مسئلہ رسالت کے ضروری ہونے کا راز یہ ہے کہ مسئلہ توحید موقوف ہے رسالت پر اور مسئلہ توحید ضروری ہی ہے تو مسئلہ رسالت بھی ضروری ہوا اور مسئلہ توحید کے مسئلہ رسالت پر موقوف ہونے کا بیان یہ ہے کہ توحید خدا تعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت ایک تعلق ہوتا ہے درمیان دو شخصوں کے اور تعلق کے لئے مناسبت شرط ہے اور بندوں میں اور خدا میں کچھ مناسبت نہیں اس لئے ضرورت ہوئی واسطہ کی اس واسطہ ہی کو رسول کہتے ہیں خدا تعالیٰ کی شان ہے کہ سید العارفین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **انت کما النیت علی نفسک**

إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

تذکرہ: وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل ہیں

تفسیری نکات

ہر شے کو مقصود کے حصول سے سکون ملتا ہے

اور دوسری وجہ عاشقانہ ہے وہ یہ کہ ہر شے کو مرکز پر پہنچ کر سکون ہو جاتا ہے چنانچہ ڈھیلا پھیلا پھینکو تو زمین پر آتا ہے اور توجہ الی مرکز کرتا ہے اور جب تک خاص نقطہ پر نہ پہنچے اس وقت تک تقاضائے حرکت باقی رہتا ہے اور مرکز پر پہنچ کر جنبش نہیں کرتا اب قلب کا مرکز دیکھنا چاہئے کہ کیا ہے قاعدہ یہ ہے کہ ہر شے کو اس کے مقصود کے حصول سے سکون ہوتا ہے۔ پھر مقاصد بھی مختلف ہیں ایک حقیقی اور ایک غیر حقیقی۔ غیر حقیقی میں گو سکون ہوتا ہے مگر وہ عارضی ہوتا ہے مثلاً بیٹے سے ملاقات ہوئی تو سکون و اطمینان حاصل ہوا مگر کسی عزیز کے انتقال کی خبر سے وہ سکون عارضی زائل ہو گیا۔

مقصود حقوق حقیقی حاصل کرنے کا طریق

اور سکون تام مقصود حقیقی پر پہنچ کر ہو سکتا ہے اور مقصد حقیقی حق تعالیٰ ہیں پس سکون کامل حق تعالیٰ تک پہنچنے ہی پر حاصل ہو سکتا ہے اب یہ سمجھو کہ ان تک پہنچنے کے کیا معنی وہ جسم تو ہے نہیں کہ جسم چل کر جس سے جا ملے اس کا طریق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام ہو جائے پس یہ توجہ تام قلب کا مرکز پہنچ جانا ہے جب مرکز پہنچ جائیں گے تو سکون تام حاصل ہوگا اور توجہ تام کا مبداء خدا کے ملنے کا اعتقاد ہے اس سے توجہ الی اللہ ہوگی اور سیر الی اللہ یہی ہے پھر اس سے سیر فی اللہ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا پس تمام مقصود کیسے آسانی سے ختم ہو گیا اس سے زیادہ کوئی آسانی کا طریقہ نہیں غرض حق تعالیٰ ہمیشہ ہر حکم کے ساتھ طریق تحصیل و تسہیل بھی بتلا دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت العما یتذکر اولو الالباب میں دو چیزوں کا امر ہے ایسے عنوان سے کہ طریق عمل بھی ساتھ ساتھ مذکور ہے اور وہ دو چیزیں یہ ہیں علم اور عمل اور اپنے فائدہ میں ہر ایک کو دوسرے کی طرف احتیاج ہے چنانچہ علم عمل کے لئے شرط ہوتا ہے اور بغیر عمل کے علم بیکار ہوتا ہے تو دونوں چیزوں کی حاجت ہوگی اور یہ کوئی دین ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر مقصود میں ان ہی دونوں کا دخل ہے۔ مثلاً تجارت میں خسارہ ہوتا ہے یا بوجہ عدم علم کے یا بوجہ عدم عمل کے مثلاً ہمارے وطن میں ایک نے تجارت کی تھی چاولوں کی اور گھروالوں کو حکم دے دیا کہ خوب کھایا کرو یا گنگوہ میں ایک شخص نے کپڑے کی تجارت کی تھی اور جو عمدہ تھان آتا اس میں گھروالوں کے جوڑے بنتے ایسے لوگوں کو ضرور خسارہ ہوگا کیونکہ یہ تجارت کے اصول کے خلاف تھا بلکہ تجارت کے اصول کا تو حاصل یہ

ہے کہ کوئی شے گہر میں بھی بلا قیمت کے نہ جائے خلاصہ یہ ہے کہ کوئی کام بلا اصول کے نہیں ہوتا اور اصول کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک یہ کہ اصول کا علم ہو دوسرے یہ کہ اس پر عمل ہو اگر علم نہ ہو تو عمل ہو نہیں سکتا اور عمل نہ کیا تو علم کا نفع ہی نہیں ہوتا پس ہر مقصود کے لئے ان دو چیزوں کی ضرورت مسلم ہوگی۔

إِنَّمَا يُوفِي الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ: مستقل مزاج والوں کو ان کا صلہ بے حساب ملے گا

تفسیری نکات

یوفی کے معنی

تشبیہ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ اجرا غیر متناہی، بمعنی لا لقف عند حد ہو تو (یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب) میں یوفی کے کیا معنی ہوں گے کیونکہ توفیہ کی حقیقت اتمام ہے اور اتمام پر زیادت متصور نہیں۔ جواب یہ ہے کہ توفیہ اور اسی طرح اتمام کے معنی یہ ہیں کہ جو اجر جس عمل کا متقاضی ہے اس میں کمی نہ ہوگی اور صیام کا اجر دلیل سے وہی اجر ہے جو غیر متناہی ہو پس اس سے کمی نہ ہوگی اور تنہا ہی کمی ہے پس تنہا ہی نہ ہوگی حاصل یہ کہ توفیہ میں کمی کی نفی ہے نہ کہ زیادت کی۔

تشبیہ: ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ بغیر حساب حسابا کے ساتھ جو کہ سورہ نبا میں ہے کس طرح جمع ہو سکتا ہے۔ جواب: یہ ہے کہ وہاں حساب کے معنی ضابطہ اور قاعدہ کے ہیں یعنی جن اعمال کے اقتضاء میں جو تفاوت ہے عطاء ثواب میں اس تفاوت کا لحاظ رہے گا قلت و کثرت کے اعتبار سے بھی اور تنہا ہی ولا تنہا ہی کے اعتبار سے بھی پس بغیر حساب اور حسابا اس طرح جمع ہو سکتا ہے۔

انما یوفی الصابرون اجرهم بغیر حساب ”مستقل رہنے والوں کا صلہ بے شمار ہی ملے گا“ میں متنبہ بھی فرمایا ہے۔ وہاں تو خفیف خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجر مل جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے آسمان وزمین کی درمیانی فضا بھر جاتی ہے اور سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل اور الحمد للہ سے پوری میزان عمل بھر جاتی ہے۔ اوکما قال

یہ اس لئے فرمایا کہ شاید کسی کو اللہ اکبر کا ثواب سن کر یہ احتمال ہو کہ نہ معلوم میزان عمل بھی کسی چیز سے بھری ہو گی کیونکہ ممکن ہے وہ آسمان وزمین کی فضا سے بھی زیادہ ہو تو ایک عمل سے اگر فضا بھی بھر جاتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ میزان بھرنے کے لئے کافی نہ ہو اور ہم کو سابقہ پڑے گا میزان اعلیٰ سے۔ خصوصاً طالب علموں کو ایسے اشکالات بہت ہوتے ہیں۔ (الجبر بالعلم بالمقدّمات اعطاء فضل مبرور ص ۳۲۲)

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۗ

ترجمہ: (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ مجھ کو بجانب اللہ حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اس کیلئے خاص رکھوں اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ سب مسلمانوں میں اول میں ہوں۔

تفسیری نکات

عبادت مع الاخلاص ہی مقبول ہے

اور شروع سورت میں الا اللہ الدین الخالص سے اس کا ماور بہ ہونا اس کے ضروری ہونے کی دلیل ہے۔ اس میں عبادت مع الاخلاص کا حکم دیا گیا ہے عبادت گوئی نفسہ خود بھی ایک امر مقصود ہے مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس وقت معتبر ہے جبکہ اخلاص کے ساتھ ہو کیونکہ ان اعبدا اللہ امرت کا معمول ہے اور مخلصا قید ہے اور مقید میں محط فائدہ قید ہوا کرتی ہے اس آیت سے مقصود بالامر اخلاص ہو یعنی مطلق عبادت نہیں بلکہ عبادت مع الاخلاص کا حکم کیا گیا ہے اسی لئے امرت ان اعبدا اللہ مخلصا فرمایا کیونکہ اگر امرت ان اخلص فرماتے تو اس سے یہ نہ معلوم ہوتا کہ اخلاق اتنی ضروری شئی ہے کہ عبادت بھی اس کے بغیر معتبر نہیں۔

اس آیت میں ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ مخلصا العبادہ نہیں فرمایا جیسا کہ ان اعبدا اللہ ہے مناسب ظاہر ابھی تھا حالانکہ مراد یہی ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کرو کہ عبادت اسی کے لئے خالص ہو بلکہ یہ فرمایا کہ مخلصا اللہ جس سے معلوم ہوا کہ عبادت دینی جب ہی ہے کہ جب اس میں اخلاص ہو کسی چیز کی آمیزش نہ ہو اب اپنے برتاؤ کو دیکھئے کہ آپ کے ساتھ جب کوئی محبت ظاہر کر رہا ہے تو آپ اس کی نیت بھی دیکھتے ہیں یا نہیں۔

اگر ایک شخص نذر بھی دے اور پھر کہے کہ میری سفارش کر دیجئے تو کیا آپ یہ نہ سمجھیں گے کہ یہ نذر اپنی غرض کے لئے تھی یا مثلاً کوئی آپ کی دعوت کرے اور چلتے وقت یہ کہے کہ میرے ذمہ قرضہ ہے کیا آپ کو یہ دعوت ناگوار نہ گزرے گی غرض کہ صبح شام تک اپنے معاملات پر نظر کیجئے کہ جو محبت خالص ہوتی ہے اسی کی قدر ہوتی ہے آپ بھی اسی دوستی کو پسند کرتے ہیں جس میں آمیزش نہ ہو تو خدا تعالیٰ جو کہ طیب ہے آمیزش دار عبادت و محبت کی کیونکر قدر کریں گے۔ افسوس محبوبان دنیا کے واسطے تو کوشش کی جاتی ہے کہ ہدیہ خالص ہو اس میں کسی چیز کا میل نہ ہو اور خدائی دربار میں جو عبادت پیش کی جاتی ہے اس کے خالص ہونے کی کوشش نہیں کی جاتی غرض عقلی اور نقلی طور پر اخلاص کی ضرورت ثابت ہوگی اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے اعمال میں اخلاص بھی ہے یا نہیں کیونکہ جب وہ ضروری چیز ہے تو اس کا دیکھنا ضروری ہے جب قرآن میں اس کا تاکید حکم ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کو فرض نہ سمجھئے

فان كنت لم تدرى فتلك مصيبة وان كنت تدرى فالمصيبة اعظم

یعنی اگر جانتے نہ ہو تو ایک ہی مصیبت ہے اور اگر جانتے ہو اور پھر عمل نہیں کرتے تو یہ دوسری مصیبت ہے اس کا کوئی بھی تدارک نہیں کیونکہ جتنے افعال اختیار یہ ہیں سب قصد پر مبنی ہیں بدوں قصد و ارادہ کے متحقق نہیں ہوتے اخلاص بھی انہیں میں سے ہے اگر ارادہ ہی نہ کرو گے تو اخلاص کیسے حاصل ہو جائے گا۔ یہ غلطی بعض طالبان باطن کو بھی پیش آتی ہے کہ درخواست کیا کرتے ہیں کوئی دعاء کر دیجئے کہ ہماری اصلاح ہو جائے کوئی ایسا تعویذ دے دیجئے کہ دل سے خطرات دور ہو جاویں ان حضرات سے کوئی پوچھے تو کہ فقط درخواست ہی کرنی آتی ہے یا کبھی اس کی فکر بھی ہوتی ہے اصلاح کا قصد بھی کیا ہے حالت دیکھو تو سبحان اللہ کسی ادا سے معلوم نہیں ہوتا کہ ان کو اپنی اصلاح کا خیال ہے اگر اپنی اصلاح کا خیال ہو تو اول پختہ ارادہ کر کے اس کے ذرائع بہم پہنچاؤ تا کہ تصفیہ میسر ہو۔

صوفی نشود صافی تا در عکشد جاے بسیار سفر باید تا پختہ شود خاے

(ترجمہ) صوفی اس وقت تک پکا صوفی نہیں بن سکتا جب تک عملاً اپنی اصلاح نہ کرتا رہے یہ راستہ بہت لمبا ہے بہت محنت کرنے کے بعد ہی کوئی طالب منزل پاتا ہے۔

بہر حال اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی غرض نفسانی اپنی نہ ہو رضائے حق مطلوب ہو اس کے حاصل کرنے کا طریقہ اور علاج یہ ہے کہ کوئی کام کرنا ہو تو پہلے دیکھ لیجئے کہ میں یہ کام کیوں کرتا ہوں اور اگر کوئی نیت فاسد ہو تو اس کو قلب سے نکال دیجئے اور نیت خالص خدا کے لئے کرنی چاہیے اور علاج کی آسانی کے لئے بہتر یہ ہے کہ مخلصین کی حکایات دیکھا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے اول قل فرمایا جس میں حضور کو حکم ہے کہ یہ بات کہہ دیجئے۔

اور یقینی بات ہے کہ اگر قل نہ بھی فرماتے جب بھی تو حضور بیان فرماتے ہی جہاں اور احکام کی تبلیغ آپ نے فرمائی اس کی بھی تبلیغ فرماتے ہی اس کے لئے لفظ قل کا زیادہ فرمانا بتلا رہا ہے کہ کوئی مہتمم بالشان حکم ہے۔ دوسرے انی امرت (محقق مجھ کو حکم ہوا ہے) فرمایا انی میں دوسری تاکید ہے پھر امرت (مجھ کو حکم ہوا ہے) تیسری تاکید اس طرح ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی محبوبیت میں نہیں تو ظاہر ہے کہ اگر احکام میں رعایت ہوتی تو حضور کی سب سے بڑھ کر رعایت ہونی چاہیے اور رعایت یہ ہوتی کہ بعض احکام سب پر واجب ہوتے اور آپ پر نہ ہوتے۔ چنانچہ اس خصوصیت کو اس آیت میں ظاہر بھی فرمایا ہے۔

لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر ”یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں“

تو باوجود اس کے جب انی امرت فرمایا کہ مجھ کو حکم کیا گیا ہے۔ اب یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ دوسروں پر واجب نہ ہو البتہ اگر تخصیص کی دلیل موجود ہو تو دوسری بات ہے اور یہاں مقتضی تخصیص کی کوئی چیز نہیں تو

جب اسکی ذات بابرکات کو بھی یہ فرمایا گیا کہ سنا دو مجھ کو حکم ہوا ہے اس بات کا تو سمجھ لیجئے کے دوسرے لوگ تو کس حساب میں ہیں ان پر تو یقیناً یہ فرض ہوگا۔

اخلاص کی اہمیت

یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر حکم کو ضروری ظاہر فرماتے تھے۔ آپ رسول تھے اور رسول کا فرض منصبی ہے کہ تمام احکام کو مخلوق کی طرف پہنچائے۔ لہذا اس کی ضرورت نہ تھی کہ حق تعالیٰ خاص طور پر کسی حکم کے لئے یہ فرمائیں کہ اس کو پہنچا دو۔ مگر پھر بھی جب کسی حکم کے لئے آپ کو یہ ارشاد ہوگا کہ اس حکم کو پہنچا دو۔ تو ضرور اس سے اس حکم کا مہتمم بالشان ہونا سمجھا جائے گا چنانچہ یہاں اخلاص کا امر فرماتے ہوئے حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو لفظ قُل سے خطاب فرمایا ہے کہ یہ بات امت سے کہہ دیجئے ایک تو یہی قرینہ ہے کہ آئندہ جو حکم آئے گا وہ بہت قابل اہتمام ہے پھر اس کے بعد اخلصو نہیں فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ اخلاص کیا کریں بلکہ اس کے بجائے امرت ان اعبد اللہ فرمایا کہ یوں کہہ دو کہ مجھ کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے اس جملہ سے حضور کا مامور بالا خلاص ہونا ظاہر فرمایا گیا اس سے اخلاص کی عظمت بہت بڑھ گئی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوب ہیں اور جس امر کا محبوب بھی مامور ہو وہ کیسا امر ہوگا بہت ہی مہتمم بالشان اور ضروری ہوگا کہ رسول اور محبوب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

حق تعالیٰ نے اس آیت میں امرت کا مفعول ان اعبد کو بنایا ہے اور مخلصا لہ الدین اس کا حال ہے اور حال میں اصل یہی ہے کہ عامل کی قید اور اس کے تابع ہوتا ہے الابدلیل مستقل تو اخلاص کو عبادت کا تابع بنایا گیا معلوم ہوا کہ عبادت اصل ہیں اور احوال و کیفیات و اخلاق ان کے تابع ہیں اب کسی کا کیا منہ ہے کہ احکام و عبادت کو بے کار کہے سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے جا بجا عبادت کی تاکید اور ان کے ترک پر وعید ہے ہاں کسی کو قرآن پر ہی ایمان نہ ہو وہ جو چاہے کہے۔

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ
 الْبُشْرَىٰ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۗ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۗ
 أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَىٰ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ هُوَ أُولُو الْأَلْبَابِ ۗ

ترجمہ: جو لوگ شیطان کی عبادت سے بچتے ہیں (مراد غیر اللہ کی عبادت ہے) اور (ہمتن) اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ مستحق خوشخبری سنانے کے ہیں سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو اس کلام الہی کو کان لگا کر سنتے ہیں یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں۔

تفسیری نکات

طاغوت کا مفہوم

ارشاد ہے وَاللَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ الخ لفظ طاغوت طغیان بمعنی تجاوز عن الحد سے ہے اس کا اطلاق شیطان اور بت اور نفس پر آتا ہے مشترک معنوی ہے مشترک لفظی نہیں ہے اور انابت بمعنی رجوع ہے مجھ کو مقصود بیان سے صرف لہم البشریٰ تک ہے باقی آیت تمیم فائدہ کے لئے پڑھ دی ہے کیونکہ اصل تو مجھ کو انابت یعنی توجہ الی اللہ اور اس کے ثمرہ کو بیان کرنا ہے اور وہ لہم البشریٰ تک ہے باقی انابو کا جو معطوف علیہ تفسیری کے طور پر اجتنبوا الطَّاغُوت ہے جس میں نفی ہے اس کی ضد کی وہ بھی اس حیثیت سے مقصود ہے کہ انابو کی توضیح اس پر موقوف ہے اس لئے کہ شے اپنی ضد سے خوب واضح ہوا کرتی ہے پس حاصل ترجمہ کا یہ ہوا کہ جو لوگ اجتناب کرتے ہیں طاغوت سے یعنی شیطان اور بتوں اور نفس سے اور اجتناب ان سے کرنا ہر چند کہ واضح تھا اس لئے کہ ہر ایک کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جو معاملہ ان سے پہلے سے کیا جاتا ہو ان سے بچیں لیکن حق تعالیٰ نے چاہا کہ کلام پاک میں ذرا سا بھی ابہام نہ رہے اور مقصود بالکل متعین ہو جاوے چنانچہ اسی اسطے ان بعدوہا فرمایا گویا یوں فرماتے ہیں کہ اجتناب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مثلاً ان کو ہاتھ نہ لگاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ پرہیز کرتے ہیں ان کی عبادت کرنے سے سبحان اللہ قرآن مجید باوجود مجز ہونے کے کوئی ضروری امر اس میں نظر انداز نہیں کیا گیا ان بعدوہا بدل ہے طاغوت سے اگر بت مراد ہیں تو معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ اجتناب کرتے ہیں بتوں کی عبادت کرنے سے اور اگر طاغوت سے شیطان مراد ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ پرہیز کرتے ہیں شیطان کی عبادت کرنے سے۔

مراتب نکلیں گے وہ سفل کی جہت میں ہوں گے یعنی اگر انابت ادنیٰ درجہ کی ہوگی تو عبادت طاغوت اس کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کی ہوگی چنانچہ اس کا بیان اوپر آچکا ہے اور اگر انابت اعلیٰ درجہ کی ہوگی تو عبادت طاغوت کا مرتبہ جو اس کے مقابلہ میں ہوگا وہ ادنیٰ درجہ کی عبادت طاغوت ہوگی انابت کا ادنیٰ درجہ اور عبادت طاغوت کا اعلیٰ درجہ تو ہم بیان کر چکے اب انابت کا اعلیٰ درجہ اور عبادت طاغوت کا ادنیٰ درجہ جو اس کے مقابلہ میں ہے اس کو بیان کرتے ہیں اور چونکہ قاعدہ مقررہ مسلمہ ہے کہ الاشیاء تعرف باضدادها اس لئے اول عبادت طاغوت کا درجہ بیان کیا جاتا ہے اس سے انابت کا اعلیٰ درجہ خود سمجھ میں آجائے گا جاننا چاہئے کہ صوفیہ کرام فرماتے ہیں کل ما سفلک عن الحق فهو طاغوت یعنی جو شے تجھ کو خدا سے عاقل کر دے وہ تیرا بت ہے اس سے معلوم ہوا کہ غفلت کو بت پرستی سے تعبیر فرماتے ہیں جتنی دیر غفلت ہوگی اسی قدر گویا بت پرستی میں مشغول رہے گا اسی بنا پر اکثر صوفیہ کرام کے کلام میں پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بت پرست مشرک لکھتے ہیں چنانچہ شیخ عبدالقدوس کے مکتوبات میں تو جا بجا یہ الفاظ دیکھے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے حکیم سنائی فرماتے ہیں۔

بہرچہ از دوست و امانی چہ کفر آں حرف وچہ ایماں

بہرچہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش وچہ زیبا

(ہر وہ بات جو دوست سے قریب کرے خواہ وہ ظاہر اکفر کی بات لگے وہ وچہ زیبا پسندیدہ ہے اور ہر وہ

چیز جو دوست سے دور کرنے کا سبب بنے خواہ کتنی ہی خوبصورت ہو وہ بری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں

ہرچہ جز ذکر خدائے احسن است گر شکر خواری ست آں جان کندن است

(اللہ کریم کے ذکر کے سوا خواہ کوئی چیز کتنی بھلی ہو وہ بھی جان نکالنے کی برابر ہے)

تحصیل علم واجب ہے

یہ ہے بشری جس کی نسبت فرمایا ہے لہم البشریٰ الحمد للہ میرا دعویٰ دلائل عقلیہ سے نقلیہ سے مشاہدہ سے ہر طرح ثابت ہو گیا یعنی یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ توجہ الی اللہ ہی وہ دولت ہے کہ جس سے دنیا اور آخرت دونوں ملتی ہیں۔ آگے فرماتے ہیں فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ یعنی میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے جو بات توجہ سے سنتے ہیں پھر اچھی بات کا اتباع کرتے ہیں اس سے یہ مسئلہ مستحبط ہوا کہ تحصیل علم واجب ہے اس لئے کہ استماع قول کا حاصل علم ہی حاصل کرنا ہے اس لئے ضروری ہے کہ توجہ الی اللہ کے ساتھ علم دین بھی حاصل کرو میں یہ نہیں کہتا کہ سب مولوی بنو بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسائل سے واقفیت حاصل کرو اردو کے رسائل ہی سہی اور اب تو بہت کتابوں کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے اور اگر اردو نہ پڑھ سکو تو کم از کم ان کتابوں کو سن ہی لو آگے ارشاد ہے اولنک الذین ہداهم اللہ واولنک ہم اولوا الالباب یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ عقل والے ہیں ہدایت

کا استعمال اکثر نقل میں اور لب کا عقل میں آتا ہے مطلب یہ ہے کہ عقلاً و نقلاً توجہ الی اللہ اور تحصیل علم دین ضروری ہے عقلاً تو اس لئے کہ عقلاً و زمان دنیا میں جو کام کرتے ہیں راحت کے لئے کرتے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا کہ راحت توجہ الی اللہ میں ہے اور نقلاً خود ثابت ہی ہے نیز ہداهم اللہ ایک بشری عاجلہ ہے اور نہایت عظیم خوشخبری ہے کہ اس سے زیادہ کوئی دل خوش کن بات نہیں ہے اس لئے دلائل صحیحہ سے جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم ہدایت پر ہیں بے راہ نہیں ہیں تو اس سے بڑا ہماری اطمینان ہوتا ہے۔

صراط مستقیم پر ہونا بہت بڑی نعمت و بشارت ہے

اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں میں ایک مرتبہ سہارنپور سے لکھنؤ جانے کے واسطے ریل میں سوار ہوا میرے سوار ہونے کے ساتھ میرے ایک ہم وطن بھی سوار ہوئے اور اسی درجہ میں بیٹھے جس درجہ میں میں تھا میں سمجھا کہ یہ بھی لکھنؤ جاتے ہوں گے میں دوسرے ساتھیوں سے جو پہنچانے آئے تھے باتیں کرتا رہا اس خیال سے کہ یہ تو اب ریل میں آ ہی گئے ان سے تو گاڑی چھوٹنے کے بعد فراغت سے باتیں کریں گے اس لئے ان سے کوئی بات نہیں کی جب ریل چھوٹ گئی اس وقت میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کہاں جاتے ہیں کہا میرٹھ میں نے کہا جناب یہ گاڑی تو لکھنؤ پہنچے گی میرٹھ تو دوسری گاڑی جاوے گی یہ سن کر حیران ہو گئے اور جاڑے کا موسم تھا نہ رضائی نہ کمل وہ اس خیال میں تھے کہ چند گھنٹہ میں میرٹھ چلا جاؤں گا اس زمانہ میں میرٹھ میں انہوں نے ایک اخبار جاری کیا تھا جب یہ سنا کہ لکھنؤ جاوے گئے سخت پریشان ہونے میں نے کہا کہ اب پریشانی سے کیا فائدہ گاڑی تو اب رڑکی سے ورے کہیں ٹھہرے گی نہیں اب خواخوہ آپ پریشان ہوتے ہیں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا باتیں کر لو اس وقت میری تو یہ حالت تھی کہ جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی تھی میری مسرت بڑھتی تھی اس لئے کہ سمجھتا تھا کہ مقصود قریب ہوتا جاتا ہے اور میں راہ پر چل رہا ہوں اور ان کی پریشانی بڑھتی تھی اس لئے کہ مقصود سے دور ہوتے جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ میں بے راہ چل رہا ہوں اس حکایت سے معلوم ہوا کہ اپنے راہ پر ہونے کا علم سے بھی بڑی مسرت ہوتی ہے آخرت کی نعمت تو جب ملے گی جب ملے گی لیکن اگر ہم کو یہاں دلائل صحیحہ سے معلوم ہو جاوے کہ ہم راہ پر ہیں یہ بھی بڑی بشارت اور نعمت ہے یہاں ہی سے اولنک علی ہدی من ربہم و اولنک ہم المفلحون (یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب) کے معنی سمجھ میں آ گئے ہوں گے کہ ہدایت سے مراد تو اس آیت میں دنیا میں اس کا علم ہونا ہے جو کہ بشری عاجلہ ہے اور فلاح سے مراد اخروی فلاح ہے خلاصہ یہ ہے کہ توجہ الی اللہ نہایت ضروری ہے ہم اور آپ مل کر توجہ الی اللہ کو اپنا سرمایہ سمجھیں اور اس کے مراتب میں سے اگر اعلیٰ نہ ہو تو متوسط درجہ (یعنی جو کام کرو حق تعالیٰ کی رضا کے لئے کرو یا کم از کم خلاف رضائے ہو) تو ضرور حاصل کریں۔

متقین کیلئے بشارت

ربط اس کا ماسبق سے یہ ہے کہ اس سے پہلے کفار کے خسران و عذاب کا ذکر تھا
 قل ان الخسرين الذين خسروا انفسهم واهليهم يوم القيمة الى قوله ذلك
 يخوف الله به عباده يعباد فاتقون.

اس کے بعد متقین کے لئے بشارت ہے اور تقویٰ کا طریق بتلایا گیا ہے
 والذين اجتنبوا الطاغوت ان يعبدوها وانا بوا الى الله لهم البشرى
 کہ جو لوگ شیطان سے بچتے ہیں یعنی اس کی عبادت سے بچتے ہیں اس ترجمہ ہی سے معلوم ہو گیا کہ ان
 يعبدوها الطاغوت سے بدل ہے اور طاغوت سے مراد شیطان ہے جو ہر شیطان کو شامل ہے خواہ شیطان الانس ہو
 یا شیطان الجن جنکاشمی ابلیس ہے کیونکہ شیطنت و طغیان میں وہ سب سے بڑھا ہوا ہے پس جو شخص کسی شیطان
 الانس کی اطاعت کرتا ہے وہ بھی ابلیس ہی کی عبادت کر رہا ہے اور شیطان کی عبادت ہر شرک میں ہے کیونکہ
 جس قدر شرکیات ہیں سب کا وہی امر کرتا ہے یہاں پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ مشرکین تو عبادت شیطان کے
 مقرر نہیں بلکہ وہ بھی اپنے زعم میں خدای کی عبادت کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ شیطان کی اطاعت اس
 طرح کرتے ہیں جو عبادت کی حد میں پہنچ گئی ہے۔

اقسام اطاعت

کیونکہ اطاعت کی دو قسمیں ہیں ایک اطاعت مطلقہ ایک اطاعت مقیدہ اطاعت مقیدہ تو یہ ہے جیسے
 مسلمان امام اور مجتہد کی اطاعت کرتے ہیں جو اس شرط سے مقید ہے کہ امر الہی کے موافق ہو اور اطاعت
 مطلقہ یہ ہے کہ ایسی اطاعت کی جائے جس میں موافقت امر الہی کی بھی شرط نہ ہو مشرکین اپنے پیشواؤں کی ایسی
 ہی اطاعت کرتے ہیں اور ایسی اطاعت مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے دوسرے کا حق نہیں جب انہوں نے
 غیر حق کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق تھا تو وہ مشرک اور شیاطین کے عابد ہوئے گوزبان سے
 اس کا اقرار نہ کریں اسی لئے حق تعالیٰ نے اہل کتاب کو اس امر کی تعلیم دی ہے۔

ولا يتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون الله

کیا ایک دوسرے کو رب نہ بنائے حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم نے عرض کیا یا رسول اللہ
 ہم نے تو اپنے علماء کو معبود نہیں بنایا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا

اليس كانوا يحلون لكم ويحرمون فتأخذون بقولهم قال نعم قال هو ذالك

یعنی کیا یہ بات نہ تھی کہ تمہارے علماء جس بات کو حلال کر دیتے تم اس کو حلال مان لیتے اور جس کو وہ حرام کر دیتے اس کو حرام مان لیتے تھے کہاں ہاں یہ تو ہوا ہے حضورؐ نے فرمایا کہ بس اس سے تم نے اپنے علماء کو اللہ کے سوا رب بنا لیا تھا مطلب حضورؐ کا یہی ہے کہ تم نے ان کی اطاعت مطلقہ کی تھی اور اطاعت مطلقہ عبادت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے بجز اللہ اہل اسلام کسی کی اطاعت مطلقہ نہیں کرتے غیر مقلدوں کا اہل تقلید پر یہ الزام ہے کہ ان مقلدوں نے بھی اپنے ائمہ و مجتہدین کو ارباب بنا لیا ہے کہ یہ بھی ان کی اطاعت مطلقہ کرتے ہیں اس کا جواب یہ ہے

بگذر از ظن خطاے بدگماں ان بعض الظن اثم را بخواں

کہ یہ محض بدگمانی ہے مقلدین اطاعت مطلقہ کسی مجتہد کی نہیں کرتے بلکہ ان کے اقوال کا اتباع اس قید کے ساتھ کرتے ہیں کہ اللہ و رسول کے حکم کے موافق ہوں اسی وجہ سے وہ ایسے شخص کا اتباع کرتے ہیں جس کی نسبت ان کو یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ یہ اللہ و رسول کا پورا قبیح ہے اور خلاف حکم شرعی کوئی بات نہیں کہتا۔

علم اور اتباع

اس کے بعد ارشاد ہے وانا بوالہی اللہ یہ تقابل بدیع ہے یعنی وہ لوگ شیطان کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اور اسی کو مقصود و معبود سمجھتے ہیں اس کے بعد مبتدا کی خبر ہے لہم البشری کہ جن کی یہ شان ہے وہ بشارت سنانے کے مستحق ہیں جیسا مفہوم ہے لام کا اس کے بعد ہے فبشر عباد اللہین یستمعون القول کہ اچھا پھر ان کو بشارت سنانی دیجئے سبحان اللہ قرآن بھی کس قدر بلیغ ہے کہ اول تو ان کا مستحق بشارت ہونا بیان فرمایا پھر بشارت سنانے کا حکم دیا کہ ان کو بشارت سنانی دیجئے۔

اس طرز تشویش کا جس درجہ مخاطب پر اثر ہوتا ہے اہل ذوق پر مخفی نہیں اب یہ سمجھئے کہ یہاں عباد اللہین یستمعون القول سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے کہ وہ شیطان سے بچتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ عربیت کا قاعدہ ہے کہ

اذا اعيدت المعرفة معرفة كانت الثانية عين الاولى

(وہ ذہ قاعدہ کلیہ ان لم یعارضہا معارض) کہ جب معرفہ کو دوبارہ معرفہ ہی بنا کر اعادہ کیا جائے تو ثانی سے مراد وہی ہوگا جو اولیٰ سے مراد ہے مگر اعادہ معرفہ کی بھی ظاہر صورت یہ تھی کہ یہاں ضمیر لائی جاتی یا اسم اشارہ یعنی فبشر ہم یا بشر ہو لاء فرمایا جاتا مگر اللہ تعالیٰ نے ضمیر کو چھوڑ کر وضع لفظ ہر موضع لہم ضمیر اختیار کیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس عنوان سے تحصیل کمالات کا طریقہ بتلایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ تحصیل کمالات میں ترتیب ہے حاصل اس ترتیب کا یہ ہے کہ تم کو اول استماع القول لازم ہے جس کا حاصل طلب علم ہے جیسا کہ ابھی معلوم ہو جائے گا اسکے بعد اس کا اتباع لازم ہے اسی کا حاصل عمل ہے خلاصہ یہ ہوا کہ تحصیل کمال کا طریقہ علم و عمل ہے۔

رونمائے قرآن حکیم

اب سمجھئے کہ یہاں يستمعون القول قول سے مراد کلام اللہ ہے دو وجہ سے ایک یہ کہ اس میں لام عہد کا ہے اور یہاں معبود کلام اللہ ہی ہے دوسرے قاعدہ عربیت کا ہے۔

المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل

کہ مطلق سے مراد فرد کامل ہوتا ہے پس یہاں بھی مطلق قول سے مراد قول کامل ہونا چاہیے اور قول کامل قرآن ہی ہے کیونکہ قرآن سے کامل تر کون سا قول ہوگا اسی لئے فرمایا ہے

ذالك الكتب لا ريب فيه

یہی کتاب کامل ہے اس میں کچھ شک نہیں (وہذا علی احدی التقادیر فی ترکیب الآیۃ)

اور یہ ایسا ہے جیسا ہمارے محاورہ میں بولا کرتے ہیں کہ بات تو یہ ہے کہ یعنی سچی اور کامل بات یہ ہے اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کے سوا اور کوئی بات بات ہی نہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ اس کے برابر دوسری بات کامل نہیں ایسے ہی ذلک الكتاب کو سمجھئے کہ اس کا مطلب بھی یہ ہے کہ اس کے برابر کوئی کتاب نہیں کیونکہ قرآن معجز ہے لفظاً بھی معنی بھی مضموناً بھی حفظاً بھی۔

قرآن کو احسن الحدیث کہا گیا ہے اور یہاں احسنہ فرمایا جس کا مرجع قول ہے تو حاصل احسن القول ہوا اور احسن الحدیث واحسن القول کے ایک ہی معنی ہیں۔ اور اس سے (یعنی قرآن کو احسن الحدیث کہنے سے) یہ معلوم ہو گیا کہ فیتبعون احسنہ میں احسن کی اضافت تغایر کے لئے نہیں بلکہ بیانہ ہے اسی لئے میں نے اپنی تفسیر میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اتباع کرتے ہیں اس کی اچھی باتوں کا ہمارے محاورہ میں یہ عنوان اس بات کو ہلاتا ہے کہ اس میں سب ہی اچھی باتیں ہیں۔ قرآن بلا تشبیہ مصری کی ڈلی ہے اگر کوئی مصری کے بارہ میں یہ سوال کرے کہ کدھر سے کھاؤں تو اس سے یوں ہی کہا جائے گا کہ میاں مصری کی ڈلی ہے جدھر سے چاہو کھاؤ جدھر چاہو منہ مارو۔ مگر کوزہ کی مصری میں تو بانس کے ٹکڑے اور تیکے وغیرہ بھی ہوتے ہیں یہ ایسی مصری ہے جس میں کوئی تیکا اور لکڑی مطلق نہیں۔

قرآن کا ہر جزو احسن ہے

قرآن کا ہر جزو احسن ہے اور معنی حسن کو احسن سے تعبیر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ قرآن چونکہ سب کلاموں سے افضل ہے اس لئے اس کے حسن کو احسن کہنا چاہیے۔ یہاں تک یہ بات ثابت ہوگئی کہ طریقہ تحصیل کمال کا یہ ہے کہ اول علم قرآن حاصل کیا جائے پھر اس پر عمل کیا جائے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھو

کہ علم قرآن کو استماع سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مراد صرف الفاظ کا سننا ہے معانی کا جاننا مطلوب نہیں مگر یہ غلط ہے کیونکہ آگے فیتبعون احسنہ بھی تو ہے اور اتباع الفاظ مجردہ کا نہیں ہو سکتا بلکہ اتباع بعد علم معانی کے احکام کا ہو گا اس قرینہ سے معلوم ہوا کہ مراد تو علم معانی ہے مگر اس کو استماع سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ معانی کا سمجھنا۔ اس پر موقوف ہے کہ اول الفاظ کو غور سے سنا جائے جو شخص تحصیل علم کے وقت معلم کی تقریر کو توجہ سے نہیں سنتا وہ مراد بھی نہیں سمجھ سکتا اور جب يستمعون القول سے مراد علم معانی ہے تو اب یہ سمجھو کہ معانی قرآن کے بہت درجات ہیں بعض معانی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سمجھ سکتے ہیں غیر رسول نہیں سمجھ سکتا ان معانی کو حضور نے بعض احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ اور بعض معانی کو حضور کے بعد مجتہدین ہی سمجھ سکتے ہیں جن معانی کو مجتہدین نے سمجھا ہے وہ فقہ کی کتب میں مدون ہیں اور بعض معانی کو تمام اہل علم سمجھ لیتے ہیں اور بعض کو ترجمہ کے بعد عوام بھی سمجھ سکتے ہیں اسی کو عارف نے کہا ہے۔

جرف حش راست در بر معنی معنی در معنی در معنی

اور ایک عارف کہتے ہیں

بہار عالم حسش دل و جان تازہ می دارد برنگ اصحاب صورت را بوار باب معنی را
اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ حدیث فقہ بھی قرآن ہی ہے بعض احکام تو بلا واسطہ اور بعض بواسطہ کلیات مدلولہ قرآن کے جن سے حجیت حدیث و فقہ کی ثابت ہے پس سب قرآن ہوا مگر دوسرے لباس میں پس یوں کہنا چاہئے کہ
عبار اتنا شنی و حسنک واحد و کل الی ذالک الجمال یشیر

پس حدیث و فقہ بھی قرآن ہی ہے گو لباس دوسرا ہے اور فقہ میں جو مسائل منصوصہ قرآنیہ ہیں وہ تو قرآن ہی میں مسائل قیاسیہ مستنبط من القرآن بھی قرآن ہی ہیں کیونکہ فقہاء فرماتے ہیں القیاس مظهر لامنت کہ قیاس سے کوئی نئی بات ثابت نہیں ہوتی بلکہ قرآن و حدیث کی مراد ظاہر ہوتی ہے اور کلیات کے واسطہ سے سب ہی قرآن ہیں جیسا اوپر مذکور ہوا اور اس مسئلہ کو تو امام ابو حنیفہ نے سب سے زیادہ سمجھا ہے غالباً طلبہ سمجھ گئے ہوں گے (کانا اشارۃ الی تجویزہ القراء بالعمیۃ للعاجز عن العربیۃ ۱۲) پس يستمعون القول میں علم قرآن و علم حدیث و علم فقہ سب داخل ہیں اور یہ آیت عورتوں کو اس طرح شامل ہے کہ عبادی میں تعلیما عورتیں بھی داخل ہیں کیونکہ یہ بات اجماعاً مسلم ہے کہ احکام کے مخاطب جس طرح مرد ہیں اسی طرح عورتیں بھی ہیں باقی عورتوں کا صراحتہ ذکر نہ کرنا اس میں حکمت یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے تابع ہیں جو احکام مردوں کے لئے ہیں ان کے تابع بھی ان کے مخاطب ہیں (حاشیہ پس ہمیں چاہیے کہ خود بھی کامل بنیں اور اپنی عورتوں کو بھی کامل بنائیں جس کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا ہے کہ اول علم دین حاصل کرو پھر عمل کا اہتمام

کہ اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب یسٹمعمون القول سے مراد قرآن ہے اور قرآن میں سب دین داخل ہے اور سارے دین کا علم و عمل دفعۃً ہم کو حاصل نہیں ہو سکتا تو ہم کس وقت اس آیت کے مصداق بنیں۔ جواب یہ ہے کہ شریعت میں غزوم اتباع بھی علم اتباع ہے۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ اس طرز میں یہ بات بتلا دی گئی ہے کہ عورتوں کے لئے پردہ ضروری ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے ان کے ذکر میں اور خطاب کو مستور رکھا ہے چنانچہ قرآن میں عورتوں کا ذکر بالاستقلال بہت کم ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدح پر بشارت کو ختم فرماتے ہیں جو علم و عمل کا اہتمام کرتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے اولئک الذین هدہم اللہ واولئک ہم اولو الالباب کہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے اور یہی ہیں جو (درحقیقت) عقلاء ہیں اس میں دو کمالات مذکور ہیں ایک ہدایت یہ تو کمال شرعی ہے اور ایک عقل یہ کمال دنیوی ہے۔

ضرورت علم و عمل

خلاصہ یہ ہے کہ علم و عمل ہی سے کمال شرعی حاصل ہوتا ہے اور اسی سے کمال دنیوی یعنی عقل حاصل ہوتی ہے عقلاء حقیقت میں وہی ہیں جو علم و عمل کے جامع ہیں نہ وہ جن کو تم عقلاء سمجھتے ہو آج کل عقلمند وہ شمار ہوتا ہے جو چار پیسے کمانے کی قابلیت رکھتا ہو خواہ اس کو علم دین اور عمل حاصل ہو یا نہ ہو چنانچہ اسی لئے انگریزی پڑھنے والے اپنے کو عقلاء اور اہل علم کو غیر عاقل سمجھتے ہیں مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو لوگ علم دین حاصل کر چکے ہیں ان کے سامنے بڑے بڑے انگریزی داں جس نے علم دین حاصل نہ کیا ہو بیوقوف ہے اگر ان کو شک ہو تو ذرا کسی عالم سے گفتگو کر کے دیکھ لیں جو دو ہی منٹ میں اپنی بیوقوفی کا اقرار نہ کر لیں اور سب سے بڑی بات یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عقل مند ان ہی کو کہا ہے جو علم دین و عمل حاصل کر لیں اور ان کے سوا ان لوگوں کو جو دنیا کی ترقی اور قابلیت میں تم سے بھی دس قدم آگے تھے اللہ تعالیٰ نے اولئک کمال انعام ہل ہم اضل فرمایا ہے کہ یہ جانوروں سے بھی زیادہ بیوقوف ہیں کیونکہ جانور بھی اپنے مصالح و مضار سے واقف ہیں اور یہ آدمی ہو کر اپنے مصالح و مضار سے ناواقف ہیں تو یہ جانور سے بھی بدتر ہیں اب بتلاؤ جس کو خدا عقلمند کہے وہ عقلمند ہے یا جس کو تم عقل مند کہو عقلمند خدا ہی کا قول سچا ہے پس ہدایت و عقل کا معیار علم و عمل ہے اسی پر ہدایت و عقل کا مدار ہے اور جو شخص علم دین اور عمل سے محروم ہے وہ عقلمند گمراہ اور بیوقوف ہے ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب کوئی اہل یورپ کو عقل مند کہتا تو نہایت برہم ہوتے اور فرماتے تھے کہ جو قوم خدا کو بھی نہ پہچانے وہ خاک عقل مند ہے ہاں یوں کہو کہ چاقو تینچی بنانا خوب جانتے ہیں یعنی کاری گرا چھے ہیں اور صنعت کو عقل سے کیا واسطہ عقل کا کام علم و معرفت ہے اس سے ان لوگوں کو مس بھی نہیں خلاصہ بیان کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو مستحق بشارت فرمایا ہے جو شرک سے بچتے اور توحید اختیار کرتے اور علم و عمل کا اہتمام کرتے ہیں اور ان ہی

کو اہل ہدایت اور عقلاء کا خطاب دیا ہے پس ہم کو ہدایت و عقل کا کمال حاصل کرنے کے لئے علم و عمل کا اہتمام کرنا چاہئے اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام الاستماع والاتباع للسعادة والاتباع تجویز کرتا ہوں اور لقب نوید جاوید رکھتا ہوں اس لقب کے جزو اول میں محرکہ کہ نام کی رعایت ہے نوید کے معنی بشارت کے ہیں اور بشارت قرآن میں جہاں بھی ہے دائمی ہے اس لئے اس کے ساتھ جاوید بڑھا دیا۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو عمل کی توفیق دیں اور ہم سلیم عطا فرمائیں۔

قُلْ يُعْبَادِي الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ

اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا تحقیق وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔

تفسیری نکات

طب روحانی میں کوئی مرض لا علاج نہیں

یہ آیت ایسوں ہی کے بارہ میں نازل ہوئی کہ کفار نے کہا تھا کہ ہمارا کفر کیسے معاف ہوگا تو جواب نازل ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ طب روحانی میں کسی مریض کو جواب نہیں دیا جاتا کہ یہ مرض لا علاج ہے یا مرض کی طب کی کتابوں میں کہیں ذکر نہیں ہاں بعض مرتبہ بعض طبیب جسمانی جواب دے دیتے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مرض ہے یا یہ مرض لا علاج ہے اور طب روحانی میں یہ کہیں نہیں چنانچہ سب سے بڑھ کر مرض کفر اور شرک کا ہے اس کا بھی علاج مذکور ہے اگر سو مرتبہ بھی ہو تو پھر بھی یہ ارشاد مذکور ہے۔

شان نزول

چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی تو بعض کفار نے یہی عذر کیا کہ ہم جانتے ہیں اسلام حق ہے مگر ہم اسلام بھی لے آئیں تو ان گناہوں کی تلافی کیونکر ہوگی جو ہم نے اب تک کئے ہیں اسلام لانے سے ان کو کیا نفع ہوگا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ اسْرِفُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کیں ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت

ہو یقیناً خدا تعالیٰ تمام گزشتہ گناہوں کو معاف فرمادے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے) اس میں بتلا دیا گیا کہ اسلام لانے سے کفر بھی مٹ جائے گا اور کفر کی حالت میں جتنے گناہ کئے ہیں وہ بھی سب مٹ جائیں گے اور اس واقعہ سے آیت کا مطلب بھی معلوم ہو گیا کہ مقصود اس آیت کا توبہ کی تعلیم ہے اور توبہ سے جو امر مانع تھا اس کو رفع کرنا ہے اس میں گناہ پر دلیری کی تعلیم نہیں ہے جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے کہ وہ جرات علی المعاصی کے لئے اس آیت کو پیش کیا کرتے ہیں یہ بالکل غلط ہے اس آیت سے گناہوں پر دلیر نہ ہونا چاہئے ہاں جو شخص گناہ کر کے توبہ کرنا چاہے اور اس کو یہ خیال مانع ہو کہ میرے اتنے گناہوں کو توبہ سے کیا نفع ہوگا اس کو اس میں کہا گیا ہے کہ جب تم اپنے پہلے گناہوں سے توبہ کر لو گے تو وہ سارے معاف ہو جائیں گے اور نامہ اعمال میں سے بھی مٹ جائیں گے وہ ایسے لکھے ہوئے نہیں ہیں جیسے چھپی ہوئی روشنائی کے حروف ہوں بلکہ ایسے لکھے ہوئے ہیں جیسے سلیٹ پر پتھر سے قلم ہے حروف لکھے ہوئے ہیں کہ لب لگا کر ان کو مٹا دیتے ہیں اس طرح توبہ کے بعد حق تعالیٰ سب گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔

شان نزول

بعض لوگوں کو آیت لا تقنطوا من رحمة الله ان الله يغفر الذنوب جميعا سے دھوکہ ہوا ہے اور وہ بے فکر ہو گئے ہیں کیونکہ وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ یقیناً سب گناہوں کو معاف کر دیں گے کیونکہ یہاں لمن یشاء کی قید نہیں ہے سو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ اس کا نزول ان لوگوں کے بارہ میں ہوا ہے جو کفر سے اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے مگر ان کو اسلام سے یہ خیال مانع تھا کہ ہم نے حالت کفر میں بڑے بڑے جرائم کئے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔ آیا اسلام کے بعد ان پر مواخذہ ہوگا یا نہیں؟ اگر مواخذہ ہوا تو پھر اسلام سے ہی کیا فائدہ؟ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا لو اسلمنا لہما یفعل بذنوبنا التی اسلفنا (او کما قالوا) کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو ہمارے پہلے گناہوں کے متعلق کیا برتاؤ ہوگا۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بعد پہلے گناہ جو حالت کفر میں کئے گئے ہیں سب معاف ہو جائیں گے پس اس میں جو مغفرت کا وعدہ حتمی ہے وہ عام نہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں کے گناہ بدوں عقاب کے معاف نہ ہوں گے۔ نہیں دوسروں کے بھی معاف ہوں گے جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن ان کے لئے وہی وعدہ ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے یغفر ما دون ذالک لمن یشاء جس میں حتمی وعدہ نہیں بلکہ مشیت کی قید سے مشروط ہے اور اس آیت میں جو بلا قید مشیت وعدہ حتمی کیا گیا ہے۔ یہ صرف نو مسلموں کے لئے ہے کہ اسلام سے ان کے پہلے گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو رہا ہے اور شان نزول مثل تفسیر کے ہے۔

شانِ نزول سے نصوصِ عامہ کی تخصیص

شانِ نزول سے نصوصِ عامہ کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ بہت سے نصوصِ بظاہر عام ہیں لیکن شانِ نزول سے ان کی تفسیر کی جاتی ہے جیسے لیس من البر الصیام فی السفر بظاہر عام ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا اچھا نہیں حالانکہ فتویٰ یہ ہے کہ اگر سفر میں مشقت نہ ہو تو روزہ رکھنا افضل ہے اور حدیث کو مقید کیا گیا ہے حالتِ مشقت کے ساتھ کیونکہ حضور نے یہ ارشاد ایسے موقع پر فرمایا تھا جبکہ آپ کا گزرا ایسے شخص پر ہوا جو سفر میں روزہ دار تھا اور ضعف کی وجہ سے بے ہوش و بدحواس ہو گیا تھا کہ لوگ اس پر سایہ کر رہے تھے تاکہ دھوپ سے دماغ پر زیادہ گرمی نہ چڑھ جاوے۔ اس واقعے میں آپ کا یہ ارشاد فرمانا ان کا قرینہ ہے کہ مراد ایسا سفر اور ایسی حالت ہے کہ اس میں روزہ رکھنا خلافِ افضل ہے بلکہ اگر جان کا اندیشہ ہو تو حرام ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس آیت کو شانِ نزول سے مقید نہیں کرتے کیونکہ اصل قاعدہ تو یہ ہے کہ العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد اور آیت میں یا عبادی الدین اسرفوا علی انفسہم بظاہر سب کو عام ہے خواہ نو مسلم ہوں یا مسلم قدیم تو میں کہتا ہوں کہ آپ شانِ نزول سے مقید نہیں کرتے تو دوسری آیت سے اس کو مقید کرنا پڑے گا اور ایک آیت کو دوسری آیت سے مقید کرنا اتحادِ واقعہ میں لازم ہے اور ظاہر ہے کہ آیت ان اللہ لا یغفران یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء اور آیت یا عبادی الدین اسرفوا علی انفسہم دونوں عصاۃ کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں اور ایک جگہ مغفرت بقید مشیت مشروط ہے اور دوسری جگہ مطلق ہے تو مطلق کا مقید پر حمل کیا جاوے گا۔

رہا یہ سوال کہ جب دونوں جگہ مشیت کی شرط ہے تو ایک آیت میں اطلاق کیوں رکھا گیا اس میں نکتہ یہ ہے کہ ایک جگہ تو قاعدہ اور قانون کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اس لئے وہاں تو قید کو ظاہر کر دیا کہ حق تعالیٰ بدوں عقاب کے بھی اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے اور دوسری جگہ مایوسین کی یاس کا زائل کرنا مقصود ہے۔ وہاں شرط مشیت کے ظاہر کرنے سے یاس کا ازالہ نہ ہوتا۔ کیونکہ مایوس آدمی کو طرح طرح کے توہمات پیدا ہوا کرتے ہیں شرط مشیت کے اظہار سے اس کو اور وساوس پیدا ہوتے ہیں نہ معلوم میرے متعلق مشیت ہوگی یا نہیں تو اس کی یاس زائل نہ ہوتی اس لئے وہاں قید کو بیان نہیں فرمایا تاکہ آیت کو سنتے ہی اس پر رجاء کا غلبہ ہو جاوے اور یاس کا غلبہ جاتا رہے اور واقعی مایوس کا علاج یہی ہے کہ اس کو ایک دفعہ کامل اطمینان دلا دیا جاوے۔ جب وہ حالت یاس سے نکل جائے پھر اس کو تدریجاً اصل قانون سے مطلع کر دیا جاوے۔

اس کو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن پر کبھی یہ حالت گزری ہو یہ تو حکمت ہے اس اطلاق کی اور اس کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اس میں مانعِ اسلام کو بھی مرفوع کیا گیا ہے۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو کفار کو سخت دوسوہ لاحق ہوتا اور وہ اسلام سے محروم رہتے اور یہ دوسوہ واقع بھی ہو چکا ہے۔ لہذا ان کو مطمئن کر دیا گیا کہ تم بے فکر ہو کر اسلام لے آؤ حق تعالیٰ تمہارے سب گناہ معاف کر دیں گے۔

گناہ سے ناامیدی اور نیکی سے امید

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ آیت لا تقنطوا میں صرف مایوسین کی یاس کا ازالہ مقصود ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اعمال کی ضرورت اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام لازم نہیں بلکہ لفظ لا تقنطوا ضرورت اعمال پر خود لالت کر رہا ہے کیونکہ اس میں قنوط و یاس کی ممانعت ہے اور تجربہ ہے کہ معاصی میں قنوط و یاس پیدا کرنے کی خاصیت ہے رجا بدوں اعمال صالحہ کے پیدا نہیں ہوتی مجرم کو اپنے جرم کا استحضار جس وقت ہوتا ہے اس وقت رجا کا مضمون دل میں نہیں آسکتا اور اگر کسی مجرم کو رجا ہوگی بھی تو کسی عمل صالح کی برکت سے ہوگی کہ اس کے پاس کوئی نیک کام ضرور ہوگا جب قنوط سے بچنا واجب تو اسباب قنوط سے بچنا بھی واجب ہوگا لان مقصدہ الواجب واجب سرکش غلام کو امید کا درجہ کبھی نصیب نہیں ہوتا جب چاہے تجربہ کر لیا جاوے۔

احب مناجاة الحبيب باوجه ولكن لسان المذنبين كليل

واقعی مجرم کی زبان مناجات سے بھی بند ہو جاتی ہے غرض اور افعال تو ایسے ہیں کہ بدوں ان کے کبھی نہ کبھی مغفرت اور نجات ہو جائے گی خواہ بعد عقاب یا قبل عقاب۔ مگر اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت و نجات ممکن نہیں یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہیں گے نہیں۔ گو قادر ضرور ہیں ورنہ تعذیب کافر پر خدا تعالیٰ کا مضطر ہونا لازم آئے گا اور اضطرار منافی وجوب ہے اور بدوں ایمان و اسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کی مغفرت نہ چاہنا قرآن میں جا بجا مذکور ہے چنانچہ ایک آیت تو وہی ہے ان الله لا يغفر ان يشرك به.

مگر شاید کوئی اس پر یہ شبہ کرے کہ یہاں تو صرف شرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر نہیں اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو شرک نہیں بلکہ موحد ہیں۔ مگر اسلام سے اباہ کرتے ہیں ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے؟ تو سچے دوسری جگہ مذکور ہے ان اللذين كفروا من اهل الكتاب والمشركين في نار جهنم خالدين فيها اولئك هم شر البرية اس میں کافر کو اہل کتاب و مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی جہنم مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہوگئی اور یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے جس کے معنی مکلف طویل کے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔

جواب یہ ہے کہ دوام خلود کے منافی بھی نہیں۔ پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے اور یہاں خلود بمعنی دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے وہ یہ کہ مشرکین کے لئے خلود بمعنی دوام ہی ہوگا اور یہاں کافر و مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے جب مشرک کے لئے خلود بمعنی دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہوگا۔ ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا اور یہ ممکن ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے ان اللذين كفروا الطغتم لهم ثياب من نار الی قوله تعالیٰ كلما ارادوا ان ينزعوا

منها من غم اعیاد و افیہا اور ارشاد ہے والذین کفروا و صدوا عن سبیل اللہ ثم ماتوا وہم کفار فلن یغفر اللہ لہم۔ پس اب کافر کا بھی ہمیشہ کے لئے معذب ہونا صاف طور سے معلوم ہو گیا جس سے اس کی عدم مغفرت بھی سمجھ میں آگئی ہوگی۔

اور یہاں سے ایک اشکال کے مندرج ہونے پر تشبیہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ خلود کے معنی مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہوگئی جو قاتل عمد کے بارہ میں وارد ہے ومن یقتل مؤمنا متعمدا الجزاء ہ جہنم خالداً فیہا کہ اس سے قاتل عمد کی توبہ کا مقبول نہ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خلود بدوں قید دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو مستلزم نہیں نہ یہاں کوئی قرینہ ارادہ دوام کے لئے مرتجح ہے۔ اس لئے مدلول آیت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہوگا (مگر کسی وقت نجات ہو جائے گی گو مدت دراز کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اس کی توبہ بھی قبول ہونی چاہیے اس میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک قاتل عمد کے لئے توبہ نہیں مگر جمہور صحابہؓ کے نزدیک قبول ہے پھر صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین و آئمہ مجتہدین کا اس پر اجتماع ہو گیا کہ اس کی توبہ مقبول ہو سکتی ہے۔ جب کہ قاعدہ شرعیہ سے ہو اور قاعدہ ہے کہ اجتماع متاخر اختلاف متقدم کا رافع ہوتا ہے لہذا اب یہ مسئلہ اجماعی ہے مگر کفار و مشرکین کے لئے دوسری بعض آیات میں خلود کے ساتھ دوام بھی مذکور ہے اس لئے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور ابد وہ ہے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو حاصل یہ ہوا کہ کفار و مشرکین جہنم میں ایسی دراز مدت کے لئے داخل ہوں گے جس کا انقطاع ہی نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو خواہ اس کے ساتھ شرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کے لئے سزا ابدالاً آباد جہنم ہے۔

قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمة اللہ ان اللہ یغفر الذنوب
جمیعا انہ هو الغفور الرحیم۔

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندوں جنہوں نے کفر و شرک کر کے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرما دیگا۔ تحقیق وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔ یہ آیت ایسوں ہی کے بارہ میں نازل ہوئی کہ کفار نے کہا تھا کہ ہمارا کفر کیسے معاف ہوگا تو جواب نازل ہوا کہ حق تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اسی طرح اس مرض کا بھی علاج قرآن مجید میں موجود ہے گو مسلمانوں کا یہ اختلاف ایک مرض جدید تھا۔ اس عنوان سے تو جدید نہیں کہ خدا اور رسول کا کہنا نہیں مانتے مگر اس عنوان سے جدید ہے کہ ہم علماء کا کہنا نہیں مانتے۔ یہ آفت ابھی نازل ہوئی ہے پہلے نہ تھی۔ تو اتنا جدید مرض مگر اس کا بھی علاج قرآن مجید میں ہے کہ واتبع سبیل من اناب الی (ان کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) ورنہ آسان بات یہ تھی کہ واتبع دین اللہ (اللہ کے دین کا اتباع کرو) فرمادیتے مگر حق تعالیٰ کو تو خبر تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ لوگ علماء کے اتباع سے بچنا چاہیں گے۔ اس لئے فرمایا کہ سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا جو میری طرف متوجہ ہیں) کہ ان کا بھی اتباع تمہارے ذمہ

ضروری ہے۔ تو یہ کتنا عجیب و غریب قصہ ہے۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ قرآن میں ہر امر کا فیصلہ ہے چنانچہ کتنا جدید مرض تھا مگر اس کا علاج مذکور ہے۔

پس اس میں دو قسم کے لوگ ہوئے ایک تو سب کے قبیح اور معتقد ہونے والے اور دوسرے وہ جو کسی کے بھی قبیح نہیں۔ پس ایک جماعت میں تفریط ہے اور ایک میں افراط ہے۔ حق تعالیٰ اس کا فیصلہ فرماتے ہیں کہ واتبع مسیبل من اناب الی (یعنی جو لوگ میری طرف متوجہ ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو)

اتباع سے تو اس جماعت کی اصلاح فرمائی جو اتباع ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے کیونکہ اس لفظ سے اتباع کی ضرورت بتلائی اور مسیبل من اناب سے علاج ہے اس جماعت کا جو ہر کس ونا کس کے معتقد ہو جانے والے ہیں اور اتباع کا صحیح معیار کوئی نہیں سمجھتے کیونکہ اس جملہ سے حق تعالیٰ نے اتباع کا معیار بتلادیا اور معیار سے مراد ہے صحیح معیار۔

لَئِنْ أَشْرَكَتْ لَيُعْطِنَنَّ عَمَلَكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۵﴾

ترجمہ: اے عام مخاطب تو اگر شرک کریگا تو تیرا کیا کرایا کام غارت ہو جائیگا اور تو خسارہ میں پڑیگا۔

تفسیری نکات

لئن اشركت کی تفسیر بے نظیر

اور اس پر کوئی لفظ وحی الیک سے اشکال نہ کرے جو اسی جملہ میں موجود ہے کہ وحی الیک میں تو یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اسکا مخاطب تو ہر شخص نہیں ہو سکتا جب ایک جملہ میں آپ ﷺ کو خطاب ہے تو جملہ ثانیہ۔ لئن اشركت الخ کے مخاطب بھی آپ ہی ہوں گے کیونکہ یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ آیت میں کئی مضمون ہوں تو سب کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کے مخاطب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور باقی مضامین تبلیغ کے لئے ہوں اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی طرف اور تمام انبیاء کی طرف وحی بھیجی گئی ہے اس مضمون کی کہ لئن اشركت ایہا المنخاطب لیحبطن عملک تاکہ یہ حکم خدا کے بندوں کو پہنچا دو کہ جو کوئی شرک کریگا اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے تو لئن اشركت میں تو خطاب افراد امت کو ہوا اور لقد اوحی الیک الخ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو خطاب ہوا بہر حال خطاب خواہ عام ہو یا خاص آحاد امت کو ہو۔ مقصود آیت میں نفی اور ابطال شرک ہے اور پوری آیت سیاق و سباق میں نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کو باطل کرنا اور توحید کو ثابت کرنا منظور ہے چنانچہ فرماتے ہیں ما قلدروا اللہ حق قدرہ یعنی ان لوگوں نے خدا کی اتنی عظمت نہیں جانی جتنی کہ واقع میں ہے۔

شُرک کا مفہوم

اس میں شکایت ہے شرک کی کیونکہ شرک کے معنی یہی ہیں کہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس واسطے دوسرے کو ماننے کی ضرورت ہے کوئی دوسرے کو کسی کام میں جب ہی شریک کرتا ہے کہ وہ کام خود اس سے پورا نہ ہو سکے مثلاً تجارت میں کوئی دوسرے آدمی کو اسی وجہ سے شریک کرتا ہے کہ اس کے پاس روپیہ کم ہے یا یہ اس میں کما حقہ محنت نہیں کر سکتا غرض اس میں مالی یا جانی کمی ہے اسی کے پورا کرنے کیلئے دوسرے کو شریک کرتا ہے تو خدا کے ساتھ جب کسی کو شریک کیا جاوے گا تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا میں کسی بات کی کمی ہے اس کے پورا کرنے کے لئے دوسرے کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں خدا تعالیٰ کو کمال و آثار کمال میں تغیر نہ ہوگا تو مشرک نے خدا کو کامل نہیں مانا بلکہ ناقص مانا تو اس نے خدا کی پوری تعظیم نہیں کی کیونکہ پوری تعظیم بدوں اسکے نہیں ہو سکتی کہ کمال یا اس کے آثار میں کمی نہ مانی جاوے میں نے یہ دو لفظ یعنی کمال و آثار کمال اس واسطے کہے کہ بعض کے اعتقاد درجہ کمال میں شرک نہیں ہوتا مثلاً خالقیت وغیرہ میں خدا لے تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جاوے مگر آثار میں شریک مانا جاوے جیسے مشرکین عرب کرتے تھے کہ مقصودیت و خالقیت میں کسی کو حق تعالیٰ کے برابر نہیں مانتے تھے ہاں اس کے آثار میں غلطی کرتے تھے اس کی شہادت قرآن میں موجود ہے حق تعالیٰ نے ان کا قول نقل فرمایا ہے مَا عْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرَّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ یعنی مشرکین کہتے تھے کہ ہم ان بتوں کی پرستش صرف اسی واسطے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے یہاں پہنچادیں اور مقرب بنا دیں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا کے برابر تو کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں خدا کے تصرفات میں بعضوں کے دخل مانتے تھے بلکہ دیگر یہ کہ کمال میں تو شریک نہیں کرتے تھے لیکن آثار کمال میں شریک کرتے تھے اور حدیث میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشرک سے پوچھا تیرے کتنے معبود ہیں کہا سات ہے ان میں سب سے بڑا تو آسمان میں ہے۔ بڑے بڑے کاموں کے لئے اس کو پکارا جاتا ہے اور معمولی کاموں کے لئے دوسرے معبود ہیں۔ دیکھئے یہ لوگ کمال مطلق تو حق تعالیٰ ہی کے لئے ثابت کرتے تھے کیونکہ اس سے بڑا کسی کو نہیں جانتے تھے ہاں کمال کے آثار میں دوسروں کو بھی شریک کرتے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پہنچانے اور قریب کرنے کے لئے ان کو معبود مانتے تھے مگر اس پر بھی حق تعالیٰ نے انکار فرمایا۔ (سورہ زمر ۳)

عظمت حق سبحانہ و تعالیٰ

چنانچہ آیت مذکورہ میں ان کا وہی قول نقل کیا ہے فرماتے ہیں وَاللَّيْنِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِيَاءَ مَا عْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرَّبُوا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا

یہودی من ہو کاذب کفار ایسے لوگوں کو کفار فرمایا ہے۔ غرض یہ دونوں مشرک ہیں۔ اسی واسطے میں نے دو لفظ عطف کے ساتھ کہے کہ کمال میں اور اس کے آثار و مقتضیات میں جب تک کمی کی بالکل نفی نہ کی جاوے اس وقت تک پوری تعظیم نہیں ہو سکتی اگر ایک میں بھی کمی مانی جاوے گی تو پوری تعظیم نہ ہوگی خواہ کمال میں کمی ہو یا اس کے آثار و مقتضیات میں یہ دونوں منافی ہیں حق تعالیٰ کی عظمت کے اور ان سے کسی ایک کا بھی قائل ہونا شرک ہے پوری بڑائی یہی ہے کہ نہ کمال میں کسی کو شریک مانا جاوے اور نہ مقتضیات کمال میں غرض شکایات کرتے ہیں کہ ما قدروا اللہ حق قدرہ ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی پوری عظمت نہیں کی حالانکہ پوری عظمت کرنی چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ زمین اسکی ایک مٹھی ہے اور آسمان ایک ہاتھ میں لپیٹ لئے جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا۔ (الشوق الی الشوق لمحمد و اعدا حیات دعوات ص ۷۹)

وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَى عَنِ الشِّرْكَونَ ۝

ترجمہ: اور ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنا چاہیے تھا حالانکہ ساری زمین ان کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں وہ پاک اور برتر ہے ان کے شرک سے۔

تفسیری نکات

عظمت حق سبحانہ و تعالیٰ

فرماتے ہیں وما قدروا اللہ حق قدرہ لوگوں نے حق تعالیٰ کی ایسی عظمت نہ کی جیسا عظمت کرنا چاہیے تھا حالانکہ ان کی عظمت وہ ہے کہ والارض جمعاً قبضتہ یوم القیامہ تمام زمین ان کی ایک مٹھی میں ہوگی قیامت میں۔ والسماوات مطویات بيمينه اور کل آسمان ان کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے یمن کا لفظ اور ایسے ہی قبضہ کا لفظ تشابہات میں سے ہے جن کا بیان کوئی کر نہیں سکتا صرف اتنا معلوم ہے کہ ان الفاظ کے معنی متعارف مراد نہیں حدیث میں ہے فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کلتا یدی ربی یمین یعنی خدائے تعالیٰ کے دونوں ہاتھ یمین ہیں مراد یہ ہے کہ قوت میں یمین ہی کی طرح ہیں وہاں فرق نہیں ہے کہ ایک ہاتھ قوی اور ایک ضعیف ہو جیسے مخلوقات میں متعارف ہے کہ داہنا ہاتھ قوی اور بائیں ضعیف ہوتا ہے تشابہات کے متعلق تحقیق یہی ہے کہ ان میں گفتگو نہ کرے اور ان پر ایمان رکھے مثلاً خدائے تعالیٰ

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي

الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ

ترجمہ: اور (قیامت کے روز) صور میں پھونک ماری جائے گی سو تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے مگر جس کو خدا چاہے۔

تفسیری نکات

مشیت استثناء کا وقع

ایک آیت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے ارواح سب کی زندہ رہیں گی ہاں نفخ صور سے ارواح بے ہوش ہو جائیں گی چنانچہ نص میں ہے وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ اور صعق کے معنی غشی اور بے ہوشی کے ہیں گو فناء بھی مراد ہو سکتا ہے مگر متبادر معنی اول ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ نفحات تین ہوں گے ایک سے ارواح بے ہوش ہو جائیں گی اور دوسری سے تمام عالم مع ارواح کے فنا ہوا جسے گاتیسری سے سب زندہ اور موجود ہو جائیں گے تو یہ دذموی بلا دلیل اور بلا ضرورت ہے۔ بلا دلیل تو اس لئے کہ نصوص سے صرف دو نفخہ نفخہ اولیٰ سے جو فنا ہوگا تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اجسام فنا ہو جائیں گے اور ارواح بے ہوش ہو جائیں پس فنا اجسام کے لئے ہے اور صعق ارواح کے لئے ہے اس تقریر سے بھی نصوص کا تعارض مرتفع ہو سکتا ہے پھر نفحات ٹکٹ کا قائل ہونا بلا ضرورت نیز اسی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض ارواح بے ہوش بھی نہ ہوں گی چنانچہ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ کے بعد الامن شاء الله مذکور ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت استثناء کا وقوع بھی ہوگا چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

فان الناس يصعقون يوم القيمة فاصعق معهم فاكون اول من يفيق فاذا موسى باطش بجانب العرش فلادري كان فيمن صعق فافاق قبلي او كان ممن استثنى الله متفق عليه .
یعنی قیامت میں سب لوگ بے ہوش جائیں گے اور مجھے سب سے پہلے افاقہ ہوگا تو میں موسیٰ علیہ السلام کو عرش کا پایہ پکڑے ہوئے دیکھوں گا اسکے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا وہ بھی سب کے ساتھ بے ہوش ہوں گے پھر مجھ سے پہلے ہوش میں آ جائیں گے یا وہ بے ہوش ہی نہ ہوں گے (کیونکہ وہ ایک بار طور پر بے ہوش ہو چکے ہیں اس کے عوض آج صعدہ سے محفوظ رہے کمافی رولیت) اور ان لوگوں میں داخل ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمایا ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور احتمال کے موسیٰ علیہ السلام کو ان

لوگوں میں داخل فرمایا ہے جو صحت سے مستثنیٰ ہوں گے اس سے معلوم ہوا کہ مشیت استثناء کا وقوع ہوگا ورنہ احتمال ثانی صحیح نہ ہوتا یہ تو ایک اشکال علمی تھا جس کو میں نے رفع کر دیا۔

صعقہ موت

یہاں صعقہ سے صعقہ موت مراد ہے اس کے بعد استثناء ہے الا من شاء اللہ کہ جس کو حق تعالیٰ چاہیں گے وہ اس صعقہ سے مستثنیٰ بھی ہوگا۔ پس ارواح الامن شاء اللہ میں داخل ہے ان کو موت نہ آئے گی۔

مگر ہم اس جواب پر مجبور و مضطر نہیں بلکہ ہم تسلیم کے بعد دوسرا جواب دیتے ہیں کہ اگر نفع صور کے وقت ارواح بھی فنا ہو جائیں تب بھی اس سے انقطاع حیات لازم نہیں آتا کیونکہ وہ فنا تھوڑی دیر کے لئے ہوگا محمد نہ ہوگا اور امور عادیہ میں زمان لطیف کا انقطاع مانع استمرار نہیں۔ موٹی بات ہے کہ اگر ایک شخص پانچ گھنٹہ تک تقریر کرے اور درمیان درمیان میں سیکنڈ سیکنڈ سکوت کرے تو یہ سکوت مانع استمرار تقریر نہیں۔ بلکہ محاورہ میں یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے پانچ گھنٹہ تک مسلسل تقریر کی۔ اس پر اگر کوئی کہنے بھی لگے کہ واہ صاحب اس نے درمیان درمیان دس دس پانچ پانچ سیکنڈ سکوت بھی کیا تھا۔ پانچ گھنٹہ مسلسل تقریر کہاں کی تو ہر شخص یہ کہے گا کہ تم اجتناب ہو کہیں دس دس سیکنڈ کے سکوت کا بھی اعتبار ہوا ہے۔

اسی طرح جب آپ چلتے ہیں تو حرکت کے ساتھ درمیان میں ایک زمان لطیف کا سکون ہوتا ہے کیونکہ ایک پیر کی حرکت کے بعد بدوں اس کے سکون کے دوسرے پیر کو حرکت نہیں ہو سکتی مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتا بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہم مسلسل بارہ کوس تک چلتے رہے۔

غرض احکام عرفیہ عادیہ میں استمرار و دوام کے لئے زمان لطیف کا تخیل مغل نہیں ہوتا تو نفع صور کے وقت ارواح کا فنا تھوڑی دیر کے لئے یا ایک لمحہ کے لئے ہوگا محض تھلہ قسم کے طور جیسے قرآن میں ہے ان منکم الا وادھا کہ ہر شخص کو جہنم کا درد ضرور ہوگا درد بمعنی مرور بھی آتا ہے اس پر تو کچھ سوال بھی نہیں اور بمعنی دخول بھی ہے۔ اس پر سوال ہوتا ہے کہ بعض تو دخول سے محفوظ رہیں گے۔ تو اس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ بعضوں کا درد اگر بمعنی دخول بھی ہو محض تھلہ قسم کے لئے ہوگا جس کی صورت یہ ہوگی کہ جہنم کی پشت پر پل صراط بچھایا جائے گا جس پر ہو کر سب مسلمان گزریں گے۔ بعض تو کٹ کر جہنم میں ہی گر پڑیں گے۔ یہ حقیقتا درد ہوں گے اور بعض مثل برق خاطف کے گزر جائیں گے۔ ان کو خبر بھی نہ ہوگی کہ جہنم کدھر کو بھی ان کا وارد تھلہ قسم کے لئے ہوگا کہ بس جہنم کی پشت پر سے گزر گئے اور راستہ میں جہنم پڑ گئی گو ان کو خبر بھی نہ ہوئی جیسے کوئی جلدی سے آگ کے اندر ہاتھ کو گزار دے اسی طرح تھلہ قسم کے لئے ارواح کا فنا بھی ایک آن کے لئے ہو جائے تو یہ مانع بقاء نہ ہوگا۔

یہ جواب محققین کا ہے اور بالخصوص فلاسفہ کے مذہب پر تو یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک زمانہ آفات سے مرکب نہیں بلکہ آن طرف زمان ہے تو اب یہ کہنا اہل ہے کہ ارواح کا بقاء تو زمانی ہے اور فنا آنی ہے اور بقاء زمانی کا انقطاع فنا زمانی ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ فنا آنی ہے۔ اس تقدیر پر حقیقت میں بھی انقطاع بقاء نہ ہوگا۔

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا
 وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ
 وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ
 عَلَىٰ الْكَافِرِينَ ۝ قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا فِيمَا نُفِثَ مَثْوَى
 الْمُتَكَبِّرِينَ ۝ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَىٰ الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا
 وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ۝

ترجمہ: اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہائیں جائیں گے یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے اس وقت اسکے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ (فرشتے بطور ملامت کے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو تمہارے اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے کافر کہیں گے کہ ہاں لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر پورا ہو کر رہا پھر (ان سے) کہا جائے گا (یعنی وہ فرشتے کہیں گے) کہ جہنم میں داخل ہو جاؤ اور ہمیشہ اس میں رہا کرو (غرض خدا کے احکام سے تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس (جنت) کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے سے) کھلے ہوئے ہوں گے (تاکہ ذرا بھی دیر نہ لگے) اور وہاں محافظ فرشتے ان سے کہیں گے السلام علیکم تم مرہ میں ہو سو اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔

تفسیری نکات

سوق کا اطلاق مسلمانوں سے مشاکلت کے طور پر ہے

وسیق اللہین کفروا الی جہنم زمرا کہ وہ جہنم کی طرف باوجود کراہت کے پیچھے سے ہانک کر لے جائیں گے جیسے جانوروں کو لے جایا کرتے ہیں مگر شاید یہاں کسی کو اشکال ہو کہ اس کے بعد مسلمانوں کے واسطے بھی تو وسیق اللہین اتقوا ربہم الی الجنة زمرا۔ فرمایا گیا ہے تو کیا وہ بھی اسی طرح ہانک کر لے

جائے جائیں گے۔ اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ اس جگہ سوق کا اطلاق مشا کلت کے طور پر ہے جیسے جزاء سینۃ سینۃ مثلھا اور مشا کلت نہ ہو تو پھر جواب یہ ہے کہ سوق کے اصلی معنی تقاضا سے لے جانا ہے پھر کبھی تقاضا کے ساتھ تذلیل بھی ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرا شخص جانا ہی نہ چاہے اور کبھی محض تقاضا ہوتا ہے۔ تذلیل نہیں ہوتی جیسے آپ اپنے لڑکے کو ساتھ لے کر سفر میں جائیں اور وہ راستہ میں ہر شہر کی سیر کرنا اور ہر دوکان و بازار کو دیکھنا چاہے تو آپ تقاضا کرتے ہیں کہ میاں جلدی چلو یہاں کیا رکھا ہے منزل پر پہنچ کر ہر قسم کا سامان راحت مہیا ملے گا۔ اس صورت میں بھی سوق کا اطلاق ہو سکتا ہے اب سمجھئے کہ جنت میں جیسی لذت و راحت ہے وہ ظاہر ہے کہ جنت کا ارد گرد بھی پھول پھلوانی اور زینت و آرائش اس قدر ہے کہ دنیا میں کسی کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی تو جس وقت مسلمان جنت کی طرف چلیں گے اس وقت وہ راستہ کی زینت اور آرائش کی سیر میں مشغول ہو جائیں گے اور اس کے دیکھنے کے لئے ٹھہر جائیں گے کہ بھائی یہ پھول پتی بڑی عجیب ہے ذرا اس کی بھی تو سیر کر لیں یہ باغ تو نہایت ہی بے نظیر ہیں۔ اس کو بھی تو دیکھیں۔ اس وقت فرشتے تقاضا کریں گے کہ تم کا ہے کی سیر میں لگ گئے تم جلدی سے جنت میں پہنچو۔ وہاں ان سب سے زیادہ عجیب و غریب پھول پھلوانی اور میوہ جات ہیں اور وہاں حوریں ہیں غلمان ہیں ذرا تم قدم اٹھا کر وہاں تو پہنچ جاؤ۔ پھر ان سب کو بھول جاؤ گے یہ سن کر مسلمان کچھ تیزی کریں گے کہ تھوڑی دور پر کوئی اور سیر گاہ نظر پڑے گی اس کی سیر کرنے لگیں گے فرشتے پھر جلدی چلنے کا تقاضا کریں گے کیونکہ وہ خیر خواہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ جنت کو دیکھ کر خود افسوس کریں گے کہ ہم نے خواہ مخواہ راستے کی چیزوں میں دیر کی جنت کے سامنے تو سب گرد ہیں اس واسطے مسلمانوں کے لئے بھی وسیع فرمایا کیونکہ ہم بھی تقاضے کے ساتھ لے جائے جائیں گے گوان کا تقاضا اور طرح کا ہے اور کفار کا تقاضا دوسری طرح کا ہے مگر معنی سوق کے دونوں جگہ متحقق ہیں۔

لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس (بالیقین آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کی پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے) سے شبہ نہ پیدا ہو کہ اس آیت میں سموات وارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم اصغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اس کی فرع کیونکر ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلانی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد کو ثابت فرمایا ہے جس پر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مر گل کر دو بارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں کو اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دو بارہ زندہ کر دینا اس پر کیا دشوار ہے کفار کو اعادہ جسم ہی پر اشکال تھا اس کو ایسی چیزوں کی خلقت سے دفع کیا گیا جو مادہ میں انسان سے

بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کے لئے اکبریت مسلم ہے۔ گفتگو معنی اور سوویت میں ہے اور اس میں انسان سب سے اشرف و اکمل ہے چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں ؕ انعم اشد خلقاً ام السماء بناها رفع سمكها فسواها واغطش ليلها واخرج ضحها. (بھلا کیا تمہارا پیدا کرنا سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بنایا اس کی سقف کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا) یہاں اشدیت محض خلقت ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے هو الذي خلق لكم ما في الارض جميعاً ثم استوى الى السماء فسواهن سبع سموات (وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف تو درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان) جس سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب انسان ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور ارشاد ہے وسخر لكم ما في السموات وما في الارض (اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے سخر بنایا تمہارے لئے) اور وسخر لكم الشمس والقمر دائبين (اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو سخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں) اور وسخر لكم الليل والنهار واتاكم من كل ما سالتموه (اور تمہارے نفع کے واسطے رات دن کو سخر بنایا اور جو چیزیں تم نے مانگی وہ تمہیں دیدی۔

سُورَةُ الْمُؤْمِنِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ﴿۱﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتے ہیں اور جس شے کو سینے میں چھپاتے ہیں اس کو بھی جانتے ہیں۔

تفسیری نکات دو گناہوں کا ذکر

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو گناہوں کا ذکر فرمایا ہے آنکھوں کے گناہ کو اور دل کے گناہ کو اور یوں آنکھوں کے گناہ بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں ایک خاص گناہ کا ذکر ہے وہ کیا ہے بدزگاہی۔

بدزگاہی کی سزا بیان نہ کرنے میں حکمت

اسی واسطے فرماتے ہیں يعلم خائنة الاعين وما تخفي الصدور يعلم۔ کالفظ دال ہے کہ اور لوگ اس سے واقف نہیں ہیں ہم ہی واقف ہیں مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے اس گناہ کی کسی کو خبر نہیں یہ صحیح نہیں ایسے کو خبر ہے کہ جس کو خبر ہو جانا غضب ہے اس لئے کہ اس کو تم پر پوری قدرت ہے اور اس گناہ کو ذکر فرما کر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی بخلاف دیگر معاصی کے کہ ان کی سزا ساتھ ساتھ بیان فرمادی ہے اس میں ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ طبائع ہم لوگوں کی مختلف ہیں بعض طبائع تو ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو سزا ہونا مانع اور زاجر ہوتا ہے وہ تو وہ لوگ ہیں جو بے حیا و بے شرم ہیں کہ جوتوں سے ڈرتے ہیں اور بغیر جوتیوں کے خواہ کسی کو خبر ہو جاوے ان کو کچھ باک نہیں اور بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ سزا کی اگر اطلاع ہو جائے تو رکاوٹ کم ہوتی ہے

قبول ہو چکی اور شیطان کو دیکھتے کٹ رہا ہے پٹ رہا ہے جو تیاں پڑ رہی ہیں۔ لعنت کا طوق گلے میں ڈالا جا رہا ہے اس وقت دعا کی اور دعا بھی ایسی جو کسی کی ہمت نہیں ہو سکتی کہ قیامت تک زندہ رہوں اور اس پر وہاں سے حکم ہوتا ہے کہ سب قبول کیا ٹھکانا ہے اس وسعت رحمت کا ناواقفوں میں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوتی مگر کونسی دعا اور کہاں کی دعا کچھ معلوم بھی ہے آخرت میں بیشک کافروں کی دعا نجات کے لئے قبول نہ ہوگی وما دعاء الكافرين الا في ضلال۔ کے یہی معنی ہیں اس ہی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن شریف کا ترجمہ خود نہ دیکھیں کسی عالم سے پڑھنا چاہیے سبقاً سبقاً اور عالم بھی حافظ ہوتا ہے اوپر نیچے کی آیت کو دیکھ کر سمجھ سکے مطلب یہ کہ سیاق و سباق معلوم کر سکے۔ (اشرف التفسیر ج ۳ ص ۱۰۷)

وَمَا دُعَاؤُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝۱۰۷

ترجمہ: اور کافروں کی دعا محض بے اثر ہے

تفسیری نکات

کیا کافر کی دعا قبول ہو سکتی ہے

عدم اجابت دعا کافر پر استدلال کرنا جیسا بعض کا قول ہے یہ شبہ سیاق و سباق پر نظر نہ کرنے سے پڑا ہے اس سے پہلے عذاب آخرت کا ذکر ہے وقال الذين في النار لخنزة جهنم ادعوا ربكم الی قوله قالوا فادعوا پس کافر جہنم سے نکلنے کی اگر دعا کریں تو وہ دعا قبول نہ ہوگی ورنہ عام طور پر یہ حکم نہیں چنانچہ ابلیس کی دعا قبول ہونا منصوص ہے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنْ

اَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۸

ترجمہ: آسمانوں اور زمین کا (ابتدا) پیدا کرنا آدمیوں کے (دوبارہ) پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔ لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔

تفسیری نکات

انسان عالم صغیر ہے

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ حکماء انسان کو عالم صغیر کہتے ہیں اور صوفیہ کبیر کہتے ہیں اور اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت میں تصریح ہے انسان کے صغیر ہونے کی اور اس صورت میں حکماء اور صوفیہ کے کلام میں تعارض معلوم ہوتا ہے اور حکماء کی تائید کلام پاک سے ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ تعارض کچھ نہیں اس لئے کہ انسان میں دو درجہ ہیں ایک کے اعتبار سے حکماء کا قول صحیح ہے اور ایک اعتبار سے صوفیا کا قول صحیح ہے یعنی مادہ کے اعتبار سے تو انسان عالم صغیر ہے جیسا لفظ طلق اس پر دال ہے اور روح کے اعتبار سے عالم کبیر ہے اور اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ کے اکثر دقائق لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے اس لئے ان کے اقوال کو بظاہر دلائل کے معارض سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ وہ حقیقت ہوتی ہے مثلاً اس وقت میں نے ہی حکماء اور صوفیہ کے قول کو بیان کیا بتلائیے ان میں کیا تعارض ہے۔

ثبوت معاد

لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس سے شاید شبہ پیدا ہوا کہ۔ اس آیت میں سموات وارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم اصغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اس کی فرع کیونکر ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد کو ثابت فرمایا ہے جس پر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مرگل کر دو بارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دو بارہ زندہ کر دینا اس پر کیا دشوار ہے کفار کو اعادہ جسم ہی پر اشکال تھا اس کو ایسی چیزوں کی خلقت سے دفع کیا گیا جو مادہ میں انسان سے بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کے لئے اکبریت مسلم ہے گفتگو معنی اور مقصودیت میں ہے اور اس میں انسان سب سے اشرف واکمل ہے چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے فرماتے ۱۰ انتم اشد خلقاً ام السماء بناها رفع سمکها فسواها واغطش لیلها واخرج ضحها یہاں اشدیت محض خلقت ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے هو الذی خلق لکم مافی الارض جمعاً ثم استوی الی السماء فسواهن سبع سموات۔

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ

عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اور کہا تمہارے رب نے مجھے پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

تفسیری نکات

اہمیت دعاء

اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اس آیت میں بڑے اہتمام سے دعا کا مضمون بیان فرمایا ہے چنانچہ شروع میں یہ تصریح فرمائی کہ وقال ربکم حالانکہ پہلے سے معلوم تھا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے مگر پھر اس کو اس لئے ظاہر فرمایا کہ اس کی تاثیر نفس میں قوی ہو جائے اور مضمون مابعد کی وقعت دلوں میں زیادہ ہو پھر لفظ ربکم ارشاد فرمایا۔ اس میں بوجہ اظہار ربوبیت گویا اشارہ ہے دعا کے قبول کر لینے کا اس طور پر کہ چونکہ ہم ہمیشہ سے تمہاری پرورش کرتے آئے ہیں حتیٰ کہ بدوں تمہاری درخواست کے بھی کی ہے تو کیا تمہاری عرض کو درخواست کرنے پر بھی قبول نہ کریں گے نہیں ضرور قبول کریں گے۔

مانبودیم و تقاضا مانبود لطف ناگفتہ مای شنود

آیت واذا نشاء کم من الارض واذا نتم اجنة فی بطون امہاتکم الخ میں اسی تربیت بے درخواست کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد پیدائش کے بعد کی حالت قابل غور ہے کہ یہ حالت ایسی تھی کہ کسی قسم کی تمیز اور شعور اس وقت نہ ہوا تھا اس حالت میں اگر تمام دنیا کے حکماء سقراط بقراط وغیرہ اکٹھے ہو کر صرف اتنی ہی تدبیر کرنا چاہیں کہ بچہ دودھ پینا سیکھ جائے تو ہرگز وہ قیامت تک اس پر قادر نہیں ہو سکتے یہ اسی قادر ذوالجلال کی حکمت اور اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے بچے کو دودھ چوسنا سکھلایا۔ حکماء کہیں گے کہ یہ خود طبیعت کا فعل ہے مگر جب کہ خود طبیعت ہی کو وہ بے شعور مان چکے ہیں تو ایسے پر حکمت کاموں کا اس کی طرف منسوب کرنا بے شعوری نہیں تو پور کیا ہے۔

تیسرا اہتمام ربکم کی اضافت ہے گویا فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ہیں تم ہم سے مانگو اور اسی کی نظر دوسری آیت میں اضافت ہے ولویؤاخذوا لله الناس الی قوله کان بعبادہ بصیرا۔ حالانکہ یہاں عباد ماخوذین کا ذکر ہے مگر ان کو بھی اپنی طرف مضاف فرماتے ہیں سبحان اللہ کیا رحمت ہے۔

اس آیت کے متعلق ایک فائدہ علمیہ تفسیر یہ سمجھنے کے قابل ہے کہ آدمیوں کے مواخذے کی تقدیر پر تمام دواب

کے ہلاک کو کیسے مرتب فرمایا تو جہاں کی یہ ہے کہ سب چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے
 هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَالِي الْأَرْضِ جَمِيعًا لِيَعْنِي تَمَامَ حَيَاتِكُمْ جِزِيْنَ جِزِيْنَ فِيْهَا تَمَارٌ مِّنْهَا لَكُمْ
 پیداکر ہے۔ خواہ ان کا نفع بلا واسطہ تم کو پہنچے یا واسطہ درواسطہ۔ پس چونکہ انسان کے لئے ہی سب چیزیں پیدا
 کی گئی ہیں اس لئے انسان اگر گناہ پر ہلاک کیا جاتا تو دوسری چیزیں بھی اس لئے ہلاک کی جاتیں کہ جب وہی
 نہ رہا جس کیلئے یہ سامان تھا تو پھر اس سامان کی کیا ضرورت ہے۔ جب آدمی نہ ہوں تو پھر خیمے ڈیرے و دیگر
 اسباب سامان کس کام کے۔

البتہ یہ شبہ اور باقی رہ گیا کہ بروں کو تو ان کے برے کام کی سزا ملتی ہے اور نیک آدمیوں کو کیوں ہلاک کیا
 جاتا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھے آدمی قدرے قلیل ہوتے ہیں اور انسان کی ضرورتیں تمدن و آسائش کے
 متعلق اس کثرت سے ہیں کہ تھوڑے آدمی ہرگز ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ پھر اگر بروں کے بعد نیک زندہ رہتے
 تو ان کو جینا و بال ہو جاتا۔ ان کے لئے یہ مرنا ہی مصلحت و رحمت ہوتا اس سے بڑھ کر مقدمہ دعا میں اس آیت
 میں یہ اہتمام فرمایا کہ دعائے کرنے والوں کے واسطے ترہیب فرمائی کہ ان الذین يستكبرون الخ

ایک فائدہ علمیہ تفسیریہ

اس موقع پر ایک فائدہ علمیہ کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ ترہیب
 اعراض عن الدعاء پر ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو مادہ دعا کا اور ترہیب میں مادہ عبادت کا ذکر ہے
 چنانچہ يستكبرون عن عبادتی ہے يستكبرون عن دعائی نہیں ہے اور تطابق ضروری اس لئے یا تو دعا
 بمعنی عبادت کیا جائے یا عبادت بمعنی دعا قرار دیا جائے احتمال دونوں فی نفسہ برابر ہیں مگر چونکہ کلام مجید کا سمجھنے
 والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص زیادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ مخاطب اول آپ ہی ہیں اس لئے اسکے تعین
 کے لئے حدیث کو دیکھا گیا۔ سو آں حضرت نے ارشاد فرمایا۔ الدعاء مع العبادۃ دعا عبادت کا خلاصہ ہے۔
 او پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی جس سے ثابت ہوا کہ دعا اپنے معنی پر ہے اور عبادت سے مراد یہاں
 خاص دعا ہے ان اہتماموں سے دعا کی شان و عظمت کس درجہ ظاہر ہوتی ہے۔

سورة حم السجدة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحا صَرْصَرا فِیْ اَیَّامِ نَحِیْسَاتِ

تَنْجِیْمًا: اور ہم نے ان پر ایک ہوائے تندایسے دنوں میں بھیجی جو منحوس تھے

تفسیری نکات

بدفالی بری چیز ہے

اکثر عورتیں بدھ کے دن کو منحوس سمجھتی ہیں اور غضب ہے کہ بعض مرد بھی اس میں ان کے ہم عقیدہ ہیں مثلاً عورتوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی دن کو گھر میں بولے تو اس دن مہمان ضرور آتے ہیں اسی طرح اگر آنے میں پانی زیادہ ہو جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ آج کوئی مہمان آنے والا ہے اکثر جانوروں کو منحوس سمجھ رکھا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ قمری منحوس ہے اس کو گھرنہ پالو بلکہ اگر شوق ہو تو مسجد میں پالنا چاہئے شاید اس میں یہ حکمت ہو کہ اگر اجڑا تو اللہ ہی کا گھرا جڑے۔ نعوذ باللہ۔

غرض جتنی چیزیں اپنے سے نکمی ہوں سب خدا کے لئے بعض عورتیں کیلے کے لگانے کو منحوس سمجھتی ہیں کہتی ہیں کہ یہ درخت مردے کے کام میں آتا ہے اس لئے اس کو گھرنہ ہونا چاہیے کہ شگون بد ہے اور مردے کی چار پائی کو اس کے کپڑوں کو منحوس سمجھتے ہیں مگر تعجب ہے کہ اس کے کپڑوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے لیکن اگر اس کا قیمتی دو شانے ہو یا اس کی جائیداد ہو تو اس کو منحوس نہیں سمجھتے حالانکہ اگر مردے کے ساتھ تلبیس سے اس کے لباس میں نحوست آئی ہے تو اس تلبیس سے اسکے قیمتی کپڑوں میں نحوست آئی چاہیے اور اگر مردے کی طرف نسبت سے ان چیزوں میں نحوست آئی ہے تو اسی نسبت سے اس کی جائیداد میں بھی نحوست آئی چاہیے۔ یہ عقیدہ بالکل مہمل وہم ہے مسلمانوں میں اس کا رواج ہندوؤں سے آیا اور بعض چیزوں کو مرد بھی منحوس سمجھتے ہیں

جیسے الوکی نسبت کہتے ہیں کہ یہ جس مقام پر بولتا ہے وہ مقام ویران ہو جاتا ہے اس لئے وہ منحوس ہے حالانکہ یہ بالکل غلط خیال ہے نہ الو منحوس ہے نہ اس کے بولنے سے کوئی جگہ ویران ہوتی ہے یاد رکھو وہ جو بولتا ہے تو خدا کا ذکر کرتا ہے تو کیا خدا کے ذکر سے یہ نحوست آئی بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ذاکر تو ہے لیکن اس کا ذکر جلالی ہے اس لئے اس کا یہ اثر پڑتا ہے حالانکہ خود یہ تقسیم اور یہ کہ جلالی میں یہ خاصیت ہوتی ہے یہی بے اصل ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ الو ایسے مقام کو تلاش کرتا ہے جہاں یکسوئی ہو اور اسکو اندیشہ نہ رہے اس لئے وہ ویرانوں میں بیٹھتا ہے اب یہ دیکھئے کہ وہ ویرانی جو پہلے سے ہے کہاں سے آئی سو وہ ہم لوگوں کے گناہ اور اعمال بد کی وجہ سے ہوتی ہے اس کے بعد الو اس مقام پر آتا اور بولتا ہے بس ویران کن ہم اور ہمارے گناہ ہوئے نہ کہ الو اور جب یہ ہے تو منحوس گنہگار ہوئے الو کیوں منحوس ہوا بعض پڑھے ہوئے لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کیا ہے دن کے منحوس ہونے پر وارسلنا علیہم ریحاً صرصراً فی ایام نحسات الخ (اور ہم نے ان پر ایک تند و تیز ہوا ایسے دنوں میں بھیجی جو ان کے حق میں منحوس ہے) کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں میں عاد پر عذاب نازل ہوا ہے وہ دن منحوس ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دن کون کون ہیں اس کا پتہ دوسری آیت کے ملانے سے چلے گا فرماتے ہیں کہ واما عاد فاهلکوا ہریح صرصر عاتبہ سخرھا علیہم سبع لیلال و ثمانیۃ ایام حسوماً (اور قوم عاد کو ہلاک کر دیا گیا تیز و تند ہوا کے ذریعہ جو ان پر سات رات اور آٹھ روز مقرر کر دی گئی تھی) کہ آٹھ دن تک ان پر وہ عذاب رہا تو صاحبو! اس اعتبار سے تو چاہیے کہ کوئی دن مبارک ہیں نہ ہو بلکہ ہر دن منحوس ہو کیونکہ ہفتہ کے ہر دن میں ان کا عذاب پایا جاتا ہے جن کو ایام نحسات کہا گیا ہے تو کیا اس کا کوئی قائل ہو سکتا ہے اب آیت کے صحیح معنی سنئے مطلب آیت کا یہ ہے کہ ان پر جن ایام میں عذاب ہوا وہ ایام بوجہ نزول عذاب خاص ان کے لئے منحوس تھے نہ کہ سب کے لئے اور وہ عذاب تھا بوجہ معصیت کے پس مدار نحوست کا معصیت ہی ٹھہری اب بھلا اللہ کوئی شبہ نہیں رہتا۔ بعض لوگوں نے قرآن شریف کی دوسری آیت سے استدلال کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نحوست ہمیشہ کے لئے ہے قرآن شریف میں ہے فی یوم نحس مستمر (منحوس دن میں آندھی چلائی) مگر میں کہتا ہوں کہ مستمر کے دو معنی ہیں ایک دائم دوسرے منقطع دوسری تفسیر پر یہ معنی ہوں گے کہ وہ نحوست منقطع ہوگئی اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال (جب کسی چیز میں شک پیدا ہو جائے تو اس کو دلیل میں پیش کرنا صحیح نہیں) اور اگر کسی کی خاطر سے ہم مان بھی لیں کہ مستمر کے معنی دائم ہی کے ہیں تو ہم وہی پہلا جواب دیں گے کہ نحس سے مراد نحس علیہم ہے اور ان کے حق میں بوجہ عذاب کے دائم ہونے کے وہ یوم ہمیشہ ہی کے لئے منحوس ہے عرض یہ اعتقاد کہ چیزوں میں نحوست ہے غلط ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ

الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي

كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۳۳۰﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) مستقیم رہے ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم سے (پیغمبروں کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔

تفسیری نکات

اقرار تو حیدور بو بیت بہ قلب

ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا

اور تفسیر یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے یوں کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر وہ اس پر جے رہے (یعنی مرتد نہیں ہوئے) البتہ قالوا میں ایک قید بے شک ضروری ہے یعنی قالوا بقلوبہم کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی ربوبیت و تو حید کا اقرار دل سے کیا ہو پس قواعد شرعیہ سے یہ قید ضروری ہے کیوں کہ بدوں تصدیق بالقلب کے ایمان معتبر نہیں۔ پھر حق تعالیٰ کے اعتبار سے تو قلب کا ایمان کافی ہے مگر اجراء احکام کے لئے زبان سے کہنا شرط ہے جس میں حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ایمان کا علم ہو تو وہ اس کو اپنا آدمی سمجھیں۔ اس کے حقوق ادا کریں اور کفار اس سے الگ رہیں۔ اس کو اپنے اندر ملانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ تو ظاہری قواعد سے حکمت معلوم ہوتی ہے اور قواعد باطن سے اس میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ جیسے باطن کا اثر ظاہر پر ہوتا ہے اسی طرح ظاہر کا بھی اثر باطن پر ہوتا ہے۔ چنانچہ بچوں کے حفظ قرآن کا طریقہ تکرار باللسان ہے زبان سے جس لفظ کو بار بار کہا جاتا ہے وہ دل میں جم جاتا ہے اسی طرح ذکر باللسان کو زیادت اثر فی الباطن میں دخل ہے پس ان الذين قالوا ربنا الله کے معنی یہ ہیں الذين امنوا بالقلب و صدقوا باللسان جنہوں نے دل سے خدا کو مانا اور زبان سے تصدیق کی اور ثم استقاموا کے معنی یہ ہیں کہ اقاموا علیہ ولم یرتدوا پھر اس پر جے رہے اور مرتد نہیں ہوئے جزو اول قالوا ربنا میں احداث ایمان ہے اور جزو دوم ثم استقاموا میں ابقاء ایمان ہے۔ یہ معنی ہیں استقامت کے سیدھے سادے۔ آگے اس پر تفریح ہے۔

تتنزل عليهم الملكة الاتخافوا ولا تحزنوا

کہ ان پر فرشتے اترتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے آتے ہیں (کہ آخرت کے احوال سے) ڈرو مت اور دنیا کے فوت ہونے کا) غم نہ کرو الخ یہ فضیلت ہر مومن کو جو مرتد نہیں ہوا حاصل ہوگی کیوں کہ استقامت کا ایک درجہ اس کو بھی حاصل ہے اور یہاں جس فضیلت کا ذکر ہے وہ مطلق استقامت پر متفرع ہے خواہ کسی درجہ کی استقامت ہو مگر نہ معلوم ان واعظوں نے کہاں سے مخلوق کا گلا گھونٹ دیا اور استقامت کو اعلیٰ درجہ میں کس دلیل سے منحصر کر دیا۔ پس یہ تمہاری جنت میں جانا چاہتے ہیں۔ اکیلے ہی فلاں نہیں مارتے پھریں گے۔ مگر جب یہ دوسروں کو محروم کرنا چاہتے ہیں تو خود بھی نہ جائیں گے کیونکہ جب لوگوں کو کمال تقویٰ سے قاصر ہونے کی وجہ سے یہ جنت سے محروم سمجھتے ہیں تو اس کے مواخذہ میں بھی اول مستحق کیسے ہو جاویں گے۔

استقامت آسان ہے

بعض لوگوں کو بعض نصوص سے اس کا شبہ ہو گیا ہے کہ استقامت دشوار چیز ہے چنانچہ بعض نے فاستقم کما امرت سے کما امرت کی قید دیکھ کر یہ سمجھا ہے کہ استقامت کوئی بڑی چیز ہے جب ہی تو اس کو کما امرت کے ساتھ مقدم کیا گیا ہے ورنہ اس قید کی کیا ضرورت تھی اور یہ حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہیں ہے کیونکہ آگے ومن تاب معک بھی ہے جس سے مطلب یہ ہوا

استقم کما امرت وليستقم من تاب معک کما امروا

کہ جس طرح کا آپ کو امر ہے اس طرح آپ مستقیم رہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں جیسے ان کو امر ہوا ہے اس طرح وہ مستقیم رہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب کو امر الہی کے موافق استقامت حاصل کرنے کا حکم ہے اس سے کم درجہ کافی نہیں۔

تو سمجھنا چاہیے کہ یہ لوگ قرآن کے سیاق و سباق میں غور نہیں کرتے اس لئے شبہ میں پڑ گئے۔ اگر سابق و لاحق کو ملا کر اس آیت کو دیکھتے تو اشکال نہ ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں اس سے پہلے کفار کا ذکر ہے چنانچہ اس آیت کے اوپر یہ آیت ہے

ولقد اتینا موسیٰ الکتب فاختلف فیہ ولولا کلمة سبقت من ربک لفضی بینہم

والہم لفی شک منہ مریب و ان کلالمہ لیوفینہم ربک اعمالہم انہ بما یعملون خبیر ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی۔ سو اس میں بھی اختلاف کیا گیا اور اگر ایک بات نہ ہوتی۔ جو آپ کے رب کی طرف سے ٹھہر چکی ہے تو ان کا فیصلہ (ابھی) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ اس (فیصلہ) کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے اور بالیقین سب کے سب ایسے ہی ہیں۔

کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ دے گا۔ بالیقین وہ ان کے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے

فاستقم كما امرت و من تاب معك

جس سے ظاہر و متبادر یہ ہے کہ اس آیت سے حضور کا تسلیہ مقصود ہے گو تسلیہ صریح نہ ہوں مگر اس میں تسلیہ کا مضمون ضرور ہے کیونکہ ایسا مضمون تسلیہ صریح میں بھی مذکور ہے حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ کفار کی حالت بیان فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تسلی اس طرح کرتے ہیں کہ سب کو اپنے اپنے کام میں لگنے کا حکم فرماتے ہیں کہ تم اپنے کام میں لگے رہو۔ کفار کا معاملہ ہمارے ساتھ ہے ہم نبٹ لیں گے چنانچہ یہی مضمون یہاں بھی ہے۔ کہ اول کفار کا حال بیان فرمایا کہ یہ لوگ پہلے انبیاء سے بھی اختلاف کر چکے ہیں آپ کے ساتھ کفار کا اختلاف کوئی نئی بات نہیں اور ہم ان کو ابھی سزا دیتے۔ مگر ہماری طرف سے ایک بات ٹھہر چکی ہے اس لئے دنیا میں فیصلہ نہیں کیا جاتا باقی وقت معلوم پر سب کو اپنے اپنے کیے کا بدلہ ملے گا اس کے بعد فرماتے ہیں فاستقم كما امرت۔

یعنی جب ان کی سزا کا معاملہ آپ سے کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ تو آپ اور مسلمان کفار کی فکر میں نہ پڑیں۔ بلکہ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ کر آپ اور مسلمان اپنے کام میں لگے ہیں جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو حکم ہے۔ یہ حاصل ہے آیت کا بھلا اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ استقامت کوئی ایسی دشوار چیز ہے جس کا آپ کو اور مسلمانوں کو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کو حدیث استقیموا ولن تحصوا سے شبہ ہوا ہے جس کا مطلب وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مستقیم رہو مگر تم سے احصار نہ ہو سکے گا اور کہتے ہیں کہ دیکھو اس میں حضور نے بتلادیا کہ استقامت پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتی اس کا احصار دشوار ہے مگر یہ مطلب بیان کرنے والا بعینہ اس کا مصداق ہے کہ حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء۔

صاحب! اگر ولن تحصوا کا متعلق وہی استقامت ہے جس کا امر کیا گیا ہے تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ حضور ایسے کام کا حکم فرماتے ہیں جو کبھی نہیں ہو سکتا یہ تو لایکلّف اللہ نفسا الا وسعها کے صریح خلاف ہے کہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ استقامت حاصل کرو اور یہ بھی فرما رہے ہیں کہ تم سے ہونہ سکے گی تو پھر جو کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا امر ہی کس واسطے کیا گیا۔ اس لئے یہ مطلب غلط ہے۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ

استقیموا ما استطعتم ولا تصمقوا فیہا فانکم لن تحصوها ولا یشار الدین احدالا غلبہ یعنی جتنی استقامت تم سے ہو سکے حاصل کرو۔ یہ تو مامور بہ ہے۔ باقی اس میں تعمق و مبالغہ نہ کرو۔ کیوں کہ یہ مامور بہ نہیں اور تعمق و مبالغہ سے جس اعلیٰ درجہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ تم سے نہ ہو سکے گا اور یہ تو ان لوگوں کے خلاف ہے کیوں کہ وہ استقامت کے اعلیٰ درجہ کو مامور بہ کہتے ہیں۔

اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ درجہ جس میں تعمق و مبالغہ ہو مامور بہ نہیں ہے باقی جو مطلب حدیث

کا یہ لوگ سمجھتے ہیں وہ تو نص کے خلاف ہے حق تعالیٰ نے وسعت سے زیادہ کہیں امر نہیں کیا اور ہر موقعہ پر جہاں اس قسم کا شبہ واقع ہو فوراً اشکال رفع کیا ہے۔ چنانچہ جب انقوا اللہ حق نفاہہ (ترجمہ) اللہ سے ڈرو۔ جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ فرمایا تو صحابہؓ اشکال ہوا کہ یہ کس سے ہو سکے گا اور ایسا تقویٰ جو حق الوہیت کے شایان ہو کون کر سکتا ہے؟ تو اس پر فرمایا یہ آیت نازل ہوئی۔

فانقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطيعوا ”یعنی اللہ سے اتنا ڈرو جتنا تم سے ہو سکے“

بعض صحابہؓ نے اس کو پہلی آیت سے کے لئے ناسخ فرمایا ہے مگر قاضی ثناء اللہ صاحب نے تصریح کی ہے اور خوب ہی فرمایا ہے کہ نسخ اصطلاح سلف میں بیان تفسیر و بیان تبدیل دونوں کو عام ہے پس بعض صحابہؓ کا اس کو پہلی ہی آیت کے لئے ناسخ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت کی تفسیر ہو گئی اور بتلا دیا گیا کہ حق نفاہہ سے مراد وہ تقویٰ ہے جو تمہاری استطاعت میں ہو جتنا تقویٰ تم سے ہو سکے کرو وہ حق نفاہہ ہی میں داخل ہے بجز اللہ اشکالات سب رفع ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ یہاں جو فضائل اور بشارتیں استقامت پر متفرع ہیں وہ ہر مسلمان کو حاصل ہوں گی کیونکہ استقامت کا ایک درجہ ہر مومن کو حاصل ہے۔

مگر اس پر اب شاید یہ اشکال ہو کہ اگر اس آیت میں استقامت کے یہی معنی ہیں کہ بس ایمان حاصل ہو اور ایمان کے بعد مرتد نہ ہو تو آگے اس استقامت کے بہت سے فضائل مذکور ہیں کہ ان اہل استقامت پر رحمت فرشتے کے نازل ہوتے ہیں بشارت سناتے ہیں خوف و حزن کو رفع کرتے ہیں فرشتے ان کے رفیق ہوتے ہیں اس میں صالح اور فاسق سب برابر ہو جائیں گے اور اگر فاسق کو بھی یہ فضائل حاصل ہو گئے تو اس کو اور کیا ضرورت رہی۔ بس ایک شخص امنست باللہ زبان سے اور دل سے کہ لے اور اس پر جمار ہے پھر جو چاہے اعمال کرتا رہے اس کے لئے رحمت بھی ہے۔ بشارت بھی ہے فرشتوں کی رفاقت بھی ہے حزن و خوف سے بے فکری بھی ہے۔

اس اشکال کا جواب میں ایک قاعدہ کلیہ سے دیتا ہوں جو ہر مقام پر کارآمد ہے کیونکہ یہ اشکال کچھ اسی آیت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ بعض احادیث پر بھی واقع ہوتا ہے جیسے من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة وہ قاعدہ کلیہ میں نے اپنے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب سے سنا ہے کتابیں زیادہ دیکھنے کی مجھے عادت نہیں۔ اگر کسی کو وسعت نظر کا شوق ہو ان کا یہ شوق مبارک ہو ہمیں تو حق تعالیٰ نے اساتذہ ہی ایسے دیئے تھے جنہوں نے بہت سی کتب سے مستغنی کر دیا۔ کیسا ہی اشکال ہو ان کی چند باتوں سے جو یاد ہیں رفع ہو جاتا ہے مولانا فرماتے ہیں کہ شارع نے جو اعمال کے فضائل بیان کئے ہیں وہ گویا خواص اعمال ہیں اور خواص اشیاء کا ظہور عقلاً ارتقاع موانع سے مشروط ہوتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طیب ادویات کی خاصیت بیان کرے تو ہر عاقل اس کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ

اگر اس کے مخالف کوئی معترض چیز نہ کھائی جائے تو یہ نفع ظاہر ہوگا پس اگر کوئی خمیرہ گاؤزبان عنبری پر دو تولہ سکھیا بھی کھالے اور مر جائے تو اس سے خمیرہ کے خواص غلط نہ ہو جائیں گے اسی طرح لا الہ الا اللہ دل سے کہنے اور اس پر مستقیم رہنے کی بھی خاصیت ہے کہ اس سے ملائکہ رحمت کا نزول ہوتا ہے بشارت سنائی جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس کے منافی کوئی کام نہ کرے مثلاً لا الہ الا اللہ کے بعد ان اللہ ثالث ثلثہ یا اسح ابن اللہ وغیرہ نہ کہے اگر کلمہ ایمان کے بعد کلمہ کفر بھی کہ دے گا تو اس کی وہی مثال ہوگی جیسے خمیرہ کے بعد سکھیا کھالے۔

منافی کی دو قسمیں

پھر منافی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو پورا منافی ہو جیسے کلمہ ایمان کا مقابلہ کلمہ کفر ہے۔ یہ تو مہطل خاصیت ہے کہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کو بالکل باطل و زائل کر دے گا اور ایک وہ جو پورا منافی نہ ہو بلکہ فی الجملہ منافی ہو جیسے کفر کے علاوہ اور معاصی ہیں۔ ان سے کلمہ ایمان کی خاصیت باطل تو نہیں ہوتی مگر کمزور ہو جاتی ہے نفع دیر میں ظاہر ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے خمیرہ گاؤزبان کے ساتھ کھٹائی اور تیل ورگڑ اور سرکہ اور پیٹن بھی کھائے جائیں کہ ان اشیاء سے خمیرہ کی قوت کمزور ہو جائے گی اور نفع دیر میں ظاہر ہوگا۔

اس تقریر سے ایک اور شبہ کا جواب معلوم ہو گیا وہ یہ کہ میں نے جو اوپر کہا تھا کہ یہ فضائل خواص اعمال ہیں اور خواص کا ظہور رفع موانع کے ساتھ مشروط ہوتا ہے اس پر کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے تو رسول اللہ کے سامنے موانع اور مضرت کو بھی پیش کیا تھا کہ یا رسول و ان زنی و ان سرق۔

مگر حضورؐ نے ان کو مضرت نہیں مانا یعنی جب آپؐ نے فرمایا کہ جو کوئی لا الہ الا اللہ کا معتقد ہو کر مر جائے دھولا یشرک باللہ اس حال میں کہ وہ شرک نہ کرتا ہو تو یہ شخص جنت میں جائے گا اس پر حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! چاہے اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو تو آپؐ نے فرمایا و ان زنی و ان سرق۔

ہاں اگر چہ اس نے چوری بھی کی ہو اور زنا بھی کیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان خواص کا ظہور بد پرہیزی سے بچنے کے ساتھ مفید نہیں۔

تقریر گزشتہ سے یہ اشکال اس طرح حل ہوا۔ کہ اس حدیث میں حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ زنا و سرقہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے لئے مہطل نہیں۔ حضرت ابوذرؓ کو مہطل سمجھتے تھے حضورؐ نے اس کی نفی کر دی۔

رہا یہ کہ اعمال کسی درجہ میں بھی لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے منافی اور مضرت نہیں یہ اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ دوسرے نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا و سرقہ وغیرہ لا الہ الا اللہ کی خاصیت کے لئے مضعف اور اس کے لئے ظہور کے لئے مؤخر ہیں۔ یعنی ایسا شخص جنت میں تو ایمان کی برکت سے چلا جاوے گا مگر دیر میں جائے گا یا یہ کہا جائے کہ ایمان کی خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے مگر مغرور جب دوسرے اجزاء سے مرکب ہو

جاتا ہے تو مرکب کا مزاج دوسرا ہو جاتا ہے پس اگر ایمان اعمال صالحہ کے ساتھ مرکب ہو تو اس وقت مجموعہ کا مزاج اور ہوگا اس وقت ایمان کی خاصیت تیز اور قوی ہوگی کیوں کہ یہ اجزاء لا الہ الا اللہ کے مناسب ہیں اور اگر اعمال سخیہ سے مرکب ہو تو مجموعہ کا مزاج دوسرا ہوگا یا یہ کہا جائے کہ خاصیت تو اب بھی وہی باقی ہے مگر عارض و موانع کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔

اور تسنزل کا صیغہ متلا رہا ہے کہ یہ نزول بتدریج یکے بعد دیگرے ہوگا تا کہ زیادت مسرت و انشراح اور زیادت اکرام کا سبب ہو جیسے ایک شخص مہمان ہو کر بادشاہ کے یہاں جائے تو اول تو اسٹیشن پر اس کا استقبال کرنے ایک جماعت آئے اور بشارت دے کہ بادشاہ آپ کو یاد کر رہے ہیں پھر تھوڑی دیر چل کر ایک اور جماعت آئے اور خوشخبری و مبارک باد سنائے کچھ دیر کے بعد تیسری جماعت آئے اور وہ بھی مبارک باد اور خوشخبری سنائے تو اس میں زیادہ مسرت و اکرام ہے دفعۃً ہیوم سے تو مہمان بعض دفعہ گھبرا جاتا ہے اس لئے وہاں ملائکہ کا نزول تدریجاً یکے بعد دیگرے ہوگا پھر وہ سب کے سب یہ بشارت دیں گے لا تخالوا ولا تحزنوا کما آفات قیامت سے تم اندیشہ نہ کرو اور دنیا کے چھوٹے کارنج نہ کرو۔ کیونکہ آگے تمہارے لئے امن و راحت اور نعم البدل ہے۔

واہشروا بالجنة التي كنتم توعدون

تم جنت کے ملنے پر خوش رہو۔ جس کا (پیغمبر کی معرفت) تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا اور دنیا کو جنت سے کچھ بھی نسبت نہیں تو اب دنیا کے چھوٹے کارنج۔

حقیقت دنیا

یہ تو ایسا ہوا جیسا کسی کو اشرفی مل جائے اور پیسہ بلکہ کوڑی کھو جائے تو اس سے کچھ بھی رنج نہ ہوگا بلکہ تمنا کرے گا کہ ایسا پیسہ تو ہر روز کھو جایا کرے جس کے بدلہ میں اشرفی مل جائے۔

اس کے بعد فرشتے کہیں گے نحن اولیاءکم فی الحیوة الدنیا و فی الآخرة

کہ ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رفیق رہیں گے۔ یہاں بھی تمہارا ساتھ ہر قدم پر دیں گے دنیا میں فرشتوں کی رفاقت دو طرح ہوتی ہے۔ ایک تو وہ اعمال صالحہ انسان کے دل میں القا کرتے ہیں۔ دوسرے مصائب کے وقت سکینہ و اطمینان نازل کرتے ہیں چنانچہ صبر کے وقت کلفت ضبط کے علاوہ قلب میں ایک قوت اور جبین بھی ہوتی ہے یہ اسی سکینہ کا اثر ہے جہاد میں بھی ملائکہ سکین نازل کرتے ہیں چنانچہ نص میں ہے کہ بدر میں ملائکہ نازل ہوئے اور ان کا کام یہ تھا فثبتوا اللدین امنوا

کہ مسلمانوں کے قلوب کو قوت دیں اور لڑائی میں ان کو ثابت قدم بنائیں گو قتال بھی ملائکہ سے ثابت ہے مگر

اصل کام ان کا وہی تثبیت اور انزال سیکہ تھا تیسری رفاقت یہ ہے کہ ہر وقت انسان کے ساتھ رہے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں نص میں ہے لہ معقبات من بین یدیه و من خلفه یحفظونه من امر اللہ و اذا اراد اللہ بقوم سوء افلا مردلہ

انسان کے دشمن سانپ بچھو تو ہیں ہی اسکے دشمن جنات بھی ہیں اور فرشتے جنات سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ حفاظت نہ ہو تو جنات اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دیں۔ ہاں جب حق تعالیٰ ہی کوئی مصیبت بھیجنا چاہیں تب وہ ٹل نہیں سکتی۔ اس وقت اس حفاظت کی صورت بدل دی جاتی ہے اور جنات یا حیوانات سے اس کو تکلیف پہنچ جاتی ہے اور آخرت کی ایک رفاقت تو لو پر معلوم ہو چکی کہ مرتے ہوئے اور قبر میں اور حشر میں گھر سے نکلنے ہوئے بشارتیں سنائیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور موقعہ پر بھی فرشتے حاضر ہوں گے یعنی جنت میں۔

یدخلون علیہم من کل باب۔ ہر دروازہ سے مسلمانوں کے پاس سلام کرنے اور مبارک باد دینے آئیں گے۔ ولکم فیہا ما نشئہی انفسکم ولکم فیہا ما تدعون۔

یعنی جنت کو عیش محدود نہ سمجھنا اس کی یہ حالت ہوگی کہ جس چیز کو بھی تمہارا جی چاہے گا اس میں موجود ہے اور جو مانگو گے تمہارے لئے وہاں موجود ہے۔ اس پر ایک طالب علمانہ شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ لکم فیہا ما نشئہی انفسکم کے بعد لکم فیہا ما تدعون کی کیا ضرورت تھی کیونکہ مانگنا تو چاہنے کی فرع ہے جب وہاں ہر مشتی موجود ہے تو اس سے ہر مدعی کا ہونا خود لازم آ گیا پھر اگر کسی وجہ سے اس کو بیان کیا گیا تھا تو بقاعدہ بلاغت ابلغ کو مؤخر کرنا چاہیے تھا کیونکہ ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوا کرتی ہے نہ کہ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف اور یہاں اعلیٰ کو مقدم کیا گیا ہے یعنی ما نشئہی انفسکم کو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشتی اور مدعی تو یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ منہ سے مانگی اور دل کی چاہی مرادیں وہاں سب برابر ہیں جیسے منہ مانگی مراد فوراً پوری ہوگی ایسے ہی دل کی چاہی مراد بھی فوراً پوری ہوگی روایات میں ہے کہ جنتی کا دل کسی پھل کو دیکھ کر رغبت کرے گا تو فوراً وہ پھل ٹوٹ کر سامنے آ جائے گا اور اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا پھل درخت پر پیدا ہو جائے گا۔ اس تسویہ کو بیان کرنے کے لئے دونوں کا ذکر ضروری تھا اور لکم فیہا ما نشئہی انفسکم کی تقدیم بھی اسی لئے ہے کہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنے میں زیادہ مبالغہ ہے مثلاً کہا کرتے ہیں کہ ہمارے یہاں اشرفی اور پیسہ برابر ہے اس صورت میں ابلغ و اعلیٰ ہی کو مقدم کرتے ہیں ایسے ہی یہاں اعلیٰ کو ادنیٰ کے برابر کرنا مقصود ہے کہ مشتی جنت میں مثل مدعی کے ہے ادنیٰ کو اعلیٰ کے برابر کرنا مقصود نہیں کیوں کہ یہ مراد کے خلاف ہے اب اشکال رفع ہو گیا۔

آگے فرماتے ہیں نزلہ کہ یہ سب کچھ بطور مہمانی کے ہوگا بھیک منگوں کی طرح کھانا وغیرہ نہیں دیا جائے گا

بلکہ عزت و قدر دانی کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ اب جب ہر طرح سے اطمینان دلا دیا گیا تو قاعدہ ہے کہ اطمینان کے بعد وہم شروع ہوا کرتا ہے اور دور دور کی سوچا کرتی ہے اب جنتیوں کو یہ خیال ہوگا کہ میاں ہم تو اس قابل نہ تھے نہ ہمارے اعمال اس لائق تھے ہم نے تو بعضے بڑے بڑے گناہ بھی کیے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مہمانی تھوڑی دیر کے لئے ہو پھر معاصی پر گرفت ہونے لگے اس لئے فرماتے ہی من غفور رحیم۔

کہ گو تم اس قابل نہ تھے مگر حق تعالیٰ بخشنے والے ہیں انہوں نے تمہارے عیوب و نقائص کو معاف فرما کر یہ انعام کیا ہے کیونکہ وہ بخشنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ جرم کو معاف فرما کر عنایت و رحمت بھی فرماتے ہیں وہ جس مجرم کو معافی دیتے ہیں اس پر انعام بھی فرماتے ہیں خلعت و زاد راہ بھی عنایت کرتے ہیں۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا قَسِمُنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ

إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۳۷﴾

ترجمہ: اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں سے ہوں۔

تفسیری نکات

استفہام انکاری ہے یعنی اس سے اچھا کسی کا قول نہیں جو اللہ کی طرف بلاوے احسن سے معلوم ہوا کہ اچھی باتیں تو اور بھی ہیں مگر جتنی اچھی باتیں ہیں ان سب میں زیادہ اچھی بات دعوت الی اللہ ہے استفہام بقصد نفی ہے سبحان اللہ کیا بلاغت ہے کہ پوچھتے ہیں کون ہے احسن از روئے قول کے اس میں مبالغہ زیادہ ہے کیوں کہ عادت ہے کہ جس جگہ پر تردد ہوتا ہے کہ کوئی خلاف جواب دے دے گا وہاں پوچھا نہیں کرتے۔

مثلاً یوں کہتے ہیں کہ میاں فلاں تجارت سے اچھی کون سی تجارت ہے یہ وہاں کہتے ہیں جہاں مخاطب کو متکلم کی رائے سے اختلاف نہ ہو اور جہاں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید مخاطب خلاف جواب دے دے وہاں پوچھا نہیں کرتے بلکہ یوں بتلاتے ہیں کہ میاں اس سے اچھی کوئی تجارت نہیں اور جہاں یہ احتمال نہیں ہوتا بلکہ اعتماد ہوتا ہے کہ مخاطب بھی پوچھنے پر یہی جواب دے گا وہاں پوچھا کرتے ہیں کہ تمہی بتلاؤ کہ کون سی بات زیادہ اچھی ہے کیونکہ ظاہر بات ہے کہ بد یہی اور حسنی بات کا کوئی انکار نہیں کرتا اسی طرح اس دعوت الی اللہ کی فضیلت اتنی صاف بد یہی اور محسوس تھی کہ صرف پوچھنا کافی ہو گیا گویا یہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس سے اچھی فلاں بات ہے تو استفہام میں تو یہ بلاغت ہے۔

احسن قولاً کی تحقیق

اب احسن قولاً کی تحقیق رعی سو یہ فعل التفصیل کا صیغہ ہے یعنی کس کی گفتگو سب سے اچھی ہے جب اس ترجمہ کی ظاہر ہے کیونکہ احسن باعتبار قصد کے صفت ہے قولاً کی اور اقوال ہی کے اعتبار سے اس کی تفصیل بھی ہے اور چونکہ مفضل جنس مفضل علیہ ہی سے ہوتا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ سب قولوں سے اچھا اس شخص کا یہ قول ہے اور یہاں تک تو کوئی اشکال نہ تھا مگر آگے ارشاد ہے وعمل صالحاً اور عمل صالح بھی کرے۔ اس جملہ کو اس کے معطوف علیہ کے ساتھ ملانے سے حاصل یہ ہوا کہ سب سے اچھی بات اس شخص کی ہے جو دعوت الی اللہ کرے۔ اور نیک کام کرے۔ اس میں اشکال یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کو تو احسبیت قولاً میں دخل ہو سکتا ہے کیونکہ وہ خود قول ہے اور سب سے احسن مگر عمل صالح کا اس میں کیا دخل کیونکہ وہ فعل ہے قول نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ وہ قول نہیں مگر آداب و مکملات قول سے ہے اس لئے یہ بھی قول کے احسن ہونے میں دخل ہے تو حاصل یہ ہوا کہ صاحب قول احسن وہ ہے جو دعوت الی اللہ بھی کرے اور اس کے ساتھ ہی خود عمل بھی اچھا کرے یعنی جو کچھ کہے اس کے موافق عمل بھی کرے تب وہ صاحب قول احسن ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کوئی بہت اچھی بات کرے اور عمل اچھا نہ کرے تو قول تو اچھا ہے گو عمل نہیں ہے مثلاً اگر کوئی دعوت الی الاسلام کرے اور خود مسلمان نہ ہو دعوت الی الصلوٰۃ کرے اور خود نمازی نہ ہو اسلام کے اوصاف بیان کرے اور خود ان پر عقیدہ نہ رکھے تو اس پر من احسن قولاً تو صادق آتا ہے کیونکہ اس کے معنی من قولہ احسن ہیں یعنی جس کی بات بہت اچھی ہو۔ وہ احسن قولاً ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب اگر کوئی خود عمل نہ کرے تو اس کے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل رہا اگر اس نے خود نماز نہ پڑھی تو اس کا یہ قول تو احسن ہے زائد سے زائد یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل احسن نہیں تو اس سے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل پڑا۔ اس کا جواب یہ ہے قرآن بجز اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ قول کے اچھے ہونے میں عمل کے اچھے ہونے کو بھی دخل ہے۔

اقسام داعی

اور اس بناء پر اس آیت سے ایک مسئلہ بھی مستنبط ہوا کہ داعی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک صاحب عمل صالح ایک غیر صاحب عمل صالح اول کا قول یا دعوت احسن ہے ثانی کا قول یا دعوت غیر احسن ہے باقی یہ کہ اس کی لم کیا ہے کہ دعوت بلا عمل صالح غیر احسن ہے۔

تو اول یہ سمجھنا چاہیے کہ احسن ہونا کیوں ہے سو بات یہ ہے کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے اور ایک اس کی غایت ہوتی ہے تو قول احسن کی بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک طاعت ہے اور ایک کی غایت ہے اور

وہ غایت یہ ہے کہ وہ دعوت سبب ہے دوسرے شخص کے رجوع الی الخیر کا تو دعوت الی اللہ کو جو اچھا کہا گیا اور وجہ سے کہا گیا ایک تو اس وجہ سے کہ یہ سبب ہے لوگوں کے متوجہ الی اللہ ہونے کا تو یہ احسیہ تو باعتبار غایت کے ہے اور دوسری اس وجہ سے کہ وہ فی نفسہا طاعت ہے اور دونوں درجوں میں اس کا احسن ہونا مشروط ہے عمل صالح کیساتھ۔ وعظ اور عمل کے ساتھ ہی اس میں کبر و عجب ہو جاتا ہے کہ میں بڑا صاحب کمال ہوں کہ اللہ میاں کے تمام حقوق ادا کرتا ہوں حق تعالیٰ اس کے علاج کے لئے آگے تواضع کی تعلیم فرماتے ہیں وقال انسی من المسلمین یعنی اس نے یوں بھی کہا کہ میں مسلمین میں سے ہوں۔

آپ کو غالباً حیرت ہوگی کہ یہ تو دعویٰ ہوا نہ کہ تواضع۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے عنوانات میں عادت تو دعوے ہی کی ہے اس لئے یہاں بھی دعویٰ ہی معلوم ہوتا ہے مگر یہاں مقصود تواضع ہی ہے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسی چیز ہے جس میں دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ طاعت کاملہ ہے اور ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ گردن نہادان بطاعت ہے گویہ بھی کمال ہے مگر عنوان کمال کا نہیں ہے یا یوں کہو کہ اسلام کی ایک ذات ہے اور ایک صفت ہے جب ذات کے اعتبار سے اپنے اسلام پر نظر پڑتی ہے تو اس نظر کا اور اثر ہوتا ہے اور صفت کے اعتبار سے پڑتی ہے تو اور اثر ہوتا ہے ذات تو ہے گردن نہادان بطاعت اور صفت ہے طاعت کاملہ۔ جیسا کہ ان الدین عند اللہ الاسلام اس پر دل ہے یعنی خدا کے نزدیک دین صحیح و کامل اسلام ہی ہے اور چونکہ صفت تابع ہوتی ہے ذات کے اس کا مقتضایہ تھا کہ ہماری نظر اولاً اس کی ذات پر ہوتی مگر اب حیرت ہوگی کہ ہماری نظر اپنے اسلام پر ذات کی حیثیت سے نہیں پڑتی بلکہ صفت کی حیثیت سے پڑتی ہے کہ ہم میں یہ صفت کمال ہے اور اسی بنا پر دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں کمال ہونے میں تو شک نہیں۔ گفتگو تو یہ ہے کہ تابع پر نظر گئی اصل چیز یعنی ذات پر کبھی نظر نہ گئی اس لئے دعویٰ پیدا ہو گیا چونکہ اس جملہ کے تکلم میں خود عادت ہے دعویٰ کرنے کی نہ کہ تواضع کی اسی لئے قرآن میں بھی سمجھ گئے کہ دعویٰ میں مستعمل ہے حالانکہ یہاں تواضع مقصود ہے اور دونوں کے قصد میں لہجہ بھی جدا جدا ہوتا ہے تو بھائی یہ غلطی تو تمہاری ہے کہ لہجہ دعویٰ پڑھ کر دعویٰ مراد لے لیا تو گویا تم نے معافی کو تابع لہجہ بنا دیا دعویٰ کا کیوں اختیار کیا لہجہ انقیاد کا کیوں نہ اختیار کیا؟

پھر انہی مسلم نہیں۔ فرمایا کہ اس میں تفرد کا شبہ ہوتا کیوں کہ بڑے کا تو غلام بنا بھی نخر ہے تو اس صورت میں پھر شائبہ عجب کارہ جاتا کہ یہ شخص یہ سمجھتا کہ تنہا میں ہی فرمانبردار ہوں سبحان اللہ قرآن مجید میں بھی علوم کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں تو انہی من المسلمین میں ایک وجہ دلالت علی التواضع کی تو مادہ کے اعتبار سے تھی اور ایک وجہ صیغہ کے اعتبار سے ہے کہ اس سے اشارہ اس امر کی طرف کر دیا کہ کام کرنے والے بہت ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ایک ہی ہوں کبھی نخرہ پیدا ہوتا کہ میں نہیں کروں گا تو کام رک جائے گا یہ لفظ بھی بتلا رہا ہے کہ وہاں بہت سے غلام ہیں

اگر ایک غلام نے فرمانبرداری نہ کی تو اس نے اپنا ہی کچھ کھویا پھر اس جگہ تو ہر واحد کے اعتبار سے بتایا کہ ایک شخص کے چھوڑ دینے سے ہمارا کام نہیں رک سکتا۔

اب آگے بقیہ آیات کا ترجمہ بھی بیان کئے دیتا ہوں۔ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ یعنی اچھائی اور برائی برابر نہیں ہے یہاں سوال ہوتا ہے کہ اوپر تو دعوت الی اللہ کا ذکر تھا یہاں یہ بیان ہے کہ نیکی بدی برابر نہیں ہے آخر اس جملہ کو سیاق و سباق سے کیا مناسبت۔ آگے ارشاد ہے اَدْفَعْ بِالسَّتِي هِيَ اِحْسَنُ یعنی مدافعت کیجئے اس طریقے سے جو اچھا ہو یہ بھی بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اخلاق کی تعلیم ہو رہی ہے۔ جواب یہ ہے کہ اصل تعلق تو دعوت الی اللہ کے معمول سے اَدْفَعْ بِالسَّتِي هِيَ اِحْسَنُ کا ہے اس طرح سے کہ جو شخص دعوت کے لئے کھڑا ہوتا ہے عموماً اس کی مخالفت ہوتی ہے لوگ برا بھلا کہتے ہیں ممکن ہے کہ اس وقت اس میں بھی بیجان پیدا ہوتا ہو اور یہ بھی بدی کے بدلے بدی کر بیٹھے اس لئے ایسے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی تعلیم فرماتے ہیں کہ اخلاق درست کرو اپنے میں ضبط اور صبر پیدا کرو یہ معنی ہوئے اَدْفَعْ بِالسَّتِي هِيَ اِحْسَنُ کے یعنی اَدْفَعْ السَّيِّئَةَ بِالْحَسَنَةِ کہ کوئی برائی کرے تو اسے نیکی کر کے دفع کر دو پس اصل تعلق تو جملہ اَدْفَعْ کا ہے باقی لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ يَهِيَ اِسْ كِي تَهْيِدُ هِيَ اِدْفَعْ بِالسَّتِي كَا مَكْر تَهْيِدُ مِي سَهْلُ اِي ك قَاعِدَه كَلِيَه تَتَاتِي هِي ك دِي كَهْوِي نِي كِي اُو ر بَدِي اِثْر مِي بَرَابَر نِي هُو تِي اِي ك اِغْرَابَرَانِي كَا اِنْقَام بَرَانِي سَه لِيَا تُو اِس كَا اِثْر اُو ر هُو كَا اُو ر اِغْرَابَرَانِي دِيَا تُو اِس كَا اِثْر اُو ر هُو كَا۔ اُو ر هُو اِثْرِيَه هُو كَا كَه

فَاذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَ بَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَانَهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ

جس شخص کے اور تمہارے درمیان میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے گاڑھا دوست۔ مطلب یہ کہ دعوت الی الاسلام کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ مخالفین بھڑکیں نہیں کیونکہ اگر بھڑکے۔ تو اس کا شر اور بڑھے گا پہلے چھپی ہوئی عداوت کرتا تھا تو اب کھل ہوئی کرے گا تو اس عداوت سے اور شر سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ ٹال دو اور انتقام لینے کی فکر نہ کرو تو دشمن دوست بن جاوے گا اور پھر وہ اگر تمہیں مدد بھی نہ دے گا تو تمہاری کوششوں کو روکے گا بھی نہیں اور دعوت الی اللہ کا کام مکمل ہوگا۔

یہاں اس کے متعلق ایک شبہ ہے کہ ہم بعض جگہ دیکھتے ہیں کہ باوجود اس رعایت کے بھی وہ دوست نہیں بنتا بلکہ اپنے شر اور فساد میں اسی طرح سرگرم رہتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بقاعدہ عقلیہ ایک شرط ملحوظ ہے وہ یہ کہ بشرط سلامتہ الطبع کہ وہ شر سے اس وقت باز رہے گا جبکہ سلیم الطبع ہو اور اگر سلامت طبع کی قید نہ ہو تو اس وقت یہ جواب ہے کہ ولی حمیم نہیں بلکہ کانہ ولی حمیم فرمایا ہے تشبیہ کا حاصل یہ ہوگا کہ کچھ نہ کچھ شر ہی میں کمی رہے گی اور اگر تم انتقام لو گے تو گو اس وقت یہ عدم قدرت کی وجہ سے خاموش ہو جاوے گا مگر در پردہ کینہ مضمر

رکھے گا اور حتی الامکان لوگوں سے تمہارے خلاف سازش کرے گا جس کو غلطی سے آدمی کبھی یوں سمجھ جاتا ہے کہ انتقام اصرح ہوا تو ایک ادب یہ بتانا تبلیغ کا کہ صبر و ضبط سے کام لیا جائے اور جو ناگوار امور مخالفین کی طرف سے پیش آویں انہیں برداشت کیا جاوے اور یہ مدافعت سپہہ بالحقہ چونکہ کام تھا نہایت مشکل اس لئے اس کی ترغیب کے لئے فرماتے ہیں۔

وما یلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها الا الذر وحظ عظیم

اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے تو اس مدافعت کی ترغیب دو وجہ سے دلائی گئی ہے ایک باعتبار اخلاق کے کہ ایسا کرنے میں صابریں میں شمار ہوگا اور ایک باعتبار اجر و ثواب کے ایسا کرو گے تو اجر عظیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔

اب اس میں ایک مانع بھی تھا یعنی دشمن شیطان جو ہر وقت لگا ہوا ہے اس کا بھی علاج بتاتے ہیں۔

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ و عمل صالحا و قال انی من المسلمین.

ترجمہ: اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو بلاوے طرف اللہ کے اور (خود بھی) نیک عمل کرے

اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

تکمیل ایمان کے تین اجزا

اس میں تکمیل ایمان کے لئے تین اجزاء مذکور ہیں۔ ایک دعوت الی اللہ کہ دوسروں کو بھی اللہ کی طرف بلائے۔ امر بالمعروف کرے۔ یعنی لوگوں کو اسلام کی دعوت دے اور مسلمانوں کو طاعات کی ترغیب دلائے دوسرے یہ کہ خود بھی اعمال صالحہ اختیار کرے۔ محض نفس ایمان پر اکتفا نہ کرے۔ تیسرے یہ کہ یوں کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

اس تیسرے جملہ پر بظاہر یہ اشکال ہوگا کہ دعا الی اللہ و عمل صالحا کے بعد اس کی کیا ضرورت رہی۔ کیوں کہ دعوت الی اللہ اور عمل صالحہ بدوں اسلام کے ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلام تو اس کے لئے پہلی شرط ہے پھر جو شخص اللہ کی طرف بلائے گا وہ خود بھی ضرور مسلمان ہوگا۔ اس سے خود اس کا مسلمان ہونا مفہوم ہو گیا۔

نیز اس سے پہلے بھی جو فضائل نفس ایمان کے مذکور ہیں وہ بھی اسلام کو مقتضی ہیں۔ بدوں اسلام کے نہ جنت مل سکتی ہے نہ بشارتیں حاصل ہو سکتی ہیں تو اب وقال النبی من المسلمین کو اخیر میں کیوں بیان کیا گیا؟ اس کو تو تکمیل استقامت میں دخل نہیں بلکہ نفس استقامت ہی اس پر موقوف ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں اسلام من حیث ہوا لا اسلام کا قبول کرنا مراد نہیں کیوں کہ واقع یہ تو پہلے کلام سے مفہوم ہو چکا ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کو اپنے اسلام کے ظاہر کرنے سے عار نہیں آتا بلکہ فخر کے طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ بات نفس اسلام سے زائد ہے۔ یہ اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کا اسلام

کامل ہو۔ لہذا اس کو تکمیل اسلام میں دخل ہوا۔ کیونکہ بعض لوگ مسلمان تو ہوتے ہیں مگر ان کو کفار کے سامنے اظہار اسلام سے عار آتا ہے۔

چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ ریل میں ایک بار نماز کا وقت آ گیا تھا۔ مگر میں نے وہاں اس لئے نماز نہیں پڑھی کہ ہندوؤں کے سامنے التاسیدھا ہونے سے اسلام کی تحقیر ہوتی۔ کہ یہ لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے کہ اسلام میں یہ کیسی تعلیم ہے یہ شیطان کی تلمیذ تھی کہ اس نے اس ترکیب سے ترک نماز کو اس کے ذہن میں آراستہ کر دیا۔

آگے اسی کے متعلق ایک بات فرماتے ہیں جو اسی آیت کے لئے کالجز وہے مستقل مضمون نہیں۔ وہ یہ کہ اوپر دعوت الی اللہ کا امر تھا اور دعوت الی اللہ میں بعض دفعہ کفار یا فجار یا ایداء پہنچاتے ہیں۔ اس کے متعلق ایک دستور العمل تعلیم فرماتے ہیں اور وہ تعلیم تو اذفع بالتی ہی احسن سے شروع ہوگی مگر اس سے پہلے مقدمہ کے طور پر ایک قاعدہ کلیہ بیان فرماتے ہیں۔

ولا تستوی الحسنة والسینة

یعنی یہ قاعدہ یاد رکھو کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ اچھا برتاؤ اور برابر برتاؤ برابر نہیں ہوتا پس تم کو دعوت میں عمدہ برتاؤ اختیار کرنا چاہیے وہ کیا ہے؟ آگے اس کا دنیوی فائدہ بتلاتے ہیں۔

اذفع بالتی ہی احسن

یعنی مخالفت کے برے برتاؤ کو اپنے اچھے برتاؤ سے دفع کرو بدی کا علاج بھلائی سے کرو۔ اگر وہ سختی کریں تو تم نرمی کرو ان کے ساتھ خشونت سے پیش نہ آؤ۔

فاذا الذی بینک و بینہ عداوة کانه ولی حمیم

یعنی پھر دیکھ لینا کہ تم میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے کسانہ ولی حمیم میں لفظ تشبیہ سے اس طرف لطیف اشارہ ہے کہ بعض لوگ تو نرمی کرنے سے بالکل ہی درست ہو جاتے ہیں اور بعض اگر دوست نہیں ہوتے لیکن ان کی عداوت ضرور گھٹ جاتی ہے اور شر میں تقلیل ہو جاتی ہے اور اس امر میں وہ دوست کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ گو دلی دوست نہ ہو مگر اس میں ایک شرط ہے جس کو میں بھول گیا تھا اپنی تفسیر کو دیکھا تو اس میں اس تمام پر سلامت حس کی قید بڑھائی ہے یعنی یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثر یہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر مخاطب کی طبیعت میں سلامتی ہوئی تو اس برتاؤ کا یہ اثر ضرور ظاہر ہوگا اور یہ قید دلیل عقلی سے پائی گئی ہے پس اب یہ اشکال نہ رہا کہ بعض دفعہ ہم دشمن سے کتنی ہی نرمی کرتے ہیں مگر عداوت بڑھتی ہی جاتی ہے جو اب ظاہر ہے کہ وہ شخص کج طبع ہے اس لئے اثر نہیں ہوا سلیم الطبع ہوتا تو ضرور جھک جاتا۔

آگے فرماتے ہیں کہ بدی کا بدلہ بھلائی سے کرنا ہر ایک کو آسان نہیں بلکہ یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے

جو بڑا مستقل مزاج اور صاحب نصیب ہے یعنی جو اخلاقی اعتبار سے مستقل اور ثواب آخرت کے اعتبار سے صاحب نصیب ہے اس میں اس معاملہ کا طریقہ بتلادیا کہ اپنے اندر استقلال کا مادہ پیدا کرو اور آخرت کے حصہ کو دل میں جگہ دو۔ پھر یہ سب کچھ آسان ہو جائے گا۔

آگے فرماتے ہیں کہ اگر کسی وقت شیطان کی طرف سے (غصہ کا) وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے اس میں غصہ کا علاج بتلایا گیا ہے کہ غصہ کے وقت زبان سے اعوذ باللہ پڑھنا چاہیے اور اس دل سے اس کے مضمون پر غور کرنا چاہیے کہ جیسے ہم دوسرے پر غصہ کرتے ہیں اور اس وقت بظاہر اس پر زبردست ہیں ایسے ہی ہمارے اوپر بھی ایک زبردست ہے جس کی پناہ کی ہم کو ضرورت ہے۔

اس کے بعد ایک مراقبہ کی تعلیم ہے جس کے عمل کرنے سے غصہ وغیرہ کا دفع کرنا بہت سہل ہو جائے گا انہ ہو السميع العليم۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو خوب سنتے اور تمہارے اعمال و احوال کو خوب جانتے ہیں اس لئے جو بات کرو اور جو کام کرو سنبھل کر کرو غصہ میں جلدی سے کچھ کام نہ کرو مبادا حق تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کام ہو جائے تو گرفت ہو۔

وما یلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها الا الذو حظ عظیم.

اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحب نصیب ہے تو اس مدافعت کی ترغیب دو وجہ سے دلائی گئی ہے ایک باعتبار اخلاق کے کہ ایسا کرنے میں صابریں میں شمار ہوگا اور ایک باعتبار اجر و ثواب کے ایسا کرو گے تو اجر عظیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔

اب اس میں ایک مانع بھی تھا یعنی دشمن شیطان جو ہر وقت لگا ہوا ہے اس کا بھی علاج بتاتے ہیں۔ واما ینزعنک من الشیطن نزع فاستعد باللہ

اگر آپ کو شیطان کی طرف سے وسوسہ آوے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے یعنی بعض اوقات مخالفین کی باتوں پر شیاطین غصہ دلاتے ہیں اور اس وقت صبر کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے تو ایسے وقت کے لئے فرماتے ہیں کہ فاستعد باللہ خدا کی پناہ میں چلے جاؤ یہ مطلب نہیں کہ صرف زبان سے اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو۔ مطلب یہ ہے کہ خدا سے دل سے دعا کرو کہ وہ شیطان کے وسوسہ کو دور کر دے اور صبر پر استقامت دے اللہ ہو السميع العليم بلاشبہ وہ خوب سنتے والا خوب جاننے والا ہے یعنی وہ تمہاری زبان سے پناہ مانگنے کو بھی سنیں گے اور دل سے پناہ مانگنے کو بھی جانیں گے اور پھر تم کو پناہ دیں گے اور مدد کریں گے اور شیطان کو دفع کر دیں گے ان آیات میں حق تعالیٰ نے پورے پورے آداب اور مکملات دعوت الی اللہ کے اور اس کے طریقے سب بتادیئے۔

الْاِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ۝

ترجمہ: یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو (اپنے علم کے) احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

تفسیری نکات

آنغوش رحمت

اگر کوئی معشوق اپنے عاشق سے یہ کہے کہ کہو تم مجھے گود میں لیتے ہو یا میں تمہیں گود لے لوں تو واللہ اگر کچھ سلامتی فہم ہے تو کہے گا کہ میری ایسی قسمت کہاں تو مجھے بغل میں لے کے بیٹھے اس لئے کہ بغل میں لینے والا تو محبت ہوتا ہے خلاصہ یہ کہ اگر کسی کو تمنا ہوتی تو محیط ہونے کی ہوتی ہے خدا کی عنایت ہے کہ وہ تمہیں بغیر تمہاری تمنا کے آنغوش رحمت میں ایسا گھیرے ہوئے ہے کہ تم کسی آن میں اس سے باہر نہیں ہو سکتے اس سے بڑھ کر اب اور مجالست کیا ہوگی اتنی بڑی دولت کے ہوتے ہوئے تم یہ چاہتے ہو کہ ثمرات ہوں احوال ہوں ذوق طے شوق طے اس کی ایسی مثال ہے کہ

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ پائے بوسی اندریں دم شد گناہ
ترجمہ: بادشاہ اگر دست بوسی کے واسطے کسی کو ہاتھ دیدے تو اس وقت میں قدم چومنا جرم ہے

سُورَةُ الشُّورَى

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝

ترجمہ: کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے

تفسیری نکات

کوئی چیز حق تعالیٰ کے مماثل نہیں

کہ حق تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں اس لئے خدا کا ہاتھ ہمارے اور تمہارے ہاتھ جیسا نہیں ہے دیکھئے یہاں حق تعالیٰ نے لیس ہو کامل شیء نہیں فرمایا کیونکہ حق تعالیٰ تو قدیم ہیں ان میں یہ احتمال ہی نہیں ہو سکتا کہ ان کا وجود کسی شیء کے وجود کی مماثلت پر قائم ہوا ہو اس لئے لیس ہو کامل شیء کہنے کی ضرورت نہ تھی ہاں دوسری اشیاء حق تعالیٰ کے وجود سے متاخر ہیں ان میں یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ شاید ان میں سے کسی شیء کا وجود یا صفت ذات حق تعالیٰ کے وجود یا ذات و صفات کی مثل بنائے گئے ہوں اس کی نفی فرمادی گو مماثلت طرفین سے ہوتی ہے اور جب ایک طرف سے مماثلت کی نفی ہوگی تو جانب آخر سے بھی نفی ہوگی اس لئے لیس کامل شیء کا مفہوم لیس ہو کامل شیء کے معنی کو بھی مستلزم ہے مگر پھر بھی جو صورت نفی تشبیہ کی قرآن میں ہے وہ اکمل ہے جس کا نکتہ میں نے بتلادیا۔

اللَّهُ يُجْتَبَىٰ إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ۗ

ترجمہ: اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے جو شخص خدا کی طرف رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دیتا ہے۔

تفسیری نکات

سلوک و جذب

اجتباء بمعنی جذب ہے یہاں اصطلاح لغت کے موافق ہے یہاں حق تعالیٰ نے جذب کو تو اپنی مشیت پر رکھا ہے کہ جس کو ہم چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں وہ وعدہ عام نہیں فرمایا اور ہدایت کی انابت پر مرتب فرمایا ہے جو مراد ہے سلوک کا اور فعل ہے عبد کا حاصل یہ ہوا کہ جو شخص بھی حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے اختیار سے اعمال قرب کو اختیار کرتا ہے حق تعالیٰ اس کو وصول الی المقصود سے کامیاب فرمادیتے ہیں اور یہ عام طریقہ ہے اس میں کسی کی خصوصیت نہیں۔

یہاں یہ حقیقت سمجھنے کے قابل ہے کہ اس جگہ ہدایت سے مراد ایصال ہے جس سے معلوم ہوا کہ انابت سلوک پر ایصال ضرور مرتب ہوتا ہے اور ایصال کا حاصل بھی وہی ہے جو اجتباء کا حاصل ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اجتباء عمل سے مقدم ہے اور اس میں عمل کو کچھ دخل نہیں اور ایصال عمل سے مؤخر ہے۔ اس میں انابت و سلوک عبد کو بھی بظاہر کچھ دخل ہے تو معلوم ہوا کہ جذب ہی کی دو قسمیں ہیں ایک قبل العمل ایک بعد العمل۔ مگر زیادہ وقوع جذب بعد العمل کا ہے عادت اللہ یہی ہے کہ سلوک یعنی عمل مقدم ہوتا اور جذب مؤخر ہوتا ہے کبھی اس کا بھی وقوع ہوا ہے کہ عمل سے پہلے جذب ہو گیا اور جذب کے بعد عمل مرتب ہوا سو اس جذب قبل العمل کے واقعات دیکھ کر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سلوک و عمل بے کار ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ عمل علت تامہ وصول کی نہیں بلکہ شرط اکثری ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ یوں کہے کہ علاج کو صحت میں دخل نہیں اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ علت نہیں تو صحیح ہے کیونکہ صحت علاج کے بعد ضروری نہیں ممکن ہے کہ ایک شخص علاج کرے اور صحت نہ ہو اور اگر مطلق سیرت کی نفی مراد ہے تو غلط ہے کیونکہ سیرت فی الجملہ مشاہد ہے یہی حال اعمال کا ہے کہ ان کو وصول و قرب میں علیت کا تو دخل نہیں باقی سیرت کی نفی نہیں ہو سکتی۔

یہی مطلب ہے حدیث لا یدخل الجنة احد بعمله کا نہیں داخل ہوگا کوئی جنت میں عمل کے استحقاق کی بناء پر کہ اس میں بھی علیت اعمال کی نفی ہے اور مقصود اس سے عجب کا علاج ہے کہ کوئی شخص عمل

کرے اترائے نہیں کہ میں نے اپنے عمل سے جنت لے لی کیونکہ اول تو عمل کے بعد بھی جذب کی ضرورت ہے اور جذب کا مدار مشیت حق پر ہے سلوک کے بعد بھی وہی پہنچتا ہے جس کو حق تعالیٰ پہنچا دیں کیونکہ وصول عبد کے اختیار سے خارج ہے اس کا مدار ایصال حق پر ہے جو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور گو سلوک پر ایصال کا ترتب عادتاً ضرور ہوتا ہے مگر جو شے عادتاً ضروری ہو اور عقلاً لازم نہ ہو اس کو عمل کا معلول نہیں کہہ سکتے اگر وہ عمل کا معلول ہوتا تو عقلاً بھی علت کے بعد اس کا وجود لازم ہوتا اور یہاں ایسا نہیں ورنہ فعل واجب کا معلول ہونا لازم آئے گا اور یہ دلائل سے باطل ہے دوسرے علت و معلول میں مناسبت بھی شرط ہے جزا عظیم کا ترتب عمل عظیم ہی پر ہو سکتا ہے تو جس درجہ جزاء عظیم ہے عمل بھی اسی درجہ عظیم ہونا چاہیے تو اب دیکھ لو کہ جنت کس درجہ عظیم ہے اور تمہارا عمل کیسا ہے جنت تو کما و کیفاً ہر طرح عظیم ہے کما تو اس کی عظمت یہ ہے کہ غیر متناہی ہے اور کیفاً اس کی یہ شان ہے کہ لاخطر علی قلب بشر (کسی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں گزرا) اور ہمارے اعمال کی یہ حالت ہے کہ کما تو متناہی ہیں اور کیفاً ناقص

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا مِنْ

دَابَّةٍ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان دونوں میں جو حیوانات پھیلانے ہیں اور وہ ان (خلائق) کے جمع کر لینے پر بھی جب وہ (جمع کرنا) چاہے قادر ہے۔

تفسیری نکات

مجموعہ ارض و سماء

مفسرین نے تو اس میں یہ تاویل کی ہے کہ مراد مجموعہ ارض و سماء ہے کہ مجموعہ میں دو اب پیدا کئے اور مجموعہ پر حکم ایک جزو کے اعتبار سے بھی صحیح ہے چنانچہ بخروج منهما اللؤلؤ والمرجان میں مفسرین نے یہی تاویل کی ہے بہر حال ممکن ہے کہ سیارات میں بھی کوئی حیوانی مخلوق ہو اور اس سے اہل سائنس کا غرور تو ٹوٹا کیونکہ وہ اہل مرتخ کو اپنے سے عقل مانتے ہیں پھر اس کے ساتھ مساوات اور اجرام علویہ کی مخلوق ملا لو اور اس کے بعد کشف کو بھی ملا لو تو عبد الکریم جبلی کا کشف ہے کہ ایک دریا زمین و آسمان سے باہر ہے جس کی ایک موج ساتوں آسمان و زمین سے دس لاکھ حصہ زیادہ ہے اگر اس کی موج آسمان و زمین کے ساتھ لگرا جائے تو سب غرق ہو جائیں مگر ملائکہ اس کی موجوں کو تھامے ہوئے ہیں تاکہ آسمان اور زمین سے نہ لگرائیں اور اس

دریا میں نہ معلوم کتنی مخلوق دریائی ہوگی تو حق تعالیٰ کی کیسی قدرت ہے کہ اپنی تمام مخلوق کی حفاظت اور کافی انتظام فرماتے ہیں اور واقعی اگر وہ حفاظت نہ فرمائیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں چنانچہ اس حفاظت پر اپنا ایک واقعہ یاد آ گیا ایک رات اندھیرے میں خانقاہ سے میں اپنے گھر گیا تو گھر کا راستہ بھول گیا اور کسی کے گھر پر پہنچ گیا بڑی دقت سے گھر کا راستہ ملا اس وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور عظمت منکشف ہوئی پس یہ فائدے ہیں مصائب میں کہ ان سے استحضار و عظمت ہوتا ہے کیونکہ رنج و تکلیف اور بیماری میں عظمت حق زیادہ منکشف ہوتی ہے اور اس کے مقابل اپنا عجز بھی زیادہ منکشف ہوتا ہے پس مصائب سے انسان پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے اور عبدیت اعلیٰ مقام ہے اور یہ مصائب میں زیادہ حاصل ہوتا ہے اسی لئے کسی نے کہا ہے

اہلکاران بوقت معزولی شبلی وقت و بایزید شوند
بازچوں میر سند برسر کار شر ذی الجوش ویزید شوند

عجائبات قدرت کا علم

بعض لوگ جو مرغ میں جانا چاہتے ہیں ہم تو اس ارادہ سے خوش ہیں کیونکہ ہمارے بہت سے کام نکلیں گے اول تو معراج سے اشکال رفع ہوگا دوسرے اخبارات میں وہاں کے حالات پڑھیں گے تو عجائبات قدرت کا علم ہوگا اور شرعاً وہاں آبادی کا ہونا محال نہیں کیونکہ شریعت نے اس کی نفی نہیں کی بلکہ غالب تو یہی ہے کہ سکوت کیا ہے اور احتمال کے درجہ میں بعض نصوص میں اس مسئلہ کو داخل بھی کر سکتے ہیں کیونکہ قرآن میں ایک مقام پر ارشاد ہے۔

ومن ابته خلق السموات والارض وما بث فیہما من دابة

”کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور ان دونوں میں جو حیوانات پھیلائے ہیں (اور دابہ کا اطلاق ملائکہ پر نہیں ہوتا)

شیطان کی مثال

شیطان کی تاریکی جیسی ہے کہ اس کو ہاتھ ہی نہ لگاؤ نہ جلب کے نہ دفع کے لئے ورنہ تم کو لپٹ جائے گا بلکہ اس کو منہ بھی نہ لگاؤ اس کی التفات بھی نہ کرو۔ تم نے اس شیطان سے ڈر کر اس کا دماغ بگاڑ دیا اس سے بالکل نہ ڈرو اور اس کو منہ ہی نہ لگاؤ۔ انہ لیس لہ سلطان علی الدین امنوا و علی ربہم یتوکلون انما سلطانہ علی الدین یتولونہ والدین ہم بہ مشرکون جن کا خدا پر بھروسہ ہے جو خدا پر نظر رکھتے ہیں ان پر شیطان کا ذرا بھی قابو نہیں اس کا قابو انہی پر چلتا ہے جو اس سے کچھ دار رکھتے ہیں اس کو منہ لگاتے ہیں لیس لہ سلطان میں نگرہ تحت الہی ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر نظر رکھنے والوں پر اس کا ذرا بھی قابو

نہیں تم اس کو منہ لگا کر قبضہ اپنے اوپر بڑھاتے ہو پس ذکر لسانی و ذکر جہر میں دوسو سے زبیا کا اندیشہ نہ کرو اس پر التفات ہی نہ کرو اور اگر شیطان یہ کہے کہ ذکر ریائی بے فائدہ ہے تو کہہ دو کہ تو غلط کہتا ہے یہ بھی ایک واسطہ سے مفید ہے۔ غالباً حضرت حاجی صاحبؒ کی حکایت ہے کہ ان سے ایک شخص نے کہا کہ فلاں شخص ریاضت سے ذکر کرتا ہے فرمایا وہ تجھ سے اچھا ہے اس کا یہی ذکر ریائی ایک ٹھنٹا ہوا چراغ بن کر اسے پل صراط سے پار کر دے گا اور تیرے پاس تو ٹھنٹا ہوا چراغ بھی نہیں اور وہ واسطہ یہ ہے کہ ریاضت سے آگے چل کر اخلاص بھی پیدا ہو جاتا اور یہ جواب پوری کامیابی نہ ہونے میں مگر پوری ناکامی بھی نہ ہونے میں ایسا ہے جیسا مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک معترض کو جواب دیا تھا۔ اس نے بعض اکابر دین پر جو ایک بڑے کام میں شریک ہوئے تھے مگر ناکام رہے اعتراض کیا تھا کہ ان لوگوں نے خواہ مخواہ اپنے کو تباہ کیا ان کو کیا حاصل ہوا مولانا نے فرمایا۔

سود اثمار عشق شیریں سے کوہ کن بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھوسکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہہ عشق باز اے روسیہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا
مگر اتنا کہے دیتا ہوں کہ ان حضرات کو اپنی سعی میں کامیابی کی توقع غالب تھی اس لئے ان کا وہ فعل موجب اجر تھا گونا گونا گویا اور اگر کامیابی کی توقع غالب نہ ہو جیسا کہ اس وقت حال ہے تو ایسے افعال جائز نہیں نہ ان میں اجر ہے۔ یہ گفتگو اس بات پر طویل ہو گئی کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں قالوا ان اللہ فرمایا ہے عملہ واعتقدوا نہیں فرمایا تو میں نے بتلادیا کہ قول میں خاص اثر ہے جو مجرد علم میں نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مصائب کے وقت ہم کو اس مضمون کے استحضار و تکرار کی تعلیم دی ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ بتلا رہا ہے کہ وہ ہم کو راحت دینا چاہتے ہیں پریشانی میں نہیں رکھنا چاہتے پس احکام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لئے آسانی چاہتے ہیں اور معاملات سے بھی اور ان کی صفات سے بھی رحمت و شفقت و رافت کا غلبہ ہوتا ہے چنانچہ جابجا ان اللہ غفور رحیم۔ ان اللہ حکم لرواف رحیم موجود ہے

ہرچہ می گویند آں بہترز حسن یار ما این دارد و آں نیز ہم
جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان حسن سے بہتر ہے۔ ہمارا محبوب یہ آن بھی رکھتا ہے اور حسن بھی۔
اب تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو پریشانی سے بچانا چاہتے ہیں ایک مقام پر فرماتے ہیں
لا تعلقوا بایديکم الی التهلكة اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حدیث میں ہے سددوا و وقار ہوا
استقیمو اولن تحصوا ولن یشاد الدین احد الا علیہ او کما قال جو شخص مشقت میں پڑتا ہے۔
اللہ تعالیٰ اس پر مشقت ہی بڑھادیتے ہیں اس کا ترجمہ فارسی میں کسی نے خوب کہا ہے
گفت آساں گیر خود کار ز روی طبع سخت می گیرد جہاں بر مرد مال سخت گوش
ترجمہ: (التفسیر للتفسیر بلحقہ مؤاعظہ تدبیر (توکل) ص ۳۱۰ تا ۳۱۳)

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ

ترجمہ: اور تم کو (اے گناہ گارو) جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے اور بہت سی تو درگزر کر دیتا ہے۔

تفسیری نکات

انسان کی بد اعمالی کے نتائج

تو دیکھئے مسبب واحد ہے اور سبب مختلف مگر ہر ایک کا اثر جدا ہے جو دباؤ و عداوت کی وجہ سے پڑا ہے اس کا دوسرا اثر ہے اور جو محبت کی وجہ سے ہے اس کا دوسرا اثر ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ایک مسبب کے لئے مختلف اسباب بھی ہوا کرتے ہیں تو اب سنئے کہ آپ نے اب تک صرف ایک سبب کو سنا ہے۔ ما اصابکم من مصیبة فيما کسبت ایدیکم کہ جو مصیبت آتی ہے وہ انسان کی بد اعمالیوں کی وجہ سے آتی ہے۔ دوسرا سبب بھی تو سنئے حدیث میں ہے اشد الناس بلاء الانبياء ثم الامثل کہ سب سے زیادہ سخت بلا انبیاء پر آتی ہے۔ پھر ان لوگوں پر جو ان کے بعد دوسروں سے افضل ہوں و علی ہذا معلوم ہوا کہ کلفت کا سبب فقط ایک ہی نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام یقیناً گناہوں سے معصوم ہیں تو ان پر گناہوں کی وجہ سے کلفت و رنج کا آنا ممکن نہیں لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ کبھی رفع درجات کے لئے بھی کلفت پیش آتی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت گناہ کی وجہ سے آتی ہے کیونکہ ما اصابکم من مصیبة یعنی جو بھی تم کو مصیبت پہنچتی ہے سے عموم مستفاد ہوتا ہے اور فيما کسبت ایدیکم تمہارے ہی ہاتھوں کی کرتوت سے پہنچتی ہے۔ ظاہر احصر معلوم ہوتا ہے۔ اب اس آیت کو اس حدیث سے تعارض ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا رفع درجات کے لئے بھی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ حدیث و قرآن میں تعارض کے وقت قرآن ہی کو ترجیح ہوگی پس یہی ثابت ہوا کہ گناہ ہی کی وجہ سے مصیبت آتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعارض کچھ نہیں اور اس شبہ تعارض کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے چنانچہ ارشاد ہے ما اصابکم من مصیبة کہ جو کچھ تم کو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے کرتوت سے آتی ہے تو یہاں مصیبت کا لفظ ہے اور حدیث میں مصیبت کا لفظ نہیں ہے وہاں بلا کا لفظ ہے۔ پس آیت کا حصر بالکل صحیح ہے کیونکہ مصیبت مذہب (گناہ گاری) کو آتی ہے اور اہل مصیبت گناہ گاری لوگ ہیں۔ ان پر جب مصیبت آتی ہے گناہوں ہی کی وجہ سے آتی ہے اور مقبولین اہل مصیبت نہیں ہیں وہ اہل بلا ہیں ان پر جب بلا آتی ہے رفع درجات اور زیادہ بڑھانا محبت کے لئے آتی ہے اور مصیبت اور بلا میں صورۃ فرق کم ہوتا ہے ظاہر میں دونوں ایک ہی معلوم ہوتی ہیں مگر آثار میں دونوں کے بڑا فرق ہوتا ہے جس

سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کی حقیقت بھی الگ الگ ہیں پس مصیبت کی حقیقت ہی سزا اور انتقام اور بلا کی حقیقت ہے محبوبانہ چھیڑ چھاڑ اور امتحان۔ محبوب کے دبانے اور بھیجنے کو مصیبت کوئی نہیں کہا کرتا پس انبیاء اور مقبولین پر بلا آیا کرتی ہے مصیبت نہیں آیا کرتی اور بلا کے معنی لغت عربی میں آزمائش اور امتحان کے ہیں۔

ما اصابکم من مصیبة لہما کسبت ایدیکم

صورت مصیبت اور حقیقت مصیبت

کہ تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی حوادث کا نزول ہوا اور بعض انبیاء کو قتل تک کیا گیا اور موت کو قرآن میں بھی مصیبت کہا گیا ہے۔ فاصابتکم مصیبة الموت

نیز غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک پر صدمہ آیا۔ سر میں زخم آیا تو کیا نعوذ باللہ حضرات انبیاء سے بھی کوئی گناہ سرزد ہوا تھا جس کی وجہ سے ان پر یہ مصائب نازل ہوئے اللہ حق کا توفیق ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں حشو یہ نے انبیاء کی قدر نہیں کی وہ ان کو معصوم نہیں مانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں حشو یہ کا یہ قول نقل کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہدہ کرتے ہیں تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لئے انتخاب نہیں یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے اشخاص کو نبوت کا عہدہ دے دیا جاتا ہے کہ اوروں کو قانون کا پابند بنادیں اور خود قانون کے خلاف کریں عقل کبھی اس کو باور نہیں کر سکتی۔

پس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی اور یہ محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے تو وہ گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں۔ گو صورت اس کی ہواب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو لے کر حضرات انبیاء و اولیاء کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء و اولیاء پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی اور وہ غایت انقیاد و تقویٰ سے یوں کہتے تھے

اے حریفان راہ ہار ابستہ یار آہوئے میگم داو شیر شکار
غیر تسلیم و رضا کو چارہ درکف شیر زخوں خوارہ

اور یوں کہتے ہیں

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من
یہ حشو یہ کی حماقت ہے کہ انہوں نے انبیاء کو اپنے اوپر قیاس کر لیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے شیر ہیں ان سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہیں دیکھا کہ ہمارے مصائب میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے اس قیاس فاسد ہی نے مخلوق کو تباہ کیا ہے اور یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا کیوں کہ انہوں نے انبیاء کو ظاہر دیکھ کر ان کو اپنے جیسا سمجھا مولانا فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زیں سب گمراہ شد کم کے زابدال حق آگاہ شد
گفتہ ایک مابشر ایساں بشر مادایاں بستہ خوابیم و خور
ایں ندانستند ایساں از عمی درمیاں فرقتے بود بے منجا
کار پاکاں را قیاس از خود مکیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
ایک شخص نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے

شیر آں باشد کہ آدم می خورد شیر آں باشد کہ آدم را می خورد
آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کر بغل میں دبانا گودبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا بھاگنا چاہے گا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو بغل میں لے کر دبائے اور زور سے دبائے۔ اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے نکلنا چاہے گا ہرگز نہیں بلکہ یوں کہے گا
نشو و نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغیت سردوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عشاق کی یہ حالت ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی ز بند شکارش نجوید خلاص از کند
اور یہ حالت ہے کہ

خوشا وقت شورید گاں غمش اگر تلخ بیند و گرم ہمیش
گدایا نے از پادشائی نفور بامیدش اندر گدائی صبور
دام شراب الم درکشند وگر تلخ بیند دم درکشند

اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ ایک صورت مصیبت ہے ایک حقیقت مصیبت ہے حقیقت مصیبت

تو واقعی گناہوں سے ہی آتی ہے مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی ہے۔

ما اصابکم من مصیبة پر شبہ کا جواب

مصیبت کی دو قسمیں ہیں ایک صورت مصیبت ایک حقیقت مصیبت۔ اس سے ایک سوال کا جواب حاصل ہو جائے گا۔ وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ايديکم کہ تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی حوادث کا نزول ہوا۔ بعض انبیاء کو قتل کیا گیا اور موت کو قرآن میں بھی مصیبت کہا گیا ہے۔ فاصابتکم مصیبة الموت۔ نیز غزوة احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک پر صدمہ آیا۔ سر میں زخم آیا تو کیا نعوذ باللہ حضرات انبیاء سے بھی کوئی گناہ سرزد ہوا تھا؟ جس کی وجہ سے ان پر یہ مصائب نازل ہوئے۔ اللہ حق کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں حشویہ (ایک باطل فرقہ) نے انبیاء کی قدر نہیں کی وہ ان کو معصوم نہیں مانتے میں کہتا ہوں حشویہ کا قول نقل کے تو خلاف ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہد کرتے ہیں تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لئے انتخاب نہیں یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے اشخاص کو نبوت کا عہدہ دے دیا جاتا کہ اوروں کو تو قانون کا پابند بنا دیں اور خود قانون کے خلاف کریں عقل کبھی اس کو باور نہیں کر سکتی۔ پس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی اور یہ شخص تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا اور وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت اس کی ہوا ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو لے کر حضرات انبیاء و اولیاء کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ حضرات انبیاء و اولیاء پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی اور وہ عاقبت انقیاد و تقویٰ سے یوں کہتے تھے۔

اے حریفان راہ ہار ابستہ یار آہوئے لکیم واد شیر شکار
غیر تسلیم و رضا کو چارہ درکف شیر زخوں خوارہ
(اے حریفوں پار نے راستہ بند کر رکھا ہے۔ ہم لنگڑے ہرن ہیں اور وہ شکاری شیر ہے۔ بجز تسلیم و رضا کے کوئی چارہ نہیں ایسے شخص کے لئے جو خونخوار شیر کے ہاتھ میں ہے ۱۲)

اور یوں کہتے ہیں

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من
ناگواری بھی مجھ کو اپنے لئے گوارا ہے۔ اس لئے کہ میرا دل اپنے محبوب پر فدا ہو چکا ہے۔

یہ حثویہ کی حماقت ہے کہ انہوں نے انبیاء کو اپنے اوپر قیاس کر لیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے شیر ہیں ان سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہ دیکھا کہ ہمارے اور ان کے مصائب میں کتنا زمین آسمان کا فرق ہے اس قیاس فاسد نے ہی مخلوق کو تباہ کیا ہے اور یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا کیونکہ انہوں نے انبیاء کا ظاہر دیکھ کر ان کو اپنا جیسا سمجھا مولانا فرماتے ہیں۔

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کے زابدال حق آگاہ شد
گفتہ ایک مابشر ایساں بشر ماؤ ایساں بستنہ خواتیم و خور
ایں ندانستند ایساں از عمی درمیان فرقتے بود بے منعہا
کارپاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند درنوشتن شیر و شیر
(ہر عالم اس سبب سے گمراہ ہو گیا۔ بہت کم کوئی ابدال سے واقف ہو سکا۔ کہا اس نے کہ یہ بھی آدمی ہیں اور ہم بھی آدمی ہیں۔ یہ اور ہم سب نیند اور کھانے کے محتاج ہیں۔ یہ نہ جانا انہوں نے بے وقوفی سے کہ آپس میں بے انتہا فرق ہے۔ پاک لوگوں کے کام کو خود پر قیاس پر مت کر۔ اگرچہ مانند ہیں لکھنے میں شیر و شیر) ایک شخص نے اس پر یہ اصناف کیا ہے

شیر آں باشد کہ آدم می خورد شیر آں باشد کہ آدم می خورد

(شیر وہ ہے کہ جو آدمی کو کھاتا ہے۔ شیر وہ ہے کہ جس کو آدمی پیتا ہے)

صاحبو! آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کے بغل میں دبانا گودبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا۔ بھاگنا چاہے گا اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو بغل میں لے کر دبائے اور زور سے دبائے اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کہ وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے لکلنا چاہے گا ہرگز نہیں بلکہ یوں کہے گا

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغیت سردوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(نہ ہو دشمن کا نصیب کہ تیری تلوار سے ہلاک ہوئے۔ دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ کے عاشق ہی چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے اور عشاق کی یہ حالت

اسیرش نخواہد رہائی ز بند شکارش بخوید خلاص از کند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا۔ اس کا شکار جال سے خلاصی تلاش نہیں کرتا)

اور یہ حالت ہے کہ

خوشا وقت شوریدگاں غمش اگر تلخ بیند وگر مر ہمیش

گدایانے از بادشاہی نفور بامیدش اندر گدائی صبور

دام شراب الم در کشند وگر تلخ بیند دم در کشند
 (کیا ہی اچھا وقت ہے اس کے خم کے شوریدہ حالوں کا۔ خواہ تلخ دیکھتے ہیں اور خواہ اس کا مرہم۔ ایسے
 گدا ہیں جو بادشاہی سے نفرت کرنے والے ہیں۔ اس کی امید کے ساتھ گدا کی میں مبر کرنے والے ہیں۔
 پے بہ پے الم کی شراب پیتے ہیں۔ اگر تلخ دیکھتے ہیں دم کھینچ لیتے ہیں)
 اب تو آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ ایک صورت مصیبت ہے ایک حقیقت مصیبت ہے۔ حقیقت
 مصیبت تو واقعی گناہوں سے ہی آتی ہے مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی
 ہے۔ (ماخوذ البدائع)

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ

بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

ترجمہ: الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی (اور تکبر)
 کرتے ہیں ایسوں کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے۔

تفسیری نکات

حقوق العباد کی تاکید

اس آیت میں حقوق العباد کے متعلق ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے جو سیاق و سباق کے لحاظ
 سے ایک خاص حق العباد کے متعلق وارد ہے مگر عموم الفاظ سے مطلقاً حقوق العباد کے متعلق ہے۔

حق سبحانہ و تعالیٰ کی عجیب تعلیم

بیوی کی قدر کرنا چاہیے کہ وہ دنیا اور دین دونوں کے معین ہے اور اس کے حقوق کی رعایت بہت زیادہ
 ضروری ہے کیونکہ اس میں چند در چند خصوصیات ہیں جن میں سے ہر ایک کے بہت سے حقوق ہیں چونکہ آج کل
 لوگ عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اس لئے میں نے اس پر تشبیہ کرنا ضروری سمجھا اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں
 حق تعالیٰ فرماتے ہیں انما السبیل علی الذین یظلمون الناس و یبغون فی الارض بغیر الحق۔

بس الزام تو ان ہی لوگوں پر ہے جو آدمیوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں عبارتہ الص
 اور مسوق لہ الکلام تو اس آیت میں انتقام کے وقت ظلم کی وعید کا بیان کرنا ہے مگر اشارۃً ابتداءً ظلم کو بھی شامل ہے
 خواہ انتقام میں ہو یا نہ ہو کیونکہ الفاظ آیت میں عموم ہے اور اسی لئے میں نے اپنی تفسیر میں تعیم پر تشبیہ کر دی ہے

بلکہ اشارہ کے ساتھ دلالت بھی تحریم ظلم پر دال ہے اور یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ انتقاماً ظلم کا حرام ہونا ابتداء ظلم کی حرمت کو بدرجہ اولیٰ مستلزم ہے کیونکہ انتقام کے وقت انسان کو جوش غضب ہوتا ہے اس لئے کہ پہلے دوسرے کی طرف سے ظلم ہو چکا ہے اور جوش میں حد سے بڑھ جانا مستبعد نہیں بلکہ حد پر قائم رہنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے تو جب مقام عذر میں بھی ظلم کی اجازت نہیں تو جہاں کوئی سبب اور عذر بھی نہ ہو وہاں تو ظلم کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے لہذا دلالت انص سے بھی یہ آیت ابتداء ظلم کو شامل ہے اس کے بعد فرماتے ہیں ویسغون فی الارض اور سرکشی و تکبر کرتے ہیں زمین میں یہ اس لئے بڑھایا کہ بتلا دیا کہ ظلم کا منشا اور سبب تکبر ہے چنانچہ میں نے کہا تھا کہ حقوق العباد کے عدم اہتمام کا ایک سبب ہے وہ یہ کہ لوگوں نے تاکد حق کا سبب صرف عظمت میں منحصر کر لیا ہے جس کی عظمت دل میں ہے اس کے حقوق تو ادا کرتے ہیں اور جس کی عظمت قلب میں نہیں اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے اور کسی کی عظمت نہ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اس کو اپنے سے حقیر سمجھا جاتا ہے اور یہی حاصل ہے تکبر کا اسی کو حق تعالیٰ نے بیغون میں بیان فرمایا ہے اور چونکہ تکبر کا مذموم ہونا عقلاً و نقلاً سب کو مسلم ہے لہذا اس کا علاج بھی ضرور ہوا آگے حق تعالیٰ نے فی الارض میں اس کا علاج بتلایا ہے حق تعالیٰ کی بھی عجیب تعلیم ہے کہ بیماری کے ساتھ ساتھ دوا بھی بتلاتے ہیں تمام قرآن کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں کسی مرض کو بیان فرمایا ہے وہاں ساتھ ساتھ علاج بھی بتلایا ہے بس وہ شان ہے کہ

درد از یار است و در ماں نیز ہم دل فدائے او شد و جاں نیز ہم

(مرض بھی دوست کی طرف سے اور اس کا علاج بھی دل بھی اس پر فدا ہے اور جان بھی)

حق تعالیٰ نے کائنات میں بھی یہی طرز رکھا ہے کہ جو چیز کسی بات کو مضر ہے اس کے پاس ہی مصلح بھی موجود ہے ایک سیاح کہتے تھے کہ ایک گھاس سخت زہریلی ہے جس کا نام بچھو ہے اگر کسی کو لگ جائے تو بچھو کے کانٹے کی سی لہر دوڑ جاتی ہے مگر اس کے پاس ایک دوسری گھاس بھی پیدا ہوتی ہے وہ اس کا تریاق ہے کہ جہاں اس کو ملا فوراً تکلیف زائل ہوگئی اسی طرح یہاں فی الارض میں علاج کبر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حیرت کی بات ہے کہ زمین پر رہ کر اور مٹی سے پیدا ہو کر تکبر کرتے ہو ذرا سوچو تو کہ تمہاری اصل کیا ہے یہی زمین تمہاری اصل ہے جس پر آدم اور چلتے پھرتے ہکتے موتے ہیں یہ تمہاری ماں ہے پس تم کو تو خاک بن کر رہنا چاہیے ایک دوسرے مقام پر بھی حق تعالیٰ نے اس بات پر تنبیہ کی ہے منہا خلقنا کم و فیہا نعید کم و منہا نخرجکم تارۃ اخوی (اس سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو پھر لوٹائیں گے اور اسی میں سے دوبارہ تم کو نکالیں گے) اس میں بھی مراقبہ ارض کی تعلیم ہے کہ ہم نے تم کو زمین ہی سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے کہ مگر سب خاک ہو جاؤ گے سارا بدن گل سڑ جائے گا پھر کس بات پر تکبر کرتے ہوئے واقعی تکبر کا یہ عجیب علاج ہے پس ہم کو اس سے کام لینا چاہیے اور زمین کی حالت میں تفکر کرنا چاہیے اسی کو سعدیؒ نے کہا ہے

ز خاک آفریدت خداوند پاک پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

(خداوند تعالیٰ نے تجھ کو خاک سے پیدا کیا پس اے بندہ مثل خاک فروتنی کر)

افسوس ہماری ماں کی تو یہ حالت ہے کہ وہ سب کے پاؤں کے تلے ہے اور ہماری یہ حالت کہ آسمان پر چڑھے جاتے ہیں صاحب یہ سارا ناز اس وقت تک ہے جب تک خدا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں اگر ایک نعمت بھی چھن جائے تو سارا ناز خاک میں مل جائے۔

وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا

الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ

عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

ترجمہ: (اور اسی طرح جیسا کہ اوپر بشر کے ساتھ ہم کلام ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے) ہم نے آپ کے پاس بھی وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (چنانچہ اس سے پہلے آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب اللہ کیا چیز ہے اور نہ (مفصلات) یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا ہے جس کے ذریعہ سے (بواسطہ آپ کے) ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ آپ (اس قرآن وحی کے ذریعہ) ایک سیدھے راستے کی ہدایت کر رہے ہیں (من بیان القرآن ملخصاً)

تفسیری نکات

فطرت سلیمہ کا تقاضا

سو یہاں حق تعالیٰ نے ما کنت تدری فرمایا ہے جس کا ترجمہ بے خبری اور ناداہی ہی سے کیا جاتا ہے یعنی معنی ہیں ووجدک ضالاً کے مگر ظاہر ہے کہ اس حقیقت کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ضالاً یا گمراہ کا استعمال کس کس معنی میں آتا ہے اس لئے ان کو وحشت نہیں ہو سکتی اور جاہل کے ذہن میں تو گمراہ کے ایک ہی معنی ہیں اس لئے اس کو ظلمان پیش آئے گا اس لئے ایسے لوگوں کو ترجمہ دیکھنا جائز نہیں۔

اب میں اسطراد ایک اشکال کا اور جواب دینا چاہتا ہوں جو دوسری آیت ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان پر واقع ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ کو کچھ خبر نہ تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کیا چیز ہے جس سے بظاہر ایمان کی نفی ہوتی ہے سو سمجھ لینا چاہیے کہ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی زمانہ ایسا بھی گزرا جس میں آپ کو ایمان حاصل نہ تھا ہرگز نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو نفس ایمان ہر وقت نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے جس سے مراد صانع عالم کا اعتقاد اور توحید کا قائل ہونا

ہے کہ اس سے کوئی نئی کسی وقت بھی خالی نہیں ہو سکتا وجود صانع اور تو حید صانع کا علم فی نفسہ فطری ہے اگر ایک بچہ کو الگ مکان پر پرورش کیا جائے جہاں اس کے سامنے کسی مذہب کا تذکرہ اٹھاتا یا نظیاً نہ کیا جائے پھر جب وہ بلوغ کو پہنچ جائے اس وقت اس سے جنگل میں کھڑا کر کے پوچھا جائے کہ آسمان و زمین کس طرح پیدا ہوئے تو وہ ضرور کہے گا کہ ان کا بنانے والا ضرور کوئی ہے اور وہ واحد ہے فطرت سلیمہ وجود تو حید صانع کا انکار نہیں کر سکتی اور انبیاء علیہم السلام کی فطرت سب سے زیادہ سلیم ہوتی ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ تو حید کے قائل نہ ہوں۔ یہ علم ان کے لئے ضروریات سے ہے۔ استدلال کی بھی حاجت نہیں الا لتقویۃ۔ پس ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان کا یہ مطلب نہیں کہ کسی وقت کو ایمان حاصل نہ تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ایمان کو جانتے نہ تھے اور عدم درایت عدم وجود کو مستلزم نہیں کیونکہ بعض دفعہ ایک آدمی کے پاس کوئی چیز موجود ہوتی ہے مگر اس کو خبر نہیں ہوتی کہ میرے پاس یہ چیز موجود ہے۔

مثلاً ایک ناواقف کے ہاتھ کہیں سے یا قوت یا زمرہ کا گلا لگ جائے تو اس وقت یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کے پاس یا قوت و زمرہ نہیں۔ اسی طرح سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا کوئی وقت نہیں گزرا جس میں آپ ایمان سے شرف نہ ہوں لیکن نبوت سے پہلے آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ ایمان اسی کیفیت کا نام ہے جو میرے اندر موجود ہے جیسے احکام ناسوتیہ میں حکماء اس کے قائل ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے اسی وقت سے اس میں عقل و شعور وغیرہ سب کچھ ہوتا ہے مگر اس وقت مرتبہ استعداد میں یہ امور ہوتے ہیں اس وقت بچہ کو خود یہ خبر نہیں ہوتی کہ میرے اندر کیا کیا جواہرات ہیں پھر بالغ ہونے کے بعد اس کی عقل وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے اور اس وقت اس کو بھی علم ہو جاتا ہے کہ ہاں میرے اندر عقل و فہم موجود ہے۔

ایمان اور نبوت

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان سے پہلے بھی حاصل تھا۔ آپ کے اندر اور کمالات کا مادہ بھی سب موجود تھا۔ آپ ابتداء ہی سے معرفت و انوار کے جامع تھے مگر آپ کو اس کی خبر نہ تھی بعد نبوت کے حق تعالیٰ نے ان کمالات سے واقف کر دیا تب معلوم ہوا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی دولت دے رکھی ہے اور اب خبر ہوئی کہ جو کیفیت میرے اندر ابتداء سے موجود ہے اسی کا نام ایمان و معرفت وغیرہ وغیرہ ہے۔ خوب سمجھ لو کہ مادری سے خبر کی نئی ہوتی ہے حصول کی نئی نہیں اور یہ بے خبری کچھ نقص نہیں بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اس صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت و عنایت زیادہ ظاہر ہوتی ہے کہ پہلے آپ بے خبر تھے پھر دفعۃً علوم کا دریا بہا دیا۔ اگر آپ پہلے سے باخبر ہوتے پھر وحی نازل ہوتی تو آپ کو حق تعالیٰ کی محبت و عنایت کا کیا پتہ چلتا اس صورت میں محبت حق کی کوئی دلیل نمایاں طور پر نہ ہوتی اور جب پہلے آپ بے خبر تھے پھر دفعۃً تمام عالم سے زیادہ علوم آپ کو عطا کر دیئے گئے۔ اب آپ کے پاس عنایت و محبت حق کی نمایاں دلیل ہو گئی کہ واقعی حق تعالیٰ مجھے بہت ہی چاہتے ہیں۔

رسالة و جيزة و مفيدة في ربط الآيات

سبق الغايات في نسق الآيات

تأليف

حضرت مكيم الأمت محمد الملت جامع الكالات منبع الحسنات فاهر العلوم القرآنية واقف الأسرار الفرقانية،
رأس المفسرين مقدم الراسخين صاحب الشريعة والطريقة، بحر المعرفة واليقظة لاكشف الأسرار التي منحها الجلى اعنى به

مولانا محمد اشرف علي الشهانوى

نور الله مرقده ومبعل الجنة مشواه

سورة الكهف

قيما لينذر الخ اعلم انه تعالى لما ذكر انه انزل على عبده هذا الكتاب الموصوف بهذا الصفات المذكورة اردفع بيان مالا جله انزله فلعلك باخع الخ الغرض تساوية لرسول صلى الله عليه وسلم انا جعلنا ما على الارض الى قوله صعيدا جززا اقال ابو سعود والمعنى لا تحزن بما غاينت من القوم تكذيب ما انزلنا عليك من الكتاب فانا قد جعلنا ما على الارض من متفاوتة الاشياء زينة لها لنختبر اعمالهم فنجازيهم بحسبها وانا لمفتنون جميع الناس عن قريب و مجاورة لهم بحسب اعمالهم قال المسكين خلاصة الكلام ان الدنيا دار الابتلاء لادار الجزاء فلا يحزنك تمتعهم ههنا فانما يجازون ولا بد في دار الجزاء ام حسبت ان الخ قال المسكين لما لا بين الله تعالى في الايات المتقدمة انزال الكتاب عليه صلى الله عليه وسلم الدال على نبوته وقد اراد اليهود امتحان نبوته بالسؤال عن امور منها قصة اصحاب الكهف حكاهما الله تعالى ليستدل بها على دعوى النبوة و اما حكمته بدأها بهذا العنوان العجيب فتقرير على ما في الكبير و يظهره ايضا وجه ارتباط عنوان هذه الاية بعنوان الاية المتقدمة هكذا اعلم ان القوم تعجبوا من قصة اصحاب الكهف وسألوا عنها رسول على سبيل الاستحاذ فقال تعالى ام حسبت انهم كانوا عجبا من اياتنا فقد فلا تحسبن ذلك فان اياتنا كلها عجب فان من كان قادر اعلى تخليق السموات والارض ثم يزين الارض بانواع المعادون والنبات والحيوان ثم يجعلها بعد ذلك صعيدا جززا خاليتها عن الكل كيف يستبعدون من قدرته وحفظه و رحمته حفظ طائفة مدة ثلثمئة سنة واكثر في النوم و اتل ما اوحى الخ قال المسكين عود الى مضمون قول انزل على عبده الكتاب و قوله لينذر بآء ساشديد امن لدنه و يبشر المؤمنين الخ فذكر الله تعالى ههنا اداب التبليغ من التسوية بين المخاطبين الاغنياء منهم والفقراء و عدم الالتفات الى الدنيا لفناءها وعدم

ل ختم السورة المتقدمة بالتكبير والفتح هذه بالتحميد وتعانقهما ظاهرا

المبالاة بعدم ايمانهم لكون النار جزاء وفاقالهم وما يقارب ذلك من المضامين كما في الكبير اعلم ان من هذه الآية الى قصة موسى والخضر كلام واحد من قصة واحدة و ذلك ان اكابر كفار قريش احتجوا وقالوا الرسول الله صلى الله عليه وسلم ان اردت ان تؤمن بك فاطر دمن عندك هؤلاء الفقراء الذين آمنوا بك والله تعالى نهاه عن ذلك ومنعه عنه و اطب في جملة هذه الايات و قل الحق من ربكم الخ لما امر رسوله بان لا يفتت الى اولئك الاغنياء قال و قل الحق اى قل هؤلاء ان هذا الدين الحق العا اى من عند الله فان قبلتموه عاد النفع اليكم و ان لم تقبلوا عاد الضر اليكم ان الذين آمنوا الخ اعلم نه تعالى لماذا ذكر وعيد المبطلين اردفه بوعده المحققين واضرب لهم مثلا الخ اعلم ان المقصود من هذا ان الكفار اتخروا اموالهم وانصارهم على فقراء المسلمين فيبين الله تعالى ان ذلك لا يوجب الافتخار لاحتمال ان يصير الفقير غنيا والغنى فقيرا اما الذى يجب حصول المفاخرة به فطاعة الله و عبادته و عى حاصلة لفقراء المؤمنين و بين ذلك بضرب هذا المثل المذكور فى الآية واضرب لهم مثل الحياة الدنيا الخ اعلم ان المقصود اضرب مثلا اخريدل على حقارة الدنيا وقلة بقاءها المال والبنون الخ لما بين تعالى ان الدنيا سريعة الانقراض بين تعالى ان المال والبنين زينة الحياة الدنيا و يوم نسير الجبال الخ اعلم نه تعالى لما بين خماسه الدنيا و شرف القيامة اردفه باحوال القيامة واذ قلنا للملئكة الخ قال ابو السعود والمراد بتذكر قصته تشديد التكبر على المتكبرين المفتخرين بانسابهم واموالهم المستكفين عن الانتظام فى سلك فقراء المؤمنين ببيان ان ذلك من صنيع ابليس و انهم فى ذلك تابعون لستويله كما ينبنى عنه قوله تعالى افتخلوه و ذريته اولياء من دونى فتطيعونهم بدل طاعنى ما شهدتهم الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لبيان عدم استحقاتهم للانخاذ المذكور و يوم يقول نا دو الخ قال المسكين هو بيان لعدم نفع ولاية الشياطين لهم ولقد صرفنا فى هذا القرآن الخ قال المسكين بيان لكون الموعظة القرآنية فى الواقعة المذكورة وغيرها بالغة و جدال الانسان فيها و تمادى كفره الى ان يقع به العذاب والاشارة الى قرب و وقوعه بهم فاضرابهم من اهل القرى وذا قال موسى لفتاه الخ اعلم ان هذا ابتداء قصة ثالثة ذكرها الله تعالى فى هذه السورة و هذا و ان كان كلاما مستقلا فى نفسه الا انه يعين على ما هو المقصود اما نفع هذه القصة فى الرد على الكفار فهو ان موسى عليه السلام مع كثرة علمه و عمله و علوا مصمير ذهب الى الخضر لطلب العلم و تواضع له و

ذلك يدل على ان التواضع خيس من التكبر و يستلونك عن ذى القرنين الخ ان اليهود امروا المشركين ان يسألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن قصة اصحاب الكهف و عن قصة ذى القرنين و عن الروح فالمراد من قوله و يستلونك عن ذى القرنين هو ذلك السؤال قال المسكين و يمكن ان يجعل اشارة الى ان ذم المال والجاه الذى ذكر فيما مر ليس على الاطلاق بل اذا جعله الانسان طاغيا باغيا و اما اذ شكر الله تعالى عليهما و نفع بهما عبادة فهو من اعظم النعم كما كان لدى القرنين الذى جمع المال والعلم المحسب الذين كفروا الخ اعلم نه تعالى لما بين من حال الكافرين انهم اعرضوا عن الذكر و عن استماع ما جاء به الرسول اتبعه بقوله فحسب الخ والمراد فظنوا انهم ينتفعون بما عبده مع اعراضهم عن تدبر الايات و تمردهم عن قبول امره و امر رسوله ان الذين امنوا الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الوعيد اتبعه بالوعدو لما ذكر في الكفار ان جهنم نزلهم اتبعه بذكر ما يرغب في الايمان والعمل الصالح قل لو كان الجرم اذا اعلم نه تعالى لما ذكر في هذه السورة انواع الدلائل والبيئات و شرح فيها اقا صيص الاولين نه على كمال حال القرآن فقال قل لو كان البحر ممداد الخ قل انما انا بشر مثلكم الخ قال المسكين لما بين تعالى في الايتين المتقدمتين فضل الايمان والعمل الصالح و فضل القرآن العظيم ذكر ما يدل على اثبات النبوة بالجواب عن طعن الكفار بالبشرية بان البشرية لاتنا في النبوة بل مدار النبوة على الوحي و قد يوحى الى و خصص من بين ما يوحى امر التوحيد لاهتمامه ولما سبب المقام لان التوحيد والنبوة اصلان عظيمان للايمان ثم نه على ما لا بد من رعايته في الاعتدال دلاخرة من العمل الصالح و شرط قبوله من ترك الشرك الجلى والخفى الذى هو الرياء فقال من كان يرجو لقاء ربه الخ

سورة مريم عليها السلام

اعلم ان الغرض من هذه السورة بيان التوحيد والنبوة والحشر والمنكرون للتوحيد هم الذين ائبتوا معبود سوى الله تعالى وهؤلاء فريقان منهم من ائبت معبودا غير الله حيا عاقلا وهم النصارى ومنهم من ائبت معبود غير الله جماد اليس يحى ولا عاقل ولا فاهم وهم عبدة الاوثان قال المسكين فى قصص هذه السورة اثبات للتوحيد كما ذكر من قصة عيسى عليه السلام وفيه رد للفريق الاول ومن وعظ ابراهيم عليه السلام وفيه رد للفريق الثانى والاثبات للنبوة بوجهين احدهما بيان نبوة الانبياء للدلالة على ان النبوة ليست بامر بدع فإى بعد فى نبوة محمد صلى الله عليه وسلم وثانيها ان النبى صلى الله عليه وسلم لم يخالط العلماء ثم قص القصص على ما وقعت فهذه دلالة بينة على كونه مؤيدا بالوحى ثم بعد ذكر القصص ذكر المعاد مختلطا بالتوحيد كما يظهر من تلاوة تلك الايات اولئك الذين انعم الله عليهم الخ اعلم انه تعالى ائبى على كل واحد ممن تقدم ذكره من الانبياء بما يخصه من الثناء ثم جمعهم اخرا فقال اولئك الذين فخلف من بعدهم خلف الخ اعلم انه تعالى لما وصف هؤلاء الانبياء بصفات المدح ترغيبا لنا فى التأسى بطريقتهم ذكر بعلمهم من هو بالضد منهم الامن تاب الخ قال المسكين هذا استثناء من المذكورين جنات عدن الخ اعلم انه تعالى لما ذكر فى التائب انه يدخل الجنة وصف الجنة بامور وما نتزل الا بامر ربك الخ قال المسكين هذا حكاية لقول جبرئيل عليه السلام ولعل وضعه ههنا لتقرير امر التوحيد والنبوة ببيان ان الملكة مامورون تحت امر الله تعالى فدل ذلك على كمال عظمة الله تعالى وانفراده بالامر كله و دل على ان الرسالة شأنها محض المامورية فلا يحتمل ان يقولوا ما لم يؤمروا فانضفت شكوك الشاكين فيها ويقول الانسان الخ قال

ل ما ختم السورة المتقدمة بالاثبات نبوته عليه السلام بقوله قل انما انا بشر مثلكم و بين فى هذه السورة نبوة بعض الانبياء السابقين حصل المناسبة بينها منه عفى عنه

المسكين شرع من ههنا في اثبات المعاد واحواله واذا تتلخ عليهم اياتنا الخ قال المسكين اخذا من ابي السعود حكاية لما قالوا عند سماع الايات الناعية عليهم فظاعة حالهم ووخامة مالهم ثم رد عليهم اغتراء هم بزخارف الدنيا بقوله وكم اهلكنا قبلهم من قرن الخ ثم بين حكمة امهالهم بقوله قل من كان في الضلالة الخ ثم ذكرت غاية للمدو هذا هو المقصود وما سبق كان للتمهيد له في قوله مت حتى اذاروا اما يوعدون الخ ويمكن ان يكون كما في الكبير جوابا عن شبهتهم في البعث باننا في سعة ههنا فكذا لعمه لو كان فرضا ويزيد الله الذين الخ قال ابو السعود كلام مستأنف سبق لبيان حال المهتدين الربان حال الضالين افرايت الذي كفر الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الدلائل اولا على صحت البعث ثم اورد شبهة المنكرين و اجاب عنها اورد عنهم الآن ما ذكروه على سبيل الاستهزاء طعنا في القول بالحشر واتخذوا من دون الله الخ اعلم انه تعالى لما تكلم في مسألة الحشر والنشر تكلم الآن في الرد على عباد الاصنام وقالوا اتخذوا الرحمن الخ قال ابوا اسعود حكاية لجناية اليهود والنصارى ومن يزعم من العرب ان الملكة بنات الله سبحانه و تعالى عن ذلك علوا كبيرا اثر حكاية عبدة الاصنام بطريق عطف القصة على القصة ان الذين امنوا الخ اعلم انه تعالى لما رد على اصناف الكفرة وبالمخ في شرح احوالهم في الدنيا والاخرة ختم السورة بذكر احوال المؤمنين و انما يسرناه بلسانك الخ كلام مستأنف بين به عظيم موقع هذه السورة لما فيها من التوحيد والنبوة والحشر والنشر والرد على فرق المضلين المبطلين وكم اهلكنا الخ قال ابوا السعود وعد لرسول الله صلى الله عليه وسلم في ضمن وعيد الكفرة بالا هلاك و حث له عليه الصلوة والسلام على الانذار

١ من كونهم في طيب عيش في الدنيا و اجاب عنها بقوله وكم اهلكنا وبقوله قل من كان في الضلالة الخ منه

٢ تقرير امر التوحيد و ابطال الشرك و بيان خاتمة حالهم يوم المعاد بانهم يكونون مفردين لا شفيع لهم

سورة طه

ما انزلنا عليك الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لتسليية عليه الصلوة والسلام بما كان يعتريه من جهة المشركين من التعب الا لكرة الخ قال ابو السعود كانه قيل ما انزلنا عليك القرآن لتغيب في تليفه ولكن تذكره لمن يخشى تنزيلا ممن خلق الخ قال ابو السعود مصدر مؤكد لمضممر مستأنف مقرر لما قبله اى نزل تنزيلا الرحمن على العرش استوى قال ابو السعود فيه اشارة الى ان تنزيل القرآن ايضا من احكام رحمة تعالى يبنى عنه قوله تعالى الرحمن علم القرآن له ما فى السموات الخ قال ابو السعود بيان لسبعة سلطنة وشمول قدرته لجميع الكائنات و ان تجهر بالقول الخ قال ابو السعود بيان لاحاطة علمه تعالى بجميع الاشياء الرببان سعة سلطنته وشمول قدرة لجميع الكائنات الله لا اله الا هو قال ابو السعود استيناف مسوق لبيان ان ما ذكر من صفات الكمال موصوفها ذلك المعبود بالحق له الاسماء الحسنى قال ابو السعود بيان لكون ما ذكر من الخالق والرحمانية والمالكية والعالمية اسماء و صفاته من غير تعدو فى ذاته تعالى وهل اتك حديث موسى الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لتقرير امر التوحيد الذى اليه انتهى مساق الحديث و بيان انه امر مستمر فيما بين الانبياء كابر اعن كابر و قد حو طب به موسى عليه السلام حيث قبل له انتى انا الله لا اله الا انا و به ختم عليه الصلوة والسلام مقاله حيث قال انما الهكم الذى لا اله الا هو و اما ما قيل من ان ذلك لترغيب النبى صلى الله عليه وسلم فى الائتساء بموسى عليه السلام فى تحمل اعباء النبوة والصبر على مقاساة الخطوب فى تبليغ احكام الرسالة فياباه ان مساق النظم الكريم لصفه عليه الصلوة والسلام عن اقتحام المشاق

١ ختم السورة المقدمة بذكر نزول القرآن و تيسره بلسان محمد صلى الله عليه وسلم و كذلك فتح هنا السورة بيان تنزيل القرآن و نفي المسرو المشقة عنه صلى الله عليه وسلم وهذا هو وجه التاسب بينهما ١٢ منه عفى عنه.

٢ فى الكبر انه تعالى عظم حال القرآن بان نسبه الى انه تنزيل ممن خلق الارض و خلق السموات على علوها و انما قال ذلك لان تعظيم الله تعالى يظهر بتعظيم خلقه و نعمه ١٢ منه عفى عنه

كذلك نقص الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما شرح قصة موسى عليه السلام اتبعه بقوله كذلك نقص عليك من سائر اخبار الامم و احوالهم تكثير الشانك و زيادة في معجزاتك وليكثر الاعتبار و الاستبصار للمكلفين بها في الدين قال المسكين ثم ذكر الكتاب المنطوي على هذه القصص ثم عظم امره ببيان و عيد المعرض عنه و ذكر يوم الوعيد و احواله من نفخ الصور و الحشر و نسف الجبال و غيرها ثم بين حال قسيم المعرض المؤمن بالقرآن و العامل به في قوله و قد اتيناك من لدنا ذكرا الى قوله فلا يخاف ظلما و لا هضما و كذلك انزلناه قرآنا عربيا الخ اعلم ان قوله و كذلك عطف على قوله كذلك نقص اي و مثل ذلك الانزال و على نهجه انزلنا القرآن كله فتعالى الله الملك الحق الخ قال ابو السعود استعظام له تعالى و لشؤنه التي يصرف عليها عباده من الاوامر و لنواهي و الوعد و الوعيد و غير ذلك و لا تعجل بالقرآن الخ قال ابو السعود نهى عن ذلك ال ذكر الانزال بطريق الاسطرا دو امرنا بستفاضة العلم و استزادته منه تعالى فليل و قل اي في نفسك رب زدني علما اي مل الله عزوجل زيادة العلم فانه الموصل الى طلبتك دون الاستعجال و لقد عهدنا الى ادم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لتقرير ما سبق من تصريح الوعيد في القرآن و بيان ان اساس بني ادم على العسيان و عرقه ارسخ في النسيان مع ما فيه من انجاز الموعد في قوله تعالى كذلك نقص عليك من انباء ما قد سبق افلم يهدلهم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق التقرير ما قبله من قوله تعات و كذلك نخري و لولا كلم سبقت الخ قال ابو السعود كلام مستأنف سيق لبيان حكمت عدم وقوع ما يشعر به قوله تعالى افلم يهدلهم الاية من ان يصيبهم مثل ما اصاب القرون المهلكة فاصبر على ما يقولون الخ لما اخبرني به بانه لا يهلك احدا قبل استيفاء اجله امره بالصبر ثم قاله فسبح وهو نظير قوله واستعينوا بالصبر و الصلوة لا تمدن عينيك الخ اعلم نه تعالى لما صبر رسوله عليه السلام على ما يقولون و امره بان يعدل الى التسبيح اتبع ذلك نهيه عن مد عينيه الى ما منع به القوم و امر اهلك الخ قال ابو السعود امر عليه السلام بان يامر اهل بيته او التابعين له من امته بعد ما امر هو بها ليتعا و نوا على الاستعانة على خصاصتم و لا يهتموا بامر المعيشة و لا يلتفتوا ارباب الثروة و قالوا الولا ياتينا الخ انه سبحانه بعد هذه الوصية حكى عنهم شبهتهم فكانه من تمام قوله فاصبر على ما يقولون ثم بين انه تعالى ازاح لهم كن عذر و علتة في التكليف فقال و لو انا اهلكنا الخ ثم انه سبحانه ختم السورة بضرب من الوعيد فقال

قل كل متر بص الخ

سورة الانبياء عليهم السلام

اقرب للناس الخ قال ابو السعود مناسبة هذه الفاتحة الكريمة لما قبلها من الخاتمة الشريفة غنية عن البيان ما يأتيهم من ذكر الخ قال المسكين هذا بيان لاعراضهم و غفلتهم بذر جنائياتهم المعتادة من لعبهم و لهوهم و جنائياتهم الخاصة من اسرار النجوى قال ربي يعلم الخ لما ورد هذا الكلام عقيب ما حكى عنهم و جب ان يكون كالجواب لما قالوه فكانه قال انكم وان اخفيتم قولكم و طعانكم فان ربي عالم بذلك و انه من وراء عقوبته فتوعدوا بذلك لكيلا يعودوا الى مثله بل قالوا اضغات احلام الخ انه تعالى عادالى حكايته قوله المتصل بقوله هل هذا الابشر الخ ثم ان الله تعالى بدأ بالجواب عن هذه السؤال الاخير بقوله ما امنت و المعنى انهم فى العتوا شد من الذين اقترحوا على انبيائهم الايات و عهدو انهم يؤمنون عندها فلما جاءتهم نكثوا و خالفوا فاهلكهم الله فلو اعطينا هم ما يقترحون لكانوا اشد نكثا و ما ارسلنا قبلك الخ قال ابو السعود جواب لقولهم هل هذا الابشر الخ متضمن لرد ماد سوا تحت قولهم كما ارسل الاولون من التعرض بعدم كونه عليه السلام مثل اولئك الرسل صلوات الله عليهم اجمعين ثم صدقناهم الوعد الخ قال المسكين تتم لحكايته الرسل لتسلية رسول الله صلى الله عليه وسلم و تهديد المنكرين لقد انزلنا اليكم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لتحقيق حقيقة القرآن العظيم الذى ذكر فى صدر السورة الكريمة اعراض الناس عما يأتيهم من آياته و الاستهزاء هم به و تسميتهم تارة سحرا و تارة اضغات احلام و اخرى مفترى و شعرا و بيان علور رتبته اثر تحقيق رسالته صلى الله عليه وسلم ببيان انه كسائر الرسل عليهم الصلوة و السلام و كم قصمنا من الخ قال ابو السعود نوع تفصيل لاجمال قوله تعالى و اهلكنا المسرفين و بيان نكفته اهلاكهم و سبه و تبيه على كثرتهم و ما خلقنا السماء و الارض الخ قال المسكين لمانعى الله تعالى على الكفار الموجودين و الماضين شناعة حالهم فى الاعراض و اللهو و الظلم بين ان الانسان لم يخلق عبثا و لم يترك سدئى ببيان القول الكلئى فى ذلك لانه

ل ختم التى تقلمت و التتح هذه بذكر الوعيد بالترص و الحساب فالمناسبة جلية غير خفية لانه عنى عنه

يلزم منه الهو واللعب في جنبه تعالى عن ذلك علوا كبيرا بل مقتضى حكمته ان يميز بين الحق والباطل وان ذلك مما يقتضى ارسال الرسل الذين منهم محمد صلى الله عليه وسلم الذى ينكرون نبوته و يصفونه بما لا يليق به عليه السلام و يستحقون به الويل ثم اكد كون العباد مكلفين بقوله وله من فى السموات والارض الخ فحاصل هذا الكلام تقرير لامر النبوة ام اتخذوا الهة من الارض الخ اعلم ان الكلام من اول السورة الى ههنا كان فى النبوات وما يتصل بها من الكلام سوآلا و جوابا و اما هذه الايات فانها فى بيان التوحيد و نفى الاضداد و الانداد و ما جعلنا لبشر من قبلك الخ قال المسكين جواب عن شماتتهم بموته عليه السلام و تمهيد لبيان المعاد المذكور فى قوله و الينا لا ترجعون المقصود فشرع من ههنا فى اثباته بعد النبوة و التوحيد الى قوله و كفى بنا حاسبين و ذكر فى تضاعيفه استهزاء هم بالرسول المحبر عن المعاد استعجالهم بالعذاب و مال المستهزئين و كلاءة الله تعالى لهم فى الدنيا عن العذاب و ضعف الهتهم عنها و عدم اغترارهم بالتمتع الدنيوى و وقوع ما يدفع نزول العذاب بهم من نقص الاطراف و يتقن و وقوع العذاب لا تبيان الوحي به وان لم لسمعه الصم و غير ذلك مما يناسب المعاد و لقد اتينا موسى و هارون الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما تكلم فى دلائل التوحيد و النبوة و المعاد شرع فى قصص الانبياء عليهم السلام و فيه كما قال ابو السعود نوع تفصيل لما اجمل فى قوله تعالى و ما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحى اليهم الى قوله تعالى و اهلكنا المسرفين و اشارة الى كيفية انجابتهم و اهلك اعدائهم ان هذه امتكم امة واحدة الخ قال المسكين كانها نتيجة القصص اى ملة التوحيد الذى اجمع عليه الانبياء عليهم السلام ملة واحدة ثم افسده هؤلاء بالتفريق المذكور فى قوله و تقطعوا امرهم ثم ذكر امر المعاد بقوله كل الينا راجعون الى قوله و عدا علينا انا كنا فاعلين او الى قوله الصالحون ان فسر الارض بارض الجنة و ان فسرت بارض الدنيا كان مناسبة هذه الاية الاخيرة بما قبلها ان الاعمال الصالحة موجبة للاعزاز فى الدارين اما فى دار الاخرة فذكر اولا و اما فى دار الدنيا فذكر فى هذه الاية ثم اتى على السورة الكريمة المشتملة على التوحيد و النبوة و المعاد بقوله ان فى هذا لايلاغا لقوم عابدين ثم على الرسول الاتى بهذا الكتاب بقوله و ما ارسلناك الا رحمة للعالمين قل انما يوحى الى الخ اعلم انه تعالى لما اورد على الكفار الحجج فى ان لا اله سواه من الوجوه التى تقدم ذكرها و بين انه ارسل رسوله رحمة للعالمين اتبع ذلك بما يكون اعدارا و انذارا فى مجاهدتهم و الاقدام عليهم

سورة الحج

يايها الناس اتقوا الخ امرا الناس بالتقوى ثم علل وجوبها عليهم بذكر الساعة ووصفها باهول صفة و من الناس من يجادل الخ قال ابو السعود كلام مبتدأ جنى به اثر بيان عظم شان الساعة المنبهة عن البعث بيانا لحال بعض المنكرين لها يايها الناس ان كنتم الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما حكى عنهم الجدال بغير العلم في البات الحشر والنشر و ذمهم عليه فهو سبحانه اورد الدلالة على صحة ذلك من وجهين احدهما الاستدلال بخلقه الحيوان اولاً الوجه الثاني الاستدلال بحال خلقته النبات على ذلك و من الناس من يجادل في الله بغير علم ولا هدى الخ قال ابو مسلم الآية الاولى واردة في الاتباع المقلدين وهذه الآية واردة في المتبوعين المقلدين قال المسكين والقرينة عليه قوله تعالى ههنا ليضل عن سبيل الله فان الاضلال من شان المتبوع و من الناس من يعبد الله الخ اعلم انه تعالى لما بين حال المظهرين للشرك المجادلين فيه عقبه بذكر المنافقين ان الله يدخل الخ اعلم انه سبحانه لما بين في الآية السابقة حال عبادة المنافقين و حال معبودهم بين في هذه الآية صفة عبادة المؤمنين و صفة معبودهم من كان يظن ان لن ينصره الله الخ. قال المسكين بيان لنصرة المعبود الحق لا ولياءه مقابلة لقوله في الالهة الباطلة ما لا ينصره و ما لا ينفعه ان الذين امنوا والذين هادوا الخ قال المسكين بيان لعال كل فريق اثر تقسيم الناس الى طوائف الم تر ان الله يسجد له الخ قال ابو السعود بيان لما يوجب الفصل المذكور من اعمال الفرق المذكورة مع الاشارة الى كفيته و كونه بطريق التعليب والالابة والاكرام والاهانة ان الذين كفروا ويصلون الخ اعلم انه تعالى بعد ان فصل بين الكفار والمؤمنين ذكر عظم حرمة البيت و عظم كفر هؤلاء ان الله يدافع الخ اعلم انه تعالى لما بين ما يلزم في الحج ومناسكها وما فيه من منافع الدنيا والاخرة وقد ذكر ان الكفار صلواتهم اتبع ذلك ببيان

مايزيل الصد و يؤمن معه التمكن من الحج و ان يكذبوك الخ قال ابو السعود تسلية لرسول الله صلى الله عليه وسلم متضمنة للوعد الكريم باهلاك من يعاديه من الكفرة و تعيين كيفية نصره تعالى له الموعد بقوله تعالى و لينصرن الله من ينصره ويستعجلونك بالعذاب الخ قال المسكين لما تضمنت الآية الاولى و عيد العذاب لهم استعجابوا به فاجابهم الله تعالى قل يا ايها الناس الخ قال المسكين هذا بيان لعدم مدخلية عليه السلام في العذاب و انما شانہ الانذار فقط ثم بين حال الفريقين في قوله فالذين امنوا و عملوا الصالحات الخ و ما ارسلنا من قبلك الخ قال المسكين لما بين الله تعالى سعي الكفار في ابطال الايات و كيدهم فيما قبل ذكر في هذه الآية كيد الشياطين فيه و ما نسخه الله تعالى و الذين هاجروا الخ اعلم انه تعالى لما ذكر ان الملك له يوم القيامة و انه يحكم بينهم و يدخل المؤمنين الجنات اتبعه بذكر وعده الكريم للمهاجرين ذلك و من عاقب بمثل ما عوقب به الخ قال المسكين ذكر فيما قبل كون المهاجر مقتولا و الان ذكر حكم كونه قاتلا و جارحا و وعده بالنصر ثم ذكر اقدرته على النصر بقوله ذلك بان الله يولج الليل الخ ثم ذكر اختصاصه بالقدره بقوله ذلك بان الله هو الحق الخ الم تر ان الله انزل الخ اعلم انه تعالى لمادل على قدرته من قبل بما ذكره من و لوج الليل في النهار و ينبه به على نعمه اتبعه بانواع اخر من الدلائل على قدرته و نعمته لكل امة جعلنا الخ قال ابو السعود كلام مستأنف جيى به لجزم ما صر به عليه السلام من اهل الاديان اسماوية عن منازعته عليه السلام ببيان حال ما تمسكوا به من الشرائع و اظهار عظامهم في النظر قال المسكين فكانه قسيم لقوله في صدر السورة و من الناس من يجادل في الله بغير علم فكانت تلك المجادلة بغير علم و هذه بعلم لكن مع الخطأ و يعنون من دون الله الخ قال ابو السعود حكاية لبعض اباطيل المشركين و احوالهم الدالة على كمال سخافته عقولهم و ركائنه ارائهم من بناء امر دينهم على غير مبنى من دليل سمعى او عقلى و اعراضهم عما القى عليهم من سلطان بين هو اساس الدين و قاعدته اشد اعراض الله يصطفى من الملكة الخ اعلم انه سبحانه لما قدم ما يتعلق بالالهيات ذكرهنا ما يتعلق بالنبوات يا ايها الذين امنوا ار كعو الخ اعلم انه سبحانه لما تكلم في الالهيات ثم في النبوات اتبعه بالكلام في الشرائع.

سورة المؤمنون

ولقد خلقنا الانسان الخ اعلم انه سبحانه لما امر بالعبادات في الاية المتقدمة والاشغال بعبادة الله تعالى لا يصح الا بعد معرفة الاله الخالق لاجرم عقبها بذكر ما يدل على وجوده واتصاله بصفات الجلال والرحمانية فذكر من الدلائل انواعا النوع الاول الاستدلال بقلب الانسان في ادوار الخلقة و اكران الفطرة وهو قوله تعالى 'ولقد خلقنا الانسان النوع الثاني من الدلائل الاستدلال بخلقة السموات وهو قوله تعالى 'ولقد خلقنا فوقكم الخ النوع الثالث الاستدلال بنزول الامطار وكيفية تأثيراتها في النبات قوله تعالى 'وانزلنا من السماء ماء الخ النوع الرابع الاستدلال باحوال الحيوانات قوله تعالى 'وان لكم في الانعام الخ واعلم انه سبحانه وتعالى لما بين دلائل التوحيد اردفها بالقصص كما هو العادة في سائر السور القصة الاولى قصة نوح عليه السلام قوله تعالى 'ولقد ارسلنا نوحا الخ قال ابو السعود شروع في بيان اعمال الامم السالفة وتركهم النظر والاستدلال فيما عد من النعم الفاتنة للحصر وعدم تذكيرهم بتذكير رسلهم وما حاق بهم لذلك من فنون العذاب تحذير للمخاطبين قال صاحب الكبير القصة الثانية قصة هود او صالح عليهما السلام قوله تعالى 'ثم انشأنا من بعدهم قرنا آخرين القصة الثالثة قوله تعالى 'ثم انشأنا من بعدهم قرنا آخرين الخ اعلم انه سبحانه وتعالى يقص القصص في القران تارة على سبيل التفصيل كما تقدم واخرى على سبيل الاجمال كهيئنا و قبيل المراد قصة لوط وشعيب و ايوب و يوسف عليهم السلام القصة الرابعة قصة موسى عليه السلام قوله تعالى 'ثم ارسلنا موسى الخ القصة الخامسة قصة عيسى ومريم عليهما السلام قوله تعالى 'وجعلنا ابن مريم الخ يا ايها الرسل الخ قال المسكين لما امر الله تعالى بالعبادة في صدر السورة ثم ذكر الايات الدالة على القدرة والنعم واينها

ا كان في غلظة السورة الاولى ذكر الشرائع من الامر بالركوع والسجود المجاهدة في الله وكلماتي اول

هذه السورة فارتبطت ۱۲ منه عني هـ

بيان القصص بين ههنا ان الامر بالعبادة والفاضة النعم و ترتب العبادة عليها شرع قديم امر به جمعى الرسل و ان هذه امتكم امة واحدة الخ المعنى انه كما تجب اتفاهم على اكل الحلال والاعمال الصالحة فكذلك هم متفقون على التوحيد و على التقاء من معصية الله تعالى فقطعوا امرهم الخ قال ابو السعود حكاية لما ظهر من امم الرسل بعلمهم من مخالفة الامر و شق العصا ان الدين هم من خشية ربهم الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لبيان من له المسارعة فى الخيرات الر القناط الكفار عنها و ابطال حسابهم الكاذب لانكلف نفسا الاوسعها الخ قال ابو السعود جملة مستانفة سقت للتحريض على ما وصف به السابقون من فعل الطاعات المؤدى الى نيل الخيرات ببيان سهولته و قوله تعالى و لدينا كتاب الخ تمة لما قبله ببيان احوال ما كلفوه من الاعمال و احكامها المترتبة عليها من الحساب و الثواب و العقاب بل قلوبهم فى غمرة الخ قال المسكين تمهيد لبيان مؤاخذه الكفار المذكور فى قوله تعالى حتى اذا اخذنا مترفيهم بالعذاب الر ذكر اعمالهم مع بيان عدم النصرة لهم قد كانت اياتى تتلى عليكم الخ اعلم انه سبحانه لما بين فيما قبل انه لا ينصروا لثك الكفار ابعه بعلمه ذلك ثم انه سبحانه لما وصف حالهم رد عليهم بان بين ان اقدامهم على هذه الامور لا بدوا ان يكون لاحد امورا ربعة احدها ان لا يتاملوا فى دليل نبوة وهو المراد من قوله افلم يدبر و القول و ثانيها ان يعتقدوا ان مجى الرسل امر على خلاف العادة وهو المراد من قوله ام جاء هم مالم يأت و ثالثها ان لا يكونوا عالمين بديانته و حسن خصاله قبل ادعائه للنبوة وهو المراد من قوله ام لم يعرفوا رسولهم و رابعها ان يعتقدوا فيه الجنون وهو المراد من قوله ام تقولون به جنة ثم انه سبحانه بعد ان عد هذه الوجوه و نبه على فسادها قال بل جاء هم الخ و لو اتبع الحق قال ابو السعود استيناف مسوق لبيان ان اهواء هم الزائفة التى ما كرهوا الحق لالعدم موافقته اياها مقتضية لطامة بل اتيناهم بذكرهم الخ قال ابو السعود انتقال من تشنيعهم بكرهه الحق الذى به يقول العالم الى تشنيعهم بالاعراض عما جبل عليه كل نفس من الرغبة فيما فيه خير ما فى الكبير ثم بين سبحانه انه عليه السلام لا يطمع فيهم حتى يكون ذلك سببا للنفرة فقال ام تسئلهم خر جا قوله و انك لتدعوهم الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما زيف طريقة القوم اتبعه ببيان صحة ما جاء به الرسول صلى الله عليه وسلم قال المسكين ثم بين عدولهم عن الصراط المستقيم و علة عدولهم عنه بقوله تعالى

وان الذين لا يؤمنون الخ ثم بين شدة عنادهم ولجاجهم بقوله ولورحمناهم وكشفنا ما بهم الخ ولقد اخذناهم بالعذاب الخ قال ابو السعود استيناف و مسوق للاستشهاد على مضمون الشرطية قال المسكين ثم بين الستكانتهم اذا عابو عذابا لآخرة بقوله حتى اذا فتحنا عليهم الخ وهو الذى انشالكم السمع الخ قال المسكين عود الى باب التوحيد والانعام اثر بيان ما يتعلق بالنبوة بل قالو امثل ما قال الاولون الخ اعلم انه سبحانه لما اوضح القول فى دلائل التوحيد عقبه بذكر المعاد قل لمن الارض الخ اعلم انه يمكن ان يكون المقصود من هذه الايات الرد على منكرى الاعادة وان يكون المقصود الرد على عبدة الاوثان ما اتخذ الله من ولد الخ قال المسكين ظاهره اثبات التوحيد وفيه اشارة الى اختصاصه بالقدرة على البعث و عدم قدرة احد على معارضة تعالى فيه قل رب اما ترى الخ قال ابو السعود ايد ان بكمال فظاعة ما وعدوه من العذاب و كونه بحيث يجب ان يستعيذ منه من لا يكاد يمكن ان يحقق به ورد لانكاره اياه واستعجالهم به على طريقة الاستهزاء به قال المسكين ثم امره عليه السلام بما يعامل به الكفار فى انكارهم واستهزاءهم بقوله ادفع بالتي هى احسن و قل رب اعوذ بك الخ اعلم انه سبحانه لما ادب رسوله عليه السلام بقوله ادفع بالتي هى احسن اتبعه بما يقوى على ذلك حتى اذا جاء احلهم الموت الخ قال المسكين تميم لذكر المعاد و قته واحواله وما يقع فيه الى اخر السورة و من يدع مع الله الخ اعلم انه سبحانه لما بين انه هو الملك الحق لا اله الا هو اتبع بان من ادعى الها اخر فقد ادعى باطلا من حيث لا يبرهان لهم فيه قال ابو السعود بدأت السورة الكريمة بتقرير فلاح المؤمنين و ختمت بنفى الفلاح عن الكافرين ثم امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بالاستغفار والاسترحام فقيل و قل رب اغفر الخ ايدانا بانهما من اهم الامور الدينية حيث امر به من قد غفر له ما تقدم من ذنبه وما تأخر فكيف بمن عداه.

سورة النور

سورة انزلناها الخ اعلم انه سبحانه ذكر في هذه السورة احكاما كثيرة الحكم الاول قوله تعالى الزانية والزاني فاجلدوا الخ الحكم الثاني قوله تعالى الزاني لا ينكح الزانية الخ الحكم الثالث القذف قوله تعالى والذين يرمون المحصنات الخ الحكم الرابع حكم اللعان قوله تعالى والذين يرمون ازواجهم الخ الحكم الخامس قصة الافك قوله تعالى ان الذين جئوا بالافك الخ الحكم السادس في الاستيذان ان قوله تعالى يا ايها الذين امنوا لا تدخلوا الخ الحكم السابع حكم النظر قوله تعالى قل للمؤمنين الخ الحكم الثامن ما يتعلق بالنكاح قوله تعالى وانكحوا الايامي منكم الخ الحكم التاسع في الكتابة قوله تعالى والذين يتخون الكتاب الخ الحكم العاشر الاكراه على الزنا قوله تعالى ولا تكرهوا الفتيانكم الخ قوله تعالى ولقد انزلنا اليكم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف جئ به في تضاعيف ماورد من الايات السابقة واللاحقة لبيان جلالة شأنها المستوجبة للالبال الكلي على العمل بمضمونها الله نور السموات الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لتقرير ما فيها من البيان مع الاشعار بكونه في غاية الكمال في بيوت اذن الله الخ قال ابو السعود لما ذكر شان القرآن الكريم في بيانه للشرائع والاحكام ومبايها وغاياتها المرتبة عليها من الثواب والعقاب وغير ذلك من الاحوال الاخرة واهوالها واشير الى كونه في غاية ما يكون من العوضيح والاطهار حيث مثل بما فصل من نور المشكوة واشير الى ان ذلك النور مع كونه في القصى مراتب الظهور انما يهتدى بهناه من تعلقت مشية الله تعالى بهنايته دون من عناه عقب ذلك بذكر الفريقين و تصوير بعض اعمالهم المعربة عن كيفية حالهم في الاهلاء و علمه الم تر ان الله يسبح له الخ

ل انكر تعالى في خاتمة السورة المقدمة على خلق الانسان عبثا مهملا و بين في هذه السورة كون الانسان مكلفا ببعض الاحكام واستلزام التكليف عدم كون خلقه عبثا بل يهيى ۱۲ منه عفى عنه

اعلم انه سبحانه لما وصف الوار قلوب المؤمنين و ظلمات قلوب الجاهلين اتبع ذلك بدلائل التوحيد قال المسكين و امتل هذا الى قوله ان الله على كل شيء قدير ثم عاد الى وصف الايات بقوله تعالى لقد انزلنا ايات مبينات الخ ويقولون امنا بالله الخ قال ابو السعود شروع في بيان احوال بعض من لم يشأ الله هدايته الى الصراط المستقيم قال الحسن نزلت في المنافقين انما كان قول المؤمنين الخ اعلم انه تعالى لما حكى قول المنافقين وما قالوه وما فعلوه اتبعه بذكر ما كان يجب ان يفعلوه وما يجب ان يسلكه المؤمنون وعد الله الذين امنوا الخ قال ابو السعود استئناف مقرر لما في قوله تعالى و ان تطيعوه تهتدوا امن الوعد الكريم و معرب عنه بطريق التصريح و مبين لتفاصيل ما اجمل فيه من فنون السعادات الدينية و الدنيوية التي هي من اثار الاهتداء و متضمن لما هو المراد بالطاعة التي نيط بها الاهتداء لتحسين الدين كفروا الخ قال ابو السعود لما بين حال من اطاعه عليه الصلوة و السلام و اشير الى فوزه بالرحمة المطلقة المستتعبة لسعادة الدارين عقب ذلك ببيان حال من عصاه عليه الصلوة و السلام و مال امره في الدنيا و الآخرة بعلمين لناهيه في الفسق تكميلا لامر الترغيب و الترهيب يا ايها الذين امنوا ليستاذلكم الخ قال ابو السعود رجوع الى بيان تنمة الاحكام السابقة بعد تمهيد ما يوجب الامتثال بالاوامرو النواهي الواردة فيها و في الاحكام اللاحقة من التمثيلات و الترغيب و الترهيب و الوعيد لما المؤمنون الذين امنوا الخ قال ابو السعود استئناف جرى به في اواخر الاحكام السابقة تقريرها و تاكيد الوجوب مراعاتها و تكميلا لها ببيان بعض اخر من جنسها لاتجعلوا دعاء الرسول الخ قال ابو السعود استئناف مقرر لمضمون ما قبله

سورة الفرقان

تبارك الذي نزل الفرقان الخ اعلم ان الله سبحانه و تعالى تكلم في هذه السورة في التوحيد والنهية و احوال القيامة ثم ختمها بذكر صفات العباد المخلصين الموقنين ولما كان اثبات الصانع واثبات صفات جلاله يجب ان يكون مقدما على الكل لاجرم افتح الله هذه السورة بذلك واتخذ وامن دون الله الهة الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما وصف نفسه بصفات الجلال والعزة والعلو ارف بتزييف مذهب عبدة الاوثان و قال الذين كفروا الخ اعلم انه سبحانه تكلم اولا في التوحيد وثانيا في الرد على عبدة الاوثان و ثالثا في هذه الاية تكلم في مسئلة النبوة و حكى سبحانه شبهتهم في انكار نبوة محمد صلى الله عليه وسلم الشبهة الاولى قولهم ان هذا الا فك وان الله تعالى اجاب عن هذه الشبهة بقوله فقد جاؤا ظلما وزورا الشبهة الثانية لهم قوله تعالى و قالوا اساطير الاولين و اجاب الله عن هذه الشبهة بقوله قل انزل الذي يعلم السر الخ الشبهة الثالثة وهي في نهاية الركعة ذكر واه صفات خمسة فزعموا انها تخل بالرسالة فاجاب الله تعالى عن هذه الشبهة بوجوه احدهما قوله انظر كيف ضربوا الخ تبارك الذي انشاء جعل الخ اعلم ان هذا هو الجواب الثاني عن تلك الشبهة بل كذبوا بالساعة الخ هذا جواب ثالث عن تلك الشبهة كانه سبحانه و تعالى قال ليس ما تعلقوا به شبهة علمية في نفس المسئلة بل الذي حملهم على تكذيبك تكذيبهم بالساعة استقالا للاستعداد لها و يحتمل ان يكون المعنى انهم يكذبون بالساعة فلا يرجون ثواب ولا عقابا ولا يتحملون كلفة النظر و الفكر فلماذا لا ينتفعون بما يورد عليهم من الدلائل قل اذلك خير الخ اعلم انه تعالى لما وصف حال العقاب المعد للمكذبين بالساعة اتبع بما يؤكد الحسرة و الندامة فقال لرسوله قل الخ و يوم نحشرهم

۱ هي التي ذكرت في قوله تعالى والهموا الصلوة. ۲ ختم السورة المتقدمة بذكر حقوق الرسول عليه الصلوة والسلام ووجوب اطاعة من لك اثبت رسالة بالدلائل وازاحة الشبهات في مفتح هذه السورة فتصهتا ۱۲ منه.

الخ اعلم ان قوله تعالى و يوم نحشرهم راجع الى قوله واتخذوا من دونه الهة وما ارسلنا قبلك الخ هذا جواب عن قولهم مال هذا الرسول ياكل الطعام وجعلنا بعضكم لبعض الخ صبره الله تعالى على كل تلك الاذية و بين انه جعل الخلق بعضهم فتنة لبعض و قال الذين لا يرجون الخ اعلم ان قوله تعالى و قال الذين الخ هو الشبهة الرابعة لمنكري نبوة محمد صلى الله عليه وسلم و حاصلها لم ينزل الله الملكة حتى يشهدوا ان محمد امحق في دعواه او نرى ربنا حتى يخبرنا به ارسله الينا لقد استكبروا الخ اعلم ان هذا هو الجواب عن تلك الشبهة يوم يرون الملكة الخ هو جواب لقولهم لولا انزل علينا الملكة فين تعالى ان الذي سالوه سيوجدون لكنهم يلقون منه ما يكرهون و قدعنا الي ما عملوا الخ قال المسكين بيان لارتفاع اسباب النفع الربيان اجتماع اسباب الضرر اصحاب الجنة يومئذ خير الخ اعلم انه سبحانه و تعالى لما بين حال الكفار في الخسار الكلي و الخيبة التامة شرع وصف اهل الجنة تنبيها على ان الحظ كل الحظ في طاعة الله تعالى و يوم تشقق السماء الخ اعلم ان هذا الكلام مبنى على ما استدعوه من انزال الملكة فين سبحانه انه يحصل ذلك في يوم له صفات و قال الرسول يارب الخ اعلم ان الكفار لما اكثر و امن الاعتراضات الفاسدة و وجوه التعنت ضاق قدر الرسول صلى الله عليه وسلم و شكاهم الى الله تعالى و قال يارب الخ ثم انه تعالى قال مسلما لرسوله عليه الصلوة و السلام و معزياله و كذلك جعلنا الخ و قال الذين كفروا لولا انزل الخ اعلم ان هذا هو الشبهة الخامسة لمنكري نبوة محمد صلى الله عليه وسلم و لا يأتونك الخ لما بين فساد قولهم بالجواب الواضح قال و لا يأتونك بمثل من الجنس الذي تقدم ذكره من الشبهات الاجتناك بالحق الذي يدفع قولهم الذين يحشرون الخ الاقرب انه صفة للقوم الذين اوردوا هذه الاسئلة على سبيل التعنت و ان كان غيرهم من اهل النار يدخل معهم و اعلم انه تعالى بعد ان تكلم في التوحيد و نفى الانداد و اثبات النبوة و الجواب عن شبهات المنكرين لها و في احوال القيامة شرع في ذكر القصص على السنة المعلومة القصة الاولى قوله تعالى و لقد اتينا موسى الخ اعلم انه تعالى لما قال و كذلك جعلنا لكل نبي عدوا من المجرمين اتبعه بذكر جماعة من الانبياء و عرفه بمنازل بمن كذب من امهم القصة الثانية قصة نوح عليه السلام قوله تعالى و قوم نوح الخ القصة الثالثة قوله تعالى و عاد و ثمود الخ القصة الرابعة قوله تعالى و لقد اتوا على القرية الخ قوله تعالى و اذا راؤك الخ اعلم انه سبحانه لما بين مبالغة المشركين

في انكار نبوة و في ايراد الشبهات في ذلك بين بعد ذلك انهم اذاروا الرسول اتخذوه
 هزوا فلم يقتصروا على ترك الايمان به بل زادوا عليه بالاستهزاء والاستحقاق وسوف
 يعلمون الخ لما حكى عنهم هذا الكلام زيف طريقتهم في ذلك الم ترالى ربك الخ
 اعلم انه تعالى لما بين جهل المعرضين عن دلائل الله تعالى و فساد طريقتهم في ذلك
 ذكر بعده انواع الدلائل الدالة على وجود الصانع قال المسكين وامتد هذا الاستدلال
 الى قوله تعالى و كان ربك قديرا و اشار في تضعيفه الى عموم بعثة عليه السلام بقوله
 ولوشئنا لبعثنا ونهاد عليه الصلوة والسلام عن المداراة مع الكفار والتلطف في الدعوة
 في قوله فلا تطع الكافرين مناسبة لقوله فاي اكثر الناس الا كفورا و يعبدون من دون الله الخ
 اعلم انه تعالى لما شرح دلائل التوحيد عاد الى تهجين سيرتهم في عبادة الاوثان و ما ارسلناك
 الا مبشرا الخ قال المسكين لما زيف طريق الكفار امر لرسول عليه الصلوة والسلام بدعوتهم
 الى الحق و علم الحزن ان لم يؤمنو و باعلامهم باخلاص الدعوة و بالتوكل على الله تعالى
 فيما يعرض في الدعوة ثم لما امره بان يتوكل عليه و صف نفسه بامور الحياة و العلم
 و القدرة و الرحمة و اذا قيل لهم اسجدوا الخ قال المسكين لما ذكر اوصاف الكمال له
 تعالى ذكر جهالة الكفار في نفورهم عن عبادة من هو موصوف بتلك الاوصاف و الكمالات
 تبارك الذي جعل الخ اعلم انه سبحانه لما حكى عن الكفار مزيد النفرة عن السجود
 ذكر ما لو تفكروا فيه و جوب السجود و العبادة للرحمن فقال تبارك الذي جعل في السماء
 بروجا و عباد الرحمن الخ قال ابو السعود كلام مستأنف مسوق لبيان اوصاف خالص عباد
 الرحمن و احوالهم الدنيوية و الاخروية بعد بيان حال النافرين عن عبادته و السجود له قل
 ما يعبا بكم الخ قال ابو السعود امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بان يبين للناس ان الفائزين
 بتلك النعماء الجليلة التي يتنافس فيها المتنافسون انما نالوها بما عدد من محاسنهم
 و لولا هالم يعتد بهم اصلا فقد كذبتم الخ قال ابو السعود بيان لحال الكفرة من المخاطبين
 كما ان ما قبله بيان لحال المؤمنين منهم.

سورة الشعرا

طسم تلك آيات الكتاب الخ لما ذكر الله تعالى انه بين الامور قال بعده لعلك باجمع
منبهاً بذلك على ان الكتاب وان بلغ في البيان كل غاية فغير مدخل لهم في الايمان لما
انه سبق حكم الله بخلافه فلا تبلغ في الحزن والاسف على ذلك ثم بين تعالى انه قادر
على ان ينزل اية يذلون عندها و يخضعون و قوله ماياتيهم الخ من تمام قوله ان نشاء
ننزل عليهم فنبه تعالى على انه مع قدرته على ان يجعلهم مؤمنين بالالغاء رحيم بهم من
حيث ياتيهم حال بعد حال بالقران وهو الذكر وهم مع ذلك على حد واحد في الاعراض
والاستهزاء ثم عند ذلك زجروا وتوعد فقال فقد كلبوا ثم انه تعالى بين انه مع انزله القران
حالا بعد حال قد اظهرا دلة تحدث حالا بعد حال فقال اولم يروا الى الارض الخ اما قوله
ان في ذلك لاية وما كان اكثرهم مؤمنين المعنى ان في ذلك دلالة لمن يتفكرون يتدبرون مع
كل ذلك يستمرا اكثرهم على كفرهم و ان ربك لهما العزيز الرحيم المراد انهم مع
كفرهم و قدرة الله تعالى على ان يجعل عقابهم لا يترك رحمتهم بما تقدم ذكره من خلق
كل زوج كريم من النبات ثم من اعطاء الصحة والعقل والهداية والخلادى ربك الخ قال
ابو السعود كلام مستأنف مسوق لتقرير ما قبله من اعراضهم عن كل ماياتيهم من الايات
التنزيلية و تكليبيهم بها الر بيان اعراضهم عما يشاهدونه من الايات التكوينية و اذ منصوب
على المفعولية بمضمرة خوطب به النبي عليه السلام اى و اذكر لا ولشك المعرضين
المكلمين زجر الهم عما هم عليه من التكليب و تحذيرا من ان يحقق بهم مثل ما حاق
باضرابهم المكلمين الظالمين في الكبير القصة الثانية قصة ابراهيم عليه السلام قوله تعالى

١ لعله سقط هنا لفظ من الناسخ و كان العبارة لعلوا و جوب الخ ٢ منه ٢ في الكبير عن ابن عباس رضى الله
عنهما ان البروج هي الكواكب العظام ٢ منه ٣ لبالغاء بمعنى العادة ١٢ ٤ ذكر في عظمة السورة
المقطعة الوعيد على التكليب و ذكر في هله السورة تفصيل جزاء المكلمين السابقين ١٢ منه على عنه

وائل عليهم الخ القصة الثالثة قصة نوح عليه السلام قوله تعالى كذبت قوم نوح الخ القصة
 الرابعة قصة هود عليه السلام قوله تعالى كذبت عاد الخ القصة الخامسة قصة صالح عليه
 السلام قوله تعالى كذبت ثمود الخ القصة السادسة قصة لوط عليه السلام قوله تعالى
 كذبت قوم لوط الخ القصة السابعة قصة شعيب عليه السلام قوله تعالى كذبت اصحاب
 الايكة الخ القول فيما ذكره الله تعالى من احوال محمد عليه الصلوة والسلام قوله تعالى
 وانه لتنزيل الخ قال المسكين هذا اعود الى ما ذكر في صدر السورة من حقيقة الكتاب
 المبين و نبوة عليه السلام و تمهد هذا الى اخر السورة و ذكر في تضاعيفها جهل الكفار
 و عنادهم و امره عليه السلام بالتبليغ و علم الاهتما سيكيد هم و شرهم و اجاب عن
 شبهاتهم الواهية و ختم السورة بالتهديد العظيم لمن انكر بعد و ضوع الحجة.

سورة النمل

قال المسكين الفتح الله هذه السورة بحقيقة القرآن وايمان السعداء به وانكار الاشقياء له ومال كل من الفريقين وانك لتلقى الخ هذه الاية بساط و تمهيد المايريد ان يسوق بعلمها من الاقاصيص واعلم ان الله تعالى ذكر في هذه السورة انواعا من القصص القصص الاولى قصة موسى عليه السلام قوله اذ قال موسى الخ القصة الثانية قصة داود و سليمان عليهما السلام قوله تعالى ولقد اتينا داود الخ القصة الثالثة قصة صالح عليه السلام قوله تعالى ولقد ارسلنا الى ثمود الخ القصة الرابعة قصة لوط عليه السلام قوله تعالى و لوطا اذ قال لقومه الخ القول في خطاب الله تعالى مع محمد صلى الله عليه وسلم قوله تعالى قل الحمد لله الخ قال المسكين لما فرغ من ذكر القصص بدأ في التوحيد والباته بالدلائل وابطال الشرك فالمقصود هو قوله الله خيرام مايشركون الخ واما قوله قل الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى فهو كالخطبة المقدمة على المقصود توطئة و تبركا قل لا يعلم من في السموات الخ قال ابوا السعود بعد ما حقق تفردة تعالى بالالوهية بيان اختصاصه بالقدرة الكاملة التامة والرحمة الشاملة العامة عقبه بذكر ماهو من لوازمه وهو اختصاصه بعلم الغيب تكميلا لما قبله و تمهيد المابعدة من امر البعث بل ادارك علمهم الخ قال ابوا السعود لما نفى عنهم علم الغيب واكد ذلك بنفى شعورهم بوقت ماهو مصيرهم لامحالة بولغ في تاكيده و تقريره و قال الذين كفرو الخ قال ابوا السعود بيان لجهلهم بالآخرة وعميهم منها بحكاية انكارهم للبعث قل سيروا في الارض الخ قال المسكين امر صلى الله عليه وسلم بتهديبهم على التكذيب ولا تحزن عليهم الخ قال المسكين هذا تسلية له عليه الصلوة والسلام ويقولون متى هذا الوعد الخ قال المسكين عود الى انكارهم للبعث بنهج اخر ثم اجاب عنه بوعدهم ببعض ما استعجلوه في قوله قل عسى ان يكون الخ ثم بين سبب تاخر العذاب الاكبر بقوله و ان ربك لدو فضل الخ ثم

١ بين حقيقة القرآن في فاتحة هذه وخاتمة ما قبلها فحصلت المناسبة ١٢ منه عفى عنه

٢ في خاتمة السورة السابقة لماتمم الحجة على الكفار بقوله و من ضا فقا . انما انا من المنذرين بين في هذه حال من

اشار الى ان لهم قبائح غير ما يظهرونه وانه تعالى يجازيهم على الكل في قوله وان ربك
ليعلم ما تكن الخ لم اشار الى ان قبائحهم كما هي معلومة له تعالى كذا هي مثبتة مع الاشياء
الاخر في اللوح المحفوظ في قوله وما من غائبة في السماء الخ ثم بين فضائل القرآن
العظيم المشتمل على هذه الامور المهمة النافعة في قوله ان هذا القرآن الخ ثم صلى
رسول الله صلى الله عليه وسلم بان قضاء هم موكلون الى الله تعالى فلا تهتم بهم ان
كذبوك ولا تخفهم ان عاندونك بل توكل على الله ولا تحزن ان لم يؤمنوا لانهم
كالموتى والصم والعمى في قوله تعالى ان ربك يقضى الى قوله فهم مسلمون فكل هذا
متعلق بالنبوة ثم عاد الى المعاد فقال واذا وقع القول عليهم الخ قال ابو السعود و بيان لما
اشير اليه بقوله تعالى بعض الذي تستعجلون من بقية ما يستعجلونه من الساعة ومباذيبها و
يوم نحشر من كل امة الخ قال ابو السعود بيان اجمالى لحال المكذبين عند قيام الساعة
بعد بيان بعض مبادئها الم يروا انا جعلنا الليل الخ قال المسكين اخذا من ابي السعود
هذا دليل لصحة البعث والنموذج له يستدل به عليها فان من تأمل في تعاقب الليل والنهار
وشاهد من الافاق تبدل ظلمة الليل المحاكية للموت بضياء النهار المضاهي للحياة
وعاين في نفسه تبدل النوم الذي هو اخو الموت بالانتباه الذي هو مثل الحياة قضى بان
الساعة آتية لا ريب فيها وان الله يبعث من في القبور و يوم ينفخ الخ اعلم ان هذا هو
العلامة الثانية لقيام وتري الجبال الخ اعلم ان هذا هو العلامة الثالثة لقيام القيامة من جاء
بالحسنة الخ اعلم انه تعالى لما تكلم في علامات القيامة شرح بعد ذلك احوال
المكلفين بعد قيام القيامة انما امرت ان اعبد الخ قال ابو السعود امر عليه الصلوة
والسلام ان يقول لهم ذلك بعد ما بين لهم احوال المبدأ والمعاد وشرح احوال القيامة
تنبيها لهم على انه قد اتم امر الدعوة بما لا مزيد عليه ولم يبق له عليه الصلوة والسلام بعد
ذلك شأن سوى الاشتغال بعبادة الله عز وجل والاستغراق في مراقبته غير مبال بهم
ضلوا ام رشدوا اصلحوا او افسدوا وقل الحمد لله سيريكم الخ انه سبحانه ختم هذه
الخاتمة في نهاية الحسن وهي قوله وقل الحمد لله على ما اعطاني من نعمة العلم والحكمة
والنبوة او على ما وفقني من القيام باداء الرسالة وبالانذار سيريكم آياته القاهرة فتعرفونها
لكن حين لا ينفعكم الايمان وما ربك بغافل عما تعملون لانه من وراء جزاء العاملين.

سورة القصص

ان فرعون علا الخ قال ابو السعود استيناف جار مجرى التفسير للجمل الموعود ولقد اتينا موسى الكتب الخ قال ابو السعود والتعرض لبيان كون ابتاءها بعد اهلاكم للاشعار بمساس الحاجة الداعية اليه تمهيد المايقبة من بيان الحاجة الداعية الى انزال القرآن الكريم على رسول الله صلى الله عليه وسلم فان اهلاك القرون الاولى من موجبات الدراسات معالم الشرائع وانظماها واحكامها الموديين الى اختلال نظام العالم وفساد احوال الامم المستدعين للتشريع الجديد بتقرير الاصول الباقية على من الدهور وترتيب الفروع المتبدلة بتبدل العصور وتذكر احوال الامم الخالية الموجبة للاعتبار وما كنت بجانب الغربي الخ قال ابو السعود شروع في بيان ان انزال القرآن الكريم ايضا واقع في زمان شدة مساس الحاجة اليه واقتضاء الحكمة له البتة ولولا ان تصيهم الخ قال المسكين هذا تعليل للارسال اى ارسلناك قطعا لمعاذيرهم بالكلية فلما جاءهم الحق الخ قال المسكين من ههنا الى قوله تعالى ضل عنهم ما كانوا يفترون تهجين طريقة المشركين في اقوالهم وعقائدهم وبيان شبهاتهم والجواب عنها و تهديدهم بتدكير حال من قبلهم وبما يرون يوم القيامة والاثبات توحيدته تعالى وعدم اغناء الهتهم عنهم شيئا فهذا كله كلام واحد متداخل بعضه في بعض ثم ذكر تعالى قصة قارون كالتفسير الاجمال قوله تعالى و كم اهلكنا من قرية بطرت معيشتها الخ تنبيها على ان متاع الحيواة الدنيا وزينتها لا ينبغي الاغترار به فان ما عند الله خير وابقى ثم ختم القصة ببيان من يصلح للدار الاخرة بقوله تلك الادارة الاخرة نجعلها الخ ثم ذكر القول الكلبي لبيان جزاء طالب الدنيا و طالب الاخرة بقوله من جاء بالحسنة الخ ثم لما ختم تفصيل احوال الكفار و كان رسول الله صلى الله عليه وسلم في اهتمام و اغتمام من امرهم كما يدل عليه قوله تعالى انك لا تهدي من احببت خاطب عليه السلام ليقوى قلبه ببعض البشارات و ذكره بعض امتنانات و امره بالاستقامة على الحق و عدم المبالاة بالكفار والاثبات على الدعوة و تفويض الحكم اليه تعالى اذ ارجع الكل اليه كل هذا مذكور في قوله تعالى ان الذي فرض عليك القرآن الى اخر السورة والله الحمد.

ل في خاتمة السورة السابقة لماتم الحجاة على الكفار بقوله و من ضل فقل انما انا من المنذرين بين في هذه حال من ضل كفرعون و من النذر كموسى عليه السلام ۱۲ منه عفى عنه

سورة العنكبوت

الم احسب الناس الخ الوجه في تعلق اول هذه السورة بما قبلها هو انه تعالى لما قال في اخر السورة المتقلبة وادع الى ربك و كان في الدعاء اليه الطعان والحراب والضراب لان النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه كانوا مأمورين بالجهاد ان لم يؤمن الكفار بمجرد الدعاء فشق على البعض ذلك فقال احسب الناس ان يتركوا الخ ولقد فتنا الذين من قبلهم الخ ما يوجب تسليتهم فقال كذلك فعل الله بمن قبلهم ولم يتركهم بمجرد قولهم امنا بل فرض عليهم الطاعات و اوجب عليهم العبادات ام حسب الذين الخ لما بين حسن التكليف بقوله احسب الناس بين ان من كلف بشئ ولم يات به يعذب وان لم يعذب في الحاك فيعذب في الاستقبال ولا يفوت الله شئ في الحال ولا في المال من كان يرجوا الخ لما بين بقوله احسب الناس ان العبد لا يترك في الدنيا سدى و بين في قوله ام احسب الذين يعملون السيئات ان من ترك ما كلف به يعذب كذا بين ان من يغترف بالآخرة و يعمل لها لا يضيع عمله ولا نجيب اصله و من جاهد الخ لما بين ان التكليف حسن واقع و ان عليه وعدا و ايعادا ليس لهما دافع بين ان طلب الله ذلك من المكلف ليس لنفع يعود اليه فانه غنى مطلقاً والذين امنوا الخ لما بين اجمالاً ان من يعمل صالحاً فلنفسه بين مفصلاً بعض التفصيل جزاء المطيع الصالح عمله و وصينا الانسان الخ لما بين الله حسن التكليف ووقعها و بين ثواب من حقق التكليف اصولها و فروعها تحريضا للمكلف على الطاعة ذكر المانع و منعه من ان يختار اتباعه فقال الانسان ان انقاد لاحد ينبغي ان ينقاد لابويه و مع هذا لو امراه بالمعصية لا يجوز اتباعهما غيرهما فلا يمنعن احدكم شئ من طاعة الله ولا يتبعن احد من يأمر بمعصية الله والذين امنوا و عملوا الخ قال المسكين اعاده لان ما قبله كان بياناً لحالتهم الحقيقية و هذا بيان لحالتهم الاضافية و من الناس من يقول الخ نقول اقسام المكلفين ثلاثة مؤمن ظاهر بحسن اعتقاده و كافر مجاهر بكفره و عناده و ملبذب

بينهما يظهر الايمان بلسانه و يضم الكفر فى فزاده والله تعالى لما بين القسمين بقوله تعالى فليعلمن الله الذين صدقوا وليعلمن الكاذبين و بين احوالها بقوله ام حسب الذين يعملون السيئات الى قوله والذين امنوا و عملوا الصلحت بين القسم الثالث و قال و من الناس من يقول امنا بالله و قال الذين كفروا اللذين امنوا الخ قال ابو السعود بيان لحملهم للمؤمنين على الكفر بالاستمالة بعد بيان حملهم لهم بالاذية والوعيد ولقد ارسلنا نوحا الخ ان الله تعالى لما بين التكليف و ذكر اقسام المكلفين و وعد المؤمن الصادق بالثواب العظيم و اوعد الكافر والمنافق بالعذاب الاليم و كان قد ذكر ان هذا التكليف ليس مختصا بالنبي واصحابه و امته حتى صعب عليهم ذلك بل قبله كان كذلك كما قال تعالى ولقد فتنا الذين من قبلهم ذكر من جملة من كلف جماعة منهم نوح النبي عليه السلام و قومه ومنهم ابراهيم عليه السلام و غيرهما مثل الذين اتخلدوا الخ لما بين الله تعالى انه اهلك من اشرك عاجلا و عذب من كذب اجلا و لم ينفعه فى الدارين معبوده و لم يندفع ذلك عنه ركوع و سجوده مثل اتخاذه ذلك معبودا باتخاذ العنكبوت بيتا لايجير اوريا ولا يريح ثوريا قال المسكين ثم قرر امر التوحيد ببيان ضعف ما يدعون من دونه و بلاغة المثل المذكور واضرا به و كونه تعالى خالقا بالحق ثم قال ان فى ذلك لاية للمؤمنين اى دليلا على التوحيد اتل ما اوحى اليك الخ يعنى ان كنت على كفرهم فاتل ما اوحى اليك لتعلم ان نوحا ولوطا وغيرهما كانوا على ما انت عليه بالغوا الرسالة وبالغوا فى اقامة الدلالة ولم ينقدوا قومهم من الضلالة والجهالة ولا تجادلوا اهل الكتاب الخ لما بين الله طريقة ارشاد المشركين و نفع من انتفع و صل الياس ممن امتنع بين طريقة ارشاد اهل الكتاب ثم بعد ذلك ذكر دليلا قياسيا فقال و كذلك انزلنا اليك الكتاب يعنى كما انزلنا على من تقلعك انزلنا اليك و هذا قياس و ما كنت تتلوا من قبله الخ هذا المبحث فى الاجوبة عن الشبهات فى النبوة من اقتراحهم الايات واستعجال العذاب ان كان نبيا و نحوهما و امتد هذا الى قوله ذوقوا ما كنتم تعملون يا عبادى الذين امنوا الخ قال المسكين بيان الامر الهجرة الربيان عنا الكفار المفضى اليها غالباً كل نفس ذائقة الموت الخ لما امر الله تعالى المؤمنين بالمهاجرة صعب عليهم ترك الاوضاع و مفارقة الاخران فقال لهم ان ماتكروهن لا بد من وقوعه فان كل نفس ذائقة الموت والموت مفرق الاحباب فالاولى ان يكون ذلك فى سبيل الله يجازيكم عليه فان الى الله مرجعكم والذين امنوا و عملوا الصلحت الخ بين ما يكون للمؤمنين وقت الرجوع الخ و كاين من دابة الخ قال ابو السعود

روى ان النبي صلى الله عليه وسلم لما امر المؤمنين الذين كالوا بمكة بالمهاجرة الى المدينة قالوا و كيف فقدم بلدة ليس لنا فيها معيشة ولئن سألتهم الخ قال المسكين عودالى تقرير التوحيد الذى كان مذكورا فى قوله تعالى مثل الذين اتخذوا الخ بالشبات الخالقية و الرزاقية و غيرهماله تعالى ثم حقر شان الدنيا المانقة لهم عن الاقبال على الاخرة بالايمان بالله و رسول مع اعترافهم بالتوحيد و فت السؤال فى قوله وما هذه الحيوه الدنيا الخ ثم اشارالى عودهم الى الفطرة الاصلية التى تقتضى التوحيد اذا زال المانع من الركون الى الزخارف والشهوات وقت ركوبهم فى الفلك بقوله فاذا ركبوا فى الفلك الخ ثم ذكر لهم نعمة عظيمة من امنهم فى الحرم تحملهم على الايمان فى قوله اولم يروا انا جعلنا حرما الخ و من اظلم ممن افترى الخ لما بين الله الامور على الوجه المذكور ولم يؤمن به احدبين انهم اظلم من يكون والذين جاهدوا افينا الخ قال المسكين كانه قسيم لقوله من اظلم ممن افترى اى حال العاصى ذلك و حال المطيع هذا والله اعلم.

سورة الروم

اولم يتفكرو الخ قال ابو السعود انكار واستقبح لقصم لظهرهم على ما ذكر من ظاهر الحية الدنيا مع الغفلة عن الآخرة اولم يسيروا في الارض الخ قال ابو السعود توبيخ لهم بعدم اعراضهم بمشاهدة احوال امثالهم الدالة على عاقبتهم ومآلهم الله يبدأ الخلق الخ قال المسكين كان ما ذكر من قوله اولم يسيروا الخ دليلا وانموذ جابو قوع الآخرة وهذا دعوى وقوعها وما تكون فيها من احوال المؤمنين والكفار فسبحان الله الخ قال ابو السعود اثر ما بين حال فريقى المؤمنين العاملين للصلوات والكافرين المكذبين بالآيات ومآلها من الثواب والعذاب امر واما ينجى من الثانى و يفضى الى الاول من تنزيه الله عز وجل عن كل مالا يليق بشانه سبحانه و من حمده تعالى على نعمه العظام يخرج الحى من الميت الخ قال المسكين بيان لبعض اعاجيب قدرة تعالى ليدل على استحقاقه للحمد وليدل على صحة البعث التى فيها الكلام ههنا ثم ذكر الآيات الدالة على البعث الى قوله وله المثل الا على فى السموات والارض وهو العزيز الحكيم قوله ضرب لكم مثلا الخ لما بين العادة والقدرة عليها بالمثل بعد الدليل بين الوجدانية ايضا بالمثل بعد الدليل واذا مس الخ لما بين التوحيد بالدليل وبالمثل بين ان لهم حالة يعرفون بها وان كانوا ينكرونها فى وقت وهى حالة الشدة ام انزلنا عليهم سلطانا الخ لما سبق قوله تعالى بل اتبع الذين ظلموا اهواءهم بغير علم حقق ذلك بالاستفهام بمعنى الانكسار واذا اذقنا الناس رحمة الخ قال المسكين بيان لاثار التوحيد المتزلزل الذى كان فى المشركين ثم بين قصور نظرهم فى قوله اولم يروا الخ ببيان كون كل من الاحوال من الله تعالى فيجب ان يرجع اليه فى كل حال ثم ذكر علامات اعتقاد كون الرزق من الله الخ الذى يجب ان يتصف به المؤمنون عن ابناء اهل الحقوق حقوقهم

لما كان المذكور فى خاتمة ما قبلها حال العاصى والمطيع من حيث ان احدهما ظالم مستحق لجهennem والاخر مهيد مستحق لمبته تعالى بين فى فاتحة هذه السورة حالهما بوجه من حيث كون احدهما غالبا والاخر مغلوبا كما مسح عنه قوله تعالى و يومئذ يفرح المؤمنون بنصر الله ۱۲ منه عفى عنه

الدال على كمال التوكل و عدم الخشية من الاقلال ونهاهم عن الحرص واطمع و طلب
الزيادة في قوله فات ذا القربى حقه الى قوله اولئك هم المضعفون الله الذى خلقكم الخ
قال المسكين عود الى مسئلة التوحيد والحشر ظهر الفساد الخ وجه تعلق هذه الاية بما
قبلها هو ان الشرك سبب الفساد قل سيروا فى الارض الخ لما بين حالهم بظهور الفساد
فى احوالهم بسبب فساد اقوالهم بين لهم هلاك امثالهم واشكالهم الذين كانت افعالهم
كافعالهم فاقم وجهك الخ قال المسكين امر بالتوحيد مع الوعيد من اتيان القيامة و فصل
الامور فيما ومن آياته ان يرسل الخ قال المسكين اقامة لدلائل التوحيد والبعث ولقد ارسلنا
من قبلك والله قال ابو السعود لعل توسط الاية الكريمة بطريق الاعتراض بين ما سبق
وما لحق من احوال الرياح واحكامها لانذار الكفرة و تحذير هو عن الاخلال بمواجب
الشكر المطلوب بقوله تعالى لعكم تشكرون بمقالته النعم المعدوة المنوطة بارسالها
كيلا يحل بهم مثل ما حل باولئك الامم من الانتقام الله الذى يرسل الخ قال ابو السعود
استيناف مسوق لبيان ما اجمل فيما سبق من احوال الرياح ولئن ارسلنا الخ لما بين انهم
عند توقف الخير يكونون مبلسين ايسين وعند ظهوره يكونون مستبشرين بين ان تلك
الحالة ايضا لا يدومون عليها بل لو اصاب زرعهم ربح مصفر لكفروا فهم منقلبون غير
ثابتين لنظرهم الى الحال لا الى المال فانك لا تسمع الموتى الخ لما علم تعالى رسوله
انواع الادلة و اصناف الامثلة و وعدوا و وعد ولم يزد هم دعاءى الافرارا قال له فانك
لا تسمع الخ الله الذى خلقكم الخ لما اعاد من الدلائل التى مضت دليل من دلائل الافاق
وهو قوله الله الذى يرسل الرياح و ذكر احوال الرياح من اوله الى اخره اعاد دليلا من دلائل
الانفس وهو خلق الأدمى و ذكر احواله فقال خلقكم من ضعف الخ ويوم تقوم الساعة الخ
قال المسكين تصريح بالمطلوب من اثبات الحشر بعد المقلمة من بيان الدليل ولقد ضربنا
للناس الخ اشارة الى ازالة الاعذار والاثبات بما فوق الكفاية من الانذار والى انه لم يبق من
جانب الرسول تقصيرى فان طلبوا شيئا اخر فذلك عنادهم بين تعالى ان ذلك بطبع الله
على قلوبهم بقوله كذلك بطبع الله ثم انه تعالى سلى قلب النبى صلى الله عليه وسلم
بقوله فاصبر الخ.

سورة لقمان

الم تلك آيات الكتاب الحكيم الخ وجه ارتباط اول هذه السورة باخرها قبلها هو ان الله تعالى لما قال ولقد ضربنا للناس الخ اشارة الى كونه معجزة و قال ولئن جنتهم باية اشارة الى انهم يكفرون بالآيات بين ذلك الم تلك آيات الكتاب الحكيم اي هذه آيات ولم يؤمنوا بها والى هذا اشار بعد هذا بقوله واذا تتلى الخ و من الناس من يشتري الخ لما بين ان القرآن كتاب حكيم يشتمل على آيات حكمية بين من حال الكفار انهم يركون ذلك يشتغلون لغيره ان الذين امنوا الخ لما بين حال من اذا تتلى عليه الآيات ولى بين حال من يقبل على تلك الآيات و يقبلها خلق السموات بغير عمد الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لاستشهاد بما فصل فيه على عزته تعالى التى هى كمالا اخذرة حكمة التى هى كمال العلم و تمهيد قاعدة التوحيد و تقريره و ابطال امر الاشرار و تبكيه اهله ولقد آتينا لقمان قال ابو السعود كلام مستانف مسوق لبيان بطلان اشرك و وصينا الانسان الخ قال ابو السعود كلام مستانف اعترض به على نهج الاستطراد فى الثناء وصية لقمان تاكيد المافيه من النهى عن الشرك يانبي انها ان تك الخ قال ابو السعود شروع فى حكاية بقية وصايا لقمان اثر تقرير ما فى مطلعها من النهى عن الشرك و تاكيده بالاعتراض الم ترو ان الله سخر الخ قال ابو السعود رجوع الى سنن ماسلف قبل قصة لقمان من خطاب المشركين و توبيخ لهم على اصرارهم على ما هم عليه مع مشاهدتهم للدلائل التوحيد و من يسلم وجهه الخ لما بين حال المشرك و المجادل فى الله بين حال المسلم المستسلم لامر الله و من كفر فلا يحزنك الخ قال المسكين هذا تسلية للنبي عليه السلام ولئن سألتهم الخ لما استدل بخلق السموات بغير عمد و بنعمة الظاهرة و الباطنة بين انهم معترفون بذلك غير منكرين له ولو ان ما فى الارض الخ قال المسكين بيان لكمال عظمة تعالى ببيان عظمة

كلماته ما خلقكم ولا بعثكم الخ لما بين كمال قدرته وعلمه ذكر ما يطل استعابهم للحشر الخ
الم تر ان الله يولج الخ قال المسكين عود الى اثبات التوحيد بالدلائل و كذا قوله الم تر ان
الفلک تجرى الخ و اذا غشيهم موج الخ لما ذكر الله ان في ذلك لايات ذكر ان الكل
متسرفون به غير ان البصير يدركه اولاً ومن في بصيرته ضعف لا يدركه اولاً فاذا غشيه
موج و وقع في شدة اعترف يا ايها الناس الخ لما ذكر الدلائل من اول السورة الى اخرها وعظ
بالتقوى لانه تعالى لما كان واحداً اوجب التقوى البالغة فان من يعلم ان الامر بيد اثنين لا يخاف
احدهما مثل ما يخاف لو كان الامر بيدهما لا غير قال المسكين و ايضا فيه بيان لكيفية
الحشر و ما ههنا ان الله عنده علم الساعة الخ قال المسكين لنا بين الساعة فيما قبل سألوا
امتى الساعة فذكر الله تعالى اختصاصه بعلمها مع اخواتها من علوم الغيب والله اعلم.

سورة السجده

الم تنزيل الكتاب الخ لما ذكر الله تعالى في السورة المتقدمة دليل الواحشية و ذكر
الاصل الاخر وهو الحشر وختم السورة بهما بدأ ببيان الرسالة في هذه السورة الله الذي خلق
السموات الخ لما ذكر الرسالة بين ما على الرسول من الدعاء الى التوحيد واقامة الدليل
وقالوا ذا ضللنا الخ لما قال قليلا ما تشكرون بين عدم شكرهم باتيانهم بضده وهو
الكفر و انكار قدرته على احياء الموتى وقد ذكرنا ان الله تعالى في كلامه القديم كلما
ذكر اصلين من الاصول الثلاثة لم يترك الاصل الثالث و ههنا كذلك ولما ذكر الرسالة
بقوله تنزيل الكتاب الى قوله لتندرو ذكر الوحداية بقوله الله الذي خلق الى قوله جعل
لكم السمع والابصار ذكر الاصل الثالث وهو الحشر بقوله تعالى و قالوا ذا ضللنا الخ
ولو ترى اذا المجرمون الخ لما ذكر انهم يرجعون الى ربهم بين ما يكون عند الرجوع
على سبيل الاجمال انما يؤمن باياتنا الخ قال المسكين بيان لحال المؤمنين الر حال
الكافرين افمن كان مؤمنا الخ لما بين حال المجرم والمؤمن قال للعاقل هل يستوى
الفريقان ثم بين انهما لا يستويان ثم بين عدم الاستواء على سبيل التفصيل و من اظلم
ممن الخ يعنى لنذيقنهم ولا يرجعون فيكونون قد ذكرو ابايات الله من النعم ولا والنقم
ثانيا ولم يؤمنوا فلا اظلم منهم احد ولقد اتينا موسى الخ لما قرر الاصول الثلاثة على
ما بيناه عادالى الاصل الذى بدأ به وهو الرسالة في قوله لتندرو قوما و قال قل ما كنت بدعا
من الرسل ان ربك هو يفصل الخ قال المسكين بيان للفصل بين من امن بالرسول و من
لم يؤمن بهم اثر اثبات الرسالة اولم يهدلهم الخ قال المسكين وعيد للمكذبين الرسول
و هذا تذكير للنعم التى وبما تحمل على الايمان اولم يروا انا نسوق الماء الخ قال
المسكين هذا تذكير للنعم التى وبما تحمل على الايمان ويقولون متى هذا الفتح الخ
قال المسكين لما اوعده و ابو قوع الفصل فى قوله ان ربك هو يفصل بينهم استبعده
فحكى الله تعالى استبعادهم واجابهم عنه.

ل وجه المناسبة بينها وبين ما قبلها مذكور فى المتن ١٢ منه عفى عنه

سورة الاحزاب

قال المسكين في جميع هذه السورة ذب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما اودى به من انواع الانداء قتال الاحزاب معه و معاونة المنافقين لهم و طعن المنافقين في نكاحه عليه الصلوة والسلام بزینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا و طلب الزواج الزیادة فی الانفاق و اشتغال بعض المسلمین بالاحادیث فی بیت علیہ السلام ونحو ذلك مما تاذی به النبی صلی اللہ علیہ وسلم فهذا القدر هو المقصود الاصلی من السورة وما سوى ذلك فهو ما توطئة لبعض ما هو المقصود و امامكمل له كما يظهر كل ذلك من التأمل فی النظم الکریم ولما كان اشد الايذاء من الكافرين و المنافقين بد اللہ تعالیٰ بالا مرتقوى اللہ تعالیٰ و عدم خشية لهم التي تقضى احيانا الى الاطاعت و بالتوكل على اللہ فقال يا ايها النبی اتق اللہ الخ ثم صرح ببعض مقاصد السورة بقوله وما جعل ادعياءكم ابناءكم الخ جوابا من قصة زينب و ذكر قبله مثلا لتأييده بقوله ما جعل اللہ لرجل من قلوبين في جوفه وما جعل ازواجكم اللاتي تظاهرون منهن امهاتكم ثم اشار الى ان نفي الابوة الصورة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا يستلزم نفي الابوة المعنوية بل هو اقرب من الأباء في هذه المرتبة فقال النبی اولی بالمؤمنين الخ ثم لما كان لنبي صلی اللہ علیہ وسلم ولاية مع جميع المؤمنين ما المؤمنون كلهم اولياء بعضهم لبعض فاورثت شبهة التوارث بين كلهم فدفعها اللہ تعالیٰ بقوله والارحام الخ ای مدار التوارث الرحم لاهذه الولاية المعنوية ثم أكد اللہ تعالیٰ ما امره به من اتباع ما يوحى بقوله و اذاخذنا من النبيين ميثاقهم الخ بيان وقوع السؤال عن التبليغ فوجب الاتباع وعدم الخوف من الطاعنين ثم شرع اللہ تعالیٰ في حكاية غزوة الاحزاب فبقوله وانزل الذين ظاهروهم الخ ثم ذكر طلب الأزواج الزيادة في الانفاق والجواب عنه بقوله

ل ختم السورة بيان الوعد للمكذبين الرسول و بين في هذه حقوفه عليهم السلام من تصديقا و تعظيمه مفضلاً و بينهما من انتقابل مالا يحق ۱۲ منه عفى عنه

يايها النبي قل لازواجك الخ ثم شرع في قصة زينب بقوله وما كان لمؤمن ولا مؤمنة الخ ثم ذكر الله تعالى حقوقه وحقوق نبيه على المؤمنين ليزدادوا تعظيماً له واجلاً لا لولذوه فقال يايها الذين امنوا اذكروا الله الى قوله سراجاً منيراً ثم امر نبيه بشارة المؤمنين المعظمين لو وانذار المنكرين المؤمنين له بقوله وبشر المؤمنين الخ ثم اراد الله ان يذكر بعض احكام النكاح لنيبه عليه السلام التي لها شأن خاص تشهد باجلاله ومحبوته لله تعالى في قوله يايها النبي انا احللتلك الخ و ذكر قبلها بعض الاحكام النكاحية المتعلقة بالمؤمنين ليظهر التفاوت بين النبي والامة بكون الاحكام المتعلقة بالامة عامنة وبالنبي خاصة فقال يايها الذين امنوا اذا نكحتم الخ ثم ذكر مسألة دخول بيوت النبي والحجاب بقوله يايها الذين امنوا لا تدخلوا الخ ثم بين متم مسألة الحجاب بقوله لا جناح عليهن الخ ثم امر بالصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم لاكمال احترامه فقال ان الله وملئكته الخ ثم ذكر الوعيد على ابداء الرسول و نبيه على ان ابداءه كابداءه تعالى فقال ان الذين يؤذون الله الخ ثم ذكر بعض افعال المنافقين من التعرض للجوارى الذي يتأذى به النبي صلى الله عليه وسلم والمؤمنون وارشد الى سببها فقال يايها النبي قل لازواجك وبناتك الخ ثم ذكر سؤالهم عن الساعة الذي قصدهوا به تكذيب النبي صلى الله عليه وسلم و ابداءه فقال يستلك الناس عن الساعة الخ ثم ختم السورة بالتصريح بالنهي عن ابداءه عليه السلام بقوله يايها الذين امنوا لا تكونوا كالذين اذوا موسى الخ ثم لمانه الله تعالى عما يؤذى النبي صلى الله عليه وسلم امرهم بما ينبغي ان يصدر عنهم فقال يايها الذين امنوا اتقوا الله الخ ثم بينا ان ما نكلفكم به انما تحملموه من انفسكم لانا حملناكم فقال انا عرضنا الامانة الخ ثم ذكر حال الذين ادوا حق الامانة والذين لم يؤدوه فقال ليعذب الله المنافقين الخ والحمد لله تعالى على ما القى في روعى من تقرير الارتباط فيما بين آيات هذه السورة.

سورة سبا

الحمد لله الذي له ما في السموات الخ قال المسكين صدر السورة بتقرير التوحيد الذي من الاصول العظيمة الدين وقال الذين كفرو الخ قال المسكين ذكر امر الساعة اثر التوحيد كما هو العادة الشائعة في القرآن ولذكر الساعة ههنا مناسبة خاصة لامر التوحيد لانه حكمفي الاية الاولى باثبات الحمد له تعالى في الاخرة وقد انكر الاخرة قوم فتصدى لاثباتها ليجزى الذي امنوا الخ قال ابو السعود علة لقوله تعالى لتا تيكر وبيان لما يتضى اثباتها والذين سعوا في اياتنا الخ لما بين حال المؤمنين يوم القيمة بين حال الكافرين ويرى الذين اوتوا العلم الخ قال ابو السعود مستأنف مسوق للاستشهاد باولى العلم على الجهلة الساعين في الايات وقال الذين كفرو الخ قال المسكين حكاية لقول منكرى الساعة بل الذين لا يؤسرون قال ابو السعود جواب من جهة الله تعالى عن ترديدهم الوارد على طريقة الاستفهام بالاضراب عن شقه والبطالهما واثبات قسم ثالث كاشف عن حقيقة الحال ناع عليهم سوء حالهم الم يروا الى ما بين ايديهم الخ قال ابو السعود استئناف مسوق لتحويلها اجتروا عليه من تكذيب آيات الله تعالى واستعظام ما قالوا في حقه عليه الصلوة والسلام وانه من العظام الموجبة لنزول اشد العقاب و حلول افطع العذاب من غير ريث و تاخير ان نشأنخسف الخ قال ابو السعود بيان لما سبى عنه ذكر احاطتهما من المحذور المتوقع من جهتهما ولقد اتينا داؤد الخ لما ذكر الله تعالى من ينيب من عباده ذكر منهم من اناب و اصاب و من جملتهم داؤد كما قال تعالى عنه فاستغفر ربه و خررا كعا و اناب و بين ما اتاه الله على انابة ثم لما ذكر المنيب الواحد ذكر منيبا آخر وهو سليمان كما قال تعالى

لما ذكر في خاتمة ما قبلها جزاء الحافظين للامانة والمضيعين لها ذكر في اول هذه وقت الجزاء وهو الساعة واعظم الامانات وهو التوحيد ۱۲ منه عفى عنه

و القينا على كرسية جسد الم اناب و ذكر ما استفاد هو بالانابة فقال و لسيمان الريح الخ
قال تعالى لقد كان لسبأ الخ لما بين الله حال الشاكرين لنعمه بذكر داود سليمان بين حال
الكافرين بانعمه بحكاته اهل سبا ولقد صدق عليهم الخ قال المسكين بيان لكونهم متبعين
لابليس في كفرهم و كون المؤمنين بمعزل عن ذلك والحكمة في تسليته عليه قل ادعوا
الذين الخ قال المسكين عود الى التوحيد في هيئة المناظرة التي لا اعتسان فيها كما قال
تعالى و انا و اياكم لعلى هدى او في ضلل مبين الخ وما ارسلناك الا كافة الخ لما بين مسئلة
التوحيد سرع في الرسالة و يقولون متى هذا الوعد الخ لما ذكر الرسالة بين الحشر وما
ارسلنا في قرية قال ابو السعود تسليته لرسول الله صلى الله عليه وسلم مما منى به من
قوله من التكذيب والكفر بما جاء به و النافة بكثرة الاموال و الاولاد و المفاخرة بحفظ
الدين و زخارفها و التكبر بذلك على المؤمنين و الاستهابة بهم من اجله قل ان ربي الخ
قال ابو السعود عليهم و حسم لمادة طمعهم الفارغو تحقيق للحق الذي عليه يدور امر التكوين
وما اموالكم الخ قال ابو السعود كلام مستأنف من جهة غرو و علاخو طب به الناس بطريق
التلوين و الالتفات مبالغة في تحقيق الحق. و تقرير ماسبق و الدين يسعون الخ قال المسكين
بيان لان الاموال لا تجدى نفعا للكفار المحضرين و ما انفقتم من شيء الخ قال المسكين
بيان لنفع الاموال للمؤمنين خلاف ما عليه الكفار و يوم يحشرهم جمعا الخ قال المسكين
تتمة لمسئلة الحشر و اذا تتلى عليهم الخ قال المسكين عود الى مسئلة الرسالة و تقرير
دليل لرساله من الايات القرانية و اتيان حقيتها و لوترى اذ فرعوا الخ قال المسكين بيان
لوضوح خطاهم اذا اكشف العطاء و تحسروهم حينئذ حيث لا ينفع الندم.

سورة فاطر

الحمد لله فاطر السموات الخ قال المسكين بذلك الكلام بالتوحيد بيان الخالق والقدرة ونفوذ المشيئة و نفاذ الامر والرازقية وان يكذبوك الخ لما بين الاصل الاول وهو التوحيد ذكر الاصل الثاني وهو الرسالة فقال تعالى و ان يكذبوك الخ ثم بين الاصل الثالث وهو الحشر فقال تعالى يا ايها الناس ان وعد الله حق الخ ثم قال تعالى ان الشيطان لكم عدو الخ لما قال ولا يفرنكم ذكر ما يمنع العاقل من الاغترار ثم بين الله تعالى حال حزبه و حال حزب الله فقال الذين كفروا افمن زين له سوء عمله الخ قال ابو السعود تقرير لما سبق من التبانين بين عاقبتى الفريقين بيان تباين حالهما الوديين الى تينك العاقبتين والله الذى ارسل الخ قال المسكين دليل على صحة البعث كما يدل عليه قوله تعالى كذلك النشور من كان يريد العزة الخ قال المسكين بيان لما يتعزز به العبد عند الله تعالى من التوحيد والعمل الصالح وما يتدلل به من المكرا السيئ والكفرون كان ظهور هذه العزة والذلة يوم الحشر ناسب ذكره بعده والله خلقكم من تراب الخ قال المسكين عود الى التوحيد بحيث يتضمن الاستدلال على صحة البعث من كيفية بخلق الانسان وايلاج الليل فى النهار وبالعكس و جريان كل من الشمس والقمر لاجل مسمى و بين فى اثناءه مثلا لعلم استواء المؤمن والكافر فى قوله وما يستوى البحران يا ايها الناس انتم الفقراء الخ قال المسكين بيان لما يحتمل العبد على التوحيد من فقره الى تعالى وقدرته تعالى عليه بالتبديل ان شاء و انحصار الفقرا الى الله تعالى بيان ان احدا لا يجدى احدا يوم القيمة ولو كان ذا قربى ثم لما كان اصرار الكفرة مع هذه الدلائل يؤذى النبى صلى الله عليه وسلم اشد الايذاء بين الله تعالى

كانت السورة المتقدمة قد ختمت بتقرير الرسالة والوعيد لمن انكرها وهذا السورة قد بدنت بالتوحيد وتلاصقهما غنى عن البيات ۱۲ منه غنى عنه

لستلية عليه السلام اختلاف احوال الناس في استعدادهم لقبول الحق ووضحه بقوله وما يستوى الاعمى والبصير وارشده عليه الاسلام بان لا يهتم بهم فان عليه الرسالة فقط وما هو باول من كذب من الرسل الم تر ان الله انزل من السماء ماء الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لتقرير ما قبله من اختلاف احوال الناس ببيان ان الاختلاف والتفاوت امر مطرد في جميع المخلوقات من التبات والجمادو والحيوان انما يخشى الله قال ابو السعود تكملة لقوله تعالى انما تنذر الذين يخشون ربهم بالغيب ان الذين يتلون الخ قال المسكين بيان لثمرات الخشية من الايمان والاعمال الصالحة مع بيان جزاءها من التجارة التي لن تبور ثم لتقرير قوله يتلون كتاب الله قال تعالى والذي اوحينا اليك من الكتاب الخ ولتفصيل قوله تجارة لن تبور قال جنات عدن يدخلونها الخ ثم قال تعالى والذين كفروا لهم نار جهنم الخ عطف على قوله ان الذين يتلون كتاب الله وما بينهما كلام متعلق بالذين يتلون الكتاب ان الله عالم غيب الخ قال المسكين عود الى التوحيد ببيان كما لانه العلمية كما في هذه الاية وكمالته العملية كما في قوله الاتى هو الذى جعلكم الخ قل ارايتم شركاءكم الخ تقرير للتوحيد وابطال للاشراك ان الله يمسك السموات الخ لما بين انه لا خلق للاصنام ولا قدرة لها على جزء من الجزاء بين ان الله قد بقوله ان الله يمسك الخ ويحتمل ان يقال لما بين شركهم قال مقتضى شركهم زوال السموات والارض كما قال تعالى تكاد السموات يظفرن منه وتنشق الارض الخ ويدل على هذا قوله فى اخر الاية انه كان حليما غفورا. واقسموا بالله الخ قال المسكين بيان لقبح كفرهم ان كفروا بعد ان اقسموا الخ ثم اوعدهم بسنة الاولين على الكفر فى قوله فهل ينظرون الخ ثم بين فى قوله ولو يؤاخذ الله الخ ان لا يفتروا بالامهال بل

سورة يس

يس والقرآن الحكيم الخ قال المسكين مدار الكلام على اثبات الرسالة بالقسم والغرض من الرسالة من الانذار والاشارة الى الدليل عليها من القران و بيان ما على الرسول من الانذار فقط لا الجبر على الهداية و انما امرها الى الله تعالى و قد حق القول على اكثرهم انهم لا يؤمنون و بيان منعنهم عن الايمان و بيان ان المنتفعون بالانذار من هم و هذا كله مذكور الى قوله اجر كريم كما يظهر بالتأمل انا نحن نحى الموتى الخ قال ابو السعود بيان لشان عظيم ينطوى على الانذار والتبشير الطواء اجماليا واضرب لهم مثلا الخ قال الله انك لمن المرسلين و قال لتندر قال قل لهم ما كنت بدعاً من الرسل بل قبلى بقليل جاء اصحاب القرية مرسلون يا حسرة على العباد الخ قال المسكين تلهف على التكذيب الترافضاص حال المكذبين الم يروا كم اهلكنا الخ لما بين الله تعالى حال الاولين قال للحاضرين الم يروا الخ وان كل لما جميع الخ قال ابو السعود بيان لرجوع الكل الى المحشر بعد بيان عدم الرجوع الى الدنيا و اية لهم الارض الخ مناسب لما قبله من وجهين احدهما انه لما قال و ان كل لما جميع لدينا محضرون كان ذلك اشارة الى الحشر فذكر ما يدل على امكانه و ثانيهما انه لما ذكر حال المرسلين و كان شغلهم التوحيد ذكر ما يدل عليه و اذا قيل لهم اتقوا الخ قال ابو السعود بيان لاعراضهم عن الايات التنزيلية بعد بيان اغراضهم عن الايات الالاقية التي كانوا يشاهدونها و اذا قيل لهم انفقوا الخ قال المسكين بيان لشناعتهم الاخرى اشلمن الاولى فان الانكار لقدرة الله الذي هو الغرض من كلامهم

١ كان الله تعالى في خاتمة فاطر قد اخبر عن قولهم لئن جاءهم نذير ليكونن اهدى من احدى الامم و قد قرر في اول يس عليه الصلوة والسلام نذير احمد منه عفى عنه

لا الامتناع من الاله ناق اشد من الاحراض عن ايات الله فكانه دليل لمضمون الاية السابقة
اي اذا اتوا بالانكار فاي استبعاد في الاعراض و يقولون متى هذا الوعد الخ قال المسكين
عود الى مسئلة الحشر فهو مرتبط بقوله و ان كل لما جميع لدينا محضرون و امتد هذا
الى قوله اليوم نختم على افواههم الاية و لو نشاء لطمسنا الخ قال المسكين هذا تقرب
لوقوع الختم يوم القيامة اي لو نشاء لا وقعنا الطمس و المسخ في الدنيا جزاء على كفرهم
لكنا لم نشاء نشاء الختم يوم القيامة فيقع ثم استدل على تقرب الطمس و المسخ بقوله
تعالى و من نعمة ننكسه فان هذا التغيير قريب من تغيير المسخ و الطمس فالقادر على
واحد قادر على اخر و ما علمناه الخ لما ذكر الاصلين الواحدانية و الحشر ذكر الاصل
الثالث و هو الرسالة ثم انه تعالى اعاد الواحدانية و دلائل دالة عليها فقال تعالى اولم يروا
انا خلقنا الخ و قوله فلا يحزنك قولهم الخ اشارة الى الرسالة لان الخطاب معه ما يوجب
تسليته دليل اجتهاد و اختياره اياه اولم يروا الانسان الخ قال ابوا السعود كلام مستأنف
مسوق لبيان بطلان انكارهم البعث بعلمنا شاهد و افي انفسهم اوضح دلائله و اعدل شواهد
كما ان ما سبق مسوق لبيان بطلان اشركهم بالله تعالى بعد ما عاينوا فيما بايديهم ما يوجب
التوحيد و الاسلام.

سُورَةُ الصَّفَاتِ

قال المسكين افتح الله تعالى هذه السورة بالبات التوحيد بعد القسم كما يدل عليه قوله تعالى ان الحكم لواحد ثم استدل عليه برؤية تعالى للسموات والارض وغيرهما ثم بتزين السماء بالكواكب بحيث يتضمن البات الرسالة ببيان امتناع الشياطين من الاستراق ثم شرع في البات المعاد بقوله فاستفتهم اهم اشد خلقا الخ وامتد هذا الى قوله ثم ان مرجعهم لالى الجحيم انهم الفوا اباؤهم الخ قال ابو السعود تعليل لاستحقاقهم ما ذكر من فنون العذاب بتقليد الاباء في الدين من غير ان يكون لهم ولا لآباءهم شيء يتمسك به اصلا ولقد ضل قبلهم الخ ذكر لرسوله ما يوجب السلية له في كفرهم وتكذيبهم فبين تعالى ان رساله للرسول قبل تقدم والتكذيب لهم قد سلف ولقد نادانا نوح الخ اعلم انه تعالى لما قال من قبل ولقد ضل قبلهم اكثر الاولين و قال فانظر كيف كان عاقبة المنذرين اتبعه بشرح وقائع الانبياء عليهم السلام فالقصة الاولى حكاية نوح عليه السلام قوله لقد نادانا القصة الثانية قصة ابراهيم عليه السلام قوله تعالى و ان من شيعته لابراهيم الخ قوله تعالى ولقد مننا على موسى الخ اعلم ان هذا هو القصة الثالثة من القصص المذكورة في هذه السورة وان الياس الخ اعلم ان هذه القصة الرابعة من القصص المذكورة في هذه السورة وان لوطا لمن المرسلين الخ هذا هو القصة الخامسة وان يونس لمن المرسلين الخ اعلم ان هذا هو القصة السادسة وهو اخر القصص المذكورة في هذه السورة فاستفتهم الربك البناات الخ قال ابو السعود امر الله عز وجل في صدر السورة الكريمة رسوله صلى الله عليه وسلم تبكيت قريش وابطال منذهبهم في انكار البعث بطريق الاستفتاء وساق البراهين القاطعة الناطقة بتحقيقه لامحالة و بين وقوعه وما سيلقونه عند ذلك من فنون العذاب واستى منهم عبادة المخلصين و

لقد ذكر في خاتمة السورة المارة امر البعث متضمنا لتقرير الواحدانية والرسالة و ذكر في فاتحة هذه دليل الواحدانية لم عقبها بالبعث فالمناسبة ظاهرة ۱۲ منه عفى عنه

فصل ما لهم من النعيم المقيم ثم ذكر انه قد ضل من قبلهم اكثر الاولين وانه تعالى ارسل اليهم منذرين على وجه الاجمال ثم اورد قصص كل واحد منهم على وجه التفصيل منها في كل قصة منها انهم من عبادة تعالى و اصفالهم تارة بالاخلاص واخرى بالايمان ثم امره عليه السلام والصلوة ههنا بتبكيتهم بطريق الاستفتاء عن وجه امر منكر خارج عن العقول بالكلية و هي القسمة الباطلة اللازمة لما كانوا عليه من الاعتقاد الزائغ حيث كانوا يقولون كبعض اجناس العرب جهينة و نبي سلمة و خزاعة و بنى مليح الملكة بنات الله و الفاء لترتيب الامر على ما سبق من كون اولئك الرسل الذين هم اعلام الخلق عليهم الصلوة والسلام عبادة تعالى فان ذلك مما يؤكّد التبكيّة و يظهر بطلان مذهبهم الفاسد ثم تبكيتهم بما يتضمنه كفرهم المذكور من الاستهانة بالملكة بجعلهم اناثا ثم ابطال اصل كفرهم المنطوي على هذين الكافرين وهو نسبة الولد اليه سبحانه و تعالى ان ذلك علوا كبيرا ولم ينظمه في سلك التبكيّة لمشاركتهم النصارى في ذلك و جعلوا بينه و بين الجنة الخ قال ابو السعود التفات الى الغيبة لا يذان بانقطاعهم عن الجواب سقوطهم عن درجة الخطاب و اقتضاء حالهم ان يعرض عنهم و تحكى جنائياتهم لاخرين والمراد بالجنة الملكة واما اعيد ذكره تمهيد المايقبه من قوله تعالى و لقد علمت الجنة انهم لمحضرون الخ والمراد به المبالغة في التكذيب ببيان ان الذين يدعى هؤلاء لهم تلك النسبة و يعلمون انهم اعلم منهم بحقيقة الحال يكذبونهم في ذلك و يحكمون بانهم معذبون لاجله حكما مؤكدا قوله سبحانه الله عما يصفون حكاية تنزيه الملكة اياه تعالى عما وصفه المشركون به بعد تكذيبهم لهم في ذلك و قوله تعالى الاعباد الله المخلصين شهادة منهم ببراءة المخلصين من ان يصفوه تعالى بذلك و قوله تعالى فانكم و ماتعدون الخ تعليل و تحقيق لبراءة المخلصين مما ذكر ببيان عجزهم عن اغوائهم و اضلالهم و قوله تعالى و ما لنا الاله مقام الخ تبين لجلية امرهم و تعيين لحيزهم في موقف العبودية بعد ما ذكر من تكذيب الكفرة فيما قالو او تنزيه الله تعالى عن ذلك و تبرئة المخلصين عنه و اظهار لقصور شانهم و قماءتهم هذا هو الذي يقتضيه جزالة التنزيل انتهى مقال ابي السعود و ان كانوا يقولون الخ قال المسكين تعبير للكافر في كفرياتهم المذكورة و غير المذكورة بانهم في هذا باناتهم كلها ناقضون للعهدنا كقولهم للوعد فيالها من عار و شامع اهليتهم للنار و لقد سبقت كلمتنا الخ

قال ابو السعود استيناف مقرر للوعيد و تول عنهم حتى حين الخ قال ابو السعود تسلية
 لرسول الله صلى الله عليه وسلم الر تسلية و تأكيد لوقوع المعاد غب تأكيد سبحان ربك الخ
 قال ابو السعود تنزيه لله سبحانه عن كل ما يفصه المشركون به مما لا يليق بجناب كبريائه
 وجبروته مما ذكر في السورة الكريمة وما لم يذكر و قوله تعالى و سلام على المرسلين.
 تشریف لهم عليهم السلام بعد تنزيهه تعالى عما ذكر و تنويه بشأنهم و اينما ان بانهم سالمون
 عن كل المكارة فاتزون بجميع المازب و قوله تعالى و الحمد لله رب العالمين الى وصفه
 عزوجل بصافته الكريمة الثبوتية بعد التبيه على اتصافه بجميع صفاته السلبية.

سورة ص

والقرآن ذى الذكر الخ قال المسكين الفتح السورة بتوحيه شان القرآن وجواب القسم مخلوف اى انه لحق او نحوه بل الذين كفروا الخ قال ابو السعود اضراب كانه قيل لاريب فيه قطعا وليس عدم اذعان الكفرة له لشائبة ريب ما فيه بل هم فى استكبار وحمية شديدة و شقاق بعيد الله تعالى ورسوله وللملك لا يلدغون له كم اهلكنا من قبلهم الخ قال ابو السعود وعيد لهم على كفرهم واستكبارهم ببيان ما اصاب من قبلهم من المستكبرين. وعجبوا ان جاءهم الخ قال ابو السعود حكاية لاباطيلهم المتفرعة على ما حكر من استكبارهم وشقاقهم قال المسكين ومخلص اباطيلهم هذه انكار النبوة ثم ذكر الجواب عنها بقوله بل هم فى شك من ذكرى الى قوله فلير تقوا فى الاسباب جند ما هنالك الخ قال المسكين هو تسلية لرسول الله صلى الله عليه وسلم بانهم جند ما من الكفار المتحزبين على الرسل مهزوم مكسور عما قريب فلا يزال بما يقولون ولا تكترث بما يهدون كلبت قبلهم الخ قال ابو السعود استيناف مقرر لمضمون ما قبله ببيان احوال العتاة الطغاة الذين هؤلاء جند ما من جنودهم مما فعلوا من التكذيب و فعل بهم من العقاب ان كل الاكذب الخ قال ابو السعود استيناف جى به تقرير التكذيب وبيان لكيفية و تمهيد السماء يعقبه وما ينظر هؤلاء الخ قال ابو السعود شروع فى بيان عقاب كفار مكة الر بيان عقاب اضرايهم من الاحزاب وقالوا ربنا عجل لنا الخ قال ابو السعود حكاية لما قالوه عند سماعهم بتأخير عقابهم الى الاخرة اصبر على ما يقولون الخ قال المسكين هذا تسلية لرسوله صلى الله عليه وسلم بتعليم الصبر و تذكيره قصص الرسل الذين كانوا صابرين او بين اولى الايدي والابصار متحملين للشدائد فى دين الله وانجر هذا الى قوله كل من الاخيار وورد فى مطاوى القصص لتقرير البعث

الـ كان المذكور فى خاتمة ما سبق امر التوحيد فى قوله سبحانه ربك الخ والرسالة فى قوله و سلام على المرسلين الخ وهذا هو المذكور فى فاتحة هذه السورة فتامل تستبط ۱۲ منه عفى عنه

والحساب والجزاء الذي ذكر في قوله وما ينظر هؤلاء الخ كلاما مستأنفا هو قوله وما خلقنا السماء والارض الخ اى خلقنا هما بالحكمة البالغة المقتضية لان لا يهمل امر الخلق سدى ثم اشار الى مال المؤمنين وانفجار في قوله ام نجعل الذين امنوا و عملوا الصلحت الخ ثم لما كان الهامى الى هذه الاسرار والحكم هو القرآن اثنى عليه بقوله كتاب انزلناه اليك الخ ثم بعد تمام القصص عاد الى ذكر الحساب والجزاء بقوله وان للمتقين لحسن مآب الى قوله ان ذلك لحق تخاصم اهل النار ثم عاد الى ما ذكر في اول السورة من امر التوحيد والرسالة فقال قل انما انا منذر تصريح بالرسالة وما من اله الا الله الواحد القهار الخ تصريح بالتوحيد قل هو نبأ عظيم الخ قال المسكين عود الى تنويه شان القرآن الذي اشير اليه في صدر السورة وهو المراد بضمير هو كما يدل عليه اخر السورة من قوله قل ما اسالكم عليه من اجر الخ ما كان لى من علم بالملا الاعلى الخ قال ابو السعود استيناف مسوق لتحقيق انه نبأ عظيم و ارد من جهته تعالى بذكر نبأ من انبائه على التفصيل من غير سابقة معرفة به ولا مباشرة سبب من اسبابها المعتادة فان ذلك حجة بنية دالة على ان ذلك بطريق الوحي من عند الله تعالى وان سائر انبائه كذلك ان يوحى الى الخ قال ابو السعود اعتراض وسط بين اجمال اختصاصهم و تفصيله تقرير الثبوت علمه عليه السلام و تعيينا لسبب اذ قال ربك للملائكة الخ قال ابو السعود شروع فى تفصيل ما اجمل من الاختصاص الذى هو ماجرى بينهم من التقاول قال المسكين وايضا المقصود من ذكر هذه القصة ههنا كما فى الكبير المنع من الحسد والكبر وذلك لان ابليس انما وقع فيما وقع فيه بسبب الحسد والكبر والكفار انما نازعوا محمدا عليه السلام بسبب الحسد والكبر قل ما اسئلكم عليه الخ قال المسكين عود الى كون القرآن من عند الله تعالى وكون ما فيه حقا واقعا ولو بعد حين كما ذكرنا فى تفسير قوله تعالى قل هو نبأ عظيم فتذكر.

سورة الزمر

انا انزلنا اليك الكتاب الخ قال ابو السعود شروع في بيان شان المنزل اليه وما يحب عليه اثر بيان شان المنزل وكونه من عند الله تعالى الا لله الدين الخالص الخ قال بوا السعود استيناف مقرر لما قبله من الامر باخلاص الدين له تعالى ووجوب الامثال به والذين اتخذوا امن دونه الخ قال ابو السعود تحقيق لحقية ما ذكر من اخلاص الدين الذي هو عبارة عن التوحيد ببيان بطلان الشرك الذي هو عبارة عن ترك اخلاصه لو اراد الله الخ قال المسكين ابطال لتوع اخر من الشرك من اتخاذ الو لدله تعالى عن ذلك علوا كبيرا خلق السموات والارض الخ اعلم ان الاية المتقدمة دلت على انه تعالى بين كونه منزها عن الولد بكونه الها واحدا و قهارا غالبا اى كامل القدرة فلما بنى تلك المسئلة على هذه الاصول ذكر عقبيها ما يدل كمال القدرة و على كمال استغناء وايضا فانه تعالى طعن في الهية الاصنام فذكر عقبيها الصفات التي باعتبارها تحصيل الالهية ان تكفروا الخ قال المسكين قطع للحجة و فصل للقول بعد ذكر فنون نعمائه و تعريف شئونه العظيمة الموجبة للايمان والشكرو اذا مس الانسان الخ اعلم ان الله تعالى لما بين فساد القول بالشرك. بين ان الله تعالى هو الذي يجب ان يعبد بين في هذه الاية ان طريقة هؤلاء الكفار الذين يعبدون الاصنام متناقضة قل تمتع الخ قال ابو السعود تهديد لذلك الضال والمضل وبيان لحاله وماله امن هو قانت الخ قال ابو السعود من تمام الكلام المأمور به كانه قيل له تاكيد للتهديد وتهكما به أنت احسن حالا ومالا ام من هو قائم بمواجب الطاعات ودائم على اداء وظائف العبادات حالتى السراء والضراء لا عند مساس الضر فقط كدأبك قل هل يستوى الخ قال ابو السعود بيان للحق

۱ كما قال تعالى بل الدين كفروا في عزة و شقاق ۱۲ منه ۲ المذكور في فاتحتها وخاتمته ما قبلها كون القرآن حقا منزلا من الله تعالى ۱۲ منه عفى عنه. ۳ من العبادة الخالصة المأمور بها في قوله فاعبد الله الخ ۱۲ منه ۴ اما ترتيب الامر بالعبادة على الزال الكتب لان الكتاب يأمربه ۱۲ منه

و تنبيه على شرف العلم والعمل قل يا عباد الخ قالوا السعود امر صلى الله عليه وسلم بتذكير المؤمنين وحملهم على التقوى والطاعة اثر تخصيص التذکر باولى الالباب ايذانا بانهم هم كما سيصرح به قل انى امرت الخ قال ابو السعود امر رسول الله صلى الله عليه وسلم ببيان ما امر به نفسه من الاخلاص فى عبادة الله الذى هو عبارة عما امر به المؤمنون من التقوى مبالغة فى حثهم على الايمان بما كلفوه و تمهيد المايقبه مما خوطب به المشركون والذين اجتنبوا الخ اعلم ان الله تعالى لما ذكر وعيد عبدة الاصنام والوثان ذكر وعيد من اجتنبوا عبادتها واحترز عن الشرك ليكون الوعد مقرونا بالوعيد ابدا فيحصل كما الترغيب والترهيب الم تر ان الله انزل الخ اعلم انه تعالى لما وصف الاخرة بصفات توجب الرغبة العظيمة لاولى الالباب فيها وصف الدنيا بصفة توجب اشتداد النفرة عنها فمن شرح الله صدره الخ اعلم انه تعالى لما بالغ فى تقرير البيانات الدالة على وجوب الاقبال على طاعة الله وجوب الاعراض عن الدنيا بين بعد ذلك ان الانتفاع بهذه البيانات لا يكمل الا اذا شرح الله صدره ونور القلب الله نزل احسن الحديث الخ لما بين تعالى ذلك اردفعه بما يدل على ان القرآن سبب لحصول النور والشفاء والهداية وزيادة الاطمينان فمن يتقى بوجهه الخ قال ابو السعود استيناف جار مجرى التعليل لما قبله من تبائن حالى المهتدى والضال كذب الذين من قبلهم الخ لما بين الله تعالى كيفية عذاب القاسية قلوبهم فى الاخرة بين ايضا كيفية وقوعهم فى العذاب فى الدنيا ولقد ضربنا للناس الخ لما ذكر الله تعالى هذه الفوائد المتكاثرة والنفائس المتوافرة فى هذه المطالب بين تعالى انه بلغت هذه البيانات الى حد الكمال والتمام ضرب الله مثلا الخ اعلم انه تعالى لما بالغ فى شرح وعيد الكفار اردفع بذكر مثل ما يدل على فساد ملههم وقبح طريقتهم انك ميت الخ قال ابو السعود تمهيد لما يقبه من الاختصاص يوم القيامة لوم انكم يوم القيامة الخ قال المسكين هذا هو المقصود وهو مرتبط بقوله ضرب الله مثلا الذى كان تقريراً للتوحيد وهذا اختصاص فيه فمن اظلم الخ قال ابو السعود مسوق لبيان كل من طرفى الاختصاص الجارى فى شان الكفر والايمان اليس الله بكاف الخ قال المسكين كان ماسبق بيانا لحال المحقين والمبطلين وهذا جواب عما كان المبطلون يخوفون المحقين به حيث قالو التكفن عن شتم الهتنا اولي صينك منهم خبل او جنون ولئن سالتهم الخ اعلم انه تعالى لما اظنب فى وعيد المشركين

و في وعدالموحدين عاد الى اقامة الدليل على تزئيف طريقة عبدة الاصنام قل يا قوم اعملوا
 الخ لما اورد الله عليهم هذه الحجة التي لا دافع لها قال بعده على وجه التهديد قل الخ
 انا انزلنا عليك الخ قال المسكين هذا تسلية لقلب النبي صلى الله عليه وسلم من حزنه
 باصرار المشركين على قبائحهم ثم عاد الى اقامة الدليل على التوحيد فقال الله يعوفى الانفس الخ ثم
 ابطل عقيدتهم الشركية فقال ام اتخلوا من دون الله الخ ثم لزيادة قوة قلبه عليه السلام
 امره بادعاء بقوله قل اللهم فاطر السموات الخ اذا تحير ليا مر الدعوة وضجر من شدة شكيمتهم
 في المكابرة والعناد ثم بين النارالحكم الذي استدعاه النبي صلى الله عليه وسلم وغاية
 شدة وفضاعته بقوله ولو ان للذين ظلموا الخ ثم بين تناقضهم القبيح في انكارهم للتوحيد بانهم
 لا يدومون على حال بل ينسبون الكل في حال العجز والحاجة الى الله تعالى و يقطعون
 عن الله في حال السلامة والصحة فقال فاذا مس الانسان ضر الخ والتناقض دليل القطع
 عن الحجة فعلم ان حججهم على دعواهم الشرك داحضة فثبت التوحيد قل يا عبادى
 الذين الخ اعلم انه تعالى لما اظنّب في الوعيد ارفع بشرح كمال رحمة وفضله واحسانه
 في حق العبيد قال المسكين وهو ايضا ازاحة لما عسى ان يختلج في صدر من امر بالتوحيد
 ان الشرك الذى مضى منا كيف يغفر فذكر الله تعالى رحمة العامة ومغفرته التامة ثم ذكر
 شرطها من التوبة والانابة و اشار في تضاعيفه الى احوال يوم القيمة الله خالق كل شىء الخ
 اعلم انه تعالى لما اطال الكلام في شرح الوعد والوعيد عاد الى دلائل الالهية والتوحيد
 وما قلروا الله حق قدره الخ قال المسكين تميم للتوحيد ببيان عظمة الله تعالى وتفصيل
 لاحوال القيامة الذى كان مبد منها قد ذكر في ابواب الانابة ثم كيفية احوال اهل العقاب
 ثم كيفية احوال اهل الثواب و ختم السورة.

سورة المؤمن

ما يجادل في آيات الله الخ اعلم انه تعالى لما قرآن كتاب انزله ليهدى به في الدين ذكر احوال من يجادل لغرض ابطاله واخفاء امره كذبت قبلهم الخ قال المسكين كشف عن معنى قوله فلا يغرك الخ الذين يحملون العرش الخ اعلم انه تعالى لما بين ان الكفار يبالفون في اظهار العداوة مع المؤمنين بين ان اشرف طبقات المخلوقات هم الملائكة الذين هم حملة العرش والحافون حول العرش يبالفون في اظهار المحبة والنصرة للمؤمنين كانه تعالى يقول ان كان هؤلاء الارذال يبالفون في العداوة فلا تبال بهم ولا تلتفت اليهم ولا تقم لهم وزنا فان حملة العرش معك والحافون من حول العرش معك ينصرونك ان الذين كفروا بنا دون الخ اعلم انه تعالى لما عاد الى شرح احوال الكافرين المجادلين في الايت الله وهم الذين ذكرهم الله في قوله ما يجادل في آيات الله الا الذين كفروا بين انهم في القيامة يعترفون بذنوبهم واستحقاقهم العذاب الذي ينزل بهم ويسألون الرجوع الى الدنيا ليتلافوا ما فرط منهم ذلكم بانه اذا دعى الله الخ قال ابو السعود جواب لهم باستحالة حصول ما يرجونه ببيان ما يوجبها من اعمالهم السيئة هو الذي يريكم آياته الخ قال المسكين لما علل في الاية السابقة عذابهم باشراكهم اشار الى دلائل التوحيد و بين في تضاعيفه احوال القيمة تتيما لما مر من بعض احوالها وامتد هذا الى قوله ان الله هو السميع البصير اولم يسيروا في الارض الخ لما بالغ في تخويف الكفار بعذاب الآخرة اردفع ببيان تخويفهم باحوال الدنيا ولقد ارسلنا موسى الخ اعلم انه تعالى لما سلى رسوله بذكر الكفار الذين كذبوا الانبياء قبله وبمشاهدة النارهم سلاه ايضا بذكر قصة موسى عليه السلام وانه مع قوة معجزاته بعثه الى فرعون و هامان و قارون فكذبوه و كابروه وقالوا هو ساحر كذاب واذ يتحاجون الخ اعلم ان الكلام في تلك القصة لما انجر الى شرح احوال النار لاجرم ذكر الله عقيبتها قصة المناظرات التي تجرى بين الرؤساء و الاتباع

لما ختم السورة المتقدمة بذكر احوال المؤمنين والكافرين في الآخرة بين في اول هذه احوال الفريقين في الدنيا من كون الكفار على طرف الهلاك و كون المؤمنين محبوبين عند الملكة حيث يدعون لهم الخ ۱۲ منه عفى عنه

من اهل النار وانا لننصر رسنا الخ ان الكلام في اول السورة انما وقع من قوله ما يجادل في آيات الله الخ وامتد الكلام في الرد على اولئك المجادلين و على ان المحققين ابدا كانوا مشغولين بدفع كيد المبطلين و كل ذلك انما ذكره الله تعالى لسلبية للرسول صلى الله عليه وسلم وتصبيره على تحمل اذى قومه ولما بلغ الكلام في تقرير المطلوب الى الغاية القصوى و عد تعالى رسوله بان ينصره على اعدائه في الحياة الدنيا و في الآخرة و لما بين الله تعالى انه ينصر الانبياء و المؤمنين في الدنيا و الآخرة ذكر نوعا من انواع تلك النصرة في الدنيا فقال ولقد اتينا موسى الهدى الخ ولما بين ان الله تعالى ينصر رسوله وينصر المؤمنين في الدنيا و الآخرة و ضرب المثال في ذلك بحال موسى مخاطب بعد ذلك محمدا صلى الله عليه وسلم فقال فاصبر ان وعد الله حق الخ فالله ناصر كتم امره بان يقبل على طاعة الله ان الذين يجادلون الخ اعلم اننا ان الكلام في اول هذه السورة انما ابتدئ ردا على الذين يجادلون في آيات الله تعالى واتصل البعض ببعض وامتد على الترتيب الذي لخصناه و النسق الذي كشفنا عنه الى هذا الموضع ثم انه تعالى به في هذه الآية على الداعية التي تحمل اولئك المجادلة لخلق السموات الخ قال ابوا السعود تحقيق للحق و تبين لاشهر ما يجادلون فيه من امر البعث على منهاج قوله تعالى اوليس الذي خلق السموات و الارض بقادر على ان يخلق مثلهم وما يستوى الاعمى الخ قال المسكين لما اقام الدليل على صحة البعث فقبل بعض وانكر بعض بين الفرق بينهما بمشال ان الساعة لا تاتي الخ لما قدر الدليل على امكان وجود يوم القيمة اردف بان اخبر عن وقوعها ودخولها في الوجود و قال ربكم ادعوني الخ اعلم انه تعالى لما بين ان القول بالقيمة حق و صدق و كان من المعلوم بالضرورة ان الانسان لا ينضع يوم القيمة الا بطاعة الله و كان اشرف انواع الطاعات الدعاء و التضرع لاجرم امر الله تعالى به في هذه الآية الله الذي جعل لكم الليل الخ قال المسكين لما امر الله تعالى في الآية السابقة بالعبادة و اصل العبادة التوحيد فاقام الدلائل على التوحيد الى قوله فانما يقول له كن فيكون الم ترالى الذين يجادلون الخ اعلم انه تعالى عاد الى ذم الذين يجادلون في آيات الله فاصبر ان وعد الله حق الخ اعلم انه تعالى لما تكلم من اصل السورة الى هذا الموضع في تزئيف طريقة المجادلين امر في هذه الآية رسوله بان يصبر على ايذائهم بتلك المحادلات التي جعل لكم الانعام الى اخر السورة اعلم انه تعالى راعى ترتيبا لطيفا في اخر هذه السورة و ذلك انه ذكر فصلا في دلائل الالهية ثم اردف بفصل في التهديد و الوعيد

سورة حم السجدة

قال المسكين الاقرب ان المقصود ههنا اثبات التوحيد الذي صرح به في قوله قل انكم لتكفرون بالذي خلق الارض الخ والذي قبله من كون القرآن منزلا من الرحمن الرحيم كالتمهيد له لاشتمال القرآن على التوحيد و ذكر معه اعراض الكفار والجواب عنه والامر بالاستقامة والاستغفار ولوعيد على الشرك والوعد للمؤمنين استطرادا و ذكر ايضا في تضاعفه ما هو المقصود من قوله انما الهكم اله واحد الخ قل انكم لتكفرون الخ اعلم انه تعالى لما امر محمد صلى الله عليه وسلم في الاية الاولى ان يقول انما انا بشر مثلكم يوحى الى انما الهكم اله واحد اردفع بما يدل على انه لايجوز اثبات الشركة بينة تعالى و بين هذه الاصنام في الالهية والمعبودية فان عرضوا الخ اعلم ان الكلام انما ابتدئ من قوله انما الهكم اله واحد واحتج عليه بقوله قل انكم لتكفرون و حاصله ان الاله الموصوف بهذه القدرة القاهرة كيف يجوز الكفر به و كيف يجوز جعل هذه الاجسام الخسيسة شركاء له في الالهية ولما تم تلك الحجة قال فان عرضوا فقل انذرتم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود و بيان ذلك ان وظيفة الحجة قدمت على اكمال الوجوه فان بقوا مصرين على الجعل لم يبق علاج في حقهم الا انزال العذاب عليهم و يوم يحشرا عداء الله الخ اعلم انه تعالى لما بين كيفية عقوبة اولئك الكفار في الدنيا اردفع بكيفية عقوبتهم في الاخرة ليحصل منه تمام الاعتبار في الزجر والتحذير وقيضنا لهم قرناء الخ اعلم انه تعالى ما ذكر الوعيد الشديد في الدنيا والاخر على كفر اولئك الكفار و اردفه بذكر السبب الذي لاجله وقعوا في ذلك الكفر وقال الذين كفروا لا تسمعوا الخ قال المسكين بيان لتزني كفرهم بحيث لا يودون سماع الهداية ثم بين وعيدهم بالعذاب ثم عين ذلك العذاب انه النار وقال الذين كفروا ربنا الخ اعلم انه تعالى لما بين ان الذي حملهم على الكفر الموجب للعقاب الشديد مجالسة قرناء السوء بين ان الكفار عند الوقوع في العذاب الشديد يقولون ربنا ارنا الخ ان الذين قالوا ربنا الله الخ اعلم انه تعالى لما اطب في الوعيد اردفع بهذا الوعد الشريف و هذا ترتيب لطيف مدار كل القرآن عليه و من احسن قول الخ قال المسكين اخذ امن الكبير و ابي السعود لما ذكر الله تعالى في اول السورة

۱- مناسبة لقوله تعالى الله الذي جعل لكم الليل الخ ۱۲ منه. ۲- مناسبة لقوله فاما نرينك الخ ۱۲ منه

۳- ختم السورة المتقدمة على التوحيد والتهديد وكذا التفتح هذه بالتوحيد كما قال قل انكم لتكفرون الخ وبالتهديد كما قال فان عرضوا الخ ۱۲ منه عفى عنه

ما قالوه للنبي صلى الله عليه وسلم من ان قلوبنا في اكنة و في وسطها من قولهم لا نسمع
 الهذا القرآن الخ و كان عليه الصلوة والسلام يتأذى بهذه الاقوال امره تعالى في هذه الايات
 بالصبر على الدعوة ايذائهم و مقابلة اساءتهم بالاحسان و من آياته الليل والنهار الخ قال
 المسكين عود الى التوحيد و اقامة الدلائل عليه و اشار في الاخر الدلائل الى صحة البعث
 بقوله ان الذي احياها لمحي الموتى الخ ان الذين يلحدون في آياتنا الخ قال المسكين
 لما اقام الله تعالى الدلائل هدد من ينازع في هذه الدلائل و يلحد فيها ان الذين كفروا
 بالذكر الخ قال السميكن كان ما قبله بيانا للايات التكوينية و هذا بيان للايات التنزيلية و
 شرفها مع التسلية لرسول عليه الصلوة والسلام في قوله ما يقال لك الا ما قد قيل الخ
 ولو جعلناه قرآنا اعجميا الخ هذا الكلام متعلق بقوله و قالوا قلوبنا في اكنة الخ و جواب
 له و التقدير انا لو انزلنا هذا القرآن بلغة العجم لكان لهم ان يقولوا كيف ارسلت الكلام
 العجمي الى القوم العرب و يصح لهم ان يقولوا قلوبنا في اكنة مما تدعونا اليه اى من هذا
 الكلام و في اذاننا و قرمنه لانفهم و لانه يحيط بمعناه اما انزلنا هذا الكتاب بلغة العرب
 وبالفاظهم و انتم من اهل هذه اللغة فكيف يمكنكم ادعاء ان قلوبكم في اكنة منها و في
 اذانكم و قرمنها و لقد اتينا موسى قال ابوا السعود كلام مستأنف مسوق لبيان ان الاختلاف
 في شان الكتب عادة قدسية غير منحص بقومك على منها بقوله تعالى ما يقال لك الا ما
 قد قيل الخ اليه يرد علم الساعة الخ اعلم انه تعالى لما هدد الكفار بقوله من عمل صالحا الخ و
 معناه ان جزاء كل احد يصل اليه في يوم القيمة و كان سائلا قال و متى يكون ذلك اليوم
 فقال تعالى انه لا سبيل الى الخلق الى معرفة ذلك اليوم و لا يعلمه الا الله و لما بين الله
 تعالى من حال هؤلاء الكفار انهم بعد ان كانوا مصرين على القول بالثبات الشركاء و الاضداد
 لله تعالى في الدنيا تهروا عن تلك الشركاء في الاخرة بين ان الانسان في جميع الاوقات
 متبدل الاحوال متغير المنهج فان احس بخير و قلرة التفرغ و تعظم و ان احسن ببلاء و
 محنة ذهل فقال لا يستم الانسان الخ و اعلم انه تعالى لما ذكر الوعيد العظيم على الشرك
 و بين ان المشركين يرجعون عن القول بالشرك في يوم القيامة ذكر عقبيه كلاما اخر
 يوجب على هؤلاء الكفار ان لا يبالغوا في اظهار النفرة من قبول التوحيد و ان لا يفرطوا في
 اظهار العداوة مع الرسول صلى الله عليه وسلم فقال قل ارايتم ان كان من عند الله الخ
 و لما ذكر هذه الوجوه الكثيرة في تقرير التوحيد و النبوة و ما جاب عن شبهات المشركين و
 تمهيات الضالين قال سنريهم آياتنا الخ ثم قال اولم يكف بربك الخ و المعنى الم
 تكفهم هذه الدلائل الكثيرة التي اوضحها الله تعالى و قررنا في هذه السورة و في كل
 سور القرآن الدالة على التوحيد و النبوة و المعاد ثم ختم السورة بقوله الا انهم في مرية الخ
 يعنى ان القوم في شك عظيم و شبهة شديدة من البعث و القيمة.

سورة الشورى

كذلك يوحى اليك الخ هذه المماثلة المراد منها المماثلة في الدعوة الى التوحيد والعدل والنبوة والمعاد و تقبيح احوال الدنيا والترغيب في التوجه الى الاخرة ولما ذكر ان هذا الكتاب حصل بالوحى بين ان الموحى من هو فقال انه هو العزيز الحكيم والصفة الثالثة قوله ما فى السموات وما فى الارض والصفة الرابعة والخامسة قوله تعالى وهو العلى العظيم تكاد السموات يتفطرن الخ لما بين ان الموحى لهذا الكتاب هو الله العزيز الحكيم بين وصف جلاله وكبريائه فقال تكاد السموات يتفطرن من فوقهن اى من هيبه و جلاله لم قال والملائكة يسبحون بحمد ربهم ويستغفرون لمن فى الارض الخ اعلم ان مخلوقات الله تعالى نوعان عالم الجسمانيات واعظمها السموات وعالم الروحانيات واعظمها الملائكة والله تعالى يقرر كمال عظمة لاجل نفاذ قدرته وهيبته فى الجسمانيات ثم يردفه بنفاذ قدرته استيلاء هيبته على الروحانيات وقوله تعالى يسبحون بحمد ربهم اشارة الى الوجه الذى بهم الى عالم الجلال والكبرياء وقوله يستغفرون لمن فى الارض اشارة الى الوجه الذى لهم الى عالم الاجسام ثم قال تعالى والذين اتخذوا من دونه اولياء اى جعلوا شركاء واندادا هو محاسبهم عليها انما انت منذر قال المسكين ثم بين الله كونه عليه السلام منذرا بقوله وكذلك اوحينا اليك الخ ثم بين شان اليوم الذى امر عليه السلام بالانذار منه فقال لا ريب فيه هذه صفته الاولى وقال فريق فى الجنة وفريق فى السعير هذه صفته الثانية اى هو يوم الفصل ولو شاء الله لجعلهم الخ المراد تقرير قوله والذين اتخذوا الى قوله وما انت عليهم بوكيل ثم قال تعالى ام اتخذوا من دونه اولياء اعاد ذلك الكلام على سبيل الاستنكاد ثم قال وما اختلفتم فيه من شىء الخ وجه النظم انه تعالى كما منع الرسول صلى الله عليه وسلم ان يحمل الكفار على الايمان قهر افكذلك منع المؤمنين ان يشرعوا

ل فهو مرتبط بقوله اليه يرد علم الساعة ۱۲ منه. ل لما ختم السورة المتضمنة بذكر البعث فى قوله الا انهم فى مرتبة من لقاء ربهم الصبح هذا السورة بذكر التوحيد وتلازمه ظاهر منه عفى عنه

معهم في الخصومات والمنازعات قال المسكين ثم وصف الحاكم نفسه بأنه هو الرب الذي يحق التوكل عليه والالابة اليه فاطر السموات والارض الى قوله انه بكل شيء عليم شرع لكم من الدين الخ اعلم انه تعالى لما عظم وحيه الى محمد صلى الله عليه وسلم بقوله كذلك يوحى اليك الخ ذكر في هذه الاية تفصيل ذلك كبر على المشركين الخ قال ابو السعود شروع في بيان احوال بعض من شرع لهم ما شرع من الدين القويم الله يجتبي اليه الخ قال ابو السعود استيناف وارد لتحقيق الحق وفيه اشعار بان منهم من يجيب الى الدعوة وما تفرقوا الخ قال ابو السعود شروع في بيان احوال اهل الكتاب عقيب الاشارة الاجمالية الى احوال اهل الشرك وان الذين اورثوا الكتاب الخ قال ابو السعود بيان لكيفية كفر المشركين بالقرآن الر كيفية كفر اهل الكتاب لذلك فادع الخ قال المسكين تفريع على الاختلاف اى لما وقع الاختلاف وجب الدعوة الى الاتفاق مع الاستقامة والاعراض عن اهوائهم والايمان والعدل واتمام الحجة والذين يحتاجون الخ قال المسكين لعالم الله الحجة هتدمن يعاند فيها بغير حق الله الذي انزل الكتاب الخ لما قرر الله هذه الدلائل خوف المنكرين بعذاب القيمة والمعنى على ما قال ابو السعود انها على جناح الايمان فاتبع الكتب واعمل به وواظب على العدل قبل ان يفاجئك اليوم الذين يوزن فيه الاعمال ويوفى جزائها يستعجل بها الدين الخ قال المسكين لما قررر امر الساعة ذكر ان لها منكرين و مصدقين الله لطيف الخ قال المسكين لعله جواب عن استعجالهم اى لا تغتروا بالامهال الذي منشاء اللطف والرهوبية وهذا الامهال لا يدوم لانه القوى العزيز من كان يريد الخ قال المسكين تقرير لعدم الاغترار بالعاجلة وترغيب فى الاجلة ام لهم شركاء الخ قال المسكين ذم على ردهم الشرع الذى و صحابه نوحا الخ وانكارهم للبعث ووعيد لهم بالعذاب اذا ارتفع المانع ترى الظلمين الخ قال المسكين بيان لوقوع العذاب بالظلمين وحصول الثواب لمقابلتهم وانجر هذا الى قوله غفور شكور واورد فى اثناء الكلام فى صورة لجملة المعترضة ما يبرى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن طلب الاجر على التبليغ ليدل على خلوصه و صدقه ووقوع ما اخبر به حتماً يقولون افتري الخ اعلم ان الكلام فى اول هذه السورة انما ابتدئ فى تقرير ان هذا الكتاب انما حصل بوحي الله وهو قوله تعالى كذلك يوحى اليك واتصل الكلام فى تقرير هذا المعنى وتعلق البعض ببعض حتى وصل الى ههنا

حكى ههنا شبهة القوم وهي قولهم ان هذا ليس وحيامن الله تعالى فان يشأ الله الخ قال ابو السعود استشهاد على بطلان ما قالوا ببيان انه عليه السلام لو اتى على الله لمنعه من ذلك قطعاً وقيل المعنى ان يشاء يجعلك من المنحوم على قلوبهم فانه لا يجترئ على الافتراء عليه تعالى الا من كان كذلك و مؤداه استبعاد الافتراء من مثله عليه السلام و يمحوا الله الخ قال ابو السعود استئناف مقرر لثبوت الافتراء اى و من عادته تعالى انه يمحوا الباطل فلو كان افتراء كماز عموا المحققه و دمه او عدة لرسول الله صلى الله عليه وسلم بانه تعالى يمحوا الباطل الذى هم عليه بتصرته عليهم وهو الذى يقبل التوبة الخ اعلم انه تعالى لما قال ام يقولون اتى الخ ثم برأسوله ما اضافوه اليه من هذا وكان المعلوم انهم قد استحقوا بهذه الفرية عقاباً عظيماً لاجرم نذبتهم الله تعالى الى التوبة و عرفهم انه يقبلها من كل مسيء و ان عظمت اساءته ولو بسط الله الرزق الخ اعلم انه تعالى لما قال فى الآية الاولى انه يجيب دعاء المؤمنين ورد عليه سوال وهو ان المؤمن قد يكون فى شدة و بلية و فقر ثم يدعو فلا يشاهد اثر الاجابة فكيف الحال فيه مع ما تقدم من قوله ويستجيب الذين امنوا فاجاب تعالى عنه بقوله ولو بسط الله الرزق لعباده لبغوا فى الارض و لا تقدموا على المعاصى و لما كان ذلك محذوراً و جب ان لا يعطيهم ما طلبوه و لما بين تعالى انه لا يعطيهم ما زاد على قدر حاجتهم لاجل انه علم ان تلك الزيادة تضرهم فى دينهم بين انهم اذا احتاجوا الى الرزق فانه لا يمنهم منه فقال وهو الذى ينزل الغيث الخ ثم ذكر اية اخرى تدل على الهيته فقال ومن آياته خلق السموات الخ قال المسكين ثم اشار الى صحته البعث الرببان الالهية كما هو الشائع فى القرآن فقال وهو على جمعهم اى حشرهم بعد البعث للمحاسبة اذا يشاء قدير ثم اشار الى نموذج المحاسبة الواقع فى الدنيا دفعا لاستبعاد المحاسبة فى الآخرة فقال وما اصابكم من مصيبة الخ ثم بين عدم قدرتهم على الهرب عن المحاسبة فقال وما انتم بمعجزين الخ ثم عاد الى ذكر دليل الالهية فقال ومن آياته الجوار فى البحر الخ فى الكبير اعلم ان المقصود من ذكره امر ان احدهما ان يستدل به على وجود القادر الحكيم والثانى ان يعرف ما فيه من النعم العظيمة لله تعالى على العباد ثم قال تعالى ان يشايسكن الريح الخ والمقصود التنبيه على ان المؤمن يجب ان لا يكون غافلاً عن دلائل معرفة الله البتة واعلم انه تعالى لما ذكر دلائل التوحيد اوردتها بالتنفير عن الدنيا و تحقير شأنها لان

الذى يمنع من قبول الدليل انما هو الرغبة في الدنيا بسبب الرياسة و طلب الجاه فاذا صغرت الدنيا في عين الرجل لم يلتفت اليها فحينئذ ينتفع بذكر الدلائل فقال فما اوتيتم من شيء الخ ثم قال وما عند الله خير وابقى ثم بين ان هذه الخيرية انما تحصل لمن كان موصوفا بصفات ان يكون من المؤمنين الخ ومن يضل الله فماله من ولى الخ قال المسكين لما ذكر في الايات السابقة حال المهتدين واستحقاقهم لعند الله من الثواب ذكر في هذه الاية حال الضالين واستحقاقهم للعذاب والحسرة استجيبوا الربكم الخ اعلم انه تعالى لما اطنب في الوعد والوعيد ذكر بعده ما هو المقصود فان عرضوا الخ وذلك تسلية من الله تعالى ثم انه تعالى بين السبب في اصرارهم على مذاهبهم الباطلة فقال وانا اذا اذقنا الانسان الخ ولما ذكر الله تعالى اذاقة الانسان الرحمة و اصابة بضلها اتبع ذلك بقوله لله ملك السموات الخ المقصود منه ان لا يفتخر الانسان بما ملكه من المال والجاه بل اذا علم ان الكل ملك الله وملكه وانما حصل ذلك القدر تحت يدلان الله انعم عليه به فحينئذ يصير ذلك حاملا له على مزيد الطاعة والخلة ثم ذكر من اقسام تصرف الله في العالم وما كان لبشر الخ اعلم انه تعالى لما بين كمال قدرته وعلمه وحكمته اتبعه ببيان انه كيف يخص انبياءه بوحيه وكلامه قال المسكين وفي هذا جواب عن قول اليهود للنبي صلى الله عليه وسلم الاتكلم بالله وتنظر اليه ان كنت نبيا وكان مقصودهم القدح في النبوة فازاح الله هذه الشبهة تقرير النبوة بعد تقرير التوحيد.

بجاء الله

فہرست مضامین

سُورَةُ الْكَهْفِ

۵	قصہ اصحاب کہف
۷	اللہ تعالیٰ کی رحمت بے انتہا ہے
۱۰	اہل اللہ خلوت کو پسند فرماتے ہیں
۱۱	آرٹھ دنیا
۱۶	عورتیں زیارت دنیا نہیں
۱۶	باقیات صالحات
۱۵	اعمال باقی
۱۶	دنیا کی حقیقت
۱۶	اعمال قیامت میں اپنی شکل میں ظاہر ہوں گے
۲۱	سفارش سے خضر علیہ السلام کے واقعہ سے ایک نکتہ
۲۲	حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ پر چند اشکالات اور لطیف جواب
۲۲	شیطان کا منتقل اشیاء کا حال معلوم کر لینا منافی عصمت نہیں
۲۲	دوسری آیت میں لک بڑھانے کا سبب
۲۵	عدم مناسبت کے سبب علیحدگی
۲۵	آباؤ اجداد کی برکت سے اولاد کو نفع پہنچتا ہے
۲۶	لم دریافت کرنے کا منشاء کبر ہے
۲۶	آداب شیخ
۲۷	حق تعالیٰ شانہ نے اپنا نام لینے کیلئے القاب و آداب کی شرط نہیں لگائی

۲۷	سبب قسم
۲۸	مسئلہ تقدیر کی تعلیم
سُورَةُ مَرْيَمَ	
۳۰	ممنوع نام رکھنے کا رواج عام
۳۱	حق سبحانہ و تعالیٰ کی بے انتہا شفقت
۳۲	حکم استقامت عبدیت
۳۲	تخصیص کی نفی
۵	مقام طالب و مطلوب
۳۶	حب مال کے اثرات
۳۷	شرف باسم شرف مسمیٰ کی دلیل ہے
۳۸	حب مال و حب جاہ
۳۹	طریق نجات
۴۰	ودا کا مفہوم
۴۰	محبوبیت کا باطنی سبب
۴۱	ایمان و عمل صالح کا محبوبیت میں دخل
سُورَةُ طه	
۴۲	اللہ تعالیٰ کے عرش پر ہونے کا مفہوم
۴۳	عرش اللہ تعالیٰ کا مکان نہیں ہے
۴۳	تجلی کی معنی
۴۳	حوادث اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے مظاہر ہیں
۴۵	نماز کا ایک عظیم ثمرہ
۴۶	نماز کی روح
۴۷	امور طبعیہ کے مؤثر ہونے میں حکمتیں

۴۷	قذف کے معنی اور عجیب و غریب تفسیر
۴۸	حق تعالیٰ سے ہم کلامی
۴۹	حضرت موسیٰ <small>علیہ السلام</small> نے شہزادوں کی طرح پرورش پائی
۴۹	امور طبعیہ فطری چیز ہیں
۵۱	فرعون کا روئے سخن حضرت موسیٰ <small>علیہ السلام</small> تھے
۵۲	ولایعلاج الساحر پر شبہ
۵۳	ایک شبہ کا حل
۵۳	ساحران موسیٰ <small>علیہ السلام</small> کا ایمان کامل
۵۴	دنیا کی تمام اشیاء کا مقصود
۵۵	تصور شیخ کا مقصود
سُورَةُ الْأَنْبِيَاءِ	
۵۶	علماء انبیاء کے وارث ہیں
۵۷	صرف کمال علمی مدح نہیں
۵۸	خشوع عمل قلب ہے
۵۹	شمس و قمر وغیرہ کے جہنم میں ڈالنے کا سبب
۶۱	ارض جنت
۶۲	جاہ کیلئے خواہش سلطنت مذموم ہے
۶۳	شان رحمت رسول اکرم <small>صلی اللہ علیہ وسلم</small>
سُورَةُ الْحَكِّ	
۶۶	ارض و سموات شمس و قمر وغیرہ سب مطہج ہیں
۶۷	صورۃ تعذیب
۶۸	مکہ میں معاصی کا گناہ اور مقامات سے زیادہ ہے
۶۹	حق سبحانہ و تعالیٰ کا ایک بڑا انعام

۷۱	اسلام کا حاصل
۷۲	تین بڑے عمال
۷۳	علامات دین کی تعظیم کا سبب
۷۴	قاعدہ کلیہ
۷۴	مفہوم شعائر
۷۴	تعظیم شعائر
۷۵	اہل ظاہر کی غلطی
۷۵	قربانی کرنے والوں کی اقسام
۷۵	روح قربانی
۷۶	حکمت تکبیر
۷۷	تکبیر تشریح
۷۸	کذب اخبار میں ہوتا ہے
۷۹	مقدار یوم بعث الف و تمسین الف میں تطبیق عجیب
۸۳	صلح کا حاصل
۸۳	اہل باطل کو اہل حق سے منازعت کی اجازت نہیں
۸۵	دین اور دشواری
۸۶	اسرار شریعت
۸۶	ملت ابراہیمی دراصل ملت محمدیہ ہی ہے
سورة الْمُؤْمِنُونَ	
۸۷	خشوع لو از م ایمان سے ہے
۸۸	پابندی صوم و صلوات کے باوجود خشیت خداوندی
۸۹	قیامت کے دن تک
۸۹	حق سبحانہ و تعالیٰ کیلئے صیغہ واحد کا استعمال خلاف ادب نہیں
۹۰	عباد مقبولین کا کام صبر ہے

سُورَةُ النُّورِ

۹۲	آیت سرقہ السارق کی اور آیت زنا میں الزانیہ کی تقدیم میں حکمت
۹۳	واقعا کف پر منطقی اشکال کا جواب
۹۴	سَوْنِیْن کے لئے دلیل کی ضرورت ہے
۹۴	بے تحقیق کوئی بات کرنا بڑا جرم ہے
۹۴	بے تحقیق بات کا زبان سے نکالنا جرم ہے
۹۶	بلا تحقیق بات کرنا بہتان ہے
۹۷	گناہ کو صغیرہ سمجھنا
۹۸	قانون میں ہر بات کے ثبوت کی ضرورت
۱۰۰	شکایت سے متاثر نہ ہونا
۱۰۱	کشف بلا تلبیس بھی حجت نہیں
۱۰۱	قانون خدا میں جھوٹا
۱۰۲	حسن ظن محتاج دلیل نہیں ہوتا
۱۰۲	منتہی سلوک کا مقام
۱۰۳	محبت آمیز نکتہ
۱۰۴	ضروری تعلیم
۱۰۵	صفات نسواں
۱۰۶	کمالات دین دنیا
۱۰۸	علم و عمل
۱۰۹	صفات نسواں
۱۱۰	مسئلہ استیذان
۱۱۰	معاشرت کا ایک علمی نکتہ
۱۱۲	حفاظت شرم گاہ کا بہترین ذریعہ
۱۱۲	پردہ کی ضرورت

۱۱۳	مراقبہ خشیت
۱۱۵	سمت امن
۱۱۵	نظر بد سے بچنا غیر اختیاری نہیں
۱۱۶	ظلمت معصیت
۱۱۷	چہرہ اور بازوؤں کے پردہ میں داخل ہونے کی مدلل بحث
۱۲۱	نور چراغ سے تشبیہ
۱۲۲	لفظ نور کا معنی
۱۲۲	خلاصہ آیت
۱۲۳	اعمال قرب حق سبحانہ و تعالیٰ
۱۲۳	انوارات مقصود نہیں
۱۲۶	مؤمن کا مال اصلی
۱۲۷	آیت کی تفسیر
۱۲۷	ذکر اللہ
۱۲۸	سلوک کی ابتداء
۱۲۹	ادب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
۱۳۰	ادب کا مدار عرف پر ہے

سُورَةُ الْفُرْقَانِ

۱۳۲	اللہ تعالیٰ سے ہم کلام نہ ہونے میں حکمت اور مصلحت
۱۳۲	حق تعالیٰ شانہ کے دیکھنے اور سننے کا مراقبہ
۱۳۳	قرآن مجید کے تدریجاً نزول میں حکمت
۱۳۳	سابقہ کتب کا نزول دفعی میں حکمت
۱۳۵	شریعت میں سخت مرض کا بھی آسان علاج ہے
۱۳۶	تبدیل سیئات کی متعدد تفسیریں
۱۳۷	توبہ کا طریق

۱۳۸	نیک اعمال کی تاکید
۱۳۹	تبدیل ملکات کی حقیقت
۱۴۰	توبہ کا طریق
۱۴۱	گنہگاروں کو بشارت

سُورَةُ الشُّعَرَاءِ

۱۴۳	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہارون علیہ السلام کیلئے رسول بنانے کی دعاء میں حکمت؟
۱۴۴	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساحران موسیٰ کو اجازت دینے کا راز
۱۴۵	اصحاب موسیٰ بوجہ ضعیف الیقین معیت حق سے محروم تھے

سُورَةُ النَّمْلِ

۱۴۸	سماع موتی اور اہل قبور سے فیض کا ثبوت
۱۴۹	وصال نبوی کے بعد خطبہ صدیق اکبرؓ
۱۴۹	حضرت جنیدؒ ایک صاحب کمال بزرگ

سُورَةُ الْقَصَصِ

۱۵۰	ازالہ خوف و حزن کی تدبیر
۱۵۱	ضبط نفس کی تعلیم
۱۵۲	قواعد شرعیہ جامع مانع ہوتے ہیں
۱۵۳	کبھی معمولی غلطی پر بھی گرفت ہو جاتی ہے
۱۵۳	اختیاری غم ممنوع ہے اضطراری نہیں
۱۵۸	خوف و حزن کا بقاء اختیاری ہے
۱۵۸	درجات خوف و حزن
۱۵۹	خوف و حزن کے دو درجے
۱۶۰	طبعی خوف نبوت و کمال کے منافی نہیں

۱۶۰	حربی کے قتل کو ناجائز قرار دینے کا سبب
۱۶۱	نمرود و فرعون خدا کی ہستی کے قائل نہ تھے
۱۶۲	شان موسویت
۱۶۳	صاحب حق مرعوب نہیں ہوتا
۱۶۳	مذمت ترجیح ہوئی
۱۶۵	اقسام ہوئی
۱۶۶	ضرورت قصد اصلاح
۱۶۷	عزم اصلاح
۱۶۸	شان نزول
۱۶۸	اختیار تکوینی اور تشریحی صرف اللہ کیلئے ہے
۱۶۹	حقیقت رجاء
۱۷۰	طب علوم مطلقاً مذموم ہے
۱۷۱	سوائے ذات باری کے سب فانی ہیں

سُورَةُ الْعَنْكَبُوتِ

۱۷۲	مصائب کی حکمت جلی اور خفی
۱۷۵	دعویٰ اور دلیل
۱۷۶	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے روایت باری تعالیٰ کا اثبات
۱۷۶	امتحان کی حقیقت
۱۷۷	امتحان سے مقصود مدعی کو خاموش کرنا ہوتا ہے
۱۷۸	رجاء کا مفہوم
۱۸۰	رجاء و امکان
۱۸۰	صفات خداوندی
۱۸۱	نصیحت ناصح
۱۸۲	عمل بغیر ایمان کے مقبول نہیں

۱۸۲	کفر و شرک پر اتفاق نا اتفاقی سے بدتر ہے
۱۸۳	شب قدر میں معمولات سلف
۱۸۳	نماز اہل فحشاء و منکر کو نمازی کے پاس آنے سے روکتی ہے
۱۸۴	ایک عجیب تفسیری نکتہ
۱۸۴	اللہ کا بتلایا ہوا راستہ
۱۸۵	نماز کی روح
۱۸۵	ذکر اللہ کی ضرورت
۱۸۷	ذکر اللہ ہی اصل مقصود ہے
۱۸۸	آیات بینات
۱۸۹	حقیقت دنیا
۱۹۱	دنیا کے مذموم
۱۹۳	مقصود طریق
۱۹۵	اصل مطلوب رضائے الہی ہے
۱۹۵	مجاہدہ و مشقت پر وعدہ ہدایت ہے
۱۹۵	وصول میں دیر نہیں لگتی

سُورَةُ الرُّومِ

۱۹۶	یہ آیت کفار کے لئے مخصوص ہے
۱۹۷	مومن و کافر کی تفریق
۱۹۷	محرمون کی تفسیر
۱۹۸	فضل و رحمت
۱۹۹	نکاح کا اصل موضوع
۱۹۹	جوش کا کم ہونا کمال محبت کی دلیل ہے
۲۰۰	معاملہ نکاح میں دلائل قدرت
۲۰۱	مصنوعات سے صانع پر استدلال کرنا فطری امر ہے

۲۰۱	نکاح میں آیات کثیرہ
۲۰۱	عورت باورچہن نہیں
۲۰۱	مودۃ ورحمۃ کا مفہوم
۲۰۱	زوجین میں محبت کا نباہ دائمی نہیں
۲۰۲	مستورات پر ظلم کی راہ سے مشقت ڈالنا بے رحمی ہے
۲۰۳	عورتوں کے ذمہ کھانا پکانا واجب نہیں
۲۰۳	لیل و نہار کا تعلق عام ہے

سُورَةُ لُقْمَانَ

۲۰۴	حقوق والدین
۲۰۵	ایک جدید مرض اور اس کا علاج
۲۰۵	اتباع کا صحیح معیار
۲۰۵	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتباع وحی کا حکم
۲۰۷	خفی کہلانے میں کوئی قباحت نہیں
۲۰۷	حضرت مجتہدین کا اتباع
۲۰۹	آثار تکبر اور اس کی مذمت
۲۱۰	منکرین توحید سے شکایت
۲۱۲	تسخیر کا مفہوم
۲۱۲	نعمت کی دو قسمیں ظاہرہ و باطنہ
۲۱۵	جدال کی دو قسمیں
۲۱۵	فضائل علم

سُورَةُ الْأَحْزَابِ

۲۱۷	ایک شخص میں دو دل ممکن ہیں یا نہیں
۲۱۸	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فطانت

۲۱۸	عشق و محبت
۲۲۰	نقشبندیہ اور چشتیہ کے الوان میں مناسبت
۲۲۱	نبی کی بیبیوں سے زنا کا صدور نہیں ہوتا
۲۲۲	ازواج مطہرات کی فضیلت کا سبب
۲۲۲	عورت کی تہذیب
۲۲۳	ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں
۲۲۵	اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے
۲۲۷	ایک مخلص کی حکایت
۲۲۸	ذکر اللہ کی اہمیت
۲۲۸	امور معاشیہ میں بھی احکام کی پابندی ضروری ہے
۲۲۸	فروج کا معنی
۲۲۹	والحفظین فروجہم کا سلیس ترجمہ
۲۲۹	حضرت زینبؓ سے نکاح کے شبہ کا ازالہ
۲۳۱	عوام کی رعایت کو سمجھنا بڑے حکیم کا کام ہے
۲۳۲	حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے روحانی والد ہیں
۲۳۳	ازواج مطہرات مؤمنین کی مائیں ہیں
۲۳۳	کثرت ذکر اللہ کا حکم
۲۳۵	صبح و شام ذکر الہی کا مفہوم
۲۳۵	اعتدال شریعت
۲۳۶	رسول اکرم ﷺ کی ایک خاص صفت کی تشبیہ کا مفہوم
۲۳۷	مشبہ بہ کا مشبہ سے افضل ہونا ضروری نہیں
۲۳۷	حضور ﷺ کو آفتاب یا چاند سے تشبیہ نہ دینے کی وجہ
۲۳۸	جامع کمالات
۲۳۹	محبت اور خلعت میں فرق

۲۲۰	حضور ﷺ میں شان محبوبی سب سے زیادہ ہے
۲۲۱	درود شریف پڑھنے کا اجر و ثواب بلا استحقاق ہے
۲۲۲	مشقت اور الجھن دفع کرنے کا طریق
۲۲۳	خشیت الہی پیدا کرنے کی ضرورت
۲۲۵	خوف حاصل ہونے کا طریقہ
۲۲۶	محبت الہی حاصل ہونے کا طریقہ
۲۲۷	کونسا نفع قابل تحصیل ہے
۲۲۸	اصل ماہہ الامتیاز محبت ہے
۲۲۸	محبت سبب حمل امانت ہے
۲۲۹	حامل امانت
۲۵۰	امانت سے مراد اختیار ہے
۲۵۱	آیت مبارکہ میں امانت کا مفہوم
۲۵۲	شیطان کے مردود ہونے کا سبب
۲۵۳	علاج النفس

سُورَةُ سَبَا

۲۵۵	حضرت سلیمان علیہ السلام پر خصوصی انعامات
۲۵۵	شکر کا تعلق قول و عمل دونوں سے ہے
۲۵۶	انقاع کی دو شرطیں
۲۵۷	صبر کی حقیقت
۲۵۷	شکر کی حقیقت
۲۵۸	نعمت کی حقیقت
۲۵۸	مصیبت کی حقیقت

۲۵۸	رہاٹ کی تفسیر
۲۵۹	قرب کا مفہوم
۲۵۹	دین کے شعبے
سُورَةُ فَاطِر	
۲۶۱	اقسام توحید و رسالت
۲۶۲	تین امہات مسائل
۲۶۲	اللہ تعالیٰ کا کمال غلبہ و قدرت
۲۶۲	آیت مملوہ کی عجیب و غریب تفسیر
۲۶۵	عظمت خداوندی
۲۶۷	علماء صاحب خشیت ہیں
۲۶۷	خشیت کی علامت
۲۶۸	ایک علمی اشکال
۲۷۰	خشیت کی ضرورت
۲۷۱	علم اور خشیت
۲۷۱	خشیت کے لئے علم ضروری ہے
۲۷۲	نفس کی اہمیت
۲۷۳	مقصدین کی مدح
۲۷۳	جوانی کی عمر بھی تذکر کے لئے کافی ہے
۲۷۳	نذیر کی تفسیر
۲۷۳	آیت میں سب غافلین کو خطاب ہے
۲۷۳	اصلاح کے لئے ایک مراقبہ
۲۷۵	عجیب و غریب ربط

سُورَةُ يٰس

۲۷۶	سورۃ یسین کی تلاوت کی فضیلت
۲۷۶	قرآن کوئی طب اکبر نہیں
۲۷۷	ازواج کا معنی
۲۷۷	کسی نے قرآن سے دانہ کا تر مادہ ہونا ثابت کیا ہے
۲۷۸	سائنس کو دین کے مطابق کرنا چاہئے نہ بالعکس
۲۷۸	سائنس کو قرآن میں داخل کرنا ہدم دین ہے
۲۷۸	قرآن کا فخر یہ ہے کہ غیر دین اس میں نہ ہو

سُورَةُ الصّٰفٰتِ

۲۷۹	حقیقت قربانی
۲۸۰	سنت ابراہیم کا مصداق
۲۸۰	استعداد نبوت
۲۸۰	اصل مقصود تسلیم و رضا ہے
۲۸۱	حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان
۲۸۳	اصل مقصود عمل ہے
۲۸۳	ابتداء قربانی

سُورَةُ ص

۲۸۳	جعل کے دو معنی
۲۸۵	حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ امتحان
۲۸۷	اتباع ہوائی کی مذمت
۲۸۸	نزول قرآن کی غرض
۲۸۸	ضعفاء کے حق میں عین رحمت
۲۸۸	ہر نبی کا معجزہ اس کے زمانے کے مطابق ہے
۲۹۱	آداب استاد

سُورَةُ الزُّمَرِ

۲۹۲	شرک پر وعیدیں اور مشرکین کی حالت
۲۹۳	ہر شے کو مقصود کے حصول سے سکون ملتا ہے
۲۹۴	مقصود حقوق حقیقی حاصل کرنے کا طریق
۲۹۵	یونی کے معنی
۲۹۶	عبادت مع الاخلاص ہی مقبول ہے
۲۹۸	اخلاص کی اہمیت
۲۹۹	طاغوت کا مفہوم
۳۰۰	شیطان کی عبادت کا مفہوم
۳۰۰	انابت کے درجات
۳۰۱	تحصیل علم واجب ہے
۳۰۲	صراط مستقیم پر ہونا بہت بڑی نعمت و بشارت ہے
۳۰۳	متقین کیلئے بشارت
۳۰۳	اقسام اطاعت
۳۰۴	علم اور اتباع
۳۰۵	رونمائے قرآن حکیم
۳۰۵	قرآن کا ہر جزو احسن ہے
۳۰۷	ضرورت علم و عمل
۳۰۸	طب روحانی میں کوئی مرض لا علاج نہیں
۳۰۸	شان نزول
۳۰۹	شان نزول
۳۱۰	شان نزول سے نصوص عامہ کی تخصیص
۳۱۱	گناہ سے ناامیدی اور نیکی سے امید

۳۱۳	لہن اشْرکت کی تفسیر بے نظیر
۳۱۴	شرک کا مفہوم
۳۱۴	عظمتِ حق سبحانہ و تعالیٰ
۳۱۵	عظمتِ حق سبحانہ و تعالیٰ
۳۱۷	مشیت استثناء کا وقع
۳۱۸	صعقہ موت
۳۱۹	سوق کا اطلاق مسلمانوں سے مشاکلت کے طور پر ہے

سُورَةُ الْمُؤْمِنِ

۳۲۲	دو گنا ہوں کا ذکر
۳۲۲	بد نگاہی کی سزا بیان نہ کرنے میں حکمت
۳۲۳	رخصت کے وقت بھی مصافحہ درست ہے
۳۲۳	کذک یطیع اللہ علی کل قلب متکبر جبار کی ایک عجیب توجیہ
۳۲۳	حسن سلوک کا اثر
۳۲۳	دعا سب کی قبول ہوتی ہے یہاں تک کہ شیطان کی بھی
۳۲۴	کیا کافر کی دعا قبول ہو سکتی ہے
۳۲۵	انسان عالم صغیر ہے
۳۲۵	ثبوت معاد
۳۲۶	اہمیت دعاء
۳۲۷	ایک فائدہ علمیہ تفسیریہ

سورة حم السجدة

۳۲۸	بدفالی بری چیز ہے
۳۳۰	اقرار توحید و ربوبیت بہ قلب

۳۳۱	استقامت آسان ہے
۳۳۲	منافی کی دو قسمیں
۳۳۵	حقیقت دنیا
۳۳۸	احسن قول کی تحقیق
۳۳۸	اقسام داعی
۳۳۱	تکمیل ایمان کے تین اجزا
۳۳۳	آغوشِ رحمت
سُورَةُ الشُّورَى	
۳۳۵	کوئی چیز حق تعالیٰ کے مماثل نہیں
۳۳۶	سلوک و جذب
۳۳۷	مجموعہ ارض و سماء
۳۳۸	عجائبات قدرت کا علم
۳۳۸	شیطان کی مثال
۳۵۰	انسان کی بد اعمالی کے نتائج
۳۵۱	صورت مصیبت اور حقیقت مصیبت
۳۵۳	ما اصابکم من مصیبة پر شبہ کا جواب
۳۵۵	حقوق العباد کی تاکید
۳۵۵	حق سبحانہ و تعالیٰ کی عجیب تعلیم
۳۵۷	فطرت سلیمہ کا تقاضا
۳۵۸	ایمان اور نبوت



میر تقی عثمانی نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے
کے جملہ خطبات و محفوظات اور تقریریں جملہ تصانیف
سے منتخب سینکڑوں الہامی تفسیری نکات

اشرف اللمام

تقدیم و کاوش

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

نظر ثانی

جام ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب مدظلہ العالی

ناشر

ادارہ پایفائلی شریفیہ

چوک نوارہ ملتان پاکستان

519240-540513-061

حکیم المحدثہ دہلیت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ
کے جملہ خطبات ملفوظات اور تقریبا جملہ تصانیف
سے منتخب سینکڑوں الہامی تفسیری نکات

اشرف التفسیر (جلد ۴)

جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

سورۃ الزخرف - تا - سورۃ الناس

تقدیم و پیش

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

نظر ثانی

علم ربانی حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

صوفی محمد اقبال قریشی صاحب
ابو حذیفہ محمد اسحاق ملتانی

ادارۃ تالیفات اشرفیہ

بک فوارہ کتبت من پکٹ تہن فون: 540513-519240

Email: Taleefat@mul.wol.net.pk

نام کتاب..... اشرف التفاسیر (جلد-۴)
تاریخ اشاعت..... صفر القمطر ۱۴۲۵ھ
ناشر..... اِذَا رَهْ تَالِیْفَاتِ اَشْرَفِیْمَا چوک فوارہ ملتان
طباعت..... سلامت اقبال پریس ملتان

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان
ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک اینجمنی خیبر بازار پشاور
دارالاشاعت اردو بازار کراچی
بک لینڈ اردو بازار لاہور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTRE)
119-121-HALLIWELL ROAD
BOLTON BL13NE. (U.K.)

ضروری وضاحت: ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کیلئے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسان کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لئے پھر بھی کسی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

اشرف التفاسیر

کا جدید اضافہ شدہ ایڈیشن

الحمد للہ ”اشرف التفاسیر“ بہت مقبول ہوئی، اہل علم نے خاص طور پر اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جزا، ہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ حضرت صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ نے حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات میں سے مزید بہت سارے تفسیری نکات جمع کر کے ہمیں ارسال فرمائے ہیں جو اس ایڈیشن میں شامل کتاب کر دیئے گئے۔

اس مبارک اضافہ کے علاوہ خود حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا عربی رسالہ **”سبق الغایات فی فسق الآیات“** بھی سورتوں کی ترتیب کے مطابق آخر میں لگایا گیا ہے۔

امید ہے کہ یہ اضافہ جات تمام علم دوست حضرات کے لئے مزید علمی و عملی برکتوں کا باعث ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

اجمالي فهرست

٢٣٧	سورة نوح	٢٤	سورة الزخرف
٢٤٠	سورة المزمل	٢٨	سورة الدخان
٢٥٢	سورة القيامة	٣١	سورة الجاثية
٢٦٠	سورة المرسلات	٤٢	سورة الاحقاف
٢٦٢	سورة عبس	٤٦	سورة محمد
٢٦٧	سورة التكويد	٥١	سورة الفتح
٢٦٨	سورة الانفطار	٥٥	سورة المجرات
٢٧٢	سورة المطففين	٦٢	سورة ق
٢٧٥	سورة البروج	٨٦	سورة الذاريات
٢٧٧	سورة الاعلى	٩٠	سورة الطور
٢٩٠	سورة الفاتيه	٩٤	سورة النجم
٢٩٢	سورة الفجر	١٠٤	سورة القمر
٢٩٧	سورة البلد	١١١	سورة الرحمن
٣٠١	سورة الشمس	١٢٢	سورة الواقعة
٣١٠	سورة الليل	١٢٥	سورة الحديد
٣١٢	سورة الضحى	١٣٧	سورة المجادلة
٣٢٢	سورة الانشراح	١٥٢	سورة المشر
٣٢٥	سورة العلق	١٥٧	سورة الممتنه
٣٢٨	سورة القدر	١٦٢	سورة الصف
٣٣٠	سورة البينة	١٦٧	سورة الجمعة
٣٣٥	سورة الزلزال	١٧٦	سورة المنافقون
٣٣٩	سورة العصر	١٩٢	سورة التغابن
٣٥١	سورة الكافرون	٢٠٨	سورة الطلاق
٣٥٢	سورة النصر	٢١٤	سورة التمريم
٣٥٨	سورة الفلق	٢٢٢	سورة الملك
٣٦٥	سورة الناس	٢٣٤	سورة الحاقة

فہرست مضامین

۲۳	سُورَةُ الزُّحُرْفِ
۲۳	حق سبحانہ و تعالیٰ کی شفقت عنایت
۲۵	سواری پر مسنونہ دعاء پڑھنے کی حکمت
۲۶	حقانیت اسلام
۲۷	رحمت کا اطلاق نبوت پر بھی ہے
۲۸	سُورَةُ الدُّخَانِ
۲۸	لیلۃ مبارک سے مراد کون سی رات ہے
۲۸	لیلۃ المبارک و لیلۃ القدر
۳۰	علمی فائدہ
۳۱	سُورَةُ الْجَاثِيَةِ
۳۲	اتباع شریعت
۳۳	تفسیر قل هذا سبیلی
۳۳	سبیلی فرمانے کا مطلب
۳۳	معیار اتباع
۳۵	اتباع شریعت
۳۵	حق تعالیٰ کا اتباع

۳۶	احواء کا مقابلہ دین ہے
۳۷	رضابالدنیا کب مذموم ہے
۳۸	علامات سفر
۳۹	لوازم سفر
۳۹	ضیاء طریق منزل
۴۰	کبریائی صرف حق سبحانہ و تعالیٰ کی شان کے لائق ہے
۴۱	تکبر کا علاج
۴۲	سُورَةُ الْأَحْقَافِ
۴۲	شان نزول
۴۳	تفسیر آیت کی
۴۳	ایمان کے لئے عمل صالح لازم ہے
۴۶	سُورَةُ مُحَمَّدٍ
۴۶	مانعة الخلو کی حقیقت
۴۷	چندہ لینے میں عدم احتیاط
۴۸	غنی کا ترجمہ بے پروا نہیں
۵۱	سُورَةُ الْفَتْحِ
۵۲	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غلبہ خوف خداوندی
۵۲	آیت برائے تسلی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
۵۳	بشارت فتح
۵۳	عاشقانہ نکتہ
۵۳	طاعت بڑی چیز ہے
۵۳	خط کا جواب

۵۵	سُورَةُ الْحُجُرَاتِ
۵۵	ایذا رسول کفر ہے
۵۶	عشاق کی قسمیں
۵۸	موصوف کے حکم کی علت صفت ہوتی ہے
۵۹	مطلق اتحاد محمود نہیں
۶۰	غیبت کی مثال
۶۰	غیبت کی سزا
۶۱	صرف حسنت میں مرتبہ خلق نظر ہونا چاہیے
۶۲	سُورَةُ وَتٍ
۶۲	کمال علم حق سبحانہ و تعالیٰ
۶۳	وساوس غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہیں ہوگا
۶۳	وسوسہ گناہ نہیں
۶۵	غیر اختیاری وسوسوں سے ڈرنا چاہیے
۶۶	وسولہ کی مثال
۶۶	حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت حسین تھے
۶۷	قرب حق
۶۹	بعث و نشر
۷۳	قرب سے مراد قرب علمی ہے
۷۳	قرب خداوندی کا معنی
۷۶	قرآن پاک میں تدبر کی ضرورت
۷۸	قرآن سے نفع حاصل کرنے کی شرائط
۷۸	لغت اور محاورہ میں فرق

۷۹	لسن کان لہ قلب کا مفہوم
۸۰	قرآن پاک سے مستفیع ہونے کا ایک گ
۸۱	معلومات کی دو قسمیں
۸۱	قلب سلیم
۸۳	الحاصل
۸۳	شان نزول
۸۳	صلوٰۃ معین صبر ہے
۸۶	سُورَةُ الدَّارِيَات
۸۶	ربط
۸۷	جن و انسان کا مقصد تخلیق
۸۸	عبادت و طاعت کا فرق
۸۹	غایت آفرینش
۹۰	سُورَةُ الطُّور
۹۰	شرف نسب میں راہ اعتدال
۹۱	نجات کے لئے نسب کافی نہیں
۹۲	حکایت حضرت سید صاحب
۹۲	دولت مقصودہ
۹۳	سُورَةُ التَّجْوِم
۹۵	ثبوت معراج جسمانی
۹۵	حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کی معراج عروجی و نزولی
۹۷	شان نزول
۹۸	آیات مجملہ و مشککہ

۹۹	جنین پر اثر
۱۰۰	دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے
۱۰۰	تقویٰ باطنی عمل ہے
۱۰۰	تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے
۱۰۳	ایصال ثواب کا ثبوت
۱۰۴	سُورَةُ الْمَمَر
۱۰۴	علامات قرب قیامت
۱۰۵	استنباط احکام محققین کا کام ہے
۱۰۷	تذکر کے لئے قرآن آسان ہے
۱۰۷	دقائق قرآن و حدیث بلا علوم درسیہ سمجھ نہیں آسکتے
۱۱۰	آیت ولقد یسرنا القرآن پرا یک شبہ اور جواب
۱۱۱	سُورَةُ الرَّحْمٰن
۱۱۱	افعال خاص حق سبحانہ و تعالیٰ
۱۱۳	بیان نعم و قلم
۱۱۷	عورتوں کے فضائل
۱۱۸	جنت کی نعمتوں کے مستحق
۱۲۰	تجلیات اسماء الہیہ کا مراقبہ
۱۲۰	کرامت استدراج میں فرق
۱۲۱	حقیقت گناہ
۱۲۲	دو جنتیں
۱۲۳	سُورَةُ الْوَاقِعَةِ
۱۲۳	اصحاب الجنتہ کی دو قسمیں
۱۲۴	السابقون مکرر فرمانے کا سبب

سُورَةُ الْحَدِيدِ	
۱۲۵	قرب حق سبحانہ و تعالیٰ
۱۲۵	مسابقت الی الجنت کا حکم
۱۲۶	شان نزول
۱۲۷	نزول حق کا مفہوم
۱۲۷	ظاہر کا اثر باطن میں پہنچتا ہے
۱۲۷	بکا مامور بہ سے مراد دل کا بکا ہے
۱۲۷	تخویف و انداز
۱۲۸	افعال و احوال قلب پر جوارج کا اثر
۱۲۸	مسئلہ تقدیر کا ثمرہ
۱۳۰	مسئلہ توحید کی تعلیم سے مقصود
۱۳۱	مسئلہ تقدیر کی حکمت
۱۳۱	مصائب میں حکمت خداوندی
۱۳۲	اصلاح اعمال میں تقدیر کا دخل
۱۳۲	حق تعالیٰ میں خفا نہیں
۱۳۲	عقیدہ تقدیر کی حکمت
۱۳۶	نعلدار جوتا
۱۳۶	سار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک
سُورَةُ الْمَجَادِلَةِ	
۱۳۷	شان نزول
۱۴۱	اصلاح معاشرہ کا ایک ثمرہ
۱۴۱	ہر مطیع مسلمان مقبول ہے
۱۴۳	آنے والوں کی دل جوئی

۱۳۴	احکام مجلس عام
۱۳۶	تکبر کا علاج
۱۳۷	اعمال عوام اور علماء کا فرق
۱۳۸	شریعت اور سائنس
۱۳۹	حال و حال
۱۵۰	اعمال صالحہ کی توفیق پر صدقہ کا حکم
۱۵۱	موذن کی فضیلت
۱۵۱	ایمان کا تقاضا
۱۵۲	سُورَةُ الْحَشْرِ
۱۵۲	اللہ تعالیٰ کو بالکل فراموش کرنے والا کون ہے؟
۱۵۳	حضرت صدیق اکبر کا رتبہ
۱۵۳	ہماری بد حالی کا سبب
۱۵۵	ذکر اللہ مرض نسیان کا علاج ہے
۱۵۶	مقصود نزول آیت
۱۵۷	سُورَةُ الْمُتَجِّنَّةِ
۱۵۷	حدود اتفاق
۱۶۰	تبیحات سیدنا قاطرہ کا شان وارڈ
۱۶۲	سُورَةُ الصَّافِّ
۱۶۲	شان نزول
۱۶۲	یہ آیت دعوت و تبلیغ سے متعلق نہیں
۱۶۳	اپنی اصلاح ضرورت میں مقدم ہے

۱۶۳	یہ آیت دعوت کے بارے میں ہے
۱۶۳	شان نزول
۱۶۵	تقریر ثانی
۱۶۷	سُورَةُ الْجُمُعَةِ
۱۶۷	یہود کے دعویٰ حقانیت کا امتحان
۱۶۷	نصاری سے احتجاج
۱۶۹	حرمت بیچ جمعہ کی اذان اول سے ہو جاتی ہے
۱۷۰	فضل سے رزق مراد ہے
۱۷۰	اجتماع صالحین کی دو صورتیں
۱۷۱	اردو میں خطبہ پڑھنا جائز نہیں
۱۷۲	عجیب بلاغت
۱۷۳	تمدن اور قیام سلطنت کا بڑا مسئلہ
۱۷۳	انسانی طبیعت
۱۷۳	خطبہ جمعہ ذکر ہے تذکیر نہیں
۱۷۳	اذان اول سے حرمت بیچ پر ایک اشکال اور اس کا جواب
۱۷۶	سُورَةُ الْمُنَافِقُونَ
۱۷۶	منافقین کی تشبیہ
۱۷۷	شان نزول
۱۷۸	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری کی پیشکش
۱۷۹	آیت کریمہ کا شان نزول
۱۸۰	منافقین کے دعویٰ مال و عزت کی تردید
۱۸۱	محبوب ترین چیزیں

۱۸۲	حقیقتِ حب
۱۸۵	مال و جاہ سے متعلق عجیب تفسیری نکتہ
۱۸۶	مال و جاہ کا حکم
۱۸۷	مناطِ عزت صرف مسلمان کو حاصل ہے
۱۸۷	معصیت کا سبب اکثر مال و اولاد کا تعلق ہوتا ہے
۱۸۸	مال و اولاد کے درجے
۱۸۹	اہلِ خسارہ
۱۹۰	حب دنیا کا علاج
۱۹۲	سُورَةُ التَّغَابُنِ
۱۹۲	دو چیزیں حضرت حق سے مانع ہیں
۱۹۳	اصلاح کے لئے علاجِ ضروری ہے توجہ شیخ کافی نہیں
۱۹۵	شانِ نزول
۱۹۸	ازالہِ غم کی ہدایت
۱۹۸	محلِ مصائب
۱۹۹	آلہ امتحان
۱۹۹	مال و اولاد کے فتنہ کا مفہوم
۲۰۰	اجرِ عظیم
۲۰۱	تقویٰ کی حقیقت
۲۰۱	اطاعت کی اقسام
۲۰۳	یضا علف کا مفہوم
۲۰۴	شکورِ حلیم کا مفہوم
۲۰۵	طاغات کے دو پہلو
۲۰۵	اولاد کا فتنہ مال سے سخت ہے

۲۰۵	تقویٰ
۲۰۶	تزکیہٴ نفس
۲۰۷	حرص کی قسمیں
۲۰۸	سُورَةُ الطَّلَاقِ
۲۰۸	حق سبحانہ و تعالیٰ کی غایت رحمت
۲۰۸	طلاق کی ایک حد
۲۰۹	حقیقت اسباب رزق
۲۱۰	ذکر کی توجیہ
۲۱۱	الحاصل
۲۱۳	سُورَةُ التَّحْرِيمِ
۲۱۵	إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ كَمَا تَمَتَّقُ
۲۱۵	توبہ باقی اعمال پر مقدم ہے
۲۱۶	ازواجِ مطہرات کی حضورؐ سے از حد محبت تھی
۲۱۷	آیتِ تخییر
۲۱۸	ازواجِ مطہرات باقی عورتوں سے افضل ہیں
۲۲۱	ملائکہ کی اطاعت
۲۲۱	حقیقی توبہ
۲۲۳	سُورَةُ الْمُلْكِ
۲۲۳	ستارے آسمان پر مزیں ہیں
۲۲۳	عمل علیٰ الحق کے دو طریقے
۲۲۷	خوف میں اعتدال
۲۲۸	تخویف کی دو قسمیں

۲۲۹	بخشون رہم فرمانے میں حکمت
۲۳۰	عجیب ربط آیت
۲۳۰	طریق تحصیل خشیت
۲۳۱	سمع کو مفرد لانے میں نکتہ
۲۳۲	مدرکات قلب کا بیان
۲۳۲	سُورَةُ الْحَاقَّةِ
۲۳۳	ایام خالیہ کی تفسیر
۲۳۵	کھانے پینے کی رعایت
۲۳۷	سُورَةُ نُوحٍ
۲۳۷	حضرت نوح علیہ السلام کی غایت شفقت
۲۳۸	حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا بے رحمی نہیں
۲۴۰	سُورَةُ الْمُرْمَلِ
۲۴۰	تہجد کی مشروعیت قرآن سے اور تراویح کی سنت حدیث سے ثابت ہے
۲۴۱	اہل اللہ کی گستاخی کا انجام
۲۴۱	گلیم و پچیدہ کا ثبوت
۲۴۱	انداز مخاطب میں حکمت
۲۴۳	اہمیت تلاوت و نماز
۲۴۵	معمول اہل تصوف
۲۴۶	انقطاع غیر اللہ
۲۴۷	طریق توجہ
۲۴۸	ضرورت وصل و فصل
۲۴۹	ذات حق کی طرف توجہ کا طریقہ

۲۴۹	کامل ذکر کیلئے خلوت ضروری ہے
۲۵۰	اقسام ذکر
۲۵۱	قبض میں حال سلب نہیں ہوتا
۲۵۱	تہجد کیلئے وقت متعین کرنا ضروری نہیں
۲۵۲	تخلیہ مقدم ہے یا تھلیہ
۲۵۳	سُورَةُ الْقِيَامَةِ
۲۵۳	قیامت میں ہر شخص اپنے اعمال پر مطلع ہو جائے گا
۲۵۵	کلام اللہ میں طرز نصیحت ہے طرز تصنیف نہیں
۲۵۵	قرآن کا طرز کلام
۲۵۶	حدیث وحی غیر مکتوب ہے
۲۵۷	کسب دنیا اور حب دنیا
۲۵۷	حب دنیا کا مغموم
۲۶۰	سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ
۲۶۰	کلام پاک میں مکرر آیات کے اعتراض کا عجیب جواب
۲۶۲	سُورَةُ عَبَسَ
۲۶۲	تعلیم اکمل
۲۶۳	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اجتہادی غلطی پر تنبیہ
۲۶۳	عظمت سرکارِ دو عالم ﷺ
۲۶۳	شان نزول
۲۶۵	ضرورت آزادی و اعتدال
۲۶۷	سُورَةُ التَّكْوِيْرِ
۲۶۷	مشیت کی دو قسمیں

۲۶۸	سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ
۲۶۸	کرانا کاتبین کے مقرر ہونے میں حکمت
۲۶۸	علت سے متعلق ہمارا مذہب
۲۶۹	بندوں کے ناز کا سبب
۲۶۹	محبت کا مدار دیکھنے پر نہیں
۲۶۹	کرانا کاتبین صفت ہے
۲۷۱	شرم کا مہنی
۲۷۱	حق تعالیٰ شانہ کا غایت قرب
۲۷۱	اعمال لکھنے کیلئے فرشتوں کے مقرر کرنے کا سبب
۲۷۱	علماء محققین ہی نے مقاصد قرآن کو سمجھا ہے
۲۷۲	آخرت کے دور ہے
۲۷۳	سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ
۲۷۳	دنیا کا کوئی انسان محبت خداوندی سے خالی نہیں
۲۷۳	ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے
۲۷۵	سُورَةُ الْبُرُوجِ
۲۷۵	بروج کی تفسیر
۲۷۵	اختلاف قراءت
۲۷۷	سُورَةُ الْاَعْلَىٰ
۲۷۷	تین اعمال کا بیان
۲۷۸	وسوسہ شیطان کا جواب
۲۷۸	ذکر نماز کا مقدمہ ہے

۲۷۹	برائیوں سے بچنے کا طریق
۲۸۰	اہل علم کی نازک حالت
۲۸۱	فلاح کا طریقہ
۲۸۳	ذکر اللہ اور دنیا
۲۸۳	ایک شبہ کا جواب
۲۸۵	طلب دنیا مذموم نہیں
۲۸۵	حیات آخرت
۲۸۶	دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا
۲۸۸	طالب جاہل اور قانع جاہل
۲۸۹	تخلیہ اور تخلیہ
۲۹۰	سورة الغاشية
۲۹۰	دلائل قدرت
۲۹۲	سورة الفجر
۲۹۲	نیک و بد کی تمیز کا طریقہ
۲۹۳	دو شکایات کا ذکر
۲۹۳	جوارج اور دل کے گناہ
۲۹۳	بلاغت کلام باری تعالیٰ
۲۹۳	گناہوں کی قسمیں
۲۹۵	دوستوں کی ملاقات میں عجیب لذت
۲۹۶	دنیا سے حصہ آخرت لے آنے کی عجیب مثال
۲۹۶	اہل اللہ سے تعلق کی ضرورت

۲۹۷	سُورَةُ الْبَلَدِ
۲۹۷	اہل ذوق کے لئے ایک علمی نکتہ
۲۹۸	علمی اور تاریخی توجیہ
۲۹۹	شرکاء بتلانا بھی نعمت ہے
۳۰۱	سُورَةُ الشَّمْسِ
۳۰۱	تفسیری نکتہ
۳۰۲	ترکیہ کی فضیلت
۳۰۳	فلاح کا مدار ترکیہ ہے
۳۰۴	دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے
۳۰۴	تقویٰ باطنی عمل ہے
۳۰۴	تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے
۳۰۵	تقویٰ فعل اختیاری ہے
۳۰۵	اپنے نفس کو پاک کہنے کی ممانعت
۳۰۶	فہم قرآن کے لئے عربیت سے واقفیت ضروری ہے
۳۰۷	بے خبری کوئی عیب نہیں
۳۰۷	انا مومن ان شاء اللہ کہنے میں اختلاف
۳۰۸	اپنے کو دعویٰ کے طور پر موجد نہ کہو
۳۱۰	سُورَةُ اللَّيْلِ
۳۱۰	علم اعتبار
۳۱۱	شان صدیق اکبر
۳۱۲	سُورَةُ الضُّحَىٰ

۳۱۳	ایک شبہ کا جواب
۳۱۴	رسول اکرم ﷺ پر تین خصوصی احسانات کا ذکر
۳۱۵	انقطاع وحی میں حکمت
۳۱۶	غنائے قلب کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے
۳۱۸	انقطاع وحی میں حکمت
۳۱۹	لفظ ضلالت کا مفہوم
۳۲۰	لفظ ضلالت کا استعمال
۳۲۱	سورۃ النجمی کا لفظی ترجمہ
۳۲۲	سُورَةُ الْاِنشِرَاحِ
۳۲۲	مع العسریسرا کی تفسیر
۳۲۵	سُورَةُ الْعَلَقِ
۳۲۵	کسی نے منیٰ میں کیڑوں کا ثبوت قرآن سے دیا
۳۲۶	نماز کا اصلی مقصود
۳۲۸	سُورَةُ الْمَدْرِ
۳۲۸	شب قدر کا ثواب
۳۲۹	عبادات شب قدر کا ثواب لامحدود ہے
۳۳۰	سُورَةُ الْبَيِّنَةِ
۳۳۱	کفار اور مشرکین کو خلود فی النار کا ثبوت
۳۳۳	کفر سے بڑا جرم
۳۳۳	محدود کفر پر غیر محدود عذاب شبہ کا جواب
۳۳۴	جواب جزا و سزا میں نیت کا دخل

۳۳۵	اتلاف حقوق الہی کی سزاجواب
۳۳۵	سُورَةُ الزَّلْزَالِ
۳۳۵	اہل غفلت کی غلطیاں
۳۳۶	اہل غفلت کا حال
۳۳۶	عذاب تطہیر
۳۳۷	خروج آدم کی حکمت
۳۳۸	مفہوم آیت
۳۳۸	نور قلب اور معاصی یکجا جمع نہیں ہوتے
۳۳۹	سُورَةُ الْعَصْرِ
۳۳۹	توضیح قسم
۳۴۱	مخلوق کی قسم قبیح لغیرہ ہے
۳۴۲	وقت کی قدر کرنا چاہیے
۳۴۸	کمال دین دو باتوں پر موقوف ہے
۳۴۹	حق اور صبر کی مراد
۳۵۰	قبروں کی پختگی پر قابل افسوس ہے
۳۵۱	سُورَةُ الْكَافِرُونَ
۳۵۱	آج کل کی ایک بے ہودہ رسم
۳۵۲	جیسا کرو گے ویسا بھرو گے
۳۵۲	احتیاط خطاب
۳۵۳	سُورَةُ النَّصْرِ
۳۵۳	رسول اکرم ﷺ کے قرب وصال کی خبر

۳۵۵	بشارت تکمیل دین
۳۵۸	سُورَةُ الْمَلَقِ
۳۵۸	حضور ﷺ پر سحر کئے جانے کا واقعہ
۳۵۹	جادو کی دو قسمیں اور ان کا شرعی حکم
۳۵۹	قرآنی سورتوں کے موکلوں کا کوئی ثبوت نہیں
۳۵۹	سحر جادو وغیرہ سے حفاظت کی اہم دُعاء
۳۶۰	آسیب لپٹ جانا
۳۶۰	آسیب اور جادو
۳۶۲	حرز ابی دجانہ
۳۶۲	برائے دفع سحر
۳۶۳	سحر کے لئے
۳۶۳	وسوسہ شیطانی
۳۶۵	سُورَةُ النَّاسِ
۳۶۵	جادو کی کاٹ کے لئے معوذتین کا عمل

سُورَةُ الزُّخْرُفِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَفَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اِنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِیْنَ ۝

ترجمہ: کیا ہم تم سے اس نصیحت (نامہ) کو ہٹالینگے اس بات پر کہ تم حد (طاعت) سے گزرنے والے ہو۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کی شفقت عنایت

جن پر حق تعالیٰ کی صفات کمال کا ظل سایہ ہے ان کو بھی مخلوق سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ وہ کوئی سنے یا نہ سنے برابر نصیحت کرتے رہتے ہیں اور ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ

کس بشنود یا نہ شنود من گفتگوئے میکنم
(یعنی کوئی شخص سنے یا نہ سنے میں برابر نصیحت کئے چلا جاؤں گا)
اور یہ خیال ہوتا ہے کہ

حافظ و وظیفہ تو دعا گفتن است و بس در بند آن مباحث کہ شنید یا نشنید

(اے حافظ تیرا کام فقط دعا کرنا ہے اور بس اس بات کی فکر میں مت رہ کہ اس نے سنایا نہ سنا

فلاسفہ اس کی قدر کیا جائیں یہ تو اہل محبت ہی خوب سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو ہم سے اس درجہ شفقت ہے کہ ایک بات کو دس مرتبہ کہہ کر نہیں چھوڑتے۔ پھر کہتے ہیں پھر کہتے ہیں۔ قرآن میں حکم ہے کہ جب گھوڑے پر سوار ہو تو یہ آیت پڑھو سبحن الذی سخر لنا هذا وما كنا له مقرنین وانا الی ربنا لمنقلبون۔ (اس کی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم تو ایسے نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے)

سواری پر مسنونہ دعاء پڑھنے کی حکمت

کہ خدا کا فضل ہے کہ اس نے ہمارے لئے اس کو مسخر کر دیا۔ ورنہ اگر بگڑ جاتا تو ہم کیا کر لیتے یہ تو خاص رکوب کے سامنے ہوا آگے فرماتے ہیں۔ وانا الی ربنا لمنقلبون اس کو بظاہر پہلے مضمون سے کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ مگر اہل لطائف نے سمجھا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بندو اس جانور پر سوار ہونے سے دوسری سواری کو بھی یاد کرو اور سمجھ لو کہ تم کو کسی تختہ پر اور چار پائی پر بھی سوار ہونا ہے۔ جس میں تم کو رکھ کر چار آدمی لے جائیں گے۔ اصل سواری وہی ہے جس پر سوار ہو کر کے تم خدا کے یہاں پہنچا دیں گے تو جب جانور پر سواری لیتے وقت اس کے یاد کرنے کا حکم ہے تو مردے کو دیکھ کر تو یاد کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا۔ اس وقت بھی یاد نہ کرنا سخت قساوت ہے۔

اب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ قبر پر بیٹھے ہیں اور مقدمے کی باتوں میں مشغول ہیں اسی طرح اگر مصیبت میں کسی کو گرفتار دیکھتے ہیں اس کو اسی شخص تک محدود سمجھتے ہیں حالانکہ سمجھنا چاہیے کہ اس پر مصیبت کیوں مسلط ہوئی۔ ظاہر ہے کہ گناہوں کی وجہ سے تو ہم کو بھی گناہوں سے بچنا چاہیے اسی لئے حدیث میں ہے کہ جب کسی کو بتلائے مصیبت دیکھو تو کہو الحمد لله الذی عافانی مما ابتلاک بہ و فضلنی علی کثیرا ممن خلق تفضیلاً اس میں بھی تذکیر ہے احتمال ابتلا کی اور اسی میں تنبیہ اجمالی ہے۔ اسباب ابتلا کی کہ مصیبت ہے اسی پر یہ شکر سکھایا کہ احتمال تھا کہ اسی مصیبت کے سبب شاید ہم بھی بتلا نہ ہو جائیں۔ لیکن یہ دعا آہستہ پڑھے کہ مصیبت زدہ کی دل شکنی نہ ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرماتے ہیں لا ینظہر الشماتۃ لا خبیک بعض دوسرے مصائب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو ڈرنا چاہیے کیونکہ مقتضی تو ہم میں بھی موجود ہیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: اور کہنے لگے کہ اگر یہ قرآن (اگر کام الہی ہے تو) ان دونوں بستیوں (مکہ اور طائف کے رہنے والوں میں) کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔

تفسیری نکات

حقانیت اسلام

کفار نے حضور ﷺ کی شان میں کہا تھا لولا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم یعنی یہ قرآن شریف طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی (یعنی دولت مند) پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ حالانکہ نبی اگر ہمیشہ صاحب سلطنت اور صاحب مال ہوا کرتے تو ان کا اتباع سلطنت اور مال کی وجہ سے ہوتا اور اس سے حق ظاہر نہ ہوتا۔ حق کا ظہور اسلام کا دین الہی ہونا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ حضور نے صاحب سلطنت و حکومت تھے نہ پڑھے لکھے تھے نہ کوئی اور کمال عرفی رکھتے تھے۔ پھر دفعۃً بڑے بڑے سلاطین بڑے بڑے اہل کمال کی آپ کے سامنے گردنیں جھک گئیں۔ جس طرح خانہ کعبہ اگر وادی غیر ذی ذرع میں نہ ہوتا اور کسی شاداب اور ترو تازہ مقام پر ہوتا تو اس کی حقانیت ایسی ظاہر نہ ہوتی یہی وسوسہ ہوتا کہ ظاہری شادابی کے سبب لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ بخلاف اس وقت کے کہ سنکستان خشک میں ہے پھر اس کی طرف لوگ مشتتیں اٹھا اٹھا کر جاتے ہیں اور جو ایک مرتبہ ہو آیا اس کو پھر ہوس ہے۔ یہ کیا بات ہے جس سے یہ کھلی دلیل ہے اس کی کہ اس میں غیبی کشش ہے۔

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ

فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

ترجمہ: کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں دنیوی زندگی میں تو ان کو روزی ہم ہی نے تقسیم کر رکھی ہے۔

تفسیری نکات

رحمت کا اطلاق نبوت پر بھی ہے

تفصیل اس مضمون کی یہ ہے کہ جب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو علاوہ اور اعتراضوں کے کفار نے یہ بھی کہا تھا کہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ نازل کیا گیا اور اس کو کیوں نہ نبی بنایا گیا حق سبحانہ ان کے اس قول کو نقل فرما کر اس کا جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا کی رحمت یعنی نبوت کو کیا یہ لوگ اپنی تجویز سے تقسیم کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ حق نہیں ہے کیونکہ سامان معیشت سے ادنیٰ چیز کو تو ہم تقسیم کرتے ہیں اور اس کے تقسیم کا ان کو اختیار نہیں دیا ہے نبوت جیسی عظیم الشان شے کو یہ خود کیوں کر تقسیم کریں گے اور ان کو اس کے تقسیم کا کیا حق ہوگا۔ جب یہ معلوم ہوگا کہ رحمت کا اطلاق نبوت پر بھی ہوا ہے تو اس سے ایک دوسری آیت کی تفسیر بھی ہوگئی اور ایک بڑا معرکہ الارام مقام حل ہو گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق سبحانہ نے فرمایا ہے قُلْ لَوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُونَ خِزَانِ رَحْمَةِ رَبِّي اِذْ لَا مَسْكُتُمْ خَشِيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُورًا۔ اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے پہلے بھی رسالت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی یہ بیچ میں انسان کے بخل کا ذکر کیسے آ گیا۔ مفسرین نے اس کے متعلق کوئی تسکین بخش بات نہیں لکھی۔ امام رازی نے گو اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے مگر انہوں نے بھی کوئی شافی بات نہیں لکھی لیکن جب کہ رحمت سے نبوت مراد لی جاوے اس وقت آیت مذکورہ بے تکلف اپنے ماقبل و مابعد سے مرتبط ہو جاوے گی۔

سُورَةُ الدُّخَانِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ

ترجمہ: ہم نے اس کو (لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر) برکت والی رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے

تفسیری نکات

لئے مبارک سے مراد کون سی رات ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کتاب کو برکت والی رات میں نازل کیا ہے ایک قول پر اس کی تفسیر شعبان کی پندرہویں شب ہے لیکن اگر یہ تفسیر ثابت بھی نہ ہو تب بھی اس رات کی فضیلت کچھ اس آیت پر موقوف نہیں احادیث سے اس کی فضیلت ثابت ہے۔ مگر یہ بات طالب علمانہ باقی رہی کہ اگر یہ تفسیر ثابت نہ ہو تو پھر لیلۃ مبارکۃ سے کیا مراد ہوگا سو دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے لیلۃ القدر مراد ہے اسی کو لیلۃ مبارکۃ بھی فرما دیا گیا۔

لیلة المبارک و لیلة القدر

سو اس تفسیر محتمل پر حق تعالیٰ نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے کتاب مبین (قرآن) کو اس برکت والی رات میں نازل کیا اس واسطے کہ ہم منذر یعنی ڈرانے والے تھے۔ اسی انداز کے لئے قرآن نازل فرمایا۔ آگے اس رات کے بابرکت ہونے کی علت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس رات کی شان یہ ہے کہ اس میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہر امر حکمت والے کا کہ وہ ہمارے پاس سے ہوتا ہے اور حکیم کی قید واقعی ہے۔ احترازی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے تمام امور با حکمت ہی ہیں ان میں کوئی بے حکمت نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمام امور کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے یا یوں کہو کہ کل امر حکیم سے مراد امور عظیم الشان

ہیں یعنی بڑے بڑے کاموں کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے باقی چھوٹے امور تو عرفاً بڑے امور کے ذکر سے وہ خود مفہوم ہو گئے۔ پس بڑے امور اصالۃً اور چھوٹے امور تبعاً۔ غرض سب امور آیت میں داخل ہو گئے۔ اب یہ شبہ رفع ہو گیا کہ روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جملہ امور کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ معظم امور فیصل ہوتے ہیں۔ وجہ رفع یہ ہے کہ چھوٹے امور بڑے کے تابع ہو کر فہم میں آ ہی جاتے ہیں۔

مشہور تفسیر اس آیت کی اکثر کے نزدیک یہ ہے کہ لیلة مبارکہ سے مراد لیلة القدر ہے شب براءت مراد نہیں کیونکہ دوسرے موقع پر ارشاد ہے انا انزلناہ فی لیلة القدر کہ ہم نے قرآن لیلة القدر میں نازل کیا اور یہاں فرما رہے ہیں کہ ہم نے لیلة مبارکہ میں نازل کیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نزول سے مراد دونوں جگہ نزول واقعی ہے تدریجی نہیں کیونکہ وہ تو ۲۳ سال میں ہوا اور نزول واقعی ایک ہی مرتبہ ہوا ہے اس لئے لیلة مبارکہ سے مراد لیلة القدر ہوگی۔ یہ قرینہ تو یہ ہے اس بات کا کہ یہاں بھی لیلة القدر ہی مراد ہے۔ لیکن ایک قول بعض کا یہ بھی ہے کہ لیلة مبارکہ سے مراد شب براءت ہے۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ اس سے لازم آتا ہے کہ نزول واقعی دو مرتبہ ہو تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ نزول واقعی دو مرتبہ بھی اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک رات میں حکم نزول ہوا اور دوسری میں اس کا وقوع ہوا۔ یعنی شب براءت میں حکم ہوا کہ اس دفعہ رمضان جو لیلة القدر میں آئے گی اس میں قرآن نازل کیا جائے گا۔ پھر لیلة القدر میں اس کا وقوع ہو گیا اور یہ بات کلام میں شائع ذائع ہے کہ قرب کو وقوع کے حکم میں کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انزلناہ فی لیلة القدر میں مراد حقیقی نزول ہے کہ وہ لیلة القدر میں ہوا ہے انا انزلناہ فی لیلة مبارکہ میں حکمی نزول ہے کہ شب براءت میں حکم ہوا ہے اور دونوں راتیں ہیں۔ قریب قریب اس لئے قرب نزول کو نزول کے حکم میں کر دیا ہو۔ بہر حال ظاہر تو یہی ہے کہ لیلة مبارکہ سے مراد شب قدر ہے مگر احتمال اس کا بھی ہے کہ شب براءت مراد ہو مگر جہاں تک اتفاق ہوا اور جو کتابیں نظر سے گزریں ان میں کوئی حدیث مرفوع اس بارہ میں نظر سے نہیں گزری اور درمنثور میں بروایت ابن جریر ابن المنذر رواہ ابن ابی حاتم عکرمہ سے یہ تفسیر منقول ہے البتہ شب براءت کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ اس میں تمام امور جیسے موالید و وفیات و رفع اعمال و نزول ارزاق فیصل ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض سلف نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لیلة مبارکہ سے مراد یہی رات مراد ہے۔ لیلة القدر مراد نہیں ورنہ اس رات کے برابر اس میں بھی واقعات کا فیصلہ ہونا لازم آئے گا تو دو راتوں میں فیصلہ ہونے کے کیا معنی۔

دوسرے یہ کہ واقعات کا تو شب براءت میں فیصلہ ہونا احادیث سے ثابت ہے۔ وہ کون سے واقعات ہیں جن کا فیصل ہونا شب قدر میں باقی رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلة مبارکہ سے مراد شب براءت ہی ہے پھر یہ کہ شب براءت میں ایک سال کے واقعات کا فیصل ہونا حدیثوں میں آیا ہے اور شب قدر سال گزرنے

سے پہلے رمضان میں آ جاتی ہے تو اس میں کیا مکر فیصلہ ہوتا ہے۔
جواب یہ ہے کہ یہاں دو صورتیں نکلتی ہیں کیونکہ عاۓہ ہر فیصلہ کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تجویز اور
ایک نفاذ پس یہاں بھی یہی دو مرتبے ہو سکتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تجویز تو شب براءت میں ہو جاتی ہے اور نفاذ
لیلۃ القدر میں ہوتا ہے اور ان میں کسی قدر فیصلہ ہونا بعید نہیں تجویز کو قدر کہتے ہیں اور حکم کے نافذ کر دینے کو قضا
کہتے ہیں کہ شب براءت میں تجویز ہوتی ہو اور لیلۃ القدر میں اسی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس تقریر سے سارے
اشکالات کا جواب ہو گیا۔ غرض آیت میں لیلۃ مبارکہ سے مراد جو بھی ہو لیکن احادیث سے تو اس رات
کا بابرکت ہونا معلوم ہوتا ہی ہے۔

احادیث میں مذکور ہے کہ جب شعبان کی پندرہویں رات ہوتی ہے تو حق تعالیٰ اول شب سے آسمان
دنیا پر نزول فرماتے ہیں۔ یہ خصوصیت اس رات میں بڑھی ہوئی ہے۔ یعنی اور راتوں میں تو پچھلے اوقات میں
نزول ہوتا ہے اور اس شب میں شروع ہی سے نزول فرماتے ہیں یہ بھی وجوہ برکت میں سے ایک وجہ ہے
برکت کی۔ اس کی قدر وہ کرے گا جس میں مادہ محبت کا ہو۔

علمی فائدہ

آیت محتمل تھی دو معنی کو۔ یا تو اس سے شب قدر مراد ہو یا شب براءت۔ سواگر شب براءت مراد ہو تو افا
انزلنہ فی لیلۃ مبارکۃ یعنی بے شک ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا۔ کے معنی کیا ہوں گے جب
نزول قرآن کا لیلۃ القدر میں ثابت ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس رات میں سال بھر کے واقعات لکھے جاتے ہیں جو کچھ ہونے والے ہوتے ہیں تکب
(لکھے جاتے ہیں) کا لفظ حدیث میں آیا ہے۔ منجملہ ان واقعات کے ایک واقعہ ہے نزول قرآن کا بھی۔ پس
مطلب یہ ہوا کہ اس رات میں یہ مقرر کر دیا گیا کہ شب قدر میں قرآن مجید نازل ہوگا۔ پس انا انزلنا (نازل کیا
ہم نے) کے معنی ہوں گے قدر نازل ہو (یعنی مقدر کیا ہم نے اس کا نزول) سو اس تقریر پر اشکال رفع ہو گیا۔

سُورَةُ الْجَاثِيَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ

الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٨﴾

ترجمہ: پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا ہے سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلے۔

تفسیری نکات

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها - ثم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں۔
ولقد اتينا بنى اسرائيل الكتب والحكم والنبوة وورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على
العلمين واتينهم بينت من الامر فما اختلفوا الا من بعد ما جاءهم العلم بغيا بينهم ان
ربك يقضى بينهم يوم القيمة فيما كانوا فيه يختلفون.

فرماتے ہیں یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں
کھانے کو دی تھیں اور ہم نے ان کو دنیا جہاں والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی
دلیلیں دیں۔ سو انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلافات کیا بوجہ آپس کی ضد اضدی کے۔ آپ کا
رب ان کا آپس میں قیامت کے روز ان امور میں فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں ثم جعلناك الخ یعنی آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی
تھی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔

اتباع شریعت

من الامر میں من بیانہ ہے کہ وہ شریعت اور طریقہ خاص کیا ہے وہ امر دین ہے پس اس کا اتباع کیجئے کتنا لطیف ہے شریعت! یعنی جس عنوان سے علماء اتباع دین کا امر کرتے ہیں وہی عنوان آیت میں وارد ہوگا۔ جس سے صریحاً علماء کا ثابت ہو گیا۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے۔

ولا تتبع احواء الذين لا يعلمون اور ان جاہلوں کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے۔ سبحان اللہ! کیا پاکیزہ طرز بیان ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ولا تتبع غیرہا کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجئے بلکہ یوں فرمایا کہ جہلا کی خواہشوں کا اتباع نہ کیجئے اس میں یہ بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہش نہیں وہ ہوائے نفسانی ہیں اس لئے وہ عمل کے قابل نہیں۔ الذین لا یعلمون سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہے۔ یعنی الذین یعلمون کی اہوا کا اتباع جائز ہے بلکہ یہ قید واقعی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو جہلا ہیں۔

جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں نہ آنا۔ تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ غیر مفسدین کے بہکانے میں آجانا۔ نہیں مطلب یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں ان سے بچتے رہنا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو۔

اور الذین لا یعلمون کا مفعول جو ذکر نہیں فرمایا سبحان اللہ! اس میں عجیب رعایت ہے۔ اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ امر الدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہو جاتا کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لئے مذموم ہے کہ وہ اہواء ہے۔ اور اہواء اس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہے۔ اس لئے یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ اہواء اس لئے مذموم ہے کہ وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں۔

یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے کیونکہ اطمینان اور چین بدوں تقلید کے نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے تو فلانے طبیب کا علاج کریں گے۔ تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے۔ بیماری کا خوف نہیں ہوگا اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں اور اگر تقلید نہیں ہے تو پھر ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں۔ اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا ایک طبیب سے رجوع کیا۔ دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے

رجوع کر لیا۔ تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا۔ تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کے تغیر میں کس سے رجوع کریں۔ غرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب دانشمند بھی نہ ہو۔ مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا اور اگر وہ تقلید حقائق کو موافق ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔

اگر شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا جیسا کہ مدلول ہے ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون کاتب بھی شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جب کہ شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری مصلحت و موجب طمانیت ہونا اور بھی ثابت ہو گیا۔ آگے وعید ہے انھم لن یغنوا عنک من اللہ شیناً یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے۔

یعنی گو یہ آج مددگار بننے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے یہاں ذرا کام نہیں آسکتے۔ اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا کہ اتباع کے بعد ہم تو اکیلے رہ گئے اس لئے فرماتے ہیں وان الظالمین بعضهم اولیاء بعض اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا جو احکام کا اتباع کرتے ہیں۔

تفسیر قل ہذہ سبیلی

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو فروع مستبط کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالاً یہ بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں ورنہ بحیثیت مستقل متبوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے۔ تو جیسی نسبت ہم ابوحنیفہ کی طرف کرتے ہیں۔ ایسی سبیل من اناب الی۔ (جو لوگ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں ان کے راستہ کا اتباع کرو) قل ہذہ سبیلی ادعوا الی اللہ (آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے بلاتا ہوں) سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یصدون عن سبیل اللہ (وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں) میں سبیل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو یہ ایسا ہے کہ

عباراتنا شتی و حسنک واحد (عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من انداز قدت رامی شناسم

یعنی جو لباس چاہے پہن لے میں تو قد سے ہی پہچان لیتا ہوں یعنی جو قرآن کا عاشق ہے اس کو حدیث و فقہ میں بھی قرآن نظر آتا ہے۔

اسی طرح قرآن و حدیث اور فقہ گو فرعیات کے اندر مختلف ہیں مگر ہیں سب دین الہی

اگر فرعیات میں تھوڑا سا اختلاف ہو گیا تو کیا وہ دین الہی نہیں رہا جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے۔ تو

کیا لکھو؟ کامطب اور دہلی کامطب فرعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا۔

سبیلی فرمانے کا مطلب

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو سبیلی (میرا راستہ) فرمایا تھا۔ اس کو یہاں سبیل من اناب الی (ان لوگوں کا راستہ جو میرے طرف متوجہ ہوئے) فرما رہے ہیں۔ پس سبیلی اور سبیل من اناب الی مصداق کے اعتبار سے ایک ہوئے اسی طرح ایک جگہ فرمایا۔

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اسی کا اتباع کئے جائیے۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں اتبع ملۃ ابراہیم حنیفا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کیجئے۔ اب اس کے کیا معنی ہیں ظاہر ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب یہ ہے ملت ابراہیم۔ یہ ہے عنوان کا اختلاف باقی اصل اتباع احکام الہیہ کا ہے پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش ہوتے ہو۔

کہ و اتبع ملۃ ابراہیم حنیفا (ملت ابراہیمی کا اتباع کرو) باوجودیکہ حضور ﷺ مستقل ہیں مگر پھر بھی کہا جاتا ہے کہ و اتبع ملۃ ابراہیم (آپ دین ابراہیم کا اتباع کیجئے) اگر اس کے دو معنی یہ ہوں کہ جو ان کا طریقہ ہے اس کا اتباع کیجئے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے کیونکہ یہ تو امتی کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقہ کا اتباع کرے نہ کہ نبی کا۔ تو بے تکلف توجیہ اس کی اس تقریر سے سمجھ میں آ جائے گی کہ ملت ابراہیم اس ملت الہیہ کا نام ہے۔ اس کے بہت سے لقب ہیں۔ اس میں سے ایک لقب ملت ابراہیم بھی ہے۔ چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بکثرت متفق ہیں۔ اس مناسبت سے اس ملت کا نام ملت ابراہیم رکھا گیا ہے۔ تو واقع میں ملت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع نہیں ہے بلکہ ملت الہیہ کا اتباع ہے جو کہ ایک مناسبت سے ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کر دی گئی تو جیسے یہاں پر ملت الہیہ کو ملت ابراہیم کہہ دیا گیا ہے اسی طرح اگر اس دین کو مذہب شافعی یا مذہب ابوحنیفہ یا قول قاضی خاں کہہ دیا جاوے تو کیا مضائقہ ہے۔

معیار اتباع

اب رہ گئے وہ لوگ جو اتباع تو کرتے ہیں مگر کوئی معیار صحیح نہیں مقرر کرتے بلکہ ہر کس و نا کس کا اتباع کرنے لگتے ہیں سو آگے ان کی اصلاح کرتے ہیں کہ سبیل من اناب (ان لوگوں کے راستہ کا جو نیب ہیں) کا اتباع کرو اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھئے کہ واقع من اناب الی (ان لوگوں کا اتباع جو میری

طرف متوجہ ہوئے) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں ایہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں۔ اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا واتبع سبیل من اناب الی (ان لوگوں کے راستہ کا اتباع کرو جو میری طرف متوجہ ہوئے) کہ وہ خود متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے وہ ہے متبوع۔ یہ ہے اتباع کا معیار کہ جس شخص کا اتباع کرو اس کو دیکھ لو وہ صاحب انابت ہے یا نہیں۔ جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو سبحان اللہ! کیا عجیب معیار ہے پس اتباع اسی معیار کے موافق کرنا چاہیے اور سب معیار چھوڑ دینے چاہئیں۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ (اللہ کی طرف توجہ کرنے) کو معیار بنایا۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو ماننے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ویہدی الیہ من ینیب (یعنی جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کرتے ہیں) کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں۔ پس اب اناب الی سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ باعمل ہو اور عمل بدوں علم کے ہو نہیں سکتا تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو پس دو چیزیں اصل ٹھہریں۔ ایک علم دین اور ایک عمل دین۔

اتباع شریعت

ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها.

دیکھئے یہاں شریعت کا لفظ صاف موجود ہے کہ شریعت کا اتباع کیجئے اس سے کس قدر جی خوش ہوتا ہے کہ مولوی شریعت کے اتباع کو کیسے نہ کہیں خدا تعالیٰ شریعت کے اتباع کا حضور ﷺ کو حکم فرما رہے ہیں۔ اور من الامر میں الف لام عہد کا ہے اس سے مراد دین ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ دین کے جس طریقہ پر آپ کو ہم نے کر دیا ہے آپ اس کا اتباع کئے جائیے۔

حق تعالیٰ کا اتباع

پس جب اتنے بڑے صاحب علم کو ضرورت ہے اتباع شریعت کی تو ہم کو کیوں نہ ضرورت ہوگی۔ تو ہر ایک کو اپنے بڑے کے اتباع کا حکم ہوا۔ حضور سے بڑھ کر تو کوئی نہیں تھا۔ تو آپ کو حکم ہوا اتباع وحی کا۔ اور صحابہ سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لئے انہیں حکم ہوا کہ حضور کا اتباع کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا فاتبعونی یحبکم اللہ سومیر اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھیں گے (اور علیکم بسنتی میری سنت کو اپنے اوپر لازم پکڑو)

پس حضور کو حکم ہے وحی کے اتباع کا اور صحابہ کو حکم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا۔ پھر علماء کو حکم ہے صحابہ کے اتباع کا اور نیچے آ کر عوام کو حکم ہے علماء کے اتباع کا۔ چنانچہ ارشاد ہے واتبع سبیل من اناب الی اور متبوع مستقل سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں پھر حضور کا اتباع کرنے کو جو کہا گیا ہے سو وہ اس لئے کہ حق تعالیٰ کا اتباع حضور ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید سمجھانے کا وعدہ حضور ہی سے کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ثم ان علینا بیانہ (یعنی پھر اس کا بیان کرادینا ہمارا ذمہ ہے) اور حضور فرماتے ہیں علمنی ربی فاحسن تعلیمی (میرے رب نے مجھ کو تعلیم دی۔ پس اچھی ہوئی میری تعلیم) تو آپ کے اتباع کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے ارشاد کے موافق خدا کے احکام کا اتباع کیا جائے۔ یہی معنی خلفائے راشدین کے اتباع کے ہیں۔ نہ یہ کہ خلفائے راشدین مستقل متبوع ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفائے راشدین کو دین خوب سمجھایا۔ اس وجہ سے دین کا اتباع صحابہ کے فرمانے کے مطابق کرنا چاہیے اور چونکہ خدا تعالیٰ کے احکام کا اتباع صحابہ کے ارشاد کے موافق کیا جاتا ہے۔ اسی لئے اس کو صحابہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے کہ سنة الخلفاء الراشدين (خلفاء راشدین کی سنت) علی ہذا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دین کو حضرات ائمہ مجتہدین نے لیا اور سمجھا اور ایسا سمجھا کہ ان کی تحقیقات کے موافق اتباع کرنا چاہیے مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ متبوع مستقل ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اگر ہم خود اتباع کرتے تو بہت جگہ احکام الہی کے سمجھنے میں غلطی کرتے اور چونکہ ہم سے زائد سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی تحقیق کے موافق اتباع کرنا چاہیے۔

اهواء کا مقابل دین ہے

ثم جعلناک علی شریعة من الامر فاتبعها ولا تتبع احواء الذین لا یعلمون .

(پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔ سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائیے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلئے)

اس مقام پر شریعت کو اہواء (خواہشات) کے مقابل قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہواء کا مقابل مطلق دین ہے خواہ احکام ظاہری ہوں یا احکام باطنی۔ باقی اس کے یہ معنی نہیں کہ بعض چیزیں احکام ظاہری کی رو سے حرام ہیں اور احکام باطنی کی رو سے حلال ہیں۔

اور باطن سے وہ مراد نہیں جس کو عوام باطن کہتے ہیں میری مراد باطن سے وہ ہے جس کی خبر نہ مدعیان باطن کو ہے نہ مدعیان ظاہر کو۔

هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: یہ قرآن عام لوگوں کے لئے دانش مندیوں کا سبق اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین یعنی ایمان لانے والوں کے لئے رحمت کا سبب ہے۔

تفسیری نکات

رضا بال دنیا کب مذموم ہے

حق تعالیٰ ایک مقام پر کفار کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں ورضوا بالحبوة الدنيا واطمأءنوا بها کہ وہ دنیا سے خوش اور مطمئن ہو گئے اس سے معلوم ہوا کہ رضا بال دنیا مطلقاً مذموم نہیں بلکہ اس وقت مذموم ہے جبکہ اس کے ساتھ اطمینان اور بے فکری بھی ہو ورنہ واطمأءنوا بها (اور اس سے مطمئن ہو گئے) نہ بڑھایا جاتا پس معلوم ہوا کہ مذمت میں اس اطمینان کو بھی دخل ہے گو یہ اطمینان بال دنیا کفر سے کم ہی ہے مگر ایسا کم ہے جیسا آسمان عرش سے کم ہے مگر فی نفسہ تو بہت بڑا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

آسمان نسبت بعرض آمد فرود لیک بس عالی ست پیش خاک تو د
(آسمان عرش کے مقابلہ میں بیشک نچا ہے لیکن مٹی کے ٹیلے سے تو کہیں اونچا ہے)

اسی طرح اطمینان بال دنیا بہت سخت چیز ہے جیسی تو اس کو کفار کی مذمت میں بیان کیا گیا۔ گو کفر سے کم ہوا اس جگہ جملہ معترضہ کے طور پر ایک تحقیق لغت کی بھی بیان کر دوں کہ آسمان لفظ مفرد نہیں ہے بلکہ مرکب ہے آس اور مان سے آس بمعنی آس یا چکی کو کہتے ہیں اور مان بمعنی مانند ہے تو یہ لفظ اصل میں آس یا مان تھا کثرت استعمال سے تخفیف کر کے آس یا کو آس بنا لیا گیا آسمان ہو گیا گو ہمیں فارسی دانی کا دعویٰ نہیں مگر جو لوگ اس کے مدعی ہیں وہ اس نئی تحقیق کو سن لیں غالباً ان کے بھی خیال میں یہ بات نہ آئی ہوگی۔ پس آسمان کو آس مان اس لئے کہتے ہیں کہ ان اہل لغت کے نزدیک چکی کی طرح اس میں بھی حرکت دور یہ ہے غرض رضا بال دنیا و اطمینان بہا (دنیا سے خوش ہونا اور اس سے مطمئن ہونا) گو بمقابلہ کفر کے کم ہے مگر فی نفسہ بہت بڑا مرض ہے۔ اس کا علاج کرنا چاہیے جس کی ایک صورت یہ ہے جو میں اس وقت بیان کر رہا ہوں کہ انسان یہ تصور پیش نظر رکھے کہ میں ہر وقت سفر میں ہوں چنانچہ قرآن کی اس آیت سے بطور دلالت التزام کے یہ بات ثابت ہے کہ انسان سفر میں ہے اور اس کے لوازم سے بے چینی اور عدم اطمینان کیونکہ مسافر کو منزل پر پہنچنے سے پہلے اطمینان

نہیں ہوا کرتا بلکہ مسافر کے لئے غیر منزل کے ساتھ اطمینان اور رضا خود موانع سفر سے ہے جو مسافر غیر منزل سے دل لگالے گا اور اسی میں قیام کر کے بے فکر ہو جائے گا یقیناً منزل پر نہ پہنچ سکے گا۔ ان سب باتوں کو بھی قرآن نے بتلا دیا ہے کہ دنیا سے رضا اور اطمینان نہ ہونا چاہیے پس قرآن سے بدلائی مطابقتی ہمارا مسافر ہونا بھی ثابت ہے اور بدلائی التزامی سفر کے لوازم بھی ثابت ہیں اور اس کے موانع بھی بتلا دیئے گئے ہیں اب اس مضمون میں کیا شبہ ہے اور نئے لوازم سفر سے طریق کا مبداء و منجہا بھی ہے۔ سو مبداء کے بیان کی تو اس لئے ضرورت نہیں کہ وہ تو چلنے والے کے سامنے ہے اور منجہا کا ذکر قرآن میں جا بجا آیا ہے چنانچہ بار بار فرماتے ہیں وَاللّٰهُ تَرْجِعُ الْاُمُوْرَ (اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں) وَاِنَّ السّٰی رِبْكَ الرَّجْعِی (تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے) وَاللّٰهُ الْمَصِیْرُ (اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے) اور ایک مقام پر صاف ارشاد ہے وَعَلٰی اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَانُّرٌ كَمَا سِیْدَهَا رَاسْتَهُ یٰ خَدَا تَكُ مَبْنِیَّتَا ہِیْ اَوَّلُ بَعْضِیْ نِیْزِہِ رَاسْتَهُ یٰ ہِیْ (اور سیدھے راستے کی توفیق تو اس کو ہوتی ہے جو طالب حق ہو) وَلَوْ شَاءَ لَهْدَكُم اَجْمَعِیْنَ (اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم سب کو (سیدھے راستے کی طرف جبراً) ہدایت کر دیتے) مگر چونکہ یہ دارالابتلاء ہے اس لئے نہیں کیا جاتا لَا اَكْرٰہُ فِی الدِّیْنِ قَدْتَبِیْنَ الرَّشْدَ مِنَ الْغٰی. (دین میں جبر نہیں ہے تحقیق ظاہر ہوگئی رشد گمراہی سے) مشہور تفسیر تو یہ ہے وَعَلٰی اللّٰهِ بَیَانُ قَصْدِ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَانُّرٌ. (سیدھا راستہ ان میں بعض نیرھے بھی ہیں) مگر اس میں مضاف کا حذف ہے جو بلا ضرورت خلاف اصل ہے اس لئے میرے نزدیک یہاں علی بمعنی الی ہے جو قرآن میں جا بجا آیا ہے۔ چنانچہ بَمَا اَنْزَلَ عَلَیْنَا بِمَعْنٰی بَمَا اَنْزَلَ الْبَیِّنَاتِ۔ (اور اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے) آیا ہے اور بھی اس کی نظائر تلاش سے ملیں گی اس صورت میں حذف کی ضرورت نہ ہوگی تو منجہا سفر بھی قرآن میں مذکور ہے۔

علامات سفر

پھر لوازم سفر سے علامات بھی ہیں ہر راستے کی کچھ علامات ہوتی ہیں تو یہاں بھی کچھ علامات ہونا چاہئیں بلکہ یہاں ضرورت زیادہ ہے کیونکہ یہ سبیل محسوس نہیں بلکہ معنوی ہے سو قرآن میں اس راستے کی علامات بھی مذکور ہیں فرماتے ہیں۔ وَمِنْ بَعْظَمِ شَعَاثِرِ اللّٰهِ فَاَنْهٰہَا مِنْ تَقْوٰی الْقُلُوْبِ. (اور جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے) شَعَاثِرُ اللّٰهِ ہِیْ اَعْلَامَاتُہِیْ جُوْخَدَاکِی طَرْفِی حَلْنِی دَلِیْلِی ہِیْ یَعْنٰی نَمَازٌ وَرُزْہٌ اَوْرَاجٌ۔

لوازم سفر

پھر لوازم سفر سے ضیاء (روشنی) بھی ہے کیونکہ راستہ میں تاریکی ہو تو چلنا دشوار ہے۔ سیر فی الطريق (راستہ میں چلنا) رویت طریق (راستہ دیکھنے) پر موقوف ہے اور رویت بدون ضیاء کے نہیں ہو سکتی تو قرآن میں اس راستہ کے لئے ضیاء بھی ثابت ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (یعنی یہ قرآن عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے) اس میں لفظ بصائر سے ضیاء پر دلالت ہے ایک دفعہ مجھے اس آیت میں یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ اس جگہ تین چیزیں کیوں بیان کی گئیں۔ بصائر و ہدی و رحمة۔ پھر سمجھ میں آیا کہ راستہ چلنے میں ایک تو رہبر کی ضرورت ہے وہ تو ہدی ہے۔ پھر رہبر کی عنایت و شفقت کی ضرورت ہے کہ مختصر اور سہل راستہ سے لے جائے وہ رحمت ہے پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ چلنے والا سوا نکہا ہو اگر راستہ حسی ہے تو بصر کی ضرورت ہے اور معنوی ہے تو بصیرت کی ضرورت ہے اس کا ذکر بصائر میں ہے۔ مگر بصائر سے مراد اسباب بصیرت ہیں یعنی ضیاء کیونکہ قرآن کو جو بصیرت فرمایا ہے ظاہر ہے کہ وہ اسباب بصیرت میں سے ہے پس قرآن میں ضیاء معنوی موجود ہے جس میں تامل کرنے سے بصیرت کام کرنے لگتی ہے اور اس کو راستہ نظر آنے لگتا ہے پس اس آیت سے ضیاء بھی ثابت ہوئی اور دوسری آیات میں تو صاف طور پر لفظ نور وارد ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ۔ (یعنی تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک کتاب واضح کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں) غرض قرآن سے سفر اور لوازم سفر سب ثابت ہیں۔

ضیاء طریق منزل

۱۶ صفر ۱۳۲۹ھ کو فرمایا کہ آج رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک طالب علم میرے پاس یہ آیت پڑھ رہا ہے۔ هَذَا بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (آیت آخر سورہ اعراف) میں نے خواب ہی میں اس سے پوچھا کہ بصائر کون جمع کیوں لائے ہیں۔ اور ہدی و رحمة کو مفرد کیوں لائے ہیں۔ اس نے جواب دیا تاکہ راستہ چلنے والے پریشان نہ ہوں میں نے کہا کہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہو اس کے بعد میں

نے خود کہا کہ راستہ چلنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے ایک ضیاء کی دوسرے طریق کی۔ تیسرے منزل کی لیکن ضیاء سے کام لینے کے لئے آنکھیں شرط ہیں اور آنکھیں ہر شخص کے لئے علیحدہ ہونی چاہئیں۔ اس لئے بصائر کو جمع لایا گیا اور ہدیٰ مثل طریق کے واحد ہے اس لئے وہ مفرد لایا گیا اور رحمۃ مثل ثمرہ طریق یعنی منزل کے ہے وہ بھی متعین اور واحد ہے اس واسطے اس کو بھی واحد لایا گیا۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

ترجمہ: اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی زبردست حکمت والا ہے۔

تفسیری نکات

کبریائی صرف حق سبحانہ و تعالیٰ کی شان کے لائق ہے

حق تعالیٰ نے آیت میں بلفظ حصر عظمت کو اپنے واسطے ثابت کیا ہے ولہ الکبریاء یعنی اسی کے واسطے ہے عظمت بلاغت کے قاعدہ سے لہ کو مقدم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ عظمت مخصوص ہے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہو سکتی نیز یہ نہیں فرمایا ولہ الکبریاء العظمیٰ کہ بڑی عظمت تو حق تعالیٰ کے لئے ہے اور چھوٹا موٹا کوئی حصہ اس کا دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے بلکہ مطلق کبریاء کو دوسرے سے نفی کر دیا اسی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ العظمة ازاری والکبریاء ردائی فمن نازعنی فیہما قصمتہ یعنی عظمت میرا تہبند ہے اور کبریاء میری چادر جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ چادر اور تہبند فرمانا کنا یہ ہے خصوصیت سے معنی یہ ہوئے کہ یہ دونوں صفتیں خاص ہیں میرے ساتھ دوسرا کوئی مدعی ہوگا تو میں اس کو سزا دوں گا جب کبریاء حق ہو باری تعالیٰ کا تو اپنے نفس میں اس کا رکھنا مساواة ہوئی۔ باری تعالیٰ کے ساتھ اور دیگر معاصی کے لئے تو حدود ہیں کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی۔ مثلاً کھانا کہ اتنا زیادہ نہ ہو کہ موجب ہو جائے مرض کا اس وقت تک مباح ہے یا بھوکا رہنا کہ جب تک سبب نہ ہو جائے ہلاکت کا جائز ہے مگر کبروہ معصیت ہے کہ اس کے لئے کوئی حد نہیں بلکہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا۔ بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تشدد ہے۔ اخر جو امن النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من ایمان یعنی قیامت کے دن حکم ہوگا کہ جس کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی ایمان ہے اسے دوزخ سے نکالو۔ اس کو پہلی حدیث سے ملائے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے

وہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر کبر جس کے دل میں ہے جنت میں نہ جائے گا۔ یہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر بھی ایمان جس کے دل میں ہے جنت میں جائے گا اس سے صاف یہ بات نکلتی ہے کہ ذرہ بھر کبر بھی کسی دل میں ہے اس میں ذرہ بھر ایمان نہیں ہو سکتا اور ذرہ بھر ایمان جس دل میں ہے اس میں ذرہ بھر کبر نہیں ہو سکتا دونوں میں بالکل نقیضیں ہیں۔ گو اس کی توجیہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرہ بھر کبر نہ ہوگا لیکن آخر اس سے بھی تو اس صفت کا مفاد ایمان کسی درجے میں ہونا ثابت ہوا سمجھ لو کہ کبر کس قدر سخت معصیت ہے اور ہونا ہی چاہیے کیونکہ سب سے بڑا گناہ کفر ہے اور کبر خود اس کی بھی اصل ہے اور کفر اس کی فرع تو مسلمان کو چاہیے غور کیا کرے کہ اس کے دل میں کبر ہے یا نہیں۔

تکبر کا علاج

حق تعالیٰ نے ایک ایسا علاج اس کا بتایا کہ جب اس کو متحضر رکھا جائے تو نہ چھوٹا گناہ ہونہ بڑا۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کی ایک صفت ولہ الکبریاء فی السموات والارض (اور اسی کو آسمانوں اور زمین میں بڑائی حاصل ہے) کو یاد رکھو گے تو گناہ خود بخود تم سے چھوٹ جائیں گے۔ یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفات کبر یا مختص ہوئی ذات باری کے ساتھ تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا تذلل جو اصل ہے تمام عبادت کی جس شخص نے صفت کبر یا کو مختص مان لیا حق تعالیٰ کے ساتھ اس نے حق تعالیٰ کو بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی اس سے بڑھ کر کوئی عالم یا محقق نہیں ہو سکتا عقل مند لوگ یہی ہیں۔

وهو العزيز الحكيم. (یعنی وہ غالب اور صاحب حکمت ہے) سے سو کہ کیا ان کو چونکانے کے لئے جو اس مفدے سے کسی طرح بچتے ہی نہیں اور اپنے طیب پر ان کی نظر ہی نہیں جب ان کو سمجھانے اور بھلائی سوجھانے سے اثر نہیں ہوتا تو فرماتے ہیں عزیز یعنی غالب بھی ہوں اگر تم کہنا نہ مانو گے تو میرے ہاتھ سے کہیں جا نہیں سکتے۔ جیسی چاہے سزا دوں گا۔

اور اگر کسی برے عمل پر فوراً سزا نہ ملے تو مطمئن مت ہو جاؤ میں حکیم بھی ہوں کسی مصلحت سے مہلت دیتا ہوں اول تو دنیا ہی میں سزا ملے گی اور اگر دنیا میں کسی مصلحت اور حکمت سے ٹل ہی گئی تو آخرت تو درالجزاء ہے ہی۔ وہاں کی سزا اور زیادہ سخت ہے۔

سُورَةُ الْأَحْقَافِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَقَوْمَنَا أَجِيبُوا دَعْوَى اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ

وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ

ترجمہ: اے قوم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دیں گے اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھیں گے۔

تفسیری نکات

شان نزول

یہ ایک آیت ہے سورہ احقاف کی اور یہ قول نقل کیا گیا ہے بعض جنوں سے جس کا قصہ شان نزول سے معلوم ہوتا ہے اور یہ آیت مکی ہے ہجرت سے قبل یہ واقعہ ہوا ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے جو قرآن شروع کیا تو ادھر سے جن گزر رہے تھے۔ انہوں نے اس کو سنا اور چلے گئے۔ مگر اس دفعہ مکالمت (بات چیت کرنے) سے مشرف نہیں ہوئے۔ ہاں دوسری بار مکالمت سے بھی مشرف ہوئے ہیں۔ اس دفعہ صرف قرآن سن کر لوٹ گئے اور اپنی قوم کے پاس جا کر قرآن کی تعریف کی اور اس پر ایمان لانے کی رغبت دلائی۔ سو اس موقع کی یہ ایک آیت ہے اور ان جنوں کا مقولہ ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے جا کر کہا ہے گویا ہر میں یہ جنوں کا مقولہ ہے۔ لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ جس بات کو نقل کر کے اس پر حق تعالیٰ انکار نہ فرمائیں تو وہ درحقیقت انہیں کا فرمان ہوتا ہے کیونکہ جب نقل کر کے انکار نہیں کیا تو اس کو صحیح سمجھا تو ایسا ہوا جیسے مفتی فتویٰ لکھے اور کوئی دوسرا لکھ دے الجواب صحیح (جواب درست ہے) تو وہ اس فتویٰ کا مصدق بھی ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ فتویٰ لکھنے والا

ایک نوآموز شاگرد ہو اور اصل میں یہاں یہی مثال ہے کہ فتویٰ لکھنے والا ہو ایک نوآموز شاگرد اور مصدق (تصدیق کرنے والا) ہو استاد کیونکہ پہلی صورت میں جہاں مفتی شاگرد مصدق (تصدیق کرنے والا) استاد نہیں ہے وہاں تو بعض دفعہ اصل مجیب (جواب لکھنے والا) زیادہ ہوتا ہے مصدق سے مگر اس صورت میں کہ مفتی نوآموز شاگرد ہے جواب دینے والا اصل میں کچھ نہیں کیونکہ وہ خود اس میں متردد ہے۔ استاد کو اس لئے دکھلاتا ہے تاکہ اس کی صحت پر اطمینان ہو جائے تو جب اس نے استاد کو دکھلایا اور استاد نے اس پر صاد بنا دیا تو اب اس کو اطمینان ہو گیا تو وہ حقیقت میں استاد کا مضمون ہے کیونکہ جس شان کا یہ مضمون اب استاد کے صاد بنانے پر ہو گیا ہے پہلے اس شان کا نہ تھا کیونکہ اب یہ حجت ہے اور اس سے پہلے حجت نہ تھا تو جب حجت کی حیثیت سے دیکھا جاوے گا تو وہ فتویٰ استاد کا کہا جاوے گا نہ کہ شاگرد کا تو اسی طرح جب حق سبحانہ و تعالیٰ کسی کا کلام نقل فرمادیں خاص کر ایسے کلام جو کہ فی نفسہ حجت نہ ہو جیسے کسی غیر کا کلام اور نقل کر کے پھر اس کی تصدیق فرمادیں تو وہ کلام حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کا کہا جاوے گا اور کسی کلام کو نقل فرما کر سکوت کرنا یہ اس کی تصدیق ہی کرنا ہے۔

تفسیر آیت کی

غرض وہ جن قرآن سن کر اپنی قوم کے پاس گئے اور جا کر وہ مقولہ کہا جو یہاں مذکور ہے۔ اور اب وہ ارشاد ہو گیا خدا تعالیٰ کا تو فرماتے ہیں کہ کہنا منو خدا کی طرف سے پکارنے والے کا آگے اجیبوا (کہنا مانو) کی تفسیر ہے۔ کہ امنوا بہ تصدیق کرو آپ کی یہ نہیں کہ زبان سے کہہ لیا کہ ہاں صاحب اور آگے کچھ بھی نہیں بہت سے لوگوں کی اجابت اسی قسم کی ہوتی ہے کہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب احکام سننے تو ہٹنے لگے اس لئے کہتے ہیں کہ امنوا بہ کہ دل سے مانو اگر ایسا کرو گے تو کیا شرہ ملے گا۔ یہ ملے گا کہ بغفر لکم من ذنوبکم۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دیں گے۔ ویجرکم من عذاب الیم۔ اور تم کو دردناک عذاب سے پناہ دیں گے۔

ارشاد ہے۔ اجیبوا داعی اللہ و امنوا بہ۔ (یعنی کہنا مانو اللہ کے منادی کا اور اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ تو امنوا یہ تفسیر ہے کہ اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ اور امنوا بہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ داعی پر ایمان لاؤ اور یہ معنی زیادہ چسپاں ہیں کیونکہ وہ جن یہودی تھے حق تعالیٰ کے ساتھ پہلے ہی سے ایمان رکھتے تھے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تھے۔ اس لئے ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو کہا گیا۔

ایمان کے لئے عمل صالح لازم ہے

اور ایک بات یہ بھی سمجھ لینے کی ہے کہ امنوبہ کے ساتھ و اعملوا صالحاً (اور نیک کام کرو) کیوں نہیں فرمایا یہاں سے تو گویا سہارا ملے بعض کو کہ ایمان کافی ہے اعمال صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں تو سمجھو کہ اس کے ذکر نہ کرنے سے یہ بتلانا ہے کہ عمل صالح تو ایمان کے لئے لازم غیر منفک (جدا نہیں) ہے کہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں دیکھو اگر حاکم کہے کہ رعیت نامہ داخل کر دو تو اس کہنے کی ضرورت نہیں کہ قانون پر عمل بھی کرنا میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی شخص نے قاضی کے کہنے سے کہا کہ میں نے اس عورت کو قبول کیا کچھ دنوں تک تو دعوتیں ہوتی رہیں اس لئے کسی چیز کی ضرورت نہ ہوئی لیکن دو چار روز کے بعد نمک لکڑی کی ضرورت ہوئی تو بیوی نے فرمائش کرنی شروع کیس۔ اب وہ گھبرایا اور پہلو تہی کرنی شروع کی جب بیوی نے بہت دق کیا تو کہنے لگا سنو بیوی میں نے صرف تمہیں قبول کیا تھا نمک لکڑی کو قبول نہیں کیا تھا۔ تو اگر آپ کے سامنے اس کا فیصلہ آوے تو آپ فیصلہ میں کیا کہیں گے ظاہر ہے کہ بیوی کا قبول کرنا ان سب چیزوں کا قبول کرنا ہے تو اسی طرح ایمان لانا سب چیزوں کا قبول کرنا ہے اس لئے امنوابہ (اس پر ایمان لاؤ) کہنا کافی ہو گیا اور و اعملوا صالحاً۔ (اور نیک کام کرو) کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ جو خدا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانے گا اس کو سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ آگے اس کا ثمرہ مرتب کرتے ہیں کہ یغفر لکم من ذنوبکم۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے اس آیت میں من یا تو ابتداءً یہ ہے کہ گناہوں سے مغفرت شروع ہوگی اور اس میں اشارہ ہے کہ اتصال ہوگا یعنی ایک سرے سے گناہ معاف ہوتے چلے جائیں گے یا من تبعیضیہ ہو کہ جن گناہوں کا اب تدارک نہیں ہو سکتا مثلاً شراب خواری وغیرہ وہ معاف ہو جائیں گے۔ باقی جن کا تدارک ہو سکتا ہے وہ معاف نہیں ہوں گے جیسے کہ مثلاً ایک شخص نے کسی سے ہزار روپے چھین لئے اور اگلے دن ہو گئے مسلمان تو وہ روپیہ ادا کرنا پڑے گا۔ معاف نہیں ہوگا۔ اب میری تقریر سے یہ اشکال جاتا رہا کہ کیا نرے ایمان پر گناہ معاف ہو جائیں گے کیونکہ معلوم ہو گیا کہ ایمان کے لئے عمل لازم ہے اور یہ بھی ایک جواب ہے کہ صرف ایمان پر بھی کبھی نہ کبھی تو مغفرت ہوگی۔ گو دخول نار کے بعد ہی سہی مگر یہ طالب علمانہ جواب ہے آگے فرماتے ہیں۔ ویجرکم من عذاب الیم۔ (اور دردناک عذاب سے تم کو محفوظ رکھیں گے) اگر ایمان کیساتھ عمل صالح بھی کیا جاوے تو عذاب الیم سے عذاب مطلق مراد ہوگا کہ ہر طرح کے عذاب سے پناہ دیں گے اور اگر نرا ایمان لیا جاوے اور اس کے ساتھ عمل صالح نہ ہو تو عذاب سے مراد عذاب مٹلہ ہوگا کہ ہمیشہ عذاب نہیں ہوگا۔ یہ تو آیت کی تفسیر ہوگئی اب اس آیت کے متعلق ایک مسئلہ بھی بیان کرتا ہوں وہ یہ

کہ یہاں جنوں کا مکالمہ ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنوں کا وجود ہے آج کل اس میں بھی اختلاف ہے اور اختلاف ایسا عام ہو گیا ہے کہ ہر چیز میں اختلاف ہے جیسے ایک مولوی صاحب کے شاگرد بد استعداد تھے۔ جب وہ کتابیں ختم کر کے جانے لگے تو استاد سے کہنے لگے کہ مجھے کچھ آتا جاتا تو ہے نہیں لوگ مجھ سے مسئلہ پوچھیں گے تو میں کیا بتاؤں گا۔ استاد نے کہا کہ تم یہ کہہ دیا کرنا کہ اس میں اختلاف ہے غرض یہ کہ جب وہ وطن پہنچے تو انہوں نے یہی طرز اختیار کیا کہ جو شخص ان سے کوئی مسئلہ پوچھتا وہ یہی کہہ دیتے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے لوگ ان کے بڑے معتقد ہوئے کہ یہ بہت وسیع النظر ہیں۔ آخر ایک شخص یہ راز سمجھ گیا اس نے کہا کہ لا الہ الا اللہ کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ انہیں تو وہی ایک جواب یاد تھا کہنے لگے اس میں اختلاف ہے۔ بس لوگ سمجھ گئے کہ انہیں کچھ نہیں آتا۔ سو اس وقت تو یہ بات ہنسی کی تھی مگر آج سچی ہو گئی۔ لا الہ الا اللہ میں بھی اختلاف ہے خدا تعالیٰ تو کہیں کہ جن ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں اور بناء انکار کی کیا ہے محض یہ کہ ہم نے نہیں دیکھے۔ میں کہتا ہوں کہ جب تک ہم نے امریکہ نہ دیکھا تھا کیا اس وقت امریکہ معدوم تھا یا غیر معلوم تھا سو معدوم تو نہ تھا تو اگر آدمی کسی چیز کو نہ دیکھے تو اس کا نہ دیکھنا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ موجود نہیں تو اگر حق تعالیٰ جنوں کی خبر نہ دیتے تو بھی محض غیر مرئی ہونے پر انکار کی گنجائش نہ تھی۔ دیکھئے مادہ کو کسی نے دیکھا نہیں اور پھر مانتے ہیں اور لطف یہ کہ مادہ کو خالی عن الصورة مان کر قدیم مانا ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اس کو دیکھا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ محض دلیل سے قائل ہوئے ہیں۔ گو وہ دلیل بھی لچر ہے تو اگر ہم خدا کے فرمانے سے کسی چیز کے قائل ہوں تو کیا حرج ہے ایک اور بات کہتا چلوں کہ جنوں کے ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہر بیماری بھی جن ہیں آج کل جہاں کوئی بیماری ہوتی ہے بس لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جن کا اثر ہے۔ اگر یہ خیال ہو کہ جن انسان کے دشمن ہیں۔ اس کے اثر سے کیا تعجب ہے تو سمجھ کہ اگر دشمن ہیں تو ہوا کریں۔ خدا تعالیٰ حافظ ہیں فرماتے ہیں۔

لہ معقبات من بین بدیہ و من خلفہ بحفظونہ من امر اللہ۔ (واسطے ان کے فرشتے ہیں یکے بعد دیگرے حفاظت کرنے والے بندہ کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے حفاظت کرتے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے) پس اگر وہ ضرر پہنچانا بھی چاہیں تو خدا تعالیٰ حفاظت کرتے ہیں ان کی حفاظت عبث نہیں۔

سُورَةُ مُحَمَّدٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَشَدُّ وَالْوَثَاقُ فَاَمَّا مَنَّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً

ترجمہ: تو خوب مضبوط باندھ لو پھر اسکے بعد یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا۔

تفسیری نکات

مانعة الخلو کی حقیقت

چنانچہ ایک نیچری مفسر نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن میں غلامی کے مسئلہ کا ثبوت نہیں ہے بلکہ ایک آیت سے تو اس کی نفی ہوتی ہے اور وہ آیت ہے۔ فشدوا الوثاق فاما منا بعد و اما فداء اس سے پہلے جہاد کا ذکر ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں۔

فاذالقيتم الذين كفروا فاضرب الرقاب

پس جب تم کفار کے مقابل ہو تو ان کی گردنیں مارو (یعنی قتل کرو) یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خوریزی کر چکو تو (تم کو دو اختیار ہیں) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا جو کہ احسان ہے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا اس سے اس نئے مفسر نے یہ استدلال کیا کہ اس آیت میں بطور حصر کے دو باتیں مذکور ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ تیسری صورت (یعنی غلام بنانا) جائز نہیں۔

اس تقریر سے ایک عالم کوشبہ پڑ گیا۔ اس کا جواب ایک دوسرے عالم نے ان کو یہ دیا کہ پہلے آپ یہ بتلائیں کہ یہ قضیہ کون سا ہے حملیہ یا شرطیہ اور شرطیہ ہے تو متصلہ یا منفصلہ اور منفصلہ ہے تو حقیقیہ یا مانعہ الجمع یا مانعہ الخلو۔ بس اتنی بات میں سارے اشکال کو درہم برہم کر دیا۔ کیونکہ حاصل جواب کا یہ ہوا کہ یہ قضیہ ممکن ہے کہ مانعہ الجمع ہو۔ یعنی ان دونوں کا جمع کرنا ممنوع ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں صورتیں مرتفع ہوں اور تیسری

کوئی اور صورت ہو کیونکہ مانعہ الجمع کا حکم یہی ہے کہ ان کا اجتماع جائز نہیں ہوتا۔ اور دونوں کا ارتفاع ممکن ہے۔ مثلاً دور سے کسی چیز کو دیکھ کر ہم یہ کہیں کہ یہ چیز یا تو درخت ہے یا آدمی ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان دونوں کا اجتماع تو ناممکن ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نہ درخت ہو نہ آدمی ہو بلکہ کوئی تیسری چیز ہو گھوڑا بیل وغیرہ۔ اسی طرح اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے کہ من و فداء دونوں کا جمع کر ممتنع ہے۔ البتہ دونوں سے غلو ممکن ہے۔ تو اب اس سے غلامی کی نفی کیوں کر ہوئی۔ سو دیکھئے جو شخص مانعہ الجمع و مانعہ اخلو کی حقیقت نہ جانتا ہو وہ نہ اس اشکال کو دور کر سکتا ہے اور نہ جواب کو سمجھ سکتا ہے۔

اِنْ يَسْئَلْكُمُوها فَيُحْفِكُمْ تَبْخُلُوا

ترجمہ: اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو۔

تفسیری نکات

چندہ لینے میں عدم احتیاط

آج کل چندہ کے بارے میں بہت ہی کم احتیاط ہے حتیٰ کہ قریب قریب تمام مدارس میں بھی اس باب میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا ہے میں اس معاملہ میں سخت ہوں اور زیادہ بے احتیاطی یہ ہے کہ جو فرداً فرداً چندہ کی تحریک کی جاتی ہے اس سے دوسرے پر بار ہوتا ہے۔ گرانی ہوتی ہے نیز نہ دینے پر بخل بھی ثابت ہوتا ہے جس کا حاصل ایک مسلمان کو مہتمم کرنا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں ہیں جو تحریک عام اور تحریک خاص میں امتیاز کرتا ہوں اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک مسلمان پر بار نہ ہو گرانی نہ ہو اور وہ بدنام نہ ہو دعوت عام اور چیز ہے اور انفرادی صورت میں کسی سے سوال کرنا اور چیز ہے مجھ کو تجربہ ہے کہ لوگوں کی حالت معلوم ہے اس تحریک خاص کا اثر ظہور بخل قرآن مجید میں بھی مذکور ہے۔ ان یسئلكم وها فیحفکم تبخلوا کیونکہ احناء والحناف خطاب خاص ہی میں ہو سکتا ہے اور اس کے بعد خطاب عام کا اس عنوان سے ذکر ہے۔ ہانتم ہؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ یہ دعوت خطاب عام ہے اور اسی فرق کی وجہ سے احناء پر جو بخل ہو اس میں نکیر نہیں فرمایا گیا کہ معذور ہے اور دعوت پر جو بخل ہو اس پر نکیر فرمایا گیا۔ فمنکم من یبخل و من یبخل فانما یبخل عن نفسه الایة میں نے میرٹھ کے ایک وعظ میں اس فرق کو بیان کیا تھا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی اس بیان میں شریک تھے۔ وعظ کے بعد خوش ہو کر فرمایا کہ آج آیت کے معنی معلوم ہوئے یہ ان کی تواضع و محبت تھی مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ میں اس کو اس وقت سے جانتا ہوں کہ یہ مجھ کو نہ جانتا تھا مجھ سے بڑی محبت فرماتے تھے اور حضرت صاحب میرے پاس ہے ہی کیا بس یہ ہی ایک چیز ہے یعنی اللہ والوں کی محبت مولانا نہایت سادہ تھے کوئی بناوٹ نہ تھی۔

وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ تو کسی کا محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو۔

تفسیری نکات

غنی کا ترجمہ بے پروا نہیں

فرمایا کہ مجالس تعزیت میں یہ بات دیکھی ہوگی کہ بعض لوگ جو جوان مر جاتے ہیں اس کی تعزیت میں عام طور پر اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہائے جوان مر گیا چھوٹے چھوٹے بچے رہ گئے۔ ابھی عمر ہی کیا تھی۔ ہاں جی اللہ کی ذات بڑی بے پروا ہے۔ سو یہ لفظ بے پروا کا نہایت ثقیل ہے۔ یہاں غنی کا ترجمہ نہیں کہ یہ صفت تو منصوص ہے بلکہ یہ بے انتظام کے معنی میں ہے۔ یہ جملہ بڑے بڑے ثقہ لوگوں کی زبان پر ہے واللہ الغنی و انتم الفقراء کے معنی تو یہ ہے کہ ان کو کسی کی طرف احتیاج نہیں اور ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم ولا یرضی لعبادہ الکفر اور من جاہد فانما یجاہد لنفسہ ان اللہ لغنی عن العالمین میں یہ معنی ہیں کہ کسی کو کفر و طاعت سے نہ ان کا کوئی ضرر ہے نہ نفع مگر ان اہل تعزیت کی یہ مراد ہرگز نہیں ان کلمات سے سخت احتیاط چاہیے۔ ممکن بلکہ امید ہے کہ جہل کے سبب معافی ہو جاوے لیکن اگر مواخذہ ہونے لگے تو استحقاق ہے۔ عارفین پر تو بعید دالاتوں پر مواخذہ ہو گیا ہے۔ ایک بزرگ نے یاس کے بعد بارش ہونے پر یہ کہہ دیا تھا کہ آج کیا اچھے موقع پر بارش ہوئی فوراً مواخذہ ہوا کہ بے ادب یہ بتلا کہ بے موقع کب ہوئی تھی۔ یہ ایسا ہے کہ کسی ماہر استاد سے کہو کہ آج کھانا بہت اچھا پکا ہے کیا یہ مطلب نہیں سمجھا جائے گا کہ پہلے اچھا نہ پکا تھا اور میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ ان اقوال میں تو کچھ قریب یا بعید سوء ادب بھی ہے بندہ کا حق یہ ہے کہ جو خالص طاعت بھی ہو اس میں بھی لرزان ترسان رہے ناز نہ کرے کیونکہ وہ بھی ان کے شانِ عظیم کے لائق تو نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ اپنے کسی عمل یا اپنی کسی حالت پر ناز نہ کرو۔ نیاز پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اسی میں خیر ہے اور ایسے ہی ناز کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

چون نداری گرد بدخوی مگرد

ناز را روئے بپایہ بچو ورد

ایک عورت بد شکل مگر اس بد شکل میں ایک ایسی ادا ہے کہ خاوند کو وہ محبوب ہے تو اس کی وجہ سے اس عورت کا حسن اس کی نظر میں خاک اور گرد ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بعض بندوں میں کوئی ایسی خداداد صفت ہوتی

ہے جس کی وجہ سے اس کے سامنے دوسروں کے کمالات گرد ہوتے ہیں اس لئے کسی کی کسی کو دیکھ کر اس کو ناقص اور اپنے کو کامل سمجھنا غلطی ہے ممکن ہے اس کا نقص عارضی ہو اسی طرح تمہارا کمال اس عارض کے ارتفاع کے بعد عکس کا ظہور ہو جاوے گا تو حتمی فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔

اور کیا کوئی ناز کر سکتا ہے ہمارے اعمال کی حقیقت ہی کیا ہے کہ جس پر ناز کرے اور غور کیا جاوے تو ہم ہر وقت ہی خطاوار ہیں مگر ان کا عفو غالب ہے اس لئے محفوظ ہیں بعض دفعہ تنبیہ بھی فرمادیتے ہیں۔ اور یہ بھی رحمت ہے چنانچہ ایک عارف کی زبان سے کوئی کلمہ نامناسب نکل گیا اس وقت تو مواخذہ نہ ہوا مگر کچھ روز کے بعد اس مواخذہ کا اس طرح ظہور ہوا کہ کلمہ طیبہ کا ذکر کرنا چاہا مگر زبان سے نہ نکلتا تھا۔ بہت پریشان ہوئے دعا کی ارشاد ہوا کہ فلاں وقت فلاں کلمہ تمہاری زبان سے نکلا تھا تم نے اب تک توبہ نہیں کی بہت ڈھیل دی آج پکڑ ہے ہمارا ذکر زبان سے نہیں کر سکتے توبہ کی تب معافی ظاہر ہوئی۔ (الاقاضات الیومیہ ج ۷ ص ۲۰۲، ۲۰۳)

وَإِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝۴

ترجمہ: اور اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا جو تم جیسے نہ ہونگے۔

تفسیری نکات

ان یسنلکوها فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم۔ اگر تم سے تمہارے مال طلب کریں۔ پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو اور اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کر دے۔ یہ سوال کرنے کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے مانگنے لگے اور مبالغہ سے مانگے تو تم بخل کرنے لگو اور وہ تمہارے کہنے کو ظاہر کر دے آگے فرماتے ہیں۔

هانتم هؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فممنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسه واللہ الغنی وانتم الفقراء وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یكونوا امثالکم دیکھے سوال کی توفی کرتے ہیں اور دعوت الی الانفاق کا اثبات فرماتے ہیں اور سوال کرنے پر بخل کرنے میں زیادہ مذمت نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک گونہ اس میں معذور رکھتے ہیں۔ چنانچہ فیحفکم تبخلوا میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور دعوت الی الانفاق میں بخل کرنے کی مذمت فرماتے ہیں کہ۔

من یبخل فانما یبخل عن نفسه۔ جو شخص بخل کرتا ہے وہ خود اپنے سے بخل کرتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ

ان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یكونوا امثالکم۔ اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ

تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

کہ اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری بجائے دوسری کسی قوم کو پیدا کر دے گا۔ جو کہ تمہاری طرح بخیل اور جان چرانے والے نہ ہوں گے اور تم سے ہر طرح افضل ہوں گے۔ دیکھئے ترغیب پر بخل کرنے سے کس قدر دھمکایا ہے کہ تمہاری تان گاڑی نہیں چلتی دوسرے بھی ہزاروں خدمت گزار موجود ہیں۔

منت منہ کی خدمت سلطان ہی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت
بادشاہ کی خدمت کر کے احسان نہ جتلاؤ کہ ہم نے خدمت کر دی اس کے احسان مند ہو کہ اس نے تم سے خدمت لے لی۔

خدا تعالیٰ ہی کا ہم پر احسان ہے کہ ہم سے یہ کام لے لیا۔ تو اس آیت میں خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ سوال اور چیز ہے اور وہ کیا ہے کہ جس میں اخفاء ہو اور اخفاء دو قسم کا ہے ایک صوری دوسرا معنوی جیسے وجاہت سے وصول کرنا کہ یہ بھی اخفاء کی ایک فرد ہے۔ غرض جس میں ایلام قلب ہو وہ اخفاء ہے اور اس پر تخلص کا ترتیب کچھ بعید نہیں ایک ہے ترغیب اس میں بخل کرنا مذموم ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو صورتیں تفسیر شروع ہیں وہ تو سوال میں داخل ہیں اور جو شروع ہیں وہ ترغیب ہیں غرض میں آپ لوگوں کو ترغیب دیتا ہوں۔

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل چندہ کے بارے میں بہت ہی کم احتیاط ہے حتیٰ کہ قریب قریب تمام مدارس میں بھی اس باب میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا میں اس معاملہ میں سخت ہوں اور زیادہ بے احتیاطی یہ ہے کہ جو فردا فردا چندہ کی تحریک کی جاتی ہے اس سے دوسرے پر بار ہوتا ہے گرانی ہوتی ہے نیز نہ دینے پر بخل بھی ثابت ہوتا ہے جس کا حاصل ایک مسلمان کو ہتم کرنا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں میں جو تحریک عام اور تحریک خاص میں امتیاز کرتا ہوں اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک مسلمان پر بار نہ ہو گرانی نہ ہو اور وہ بدنام نہ ہو۔ دعوت عام اور چیز ہے اور انفرادی صورت میں کسی سے سوال کرنا اور چیز ہے مجھ کو تجربہ ہے لوگوں کی حالت معلوم ہے اس تحریک خاص کا اثر ظہور بخل قرآن مجید میں بھی مذکور ہے۔ ان یسئلکم وہا فی حفاکم تبخلوا الایۃ کیونکہ اخفاء والخاف خطاب خاص ہی میں ہو سکتا ہے اور اس کے بعد خطاب عام کا اس عنوان سے ذکر ہے ہانتہم ہولاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ یہ دعوت خطاب عام کا اس عنوان سے ذکر ہے ہانتہم ہولاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ۔ یہ دعوت خطاب عام ہے اور اسی فرق کی وجہ سے اخفاء پر جو بخل ہو اس میں نکیر نہیں فرمایا گیا کہ معذور ہے اور دعوت پر جو بخل ہو اس پر نکیر فرمایا گیا۔ فمنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسه الایۃ۔ میں نے میرٹھ کے ایک وعظ میں اس فرق کو بیان کیا تھا حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی اس بیان میں شریک تھے وعظ کے بعد خوش ہو کر فرمایا کہ آج آیت کے معنی معلوم ہوئے یہ ان کی تواضع و محبت تھی۔

سُورَةُ الْفَتْحِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ

عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝

ترجمہ: تاکہ اللہ تعالیٰ آپ (ﷺ) کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف فرمادے اور آپ (ﷺ) پر اپنے احسانات مکمل کر دے اور آپ کو سیدھے راستے پر لے چلے۔

تفسیری نکات

یہاں پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوا کرتا ہے اس کا حل کر دینا بھی جملہ معترضہ کے طور پر ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ انا فتحنا پر لیغفر لک اللہ الخ۔ کیسے مرتب ہوا۔ کہاں فتح مکہ اور کہاں مغفرت وغیرہ۔ فتح کو مغفرت وغیرہ میں کیا دخل؟ مفسرین نے مختلف اور بعید از بعید تو جہیں اس مقام کی لکھی ہیں مگر الحمد للہ میری سمجھ میں جو آیا ہے وہ بے تکلف اور دل پذیر بات ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام عرب کے لوگ اس کے منتظر تھے کہ فتح مکہ ہو تو ہم مسلمان ہوں چنانچہ فتح مکہ پر جوق در جوق اسلام لانے لگے اور لوگوں کے اسلام لانے سے حضور کے مراتب قرب بڑھتے ہیں۔ نفس تبلیغ سے تو اور طرح کا ثواب ہوتا ہے اور اس تبلیغ سے اسلام لانے کا ثواب اور نوع کا ہے۔ ورنہ تبلیغ تو تمام انبیاء نے کی ہے۔ نفس تبلیغ میں سب انبیاء برابر ہیں۔ حضور جو فخر فرمادیں گے وہ کثرت امت پر ہوگا۔ فتح مکہ سبب ہے اسلام لانے کا اور اسلام لانا لوگوں کا سبب ہے آپ کی زیارت قرب کا اور زیارت قرب سبب ہے لیغفر لک اللہ (الی) ینصروک اللہ کا اور سبب کا سبب یا سبب سبب کا سبب اس سبب کا بھی سبب ہوتا ہے پس فتح مکہ کو مغفرت وغیرہ میں اس طرح دخل ہوا اور ترتیب بے تکلف درست ہو گیا۔ دیکھئے یہاں بھی قرآن کے فہم کے لئے علوم عقلیہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے خلاصہ یہ ہوا کہ جن علوم

کے قفل بے کھلے رہ گئے تھے اگر آپ کا اتباع کرو گے تو وہ علوم کے قفل تم پر کھل جائیں گے۔

بنی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا
اوشنچ ایں جہاں و آن جہاں
ایں جہاد در دین آنجا در جتا

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غلبہ خوف خداوندی

فرمایا کہ کسی نے دریافت کیا کہ لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ سے گناہ سرزد ہوئے ہیں۔ فرمایا معاً قلب میں جواب میں یہ بات آئی کہ جب کوئی شخص نہایت خائف ہوتا ہے۔ تو وہ ڈر کر کہا کرتا ہے کہ مجھ سے جو قصور ہو گیا ہو معاف کر دیجئے حالانکہ اس سے کوئی گناہ نہیں ہوا ہوتا۔ اس طرح دوسرا اس کی تسلی کے لئے کہہ دیتا ہے۔ کہ اچھا ہم نے تمہارا قصور سب معاف کیا اسی طرح چونکہ اس خیال سے آپ کو غم رہا کرتا تھا۔ حق تعالیٰ نے تسلی فرمادی۔

آیت برائے تسلی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک و ما تاخر اس میں ایک تو یہ بحث ہے کہ ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ صاحب نبوت کے حق میں جو کہ معصوم ہے یہ بحث جدا گانہ ہے اس کو مسئلہ مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہاں پر مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ پہلے گناہوں کی معافی تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن پچھلے گناہوں کی معافی جو ابھی تک ہوئے ہی نہیں۔ کیا معنی۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ خوف و خشیت کا غلبہ تھا اگر آپ کو آئندہ گناہوں کی معافی دے کر تسلی نہ دی جاتی تو اندیشہ تھا کہ غلبہ خوف سے اسی فکر میں آپ پریشان رہتے کہ کہیں آئندہ امر خلاف مرضی نہ ہو جائے۔ اس لئے آپ کو آئندہ کے لئے بھی مطمئن کر دیا گیا۔ دوسری آیت اس کی موید یہ ہے کہ حق جل و علی سلیمان علیہ السلام کو فرماتے ہیں کہ هذا عطاء نافع لمن او امسک بغیر حساب۔ اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ بغیر حساب کو عطاء نا کے متعلق کیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ عطا بے حساب ہے یعنی کثرت سے ہے اور دوسرا احتمال اور وہ بہت مرجع معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ بغیر حساب کو فائز اور امسک دونوں کے متعلق کیا جائے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ آپ پر دینے اور روک دینے میں کوئی حساب متعلق کیا جائے اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ آپ پر دینے اور روک رکھنے میں کوئی حساب اور مواخذہ نہیں۔ چونکہ سلیمان علیہ السلام کو بوجہ غلبہ خوف کے ہر عطاء و امساک میں یہ خیال رہتا کہ شاید یہ عطاء یا امساک بر محل ہوا ہے یا نہیں۔ کہیں دینے میں اسراف یا امساک میں بخل نہ ہو گیا ہو اور یہ ظلمان مانع حضور خاص تھا تو اس لئے سلیمان علیہ السلام کو مطمئن کر دیا کہ عطاء

اساک میں مطلقاً آپ سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ آپ اس کی فکر نہ کریں اور اصل کام میں لگے رہیں۔ مگر ایسے ارشادات اہل خوف کیلئے ہیں کیونکہ ان سے خلاف امر اور عصیان کا صدور ہی مستبعد ہے۔ اب اس سے زیادہ خوف ان کے حق میں مضر ہے۔ اس لئے ان کو اطمینان دلایا جاتا ہے۔

بشارت فتح

اسی لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اول یہ فرمایا گیا کہ لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخرو اہل ظاہر کو ما قبل سے اس کا ربط سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اوپر فرمایا ہے انا فتحنا لک فتحاً مبیناً۔ ہم نے آپ کو فتح مبین عطا کی ہے اور نمایاں کامیابی دی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں تو اہل ظاہر یہاں چکرا جاتے ہیں کہ بشارت فتح سے مغفرت کا کیا جوڑ ہے مگر عشاق نے اس کا ربط سمجھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اصل میں تو فتح کے مضمون پر اتمام نعمت اور ہدایت و استقامت و نصرت و غلبہ کو متفرع کرنا مقصود تھا مگر چونکہ ان چیزوں کا مزہ حضور ﷺ کو اسی وقت آسکتا تھا جبکہ پہلے یہ تسلی کر دی جائے کہ حق تعالیٰ آپ سے راضی بھی ہیں اسی لئے ان بشارات کی لذت کامل کرنے کے لئے پہلے لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک و ماتاخرو۔ فرمایا گیا اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مذاق عشق غالب تھا آپ کو سب سے پہلے اس کی فکر رہتی تھی کہ محبوب راضی بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے اول اس کا اطمینان دلا کر پھر دوسری بشارتوں کو بیان کیا گیا۔ ویتم نعمتہ علیک و یهدیک صراطاً مستقیماً و ینصرک اللہ نصراً عزیزاً۔ کہ اس فتح سے آپ پر نعمت کا کام تمام کرنا مقصود ہے اور آپ کو صراط مستقیم پر پہنچانا اور نصرت الہی کے ساتھ (مخالفین پر) پورا غلبہ دینا منظور ہے۔

لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک و ماتاخرو تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں۔

عاشقانہ نکتہ

یہاں ایک عاشقانہ نکتہ ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ذنب کا اطلاق کیا گیا۔ حالانکہ واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ذنب سے پاک ہیں۔ یہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید مجھ سے کچھ گناہ ہو گیا ہو۔ تو اس شبہ کو بھی رفع فرما دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے عاشق اپنے محبوب سے رخصت ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میری خطا معاف کر دیجئے گا۔ حالانکہ عاشق سے خطا کا احتمال کہاں۔ خصوصاً ایسا عاشق جو عشق کے ساتھ عقل بھی کامل رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے۔

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ

ترجمہ: ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔

طاعت بڑی چیز ہے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ طاعت بڑی چیز ہے اس کے آثار چہرہ تک پر ظاہر ہونے لگتے ہیں اس سے ایک قسم کی ملاحظہ اور نور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے۔

نور حق ظاہر بود اندر ولی نیک بین باشی اگر اہل دلی
خوب ترجمہ کیا ہے

مرد حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور
سیمام فی وجوہہم من اثر السجود کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ بخلاف نافرمانی کے کہ اس سے چہرہ
پر ظلمت اور وحشت برسنے لگتی ہے۔ ظاہری حسن اور جمال کو بھی خاک میں ملا دیتی ہے اور باطن کو اس قدر خراب
اور برباد کرتی ہے کہ قریب قریب باطن تو مردہ ہی ہو جاتا ہے حدیث میں ہے کہ معصیت سے دل پر ایک سیاہ دھبہ
پیدا ہوتا ہے اگر توبہ نہ کی تو وہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ سارے قلب کو گھیر لیتا ہے۔ اسی کو مولا نافرمانتے ہیں۔

ہر گناہ زنگے است بر مراۃ دل دل شود زین زنگ ہا خوار و نخل
چون زیادت گشت دل را تیرگی نفس دون را پیش گرد و خیرگی

خط کا جواب

قال اللہ تعالیٰ فاؤلئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء
والصالحین یہ آیت نص ہے ان سب طبقات کی تعداد و تکرار میں۔ مگر دوسری نص قطعی سے نبوت کا ختم ثابت
ہے اور دوسرے طبقات کا ختم ثابت نہیں پس وہ عام ہوگا اس امت اور ام سابقہ کو۔ پس اس امت میں بھی
صدیقین متعدد ہیں جیسے شہداء متعدد ہیں صالحین متعدد ہیں اس سے زیادہ سورہ حدید کی آیت اس میں نص ہے۔
والذین امنوا باللہ ورسولہ اولئک ہم الصدیقون والشہداء الخ۔ اس سے واضح ہے کہ جب تک
سلسلہ ایمان کا جاری ہے صدیقیت کا بھی جاری ہے۔ پس الصدیقین کا اس امت میں بھی کثیر ہونا ثابت ہوا۔
البتہ درجات میں تفاوت ہونا اور بات ہے۔ حضرت خلیفہ اول اعظم الصدیقین ہیں۔ حضرت امام مہدی کی نسبت
تصریح تو نہیں دیکھی باقی ظاہر اوہ ضرور اس رتبہ سے مشرف ہیں اور حضرت عائشہ کا صدیقہ ہونا اسی اعتبار سے
ہے جس اعتبار سے اور صدیقین کا صدیق ہونا۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱ ص ۱۹۷)

سُورَةُ الْحُجُرَاتِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا

تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ

لَا تَشْعُرُونَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں گے اور تم کو خبر بھی نہیں ہوگی۔

تفسیری نکات ایذا رسول کفر ہے

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجهروا له بالقول عرب میں بے تکلفی بہت زیادہ تھی بڑے بڑے لوگوں کے نام دیتے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی بعض نے لیا خدا تعالیٰ نے اس تعلیم میں اس کی ممانعت فرمائی اور یہ فرمایا کہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ تمہارے اعمال حبط نہ ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو انتم لا تشعرون۔ کے معنی میں یہ سمجھا ہوں کہ حبط ہوتا ہے ایذا سے اور ایذا ہوتی ہے ایسے شخص کی بے ادبی سے جو مؤدب سمجھا جاتا ہو اور یہ فطری قاعدہ ہے چنانچہ حکام کو دیکھو کہ دیہاتیوں سے بہت سی باتیں گوارا کر لیتے ہیں جو کہ شہریوں سے ہرگز گوارا نہیں ہو سکتیں۔ ایک دیہاتی کی حکایت ہے کہ اس نے ایک درخواست پیش کی تو کاغذ پر ٹکٹ نہیں لگایا اور جب حاکم نے اس سے کہا کہ اس پر ٹکٹ لگاؤ تو روپیہ جیب سے

نکال کر کہتا ہے لے رو پیسے بس تیری صاحبی معلوم ہوگئی اس میں سے ٹکٹ لگا لیجو جو بچے رکھ لیجو جو حاکم ہنس کر خاموش ہو گیا اور درخواست مفت لے لی بھلا کوئی شہری تو ایسا کر کے دیکھے کہ اس کی کیا گت بنتی ہے اسی کو کہتے ہیں۔

ملت عاشق زملعہا جداست عاشقان را مذہب و ملت جداست
(عاشق کا مذہب سارے مذہبوں سے جدا ہے اور ان کا ملک سب سے الگ ہے)

گر خطا گوید در اخطایے بگو در رشود پر خون شہیداں را مشو
(اگر وہ غلط ہے تو ان سے غلط گو مت کہو اور اگر وہ شہید ہو جائے تو اس کا خون مت دھو)

موسیا آداب دانا دیگر اند سوختہ جاں در دانا دیگر اند
(کالے بال والے اور آداب سے واقف دوسرے ہیں اور سوختہ جان اور روح والے دوسرے ہیں)

تو دیکھئے خود فرماتے ہیں کہ موسیا آداب دانا دیگر اند۔ اس لئے مولانا فرماتے ہیں کہ

با ادب تر نیست زو کس در جہاں بے ادب تر نیست زو کس در جہاں

عشاق کی قسمیں

اس کی کئی تو جیہیں ہو سکتی ہیں منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض عشاق بہت با ادب ہوتے ہیں اور بعض مغلوب الحال ہوتے ہیں اور پہلوں کو فوراً تنبیہ ہوتی ہے چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ بارش پر یہ فرمایا کہ آج کیسے موقع سے بارش ہوئی ہے فوراً تنبیہ کی گئی کہ او بے ادب! اور بے موقع کس روز ہوئی تھی سن کر ہوش اڑ گئے اور مواخذہ بالکل سچا ہے کیونکہ بے موقع کبھی بھی نہیں ہوتی تو با ادب جب بے تمیزی کرتا ہے تو بہت ناگواری ہوتی ہے اس کی اصلاح اس آیت میں فرماتے ہیں اور اس کی متعدد جگہ اصلاح فرمائی ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرِ نَظَرٍ فِيهَا وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعَمْتُمْ فَانْتَشِرُوا وَلَا مَسْتَأْذِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَلِكَ كَانَ يُؤْذَى النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ۔ ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ اے مومنو تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بجز دعوت کے ویسے مت جاؤ اور اس میں بھی پہلے سے جا کر انتظار تیاری میں مت بیٹھو بلکہ جب بلایا جاوے جاؤ اور کھاتے ہی منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں مشغول ہو کر مت بیٹھ جاؤ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا ہوتی ہے اور وہ لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کیوں شرمائے وہ تو خدا تعالیٰ ہیں۔ دیکھئے اس انداز سے کیا صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے کیسا بیدھڑک فرما دیا کہ واللہ لا يستحي من الحق ایک جگہ ارشاد ہے لا تكونوا كالذين اذوا موسى فبراه الله مما

قالوا. (ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی تھی۔ بس اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قول سے بری کر دیا) غرض اس کا بہت اہتمام فرمایا گیا ہے کہ ایذا نہ ہو۔ تو ایذا اور رسول حرام ہے اور اس کا وہ اثر ہے جو کہ کفر کا ہے اور بعض اوقات یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ایذا ہوئی ہے یا نہیں اور اعمال حبط ہو جاتے ہیں اس لئے ارشاد ہوا کہ وہ کام بھی نہ کرو جس میں ایذا کا احتمال بھی ہو اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں البتہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حبط کے کچھ اور معنی ہیں تو خیر لیکن اس وقت تک مجھے یہی معلوم ہے کہ حبط کے یہی معنی ہیں تو معاصی میں صرف یہ معصیت ایسی ہے البتہ کفر تو ایسی چیز ہے کہ طاعت کی بقا اور صحت دونوں اس کے ترک پر موقوف ہیں۔ اور بعض معاصی ایسے ہیں کہ ان کا ترک ہی شرط بقا عمل ہے یعنی عمل تو صحیح ہو گیا تھا لیکن وہ معلق رہا کہ اگر وہ عمل نہ ہوتا تو باقی رہتا ہے ورنہ باطل ہو جاتا ہے چنانچہ قرآن شریف میں ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى.** (اے مومنو اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل مت کرو) لا تبطلوا کے معنی یہ ہیں کہ قبل من واذی ثواب تو ہوا تھا لیکن وہ من واذی سے پھر جاتا رہا غرض بعض معاصی کو یہ دخل ہوا پس ہمارے اس دعوے میں کہ معاصی سے طاعات کا ثواب زائل نہیں ہوتا معاصی سے مراد ایسے معاصی مذکور نہیں ہیں بلکہ وہ معاصی مراد ہیں جن کے وجود کو طاعت کے وجود یا بقا میں دخل نہ ہو ایسے گناہوں میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ان سے نیکیاں ضائع نہیں ہوتیں اور اس کی ایک اور بھی دلیل ہے فرماتے ہیں۔ **ان الحسنات يذهبن السيئات.** (درحقیقت نیکیاں برائیوں کو ختم کرتی ہیں) تو گناہ کرنے سے اگر نیکیوں کا ثواب نہ ملے تو نیکیوں میں یہ اثر جو مصرح ہے کہاں سے آئے گا اور اس سے ایک بڑی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ گناہوں سے تو نیکیاں نہیں ٹٹیں۔ لیکن نیکیوں سے گناہ دھل جاتے ہیں تو یہ نہایت قوی دلیل ہے۔ البتہ اس کے متعلق یہ مستقل تحقیق ہے کہ سینات سے مراد یہاں صفائے ہیں یعنی نیکیوں سے جو گناہ معاف ہوتے ہیں وہ صغیرہ ہیں اور کبائر صرف توبہ سے یا فضل بلا وعدہ سے معاف ہوتے ہیں۔ البتہ ایک روایت سے شبہ ہوتا ہے کہ صغیرہ بھی جب معاف ہوتا ہے کہ جب کبیرہ سے بچا رہے کیونکہ حدیث میں ما اجتنب الكبائر نیز ایک آیت سے بھی یہ شبہ ہوتا ہے۔ آیت یہ ہے **ان تجتنبوا كبائر ما تنهون عنه نكفر عنكم سيئاتكم.** (اگر تم کبیرہ گناہوں سے جس سے کہ تمہیں روکا جاتا ہے بچتے رہو ہم اسے تمہارے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنا دیں گے۔ اب ضرورت ہے اس حدیث اور آیت کے معنی سمجھنے کی تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفارات لما بینھن ما اجتنب الكبائر اور ما عام ہے تو ترجمہ یہ ہوا کہ سارے گناہوں کا کفارہ تو جب ہی ہے کہ کبائر سے بچے ورنہ سب کا نہیں بلکہ صرف صفائے کا ہوگا یہ لازم نہیں آتا کہ صغیرہ بھی معاف نہ ہو اور آیت کے معنی اس سے بھی زیادہ

صاف ہیں۔ یعنی ان سبقتینوا میں ایک شرط کی دو جزائیں ہیں۔ نکفرہ اور ندخلکم مدخلا کریمعا (ہم تمہیں بہترین جگہ داخل کریں گے) پس اس مجموعہ کیلئے جزا میں بیشک یہی شرط ہے کہ کبائر سے بھی بچے اور اگر کبائر صادر ہوئے تو مجموعہ مرتب نہ ہوگا۔ یعنی مدخلا کریمعا بمعنی دخول جنت بلا عقاب و عتاب تو یہ یا فضل پر موقوف ہوگا پس اب وہ شبہ نہ رہا اور یہ ثابت رہا کہ گناہ معاف ہوتے ہیں حسنات سے تو اگر نیکیاں قبول نہ ہوتیں تو اس میں یہ اثر کہاں سے ہوا پس معلوم ہوا کہ قبول تو ہوئیں لیکن ان میں برکت نہیں ہوئی اور یہ برکت نہ ہونا اس حدیث سے ثابت ہے۔

فرماتے ہیں کہ اگر گناہوں سے نہ بچے تو کھانا پینا چھوڑنے سے کیا فائدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فائدہ کی نفی فرما رہے ہی اور یہ میں پہلے بدلیل کہہ چکا ہوں کہ روزہ ہو جاتا ہے باوجود گناہوں کے بھی تو جو فائدہ منفی رہا وہ روزے کی برکت ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوِيكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ

لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ ۝۴

ترجمہ: مسلمان تو سب بھائی ہیں سواپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔

تفسیری نکات

موصوف کے حکم کی علت صفت ہوتی ہے

انما المؤمنون اخوة۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس میں حق تعالیٰ نے حکم اخوت کو صفت مؤمن پر مرتب فرمایا ہے اور اصول کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی صفت پر حکم مرتب ہوتا ہے وہاں وہ وصف حکم کی علت ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ ہم میں جو اخوت کا تعلق ہے اس کی علت ایمان ہے اور وہی اخوت مطلوب ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو صاحبو آج کل جو اتحاد و اتفاق کو بقائیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی بلکہ ہوائے نفس یا معاصی پر ہوتی ہے اس لئے وہ بہت جلد ہوا ہو جاتا ہے یعنی فنا اس لئے اگر اتفاق کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد ایمان پر قائم کرو۔ مگر آج کل تو ایمان کو ایسی بے قدر چیز سمجھ رکھا ہے کہ اس کی کچھ وقعت ہی نہیں جس کام کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے اس کے متعلق لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ملائوں کا

کام ہے چنانچہ آج کل زبانوں پر یہ بات بہت کثرت سے ہے کہ یہ وقت نماز روزہ کا نہیں اتحاد کا وقت ہے اور جب کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کرتا ہے کہ اتحاد کی وجہ سے احکام شرعیہ کا فوت کرنا جائز نہیں تو نہایت بے باکی سے جواب دیا جاتا ہے کہ یہ وقت جائز و ناجائز کا نہیں۔ کام کا وقت ہے اور غضب یہ کہ اس متن پر بعض اہل علم نے یہ حاشیہ چڑھا دیا کہ اتفاق و اتحاد وہ چیز ہے کہ اس کے قائم کرنے کے لئے غزہ احزاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازیں قضا کر دی تھیں بتلائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کس سے اتحاد کر رہے تھے جو اتحاد کی وجہ سے نمازیں قضا ہوئیں بلکہ وہاں تو عدم اتحاد اس کا سبب ہوا تھا کفار سے مقابلہ اور لڑائی تھی نہ کہ اتحاد کی گفتگو۔

مطلق اتحاد محمود نہیں

پس اتحاد کی بھی ہر فرد مستحسن نہیں اس کو علی الاطلاق محمود کہنا اتحاد کا ہیضہ ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل اتحاد کے فضائل تو بہت بیان کئے جاتے ہیں مگر اس کے اصول حدود بیان نہیں کئے جاتے پس خوب سمجھ لو کہ خدا سے نا اتفاقی کرنے پر اتفاق کرنا مذموم اور نہایت مذموم ہے پس اس سے اس اتحاد کا حکم سمجھ لیا جاوے جس میں اتحاد کے لئے شریعت کے احکام کو چھوڑا جاتا ہے صاحبو جیسے اتفاق مستحسن ہے ایسے ہی کبھی نا اتفاقی بھی مستحسن ہے پس جو لوگ خدا تعالیٰ کے احکام چھوڑنے پر اتفاق کریں ان کے ساتھ نا اتفاقی کرنا اور مقابلہ کرنا محمود ہے دیکھو جیسے عمارت بنانا محمود ہے ایسے ہی بعض عمارت کا گرانا بھی محمود ہے اگر آپ اپنی رعایا سے کوئی مکان خریدیں اور اس میں بجائے کچھ کوٹھڑیوں کے عمدہ کوشی بنانا چاہیں تو پہلی عمارت کو گرائیں گے یا نہیں یقیناً گرائیں گے۔ اب بتلائے یہ افساد محمود ہے یا مذموم۔ اس کے محمود ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں ہوتا پھر کسی موقع پر نا اتفاقی کے محمود ہونے میں کیوں شبہ ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس طرح بھی صلح کرادو بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ صحیح بنیاد پر صلح کرادو اور اگر لوگ اس پر راضی نہ ہوں تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھا دو پھر قتال کے بعد اگر طائفہ باغیہ حق کی طرف رجوع ہو جائے تو حکم یہ ہے کہ فان فاءت فاصلحوا بینہما بالعدل و اقسطوا۔ یعنی اب پھر ان کے معاملہ کی انصاف کے ساتھ اصلاح کرو۔ یہ نہیں کہ بس لڑائی موقوف ہوتے ہی ان کا مصافحہ کرادو۔ اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں بعض لوگ صلح کرانا اس کو سمجھتے ہیں کہ جہاں دو آدمیوں میں نزاع ہو فوراً دونوں کا مصافحہ کرادیا چاہے فریقین کے دل میں کچھ ہی بھرا ہو میں کبھی ایسا نہیں کرتا بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلے معاملہ کی اصلاح کرو پھر مصافحہ کرو ورنہ بدوں اصلاح معاملہ کے نرا مصافحہ محض بیکار ہے اس سے فریقین کے دل کا غبار نہیں نکلتا تو مصافحہ کے بعد پھر مکافحہ شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی مقاتلہ تو حق تعالیٰ نے فاءت کے بعد یہ نہیں فرمایا فکفوا یدیکم۔ کہ زیادتی کرنے والا حق کی طرف رجوع ہو تو بس تم ہاتھ روک لینے پر اکتفا کرو بلکہ فرماتے

ہیں کہ جب دوسرا فریق زیادتی چھوڑ دے تو اب پھر اصلاح کی عدل کے ساتھ کوشش کرو یہ قید یہاں ایسی بڑھائی گئی ہے جس پر ساری عقول قربان ہیں کیونکہ نزاع بدوں اس کے ختم ہو ہی نہیں سکتا مگر اس نکتہ پر کسی کی عقل نہیں پہنچتی۔ بہر حال اصلاح کے نہ یہ معنی ہیں کہ صاحب حق کو دبایا جائے نہ یہ معنی ہیں کہ محض مصافحہ کرادیا جائے بلکہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کیا جائے اس پر فریقین اتفاق کر لیں تو خیر ورنہ اس اتفاق کی طرف لانے کے لئے فریق مہطل سے نا اتفاقی اور قتال کا حکم ہے۔

وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا

ترجمہ: کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے

غیبت کی مثال

یہ حکم بھی منع کے لئے کافی تھا مگر اس کو ایک گندی مثال سے موکد فرمادیا جو ناگوار طبعی ہے تاکہ غیبت سے ایسی نفرت ہو جائے جیسی اس مثال میں ہے مثال یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے۔ اول تو مردار ہی سے نفرت ہوتی ہے پھر اپنے بھائی کا گوشت یہ کیسی گندی مثال ہے اس کا تصور کرنے کے بعد تو غیبت سے ضرور ہی نفرت ہو جائے گی۔ جس شخص کی غیبت کی جاتی ہے وہ چونکہ موجود نہیں ہوتا اور اس وجہ سے وہ اس غیبت کا جواب کچھ نہیں دے سکتا ہے۔ جیسے مردہ کہ وہ بھی مدافعت نہیں کر سکتا اور اس بناء پر اس کا گوشت کھانا عقلاً و طبعاً مکروہ ہے لہذا مثال میں غیبت کو مردہ کا گوشت کھانا بتلایا گیا کہ وہ بھی عقلاً و طبعاً مکروہ ہے۔

غیبت کی سزا

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے شب معراج میں کچھ آدمی دیکھے کہ وہ اپنے مونہوں کو اپنے ہاتھوں سے نوج رہے تھے۔ اور ناخن ان کے تانے کے تھے اور وہ غیبت کرنے والے تھے۔ دیکھے غیبت کس قدر بری چیز ہے۔ آخر ہم جب ایمان رکھتے ہیں تو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کا کچھ تو اثر ہونا چاہیے۔ کبھی تو یہ خیال آنا چاہیے کہ گناہ کا انجام یہ ہوگا دنیا کی ذرا سی بھی تکلیف نہیں جھیلی جاتی تو یہ عذاب کیسے اٹھائیں گے۔

قُلْ لَا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُم بَلِ اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ

لِلْإِيمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۶۱﴾

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھوں بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم سچے ہو۔

صرف حسنات میں مرتبہ خلق نظر ہونا چاہیے

فرمایا کہ جن لوگوں کی نسبت مع اللہ راسخ ہو چکتی ہے اگر وہ ماہل الی المعصیت نہ ہوں اور جن پر خوف خداوندی کی براں تیغ ہر دم کشیدہ رہتی ہے اگر وہ پاک باز ہوں تو کوئی عجیب بات نہیں البتہ ان پر خدا کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان کیفیات کی طریان ہو کر ان کے لئے حال بن گئیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے قل لا تمنوا علی اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ہدکم للإیمان ان کنتم صدقین البتہ جن لوگوں کو ہنوز نسبت مع اللہ نہیں ہوئی اور پھر بھی وہ معاصی کے چھوڑ دینے کی ہمت کرتے ہیں اور اپنے اوپر جبر کر کے اپنے کو صالح بناتے ہیں ان کا بڑا اکمال ہے اگرچہ اصل توفیق ان کو بھی خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے ان کے اختیار میں کچھ نہیں لیکن تاہم یہ مجاہدہ میں قابل مدح ہیں اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب اہل نسبت کی اطاعت کوئی زیادہ قابل مدح نہیں ہے تو غیر اہل نسبت کی معصیت بھی قابل ملامت نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ مطیع کا اپنے کو ممدوح نہ سمجھنا تو اس بناء پر تھا کہ جو امر داعی الی الطاعة ہے وہ خدا کی جانب سے ہے پس عاشق کا اپنے کو قابل ملازمت نہ سمجھنا بھی اسی بناء پر ہوگا تو یہ امر بالکل خلاف ادب ہے حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

گنہ اگرچہ نہ بود اختیار ما حافظ تو در طریق ادب کوش کیں گناہ منست

لوگوں میں مشہور ہے کہ اس کے معنی بہت مشکل ہیں بوجہ اس قول کے ”بنود اختیار ما“ اور بظاہر معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے یہ شعر بالکل صاف ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ بروئے عقل و نقل ثابت ہے کہ ہر عمل میں ایک مرتبہ خلق کا ہے اور ایک مرتبہ کسب کا ہے اور مرتبہ خلق صرف خدا تعالیٰ کیلئے ہے اور مرتبہ کسب بندہ کے لئے۔

سو یوں تو ہر فعل میں یہ دونوں ہی مرتبے ہیں لیکن ادب یہ ہے کہ ہم کو حسنات میں تو صرف مرتبہ خلق پر التفات چاہیے اور مرتبہ کسب عہد پر نظر نہ چاہیے اور معاصی میں مرتبہ خلق پر نظر نہ کی جائے بلکہ ہر دم اپنے کسب پر التفات چاہیے پس بنود اختیار مرتبہ خلق کے اعتبار سے ہے اور کیں گناہ مرتبہ کسب میں پس اس سے کسب کا غیر اختیاری ہونا لازم نہیں آتا ہے۔

سُورَةُ وَت

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۗ

﴿تَنْجِيحًا﴾: اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں

تفسیری نکات

کمال علم حق سبحانہ و تعالیٰ

یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو عایت درجہ علم و حکمت اور قدرت کی دلیل ہے کیونکہ انسان تمام مخلوق میں سب سے زیادہ عاقل اور ہوشیار اور ذی علم ہے تو سمجھ لو کہ اس کا پیدا کرنے والا کیسا ذی علم ہوگا) اور ہم ان باتوں کو بھی جانتے ہیں جو اس کے نفس میں بطور وسوسہ کے گذرتی ہیں (کیونکہ اس کا فشاء حرکت قلب ہے اور اس حرکت کو بھی ہم ہی پیدا کرتے ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ انسان کے قبضہ میں یہ وسوساں نہیں ہیں تو جو وسوساں کو بھی جانتا ہے جن کا قیام بھی قلب میں نہیں ہوتا وہ انسان کے ارادہ اور عزم کو کیوں نہ جانے گا جس کا قلب میں قیام ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر اعمال جو ارج و اقوال لسان کو کیوں نہ جانے گا جو سب کو محسوس ہوتے ہیں گو بوجہ عرض ہونے کے ان کو خود قیام نہیں مگر پھر بھی مجال اللذات (ذات کے تابع ہو کر) ان کا ادراک مخلوق کو بھی ہوتا ہے تو خالق کو کیوں نہ ہوگا اور جب وہ وسوساں قلب اور ارادہ و عزم اور افعال و اقوال کو جانتا ہے تو اجزاء مستحیلہ متفرقہ کو جو جو اہر و اعیان ہیں کیونکہ نہ جانے گا) یہ تو سابق کی دلالت تھی اس استدلال پر آگے سیاق تو بہت ہی صریح ہے فرماتے ہیں وَنَحْنُ اقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۔ کہ ہم اعتبار علم کے اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں (رگ سے مراد یہاں پردہ رگ ہے جس کا اتصال شرط حیوة ہے اور

حیوة کا مدار اس نفس وروح ہے مقصود یہ ہے کہ ہم انسان کے نفس وروح سے بھی زیادہ اس کے احوال کو جانتے ہیں کیونکہ ہمارا علم قدیم ہے اور حضوری اور انسان کے نفس وروح کا علم حادث ہے خواہ حضوری ہو یا حصولی اور حصولی تو فی نفسہ بھی ناقص ہے (۱۲) علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں اقربیت سے اقربیت بالعلم مراد ہے۔ پس ونحن اقرب الیہ من جبل الوردیہ۔ (ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں) یہاں ایسا ہے جیسا الایعلم من خلق کے بعد وهو اللطیف الخبیر۔ (حالانکہ وہ باریک بین اور صاحب علم ہے) تھا حاصل دونوں کا ایک ہے کہ خالقیت سے عالیت پر استدلال کیا گیا ہے اور علم الہی کا کمال ثابت کیا گیا ہے جس سے امکان معاذ کو ثابت کر کے استبعاد کو رفع کرنا مقصود ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ ان وساوس پر مواخذہ ہوگا یا نہیں بلکہ صرف علم وساوس سے کمال علم کو ثابت کرنا مقصود ہے خوب سمجھ لو پس اس آیت سے وساوس پر مواخذہ کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔

وساوس غیر اختیار یہ پر مواخذہ نہیں ہوگا

اور جس آیت سے اول نظر میں وساوس پر مواخذہ کا شبہ ہو سکتا تھا حق تعالیٰ نے اس کو بہت صاف اور صریح طور پر رفع فرمادیا ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوه یحاسبکم بہ اللہ فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء واللہ علی کل شیء قدیور۔ (اور اگر تم ظاہر کرو ان باتوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں یا چھپاؤ بہر حال اللہ تعالیٰ تم سے ان کا محاسبہ فرمائیں گے پھر جس کو چاہیں گے معاف کر دیں گے اور جس کو چاہیں گے عذاب دیں اور اللہ تعالیٰ کو ہر بات پر قدرت ہے) یہاں بظاہر لفظ ما عام ہے وساوس غیر اختیار یہ اور خیالات اختیار یہ سب کو اور عموم ہی کی وجہ سے صحابہ کو اشکال ہوا تھا مگر اس کا منشاء عدم علم نہ تھا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ امور غیر اختیار پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے کیونکہ یہ مسئلہ عقلیہ بھی ہے بلکہ غلبہ خشیت سے ان کو عموم کا شبہ ہوا کیونکہ لفظ بظاہر عام تھا اور خشیت وہ چیز ہے کہ جب اس کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت علم پر نظر نہیں رہتی۔ صحابہ نے اس شبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کیونکہ آپ پر غلبہ ادب تھا ادھر وحی قطعی سے رفع اشتبہ کی امید تھی اس لئے آپ نے خود تفسیر کی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی مدح میں یہ آیات نازل ہوئیں۔ امن الرسول بما انزل الیہ من ربه والمؤمنون۔ (اعتقاد رکھتے ہیں رسول اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا احکام منزلہ من اللہ پر بڑا کمال ایمان ہے کہ ہر حکم پر دل سے راضی ہو جاتے ہیں اور سمعنا واطعنا (ہم نے سنا اور خوشی سے مانا) کہتے ہیں اس کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر فرمائی۔ لا یکلف

اللہ نفساً الاوسعها لها ما كسبت و عليها ما اكتسبت. (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کو اس کا ثواب ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے) یعنی حق تعالیٰ وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتے اور وساوس غیر اختیاری ہیں تو ان پر مواخذہ نہ ہوگا اس آیت سے پہلی آیت کی تفسیر ہوگئی کہ اس میں ما فی انفسکم. (جو تمہارے دلوں میں ہے) سے عزم و ارادہ مراد ہے۔ جو ما کسبت و اکتسبت۔ (جو ارادہ سے کرے) میں داخل ہے نہ کہ وسوسہ رہا یہ کہ احادیث میں تو یہ آتا ہے کہ دوسری آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا اور تمہاری تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان تبدیل نہیں بیان تفسیر ہے اس کا جواب قاضی ثناء اللہ صاحب نے خوب دیا ہے کہ سلف کی اصطلاح میں نسخ عام ہے وہ بیان تفسیر کو بھی نسخ ہی سے تعبیر کر دیتے ہیں واقعی یہ بہت قیمتی تحقیق ہے اور جو شخص احادیث میں غور کرے گا اس کو اس کی قدر معلوم ہوگی اور تتبع سے اس تحقیق کی صحت معلوم ہو جائے گی اب بحمد اللہ سب اشکالات رفع ہو گئے اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ ممکن ہے آیت ونعلم ما توسوس به نفسه. (ہم ان باتوں کو خوب جانتے ہیں جو اس کے دل میں بطور وسوسہ کے گزرتی ہیں) نزولاً موخر ہو اور لا یكلف اللہ نفساً الا وسعها (حق تعالیٰ شانہ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) مقدم ہو تو موخر مقدم کے لئے نسخ ہو جائے گا اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ تاریخ دیکھو علماء مفسرین نے تصریح کی ہے کہ سورۃ ق پوری مکی ہے اور سورۃ بقرہ مدنی ہے دوسرے سورۃ ق کی یہ آیت مواخذہ علی الوساوس (وسوسوں کے مواخذہ پر) اور سورۃ بقرہ کی آیت عدم مواخذہ میں صریح ہے اور غیر صریح صریح کے لئے نسخ نہیں ہو سکتا۔ کلام بہت بڑھ گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ نماز میں اگر خود بخود وساوس آویں تو وہ ذرا مضرب نہیں ہاں ارادہ سے لانا برا ہے اور بلا ارادہ کے آئیں تو آئیں تم پرواہ نہ کرو اب جس شخص کو یہ مطلوب حاصل ہو اس کا پھر یہ شکایت کرنا کہ ہائے مجھے وساوس بہت آتے ہیں اس کی دلیل ہے کہ وہ مقصود کا طالب نہیں کسی اور چیز کا طالب ہے اور وہ وہی ہے حظ نفس کیونکہ اگر وساوس بالکل نہ آئیں اور محویت کی سی حالت ہو جائے تو اس میں لذت خوب آتی ہے اور نفس کو کشاکشی سے نجات رہتی ہے۔ اس حظ نفس کی وجہ سے یہ شخص لذت و محویت کا طالب ہے گو اس کو نہ دنیا مقصود ہے نہ جاہ وغیرہ لیکن ایک غیر مقصود کا تو طالب ہے اور اب تک حظوظ میں پڑا ہوا ہے۔

وسوسہ گناہ نہیں

مثلاً ایک آیت میں ہے ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس به نفسه. اس سے ظاہر متبادر ہو سکتا ہے کہ وسوسہ بھی گناہ ہے حالانکہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے تجاوز اللہ عن امتی ما وسوست

بہ صدورھا۔ یعنی حق تعالیٰ نے میری امت کے قلبی وسوسوں کو معاف فرمادیا ہے۔ سو دونوں نصوص میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن اس تقریر سے یہ تعارض رفع ہو گیا کیونکہ میں نے بیان کیا ہے کہ وسوسہ گونا گونا نہیں مگر منع اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ کبھی ذریعہ گناہ کا بن جاتا ہے اور یہ شریعت کا انتظام ہے کہ منہیات کے ذرائع سے بھی نہی فرمائی ہے سو حدیث ظاہر حقیقت پر محمول ہے اور آیت میں جو کچھ وسوسہ کی برائی ظاہر معلوم ہوتی ہے وہ بطور پیش بندی کے ہے اور میں نے ظاہر اس لئے کہا کہ اگر غور کیا جائے تو واقع میں آیت میں وسوسہ پر وعید ہی نہیں ہے بلکہ صرف اپنے احاطہ علمی کا بیان فرمایا ہے جیسے دوسری آیت میں ہے انہ علیم بذات الصدور الایعلم من خلق فرماتے ہیں انہ علیم بذات الصدور آگے اس کی دلیل ہے الایعلم من خلق سبحان اللہ قرآن کی کیا بلاغت ہے یعنی یہ بات تو پہلے سے معلوم ہے کہ سب چیزیں پیدا کی ہوئی خدا تعالیٰ کی ہیں اور خلق مسبوق بالعلم ہوتا ہے تو اپنی پیدا کردہ چیز کا علم دلیل عقلی سے ثابت ہوا اس واسطے بطور انکار اور تعجب کے فرمایا الایعلم من خلق کیا خدا تعالیٰ اپنی پیدا کی ہوئی چیز کو نہ جانے گا ضرور جانے گا اور دل کی باتیں بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں تو ان کو بھی ضرور جانے گا اس سے ظاہری محسوسات کا علم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا جس کا اوپر ذکر ہے واسر و اقولکم او اجہرو ابہ تو اس سے احاطہ علم کا بیان کرنا منظور ہے نہ یہ کہ جس چیز کے متعلق علم ہو وہ بری اور گناہ ہے ورنہ لازم آتا ہے کہ تمام ذات الصدور اور قول سر اور قول جہر سب گناہ ہی ہوں حالانکہ یہ بڑا ہتہ متعجب نہیں تو اسی طرح اس آیت میں سمجھ لیجئے ونعلم ما تو سوس بہ نفسہ کہ اس میں احاطہ علم کا بیان فرمانا مقصود ہے۔ چنانچہ یہاں بھی پہلے ولقد خلقنا الانسان موجود ہے تو اس آیت میں ما تو سوس پر وعید نہیں اور اس سے پیچھے ونحن اقرب الیہ میں تاکید ہے اسی احاطہ علم کی اور توضیح ہے اس دعویٰ کی یعنی ہمارے علم میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ہم تو اس کی جان کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ تو آیت ما تو سوس بہ نفسہ سے شبہ وسوسہ کے گناہ ہونے کا کیا جائے جیسا نعلم کے افتران سے متوہم اس بناء پر ہو گیا تھا کہ بعض آیات میں اثبات وعید بھی مقصود ہے۔

غیر اختیاری وسوسوں سے ڈرنا چاہیے

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وسوسوں کے متعلق بعض اغلاط کا ذکر کر دیا جائے وہ یہ ہے کہ آج کل ایک جماعت ذاکرین کی اس غلطی میں مبتلا ہو گئی ہے کہ غیر اختیاری وسوسوں سے بہت ڈرتے ہیں حتیٰ کہ بعض کو جان دینے تک کی نوبت آگئی ہے اور اس کی وجہ ان کا ذکاؤ حس اور خوف خدا ہے اور یہ حالت بھی فی نفسہ کوئی بری نہیں ان کو احساس تو ہے باقی عوام تو ہاتھی کے ہاتھی نکل جائیں اور ان کو احساس نہ ہو اور ذاکرین

کی یہ حالت ہوتی ہے کہ مکھی بھی آ بیٹھے تو ناگوار ہوتی ہے اس ہاتھی اور مکھی پر لطیفہ یاد آ گیا۔

وسولہ کی مثال

دہلی میں ایک دیہاتی شخص نان بانی کی دوکان پر گوشت کا سالن خریدنے گیا دوکاندار نے پیالہ میں گوشت دیا دیکھا تو اس میں ایک مکھی بھی تھی۔ دوکاندار سے کہا میاں اس میں تو مکھی ہے تو بیباک دوکاندار کیا کہتا ہے کہ کیا چار پیسہ میں ہاتھی نکلتا خیر یہ تو لطیفہ تھا مقصود یہ ہے کہ جیسا فرق ہاتھی اور مکھی میں ہے۔ بعض لوگوں کو ایک آیت سے دھوکا ہوا ہے۔

واحلل عقدة من لسانی یفقہوا قولی (طہ آیت ۲۷، ۲۸) اور میری زبان سے بنگلی ہٹا دیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت حسین تھے

فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں گرہ تھی۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ باقی ربی یا بعد دعا کے زائل ہوگئی۔ دعایہ ہے واحلل عقدة من لسانی یفقہوا قولی۔ بعض کا قول ہے کہ دعا کے بعد زائل ہوگئی تھی بعض کہتے ہیں عقدہ زائل نہیں ہوا بلکہ ہو گیا وہ بھی قرآن ہی سے تمسک کرتے ہیں کہ فرعون نے کہا ام انا خیر من هذا الذی ہو مہین ولا یکا دیبین دوسری آیت ہے ویضیق صدری ولا ینتلق لسانی الخ اور آیت عقدہ کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دعا میں عقدہ نکرہ ہے خیر اثبات میں جس سے عموم نہیں ہوتا۔ تو سب نہیں زائل ہوا کچھ باقی رہا۔ صرف اتنا زائل ہوا کہ مخاطب بات سمجھ سکتا تھا اور اس دعا پر یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ عام اولیاء حق تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے نبی ہو کر رضا کیوں نہ اختیار کی۔ جواب یہ ہے کہ چونکہ نبی تھے اور جانتے تھے کہ مجھے تبلیغ کا کام کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے کہ کچھ عقدہ زائل ہو جاوے۔ اس واسطے دعا میں یفقہوا قولی بڑھایا یعنی اتنا عقدہ زائل ہو کہ مخاطب بات سمجھ سکے۔ کس قدر ادب کا لحاظ رکھا کہ جتنی مقدار ضروری تھی اس سے زیادہ کا سوال نہیں فرمایا۔ پھر اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ مخاطب جب بات سمجھ سکتے تھے تو حضرت ہارون علیہ السلام کے رسول ہونے کی دعا کیوں کی؟ جواب یہ ہے کہ دعا کی وجہ بھی قرآن سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ یہ بھی میری تصدیق کریں۔ فارسلہ معی رداً یصلقنی تو اپنی تصدیق کرانی مقصود تھی۔ اس تصدیق سے طبعاً ہمت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ مدرس دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ تقریر کر دی طلبہ سمجھیں یا نہ سمجھیں ان کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی روانی تقریر میں فرق آتا ہی نہیں اور ایک وہ کہ اگر طلبہ نہ سمجھیں تو ان کی تقریر میں روانی نہیں ہوتی طبیعت میں بنگلی آتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ طبیعت کے تیز

تھے اور فرعون کا انکار دیکھ کر یہ خطرہ تھا کہ طبیعت میں روانی نہ آئے گی اور یہ مقصد تبلیغ کے منافی ہے۔ اس واسطے فرمایا کہ ہارون علیہ السلام رسول ہو کر تصدیق کریں گے تو طبیعت بڑھ جائے گی اور حق تبلیغ خود ادا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے شاہزادوں کی طرح پرورش پائی ہے۔ فرعون کے گھوڑے پر سوار ہوتے اسی کی طرح کپڑے پہنتے اور بہت خوبصورت تھے اسی واسطے حضرت آسیہ اور خود فرعون دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔ القیت علیک محبة منی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے (ملفوظات حکیم الامت ص ۱۰۲ تا ۱۰۹)۔

ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس به نفسه و نحن اقرب الیہ من حبل الوريد
کہ اس سے بظاہر وسوسہ پر مواخذہ ہونا مفہوم ہوتا ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو انسان کے دل میں کھنکتی رہتی ہیں اور محاورہ قرآنیہ میں یہ لفظ نعلم مواخذہ اور وعید پر دلالت کرتا ہے۔ کثرت سے ایسی آیتیں وارد ہیں اور عام محاورہ بھی اس کے موافق ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ مجھے تمہاری حالت خوب معلوم ہے۔ یعنی ٹھہرے رہو تم کو سمجھوں گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ذرا اس آیت کے اوپر نظر کرو اور سیاق و سباق کو ملاحظہ کرو اور یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھو کہ کسی آیت کی تفسیر محض اس آیت کے الفاظ کو دیکھ کر نہ کرو بلکہ سیاق و سباق کو ملاحظہ کرنا ضروری ہے اور بغیر اس کے تفسیر معتبر نہیں۔ اسی سے بہت جگہ غلطی واقع ہوتی ہے ایسے ہی یہاں بھی سیاق و سباق کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس مقام پر حق تعالیٰ کا مقصود معاد کو ثابت کرنا ہے جس کے لئے شرط ہے کمال قدرت اور کمال علم۔

قرب حق

تو اوپر کمال قدرت کا ذکر تھا کہ ہم نے آسمان کو اس طرح پیدا کیا زمین کو اس طرح بنایا اور اس میں درخت و نباتات پیدا کئے اب کمال علم کو ثابت کرتے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم کو ان وساوس پر بھی اطلاع ہے جو قلب انسان پر گزرتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وساوس نہایت خفی چیز ہیں۔ جب ہم کو ان کا بھی علم ہے تو ہمارا علم نہایت کامل ہے تو اس سے وعید و مواخذہ پر دلالت کہاں ہوئی؟ بلکہ محض کمال علم پر دلالت ہوئی اس لئے آگے بھی سزا کا ذکر نہیں بلکہ قرب کا ذکر ہے۔ و نحن اقرب الیہ من حبل الوريد کہ ہم انسان کے رگ گردن سے زیادہ اس کے قریب ہیں یہ دلیل ہے علم کامل کی۔

رہا یہ سوال کہ اقرب من حبل الوريد کیسے ہیں۔ یہ ایک مستقل سوال ہے سو اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کو کوئی حل نہیں کر سکتا چنانچہ بعض نے تو یہ کہہ دیا ہے کہ یہاں قرب علمی مراد ہے مگر من حبل الوريد کا لفظ بتلا رہا ہے کہ یہاں قرب علمی سے زیادہ کوئی دوسرا قرب بتلانا مقصود ہے کیونکہ حبل الوريد ذی علم نہیں ہے جس سے اقرب ہونا اقربیت فی العلم پر دال ہے بلکہ یہاں قرب ذات پر دلالت مفہوم ہوتی ہے مگر اس کی

کیفیت کو ہم بیان نہیں کر سکتے کیونکہ حق تعالیٰ جو بندہ کے قریب ہیں۔ اس قرب سے قرب علم یا رضا مراد ہے قرب حسی مراد نہیں اس لئے کہ قرب حسی جانین سے ہوتا ہے کیونکہ ایک شے جب کسی شے سے حتماً قریب ہوگی تو لامحالہ وہ شے بھی اس سے قریب ہوگی اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرب جانین سے نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

نحن اقرب الیہ من جبل الورد

یہاں اتم اقرب الیہ نہیں فرمایا۔ نحن اقرب الیہ فرمایا یعنی ہم بہت قریب ہیں تو معلوم ہوا کہ قرب خدا کی طرف سے ہے ہماری طرف سے نہیں پس یہاں اس قرب سے قرب علمی مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس به نفسه و نحن اقرب الیہ من جبل الورد

اس آیت میں نعلم پر قرب کو مرتب فرمایا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس قرب سے مراد قرب علمی ہے یعنی جیسا خدا کو علم ہے بندہ کا بندہ کو اس کا ذرہ بھر بھی نہیں باقی حقیقت کے اعتبار سے حق تعالیٰ کو بندہ سے بہت بعد ہے وہ وراء الورد اتم وراء الورد ہے۔ بندہ کو اس سے کیا نسبت یہ تو اس کا تصور صحیح بھی نہیں کر سکتا۔

کیفیت سے منزہ ہیں۔ ان کا قرب بھی کیفیت سے منزہ ہے۔ مگر تقریب فہم کے لئے اتنا بتائے دیتا ہوں کہ ہم کو جو اپنی ذات سے قرب ہے یہ قرب وجود کی فرع ہے۔ اگر وجود نہ ہوتا تو نہ ہم ہوتے نہ ہم کو اپنی ذات سے قرب ہوتا اور ظاہر ہے کہ وجود میں حق تعالیٰ واسطہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہمارے اور اس تعلق کے درمیان میں واسطہ ہیں جو ہم کو اپنی جان کے ساتھ ہے تو ہم کو اول حق تعالیٰ سے تعلق ہے پھر اپنی جان کے ساتھ تعلق ہے۔ اس تقریر کے استحضار سے قرب حق کا مشاہدہ کو بہت کچھ ہو جائے گا مگر کیفیت اب بھی واضح نہ ہوگی البتہ عقلاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ہماری جان سے بھی زیادہ قرب و تعلق ہے اور یہی مقصود ہے۔

و نحن اقرب الیہ من جبل الورد کے معنی کہ علما و معترفینہ بندہ سے ہم قریب ہیں بدلیل و نعلم ما توسوس به نفسه اسی وجہ سے نحن اقرب فرمایا کہ ہم قریب ہیں۔ اتم اقرب الیہ نہیں فرمایا۔ کہ تم ہم سے قریب ہو۔ سو اگر اس سے قرب حقیقی مراد ہوتا تو دونوں طرف سے قرب ہوتا کیونکہ یہ قرب نسبت متکررہ سے ہے۔ اگر ایک طرف سے قرب ہوگا تو دوسری طرف سے بھی ضرور ہوگا۔ رہا قرب علمی سو اس میں یہ ضرور نہیں کہ اگر ایک طرف سے قرب ہو تو دوسری طرف سے بھی ہو تو قرب علمی خدا کی طرف سے تو ہے اس لئے کہ ان کا علم کامل ہے اور بندہ کی طرف سے نہیں۔ کیونکہ بندہ ہے غافل پس بندہ تو خدا سے دور ہوا اور اللہ تعالیٰ بندہ سے قریب غرض حق تعالیٰ کو پوری معرفت ہے۔

بعث و نشر

اذیتلقی الی آخر السورہ اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے بعث و نشر کا ذکر فرمایا ہے ان مواقع پر استدلال میں اپنی تین صفات کا بھی ذکر فرمایا ہے جن کی بعث و نشر کے لئے ضرورت ہے۔ یعنی قدرت ارادہ اور علم چنانچہ یہاں بھی اپنی قدرت اور ارادہ کا ذکر تو اس آیت میں فرمایا ہے۔ افعینا بالخلق الاول بل ہم فی لبس من خلق جدید۔ اس کے بعد اپنے علم کا ذکر فرماتے ہیں۔ و نعلم ما تو سوس بہ نفسہ و نحن اقرب الیہ من جبل الورد۔ یعنی ہمارا علم ایسا وسیع ہے کہ مواد تو مواد و سادس تک کا ہم کو علم ہے پس جو اجزاء منتشر ہو گئے ہیں ان کا ہم کو پورا علم ہے کہ کہاں کہاں موجود ہیں ان کو ہم جب چاہیں گے پھر مجتمع کر دیں گے پس یہاں جو وسوس کے علم کا ذکر ہے تو وہ اس غرض سے ہے کہ بعث و نشر کے وقوع پر دلیل قائم کی جائے اور یہ مراد نہیں کہ ان پر مثل اور اعمال کے جزا و سزا ہوگی جیسا کہ سیاق و سباق سے میں نے ثابت کر دیا ہے۔ اس پر عرض کیا گیا کہ کیا حضرت نے یہ تحقیق اپنی تفسیر بیان القرآن میں بھی لکھی ہے۔ فرمایا کہ تفسیر میں کیا کیا لکھا جاتا یہ تفصیل تو یاد نہیں ہے لیکن کوئی مختصر سی عبارت بین القوسین ترجمہ میں ضرور ہوگی۔ جس سے کوئی اشکال بھی رفع ہو جائے۔ مجھے اب کیا یاد ہے اور اس وقت کیا معلوم یہ تفسیر ذہن میں تھی یا نہیں اور یاد رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے یہاں تو الحمد للہ الحمد للہ چشمہ ہر وقت ابل رہا ہے پھر تھوڑے سے سکوت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر فرمایا کہ حضرت بدوں اس کے کہ وہاں کوئی خدمت پیش کی جائے یہ سب تحقیقات ہیج ہیں۔ ایک بھنسانی کا ان پڑھ دیہاتی جو معانی تو کیا الفاظ بھی نہیں جانتا لیکن حرام حلال کا اہتمام رکھتا اور پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے وہ ان صوفیہ سے افضل ہے جن میں قوت عملیہ نہیں۔ صرف حقائق و معارف ہی ہیں۔ عرض کیا گیا کہ محققین کی نماز تو غیر محققین سے افضل ہوگی فرمایا کہ ان تحقیقات کو اس افضلیت میں کچھ دخل نہیں بلکہ اس کا مدار اخلاص ہے چونکہ محقق اخلاص کی حقیقت غیر محقق سے زیادہ جانتا ہے اگر وہ اس پر عمل کرے گا تو عمل کے اعتبار سے اس کی نماز افضل ہوگی اور اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ غیر اللہ پر نظر نہ ہو محض اللہ ہی مقصود ہو غیر اللہ مقصود نہ ہونے علما نہ عملاً۔ اور ایک نظر تو معبود ہونے کی حیثیت سے ہوتی ہے وہ تو الحمد للہ نماز میں غیر اللہ پر کسی کو نہیں ہوتی کیونکہ نمازی کا یہ پختہ اعتقاد ہوتا ہے کہ معبود اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن دوسرے اعتبار سے نظر ہو جاتی ہے یعنی نماز کے وقت قصداً خطرے جمع کر لئے جاتے ہیں اور یہ عملاً نظر الی الغیر ہے جو ممنوع ہے کیونکہ یہ منافی خشوع ہے اور یہ درجہ ہر شخص کو ادنیٰ توجہ سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن ناواقفی سے لوگوں نے خشوع کو بہت مشکل سمجھ رکھا ہے حالانکہ جو درجہ اس کا مامور بہ اور ضروری ہے وہ بہت آسان ہے اور وہ وہ درجہ ہے جس کو میں نے ایک مثال

سے ظاہر کیا ہے اس سے پھر رفتہ رفتہ اس میں قوت ہو جاتی ہے وہ مثال یہ ہے کہ دو طرح کے حافظ ہوتے ہیں ایک پکا حافظ دوسرا کچا حافظ۔ پکا حافظ تو بلا سوچے ہوئے پڑھتا چلا جاتا ہے اس کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ ہر لفظ پر سوچے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ وہ آزادی کے ساتھ دوسری باتیں سوچتا رہتا ہے اور پڑھتا چلا جاتا ہے کیونکہ اس کو بھولنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا اور ایک کچا حافظ ہوتا ہے اس کو برابر اپنی توجہ ہر لفظ پر قائم رکھنی پڑتی ہے تاکہ وہ بھول نہ جائے۔ بس اتنی توجہ عبادت کے وقت کافی ہے جتنی میں نے اس مثال سے بتلا دی۔ اس سے زیادہ کاوش ہے اور اس سے کم کم ہمتی۔ پھر اس توجہ میں رفتہ رفتہ قوت بڑھ جائے گی۔ یعنی اول اول اس توجہ میں تکلف ہوگا پھر آسانی ہونے لگے گی۔ یہ مثال بھی کسی نے نہیں دی یہ اللہ کا فضل ہے کہ میرے دل میں اس نے یہ مثال ڈال دی۔ اس سے یہ بالکل صاف ہو گیا کہ ضروری استحضار کا درجہ کتنا ہے۔ بس وہ یہ درجہ ہے باوجود اس کے لوگ کہتے ہیں کہ خشوع و خضوع بڑا مشکل ہے۔ اب بتلائیے کہ جو درجہ ضروری ہے وہ یہ ہے اور یہ کیا مشکل ہے لوگ خشوع و خضوع کے انتہائی درجہ کو مشکل سمجھ کر ضرورت کے درجہ سے بھی محروم ہو گئے بس وہ مثال ہے کہ کھاؤں گھی سے نہیں جاؤں جی سے۔ کہتے ہیں کہ نماز میں ایسا استغراق ہو کہ تیر لگا ہوا نکال لیں تو خبر نہ ہو۔ جانے کہاں سے یہ درجہ گھڑ لیا ہے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس کی نماز کامل اور باخشوع ہو سکتی ہے لیکن ایسا استغراق تو حضور ﷺ کو بھی نہ ہوتا تھا۔ حضور خود فرماتے ہیں کہ میں بعض اوقات نماز میں طویل قراءت کا قصد کرتا ہوں لیکن جب کسی بچے کے رونے کی آواز نماز میں سنتا ہوں تو اس خیال سے کہ کہیں اس کی ماں جماعت میں شریک نہ ہو بڑی سورۃ کی بجائے چھوٹی سورت پڑھتا ہوں تاکہ اس کی ماں جلدی سے فارغ ہو کر اس کو جا کر سنبھال لے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کو نماز میں ایسا استغراق نہ ہوتا تھا۔ استفسار پر فرمایا کہ نماز میں سہو ایسا استغراق کی کمی سے ہوتا ہے پھر فرمایا کہ اس کے متعلق ایک عجیب و غریب نکتہ ہے وہ یہ کہ بعض اوقات میرے ہی ذہن میں آئی ہوگی اس وقت لکھ دیا پھر بھول گیا غرض بجائے اس کے کہ علوم درسیہ میں کمال حاصل کرنے کی فکر میں رہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق محبت بڑھا دے جو ان کمالات کو بڑھاتا ہے۔ وہ ضابطہ سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اور نجات ہوتی ہے رابطہ سے اسی کی کوشش کرے اور اسی کو مانگے ہم جاہل سہی بد عقل سہی مگر اس حال میں بھی ہمیں خدا سے مانگنا چاہیے کیونکہ ہم چاہے جیسے بد حال ہوں شیطان سے تو زیادہ بد حال نہیں اس نے باوجود اس درجہ بد حال ہونے کے بھی اللہ تعالیٰ سے مانگا تو ہم کیوں نہ مانگیں ہم تو الحمد للہ مؤمن ہیں چاہے ایمان ضعیف ہی ہو جو ولایت عامہ کے لئے بھی کافی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اللہ ولی اللین آمنوا ینخرجہم من الظلمت الی النور دیکھئے اس میں قید عملوا لصلحت کی بھی نہیں ہے۔ البتہ دوسری آیت میں ولایت خاصہ کا ذکر ہے الا ان اولیاء اللہ لا خوف

عليهم ولا هم يحزنون الذين آمنوا وكانوا يتقون اس ولایت میں تقویٰ کی بھی ضرورت ہے اور یوں تو اللہ تعالیٰ کی نگوینی رحمت کفار پر بھی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی حفاظت کے لئے ملائکہ متعین ہیں۔ لیکن اس کو ولایت نہیں کہتے اور یہ رحمت صرف کفار کے ساتھ یہاں دنیا میں ہے باقی وہاں آخرت میں نہیں ہوگی۔ دنیا میں اس رحمت کے عام اور آخرت میں خاص ہونے پر اسطر ادا ایک مناظرہ یاد آ گیا جو شیطان نے ایک بڑے عارف سے یعنی غالباً حضرت عبداللہ بن اہل سے کیا تھا اور ان کو اس مناظرہ میں شیطان نے ساکت کر دیا تھا۔ اس بناء پر حضرت عبداللہ نے یہ وصیت فرمادی ہے کہ شیطان سے کبھی کوئی مناظرہ نہ کرے واقعہ یہ ہے کہ شیطان نے حضرت عبداللہ سے کہا کہ آپ کیا لعنت لعنت میرے اوپر کیا کرتے ہیں خبر بھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ورحمتی وسعت کل شیء اور میں بھی شیء میں داخل ہوں اللہ تعالیٰ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ وہ مجھ پر بھی ہوگی آپ کیا لعنت لعنت لئے پھرتے ہیں حضرت عبداللہ نے جواب دیا ہاں خبر ہے رحمت تو وسیع ہے لیکن اس میں قید بھی ہے۔ فساکتہا للذین یقون اس پر اس نے کہا کہ جناب قید آپ کی صفت ہی اللہ تعالیٰ کی صفت نہیں اللہ تعالیٰ مقید نہیں اس پر حضرت عبداللہ بن اہل چپ ہو گئے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ گو اس کا جواب تو تھا جو مجھ ناکارہ تک نے دیدیا ہے جس کو عرض کروں گا مگر انہوں نے بجائے اس کو جواب دینے کے اہل طریق کو یہ وصیت کی کہ کبھی شیطان سے مناظرہ نہ کرے حضرت عبداللہ بن اہل سے جو جواب نہ بن پڑا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شیطان نے ان کے ذہن میں تصرف کیا کیونکہ وہ بڑا صاحب تصرف ہے اسی طرح حضور نے بھی یہ فرمایا ہے کہ دجال کا سامنا ہو جائے تو اس سے مناظرہ نہ کریں بہت لوگ اس سے مناظرہ کرنے جاویں گے اور اس کے معتقد ہو جاویں گے۔ اس کاراز حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے جو کہیں گو منقول دیکھا نہیں لیکن جی کو لگتا ہے یہ مولانا کا کشف ہے جو حجہ تو نہیں لیکن چونکہ نصوص میں یہ مسکوت عنہ ہے اس لئے اگر ان کے جی کو لگے جن کو مولانا سے محبت و عقیدت ہے تو اس کا کچھ مضائقہ بھی نہیں مولانا فرماتے تھے کہ اس کی حالت مجذوبوں کی سی ہوگی اس کے اقوال کی لوگ تاویل کریں گے یہاں تک کہ دعویٰ خدائی کی بھی تاویل کریں گے اسی واسطے مجذوبوں سے زیادہ تعلق رکھنا نہ چاہیے گو ان میں اگر آثار قبول پائے جاویں ان پر اعتراض بھی نہ کرے لیکن ان سے زیادہ اختلاط بھی نہ کرے اسی طرح اہل باطل سے مناظرہ بھی نہ چاہیے کیونکہ مناظرہ میں ان سے تلبس ہوتا ہے اور تلبس سے اثر ہو جاتا ہے ایک بزرگ کا یہاں تک ارشاد ہے کہ اہل باطل کے شبہات کا عوام میں ظاہر کرنا بھی مضر ہے گو ساتھ ہی انکار بھی کر دیا جائے کیونکہ عوام کے ذہن پہلے سے خالی ہیں خود نقل کرنا ان کے ذہن میں خواہ مخواہ شبہات کا ڈالنا ہے پھر چاہے وہ زائل ہی کر دیئے جائیں کیونکہ اس صورت میں یہ بھی تو احتمال ہے کہ وہ شبہات پیدا ہو جانے کے بعد

پھر باوجود انکار کر دینے کے زائل ہی نہ ہوں۔ اسی لئے مجھے اس وقت شیطان کے اس مناظرہ کو نقل کرتے ہوئے ڈر بھی معلوم ہوا لیکن خیر یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جس کو شبہ پڑ جائے بالخصوص جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی میرے ذہن میں القاء فرما دیا ہے۔ اس کو ذرا توجہ سے سنئے البتہ اس کے سمجھنے کے لئے درسیات کی ضرورت ہے۔ درسیات بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہیں۔ علماء کے قلوب میں یہ اللہ تعالیٰ کی الہام فرمائی ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ فلسفہ اور منطق بھی جو داخل درس ہیں یہ بھی بڑے کام کی چیز ہیں گو یہ مبادی ہیں مقاصد نہیں لیکن چونکہ مقاصد کی تحصیل ان پر مبنی ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہیں گو مقاصد کے درجہ کو نہیں پہنچتے مقاصد تو بہت عالی ہیں اگر علم کلام میں اور منطق میں مہارت ہو تو قرآن و حدیث اور فقہ کے سمجھنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے غرض جو یہ چیزیں درس میں داخل ہیں یہ بڑے کام کی ہیں چنانچہ انہیں کی بدولت یہ اشکال بھی حل ہوا جس کی تقریر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے جن میں رحمت بھی ہے دو تعلق ہیں۔ ایک تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ اور وہ تعلق اتصاف کا ہے یعنی اس صفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا متصف ہونا اور ایک تعلق مخلوق کے ساتھ ہے اور وہ تعلق تصرف کا ہے یعنی مخلوق میں اس صفت کا اثر ایجاد کا ہونا۔ تو جو تعلق اتصاف کا ہے وہ تو غیر مقید ہے یعنی اس میں عموم اور اطلاق ہے یعنی وہ رحمت فی نفسہ غیر محدود ہے لیکن جو درجہ مخلوق کے ساتھ تعلق کا ہے وہ مقید ہے یعنی کسی پر رحمت فرماتے ہیں کسی پر نہیں جیسے آفتاب خود پانی صفت نور میں تو مقید نہیں لیکن جب اس کا نور زمین پر فائض ہوتا ہے تو وہاں چونکہ حجابات بھی موجود ہیں اس لئے وہاں قیود بھی ہیں تو یہ قیود ادر نہیں ہے ادر ہے خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ اپنی صفت رحمت میں بالکل مقید نہیں لیکن جب اس صفت کا تعلق مخلوق سے ہوتا ہے تو چونکہ اس کا مدار خاص اسباب کی ساتھ مشیت پر ہے۔ اس لئے اس سے جب یہ صفت متعلق ہوتی ہے تو اس قید کے ساتھ کہ جو اہل تقویٰ ہیں ان پر تو آخرت میں رحمت ہوتی ہے اور جو اہل تقویٰ نہیں ان پر نہیں ہوتی یہ جواب بھی سالہا سال کے بعد میری سمجھ میں آیا اور غالباً میں اس وقت امرت سر میں تھا۔ جب میں لاہور دانت بنوانے گیا تو امرت سر بھی جانا ہوا تھا۔ اور چونکہ وہاں صرف ایک دن رہنا تھا اس لئے وہاں میں نے ملنے والوں کی کوئی روک تھام نہیں کی۔ احباب نے اس کا انتظام بھی کرنا چاہا مگر میں نے روک دیا کہ اس میں لوگوں کی دل شکنی ہوگی۔ برخلاف اس کے لاہور میں پہرہ چوکی کا انتظام کیا گیا۔ کیونکہ وہ بڑا شہر تھا اور دانت بنوانے کے لئے کئی دن رہنا تھا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو ہر وقت ہجوم رہتا اور جس کام کے لئے جانا ہوا تھا اس میں خلل پڑتا۔ بعض لاہور والوں نے برا بھی مانا یہاں تک کہ لوگ اخباروں میں بھی اس کی شکایت چھاپنے کو تھی غرض پنجاب میں ایک مسئلہ مختلف فیہ ہو گیا لاہور والے تو سمجھے کہ بڑا بد خلق ہے اور امرت سروالے سمجھے کہ بڑا خلق ہے یاد پڑتا ہے کہ امرت سر میں میں نے یہ جواب دیا تھا وہاں اس وقت علماء کا مجمع تھا سب نے بہت

پسند کیا اور یہ فیض بھی خود عبد اللہ بن سہل ہی کا تھا کیونکہ مجھے اولیاء اللہ سے محبت ہے اور اولیاء اللہ سے جو محبت ہوتی ہے تو ان سے برکات حاصل ہوتے ہیں اگر حضرت عبد اللہ سے مجھے محبت نہ ہوتی تو مجھے ان کی طرف سے جواب دینے کی اتنی فکر نہ ہوتی میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان کی طرف سے جواب نہ ہو کیونکہ وہ ایسے نہیں تھے کہ لا جواب ہو جاویں اس ادب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جواب ذہن میں ڈال دیا ادب بڑی برکت کی چیز ہے اور بے ادبی اس طریق میں سخت وبال لاتی ہے چنانچہ حسین بن منصور پر جو بلا آئی وہ اسی قلت ادب کی وجہ سے اور گو وہ مغلوب تھے اسی لئے حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ان کی حمایت فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

چوں قلم در دست غدارے فتاد لاجرم منصور بردارے فتاد

اور یہاں غدار سے مراد اہل فتویٰ نہیں ورنہ غداران ہوتا بلکہ خاص ایک وزیر ہے جس نے استثناء کر کے سزا کا حکم نافذ کیا اس کا واقعہ تاریخ میں لکھا ہے کہ علقمی وزیر ان کا دشمن تھا۔ اس نے خود ساختہ سوال کر کے فتویٰ حاصل کیا تھا اور اسی مغلوبیت کی وجہ سے حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ میں اگر ہوتا تو کبھی فتویٰ منصور کے خلاف نہ ہونے دیتا انا الحق کی یہ تاویل کرتا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انا علی الحق یہ تو مولانا کی تاویل ہے اور میں نے ایک اور تاویل کی ہے وہ یہ کہ عقائد کا یہ مسلم مسئلہ ہے کہ حقائق الاشیاء ثابتہ تو انا الحق کے معنی یہ ہوئے کہ انا ثابتہ یعنی میں بھی منجملہ اشیاء کے ایک شی ہوں یعنی چونکہ حقائق اشیاء ثابت ہیں میرا وجود بھی حق ثابت اور مطابق واقع کے اور موجود ہے۔ تو یہ گویا سفسطائی کے مسلک کا رو ہے کیونکہ وہ لوگ اس عالم کو بالکل ایک عالم خیال سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ واقع میں کچھ ہے ہی نہیں اور یہ جو کچھ ہم کو نظر آتا ہے یہ محض وہم اور خیال ہے اور یوں تو وحدۃ الوجود والے بھی یہی کہتی ہیں مگر اس کے اور معنی ہیں وہ کہتے ہیں کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا وجود ہے ویسا ہمارا وجود نہیں ہے مگر جیسا بھی ہے وجود واقعی ہے بخلاف سفسطائی کے کہ وہ وجود کی واقعیت ہی کی نفی کرتا ہے۔ ان ہی کے مقابلہ میں اہل حق نے اول مسئلہ عقائد کا اسی کو قرار دیا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے وجہ یہ کہ سب کا اصل الاصول مسئلہ اثبات صانع ہے اور اس کی دلیل کا مقدمہ بھی حقائق اشیاء کا ثبوت ہے کیونکہ جب کوئی چیز ثابت ہی نہ ہوگی تو وہ حق تعالیٰ کے وجود کی دلیل کیسے بن سکے گی۔ جب مصنوع نہ ہوگا تو صانع کے وجود کو کیسے ثابت کیا جاوے گا پس ابن المنصور کے قول کا محمل یہ ہو سکتا ہے اور حق بایں معنی احادیث میں مستعمل ہے چنانچہ وارد ہے البعث حق والوزن حق یعنی یہ سب چیزیں ثابت ہیں اسی طرح انا الحق کے معنی یہ ہوئے کہ میرا وجود ثابت ہے۔ گو یہ تاویل ہی ہے مگر بعید نہیں اور اس تاویل میں اعلیٰ کے مقدر ماننے کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اسی مغلوبیت کی وجہ سے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ گو سخت پابند سنت ہیں اور اپنے خطوط میں اتباع شریعت کی بہت سختی سے تاکید فرماتے ہیں مگر حضرت منصور بے حد حامی

ہیں۔ حضرت مولانا روم دوسری جگہ فرماتے ہیں

گفت فرعونے انا الحق گشت پست
گفت منصورے انا الحق گشت مست

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿۷۲﴾

ترجمہ: میں اس کی طرف شرگ سے بھی زیادہ قرب ہوں۔

تفسیری نکات

قرب سے مراد قرب علمی ہے

اور خدا کا قرب بھی قرب علمی و قرب رحمت ہے اور انتم اقرب الینا۔ (تم ہماری طرف زیادہ قریب ہو) نہیں فرمایا۔ اگر کوئی کہے کہ قرب و بعد تو امور نسبیہ مکررہ مشترکہ میں سے ہیں یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ انہیں ہم سے قرب ہو اور ہمیں ان سے بعد ہو۔

جواب یہ ہے کہ قرب حسی بالمعنی الملقوی بیشک ایسا ہی ہے اور یہاں تو قرب بمعنی توجہ کے ہے سو خدا کا قرب الی العبد من حیث التوجہ قرب عبد الی اللہ من حیث خدا کا قرب بندہ کی طرف باعتبار توجہ کے بندہ کا قرب اللہ تعالیٰ کی طرف باعتبار توجہ کے التوجہ کو مستلزم نہیں بس وہ اشکال مرتفع ہو گیا۔

قرب خداوندی کا معنی

یہ کہ نحن اقرب الیہ من حبل الورد۔ (ہم اس کی طرف شرگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) سے بظاہر یہ لازم آتا ہے کہ جب حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں تو ہم بھی ان سے قریب ہوں کیونکہ قرب و بعد امور نسبیہ متضادہ میں سے ہیں اور امور نسبیہ کے لئے طرفین ضروری ہیں۔ توجہ ایک شے دوسری شے سے قریب ہے تو یقیناً دوسری بھی اس سے قریب ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ زید تو عمرو سے قریب ہو اور عمرو اس سے قریب نہ ہو بلکہ اگر وہ اس سے قریب ہے تو یہ بھی اس سے قریب ہے اور اس بناء پر لازم آتا ہے کہ سارا جہان مقرب ہو جائے جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ یہ بات قرب حسی و قرب مکانی میں ہوا کرتی ہے کہ ایک شے کا دوسری سے قرب ہونا اس کے قرب کو بھی مستلزم ہے اور یہاں حق تعالیٰ کو بندہ سے اور بندہ کو حق تعالیٰ سے جو قرب ہوتا ہے وہ قرب مکانی حسی نہیں بلکہ قرب علمی ہے اور قرب علمی میں یہ لازم نہیں کہ اگر ایک شخص کو دوسرے سے قرب علمی حاصل ہو تو دوسرے کو بھی اس سے قرب علمی حاصل ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کو دوسرے کا علم ہو اور

دوسرے کو اس کا علم نہ ہو جیسا اوپر ایک مثال کے ضمن میں بتلایا گیا ہے۔ پس خدا تعالیٰ کو تو سب بندوں سے قرب علمی حاصل ہے مگر بندوں میں سب کو خدا تعالیٰ سے قرب علمی حاصل نہیں کیونکہ بہت سے اس سے غافل ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے نحن القرب الیہ (ہم اس سے زیادہ قریب ہیں) فرمایا ہے۔ ہوا قرب الینا۔ (وہ ہماری طرف زیادہ قریب) نہیں فرمایا۔

(فان قلت اذا كان القرب من الامور النسبية يلزم فی القرب العلمی ایضاً من قرب احد الشیخین بالآخر قربه به قلت الذى يلزم فی القرب العلمی من قرب احد هما بالآخر هو كون الآخر قریباً منه من حیث العلمیة دون العایلة فمر او الشیخ ان قرب شی بالآخر من حیث العایلة لا یستلزم قرب الاخر به من هذه الحیثیة فیجوز ان یکون احد عالما بک و تكون انت انت جاهلاً به و اما ان قرب شی بالآخر من حیث العلمیة لا یستلزم قربه به من حیث العلمیة ایضاً فلم یرده الشیخ اصلاً ۱۲ جامع)

اور یہ کوئی چیتاں نہیں ہے اس کی حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کا علم تو ہمارے ساتھ ہر وقت متعلق ہے اس لئے وہ اپنے علم سے ہمارے بہت نزدیک ہیں اور ہمارا علم حق تعالیٰ کے ساتھ یا تو متعلق ہی نہیں ہے یا متعلق ہے تو ہر دم متعلق نہیں اس لئے ہم اپنے علم سے حق تعالیٰ سے ہر دم قریب نہیں ہیں خوب سمجھ لو۔

ان فی ذلک لذکری لمن کان له قلب او القی السمع وهو شهید (اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا متوجہ ہو کر کان ہی لگا لیتا ہے) عربی زبان جاننے والے سمجھ لیں گے کہ فی ذلک کا اشارہ مذکورہ قصہ کی طرف ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ اشارہ نہ من حیث القصہ ہے بلکہ بحیثیت اس قصہ کے جزو قرآن ہونے کے ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس جزو قرآن سے نفع کس کو حاصل ہو گا۔ جس پر من کان له قلب (جس کے پاس دل ہو) صادق ہو اور ظاہر ہے کہ قرآن تمامہ بندوں کے نفع ہی کے لئے اتارا گیا ہے تو کسی جزو کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی تو یہاں گو ذلک کا اشارہ الیہ ایک جزو ہے لیکن مراد کل قرآن ہوا تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن سے انتفاع کا طریقہ یہ ہے جو بیان ہو گا نہ کہ صرف اس قصہ سے انتفاع کا طریقہ جو اس سے اوپر مذکور ہے تو سارے ہی قرآن کی یہ حالت ہوئی کہ اس سے انتفاع شرائط مدلولہ آیت پر موقوف ہے۔ یہ مضمون مجھے اس وقت ضروری معلوم ہوا کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ قرآن تو یہ لوگ پڑھتے ہیں بلکہ اگر یہ بھی کہا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا کہ گذشتہ زمانہ سے زیادہ آج کل تلاوت قرآن کی جاتی ہے۔ بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ مخالفین اسلام بھی قرآن پڑھتے ہیں۔ لیکن یہ دعوے سے کہا جاتا ہے کہ انتفاع بالقرآن (قرآن سے نفع حاصل کرنا) پہلے سے بہت کم بلکہ قریب قریب مفقود ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شرائط انتفاع جمع نہیں بس اس آیت میں انہیں شرائط کا بیان ہے۔ ان فی ذلک لذکری لمن کان له قلب او

القی السمیع وهو شہید۔ (اس میں اس شخص کیلئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر کان ہی لگا دیتا ہو) اور ان شرائط، بیان قرآن میں اور بھی بہت جگہ ہے اور ان کو جا بجا مختلف عنوانات سے بیان فرمایا ہے کہیں فرمایا ہے ذکرى للمؤمنین۔ (مومنوں کے لئے عبرت ہے) اور کہیں عبسرة لاولی الابصار۔ (اہل بصیرت کے لئے عبرت ہے) اور کہیں فرمایا لمن اراد ان یدکر۔ (یعنی اس میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جس کا ارادہ عبرت حاصل کرنے کا ہے) اور کہیں ان فی ذلک لعلبرة لمن ینحشی (اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لئے جس کو خوف خدا ہو) نزول قرآن تو گو نفع عام کے لئے ہے مگر نفع ہوتا ہے شرائط کے ساتھ اس کو اس مثال سے سمجھ لو ایک طبیب نے دو شخصوں کے لئے مسہل تجویز کیا اور دونوں کو طریقہ مسہل لینے کا اور شرائط مسہل کے مفید ہونے کے بتائے ان میں سے ایک نے تو مسہل کو ان شرائط کے ساتھ استعمال کیا اس کو خاطر خواہ نفع ہوا اور دوسرے نے بغیر شرائط کے استعمال کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کو نفع نہ ہوگا بلکہ عجب نہیں کہ نقصان پہنچ جائے۔ یہاں کیا بات ہے ظاہر ہے کہ طبیب نے تو دونوں کے نفع کے لئے واسطے مسہل تجویز کیا تھا لیکن ایک کو طبیب کی تجویز نافع ہوئی اور دوسرے کو نافع نہ ہوئی وجہ کیا ہے یہی کہ نفع مشروط بالشرائط تھا۔ واذافات الشرط فالتشریط (جبکہ شرط فوت ہو جاتی ہے مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے) شرائط نہیں پائی گئیں نفع بھی نہیں ہوا میں نہیں کہا جاسکتا کہ طبیب کی تجویز مفید نہیں تھی وہ تو تکلیف تھی چنانچہ دوسرے کو نفع ہوا اور اس کو جو نفع نہیں ہوا تو بوجہ شرائط موجود نہ ہونے کے نہ ہوا اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اثر کے لئے صرف شے نافع کا وجود کافی نہیں بلکہ وجود مع الشرائط ہونا چاہیے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک ہر کام میں یہی بات ہے کہ اثر کے لئے کچھ شرائط ہوتے ہیں کہ بدوں ان کے اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اب لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر اثر نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے پھر یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ اثر نہیں ہوا۔

قرآن پاک میں تدبیر کی ضرورت

نہ معلوم کیا بات ہے صاحبو! قرآن میں کمی نہیں ہم میں کمی ہے۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ قرآن کی چیز سے اثر نہ ہو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرايته خاشعاً متصدعاً من خشية الله۔ یعنی اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو وہ پاش پاش اور ریزہ ریزہ ہو جاتا خدا کے خوف سے تعجب ہے کہ پہاڑ جیسی سخت چیز قرآن سے متاثر ہو اور ریزہ ریزہ ہو جائے اور انسان جیسی نرم چیز متاثر نہ ہو گو دونوں جگہ اثر حسب اقتضائے حکمت مختلف ہو مثلاً انسان چونکہ مکلف ہے اس لئے اس میں تصدع غالباً اس لئے خلاف حکمت ہو کہ پھر مکلف بہ یعنی قرآن کا نزول عبث ٹھہرتا ہے کہ عامل ہی مفقود ہو جائے گا اس لئے اس میں اثر صرف خشوع کافی ہوگا اور احیاناً تصدع وز ہوق روح ہو جانا اس لئے خلاف حکمت نہیں کہ اس سے مکلف بہ کا

عبث ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ دوسرے مکلفین تو موجود ہیں غرض انسان میں خشوع تو عام ہو مگر یہ بھی نہیں جس کی وجہ دوسری جگہ فرماتے ہیں افلا بتدبرون القرآن ام علی قلوب اقلالہا۔ یعنی قرآن کو غور سے نہیں دیکھتے بلکہ دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں یہی بات ہے کہ قرآن کی آیتوں میں تدبیر نہیں کیا جاتا اور دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں جن لوگوں نے تدبیر سے قرآن کو دیکھا خواہ موافقین نے یا مخالفین نے تو اثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ کیسے کیسے پتھر موم ہو گئے کیسے کیسے معاندوں نے گردن جھکا دی اس سے تاریخ بھری پڑی ہے کسی زمانہ میں قرآن میں یہ اثر تھا کہ معاندین اس کے سامنے پانی ہوتے تھے اس واسطے اس کے سننے سے بچتے تھے کہ ہمارے اوپر اثر نہ ہو جائے اور اب لوگوں کو جو اس پر ایمان کے مدعی ہیں اور جو اس کو پڑھتے ہیں شکایت ہے کہ اثر نہیں ہوتا اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہیں مگر تدبیر کے ساتھ نہیں پڑھتے صرف الفاظ پڑھ لیتے ہیں اور یہ بھی ان کا ذکر ہے جو الفاظ کو پڑھتے ہیں ورنہ اب تو دماغوں میں یہ خبط بھی پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ جتنا وقت اس میں صرف کیا جائے اتنے وقت میں کوئی ڈگری کیوں نہ حاصل کی جائے اور تدبیر و عمل کو جو ہم شرط نفع کی کہہ رہے ہیں یہاں نفع سے خاص نفع یعنی اثر مراد ہے اور مطلق نفع کی نفی نہیں مثلاً ایک حرف پر دس نیکیاں ملنا حدیث میں آیا ہے۔ اس میں یہ شرط نہیں اور یہ لوگ حسانت ہی کو لاشے محض سمجھتے ہیں پس ہمارا مقصود اور ہے ان کا اور۔ خلاصہ یہ کہ بہت سے مسلمان تو قرآن پڑھتے ہی نہیں اور جو پڑھتے بھی ہیں تو تدبیر کے ساتھ نہیں پڑھتے جس پر بروئے آیت مذکورہ نفع حاصل ہونا موقوف ہے پھر شکایت عدم نفع کی کیسی۔ مسلمانوں کو تو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں رہا اور اس کے ساتھ یہ جہل مرکب ہے کہ قرآن سے نفع نہیں ہوتا قرآن سے نفع کیسے ہو جب تم اس سے لگاؤ بھی نہیں رکھتے اس سے تعجب ہوگا کہ مسلمانوں کو قرآن سے لگاؤ نہیں رہا کیوں کہ قرآن کیسے کیسے عمدہ چھپے ہوئے گہروں میں ہیں۔ تلاوت بھی کی جاتی ہے پھر یہ کیسے کہا جائے کہ قرآن سے لگاؤ نہیں رہا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن سے مراد میری صرف لکھا ہوا قرآن نہیں ہے۔ جس کی تلاوت کی جاتی ہے بلکہ جس کے بہت سے اجزاء ہیں جیسے عقائد اعمال معاشرت معاملات اخلاق یہ سب وہ اجزاء ہیں جن کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں تصوف بھی انہیں اجزاء میں داخل ہے کیونکہ تصوف کی تعریف گیر واکپڑے پہننا تعویذ گنڈے کرنا یا کشف و کرامات نہیں ہے بلکہ تصوف کی تعریف ہے تعمیر الظاہر والباطن (ظاہر و باطن کی درستی) اس تعریف کی بناء پر اس کا دین ہونا ظاہر ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرَى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝

ترجمہ: اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا وہ (کم از کم دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو۔

تفسیری نکات

قرآن سے نفع حاصل کرنے کی شرائط

وہ طریقے کیا ہیں اسی کو فرماتے ہیں ان فی ذلک لذکرى یعنی اس بیان میں (اس سے اوپر ہم سابقہ کے کفار کے ہلاک کا ذکر ہے) نصیحت ہے مگر کس کو جس میں دو باتیں ہوں اور دو کا ذکر علی سبیل منع خلو ہے۔ یعنی دونوں سے خالی نہ ہو خواہ دونوں جمع ہو جائیں چنانچہ یہاں ہر واحد بھی کافی ہے اور دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے اس پر دلائل مستقلہ قائم ہیں (اس کا بیان بقدر ضرورت ختم وعظ کے قریب جہاں الہی السمع کا بیان شروع ہوا مذکور ہے ۱۲) وہ دو باتیں کیا ہیں لمن کان له قلب۔ جس کے پاس قلب ہوا والقی السمع۔ یعنی کان کو متوجہ ہو کر لگا دے ان دونوں لفظوں کا ترجمہ ذرا سا ہے اور لفظ بھی چھوٹے چھوٹے ہیں اس اختصار سے تعجب ہوگا کہ ذرا ذرا سی چیزیں ہیں اور ذرا سی بات ہے جس پر تمام دین کا نفع مبنی ہے۔ اس تعجب کا رفع میں کئے دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ سمجھ لیجئے کہ قرآن منطق کی اصطلاح میں نہیں نازل ہوا بلکہ سامعین کے محاورات میں نازل ہوا ہے یہ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورے میں ہے کہ یہ دل گردہ والے کا کام ہے اس کے اگر لغوی معنی لئے جائیں تو کلام بلاغت سے بہت ہی گرا ہوا ہو جاتا ہے بلکہ مفہوم ہی غلط ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں تو یہ معنی ہو جائیں گے کہ جس کے جسم میں دل اور گردہ ہو وہ یہ کام کر سکتا ہے سو دل اور گردہ تو ہر انسان کے جسم میں موجود ہیں تو اس کے تو یہ معنی ہو گئے کہ ہر انسان یہ کام کر سکتا ہے حالانکہ یہ جملہ بولا جاتا ہے ایسے موقع پر کہ اس کام کو ہر انسان نہ کر سکے۔

لغت اور محاورہ میں فرق

بات یہ ہے کہ لغت اور محاورہ میں فرق ہوتا ہے وہ یہ کہ محاورہ میں لغوی معنی پر ایک زیادتی ہوتی ہے کہ وہ ہی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً یہاں دل سے مراد لغوی دل نہیں بلکہ وہ دل مراد ہے جس میں صفات دل ہوں اور گردہ سے مراد لغوی گردہ نہیں بلکہ وہ گردہ مراد ہے جس میں صفات گردہ ہوں اور دل کی صفت ہے ہمت اور گردہ کی صفت ہے قوت تو اس لفظ کے یہ معنی ہوئے کہ یہ کام وہ کر سکتا ہے جس میں ہمت و قوت ہو دیکھئے اب یہ لفظ کیسا

بلخ ہو گیا اور اس موقع پر کیسا چسپاں ہو گیا جس میں یہ بولا جاتا ہے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ ایک حاکم کہتا ہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ ایک ایسا شخص تلاش کیا جائے جس پر آدمی کا اطلاق ہو یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اب کسی نے اس پر یہ عمل کیا کہ ایک ایسے انسان کو جو نہایت درجہ بیمار اور اپاہج ہے ڈولی میں ڈال کر لے آیا اور حاکم کے سامنے پیش کر دیا کہ لیجئے حضور آدمی حاضر ہے حالانکہ اس میں کسی کام کے کرنے کی قوت تو درکنار حواس بھی پورے موجود نہیں۔ بس ایک مضعہ گوشت ہے۔ ہاں سانس چل رہا ہے اب آپ ہی فرمائیے کہ کیا اس کے حکم پر عمل ہو گیا۔ لفظ تو ہو گیا کیونکہ آدمی کا اطلاق اس پر صادق آتا ہے آخر وہ بھی اولاد آدم تو ہے ہی۔ اور از روئے منطوق بھی وہ آدمی ہے کیونکہ حیوان ناطق ہے اور ناطق کے معنی بولنے والا نہیں جیسا کہ عرف عام میں سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کے معنی ہیں مدرک کلیات و جزئیات جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں یہ سب کچھ ہے لیکن اس حاکم کے سامنے ایسے مریض انسان کا پیش کرنا امتثال امر نہیں سمجھا جاتا۔ وجہ کیا ہے جو اغراض آدمی کے متعلق ہیں جن کے واسطے حاکم آدمی مانگتا ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہیں حتیٰ کہ اگر کمزور آدمی کو بھی پیش کیا جائے تو اس کو بھی وہ منظور نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ تو ایسے آدمی کو چاہتا ہے جو خدمت گزاری اچھی طرح کر سکے اور یہ کام بہت بڑے کٹے اور توانا و تندرست آدمی کا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس کام کے لئے آدمی چاہیے اگر اس سے وہ کام نہیں ہو سکتا تو اس سے آدمیت ہی کی نفی کی جاتی ہے۔ اسی معنی کر یہ کہا گیا ہے

آزرا کہ عقل و ہمت تدبیر روئے نیست خوش گفت پردہ دار کہ کس در سرائے نیست
(جو شخص عقل و ہمت و تدبیر و رائے نہیں رکھتا پردہ دار نے خوب کہا کہ سرائے گھر میں کوئی آدمی نہیں ہے)
دیکھئے کس کی نفی کی ہے حالانکہ وہاں آدمی موجود ہیں وجہ یہی ہے کہ وہ محض لغوی آدمی ہیں ایسے آدمی نہیں جن سے وہ غرض پوری ہو جو آدمی سے پوری ہوتی ہے یعنی لغوی آدمی ہیں اصطلاحی نہیں ہیں۔ امراء کے ہاں تو یہ محاورہ بہت مستعمل ہے کہا جاتا ہے کہ آپ فلاں تجارت شروع کیجئے یا فلاں محکمہ کھولئے تو کہتے ہیں میں مجبور ہوں میرے پاس کوئی آدمی نہیں ہے یعنی اس کام کا آدمی نہیں ہے یوں لغوی آدمی تو بہت سے موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ محاورات میں محض لغت پر نظر نہیں ہوتی بلکہ حصول اغراض پر نظر ہوتی ہے۔

لمن کان له قلب کا مفہوم

اب سمجھ میں آ جائے گا کہ لمن کان له قلب کے کیا معنی ہیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ جسکے جسم میں دل بمعنی مضعہ گوشت ہو بلکہ وہ دل ہو جس سے وہ اغراض حاصل ہو سکیں جس کے لئے دل ہوتا ہے وہ اغراض کیا ہیں۔ ادراک یعنی بھلے برے کو سمجھنا اور ارادہ جس سے نافع کو اختیار اور مضر کو ترک کر سکے۔ ان کو شرعی اصطلاح میں علم

وعزم کہتے ہیں تو دو صفت ہوئیں قلب کی علم اور عزم۔ میں نے دونوں لفظ (یعنی علم اور عزم) پہلے نہیں استعمال کئے بلکہ بجائے ان کے دوسرے الفاظ یعنی ادراک و ارادہ۔ اس واسطے کہ آج کل ایسی بد مذاقی پھیل رہی ہے کہ اپنے علوم یعنی علوم دینیہ کی اصطلاحوں سے بھی اجنبیت ہو گئی اسی واسطے میں نے اول عام محاورات سے تفہیم کر کے اس کے بعد ان لفظوں کا استعمال کیا۔ غرض دو صفت ہیں قلب کی علم اور عزم جب یہ دونوں صفتیں موجود ہوں گی تب کہا جائے گا کہ اس پر لمن کان له قلب صادق ہے۔

قرآن پاک سے منتفع ہونے کا ایک گر

اسی قبیل سے یہ لفظ ان فی ذلک لذكری لمن کان له قلب (اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہے) اس میں بھی ایک ضابطہ بتلایا گیا ہے۔ قرآن سے منتفع ہونے کا۔ اس میں سب باتیں دین کی داخل ہو گئیں اور یہ ضابطہ ایسا جامع ہو گیا جیسے حساب دانوں کے یہاں گر ہوتے ہیں جن کو گریاد ہوتے ہیں وہ کیسی جلدی حساب کر لیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ گر جانتے ہیں۔ باقاعدہ ضرب تقسیم کرنے والا جس حساب کو منٹوں میں نکالے گا اس کو گر جاننے والے سیکنڈوں میں نکال دیتے ہیں۔ اور باقاعدہ حساب لگانے والے کو قلم دوات پنسل کاغذ تختی سلیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور گر جاننے والوں کی زبان پر حساب کے گر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بات یہی ہے کہ ان کو حساب کے گریاد ہوتے ہیں مثلاً جتنے روپے کی سیر بھر چیز اتنے آنے کی چھٹانک بھریا جتنے روپیہ کا ایک گز کپڑا اتنے آنے کا ایک گرہ۔ اس سے ہزاروں روپیہ کا حساب ذرا سی دیر میں زبانی ہی لگایا جاتا ہے۔ غرض گر بھی تو ایک ضابطہ ہی کا نام ہے جو استقرار کے بعد وضع کر لیا جاتا ہے۔ گر کا فائدہ یہ ہے کہ حساب کرنے میں بہت سہولت اور جلدی ہوتی ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی اس آیت میں گر بتا دیا ہے۔ قرآن سے منتفع ہونے کا۔ تو دیکھئے ایک گر کتنے استقرار کے بعد وضع ہوتا ہے اگر ہم قرآن سے نفع اٹھانے کا گروضع کرتے تو کتنے استقرار کی ضرورت ہوتی اور کتنے زمانہ میں اس میں کامیابی ہو سکتی تھی پھر بھی ہمارا ذہن کہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ لہذا یہ بالکل سچی بات ہے کہ برسوں کی محنت بھی اس کے لئے کافی نہیں ہوتی پس قدر کیجئے حق تعالیٰ کی رحمت کی کہ ہم کو اس محنت سے بچا دیا اور اپنی طرف سے خود ہی اس گر کی تعلیم کر دی جس کا مختصر عنوان علم و ہمت ہے۔

یہ ایک تفصیل تھی آیت کے ایک جزو ان فی ذلک لذكری لمن کان له قلب اس میں بڑی عبرت ہے اس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہے اب آیت کا دوسرا جزو رہ گیا یعنی او القی السمع و هو شہید جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یا اس شخص کو نفع ہو گا قرآن سے جس نے قرآن کو سنا توجہ کے ساتھ کان لگا کر

اس تقابل پر نظر ظاہر میں شبہ ہو سکتا ہے کہ کان لگا کر سننا یہ بھی ایک ذریعہ علم ہی ہے تو معنی یہ ہوئے کہ جس کو علم ہو اس کو نفع ہو گا قرآن سے اور لمن کان لہ قلب میں بھی یہی مضمون تھا جیسا آپ نے اس کا حاصل سنا کہ جس قلب میں علم و عزم ہو۔ تو اس دوسرے جملہ میں باعتبار علم کے بلکہ ظاہر تکرار ہو گیا۔

معلومات کی دو قسمیں

اس شبہ کا حل یہ ہے کہ معلومات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جو بدوں سے سمجھ میں آ سکتی ہیں اور ایک وہ جو بدوں سے سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ اول کی مثال مسئلہ وجود صانع ہے کہ سننے پر موقوف نہیں۔ دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی ایسا نہیں جو فعل کے لئے فاعل کی ضرورت نہ سمجھتا ہو اور دوسری کی مثال مسئلہ معاد ہے اور کیفیت حشر و نشر و جنت و نار ہے کہ اس کا علم بلا سماع کے نہیں ہو سکتا تو لمن کان لہ قلب (اس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہے) متعلق ہے قسم اول کے معنی یہ ہوئے کہ جس کا قلب سلیم ہو یعنی اس میں عقل سلیم سے استعداد ہو صحیح بات کے سمجھنے کی چنانچہ صاحب جلالین نے قلب کی تفسیر عقل سے کی ہے اور القی السمع متعلق ہے قسم دوم کے معنی یہ ہوئے کہ جو باتیں مدرک بالعقل نہیں جن کو سمعیات کہتے ہیں ان کے متعلق یہ عادت ہو اس شخص کی کہ غور سے سنے خواہ مخواہ عناد نہ کرے جیسے بعض کفار نے کہہ دیا تھا کہ قلوبنا فی اکنة مما تدعوننا الیہ وفی اذاننا وقر و من بیننا و بینک حجاب یعنی جس بات کی طرف آپ ہم کو بلا تے ہیں اس کی طرف سے ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا ہے مطلب یہ کہ تمہاری دعوت کو قبول کرنا تو کہاں ہم تمہاری بات سننا بھی نہیں چاہتے۔ یہ عناد ہے تو جس شخص میں یہ عناد نہ ہوگا بلکہ غور سے سنے گا قرآن کو تو اس کو بھی نفع ہوگا اور قرآن جو باتیں سمعیات کی قسم سے بتائے گا وہ اس کی سمجھ میں آ جائیں گی کیونکہ وہ باتیں سب حق ہیں عناد سے ان پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جب عناد نہ ہوگا تو ان کی واقعیت قلب میں بیٹھتی چلی جائے گی۔

قلب سلیم

تو حاصل یہ ہوا کہ جس میں ایسا قلب ہو کہ عقلیات میں صفت سلامت رکھتا ہو اور بات کو صحیح سمجھتا ہو (اور یہ حاصل ہے جزو اول کا) اور سمعیات میں قرآن کو کان لگا کر توجہ سے سنے عناد نہ کرے تو اس کو نفع ہوگا۔ اب جملہ او القی السمع (یا متوجہ ہو کر کان لگائے) میں تکرار نہ رہا تقابل ہو گیا اب ایک شبہ رہا کہ اوپر جو قلب کی صفات بیان کی گئی ہیں اس میں کسی علم کی تخصیص نہیں تھی۔ اور تقابل کا مدار تخصیص ہے تو تعمیم میں پھر

تقابل نہ رہا جواب یہ ہے کہ یہ تقابل منطقی نہیں کہ ایک دوسرے کا جزو نہ ہو تقابل عرفی ہے جس کے لئے بعض اجزاء کا تقابل بھی کافی ہے۔ پھر یہ تقابل تضاد کا نہیں ہے بلکہ مانع الخلو ہے کیونکہ دونوں صفتیں ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں اور صحت حکم کے لئے فرد واحد کافی ہے (کما سیاتی) (جیسا کہ عنقریب آتا ہے) جو شان ہوتی ہے مانع الخلو کی چنانچہ شروع وعظ کے ذرا بعد دل گردہ کی مثال سے ذرا پہلے مانع الخلو ہونے کی تصریح ہے۔

ثم رایت بعد سنین فی روح المعانی ما یقارب هذا باختلاف العنوان مع الحکم بكونه مانعة الخلو والله الحمد ولهذا التقابل وجوه اخرى محتملته (چند سال کے بعد میں نے روح المعانی میں اختلاف عنوان سے اس کے قریب قریب دیکھا مع حکم مانع الخلو کے الحمد للہ اس تقابل کے لئے اور بھی وجوہ محتمل ہیں) اب ان متقابلین میں جو امر مشترک ہے اور وہ امر مشترک روح ہے شرائط کی وہ قلب سلیم ہے کیونکہ عناد نہ ہونا بھی صفت قلب ہی کی ہے تو مدار آخرت قلب ہی پر ٹھہرا تو یہ معنی ہوئے کہ جس شخص میں ایسا قلب ہو جس کو قلب کہا جاسکتا ہے کہ عقلیات کے متعلق بھی سلیم ہو اور سمعیات کے متعلق بھی سلیم ہو اس کو نفع ہوگا قرآن سے اور چونکہ یہ سب آثار قلب سلیم کے لوازم سے ہیں تو بواسطہ ملزوم کے ان سب لوازم میں بھی تلازم ہوگا۔ تحقق ملزوم کے وقت تو تلازم عقلی اور صرف ایک لازم کے تحقق کے وقت تلازم عرفی اس لئے ہر واحد کے تحقق کو صحت حکم کے لئے کافی کہیں گے (یہ بیان ہے سیاتی کا جو ابھی گذرا خلاصہ یہ کہ قرآن نصیحت ہے قلب سلیم کے لئے۔ تو قلب کو سلیم بنائیے پھر دیکھیے قرآن سے کیا کیا چیزیں حاصل ہوں گی۔ جب قلب سلیم ہوگا تو قرآن سے اس میں صفت علم بڑھے گی اور اس میں دن دوئی رات چوگنی ترقی ہوگی اسی کے بارہ میں کہا ہے۔

بنی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر انبیاء جیسے علوم بغیر کتاب و استاد اور معین کے دیکھو گے)

یعنی وہ علوم پیدا ہوں گے کہ تمام علوم ان کے سامنے گرد نظر آئیں گے اور ہر چیز کی حقیقت منکشف ہو گی وہ علوم ہوں گے جن کو علوم کہنا صحیح ہے۔ سفلی اور اوہام نہ ہوں گے دنیا کے عقلاء ان کے سامنے سر جھکائیں گے اور اس علم کی برکت سے ہمت کا تڑاؤ کی بھی یہ کیفیت ہوگی کہ کسی کا خوف اس کے دل میں نہ رہے گا دنیا بھر ایک طرف اور وہ ایک طرف۔

چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش

موحد چہ درپائے ریزی زرش

ہمیں است بنیاد توحید و بس

امید و ہراسش نباشد زکس

(موحد کے قدموں پر سونا نچھاور کر دو خواہ اس کے سر پر تلوار ہندی رکھو امید و خوف اس کو کسی سے نہ ہوگا۔ بس توحید کی بنیاد یہی ہے)

نہ کسی کے خوف سے حق سے وہ منحرف ہو گا نہ کسی لالچ سے وہ حق کو چھوڑے گا اور ہمت کی قوت کی وہ حالت ہوگی۔

الحاصل

اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو یا اگر فہیم زیادہ نہ ہو تو کم از کم یہی ہو کہ وہ (دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور سن کر اجمالاً حقانیت کا معتقد ہو کر اتباعاً لایل الفہم اس بات کو قبول کر لیتا ہو) آہ تو ضیح مزید جدید و مفید پہلی شان محقق کی ہے اور دوسری مقلد کی یعنی تذکر کے لئے یہ شرط ہے کہ مخاطب محقق ہو یا مقلد۔ فقط

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا

مَسْنَا مِنْ لُغُوبٍ فَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ

الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۚ

ترجمہ: ہم نے بیشک آسمان زمین کو اور ان کی درمیانی اشیاء کو چھ دن میں پیدا کیا مگر ہم کو کچھ تھکن ذرا بھی نہیں ہوئی (کیونکہ یہ تو تاثر ہے جو ممکن کی شان سے ہے واجب کو تاثر نہیں ہوا کرتا) پس آپ ان (یہودیوں) کی باتوں پر صبر کیجئے (زیادہ رنج نہ کیجئے) اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیے اقباب نکلنے سے پہلے اور چھپنے سے پہلے۔

تفسیری نکات

شان نزول

واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود کے اس قول سے سخت رنج پہنچا تھا ان اللہ استلقى علی العرش فی یوم السبت للراحة (نعوذ باللہ منہا) کہ اللہ تعالیٰ چھ دن میں آسمان و زمین پیدا کر کے ساتویں دن یعنی سینچر کو عرش پر لیٹ گئے تاکہ تھکن دور ہو اور آرام ملے نعوذ باللہ نعوذ باللہ اور اس پر یہود کے قول کے رد کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ ولقد خلقنا السموات والارض وما بینہما فی ستة ایام وما مسنا من لغوب فاصبر علی یقولون۔

صلوٰۃ معین صبر ہے

اس کے بعد یہ بڑھایا و سبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب جس میں نماز کا حکم ہے اب دیکھنا چاہیے کہ اس کو تسلی میں کیا دخل ہے کیونکہ یہ قرآن ہے جس کا لفظ لفظ مربوط ہے۔ کوئی بات بے ربط نہیں تو فاصبر علی ما یقولون کے بعد تسبیح بمعنی صلوٰۃ کا امر یہ بتلاتا ہے کہ صلوٰۃ معین صبر ہے اور یہ ایسی اعانت ہے جیسے عاشق کو کسی دشمن کی گستاخی سے جو اس نے محبوب کی شان میں کی ہو رنج ہو اور محبوب یہ کہے کہ تم ان باتوں سے رنج نہ کرو آؤ تم ہم سے باتیں کرو۔ بے ہودوں کی باتوں کو چھوڑو غور کیجئے محبوب کی اس بات سے عاشق کو کس قدر تسلی ہوگی۔ اس طرح حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آپ ان کی بیہودہ باتوں سے رنج نہ کیجئے آئیے نماز میں ہم سے باتیں کیجئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج کا اندازہ دوسری آیت سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں قد نعلم انه لیحزنک الذی یقولون فانہم لا یكذبونک و لكن الظلمین بایات اللہ یحجدون ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان کافروں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے۔ آگے مشہور تفسیر تو یہ ہے اور میں نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ فانہم لا یكذبونک علت ہے ایک جملہ محذوف کی تقدیریوں ہے فلا تحزن و کل امرہم الی اللہ فانہم لا یكذبونک السخ یعنی آپ غم نہ کیجئے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کیجئے کیونکہ یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلاتے ہیں۔ (کیونکہ آپ کو تو محمد امین کہتے اور صادق مانتے تھے) بلکہ یہ ظالم تو خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (سو آپ کس لئے رنج کرتے ہیں وہ آپ کو تو کچھ نہیں کہتے ہماری آیتوں سے گستاخی کرتے ہیں سو ہم خود نمٹ لیں گے) مگر ایک بار مجھے ذوقاً دوسری تفسیر سمجھ میں آئی تھی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عشق مع اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس مشہور سے یہ ابہام ہوتا ہے کہ حضور کو آیات الہیہ کی تکذیب سے رنج نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنی ذات کے ساتھ جب کوئی خلاف بات ہو اس وقت رنج ہونا چاہیے حالانکہ آپ کے عشق و محبت کا مقتضایہ ہے کہ آپ کو کفار چاہے کتنا ہی کہہ لیتے اس سے آپ کو زیادہ رنج نہ ہوتا آپ کو تو بڑا رنج اسی کا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ گستاخی کرتے اور آیات الہیہ کی تکذیب کرتے تھے پس خاص اس اعتبار سے اس کی تفسیر قریب یہ ہو سکتی ہے کہ فانہم لا یكذبونک علت ہے لیحزنک الذی یقولون کی اور ترجمہ یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کو کفار کی باتوں سے بہت رنج ہوتا ہے کیونکہ اس لئے کہ وہ آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اگر آپ ہی کی شان میں گستاخی کرتے ہیں تو آپ کو زیادہ غم نہ ہوتا مگر آپ کو تکذیب آیات الہیہ کا تحمل نہیں ہو سکتا اس صورت میں حذف و تقدیر کی بھی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر آپ کی شان عشق

کے بھی موافق ہے اور اس حدیث کے بھی موافق ہے۔ کان لا ینتقم لنفسه فی شی الا ان تنتھک حرمت اللہ فینتقم فیہا للہ او کما قال۔ کہ آپ اپنے واسطے اپنی ذات کے لئے کسی سے کسی بات میں انتقام نہ لیتے تھے ہاں اگر حرمت کی توہین ہوتی دیکھتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے لئے انتقام لیتے تھے اور گو ظاہر ایہ تفسیر سیاق سے بعید ہے مگر ایک بار ذوقاً کچھ قریب معلوم ہوئی تھی اسی لئے اس مقام پر اپنے دعوے کی تائید میں اس کو ذکر کر دیا گو وہ دعوے اس پر موقوف نہیں بلکہ ظاہر ہے کہ آپ کو کفار کی ان گستاخیوں سے جو حضرت حق کی شان میں وہ کرتے تھے سخت رنج ہوتا تھا تو ایسے شدید حزن کے لئے نہایت قوی تسلی کی ضرورت ہے اور یہاں تسبیح بمعنی صلوة کو تسلی کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور عادتاً عاشق کو تسلی کسی چیز سے ایسی نہیں ہوتی جیسے محبوب کے قرب و مشاہدہ سے ہوتی ہے پس معلوم ہوا کہ نماز میں ایسا قوی قرب و مشاہدہ ہوتا ہے جو کسی اور امر سے نہیں ہوتا۔

سُورَةُ الذَّارِيَاتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كَانُوا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ﴿۱﴾

ترجمہ: وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے۔

تفسیری نکات

ربط

وبالاسحار ہم يستغفرون کا ربط کانوا قليلاً من الليل ما يهجعون سے ظاہر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ رات کو تہجد پڑھنے سے استغفار بالاسحار کو کیا تعلق ہے بعض مفسرین نے تو یہ کہا کہ وہ معاصی سے توبہ کرتے ہیں اور اسحار کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ وقت اجابت دعا کا ہے اور تہجد سے استغفار کا تعلق یہ ہے کہ وہ جلب منفعت ہے اور یہ دفع مضرت ہے۔ اور بعض نے کہا کہ وہ تہجد پڑھ کر اس طاعت ہی سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ طاعات بھی معاصی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ زیادہ سہل اور ظاہر یہ ہے کہ وہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں اور اخیر شب میں لذت طاعات سے یہ اس لذت کے آثار سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ اس وقت یہ حال ہوتا ہے۔

۔ چہ خوش وقتی و خرم روزگارے کہ یارے برخوردار از وصل یارے اور وصل کی لذت جیسی ہوتی ہے معلوم ہے اس لذت میں کبھی انہماک ہو کر اس کی مقصودیت کا شبہ ہو جانا بعید نہیں اور اس دولت وصل سے مشرف ہو کر عجب کا پیدا ہو جانا بھی عجیب نہیں اس لئے اس سے استغفار کرتے ہیں (ایضاً ص ۴۲)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۗ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ

وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۗ

ترجمہ: اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں میں ان سے (مخلوق کی) رزق رسائی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے کھلایا کریں بے شک اللہ خود سب کو رزق پہنچانے والا قوت والا نہایت قوت والا ہے۔

تفسیری نکات

جن و انسان کا مقصد تخلیق

ما ارید منهم من رزق ای لا نفسهم ولا لعیالهم. وما ارید ان یطعمون ای وما اردت بنخلقهم ان یطعمونی. یعنی میں نے اس لئے نہیں پیدا کیا کہ وہ اپنے اور اپنے عیال کے لئے رزق ڈھونڈیں نہ اس لئے پیدا کیا کہ وہ مجھے کھلاویں۔ یہاں ایک نکتہ سمجھنا چاہیے کہ اطعام حق کے غایت ہونے کا تو احتمال ہی نہ تھا پھر اس کی نفی کی کیا ضرورت تھی۔ سو نکتہ یہ ہے کہ یہاں دونوں میں دو غایتوں کی نفی کو قرین فرمایا ان میں ایک ایسا امر ہے کہ اس کے غایت ہونے کا احتمال ہی نہیں اور ایک میں اس کا احتمال تھا سو دونوں کو قرین فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ جیسا ایک امر یقیناً منفی ہے ایسا ہی دوسرے کو سمجھو کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے چنانچہ اس علت کو اس طرح ذکر فرمایا کہ ان اللہ هو الرزاق الخ یعنی وہ تو خود بڑے رزاق ہیں کہ تم کو اور تمہارے عیال کو سب کو رزق دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے و امر اهلک بالصلوة واصطر علیہا لا نسلک رزقاً نحن نرزقک (اور اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہئے اور خود بھی اس کے پابند رہئے ہم آپ سے معاش (کمواتا) نہیں چاہتے معاش تو آپ کو ہم دیں گے) یہ آیت بھی اس کے قریب قریب ہے خلاصہ یہ ہے کہ نہایت تاکید و اہتمام کے ساتھ اس مقصود کو ثابت فرمادیا کہ انسان و حق جل و علی شانہ نے صرف عبادت کے واسطے پیدا کیا ہے تو عبادت اتنا بڑا امر اہم ہے۔ اب صرف یہ سمجھنا باقی رہا کہ عبادت ہے کیا چیز سو اس میں غلطی یہ واقع ہوئی ہے کہ اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا سو جو عربی جاننے والے ہیں ان کو تو اس کی حقیقت سمجھنا آسان ہے۔ مگر حق تعالیٰ کی تعلیم ایسی سہل ہے کہ اس کا فیض سب کو پہنچتا ہے چنانچہ لفظ عبادت ہی کو محاورات میں ایسا

جاری کر دیا گیا کہ اب کوئی بھی اس سے ناواقف نہیں ہے مگر غایت ظہور کی وجہ سے اس کی حقیقت سمجھنے میں خفا ہو گیا۔ چنانچہ اس کا مفہوم سب کے لئے بہت ہی آسان ہے جو لوگ عربی دان ہیں وہ تو لغت میں دیکھ لیں گے کہ اس کے معنی ہیں غلیۃ التذلیل (نہایت ذلت) مگر عوام جو لغت نہیں جانتے اگر ان کے سامنے صرف اسی کو پیش کیا جائے ان کو یہ شبہ ہوگا کہ یہ ابھی تراشا گیا ہے اس لئے میں ان کے مستعمل محاورہ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ عبد کے معنی سب کو معلوم ہیں کہ غلام ہیں چنانچہ عوام میں بھی عبد اللہ عبد الرحمن نام اسی واسطے رکھے جاتے ہیں اور عبادت اسی عبد کا مصدر ہے اور عبد اسی مصدر سے مشتق ایک صفت ہے جب عبد کے معنی غلام ہیں تو عبادت کے معنی عبد شدن یعنی غلام ہو جانا یا بندہ ہو جانا ہوئے۔ بندہ فارسی ہے اور عبد اور غلام عربی ہے مگر غلام کو اردو میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اردو میں سب زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں اور غلام کا لفظ بہ نسبت عبد بلکہ بہ نسبت بندہ کے بھی بوجہ کثرت استعمال کے زیادہ اقرب الی الفہم (فہم سے زیادہ قریب) ہے بہر حال ان تینوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس سے عبادت کی حقیقت منجملہ تو سمجھ میں آگئی کہ غلام ہونا ہے۔

عبادت و طاعت کا فرق

اس کے متعلق حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحقیق بیان کرتا ہوں فرمایا کہ قرآن شریف میں ارشاد ہے ما خلقت الجن والانس الا ليعبدون (میں نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) تو باوجود اس کے کہ ملائکہ اور حیوانات جمادات نباتات جو اہر و اعراض سب کے سب عبادت میں مصروف ہیں جیسا کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے بارے میں ارشاد ہے یسبحون الیل والنہار لایفترون (پاکی بیان کرتے ہیں رات اور دن اور اس سے نہیں تھکتے) حیوانات وغیرہ کے بارے میں فرماتے ہیں ان من شیء الا یسبح بحمده ولكن لا تفقہون تسبیحہم (کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے کہ اللہ کی حمد و تعریف نہ کرتی ہو لیکن ان کی تسبیح کو تم لوگ نہیں سمجھتے) ان کے علاوہ اور متعدد آیات سے ہر ایک چیز کا عبادت میں مشغول ہونا معلوم ہوتا ہے پھر انسان اور جن کی تخصیص عبدیت میں کیوں فرمائی گئی فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ ایک تو نوکر ہوتا ہے۔ ایک غلام ہوتا ہے نوکر کی خدمات ہمیشہ معین ہوا کرتی ہیں یعنی اگرچہ کتنے بھی مختلف کام نوکر سے لئے جائیں لیکن کوئی کام ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس میں نوکر عذر کر دے اور کہہ دے کہ میں اس کام کے لئے نہیں ہوں مثلاً اگر کوئی شخص اپنے نوکر سے کہنے لگے کہ تو مہتر کا کام بھی کیا کر تو وہ ہرگز نہ منظور کرے گا اور عذر کر دے گا۔ علی ہذا اور بہت سے کام ایسے نکلیں گے جن میں نوکر کی جانب سے عذر ہوگا بلکہ اولاد بھی جس پر نوکر سے زیادہ قبضہ اور تسلط ہوتا ہے بعض کاموں میں انکار کر دیتی ہے چنانچہ ہمارے ایک

خاندانی سید اور معزز دوست نے ایک ایسے موقع پر کہ سقوں نے پانی بھرنا چھوڑ دیا تھا اپنے لڑکے کو کہا کہ بھائی سقوں نے تو پانی بھرنے سے جواب دیدیا ہے اہل محلہ کو سخت تکلیف ہوتی ہے تم ہی لوگوں کے یہاں پانی بھرا آیا کرو وہ لڑکا بہت خفا ہوا برخلاف غلام کے کہ اس کا کوئی خاص مقرر کام نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک وقت آقا کی نیابت کرتا اور زرق برق لباس میں ہوتا ہے اور دوسرے وقت آقا کے نجس کپڑوں کو صاف کرتا ہے ایک وقت بھنگی کا کام کرتا ہے تو دوسرے وقت سفارت کا کام کرتا ہے۔ پس غلام نوکر بھی ہے مہتر بھی ہے سفیر بھی ہے خلیفہ بھی ہے پس انسان اور جن تو بمنزلہ غلام کے ہیں اور دوسری مخلوقات مثل نوکر کے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی عبادت کو تسبیح و تقدیس و سجدہ وغیرہ الفاظ سے فرمایا اور انسان اور جن کی عبادت کو بلفظ عبدیت فرمایا اور جب انسان اور جن عبد اور غلام ہیں تو ان کی کوئی خاص خدمت نہ ہوگی بلکہ ایک وقت نماز روزہ کرنا عبادت ہوگا تو دوسرے وقت سونا اور قضائے حاجت کرنا لوگوں سے ملنا وغیرہ وغیرہ کام عبادت ہوں گے چنانچہ حدیث میں ہے۔ نہی رسول اللہ ان یصلی حاقنا او کما قال (قضا حاجت کی شدت کے وقت نماز ادا کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا) کہ جس وقت پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو اس وقت نماز پڑھنے کی ممانعت ہے اور دفع فضلہ واجب ہے دیکھتے ایک وقت انسان کے لئے ایسا نکلا کہ اس کو مسجد جانا حرام اور بیت الخلا جانا واجب ہوا۔

وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

غایت آفرینش

عبادت ایسی ضروری چیز ہے کہ غایت خلق جن و انس کی بھی ہے۔ اور یہاں جن کو بھی انسان کے ساتھ ذکر اشریک کیا گیا ہے اور دوسرے اکثر مقامات میں باوجودیکہ جن بھی انسان کی طرح تمام احکام شرعیہ کے مکلف ہیں مگر پھر بھی تعبیر میں جو جن کا ذکر نہیں آتا تو وہ اکتفاء ہے۔ لہذا انسان ہی کا ذکر آتا ہے ورنہ احکام شرعیہ دونوں ہی میں مشترک ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ آفرینش کی غایت محض عبادت ہے اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بجز اس کے اور کوئی مقصود ہی نہیں تمام مقاصد کا انحصار کر کے فرمایا کہ صرف عبادت کیا کریں اور اس حصر سے باوجودیکہ سب غایت کی نفی ہوگئی مگر پھر بھی جن غایات کی مقصودیت کا باعتبار عادات کے کچھ شبہ نہ ہو سکتا تھا اس مقام پر ان سب کی نفی تصریحاً بھی فرمادی۔

سُورَةُ الطُّورِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

وَمَا أَلْتَهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ

تَنْجِيًّا: اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا ہم ان کی اولاد کو بھی (درجہ میں) ان کے ساتھ شامل کر دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی چیز کم نہیں کریں گے۔

تفسیری نکات

شرف نسب میں راہ اعتدال

میری پھوپھی صاحبہ اپنے گھر پر لڑکیوں کو پڑھایا کرتی تھیں اور کسی سے معاوضہ وغیرہ کچھ نہ لیتی تھیں ایک مرتبہ ان کے یہاں ایک سید کی لڑکی پڑھنے آئی وہ فرماتی تھیں کہ اسی روز رات کو میں نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا فرماتی تھیں کہ عمدۃ النساء دیکھو ذرا میری بچی کو محبت سے پڑھانا۔ اسی طرح اور بہت سی بشارتیں اور منامات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو اپنی اولاد کا خیال رہتا ہے اور آخرت میں اس نسبت سے یہ نفع ہوگا کہ حق تعالیٰ بزرگوں کی اولاد کو انہی بزرگوں کے درجوں میں پہنچادیں گے چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلْتَهُمْ مِنْ شَيْءٍ اس میں افراط و تفریط دونوں کا علاج کر دیا گیا فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہی یعنی کافر و شریر نہ ہوں تو ہم ان کو بھی ان ہی کے ساتھ ملا دیں گے یعنی گو عمل میں دونوں برابر نہ ہوں مگر پھر بھی سب کو برابر کر دیا جائے گا جیسے کوئی بادشاہ کہیں مہمان بن کر جائے اور

اولاد کے کام آئے گا یہ نہیں کہ صرف شریف النسب ہی کام آئے اور دنی النسب کی بزرگی اس کی اولاد کے لئے کارآمد نہ ہو۔ حاشا وکلا۔

وَأَصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا

ترجمہ: اور آپ ﷺ اپنے رب کی تجویز پر صبر سے بیٹھے رہے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔

تفسیری نکات

حکایت حضرت سید صاحبؒ

(۹) فرمایا کہ حضرت سید صاحبؒ نے جب حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بیعت کی تو حضرت شاہ صاحب نے تصور شیخ تعلیم فرمایا سید صاحبؒ نے باادب انکار فرمادیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔

بھی سجادہ رنگین کن گرت پیرمغاں گوید

سید صاحب نے فرمایا بھی سجادہ رنگین کن معصیت کے باب میں ہے اور معصیت جو بھی آپ فرمادیں کر سکتا ہوں۔ مگر شرک نہیں کر سکتا۔ اس پر شاہ صاحب نے فرمایا۔ ہم آپ کو طریق نبوت سے سلوک طے کرا دیں گے طریق ولایت چھوڑ دیں گے کیونکہ آپ کی استعداد بہت ہی اعلیٰ ہے چنانچہ کل تیرہ دن میں سارا سلوک طے ہو گیا۔

دولت مقصودہ

فرمایا۔ ذکر میں اس طرح مشغولی اختیار کرنا کہ اہل دعیاں کی بھی خبر نہ رہے یہ معصیت ہے کیونکہ مشغولی کا کمال وہی ہے جس کو شریعت نے تجویز فرمایا ہے۔ درحقیقت خلق (مخلوق) مشاہدہ حق کا مرآة ہے پس جس وقت حکم ہو کہ براہ راست ہمارا مشاہدہ مت کرو بلکہ اس مرآة (یعنی مخلوقات) کے ذریعہ سے دیکھو تو اس وقت یہ مشاہدہ بالواسطہ ہی مطلوب ہے حتیٰ کہ اگر مشاہدہ خاصہ ہر دو قسم یعنی بواسطہ مرآة و بغیر مرآة) سے منع فرمادیتے تو بھی اطاعت واجب ہوتی۔ اگر اطاعت بلا مشاہدہ خاصہ ہو تو اس کی مثال یہ ہے۔

(۱) ارید وصالہ و برید ہجری۔ (میں ان سے ملاقات چاہتا ہوں اور وہ میرے فراق کے

طالب ہیں)

اور وہ کافی ہے کیونکہ اس حالت میں اگر یہ شخص راوائی نہیں مگر مرئی تو ہے اور یہ بھی دولت مقصودہ ہے۔

اور آیت (۲) و اصبر لحکم ربک فانک باعینا (اور آپ اپنے رب کی تجویز پر صبر سے بیٹھے رہے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں) (الطور آیت ۲۸) میں یہی صورت ہے کہ عاشق کو ارشاد ہے ہم تو تم کو دیکھ رہے ہیں پس محبوب اگر توجہ کرے اور آغوش میں لے لے تو عشاق کے نزدیک بعض وجوہ سے وہ الذہب کی نظر میں (۳) الا انہ بکل شیء محیط (یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو اپنے علم کے احاطہ میں رکھتے ہیں) (السجدہ آیت ۵۴)

میں اللہ تعالیٰ کا احاطہ الذہب ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی توجہ کی دلیل ہے۔ پس اہل و عیال میں مشغول ہونے سے گو بندہ کی توجہ اصطلاحیہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ تو اس کو دیکھتے ہیں اور اپنے بندے کی طرف متوجہ ہیں اور احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۳ ص ۲۸)

سُورَةُ النَّجْمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِن هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۗ ﴿۹۴﴾

ترجمہ: اور نہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے باتیں بناتے ہیں ان کا ارشاد نبوی وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے۔

تفسیری نکات

حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے تائیر نخل کے بارہ میں اول مشورۃ منع فرمایا اور بعد میں فرمایا انتم اعلم بامور دنیا کم اس پر بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جس قدر ارشاد نبوی ہوتا ہے وحی سے ہوتا ہے۔ اور وحی میں خلاف کہاں وہاں یَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ان هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ارشاد حق تعالیٰ ہے جو اب یہ ہے کہ وحی سے جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں وہ احکام دینیہ ہیں وہ ضرور واقعی ہوتے ہیں ان میں مشورۃ نہیں فرمایا جاتا۔ اور جو امور دنیوی ہیں جن میں مشورہ ہے ان میں خلاف ممکن ہے اتم اعلم اسی واسطے فرمایا بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امور دنیویہ میں شریعت کو دخل نہیں اور تائیر نخل کے قصے کو دلیل لاتے ہیں یہ بات غلط ہے اس واسطے کہ اوامرو نواہی متعلقہ امور دنیا شریعت ہی سے ثابت ہیں پھر انکار کیوں ہو سکتا ہے احکام جو متعلق امور دنیوی ہیں جن کا اہتمام ضروری ہے شریعت ہی سے ثابت ہیں پس معاملات میں دوسرے ہیں ایک تو تجربات کہ فلاں کام کیوں کریں کہ نفع ہو۔ زراعت کیونکر کریں کہ غلہ پیدا ہو۔ کھیت کیونکر جوتا جائے تخم ڈالنا کس وقت مناسب ہے۔ یہ تو تجربات ہی۔ دوسرے شریعات ہیں کہ فلاں صورت سے تجارت کرنے میں ربوا ہوگا۔ وہ حرام ہے فلاں صورت پر جائز ہے مثلاً یعنی احکام حلت و حرمت گو امور دنیاوی ہی سے متعلق ہوں یہ مسائل اور شریعت سے ثابت ہیں تائیر نخل تجربات سے ہے۔

وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۗ

ترجمہ: اور انہوں نے (یعنی پیغمبر نے) اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی صروتِ اصلیہ میں دیکھا ہے۔

تفسیری نکات

ثبوت معراج جسمانی

فرمایا کہ رام پور میں ایک شخص نے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہو یا روحانی۔ میں نے کہا کہ جسمانی کہنے لگے کہ ثبوت میں نے کہا سبحان الذی اسری بعبدہ الایة اور لقد راہ نزلة اخری عند سدرة المنتھی اور حدیثیں کہنے لگے کیا یہ ممکن ہے کہ جسم انسانی ایسے طبقہ سے عبور کرے جہاں ہوانہ ہو میں نے کہا کہ ہاں ممکن ہے کہ ثبوت میں نے کہا کہ امکان نام ہے عدم الوجود و عدم الامتناع کا جب وجوب و امتناع نہ ہوگا تو امکان ثابت ہو جائے گا اور چونکہ امکان اصل ہے لہذا جو مدعی امتناع یا وجوب کا ہو دلیل اس کے ذمہ ہے ہم اصل سے متمسک ہیں ہمارے ذمہ دلیل نہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کی معراج عروجی و نزولی

غرض حضور ﷺ کی معراج عروجی تو کامل ہے اور آپ ﷺ کی معراج نزولی اکمل ہے۔ سوان میں فرق کامل اکمل کا ہے ناقص اکمل کا نہیں۔ کیونکہ آپ کی جو حالت بھی ہے وہ کمال سے خالی نہیں۔ گو بعض حالتیں بعض سے زیادہ کامل ہوں مگر ناقص کوئی نہیں۔ اور آپ کی معراج نزولی کا معراج عروجی سے افضل ہونا صرف صوفیہ کے قول ہی سے ثابت نہیں بلکہ اس پر دلائل موجود ہیں۔

ایک دلیل تو یہ ہے کہ معراج کی غایت حق تعالیٰ نے رویت آیات بیان فرمائی ہے چنانچہ سورہ نجم میں تو فرمایا ہے لقد راہی من آیات ربہ الكبرى اور سورۃ الاسراء میں فرمایا ہے لسنیہ من ایاتنا اور ظاہر ہے کہ حضور کو آیات دکھلانے سے دو فائدے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کی معرفت زیادہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپ خود کچھ کر دوسروں کو بتلا دیں۔

خلاصہ یہ کہ معراج سے دو مقصود تھے۔ ایک یہ کہ رویت آیات و از دیاد علوم سے آپ کی تکمیل ہو دوسرے یہ کہ ان علوم سے آپ دوسروں کی تکمیل کریں پہلا فائدہ لازمی ہے اور دوسرا فائدہ متعدی ہے اور ظاہر ہے کہ جو وقت فائدہ متعدیہ کے ظہور کا ہوگا وہ فائدہ لازمیہ کے وقت سے افضل ہوگا کیونکہ بعثت رسول سے

اصل مقصود افادہ خلافت ہی ہے نیز دوسروں کی تکمیل سے خود رسول کے درجات میں بھی ترقی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ فائدہ متحد یہ کا ظہور بعد نزول کے ہوا تو نزول کا عروج سے افضل ہونا ثابت ہو گیا۔

دوسری دلیل یہ آیت ہے وَلِلْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّكَ مِنَ الْاُولٰٓئِیْ اس کا بیان یہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ دنوں نزول وحی میں توقف ہو گیا اور کفار نے طعن کیا تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رنج و غم کا اثر ہوا اور آپ پر حالت قبض طاری ہو گئی۔ تو بعد میں حق تعالیٰ نے آپ کی تسلی فرمائی اور سورہ ضحیٰ نازل ہوئی۔ جس میں اول ان آیات کی قسم کھائی ہے جن کو اس حالت سے خاص مناسبت ہے فرماتے ہیں۔ وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وُدَّ عٰکِ رِبْکَ وَمَا قَلٰی قَسَمٌ ہِیَ دِنٌ کِیْ اُوْر رٰتِ کِیْ جِبْ وَّہٗ قَرَارٌ یُّکْرَ لَیْ اِسْ جِکَ رٰتِ اُوْر دِنِ کِیْ قَسَمٌ بَہْتٌ ہِیَ مَنَاسِبٌ ہِیَ کِیْوَنَکَ دِنٌ مَشَابِہٌ ہِیَ حَالَتٌ بَسَطٌ کَے اُوْر یَہٗ رٰتِ مَشَابِہٌ ہِیَ حَالَتٌ قَبْضٌ کَے۔

وجہ تشبیہ ایک تو یہ ہے کہ حالت بسط میں انوار کا توارد ہوتا ہے اور دن بھی محل نور ہے اور حالت انوار میں وہ انوار نہیں رہتے تو وہ رات کے مشابہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جس طرح دن میں کاروبار زیادہ ہوتے ہیں اسی طرح حالت بسط میں سالک سے کام زیادہ ہوتا ہے اور حالت قبض میں کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔ نماز میں دل لگتا ہے نہ ذکر میں نہ تلاوت میں تو قبض میں کام کم ہو جاتا ہے۔ وہ رات کے مشابہ ہے کہ اس میں بھی کاروبار بند ہو جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس جگہ رات اور دن کی قسم سے مقام کی یعنی جواب قسم ما وودعک ربک وما قلی وللآخرة خیر لک من الاولیٰ کی حقیقت بتلاوی جس کا حاصل یہ ہے کہ سالک پر ان دونوں حالتوں کا آنا ایسا ہے جیسے لیل و نہار کا تعاقب پس جس طرح دن کے بعد رات کا آنا غیر مقبول ہونے کی علامت نہیں اسی طرح بسط کے بعد کہ تو اترو جی ہے قبض کا آنا کہ توقف وحی ہے غیر مقبول ہونے کی دلیل نہیں بلکہ جس طرح ہم نے عالم میں لیل و نہار کا اختلاف حکمت کے لئے رکھا ہے یونہی سالک پر بسط و قبض کا تعاقب حکمت کے لئے مقرر کیا گیا ہے پس قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔

اِنْ يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يَغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۝

ترجمہ: یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں اور یقیناً بے اصل بات امر حق کے اثبات میں (ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

تفسیری نکات

شان نزول

شان نزول اس کا یہ ہے کہ دین کے باب میں کفار انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں کچھ دعوے کیا کرتے اور وہ دعوے بلا دلیل تھے حق تعالیٰ ان پر ملامت فرماتے ہیں کہ یہ لوگ صرف اپنے خیالات اور ظن کا اتباع کرتے ہیں حالانکہ ظن محض سے حق ثابت نہیں ہوتا ہے محض سے مراد وہ جس کا استناد نص کی طرف نہ ہو رائے محض ہو۔ یہ محض کا لفظ اہل علم کے یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اہل علم کو اس مقام پر شبہ ہو جایا کرتا ہے کہ شریعت میں ظن کا تو اعتبار کیا گیا ہے چنانچہ خبر واحد اور قیاس ظنی ہے اسی طرح قیاس شرعی بھی اس کا جواب محض کے لفظ سے نکل آیا یعنی جو ظن معتبر ہے وہ محض ظن نہیں ہے بلکہ وہ ظن معتبر ہے جس کا استناد نص کی طرف ہے چنانچہ خبر واحد جو ظنی ہے وہ تو اصل ہی میں ظنی الثبوت نہیں ہے محض اس کی سند میں ظن عارض ہو گیا ہے ورنہ بحیثیت رسول ہونے کے فی نفسہ قطعی ہے اسی طرح قیاس تو اصل ہی میں ظنی ہے لیکن وہ خود مثبت (یعنی حکم کا ثابت کرنے والا) نہیں ہے بلکہ مظہر (حکم کو ظاہر کرنے والا) ہے۔ اور مثبت تو نص ہے اور قیاس کی طرف مستند ہے اور یہاں جس ظن پر ملامت ہے اس سے مراد وہ ظن ہے جس کا کسی نص کی طرف اسناد نہ ہو بعض نصوص سے علوم ظنیہ کے مطلقاً مفید نہ ہونے کا شبہ ہو گیا ہے جن میں سے ایک ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً یقیناً ہے بے اصل خیالات امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

اس میں شیئاً نکرہ ہے تحت الٹھی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ظن کسی درجہ میں بھی مفید نہیں تو سمجھنا چاہیے کہ یہ دھوکا اصطلاح اور محاورہ کے خلط سے پیدا ہوا ہے قرآن کو محاورات پر سمجھنا چاہئے کیونکہ اس کا نزول محاورات عرب ہی پر ہوا ہے نزول قرآن کے وقت اہل عرب ان معقولی اصطلاحات کو جانتے بھی نہ تھے یہ تو بعد میں مقرر ہوئی ہیں۔

پس اب سمجھو کہ محاورات میں ظن کے معنی مطلق خیال کے ہیں خواہ صحیح یا غلط مدلل یا غیر مدلل مطابق واقع ہو یا خلاف واقع۔ تو ظن اصطلاحی بھی اس کی ایک فرد ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ظن کا استعمال بمعنی

اعتقاد جازم ہوا ہے۔ یظنون انہم ملاقوا ربہم وہ اللہ کی ملاقات کا یقین رکھتے ہیں۔
یہاں اعتقاد جازم مراد ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ اعتقاد آخرت میں ذرا سا بھی شک کفر ہے اور ایک
جگہ آخرت کے متعلق کفار کا قول نقل کیا گیا ہے۔

ان نظن الاظناً و مانحن بمستیقین محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو یقین نہیں۔
یہاں وہ ہم و خیال مراد ہے کیونکہ ان کو آخرت کے متعلق ظن اصطلاحی بھی نہ تھا بلکہ وہ تو منکر و مذہب تھیں ہی طرح۔
ان الظن لا یعنی من الحق شیئاً یقیناً بے اصل خیالات امر حق میں ذرا مفید نہیں ہوتے۔
میں ظن اصطلاحی مراد نہیں بلکہ خیال بلا دلیل مراد ہے کیونکہ یہاں کفار کے بارہ میں گفتگو ہے اور
ان کا ظن (ملائکہ بنات اللہ ہونے کے بارہ میں) کسی دلیل سے نہ تھا بلکہ خلاف دلیل تھا۔ چنانچہ اوپر کی آیت
سے اس کا کفار کے متعلق ہونا ظاہر ہے فرماتے ہیں۔

ان الذین لا یؤمنون بالآخرة لیسمون الملائکة تسمیة جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لائے وہ
فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں شمار کرتے ہیں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے محض بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں۔
اسی کے متعلق آگے ارشاد ہے وان الظن لا یعنی من الحق شیئاً کہ ایسا ظن جو بلا دلیل ہو جیسا کفار
کو تھا مغنی عن الحق نہیں ہے۔

آیات منجملہ و مشککہ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ طلباء معقول کے بعد قرآن کو پڑھتے ہیں جبکہ وہ اصطلاحات ان کے ذہن میں رچی
ہوئی ہوتی ہیں تو قرآن میں بھی ان کو وہی سوجھتی ہے اسی کی مناسبت سے وحدۃ الوجود کا ذکر آ گیا کہ اس کی
حقیقت بھی ایک چیز کا ذہن میں رچ جانا ہے۔ بہر حال ان الظن لا یعنی من الحق شیئاً میں ظن
اصطلاحی مراد نہیں بلکہ ظن بلا دلیل مراد ہے پس ظن اصطلاحی کا غیر کافی ہونا یا حجت نہ ہونا قرآن سے ثابت نہیں
ہو سکتا بلکہ دلائل شرعیہ سے اس کا معتبر و حجت ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں
بعض آیات مجملہ و مشککہ بھی ہیں۔ سب کی سب مفسر و محکم ہی نہیں ہیں اور جب بعض آیات مجمل و مشکل بھی
ہیں تو ان کی کوئی تفسیر قطعی نہیں ہو سکتی ورنہ پھر اجمال و اشکال ہی کہاں رہا اور جب کوئی تفسیر قطعی تو نہیں، ظنی ہو
گی۔ اب اگر ظن مطلقاً غیر معتبر ہے تو آیات مجملہ و مشککہ بالکل متروک العمل ہو جائیں گی۔ حالانکہ اس کا کوئی
قابل نہیں ہے۔ مثلاً لاسم النساء میں ابہام ہے۔ جس کی وجہ سے تفسیر میں اختلاف ہو رہا ہے کہ اس سے مراد
لس بالید ہے یا ملاستہ بالجماع ہر فریق اپنی تفسیر کو دلائل سے ثابت کرتا ہے اور جس کے نزدیک جو معنی راجح
ہیں اس پر عمل کرتا ہے حالانکہ ہر تفسیر ظنی ہے قطعی کی گنجائش بھی نہیں مگر کسی نے اس آیت کو یہ کہہ کر ترک نہیں کیا

کہ اس کی قطعی مراد تو معلوم نہیں اور ظن معتبر نہیں لہذا اس پر عمل نہیں ہو سکتا اور جب ظن معتبر ہے تو جو معنی جس شخص کے نزدیک راجح ہیں وہ اس کو مدلول کلام ہی سمجھ رہا ہے گو قطعاً نہ سہی ظناً ہی سہی جس کا قرینہ یہ ہے کہ اس ظن کی بناء پر وجوب و حرمت کراہت و مندوبیت وغیرہ احکام شرعیہ ثابت کئے جاتے ہیں اور یہ احکام بدوں نسبت الی الشارح کے ثابت نہیں کئے جاسکتے پس ثابت ہو گیا کہ مدلول ظنی بھی مدلول نص ہی ہے (تو جس طرح قطعیات کو قطعاً مدلول نص کہا جاتا ہے اسی طرح ظلیات بھی ظناً مدلول نص ہیں خواہ بلا واسطہ قیاس کے خواہ بواسطہ قیاس کے غرض محکم حکم اور علل کا جدا جدا حکم ہے۔

وَإِذْ أَنْتُمْ آجِنَةٌ فِي بُطُونِ امهاتِكُمْ

تَجْوِیٰمِ: اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

تفسیری نکات

جنین پر اثر

حکماء کا قول ہے کہ جس عمر میں بچہ عقل ہیولانی کے درجہ سے نکل جاتا ہے تو گو اس وقت وہ بات نہ کر سکے مگر اس کے دماغ میں ہر بات اور ہر فعل منقش ہو جاتا ہے اس لئے اس کے سامنے کوئی بات بھی بے جا اور نازیبا نہ کرنا چاہیے بلکہ بعض حکماء نے یہ لکھا ہے کہ بچہ جس وقت ماں کے پیٹ میں جنین ہوتا ہے اس وقت بھی ماں کے افعال کا اثر اس پر پڑتا ہے اور اجزاء اسی جنین کی جمع ہے قرآن میں ہے و انتم اجنۃ فی بطون امهاتکم بعض لوگ اجزاء کو جن کی جمع سمجھتے ہیں یہ غلط ہے جن کی جمع جنات و جان ہے اور مفرد جنی ہے مونث جنیتہ ہے اور جن اسم جنس ہے تو حکماء الہی نے یہ کہا ہے کہ ماں کو لازم ہے کہ حمل کے زمانہ میں نہایت تقویٰ و طہارت سے رہے کیونکہ بحالت حمل بھی اس کے افعال کا اثر جنین پر ہوتا ہے چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق ایک حکایت سنی ہے گو کتابی نہیں مگر تقریب فہم میں اس کو بطور مثال بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک مرد و عورت بہت نیک تھے مگر ان کے بچہ نہ ہوتا تھا بڑی دعاؤں اور امیدوں کے بعد حمل ٹھہرا اور بچہ کی امید ہوئی تو دونوں نے عہد کیا کہ دونوں زمانہ حمل میں احتیاط اور تقویٰ سے گزر کر یں مرد نے بھی بہت احتیاط کی تاکہ اس کے افعال کا اثر عورت پر نہ پڑے اور اس کا جنین پر نہ پڑے چنانچہ غایت احتیاط کے بعد بچہ پیدا ہوا اور اس آثار رشد و صلاح کے ظاہر تھے جو بڑھتا گیا رشد و اصلاح کے آثار نمایاں ہوتے گئے۔ ایک مرتبہ وہ ہوشیار ہو کر باپ کے ساتھ بازار جا رہا تھا کہ ایک کنجڑن کے ٹوکے میں سے ایک بیر اٹھا کر کھالیا مرد کو حیرت ہوئی کہ یہ بات اس میں

کہاں سے آئی گھر آ کر تلوار سوت لی اور بیوی سے دھمکا کر پوچھا کہ بتلا اس میں یہ عیب کہاں سے آیا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے حمل کے زمانے میں کسی کی چوری کی ہے۔ عورت نے کہا تلوار کو نیام میں کرو میں سوچ کر بتلاؤں گی پھر سوچ کے بتلایا کہ ہمارے پڑوسی کی پیری کی ایک شاخ ہمارے گھر میں لٹک رہی ہے اس پر سے ایک بیر توڑ کر میں نے کھالیا کیونکہ میں نے غلطی سے اس کو چوری کا نہیں سمجھا جب جنین پر بھی ہماری حرکات و افعال کا اثر ہوتا ہے تو ہوشیار بچوں کی طبیعت پر کیوں اثر نہ ہوگا گو وہ بات نہ کر سکتے ہوں مگر اثر ہر بات کا لیتے ہیں۔

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ

ترجمہ: تم اپنے نفسوں پر تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے۔

تفسیری نکات

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ

جس کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ لا تزکو انہی کا صیغہ ہے مشتق تزکیہ سے تو اب اس پر اشکال واقع ہوگا کہ ایک جگہ تو تزکیہ کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نہی ہے اس کے کیا معنی جواب اس کا یہ ہے کہ اگر اسی آیت میں لا تزکو انفسکم (تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ بیان کرو) کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہو جائے گا۔ قرآن میں اکثر شبہات ماسبق اور مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں اگر شبہ وارد ہونے کے وقت آیت کے ماسبق اور مابعد میں غور کر لیا کریں تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہو جایا کرے اور اسی جگہ شبہ کا جواب موجود ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہر شبہ کا جواب بھی ساتھ ساتھ ذکر فرمادیا ہے جیسا کہ تلوینیات میں بھی حق تعالیٰ کی یہی عادت ہے چنانچہ جن لوگوں نے خواص ادویہ کی تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جن نباتات میں کسی قسم کا ضرر ہے جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہیں اسی مقام پر ایک دوسری نباتات بھی حق تعالیٰ پیدا کر دیتے ہیں جس میں اس ضرر کی اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک گھاس زہریلی ہوتی ہے جس کو کہتے ہیں اس میں پچھو کی سی خاصیت ہے اس کے چھونے سے پچھو کا سا اثر ہوتا ہے تو جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہے اسی مقام پر اس کے پاس ہی اللہ تعالیٰ نے دوسری گھاس اس کی اصلاح کرنے والی پیدا کر دی ہے کہ اس کے ملنے سے وہ اثر زائل ہو جاتا ہے خیر تلوینیات میں تو ہم کو زیادہ تحقیق نہیں اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں کہ سب چیزوں کی خاصیات دریافت کی جائیں اور ہر قسم کی دوائیں جمع کی جائیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ عدم تحقیق کی وجہ سے کسی مضر کو استعمال کر لے گا اور اس کی

مضرت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ ہلاک ہو جائے گا تو ہلاک ہونا تو ایک دن ضروری ہے۔ بدوں کسی مضر چیز کے استعمال کئے بھی موت ایک دن آتی ہے۔

دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے

مگر شریعت میں یہ ضروری ہے کہ جو امور مضر ہیں ان کو جانے کیونکہ ان کے نہ جاننے سے دینی ضرر ہوتا ہے جو کہ خسارہ عظیم ہے۔ اس کا ضرر موت سے بھی ختم نہ ہوگا بلکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے گا اور یہ سخت ضرر ہے۔ جس کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کانوا یسنلونہ عن الخیر و کنت اسئلہ عن الشر مخافة ان یدرکنی یعنی اور صحابہ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی تحقیق کیا کرتے تھے اور میں شر کی تحقیق زیادہ کیا کرتا تھا اس خوف سے کہ کہیں شر میں مبتلا نہ ہو جاؤں اس لئے جو چیز دین کو مضر ہو اس کی تحقیق کر لینا لازم ہے۔ منجملہ اس کے وہ شبہات بھی ہیں جو قرآن و حدیث میں لوگوں کو پیش آیا کرتے ہیں ان کا رفع کرنا ضروری ہے اور اس میں حق تعالیٰ نے یہ اعانت فرمائی ہے کہ جس جگہ قرآن میں شبہ ہوتا ہے وہیں جواب بھی مذکور ہوتا ہے لہذا شبہ کے وقت سیاق و سباق میں ضرور غور کر لینا چاہیے۔ چنانچہ لاتزکوا انفسکم (تم اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان کرو) پر جو قد افلح من زکھا سے تعارض کا شبہ ہوا تھا اس کا جواب اسی جملہ کے ساتھ ساتھ دوسرے جملہ میں مذکور ہے یعنی هو اعلم بمن اتقى (وہ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے) میں کیونکہ اس میں مذکور کی علت کا ذکر ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے اس میں حق تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک اپنا زیادہ عظیم ہونا دوسرے من اتقى کے ساتھ علم کا متعلق ہونا۔

تقویٰ باطنی عمل ہے

نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تقویٰ باطنی عمل ہے چنانچہ حدیث میں صراحتاً مذکور ہے الا ان التقویٰ ہنا و اشار الی صدرہ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سنو تقویٰ یہاں ہے۔

تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے

نیز تقویٰ کے معنی لغتاً ڈرنے اور پرہیز کرنے کے ہیں یعنی معاصی سے بچنا اور ڈرنا تو ظاہر ہے کہ باطن کے متعلق ہے اور معاصی سے بچنے کا ڈر خود اصلاح باطنی ہے چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی پوری

تصریح ہے۔ ان فی جسد ابن ادم مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کله الا وہی القلب کہ انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے کن لو وہ دل ہے اس سب سے تقویٰ کی حقیقت واضح ہو گئی کہ تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے۔ پس اب تقویٰ اور تزکیہ دونوں مترادف ہوئے آیت کا حاصل یہ ہوا۔ ہو علم بمن تزکیٰ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب یہ سمجھو کہ اس میں تزکیہ کو عبد کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے اس کا داخل اختیار ہونا مفہوم ہوتا ہے تو وہ مقدر ہوا۔ پھر یہ کہ اعلم فرمایا ہے اقدر نہیں فرمایا۔ اس سے بھی اشارہ معلوم ہوا کہ بندہ کی قدرت کی نفی مقصود نہیں ہے پس اس سے بھی تقویٰ و تزکیہ کا مقدر و عبد ہونا مفہوم ہوا۔ ورنہ اعلم نہ فرماتے بلکہ اقدر علی جعلکم متقین یا اس کے مناسب اور کچھ فرماتے جب تقویٰ اور تزکیہ ایک ٹھہرے اور مقدر و عبد ٹھہرے اب غور کرنا چاہیے کہ ہوا علم بمن اتقی تزکیہ کو انفسکم کی علت بن سکتی ہے یا نہیں اگر لا تزکیہ کو اس کے معنی یہ لئے جائیں کہ نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی نفس کو رذائل سے پاک کرنے کی کوشش نہ کرو تو ہوا علم بمن اتقی کی علت نہیں ہو سکتی کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو رذائل سے پاک نہ کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکیہ اور تقویٰ کیا ہے اور یہ ایک بے جوڑی بات ہے یہ تو ایسا ہوا جیسے یوں کہا جائے کہ نماز نہ پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے نماز پڑھی ہے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا بندہ کے کسی فعل کو جانا اس کے ترک کی علت نہیں ہو سکتی ورنہ پھر سب افعال کو ترک کر دینا چاہیے کیونکہ حق تعالیٰ تو بندہ کے سبھی افعال کو جانتے ہیں بلکہ اس کے مناسب یہ علت ہو سکتی تھی کہ ہوا اقدر علی جعلکم متقین او نحوہ یعنی یوں فرماتے کہ تم نفس کو رذائل سے پاک نہ کرو۔ کیونکہ تم کو متقی بنانے پر حق تعالیٰ زیادہ قادر ہیں تم پورے قادر نہیں ہو پھر کیوں کوشش کرتے :- جب یوں نہیں فرمایا بلکہ اعلم بمن اتقی فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں تزکیہ کے وہ معنی نہیں بلکہ کچھ اور معنی ہیں جس کے ترک کی علت ہوا علم بمن اتقی ہو سکتی ہے یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو۔ یعنی پاکی کا دعویٰ نہ کرو۔ کیونکہ حق تعالیٰ ہی کو خوب معلوم ہے کہ کون متقی ہے اور کون پاک ہوا ہے یہ بات تم کو معلوم نہیں اس لئے دعویٰ بلا تحقیق مت کرو۔ اب کلام میں پورا جوڑ ہے اور علت و معلول میں کامل ارتباط ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تزکیہ باب تفعیل کا مصدر ہے اور تفعیل کی خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح اس کی ایک خاصیت تعدیہ ہے اسی طرح ایک خاصیت نسبت بھی ہے پس قد افلح من زکھا میں تزکیہ کا استعمال خاصیت تعدیہ کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا اس میں نفس کو رذائل سے پاک کرنے کا امر ہے اور لا تزکیہ کو انفسکم میں تزکیہ کا استعمال خاصیت نسبت کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو اس میں نفس کو پاک کہنے کی ممانعت ہے اب ان دونوں میں کچھ بھی

تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کا ایک جگہ امر ہے دوسری جگہ اس کی ممانعت نہیں۔ بلکہ ایک نئی چیز کی ممانعت ہے۔ حکم تو نفس کے پاک کرنے کا ہے اور ممانعت پاک کہنے سے ہے کہے اب کیا اشکال رہا (زکوٰۃ النفس)

وَأَنَّ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۗ

ترجمہ: انسان کو وہی ملتا ہے جو اس نے سعی کی ہے۔

ایصال ثواب کا ثبوت

یہاں پر ایک بات طلباء کے کام کی یاد آئی وہ یہ ہے کہ معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ایک کے عمل کا ثواب دوسرے کے پہنچانے سے بھی نہیں پہنچ سکتا اور ایصال ثواب کا انکار کرتے ہیں جو اب اس کا یہ ہے کہ لانا انسان میں لام نفع کا ہے اور نفع دو قسم کا ہے ایک ثواب دوسرا وہ خاصیت جو عامل کے اندر اس سے پیدا ہوتی ہے پس یہاں دوسری قسم کا نفع مراد ہے نہ کہ اول قسم بوجہ دوسری نصوص کے چنانچہ ایک دوسری آیت سے بھی یہ مضمون معلوم ہوتا ہے۔

سُورَةُ الْقَمَرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاَنْشَقَّ الْقَمَرُ ①

ترجمہ: قیامت نزدیک آگئی اور چاند شق ہو گیا

تفسیری نکات

علامات قرب قیامت

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ شق قمر کا معجزہ علامات قیامت سے ہے اس میں وقوع کا انکار نہیں بلکہ معجزہ نہیں مطلب یہ ہے کہ جیسے طلوع شمس من المغرب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بلکہ علامات قیامت ہے ایسے ہی شق القمر بھی معجزہ نہیں بلکہ علامات قرب قیامت سے ہے جیسے آیت میں اقتراب ساعت کے اقتران سے مفہوم بھی ہوتا ہے اقتربت الساعة وانشق القمر

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدْكِرٍ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

تفسیری نکات

استنباط احکام محققین کا کام ہے

ایک بار دین میں موجودہ زمانہ کے لوگوں کی آزادی اور خود رائی کا بیان ہو رہا تھا ارشاد فرمایا کہ اب تو لوگوں کی جرات یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ فقہاء اور مجتہدین نے جو مسائل قرآن و حدیث سے استنباط کئے ہیں ان کو غلط قرار دیتے ہیں اور خود قرآن و حدیث سے احکام کا استنباط کرنا چاہتے ہیں اور جب ان کو استنباط کی صعوبت پر متنبہ کیا جاتا ہے تو آیت ولقد یسرنا القرآن للذکر الایۃ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب قرآن آسان ہے تو پھر کیا وجہ اس کو سمجھنا اور اس سے مسائل کا استنباط صرف علماء ہی کے ساتھ مخصوص ہو ہم نہ کر سکیں حالانکہ ان کا نہ یہ دعویٰ صحیح ہے اور نہ ان کا اس آیت سے یا اسی قسم کی دوسری آیتوں سے استدلال صحیح ہے کیونکہ قرآن و حدیث کے متعلق دو چیزیں ہیں ایک تو ان سے استنباط مسائل کا دوسرے تذکر و تذکیر یعنی ترغیب و ترہیب تو قرآن کو جو آسان فرمایا گیا ہے وہ صرف تذکر و تذکیر کے لئے آسان فرمایا گیا ہے چنانچہ اس آیت میں یسرنا کے بعد للذکر کا لفظ موجود ہے اسی طرح اس مضمون کی ایک دوسری آیت ہے۔ فانما یسرناہ بلسانک لتبشر بہ المتقین و تنذربہ اس میں بھی تصریح ہے کہ قرآن تبشیر و انداز کے لئے آسان کیا گیا ہے باقی رہا استنباط مسائل کا سوال سو اس کے متعلق کہیں ارشاد نہیں کہ وہ آسان ہے بلکہ میں خود قرآن سے ثابت کرتا ہوں کہ قرآن و حدیث سے استنباط احکام صرف محققین ہی کا کام ہے ہر شخص اس کا اہل نہیں۔ پانچویں پارہ میں ارشاد ہے۔ واذا جاء ہم امر من الامن او الخوف اذا عوا بہ ولوردوہ الی الرسول والی اولی الامر منہم لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم شان نزول اس آیت کا بالاتفاق یہ ہے کہ حضور کے زمانہ میں جب کوئی جہاد وغیرہ ہوتا تھا تو مواقع قتال سے جو خبریں آتی تھیں بعض لوگ بلا تحقیق ان کو مشہور کر دیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس آیت میں ارشاد ہے کہ جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ وہ امن کی ہو یا خوف کی تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جوان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالہ پر رکھتے تو ان میں جو اہل استنباط ہیں اس کو وہ حضرات پہچان

لیتے کہ کون قابل اشاعت ہے کون نہیں دیکھئے۔ یہاں یسٹنبتونہ منہم فرمایا ہے اور یہ من تبعضیہ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اہل استنباط ہیں۔ سب نہیں حالانکہ یہ جنگ کی خبریں کوئی اقسام احکام شرعیہ نہ تھیں بلکہ واقعات حسیہ تھے جو احکام کے مقابلہ میں عسیر الفہم نہیں تو جب معمولی واقعات حسیہ کے متعلق قوت استنباط کا اثبات صرف بعض لوگوں کے لئے کیا گیا ہے تو موٹی بات ہے کہ قرآن و حدیث سے احکام کا استنباط تو بدرجہا مشکل ہوگا اس کا اہل ہر شخص کیسے ہو سکتا ہے اسی طرح حضور کے زمانہ کا ایک دوسرا واقعہ ہے وہ یہ کہ جب اول بار آیت لا یستوی القاعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر والمجاہدون الا یہ نازل ہوئی جس میں مجاہدین کی قاعدین پر تفصیل کا بیان ہے تو اس وقت اس میں غیر اولی الضرر نہ تھا۔ اس لئے صحابہ تک نہ سمجھ سکے کہ یہ حکم مخصوص ہے قاعدین غیر اولی الضرر کے ساتھ حالانکہ حقیقت لغویہ و نصوص اعتبار عذر کی بناء پر قاعدین سے مراد یہاں وہی لوگ ہو سکتے تھے جو بلا کسی عذر کے جہاد میں شریک نہ ہو سکے ہوں ورنہ معذورین تو فی الحقیقت مقعدین ہیں۔ قاعدین نہیں مگر باوجود اس کے صحابہ اس کو نہ سمجھ سکے اس لئے اس کے متعلق سوال کیا جس پر غیر اولی الضرر بعد میں نازل ہوا اس سے صاف معلوم ہوا کہ محض زبان دانی فہم احکام کے لئے کافی نہیں یہ تو ایک فرع کے متعلق تحقیق تھی۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ عمیق ایک اصل کی مدققی ہے وہ یہ کہ ظاہر اس میں ایک اشکال متوہم ہوتا ہے کہ غیر اولی الضرر قاعدین کا بیان ہے اور پھر نزول میں اس سے فصل کے ساتھ موخر تو اصل کلام میں بیان مراد سے کمی کا احتمال رہتا ہے اس اشکال کے حل کے لئے انہوں نے فہم خداداد سے اسی آیت کے قرینہ سے ایک اصل کلی کا استنباط کیا کہ بیان کے اقسام اور ان کے جدا جدا احکام سمجھ کر ایسی عجیب تفصیل کی کہ حیرت ہوتی ہے اس تفصیل کی بناء پر غیر اولی الضرر کو بیان تغیر نہیں قرار دیا بلکہ بیان تفسیر فرمایا ہے اور یہ حکم فرمایا کہ اگر بیان تغیر ہوتا تو اس کے اندر فصل نہ ہوتا بخلاف بیان تفسیر کے کہ اس کے اندر فصل جائز ہو دیکھئے کیا ایسے اصول ہم جیسے موسس کر سکتے ہیں اس تقریر سے جواب کا خلاصہ یہ نکلا کہ تذکرہ و تذکیر کے لئے تو قرآن آسان ہے باقی رہا استنباط فروع کا یا اصول کا یہ ایسا مشکل ہے جو ہمارے بس کا نہیں اس ایک ہی مسئلہ کو دیکھ لیجئے فرع کو بھی اور اس کی بناء بیان تغیر و بیان تفسیر کو بھی۔

اگر فقہاء ان مسائل کو استنباط نہ کر جاتے تو آج کل کے معترضین میں سے کیا کوئی شخص اس پر قادر تھا کہ ان مسائل کا ایسا استنباط کر سکے۔

استدلالات اور استنباطات کا ہے وہ دقیق ہے۔ اب رہا یہ شبہ کہ جب قرآن و حدیث کا سمجھنا بلا علوم درسیہ کے دشوار ہے تو صحابہ نے قرآن و حدیث کو کیونکر سمجھا کیونکہ یہ علوم درسیہ اس زمانہ میں تو مدون نہ تھے نہ ان کی تحصیل معتاد تھی تو جواب اس کا یہ ہے کہ صحابہ کی طبائع سلیم تھیں اس لئے ان کو قرآن و حدیث کے اندر

ایسے شبہات ہی پیدا نہ ہوتے اور مقاصد کے سمجھنے کے لئے ان کو مبادی کی تحصیل کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی اس لئے قرآن و حدیث کو بلا علوم درسیہ بخوبی سمجھ لیتے تھے۔ بخلاف آج کل کے لوگوں کے کہ وہ قرآن و حدیث کو تو بلا علوم درسیہ کے کیا سمجھتے معمولی معاملات و واقعات روزمرہ کے دقائق کا بھی بلا علوم درسیہ کے سمجھنا ان کو دشوار ہی ہو جاتا ہے۔

تذکر کے لئے قرآن آسان ہے

فرمایا ولقد یسرنا القرآن للذکر کا مطلب یہ تذکر کے لئے قرآن آسان ہے باقی استنباط احکام کا سو یہ بہت مشکل ہے عوام کیا سمجھتے عوام تو اخبار و حکایات کی کہنہ بھی نہیں سمجھ سکتے چنانچہ ارشاد ہے واذا جاء ہم امر من الامن او الخوف الی قوله تعالیٰ لعلمہ الذین یستنبطونہ منهم (الخ) (اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف) تو اس کو وہ حضرات پہچان لیتے ہیں جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۴ ص ۱۲۲-۱۲۳)

دقائق قرآن و حدیث بلا علوم درسیہ سمجھ نہیں آ سکتے

قرآن و حدیث کے اندر جو دقیقیات ہیں وہ بغیر مبادی کے سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور مبادی بدوں تحصیل درسیات کے سمجھ میں نہیں آ سکتے تو قرآن و حدیث کے بہت سے دقائق بلا علوم درسیہ کے سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے دو حصے ہیں ایک حصہ تو نفس احکام اور اس کے متعلق تذکر و تذکیر کا ہے وہ تو آسان ہے اور نصوص کے اندر جا بجا جو قرآن کو آسان فرمایا گیا ہے اس سے مراد یہی حصہ ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر دوسری جگہ فرماتے ہیں وانما یسرناہ بلسانک لبشر بہ المتقین وتندر بہ قوما لدا۔ باقی رہا دوسرا حصہ جو استدلال اور استنباطات کا ہے وہ دقیق ہے۔ اب رہا یہ شبہ کہ جب قرآن و حدیث کا سمجھنا بلا علوم درسیہ کے دشوار ہے تو صحابہ نے قرآن و حدیث کو کیونکر سمجھا کیونکہ یہ علوم درسیہ اس زمانہ میں تو مدون نہ تھے۔ نہ ان کی تحصیل معتاد تھی تو جواب اس کا یہ ہے کہ صحابہ کی طبائع سلیم تھیں اس لئے ان کو قرآن و حدیث کے اندر ایسے شبہات ہی پیدا نہ ہوتے اور مقاصد کے سمجھنے کے لئے ان کو مبادی کی تحصیل کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی اس لئے قرآن و حدیث کو بلا علوم درسیہ بخوبی سمجھ لیتے تھے۔ بخلاف آج کل کے لوگوں کے کہ وہ قرآن و حدیث کو تو بلا علوم درسیہ کے کیا سمجھتے معمولی معاملات و واقعات روزمرہ کے دقائق کا بھی بلا علوم درسیہ کے سمجھنا ان کو دشوار ہی ہو جاتا ہے

چنانچہ میں اس کی تائید۔۔۔ ایک تازہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ جب میری سوانح لکھی جا رہی تھی تو میں نے ہدایت کی تھی کہ اس سوانح میں میرے متعلق کشف و کرامت کا کوئی باب نہ تجویز کیا جاوے کیونکہ مجھ سے کوئی کشف و کرامت صادر ہی نہیں ہوئی۔ اس پر بعض احباب نے کہا کہ مثلاً فلاں فلاں واقعات ایسے ہیں جو پسند صحیح ثابت ہیں اور اگر وہ دوسروں کے متعلق ہوتے تو ان کو ضرور کشف و کرامت کے اندر داخل سمجھا جاتا تو اگر ان واقعات کو ہم کرامت کے باب میں درج کر دیں تو کیا حرج ہے میں نے کہا کہ چونکہ ایسے واقعات کے اندر مجھ کو دوسرا بھی احتمال ہوتا ہے اس لئے میں ایسے واقعات کو بھی کرامت کے عنوان سے درج کرانا نہیں چاہتا البتہ تمہارا دل چاہے تو ایسے واقعات کو سوانح میں انعامات الہیہ کے عنوان کے تحت میں درج کر سکتے ہو تو میرا یہ جواب ان کی سمجھ میں نہ آیا اور اس پر انہوں نے یہ شبہ پیش کیا کہ کرامت بھی تو حق تعالیٰ کا انعام ہی ہوتا ہے پھر کرامت میں اور انعام میں کیا فرق ہوا۔ لہذا ہماری درخواست ہے کہ ان واقعات کو کرامت ہی کے عنوان کے تحت درج کرنے کی اجازت دی جائے تو پھر میں نے ان کو علوم درسیہ کے قواعد کے ذریعہ سمجھایا اور یہ جواب دیا کہ ملزوم تو لازم کے لئے مستلزم ہوتا ہے مگر لازم ملزوم کے لئے نہیں ہوتا جیسے آگ تو حرارت کے وجود کو مستلزم ہے مگر حرارت آگ کے وجود کو مستلزم نہیں پس ہر کرامت کا تو انعام ہونا لازم ہے مگر ہر انعام کا کرامت ہونا لازم نہیں۔ لہذا ہر انعام کو کرامت میں کیسے داخل کرتے ہیں تب وہ خاموش ہوئے۔ اب میں بطور مثال کے ایک شبہ بیان کرتا ہوں جو علوم درسیہ سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے خود قرآن کی ایک آیت کے متعلق ہوتا ہے وہ یہ کہ نوس پارہ میں ارشاد ہوتا ہے **وَلَوْ عَلَّمَ اللَّهُ خَيْرًا لَّاسْمَعَهُمْ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ**۔ اس آیت میں کفار کی مذمت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ علم خیر کے لئے اسماع لازم ہے اور اسماع کے لئے تولى لازم ہے اور قاعدہ عقلیہ ہے کہ لازم کا لازم لازم ہوا کرتا ہے تو علم خیر کیلئے تولى لازم ہوئی جس کا مطلب اس قاعدہ مذکورہ کی بناء پر یہ ہوا کہ اگر حق تعالیٰ کو ان کفار کے متعلق خیر اور بھلائی کا علم ہوتا تو ان کفار سے تولى اور اعراض کا صدور ہوتا اور اس کا استحالہ ظاہر ہے کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے علم کا واقع ہے مطابق نہ ہونا لازم آتا ہے جو محال ہے۔ اب اس شبہ کا رفع کرنا اس شخص کے لئے جو علوم درسیہ سے واقف نہ ہو بہت دشوار ہے اور جو علوم درسیہ پڑھ چکا ہو اس کے لئے ایک اشارہ کافی ہے۔ وہ کہ یہ شبہ تو جب صحیح ہوتا کہ یہاں اسماع حد اوسط ہوتا حالانکہ اسماع حد اوسط نہیں اس لئے کہ وہ مکرر نہیں کیونکہ پہلا اسماع اور ہے اور دوسرا اسماع اور ہے لہذا تولى کو جو لازم کا لازم سمجھا گیا اور اس بناء پر علم خیر کے لئے تولى کو لازم قرار دیا گیا خود یہی غلط ہوا پس حق تعالیٰ کے علم کے متعلق واقعہ کے غیر مطابق ہونے کا جو شبہ ہوا تھا وہ رفع ہو گیا اب آیت کا صحیح مطلب یہ ہوا کہ اگر حق تعالیٰ ان کے اندر کوئی خیر دیکھتے تو ان کو باسماع قبول

سناتے مگر جبکہ حق تعالیٰ کے علم میں ان کے اندر کوئی چیز نہیں ہے ایسی حالت میں اگر ان کو نصیحت سنا دیں جو اسماع قبول نہ ہوگا کیونکہ یہ اسماع حالت عدم خیر میں ہوگا تو وہ لوگ اس کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ بلکہ توی اور اعراض کریں گے۔ اسی طرح قرآن کی آیت پر ایک دوسرا شبہ اور اس کا جواب یاد آیا اس کا واقعہ یہ ہے کہ جنگ بلقان کے زمانہ میں جب ایڈریانو پل پر کفار کا قبضہ ہوا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت پریشانی ہوئی اور طرح طرح کے خیالات فاسدہ آنے لگے حتیٰ کہ بعض کو تو نصوص پر کچھ شبہات بھی پیدا ہو گئے تھے یہ حال دیکھ کر دہلی کے مسلمانوں نے ایک بڑا جلسہ کیا اور مجھ کو اس جلسہ کے اندر مدعو کیا اور صدر بنایا اور لوگوں کے عقائد کی اصلاح کی نیت سے مجھ سے وعظ کی درخواست کی چنانچہ میری اس جلسہ میں تقریر ہوئی جب وعظ ہو چکا تو بآواز بلند میں کوئی شخص یہ نہ کہے کہ مجھ کو یہ پوچھنا تھا اور نہ پوچھ سکا۔ یہ سن کر ایک ولایتی منتمی طالب علم کھڑے ہوئے یہ لوگ معقول زیادہ پڑھتے ہیں قرآن سے معلوم ہوتا تھا کہ معقولی ہیں کہنے لگے کہ قرآن شریف میں وعدہ ہے ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون مگر باوجود اس کے پھر ایڈریانو پل پر کفار کا قبضہ ہو گیا تو اس کی کیا وجہ میں نے کہا کہ ذرا یہ تو بتلائیے کہ موجهات میں سے یہ کونسا قضیہ ہے بس میرے اس کہنے پر ہی وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر میں نے ہی خود ان سے کہا کہ آپ کو جو یہ شبہ ہوا کہ یہ قضیہ ضرور یہ یاد آئے ہے تو اس کی کیا دلیل ہے ممکن ہے کہ مطلقہ عامہ ہو جس کا ایک بار بھی وقوع کافی ہوتا ہے جو ہو چکا اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو گیا اس کے بعد پھر کوئی شخص نہیں کھڑا ہوا تو دیکھئے چونکہ یہ طالب علم علوم درسیہ پڑھے ہوئے تھے اور مبادی ان کے ذہن میں تھے اس لئے میرے ایک لفظ سے ان کا شبہ حل ہو گیا۔ اسی طرح ایک اور مولوی صاحب کو قرآن شریف کی ایک آیت کے متعلق شبہ تھا وہ یہ آٹھویں پارہ میں ارشاد ہے سيقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا ابائنا ولا حرمانا من شیء کذالک کذب الذین من قبلہم حتی ذاقوا باسنا قل هل عندکم من علم فتخرجوه لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اول کفار مشرکین کا معقول نقل فرمایا ہے کہ اگر حق تعالیٰ یہ چاہتے کہ ہم سے شرک کا وقوع نہ ہو تو ہم شرک نہ کرتے (مگر جب ہم سے شرک کا وقوع ہوا تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کیا ہے جو حق تعالیٰ کا چاہا ہوا تھا) پھر اس مقولہ کے نقل فرمانے کے بعد حق تعالیٰ نے کذلک سے تخرصوں تک کفار کے اس مقولہ کا رد فرمایا ہے۔ اور ساتویں پارہ میں ہے ولو شاء اللہ ما اشرکوا کو یعنی حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں کہ ان مشرکین پر اتنا رنج و غم نہ کیجئے کیونکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں ہماری مشیت سے کر رہے ہیں اگر ہم چاہتے کہ یہ شرک نہ کریں تو یہ شرک نہ کرتے تو آٹھویں پارہ میں جو آیت ہے وہاں تو شرک کے متعلق مشیت کی نفی فرمائی ہے اور اس سے

دوسری آیت میں اس مشیت کا اثبات فرما رہے ہیں۔ تو ان دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے وہ مولوی صاحب مجھ سے اس کے جواب کے طالب ہوئے اب وہ لوگ جو بلا علوم درسیہ پڑھے ہوئے محض ترجمہ قرآن کو بطور خود دیکھ کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہم نے قرآن کو سمجھ لیا۔ ذرا اس شبہ کا تو جواب دیں۔ میں نے یہ جواب دیا کہ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ تعارض تو جب ہوتا کہ جس مشیت کی ایک جگہ نفی کی گئی ہے اسی مشیت کا کوئی دوسری جگہ اثبات کیا جاتا۔ حالانکہ ایسا نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ مشیت کی دو قسمیں ہیں ایک مشیت تشریحی جس کا دوسرا نام رضا ہے اور دوسرے مشیت تکوینی جس کا نام ارادہ ہے تو آٹھویں پارہ میں جس مشیت کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد مشیت تشریحی یعنی رضا ہے اور دوسری جگہ آیت میں جو مشیت کا اثبات کیا گیا ہے اس سے مراد مشیت تکوینی یعنی ارادہ ہے کیونکہ پہلی آیت میں حق تعالیٰ نے کفار کا عقیدہ بیان فرمایا ہے تو کفار اپنے سے شرک کے متعلق مشیت تشریحی یعنی حق تعالیٰ کی رضا کے معتقد تھے اور دوسری آیت میں ایک عقیدہ شرعیہ بیان فرما کر حق تعالیٰ حضور کی تسلی فرماتے ہیں اور وہ عقیدہ شرعیہ یہی ہے کہ عالم میں جس سے بھی کفر و شرک کا وقوع ہو رہا ہے وہ حق تعالیٰ کے علم و ارادہ سے ہو رہا ہے گو مشیت تشریحی نہ ہو۔ اس کے بعد حضرت حکیم الامتہ دام ظلہم العالی نے حاضرین سے فرمایا کہ ان ہی دقائق کو دیکھ کر محققین نے لکھا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کے لئے چودہ علوم میں مہتر ہونے کی ضرورت ہے میں تو غیر مہتر کو اگر چہ وہ درسیات سے فارغ مولوی ہی کیوں نہ ہو۔ لوگوں کے سامنے ترجمہ قرآن بیان کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

آیت ولقد یسرنا القرآن پر ایک شبہ اور جواب

قرآن کریم نے متعدد مرتبہ اس کلام کو دہرایا ہے کہ ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدکر یعنی ہم نے قرآن کو آسان کر دیا ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔ اس پر عام طور پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ قرآن کے علوم و معارف تو ایسے ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء اور علماء کو اپنی عمریں صرف کرنے کے بعد بھی ان پر احاطہ نہیں ہو سکتا تو پھر اس کو آسان فرمانے کا کیا مطلب۔

حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ یسر (آسانی) مسائل میں ہے دلائل میں نہیں یعنی قرآن مجید نے جو احکام دیئے ہیں ان کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں۔ البتہ ان کے دلائل اور حکمتیں اور شبہات کے جوابات ان میں یسر کا ذکر نہیں۔ وہ اپنی جگہ محنت اور غور چاہتے ہیں۔ (مجالس حکیم الامت ص ۳۰۱)

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۙ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۙ

ترجمہ: رحمن نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھائی۔

تفسیری نکات

افعال خاص حق سبحانہ و تعالیٰ

حق سبحانہ تعالیٰ نے ان چھوٹی سی آیتوں میں اپنے خاص افعال کا ذکر فرمایا ہے کہ جو سر اس رحمت ہے اور پھر اپنے اسم مبارک کو بھی عنوان رحمت ہی سے ذکر فرمایا ہے اور اس آیت میں تین رحمتوں کا ذکر ہے اور تینوں بڑی رحمتیں ہیں اور ہر ایک کو الرحمن ہی سے شروع کیا ہے کیونکہ الرحمن مبتداء ہے اور اس کے بعد خبر ہیں تو گویا عبارت یوں ہے۔

الرحمن علم القرآن الرحمن خلق الانسان الرحمن علم البيان

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں نعمتوں کا منشاء خدا تعالیٰ کی رحمت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی سے کہے کہ مہربان حاکم نے تم کو عہدہ دیا۔ مہربان حاکم نے تمہاری ترقی کی مہربان حاکم نے تم کو افسر بنایا اس سے ہر اہل زبان سمجھ سکتا ہے کہ منشاء ان تمام عنایتوں کا مہربانی ہے۔ پس اسی طرح ان سب نعمتوں کا منشاء بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے اور پھر رحمت بھی عظیمہ کیونکہ رحمن مبالغہ کا صیغہ ہے تو ترجمہ کا حاصل یہ ہوا کہ۔

۱- جس ذات کی بڑی رحمت ہے اس نے قرآن کی تعلیم دی۔ یہ تو پہلی نعمت کا بیان ہے۔

۲- دوسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو پیدا کیا۔

۳- تیسری نعمت یہ کہ اس نے انسان کو بیان کرنا سکھلایا۔

ان تینوں نعمتوں میں اس وقت کی غرض کے مناسب تیسرا جملہ ہے۔ مگر چونکہ ان دو نعمتوں کی تقدیم جس طرح ذکر میں ہے اسی طرح وہ دونوں وجود میں بھی اس تیسری نعمت پر مقدم ہیں خواہ وجود حسی ہو یا وجود معنوی اس لئے ان کے دو جملوں کی بھی تلاوت کی گئی۔ چنانچہ ایک مقام کا تقدم اور دخل تو ظاہر ہے یعنی خلق الانسان کہ اس کو تو تکویناً دخل ہے اور یہ شرط تکوینی ہے کیونکہ جب تک انسان پیدا نہ ہو اس وقت تک تعلیم بیان ہو ہی نہیں سکتی۔ تو تعلیم و تعلم موقوف ہے وجود پر اور وجود موصوف ہے ایجاد پر۔

اسی سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ اگر پیدا نہ ہوتے تو بیان نہ کر سکتے لیکن اس کے مستقلاً ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اس پر متنبہ فرمانا ہے کہ جو نعمت کسی دوسری نعمت کا وسیلہ ہو وہ ایک درجہ میں مستقل اور مقصود بھی ہے اس کو محض واسطہ ہی نہ سمجھا جائے یعنی بعض نعمتیں چونکہ وسیلہ ہوتی ہیں اس واسطے ان کی طرف اکثر توجہ نہیں ہوا کرتی۔ اس لئے مستقلاً ذکر کرنے سے گویا یہ ارشاد فرما دیا کہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے اور یہ بھی قابل مستقل ذکر اور توجہ ہے صرف علم البیان ہی نعمت نہیں پس اگر یہ نعمت تکوین مذکور نہ ہوتی تو اس کی مقصودیت پر لفظاً تنبیہ نہ ہوتی اور ذکر کرنے میں تنبیہ ہو گئی ہے یہ مستقلاً بھی نعمت ہے کیونکہ پیدا کرنا صرف واسطہ تعلیم بیان ہی نہیں بلکہ اس میں اور بھی تو مصالح ہیں بہر حال اس پر تو توقف تکوینی ہے اور بہت ظاہر ہے۔

رہا دوسری شرط کا تقدم وہ بہت غامض ہے حتیٰ کہ اہل علم بھی بعض اوقات اس کی طرف التفات نہیں کرتے اور وہ شرط علم القرآن ہے کہ اس پر توقف تشریحی ہے یعنی بیان کا وجود اگرچہ بدوں قرآن کے حساً ہو گیا لیکن وجود صحیح قابل اعتبار تعلیم قرآن کے بعد ہوگا کیونکہ اگر بیان میں تعلیمات قرآنیہ کا لحاظ نہیں تو وہ بیان اور تقریر شرعاً باطل اور کالعدم ہے جیسا کہ آج کل اکثروں نے قرآن کی تعلیم کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ عوام الناس کو تو دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر امور میں حدود شرعیہ سے متجاوز ہو گئے ہیں اور ان کی ذرا رعایت نہیں کرتے مگر ہم اس طرح طلباء کو بھی اپنے اقوال و افعال میں جادہ شریعت سے بہت بڑھا ہوا پاتے ہیں۔ اور قرآن کی تعلیم کو انہوں نے بھی بہت زیادہ چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق طلبہ کو ایسے جلسوں اور انجمنوں کی اجازت دیتے ہوئے کھکتے ہیں کیونکہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ جلسوں کی کارروائی میں متجاوز عن الشرع نہ ہو جاویں پس جو بیان متجاوز حدود عن الشرع ہو وہ علمہ البیان میں داخل نہیں ہے۔

فِي آيَةِ الْاِءِ رَبِّكُمْ كَذِبًا ﴿۱۲﴾

ترجمہ: سوائے جن وانس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

تفسیری نکات

بیان نعم و قلم

اور یہی وجہ ہے کہ سورۃ رحمن میں بیان قلم (عذاب) کے بعد بھی وہی فرمایا ہے جو بیان نعم کے بعد فرمایا ہے یعنی فبای الاء ربکمما تکذبان یعنی خدا کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو اس کی ضروری تفصیل اہل علم کے لئے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ سورہ رحمن کے اول رکوع میں نگوینی نعم کا بیان ہے اور تیسرے رکوع میں نعم اخرویہ کا ان کے ساتھ توفبای الاء ربکمما تکذبان (اپنے رب کی کون کون سی نعمت جھٹلاتے ہو) کا ربط ظاہر ہے لیکن دوسرے رکوع میں قلم کا بیان ہے ان کے ساتھ فبای الاء الخ کا بظاہر کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا نعم کے بعد توفبائے الاء سے خطاب سب کے نزدیک بر محل ہے مگر اکثر لوگ قلم کے بعد فبای الاء الخ پر تعجب کرتے ہیں کہ قلم کے بعد اس کا کیا جوڑ مثلاً جہنم کا ذکر فرمایا اس کے بعد فرمایا فبای الاء الخ یعنی اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو اس میں یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا جہنم بھی نعمت ہے اس کا جواب یہ ہے کہ گو بظاہر مذکور کے درجہ میں جہنم نعمت ہے لیکن ذکر کے درجہ میں وہ نعمت ہے کیونکہ اس کا ذکر ہدایت کے لئے کیا گیا ہے اور نعمت کے ساتھ ظاہر کا لفظ اس واسطے کہا کہ واقع میں خود جہنم بھی نعمت ہے ان شاء اللہ اس کو بھی بیان کر دوں گا اس وقت یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ جس طرح جنت کا ذکر کر کے ترغیب دینا نعمت ہے اسی طرح جہنم کا ذکر کر کے ترہیب کرنا بھی نعمت ہے۔ جیسا کہ طبیب کا دوا بتلانا بھی نافع ہے اور قابل پرہیز اشیاء کی فہرست بتلانا اور ان کی مضرتیں بیان کرنا بھی نافع ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جس طرح حصول خیر میں کوشش کی جاتی ہے اسی طرح شر سے بچنے کا بھی اہتمام ہوتا ہے چنانچہ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا ہے کہ اسالہ الشر مخالفة ان یدرکنی یعنی کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام جتنے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت والی ہے رہے گی۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے کل شیء ہالک الا وجہہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نفع صور کے تحت ارواح بھی فنا ہو جائیں گی تو پھر حیات ملکوتیہ بھی اچھی نہ ہوئی۔

اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ ایک آیت میں استثناء بھی وارد ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ و نفتح فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض الا من شاء اللہ۔

کہ جب نفتح صور ہوگا تو آسمان اور زمین والے سب بے ہوش ہو جائیں گئیں گے یہاں صعقہ سے صعقہ موت مراد ہے اس کے بعد استثناء ہے الا ماشاء اللہ کہ جس کو حق تعالیٰ چاہیں گے وہ اس صعقہ سے مستثنیٰ بھی ہوگا پس ارواح الا ماشاء اللہ میں داخل ہیں ان کو موت نہ آئے گی۔

مگر ہم اس جواب پر مجبور و مضطر نہیں ہیں بلکہ ہم تسلیم کے بعد دوسرا جواب دیتے ہیں کہ اگر نفتح صور کے وقت ارواح بھی فنا ہو جائیں تب بھی اس سے انقطاع حیات لازم نہیں آتا کیونکہ وہ فنا تھوڑی دیر کے لئے ہوگا ممتد نہ ہوگا اور امور عادیہ میں زمان لطف کا انقطاع مانع استمرار نہیں مونی بات ہے کہ اگر ایک شخص پانچ گھنٹہ تک تقریر کرے اور درمیان درمیان میں سیکنڈ سیکنڈ سکوت کرے تو یہ سکوت مانع استمرار تقریر نہیں بلکہ محاورہ میں یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے پانچ گھنٹہ تک مسلسل تقریر کی اس پر اگر کوئی کہنے بھی لگے کہ واہ صاحب اس نے درمیان درمیان دس دس پانچ پانچ سیکنڈ سکوت بھی تو کیا تھا۔ پانچ گھنٹہ مسلسل تقریر کہاں کی تو ہر شخص یہ کہے گا کہ تم احمق ہو کہیں دس دس سیکنڈ کے سکوت کا بھی اعتبار ہوا ہے۔

اسی طرح جب آپ چلتے ہیں تو حرکت کے ساتھ درمیان میں ایک زمان لطف کا سکون ہوتا ہے کیونکہ ایک پیر کی حرکت کے بعد بدوں اس کے سکون کے دوسرے پیر کو حرکت نہیں ہو سکتی مگر اس کا کوئی اعتبار نہیں کرتا بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ ہم مسلسل بارہ کوس تک چلتے رہے۔

غرض احکام عرفیہ عادیہ میں استمرار و دوام کے لئے زمان لطف کا تخیل مخل نہیں ہوتا تو نفتح صور کے وقت ارواح کا فنا تھوڑی دیر کے لئے یا ایک لمحہ کیلئے ہوگا۔ محض تھلہ قسم کے طور پر جیسے قرآن میں ہے ان منکم الا واردھا کہ ہر شخص کو جہنم کا درد ضرور ہوگا۔ درد بمعنی مرور بھی آتا ہے اس پر تو کچھ سوال بھی نہیں اور بمعنی دخول بھی ہے۔ اس پر سوال ہوتا ہے کہ بعض تو دخول سے محفوظ رہیں گے۔ تو اس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ بعضوں کا درد اگر بمعنی دخول بھی ہو محض تھلہ قسم کیلئے ہوگا۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ جہنم کی پشت پر پل صراط بچھایا جائے گا جس پر ہو کر سب مسلمان گزریں گے۔ بعض تو کٹ کر جہنم میں ہی جا کریں گے یہ تو حقیقہ وارد ہوں گے اور بعض مثل برق خاطف کے گزر جائیں گے ان کو خبر بھی نہ ہوگی کہ جہنم کدھر کونسی ان کا درد تھلہ قسم کے لئے ہوگا کہ بس جہنم کی پشت پر سے گزر گئے اور راستہ میں جہنم پڑ گئی گو ان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ جیسے کوئی جلدی آگ کے اندر ہاتھ کو گزار دے۔ اسی طرح تھلہ قسم کے لئے ارواح کا فنا بھی ایک آن کے لئے ہو جائے تو یہ مانع بقاء نہ ہوگا۔

یہ جواب محققین کا ہے اور بالخصوص فلاسفہ کے مذہب پر تو یہ بات بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ ان کے نزدیک

زمانہ آفات سے مرکب نہیں بلکہ آن طرف زمان ہے۔ تو اب یہ کہنا بہت سہل ہے کہ ارواح کا بقا تو زمانی ہے اور فناء آتی ہے اور بقا زمانی کا انقطاع فناء زمانی ہی سے ہو سکتا ہے۔ نہ کہ فناء آتی سے اس تقدیر پر درحقیقت میں بھی انقطاع بقاء نہ ہوگا۔

يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرتے ہیں آسمان والے اور زمین والے اور وہ ہر وقت ایک شان میں ہے۔

تفسیری نکات

یعنی ہر وقت عالم میں مختلف قسم کے تصرفات کرتا رہتا ہے کسی کو حیات بخشا رہتا ہے کسی کو موت دیتا ہے کسی کو خوشی کسی کو غم کسی کو عزت کسی کو ذلت کسی کو پستی کسی کو رفعت یہاں پر لفظ سوال عام ہے خواہ بلسان قال ہو یا بلسان حال ہو یہ اس واسطے میں نے کہا کہ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مخلوق میں تو بعض لوگ طہر بھی ہیں جو خدا ہی کو نہیں مانتے اور بعض مانتے تو ہیں مگر زبان سے کبھی خدا سے کچھ نہیں مانگتے تو سمجھ لو کہ طہرین متکبرین گوزبان قال سے سوال نہ کریں مگر زبان حال سے سب سوال کرتے ہیں کیونکہ سوال بزبان حال ہی کی دو قسمیں ہیں ایک بقصد ایک بلا قصد مریض حکیم کے پاس اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے یہ زبان حال سے سوال ہے معالجہ کا گوزبان قال سے کچھ نہ کہتا یہ تو سوال بزبان حال بقصد ہے اور بلا قصد کی یہ صورت ہے کہ ایک بیمار پڑا ہوا چیخ رہا ہے اس کی حالت بتلا رہی ہے کہ وہ معالجہ کا طالب ہے گو وہ قصد سوال بھی نہ کرتا ہو غرض کوئی زبان حال سے سوال کرتا اور کوئی زبان حال سے بقصد اور کوئی زبان حال سے بلا قصد شریعت میں بھی زبان حال سے قصداً سوال کرنے کی ایک نظیر موجود ہے۔ حدیث میں ہے من شغله القرآن عن ذكرى ومسئلى اعطيته افضل ما اعطى السائلين جو شخص قرآن میں اس درجہ مشغول ہو کہ اسے ذکر و دعا کی بھی فرصت نہ ہو یا دعا کی طرف التفات نہ ہو تو حق تعالیٰ اس کو سائلین سے زیادہ عطا فرماتے ہیں کیونکہ تلاوت قرآن میں مشغول ہونا یہ بھی سوال بزبان حال قصداً ہے اور بلا قصد میں سب شامل ہیں جمادات بھی اور نباتات بھی اور طہرین و متکبرین بھی کیونکہ سب کی حالت حدوث و امکان بتلا رہی ہے کہ یہ کسی بہت بڑی ہستی کے محتاج ہیں جس کے قبضہ میں سب کا وجود و بقاء ہے چنانچہ ہر طہر و متکبر کی حالت دیکھ لی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ احتیاج میں سر سے پیر تک بندھا ہوا ہے جب سوال کو عام لے لیا گیا کہ خواہ بزبان حال ہو یا بزبان حال اور بقصد ہو یا بلا قصد تو اب من فی السموات والارض (جو آسمانوں اور زمین ہیں) میں لفظ من اپنے عموم پر ہے خاص کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ لفظ من میں ذوی العقول کی تغلیب ہے غیر ذوی العقول پر کہ

ذوی العقول کے لفظ میں غیر ذوی العقول کو بھی شامل کر لیا گیا اور اگر اہل تحقیق کا قول لے لیا جائے تو پھر تغلیب کی بھی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ ان کے نزدیک جمادات و نباتات وغیرہ سب ذوی العقول ہیں غیر ذوی العقول نہیں گو ان کی عقل اس درجہ نہ ہو جو تکلیف بالا احکام کے لئے کافی ہو مگر معرفت حق کے لئے ضرور کافی ہے چنانچہ حیوانات و جمادات و نباتات سب کے سب خدا کو پہچانتے ہیں بلکہ انبیاء اولیاء تک کو پہچانتے ہیں ہاں اگر یہ کہا جائے کہ لغت سب پر حاکم ہے محققین پر بھی اور غیر محققین پر بھی کیونکہ قرآن کا نزول لغت پر ہوا ہے نہ کہ محققین کی تحقیقات پر اور لغت میں لفظ من ان ذوی العقول کے لئے خاص ہے جو ظاہر میں ذوی العقول ہیں تو بے شک تغلیب کا ماننا ضروری ہوگا اور یہی صحیح ہے لیکن اب یہ سوال ہوگا کہ پھر تغلیب میں نکتہ کیا ہے سو اس میں نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے کہ اس میں ذوی العقول کو تشبیہ ہے کہ خدا سے مانگنا اصل میں ذوی العقول کا کام ہے اور جو تمہارا کام تھا اس میں غیر ذوی العقول بھی تمہارے شریک ہیں پھر تمہارا خدا سے سوال نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟ کسی سے سوال نہ کرنے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ اس کے خزانے میں کمی ہو یا اس میں شفقت و رحم نہ ہو یا سخاوت نہ ہو اور جس میں یہ سب باتیں موجود ہوں کہ اس کے خزانے میں بھی بے انتہا ہوں شفقت و رحم بھی کامل درجہ کا ہو سخاوت بھی اعلیٰ درجہ کی ہو اس سے سوال نہ کرنا تو بڑا غضب ہے پس خدا تعالیٰ سے ضرور سوال کرنا چاہیے شاید آپ یہاں ایک بات کہیں وہ یہ کہ ہم نے بعض دفعہ سوال کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں مگر مطلوب نہیں ملتا سو اس کا ایک تو جواب یہ ہے کہ آپ نے سوال کی طرح سوال ہی نہیں کیا خدا تعالیٰ سے اس طرح مانگو جس طرح کسی دنیا کے بادشاہ سے مانگا کرتے ہیں کیا بادشاہ سے مانگنے کے وقت آپ کی وہی صورت ہوتی ہے جو دعا کے وقت ہوتی ہے ہرگز نہیں۔ ایک ادنیٰ بادشاہ سے بھی کوئی سوال کرتا ہے تو اس کا دل رعب و جلال سے پر ہوتا ہے صورت پر عاجزی و خشوع کا پورا اثر ہوتا ہے اور سوال کے وقت کوئی بات بادشاہ کی مرضی کے خلاف اس میں نہیں ہوتی اور ہماری یہ حالت ہے کہ عین دعا کے وقت ہم سینکڑوں گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں کسی کے پاس پر ایسا حق دبا ہوا ہے کسی کے پاس موروثی زمین دبی ہوتی ہے بعض کی صورت بھی دعا کے وقت شریعت کے موافق نہیں ہوتی بلکہ باغیانہ شکل ہوتی ہے پھر یہ کہ دعا میں بھی لجاجت و التجا نہیں ہوتی دل بھی حاضر نہیں ہوتا اوپر سے دل سے دعا کرتے ہیں صورت پر بھی عاجزی اور زاری نہیں ہوتی اس حالت میں یہ بتلاؤ سوال سوال ہے۔ (السوال فی السوال)

پس اب حاصل آیت کا یہ ہوا کہ تمام مخلوق جو آسمان و زمین میں ہے حق تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے اب ایک سوال پیدا ہوگا کہ معنی عبادت کو لفظ سوال سے کیوں تعبیر کیا گیا اس میں کیا نکتہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک نکتہ تو یہ ہے کہ مخلوق عبادت کر کے کچھ ہم پر احسان نہیں کرتی بلکہ اپنا ہی بھلا کرتے ہیں کہ صورت سوال پیدا کر کے کچھ ہم سے لے لیتے ہیں دوسرے اس میں اس پر بھی تشبیہ ہے کہ عبادت کے اندر سوال کی

شان ہونا چاہیے عبادت اس طرح کرنا چاہیے جس طرح سوال کیا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سوال میں صورت بھی عاجز اندہ ہوتی ہے دل میں بھی تقاضا و طلب ہوتا ہے اور جس سے سوال کرتے ہیں اس کی طرف آنکھیں لگی ہوتی ہیں دل بھی ہمہ تن متوجہ ہوتا ہے کہ دیکھئے درخواست کا کیا جواب ملے تو یہی شان عبادت میں ہونا چاہیے اس سے تکمیل عبادت کا سہل طریقہ معلوم ہو گیا کہ عبادت کیونکر کامل ہوتی ہے لیجئے یہ امور جو اہرات آپ کو مفت بلا مشقت مل گئے ان کی قدر کیجئے اور یہاں سے علوم قرآن کا اندازہ ہوگا کہ لفظ لفظ میں کتنے علوم ہیں اور یہ تو وہ ہیں جہاں ہم جیسوں کی فہم پہنچتی ہے اور حکماء امت و عارفین اور صحابہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہاں تک پہنچی ہوگی ان کی کیا شان ہوگی۔

عورتوں کے فضائل

اور حوروں کی شان میں قرآن پاک میں بھی وارد ہے فہن قاصرات الطرف نیز عورتوں کے فضائل میں ہے الغافللات المؤمنات معلوم ہوا کہ خارجیات سے بے خبری اصل وضع ہے۔ عورتوں کی اور گو یہاں پر مراد غفلت عن الفواحش ہے۔ مطلق بے خبری مراد نہیں مگر غفلت عن الفواحش مردوں میں بھی تو مقصود ہے لیکن باوجود اس کے عورتوں کی مدح میں تو اس کو لائے مردوں کے لئے تو یہ نہیں فرمایا اس سے صاف معلوم ہوا کہ مطلق بے خبری بھی عورتوں کے زیادہ مناسب ہے اب نالائق کہتے ہیں کہ پردہ توڑ کر بے پردہ ہو جاؤ اور ترقی کروان کے یہاں کسی چیز کی کوئی حد ہی نہیں عجب گو بردماغوں میں بھرا ہے میرا دل تو گواہی دیتا ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ کبھی ان نالائقوں کو کامیابی نہ ہوگی اللہ تعالیٰ دین کی امداد کریں گے جس سے ان اطراف کی عورتیں ہرگز قبول نہیں کریں گی۔

فرمایا حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کل یوم ہو فی شان مثلاً زندہ کرنا مارنا وغیرہ وغیرہ تجلیات اسمائے الہیہ ہر وقت ہر آن ہوا کرتی ہیں اسمائے الہیہ کی تجلی کو اس طرح پر سوچے کہ فلاں فلاں اسم کے فلاں فلاں اثر ظاہر ہوئے مثلاً امانت احیاء تخلیق ترزلیق وغیرہ جو ان کے ساتھ متعلق ہے اس سے عرفان میں ترقی ہوگی۔

فبای الاء ربکما تکذبان (پس اپنے رب کی کون کونسی نعمت کی تکذیب کرو گے) اس سورہ میں تین قسم کے مضمون ہیں۔ اول رکوع میں آیات توحید ہیں اور دوسرے رکوع میں آیات عذاب اور تیسرے رکوع میں جنت کا بیان۔ اول اور سوم میں یعنی توحید اور جنت کے بیان میں تو فبای الاء ربکما تکذبان ظاہراً بھی بے جوڑ نہیں لیکن جہنم کے ذکر کے ساتھ فبای الاء ربکما تکذبان کا کیا جوڑ ہو سکتا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں فیومنذلابسنل عن ذنبہ انس ولا جان یعنی قیامت کے دن کسی جن وانس کا عذر گناہ کے متعلق نہ چلے گا اس کے آگے پھر وہی فبای الاء ربکما تکذبان ہے اس میں کونسی نعمت تھی جو یاد دلائی گئی

آگے ہے يعرف المجرمون بسماهم فیؤخذ بالواصی و الاقدام یعنی گنہگاروں کو ان کے چہروں سے پہچان لیا جائے گا پھر یہ گت بنے گی کہ ایک طرف سے بال پکڑے جائیں گے اور ایک طرف سے پیر اور دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اس کے آگے بھی فرماتے ہیں فبای الاء ربکما تکذبان اس میں کوئی نعمت ہے جس کو جتلیا گیا۔ آگے ہے هذه جهنم التي یکذب بها المجرمون بطوفون بینها و بین حمیم ان یعنی بطور سرزنش کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو بحر میں جتلیا کرتے تھے حاصل یہ ہے کہ ان کی یہ حالت ہوگی کہ کبھی آگ میں جلائے جائیں گے اور کبھی ماء حمیم پلایا جائے گا جس سے آنتیں کٹ پڑیں گی بتائیے کس قدر سخت عذاب ہے لیکن اس کے ساتھ بھی وہ آیت ملی ہوئی ہے فبای الاء ربکما تکذبان (حق تعالیٰ شانہ کا عذاب سے ڈرانا بھی رحمت ہے) ان ساری آیتوں میں سے کسی میں بھی رحمت کا ذکر نہیں بلکہ عذاب ہی عذاب کا ذکر ہے پھر کس نعمت کو یاد دلایا اور اس کا کیا جوڑ ہے۔

دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ کہا جائے کہ یہ آیت نعوذ باللہ جا بجا بے جوڑ ہے یا کچھ جوڑ بتلایا جائے بے جوڑ تو ہو نہیں سکتی اس واسطے کہ قرآن شریف ایسا کلام ہے جس کی فصاحت و بلاغت صرف مسلمانوں ہی کے نزدیک مسلم نہیں بلکہ بے دینوں اور دشمنوں اور مخالفین کے نزدیک بھی مانی ہوئی ہے اور کلام کے لئے اس سے زیادہ کوئی عیب نہیں ہو سکتا کہ اس میں جوڑ اور ربط بھی نہ ہو۔ غرض قرآن میں اس شق کا تو احتمال ہی نہیں پس یہ یقینی بات ہے کہ جوڑ ہے اور جوڑ یہی ہے کہ عذاب کو یاد دلایا گیا تاکہ اس کے موجبات سے لوگ بچیں اور رحمت کے مستحق ہوں جیسے کہ باپ نے بچے کو ڈرایا تھا کہ اس چیز کو مت کھانا اس سے بچش ہو جائے گی۔ یہ اس نے اسی واسطے کہا کہ بچہ اس تکلیف دہ چیز سے بچ جائے اور بچش کی تکلیف نہ اٹھائے جس طرح باپ کا ڈرانا رحمت تھا اسی طرح حق تعالیٰ کا عذاب کو بیان کرنا بھی رحمت ہے اسی کو بار بار یاد دلاتے ہیں اور فرماتے ہیں فبای الاء ربکما تکذبان یعنی ہماری تمہارے اوپر ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ ہم تم کو ایسے ایسے عذابوں سے بچانا چاہتے ہیں تم کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے اس آیت کے تکرار سے میرے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ آیات عذاب بھی آیات رحمت ہیں اب غور کرنے کی بات ہے کہ جن کی آیات عذاب بھی رحمت ہوں تو آیات رحمت کا کیا حال ہوگا اس کو کس لفظ سے بیان کیا جائے۔

جنت کی نعمتوں کے مستحق

کیونکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جن اچھے عمل کریں گے تو جنتی ہوں گے سورۃ رحمن میں جنت کی نعمتوں کا ذکر کر کے فرمایا ہے۔ فبای الاء ربکما تکذبان (پھر تم اے جن وانس) اپنے رب کی

کوئی نعمت کا انکار کرتے ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتیں دونوں ملیں گی نیز یہ بھی فرمایا کہ لَمْ يَطْمِئِنُّ اَنْسَ قَلْبُهُمْ وَلَا جَنَانٌ (یعنی حوروں کو ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا نہ کسی جن نے) تو اگر جن کا احتمال ہی نہ تھا تو یوں کیوں فرمایا اور اس سے بھی صاف لیجئے کہ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ایک فریق جنت میں ہوگا۔ ایک فریق دوزخ میں ہوگا تو دوسرا فریق فرمائے ہیں تیسرا فریق نہیں فرمایا اور یہ یقین ہے کہ دوزخ سے بچے رہیں گے تو اب اگر وہ جنت میں نہ جاویں تو تیسرا فریق ہونا لازم آتا ہے نہ وہ فریق فی الجنۃ (جنت کے فریق) میں داخل ہوئے نہ فریق فی السعیر (دوزخ کے فریق) میں اب رہی یہ بات ہے کہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اعراف میں بھی رہیں پس تیسرے فریق کا بھی ثبوت ہوا مگر یہ شبہ بہت جلد زائل ہو جاوے گا کیونکہ اسی مقام پر فرماتے ہیں ادخلوا الجنة لا خوف عليكم ولا انتم تحزنون (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں نہ تم رنجیدہ ہو گے) اس میں دو تفسیریں ہیں ایک تو وہ جو میں اختیار کرتا ہوں کہ یہ اہل اعراف کا قول ہے وہ دوزخیوں کو چڑانے کے لئے اہل جنت کے بارہ میں کہیں گے کہ اهلوا الذين اقسمتم لا ينالهم الله برحمة (کیا یہ وہی لوگ۔ ہیں کہ جن کے بارہ میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہ کرے گا۔)

قيل لهم ادخلوا الجنة الخ دیکھو انہیں تو یہ کہہ دیا گیا کہ تم جنت میں چلے جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم رنجیدہ ہو گے دوسرا ایک قول اور ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اہل اعراف کے لئے ادخلوا الجنة۔ یعنی تم بھی جنت میں داخل ہو جاؤ سو اس آیت میں تو دونوں احتمال ہیں مگر میں دوسری آیت سے استدلال کرتا ہوں فرماتے ہیں وبينهما حجاب و على الاعراف رجال يعرفون كلا بسيماهم ونادوا اصحاب الجنة ان سلام عليكم لم يدخلوها وهم يطمعون (ان دونوں کے درمیان ایک اڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے السلام علیکم۔ ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے۔) اس سے معلوم ہوا کہ اہل اعراف کو جنت میں داخل ہونے کی امید ہوگی اور عالم آخرت عالم انکشاف حقائق ہے۔ وہاں غلط امید نہیں ہو سکتی دوسرا استدلال اور ہے کہ سورہ حدید میں ہے فضرب بينهم بسور له باب باطنه فيه الرحمة وظاهره من قبله العذاب (پھر ان کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا کہ اس کے اندرونی جانب میں رحمت ہوگی اور بیرونی جانب میں عذاب ہوگا۔)

مگر اس سے قبل سمجھئے کہ حدیث میں ہے کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ کہ ان کے حسنات زیادہ ہوں گے سیئات سے وہ تو جنت میں جائیں گے یہ لوگ اعراف میں ہوں گے۔ اب سنئے بسورہ باب کو مفسرین نے بالا جماع اعراف کہا ہے تو اس کے دوزخ میں ایک طرف عذاب ہے اور ایک طرف رحمت ہے تو وہاں دونوں

طرف کا اثر ہے اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ مؤمنین میں سے جو جہنم میں جاویں گے وہ گناہوں کی سزا ملنے کے بعد جنت میں جاویں گے تو اہل اعراف جو ان سے اس صلح حالاً ہیں وہ کیوں جنت میں نہ جاویں گے اور گفتگو ان جنوں میں ہو رہی ہے جو صالح ہوں ہاں اس کے ہم بھی قائل ہوں گے کہ جنوں میں تین قسم کے لوگ ہوں گے اس میں سے ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہیں جن کے حسنات و سیئات برابر ہوں گے اور وہ اولاً اعراف میں ہوں گے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر جنت میں جاویں گے اور اعراف کے متعلق ایک اور بات یاد آئی جو عوام میں مشہور ہے اور بالکل غلط ہے وہ یہ کہ رستم اور نوشیرواں اور حاتم طائی یہ سب اعراف میں رہیں گے لوگوں کی بھی عجیب حالت ہے اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں گویا یہ اس محکمہ کے حاکم ہیں کہ ان کے اختیار میں ہے جس کو جہاں چاہیں بھیج دیں خوب سمجھ لو کہ اگر ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے تو محض سخاوت یا شجاعت یا عدالت کی وجہ سے جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے کسی کے اندر کتنی ہی خوبیاں ہوں جب تک ایمان نہ ہوگا سب بے کار ہیں۔

تجلیات اسماء الہیہ کا مراقبہ

فرمایا حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کل یوم ہو فی شان مثلاً زندہ کرنا مارنا وغیرہ وغیرہ تجلیات اسمائے الہیہ ہر وقت ہر آن ہوا کرتی ہیں۔ اسمائے الہیہ کی تجلی کو اس طرح پر سوچے کہ فلاں فلاں اسم کے فلاں فلاں اثر ظاہر ہوئے مثلاً امات احیاء تخلیق ترزق وغیرہ جو ان کے ساتھ متعلق ہے اس سے عرفان میں ترقی ہوگی۔

(مقالات حکمت صفحہ ۶۶)

هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿۷۶﴾

ترجمہ: یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم لوگ جھٹلاتے تھے۔

تفسیری نکات

کرامت استدراج میں فرق

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا گیا کہ اگر کسی خارق (کرامت) کے بعد قلب میں زیادت تعلق مع اللہ محسوس ہو تب تو وہ کرامت ہے اور اگر اس میں زیادت محسوس نہ ہو تو ناقابل اعتناء (توجہ) ہے اور یہ جو آج کل مخترع کشف و کرامت کی بناء پر بیروں کو مریداں می پرانند کا مصداق بناتے ہیں اور لوگوں کو پھنساتے ہیں بالکل ہی داہیات بات ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کیا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بدوی نفاع نام معتقد تھا اس نے ایک بار کہلا کر بھیجا کہ لڑائی میں میرے گولی لگ گئی ہے تکلیف ہے دعا کیجئے نکل جائے اس کا بیان ہے کہ دوسرے دن حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور زخم میں انگلی ڈال کر گولی نکال لی۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سن کر فرمایا کہ مجھے پتہ بھی نہیں نیز بعض اوقات خارق استدراج (ڈھیل) ہوتا ہے اور استدراج کے بعد نفس میں تکبر ہوتا ہے بس ایسے اشتباہ کی حالت میں اگر کوئی چیز راحت اور آرام کی ہے تو وہ ذکر اللہ میں مشغول رہنا ہے اور گنہگاری اور اپنے کو فنا کر دینا اور مٹا دینا اس ہی میں لطف ہے بدوں اس کے چمن ملنا مشکل ہے مولانا فرماتے ہیں۔

بیچ کنبے بے دو بے دام نیست جز بخولت گاہ حق آرام نیست

اور کرامت و استدراج میں ایک ظاہر فرق یہ ہے کہ صاحب کرامت متصف بالایمان والعباد وغیرہ ہو گا۔ اور صاحب استدراج افعال منکرہ میں مبتلا ہوگا اور پہلا فرق جو مذکور ہوا انکسار و تکبر وغیرہ کا وہ اثر کے اعتبار سے ہے۔ (الافاضات الیومیہ ج ۱ ص ۲۱۹)

حقیقت گناہ

یہ تو ان گناہوں کی حالت ہے جن کو ہم گناہ سمجھتے تھے۔ مگر چند روز عادی ہو جانے کی وجہ سے غفلت ہو گئی بہت سے گناہ ایسے ہیں کہ جن کی طرف آج کل خیال بھی نہیں جاتا بلکہ چھوڑنے سے جی برا ہوتا ہے اور یوں تو گناہ سب ہی برے ہیں لیکن ایسے گناہ زیادہ خطرناک ہیں جو علی العموم عادت اور رواج میں داخل ہو گئے ہوں کیونکہ طبیعتیں ان سے مانوس ہو گئی ہیں حتیٰ کہ ان کی برائی ذہن سے دور ہو گئی اور بجائے اس کے ان کی ضرورت اور بھلائی دلنشین ہو گئی ہے ان کے چھوٹنے کی کیا امید ہو سکتی ہے آدمی چھوڑتا اس چیز کو ہے جس کی برائی خیال میں ہو اور جس چیز کی برائی ذہن سے نکل جاتی ہے پھر اس کو کیوں چھوڑنے لگا ان گناہوں کو میں مختصر بیان کرتا ہوں۔

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ گناہ کیا چیز ہے گناہ کی حقیقت ہے خدا کے حکم کو بجانہ لانا اور ان احکام کی کئی قسمیں ہیں ایک وہ جو کہ عقائد کے متعلق ہیں اور ایک وہ جو عمل کے متعلق ہیں اور بعض معاملات کے متعلق ہیں اور بعض حقوق عباد کے متعلق ہیں میں ان کو ترتیب وار مختصر مختصر بیان کرتا ہوں اول عقائد کے متعلق سنئے۔

ان حقوق کا بجالانا یہ ہے کہ عقائد جیسے خدا تعالیٰ نے بیان فرمائے ویسے ہی رکھے جائیں لیکن ان میں بھی بہت فساد آ گیا اور ان کو جو کچھ خراب کیا جہالت نے کیا عورتوں میں تو عام رواج ہے کہ پڑھنے پڑھانے کو کچھ چیز ہی نہیں سمجھتیں۔ جس کی طبیعت بچپن سے جس طرف کو چل جائے اسی طرف چھوڑ دی جاتی ہے۔

وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ ۖ فِيْهَا اِيَّا رَبِّكُمْ تَكْذِبُوْنَ ۙ ذٰوَاتَا

اَفْتَانٍ ۙ فِيْهَا اِيَّا رَبِّكُمْ تَكْذِبُوْنَ ۙ فِيْهِمَا عَيْنٌ تَجْرِيْنِ ۙ

فِيْهَا اِيَّا رَبِّكُمْ تَكْذِبُوْنَ ۙ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجِنِ ۙ

ترجمہ: جو شخص دنیا میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانہ ہے جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہتا ہے اس کے لئے دو باغ ہیں سوائے جن وانس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔ وہ دونوں باغ کثیر شاخوں والے ہوں گے سوائے جن وانس اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں سے منکر ہو جاؤ گے۔ ان دو باغوں میں دو چشمے ہوں گے بہتے ہوئے چلے جائیں گے سوائے جن وانس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے ان دونوں باغوں میں ہر میوے کی دو قسمیں ہوں گی

تفسیری نکات

دو جنتیں

یعنی جو شخص حق تعالیٰ کے خوف سے گناہ سے بچے گا اس کی جگہ جنت ہی میں ہے اور دوسری آیت میں ہے کہ اس کے لئے دو جنتیں ہیں کہ ان میں نہریں ہیں اور طرح طرح کے نعیم ہیں لیکن اس درجہ کا تو کیا ذکر ہماری تو یہ حالت ہے کہ ہم معاصی کئے جاتے ہیں اور دل میں کبھی کھٹکا بھی نہیں ہوتا کہ یہ گناہ ہوا بلکہ ان معاصی پر فخر کرتے ہیں کہتے ہیں ہم نے ذرا سی نوکری میں اتنا روپیہ کما لیا یہ ہمارا ڈھنگ اور چالاکی ہے۔ دھوکہ دے کر اور معاملات ناجائز کر کے ساری عمر روپیہ جمع کرتے رہتے ہیں پھر اس کو ہنر سمجھتے ہیں یہ وہ حالت ہے جس کو موت قلب کہتے ہیں اس کے بعد توبہ کی بھی کیا امید ہے کیونکہ توبہ کی حقیقت ہے ندم یعنی پشیمانی اور پشیمانی اسی کام سے ہوا کرتی ہے جس کی برائی ذہن میں باقی ہو۔ اور جب گناہ دل میں ایسا رچ گیا کہ اس پر فخر کرتے ہیں تو پھر پشیمانی کہاں؟

سُورَةُ الْوَاقِعَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَأَصْحَابُ الْيَمِينِ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ۝ وَأَصْحَابُ الْمَشْأَمِ

مَا أَصْحَابُ الْمَشْأَمِ ۝

ترجمہ: سو جو دہانے والے ہیں۔ وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں اور جو بائیں والے ہیں۔ وہ بائیں والے کیسے برے ہیں۔

تفسیری نکات

اصحاب الجنۃ کی دو قسمیں

ظاہر ہے کہ یہاں اصحاب الیمین سے مراد اصحاب جنت ہیں اور اصحاب المشئمہ سے مراد کافر ہیں مگر اصحاب الیمین سے مراد کل اصحاب جنت نہیں بلکہ صرف عامہ مومنین مراد ہیں اور خواص کا ذکر آگے ہے۔
والسابقون السابقون اولئک المقربون .

اس سے پہلے معلوم ہوا کہ یہ تیسری قسم ہے جو اصحاب الجنۃ سے بھی ممتاز ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ کہیں جنت سے الگ رہیں گے نہیں سکونت کے اعتبار سے یہ بھی اصحاب جنت ہیں مگر طلب کے اعتبار سے ان سے الگ ہیں۔

پس اصحاب الجنۃ کی دو قسمیں ہیں ایک من یطلب الجنۃ دوسرے من یتطلب الحق وان سکن الجنۃ اور السابقون کے تکرار سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ دونوں مذکورہ طبقوں سے سابق ہیں پس اصحاب جنت سے بھی سابق ہوئے یعنی معنی ہیں اہل جنت سے ان کے ممتاز ہونے کے آگے حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ

اولئک المقربون کے بعد فی جنت النعیم بھی فرمادیا تاکہ یہ شبہ نہ ہو کہ شاید مقرب ہونے سے مراد یہ ہے کہ نعوذ باللہ وہ خدا تعالیٰ کی گود میں بیٹھیں گے تو بتلادیا کہ وہ بھی جنت ہی میں ہوں گے مگر دوسروں سے مقرب ہوں گے بہر حال اہل جنت میں دو قسمیں ہونا نصوص سے صراحتاً معلوم ہو رہا ہے اور اہل طریق کے کلام میں تو اس کی بہت تصریح ہے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ طلب کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی چیز کا طالب نہ ہو نہ جنت کا نہ دوزخ سے بچنے کا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کو طلب نہ کرے بلکہ یہ مطلب ہے کہ بالذات طلب نہ کرے گو بعض اہل حال ایسے بھی ہیں جنہوں نے یہ صاف کہہ دیا کہ ہم کو نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کی۔ مگر یہ لوگ محقق نہیں ہیں ہاں مغلوب ہیں چنانچہ اہل حال ایسے بہت گزرے ہیں جنہوں نے طالبان جنت پر انکار کیا ہے۔

السابقون مکرر فرمانے کا سبب

فرمایا کہ ایک نکتہ بیان کرتا ہوں گو ہے دلالت میں متحمل مگر قواعد کے بالکل مطابق ہے چونکہ کسی بزرگ کے کلام میں دیکھنے میں نہیں آیا اس لئے جرات نہیں ہوتی۔ اگر صوفیہ کو سوچتی تو بڑے اچھلتے کودتے اور ہم تو طالب علم ہیں ہم میں وہ ذوق نہیں اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ایک آیت ہے فاصحاب المیمنة ما اصحاب الميمنة و اصحاب المشمة ما اصحاب المشمة و السابقون السابقون اولئک المقربون یہاں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اس آیت میں سابقون سابقون دو جگہ فرمایا ہے اس میں یہ اشارہ ہے کہ مقربین اصحاب میمنہ سے بھی بڑھ گئے۔ ایک سابقون سے ایک جماعت سے سبقت کی طرف اشارہ ہے دوسرے سابقون سے دوسری جماعت ہے۔ یہ میرا ذوق ہے کوئی دلالت قطعی نہیں ہے اس اشارہ پر اس میں تائید ہو جائے گی بعض عشاق کے ایسے مقالات کو جو موہم ہیں استغناء عن جنات کی اور یہ تائید اس تاویل سے ہوگی کہ مراد جنت کا وہ درجہ ہے جو اصحاب یمن کے ساتھ خاص اور یہ ان سے سابق ہونے کے طالب ہیں۔

سُورَةُ الْحَدِيدِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ

ترجمہ: تو ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں۔

تفسیری نکات

قرب حق سبحانہ و تعالیٰ

ہاں تم ہی ان سے دور ہو اس لئے ونحن اقرب الیہ من حبل الوريد یعنی ہم تم سے بہت نزدیک ہیں یہ نہیں فرمایا کہ تم اقرب الینا۔ کہ تم ہم سے بہت نزدیک ہو اس لئے کہ تم دور ہو اور وہ نزدیک ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ قرب و بعد تو نسبت مکررہ میں سے ہے۔ جب ایک دوسرے کے قریب ہوگا تو دوسرا بھی اس سے قریب ہوگا ایک بعید ہوگا تو دوسرا بھی بعید ہوگا مگر یہ قرب جسمی میں ٹھیک ہے۔ یہاں قرب کے معنی قرب علمی کے ہیں قرب جسمی کے نہیں ہیں پس مراد محض یاد اور توجہ ہے تو اس اعتبار سے وہ قریب ہیں یعنی تمہاری طرف متوجہ ہیں اور تم بعید ہو یعنی تم ان کی طرف متوجہ نہیں پس اگر تم ذرا ان کی طرف متوجہ ہو تو پھر ان کا قرب تمہیں معلوم ہو۔

میان عاشق و معشوق بیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں عاشق اور معشوق میں کوئی پردہ نہیں۔ تو خود ہی حجاب ہے اے حافظ در میان سے علیحدہ ہو۔

مسابقت الی الجنۃ کا حکم

سابقوا الی مغفرة من ربکم و جنۃ عرضہا کعرض السماء والارض تم اپنے پروردگار کی

طرف دوڑو اور نیز ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ اس میں مسابقت الی البخت کا امر ہے اگر جنت میں جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو حکم سابقوا کیوں ہے؟ معلوم ہوا کہ ہمارے اختیار میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ اختیاری امور ہی کا مکلف فرمایا کرتے ہیں غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں فرماتے نص موجود ہے۔

لا یکلف اللہ نفساً الا وسعها اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف شرعی نہیں بنا تا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔

الْمَيَّانِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ

مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ

عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: کیا ایمان والوں کیلئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق (منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب آسمانی ملی تھی (یعنی یہود جو نصاریٰ) پھر اس حالت سے ان پر زمانہ دراز گزر گیا (اور تو بہ نہ کی) پھر ان کے دل خوب سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی ان سے آج کافر ہیں۔

تفسیری نکات

شان نزول

اس آیت کا شان نزول سن لیجئے اس لئے کہ اس کی حقیقت سمجھنا اس پر موقوف بھی ہے۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپس میں ہنسنا بولنا شروع کیا تھا۔ اور ظاہر بات ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہنسنا بولنا معصیت کے درجہ میں ہرگز نہ تھا۔ اس لئے کہ صحابہ ایسے جری نہ تھے کہ ایک جماعت کی جماعت معصیت میں جان بوجھ کر مبتلا ہو اور نہ یہ احتمال ہے کہ ان کو معصیت کی خبر نہ ہو اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہوں کی فہرست صاف صاف بتا دی تھی۔ حدیث میں ہے الحرام بین و بینہما مشتبہات حلال و حرام میں کسی قسم کا خفاء و غموض نہ تھا پھر علاوہ اس کے یہ ہے کہ صحابہ کا علم و معرفت ایسا نہ تھا کہ ان کو کسی معصیت کے ہونے کی خبر نہ ہو۔ وہ حضرات تو دقائق اور حقائق تک پہنچتے تھے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ کوئی دقیقہ ان سے مخفی نہ تھا یا یہ کہ وہ معصوم تھے میرے دعوے کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ جس امر میں ان

کی جماعت شریک ہو وہ امر ہرگز معصیت نہ ہوگا پھر یہ کہ ایک جماعت اس میں شریک ہو اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ اگر یہ ہنسنا بولنا معصیت ہوتا تو ضرور اس پر انکار تو ہوتا اور ہنسنا بولنا کوئی ایسا امر مخفی ہے نہیں کہ کونہ میں چھپ کر کرتے ہوں ظاہر ہے کہ کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے یہ سب دلائل وقرائن ہیں اس بات کے کہ یہ ہنسنا بولنا ہرگز معصیت نہیں تھا مگر اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

نزول حق کا مفہوم

اس آیت میں اس فعل کے اثر سے تعرض ہے خود نفس فعل پر گرفت نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ کیا وہ وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لئے کہ ان کے دل نرم ہو جاویں یعنی کس شے کا انتظار ہے کیا ان کے نزدیک ابھی دل کے نرم ہونے کا وقت نہیں پہنچا اور نرم ہونا کس شے کے واسطے اللہ کی یاد کے لئے اور جو حق بات نازل ہوئی ہے حق سے مراد وعدہ و عیدانذار و تبشیر پیدا کرنا چاہیے۔ یعنی خاشعین کی شکل بنانا چاہئے اس سے رفتہ رفتہ خشوع پیدا ہو جائے گا۔

ظاہر کا اثر باطن میں پہنچتا ہے

اس لئے کہ جس طرح باطن ظاہر میں موثر ہے اسی طرح ظاہر کا اثر بھی باطن میں پہنچتا ہے جس طرح دل کے اندر اگر غم ہو تو اس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے اسی طرح اس کا عکس بھی ہے کہ اگر رونے کی شکل بنالی جاوے تو دل میں بھی کیفیت غم کی پیدا ہو جاوے گی۔ اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر رونانہ آوے تو رونے کی شکل ہی بنا لو تو شکل بنانا مقصود اصلی نہیں ہے مقصود تو یہ ہے کہ دل میں خشوع پیدا ہو اور اگر خشوع ہے اور رونانہ آوے تو کچھ حرج نہیں۔

بکا مامور بہ سے مراد دل کا بکا ہے

ایک دوست نے مجھ کو لکھا ہے کہ میں جب حج کرنے نہیں گیا تھا تو رونا بھی آتا تھا اور جب سے حج کر آیا ہوں رونا نہیں آتا۔ اس کا بہت افسوس ہے۔ میں نے لکھا کہ مراد دل کا رونا ہے وہ تم کو حاصل ہے حاصل آیت کا یہ ہے کہ ذکر اللہ و ما نزل من الحق کا مقتضایہ ہے کہ خشوع ہو اور حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر خشوع پیدا نہ ہو تو رونے کی شکل بنائے اور آیت میں اس کو بطور استفہام کے فرمایا کہ کیا اس کا وقت نہیں آیا مطلب یہ ہے کہ وقت آنا چاہیے۔

تخویف و انداز

ارشاد ہے ولا یكونوا كالذین اوتوا الكتاب الخ یعنی نہ ہو جاویں وہ مثل ان لوگوں کے کہ جن کو

پہلے کتاب دی گئی ہے۔ پس ایک زمانہ درازان پر گزرا اور ان کے دل سخت ہو گئے۔ یہ ان تَخَشَع قلوبہم کے مقابلہ میں بظاہر تو یوں فرماتے ان لا تَخَشَع قلوبہم کہ ایسا نہ ہو کہ قلب میں خشوع نہ رہے یہ نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد ہے کہ اہل کتاب جیسے نہ ہوں کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے تھے یہ تَخْوِيف و انذار ہے کہ اگر تم نے غفلت کی تو تمہارے دلوں کے اندر قسادت نہ ہو جاوے۔

افعال و احوال قلب پر جوارح کا اثر

جس کا اثر یہ ہے و کثیر منہم فسقون کہ بہت سے ان میں حد سے تجاوز ہیں۔ اس کا اثر ظاہر فرما دینا بڑی رحمت ہے اس لئے کہ جو معاصی ظاہرہ ہیں ان کو تو برا سمجھتے ہیں مگر قلب کے احوال کی اطلاع کم ہوتی ہے۔ پس اگر یہ اثر ظاہر نہ فرماتے تو اس سے بچنے کا زیادہ اہتمام نہ ہوتا حالانکہ یہ اہتمام اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ خود افعال جوارح کا مناظ بھی افعال و احوال قلب ہیں۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي

كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِكَيْلَا

تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ

مُتَعَبِّلٍ ۝ فَخُورٌ ۝

ترجمہ: کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب یعنی روح محفوظ میں لکھی ہے قبل اس کے ہم ان جانوں کو پیدا کریں یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے یہ بات بتلا اس واسطے دی ہے کہ تا کہ جو چیز تم سے جاتی رہے اس پر رنج اتنا نہ کرو اور تا کہ جو چیز تم کو عطا فرمائی اس پر اتر او نہیں۔

تفسیری نکات

مسئلہ تقدیر کا ثمرہ

یہ تعلیل ہے ماسبق کی جس کا تعلق اخیر نا کم بدلک مقدر سے ہے یعنی ہم نے تم کو اس مسئلہ کی تعلیم اس لئے کی تا کہ تم مغموم نہ ہو اور اتر او نہیں اب غور کے قابل یہ امر ہے کہ لازم کے غایت کے واسطے لایا جاتا

ہے اور اوپر مسئلہ تقدیر کا ذکر ہے تو اس کی علت و غایت دوسری آیت میں بتلائی گئی ہے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم کو مسئلہ تقدیر اس لئے تعلیم کیا ہے کہ جب تم اس کے معتقد ہو گے تو تم کو حزن و فرح نہ ہوگا اور مسئلہ تقدیر کا یہ اثر مشاہد ہے جو لوگ تقدیر کے معتقد ہیں وہ مصائب و حوادث میں منکرین تقدیر سے زیادہ مستقل اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کا ثمرہ ایک عمل بھی ہے یعنی حصول تفویض و توکل اور اس کا عمل ہونا ظاہر ہے پس عقائد ہر چند کہ خود بھی مقصود ہیں مگر ان کو تکمیل عمل میں بڑا دخل ہے اور یہ دخل مطلوب بھی ہے جیسا کہ آیت میں لکھا تا سوا سے استفاد ہوتا ہے اب اسی پر تمام عقائد کو قیاس کر لیجئے کہ مثلاً توحید کی تعلیم خود بھی مقصود ہے اور اس سے اعمال کی تکمیل بھی مقصود ہے کیونکہ جس شخص پر جس قدر توحید کا غلبہ ہوگا اتنا ہی اس کے اعمال مکمل ہوں گے اس کی نماز دوسروں کی نماز سے اکمل اس کی زکوٰۃ دوسروں کی زکوٰۃ روزہ سے افضل ہوگی اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

مغرور سخن مشوکہ توحید خدا

اور شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

موحد چہ بر پائے ریزی زرش

ہمیں ست بنیاد توحید و بس

امید و ہر اش نباشد ز کس

غرض موحد کامل کی یہ حالت ہوگی جو شیخ نے بیان فرمائی ہے جو ادنیٰ توحید والے کو حاصل نہیں ہو سکتی تو عقائد گو بظاہر جملہ خبریہ ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بیان میں عرض کیا ہے مگر ان سے مقصود جملہ انشائیہ ہیں اعتقاد یہ بھی عملیہ بھی جیسا ابھی مذکور ہوا اس بناء پر اللہ واحد کا مطلب یہ ہے کہ اس اعتقاد کے ساتھ عمل میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں پس اپنے عمل میں خدا کے سوا کسی کو مقصود نہ بناؤ ورنہ ریا ہو جائے گی جو شرک اصغر ہے اور توحید کامل کے خلاف ہے اسی طرح عقلاً خدا کے سوا کسی سے طمع و خوف نہ رکھو کہ یہ بھی توحید کے خلاف ہے ہاں طبعی طمع و خوف کا مضائقہ نہیں کیونکہ وہ تو اضطرار بے اختیار ہوتا ہے جیسے سانپ کو دیکھ کر طبعاً ڈر جانا یا شیر سے ہیبت زدہ ہو جانا مگر عقلاً یہ مضمون ہر دم پیش نظر رہنا چاہیے کہ بدوں مشیت الہی کے کوئی چیز نفع یا ضرر نہیں دے سکتی۔ وما ہم بضارین بہ من احد الاباذن اللہ وان یمسک اللہ بضرفلا کاشف لہ الا هو وان یردک بخیر فلا راد لفضلہ۔

کہ نہ راحت رشد زخلق نہ رنج

گر گزندت رسد زخلق مرنج

کہ آں ہر دو در تصرف اوست

از خداں خلاف دشمن و دوست

اور یہ بڑا قیمتی مضمون ہے کہ جملہ خبریہ سے محض خبر مقصود نہیں ہوتی بلکہ کوئی انشا مقصود ہوتی ہے۔

بہت سے لوگوں کو اپنے اعتقادات کی صحت پر ناز ہو جاتا ہے بس وہ اعتقاد صحیح کر کے نحن ابنا اللہ واحبناہ کا مصداق ہو جاتے ہیں کہ ہم اہل حق میں داخل ہیں اب ہم کو عذاب نہیں ہوگا چاہے کچھ بھی کرتے رہیں بہت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ درستی عقائد کے بعد اعمال میں کوتاہی زیادہ مضر نہیں اور اس کا غشایہ ہے کہ ان لوگوں نے اعتقادیات میں محض علم کو مقصود سمجھ لیا ہے اور میں بھی پہلے یہی سمجھتا تھا کہ اعتقادیات میں علم ہی مقصود ہے مگر سالہا سال کے بعد ایک آیت نے مجھے اس طرف راہبری کی کہ عقائد فی نفسہ بھی مقصود ہیں اور عمل کے واسطے بھی مقصود ہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ما اصاب من مصيبة في الارض ولا في انفسكم الا في كتاب من قبل ان نبراهنا ان ذلك على الله يسير لكي لاتا سو على ما فاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم واللہ لا يحب كل مختال فخور۔
یہاں پہلی آیت میں تو مسئلہ تقدیر کی تعلیم ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے زمین میں یا تمہاری ذات میں وہ ایک کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے (یعنی لوح محفوظ میں) اس مصیبت کے پیدا ہونے سے بھی پہلے بے شک یہ بات حق تعالیٰ پر آسان ہے۔ (اس کا انکار وہی کر سکتا ہے جس کو قدرت الہیہ کا علم نہ ہو) آگے تعلیم مسئلہ کی تعلیل فرماتے ہیں کہ یہ بات ہم نے تم کو کیوں بتلائی اس لئے تاکہ کسی چیز کے فوت ہونے پر تم کو رنج نہ ہو (بلکہ اس سے تسلی حاصل کر لو کہ یہ مصیبت تو لکھی ہوئی تھی اس کا آنا ضروری تھا ۱۲) اور کسی نعمت کے ملنے پر اتراؤ نہیں۔ (بلکہ یہ سمجھو کہ اس میں ہمارا کچھ کمال نہیں حق تعالیٰ نے پہلے ہی سے یہ نعمت ہمارے لئے مقدر کر دی تھی ۱۲)
اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کی تعلیم سے صرف اعتقاد کر لینا ہی مقصود نہیں بلکہ یہ عمل بھی مقصود ہے کہ مصائب میں مستقل رہے اور ہر مصیبت کو مقدر سمجھ کر پریشانی نہ ہو اسی طرح نعمتوں پر تکبر و بطرنہ ہو ان کو اپنا کمال نہ سمجھے جب نص سے اس کا مقصود ہونا معلوم ہو گیا اور قاعدہ ہے کہ الشیء اذا خلا عن غایتہ انتفی شے جب اپنی حالت سے خالی ہو تو وہ کالعدم ہوتی ہے تو اب جس شخص کا مصائب و نعم کے وقت یہ حال نہ ہو وہ گویا تقدیر کا معتقد ہی نہیں یعنی کامل معتقد نہیں اگر کامل اعتقاد ہوتا تو اس کی غرض ضرور مرتب ہوتی۔

مسئلہ توحید کی تعلیم سے مقصود

اسی طرح توحید کا مسئلہ تعلیم کیا گیا ہے اس سے بھی صرف علم مقصود نہیں بلکہ قرآن میں غور کرنے سے توحید کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا خوف اور اس سے طمع نہ رہے اب جو شخص توحید کا قائل ہے مگر غیر اللہ سے خوف و طمع بھی رکھتا ہو وہ گویا توحید کا معتقد ہی نہیں بلکہ مشرک ہے چنانچہ صوفیاء نے اس پر شرک کا اطلاق کیا ہے اور صوفیاء نے کیا حق تعالیٰ نے اس کو شرک فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

فمن كان يرجو لقاء ربه فليعمل عملاً صالحاً ولا يشرك بعبادة ربه أحداً كهو كوني لقاء ربك في امید رکھتا ہو وہ نیک عمل کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ حدیث میں لا یشْرک کی تفسیر لایرائی آئی ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ عبادت میں ریا نہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ ریا شُرک ہے حالانکہ ریا میں غیر اللہ معبود نہیں ہوتا مگر چونکہ فی الجملہ مقصود ہوتا ہے کہ اس کی نظر میں بڑا بننے کے لئے بنا سنوار کر عبادت کی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو شُرک فرمایا اور یہ بالکل عقل کے مطابق ہے کیونکہ عبادت غیر اللہ جو ارح سے ہوتی ہے اور جب وہ شُرک ہے تو قلب سے غیر اللہ کو مقصود بنانا کیونکہ شُرک نہ ہوگا یہ تو قلبی عبادت ہے پس غیر اللہ سے خوف و طمع پر صوفیہ کا لفظ شُرک اطلاق کرنا غلط نہیں کیونکہ اس صورت میں توحید کی غایت مفقود ہے اسی طرح تمام عقائد میں غور کرو تو نصوص سے معلوم ہوگا کہ ہر اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہے تنہا اعتقاد مطلوب نہیں اور ہماری عادات میں بھی اعتقاد سے عمل بھی مطلوب ہوتا ہے۔

ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نزلنا ان ذلک علی اللہ یسر

مسئلہ تقدیر کی حکمت

یہاں تک تو مسئلہ تقدیر کا بیان تھا آگے اس کی حکمت بتلاتے ہیں۔ لکیلا تا سوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم

کہ یہ مسئلہ تم کو اس لئے تعلیم کیا گیا تا کہ تم کو کسی فوت ہونے والی شے پر رنج نہ ہو اور کسی حاصل ہونے والی شے پر فرح نہ ہو کیونکہ فرح مطلقاً محمود نہیں بلکہ فرح شکر اہو وہ محمود ہے اور اسی کا ذکر ہے اس آیت میں قل بفضل اللہ وبرحمته فبذلک فلیفرحوا اور جو فرح بطراً ہو وہ محمود نہیں بلکہ مذموم ہے چنانچہ قارون کے قصہ میں ارشاد ہے اذ قال له اومه لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین (پ ۲۰)

مصائب میں حکمت خداوندی

حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما اصاب من مصیبة فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نیراها ان ذلک علی اللہ یسر لکیلا تا سوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم بتلایئے اس آیت میں لام غایت کا متعلق کون ہے مذکور تو ہے نہیں چنانچہ ظاہر ہے کہ اس میں کوئی جزو اس کا صالح نہیں، لامحالہ مقدر ماننا پڑے گا اب یہ بھی سمجھ لو کہ مقدر کیا ہے تو اس لازم سے اوپر اللہ تعالیٰ نے مسئلہ تقدیر بیان فرمایا ہے یعنی تم کو جو مصیبت بھی پہنچتی ہے خواہ آفاقی ہو یا نفسی وہ ایک کتاب میں اپنے ظہور سے پہلے لکھی

ہوئی تھی چونکہ یہ عجیب بات تھی اس لئے فرماتے ہیں کہ تعجب نہ کرو اللہ کو یہ سب آسان ہے اب اس مسئلہ کے بتلانے کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو یہ مسئلہ اس لئے بتلایا تاکہ تم فائت پر غم نہ کرو اور عطا کی ہوئی چیز پر اتر او نہیں پس وہ مقدر را خبر تا کم بہ ہے۔

اصلاح اعمال میں تقدیر کا دخل

اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ تقدیر کو اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے کیونکہ اس سے حزن و بطر رفع ہو جاتا ہے اور حزن جڑ ہے تعطل ظاہر کی اور تکبر و بطر اصل ہے تعطل باطن کی یعنی غمگین و پریشان آدمی ظاہر میں تمام دین و دنیا کے کاموں سے معطل ہو جاتا ہے اور متکبر آدمی کا دل خدا کے تعلق سے معطل ہو جاتا ہے جب تک تکبر نہ نکلے خدا کے ساتھ دل کو لگاؤ نہیں ہو سکتا یہ تو تقدیر کو دخل تھا اعمال میں اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ توحید جو اعظم العقائد و اساس العقائد ہے اس کو بھی اصلاح اعمال میں بڑا دخل ہے چنانچہ سعدی فرماتے ہیں۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش چہ فولادی ہندی نمی بر سرش
امید و ہر اش نباشد ز کس ہمیں ست بنیاد توحید و بس

یعنی توحید سے مخلوق کا خوف و طمع زائل ہو جاتا ہے جب اتنا بڑا عقیدہ بھی اصلاح اعمال میں دخیل ہے تو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے اعتقاد کو آپ کے اتباع میں دخیل مانا جاوے تو کیا اشکال ہے اور یہی حضور کا اصل مقصود ہے (گو وہ فضائل ایک درجہ میں مقصود بالذات بھی ہیں)

اس لئے حضور نے اس میں زیادہ کاوش سے منع فرمایا کیونکہ جو مقصود ہے اس اعتقاد فضیلت سے وہ بدوں تفصیل کے بھی صرف اجمالی اعتقاد سے حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر نے اولیاء و مجتہدین میں بھی تفاضل سے منع فرمایا ہے۔

حق تعالیٰ میں خفا نہیں

چنانچہ نص میں ہے والظاهر و الباطن پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں صفت باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں بھی خفا ہے۔

اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفا نہیں بلکہ غایت ظہور سے بطون ہو گیا۔

رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہو گیا۔ اس سے تو ظہور ہونا چاہیے تھا تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لئے غیبت و خفا کی بھی ضرورت ہے اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو اس کا ادراک نہیں ہو سکتا کیونکہ ادراک

التفات سے ہوتا اور التفات غیبت کی وجہ سے ہوتا ہے جو چیز من کل وجہ حاضر ہو اس کی طرف التفات نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی روح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب روح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے اس میں کوئی درجہ غیبت کا نہیں اس لئے اس کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا اور جب التفات نہیں تو ادراک کیسے ہو۔ اسی طرح بلا تشبیہ کیونکہ یہ تشبیہ بھی ناقص ہے حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غیبت و خفا کا نہیں اس لئے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں۔ ہم کو دھوپ کا ادراک اس لئے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہو جاتی ہے۔ اگر غائب نہ ہوتی تو آپ اس کو دیکھتے مگر ادراک نہ ہوتا دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفا ضواء ہی کا نام ہے نیز اگر غیبت نہ ہو تو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی دن میں جو لذت ہے وہ اسی لئے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہو جاتی ہے۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتی نہ دہد لذت حضور

(میں ہجر کی شکایت نہیں کرتا اگر ہجر نہ ہوتا تو قرب میں لذت نہ معلوم ہوتی)

غرض چونکہ حق تعالیٰ ہر وقت ظاہر ہیں اسی لئے خفا ہو گیا کیونکہ یہاں ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتا۔ ہاں آخرت میں یہ ادراک قوی ہو جائے گا تو ظاہر من کل وجہ کے ساتھ بھی متعلق ہوگا وہاں روح کا بھی انکشاف ہوگا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہوگا اور معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے حجاب ہماری طرف سے تھا ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں جیسے خفاش میں آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

شدتِ ہفت پردہ چشم بے پردہ ورنہ ما ہے چوں آفتاب دارم

یعنی آنکھ کے ساتھ پردے ہی دیدار سے مانع ہو گئے تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے ادھر سے کوئی مانع نہیں۔ اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھوں پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہوگا آفتاب کو مخفی نہ کہا جاوے گا۔

اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر کرتا ہے۔ لایسقی علی وجہہ الورداء الکبریاء اس کے چہرہ پر سوائے کبریائی چادر کے کچھ باقی نہ رہے گا وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے مگر کنہ کا ادراک نہ ہوگا اور رویت کے لئے ادراک کنہ لازم نہیں ہم یہاں بھی بہت چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہر حال دنیا میں رویت الہی محال عادی ہے چنانچہ حدیث مسلم میں ہے۔

انکم لن تروا ربکم حتی تموتوا مرنے سے پہلے تم کو ہرگز تمہارے رب کا دیدار نہ ہوگا۔

اور نص میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد ہے۔ لن ترانی (ہرگز مجھ کو نہیں

دیکھ سکتے) یہ جواب قابل دید ہے۔ حق تعالیٰ نے لسن نرانی (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے) فرمایا ہے۔ لسن اری ہرگز نہ دیکھا جاؤں گا) نہیں فرمایا۔ بتلادیا کہ میں تو اب بھی اس قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں، مگر تم میں قوت دیدار نہیں تم مجھے اس وقت نہیں دیکھ سکتے۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا، کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے۔ ہاں تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے حجابات اٹھادیئے تھے۔ مگر موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئے۔

عام طور پر تجلی کے لفظ سے معنی عرفی اور وہ بھی عرف عام کی طرف نظر پہنچتی ہے جس سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ تجلی کے معنی لغتاً ظہور ہیں جو ایک اعتبار سے صفت ہے اور ایک اعتبار سے فعل ہے اور افعال کا ظہور فاعل کا ظہور ہے۔ اس معنی کو ظہور سے تعبیر کرنا موہم خلاف مقصود نہیں۔

اور یہی معنی فلما تجلی ربہ میں مراد ہیں۔ مگر عرف عام میں تجلی کے معنی نظر آنے کے مشہور ہیں جس سے آیت میں اشکال واقع ہوتا ہے کہ تجلی ربہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی تجلی ہوئی اور اس سے پہلے لسن ترانی میں رویت کی نفی ہو چکی ہے مگر تجلی بمعنی ظہور سے یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کیونکہ لسن ترانی سے تجلی بمعنی رویت کی نفی تھی نہ کہ تجلی بمعنی ظہور کی۔

البتہ ایک اشکال باقی رہے گا وہ یہ کہ لسا تجلی ربہ شرط ہے وخر موسیٰ صعق مع اپنے معطوف علیہ کے جزا ہے اور شرط وجزا میں تقدم و تاخر لازم ہے تو معلوم ہوا کہ ظہور کے بعد موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے تو ظہور کے وقت بے ہوش نہ تھے اور بے ہوشی ہی مانع رویت تھی تو لازم آتا ہے کہ بے ہوشی کے قبل رویت ہو گئی تو اشکال عود کر آیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شرط وجزا میں تقدم و تاخر تو ضروری ہے مگر وہ عام کہ ذاتی ہو یا زمانی صحت مجازاۃ کے لئے احد ہا کافی ہے زمانی ہی ضروری نہیں اور نہ یہاں اس پر کوئی دلیل قائم ہے پس ہم کہتے ہیں کہ یہاں تقدم و تاخر محض ذاتی ہے اور وقوع دونوں کا ایک زمانہ میں ساتھ ساتھ ہوا تجلی کا بھی اور صعق کا بھی۔ پس اب تقدم و تاخر سے وقوع رویت لازم نہیں آتا۔ البتہ اگر تجلی کے بعد کچھ زمانہ صعق میں فاضل ہوتا تو اشکال ہوتا لیکن اس پر کوئی دلیل نہیں اس لئے اشکال رفع ہو گیا۔

لکیلا ناسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اتکم (الحمدید آیت ۲۳)

تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتر او نہیں۔

عقیدہ تقدیر کی حکمت

قرآن کریم نے مسئلہ تقدیر کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ لکیلا ناسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا

بما آتاکم یعنی تقدیر خداوندی کے معتقد ہونے کا یہ فائدہ ہے کہ اگر تمہارا کوئی مقصود فوت ہو جاوے تو تم زیادہ افسوس اور رنج و غم میں گھلو اور اگر کوئی مقصود حاصل ہو جائے تو بہت زیادہ خوشی جو تکبر و غرور تک پہنچائے اس میں جتلا نہ ہو۔ واقعی بات یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے تمام واقعات و حالات کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ تقدیر الہی سے ہوتا ہے اور اس کا واقعہ ہونا ناگزیر ہے۔ کسی کی طاقت اس کو روک نہیں سکتی وہ عیش و مصیبت اور راحت و تکلیف کی دونوں حالتوں میں اعتدال پر رہتا ہے۔

حضرت نے فرمایا اس کی واضح مثال یہ ہے کہ دو شخص ہوں ایک قائل تقدیر دوسرا منکر تقدیر اور دونوں کے دوڑ کے ہوں اور دونوں اکلوتے ہوں اور وہ دونوں ایک ہی وقت ایک ہی مرض میں مبتلا ہو جاویں اور علاج معالجہ کے باوجود دونوں مر جاویں۔ پھر دونوں کے متعلق یہ ثابت ہو جاوے کہ علاج میں غلطی ہو گئی تو اب دونوں کا حال دیکھئے منکر تقدیر کو عمر بھر اضطراب اور بے چینی رہے گی کبھی قرار نہ آئے گا۔ اور قائل تقدیر کو اس طرح کا اضطراب نہیں ہوگا کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ علاج کی غلطی بھی مقدر ہی تھی جس کا واقعہ ہونا ضروری تھا۔

دنیا کو اللہ تعالیٰ نے علم اسباب بنایا ہے جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے پردوں سے اس کا ظہور ہوتا ہے حقیقت ناشناس لوگ انہیں پردوں میں رکھ کر رہ جاتے ہیں اور جن کو حقیقت کا علم ہے اور جانتے ہیں کہ اسباب عالم سب پردے ہیں اصل فاعل تو قدرت حق ہے حافظ شیرازی نے خوب فرمایا۔

ایں ہمہ مستی و بیہوشی نہ حد بادہ بود با حریفان آنچہ کرد آں زگس مستانہ کرد

زگس مستانہ کنایہ ہے عنایت حق سے۔ (مجالس حکیم الامت ص ۳۱۰)

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ

لِيُقِيمُوا النَّاسَ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ

ترجمہ: ہم نے (اسی اصلاح آخرت کے لئے) اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے کے حکم کو نازل کیا تاکہ لوگ (حقوق اللہ اور حقوق العباد میں) اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے۔

تفسیری نکات

نعلدار جوتا

اس کی تفسیر میں ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے حدید سے مراد ہے نعلدار جوتا (یعنی فیہ باس شدید کی صفت کے اعتبار سے سلاح مراد ہے جس کی تعبیر اہل محاورہ اس عنوان سے کیا کرتے ہیں کیونکہ جو نہیم کم ہوتے ہیں ان کے لئے جوتا کی بھی ضرورت ہے (اسرار العبادۃ)

سنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک

تو صاحبو یہ ایسی دلیل ہے کہ ٹوٹی ہی نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ بلا دلیل اللہ واحد ہے۔ سنار کی کھٹ کھٹ لوہار کی ایک یہ سو کی ایک دلیل ہے مولانا یعقوب صاحب اسی باب میں فرماتے ہیں

الوعظ ينفع لوبالعلم والحكم والسيف يبلغ وعاظ على اقم

اور یہ بھی فرماتے تھے دیکھو لوگ تو کہتے ہیں چار کتابیں نازل ہوئی ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ ایک پانچویں کتاب بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے لقد ارسلنا رسلنا بالبينات و انزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط و انزلنا الحديد فيه باس شديد و منافع للناس (حدید ۲۵)

کتب اربعہ کے بارے میں بھی انزلنا آیا ہے کہ سب کتابیں آسمان سے نازل ہوئی ہیں اور حدید کے واسطے بھی انزلنا آیا ہے یہ پانچویں کتاب ہے اور بعض وقت ظرافت فرماتے تھے کہ حدید سے مراد ہے نعلدار جوتا اور مولانا نے اس کا نام رکھا تھا روشن دماغ کہ سر پر دو چار لگا دیئے۔ دماغ درست ہو جاتا ہے اور اس سے بھی ایک نور پیدا ہوتا ہے۔

سُورَةُ الْمَجَادِلَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ

فَامْسَحُوا بِسُجُودِكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ فَانشُرُوا فَمَا تَشُرُوا يَرْفَعِ

اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝۱۱

ترجمہ: اے ایمان والو جب تم کو کہا جائے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو تم جگہ کھول دیا کرو اللہ تم کو جنت میں کھلی جگہ دے گا اور جب کبھی ضرورت سے یہ کہا جائے کہ مجلس سے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جایا کرو (اس حکم کی اطاعت سے) ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) جن لوگوں کو علم دین عطا ہوا ہے (اخروی) درجے بلند کرے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی خبر ہے۔

تفسیری نکات

شان نزول

اس آیت کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حاضر تھے کہ اصحاب بدر آئے اصحاب بدر وہ لوگ کہلاتے ہیں کہ جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ہیں۔ ان کی فضیلت بہت ہے اس وقت مجلس میں کچھ تنگی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین مجلس کو حکم فرمایا کہ مل کر بیٹھو اور ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض کو فرمایا کہ تم اٹھ جاؤ اپنے کسی دوسرے کام میں

لگو با اشرہ کر دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔ ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ آیت کا مجموعہ ان دونوں کے مجموعے پر دال ہے کہ بعض کو مل کر بیٹھنے کا حکم دیا ہو اور بعض کو اٹھ جانے کا حکم دیا ہو۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لبوں کو تکتے تھے وہ تو اس پر نہایت خوشی سے عامل ہو گئے۔ لیکن منافقین نے کہ وہ ایسے مواقع کے لئے ادھار کھائے بیٹھے رہتے تھے اس پر اعتراض کیا اور یہ گویا ان کو عیب جوئی کا ایک موقع مل گیا۔ حالانکہ اگر سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تب بھی اس انتظام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمال خوبی معلوم ہوتی ہے کہ تمام طالبان کی کس قدر رعایت کی کہ جگہ نہ ہونے کی مجبوری سے کوئی شخص محروم نہ رہ جائے لیکن چشم بد میں ہنر بھی عیب ہی ہو کر نظر آتا ہے۔

چشم بد اندیش کہ برکنده باد عیب نماید ہنرش در نظر

(بد اندیش آدمی جب کسی کام کو دیکھتا ہے تو اس کی نظر میں اس کا ہنر عیب معلوم ہوتا ہے)

منافقین کو اعتراض کا بہانہ مل گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ نئے آنے والوں کی خاطر پہلے بیٹھے ہوؤں کو اٹھایا جائے خدا تعالیٰ نے اس اعتراض کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض لغو اس لئے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ دونوں حکم مناسب اور مستحسن تھے اور مستحسن کو غیر مستحسن کہنا حماقت ہے اور مستحسن ہونا اس طرح ظاہر فرمایا کہ ان حکموں کا خود بھی امر فرمایا اور خدا تعالیٰ اگر کوئی حکم فرمائیں تو وہ قبیح نہیں سکتا۔ عقلاً بھی اور نقلاً بھی جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے ان اللہ لا یامر بالفحشاء اور اس کا حکم خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ مستحسن ہے کیونکہ ایسی ذات کا حکم ہے جس کی برابر کوئی حکیم نہیں پھر ہر حکم پر ایک ایک ثمرہ مطلوبہ کو بھی مرتب فرمایا کہ وہ استحسان کی مزید دلیل ہے چنانچہ حکم اور ثمرہ دونوں کے لئے ارشاد ہے اذ اقبل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا۔ ایک حکم کا تو یہ صیغہ امر اس میں ارشاد ہے اس کے بعد فرماتے ہیں بفسح اللہ لکم اس کا ثمرہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو خدا تعالیٰ جنت میں تمہارے لئے فراخی فرمائیں گے یہاں تک تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ تھا آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم فرماتے ہیں واذا قبل انشزوا فانشزوا یعنی جب اٹھ جانے کا حکم ہوا کرے تو اٹھ جایا کرو۔ نقلی استحسان تو اس ارشاد ہی سے ثابت ہو گیا باقی عقلی استحسان کی تقریر یہ ہے کہ صدر مجلس جب اہل ہو اور یہ حکم کرے تو وہ کسی مصلحت کی بنا پر ہوگا۔ پس اس کا قبول کرنا ضرور ہوگا اور مطلق صدر مجلس بلا تخصیص اس لئے کہا گیا کہ قرآن میں لفظ قبل ہے جو کہ ہر صدر مجلس کے کہنے پر صادق آتا ہے پس یہ شبہ جاتا رہا کہ یہ خاص ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اگرچہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے ارشاد فرمایا تھا لیکن جس طرح حضور ﷺ کو اس کی ضرورت پیش آئی اسی طرح جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں اور

نیابت کی اہلیت ان میں ہے ان کو بھی صدر مجلس ہونے کی صورت میں ایسی ضرورت پیش آ سکتی ہے اور اس کے قبول پر بھی عمل کرنا ایسا ہی واجب ہوگا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر۔ تو اگر وہ اٹھنے کا حکم دیں تو فوراً اٹھ جانا چاہیے۔ اور اس کے امتثال میں تنگ و عامر نہ کرنا چاہیے کیونکہ مصلحت وقت سے ایسا کیا جاتا ہے اور توضیح مقام کی یہ ہے کہ ان حکموں کا حاصل تنادب فی الانتفاع ہے اور تنادب شرعاً بھی محمود ہے یعنی اگر کوئی مطلوب مشترک ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لئے سب طالبین کی گنجائش ایک مجلس میں نہ ہو تو شریعت نے اس کے لئے تنادب تجویز فرمایا ہے اور عقل بھی اس کے ساتھ اس میں متفق ہے کہ سب طالبین کے کمال حاصل کرنے کی یہی صورت ہے کہ آپس میں تنادب ہو زیادہ وضاحت کے لئے اس کو ایک مثال میں سمجھئے مثلاً ایک کنواں ہے کہ شہر کے ہر شخص کو اس کے پانی کی ضرورت ہے اور ایک ساتھ سب کے سب اس سے پانی نہیں بھر سکتے تو سب کے پانی حاصل کرنے کی صورت یہی ہے کہ یکے بعد دیگرے سب کے سب پانی حاصل کریں اور چار آدمیوں کو یہ حق نہیں کہ وہ کنویں پر جم کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو جگہ نہ دیں یہ مثال ایسی ہے کہ اس کے تسلیم کرنے میں کسی کو بھی کلام نہیں تو جس طرح دنیاوی نفع میں تنادب مسلم ہے اسی طرح دینی نفع میں بھی سب کے انتفاع کی یہی صورت ہے کہ علی سبیل التناوب سب نفع حاصل کریں۔ اسی مثال کے قریب ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں کہ وہ وضاحت میں تو اس سے کم ہے مگر اس موقع کے زیادہ مناسب ہے وہ یہ کہ اگر ایک مدرسے میں ایک عالم ایسے ہوں کہ ہر طالب علم کو ان کی ضرورت ہو اور ہر شخص ان سے نفع حاصل کرنا چاہے کوئی بخاری شریف پڑھنا چاہے اور کوئی نسائی اور کوئی منطق و فلسفہ تو اگر بخاری شریف والے ان کو گھیر کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کو وقت ہی نہ دیں تو دوسروں کے نفع حاصل کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے اور اس لئے بخاری والوں کو یہ حق نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ دوسری جماعتوں کے لئے بھی وقت چھوڑ دیں۔ ان مثالوں سے معلوم ہوا ہوگا کہ نفع دنیاوی اور دینی دونوں میں اگر طالبین کا اجتماع نہ ہو سکے تو تنادب ہونا ضروری ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نہایت ہی قرین مصلحت تھا اور چونکہ تفسیر اور انشز و اعام ہے بعض اور کل دونوں کو۔ اس لئے اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کو اٹھنے کو فرمائیں سب کو اٹھ جانا واجب ہوگا اور اس میں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ مہینے اس کا تو انتفاع اجماع تھا سب کے اٹھانے میں تو حرمان اجماع ہے جواب یہ ہے کہ اس میں بھی انتفاع اجماع اس طرح ہو سکتا ہے کہ شاید آپ خلوت میں کچھ نفع عام کے لئے سوچیں یا آرام فرمائیں تاکہ پھر سب کی مصلحت کے لئے تازہ ہو جائیں پس اس میں بھی جمع کا انتفاع ہوا اسی طرح اگر کسی دوسرے صدر مجلس کو بھی اس کی ضرورت پیش آئے کہ وہ کسی مصلحت سے بعض مجلس یا ساری مجلس کو اٹھنے کا حکم دے تو اس کو اجازت ہے کہ کہہ دے کہ اب تم لوگ اٹھو اور اس کا یہ کہہ دینا بدلیل اس کے اہل

ہونے کے قریب مصلحت سمجھا جائے اور اس پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ تو منافقین کی یہ شکایت محض حسد کی بناء پر تھی اور اس کے قبول کرنے سے اباہ کرنا محض عار و استنکاف تھا اور نہ واقع میں بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں وہ ایسے امور میں اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اس وقت مجھے اپنی ایک حکایت یاد آئی اپنی اوائل عمر میں جبکہ میں بالغ ہو چکا تھا ایک مرتبہ اپنی مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے کھڑا ہوا صف میں داہنی طرف آدمی زیادہ ہو گئے تھے اور بائیں طرف کم تھے۔ میں نے داہنی طرف کے ایک شخص کو کہا کہ آپ بائیں طرف آ جائیں یہ سن کر ان کو اس قدر غصہ آیا کہ چہرہ تمٹما گیا زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں ہوئے حالانکہ یہ کوئی غصہ کی بات نہ تھی ترتیب صفوف تو شریعت میں بھی ضروری قرار دی گئی ہے ان کی یہ حرکت مجھے بھی ناگوار ہوئی آخر میں نے ان کے قریب کے آدمی سے کہا کہ بھائی تم ادھر آ جاؤ کیونکہ ان کی تو شان گھٹ جائے گی اس پر تو وہ ایسے خفا ہوئے کہ صف میں سے نکل کر مسجد ہی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ تو بعض طبیعتیں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ اس کو عار سمجھتے ہیں کہ کسی دوسرے کا کہنا مانا کریں اور اس کا اندازہ ایسے لوگوں کے حالات دیکھنے اور ان سے ملنے سے ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے ذریعے سے یہ قانون دائمی مقرر کیا گیا اور نہ بظاہر اس کا قانون بنانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ تو ایسی ظاہر بات ہے کہ معاشرت روزمرہ میں داخل اور فطرت سلیمہ کا مقتضا ہے مگر اسی قسم کی طبائع کی بدولت یہ قانون مقرر فرمایا کہ واجب سمجھ کر ماننا پڑے اور اس کا امر بھی فرمایا اور امر کے ساتھ ترغیب بھی دی تاکہ کوئی ہیبت سے مانے اور کوئی ترغیب سے کیونکہ دوہی قسم کی طبیعتیں ہوتی ہیں بعض پر رغبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے اور بعض پر ہیبت کا زیادہ اثر ہوتا ہے جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن میں زیادہ لطف اسی شخص کو آتا ہے جس کی نظر واقعات پر ہو اور وہ واقعات میں غور کرے۔ مثلاً اگر ان بڑے میاں کا واقعہ پیش نظر نہ ہوتا تو اس حکم کی مشروعیت کی حکمت سمجھنے کا لطف نہ آتا اور اب معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر پاکیزہ انتظام فرمایا ہے کہ ذرا سی بات کو بھی نہیں چھوڑا غرض اس قسم کے واقعات ہوئے بھی ہیں اور قیامت تک ہونے والے بھی ہیں۔ اس لئے یہ قانون دائمی مقرر فرمایا اور اس پر اس ثمرے کو مرتب فرمایا کہ ہم تمہارے لئے جنت میں جگہ کو فراغ فرمائیں گے اور دوسرا حکم یہ فرمایا کہ اگر اٹھ جانے کا حکم ہوا کرے تو اٹھ جایا کرو۔ خدا تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور اہل علم کے درجات بلند فرمائیں گے۔ یہ حاصل ہے ارشاد کا۔ اس تقریر سے آپ کو سب نزول آیت بھی معلوم ہو گیا اور حاصل آیت بھی جس میں حکم اور ثمرہ دونوں مذکور ہیں۔ اب میں وہ بات بیان کرتا ہوں جس کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے میں نے کہا تھا کہ اس ثمرے کا ایک مینے ہے اس میں غور کرنے سے وہ قاعدہ عامہ نکلے گا۔ جس کا استحضار ہر وقت ضروری ہے سو یہاں ایک امر تو یہ ہے کہ تفسحوا اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ یفسح الله لكم یعنی جنت میں فراخی ہوگی اور دوسرا حکم یہ ہے کہ

فانشزوا اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ یوفع اللہ الذین امنوا منکم تو ان دونوں میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ صدر مجلس کے کہنے سے فراخی کر دینے میں جنت میں فراخی کیوں ہوگی اور اٹھ جانے میں رفع درجات کیوں ہوں گے۔ جس کو ذرا بھی عقل ہوگی وہ تو اس میں بالکل بھی تامل نہ کرے گا بلکہ یہی کہے گا کہ جی یہ ہے کہ اس نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اور اولی الامر کا حکم بھی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ ہی نے ہم کو اولی الامر کا کہنا ماننے کو فرمایا ہے پس اگر ہم نے صدر مجلس کا حکم مان لیا تو خدا تعالیٰ کا حکم مان لیا غرض پھر پھر کر جی یہی نکلے گا کہ چونکہ اس امر کا امتثال کرنے والا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننے والا ہے اس لئے اس کو یہ ثمرہ حاصل ہوا۔ سو اصل مقصود اس وقت اسی امر کا بیان کرنا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر یہ دو ثمرے مرتب ہوتے ہیں۔

اصلاح معاشرہ کا ایک ثمرہ

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ اصلاح معاشرت پر بھی آخرت کے ثمرے ملتے ہیں۔ جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ احکام شرعیہ میں جس امر کو تم بالکل دنیا سمجھتے ہو اس میں بھی تم کو اجر ملے گا وجہ دلالت ظاہر ہے کہ فسحت اور قیام پر جو کہ معاشرت میں سے ہیں آخرت کا وعدہ فرمایا۔

ہر مطیع مسلمان مقبول ہے۔

ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ عام اہل ایمان بھی اگر چہ وہ جاہل ہو مقبول ہیں کیونکہ اہل علم سے قبل اہل ایمان کو بھی مقام فضل میں فرمایا ہے لہذا عام مومنین کو بھی حقیر اور ذلیل نہ سمجھنا چاہیے پس ہر صاحب ایمان اگر وہ مطیع ہو مقبول ہے اور مطیع کی قید اس لئے لگائی کہ فسح اور رفع درجات کو جس سے کہ اہل ایمان کے فضل پر استدلال کیا گیا ہے اطاعت ہی پر مرتب کیا ہے کیونکہ تقدیر کلام یہ ہے تفسحوا فی المجالس ان تفسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا ان تنشزوا یرفع اللہ لکم (محلوں میں فراخی کرو اگر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے فراخی کریں گے اور جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ اگر اٹھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے مرتبے بلند فرمادیں گے۔) مطلب یہ ہے کہ جب ان دو امر میں امتثال ہوگا تو یہ مرتبہ ملے گا اور اس مدلول کے بیان کرنے سے جیسے اہل علم کی اصلاح کرنا مقصود ہے کہ عوام مومنین کو حقیر نہ سمجھیں اسی طرح غیر اہل علم میں سے متکبرین کی بھی اصلاح کرنا مقصود ہے کہ ان کو بھی جلا ہے تیلیوں کو ذلیل سمجھنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ یہاں مدار فضل مطلق ایمان و اطاعت ہے۔ خواہ کوئی قوم ہو۔ ایک مدلول اس آیت

کا اور ہے جو کہ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے یعنی فائز وا کے بعد جو ثمرہ مرتب کیا ہے تو ایک خاص عنوان سے کیا ہے یعنی اس طرح فرمایا یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اتوا العلم اور یوں نہیں فرمایا یرفعکم والذین اتوا العلم پس اس وضع مظہر موضع ضمیر میں اشارہ اس طرف ہو گیا کہ زیادہ دخل اس ترتیب رفعت میں ایمان کو ہے پس اس سے یہ بات نکل آئی کہ اگر کوئی مومن پورا مطیع نہ ہو مگر مومن ہو تو وہ بھی عند اللہ ایک گونہ رفعت سے خالی نہیں تو جو لوگ عاصی مومن ہیں ان کو بھی ذلیل نہ سمجھو البتہ اگر خدا کے لئے ان پر ان کے سوء اعمال کے سبب غصہ کرو تو جائز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمدردی اور رحم ہونا بھی ضروری ہے۔ نفسانی غیظ اور کبر نہ ہو اور ان میں فرق کے لئے میں ایک موٹی سی مثال بیان کرتا ہوں جس کو میرے ایک دوست نے بہت پسند کیا اور ان ہی کی پسند سے مجھے بھی اس کی بہت قدر ہوئی یعنی معمولی قصوں میں غصہ دو موقعوں پر آتا ہے ایک تو اجنبی پر اور ایک اپنے بیٹے پر۔ سوا اجنبی سے تو اس کی شرارت پر نفرت اور عداوت ہو جاتی ہے اور اگر اپنا بیٹا ہی حرکت کرے تو اس سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ شفقت کے ساتھ تاسف ہوتا ہے اس کے لئے دعاء کرتا ہے دوسروں سے دعا کرتا ہے اس کی حالت پر دل کڑھتا ہے اور غصہ جو ہوتا ہے تو اس کے ساتھ یہ شفقت ملی ہوتی ہے۔ پس اخوة اسلامیہ کا مقتضایہ ہے کہ اجنبی عاصی کے ساتھ بھی بیٹے کا سا برتاؤ رکھنا چاہیے یعنی اگر کبھی اس پر غصہ آئے اور خیال ہو کہ یہ غصہ خدا کے لئے ہے اس میں نفس کی آمیزش نہیں تو اس وقت دیکھنا چاہیے کہ اگر میرا بیٹا اس حالت میں مبتلا ہوتا تو اس پر مجھے اس قسم کا غصہ آتا یا نہیں اگر قلب سے نفی میں جواب آئے تو سمجھے کہ یہ غصہ خدا کے لئے نہیں ہے بلکہ تفرغ کا غصہ ہے اور یہ اس شخص کی معصیت سے بھی بڑھ کر معصیت ہے اور خوف کا مقام ہے خدا تعالیٰ کی ایسی شان ہے کہ اگر ایک گنہگار اپنے کو ذلیل سمجھتا ہے تو وہ مغفور ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایک مطیع اپنے کو بڑا سمجھتا ہے تو وہ مقہور ہو جاتا ہے (خوب کہا ہے)

عافل مرد کہ مرکب مردان زہدرا در سنگلاخ باد یہ پیا بریدہ اند

لومید ہم مباح کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیک خروش بمنزل رسید اند

سو نہ تو خدا پر ناز کرنا چاہئے اور نہ ناامید ہونا چاہیے غرض تحقیر تو کسی مسلمان کی کرے نہیں لیکن غیظ و غضب جس کا خشاء بغض فی اللہ اور رحم و ہمدردی ہو اس کا مضائقہ نہیں۔ باقی کبر و عجب تو خدا تعالیٰ کو بہت نا پسند ہے۔ ہمارے ہاں ایک لڑکی تھی نماز روزے کی پابند (اب اس کا انتقال ہو گیا ہے) اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی جو کہ اس قدر پابند نہ تھا ایک روز کہتی ہے کہ اللہ کی شان میں ایسی پرہیزگار پارسا اور میرا نکاح ایسے شخص سے ہو۔ صاحبو! کتنی حماقت کی بات ہے کیونکہ اگر کوئی بزرگ بھی ہے تو ناز کس پر کرتا ہے۔ بزرگی پر ناز کرنے کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی مریض طبیب کا نسخہ پی کر ناز کرنے لگے کہ ہم ایسے بزرگ

ہیں کہ ہم نے دوا پی لی۔ کوئی اس سے پوچھے کہ اگر دوا پی کرناز کرنے لگے کہ ہم ایسے بزرگ ہیں کہ ہم نے دوا پی لی۔ کوئی اس سے پوچھے کہ اگر دوا پی لی تو کس پر احسان کیا اور کیا کمال کیا نہ کرنا جہنم میں پڑنا البتہ بجائے ناز کے خدا تعالیٰ کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرمائی۔ حاصل یہ کہ الذین امنوا سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گنہگار بھی رفعت عند اللہ سے خالی نہیں۔ ایک مدلول اس آیت کا یہ ہے کہ الذین امنوا منکم والذین او توالعلم میں تخصیص بعد تعمیم سے معلوم ہوا کہ قبول اعمال کا تفاوت خلوص سے ہوتا ہے کیونکہ اہل علم کے درجات میں امتیاز اس خلوص ہی کے سبب سے تو ہوا جیسا او پر مذکور ہوا ہے اور اس مسئلے کو بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کہ آج کل لوگ اعمال کے تو شائق ہیں لیکن خلوص کی پروا اکثر نہیں ہوتی۔ حالانکہ خلوص وہ چیز ہے کہ اسی کی بدولت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ ان کا نصف مد جو خرچ کرنا اور ہمارا احد پہاڑ برابر خرچ کرنا برابر نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ یہ صحبت نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے ہے تو میں یہ کہوں گا کہ ان کا خلوص بھی صحبت کی برکت سے ہے تو یہ دونوں متلازم ہیں اب خواہ صحبت کو سبب کہہ دیجئے خواہ خلوص کو بالکل وہ حالت ہے کہ

۔ عباراتنا شتی و حسنک واحد فکل الی ذاک الجمال بشیر

(ہماری تعبیرات مختلف ہیں اور تیرا حسن ایک ہے ساری تعبیریں اسی (ایک) جمال کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔) سب ایک ہی جمال کی تعبیریں ہیں میں نے اپنے پیرومرشد سے سنا ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی ایک لاکھ رکعت سے افضل ہے وجہ یہی ہے کہ اس کی ایک رکعت میں بوجہ معرفت کے خلوص زیادہ ہو گا۔ اور اسی مدلول پر ایک اور بات بھی متفرع ہوتی ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں واللہ بما تعملون خبیرہ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال پر خبردار ہیں۔ اس کو ہر جملے سے تعلق ہے کہ تم ہر حکم کی پابندی کرو اور اس میں کوتاہی نہ ہونے دو کیونکہ خدا تعالیٰ کو تمہارے باطن کی بھی خبر ہے تو خدا تعالیٰ کو اس کی اور فرد گذشت تک کی بھی اطلاع ہو جائے گی جو تمہاری نیتوں میں بھی ہوگی۔ گویا اس جملہ سے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک مضمون کا مراقبہ سکھلایا ہے کہ اگر اس کو مستحضر رکھیں تو عمل میں کبھی کوتاہی نہ ہو۔ یعنی ہر وقت یہ خیال رکھیں کہ اللہ تعالیٰ میرے ظاہر و باطن کو دیکھ رہے ہیں اس کی مداومت کے بعد چندے ایک حال پیدا ہوگا اور ذوقاً یہ سمجھے گا کہ گویا میں خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں اور قرآن وحدیث میں اس قسم کے جتنے مضامین ہیں یہ سب مراقبات ہیں ان میں بتلا دیا ہے کہ اطاعت کی اصل اور راسخ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ یہ مراقبات مستحضر ہو جائیں کیونکہ جب یہ خیال پختہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے اس کام کی حاکم کو بھی اطلاع ہے تو پھر اس میں کوتاہی نہیں ہوا کرتی۔

آنے والوں کی دل جوئی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے توہر فعل میں اعتدال و انتظام تھا۔ نشست و برخاست میں خورد و نوش میں گفتار میں رفتار میں اسی کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان خلقہ القرآن کہ قرآن میں جو امور مذکور ہیں وہ آپ کے لئے مثل امور طبعیہ عادیہ کے ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب کوئی آپ کے پاس آتا آپ اپنی جگہ سے کھسک جاتے اللہ اکبر ایسی باریک باتیں آپ سے طبعی امور کی طرح سرزد ہوئی تھیں۔ اس میں مصلحت یہ ہے کہ آنے والے کی دلجوئی اس کی قدر دانی اس کے آنے سے مسرت کا اظہار اور قرآن میں ہے۔ **يا ايها الذين امنوا اذا قيل لكم تفسحوا في المجالس فافسحوا** (اے ایمان والو جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں جگہ کھول دو تو تم جگہ کھول دیا کرو) قرآن میں تو یہ ہے کہ تمہیں جب جگہ چھوڑنے کا حکم ہو اس وقت کھسک جاؤ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو باوجودیکہ جزئی حکم نہیں ہوا تھا۔ مگر آپ کھسک جاتے تھے کہ آپ کی نظر اس حکم کی علت پر تھی پس ایسی غامض (باریک) بات اور وہ آپ کی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) طبیعت کا مقتضا ہو گئی تھی پس آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھسک جاتے تھے۔ (روح القیام)

احکام مجلس عام

یہ سورہ مجادلہ کی آیت ہے حق سبحانہ و تعالیٰ نے آیت میں بعض آداب مجالس کے بیان فرمائے ہیں ہر چند آیت کا شان نزول خاص ہے مجلس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں اس لئے خصوص مورد کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ عموم الفاظ کے اعتبار سے حکم عام ہوگا پس خاص حضور ہی کی مجلس کے ساتھ یہ حکم مخصوص نہیں بلکہ یہ حکم تمام مجالس کو عام ہے اور حق تعالیٰ شانہ نے اس جگہ اس حکم کے جو کہ دو حکموں پر مشتمل ہے اتمثال پر اس کے ثمرہ کا بھی وعدہ فرمایا ہے چنانچہ پہلے حکم اور اس کے ثمرہ کے لئے ارشاد ہے۔

اذا قيل لكم تفسحوا في المجالس فافسحوا يفسح الله لكم (یہ تو پہلا حکم اور اس کا ثمرہ ہے) آگے بذریعہ عطف دوسرا حکم اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں **واذا قيل انشروا فانشروا** یہ تو حکم ہے اور اس کا ثمرہ ارشاد فرماتے ہیں۔

یرفع الله الذين امنوا منكم والذين اوتوا العلم درجات اور اس ثمرہ اور اس کے وعدوں میں اول تعیم فرمائی اس کے بعد تخصیص کے طور پر بعض لوگوں کے واسطے یعنی اہل علم کے لئے ثمرہ جداگانہ بیان فرمایا اور تخصیص بعد تعیم بقواعد علم بلاغت اہتمام کو مقتضی ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اہل علم کو چاہیے کہ اس کو بہتم

بالشان سمجھ کر اس کا خاص طور پر اہتمام کریں۔

اس اجمال کی تفصیل اس کے ترجمہ سے واضح ہو جائے گی۔ اور ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تم سے کہا جاوے کہ مجلس میں فراخی کرو تو فراخی کر دیا کرو جب تم سے کہا جاوے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ جایا کرو یعنی اگر اس جگہ سے اٹھنے کا امر ہو تو اس جگہ سے اٹھ جایا کرو پھر خواہ تم کو دوسری جگہ بیٹھنے کا حکم ہو جاوے خواہ چلنے دینے کا امر ہو اسی پر عمل کیا کرو (استکبار و انکار نہ کیا کرو) اور ظاہر ہے کہ یہ امر عقائد میں سے نہیں اعمال رکنیہ میں سے نہیں مالی حقوق میں سے نہیں اس لئے اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا۔ چنانچہ اول تو یا ایہا الذین امنوا سے خطاب ہے۔ باوجودیکہ قرآن سے تو مومنین ہی مخاطب ہیں اور اکثر قرآن میں مسلمانوں ہی سے خطاب ہوتا ہے پھر اس صریح خطاب سے کیا فائدہ ہے تو خوب سمجھ لو کہ اس سے مقصود رغبت دلانا ہے کہ یہ امر ہر چند شعائر دین سے نہیں اس لئے عام طور پر سے ممکن ہے کہ لوگوں کو اس کا اہتمام نہ ہو مگر ہمارے مخاطب وہ ہیں جو ہم پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ ضرور اس کو قبول کریں گے اس طرز کلام سے اس مضمون کی سامعین کو رغبت دلائی اور دوسرا اہتمام ”اذا قیل“ بصیغہ مجہول سے ظاہر فرمایا باوجودیکہ واقعہ خاصہ میں اس قول کے قائل خاص حضور اقدس ہیں پھر بھی عنوان عدم تعیین قائل سے تعبیر فرمایا (یعنی قیل مجہول کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا بجائے صیغہ معلوم ”قال لکم“ کے) اور یہ عدول اس وجہ سے فرمایا کہ اس مسئلہ میں حضور کے ارشاد کی تخصیص نہیں اس لئے حکم عام ہے ہر صدر مجلس کے قول کو۔ تیسرا اہتمام یہ کہ امر کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے یعنی ”فانشروا“ اور ”فانشروا“ اور ظاہر ہے کہ امر حقیقہ و جوب کے لئے ہوتا ہے جب تک کہ کوئی قرینہ صارفیہ عن الحقیقہ نہ ہو گو واجبات کے درجات مختلف ہوتے ہیں کہیں وجوب بعینہ ہوتا ہے کہیں وجوب لغیرہ مگر نفس وجوب میں شرکت ضرور ہوتی ہے چوتھا اہتمام یہ ہے کہ ”تفسحوا“ کا امر اور اس کا ثمرہ جدا بیان فرمایا۔ اور ”انشروا“ اور اس کا ثمرہ جدا بیان فرمایا اور نہ اگر اختصار کے ساتھ مجلس میں حکم صدر کی اتباع کا مشترکہ امر فرمادیتے تو اس درجہ اہتمام نہ ہوتا جیسا کہ جدا جدا بیان کرنے میں ہوا پانچواں اہتمام یہ ہے کہ لفظ فی المجالس بصیغہ جمع فرمایا باوجودیکہ فی المجلس بھی کافی تھا وہ بھی جنس کی وجہ سے عام ہوتا مگر چونکہ اس میں یہ احتمال باقی تھا کہ اس عام کو خاص پر حمل کر لیا جاتا اور مجلس سے خاص مجلس مراد لے لی جاتی (یعنی حضور کی مجلس) اس لئے فی المجالس فرمایا کہ اس کا احتمال بھی قطع فرمادیا کہ اب احتمال تخصیص کا ہو ہی نہیں سکتا لہذا حکم عام ہوگا تخصیص کا احتمال ہی نہیں چھٹا اہتمام یہ ہے کہ جس ثمرہ کو مرتب فرمایا اس کا بڑا ہونا ظاہر فرمادیا کیونکہ مقتضا علم بلاغت کا یہ ہے کہ عادتہ چھوٹے ثمرہ کو ذکر نہیں کیا کرتے اور یہاں ثمرہ کا ذکر موجود ہے اور قرآن کا فصیح و بلیغ ہونا مسلم ہے پس قرآن میں کسی ثمرہ کا ذکر کرنا اس کو مقتضی ہے کہ یہ ثمرہ بہت بڑا ہے اور جب ثمرہ بڑا ہوتا ہے تو عمل کا بڑا ہونا بھی ضروری ہے جس پر اس قدر بڑا ثمرہ مرتب ہوا ہے تو اس سے عمل مذکور کی یعنی توسع اور قیام کی اہمیت و عظمت بھی معلوم ہوئی ساتواں اہتمام خاص

اہل علم کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے یہ کیا گیا کہ شمرہ یرفع اللہ الذی امنوا منکم والذین اتوا العلم درجت میں ایمان والوں کو اولاً و عموماً اور اہل علم کو ثانیاً و خصوصاً بیان فرمایا تاکہ اہل علم کی بالخصوص فضیلت معلوم ہو جاوے پھر اس سب کے خلاف پر وعید ہے۔ واللہ بما تعملون خبیر اس سے اور زیادہ اہتمام بڑھ گیا یعنی اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو حق تعالیٰ اس سے خبردار ہیں اس لئے تمہیں مخالفت سنبھل کر کرنی چاہیے پس واللہ بما تعملون خبیر ظاہراً و عید ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ وعدہ ہو کہ اس عمل کے کرنے پر شمرہ کا ترتب ضرور ہوگا کیونکہ تمہارے اعمال کی حق تعالیٰ کو خبر ہے اس لئے اس عمل کے کرنے پر شمرہ کا ترتب فرمادیں یا اعمال مذکورہ کے معتد بہ ہونے کی شرائط کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی تفسیح فی المجالس یا نشوز مطلقاً معتبر و معتد بہ نہیں بلکہ اس میں خلوص بھی شرط ہے یعنی صرف صورت عمل پر شمرہ مذکورہ مرتب نہ ہوگا بلکہ اخلاص بھی ضروری ہوگا اور اخلاص امر باطنی ہے اس لئے اپنے خبیر بمعنی عالم باطن الامور ہونے پر تنبیہ فرمادی غرض ان سب اہتماموں سے معلوم ہوا کہ یہ عمل نہایت مہتمم بالشان ہے۔

تکبر کا علاج

اذا قبل لکم تفسحوا فی المجالس میں ایک بڑی ضروری تعلیم ہے لیکن بعد تا مل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص اہتمام سے تکبر کا علاج کیا گیا ہے جو منشاء ہے آداب مجالس پر عمل نہ کرنے کا اور بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کرنے کا پھر جب اصل اور جڑ خرابی کی جاتی رہے گی یعنی تکبر کا علاج ہو جائے گا اور اس کے علاج سے گناہ متروک ہو جائیں گے تو اب اعمال کرنے سے ارتفاع موانع کے سبب ان کا اصلی ثمرہ ضرور مرتب ہوگا۔ یہ حقیقت ہے اس تعلیم کی کہ اس کو معمولی نہ سمجھو اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ صدر مجلس کے کہنے پر عمل کرنے کو ازالہ تکبر میں کیا دخل ہے۔ ہم نے تو ایک بار ایسا کیا مگر کچھ بھی اثر نہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ گواہی بار عمل کرنا بھی بے کار نہیں مگر ایک بار میں معتد بہ اثر کا ظہور نہیں ہوتا، لیکن اگر بار بار اس پر عمل کریں گے تو خود ہی اثر معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو ایک جگہ پانی کا قطرہ ٹپکتا ہے تو اس وقت تو اس سے کچھ اثر محسوس نہیں ہوتا لیکن اگر اسی طرح ٹپکتا رہے تو دس برس میں اس پانی کے قطرہ ہی سے غار ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ اس اثر میں جس طرح مجموعہ من الحیث المجموع کو دخل ہے اسی طرح ہر قطرہ کا بھی دخل ہے اسی طرح ہر عمل شرعی پر ایک مرتبہ بھی عمل کرنا ضرور تصفیہ باطن میں اثر رکھتا ہے گو کمال اثر کی علت تامہ نہ سہی اس کے لئے ضرورت ہے تکرار دوام کی۔

یہ تمہید میں مذکور ہے کہ آیت میں دو عمل اور دو ثمرے بیان کئے گئے ہیں۔ عمل اول تفسیح فی المجالس اور اس کا ثمرہ یفسح اللہ لکم اور یہ عمل مع شمرہ کے بیان ہو چکا ہے اور عمل ثانی انشوزوا۔ جس پر شمرہ رفع درجات کو مرتب فرمایا اور انشوزوا کا احتمال چونکہ واقع میں تفسیح فی المجالس سے ارفع ہے کیونکہ اس میں انقیاد کا زیادہ

اظہار ہے جو نفس کو زیادہ شاق ہے اس لئے اس پر شمرہ بھی ارفع یعنی رفع درجات کا مرتب فرمایا۔ غالباً یہ امر بیان سے رہ گیا کہ فافسحو اور فانشزوا عام ہے خواہ جو ارح سے ہو یا قلب سے یعنی جس وقت مجلس میں تفسیح کا حکم ہو کشادگی کر دے اور جب مجلس سے اٹھایا جائے اٹھ جائے اور جب تک اس حکم کی نوبت نہ آوے تو اس کے لئے دل سے آمادہ رہے اس آمادگی سے قلب میں زیادہ وسعت ہوگی اصلاح اخلاق کیلئے کیونکہ حالت قلب کی زیادہ قابل اعتبار ہے۔ پس یقیناً یہی امر منسوخ ہوا کہ آرام اور راحت روح کی معتبر ہے نہ کہ جسم کی اس حکمت کے لئے حق سبحانہ تعالیٰ کا یہ ارشاد۔ یفسح اللہ لکم اور فانشزوا یرفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اتوا العلم درجات ظاہر و باطن سب کے لئے شامل رکھا گیا۔

اعمال عوام اور علماء کا فرق

اب اس مضمون ضمنی کے بعد یرفع اللہ الذین امنوا کا بیان کرتا ہوں کہ یہاں پر حکم رفع درجات عام مومنین کے لئے ثابت فرمایا پھر تخصیصاً اہل علم کے لئے اس کا حکم کیا اور صرف یرفع اللہ الذین امنوا پر اکتفاء نہیں فرمایا، گو وہ اہل علم کو بھی شامل ہو جاتا، سو ایسا کرنے سے مقصود اہل علم کی فضیلت کا ثابت کرنا ہے اور راز اس کا یہ ہے کہ ایک عمل عوام کا ہے کہ بوجہ بہت حقائق نہ جاننے کے وہ اس عمل کے پورے حقوق ادا نہیں کر سکتے اور ایک عمل اہل علم کا ہے وہ اس کے زیادہ حقوق ادا کر سکتے ہیں، پس اس عارض کی وجہ سے ان دونوں کے اعمال میں ضرور فرق ہوا، اور اہل علم کا عمل قوی اور کامل ہوا تو اہل علم کو جدا کر کے بیان کیا اور ظاہر ہے کہ اہل علم اور عوام میں جو یہ فرق ہوا، اس کا مدار بجز علم کے اور کئی شے نہیں۔ لہذا علم ہی ایسی چیز ہوئی، اس سے اہل علم کو فضیلت ہوئی، پھر جب علم مقبول و محبوب ہوا، تو اہل علم بھی ضرور محبوب اور مقبول ہوں گے اور قاعدہ ہے کہ محبوب کو غیر محبوب سے زیادہ اجر دیتے ہیں، اس لئے اہل علم کو زیادہ اجر ملے گا۔ اب میں اس راز کو بھی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ ایک شمرہ تو نفس عمل پر مرتب ہوتا ہے اور ایک اس کی خصوصیت پر، مثلاً دو شخصوں سے ایک مضمون لکھو، ایک تو محض مضمون لکھ دے، اور ایک منشی ذی فہم ہو کہ اس کو سمجھے بھی اور خوشنویسی سے زیب و زینت کیساتھ لکھے گا، تو یہ زیادتی نفس عمل پر نہیں ہوئی بلکہ اس کی تحسین و تکمیل موقوف ہوئی علم پر، اور جب کسی عمل میں تکمیل ہوگی تو وہ عمل افضل ہوگا، اور اس عمل کے ثمرات بھی افضل ہوں گے۔ پس اسی وجہ سے اہل علم کے عمل پر ثمرات بھی عوام کے ثمرات سے زیادہ مرتب ہوں گے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عارف کی نماز غیر عارف کی لاکھ نمازوں سے افضل ہے اس لئے کہ تکمیل موقوف ہے علم پر مجھے ایک حکایت یاد آئی حضرت حاجی صاحب کے ایک خلیفہ تھے ایک مرتبہ انہوں نے قصداً اہتمام کر کے نہایت خضوع و خشوع سے نماز پڑھی اور نماز پڑھ کر مراقب ہوئے

عالم امثال کی طرف اس کی صورت دیکھنے کے لئے متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ نہایت حسین و جمیل عورت ہے جو سر سے پیر تک زیوروں میں لدی ہوئی تھی مگر آنکھوں سے اندھی ہے۔ یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب سے بیان کیا۔ حضرت نے معانتے ہی فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی ہوگی۔ عرض کیا جی ہاں حضرت نے فرمایا یہی وجہ ہے کہ اندھی نظر پڑی حضرت کا فہم عجیب و غریب تھا فرمانے لگے کہ آنکھ کا بند کرنا خطرات سے بچنے کے لئے گوجائز ہے لیکن زیادہ اچھا ہے کہ آنکھیں کھلی رہیں گولاکھوں خطرات آتے رہیں۔ کیونکہ نماز میں آنکھیں کشادہ رہنا موافق سنت کے ہے اور بند کرنا خلاف سنت ہے یہ فرق ہے عارف اور غیر عارف میں اور عارف جس کا مدار وہی علم کا ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عارف کی ایک رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے افضل ہے اب تو معلوم ہو گیا کہ یہ وجہ ہے علم کی رفعت کی دوسری ایک وجہ یہ ہے کہ اعمال کا ثمرہ علم ہی کی وجہ سے ملتا ہے کیونکہ وہ موقوف ہیں علم پر تو جو موقوف پر ثمرہ ملتا ہے وہ بلحاظ موقوف علیہ کے ملتا ہے کیونکہ اس کے بدوں موقوف کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ پس عمل کا اجر ہی موقوف ہوا۔ پس عقلاً بھی علم کی فضیلت ثابت ہو گئی اور اسی سے علماء کے لئے زیادت اجر کا ملنا عقلاً معلوم ہو گیا۔

شریعت اور سائنس

اب میں نو تعلیم یافتہ جماعت کی ایک غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شریعت میں جو علم کی فضیلت وارد ہے اس میں علم سائنس و علم و معاشیات وغیرہ داخل نہیں۔ بلکہ علوم احکام مراد ہیں جو قرآن و حدیث و فقہ میں منحصر ہے بعض احادیث و نصوص میں جو علم کا لفظ مطلق وارد ہوا ہے تو اس مطلق سے یہ مقید ہی مراد ہے اس سے ایسا عموم سمجھنا جس میں سائنس وغیرہ سب داخل ہو جائیں ایسا ہے جیسا کوئی شخص کہے کہ تعلیم حاصل کرؤ اس کا مطلب بیان کیا جائے کہ پاخانہ کمانا بھی سیکھو ہر چند کہ پاخانہ اٹھانا بھی واقعہ میں تعلیم کا ایک شعبہ ہے مگر عرفاً تعلیم حاصل کرنے سے ہرگز ہرگز کوئی شخص یہ نہ سمجھے گا کہ پاخانہ اٹھانے کی بھی تعلیم مراد ہے۔ پس اسی طرح قرآن و حدیث میں جو علم کی فضیلت مذکور ہوئی ہے۔ اس علم میں سائنس وغیرہ ہرگز داخل نہیں بلکہ یہ علم تو بمقابلہ علم احکام کے بحکم جہل ہے دیکھئے قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے یہود کے متعلق اول تو لَقَدْ عَلِمُوا فرمایا۔ اس سے ان کا اہل علم ہونا ظاہر فرمایا ہے اور اس کے بعد لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ فرمایا جس میں انہی سے علم کی نفی فرماتے ہیں تو یہاں نفی علم سے مراد علم مع العمل کی نفی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ شریعت میں جہاں علم کی فضیلت کا ذکر ہے وہاں علم سے وہ مراد ہے جس کو عمل میں بھی دخل ہو بلکہ اس کے ساتھ عمل موجود بھی ہو پس بتلائے کہ سائنس کو عمل شرعی میں کیا دخل ہے جو اس کو اطلاق شرع میں داخل کیا جائے۔ اس دعویٰ کی دوسری

دلیل یہ ہے کہ حدیث میں ہے ان الانبیاء لم یوردثوا دینار اولاد رہما ولكن ورتثوا العلم۔ پس اس سے روز روشن کی طرح ظاہر اور واضح ہو گیا کہ شریعت میں علم سے مراد علم دینار اور درہم نہیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے بعض انبیاء علیہم السلام کو علوم ذرائع کسب بھی عطا فرمائے تھے مگر حضور نے نہ ان کو علم سے تعبیر فرمایا اور نہ ان میں وراثت جاری ہوئی کہ جو کسب ایک نبی کو عطا فرمایا تھا وہ وراثتہ ان کی اولاد اور اولاد چلا ہو جب یہ امر منقطع اور طے ہو گیا کہ علم سے مراد ایسے ذرائع و طرق کسب بھی نہیں۔ جو بعض انبیاء کو عطا فرمائے گئے تھے جیسا داؤد علیہ السلام کو زرہ بنانا سکھلایا اور ان کے ہاتھوں میں لوہے کو موم بنا دیا گیا۔ والناله الحدید در کف داؤد آہن موم کرد اور اس قسم کے کسب انبیاء علیہم السلام کو بھی عطا فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ زکریا علیہ السلام نجار تھے۔ نیز انبیاء کے لئے ہوا کو مسخر فرما دیا۔ مگر ان سب امور سے انبیاء کسی ایسے امر کے لئے مبعوث نہیں ہوئے اور نہ انبیاء کی وراثت بجز علم شرعی کے کسی اور چیز میں جاری ہوئی سو جب یہ مفید علوم بھی نصوص فضیلت میں داخل نہیں تو پھر سائنس اور جغرافیہ جو طرق کسب میں سے بھی نہیں علم انبیاء میں کیونکر داخل ہو سکتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ انبیاء کے کلام میں علم سے مراد علم نبوت ہے نہ کہ علم کسب اور نہ علم طبیعیات وغیرہ الغرض اس ذی فضیلت علم سے دین کا علم مراد ہے اور اہل علم کی فضیلت اسی علم کی وجہ سے ہے۔

حال و قال

اب ان فضائل کے بعد چونکہ یہاں علماء کے ناز کا موقع تھا کہ ہم اہل علم ہیں اور ہمارا عمل عوام سے بڑھا ہوا ہے تو ان لوگوں کی تنبیہ کے لئے فرماتے ہیں واللہ بما تعملون خبیر اے علیہم باطن الامور یعنی خدا تعالیٰ کو عمل کے ساتھ باطن کی بھی خبر ہے۔ وہ سب کے باطن کو بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس میں اخلاص ہے کس میں نہیں محض علم پر ناز نہ کرنا کیونکہ یہ علم تو شیطان اور بلعم باعور کو بھی حاصل تھا۔ شیطان بقول مشہور معلم ملائکہ بھی تھا اور بلعم باعور اپنی قوم کا داعظ بھی تھا۔ اور دونوں شخص علم کے ساتھ عمل ظاہر کے بھی جامع تھے۔ بڑے عابد اور جفاکش مجاہدہ کرنے والے تھے۔ مگر ان کے باطن میں اخلاص اور خدا تعالیٰ کی محبت و معرفت پوری نہ تھی اس لئے یہ علم و عمل سب بے کار ہو گیا۔ پس عمل کے ساتھ بھی سب بے کار ہو گیا۔ پس عمل کے ساتھ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوئی جس کا نام حال باطنی ہے بدوں حال کے علم و عمل قابل اعتبار نہیں اور یہ حال کتب نبوی سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ کسی صاحب حال کی جو تیاں سیدھی کرنے سے نصیب ہوتا ہے۔ غرض اس جگہ آیت میں باختلاف وجوہ دلالت تین چیزیں مذکور ہوئیں علم و عمل و حال اور ان تینوں کی تحصیل ضروری ٹھہری اور محض علم و عمل حاصل ہو گیا مگر حال نہ ہو تو اس کی نسبت ارشاد ہوتا ہے واللہ بما تعملون خبیر جیسا قریب ہی

مذکور ہوا۔ یعنی خدا باطن کو بھی دیکھتے ہیں۔ نرے ظاہری علم و عمل کو نہیں دیکھتے، عارف رومی فرماتے ہیں۔

مابروں را ننگریم و قال را مادیوں را ننگریم و حال را

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِ مُوَابِنَ

يَدَيَّ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ

ترجمہ: یعنی اے ایمان والو جب تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوشیدہ بات کرنا چاہو تو پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔

تفسیری نکات

اعمال صالحہ کی توفیق پر صدقہ کا حکم

مناجات رسول ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں سے ہے۔ پس اس کے ارادہ پر صدقہ دینے کا حکم ہوا۔ اور سبحان اللہ کیا بلاغت ہے یوں نہیں فرمایا۔ فقد موابین یدیکم نفقة اس لئے کہ اس میں کسی ملحد کو یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ ان کے رسول نے بھی اپنی کمائی کے بھی خوب ڈھنگ نکال رکھے تھے۔ اب یہ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ صدقات واجبہ کا مال جیسا کہ صیغہ امر سے اس صدقہ کا وجوب معلوم ہوتا ہے حضور اور حضور کی اولاد کے لئے بلکہ مطلق بنی ہاشم کے لئے حرام تھا۔ اس لئے کہ صدقہ کو اوساخ الناس فرمایا ہے۔ ہاں صدقات نافلہ بنی ہاشم کے لئے جائز ہیں اور آپ کے لئے وہ بھی حرام تھے۔

جب یہ قانون ہوا تو لوگ ڈر گئے اس لئے کہ بعضوں کے پاس روپیہ تھا اور بعضوں کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور حضور سے باتیں کرنے کے سبب دلدادہ اور شیفہ تھے۔ اس قانون پر صرف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمل کرنے پائے تھے کہ فوراً دوسری آیت اس کی ناسخ نازل ہوئی۔ ء اشفقتم ان تقدموا بین یدی نجواکم صدقات فاذلم تفعلو و تاب اللہ علیکم الخ یعنی کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات پیش کرو۔ پس جب تم نے نہ کیا (بوجہ غیر مستطیع ہونے کے) اور اللہ تعالیٰ نے تم پر رجوع فرمایا (یعنی اس حکم کو منسوخ کرنے سے تم پر رحمت فرمائی الخ) سبحان اللہ قرآن شریف کی کیا بلاغت ہے اول آیت میں تو صدقہ لفظ مفرد سے فرمایا اور دوسری آیت میں صدقات کو جمع کے صیغے سے لائے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ہمارے بندے ہمارے رسول کے ایسے چاہنے والے ہیں کہ ان کو بغیر رسول سے بات کئے

ہوئے چین نہ آوے گا اور بہت سے صدقات دینے پڑیں گے۔ خیر میری غرض اس آیت اور اس کے شان نزول کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ اعمال صالحہ کی توفیق ہونے کا مقتضی تو یہ ہے کہ اس پر کچھ خرچ کرنا چاہیے چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سورہ بقرہ ختم ہوئی ہے تو انہوں نے ایسی اونٹنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح کی تھی جس کی انگوٹھیں سواشرفیاں ملتی تھیں۔ آج تو سارا قرآن شریف یاد ہونے پر اگر حافظ جی کو پانچ روپیہ دیدے تو گویا حافظ جی کو خرید لیا۔ اس زمانہ میں مولویوں اور معلم قرآن اور مساجد کے موزنوں کی کچھ قدر نہیں۔ خیر مولویوں کی تو کچھ تھوڑی بہت ہے بھی لیکن قرآن شریف پڑھانے والوں کی تو کچھ بھی نہیں ہے بہت سے بہت تنخواہ حافظ کی مقرر کریں گے تو چار یا پانچ روپیہ۔

موزن کی فضیلت

اور بے چارے موزنوں کو تو کون پوچھتا ہے ان کو تو بہت ذلیل اور اپنا خادم سمجھتے ہیں۔ سب کام موزنوں کے ہی ذمہ ہے پانی گرم کرنے کے لئے گوبر اور کوڑا لانا بھی اسی کے ذمہ ہے اور محلہ بھر کے گھروں کا کام کرنا بھی اس کے ذمہ سمجھا جاتا ہے۔ صاحبو! موزنوں کی حدیث شریف میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ان کی قدر کرنا چاہیے یہ سرکاری آدمی ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لا تجد قوماً يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادون من حاد الله ورسوله ولو كانوا آباءهم أو أبناءهم أو إخوانهم أو عشيرتهم أولئك كتب في قلوبهم الآيما ن وابدہم بروح منہ۔

ترجمہ: یعنی نہیں پائیں گے آپ اے محمد ایسی قوم کو جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ دوستی کریں ان لوگوں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کریں اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا گھرانے والے یہ لوگ (یعنی مومنین) وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں ایمان جمادیا ہے۔ اور ان کی اپنے پاس سے روحانی تائید کی ہے۔ (الحشر آیت ۲۲)

ایمان کا تقاضا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ اللہ ورسول کے مخالفین کے ساتھ دوستی نہ ہو اور نیز اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوستی سے بچنا دو چیزوں پر موقوف ہے اول صحیح عقائد اور دوسری بات وہ ہے جس کو روح فرمایا ہے روح کہتے ہیں حیات کو اس سے مراد نسبت مع اللہ ہے جس سے قلب کی حیات ہے۔ (الرغبة المملو بہ)

سُورَةُ الْحَشْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ

هُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ سے بے پرواہی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا یہی لوگ نافرمان ہیں۔

تفسیری نکات

اللہ تعالیٰ کو بالکل فراموش کرنے والا کون ہے؟

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جاؤ۔ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔ سبحان اللہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ کیسا لحاظ فرماتے ہیں کہ یوں نہیں فرمایا۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَنَسُوا أَنفُسَهُمْ يَوْمَ يَعْلَمُونَ ﴿۱۶﴾ ہے کہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے ہیں۔ کیونکہ آیت کے مخاطب مسلمان ہیں (اور خدا کے بھولنے والے کافر ہیں) حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرح خطاب کرنا گوارا نہیں فرمایا۔ کہ تم خدا کے بھولنے والے نہ بن جانا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ دیکھو بھولنے والوں کے مشابہ نہ ہو جانا۔ اس میں جس قدر عنایت و لطف ہے ظاہر ہے کیونکہ اس کا یہ مطلب ہوا کہ خدا کو بھول جانا تو تمہاری محبت سے بعید ہے ہاں بھولنے والوں کی طرح ہو سکتے ہو۔ تو ہم تم سے کہتے ہیں کہ تم ایسے بھی نہ ہونا۔ اس لئے لَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فرمایا دوسرے یہ بھی اس میں نکتہ ہو سکتا ہے۔ کہ خدا کا بالکل بھولنے والا کافر ہے۔ اور آیت کے مخاطب مسلمان ہیں اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کو لَا تَكُونُوا مِنَ الَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ کے ساتھ خطاب ہو بھی نہیں سکتا بلکہ ان

کو تو لاتکونوا کالذین نسوا اللہ ہی سے خطاب ہو سکتا ہے۔ (ایضاً ص ۳۳)

اور اس میں بہ نسبت نکتہ اولیٰ کے زیادہ مبالغہ ہوا (کیونکہ اس نکتہ اولیٰ کا حاصل یہ تھا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا بعید ہی سہی لیکن بھول سکتا ہے مگر حق تعالیٰ نے پھر بھی عنایت و شفقت کی بناء پر یہ نہیں فرمایا کہ تم ہم کو بھولنا مت بلکہ یہ فرمایا کہ بھولنے والے کی طرح نہ ہونا اور دوسرے نکتہ کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کا خدا کو بھول جانا ممکن ہی نہیں کیونکہ بالکل بھول جانا کافر کا کام ہے اور مسلمان کافر نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً ص ۴۰)

آگے ارشاد ہے فانسہم انفسہم کہ جب وہ خدا کو بھول گئے تو خدا تعالیٰ نے ان کے نفسوں کو بھی ان کو بھلا دیا یہاں ایک نکتہ ہے گو ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا مگر خیر دل میں آئی ہوئی بات کو کیوں روکوں شاید کسی کو نفع ہو جائے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے ونحن اقرب الیہ من حبل الوريد کہ ہم انسان کی جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ تو جو شخص جان سے زیادہ قریب کو بھول جائے تو ممکن نہیں کہ وہ اپنے کو یاد رکھے حقیقت میں خدا کو بھولنے والا اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جو اپنے آپ کو بھی بھول گیا اس کو تو مقام فنا حاصل ہوا تو جواب یہ ہے کہ لعنت ہے ایسی فنا پر فنا کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یاد میں اتنا مستغرق ہو کہ اپنے کو بھول جائے۔ نہ یہ کہ خدا کو بھلا کر اپنے آپ کو بھولے۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ خدا کو بھول کر ہم اپنے کو کہاں بھولتے ہیں اپنی یاد تو پھر بھی رہتی ہے تو پہلے یہ سمجھو کہ یاد کے معنی کیا ہیں۔ یاد مطلوب وہ ہے جو نافع ہو اور جو محبت کے ساتھ ہو چنانچہ یہ محاورہ بھی تو ہے کہ دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ بھائی ہم کو یاد رکھنا اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ محبت سے یاد رکھنا یہ کسی کا مطلب نہیں ہوتا کہ بس جس طرح سے بھی ہو یاد رکھنا خواہ روزانہ دو چار لپڑ ہی لگا دیا کرنا اور اگر وہ آ کر دو چار لپڑ لگا دیا کرے اور یہ کہے کہ تم نے یاد کرنے کو کہا تھا میں یاد ہی تو کرتا ہوں تو اس کو ہرگز یاد نہیں کہا جاسکتا۔ غرض محاورہ میں بھی محبت ہی کی یاد کو یاد کہتے ہیں۔ دشمن اور ضرر رسانی کی یاد کو یاد نہیں کہا کرتے۔ اب سمجھئے کہ جس وقت کسی نے اپنے خدا کو بھلا دیا تو اس نے اپنے تمام مصالح کو فوت کر دیا۔

اب اس کو یہ یاد نہیں رہا کہ میرے نفس کی فلاح کا طریقہ کیا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے کو بھول گیا اور اب اس کو اپنی یاد ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کو روزانہ دو چار جوتے مار کر یہ کہے کہ میں تجھ کو یاد کرتا ہوں غرض جو شخص خدا تعالیٰ کو بھولے گا وہ اپنے کو بھی ضرور بھول جائے گا اسی طرح جو خدا کو یاد رکھے گا وہ اپنے کو بھی یاد رکھے گا۔ مگر مستقلاً نہیں بلکہ اس طرح کہ میں خدا کی چیز ہوں خدا تعالیٰ کے ساتھ مجھے تعلق ہے اور جو کچھ میرے پاس ہے سب خدا کی امانت ہے وہ کسی چیز کو بلا واسطہ خدا تعالیٰ کے یاد نہ کرے گا بلکہ جیسے عاشق کو محبوب کی سب چیزیں یاد رہتی ہیں اور ان کی یاد حقیقت میں محبوب ہی کی یاد ہوتی ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا رتبہ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا رتبہ تو یہاں تک ہے کہ ان سے پوچھا گیا اہل عرفت ربک بمحمد ام عرفت محمد بر بک کہ آپ نے حق تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے پہچانا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے پہچانا تو فرمایا عرفت محمداً بر بى کہ میں نے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے واسطے پہچانا اگر آج کوئی شخص یہ بات کہہ دے تو بس کافر ہو گیا بجائے قدر کرنے کے غریب پر چار طرف سے کفر کے فتوے لگیں گے کیونکہ حقیقت شناس دنیا سے اٹھ گئے چنانچہ ایک شخص نے میرے ایک دوست سے کہا کہ تم جو توحید کے مضامین زیادہ بیان کرتے ہو (کہ حق تعالیٰ کے افعال میں نہ کسی ولی کو دخل ہے نہ نبی کو وہاں کوئی دخل کار نہیں ہے وغیرہ وغیرہ) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیسی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا تو بہ تو بہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیم سے تھوڑا ہی روکتے ہیں بلکہ خدا کی توہین سے روکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ حق تعالیٰ کو گھٹا دو غور کر کے دیکھا جائے تو جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صفات الوہیت ثابت کرتے ہیں حقیقت میں وہ آپ کی بے تعظیسی کرتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ صفات الوہیت درجہ کمال میں تو آپ کے لئے ثابت کر نہیں سکتے لامحالہ درجہ نقصان میں ثابت کریں گے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقص قرار دیا اور ہم آپ کے لئے صفات الہی کو ثابت نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی نفی کر کے صرف صفات بشریہ اور کمالات نبوت کو آپ کے لئے ثابت کرتے ہیں اور ان میں سے ہر صفت کو درجہ کمال میں ثابت کرتے ہیں تو ہم آپ کو بشر کمال و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کمال کہتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہو گے تو ناقص خدا کہو گے اور ہم انسان کہتے ہیں مگر کمال انسان تو بتلاؤ بے تعظیسی کس نے کی بے ادب وہ ہے جو آپ کو ناقص کہے یا وہ جو کمال کہے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا سے گھٹانا بھی بے ادبی ہے تو پھر حضرت صدیق اکبر کو کیا کہئے گا جو یوں کہتے ہیں کہ میں نے اول خدا کو جانا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خدا کو نہیں پہچانا غرض یہ ثابت ہو گیا کہ عارف کی نظر اول خدا پر پڑتی ہے۔ پھر اپنے پر تو معلوم ہوا کہ خدا قریب ہے اور نفس دور ہے۔ (اگر خدا تعالیٰ نفس سے قریب تر نہ ہوتے تو کسی کی نظر بھی اول ان پر نہ پڑ سکتی ۱۲) تو لازم آ گیا کہ جو خدا کو بھول گیا وہ اپنے نفس کو بھی بھول گیا اسی کا بیان ہے فانسہم انفسہم پس وہ اپنے نفسوں کو بھول گئے)

ہماری بد حالی کا سبب

آگے فرماتے ہیں اولنک ہم الفاسقون یہ ہے جز و مقصود جس سے مجھ کو بد حالی مذکور سابقاً کا علاج

مستنبط کرنا ہے ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں حکم سے نکل جانے والے اس میں اولئک اسم اشارہ ہے جس کے لئے فاسقون کا حکم ثابت کیا گیا ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اسم اشارہ میں مشارالیه کا مع صفات مذکورہ کے اعادہ ہوتا ہے اور حکم کی بناء انہی صفات پر ہوتی ہے جو پہلے مذکور تھیں۔ اولئک علی ہدیٰ من ربہم واولئک ہم المفلحون (یہی لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کو اللہ کی جانب سے ملی اور یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے) کی تفسیر میں مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے کہ اسم اشارہ سے اس جگہ یہ بات بتلائی گئی ہے کہ ہدایت و فلاح کا حکم صفات مذکورہ ایمان بالغیب و اقامۃ الصلوٰۃ کتب منزلہ و انفاق مال وغیرہ پر مبنی ہے۔ اور ان صفات کو حکم فلاح میں دخل ہے (۱۲) اس قاعدے کی بناء پر یہاں بھی اولئک میں صفت نسیان کا اعادہ ہوگا۔ جو پہلے الذین نسوا اللہ (جو لوگ اللہ کو بھول گئے ہیں) میں مذکور ہو چکی ہے اور حکم فسق کی بناء اسی صفت پر ہو گی خلاصہ یہ کہ آیت میں نسیان خدا پر فسق کو مرتب کیا گیا ہے تو یہ سبب ہو فسق کا یعنی حکم سے نکل جانے اور حکم سے نکل جانا یہی حقیقت ہے معصیت کی جس میں ہم مبتلا ہیں تو الحمد للہ آیت سے صاف طور پر سبب مرض کی تشخیص ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ ہماری بد حالی کا سبب یہ ہے کہ ہم خدا کو بھول گئے ہیں۔

ذکر اللہ مرض نسیان کا علاج ہے

اور طبعی قاعدہ ہے العلاج بالضد (علاج ضد کے ساتھ ہونا چاہیے) اور نسیان کی ضد ذکر ہے تو معصیت کا علاج ذکر اللہ ہو یا یوں کہئے کہ ہر مرض کا علاج رفع سبب سے ہوتا ہے (خواہ ضد کے ذریعہ سے رفع کیا جائے یا مثل کے ذریعہ سے مگر ازالہ مرض کے لئے رفع سبب سب کے نزدیک ضروری ہے ۱۲) اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرض عصیاں کا سبب نسیان ہے تو اس کا علاج یہ ہوا کہ نسیان کو اٹھا دو اور رفع نسیان مستلزم ہے وجود ذکر کو (کیونکہ ارتقاغ نقیضین محال ہے تو حاصل پھر وہی ہوا کہ معصیت کا علاج خدا کو یاد رکھنا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اس آیت میں اولئک ہم الفاسقون نسوا اللہ پر مرتب کیا گیا ہے جس سے اس نسیان کا سبب فسق و معصیت ہونا ظاہر ہوا اور مرض کا علاج سبب کے ازالہ سے ہوتا ہے تو معصیت کا علاج نسیان ہوا اور ازالہ نسیان ذکر سے ہوتا ہے اس لئے گناہوں سے بچنے کے واسطے ذکر اللہ لازم ہوا۔ (ذم النسیان)

لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا

مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ

ترجمہ: کہ اگر یہ قرآن پہاڑ پر نازل ہوتا کہ وہ بھی حق تعالیٰ کی ایک توجہ ہے تو وہ خوف الہی سے پست ہو جاتا۔ اور پھٹ جاتا۔

تفسیری نکات

مقصود نزول آیت

یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ جب قرآن میں یہ اثر ہے تو انسان پر یہ اثر کیوں ظاہر نہیں ہوتا اگر یہ کہا جائے کہ انسان میں تاثر کی استعداد نہیں تو اس صورت میں اس کا عذر تو ظاہر ہے مگر سیاق آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون انسان کو غیرت دلانے کے لئے سنایا گیا ہے کہ تم ایسے سنگدل ہو کہ قرآن سن کر بھی بس سے مس نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ اگر پہاڑ پر نازل ہوتا تو اس کی یہ حالت ہو جاتی تو اگر انسان میں تاثر کی استعداد نہیں تو اس حالت میں غیرت دلانا بے کار ہوگا۔ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھ میں یہ استعداد ہوتی تو میری بھی وہی حالت ہوتی۔ اور اگر انسان میں استعداد تاثر ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس پر یہ اثر کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔

جواب یہ ہے کہ انسان میں تاثر کی استعداد موجود ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس میں تحمل کی قوت بھی پہاڑ سے زیادہ ہے۔ اگر پہاڑ پر حق تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا تو اس میں خشوع تاثر کے ساتھ انشقاق و تصدع بھی ہوتا۔ کیونکہ اس میں قوت تحمل نہیں ہے تم میں اگر بوجہ تحمل کے انشقاق و تصدع نہیں ہے تو کم از کم تاثر و خشوع تو ہونا چاہیے تو شکایت اس کی نہیں کہ قرآن سن کر تمہارے دل پھٹ کیوں نہیں گئے بلکہ شکایت اس کی ہے کہ خشوع کیوں نہیں پیدا ہوا۔

اور انسان میں قوت تحمل کا جہاں سے زائد ہوتا دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا
وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

اسی کو عارف اسی طرح فرماتے ہیں

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

آسماں بار امانت نتوانست کشید

(جس بار امانت کو زمین و آسمان نہ اٹھا سکا اس کا قرعہ میرے جیسے دیوانہ کے نام نکل آیا)

سُورَةُ الْمُمتَحِنَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسُوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ

اِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بَرّاءٌ وَّاَمِنُكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ

دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ

اِبْدًا حَتّٰى تُوْفِيُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَةً

ترجمہ: تمہارے لئے ابراہیم علیہ السلام میں اور ان لوگوں میں جو ایمان و طاعت میں ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں بغض اور عداوت ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

تفسیری نکات

حدود و اتفاق

لوگ آج کل اتفاق اتفاق تو پکارتے ہیں مگر اس کی حدود کی رعایت نہیں کرتے بس اتنا یاد کر لیا ہے کہ قرآن میں حکم ہے لا تفرقوا افتراق نہ کرو۔ مگر اس سے پہلا جملہ نہیں دیکھتے و اعتصموا بحبل اللہ جمعاً کہ اس میں اللہ کے راستہ پر قائم رہنے کا پہلے حکم ہے اس کے بعد ارشاد ہے کہ حبل اللہ پر متفق ہو کر اس سے تفرق نہ کرو تو اب مجرم وہ ہے جو حبل اللہ سے الگ ہو اور جو حبل اللہ پر قائم ہے وہ ہرگز مجرم نہیں گواہل باطل

سے اس کو ضرور اختلاف ہوگا۔ پس یاد رکھو کہ نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے جیسا کہ ابھی ثابت کیا گیا اور نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے بلکہ اتفاق محمود ہے جو جبل اللہ کے اعتصام پر ہو ورنہ کفار نے بھی توبت پرستی پر اتفاق کیا تھا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں وَقَالَ انما اتخذتم من دون الله اوثانا مودة بينكم في الحياة الدنيا کہ تم لوگوں نے حیات دنیا میں اتحاد اور دوستی قائم کر کے چند بتوں کو معبود بنا لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کفار میں اتحاد و اتفاق تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ دوسرے مقام پر اس کا بھی ذکر ہے قد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين معه اذ قالو القوم همم انا براء وامنكم ومما تعبدون من دون الله كفرنا بكم وبدابیننا و بینکم العداوة والبغضاء ابراهيم علیہ السلام نے اس اتفاق کی جڑیں اکھاڑ دیں اور اہل باطل سے صاف صاف بیزاری کا اعلان کر دیا اور فرما دیا کہ قیامت تک کے لئے ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت بغض قائم ہو گیا معلوم ہوا کہ اہل باطل کے ساتھ اس طرح اتفاق کرنا محمود نہیں کہ وہ اپنے باطل پر جسے رہیں اور اسی حالت میں ہم ان سے اتفاق کر لیں۔ بلکہ اس صورت میں تو ان سے بیزاری اور اختلاف و عداوت رکھنا ہی مطلوب ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اتباع نے کیا اور انہی کی اقتداء کا حق تعالیٰ ہم کو حکم فرما رہے ہیں۔

نمونہ دینے سے کیا غرض ہوتی ہے یہی کہ اس کے موافق دوسری چیز تیار ہو۔ میں نے ایک بزرگ محقق کا اس کے متعلق ایک لطیف مضمون سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے درزی کو ایک اچکن سینے کو دی اور نمونہ کے لئے ایک سلی ہوئی اچکن بھی دی کہ اس ناپ اور نمونہ کی اچکن سی لاؤ درزی نے ساری اچکن نمونہ کے موافق تیار کی غرض طول بھی برابر سلائی بھی یکساں غرض کہیں تصور نہیں کیا۔ فرق کیا تو صرف یہ کیا کہ ایک آستین ایک بالشت چھوٹی بنا دی جب وہ اچکن لے کر مالک کے پاس پہنچے گا تو مالک اسے کیا کہے گا وہ اچکن خوش ہو کر لے گا یا اس کے سر پر مارے گا۔

اگر درزی جواب میں یہ کہے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے صرف ایک آستین میں ذرا سی کمی ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ مالک اس کو پسند کرے گا ہرگز نہیں اس سارے کپڑے کی قیمت رکھوائے گا۔

خوب یاد رکھئے کہ حق تعالیٰ نے احکام نازل کئے جو بالکل مکمل قانون ہے اور ان کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا سو اگر آپ کے اعمال نمونے کے موافق ہیں تو صحیح ہیں ورنہ غلط ہیں اگر نماز آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے موافق ہے تو نماز ہے ورنہ کچھ بھی نہیں اگر ذکر آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے موافق ہے تو ذکر ہے ورنہ الٹی معصیت ہے دیکھئے نماز میں کوئی بجائے دو کے ایک سجدہ کر لے تو وہ

نماز نہ رہی دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

کوئی قرآن شریف بحالت جنابت پڑھے تو بجائے ثواب کے الٹا گناہ ہوتا ہے۔ (اسی قبیل سے یہ بھی ہے کہ اسمائے الہی توقیفی ہیں اپنی طرف سے کوئی نام رکھنا جائز نہیں) اگر آپ روزہ رکھیں تو وہی روزہ صحیح ہوگا جو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو علیٰ ہذا حج وہی صحیح ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موافق ہو اگر حج میں کوئی احرام نہ باندھے تو وہ حج حج نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ وہی صحیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ہو اور کوئی سارا مال خلاف تعلیم خرچ کر دے تو زکوٰۃ سے فارغ نہیں ہو سکتا۔

یہ ارکان اسلام ظاہری ہوئے اسی طرح اعمال باطنی کو سمجھ لیجئے اور معاملات اور طرز معاشرت سب میں یہی حکم ہے حق تعالیٰ نے ہمارے پاس کسی فرشتہ کو رسول بنا کر نہیں بھیجا اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر فرشتہ آتا تو وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتا تھا اس کو نہ کھانے کی ضرورت ہوتی نہ پہننے کی نہ ازدواج کی نہ معاشرت کی ان چیزوں کے احکام میں صرف یہ کرتا کہ ہم کو پڑھ کر سنادیتا یہ کام صرف کتاب کے بھیج دینے سے بھی نکل سکتا تھا کہ ایک کتاب ہمارے اوپر اتر آتی اس میں سب احکام لکھے ہوتے اس میں آپ پڑھ لیتے اور عمل کر لیتے فرشتے کے اترنے سے اس سے زیادہ کوئی بات نہ پیدا ہوتی جو کتاب سے ہو سکتی تھی۔

حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہماری جنس میں سے پیغمبر بنائے کہ وہ ہماری طرح کھاتے پیتے بھی ہیں؛ ازدواج اور تعلقات بھی رکھتے ہیں۔ تمدن اور معاشرت کے بھی خوگر ہیں اور ان کے ساتھ کتابیں بھیجیں تاکہ کتاب میں احکام ہوں اور وہ خود بنفس نفیس ان کی تعمیل کر کے دکھادیں تاکہ ہم کو سہولت ہو اسی واسطے فرمایا ہے۔

وما ارسلنا قبلك من المرسلین الا انهم لیاكلون الطعام ویمشون فی الاسواق
ترجمہ: یعنی ہم نے جس قدر پیغمبر بھیجے وہ اور آدمیوں کی طرح کھانے پینے والے اور معاشرت رکھنے والے بھیجے دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلاً

یعنی اگر ہم فرشتہ کو احکام لے کر بھیجتے تب بھی یہ ہوتا کہ وہ انسان کی صورت میں آتا ورنہ انسان کو اس سے ہدایت نہ ہو سکتی کیونکہ وہ نمونہ نہ بن سکتا۔ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات فرشتوں سے بھی زیادہ ہیں لیکن حکمت الہی اسی کی مقتضی ہوئی کہ آپ نسل انسان سے پیدا ہوں تاکہ تمام افعال انسانی میں نمونہ بن سکیں دیکھ لیجئے کہ جتنی باتیں انسان کو پیش آتی ہیں سب آپ کو پیش آئیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیبیاں رکھیں اور اپنی اولاد کا نکاح کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں غمی کی تقریبیں بھی ہوئیں کئی صاحبزادوں نے انتقال کیا جو حالات ہم کو پیش آتے ہیں وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں نکلے تاکہ ہمارے لئے پورا ایک دستور العمل بن جائے۔

اب آپ دیکھ لیجئے کہ کونسا فعل ہمارا نمونہ کے موافق ہے کوئی تقریب خوشی کی ہوتی ہے تو ہم نہیں دیکھتے اور کوئی تقریب غمی کی ہوتی ہے تب ہم نہیں دیکھتے کہ دستور العمل میں کیا ہے اس درزی کی مثال کو یاد رکھئے ایک بالشت کپڑا کم کر دینے سے اچکن منہ پر ماری جاتی ہے اور اگر وہ بجائے سینے کے کپڑے کی دھجیاں کر کے مالک کے سامنے جا کر رکھے تو وہ کس سزا کا مستوجب ہے جبکہ مالک قادر بھی ہو۔

واللہ باللہ ہمارے اعمال کی حالت یہ ہی ہوگئی ہے کہ جو طریقہ ان کا بتلایا گیا تھا وہ تو کوسوں دور ان اعمال کو تباہ کر کے اور دھجیاں اڑا کے ہم حق تعالیٰ کے سامنے رکھ دیتے ہیں یہ کچھ مبالغہ آمیز الفاظ نہیں ہیں دیکھ لیجئے کہ جیسے اچکن سینے کے واسطے کپڑے کا اپنی اصل پر رہنا شرط ہے اور دھجیاں کرنے والا اس کو اس اصل سے نکال دیتا ہے کہ جس سے اچکن تو کیسی کپڑے کی کوئی غرض بھی اس سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح تمام اعمال کے صحیح ہونے کے واسطے ایمان کا ہونا شرط ہے کوئی چاہے کہ ایمان کھو کر کوئی عمل کرے تو وہ ایسے ہی بے کار ہوگا جیسے کوئی کپڑے کی دھجیاں کر کے اچکن سینا چاہے۔

تسبیحات سیدنا فاطمہؑ کا شان وارو

حدیث شریف میں قصہ وارد ہوا ہے کہ سیدنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دست مبارک میں چکی پینے سے چھالے پڑ گئے تھے ان سے کہا گیا کہ حضورؐ کے ہاں غلام باندی بہت آتے ہیں ایک آپ بھی مانگ لیں۔ چنانچہ وہ حضورؐ کی خدمت میں تشریف لے گئیں لیکن حضورؐ دولت خانہ میں اس وقت تشریف نہ رکھتے تھے۔ جب حضور تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت صاحبزادی صاحبہ کا تشریف لانا ذکر فرمایا۔ حضور خود ان کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت لیٹی تھیں۔ اٹھنے لگیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم اسی حالت سے رہو۔ فرمایا اے فاطمہ تم لونڈی غلام کی درخواست کرتی ہو کیا میں تم کو اس سے اچھی اور بہتر شے نہ بتاؤں۔ جب تم سونے لگو تو سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۳ بار پڑھ لیا کرو۔ یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے سیدۃ المؤمنین اس پر راضی ہو گئیں تو حضورؐ نے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے تمعم اور دنیا کو مطلقاً پسند نہیں فرمایا۔ چہ جائیکہ صدقات واجبہ وہ تو حرام تھے ہی اس لئے آیت میں لفظ صدقہ فرمایا جس کا صرف کرنا اپنے لئے آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو جائز ہی نہ تھا تا کہ یہ شبہ ہی بالکل زائل ہو جاوے کہ حضورؐ نے نعوذ باللہ اپنے لئے آمدنی کا طریقہ نکالا تھا اس لئے کہ صدقہ کا قانون اور ایک معلوم ہے کہ وہ رقم حضور کے یہاں نہ آوے گی پس قرآن میں بھی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یا ایہا الذین امنوا قوا انفسکم و اہلیکم ناراً اس میں ایمان والوں کو صاف حکم ہے کہ جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بھی بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی تو اس کا بھی وہی مطلب ہو گیا جو

ارجل راع علی اهل بیت کا تھا کہ مرد اپنے گھر والوں کی اصلاح کا ذمہ دار ہے بلکہ قرآن میں جن لفظوں سے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اس میں رجال کی بھی تخصیص نہیں بلکہ یا ایہا الذین امنوا میں تہلیغاً عورتیں بھی داخل ہیں جیسا کہ قرآن میں تمام جگہ یہی طرز ہے کہ عورتوں کو مستقلاً خطاب نہیں کیا جاتا بلکہ مردوں کے ساتھ تبعا ان کو بھی خطاب ہوتا ہے تو یہاں بھی اس قاعدہ کے موافق یہ خطاب مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے تو عورتوں کے لئے بھی یہ بات ضروری ہوئی کہ وہ اپنے خاوند اور اولاد کو جہنم کی آگ سے بچادیں اور ان کو خلاف شرع امور سے روکنے میں کوشش کریں۔ قرآن میں تو یہ مضمون عورتوں کے متعلق اجمالاً ہے اور حدیث میں اجمالاً بھی ہے اور تفصیلاً بھی بہر حال خواہ اجمالاً ہو خواہ تفصیلاً قرآن و حدیث دونوں بتلا رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کے متعلق کچھ حقوق ہیں جن کے متعلق ان سے باز پرس ہوگی۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی حالت میں غور کریں کہ ہم لوگ ان احکام کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ آیا ان کا امتثال کرتے ہیں یا نہیں۔

سُورَةُ الصَّافِّ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا

مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ

ترجمہ: کہ وہ باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں خدا کے نزدیک نہایت مبغوض ہے کہ جو کام خود نہ کروا سکو۔

تفسیری نکات

شان نزول

اس کا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی عبادت سب سے زیادہ خدا کو پسند ہے تو ہم دل و جان سے اس کو خوب بجالائیں اس پر ارشاد ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ خدا کو بہت پسند ہے پس یہ سن کر بعضوں کا خون خشک ہو گیا ان لوگوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی باتوں کا دعویٰ یا وعدہ کیوں کرتے ہو جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے۔

یہ آیت دعوت و تبلیغ سے متعلق نہیں

تو یہاں لم تقولون سے لم تنصحون غیر کم یا قول امری وانشائی مراد نہیں ہے بلکہ قول خبری و ادعائی مراد ہے حاصل یہ کہ یہ آیت دعویٰ کے باب میں ہے دعوت کے بارے میں نہیں اس آیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کچھ بھی مس نہیں۔

اپنی اصلاح ضرورت میں مقدم ہے

غرض واجب تو دوسرے کی اصلاح بھی ہے مگر اپنی اصلاح اس پر ضرورت میں مقدم ہے اپنے کو اصلاح میں بھلانا نہیں چاہیے اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو اور اپنی خبر نہیں لیتے۔

مگر کوئی اس سے یہ نہ سمجھے کہ اگر اپنی اصلاح نہ ہوئی ہو تو دوسرے کو تنبیہ نہ کرے دراصل یہ دو کام (اپنی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر) الگ الگ ہیں ایک دوسرے کا موقوف علیہ نہیں ایک کو بھی ترک کرے گا تو اس کے ترک کا گناہ ہوگا اور دوسرے کے ترک کا گناہ ہوگا۔ دونوں کو ترک کرے گا تو دونوں کے ترک کا گناہ ہوگا۔ (ضرورت تبلیغ ملحقہ دعوت و تبلیغ ص ۲۹۹ تا ۳۰۱)

یہ آیت دعوت کے بارے میں ہے

دراصل یہ لوگ محض ترجمہ دیکھنے سے دھوکے میں پڑ گئے۔ ترجمہ سے یہ سمجھے کہ مطلب یہ ہے کہ جو کام خود نہ کرے وہ دوسروں کو بھی کرنے کو نہ کہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے تفسیر میں اسباب نزول سے آیات کے صحیح مطلب کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی عبادت سب سے زیادہ خدا کو پسند ہے۔ تو ہم دل و جان سے اس کو خوب بجالاتے ہیں۔

اس پر ارشاد ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ خدا کو بہت پسند ہے۔ بس یہ سن کر بعضوں کا خون خشک ہو گیا۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسی باتوں کا دعویٰ یا وعدہ کیوں کرتے ہو جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے۔ تو یہاں پر لم تقولون سے لم تنصحنون غیر کم یا قول امری و انشائی مراد نہیں ہے۔ بلکہ قول خبری و ادعائی مراد ہے۔ حاصل یہ کہ یہ آیت دعویٰ کے باب میں ہے دعوت کے باب میں نہیں۔ اس کے شان نزول معلوم ہو جانے کے بعد سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اس آیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ممانعت سے کچھ بھی مس نہیں۔ (ضرورت تبلیغ)

لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون ایک دوسری آیت میں ہے جو اس سے بھی صاف ہے اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم۔

شان نزول

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو کیوں کہتے ہو۔ وہ جو کرتے نہیں خدا کے نزدیک یہ نہایت مبغوض

تقریر ثانی

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ یا ایہا الذین امنوا لم تقولون ما لا تفعلون۔ اس آیت میں حرف استفہام لم خود تقولون پر داخل ہے جس سے صاف یہی سمجھا جاتا ہے کہ دوسروں کو کیوں کہتے ہو وہ بات جو خود نہیں کرتے اتنا مردوں الناس میں تو یہ بھی گنجائش تھی کہ ہمزہ استفہام کو باعتبار مجموع کے تسمون پر داخل مانیں۔ یہاں تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ سو اس سے تو صاف یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اگر خود عمل نہ کرے تو دوسرے کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں ہے یہ ایک بہت باریکی غلطی ہے لیکن شان نزول معلوم ہونے سے یہ اشکال حل ہو جاتا ہے۔ شان نزول اس کا یہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کو خبر ہو جاوے کہ فلاں عمل کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں تو ہم اس کے اندر جدوجہد کریں گے چونکہ یہ ایک صورت ہے دعویٰ کی یہ ناپسند ہوئی۔ اس لئے ان کو تادیب کی جاتی ہے کہ ایسی بات زبان سے کیوں نکالتے ہو جو کہ نہ کر سکو۔ پس تقولون میں قول اخباری ہے انشائی نہیں یعنی دوسرے کو نصیحت کرنا مراد نہیں ہے بلکہ اپنے کمالات کا دعویٰ کرنا مراد ہے۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانہم بنیان مرصوص۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے بڑے عمل کرنے والے اور ہماری پسندیدگی کے طالب ہو تو لو ہم بتاتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو دوست رکھتے ہیں جو اللہ کے راستہ میں ایسا عمل شاق کرتے ہیں۔ اگر ہماری محبت سے تو اس پر عمل کر دو ورنہ دعویٰ نہ کرو پس اس آیت میں امر بالمعروف کا ذکر ہی نہیں کہ جو باعث شبہ کا ہو ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ فن کے نہ جاننے سے اب انصاف فرمائیے کہ جو حضرات صرف ترجمے کا مطالعہ کرتے ہیں اور ترجمہ بھی کون سا جو امیر ترجمہ ہو۔ غریب ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

یہ آیت واعظ غیر عامل کے بارے میں ہے لیکن اس میں انکار صرف جزو اخیر پر ہے۔ یعنی نسیان نفس پر ہر چیز پر انکار نہیں پس آیت میں واعظ کے غیر کامل ہونے پر انکار ہے۔ غیر عامل کے واعظ ہونے پر انکار نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ واعظ کو جملائے معصیت ہونا حرام ہے اور جملائے معصیت کو وعظ کہنا حرام نہیں۔ خوب سمجھ لو اور دوسری آیت کو تو وعظ پر حمل کرنا ہی صحیح نہیں کیونکہ ”لم تقولون“ سے قول انشائی مراد نہیں بلکہ قول خبری مراد ہے یعنی دعویٰ مراد ہے دعوت مراد نہیں کیونکہ جس معاملہ کے متعلق اس کا نزول ہوا ہے اس میں لمبے چوڑے دعوے ہوئے تھے کہ اگر ہم کو احب الاعمال کا علم ہو جائے تو ایسا ایسا مجاہدہ کریں جب ایک واقعہ میں ترغیب ہوئی اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایسے دعوے کس لئے کرتے ہو جن کو پورا نہیں کر سکتے تو یہاں دراصل دعویٰ سے احکام اسلامیہ پر عمل کرنے کا حکم کیا جاتا ہے اور نواجی سے منع کیا جاتا ہے جس کا حاصل

دعوت ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر، اس لئے وعظ گوئی اس آیت میں داخل نہیں مگر چونکہ کبھی کلام انشائی بھی مضمّن خبر ہو جاتا ہے۔ جیسے منافقین کا نشہد انک لرسول اللہ کہنا واقع میں تو انشاء ہے کہ ہم آپ کی رسالت کی تصدیق کرتے ہیں مگر ضمناً اس میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ ہم سچے اور مخلص مسلمان ہیں منافق نہیں ہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے آگے فرمایا۔ واللہ یشہد ان المتفقین لکذیبون۔ جس میں ان کو اس کلام میں کاذب فرمایا گیا اور یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ کلام انشائی کے قائل کو صادق کاذب کہہ نہیں سکتے تو یہاں ان کو کاذب کیسے کہا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ کلام انشائی ایک کلام خبری کو مضمّن ہے اس مضمّن کے اعتبار سے ان کو کاذب کہا گیا ہے اسی طرح ہر چند کہ وعظ کلام انشائی ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر لیکن صورتہ اس میں ایک قسم کا دعویٰ بھی ہے کہ ہم خود بھی اس پر عامل ہیں اس دعویٰ ضمنی کے اعتبار سے باحیاء آدمی کو وعظ کہتے ہوئے طبعاً لم نقولون ما لا نفعلون پیش نظر رہے گا گواصل میں یہ آیت وعظ کے متعلق نہیں مگر وہ مضمّن خبر کی وجہ سے اپنے کو اس کا مصداق سمجھ کر شرماتا ہے اور جلد اصلاح کر لیتا ہے۔

سُورَةُ الْجُمُعَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ

النَّاسِ فَتَمَتُّوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَكَ

أَبَدًا إِمَّا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اے یہودیو! اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم بلا شرکت غیرے اللہ کے مقبول ہو تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو۔ اور وہ کبھی اس کی تمنا نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں کی۔

تفسیری نکات

یہود کے دعویٰ حقانیت کا امتحان

خداوند تعالیٰ نے ان آیات میں یہود کے دعویٰ حقانیت کا ایک امتحان مقرر کیا ہے جس امتحان کے متعلق پیشین گوئی بھی کی گئی ہے۔ امتحان یہ کہ یہود یہ دعویٰ کرتے تھے کہ آخرت ہمارا حصہ ہے۔ ان آیات میں جناب باری تعالیٰ نے اس پر گفتگو کی ہے ایسے طرز سے جس کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ مناظرہ کا یہ طریقہ ہے آج کل مناظرہ کا طرز عجیب ہے کہ تمام عمر اسی قیل و قال میں گزر جاتی ہے۔

نصاریٰ سے احتجاج

ایک آیت میں نصاریٰ سے احتجاج ہے جبکہ انہوں نے کوئی دلیل نہیں مانی تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

فمن حاجك فيه من بعد اجماعك من العلم یعنی بعد دلائل کے بھی جو شخص کج بحثی کرے اس سے خاص طور پر قسم قسمی کر لو اور اس آیت میں یہودی مخاطب ہیں یعنی ان زعمتم انکم اولیاء للہ یعنی اگر تم حق پر ہو اور آخرت تمہارے لئے ہے تو موت سے ڈرو مت کیونکہ موت نعمائے آخرت میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لئے اگر تم اپنے کو واقعی حق پر سمجھتے ہو تو موت کی تمنا کرو چنانچہ اس امتحان میں یہودنا کامیاب رہے اور ان کے سکوت سے میدان خالی ہو گیا۔ مدعی پسپا ہوئے اور اب تبلیغ عام کا خوب موقع ملا۔ چنانچہ اس مقام پر بھی خدا نے بتلایا ہے ولا یتمنونه ابد یعنی وہ موت کی تمنا نہ کر سکیں گے اور علت اس کی یہ ہے کہ ہما قدمت ایدیہم یعنی جو کچھ انہوں نے کیا ہے اور اپنی زندگی میں برے کام کئے ہیں اور مشاغل کو بڑھا رکھا ہے۔ وہ ان کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کر سکیں گے۔ پس غور کرنے سے معلوم ہو گیا کہ موت کی تمنا نہ کرنے کا باعث اور سبب یعنی ارشاد ہوا کہ اعمال سیرہ کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کریں گے۔ قرآن شریف یہ بتلاتا ہے کہ موت کی عدم تمنا کا سبب اعمال سیرہ ہیں۔ مگر معاصی و تمنا جمع نہیں ہو سکتیں۔ جب اعمال سیرہ ہوں گے تو موت سے انس نہ ہوگا۔ اس مقابلہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسے اعمال سیرہ میں یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان موت سے نفرت کرتا اور متوحش ہے اسی طرح اعمال صالحہ میں موت سے وحشت نہیں ہوتی ایک حکم نھما ثابت ہوا یعنی اعمال سیرہ میں موت سے نفرت و وحشت اور دوسرا حکم یعنی اعمال صالحہ میں موت کی تمنا اور خواہش استنباطا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم لوگ موت کو کیسا سمجھتے ہیں ذرا اپنے قلوب کو ٹٹول لیں اور دیکھیں کہ ہم میں موت سے نفرت پائی جاتی ہے یا موت کی تمنا اور یہ دوسرے نہ ہو کہ اس آیت میں ہم کو خطاب ہی نہیں پھر اس سے ہم کیوں فکر میں پڑیں۔ سو سمجھ لینا چاہیے کہ گو خطاب خاص ہے مگر مضمون عام ہے اور یہ خداوند تبارک و تعالیٰ کی رحمت ہے کہ دوسروں کی حکایت میں ہماری تشبیہ مقصود ہے اور دوسروں کے واقعات بتلا کر ہم کو بتلایا جاتا ہے کہ ایسے خطرات سے بچو تا کہ تم بھی محفوظ رہ سکو۔ پس یہ ہماری رعایت ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت خداوند تعالیٰ کو ہمارے ساتھ منظور ہے جیسا کہا گیا ہے۔

خوشر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگران

کیا ہی اچھی بات ہے کہ ہمارے دل کی بات دوسروں کی حکایت میں کہہ دیجائے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ قرآن مجید میں ایسی رعایت رکھی گئی قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے دوسری امت کے ذکر میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے بڑی بڑی قیمتی ہدایات بیان فرمائی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہم تدبر نہیں کرتے اور نہیں خیال کرتے کہ خداوند تعالیٰ نے ہمارے واسطے کیا کیا مفید باتیں بیان فرمائی ہیں۔ افلا یتدبرون القرآن کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے (لآیۃ) لیکن تدبر میں صرف مطالعہ ترجمہ قرآن اور اپنی

رائے پر اکتفا نہ کریں لوگ سخت غلطی کرتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کا خود اردو ترجمہ دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے اردو ترجمے دیکھ کر کبھی ایک اردو داں شخص قرآن مجید کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ قرآن مجید کے سمجھنے اس میں تدبیر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ علوم درسیہ کو حاصل کیا جائے لیکن یہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو فارغ ہیں اور علوم درسیہ کے حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس وقت ہو۔ اس لئے جو لوگ غیر فارغ ہیں ان کے لئے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان کو سبقاً سبقاً پڑھنا چاہیے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ترجمہ کو حرفاً حرفاً کسی مولوی صاحب سے پڑھے اور سمجھے۔ خود پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا لا حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں بڑی غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ کا کچھ لوگ سمجھ لیتے ہیں۔ تجربات سے ان کو بہت کچھ نقصانات معلوم ہوئے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ

فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ

كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ① فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي

الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا

لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ②

ترجمہ: اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جائے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز و خطبہ) کی طرف فوراً چل پڑا کرو اور خرید و فروخت (اسی طرح دوسرے مشاغل جو چلنے سے ممانع ہوں) چھوڑ دیا کرو۔ یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (کیونکہ اس کا نفع باقی ہے بیع وغیرہ کا فانی) پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت تم کو اجازت ہے تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی کو تلاش کرو اور اس میں بھی اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو تاکہ تم کو فلاح ہو۔

تفسیری نکات

حرمت بیع جمعہ کی اذان اول سے ہو جاتی ہے

فرمایا۔ اذ انودى للصلاة من يوم الجمعة الخ (جب جمعہ کی اذان ہو تو خرید و فروخت بند کر دو)

پر اشکال یہ ہوا کہ اول اذان ثانی تھی اور یہی اذان بعد میں ہوئی تو اب ترک بیع اذان ثانی سے ہونی چاہیے۔ حالانکہ فقہاء کہتے ہیں کہ حرمت بیع کی اذان اول سے ہو جاتی ہے۔ بعض نے جواب دیا عموم الفاظ کا اعتبار ہے مگر میرے نزدیک عموم وہ معتبر ہے جو مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو جیسا لیس من البر الصیام فی السفر سفر میں روزہ رکھنا سبکی نہیں۔ تو یہ وجہ تو درست نہ ہوئی وجہ یہ ہے کہ اذان ثانی تو مدلول ہے اور بوجہ اشتراک علت کے وہ بھی داخل آیت ہے اور علت سعی الی ذکر اللہ ہے۔ خوب سمجھ لو (الکلام الحسن حصہ دوم)

فضل سے رزق مراد ہے

میں رزق کو فضل فرمایا ہے کیونکہ اسی آیت میں فان تشروا فی الارض بھی ہے اور انتشار فی الارض پر جس فضل کی طلب مرتب ہوتی ہے ظاہر ہے کہ وہ طلب رزق ہی ہے لیکن سب افراد فضل کے برابر نہیں اسی لئے اس امر کو یعنی وابتغوا من فضل اللہ کو مفسرین نے اباحت پر محمول کیا ہے۔ کیونکہ اس کے اوپر ہے وابتغوا من فضل اللہ کو مفسرین نے ترک بیع کا امر مستمر ہو پس فان تشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ سے بتلا دیا گیا کہ بعد فراغ صلوٰۃ کے وہ اب جائز ہو گیا ہے کیونکہ امر بعد الخطر اباحت کے لئے ہوتا ہے غرض یہاں سب کے نزدیک تفسیر فضل کی رزق ہی ہے اس لئے اس کے بعد یوں بھی فرمادیا کہ واذکروا اللہ کہ خدا کی بھی یاد رکھو یہ نہ ہو کہ رزق کو فضل مقصود بالذات سمجھ کر اس کی تلاش میں خدا کو بھول جاؤ۔ نہیں بلکہ دنیا غالب نہ ہو اور یہاں سے ایک مسئلہ تمدن کا بھی نکلتا ہے جس کو استطراداً ذکر کرتا ہے۔

اجتماع صالحین کی دو صورتیں

وہ یہ کہ مجمع کی دو قسمیں ہیں ایک اجتماع مفسدین کا اور یہ اکثر تو بیشک موجب خطر ہے دوسرا اجتماع صالحین کا اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ کسی ضرورت سے ہو دوسرے یہ کہ کام کچھ نہیں ویسے ہی اجتماع ہو گیا تو اس صورت میں تجربہ ہے کہ نفس خود کوئی کام اپنے لئے تجویز کر لے گا اور ظاہر ہے کہ نفس کا میلان الی الشر زیادہ ہے اس لئے غالباً وہ شر ہی کو تجویز کرے گا اور جس شر کو مجمع تجویز کرے گا اس کا اثر بھی بہت شدید ہوگا اگرچہ تنہائی میں بھی نفس اپنے لئے شر تجویز کرے گا مگر وہ بہت کم متعدی ہوگا مثلاً تنہائی میں تو یہ سوچتا رہے گا کہ کسی کی ٹمٹم لے لو کسی کا لڑکا اچھا ہے اور اسے گھور لو کوئی عورت اچھی ہے اسے تاکو اور مجلس میں جو شر تجویز ہوگا وہ آج کل کی اصطلاح کے موافق تبادلہ خیالات سے تجویز ہوگا۔ خدا جانے یہ تبادلہ کون سا صیغہ ہے خیر میں بھی انہی کے الفاظ میں کہتا ہوں جس میں سمجھنے میں آسانی ہو تو تبادلہ خیالات سے ایک جوش اور ہیجان پیدا ہوگا کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ دوسرا سوچے گا کہ اس کی تجویز میں ہمارے خلاف جو اجزاء ہیں انہیں رد کرنا چاہیے۔ ورنہ

سکوت و خاموشی تسلیم و رضا لازم آئے گا۔ پس اول تو دونوں راد بنے کہ ایک نے دوسرے کے قول کو رد کیا پھر دونوں مردود ہو گئے کہ کچھ انہوں نے انکار کر دیا اور کچھ انہوں نے اور یہی فساد ہے اس لئے اس صورت میں عقل یہ حکم کرتی ہے کہ جب مجمع ناجائز ہو تو منتشر کر دو چنانچہ اس حکم عقلی کے موافق تمام حکومتوں نے قانون بنایا ہے لیکن اس میں ایک کسر تھی کہ اسی حالت میں منتشر کرنے کا حکم دیا جب غرض ناجائز کے لئے اجتماع ہوا اور شریعت نے اس کسر کو اپنے یہاں نہیں رکھا بلکہ مجمع ناجائز اسے بھی قرار دیا جو طاعت میں مشغول نہ ہوا اگرچہ وہ ناجائز غرض سے جمع نہ ہوا ہو جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا تو اب جب نماز ختم ہو گئی تو مسجد میں خالی بیٹھ کر کیا ہوگا ایک ایک کی غیبت ہوگی اور پھر رد و قدح ہوگا اور اس سے فساد برپا ہوگا اس لئے حکم ہوا کہ ذکر و طاعت میں مشغول ہو تو مسجد میں ٹھہرو ورنہ چلے جاؤ اور چونکہ وعظ بھی ذکر ہے اس لئے بعد نماز جمعہ اگر وعظ کے لئے اجتماع باقی رہے تو جائز ہے۔

اردو میں خطبہ پڑھنا جائز نہیں

اور اس مقام پر ایک مسئلہ فاسعوالی ذکر اللہ سے مستحب ہوا اس کو بھی استطراداً ذکر کرتا ہوں وہ یہ کہ خطبہ اردو میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں وہ استنباط یہ ہے کہ قرآن سے خطبہ کا نام ذکر اللہ رکھا ہے چنانچہ فاسعوالی ذکر اللہ فرمایا ہے جب خطبہ ذکر ہے تذکیر نہیں تو خطبہ کو اردو میں نہ پڑھیں گے جیسے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ خطبہ سے مقصود تذکیر ہے اور تذکیر موقوف ہے فہم پر اس لئے مادری زبان میں پڑھنا چاہیے تو اس سے اس کا جواب ہو گیا کہ قرآن نے خطبہ کو ذکر فرمایا ہے جس کی غرض فہم پر موقوف نہیں تذکیر نہیں بلکہ قرآن مجید کو جا بجا ذکر کرنا بمعنی تذکیر فرمایا گیا ہے مگر پھر بھی کسی کے نزدیک نماز میں وہ مادری زبان میں نہیں پڑھا جاتا تو خطبہ کیلئے تو بدرجہ اولیٰ یہ حکم ثابت ہوگا۔ تو فاسعوالی ذکر اللہ سے یہ مسئلہ مستحب ہوا اور یہ تبرع ہے ورنہ اگر اس سے یہ نہ بھی مستحب ہو تب بھی فتویٰ اس پر موقوف نہیں فتویٰ تو فقہاء کے قول پر ہے کہ انہوں نے اس پر نہایت قوی استدلال کیا ہے کہ صحابہ نے کبھی غیر عربی زبان میں خطبہ نہیں پڑھا حالانکہ وہ فارس میں روم میں برابر رہے اور صحابہ وہاں کی فارسی اور ترکی زبان کے ماہر بھی تھے مگر خطبہ کبھی ترکی یا فارسی زبان میں نہیں پڑھا بس ہمارے لئے فقہاء کا یہ کہہ دینا کافی ہے خیر میں نے نکتہ اور لطیفہ کے طور پر آیت سے بھی اس کو مستحب کر دیا جیسے فانتشروا سے تمدن کا مسئلہ ذکر کر دیا تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ نماز کے بعد اگر وعظ میں مشغول ہو گئے یا کسی اور طاعت میں لگ گئے تو اس کے لئے اجتماع جائز ہے کیونکہ اس کے لئے بھی تو جمع ہی کئے گئے ہیں لیکن اگر کوئی کام نہیں ہے تو اپنے اپنے کام کو جاؤ خالی مت بیٹھو کہ فساد کا اندیشہ ہے۔ فانتشروا کا بھی حاصل ہے اب اگر اس تقریر پر فانتشروا کو بجائے اباحت کے استجابات کے لئے کہہ دیا جاوے تو کوئی حرج نہیں ہے

اگر چہ کوئی جزئی اس علت کے سبب امر کو جو ب کے لئے بھی کہہ سکتا ہے مگر یہ وجوب لغیرہ ہوگا بعینہ نہ ہوگا اس کے بعد ارشاد ہے وابتغوا من فضل اللہ یعنی منتشر ہونے کے بعد رزق تلاش کرو یہ نہیں کہ لہو و لعب میں مشغول ہو جاؤ۔ بعضے اہل ہوی صرف اسی آخر کے ٹکڑے کو لے لیتے ہیں کہ قرآن میں تلاش رزق کا حکم ہے بس رات دن اسی میں مشغول رہنا چاہیے گویا تمام قرآن میں ان کو یہی حکم پسند آیا جیسے کوئی شخص روزہ تو رکھتا نہ تھا مگر افطاری و سحری میں شریک ہو جاتا تھا کسی نے کہا کہ روزہ تو رکھتا نہیں سحری و افطاری کیوں کھاتا ہے کہنے لگا کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ بالکل ہی کافر ہو جاؤں چونکہ روزہ میں مشقت تھی اس لئے اس نے روزہ چھوڑ دیا اور افطاری سحری میں چکوتھیاں ملتی تھیں کہ مسجد میں دس گھر کی افطاری جمع ہوتی ہے اسے پسند کر لیا ایسے ہی انہیں بھی اوپر کی آیات کے احکام و ذروا البیع اور فاسعوا الی ذکر اللہ تو پسند نہیں آئے صرف آخر میں وابتغوا من فضل اللہ پسند آیا یہ نفس بڑا اپنے مطلب کا ہے انتخاب اعمال میں اس نفس کا یہی خاصہ ہے ایسے ہی لوگوں کی بابت میں شیخ نے کہا ہے

نہ سنت نہ بنی در ایشان اثر
مگر خواب پیشین و نان سحر

(یعنی سوائے قیلولہ اور سحری کی روٹیوں کے ان میں سنت کا کوئی اثر نہ پائے)

یعنی ان کو سنتوں میں صرف دو سنتیں پسند آئیں ایک قیلولہ اور ایک سحری روٹیاں ایسے ہی ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس سے پوچھا گیا تم کو احکام میں سے کیا پسند ہے کہنے لگا کلو او اشربوا کھاؤ پیو۔ پھر پوچھا گیا دعاؤں میں کون سی دعا پسند ہے کہنے لگا ربنا انزل علینا مائدة من السماء اے اللہ ہمارے لئے آسمان پر سے دسترخوان نازل فرما دیجئے بہر حال حق تعالیٰ نے محض فانتشروا فی الارض پر تو اکتفا نہیں فرمایا کیونکہ محض مسجد سے نکل جانا ہی مقصود نہیں کیونکہ وہاں تو نمازی تھے اور یہاں بازار میں اہل بازی ہیں اور نہ محض ابتغاء رزق پر اکتفا فرمایا بلکہ اسی کے ساتھ واذکروا اللہ کثیراً بھی فرمایا پھر اس وابتغوا میں بھی ایک قید لگائی یعنی رزق کو جو فضل سے تعبیر فرمایا تو اس کو اللہ کی طرف مضاف فرمایا یعنی اس طرح فرمایا۔

عجیب بلاغت

وابتغوا من فضل اللہ جس میں عجیب بلاغت ہے کہ خالی فضل نہیں فرمایا بلکہ فضل اللہ فرمایا یعنی رزق کو رزق سمجھ کر حاصل نہ کرو بلکہ خدا کا فضل سمجھ کر حاصل کرو کہ اس میں بھی خدا سے تعلق رکھو۔ سبحان اللہ کیا تعلیم ہے کہ دنیا طلبی میں بھی خدا سے تعلق رکھو۔ محض دنیا کا قصد نہ رکھو بلکہ اس کے ساتھ خدا کے تعلق کو بھی ملا لو یہی عارفین کی تعلیم کا بھی خلاصہ ہے وہ یہی چاہتے ہیں کہ ہر امر میں خدا سے تعلق صحیح باقی رہے اور اس تعلق کے

سبب عارف کو نعمت سے جتنی محبت ہوتی ہے اتنی غیر عارف کو نہیں ہوتی کہ عارف یہ سمجھتا ہے کہ اسے محبوب سے تعلق ہے اور اسی اصل پر طالب کو شیخ سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ ماں باپ سے بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ موصل الی اللہ ہے اور اسی حیثیت سے عارف کو اپنے ہاتھ پاؤں سے بھی محبت ہوتی ہے اور وہ ان کی بہت حفاظت کرتا ہے کہ حلوے کھا رہا ہے گھی کھا رہا ہے کیونکہ یہ سب سرکاری چیزیں ہیں اس حیثیت سے ان کی حفاظت ضروری ہے جیسے سرکاری مشین کا نوکر مشین کو اس حیثیت سے تیل دیا کرتا ہے اس پر شاید کوئی نفس پرست کہے کہ اچھا اب سے ہم بھی یہی سمجھ کر خوب حلوے اور مٹھائیاں کھایا کریں گے۔ صاحب خوب سمجھ لو یہ بات کہیں محض سمجھنے سے تھوڑا ہی ہوتی ہے بلکہ وہ تو ایک حال ہے کہ یہ سرکاری چیزیں ہیں اور اس کا معیار یہ ہے کہ جو ارجح نا فرمانی میں مشغول نہ ہوں۔ کیونکہ سرکاری چیزیں خلاف قانون استعمال نہیں کی جاتیں تو جب یہ حال ہو جائے تو ایسا شخص جو کچھ کھائے گا وہ عبادت ہے۔ (اشرف العلوم)

تمدن اور قیام سلطنت کا بڑا مسئلہ

فرمایا کہ تمدن اور قیام سلطنت کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بلا ضرورت عام کا اجتماع نہ ہونے پائے تمام سلطنتوں کو اس کا خاص اہتمام ہے۔ سو کلام مجید سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں وہ موجود ہے۔ فاذا قضیت الصلوة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیر العلکم تفلحون کیونکہ انتشار کا حکم اس وجہ سے ہوا کہ ضرورت اجتماع باقی نہیں رہی۔ اگر مختلف الطبع لوگ بلا ضرورت ایک جگہ رہیں گے تو فساد و نزاع کا احتمال ہے اور اسی لئے انتشار و کے بعد یہ بھی فرمادیا کہ ابتغوا من فضل اللہ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد سے نکل کر بھی آوارہ نہ پھرو بلکہ خدا کے رزق کی طلب میں مشغول ہو جاؤ آگے اس شغل بال دنیا کے مفاسد کا علاج فرماتے ہیں۔ کہ اذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون تو ہر پہلو کو کیسا معتدل کیا ہے اور یہی اعتدال وہ چیز ہے کہ قرآنی تعلیم کے سوا کسی دوسری جگہ اس مرتبہ میں میسر نہیں ہو سکتی۔ (مقالات حکمت)

انسانی طبیعت

فاذا قضیت الصلوة فانتشروا فی الارض یعنی جب نماز ادا کر لی جائے تو زمین میں متفرق ہو جاؤ۔ ہم لوگ خود ایسے تھے کہ نماز کے بعد خود ہی بھاگتے لیکن حکم بھی فرمادیا۔ اس میں بھی مذاق طبعی کی کس قدر رعایت ہے اور یہی وجہ تشبیہ ہے مگر یہ حکم و جوبی نہیں اور نیز ایسے دلدادہ بھی تھے جو مسجد میں رہ جاتے ہیں۔ بقول امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ

باشد کہ از بہر خدا سوائے غریباں بگری

خسرو غریب ست گدا افتادہ در کوائے ثنا

ان کے لئے بھی انتشار فی الارض کو مصلحت سمجھا اور اس میں بھی بڑی مصلحت یہ ہے کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک کام سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور نیز طبائع اکثر ضعیف ہیں۔ جب زیادہ پابندی ہوتی ہے اور اس سے ہرج معاش ہوتا ہے اور حاجت ستاتی ہے تو ساری محبت رکھی رہ جاتی ہے۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ یعنی زمین میں متفرق ہو جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی رزق طلب کرو۔ علاوہ اس کے اس میں ایک تمدنی و سیاسی مصلحت بھی ہے جس کو میں نے ایک مرتبہ کراچی میں وعظ کے اندر بیان کیا تھا اس طرح جیسے کہ تمدن کے مسائل جیسے قرآن مجید سے ثابت ہوتے ہیں ایسے دوسری جگہ سے نہیں ہوتے چنانچہ اس آیت سے بھی ایک مسئلہ مستنبط ہوا کہ بلا ضرورت اجتماع نہ ہونا چاہیے اگر بضرورت ہو تو رفع ضرورت کے بعد فوراً منتشر ہو جانا چاہیے۔ یہی وہ مضمون ہے جو تمام اہل سیاست مانے ہوئے ہیں کہ ناجائز مجمع کو منتشر کر دیا جاوے۔ قرآن مجید میں اس مجمع کے ناجائز بننے سے پہلے ہی محض اس احتمال پر کہ اب ان کو کوئی کام تو رہا نہیں یہ ناجائز مجمع نہ بن جاوے سب کو منتشر کر دیا گیا۔ التہذیب)

خطبہ جمعہ ذکر ہے تذکیر نہیں

امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ سبحان اللہ یا الحمد للہ کہنے سے خطبہ ادا ہو جائے گا اس سے معلوم ہوا کہ خطبہ ذکر ہے تذکیر (احکام پہنچانا) نہیں اور دوسری زبان میں پڑھنے کا مشورہ دینے والے زیادہ تر اسی سے استدلال کرتے ہیں کہ عربی زبان کو مخاطبین سمجھتے نہیں پھر کیا فائدہ اس کا جواب ظاہر ہو گیا کہ جب وہ تذکیر نہیں تو سمجھنے کی بھی ضرورت نہیں اس استدلال کے ہوتے ہوئے ہم کو کسی اور استدلال کی ضرورت بھی نہ تھی اس کے قبل یہ میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا اور اس کا ذکر ہونا خود قرآن شریف سے ثابت ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فاسعوا الی ذکر اللہ وذرّوا البیع اس کو ذکر فرمایا ہے ذکر یعنی تذکیر نہیں فرمایا جیسے قرآن مجید کے متعلق فرمایا ہے۔ وما هو الا ذکر الی اللعلمین پس خطبہ امر تعبدی ہے جیسے نماز میں قراءت اس میں قیاس کا کچھ دخل نہیں اس لئے اس میں یہ قیاس بھی نہیں چلتا کہ مقصود اس سے تفہیم ہے سو یہ مقصود جس طرح حاصل ہو جاوے اور فقہاء نے جو خطبہ کے متعلق لکھ دیا ہے کہ اس میں احکام کی تعلیم کی جاوے وہ حکمت ہے علت نہیں۔ (ملفوظات جلد ۴)

اذان اول سے حرمت بیع پر ایک اشکال اور اس کا جواب

اور ایک اشکال ہے اذان اول سے حرمت بیع کے ثبوت آیت سے تو نہیں پھر کیسے لکھتے ہیں۔ کتابوں

میں لقولہ تعالیٰ 'اذانو دی للصلوة الخ' اگر کہا جائے عموم الفاظ کا اعتبار ہے۔ مورد کا لحاظ نہیں تو اس میں تو اس میں بہت پرانا شبہ ہے عموم میں یہ قید ہونا چاہیے کہ مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو۔ جیسے "لیس من البر الصیام فی السفر" علماء اس کو عام نہیں لیتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ہر سفر نہیں بلکہ جہاں مشقت ہو، میں ایک دفعہ مراد آباد گیا وہاں بیان ہوا اس میں بات کو بھی ذکر کیا بیان میں شاہ صاحب مفتی صاحب بھی تھے اس کے بعد شوکت باغ گیا۔ مولوی قدرت اللہ صاحب نے اس قاعدہ کے متعلق سوال کیا۔ شاہ صاحب نے کہا ابھی تم نے سنا نہیں اس قاعدہ کی تحقیق اس میں یہ قید ہے پھر تو اور کسی کی موافقت کی ضرورت نہیں۔ اور اصولین نے لکھا کہ اصول فروع سے نکلا یا گیا تو جب اذان یہی (ثانی) تھی نزول کے وقت تو ذوق تو یہی ہے کہ ثانی مراد ہے لہذا اس سے استدلال کرنا حرمت بیع پہلے اذان سے ثابت ہے اس آیت سے ٹھیک نہیں۔ پس جواب یہ ہے کہ استدلال دو قسم کے ہیں یعنی آیت سے استدلال کرتے ایک تو بواسطہ اور ایک بلا واسطہ ثانی اذان میں تو بلا واسطہ ہے اور اذان اول میں دراصل قیاس کیا گیا۔ ثانی اذان پر بوجہ اشتراک علت کے یہ جواب جب سے سمجھ میں آیا بہت جی خوش ہوا۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۹۱)

سُورَةُ الْمُنَافِقُونَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

كَانَهُمْ خَشَبٌ مُسْتَدَاعٌ

ترجمہ: گویا وہ لکڑیاں جو درد یوار کے سہارے لگائی ہوئی کھڑی ہیں۔

تفسیری نکات

منافقین کی تشبیہ

حق تعالیٰ ایک تشبیہ میں فرماتے ہیں کانہم خشب مسندہ یہ منافقین کی تشبیہ ہے اور کیا غضب کی بلاغت ہے کہ منافقین ظاہر میں بہت چکنے چڑے اور لسان ہوتے تھے اور باطن میں خبیث تھے تو حق تعالیٰ نے دونوں باتوں کی رعایت کر کے کیا عجیب تشبیہ دی ہے کانہم خشب مسندہ یعنی وہ ایسے ہیں جیسے لکڑیاں لیمن باندھ کر رکھی ہوئی۔ لکڑیوں کو تراشنے کے بعد ہی لیمن باندھ کر رکھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ چونکہ ظاہر میں یہ منافق بہت شائستہ ہیں اس لئے ان کو کندہ تراش تو نہ کہو۔ ہیں کندہ تراشیدہ مگر ہیں لکڑیاں ہی۔ یعنی عقل و شعور سے خالی جماد محض ہیں۔

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ
 حَتَّىٰ يَنْفَضُوا ۗ وَاللَّهُ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَلَكِنَّ
 الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۗ يَقُولُوْنَ لَیْن رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ
 لَيُخْرِجَنَّ اِلَّا عَزْمٌ مِّنْهَا الْاَذَلُّ ۗ وَاللَّهُ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ
 وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۗ

ترجمہ: وہ منافقین وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر خرچ مت کرو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جاویں اور اللہ ہی کے لئے ہیں۔ خزانے آسمانوں اور زمین کے لئے منافقین نہیں سمجھتے (اور) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ میں لوٹ کر گئے تو ہم میں جو عزت والا ہے (یعنی ہم) وہ ذلت والے کو (یعنی صحابہ کو) نکال دیگا اور اللہ ہی کے لئے ہے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور اہل ایمان کے لئے لیکن منافقین نہیں جانتے۔

تفسیری نکات

شان نزول

قصہ یوں ہوا تھا کہ ایک غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مہاجرین اور انصار وغیرہ سب تھے اور غزوہ (جہاد) اور لڑائیوں میں منافقین بھی اکثر ساتھ جایا کرتے تھے اور ان کی غرض کبھی تو یہ ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے اسرار (بھید) معلوم کر کے کفار کو اطلاع دیں جیسے جاسوس کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ وفیکم سمعون لہم۔ یعنی تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں۔

قرآن مجید میں موجود ہے اور کبھی غنیمت میں حصہ لینے کو جاتے تھے کیونکہ ظاہری اسلام کے سبب سال غنیمت میں ان کو بھی حصہ ملتا تھا اور حکمت اس کی یہ کہ لڑائی لڑنے والے اپنی کمک کی قوت پر لڑا کرتے ہیں تو چونکہ یہ لوگ ظاہر میں بطور کمک کے جاتے تھے ان کو بھی مال غنیمت میں حصہ ملتا تھا اور ان سے معاملہ مسلمانوں کا سا کیا جاتا تھا اور وہ جانتے بھی تھے کہ مسلمان ہم سے یہ برتاؤ کریں گے اور بعض مرتبہ دونوں طرف سے لیتے تھے کہ کفار سے جا کر کہتے تھے کہ ہم نے تمہارے بھلے کی یہ رائے دی تھی۔ تو غرض یہ ہے کہ منافقین بھی جایا

کرتے تھے۔ تو اس غزوہ میں بھی یہ لوگ شریک تھے اور جہاں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں وہاں اختلاف ہو ہی جاتا ہے۔ بلکہ اچھوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اچھوں کو اس پر اصرار نہیں ہوتا تو اتفاق سے دو شخصوں میں کچھ گفتگو بڑھ گئی۔ ایک مہاجر تھے اور ایک انصاری۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایک گندی بات ہے۔ تو وہ جوش ان لوگوں کا فوراً کم ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری کی پیشکش

مکہ میں ایک مرتبہ کفار نے باہم مشورہ کر کے ایک شخص کو پیام دے کر بھیجا اور یہ درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کو براندہ کہئے۔ تو آپ جو کچھ کہیں اس کے لئے ہم موجود ہیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تمنا ہو تو جن عورتوں کو آپ پسند فرمائیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہو تو جس قدر چاہیں ہم سے مال لے لیں اور اگر آپ سرداری چاہیں تو ہم آپ کو سردار بنانے کے لئے موجود ہیں اور اس رائے میں تمام بڑے بڑے کفار ابو جہل وغیرہ بھی شریک تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کی اس درخواست کو نہایت تحمل سے سنتے رہے گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگوار ہوا۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال خوش اخلاقی بھی ثابت ہوتی ہے۔ آج ذرا سی بات خلاف مزاج ہو تو تحمل نہیں ہو سکتا۔ جب کفار کہہ چکے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ پڑھ کر یہ آیتیں شروع کیں۔

او جحدوا بہا و استیقنتھا انفسہم ظلماً و علواً (النمل آیت ۱۴)

اور ظلم اور تکبر کی راہ سے ان کے منکر ہو گئے۔ حالانکہ ان دلوں نے ان کا یقین کر لیا گیا

فرمایا آیت سورہ یونس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے تکلم بکلمۃ الایمان کیا وجوہ تصدیق پر کوئی کلمہ دال نہیں۔ سو اس سے عند اللہ اس ایمان کا مقبول ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر مان لیا جاوے کہ تصدیق بھی تھی تو یہ تصدیق اضطراری تھی جو کہ اکثر کفار کو حاصل ہے کما قال اللہ تعالیٰ یعرفونہ کما یعرفون ابناء ہم اور خود فرعون کو بھی قبل سے تھی و جحدوا بہا و استیقنتھا انفسہم ظلماً و علواً مگر فرق اتنا تھا کہ اس سے پہلے تکلم نہیں کیا تھا۔ اس وقت تکلم کیا سو یہ تکلم ممکن ہے کہ عذاب غرق سے بچنے کے لئے ہونہ انقیاد و تسلیم کے طور پر جس طرح اس کی نظیر پہلے بھی ہوئی تھی۔ قالو یا موسیٰ ادع لنا ربک بما عہد عندک لئن کشفنا عننا الرجز لنؤمنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل الیٰ اخرہ اور ایمان مامور باور مقبول وہ ہے جس میں تصدیق اختیاری ہو اور تکلم انقیادی ہو اس لئے اس آیت سے اس کا مومن مقبول الایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا اور جو قول حضرت شیخ اکبر قدس اللہ سرہ کی طرف منسوب ہے حسب تحقیق شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ جیسا کہ ایواقیت والجوہرین

ہے وہ شیخ اکبر کے کلام میں مدسوس ہے دوسرے نصوص سے اس کا ناری ہونا صاف ثابت ہوتا ہے جس میں تاویلات کی گنجائش نہیں ہے اور خود شیخ کی آخر تصنیفات میں فرعون کا ناری ابدی ہونا درج ہے جیسا کہ ایواقیت میں ہے اور ایسے احتمالات و تاویلات سے تو کوئی کلام خالی نہیں۔ (مقالات حکمت ص ۳۸)

حم تنزيل من الرحمن الرحيم کتاب فصلت آیتہ قرانا عربيا لقوم يعلمون ترجمہ: حم یہ کلام رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے۔ ایسے لوگوں کے واسطے مفید ہے جو دانشمند ہیں۔ جب اس آیت پر حضور پہنچے۔

فان اعرضوا فقل انذرتکم صنعة مثل صنعة عاد و ثمود یعنی پھر اگر یہ لوگ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے بچاتا ہوں جیسے عاد اور ثمود پر آفت آئی تھی۔ تو وہ شخص گھبرا گیا اور کہا بس کیجئے اور وہاں سے بھاگا اور اس کمیٹی میں پہنچا تو ابو جہل اتنا عاقل تھا کہ اس شخص کو دور سے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ گیا تھا اور چہرہ سے اور آ رہا ہے اور چہرہ سے۔ اس کا تو خیال بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے آ کر بیان کیا کہ بھائیو قرآن سن کر میری تو حالت بدلنے لگی۔ خصوص اس آیت پر تو مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ایک بجلی گری اور میرا کام تمام ہوا۔ بڑی مشکل سے وہاں سے نکلا۔

آیت کریمہ کا شان نزول

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو یہ جواب دیا تھا پس نہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سرداری کی درخواست کی اور نہ مدینہ میں مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو بڑا بنائیں اس کو کون چھوٹا کر سکتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرداری کی تمنا نہ تھی مگر آپ کی تشریف آوری پر لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سردار بنا لیا۔ تو عبد اللہ بن ابی جہل مرا کہ میری سرداری آپ کی بدولت گئی اور کیوں نہ ہوتی۔

طلعت الشمس ما یغنیک عن زحل

یعنی سورج کے طلوع ہونے سے زحل سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔

تو خلاصہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن ابی جہل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وجہ سے سخت حسد تھا اور ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا تو اس واقعہ سے اس کو سخت ناگواری ہوئی کہ شہری لوگوں کے مقابلہ میں ان پر دیسیوں کو اتنی دلیری ہو گئی تو اس نے اپنی جماعت میں کہا کہ تم ہی نے تو ان کو جری کیا۔ تو اب مدینہ چل کر معاملہ کو بدل ڈالو اور اس کی یہ صورت بتلائی کہ جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ پس اس کا پہلا مقولہ ہے کہ ہم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتی ینفصوا یعنی کچھ خرچ مت کرو رسول اللہ

کے ساتھیوں پر کہ سب متفرق ہو جاویں کیونکہ یہ سب روٹیاں کھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور جب یہی نہ رہیں گی تو سب منتشر ہو جاویں گے۔ ایک مقولہ تو یہ تھا اور دوسرا یہ تھا کہ لیخرجن الاعزمنها الاذل کہ مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے اور معزز اپنے کو سمجھتے ہیں۔

تو یہ عبداللہ بن ابی نے کہا اور آہستہ اپنی جماعت میں کہا۔ مگر زید بن ارقم نے یہ سن لیا اور جوش بیتابی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً عبداللہ بن ابی کو بلایا اور پوچھا تو اس نے آ کر قسم کھالی کہ غلط ہے میں نے ہرگز نہیں کہا۔ اسی کو تو کہتے ہیں کہ

اذا جاءك المنفقون قالو نشهد انك لرسول الله یعنی جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیشک اللہ کے رسول ہیں۔

زید بن ارقم کے چچا نے ان کو ملامت کی کہ تم کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا۔ یہ مارے رنج کے گھر میں بیٹھ رہے کہ اب کیا منہ دکھلاؤں۔ اللہ اکبر کیا غیرت تھی حق تعالیٰ کو ان کی یہ حالت رنج کی گوارا نہ ہوئی اور اس وجہ سے یہ سورت نازل فرمائی۔ حالانکہ صرف ایک شخص کا قصہ تھا مگر مقبول ہونا یہ ہے کہ ایک شخص کے لئے ایک سورت نازل فرمائی جو کہ قیامت تک کے لئے نمازوں میں پڑھی جاوے گی اور عبداللہ بن ابی کا وہ مقولہ بالتصریح (ظاہر طور سے) نقل فرمایا کہ اس نے ضرور یہ کہا ہے تا کہ زید بن ارقم کی راست بیانی اچھی طرح ثابت ہو جاوے۔ چنانچہ یہاں اس قصہ سے مقصود ایک علم ہے جو ساتھ ہی مذکور ہے۔ چنانچہ منافقین کے پہلے مقولہ کے ساتھ فرمایا کہ ولله خزائن السموات والارض کہ حق تعالیٰ ہی کے لئے سب خزانے آسمانوں اور زمین کے ہیں۔

اور ان کے دوسرے مقولہ کے ساتھ فرمایا۔ ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين کہ عزت تو اصل میں حق تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کی ہے۔ ان دونوں آیتوں کے مضمون میں غور کرنے سے مفہوم ہوگا کہ مقصود کیا ہے۔

منافقین کے دعویٰ مال و عزت کی تردید

تو پہلی آیت میں تو مقصود ہے مال کے ایک اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا اور دوسری آیت میں مقصود ہے عزت کے اثر کو بیان کرنا اور پھر اس کو رد کرنا۔ کیونکہ پہلی آیت میں منافقین کو مال کا دعویٰ تھا حق تعالیٰ نے اس کو رد فرمایا کہ منافقین مال کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کا دعویٰ غلط ہے کیونکہ آسمان و زمین کے سارے خزانے تو حق تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اور دوسری آیت میں منافقین کو عزت کا دعویٰ تھا وہ اپنے آپ کو معزز خیال کر کے کہتے تھے کہ لیخرجن الاعزمنها الاذل یعنی مدینہ چل کر معزز ذلیل کو نکال دیں گے۔

تو حق تعالیٰ نے اس کو بھی رد فرمایا کہ عزت تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے ہے تو خلاصہ ان دونوں آیتوں کے مضمون کا یہ ہوا کہ ایک آیت یعنی پہلی مال کے متعلق ہے اور دوسری جاہ کے متعلق ہے۔

محبوب ترین چیزیں

تو دنیا میں دو ہی چیزیں ہوتی ہیں مال اور جاہ اور یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ہر ایک کو محبوب ہیں۔ چنانچہ کیسیا جو ہر ایک کو ایسی محبوب ہے کہ اگر کسی کو بتلائی جاوے تو اہل اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں کہ اس سے انکار کرے۔ تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں اور اس کے سوا دنیا میں بہت کم ذرائع ایسے ہیں کہ اس میں مال اور جاہ دونوں جمع ہوں۔ اکثر جاہ بدوں مال کے تلف کئے ہوئے نہیں ملتا اور اس میں مال و جاہ دونوں جمع ہیں۔ اس لئے یہ اس درجہ کی محبوب ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ دونوں چیزیں نہایت ہی محبوب ہیں اور انہیں کا نام دنیا بھی ہے۔ تو اب میرا یہ کہنا کہ دنیا مطلوب ہے یا نہیں اس میں مال و جاہ دونوں آگئے تو اب دنیا سے مراد ان دونوں کا مجموعہ ہوگا۔ پس حاصل یہ ہوا کہ مال و جاہ مطلوب ہیں یا نہیں حق تعالیٰ نے اس کا فیصلہ ان آیات میں فرمایا ہے پس منافقین کے اول مقولہ کے بعد فرماتے ہیں۔ وَلِلّٰهِ خِزَانِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی اللہ ہی کے ہیں تمام خزانے آسمانوں کے اور زمینوں کے۔

اس سے تو احکام مال کے بتلانا مقصود ہیں۔ اور دوسرے مقولہ کے بعد فرماتے ہیں وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی۔

اس سے احکام جاہ کے بتلانا مقصود ہیں۔

پس اب اس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سو غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ مال فی نفسہ محمود ہے دوسرے یہ کہ مال سے اگر کوئی مفسدہ مرتب ہونے لگے تو مذموم ہے۔ مال کافی نفسہ محمود ہوتا تو اس لئے معلوم ہوا کہ اپنے کو مالک الاموال (سب مالوں کا مالک) فرما رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہے وَلِلّٰهِ خِزَانِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کی ملک میں ہیں۔ پس اگر مال فی نفسہ کوئی بری اور معیوب چیز ہوتی تو جس طرح سے خصوص کے ساتھ اپنے کو خالق الکلاب والخنازیر نہیں فرمایا اسی طرح اپنے کو خصوص کے ساتھ مالک الخزائن (خزانوں کے مالک) نہ فرماتے۔ اور اس میں نقود عروض (روپیہ و اسباب) سب داخل ہو گئے اور مال کا باعتبار عارض کے مذموم ہونا اس سے معلوم ہوا کہ مال سے ان کو یہ ضرر ہوا کہ انہوں نے اس کو بے موقع استعمال کیا۔ چنانچہ کہا کہ لَا تَنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوں ان پر کچھ مت خرچ کرو۔

سواپنے تمول کو وہ اس طرح کام میں لائے کہ مسلمانوں پر خرچ کرنا موقوف کر دیا جس سے ان کو تکلیف پہنچی۔ تو یہ سوء (برا) استعمال ہو مال کا پس حق تعالیٰ نے اس پر رد فرمایا کہ تم کیا چیز ہو۔ خزانے تو سارے ہمارے پاس ہیں پس ان کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی پس اس سے دوسری بات بھی ثابت ہو گئی کہ جب مال کے ساتھ سوء استعمال ہو تو وہ مذموم ہے اسی طرح دوسرے مقولہ کے بعد فرمایا وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ یعنی عزت اللہ ہی کی ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور مسلمانوں کی۔ تو یہاں بھی بتلادیا کہ جاہ فی نفسہ مذموم نہیں مگر سوء استعمال کی وجہ سے مذموم ہو جاتا ہے۔ پس اس سے بھی دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ جاہ فی نفسہ محمود ہے دوسرے یہ کہ جب سوء استعمال ہو تو مذموم ہے جاہ کافی نفسہ محمود ہوتا تو اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے وَاللّٰهُ الْعِزَّةُ - لآیہ فرمایا تو اپنے لئے عزت ثابت فرمائی۔ اگر جاہ کوئی بری چیز ہوتی تو اپنے لئے ثابت نہ فرماتے۔

اب اگر یہ شبہ ہو کہ جاہ اچھی چیز تو ہے لیکن یہ ممکنات کے لئے نہیں بلکہ حق تعالیٰ کے لئے ہے تو سمجھو کہ آگے وَلِلْمُؤْمِنِينَ (اور مسلمانوں کی) بھی تو ہے تو پس مسلمانوں کا ذی عزت ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے تو یہ شبہ نہ رہا کہ شاید ممکنات کے لئے محمود نہ ہو اور جاہ کا مذموم ہونا اس سے معلوم ہوا کہ ساتھ ہی ساتھ منافقین کی اس بات پر مذمت بھی فرمائی ہے کہ انہوں نے اس کا بے موقع استعمال کیا چنانچہ انہوں نے کہا کہ لیسخر جن الاعز منها الاذل یعنی جو عزت والا ہے وہ مدینہ سے ذلت والے کو نکال دے گا۔

تو ان کا یہ کہنا سوء استعمال ہو جاہ کا کہ ذریعہ بنایا جاہ کو مسلمانوں کے ضرر کا۔ اس پر حق تعالیٰ نے رد فرمایا کہ تم ہو کیا چیز معزز تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم و مسلمان ہیں۔ پس ان کی یہ مذمت سوء استعمال کی وجہ سے کی گئی۔ پس ان دونوں آیتوں سے چار مسئلے ثابت ہوئے۔

ایک یہ کہ مال اچھی چیز ہے۔

دوسرا یہ کہ جاہ اچھی چیز ہے۔

تیسرا یہ کہ مال کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

چوتھا یہ کہ جاہ کو ناجائز طور پر استعمال کرنا مذموم ہے۔

حقیقت حب

ایک تو ہے مال اور ایک ہے حب مال اسی طرح ایک ہے جاہ اور ایک ہے حب جاہ۔ تو مذمت مال کی نہیں ہے بلکہ حب مال کی ہے۔ جس سے برے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ تو مذموم دو چیزیں ہوئیں حب مال اور

حب جاہ باقی رہے مال اور جاہ سو یہ دونوں مذموم نہیں کیونکہ حق تعالیٰ امتنان (نعمت دینا) کے طور پر فرماتے ہیں ان الذین امنوا و عملوا الصلحت سیجعل لهم الرحمن ودا کہ ہم مومنین اہل عمل صالح کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے اور محبوبیت ہی کا نام جاہ ہے۔ لوگ جاہ کے معنی بھی غلط سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمارے خوف کی وجہ سے ہماری تعظیم کریں حالانکہ جاہ کی حقیقت ہے ملک القلوب (یعنی دلوں کا مالک ہونا) پس ملک المال (مال کا مالک ہونا) تو تمہول ہے اور ملک القلوب (دلوں کا مالک ہونا) جاہ ہے اور خوف اور ہیبت ہو تو وہ صورت جاہ ہے حقیقت جاہ نہیں اور یہ خود ہی اپنے کو معزز سمجھتے ہیں ورنہ لوگوں کے دلوں میں کچھ بھی ان کی عزت نہیں ہوتی چنانچہ ان کے پیچھے لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ بعض لوگ اپنی نظر میں برے ہوتے ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کلاب اور خنازیر (کتے اور سور) سے بدتر ہوتے ہیں اور ان کے سامنے خوف کی وجہ سے لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ تو یہ کوئی عزت نہیں ہے کیونکہ ایسی عزت تو سانپ کی بھی ہے تو جسموں کا شاہ ہونا جاہ نہیں ہے بلکہ دلوں کا شاہ ہونا جاہ ہے اور یہ بات محبوبیت سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ پس محبوبیت ہی اعلیٰ درجہ کی جاہ ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں سیجعل لهم الرحمن ودا اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبوبیت پیدا کر دیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ جاہ بری چیز نہیں بلکہ یہ تو اچھی چیز ہے کہ حق تعالیٰ بطور امتنان (نعمت) اپنے صالح بندوں کو عنایت فرمانا بتلا رہے ہیں اسی طرح مال کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ نعم المال الصالح للرجال الصالح نیک آدمی کے لئے نیک مال اچھی چیز ہے۔

پس مال اور جاہ مذموم خود نہیں ہیں بلکہ مذموم حب مال اور حب جاہ ہیں۔ جس کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ما ذنبان جانعان ارسلنا فی غنم بافسد لها من حب المال والشرف لدين المرء یعنی حب مال اور حب شرف آدمی کے دین کو ایسا تباہ کرتی ہے کہ اگر دو بھیڑیے بھوکے بھی بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیئے جاویں تو وہ بھی بکریوں کو اس قدر تباہ نہیں کر سکتے پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حب کا لفظ تصریحاً فرما دیا تو حب بری چیز ہے اب جہاں مال کی مذمت آوے اور اس کے ساتھ حب کی قید نہ ہو تو سمجھ لیں کہ اس سے مراد وہی حب کا درجہ ہوگا کیونکہ بعض قرآن ایسے موجود ہیں جن سے وہ قید معلوم ہو جاتی ہے اور اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو چونکہ غالب عادت یہی ہے کہ جب مال ہوتا ہے تو حب مال بھی ہوتی ہے پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ مال سے مراد وہی ہے جو حب کے درجے میں ہو۔

حب کے دو درجے قرار دیئے اس میں سے صرف ایک درجہ کی ممانعت کی اور دوسرے درجہ کی ممانعت نہیں کی اور یہ ایک آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے وہ آیت یہ ہے قل ان کان آباؤکم و ابناءؤکم

واخوانکم وازواجکم و عشیرتکم و اموال را قتر فتموها و تجارة تخشون کسادها و مسکن ترضونها احب الیکم من الله ورسوله و جهاد فی سبیلہ (یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور وہ تجارت جس میں نکاح نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو کہ اللہ تعالیٰ اپنا عذاب بھیج دیں)

حاصل یہ ہے کہ اگر دنیا کی چیزیں اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے احکام سے زیادہ محبوب ہوں تو عذاب کیلئے تیار ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان چیزوں کی احب ہونے پر وعید فرمائی اور محبوب ہونے پر نہیں فرمائی پس اس سے معلوم ہوا کہ نفس محبوبیت بھی مذموم نہیں ہے اور اس سے اس حب دنیا کی بھی تفسیر کر دی جس کی حدیث حب الدنیا راس کل خطیئة (یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے) وغیرہ میں مذمت فرمائی ہے کہ اس سے مراد اجنبیت (زیادہ محبوب ہونا) کا درجہ ہے اس آیت میں تو یہ بات مصرح ہے کہ نفس حب مذموم نہیں اور ایک دوسری آیت سے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو استنباط کیا ہے وہ یہ ہے زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطر المقنطرة من الذهب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث ذلک متاع الحیوة الدنیا واللہ عنده حسن المآب (یعنی خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے چاندی کے نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی یہ دنیاوی زندگی کی استعمال کی چیزیں ہیں اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ حضرت عمرؓ کے پاس جب سامان کسریٰ کا آیا تو کروڑوں روپے کا سامان تھا آپ نے دیکھ کر یہ آیت پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ان چیزوں کی محبت مزین کر دی گئی ہے یعنی محبت ان کی طبعی امر ہے اور یہ سب حیات دنیا کا سامان ہے سو دنیا کی محبت کو امر طبعی فرمایا۔ بس حضرت عمرؓ نے اس آیت کو پڑھ کر یہ دعا کی کہ اے اللہ اس پر تو ہم قادر نہیں کہ دنیا کی محبت نہ رہے کیونکہ وہ امر طبعی ہے لیکن اے اللہ ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ یہ محبت آپ کی محبت کی معین ہو جاوے مزام نہ ہو۔ پس اس میں فیصلہ کر دیا کہ اجنبیت (زیادہ محبوب ہونا) مذموم ہے نہ کہ نفس محبوبیت اور اجنبیت کی تفسیر بھی کر دی کہ جو تیری محبت کے معارض ہو پس نتیجہ یہ نکلا کہ مال بھی اچھا اس کا کمانا بھی اچھا اس کی محبت بھی اچھی اسی طرح جاہ بھی مگر ان کی اجنبیت بری ہے۔ یعنی دنیا کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب نہ سمجھو اور اس کی علامت یہ ہے کہ دین پر دنیا کو ترجیح نہ دو اگر کسی صورت میں دنیا کے حاصل کرنے سے دین کا کوئی حرج ہوتا ہو اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہوتا ہو تو اس

صورت کو چھوڑ دو چاہے دنیا کا کتنا ہی نقصان ہو کیونکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی حقیقت کیا ہے یہی تو ہے کہ ہر فعل و ہر قول میں اس کی خوشی کو مقدم اور مطلوب سمجھیں اور اس کا نام محبت نہیں ہے کہ کسی مضمون کو سن کر رونے لگے۔ صرف رونے سے کیا ہوتا ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدی وصال صد سال سے تو اس جتنا گریستن

مال و جاہ سے متعلق عجیب تفسیری نکتہ

صرف آیت کے بعض اجزاء کا حل رہ گیا ہے وہ بھی عرض کرتا ہوں کہ مال کے قصہ میں تو منافقین کے ان اقوال کے جواب کے ختم میں لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتی ینفصوا (یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں ان پر مت خرچ کرو یہاں تک کہ وہ آپ منتشر ہو جائیں گے) لا یفقیہون (وہ سمجھتے نہیں ہیں) فرمایا اور آگے جاہ کے قصہ میں ان کے جواب کے خاتمہ میں لا یعلمون (وہ جانتے نہیں ہیں) فرمایا اس میں ایک نکتہ ہے کہ فقہ خاص ہے علم سے فقہ تو خاص ہے امور خفیہ کے ساتھ اور علم عام ہے جلی کے لئے بھی پس اب اس کی وجہ سمجھ میں آگئی ہوگی کیونکہ مال کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے ولله خزائن السموات والارض یعنی آسمان اور زمین کے تمام خزانے خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں سو اس کے لئے تو سمجھ کی ضرورت ہے کیونکہ بظاہر تو وہ ہمارے ہاتھوں میں ہے پس یہاں تامل کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر ہمارے ہاتھوں میں ہونے کے اسباب کس کے ہاتھوں میں ہیں پس چونکہ یہ ذرا خفی اور استدلال کا محتاج تھا اس لئے یہاں لا یفقیہون فرمایا اور جاہ کے قصہ میں ارشاد فرمایا ہے ولله العزة و لرسوله و للمؤمنین (یعنی عزت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین ہی کیلئے ہے) اور یہ بالکل ظاہر تھا خدا تعالیٰ کے لئے عزت ہونا تو اس لئے کہ عالم کے اندر جو تصرفات ہوتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ہمارے اختیار میں نہیں مثلاً زلزلہ ہے اور بارش ہے اب اگر کہئے کہ یہ سب کچھ صورت نوعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس بات کو تو وہ خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ طبیعت اور نیچر ذی شعور نہیں تو میں کہتا ہوں کہ طبیعت کو فاعل قرار دینے کی مثال ایسی ہوگی جیسے کہ دو شخصوں نے ایک خوبصورت گھڑی دیکھی اس پر تو دونوں کو اتفاق ہوا کہ اس کو کسی نے بنایا ہے لیکن اس میں اختلاف ہوا کہ کس نے بنایا ہے ایک نے تو یہ کہا کہ ایک بالکل اندھے لٹھے لٹکڑے بے شعور نے بنایا ہے اور ایک نے یہ کہا کہ کسی بڑے عقلمند اور کامل گھڑی ساز نے بنایا ہے تو ظاہر بات ہے کہ یہ دوسرا شخص حق کہتا ہے تو جیسا ان دونوں میں فرق ہے ایسا ہی مسلمان اور اہل سائنس میں فرق ہے کہ اہل اسلام تو ان تمام مصنوعات عجیبہ کا اللہ تعالیٰ کو فاعل کہتے ہیں اور اہل سائنس طبیعت کو جس کو کچھ شعور تک بھی نہیں وہ

خدا کے قائل نہیں اور اگر وہ یہ کہیں کہ ہم خدا کے بھی قائل ہیں اور طبیعت کے بھی تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا تعالیٰ کو فاعل مانتے ہیں تو اس کے ساتھ طبیعت کے فاعل ماننے کی ضرورت ہی نہیں ورنہ اس کی مثال ایسی ہوگی کہ کوئی کہے کہ اس گھڑی کو ایک کامل اور ایک اندھے نے مل کر بنایا ہے تو اس احمق سے کہا جاوے گا کہ کامل کے ساتھ اس اندھے کے ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ پس ایک شخص جمع نہیں کر سکتا خدا اور سائنس کو پس خدا کا غلبہ تو اس سے ثابت ہو گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سے ظاہر ہے باقی وللمؤمنین یعنی مؤمنین کا غلبہ تو اس کا جب چاہے تجربہ کر لیجئے کہ جتنا ایمان ہوگا اتنی ہی عزت بھی ہوگی۔ چنانچہ صحابہ کرام اس کا نمونہ ہیں۔ ان کے ایمان کی حالت تو یہ تھی کہ حق تعالیٰ ان کے حق میں ارشاد فرماتے ہیں - الذین ان مکنہم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ (یعنی یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں) اور ان کے غلبہ کی یہ حالت تھی کہ تمام قومیں اس کی قائل ہیں کہ ان کی برابر کوئی قوم ترقی یافتہ نہیں ہوئی اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ نمونے بہت پرانے ہو گئے ہیں تو اب بھی دیکھ لیجئے کہ جو مسلمان اپنی اصلی حالت پر باقی ہیں ان کی کتنی عزت ہے خیر خواہان ترقی کی نگاہ میں بھی وہ مخفی نہیں ہے اور وجہ یہ ہے کہ اصل تو خدا کی عزت ہے پھر جو لوگ ان کے ساتھ وابستہ ہوں گے ان کی بھی عزت ضرور ہوگی ہاں اگر کسی کو خدا ہی کی عزت کی خبر نہ ہو تو دوسری بات ہے۔

مال و جاہ کا حکم

تو خلاصہ یہ ہوا کہ مالک الاموال ہونا چونکہ کسی قدر مخفی تھا اس لئے وہاں لایفقہون (وہ سمجھتے نہیں) فرمایا اور صاحب عزت ہونا ظاہر تھا اس لئے وہاں لایعلمون (وہ جانتے نہیں) فرمایا نیز اس سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا کہ مال تو اس واسطے ہے کہ اس سے انتفاع حاصل کیا جاوے اور جاہ اس واسطے ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنے کو صبر سے بچایا جاوے نہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں پر دباؤ ڈال کر انتفاع حاصل کیا جاوے اول کی تو یہ دلیل ہے کہ جب منافقین نے کہا کہ مسلمانوں پر خرچ مت کرو تا کہ جب کھانے کو نہ ملے گا خود منتشر ہو جاویں گے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ رد فرمایا کہ خزائن کے مالک تو ہم ہیں تم اپنے مالوں سے ان کو مستفیع نہ کرو گے تو ہم اپنے خزائن سے ان کو دیں گے تا کہ وہ اس سے مستفیع ہوں اس سے معلوم ہو گیا کہ مال انتفاع کے لئے ہے اور دوسری تردید کی یہ دلیل ہے کہ منافقین نے اپنے جاہ سے مسلمانوں کو ضرر پہنچانا چاہا تھا تو حق تعالیٰ نے اس پر رد فرمایا کہ عزت تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کے لئے ہے۔ یعنی چونکہ ہم نے ان کو جاہ عنایت کی ہے اس لئے تم ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتے مؤمنین اس جاہ سے تمہارے ضرر کو دفع کر

دیں گے اس سے ثابت ہوا کہ جاہ دفع ضرر کے لئے ہے (المال والجاہ)

مناط عزت صرف مسلمان کو حاصل ہے

ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين سے کہاں کی عزت مراد ہے اور کیا اس کا مفہوم سابقین ہی پر ختم ہو گیا فرمایا کہ مناط عزت تو مسلمان ہی کو حاصل ہے اور وہ عزت آخرت کی ہے اس لئے کہ یہاں پر تو خلاف کا وقوع بھی ہوتا رہتا ہے جس عزت کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں وہ عزت آخرت ہی کی ہے کہ وہاں کمال عزت کا درجہ مسلمانوں ہی کو عطا فرمایا جاوے گا اور کفار کو انتہائی ذلت کا سامنا ہوگا۔ (ملفوظات جلد ۱)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ

ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَيْرُونَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پاویں اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں۔

تفسیری نکات

معصیت کا سبب اکثر مال و اولاد کا تعلق ہوتا ہے

اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے مسلمانوں کو مال و اولاد کی وجہ سے غفلت میں پڑ جانے سے منع فرمایا ہے اور اس بات پر آگاہ فرمایا ہے کہ جو لوگ ان چیزوں کی وجہ سے غفلت میں پڑ جائیں گے وہ خسارہ میں ہیں۔ اب آپ اپنی حالت میں غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ معصیت کا زیادہ سبب اکثر مال و اولاد ہی کا تعلق ہوتا ہے حق تعالیٰ اسی سے روکتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ مال و اولاد تمہارے لئے ذکر اللہ سے غفلت کا سبب ہو جاویں۔

یہاں ذکر اللہ سے مراد طاعت اللہ ہے چونکہ طاعات کی وضع ذکر اللہ ہی کے لئے ہے اس لئے ذکر بول کر طاعت مراد لی جاتی ہے (اور کنایہ میں نکتہ یہ ہے کہ جس طرح معصیت کا سبب غفلت ہے جس پر لا تلہکم میں دلالت ہے اور غفلت کا سبب دنیا کے ساتھ قلب کا تعلق ہونا ہے جس پر اموالکم و اولادکم دلالت کر رہا ہے۔ جس سے مراد مجموعہ دنیا ہے اور ان دونوں کی تخصیص لفظی کی یہ وجہ ہے کہ یہ دونوں دنیا کے اعظم افراد ہیں

اسی طرح طاعت کی بجائے ذکر اللہ کہنے میں اس پر دلالت ہے کہ طاعات کا سبب غفلت کا مقابل ہے یعنی ذکر اور ذکر کا سبب خدا کے ساتھ دل کا متعلق ہونا ہے جس پر اضافت ذکر الی اللہ سے دلالت ہو رہی ہے) تو اس سے یہ بات مفہوم ہوئی ہے کہ مال و اولاد اکثر طاعت سے غفلت کا سبب ہوا کرتے ہیں۔ اور جب طاعت سے غفلت ہوگی تو وہ معصیت ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معصیت کا زیادہ سبب مال و اولاد کا تعلق ہے اور جب یہ زیادہ تر معصیت کا سبب تھے جیسی تو حق تعالیٰ نے ان کی وجہ سے غفلت میں پڑنے کی ممانعت فرمائی کیونکہ حق تعالیٰ حکیم ہیں اور حکیم کا کوئی کلام حشو و زائد نہیں ہوتا۔ پس دنیا بھر کی چیزوں میں سے اموال و اولاد کو خاص طور پر ذکر فرمانا اس کی صاف دلیل ہے کہ ان دونوں کو غفلت عن الطاعات یعنی صدور معاصی میں زیادہ دخل ہے۔

تو حق تعالیٰ کا اموال و اولاد کی وجہ سے غفلت میں پڑنے کی ممانعت فرمانا ہی اس کی دلیل ہے کہ یہ زیادہ تر معصیت کا سبب ہوتے ہیں خود کلام اللہ بھی اس کو بتلا رہا ہے اور مشاہدہ بھی چنانچہ اپنی حالت میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مال و اولاد کی وجہ سے کتنے گناہ ہوتے ہیں۔

مال و اولاد کے درجے

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مال میں عمل کے دو مرتبے ہیں۔ ایک درجہ حاصل کرنے کا اور ایک اس کو محفوظ رکھنے کا اسی طرح اولاد میں بھی یہ دو مرتبے ہیں ایک اولاد حاصل کرنے کا دوسرے ان کی حفاظت کا اور ایک تیسرا مرتبہ اور ہے لیکن یہ مرتبہ اموال و اولاد میں دونوں کے لئے جدا جدا ہے پہلے دو مرتبوں کی طرح مشترک نہیں ہے چنانچہ مال میں تو تیسرا مرتبہ صرف کرنے کا ہے اور اولاد میں تیسرا مرتبہ ان کے لئے آئندہ کی فکر کرنے کا ہے۔ غرض تین درجے عمل کے مال میں ہیں اور تین درجے اولاد میں ہیں۔ مال میں تو تین عمل یہ ہیں۔

۱۔ مال کا پیدا کرنا۔ ۲۔ مال کی حفاظت کرنا۔ ۳۔ مال کا صرف کرنا۔

اور اولاد میں تین درجے عمل کے یہ ہیں۔

۱۔ اولاد کا حاصل کرنا ۲۔ پھر اس کی حفاظت کرنا۔ ۳۔ پھر اس کے لئے آئندہ کی فکر کرنا۔

تو کل چھ مرتبے ہوئے جو کہ حقیقت میں اعمال کے درجے ہیں اب ان چھ مرتبوں میں بہت مختصر انداز سے اپنی حالت کو دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ہمارا برتاؤ کیا ہے اور ان میں ہم کتنے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مثلاً مال میں تین مرتبے تھے ایک حاصل کرنا دوسرے حفاظت کرنا تیسرے صرف کرنا اب دیکھئے یہ مال کتنے ناچ نچاتا ہے۔

اہل خسارہ

یہاں کیا اچھا لفظ ارشاد فرمایا ہے فاولئک ہم الخسروں جس میں جیسا کہ ابھی مذکور ہوتا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ ایسا شخص نفع کی چیز میں ٹوٹا اٹھانے والا ہوگا۔ جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ مال و اولاد فی نفسہ ضرر کی چیز نہیں بلکہ اگر معصیت کا سبب نہ بنے تو واقع میں نفع کی چیز ہے اور یہ اشارہ اس وجہ سے ہے کہ خسارہ مطلق نقصان کو نہیں کہتے بلکہ نفع کی چیز میں نقصان کو خسارہ کہا کرتے ہیں۔ بہر حال ایسے لوگ خسارہ میں ہیں اور زیاں کار ہیں۔

اطلاق خسارہ سے اس پر بھی دلالت ہے کہ صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی یہ لوگ خسارہ ہی کے اندر ہیں کیونکہ مال و اولاد کی ایسی محبت و بال جان ہو جاتی ہے اور مال و اولاد ایسے ہی شخص کے لئے معصیت کا سبب ہو جاتے ہیں جس کو ان سے ایسی محبت ہو سو محبت مال کا و بال جان ہونا تو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کو اسی کی فکر رہتی ہے کہ آج اتنے روپے ہیں تو کل کو اتنے ہو جائیں۔ چنانچہ اپنی جان پر مصیبت ڈال ڈال کر روپیہ جوڑا جاتا ہے پھر رات کو اسے بار بار دیکھا جاتا ہے کہ اپنی جگہ پر ہے بھی یا نہیں چوروں کے کھٹکے سے راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے اور اولاد کا و بال جان ہونا آپ کو اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ایک والی ملک کی بیٹی کو دیکھا ہے کہ ان کو اپنے بیٹوں سے اس قدر محبت تھی کہ رات کو وہ سب کو ساتھ لے کر لیتے تھیں۔ جدا کر کے ان کو چین ہی نہ آتا تھا پھر جب بچے زیادہ ہو گئے اور ایک پٹنگ پر نہ آسکے تو انہوں نے پٹنگ پر سونا چھوڑ دیا سب کو لے کر نیچے زمین کے فرش پر سویا کرتی تھیں اور اس پر بھی اعتبار نہ آیا بلکہ کسی پر ہاتھ رکھ لیتیں اور کسی پر پیر اور رات کو بار بار آنکھ کھلتی اور بچوں کو نٹول کر دیکھ لیا کرتیں۔

واقعی یہ محبت تو عذاب ہی ہے پھر اگر ایمان بھی نہ ہو تو دونوں عالم میں معذب ہے اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولا تعجبک اموالہم ولا اولادہم انما یرید اللہ ان یعذبہم بہا فی الدنیا و نزهق انفسہم و ہم کافرون کیونکہ ان کو نہ دنیا میں چین ملانے آخرت میں اور اگر ایمان ہو تو خیر دنیا ہی بے لذت ہوئی آخرت انجام کار ان شاء اللہ پر لطف ہو جائے گی۔ غرض ثابت ہو گیا کہ محبت مال و اولاد کبھی معصیت کا سبب ہو جاتی ہے اور اس سے دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ ہو جاتا ہے خواہ خسارہ محدود ہو یا غیر محدود البتہ جو لوگ اعتدال کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور حقوق الہیہ کو غالب رکھتے ہیں ضائع نہیں کرتے وہ ہر وقت لطف میں ہیں بس اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ ہم کو اپنی یاد سے غافل نہ فرمائیں اور مال و اولاد کو ہمارے لئے سبب فتنہ نہ بنائیں۔ آمین۔

وَأَنْفِقُوا مِنْ تَارِزَقِكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَقَ وَأَكُنْ
مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا
وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ: اور (مجملہ طاعات کے ایک طاعت مالیہ کا حکم کیا جاتا ہے) کہ ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (حقوق واجبہ) اس سے پہلے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کی موت آکھڑی ہو پھر وہ بطور (تمنا و حسرت) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو تھوڑے دنوں کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا۔ اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اس کی میعاد (عمر کی ختم ہونے پر) آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ کو سب کاموں کی پوری خبر ہے ایسی ہی جزا کے مستحق ہوں گے۔

تفسیری نکات

حب دنیا کا علاج

اور دیکھئے خدا تعالیٰ نے مہارزقنکم فرمایا کہ بتلا دیا کہ ہم نے ہی تو دیا ہے پھر بخل کیوں کرتے ہو نیز لفظ من تبغیضہ فرما کر یہ بھی تسلی فرمادی کہ ہم سب سارا مال نہیں مانگتے۔ آگے فرماتے ہیں من قبل ان یاتئ احدکم الموت (اس سے پہلے کہ تمہیں موت آجائے) یہ وہ تعلیم ہے کہ اگر روز پندرہ بیس منٹ بھی اس کو سوچ لیں تو دنیا کی محبت بالکل جاتی رہے یعنی یہ سوچ لیا کریں کہ ایک دن ہم کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد ہم سے ہر بات کے متعلق ایک دن سوال ہوگا۔ میزان عدل قائم کی جائے گی اگر ہماری نیکیاں غالب آگئیں تو فیہا ورنہ قعر جہنم ہے اور ہم ہیں اور وہاں یہ حالت ہوگی لا یموت فیہا ولا یرحی (نہ تو موت ہی ہونہ کچھ زندگی) آگے فرماتے ہیں کہ اگر خرچ نہ کرو گے تو یہ کہو گے لولا اخرتسی الی اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین اگر مجھے تھوڑی سی مہلت دیدی جاتی تو میں خوب خیرات کرتا اور اچھے لوگوں میں سے ہو جاتا) دوسری آیت اس طلب مہلت کے جواب میں ہے کہ ولن یؤخر اللہ نفساً اذا جاء اجلها یعنی جب موت کا

وقت آجائے گا تو ہرگز مہلت نہ ملے گی اس کے بعد غفلت پر وعید ہے۔ واللہ خبیر بما تعملون لفظ خبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو دل تک کی خبر ہے اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ دین یہ ہے کہ باطن بھی درست کرو حاصل یہ ہے کہ اس بات میں ہم کو حسب دنیا کے مرض پر جتایا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ۔

غم دیں خور کہ غم غم دین ست ہمہ غمہا فرو تراز ایں ست
(دین کی فکر میں رہو کیونکہ اصل فکر دین ہی کی فکر ہے اور تمام فکریں اس سے کم درجہ کی ہیں)

خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل بخشیں (اس واعظ میں حضرت حکیم الامت دینی مدرسہ قائم کرنے یا کسی عالم واعظ کو احکام مسائل ہفتہ وار بیان کرنے کے لئے تعینات کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس عالم واعظ کی تنخواہ مقرر کر کے دینا وانفقوا میں داخل ہے۔

سُورَةُ التَّغَابُنِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِیْبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ

تَرْجُمًا: کوئی مصیبت بدوں حکم خدا کے نہیں آتی۔

تفسیری نکات

دو چیزیں حضرت حق سے مانع ہیں

الحاصل دو چیزیں حضرت حق سے مانع ثابت ہوئیں۔ نعمت اور مصیبت پھر ان کی اور بہت سی جزئیات ہیں۔ پس ان میں سے اہمات جزئیات کی فہرست ان آیات میں ارشاد فرماتے ہیں ارشاد ہے مَا أَصَابَ مِنْ مُصِیْبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ یعنی کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ کے حکم سے یہ علاج ہے مصیبت کے مانع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم مالک اور محبوب ہیں اور مصیبت ہمارے ہی حکم سے آتی ہے تو تم کو اس پر اعتراض اور چون و چرا کا حق نہیں ہے اگر حق تعالیٰ کی مالکیت اور محبوبیت اور اس کا اعتقاد کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے قلب میں راسخ ہو جاوے تو مصیبت کی شدت الم قلب کو ہرگز از جا رفته نہ کرے گی یہ نسخہ کیمیا کا اثر رکھتا ہے آگے ارشاد ہے وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَاءُ لَعَلَّہُ یَرْحَمُہُ یعنی جو شخص اللہ کے ساتھ ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس علاج کی ہدایت فرماتا ہے۔

یہ جواب ہے ایک سوال کا جو جملہ اولیٰ کو سن کر ناشی ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے علاج تو بتلا دیا اور ہمارا اس پر ایمان بھی ہے کہ مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے لیکن قلب میں اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو اس کا جواب ارشاد ہے کہ تمہاری طرف سے ایمان اور ایقان ہونا چاہیے کام تم شروع کرو یعنی یقین پختہ تم کر لو باقی ہدایت اور اثر تو ہم دیں گے۔

اسی طریق پر یہاں ارشاد ہے کہ تم کام کرو جب تم کام کرو گے تو تمہارے قلب کو ہم ہدایت کریں گے۔ آگے ارشاد ہے واللہ بكل شیء علیم ”یعنی اللہ ہر شے کو جانتا ہے“ پس یہ بھی جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں سعی کرنے والا ہے اور کون نہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہیے کہ مریض کو جو مرض پیش آتا ہے اس کا ایک علاج تو خاص اسی مرض کا ہوتا ہے اور اسی کا خاص پرہیز ہوتا ہے، مثلاً مرض اگر غلط سوداء کے سبب سے ہے تو اسی کا خاص علاج اور خاص پرہیز کرایا جاتا ہے کہ نسخہ بھی اسی کا اور جو چیزیں سوداء کے بڑھانے والی ہیں انہی سے بچنا بھی اور ایک عام علاج اور عام پرہیز ہے کہ جس کو تمام امراض میں پیش نظر رکھنا مریض کو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جو چیزیں عامۃ مضعف (کمزور کرنے والی) اور کلیۃ منافی طبیعت ہیں ان سے بچنا چاہیے یہاں تک تو حق تعالیٰ نے اس مرض یعنی مصیبت کے مانع عن الطریق (راہ سے روکنے والا) ہونے کا خاص نسخہ کہ جو ایک خاص مراقبہ ہے کہ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ارشاد فرمایا تھا آگے ایک عام نسخہ کہ جس کا تمام اوقات میں ہر شخص کو التزام کرنا چاہیے ارشاد فرماتے ہیں اس لئے کہ اگر خاص مرض کے لئے خاص نسخہ کا استعمال کیا اور قواعد عامہ صحت کی رعایت نہ رکھی تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع مرتب نہ ہوگا۔

وہ عام علاج یہ ہے کہ جس میں تندرست اور مریض سب شریک ہیں۔ یعنی واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول یعنی ہم نے جو خاص علاج خاص مرض کے لئے تم کو تعلیم کیا ہے اسی پر اکتفا نہ کرو کہ یہ مراقبہ تو کر لیا اور دیگر احکام شرعیہ میں اخلاص کیا، بلکہ اس کے ساتھ اللہ ورسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام امور میں اطاعت کرو اور یہی وجہ ہے کہ اطیعوا کا متعلق ذکر نہیں فرمایا، جس سے بقاعدہ بلاغت عموم مستفاد ہوتا ہے یعنی اگر تم نے صرف خاص اسی نسخہ کو استعمال کیا اور عام قواعد کی رعایت نہ کی مثلاً احکام کی پابندی نہ کی اور معاصی کا ارتکاب کرتے رہے تو اس خاص نسخہ کا کوئی نفع معتد بہ تم کو نہ ہوگا۔

اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے جس مضمون کو ارشاد فرمایا ہے اس کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔

اصلاح کے لئے علاج ضروری ہے توجہ شیخ کافی نہیں

اس کے بعد سمجھو کہ بعض مریض ایسے ست اور کاہل یا کنجوس یا بد پرہیز ہوتے ہیں کہ طبیب سے نسخہ لکھوانا اور دو آخریدنا پھر اس کو پکا کر پینا اور پرہیز کرنا ان کو نہایت شاق اور پہاڑ معلوم ہوتا ہے ہاں مرض کی شکایت کیا کرتے ہیں اور یہ کہا کرتے ہیں کہ دو ادارو تو صاحب ہم سے ہوتی نہیں، کوئی شخص ایسا ملے کہ چھو کر دے اور مرض جاتا رہے ایسے ہی روحانی مرض کے مریض بھی دیکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگ بکثرت ہیں کہ جو مجاہدہ

ریاضت تو اختیار کرتے نہیں ہاں یہ سوچتے ہیں کہ کوئی بزرگ توجہ ڈال دیں اور ہمارا مرض جاتا رہے ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے حالانکہ محض توجہ سے بغیر اپنے کئے کچھ نہیں ہوتا تو ایسے مریضوں کے لئے ارشاد ہے فان تولینم فانما علی رسولنا البلاغ المبین ”یعنی ہم نے جو تمہارے مرض کا علاج اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ارشاد فرمایا ہے اگر تم اس نسخہ کے استعمال کرنے اور اس کا جو خاص اور عام علاج و پرہیز ہے اس سے اعراض کرو تو یاد رکھو کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ تم کو علی الاطلاق دوا اور پرہیز بتلا دیں کہ جو طبیب کا منصب ہے کیا طبیب کا یہ تھوڑا احسان ہے کہ تم کو دیکھ کر وہ دوا بتلا دے اس کے ذمہ یہ نہیں ہے اور نہ اس کے بس میں ہے کہ شفاء اور صحت تمہارے منہ میں زبردستی ٹھونس دے اگر تم کو اپنی صحت مد نظر ہے تو جو دوا بتلائی گئی ہے ہمت سے اس کا استعمال کرو ورنہ تم جانو اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ انبیاء اور اولیاء کی توجہ میں برکت نہیں بیشک برکت ہے لیکن وہ توجہ مشروط ہے اس کے ساتھ کہ تم بھی خود کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ ورنہ محض توجہ موثر نہیں ہوگی اور نہ اس کے متوجہ کرنے کا یہ طریق ہے۔

یہ بیان تو ان لوگوں کا تھا جو کام میں لگے ہی نہیں۔ اب ایک وہ ہیں جو کام کرتے ہیں اور ان کو اس کے کچھ ثمرات بھی حاصل ہوئے مگر ان میں ایک اور مرض پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ جہل اور کمی بصیرت سے یہ سمجھے کہ یہ ثمرات ہمارے کام سے مرتب ہوئے اور اس پر ان کو ایک ناز اور عجب پیدا ہو گیا تو ان کو اس مرض کے دفعیہ کے لئے یہ ارشاد ہے اللہ لا الہ الا هو و علی اللہ فلیتوکل المؤمنون مطلب یہ ہے کہ تم کو حضرت حق اور موجود حقیقی کے سامنے اپنے وجود کا دعویٰ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ارے یاد رکھو کہ ماسوا اس کے کوئی موجود حقیقی نہیں ہے پس ناز چہ معنی (ناز سے کیا مطلب) مؤمنین کو چاہئے کہ اسی ایک ذات پر بھروسہ رکھیں اور غیر کو کہ جس میں اپنا وجود بھی ہے فانی محض اور ہالک محض سمجھیں نہ کہ اپنے وجود کا دعویٰ کریں تم کچھ بھی نہیں ہو اور نہ کچھ کر سکتے ہو یہ ہمارا ہی کام تھا کہ تم کو کام کی توفیق دی اور اس کے اسباب مہیا کر دیئے اور پھر اس میں کامیابی عطا فرمائی۔

یہاں تک مصیبت کے متعلق بیان تھا جو مانع عن الطریق ہوتی ہے اب دوسرا مانع نعمتہ ہے کہ جو اپنی زیادہ گوارائی کے سبب مانع عن الطریق (راستہ سے روکنے والی) اور ہمارے لئے رہزن بن جاتی ہے آگے اس کے متعلق ارشاد ہے یا ایہا الذین امنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدو الکم فاخذروہم ”یعنی اے ایمان والو تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے کچھ تمہارے دشمن بھی ہیں تو تم ان سے احتیاط رکھو“ ایسا نہ ہو کہ یہ تم کو اپنے اندر مشغول کر کے راہ حق سے ہٹا دیں اور گونجتیں تو بہت ہیں لیکن دنیا میں اولاد اور ازواج انسان کو بہت محبوب ہوتی ہیں اس لئے بالخصوص ان کا ذکر فرما کر ان سے تھذیر فرماتے ہیں اور اس آیت میں جواز و اجاز اور اولاد کو حق تعالیٰ نے مانع عن الطریق فرمایا ہے تو ان کا مانع ہونا و طریق سے ہے۔

اول طریق تو یہ ہے کہ اولاد اور ازواج ایسی فرمائش کریں کہ جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہیں اور یہ مغلوب ہو کر ان کا ارتکاب کرے دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ تو کچھ نہیں کہتے، مگر یہ خود ان کی محبت میں ایسا مستغرق ہے کہ وہ محبت اس کو مانع بن رہی ہے، پہلی صورت میں مانعیت اختیاری ہوگی یعنی وہ مانعیت اولاد اور ازواج کے اختیار میں ہے اور دوسری غیر اختیاری ہر چند کہ ظاہر نظر میں یہ جملہ دونوں طریق کو عام معلوم ہوتا ہے لیکن آگے جو ارشاد ہے **وَان تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا** **وَإِن اللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ** (اگر تم معاف کر دو اور سزا سے درگزر کرو اور ان کا گذشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے (رحم والا ہے) وہ قرینہ اس کا ہے کہ یہاں مانعیت اختیاری ہی مراد لی جاوے جس پر غصہ متحمل ہونے کے بعد غفود صبح کی ترغیب واقع ہوئی، چنانچہ شان نزول سے بھی اس مراد کی تعیین ہوتی ہے۔

شان نزول

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باہر کے کچھ مسلمان علوم سیکھنے کے لئے آ کر رہنا چاہتے تھے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ جو شخص کسی گھر میں بڑا ہوتا ہے وہ اگر کہیں چلا جاتا ہے تو گھر بے رونق ہو جاتا ہے، کبھی بعضی کلفتوں کا بھی خیال ہوا کرتا ہے اس لئے گھر کی بیبیاں بچے بھی چاہا کرتے ہیں کہ یہ کہیں نہ جاویں، چنانچہ ان کو بھی اسی طرح روکا، مگر بعد چندے جب یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ جو صحابہ ان سے پہلے آئے ہوئے تھے وہ اور مسائل میں بہت دور نکل گئے ان کو بڑی حسرت اور ندامت ہوئی کہ ہم بیوی بچوں ہی میں رہے اور دوسرے لوگ بہت دور نکل گئے اور ہم سے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ یہ سوچ کر ان کو اپنی اولاد اور ازواج پر غصہ آیا اور یہ ارادہ کیا کہ گھر جا کر ان کو خوب ماریں گے کہ وہ ہم کو راہ حق سے مانع ہوئے تو جس وقت انہوں نے روکا تھا اس وقت تو جزو اول آیت کا یعنی **فَاَحْذَرُوهُمْ** (پس ان سے احتیاط رکھو) نکل نازل ہوا اور جب انہوں نے ان کے مارنے کوٹنے کا ارادہ کیا تو **وَان تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا** نازل ہوا، مطلب یہ ہے کہ اگر تم معاف کر دو اور سزا سے درگزر کرو اور ان کا گذشتہ قصور معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم والا ہے تمہارے گناہ بھی بخش دے گا اور تمہارے حال پر رحم فرمائے گا۔

پس یہ قصہ اور یہ جزو قرینہ اس کا ہے کہ یہاں اختیاری طریق مراد ہے اور دوسری صورت اس سے مستحب ہوتی ہے گو وہ مدلول مطابقی نہیں ہے لیکن مدلول التزامی ضرور ہے یا یوں کہو کہ مدلول نصی نہیں تو مدلول بدلالة النص ضرور ہے اور اس صورت میں ان کو عدوا لکم فرمانا اس معنی کے اعتبار سے ہوگا کہ گو وہ مانعیت اور عداوت

کے مباشر نہیں ہیں لیکن سبب تو ہیں پس ان کو عدو فرماتا جو کہ مشرزم ہے درجہ سبب میں ہو گا نہ یہ کہ اس عداوت میں عاصی ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک کبوتر کے پیچھے بھاگا جاتا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان يتبع شیطانہ ایک شیطان ایک شیطانہ کے پیچھے جا رہا ہے اس کو شیطانہ اس لئے فرمایا کہ اس کے حق میں تو اس نے شیطان ہی کا کام دیا کہ اس کو ذکر اللہ سے غافل کر دیا پس ایسے ہی وہ اولاد اور ازواج اس محبت کے حق میں بلا قصد عدو بن گئے کہ وہ ان کی محبت میں ایسا منہمک ہوا کہ اپنے اصلی کام کو بھول گیا پس اصل مانع اور مدار منع انہما کی فی المحبت (محبت میں منہمک ہونے سے منع) ہو اور اسی مدار کے اعتبار سے کہ محبوب کو عام ہو سکتا ہے یہ مضمون جیسا کہ اولاد اور ازواج کو شامل ہے غیر اولاد اور غیر ازواج کو بھی جس شے کی محبت میں بھی یہ اپنے مولیٰ کو بھول جاوے عام ہو گیا جس کو صوفیہ نے اس عبارت سے ادا کیا ما شغلک عن الحق فهو طاغوتک ”کہ جو چیز بھی تجھ کو حق سے مانع ہو جاوے تیرا بت ہے حکیم ثنائی اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

بہر چہ از دوست و امانی چہ کفر آں حرف و چہ ایمان بہر چہ از یار دور رفتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا
”یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ بھی ہو“

اور اس شعر میں ایمان سے مراد ایمان حقیقی نہیں اس لئے کہ وہ تو عین مطلوب ہے نہ کہ مانع عن المطلوب بلکہ یہ ایسا ہے جیسے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں قل بنسما یا امرکم بہ ایمانکم (بری ہے وہ چیز جس کو تمہارے ایمان حکم دیتے ہیں اور اگر زیادہ کیا جاوے تو یہ مانعیت غیر اختیاری بھی آیت کا مدلول مطابقی بن سکتا ہے تعفوا الخ اس پر بھی منطبق ہو جاوے گا۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جیسے مباشرت مانعیت پر غصہ آتا ہے۔ بسبب مانعیت بھی موجب غیظ ہو جاتا ہے کہ اس شے کی محبت ہم کو ہمارے مقصود میں مانع ہوئی ہے اس کو ہی اڑانا چاہئے باقی رہا شان نزول تو اس کا جواب یہ ہے کہ العبرة لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد (عموم الالفاظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ خصوص الالفاظ کا پس اس صورت میں آیت مانعیت کی دونوں طریق کو دلالت مطابقی سے شامل ہو جاوے گی اور تعفوا و تصفحوا الخ بھی بلا تکلف دونوں پر منطبق ہو جاوے گا یہ دو طریق تو مانعیت کے ازواج اور اولاد کی حیات میں تھے کہ یا تو اولاد اور ازواج نے اس کو خود روکا تھا یا یہ خود ان کی محبت میں اس قدر مغلوب تھا کہ اللہ کی یاد سے رک گیا تھا تیسری صورت ان کی مانعیت کی ایک اور ہے کہ اولاد یا ازواج مر گئے یہاں مصیبت اور محبت دونوں مانع جمع ہو گئے محبت تو مقتضی ہے یاد کو کہ اس کی وجہ سے یہ سب اشغال سے معطل ہو گیا اور محبوب کے فقدان کے الم کا مصیبت ہونا ظاہر ہی ہے اور وہ بھی شامل عن الحق (اللہ کے ذکر سے روکنے والا) ہو رہا ہے اور جاننا چاہئے کہ حیات محبوب میں جو مانعیت ہے

اور ممت محبوب میں جو مانعیت ہے یہ دونوں مانع نفس مانعیت میں تو مشترک ہیں لیکن ان میں ایک فرق ہے جس پر نظر کر کے بعد ممت والی مانعیت زیادہ عجیب اور فہم سلیم سے زیادہ بعید ہے وہ یہ کہ محبوب کی حیات کی صورت میں تو فی الجملہ گوہ حقیقت نہ سہی مگر ظاہر اہ نسبت حالت ممت کے یہ شخص کسی قدر معذور بھی ہے کہ محبوب مجازی کا کچھ قرب ہے کچھ مشاہدہ ہے یا امید مشاہدہ ہے یہ محرک ہو گیا ہے اس کی محبت میں ایسا جتلارہنے کا کہ وہ محبت اس کو محبوب حقیقی سے مانع ہو گئی مگر اسکے فقدان و ممت کی صورت میں تو کوئی عذر نہیں ہے اس لئے کہ اس سے مفارقت بھی ہو گئی اور اس کی محبت کا کوئی محرک بھی نہ رہا ادھر دوسرا محبوب یعنی محبوب حقیقی موجود ہے اور اس سے تسلی کرنا ممکن بھی ہے تعجب ہے کہ جو محبوب اس کے پاس موجود ہو اس میں تو مشغول ہو کر تسلی نہ پائے اور محبوب مجازی جو کہ سامنے موجود بھی نہیں اس میں کھلے۔ واقعی یہ شخص معذور نہیں اور یہ ساری خرابی غیر اللہ کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق بڑھانے کی ہے اور یہ محبت بعض مرتبہ شرک کے درجے میں پہنچ جاتی ہے۔

یہ تمام تر کلام محبت کے بارہ میں تھا تیسرا مانع کہ وہ بھی فرد نعمت کا حب مال ہے اس لئے آگے اس کو ارشاد فرماتے ہیں انما اموالکم و اولادکم فتنۃ واللہ عنده اجر عظیم ”یعنی تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں اور اللہ کے نزدیک اجر عظیم ہے“ چونکہ اولاد کا فتنہ زیادہ سخت ہے اس لئے یہاں اس کو مکرر ارشاد فرمایا اور نیز اس لئے کہ اموال کے ساتھ محبت کا ایک منشاء اولاد کی محبت بھی ہے اس لئے بھی اولاد کو مکرر ذکر فرمایا اور مال کی محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک تو بضرورت حدود شرعیہ کے اندر یہ مذموم اور مانع نہیں اور ایک وہ محبت جس کے غلبہ میں حقوق شرعی فوت ہوتے ہیں چنانچہ آج کل یہ بلا بھی عام ہے جو کہ حب مال کا شعبہ ہے وہ یہ کہ حقوق العباد میں بہت کوتاہی کرتے ہیں اس زمانہ میں وہ لوگ بڑے باہمت ہیں جو ڈھونڈھ موٹ کر اہل حقوق کو حقوق پہنچاتے ہیں۔

آج کل بڑے بڑے دینداروں کی یہ کیفیت ہے کہ نمازیں بہت پڑھیں گے حتیٰ کہ نوافل اور تسبیح و ذکر و شغل کے پابند لیکن حقوق کے ادا کرنے میں تساہل حتیٰ کہ بعض علماء کا یہ حال ہے کہ کسی مردہ کے ورثاء اس کا مال ان کے مدرسہ یا مسجد میں لا دیں گے تو بے تکلف لے لیتے ہیں نہ اس کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس شخص کے کتنے وارث ہیں اور سب کی رضامندی ہے یا نہیں کوئی ان میں نابالغ تو نہیں ہے اس بلا میں باستثناء خاص خاص بندوں کے سب ہی مبتلا ہیں خصوصاً مدارس میں تو اس چندہ کا قصہ بڑا نازک ہے۔

وَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ يَهْدِ اللَّهُ قَلْبَهُ ۗ

ترجمہ: کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت کر دیتے ہیں۔

تفسیری نکات

ازالہ غم کی ہدایت

یہ تو ترجمہ ہے مگر اصطلاحی لفظوں میں اس کا حاصل یہی ہے کہ تصحیح عقائد سے ہدایت ہو جاتی ہے کیونکہ ایمان کے یہی معنی ہیں اب رہا یہ کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تصحیح عقائد سے غم زائل ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں ازالہ غم کا کوئی ذکر نہیں صرف ہدایت کا ذکر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ بیشک صرف ہدایت کا ذکر ہے مگر ہدایت کے لئے مفعول کی ضرورت ہے جو اس جملہ میں مذکور نہیں۔ تو سیاق و سباق میں تامل کر کے مفعول مقدر کرنا چاہئے سو اس سے پہلے ارشاد ہے۔ ما اصاب من مصیبة الا باذن اللہ کہ کوئی مصیبت بدون اذن خداوندی کے نہیں پہنچتی۔ اس کے بعد ہے۔ ومن یؤمن باللہ ینقلبہ کہ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اس کے دل کو ہدایت ہو جاتی ہے۔ یعنی اس مضمون سابق کی کہ وہ مسئلہ قدر ہے اس کو ہدایت ہو جاتی ہے اس طرح سے اس کو مسئلہ تقدیر پر جزم و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے یا یوں کہو کہ اس کو ازالہ غم کی ہدایت ہو جاتی ہے کیونکہ ما اصاب من مصیبة الا باذن اللہ کا مضمون ہی ایسا ہے جس کے استحضار سے مصیبت و غم زائل ہو جاتا ہے تو مضمون مذکور اور ازالہ غم کی ہدایت گویا دونوں مترادف ہیں اور اس کی بڑی دلیل مشاہدہ ہے۔ جو لوگ اس مضمون پر جازم و مطمئن ہیں ان کی حالت کو دیکھ لیا جائے کہ وہ مصائب و حوادث میں کیسے مستقل و صابر و شاکر رہتے ہیں۔ غرض تصحیح عقیدہ کو ازالہ غم میں بڑا دخل ہے۔

محل مصائب

مگر ازالہ سے مراد تسہیل و تخفیف ہے اور یہی مطلوب ہے۔ زوال کلی مراد نہیں۔ کیونکہ طبعی غم کا زوال مقصود نہیں بلکہ اس کی خفت مطلوب ہے۔ ہاں اس خفت کے لئے لازم یا مثل لازم کے زوال ہے اور مثل لازم اس لئے کہا کہ بعض ضعیف طبائع کو عمر بھر بھی خفیف سا غم یا کلفت رہتی ہے مگر اس کا ازالہ خود مطلوب ہی نہیں کیونکہ اس سے زیادہ اذیت نہیں ہوتی اور تھوڑی بہت کلفت تو کھانے میں بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے خصوصاً آرام طلب لوگوں کو تو منہ میں لقمہ لے جانا ہی پارگراں ہے۔

یہ تقریر تو اس تقدیر پر تھی کہ یہ دل قلب کے لئے مفعول مقدر کیا جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ مقطوع عن المفعول ہو اور معنی یہ ہوں۔ من یومن باللہ یحصل لہ الہدایۃ ای الوصول الی المطلوب کہ جس شخص کے عقائد صحیح ہوں اس کے دل کو ہدایت ہو جاتی ہے یعنی وہ ان مصائب وحوادث کے حکم و اسرار سے باخبر ہوتا ہے اس لئے اس کی مصیبت مصیبت نہیں رہتی کیونکہ کوئی مصیبت اپنی ذات سے مصیبت نہیں بلکہ محل کے اعتبار سے مصیبت ہے ممکن ہے کہ جو چیز ایک محل میں مصیبت ہو دوسرے محل میں مصیبت نہ ہو چنانچہ قطع جلد تندرست کے لئے مصیبت ہے مگر مریض محتاج اپریشن کے لئے صحت ہے۔ فاقہ تندرست کو مصیبت ہے اور مریض بدبھمی کے لئے راحت و صحت ہے و علی ہذا۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ

ترجمہ: تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے۔

تفسیری نکات

آلہ امتحان

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ نکاح کے تاکد میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ النکاح من سنتی اور نکاح سے اولاد ہونا ظاہر ہے مگر اولاد کے لئے آیت شریفہ ہے انما اموالکم و اولادکم فتنۃ تو پھر سنت پر عمل کر کے فتنہ سے کیونکر بچاؤ ہو سکتا ہے مولانا نے جواب میں فرمایا کہ فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ مضرت کے نہیں۔ پس یہ آلہ ہے امتحان کا جس کا انجام بعض کے لئے یعنی مطیع کے لئے اچھا اور بعض کے لئے یعنی عاصی کے لئے برا۔

مال و اولاد کے فتنہ کا مفہوم

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ ایک صوفی طے اموال کی ندمت اولاد کی ندمت کرنے لگے اور استدلال میں یہ آیت پڑھی انما اموالکم و اولادکم فتنۃ میں نے کہا فتنہ کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے جو آپ کا ہے کہ یہ چیزیں ہر حال میں مضرت ہیں۔ دوسرے اس سے پہلے قرآن میں یہ بھی تو ہے ان من ازواجکم و اولادکم عدو الکم فاحذروہم تو بیوی کو علی الاطلاق مذموم کیوں نہیں سمجھتے حسین ہی کیوں تلاش کی جاتی ہے جیسی بھی مل جائے اندھی ہو کانی ہو چڑیل ہو سڑیل چپک منہ داغ ہو اس پر راضی رہنا چاہیے یہ غیر محقق لوگ

ایسی ہی باتیں لئے پھرتے ہیں محقق کا تو یہ مشرب ہے کہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرتے ہیں اور اذان شرعی کے بعد اس سے استغناء و اعراض نہیں کرتے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا

لِأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُوقْ شَيْئًا نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: سو ڈرو اللہ سے جہاں تک ہو سکے اور سنو اور مانو اور خرچ کرو اپنے بھلے کو اور جس کو بچا دیا اپنے جی کے لالچ سے سو وہ لوگ وہی مراد کو پہنچے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

تفسیری نکات

اجر عظیم

اس کے قبل فرمایا تھا واللہ عنده اجر عظیم اس سے یہ آیت مرتبط ہے اور ضرورت ارتباط یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں (ف) ہے جس کا ترجمہ ہے پس اور لفظ پس یا لفظ تو ایسے مقام پر آتا ہے کہ مرتبط ہو ماقبل سے اور یہاں ماقبل سے ربط کے لئے تو سب سے پہل جزو واللہ عنده اجر عظیم ہے۔ یعنی جب اللہ کے یہاں بہت بڑا اجر ہے تو تم کو چاہیے کہ اس پر نظر کر کے خدا سے ڈرا کرو کیونکہ اس کا اجر عظیم ہونا مقتضی اس کا ہے کہ تم وہ برتاؤ کرو کہ اس اجر کے مستحق ہو جاؤ یعنی استحقاق بسبب وعدہ خداوندی کے نہ اس لئے کہ اس کے ذمہ کسی کا حق واجب ہے اور کیونکہ کسی کا حق ہو سکتا ہے اگر حق ہوتا عمل کے سبب ہوتا اور عمل کی کیفیت یہ ہے کہ وہ محض بظاہر آپ کی طرف منسوب ہے ورنہ حقیقت میں وہ آپ کا عمل ہی نہیں کیونکہ تمام آلات ہاتھ پیر جن سے عمل ہوتا ہے سب اسی کے دیئے ہوئے ہیں۔

نیاوردم از خانہ چیزے نخت تو دادی ہمہ چیز من چیزتست

اس میں چند صیغے امر کے فرمائے جس سے معلوم ہوا کہ ان میں ہر مامور بہ ضروری ہے۔

فاتقوا اللہ ما استطعتم الخ پس اس میں ایک امر تو یہ ہے کہ خدا سے ڈرو جتنا تم سے ہو سکے دوسرا امر فرمایا ہے کہ سنو اور تیسرا امر ہے اطاعت کرو اور چوتھا یہ ہے کہ خرچ کرو تمہارے لئے بہتر ہوگا اور یہ یا تو اخیر کے ساتھ ہے یا سب کے ساتھ ہے پس یہ چار امر ہیں اور ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادا امر سب الگ الگ ہیں تو اگر ایسا ہوتا بھی تو بھی مضائقہ نہیں تھا لیکن واقع میں اس میں ربط بھی ہے اور اس سبب مجموعہ سے مقصود

ایک ہی چیز ہے جو کہ اصل ہے یعنی اطاعت اور یہ دوسرے اوامر اس کے طرق ہیں۔
تفصیل اطاعت کی یہ ہے کہ اول دیکھا جاوے کہ ہماری ترکیب کتنے اجزاء سے ہے تو انسان میں دو چیزیں ہیں ایک جوارح ایک قلب یا ایک ظاہر اور ایک باطن تو خدا نے اس اطاعت کی تفصیل فرمائی کہ اول اتقوا اللہ فرمایا ہے یہ تو قلب کے متعلق ہے۔

تقویٰ کی حقیقت

سو تقویٰ حقیقت میں یہ نہیں جس کو لوگوں نے تجویز کیا ہے تقویٰ وہ ہے کہ جو حدیث میں ہے الا ان التقویٰ ههنا و اشار الی صدره ہاں ظاہری درستی بھی اس پر مرتب ہوتی ہے تو اصل لغت میں اس کی حقیقت ہے۔ ڈرنا اور شریعت میں ایک مضاف الیہ کی تخصیص ہے کہ خدا سے ڈرنا پس تقویٰ تو افعال قلوب سے ہے تو فاتقوا اللہ میں تو یہ فرمایا کہ قلب کو درست کرو جو کہ قلب کی اطاعت ہے اس کے بعد فرمایا ہے واسمعوا یہ جوارح کا فعل اور اس کی اطاعت ہے پس حاصل یہ ہوا کہ تم ظاہر اور باطن دونوں کو اطاعت میں مشغول کرو۔ یہ ہے اصلاح تو خدا تعالیٰ نے ہم کو دو عملے دیئے ہیں ایک ظاہر ایک باطن تو اطاعت میں سب ہی مقید ہیں چنانچہ خداوند جل جلالہ نے اتقوا کے ساتھ اسمعوا فرمادیا کہ دونوں ہی درست ہوں اور اسی میں مقاسمہ کے طور پر سارے جوارح لے لئے کیونکہ جارح سمع و دیگر جوارح میں کوئی وجہ فرق کی نہیں پھر اس کے بعد اطیعوا فرمادیا کہ کوئی کسی خاص عمل کی تخصیص نہ سمجھ جاوے اور اطیعوا میں ایک بات ہے طالب علموں کے سمجھنے کی وہ یہ کہ اطاعت مشتق طوع سے ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت کو تو ترجمہ اس کا یہ ہے کہ خوشی سے کہنا مانو اور خوشی قلب میں ہوتی ہے اور کہنا ماننا جوارح کو بھی عام ہے پس اس میں بھی جمع بین الظاہر والباطن ہو گیا۔

اطاعت کی اقسام

آگے ارشاد ہے انفقوا خیر الانفسکم اس میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ طاعات دو قسم کی ہیں ایک مالی ایک بدنی۔

ہر چند کہ اطیعوا میں سب آگئے ہیں لیکن چونکہ حرص ہم میں غالب ہے تو خدا تعالیٰ نے اتقوا سے پرہیز بتلایا ہے کہ یہ پرہیز کرو۔

اکثر طبائع میں یہ حب غیر برنگ حب مال زیادہ ظاہر ہوا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے ایک لطیف طریقہ بتلایا ہے اس کے نکلنے کا کہ خرچ کیا کرو واللہ العظیم کوئی بتلا نہیں سکتا کیا خبر ہو سکتی ہے کسی کو معافی کے خواص کی صاحبو! حکماء صرف خواص اجسام کو در یافت کر سکے مگر انبیاء علیہم السلام نے خدا کے بتلانے سے معافی کے خواص

کو بتلایا ہے مثلاً حسب مال کے خاصہ کو دیکھ کر اس کا علاج بتلایا ہے کہ خرچ کیا کرو اور علاج بھی کیسا آسان کہ جس میں نہ محنت ہو نہ مشقت ہر شخص کر سکے۔

محققین کے یہاں ہر شخص کو اس کی حالت کے موافق تعلیم دی جاتی ہے قوی کو اس کے موافق ضعیف کو اس کے موافق جب اس میں اس قدر سہولت ہے تو یہ دولت اصلاح باطن ہر شخص کو حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ حسب دنیا کو نکالنے کے لئے ظاہر کسی مشکل پیش آئی تھی مگر خدا تعالیٰ نے اس کا بھی کیسا آسان طریقہ بتلادیا کہ خرچ کیا کرو تو اب کیسی جامع تعلیم ہو گئی کہ مرض بتلایا دو بتلانی پر ہیز بتلادیا اس لئے ان کو اس جگہ جمع کر دیا گیا اور ہر ایک میں مناسب مناسب اور مفید رعایتیں فرمائیں میں ہر ایک کو مفصل ذکر کرتا مگر وقت گزر گیا ہے اور مجملاً ذکر بھی ہو گیا ہے اس لئے میں سب کا قدرے قدرے بیان کرتا ہوں پس اتقوا اللہ میں یہ قید لگائی کہ ما استطعتم جس سے معلوم ہوا کہ ہم کو اسی قدر کا مکلف کیا گیا ہے کہ جس قدر طاقت ہو اگر اس پر کوئی کہنے لگے کہ ہم کو تو صرف ایک ہی وقت کی نماز کی طاقت ہے تو جواب یہ ہے کہ تم نے صرف اسی کو دیکھا ہے دوسرے مقام کو نہیں دیکھا کہ حق تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز کا مکلف فرمایا اور پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ لا یكلف اللہ نفساً الا وسعہا اس سے صاف معلوم ہوا کہ جتنے کا مکلف فرمایا ہے اس کی طاقت ضرور ہے پس اب جو یہاں فرمایا استطعتم تو مطلب یہ ہوا کہ جتنا تم کو بتلایا سب کرو اور یہ عنوان دل بڑھانے کے لئے فرمایا جیسے کوئی نوکر سے کہے کہ تم سے یہ کام تو جو ہو سکتا ہے وہ تو کرو تو گویا تصریحاً متنبہ کیا کہ تم سے تو ہو سکتا ہے تو یہ شبہ تو دفع ہو گیا۔

إِنْ تَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يَضْعَفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ

شَكُورٌ حَلِيمٌ ۝ عَلِيمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ: اگر تم اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح (خلوص کے ساتھ) قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا قادر دان ہے (کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے) اور بڑا بردبار ہے۔ پوشیدہ اور ظاہر (اعمال) کو جاننے والا اور زبردست (اور) حکمت والا ہے۔

تفسیری نکات

ایضاعف کا مفہوم

ایضاعف سے شاید آپ نے دونا سمجھا ہو گا یہ نہیں بلکہ مضاعف کے معنی مطلق بڑھانے کے ہیں خواہ دونا ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ دونا سے زیادہ کو بھی یہ لفظ شامل ہے کیونکہ دوسری آیت میں اس کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے۔ مثل الدین ینفقون اموالہم فی سبیل اللہ کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائة حبة واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک دانہ سے سات خوشہ پیدا ہوں اور ہر خوشہ میں سو سو دانہ ہوں تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک چیز دینے سے سات سو حصے اس کے آخرت میں ملیں گے اس کے بعد ارشاد ہے واللہ یضاعف لمن یشاء کہ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں حدیث میں اس کی زیادہ توضیح ہے کہ اگر ایک چھوڑا اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو حق تعالیٰ شانہ اس کو پرورش فرماتے ہیں اور بڑھاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ احد پہاڑ کے برابر کر کے اس شخص کو دیں گے اس حدیث کو ہم لوگ پڑھتے ہیں مگر غور نہیں کرتے غور کر کے دیکھئے اگر احد پہاڑ کے تم ٹکڑے کرنے لگو چھوڑا کے برابر تو وہ ٹکڑے کس قدر ہوں گے اور خصوصاً اگر ٹکڑے چھوڑا کی جسامت کے برابر نہ کئے جاویں بلکہ چھوڑا کے وزن کے برابر لئے جاویں تو احد پہاڑ چونکہ پتھر ہے اس کا ذرا سا ٹکڑا وزن میں چھوڑا کے برابر ہو جائے گا تو اس صورت میں تو اور بھی زیادہ ٹکڑے ہوں گے تو اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ تضاعف سات سو یا سات سو کے مضاعف تک محدود نہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اکثر ایسے موقع میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مثال سے سمجھ لو اور حقیقت میں وہ ثواب اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے تو احد کے ٹکڑوں کے ساتھ بھی ثواب محدود نہیں تو دیکھئے یہ حساب کہاں تک پہنچتا ہے اسی کو فرماتے ہیں مولانا۔

خود کہ باید اس چنیں بازار را کہ بیک گل مہری گزار را
 نیم جاں بستاند و صد جاں دہد انچہ درو ہمت نیابد آں دہد
 حضرت یہ تو مال بھی اور جان بھی سب انہی کی ہے وہ مفت مانگیں تب بھی سب قربان کر دینا چاہئے تھا
 چہ جائیکہ اس قدر ثواب کا وعدہ بھی ہے۔

ہیچو اہلعلیل پیشش سرینہ شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ
 ہرکہ جاں بخشہ اگر رواست نائب ست و دست او دست خداست

شکور حلیم کا مفہوم

واللہ شکور حلیم اگر تم حق تعالیٰ کو قرض حسن دو گے تو تمہاری مغفرت کر دیں گے اور اس کو مضاعف کر دیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ قدر دان ہیں (قدر دانی تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا قدر دانی ہوگی اس کی تفصیل ابھی بیان ہو چکی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں حلیم کے وہ بردبار بھی ہیں یہ صفت اس لئے بیان فرمائی کہ طاعات میں جو کوتاہی ہو جاتی ہے اس پر نظر نہیں فرماتے بوجہ حلیم ہونے کے دوسرے یہ کہ بعض لوگ ایسے بھی تو ہیں جو طاعات کرتے ہی نہیں بلکہ معاصی میں مبتلا ہیں تو اہل طاعات کی قدر فرماتے ہیں اور اہل معاصی سے حلم اور بردباری فرماتے ہیں کہ ان کو جلدی سزا نہیں ملتی تو حلیم بڑھا کر اہل معاصی کو متنبہ کر دیا کہ سزا نہ ملنے سے یہ نہ سمجھیں کہ وہ مستحق سزا نہیں بلکہ بوجہ حلم کے ان کو جلدی سزا نہیں ملتی پھر کسی وقت یعنی آخرت میں سزا دیں گے اور کبھی تھوڑی سی سزا دنیا میں بھی دیدیتے ہیں اور ایک نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے بہت عجیب بات ہے وہ یہ کہ شکور حلیم کو طاعات و معاصی دونوں کے اعتبار سے نہ مانا جائے بلکہ صرف ایک ہی امر کے متعلق مانا جائے یعنی طاعات ہی کے متعلق دونوں صفتوں کو قرار دیا جائے مطلب یہ کہ حق تعالیٰ شانہ تمہاری طاعات کو بوجہ قدر دانی اور حلم کے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ہماری طاعات کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ وہ ہماری طاعت ہے اور ہم ناقص ہیں تو اس لحاظ سے اس کو گستاخی کہا جائے تو عجب نہیں اور میں اس کو ایک مثال سے عرض کرتا ہوں آپ کو بعض نوکر ایسے نالائق ملے ہوں گے کہ وہ موافق آپ کی طبیعت کے کام نہیں کرتے ہوں گے اس لئے کہ ان کو سلیقہ اور تمیز نہیں اگر پنکھا جھلتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سر میں مار دے گا ہر دفعہ آپ اپنے سر کو بچاتے ہیں تو اب دو موقعے پیش آتے ہیں ایک تو یہ کہ آپ اس کو ڈانٹ دیں اس وقت تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میری خدمت سے راحت نہیں پہنچی بلکہ تکلیف ہوئی ایک موقع یہ ہے کہ آپ اپنے حلم سے خاموش رہیں اس وقت وہ سمجھتا ہے کہ میں نے میاں کو ایک گھنٹہ کھڑے ہو کر پنکھا جھلاتا تو میں مستحق جزا و انعام کا ہوں حالانکہ

یہ نہیں سمجھتا کہ اس گھنٹہ بھرتک میاں کو ستایا اس سے تو خالی ہی بیٹھا رہتا تو اچھا تھا اس کی خدمت گستاخی کا حکم رکھتی تھی ایسی ہی ہماری عبادت ہے کہ وہ مواقع میں عبادت اور طاعت کہنے کے لائق نہیں۔

طاعات کے دو پہلو

کہ ہماری طاعات میں دو پہلو تھے ایک کے اعتبار سے شکور فرمایا گیا اور دوسرے کے اعتبار سے حلیم فرمایا گیا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں عالم الغیب والشہادۃ یعنی حق تعالیٰ جاننے والے ہیں پوشیدہ اور ظاہر کے یہ اس لئے فرمایا گیا تاکہ لوگ خلوص سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کریں کیونکہ دار و مدار ثواب کا خلوص پر ہے اور خدا تعالیٰ کو دلوں کی باتوں کا علم پورا پورا ہے اس کے سامنے کوئی حیلہ بہانہ چل نہیں سکتا۔

اس کے بعد ارشاد ہے العزیز الحکیم یعنی حق تعالیٰ شانہ غالب ہیں صاحب حکمت ہیں یہ اس لئے فرمایا کہ اجر دینے کا جو پہلے وعدہ فرمایا تھا اس پر شاید کسی کو یہ شک ہوتا کہ معلوم نہیں دیں گے بھی یا نہیں تو فرماتے ہیں کہ خدا ہر شے پر غالب ہے۔ ان کو ایفاء وعدہ سے کوئی امر مانع نہیں اس کا وعدہ خلاف نہیں ہو سکتا اس پر پھر کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ جب غالب ہیں ابھی کیوں نہیں دیدیتے دیر کس لئے کی جاتی ہے اس شبہ کو حکیم سے قطع فرمادیا کہ وہ صاحب حکمت ہیں ان کا ہر کام حکمت سے ہوتا ہے اس دیر میں بھی حکمت ہے۔

اولاد کا فتنہ مال سے سخت ہے

کیوں کہ اولاد کا فتنہ زیادہ سخت ہے اس لئے یہاں اس کو مکرر ارشاد فرمایا اور نیز اس لئے کہ اموال کے ساتھ محبت کا ایک منشاء اولاد کی محبت بھی ہے۔ اس لئے بھی اولاد کو مکرر ذکر فرمایا اور مال کی محبت کے بھی دو درجے ہیں ایک تو بضرورت حدود شرعیہ کے اندر یہ مذموم اور مانع نہیں اور ایک وہ محبت جس کے غلبہ میں حقوق شرعی فوت ہوتے ہیں چنانچہ آج کل یہ بلا بھی عام ہے جو کہ حسب مال کا شعبہ ہے وہ یہ کہ حقوق العباد میں بہت کوتاہی کرتے ہیں۔

تقویٰ

اور وہ کل تین چیزیں ہوں گی ایک مصیبت اور نعمت کے افراد میں سے ایک اولاد و ازواج دوسرا مال اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مانعیت ان کی بوجہ افراد محبت و تاثر کے ہے اب اس مقام پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ محبت اور تاثر تو قلب میں ہوتا ہے اور وہ اختیار میں نہیں ہے یہ تو سخت مصیبت ہوئی تو آگے اس کا جواب ارشاد ہے فاتقوا اللہ ما استطعتم مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کون کہتا ہے کہ تم آج ہی جنید جیسے ہو جاؤ میاں جس قدر تم سے ہو سکے تقویٰ کرتے رہو رفتہ رفتہ مطلوب تک پہنچ جاؤ گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت فاتقوا اللہ حق

نفاہ کی ناسخ ہے لیکن میرے تفسیر کر دینے سے معلوم ہوا ہوگا کہ فاتقوا اللہ حق نفاہ کو منسوخ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب آیت فاتقوا اللہ حق نفاہ نازل ہوئی تو صحابہ یہ سمجھے کہ امر کا صیغہ اس میں فور کے واسطے ہے اسی وقت اللہ سے ایسا درجہ تقویٰ حاصل کر لو جو حق ہے اس کا اور قاعدہ تو یہی ہے کہ امر فور کے لئے نہیں ہوتا لیکن گاہ گاہ قرآن سے فور بھی محتمل ہوتا ہے پس صحابہ اس احتمال سے کانپ اٹھے اس لئے جو حق ہے تقویٰ کا وہ فوراً کیسے حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد یہ آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم بطور اس کی تفسیر کے نازل ہوئی مطلب یہ ہوا کہ حق نفاہ درجہ منتہی کا ہے اور اس مامور بہ کا حاصل کرنا علی الفور واجب نہیں ہے بلکہ بقدر استطاعت تقویٰ اختیار کرو اور بتدریج اس میں جتنی جتنی ہو سکے ترقی کرتے رہو حتیٰ کہ جو تقویٰ مطلوب ہے اس پر جا پہنچو گے پس اس تقریر پر ان دونوں آیتوں میں نسخ اصطلاحی نہیں ہوا اور بعض روایات میں جو یہاں نسخ کا لفظ آیا ہے وہ بالمعنی المصطلح نہیں بلکہ بالمعنی الاعم ہے جو تفسیر مبہم کو بھی شامل ہے اب یہاں پر یہ غلجان ہوا کہ تقویٰ کا سلسلہ ایسا دراز ہے کہ اس کے علوم موقوف علیہا اور اعمال موتی بہا کا احاطہ حاصل نہیں تو عمل کی کیا صورت ہو آگے اس کا دفعیہ فرماتے ہیں واسمعوا واطیعوا یعنی تم اپنا دستور العمل یہ بنا لو کہ سنو اور مانو اور اپنی طبیعت کو پریشان نہ کرو جب کوئی بات سنی فوراً اس پر عمل شروع کر دو گو اس وقت احاطہ نہ ہو البتہ یہ نہ کرو کہ سن کر غفلت اور عمل میں کوتاہی کرو۔

پس واسمعوا واطیعوا میں ایک اعلیٰ درجہ کا دستور العمل بتلا دیا گیا اور چونکہ مال انسان کو بالطبع محبوب ہے اور نیز انسان کے اندر بخل بھی طبعی سا ہے اس لئے تقویٰ کے افراد میں سے تعیم بعد تخصیص کے طور پر اہتمام کے لئے اس کو مستقل طور سے بھی ارشاد فرماتے ہیں۔ وانفقوا خیر الانفسکم یعنی اپنے نفسوں کے لئے مال خرچ کرو اور لانفسکم اس لئے فرمایا کہ شاید تم یہ سمجھنے لگو کہ اس کا نفع حق تعالیٰ کا ہوگا سو یاد رکھو کہ اس انفاق کا نفع تمہاری ہی طرف عائد ہوگا ہم تو نفعی بالذات ہیں اور چونکہ جملہ کلام سابق یعنی اسمعوا واطیعوا سے بعضے کوتاہ ہیں ممکن ہے کہ یہ سمجھیں کہ صرف ظاہر احکام پر عمل کر لینے سے بس مقصود حاصل ہو جائے گا۔

تزکیہ نفس

اس لئے آگے ان اعمال ظاہرہ کی روح کی تعیین فرماتے ہیں ارشاد ہے ومن یوق شح نفسه فاولئک ہم المفلحون مطلب یہ ہے کہ صرف اعمال ظاہرہ کی صورت پر مت رہو بلکہ روح کو بھی حاصل کرو اور اس کو ہم ایک مختصر عنوان میں بیان کرتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص نفس کی حرص سے بچا لیا جائے تو یہ لوگ ہیں کامیاب یعنی جب نفس کے اندر اس قدر سکتہ پیدا ہو جائے کہ غیر اللہ کا تعلق اس میں نہ رہے اور غیر پر نہ گرے تو جانو کہ فلاح حاصل ہو گئی اور یہ روح عادت الہیہ میں حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کی خدمت و صحبت سے

اور یوق بصیغہ مجہول فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا ومن یوق شح نفسه (جو شخص اپنے کو بچائے حرص سے) اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ وقلیۃ (مگہداشت) تمہارا کام نہیں ہے بلکہ بچانے والے ہم ہیں یعنی اپنے پرناز نہ کرنا ہم ہی ہیں جو مقصود پر پہنچا دیتے ہیں جس کا ظاہری واسطہ اہل اللہ ہیں اس سے داوم مجاہدہ کی حد بھی بیان فرمادی کہ جب تک نفس کے اندر حصر اور شح باقی رہے اس وقت تک مجاہدہ نہ چھوڑو اور چونکہ نفس کے اندر حرص اور شح جلی ہے کہ کسی طرح قابل زوال نہیں اس لئے مجاہدہ بھی مدۃ العمر ہی ضروری ہوا البتہ بعد چندے اس میں زیادہ مشقت نہیں رہتی اور چونکہ ومن یوق شح نفسه الخ اس کی تمام حرصیں جو غیر اللہ کے متعلق ہیں چھڑانا مقصود ہے اور یہ جب تک کہ نفس کو اس سے بڑی چیز کی حرص نہ دلائی جائے یہ نکل نہیں سکتی جیسے کسی کے پاس پیسہ ہو تو اس کو جب تک روپیہ یا گنی کالا لچ نہ دیا جائے اس کو چھوڑ نہیں سکتا اس لئے آگے ثمرہ اعمال کی خیر کی حرص دلاتے ہیں۔

حرص کی قسمیں

یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ مطلق حرص مذموم نہیں بلکہ حرص کی دو قسمیں ہیں غیر اللہ کی حرص تو مذموم ہے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات کی حرص محمود ہے چنانچہ ارشاد ہے ان تقرضوا اللہ قرضاً حسناً یضاً عفہ لکم یعنی ہم جو تم سے تمہارے اموال اور اولاد اور ازواج سے تمہاری جان چھڑانے (یعنی قلب سے نکالنے) کے لئے آیات سابقہ میں ارشاد کر آئے ہیں اس سے ڈرو مت کہ ہم تو بالکل ہی مفلس ہو جائیں گے تم یہ سب چیزیں ہم کو قرض دے رہے ہو سو اگر تم اچھا قرض دو گے یعنی خالص بلا ریاہ کے یعنی ان کی حب مفرد کو چھوڑ دو گے اور جس کیلئے انفاق بھی لازم ہے جان کا بھی مال کا بھی تو ہم اس کو بڑھا دیں گے مولانا اسی مضمون کو فرماتے ہیں۔

خود کہ باید این چنین بازار را کہ بیک گل می خری گلزار را

نیم جان بستاند و صد جان دہد آنچه در دہمت نیاید آن دہد

اور دوسرے مقام پر اضعا فاکثیرہ ہے یعنی بہت حصے بڑھا دیں گے جس کی کوئی انتہا نہیں اور بعض

روایتوں میں جو سات سو تک مضاعفت آئی ہے اس سے مراد تعدید نہیں بلکہ تکثیر ہے۔

سُورَةُ الطَّلَاقِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ مِنْ لَدُنْهُنَّ وَأَحْصُوا

الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تَخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا

يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ

اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي

لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا ۝

ترجمہ: اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب تم لوگ اپنی عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو (زمانہ) عدت (یعنی حیض سے پہلے یعنی طہر میں) طلاق دو اور تم عدت کو یاد رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے ان عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں سے مت نکالو کیونکہ سنی مطلقہ کا مثل منکوحہ کے واجب ہے اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے اور یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے احکام ہیں اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا تجھ کو خبر نہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ بعد طلاق دینے کے تیرے دل میں نئی بات پیدا کر دے۔

تفسیری نکات

حق سبحانہ و تعالیٰ کی غایت رحمت

لعل الله يحدث بعد ذلك امراً میں ایک حکمت کی طرف اشارہ ہے جو حق تعالیٰ کے ذمہ حکمتیں

بیان کرنا نہیں ہے لیکن ان کی رحمت نہایت درجہ ہے وہ چاہتے ہیں کہ سامعین کی اصلاح ہو ہی جائے کیونکہ بعضے ایسے بھی ہیں جو بدوں حکمت کے دل سے احکام کو نہ مانیں گے اس لئے کہیں انہوں نے احکام کی حکمت بھی بیان کر دی ہے مگر بعض جگہ نہیں بھی کی تاکہ سامعین کو حکمت معلوم کرنے کی عادت نہ ہو جاوے اور کسی جگہ حکمت غامض ہوتی ہے جس کو ہر شخص نہ سمجھ سکے گا اور عادت پڑ گئی ہے حکمت معلوم کرنے کی تو وہ عمل بھی نہ کرے گا اور گنہگار ہوگا اس لئے خدا تعالیٰ نے نہ تو ہر جگہ حکمت بیان کی نہ یہ کہ کہیں بھی ذکر نہ ہو۔

طلاق کی ایک حد

اب پوری آیت کی تفسیر سنئے اس سے اس حکمت کی حقیقت واضح ہوگی حق تعالیٰ فرماتے ہیں یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوهن لعدتھن اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کو عدت سے پہلے طلاق دو یہاں سب کے نزدیک حسب روایت لعدتھن کے معنی فی قبل عدتھن (ان کی عدت سے پہلے) ہیں پھر قبل کے معنی میں حنفیہ و شافعیہ کا اختلاف ہے حنفیہ کے نزدیک عدت حیض سے شمار ہوتی ہے تو ان کے نزدیک قبل کے معنی استقبال و آمد کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ حیض آنے سے پہلے یعنی طہر میں طلاق دو اور شافعیہ کے نزدیک عدت طہر سے ہے ان کے نزدیک قبل کے معنی ابتداء کے ہیں یعنی زمانہ عدت کے شروع میں طلاق دو اس کا حاصل بھی وہی ہوا کہ طلاق طہر میں ہونی چاہیے لیکن جس طہر میں طلاق دی جائے گی حنفیہ کے نزدیک وہ عدت میں شمار نہ ہوگا بلکہ عدت حیض سے شمار ہوگی اور کے نزدیک وہ طہر بھی عدت میں شمار ہوگا کتب اصول میں فریقین کے دلائل مذکور ہیں اس وقت میں ان کو بیان کرنا نہیں چاہتا آگے فرماتے ہیں واحصوا العدة یعنی طلاق دینے کے بعد تم عدت کو یاد رکھو واتقوا اللہ ربکم اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے یعنی طلاق کے متعلق جو خدا کے احکام ہیں ان کے خلاف نہ کرو مثلاً یہ کہ حدیث میں تین طلاق دفعہ دینے کی ممانعت ہے تو ایسا نہ کرو اور حیض میں طلاق مت دو وغیرہ وغیرہ

اور ایک حکم آگے مذکور ہے لا تخرجن من بیوتھن ولا یخرجن الا ان یاتین بفاحشة مبینة یعنی عدت میں ان مطلقہ عورتوں کو ان کے رہنے کے گھروں سے مت نکالو اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے مثلاً بدکاری یا سرقہ کی مرتکب ہوں اس صورت میں سزا کے لئے گھر سے نکالی جاویں یا بقول بعض علماء کے وہ زبان درازی اور ہر وقت کارنج و تکرار رکھتی ہوں تو ان کو نکال دینا اور باپ کے گھر بھیج دینا جائز ہے۔ تلک حدود اللہ ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسه یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود ہیں جو شخص حدود خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً تین طلاق دفعہ دیدیں یا طلاق

کے بعد عورت کو گھر سے نکال دیا) تو اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا (یعنی گنہگار ہوا) آگے طلاق دینے والے کو ترغیب دیتے ہیں کہ طلاق میں رجعی بہتر ہے طلاق مغلظہ نہ دینی چاہیے فرماتے ہیں لا تلتوی لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً اے طلاق دینے والے تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ اس طلاق کے بعد کوئی نئی بات تیرے دل میں پیدا کر دیں مثلاً طلاق پر ندامت ہو تو رجعی طلاق میں اس کا تدارک ہو سکے گا۔

مفسرین نے لا تلتوی الخ کی توجیہ میں اختلاف کیا ہے بعض نے یہ کہا ہے کہ ایک طلاق دینی چاہیے تمین نہ دینی چاہئیں۔ اور ایک توجیہ یہ ہے کہ تمین دفعہ مت دو۔ اگر تمین ہی دینی ہوں تو ایک طہر میں ایک طلاق پھر دوسرے طہر میں دوسری طلاق متفرقا دینی چاہئیں مجھے سب توجیہوں کا بیان کرنا مقصود نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ اس جگہ طلاق کی حد نہ کور ہے کہ ایک وقت میں ایک دینی چاہئے ایک دم سے تمین نہ دینی چاہئیں اور اس کی حکمت یہ بتلانی ہے کہ تم کو کیا معلوم ہے کہ اس کے بعد تمہارے دل میں کیا بات پیدا ہو تو ایک طلاق دینے میں یا تمین متفرقا دینے میں مصالح و منافع کی رعایت ہے اور تمین دفعہ دینے میں معاملہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے پھر اگر ندامت ہو تو سوائے حسرت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ (حرمت الحدود ص ۶۸-۶۹)

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝

ترجمہ: جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ نکال دیتے ہیں

تفسیری نکات

حقیقت اسباب رزق

مگر اس کے یہ معنی نہ سمجھنا کہ نوکری کی ضرورت نہ رہے گی زراعت و تجارت کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کے معنی ایک مثال سے واضح ہو جائیں گے زراعت و تجارت ملازمت کی مثال زنبیل گدائی کی ہی ہے۔ حق تعالیٰ کا معاملہ اکثر یہ ہے کہ جو شخص جو زنبیل پھیلاتا ہے حق تعالیٰ اسی میں عطا کرتے ہیں۔ ہاں بعض کو بے زنبیل لائے بھی دیتے ہیں دیکھو دنیا میں بھی دینے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ کھانا دے دیا مگر شرط یہ کہ اپنا برتن لاؤ ایک یہ کہ کھانا مع برتن دے دیا پس جس طرح زنبیل لانے پر کھانا ملنے میں معطی (عطا کرنے والا) سب اس جو ادھی کو سمجھتے ہیں زنبیل کو کوئی موثر نہیں سمجھتا چنانچہ اس صورت میں اگر کوئی زنبیل سے کھانا نکال کر کہنے لگے کہ یہ تو خود بخود میرے برتن میں سے نکلا کسی نے اس میں ڈالا نہیں تو یہ اس کی حماقت ہے اور اسے کہا

جائے گا رے بیوقوف برتن میں کیا تھا وہ تو محض طرف ہے ہی طرح حق تعالیٰ نے بھی کسی مصلحت سے قانون مقرر کر دیا ہے کہ اپنا برتن لاؤ اور لے جاؤ تو یہ تجارت و ملازمت و زراعت برتن ہیں اب اگر کوئی کہنے لگے کہ خدا نے نہیں دیا وہ تو میری ملازمت یا تجارت یا زراعت سے پیدا ہوا تو جس طرح وہ بیوقوف ہے یہ بھی احمق ہے اور یہ تو قارون کا مذہب ہے اور اس نے اپنے مال کو کہا تھا کہ خدا نے نہیں دیا بلکہ انعاماً او تینہ علی علم عندی میرے پاس ایک ہنر ہے اس کی بدولت مجھے یہ حاصل ہوا بعضوں نے ہنر کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ کیمیا گر تھا بعضوں نے کہا ہے کہ بہت بڑا تاجر تھا بہر حال اپنے مال کو ہنر کی طرف منسوب کرنا تھا تو یہ قارون کا مذہب ہے کہ علت حقیقیہ رزق کی نوکری یا زراعت یا تجارت کو قرار دے خوب سمجھ لو کہ یہ کاسہ گدائی ہیں خدا کی عادت غالبہ یہ ہے کہ برتن لاؤ تو دیں گے تجارت کرو یا نوکری یا زراعت وہی دیتے ہیں اسباب تو نظر آتے ہیں اور وہ مسبب نظر نہیں آتا۔

قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ

مُبَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ

إِلَى النُّورِ ۚ وَمَنْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَكَ رِزْقًا ۝

ترجمہ: خدا تعالیٰ نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا اور وہ نصیحت نامہ دے کر ایک ایسا رسول بھیجا جو تم کو اللہ کے صاف صاف احکام پڑھ کر سناتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں (کفر و جہل) کی تاریکیوں سے (ایمان و علم و عمل) کے نور کی طرف لے آئیں (اور آگے ایمان و طاعت پر وعدہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور اچھے عمل کرے گا خدا اس کو جنت کے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت اچھی روزی دی۔

تفسیری نکات

ذکر کی توجیہ

قد انزل الله اليكم ذكراً اس کی توجیہ میں اختلاف ہے ایک توجیہ تو یہ ہے کہ ذکر کی تفسیر قرآن مجید

سے کی جائے اور رسولاً ذکر ا کا بدل الاشمال ہے اور ایک توجیہ ہے کہ ذکر ا کے معنی ہیں شرفاً کے اور رسولاً اس سے بدل الکل ہو مطلب یہ کہ خدا تعالیٰ نے ایک شرف نازل کیا۔

شرف کا لفظ عظمت کو ظاہر کر رہا ہے۔ وہ کون ہیں رسول ہیں انزل بھی آپ کے شرف پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ انزال اوپر سے نیچے آنے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تھی تو اونچی رکھنے کی چیز بوجہ شرف کے مگر تمہاری خاطر سے نیچے بھیج دیا ہے اس صورت میں آپ کا شرف در شرف ظاہر ہو گیا۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ دوسرے موقع پر قرآن شریف میں ہے و انزلنا الحديد کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا حالانکہ وہاں اوپر سے نیچے آنا نہیں پایا جاتا کیونکہ لوہا آسمان سے تو نازل نہیں ہوتا وہ تو زمین میں سے نکلتا ہے اس لئے انزال کے معنی اوپر سے نیچے آنے کے کہاں ہوئے۔

جواب یہ ہے کہ وہاں مجاز ہے تعذر حقیقت کے سبب سے ہے اور قد انزل اللہ الیکم ذکراً میں تعذر نہیں۔ اس لئے حقیقت مراد ہے۔ دوسرے کسی نے اس کے بھی توجیہ کی ہے کہ حضرت آدم کے ساتھ کئی چیزیں آئی تھیں۔ ہتھوڑا تھا اور وہ اوپر ہی سے آئی تھیں۔ تیسری توجیہ یہ کہ حدید نکلتا ہے زمین سے اور سب اس کا بخارات ہیں جو پانی سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی اوپر سے آتا ہے اور زمین میں نفوذ کرتا ہے۔ سو اس طرح وہاں بھی معنی حقیقی ہی ہیں۔ غرض حقیقی معنی انزال کے اوپر سے آنے کے ہیں اور انزال کا کلمہ بارش کے لئے بھی آیا ہے سو آپ کے لئے اس کا استعمال ہونا یہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کی شان بارش کی سی ہے کہ وہ بھی رحمت ہے اور آپ بھی رحمت۔ چنانچہ حدیث میں ہے انا رحمة مہداة یعنی میں خدا کی رحمت ہوں جو بندوں کے لئے خدا کے پاس سے تحفہ کر کے آیا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاصیت بارش کی سی ہے چنانچہ بارش سے حیات ہوتی ہے ارض کی اور آپ سے حیات ہوتی ہے قلب کی۔

ایک شعر حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب نے ایسے موقع پر پڑھا تھا کہ کسی نے آپ سے مسئلہ مولد کے متعلق پوچھا تھا آپ نے فرمایا لو ہم مولد پڑھتے ہیں اور یہ شعر پڑھا۔

تر ہوئی باراں سے سوکھی زمین یعنی آئے رحمت للعالمین

اس شعر سے میرے اس مضمون کو اور قوت ہو گئی۔ غرض ذکر میں آپ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ رسولاً میں متابعت کی طرف کیونکہ ایک مدار متابعت کا رسالت ہے اور آمنوا میں محبت کی طرف کیونکہ ایک آیت ہے۔ والذین آمنوا اشد حباً للہ اور حب اللہ اور حب الرسول میں تلازم ہے تو جس طرح ایمان کے لئے اللہ کی شدت محبت لازم ہے اسی طرح رسول کی شدت محبت بھی لازم ہے آگے ہے مہینات یعنی خود ظاہر بھی اور

ظاہر کرنے والی بھی۔ آگے ارشاد ہے لیخرج الذین الخ لیخرج میں لام غایت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیوں بھیجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے برکات حاصل کریں۔

یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ موصوف ہوگا وہ تو خود ہی خارج من الظلمات الی النور ہوگا۔ پھر ان کے خارج ہونے کے کیا معنی؟

سو مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظلمت سے نور کی طرف خارج ہوئے ہیں وہ ایمان اور اعمال صالحہ کر کے ہوئے ہیں یعنی یہ برکت ایمان اور اعمال صالحہ ہی کی ہے کہ وہ تاریکی سے نور کی طرف لے آئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے پورے حقوق ادا کرنے چاہئیں یعنی ذکر بھی کریں محبت بھی کریں۔ متابعت بھی ادب و تعظیم بھی آگے آیت میں خاصیت ایمان اور اعمال صالحہ کی بیان فرماتے ہیں۔ ومن یومن باللہ الخ مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کر کے کیا ملے گا۔ بشارت دیتے ہیں کہ یہ ملے گا۔ یدخلہ جنت

تجرى من تحتها الانهر خلدین فیہا ابداء قد احسن اللہ له رزقا۔

یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ ہے کہ حق تعالیٰ ایسی جنات میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خالدین فیہا ابداء کہ وہ نعمتیں بلا حساب اور بلا انقطاع ہوں گی۔ یہی دو صورتیں کمال نعمت کی ہوتی ہیں کہ نفس اور عمدہ بھی ہو اور بلا انقطاع بھی ہو کہ مزیت کما ہے سو یہ جنت میں حاصل ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ کے جملہ حقوق ادا کر کے جنت کی نعمتیں حاصل کریں اور اگر حقوق ادا نہ کئے برائے نام تھوڑی سی تعریف کر لی یا محفل منعقد کر لی اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ مثلاً طبیب کی تعریف سے کیا فائدہ جب تک اس سے نسخہ لکھا کر اس کا استعمال نہ کیا جائے اور اس کے کہنے پر عمل نہ کیا جائے اور یہ حقوق آپ کے دائمی ہیں۔ تو آپ ایسی بارش کے مشابہ نہیں جو کسی خاص موسم میں ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بارش ہیں کہ جس سے ہمیشہ بہار ہی بہار ہے کبھی خزاں ہی نہیں۔ یہ نہیں کہ ربیع الاول میں تو بہار ہو اور مہینوں میں نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہار جو حیات میں تھی وہ اب بھی بحالہ ہے۔ اب میں اس مضمون کے مناسب اس شعر پر اپنے وعظ کو ختم کرتا ہوں۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشاں ست خم و خم خانہ بامبر و نشان ست

محروم ہے وہ شخص جو ایسے نبی کی برکات حاصل نہ کرے دعا کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نصیب ہو متابعت کی توفیق ہو اور آپ کی عظمت ہو قلب میں۔ (الربیع فی الربیع لمحدثہ مواعد میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص ۳۷۸-۳۷۹)

الحاصل

غرض اس وقت یہ تین جماعتیں ہیں۔

- (۱) ایک وہ جو محبت رکھتے ہیں مگر اتباع و عظمت نہیں۔
- (۲) ایک وہ جو عظمت کرتے ہیں لیکن محبت و اتباع نہیں۔
- (۳) ایک وہ جو اتباع کرتے ہیں مگر عظمت و محبت نہیں۔

سو یہ تینوں جماعتیں پورے حقوق ادا نہیں کرتیں۔ کسی نے ایک کو لیا دو کو چھوڑا کسی نے دو کو لیا تیسرے کو چھوڑا علیٰ ہذا جامع وہ شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں متابعت میں عظمت میں سرائفگندہ رہتا ہو۔

سُورَةُ التَّحْرِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَاۤ ۗ وَاِنْ تَظْهَرَا عَلَیْهِ

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ

ترجمہ: اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کر لو تو تمہارے دل مائل ہو رہے ہیں اور اگر پیغمبر کے مقابلہ میں تم دونوں کا ردائیاں کرتی رہیں تو پیغمبر کا رفیق اللہ ہے اور جبریل ہیں اور نیک مسلمان ہیں۔

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ كے متعلق

ان توبہ الی اللہ فقد صغت قلوبكما و ان تظہر اعلیہ فان اللہ ہو مولاه و جبریل و صالح المؤمنین میں وہ ان تظہر اعلیہ کی جزا محذوف ہے اور وہ لا ینضرہ ہے کیونکہ فان اللہ ہو مولاه صلاحیت جزاء کی نہیں رکھتا کیونکہ جزا متاخر عن الشرط ہوتی ہے اور ولایت حق تعالیٰ متاخر نہیں۔ (ملفوظات عیہ السلام ج ۵ ص ۴۵)

عَسَىٰ رَبُّهُٓ اِنْ طَلَّقَكُنْ اَنْ يُبَدِّلَهُٓ اٰزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكَ مُّسَلِّمًا

مُؤْمِنًا قِنْتَ تَبَّتْ عِيْدَتِ سَبَّحَتْ تَبَّتْ وَ اَبْكَارًا ۝

ترجمہ: اگر پیغمبر تم کو طلاق دیدے تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیویاں دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں۔

تفسیری نکات

توبہ باقی اعمال پر مقدم ہے

اس میں بھی تائبات مقدم ہے عبادات پر ان آیات سے اور ان مویدات سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ توبہ جملہ عبادات پر مقدم ہے تو توبہ اول اعمال ہوئی۔ ہاں اس آیت عسی ربہ الخ پر ایک شبہ ہے۔

وہ یہ کہ اس میں تائبات کا لفظ عبادات پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا ہے مگر اول اعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیونکہ اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں۔ اور وہ یہ ہیں مسلمات مؤمنات قانتات ترتیب کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ چوتھے مرتبہ میں درجہ تائبات کا ہے توبہ کا اول اعمال ہونا جب مستطب ہوتا جب کہ آیت التائبون کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم التائبات ہوتا۔

اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے اس بیان میں تصریح کر دی تھی کہ توبہ کے اول اعمال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بجز ایمان و اسلام کے اور سب اعمال پر مقدم ہے اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلم ہے کیونکہ یہ تمام اعمال کی صحت کے لئے شرط ہیں ان کے بغیر تو اعمال خواہ کیسے ہی اچھے ہوں ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ رعایا کی بہت خدمت کرے اور بڑے بڑے کارہائے نمایاں کرے چندہ رفاہ عام بھی بدرجہ وافر دے اور قحط وغیرہ میں بہت امداد دے مگر ہے باغی تو یہ سب کام اس کے بے کار ہیں کوئی بھی ان میں سے سلطنت کی نظر میں کچھ شمار نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک کہ بغاوت سے رجوع نہ کرے۔

اسی طرح ایمان و اسلام ہے کہ کوئی عمل بدوں ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رہی تو اس آیت میں تین لفظ ہیں جو تائبات پر مقدم ہیں یعنی مسلمات اور مؤمنات اور قانتات۔ مسلمات اور مؤمنات کی وجہ مقدم توبہ ظاہر ہے صرف قانتات پر شبہ رہا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قنوت ایک خاص وجہ سے توبہ سے مقدم ہے اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں اور ندامت جب ہوگی جب کہ تعب قنوت ہو کیونکہ جب تک نرمی اور جھک جانا اور بحر قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ ہے قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی تو عقلاً ثابت ہو گیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے اس واسطے قاننات کو بھی اس آیت میں تا نبات پر مقدم کیا تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول اعمال ہونے کا کہ ان اعمال سے جن پر توجہ مبنی ہے ان سب سے مقدم توبہ ہے۔ باقی قنوت چونکہ توبہ کے لئے شرط عقلی ہے لہذا توبہ پر مقدم ہے اور ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے۔

ازواج مطہرات کی حضور سے از حد محبت تھی

ان آیات میں اسی عتاب کا ذکر ہے اور یہ دھمکی ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت ہی محبت تھی اور یہ کہ وہ دنیا دار نہ تھیں بلکہ کامل دیندار تھیں کیونکہ یہاں جہنم وغیرہ کی دھمکی نہیں دی گئی۔ نہ کسی آفت ارضیہ و سماویہ سے ڈرایا گیا بلکہ دھمکی یہ دی گئی کہ اگر تم حضور کو ملکر کرو گی تو اندیشہ ہے کہ حضور تم کو طلاق دے دیں اور ہم آپ کو تم سے بہتر بیبیاں دے دیں اور ظاہر ہے کہ یہ دھمکی عاشق ہی کو دی جاسکتی ہے جو بیوی عاشق نہ ہو اس کے حق میں یہ کچھ بھی دھمکی نہیں بلکہ وہ تو اس کو بشارت سمجھے گی خصوصاً جب کہ عدم محبت کے ساتھ یہ بات بھی ہو کہ شوہر کے یہاں کھانے پہننے کی بھی تنگی ہو دنیا کی عیش و راحت بھی نہ ہو جیسا کہ حضور کے یہاں حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ کے یہاں فاقہ بھی ہوتا تھا۔

آیت تخیر

بہر حال جب یہ آیت تخیر نازل ہوئی تو سب ازواج نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اختیار کیا کہ کسی نے بھی اختیار نہیں کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس درجہ کی محبت تھی کہ فقر و فاقہ اور تنگی میں رہنا منظور تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علیحدگی منظور نہ تھی چنانچہ اس محبت ہی کی وجہ سے ان کو حق تعالیٰ نے جہنم کے عذاب وغیرہ کی دھمکی نہیں دی بلکہ صرف اس سے ڈرایا کہ دیکھو کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تم کو اپنے سے علیحدہ نہ کر دیں۔ اور تم یہ نہ سمجھنا کہ اگر ہم کو الگ کر دیا تو ہم سے بہتر بیبیاں کہاں سے ملیں گی۔ خوب سمجھ لو کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو طلاق دے دی تو حق تعالیٰ قادر ہیں کہ وہ تم سے بہتر بیبیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیں عسی ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجاً خیر امنکن (اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیبیاں دے دے گا) یہ تو اجمالاً ان کی خیریت کا ذکر تھا آگے اس خیریت کی تفصیل ہے کہ وہ بیبیاں کیسی ہوں گی۔ مسلمات مومنات قاننات تا نبات

عبادات سائخت وہ اسلام والیاں ہوں گی اور ایمان والیاں اور خشوع خضوع والیاں اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے والیاں اور عبادت کرنے والیاں اور سائحات ہوں گی۔ سائحات (روزہ رکھنے والیاں) کی تفسیر عنقریب آتی ہے یہ تو تشریحی صفات ہیں آگے تکوینی صفات مذکور ہیں۔ نیت و ابکاراً (کچھ بیوہ کچھ کنواریاں)

ازواج مطہرات باقی عورتوں سے افضل ہیں

اس مقام پر ایک اشکال طالب علمانہ ہے وہ یہ کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ازواج مطہرات سے خیر و بہتر عورتیں موجود تھیں اگر نہیں تھیں تو یہ دھمکی کیسی؟ اور اگر تھیں تو بظاہر بہت بعید ہے کہ ان سے بہتر عورتیں دنیا میں ہوں اور حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کمتر تجویز فرمائیں۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال فیض و قوت تاثیر صحبت پر نظر کر کے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت یافتہ عورتوں سے بہتر کوئی ایسی عورت ہو سکے جس نے ابھی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل نہیں کی اور خود نص میں بھی تو ہے یا نساء النبی لستن کا احد من النساء ان اتقین (اے نبی کی بیبیو تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تقویٰ اختیار کرو) اس آیت میں قلب ہے مطلب یہ ہے لیس احد من النساء کما لکن کہ کوئی عورت تم جیسی نہیں ہے اگر تم متقی ہو اور ازواج مطہرات کا متقی ہونا معلوم ہے تو ثابت ہوا کہ ان کے مثل کوئی عورت دنیا میں اس وقت نہ تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ قلب نہ ہو اور تقدیر اس طرح ہو یا نساء النبی لستن دنیات کفیر کن (اے نبی کی بیبیو تم غیر عورتوں کی طرح دنیا دار نہیں ہو) اس اشکال کا جواب میں نے ایک عالم کے خادم سے سنا ہے اپنے شیخ سے نقل کرتے تھے کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ ازواج مطہرات کی خیریت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح ہی کی وجہ سے تھی۔ قبل از نکاح تو وہ اور دوسری عورتیں یکساں تھیں۔ پھر اگر آپ ان کو طلاق دے دیتے تو ان سے خیریت کم ہو جاتی اور دوسری جس بیوی سے نکاح کر لیتے نکاح کے بعد وہ ان سے بہتر ہو جاتی۔ پس خیراً منکن (جو تم سے بہتر ہوں گی) بالفعل کے اعتبار سے نہیں فرمایا گیا بلکہ اول (آئندہ حالت کے) اعتبار سے فرمایا گیا ہے اب کوئی اشکال نہیں یہ جواب مجھے بہت پسند آیا یہ تو اشکال کا جواب تھا۔

بعض علماء نے جو سائح کی تفسیر سیاحت کنندہ سے ہے انہوں نے سیاحت کرنے والے کو تشبیہات بالصائم (روزہ دار سے تشبیہ دے کر) سائح کہہ دیا ہے صائم کو سیاحت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دے کر سائح نہیں کہا گیا پس اصل تفسیر سائحات کی صائمات (روزہ رکھنے والیاں) ہے اور تووا جمہود میل مستقل ہے کہ اکثر علماء مفسرین نے سننحت کی تفسیر یہی کی ہے جب یہ معلوم ہو گیا کہ سننحت کی تفسیر روزہ رکھنے والیاں ہیں تو

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ بڑی عبادت ہے کیونکہ تخصیص بعد تقسیم اہتمام کے لئے ہوتی ہے تو حالانکہ مسلمات اور عبادات میں روزہ بھی داخل تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو اہتمام کے ساتھ الگ بیان فرمایا ہے جس سے اس کی خاص عظمت و فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ بہت بڑی عبادت ہے مگر اس سے ناز نہ کرنا کہ ہم نے بڑا کام کیا بلکہ حق تعالیٰ کا احسان سمجھو کہ انہوں نے ہم سے یہ کام لے لیا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت
(احسان مت کرو کہ بادشاہ کی خدمت کرتے ہو بلکہ اس کا احسان مانو کہ اس نے تم کو خدمت کے لئے رکھ لیا ہے)

اب سمجھئے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے سمجھات کو جس کی تفسیر ابھی معلوم ہو چکی ہے کہ اس کے معنی روزہ رکھنے والیوں کے ہیں مقرون کیا ہے نیت و اہتمام کے ساتھ جو صفات غیر اختیاریہ ہیں اور صفات غیر اختیاریہ سب سے زیادہ سہل ہیں کیونکہ ان میں کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا۔ حتیٰ کہ ارادہ و اختیار کو بھی صرف کرنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ وہ بدو و ارادہ و اختیار کے خود بخود ثابت ہیں اور اوپر ابھی معلوم ہوا کہ اقترا حکمت سے خالی نہیں تو معلوم ہوا کہ صفت صوم کو صفات غیر اختیاریہ سے مقترن کرنے میں بھی کچھ حکمت ہے اور وہ حکمت میرے نزدیک یہی ہے کہ صوم بھی مثل صفات غیر اختیاریہ کے سہل ہے کہ اس میں بھی کچھ فعل و جو دی کرنا نہیں پڑتا پس آیت سے سہولت صوم پر عجیب طرز سے دلالت ہے رہا یہ کہ یہ صفات غیر اختیاریہ کیسے ہیں تو سنئے کہ ثبوت تو اس لئے غیر اختیاری ہے کہ لغت میں ثبوت بکارت کے مقابل ہے اور شرعاً ثبیب وہ ہے جو صاحب زوج ہو چکی ہے پھر اس سے فرقت ہو گئی ہے بوجہ طلاق یا موت کے اور باکرہ وہ ہے جو ابھی تک صاحب زوج نہیں ہوئی۔

پس ثبوت کو اگر اپنے جزو اول کے اعتبار سے من کل الوجوہ غیر اختیاری تسلیم نہ بھی کیا جائے تب جزو ثانی کے اعتبار سے تو یقیناً غیر اختیاری ہے کہ اس صفت کا ثبوت عورت میں بدو اس کے اختیار کے ہو جاتا ہے تو جزو اخیر ثبوت کی علت تامہ کا ہر حال میں غیر اختیاری رہا اگر مجموعہ اجزاء پر نظر کی جائے تب بھی مجموعہ اختیاری و غیر اختیاری کا غیر اختیاری ہوتا ہے تو ثبوت غیر اختیاری ہی رہی اور بکارت کا غیر اختیاری ہونا ظاہر ہے پس۔ مسنعت کو نیت و اہتمام کے ساتھ مقرون کرنا بتلا رہا ہے کہ صوم مثل امور طبعیہ کے سہل ہے اور واقعی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صوم امر طبعی ہے کیونکہ امر طبعی وہ ہے جس کیلئے قصد و ارادہ کی ضرورت نہ ہو اور ظاہر ہے کہ کھانے پینے کے لئے تو قصد و ارادہ کی ضرورت ہے اور نہ کھانے اور نہ پینے کے لئے قصد و ارادہ کی کیا ضرورت ہے کچھ بھی نہیں ہم گھنٹوں بدو کھانے پینے کے کام میں لگے رہتے ہیں اس وقت اس حالت پر التفات بھی نہیں ہوتا کہ ہم اس وقت کھاتے پیتے نہیں ہیں دوسرے یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کے زیادہ

تر اوقات نہ کھانے اور نہ پینے ہی کے ہیں۔ کھانے پینے کے تو چند اوقات معین ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ نہ کھانا نہ پینا امر اصلی ہے اگر کھانا پینا امر اصلی ہوتا تو اس کے اوقات زیادہ ہوتے مگر واقعہ اس کے خلاف ہے اور اصلی سہولت ہے رہا یہ شبہ کہ نہ کھانے پینے کی حالت میں جو التفات شراب و طعام کی طرف نہیں ہوتا تو یہ اسی وقت تک ہے جب تک بھوک نہ لگے اور جب بھوک لگتی ہے تو خاص التفات ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو بھوک میں بھی شراب و طعام کی طرف التفات بے کاری کی حالت میں ہوتا ہے اور اگر کسی کام میں لگ جائے تو کھانے پینے کی تو کیا بھوک کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ چنانچہ بہت واقعات ایسے ہو چکے ہیں اور کم و بیش ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوتا ہوگا اور اگر مان بھی لیا جائے کہ بھوک میں طعام و شراب کی طرف التفات ہوتا ہے تو اس کا انکار ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک عارض کی وجہ سے ہے اب معدہ ان رطوبات اصلیہ کے ہضم کی طرف متوجہ ہو گیا جس سے تکلیف ہوتی ہے جب یہ عارض مرتفع ہو جائے گا۔ التفات بھی جاتا رہے گا۔ اب یہاں سے میں ایک اور شبہ کا جواب دینا چاہتا ہوں جس کا جواب دینا جمعہ کو بھول گیا تھا (وہ اسی اقتران کی مثل ایک اور صفت سے اقتران اسی کا ہم اثر ہے نقدیر اس کی یہ ہے کہ سورہ احزاب میں صائمین و صائمات روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں (کا اقتران و الحافظین فر و جہم و الحافظات اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں کے ساتھ ذکر میں واقع ہوا ہے اور حفظ فروع اہل طبائع سلیمہ کا اور ان میں سے بھی بالخصوص اناث کا امر طبعی ہے تو اس امر طبعی کے ساتھ اقتران نیز مویذ ہر علوم کے مشابہ ہونے کا جو کہ بے حد سہل ہوتے ہیں جیسا کہ متن میں مذکور ہے یہ مضمون بعد میں ذہن میں آیا اس لئے حاشیہ میں لکھ دیا گیا۔ ۱۲

وہ یہ کہ نہ کھانا اور پینا اگر آسان ہے تو کسی کو مہینہ بھر تک بھوکا رکھ کر دیکھا جائے معلوم ہو جائے گا کہ نہ کھانا کیونکہ آسان ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عدم اکل کی حقیقت فی نفسہ دشوار نہیں بہت سے بہت آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ امتداد عدم اکل دشوار ہے تو یہ دشواری امتداد عارض سے ہو گئی نہ کہ حقیقت عدم اکل سے۔ اور شریعت نے جو عدم اکل و شرب کی حد مقرر کی ہے وہ ممتد نہیں ہے اس لئے صوم کچھ دشوار نہیں سواب سب اشکالات رفع ہو گئے اور سہولت صوم کا دعویٰ بے غبار ہو گیا۔ پھر اقتران سننحت ثبیت و ابکاراً کے علاوہ خصوصیت مقام سے اس سہولت میں ایک اور اضافہ ہو گیا وہ یہ کہ اس جگہ عورتوں کے روزہ کا ذکر ہے اور عورتوں کو طبعاً بھی روزہ اس لئے آسان ہے کہ ان میں رطوبت و برودت زیادہ غالب ہوتی ہے ہاں کوئی ضعیف و نحیف ہو تو اور بات ہے ورنہ عام طور سے مزاج عورتوں کا رطب و بارد ہے اور ایسے مزاج والے کو روزہ دشوار نہیں ہوتا روزہ حار و یا بس مزاج والے کو زیادہ گراں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں نماز میں تو سست ہیں مگر روزہ میں بچیاں بھی ہمت والی ہیں۔ نیز عورتوں کا طرز عمل بھی بتلاتا ہے کہ ان کو روزہ سہل ہے اور وہ یہ کہ عورتیں جب کبھی نذر و منت مانتی ہیں تو زیادہ تر روزہ کی منت مانتی ہیں نماز کی نذر کوئی نہیں کرتی کیونکہ نماز ان پر گراں ہے اس میں پابندیاں بہت ہیں اور افعال

اختیار یہ بھی زیادہ ہیں پابندی کا تو یہ حال ہے کہ نماز میں بات بھی نہیں کر سکتے۔

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿۷﴾

ترجمہ: جو خدا کی نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو فوراً بجالاتے ہیں۔

تفسیری نکات

ملائکہ کی اطاعت

فرمایا کہ اگرچہ ملائکہ بھی بوجہ اطاعت خداوندی کے جیسا کہ ارشاد ہے لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ افضل واکمل ہیں لیکن ان کا کمال زیادہ عجیب نہیں کیونکہ ان میں وہ تقاضے پیدا ہی نہیں ہوتے جن سے مخالفت کی نوبت آئے مگر انسان کا مطیع ہونے میں کامل ہونا زیادہ عجیب ہے اس لئے کہ انسان میں جس طرح علت الخیر ہے علت الشر بھی موجود ہے۔ پس اس میں متنافسین کا تزام ہے اور اس تزام کے ساتھ کمال اطاعت ہونا زیادہ عجیب ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ

أَن يُكْفِرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کے آگے سچی توبہ کرو امید ہے تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کر دینگے

تفسیری نکات

حقیقی توبہ

مقصود اس آیت کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ توبہ کا حکم کرتا ہے اسی کو توبہ کہتے ہیں کہ بندہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائے یہی توبہ کی حقیقت ہے اور صرف لفظ توبہ زبان سے کہہ لینا کافی نہیں کیونکہ صرف زبانی وہی توبہ ہے جس کو کہتے ہیں۔

سبحہ بر کف توبہ بر لب دل پر از ذوق گناہ معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

(ہاتھ میں تسبیح ہونٹوں (زبان) پر توبہ توبہ ہو اور دل اندر اندر گناہ کے مزے لے رہا ہو تو ایسی حالت

میں خود گناہ کو بھی ہماری ایسی توبہ و استغفار پر ہنسی آ جاتی ہے۔)

تو حقیقت توبہ کی یہ ہوئی کہ دل سے توبہ ہو تو فرماتے ہیں یا ایہا اللعین امنوا توبوا الخ (اے مسلمانو توبہ کرو) خلاصہ یہ کہ اس مقام پر توبہ کا حکم ہے اور توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور گناہ کا علم دین کے جاننے سے ہوتا ہے کہ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ گناہ کس قدر ہیں اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی وقت ایسا گزرتا ہو کہ ہم سے گناہ نہ ہوتے ہوں۔

گناہ کا خلاصہ ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اس کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے یہ معلوم کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس کس بات کا حکم دیا ہے اور ہم اس میں سے کتنوں پر عمل کرتے ہیں اور کتنے نواہی سے اجتناب کرتے ہیں۔ (تفصیل التوبہ ص ۵)

سُورَةُ الْمُلْكِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِعَصَابٍ

مُتَجَسِّمَاتٍ: اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے۔

تفسیری نکات

ستارے آسمان پر مزین ہیں

ایک مشہور فاضل نے حضرت والا سے دریافت فرمایا کہ بعض لوگ اسی دعویٰ کی دلیل میں یہ تارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِعَصَابٍ مُتَجَسِّمَاتٍ تو کیا اس آیت سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ تارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں حضرت حکیم الامتہ دام ظلہم العالی نے ارشاد فرمایا کہ ہرگز نہیں اس آیت کی اس امر پر کچھ بھی دلالت نہیں اس آیت سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان ستاروں سے آسمان کو مزین کیا گیا ہے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ اجرام آسمان میں جڑے ہوئے ہیں کیونکہ کسی چیز کو اگر ہم کسی چیز سے مزین کریں تو یہ تھوڑا ہی ضروری ہے کہ جس چیز سے مزین کریں اس کو اس میں جڑ بھی دیں بلکہ تزئین بغیر جڑے بھی ہو حاصل ہو سکتی ہے جیسے کہ چھت کو قندیلوں سے مزین کیا کرتے ہیں سو اس تزئین کے لئے قندیلوں کو چھت کے اندر جڑا کب جاتا ہے بلکہ قندیلیں چھت سے بہت نیچے ہوتی ہیں اسی طرح ان اجرام سے گو آسمان کو مزین کیا گیا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اجرام آسمان میں جڑے ہوئے بھی ہوں۔ لہذا اس آیت سے اس دعویٰ پر کہ تارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں استدلال کرنا بالکل غلط ہے اور مدت کے بعد ان ہی فاضل نے سورہ نوح کی آیت وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ

سورہ کے ظاہر سے قمر کے مرکوز فی السماء ہونے پر استدلال کیا لیکن اس کا جواب خود آیت میں ہے کیونکہ فیہن کی ضمیر سموات کی طرف ہے اور ظاہر ہے کہ متعدد سموات میں مرکوز کے کوئی معنی نہیں پس آیت مادل ہو گی اور تاویل جیسے فی مجموعہن سے محتمل ہے۔ اسی طرح فی قمر بھن یا فی جمعہن سے محتمل ہے اسی طرح ظرفیہ باعتبار نور کے ہونا اور باعتبار جمع کے نہ ہونا ممکن ہے تو ان احتمالات کے ہوتے ہوئے رکز پر استدلال نہیں ہو سکتا جیسے اس کے خلاف پر بھی کوئی دلیل قائم نہیں۔

نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ①

تَنْجِيحًا : اور (کافر فرشتوں سے یہ بھی) کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم اہل دوزخ میں (شامل) نہ ہوتے۔

تفسیری نکات

عمل علی الحق کے دو طریقے

اس حکایت میں اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کو منحصر کیا ہے ایک تو سننے میں اور ایک سمجھنے میں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ عمل علی الحق کے دو طریقے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ کسی سے سنا ہو دوسرے یہ کہ خود سمجھا ہو۔ کفار نے چونکہ نہ سنا تھا نہ خود سمجھا تھا اسی لئے ان کو حسرت کی نوبت آئی۔ اس سے آپ کو آیت کا حاصل مجمل معلوم ہو گیا ہوگا خدا تعالیٰ نے اس حکایت کو نقل کر کے اس پر انکار نہیں فرمایا اور اس کو غلط نہیں کہا بلکہ اگلی آیت میں اس کی تصدیق فرمائی۔ فاعترفوا بذنبہم انہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا جس سے معلوم ہوتا ہے ان کا ذنب یہی تھا معلوم ہوا کہ یہ امر حق ہے اور ان ہی دو کا نہ ہونا باعث دخول جہنم ہوا اگر اس کو نقل فرما کر سکوت بھی کیا جاتا تب بھی یہ حق سمجھا جاتا کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس بات کو بیان کر کے اس پر سکوت کیا جائے اور رد اور انکار نہ کیا جائے تو وہ حاکمی کے نزدیک امر مرضی ہوا کرتا ہے۔ نیز اصولیوں نے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ نیز قطع نظر اس مقدمے کے اس کے حق ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ یہ مقولہ قیامت کا ہے اور قیامت میں چونکہ سب امور منکشف ہو جائیں گے اس لئے کوئی جھوٹ نہ بولے گا اور اگر بعض آیات سے مثلاً واللہ ربنا ما کنا مشرکین (قسم ہے اللہ کی جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں ہیں) یہ شبہ ہوا کہ ان لوگوں نے جھوٹ بولا چنانچہ ارشاد ہے انظر کیف کذبوا علی انفسہم (دیکھو تو اپنی جانوں پر کس طرح جھوٹ بول رہے ہیں) تو جواب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ ایک عارض کی وجہ سے بولا اور وہ عارض یہ ہے کہ بولنے میں ان کو نفع کی

توقع تھی اور یہاں یہ بات نہیں ہے بلکہ اس قول میں خود ان ہی کا ضرر ہے کہ اعتراف ذنب لازم آتا ہے۔ اس لئے یہ قول غلط نہ ہوگا خلاصہ یہ ہے قیامت میں کشف حقیقت کا اصل مقتضایہ ہے کہ وہاں جو بات کہی جائے بالکل صحیح کہی جائے لیکن بعض لوگ عارض نفع کی وجہ سے اس مقتضایہ کے خلاف کریں گے۔ تو جس جگہ وہ عارض پایا جائے گا اس موقع پر تو ان کے قول میں کذب کا احتمال ہوگا اور جس موقع پر وہ عارض نہ ہو وہاں اصل مقتضایہ کی وجہ سے قول کو صادق ہی سمجھا جائے گا۔ لہذا کفار کا یہ قول بالکل سچا ہے اور پھر جبکہ اس کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف سے تائید بھی موجود ہے تو اس کے صدق میں کوئی شبہ ہی نہیں رہا چنانچہ ارشاد ہے فاعترفوا بذنوبکم فسحقاً لأصحاب السعیر (انہوں نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا) جس کی اوپر تقریر ہو چکی ہے اب میں اصل مقصود کو بیان کرتا ہوں اور اس آیت سے ان شاء اللہ اس کو ثابت کر دوں گا کیونکہ وہ مضمون اس آیت کا مدلول ہے اور اس کی ضرورت نہایت عام ہے ہر وقت ہر جگہ ہر مسلمان کو اس کی ضرورت ہے ایسا ہی اس کا فائدہ بھی نہایت عام ہے یعنی اس کے استعمال کے بعد حتمی فائدہ اس میں ہے نیز یہ مضمون نہایت سہل ہے تو ان تینوں باتوں پر نظر کر کے اس کی ضرورت میں ذرا بھی کلام نہیں رہتا۔ دیکھئے عقلی قاعدہ یہ ہے کہ مرض جس قدر صعب ہوتا ہے مثلاً اگر کسی شخص کو یا کسی جماعت کو یا کسی ایک شہر میں کوئی سخت مرض پھیل جائے تو عقلاً اس کے لئے سخت تدابیر تجویز کرتے ہیں اور جب یہ قاعدہ مسلم ہے اور عقلاً اس کو برداشت کیا جاتا ہے اور اگر برداشت کی تاب نہیں ہوتی تو علاج سے مایوس ہونا پڑتا ہے چنانچہ بعض مرتبہ اطباء کہتے ہیں کہ تمہارا مرض امیرانہ ہے مثلاً کسی غریب آدمی کو جنون ہو جائے اور کوئی طبیب اس کا علاج شروع کرے اور کسی طرح اس کو فائدہ نہ ہو تو پریشان ہو کر طبیب کو یہ کہنا پڑے گا کہ بھائی تمہارا مرض تو امیرانہ ہے اور تم دو چار پیسے کی دوا میں اس کا علاج چاہتے ہو یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے تو بہت سخت تدابیر کی ضرورت ہے جن کی وسعت تم میں نہیں ہے لہذا تم اچھے نہیں ہو سکتے تو از روئے عقل ہر مرض صعب کی تدبیر بھی صعب ہوتی ہے اور بعض اوقات مایوسی کی نوبت آتی ہے لیکن اس طب میں جس کا نام طب ایمانی ہے کوئی درجہ بھی ایسا نہیں ہے کہ وہاں پہنچ کر مایوس کر دیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ اب تمہارا مرض لا علاج ہو گیا بلکہ ہر مرض کے لئے علاج موجود ہے اور نہایت سہل علاج موجود ہے میں ان شاء اللہ اس کو بدلیل بیان کر دوں گا کہ صعب سے صعب مرض میں بھی نہایت سہل نسخہ تجویز کیا ہے اور یہ دلیل ہے خدا تعالیٰ کی رحمت عامہ کی کہ اتنا بڑا مرض اور اس کا علاج اس قدر سہل اور اس سے اس آیت کے معنی بھی منکشف ہو جائیں گے۔ کہ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر اور ما جعل علیکم فی الدین من حرج یعنی خدا تعالیٰ نے دین میں تم پر کچھ تنگی نہیں کی یہاں سے ایک جملہ معترضہ عرض کرتا ہوں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں کچھ

تنگی نہیں ہے حالانکہ مشاہدہ اس کے بالکل خلاف ہے یعنی اکثر دینداروں کو عمل بالشرع میں بہت تنگی پیش آتی ہے اور جو لوگ آزاد ہیں وہ نہایت مزے میں ہیں کہ جو جی میں آیا کر لیا ان کو کارروائی میں تنگی نہیں ہوتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین پر عمل کرنے میں تنگی ہے اور آزاد رہنے میں آسانی کیونکہ دیندار آدمی کو تو قدم بقدم حرام کی فکر لگی رہتی ہے بلکہ جس بات کو ان سے پوچھئے اس کو حرام ہی کہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کو نہایت پریشانی اور تنگی ہوتی ہے۔ مثلاً اب آموں کی بہار آ رہی ہے جو لوگ آزاد ہیں وہ تو نہایت چین میں رہیں گے کہ فصل شروع ہوتے ہی فروخت کر دیں گے اگر چہ ابھی تک نرا پھول ہی ہو اور ان کو نہایت اچھے دام اٹھیں گے اور جو لوگ دیندار ہیں وہ اس فکر میں لگے رہیں کہ پھول فروخت کرنا حرام ہے لہذا اس وقت فروخت کرنا چاہیے کہ جب پھل آ جائیں اور پھل بھی بڑھ جائیں نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی حفاظت کے لئے کم سے کم ماہوار کا ایک ملازم رکھیں گے یا خود حفاظت کریں گے پھر آندھیوں میں جو کچھ آم گریں گے سب ان کے گریں گے ان کی وجہ سے قیمت کم اٹھے گی علیٰ ہذا اگر تجارت کریں تو شریعت پر عمل کرنے میں کوئی صورت قرار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہے کسی داد و ستد میں سود لازم آ گیا وہ اس لئے حرام ہے غرض شریعت پر عمل کرنے میں ہر طرح تنگی و مصیبت ہے اور جب کوئی چیز بھی تنگی سے خالی نہیں تو یہ تو قرآن ہی میں شبہ پیدا ہو جاتا ہے (نعوذ باللہ من ذالک) تو یہ شبہ بعض لوگوں کو پیدا ہونا ممکن ہے میں نے متعدد مقامات پر اس کا جواب عرض کیا ہے اس وقت بھی وہی جواب دیتا ہوں مگر توضیح کے لئے اول ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ فرض کرو کہ ایک شخص مریض ہو اور وہ کسی طبیب کے پاس گیا اور نسخہ دریافت کیا اور حکیم صاحب نے نسخہ لکھا لیکن اتفاق سے مریض ایسی جگہ رہتا ہے کہ اس جگہ کوئی دوا دستیاب نہیں ہوتی اس کے بعد حکیم صاحب نے پرہیز بتلایا اور اتفاق سے اس گاؤں میں صرف وہی چیزیں ملتی ہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے اور جن چیزوں کی اجازت ہے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں ملتی۔ پس اگر یہ مریض حکیم صاحب کے نسخہ کو دیکھ کر اور پرہیز کو سن کر یہ کہنے لگے کہ طب میں نہایت ہی تنگی ہے کیونکہ دوائیں وہ بتلائیں جن میں سے ایک بھی میسر نہیں غذائیں وہ تجویز کیوں جو کبھی گاؤں بھر میں بھی نہیں آتی اور جتنی چیزیں کھانے کی ہیں وہ سب ممنوع کہ نہ بیٹن کھانا نہ آلو کھانا نہ بھینس کا گوشت کھانا اور اس کے ساتھ ہی حکیم صاحب کو بھی اپنے جہل کی وجہ سے برا بھلا کہنے لگے تو عقلاء اس کو کیا جواب دیں گے۔ یہی جواب دیں گے کہ طب میں تو ذرا بھی تنگی نہیں اس شخص کے گاؤں ہی میں تنگی ہے کیونکہ طب میں تنگی تو اس وقت سمجھی جاتی ہے جبکہ دو چار چیزوں کی اجازت ہوتی اور باقی سب چیزیں ممنوع ہوتیں اور جبکہ بیس کی اجازت ہے اور صرف چار کی ممانعت تو طب میں تنگی ہرگز نہیں بلکہ اس شخص کے گاؤں میں تنگی ہے کہ اس میں صرف وہی چیزیں منتخب ہو کر آتی ہیں جو کہ سراسر مضر ہیں۔ (طریقہ الحاجات ص ۷۳)

إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿۱۷﴾

وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۸﴾

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: بے شک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم مقرر ہے اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو یا پکار کر اللہ تعالیٰ کو سب کی خبر ہے کیونکہ دلوں تک کی باتوں سے خوب واقف ہیں بھلا کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین اور پورا باخبر ہے۔

تفسیری نکات

خوف میں اعتدال

پس ارشاد ہے ان الذين يخشون ربهم بالغيب الخ یعنی جو لوگ اپنے رب سے غیب میں ڈرتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

اب یہاں یہ امر قابل غور اور نتیجہ خیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے يخشون اللہ کا تعلق لفظ ربہم سے فرمایا یعنی یہ فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور يخشون اللہ نہ فرمایا اس میں تعدیل خوف کی طرف اشارہ ہے۔ مخلوق کے کلام میں ایسی رعایت نہیں ہوتی اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام بشر کا نہیں خالق کا کلام ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خوف کے اندر دو خاصیتیں ہیں ایک تو یہ کہ گناہوں سے روکتا ہے جیسے مدلل پہلے معلوم ہو چکا ہے یہ تو جب ہے کہ خوف درجہ اعتدال میں ہو۔ اور دوسرا خاصہ یہ ہے کہ طاعت سے بھی روک دیتا ہے یہ اس وقت ہے کہ فوق الحد ہو دنیوی امور میں ہم اس کی نظر بکثرت دیکھتے ہیں کہ جب کسی امر کا زیادہ خوف ہوتا ہے تو کام نہیں ہوتا ہے جیسے کوئی شخص کوئی مضمون لکھ رہا ہو اور کوئی ایسا شخص جس کو وہ اپنے سے استعداد میں زیادہ سمجھتا ہو دیکھنے لگے تو ہرگز نہ لکھا جائے گا امتحان میں وہ طلبہ جن پر امتحان کا خوف غالب ہو جاتا ہے نا کام ہو جاتے ہیں۔ علی ہذا بہت سے نظائر سے یہ امر ثابت ہے کہ غلبہ خوف میں کام نہیں ہوتا جیسا کہ اگر بالکل خوف نہ ہو تو کام نہیں ہوتا اور اس لئے زندگی میں حکم ہے اتقوا ربکم و اخشوا (اپنے رب سے ڈرو) یعنی خشیت اور مرنے کے وقت ارشاد ہوتا ہے لا تخافوا ولا تحزنوا و ابشروا بالجنة (تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور تم جنت کے ملنے پر خوش رہو) اور یہی منشاء ہے اس ارشاد کا کہ جو حضرت حاجی

صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ زندگی میں تو خوف کا غلبہ ہونا چاہیے تاکہ گناہوں سے بچا رہے کیونکہ وہ وقت عمل کا ہے اور موت کے وقت امید کا غلبہ ہونا ضرور ہے اس لئے کہ وہ وقت لقاء حق کا ہے اور اللہ تعالیٰ سے امید لے کر ملنا چاہیے تاکہ بمقتضائے انا عند ظن عبدی ہی (یعنی میں اپنے بندے کے گمان کے نزدیک ہوں جو اس کو میرے ساتھ ہے) یہ شخص مورد رحمت ہو لیکن غلبہ خوف سے یہ مراد ہے کہ وہ حد سے متجاوز ہو جائے یہاں غلبہ مقابلہ میں امید کے ہے یعنی امید سے زیادہ خوف ہو اس لئے کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب خوف فوق الحد ہوتا ہے تو وہ مانع طاعات بن جاتا ہے چنانچہ بہت سے سالکین پر جب خوف کا غلبہ ہو گیا ہے تو طاعات چھوڑ بیٹھے ہیں۔ بعض نے نماز چھوڑ دی ہے کسی نے ذکر چھوڑ دیا ہے۔ اصطلاح صوفیہ میں ان کو سالکین مستہلکین کہتے ہیں۔ ایسے لوگ مقبول مقرب نہیں ہوتے اور یہ لوگ اپنی خود رانی کی وجہ سے ایسے گڑھے میں گرتے ہیں کہ تمام عمر اس سے خلاصی نہیں ہوتی ایسے وقت رہبر کامل کی ضرورت ہے وہ بہ تدابیر اس مہلکے سے نکال لیتا ہے اور تدابیر متعلقہ تدابیر باطن بعض مرتبہ ایسی لطیف ہوتی ہیں کہ عوام کا فہم ان کے ادراک سے قاصر ہوتا ہے بلکہ ان کو بادی النظر میں نامناسب سمجھتے ہیں۔

تخويف کی دو قسمیں

پس دہم اگر نہ فرماتے تو اللہ کے بعض بندے بوجہ غلبہ استحضار شان جلال وقہاریت کے خوف کی وجہ سے جان ہی دیدیتے اس لئے دہم اختیار فرمایا کہ جس ذات سے خوف کی فضیلت بیان ہو رہی ہے وہ تمہارا مربی بھی ہے تم سے بے تعلق نہیں وہ کوئی شیر یا بھیڑ یا نہیں اے میرے مقبول بندو! تم اس قدر خوف کے اندر مت گھلو جیسی مجھ میں شام جلال وقہاریت ہے اسی طرح شان تربیت بھی تو ہے اسی وجہ سے فاما من خاف مقام ربہ (جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے) میں بھی رب فرمایا ہے اور یہاں ربہ کے ساتھ ایک لفظ مقام کا اور زیادہ فرمایا۔ اس میں عجیب نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ خوف کے قائم رکھنے کے لئے بڑھایا شرح اس کی موقوف ہے ایک مثال پر۔

وہ یہ ہے کہ مثلاً کسی کا باپ اگر حاکم ہو تو جب وہ برسر اجلاس ہوگا تو اس کا اور اثر ہوگا اور جب نچ پر ہوگا تو دوسرا اثر ہوگا اجلاس پر تو شان حکومت جلوہ گر ہوگی خواہ کوئی سامنے آئے اور رنج پر شان شفقت پداری کی ظاہر ہوگی اس وقت شان حکومت ظاہر نہ ہوگی پس مقام کا لفظ بڑھا کر یہ بتلا دیا کہ گو وہ تمہارا رب ہے جس کا مقتضا شفقت و رحمت و تربیت ہے لیکن جبکہ وہ قیامت کے دن جلال وقہاریت کے ساتھ ظہور فرمائیں گے تو اس وقت ان کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد کر کے اس سے ڈرنا چاہیے خلاصہ یہ کہ مقام کا لفظ خوف دلانے کو بڑھایا

اور بہ تعدیل خوف کے لئے لائے اسی طرح یہاں یخشون ربہم (جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں) میں اسی تعدیل کے لئے ربوبیت کو یاد دلایا اور جاننا چاہیے کہ یخشون ربہم میں ربہم کا لفظ جیسے کہ جانب افراط کی تعدیل کرتا ہے اسی طرح جہت تفریط کا بھی معدل ہے یعنی نفس خوف کے وجود کا بھی متحرک تفصیل اس کی یہ ہے کہ تخویف کی دو قسمیں ہیں ایک توبہ کی کسی امر موجب سے خوف دلایا جائے جیسے کہا جائے کہ اگر چوری یا ڈکیتی کرو گے تو جیل خانہ جاؤ گے اس کا اثر تو ضعیف ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ مقدمہ میں رہا ہو جائیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ کسی امر معجل سے تخویف ہو مثلاً کسی سرکاری ملازم سے کہا جائے کہ فلاں جرم کا اگر ارتکاب کرو گے تو سب سے اول سزا یہ ہوگی کہ تمہاری ملازمت جاتی رہے گی۔ تنخواہ بند ہو جائے گی اور پھر جیل خانہ جاؤ گے۔ یہ موثر قوی ہے کیونکہ نوکری کا نفع کہ تنخواہ ہے وہ فی الحال جاری ہے اس کا انقطاع زیادہ مخوف ہے اسی طرح تعزیرات الہیہ میں بھی سمجھئے کہ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اس گناہ کی سزا یہ ہے کہ دوزخ میں جلو گے اس کا اثر بعض طبائع پر ضعیف ہے اس لئے کہ جانتے ہیں کہ میاں جب قیامت ہوگی دیکھا جائے گا۔ (خواص الخشیہ ص ۱۶۷)

یخشون ربہم فرمانے میں حکمت

اب سمجھئے کہ ربہم سے کس طور سے نفس خوف پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گویا یہ فرماتے ہیں کہ ایسی ذات سے ضرور ڈرنا چاہیے کہ تمہاری تربیت کا مدار اسی کے ہاتھ میں ہے اس لئے کہ اگر اس سے نہ ڈرو گے تو تمہاری تربیت میں کمی آ جائے گی۔ مثلاً روزی نہ ملے گی۔ عافیت جاتی رہے گی سبحان اللہ کلام اللہ کے ایک ایک لفظ کے اندر کتنے بے شمار معانی بھرے ہوئے ہیں اور ہر مقام پر نظائر بیان کرنے سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ کلام اللہ کے اندر پورا لطف اس کو آئے گا جس کی محاورات اور واقعات پر نظر ہو اور استدلال اور فلسفیت کی زیادہ کاوش سے خالی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم تو گناہوں کے اندر رات دن رہتے ہیں اور ہم کو خوب رزق ملتا ہے تا فرمانی سے رزق کبھی نہیں گھٹتا اس کے دو جواب ہیں اول تو نقلی قرآن و حدیث سے مسلمانوں کا چونکہ وہ ایمان ہے ان لئے اس کے لئے تو یہی کافی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں من اعرض عن ذکری فان له معیشتہ ضنکاً یعنی جو شخص میری یاد سے اعراض کرے اس کے لئے تنگ زندگی ہے۔ اگرچہ اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ معیشتہ ضنکاً سے مراد یہ ہے کہ قبر میں اس کی حیات اخروی تنگ ہوگی لیکن معیشتہ کے لفظ سے متبادر یہی ہے کہ دنیا ہی کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ بندہ گناہ کرنے سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔ دوسرا جواب عقلی ہے اور اس کی اگرچہ بعد قرآن و حدیث کے ضرورت نہیں لیکن ہم تبرعاً واقعات سے دکھلاتے ہیں بات یہ ہے کہ رزق میں یہ غور کرنا چاہیے کہ کیا شے

مطلوب ہے جائیداد اگر مطلوب ہے تو کیوں ہے ڈھیلے تو مطلوب ہیں نہیں مکان طلب کیا جاتا ہے تو کیوں کیا جاتا ہے اگر کہو کہ مطلوب جائیداد سے روٹی کپڑا اور مکان ہے اس میں رہنا ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس مقصود کا بھی کوئی مقصود ہے یا کھانا پہننا بذاتہ مطلوب ہے اگر کھانا پہننا بذاتہ مقصود ہوتا تو عاریت کے کپڑے اور عاریت کے گھر میں ایسا لطف کیوں نہیں جیسے اپنے کپڑے پہننے اور اپنے مکان میں رہنے سے آتا ہے معلوم ہوا کہ نفس پہننا کھانا رہنا مقصود نہیں کوئی اور شے مطلوب ہے وہ کیا ہے وہ ہے لذت راحت حلاوت چونکہ اپنا کپڑا پہننے میں اپنے مکان میں رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ (خواص النسخہ ص ۱۹۱۸)

عجیب ربط آیت

اس لئے خشیت کی فضیلت معلوم کرنے کے بعد ممکن ہے کہ کسی کو خیال ہو کہ میاں ہم ایسی جگہ جا کر گناہ کریں گے کہ کسی کو خبر ہی نہ ہو اس کے جواب میں ارشاد ہے کہ تم لوگ خواہ سرگوشی کر دیا جہر سے بات کرو ہم کو دلوں تک کی خبر ہے سبحان اللہ کیا کلام ہے انہ علیہم بذات الصدور (وہ دلی باتوں سے واقف ہیں) میں قول سے لے کر ذات الصدور تک جتنے مراتب ہیں ظہور و اخفا کے سب آگئے۔ آگے اس کے دلیل عقلی ہے الا یعلم من خلق یعنی وہ ذات جس نے پیدا کیا ہے وہ نہ جانے گا یہ عقلی مسئلہ ہے کہ ایجاد بعد علم کے ہوتا ہے اس لئے کہ فعل اختیاری مسبوق بالارادہ ہوتا ہے اور ارادہ مسبوق بالعلم سے مطلب یہ ہوا کہ کیا ہم تمہاری چھٹی کھلی ہوئی بات سے ناواقف ہیں ہم نے خود ہی تو سب کو پیدا کیا ہے اس میں بڑی تاکید خشیت کی ہوگی کہ ہر حال میں ڈرنا چاہیے آگے ارشاد ہے وهو اللطیف الخبیر (وہ باریک بین اور پورے باخبر ہیں) یہ جملہ بھی خشیت کا مؤکدہ ہے اس لئے کہ نہ ڈرنے کی دو وجہ ہوتی ہیں کبھی تو خوف منہ کا بعید ہونا تو اس کی نسبت تو ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت قریب ہیں لیکن چونکہ لطیف ہیں اس لئے نظر نہیں آتے دوسری وجہ نہ ڈرنے کی خوف منہ کو خبر نہ ہونا ہوتی ہے تو اس کے لئے فرماتے ہیں کہ وہ خبیر بھی ہیں غرض فحوا قیاس الغائب علی الشاہد تم ہم کو مخلوق پر قیاس نہ کرو ہم سے تم کسی بات کو چھپا نہیں سکتے اس لئے خشیت ضروری ہے ان آیات سے خوف کی فضیلت اور اس کا مفتاح سعادات دنیویہ و اخرویہ ہونا معلوم ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خشیت بہت ہی ضروری شے ہے۔ (خواص النسخہ ص ۲۱۳۰)

طریق تحصیل خشیت

اپنے روزانہ اوقات میں سے آدھ گھنٹہ یا بیس منٹ نکال کر تنہا بیٹھ کر دو چیزوں کو سوچا کرو۔ اول تو اپنے اعمال سیئہ کو یاد کرو اور خدا تعالیٰ نے جو اس پر سزا مقرر فرمائی ہے اس کو سوچا کرو اور اس کے بعد اپنے نفس سے

کہو کہ اے نفس تو کیوں ہلاک ہوتا ہے دیکھ تو سہی ان اعمال کی یہ پاداش تجھ کو بھگتنا پڑے گی اور اس کے بعد اپنے مرنے سے لے کر جنت اور جہنم کے داخل ہونے تک جو جو واقعات پیش آنے والے ہیں مثلاً قبر میں جانا منکر تکبیر کا سوال کرنا حساب کتاب پل صراط سب واقعات تفصیل کے ساتھ سوچو یہ وظیفہ اپنا روزانہ رکھو دیکھئے تو سہی کیا شمرہ ہوتا ہے۔ (خواص الحیۃ ص ۳۱)

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ

ترجمہ: اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے

تفسیری نکات

سمع کو مفرد لانے میں نکتہ

ایک اور نکتہ بیان کرتا ہوں کہ دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے وجعل لكم السمع والابصار والافئدة اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے اس میں ابصار و افئدة کو جمع لایا گیا ہے اور سمع کو مفرد مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا تھا کہ سمع ایسی چیز ہے کہ بہت سے سننے والے ایک دم سنتے ہیں اس لئے وہ سب مل کر مثل ایک کے ہیں۔ مجلس واحدہ میں عادتاً یہی ہوتا ہے کہ سب ایک دم سنیں یہ نہیں کہ علی التعاقب سنیں تو گویا سب سمع جمع ہو کر سمع واحد کے حکم میں ہیں اور ابصار میں تعاقب ہو سکتا ہے اسی طرح قلوب کے فہم میں بھی تعاقب ہوتا ہے خلاصہ یہ ہے کہ ادراک سمع کا واحد تھا اس لئے سمع کو مفرد لائے بخلاف ابصار و قلوب کے کہ ان کا ادراک علی التعاقب جدا ہو سکتا ہے اور اس نکتہ کی ضرورت اس مقام پر ہوگی کہ ابصار و قلوب بدون اضافت الی ضمیر الجمع آیا ہو ورنہ اضافت الی ضمیر الجمع (ضمیر کی جمع کی طرف مضاف ہونے کے بغیر کے وقت تو بوجہ مقابلہ جمع بالجمع کے ابصار و قلوب بھی حکم مفرد میں ہو جاویں گے۔ اب ایک نکتہ اور بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ ختم اللہ علی سمعہم (ان کے کانوں پر اللہ نے مہر لگا دی) آیت میں قلب اور سمع کے لئے ختم لائے اور بصر کے واسطے غشاوة لائے اس میں بھی ایک نکتہ ہے وہ یہ کہ قلوب اور سمع کا ادراک کسی ایک جانب کے ساتھ خاص نہیں تو ان کے ابطال ادراک کے لئے سب جوانب سے موانع کے احاطہ کی ضرورت ہے اور ختم میں ایسا ہے احاطہ ہوتا ہے جو سب جوانب سے مانع ہوتا ہے بخلاف بصر کے کہ اس کا ادراک صرف جہتہ مقابلہ سے ہوتا ہے سو اس کے مانع کا بھی ایک جانب سے ہونا کافی ہے اور

غشاوة ایک ہی جانب سے ہوتا ہے اس لئے فرمایا ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم (یعنی ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی) و علی ابصارہم غشاوة یعنی ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور یہ نکتہ جب ہے کہ و علی سمعہم کا عطف علی قلوبہم پر ہوا اور بعض مفسرین و علی ابصارہم کا عطف علی قلوبہم پر نہیں کرتے بلکہ اس کو معطوف علیہ قرار دیتے ہیں۔ و علی ابصارہم کا تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا سمع و بصر دونوں پر پردہ ڈالا گیا ہے اور مجھے یاد نہیں کہ اس جگہ عطف میں کیوں اختلاف ہوا ہے میرے نزدیک توشیح اول متعین ہے کیونکہ دوسری جگہ احتمال اول کی تصریح ہے۔ و ختم علی سمعہ و قلبہ و جعل علی بصرہ غشاوة اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا پس جب وہ وجہ محتمل ہی نہیں تو میں اس کی توجیہ میں دماغ کیوں تھکاؤں ناحق کے نکتے اچھے نہیں معلوم ہوتے۔

کوئی احتمال کی بناء پر سوال کرے اور کہے کہ آخر اس کا احتمال تو ہے ہی کہ علی سمعہم کا عطف علی قلوبہم پر ہو تو میں کہوں گا کہ ایسے احتمالات کا اعتبار نہیں ہے کیا قرآن شریف دوبارہ نازل ہوگا جب دوسری جگہ قرآن شریف میں صرحاً و ختم علی سمعہ و قلبہ و جعل علی بصرہ غشاوة اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا) موجود ہے تو پھر اس جگہ بھی اس کے مطابق توجیہ کیوں نہ کی جاوے۔

مدرکات قلب کا بیان

اب اس کا بیان کرتا ہوں کہ اس آیت میں ان مدرکات ثلاثہ میں سے کن مدرکات کا بیان ہے سوا اول نظر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقط ایک مدرک کا بیان ہے یعنی فقط بصر کا ذکر ہے مگر بعد تامل معلوم ہوتا ہے کہ دو کا ذکر ہے ایک بصر کا عینین میں دوسرے قلب کا گو اس کا ذکر منظوقاً نہیں کیا ہے۔ مگر و ہدیناہ النجدین۔ میں مفہوم ما ذکر کر دیا پس ہدیناہ النجدین میں نعمت قلب کا تذکرہ ہے کیونکہ فعل قلب کا ہے قلب ہی سے تو ہدایت کا ادراک ہوتا ہے اور یہی قلب مخاطب ہے امر و نہی کا اور یہی مدرک ہے کلیات و جزئیات کا گو بواسطہ آلات سمی اور وہ آلات عقل و حواس ہیں ظاہر ابھی باطنہ بھی اور یہ قلب حافظہ ہے کلیات و جزئیات مدرک کو ظواہر نصوص سے مفہوم ہوتا ہے اور گو یہ حکماء کے خلاف ہے کہ انہوں نے اختلاف مدرکات (بصیرۃ المفعول) سے خود مدرکات (بصیرۃ الفاعل) میں بھی اختلاف کا دعویٰ کیا ہے۔ کلیات کے لئے عقل اور جزئیات کے لئے حواس پھر مختلف مدرکات کے لئے حافظات بھی جدا جدا مانے ہیں مگر متکلمین کو یہ مضرب نہیں کیونکہ یہ قول حکماء کا سب بناء الفاسد علی الفاسد ہے کیونکہ اس تغایر کی ضرورت ان کو الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد (واحد سے ایک

عی صادر ہوتا ہے) کی وجہ سے ہوئی ہے جیسا کتب فلسفہ میں مشہور ہے اور یہ قاعدہ خود غلط ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے و نیز اس قاعدہ میں خود حکماء نے تصریح کی ہے کہ یہ قاعدہ واحد حقیقی کے متعلق ہے اور قوی مدرکہ کی وحدت ہقیقہ خود باطل ہے۔ نامعلوم یہ حکماء کہاں چلے جاتے ہیں اصل مسئلہ میں تو واحد کے ساتھ حقیقی کی قید لگاتے ہیں اور تحقیق فروع کے وقت اس قید کا خیال نہیں کیا جاتا۔ کتنی بڑی غلطی ہے۔ یہ تو ایسا ہوا کہ بچے کئے تبت کے اور رواں پڑھاں بطح البتہ آلات اور ان کے تغائر کا دعویٰ صحیح ہے جس کی سیدھی دلیل انی مشاہدہ ہے مگر حکماء نے دلیل لمی بیان کرنا چاہا اور مدرکہ (بالفتح) مختلف پائے گئے اس لئے قاعدہ مذکورہ کی بناء پر مختلف مدرکات کی ضرورت پڑی پھر جن جن مدرکات میں قابلیت جس جس کی ادراک سمجھے ایک ایک ادراک کو ان کے سپرد کر دیا۔ جن میں سب مدرکات (بالفتح) حسیہ تو ادراک و حفظا حواس کے متعلق ہو گئے مگر مدرکات کلیہ باقی رہ گئے ان کا مدرک عقل کو تجویز کیا مگر کوئی حافظ ان کلیات کا نہیں ملا تو عقلی گھوڑے دوڑائے اور کوئی نہ تھا تو عقل فعال کا نام دے دیا اور عقل فعال کو کھینچ لائے۔

سُورَةُ الْحَاقَّةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۱﴾

ترجمہ: اور (علم ہوگا) کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گذشتہ ایام (یعنی زمانہ قیام میں کئے ہیں)

تفسیری نکات

ایام خالیہ کی تفسیر

پس ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت میں اصحاب الیمین سے کہا جائے گا کلووا و شربوا ہنیئاً بما اسلفتم فی الايام الخالیہ کہ کھاؤ اور پیو ان اعمال کے عوض میں جو تم نے ایام خالیہ میں کئے ہیں۔ ایام خالیہ کی ایک تفسیر ابن عدی و بیہقی نے وہ نقل کی ہے جو پہلے سے میرے دل میں تھی اور اسی کی بناء پر میں نے اس آیت کو بیان کے لئے اختیار کیا تھا مگر مجھے تلاش تھی کہ اس کی تائید سلف کے کلام سے بھی مل جائے بدوں تائید سلف کے میں قرآن کے ایک لفظ کی تفسیر بھی گوارا نہیں کرتا کیونکہ تفسیر بالرأے سے ڈر لگتا ہے ہاں نکات و لطائف بیان کرنے کا مضائقہ نہیں کیونکہ وہ تفسیر میں داخل نہیں بلکہ امر زائد کی قبیل سے ہیں بہر حال مجھے تلاش تھی کہ ایام خالیہ سے جو میں نے سمجھا ہے اس کی تائید منقول سے مل جائے اول اور تفاسیر دیکھیں جلالین وغیرہ مگر کسی میں اس کی موافقت نہ ملی پھر اخیر میں درمنثور میں تلاش کیا تو اس میں ابن منذر و ابن عدی اور بیہقی کی تخریج سے نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن رفیع نے بما اسلفتم فی الايام الخالیہ (یہ بدلہ ہے اس کا جو ایام خالیہ میں تم نے کئے ہیں) کی تفسیر میں فرمایا ہے هو الصوم (وہ روزے ہیں) قلت و عزاه القمی فی تفسیر الی مجاہد و الكلبي قال لا هی ایام الصیام قال القمی فیکون الاکل والشرب فی الجنة بدل الا

مساك عنهما في الدنيا (ج ۲۹ ص ۳۳) (میں کہتا ہوں تمہی تفسیر میں مجاہد و کلبی کی طرف منسوب کیا ہے انہوں نے کہا ایام خالیہ سے مراد روزے کے دن ہیں لہذا کھانا پینا جنت میں دنیا میں کھانے پینے سے رکنے کا بدل ہو جائے گا) اگر یہ تائید نہ ملتی تو بڑی فکر ہوتی اور مجھے کوئی دوسری آیت تلاش کرنا پڑتی۔ مگر دل اسی کے بیان کو چاہتا تھا کیونکہ اول ذہن میں یہی آئی تھی اور اس کے ہی متعلق ایک خاص مضمون ذہن میں بھی آ گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ تائید مل گئی اور مجھے دوسری آیت تلاش کرنا نہ پڑی اب سنئے کہ مشہور تفسیر تو ایام خالیہ کی ایام ماضیہ ہے اور میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ ایام خالیہ سے مراد وہ ایام ہیں جو طعام و شراب سے خالی تھے۔ یعنی ایام صیام چنانچہ سلف کے کلام سے بھی اس کی تائید ہو گئی دوسرے عقلی طور پر ظاہر یہ ہے کہ جزا مناسب عمل ہو اور نصوص میں غور کرنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور صوفیہ نے تو اس کو کشفی طور پر بیان کیا ہے اس قاعدہ سے بھی صوم کا عوض اکل و شرب ہی ہونا چاہیے۔

فہو فی عیشة راضیہ فی جنۃ عالیہ قطو فہا دانیہ کلوا و اشربوا ہنینا بما اسلفتم فی الایام الخالیہ کہ وہ شخص نہایت چین میں ہوگا۔ بلند جنت میں ہوگا جس کے میوے نزدیک ہیں (یعنی جھکے ہوئے ہیں جن کے توڑنے میں کوئی دشواری نہیں پھر ارشاد ہے کلو و اشربوا الخ کہ ان سے کہا جائے گا کھاؤ پو بعض اس کے کہ تم نے ایام خالیہ میں کیا ہے۔

چونکہ ایام خالیہ کی تفسیر مختلف ہے اس لئے میں ابھی اس کا ترجمہ نہیں کرتا بلکہ تحقیق بیان کرنے کے بعد ترجمہ کروں گا۔

کھانے پینے کی رعایت

پہلے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اکل و شرب (کھانے پینے) کا ذکر مستقل طور پر کیوں کیا۔ حالانکہ فہو فی عیشة راضیہ میں یہ بھی داخل ہو چکا تھا تو اس افراد بالذکر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسان کھانے پینے کا سب سے زیادہ عاشق ہے اور اس کے سوا جتنی مستیاں وہ سب اسی کے تابع ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کو جو کسی عورت یا مرد پر عاشق ہو چار پانچ دن تک کھانے پینے کو نہ دیا جائے پھر اس سے پوچھا جائے کہ بتلاؤ روٹی اور پانی لاویں یا عورت اور مرد کو بلائیں تو وہ اس وقت روٹی اور پانی ہی کی درخواست کرے گا اور عورت اور مرد کے عشق کو بھول جائے گا۔ اسی طرح اور سارے مطلوبات کو دیکھ لیا جائے تو سب کا مدار اسی پر ہے چنانچہ اسی کے لئے نوکری اور ملازمت کی جاتی ہے اور اسی کیلئے تیری میری غلامی کی جاتی ہے۔ بعض دفعہ آدمی اس سے گھبرا کر یوں بھی کہنے لگتا ہے کہ یہ دوزخ کہاں کا لگ گیا مگر پھر بھی اس دوزخ کے بھرنے سے نہیں رکتا ایک وقت بھرنے کے بعد پھر دوسرے وقت کے لئے فکر ہے کہ شام کو اسے کس چیز سے بھرا جائے گا اور یہاں

سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے جذبات کی کس قدر رعایت فرمائی ہے۔

وما هو بقول شاعر (الحاقہ آیت ۴۱)

اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔

ملفوظ ۱۸: ”وما هو بقول شاعر“ پر اشکال اور اس کا جواب

ارشاد فرمایا قرآن شریف میں ہے وما علمناہ الشعر وما ينبغي له اور وما هو بقول شاعر حالانکہ قرآن کی بہت سی آیتیں نظم پر منطبق ہیں جیسے فاصبحوا لایروی الامساکنہم یا جیسے یرزقہ من حیث لا یحتسب پھر اس کے کیا معنی؟ جواب یہ ہے کہ ایک تو انطباق ہے اور ایک تطبیق ہے۔ ممانعت اگر ہے تو تطبیق کی ہے نہ انطباق کی۔ یعنی قصداً اوزان شعری پر منطبق کرنے کی ممانعت ہے۔ اور ایک منطبق ہو جانا اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اسی تفصیل پر تغنی بالقرآن کے حکم ہے، اگر قصد غنا کے ہو تو ممانعت ہے والا فلا یعنی اصل مقصود تو ادائے حروف اس میں اگر تبعا کوئی غنا کی صورت پیدا ہو جائے کچھ حرج نہیں قصد تغنی کے نہ ہونا چاہیے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۱۵ ص ۳۳)

سُورَةُ نُوحٍ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ رَبِّ اِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لِيَلَا وَنَهَارًا ۗ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَايَ

اِلَّا فِرَارًا ۗ وَاِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا اَصَابِعَهُمْ

فِي اِذَانِهِمْ وَاسْتَعْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاصْرُوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۗ

ثُمَّ اِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۗ ثُمَّ اِنِّي اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ

لَهُمْ اَسْرَارًا ۗ

ترجمہ: آخر نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی (دین حق کی طرف بلایا) سو میرے بلانے پر دین سے اور زیادہ بھاگتے رہے اور (وہ بھاگنا یہ ہوا کہ) میں نے جب کبھی ان کو دین حق کی طرف بلایا تا کہ آپ ان کو بخش دیں تو انہوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں دے لیں اور (نیز زیادتی کی انتہا ہے) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹ لئے اور اصرار کیا اور (میری اطاعت سے) غایت درجہ کا تکبر کیا پھر بھی میں نے ان کو یہ آواز بلند فرمایا پھر میں نے ان کو خطاب خاص کے طور پر ان کو علانیہ بھی سمجھایا اور خفیہ بھی سمجھایا۔

تفسیری نکات

حضرت نوح علیہ السلام کی غایت شفقت

بعض ظالم مصنف نوح علیہ السلام کی بابت کہتے ہیں کہ ان میں شفقت و رحم نہ تھا اور یہ دلیل لکھی کہ انہوں نے اپنی قوم کے لئے بہت ہی سخت بددعا کی ہے۔ رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیاراً (خداوند!)

کافروں میں سے زمین پر ایک بھی بسنے والا نہ رہے)

میں کہتا ہوں کہ اس شخص نے نوح علیہ السلام کی بددعا کو تو دیکھ لیا مگر اس کو نہ دیکھا کہ انہوں نے اس ظالم قوم کی تکلیفیں کتنی مدت تک برداشت کیں اس شخص کو بڑا ہمدردی قوم کا دعویٰ ہے ذرا وہ نو مہینے ہی ایسی تکالیف برداشت کر کے دکھلا دے ثانی یاد آ جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ نوح علیہ السلام کا ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کرتے رہنا اور قوم کی اصلاح میں سعی کرتے رہنا اور ان تکلیفوں کو سہتے رہنا جس کا ذکر اسی آیت میں ہے۔

قال رب انی دعوت قومی لیلاً ونهاراً الی قوله ثم انی دعوتهم جہاراً ثم انی اعلنت لهم واسررت لهم اسراراً یہ ان کی غایت درجہ شفقت کی دلیل ہے جب اصلاح سے مایوس ہی ہو گئے اور مایوسی بھی وحی سے واقع ہوئی جیسا اس آیت میں ہے۔

واوحی الی نوح انه لن یومن من قومک الا من قد امن الی قوله ولا تخاطبنی فی الذی ظلموا انہم مغرورون

اور یہ سمجھا کہ اب ان سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا سخت اندیشہ ہے اور بظاہر نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ اس کی اولاد میں کسی کے مومن ہونے کی امید ہے اس وقت انہوں نے بددعا کی چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں۔

انک ان تذرہم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً

جب تک ان کو اصلاح کی امید رہی اس وقت تک تبلیغ کرتے رہے مصائب جھیلتے رہے جو ایک سال دو سال کی مدت نہ تھی بلکہ اکٹھے ساڑھے نو سو برس اسی حال میں گزر گئے جب ان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور مسلمانوں کو ان کے وجود سے خطرہ ہونے لگا اس وقت مسلمانوں کے حال پر رحم کر کے کفار پر بددعا کی تو یہ بددعا بھی حقیقت میں رحمت تھی اور اس کا منشاء بھی شفقت ہی تھی یعنی مسلمانوں کے حال پر مگر لوگوں میں مرض یہ ہے کہ وہ صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اعتراض کر دیتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا بے رحمی نہیں

تو بتلائے اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام ان کے لئے بددعا نہ فرماتے تو اس کا انجام کیا ہوتا ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی کم محدودے چند تھے اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا نہ یہ خود ایمان لائیں گے نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ سب ایمان دار ہی ہوں گے بلکہ ان میں بھی ایمان دار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونے والا تھا۔ اب اگر اس زمانہ کے کافر غرق نہ کئے جاتے

اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی تو مسلمانوں کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔

(احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اس قدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آ رہا ہے تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا۔ خصوصاً جبکہ ان کفار کی اولاد میں مسلمان کوئی نہ ہوتا سب کافر ہی ہوتے اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بددعا کی ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آ جاتی اور ان کو جینا محال ہو جاتا ۱۳)

غرض اس سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بددعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بددعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہے سراسر رحم تھی ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دو بھر ہو جاتا یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا۔ (العمرہ بذبح البقرہ ملاحظہ مواعد ظراہ نجات ص ۳۲۷)

سُورَةُ الْمَرْمَلِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

يَا أَيُّهَا الْمَرْمَلُ ۝ قُمْ الْبَيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوْ انْقُصْ

مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝

ترجمہ: اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی یعنی نصف رات کہ (اس میں قیام نہ کرو بلکہ آرام کرو یا اس نصف سے کسی قدر کم کرو یا نصف سے کچھ بڑھا دو اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو۔

تفسیری نکات

تہجد کی مشروعیت قرآن سے اور تراویح کی سنت

حدیث سے ثابت ہے

اس کی دلیل ہے پھر دوسرا کوغ گیا رہ بارہ مہینے میں نازل ہوا جس کا حاصل اس فرضیت کا منسوخ کر دینا ہے اور تراویح کی نسبت حضور فرماتے ہیں سنت لکم قیامہ میں نے تمہارے لئے اس میں تراویح مسنون کی ہے (۱۲) اگر یہ تہجد ہے تو اس کو حضور نے اپنی طرف کیوں منسوب کیا۔ اس سے لازم آتا ہے کہ جو خدا کی طرف سے منسوب ہے وہ حضور اپنی طرف منسوب فرماتے ہیں لہذا معلوم ہوا کہ تہجد اور ہے جس کی مشروعیت حق تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہوتی ہے اور تراویح اور ہے جس کی سلیت حضور کے ارشاد سے ثابت ہوتی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ تعالٰ امت نے دونوں میں فرق کیا ہے۔ غرض یہ عبادت مخصوص ہے اس کے ساتھ اور حقیقت اس کی نماز ہے۔

اہل اللہ کی گستاخی کا انجام

وذرنی الخ میں تسلی ہے حضور کی مجھ کو ان مکذبین کے ساتھ بننے دو اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ مقبولان حق کے ساتھ گستاخی کرنے سے خود حضرت حق تعالیٰ انتقام لیتے ہیں چنانچہ ذرنی فرمایا ۔
بس تجربہ کر دیم الخ ہر کہ در افتاد بر افتاد بیچ قومی را خدا رسوا نکرد تا دل صاحب دلی نامہ بدرد

گلیم پیچیدہ کا ثبوت

یا ایہا المزمّل بمعنی گلیم پیچیدہ میں اشارہ اس طرف ہے کہ صوفیہ کا یہ بھی ایک طریق ہے کہ اپنے بدن کو جس میں سر بھی داخل ہے کپڑے میں لپیٹے رہیں تاکہ نگاہ منتشر نہ ہونے پائے اس سے قلب بھی منتشر ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔

اندازِ مخاطب میں حکمت

یا ایہا المزمّل قم الیل الا قليلا نصفه او انقص منه قليلا اوزد علیہ الآیة
یہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم اس کا امت کو بھی شامل ہے اور مزمّل کے معنی ہیں چادر اوڑھنے والا چونکہ رسول اللہ ﷺ کو کفار کی تکذیب سے بہت تکلیف ہوئی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو یہ چاہتے تھے کہ یہ کم بخت ایمان لائیں تاکہ جہنم سے چھوٹ جائیں اور وہ لوگ ایمان تو کیا لاتے انہیں تکذیب پر کمر باندھ رکھی تھی اور آیت الہی سے تمسخر اور مقابلہ کیا کرتے اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدت غم ورنج و حزن سے چادر اوڑھ کر بیٹھ گئے تھے اس لئے خاص اس حالت کے اعتبار سے یا ایہا المزمّل نداء و خطاب میں فرمایا گیا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گونہ تسلی ہو اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص ہجوم اعداء اور ان کے طعن و تشنیع سے تنگ آ گیا ہو اس وقت محبوب خاص اسی حالت کے عنوان سے اس کو پکارے جس کیساتھ اس کا تلبس ہے۔

تو دیکھئے اس شخص کو کتنی تسلی ہوگی اور اس لفظ کی کتنی لذت معلوم ہوگی جس کی ایک وجہ یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ محبوب کو میرے حال پر نظر ہے ایسا ہی یہاں بھی یا ایہا المزمّل کے عنوان سے جو کہ مناسب وقت سے ہے نداء دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ اور بعد اس کے بعض اعمال کا حکم دیا جاتا ہے اور ان بعض ارضی احوال پر صبر کرنے کا ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ ایک دوسرے مقام پر بھی اسی طرح فرمایا ہے کہ فاصبر علی ما یقولون و سبح بحمد ربک اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اوپر کہ مثال میں اس شخص کا محبوب اس کو یہ

کہے کہ میاں تم ہم سے باتیں کرو ہم کو دیکھو۔ دشمنوں کو بکنے دو جو بکتے ہیں آؤ تم ہم سے باتیں کرو۔ وہ کام کرو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو یہ تسلیہ بذریعہ وحی کے ہوا مگر امت میں اور اہل اللہ کو اس قسم کے خطابات وغیرہ بذریعہ الہام اور واردات ہوتے ہیں۔ اور اس مقام لفظ مزمل کی تفسیر سے ایک مسئلہ نکلتا ہے وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اوڑھنے کی وجہ شدت ملال و حزن تھی اس سے ثابت ہوا کہ کامل باوجود کمال کے بشریت سے نہیں نکلتا جیسا یہاں پر بوجہ تکذیب مخالفین کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مغموم ہونا معلوم ہوتا ہے ہاں اتنا فرق ہے کہ ہم لوگوں کا غم ایسے مواقع پر بوجہ تنگ دلی و ضعف تحمل کے ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غم غایت شفقت اور رحم کے تھا آپ اس پر مغموم تھے کہ اگر لوگ ایمان نہ لائیں گے تو جہنم میں جائیں گے اس وجہ سے ان پر رحم آتا تھا اور غم پیدا ہوتا تھا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے لعلک باسع نفسک الخ شاید ان کے ایمان نہ لانے پر جان دیدیں گے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مکیر گر چہ ماند در نوشتن شیر و شیر

نیک لوگوں کو اپنے اوپر مت قیاس کرو اگر چہ شیر اور شیر کو لکھنے میں ایک ہی ہیں مگر معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اب ندائے یایہا المزمیل کے بعد احکام کا بیان ہوتا ہے حاصل احکام کا یہ ہے کہ تعلق دو طرح کے ہوتے ہیں ایک خالق کے ساتھ دوسرا مخلوق کے ساتھ اور یہ تعلق دو قسم کا ہے موافق کیساتھ اور مخالف کے ساتھ اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے قم اللیل الا قلیلاً اس میں ایک تو قیام و ادب تعلیم کیا ہے اور اس کے ساتھ اقتصاد میانہ روی کا ارشاد فرمایا ہے ادب یہ کہ قیام لیل کے لئے وہ وقت مقرر کیا گیا ہے جو کہ نہ بھوک کی تکلیف کا وقت ہے اور نہ معدے کی پری کا وقت ہے کہ طبیعت میں گرانی اور بوجھ ہو اور قیام میں کدورت ہو بلکہ ایسا وقت دونوں تکلیفوں سے خالی ہے اور طبیعت میں نشاط اور سرور ہوتا ہے اور اس میں تشبہ بالملائکہ بھی ہوتا ہے کہ نہ بھوک لگے نہ پیاس لگے نیز رات کے وقت یکسوئی ہوتی ہے اور اقتصاد یہ کہ ساری رات کے قیام کا حکم نہیں دیا کیونکہ اس میں سخت تعب ہوتا ہے بلکہ کچھ حصہ سونے کے لئے بھی مقرر کیا گیا ہے اور چونکہ ہر وقت اور ہر حالت میں ہر شخص کے لئے معین مقدار متعین نہیں ہو سکتی اس لئے اونچیر یہ سے نصف اور ثلث اور دوثلث میں جو مفہوم ہے او انقص منه قلیلاً او زد علیہ کا جیسا کہ دوسرے رکوع سے معلوم ہوتا ہے اختیار دے کر مخاطب کی رائے پر چھوڑا گیا کہ اگر زیادہ قیام نہ ہو سکے تو تھوڑا ہی سہی حدیث میں ہے۔ وشیء من الدلیجة اس اقتصاد میں ایک یہ بھی مصلحت ہے اور حکمت ہے کہ توسط میں دوام ہو سکتا ہے اور افراط میں دوام نہیں اور پہلے یہ قیام اللیل کہ مراد تہجد ہے فرض تھا بعد اس کے فرض منسوخ ہو کر مسنونیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل

تہجد کا سنت فرض تھا بعد اس کے فرض منسوخ ہو کر مستونیت باقی رہ گئی اور اقرب الی الدلیل تہجد کا سنت موکدہ ہوتا ہے تہجد سے محروم رہنے والوں کو اکثر غلطیاں ہونے لگی ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ تہجد صرف اخیر شب کو ہوتا ہے اور اس وقت اٹھنا دشوار ہے اس لئے انہوں نے چھوڑ رکھا ہے کہ اگر اخیر شب میں نہ اٹھ سکو تو اول شب میں ہی پہلے پڑھنا جائز ہے بعض سمجھتے ہیں کہ تہجد کے بعد سونا نہیں چاہیے سونے سے تہجد جا تا رہتا ہے یہ لوگ اس لئے نہیں اٹھتے یہ بھی غلطی ہے تہجد کے بعد سونا بھی جائز ہے غرض اہل سلوک کے لئے تہجد کا یہ عمل بھی ضروری ہے اگر کبھی قضاء ہو جائے تو زیادہ غم میں نہ پڑے تہجد کی قضا بعد میں کر لے اس آیت سے یہی مراد ہے۔ وهو الذی جعل اللیل والنهار خلفة لمن اراد ان یذکر الخ بعض لوگوں کا اگر تہجد قضا ہو جائے تو لوگ حد سے زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں اور کراہتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تہجد کبھی قضا نہ ہوا تھا یاد رکھو اتنی پریشانی کا بعض اوقات یہ انجام ہوتا ہے کہ مطالعہ محبوب میں مشغول ہونے کی بجائے خود کے مطالعے میں مشغول ہو جاتے ہیں حالانکہ اس غم میں لگ کر اصل ذکر سے جو کہ مقصود ہے رہ جاتے ہیں اور انسان مطالعہ محبوب کے لئے پیدا ہوا ہے۔

ان ناشئة اللیل الخ میں ارشاد ہے کہ رات کو اٹھنے کے وقت چونکہ شور اور شغب سے سکون ہوتا ہے اور معاش کا وقت بھی نہیں ہوتا اس لئے قلب میں یکسوئی ہوتی ہے اس لئے اس وقت جو کچھ زبان سے پڑھا جاتا ہے دل پر بھی تاثیر ہوتی ہے اس مضمون میں ما قبل والی آیت ورتل القرآن تزیلا کی تعلیل ہے کہ اس وقت بوجہ اور اسباب کے حضور قلب زیادہ ہوتا ہے لہذا اقیام لیل اور تریل کا فائدہ اس وقت پورے طور سے حاصل ہوگا اس کے بعد ان لک فی النهار الخ میں بطور حکمت بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو دن میں اور بھی کام رہتے ہیں مثلاً تبلیغ دین اور تربیت خلائق خود بھی دین ہے لیکن چونکہ اس میں ایک قسم کا تعلق مخلوق سے ہوتا ہے لہذا اس میں خاص قسم کی توجہ الی اللہ پورے طور پر نہیں ہو سکتی جیسی خلوت میں ہو سکتی ہے۔

اہمیت تلاوت و نماز

اب دوسرا معمول اہل سلوک کا مذکور ہوتا ہے۔ ورتل القرآن تزیلا تزیلا کے معنی ہیں تھام تھام کر پڑھنا صحابہؓ کے زمانہ میں ایک یہ بھی طریق حصول نسبت کا تھا کہ قرآن اور نماز پر مداومت اور محافظت کرتے تھے چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خواب میں دریافت کرنا کہ آج کل کے صوفیہ کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ آپ کے موافق ہے اور اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد کہ ہمارے زمانے میں تقرب کا ذریعہ ذکر کے ساتھ قرآن اور نماز بھی تھا اور اب صرف ذکر پر اکتفا کر لیا ہے مشہور ہے اور اس تغیر کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ صحابہ کے قلوب بہ برکت صحبت نبویؐ اس قابل تھے

کہ ان کو اور قیود کو جو بعد میں حادث ہوئیں ضرورت نہ تھی ان کے قلوب میں صحبت نبویؐ کے فیض سے خلوص پیدا ہو چکا تھا وہ حضرات تلاوت قرآن اور کثرت نوافل سے بھی نسبت حاصل کر سکتے تھے ان کو اذکار کے قیود زائد کی حاجت نہ تھی برخلاف بعد کے لوگوں کے کہ ان میں وہ خلوص بدوں اہتمام کے پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے صوفیہ کرام نے جو اپنے فن کے مجتہد گزرے ہیں اذکار اشغال خاصہ اور ان کی قیود ایجاد کیں اس وجہ سے کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خلوت میں جب ایک ہی اسم کا بتکرار ورد کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ضرب و جہر وغیرہ قیود مناسبہ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے اور اس کی تاثیر نفس و قلب میں واقع و اثبت ہوتی ہے اور رقت و سوز پیدا ہو کر موجب محبت ہو جاتا اور محبت سے عبادت میں اخلاص پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ عبادت خالص کا حکم فرماتے ہیں۔ وما امر و الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين و امرت ان اعبد الخ وغيره من الآيات پس معلوم ہوا کہ حضرات صوفیہ نے یہ قیود ذکر کے طور پر معالجہ تجویز فرمائی ہیں اور اصل مقصد وہی اخلاص ہے پس اگر کسی شخص کو ان قیود سے مناسبت نہ ہو یا بغیر ان قیود کے کسی کو اذکار مسنونہ نوافل و تلاوت قرآن میں پورا اخلاص پیدا ہو سکتا ہے تو صوفیہ کرام ایسے شخص کے لئے ان قیود کی ضرورت نہیں سمجھتے پس اب معلوم ہو گیا کہ یہ تمام قیود اصلاح و تقویت کے واسطے علاجاً تجویز کئے گئے ہیں کوئی شرعی امر قربت مقصود نہیں سمجھا جاتا جو بدعت کہا جائے۔

اب کامل کی توجہ الی الخلق میں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ اشتغال بالحق اس کو یا حق سے مانع ہوگا سو اس شبہ کی منتہی کامل کے حق میں گنجائش نہیں کیوں کہ منتہی کی سبب وسعت صدر کے یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو شغل خلق یا د حق سے مانع نہیں ہوتا اور نیز خلق کے ساتھ اس کا مشغول ہونا بھی بامر حق ہوتا ہے اور اس کو مقصود اس سے امتثال امر اور رضائے حق جل و علا ہی ہوتی ہے اور خلق کی طرف اس کی توجہ خدا ہی کے لئے ہوتی ہے اس لئے اس کو اشتغال بالخلق مانع عن الحق نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اشتغال خود حقوق خلق سے ہے اور اس آیت میں سبحا طویلا بطور جملہ معترضہ کے مخلوق کے اس حق کی طرف اشارہ ہے اور مخلوق کا وہ حق یہ ہے کہ نصیح عام تربیت ارشاد لیکن اس حق خلق میں حق خالق کو نہ بھولنا چاہیے چنانچہ یہاں بھی مخلوق کے حقوق کے بیان سے پہلے تم ایل الخ میں حقوق اللہ بیان کئے گئے تھے اور مخلوق کے حقوق کے بعد بھی و اذکر اسم ربک فرمایا گیا ہے تو گویا یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اس شغل میں ہمیں نہ بھول جانا اول آخردنوں جگہ یاد دلا یا گیا ہے اور و اذکر اسم ربک میں اکثر مفسرین لفظ اسم کو زائد کہتے ہیں اور بعض زائد نہیں قرار دیتے اور اس اختلاف سے یہاں ایک عجیب مسئلہ مستفاد ہو گیا اور اختلاف امتی رحمۃ کا ظہور ہو گیا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ اہم قول کا تو موافق حالت منتہی کے ہے اور عدم زیادہ کا قول موافق حالت مبتدی کے ہے کیونکہ مبتدی کو خود مسکی اور مذکور کا تصور کم

جس کا اسم ہی کا تصور ہو جائے برخلاف منہی کے کہ اس کو ملاحظہ ذات بلا واسطہ بہل ہے اور حدیث ان تعبد اللہ کانک تراہ میں مشہور توجیہ پر منہی کا طریق اور اس کا بیان ہے اور علم کے لئے حضور کا ایک آسان اور بہل طریقہ خدا کے فضل سے سمجھ میں آیا ہے اور وہ یہ کہ آدمی یہ خیال کر لے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مثلاً فرمائش کی ہے اور میں اس فرمائش پر اس کو سنا رہا ہوں اس سے بہت آسانی سے حضور میسر ہو جاتا ہے اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ وتبتل الیہ تبیلاً اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تجل کو صرف واذکر اسم کے متعلق کیا جائے تو اس صورت میں تجل سے اشارہ ہوگا مراقبہ کی طرف یعنی ذکر کیساتھ مراقبہ ہو اور ایک یہ کہ تجل کو مستقل حکم کہا جائے مطلب یہ ہوگا کہ علاوہ احکام مذکورہ کے یہ بھی حکم ہے کہ سب سے قطع تعلق کرو بایں معنی کہ سب کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تعلق علمی اور جہی سے مغلوب ہو جائے اور اثر اس مغلوبیت کا تعارض مقاصد کے وقت معلوم ہوتا ہے مثلاً ایک وقت میں دو کام تضاد پیش آئے ایک کام تو اللہ تعالیٰ کے متعلق کا ہے اور دوسرے غیر اللہ کے متعلق کا اور دونوں کا جمع ہونا ممکن نہ ہو تو ایسے وقت پر اللہ کے کام کو اختیار کرنا اور خلاف مرضی حق کو چھوڑ دینا بس یہی معنی ہیں قطع تعلق کے نہ یہ کہ کسی سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے۔

تعلق حجاب است ذی حاصلے چو پیوندھا بنگسی واصلے

تعلق غیر اللہ حجاب لا حاصل ہیں ان تعلقات کو قطع کر کے تم واصل ہو جاؤ گے البتہ اخلاط میں افراط پیدا کرنا منع ہے اس کے آگے فرماتے ہیں مشرق اور مغرب کا وہی مالک ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو اسی کو اپنے کام کرنے کے لئے معبود قرار دیتے ہیں۔

معمول اہل تصوف

جس کا حاصل تبلیغ دین اور ارشاد و تربیت اور ہے چونکہ موافقین سے تعلق محبت ہے اس کے حقوق بوجہ اس کے کہ وہ حالت طبعی ہے تقاضائے حب کی وجہ سے خود بخود ادا ہو جاتے ہیں اس لئے اس میں زیادہ اہتمام کی ضرورت نہ ہوئی البتہ مخالف کے معاملہ میں ممکن تھا کہ کچھ افراط تفریط ہو جاتی اس لئے اس کا بیان اہتمام سے فرماتے ہیں۔ واصر علی ما یقولون و اھجر ہم ہجرأ جمیلاً مطلب یہ کہ مخالف کی ایذا پر صبر کیجئے اور ان سے علیحدہ رہئے اچھے طور پر کہیں ایسا نہ ہو کہ سختی سے ان کی آتش عناد اور بھڑک اٹھے اور زیادہ تکلیف پہنچائیں ہجر جمیل سے مراد قطع تعلق ہے اس طرح پر کہ قلب پر تنگی نہ ہو پھر جب صبر کی تعلیم دی گئی تو اس تسہیل کے لئے حضور ﷺ کو اپنے انتقام لینے کی خبر سنا کر آپ کو تسلی بھی فرمائی جاتی ہے کہ وذرنسی و المکذبین اولی النعمة و مهلهم قليلاً یعنی مخالفین کے معاملے کو ہم پر چھوڑ دیجئے ہم ان سے پورا بدلہ لے لیں گے یہ

خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ اہل حق کے مخالفین سے پورا انتقام لیتے ہیں اس لئے بھی مناسب یہی ہے صبر اختیار کیا جائے کیونکہ جب اپنے سے بالادست بدلہ لینے والا موجود ہے تو کیوں فکر کیجئے خدا تعالیٰ کی اس سنت کے مخالف کو آخرت اور دنیا دونوں میں رسوائی ہو جاتی ہے۔

بس تجربہ کر دیم دیر مکافات بادرد کشان ہر کہ در افتاد بر افتاد
بچ توے را خدا رسوا نہ کرد تاد لے صاحب لے نیامد بدر

غرض اہل تصوف کی معمول یہ چند چیزیں ہوئیں جن کا بیان اس مقام پر ہوا قیام اللیل یعنی تہجد تلاوت قرآن تبلیغ دین ذکر و تہجد توکل صبر اس لئے اس مجموعہ بیان کو جو کہ اہل تصوف کے معمولات کو بفضلہ حاوی اور شامل ہے سیرۃ الصوفی کے لقب سے ملقب کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے اور یایہا المزمحل میں دو لطیفے معلوم ہوئے ایک یہ کہ جس طرح آپ بوجہ غایت حزن و الم اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھے اسی طرح بعض اہل طریق کا معمول ہوتا ہے کہ چادر ایسے طور پر لپیٹ لیتے ہیں کہ نظر منتشر نہ ہو اور اس کا قلب منتشر نہ ہو کہ جمعیت کے ساتھ ذکر میں لگا رہے دوسرا لطیفہ یہ المزمحل کے معنی عام ہیں کبیل اوڑھنا بھی ہوتا ہے۔ تو یایہا المزمحل میں اشارہ ہوگا یایہا الصوفی ہے کیونکہ لفظ صوفی میں گواختلاف ہے مگر ظاہر یہی ہوتا ہے کہ مراد موٹا کپڑا کبیل وغیرہ مراد لیا جائے پس صوفی اور مزمحل متقارب المعنی ہوئے۔ (سیرت الصوفی)

وَ اذْکُرْ اسْمَ رَبِّکَ وَ تَبْتَکُلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ۝

ترجمہ: اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ رہو۔

تفسیری نکات

انقطاع غیر اللہ

چنانچہ اس میں ایک جملہ تو واذکر اسم ربک ہے اس میں ذکر اللہ کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور لگاؤ ہوتا ہے اور تبتل الیہ تبتیلاً میں انقطاع کا حکم ہے۔ کیونکہ لغت میں تبتل کے معنی انقطاع ہی کے ہیں۔ رہا یہ کہ انقطاع کس سے؟ تو ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ سے انقطاع تو مراد نہیں کیونکہ الیہ میں صلہ الی خود بتلا رہا ہے کہ انقطاع کے بعد حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہے پس انقطاع غیر اللہ سے مراد ہوگا۔ بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو صرف تبتل الیہ یہی ایک جملہ دونوں باتوں سے بیان کے لئے کافی تھا کیونکہ جن لوگوں کی نظر عربیت پر ہے وہ جانتے ہیں کہ تبتل و انقطاع کا اصلی صلہ عن ہے جو اس چیز پر

داخل ہوتا ہے جس سے تعلق قطع کیا جاتا ہے اور اس کا اصلی صلہ الی نہیں ہے بلکہ یہ عارضی صلہ ہے اور جس وقت اس کے بعد الی ہوتا ہے اور اس وقت یہ معنی وصول کو متضمن ہوتا ہے اس کو اہل بلاغت تفسیرین کہتے ہیں پھر کبھی تو ایسے ہوتا ہے کہ متضمن و متضمن دونوں کا صلہ مذکور ہوتا ہے۔ اس وقت تجمل کا استعمال عن والی دونوں کے ساتھ ہوگا اور کبھی صرف الی مذکور ہوتا ہے جو کہ معنی وصول کا صلہ ہے جس کو تجمل کے ضمن میں لیا گیا ہے اور اس کا مدخول وہ ہوتا ہے جس سے وصل ہوگا۔ اور اصلی صلہ یعنی عن مع اپنے مدخول کے حذف کر دیا جاتا ہے مگر لفظوں ہی سے حذف ہوتا ہے ارادہ سے حذف نہیں ہوتا بلکہ ارادہ میں ملحوظ ہوتا ہے اور اس کو حذف اس لئے کر دیتے ہیں کہ وہ تو اس لفظ کا اصلی صلہ ہے اگر محذوف بھی ہوگا تو سننے والے خود سمجھ لیں گے چنانچہ یہاں ایسا ہی ہوا ہے کہ تجمل کا عارضی صلہ الی مذکور ہے اور اصل صلہ عن مقدر ہے لفظ الی سے معلوم ہو گیا کہ تجمل معنی وصل کو حصصن ہے پس معنی یہ ہوئے کہ تجمل عن الخلق الیہ یعنی مخلوق سے منقطع ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جائے تو چونکہ یہاں معنی انقطاع لفظ تجمل سے اور معنی وصل صلہ الی سے مفہوم ہورہے ہیں۔ اس لئے یہی ایک جملہ وصل و فصل دونوں پر دلالت کر رہا ہے۔

طریق توجہ

اب سوال ہوگا کہ پھر واذکر اسم ربک کی کیا ضرورت تھی کہ کیا یہ زائد ہوا تو خوب سمجھ لو کہ یہ بھی زائد نہیں کیونکہ گو تجمل الیہ میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہو گیا مگر اس میں طریق توجہ کا ذکر نہ تھا واذکر اسم ربک میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ بتلایا گیا ہے اور اس کے بتلانے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ توجہ کے جتنے طریقے ہیں یہاں سب محذّر ہیں توجہ کا ایک طریقہ تو مشاہدہ یعنی رویت ہے اور یہاں حق تعالیٰ کا یہ مشاہدہ نہیں ہو سکتا ہاں آخرت میں ہوگا چنانچہ حدیث مسلم میں ہے لن ترور ربکم حتی تموتوا

ہرگز نہ دیکھو گے اپنے رب کو مرنے سے پہلے اس سے جیسے دنیا میں مشاہدہ کی نفی ہوئی ایسے ہی مرنے کے بعد رویت کا اثبات بھی ہورہا ہے۔

تجمل الیہ میں وصل و فصل دونوں مذکور ہیں اور یہی خلاصہ ہے طریق کا مگر اس جگہ طریق کا مبداء و ملتہی بتلایا گیا ہے کہ فصل مبداء طریق ہے اور وصل منتہی اور ان دونوں کے بیچ میں کچھ وسائط بھی ہیں کیونکہ فصل کے درجات ہیں ناقص اور متوسط اور اعلیٰ پھر جیسا جیسا فصل ہوتا جائے گا ویسا ویسا وصل حاصل ہوتا جائے گا جب تک فصل ناقص ہے وصل بھی ناقص ہے اور جب فصل متوسط ہوگا وصل بھی متوسط ہوتا جائے گا اور جس دن فصل کامل ہو جائے گا فوراً وصل بھی کامل ہو جائے گا۔

میں دیکھتا ہوں کہ مشائخ کا مریدوں کے اجتماع و ہجوم سے جی نہیں گھبراتا نہ ان کی تعظیم و تکریم سے الجھن ہوتی ہے حالانکہ ضرورت ہے کہ کوئی وقت ایسا ہو کہ جس میں مخلوق سے یکسو ہو کر خالق کی طرف متوجہ رہا جائے بھلا اور تو کس شمار میں ہیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی امر ہے و تبتل الیہ تبتیلاً جس میں مفعول مطلق تاکید کے لئے حاصل یہ ہوا کہ مخلوق سے کامل طور پر منقطع ہو کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور ظاہر ہے کہ کامل توجہ بدوں تفکیک تعلقات کے ہرگز نہیں ہو سکتی تو مشائخ اور سالکین کو تعلقات قائم کرنے کا اہتمام نہ ہونا چاہیے اور لوگوں کے اجتماع و ہجوم سے پریشانی اور تعظیم وغیرہ سے الجھن ہونی چاہیے یہ مذاق پیدا کرو کیونکہ کمال وصول بدوں اس کے نہیں ہو سکتا سوا اگر ان آفات سے بچنا چاہتے ہو تو تجربہ کی بناء پر میری رائے یہ ہے کہ کئے ملا بن کر رہو کہ نہ ہونہ تعویذ گنڈوں کا سلسلہ ہو درویشوں کا رنگ نہ اختیار کرو اس سے ہجوم غلط ہوتا ہے بلکہ ملانے بن کر رہو تاکہ لوگ صورت دیکھ کر یہ سمجھیں کہ یہ سب خشک مولوی ہیں اور متعلقین کو بھی ایسا بننے کی تاکید کرو۔

ضرورت وصل و فصل

خلاصہ یہ ہے کہ وصل و فصل دونوں کا اہتمام کرو۔ خدا سے تعلق بڑھاؤ اور غیر سے تعلق کم کرو اور اس کا طریقہ کسی محقق سے پوچھو اور اگر شیخ میسر نہ ہو تو محققین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے کام شروع کرو۔ ان شاء اللہ ناکامی نہ ہوگی اور اگر مشائخ محققین موجود ہوں تو ان سے مل کر طریق معلوم کرو اگر ملنا نہ ہو سکے تو خط و کتابت سے مراجعت کرو اور عمل کا اہتمام کرو کیونکہ بدوں عمل کے باتیں یاد کر لینا اور تصوف کے مسائل رٹ لینا محض بے کار ہے اس طریق میں باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ صاحب حال ہونے کی ضرورت ہے پھر حال بھی خود مطلوب نہیں بلکہ اصل مطلوب عمل ہے کیفیات و احوال کی ضرورت بھی عمل ہی کے لئے ہے ورنہ خود کیفیات احوال مقصود نہیں ہیں مگر چونکہ حال سے عمل میں سہولت ہو جاتی ہے اس لئے صاحب حال ہونے کی ضرورت ہے بدوں حال کے عادتاً کام نہیں چلتا۔

اور یاد رکھو کہ حال بھی عمل ہی سے پیدا ہوتا ہے بدوں عمل کے حال وغیرہ کچھ حاصل نہیں ہوتا عمل ہی کی برکت سے ظاہر حال بن جاتا ہے اس پر شاید یہ شبہ ہو کہ ابھی تو تم نے عمل کے لئے حال کی ضرورت بتلائی تھی اور اب حال کے لئے عمل کو ضروری کر دیا یہ تو دور ہو گیا تو بات یہ ہے کہ دور جب لازم آتا ہے کہ موقوف و موقوف علیہ متحد ہوں اور یہاں ایسا نہیں بلکہ یہاں حصول حال اختیار عمل پر موقوف نہیں عمل بدوں حال کے بھی ہو سکتا ہے گو مشقت سے ہو تو ایک جگہ حصول موقوف ہے اور دوسری جگہ سہولت و دوام اس لئے دور نہیں پس حاصل یہ ہوا کہ اول

تو ہمت کر کے عمل میں لگے یہاں تک کہ حال پیدا ہو جائے پھر حال پیدا ہونے کے بعد عمل میں ہمت و مجاہدہ کی ضرورت نہ رہے گی بلکہ سہولت سے ہونے لگے گا۔

اب میں ختم کرتا ہوں دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہم کو حال و عمل عطا فرمائیں۔ (آمین)

ذات حق کی طرف توجہ کا طریقہ

واذ کسر اسم ربک میں بھی یہی طریقہ بتلایا گیا ہے اس لئے یہ جملہ زیادہ نہیں۔ حاصل طریقہ کا یہ ہے کہ گو ذات حق کی طرف توجہ تام نہیں ہو سکتی مگر تم اس کو یاد ہی کرتے رہو۔ بس یہی توجہ ذکر کی کافی ہے۔ اور اسی سے مطلوب حاصل ہو جائے گا۔ گو ذکر کے وقت تمہارے ذہن میں ذات کا تصور حقیقی نہ ہوگا۔ بالوجہ ہی ادراک ہوگا۔ مگر یہی کافی ہے بلکہ اگر کسی کا تصور بالکل نہ ہو۔ محض اسم اللہ ہی کا تصور ہو تو یہ بھی کافی ہے اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اس جملہ میں لفظ اسم بھی زائد نہیں گو بعض نے اس کو زائد کہا ہے مگر اسلم و راجح یہ ہے کہ زائد نہ ہو کیونکہ توجہ الی اللہ کا طریقہ ابتداء میں یہی ہے۔ کہ توجہ الی الاسم کی جائے یہ عقدہ حضرت حاجی صاحب کی برکت سے حل ہوا۔ حضرت فرماتے تھے کہ ذکر میں اول تو توجہ الی المذکور چاہئے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو توجہ الی الذکر ہی کر لے اس سے بھی شدہ شدہ مذکور کی طرف توجہ ہو جاتی ہے گو اس کی توجہ ذکر کی طرف ہے بلکہ اگر توجہ الی المذکور کے ساتھ بھی توجہ الی الذکر ہو تب بھی اس کو توجہ الی المذکور میں مغل سمجھ کر اس کی نفی نہ کرے کیونکہ بالذات اس کی توجہ مذکور ہی کی طرف ہوگی اور ذکر کی طرف طبعاً توجہ ہے۔

کامل ذکر کیلئے خلوت ضروری ہے

حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان لک فی النہار سبحاً طویلاً واذ کسر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلاً۔ تبتیل سے پہلے ان لک فی النہار سبحاً طویلاً خرمایا یعنی دن میں کام زیادہ رہتا ہے اور اس وجہ سے ذکر و تبتیل کے لئے فراغ نہیں ہوتا اس لئے شب کا وقت اس کے واسطے تجویز کیا گیا اور اس کا راز یہ ہے کہ برکت تعلیم کے لئے ضرورت ہے نور کی اور نور پیدا ہوتا ہے ذکر کامل سے اور ذکر کامل کے لئے ضرورت ہے خلوت کی۔ اس لئے بزرگوں نے یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ قلب کو بجز ذات واحد کے کسی طرف متوجہ نہ کرنا چاہیے اور وہ ذات حق تعالیٰ کی ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

دلآر امیکہ داری دل درو بند

دوسرے یہ کہ اذ کرو اللہ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) یا واذ کسر اسم ربک (اپنے رب کے نام کی یاد کرو) میں حق تعالیٰ نے ذکر کو کسی قید کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے خواہ لسان ہو یا اور کچھ نیز ذکر باعتبار لغت کے عام بھی ہے۔

ذکر قلبی و ذکر لسانی دونوں کو بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ ذکر کے اصلی معنی ذکر قلبی ہی کے ہیں اور جہاں کہیں ذکر لسانی مراد ہے وہاں قرآن سے اس پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ ذکر کے معنی ہیں یا ذاب دیکھ لیجئے کہ یاد کس کا فعل ہے زبان کا یا قلب کا۔ پس اب ذکر قلبی کے لئے تو ثبوت کی ضرورت نہ رہی۔ البتہ ذکر کا لسانی ہونا محتاج دلیل ہو گیا۔

اقسام ذکر

ذکر کے متعلق اہل علم کو ایک اور شبہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ انہوں نے وا ذکر اسم ربک (اپنے رب کے نام کو یاد کرو) میں لفظ اسم کو زائد رکھا ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں ہے جس کی سہل توجیہ یہ ہے کہ ذکر دو قسم کے ہیں ایک مبتدی اور ایک منتہی۔ تو اسم ربک میں مبتدی کی حالت کا اعتبار کیا گیا ہے۔ کیونکہ مبتدی کی اور حالت ہے اور منتہی کی اور۔ اس لئے یوں کیوں نہ کہا جاوے کہ مبتدی کے لئے وا ذکر اسم ربک ہے اور منتہی کے لئے وتبتل الیہ تبتلاً ہے کیونکہ مبتدی کے لئے یہی ذکر کا درجہ بہت ہے کہ محبوب کا نام اس کی زبان پر آ جاوے یا قلب میں نام آ جائے۔ ذکر لفظی کی بھی کئی صورتیں ہیں ایک ذکر لفظی زبان سے ایک قلب سے۔ ایک ذکر منطوق ہے اور ایک متصور۔ منطوق تو ظاہر ہے متصور و مثال سے سمجھ لیجئے۔

اب ذکر کی اقسام چند ہو گئیں۔ ایک لسانی ایک قلبی اور ذکر قلبی کی خود دو قسمیں ہیں۔ ایک ذکر قلبی لفظی، ایک ذکر قلبی نفسی اور ان اقسام میں سے ذکر لسانی بھی غیر موقت نہیں بلکہ بعض احوال کے لحاظ سے وہ بھی موقت ہے کیونکہ نیند کے غلبہ میں اور بول و براز و جماع و مواقع قاذورات میں زبان سے ذکر کرنے کی ممانعت ہے۔ البتہ ذکر قلبی کی کسی حال میں بھی ممانعت نہیں ہر وقت اجازت ہے یہ پیشک محیط کل اور ہر جہت سے غیر موقت ہے پس ذکر قلبی ہی اپنے دونوں قسموں کے ساتھ ایک ایسا مشغلہ ہے جو ہر وقت ہو سکتا ہے۔ گو سونے کے بعد نہ ہو۔ سو اس حالت میں انسان مکلف ہی نہیں۔ اس لئے اس کے متعلق سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ کھاتے وقت بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہ ذکر لسانی سے بڑھا ہوا ہے مثلاً جہاں ریا کا شبہ ہو ایک شخص ہے کہ زبان سے تو ذکر کرتا ہے مگر قلب متوجہ نہیں ہوتا تو اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ قلب سے ذکر کرے اور زبان سے نہ کرے تو ایسے شخص کے اعتبار سے محض ذکر قلبی ہی افضل ہے۔

مگر مہربانی کر کے اس مسئلہ کو نماز کی قراءت میں متعدی نہ کر لیجئے کیونکہ نماز میں قراءت و تکبیرات و تشہد وغیرہ اگر کوئی شخص قلب میں پڑھ لے اور زبان سے ادا نہ کرے تو نماز نہ ہوگی۔ ہاں گونگا البتہ معذور ہے اس کی نماز محض تصور ہی سے ہو جاوے گی۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ﴿۱۰﴾

ترجمہ: وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اسی کو اپنے کام سپرد کر دینے کے لئے قرار دیئے رہو۔

قبض میں حال سلب نہیں ہوتا

مشرق و مغرب کے ذکر میں اشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح شمس میں طلوع اور غروب ہوتا ہے اسی طرح حالات میں بھی قبض و وسط اسی کے مشابہ ہوتا ہے یعنی قبض میں حال سلب نہیں ہوتا بلکہ مستور ہو جاتا ہے مثل آفتاب کے کہ غروب ہو جاتا ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ

وَتُلُثُهَا وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ

ترجمہ: آپ کے پروردگار کو معلوم ہے کہ آپ کبھی دو تہائی رات سے کچھ کم جاگتے ہیں کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات جاگتے ہیں اور ایک جماعت بھی ان لوگوں میں سے جو آپ کے ساتھ ہے۔

تفسیری نکات

تہجد کیلئے وقت متعین کرنا ضروری نہیں

اس کے بعد فرماتے ہیں واللہ یقدر اللیل والنہار کہ رات اور دن کا پورا اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں یہ جملہ بے کار نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکتے۔ کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو اس لئے کسی خاص وقت کی تعیین لازم نہیں کی جاتی جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیے یہی معنی ہیں اس کے جو فرمایا ہے علم ان لن تحصوه فتاب علیکم فاقراء واما تیسر من القرآن اور پھر بیماروں کو اور کسب معاش کرنے والوں کو وقت تھی انکی آنکھ بعض دفعہ صبح کے قریب کھلتی ہے تو ارشاد فرماتے ہیں۔

علم ان سیکون منکم مرضی واکھرون یضربون فی الارض یتغون من فضل اللہ

واکھرون یقاتلون فی سبیل اللہ فاقروا اما تیسر منہ

یعنی بیماروں اور مسافروں کو زیادہ بیداری معاف ہے ان کی آنکھ کھل جائے صبح سے پہلے پہلے تو وہ جتنا قرآن پڑھ سکیں نماز میں پڑھ لیا کریں چاہے دو رکعت ہی پڑھ لیا کریں اس سے بھی کامل ثواب مل جائے گا اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کرے۔ اس کی نسبت کفتاہ وارد ہے جس کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے۔ سبحان اللہ ہماری روٹیوں کی بھی رعایت ہے کہ تجارت کے لئے سفر کرو تو طویل بیداری معاف ہے جتنا ہو سکے کر لیا کرو کوئی طبیب ایسا ہے جو اسے یوں کہہ دے کہ اس نسخہ میں آدھاپی لو یا ربع پی لو تو صحت کے لئے کافی ہے ایسا کوئی طبیب نہ ملے گا وہ تو قدحے ہی پلاوے گا مگر حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ رعایت فرماتے جاتے ہیں کہ زیادہ نہ ہو سکے تو اخیر شب میں دو رکعت ہی پڑھ لو اتنا بھی نہ ہو سکے تو سونے سے پہلے وتر کے بعد دو رکعت پڑھ لو یا رات کو دو تین بار سبحان اللہ ہی کہہ لو بس کافی ہے غرض یہاں بھی ترک منام کے ساتھ فعل مشروع ہوا ہے محض بیداری پر اکتفا نہیں فرمایا۔

تخلیہ مقدم ہے یا تخلیہ

البتہ شیوخ کا اس میں اختلاف ہے کہ تخلیہ کو مقدم کیا جائے اور تخلیہ کو موخر یا تخلیہ کو مقدم کیا جائے اور تخلیہ کو موخر اور مفید دونوں طریق ہیں خواہ تخلیہ کو مقدم کیا جائے یا تخلیہ کو کیونکہ ان دونوں میں جانہین سے استلزام ہے جیسے ایک بوتل میں پانی بھرا ہو اور ہم پانی نکال کر اس میں ہوا بھرنا چاہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے پانی کو نکال دو ہوا خود بخود بھر جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی آلہ کے ذریعہ سے پہلے ہوا بھرنا شروع کرو پانی خود ہی نکل جائے گا۔ اسی طرح فضائل کے حاصل کرنے سے رذائل خود بخود زائل ہو جاتے ہیں مثلاً کسی نے سخاوت کی صفت حاصل کر لی تو بخل جاتا رہے گا اور رذائل کے زائل کرنے سے فضائل خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بخل زائل ہو گیا تو سخاوت حاصل ہو جائے گی غرض دونوں طریق مفید ہیں مگر چشتیہ نے تخلیہ کو مقدم کیا ہے (اور یہ آیت بظاہر موید ہے) اور نقشبندیہ نے تخلیہ کو مقدم کیا اور آیت واذکر اسم ربک وبتل الیہ تبئلا (اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ) کا ظاہر ان کو موید ہے۔ (زکوٰۃ انفوس)

سُورَةُ الْقِيَامَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۗ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝

لَا تُحْرِكُهُ بِهِ لِسَانُكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۗ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۗ ۝

فَإِذَا قُرَأَ لَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۗ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۗ ۝

ترجمہ: بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خود مطلع ہوگا گو باقتضائے طبیعت اس وقت بھی (اپنے حیلے (حوالے) پیش لائے اور اے پیغمبر آپ قبل اختتام وحی قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی لیں ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا اور پڑھوادینا جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اس کی پیروی کریں پھر اس کا بیان کرادینا ہمارے ذمہ ہے۔

تفسیری نکات

قیامت میں ہر شخص اپنے اعمال پر مطلع ہو جائے گا

چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے سورہ قیامت میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان کیا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کلام جتلا دیئے جائیں گے پھر فرماتے ہیں بل الانسان على نفسه بصيرة ولو ألقى معاذيره. یعنی (انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ اس دن انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خود واقف ہے) کیونکہ اس

وقت حقائق کا انکشاف ہو جائے گا اگرچہ وہ (باقضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے 'واللہ! ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے۔ یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے اس کے بعد فرماتے ہیں۔ لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرانه فاذا قراناه فاتبع قرانه ثم ان علينا بيانه.

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کو یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جمادینا اور زبان سے پڑھوادینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قراءت کا اتباع کیجئے۔ پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔ کلابل تحبون العاجلة و تذرون الاخرة کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں وجوه يومئذ ناضرة الى ربها ناظرة بعضوں کے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ تو لا تحرك به لسانك سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے۔

کلامیکہ محتاج معنی باشد لا یعنی ست

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے۔ صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سالقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے لیکن جو باپ ہوا ہو گا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی اس طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں۔ جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں۔ یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔ قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا۔ تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقضایہ

تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہو تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدای کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے چنانچہ جو رسالے ربط کے باب میں لکھے گئے ہیں ان سے اس آیت کا مضمون قیامت سے ربط مفہوم ہو سکتا ہے میں نے بھی اپنے ایک رسالہ عربی میں اور اپنی تفسیر کے اندر اردو میں اس کا ماقبل سے ارتباط بیان کیا ہے جو کہ تبرع اور احسان کے درجہ میں ہے ورنہ یہاں ربط کی ضرورت ہی نہ تھی۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب ربط کی ضرورت نہ تھی تو ممکن ہے کہ یہ روابط سب مختراع ہوں پھر ان کی حاجت ہی کیا تھی؟ (کیونکہ تقریر سابق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ فرط شفقت کا مقتضایہ ہے کہ ترتیب و ربط کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ مخاطب کی ضرورت کے موافق کلام کی جائے چاہے ربط ہو یا نہ ہو اور قرآن کا طرز کلام یہی ہے تو اس صورت میں جو کچھ ربط بیان کیا جائے گا وہ مختراع ہوگا کیونکہ متکلم نے ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں) اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مختراع نہیں ہیں۔

کلام اللہ میں طرز نصیحت ہے طرز تصنیف نہیں

آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی تو جبرئیل بحکم خداوندی حضور سے یہ کہتے کہ اس آیت کو مثلاً سورۃ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جائے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورت کیساتھ و علیٰ ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کیساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہو تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا تو عجیب بے نظیر کلام ہے کہ باوجود ضرورت ربط نہ ہونے کے پھر بھی اس میں ربط اور پورا ربط ہے پس خدا تعالیٰ کے کلام میں اس مستقل دلیل سے ہم ربط کے قائل ہیں لیکن اگر ربط نہ بھی ہوتا تب بھی قرآن پر اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ ہم کہہ سکتے تھے کہ قرآن میں طرز تصنیف نہیں اختیار کیا گیا بلکہ طرز نصیحت مع لحاظ شفقت اختیار کیا گیا ہے۔

قرآن کا طرز کلام

اس میں ضرورت مخاطب کے لحاظ سے گفتگو کی جاتی ہے جس کی بے ربطی ہزار ربط سے افضل ہوتی ہے اور یہی منشاء شفقت ہے اس امر کا کہ قرآن کی ہر تعلیم کامل ہے جس میں تمام پہلوؤں کی پوری پوری رعایت کی

جاتی ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ ہر سورت میں بہت سے احکام بیان فرما کر اخیر میں ایسی بات بیان فرماتے ہیں جو سب کی جامع ہوتی ہے اور جس پر عمل کرنے سے تمام احکام مذکورہ میں سہولت ہو جاتی ہے۔

حدیث وحی غیر منکلوہ ہے

پس حدیث تو چونکہ وحی ہے اگرچہ غیر منکلوہ ہے اس لئے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے قرآن کی شرح ہے اور اس لئے اس کا حکم بھی قرآن شریف کا سا ہے اور مسائل فقہ چونکہ انہی اصول پر مبنی ہیں جو قرآن و حدیث میں ہیں اس لئے وہ بھی حکم میں وحی کے ہوں گے تو وحی کبھی جلی ہوتی ہے اور کبھی خفی۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں ثم ان علينا بیانہ چنانچہ جب حضور پر آیت ان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوه بحاسبکم بہ اللہ نازل ہوئی تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ شاید وساوس پر بھی گرفت ہو۔ اس لئے بہت گھبرائے ان کی گھبراہٹ پر دوسری آیت نازل ہوئی جس نے اس کی تفسیر کر دی۔ لا یكلف اللہ نفسا الا وسعها اس آیت نے بتلادیا کہ وساوس پر جب تک کہ وہ دوسو سے کہ درجے میں رہیں مواخذہ نہ ہوگا نیز حدیث کے ذریعے سے حضور نے اس کی تفسیر فرمائی۔

ان اللہ تجاوز عن امتی عما وسوست صدورہا مانم تعمد او تکلم او کما قال پس حدیث قرآن کی تفسیر ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور بعض چیزیں چونکہ حدیث میں بھی مجمل رہ گئی تھیں مثلاً مسائل ربو میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مثلاً بمثل بدابدو الفضل ربوا اور دوسری جگہ یہ فرمایا کہ دعوا الربوا والرہبہ اس سے معلوم ہوا کہ ربوا حرام ہے مگر اس کی جزئیات کا پتہ اس سے نہیں چلتا تھا۔ ہمارے فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بمثل اور یدابدو سے سب جزئیات کو نکال دیا جن کو عوام الناس نہ سمجھ سکتے تھے اور اسی لئے علم اصول مدون کیا۔ نیز یہ بھی کہہ دیا کہ القیاس مظہر لا مثبت جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ جو کچھ کہا ہے حدیث و قرآن ہی کی تفسیر ہے اسی طرح حضور ﷺ کے متعلق جا بجا قرآن میں یہ ارشاد فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وحی سے فرماتے ہیں کوئی بات وحی کے خلاف نہیں تو اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو حدیث یا فقہ کو نہیں مانتے اور محدثین اور فقہاء پر اعتراض کرتے ہیں۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۵۷﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿۲۵۸﴾

ترجمہ: (اے منکرو) ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔

تفسیری نکات

کسب دنیا اور حب دنیا

اصل یہ ہے کہ وہ حب دنیا ہے جس کی مذمت اس آیت میں ہے اور آیت سے حدیث حب الدنیا اس کل خطیہ (حب دنیا تمام گناہوں کی جڑ ہے) کی تصریح بھی ہوگئی ایک تو ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا تو کسب دنیا تو جائز ہے حب دنیا ناجائز اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو پانخانہ میں بہ ضرورت طبیعت بیٹھنا اور ایک پانخانہ کو پیارا سمجھ کر اس میں جی لگا کر بیٹھنا پہلی صورت جائز دوسری ناجائز۔ اسی طرح دنیا کو کمانا تو جائز ہے لیکن اس کو مرغوب و محبوب سمجھنا حرام ہے۔ قرآن شریف میں ان ہی الفاظ سے وضاحت کی گئی ہے یعنی کلابل تحبون العاجلة و تذرون الاخرة یعنی تم لوگ دنیا کو محبوب سمجھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہو اور اس خصوص میں ایک شبہ کا احتمال ہے یہ کہ بعض آدمی یہ سن کر کہ یہ آیت کفار کے متعلق ہے کہنے لگتے ہیں کہ کفار کے متعلق آیات سے ہم کو کیا تعلق اسی طرح اگر وہ کسی ترجمہ قرآن میں دیکھ لیتے ہیں کہ یہ آیت مکی ہے وہ خیال کر لیتے ہیں کہ مکی آیت سے ہم کو کیا تعلق اس لئے اس پر اس کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا ضروری ہے خداوند تعالیٰ کو کسی کی ذات سے محبت و عداوت نہیں ہے بلکہ اس کی بناء اعمال ہیں اور جو بعض احکام کا مورد اگرچہ خاص ہوتا ہے لیکن الفاظ کے عموم سے حکم عام ہوتا ہے اس لئے کفار کی شان میں جو بعض آیات اتری ہیں وہ اگرچہ باعتبار مورد کے خاص ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے جس عمل پر کفار کی شکایت ہے اگر وہ عمل ہم میں بھی ہے تو ہم کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

حب دنیا کا مغموم

مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میں لوگوں کے جزئی شکوک اور شبہات کا جواب دوں لیکن تبرعاً خاص اس مقام کے اقتضاء سے اتنا کہوں کہ تحبون العاجلة بعد بطور تفسیر کے تذرون الاخرة بڑھادینے سے حب الدنیا اس کل خطیہ کے متعلق شبہات کا جواب ہو گیا کہ حب دنیا وہی ہے جس میں ترک آخرت ہونہ کہ کسب دنیا پس کسب دنیا جائز ہے اور حب دنیا ناجائز کسب اور حب میں وہی فرق ہے جو کہ غلیظ اور صاف کرنے اور کمانے اور اس کے کھانے میں کہ اول برائے نہیں دوسرا برا اور معیوب ہے اور یہی وجہ ہے کہ تحبون العاجلة فرمایا تکسبون العاجلة نہیں فرمایا اب اپنے اوپر منطبق کر لیجئے اور دیکھئے کہ آپ تحبون کے مصداق ہیں یا

تکسوں کے۔ اس انطباق میں عوام سے تو کچھ خوف اور اندیشہ اس لئے نہیں کہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں ان بے چاروں سے جو بات کہہ دی گئی انہوں نے سن لی اور عمل کر لیا اور علماء سے اس لئے خوف نہیں کہ ان حضرات کی نظرس اصل حقیقت تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں البتہ ان نیم خواندہ لوگوں سے جو بوجہ نیم ہونے کے تلخ بھی ہیں ڈر لگتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ دیکھ کر یہ نہ کہہ دیں کہ ہم کو یہ آیت سن کر اپنی حالت پر منطبق کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ہم اس کے مخاطب ہی نہیں کیونکہ یہ آیت مکی ہے لہذا کفار اس کے مخاطب ہوں گے ہم مسلمان اس کے مخاطب نہیں ہو سکتے ہم سے اس آیت کو کیا تعلق لہذا اس کے متعلق عرض کرتا ہوں اور میں نے اس مضمون کو متعدد مرتبہ اس کے قبل بھی بعض جلسوں میں بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر لوگ آیات کے متعلق یہ سن کر کفار کو خطاب کیا گیا تھا بے فکر ہو جاتے ہیں حالانکہ اس سے بے فکر نہیں ہونا چاہیے بلکہ زیادہ فکر میں پڑ جانا چاہیے اور زیادہ اثر لینا چاہیے کیونکہ جب کوئی آیت عتابیہ کفار کی شان میں نازل ہوتی ہے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس آیت کے مضمون کا خطاب کفار کو ان کی ذات کی وجہ سے ہوا ہے یا کسی صفت کی وجہ سے ظاہر ہے کہ ذات کی وجہ سے یہ خطاب نہیں ہوا اور نہ ہر انسان کو گو وہ متقی ہی ہو اس کا خطاب ہوتا کیونکہ ذاتاً سب متحد ہیں اور لازم باطل ہے پس معلوم ہوا کہ کسی صفت کی وجہ سے یہ خطاب ہوا ہے اور کوئی حالت خاصہ اس مضمون کے ترتیب کی علت ہے تو اگر وہ علت کفار کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی پائی جائے گی تو اس جگہ بھی یہ مضمون مرتب ہوگا مثلاً اسی آیت میں وعید کا مدار حسب العاجلہ ہے لہذا اگر حسب العاجلہ تمہارے اندر پائی جائے گی تو تم بھی وعید کے تحت داخل ہو گے پس اب غور کر لو اور اگر اپنے اندر حسب العاجلہ دیکھو تو بہت جلد اس کا علاج کرو اور اپنی حالت پر افسوس کرو کہ جو امور اس زمانے میں کفار میں ہوتے تھے وہ آج تمہارے یعنی مسلمانوں کے اندر موجود ہیں۔ اسی طرح حدیث من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر کسی نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کا کام کیا (میں تاویل کر کے لوگ بے فکر ہو گئے ہیں حالانکہ یہ بے فکری کی بات نہیں بلکہ اگر تاویل اس میں نہ ہوتی اور حقیقی معنی مراد ہوتے تو کچھ زیادتی نہ تھی کیونکہ اگر کسی چمار کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو کچھ غیرت نہ آئے گی اور اگر کسی شریف کو چمار کہہ دیا جائے تو اس کو مر رہنا چاہیے تو تاویل کرنے سے وعید میں من وجہ زیادہ شدت ہو گئی اور زجر بڑھ گیا مگر افسوس ہے کہ ہم لوگ فہم سے کام نہیں لیتے بحمد اللہ نیم خوانوں کا شبہ تو رفع ہوا لیکن ایک شبہ تین پاؤ خوانوں کا رہ گیا ہے کہ تحبون اور تذرون سے مطلق محبت اور ترک مراد نہیں بلکہ یہ دونوں لفظ خاص ہیں یعنی وہ ترک مراد ہے جو اعتقاداً ہو اسی طرح محبت سے وہ محبت مراد ہے جو اعتقاداً بقائے دوام کے ساتھ ہو اور ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں کیونکہ ہم بحمد اللہ قیامت کے قائل ہیں دنیا کو فانی جانتے ہیں اس کا جواب ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں کوئی قید نہیں اور تمہارے پاس قید کی کوئی دلیل نہیں اور بلا دلیل کوئی دعوے مسوع نہیں ہوتا پس اس قسم کی قید لگانا قرآن شریف کے مقصود کو باطل کرتا ہے اور یہ ایسی مثال ہے کہ ایک شخص نے کسی جگہ پر پہنچ کر ایک مجمع میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا کہ میں جب یہاں آیا تو ایک عورت سے میری آشنائی ہوئی اور میں اس کے گھر

جایا کرتا تھا اور اس کا گھر ایسا ایسا تھا اور اس کا شوہر ایک بار آ گیا تھا اور اس نے مجھ کو اس اس طرح چھپا دیا تھا اور اس موقع پر اس عورت کا شوہر بھی تھا اور اس کے پکڑنے کی فکر میں تھا اب یہ اقراری مجرم مجمع کے سامنے ہو گیا جرم ثابت ہونے میں کوئی حجت باقی نہ رہی اس عورت کو خبر ہوئی اور کچھ اشارہ کر دیا جس کو یہ سمجھ گیا اور تمام قصہ ختم کر کے اخیر میں کہہ دیا کہ بس اتنے میں آنکھ کھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا لوگوں نے کہا کہ کیا یہ سب خواب تھا کہنے لگا اور نہیں تو بھلا میں غریب پردہ کی مجھ کو کون پوچھتا ہے تو ایسی تاویل آپ حضرات ہی کو مبارک ہو ہمارا مذہب ہے کہ المطلق بجز علی اطلاقہ (جس میں کوئی شرط اور قید نہ ہو وہ عام ہی رہے گا البتہ اگر عمل کی اباحت کہیں قرآن شریف یا حدیث شریف میں مذکور ہوتی تو البتہ رفع تعارض کے لئے اس موقع پر قید مذکور لگا کر تاویل کی جاتی اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ مسئلہ اجرائی مطلق علی الاطلاق ہر جگہ نہیں بلکہ اس مقام پر ہے کہ جہاں مطلق کو اطلاق پر رکھنے میں کسی دوسری آیت یا حدیث سے تعارض واقع نہ ہو اور اگر تعارض ہو گا تو مطلق اپنے اطلاق پر نہ رہے گا غرض یہ ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی مرضی کے موافق چاہیں اور جس طرح چاہیں کر لیں مگر افسوس ہے کہ ہم کو اس کی ذرا پروا نہیں وہ حالت رہی ہے کہ

۔ برہوا تاویل قرآن میکنی پس و کز شد از تو معنی سنی
چوں ندارد جان تو قدیل ہا بہرینش میکنی تاویلہا
کردہ تاویل لفظ بکر را خویش را تاویل کن نے ذکر را
(تیرے پاس روشنی کے لئے قدیل نہیں ہیں تو تو اپنی عقل کے لئے تاویل گھڑ رہا ہے)

اور میں علی سبیل التذلیل کہتا ہوں کہ اگر یہ معنی مطلق نہ بھی ہوں اور تذرون مقید ہوا عقادی ترک کے ساتھ۔ تب بھی آپ کو بے فکری نہ ہونا چاہیے کیونکہ جس دل میں درد نہ ہوتا ہے اس کو تھوڑے سے التفات سے تنبیہ ہو جاتا ہے گو وہاں دوسری ہی حالت کا بیان ہو مشہور ہے کہ ع عشق ست و ہزار بدگمانی

حضرت شبلی رحمۃ اللہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک سبزی فروش صدا لگاتا ہوا نکلا الخیار العشرة بدائق جس کے معنی یہ ہیں کہ دس گلڑیاں ایک دانق کی عوض لیکن حضرت شبلی رحمۃ اللہ نے سن کر ایک چیخ ماری اور رونے لگے اور فرمایا کہ جب دس پسندیدہ آدمیوں کی یہ حالت ہے تو ہم گنہگار کس شمار میں ہیں۔ ان کا ذہن منتقل ہوا خیار کے دوسرے معنی کی طرف یعنی نیک لوگ۔ ان لوگوں کے دل میں ہر وقت وہی ایک بات رچی رہتی ہے حضرت جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا میشود دور پندارم توئی

سُورَةُ الْمُرْسَلَاتِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔

کلام پاک میں مکرر آیات کے اعتراض کا عجیب جواب

کسی مسلمان بادشاہ کے زمانہ میں ایک لمحہ نے قرآن پر اعتراض کیا تھا کہ اس میں مکرر آیات بھی موجود ہیں۔ یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا بادشاہ نے اس کو گرفتار کر کے بلایا اور پوچھا کہ قرآن پر تجھ کو کیا شبہ ہے بیان کر۔ اس نے یہی کہا کہ قرآن میں بعض جگہ مکررات موجود ہیں اس لئے یہ خدا کا کلام نہیں معلوم ہوتا۔ خدا تعالیٰ کو مکررات لانے کی کیا ضرورت تھی۔ بادشاہ نے جلا دیکھ کر دیا کہ اس شخص کے اعضاء مکررہ میں سے ایک ایک کاٹ دو۔ ایک ہاتھ رہنے دو اور ایک پیر۔ ایک آنکھ رہنے دو اور ایک کان کیونکہ یہ خدا کا بنایا ہوا نہیں معلوم ہوتا خدا تعالیٰ کو مکررات کی کیا ضرورت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اس میں اضافہ کیا ہے لہذا مکررات کو حذف کر دو اور ایک ایک عضو رہنے دو۔ واقعی خوب سزا دی۔ اسی طرح آج کل ہمارے بھائیوں نے دین میں انتخاب کیا ہے کوئی نماز کو ضروری سمجھتا ہے اور نماز ہی کی پابندی کرتا ہے نہ زکوٰۃ دے نہ حج کرے نہ معاملات میں سود اور رشوت سے پرہیز کرے۔ کوئی روزہ کو ضروری سمجھتا ہے اور رمضان میں روزہ کا خوب اہتمام کرتا ہے اور بقیہ اعمال و طاعات کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے کوئی حج کو۔ (الہمدی والمغفرہ ملحقہ مواظف نضائل علم ص ۱۳۶)

و اما من خاف مقام ربہ و نہی النفس عن الہوی

اس میں دو کام فرماتے ہیں جو تمام طرق کو جامع ہیں۔ ایک اپنے مالک کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف۔ دوسرا نہی النفس عن الہوی الف لام عوض مضاف الیہ ہے اے عن ہواہا نفس کو اس کی خواہشوں سے روکنا۔ یہ دونوں عمل جملہ طرق حصول جنت کو جامع ہیں۔

ہر چند کہ یہ دونوں عمل افراد بہت سے رکھتے ہیں۔ اور تفصیل کرتے وقت افراد میں کچھ کمی نہ ہوگی مگر اس اختصار کی منفعت یہ ہے کہ جب یہ دونوں مضمون ذہن نشین ہو جائیں تو ہر فرد عمل میں اس کی رعایت رکھنے سے نیک و بد میں تمیز سہولت سے ہو جائے گی۔ مگر میں یہی ہوا کرتا ہے کہ افراد کم نہیں ہو جاتے صرف طریق شناخت میں اختصار و سہولت ہو جاتی ہے۔

دیکھئے کتنی سہولت ہو گئی۔ جب آدمی کے دل میں خوف ہوگا کہ مجھے ہر عمل پر حق سبحانہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا تو ہر کام کو تامل کے ساتھ کرے گا اور خیال رکھے گا کہ یہ کام کہیں خلاف مرضی باری تعالیٰ نہ ہو۔ اس سے ایک بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ ہر برے عمل کو پہچان لے گا۔ اور اس سے بچ جائے گا۔

(علاج الحصر بالمحقة مؤاعظ حقیقت مال و جاہ ص ۳۹۲)

امامن خاف مقام ربہ و نہی النفس من الهویٰ فان الجنة ہی الماویٰ (النزعات آیت نمبر ۳۹) اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا۔

ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ نفس بری بلا ہے اس سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے عجیب بات ہے کہ جس قدر انسان ریاضات مجاہدات عبادات میں مشغول ہوتا ہے اسی قدر اس کے اندر بھی ایک طاقت ادراک کی پیدا ہوتی رہتی ہے اور اس لطافت سے اس کے کید بھی نہایت لطیف صورت میں پیدا ہونے لگتے ہیں اس لئے یہ بڑی ہی خطرناک چیز ہے۔ اور اس کا علاج بجز قوت اور ہمت کے کچھ نہیں شیطان تو لا حول سے بھاگ جاتا ہے مغلوب ہو جاتا ہے مگر یہ ظالم بجز مقابلہ کے اور وہ بھی ہمت اور قوت سے ہو قبضہ میں نہیں آتا اور ایک چیز سے تو یہ بالخاصہ بہت جلد پھول کر گدھا بن جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب اس کی مدح کی جاتی ہے اس لئے بزرگوں نے اس مدح سے بچنے کی خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ کوشش کی ہے۔ مدح سے اس میں فرعونیت پیدا ہوتی ہے یہ فرعون ہو جاتا ہے۔ نفس اور شیطان کے فرق میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے و اما من خاف مقام ربہ و نہی النفس عن الهویٰ فان الجنة ہی الماویٰ جس سے نفس کی قوت معلوم ہوتی ہے کہ اس کے لئے کف اور ضبط کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اور شیطان کے حق میں فرماتے ہیں ان کید الشیطان کان ضعیفاً اس کے لئے ضعف کو ثابت کیا ہے اور نفس کی یہ خاصیت کہ یہ مدح سے فرعون ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں۔

نفس از بس مدح فرعون شد کن ذلیل النفس ہونا لاتد

(الافاضات الیومیہ ج ۹ ص ۲۱۲۰)

سُورَةُ عَبَسَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۱۱ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمَى ۱۲ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزْكَى ۱۳

اَوْ يَدَّكُرُ فَنَنْفَعَهُ الذِّكْرَى ۱۴ اِمَّا مِنْ اِسْتَعْغَى ۱۵ فَاَنْتَ لَهٗ

تَصَدَّى ۱۶ وَمَا عَلَيْكَ اِلَّا يَزْكَى ۱۷ وَاِمَّا مِنْ جَاءَكَ يَسْعَى ۱۸

وَهُوَ يَخْشَى ۱۹ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى ۲۰ كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۲۱

ترجمہ: پیغمبر ﷺ جیسے جبیں ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا شاید نابینا آپ کی تعلیم سے پورے طور پر سنور جاتا یا کسی خاص امر میں نصیحت قبول کرتا سو اس کو نصیحت کرنا (کچھ نہ کچھ) فائدہ پہنچاتا۔ تو جو شخص دین سے بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے اور جو شخص آپ کے پاس دین کے شوق میں دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا ہے آپ ﷺ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں (آپ آئندہ) ہرگز ایسا نہ کیجئے قرآن (محض ایک) نصیحت کی چیز ہے سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے۔

تفسیری نکات تعلیمِ اِکمل

اسی سلسلہ میں ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام سے کبھی حقیقی غلطی نہیں ہوئی عرض کیا کہ حضرت والا مثال میں کوئی ایسا واقعہ بیان فرمائیں جس

سے اس کی توضیح ہو۔ فرمایا کہ ایک مرتبہ جناب رسول ﷺ ایک کافر رئیس کو اسلام کی تعلیم فرما رہے تھے ایسے وقت میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم اعمیٰ نے آکر باواز بلند عرض کیا علمنی یا رسول اللہ مما علمک اللہ یہ سن کر حضور کے چہرہ مبارک پر ترش روئی کے آثار پیدا ہو گئے جس کا منشا یہ تھا کہ میں اس وقت اصول اسلام کی تعلیم کر رہا ہوں اور یہ فروع کی تعلیم چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اصول مقدم ہیں فروع پر۔ اس پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ اِنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا يَدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزْكٰى . اُوَيْذُكَرُ فَتَنْفَعُهٗ الَّذٰى كَرٰى . اِمَّا مِنْ اِسْتَفْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصْدٰى . وَمَا عَلِيْكَ الْاِيْزٰى كٰى . وَاِمَّا مِنْ جِءَاكَ يَسْعٰى . وَهُوَ يَخْشٰى . فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهٰى . كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ . فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ . اَبَدِكُمْ لِيَجْزِيَ كَيْفَ يَشَاءُ تَعْلِيْمِ حَضْرُوْكَ كِي طَاعَتِ تَحٰى يٰغَيْرِ طَاعَتِ ظٰهَرِ هٰى كِي طَاعَتِ تَحٰى لِيْكَنَ يٰى خَطَابِ مَتَابِ اَصُوْلِ كِي تَقْدِيْمِ فُرُوْعِ پَرِ عَلٰى الْاِطْلَاقِ نِيْسِ بَلْكَ اِسْ مَقَامِ پَرِ هٰى جِهًا دُوْنُوْكَ كَا اَثْرُ مَتَمَآثِلِ هُوَ بَاقِي تَعْلِيْمِ فُرُوْعِ كَا نَفْعٌ يَّقِيْنِيْ هُوَ اَوْرُ تَعْلِيْمِ اَصُوْلِ كَا مَحْتَمَلِ وَهًا يٰى يٰى مَقْدَمِ هٰى اَوْرُ ظٰهَرِ هٰى كِي يِهًا اِيْسا يٰى تَحٰا اِسْ لَعْنَةُ حَقِّ تَعَالٰى نِي شِكَايَتِ فَرْمَا نِي كِي طَرُقِ تَعْلِيْمِ مِيْسِ اَفْضَلِ كُو چھوڑ كَرِ غَيْرِ اَفْضَلِ كِي طَرَفِ كِيُوْنِ مَتَوَجِّهٖ هُوَ لَعْنَةُ تُوْ اَبْ كَا اَمَلِ بَحٰى طَاعَتِ تَحٰا . مَكْرُ دُوْسَرِيْ طَاعَاتِ اِسْ سَعِ اَكْمَلِ تَحٰى اِسْ سَعِ ثَابِتِ هُوَ كِيَا كِي اَنْبِيَآءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ كِي تَمَامِ اَعْمَالِ فِيْ نَفْسِهِ حَسَنَاتِ اَوْرُ طَاعَاتِ اِسْ سَعِ اَكْمَلِ تَحٰى اِسْ سَعِ ثَابِتِ هُوَ كِيَا كِي اَنْبِيَآءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ كِي تَمَامِ اَعْمَالِ فِيْ نَفْسِهِ حَسَنَاتِ اَوْرُ طَاعَاتِ هِيْنَ لِيْكَنَ بَزِيْ طَاعَتِ كِي مَقَابِلَهُ مِيْسِ چھوٹی طَاعَتِ كُو غَلْطِيْ فَرْمَا يٰى . سَآئِلُ نِي اَعْرَضَ كِيَا كِي فِي الْحَقِيْقَتِ يٰى مَسْئَلُهُ خُوْبٌ صَافٌ هُوَ كِيَا . پَحْرُ اَعْرَضَ كِيَا كِي وَهُوَ صَحَابِيْ تُو خُوْشِ هُوَ لَعْنَةُ هُوْنِ كِيَا كِي هَمَارِيْ وَجِبِ سَعِ حَقِّ جَلِّ عَلٰى شَاْنِهِ نِي اِيْسا فَرْمَا يٰى . فَرْمَا يٰى كِيَا كِي وَهُوَ حَضْرَاتِ اِسْ پَرِ خُوْشِ هُوْنِ وَالِيْ نِي تَحٰا اِن حَضْرَاتِ كُو حَضْرُوْ سَعِ اِسْ قَدْرُ تَعْلُقِ اَوْرُ مَحَبَّتِ تَحٰى كِي اِيْسِيْ مَوْجِعِ پَرِ شَرْمَنْدِهٖ هُوْتِيْ تَحٰا كِي هَمَارِيْ وَجِبِ سَعِ حَضْرُوْ كُو اِيْسا خَطَابِ كِيَا كِيَا پِنِيْ پَرِ قِيَاسِ نِي كَرْنَا چَاهِيْ اِسْ كُو مَوْلَا نَارُوِيْ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ فَرْمَاتِيْ هِيْنَ .

کار پاکاں راقیاس از خود مکیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اجتہادی غلطی پر تنبیہ

فرمایا عبس و تولى میں حضور ﷺ کی اجتہادی لغزش تھی کیونکہ یہاں دو قاعدے ہیں۔ ایک یہ کہ تعلیم اصول مقدم ہوتی ہے تعلیم فروع سے۔ اس قاعدہ کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر کو تبلیغ فرمائی۔ کیونکہ اس کو حضور ﷺ تبلیغ فرما رہے تھے اور ابن مکتوم مسلمان تھے ان کو فروع کی تعلیم ہوتی۔ گو وہ فروع بھی کسی دوسری شے کی بہ نسبت اصل ہو۔ مگر اسلام کی نسبت تو فرع ہے جیسے اصول فقہ کے لئے اصلی ہے مگر علم کلام کی بہ نسبت فرع ہے اور دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ نفع متیقن مقدم ہوتا ہے نفع متوہم سے۔ اس وقت اس قاعدہ کی

طرف توجہ نہ ہوئی۔ تو اب حاصل یہ ہے کہ تعلیم اصول فروع سے مقدم ہے بشرطیکہ تاثیر نفع میں دونوں برابر ہوں اور جب علم فروع میں نفع یقینی تو یہ مقدم ہوگی۔ اگر یہ شبہ ہو کہ! جہتہادی لغزش پر حضور ﷺ کو ملامت کیوں فرمایا گیا تو جواب یہ ہے اگر حضور ﷺ پر ایک شبہ کا کہ حضور ﷺ نے اُمی کی دل شکنی کی۔ لفظ اُمی میں جواب کی طرف اشارہ کہ حضور ﷺ نے زبان سے کچھ نہیں فرمایا۔ صرف تیوری پر بل ڈالے اور چونکہ وہ نابینا تھے اس لئے ان کو تیوری چڑھانے کی خبر نہیں ہوئی تو ان کی دل شکنی بھی نہ ہوئی کیونکہ وہ تو اُمی تھے ہاں اگر بینا ہوتے تو بیشک دل شکنی ہوتی۔ (الکلام الحسن)

عظمت سرکارِ دو عالم ﷺ

جس واقعہ میں نازل ہوئی ہے وہ کیسی معمولی بات تھی کہ جس پر عتاب ہونے کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ مگر عتاب ہوا اور عتاب بھی عجیب و غریب عنوان سے کہ غائب کے صیغہ کے ساتھ عتاب فرمایا۔ معنی یہ ہیں کہ ایک شخص ہیں کہ انہوں نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا عبت و تولیت صیغہ حاضر کا نہیں لائے۔ اس میں آپ کی عظمت و وقعت کی کس قدر رعایت فرمائی کہ اوروں کو پتہ نہ چلے کہ کس کو عتاب ہوا۔

شان نزول

جس پر سورہ عبس و تولی نازل ہوئی کہ عبد اللہ بن ام مکتوم آئے یہ نابینا تھے اور طالب تھے نابیناؤں کو بعض اوقات موقع کا اندازہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے حضور سے کچھ پوچھنا چاہا اس وقت حضور کے پاس کچھ لوگ اور بیٹھے تھے آپ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے کچھ سوال کیا آپ کو بے موقع سوال سے ایک گونہ ناگواری ہوئی کیونکہ آپ تبلیغ اصول میں مشغول تھے اور یہ فروع کا سوال کرتے تھے اور اصول مقدم ہیں فروع پر لیکن یہاں سائل نابینا تھے جن کو حضور کا مشغول یا فارغ ہونا۔ معلوم نہ تھا اس لئے وہ بھی اس فعل میں معذور تھے۔ اس پر یہ آیت اتری جس میں عتاب ہے اور بطور شکایت نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے برامانا اور منہ پھیر لیا کیا مزہ کا عتاب ہے۔ جس میں آگے حضور کے عذر کا بھی بیان ہے کہ ایسا کیوں ہوا ان جساء ہ الا عمی۔ اُمی کے لفظ میں اشارہ ہو گیا کہ آپ کے عبوس کی اس سائل کو اطلاع بھی نہیں ہوئی جس سے ان کو ناگواری ہوتی۔ غرض کوئی تکلیف سائل کو نہیں ہوئی باقی یہ کہ پھر کیوں عتاب ہوا تو وہ عتاب اس پر ہوا کہ ایسی شکل بنائی کیونکہ اگر وہ سو جھا کا ہوتا تو برامانا کس قدر اخلاق کی تعلیم ہے کہ عبوس کی صورت بنانے سے بھی منع فرمایا گیا اور حضور کی شان محبت الہی کو دیکھئے کہ اس واقعہ کے بعد یہ حالت تھی کہ جب کبھی عبد اللہ بن ام مکتوم آتے تو آپ اپنی ردائے مبارک ان کے واسطے بچھا دیتے۔ اور فرماتے مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی یعنی

مرحبا اس شخص کو جس کے بارہ میں مجھ پر میرے رب نے عتاب کیا اس پر لطف عتاب کا مزہ کوئی دوسرا کیا جان سکتا ہے میں کبھی کبھی بعضے اندھے آدمیوں کے پاس کو گزرتا ہوں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ سلام نہیں کرتا اس خیال سے کہ وہ مجھے مشغول کر لیں گے مگر اس وقت سورہ عبس کو یاد کر کے شرماتا ہوں اور اسی واقعہ میں حضور کی شفقت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اس وقت جن لوگوں سے حضور بات کر رہے تھے وہ مسلمان نہ تھے حضور نے ان کو ایک اہل دین کے مقابلہ میں خطاب میں مقدم رکھا تو یہ کس قدر شفقت ہے کہ دشمنوں کے ساتھ برتاؤ ہے کہ دوستوں سے ان کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ غرض یہ نظائر ہیں حضور کی شفقت اور نرمی اور اخلاق کے۔

ضرورت آزادی و اعتدال

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں و ان کان کبر علیک اعراضہم فان استطعت ان تبغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتہم بآیة اور ایک جگہ فرماتے ہیں ولقد نعلم انک بضیق صدرک بما یقولون غرض جا بجا قرآن میں مصرح ہے کہ اس کا شدید اہتمام نہ کیجئے کہ ہدایت ہو ہی جائے اور اس تعلیم خداوندی میں ایک راز ہے وہ یہ کہ آزادی اور اعتدال سے کام کرتا رہے ورنہ جو کام کر رہا ہے غلو کرنے سے کہیں تنگ ہو کر اس کو چھوڑ نہ بیٹھے اور اعتدال کی صورت میں ہمیشہ کر سکتا ہے۔ اسی بنا پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس ثمرہ کے منتظر نہ رہنا چاہیے جس کو اہل ظاہر ثمرہ کہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ انک لا تہدی من احببت ولكن الله یهدی من یشاء سبحان اللہ کیا پاکیزہ اور پر مغز تعلیم ہے چنانچہ یہ فرما کر کہ ولقد نعلم انک بضیق صدرک اس سے بچا دیا کہ ضیق صدر میں کیوں مبتلا ہوا جائے چھوڑیے اس کو جیسے لڑکا پڑھنا نہ چاہے اور استاد پڑھانا چاہے تو سخت کوفت ہوتی ہے بس اس کا علاج یہ ہی ہے کہ ایک دو بار تقریر کر دے اور کہہ دے کہ جاؤ بھاگو بلا ضرورت دوسروں کی فکر میں پڑتا اس کی نسبت ماموں صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دوسروں کی جوتیوں کی حفاظت کی بدولت کہیں اپنی گٹھڑی نہ اٹھوادینا۔

اب ایک سوال یہ باقی رہا کہ جب حضور ﷺ ایک ایسے اہم کام میں مشغول تھے جو ان صحابی کی تعلیم سے مقدم تھا تو ان صحابی کا اس اہم کام میں نخل ہونا۔ ضرور موجب گرانی تھا۔ اور حضور ﷺ اس ناگواری میں مصیب تھے پھر عتاب آپ پر کیوں ہوا۔ ان صحابی پر ہونا چاہیے تھا کہ یہ ایسے ناوقت کیوں آئے اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ اعمیٰ میں ان صحابی کا عذر مذکور ہے۔ کہ وہ بوجہ نابینا ہونے کے معذور تھے۔ ان کو یہ خبر نہ تھی کہ حضور اس وقت کس کام میں مشغول ہیں اور دوسرا جواب حق تعالیٰ نے آگے بیان فرمایا ہے۔ اما من استغنی فانہ لہ تصدی و ما علیک ان لایزکی جس کا حاصل یہ ہے کہ جن کفار کو آپ تبلیغ فرما رہے تھے وہ

طالب نہ تھے محض حضور کا دل چاہتا تھا۔ کہ وہ ایمان لے آئیں لیکن وہ خود حق سے اعراض کرتے تھے اور صحابی طالب حق تھے۔ اس صورت میں کفار کی اصلاح موہوم اور صحابی کی اصلاح متیقن تھی تو آپ نے اصلاح موہوم کا اس درجہ اہتمام کیوں فرمایا۔ کہ اس وقت طالب حق کا آنا گراں ہونے لگا۔ اگر ان غریبوں کے آنے سے وہ چلے جاتے۔ تو آپ ﷺ کی جوتی سے۔ آپ کو بھی ان کے ساتھ استفنا کا برتاؤ کرنا چاہیے تھا اور صحابی کی تعلیم میں مشغول ہو جانا چاہیے تھا جس کی اصلاح یقینی تھی پس یہاں سے یہ مسئلہ بتلا دیا گیا کہ منفعت موہومہ پر منفعت متیقنہ کو مقدم کرنا چاہیے۔

سُورَةُ التَّكْوِيْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا تَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۴

ترجمہ: اور تم بدوں خدا سے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔

تفسیری نکات مشیت کی دو قسمیں

فرمایا مشیت رو ہیں مشیت عباد مشیت رب بندہ کے افعال بمشیت بندہ ہیں مگر وہ مشیت معلول ہے۔ مشیت رب قال اللہ تعالیٰ و ما تشاءون الا ان يشاء الله رب العالمین اور بندوں کے افعال مشیت بندہ کہلانے کی وجہ یہ کہ یہ مشیت اول افعال کی علت قریب ہے اور مشیت رب علت بعیدہ اور نسبت علت قریبہ کی طرف کیا کرتے ہیں قدریہ اور جبریہ ایک ایک مشیت پر نظر کر کے راہ حق سے بہک گئے۔ اہل سنت و جماعت کی نظر دونوں مشیتوں پر ہے صراط مستقیم پر قائم رہے۔

سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحِفْظِیْنَ ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۝۱۱

ترجمہ: اور تم پر اپنے اعمال یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے مقرر ہیں۔

تفسیری نکات

کراماً کاتبین کے مقرر ہونے میں حکمت

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ اور قادر مطلق ہیں پھر باوجود اس کے جو اعمال لکھنے کے لئے یا عذاب کے لئے جو فرشتے مقرر فرمائے اس کی کیا وجہ ہے بظاہر تو یہ امر خلاف عقل معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ لکھنے کی توجہ ضرورت ہوتی جبکہ خود کو علم نہ ہوتا اور نیز دوسروں کے واسطے سے سزا دینے کی جب حاجت تھی جب کہ بالذات قدرت نہ ہوتی اور وہاں دونوں امر مفقود ہیں پھر اس کی کیا ضرورت ہے چنانچہ معتزلہ نے تو اسی بناء پر کتابت اعمال کا صاف انکار ہی کر دیا ہے۔ اور اہل سنت نے اس مسئلہ میں تحقیق کی ہے اور جن نصوص میں کتاب یا وزن اعمال کی خبر دی گئی ہے ان کا یا تو انکار کیا اور یا ان میں تاویل کی گئی ہے۔

علت سے متعلق ہمارا مذہب

اہل سنت کی طرف سے حقیقی جواب تو یہ ہے کہ نصوص میں جب وارد ہوا ہے تو حق ہے گو ہم کو اس کی علت معلوم نہیں اور نہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے ہمارا تو یہ مذہب ہے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو

نیکی بخش علت از کار تو!

آپ کا ذکر کرنا چاہیے نہ آپ کے کاموں کی علت

بندوں کے ناز کا سبب

باقی حکمت کے مرتبہ میں جو بات حق تعالیٰ نے میرے قلب پر وارد فرمائی وہ یہ ہے کہ بندوں کو اپنے مالک تعالیٰ شانہ سے بے نہایت تعلق و خصوصیت ہے کہ اس قدر کسی سے نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور یہ خصوصیت اس درجہ پر ہے۔ کہ اس کی وجہ سے بندوں کو ایک ناز ہو گیا ہے۔

محبت کا مدار دیکھنے پر نہیں

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کو کیسے محبت ہو گئی ہم نے ان کو دیکھا تو ہے نہیں۔ میں نے کہا کہ محبت کا مدار دیکھنے پر نہیں ہے۔ دیکھو اپنی جان سے کیسی محبت ہے بلکہ حق تعالیٰ سے جان سے بھی زیادہ تعلق ہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق اول ہوا ہے اور اس تعلق کی ہی وجہ سے اپنی جان سے تعلق ہوا (لان بينهما علاقة العلیة) لیکن ہم کو غایت تعلق و قرب کی وجہ سے ہے اس کا احساس نہیں ہے اس کی مثال محسوسات میں موجود ہے مگر اس سے پہلے اول یہ معلوم کرنا چاہیے۔ کہ یہ فلسفی مسئلہ ہے اور نیز مشاہدہ ہے انسان کی قوت باصرہ ادراک مبصرات میں مستقل نہیں ہے بلکہ بواسطہ کسی خارجی نور کے ادراک کرتی ہے خواہ وہ نور شمس کا ہو یا چراغ کا نجوم کا اسی واسطے تاریک مکان میں خواہ کتنا ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں کچھ بھی نظر نہیں آتا پس اولاً ہم کو ادراک اس نور کا ہوتا ہے اور اس کے واسطے سے دوسری اشیاء ہم کو نظر آتی ہیں۔ اب سمجھئے کہ ہم نے مثلاً دیوار کو دیکھا تو ہم تو سمجھتے ہیں کہ اول ہم نے دیوار کو دیکھا اور دیوار کے سوا کوئی شے ہم کو نظر نہیں آتی حالانکہ اول ادراک ضوشمس کا ہوا اور اس کے واسطے سے دیوار نظر آئی مگر ہم اس نور کو غایت قرب کی وجہ سے اس کو مدرک اول نہیں جانتے مری اول دیوار ہی کو جانتے ہیں اور جو اصلی علت رویت کی تھی وہ غایت قرب کی وجہ سے مدرک نہیں ہوتی لیکن وہ ضیاء ہو سکتی ہے انسا اقرب الیک من الجدار یعنی اے دیکھنے والے میں تجھ سے دیوار کی نسبت قریب تر ہوں پس معلوم ہوا کہ غایت قرب بھی بعض اوقات مانع ادراک ہو جاتا ہے پس ایسا ہی تعلق و قرب ہم کو ذات باری تعالیٰ سے ہے کہ وہ اس قدر قوی ہے کہ غایت قوت کی وجہ سے اس کا ہم کو ادراک نہیں ہوتا اور تمام اشیاء کے ادراک کا وہ واسطہ ہے۔

کراما کا تبین صفت ہے

ان علیکم لحافظین کراما کاتبین یعلمون ماتفعلون یعنی بے شک تم پر نگہبان مسلط ہیں جو کریم الذات ہیں اور لکھنے والے ہیں جانتے ہیں وہ شے جو تم کرتے ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کراما

کاتبین ان کا نام نہیں ہے جیسا کہ عوام میں مشہور ہے بلکہ ان کی یہ صفت ہے اور اس صفت کا یہ بھی اثر ہے کہ وہ مخلوق کریم کسی سے کہتے نہیں صرف لکھنے والے ہیں اس سے شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ لکھتے ہوں لیکن ہمارے کرتوت کی ان کو خبر نہ ہو پر اسی کی طرح کوئی شے ان کے پاس ہوگی کہ جب کوئی عمل ہم سے ہو اور وہاں منطبع ہو گیا۔ اس کا جواب دیتے ہیں۔ **یعلمون ماتفعلون** یعنی جو کچھ کرتے ہو وہ اس کو جانتے بھی ہیں۔ صاحبو اگر یہ مضمون پیش نظر ہو جاوے کہ فرشتے ہمارے اعمال کو دیکھ رہے اور لکھ رہے ہیں واللہ کوئی گناہ نہ ہو۔

شرم کا مہنی

بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک پاک مخلوق جو کہ ہماری جنس بھی نہیں مگر ذی شعور و ذی عقول ہیں ہماری نافرمانیاں اور ناپائیاں دیکھے اور لکھے اور بالخصوص غیر قوم جو ہمارے ہم جنس نہیں ہیں ان سے تو اور بھی زیادہ شرمانا چاہیے۔ دیکھو اگر ہم پر کسی غیر قوم کی حکومت ہوتی تو ہم کو بہ نسبت اپنی قوم کے ان سے زیادہ خوف ہوتا ہے۔ یہ تو آیت کا حاصل ہوا اور جو مہنی شرم کا اس آیت کی تقریر میں بیان کیا گیا ہے یعنی مخلوق کو اطلاع ہونا ہمارے اعمال کی اس کی تقویت کے لئے اور بھی بعض مخلوقات کے ہمارے اعمال پر مطلع ہونے کا مضمون بیان کیا جاتا ہے کہ اور بھی ایک دوسری جماعت ہے جو ہمارے افعال پر مطلع ہوتی ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کا غایت قرب

اسی واسطے ارشاد ہے **نحن اقرب الیہ من حبل الورد** یعنی ہم انسان اس کی رگ جان سے زیادہ قریب تر ہیں اور فرماتے ہیں **و نحن اقرب الیہ منکم** و لکن لا تبصرون یعنی ہم تمہارے تم سے بھی زیادہ قریب ہیں لیکن تم بصیرت نہیں رکھتے غرض حق تعالیٰ کے ساتھ جان سے بھی زیادہ محبت ہے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محبت اگر ہو سکتی ہے تو وہ خدا ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے اور کسی شے کے ساتھ محبت نہیں ہو سکتی پس اس غایت قرب کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں کو اپنے خالق تعالیٰ شانہ پر ایک قسم کا ناز ہے جیسے بچہ کو غایت تعلق کی وجہ سے ماں پر ناز ہوتا ہے کہ شرم کم ہو جاتی ہے پس فی نفسہ تو اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ گناہ سے بچنے کا نہ تھا کہ بندہ اپنے خالق تعالیٰ شانہ سے شرم کر گناہ کو چھوڑ دیتا لیکن ناز نے اس شرم کا اثر کم کر دیا اور نیز ہمارا قصور فہم بھی عارض ہو گیا اس لئے یہ طریقہ کافی نہ ہوا اور یہ قرب حاجب عن العصیان نہ ہوا۔ اس لئے ضرورت ہوئی ایسے طریقہ کی کہ جو اس کے تدارک تلافی کر سکے۔

اعمال لکھنے کیلئے فرشتوں کے مقرر کرنے کا سبب

اور وہ طریقہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے اعمال کی کتابت کے لئے فرشتے مقرر فرمادئے اور پھر ہم کو

اس کی خبر کردی گو یا مطلب یہ ہے کہ تمہارے اعمال کی صرف ہم کو ہی خبر نہیں بلکہ فرشتوں کو بھی خبر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے ان علیکم لحافظین کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون پس یہ معلوم ہو کر ہمارے افعال کی ملائکہ کو بھی خبر ہے نہایت غیرت اور شرم آدے گی اور اس کا استحصار اگر تام ہو جائے تو بالیقین گناہ سے احتراز ہو جائے اسی طرح گناہ پر سزا خود بھی دے سکتے تھے۔ مثلاً گناہ کرتے ہی ایسا درد پیدا ہوتا کہ بے قرار ہو جاتا لیکن یہ طریقہ بھی کافی نہ ہوتا۔ دیکھ لیجئے اگر باپ بیٹے کو سزا دے تو وہ زاجر نہیں بخلاف اس کے کہ استاد یا غیر اس کو سزا دے کہ وہ کافی ہوتا ہے اس لئے سزا دینے کے لئے بھی ملائکہ کو بھی مقرر فرمایا پس یہ ہے وہ مضمون جس پر بے ساختہ مجھ کو یہ شعر یاد آتا ہے۔

خوشر آن باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگران
(اچھا یہ ہوتا ہے کہ دوستوں کی باتیں دوسروں کی باتوں کے دوران بیان کر دی جائیں)

علماء محققین ہی نے مقاصد قرآن کو سمجھا ہے

چنانچہ ارشاد ہے یا ایہا الانسان ما غرک بربک الکریم یعنی اے انسان تجھ کو اپنے رب کریم کے ساتھ کس شے نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔ بعض اہل حال کو یہ آیت سن کر حال طاری ہو گیا ہے اور انہوں نے جواب میں کہا ہے غرنسی کر مک یعنی آپ کے کرم نے ہم کو مغرور کر دیا ہے علماء و محققین نے اس پر انکار بھی کیا ہے لیکن ان کا انکار بھی بے جا نہیں ان کا منصبی کام اور حق یہی ہے کہ علماء محققین ہی نے مقاصد قرآن کو سمجھا ہے بلکہ انتظام شرع تو اس کو مقتضی ہے کہ محض ظاہری علماء کے علوم کو بھی محض صوفیہ کے علوم پر مقدم رکھا جاوے اور احادیث سے مطلقاً حضرات علماء کے مناقب مفہوم ہوتے ہیں۔

بعض تو وہ تھے جن کو علم الہی سے تاثر ہوتا ہے ان کے لئے تو یہی کافی ہے ان کے لئے تو یہ ارشاد ہے ما غرک بربک الکریم بعض کو اس سے اثر ہوتا ہے کہ فرشتے دیکھ رہے ہیں ان کے لئے یہ ارشاد ہے وان علیکم لحافظین کراما کاتبین بعض وہ ہیں جو جزا و سزا ہونے سے خائف ہیں ان کے لئے ارشاد ہوا ان الابرار لفی نعیم و ان الفجار لفی جحیم۔ اب یہاں پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ فرشتے تو ہر وقت ساتھ نہیں رہتے۔ چنانچہ جب پانچا نہ میں جاتے ہیں تو فرشتے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور نیز مردوں کو بھی ضرور نہیں ہے کہ ہر وقت علم ہو۔ اس لئے اس کی ہم کو یہ بھی خبر دے دی کہ قیامت کے دن جب کہ تمام اولین و آخرین جمع ہوں گے وہاں اعلان کیا جاوے گا کما قال تعالیٰ و یقول الاشهاد هو لاء الذین کذبوا علی ربہم الا لعنة اللہ علی الظالمین غرض جو مخلوق گناہوں کے جاننے سے باقی رہ گئی تھی وہ سب وہاں دیکھیں گے اور سنیں گے۔ اب آخرت کی نسبت شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت دور ہے۔

آخرت کے دو درجے

بات یہ ہے کہ آخرت کے دو درجے ہیں زمانِ آخرت اور مکانِ آخرت، سو زمانِ آخرت بھی گو کچھ دور تو نہیں ہے لیکن خیر اس کی نسبت بعید ہونے کا گمان ہو سکتا ہے لیکن مکانِ آخرت تو بالفعل ہی موجود ہے اس لئے اس آسمانِ دنیا سے آگے مکانِ آخرت ہی ہے تو اگر ذہن میں یہ مضمون جمالو کہ چھت پر گویا ایک کثیر مخلوق ہم کو دیکھ رہی ہے تو یہ مراقبہ بھی ان شاء اللہ گناہ سے بچنے کے لئے کافی ہوگا۔ اور آسمان کے چھت ہونے سے کوئی شبہ ہی نہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

جعل لكم الارض فراشا و السماء بناء غرض یہ ہے کہ جس طرح ہو سکے گناہ سے بچو۔ (انفصاح لمحقہ لو نجات) اور اس جواب سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ پاخانہ کے وقت کے اعمال پر مطلع نہ ہونا فرشتوں کا تسلیم کر لیا گیا ہے بلکہ یہ جواب تو آخر جواب ہے باقی اس وقت کے اعمال پر بھی فرشتے مطلع ہو جاتے ہیں اب یہ کہ کیونکر مطلع ہو جاتے ہیں سو حق تعالیٰ کسی طریق سے مطلع فرمادیتے ہیں۔

سُورَةُ الْمُطَفِّفِينَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّحَجُوبُونَ ﴿١٥﴾

ترجمہ: ہرگز ایسا نہیں یہ لوگ اس روز (ایک تو) اپنے رب کا دیدار دیکھنے سے روک لئے جائیں گے پھر صرف اسی پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ یہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

تفسیری نکات

دنیا کا کوئی انسان محبت خداوندی سے خالی نہیں

فرمایا کہ بعض اہل لطائف کا قول ہے کہ دنیا میں کوئی انسان خدا تعالیٰ کی محبت سے خالی نہیں ہے۔ مسلم کافر سب کو خدا تعالیٰ کی محبت ہے کسی کو کم کسی کو زیادہ اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ خدا تعالیٰ زجر و توبیخ کے لئے کفار کی شان میں فرماتے ہیں۔ کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون (پس اگر کفار خدا تعالیٰ کو دوست نہیں رکھتے تو اس حجاب کی وعید سے ان کو کیا زجر ہوا) اور اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب سے حکمت مشروعیت حج کی نقل کی کہ وہ فرماتے تھے کہ ہر مسلمان کو ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ سے شدت کے ساتھ محبت ہے اور محبت کا خاصہ ہے کہ اگر بالکل قرب و وصال نہ ہو تو یا محبت جاری رہتی ہے یا محبت ہلاک ہو جاتا ہے اور دونوں مضر ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے محبت و محبت کی حفاظت کی حکمت سے ایک مکان بنایا اور اس کو اپنی طرف منسوب فرمایا اور جو معاملہ محبوب کے مشاہدے کے وقت عادتاً کیا جاتا ہے۔ یعنی طواف و تقبیل و التزام و مثل ذالک اس بیت کے ساتھ بھی مشروع فرمایا کہ خمین کو اگر پورا وصال نصیب نہ ہو تو اس معاملہ ہی سے کچھ تسکین ہو جائے اور اسی واسطے اس میں حجر اسود کو یمین اللہ کا لقب دیا کہ دست بوسی کے لئے بے قرار ہوں تو اس سے تسلی کر لیں۔

طواف کا حکم دیا کہ عاشق کی طبعی حالت ہے اور چونکہ عشق میں عاداتاً مانع سے عداوت بھی ہوتی ہے اس لئے ایک مقام کو شیطان کی طرف سے منسوب کر کے اس کی رمی کا حکم دیا (رمی جمار) وغیرہ ذالک اور جب سفر حج اس حکمت سے مشروع ہوا تو اس سفر میں اگر ہزار ہا تکلیف بھی ہوں تو پروا نہ کرنی چاہیے۔

ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے

اگر کوئی یہ کہے کہ نعوذ باللہ ہم کو تو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں ہے تو میں کہوں گا تم غلط کہتے ہو کیونکہ ہر مسلمان کو خدا سے محبت ہے بلکہ کفار کو بھی اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔ اسی لئے تو کفار کو اللہ تعالیٰ نے یہ دھمکی دی ہے۔ کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون کہ کفار قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (کے دیدار) سے محجوب رہیں گے۔ اگر ان کو محبت نہ ہوتی تو یہ دھمکی نہ دی جاتی۔ کیونکہ یہ دھمکی محبت ہی کے دل پر اثر کر سکتی ہے غیر محبت پر اس سے اثر نہیں ہو سکتا بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس کو غیر حق سے بھی محبت ہے اس کو بھی خدا ہی سے محبت ہے کیونکہ تمام مخلوق مظہر جمال الہی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کو گنبد کے کلس پر آفتاب کی شاع پڑنے سے گنبد بھلا معلوم ہو اور بار بار اس کی چمک کو دیکھنے لگے تو حقیقت میں اس کو گنبد سے محبت نہیں بلکہ آفتاب سے محبت ہے۔ گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گنبد پر عاشق ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھو کہ جس کسی کو کسی مخلوق کے ساتھ کسی کمال یا جمال کی وجہ سے محبت ہے حقیقت میں اس کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے کیونکہ مخلوق میں جو کچھ جمال و کمال ہے وہ جمال حق کا آئینہ ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردہ پس پشیم عاشقاں خود را تماشا کردہ اپنے حسن کو تو نے خوب رو لوگوں کے چہرے سے ظاہر کیا اور پھر عاشقوں کی آنکھ سے اپنے آپ کو دیکھا ہے۔

(مواعظ فضائل صبر و شکر ص ۲۴۸۔ مانیہ الصمدی)

سورة البروج

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالسَّمَاوٰتِ الْبُرُوجِ ۝۱

ترجمہ: قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔

تفسیری نکات بروج کی تفسیر

فرمایا۔ بعض مفسرین نے بروج کی تفسیر میں اہل بیت کا قول لے لیا ہے جس کا عربیہ میں کہیں نشان نہیں مزید برآں اس کے ساتھ نجوم کو بھی شامل کر لیا کہ خاص کو اکب کا خاص بروج سے تعلق مانا اور یہ اہل نجوم کا خیال ہے اور وہ بھی محض اس وہمی بناء پر کہ مثلاً شمس گرم ہے اور اسد کا مزاج بھی گرم ہے تو شمس کا تعلق اسد سے ہوگا اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے کیونکہ اسد جو گرم ہے تو حیوان ہے نہ کہ شکل اسد جو کو اکب کے اجتماع سے متخیل ہوگی۔ نیز اب وہ شکل بھی اہل فن کے نزدیک بروج میں مجتمع نہیں رہی۔ (الکلام الحسن ج ۱ ص ۶۶، ۶۷)

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدِ ۝۵

ترجمہ: عرش کا مالک اور عظمت والا ہے۔

تفسیری نکات اختلاف قراءت

فرمایا کہ غیر مقلدین اس امر کے مدعی ہیں کہ حضور ﷺ سے مواقع آیات میں وصل فرمانا یا غیر مواقع

آیات میں وقف فرمانا منقول نہیں ہے لیکن فواصل کا اختلاف قراءت اس دعوے کے ایک جزو کی قطعاً تردید کرتا ہے کیونکہ یہ امر مجمع علیہ ہیں۔ اختلاف قراءت آرائے امت سے نہیں بلکہ مسوع و منقول ہیں۔ حضور ﷺ سے اور اگر اجتہاد و رائے سے ہوتا تو اب بھی بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں متعدد اعراب ممکن ہیں۔ لیکن وہاں صرف ایک ہی قراءت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اب جن مقامات پر اختلاف ہے وہ مسوع ہے نیز علاوہ اجماع کے اختلاف قراءت متواتر منقول ہیں جن کے انکار کی گنجائش ہی نہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ذوالعرش المجید مجید کی وال پر آیت یقیناً ہے لیکن پھر بھی اس میں صحابہ سے دو قراءت منقول ہیں متواتر ابکسر الدال علی انه صفة اللعش و بضم الدال علی انه تابع لذو پس یہ اختلاف اس امر کو صاف بتلاتا ہے کہ حضور ﷺ نے اس موقع پر گاہ گاہ وصل بھی فرمایا ہے۔

سُورَةُ الْأَعْلَى

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ۖ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۝

ترجمہ: بامراد ہوا جو شخص (قرآن سن کر خباثت عقائد و اخلاق) سے پاک ہو گیا اور اپنے رب کا نام لیتا رہا اور ذکر کرتا رہا۔

تفسیری نکات تین اعمال کا بیان

یہاں تین اعمال بیان کئے ہیں ایک تزکی ایک ذکر اسم ربہ ایک صلی یہاں پر تزکیہ سے عام مراد بھی لے سکتے ہیں ذمائم باطنی سے بھی تزکیہ ہو اور معاصی جوارج سے بھی۔ مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمائم باطنی سے پاکی مراد ہے چنانچہ ارشاد ہے ونفس وما سواها فالههنا فجورها و تقواها قد افلح من زكها۔ اور قسم ہے انسان کی جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا اور پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگار (دونوں باتوں کا) اس کو القاء کیا۔ یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے (جان) کو پاک کر لیا۔ زکھا میں مفعول کی ضمیر نفس کی طرف ہے کہ نفس کا تزکیہ کر لیا۔ اس آیت میں تصریح ہے کہ مدار فلاح کا تزکیہ نفس پر ہے اور ظاہر ہے کہ نفس کا تزکیہ اور اس کی پاکی ذمائم باطنی کے ازالہ سے ہوتی ہے۔

پہلی آیت میں تو تزکیہ باطن کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں ایک ظاہر اور دوسرا من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن دونوں کے تزکیہ کا ذکر ہے کیونکہ عمل تین حال سے خالی نہیں یا تو اس کا تعلق باطن سے ہے یا افعال جوارج سے اور یا زبان سے۔ اعمال جوارج تو ظاہر ہیں اور زبان برزخ ہے۔ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن اور حسابی چنانچہ اگر منہ بند رکھو تو زبان باطن میں داخل ہے اور منہ کھولو تو ظاہر میں خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ باطن کی

بھی اصلاح کرو اور ظاہر کی بھی۔ یعنی زبان جو ارج اور قلب کی درستی اور بجائے اس ساری فہرست کے ذکر اسم ربہ فصلی فرمایا کہ اگر اس کو اختیار کرو گے تو بآسانی تمام امور کی درستی پر قادر ہو جاؤ گے۔ ان سب کی فہرست یاد رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

وساوس شیطان کا جواب

ذکر اسم ربہ فرمانے سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ ذات حق کا جب تصور نہیں ہو سکتا تو اس کی یاد کیسے ہو سکتی ہے۔ بعض سالکین کو اس قسم کے خطرات پیش آتے ہیں۔ یہ سب شیطان کے حیلے بہانے ہیں کہ وہ خدا کی یاد سے روکنا چاہتا ہے اس واسطے حق تعالیٰ نے اس جگہ اسم کا لفظ آیت میں بڑھا دیا کہ اگر کسی کا ذکر نہیں ہے تو اسم کا تو ممکن ہے اسی واسطے قرآن شریف میں فاذا کرونی اور واذا کوربک فی نفسک مطلب یہ کہ ذات کا تصور نہ ہو سکے تو صفات کا سہی اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اسم اور لفظ ہی کا سہی۔ اسی لفظی ذکر سے پھر حقیقی ذکر بھی نصیب ہو جاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس لفظی ذکر سے حقیقی ذکر کا قصد ہو۔ یہ قصد ہی ایسی چیز ہے کہ اس سے باطن میں اثر ضرور ہوتا ہے۔

ذکر نماز کا مقدمہ ہے

اس آیت میں ایک نکتہ اور ہے وہ یہ کہ فصلی میں توف لائے اور ذکر اسم ربہ میں واؤ۔ حالانکہ دونوں جگہ عطف ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز بعض وجوہ سے مقصود اعظم ہے کیونکہ ذکر پر نماز کی اس طرح تفریح کی ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر مقدمہ ہے نماز کا اور اصل مقصود (نماز ہے پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اول ذکر سے نماز کی قابلیت پیدا کی اور پھر نماز پڑھی۔ اس سے نماز کی مقصودیت عظمیٰ معلوم ہوئی دوسرے قد افلح من تزکی کے ساتھ و ذکر اسم ربہ فصلی کی قید لگانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ گو تزکیہ بہت بڑا عمل ہے مگر بغیر نماز کے فلاح کے لئے کافی نہیں ہاں جب کہ تزکیہ کے ساتھ نماز بھی پڑھی تو اس وقت سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری فلاح ہوگی نماز سبب عظمیٰ ہے فلاح کا۔ کیونکہ وہ بھی ذکر ہے۔ مگر یہ بات اسی وقت حاصل ہوگی جبکہ نماز کی تکمیل کرے وقت پر پڑھے جماعت کے ساتھ ادا کرے قرآن کی تصحیح کرے اور قلب کے متوجہ کرنے کی کوشش کرے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دے مگر نرمی سے دوسرے کو ذلیل مت سمجھے اگر کسی کو سیاست کرنا پڑے تو اس کو حقیر نہ سمجھے۔ پس امر بالمعروف اس طرح ہونا چاہیے اور اس طرح دوسروں کو بھی اپنے ساتھ فلاح میں لاؤ۔ (الصلوٰۃ بالمحۃ نضال صوم و صلوٰۃ)

لہذا اولیٰ یہ ہے کہ یہاں بھی ذمائم باطنی ہی سے تزکیہ مراد ہو مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری اعمال کی

ضرورت نہیں جیسا کہ بعض لوگ آج کل کہتے ہیں۔ سوترکیہ باطن کا حکم دینے سے حق تعالیٰ کا یہ مقصود نہیں کہ تزکیہ ظاہر ضروری نہیں۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو آگے و ذکر اسم ربہ فصلی کیوں فرماتے بلکہ مقصود یہ ہے کہ نفس کا پاک کرنا اصل ہے اور ظاہر اس کی فرع ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر بسز کیہم فرمایا ہے تو اس سے بھی اسی قرینہ سے تزکیہ نفس مراد ہے کیونکہ اصل چیز تو تزکیہ باطن ہی ہے۔ اگر تزکیہ باطن اصل چیز نہ ہوتی تو آپ حدیث میں یہ کیوں فرماتے۔

التقویٰ ہنا و اشار الی صدرہ کہ تقویٰ یہاں پر ہے اور آپ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ الغنی غنی النفس (کہ غنا نفس کا غنا ہے) اس کا یہ مطلب نہیں کہ غنا ظاہری چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصل غنا تو نفس ہی کا ہے اور جب نفس میں غنا ہوتا ہے تو پھر ویسے ہی افعال صادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ مطلب نہیں کہ تقویٰ ظاہری کوئی چیز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کی جڑ تو قلب میں ہے اور جب تقویٰ قلب میں ہوتا ہے تو افعال بھی اچھے ہی صادر ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے کہ اگر تقویٰ قلب میں نہ ہوگا تو اچھے افعال کے صادر ہونے کا تقاضا نہ ہوگا۔

پس و ذکر اسم ربہ فصلی میں تزکیہ ظاہر اور تزکیہ ماہوبین الظاہر والباطن (یعنی برزخ) دونوں کا ذکر ہو گیا۔ فصلی تو ظاہر کے متعلق ہے اور ذکر اسم ربہ زبان کے متعلق جو کہ من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے غرض دونوں قسم کے تزکیہ کا ذکر اس آیت میں آ گیا۔

پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ باطن کی بھی اصلاح کرو اور ظاہر کی بھی اصلاح کرو اور ایسی چیز کی بھی اصلاح کرو جب من وجہ ظاہر اور من وجہ باطن ہے حاصل یہ تین فعل ہیں۔

۱۔ زبان کی درستی ۲۔ جوارح کی درستی ۳۔ قلب کی درستی

پس مطلب یہ ہوا کہ ہر قسم کی درستی کرو اور چونکہ وہ امور جن کی درستی ہونا چاہئے اتنے ہیں کہ ہر وقت ان کی تفصیل یاد رکھنا مشکل تھا اور بدوں استحصار درستی کا اہتمام مشکل۔ اسی لئے اس کی سہولت کے لئے بجائے اس ساری فہرست کے ذکر اسم ربہ فصلی فرمادیا۔

راز اس کا یہ ہے کہ اس میں ایک ضابطہ بتلاتے ہیں کہ اگر اس کو اختیار کر لو گے تو بآسانی تمام امور کی درستی پر قادر ہو جاؤ گے۔ ان سب کی فہرست یاد رکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

برائیوں سے بچنے کا طریق

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اپنا اصل کام ذکر کو سمجھو گے تو خود بخود سب چیزوں سے رک جاؤ گے۔ غلطی ہماری یہ ہے کہ ہم اصل کام ذکر کو نہیں سمجھتے۔ اسی واسطے برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ برائیوں میں کبھی

بتلانا ہوں۔ مشائخ برائیوں کے چھوڑنے کی تعلیم تفصیلاً بھی کرتے ہیں مگر سب سے اہل یہ طریقہ ہے کہ اپنے لئے ایک اصل کام تجویز کر لے پھر اس میں مشغول ہونے سے خود ہی سب برائیاں چھوٹ جائیں گی۔ وہ اصل کام ذکر ہے۔ تو جو چیزیں اس میں نخل ہوں گی خود بخود ان سے انقباض ہوگا تو بقدر ضرورت ہوگا اور ضرورت اسے کہتے ہیں کہ بدوں اس کے ضرر ہونے لگے۔

مثلاً نوکر کو کوئی ایسا کام بتلانا ہے کہ اگر نہ بتلائے تو گا ضرر ہوگا۔ یہ ضرورت ہے پس اس کو تو وہ اختیار کرے گا اور ایک ہے مشغلہ کے طور پر باتیں ہانکنا۔ لغویہ غیر ضروری ہیں جو شخص ذکر کو اصلی کام سمجھے گا وہ کبھی اس میں مشغول نہ ہوگا۔

اہل علم کی نازک حالت

یہاں ظاہر ایہ مناسب معلوم ہوتا تھا کہ یوں فرماتے ذکر ربہ فصلی لفظ اسم کیوں بڑھایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ذکر ربہ فرماتے تو اس میں بعض سالکین کو یہ شبہ ہوتا کہ خدا کو کیسے یاد کریں۔ کیونکہ یاد کرنا موقوف ہے تصور پر اور تصور بڑا مشکل ہے کیونکہ ان تک ہمارے ذہن کی رسائی کہاں ہو سکتی ہے۔ ان کی تو یہ شان ہے۔

اے بر تراذ خیال و قیاس و گمان و وہم وز ہرچہ گفتہ ایم و شنیدہ ایم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ماہیچناں در اول و صف تو ماندہ ایم
اور یہ شان ہے

در تصور ذات و رائج کو مادر آید در تصور مثل او

غرض کہ ذکر اللہ کو بعض لوگ اس لئے بیکار سمجھتے ہیں کہ خدا تک ہماری رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر یاد کہاں۔ اہل سلوک تک اس میں بتلا ہیں۔ اس واسطے حق تعالیٰ نے اس جگہ اسم کا لفظ آیت میں بڑھا دیا کہ اگر مسمیٰ کا ذکر نہیں ہے تو اسم کا تو ممکن ہے اور بعض جگہ قرآن شریف میں ذات کے ذکر کرنے کو بھی فرمایا ہے جیسے فاذا کرونی اور کہیں صفت کے ذکر کو لائے ہیں جیسے واذا کربک فی نفسک مطلب یہ ہے کہ ذات کا تصور نہ ہو سکے تو صفات کا سہی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو اسم اور لفظ ہی کا سہی۔ لفظی ذکر سے پھر حقیقی ذکر بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس لفظی ذکر سے حقیقی ذکر کا قصد ہو۔ یہ قصد ہی ایسی چیز ہے کہ اس سے باطن میں ضرور اثر ہوتا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۱۵

ترجمہ: بلکہ تم ترجیح دیتے ہو دنیاوی زندگی کو

تفسیری نکات فلاح کا طریقہ

بل تو ثرون الحیوة الدنیا بل اس میں اضراب کے واسطے ہے جس کے معنی ہیں اعراض کرنا ایک بات سے دوسری بات کی طرف۔ جیسے یوں کہیں جاؤ زید بل عمرو۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زید کی طرف جو نسبت آنے کی تھی اس سے رجوع کر کے یہ نسبت عمرو کی طرف کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کا طریقہ تو وہ ہے جو بتلایا گیا۔ تمہیں اسی طریقے کو اختیار کرنا چاہیے تھا۔ اس کے اختیار کرنے سے فلاح حاصل ہوتی مگر اس کو اختیار نہیں کرتے۔ بل تو ثرون الحیوة الدنیا بلکہ تم اس سے اعراض کر کے اور اس کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہو۔ جس سے فلاح حاصل ہو سکتی ہے۔

اس میں مدعیان عقل کی غلطی بیان کر رہے ہیں کہ فلاح کا طریقہ وہ ہے جو ہم نے بیان کیا نہ کہ وہ جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ یوں فلاح تو سب کو مطلوب ہے اس میں کسی کو کلام نہیں۔ مقصود اصلی سب کا یہی ہے باقی اس کے طریقے میں اختلاف ہے۔ مدعیان عقل تو فلاح کا طریقہ اور بتاتے ہیں اور حق تعالیٰ دوسرا طریقہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور بتلا رہے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کرو گے تو فلاح ہوگی نہ اس طریقہ سے جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب عام ہے یعنی سب اسی کو چاہتے ہیں۔ کسی کو بھی اس میں تردد نہیں مگر اس کے طریقہ میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا (الاحزاب آیت ۵۳) جب تم کو بلایا جائے تب جایا کرو پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو۔

مقلب به اجمع الکلام فی انفع النظام

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ آج کل تو اکثر اہل علم سے بھی امید بہت کم ہو گئی کہ آئندہ ایسے امور کی اصلاح کریں جن میں عام ابتلا ہے کیونکہ یہ لوگ خود ہی قابل تربیت ہیں ایک طالب علم آئے تھے مراد آباد سے انہوں نے یہاں سے جا کر اعتراض کے طور پر لکھا کہ تم نے جو اوقات کا انضباط کیا ہے خیر القرون میں یہ

انضباط نہ تھا اس لئے بس سب بدعت ہے مگر جواب کے لئے نہ نکتہ تھا نہ کارڈ اگر ہوتا تو میں جواب لکھتا کہ تم نے جو مراد آباد کے مدرسہ میں پڑھا ہے وہاں پر بھی اسباق کے لئے اوقات کا انضباط تھا کہ ۸ بجے تک فلاں سبق اور ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک فلاں سبق اور ۲ بجے سے ۳ بجے تک فلاں سبق یہ بھی خیر القرون میں نہ تھا لہذا یہ بھی بدعت ہو اس بنا پر آپ کا سارا علم جو بدعتی طریق پر حاصل کیا گیا ہے نامبارک اور ظلمانی ہوا بلکہ اگر بدعت کے یہ معنی ہیں جو ان حضرت نے سمجھے ہیں کہ جو چیز خیر القرون میں نہ ہو تو خیر القرون میں تو ان کا بھی وجود نہ تھا پس یہ بھی مجسم بدعت ہوئے کیا خرافات ہے۔ تحصیل علم کرنے والوں کے فہم کی حالت ہے عوام بے چاروں کی تو کیا شکایت کی جائے جب کہ لکھے پڑھے علم کے مدعی اس زمانہ میں بکثرت اس قدر بد فہم اور کم عقل پیدا ہو رہے ہیں ان بزرگ کو بدعت کی تعریف بھی معلوم نہیں یہ انضباط کسی کے اعتقاد میں عبادت تو نہیں اس لئے ان کا خیر القرون میں نہ ہونا اور اب ہونا بدعت کو مستلزم نہیں میں نے حیوۃ المسلمین روح ہشتم (نمبر ۳) میں ایسے انتظامات کے متعلق لکھ دیا ہے چنانچہ ایک آیت میں ہے کہ اس بات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں (اور زبان سے نہیں فرماتے کہ اٹھ کر چلے جاؤ) اور اللہ تعالیٰ صاف صاف بات کہنے سے (کسی کا لحاظ نہیں کرتے) (سورۃ احزاب) اسی واسطے خود فرما دیا۔

اِذَا دَعَيْتُمْ فَاذْخُلُوا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوا الْاِيه

اور اس مقام میں جس طرح شان انتظامی کی تعلیم کی ہے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق پر دلالت سے جیسا کہ سستی سے معلوم ہوتا ہے اللہ اکبر کیا انتہا ہے آپ کی مروت کی کہ اپنے غلاموں کو بھی یہ فرماتے ہوئے شرماتے تھے کہ اب اپنے کاموں میں لگو مگر یہ لحاظ اپنے ذاتی معاملات میں تھا احکام کی تبلیغ میں نہ تھا اور اس باب میں بہت نصوص ہیں اب یہاں کے قواعد اور ان ضوابط کے متعلق ایک غیبی لطیفہ سنئے ایک صاحب مخلص اور دوست یہاں پر مہمان ہوئے ان کے ساتھ ان کا ملازم ایک بے ریش لڑکا تھا قانون یہاں پر یہ ہے کہ شب کو بے ریش لڑکا خانقاہ میں نہیں رہ سکتا مگر چونکہ ان سے بہت خصوصیت کا تعلق تھا اور ان کی نگرانی پر اعتماد بھی تھا اس لئے ان سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ کہتے ہوئے شرمایا غرضیکہ وہ شب کو مع اپنے اس ملازم کے خانقاہ میں مقیم رہے صبح کو بعد نماز فجر کہنے لگے کہ رات بڑی ہی طبیعت کو اغتشار رہا وہ یہ کہ میں نے رات کو خواب میں حضرت حافظ ضامن صاحب کو دیکھا کہ بہت خفا ہوئے ہیں کہ بے ریش لڑکے کو لے کر خانقاہ میں کیوں قیام کیا میں نے کہا کہ قانون تو یہاں کا یہی ہے مگر محض آپ کے لحاظ سے اس کا اظہار نہیں کیا گیا مگر آج معلوم ہوا کہ یہاں زندہ ہی منتظم نہیں مردے بھی منتظم ہیں۔ (یہ مزاحا کہا گیا) پھر میں نے کہا کہ اب سے امرد کو ساتھ مت لانا اور مجھ کو بھی اس خواب پر بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ ان کو خبر بھی نہ تھی کہ یہ معمول ہے اس لئے قوت متحیلہ کا بھی احتمال نہ تھا۔ (الافاضات الیومیہ ج ۲ ص ۱۲۱۲)

ذکر اللہ اور دنیا

اس آیت میں دو دعوے ہوئے ایک تو یہ کہ تم لوگ ترجیح دے رہے ہو دنیوی زندگی کو آخرت پر دوسرے یہ کہ اس سے فلاح حاصل نہ ہوگی۔ پہلا دعویٰ تو بدیہی بلکہ حسی ہے چنانچہ لوگوں کے معاملات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز دنیا ہی میں منہمک اور اس کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں تک دین سے بے تعلقی ہے کہ اگر دین کو بھی اختیار کرتے ہیں تو اس میں بھی دنیا کی آمیزش ہوتی ہے حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ دنیا میں بھی دین ہی کی شان ہوتی چونکہ اہل ایمان کی شان کو ایک موقع پر حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ لا تلهیہم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ و اقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ یعنی ان کی یہ شان ہے کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔

تجارت تو اس کو کہتے ہیں جو بڑا معاملہ ہو اور بیع چھوٹے اور بڑے معاملہ دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بڑا معاملہ ان کو ذکر اللہ سے غافل کرتا ہے اور نہ چھوٹا معاملہ غافل کرتا ہے۔ سو یہ شان ہوا کرتی ہے اہل ایمان کی اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ذکر اللہ اور دنیا میں اجتماع کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے نظائر موجود ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت بل تو ثرون النع میں ترجیح کی مذمت ہے اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ من کان یرید العاجلة عجلنا لہ فیہا ما نشاء لمن یرید ثم جعلنا لہ جہنم۔ یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں دے دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کا ٹھکانا جہنم کو بناتے ہیں۔

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ آگے فرماتے ہیں۔ ومن اراد الاخرة۔ الا یہ پس معلوم ہوا کہ وہ ارادہ دنیا ہے جو مقابل ہے من اراد الاخرة کے یعنی جس میں ارادہ آخرت نہ ہو پس ارادہ دنیا کی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک وہ ارادہ دنیا جس کے ساتھ لم یرد الاخرة ہو پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے۔ ایک اور موقع پر ہے من کان یرید حرث الاخرة نزدلہ فی حرثہ و من کان یرید حرث الدنيا نؤتہ منها و مالہ فی الاخرة من نصیب۔ یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ من کان یرید حرث الدنيا ولم یرد حرث الاخرة تقابل قرینہ ہے۔ اس کا اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور نہ ہو تو اس کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے۔ من کان یرید الحیوة الدنيا وزینتہا نوف الیہم اعمالہم فیہا وہم فیہا لا ینحسون اولئک الذین لیس لہم فی الاخرة الا النار وحبط ما صنعوا فیہا و باطل ما کانوا یعلمون۔

گو کہ یہاں لفظوں میں تقابل نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے من كان يريد الحياة الدنيا وزينتها ولم يرد الاخرة پس یہ معلوم ہو گیا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دینا مذموم ہے اور کسب دنیا مذموم نہیں۔ سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھوڑنا چاہتے ہیں میرے بیان سے ان کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہو گیا۔

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معترضین بھی اتنے معتقد نہیں۔ آپ تو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری کہتے ہیں۔ لہذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے۔ مگر ضروری ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ الضروری يتقدر بقدر الضرورة کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے۔ سو دنیا ہے ضرورت کی چیز مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ بس قدر ضرورت اس کو حاصل کر لو۔ اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں جو قاعدہ مذکورہ کی بناء پر قابل ترک ہے۔ آیت میں بھی وزينتها كالفظ جو بڑھایا ہے اس سے بھی اس کا مذموم ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔

بس طلب کے دو درجے ہوئے۔ ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہو جاوے اور ایک طلب زینت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد ہو۔ سوا دل کی مذمت نہیں پانی کی مذمت ہے کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے اب جو دنیا اس کے لئے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھے گا تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا یہی قابل مذمت ہے۔

ایک شبہ کا جواب

منکم من يريد الدنيا و منکم من يريد الاخرة۔ یہ قرآن کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض صحابہ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن عطاء اسکندری کا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب یہ ہے کہ ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں۔ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا اللدنیہ اور ایک ارادہ دنیا اللآخرت۔ پہلا ارادہ مذموم ہے دوسرا مذموم نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبداللہ احرار کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے گئے خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت تھی۔

مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بے باک ہوا ہی کرتا ہے اس وجہ سے ان کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرع پڑھا۔ نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد

اور واپس چلے آئے اور مسجد میں آ کر سو رہے تھے خواب میں دیکھا کہ میدان حشر برپا ہے۔ اسی حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آ کر ان کو پکڑ لیا اور کہا دو پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں دنیا میں تمہارے ذمہ رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند پیچھا چھڑاتے ہیں وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خولجہ صاحب کی سواری آئی آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کر رکھا ہے۔ ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا ہوا ہے وہ کس واسطے ہے ان کے ذمہ جتنا مطالبہ ہے اس میں سے ادا کر دو ان کے کہنے سے انہیں رہائی ملی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا خولجہ صاحب کی سواری آرہی ہے۔ اب یہ بہت ہی مجھوب ہیں۔ خولجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار کرنے پر پڑھا۔ نہ مردست آنکھ دنیا دوست دارد

آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ نا تمام ہے۔ اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہیے۔ اگر دراد برائے دوست دارد

طلب دنیا مذموم نہیں

تو اس مقام پر تو ثرون ارشاد فرمایا تطلبون یا تکسبون ارشاد نہیں فرمایا یعنی یہ نہیں فرمایا بل تطلبون الحیوة الدنیا کہ تم حیات دنیا کو طلب کرتے ہو یا تکسبون الدنیا کہ تم دنیا کماتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ترجیح دیتے ہو حیات دنیا کو۔ سوا اور الفاظ کو چھوڑ کر جو تو ثرون فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا چھوڑانی نہیں جاتی۔ دنیا کمانے کو منع نہیں کیا جاتا۔ قرآن شریف میں تو خود ہی ایسا لفظ موجود ہے جس سے اشارہ ہو گیا اس طرف کہ دنیا کا طلب کرنا مذموم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو مذمت کر رہے ہیں تو دنیا کی ترجیح دینے پر کر رہے ہیں۔ نہ دنیا کی طلب اور اس کی کھصل پر۔

حیات آخرت

اب ایک چھوٹی سی بات اس آیت کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ قرآن شریف میں دنیا کے ساتھ تو لفظ حیات لائے۔ مثلاً فرمایا الحیوة الدنیا اور آخرت کے ساتھ لفظ حیات نہ لائے۔ یوں نہیں فرمایا و حیوة الاخرة خیر و ابقی پر کیا بات ہے؟

سو اس میں یہ بتلایا ہے کہ آخرت حیات ہی حیات ہے وہاں ممات کا کچھ کام نہیں۔ پس اس میں حیات کا لفظ لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ حیات آخرت تو جب کہا جاوے گا جب کہ اس میں غیر حیات کوئی اور شے بھی ہو۔ پس جب کہ حیات آخرت ایسی چیز ہے اور لوگ پھر بھی اس کی طلب نہیں کرتے۔ تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں نے آخرت کو پہچانا ہی نہیں ورنہ اس کی طرف توجہ تام کرتے بلکہ دنیا کو بھی نہیں پہچانا ورنہ اس کی طرف رخ بھی نہ کرتے۔ دنیا ہی کو پہچان لو۔ اسی کو سوچو۔ اگر اس کی پوری حقیقت سمجھو تو اس مردار کا نام بھی نہ لو۔ تم جو دنیا

کے عاشق ہوئے ہو۔ ذرا اس کو دیکھو تو سہی۔

اسی کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی بدہیت عورت نے پوڈرل رکھا ہو اور دو چار چندھے اس پر عاشق ہو جاویں۔ حضرت دنیا کی بالکل ایسی حالت ہے۔

حالت دنیا رابہ پرسیدم من از فرزانه گفت یا خوابے ست یا بادے ست یا افسانہ باز گفتم حال آنکس گو کہ دلدروئے بہ بست گفت یا غولے ست یا دیوے ست یا دیوانہ حقیقت میں دنیا کی ایسی مثال ہے۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی ہے۔ بل تو ثرون الحیوة الدنیا والآخرہ خیر و ابقی کہ دنیا ایسی رذیل چیز کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت خیر اور احق ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو ترجیح دینا یہ شکایت کی بات ہے نہ دنیا کو طلب کرنا۔ اسی لئے یوں ارشاد فرمایا بل تو ثرون الحیوة الدنیا اور یہ نہیں فرمایا۔ بل تطلبون الدنیا آگے فرماتے ہیں والآخرہ خیر و ابقی (یعنی تم دنیا کو ترجیح دیتے ہو) حالانکہ آخرت خیر بھی ہے اور احق بھی اس کو ترجیح دینا چاہئے نہ دنیا کو کیونکہ آخرت دو وجہ سے دنیا پر فضیلت رکھتی ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ خیر یعنی بہتر ہے دنیا سے کہ محل اعلیٰ درجہ کے باغ نہریں بہتی ہوئی جن کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا نہایت شیریں غرض ہر نعمت اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ احق ہوگی کہ یہ تمام نعمتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوں گی کبھی زائل نہ ہوں گی۔ تندرستی ایسی کہ کبھی سر میں درد تک نہ ہوگا۔

دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہماری ایک حالت کا بیان فرمایا ہے پھر اس پر شکایت فرمائی ہے اور جس طرح اس حالت کے درجات مختلف ہیں کہ اس کا ایک درجہ کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور ایک درجہ اہل ایمان و اہل کفر دونوں میں مشترک ہے اسی طرح شکایت کے بھی درجات مختلف ہیں بڑے درجہ میں زیادہ شکایت ہے اور چھوٹے درجہ میں کم لیکن چھوٹا درجہ اہل ایمان اور کفر میں مشترک ہے۔ اس لئے اس درجہ میں شکایت بھی مشترک ہے۔ اب سنئے وہ حالت کیا ہے اور اس پر شکایت کیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں بل تو ثرون الحیوة الدنیا (بلکہ تم نے دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے) اس میں لفظ بل اعراض کے لئے ہے یعنی پہلی بات سے اعراض کر کے اس کے مقابل دوسری بات کا ذکر ہے اس سے پہلے ارشاد ہے قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلی۔ اس میں فلاح کا طریقہ بتلایا ہے کہ با مراد ہو اوہ شخص جو (قرآن سن کر خبیث عقائد و اخلاق اور ناشائستہ اعمال سے) پاک ہو گیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا۔ اس کے بعد لفظ بل اعراض کے لئے لایا گیا یعنی مگر اے منکر و تم قرآن سن کر اسے نہیں مانتے اور آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ تم دنیوی

زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حاصل یہ ہوا کہ فلاح کے مقابل ہماری یہ حالت ہے گو اس میں مقابلہ کی تصریح نہیں مگر لفظ بل مقابلہ کو بتلاتا ہے کیونکہ وہ موضوع ہے اعراض کے لئے جس کی حقیقت ہے پہلے کی نفی اور دوسرے کا اثبات اور اثبات و نفی میں تقابل ظاہر ہے پس اس سے صاف معلوم ہوا کہ دنیوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا فلاح کے خلاف ہے اور اسے فلاح مبدل بہ خسران ہو جاتا ہے۔ حق تعالیٰ اسی کی شکایت فرماتے ہیں کہ تم ترجیح دنیا علی الاخرۃ کے مرض میں مبتلا ہو فرماتے ہیں۔ بل تؤثرون الحیوة الدنیا (ای علی الاخرۃ) والاخرۃ خیر و ابقى۔ بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت دنیا سے بہتر ہے اور زیادہ پائیدار ہے۔ یعنی تم اس کی کوشش کرتے ہو کہ دنیا میں عیش و عشرت اچھی طرح ہو آخرت چاہے کیسی ہے برباد ہو جائے۔ اس جگہ آخرت کے متعلق ایک لفظ خیر کا فرمایا ہے جو کہ اسم تفصیل کا صیغہ ہے مطلب یہ ہوا کہ آخرت دنیا سے بدرجہا بہتر ہے اور بہتر ہے دوسرا لفظ اقی فرمایا کہ وہ بھی اسم تفصیل ہے کہ آخرت بہ نسبت دنیا کے پائیدار بھی زیادہ ہے مگر پھر بھی تم دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہو اور آخرت سے بے فکری حالانکہ ایک امر یہ بھی مشاہد ہے کہ آخرت سے بے فکری کے ساتھ دنیا اور گندی ہو جاتی ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے لفظ دنیا میں ہمارا عذر بیان فرمایا ہے کہ لو ہم تمہارے عذر کو بیان کئے دیتے ہیں۔ کہ تم دنیا کو اس وجہ سے آخرت پر مقدم کرتے ہو کہ اس سے منافع قریب اور عاجل ہیں لیکن اس کا جواب بھی سن لو۔ والاخرۃ خیر و ابقى (آخرت بہتر اور بہت پائیدار ہے) اس میں جواب ہے اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہو گیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا اس کی ترجیح کے لئے کافی نہیں بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں سو دنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہے مگر آخرت میں اس کے مقابل دو صفتیں ہیں ایک خیریت دوسرے بقاء یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار رہنے والی بھی ہے دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے نہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دیتا کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہو تو پھر تجارت کبھی نہ ہو سکے کیونکہ اس میں سرمایہ عاجلہ کو اس وقت لگانا پڑتا ہے اور نفع زائد آج ملے لیکن تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجود سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا معلوم ہوا کہ زیادت و کثرت کے مقابلہ میں وصف عاجل نظر انداز کر دیا جاتا ہے پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور آخرت آج ملے ہے تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور کتنی عمدہ ہے اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہو سکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو بس زراعت کو بھی جواب دے دو مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت

کرتے ہو کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی امید ہے پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور یہ آجل ہے ارے وہ آجل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی قابل بھی نہیں اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ اچھی ہے بہت پائیدار ہے اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اس کے مقابلہ میں وصف عجلت کوئی چیز نہیں چنانچہ دنیا میں اس کی صد ہا نظیریں ہیں ایک شخص آپ کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اس کے پاس دو مکان ہیں ایک تو کچا بنا ہوا ہے اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالی شان ہے اور وسیع بھی ہے وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا چاہو تو میں یہ بھی دے سکتا ہوں مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جائے گا اور اگر کچا مکان لینا چاہو تو وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ملک کر دوں گا اب بتلائیے آپ کیا کریں گے۔ یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ بھائی عالی شان محل سے جو عاریتہ ملتا ہو وہ کچا مکان اچھا جو دو ما ملک ہو مگر افسوس تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہو کہ آخرت کو جو دوامی ہے دنیا کے لئے چھوڑتے ہو جو چند روزہ ہے انسان کی حیات ہی کیا ہے۔ بعض لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے اس نا پائیدار مردار کے لئے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کیلئے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتے ہیں۔ (ترجیح الاخرہ) اس میں فلاح کے حصول ترقی پر موقوف فرمایا ہے بتلا دیا کہ گو مامور بہ ترقیہ ہے ترقی مامور بہ نہیں مگر ترقیہ وہی مامور بہا ہے جس پر ترقی مرتب ہو جائے اور وہ ایسا ترقیہ ہے جس میں تکمیل اعمال کا اہتمام ہو اختیار اسباب تکمیل سے غفلت اور تکاسل نہ ہو۔ حاصل یہ ہوا کہ ناقص عمل کو کافی مت سمجھو۔ بلکہ تکمیل اعمال میں کوشش کرتے رہو اور ان کو اس حد تک پہنچاؤ جس پر ترقی مرتب ہو جائے گی۔ اگرچہ ترقیہ کے وقت ثمرہ ترقی پر نظر نہ کرو بلکہ نظر عمل ہی پر رکھو لیکن عمل وہی اختیار کرو جو موثر ہو حصول ترقی میں۔

طالب جاہل اور قانع جاہل

پس ایک آیت میں طالب جاہل کی اصلاح ہے اور دوسری آیت میں قانع جاہل کی۔ طالب جاہل وہ ہے جو ثمرہ مرتب نہ ہونے سے عمل کو چھوڑ دے اور قانع جاہل وہ ہے جو ناقص عمل پر قناعت کر لے۔ اب یہاں ایک شبہ اور ہے کہ جب ترقی تدریجاً حاصل ہوتی ہے اور وہاں فلاح اس کی ہوگی جو ترقی حاصل کر چکا ہو۔ تو ممکن ہے کوئی شخص ترقیہ میں مشغول ہو اور تدریجاً اسے ترقی حاصل ہو رہی ہو جو درجہ کمال کو ابھی نہیں پہنچی تھی کہ یہ پہلے ہی مر گیا تو کیا اس کو فلاح نہ ہوگی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ قد افلح من ترقی میں جو حصول ترقی پر فلاح کو موقوف کیا گیا ہے یہ اس شخص کے لئے جس کو اتنا وقت ملا تھا کہ اگر وہ برابر ترقیہ میں مشغول رہتا تو ترقی حاصل ہو جاتی۔ یہ شخص اگر اپنی سستی کی وجہ سے قبل حصول ترقی مر گیا تو نا کام مرے گا۔ اور جس کو اتنا وقت ہی نہ ملا جس میں ترقی حاصل کر لیتا وہ اگر قبل حصول مقصود مر جائے تو نا کام نہیں اس لئے قد افلح من زکھا

(جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ پاک ہو گیا) کے موافق یہ تزکیہ ہی تزکی کے حکم میں ہے۔ مگر بشرط عدم انقطاع نامرادی کو مولانا بحکم فرماتے ہیں۔

گر مرادت رائد اذق شکر است
بے مرادی نے مراد دلبراست

تخلیہ اور تھلیہ

حق تعالیٰ نے قد افلح من تزکی (جس نے تزکی حاصل کر لی کامیاب ہو گیا) کے بعد فرمایا ہے و ذکر اسم ربہ فصلی (اپنے رب کا نام ذکر کیا پس نماز پڑھی) اس میں تزکی کو ذکر و صلوة پر مقدم کیا گیا ہے اس سے تصوف کا ایک مسئلہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ سلوک میں دو عمل ہوتے ہیں ایک تخلیہ اور تھلیہ کو تخلیہ و تھلیہ بھی کہتے ہیں کیونکہ تخلیہ کے معنی ہیں رذائل کو زائل کرنا اور تھلیہ کے معنی ہیں فضائل کو حاصل کرنا تو لفظ تزکی میں اس طرف اشارہ ہے کہ رذائل کو زائل کرو اور ذکر اسم ربہ فصلی (اس نے اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پس نماز پڑھی) میں اس طرف اشارہ ہے کہ فضائل کو حاصل کرو اور ہر چند کہ تحصیل فضائل بھی تزکی میں داخل ہو سکتا ہے کیونکہ تزکی کے معنی ترک رذائل ہیں اور فضائل کا ترک بھی اس میں آ گیا اور ترک التکر ایجاد ہے اس لئے تحصیل فضائل بھی تزکی میں داخل ہو گیا اور تحقیق اس کی یہ ہے کہ ترک کے دو درجے ہیں ایک ترک وجودی دوسرے ترک عدمی۔ ترک وجودی یہ ہے کہ کسی امر کو خواہ مامور بہ ہو یا منہی عنہ احتمال وجود کے وقت ترک کیا جائے مثلاً ایک عورت سامنے سے گزری اور اس نے نظر کو اس طرف سے ہٹا لیا اور بالکل نظر نہ کی تو یہاں ترک نظر ترک منہی عنہ کی مثال ہے۔ یا نماز کا وقت آیا اور اس نے نماز ترک کر دی یہ ترک صلوة ترک مامور بہ کی مثال ہے اور ترک عدمی یہ ہے کہ اسباب وجود کے نہ ہوں اور کسی کام کو ترک کیا جائے جیسے ایک وقت بہت سے افعال منہی عنہا سے آدمی بچا رہتا ہے اور احتراز کا قصد بھی نہیں ہوتا۔ پس پہلا ترک تو کبھی طاعت ہے اور کبھی معصیت اور دوسرا ترک نہ معصیت ہے نہ طاعت اس لئے تزکی سے ترک عدمی تو مراد ہو سکتا نہیں کیونکہ نحل مدح میں فرمانا دلیل ہے اس کی اطاعت ہونے کی اور ترک عدمی طاعت بھی نہیں۔ پس یقیناً ترک وجودی ہی مراد ہے یعنی احتمال وجود کے وقت رذائل کا ترک کرنا اور معصیت بھی رذائل کا فرد ہے۔ پس تزکی میں تمام معاصی کا ترک داخل ہو گیا اور معاصی میں طاعت کا ترک بھی داخل ہے تو اس طرح سے قد افلح من تزکی (بامراد ہوا وہ شخص جو پاک ہو گیا) ہی میں ترک معاصی و امثال طاعات سب داخل ہو جاتا ہے۔ مگر چونکہ یہ اشتمال ظاہر نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے تحصیل طاعات کو و ذکر اسم ربہ فصلی (اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا) میں ذکر فرما دیا۔ پس اب تزکی میں ترک منہیات ہی داخل رہا اور ان دونوں کے مجموعہ کو مدار فلاح ٹھہرایا گیا تو ثابت ہوا کہ فلاح کا مدار تخلیہ و تھلیہ دونوں کے مجموعہ پر ہے اور یہی صوفیہ کا قول ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بدوں ان دونوں کے سلوک کامل نہیں ہو سکتا۔

سورة الغاشية

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ^{دَقَقَ} ۖ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ^{دَقَقَ} ۙ

وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ^{دَقَقَ} ۖ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ^{دَقَقَ} ۚ

ترجمہ: کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح عجیب طور پر پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کی طرف کہ وہ کیسے بلند کر دیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ وہ کیسے گاڑھ دیئے گئے اور زمین کی طرف کہ وہ کیسے بچھا دی گئی۔

تفسیری نکات

دلائل قدرت

اس میں سب سے پہلے اونٹ کا ذکر کیا گیا کیونکہ اہل عرب کثرت سے اسی پر سوار ہوتے ہیں اور راکب جمل کو زیادہ تلبس اونٹ ہی سے ہوتا ہے پھر اہل عرب کو اونٹ سے محبت بھی بہت ہے چنانچہ اپنے ایک شاعر اپنے محبوب کے خال رخسار کی تشبیہ میں کہتا ہے کہ رخسارہ پر تل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالو کے میدان میں اونٹ کی میٹھی پڑی ہو اس سے اونٹ کے ساتھ اس کا تعلق ظاہر ہے اور ایک شاعر کہتا ہے۔

احبھا و تعبني و يعحب ناقتها بعيري

میں محبوب سے محبت رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے اونٹ کو اسی کی اونٹنی سے محبت ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ ہمارے دلائل قدرت کو اونٹ میں نہیں دیکھتے کہ اس کو کیسا عجیب الخلق بنا دیا ہے اور کیسا جفاکش اور صابر و بردبار کر دیا ہے۔ پھر اونٹ پر سوار ہوتے ہی آدمی اونچا ہو جاتا

ہے تو سامنے آسمان نظر آتا ہے اس لئے اس کے بعد فرماتے ہیں والی السماء کیف رفعت اور آسمان کو نہیں دیکھتے کیونکہ بلند کیا گیا ہے پھر سفر شروع کرنے کے بعد دائیں بائیں پہاڑ نظر آتے ہیں تو آگے فرماتے ہیں والی الجبال کیف نصبت اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کس طرح زمین میں نصب کئے گئے ہیں پھر گا ہے بگا ہے سواری کی حالت میں زمین پر بھی نظر پڑ جاتی ہے سامنے بڑے بڑے میدان آتے ہیں جن کو مسافر طے کرتا جاتا ہے تو فرماتے ہیں والی الارض کیف سطحت اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی جو شخص کبھی اونٹ پر سوار ہوا ہو یا اس نے راکب جمل کی حالت میں تامل کیا ہو وہ اس ترتیب کی خوبی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ پہلے اونٹ کا ذکر کیا پھر آسمان کا پھر پہاڑوں کا پھر زمین کا کیونکہ رکوب کی حالت میں اکثر نظر اسی ترتیب سے واقع ہوتی ہے۔

امارد سے بد نظری کی مذمت

بقراط کی حکایت شیخ سعدی شیرازی نے لکھی ہے کہ چلا جا رہا تھا ایک شخص کو دیکھا کہ پسینہ پسینہ بے خود ہو رہا ہے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے لوگوں نے کہا کہ یہ ایک بزرگ ہے اس نے ایک حسین لڑکے کو دیکھ لیا ہے اس میں حق تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ کر رہا ہے بقراط نے کہا کیا حق تعالیٰ نے صرف یہی لڑکا ہی اپنی قدرت کے اظہار کے لئے پیدا کیا ہوا ہے اور کوئی نہیں ایک دن کا بچہ بھی تو اس کا پیدا کیا ہوا ہے اس کو دیکھ کر حال متغیر نہ ہوا۔

محقق ہماں بیند اندر ابل کہ در خوب رویان چین و چگل

یعنی جو شخص حقیقت میں ہے وہ اونٹ میں بھی وہ دیکھتا ہے جو چین و چگل میں خوبصورتوں میں دیکھتا ہے بلکہ اونٹ کے دیکھنے میں تو نفع محض ہے اور امرد کو دیکھنے میں فتنہ کا احتمال بھی غالب ہے اس لئے اونٹ کے دیکھنے کا امر ہے۔ جیسا آیت مذکورہ میں گزرایہ نہیں فرمایا افلا یسظرون الی امارد کیف خلقوا (کیا وہ امردوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پیدا کئے گئے ہیں) یہ جہلا صوفیا کفار قریش سے بھی بڑھ گئے۔

سُورَةُ الْفَجْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ

رَبِّيَ أَكْرَمَنِ ۖ وَإِنَّمَا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ

رَبِّيَ أَهَانَنِ ۗ

ترجمہ: سو آدمی کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو ظاہراً اکرام و انعام دیتا ہے تو وہ بطور فخر کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھادی اور جب اس کو دوسری طرح آزماتا ہے یعنی اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ (شکایتاً) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹادی۔

تفسیری نکات

نیک و بد کی تمیز کا طریقہ

فرمایا کہ جو لوگ بلا اور مصیبت میں مبتلا ہوں ان کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ خدا کے نزدیک مبغوض ہیں اور ہم چونکہ بلا میں مبتلا نہیں اس لئے مرحوم ہیں اس لئے کہ کبھی نیک لوگوں پر بھی بلا نازل ہوتی ہے تاکہ پاک صاف ہو کر خدا تعالیٰ کے پاس جائیں اور بعض کو تمام حجت عذاب کے لئے دنیا میں چھوڑ دیا جاتا ہے اور فرمایا کہ یہ نعمت و بلا نیک و بد کو پہچاننے کا طریقہ نہیں ہے چنانچہ اس کا علامت نہ ہونا ارشاد ہے فاما الانسان اذا ما ابتلاه ربه فاكرمه ونعمه فيقول ربي اكرم من واما اذا ما ابتلاه فقدر عليه رزقه فيقول ربي اهانن كلا اس سے معلوم ہوا کہ تمیز کا طریقہ یہ نہیں ہے بلکہ طریقہ اس کا محض فرمانبرداری اور نافرمانی ہے۔ (اشرف القالات)

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمَنًّا ۝ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

ترجمہ: اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے تم لوگ بہت ہی محبت رکھتے ہو۔

تفسیری نکات

دو شکایات کا ذکر

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دو شکایتیں فرمائی ہیں ایک یہ کہ پرایا حق کھا جاتے ہو دوسرے مال سے محبت رکھتے ہو یہ دونوں جدا جدا مضمون نہیں بلکہ ثانی اول کے لئے علت ہے یعنی حق تعالیٰ کو میراث کھا جانے کی وجہ بیان فرمانا بھی مقصود ہے اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ تم کو مال سے بہت محبت ہے اکل میراث کا مذموم ہونا گویا دو حیثیتوں سے بیان فرمایا کہ یہ فعل خود بھی برا ہے اور اس کا منشاء جس سے یہ پیدا ہوا ہے وہ بھی برا ہے جیسے کسی کی مذمت کرنا ہو تو کہتے ہیں کہ تم بھی نالائق ہو اور تمہارا باپ بھی نالائق تھا اس میں بلاغت زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس جب موقع شکایت میں و تاكلون التراث فرمایا تو جس کی طبیعت میں ذرا بھی سلامتی ہو وہ خود سمجھ لے گا کہ یہ فعل برا ہے۔ نفس مذمومیت تو اسی سے سمجھ میں آگئی لیکن حق تعالیٰ نے اس پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ اس کا سبب بھی بتایا کہ و تحبون المال حبا جما۔ اور وہ سبب ایسا ہے کہ وہ خود بھی گناہ ہے تو اس سے اس کا مذموم ہونا اور زیادہ بوجہ ابلغ واضح ہو گیا۔ پس ایک حکمت تو علت بیان کرنے سے یہ تھی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مقام میں نظر صرف پرایا مال کھا جانے ہی پر متصور نہ رہے بلکہ اصل علت پر بھی نظر ہو جاوے تاکہ اس سے اس کے علاوہ جتنی شخصیں متفرع ہوتی ہیں سب پیش نظر ہو جاویں اور حق تعالیٰ کے نزدیک سب کا مذموم ہونا واضح ہو جاوے تیسرے ایک اور حکمت اسی وقت سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ظاہر نظر میں بھی گناہ ہیں اور اکثر لوگ ان کو ہی گناہ سمجھتے ہیں جیسے چوری، زنا، قتل، ناحق ظلم، پرایا مال کھا جانا، شراب پینا وغیرہ۔ دوسرے وہ گناہ کہ لوگ ان کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ اس طرف کبھی ان کا ذہن جاتا ہے کہ یہ گناہ ہیں مثلاً مال کا لالچ، ہونا خدا کے سوا کسی سے محبت ہونا اللہ کی یاد سے غافل ہونا یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کا شبہ تک بھی نہیں ہوتا چنانچہ جب کبھی اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہیں تو ظلم چوری، چغلی، غیبت وغیرہ تو یاد آتے ہیں مگر یہ ہرگز یاد نہیں آتا کہ ہمارے دل میں لالچ ہے ہماری تمام عمر غفلت میں گزر گئی اور تمام عمر اس کوشش میں گزر گئی کہ ہم بڑے بن کر رہیں، ناک اونچی ہو ان کو وہی لوگ گناہ سمجھتے ہیں جو جاننے والے ہیں اور جاننے والوں سے میری مراد وہ ہیں جو علم دین کامل رکھتے ہیں نہ صرف حرف شناس یا مدعی جیسے بعضے جاہل یا اکثر عورتیں جو کچھ حرف شناس ہو جاتی ہیں وہ اپنے کو عالم اور محقق سمجھنے لگتی ہیں۔

جوارح اور دل کے گناہ

پس تاكلون التراث تو ہاتھ منہ کا گناہ ہے جس کے گناہ ہونے کو سب جانتے ہیں اور تحبون المال دل کا گناہ ہے جس سے یہ ظاہری گناہ متفرع ہوا۔

بلاغت کلام باری تعالیٰ

اور دیکھئے رحمت حق تعالیٰ کی کہ شکایت صرف حب مال کی نہیں فرمائی بلکہ اس کو مقید فرمایا ہے جباجما سے مطلب یہ ہے کہ نفس حب مال کی ہم شکایت نہیں کرتے بلکہ شکایت اس بات کی ہے کہ مال کی بہت زیادہ محبت رکھتے ہو ان ہی رعایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام تو آدمی کا نہیں ہے۔ آدمی اپنے کلام میں خواہ کتنی ہی رعایت کرے مگر ہر پہلو پر اس کی نظر نہیں رہتی جس ایک پہلو کو لیتا ہے اس میں حد سے بڑھ جاتا ہے مثلاً ہم لوگ غصہ میں کسی کی توہین یا کسی کا نقص یا ملامت کریں گے تو حد اعتدال سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اگر اس وقت حد پر رہنے کی کوئی تدبیر بھی کرنا چاہتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا یا ہمت نہیں ہوتی بخلاف کلام باری تعالیٰ کے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم لوگ تو مغلوب ہیں طبیعت کے اور حق تعالیٰ اس سے پاک ہیں دیکھئے ملامت فرما رہے ہیں لیکن اس میں بھی کیا رحمت ہے کہ نفس حب پر ملامت نہیں اگر نفس حب مال پر شکایت ہوتی تو مخا طبین سخت سوچ اور فکر میں پڑ جاتے اس لئے کہ ایسا کون ہے جس کو مال سے تعلق نہیں اس لئے یہ فکر ہو جاتی کہ بس جی ہم تو بالکل ہی مردود ہیں چنانچہ بعضے سالک جہل یا غلبہ حال سے یا ناواقف مشائخ کے ہاتھ میں پھنس جانے سے بھی سمجھ بیٹھے کہ غیر اللہ سے کسی درجہ کا بھی تعلق رکھنا مذموم ہے۔ بس ان کی یہ حالت ہوئی کہ بیوی کو چھوڑ دیا مال کو لٹا دیا اور تماشا ہے کہ ان کے ناواقف مشائخ اپنے مریدوں کی اس حالت پر ناز کرتے ہیں سو یہ لوگ خود ہی اس قابل ہیں کہ ان کی اصلاح کی جاوے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اچھی کس کی تربیت ہوگی سو سن لیجئے ایک صحابی دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے اور شب کو قیام بہت کرتے۔ حضور ﷺ نے ان کو نصیحت فرمائی کہ تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے کمزور ہو جاؤ گے۔ آنکھ کا بھی حق ہے مہمان کا بھی حق ہے خدا تعالیٰ کا بھی حق ادا کرو اور دوسرے حقوق بھی ادا کرو۔ حضور ﷺ کی تربیت تو یہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی تربیت دیکھئے کہ دشمنوں کو خطاب ہو رہا ہے کہ مال کی محبت تم کو زیادہ کیوں ہے اور یہی مذموم ہے باقی حب مال مطلقاً مذموم نہیں۔

گناہوں کی قسمیں

آیت مبارکہ وَتَأْكُلُونَ التَّرَاثَ أَكْلًا لَمِيًّا وَتُحِبُّونَ لِلنَّالِ حُبًّا جَنًّا کی ایک حکمت اسی وقت سمجھ میں آئی وہ یہ کہ گناہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ظاہر میں بھی گناہ ہیں اور اکثر لوگ ان ہی کو گناہ سمجھتے ہیں جیسے چوری

زنا، قتل، ناحق ظلم پر ایسا مال کھانا جانا، شراب پینا وغیرہ۔ دوسرے وہ گناہ کہ لوگ ان کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ کبھی اس طرف ان کا ذہن جاتا ہے وہ یہ گناہ ہیں مثلاً مال کا لالچ ہونا خدا کے سوا کسی سے محبت ہونا اللہ کی یاد سے غافل ہونا یہ وہ چیزیں ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کا شبہ تک بھی نہیں ہوتا۔ (آیت مبارکہ میں اسی پر تنبیہ ہے)

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارجعي إلى ربِّك راضيةً

قَرُضِيَّةً ۗ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۗ

ترجمہ: اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف واپس چل اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہیں پس تو میرے خاص بندوں (کی جماعت) میں داخل ہو جا اور میری جنت میں پہنچ جاؤ۔

تفسیری نکات

دوستوں کی ملاقات میں عجیب لذت

اب ایک نکتہ بھی بیان کر دوں وہ یہ کہ آیت میں ادخلی فی عبادی کو ادخلی جنتی پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ سو اس کی توجیہ حضرت امام شافعی کے قول سے سمجھ میں آتی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ جنت میں دوستوں کی زیارت اور ملاقات ہوگی اس وقت سے مجھے جنت کا اشتیاق ہو گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دوستوں ملاقات میں جنت سے بھی زیادہ لذت ہے مگر شرط نچ باز گنجفہ باز دوست نہیں بلکہ امام شافعی جیسے دوست جو شافعی ہوں یا شافعی ہوں۔ اور یاء وعین دونوں جمع ہو جائیں تو نور علی نور ہے اور اگر ایسے دوست نہ ہوں بلکہ محض دنیوی دوستی ہو تو وہ آخرت میں مبدل بعبادات ہو جائے گی۔ الاخلاء یومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقین تمام دنیاوی دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے سوائے خدا سے ڈرنے والوں کے۔ وہاں وہی دوستی باقی رہے گی جس کا منشاء دین اور تقویٰ ہو۔ بہر حال دوستوں کی ملاقات میں ایسی لذت ہے کہ اس کے بغیر جنت بھی خار ہے۔ یا ایُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارجعی الی ربِّک راضیة مرصیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی اے ان اطمینان والی جس کو ذکر اللہ میں چین تھا آ جا اپنے رب کی طرف اور لفظ ارجعی میں ایک لطیفہ ہے یعنی اس میں اشارہ ہے کہ تم تو خدا ہی کے پاس تھے یہاں تو تم آ کر اجنبیوں میں مبتلا ہو گئے تو تمہارا امرنا اصل کی طرف واپس جانا ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

ہر کے کو در و ماند از وصل خویش باز جوید روزگار وصل خویش

ہر شخص کا قاعدہ ہے کہ جب اپنی اصل سے جدا ہوتا ہے تو اس زمانہ وصال کا جو یاں ہوتا ہے۔ حضرت عارف جامی کہتے ہیں۔

دلالتا کے دریں کاخ مجازی کنی مانند طفلان خاک بازی چرازاں آشیای بیگانہ گشتی چودوئاں چغداں ویراں
(اے دل تو کب تک اس مجازی یعنی عارضی محل میں لڑکوں کی طرح مٹی سے کھیلتا رہے گا اور اس آشیای
میں آخرت سے تو کیوں اجنبی بن گیا اور نا اہل کی طرح سے اس دنیا کے ویرانہ کو الو بن کر رہ گیا)

دنیا سے حصہ آخرت لے آنے کی عجیب مثال

اب اس سے یہ بھی سمجھ لو کہ پھر تم کو کیا دنیا و آخرت کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے اور اس کو اس مثال سے سمجھو کہ تم کبھی جلال آباد سے مظفر نگر جاتے ہو تو جو چیز وہاں اچھی ہوتی ہے اس کو یہاں لا کر برتتے ہو پھر یہاں دنیا میں آ کر آخرت سے کیوں اجنبی ہو گئے۔ چاہئے یہ کہ دنیا بھی ملے تو آخرت ہی کے واسطے لے جاؤ۔ قارون کو خطاب ہے وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرة ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض الایة ترجمہ: دنیا میں سے کچھ حصہ آخرت کے لئے لے لے اور بھول مت اپنے اس حصہ کو۔ باہر جلال آباد کے تلاش معاش میں آتے ہو وہاں سے کما کر لاتے ہو اور یہاں کھاتے ہو اس طرح آخرت کے لئے یہاں سے کمائی کر کے اور بٹور بٹار کرو وہاں لے جاؤ۔ یہاں سے ذخیرہ آخرت جمع کر کے اپنے رب کے پاس لوٹ جاؤ۔ دنیا میں آخرت کی فکر سے غافل مت رہو کیونکہ جہاں سے آئے تھے وہاں لوٹ کر جانا ہے اور یہاں سے لوٹ کر وہاں جاؤ تو کس طرح جاؤ۔ جس طرح آ گئے اس نفس کے خطاب میں فرماتے ہیں۔

اہل اللہ سے تعلق کی ضرورت

تم اللہ سے راضی ہو اللہ تم سے راضی دیکھئے بہت لوگ لاکھوں روپیہ حکام کی خوشنودی طلب کرنے کو خرچ کرتے ہیں۔ کیا ہر حکام کی خوشنودی تو مطلوب ہو اور حاکم حقیقی ہی کی خوشنودی مطلوب نہ ہو۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی میرے خاص بندوں میں داخل ہو جاؤ اسے نفس مطمئنہ اور داخل ہو جا میری جنت میں حق تعالیٰ نے یہاں دو ثمرے ذکر فرمائے ہیں خاص بندوں میں شامل ہونا اور جنت میں داخل ہونا۔ ذرا غور کیجئے خاص بندوں میں داخل ہونے کو پہلے فرمایا ہے پھر جنت میں داخل ہونا مذکور ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز خاص بندوں میں شامل ہونا ہے جس کی بدولت جنت ملے گی۔ اس جگہ اشارہ یہ بات بھی ظاہر فرمادی کہ اگر ہمارے خاص بندوں کے ساتھ لگے لپٹے رہو گے تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

سُورَةُ الْبَلَدِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَا أُقْسِمُ بِهَذَا الْبَلَدِ ۗ وَأَنْتَ حِكْمٌ يَهْدِي الْبَلَدِ ۗ وَالْوَالِدِ

وَمَا وُلَدٍ ۗ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ۗ أَيْحَسِبُ أَنْ

لَنْ يُقَدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۗ يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُبَدًا ۗ

أَيْحَسِبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۗ أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۗ وَلِسَانًا

وَشَفَتَيْنِ ۗ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۗ

ترجمہ: میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی اور (بطور جملہ معترضہ کے تسلی کے لئے پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ) آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے۔ اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے کیا وہ یہ خیال کرتا ہے اس پر کسی کا بس نہ چلے گا اور کہتا ہے کہ میں نے اتنا مال خرچ کر ڈالا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور ہم نے اس کو دونوں راستے (خیر و شر کے) بتلا دیئے۔

تفسیری نکات

اہل ذوق کے لئے ایک علمی نکتہ

لا اقسام میں لازا آمد ہے اور لا بڑھانے میں یہ نکتہ ہو سکتا ہے کہ یہ بات قسم کھانے کی تو ہے نہیں مگر تمہارے فہم

کی رعایت سے کھائی جاتی ہے اور یہ علمی نکتہ ہے مگر اہل ذوق اس سے متاثر ہوتے ہیں ہمارا ذوق صحیح نہیں ہے ورنہ ہمارے بھی ہوش اڑ جاتے اور اہل ذوق نے ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسہم و اموالہم بان لہم الجنة کون کر بھی گردنیں جھکا دیں۔

علمی اور تاریخی توجیہ

میں اس میں گفتگو کر رہا تھا کہ نزول کی حدیث میں ظاہر بین تو لفظ کی تحقیق میں پڑ گئے اور اہل بصیرت نے اس کے مقتضاء پر عمل کیا کہ اس وقت کی قدر کی۔ اسی طرح ہم لاقسم میں لا کو زائد کہہ کر نازاں ہوں گے اور اپنے آپ کو محقق سمجھنے لگے اول تو محقق ہی کیا ہوئے اور ہوئے بھی تو الفاظ کے مگر یہاں تو دوسری چیز کی ضرورت ہے یعنی عمل کی کسی نے خوب کہا ہے۔

مغرور رخن مشوک توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(دھوکہ مت کھاؤ توحید خدا کو ایک ماننے کا نام ہے نہ ایک کہنے کا)

واقعیت حاصل ہونی چاہیے یہ نرے الفاظ سے کام نہیں چلتا بہر حال ترکیب میں جب لازائد ہو تو لاقسم بھذا البلد کے معنی ہوئے میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی یعنی مکہ کی میں ہر لفظ کے ساتھ مختصر علوم بیان کرنا چاہتا ہوں اس میں یہ بات بیان کرنا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں رکھا گیا مگر حق تعالیٰ نے بہت جگہ غیر اللہ کی قسم کھائی ہے سوال اول تو وہ حاکم ہے اس کے افعال میں چوں وجہ کی مجال نہیں اس لئے یہ سوال ہی بیکار ہے دوسری بات یہ ہے کہ حکمت اور غرض اصلی قسم کی تاکید کلام ہے اور تاکید کے دو طریق ہیں ایک تو معظم کی قسم کھانا اور دوسرا طریق ایسی چیز کا ذکر کرنا جس میں غور کرنے سے جواب قسم کی تائید جس سے یہ کلام بمنزلہ قضایا قیاسا تہا معہا کے ہو جاتا ہے یعنی ایک ایسی چیز کا پتہ دے دینا کہ اس میں غور کرنے سے صدق کلام معلوم ہو جائے جب یہ سمجھ لیا تو سنو کہ پہلی قسم میں لازم ہے کہ مقسم بہ غیر اللہ نہ ہو کیونکہ ایسی تعظیم بالغ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور دوسری قسم میں غیر اللہ کی قسم بھی فی نفسہ جائز ہے اور اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ مخلوق کیلئے بھی یہ قسم جائز ہوتی مگر چونکہ یہ غرض مشہور و متعارف نہیں ہے اس لئے ذہن سبقت کرے گا پہلی قسم کی طرف اس واسطے سدا للباب و صونا عن الایہام مطلقاً غیر اللہ کی قسم کو ممنوع کر دیا گیا کیونکہ اعتبار غالب احوال کا ہوتا ہے اور غالب یہی ہے کہ معظم کی قسم کھا کر کلام کی تاکید کرتے ہیں اور حق تعالیٰ نے جو بعض مخلوق کی قسم کھائی ہے اس میں قسم اول کا تو شبہ بھی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اس سے بڑا کون ہے اس لئے لامحالہ دوسری غرض کی طرف ذہن جاوے گا اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے اللہ کا شکر ہے کہ نئی بات سمجھا دی۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو یہ شبہ

جاتا رہا کہ غیر اللہ کی قسم کیوں کھائی گئی بس اب غور کرنا چاہیے کہ مقسم بہ کو مقسم علیہ سے تائید کا کس طرح علاقہ ہے سو اس جگہ مقسم علیہ لقد خلقنا الانسان فی کبد ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے یعنی ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا ہے اب مقسم بہ میں غور کیا جاوے کہ اس سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے یا نہیں سو مقسم بہ مکہ معظمہ ہے اور اس کی شان فی نفسہ و نیز باعتبار اضافت کے سخت ہے کیونکہ وہ واد غیر ذی زرع (جنگل بلا کھیتی والا) اور وہاں گرمی بھی بڑی سخت ہے بس اس سے خود مشقت کا پتہ لگتا ہے بس صاف معلوم ہو گیا کہ اس مقسم بہ کو دخل ہے مقسم علیہ کے اثبات میں بطور اثبات النظر بالنظر کے یہ تو اس کی شدت تھی فی نفسہ اور اضافی شدت یہ ہے کہ مکہ میں حضور ﷺ کا زمانہ بہت مشقت کا تھا تو اس کا ذکر مذکور ہو گیا مشقتوں کا خاص کر جبکہ حل بمعنی نازل کے ہو یعنی آپ کی اقامت مکہ کے زمانہ میں مکہ کی قسم کھائی یہ تو علمی اور تاریخی توجیہ ہے۔ اور عشاق نے اس انت حل سے کچھ اور سمجھا ہے اور قرآن مجید کی یہ حالت ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ دارد برنگ اصحاب صورت راہوار باب معنی
عشاق نے یہ سمجھا کہ اس میں حضور اکرم ﷺ کی جلالت شان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مطلقاً مکہ کی قسم نہیں کھائی بلکہ جب آپ اس میں رونق افروز ہوں۔ عشاق کے محاورہ میں گویا آپ ﷺ کے خاک پا کی قسم کھائی اور اس میں عربیت متروک نہیں ہوئی بلکہ لغت سے متاید ہے اس لئے یہ محض نکتہ نہیں بس عشاق کا ذہن اس طرف گیا کہ آپ ﷺ کی ذات تو بہت بڑی ہے جبکہ آپ ﷺ کی ذات سے مکہ قابل قسم ہو گیا۔

شرکاء بتلانا بھی نعمت ہے

ایحسب ان لم یرہ احد تک کا حاصل یہ ہوا کہ انسان کو نعم اور تکالیف سے تنبیہ نہیں ہوا۔ آگے نعمتیں یاد دلاتے ہیں الم نجعل له عینین ولساناً وشفقتین وهدینہ النجدین کہ اس کو نعم سے بھی تنبیہ نہیں ہوا۔ اس استفہام میں نکیر شدید ہے ان نعمتوں کے بھلا دینے پر اور یہی آیت اس وقت مقصود بالبیان ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ مقصود مطول ہو۔ اور اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کیا ہم نے اس (انسان) کے واسطے دو آنکھیں نہیں بنائیں اور کیا ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور اس کو دو راستے نہیں بتلائے اور دو راستوں سے مراد خیر و شر ہیں سو خیر تو اس لئے بتلائی کہ اس کو اختیار کیا جاوے۔ اور شر اس واسطے بتلایا کہ اس سے پرہیز کیا جاوے۔ بس شرکاء بتلانا بھی نعمت ہے۔ وبضدھا تتبین الاشیاء (اپنی ضد سے چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اور یہ تو بعد میں بتلاؤں گا کہ آیت میں کن کن نعمتوں کا بیان ہے پہلے یہ سمجھو کہ حق تعالیٰ نے سمع و بصر کو کہیں تو مفرد کے صیغوں سے بیان فرمایا ہے یعنی سمع و بصر اور کہیں جمع کے صیغوں سے یعنی البصار و آذان بہر حال تشبیہ کہیں

نہیں فرمایا گیا۔ جز اس جگہ کے سوا اس میں کیا نکتہ ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال مگر میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ مخاطب نبی کو خاص تشبیہ کر دی کہ آنکھ دی اور ایک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو عنایت کیس ہیں اور دوسرا نکتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اشارہ ہو ایک مسئلہ طبیعہ کی طرف۔ قرآن شریف کی یہ شان ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را ہو ار باب معنی را
(اس عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جاں کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جاں کو بو سے تازہ رکھتی ہے وہ مسئلہ دو ہیں مگر بمنزلہ ایک کے کیونکہ دونوں آنکھیں ایک وقت میں ایک ہی چیز کو دیکھ سکتی ہیں ایسے ہی شفتین کہ دونوں سے ایک ہی کلام ہو سکتا ہے یہ نہیں کہ ایک آنکھ سے ایک چیز کو دیکھ لیں اور دوسری سے دوسری کو ایک ہوٹ سے ایک بات کرتے رہیں اور دوسرے سے دوسری بات کرنے لگیں اور کوئی یہ نہ کہے کہ تم تو قرآن شریف میں حکمہ طبیعہ کے مسائل نکالنے سے منع کیا کرتے ہو بات یہ ہے کہ قرآن شریف میں حکمت کے مسائل مقصود نہیں باقی کہیں نکل آویں تو اس سے مجھ کو انکار نہیں البتہ الضروری بتقدر الضرورة (ضروری بقدر ضرورت ہی ضروری ہوتی ہے) کا لحاظ ضروری امر ہے یہ تو نکتہ تشبیہ کا ہوا۔

سُورَةُ الشَّمْسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۝۵

ترجمہ: قسم ہے نفس کی اور اس ذات کی جس نے اس کو پیدا کیا۔

تفسیری نکات

تفسیری نکتہ

ما بمعنی من ہے۔ اور یہاں نفس کے ساتھ قسم کو قسم بالرب پر جو مقدم کیا گیا ہے تو اس میں اشارہ ہو سکتا ہے اس امر کی طرف کہ من عرف نفسه فقد عرف ربه کہ نفس بڑی چیز ہے یہ ہماری قسم کا مقسم بہ بننے کے قابل ہے تم اس کو پہچانو اگر اس کو پہچان لو گے تو ہم بھی بھی پہچان لو گے چونکہ معرفت نفس وسیلہ ہے معرفت رب کا اس لئے نفس کی قسم کو مقدم کیا گیا جیسے مقدمہ مذکور میں مقدم ہوتا ہے گو مقصودیت میں موخر ہو اور یہ یہی نکتہ ہے کوئی علم مقصود نہیں۔

اس حدیث میں حضور ﷺ نے مسئلہ تقدیر کو بیان کرنے کے بعد صراحتاً یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی تصدیق کتاب اللہ کی اس آیت میں ہے پہلی حدیث میں یہ صراحت نہ تھی صرف اتنی بات تھی کہ آپ نے مسئلہ تقدیر کے بعد ایک آیت کی تلاوت کی تو وہاں اس بات پر کہ مسئلہ تقدیر کو اس آیت کے مضمون سے مناسبت حاصل ہے صرف قرینہ حالیہ تھا اور یہاں قرینہ مقالیہ موجود ہے مگر اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں بھی تقدیر کے مسئلہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ صرف یہ مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس کی اور خالق نفس کی قسم کھائی ہے اور اس کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ فالہمها فجورها و تقوہا۔

کہ خدا نے نفس کو پیدا کر کے اس کو خیر و شر کا الہام کیا یعنی انسان کے نفس میں نیکی اور بدی کی دو طاقتیں فطر تار کھدی ہیں اس سے مسئلہ تقدیر کی تائید تصدیق کیونکر ہوئی۔

شاہ صاحب نے یہاں بھی وہی جواب دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بھی علم اعتبار کے طور پر تشبیہ دی ہے کہ جس طرح فجور و تقویٰ القا ہوا ہے اسی طرح اعمال کو مقدر بھی کر دیا ہے۔ پس بقول شاہ صاحب کے ان دو حدیثوں میں رسول ﷺ نے علم اعتبار کا استعمال فرمایا ہے بڑے شخص کے سر رکھ کر میں یہ کہہ رہا ہوں خود اتنی بڑی بات نہیں کہتا کیونکہ یہ بڑا دعویٰ ہے اور اگر کوئی شخص شاہ صاحب کے قول کو نہ مانے تو میں اس سے کہوں گا کہ پھر وہ ان حدیثوں کی شرح کر دے یقیناً ان حدیثوں اور آیتوں میں اور کوئی وجہ ربط و جزا اس کے جو شاہ صاحب نے فرمایا بیان نہیں کر سکے گا۔ یہ شاہ صاحب کا علم وہی ہے میں نے ان حدیثوں کا ایسا حل کسی کے کلام میں نہیں دیکھا۔ (غایت نکاح فی آیت نکاح ملحقہ حقوق الزوجین)

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝

ترجمہ: جس نے اپنے نفس کو زائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا

تزکیہ کی فضیلت

بہر حال آیت کا مدلول عام لیا جاوے یا خاص مگر میرا مقصود یہاں پر وہ اعمال ہیں جن سے تزکیہ بلا واسطہ ہوتا ہے بیچ میں ایک شبہ کو دفع کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ شبہ عامیانا نہ ہے لیکن آج کل مصیبت یہ ہے کہ ہر شخص مجتہد ہے اگر ترجمہ اردو قرآن و حدیث کے دیکھنے کا شوق ہے یہ شوق تو برا نہیں لیکن ہر کام کی تدبیر اور قاعدہ دنیا میں ہے کہ ہر کام کا ایک استاد ہوتا ہے بہتر یہ ہے کہ کسی استاد سے یہ ترجمہ پڑھیں اپنی رائے کو دخل نہ دیں شبہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہاں تو تزکیہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور ایک مقام پر ارشاد ہے فلا تزكوا انفسكم تو بظاہر یہاں تزکیہ سے نہی ہے تو اس سے اردو ترجمہ دیکھنے والے کو جبکہ اس کو علم نہ ہو سخت حیرانی ہوتی ہے کہ یہ کیا بات ہے بات یہ ہے کہ تزکیہ کے دو معنی آتے ہیں۔ پاک کردن و پاک گفتن جہاں فضیلت بیان فرمائی ہے وہاں تو معنی اول مراد ہیں اور جہاں نہی ہے وہاں معنی ثانی اس لئے کہ یہ ایک حالت ہے کوئی مضمون علمی نہیں ہے جس پر وہ حالت گزرتی ہے وہ اس کا مشاہدہ کرتا ہے پس غرض فلا تزكوا انفسكم میں دعویٰ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے چنانچہ قرینہ اس کا یہ ہے کہ اس کے بعد فرماتے ہیں هو اعلم بمن اتقى اگر پاک کردن کے معنی ہوتے تو اعلم نہ فرماتے پس دعویٰ کی ممانعت ہے واقعی اگر آدمی غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کی بھی پاکی حاصل کرے حق تعالیٰ کی درگاہ کے لائق کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ (الجدیب)

فلاح کا مدار تزیہ ہے

یہ ایک مختصری آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تزیہ کو مدار فلاح ٹھہرایا ہے جس سے تزیہ کی ضرورت ظاہر ہے۔ کیونکہ فلاح کی ضرورت سب کو ہے اور اس کا مدار تزیہ کو ٹھہرایا گیا ہے یہاں ایک خفیف سا شبہ ہے ممکن ہے کہ جن لوگوں نے درسیات باقاعدہ نہ پڑھی ہوں ان کو یہ شبہ ہو جائے اور ممکن ہے کہ وہ اس تقریر کے بعد بھی اپنے شبہ کو حل نہ کر سکیں کیونکہ قرآن سمجھنے کے لئے علوم عربیہ کی ضرورت ہے اور جو شخص عربیہ سے ناواقف ہے وہ قرآن کو نہیں سمجھ سکتا لیکن مجملًا اس تقریر سے ان کے شبہ کا غلط ہونا تو معلوم ہو جائے گا اور اتنا بھی کافی ہے وہ شبہ یہ ہے کہ یہاں پر تو اللہ تعالیٰ نے قد افلح من ذکھا (جس نے اپنے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا) فرمایا ہے جس سے تزیہ کا مدار فلاح اور مامور بہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے لاتزکوا انفسکم ہوا اعلم بمن اتقى (تم اپنے نفسوں پر تزیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے) جس کا ترجمہ ناواقف یوں کرے گا کہ اپنے نفسوں کا تزیہ نہ کرو کیونکہ لاتزکوا نہی کا صیغہ ہے مشتق تزیہ سے تو اب اس کو اشکال واقع ہو گا کہ ایک جگہ تو تزیہ کا امر ہے اور ایک جگہ اس سے نہی ہے اس کے کیا معنی جو اب اس کا یہ ہے کہ اگر اسی آیت میں لاتزکوا انفسکم (تم اپنے نفسوں کا تزیہ نہ بیان کرو) کو اس کے مابعد سے ملا کر غور کیا جائے تو شبہ حل ہو جائے گا۔ قرآن میں اکثر شبہات ماسبق اور مابعد کو نہ ملانے سے پیدا ہوتے ہیں اگر شبہ وارد ہونے کے وقت آیت کے ماسبق اور مابعد میں غور کر لیا کریں تو خود قرآن ہی سے شبہ رفع ہو جایا کرے اور اسی جگہ شبہ کا جواب موجود ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہر شبہ کا جواب بھی ساتھ ذکر فرما دیا ہے جیسا کہ تکوینیات میں بھی حق تعالیٰ کی یہی عادت ہے چنانچہ جن لوگوں نے خواص ادویہ کی تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جن نباتات میں کسی قسم کا ضرر ہے جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہیں اسی مقام پر ایک دوسری نباتات بھی حق تعالیٰ پیدا کر دیتے ہیں جس میں اس ضرر کی اصلاح ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے سنا ہے کہ ایک گھاس زہریلی ہوتی ہے جس کو کہتے ہیں اس میں پچھو کی سی خاصیت ہے اس کے چھونے سے پچھو کا سا اثر ہوتا ہے تو جس مقام پر وہ پیدا ہوتی ہے اسی مقام پر اس کے پاس ہی اللہ تعالیٰ نے دوسری گھاس اس کی اصلاح کرنے والی پیدا کر دی ہے کہ اس کے ملنے سے وہ اثر زائل ہو جاتا ہے خیر تکوینیات میں تو ہم کو زیادہ تحقیق نہیں اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں کہ سب چیزوں کی خاصیات دریافت کی جائیں اور ہر قسم کی دوائیں جمع کی جائیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ عدم تحقیق کی وجہ سے کسی مضر کو استعمال کر لے گا اور اس کی مضرت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ ہلاک ہو جائے گا تو ہلاک ہونا تو ایک دن ضروری ہے بدوں کسی مضر چیز کے استعمالات کئے بھی موت ایک دن آتی ہے۔

دینی ضرر ایک خسارہ عظیم ہے

مگر شریعات میں یہ ضروری ہے کہ جو امور مضر ہیں ان کو جانے کیونکہ ان کے نہ جاننے سے دینی ضرر ہوتا ہے جو کہ خسارہ عظیم ہے اس کا ضرر موت سے بھی ختم نہ ہوگا بلکہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے گا اور یہ سخت ضرر ہے جس کا تحمل نہیں ہو سکتا اسی لئے حضرت حدیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کانو یسنلونہ عن الخیر و کنت اسئلہ عن الشر مخافة ان یدرکنی یعنی اور صحابہؓ تو جناب رسول ﷺ سے خیر کی تحقیق کیا کرتے تھے اور میں شر کی تحقیق زیادہ کیا کرتا تھا اس خوف سے کہ کہیں شر میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اس لئے جو چیز دین کو مضر ہو اس کی تحقیق کر لینا لازم ہے۔ من جملہ اس کے وہ شبہات بھی ہیں جو قرآن و حدیث میں لوگوں کو پیش آیا کرتے ہیں ان کا رفع کرنا ضروری ہے اور اس میں حق تعالیٰ نے یہ اعانت فرمائی ہے کہ جس جگہ قرآن میں شبہ ہوتا ہے وہیں جواب بھی مذکور ہوتا ہے لہذا شبہ کے وقت سیاق و سباق میں ضرور غور کر لینا چاہئے چنانچہ لا تزکوا انفسکم (تم اپنے نفسوں کا تزکیہ بیان نہ کرو) پر جو قد افلح من زکھا سے تعارض کا شبہ ہوا تھا اس کا جواب اسی جملہ کے ساتھ ساتھ دوسرے جملہ میں مذکور ہے یعنی هو اعلم بمن اتقى (وہ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے) میں کیونکہ اس میں نبی مذکور کی علت کا ذکر ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ تم اپنے نفسوں کا تزکیہ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون متقی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک اپنا زیادہ عظیم ہونا دوسرے من اتقى کے ساتھ علم کا متعلق ہونا۔

تقویٰ باطنی عمل ہے

نصوص شرعیہ میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ تقویٰ باطنی عمل ہے چنانچہ حدیث میں صراحتاً مذکور ہے الا ان التقویٰ ہنا و اشار الی صدرہ یعنی حضور ﷺ نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ سنو تقویٰ یہاں ہے۔

تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے

نیز تقویٰ کے معنی لغت میں ڈرنے اور پرہیز کرنے کے ہیں یعنی معاصی سے بچنا اور ڈرنا تو ظاہر ہے کہ باطن کے متعلق ہے اور معاصی سے بچنے کی ڈر خود اصلاح باطنی ہے۔ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اس کی پوری تصریح ہے ان فی جسد ابن ادم مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کله الا وہی القلب کہ انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے۔ سن لو وہ دل ہے

اس سب سے تقویٰ کی حقیقت واضح ہو گئی کہ تقویٰ صلاحیت قلب کا نام ہے پس اب تقویٰ اور تزکیہ دونوں مرادف ہوئے تو آیت کا حاصل یہ ہوا ہوا علم بمن تزکی (وہ خود جانتے ہیں کہ کس نے تزکیہ نفس کیا ہے) ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

تقویٰ فعل اختیاری ہے

اب یہ سمجھو کہ اس میں تزکیہ کو عبد کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس سے اس کا داخل اختیار ہونا مفہوم ہوتا ہے۔ تو وہ مقدور ہوا پھر یہ کہ اعلم فرمایا۔ اقد نہیں فرمایا (اس سے بھی) اشارۃ معلوم ہوا کہ بندہ کی قدرت کی نفی مقصود نہیں ہے پس اس سے بھی تقویٰ و تزکیہ کا مقدور عبد ہونا مفہوم ہوا اور نہ اعلم نہ فرماتے بلکہ اقدر علی جعلکم متقین یا اس کے مناسب اور کچھ فرماتے۔ جب تقویٰ اور تزکیہ ایک ٹھہرے اور مقدور عبد ٹھہرے اب غور کرنا چاہیے کہ ہو اعلم بمن اتقی لا تزکوا انفسکم کی علت بن سکتی ہے یا نہیں لا تزکوا کے معنی یہ لئے جائیں کہ نفس کا تزکیہ نہ کیا کرو یعنی نفس کو رذائل سے پاک کرنے کی کوشش نہ کرو تو ہو اعلم بمن اتقی (وہ خوب جانتے ہیں کہ متقی کون ہے) اس کی علت نہیں ہو سکتی کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے نفسوں کو رذائل سے پاک نہ کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے تزکیہ اور تقویٰ کیا ہے اور ایک بے جوڑی بات ہے یہ تو ایسے ہوا جیسے یوں کہا جائے کہ نماز پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس نے نماز پڑھی ہے۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا بندہ کے کسی فعل کو جانتا اس کے ترک کی علت نہیں ہو سکتی ورنہ پھر سب افعال کو ترک کر دینا چاہیے کیونکہ حق تعالیٰ تو بندہ کے سبھی افعال کو جانتے ہیں بلکہ اس کے مناسب یہ علت ہو سکتی تھی کہ ہو اقدر علی جعلکم متقین او نحوہ (وہ اللہ زیادہ قادر ہیں تمہارے متقی بنانے پر) یعنی یوں فرماتے ہیں کہ تم نفس کو رذائل سے پاک نہ کرو کیونکہ تم کو متقی بنانے پر حق تعالیٰ زیادہ قادر ہیں تم پورے قادر نہیں ہو پھر کیوں کوشش کرتے ہو۔

اپنے نفس کو پاک کہنے کی ممانعت

جب یوں نہیں فرمایا بلکہ اعلم بمن اتقی (وہ زیادہ واقف ہیں کہ کون متقی ہے) فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں تزکیہ کے وہ معنی نہیں بلکہ کچھ اور معنی ہیں جس کے ترک کی علت ہو اعلم بمن اتقی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو یعنی پاکی کا دعویٰ نہ کرو کیونکہ حق تعالیٰ ہی کو خوب معلوم ہے کہ کون متقی ہے (اور کون پاک ہوا ہے) یہ بات تم کو معلوم نہیں اس لئے دعوے بلا تحقیق مت کرو۔ اب کلام میں پورا جوڑ ہے اور علت و معلول میں کامل ارتباط ہے۔ اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ تزکیہ باب تفعیل کا مصدر ہے اور تفعیل کی

خاصیتیں مختلف ہیں جس طرح اس کی ایک خاصیت تعدیہ ہے اسی طرح ایک خاصیت نسبت بھی ہے۔ پس قد افلس من زکھا میں تزکیہ کا استعمال خاصیت تعدیہ کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے نفس کو رذائل سے پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا اس میں نفس کو رذائل سے پاک کرنے کا امر ہے۔ لائنز کو انفسکم میں تزکیہ کا استعمال خاصیت نسبت کے ساتھ ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کو پاک نہ کہو اس میں نفس کو پاک کہنے کی ممانعت ہے۔ اب ان دونوں میں کچھ بھی تعارض نہیں کیونکہ جس چیز کا ایک جگہ امر ہے دوسری جگہ اسکی ممانعت نہیں بلکہ ایک نئی چیز کی ممانعت ہے۔ حکم تو نفس کے پاک کرنے کا ہے اور ممانعت پاک کہنے سے ہے کہئے اب کیا اشکال رہا۔

فہم قرآن کے لئے عربیت سے واقفیت ضروری ہے

مگر اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو عربیت سے واقف ہے اس لئے فہم قرآن کے لئے عربی جاننے کی سخت ضرورت ہے۔ بدوں زبان عربی کا کافی علم حاصل کئے قرآن کا صحیح ترجمہ سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اردو میں جب عربی زبان کا ترجمہ کی آجاتا ہے تو چونکہ اردو اور عربی زبانیں مختلف ہیں دونوں کے محاورات الگ ہیں اس لئے اگر کسی کو عربی علم کافی نہیں اس کے ترجمہ میں بعض جگہ ایہام رہ جائے گا جس سے شبہات پیدا ہوں گے اور بعض جگہ ترجمہ غلط ہو جائے گا۔

لفظ ضال کے دو معنی ہیں جیسے سورۃ النجمی میں ضالا کا ترجمہ بعض نے گمراہ کر دیا جو باوجود فی نفسہ صحیح ہونے کے ایک عارض یہ ہے کہ ضال لفظ عربی ہے جس کا عربی میں مختلف استعمال ہوتا ہے یعنی اس میں بھی جس کو وضوح دلیل نہ ہو اور اس میں بھی جو بعد وضوح دلیل کے مخالفت کرے اور گمراہ ہمارے محاورہ میں صرف اس کو کہتے ہیں جو وضوح دلائل کے بعد حق کا اتباع نہ کرے اور لغت عربیہ کے اعتبار سے لفظ ضال دو معنی کو جیسا کہ مذکور ہوا عام ہے ایک معانی ضال کے وہ ہیں جو ہمارے محاورہ میں گمراہ کے ہیں اور دوسرے معنی بے خبر کے ہیں اور بے خبر اس کو کہتے ہیں جس پر دلائل ظاہر ہی نہیں ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ رسول ﷺ سے وضوح حق کے بعد اس کا اتباع نہ کرنا محال ہے لہذا اس جگہ گمراہ سے ترجمہ کرنا غلط ہے بلکہ بے خبری سے ترجمہ کرنا مناسب ہے اور گوبے علمی بھی بے خبری کا مترادف ہے مگر اس سے بھی ترجمہ کرنا مناسب نہیں کیونکہ ہمارے محاورہ میں بے علم جاہل کو کہتے ہیں جو علوم صحیحہ سے بالکل عاری ہو اور رسول اللہ ﷺ نبوت سے پہلے گو علوم نبوت سے بے خبر ہوں مگر علوم عقلیہ میں کامل تھے (چنانچہ آپ نبوت سے پہلے بھی تمام عقلاء میں ممتاز صائب الرائے صحیح العقل کامل الفہم مشہور تھے۔ اور یہ محض دعوے ہی نہیں بلکہ واقعات تاریخیہ اس پر شاہد ہیں کہ نبوت سے پہلے اہم واقعات اور امور متنازعہ میں

لوگ حضور ﷺ کی طرف بکثرت رجوع کرتے تھے) پس بے علمی سے بھی ترجمہ مناسب نہیں بلکہ بے خبری ہی سے ترجمہ کرنا مناسب ہے۔ اور کسی بات سے بے خبری کچھ عیب نہیں کیونکہ علم ذاتی علم محیط سوا خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہر شخص علم میں تعلیم الہی کا محتاج ہے (بالخصوص علوم سمعیہ نقلیہ میں جن کے ادراک کے لئے عقل محض نا کافی ہے) اور ہر شخص کو جو علم حاصل ہوتا ہے معلوم کرنے سے پہلے وہ غیر معمول ہی ہوتا ہے پس علم بعد عدم علم کوئی عیب نہیں۔

بے خبری کوئی عیب نہیں

چنانچہ حق تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں بھی فرماتے ہیں و کذالک نری ابراہیم ملکوت السموات والارض ولیکون من الموقنین (ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں تاکہ وہ عارف ہو جائیں اور تاکہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں) اس آیت سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت سموات والارض کا پہلے علم نہ تھا اللہ تعالیٰ کی تعلیم واردات سے ان کو یہ علم حاصل ہوا پس بے خبری کچھ عیب نہیں تو مناسب ترجمہ ضالہ کا اس جگہ ناواقف ہے پس اس لفظ کا صحیح ترجمہ موجود تھا۔ مگر مترجمین کی نظر اس پر نہیں پڑی اور وہ ضالہ کا ترجمہ گمراہ کر گئے حاصل یہ کہ الفاظ عربیہ کا ترجمہ ہر جگہ کافی نہیں ہوتا اور مقصود کے سمجھنے میں غلطی واقع ہو جاتی ہے اس لئے ترجمہ کے لئے خود عربی کا بھی پوری طرح جاننا اور اس زبان کے محاورات سے بھی جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے پورا واقف ہونا ضروری ہے۔

انا مومن ان شاء اللہ کہنے میں اختلاف

یہ ایسا ہے جیسا کہ امام اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ انا مومن حقا (میں یقیناً مومن ہوں) نہ کہنا چاہیے بلکہ انا مومن ان شاء اللہ (میں ان شاء اللہ مومن ہوں) کہنا چاہیے اور انہوں نے بھی حقیقت میں دعوے ہی سے منع کیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ انا مومن ان شاء اللہ کہنا چاہئے یا انا مومن حقا تو اشعری کے نزدیک انا مومن ان شاء اللہ (میں ان شاء اللہ مومن ہوں) کہنا چاہیے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انا مومن حقا (میں واقعی مومن ہوں) کہنا چاہیے مشہور قول میں تو اس اختلاف کا منشاء یہ ہے کہ جن لوگوں نے انا مومن حقا سے منع فرمایا ہے اور انا مومن ان شاء اللہ کہنے کی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے مآل پر نظر کی ہے اور چونکہ مآل معلوم نہیں کہ ہم مآل میں مومن ہیں یا نہیں اس لئے ان شاء اللہ بڑھانے کی تاکید کی ہے اور جن لوگوں نے کہا کہ انا مومن حقا کہنا چاہیے ان کی نظر حال پر ہے اور فی الحال اپنے ایمان میں تردد و شک کرنا کفر ہے اس لئے وہ ان شاء اللہ بڑھانے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انا مومن حقا کہنا چاہیے اے فی الحال اور یہ نزاع محض لفظی ہوگا کیونکہ مآل کے اعتبار سے ان شاء اللہ بڑھانے کو کوئی منع

نہیں کر سکتا اور حال کے اعتبار سے انا مومن تھا سے کوئی روک نہیں سکتا۔ مگر میرے ذوق میں یہ ہے کہ جیسے انا مومن تھا حال کے اعتبار سے ہے اسی طرح انا مومن ان شاء اللہ بھی حال ہی کے اعتبار سے ہے مآل کے اعتبار سے نہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ حال کے اعتبار سے بھی انا مومن ان شاء اللہ ہی کہنا چاہیے اور مطلب اشعری کا یہ ہے کہ انا مومن تھا دعویٰ کے طور سے نہ کہنا چاہیے بلکہ دعویٰ سے بچنے کے لئے ان شاء اللہ کہنا چاہیے۔ اور یہ ان شاء اللہ محض برکت کے لئے ہوگا۔ تعلق و تردد کے لئے نہیں ہوگا جس سے مقصود تفویض و توکل ہے۔ کیونکہ ان شاء اللہ جیسے تعلق فی المستقبل کے لئے آتا ہے کبھی حال کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے جس سے تعلق مقصود نہیں ہوتی چنانچہ اس آیت ولا تقولن لشيء اني فاعل ذلك غدا الا ان يشاء الله (آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملا دیا کیجئے) میں بھی حضور ﷺ کو برکت ہی کے لئے ان شاء اللہ کہنے کی تعلیم کی گئی ہے۔ یہ ان شاء اللہ تعلق کے لئے نہیں ہے کیونکہ آگے ارشاد ہے واذکر ربك اذا نيست (اپنے رب کا ذکر کرو جبکہ بھول جاؤ) کہ اگر کبھی ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو جب یاد آئے اسی وقت ان شاء اللہ کہ لیا کرو۔ یعنی ایک بات کہہ کر دو گھنٹہ کے بعد ان شاء اللہ کا خیال آئے تو اس وقت بھی امر ہے کہ ان شاء اللہ کہہ لو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ لفظ تعلق کے لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ تعلق کے لئے کلام سابق سے موصول ہونا عقلاً ضروری ہے اور اگر ان شاء اللہ کلام سے موصول ہو تو تعلق کو مفید نہیں ہو سکتا۔ قلت وبقيد العقل خرج جوابا عما قيل ان هذا انما يصلح الزاما على الحنفية القائلين بعدم جواز الفصل بان المعلق والتعليق والقائل ان يقول ان لفظه الا ان يشاء الله فيه التعليق والاستثناء كما هو الاصل فيهما قولہ واذکر ربك اذا نيست يجيز الفصل بين المعلق والتعليق والمستثنى منه والا استثناء كما هو مذهب ابن عباس رضی اللہ عنہ پس یہاں بھی یعنی انا مومن ان شاء اللہ میں لفظ ان شاء اللہ محض تفویض کے لئے ہے نہ کہ تعلق و تردد کے لئے اور مطلب اشعری رحمۃ اللہ کا یہ ہے کہ انا مومن حق میں ایک قسم کا دعویٰ ہے۔

اپنے کو دعویٰ کے طور پر موجد نہ کہو

اس لئے دعویٰ سے بچنا چاہیے اور تفویض کے لئے ان شاء اللہ کہنا چاہیے یہی مطلب صوفیہ کا ہوگا اس قول سے

مغرور سخن مشوکہ توحید خدا واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(توحید خدا کا دعویٰ مت کرو کہ توحید خدا واحد جانتا ہے نہ واحد کہنا)

یہاں بھی واحد گفتن کے معنی دعویٰ کے کردن ہیں تو صوفیہ کی مراد یہ ہے کہ اپنے کو دعویٰ کے طور پر

موصد نہ کہو اور جنہوں نے حقا کہنے کو فرمایا ہے مراد وہ کہتا ہے جو بطور اقرار بالایمان کے ہو اور یہی مطلب لا تزکوا کا ہے کہ دعوے کے طور پر اپنے کو پاک نہ کہو جس پر قرینہ ہوا علم ہے یعنی خدا ہی کو خبر ہے کہ کون پاک ہے پس دعویٰ پاکی کا نہ کر دینے قرینہ اس پر دال ہے کہ یہاں تزکیہ کے معنی پاک کہنے کے ہیں نہ پاک کرنے کے جیسا فصلا او پر مذکور ہو چکا۔

بہر حال تزکیہ میں سالکین کو دو طرح کی غلطی واقع ہوتی ہے ایک یہ کہ تزکی کو مطلوب سمجھتا ہے اور جلدی مرتب عمل کامل نہ ہونے کی وجہ سے مغموم ہو کر عمل ہی سے معطل ہو جاتا ہے اور دوسری یہ کہ تزکی کو مطلب نہیں سمجھتا۔ اس لئے عمل ناقص پر جس پر تزکی مرتب نہیں ہوتی اکتفا کرتا ہے۔ سو یہ دونوں جماعتیں غلطی پر ہیں حق تعالیٰ نے پہلی جماعت کی غلطی کو قد افلح من زکھا (جس نے اپنے نفس کو تزکیہ کر لیا کامیاب ہو گیا) میں رفع فرمایا ہے کہ تم خود تزکیہ کو مقصود سمجھو تزکی کا انتظار نہ کرو ضرور کامیاب ہو جاؤ گے اور دوسری جماعت کی غلطی ایک دوسری آیت میں رفع فرمادی۔ قد افلح من تزکی (جس کا نفس پاک ہو گیا)

سُورَةُ التَّلِيْلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَقَ بِالْحُسْنٰی ۝

ترجمہ: سو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات یعنی ملت اسلام کو سچا سمجھا۔

تفسیری نکات علم اعتبار

فرمایا کہ علم اعتبار کو شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں اس واقعہ سے ثابت فرمایا ہے فاما من اعطى واتقى الایة (والحدیث مذکور فی مشکوٰۃ) لیکن اس سے بھی زیادہ واضح طور سے اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے حضرت ابی کو پکارا اور وہ نماز میں تھے اس لئے انہوں نے جواب نہیں دیا بعد نماز کے جب وہ آئے اور انہوں نے نماز میں ہونے کا عذر کیا تو آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی یا ایہا الذین امنوا استحبوا اللہ ولرسولہ اذا دعاکم لما یحییکم تو اس آیت کا تلاوت فرماتا اور اس سے استدلال بطور علم اعتبار کے ہے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اس آیت میں دعوت اور استجابة سے خاص دعوت اور خاص استجابة مراد ہے یعنی احکام شرعیہ میں اطاعت تو اس آیت کی تلاوت سے مقصود یہ تھا کہ تم تو عالم فقیہ ہو تم کو تو سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ استجابة بھی مثل استجابة میں بڑی قباحت یہ ہے کہ اگر وہ دینوی مصالح کسی دوسرے طریقے سے حاصل ہونے لگیں اور اسلام پر ان کے مرتب ہونے کی توقع نہ رہے تو چونکہ اسلام کو مقصود بالعرض رکھا ہے اور مصالح دینویہ کو مقصود بالذات اس لئے نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرے طریقے کو اختیار کر لیں گے۔ تیسرے یہ مصالح ہیں تخمینی اور تخمیدیات بہت آسانی سے مخدوش ہو سکتے ہیں تو اگر یہ کبھی مخدوش ہو

جائیں تو چونکہ حکم شرعی اس پر مبنی سمجھا گیا تھا لہذا وہ حکم بھی مخدوش ہو جائے گا پھر فرمایا کہ اگر یہ علوم مقصود ہوتے تو حضرات صحابہؓ ان کی تحقیق کے زیادہ مستحق تھے لیکن صحابہ نے کبھی ایسے سوال نہیں کئے۔

وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَكَ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءً

وَجْهٍ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ۚ

ترجمہ: اگر بجز اپنے عالی شان پروردگار کی رضا جوئی کے (کہ اس کا مقصود یہی ہے) اس کے ذمہ کسی کا احسان نہ تھا کہ اسے دینے سے اس کا بدلہ اتارنا مقصود ہو۔ اور یہ شخص عنقریب خوش ہو جاوے گا۔

تفسیری نکات

شان صدیق اکبر

فرمایا کہ جو لوگ مصالِحِ مختَرَعہ کو بناء احکامِ شرعیہ تعبدیہ کی قرار دیتے ہیں ان کا رد اس آیت سے ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف میں فرماتے ہیں جبکہ انہوں نے حضرت بلال کو خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ وما لاحد عنده من نعمة تجزى الا ابتغاء وجه ربه الاعلى تو اس میں ان کے فعل کا سبب نفی اور استثناء کر کے منحصر فرما دیا ہے۔ ابتغاء وجه ربہ حالانکہ اس میں یہ بھی ایک مصلحت تھی کہ قومی ہمدردی ہے اور ایک کافر کے ظلم سے ان کو چھڑایا دوسرے اس مدلول آیت کے ہے۔ (اشرف المقالات)

سُورَةُ الضُّحَىٰ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالضُّحَىٰ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ۝

لَلْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۝ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ۝

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝

وَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝

ترجمہ: قسم ہے دن کی روشنی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑے (آگے جواب قسم ہے) کہ آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ کو چھوڑا نہ آپ سے دشمنی کی اور آخرت آپ کیلئے دنیا سے بدرجہا بہتر ہے (پس وہاں آپ کو اس سے زیادہ دوستیں ملیں گی) اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو آخرت میں بکثرت نعمتیں دے گا سو آپ کو خوش ہونا چاہیے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر آپ کو ٹھکانا دیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو شریعت سے بے خبر پایا پھر آپ کو شریعت کا پتہ بتلا دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا سو مالدار بنا دیا۔

تفسیری نکات

چنانچہ اس قسم کی بے چینی پر یہ سورۃ نازل ہوئی تھی جس کی آیتوں کی تلاوت کی گئی ہے جس کے نزول کا قصہ احادیث میں اس طرح آتا ہے کہ ایک مرتبہ چند روز تک وحی منقطع ہو گئی جس پر کفار طرح طرح کے طعن کرتے تھے بڑا طعن ان الفاظ میں تھا ترکک شیطانک (تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا) نعوذ باللہ آپ کو

انقطاع وحی سے بھی صدمہ ہوا جیسے محبوب کے خط میں دیر ہونے سے عاشق کو صدمہ ہوتا ہے اور محبوب دیر کیوں کرتا ہے اس لئے تاکہ عشق کی آگ اور بھڑکے اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں تھیں تو ایک صدمہ تو آپ کو انقطاع وحی سے تھا ہی مزید برآں یہ کہ کفار نے طعن دینا شروع کیا کہ بس خدا نے آپ کو چھوڑ دیا بعض نالائقوں نے خدا کی شان میں گستاخانہ کلمات کہے اس کا بھی آپ کو صدمہ ہوا نہ اس واسطے کہ معتقد کم ہو جاویں گے یہ فکر تو ہم جیسوں کو ہوا کرتی ہے۔ حضور ﷺ کی شان اس سے ارفع ہے دوسرے کفار معتقد ہی کہاں تھے بلکہ آپ کو کفار کی ان حرکات سے اس لئے صدمہ ہوا کہ آپ کو امت سے تعلق شفقت بہت ہی زیادہ ہے آپ کی خواہش و تمنا یہ تھی کہ میرا کوئی مخاطب جہنم میں نہ جائے سب کے سب جنتی بن جاویں پھر اس شفقت کے ساتھ کفار کی بد حالی پر جتنا رنج بھی آپ کو ہو تھوڑا ہے حق تعالیٰ نے بار بار اس رنج کو قرآن میں دور فرمایا ہے کہیں فرماتے ہیں لا تسئل عن اصحاب الجحیم (دوزخیوں کے بارہ میں آپ سے سوال نہ کیا جائے گا) کہ آپ کفار کی حرکات پر اتنا رنج کیوں کرتے ہیں آپ سے یہ سوال نہ ہوگا کہ اتنے آدمی جہنم میں کیوں گئے کہیں ارشاد ہوتا ہے لعلک باخع نفسک الا یكونوا مؤمنین شاید آپ اس رنج میں اپنی جان کو ہلاک ہی کر دیں گے کہ یہ کافر ایمان نہیں لاتے۔ اس آیت سے اندازہ دے دیا ہے فرماتے ہیں ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی ینظروا ما بانفسہم یعنی حق تعالیٰ کسی قوم سے اپنا برتاؤ نہیں بدلتے جب تک کہ وہ لوگ خود ہی اپنا برتاؤ خدا تعالیٰ سے نہ بدل دیں پس جو لوگ مرتد ہو رہے ہیں یا نیکی و تقویٰ کے بعد معاصی میں مبتلا ہو رہے ہیں اول خود ان لوگوں نے اپنا تعلق منقطع کر لیا تب حق تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت کو منقطع کر دیا اب یہاں ایک مقدمہ اور ماننا پڑے گا وہ یہ کہ آپ نے اپنا تعلق حق تعالیٰ سے کم نہیں کیا اور مقدمہ بالا کی بناء پر کریم کی عادت ہے کہ وہ از خود اپنے برتاؤ کو نہیں بدلا کرتا۔ اس مجموعہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ انقطاع وحی سے قطع تعلق کا وسوسہ ہرگز نہ لائیں رہا یہ سوال کہ پھر وحی منقطع کیوں ہوئی تھی اس میں کیا حکمت تھی جو اس کو حق تعالیٰ نے اس سورت کے شروع ہی میں اشارۃً بیان فرما دیا ہے والضحیٰ واللیل اذا مسجی۔ قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑے) میں جس میں دن اور رات کی قسم ہے اس میں انقطاع وحی کی حکمت ہی کی طرف اشارہ ہے قرآن کی اقسام میں علوم ہوتے ہیں قسم سے محض تاکید کلام ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ ان میں جواب قسم پر استدلال ہوا کرتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

حضور ﷺ کے یتیم و فقیر ہونے کو بیان کرنے سے اظہار نقص کا شبہ ہوتا ہے اس کا جواب اول تو یہ ہے

کہ دیکھنا چاہیے کہ وہ ظاہر کرنے والا کون ہے حق تعالیٰ ہی تو ظاہر کر رہے ہیں سو محبوب اگر محبت کے متعلق کوئی نقص کی بات بھی کہہ دے اس سے جو خوشی ہوتی ہے اس کو عاشق ہی کا دل جانتا ہے بس جس کو آپ اظہار نقص سمجھتے ہیں اس کو حضور ﷺ کے دل سے پوچھنا چاہیے کہ آپ کو اس میں کیا لطف آیا ہوگا۔ سورہ عبس میں بظاہر حضور ﷺ کو کچھ عتاب فرمایا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ ایک بار آپ کی مجلس میں رؤسائے قریش جو سرداران کفار تھے بیٹھے ہوئے تھے اور حضور ﷺ ان کے سمجھانے میں مشغول تھے کہ شاید ان کو ہدایت ہو جاوے۔ اتنے میں عبد اللہ بن ام مکتوم صحابی نابینا حاضر ہوئے اور پکار کر عرض کیا یا نبی اللہ علمنی مما علمک اللہ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو سکھلائیے اس سے جس کا علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے) حضور ﷺ کو اس وقت ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو کفار کی بد حالی سے کس قدر صدمہ ہوتا تھا جس کے متعلق حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک ہی کر دیں گے جب کسی طرح آپ کا صدمہ کم نہ ہوا تو پھر صاف صاف فرمادیا کہ ہم کو ہی سب کا مسلمان ہونا منظور نہیں۔ ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلہم جمیعاً افسانت تکرہ الناس حتی یکنوا مومنین (اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے سو کیا آپ لوگوں پر بردستی کر سکتے ہیں جس میں وہ ایمان ہی لے آویں) وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین (اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں اگر چہ آپ ان کے ایمان لانے کی حرص بھی کریں)

رسول اکرم ﷺ پر تین خصوصی احسانات کا ذکر

اور جب حضور ﷺ کے غلام نہیں چاہتے کہ ان کی وجہ سے کوئی دوزخ میں جاوے تو حضور ﷺ کب چاہ سکتے تھے اس لئے واقعہ انقطاع وحی میں ایک صدمہ تو ہوا محبت حق کی وجہ سے اور دوسرا مقدمہ ہوا شفقت علی الخلق کی وجہ سے سبب ثانی کا علاج بہت جگہ کر دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے لست علیہم بمصیطر (آپ ان پر مسلط نہیں ہیں) اور ولا تک فی ضیق مما یمکرون (اور جو کچھ شرارتیں کر رہے ہیں اس سے تنگ نہ ہوں جیسے یہاں اس مقام پر پہلے سبب کا ازالہ فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے آپ سے تعلق قطع نہیں کیا آپ دل کا دوسوہ نہ لائے پھر اس کی تائید کے لئے اپنے احسانات یاد دلاتے ہیں کہ ہم کو آج ہی نہیں بلکہ آپ کے ساتھ ہمیشہ سے تعلق ہے ہم ہمیشہ آپ کے اوپر عنایت و کرم کرتے رہے ہیں پھر آج آپ کو قطع تعلق کا دوسوہ کیوں پیدا ہوا اس جگہ جو احسانات حق تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں ان میں سب سے پہلے ایک جسمانی احسان کو بیان فرمایا ہے۔ الم یجدک یتیمًا فاری کیا خدا نے آپ کو یتیم نہیں پایا تھا کہ پھر ٹھکانا دیا کہ آپ کے دادا عبدالمطلب اور چچا ابوطالب کو تربیت کے لئے مقرر فرمایا کہ انہوں نے آپ کو

تیبوں کی طرح نہیں پالا بلکہ اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز رکھ کر پالا۔ دوسرا احسان باطنی ہے و وجہ سدک ضالا فہدی یعنی خدا تعالیٰ نے آپ کو (امور عقلیہ سمعیہ سے) ناواقف پایا پھر خبردار کر دیا یہ قیود میں نے اس لئے بڑھائیں کہ امور عقلیہ کے علم میں انبیاء علیہم السلام بدو فطرت ہی سے کامل ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام عقل میں سب لوگوں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ ہر زمانہ کہ عقلاء کو یہ بات تسلیم کرنا پڑی ہے کہ واقعی انبیاء علیہم السلام کامل العقل ہوتے ہیں پس آپ امور عقلیہ سے کسی وقت ناواقف نہ تھے۔ البتہ وہ علوم جو عقل کے ادراک سے باہر ہیں جیسے بعض صفات واجب و احوال جنت و نار و مقادیر عبادات وغیرہ ان سے قبل از وحی آپ بے خبر تھے وحی کے بعد خبردار ہوئے اور بعض امور عقلیہ ظنیہ میں گو قبل از وحی بھی آپ کو علم حاصل تھا مگر ظنی تھا پھر وحی سے ان کی تاکید کر دی گئی تاکہ وحی سے وہ علم قطعی ہو جائے کیونکہ عقل سے بلا واسطہ جو علوم حاصل ہوتے ہیں ان میں خلط و ہم کا اندیشہ رہتا ہے اور وحی میں کسی قسم کا احتمال نہیں اس لئے امور عقلیہ وحی کے بعد زیادہ قطعی ہو جاتے ہیں۔

انقطاع وحی میں حکمت

غرض اس جگہ حق تعالیٰ نے تین احسان بیان فرمائے ہیں ایک جسمانی بیچ میں روحانی اخیر میں پھر جسمانی یعنی ووجدک عائلاً فاغنیٰ کہ آپ کو حاجت مند پایا تو تو نگر کر دیا اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر امور جسمانیہ کو امور روحانیہ سے تلبس ہو جاوے تو وہ جسمانیات بھی روحانیات ہی میں داخل ہو جاتے ہیں چنانچہ دنیا کو اگر دین کے کاموں میں صرف کیا جائے اور اس کو آخرت کے لئے معین بنایا جاوے تو اس وقت دنیا بھی دین میں داخل ہو جاتی ہے ان احسانات کی یاد دہانی سے مطلب یہ ہوا کہ ہم نے آپ پر یہ احسانات کئے ہیں اور ایک مقدمہ یہاں محذوف ہے اس کو ملایا جائے وہ یہ کہ کریم اپنی عادت کو نہیں بدلا کرتا ہے اس لئے آپ بے فکر رہے کہ جو برتاؤ ہمارا آپ کے ساتھ اب تک رہا ہے ہمیشہ وہی برتاؤ رہے گا۔ اور اسی طرح آپ پر انعامات و احسانات ہوتے رہیں گے قطع تعلق کا کبھی وسوسہ نہ لائے۔ شاید تم اس مقدمہ پر یہ کہو کہ ہم تو بعض دفعہ انقطاع نعمت دیکھتے ہیں سب سے بڑھ کر نعمت ایمان ہے ہم تو اس کا انقطاع بھی دیکھ رہے ہیں چنانچہ بعض لوگ دین سے مرتد ہو جاتے ہیں جن کی نظیریں آج کل بہت نظر آ رہی ہیں اس شبہ کا جواب ایک آیت میں خود حق تعالیٰ ہی نے کا آنا کسی قدر گراں ہوا کیونکہ غرباء کے ساتھ مل کر بیٹھنے کو رؤساء قریش گوارا نہ کرتے تھے تو آپ کو خیال ہوا کہ اب ان غریبوں کے آنے سے یہ کم بخت چلے جائیں گے اور ہدایت سے محروم رہیں گے۔ آپ کی نیت بالکل بجا تھی مگر غریب مسلمانوں کے مقابلہ میں حق تعالیٰ کو رؤساء کفار کی ہدایت کا اتنا اہتمام بھی گوارا نہیں جس سے غربا کا آنا کسی وقت بار خاطر ہو اس لئے سورہ عبس میں حضور ﷺ کو نہایت لطیف عنوان سے اس بات پر

متنبہ کیا گیا ہے کہ ناجینا کا حاضر مجلس ہونا حضور ﷺ پر گراں کیوں ہوا پھر اس خطاب میں آپ کو کیا لطف آیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد جب کبھی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ حاضر مجلس ہوتے تو حضور ﷺ فرمایا کرتے مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی مرحبا اس شخص کو جس کے متعلق میرے پروردگار نے مجھ پر عتاب فرمایا۔ محبوب کے عتاب آمیز خطاب میں جو لذت ہوتی ہے اس کو عشاق ہی جانتے ہیں ایک بزرگ کے مرید حج کو جا رہے تھے چلتے ہوئے شیخ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کے حضور میں ہمارا سلام عرض کر دینا چنانچہ جب وہ حاضر روضہ اطہر ہوئے شیخ کا سلام عرض کیا وہاں سے جواب عطا ہوا کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا جب یہ شخص واپس آیا اور شیخ کی زیارت کو گیا انہوں نے پوچھا کہ بھائی ہمارا سلام عرض کیا تھا اس نے کہا جی ہاں عرض کیا تھا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا مرید نے بدعتی کا لفظ نہ کہا۔ شیخ نے فرمایا کہ ایک لفظ کیوں چڑایا جو جان تھی خطاب کی کہا حضرت میں ادب کی وجہ سے وہ لفظ نہیں کہہ سکتا اور آپ کو تو معلوم ہی ہے پھر میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے فرمایا کہ سننے میں جو لطف ہے وہ جاننے میں تھوڑا ہی ہے۔ اور تم کو ادب یا بے ادبی سے کیا تعلق تم تو پیام رساں ہو تم کو وہی کہنا چاہیے جو حضور ﷺ نے فرمایا وہ تمہارا کہا ہوا نہ ہوگا بلکہ حضور ﷺ کا فرمودہ ہوگا چنانچہ مرید نے مجبور ہو کر کہا حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا بس یہ سنتے ہی شیخ کو وجد آ گیا قص کرتے تھے اور یوں کہتے تھے۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ لک گفتی
جواب تلخ می زبید لب لعل شکر خارا

غنائے قلب کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے

اسی طرح جب آپ کو مفلس پایا تو حق تعالیٰ نے غنی کر دیا تو یہ غنا بھی کامل ہی ہوگا کیونکہ حق تعالیٰ خود اس کا اہتمام فرمایا اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حضور ﷺ کے پاس مال اتنا زیادہ کہاں تھا جس سے آپ کے غنا کو کامل کہا جاوے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو حضور ﷺ کو غنائے ظاہری کی ضرورت نہ تھی اور جو اصل غنا ہے یعنی غنائے قلب وہ تو آپ کے پاس بدو فطرت سے موجود تھی اور نبوت کے بعد اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ کسی کو بھی آپ کے برابر غنائے قلب حاصل نہ ہوگا۔ (کیونکہ اس کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے اور ان صفات میں حضور ﷺ سے زیادہ کوئی کامل نہیں اس لئے آپ کے غناء قلب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا بلکہ ظاہری غنا سے تو اہل قلب کو اور پریشانی ہوتی ہے اور اس کے حقوق کا خیال کر کے یہ پریشانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اسی کے ازالہ کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت سلیمان سے فرمایا ہذا عطاءنا فامنن او امسک بغير حساب (یہ بے شمار ہماری عطا ہے دو یا نہ دو) اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں ایک یہ کہ ہذا عطاءنا بغير حساب یہ ہماری عطا

ہے اور بے حساب یعنی بے شمار بغیر حساب سے کثرت کا بتلانا مقصود ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ بغیر حساب معمول ہے فامنین او امسک کا یعنی یہ ہماری عطا ہے خواہ دو یا نہ دو آپ سے اس کے حقوق کے متعلق کوئی سوال اور باز پرس نہ ہوگی دو یا نہ دو جس طرح چاہو تصرف کرو کلی اختیار ہے۔ دوسری تفسیر مجھے زیادہ پسند ہے اور واقعی حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اتنی بڑی سلطنت اور اس کا ساز و سامان خارجان ہو جاتا اگر ان کی تسلی اس طرح نہ کی جاتی جب بغیر حساب فرما کر بارغم ہلکا کر دیا گیا اس کے بعد انہوں نے بے فکری سے سلطنت کی اس سے ظاہری سامان کی کثرت کا موجب پریشان ہونا ثابت ہو گیا تب ہی تو اس کا ازالہ کیا گیا اسی واسطے جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ چاہے نبی ملک ہونا اختیار کر لیں یا نبی عبد ہونا حضور ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کے مشورہ سے نبی عبد ہونا اختیار کیا اگر آپ بھی نبی ملک ہونا چاہتے تو آپ سے بھی یہی ارشاد ہوتا ہذا عطاؤنا فامنین او امسک بغیر حساب (یہ بے شمار ہماری عطا ہے دو یا نہ دو) اور اس سے آپ کی بھی تسلی کر دی جاتی مگر آپ نے سلطنت پر عبدیت کو ترجیح دی اور غنائے ظاہری کو اختیار نہیں فرمایا دوسرے اگر غنائے ظاہری ہی مراد لی جائے جیسا مشہور مفسرین میں یہی ہے تو گو آپ کے پاس مال جمع نہ رہتا تھا اور اسی سے شبہ عدم غناء ظاہری کا ہو سکتا ہے مگر جو مقصود ہے غنائے ظاہری سے کہ کوئی مصلحت ان کی نہ رہے وہ مقصود اس طرح حاصل تھا کہ وقتاً فوقتاً اس طرح مال آتا تھا کہ سلاطین و امراء کی طرح آپ خرچ فرماتے تھے جس میں یہ بھی حکمت تھی کہ آپ مقتداء تھے اور مقتداء کے لئے وقعت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عرفاً تمول سے ہوتی ہے بشرطیکہ تمول پر تحول بھی مسلط ہو (یعنی سخاوت بھی ہو کہ لوگوں کو دینا دلالتا رہے جس سے مال چلتا پھرتا رہے) چنانچہ حضور ﷺ کے ظاہری غنا کی بھی یہ حالت تھی کہ آپ نے حج و اداع میں سواونٹ قربانی کئے جن میں تریسٹھ اپنے دست مبارک سے نحر کئے جس کی کیفیت حدیث میں آتی ہے کلھن یزدلفن الیک کہ ہراونٹ حضور ﷺ کی طرف اپنی گردن بڑھاتا تھا گویا ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کیجئے سبحان اللہ کیا شان محبوبیت تھی۔

ہم آہوان حصر اسر خود نہادہ بر کف بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

(جنگل کے تمام ہرنوں نے اپنا سر تھیلی پر رکھ لیا ہے اس امید پر کہ کسی دن تو شکار کو آوے گا)

یہ شعر حضور ﷺ ہی کی شان میں زیادہ چسپاں ہے واقعی آپ تو ایسے ہی تھے کہ جانور اپنی گردنیں خود آگے بڑھاتے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کاش پہلے میں آپ کے ہاتھ سے ذبح ہو جاؤں تو اتنے اونٹوں کا ذبح ہونا بدوں ظاہری غنا کے کب ممکن ہے اسی طرح آپ کی عطاء اور سخاوت کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ نے سو سو دو سو اونٹ ایک ایک شخص کو عطا فرمائے ایک اعرابی کو بکریوں کا بھرا جنگل عنایت فرما دیا۔ بحرین سے جب مال آیا تو وہ اتنا تھا کہ مسجد میں سونے چاندی کا ڈھیر لگ گیا اور حضور ﷺ نے سب کا سب ایک دم

سے بانٹ دیا اور بعض صحابہ کو اتنا دیا جتنا وہ اٹھا سکتے تھے ایسی نظریں تو سلاطین کے یہاں بھی نہیں سنی جاتیں اس سے آپ کا غنائے ظاہری بھی ظاہر ہے کیونکہ غنائے ظاہری کی حقیقت مال کو رکھنا نہیں بلکہ مال کا خرچ کرنا ہے وہ بوجہ اکل ثابت ہو گیا اس کے بعد ووجدک ضالاً فہدیٰ اور آپ کو بے خبر پایا تو راستہ بتلا دیا) میں آپ کی کمال ہدایت کا بیان ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے خود آپ کی تعلیم و تربیت کا اہتمام فرمایا تو ضرور ہے کہ اس کا درجہ بھی کامل ہو چنانچہ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کا علم کتنا کچھ کامل تھا۔ بھلا جس نے بچپن میں کسی استاد سے ایک حرف بھی نہ پڑھا، وہ نہ ایک حرف لکھا ہو اس کے علم کی یہ حالت کہ تمام دنیا کو علم سکھلا دیا عرب کے جاہلوں کو ارسطو افلاطون سے زیادہ حکیم بنا دیا یہ کمال ہدایت نہیں تو کیا ہے۔ حضور ﷺ کے علوم کا اندازہ احادیث کے پڑھنے اور قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے چنانچہ قرآن کے مطالب کو ایسا کوئی شخص حل نہیں کر سکا جیسا کہ حضور ﷺ اس کو جانتے تھے ادھر احادیث میں حضور ﷺ نے اصلاح اخلاق و تہذیب نفس و حسن معاشرت و تمدن و قضاء و امارت و سلطنت سے جو اصول قواعد بیان فرمائے ہیں ان کو دیکھ کر آپ کے علوم کا اندازہ ہو سکتا ہے بھلا کوئی شخص بھی ایسا جامع ہو سکتا ہے جو عبادات کی بھی کامل تعلیم دے اخلاق کی بھی معاملات کی بھی معاشرت کی بھی اور تمدن و سیاست کی بھی پھر تعلیم بھی کیسی پاکیزہ جس کی نظیر ملنا محال ہے پس حق تعالیٰ نے اس مقام پر حضور ﷺ کے نقائص کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ آپ کے احوال کی تکمیل و کمال کو بیان فرمایا ہے خوب سمجھ لو اشکال کا جواب تو ہو گیا۔ (ابوالیتامی)

انقطاع وحی میں حکمت

والضحیٰ واللیل اذا سجدی میں جس میں دن اور رات کی قسم ہے اس میں انقطاع وحی کی حکمت ہی کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کی اقسام میں علوم ہوتے ہیں قسم سے محض تاکید کلام ہی مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ ان میں جواب قسم پر استدلال ہوا کرتا ہے چنانچہ اس سورۃ میں بھی جو وحی و لیل کی قسم ہے تو اس میں بھی اشارہ ہے۔ انقطاع وحی کی حکمت پر جس سے شبہ ہو گیا تھا۔ قطع تعلق اور ناراضی حق کا۔ فرماتے ہیں اے محمد ﷺ وحی مثل چاشت کے ہے اور انقطاع وحی مثل رات کے ہے اور جس طرح عالم جسمانی کے لئے لیل و نہار کا تعاقب ناگزیر ہے۔ اور بہت سی حکمتوں پر مشتمل ہے اسی طرح عالم روحانی میں بھی قبض و بسط کا تعاقب ضروری ہے کیا آپ یوں چاہتے ہیں کہ تمام عمر دن ہی رہا کرے۔ تو اس صورت میں بھلا رات کی حکمتیں کیونکر حاصل ہوں گی۔ اگر ساری عمر دن رہا کرتا تو انسان ایسا اپنے کام کا حریص ہے کہ تمام دن کام کرنا چاہتا۔ تاجر تجارت میں لگا رہتا کاشتکار زراعت میں لگا رہتا۔ ہر پیشے والا اپنے پیشے میں مشغول رہتا چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جاڑوں میں چھوٹا دن ہوتا ہے اس میں تو تمام کام کرتے ہی ہیں۔ گرمیوں میں بڑا دن ہوتا ہے وہ بھی سارا کام ہی میں

صرف ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جتنا بھی بزا دن ہوتا۔ انسان اس کو اپنے کام ہی میں صرف کرتا۔ جان کو آرام نہ دیتا حق تعالیٰ نے اس کی راحت کے لئے دن کے ساتھ رات بھی لگا دی جس میں چاہے کتنا ہی روشنی کا انتظام کیا جائے مگر دن کی طرح کام نہیں ہو سکتا۔ پھر دن میں تو اگر نیند کو ٹالنا چاہو ٹال سکتے ہو مگر رات کو یہ ایسا چوکیدار ہے کہ خود بخود دفعہ آنکھوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔ کتنا ہی ٹالو نہیں ٹال سکتا۔ اسی طرح ببط میں عبادات کا شوق بہت ہوتا ہے طاعات میں خوب دل لگتا ہے۔ کام اچھی طرح ہوتا ہے۔ اگر سالک پر ہمیشہ ببط ہی رہا کرے تو یہ ہر وقت عبادات ہی میں مشغول رہنا چاہے اور اپنی جان کو آرام نہ دے۔ اور ایسا کرنے سے شوق ختم ہو جاتا۔ پھر عبادت سے معطل ہو جاتا۔ کیونکہ طبعی امر ہے۔ اگر سارا شوق ایک دم سے پورا کر لیا جاوے۔ تو پھر وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ غرض چونکہ طاعات و عبادات کا کام ساری عمر کا ہے ایک دو دن کا نہیں اور ببط میں شوق زیادہ ہوتا ہے جس سے سالک ہر وقت کام لینا چاہتا اور اس کا انجام تعطیل ہوتا اس لئے حق تعالیٰ کبھی کبھی قبض طاری کر دیتے ہیں جس میں چند روز کے لئے سالک کام کی زیادتی سے رک جاتا ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ کیفیات و واردات میں کمی آ جاتی ہے کام کرنا بھی چاہتا ہے تو نہیں ہو سکتا۔ جس میں سالک یہ سمجھتا ہے کہ طاعات میں کمی آگئی مگر حقیقت میں وہ طاعات کی ترقی ہے۔ کیونکہ قبض کے بعد جو ببط آئے گا تو پھر خوب ہی کام ہوگا۔ اور اگر قبض بھی نہ ہوا کرے تو چند روز کے بعد شوق جب پورا ہو جائے گا پھر ساری عمر کام نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ انسان کی حالت یہ ہے کہ جب اس کا جوش اور شوق پورا ہو جاتا ہے پھر اس سے کام نہیں ہوتا۔ اس لئے قبض بھی ضروری ہے تاکہ سارا شوق ایک ہی دفعہ ختم ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبض کا ورود دراصل ببط کے لئے ہے۔ اس لئے قبض سے پریشان نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کے بعد جو ببط آئے گا اس کا خیال کر کے دل کو تسلی دینا چاہیے۔ اس کو مولانا فرماتے ہیں۔

چوں قبض آمد تو دروے ببط میں تازہ باش و چیں میفکن برجیں

چونکہ قبضے آیت اے راہ رو آں صلاح تست آپس دل مشو

یہ حکمت تھی انقطاع وحی میں جس کی طرف والضحیٰ والیل اذا سجی میں قسم کے ضمن میں اشارہ

ووجدک ضالا فہدی

لفظ ضلالت کا مفہوم

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت حیران ہوا پایا۔ سو اس نے آپ کو راہ سلوک دکھائی۔ مفسرین ضلالت کی تفسیر میں بہت حیران ہوئے ہیں کسی نے کچھ کہا ہے کسی نے کچھ لیکن جو بات میرے دل کو لگتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ضلالت بھی حیرانی اور بھٹک ہے جو سالک کو شوق کار سے پہلے پیش آتی ہے اور فہدی میں سلوک کا بتا مراد ہے اور الم

نشرح لك صدرک کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا۔ میں وصول مقصود ہے یہی ہے وہ بھٹک کہ جس کی وجہ سے حضور نے کئی مرتبہ خود کشی کا ارادہ فرمایا۔ اسی قسم کی بھٹک سا لک کو پیش آتی ہے۔ تو اگر کوئی مرشد کامل موجود ہو تو وہ تسلی کرتا ہے اور کہتا ہے۔

کوئے تو میدی مردو کا مید ہاست سوئے تاریکی مردو خورشید ہاست
نا امید کی راہ مت چلو کیونکہ خدا کے فضل سے بہت سی امیدیں ہیں ظلمت یعنی مدعیان مزور کی طرف
مت جاؤ خورشید یعنی منور باطن لوگ موجود ہیں۔ اور یہ بھٹک ابتدا میں ہوتی ہے۔

لفظ ضلالت کا استعمال

چنانچہ وطن میں ایک شخص نے میرے سامنے ایک اشکال پیش کیا۔ اس طرح سے کہ پہلے مجھ سے پوچھا
ووجدک ضالا فہدی کا ترجمہ کر دو۔ پھر اشکال کروں گا۔ میں سمجھ گیا کہ کیا اشکال ان کو پیش آیا ہے۔ غشاء
اشکال کا یہ تھا کہ قرآن مجید کے بعض تراجم میں ضال کے معنی گمراہ کے لکھے ہوئے ہیں۔ پیش شبہ یہ تھا کہ اس
میں حضور کو گمراہ کہا گیا ہے میں نے کہا کہ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ پایا آپ کو ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اب وہ
میرا منہ تکتے لگا میں نے کہا میاں بتلاؤ کیا اشکال تھا؟ کہنے لگا اب تو کچھ بھی نہیں۔

اس جگہ راز یہ ہے کہ ضلالت کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک مذموم میں چنانچہ ولا الضالین میں جو ضال
کہا گیا ہے وہاں تو مذموم میں مستعمل ہے۔ یعنی جو بعد وضوح حق بھی اتباع حق نہ کرے اور ایک غیر مذموم
ہے۔ یہ کہ اب تک وضوح حق نہیں ہوا۔ اس کے معنی ناواقف کے ہیں جو نقص نہیں۔ کیوں کہ حضور پر ایک زمانہ
ایسا بھی گزرا ہے جس میں آپ پر حقائق واضح نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ما كنت تدري
ما الكتاب ولا الايمان یعنی نزول وحی سے پہلے آپ ان علوم کو کچھ بھی نہیں جانتے تھے ووجدک
ضالا فہدی میں یہی درجہ مراد ہے کہ پہلے آپ پر وضوح حقائق نہیں ہوا تھا۔ اب ہم نے وحی نازل کر کے
حقائق کو واضح کر دیا اور ولا الضالین میں وہ درجہ مراد ہے کہ وضوح حق ہو چکا تھا مگر بعد وضوح حق بھی کجی
اختیار کی تو جس طرح ضلالت کے دو معنی ہیں اسی طرح لفظ گمراہ بھی فارسی میں دونوں معنوں کو شامل ہے۔ اسی
لحاظ سے بعض مترجموں نے ضال کا ترجمہ گمراہ کیا ہے مگر اب ہمارے محاورہ میں گمراہ کا لفظ زیادہ تر معنی ثانی میں
مستعمل ہوتا ہے اس لئے اب ضرورت ہے ترجمہ بدلنے کی۔ کہ ایسے الفاظ سے ترجمہ نہ کیا جاوے۔ جس سے
عوام دھوکہ میں پڑیں۔ اسی طرح لا تکونن من الجاهلین کے معنی یہ ہیں۔ کہ آپ نادانوں کی سی باتیں نہ
کیجئے اس سے کچھ بھی ابہام نہیں ہوتا بلکہ پیار کا لفظ ہے۔ دیکھو اگر تم کسی کو کہو کہ او مرغ کہ بچے تو وہ بھڑک اٹھتا

ہے، غضب ناک ہوتا ہے گویا آگ لگادی اور اگر کہو اور چوزے تو ہنس دیتا ہے اور یہ لفظ کس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کو گمان ہوتا ہے کہ کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہو گیا ہو تو دیکھئے لغت کے بدلنے سے اثر بدل جاتا ہے اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ ترجمہ ایسا کیا جائے جس سے سامعین کو وحشت نہ ہو۔ (آداب تبلیغ)

سورة الضحیٰ کا لفظی ترجمہ

ارشاد فرمایا کہ ایک صاحب نے مجھ سے درخواست کی کہ وہ ووجدک ضالا فہدی کا لفظی ترجمہ کر دو۔ پھر کچھ سوال کروں گا۔ وہ سمجھے تھے کہ ضال کا ترجمہ گمراہ کریں گے اور میں اعتراض کروں گا۔ میں نے ترجمہ یہ کیا۔ پایا آپ کو آپ کے رب نے ناواقف پس واقف بنا دیا۔ اس ترجمے سے ان کے سب اعتراض پادر ہوا ہو گئے اور حقیقت میں لفظ ضال محاورہ عرب میں عام ہے چچو و بعد الہدایت اور بے خبری قبل الہدایت کو اور اسی طرح لفظ گمراہ فارسی محاورہ میں عام ہے۔ مگر اردو میں اکثر استعمال اس کا معنی اول میں ہے اس لئے ہماری زبان کے اعتبار سے ترجمہ گمراہ منشاء اشکال ہوتا ہے۔ (الضحیٰ آیت نمبر ۷)

سُورَةُ الْاِنشِرَاحِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝۱

ترجمہ: سو بے شک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی ہونے والی ہے

تفسیری نکات

مع العسر يسرا کی تفسیر

مکہ میں آپ ﷺ کو سخت ایذا میں پہنچتی تھیں جنکے متعلق اس آیت میں حق تعالیٰ نے آپ کو تسلی فرمائی ہے فرماتے ہیں ان مع العسر يسرا اس میں الف لام عہد کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ایذا میں اس وقت آپ کو دی جا رہی ہیں اور جو دشواری اس وقت موجود ہے اس کے بعد آسانی ہونے والی ہے۔

یہ تفسیر حق تعالیٰ نے میرے قلب پر القاء فرمائی ہے۔ اس سے بہت سے اشکالات رفع ہو گئے اگر لام عہد کے لئے نہ مانا جائے تو ایک اشکال تو یہ ہوتا ہے کہ ہم بہت سی مشکلات کو آسان ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے خیر مسلمانوں کے مصائب کے متعلق تو یہ جواب بھی دے سکتے ہیں کہ آخرت میں يسر ہو جائے گا۔ لیکن اگر العسر کو عام رکھا جائے تو اس میں کفار کے مصائب بھی داخل ہوں گے اور ظاہر ہے کہ ان کے مصائب قیامت میں بھی حل نہ ہوں گے۔ اب لام کو عہد کے لئے ماننے سے کوئی اشکال نہ رہا۔

لیکن اس پر یہ سوال باقی رہے گا کہ پھر بزرگوں نے اس کو عام طور پر ہر جگہ کیوں پیش کیا ہے۔

جیسا کہ حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی پریشانی عرض کی تو آپ نے فرمایا لسن يغلب عسر

یسرین اور ظاہر ہے کہ یہ اشارہ اسی آیت کی طرف ہے کہ ایک عسر دوسرے پر غالب نہیں آسکتا بوستان کے ان اشعار میں۔

کے مشکلے برد پیش علیؑ... الخ

یہی حکایت مراد ہے بعض نے اس حکایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے جواب میں فرمایا تھا۔

اذا ضاقت بك البوى ففكر فى الم نشرح فعمس بين يسرين اذا فكرته فافرح

اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یوں نہیں بلکہ اس طرح ہونا چاہیے۔ فبعد العسر يسر ان اذا فكرته فافرح آپ نے قبول فرمایا یہ دونوں شعر اس میں تو مشترک ہیں کہ عسر ایک ہے اور يسر دو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اصولی قاعدہ ہے کہ معرفہ کا اعادہ اگر تعریف کے ساتھ ہو وہ عین اول ہوتا ہے اور نکرہ کا اعادہ اگر تکمیل کے ساتھ ہوتا ہے تو وہ غیر اول ہوتا ہے تو آیت میں عسر تو ایک ہو اور يسر دو ہوئے اس میں تو دونوں شعر مشترک ہیں اور اس میں مختلف ہیں کہ یہ يسر عسر واحد کے بعد ہیں یا اس کے طرفین میں ہیں۔ مگر اشکال مذکور دونوں صورتوں میں ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہ قول اول تو بطریق اسناد حضرت علیؑ سے ثابت نہیں اور ثابت بھی ہو تو یہ علم اعتبار کے طور پر ارشاد فرمایا ہوگا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے معاملات کبھی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک عسر کے ساتھ یا بعد دو يسر عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ کے ساتھ یہ معاملہ نص سے ثابت ہے اور دوسروں سے نفی نہیں تو امید رکھو کہ حق تعالیٰ تم سے بھی یہی معاملہ فرمائیں گے۔ وانا عند ظن عبدی بی کو ملا کر یہ مضمون زیادہ قوی ہو گیا کہ اس امید سے ان شاء اللہ تمہارے ساتھ ضرور ایسا ہی معاملہ ہوگا۔ تو اس سے تسلی حاصل کرو یہ حاصل ہوگا حضرت علیؑ کے قول کا۔ تو وہ میری تفسیر کے منافی نہیں۔

بہر حال اس آیت میں حضور کو تسلی ہے نیز میرے ذوق میں ظاہر یہ ہے کہ اس میں ان مع العسر يسرا کا تکرار محض تاکید کیلئے ہے اور تاکید میں نکتہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں مختلف قسم کی تکلیفیں تھیں تو ایک مرتبہ ان مع العسر يسرا فرمانے سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید کسی خاص نوع عسر کے زوال کی خبر دی گئی ہے اس کے بعد یہ فکر ہوتا کہ نامعلوم کونسی عسر کے زوال کی خبر دی گئی ہے تکرار جملہ سے یہ شبہ رفع ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ ہر قسم کے عسر کے لئے آسانی کا وعدہ ہے اور یہ استغراق عہد کے منافی نہیں مراد افراد معبودہ کا استغراق و عموم ہے اور لفظ مع میں نکتہ یہ ہے کہ گو مراد معنی بعد ہے مگر لفظ بعد سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نہ معلوم کتنی مدت کے بعد يسر ہوگا اس لئے لفظ مع اختیار فرمایا کہ کچھ زیادہ دیر نہیں۔ ایسی بعدیت ہے کہ گویا معیت ہی ہے یونس علیہ السلام کی وہ پستی اور نزول عین ترقی تھی تو ضد کے جالب ضد ہونے پر کیا شبہ کیا جائے بلکہ معاملات باطن میں تو ضد عین ضد بھی ہو جاتی ہے مگر باعتبارات مختلفہ اعتبارات کا ملانا ضروری ہے۔ ولولا الاعتبار لبطلت الحکمة یہی وہ مضمون ہے جس کی طرف آیت ان مع العسر يسرا میں میرا ذہن منتقل ہوا کہ کبھی ضد بھی جالب ضد ہو جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سختی و دشواری کے ساتھ آسانی ہے تو اس میں لفظ مع کو سمیت پر دلالت نہیں کرتا محض اقتران پر دلالت ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقتران محض اتفاقی نہیں بلکہ عسر کو يسر

میں دخل ہے کیونکہ عمر سے نفس پامال ہوتا ہے اور عارف کو اس وقت اپنا عجز و فنا مشاہد ہوتا ہے نیز صبر جمیل و رضا بالقضا حاصل ہوتا ہے یہ سب یسر و فرح کا سبب بن جاتے ہیں اس کے ساتھ جب وہ حدیث طلالی جائے کہ انبیاء پر تکالیف و شدائد اس لئے زیادہ آتے ہیں تاکہ ان کے درجات بلند ہوں پھر تو عمر کے سبب یسر ہونے میں کوئی بھی اشکال نہ رہے گا اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لیجئے کہ عسر یسر باطنی کا سبب تو ہوتا ہی ہے کیونکہ درجات بڑھتے ہیں مگر اکثر یسر ظاہری کا بھی سبب ہو جاتا ہے۔ آخرت متقین کے واسطے ہے اور ہم اپنے رسولوں کی اور مومنین کی مدد ضرور کریں گے اور اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ایمان والوں سے اور جنہوں نے اچھے عمل کئے کہ ان کو ضرور زمین میں خلیفہ بناؤں گا اور بے شک زمین کے میرے بندے جانشین ہوں گے۔

عموماً انبیاء علیہم السلام اور ان کے قبعین کے ساتھ یہی معاملہ ہوا ہے کہ اول ان پر عسر ہوا پھر انجام کار ہر طرح یسر حاصل ہوا کہ ظاہر میں بھی وہ اپنے اعداء پر غالب ہوئے پس یسر باطنی کے اعتبار سے تو مع العسر یسر میں مع اپنے حقیقی معنوں میں ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ یسر ہے کیونکہ انبیاء کی ترقی درجات عین عسر کی حالت میں ہوتی رہتی ہے۔

یسر ظاہری کے اعتبار سے بمعنی بعد سے تعبیر فرمایا جو تفسیر لیجئے گا ویسے ہی مع کے معنی لے لیجئے بہر حال اولاً یہ مسئلہ خود بخود میرے دل میں آیا تھا کہ ضد سبب ضد بھی ہو جاتی ہے پھر اس آیت میں بھی اس کی طرف ذہن چلا گیا جس کی تقریر ابھی کر چکا ہوں۔ الحمد للہ مضمون کلی بھی بیان ہو گیا اور آیت سے اس کا تعلق بھی بیان ہو گیا۔

سُورَةُ الْعَلَقِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝

ترجمہ: جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔

کسی نے منی میں کیڑوں کا ثبوت قرآن سے دیا

ایک صاحب نے منی میں کیڑے ہونے کا ثبوت قرآن کریم سے دیا۔ سورۃ اقرآن میں لفظ من علق جو تک کو کہتے ہیں اور کیڑا ایک ہی چیز ہے ہمارے قرآن میں وہ چیزیں موجود ہیں جو اب تیرہ سو برس کے بعد لوگوں کو معلوم ہوئیں۔ دین میں ایسی جرات ہوئی ہے لوگوں کو کہ ہر شخص دخل دینے کو تیار ہے لغت تک کے علم کی ضرورت نہیں رہی۔ ہر کیڑا تو جو تک نہیں اور منی میں جو تک نہیں اور مجاز کی کوئی دلیل نہیں پھر القرآن یفسر بعضہ بعضا اور دوسری آیات میں فرمایا ہے من نطفة ثم من علقہ ثم من مضغہ جس سے صاف واضح ہوا کہ علق ایسی کوئی چیز ہے جو نطفہ و مضغہ کے درمیان میں ہے تو وہ خون بستہ ہے اور وہ کیڑا تو نطفہ کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ نطفہ کے بعد اور مضغہ کے قبل پس علق کے معنی لغت عرب میں خون بستہ کے ہیں۔ کیا قرآن سے عقیدت اور محبت ہے کہ اس میں وہ چیزیں داخل کی جاتی ہیں جن کو اس کی زبان بھی شامل نہیں اور اس خرافات کو حمایت دین کہا جاتا ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت ج ۲۰ ص ۱۸۵ تا ۱۸۶)

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝۱۹ السجدة

تسبیح: اور (بدستور) نماز پڑھتے رہیے اور (خدا کا) قرب حاصل کرتے رہیے۔

تفسیری نکات

نماز کا اصلی مقصود

واسجدواقترب اور نماز پڑھتے رہئے اور خدا کا قرب حاصل کرتے رہئے۔ سو نماز کا فائدہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں واسجدواقترب یعنی سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ پس نماز کا اصلی مقصود قرب ہے مولانا فرماتے ہیں۔

قرب تر ہستی بہ بالا رفتن است بلکہ قرب از قید ہستی رستن است یعنی قرب اس کا نام نہیں ہے کہ نیچے سے اوپر کو چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ قید ہستی سے چھوٹ جاؤ اس لئے کہ اوپر جانا قرب جب ہوتا کہ خدا تعالیٰ کا مکان اوپر ہوتا۔ خدا تعالیٰ مکان سے پاک ہے۔ پس اس کا قرب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملا دو اسی کو وصل کہتے ہیں۔ بعض لوگ وصل کے خدا جانے کیا کیا معنی سمجھتے ہیں وصل کے معنی الہ فن سے پوچھئے شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

تعلق حجاب ست و بے حاصلی جو پیوند ہا بکسلی واصلی یعنی غیر کے ساتھ علائے جب قطع کر دو گے واصل ہو جاؤ گے۔ یہی تعلق حجاب ہے پس سجدہ کی غرض اپنی اس ہستی و تعلق کو مٹانا اور ہستی کا مٹانا یہ نہیں ہے کہ سٹکھیا کھا کر مر رہو۔ مطلب یہ ہے کہ دعویٰ اور انانیت دماغ میں سے نکالو یہ سجدہ اسی کا سامان ہے اس لئے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور پھر تمام اعضاء انسان کے اندر اشرف چہرہ ہے اسی واسطے چہرہ پر مارنا حرام ہے۔

حکم ہے کہ مجرم کے بھی چہرہ پر مت ماور قتل کرنا جائز اور چہرہ پر مارنا ناجائز۔ اس لئے کہ چہرہ معظم ہے تو ایسے شریف عضو کو حکم ہے کہ ارذل الاشیاء کے سات ملصق کر دو یعنی زمین کے ساتھ جو بہت سے وجوہ سے اور نیز باعتبار چیز کے پس ترین مخلوق ہے تو یہ کا ہے کی تعلیم ہے اسی کی تعلیم ہے کہ اپنے کو مٹا دو اور ہستی کو کھو دو کہ تمہاری ہستی تمہارا حجاب بن رہی ہے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

میاں عاشق و معشوق ہیج حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز
پس نماز کی یہ حکمت ہے۔ مگر جرمنی صاحب نے چونکہ ورزش اس کی حکمت بیان کی ہے تو ہمارے بھائی
اس تحقیق پر غش ہیں۔

یاد رکھو! شارع علیہ السلام نے یہ حکمت نماز کی کہیں بیان نہیں کی اور جو چیز شریعت میں نہیں ہے وہ سب
ہیج ہے گو اس جرمنی کی زبان سے اتنا کلنا بھی غنیمت ہے لیکن اے بھائیو! تم کو کیا ہو گیا ہے واسجد
واقتراب کے ہوتے ہوئے ایک جرمنی کافر کی تحقیقات کو پسند ہی نہیں بلکہ اس پر ناز کرتے ہو کیونکہ خواہ مخواہ
گداگری کرتے ہو؟ تمہارے یہاں سب کچھ ہے آپ لوگوں کی وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں۔

یکہ سد پر نان ترا فرق سر
تاہی جوئی لب ناں در بدر
تاہزانوئے میاں قعر آب
وز عطش وز جوع کشتستی خراب

اے صاحبو! آپ کے یہاں ساری دولتیں موجود ہیں کیوں فقیروں سے مانگتے ہو کیوں جرمنیوں کا کاسہ لیس
کرتے ہو۔

سُورَةُ الْقَدْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ﴿۱﴾

ترجمہ: شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے

تفسیری نکات

شب قدر کا ثواب

اور یہی خیال میرا لیلۃ القدر کے متعلق ہے کہ وہاں جو الف شہر فرمایا وہ الف تحدید کے لئے نہیں بلکہ تکثیر کثیر کے لئے ہے گو وہ فی الواقع خدا کے نزدیک ضرور محدود ہوگا کیونکہ کمال شیء عندہ بمقدار منصوص ہے اور جب خدا کے نزدیک محدود ہے تو واقع میں بھی محدود ہی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے (بلکہ یوں کہئے کہ واقع خدا تعالیٰ کے علم کے مطابق ہے) پس واقع میں تو ثواب لیلۃ القدر محدود ہے مگر یہاں تحدید مذکور نہیں اور اگر غیر محدود و غیر متناہی بمعنی لا تسقف عند حد کہو تو یہ فی نفسہ ممکن ہے مگر لیلۃ القدر کے ثواب کا بایں معنی غیر متناہی ہونا محتاج دلیل ہے اور اس پر دلیل قائم ہونے کی ضرورت ہے جب دلیل نہیں تو اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا پس ظاہر بھی ہے کہ وہ واقع میں محدود بمعنی موقوف عند حد ہے مگر وہ حد الف نہیں اب یہ سوال رہا کہ جب الف کی تحدید نہیں تو الف شہر کیوں فرمایا اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ لغت عرب میں عدد کے لئے الف سے زیادہ کوئی لغت موضوع نہیں جیسے ہمارے یہاں مہاسنکہ سے آگے کوئی لفظ نہیں اس سے آگے کوئی شمار کرے تو ایک مہاسنکہ دو مہاسنکہ سو مہاسنکہ کہے گا کوئی اور لغت نہیں بیان کر سکتا اسی طرح اہل عرب الف کے آگے جس عدد کو بیان کریں گے لفظ الف ہی کے ذریعہ سے بیان کریں گے جیسے الف الف ماتہ الف وغیرہ جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ الفاظ عدد کا متنبی عرب میں الف ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جو عدد

تمہارے نزدیک اعداد کی غایت اور منتہی ہے لیلۃ القدر اس سے بھی بڑھ کر ہے پھر لفظ خیر اسم تفضیل ہے معنی یہ ہوئے کہ بہت بڑھ کر سواب تو اگر الف تحدید کے لئے بھی تب بھی خیر عدم تحدید پر دل ہے خیر یہ تضاعف الی غیر المعدود تو قانونی طور پر نہیں بلکہ بطریق فضل ہے مگر دس گونہ ملنا تو قانون ہے جو کہ واقعہ صلوة میں شروع ہوا۔

عبادات شب قدر کا ثواب لامحدود ہے

ارشاد فرمایا کہ لیلۃ القدر خیر من الف شہر میں مراد الف کا عدد معین نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ لیلۃ القدر افضل اور بہتر ہے جمیع ازمنہ سے گوان ازمنہ کی مقدار کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو یہ معنی اس لئے مراد لیا گیا ہے کہ عرب کے لوگوں میں حساب کی کمی کی وجہ سے الف سے زائد مقدار کے لئے کوئی لغت مفرد موضوع نہیں پس حاصل یہ ہے کہ زائد سے زائد مدت جو تم تصور کر سکتے ہو لیلۃ القدر اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ اب یہ شبہ کہ بجائے شہر سال کیوں نہیں فرمایا۔ اس کا یہ جواب ہے کہ کفار عرب کے ہاں چونکہ سال نسبی کی وجہ سے کم و بیش ہوتا رہتا تھا۔ منضبط نہ تھا۔ اور شہر کا اہتمام و انضباط وہ کرتے تھے اس لئے شہر کو اختیار فرمایا۔ باقی سال ان کے ہاں ٹھیک نہ تھا۔ کبھی تیرہ مہینے کا بنا دیا۔ کبھی گیارہ کا کبھی پورا کبھی کسی مہینہ کو سال میں آگے کر دیا کبھی پیچھے۔ آنحضرت ﷺ کی ۹ ہجری میں حج نہ کرنے کی ایک وجہ علاوہ شغل ہدایت و فود کے یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس سال گواصلی حساب سے وہ مہینہ ذی الحج کا تھا مگر ان کفار کے حساب سے کچھ آگے پیچھے تھا۔ لہذا حضور نے بوجہ رفع تہمت اس سال حج نہیں کیا۔ شاید کفار یہ سمجھیں کہ یہ لوگ ملت ابراہیمی کے خلاف غیر موسم حج میں حج کرتے ہیں اس کی ویسی ہی مثال سمجھنی چاہیے جیسا کہ آنحضرت نے بناء قریش کو باس وجہ رہنے دیا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھ جائیں کہ کعبہ کو گرا دیا۔

ارشاد فرمایا کہ لیلۃ القدر خیر من الف شہر میں مراد الف کا عدد معین نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ لیلۃ القدر افضل اور بہتر ہے جمیع ازمنہ سے گوان ازمنہ کی مقدار کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو یہ معنی اس لئے مراد لیا گیا ہے کہ عرب کے لوگوں میں حساب کی کمی کی وجہ سے الف سے زائد مقدار کے لئے کوئی لغت مفرد موضوع نہیں پس حاصل یہ ہے کہ زائد سے زائد مدت جو تم تصور کر سکتے ہو لیلۃ القدر اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے اب یہ شبہ کہ بجائے شہر کے سال کیوں نہیں فرمایا۔ اس کا یہ جواب ہے کہ کفار عرب کے ہاں چونکہ سال نسبی کی وجہ سے کم و بیش ہوتا رہتا تھا۔ منضبط نہ تھا اور شہر کا اہتمام اور انضباط وہ کرتے تھے اس لئے شہر کو اختیار فرمایا باقی سال کا اہتمام ان کے ہاں کچھ ٹھیک نہ تھا کبھی تیرہ مہینے کا بنا دیا کبھی گیارہ مہینے کا کبھی کسی مہینہ کو سال میں آگے کر دیا کبھی پیچھے۔ (مکالات حکمت ص ۱۰۹)

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ

جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝

ترجمہ: بے شک جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ آتش دوزخ میں جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں۔

تفسیری نکات

کفار اور مشرکین کو خلود فی النار کا ثبوت

ان الله لا يغفر ان يشرك به (سورة نساء ۴۸)

مگر شاید کوئی اس پر یہ شبہ کرے کہ یہاں تو صرف شرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر نہیں اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو شرک نہیں بلکہ موحد ہیں۔ مگر اسلام سے ابا کرتے ہیں ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے؟ تو سنے دوسری جگہ مذکور ہے ان الذين كفروا من اهل الكتاب والمشركين في نار جهنم خالدين فيها اولئك هم شر البرية (البينة ۶) اس میں کافر کو اہل کتاب و مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی جہنم مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہو گئی اور یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے۔ جس کے معنی مکث طویل کے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔ جواب یہ ہے کہ دوام خلود کے منافی بھی نہیں پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے اور یہاں خلود بمعنی دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے۔ وہ یہ کہ مشرکین کے لئے خلود بمعنی دوام ہی ہوگا اور یہاں

کافر و مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے جب مشرک کے لئے خلود بمعنی دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہوگا۔ ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا۔ اور یہ ممتنع ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے فالذین کفروا قطعت لهم ثياب من نار الی قوله تعالیٰ کلما ارادوا ان یخرجوا منها من غم اعدوا فہیا اور ارشاد ہے ان الذین کفروا اوصدوا عن سبیل اللہ ثم ماتوا وهم کفار فلن یغفر اللہ لهم پس اب کافر کا بھی ہمیشہ کیلئے معذب ہونا صاف طور پر معلوم ہو گیا جس سے اس کی عدم مغفرت بھی سمجھ میں آگئی ہوگی۔

اور یہاں سے ایک اشکال کے لئے مندرج ہونے پر تنبیہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ خلود کے معنی مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہوگئی جو قاتل عمد کے بارہ میں وارد ہے ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاء جہنم خالداً فیہا کہ اس سے قتل عمد کی توبہ کا مقبول نہ ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خلود بدوں قید دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو مستلزم نہیں۔ نہ یہاں کوئی قرینہ ارادہ دوام کے لئے مرنج ہے۔ اس لئے مدلول آیت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہوگا (مگر کسی وقت نجات ہو جائے گی) گو مدت دراز کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اس کی توبہ بھی قبول ہونی چاہیے اس میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک قاتل عمد کے لئے توبہ نہیں۔ مگر جمہور صحابہؓ کے نزدیک قبول ہے پھر صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین و آئمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ اس کی توبہ مقبول ہو سکتی ہے جب کہ قاعدہ شرعیہ سے ہو اور قاعدہ ہے کہ اجماع متاخر اختلاف متقدم کا رافع ہوتا ہے لہذا اب یہ مسئلہ اجماعی ہے مگر کفار و مشرکین کے لئے دوسری بعض آیات میں خلود کے ساتھ دوام بھی مذکور ہے اس لئے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور ابد وہ ہے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو حاصل یہ ہوا کہ کفار و مشرکین جہنم میں ایسی دراز مدت کے لئے داخل ہوں گے جس کا انقطاع ہی نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو خواہ اس کے ساتھ مشرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کیلئے سزا ابدالاً بابد جہنم ہے۔

کفر سے بڑا جرم

جب ترک اسلام کی سزا یہ ہے کہ تو اس سے اسلام کی عظمت و فضیلت اور اس کی ضرورت کا درجہ معلوم ہو گیا اور ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ بعد قبول کر کے ترک کر دے۔ دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی سے اشد ہے چنانچہ قوانین

سلطنت میں بھی باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جاوے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریائے شور کے کچھ سزا ہی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بن کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اس کی تعلیم کو دوسروں کی نظروں میں حقیر کرنا ہے۔ دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ سے مخالفت ہے اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور کبھی وہ آپ کی مذمت و ہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں کہ میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہے۔ دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال آپ کا دوست رہا۔ پھر کسی وقت مخالف بن گیا اس کی مخالفت سے بہت ضرر پہنچتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے۔ لوگ ان پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کہہ رہا ہے اس کا منشاء محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں اس لئے مخالف ہو گیا (حالانکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ اترے پترے معلوم کرنے کے بعد ہی دشمن بنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے دوستی ہی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانہ میں مجھے اس کا راز دار سمجھ لیں گے تو پھر مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص راز دار رہ چکا ہے اس کو ضرور کچھ ناگوار باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس لئے مخالف ہو گیا چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ و قال طائفة من اهل الكتاب امنوا بالذی انزل علی الذین امنوا ووجه النهار واکفروا اخره لعلهم یسرجعون پس ہر چند کہ دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر) عادۃ لوگ دوستوں کی مخالفت سے عموماً جلد متاثر ہو جاتے ہیں (اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے) اس لئے عقلاً و شرعاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے اسی لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

اس تقریر سے آیت کے ترجمہ و تفسیر کا بیان تو ہو گیا کیونکہ اس آیت میں اصل مقصود اسلام کی فضیلت ہی کا بیان ہے مگر مجھے اس وقت صرف بیان فضیلت پر اکتفا مقصود نہیں بلکہ اس پر ایک دوسرے مضمون کو مرتب کرنا ہے جس کو آئندہ بتلاؤں گا۔

محدود کفر پر غیر محدود عذاب شبہ کا جواب

اس سے پہلے ایک شبہ عقلی کا جواب دیدینا چاہتا ہوں۔ شبہ یہ ہے کہ شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے؟ حالانکہ سزا مناسب جنایت ہونی چاہیے۔ اور یہاں جنایت متناہی ہے کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ مقدمہ تو مسلم ہے کہ سزا جنایت کے مناسب ہونی چاہیے مگر کیا تناسب کے یہ معنی ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو اگر یہی بات ہے تو چاہیے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو اور ڈاکو گرفتار ہو کر آئیں تو حاکم ڈاکوؤں کو صرف دو گھنٹہ کی سزا دے دے اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف مانیں گے؟ اور سزا کو عنایت کے مناسب مانیں گے؟ ہرگز نہیں اس سے معلوم ہوا کہ سزا و جنایت میں مناسبت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدر شدت جرم ہو اب تم خود فیصلہ کر لو کہ شریعت نے کفر کی سزا میں جو شدت بیان کی ہے وہ شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں اور یہ جرم شدید ہے یا نہیں؟

جواب جزا و سزا میں نیت کا دخل

شاید آپ کہیں کہ جرم شدید تو ہے مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابداً باء جہنم ہو میں کہوں گا کہ یہ خیال آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے صرف فعل کی سزا ظاہری صورت پر نظر کی ہے حالانکہ سزا و جزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے بلکہ نیت کو بھی اس میں بہت بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے چنانچہ اگر ایک شخص دھوکہ سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا گو صورت گناہ موجود ہے کیونکہ نیت نہ تھی اور اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دوکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اس کو دیدے جسے یہ شراب سمجھ کر پی لے تو اس کو گناہ ہوگا کیونکہ اس کی نیت تو شراب پینے ہی کی تھی۔ اسی لئے فقہاء نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرے مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے تو اس کو گناہ ہوگا اسی طرح اگر مجامعت میں تصور کسی اجنبیہ کا کرے یعنی بیوی سے مجامعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا فلاں اجنبیہ سے مجامعت کر رہا ہوں اور اس کی صورت ذہن میں حاضر کر کے اس سے لذت لے تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجائے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہمبستر ہوا کہ یہی میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اور یہ وطی زنا شمار نہ ہوگی بلکہ وطی بالشبہ ہوگی جس سے ثبوت نسب بھی ہو جاتا ہے اور

عدت بھی لازم ہوتی ہے جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ ظاہر میں کفر کا فرمتنا ہی ہے مگر اس کی نیت یہ تھی کہ اگر زندہ رہا تو میں ابدلاً با داسی حالت پر رہوں گا اس لئے اپنی نیت کے موافق اس کو ابدلاً با د جہنم کا عذاب ہوگا اور اسی طرح مسلمان کا اسلام کو بظاہر متنا ہی ہے مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا اس لئے اس کے لئے ابدلاً با د ثواب جنت ہے۔

اتلاف حقوق الہی کی سزا جواب

اور ایک دقیق جواب یہ ہے کہ کفر سے حقوق الہی کی تقویت ہے اور حقوق الہی غیر متنا ہی ہیں تو ان کی تقویت کی سزا بھی غیر متنا ہی ہونی چاہیے اور اسلام میں حقوق الہی کی رعایت ہے وہ غیر متنا ہی ہیں تو ان کی رعایت کا بدلہ بھی غیر متنا ہی ہونا چاہیے۔ الحمد للہ اب یہ اشکال بالکل مرتفع ہو گیا

اب میں اس مقصود کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو فضیلت اسلام پر مجھے متفرع کرنا ہے اور وہ دو مقصود ہیں ایک راجع ہے اپنی طرف دوسرا راجع ہے دوسروں کی طرف یعنی ایک مقصود لازم ہے ایک متعدی۔

(محاسن الاسلام بلحاظ مواضع محاسن اسلام ص ۲۵۲، ۲۵۳)

سُورَةُ الزَّلْزَالِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۗ وَمَنْ يَعْمَلْ

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۙ

ترجمہ: پس جو شخص ذرا برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرا برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

تفسیری نکات

اہل غفلت کی غلطیاں

اس آیت کا مضمون سمجھنے میں جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں ایک وہ جو اہل غفلت کو ہوتی ہیں دوسری وہ جو اہل ذکر کو پیش آتی ہیں۔ پھر اہل ذکر میں دو طبقہ ہیں ایک اہل ظاہر اور دوسرے اہل باطن۔ ان میں سے ہر ایک کو اس مضمون کے متعلق غلطی ہوئی ہے سو جو غلطیاں اہل غفلت کو ہوئی ہیں مجملہ ان کے ایک یہ غلطی ہے کہ اس آیت کے جو دو جزو ہیں اول فمن يعمل مثقال ذرة خیرا یرہ اور دوسرے ومن يعمل مثقال ذرة شرا یرہ ان لوگوں کی دونوں پر نظر نہیں یہ بات تو نہیں کہ اس مضمون کا ان کو اعتقاد نہیں ہے اعتقاد اور علم تو ہے لیکن عمل سے ان کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس طرف التفات نہیں ہے۔ اس سے غفلت ہے میں اس کا نام غفلت رکھتا ہوں حضرات صوفیہ اسی کا نام جہل رکھتے ہیں لیکن چونکہ جہل لفظ سے بگڑتے ہیں کیونکہ اپنے کو عالم اور معنی شناس جانتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو ذی علم ہیں ہم جاہل کدھر سے ہیں۔ اس لئے میں نے اس لفظ کو چھوڑ کر اس کو غفلت سے تعبیر کیا ہے۔

اہل غفلت کا حال

ان لوگوں نے اپنے لئے تو فمں بعمل مثقال ذرۃ خیر ایرہ پر نظر رکھی یعنی خود اگر تھوڑا سا عمل نیک کیا تو اس پر نظر ہے اور دوسروں کے لئے ومن بعمل مثقال ذرۃ شر ایرہ پیش نظر ہے یعنی ان کے اعمال نیک پر نظر نہ کر کے ان کے برے ہی اعمال پر نظر ہے اور سب کو حقیر جانتے ہیں ایک نماز انہوں نے کیا شروع کی کہ سارے جہان کو حقیر جاننے لگے اور خود ان حضرات کی حالت خواہ کچھ ہی ہو۔ چنانچہ بہت لوگ ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں اور وظیفے گھونٹتے ہیں اور اپنے کو مقدس جانتے ہیں اور حقوق العباد ضائع کر رہے ہیں۔ دھوکے دیکر لوگوں کے مال چھین رہے ہیں اور اس پر بھی دوسروں کو حقیر جانتے ہیں حالانکہ جیسے ترک صلوة حرام ہے حقوق العباد ادا نہ کرنا اور دوسروں کو حقیر جانتا اور ریابھی حرام ہے۔ (عمل الذرہ)

عذاب تطہیر

خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن نہ کسی کی خیر اگر چہ وہ ذرا ہی سی ہو ضائع ہو جائے گی اور نہ کسی کی شر اگر چہ بہت کم ہو غائب ہوگی۔ میں نے خیر کے ساتھ ضائع کا لفظ اور شر کے لئے لفظ غائب اس لئے استعمال کیا ہے کہ خیر پر تو اللہ تعالیٰ جزا دیں گے اس لئے وہ ضائع نہ ہوگی۔ بخلاف شر کے کہ گونا گونا ضرور ہوگی اللہ تعالیٰ سے کہیں چھپے گی نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس پر ضرور ہی عتاب ہو۔ بلکہ اکثروں کے لئے امید یہ ہے کہ فضل و کرم سے معاف فرما دیں گے اور بعض کو سنا بھی دیں گے لیکن وہ بھی رحمت اور فضل و کرم ہی ہوگا مقبولین پر دنیا کے مصائب تو فضل و رحمت ہیں ہی کہ ان پر اجر و ثواب ہے چنانچہ اس کو سب جانتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ مقبولین پر آخرت میں بھی اگر کوئی کلفت ہوگی تو وہ بھی رحمت ہی ہے اس کو سن کر شاید تعجب ہوا ہوگا۔ لیکن قرآن سے خود اس کا اثبات ہوتا ہے چنانچہ کفار کے بارہ میں ارشاد ہے لا یکلمہم اللہ یوم القیمة ولا یرکبہم یعنی اللہ تعالیٰ کفار سے قیامت کے روز نہ کلام فرما دیں گے اور نہ ان کو پاک کریں گے۔ مفہوم مخالف تمام علماء کے نزدیک موقع و عید میں معتبر ہے پس معلوم ہوا کہ یہ آیت کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور مسلمانوں سے کلام بھی فرما دیں گے اور ان کو پاک بھی کریں گے پس عذاب جو ہوگا وہ محض عذاب کی صورت میں ہے حقیقت میں پاک کرنا مقصود ہے گناہوں سے۔

آخرت کی تکالیف بھی مسلمانوں کے لئے رحمت ہیں

پس آخرت کی تکالیف بھی مسلمانوں کے لئے رحمت ہیں ان کے حق میں وہ جہنم نہیں ہے جہنم کفار کے لئے ہے چنانچہ اسی واسطے ارشاد ہے اعدت للکفرین یعنی تیار کی گئی ہے کفار کے لئے پس جہنم من حیثی جہنم اور

عقوبت من حیث ہی عقوبت صرف کافرین ہی کے لئے ہے اور ہمارے لئے وہ ترکیہ اور تطہیر ہے باقی تکلیف اس لئے ہوں گی کہ میل ہمارا بے حد ہے جب تک خوب تیز پانی سے غسل نہ دیا جاوے گا میل علیحدہ نہ ہوگا۔ اور میل کے رہتے ہوئے جنت میں جانا ممکن نہیں اس لئے کہ جنت کا خاصہ ہے کہ نجاست لے کر کوئی وہاں نہیں جاسکتا۔

خروج آدم کی حکمت

بعض حضرات محققین نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کا باعث حقیقت عتاب نہیں تھا بلکہ جس درخت سے کھانے کی ممانعت فرمائی گئی تھی اس کی خاصیت یہ تھی کہ اس کے کھانے سے فضلہ پیدا ہوتا تھا جب آدم علیہ السلام نے اس کو کھایا تو استنجے کی ضرورت ہوئی اور وہ محل اس کا تھا نہیں اس لئے نکلنے کا حکم ہوا اس لئے کہ جنت میں پولیس تو تھی نہیں یہاں دنیا میں پانخانہ پھرنے آئے تھے۔ واقع میں حقیقی عتاب اس کا سبب نہ ہوا تھا۔ مثلاً یہاں جامع مسجد میں کسی کو پانخانہ کی ضرورت ہو تو اس کو یہاں سے نکالیں گے۔ اس لئے کہ مسجد پانخانہ کی جگہ نہیں ایسی ہی جنت گندگی کی جگہ نہیں۔

اور اس پر ایک مقولہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا یاد آ گیا فرماتے تھے کہ آدم علیہ السلام کا نکلنا واقع میں رحمت ہے کیونکہ اگر آدم علیہ السلام نہ نکلتے اور ان کی اولاد ہوتی تو اولاد میں سے ضرور ایسے ہوتے کہ وہ نکلتے اس لئے کہ جب آدم علیہ السلام ہی سے اس کے کھانے سے صبر نہ ہوا تو اولاد سے تو بطریق اولیٰ نہ ہوتا۔ پھر اگر اولاد میں سے نکلتے تو ایسی حالت میں نکلتے کہ جنت بھری ہوئی ہوتی۔ وہ نکلنے والا کسی کا بیٹا ہوتا کسی کا باپ ہوتا کسی کی ماں ہوتی تو اس کے نکلنے سے ایک کھرام مچ جاتا اور جنت جنت نہ رہتی بلکہ زحمت ہو جاتی۔ حق تعالیٰ کی عجیب رحمت ہے کہ آدم علیہ السلام کو یہاں بھیج دیا اور اولاد کو حکم ہوا کہ پاک ہو کر ہمارے پاس آویں۔

چنانچہ ارشاد ہے و من تزکی فانما یتزکی لنفسہ پس جس نے ان اوامر کو سمجھ لیا اور گناہوں اور شوائب نفس سے غسل کر کے پاک ہو گیا اور تقویٰ کا لباس پہنا وہ پھر جنت میں جو ہمارا اصلی ٹھکانہ ہے چلا جائے گا اور جس نے غسل نہ کیا اور نہ کپڑے بدلے تو اس کو حمام ضرور کرایا جاوے گا تاکہ جنت میں جانے کی اہلیت اس میں ہو جاوے پس مسلمانوں کے لئے دوزخ میں جانا بھی فضل ہوا۔

دلیل اس کی یہ آیت ہے فمن يعمل مثقال ذرة خیرا یرہ و من يعمل مثقال ذرة شرا یرہ (جو شخص ایک ذرے کے برابر بھی کوئی بھلائی کرے گا اس کے (فائدے) کو دیکھے گا اور جو شخص ایک ذرا بھی برائی کرے گا وہ اس کو بھی نظر آئے گی۔

مفہوم آیت

لفظ من عام ہے مطیعین کو بھی اور عاصین کو بھی تو جب یہ فرمایا کہ جو شخص کرے گا تو اس کے عموم میں گنہگار اور فرمانبردار دونوں داخل ہو گئے۔ اس سے صاف طور پر سے معلوم ہوا کہ نیک کام کرنے پر ہر حالت میں ثواب ملے گا کسی وقت میں اس کا ثواب ضائع نہ ہوگا اسی طرح دوسرے جملے میں بھی من عام ہے اور اس سے ناز کا علاج بھی ہو گیا جیسے پہلے من سے مایوسی کا علاج ہو گیا تھا دوسرے من میں فرمانبردار بھی داخل ہوں گے یعنی اگر کوئی بڑا اولیٰ کامل بھی گناہ کرے تو اس کو بھی گناہ ہوگا۔ (الزلزل)

شاید کوئی یہ کہے کہ قرآن شریف میں ہے وانه لحب الخیر لشدید (بیشک وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہے) کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیة (تم پر ضروری کی گئی ہے وصیت جب کسی کو موت آنے لگے اگر وہ مال چھوڑے) یہاں مال کو خیر فرمایا ہے۔ لہذا مال کی ترقی بھی خیر اور بھلائی میں ترقی ہوئی اور فاستبقوا الخیرات (بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو) میں یہ بھی آگئی۔

جواب یہ ہے کہ الخیرات میں مطلق خیر مراد ہے یعنی جو ہر طرح بھلائی ہی بھلائی ہو۔ اور مال ہر طرح بھلائی نہیں اس کی بھلائی ہونے کی بہت سی شرطیں ہیں جن کی رعایت نہیں کی جاتی۔ اس لئے مالی ترقی کو بھلائی میں ترقی نہیں کہہ سکتے اور جس درجہ میں مال بھلائی ہے اس درجہ ترقی کو ہم بھی نہیں روکتے جائز بلکہ فرض کہتے ہیں۔

حضور کا ارشاد ہے کسب الحلال فریضة بعد الفریضة (حلال مال کمانا اور فرضوں کے بعد فرض ہے) (علاج الحرم)

نور قلب اور معاصی یکجا جمع نہیں ہوتے

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ معصیت کیساتھ اعمال صالحہ تو جمع ہو سکتے ہیں فمن بعمل مثقال ذرة خیرا یبرہ' ومن بعمل مثقال ذرة شر ابرہ' لیکن نور قلب اور معاصی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے معاصی اس میں نخل ہیں۔ (الافاضات الیومیہ ج ۶ ص ۷۵)

سُورَةُ الْعَصْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالْعَصْرِ ۝١ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝٢ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالْحَقِّ ۝٣ وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ ۝٤

تفسیر: قسم ہے زمانہ کی (جس میں نفع و نقصان واقع ہوتا ہے) کہ انسان (بوجہ تفسیح عمر کے) بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ کہ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے کہ (یہ مال ہے) اور ایک دوسرے کے (اعتقاد) حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (اعمال) کی پابندی کی فہمائش کرتے ہیں۔

تفسیری نکات توضیح قسم

قسم کے ساتھ تاکید کلام کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے اس کے نام کی عظمت کی وجہ سے قسم کھانے والا جھوٹ سے رکتا اور ڈرتا ہے کہ اگر اس کا نام لے کر جھوٹ بولوں گا تو وبال میں گرفتار ہو جاؤں گا یہ صورت تو قرآن میں اللہ تعالیٰ کی کھائی ہوئی قسموں میں نہیں ہو سکتی کیونکہ مخلوق میں کوئی ایسا معظم نہیں جس کا نام لینا خدا کو کسی امر سے مانع ہو۔ دوسری صورت تاکید قسم کی یہ ہے کہ مقسم بہ سے جواب قسم کی توضیح مقصود ہو میں نے جہاں تک غور کیا تو اقسام قرآن میں یہی صورت معلوم ہوئی کہ مقسم بہ کو جواب قسم کی توضیح میں بڑا دخل ہے اور یہ بہت بڑا علم ہے لیکن ہر مقام پر سیاق و سباق کو دیکھنا اور غور کرنا پڑتا ہے اور غور کرنے سے قسم و جواب قسم میں ارتباط معلوم ہو جاتا ہے۔

اب سورة العصر کی قسم کو سمجھے کہ اس کو جواب قسم سے کیا مناسبت ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان دو چیزوں میں مقید ہے ایک زمان میں ایک مکان میں لیکن مکان مستقر ہے۔ یعنی اس کے لئے انقضاء نہیں اور زمان غیر مستقر ہے یعنی اس کے لئے انقضاء ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ جو زمانہ گزر گیا قبضہ سے باہر ہو گیا تو حق تعالیٰ اس قسم سے انسان کے خسارہ کی دلیل بتلاتے ہیں کہ یہ ایسا عاجز ہے کہ جس طرف میں اس کا عمل مقید ہے وہ اس کے اختیار سے باہر ہے اگر کسی وقت میں کوئی عمل اس سے فوت ہو گیا تو اگر یہ اس کا مدارک بھی کرے گا تو دوسرے وقت میں کرے گا اور جو زمانہ عمل سے خالی گزر گیا وہ بے کار گیا۔ تو واقعی انسان بڑے خسارہ میں ہے البتہ مسلمان اس خسارہ سے بچا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ایمان کی دولت ایسی ہے کہ وہ ہر وقت میں باقی رہنے والی ہے کہ ایک دفعہ ایمان کو اختیار کر لینے سے جب تک معاذ اللہ اس کی ضد کا اعتقاد نہ ہو ایمان قائم رہے گا اور یہ ہر وقت میں مومن ہوگا۔ سوتے ہوئے بھی چلتے پھرتے بھی اور کھاتے پیتے ہوئے بھی غرض کوئی وقت اور کوئی ساعت مسلمان کی طاعت سے خالی نہیں گزرتی۔ اگر اس سے اور بھی کوئی عمل صادر نہ ہو۔ تب بھی ایمان تو ایسی طاعت ہے جو ہر وقت اس سے صادر ہو رہی ہے۔ اسی سے کافر کا خسارہ عظیمہ میں ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ کہ اس کا کوئی وقت معصیت سے خالی نہیں گزرتا۔ اگر وہ اور بھی کچھ گناہ نہ کرے۔ تو کفر ہی اس سے ہر وقت صادر ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ کفر اختیار کرنے کے بعد جب تک ایمان نہ لائے کافر ہر وقت کافر ہے۔ کوئی ساعت اس کی کفر سے خالی نہیں گزرتی۔ بس اس قسم سے انسان کے خسارہ کی بڑی دلیل معلوم ہوئی۔ بدوں ایمان کے اس کے خسارہ کی کچھ انتہا نہیں کہ ہر سیکنڈ اور ہر منٹ میں اس کے سر پر عذاب بڑھتا جا رہا ہے اور ایمان کے بعد اس کے نفع کی کچھ انتہا نہیں۔ کہ ہر ساعت میں اس کی طاعت بڑھتی رہتی ہے خلاصہ یہ کہ تمام دنیا جانتی ہے کہ نفع اور خسارہ زمانہ ہی میں ہوتا ہے پس اس شخص سے بڑھ کر کوئی خسارہ میں نہیں۔ جس کا کوئی وقت سیکنڈ خسارہ سے خالی نہ ہو (اور یہ کافر ہے) اور اس شخص سے بڑھ کر کوئی نفع میں نہیں۔ جس کا کوئی وقت کوئی سیکنڈ کوئی حالت نفع سے خالی نہیں (اور وہ مومن ہے)

اور ہر چند کہ مسلمان کا نفع صرف ایمان ہی سے ہر وقت بڑھ رہا ہے مگر پورا نفع جب بڑھے گا جب کہ ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔ کیونکہ عمل صالح سے ایمان قوی ہوتا اور گناہوں سے کمزور ہوتا ہے پس مومن فاسق کا ہر وقت نفع کا بڑھنا ایسا ہے جیسے کسی شخص کو ہر سیکنڈ میں ایک پیسہ کا منافع بڑھتا ہو اور مومن صالح کا ہر وقت نفع بڑھنا ایسا ہے جیسے کسی کا ہر سیکنڈ میں ہزار روپیہ کا منافع بڑھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ پورا نفع اسی کا بڑھ رہا ہے جس کو ہر سیکنڈ میں ہزار روپیہ کا نفع ہوتا ہو۔ پس گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہایت ضروری ہے اور عمل صالح اختیار کرنا لازم ہے۔ تاکہ ہر سیکنڈ میں ہزاروں کی ترقی ہو اور ہزار روپیہ سے کمی ہو کر ایک پیسہ ہی نہ رہ جائے۔ کہ نفع عظیم کے مقابلہ میں

یہ بھی خسارہ ہے گو کافر کے خسارہ کے مقابلہ میں نفس ایمان کا نفع بھی لاکھ درجہ افضل ہے۔

اور اگر معاملہ یہیں تک رہتا تب بھی کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم کو ہزار کا نفع نہ سہی ایک پیسہ ہی کا سہی مگر مصیبت اور خطرہ تو یہ ہے کہ گناہوں کی وجہ سے بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے پھر وہ ایک پیسہ کی بھی ترقی نہیں رہتی بلکہ خسارہ ہی خسارہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عمل صالح اور تو اوصی بالحق اور تو اوصی بالصبر کو کیوں بڑھایا۔ اس کی وجہ یہی ہے جو ہر ایمان کے محافظ ہیں اور گناہ و معاصی اس دولت کے دشمن ہیں جو شخص خود گناہ کرتا یا دوسروں کو گناہ میں مبتلا دیکھ کر نصیحت نہیں کرتا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل سے گناہوں کی نفرت کم ہو جاتی ہے اور پھر زائل ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں کو ہلکی اور معمولی بات سمجھنے لگتا ہے اور یہی کفر ہے۔ غرض اس مقام پر زمانہ کی قسم کو جواب قسم کی توضیح میں بڑا دخل ہے کہ اس سے خسارہ کی دلیل معلوم ہوگی اور یہ دعویٰ مدلل ہو گیا کہ واقعی انسان بڑے خسارے میں ہے۔ اگر ایمان اور عمل صالح سے محروم ہو۔ (التواصی بالحق بالحقہ دعوت و تبلیغ)

مخلوق کی قسم قبیح لغیرہ ہے

اب سمجھئے کہ مخلوق کی قسم قبیح لغیرہ ہے قبیح یعنی نہیں وہ قباحت عارضی ایسی ہے کہ اگر مخلوق مخلوق کی قسم کھائے تو قباحت ہے اور اگر خالق مخلوق کی قسم کھائے تو قباحت نہیں اور وہ شرک اور ایہام شرک ہے۔ اس طرح سے کہ اس میں شبہ ہوتا ہے تعظیم مخلوق کا کیونکہ عادتاً قسم معظم چیز کی کھائی جاتی ہے اس لئے ممانعت ہوگی ہے قسم کھانے کی جیسے بعض مشرکین قسم کھاتے ہیں دریاؤں کی پہاڑوں کی مقصود ان کا یہ ہوتا ہے کہ اتنی بڑی چیز کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولیں گے اس میں ایہام شرک ہے اور ایہام شرک کا شبہ اسی میں ہو سکتا ہے جو خود چھوٹا ہو اور اس سے دوسری چیز بڑی ہو اور خداوند جل جلالہ چونکہ سب سے بڑا ہے اس لئے اس میں یہ شبہ نہیں ہو سکتا چونکہ اس میں ایہام شرک نہیں اس لئے وہ عارضی قسم اس میں نہیں ایک سوال اور رہ گیا کہ قباحت تو لازم نہیں آتی مگر اپنی قسم چھوڑ کر چھوٹی شے کی قسم کیوں کھائی۔ بات یہ ہے کہ قسم سے تین غرضیں ہوتی ہیں غالب تو یہ کہ کسی شے کو معظم بتلانا اور یہ گمان کرنا کہ اگر ہم اس کا نام لے کر جھوٹ بولیں گے تو ہم پر اس کا وبال ہوگا۔ دوسری غرض یہ کہ اس مقسم بہ (جس کے ساتھ قسم کھائی گئی ہو) کا اپنے سے خاص تعلق ہے اگر جھوٹ بولیں تو ہمارے منافع اس سے منقطع ہو جائیں مثلاً بیٹے کی قسم تیسری غرض یہ کہ مقسم بہ کا کثیر النفع ہونا فی نفسہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بڑے کام آتی ہے۔ ہر چند کہ مخلوق کی قسم کھانے سے تینوں احتمال ہو سکتے ہیں مگر شریعت میں احتیاط بہت کی گئی ہے کہ شبہ شرک تو ہر جگہ ہوتا ہی ہے رہا خداوند جل جلالہ جو کسی مخلوق کی قسم کھاتے ہیں اس کی حکمت کیا ہے بلطف دیگر آج کل کی مخترع (من گھڑت) اصطلاح کے موافق یوں کہتے ہیں کہ اس کی فلاسفی کیا ہے

وہ یہ کہ پہلی اور دوسری غرض تو وہاں ہے نہیں لیکن تیسری غرض یعنی حکمت مذکورہ ہے اور غرض کی تفسیر حکمت سے اس لئے کی کہ حق تعالیٰ کو کسی کی کیا غرض ہوئی غرض تو مخلوق کو ہوا کرتی ہے وہاں حکمت ہوا کرتی ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم
یعنی ہم نے اس لئے مخلوق کو نہیں پیدا کیا کہ ہم اس سے نفع اٹھائیں یا اس سے ہماری کوئی غرض انکی ہوئی ہے بلکہ محض اس لئے کہ مخلوق پر احسان کریں۔ پس خداوند عزوجل جلالہ جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اے سننے والو یہ شے کثیر النفع ہے اس کی طرف التفات کرو اور اس سے منتفع ہو۔

مفسدہ کا احتمال تو پہلے ہی دفع ہو چکا تھا۔ اب مصلحت کا سوال بھی ختم ہو چکا خداوند جل جلالہ نے بہت کثرت سے مخلوق کی قسم کھائی ہے۔ مثلاً لا اقسام بیوم القيامة ولا اقسام بالنفس اللوامہ (قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور قسم کھاتا ہوں میں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے ۱۲) فالعصفت عصفا یعنی قسم ہے ان ہواؤں کی جو تندی کے ساتھ چلتی ہیں (۱۲) والفجر (قسم ہے فجر کی ۱۲) والشمس (قسم ہے سورج کی ۱۲) ہر جگہ یہی مراد ہے کہ یہ اشیاء کثیر النفع ہیں ان کی جانب التفات کرو اور حق تعالیٰ کے مخلوق کی قسم کھانے میں ایک راز خاص اور ہے وہ یہ کہ جس مقام پر قسم کھائی ہے اس کے بعد ایک جواب قسم بھی ہوتا ہے تو غور کرنے سے معلوم ہوا کہ مقسم بہ جواب قسم کی جو ایک دعویٰ ہے بمنزلہ دلیل کے ہوتا ہے یعنی خداوند جل جلالہ نے جس چیز کی قسم کھائی ہے اس کے آگے جواب قسم سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مقسم بہ اس دعویٰ کی دلیل ہے اسے ایک مثال سے سمجھئے مثلاً فرماتے ہیں والمرسل عرفا الخ (قسم ہے ان ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں ۱۲) اس سے آگے فرماتے ہیں انما توعدون لواقع (یعنی جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے) قسم کھا کر فرماتے ہیں قیامت ضرور آنے والی ہے والنزعت عرفا الخ (یعنی قسم ہے ان فرشتوں کی جو کافروں کی جان سختی سے نکالتے ہیں ۱۲) یہاں بھی قسم کھا کر فرماتے ہیں قیامت ضرور آنے والی ہے اور اسی طور پر جا بجا قسمیں کھائی ہیں خاص خاص اشیاء کی یہاں ایک دعویٰ ہے قیامت ضرور آئے گی اب اس کی دلیل کی ضرورت ہے مثلاً ہوا ہے کہ اس کے اندر تغیر بتلایا ہے اور ہوا ایک ایسی بڑی چیز ہے جو دم بھر میں بڑے بڑے پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے جسے ہوئے درختوں کو اکھاڑ پھینکتی ہے کیا قدرت اور رحمت ہے جل جلالہ کی ہر وقت لاکھوں من ہوا ہمارے سر پر رہتی ہے کیونکہ جو (آسمان وزمین کے درمیان خلاء) میں تمام ہوا بھری ہوئی ہے جتنی جگہ ہمارے جسم سے رکی ہوئی ہے صرف وہ ہوا سے خالی ہے اور باقی تمام ہوا ہی ہوا ہے اور ہم کو محیط ہے اور ہم کچلنے نہیں دیتے مرتے نہیں تو اس تغیر سے معلوم ہوتا ہے کوئی بڑا قادر ہے جو ہوا جیسی طاقتور چیزوں کو دم بھر میں الٹ پلٹ کر دیتا ہے اس کو قیامت لانا کیا مشکل ہے یہاں منکرین کے پاس دو

مقام ہیں ایک یہ کہ قیامت محال ہے اور یہ خیال تھا فلاسفہ کا اس کے مقابلے میں امکان ہے دوسرے یہ کہ ضرور ہے کہ ہر ممکن واقع ہی ہوا کرے جائز ہے کہ کسی شے کا امکان تو ہو مگر وقوع اس کا مستبعد ہو اور یہ خیال تھا کہ مشرکین عرب کا فلاسفہ کے مقابلے میں تو امکان کا اثبات درکار ہے اور دفع استبعابثبات امکان کو مستلزم تھا اور فلاسفہ قلیل بھی تھے۔ اس لئے استقلالاً ان کے شبہ سے تعرض نہیں کیا اور عوام الناس زیادہ ہیں اس لئے انہیں کے مذاق کے موافق دلائل بیان کئے گئے پس یہاں گفتگو ان لوگوں کے جواب میں ہے جو قیامت کو مستبعد سمجھتے ہیں چنانچہ کہا کرتے تھے کہ ء اذامتنا و کنا تروا با (یعنی کیا ہم جب مرجائیں گے اور ہو جائیں گے ہم مٹی) کیا ہماری ہڈیاں جب گل سڑ جائیں گی اور ہم بالکل خاک ہو چکیں گے اس وقت ہم پھر زندہ کئے جائیں گے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے قرآن مجید میں اسی استبعاد کو دفع کیا گیا ہے اور جا بجا مذکور ہے کہ خدا نے جب ابتدا اپنی مخلوق کو پیدا کر دیا کہ اس وقت بظاہر زیادہ مشکل تھا گو واقع میں خداوند جل جلالہ کو کچھ بھی مشکل نہیں تو اب دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ پس جہاں کہیں قرآن مجید میں قسمیں وارد ہوئی ہیں ان قسموں سے ان کے جواب کا استبعاد فرنی ہوتا ہے کہ جو ہوا کو جو ایسی طاقتور ہے دم بھر میں الٹ پلٹ کر دیتا ہے اس کو کیا مشکل اور مستبعد ہے جو سب کو الٹ پلٹ کر دے۔

بہر حال یہ راز تھا خداوند جل جلالہ کی قسموں کا۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جن کی قسمیں کھائی ہیں ان کے احوال نہایت قابل تدبیر و تفکر ہیں۔ گو بظاہر وہ کسی ہی سرسری و معمولی ہوں جب حق تعالیٰ نے ان کی قسم کھائی ہے وہ ضرور قابل اہتمام ہیں۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں کہیں تو ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جو ظاہر میں با وقعت ہیں مثلاً والسماء (قسم ہے آسمان کی) والارض (قسم ہے زمین) اور کہیں ایسی چیزوں کی قسم کھائی ہے جو بظاہر بے وقعت ہیں مثلاً واتین یعنی قسم ہے انجیر کی مقصود یہاں بھی یہی ہے کہ انجیر کثیر النفع شے ہے۔ اس کے منافع کی طرف التفات کرو اسی طرح یہاں فرمایا والعصر یعنی قسم ہے زمانہ کی زمانہ کی زمانہ تو انجیر سے بھی نہایت کمتر ہے انجیر جو ہر محسوس تو ہے زمانہ تو عرض غیر محسوس ہی ہے اسی وجہ سے متکلمین اور فلاسفہ میں زمانہ کی تحقیق میں اختلاف ہوا ہے فلاسفہ تو کہتے ہیں کہ زمانہ فلک الافلاک کی حرکت کا نام ہے اور متکلمین اسے امتداد موہوم مانتے ہیں یعنی زمانہ ایک وہی اور خیالی شے ہے سو گو وہ (زمانہ) محض موجودہ انتزاعی ہی ہو مگر ایک ایسی چیز جو قابل اہتمام ہے اس واسطے کہ اس کا تعلق ہے واقعات سے اور ان کے خاص آثار ہوتے ہیں اور وہ قابل اہتمام ہوا کرتے ہیں۔ مگر چونکہ متلبس بالزمانہ ہیں اس لئے زمانہ بھی قابل نظر ہوا پس حق تعالیٰ اس زمانہ کی یا بلفظ دیگر وقت کی قسم کھاتے ہیں اور اس دوسرے عنوان کے اعتبار سے میرا یہ بیان صرف پرانے ہی خیال والوں کے مذاق پر منطبق نہ ہوگا بلکہ نئے خیال والوں کے مذاق کے بھی موافق ہوگا۔ یعنی وقت کیسی

باوقعت چیز ہے نئے خیال والوں کو میرا ممنون ہونا چاہیے کہ میں نے وقت کے باوقعت ہونے کو قرآن سے ثابت کر دیا۔ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ اہل یورپ وقت کی بہت قدر کرتے ہیں اور اہل اسلام کے یہاں وقت کی قدر نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بڑی قدر ہے اگر نہ ہوتی تو قرآن مجید میں وقت کی قسم کیوں مذکور ہوتی۔ مگر ہم لوگوں نے بالکل اسلام پر عمل ہی چھوڑ دیا ذرا آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے کہ اس میں کیا خوبیاں ہیں اور کیسی عمدہ تعلیم ہے اور جو خوبیاں اہل یورپ میں کہی جاتی ہیں وہ دراصل انہوں نے اسلام ہی سے لی ہیں اور ہم اپنے یہاں غور نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ انہیں کے ملک ہیں۔ ہاں اس معنی کرا نہیں کی ملک ہیں جیسا کاشتکار بارہ برس تک اگر زمیندار کی زمین پر قبضہ رہے تو یہ قانون ہے کہ موروثی ہو کر کاشتکار بمنزلہ ملک سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اہل یورپ نے عرصہ سے ان خوبیوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنا دستور العمل بنا لیا تو ہم یہ سمجھنے لگے کہ یہ موروثی ہو کر انہیں کی ملک ہو گئیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ آج کل اہل یورپ کی تہذیب کا اس قدر غلبہ ہو گیا کہ ان کے منہ سے کوئی بات نکلے اور قرآن میں اس کے خلاف ہو تو اہل یورپ کے قول کا یقین کر لیا جاتا ہے اور قرآن برخلاف واقع ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ محمد ﷺ تو فرمائیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈارون جو ایک ملحد ہے وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مادہ مطلقہ موجود تھا اور پھر تحرک سے اس میں حرارت پیدا ہوئی اور شمس وغیرہ بنا اور اس کے بعد پھر نباتات بنے پھر حیوانات بنے ان میں بندر بنا۔ یکا یک جست کر کے انسان بن گیا۔ اسی طور پر وہ تمام حیوانات نباتات ہیں اسی کا قائل ہے کہ ایک دوسرے سے نکلنے چلے آئے تو محمد ﷺ کے فرمانے پر تو شبہ کیا جاتا ہے اور ڈارون کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہے یہی ایمان ہے۔ ڈارون تو صانع کا قائل نہیں تھا اس لئے ایسی بعید اور بے ہودہ تاویلیں کرتا تھا مگر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ صانع کو مانتے ہیں اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں۔ شاید کوئی یہاں کہے کہ ہم کو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس سے ہو جاتا ہے کہ حکماء کو تو مشاہدہ ہے اور اسی بناء پر ہم کو قرآن پر شبہ ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے۔ یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے میں کہتا ہوں کہ آپ مشاہدہ کی حقیقت ہی کو نہیں جانتے میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ مادہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہوگی پھر شمس و کواکب ہوئے نباتات ہوگئی اور نباتات سے حیوانات میں ایک خاص نوع بندر بنے پھر بندر یکا یک جست کر کے انسان ہو گیا۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان مقررین بالقرودیت (بندر ہونے کے اقرار کرنے والوں) کو بھی بندر نہ بننے دیں آدمی ہی بنائیں یہی مشاہدات ہیں انہیں ڈھکوسلوں اور مہمل اور ذہنی باتوں کو مشاہدات قرار دے کر خدا اور رسول ﷺ پر شبہات اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کیا یہ مشاہدہ ہے کہ آفتاب کو سکون ہے۔ زمین کو حرکت ہے خیر ہمیں

اس سے بحث نہیں کہ کس کو سکون ہے اور کس کو حرکت کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں مگر یہ سوچ لو کہ اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر ہے۔ دلیل کچھ بھی نہیں مگر ہم کہیں گے الشمس تجری (سورج چلتا رہتا ہے) چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے اس لئے آپ آفتاب کو ساکن محض ماننے سے گنہگار ہوں گے زمین کو چاہے آپ ساکن نہ ماننے متحرک محض ماننے مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا پڑے گا شاید کسی کو یہ شبہ ہو وجعلنا فی الارض رواسی الخ (یعنی اور ہم نے زمین میں اس لئے پہاڑ بنائے کہ زمین اور لوگوں کو لے کر ملنے نہ لگے) سے تو زمین کا سکون ثابت ہوتا ہے پھر یہ کیوں کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں جو اب یہ ہے کہ اس سے نفی حرکت اضطرابیت کی مراد ہے حرکت غیر اضطرابیہ کی نفی مراد نہیں۔ غرض اس کی آپ کو اجازت ہے کہ زمین کو اگر جی چاہے متحرک مانیں کچھ حرج نہیں۔ اسی طرح اس کی خبر دی گئی ہے کہ آسمان موجود ہے یہ کون سے مشاہدہ کے خلاف ہے گو اس نظام طلوع وغروب کے لئے سموات کی ضرورت نہ ہو لیکن نظام خاص کی ضرورت نہ ہونا نفی کی تو دلیل نہیں ہو سکتی آسمان دوسری مستقل دلیل سے ثابت ہے۔ اس کی نفی کرنا جائز نہیں یہ کس مشاہدہ سے ثابت ہوا کہ آسمان نہیں ہے بلکہ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس نیلگوں صورت کو حد نظر مان کر آسمان کی نفی کا ہمیں جواب سکھا دیا کیونکہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آیا کہ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے یہی آسمان ہے پس اگر آپ کہیں گے کہ اگر آسمان کوئی چیز ہے تو نظر کیوں نہیں آتا۔ ہم یہ کہیں گے کہ نظر اس لئے نہیں آتا کہ آپ نے اس سقف نیلی کو حد نظر مان لیا پس جب یہ حد نظر ہے تو آسمان اس کے آگے ہے اور چونکہ نظر یہاں تک انتہا ہو جاتی ہے اس لئے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اب آپ کو آسمان کے نفی کرنے کی بالکل گنجائش نہیں رہی اب اس شبہ کی بالکل گنجائش نہیں رہی کہ ہم حکماء کے قول پر قرآن کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ مشاہدہ کی بناء پر جس کی مثال میں یہ پیش کیا کرتے ہیں کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا اور قرآن مجید میں سکندر ذوالقرنین کے قصہ میں مذکور ہے کہ آفتاب کو کیچڑ اور دلدل میں غروب ہوتے پایا بھلا دیکھو کتنا مشاہدہ کے خلاف ہے آفتاب ایک جرم عظیم ہے۔ زمین سے کتنے ہی حصہ بڑا ہے کہیں زمین کی دلدل اور کیچڑ میں غروب ہو سکتا ہے لیکن اگر عقل ہوگی تو اس میں جواب نظر آئے گا یعنی قرآن مجید میں وجد الخ وارد ہوا ہے۔ یعنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا۔ یعنی اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیچڑ میں دھنس رہا ہے۔ یہاں یہ نہیں فرمایا غربت فی (کیچڑ میں ڈوب گیا) جہاز پر سوار ہو کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر میں سے نکلتا ہے اور اسی میں ڈوب رہا ہے اسی طور پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع وغروب کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا اور زمین ہی میں گھس گیا۔ پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا اب فرمائیے مشاہدہ سے کہاں تعارض ہے کہیں بھی نہیں۔ پھر افسوس ہے کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ

کرتے ہیں اور قرآن اگر فیثا غورس کے قول کے مخالف ہو تو قرآن پر خلاف مشاہدہ کا شبہ کرتے ہیں فیثا غورس کے قول پر خلاف واقع ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔ اسلام کی عظمت قلوب سے جاتی رہی۔ غرض یہ ہے کہ نئے مذاق میں یہ خرابی ہوگئی ہے سائنس والے جو کہہ دیں اس پر آمنوا صدقنا (یعنی اس پر ہم ایمان لائے اور ہم نے اس کو سچ مان لیا) قرآن پر شبہات مگر وقت کے با وقعت ہونے میں تو فلسفہ و قرآن دونوں متفق ہو گئے کہ اس کی قسم کھانے سے خود اس کی وقعت پر دلالت ہوگئی۔ اب اس کو قاعدہ پر بھی منطبق کرنا چاہتا ہوں کہ مقسم دلیل ہوتی ہے جو اب قسم کی سو یہاں جو اب قسم میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان الانسان لفسى خسرا انسان بڑے خسارے میں ہے۔ الا الذين امنوا و عملوا الصلحت و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر یعنی خسارے سے وہ مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور ایک دوسرے کو حق اور استقلال کے لئے کہتے اور سنتے رہے۔ یہاں چار چیزیں ذکر فرمائیں ایمان اعمال صالحہ تو اسی بالحق اعتقاد حق پر ایک دوسرے کو قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہنا) تو اسی بالصبر (ایک دوسرے کو پابندی اعمال کی فہمائش کرتے رہنا) سبحان اللہ کیسی جامع تعلیم ہے اصل یہ کہ انسان جن امور کا مکلف ہوا ہے وہ دو قسم کے ہیں ایک اصول۔ ایک فروع۔ اول عقائد میں دوسرے اعمال اصول و فروع اس لئے کہلاتے ہیں کہ اصل مدار ایمان کا عقائد ہیں۔ پھر اس کا کھل اعمال مثلاً ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے مگر ہمیشہ قانون کے خلاف عمل کرتا ہے۔ چوری بھی کرتا ہے جو ابھی کھیلتا ہے اور بد تہذیب بھی ہے ایسے شخص کے قلب میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے اس لئے اسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کے لئے مردود نظر نہ ہوگا بلکہ صرف اختتام سزائے معین اور اس کے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائے گا برخلاف اس شخص کے کہ جو نہایت مہذب و متین ہو اور افعال قبیحہ خلاف قانون سے بھی بچتا ہو مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہ کرتا ہو تو اس کو بغاوت کی سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا یا پھانسی دے دیا جائے گا اور ہمیشہ کے لئے معتوب رہے گا۔

اے صاحبو! سمجھ لیجئے کہ اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے اگرچہ نماز و روزہ کرے اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کے لئے مردود بارگاہ ایزدی ہوگا اگر توبہ نہ کرے۔

وقت کی قدر کرنا چاہیے

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ ایک برف فروش سے مجھ کو بہت عبرت ہوئی وہ جا رہا تھا کہ اے لوگو مجھ پر رحم کرو کہ میرے پاس ایسا سرمایہ ہے کہ ہر لمحہ تھوڑا تھوڑا ختم ہو جاتا ہے اسی طرح کہ ہماری بھی حالت ہے کہ ہر لمحہ برف کی طرح تھوڑی تھوڑی ختم ہو جاتا ہے۔ اسے گھٹنے سے پہلے بیچنے کی کرو کس کے ہاتھ؟ جس نے فرمایا ان

اللہ اشتری من المؤمنین انفسهم و اموالهم الخ

یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا کہ ان کو جنت ملے گی) اور اس عمر کو ضائع مت کرو۔

عمر عزیز قابل سوز و گداز نیست
 ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست
 (پیارے عمر ضائع و برباد کرنے کے لائق نہیں اس کو ضائع مت کرو اس کا سلسلہ اتنا دراز نہیں کہ اس کو فضولیات میں برباد کیا جائے)

والعصر ان الانسان لفی خسر

یہ ایک سورت چھوٹی سی ہے۔ گو الفاظ اس کے کم ہیں مگر اس میں مضمون بہت ضروری اور عام ضرورت کا ہے ویسے ہی جامع بھی ہے اور جامع اس معنی کر ہے کہ کوئی عمل اور کوئی حالت انسان کی ایسی نہیں جو فی الوقت نہ ہو اور اس وقت کے متعلق کوئی خاص حکم نہ ہو۔ اس واسطے اس وقت اس کو اختیار کیا گیا حق جل شانہ نے اپنی سورت کو شروع کیا ہے ایک قسم کے ساتھ آگے اس کے جواب قسم ہے اور قسم کھائی ہے ایک ایسی چیز کی جس کی کوئی وقعت بھی عام قلوب میں نہیں۔ اس کی طرف کوئی خاص التفات بھی نہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو مخلوق کی قسم کھائی ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو نہایت قابل التفات اور مہتمم بالشان ہیں۔

اب رہا یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنی سورت کو شروع کیا ہے ایک قسم کے ساتھ آگے اس کے جواب قسم ہے اور قسم کھائی ہے ایک ایسی چیز کی جس کی کوئی وقعت بھی عام قلوب میں نہیں۔ اس کی طرف کوئی خاص التفات بھی نہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو مخلوق کی قسم کھائی ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو نہایت قابل التفات اور مہتمم بالشان ہیں۔

اب رہا یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنی قسم چھوڑ کر مخلوق کی قسم کیوں کھائی۔ یہ ایک نہایت عجیب اور حل طلب سوال ہے سو ہم مختصراً یہ کہیں گے کہ خدا کو اختیار ہے جو جی چاہے کرے آپ کون ہوتے ہیں ہاں اگر کوئی اس سوال کو یوں بدل کر کہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیں غیر مخلوق کی قسم کھانے سے کیوں ممانعت کی۔ ممانعت تو اس چیز سے ہوا کرتی ہے جو بری ہو اور جو شے بری ہو حق تعالیٰ سے اس کا صدور کیسے ہو سکتا ہے البتہ اس عنوان سے سوال ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض چیزوں کا قبضہ (اپنی ذات کے اعتبار سے) ہوتا ہے اور بعض کا بغیرہ (غیر کے اعتبار سے) ہوتا ہے۔ اور جو چیزیں قبضہ یعنی ہیں مثلاً زنا سرقت وغیرہ ان کی اجازت کسی کو نہیں ہوتی اور ان کا صدور حکیم سے بھی نہیں ہو سکتا اور بعض چیزیں قبضہ بغیرہ ہیں۔ یعنی ان میں کوئی خاص مفسدہ ہے اور وہی مانع ہے اجازت سے۔ جب وہ مرتفع ہو جائے گا قبضہ بھی مرتفع ہو جائے گا۔

اس کی ایک مثال سمجھ لیجئے کہ مثلاً اذان جمعہ کے وقت بیع و شراء (خرید و فروخت) کرنا کہ اگر جمعہ کی طرف

چلتے ہوئے راہ میں بیع و شراء کریں تو جائز ہے۔ مگر افسوس ہمارے قصب میں عین جمعہ ہی کے وقت بازار لگتے ہیں شاید یہ کسی بڑے بوزھے کی اچھی نیت تھی کہ گاؤں والے لوگ بھی آ کر نماز جمعہ میں شریک ہو سکیں گے۔ مگر حفظت شینا و غابت عنک اشیاء (ایک چیز کا تو خیال کیا اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کر دیا)

ایک چیز کا تو خیال کر لیا کہ نماز جمعہ میں شریک ہو سکیں گے مگر اس کا خیال نہ کیا کہ جب تک وہ گاؤں میں ہیں اس وقت تک ان پر جمعہ واجب نہیں۔ اگر جمعہ پڑھنے کے لئے یہاں نہ آئیں تو کچھ حرج نہیں اور جب یہاں آگئے تو ان پر جمعہ واجب ہو گیا۔ اب اگر نہ پڑھیں گے تو گناہگار ہوں گے اور اذان جمعہ کے وقت بیع و شراء کرنا بھی حرام ہے اس حرام میں بھی مبتلا ہوں گے خیر اہل علم اس مسئلہ کو تو خوب جانتے ہیں۔

مگر ایک شخص نے مجھ سے ایک اور مسئلہ اس کے متعلق پوچھا کہ کیا اذان جمعہ کے بعد کھانا پینا بھی حرام ہے۔ سو اس مسئلہ پر کسی کو التفات بھی نہیں حالانکہ وہ بھی حرام ہے۔ جس کے بعد اہل علم اس پر ناز نہ کریں کہ ہم کو بیع سے سابقہ ہی نہیں پڑتا۔ اس لئے ہم اس آیت کے خلاف سے محفوظ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اذان جمعہ کے بعد جیسا بیع و شراء حرام ہے ویسا ہی کتاب دیکھنا بھی حرام ہے۔ پڑھانا بھی حرام ہے۔

رہا یہ کہ بعض اہل علم کو شاید شبہ ہو کہ قرآن میں تو ذر و المبیع (خرید و فروخت ترک کرو) آیا ہے و ذر القراءۃ (پڑھنا ترک کرو) نہیں آیا ہے تو جناب فقہاء نے لکھ دیا ہے کہ تخصیص جریا علی العادۃ (بیع کی تخصیص قرآن پاک میں بیع کی عادت پڑنے کی وجہ سے) ہے۔ ورنہ حکم میں تخصیص نہیں حکم عام ہے۔ بیع صرف اس لئے حرام ہے کہ مخل سعی جمعہ ہے۔ تو جو چیز مخل سعی جمعہ ہو گئی وہ حرام ہے۔ ہاں جب یہ مانع مرتفع ہو جائے گا حرمت بھی مرتفع ہو جائے گی۔ مثلاً تو شخص چلتے چلتے ایک قلمند ان کی بیع کریں تو چونکہ یہ بیع مخل سعی نہیں اس لئے حرام بھی نہ ہوگی۔ یہ بیع لغیرہ کہلاتی ہے۔

کمال دین دو باتوں پر موقوف ہے

سو اس سورت میں حق تعالیٰ نے اسی پر ہم کو متوجہ کیا ہے کہ جب تک تم دین کو کامل نہ کرو گے۔ خسارہ میں رہو گے اور دین کا کمال دو باتوں پر موقوف ہے۔ ایک اپنی تکمیل پھر دوسروں کی تکمیل۔ دوسروں کی تکمیل تو اسی اور تبلیغ سے ہوتی ہے اور اس کے دو محل ہیں۔ دونوں کو حق تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمایا ہے ایک کو لفظ حق سے اور دوسرے کو لفظ صبر سے اور میں نے ان دونوں کے اندر فرق بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اس کو پورا کرتا ہوں۔ حق کہتے ہیں امر مطابق للواقع کو۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی خبر ہے۔ سو سمجھ لیجئے کہ اس سے مراد عقائد ہیں اور عقائد حقہ جس قدر ہیں۔ وہ سب اخبارات ہی ہیں۔

اللہ احد الرسول صادق والقیامۃ اتیہ لاریب فیہا والجنۃ حق والنار حق والقدر حق وغیرہ وغیرہ اور صبر سے مراد اعمال ہیں۔ کیونکہ صبر کے معنی ہیں مضبوطی اور پختگی اور حبس النفس علی من تکرہہ کہ

نفس کو ناگوار باتوں پر جمانا اور اس میں استقلال و پختگی پیدا کرنا اور مشقت و ناگواری اعمال ہی میں ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں کچھ کرنا پڑتا ہے۔ عقائد میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ ان میں تو صرف چند سچی باتوں کو جان لینا اور مان لینا ہے۔ اگر مشقت ہوتی ہے تو اپنے پہلے عقیدہ کے چھوڑنے میں ہوتی ہے۔ عقیدہ حقہ کے اختیار کرنے میں کوئی مشقت نہیں۔ مشکل اور دشواری اعمال میں ہوتی ہے اسی لئے ان کو صبر سے تعبیر کیا گیا۔ حاصل یہ ہوا کہ تو اسی اور تبلیغ عقائد کی بھی کرو اور اعمال کی بھی۔

حق اور صبر کی مراد

دوسری عبارت میں یوں کہئے کہ حق سے مراد اصول ہیں اور صبر سے مراد فروع ہیں۔ اسی کو میں نے پہلے کہا تھا کہ تبلیغ اصولاً بھی فرض ہے اور فروعاً بھی۔ یا یوں کہئے حق سے مراد علوم ہیں اور صبر سے مراد اعمال۔ اور اس میں بڑا لطیفہ یہ ہے کہ لفظ حق آمنا کے مناسب ہے اور لفظ صبر عملوا الصلحت کے مناسب ہے۔ جس چیز کو پہلے ایمان و عمل صالح کے عنوان سے بیان فرمایا تھا۔ اسی کو اس جگہ دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اب قسم کی توجیہ بتلاتا ہوں جس کا میں نے شروع میں وعدہ کیا تھا تو سمجھئے کہ قسم کے ساتھ تاکید کلام کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے اس کے نام کی عظمت کی وجہ سے قسم کھانے والا جھوٹ سے رکتا اور ڈرتا ہے۔ کہ اگر اس کا نام لے کر جھوٹ بولوں گا تو وبال میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ یہ صورت تو قرآن میں اللہ تعالیٰ کی کھائی ہوئی قسموں میں نہیں ہو سکتی کیونکہ مخلوق میں کوئی ایسا معظّم نہیں۔ جس کا نام لینا خدا تعالیٰ کو کسی امر سے مانع ہو۔ دوسری صورت تاکید بقسم کی یہ کہ مقسم بہ سے جو اب قسم کی توضیح مقصود ہو۔ میں نے جہاں تک غور کیا۔ تو اقسام قرآن میں یہی صورت معلوم ہوئی کہ مقسم بہ کو جو اب قسم کی توضیح میں بڑا دخل ہے اور یہ بہت بڑا علم ہے لیکن ہر مقام پر سیاق و سباق کو دیکھنا اور غور کرنا پڑتا ہے اور غور کرنے سے قسم و جو اب قسم میں ارتباط معلوم ہو جاتا ہے۔ والذین جاہدوا فینا لنھدینھم سبلنا مگر غور کرنے کی اس کو اجازت ہے جس کے پاس آلات اعتبار ہوں۔

چنانچہ اس کی ایک مثال اس وقت ذہن میں آئی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں والضحی واللیل اذا سجی ما ودعک ربک وما قلی یہ سورت ایک باری قترۃ وحی کے بعد نازل ہوئی ہے اور قترۃ وحی قبل کی صورت ہے اور نزول وحی ببط ہے تو حق تعالیٰ دن اور رات کی قسم کھا کر فرماتے ہیں۔ کہ آپ کو اے محمد ﷺ خدا تعالیٰ نے نہ چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہے۔ اس قسم کو جو اب قسم کی توضیح میں اس طرح دخل ہے کہ بتلا دیا۔ کہ قبض کو علامت غیر مقبولیت نہ سمجھو جیسا کہ بعض سالکین اس میں بتلا ہو جاتے ہیں۔ کہ نزول واردات کو علامت رضا اور انسداد احوال و کیفیات کو علامت رد سمجھتے ہیں جیسا کہ دنیا والے قبض و بطن رزق کو بھی علامت رضا و عدم رضا کی سمجھتے ہیں۔ روزی والے کو سب لوگ بھاگوں کہتے ہیں اور تنگ دست کو منخوس اور بتلائے ادبار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ اس کی حکایت فرماتے ہیں۔

فاما الانسان اذا ما ابتلاه ربه فاكرمه ونعمه فيقول ربى اكرم من - واما اذا ما ابتلاه فقدر عليه رزقه فيقول ربى اهانن

اللہ تعالیٰ نے اس خیال کو سورہ والضحیٰ میں لیل و نہار کی قسم سے رفع فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قبض و بسط کی مثال لیل و نہار جیسی ہے بس جس طرح دن کے بعد رات کا آنا علامت رد نہیں۔ کیونکہ یہ غیر اختیاری بات ہے۔ اسی طرح بسط کے بعد قبض کا آنا علامت رد نہیں۔ اور جس طرح تعاقب لیل و نہار حکمت پر مبنی ہے۔ اسی طرح تعاقب قبض و بسط میں بھی حکمتیں ہیں۔ جیسے لیل و نہار کا تعاقب ناگزیر ہے کہ بدوں اس کے عالم کا انتظام درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح سالک پر قبض و بسط کا تعاقب ضروری ہے۔

الهنکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر (الحکاثر آیت ص ۲۱) فخر کرنا تم کو غافل کئے رکھتا ہے یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو۔

قبروں کی پختگی پر قابل افسوس ہے

شیخ سعدیٰ نے لکھا ہے نا کہ ایک رئیس زادے اور غریب زادے میں گفتگو ہوئی رئیس زادے نے کہا کہ دیکھو ہمارے باپ کی قبر کیسی عمدہ اور مضبوط ہے جس پر شان و شوکت برستی ہے اور تمہارے باپ کی قبر کچی اور شکستہ ہے جس پر بے کسی برستی ہے غریب زادہ نے کہا بیشک یہ فرق تو ہے لیکن قیامت کے دن میرا باپ تو قبر میں سے آسانی سے نکل آئے گا اور تمہارا باپ پتھر ہی ہٹانے میں رہے گا وہ اتنے چٹانوں اور پتھروں کو ہی ہٹاتا رہے گا میرا باپ جنت میں جا پہنچے گا کچھ ٹھکانا ہے اس تقاخر کا کہ قبروں کی پختگی پر بھی فخر کیا جاتا ہے۔ اسی کو تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے الهنکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر (اے لوگوں تم کو تقاخر نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ گئے) زرتم المقابر کے یا تو یہ معنی ہیں کہ تم اس تقاخر ہی کی حالت میں قبروں میں پہنچ گئے یعنی مر گئے یا یہ کہ تم تقاخر کے لئے قبروں کو دیکھنے گئے۔ جاہلیت میں عرب کی عجیب حالت تھی بعض دفعہ جب دو قبیلے باہم فخر کرتے ایک کہتا کہ ہماری قوم زیادہ ہے دوسرا کہتا کہ ہمارا جتنا زیادہ ہے اور اس کے بعد مردم شماری ہوتی اور ان میں سے کوئی ایک قبیلہ شمار میں کم ہو جاتا تو وہ کہتا کہ ہمارے آدمی لڑائی میں زیادہ کام آئے ہیں اس لئے ہم کم ہو گئے ورنہ ہماری شمار زیادہ تھی دوسرا قبیلہ کہتا کہ یہ بھی غلط ہے تمہارے مردے ہمارے مردوں سے زیادہ نہیں ہیں اس کے فیصلے کے لئے قبروں کی شمار کی جاتی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ تو کفار کی حالت تھی مگر افسوس آج کل مسلمانوں میں بھی یہ مرض پیدا ہو گیا ہے تو وہ قبروں کو شمار تو نہیں کرتے مگر ان کی پختگی اور خوبصورتی پر فخر کرتے ہیں چنانچہ اس لئے بعض لوگ خود اپنی قبر کے پختہ کرنے کی وصیت کر جاتے ہیں اس تقاخر ہی کی وجہ سے یہ تمام تکلفات پیدا ہوئے ہیں کہیں زیادہ روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے کہیں جھاڑ فانوس اور قندیل لٹکائے جاتے ہیں۔

سُورَةُ الْكَافِرُونَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنْتُمْ

عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ ۝ وَلَا أَنْتُمْ

عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينٌ ۝

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اے کافرو میں اس شے کی عبادت نہ کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم عبادت کرو گے اس شے کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں اس شے کی جس کی تم نے عبادت کی ہے۔ اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس شے کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے میرے لئے میرا دین۔

آج کل کی ایک بے ہودہ رسم

جیسا آج کل یہ بیہودہ رسم نکلی ہے کہ مسلمان کفار کے میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کو اپنی عید بقرعید کے موقع پر شریک کرتے ہیں یہ تو وہی قصہ ہے جیسا کہ اہل شرک نے حضور سے کہا تھا کہ اے محمد ہم اور آپ صلح کر لیں ایک سال آپ ہمارے دین کو اختیار کر لیں اور دوسرے سال ہم آپ کے دین کو اختیار کر لیں گے اسی وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں یعنی نہ میں تمہارا دین اختیار کروں گا اور نہ تم میرا دین قبول کرو گے۔ یہ بطور اخبار کے فرمایا پس لکم دینکم الخ کو اس تقریر پر منسوخ کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ پس کفار سے تو بالکل علیحدہ ہی رہنا چاہیے۔ یہاں چونکہ ایک جگہ رہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ آپس میں لڑیں نہیں باقی ان کے مذہبی میلے اور مجامع میں جانا بالکل بند کرنا چاہیے۔

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

بعض لوگوں نے ایک غلطی کی ہے کہ لکم دینکم ولی دین کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ تمہارے واسطے تمہارا دین ہے ہمارے واسطے ہمارا دین ہے اور یہ تفسیر کر کے اسی آیت کے حکم کو باقی سہی سمجھا ہے چنانچہ بعض صوفیہ نے اسی کو اپنا معمول بنا لیا اور صلح کل اپنا مذہب بنا لیا کہ موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود کسی سے لڑنے جھگڑے کی ضرورت نہیں مگر یہ استدلال اس لئے غلط ہے کہ اول تو یہاں دین بمعنی مذہب ہونا مسلم نہیں بلکہ بمعنی جزا ہونا محتمل ہے یعنی جیسا تم کرو گے ویسا بھرو گے پس لکم دینکم ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہتے ہیں کما تدين ندان اور اس صورت میں منسوخ ماننے کی بھی ضرورت نہ ہوگی اور اگر یہی تفسیر کی جاوے تو اس صورت میں یہ آیت منسوخ ہوگی۔

احتیاط خطاب

کاندھلہ میں ایک بار مولویوں کے مجمع میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کافر کو کافر کہنا کیسا ہے ایک جماعت یہ کہہ رہی تھی کہ تہذیب کے خلاف ہے اور ایک جماعت کہہ رہی تھی کہ جائز ہے کیونکہ قرآن میں بکثرت کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے پہلی جماعت نے اس کا یہ جواب دیا کہ قرآن میں خطاب کے موقع پر کافروں کو کافر نہیں کہا گیا (بلکہ یا ایہا الناس سے خطاب کیا گیا ہے) اور گفتگو اس میں ہے کہ کافر کو کافر کہہ کر خطاب کرنا کیسا ہے پھر ایک مولوی صاحب کو حکم بتایا گیا کہ اس اختلاف کا فیصلہ کریں انہوں نے کہا کہ قرآن میں خطاب کے موقع پر بھی کافروں کو کافر کہا گیا ہے قل یا ایہا الکافرون لا اعبد ما تعبدون مگر میں اس محاکمہ کا بھی محاکمہ کرتا ہوں کہ قرآن میں کفار کو کافر کہہ کر بلا ضرورت خطاب نہیں کیا گیا اور جہاں اس لفظ سے خطاب کیا گیا ہے وہاں ضرورت تھی وہ یہ کہ ان ظالموں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بے ڈھنگی درخواست کی تھی کہ ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کر لیا کریں ایک سال ہم آپ کے خدا کی عبادت کر لیا کریں گے اس کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی کہ ان سے فرما دیجئے کہ اے کافرو! میں تمہارے معبودوں کی پرستش نہ کروں گا نہ تم میرے معبودوں کی عبادت کرو گے نہ اب نہ آئندہ تو یہاں ان لوگوں کی امیدیں قطع کرنے کے لئے سختی کے ساتھ کافر کہہ کر ان کو خطاب کیا گیا ہے باقی آیات میں اس لفظ سے خطاب نہیں کیا گیا کیونکہ ضرورت نہ تھی پس فیصلہ یہ ہوا کہ خش خطاب بلا ضرورت نہ کرنا چاہیے ہاں ضرورت سے ہو تو جائز ہے۔ (المرابطہ بالحقہ واعظ حقیقت مال وجاہ ص ۶۵)

سُورَةُ النَّصْرِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۚ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ

اللَّهِ أَفْوَاجًا ۚ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ إِنَّكَ كَانَتْ تَوَّابًا ۝

ترجمہ: اے محمد ﷺ جب خدا کی مدد اور فتح کی فتح (ملے اپنے آثار کے) آ پہنچے (یعنی واقع ہو جائے) اور (آثار جو اس پر متفرع ہونے والے ہیں کہ آپ لوگوں کو اللہ کے دین (یعنی اسلام) میں جوق در جوق داخل ہوا دیکھ لیں تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے استغفار کی درخواست کیجئے۔

تفسیری نکات

رسول اکرم ﷺ کے قرب وصال کی خبر

اس صورت میں حضور ﷺ کی خبر دی گئی ہے آپ کی وفات شریفہ کے قریب ہونے کی جیسا کہ اور نصوص میں بھی بکثرت اس کی خبر دی ہے مثلاً انک میت وانهم میتون اور وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم مگر ان میں مطلق وفات کی خبر ہے اور اس سورت میں اس کے قرب کی بھی خبر ہے جس میں بعض علامات کا ذکر کر کے ان علامات کے ظہور پر اس وقت کو بتلایا گیا ہے وہ علامت یہ ہیں کہ اذا جاء نصر الله والفتح (یعنی جب مدد الہی پہنچ جائے) اور مکہ فتح ہو جائے ورايت الناس يدخلون في دين الله افواجا۔ (یعنی آپ لوگوں کو جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں) اور ایک تفسیر پر جبکہ اذما مضی کے لئے ہو یعنی ہوں گے (کہ چونکہ نصرت و فتح معہود رویت و دخول افواج ہو چکی) چونکہ احادیث میں ہے کہ اس

سورت میں آپ کو قرب اجل کی خبر دی گئی ہے اور احادیث میں ان علامات کے علاوہ دوسری علامات بھی مذکور ہیں مثلاً اخیر سال میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مادہ رمضان میں قرآن کا دو مرتبہ عرض کرنا (یعنی دو کرنا) وغیرہ وغیرہ ان واقعات کے ظہور پر آگے آپ کو تیاری آخرت کی تاکید کی گئی ہے کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی حمد و تسبیح اور استغفار میں مشغول ہو جائیے۔ یہ حاصل ہے بیان کا۔ اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ اس سورۃ کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا ہے اور اس کے نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ دو برس اور زندہ رہے نزول سے پہلے تو ایک دو آدمی ہی روزانہ اسلام لاتے تھے اور فتح مکہ کے بعد دیہات کے دیہات اور ایک ایک دن میں ایک ہزار دو دو ہزار اسلام لانے لگے اور جب یہ خبر اچھی طرح پھیل گئی کہ مکہ والے مسلمان ہو گئے ہیں تو پھر قبائل عرب ایک دم سے اٹھ پڑے اور جو لوگ بعد مسافت کی وجہ سے سب کے سب نہ آ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے وفود بھیجے کہ حضور کو جا کر ہمارے اسلام کی اطلاع کر دو اور وہاں سے احکام دریافت کر کے آؤ۔ چنانچہ اس لئے ۹ھ کو سۃ الوفود کہتے ہیں اور اسی لئے آپ ۹ھ میں حج کو تشریف نہیں لے جاسکے حالانکہ فتح مکہ کے بعد حج فرض ہو گیا تھا کیونکہ اس سال آپ وفود کی تبلیغ و تکمیل میں مشغول تھے۔ پھر ۱۰ھ میں آپ نے حج ادا کیا جس میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ کے بعد ہوا اور ایک روایت یہ ہے کہ حجۃ الوداع میں اس کا نزول ہوا ہے۔ ان سب روایتوں میں جمع اس طرح ہو سکتا ہے کہ نزول تو فتح مکہ سے پہلے ہوا ہو مگر حضور نے فتح مکہ کے بعد یا حج و داع میں کثرت تسبیح و تحمید کی وجہ بیان فرماتے ہوئے اس سورت کو تلاوت فرمایا ہو۔ راوی نے یہ سمجھا کہ ابھی نزول ہوا ہے مگر جن راویوں نے اس کا نزول فتح مکہ کے بعد متصل یا حج و داع میں مانا ہے۔ ان پر یہ اشکال وارد ہوگا کہ اس میں لفظ اذا ہے جو مستقبل کے لئے آتا ہے اس کا مقتضایہ ہے کہ نزول کے وقت فتح مکہ و دخول الناس افواجا کا وقوع نہ ہوا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اذا کبھی ماضی کے واسطے بھی آتا ہے جیسے قرآن میں بھی دوسری جگہ ہے حتی اذا جعلہ ناراً اور حتی اذا ساوی بین الصدفین تو پہلی تقریر پر تو ترجمہ یہ تھا کہ جب اللہ کی مدد آ جائے اور فتح مکہ ہو جائے اور آپ لوگوں کو جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں تو تسبیح و تحمید میں مشغول ہو جائیے اور دوسری تقریر پر ترجمہ یوں ہوگا کہ جب اللہ کی مدد آ چکی ہو اور لوگوں کو اسلام میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا آپ نے دیکھ لیا ہو تو اب آخرت کی تیاری کیجئے۔

یہ تو ترجمہ اور توجیہ تھی اقوال مفسرین کی۔ اب میں وہ نعمتیں بتلاتا ہوں جو حضور کو یا تبعامت کو سفر آخرت کی وجہ سے عطا ہوئیں اور اس سورت میں ان پر دلالت ہے۔ نزول کے وقت فتح مکہ ہوانہ بدخلون فی دین اللہ

افواجاً کا ظہور ہوا تھا۔ اس سورت میں ان آیات میں پیشین گوئی ہے کہ ایسا ہونے والا ہے اس وقت سمجھ لیجئے۔
فتح مکہ پر اس مقصود کی تکمیل اس لئے موقوف تھی کہ عام لوگ اسلام لانے میں اہل مکہ کے اسلام کے منتظر
تھے کہ دیکھئے نبی کی قوم بھی ان کی اطاعت کرتی ہے یا نہیں کیونکہ عوام کی یہ طبعی بات ہے عقلاء کی تو نہیں کہ وہ
کسی شخص کے معتقد بننے میں یہ دیکھا کرتے ہیں کہ اس شخص کے خاندان اور بستی والے کچا چٹھا جانتے ہیں۔ وہ
ایسے ایسے شخص کے معتقد نہیں ہوا کرتے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ سچے آدمی کے بھی معتقد نہ ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا
کہ جھوٹے آدمی کے معتقد ہو جائیں۔ خصوصاً خاندان والے تو بہت دیر میں معتقد ہوتے ہیں کیونکہ ان میں
کوئی تو اس شخص کا چچا ہے کوئی ماموں ہے کوئی بھائی بھتیجا ہے جن کو مساوات کا یا ناز کا دعویٰ ہوتا ہے یا بزرگی کا وہ
اپنے سے چھوٹے یا برابر کی اطاعت جبری کر سکتے ہیں جبکہ کھلم کھلا کوئی ایسی بات دیکھ لیں جو ان کی اطاعت پر
مجبور کر دے۔ مگر اس پر عوام ہی کی نظر ہوتی ہے کہ خاندان والوں کا کیا خیال ہے باقی عقلاء کو کسی کے اعتقاد اور
عدم اعتقاد پر نظر نہیں ہوتی بلکہ وہ تو کمالات کو دیکھتے ہیں اگر ایک شخص میں کمالات موجود ہوں۔

چاہے خاندان اور بستی ہی کیا ساری دنیا بھی اس کی مخالفت کرتی ہو تب بھی معتقد ہو جاتے ہیں۔
چنانچہ عقلاء صحابہ نے ایسا ہی کیا کہ انہوں نے اہل مکہ یا حضور کے قرابت داروں کی اطاعت کا مطلق
انتظار نہیں کیا۔ بعض تو ایسے وقت اسلام لائے تھے کہ حضور کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا اور بعض نے ایسے وقت
اطاعت اختیار کی کہ آپ کے ساتھ دو چار آدمی تھے البتہ عام لوگ اس کو دیکھتے ہیں کہ خاص بستی والے اور
خاندان والے کیا برتاؤ کرتے ہیں۔ کیونکہ عوام کی نظر کمالات تک نہیں پہنچتی۔ اس لئے وہ ایسے ایسے قرآن کا
انتظار کیا کرتے ہیں اسی قاعدہ کے مطابق عام طور پر اہل عرب کو اہل مکہ کے اسلام کا انتظار تھا کیونکہ وہاں آپ
کی برادری تھی اور اسی لئے کم لوگ مسلمان ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور رسول ﷺ مکہ میں
غالب ہو کر داخل ہوئے تو اس وقت بہت سے اہل مکہ مسلمان ہو گئے اور بعض غنور و تامل کے لئے مہلت مانگی
تو ان کو چار مہینے یا اس سے زائد کی مہلت دی گئی۔ کہ اس مدت میں یا اسلام لے آئیں یا مکہ سے نکل جائیں
اسی وقت مکہ دارالاسلام ہو گیا اور چند روز میں وہاں ایک بھی کافر نہ رہا۔ اس وقت عام طور پر اہل عرب جو ق در
جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔

بشارت تکمیل دین

سو اس پر تو سب مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سورۃ کا نزول سفر آخرت کی تیاری کے لئے ہوا ہے اور اس کو
متعلق کیا گیا ہے چند علامات پر جو کہ اس جگہ مذکور ہیں یعنی نصرو فتح مکہ و رویت دخول الناس فی الدین۔ تو
ایک نعمت تو یہ ہوئی کہ آپ کا سفر آخرت سبب ہو گیا شیوع اسلام کا۔ گویا ہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیوع

اسلام آپ کے سفر آخرت کا سبب ہوا کیونکہ سلاطین کی عادت بھی یہی ہے کہ کسی افسر کو کسی کام کی تکمیل کے لئے بھیجتے ہیں کام پورا ہونے کے بعد اس کو اپنے پاس بلا لیتے ہیں اور دلالت لفظ سے بھی یہی متبادر ہے۔ چنانچہ یہاں لفظ اذا یہی بتلا رہا ہے کیونکہ اذا تعلق کے لئے ہے تو مجنی نصر فتح مکہ وغیرہ معلق علیہ ہے اور تیاری آخرت معلق اور ظاہر ہے کہ معلق علیہ سبب ہوا کرتا ہے معلق کا لیکن اگر نظر کو گہرا کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ واقع میں یہاں معلق سبب ہے معلق علیہ کا آگے اس کی دلیل آتی ہے۔ سو اس بناء پر یہاں معلق علیہ محض علامات کے درجہ میں ہوگا۔ اس کو معلق کے ساتھ سببیت یا علیت کا تعلق نہیں ہوگا۔

بس اس کی مثال بالکل ایسی ہے (جیسے ہم کسی کو کہیں بھیج کر اس سے کہہ دیں کہ جس وقت ہم جھنڈی ہلا دیں اس وقت واپس چلے آنا تو ظاہر میں تو جھنڈی کے ہلنے کو دخل ہے اس شخص کی واپسی میں مگر حقیقت میں اس کی واپسی کو جو کہ اصل مقصود ہے دخل ہے جھنڈی کے ہلنے میں اور اس کی دوسری مثال یہ ہے)

جیسے کوئی بادشاہ ایک انجینئر کو جو کہ اس کا محبوب و مقرب ہے کسی جگہ بھیجے کہ وہاں جا کر ایک نہر کھدواؤ جس سے تمام ملک کو سیرابی حاصل ہو وہ گیا اور وہاں جا کر اس نے اپنے عملہ کے ساتھ کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ چند روز کے بعد بادشاہ کو اس کا اپنے پاس جلد لانا مقصود ہوا۔ اس لئے ایک بہت بڑا عملہ اس کام کی تکمیل میں اس کی امداد کیلئے اس کی ماتحتی میں بھیج دیا جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں نہر کو کھود کر اور انجینئر کے حکم اور نقشہ کے مطابق بنا سنوار کر درست کر دیا اور اس نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ حضور کا کام پورا ہو گیا وہاں سے حکم ہوا کہ اچھا اب تم ہمارے پاس چلے آؤ۔ تو ظاہر میں تو تکمیل نہر کی اس کے بلانے کا سبب ہوا مگر حقیقت میں بادشاہ کا اس کو بلانا تکمیل نہر کا سبب ہوا۔ اگر وہ اس کو جلدی بلانا نہ چاہتا تو دوسرا عملہ کیوں بھیجتا۔

اب اس کی تحقیق باقی ہے جب تعلق میں دونوں صورتیں ہوتی ہیں تو یہاں دونوں احتمال ہوئے ایک کی تعیین کی کیا دلیل؟

جواب یہ ہے کہ قرآن سے تعیین ہو جاتی ہے یہاں آپ کی محبوبیت قرینہ مرتجہ ہے اس احتمال کا۔ چنانچہ اوپر پہلی کی حدیث میں حضرت جبریل علیہ السلام کا مقولہ یا محمد ان الله قد اشتاق الی لقائک اس پر صریح دال ہے کہ بلانے کا سبب اشتیاق ہے۔ تو بلانا جن اسباب پر موقوف تھا ان کی تکمیل بھی اس اشتیاق کے سبب فرمائی۔ تو سبب ہو بلانا اذا جاء نصر الله والفتح یہ ایک سورت ہے جو حضور اکرم ﷺ کی آخری عمر میں نازل ہوئی ہے جس کا مدلول ظاہری تو رسول ﷺ کا نعمت فائضہ پر مکہ کے مقابلہ میں مطالبہ شکر ہے کہ ایک بڑی نعمت یعنی فتح مکہ آپ کو عطا ہونے والی ہے یا ہو چکی ہے اس پر شکر کا مطالبہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ نعمت عطا ہو اس وقت شکر کیجئے یا یہ کہ وہ نعمت کاملہ چونکہ فائض ہو چکی ہے اس لئے شکر کیجئے۔ یا کلمہ

تردد میں نے اس واسطے کہا ہے کہ مفسرین کو اس میں گفتگو ہے کہ اس میں اذا مستقبل کے لئے ہے یا ماضی کے لئے جیسے اذا ساوی بین الصدقین اور اذا جعلہ نارا میں اور اس کا غشایہ ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا ہے یا بعد میں۔ مدلول ظاہری کلی تو سورت شریفہ کا یہ ہے اور مدلول خفی یہ ہے کہ جب آپ کی عمر ختم ہو جائے یعنی قریب ختم ہو جائے تو حمد و تسبیح میں مشغول ہو جائے اور واسطہ اس ولادت کا یہ ہے کہ جب آپ کے فیوض کی تکمیل ہو جائے جس کی طرف اذا جاء نصر اللہ و رایت الناس میں اشارہ ہے تو اس وقت طاعت میں زیادہ مشغول ہو جائے کیونکہ شکر و حمد بھی عنوان طاعت ہی ہے صرف عنوان کا تفاوت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت آخرت کی خاص تیاری کیجئے۔

تبت ید اابی لہب و تب (ابولہب برباد ہو جو) ما اغنی عنہ مالہ و ما کسب (اور اس بربادی سے نہ اس کا مال بچا سکتا ہے نہ اس کی کمائی و امرء تہ حمالة الحطب (اور اس کی بیوی لکڑیاں چننے والی ہے) بعض لوگوں نے تو اس کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ اس سے اس کا اظہار بخل مقصود ہے کہ باوجود مال و دولت کے پھر بھی اتنی کنجوس ہے کہ لکڑیاں خود چن کر لاتی ہے عرب میں بخل کو زنا سے بھی زیادہ قبیح سمجھتے تھے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ جنگل سے خاردار لکڑیاں چن کر لاتی تھی اور حضور کے راستہ میں بچھا دیتی تھی تاکہ آتے جاتے آپ کو تکلیف ہو۔

سُورَةُ الْفَلَقِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝

ترجمہ: آپ کہیے کہ میں ان عورتوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو گرہوں پر پڑھ کر پھونک مارنے والی ہیں۔

تفسیری نکات

حضور ﷺ پر سحر کئے جانے کا واقعہ

یہودیوں میں سحر (جادو) کا بہت چرچا تھا۔ اور وہ اس میں بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر بھی سحر کیا تھا اور وہ لبید کی بیٹیوں نے سحر کیا تھا۔ جس کا اثر بھی حضور ﷺ پر ہو گیا تھا۔ پھر وحی کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا گیا کہ آپ پر فلاں شخص نے سحر کیا ہے۔ چنانچہ سورہ فلق میں اس طرف اشارہ ہے: وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ”آپ کہئے کہ میں ان عورتوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، جو گرہوں پر پڑھ کر پھونک مارنے والی ہیں“۔

گرہوں پر پھونک مارنے کی تخصیص اس لئے ہے کہ حضور پر جو سحر ہوا تھا وہ اسی قسم کا تھا کہ ایک تانت کے ٹکڑے میں گیارہ گرہیں دی گئی تھیں اور گرہ پر کلمات سحر کو دم کیا گیا تھا۔ اور عورتوں کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس واقعہ میں عورتوں ہی نے سحر کیا تھا۔ دوسرے کچھ تجربے سے اور نیز علم طبعی کے لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کا سحر بہ نسبت مردوں کے زیادہ موثر ہوتا ہے کیوں کہ سحر میں قوت خیالی کو زیادہ اثر ہے خواہ سحر حلال ہو یا سحر حرام۔ (تیم، نسیم، تبلیغ)

جادو کی دو قسمیں اور ان کا شرعی حکم

سحر (جادو) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سحر حرام۔ اور محاورات (یعنی اصطلاح میں اکثر اسی پر سحر کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسرے سحر حلال جیسے عملیات اور عزائم اور تعویذ وغیرہ کہ لفظ یہ بھی سحر کی قسم میں داخل ہے۔ اور ان کو سحر حلال کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعویذ و عزائم (عملیات) وغیرہ مطلقاً جائز نہیں بلکہ اس میں بھی تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اس میں اسماء الہی سے استعانت (مدد حاصل کرنا ہو) اور مقصود بھی جائز ہو تو جائز ہے اور اگر مقصود ناجائز ہو تو حرام ہے۔

اور اگر شیاطین سے استعانت (مدد حاصل کرنا) ہو تو مطلقاً حرام ہے۔ خواہ مقصود اچھا ہو یا برا۔ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جب مقصود اچھا ہو تو شیاطین کے نام سے بھی استعانت (مدد حاصل کرنا) جائز ہے یہ بالکل غلط ہے۔ خوب سمجھ لو۔ (التبلیغ)

قرآنی سورتوں کے موکلوں کا کوئی ثبوت نہیں

بعض لوگوں نے موکلوں کے نام عجیب عجیب گھڑے ہیں۔ کلکائیل، دردائیل اور اسی طرح اس کے وزن پر بہت سے نام ہیں۔ اور غضب یہ ہے کہ ان ناموں کو سورہ فیل کے اندر ٹھونسا ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ يَا كَلْكَائِيلِ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ يَا ذُرْدَائِيلِ.

یہ سخت واہیات ہے۔ اول تو یہ نام بے ڈھنگے ہیں نہ معلوم کلکائیل کہاں سے ان لوگوں نے گھڑا ہے۔ بس یہ لوگ رات دن کل کل ہی میں رہتے ہوں گے۔ پھر ان کو قرآن میں ٹھونسا یہ دوسرا بے ڈھنگا پن ہے اور نہ معلوم یہ موکل ان لوگوں نے کہاں سے تجویز کئے ہیں۔ یہ سب محض خیالات ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اس کا مصداق معلوم ہوتے ہیں۔ اِنْ هِيَ اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ. (تمیم نسیم)

سحر جادو وغیرہ سے حفاظت کی اہم دعاء

بعض دعائیں ایسی ہیں کہ سحر (جادو) وغیرہ کے اثر سے محفوظ رکھتی ہیں۔

حضرت کعب الاحبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ چند کلمات کو اگر میں نہ کہتا رہتا تو یہود (سحر و جادو سے) مجھ کو گدھا بنا دیتے۔ کسی نے پوچھا وہ کلمات کیا ہیں انہوں نے یہ بتلائے:

اَعُوذُ بِوَجْهِ الْعَظِيْمِ الَّذِي لَيْسَ شَيْءٌ اَعْظَمَ مِنْهُ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ وَبِاسْمَاءِ اللّٰهِ الْحُسْنٰى مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ اَعْلَمْ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَزُرّاً

وَبِرًّا. (روایت کیا ہے اس کو مالک نے جزء الاعمال)

یہ دعاء کم از کم صبح و شام پابندی سے تین تین مرتبہ پڑھ کر دم کر لیا کریں انشاء اللہ مکمل حفاظت رہے گی۔

آسیب لیٹ جانا

ان آیتوں کو پڑھ کر بیمار کے کان میں دم کرے اور پانی پڑھ کر اس کو پلاوے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اِنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّانْتُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهِ فَاِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُونَ وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَاَرْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ. اور سورۃ وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ سات بار کان میں دم کرنا اور داہنے کان میں اذان اور بائیں میں تکبیر کہنا بھی آسیب کو بھگا دیتا ہے۔

آسیب اور جادو

اگر کسی پر آسیب کا شبہ ہو تو آیات ذیل لکھ کر مریض کے گلے میں ڈالیں اور پانی پر دم کر کے مریض پر چھڑک دیں اور اگر گھر میں اثر ہو تو ان کو پانی پر پڑھ کر گھر کے چاروں گوشوں میں چھڑک دیں۔ آیات یہ ہیں۔

(۱) بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مَا لِكُ یَوْمَ الدِّیْنِ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ

(۲) اَلَمْ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیَقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اَنْزَلَ اِلَیْكَ وَمَا اَنْزَلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِاٰخِرَةِ هُمْ یُوقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًى مِّنْ رَبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(۳) وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ

(۴) اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا نَفْصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ط اللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا

أُولَئِنَّهُمْ الطَّاغُوثُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلْمَةِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ
 (۵) لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِنْ تُبَدُّوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفَوْنَ يُحَاسِبُكُمْ بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَكَاتِهِ وَكُتِبَ لَهُمْ أَنْ يُعْرِضُوا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ

(۶) شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَانِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

(۷) إِنَّ رَبَّكُمْ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِلَّا لَهُ الْخَلْقِ وَالْأَمْرِ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ .

(۸) فَتَعَلَّى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ .

(۹) وَالصَّفَاتِ صَفًا فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا إِنَّ إِلَهُكُمْ لَوَاحِدٌ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ إِنَّا زَيْنَا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ وَحِفْظًا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَارِدٍ لَا يَسْمَعُونَ إِلَى الْمَلَاءِ الْأَعْلَى وَيُقَدِّفُونَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُخُورًا وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاتَّبَعَهُ شَهَابٌ ثَاقِبٌ فَاسْتَفْتِهِمْ أَهْمُ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَنْ خَلَقْنَا إِنَّا خَلَقْنَا هُمْ مِنْ طِينٍ لَازِبٍ .

(۱۰) هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّمُنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِي الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ .

- (۱۱) وَأَنَّهُ تَعَلَىٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا .
- (۱۲) قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ .
- (۱۳) قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ وَمِن شَرِّ النَّفَّاثِ فِي الْعُقَدِ وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ .
- (۱۴) قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَهِ النَّاسِ مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ .

حرز ابی دجانہ

ایضاً۔ کلمات ذیل کو لکھ کر مریض کے گلے میں ڈال دیا جائے (اس عمل کا نام حرز ابی دجانہ ہے) نہایت مجرب ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ هٰذَا كِتَابٌ مِّنْ مُحَمَّدٍ رَّسُولِ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اِلٰی مَنْ طَرَقَ الدَّارَ مِنْ الْعُمَارِ وَالرُّوَّارِ وَالسَّائِحِیْنَ اِلَّا طَارِقًا یَطْرُقُ بِخَیْرِ یَا رَحْمٰنُ اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ لَنَا وَلَكُمْ فِی الْحَقِّ سَعَةٌ فَاَنْ تَكُ عَاشِقًا مَوْلَعًا اَوْ فَاجِرًا مُّقْتَحِمًا اَوْ رَاعِیًا حَقًّا مُّبِطَلًا هٰذَا كِتَابٌ اللّٰهِ یَنْطِقُ عَلَیْنَا وَعَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَتْرَكُوا صَاحِبَ كِتَابِیْ هٰذَا وَانْطَلِقُوا اِلٰی عِبَادَةِ الْاَوْثَانِ وَالْاَصْنَامِ وَاِلٰی مَنْ یَزْعَمُ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ لَهٗ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ تُقَلِّبُوْنَ حَمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ حَمَّعَسَقَ تَفْرُقْ اَعْدَاءَ اللّٰهِ وَبَلَغْتَ حُجَّةَ اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ فَسَیَكْفِیْكُمْ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ . اس کو لکھ کر گلے میں ڈال دیا جائے۔

ایضاً۔ اگر آسب کا اثر گھر میں معلوم ہو تو آیات ذیل پچیس بار چار کیلوں پر پڑھ کر گھر میں چاروں کونوں میں گاڑ دیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اِنَّهُمْ یَكْفُرُوْنَ كَیْدًا وَّاَكْبَدُ كَیْدًا فَمَهْلِكِ الْكٰفِرِیْنَ اَمْهَلَهُمْ رُوْبَدًا .

برائے دفع سحر

آیات ذیل لکھ کر مریض کے گلے میں ڈال دیں اور پانی پر پڑھ کر اس کو پلا دیں، اگر نہ ہلانا نقصان نہ کرتا ہو تو ان ہی آیات کو پانی پر پڑھ کر اس سے مریض کو نہلا دیں۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فَلَمَّا الْقَوَا قَالَ مُوسٰی مَا جِئْتُمْ بِهٖ السَّحْرَ اِنَّ اللّٰهَ سَیَبْطِلُهُ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ وَیُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِہٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ اور قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ وَمِن شَرِّ النَّفَّاثِ فِي الْعُقَدِ وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ اور قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَهِ النَّاسِ

النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَأَسْوَأِ الْخَنَاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ .

سحر کے لئے

۱۔ فَلَمَّا آتَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَابِغُهُ إِنَّ اللَّهَ لَا يَمُوتُ بِعَمَلِ الْفَاسِقِينَ
وَيُحْيِي اللَّهُ الْحَيِّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْجَاهِلُونَ ﴿۱۳﴾

(پارہ ۱۱، رکوع ۱۳)

ترجمہ: سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بنا کر) لائے ہو جادو ہے یعنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو درہم برہم کئے دیتا ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے فسادیوں کا کام بننے نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ دلیل صحیح (یعنی معجزہ) کو اپنے وعدوں کے موافق ثابت کر دیتا ہے جو مجرم (اور کافر) لوگ کیسا ہی ناگوار سمجھیں۔
خاصیت: سحر کیلئے بہت مجرب ہے جس پر کسی نے سحر کیا ہو ان آیتوں کو لکھ کر اس کے گلے میں ڈالے یا پشتری پر لکھ کر پلائے انشاء اللہ تعالیٰ صحت یاب ہو جائے گا۔

۲۔ يٰۤاٰدَمُ خُذْ زِينَتَكَ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ﴿۱۰۸﴾
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذٰلِكَ نَفِصِلُ الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رِجْسَ الْفَوَاحِشِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ ۖ وَاللَّغْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُكْرَهُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزَّلْ بِهِ سُلْطٰنًا ۚ أَنْ تَقُولُوا عَلٰى
اللَّهِ مَا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ (پارہ ۸، رکوع ۱۱)

ترجمہ: اے آدم کی اولاد تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو اور خوب کھاؤ اور پیو اور حد سے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے حد سے نکل جانے والوں کو، آپ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے چیزوں کو جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے۔ آپ یہ کہہ دیجئے کہ یہ اشیاء اس طور پر کہ قیامت کے روز بھی خالص رہیں۔ دنیوی زندگی میں خالص اہل ایمان ہی کیلئے ہیں۔ ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھداروں کے واسطے صاف صاف بیان کیا کرتے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو ان میں جو پوشیدہ ہیں وہ بھی اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے اور اس بات کو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کی تم سند نہ رکھو۔

خاصیت: یہ آیت زہر و چشم و بدو سحر کے دفع کیلئے مفید ہے جو شخص اس کو انگور سبز کے عرق اور زعفران سے لکھ کر اولے کے پانی سے دھو کر غسل کرے چشم بد اور جادو اس سے دفع ہو اور جو کھانے میں ملا کر کھائے تو زہر سے مامون رہے اور سحر اور نظر بد سے بھی۔

۳۔ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُم مُّوسَى الْقُوا مَا أَنْتُمْ مُفْلِقُونَ ﴿۱۳﴾ فَلَمَّا الْقَوْأ قَالَ مُوسَى مَا جِئْتُمْ بِهِ
لِتَسْحَرُوا بِإِنَّ اللَّهَ سَبَّاطِلَةٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يَصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۴﴾ (پارہ ۱۱، رکوع ۱۳)

ترجمہ: سو جب وہ آئے (اور موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا) موسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے فرمایا کہ ڈالو جو کچھ تم کو (میدان میں) ڈالنا ہے سو جب انہوں نے (اپنا جادو کا سامان) ڈالا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ تم (بنا کر) لائے ہو جادو ہے۔ یعنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اس (جادو) کو ابھی درہم برہم کئے دیتا ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے فساد یوں کا کام بننے نہیں دیتا۔

خاصیت: سخت جادو کے دفع کرنے کیلئے نافع ہے ایک گھڑا بارش کے پانی کالے کر ایسی جگہ سے جہاں برسنے کے وقت کسی کی نظر نہ پڑی ہو اور ایک گھڑا ایسے کنوئیں کے پانی کالے جس میں سے کوئی پانی نہ بھرتا ہو پھر جمعہ کے روز ایسے درختوں کے سات پتے لے جن کا پھل نہ کھایا جاتا ہو۔ پھر دونوں پانی ملا کر اس میں ساتوں پتے ڈال دے پھر ان آیتوں کو کاغذ پر لکھ کر اس پانی سے دھو کر مسور کو کنارہ دریا پر لے جا کر پانی میں اس کو کھڑا کر کے رات کے وقت اس پانی سے اس کو غسل دیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ سحر باطل ہو جائے گا۔

وسوسہ شیطانی

۱۔ وَإِنَّا نَنزَّلُكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْرًا فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳﴾ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا
مَتَّحُوا ظَهْرَهُمُ مِنَ الشَّيْطَانِ تَدَاكَّرُوا فَادَا لَهُمْ مُبْصِرُونَ ﴿۱۴﴾ (پارہ ۹، رکوع ۱۳)

ترجمہ: اور اگر آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔ بلاشبہ وہ خوب سننے والا ہے۔ یقیناً جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکا یک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

خاصیت: جس کو وساوس اور خطرات و خیالات فاسدہ اور لرزہ قلب نے عاجز کر دیا ہو۔ ان آیات کو کلام وزعفران سے جمعہ کے روز طلوع شمس کے وقت سات پرچوں پر لکھ کر ہر روز ایک پرچہ نکل جائے اور اس پر ایک گھونٹ پانی کاپی لے انشاء اللہ تعالیٰ دفع ہو جائے گا۔

فائدہ: احادیث میں آیا ہے کہ وسوسہ کے وقت اَمَنْتُ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ کہے یا اَعُوذُ بِاللَّهِ پڑھ کر بائیں جانب تین مرتبہ تھکارنا آیا ہے۔ اَمَنْتُ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ پڑھے اس سے کسی کو نجات نہیں ہوتی اس کا غم نہ چاہیے۔ یا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ بکثرت پڑھے۔ ابوسلیمان وارانہ نے عجیب تدبیر بتلائی ہے کہ جب وسوسہ آئے خوب خوش ہو۔ شیطان کو مسلمان کا خوش ہونا سخت ناگوار ہے وہ پھر وسوسہ نہ ڈالے گا۔

سُورَةُ النَّاسِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلَهِ النَّاسِ ۝

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي

صُدُورِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

جادو کی کاٹ کے لئے معوذتین کا عمل

۱- قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تین تین بار پانی پر دم کر کے مریض کو پلاویں اور زیادہ پانی پر دم کر کے اس پانی میں نہلا دیں اور یہ دعا چالیس روز تک روزمرہ چینی کی تشری پر لکھ کر پلایا کریں۔ یا خبی حین لا حی فی ذیمومۃ ملکہ وبقائہ یا خبی انشاء اللہ تعالیٰ جادو کا اثر جاتا رہے گا اور یہ دعا ہر اس بیمار کے لئے بھی بہت مفید ہے جس کو حکیموں نے جواب دیدیا ہے۔

۲- اکثر عوام اور خصوصاً عورتیں چچک (اسی طرح بعض اور امراض) کے علاج کرانے کو برا سمجھتی ہیں۔ اور بعض عوام اس مرض کو بھوت پریت کے اثر سے سمجھتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔

۳- بعض عوام سمجھتے ہیں کہ جو کوئی قل اعوذ برب الناس کا وظیفہ پڑھے اس کا ناس ہو جاتا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ بلکہ اس کی برکت سے تو وہ مصیبتوں سے نجات پاتا ہے۔

۴- اور بعض عوام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر جمعرات کی شام کو مردوں کی روہیں اپنے اپنے گھروں میں آتی ہیں، اور ایک کونے میں کھڑی ہو کر دیکھتی ہیں کہ ہم کو کون ثواب بخشا ہے؟ اگر کچھ ثواب ملے گا تو خیر، ورنہ مایوس ہو کر لوٹ جاتی ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ (اغلاط العوام)

بِسْمِ اللَّهِ

رسالة و جيزة و مفيدة في ربط الآيات

سبق الغايات في نسق الآيات

تأليف

حضرت مكيم الأنت مجذو الملت جامع الكلمات منبع الحسنات ماهر العلوم القرآنية واقف الأسرار الفرقانية،
رئيس المفسرين مقدم الراسخين صاحب الشريعة والطريقة، بحر المعرفة والحقيقة كاشف الأسرار النفي منها والجلي اعنوس به

مولانا محمد اشرف علي الشهانوي

نور الله مرقدة ومعمل الجنة مشواه

سورة الزخرف

قال المسكين افتتح الله هذه السورة باثبات النبوة باثبات كون القرآن منزلا من الله تعالى مع الوعيد للمنكرين ولئن سألتهم الخ قال المسكين اثبات للتوحيد مع الاشارة الى البعث اثرا اثبات النبوة وجعلوا له من عباده الخ توبيخ على اشراكهم باثبات الجزء له تعات و اثبات البنات له تعات لاسما جعل الملائكة بنات له وقالوا الوشاء الرحمن الخ اعلم انه تعالى حكى اخر من كفرهم وشبهاتهم و اذ قال ابراهيم الخ اعلم انه تعالى لما بين في الآية انه ليس لاولئك الكفار داع يدعوهم الى تلك الاقاريل الباطلة الاتقليد الابهاء والاسلاف ثم بين انه طريق باطل ومنهج فاسدو ان الرجوع الى الدليل لولي من الاعتماد على التقليد اردو به هذه الآية والمقصود منها ذكر وجه اخريدل على فساد القول بالتقليد و تقريره انه تعالى حكى عن ابراهيم عليه السلام انه تبرع عن دين ابيه ه

كان خاتمة السورة التي قبلها في اثبات التوحيد والنبوة فكذا فاتحة هذه السورة في

اثبات الامرين ۱ ۲ منه عفى عنه

بناء على الدليل ثم قال تعالى بل تمتع هؤلاء الخ وجه النظم انهم لما عولوا على تقليد الابهاء ولم يتفكروا في الحجة اغتروا بطول الامهال وامتاع الله اياهم بنعيم الدنيا فاعرضوا عن الحق وقالوا لولا نزل هذا القرآن الخ اعلم ان هذا من كفرياتهم التي حكاها الله تعالى عنهم في هذه السورة ثم ابطل الله تعالى هذه الشبهة ولولا ان يكون الخ اعلم انه تعالى اجاب عن الشبهة التي ذكروها بناء على تفضيل الغنى على الفقير وهو انه تعالى بين ان منافع الدنيا و طيباتها حقير خسيصة عند الله. و من يعش عن ذكر الرحمن الخ المراد منه التبيه على افات الدنيا و ذلك ان من فاز بالمال والجاه صار كالا عشى عن ذكر الله و من صار كذلك صار من جلساء الشياطين الضالين المضلين افانت تسمع الصم الخ اعلم انه تعالى لما و

صفهم فى الآية المتقدمة بالعشى و صفهم فى هذه الآية بالصم والعمى فاما نذهب بك الخ اعلم ان هذا الكلام يفيد كمال التسلية للرسول عليه السلام لانه تعالى بين انهم لا تترفهم دعوة والياس احدى الراحين ثم بين انه لا بدو ان ينتقم لاحله منهم اما حال حياته او بعد وفاته و ذلك ايضا يوجب التسلية فبعدها امره ان يتمسك بما امره الله تعالى فقال فاستمسك بما اوحى اليك الخ و لما بين تاثير التمسك بهذا الذين فى منافع الدين بين ايضا تاثيره فى منافع الدنيا فقال و انه لذكر لك الخ و اعلم ان السبب الاقوى فى انكار الكفار لرسالة محمد صلى الله عليه وسلم و لبغضهم له انه كان ينكر عبادة الاصنام فبين تعالى ان انكار عبادة الاصنام ليس من خواص دين محمد صلى الله عليه وسلم بل كل الانبياء و الرسل مطبقين على انكاره فقال و اسأل من ارسلنا الخ قوله تعالى و لقد ارسلنا موسى الخ اعلم ان المقصود من اعادة قصة موسى عليه السلام و فرعون فى هذا المقام تقرير بر الكلام الذى تقدم و ذلك لان كفار قريش طعنوا فى نبوة محمد صلى الله عليه وسلم بسبب كونه فقيرا عديم المال والجاه فبين الله تعالى ان موسى عليه السلام بعد ان اورد المعجزات القاهرة الباهرة التى لا يشك على صحتها عاقل اورد فرعون عليه هذه الشبهة التى ذكرها كفار قريش ولما ضرب ابن مريم الخ قال المسكين حكاية لقصة عيسى عليه السلام اثر قصة موسى عليه السلام و المقصود تقرير امر التوحيد ببيان كونه عليه السلام عبدا و الجواب عن الشبهة التى تمسك بها النصارى من كون خلقه ابداع بيان كون الملائكة فى خلقهم ابداع و كونهم مع ذلك عباد الله تعالى مقهورين مسخرين قابلين لتصرفه تعالى فيهم مع الاشارة فى اثناء الكلام الى صحة البعث بكونه عليه السلام علامة لها اما بنزوله شرط من اشراطها او بحدوثه بغير اب او باحيائه الموتى و التصريح بمجيئه عليه السلام بالبينات والتوحيد و وعيد المنكرين بعذاب اليوم الاليم و وقوع الساعة بهم بغتة الاخلاء يومئذ الخ اعلم انه تعالى لما قال هل ينظرون الخ ذكر عقبه بعض ما يتعلق باحوال القيامة ان المجرمين فى عذاب الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الوعد اذ دفعه بالوعد على الترتيب المستمر فى القرآن قل ان كان للرحمن ولد الخ قال المسكين عود الى تقرير التوحيد مع الوعد للمشركين و تسلية عليه السلام الى اخر السورة.

سورة الدخان

حم والكتب المبين الخ اعلم ان المقصود منها تعظيم القران من ثلثة اوجه احدها بيان تعظيم القران بحسب ذاته الثاني بيان تعظيمه بسبب شرف الوقت الذي نزل فيه الثالث بيان تعظيمه بحسب شرف منزله ثم انه تعالى اراد ان يكونوا موقنين بقوله بل هم في شك يلعبون وان اقرارهم غير صادر عن علم و يقين فارتقب يوم تأتي السماء الخ قال المسكين بيان لوعيد المصرين على الكفر ولقد فتنا قبلهم الخ اعلم انه تعالى لما بين ان كفار مكة مصرون على كفرهم بين ان كثيرا من المتقدمين كانوا كذلك فبين حصول هذه الصفة في اكثر قوم فرعون ولقد نجينا الخ اعلم انه تعالى لما بين كيفية اهلاك فرعون و قومه بين كيفية احسانه الى موسى و قومه ان هؤلاء يقولون الخ رجع الى الحديث الاول و هو كون كفار مكة منكرين للبعث ولما حكى الله عنهم ذلك قال اهم خيرا م قوم تبع الخ والمعنى ان كفار مكة لم يذكروا في نفى الحشر والنشر شبهة حتى

يحتاج الى الجواب عنها ولكنهم اصرروا على الجهل فهذا السبب اقتصر الله تعالى على الوعيد فقال ان سائر الكفار كما نوا اقوى من هؤلاء ثم ان الله تعالى اهلكهم فكذلك يهلك هؤلاء ثم انه تعالى ذكر الدليل القاطع على صحة القول بالبعث والقيمة فقال و ما خلقنا السموات الخ ولولم يحصل البعث لكان هذا الخلق لعبا و عبثا ان يوم الفصل الخ اعلم ان المقصود من قوله و ما خلقنا السموات الخ اثبات القول بالبعث والقيمة لاجرم ذكر عقبه قوله ان يوم الفصل الخ ان المتقين في مقام الخ اعلم انه تعالى لما ذكر الوعيد في الآيات المتقدمة ذكر الوعد في هذه الآيات ولما بين الله تعالى الدلائل و شرح الوعد والوعيد قال فانما يسرناه بلسانك الخ والمعنى انه وصف القران في اول هذه السورة بكونه كتابا مبينا اي كثير البيان والفائدة وذكر في خاتمتها ما يؤكد ذلك فارتقب الخ قال المسكين هو تسليلة له عليه السلام اي ليس عليك الا البلع لما نزل عليك و امر الانتقام الينا فليس لك الا الانتظار

لما ختم السورة السابقة بتقرير التوحيد بدء هذه بتعظيم القران الدال على النبوة ولا يخفى تعانق التوحيد والنبوة ۱۲ منه عفى عنه

سورة الجاثية

قال المسكين افتتح الله هذه السورة بسرد الآيات التكوينية و شرف الايات التنزيلية الى قوله فباي حديث بعده الخ ويل لكل افاك الخ اعلم انه تعالى لما بين الآيات للكفار وبين انهم باي حديث بعده يؤمنون اذالم يؤمنوا بها مع ظهورها اتبعه بو عيد عظيم لهم الله الذي سخر الخ قال المسكين عود الى ذكر بعض الآيات التكوينية قل للذين امنوا الخ اعلم انه تعالى لما علم دلائل التوحيد والقدرة والحكمة اتبع ذلك بتعليم الاخلاق الفاضلة والافعال الحميدة قال المسكين لما اصر الكفار على الكفر بعد اقامة الدلائل القاطعة غاظ المؤمنون عليهم فامر الله تعالى بالمغفرة وتوكيل امورهم الى الله تعالى ولقد اتينا بنى اسرائيل الخ اعلم انه تعالى بين انه انعم بنعم كثيرة على بنى اسرائيل مع انه حصل بينهم الاختلاف على سبيل الغي والحسد والمقصود ان يبين ان طريقة قومه كطريقة من تقدم ولما بين تعالى انهم اعرضوا عن الحق لاجل

البغى والحسد امر رسوله صلى الله عليه وسلم بان يعدل عن تلك الطريقة و ان يتمسك بالحق و ان لا يكون له غرض سوى اظهار الحق و تقرير الصدق فقال تعالى ثم جعلناك على شريعة الخ و لما بين الله تعالى هذه البيانات الباقية النافعة قال بهذا بصائر للناس و لما بين الله تعالى الفرق بين الظالمين و بين للمتقين من الوجه الذي تقدم بين الفرق بينهما من وجه اخر فقال ام حسب الذين قوله تعالى و خلق الله السموات الخ اعلم انه تعالى لما افتي بان المؤمن لا يساوى الكافر في درجات السعادات اتبعه بالدلالة الظاهرة على صحة هذه الفتوى فقال و خلق الله السموات والارض بالحق و لو لم يوجد البعث لما كان ذلك بالحق بل كان بالباطل لانه تعالى لما خلق الظالم وسلطه على المظلوم الضعيف ثم لا ينتقم للمظلوم من الظالم كان ظالما ولو كان ظالما لبطل انه خلق السموات والارض بالحق ثم عاد تعالى الى شرح احوال الكفار و قبائح طرائقهم

ل كان المذكور في اخر الاولى امر التبليغ فذكر في اول هذه الاخرى ما يلفه من الآيات منه عفى عنه

فقال افرأيت من اتخذ الخ واعلم انه تعالى حكي عنهم بعد ذلك سبهتهم في انكار
القيامة في قوله تعالى و قالو اما هي الاحيانا الخ و اعلم انه تعالى لما احتج بكونه قادرا
على الاحياء في المرة الاولى و على كونه قادرا على الاحياء في المرة الثانية في الايات
المتقدمة عم الدليل فقال ولله ملك السموات الخ ولما بين تعالى امكان القول بالحشر
والنشر بهذين الطريقتين ذكر تفاصيل احوال القيامة ولما تم الكلام في هذه المباحث
الشريفة الروحانية ختم السورة بتحميد الله تعالى فقال فلله الحمد رب السموات الخ

سورة الاحقاف

خم تنزيل الكتاب الخ اعلم ان نظم اول هذه السورة كنظم اول سورة الجاثية وما خلقنا السموات الخ هذا يدل على اثبات الاله لهذا العالم و يدل على ان القيمة حق قل ارانتم ما تدعون الخ قال المسكين ابطال لمذهب عبدة الاصنام اثرا ثبات التوحيد و اذا تلى عليهم الخ اعلم انه تعالى لما تكلم في تقرير التوحيد و نفى الاضداد والانداد تكلم في النبوة قل ما كنت بدعا من الرسل الخ حكى عنهم نوعا اخر من الشبهات وهو انهم كانوا يقترحون منه معجزات عجيبة قاهرة و يطالبونه بان يخبرهن المغيبات فاجاب الله تعالى عنه و قال الذين كفروا الخ هذه شبهة اخرى للقوم في انكار نبوة محمد صلى الله عليه وسلم و من قبله كتاب موسى الخ قال ابو السعود هولرد قولهم هذا افك قديم و ابطاله بان كونه مصلدا لكتاب موسى مقرر لحقية قطعا ان الذين قالو الخ اعلم انه تعالى لما قرر دلائل التوحيد والنبوة وذكر شبهات المنكرين و اجاب عنها ذكر بعد ذلك طريقة المحققين و المحققين و اعظم انواع هذا النوع الاحسان الى الوالدين لاجرم اردفه بهذا المعنى فقال تعالى و وصينا الانسان الخ قوله والذي قال لوالديه الخ اعلم انه تعالى لما وصف الولد البار بوالديه في الآية المتقدمة وصف الوالد العاق بوالديه في هذه الآية و ذكر من صفات ذلك الولد انه بلغ في العقوق الى حيث لمادعاه ابواه الى الدين الحق و هو الاقرار بالبعث والقيامة اصرا على الانكار و ابى واستكبر و عول في ذلك الانكار على شبهات خسية و كلمات و اهية و لكل درجات الخ عائد الى الفريقين والمعنى و لكل واحد من الفريقين درجات في الايمان والكفر و الطاعة والمعصية و يوم يعرض الذين كفروا الخ لما بين الله تعالى انه يوصل حق كل احد اليه بين احوال اهل العقاب و اذكر اخاعد الخ اعلم انه تعالى لما اوردانواع الدلائل في اثبات التوحيد والنبوة و كان اهل مكة بسبب

كان حاتمة الجاثية في اثبات المعاد و فاتحة الاحقاف في اثبات التوحيد و هما متقارنان في القرآن ۱۲ مه عمره عنه

استغفر اقمهم في لذات الدنيا والشعالمهم بطلها اعرضوا عنها و لم يلتفتوا اليها و لهذا السبب قال تعالى في حقهم اذ هبتم طياتكم في الحياة الدنيا فلما كان الامر كذلك بين ان قوم عاد كانوا اكثر اموالا و قوة و جاهها منهم ثم ان الله تعالى سلط العذاب عليهم بسبب شوم كفرهم فذكر هذه القصة ههنا ليعتبر بها اهل مكة و لقد اهلكنا ما حو ما لكم قال المسكين اخذ من الكبير اشارة الى قصة اقوام اخرى من قوبيه عاد و ثمود باليمن و الشامرو اذ صرفنا اليك الخ اعلم انه تعالى لما بين ان في الانس من امن و فيهم من كفريين ايضا ان الجن فيهم من امن و فيهم من كفروا و مؤمنهم معرض للشواب و كافرهم معرض للعقاب اولم يروا الخ الى ههنا قدتم الالكلام في التوحيد و في النبوة ثم ذكر عقبيهما تقرير مسئلة المعاد و من تأمل في هذا البيان علم ان المقصود من كل القران تقرير التوحيد و النبوة و المعاد و اما القصص فالمراد من ذكرها ما يجرى مجرى ضرب الامثال في تقرير هذه الاصول فاصبر كما صبر الخ اعلم انه تعالى لما قرر المطالب الثلاثة و هي التوحيد و النبوة و المعاد و اجاب عن الشبهات اردفه بما يجرى مجرى الواعظ و النصبحة للرسول صلى الله عليه وسلم

سورة محمد صلى الله عليه وسلم

الذين كفروا الخ اول هذه السورة مناسب الأخر السورة المتقدمة فان آخرها قوله تعالى فهل يهلك الخ فان قال قائل كيف يهلك الفاسق وله اعمال سالحة كا طعام الطعام وصلة الارحام وغير ذلك قال تعالى الذين كفروا الخ اى لم يبق لهم عمل ولم يوجد فلم يمتع الاهلاك والذين امنوا الخ لما بين الله تعالى حال الكفار بين حال المؤمنين ذلك بان الذين كفروا الخ قال المسكين تعليلا للحكمين فاذا القيتم الذين كفروا الخ لما بين ان الذين كفروا اضل الله اعمالهم واعتبار الانسان بالعمل و من لم يكن له عمل فهو هامج فان صار مع ذلك يوذى حسن اعدامه فاذا القيتم بعد ظهور ان لا حرمة لهم و بعد ابطال عملهم فاضربوا اعناقهم قال المسكين ثم رغب بقوله ان تنصروا الله ينصركم الخ فى القتال ثم علل اباحة القتال بقوله ذلك بانهم كرهوا الخ ثم ذكر للعبارة عقوبة الكفار السابقين بقوله فلم يسيروا الى الارض الخ للدفع استبعاد مشروع عية عقوبتهم بالقتال ثم علل بقوله ذلك بان الله مولى الذين امنوا الخ كون المؤمنين غاليين و كون الكفار مغلوبين ان الله يدخل الخ لما بين الله تعالى حال المؤمنين والكافرين فى الدنيا بين حالهم فى الآخرة و كاي من قرية الخ لما ضرب الله تعالى لهم مثلاً بقوله فلم يسيروا ضرب للنبي صلى الله عليه وسلم مثلاً تسلية له افمن كان على بينة الخ قال ابو السعود تقرير لتباين حالى فريق المؤمنين والكافرين و كون الاولين فى اعلى عليين والاخرين فى اسفل سافلين و بيان لعدة مالكل منهما من الحال مثل الجنة التى الخ لما بين الفرق بين الفريقين فى الاهتداء والضلال بين الفرق بينهما فى مرجعها و مالهما و منهم من يستمع الخ لما بين الله تعالى حال الكافر ذكر حال المنافق بانه من الكفار والذين اهدوا الخ لما بين الله تعالى ان المنافق يستمع ولا ينتفع و يستبعد ولا يستفيد بين ان حال المؤمن المهتدى بخلافه فهل ينظرون الخ قال المسكين و عيد للكفار والمنافقين فاعلم انه لا اله الا هو الخ قال

ابو السعود ای اذا علمت ان مدار السعادة هو التوحيد و الاطاعة و مناط الشقاوة هو الاشراك
 و العصيان فاثبت على ما انت عليه من العلم بالواحدانية و العمل بموجب و يقول الذين
 امنوا الخ لعابین الله حال المنافق و الكافر و المهتدی المؤمن عند استماع الآيات العلمية
 من التوحيد و الحشر و غیرهما بقوله و منهم من يستمع اليك و قوله و الذين اهتموا ازادهم
 هدی بین حالهم فی الآيات العلمية فان المؤمن كان ينتظر ورودها و يطلب تزیلها و اذا اخرجته
 التكليف كان يقول هلا امرت بشيء من العبادة خوفا من ان لا يؤهل لها و المنافق اذا نزلت
 السورة و الآية و فيها تكليف شق عليه فهل عسىتم الخ قال المسكين اخذ من ابی السعود
 تفريع على اعراضهم و تقاعد هم عن الجهاد ضعفا في الدين و حرصا على الدنيا و تقريره
 ان الجهاد احراز كل خير و صلاح و دفع كل شر و فساد فلما اعرضتم عنه و انتم مأمورون و
 شانكم الطاعة و القول المعروف فالمتوقع منكم اذا اطلقت اعتكم و صرتم امرين الافساد
 و قطع الارحام اولئك الذين لعنهم الخ قال المسكين و عيد للمتصفين بالاوصاف المذكورة
 لم امتلذذوا هؤلاء المنافقين الى قوله تعالى نبلوا اخباركم ان الذين كفروا الخ قال المسكين
 ذم لكفار اهل الكتب الرذم المشركين و المنافقين او عود الى ذم المشركين هما قولان
 يابها الذين امنوا الخ قال المسكين نهى للمؤمنين عن ان يكونوا امثال هؤلاء المذكورين
 ان الذين كفروا و صلوا الخ قال المسكين من تنمة حال الكفار فلا تهنوا الخ قال ابو السعود
 الفاء لترتيب النهي على سبق من الامر بالطاعة انما الحياة الدنيا الخ قال المسكين ترغيب
 في بدل الاموال اثر الترغيب في بدل النفوس فيمن حقايرة الدنيا و انه تعالى لا يسألکم جميع
 اموالکم لتبخلوا و انما يقتصر على نلر يسير منها و تدعون الى انفاقه فان بخلتم فانما تضرون
 انفسکم ثم ختم سورة ببيان استغناءه تعالى عن الاموال و الانفس بقوله و ان تتولو الخ

سورة الفتح

قال المسكين ذكر الله تعالى في هذه السورة قصة الحديدية و ماروعى فيها من الحكم
 و المصالح مع البشارات للمؤمنين و التهديدات للكافرين و المنافقين و هذه خلاصة السورة
 كلها متعانقة بعضها ببعض و لما كان وجه الارتباط جليا غير خفى لم يحتج الى التفصيل
 فما ذكرنا من الاجمال كاف لمن يتدبر ادنى تدبر ان شاء الله تعالى و كلما اكثر السور من
 ههنا الى اخر القرآن فافهم و تفكر و لا تهتم و لا تتحير و العون من الله تعالى

سورة الحجرات

قال المسكين هذه السورة فيها ارشاد للمؤمنين الى مكارم الاخلاق و حسن الادب
والمعاشرة مع الرسول صلى الله عليه وسلم و مع اخوانهم المؤمنين فالنصف الاول في
ادب الرسول والنصف الثاني في ادب الاخوان فتفكر

سورة ق

قال المسكين هذه السورة كلها فيها تقرير مسئلة المعاد و اقامة الدلائل عليها و بيان
ما يتعلق بها فتدبر

سورة الذاريات

قال المسكين هذه السورة ايضا فيها تقرير المعاد و ما يعود اليه حال الكافرين
والمؤمنين ولتهديد المكذبين ذكر بعض القصص و ختم السورة لتوحيد و عيد
المنكرين له وللحشر و غيره.

سورة الطور

هذه السورة مناسبة للسورة المتقدمة من حيث الافتتاح بالقسم و بيان الحشر و اول
هذه السورة مناسب لآخر ما قبلها لان في اخرها قوله تعالى فويل للذين كفروا وهذه السورة
في اولها فويل يومئذ للمكذبين و في اخر تلك السورة قال فان للذين ظلموا اذنوا بالاشارة
الى العذاب وقال هنا ان عذاب ربك لواقع قال المسكين ان نصف السورة في بيان الحشر
و نصفها في رفع شبهات الكفار في صدق ما جاء به النبي صلى الله عليه وسلم من النبوة
والمعاد لان رفع الشبهات يؤيد وقوع الحشر ثم ختم السورة بالاخبار عن يوم الحشر
حيث قال فذرهم حتى يلاقوا النخ

سورة النجم

قال المسكين هذه السورة لها اجزاء في الجزء الاول و هو من اولها الى قوله لقد
راى من آيات ربه الكبرى اثبات النبوة و في الجزء الثاني الى قوله و هو اعلم بمن اهتدى

بيان التوحيد والاعراض عن اهل الشرك و توكيل امر هو الى الله تعالى و فى الجزء الثالث اخر السورة بيان جزاء الاعمال و قيام الساعة فاشتملت السورة الاصول الثلاثة التى هى ام مقاصد القران التوحيد والرسالة والحشر فتبصر

سورة القمر

قال المسكين مقصود السورة الاخيار عن وقوع الساعة و علامتها و ذم المكذبين بها و بعض قصص المكذبين للاعتبار فتدبر

سورة رحمن

اعلم اولان مناسبة هذه السورة لما قبلها بوجهين احدهما ان الله تعالى افتتح السورة المتقدمة بذكر معجزة تدل على العزة والجبروت والهيبة وهو انشقاق القمر فان من يقدر على شق القمر يقدر على هدا الجبال وقد الرجال وافتتح هذه السورة بذكر معجزة تدل على الرحمة والرحموت وهو القران الكريم فانه شفاء القلوب بالصفاء عن الذنوب ثانيهما انه تعالى ذكر فى السورة المتقدمة فكيف كان عذابي و نذر غير مرة و ذكر فى هذه السورة فباى الاء ربكما تكذبان مرة بعد مرة لما بينا ان تلك السورة سورة اظهار الهيبة وهذه السورة سورة اظهار الرحمة ثم ان اول هذه السورة مناسب لاخر ما قبلها حيث قال فى اخر تلك السورة عند مليك مقتدر والاقتدار الاشارة الى الهيبة والعظمة وقال ههنا الرحمن اى عزيز شديد منتقم مقتدر بالنسبة الى الكفار والفجار رحمن منعم غافر للابرار . قال المسكين جزء الله تعالى هذه السورة ثلاثة اجزاء الاول فى تعداد النعم الدنيوية الى قوله وله الجوار المنشنت فى البحر كالا علام الجزء الثانى فى النقم الاخروية للكافر و هى نعم باعتبار التنبيه على ماسيلقونه يوم القيامة للتحذير عما يؤدى الى سوء الحساب والجزء الثالث و هو من قوله و لمن خاف مقام ربه الى اخر السورة فى بيان النعم الاخر و بة للمؤمنين فطرفا السورة فى ذكر النعم ووسطها فى بيان النقم ولما كان للاكثر حكم الكل سيما اذا كان ذكر النقم فيه لطف و نعمة ببيان عاقبة ما هم عليه كانت السورة كلها مظهر الحضرة الجمال و من ثم سماها رسول الله صلى الله عليه وسلم عروس القران فتامل ولا تعطل

سورة الواقعة

اما تعلق هذه السورة بما قبلها فذلك من وجوه احدها ان تلك السورة مشتملة على تعليد النعم على الانسان و مطالبة بالشكر و منعه عن التكذيب كما مر وهذه السورة مشتملة على و كرا الجزاء بالخير لمن شكرو بالشكر من كذب و كفر ثانيا ان تلك والسورة متضمنة للتهيئات بذكر الألاء في حق العباد و هذه السورة كذلك لذكر الجزاء في حقهم يوم التناد ثالثا ان تلك السورة سورة اظهار الرحمة و هذه السورة سورة اظهار الهيبة على عكس تلك السورة مع ما قبلها و اما تعلق الاول بالآخر ففي اخر تلك السورة اشارة الى الصفات من باب النفس

سورة الحديد

قال المسكين اول هذه السورة في التوحيد الى قوله و هو عليم بذات الصدور و اوسطها في ترغيب اعمال الخير الاصلية و الفرعية من الايمان و الانفاق و ما للعاملين من كل صنف من البشارات و الانذار و تحقير الدنيا نعمها و نقمها و تعظيم حال الآخرة ليسهل السعى في الآخرها في اثبات مسئلة الرسالة و ذكر بعض الرسل المتقدمين و امهم و هو من قوله و لقد رسلنا الى خاتمه السورة و الله اعلم .

سورة المجادلة

قال المسكين كان مقصود السورة بيان احاطة علمه تعالى باحوال المنافقين فان اكثرها يشتمل عليها و ذكر سماع المجادلة تمهيد له اى لا يخفى على الله تعالى نجوى موافق و لا منافق فتدبر و لا تحير

سورة الحشر

قال المسكين خلاصة السورة ذكر قصة بنى النضير و اخوانهم من المنافقين و ختم السورة بارشاد المؤمنين الى ان لا يكونوا امثالهم للفتاوت بين المطيع و المعاصي بل
 ۱- وجه المناسبة بين السورتين المذكور في المن بوجه ۱۲ منه عفى عنه

ليتقوا الله الذي هو متصف بصفات الجلال و الجمال

سورة الممتحنة

قال المسكين حاصل السورة النهى عن الاحتلاط مع المشركين بالتزوج والتناكح
فتناسب ما قبلها لان فيه التقاطع عن اهل الكتاب

سورة الصف

قال المسكين كان المذكور في السورة السابقة الامر بمخالفة الكفار و في هذه
الامر بمقاتلتهم والوعد بالثواب عليها

سورة الجمعة

قال المسكين اول السورة في البات التوحيد والرسالة والالزام على بعض منكرى
الرسالة و آخرها في النهى عن الانهماك في الدنيا لانه الموجب لاختلاط الكفار و هو
المانع عن المخالفة والمقاتلة والاعراض عن الدنيا هو المكمل لاعتقاد التوحيد والنبوة

سورة المنافقون

وجه تعلق اول هذه السورة بما قبلها هو ان تلك السورة مشتمله على ذكر بعثة الرسول
صلى الله عليه وسلم و ذكر من كان يكذبه قلبا ولسانا بضرب المثل كما قال مثل الذين
حملوا التوراة و هذه السورة على ذكر من كان يكذبه قلبا دون اللسان و يصدقه لسانا
دون القلب و اما الاول بالآخرة فذلك ان في آخر تلك السورة تنبيها لاهل الايمان
على تعظيم الرسول صلى الله عليه وسلم و رعاية حقه بعد النداء لصلوة الجمعة و تقديم
متابعة في الاداء على غيره و ان ترك التعظيم والمتابعة من شيم المنافقين والمنافقون
هم الكاذبون كما قال في اول هذه السورة قال المسكين و ختم السورة بالنهى للمؤمنين
عن ان يكونوا كالمنافقين في الهاء اموالهم و اولادهم عن ذكر الله والاخلاص له

سورة التغابن

قال المسكين خلاصة السورة التوحيد والرسالة والبعث والتوجه الى الله تعالى بالتوكل والاعراض عما يلهي كآخر ما قبلها

سورة الطلاق

قال المسكين لماذا ذكر فيما قبل من عداوة الازواج ذكرهنا حقوقهن لنلا يفرط فيها ثم نبه في الركوع الثاني ان الله تعالى في المعاملات الدنيوية ايضا واجب الامثال لا كزعم بعض الجهلة

سورة التحريم

اما التعلق بما قبلها فذلك لا شتر اكهما في الاحكام المخصصة بالنساء قال المسكين امر الازواج المطهرات ان لا يكن للعامة عداوت البعل اى بعل و ليخفن الطلاق ان فعلم ذلك فنا سبت السورة سورة التغابن والطلاق

سورة الملك

قال المسكين فيها بيان التوحيد والجزاء على التصديق والتكذيب

سورة النون

قال المسكين ملخص السورة في اثبات الرسالة والجزاء على التصديق والتكذيب

سورة الحاقة

قال المسكين خلاصة السورة بيان يوم القيمة و حقيقة القران الجاءى به

سورة المعارج

قال المسكين فيها ذكر الحشر و موجبات الثواب والعذاب

سورة نوح عليه السلام

قال المسكين خلاصة السورة بيان جزاء من يكذب الرسل في ضمن قصة نوح عليه السلام

سورة الجن

قال المسكين خلاصة السورة التنبيه على ان الجن النارين المستكبرين قداموا فما بال البشر الترابين المستصغرين لا يؤمنون وختم السورة باثبات التوحيد الذي هو اصل الايمان

سورة المزمل

قال المسكين خلاصة السورة تعليم تصفية الباطن بعد اصلاح الظاهر والامر بالابتغال الى الله تعالى والاعراض من المنكرين وتوكيل امرهم الى الله تعالى فانه يجازيهم كيف يشاء فان شغل القلب بغير الله تعالى مما يخل بالذكر و صفاء الجوهر الروحاني

سورة المدثر

قال المسكين ملخص السورة الانذار

سورة القيمة

قال المسكين ملخص السورة اثبات البعث و لعله اتفق للرسول صلى الله عليه وسلم عند نزول هذه الآيات الاستعجال بالقراءة فنهى عند و على قول القفال قوله تعالى لا تحرك النخ

خطاب مع الانسان يوم القيمة وقت قراءة كتاب اعماله فيكون من متعلقات البعث

سورة الدهر

قال المسكين ملخصها اثبات جزاء الاعمال فكانه مناسب لقوله ايحسب الانسان ان يترك سدى لايجزى على الاعمال

سورة المرسلات

قال المسكين خلاصتها بيان ما يقع يوم القيامة وه ايتبعها

سورة النبأ

قال المسكين فيها ايضا احوال القيمة

سورة النزعت

قال المسكين فيها ايضا اثبات البعث اما وجه المناسبة بين قصة موسى عليه السلام وبين ما قبلها فعلى ما فى الكبير من وجهين الاول انه تعالى حكى عن الكفار اصرارهم على انكار البعث حتى انتهوا فى ذلك الانكار الى حد الاستهزاء فى قولهم تلك اذا كرة خاسرة و كان ذلك يشق على محمد صلى الله عليه و سلم فذكر قصة موسى عليه السلام و بين انه تحمل المشقة الكثيرة فى دعوة فرعون ليكون ذلك كالتسلية للرسول صلى الله عليه وسلم الثانى ان فرعون كان اقوى من كفار قريش و اكثر جمعا و

اشد شوكة فلما تمرد على موسى عليه السلام اخذه الله نكال الأخره والاولى فكذلك هؤلاء المشركون في تمردهم عليكم ان اصروا اخذهم الله تعالى و جعلهم نكالا

سورة عبس

قال المسكين فيها بيان احوال القيمة والامر بتذكير من يتذكر

سورة الانفطار

قال المسكين فيها اثبات البعث و بيان جزاء الاعمال والتقريع على الغفلة

سورة التطفیف

قال المسكين كان فيما قبل بيان حقوق الله تعالى و في هذه بيان حقوق الناس من اموالهم واعراضهم و بيان تعظيم يوم مكافاة الحقوق

سورة الانشقاق

قال المسكين فيها بيان الجزاء الاعمال يوم القيمة

سورة البروج

السورة وردت في تثبيت المؤمنين و تصبيرهم على اذى اهل مكة و تذكيرهم بما جرى على من قتلهم من التعذيب على الايمان حتى يقتلوا بهم و يصبروا على اذى

قومهم و يعلموا ان كفار مكة عندالله بمنزله اولئك

سورة الطارق

قال المسكين فيها بيان حفظ الاعمال والجزاء بعد البعث و كونه حقا غير هزل

سورة الاعلى

قال المسكين فيها بيان فناء الدنيا و بقاء الاخرة والامر بالتذكير به بالقران و بيان
النعم الباعثة على الاطاعة فتأمل

سورة الغاشية

قال المسكين فيها بيان القيمة والجنة والنار و الآيات الدالة على وجود الصانع
المنجى اعتقاده والمردى عناده

سورة الفجر

قال المسكين فيها ذكر جزاء المكذبين و عدم الاغترار بالدنيا الحاملة على
التكذيب و ابتازيوم الجزاء

سورة البلد

قال المسكين فيها ذم صرف القوى الى الدنيا والامر بصرفها في العقبى

سورة الشمس

المقصود من هذه السورة الترغيب فى الطاعات والتحذير من المعاصى قال المسكين لان جواب القسم على ما قال ابو السعود قوله تعالى قد افلح الخ

سورة الليل

اقسم تعالى ان اعمال عباده لشتى اى مختلفة فى الجزاء ثم بين معنى اختلاف الاعمال فيما قلناه من العاقبة المحمودة والمذمومة والثواب والعقاب

سورة الضحى

قال المسكين فيها بيان النعم على نبيه صلى الله عليه وسلم ليذهب حزنه بالتكذيب والامر باداء الشكر عليها

سورة الانشراح

قال المسكين فيها ايضا فى الاولى مع الامر بالاجتهاد فى العبادة اداء لشكر النعم

سورة التين

قال المسكين فيها بيان النعم على الانسان و شكر بعضهم عليها و كفر بعضهم بها و بيان جزاء الفريقين

اعلم ان الرازى رحمه الله تعالى اورد فى تفسير الكوثر تقرير ابوخذ منه الارتباط بين سورة الضحى الى اخر القرآن المجيد فنورده بعينه وهو هذا. ان هذه السورة كالتمة لما قبلها من السور و كالاصل لما بعدها من السور اما انها كالتمة لما قبلها من السور فلان الله تعالى جعل سورة والضحى فى مدح محمد عليه السلام و تفصيل احواله فذكر فى اول السورة ثلاثة اشياء تتعلق بنبوته (اولها) قوله ماودعك ربك و ما قلى (وثانيها) قوله و للأخرة خير لك من الاولى (وثالثها) و لسوف يعطيك ربك فترضى ثم ختم هذه السورة بذكر ثلاثة احوال من احواله عليه السلام فيما يتعلق بالدنيا و هى قوله الم يجدك يتيماً فآوى و وجدك ضالاً فهدى و وجدك عائلاً فاغنى ثم ذكر فى سورة الم نشرح انه شرفه بثلاثة اشياء (اولها) الم نشرح لك صدرك (وثانيها)

سورة العلق

قال المسكين فيها حث على الطاعة والذكر شكر النعم و ذم وردع لمن كفر بها

بطغيانه

سورة القدر

قال المسكين فيها تعظيم القرآن بتعظيم زمانه و هو احد وجوه التعظيم

سورة البينة

قال المسكين فيها تعظيم الرسول و جزاء المصدقين والمطيعين له والمكذبين

والعصاة

سورة الزلزال

انه تعالى لما قال جزاء هم عند ربهم فكان المكلف قال و متى يكون ذلك يا رب

فقال اذا زلزلت الارض قال المسكين ففيها بيان الجزاء و وقته

سورة العاديات

قال المسكين فيها بيان سكون الانسان معترف بالقال او بالحال على نفسه

باستحقاقه للجزاء لاعترافه بكونه كنودا كفوراً فلا تحكم فيه

سورة القارعة

اعلم انه تعالى لما ختم السورة المتقدمة بقوله ان ربهم بهم يومئذ لخبير فكانه قيل

و ما ذلك اليوم فقيل هي القارعة قال المسكين في هذه السورة قانون الجزاء

سورة التكاثر

قال المسكين فيها بيان ذم الغفلة عن الآخرة

سورة العصر

قال المسكين فيها بيان اسباب الخسران والربح في الآخرة

سورة الهمزة

قال المسكين فيها بيان خصال العذاب

سورة الفيل

قال المسكين هذه السورة كالدليل على ان الهمزة اللمزة الطاعن في النبي صلى الله عليه وسلم مستحق للعذاب فان الذي عذب من اهان بيته كيف يترك من اهان نبيه وهذا ماخوذ من الكبير

سورة قريش

قال المسكين فيها بيان النعمة العظيمة على قريش حيث جعلهم اهل بيت عظيم اهلك الله تعالى من اهانهم والقى حرمة في قلوب الناس

سورة الماعون

قال المسكين فيها ذم خصال الكفار والمنافقين

سورة الكوثر

قال المسكين فيها تنويه لسان الرسول صلى الله عليه وسلم و تفضيح لعدوه

سورة الكافرون

قال المسكين فيها النبذ على السواء في الدين لقطع الطمع عن التوافق فيه

سورة النصر و ابي لهب

اعلم انه تعالى قال وما خلقت الجن و الانس الا ليعبدون ثم بين في سورة قل يا ايها الكافرون ان محمدا صلى الله عليه وسلم اطاع ربه و صرح بنفى عبادة الشركاء و الاضداد و ان الكافر عصي ربه و اشتغل بعبادة الاضداد و الانداد فكانه قيل ما ثواب المطيع و ما عقاب العاصي فقال ثواب المطيع حصول النصر و الفتح و استعلاء في الدنيا و الثواب الجليل في العقبى كما دل عليه سورة اذا جاء نصر الله و اما عقاب العاصي فهو الخسار في الدنيا و العقاب العظيم في العقبى كما دلت عليه سورة تبت

سورة اخلاص

قال المسكين فيها بيان التوحيد و هو اصل الدين

سورة الفلق

قال المسكين فيها الامر بالتوكل في الحسيات

سورة الناس

قال المسكين فيها الامر بالتوكل في العقليات و التوكل هو اصل الاعمال و مدارها ف سبحانه ما اعظم شأنه كيف ختم كتابه بذكر الاصول العظيمة لان الدين كله هو الاعتقاد و العمل لا غير و الاعمال يتوقف صدورها على سلامة البدن و سلامة النفس فوجب التوكل على الله تعالى في حفظهما عن الشرور و البوائق فجمع الله تعالى العقائد الصحيحة الحققة كلها في سورة الاخلاص و امر بالتوكل في سلامة البدن في سورة الفلق

و فی سلامة النفس فی سورة الناس و بما ذکر تم امر الدین و الحمد لله رب العالمین ربنا
 اتمم لنا نورنا و اغفر لنا انک علی کل شیء قدير و بالآجابه جدير و صلی الله علی سیدنا
 محمد المبعوث بجوامع الکلم و منابع الحکم و علی جمیع الانبیاء و الرسل و اللهم و
 صاحبهم سراج السبیل ابد الابدین و دهر الداهرین

خاتمه

قدم الكتاب و الحمد لله الوهاب علی یهذا التراب فی نحو مدة شهرین و اسبوعین
 و قد فرغ منه فی يوم الخميس ثالث عشر من شهر ربیع الآخر ۱۳۱۶ھ من الهجرة فی کورة
 تهانه بهون من مضافات مظفر نگر لازالت مصونة من الفتن و ما موته من الشر و مقرنة
 بالخير و الظفر بحرمة سید البشر صلی الله علیه و علی آله و صحبه وسلم ما سارت
 الشمس و القمر .

حق تعالیٰ کی توفیق سے اشرف التفاسیر کی چوتھی اور آخری جلد بمطابق جمادی الاول ۱۳۲۰ھ ستمبر ۱۹۹۹ء
 مکمل ہوئی۔

اللهم لك الحمد كما ينبغي لجلال و جہك

عام فہم اردو تفسیر

الاولیٰ الیسین

فی کشف اسرار القرآن

تیس اور عام فہم زبان میں اردو کی سب سے پہلی مفصل اور جامع تفسیر، تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث کا خصوصی اہتمام، دلنشین انداز میں احکام و مسائل اور مواضع و فصاح کی تشریح، اسباب نزول کا مفصل بیان، تفسیر وحدیث اور کتب فقہ کے حوالوں کیساتھ

محقق العصر ^{رحمۃ اللہ علیہ} محمد عاشق الہی مہاجر مدنی
حضرت مولانا مفتی محمد عاشق الہی مہاجر مدنی

کامل 9 جلد

ادارۃ الیقاہ شرفیہ

پتہ: نوارہ ملتان، پاکستان فون: 540513

علوم قرآن کے شائقین کیلئے خوشخبری..... بیک وقت چھ تفاسیر کا مطالعہ

مصروفیت کے اس دور میں ضخیم تفاسیر کا مطالعہ بہت مشکل ہو گیا ہے اس لئے اکابر علمائے کرام اور مفتیان عظام کی آراء اور مشوروں کی راہنمائی کے تحت چھ مستند تفاسیر کے مضامین کا انتہائی معنی خیز منتخب عوام الناس اور علمائے کرام کی سہولت کیلئے یہ مجموعہ مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں ترتیب دیا گیا ہے

کامل کے جلد

گلدستہ تفاسیر

جدید
کمپیوٹر
کتابت

مع تفسیری افادات

حضرت شیخ احمد مجتہد دالغ ثانی رت
مجتہد الملت حکیم الامت حضرت تھانوی رت
حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب رت
حضرت علامہ علامہ شمس الحق افغانی رت
آخر میں 1400 سالہ مفسرین کی تاریخ

مرتب حضرت الحاج عبدالقیوم مہاجر مدنی مدظلہ العالی

اول مکمل تفسیر عثمانی * تفسیر مظہری * تفسیر عزیزی

تفسیر ابن کثیر معارف مفتی اعظم رت * معارف کاندھلوی رت

اس تفسیر کے متعلق علماء کی آراء

حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب مدظلہ العالی اس کاوش سے علماء طلباء اور عوام الناس کو بے حد نفع ہوگا

حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ فہم قرآن کے شائقین کیلئے قرآنی علوم کا گلدستہ

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی دور حاضر کی چھ شاہکار تفسیروں کا حاصل ”گلدستہ تفاسیر“

حضرت مولانا محمد موسیٰ کرما ڈی مدظلہ العالی یہ تفسیر عوام و خواص کیلئے نہایت مفید ہے

حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہ العالی یہ تفسیر اکابر کی تفاسیر کا نچوڑ ہے اور اس میں مسلک حق کی پوری پوری ترجمانی ہے

تقریباً 5000 صفحات پر مشتمل، بہترین سفید کاغذ غیر ملکی اشائل کی 7 جلدوں میں قیمت -/1995 روپے

محدود مدت کیلئے رعایتی قیمت صرف -/1100 روپے صرف فون کر کے بھی آپ وی پی منگوا سکتے ہیں ڈاک خرچہ -/100 روپے

ادارۃ تالیفات شریفہ - چوک فوارہ ملتان
فون: 540513-519240
ہر قسم کے قرآن مجید، تفاسیر اور اسلامی کتب کیلئے

پاکستان میں پہلی بار جدید کمپیوٹر کتابت کے ساتھ بڑے سائز میں

تفسیر بیان القرآن

کامل ۳ جلد
۱۴۳۴ھ

رَفْعُ الشُّكُوكِ لِرُتْبَةِ مَسَائِلِ السُّلُوكِ مِنْ كَلَامِ مَلِكِ الْمُلُوكِ

وَجُوهُ الْمَتَانِي مَعَ تَوْجِيهِ الْكَلِمَاتِ وَالْمَعَانِي (عربی)

حضرت حکیم الامت مجدد الملت جامع الکمالات منبع المسائل ماہر العلوم القرآنیۃ واقف الاسرار الفرقانیۃ،
راس الفسرين مقدم الراشدين صاحب الشریعۃ والطریقۃ، بحر العرفۃ والحققہ کاشف الاسرار الغنی منہا والجلی المعنی بہ

مولانا محمد اشرف علی التھانوی

نور اللہ مرقدہ وجعل الجنة مشواہ

تعارف و تقدیم فقہ العصر حضرت مولانا مفتی

عبد الشکور ترمذی

تفسیر بیان القرآن اور اس کے متعلقہ تمام رسائل کی جدید اشاعت کے لئے کمپوزنگ و ترتیب اس
قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ جو خود حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا نظر فرمودہ شاہے اور اس
پر حضرت کی تصدیق اور دستخط ہیں نیز حضرت مولانا بشیر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دستخط موجود ہیں
یہ نسخہ ۱۳۵۳ھ میں مطبع اشرف المطابع تھانہ بمبوں سے شائع ہوا تھا۔

ادارہ تالیفات اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان 061-540513-519240
E-mail: ishaq90@hotmail.com/Website: www.taleefat-e-ashrafia.co

**Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library**